1680/1

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

(۲)

ابن بطوطہ - ابن بیطار - ابن تومرت - ابن تیمیہ
ابن جریر - ابن جزری - ابن جماعت - ابن جوزی -
ابن حجر - ابن حزم - ابن حنبل - ابن حوقل - ابن حیات
ابن خرداذبہ - ابن خطیب - ابن خلدون - ابن خلکان
ابن رشد - ابن زبیر - ابن زہر - ابن زیاد - ابن سعد
ابن سعود - ابن سعود، عبدالعزیز - ابن سینا - ابن صیاد
ابن طباطبا - ابن طفیل - ابن طقطقی - ابن عباد - ابن عباس
ابن عبدالبر - ابن عبدالحکم - ابن عذاری - ابن عربی
ابن عساکر - ابن عسال - ابن عسکر - ابن عطار آدمی
ابن عطاء اللہ - ابن علقمی - ابن عمار - ابن عمر
ابن عوام - ابن فرح - ابن فوطی - ابن قاسم - ابن قتیبہ
ابن قدامہ - ابن قوطیہ - ابن قیم - ابن کثیر -
ابن کلبی - ابن ماجد - ابن ماجہ - ابن مسرۃ -
ابن مسعود - ابن مسکویہ - ابن معین - ابن ملجم -
ابن ندیم - ابن ہشام - ابو الاعلیٰ مودودی -
ابو البرکات - ابو البشر - ابو الحسنات -
ابو الحسن اشعری - ابو الحسن العامری - ابو الحسن علی -
ابو الحسن علی ہجویری - ابو الخیر - ابو الخیر اشبیلی -
ابو الدردا - ابو السرایا - ابو العاص - ابو العباس
سفاح - ابو الفدا - ابو الفرج - ابو الفضل، شیخ
ابو الفتاسم - ابو القاسم الزہراوی - ابو القاسم
گرگانی - ابو الکلام آزاد - ابو المعالی - ابو الوفا
ابو الہول - ابو امامہ - ابو ایوب انصاری - ابو بصیر
ابو بکر بن ظفر - ابو بکر بن عبدالرحمٰن - ابو بکر تفادی -
ابو بکر شبلی - ابو بکر صدیق - ابو بکر قندھاری -
ابو بکر وراق - ابو بکرہ - ابو تاشفین اوّل - ابو تاشفین
ثانی - ابو تراب - ابو جندل - ابو جہل - ابو حاتم -
ابو حذیفہ - ابو حفص - ابو حمو اوّل - ابو حمو ثانی -
ابو حمید مساعدی - ابو حنیفہ - ابو حنیفہ الدینوری -
ابو حیان - ابو خطاب اسدی - ابو خطاب معافری -
ابو خطار - ابو داؤد - ابو دجانہ - ابو ذر غفاری -
ابو ذویب - ابو رافع - ابو رغال - ابو زیان - ابو سرایا
ابو سعود - ابو سعید - ابو سعید ابو الخیر -
ابو سعید فضل اللہ - ابو سعید مجدّدی - ابو سفیان
ابو سلمہ - ابو طالب - ابو طلحہ - ابو عباس سفاح
ابو عبداللہ - ابو عبس - ابو عبید - ابو عبیدہ -
ابو عثمان سعید - ابو علی رودباری - ابو علی قلندر -
ابو علی کاتب - ابو فرج اصفہانی - ابو قبیس - ابو قتادہ
ابو قیس حرمہ - ابو لہب - ابو محجن - ابو محی الدین -
ابو مدین شعیب - ابو مسعود بدری - ابو مسلم
خراسانی - ابو موسیٰ اشعری - ابو نجیب سہروردی -
ابو نعیم اصفہانی - ابو ہذیل العلاف - ابو ہریرہ -
ابو یزید بسطامی - ابو یعقوب یوسف - ابو یوسف
ابو یوسف چشتی - ابو یوسف یعقوب - اتاترک -
اتحاد - اتسز - اثر الشریف - اثنا عشریہ

59586

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط (۲) وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود

مدیر: عطش دُرّانی

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۲۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

وقت کے ساتھ ساتھ

"اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کی قسط اول گذشتہ ماہ شائع ہوئی تھی [illegible] نے ہماری اس کوشش کو سراہا ہے۔ خاص و عام نے اسے پسند کیا ہے اور بالعموم ہمیں "پُرخلوص دعاؤں" سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جس علمی کاوش کے لئے پڑھنے والوں کی طرف سے دعائیں بھی دی جائیں، اس کی اہمیت و افادیت مسلّم ہے۔ اس سے ہماری بے پناہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور ہمیں اپنی اس ذمہ داری کا زیادہ شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ اس بُحران زدہ معاشرے میں علم و ادب کی لاج بہر قیمت رکھنی ہے۔

بعض اربابِ علم نے قسط اول کی غلطیوں کی نشاندھی بھی کی ہے جو زیادہ تر پروف خوانی کی غلطیاں ہیں۔ یہ غلطیاں کیوں ہوتی ہیں؟ اس کا سبب ہماری بے سروسامانی ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا" ایسے عظیم کام سرکاری ادارے انجام دیا کرتے ہیں اور ان کا عمل کچھ یوں ہوا کرتا ہے کہ پہلے بہت بڑا بجٹ بنایا جاتا ہے۔ اس بجٹ کے مطابق گرانٹ حاصل کی جاتی ہے۔ بہت بڑا دفتر لیا جاتا ہے۔ خوب صورت فرنیچر خریدا جاتا ہے، قالین بچھائے جاتے ہیں، پردے آویزاں کئے جاتے ہیں، بڑی بڑی تنخواہوں کا عملہ بھرتی کیا جاتا ہے۔ پھر انڈکس بنانے کا کام شروع ہوتا ہے۔ کئی برس اس مرحلہ اوّلین میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ایک مضمون نگار ہوتا ہے، دُوسرا اس کی نظرثانی کرتا ہے۔ تیسرا اس کی منظوری دیتا ہے چوتھا اس کی پروف ریڈنگ کرتا ہے ——— اور بسا اوقات صحت و اسناد کا اتنا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کبھی شائع ہو کر پڑھنے والوں کے سامنے نہیں آتا۔ (مثال کے طور پر ادارۂ فرینکلن کا مرتبہ انسائیکلوپیڈیا) یا وہ شائع بھی ہوتا ہے تو اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کی قوّتِ خرید سے باہر ہوتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ چوبیس گھنٹے میں پچیس گھنٹے کا کام کرتے ہیں اور سارا کام خود ہی کرتے ہیں۔ بہرحال اب رفتہ رفتہ ہمارے کاموں کی پذیرائی ہو رہی ہے تو ہاتھ بٹانے والوں کا بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اب پروف خوانی کا بھی مناسب بندوبست کر لیا گیا ہے ——— اور اب انشاءاللہ شاہکار مطبوعات میں غلطیاں نہیں ہوا کریں گی۔ اس کے باوجود کوئی غلطی رہ جائے تو اس کی نشاندھی کرنا آپ کا فرض ہے۔

آپ کا
سید قاسم محمود

تاریخ اشاعت ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء - ناشر: سید قاسم محمود طابع: ریاض حسین الجدہ پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

... ۱۳۰۴ء - ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء) ابو عبداللہ شرف الدین محمد بن عبداللہ بن محمد بن ابراہیم۔ افریقہ، ایشیا اور یورپ کے اکثر علاقوں کی سیاحت کرنے والا عظیم مسلمان سیاح اور جغرافیہ دان مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔

ابھی بائیس برس کا تھا کہ جون ۱۳۲۵ء میں حج کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ قافلہ والوں نے اس کے زہد و تقویٰ کے باعث اُسے اپنا قاضی مقرر کر لیا۔ اس قافلہ کی راہ سکندریہ اور قاہرہ سے ہوتی ہوئی جدہ کی جانب تھی۔ سکندریہ میں ابن بطوطہ کی ملاقات برہان الدین سے ہوئی جس نے اس کے دل میں چین اور ہندوستان کی سیاحت کا شوق پیدا کر دیا۔ بحیرہ احمر کو عبور کرنے کا کوئی انتظام نہ پا کر اسے شام کے بالائی علاقوں سے ہو کر مکہ آنا پڑا۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد ابن بطوطہ معلومہ دنیا کے اس عظیم سفر پر نکل کھڑا ہوا جس کی روئداد آج بھی علمائے تاریخ و ادب کے لئے ماخذوں کے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابن بطوطہ کا اگلا سفر عراق اور فارس کے لیے تھا۔ موصل اور دیار بکر سے ہوتا ہوا وہ ایک بار پھر مکہ واپس آیا۔ اور حج کے بعد دو برس تک یہیں مقیم رہا۔ ۱۳۳۰ء میں جنوبی عرب، یمن اور عدن سے ہوتا ہوا، جنوبی افریقہ، عباسیہ اور مشرقی افریقہ تک گیا واپسی میں عمان اور ہرمز کی طرف آنکلا اور یہاں سے تیسری بار حج کے لیے مکہ کو روانہ ہوا۔

ابن بطوطہ کا چوتھا سفر مصر اور شام کے راستے ایشیائے کوچک (ترکی) کے لیے تھا۔ ان تمام جگہوں پر ہمیشہ اس کی عزت افزائی ہوئی۔ عام طور پر وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے رہتا۔ ایشیائے کوچک میں اس کی ملاقات سلطان محمد سے ہوئی۔ اور وہ اس کی بیوی کے جلو میں قسطنطنیہ پہنچا وہاں قیصر سوم سے ملاقات ہوئی۔ پھر ہندوستان جانے کے لئے دریائے وولگا سے گذر کر خوارزم بخارا اور خراسان ہوتا ہوا وہ ربیع الثانی ۳۴ھ/۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء میں کوہ ہندوکش کے راستے ہندوستان وارد ہوا۔ دہلی میں محمد تغلق نے اس کی آؤ بھگت کی اور حنفی مسلک کا قاضی مقرر کیا۔ اگلے دو برس تک ابن بطوطہ نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی سیر کی اور یہاں کے رسم و رواج کا بغور مطالعہ کیا۔ ۱۳۴۲ء میں اسے ایک سفارت کے ہمراہ چین بھیجا گیا۔ مگر وہ صرف ساحل مالابار تک پہنچ سکا جزائر مال دیپ کے سلطان نے بھی اسے ایک بار پھر قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ یہاں ایک برس رہنے کے بعد وہ لنکا پہنچا۔ جہاں مشہور چوٹی "آدم کی چوٹی" پر بھی چڑھا۔ (دیکھئے۔ "آدم کی چوٹی")

۱۳۴۵ء میں ابن بطوطہ لنکا سے بنگال، سلہٹ اور کمبوڈیا کے راستے پیکنگ اور کینٹن کی طرف بھی گیا تھا۔

واپسی پر سماٹرا، مالابار، ظفار، عمان، جنوبی فارس اور بغداد سے ہوتا ہوا ۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء میں وہ چوتھی بار حج کے لئے مکہ پہنچا۔ بغداد میں اُسے علم ہوا کہ پندرہ برس ہوئے اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ البتہ والدہ ابھی زندہ ہے۔ چنانچہ وہ شام اور مصر کے راستے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اور ۲۵ شعبان ۵۰ھ/۸ نومبر ۱۳۴۹ء میں چوبیس برس کے بعد طنجہ پہنچ۔

۵۴ھ/۱۳۵۲ء میں ابن بطوطہ اپنے آخری اور طویل تر سفر پر روانہ ہوا۔ تیونس، الجزائر اور سینیگال کے علاقوں سے ہوتا ہوا وہ ٹمبکٹو، مالی، اگدیز اور گوگر کے سبزہ زاروں اور جنگلوں کی سیر کرتا ہوا ۵۶ھ/۱۳۵۴ء میں واپس مراکش پہنچ گیا۔ یوں اس کا یہ اٹھائیس سالہ طوفانی سفر ختم ہوا، جس میں اس نے مجموعی طور پر ۷۵ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا۔

فاس (مراکش) کے حکمران ابو عنان نے اسے آپ بیتی لکھنے کا حکم دیا۔ تو اس نے ابن جزی (محمد بن محمد بن جزی) کو اپنے سفر کے احوال قلم بند کروائے۔ یہ آج "سفر نامہ ابن بطوطہ" کے نام سے ملتا ہے۔ اس کا ایک انگریزی ترجمہ (تلخیص) ۱۸۲۹ء میں ڈاکٹر سموئیل لی نے شائع کروایا۔ مکمل متن کی پہلی جلد پروفیسر گب نے ۱۹۵۸ء میں کیمبرج سے شائع کی اردو میں سب سے پہلے ڈاکٹر نوازش علی نے سموئیل لی کے ترجمے سے اس کا ترجمہ کیا۔ پھر ۱۸۹۸ء میں محمد حسین نے لاہور سے اس کی جلد دوم کا ترجمہ شائع کیا۔ پہلی جلد کا ترجمہ محمد حیات الحسن نے ۱۸۹۷ء میں کیا تھا، جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

فاس میں ابن بطوطہ نے اپنے باقیماندہ ایام بطور قاضی گذارے اس کا کاتب ابن جزی اس سے پہلے ہی ۱۳۵۶ء میں فوت ہو گیا تھا۔ ابن بطوطہ کی وفات مراکش ہی میں ہوئی۔

ابن بیطار (وفات ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) مسلمان سائنسدان، ماہر نباتات مالقہ کے ابن بیطار خاندان میں چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ علم نباتات کے مطالعہ کی غرض سے افریقہ کے اکثر ممالک کی سیر کی۔ مصر میں الملک الکامل کی ملازمت اختیار کی۔ اس نے افسر ماہرین نباتیات مقرر کیا۔ اس کے بیٹے الملک الصالح کے عہد میں بھی اسی عہدہ پر دمشق میں کام کیا۔ اس دوران میں جڑی بوٹیوں اور ادویہ پر تحقیقات کیں۔ ابن ابی

اصیبعہ اسی کا شاگرد تھا۔ اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس کے ساتھ جایا کرتا تھا ابن بیطار کی دو کتابیں "کتاب الجامع فی الادویہ المفردہ" جس میں قدرتی ادویہ کے نسخے اور خواص حروف تہجی کی ترتیب سے مدرج ہیں اور "المغنی فی العلاج بالادویہ المفردہ" ادویہ کے خواص پر زیادہ مشہور ہیں۔

ابن تومرت (۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء - ۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء) مراکش کا ایک مصلح جو امام مہدی ہونے کا دعویدار تھا۔ اس کے پیروکار "الموحد

Marfat.com

کہلاتے تھے۔ باپ کا نام عبداللہ تھا۔ جو بربر قبیلے کا ایک سردار تھا۔ ابن خلدون کا کہنا ہے کہ یہ خاندان اپنی دینداری کے لیے مشہور تھا۔ ابن تومرت کو بچپن ہی سے تحصیل علم کا شوق تھا۔ مسجدوں میں جاکر بڑے شوق سے موم بتیاں جلانا اس کا مشغلہ تھا۔ بعدازاں وہ مشرق کی طرف سیر یا طلب علم کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس دور میں مغرب اور اندلس پر المرابطون کا خاندان حکمران تھا۔ امام مالک کی تعلیمات اس علاقے میں رائج تھیں۔ الغزالی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ ان حالات میں ابن تومرت نے الغزالی اور ابن حزم کی تعلیمات سے اثر لیا۔ چنانچہ اس نے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔

اپنے سفر کا آغاز اندلس سے کرکے وہ سکندریہ کے راستے دمشق تک پہنچا اور واپسی پر طرابلس میں تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہیں اسے عبدالمومن ملا۔ جس نے اس کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ اپنی تبلیغ کے اصولوں میں وہ شدت پسند ہوتا گیا بعدازاں اس نے مہدی ہونے کا دعوے بھی کر دیا۔ اپنے پیروکاروں کو منظم کرنے کے بعد اس نے تینمال شہر پر قبضہ کرکے حکومت قائم کر لی۔ اردگرد کے قبائل اس کے پیروکار بن گئے؛ جو الموحدون کہلائے۔ بعدازاں اس نے المرابطون کے ساتھ بھی جنگ کی جس میں شکست کھائی۔ اس کے انتقال کے بعد عبدالمومن نے اس کی تحریک جاری رکھی۔ مگر اس میں وہ زور شور نہ رہا، جو ابن تومرت جیسے ذہین اور چالاک آدمی کا مرہون منت تھا۔

ابن تیمیہ، امام (۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ/۲۳ جنوری ۱۲۶۳ء — ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ/۲۶ ستمبر ۱۳۲۸ء) تقی الدین بن ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم بن مجدالدین عبدالسلام بن عبداللہ بن الخضر، بن محمد بن الخضر، بن علی بن عبداللہ بن تیمیہ الحرانی الحنبلی، عالم دین، فقیہہ اور مجدد، علما و فضلا کے خاندان میں حران میں پیدا ہوئے۔ بیس ہی برس میں قرآن، فقہ اور مناظرہ و استدلال میں مہارت پیدا کر لی اور بڑے علما میں شمار ہونے لگے۔ ۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء میں حج کیا۔

یہ وہ دور تھا جب اسلام میں فرقوں کی بہتات ہو چکی تھی۔ بدعات عام تھیں۔ رسومات قبر پرستی اور پیر پرستی اپنے جوبن پر تھیں۔ مسلمان اسلام کی صحیح تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔ ابن تیمیہ نے ان تمام باطل عقائد کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کیا مخالفین نے آپ کو بہت اذیتیں دیں۔ کفر و الحاد کے فتوے لگائے اور حکمرانوں کے کان بھر کر قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا

۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء سے آپ حنبلی فقہ کے استاد تھے۔ ۶۹۸ھ/۱۲۹۹ء کو شافعی علما کی مخالفت کی وجہ سے اس عہدے سے برطرف ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے مختلف فرقوں اور ان کی تعلیمات کے خلاف عملی و قلمی جہاد شروع کیا۔ ۸ شوال ۷۰۷ھ کو انھیں قاہرہ کے سلطان کے حکم سے حارۃ الدیلم میں قید کر دیا گیا۔ ڈیڑھ دو برس کی قید کے بعد سلطان الناصر نے اپنے مدرسے میں ان کا تقرر کر دیا۔ ۷۱۲ھ میں دوبارہ دمشق پہنچے اور پھر سے مدرس کی جگہ سنبھال لی۔ رجب ۷۲۰ھ/اگست ۱۳۲۰ء کو طلاق کی قسم پر فتویٰ دینے سے باز نہ رہنے پر چھ ماہ کے لیے قید کر دیا گیا۔ شعبان ۷۲۶ھ/جولائی ۱۳۲۶ء میں ایک بار پھر قبر پرستی کے فتوے کے جرم میں قید کر دیا گیا۔ قید کے دوران میں انھوں نے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ دشمنوں کو یہ بھی پسند نہ آیا اور انھیں کتابوں، کاغذوں اور روشنائی وغیرہ سے محروم کر دیا۔ اس صدمے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھا دنیا کے ہر گوشے میں ان کے لیے نماز جنازہ پڑھی گئی۔

ابن تیمیہ قرآن [illegible] کے ذہن میں پاسخ تھا [illegible] سے مسائل میں علما سے [illegible] قرار دینے میں دوسروں کا ساتھ نہیں دیتے [illegible] سادہ ایمان و عقائد رکھتے تھے، انھیں [illegible] کو خود رسول نے حقانیت کا سبق دے رکھا تھا۔ اس لیے [illegible] ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک صوفیا اور متکلمین ایک ہی [illegible]

ابن تیمیہ کا اصول استدلال قرآن مجید کو اپنا ماخذ بنانا۔ اس کے بعد سنت و حدیث سے استنباط کیا جاتا۔ پھر روایت کے طریقے پر کھتے اور بعدازاں صحابہ اور پائمہ کرام کے طریق سے اسے جانچتے۔

ابن تیمیہ شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ کے اشعار "البدایہ"، "فتاوی حلبیہ" اور "طبقات سبکی" میں موجود ہیں۔ یہ شاعری ان کے لیے کبھی بھی باعث افتخار نہیں تھی۔

اکثر علما نے ابن تیمیہ کو کافر اور ملحد قرار دیا ہے۔ بعض انھیں راہ راست سے بھٹکا ہوا سمجھتے ہیں۔ خصوصاً ابن بطوطہ، عبدالوہاب، تقی الدین سبکی اور ابوحیان النحاسی کے نزدیک انھیں شیخ الاسلام کہنے والا بھی کفر کے دائرے میں داخل ہے۔ تاہم ان کی تعریف اور پیروی کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ ان کے شاگرد ابن قیم الجوزیہ نے ان کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلایا۔ ابن قدامہ، محمود آلوسی، محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ ولی اللہ، ابوالکلام آزاد اور بالآخر اقبال ابن تیمیہ ہی کی تعلیمات اور تصانیف کے زیر اثر ملت اسلامیہ کی اصلاح اور احیاء کے لیے کوشاں رہے۔

ابن تیمیہ نے تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، لغت، فلکیات، الجبرا، ریاضی، علوم عقل و نقل اور تقابل ادیان کے موضوعات پر پانچ سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ غلام جیلانی برق اور صدیق حسن خان نے ۴۰۸ کتب کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے دیئے ہیں۔ براکلمان نے ۱۵۳ محفوظ کتابوں کی فہرست دی ہے۔ "دائرۃ المعارف اسلامیہ" میں ۵۹ کتابوں کے نام درج ہیں۔

ابنِ جریر مشہور مورخ طبری کی کنیت۔ (دیکھئے "طبری")

ابنِ جزری (۲۵ رمضان ۷۵۱ھ/۳۰ نومبر ۱۳۵۰ء — ۹ ربیع الاول ۸۳۳ھ/۲ دسمبر ۱۴۲۹ء) شمس الدین ابوالخیر محمد بن محمد، عالم دین تھا اور علم قرأت پر مستند تھا۔ دمشق میں پیدا ہوا۔ جزیرہ ابن عمر کی طرف نسبت کی وجہ سے ابن جزری کہلایا۔ ۷۶۸ھ/۱۳۶۷ء میں مختلف قراتوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اسی سال حج کرکے قاہرہ کا رخ اختیار کیا۔ ۷۷۴ھ/۱۳۷۳ء میں ابوالفدا اسماعیل بن کثیر کی طرف سے فتویٰ دینے کی اجازت ملی۔ ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء دمشق میں قضا کے عہدے پر مقرر ہوا۔ پانچ سال بعد سلطان بایزید کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں تیمور نے اسے سمرقند بھجوا دیا جہاں وہ درس عام دیتا رہا۔ بعدازاں خراسان، ہرات، اصفہان اور شیراز سے ہوتا ہوا بصرے کے راستے مکہ اور مدینہ گیا۔ چند سال بعد شیراز لوٹ آیا اور وہیں انتقال کیا۔ "دائرۃ المعارف اسلامیہ" میں اس کی اکیس کتابوں کے نام دیئے گئے ہیں۔

ابنِ جماعت علماء کے ایک خاندان کا نام۔ (۱) بدرالدین ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم (۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء — ۲۱ جمادی الاول ۷۳۳ھ/[illegible]) عرب فقیہہ امام شافعی کے مزار کے پاس دفن ہوا۔ دمشق میں مدرس اور قاضی القضاۃ

Marfat.com

[illegible] اسلام ہے۔
(۲) [illegible] عزالدین [illegible] (۶۹۴ھ/ [illegible] ۱۲۹۴ء [illegible] دمشق میں قاضی [illegible] مدرس رہا۔
(۳) ابراہیم بن عبدالرحیم برہان الدین کا پوتا (۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء - ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء) قاہرہ اور دمشق میں قاضی اور مدرس رہا۔
(۴) ابوعبداللہ محمد، عزالدین کا پوتا (۷۵۹ھ/ ۱۳۵۸ء - ۸۱۹ھ/ ۱۴۱۶ء) قاہرہ میں طبیب اور مدرس رہا۔ تصانیف کی کافی تعداد ہے۔ ایک خودنوشت سوانح عمری بھی ہے۔

② ابن جوزی (۵۱۰ھ/ ۱۱۱۶ء - ۵۹۷ھ/ ۱۲۰۰ء) عبدالرحمان بن علی بن محمد ابوالفرج جمال الدین القرشی البکری الحنبلی، محدث اور مورخ۔ بغداد میں پیدا ہوئے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا۔ تقریباً اسی اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ یہ گویا ان کے نزدیک بدرجہ عبادت تھی۔ وعظ و تذکیر کو پیشہ بنایا اکثر خلفا ان پر بے حد مہربان رہے۔ ۵۷۰ھ میں بغداد کے درب دینار میں ایک مدرسے کی بنا رکھی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں انھوں نے اپنے سلسلہ مواعظ میں قرآن مجید کی تفسیر مکمل کی۔ اس لحاظ سے وہ عالم اسلام کے پہلے مفسر ہیں۔ ان کی محفلوں میں اکثر اوقات دس دس ہزار سے زیادہ لوگ جمع ہوتے تھے۔ یہ ان کی تاثیر وعظ ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک لاکھ سے زائد آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ بیس ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ آخری عمر میں حضرت عبدالقادر جیلانی کو نہ ماننے اور ان کے صاحبزادے کے ساتھ مخالفت کی وجہ سے شہر واسط میں قید کر دیئے گئے۔ پانچ سال بعد انہیں رہا کیا گیا۔ جس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بغداد میں انتقال کر گئے۔

ابن جوزی کی تصانیف کی فہرست ابن رجب نے "ذیل طبقات الحنابلہ" میں دی ہے۔ یہ کوئی ساڑھے تین سو سے زائد تصانیف ہیں۔ ان میں مشہور ترین کتاب "المنتظم فی تاریخ الملوک والامم" ہے۔ یہ اس زمانے کے سلجوقیوں اور عباسیوں کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ دوسری اہم کتابیں "تلبیس ابلیس"، "کتاب القصاص والمذکرین"، "کتاب الیاقوتہ"، "کتاب عجب الخطب" اور "النلق المفهوم" وغیرہ ہیں۔ انہوں نے امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کو ضعیف احادیث سے پاک کر کے ایک نسخہ بھی مرتب کیا تھا۔

ابن جوزی حنبلی مسلک کے بڑے سخت حامی تھے۔ بدعتیوں کے ساتھ اتنی سختی کرتے کہ اکثر اوقات ان کے احباب کو فتنے کا خدشہ پیدا ہو جاتا۔ عربی ادب میں خطیب اور واعظ کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کثرت تصانیف بھی ایک طرح سے ان کی خوبیوں میں شامل ہے۔

ابن حجر العسقلانی (۱۲ شعبان ۷۷۳ھ/ ۱۸ فروری ۱۳۷۲ء - ۱۸ ذی الحجہ ۸۵۲ھ/ ۱۲ فروری ۱۴۴۹ء) ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد الکنانی العسقلانی المصری القاہری، شافعی مذہب کے مستند فقیہہ، محدث اور مورخ، قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ ایک تاجر زکی الدین الخروبی نے ان کی پرورش کی۔ نو ہی برس میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس دور کے مشہور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مسلسل دس برس تک زین الدین العراقی سے حدیث پڑھی۔ محرم ۸۲۷ھ/ دسمبر ۱۴۲۳ء میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور تقریباً اکیس برس تک اس عہدے کے ساتھ ساتھ تدریس و وعظ کا سلسلہ جاری رکھا۔

ابن حجر حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے، ان کی کتاب "فتح الباری فی شرح البخاری" خاصی مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ میں بیس کے قریب کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

ابن حزم (۳۰ رمضان ۳۸۴ھ/ ۷ نومبر ۹۹۴ء - ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ/ ۱۵ اگست ۱۰۶۴ء) ابو محمد علی بن احمد بن سعید ابن حزم، اندلس کا عالم دین، فقیہہ، مورخ اور شاعر، قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس لئے قرطبی بھی کہلاتا ہے۔ باپ منصور الحاجب اور اس کے بیٹے مظفر کا وزیر تھا۔ چنانچہ ابن حزم نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ والد کے انتقال (۴۰۲ھ) کے بعد قرطبہ کو چھوڑ کر المریہ میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کے والی خیران العامری نے انھیں اپنے خلاف سازش کے شبہ میں پہلے تو قید رکھا اور پھر جلاوطن کر دیا۔ جب عبدالرحمان الرابع المرتضیٰ نے خلافت کا اعلان کیا تو ابن حزم اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ غرناطہ کے محاذ پر اسے دشمنوں نے قید کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد رہائی ملی تو قرطبہ واپس چلا آیا۔ پانچ سال یہاں رہنے کے بعد اسے ایک بار پھر حکومت میں وزارت کا عہدہ ملا۔ عبدالرحمان الخامس نے رمضان ۴۱۴ھ/ دسمبر ۱۰۲۳ء میں اقتدار سنبھالا اور اپنے دوست ابن حزم کو وزیر مقرر کر دیا۔ مگر دو ہی ماہ بعد عبدالرحمان قتل ہو گیا اور ابن حزم کو قید خانے کا منہ دیکھنا پڑا۔ معلوم نہیں وہ کب تک قید رہا لیکن اتنا ضرور علم ہے کہ اس کے بعد اس نے علم و ادب کی طرف توجہ دی اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ وہ اکثر مناظرے پر تلا رہتا۔ اس لئے بہت سے علما اس کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ اسے اپنی خاندانی جاگیر منت لیشم میں جاگزیں ہونا پڑا۔ یہیں پر اس کا انتقال ہوا۔

ابن حزم کی تصانیف کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ شاگردوں کا ایک مختصر حلقہ بھی تھا۔ بیٹوں میں سے ابورافع الفضل، ابواسامہ یعقوب اور ابوسلیمان المصعب کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں بہت سے علما نے ابن حزم سے استفادہ کیا۔ ابن عربی نے بھی اس کی کتابوں کی اشاعت کی۔

ابن حزم کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر قرطبہ میں سیویل گال کے قریب ۱۲ مئی ۱۹۶۳ء کو کانسی سے بنا ہوا ایک مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ یہ مجسمہ اس کی نوسویں برسی کی یادگار کے طور پر لگایا گیا ہے۔

ابن حزم نے ابتدا میں نفسیات، فلسفہ اور علم الاخلاق کی طرف توجہ دی۔ نفسیات میں اس کی کتاب "طوق الحمامہ" ہے۔ جس میں عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت چھوٹے چھوٹے قصوں اور مشاہدات کی بنا پر کی گئی ہے۔ علم الاخلاق میں اس کی کتاب "الاخلاق والسیر" بے حد اہم ہے۔

تاریخ کے موضوع پر ابن خلدون نے اس کی ایک کتاب "جمہرۃ الانساب" کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ المغرب اور اندلس کے عرب اور بربر خاندانوں کے انساب پر لکھی گئی ہے۔

ابن حزم کا مسلک ہمیشہ ایک نہیں رہا۔ پہلے پہل وہ شافعی مذہب کا بہت بڑا حامی تھا۔ پھر فرقہ ظاہریہ کا پیرو بن گیا۔ بعد ازاں اس نے مخالفین پر شدت سے الزامات لگانے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ اس نے بعض راسخ العقیدہ اماموں کو بھی نہیں بخشا اور ان میں سے کئی مستند آئمہ پر کفر و الحاد کے الزامات لگائے۔ اشعریؒ، ابوحنیفہؒ اور مالکؒ خاص طور پر اس کی تنقید کا ہدف بنے رہتے تھے۔

ابن حزم نے اپنے اس نظریے کی پرزور حمایت کی ہے کہ فقہی استنباط کی ان جزئیات کو، جن کی بنیاد قرآن اور حدیث پر نہیں، رد کر دینا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اس کی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" خاصی اہم ہے۔ اس کے علاوہ بہت

Marfat.com

سی کتابیں ظاہری احکام فقہ پر ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "الفصل فی الملل والاہوا والنحل" ہے جس میں دیگر فرقوں پر بڑی تنقید کی گئی ہے۔ "کتاب المحلی" اور "کتاب الناسخ والمنسوخ" دیگر اہم کتابیں ہیں۔ جن میں قرآن اور حدیث سے بحث کی گئی ہے۔

ابنِ حنبل مسلمانوں کے امام احمد بن حنبل (دیکھیے "احمد بن حنبل")

ابن حوقل (وفات ۳۵۰ھ/۹۶۱ء) ابوالقاسم محمد ابن حوقل، جغرافیہ دان، سیاح اور مورخ رمضان ۳۳۱ھ/مئی ۹۴۳ء میں بغداد سے سیاحت کے لیے نکلا۔ کئی ممالک کی سیر کی۔ اپنے پیش رو سیاحوں کی تصانیف کو پڑھا۔ اور چشم دید حالات لکھے۔ ۳۴۱ھ/۹۵۲ء میں اصطخری سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد اپنی کتابوں میں اصلاح کی اور ۳۶۷ھ/۹۷۷ء میں "المسالک والممالک" لکھی اس میں تیونس کے بحری بیڑے کی مہارت اور فسطاط کے اسلحہ خانے کا بھی ذکر ہے اور بادشاہوں کے نام اور ان کے بعض کارناموں کی تفصیل بھی درج ہے۔ مشہور جغرافیہ دان ادریسی نے اس تصنیف سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کی ایک اور کتاب "صورۃ الارض" ہے، جو علم الارض پر اہم حیثیت رکھتی ہے۔

ابن حیان مشہور مسلمان سائنسدان، جو بابائے کیمیا کے نام سے مشہور ہے (دیکھیے "جابر بن حیان")

ابن خرداذبہ (۲۱۱ھ/۸۲۶ء - ۳۰۰ھ/۹۱۲ء) ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ مشہور جغرافیہ دان۔ خلیفہ المعتمد نے اسے اپنا گہرا دوست بنا لیا تھا۔ علم موسیقی کا شیدائی بھی تھا۔ دادا نے جو آتش پرست تھا، اسلام قبول کیا، باپ طبرستان کا والی تھا۔ اسحاق موصلی سے علم موسیقی حاصل کیا، جس کا ذکر المسعودی بھی کرتا ہے۔ خود محکمہ برید و اخبار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ المعتمد کی درخواست پر کتاب "المسالک والممالک" لکھی تھی۔ یہ کتاب ۲۳۲ھ/۸۴۶ء میں لکھی گئی تھی۔ مزید براں اس کی ایک کتاب "اللہو والملاہی" بھی ہے جو کھوان پر ہے اور اب ناپید ہے۔

ابن خطیب (۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء - ۷۷۶ھ/۱۳۷۵ء) ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن خطیب لسان الدین، مورخ اور ادیب، سلطان ابوالحجاج یوسف اول کے دربار میں وزارت تعلیم اور وزارت دفاع کے ذو عہدے حاصل کئے علمی اور سیاسی حیثیت سے بلند مرتبہ حاصل کیا تھا۔ غرناطہ میں سیاسی مخالفت کی بنا پر قید کیا گیا۔ ایک نائب وزیر سلیمان بن داؤد نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔

ابن خطیب کی تصانیف کی تعداد ساٹھ ہے، جو ادب، فلسفہ، تصوف، تاریخ جغرافیہ اور طب کے موضوع پر ہیں۔ سب سے اہم تصنیف "الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ" ہے یہ مشاہیر اور علما کا ایک تذکرہ ہے۔ اس کی ایک تلخیص قاہرہ سے ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۰ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

ابنِ خلدون عبدالرحمان ابوزید اور اس کا بھائی یحییٰ ابوزکریا، مشہور مورخ ان میں خصوصاً عبدالرحمان ابن خلدون بطور مورخ اور بانی عمرانیات (سماجیات) زیادہ مشہور ہے۔ ان کا خاندان تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں حضرموت سے ہجرت کر کے اندلس چلا گیا تھا اور ان کا پردادا الحسن تیونس میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔

عبدالرحمان ابن خلدون (یکم رمضان ۷۳۲ھ/۲۷ مئی ۱۳۳۲ء - ۲۵ رمضان ۸۰۸ھ/۱۹ مارچ ۱۴۰۶ء) اپنے باپ محمد کا دوسرا بیٹا تھا۔ تیونس میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ابوالحسن مرینی کے درباری علماء سے بھی استفادہ کیا۔

۱۳۵۲ء میں اسے بھی دربار میں رسائی اور عہدہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اگلے ہی برس وہ بادشاہ کا کاتب مقرر ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ حاکم زاب کے ہاں چلا گیا۔ مگر علما کی درخواست پر سلطان نے اسے دوبارہ فاس آنے کی دعوت دی چنانچہ ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں وہ ابوعنان فریی کا کاتب بن گیا۔ کامل دو برس بعد اس پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ قید خانے بھیج دیا گیا۔ نئے سلطان ابوسالم نے اسے رہائی دلائی اور عہدہ بھی پیش کیا۔ مگر اس نے غرناطہ کا رخ کیا۔ تاہم جلد واپس آ گیا اور تلمسان کے حکمران ابوحمو ثانی کی ملازمت اختیار کر لی۔ بعد ازاں مرینی حکمران عبدالعزیز کی مصاحبت اختیار کر لی۔

جلد ہی وہ ان سب سے تنگ آ گیا اور قلعہ ابن سلامہ میں گوشہ نشین ہو کر تاریخ عالم لکھنا شروع کر دی۔ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء میں کسی ضرورت کے تحت تیونس گیا۔ ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء میں اسے قاہرہ کے سلطان الظاہر برقوق نے مالکی قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں حج کیا اور واپس آنے کے بعد مدرس اور قاضی کے عہدوں پر کام کیا۔ اس اثنا میں تیمور نے دمشق پر حملہ کر دیا تو اس کے ساتھ گفت و شنید کے لیے اسے بھیجا گیا۔ ۱۴ جنوری ۱۴۰۱ء کو وہ رسوں کی مدد سے قلعہ دمشق کی فصیل پر سے اترا اور تیمور سے ملاقات کی۔ تیمور اس کی علمیت سے خاصا متاثر ہوا۔ واپسی پر وہ پھر قاہرہ میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔

عبدالرحمان ابن خلدون کی کتاب "العبر" اس زمانے کی اہم تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ خصوصاً اس کا "مقدمہ" علمی دنیا میں معرکۃ الآرا حیثیت کا مالک ہے۔ یہی وہ حصہ کتاب ہے جس نے عبدالرحمان ابن خلدون کو بام شہرت پر پہنچا دیا ہے۔ ایک

Marfat.com

کی تاریخ نویسی اتنی زیادہ مستند نہیں لیکن مقدمہ میں پہلی بار اس نے تاریخ و تمدن عالم کا ایک تجزیہ پیش کیا ہے اور اقوام کے عروج و زوال کے بارے میں ایک واضح نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کے خیال میں تاریخ "بذات خود ایک زندہ اور فعال شے ہے" قومیں ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتیں۔ اس لحاظ سے ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کا بانی ہے عصر حاضر کے مشہور مورخ ٹائن بی نے بھی اپنے نظریۂ تاریخ کو پیش کرتے ہوئے ابن خلدون سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "عیسائی دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ افلاطون، ارسطو اور آگسٹن بھی اس کے ہم پایہ نہ تھے۔"

عمرانیات یعنی انسان اور معاشرے کے تعلق کا مطالعہ کرتے ہوئے ابن خلدون نے ہی اس علم کا صحیح معنوں میں آغاز کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ تمدن کی ایک بنیاد انسانی ضروریات اور دوسری بنیاد دفاعی ضروریات ہیں نیز معاشرہ پر تین عوامل دین، جغرافیائی حالات اور اسباب حیات کی فراوانی یا کمی بہرحال اثر انداز ہوتے ہیں۔ انہی سے قوموں کو عروج و زوال نصیب ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک محنت ہی انسانی اجرت کا معیار اور قیمت ہے۔ اس لئے رعایا سے صرف اتنی محنت وصول کرنی چاہیئے جتنی سے ان کی صلاحیت کار پر کوئی اثر نہ پڑے غلامی اور بیگاری کو غیر طبعی ہونے کے باعث ختم کر دینا چاہیئے۔ اس کے نزدیک ہر قوم ایک عمر طبعی رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر قوم کی طبعی عمر ایک سو بیس سال ہوتی ہے، یہ تین حصوں پر منقسم ہوتی ہے، ان میں سے ہر حصے کو ایک "جیل" کہتے ہیں۔ یہاں ابن خلدون ایک اور بیان بھی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر قوم اپنے تصور حیات کے مطابق اپنی عمر میں کمی بیشی کر سکتی ہے، جس قوم کا نظریہ جتنا پائدار ہوگا اس قوم کی عمر اتنی زیادہ ہوگی۔

مذہب کے بارے میں لکھتے ہوئے ابن خلدون کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو معاشرے کی سمتیں بدل دیتا ہے۔ یہی قوم کو نظریۂ حیات بخشتا ہے جو مذہب معاشرے میں جسقدر گھلا ملا ہوگا، وہ اتنا ہی صادق ہوگا۔ اگر مذہب کا فلسفہ نظروں میں جچتا ہے اگر اس میں ہمہ گیری اور ابدیت ہے تو وہ زندہ رہ سکتا ہے بصورت دیگر نہیں۔

نبوت کو ابن خلدون ایک خارق (معجزہ) قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک انسانی فکر کی ارتقاء کا قانون جاری ہے، زندگی کی ابتدا نباتات سے ہوئی، جس کا ارتقاء حیوانات کی صورت میں ہوا۔ انسان حیوانی ارتقاء کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ڈارون سے بہت پہلے ڈارونیت کا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ارتقاء کا یہ عمل جاری و ساری ہوتا ہے ہر نوع کا آخری سرا اگلی نوع کے ابتدائی سرے سے ملا ہوتا ہے۔ ابتدائی انسان نے آہستہ آہستہ ادراک و احساس کی منزلیں طے کیں حتیٰ کہ اس میں سے ایک ایسا انسان معرض وجود میں آیا، جس میں غور و فکر کی تمام صلاحیتیں جلوہ گر تھیں۔

ابن خلدون کے نزدیک ارتقاء و تغیر کا قانون چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ یہیں نہ رکے بلکہ اور آگے بڑھے۔ اس لئے انسان سے بالا ایک اور ذات چاہیئے جس میں ادراک صرف اور تعقل محض ہو۔ یہ ذات فرشتے کی ہے۔ اس کا ایک پہلو نفس انسانی سے ملا ہوا ہے اور دوسرا جدا ہے۔ نبوت انہی دونوں جہتوں کی درمیانی صورت حال کا نام ہے۔ یعنی کبھی کبھی نفس بشری رفتہ رفتہ یا ایک ہی جست میں عالم بشریت سے قطع ہو کر ملائکہ تک پہنچتا ہے۔ یہ صورت کسی خاص خاص بشر کے اندر ودیعت ہوتی ہے۔ گویا انسان اپنی ذاتی کوشش سے نبی نہیں بن سکتا بلکہ جب خدا چاہتا ہے تو وہ کسی انسان کو عالم بشریت سے نکال کر عالم ملائکہ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیتا ہے، اس طرح کہ وہ بشر بھی رہتا ہے اور ملائکہ سے بھی ہم کلام ہوتا ہے البتہ انسان ریاضت و مجاہدہ سے ایسی صلاحیتیں حاصل کر سکتا ہے، جس سے وہ کسی حد تک عالم ملائکہ کو چھو لے یہ منزل اولیاء کی ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک نبوت، ولایت اور فلسفہ کی سرحدیں آخر میں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔

تعلیم کے بارے میں ابن خلدون اس چیز کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ متعلمین کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے اور جسمانی مار پیٹ سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ کیونکہ اس سے طلبہ میں اونچے اور حوصلہ مند جذبات پیدا نہیں ہوتے۔

ابن خلدون نے "مقدمہ تاریخ" ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء میں لکھا تھا۔ پوری تاریخ کا اردو ترجمہ ۱۹۰۱ء میں الٰہ آباد سے احمد حسین نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ ابن خلدون کی دیگر کتابیں "شرح البردہ"، "الحساب" اور "المنطق" بڑی اہم ہیں۔

چھوٹا بھائی یحییٰ ابن خلدون (۷۳۴ھ/۱۳۳۳ء - رمضان ۷۸۰ھ/دسمبر ۱۳۷۸ء) بھی مورخ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ بھی فاس میں اپنے بھائی کے ساتھ ابوسالم کے دربار میں موجود تھا اس نے بھی تلمسان اور بسکرہ کے حکمرانوں کے ہاں ملازمتیں اختیار کیں۔ ۷۶۹ھ/۱۳۶۸ء میں اسے تلمسان کے حاکم ابوحمو نے کاتب الانشاء کے عہدے پر فائز کیا۔ یہاں سے ایک بار پھر وہ مرینی کے سلطان عبدالعزیز کی ملازمت میں گیا مگر جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ مگر ابوحمو کے بڑے بیٹے ابوتاشفین نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کی کتاب "الرواد فی ذکر الملوک" بڑی اہم تاریخی کتاب ہے جو بنی عبدالواد کے حکمرانوں کی سیاسی تاریخ پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اسلوب نگارش خوب صورت اور مرصع ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم ادبی کتاب بھی ہے۔

ابن خلکان (۱۱ ربیع الثانی ۶۰۸ھ/۲۲ ستمبر ۱۲۱۱ء - ۲۶ رجب ۶۸۱ھ/۳۰ اکتوبر ۱۲۸۲ء) شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن ابراہیم بن خلکان البرکی الشافعی، مورخ اور مصنف، موصل کے قریب پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم باپ سے حاصل کی۔ بعد ازاں دمشق میں تعلیم پائی۔ ۶۳۶ھ/۱۲۳۸ء میں قاہرہ پہنچا اور قاضی القضاۃ یوسف بن الحسن السنجاری کا نائب بن گیا۔ ۶۵۹ھ/۱۲۶۰ء میں دمشق میں قاضی بنا۔ بعد ازاں موقوف ہوا اور قاہرہ کے مدرسہ الفخریہ میں سات سال تک مدرس رہنے کے بعد دوبارہ ملا۔ ۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء میں دوبارہ چھن گیا۔ کچھ عرصہ مدرسہ الامینیہ میں مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ یہیں وفات پائی۔

ابن خلکان کی اہم تصنیف "وفیات الاعیان وانباء ابناء" ہے یہ کتاب ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں قاہرہ میں لکھنا شروع کی تھی۔ اور کوئی اٹھارہ برس میں مکمل ہوئی۔ ادب، تاریخ و سیر کے بارے میں یہ ایک اہم ماخذ ہے۔

ابن رشد (۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء - ۹ صفر ۵۹۵ھ/۱۰ دسمبر ۱۱۹۸ء) عبدالولید محمد بن احمد بن محمد رشد، سپین کا سب سے بڑا عرب فلسفی اور سائنسدان۔ فلسفہ، طب، فلکیات اور فقہ کا بہت بڑا ماہر، قرطبہ میں پیدا ہوا۔ باپ دادا قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔

ابن رشد کے ابتدائی حالات کا تو علم نہیں۔ غالباً ابن طفیل نے اسے دربار میں الموحدون سے متعارف کرایا تھا اور اسی نے اسے تحصیل علم کی طرف راغب کیا تھا ۵۶۵ھ/۱۱۶۹ء میں ابن رشد اشبیلیہ کا قاضی مقرر ہو گیا اور ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں وہ قرطبہ کا قاضی القضاۃ ہو گیا۔ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں اسے ابو یعقوب یوسف نے اپنے طبیب خاص کی حیثیت سے مراکش طلب کر لیا۔ یہاں علمائے دین نے اس کے خلاف

Marfat.com

خیالات کے باعث سخت مخالفت کی، جس کے باعث اسے واپس قرطبہ آنا پڑا مگر یہاں بھی کفر کے فتووں نے اسے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ ادھر خلیفہ نے بھی فلسفہ کی تعلیم پر پابندی لگا دی مگر بعد ازاں اس نے ابن رشد کو مراکش میں اپنے پاس بلا لیا۔ جہاں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ابن رشد کا انتقال ہو گیا۔

ابن رشد کی تصانیف "تہافۃ التہافتہ" (جو امام غزالی کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ کا جواب ہے۔) ارسطو کی کتابوں کی شرحیں، افلاطون کی "سیاست" کی شرح اور طب پر "الکلیات" ہیں۔ ان میں سے "تہافۃ التہافتہ" سب سے زیادہ اہم ہے۔ جس میں اس کے فلسفیانہ افکار کی جھلک ملتی ہے۔

ان افکار کی بنا پر ابن رشد کو نہ صرف مسلمان علمائے دین بلکہ عیسائی پادریوں نے بھی کافر ٹھہرایا ہے۔ دراصل ابن رُشد علماء کے اس مکتب فکر سے تعلق تھا، جو متکلمین تو نہیں تھے مگر عقلیت پسند ہونے کے باعث مسلّمہ عقائد کو فلسفے پر منطبق کرنا چاہتے تھے، چنانچہ الکندی، فارابی، ابن سینا، ابن باجہ اور ابن طفیل اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی آخری کڑی ابن رشد ثابت ہوا۔ مشرق میں چونکہ صوفیا کا زور تھا، یعنی ابن عربی کے نظریات کا فروغ تھا اور وسطی ممالک میں امام غزالی نے اس دبستانِ فکر کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا، چنانچہ ابن باجہ اور ابن رشد جیسے عقلیت پسند مفکرین کو مغرب کے دامن میں پناہ لینا پڑی، جس نے انھیں بڑی فراخدلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ یہی وجہ ہے کہ علوم عقلیہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب نے اور تصوف میں مشرق نے بڑی ترقی کی اور ان میں اپنا اپنا تشخص حاصل کر لیا۔

ابن رشد کا دعوےٰ تھا کہ مذہب کے الہامی اصولی و عقائد کے سوا ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ اس طرح سے اس نے دنیا کو ارسطا طالیت کی راہ دکھائی اور دنیا نے اسے ارسطو کا سب سے بڑا شارح اور مفسر تسلیم کر لیا

الٰہیات میں ابن رشد کا نظریہ بڑا لچکدار ہے، چنانچہ وہ بھی کسی حالت میں منکر غیب نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک اللہ تعالےٰ کا علم ایک برتر نوعیت کا حامل ہے۔ اور یہ انسانی علم کی مانند نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو اور لوگ بھی اس علم میں شریک ہو جائیں گے۔ اس طرح خدا اپنی ہستی کے اندر واحد نہیں رہتا۔ مزید برآں خدا کا علم انسان کے علم کی مانند نہیں۔ کیونکہ انسانی علم اشیاء سے ماخوذ ہے جبکہ خدا کا علم اشیاء کا محرک اور علت ہے، جو ایک مسلسل حیثیت سے اس کائنات کی تخلیق میں مصروف ہے۔ گویا اس کے نزدیک تمام اشیاء عدم سے ایک ہی بار پیدا نہیں ہو جاتیں بلکہ ارتقا کی حیثیت اختیار کرتی ہیں اور ایک تخلیقی قوت اسے قائم رکھتی اور حرکت دیتی ہے۔ نیز مرنے کے بعد انسانی روح اس روحِ کل میں چلی جاتی ہے، جو اس کائنات میں ازل سے موجود ہے روزِ حشر یہ کسی اور مماثل صورت میں پیدا ہوگی مگر موجودہ مادی جسم میں نہیں ہوگی، کیونکہ موجودہ اجسام نامکمل ہیئت کے مالک ہیں، جب کہ آئندہ کامل اور مکمل اجسام کی ضرورت ہوگی

مذہب کی تعلیم کے بارے میں ابن رشد کا نظریہ یہ ہے کہ عوام الناس کو قرآنی قصص اور تمثیلات کا وہی مفہوم بتایا جائے، جس طرح سے وحی نے پیش کیا ہے۔ البتہ فلسفی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان میں مضمر گہرے حقائق کو تلاش کرے البتہ انہیں عوام تک نہ پہنچائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک عوام میں اتنی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ دقیق مسائل کو سمجھ سکیں۔ اس طرح سے وہ انسان کی سمجھنے کی صلاحیتوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلی اور سب سے بڑی جماعت ان لوگوں کی ہے جو محض تبلیغ کے ذریعے ایمان لاتے ہیں، دوسری جماعت کے لوگ استدلال سے متاثر ہو جاتے ہیں اور تیسری قلیل تعداد ان لوگوں کی ہے جو محض ثابت شدہ دلائل پر اپنے عقائد کی

اساس رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کا فرانہ خیالات کا حامل نہیں تھا البتہ وہ اس امر کا یقین رکھتا تھا کہ حقیقت کو مختلف طریقوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابن رشد فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسدان اور ماہر فلکیات بھی تھا، وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلی بار سورج میں موجود دھبوں کا ذکر کیا تھا۔ جنہیں اس نے دوربین کے بغیر دیکھا تھا۔ طب میں بھی اس نے خاطر خواہ اضافے کیے تھے اور ادویات کے ان خواص کا ذکر کیا۔ جنہیں تجربات سے ثابت کیا جا چکا تھا۔

ابنِ زُبیر صحابی، عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ (دیکھیے "عبداللہ بن زبیرؓ")

ابنِ زُہر اندلس کے مسلمان علماء کا خاندان۔ مورث اعلیٰ کا نام زُہر تھا۔ جس کا سلسلۂ نسب عدنان تک پہنچتا ہے جو عرب قوم کے بانیوں میں سے تھا۔ اس کا ایک بیٹا مروان تھا، جو ابوبکر محمد جیسے عالم و فقیہہ کا باپ تھا۔ ابوبکر محمد نے ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں طلبیرہ میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ابومروان عبدالملک ایک مشہور طبیب تھا۔ اس نے دانیہ میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ابوالعلاء زہر بن ابی مروان بھی طبیب تھا۔ یوسف بن تاشفین کا وزیر رہا۔ اس کی وفات قرطبہ میں ہوئی۔ اس کا بیٹا ابومروان عبدالملک عالم دین اور فقیہہ تھا۔ ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء کو اشبیلیہ میں پیدا ہوا۔ بعد ازاں طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کی دو کتابیں "الاقتصاد فی اصلاح النفس" اور "التیسیر فی المداواۃ والتدبیر" بڑی اہم ہیں۔ یہی شخص مغرب میں حکیم ابن زہر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے تشریح الاعضاء کا آغاز کیا۔ اس نے سب سے پہلے مری میں شگاف دینے کی سفارش کی اور رسولی بذریعہ آپریشن نکالنے کا طریقہ دریافت کیا۔ مگر خود ایک رسولی ہی کے ہاتھوں ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء میں وفات پائی اس کا بیٹا ابوبکر محمد اور پوتا ابومحمد عبداللہ بھی اعلیٰ پائے کے طبیب تھے۔ دونوں ہی سازش کا شکار ہوئے اور زہر خورانی کے باعث ہلاک ہوئے۔ ان کی اولاد نے بھی طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ گویا ایک طرح سے ابن زُہر کا پورا خاندان طب کو اختیار کئے ہوئے تھا۔

ابنِ زیاد (وفات ۶۷ھ/۶۸۶ء) عبیداللہ بن زیاد، گورنر کوفہ، حادثۂ کربلا کا محرک، مسلم بن عقیل اسی کے حکم سے قتل ہوئے۔ جب انھوں نے کوفہ میں حضرت امام حسینؓ کے حق میں بیعت لینا شروع کی۔ اس وقت یزید نے ابن زیاد [illegible]

Marfat.com

سے تبدیل کر کے کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ مسلم بن عقیل کے قتل کے بعد اس نے حُر کو ایک ہزار سوار دے کر حضرت امام حسینؓ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجا۔ جب حضرت امام حسینؓ میدان کربلا میں ٹھہرے تو ابن زیاد نے پہلے عمر بن سعد اور پھر شمر کو فوج دے کر ان کے مقابلے میں بھیجا۔ کربلا کا خونی حادثہ ۶۱ھ/۶۸۰ء میں ہوا۔ ٹھیک چھ برس بعد مختار بن ابی عبید ثقفی کے جرنیل کے ساتھ ایک معرکہ میں ابن زیاد کو شکست ہوئی۔ اور وہ میدان جنگ میں ہی مارا گیا۔ قتل کے بعد اس کے سر کو کوفہ میں اسی مقام پر لا کر رکھا گیا جہاں چھ برس قبل اس نے حضرت امام حسینؓ کا سر مبارک رکھوایا تھا۔

(۱۶۸ھ/۷۸۴ء — ۴ جمادی الثانی ۲۳۰ھ/۱۶ فروری ۸۴۵ء)

ابن سعد ابو عبداللہ محمد بن سعد بن منیع البصری، مورخ، محدث اور ادیب "طبقات" اور "تاریخ اسلام" کے مصنف، البصرہ میں پیدا ہوئے۔ مشہور مورخ واقدی کے نائب تھے، لیکن ان سے کہیں زیادہ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ قبیلہ بنی ربیع سے تعلق تھا۔ ابتدائی عمر میں غلام تھے۔ ابتدائی تعلیم بصرہ میں حاصل کی، پھر بغداد آ گئے۔ آزاد ہوئے تو علم کی خدمت میں عمر گزاری۔ بغداد میں فوت ہوئے۔

"طبقات" نام کی دو کتابیں "صغیر" اور "کبیر" لکھیں۔ "طبقات صغیر" ان دنوں ناپید ہے۔ "طبقات کبیر" میں حضرت رسول اللہ صلعم سے لے کر صحابہ کرام، تابعین اور مولف تک کے زمانے کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور "طبقات ابن سعد" کے نام سے مشہور ہے۔ تیسری کتاب "تاریخ اسلام" بھی ان دنوں ناپید ہے۔

ابن سعود سعودی خاندان، ریاض اور موجودہ سعودی عرب کا حکمران وہابی خاندان بانی محمد ابن سعود تھا جو قبیلہ سالخ ولد علی سے تعلق رکھتا تھا۔ سعود درعیہ کا حکمران تھا۔ اس کی وفات کے بعد ۱۷۲۶ء سے ۱۷۳۶ء کے دوران محمد بن سعود تخت نشین ہوا۔ یہی خاندان اب تک برسر اقتدار ہے۔

اس خاندان کی تاریخ کے تین بڑے ادوار گذرے ہیں۔ ایک ابتدائی دور ہے جو ۱۸۲۰ء تک ہے۔ اس دور میں ریاض اور درعیہ کے علاقوں پر مصریوں کا قبضہ تھا۔ دارالحکومت درعیہ تھا۔ دوسرا دور ۱۸۹۶ء تک کا ہے، جس میں محمد بن عبداللہ کے پوتے ترکی اور اس کے بیٹے فیصل کے ہاتھوں سلطنت کا احیاء ہوا۔ اس دور میں دارالحکومت ریاض رہا۔ اس دور کا خاتمہ ابن رشید کے قبضہ پر ہوتا ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۲ء میں شروع ہوتا ہے، جب عبدالعزیز نے حکومتِ ابن رشید کا تختہ الٹ دیا اور سلطنت ریاض قائم کی۔ موجودہ مملکت سعودی عرب کا بانی یہی عبدالعزیز تھا، جس کے بعد اس کے بیٹے شاہ سعود اور شاہ فیصل تخت نشین ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں شاہ فیصل کی شہادت کے بعد شاہ خالد بن عبدالعزیز حکمران ہوئے ہیں۔

۱۔ **محمد بن سعود** (۱۷۲۵ء — ۱۷۶۶ء) تقریباً ۱۷۴۰ء میں محمد بن عبدالوہاب (وہابی فرقے کا بانی) کو عیینہ سے نکال دیا گیا اور اس نے اپنے دوست محمد بن سعود کے پاس پناہ لی۔ ان دونوں نے مل کر تبلیغ اور تلوار کے زور سے اس فرقے کو پھیلایا۔ ۱۱۵۹ھ میں جو ۱۷۴۶ء سے شروع ہوتا ہے، گرد و نواح کے شہروں اور قبائل اضلاع سے جنگ شروع ہو گئی اور جلد ہی بعض طاقتور پڑوسیوں مثلاً الاحساء کے بنو خالد اور نجران کے بنو مکرمی کو اس جنگ میں دخل انداز ہونا پڑا لیکن وہ وہابیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہ روک سکے۔ مکے کے "شریف" وہابی حاجیوں کو ایک علیحدہ فرقے کے پیرو خیال کرتے ہوئے انہیں مقامات مقدسہ کی زیارت کی اجازت نہ دیتے۔ "شریفوں" کی اطلاعات مرسلہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء کے ذریعے اس فرقے کے متعلق پہلی مرتبہ خبر قسطنطنیہ پہنچی۔ محمد بن سعود نے تقریباً تیس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں درعیہ میں وفات پائی۔

(۱۱۷۹ھ/۱۷۶۶ء — ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء)

۲۔ **عبدالعزیز بن محمد بن سعود** جو ۱۱۳۲ھ/۱۷۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وفات پائی۔ اس کے عہد کے چند ابتدائی سال آس پاس کے شہروں اور قبائل، بنو خالد، بنو مکرمی اور بنو منتفق سے مسلسل جنگ میں گذرے ۱۷۹۵ء میں وہابیوں نے یورش کر کے الاحساء اور قطیف پر قبضہ کر لیا اور اس طرح وہ خلیج فارس کے ساحل پر بھی متمکن ہو گئے۔ وہاں سے ان کو نکالنے کے لئے بصرے اور بغداد کے ترکی والیوں نے اور ان کے حلیفوں، بنو منتفق کے شیخ ثوینی کی مہم اور ۱۷۹۸ء میں کیا یا علی پاشا کی مہم لیکن یہ سب کوششیں ناکام رہیں۔ آخر ۱۷۹۹ء میں عبدالعزیز اور بغداد کے پاشا کے درمیان چھ سال کے لئے عارضی صلح کا معاہدہ ہو گیا۔

۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں مکے کے شریف سرور نے وہابیوں کو ایک مخصوص ٹیکس ادا کرنے پر مقامات مقدسہ میں داخلے کی اجازت دے دی، مگر اس کے جانشین غالب نے جس کا عہد حکومت ۱۲۰۲ھ سے شروع ہوتا ہے اس رعایت کو واپس لے لیا اور پھر ۱۷۹۰ء، ۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۸ء میں غالب نے حجاز کی جانب وہابیوں کی پیشقدمی روکنے کے لئے ناکام فوجی اقدامات کئے۔ لیکن ۱۷۹۸ء میں اسے ان سے صلح کرنا پڑی اور انہیں حج کی اجازت بھی دینی پڑی۔ شرط یہ طے پائی کہ آئندہ وہ شریف کے زیر علاقے پر کوئی دراز دستی نہیں کریں گے۔

شریف مکہ اور والیٔ بغداد کے درمیان یہ مصالحانہ تعلقات تھوڑی ہی مدت تک قائم رہے۔ وہابیوں کے ایک قافلے پر شیعی خزائل کے حملے کا بدلہ لینے کے لئے سعود بن عبدالعزیز نے ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ء کو کربلا پر حملہ کر دیا۔ ۱۸۰۱ء میں سعود حج کے لئے گیا اور عسیر اور تہامہ کے قبیلے اور بنو حرب جو اب تک شریف غالب کے ماتحت تھے۔ وہابیوں سے مل گئے جس کے نتیجے میں علی الاعلان لڑائی چھڑ گئی اور ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء کو وہابیوں نے طائف پر قبضہ کر لیا۔ اور سعود فاتحانہ مکے میں داخل ہو گیا۔ لیکن سعود کی واپسی پر شریف غالب نے مکے میں وہابیوں کی قلعہ نشین فوج کو نکال لیا۔ لیکن مجبوراً اسے وہابیوں کو مزید مراعات دینا پڑیں۔

۱۸۰۰ء ہی میں وہابیوں نے خلیج فارس کے جزیروں میں اپنی قوت بڑھانا شروع کر دی تھی اور آئندہ چند سالوں کے اندر اندر انہوں نے بحرین اور ساحلی قبیلوں یعنی راس الخیمہ کے جواسمی قبائل کو اپنا محکوم بنا لیا تھا۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء نومبر کی تین تاریخ کو ایک شیعی نے درعیہ کی مسجد میں عبدالعزیز کو خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔

(۱۲۱۸ھ تا ۱۲۲۹ھ) ۱۸۰۳ء سے ۱۸۱۴ء۔

۳۔ **سعود بن عبدالعزیز** بغداد اور عمان کے خلاف چھوٹے چھوٹے اقدامات کے بعد سعود نے شریف غالب کی حکومت کا خاتمہ کرنے کا پکا ارادہ کر لیا اور ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں مدینے اور ۱۸۰۶ء میں مکے پر قبضہ کر لیا۔ اپنے بچے کھچے اقتدار کو بچانے کے لئے غالب نے اپنے آپ کو کلیتہً وہابیوں کا مطیع بنا دیا۔ وہابیوں نے اب حجاز میں بھی اپنے مسلک کی اشاعت شروع کر دی۔ حاجیوں کے ان قافلوں کو جنہیں حکومت ترکی نے تیار کیا ہو، (؟) میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ سلطان ترکی کے نام کا خطبہ موقوف کر دیا گیا اور ایک رسمی خط میں سعود نے مطالبہ کیا کہ نہ صرف دمشق کے والی کو بلکہ خود سلطان ترکی کو بھی

Marfat.com

چاہیئے کہ وہ وہابی عقائد اختیار کرے۔

دمشق کے پاشا کے پرزور انکار کا جواب سعود نے یوں دیا کہ ۱۸۱۰ء میں حوران کو تاخت و تاراج کیا اور خلیج فارس کے ساحلی قبائل کی بحری قزاقی کو بڑے پیمانے پر منظم کر دیا۔ ۱۸۰۹ء میں حکومت برطانیہ نے جو ان دنوں ہندوستان پر مسلط تھی راس الخیمہ پر حملہ کر کے اس بڑے کو جو بقول حکومت برطانیہ سمندری لٹیروں کا بیڑا تھا، تباہ کر دیا۔ چونکہ باب عالی ترکی کی حکومت اپنی مملکت کو وہابیوں سے بچانے کے قابل نہ تھی اس لئے اس نے والی مصر محمد علی پاشا کو اس کام پہ مامور کیا کہ وہ حجاز کو دوبارہ فتح کرے۔

لہٰذا مصری فوجوں کی پہلی مہم طوسون پاشا کے ماتحت ۱۸۱۱ء میں ینبوع البحر اور ینبوع البر کی دوبارہ فتح سے شروع ہوئی۔ لیکن جب طوسون پاشا مدینے کی جانب بڑھا تو اسے ۱۸۱۱ء میں جدیدۃ کے تنگ درے میں سعود کے بیٹوں عبداللہ اور فیصل کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اسے ینبوع کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ اس کے بعد ۱۸۱۲ء میں اس نے دوبارہ فوجی کارروائیاں شروع کیں اور اس بار زیادہ کامیاب رہا۔ اسی سال نومبر میں مدینہ فتح ہو گیا اور ۱۸۱۳ء جنوری کے آخر میں مکے پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ پھر چند دنوں بعد طائف پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ برخلاف اس کے ۱۸۱۳ء کے موسم گرما میں تربۃ کے مقام پر مصریوں کی مزید پیشقدمی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی سال اگست کے آخر میں محمد علی پاشا خود جدہ آیا اور سعود کی اس سے صلح کی گفت و شنید کی کوشش ناکام رہی۔ ۱۸۱۵ء تک طوسون پاشا تربۃ کو فتح کرنے میں ناکام رہا۔ جبکہ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں سعود درعیہ میں وفات پا چکا تھا۔

۴۔ عبداللہ بن سعود

(۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء – ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) ۱۸۱۵ء کے شروع میں محمد علی پاشا تربۃ پر حملہ کرنے کے لئے پھر روانہ ہوا اور وسط جنوری میں اسی سال شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ عسیر کی طرف بڑھا اور قنفذۃ کے راستے سے مکے واپس آیا۔ مارچ میں طوسون پاشا حناکیۃ کے راستے نجد میں داخل ہوا اور الرس کے مستحکم شہر پر قبضہ کر لیا۔ جہاں عبداللہ بن سعود سے اس کی ملاقات ہوئی اور ایک حاصل طویل عارضی صلح ہوئی اور مصالحت کی یہ گفت و شنید ۱۸۱۶ء تک جاری رہی۔ اس سال محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم پاشا نے عربستان کی اعلیٰ کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور اٹھارہ ماہ کی متواتر صعوبتوں اور شدید جنگ آزمائی کے بعد وہ اپنی فوج کو درعیۃ کے دروازوں تک لے گیا۔ ۱۸۱۷ء میں ماویۃ کے مقام پر عبداللہ کو شکست ہوئی۔ تین ماہ کے مسلسل محاصرے کے بعد مصریوں نے الرس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۸ء میں عنیزۃ کو فتح کیا۔ دارالحکومت کا محاصرہ، جس کی محافظت عبداللہ اور اس کے رشتہ دار کر رہے تھے، اپریل سے ستمبر ۱۸۱۸ء تک جاری رہا۔ شہر کے فتح ہو جانے کے بعد بھی عبداللہ نے قصر درعیۃ میں ٹھہر کر چند دن اور مقابلہ کیا۔ بالآخر ستمبر کے وسط میں اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اس کے خاندان اور محمد بن عبدالوہاب کی اولاد کو قاہرہ روانہ کر دیا گیا۔ محمد علی پاشا نے عبداللہ کو اس کے کاتب اور خزانہ دار کو قسطنطنیہ روانہ کر دیا۔ جہاں ۱۷ دسمبر ۱۸۱۸ء کو ان سب کے سر قلم کر دیئے گئے۔

۵۔ مُشاری بن سعود

(مقتول عبداللہ کا بھائی) جب ۱۸۱۹ء میں ابراہیم پاشا نجد سے چلا گیا تو درعیۃ میں اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اپنا قیام العارض میں رکھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد حسین بک نے جسے محمد علی پاشا نے اس کے خلاف بھیجا تھا۔ اسے گرفتار کر کے مصر بھیج دیا لیکن ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء کو راستے ہی میں مر گیا۔

۶۔ ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود

مصری حملے کے وقت یہ بھاگ کر سدیر چلا گیا تھا اور مشاری بن سعود کی وفات کے بعد اس نے ریاض میں [illegible] قائم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن [illegible] میں وہ ریاض کی [illegible] مصری [illegible] اور حجاز کے والیوں کے خلاف کبھی کامیاب اور کبھی ناکام [illegible] بالآخر اُس نے محمد علی پاشا کو خراج دینا منظور کر لیا۔ ۱۸۳۰ء میں اس نے الاحسا کے ضلع پر قبضہ کر لیا۔ جہاں ۱۸۱۳ء میں ترک متصرف ہو گئے تھے۔ اس نے بحرین میں بھی اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب درعیہ کی بجائے وہابیوں نے ریاض کو اپنا دارالحکومت بنا لیا کیونکہ درعیہ ویران ہو چکا تھا۔ اسے ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء میں مشاری بن عبدالرحمان بن مشاری بن حسن بن مشاری بن سعود نے قتل کر دیا۔

۷۔ مشاری بن عبدالرحمٰن بن مشاری بن حسن بن مشاری بن سعود

اس پر چالیس دن بعد صفوف میں حملہ کر دیا گیا اور فیصل نے (جو ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود ۶ کا بیٹا تھا) اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۸۔ فیصل بن تُرکی

(پہلا دور حکومت ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء – ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) ۱۸۳۷ء میں سعود بن عبدالعزیز ۳ کے بیٹے خالد نے مصریوں کی مدد سے اس کے خلاف بغاوت کر کے درعیۃ پر قبضہ کر لیا اور اسے ریاض کے مقام پر شکست دی۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مصری فوج کے سپہ سالار خورشید پاشا نے الدلم کے مقام پر دوبارہ شکست دی اور قید کر کے مصر بھیج دیا۔ لیکن ۱۲۵۹ھ میں وہ مصر میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور الدعار، القصیم اور العارض پر قابض ہو گیا۔

۹۔ خالد بن سعود

(۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء – ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء) ابراہیم پاشا سے جنگ کے بعد اس نے مصر میں پرورش پائی تھی۔ اس نے محمد علی پاشا کی امداد سے ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۵ء میں فیصل بن ترکی پر حملہ کیا اور ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۸ء میں اس پر فتح پائی اور امام مسقط سے بھی خراج کا مطالبہ کیا۔ ۱۸۴۰ء میں مصری فوجوں کی واپسی کے بعد عبداللہ بن ثُنیان نے اُسے ۱۸۴۱ء میں ریاض سے نکال دیا۔ اس کے بعد حالات اس کے مخالف ہو گئے اور پہلے ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں الدمام، پھر کویت اور وہاں سے مکے ہوتا ہوا جدہ چلا گیا۔ جہاں ۱۸۶۴ء میں فوت ہو گیا۔

۱۰۔ عبداللہ بن ثُنیان بن سعود

(۱۲۵۷ھ/۱۸۴۲ء – ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) پہلے اس نے خالد ۹ کی اطاعت کر لی تھی لیکن پھر مخالف ہو گیا۔ وہ محض ایک سال ہی حکومت کر پایا تھا کہ فیصل ۸ نے جو ۱۸۴۳ء میں رہائی حاصل کر چکا تھا ریاض میں اس کا محاصرہ کر کے اُسے قید کر لیا اور قید خانے ہی میں ابن ثنیان ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں مر گیا۔

۱۱۔ فیصل بن تُرکی

(دوسرا دور حکومت ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء – ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) اپنے عاقلانہ اور امن پسندانہ تدبر سے اُس نے اپنے خاندان کی حکومت نجد میں قائم کر لی۔ اس کے زمانے میں جبل شمر کے حاکم ابن رشید نے جو اس کے حلیف تھے اُبھرنا شروع کیا۔ مصر اور سلطان ترکی کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں فیصل ریاض میں ہیضے سے مر گیا۔ آخری عمر میں اس کی بصارت جاتی رہی تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ عبداللہ، محمد، سعود اور عبدالرحمان۔

۱۲۔ عبداللہ بن فیصل بن تُرکی

(پہلا دور حکومت ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء – ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء) اپنے والد کی وفات پر مسند نشین ہوا۔ ۱۲۸۷ھ میں اس کے بھائیوں نے اسے مسند سے اُتار دیا۔

Marfat.com

[illegible] فیصل بن ترکی ... عہد کے آغاز میں حکمراں نے عبداللہ کی حکومت [illegible] ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷[illegible]ء [illegible] کو جب [illegible] پر قبضہ کر لیا۔ اور سعود کی انھیں واپس لینے کی متواتر کوششوں کے باوجود وہ ان جگہوں پر قابض رہے۔

۱۴۔ عبداللہ بن فیصل بن ترکی (دوسرا دور حکومت ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء - ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء) مسعود ۱۳ کی وفات پر اس نے دوبارہ تخت حاصل کر لیا اور محمد اور سعود کے بیٹوں سے جو اس کے دعوے دار تھے وہ اس پر قابض رہا۔ ۱۸۸۳ء میں حائل کے حکمران محمد بن رشید سے اس کی جنگ چھڑ گئی اور اس کے بھتیجوں یعنی سعود ۱۳ کے بیٹوں نے ۱۸۸۴ء میں اسے جلا وطن کر دیا۔

۱۵۔ محمد بن سعود ۱۸۸۴ء میں یہ تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت تھوڑے عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد اس کا چچا اس کا جانشین ہوا۔

۱۶۔ عبدالرحمن بن فیصل یہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء میں فوت ہوا۔ یہ موجودہ شاہ فیصل کا دادا تھا۔ وہ دوبارہ تخت نشین ہوا۔ پہلے اپنے بھائی سعود کے بعد لیکن ایک سال کے بعد ہی اس نے اپنے بھائی عبداللہ کے لئے تخت خالی کر دیا۔ بہرحال وہ ایک بار پھر برسر اقتدار آگیا۔ لیکن محمد بن رشید نے اسے معزول کر کے اس کی جگہ

۱۷۔ عبداللہ بن فیصل کو تیسری مرتبہ ۱۸۸۷ء میں تخت پر بٹھا دیا۔ عبداللہ غالباً ۱۸۸۹ء میں انتقال کر گیا اس کے بعد ریاض حائل کی ماتحتی میں آگیا۔ اس کے باوجود کہ عبدالرحمان نے خالی تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی۔ ۱۸۹۱ء میں محمد بن رشید نے ریاض کو فتح کر لیا۔ اور ۱۸۹۲ء میں اس نے فیصل کے تیسرے بیٹے محمد بن فیصل کو ریاض کا امیر مقرر کیا۔

۱۸۔ محمد بن فیصل ۱۸۹۲ء کو ریاض کا امیر مقرر کر دیا۔ (محمد کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔) محمد کے بعد ریاض پر ابن رشید کے عمال کی حکومت رہی۔

۱۹۔ عبدالعزیز بن عبدالرحمن بن فیصل ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے شیخ کویت مبارک کی مدد سے، جس کے پاس اس کے والد نے پناہ لی تھی، حکومت کا تختہ الٹ کر ریاض پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور حائل کے ابن رشید کے مقابلے میں اس پر برابر قابض رہا۔ انھوں نے بالآخر ترکوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ تاہم اس بدنظمی کی بدولت جو حائل میں پھیل رہی تھی اور عام لوگوں کی مدد سے جنہیں سعود کے خاندان سے محبت تھی، عبدالعزیز سلطنت ریاض کے اقتدار کو از سر نو قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ موجودہ مملکت سعودی عرب کا بانی یہی عبدالعزیز ہے جو ابن سعود کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ (دیکھئے "ابن سعود، عبدالعزیز")

۲۰۔ سعود بن عبدالعزیز ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا اور باپ کی وفات پر نومبر ۱۹۵۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا بھائی فیصل بن عبدالعزیز حجاز کا والی، ولی عہد اور وزیر اعظم و وزیر خارجہ بنا۔

۲۱۔ فیصل بن عبدالعزیز ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے اور اپنے بھائی سعود کی معزولی پر نومبر ۱۹۶۴ء میں تخت نشین ہوئے۔ ان کی شخصیت [illegible] مستقل توجہ رہی۔ بین الاقوامی سیاسیات میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا

شجرہ ابن سعود (آل سعود)

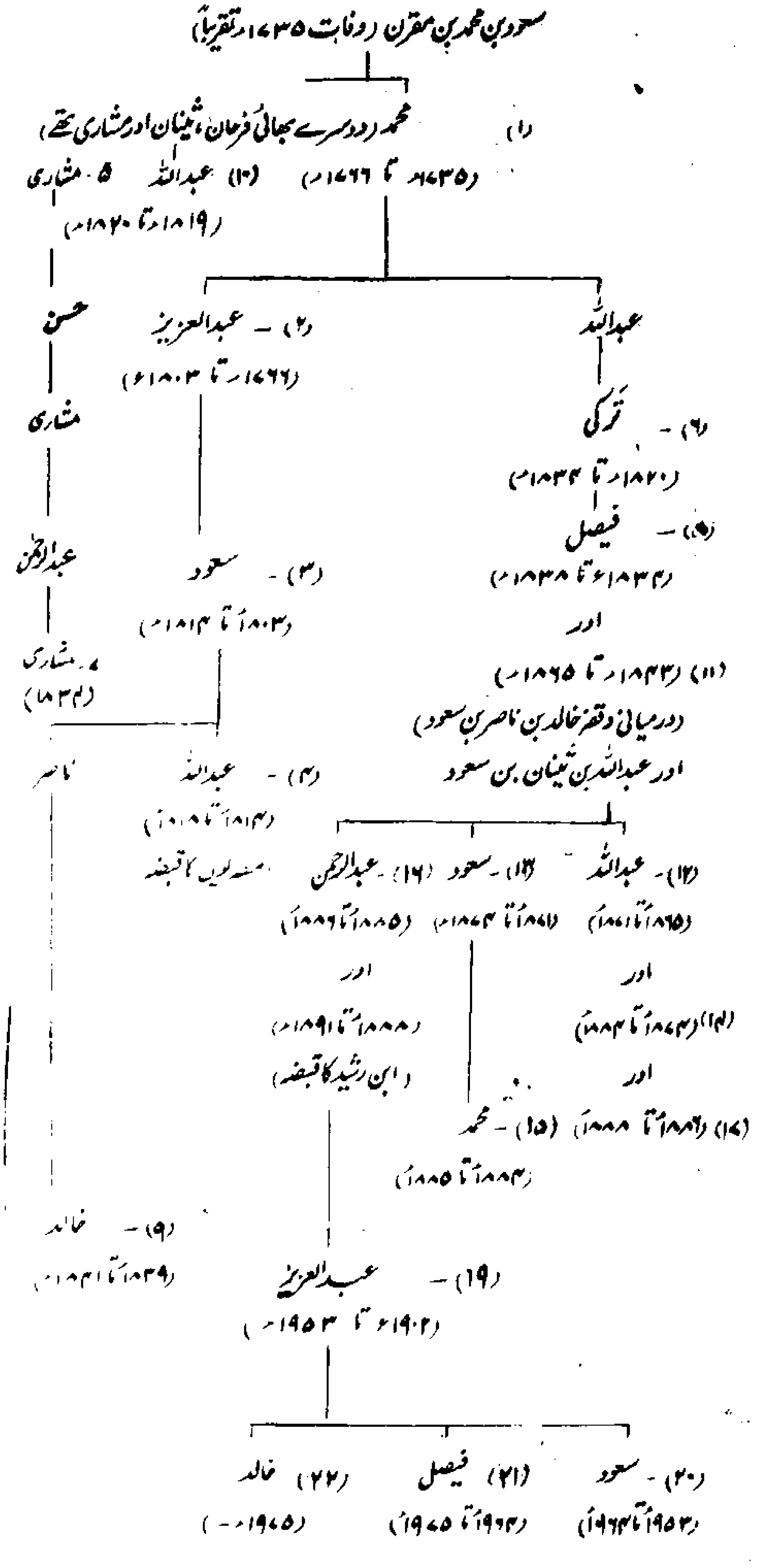

اسلامی اتحاد کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے پاکستان کا دورہ کیا، جس میں ان کا بے مثل استقبال کیا گیا۔ اجتماع ملت اسلامیہ (اسلامی کانفرنس) ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء میں ان کا کردار اور بھی اہم ہو گیا تھا۔ مسلمانان عالم نے ان سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن فرشتۂ اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔ اور ۱۹۷۵ء

Marfat.com

یہاں ان کے بھتیجے فیصل نے ذاتی رنجش کی بنا پر انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ لبعد ازاں قاتل کو بھی سزائے موت دی گئی۔ (دیکھیے "فیصل بن عبدالعزیز")

۲۲۔ خالد بن عبدالعزیز ۱۹۷۵ء سے سعودی عرب کی حکومت ایک اور ذی وقار اور فطین شخصیت خالد بن عبدالعزیز کے ہاتھ آئی ہے۔ شاہ فیصل کے قتل کے بعد انہوں نے سعودی حکومت کا انتظام بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رکھا ہے۔ اور اپنے بھائی کے اس مشن کے لیے سرگرم عمل ہیں جس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

ابن سعود، عبدالعزیز (۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء – ۲ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ/۹ نومبر ۱۹۵۳ء) عبدالعزیز بن عبدالرحمان بن فیصل، موجودہ مملکت سعودی عرب کا بانی ریاض میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ صرف ریاض کا حکمران تھا، جسے محمد بن رشید نے معزول کر کے ۱۸۸۰ء میں عبداللہ بن فیصل کو تخت پر بٹھا دیا تھا جس کے انتقال کے بعد حکومت ابن رشید کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں اس نے فیصل کے تیسرے بیٹے محمد کو ریاض کا امیر مقرر کر دیا اور عبدالرحمان اپنے خاندان سمیت کویت کے شیخ مبارک کے ہاں چلا گیا۔

۱۹۰۲ء میں عبدالعزیز نے اپنے باپ کا تخت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دو سو آدمیوں کے ہمراہ ریاض میں داخل ہو کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ابن رشید کی حمایت میں ترکوں نے اپنی فوج بھیج دی۔ مختلف مقامات پر جھڑپیں ہوتی رہیں بالآخر ۱۹۰۶ء میں محمد ابن رشید کی وفات کے بعد عبدالعزیز کی فوجوں کی راہ میں مزید مزاحمت باقی نہ رہی۔

اگلے کئی برس عبدالعزیز نے نجد کے اکثر علاقوں کے انتظام و انصرام میں گذارے۔ اس نے قبائلی نظام کا خاتمہ کرنے کے لیے عرب قومیت کے نعرے کو پروان چڑھایا اور "اخوان" نام کی مختلف کالونیاں قائم کیں، جہاں عدل و انصاف کے لیے "شریعت" کو نافذ کیا گیا یہ سب کچھ وہابی مسلک کی رُو سے کیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر مکہ میں حجاز کی سلطنت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ شریف مکہ حسین بن علی نے انگریزوں کی شہ پر "حزما" کو قبضے میں کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں [illegible] گئیں، جن میں [illegible] پر قابض ہوتی چلی گئیں۔ ستمبر [illegible] بیٹے علی کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ [illegible] سے فرار ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں عبدالعزیز مکہ میں [illegible] بھی وہابیوں کے قبضے میں آ گیا۔

۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو عبدالعزیز نے بادشاہ حجاز [illegible] ابن سعود کا لقب اختیار کیا۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۷ء کو اس کے اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے برطانیہ نے مملکت نجد و حجاز کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۲ء میں اس مملکت کا نام "سعودی عرب" رکھا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں یمن کے ساتھ بھی ایک معاہدہ ہوا، جس کی رُو سے دونوں ملکوں نے اپنی اپنی سرحدوں کا تعین کیا۔ اسی طرح کا ایک دوستانہ معاہدہ ۱۹۴۲ء میں شیخ کویت سے بھی ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے تخت نشینی کا پچاس سالہ جشن (جوبلی) منایا۔ تین برس بعد مکہ میں وفات پائی۔ اس کا بڑا بیٹا سعد بن عبدالعزیز السعود (۱۹۰۵ء – ۱۹۶۳ء) تخت نشین ہوا اور فیصل بن عبدالعزیز (۱۹۰۶ء – ۱۹۷۵ء) نے ولی عہد کی حیثیت سے امور خارجہ کا قلمدان سنبھالا۔

ابن سینا، بُوعلی (صفر ۳۷۰ھ/اگست ۹۸۰ء – ۴ رمضان ۴۲۸ھ/۲۱ جون ۱۰۳۷ء) ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا، دنیائے اسلام کا نامور طبیب شہرہ آفاق سائنسدان، جامع العلوم فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات، ملقب بہ الشیخ الرئیس، بخارا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ مغرب میں اوی سینا (AVICENA) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی کتاب "القانون فی الطب" مدتوں تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہی۔ اور کتاب "الادویہ" طب کی انجیل بنی رہی۔

ابوعلی ابھی چھ برس کا تھا کہ وہ بخارا پہنچا اور تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ باپ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا، اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی مسلک کی تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہا، لیکن ہونہار بروا نے دس برس میں قرآن، فقہ اور ادب کا سلسلہ ختم کر لیا۔ اور اب دیگر علوم عقلیہ کی طرف مائل ہوا۔ ابوعبداللہ ناتلی سے اس نے منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ خود ہی طب اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کیا اور بہت جلد اپنے اساتذہ پر سبقت لے گیا۔

Marfat.com

[illegible] کی عمر میں ابوعلی ابن سینا نے بخارا کے حکمران نوح بن منصور کا علاج بڑی کامیابی کے ساتھ کیا۔ جس کے عوض اسے کتب خانہ شاہی کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ ذہن رسا پایا تھا، چنانچہ ایک ہی برس میں سارا کتب خانہ چھان مارا۔ براہ راست مشاہدوں اور تجربات کی مدد سے وہ اپنی معلومات کی تکمیل بھی کرتا رہا۔ اگلے ہی برس حاکم بخارا فوت ہوگیا اور ابن سینا کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ لیکن اس اثنا میں وہ تحصیل علم کی تکمیل کرچکا تھا۔ اور اب تصنیف و تالیف کے میدانوں میں کود پڑنے والا تھا۔

۱۰۰۱ء میں ابن سینا خوارزم پہنچا اور علی بن مامون کے دربار میں داخل ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات اس دور کے دیگر عظیم علماء و فضلاء سے ہوئی۔ البیرونی، العراقی اور ابوالخیر کے ساتھ اکثر مباحثے ہوتے رہے۔ یہاں سے عراق اور ۱۰۰۹ء میں جرجان کا رُخ کیا۔ ان تمام جگہوں پر وہ کبھی بھی چین سے بیٹھ سکا۔ ۱۰۱۵ء میں اس نے رے کا رُخ اختیار کیا۔ راستے کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے اور مشورے دیتے ہوئے ۱۰۲۲ء میں اصفہان کے امیر علاء الدولہ کے ہاں اسے کسی قدر سکون ملا۔ علاؤ الدولہ اکثر اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ عمر کے آخری چودہ برس اس نے علاؤ الدولہ ہی کے ہاں گذارے، اگرچہ اس میں بھی وہ زیادہ عرصہ بیمار ہی رہا۔ اور بالآخر ہمدان میں مرض قولنج کے ہاتھوں فوت ہوگیا۔

ابن سینا نے فلسفہ، منطق، ریاضی اور سائنس کے موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں فلسفہ پر "الشفاء"، طب میں "القانون" اور "الادویہ" انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں ان کے تراجم یورپی زبانوں میں ہوئے اور اگلی کئی صدیوں تک یہ اسلامی اور یورپی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ دیگر کتابوں میں "النجات"، "الاشارات"، "الہدایت"، رسائل فی الحکمت والطبیعیات" زیادہ مشہور ہیں۔

ابن سینا کے نزدیک علم کی دو اقسام ہیں۔ ایک نظری یا نظریاتی اور دوسرے عملی۔ نظری علوم محسوس سے مجرد کی طرف بڑھتے ہیں مثلاً طبیعیات ریاضیات اور مابعد الطبیعیات وغیرہ اور عملی علوم اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ ہیں۔

ابن سینا کے نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ ذات اور وجود دو الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح روح اور جسم دو الگ الگ حیثیتوں کے مالک ہیں۔ روح مادے کی نہیں بلکہ صورت کی ایک قسم ہے۔ لیکن روح جسم کے بغیر بے کار ہے۔ اس کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں لیکن یہ جسم کے تابع بھی نہیں بلکہ اسے اپنا ادراک حاصل ہے۔ عقل اس کا ایک ملکہ ہے، اس کی ایک خصوصیت ہے اور عقل کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ نہ صرف خود کو پہچانتی ہے بلکہ مسلسل ترقی بھی کرتی ہے، جبکہ جسم ایک خاص عمر کے بعد زوال کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ مادے اور صورت کی تبدیلی کے باوجود روح یا عقل میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

ہر مادہ ایک صورت رکھتا ہے اور ہر صورت کے لئے مادہ ہونا لازمی ہے۔ گویا صورت اور مادہ ایک دوسرے کے لئے علّت (وجہ) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علّت کی اس کے نزدیک چار اقسام ہیں۔ علّت مادی، علّت صوری، علّتِ غائی (آخری) اور علّت حرکی (تحریک دینے والی)، ابن سینا کے نزدیک ان تمام علتوں کے آخر میں ایک اور علّت نکل آتی ہے، جو ان سب کو حرکت دیتی ہے۔ اسی علّت العلل کو وہ خدا کی ہستی قرار دیتا ہے، جو بیک وقت علّتِ فاعلہ (یعنی کام کرنے والی علّت) اور علّت الغایت (آخری علّت) ہے گویا ایک ایسی علّت کا وجود لازم ہے، جس سے تمام علّتیں نکلتی ہیں، یہی وہ عقل اوّل ہے جس نے اتنی عظیم الشان کائنات قائم کی۔ گویا اس کے وجود سے بے شمار وجود ظہور میں آگئے مگر اس کی ذات واحد ہے۔ اس طرح سے ابن سینا ذات اور وجود کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیتا ہے، وجود کے لیئے ذات تو لازم ہے لیکن ذات کے لئے وجود لازم نہیں۔ اگر خدا صرف ممکن حیثیت رکھتا ہے، تو وہ ذات محض ہے، جس کے لئے وجود لازم نہیں اور اگر وہ وجود رکھتا ہے تو اس کے لیئے ذات لازم ہے۔ ہر دو صورتوں میں خدا عین ذات ہے۔ وہی عقل مطلق ہے جسے اپنی ذات کا شعور بھی ہے اور کائنات کا شعور بھی، اور اگر خدا واجب ہے (یعنی ممکن کی حد سے آگے نکل کر لازم ہے) تو اس کا وجود بھی ہے اور ذات بھی۔ ممکن تو ایک ایسا وجود ہے، جس کی کوئی علّت ہونا لازم ہے تبھی ممکن وجود پذیر ہوگا۔ لیکن واجب وہ لازم ہے، جس کے لیئے کسی قسم کی علّت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ ممکن کی ایک علّت کو بھی ممکن ہی تسلیم کیا جائے گا اور اس کی آگے پھر ایک علّت ہوگی اور پھر وہ علّت ممکن ہوگی اس طرح سے ثابت ہوا کہ ممکن کے وجود کی مثبت دلیل نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ ایک ایسا وجود ہونا چاہیئے، جو ممکن سے پاک اور واجب ہو۔ اس فلسفیانہ چکر سے تھک کر ابن سینا اقرار کرتا ہے کہ عقل و برہان کے ذریعے خدا کی ہستی کا ادراک ناممکن ہے۔ بس یہی سمجھ لیں کہ خدا ہے۔ اس کی نہ تو کوئی علّت ہے نہ دلیل نہ تعریف بلکہ یہ کائنات اور موجودات اسے ثابت کرنے کے لیئے کافی ہیں۔ یہاں ابن سینا کی عقلیت ایک بار پھر فلسفہ کے دائرے سے نکل کر مذہب کی راہوں پر آجاتی ہے۔ وہ خدا کی ہستی کو تسلیم بھی کرتا ہے مگر اسے کائنات سے الگ تھلگ بے جسم، بغیر مادہ، بغیر حیات کے ایک ہستی قرار دیتا ہے۔ وہ کامل ہستی ہے جسے حرکت نہیں کرنا پڑتی۔ حرکت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہستی کائنات کا علم نہیں رکھتی جبکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ خبیر و بصیر ہے اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ یہاں ابن سینا کہتا ہے کہ خدا دنیا سے باخبر تو ہے لیکن اس کے جزئیات کا علم عمومی نوعیت کا ہے۔ اس لیئے وہ موجودات پر فیضان کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی خوبی موجودات میں سے منعکس ہو۔

ابن سینا کے نزدیک خیر اور شر دونوں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ تاہم اس کے نزدیک خیر ہی اوّل اور خیر ہی آخر ہے، شر محض جہالت، نادانی اور رنج و غم کی وجہ سے

Marfat.com

[illegible] علم، تعقل اور معرفت حاصل ہوتی ہے تو یہ [illegible] پیدا ہوتا ہے اور جب اسے علم، تعقل اور معرفت حاصل ہوتی ہے [illegible] ہوجاتا ہے۔ —

ابن سینا عقل اور ایمان کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتا ہے۔ تاہم وہ عقل کو ایمان کی ابتداء اور ایمان کو عقل کی انتہا قرار دیتا ہے۔ اس طرح سے اس کے نزدیک پیغمبروں کا درجہ فلسفیوں اور عقل پرستوں سے افضل ہے۔ اور وحی کی حیثیت ادراک کی قوت سے بلند تر ہے۔ اس کا قول ہے کہ منطق اور علم ہمیں اتنی جلد خدا کے قریب نہیں کرتے جتنا ایمان اور تصوّف۔ گویا زہد، تقویٰ اور ریاضت سے خدا کی ہستی کا علم عقل و منطق کی بہ نسبت جلد اور بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح سے ابن سینا فلسفے اور منطق کی راہوں سے ہوتا ہوا الٰہیات کی منازل تک چلا آتا ہے۔

طبیعیات میں ابن سینا نے نور، حرارت، خلا، قوت، حرکت اور فدّات کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے نزدیک روشنی کی ایک رفتار مقرر ہے اور ہر شے اپنا ایک مخصوص وزن رکھتی ہے۔ ابن سینا کیمیاگری کا سخت مخالف تھا۔ اس کے نزدیک عناصر ایک دوسرے میں تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔ معدنیات پر اس کا رسالہ مدّتوں یورپی علوم کا ماخذ رہا۔ اسی طرح ارضیات کے میدان میں بھی اس نے پہلا قدم اٹھایا اور متحجرات اور پہاڑوں کی ساخت کی وضاحت کی۔

علم طب میں ابن سینا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ علم نہیں تھا تو بقراط نے اسے جنم دیا، جب یہ مرگیا تو جالینوس نے حیات نو بخشی، جب یہ بکھر گیا تو رازی نے سمیٹا لیکن یہ ناقص تھا اور ابن سینا نے اس کی تکمیل کی۔

ابنِ صیّاد ایک یہودی کا بیٹا، جسے دجّال سمجھا جاتا رہا تھا۔ اس کا اسلامی نام عبداللہ تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ساحر تھا اور مسلمان ہوگیا، اور مکّہ اور مدینہ میں آتا جاتا رہا۔ حضرت رسول اکرمؐ نے اس سے ملاقات کی تھی انہیں شک تھا کہ شاید دجال یہی ہو لیکن آپؐ نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ ابن صیاد ہی دجال ہے۔ —

دجال کے متعلق احادیث سے علم ہوتا ہے کہ قیامت آنے سے پہلے اس کا فتنہ ظہور پذیر ہوگا۔ وہ ایک آنکھ سے کانا شخص ہوگا اور لوگوں سے اپنی خدائی منوائے گا۔ اکثر لوگ اسے خدا تسلیم کریں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ مرجائے گا۔ حضرت رسول اکرمؐ نے مزید فرمایا کہ اگر وہ میرے زمانے میں ظاہر ہوا تو میں اس سے نبٹ لوں گا اور اگر وہ بعد میں آیا تو اللہ اپنے مومنوں کا حامی و ناصر ہوگا۔ —

ابن صیاد کی ایک آنکھ میں پھولا تھا اور وہ عین اس وقت پیدا ہوا جب مسلمان ذکر دجال سن چکے تھے۔ حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "دجال کا باپ تیس سال تک لاولد رہے گا، پھر ایک کانا لڑکا پیدا ہوگا جس کے دانت لمبے ہوں گے اور وہ اپنے ماں باپ کے حق میں نفع رساں نہ ہوگا۔ اس کی آنکھیں سوئی ہوئیں لیکن دل جاگتا ہوگا۔ پھر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اس کا باپ لمبا مگر دبلا ہوگا اور اس کی ناک چونچ کی مانند ہوگی اور اس کی ماں بھاری جسم اور لمبے ہاتھوں والی ہوگی۔ ابوبکرہؓ کہتے ہیں، اس وقت مدینہ میں ایک یہودی کے گھر ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی تو میں اور ابن عوام دونوں دیکھنے گئے تو دیکھا کہ وہ ویسا ہی تھا جس کے متعلق آنحضورؐ نے پیش گوئی کی تھی اور وہ تیس سال بعد ہی اپنے والدین کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ (ترمذی)

[illegible] دیکھا کہ وہ [illegible] جب دیکھا تو پکار اٹھی [illegible] سے منہ نکالا۔ آنحضورؐ نے فرمایا [illegible] سی باتوں کا انکشاف ہوجاتا۔ —

عبداللہ بن عمرؓ اور دیگر اصحابؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت رسول اللہ [illegible] ان کے ہمراہ ابن صیاد کے پاس سے گزرے۔ وہ اس وقت بنی [illegible] میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ابن صیاد بالغ ہونے والا تھا۔ [illegible] کے آنے کی خبر نہ ہوئی تو آپؐ نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر فرمایا، "کیا تو [illegible] میں اللہ کا رسول ہوں؟" تو اس نے جواب دیا کہ "ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ امیوں (ان پڑھوں) کے رسول ہیں۔ نیز کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں رسول ہوں؟"

آنحضور صلعم نے اسے جھنجھوڑا اور فرمایا: "میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہوں۔ (اگر تو بھی ہوتا میں ایمان لاتا)" پھر فرمایا۔ "کیا تجھ پر غیب سے کچھ آتا ہے؟" اس نے کہا "ہاں! کبھی صحیح اور کبھی غلط۔" پھر آپؐ نے دل میں ایک آیت سوچی "یوم تاتی السماء بدخان مبین" اور اس سے پوچھا "میں نے دل میں کیا سوچا ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "دُخ (دھواں)" اس نے ایک ہی لفظ بتایا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ طیش میں آگئے اور عرض کی کہ اگر آپؐ اجازت دیں تو اس کی گردن مار دوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ "نہیں! اگر یہ دجال ہے تو پھر تو اس پر قابو نہ پائے گا۔ اور اگر یہ دجال نہیں تو اس کا قتل کرنا واجب نہیں۔"

ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے ابن صیاد کا مدینہ سے مکہ تک ساتھ دیا تو اس نے مجھے کہا کہ لوگوں سے میں نے تکلیف پائی ہے کہ وہ مجھے دجال کہتے ہیں اور تم جانتے ہو کہ ایسا نہیں کیونکہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دجال لاولد ہوگا اور میری اولاد ہے اور یہ بھی فرمایا کہ دجّال کافر ہوگا اور میں مسلمان ہوں۔ پھر آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ مکّہ مدینہ میں داخل نہ ہوگا اور میں مکّہ سے مدینہ کو جاتا ہوں پھر اس نے کہا کہ میں دجّال کی پیدائش کا وقت اور مکان جانتا ہوں اور اس کے ماں باپ سے بھی واقف ہوں۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ اس کی آخری باتوں نے مجھے شبے میں ڈال دیا۔"

ان احادیث کی روشنی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صیاد ایک یہودی کا بیٹا تھا جو بعد میں مسلمان ہوگیا، اس کی ظاہری علامات سے مسلمانوں نے اسے دجّال سمجھا جبکہ یہ بات ثابت نہ ہوسکی۔ بعد ازاں اس نے حج بھی کئے اور صاحب اولاد بھی تھا۔

ابن طباطباء (دیکھئے۔ "ابن طقطقی")

ابنِ طفیل (۴۹۴ھ/۱۱۰۰ء - ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء) ابوبکر محمد ابن عبدالملک ابن طفیل مسلمان فلسفی، طبیب اور مشہور رمزی فلسفیانہ افسانے "حی ابن یقظان" کا مصنف، اندلس کے شہر غرناطہ کے قریب وادی آش میں پیدا ہوا۔ شروع میں غرناطہ میں طبابت کرتا رہا بعد ازاں اندلس کے الموحد حکران ابو یعقوب یوسف (۱۱۶۳ء-۱۱۸۴ء) کا طبیب مقرر ہوا۔ یہیں اس نے مشہور فلسفی ابن رُشد کا اس وقت تعارف کروایا تھا جب کہ وہ ابھی نوجوان تھا۔ اسی نے ابن رشد کو ارسطو کی تصانیف کی تشریح لکھنے کے لیے اکسایا تھا۔ —

ابن طفیل نے طب پر بہت سی کتابیں لکھیں لیکن [illegible]

Marfat.com

ان کی (مشہور) تصنیف "حی بن یقظان" ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے، جس میں مؤثر پیرایہ اظہار میں دراصل ابن طفیل نے اپنے مکتب فکر کے خیالات کی وضاحت میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنی زندگی کے ابتدائی ۵۰ سال ایک ویران جزیرے پر گذارتا ہے۔ وہ کائنات کے اسرار کھوجتا اور اپنا علم بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ فلسفہ کا علم اور شریعت کا علم دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں اور الہامی مذاہب بھی وہی کچھ ہیں، جن تک فلسفیانہ عقیدہ پہنچ گیا ہے۔ (دیکھیے "حی بن یقظان")

دراصل اس کہانی کے پردے میں ابن طفیل اس مکتب فکر کا موقف واضح کرتا ہے، جو الکندی سے شروع ہو کر ابن رشد تک ختم ہوتا ہے۔ یہ لوگ عقل پرست ہیں۔ تاہم مذہبی امور کو فلسفے کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابن طفیل کے نزدیک چونکہ فلسفہ عام لوگوں کے ذہنوں سے بالاتر ہے۔ اس لئے اسے قصے کی شکل میں بیان کرنا چاہیے۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ابن طفیل فلسفے ہی کو حتمی اور آخری مقصد قرار دیتا ہے بلکہ اس کے نزدیک شریعت اور تصوف ہی وہ آخری منزل ہے۔ جو نہ صرف عوام الناس بلکہ حی بن یقظان جیسے مفکرین کے لئے بھی جائے پناہ ہے۔ کیونکہ حی بن یقظان عوام سے بددل ہو کر واپس اسی جزیرے میں چلا جاتا ہے تاکہ رہبانیت کی زندگی گذارے۔

چودھویں صدی عیسوی میں موسیٰ نبرونی نے اس افسانے کا عبرانی زبان میں ترجمہ کیا اور پندرھویں صدی عیسوی میں پی ڈی میرانڈولس نے عبرانی سے اس کا لاطینی ترجمہ کیا بعدازاں عربی متن سے اس کا لاطینی ترجمہ ای پوکوک نے ۱۶۷۱ء میں شائع کیا۔ انگریزی ترجمہ ۱۷۰۸ء میں سائمن اوکلے نے شائع کیا۔ بعدازاں دیگر زبانوں میں بھی تراجم ہوئے۔ انگریزی زبان کا مشہور کلاسیک "رابن سن کروسو" شاید اسی افسانے کے زیر اثر لکھا گیا تھا۔

ابن طقطقی (۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء — ؟) جلال الدین ابوجعفر محمد بن تاج الدین ابی الحسن علی، شیعی نقیب اور مورخ، ابراہیم طباطبا کے واسطے سے حضرت علیؓ کی بیسویں پشت سے ہیں۔ ان کے والد کو حِلّہ اور بغداد میں خاندان علیؓ کے نمائندہ اور نقیب النقباء کہلاتے تھے، آباقا کے وزیر الجوینی کے اشارے پر ۶۸۰ھ/۱۲۸۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ باپ کے قتل کے بعد الحلہ اور نجف و کربلا کی نقابت ان کے سپرد ہوئی۔ خراسان اور موصل کا سفر بھی کیا۔ اسی سفر کے دوران میں "کتاب الفخری" تحریر کی۔ اس میں امور سیاسیات اور اسلامی تاریخ کا بیان ہے۔ ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔ اپنی کنیت ابراہیم طباطبا سے کرتے تھے۔ اس لئے انہیں ابن طباطبا بھی کہا جاتا ہے۔ نیز طقطقی کے معنی بہت بولنے والا کے ہیں۔

ابن عباد (۳۲۶ھ/۹۳۸ء — ۳۸۵ھ/۹۹۵ء) ابوالقاسم، کافی الکفاۃ اسماعیل بن عباد بن العباس بن عباد بن احمد ادریس الطالقانی عالم و ادیب طالقان (اصفہان) میں پیدا ہوا۔ والد رکن الدولہ بویہی کا وزیر تھا۔ تعلیم بغداد میں حاصل کی اور وہیں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۳۴۷ھ/۹۵۸ء میں وزیر ابوعلی القاشا کی ملازمت میں چلا گیا پھر ابوالفضل بن العمید کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں اس کا تقرر مؤید الدولہ بن رکن الدولہ کے وزیر کی حیثیت سے ہوا۔ "کافی الکفاۃ" کا لقب مؤید الدولہ ہی نے دیا۔ ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں اسے ہمدان میں عضد الدولہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ ۳۷۳ھ/۹۸۳ء میں مؤید الدولہ بغیر فیصلہ جانشینی کئے فوت ہو گیا تو ابن عباد کی سفارش پر اس کے بھائی فخر الدولہ کو بادشاہت قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس کے دربار میں بھی ابن عباد کا اثر و رسوخ بے مثل تھا۔ اس نے فخر الدولہ کو عراق و عرب فتح کرنے پر بھی اکسایا لیکن وہ ناکام رہا۔

ابن عباد کی اصل شہرت اس کے علم و فضل کی وجہ سے ہے۔ وہ اٹھارہ کتابوں کا مصنف بھی تھا، جن میں سے اب چار دستیاب ہیں۔ اس کے کتب خانے کی فہرست کتب دس جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس نے رے ہی میں وفات پائی۔

ابن عباسؓ صحابی، محدث اور فقیہہ۔ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ (دیکھیے "عبداللہ بن عباس")

ابن عبدالبر (۲۵ ربیع الثانی ۳۶۸ھ/۳۰ نومبر ۹۷۸ء — ۱۹ ربیع الثانی ۴۶۳ھ/۴ جنوری ۱۰۷۱ء) ابوعمر یوسف بن عبدالبر، فقیہہ اور محدث، قرطبہ کے رہنے والے تھے۔ حدیثوں کے اکٹھا کرنے کا شوق تھا جو بعد میں علمی حیثیت اختیار کر گیا۔ حدیثیں جمع کرنے کے لئے مارے مارے پھرتے تھے۔ فقہ میں بے حد مہارت حاصل تھی اور اس ضمن میں اندلس کے علماء میں افضل سمجھے جاتے تھے شاطبہ کے مقام پر وفات پائی۔ تصانیف میں "استیعاب"، "کتاب الصغیر" (قبائل عرب اور ان کے نسب)، "الاستذکار" (موطا کی شرح)، "تمہید الموطا" (۷۰ جلدوں میں) اور بہجۃ المجالس و انس المجالس (تین جلدوں میں اقوال و لطائف) زیادہ مشہور ہیں۔

ابن عبدالحکم (وفات ۲۵۷ھ/۸۷۱ء) عبدالرحمان بن عبداللہ بن عبدالحکم، مصر کا عرب مورخ، تاریخ و جائے ولادت کا علم نہیں۔ اس کے والد عبداللہ فقیہہ اور حدیث کے عالم تھے اور مصر میں مالکی مذہب کے امام تھے۔ یہ بھی بعد میں امام بنے۔ چونکہ ان لوگوں نے عقیدہ خلق قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے خلیفہ الواثق باللہ نے ۲۳۷ھ/۸۵۱ء میں اس خاندان پر غبن کا مقدمہ چلایا۔ جس پر یہ لوگ بدنام ہوئے۔

ابن الحکم کو حدیث سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے "فتوح مصر" مرتب کی، جو سات جلدوں پر ہے۔ سیوطی کی کتاب "حسن المحاضرہ" بھی زیادہ تر اسی سے نقل ہے۔ خود اس کا مواد مدنی روایات پر مشتمل ہے۔ فسطاط میں وفات پائی۔

ابن عذاری ابوعبداللہ محمد ابن عذاری، مورخ، تاریخ پیدائش و وفات کا علم نہیں المراکشی مشہور ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں بقید حیات تھا کیونکہ اس کی تصنیف میں ۶۶۷ھ/۱۲۶۹ء تک کے واقعات ملتے ہیں۔ لیکن تصانیف سے حالات کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ ایک کتاب "تاریخ مشرق" اب ناپید ہے اور دوسری کتاب "البیان المغرب فی اخبار المغرب" ہے (۴۶۰ھ/۱۰۶۸ء تک کے واقعات کے چند اجزا چھپ چکے ہیں۔) ڈوزی نے اس کا ترجمہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء کے دوران میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ نیا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بعض اوراق گمگشتہ کے اقتباسات ہیں۔ اس لئے اس کی تاریخی اہمیت بے انتہا ہے۔

ابن عربی (۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء — ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء) شیخ ابوبکر محی الدین محمد ابن علی، الشیخ الاکبر، مرسیا میں پیدا ہوئے، عرب کے قدیم قبیلہ طے سے تعلق رکھتے

Marfat.com

تھے۔ ۵۶۸ھ/۱۱۷۳ء میں آپ اشبیلیہ چلے گئے اور تیس برس تک حصولِ علم میں سرگرداں رہے۔ اکثر صوفیاء سے یہیں ملاقات کی۔ ۵۹۸ھ/۱۲۰۱ء میں بلادِ مشرق کو روانہ ہوئے یہ سرزمین انہیں اس قدر پسند آئی کہ پھر کبھی واپس نہ گئے۔ مصر، مشرقِ قریب، ایشیائے کوچک اور عرب کے مختلف شہروں کی سیر کی اور بالآخر ملک شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ شہر دمشق ہی میں وفات پائی۔

آپ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ان میں خاص خاص کتابیں یہ ہیں:—

۱۔ "فتوحاتِ مکیہ" اس میں مختلف مذاہب اور مسالک پر بحث کی گئی ہے۔
۲۔ "فصوص الحکم" تصوف اور فلسفے کے مسائل اور الٰہیات پر ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے
۳۔ "ذخائر الاعلاق" اشعار کا دیوان ہے، جس میں حُبِّ الٰہی کی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے

بعض لوگوں کی رائے میں ابن عربی کامل ولی، قطبِ زماں اور علم باطنی میں ایسی سند تھے جس میں کلام ہی نہیں ہے۔ دوسری جانب کا گروہ کہتا ہے کہ وہ بدترین قسم کے ملحد تھے۔ ان کے مداحوں میں جلیل القدر علماء بھی تھے جنھوں نے ان کے عقائد کی تائید میں کتابیں بھی تالیف کیں۔ ایسے علماء میں سراج الدین المخزومی، الفخر الرازی، الجلال السیوطی مجدالدین فیروزآبادی اور عبدالرزاق الکاشانی شامل ہیں۔ متاخرین میں سے عبدالوہاب الشعرانی بھی تھے۔ ان کے بعض مشہور و ممتاز مخالفین میں رضی الدین بن الخیاط الذہبی، ابن تیمیہ، ابن ایاس، علی القاری اور جمال الدین محمد بن نورالدین صاحب "کشف الغمۃ عن ھذہ الامۃ" شامل تھے۔ بعض بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں مثلاً ابن تیمیہ، ابن خلدون اور ابن حجر عسقلانی ان کے بعد بھی مخالفت میں سرگرم رہے۔

آج بھی ان کی تصانیف کے بارے میں اس قسم کا متضاد رویہ اختیار کیا جاتا ہے بعض ان کی تصانیف کے مطالعہ کا حکم دیتے ہیں اور بعض ان کی تصانیف پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف کا موضوع تصوف ہے۔ اس وسیع و بسیط موضوع کے علاوہ ابن عربی نے حدیث، تفسیر، سیرت النبی، ادب۔ جس میں متصوفانہ شاعری بھی شامل ہے علوم طبیعی بالخصوص گیہاں شناسی، ہیئت اور علوم مخفیہ پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں یکسانیت نہیں ہے اور اندازِ فکر بھی وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے۔ چاہیں تو واضح اور سلیس انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انھوں نے کس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور وہ موضوع مذہبی نقطۂ نظر سے کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے ہاں شاعرانہ رنگین بیانی بھی ملتی ہے اور سادہ نثر بھی۔

ان کی آخری تصانیف بالخصوص "فصوص" مبہم ترین ہیں۔ اس کا اسلوب رمزیہ ہے اور اندازِ بیان انتہائی اصطلاحی۔ ان امور کو جنہیں بڑی سادگی اور سلاست سے بیان کیا جا سکتا تھا جان بوجھ کر گنجلک اور پیچیدہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس طرح تنگ خیال، راسخ العقیدہ اور راہِ تصوف سے بے خبر لوگوں کی نظر سے اپنے "وحدت الوجودی" عقائد کو چھپایا ہے۔ ان کی درست اعتقادی کے بارے میں جو اختلافِ رائے دنیائے اسلام میں پایا جاتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے پردے میں اپنے اصل خیالات کو چھپانے میں صرف ایک حد تک ہی کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک اعتبار سے "فصوص" کو تفسیرِ قرآن بھی کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تفسیر کے لیے جن آیات کو چنا ان کی تاویل اس طرح کی ہے کہ ان سے وہی معانی نکل سکیں جو وہ انہیں پہنانا چاہتے ہیں بعض اوقات قواعد نحوی و اشتقاقی کے علی الرغم بھی قرآن کو فلسفۂ وحدت الوجود کے ایک مسلسل و مربوط نظامِ فکر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دونوں کو اس طرح ملتبس کر دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا کمتر درجہ تک یہی طریقہ تا وہاں احادیث نبوی کے سے بھی استعمال کیا ہے [illegible] ایک اچھوتا اندازِ فکر بھی رکھتے تھے۔ [illegible] فلسفہ کچھ بے ترتیب سا ہے۔ وہ ایک بہت [illegible] ہیں۔ وہ انتہا درجے کے خواب و خیال کی دنیا میں بسنے والے [illegible] تخیل کے ذریعے سے کام کرتا ہے مگر اس میں استدلال کی ایک کڑی بھی جا ملتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقتاً فوقتاً اس کا تسلسل ٹوٹتا رہتا ہے۔ استدلالی اور تصوفی (خیالی) یہ دو پہلو ان کے فکر میں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

اپنے خیالات کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کبھی تو انھیں ثابت کرنے کے لیے رسمی جدلیاتی استدلال استعمال کیا اور کبھی اسے نظرانداز کر گئے۔ بعد ازاں یا تو ان کے قطعی ثبوت کے لیے صوفیانہ وجدان کا حوالہ دے دیا اور یا ان کے متعلق محض ایک تخیلی بیان مہیا کر دیا۔ اپنی نفسیات میں وہ تخیلہ کو بہت اونچا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی قوت ہے جس سے حقیقی علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے تخیل میں ایسی اشیاء کا مشاہدہ کیا ہے جو ان کے لئے موجوداتِ خارجیہ جیسی، بلکہ ان سے بھی زیادہ حقیقی تھیں۔ انھوں نے دنیا کے سامنے متصوفانہ فلسفے کا ایک نظام ضرور پیش کیا ہے، مگر اس نظامِ فکر کے عناصر ترکیبی ہر ممکن ماخذ سے لیے گئے ہیں۔ ان کے سامنے یونانیوں کا وہ سارا گنجینۂ افکار موجود تھا جو مسلم فلسفیوں اور متکلمین کے واسطے سے ان تک پہنچا تھا۔ وہ تمام اسلامی علوم سے آشنا اور صوفیۂ متقدمین کی تصانیف سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انھوں نے اپنے نظامِ فلسفہ کے لئے جو شے مناسب نظر آئی وہ ان تمام ماخذ میں سے مستعار لے لی۔

وہ بنیادی اصول جس پر ابن عربی کے سارے متصوفانہ فلسفے کا دارومدار ہے۔ عقیدۂ وحدت الوجود ہے۔ انھوں نے اس عقیدے کا اظہار ان چند الفاظ میں کر دیا ہے "بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا۔ اور جو خود ان کا جوہر اصلی (اعیانہا) ہے۔" پھر یوں کہا۔ "اے کہ تو نے تمام اشیاء کو اپنی ذات میں خلق کیا، تو جمع کرتا ہے ہر اس چیز کو جسے تو پیدا کرتا ہے، تو وہ چیز پیدا کرتا ہے جس کا وجود تیری ذات میں رل کر کبھی فنا نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح تو ہی تنگ ہے اور تو ہی وسیع بھی ہے۔"

ابن عساکر کئی عرب مصنفین کا نام جن میں سے درج ذیل دو زیادہ معروف ہیں۔
(۱)۔ مؤرخ دمشق۔ علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ، ابوالقاسم، ثقۃ الدین الشافعی۔ ۴۹۹ھ/۱۱۰۵ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ بغداد اور ایران کے بڑے بڑے شہروں میں علم حاصل کیا۔ دمشق کے مدرسۃ النوریہ میں مدرس رہے اور وہیں ۵۷۱ھ/۱۱۷۶ء کو وفات پائی۔ "الانساب" کے مصنف السمعانی ان کے رفقاء میں سے تھے جنھوں نے ۵۶۲ھ میں وفات پائی۔ ان کی سب سے بڑی کتاب "تاریخ مدینۃ الدمشق" ہے جو اسّی جلدوں پر مشتمل تھی۔
(۲)۔ (۱) کا بیٹا، القاسم، ۵۲۷ھ/۱۱۳۲ء میں پیدا ہوا اور ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء میں وفات پائی۔ علاوہ دیگر تصانیف کے اس نے "الجامع المستقصی فی فضائل المسجد الاقصیٰ" بھی لکھی۔

ابن عسال قبطیوں میں مذہبی اور علمی تحریک کے بانی تین بھائیوں کے نام:۔
(۱) الفضل الحکیم الاسعد، ابوالفرج ہبۃ اللہ۔ مشہور [illegible]

Marfat.com

اس نے قبطی زبان کی صرف و نحو پر ایک کتاب عربی زبان میں لکھی اور اناجیل کے ایک منتخب عربی نسخے کو بھی طبع کیا۔ جس میں وہ اپنے آپ کو الکاتب المصری کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ رسائل پولس کا ایک مقدمہ بھی لکھا۔

(۲)۔ الصفی، الشیخ الفاضل، ابوالفضائل اسعد۔ ماہر قوانین کلیسا تھا اور مناظروں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ دینیات پر متعدد رسائل لکھنے کے علاوہ اس نے مذکورہ قوانین کا ایک مختصر مجموعۃ المجموع الصفوی فی القوانین (الی) قوانین الکتب بھی مرتب کیا۔

(۳)۔ مؤتمن الدولہ ابواسحاق:۔ بظاہر وہ سب سے چھوٹا ہے۔ وہ کسی سرکاری عہدے پر مامور تھا۔ چونکہ اُسے المؤتمن الدولہ والدین المسیحی لکھا جاتا ہے اس کی سب سے اہم تصنیف "سُلّم المقفیٰ او ذھب کلامۃ المصفیٰ" یعنی ایک قبطی، عربی فرہنگ ہے، جس میں وہ الفاظ درج ہیں جو مسیحی عبادات میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اور جنھیں ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔

متذکرہ تینوں بھائی تیرہویں صدی میلادی کے نصف اوّل میں گذرے ہیں ان کے والد کو جو القابات دیئے گئے تھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب حیثیت اور ایک اچھے خاندان کے افراد تھے۔ یہ ایک عالیشان مکان کے مالک بھی تھے۔ ان بھائیوں کے بارے میں ابھی بہت کچھ تحقیق طلب ہے۔

ابنِ عسکر محمد بن علی بن عمر بن حسین ابن مصباح سیّاح، مصنف اور قاضی القضاۃ، مراکش کے قصبہ الحبط میں پیدا ہوا۔ اسے اپنی تصنیف "دوحۃ الناشر لمحاسن من کان من المغرب من اہل القرن العاشر" کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی جو ۱۵۷۵ء کے لگ بھگ مرتب کی گئی تھی۔ یہ ان اولیاء اور علماء کی سیرت کا مجموعہ ہے جن سے وہ واقف تھا یا پھر دوسرے لوگوں کی وساطت سے متعارف ہوا۔ اس کا تعلق ادریسیہ کی ایک شاخ سے تھا۔ نوجوانی میں مملکت جبالتہ کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ کچھ دنوں طیطوان اور فاس میں مقیم رہا۔ ۱۵۶۲ء میں وہ پھر سیاحت پر نکلا۔ ۱۵۷۳ء میں فاس میں حسنی شریف محمد بن علی نے اسے قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ جو الغالب کا بیٹا تھا۔ اور اس کے چچا عبدالملک کے نزدیک خلافِ دستور تخت نشین ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ابن عسکر نے حسنی کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ پرتگال چلا گیا تاکہ ڈوم سبستیان سے کمک طلب کرے۔ مراکش میں واپسی پر دونوں کے درمیان وادی المخازن میں شدید جنگ ہوئی۔ جس میں ڈوم۔ حسنی اور ابن عسکر سب مارے گئے۔ حتیٰ کہ عبدالملک بھی جو ابتدائے جنگ ہی میں لقمۂ اجل ہو گیا تھا۔

ابنِ عطاء آدمی (دیکھئے "آدمی، ابنِ عطاء")

ابنِ عطاءُ اللہ احمد بن محمد ابوالفضل تاج الدین الاسکندری الشاذلی عرب صوفی (المالکی اور شاید الشافعی) جو ابن تیمیہ کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھا۔ ۷۰۹ھ ۱۳۰۹ء میں قاہرہ کے مدرسہ المنصوریہ میں وفات پائی۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، نحو اور اصول میں درجۂ فضیلت کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی کمال پیدا کیا۔ ابتداء میں صوفیاء سے دور دور رہے لیکن پھر شیخ الشیوخ ابوالعباس المرسی کی صحبت نے انہیں تصوف کے رنگ میں رنگ دیا۔ قاہرہ میں ہی رہتے ہوئے الازہر میں حلقۂ درس قائم کیا۔ حلقۂ ارادت بڑا وسیع، کلام پُر تاثیر، اقوال و آثار سے پُر تھا۔ تصانیف میں اسرار و معارف اور رموز علم و حکمت نظم و نثر دونوں میں بیان کئے گئے ہیں۔

ابنِ علقمی (۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء - ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) مؤیّدالدین ابوطالب محمد ابن احمد بن محمد بن علی الاسدی، البغدادی، بنو عباس کا آخری وزیر۔ مذہباً شیعہ تھا۔ پہلے وہ عباسی خلیفہ المستنصر باللہ کے عہد میں شمس الدین ابن الناقد کی معزولی کے بعد "استاددار" مقرر ہوا۔ پھر المستعصم باللہ نے اپنے عہد میں نصرالدین الناقد کی وفات کے ابتداء سے ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں قلمدانِ وزارت سونپ دیا۔ یہ چودہ برس اس عہدے پر متمکن رہا۔ حتیٰ کہ تاتاریوں کے سیلاب نے خلافت بنو عباس ہی کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ آور ہونے کی دعوت اسی نے دی تھی۔ اس غرض کے لیے اس نے اپنے ایک بھائی اور ایک مملوک کو ہلاکو کے پاس بھیجا اور صاحب موصل الملک الرحیم بدرالدین لؤلؤ (متوفی ۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء) کے خطوط جن میں اس نے تاتاری سیلاب کے لمحہ بلمحہ بڑھنے کی خبر دی تھی، خلیفہ تک نہ پہنچنے دیئے۔ اس عظیم سازش کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلیفہ کے منظورِ نظر "دوات دار" سے اس کے اختلافات تھے۔ جس کے باعث اسے اپنا اقتدار متزلزل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ علاوہ ازیں بغداد کے محلہ کرخ میں جب شیعہ، سُنّی فساد ہوا تو حکومت نے شیعوں کو سختی سے دبا دیا۔ اس بات کا بھی ابن علقمی کو رنج تھا۔ بہرحال وہ تاتاریوں کو بلا تو بیٹھا لیکن جلد ہی افسوس و ندامت نے اُسے گھیر لیا۔ مگر پھر ہو کیا سکتا تھا؟ پانی سر سے گذر چکا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا "قضا و قدر کے فیصلے میری تمناؤں کے خلاف ہوئے"۔ بغداد پر قبضے کے بعد ہلاکو نے شہر کا انتظام علقمی کے حوالے کر دیا اور اس کی کوششوں سے شہر کی حالت جلد سنبھل بھی گئی۔ مگر اس نقصان کی تلافی ممکن نہ تھی۔ رنج و ندامت نے اس کی زندگی کے دن مختصر کر دیئے اور چند ماہ بعد ہی مر گیا۔

ابن علقمی عالم، فاضل نامور ادیب اور کتابوں کا عاشق تھا۔ اس کے کتب خانے میں دس ہزار کتب تھیں۔ ابن ابی الحدید نے "نہج البلاغۃ" اسی علقمی کے کہنے سے لکھی تھی۔ الصغانی کی "العباب" بھی اسی کے کہنے پر لکھی گئی۔ العلقمی دراصل اس کے دادا کا لقب تھا۔ اس لیے کہ خلیفہ کے احکام کی تعمیل میں دریائے فرات کے مغربی سمت میں العلقمی نام کی نہر اس نے تیار کروائی تھی۔

ابنِ عمّار ابوطالب امین الدولہ، الحسن طرابلس کا شیعی قاضی جس نے پانچویں صدی ہجری کے تقریباً وسطی زمانے میں طرابلس کے فاطمی عامل مختار الدولہ ابن بزّال کی موت پر زمامِ حکومت خود سنبھال لی اور خلیفہ مصر کی سیادت سے آزاد ہو گیا۔ اس کے عہد میں طرابلس نے خوب ترقی کی اور وہ سرزمینِ شام کا علمی مرکز بن گیا۔ ابن عمار نے یہاں ایک کتب خانہ اور مدرسہ بھی قائم کیا۔ کتب خانہ میں ایک لاکھ کتابیں تھیں۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا جلال الملک ابوالحسن علی بن محمد بن عمار تاج و تخت کا وارث ہوا اور اپنی وفات ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء تک برابر اس پر متصرف رہا اور پھر اس کے بعد اس کا بھائی ابو علی فخر الملک عمار بن محمد ۴۹۲ھ میں تخت نشین ہوا لیکن امن، جو اس کے پیشروؤں کی بدولت ہوا تھا دیر تک قائم نہ رہا۔ اس لیے کہ طرابلس جیسے دولت مند شہر پر صلیبیوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ ۴۹۵ھ/۱۱۰۲ء میں ریمنڈ سینٹ گائیلز نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ اور گرد و اطراف کے علاقے سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکا۔ ہاں پھر اس نے شہر کے بالمقابل "تل الحجاج" پر ایک قلعہ تعمیر کر دیا تاکہ طرابلس کے خلاف پھر کبھی قدم اٹھا سکے۔ ابن العمار چند سال کامیابی سے شہر کا دفاع کرتا رہا لیکن ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء میں جب ریمنڈ

Marfat.com

ابن عمار

ہوا تو اس کے جانشین نے شہر طرابلس کے گرد اور بھی سختی سے گھیرا ڈال دیا۔ اس پر ابن عمار سلجوق سلطان سے مدد حاصل کرنے کے لیے بغداد روانہ ہوگیا۔ اور اس کی عدم موجودگی بڑی تباہ کن ثابت ہوئی۔ اہل شہر نے شہر کو فاطمی خلیفہ کے حوالے کر دیا۔ مگر خلیفہ نے بجز اس کے کچھ نہ کیا کہ عمار کے خزائن، اس کے ساتھیوں اور اہل و عیال پر مستولی ہو جائے یوں طرابلس اپنے جبلہ وسائل اور بہترین محافظوں سے محروم ہوگیا۔ عمار بھی سلطان کو مدد کے لیے تیار نہ کر سکا۔ لہٰذا وہ بھی واپس طرابلس نہ آیا۔ برعکس اس کے وہ دمشق کے اتابک طغتگین کی مدد سے کچھ عرصہ جبلہ پر قابض رہا۔ لیکن ۵۰۲ھ میں جبلہ اور طرابلس دونوں فرنجیوں کے قبضے میں آگئے۔ اس پر کچھ دن ابن عمار طغتگین کے دربار میں حاضر رہا تاآنکہ اس نے الزبدانی جو وادیٔ بردی میں تھی جاگیر میں دے دی۔ بعد ازاں وہ امیر موصل مسعود کے ہاں منصب وزارت پر متمکن ہوگیا اور ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء تک وہیں رہا۔ آگے چل کر اس نے عباسی خلیفہ کی ملازمت اختیار کر لی۔

ابنِ عمر (دیکھیے "عبداللہ بن عمرؓ")

ابنِ عوام

ابو زکریا یحییٰ بن محمد بن احمد بن العوام الاشبیلی علم زراعت پر ایک مضبوط رسالے "کتاب الفلاحت" کا مصنف، جسے اس موضوع پر اسلامی اندلس ہی نہیں بلکہ ازمنۂ وسطیٰ کی بہترین تصنیف کہا گیا ہے۔ ہمیں اس کے حالاتِ زندگی، سوائے اس کے کہ وہ اشبیلیہ میں رہتا تھا، معلوم نہیں۔ اس سے ایک صدی پہلے عمر بن حجاج نے جو کچھ کہا تھا، ابن عوام نے اپنی کتاب میں محض اسی کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ تاہم اس نے اپنے اور معاصرین کے مشاہدات اور تجربات کو زیادہ تر پیش نظر رکھا ہے۔ اس کی کتاب کے چونتیس الواب ہیں۔ پہلے تیس الواب کا موضوع زراعت ہے اور باقی چار مویشیوں کی پرورش، مرغی خانے اور شہد کی مکھیوں کی پرورش کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ اس نے ۵۸۵ پودوں اور پچاس سے زائد میوہ دار درختوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان کے معالجے نیز زمین اور کھاد کے علاوہ پیوند کاری پر تحقیق کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ابنِ فرح الاشبیلی

(۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء - ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء) شہاب الدین ابو العباس احمد بن فرح بن احمد بن محمد الاشبیلی، شافعی محدث تھے، اشبیلیہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء میں جب قسطالیہ کے حکمران فرڈیننڈ ثالث کی زیر قیادت ہسپانویوں نے الموحدون کے اندلسی دار السلطنت اشبیلیہ کو فتح کیا۔ تو انہیں قید کر دیا گیا۔ لیکن یہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں قاہرہ پہنچے۔ وہاں شیخ الاسلام عز الدین عبد السلام کمال العز یزا اور دوسرے نامور علماء سے استفادہ کے بعد دمشق چلے گئے۔ اور وہاں بھی ممتاز علماء سے پڑھتے رہے۔ بعد ازاں وہیں سکونت اختیار کر لی اور حدیث کے ایک بڑے عالم کی حیثیت سے جامع اموّیہ میں درس دینے لگے۔ جب انہیں دار الحدیث النوریہ میں استادِ حدیث کا عہدہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔

ان کے تلامذہ میں الدمیاطی، المقاتلی، النابلسی ابو محمد ابن الولید اور البرزالی کے علاوہ الذہبی جیسا تاریخ و حدیث کا مستند عالم بھی شامل تھا۔ انہوں نے تربتِ ام الصالح میں اسہال کے عارضے سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کا مشہور ترین علمی کارنامہ علم حدیث کی ۲۸ اصطلاحوں کی تعبیر میں ایک پند آموز نظم (لامیہ غزلیہ)

ہے، جو بحر طویل میں ہے [illegible]

ابن فوطی

(۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء - [illegible]) [illegible] ابن احمد بن محمد الحنبلی [illegible] [illegible] کی اولاد سے تھے اور اپنے نانا موفق الدین عبداللہ [illegible] الفوطی کہلاتے تھے جو ہندو کے دوبارہ مدبر [illegible] [illegible] کے ساتھ بغداد میں پکڑ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ ابن الفوطی کا آبائی [illegible] بغداد کے محلہ خاتونیہ میں تولد ہوئے۔ بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا اور محی الدین یوسف بن ابی الفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی سے جو المستعصم باللہ کے استاد تھے [illegible] کے باہر شہید کر دیئے گئے تھے، اور ان کے طبقے کے دیگر مشائخ سے مزید علم حاصل کیا۔

سقوطِ بغداد کے وقت ابن الفوطی کی عمر چودہ برس کی تھی۔ اس قیامتِ صغریٰ میں دیگر کے ہمراہ یہ بھی گرفتار ہوئے تھے۔ لیکن انھیں جلد ہی رہائی مل گئی۔ ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء میں خواجہ نصیر الدین الطوسی نے انہیں اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا اور اپنے پاس مراغہ بلا لیا۔ جہاں انھوں نے منطق، فلسفہ، نجوم اور دیگر علوم عقلیہ سیکھے۔ مراغہ میں خواجہ طوسی کے علاوہ مبارک بن الخلیفہ المستعصم (متوفی ۶۶۶ھ) بھی ان کے خاص اساتذہ میں سے تھے۔ آپ عربی اور فارسی میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ علم ہیئت اور نجوم میں انھوں نے اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ خواجہ طوسی نے "ایلخانیہ" لکھتے وقت ان سے بھی مشورہ لیا۔

۶۶۹ھ/۱۲۷۱ء میں آپ خواجہ طوسی کے خزانۃ الرصد کی کتابوں کے خازن بنائے گئے اس لائبریری میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ ابن الفوطی ان کتابوں سے استفادہ کرتے رہے اور یہیں آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا۔ ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں "الصاحب" علاؤ الدین عطا ملک الجوینی کی فرمائش پر آپ بغداد آئے جہاں انھیں المدرسۃ المستنصریہ کے کتب خانے کا خازن مقرر کر دیا گیا۔ اپنی وفات تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ بغداد میں واپسی پر آپ پھر محلہ خاتونیہ میں سکونت پذیر رہے۔ رشونزیہ میں دفن کیے گئے۔ ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء میں آپ کوفے میں تھے۔ ۷۰۰ھ/۱۳۰۱ء میں آپ سماس اور ۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء میں ہمدان میں تھے ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں اران اور ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں تبریز میں تھے۔ ان کا یہ سفر غالباً تاریخی معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں تھا۔ انہوں نے تراسی کتب تصنیف کیں جن میں سے چار اب تک باقی ہیں۔ "مختصر اخبار الخلفاء العباسیین" دس جلدوں میں تھی۔

ابن قاسم

(وفات ۱۹۱ھ/۸۰۶ء) ابو عبداللہ عبدالرحمان بن القاسم العتقی، فقیہ، امام مالکؒ کے ممتاز ترین شاگرد تھے۔ بیس برس تک امام مالکؒ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد انھیں سب سے بڑا مالکی شیخ تسلیم کیا گیا۔ مغرب میں مالکی مسلک انھی کے ذریعے پھیلا۔ وہاں اب بھی اسی مسلک کے لوگ آباد ہیں۔ آپ کی وفات قاہرہ میں ہوئی۔

آپ کی ایک اہم تصنیف "المدونۃ (الکبریٰ)" ہے، یہ بیس جلدوں پر ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں مصر میں شائع ہوئی ہے۔ اسے اسد بن الفرات نے مرتب کیا ہے۔ یہ ان جوابات پر مشتمل ہے، جو ابن القاسم نے مالک بن انسؒ کے مسلک کے بارے میں اسد کے سوالات کے دیئے تھے اور جنھیں قاضی قیروان سحنون ابو سعید التنوخی (وفات ۲۴۰ھ/۸۵۴ء) نے کتاب کی صورت میں قلم بند کیا ۱۸۸ھ/۸۰۴ء میں جب قاضی صاحب ابن القاسم سے ملنے گئے تو آپ نے ان کے مرتب کردہ نسخے میں بکثرت اصلاحات کیں۔ اس کتاب کی شرح مختلف اور متعدد مالکی علماء نے کی ہے۔

Marfat.com

[illegible] ابو عبداللہ محمد بن مسلم ابن الانباری
[illegible] الدینوری القتبی ، عرب مصنفین کرنے میں پیدا ہوئے ۔
والد کی جانب سے ابن النسبت سے المروزی بھی کہلاتے ہیں ۔ کچھ عرصے کے لئے اقلیم جبل میں [illegible] قاضی بھی ہو رہے ۔ بعد ازاں بغداد کے مدرس ہوئے اور وہیں وفات پائی ۔ [illegible] معاصر ابو حنیفہ الدینوری اور الجاحظ کی طرح ان کا دائرہ عمل اپنے زمانے کے تمام علوم پر حاوی تھا ۔ انہوں نے اپنے زمانے کی مذہبی بحثوں میں بھی حصہ لیا اور فلاسفہ کے شک آمیز رویے کے خلاف قرآن اور حدیث کی حمایت کی ۔ بایں ہمہ لوگوں کو ان پر بھی الحاد کا شک ہو گیا اور انہیں مشبہہ کے خلاف ایک کتاب لکھنا پڑی تاکہ اپنے آپ کو اس فرقہ کے پیرو ہونے کے الزام سے بچا سکیں فلسفہ ولغت میں ان کی مشہور کتابیں "ادب الکاتب" اور "معانی الشعر" ہیں ۔ جو بارہ حصوں میں ہے ۔ ان کی سب سے بڑی کتاب "عیون الاخبار" ہے ۔ جو دس جلدوں میں تشکیلانہ ادب کا ایک نمونہ ہے اور جس کے انداز کی تقلید میں اکثر نقل کی گئی ۔ ان کی ایک کتاب "المسائل والجوابات" ہے جو مسائل حدیث سے متعلق ہے ۔ الامامۃ والسیاسۃ " جو ایک نیم تاریخی تالیف ہے ۔ ان کے اساتذہ میں ابو حاتم السجستانی اور تلامذہ میں ابن درستویہ کے نام ملتے ہیں ۔

ابن قدامۃ الحنبلی چھٹی صدی ہجری کے وسط میں جماعیل (فلسطین) کے دو گھرانے (خانوادۂ ابن قدامہ اور ابن سرور) ہجرت کر کے دمشق آباد ہو گئے ۔ ان دونوں گھرانوں میں مدت تک آپس میں قرابتداری قائم رہی ۔ ان میں سے خانوادۂ ابن قدامہ زہد و تقویٰ میں مشہور تھا اور اس کے افراد نے فقہ حنبلی کی بہت خدمت کی ۔ منصب قضا پشتوں تک اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا ۔ اس خاندان کی چند خواتین نے بھی علمی دنیا میں نام پایا ہے ۔ یہ خواتین درس دیتی تھیں اور علما نے یہاں سے علم حاصل کیا ہے ۔

۱۔ **ابو عمر محمد بن احمد بن محمد قدامۃ** ۵۲۸ھ میں جماعیل میں پیدا ہوئے اور ۵۵۱ھ میں جب فلسطین میں فرنگیوں کا زور بڑھا تو انہوں نے اپنے والد اور دیگر اقرباء کے ساتھ دمشق کی جانب ہجرت کی جہاں وہ پہلے باب شرقی کے باہر مسجد ابی صالح (الصالحیہ) میں آکر ٹھہرے لیکن کچھ مدت کے بعد جبل قاسیون میں مستقل اقامت اختیار کر لی ۔ ابو عمر بڑے عالم باعمل اور عابد و زاہد تھے ۔ ظہر اور عصر کے درمیان ایک منزل کی تلاوت ان کا روز کا معمول تھا ۔ نماز عشاء کے بعد دیر تک آیات الحرس ، یٰسین ، تبارک ، واقعہ ، معوذتین اور اخلاص کا ورد کرتے تھے ۔ باوضو سوتے تھے ۔ نماز فجر کے بعد سے ضحیٰ تک لوگوں کو درس قرآن دیتے تھے ۔ ہر جمعہ کو عصر کے بعد زیارت قبور کو جایا کرتے ۔ ہر دوشنبہ اور جمعرات کو مغارۃ الدم تک پاپیادہ جاتے اور مسکین لوگوں اور نادار بیواؤں کو آٹا اور درہم پہنچایا کرتے ۔ خود نان جو کے سوا کچھ نہ کھاتے ۔ اور چٹائی پر سوتے تھے ۔ زود نویس اور خوش خط تھے ۔ لوگوں کو کتابیں اور مصحف لکھ کر مفت دیا کرتے ۔ جامع مظفری دمشق کے خطیب بھی تھے ۔ اور رقت انگیز وعظ دیا کرتے تھے ۔ آپ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ساتھ جنگوں میں بھی شامل ہوئے ۔ جب ۵۸۳ھ میں ۲۷ رجب کو بیت المقدس میں لشکر اسلام وارد ہوا تو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ خود چل کر آپ کے خیمے میں زیارت کے لئے آئے اس وقت آپ نماز ادا کر رہے تھے ۔ آپ نے نماز اور بعد کے ورد کو وقار کے ساتھ اور اطمینان سے ادا کیا اور پھر سلطان سے ملاقات کی ۔ آپ نے ۶۰۷ھ میں وفات پائی ۔ ان کے دو بیٹے تھے عبدالرحمان اور عبداللہ ۔

۲۔ **موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ الحنبلی المقدسی الصالحی** خاندان ابن قدامہ کے نیر درخشاں ترین چراغ ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں جماعیل میں پیدا ہوئے ۔ ہجرت دمشق کے وقت ان کی عمر دس برس تھی ۔ ۵۶۰ھ میں اپنے خالہ زاد بھائی عبدالغنی بن عبدالواحد بن علی ابن سرور المقدسی (متوفی ۶۰۰ھ) کے ساتھ بغداد گئے ۔ جہاں آپ تقریباً چار سال تک رہے اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (متوفی ۵۶۱ھ) ھبۃ اللہ الحسن بن ہلال الدقاق (متوفی ۵۶۲ھ) اور ابا جسرادی (متوفی ۵۶۳ھ) جیسے علماء سے استفادہ کرتے رہے ۔ ۵۶۷ھ میں آپ پھر لوٹ کر بغداد آئے اور ابوالفتح نصر بن فتیان بن مطرف بن المنیؒ (متوفی ۵۸۱ھ) سے فقہ میں درس لیتے رہے ۵۷۳ھ میں آپ مکے گئے اور ۵۷۴ھ میں حج کیا اور مبارک بن علی بن الطباخ الحنبلی سے فقہ پڑھی ۔ ۵۷۵ھ میں ابن طباخ کی وفات کے بعد آپ بغداد چلے گئے ۔ جہاں آپ ابن المنیؒ کے درس میں پھر شامل ہو گئے ۔ ایک برس کے بعد عازم دمشق ہوئے تو ابن المنیؒ نے کہا کہ بغداد کو ان کی ضرورت ہے ۔ لیکن آپ نہ رکے اور دمشق آکر "المغنی" کی تالیف میں مصروف ہو گئے ۔ ۶۰۰ھ میں بھائی (ا) کی وفات کے بعد جامع مظفریؒ کے خطیب بنائے گئے ۔ آپ اپنے بھائی کی طرح عزیز المثال تھے اور شکوہ و وقار میں ممتاز ۔ آپ تفسیر حدیث ، فقہ کے علوم میں امام زمانہ تھے ۔ اور نحو ، حساب اور نجوم میں بھی دسترس رکھتے تھے

اپنی پگڑی میں ریت کی پڑیا رکھتے اور جب فتویٰ یا اجازۃ لکھتے تو تحریر کو ریت سے خشک کر لیا کرتے ۔ اس سلسلے میں ایک شب کسی مجلس میں جبکہ خاصہ مجمع تھا ، کی پگڑی کھل کر پڑیا کے ہمراہ ہی گر پڑی اور ایک منچلے نے پگڑی اٹھالی ۔ آپ نے فرمایا میاں پڑیا رکھ لو اور پگڑی دے دو کہ میں اسے باندھ لوں ۔ اس شخص نے جب دیکھا کہ کاغذ میں کچھ وزنی چیز ہے تو پڑیا جیب میں ڈال لی ۔ اور پگڑی انھیں لوٹا دی ۔ آپ ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں فوت ہوئے ۔ محمد بن عبدالرحمان العلوی سے روایت ہے کہ ۔" ہم جبل بن ہلال میں تھے کہ اچانک دیکھا کہ قاسیون میں روشنی ہو رہی ہے ۔ ہم یہ سمجھے کہ دمشق میں آگ لگ گئی ہے ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موفق فوت ہو گئے ۔"

موفق الدین کے تین بیٹے تھے محمد ، یحییٰ اور عیسیٰ ۔ یہ تینوں ہی ان کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے ۔ عیسیٰ کے دو بیٹے ہوئے جو لاولد فوت ہو گئے اور یوں موفق کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ ان کی تالیفات کی تعداد پچیس سے اوپر ہے ۔ ان کی کتاب المغنی افضل سمجھی جاتی ہے ۔ یہ کتاب تعصب سے بالا ہے اور اس میں صرف مسائل اجتماع کا بیان کئے گئے ہیں جو ہر مسلمان پر واجب ہیں ۔ اگر کسی مسئلے میں انھوں نے حنبلی مسلک کی طرف میلان ظاہر کیا ہے تو دلیل اور حجت کو ترجیح کی بنیاد بنایا ہے ۔ المغنی میں جا بجا تقلید محض سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے ان کی کتاب " المقنع " بھی بہت مقبول ہے ۔

۳۔ **قاضی القضاۃ شمس الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن محمد بن قدامہ الحنبلی الصالحی** ۵۹۷ھ/۱۲۰۱ء میں قاسیون میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے اپنے والد اور چچا موفق الدین اور دیگر علمائے وقت سے علم حاصل کیا ۔ آپ بڑے وجیہہ اور باوقار تھے ۔ حلیم اور بردبار بھی تھے اور رقیق القلب بھی تھے ۔ فخر الدین البعلبکی (متوفی ۶۸۸ھ) کا قول ہے کہ ۔
" میں ۵۰ برس سے جانتا ہوں کہ شمس الدین کبھی غصے نہیں ہوئے ۔"

۶۵۸ھ میں الملک الظاہر نے دمشق میں بھی الگ الگ مسلک کے قاضی مقرر کئے ۔ شافعیوں کے قاضی ابن خلکان تھے ۔ احناف کے قاضی الاذرعی تھے اور حنابلہ کے قاضی عبدالرحمان ابن قدامہ تھے ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں قاضی " شمس الدین " کے لقب سے مشہور ہوئے ۔ چنانچہ بعض شعراء نے اپنے کلام میں انہیں " شموس الشام "

Marfat.com

کو گریاد کیا ہے ۔عہدۂ قضا کو عبدالرحمان ۱۲ سال تک کرمانجام دیتے رہے ۔ انھوں نے "الشافی" (الشرح الکبیر) جو موفق الدین کی المقنع پر ایک مبسوط شرح ہے لکھی ۔ آپ ۶۸۲ھ/۱۲۸۳ء میں فوت ہوئے ۔ تقی الدین ابن تیمیہ اور مجدالدین اسماعیل بن محمد الحرانی ان کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ان کی ایک کتاب کا نام "تسہیل المطلب فی تحصیل المذہب" ہے۔

ابن قوطیہ لغوی، نحوی، مورخ، شاعر، قاضی ابوبکر محمد بن عمر بن عبدالعزیز بن ابراہیم بن عیسیٰ بن مزاحم جسے بالعموم ابن القوطیہ، یعنی قوطی عورت کا بیٹا اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے جدِّ اعلیٰ عیسیٰ ، مولیٰ عمر بن عبدالعزیز نے سارہ نامی ایک ہسپانوی شہزادی سے جو قوطی بادشاہ ادپاس کی بیٹی اور دل منا کی پوتی تھی ، شادی کرلی تھی ۔ سارہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے پاس اپنے چچا اَردبَشت کے خلاف شکایت کرنے دمشق گئی تھی ۔ عیسیٰ کواس کی بیوی کے ہمراہ ہسپانیہ بھیج دیا گیا اور اس کی اولاد اشبیلیہ میں رہنے لگی ۔ ابن القوطیہ خود قرطبہ میں پیدا ہوا تھا اور اپنے آبائی وطن اشبیلیہ میں محمد بن عبداللہ ابن القون ، حسن بن عبداللہ الزبیری اور سعید بن جابر وغیرہم سے تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے وطن واپس چلا گیا ۔ اور وہاں طاہر بن عبدالعزیز، محمد ابن عبدالوہاب بن مغیث ، محمد بن عمر بن لبابہ ، قاسم ابن اصبغ ، محمد بن عبدالملک بن ایمن وغیرہم سے تکمیل تعلیم کی ۔ قاضی ابوالحزم خلف بن عیسیٰ الوشقی اور مورخ ابن الفرضی اس کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ابو علی القالی نے جو "الامالی" کے مصنف تھے ۔ اس کا تعارف خلیفہ الحکم ثانی سے کرایا اور اسے اپنے ملک کا سب سے بڑا فاضل بتایا ۔ کچھ عرصے تک خلیفہ نے اسے قاضی کے عہدے پر رکھنے کے بعد اسے قرطبہ کا صاحب الشرطہ (انسپکٹر پولیس) بنا دیا ۔ اسے حدیث اور فقہ میں زیادہ درک حاصل نہ تھا ۔ اس کی دو تصانیف کے بارے میں معلوم ہوسکا ہے ۔ ایک تاریخ جس کا نام "تاریخ فتح الاندلس" ہے اور دوسری "کتاب الافعال"۔

ابن قیم (۶۹۱ھ/۱۲۹۲ء - ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرعی ۔ حنبلی، محدث، فقیہ، دمشق میں پیدا ہوئے اور دمشق ہی میں ۶۰ برس کی عمر میں وفات پائی ۔ ان کے والد دمشق کے مدرسہ الجوزیہ کے قیّم (منتظم) تھے ۔ اسی لئے ابتدا میں انھیں ابن قیم الجوزیہ کہا جاتا تھا ۔ بعد میں صرف ابن القیم کے نام سے مشہور ہوئے ۔ ان کے والد ابوبکر بن ایوب علم الفرائض کے ماہر تھے ۔ انھوں نے یہ علم اپنے والد سے سیکھا اور ایک مدت تک جملہ علوم و فنون کی تکمیل اپنے دور کے مشہور شیوخ سے کی ۔ ۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء میں جب ابن تیمیہ مصر سے مراجعت کرکے دمشق میں مقیم ہوئے تو آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۷۲۸ھ تک جب ابن تیمیہ نے وفات پائی ، متواتر ان کے پاس رہے اور ایک لمحے کے لئے بھی ان سے جدا نہ ہوئے ۔ اس طویل صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن تیمیہ کا رنگ ان پر غالب آگیا ۔ وہ ابن تیمیہ کے صحیح جانشین اور ان کے علوم کے صحیح معنوں میں حامل تھے ۔

ابن تیمیہ کے بعد انھوں نے ان کی کتابوں کی تہذیب و تبویب کی اور ان کی نشرواشاعت بھی ان ہی کی بدولت ہوئی ۔ مسئلہ "شدالرحل لزیارت قبرالخلیل" اور مسئلہ "طلاق ثلاثہ" میں امام ابن تیمیہ کی رائے جمہور علمائے مختلف تھی ۔ اور ابن القیم ان مسائل میں ابن تیمیہ کے ہمنوا تھے ۔ علمائے وقت نے ان مسائل کی بنا پر کئی دفعہ ان کے خلاف ہنگامے کھڑے کئے اور کئی دفعہ انہیں محبوس ہونا پڑا ۔ سب سے آخری بار جب امام ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعے میں قید کر دیا گیا تو ابن القیم بھی امام صاحب کے ساتھ تھے ۔ چونکہ آپ امام صاحب کے خاص الخاص شاگرد تھے ۔ اس لئے انہیں خاص طور پر نشانہ ستم بنایا گیا ۔ اور اونٹ پر سوار کرکے سارے شہر میں [illegible] گیا ۔ ابن تیمیہ کی وفات کے بعد [illegible] انھیں دوبارہ پہلی سی مصیبتیں برداشت [illegible]

ابن القیم تقلید شخصی کے سخت خلاف تھے ۔ [illegible] استاد کی طرح امام احمد ابن حنبل کی طرف تھا ۔ اصول و عقائد میں آپ حنبلی المذہب تھے لیکن فروع میں آزاد تھے ۔ اپنے استاد کی طرح وہ فلسفیوں ، معتزلیوں ، جہمیوں ، حشویوں اور وحدت الوجودیوں کے سخت مخالف تھے اور کلام ، عقائد اور تصوف کے مسائل میں سلف صالحین کے نقطہ نظر کے حامی تھے ۔ آپ محدثات و بدعات کو ناپسند کرتے تھے اور مسلمانوں کو ابتدائی دور کے سادہ اسلام کی طرف لے جانا چاہتے تھے ۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے عقائد باطلہ کی تردید میں بھی انھوں نے متعدد کتابیں تحریر کیں ۔

ابن القیم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ۔ ان میں سے بیشتر آج ناپید ہیں ان کی ۴۵ کتابوں کی فہرست ابن العماد الحنبلی نے اپنی کتاب "شذرات الذہب" میں دی ہے ۔ اور بعد میں وغیرہ ذالک بھی لکھا ہے ۔ براکلمان نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات عربی" میں ان کی ۵۲ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ آج ان کی ۲۳ کتابیں دستیاب ہیں ۔

ابن کثیر (۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء - شعبان ۷۷۴ھ/فروری ۱۳۷۳ء) اسماعیل بن عمر عماد الدین ابوالفداء ابن الخطیب القرشی ، مورخ ، محدث اور مفسر ، امام ابن تیمیہ کے شاگرد تھے ۔ دمشق میں درس حدیث دیتے رہے ۔ ان کی سب سے بڑی تصنیف "البدایۃ والنہایۃ" ہے ، جو ابتدائے عالم سے ان کے دور تک کی تاریخ ہے ۔ قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی اور احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ۔

ابن کلبی کوفے کے علماء کا ایک خاندان ؛ جو ابوالنضر محمد بن ملک بن سائب بن بشر کے نسب سے تھا ۔ بشر اور سائب جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے طرفدار تھے اور ملک بن سائب ، مصعب بن الزبیر کی طرف سے لڑتے ہوئے کام آئے تھے ابوالنضر نے ۸۲ھ/۷۰۱ء میں عبدالرحمان بن محمد بن الاشعث کے پیروکار کی حیثیت سے جنگ دیرالجماجم میں حصہ لیا تھا ۔ بعدازاں علم و ادب کی راہ اختیار کی ۔ سلیمان بن علی کو قرآن کی تفسیر کا درس دیا ۔ ۱۴۶ھ/۷۶۳ء میں وفات پائی ۔ اس کے بیٹے ابوالمنذر ہشام نے زیادہ تر تاریخ اور حدیث پر کام کیا ۔ ابن حجر العسقلانی ، ابن عساکر اور امام دارقطنی وغیرہ نے اس کی تدوین کردہ احادیث میں اکثر کو کذب و رفض اور متروک کہا ہے ، بعد میں کئی علماء نے اس کے کام کو بے حد سراہا ۔ اس کی ۱۴۰ تصانیف تھیں ، جن میں "الجمہرۃ فی النسب" اور "کتاب الاصنام" ، زیادہ مشہور ہیں ۔

ابن ماجد عرب جہازران اور مصنف ۔ شہاب الدین احمد ۔ جو پندرہویں صدی میلادی میں ہوا ۔ اس کی کتاب میں بحرہند ، بحرقلزم ، خلیج فارس ، بحیرۂ چین کے مغربی حصے اور مجمع الجزائر میں جہازرانی کے متعلق ہدایات درج ہیں ۔ ۱۴۹۸ء میں جب واسکوڈی گاما مشرقی افریقہ کے ساحل پر ملندی پہنچا تو اسے وہاں ایک ایسا بحری ناخدا مل گیا جس نے اسے براہ راست کالی کٹ (ہندوستان) پہنچا دیا ۔ یہ واقعہ مختصر طور پر اس مہم کے ملاحوں میں سے ایک نے [illegible] درج کیا ہے اور اس کی تفصیل مزید سولہویں صدی کے پرتگالی [illegible]

Marfat.com

...ل ... نے اس بحری معلم کا نام "معلم کنکا" (یعنی ستاروں کی مدد سے جہازرانی کے فن کا استاد) بتلاتے ہیں۔ اس روایت کی تائید ایک عربی کتاب "البرق الیمانی فی الفتح العثمانی" مؤلفہ قطب الدین النہروالی سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں پرتگالیوں کے اس رہنما کا نام احمد بن ماجد لکھا ہے۔ قطب الدین کا بیان ہے۔

"ملعون پرتگالیوں کا، جو ملعون فرنگیوں کی ایک شاخ ہیں۔ ممالک ہند میں داخلہ۔ ان کا ایک گروہ سبتہ کی تنگنائے میں جہازوں پر سوار ہوتا تھا اور بحر ظلمات میں داخل ہوکر کوہ قمر (جبل سفید) کے پیچھے سے گذرتا اور (افریقہ کے) مشرق میں پہنچ جاتا۔ (یاد رہے کوہ قمر ہی میں دریائے نیل کا سرچشمہ ہے) اور ساحل کے قریب ایک تنگنائے میں سے ایک ایسے مقام سے گذرتا تھا جس کی ایک جانب پہاڑ اور دوسری جانب بحر ظلمات ہے اس مقام پر سمندر میں بہت تلاطم رہتا تھا۔ جس سے ان کی کشتیاں سنبھل نہ سکتی تھیں بلکہ ٹوٹ جاتی تھیں اور ان میں سے کوئی ملاح زندہ نہ بچتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا اور وہ اس مقام پر ہلاک ہوتے رہے اور ان میں سے کوئی بھی سلامت بحر ہند میں نہ پہنچ پایا۔ تاآنکہ ان کی ایک کشتی بحر ہند میں پہنچ گئی۔ یہ لوگ اس سمندر کی تلاش میں رہے تاآنکہ ایک ماہر ملاح نے جس کا نام احمد بن ماجد تھا ان کی رہنمائی کی۔ فرنگیوں کا سردار اس کے ساتھ ملندی تک گیا اور اسے اپنے ساتھ مے نوشی میں شریک کیا۔ اس نے (ابن ماجد) نشے کی حالت میں اسے راستہ بتا دیا۔ اور اُن سے کہا کہ اس مقام کے ساحل کے قریب نہ جاؤ بلکہ کھلے سمندر میں داخل ہو جاؤ پھر مڑ جاؤ تو موجوں سے تمھیں نقصان نہ پہنچے گا۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو ان کے بہت سے جہاز ٹوٹنے سے بچنے لگے۔ پس بحر ہند میں ان کی کثرت ہوگئی۔ اور انھوں نے شہر گوآ کی بنا رکھی۔"

مدہوشی کا یہ قصہ گھڑ لیا گیا ہے اور یہ بظاہر ایک دروغ مصلحت آمیز ہے۔ تاکہ مسلمان کے اس فعل کا عذر تراشہ جائے جو مسلمانان مکہ کی نظر میں غداری کا مترادف تھا۔ (قطب الدین مکہ ہی کا رہنے والا تھا) برخلاف اس کے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس عرب معلم نے پرتگالی بیڑے کی رہنمائی اس وعدے پر کی تھی کہ اسے اس کی خدمات کا بھاری معاوضہ دیا جائے گا۔ پرتگالی تذکرہ نگار جنہیں اس واقعہ کو چھپانے کی ضرورت نہ تھی اس سے بالکل مختلف قصہ بیان کرتے ہیں۔

باروس (پرتگالی) جس نے اس واقعہ کو سب سے زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے، کہتا ہے ــــ "جن دنوں واسکوڈی گاما ملندی میں مقیم تھا وہاں کھمبائت (علاقہ گجرات کاٹھیاواڑ) کے کچھ بنیے امیر البحر سے ملنے آئے۔ ان ہندوؤں نے حضرت مریمؑ کے بت کی بڑی تعظیم و تکریم کی تو امیر البحر یہ سمجھا کہ ان (ہندوؤں) کا تعلق شاید ان عیسائیوں سے ہے جو سینٹ ٹامس کے زمانے سے ہندوستان میں موجود تھے۔ ان بنیوں کے ہمراہ گجرات کا ایک مُور بھی آیا تھا جسے وہ "معلم کنکا" کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ہمارے جہازرانوں کی صحبت میں بڑا خوش رہتا۔ علاوہ ازیں ملندی کے حکمران کی خواہش یہ تھی کہ وہ پرتگالیوں کے ہمراہ ان کا رہنما بن کر جائے اور انھیں ہندوستان کا راستہ دکھائے وہ حاکم ملندی کی خواہش پر اس بات کے لئے رضامند ہوگیا، واسکوڈی گاما نے اس سے بات چیت کی تو اس کی معلومات سے بہت خوش اور مطمئن ہوا۔ خاص طور پر جب اس مُور نے اُسے ہندوستان کے پورے ساحل کا ایک نقشہ بھی دکھایا۔ یہ نقشہ عربی نقشوں کی طرز پر بنا ہوا تھا اور اس میں درجات طول بلد اور عرض بلد بڑی تفصیل سے دکھائے گئے تھے البتہ اس نقشے میں ہواؤں کے چلنے کی سمتوں کے بارے میں کچھ نہ دکھایا گیا تھا۔ بہرحال اس نقشے سے شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً چلنے والی ہواؤں کی بدولت ساحل (کا رُخ) نہایت صحت سے متعین ہو جاتا تھا۔ جبکہ نقشے میں ہواؤں کی سمتوں کو دکھانے کی علامتوں کی بھرمار ہو جاتی۔ جیسا کہ پرتگالی نقشوں کا انداز ہے، اور جن کی دوسرے بھی نقل کرتے ہیں۔ واسکوڈی گاما نے اُسے لکڑی کا اصطرلاب دکھایا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور وہ اصطرلاب بھی جو دھات کے بنے ہوئے تھے۔ جن سے سورج کے ارتفاع کی پیمائش کی جاتی تھی۔ لیکن اس مُور نے جب ان آلات کو دیکھا تو وہ ذرا بھی متعجب نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ بحر قلزم کے عرب رہنما سورج اور قطب ستارے کا ارتفاع معلوم کرنے کے لیے مثلث شکل کے پیتل کے آلات (سدس) اور مزولہ (مقیاس الزاویہ) سے کام لیتے ہیں اور جہازرانی میں ان سے بے حد فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لیکن اس نے کہا کہ وہ خود، نیز کھمبایت اور سارے ہندوستان کے ملاح چند شمال و جنوب کے ستاروں، نیز بعض دیگر اُن نمایاں ستاروں کی مدد سے جو مرکزِ آسمان کو شرقاً غرباً عبور کرتے ہیں، جہازرانی کرتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ واسکوڈی گاما کے دکھائے ہوئے آلات سے ارتفاع معلوم نہیں کرتے بلکہ ایک اور آلے کے ذریعے ارتفاع معلوم کرتے ہیں۔ وہ یہ آلہ جاکر لے آیا اور واسکوڈی گاما کو دکھایا۔ اس نے یوں محسوس کیا کہ اسے ایک بہت بڑا خزانہ مل گیا ہے۔ لہٰذا وہ اپریل ۱۴۹۸ء میں جہاز لے کر ارض ہند کی جانب روانہ ہوگیا۔ یہ عرب (مُور) "معلم کنکا" بلاشک و شبہ وہی احمد بن ماجد ہے جس کا ذکر "البرق الیمانی" میں آیا ہے۔ یہ معلم عربی نژاد تھا جو "جلفار" میں پیدا ہوا اور یہی واسکوڈی گاما کا رہنما تھا

ترکی امیر البحر سیدی علی کہتے ہیں کہ ــ "میں نے بصرے میں اپنے پانچ ماہ کے قیام کے دوران میں (۱۵۵۴ء) جو شروع برسات تک قائم رہا اور پھر بصرے سے ہندوستان تک سفر کے دوران میں جو آٹھ ماہ تک رہا ان ساحلی راہنماؤں اور مقامی ملاحوں سے جو میرے جہاز پر موجود تھے، میں نے جہازرانی کے مسائل پر گفتگو ... یوں مجھے معلوم ہوا کہ ہرمز اور ہندوستان کے پرانے بحری راہنما لیث بن کہلان، محمد بن ... اور سہل بن ابان بحر ہند میں کس طرح سفر کیا کرتے تھے۔ میں نے وہ کتابیں بھی جمع کیں جنھیں جدید معلموں نے لکھا ہے، مثلاً صوبہ عمان کے مقام جلفار کے احمد بن ماجد اور علاقہ جزز (جنوبی عرب) شحر نامی مقام کے سلیمان بن احمد نے "کتاب الفوائد" اور "الحاویۃ" (مؤلفہ ابن ماجد)، "تحفۃ الفحول"، "منہاج"، "قلادۃ الشموس" (تالیفات سلیمان) کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے بغیر بحر ہند میں سفر کرنا غیر معمولی طور پر مشکل ہو جاتا۔ اجنبی کپتان اور ملاح یہاں کی جہازرانی سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا انھیں کسی رہنما کی ناگزیر ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے اپنے پاس کوئی معلومات نہیں ہوتیں۔"

سیدی علی نے اپنی کتاب "المحیط" میں ابن ماجد کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ اسے ملاحوں میں معتبر ترین معلم بحر ہند اور جدید مؤلفین ہدایات جہازرانی میں سب سے زیادہ قابل اعتماد بتاتا ہے۔ سیدی علی کی یہ کتاب "المحیط" دراصل ابن ماجد اور سلیمان کے راہ ناموں اور اصول جہازرانی کے ایک حصے کا ترکی ترجمہ ہے۔ ابن ماجد کی کتاب "الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد" (جسے سیدی علی صرف "الفوائد" کہتا ہے) نثر میں ہے۔ اس کے بارہ الباب ہیں اور ۸۹۵ھ/۸۹-۱۴۸۹ء میں لکھی گئی تھی۔ ابتدائی اوراق میں جہازرانی اور مقناطیسی سوئی کے افسانوی آغاز سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد ابن ماجد ۲۸ منازل قمر کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح ان ستاروں کا جو قطب نما کی بتیس جہات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور بحر ہند کے سمندری راستوں کا اور اس سمندر اور مغربی بحر چین کی چند بندرگاہوں کے عرض بلد کا اور خشکی کے قریب ہونے کی ان علامتوں کا جو پرندوں اور ساحل کی ہیئت کذائی سے ظاہر ہوتی ہیں، اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر خشکی تک پہنچنے کی گذرگاہوں کا اور دس مشہور جزیروں یعنی جزیرہ نمائے عرب، جزیرہ قمر (مداغاسکر)، سمطرہ، جاوہ، الغور (فارموسا) سیلان، زنجبار، بحرین یعنی اوال، خلیج فارس کے جزیرہ

Marfat.com

ابن جاوان اور سقطری کا، رضمناً بحرین اور جہرہ کے تاریخی اور سیاسی حالات، نیز لوزیں صدی ہجری کے ربع چہارم کی خانہ جنگیوں وغیرہ کے حالات کا) اور سفر کے لیے موزوں موسمی ہواؤں اور اُن میں سے ہر ایک کی تاریخ کا فارسی تقویم کے لحاظ سے ذکر کرتا ہے۔ اس سمندر (بحر ہند) کے مقامات لنگراندازی، اُتھلے حصے پانی میں ڈبل یا پانی سے نکل ہوئی چٹانوں کا بھی پوری تفصیل سے ذکر کرتا ہے۔

ابن ماجد کی دوسری تالیف "حاویۃ الاختصار فی اصول البحار" (جسے سیدی علی "حاویۃ" کہہ کر کرتا ہے۔) ہے۔ گیارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۸۶۶ھ میں لکھی گئی۔ تیسری کتاب "المعربۃ" ہے ابن ماجد نے اسے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں لکھا۔ یہ خلیج عدن میں جہازرانی سے متعلق ہے۔ کتاب "قبلۃ الاسلام فی جمیع الدنیا" یہ کتاب ان شہروں کے لئے ہے جو سمندر کے قریب واقع ہیں۔ یہ ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء میں تالیف کی گئی۔ کتاب "ارجوزۃ بحرالعرب فی خلیج الفارس" جو خلیج فارس میں ساحل عرب کے ساتھ ساتھ جہازرانی کے متعلق ہے۔ الغرض ابن ماجد نے کل ۳۲ کتابیں تالیف کیں۔ ابن ماجد ازمنہ جدیدہ کے مؤلفین علم جہازرانی میں بلحاظ تاریخ قدیم ترین ہے اور اس کی یہ کتابیں قابل داد ہیں۔ موسمی، مقامی ہواؤں سارے بحر ہند کو عبور کرنے کے راستوں اور عرضہائے بلد کے متعلق اس نے جو معلومات دی ہیں وہ اتنی ہی واضح اور مفصل ہیں جتنی اس زمانے میں متوقع ہو سکتی تھیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ملکوں کے موسم آہستہ آہستہ بدلتے رہتے ہیں۔

(۲۰۹ھ/۸۲۴ء - ۲۲ رمضان ۲۷۳ھ/۱۸ فروری ۸۸۶ء) محدث امام

ابن ماجہ مفسر، ابو عبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ الربعی القزوینی۔ المعتمد علی اللہ کے دورِ خلافت میں فوت ہوئے۔ سوائے امام نسائیؒ (وفات ۳۰۳ھ) کے تمام مصنفین "صحاح ستہ" کی وفات اسی خلیفہ کے عہد میں ہوئی۔ ابن ماجہؒ کی تصنیف "سنن ابن ماجہ" صحاح ستہ کی چوتھی عظیم الشان کتاب ہے۔ جس میں ۴۳۴۱ احادیث ہیں۔ ان میں سے ۳۰۰۲ حدیثیں تو وہ ہیں جو صحاح کی باقی پانچ کتابوں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی) میں بھی موجود ہیں اور باقی ۱۳۳۹ احادیث ایسی ہیں جو زوائد ابن ماجہ ہیں۔ سب سے پہلے ابوالفضل محمد بن طاہر (متوفی ۵۰۷ھ) نے اس کتاب کو صحاح ستہ میں شمار کیا تھا۔ متاخرین میں سے السیوطی (متوفی ۹۱۱ھ)، عبدالغنی النابلسی (متوفی ۱۱۴۳ھ) عبدالغنی المجددی (متوفی ۱۲۹۵ھ) اور عام محدثین اور مصنفین اطراف و رجال نے اسے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہی عام متاخرین کا فیصلہ ہے۔ لیکن ابن السکن (متوفی ۳۵۳ھ) ابن مندہ (متوفی ۳۹۵ھ) ابوطاہر (متوفی ۵۷۶ھ) ابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ)، ابن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ) النووی (متوفی ۶۷۶ھ) اور المزی (متوفی ۷۴۲ھ) ایسے علماء اسے صحاح ستہ میں شامل نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے بجائے یا تو وہ صحاح خمسہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور یا بعض لوگ امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) کی "موطا" کو صحاح ستہ کے زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ عبدالغنی النابلسی کہتے ہیں کہ چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے۔ اہل مشرق کے نزدیک وہ سنن ابن ماجہؒ ہے، اور اہل مغرب کے نزدیک موطا امام مالکؒ ہے۔

آپ کی پیدائش ایران کے صوبہ آذربائیجان کے مشہور شہر قزوین میں ہوئی جو ان دنوں مرکز علم بنا ہوا تھا۔ تکمیل علم کے بعد آپ نے حدیث نبوی کی تلاش و تدوین کے لیے زندگی وقف کر دی اور اسی دھن میں خراسان، عراق، حجاز اور مصر و شام میں معروف شہروں میں بکثرت سفر کیے۔ جن جن شہروں میں آپ حصول حدیث اور علم کے لیے گئے، ان میں کوفہ، بصرہ، بغداد، واسط، سامرا، جرجرایا، حدیثہ، باکسادیہ، دمشق، حمص، عسقلان، اطرابلس، ایلہ، بیت المقدس، بالس، ٹیونس، رقہ، حرآن، اہواز، رے، اصفہان، ہمدان، دامغان، نیشاپور، مرو، بلخ وغیرہ [illegible]

ابن ماجہؒ نے ایک ضخیم کتاب [illegible] میں احادیث و آثار کو بالاسناد جمع کیا [illegible] سنن ابن ماجہ کے علاوہ اس تفسیر [illegible] السیوطی نے بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی [illegible] صحابہ کرامؓ سے لے کر مصنف کے عہد تک کی تاریخ ہے۔ ابن خلکان نے اسے "تاریخ ملیح" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور ابن کثیر اسے "تاریخ کامل" کہتے ہیں۔ آپ کی [illegible] تفسیر دونوں ناپید ہیں۔ حاجی خلیفہ نے بھی "کشف الظنون" میں ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے "تاریخ قزوین" کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی مستقل کتاب نہ ہو اور محض ایک رسالے کی حیثیت رکھتی ہو۔

ابن مَسَرَّہ قرطبہ کا ایک معتزلی ملحد۔ محمد بن عبداللہ بن مَسَرَّۃ بن نجیح، قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس نے کن اساتذہ سے تعلیم پائی اس سلسلے میں اس کے سیرت نگاروں نے بہت کم لکھا ہے۔ وہ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں یہ قرطبہ میں موجود تھا اور اپنے مریدوں کے حلقے میں گھرا رہتا تھا۔ اس کے زیادہ قریبی مرید اس کے ساتھ ایک خانقاہ میں رہتے تھے۔ یہ خانقاہ جبال قرطبہ کے کنارے واقع تھی اور اس کی ملکیت تھی۔ ابن مسرۃ اس خانقاہ میں انتہائی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ان لوگوں کی زندگی انتہائی رازداری کی تھی۔ اس لئے وہ جس قانون کے پابند تھے اس کا سختی سے خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقائد کی تلقین عوام تک نہ پہنچ سکی بیرونی دنیا کو محض یہی معلوم ہو سکا کہ وہ خود مُرشد اور اس کے مرید بڑی پرہیزگاری اور فقر کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد عوام کے شکوک بڑھنے لگے اور گمان ہونے لگا کہ مذہب اور تقشف کے پردے میں کچھ اور تو پوشیدہ نہیں۔

پھر یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ ابن مسرۃ معتزلی الحاد کی تلقین کرتا ہے اور اس لئے اختیار (قدر) کا قائل ہے۔ جب لوگ یہ سنتے کہ اس کے نزدیک "عذاب" کی کوئی حقیقت نہیں تو وہ حیران ہو جاتے۔ البتہ پڑھا لکھا طبقہ یہ کہنے لگا کہ وہ قدیم یونانی فلسفی ایمپی ڈوکلیس کے فلسفہ "ہمہ اوست" یعنی کفر کی تعلیم دیتا ہے۔ اور پھر جلد ہی اس پر کفر کا الزام عائد کر دیا گیا جو اس کے مسلک کے لئے مفید ثابت نہ ہوا۔ وہ ان افواہوں کو سن کر افریقہ پہنچ گیا۔ پھر عبدالرحمان الثالث کے عہد میں وہ قرطبہ واپس آیا اور پھر اپنا سلسلہ درس و تدریس جاری کر دیا۔ جو صرف چند برس ہی چل سکا۔ اس انتہائی دماغی محنت، غور و فکر، مطالعے، مناظرے نیز متقشفانہ مذہبی زندگی کے باعث اس کی ہمت اور طاقت جواب دے گئی۔ اور ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں قرطبہ کی خانقاہ ہی میں انتقال کیا۔

ابن مسرۃ کی تعلیمات کا کوئی پُرزہ بھی موجود نہیں ہے لہٰذا اس کے بارے میں تمام معلومات بالواسطہ ہی ہم تک پہنچی ہیں۔ ابن حزم نے اس کے فلسفیانہ نظریات کو بیان کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں قاضی ابن صاعد جن کا علم و فضل اور دینیات مسلم ہے اور قابلِ وثوق مصنف ہیں، اپنی تصنیفات میں مسرّی نظام فکر اور اس کی عام خصوصیات کا حال محفوظ کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن مسرۃ ایمپی ڈوکلیس کے فلسفے کا بڑا پُرجوش حامی تھا۔ اپنے عقائد کے باعث وہ قرآن کی ہر آیت کی [illegible] پر مجبور تھا جس کا لفظی مفہوم ان سے بالکل مختلف ہوتا [illegible] کوشش سے منازل کمال طے کر سکتا ہے جس سے [illegible]

Marfat.com

کی ماہیت بیچ سکتا ہے بلکہ اس قابل ہے کہ اپنے اعمال حسنہ کی جزا کے طور پر نبوت اور اس سے متعلقہ صفات عالیہ بھی حاصل کرلے۔

اس سلسلے میں آخری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اندلس میں تصوف کی اجتماعی تنظیم کے آثار ابن مسرۃ ہی کے زمانے سے نمودار ہونے لگے۔ اس نے جبال قرطبہ میں جو چھوٹی سی جمعیت قائم کی تھی اُسے بطور مثال سامنے رکھتے ہوئے ایسے ہی متعدد اساتذۂ تصوف کے زیر ہدایت مختلف سلسلے اور جمعیتیں قائم ہونے لگیں۔ جو نہ صرف اس لئے کہ انھوں نے اپنے زہد وورع اور ریاضت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے بلکہ باعتبار علم وفضل بھی اُن کا درجہ بڑا بلند تھا۔ اور انھیں یہ قدرت حاصل تھی کہ تحریر وتقریر دونوں ذرائع سے عوام کو اپنی طرف مائل کریں۔ الزرکلی الاعلام نے اسے اسماعیلی داعی بتایا ہے اور محمد البہلی النیال کے ایک مقالے کا حوالہ دیا ہے جو تونس کے مجلۂ الندوۃ میں چھپا تھا اور جس میں کہا گیا ہے کہ ابن مسرۃ عبیدلین رفاطمیہ مصر کے جاسوسوں میں سے تھا۔

•

ابن مسعود

صحابی، محدث اور مفسر۔ عبداللہ بن مسعود نام تھا۔ زیادہ تر اسی نام سے مشہور ہیں۔ (دیکھئے "عبداللہ بن مسعود")

•

ابن مسکویہ

(۳۳۰ھ/۹۴۲ء۔ ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ الرازی بہت بڑا فلسفی، مورخ اور ادیب، وزیر المہلبی کا ملازم تھا۔ گمان ہے کہ اس وقت اس کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ المہلبی کی وفات ۳۵۰ھ/۹۶۱ء کے بعد آل بویہ کے وزیر الحمید کی ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں اس کے شہرۂ آفاق کتب خانے کا خازن رہا۔ ۳۵۵ھ/۹۶۶ء میں جب خراسان کے غازی رومیوں اور ارمنوں سے لڑنے کے لئے رے میں داخل ہوئے اور اُسے لوٹا اور تباہ وبرباد کردیا تو مسکویہ نے اس کتب خانے کو تباہی سے بچالیا۔ ابن العمید کی وفات ۳۶۰ھ/۹۷۰ء میں اس نے اس کے بیٹے ابوالفتح ابن العمید کی ملازمت اختیار کرلی اور پھر اس کی وفات پر ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں دیلمی تاجدار عضد الدولہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ اُس نے عضد الدولہ اور آل بویہ کے دوسرے تاجداروں کے دربار میں اہم مراتب حاصل کئے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو الصاحب ابن عباد سے رتبے میں کم نہ سمجھتے تھے۔ محمد باقر الخوانساری لکھتا ہے کہ ان کی قبر شہر اصفہان کے محلۂ خواجو میں ہے۔

ابن مسکویہ نے ایک تاریخ "تجارب الامم وتعاقب الہمم" لکھی جسے طوفان نوح سے شروع کرکے ۳۱۹ھ/۹۳۱ء پر ختم کیا۔ اس کا سب سے بڑا ماخذ ایک تو طبری کی تاریخ ہے۔ اور دوسرا محمد بن یحیٰ الصولی کی "ورقۃ" اور تیسرا ماخذ ثابت ابن سنان کی "وقائع"۔ ابن مسکویہ نے جگہ جگہ حالات لکھنے سے اجتناب کیا ہے اور محض ایسے واقعات قلم بند کئے ہیں جو اس کے نزدیک احسن یا اضمحلال وزوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ابن مسکویہ کے نزدیک تاریخ تجربوں کے ایک مجموعے کا نام ہے جس سے لوگ ہر وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کی اس تاریخ کا وہ حصہ جو ۳۲۱ھ سے ۳۶۹ھ تک کے حالات پر ہے اس کے اپنے مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ میں ایک بات یہ ہے کہ ابن مسکویہ نے اسناد کا طریقہ ترک کرتے ہوئے توجہ صرف حوادث پر رکھی ہے۔ وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ راوی کون تھا۔ وہ اس واقعہ کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں طبری کی تلخیص بھی ہوگئی ہے جو بجائے خود فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

ابن مسکویہ کی ایک کتاب "آداب العرب والفرس" ہے جو ایرانیوں، ہندوؤں، عربوں، رومیوں اور مسلمانوں کی تصانیف سے ماخذ اقوال کا مجموعہ ہے۔ تیسری مشہور کتاب "تہذیب الاخلاق وتطہیر الاعراق" ہے۔ اس کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اور یہ سات مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ تمہیدی حیثیت رکھتا ہے جس میں انھوں نے نفس یعنی روح کی ماہیت اور حکمت اور اس کی قسموں سے بحث کی ہے۔ بعد کے مقالوں میں انھوں نے خلق اور اس کی انواع، خیر وسعادت کی ماہیت ان کے باہمی فرق اور اقسام، فضائل، الفت انس اور اجتماع کی ضرورت، نفس کی بیماریوں، ان کی صحت اور محافظت وغیرہ پر قلم اٹھایا ہے۔

ان کی تیسری مشہور کتاب "الفوز الاصغر" ہے جو تین مسائل پر مشتمل ہے۔ صانع (خالق کائنات)، نفس یعنی روح اور نبوت۔ جہاں تک روح کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں کہ "روح زندگی نہیں بلکہ زندگی روح سے ہے۔" اندریں صورت روح کے سلسلے میں حیات بعد الموت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آخر الامر نبوت کا کمال انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی چوتھی مشہور کتاب "الشوامل" ہے جو ابوحیان التوحیدی کے سوالات "الہوامل" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ کل سوالات ایک سو اسی ہیں۔ جو اخلاقی، لغوی، کلامی، فقہی، فلسفی اور ادبی مسائل کے متعلق ہیں۔ ابوحیان التوحیدی ان کا ہمعصر تھا۔ وہ ان کا عجیب وغریب نقشہ کھینچتا ہے۔ حالانکہ وہ ان سے ملا بھی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ابن مسکویہ کا ذہن فلسفیانہ غور وفکر سے عاری تھا۔ گو اس کی یہ کوشش تھی کہ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرے اس کی ساری توجہ علم کیمیا پر تھی۔ جس میں اس نے ابوالطیب الرازی الکیمیائی کے ساتھ اپنی ساری عمر، دولت اور محنت "حجر اعظم" کی تلاش میں صرف کردی۔" ابن سینا کے بھی جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابن مسکویہ فلسفے سے نابلد اور ایک کم فہم انسان تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایات حسد کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ان کے مقابلے میں دوسری روایات ایسی بھی ہیں جن سے ابن مسکویہ کی فلسفیانہ بلندی اور کمال ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔

حقیقت کچھ بھی ہو وہ ایک آزاد خیال مفکر تھے۔ انھوں نے تاریخ کا مطالعہ ایک فلسفی اور سائنسدان کی حیثیت سے کیا۔ لہٰذا انھیں واقعات سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ ان کے حقیقی اسباب وعلل سے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ قوموں کی زندگی اور ان کے عروج وزوال میں جو افراد حصہ لیتے ہیں ان کے اعمال وافعال کے محرکات کیا ہیں! کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو کیوں؟ یہ واقعہ پھر کبھی رونما ہوسکتا ہے؟ لہٰذا تاریخ کا تعلق اگرچہ ماضی سے ہے لیکن اس میں مستقبل کے لئے بھی ایک سبق ہے۔ جس سے افراد ویسے ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جیسے پہلے افراد اٹھا چکے ہیں۔ تاریخ گویا ہمارے ارادوں اور ہمارے مقاصد میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اور اگر ہم نے اسے ٹھیک سے سمجھ لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان غلطیوں سے محترز نہ رہیں۔ جو دوسروں کے لئے ناکامی کا سبب بنیں۔ تاریخ گویا آئینہ ہے اس اجتماعی عمل، اس کے محرکات، اسباب اور نتائج کا جس سے قوموں کا گذر ہوتا ہے۔

ابن مسکویہ کی نظر میں تاریخ کو افسانوں اور معجزات سے الگ رکھنا چاہیے۔ تو ٹھیک ہے مگر باوجود نبوت کی فضیلت کے اعتراف کے وہ تاریخ میں اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہ کرسکے جو ایک افسوسناک فروگذاشت ہے۔ ان کے نزدیک ہر ہستی کے اندر ایک شوق ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے کمال کی طرف حرکت کرے۔ یہی حرکت خیر وفضیلت ہے۔ انسان کا کمال چونکہ انسانیت میں ہے۔ جو حیوانات میں نہیں۔ لہٰذا انسان کی فضیلت اسی میں ہے کہ وہ اس مرتبے کو حاصل کرے۔ لیکن اس مرتبے تک پہنچنے کی استعداد سب انسانوں میں یکساں نہیں۔ ان میں کچھ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو فطرتاً خیر یعنی کمال انسانیت کی طرف حرکت کرتی ہیں۔ ان میں اشرار بھی ہیں جو فطرتاً شر کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ اکثر انسان ان دونوں قسموں کے بین بین ہیں۔ اور تربیت کے زیر اثر خیر یا شر کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انسان خواہ اُن کی استعداد کچھ بھی ہو۔ فرداً فرداً محض اپنی کوشش سے خیر کو حاصل نہیں کر

Marfat.com

سکتے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ باہم مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اندریں صورت ضروری ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو۔

نظم و نثر میں بھی ابن مسکویہ کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے بڑے بڑے ادیبوں مثلاً بدیع الزمان الہمدانی سے اُن کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ ابوحیان التوحیدی بھی، جو فلسفے میں اگرچہ اسے بے حقیقت سمجھتا ہے۔ اس باب میں خاص طور پر اس کی بزرگی کا معترف ہے۔

ابن معین (۱۵۸ھ/۷۷۵ء - ۲۲ ذی الحج ۲۳۳ھ/۲۸ جولائی ۸۴۸ء) یحییٰ بن معین محدث اور فقیہہ، انبار کے قریب ناقیہ کے رہنے والے تھے۔ والد رے میں افسر خراج تھے۔ اس لئے وراثت میں کوئی ڈیڑھ لاکھ درہم حاصل ہوئے، جو سب کے سب تحصیل حدیث میں صرف کر دیئے۔ آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ پہننے کو جوتا بھی نہ رہا تھا۔

ابن معین کا کہنا ہے کہ انھوں نے کوئی چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ایک سو تیس صندوق کتابوں سے بھرے نکلے۔ ان کے علاوہ چار گڑونچیوں پر کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ بخاری، مسلم اور داؤدؒ جیسے محدثین ان کے شاگردوں میں سے تھے اور امام احمد بن حنبل معاصر اور دوست تھے۔

ابن ملجم حضرت علیؓ کا قاتل، عبدالرحمان نام تھا۔ خارجی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دو اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ، معاویہؓ، عمرو بن العاصؓ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ انھیں حضرت علیؓ پر وار کرنے کا موقع مل گیا اور ۱۷ رمضان ۴۰ھ/۲۴ جنوری ۶۶۱ء کو اس نے حضرت علیؓ کے سر پر وار کیا، جس سے آپؓ سخت زخمی ہو گئے اور تین روز بعد انتقال فرمایا۔ ابن ملجم کے حالات زندگی نہیں ملتے۔

ابن ندیم مورخ اور خوش نویس، مشہور کتاب "الفہرست" کا مصنف، محمد بن اسحاق بن ندیم وراق نام تھا۔ (دیکھئے "اسحاق بن ندیم")

ابن ہشام (وفات ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) ابو محمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری، مورخ اور ادیب، سیرۃ کے مصنف، فسطاط میں فوت ہوئے۔ انھوں نے ابن اسحاق کی سیرت کو نئے سرے سے لکھا۔ اس کے علاوہ انجیل اور جنوبی عرب کے قصوں اور افسانوں کا ایک مجموعہ "کتاب التیجان" لکھا۔

دنیا میں سیرتِ ابن اسحاق آج سیرت ابن ہشام ہی کے نام سے ملتی ہے۔ تاہم ابن ہشام نے دیگر ماخذوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس نے زیادہ تر اپنی سیرت کو زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی (وفات ۱۸۳ھ) کے واسطے سے روایت کیا ہے۔ بکائی کا جو درجہ محققین کے نزدیک ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امام بخاریؒ کے استاد علی بن محمد فرماتے ہیں کہ "بکائی ضعیف الروایت ہے۔ اس لئے میں نے اس سے کوئی روایت نہیں لی۔" حضرت ابوحاتم اور امام نسائی بھی بکائی کو غیر مستند اور ضعیف کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ اور امام بخاریؒ بھی اسے غیر مستند قرار دیتے ہیں۔ نیز مولانا شبلی کے نزدیک بھی بکائی کا مقام یہی ہے۔ تاہم ابن ہشام کی "سیرۃ" تاریخی ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی، سید دورِ حاضر میں عالم اسلام کے ایک بہت بڑے عالم۔ (دیکھئے "مودودی، ابوالاعلیٰ، سید")

ابوالبرکات ([illegible]) [illegible] اور طبیب، موصل کے قریب بلد کے مقام پر پیدا ہوئے [illegible] اور غلام تھے۔ بعد ازاں خلفائے بغداد اور سلجوقی سلاطین کے طبیب بنے۔ خاصی بڑی عمر میں پہنچ کر اسلام قبول کیا۔ آخری عمر میں نابینا ہو گئے اور بغداد میں انتقال کیا۔ البیہقی نے تاریخ وفات ۵۴۷ھ/۱۱۶۱ء لکھی ہے۔ آپ کی خاص تصنیف "کتاب المعتبر" ہے جس میں منطق، طبیعات بشمول نفسیات اور مابعد الطبیعیات کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے توریت کے صحیفہ مواعظ پر جو مفصل تفسیر لکھی ہے، وہ بھی خاص فلسفیانہ دلچسپی کی حامل ہے، جس میں نوفلاطونی فلسفے پر زور دیا گیا ہے۔

ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا لقب (دیکھئے "آدم")

ابوالحسنات، حکیم (وفات ۱۹۶۱ء) سید محمد احمد قادری، خطیب مسجد وزیر خاں لاہور، مولانا سید دیدار علیؒ کے صاحبزادے تھے۔ درس نظامی اور دیگر علوم کی تحصیل اپنے والد اور صدرالافاضل مراد آبادی سے کی۔ قرآن مجید کے بہترین قاری اور حافظ تھے۔ طب نواب حامی الدین مراد آبادی سے پڑھی۔ شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے لیے کام کیا اور جمعیت علمائے ہند کی مخالفت کی اور ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علمائے پاکستان کی تشکیل کی۔ ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں جو مجلس عمل بنی، اس کے صدر رہے۔ ایک سال کے لئے جیل گئے۔ داتا گنج بخش کے مزار کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ مشہور تصانیف "اوراق غم"، "طیب الوردہ شرح قصیدہ بردہ"، "رفیق السفر" اور "تفسیر الحسنات" ہیں۔

ابوالحسن اشعری (دیکھئے "اشعری، ابوالحسن")

ابوالحسن العامری (وفات ۲۷ شوال ۳۸۱ھ/۶ جنوری ۹۹۲ء) محمد بن یوسف المشہور ابوالحسن بن ابی ذرّ نیشاپوری، فلسفی، ابوزید احمد بن السہل بلخی کا شاگرد۔ ابتدائی تعلیم خراسان میں حاصل کی۔ بعد ازاں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ دو دفعہ بغداد گیا۔ رے میں پانچ برس گزارے۔ وہ علوم شرعیہ اور علوم فلسفہ کی تطبیق کا قائل تھا۔ اس نے ارسطو کی اکثر کتابوں کی شرح کی ہے۔ بوعلی سینا نے اس کے بعض اقوال کو سختی سے رد کیا ہے۔ اور اسے احمق، کودن، کندۂ ناتراش اور خشک مغز تک کہا ہے۔

ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی اس کا نام "ابوالحسن العامری" دینے پر اکتفا کرتا ہے اسے یعقوب بن اسحاق الکندی، حنین بن اسحاق، ابوسلیمان السجزی، ابوزید احمد بن سہل البلخی، مسکویہ، الرازی اور ابونصر الفارابی کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ لیکن اس کے حالات و اقوال کچھ بھی بیان نہیں کرتا۔

ابن تیمیہ نے العامری کا دو بار ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "محمد بن یوسف العامری" جو فلسفیوں کا ایک مصنف ہے، ذکر کیا ہے کہ قدمائے فلاسفہ شام میں آئے اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے پیروؤں سے بہت کچھ سیکھا۔ فیثاغورس جو سقراط کا استاد تھا۔ لقمان کی تعلیمات سے مستفید ہوا اور یہ سقراط افلاطون کا استاد ہے اور افلاطون ارسطو کا استاد ہے۔ العامری کی طرف ۲۳ کتابوں کی فہرست منسوب کی جاتی ہے جن میں سے آج ایک بھی دستیاب نہیں ہے۔ البتہ اس کی وفات کے متعلق مؤرخین نے ایک [illegible]

59586
Marfat.com

واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ احمد بن الحسین ابن مہران ابوبکر النیشاپوری المقری کی جو اپنے زمانے میں ماہر قرأت تھا اور ابوالحسن العامری صاحب الفلاسفہ کی وفات ایک ہی تاریخ کو ہوئی۔ اسی رات احمد بن الحسین کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟۔

انھوں نے جواب دیا کہ اللہ نے ابوالحسن العامری کو میرے سامنے لا کھڑا کیا اور کہا کہ جا تجھے اس کے طفیل میں نے دوزخ سے نجات دی۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے دین کے ہاں ان لوگوں کی کتنی وقعت تھی جو فلسفہ و حکمت کو پھیلانے اور اسے شریعت کے ساتھ تطبیق دینے میں کوشاں تھے۔ حاکم نیشاپوری نے اس خواب کو نقل کرنے کے بعد ایک مستند حدیث بروایت ابوموسیٰ الاشعری نقل کی ہے کہ ــــ "پیغمبر ؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ اس امت کے ہر ایک شخص کے ساتھ کفار کے ایک آدمی کو یہ کہہ کر بخش دے گا کہ تجھے اس کے طفیل میں بخشا گیا۔"

الوالحسن علی فاس کے خانوادہ مرینیہ کا دسواں حکمران، چونتیس برس کی عمر میں ۷۳۱ھ/۱۳۳۱ء میں اپنے والد ابوسعید عثمان کے بعد وارث تخت و تاج ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ جسمانی طور پر بہت طاقتور تھا۔ اس میں ایک عظیم حکمران کی سی مستعدی اور وسعت نظر بھی موجود تھی۔ بہت سی عوامی عمارات اس کی دینداری اور عظمت و شان پر شاہد ہیں۔ اس کے عہد میں نہ صرف بنومرین اپنے انتہائی عروج کو، اور اس کے خاندان کی مملکت اپنی انتہائی وسعت کو پہنچ گئی بلکہ ان کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا۔

اندلس میں اس نے ۱۳۳۲ء میں جبل الطارق کو عیسائیوں سے چھین لیا۔ لیکن ایک بحری فتح حاصل کرنے کے بعد اسے طریف کے نزدیک وادی بکہ کے مقام پر تباہ کن ہزیمت برداشت کرنا پڑی، جس سے عیسائیوں کے خلاف مرینیوں کے جہاد کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۳۴۰ء میں بلاد بربر میں اس نے عظیم الشان موحد سلاطین کی توسیعی حکمت عملی کو دوبارہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس نے تلمسان کا محاصرہ کیا۔ فوجی مستقر المنصورہ کو از سر نو تعمیر کیا اور تین سال کے بعد بالآخر خانوادہ عبدالواد (بنوزیان) کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ مفتوحہ تلمسان میں اسے مصر کے مملوک سلطان اور شاہ سوڈان کے پیغامات تہنیت موصول ہوئے۔ اپنے حلیف، تونس کے حفصی بادشاہ، کی حمایت میں اس نے افریقیہ پر فوج کشی کی۔ لیکن فتح و کامیابی کے ایک دور کے بعد اسے (القیروان) کے نزدیک عرب بدوؤں کی ایک متحدہ جماعت نے شکست فاش دی (۱۳۴۸ء)۔ تونس سے وہ سمندر کے راستے روانہ ہوا لیکن اس کا بیڑا ڈوب گیا۔ اس نے الجزائر میں اتر کر اپنی سلطنت، جس پر اس کے بیٹے ابوعنان نے قبضہ کر لیا تھا دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۷۵۲ھ/۱۳۵۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور ابوعنان نے اسے شلہ میں دفن کیا۔

الوالحسن علی ندوی ندوہ (ہندوستان) کے بہت بڑے عالم دین اور مصنف (دیکھئے "علی ندوی")

الوالحسن علی ہجویری مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخش کا نام (دیکھیے "داتا گنج بخش")

الوالخیر ازبک حکمران ازبک قوم کے اقتدار کا بانی۔ یہ جوجی کے سب سے چھوٹے بیٹے شیبان کی اولاد میں سے تھا۔ ۱۴۱۲ء میں پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ پہلے شیبان کے ایک اور خلف جمدق خان کا ملازم تھا۔ جمدق ایک بغاوت کے دوران مارا گیا۔ الوالخیر گرفتار ہوا لیکن کچھ عرصے بعد اسے سترہ برس کی عمر میں علاقہ تُرا (موجودہ سائبیریا) کا خان بنا دیا گیا۔ خاندان جوجی کے ایک اور خان کو شکست دینے کے بعد قپچاق کے زیادہ تر لوگ اس کے مطیع ہو گئے

۱۴۳۰ء میں اس نے خوارزم کی مملکت اس کے صدر مقام ارگنج سمیت سر کر لی۔ اور اسے تاراج کر ڈالا۔ لیکن جلد ہی اس نے یہ مملکت واپس کر دی۔

اس کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس کے بعد الوالخیر نے دو اور امیروں محمود خان اور احمد خان کو شکست دی۔ اردو بازار کا شہر سر کیا اور کچھ عرصے کے لئے "بالو کے تخت" پر بھی قبضہ جما لیا۔ سلطان شاہرخ کی وفات (۱۴۴۷ء) سے کچھ عرصہ پہلے الوالخیر نے دریائے آمو کے کنارے کے سغنق (موجودہ سُنَق قرغن کے آثار) آرقوق، سُزرق، آق قرغن اور ازکند نامی قلعوں کو سر کر کے اپنا اقتدار اچھی طرح قائم کر لیا۔ اس کا یہ کارنامہ ازبکوں کی آئندہ تاریخ کے لئے اس کے عہد حکومت کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس کے بعد سغنق اس کا صدر مقام قرار پایا۔ الوالخیر نے اس علاقے کے جنوب میں کوئی پائیدار فتح نہیں کی حتیٰ کہ ترکستان کا شہر یسی (موجودہ ترکستان) بھی تیموریوں کے زیر نگیں رہا۔ البتہ لوٹ مار کی مہمیں بخارا اور سمرقند جیسے دور افتادہ اقطاع تک بھی بارہا روانہ کی گئیں۔

۱۴۵۱ء میں الوالخیر پہلے سے بھی بھاری لشکر لے کر امیر ابوسعید کے حلیف کی حیثیت سے سمرقند کے حکمران عبداللہ کے خلاف ایک مہم میں شامل ہوا۔ اس کی مدد سے عبداللہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا اور ابوسعید کو سمرقند کا حکمران بنا دیا گیا۔ الغ بیگ کی بیٹی رابعہ سلطان بیگم الوالخیر کے عقد میں آئی۔ الوالخیر نے آل تیمور کے باہمی جھگڑوں میں دخل دینے کی ایک اور کوشش کی، جس کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہ نکلا۔ محمد جوگی کو جسے ابوسعید کے خلاف الوالخیر کی حمایت حاصل تھی، شروع میں تو کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن ابوسعید کی آمد ۱۴۶۰ء میں اسے سمرقند کا محاصرہ اٹھانا اور اس علاقے کو چھوڑنا پڑا جسے الوالخیر کی امدادی افواج زیر قیادت برکہ سلطان نے تاراج کر ڈالا تھا اور آخر کار ۱۴۶۳ء میں الوالخیر کی طرف سے کوئی امداد نہ ملنے پر اپنے حریف کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس واقعے سے کچھ عرصہ پہلے غالباً ۱۴۵۶ء کے قریب جبکہ الوالخیر کا پوتا محمد جو ۱۴۵۱ء میں پیدا ہوا تھا، تین برس کا تھا، الوالخیر کے اقتدار کو قلمقوں (کلمکوں) کے ہاتھوں زبردست دھکا لگا۔ الوالخیر نے کھلے میدان میں شکست کھائی اور سغنق کی طرف بھاگ نکلا۔ دشمن نے سیر دریا تک اس کا سارا علاقہ تاراج کر ڈالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۶۵ء کے لگ بھگ ازبکوں کے درمیان وہ مشہور افتراق رونما ہوا جس کے باعث گیا ہستان کے اصلی باشندے جو اسی وقت سے قازق کہلانے ہیں، قوم کے باقی ماندہ حصے سے الگ ہو گئے۔ ۱۴۶۸ء میں الوالخیر کا انتقال ہوا۔ جس سلطنت کی بنیاد الوالخیر نے رکھی تھی اسے ایک مختصر وقفے کے بعد اس کے پوتے محمد شیبانی نے بحال کر لیا اور اسے مزید وسعت دی۔

الوالخیر کے سوانح حیات جو مسعود ابن عثمان الکوہستانی نے ۱۵۴۳ء کے قریب لکھے تھے۔ اس کے مندرجات برٹش میوزیم کے نسخے کے عین مطابق ہیں۔ مسعود نے الوالخیر کے بیٹے سولونج خان (متوفی ۱۵۲۵ء) سے سنتے ہوئے زبانی بیانات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جس نے اپنی معلومات الوالرزاق سمرقندی کی کتاب "مطلع السعدین" سے حاصل کی تھیں۔ الوالخیر کے متعلق مزید معلومات ان تواریخ میں سے مل سکتی ہیں جو اس کے پوتے شیبانی اور اس کے جانشینوں کے متعلق لکھی گئیں۔ بالخصوص تواریخ نصرت نامہ ہیں اور ان تحریرات ہیں جو اس تصنیف پر مبنی ہیں۔

الوالخیر الاشبیلی ماہر اشجار، فن زراعت پر ایک کتاب کے مصنف۔ ان کا لقب اشجار ہے۔ یہ اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہیں ہے۔ ابن العوام نے جو بارہویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں، ان کی کتاب سے اقتباس کیا ہے۔ اس لئے کہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ان سے پہلے

Marfat.com

گذرے ہیں۔ امکان غالب ہے کہ یہ گیارہویں صدی عیسوی کے ان اطبا کے معاصر تھے جو علم نباتات اور فن باغبانی کے بھی فاضل تھے۔ مثلاً ابن وافد اللخمی، ابن بصال، ابن حجاج الاشبیلی الطغری۔

ان کی کتاب "الفلاحۃ" مخطوطے کی شکل میں پیرس کے کتب خانے نیز تونس کی مسجد زیتونہ اور شمالی افریقہ کے بعض نجی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ ان کی کتاب کے خاص مضامین یعنی پودے لگانے کے متعلق عام باتیں، موزوں مہینے، پودوں پر چاند کے اثرات، وہ عرصہ جو پودوں کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں درکار ہوتا ہے، اشجار کی عمر، نقصانات، موسم، جاندار، آگ اور پانی، اور زیتون، انگور، انجیر اور کھجور کی مخصوص غور و پرداخت، مثلاً اشجار، جھاڑیاں، غلہ، بیج، ٹہنی لگانا، کاٹ چھانٹ، پیوند کاری، پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے، خوشبودار پودے، پھول، سن اور کپاس، کیلا اور گنا وغیرہ۔ جانور۔ پائیں باغ کے بالخصوص کبوتر، شہد کی مکھی اور جنگلی جانور، ضرررساں جانور، رینگنے والے، کترنے والے جانور، کیڑے مکوڑے، بالآخر "تجارب العام" پر دو صفحات جن میں موسم اور جوتش کی پیش گوئیاں درج ہیں۔

ابوالخیر کی تحریریں ان ذاتی تجربوں اور مشاہدوں پر مبنی ہیں جو انہوں نے ضلع اشبیلیہ کے علاقہ الشرف کے باغوں، خیابانوں، کھیتوں، تاکستانوں اور جنگلوں میں کئے تھے۔ ادبی اسناد میں وہ غالباً بالواسطہ حسب ذیل کتب سے حوالہ دیتے ہیں۔ ابوحنیفہ الدینوری کی "کتاب النبات" جس کی شرح ابن اخت غنم نے ساٹھ جلدوں میں لکھی ہے۔ "نفح الطیب"، ابن وحشیہ کی کتاب "الفلاحۃ النبطیۃ" کے واسطے سے۔ بالعموم یہ کتاب ایک ایسی عملی عقیق اور تصنیف ہے جو ذاتی تجربات پر مبنی ہے، لیکن زراعت سے متعلق عام ادب کی طرح یہ بھی توہمات عامہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ اس میں تعویذوں کے کلمات اور طلسمانی نقوش بھی درج ہیں۔

ابوالدرداء رضؓ عویمر بن زید بن قیس، صحابی اور حافظ قرآن، قبیلہ خزرج کے خاندان بلحارث کے فرد تھے۔ جنگ بدر کے فوراً بعد اسلام قبول کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ اپنے گھرانے میں سب سے آخر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کے جو وظائف مقرر کئے تھے ان میں ان کا وظیفہ اصحاب بدرؓ کے برابر تھا۔

ایک روایت ہے کہ آپ غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے۔ میدان جنگ میں ان کی جانبازی دیکھ کر نبی اکرمؐ نے فرمایا "عویمر کیا ہی اچھا سوار ہے"۔ جب آنحضرت صلعم نے مہاجرین اور انصار میں بھائی چارہ قائم کیا تو آپ سلمان فارسیؓ کے بھائی کے طور پر منتخب ہوئے۔

ابوالدرداء سے مختلف احادیث مروی ہیں جو "ذخائر المواریث" میں درج ہیں۔ صوفیا انہیں "اصحاب صفہ" میں شمار کرتے ہیں اور ان کے زہد و تقویٰ کے مضمون پر مشتمل بہت سے اقوال نقل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "طبقات" میں انہیں فقیہہ، زاہد اور صاحب علم کہا گیا ہے۔ ان کی شہرت کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ آپ حافظ قرآن اور اس کے بارے میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔

ابوالسرایا (وفات ۱۰ ربیع الاول ۲۰۰ھ/۱۸ اکتوبر ۸۱۵ء) السری منصور الشیبانی ایک شیعہ باغی، جو پہلے گدھے ہانکا کرتا تھا اور پھر ڈاکو بن گیا۔ یزید بن زید الشیبانی کا ملازم بنا۔ بعد ازاں حج پر جانے کے بہانے اس سے الگ ہو کر باغی ہو گیا۔ الرقہ میں محمد ابراہیم طباطبا سے ملا اور پھر ان کے ساتھ مل کر کوفے میں الحسن بن سہل کو شکست دی۔ طباطبا کے فوت ہو جانے کے بعد علویوں کی باگ ڈور ... آ گئی۔ جب اس نے بغداد پر چڑھائی کی تو ہرثمہ نے الحسن بن سہل کی ... ابوالسرایا کو شکست دے کر کوفہ میں محصور کر لیا۔ ۱۶ محرم ۲۰۰ھ/۱۲ اگست ۸۱۵ء کو ابوالسرایا آٹھ سو سواروں کے ہمراہ بھاگ نکلا۔ الحسن بن سہل کے آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا، اور الحسن نے اس کا سر قلم کروا کر لاش بغداد کے پل پر برائے عبرت عام لٹکا دی۔

ابوالعاص رضؓ حضرت خدیجہؓ کے بھانجے، لقیط نام تھا، زمانہ جاہلیت میں بہت بڑے لیکن ایماندار تاجر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی فرمائش پر آنحضرتؐ نے اپنی بیٹی زینبؓ کا نکاح ان سے کر دیا۔ عرصہ تک مسلمان نہ ہوئے۔ اس لئے جب غزوہ بدر میں قید ہو کر حضور اکرمؐ کے پاس پہنچے تو آپؐ نے اس شرط پر رہا کیا کہ اپنی زوجہ زینبؓ کو مدینہ بھجوا دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حسب وعدہ زینبؓ کو مدینہ بھجوا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ مسلمان ہوئے اور مدینہ چلے آئے چونکہ آپ کا کاروبار مکہ ہی میں تھا اس لئے دوبارہ مکہ لوٹ گئے۔ ۱۰ھ میں حضرت علی کی سرکردگی میں یمن جانے والے سریہ میں شریک ہوئے۔ واپسی پر اس علاقے کے عامل بنائے گئے۔ ۱۲ھ میں انتقال کیا۔

ابوالعباس السفاح (دیکھئے "ابوعباس السفاح")

ابوالفداء (جمادی الاول ۶۷۲ھ/نومبر ۱۲۷۳ء — ۲۳ محرم ۷۳۲ھ/۲۷ اکتوبر ۱۳۳۱ء) اسماعیل علی بن محمود بن محمد بن تقی الدین مورخ اور جغرافیہ دان شامی امیر تھا۔ دمشق میں پیدا ہوا۔ ۶۹۸ھ/۱۲۹۹ء میں جب حماۃ کی ایوبی ریاست ختم ہوئی تو ابوالفداء نے ریاست کے مملوک عمال کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸ جمادی الاول ۷۱۰ھ/۱۴ اکتوبر ۱۳۱۰ء کو امیر العرب کے شیخ آل فضل کے کہنے پر حماۃ کا صوبیدار مقرر ہوا۔ ۷۱۹ھ/۱۳۲۰ء میں اس نے سلطان محمد کے ہمراہ حج بیت اللہ کا قصد کیا۔ سلطان نے اسے شام کے سب حاکموں سے زیادہ درجہ عطا کیا۔ چنانچہ اپنی وفات تک وہ بڑی شان و شوکت سے رہا۔

ابوالفداء کی شہرت کا دارومدار دو تصانیف پر ہے۔ ایک "مختصر تاریخ البشر" ہے جس میں عہد قبل از اسلام سے ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء تک کی عمومی تاریخ ہے اور جو زیادہ تر ابن اثیر کی کتابوں سے ماخوذ ہے اور دوسری "تقویم البلدان" ہے، جو جغرافیہ پر ایک اہم تصنیف ہے اس میں طبیعی اور ریاضی کی معلومات کا اضافہ جدولوں کے ساتھ کیا گیا ہے یہ کتاب ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء کو پایۂ اختتام کو پہنچی۔ اکثر مصنفوں نے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ یورپ میں سترھویں صدی عیسوی سے اب تک اس کتاب کا بڑا چرچا رہا ہے۔ علم جغرافیہ کی تاریخ میں یہ کتاب ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابوالفرج الاصبہانی (دیکھئے "ابوفرج اصفہانی")

ابوالفضل، شیخ (۶ محرم ۹۵۸ھ/۱۴ جنوری ۱۵۵۱ء — ۴ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ/۲۲ اگست ۱۶۰۲ء) اکبر بادشاہ کے مشہور نورتن میں سے ایک علامہ فیضی کا چھوٹا بھائی اور شیخ مبارک ناگوری (وفات ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء) کا بیٹا

آگرے میں پیدا ہوا۔ ۱۵۷۲ء میں اپنے بھائی کے ذریعے دربار اکبری میں رسائی حاصل کی۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کے انتہائی قریب ہوگیا اور ترقی کرتا ہوا صدر الصدور کے عہدے پر پہنچ گیا۔

ابوالفضل نے اکبر کے مذہبی عقائد میں اثر انداز ہو کر اسے اس امر کا یقین دلا دیا کہ مذہب کے متعلق اس کے نظریات معاصر علماء سے کہیں بہتر ہیں۔ چنانچہ اکبر نے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۵ء میں ایک "عبادت خانہ" بنوایا جس میں علماء کے مناظرے سنا کرتا تھا۔ بعدازاں اکبر نے "دین الٰہی" جاری کیا تو اسے قبول کرنے والا پہلا رتن یہی ابوالفضل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "دین الٰہی" کا محرک بھی یہی تھا۔ (دیکھیے "دین الٰہی")

ابوالفضل کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو دیکھ کر شہزادہ سلیم نے اسے قتل کرا دیا اکبر کو اس واقعے سے سخت افسوس ہوا اور اس روز سے وہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے بدظن رہا۔ اس صدمے سے اس نے تین روز تک کھانا بھی نہ کھایا۔ ابوالفضل کا ایک بیٹا عبدالرحمان اس کے قتل کے بعد ۱۶۱۳ء تک زندہ رہا اور صوبہ بہار کا حاکم مقرر ہوا۔

ابوالفضل ایک عالم فاضل شخص تھا اور علامی تخلص کرتا تھا۔ اس کی تصانیف میں سب سے اہم "اکبر نامہ" اور "آئین اکبری" ہیں۔ اکبر نامہ میں عہد اکبری کی مبسوط تاریخ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں خاندان تیموریہ کا تذکرہ ہے اور دوسرے میں عہد اکبری کی تاریخ ہے۔ بعض لوگ "آئین اکبری" کو اکبر نامہ کی تیسری جلد کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں سلطنت اکبری کے نظم و نسق رسوم و رواج اور عقائد کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ابوالفضل نے "عیار دانش" "مہابھارت کے فارسی ترجمے کا دیباچہ" "رزم نامہ" بائبل کا فارسی ترجمہ "انجیل"، ایک طویل نظم "مناجات" "انشائے ابوالفضل" بھی تصنیف کی ہیں۔ آخری کتاب اسکے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے نجی خطوط کا ایک اور مجموعہ "رقعات ابوالفضل" بھی ہے۔

ابوالقاسم حضرت رسول اکرمؐ کی کنیت، جو آپؐ کے بڑے بیٹے قاسم کے نام پر ہے۔ حضرت قاسمؓ حضرت خدیجہؓ کے بطن میں سے تھے اور شیر خوارگی میں انتقال کر گئے تھے۔ (نیز دیکھیے "محمدؐ")

ابوالقاسم الزہراوی مسلمان سائنسدان، طبیب اور فلسفی (دیکھیے "زہراوی")

ابوالقاسم گرگانی (دیکھیے "گرگانی، ابوالقاسم")

ابوالکلام آزاد (دیکھیے "آزاد، ابوالکلام")

ابوالمعالی قادری، شیخ (۱۰ ذی الحجہ ۹۶۰ھ/ ۱۷ نومبر ۱۵۵۲ء — ۱۷ ربیع الاول ۱۰۲۴ھ/ ۱۶ اپریل ۱۶۱۵ء) خیرالدین کرمانی لاہور کے مشہور صوفی بزرگ، شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے مرید اور داماد کا نام میر سید فتح اللہ شاہ تھا پیدائش کے وقت ہندوستان پر ہمایوں کی حکومت تھی۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سے سید فیض اللہ اپنے بیٹے سید مبارک کے ہمراہ ۷۹۶ھ میں کرمان سے ہندوستان آئے تھے اور اُچ شریف میں مقیم ہوئے۔ بعدازاں ملتان کے نواح میں داؤد جال قصبے میں سکونت اختیار کی۔ ۹۴۰ھ میں یہ خاندان ستگھرہ (شیر گڑھ) میں منتقل ہوگیا۔

شیخ ابوالمعالی اپنے مرشد کے حکم سے لاہور تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر پچاس برس تھی۔ یہاں آپ قطب الاقطاب کے درجے پر فائز تھے۔ ایک کرامت آپ سے منسوب ہے کہ جو بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا، اسے رات خواب میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی زیارت نصیب ہوتی۔

آپ کی تصانیف میں "دیوان غربتی" (غربتی آپ کا تخلص تھا) "تحفۃ القادریہ" "رسالہ گلدستہ باغ ارم"، "رسالہ مونس جان" اور "زعفران زار" مشہور ہیں۔ آپ کا مزار لاہور میں میکلوڈ روڈ کے قریب واقع ہے۔ مزار کے قریب ایک کنواں اور مسجد ہے۔ مزار پر بہت سے کبوتروں کا ڈیرہ ہے۔ سال بھر میں چار عرس لگتے ہیں۔ پہلا عرس ۱۷ ربیع الاول کو، دوسرا عید، بقر عید اور شب برات کو بھی میلے لگتے ہیں۔ ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

ابوالوفا البوزجانی (یکم رمضان ۳۲۸ھ/ ۱۰ جون ۹۴۰ء — رجب ۳۸۸ھ/ جولائی ۹۹۸ء) محمد بن محمد بن یحییٰ بن اسماعیل بن العباس۔ بہت بڑا ریاضی دان، قہستان کے شہر بوزجان میں پیدا ہوا۔ ایرانی النسل تھا۔ ۳۴۸ھ/ ۹۵۹ء میں عراق چلا گیا اور اپنی وفات تک وہیں رہا۔ ابن خلکان کے نزدیک وہ ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں فوت ہوا۔ ریاضی میں اس کی معرکۃ الآرا تصنیف "الکامل" ہے۔ جس میں اس نے علم المثلثات کو باقاعدہ علم کی حیثیت دی۔ غالباً اسی نے پہلے جیب الزاویہ کا دعویٰ تمام کیا۔ اسی طرح چاند کی تبدیلیوں کو دریافت کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ تاہم بعض محققین اس امر سے انکار کرتے ہیں۔ دوسری کتاب "عمال من علم الحساب" ہے اور تیسری "الہندسہ" یہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے۔ یہ پیرس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مزید براں اس نے اقلیدس اور دیوفنطوس اور خوارزمی کی کتابوں پر شرحیں بھی لکھیں جو آج ناپید ہیں۔

ابوالہول (SPHINX) "خوف والا" مصر کے آثار قدیمہ کا ایک بت۔ جو غزہ کے علاقے میں ایک چٹان تراش کر بنایا گیا ہے۔ یہ شیر کی شکل کا ۱۸۹ فٹ لمبا

Marfat.com

اور ۶۵ فٹ اونچا مجسمہ ہے، جس کے پنجے اور دھڑ شیر کے ہیں اور سر انسان کا ہے۔ پہلے پہل صرف اس کا سر نظر آتا تھا۔ باقی مجسمہ زمین میں دبا ہوا تھا۔ ۱۸۱۷ء میں اس پر سے ریت ہٹائی گئی، استداد زمانہ کے باعث اس کی صورت کافی بگڑ چکی ہے۔ ڈاڑھی اور ناک ٹوٹ چکی ہے جس کی بنا پر یہ خوفناک منظر پیش کرتا ہے، شاید اسی لئے اس کا نام "ابوالہول" پڑ گیا ہے

"ابوالہول" کا بت اہرام مصر میں سے ایک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک پردار شیر کا بت ہے۔ جو قوم جن میں سے تھا اور مختلف شکلیں بدلا کرتا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے علم حاصل کیا تھا اور لوگوں کو سوالات کے ذریعے خوفزدہ کر دیا کرتا تھا۔ اس کا اہم سوال یہ تھا کہ وہ کون سا جانور ہے جو صبح کو چار ٹانگوں اور دوپہر کو دو ٹانگوں اور شام کو تین ٹانگوں پر چلتا ہے۔ یونانی دیومالا میں ہے کہ اڈیپس نے اس کا جواب دیا کہ وہ جانور "انسان" ہے جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اس پر اس انسانی شکل کے شیر نما جن نے خودکشی کر لی۔

یونانیوں کے ہاں اس بت کا نام "سفنکس" ہے۔ اسے فرعون مصر خفری نے ۲۵۵۰ ق م میں بنوایا تھا۔ قبطیوں کے ہاں اس کا نام "بلہیب" تھا، جو بگڑ کر "بلہول" یا "ابوالہول" بن گیا۔ المقدسی کے بیان کے مطابق ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں اس کا چہرہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں خزانے تلاش کرنے والوں نے اسے مزید توڑ پھوڑ دیا۔ کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دریائے نیل کی دولت کا محافظ اور طغیانی روکنے والے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے اس میں سے دولت تلاش کرنا شروع کر دی۔ بعدازاں مسلمانوں نے اسے مذہبی اقتدار کی بنا پر نقصان پہنچایا اور اس کے پتھر مسجد کی تعمیر میں لگا دیئے

ابوامامہؓ ایک صحابی، صدی نام تھا، ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہوئے۔ غزوہ حدیبیہ و بیعت رضوان میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی کوششوں سے ان کا قبیلہ باہلی مسلمان ہوا۔ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ پھر شام میں سکونت اختیار کی ۸۶ھ/۷۰۵ء میں سو برس سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔ احادیث کی تبلیغ میں سرگرم رہا کرتے تھے۔ بڑے بڑے صحابہ حدیث کا درس لینے آپ کے پاس آتے تھے۔ ان سے ۲۵۰ حدیثیں مروی ہیں۔ ——

ابوایوب انصاریؓ خالد بن زید بن کلیب النجاری، جلیل القدر صحابی۔ عام الفیل یعنی ہجرت نبوی سے ۳۱ برس قبل پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام ہند بنت سعد تھا۔ عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانی کے درمیانی وقت میں اسلام قبول کیا۔ جب مصعب بن عمیرؓ دیگر ۷۳ انصاری مردوں کو لے کر ۱۲ نبوی میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت ابوایوب بھی ان میں شامل تھے۔ جب حضورؐ نے ہجرت فرمائی تو مسجد نبوی کی تعمیر تک ان کے ہاں قیام فرمایا۔ مواخات میں ابوایوبؓ کے بھائی مصعب بن عمیرؓ بنائے گئے تھے۔

حضرت ابوایوبؓ نے عہد نبوی کے تمام غزوات میں حصہ لیا۔ حجۃ الوداع میں آپ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد تمام عمر جہاد میں شریک رہے۔ امیر معاویہ کے زمانے میں قسطنطنیہ کی مہم میں شرکت کی اور شہادت پائی۔ وصیت کے مطابق آپ کو قسطنطنیہ کے شہر پناہ سے متصل دفن کیا گیا۔ سلطان محمد فاتح نے ایک مسجد بھی بطور یادگار تعمیر کرائی جو ترکی کی قدیم مساجد میں سے ہے۔ ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۰ء میں آمک جی زادہ احمد پاشا نے مسجد میں توسیع کرائی۔ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں اس میں دو نئے میناروں کا اضافہ کیا گیا۔ اس وقت سے اس مزار کے تین حصے ہیں۔ جامعہ ایوبؓ، مزار ایوبؓ اور قبرستان ایوبؓ (جس میں کئی ممتاز ترک اور عثمانی حکمران مدفون ہیں۔) سلطان محمد فاتح کے وقت سے اس مزار اقدس کو یہ اہمیت حاصل رہی کہ سلاطین عثمانیہ کی تاجپوشی کے موقع پر ہر سلطان یہاں آتا اور شیخ الاسلام اس کی کمر میں بانیٔ خاندان سلطان عثمان خان کی تلوار حائل کرتا۔

حضرت ابوایوبؓ حافظ قرآن تھے اور پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ آپ کی طرف ۱۵۰ احادیث منسوب ہیں۔ جن میں سے پانچ متفق علیہ ہیں۔ آپ نے اپنے پیچھے تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔

ابوبصیرؓ مکہ کے مسلمان باشندے تھے، جو صلح حدیبیہ کی شرائط کی رو سے مکہ میں رہنے پر مجبور تھے۔ مگر کفار کی سختیوں کی تاب نہ لا کر مدینہ بھاگ آئے۔ قریش نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو حضورؐ نے معاہدہ کی شرط کی رو سے انھیں دو آدمیوں کے ہمراہ واپس کر دیا۔ ابوبصیر نے راستہ میں ایک کو تو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ گیا اور واپس آ کر مدینہ میں حضورؐ سے اس امر کی شکایت کی۔ ابوبصیرؓ بھی مدینہ چلے آئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے واپس کر کے آپ بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ اب جو کچھ کیا ہے اس کا میں خود ذمہ دار ہوں۔" اس کے بعد وہ مدینہ سے نکل کر عیص میں مقیم ہو گئے۔ مکہ کے دیگر مسلمان بھی بھاگ بھاگ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے اور یوں ان کی ایک خاصی جمعیت بن گئی۔ انہوں نے انتقاماً قریش کے قافلوں پر حملے شروع کر دیئے۔ بالآخر قریش نے مجبور ہو کر معاہدہ کی اس شرط سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور ابوبصیرؓ دیگر ساتھیوں سمیت مدینہ میں آ بسے۔

ابوبکر بن ظفر خان ہندوستان میں تغلق خاندان کا پانچواں فرمانروا۔ سلطان فیروز شاہ کے بیٹے فتح خان کا پوتا ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء کو تغلق شاہ بن فتح خاں کے بعد تخت پر بیٹھا۔ باغیوں پر قابو پانے کے بعد ملتان لاہور اور دوسرے علاقوں کے حاکموں کو سلطانی عہدیداروں کے قتل کا حکم دیا۔ چنانچہ فسادات شروع ہو گئے۔ کسانوں نے لگان ادا کرنا بند کر دیا۔ اور محمد شاہ بن فیروز شاہ کی زیر قیادت

اکٹھے ہوتا شروع ہو گئے۔ محمد شاہ دلی پر حملہ آور ہوا۔ ادھر اس کا بیٹا شہزادہ ہمایوں خان بھی حملہ آور ہوا۔ ابوبکر ڈیڑھ سال کی فرمانروائی کرنے کے بعد فرار ہو گئے

ابوبکر بن عبدالرحمان (وفات ۹۴ھ/۷۱۲ء م) محمد ابوبکر بن عبدالرحمان، فقیہہ اور محدث، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے ایک تھے۔ احادیث پر کامل عبور تھا۔ اکثر احادیث زبانی یاد تھیں اس بنا پر خلفاء قدردانی کرتے تھے۔ خصوصاً اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان آپکا بڑا مداح تھا

ابوبکر تفاوی (۱۹۱۲ء-۱۹۶۶ء) نائیجریا کے پہلے وزیر اعظم اور قائد، ایک گاؤں تفاوی بلیوا کے غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ شمالی نائیجریا میں اکثر امراء ہی کو اقتدار حاصل رہا۔ اس ہونہار بروا نے نائیجریا میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی قائدانہ صلاحیتوں کی جھلک دکھانا شروع کی۔ انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملکی سیاست اور فلاحی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ ابتدا میں ملک میں خواندگی کم ہونے اور باشعور لیڈر نہ ہونے کے احساس کے پیش نظر آزادی کی مخالفت کرتے رہے اور یہ اعلان کیا کہ اگر برطانیہ نے نائیجریا کو آزاد کر کے حکومت وہاں کے ترقی یافتہ قبائل الیوا دمیرو جا کے ہاتھ منتقل کی تو وہ ان کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر ۱۹۵۵ء میں وزیر تعمیرات کی حیثیت امریکہ کا دورہ کرنے کے بعد ان کے دل میں بھی آزادی کی خواہش اور نظریات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے آزادی کا نعرہ لگایا اور اس کے لئے میدان میں کود پڑے۔

آزادی کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء کو انھیں نائیجریا کا پہلا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں وہاں پہلے انتخابات کے بعد بھی انھی کو دوبارہ وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں ملک میں بغاوت ہو گئی اور باغیوں نے انھیں اغوا کر کے ہلاک کر دیا۔ بعد میں جب فوج نے اقتدار سنبھالا اور جنرل ادرنسی نے امن و امان قائم کیا تو ابوبکر کی لاش کو تلاش کر کے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ان کے گاؤں میں دفن کر دیا گیا۔

ابوبکر شبلی بغداد کے مشہور صوفی بزرگ (دیکھیے "شبلی، ابوبکر")

ابوبکر صدیق رضؓ خلیفہ اوّل، یارِ غار رسولؐ، حضرت عائشہؓ کے والد ماجد، آنحضورؐ کے خسر والدین نے عبداللہ نام رکھا تھا۔ ابوبکر کنیت اور عتیق اور صدیق لقب تھا۔ والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی۔ والدہ ماجدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی۔ قریش کی ایک شاخ تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ شجرہ نسب یہ تھا۔ عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ۔

حضرت ابوبکر کی ولادت سن ہجری سے پچاس برس قبل یعنی ۵۷۱ء میں ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ آنحضرت صلعم سے تین برس چھوٹے تھے۔ آپ کے والد ابو قحافہ نے فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا اور ۱۴ھ/۶۳۵ء مکہ، ۹۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی والدہ بہت پہلے اسلام لے آئیں تھیں اور آپ کے زمانہ خلافت کے بعد تک زندہ رہیں۔ تاہم والد سے قبل انتقال کر گئیں

طبری نے حضرت ابوبکر کے دو اور بھائیوں معتق اور عتیق کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ ترمذی شریف کے مطابق عتیق حضرت ابوبکر کا لقب تھا، جو آنحضورؐ نے دیا تھا۔ اس کا مطلب ہے دوزخ سے آزاد ہونا۔ طبری ہی کی ایک روایت ہے کہ عتیق آپ کا لقب تھا۔ جبکہ آپ کا دوسرا لقب صدیق تھا۔ طبقات ابن سعد کے مطابق یہ لقب بھی آپ کو آنحضورؐ کی طرف سے ملا تھا جس کے معنی ہیں تصدیق کرنے والا۔ اس لقب کے محرک جبرئیل امین تھے۔ جب شب معراج میں آنحضورؐ نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ "میری قوم میں اس واقعہ کی تصدیق کون کرے گا۔" تو انہوں نے جواب دیا۔ "ابوبکر آپ کی تصدیق کریں گے۔ وہ صدیق ہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ کا پیشہ تجارت تھا۔ آپؓ کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؓ نے پہلا سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا۔ یہ کاروبار نفع آور ثابت ہوا۔ جس سے آپؓ بڑے دولت مند اور صاحب ثروت ورائے ہو گئے۔ ابن ماجہ کا بیان ہے کہ آپؓ قریش میں سب سے بڑے متمول تاجر تھے۔ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور عقل و فہم اور اصابت رائے میں بھی مشہور تھے۔ اکثر اوقات قتل کے مقدمات آپ کے پاس پیش ہوتے تھے۔ علم الانساب اور علم تاریخ کے ماہر تھے۔ ایک روایت ہے کہ شعر بھی کہتے تھے۔ مگر اسلام کے بعد شاعری ترک کر دی۔

حضرت ابوبکرؓ زمانہ جاہلیت سے با اخلاق اور عصمت و عفت کے محافظ تھے فقرا اور مساکین کی دستگیری کرتے، مہمان نوازی اختیار کرتے، حافظ ابن عبدالبر اور جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ "ابوبکرؓ نے عہد جاہلیت میں بھی شراب اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ اسلام لانے کے بعد آپ کے اخلاق و اوصاف میں دوگونہ اضافہ ہو گیا۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر آپ نے ایسا دوست تلاش کیا جو لہو و لعب سے کوسوں دور اور اخلاق و آداب میں آپ سے بڑھ کے تھا۔ یہ عظیم شخصیت جس کا دوست بننے پر آپ کو فخر تھا۔ آپ کے چچیرے بھائی حضرت محمدؐ تھے۔ جن کا دامن آپ نے ایک دفعہ تھامنے کے بعد پھر کبھی نہ چھوڑا اور جن کی قابل فخر رفاقت اور رہنمائی میں آپ نے وہ بلند مقام حاصل کر لیا، جو رہتی دنیا تک جمہوریت کے علمبرداروں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا رہے گا۔ یہ اخلاق و فضائل کی مماثلت ہی تھی، جس نے دونوں عظیم ہستیوں کو باہم رفاقت و دوستی کے رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ آنحضورؐ صبح و شام دونوں وقت آپ کے مکان پر ضرور تشریف لاتے اور یہ دستور بعد اسلام بھی قائم رہا۔

آنحضورؐ پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ یمن گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر سرداران قریش نے آپ سے آنحضورؐ کے دعوائے نبوت کا ذکر کیا۔ یہ سن کر آپ کا قلب صادق تڑپ اٹھا اور آپ اسی وقت اپنے بہترین رفیق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا جھجک پکار اٹھے "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ واحد اور لاشریک ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اس لحاظ سے مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوا۔ اسی شام سعد بن ابی وقاص نے بھی اسلام قبول کیا

ایمان کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی تمام دولت، قوت، قابلیت، اثر، رسوخ، جان اور اولاد، غرضیکہ جو کچھ آپ کے پاس تھا، سب کچھ دینِ حق کی راہ میں وقف کر دیا۔ مگر اپنی عظمت و جلالت، اثر و رسوخ اور مال و دولت کے باوجود کفار کے ظلم و ستم کے ہاتھوں محفوظ نہ تھے۔ جب یہ مصائب حد سے بڑھ گئے تو آنحضورؐ نے ہجرت حبشہ کا حکم دیا۔ پہلی بار گیارہ مرد اور چار عورتیں اور دوسری بار اس سے کچھ زیادہ افراد نے ہجرت کی۔ آپ بھی حبشہ کی طرف روانہ ہوئے مگر مصائب سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ عبادت الٰہی کے لئے بہتر گوشے کی تلاش میں۔ لیکن ابھی مکہ سے یمن کی جانب تین روز کی مسافت ہی طے کی تھی کہ برک الغماد کے مقام پر قبیلہ القارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا "ابوبکرؓ! کہاں کا ارادہ ہے؟" آپ نے کہا "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے۔ ارادہ ہے کہ کہیں الگ جا کر عبادت کروں۔" ابن الدغنہ نے کہا "تم جیسا شخص نہ نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے۔" ابن الدغنہ آپ کو مکہ واپس لے آیا۔ آپ مکے ہی میں ... تھے ہجرت مدینہ کا وقت آ گیا۔ جب آنحضورؐ نے مسلمانوں کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو آپ نے بھی اپنے لئے اجازت چاہی۔ آنحضورؐ نے فرمایا "تم ابھی ٹھہرو کیونکہ امید ہے کہ مجھے

Marfat.com

بھی اجازت مل جائے گی۔"

آخر نبی اکرمؐ کی زندگی کا سب سے خطرناک وقت آیا اور یہ وہی وقت ہے جب سے حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کا سب سے درخشاں باب شروع ہوتا ہے۔ نبی کریمؐ نے مدینہ کی جانب ہجرت کرتے وقت انھی کو اپنا رفیقِ سفر بنایا۔ اس اہم واقعہ کا ذکر قرآن پاک (۹۔ الانفال: ۴۰) میں بھی آیا ہے۔ ہجرت کا واقعہ ایک پُرخطر راز تھا۔ لیکن ابوبکرؓ اور آپ کے خاندان کے سینے اس راز کا مدفن بن گئے تھے۔ مدینہ پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ کا کنبہ جو بغایر اُمِّ رومانؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت اسماءؓ اور شاید عبداللہ پر مشتمل تھا ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گیا۔ آپ کے والد ابو قحافہؓ مکہ ہی میں رہے۔ اور بیٹے عبدالرحمان نے تو بدر اور احد میں مسلمانوں کے خلاف جنگ بھی کی۔ (اگرچہ فتح مکہ سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا۔) مدینہ میں آپ کو بنو حارث بن خزرج کے درمیان محلہ "السنح" میں مکان ملا۔ ——

مواخاۃ میں آپ کے انصاری بھائی حضرت خارجہؓ بن زید تھے جو بعد میں آپ کے خسر بھی ہو گئے۔ مدینہ میں جو سب سے پہلے مسجد تعمیر ہوئی اس کی قیمت حضرت ابوبکرؓ نے ادا کی۔ یہ رقم ان پانچ ہزار درہم میں سے ادا ہوئی جو آپ مکہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ مسجد کی یہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی جنھوں نے برضا و رغبت یہ زمین بلا قیمت دینا چاہی تھی لیکن آنحضورؐ نے مناسب نہ سمجھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ آخری پونجی تھی جو اسلام پر قربان کر دی گئی۔ مسلمانوں میں آپ کی مخصوص حیثیت اس سے اور نمایاں ہو گئی کہ آنحضورؐ نے آپ کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی کر لی۔ مدینہ میں آپؓ آنحضرتؐ کے تمام غزوات و مشاہدات میں شامل رہے اور ہمیشہ حضورؐ کے پہلو میں حاضر رہتے۔ نازک اور پُرخطر لمحات میں آپؓ ایک چٹان کی مانند مستقل مزاج رہتے اور کبھی ہمت نہ ہارتے تھے۔ آپ کے اور قائد (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان حیرت انگیز اتفاق اور ہم آہنگی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہؐ نے "الحدیبیہ" پر صلح کرنے اور "الطائف" کا محاصرہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا تو آپؐ کے ان فیصلوں پر اعتراض ہوا۔ (جنھیں اس رائے سے اختلاف تھا ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے جو حضرت ابوبکرؓ سے کبھی جدا نہ ہوتے تھے۔) لیکن حضرت ابوبکرؓ نے بلا تامل اور پورے خلوص کے ساتھ حضورؐ کے ان فیصلوں کی تائید کی۔ یہ صرف اور صرف حضرت ابوبکرؓ ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے (نبی اکرمؐ کے بعد) اس مہم کی حقیقی غرض و غایت کو جان لیا تھا جو ۸ھ / ۶۳۰ء میں فتح مکہ پر منتج ہوئی۔ بالفاظ دیگر آپ رسول اللہؐ کے مشیر خاص تھے۔ سرایا (وہ جنگیں جن میں آنحضرتؐ شامل نہ ہوئے حالانکہ وہ آپؐ کے عہد رسالت میں ہوئیں) میں سے چند ایک کی امارت آپ نے کی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر صلحنامے پر آنحضرتؐ کے بعد پہلا نام ابوبکر صدیقؓ کا تھا۔

رمضان المبارک ۸ ہجری میں جب مکہ فتح ہوا تو اس موقع پر آنحضرتؐ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ کے ساتھ ابوبکرؓ بھی "قصواء" نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ ۹ ہجری میں حضورؐ نے آپ کو امیرِ حج مقرر فرمایا۔ آنحضرتؐ کی آخری بیماری کے دوران حضورؐ کے حکم پر آپ نے مسجد نبوی میں نماز کی امامت کی۔

رسول کریمؐ کی وفات کا دن نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لیے ایک نازک دن تھا۔ انصار مدینہ نے اپنے میں سے کسی کو رئیس بنانے کے لیے صلاح مشورہ شروع کر دیا، لیکن حضرت عمرؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے انہیں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لینے پر آمادہ کر لیا۔ مسجد نبوی میں (۱۱ھ / ۶۳۲ء) ابوبکرؓ کے ہاتھ پر عام بیعت ہوئی۔ بیعت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا کے بعد پہلا خطبہ دیا جو رہتی دنیا تک حکمت و موعظت کے شاہکار کی حیثیت سے زندہ رہے گا:

"اے لوگو! میں تمہارا حاکم تو بنا گیا ہوں لیکن تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو اس میں میری مدد کرو اور اگر برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تمہارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں تمہارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اس سے وہ حق جو حق ہے وہ اس سے نہ لے لوں۔ جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی ہے۔ اس پر اللہ ذلت و خواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اب نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔"

بیعت کے اختتام پر رسول اللہؐ کی تدفین کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ زمام خلافت سنبھالنے کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کے سامنے سب سے پہلے اسامہؓ کا معاملہ آیا جسے آنحضرتؐ شام پر لشکر کشی کا حکم دے چکے تھے لیکن یہ مہم وصالِ رسولؐ کے باعث رکی پڑی تھی۔ ادھر جونہی رسول اللہ کی وفات کی خبر پھیلی تو قبائل عرب میں ارتداد کی لہر دوڑ گئی اور بدوؤں نے فوراً حکومت مدینہ کا جوا کندھوں سے اتار نے اور بعثت نبوی سے قبل کی بدویانہ اور غیر ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور پھر نفاق کا ستارا اوج پر پہنچ گیا یہودیوں اور نصرانیوں کی بن آئی اور چاروں طرف مسلمانوں کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اہل مکہ تک اسلام سے روگردانی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حتیٰ کہ عتابؓ بن اسید کو جو رسول اللہ کی طرف سے مکہ کے عامل تھے، خوف کے مارے روپوش ہونا پڑا۔ اس وقت سہیلؓ بن عمرو نے اہل مکہ سے کہا:

"اس واقعہ سے اسلام کی شان و شوکت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ جو شخص اسلام کے متعلق شک و شبہ کو اپنے دل میں جگہ دے گا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔" اور پھر مجمع عام میں کہا:

"اے اہل مکہ! تم وہ لوگ ہو جو سب سے آخر میں ایمان لائے ہو۔ اب سب سے زیادہ ارتداد اختیار کرنے والے نہ بنو۔ اللہ تعالےٰ اس دین کو ضرور غلبہ عطا فرمائے گا جیسا کہ وہ اپنے رسولؐ سے وعدہ کر چکا ہے۔" سہیلؓ کی اس تقریر سے اہل مکہ بدستور اسلام پر قائم رہے۔

ادھر فتنہ ارتداد اور جھوٹے مدعیان نبوت کی سرکشی کی وجہ سے صحابہؓ نے ابوبکرؓ کو رائے دی کہ اسامہؓ والی مہم کو فی الحال روک دیا جائے۔ لیکن سیدنا ابوبکرؓ اس مہم کو روکنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ جس کا آغاز خود نبی اکرمؐ نے کیا تھا۔ اس لیے صحابہؓ کی رائے کے خلاف جن میں سیدنا عمرؓ بھی تھے آپ نے کہا: "بخدا اگر مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آ کر میری ٹانگ کھینچ لیں تب بھی میں اس مہم کو نہیں روک سکتا جس کے بھیجنے کا رسول اللہؐ نے فیصلہ فرمایا ہے۔" چنانچہ آپ نے یہ مہم روانہ کر دی۔

ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ زیادہ تر ارتداد کی تحریک سے نبٹنے میں گذرا۔ ایسی مختصر مدت میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام پائے جن پر تاریخ اسلام کو ناز ہے۔ یہ تحریک جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، جو عرب مورخین نے اسے دیا ہے ان کے نزدیک ابتداءً یہ ایک مذہبی تحریک تھی۔ لیکن عہد حاضر کے یورپین نے بالخصوص یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تحریک حقیقتاً ایک "سیاسی تحریک" تھی۔ دراصل رسول اللہؐ کے بعد وفعتاً حالات نہایت سنگین اور پُرپیچ بن گئے تھے۔ بعض قبیلے حکومت اور مذہب دونوں سے باغی ہو گئے تھے

Marfat.com

[illegible] تھے اور ضعیف کے باہم [illegible] تھے۔ ایسی حالت میں سب سے پہلی حکومت کا سب سے مقدم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت فتنہ و فساد کو ختم کر کے امن و امان بحال رکھے۔ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ بغاوت کس طرف سے ہو رہی ہے، نوعیت کیا ہے اور قیادت کون کر رہا ہے۔ اس بنا پر ابوبکرؓ نے باغیانہ سرگرمیوں کو کچلنے میں نہایت چابکدستی دکھلائی۔ اور راہ کی تمام جذباتی چیزوں اور شکایتوں کو نظرانداز کر دیا۔ حتیٰ کہ اگر حضرت خالدؓ بن ولید کی طرف سے بعض ایسے اقدام کی جن کو عام طور پر پسند نہ کیا جاتا تھا۔ تو لوگوں کی تالیف قلوب و تسکین خاطر کا ایک حد تک ضرور خیال رکھا اور خالدؓ بن ولید پر بھی آنچ نہ آنے دی۔

اغلب ہے کہ اس تحریک کی سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتیں تھیں۔ مدینہ ایک ایسے معاشرتی اور سیاسی نظام کا مرکز بن گیا تھا جس کا ایک جزو لاینفک مذہب بھی تھا لہٰذا یہ بات ناگزیر تھی کہ اس نظام کے خلاف جو ردعمل پیدا ہو وہ مذہبی رنگ بھی اختیار کر لے۔ اس ردعمل کے چھ بڑے مرکز تھے۔ ان میں سے چار مرکزوں میں تحریک ارتداد کے قائدین مذہبی کردار کے حامل تھے۔ جنھیں عام طور پر جھوٹے نبی، کہا جاتا ہے۔ یعنی یمن کا الاسود العنسی، یمامہ کے قبیلہ حنیفہ کا مسیلمہ کذاب، اسد اور غطفان کے قبیلوں میں طلیحہ اور قبیلہ تمیم کی کاہنہ سجاح۔ ارتداد کی صورتیں ہر مقام پر وہاں کے حالات و کوائف کے مطابق مختلف تھیں۔ ان میں بنیادی طور پر مدینے کو بھیجے ہوئے عاملوں کا حکم ماننے سے انکار اور مدینے کو بھیجنے والے محاصل سے انکار بھی شامل تھا۔

یمن میں تحریک ارتداد حضرت نبی کریمؐ کی وفات سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور جب سیدنا ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالی تو قیس بن (ھُبَیرہ بن عبد یغوث) المکشوح، الاسود کی جگہ لے چکا تھا۔ اور جن دنوں مسلمانوں کا لشکر اسامہؓ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ملک شام کو گیا ہوا تھا تو بعض نواحی قبائل نے مدینہ پر حملہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بالآخر ذوالقصہ کے مقام پر انھیں شکست ہوئی۔ اسلامی لشکر شام کی مہم سے واپس آ گیا تو خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر باغیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔

سب سے پہلے طلیحہ کو بزاختہ کی لڑائی میں شکست دی گئی اور اس علاقے کو از سر نو اسلام کا مطیع بنایا گیا۔ اس کے بعد جلد ہی قبیلہ تمیم نے سجاح کا ساتھ چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اختیار کر لی۔ ردّہ کی اہم ترین جنگ یمامہ کی لڑائی تھی جو عقربا کے مقام پر لڑی گئی۔ جسے طرفین کی کثرت اموات کی وجہ سے حدیقۃ الموت کا نام دیا گیا۔ (لواخر ربیع الاول ۱۲ ہجری / مئی ۶۳۳ء) یہاں مسلمانوں کے سب سے خطرناک دشمن مسیلمہ کذاب نے شکست کھائی۔ وہ مارا گیا اور وسطی عرب کا علاقہ دوبارہ عربوں کے زیر نگیں آگیا۔ بعدازاں خالد بن ولید خود تو عراق کی جانب کوچ کرنے سے پہلے یمامہ میں امن قائم کرتے رہے اور اپنے ماتحت سپہ سالاروں کو ضمنی مہموں میں بحرین اور عمان اور مہرہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ یمن اور حضرموت میں اہل ردّہ کو المہاجرؓ بن ابی امیہ نے شکست دی۔

ابوبکرؓ نے اسیر سرداروں سے بعض کے ساتھ نہایت نرمی اور ملاطفت کا سلوک کیا اور ان میں سے اکثر دین اسلام کے سرگرم حامی اور مؤیدین گئے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ردّہ کی تحریک ۱۱ ہجری کے اختتام (مارچ ۶۳۳ء) تک دبائی جا چکی تھی لیکن مستشرقین کو اس سے اختلاف ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک ۱۲ھ / ۶۳۴ء تک جاری رہی۔ بہر حال جب وسطی عرب میں مسیلمہ کذاب کا خاتمہ ہو گیا تو ابوبکرؓ نے خالد بن ولیدؓ کو عراق کی جانب بڑھانے میں ذرا بھی غفلت سے کام نہ لیا۔ یوں عہد صدیقیؓ میں ملکوں کی فتح عظیم کا آغاز ہوا۔ سیدنا حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے وقت صورت حال بظاہر یہ تھی کہ خالد بن ولیدؓ قبیلہ بنو بکر بن وائل کے ایک لشکر کے ساتھ مل کر، جو المثنیٰ کی قیادت میں تھا، عراق میں پیش قدمی کر رہے تھے، اور حیرۃ کا قدیم شہر ان کی زد میں آ گیا تھا۔ لیکن اس شہر کے لوگوں نے ساٹھ ہزار درہم دے کر امان پائی۔

پھر المثنیٰ تو اسی محاذ پر رکے رہے لیکن خالدؓ نے دمشق کی طرف اپنی شہرۂ آفاق یلغار کی اور ان تین اسلامی دستوں سے جا ملے جو یزیدؓ بن ابو سفیان، شرجیل بن حسنہ اور عمرو بن العاص کے زیر قیادت فلسطین میں کامیابی سے لڑتے رہے تھے۔ لیکن اب ایک اپنے سے بڑے بوزنطی لشکر کے مقابلے میں دب رہے تھے۔ مسلمانوں نے جمادی الاول کے آخر میں جولائی ۶۳۴ء میں یروشلم (القدس) اور غزہ کے درمیان الاجنادین (غالباً الجنابتین کی بگڑی ہوئی شکل) کے مقام پر دشمن کو شکست دی۔ اسی طرح ایرانی سلطنت میں اسلام کی توسیع کا آغاز بھی سیدنا ابوبکرؓ نے کیا۔ لیکن پھر بھی ان کی زیادہ تر توجہ ملک شام ہی کی طرف مرکوز تھی۔

حضرت ابوبکرؓ جمادی الآخر ۱۳ھ / اگست ۶۳۴ء کو مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ اس روز اتوار تھا، چاند کی ساتویں اور اگست کی ۸ تاریخ تھی۔ بعض روایات میں مرض کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ حارث بن کلدہ کے ساتھ مل کر ایک یہودی نے حضرت ابوبکرؓ کو چاولوں میں ملا کر زہر کھلا دیا تھا جس کا اثر آہستہ آہستہ جڑیں پکڑتا گیا اور بالآخر ایک سال بعد آپ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ بعض کے نزدیک حضورؐ کی جدائی کے غم نے اندر ہی اندر آپ کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

مرض کے دوران میں حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اور حضرت عثمانؓ بن عفان یکے بعد دیگرے آپ سے جانشینی کے بارے میں گفتگو کرنے آئے تو آپ نے حضرت عمرؓ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ بعدازاں آپ نے حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کی جانشینی کا پروانہ لکھنا شروع کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اسے لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔ آپؓ نے لوگوں سے پوچھا "کیا تم انھیں (حضرت عمرؓ کو) قبول کرتے ہو؟" سب نے بیک آواز کہا "ہاں!"۔ تب آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور وصایا نصائح شروع کیے۔

حضرت مثنیٰؓ جب عراق سے مزید فوج طلب کرنے آئے تو حضرت ابوبکرؓ اس وقت تک حضرت عمرؓ کو اپنا خلیفہ نامزد کر چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مثنیٰؓ کی درخواست پر حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ سب کام چھوڑ کر عراق مزید فوج بھیجنے کا بندوبست کریں۔ ملک و ملت کے کاموں سے فارغ ہو کر آپؓ نے نجی معاملات کی طرف توجہ دی۔ حضرت عائشہؓ کو ایک قطعہ اراضی آپ نے عنایت فرمایا تھا، اسے دیگر وارثوں میں بھی تقسیم کیا۔

اب اپنے بارے میں سوال کیا: "مجھے اب تک بیت المال سے کتنا وظیفہ ملا ہے؟" جواب ملا: "چھ ہزار درہم" حکم فرمایا۔ "میری فلاں زمین فروخت کر کے یہ روپیہ بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔" پھر دریافت کیا "میرے مال میں خلافت کے دور میں کتنا اضافہ ہوا ہے؟" معلوم ہوا کہ ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھلاتا ہے اور مسلمانوں کی تلواریں چمکاتا ہے دوسرے ایک اونٹنی ہے تیسرے ایک چادر ہے۔ ارشاد ہوا "یہ تینوں چیزیں وفات کے بعد خلیفۂ وقت کی خدمت میں بھیج دی جائیں۔ جب حکم کی تعمیل ہوئی اور یہ چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچیں تو بے ساختہ جی امنڈ آیا۔ حضرت عمرؓ روتے جاتے اور کہتے تھے "اے ابوبکر! تم اپنے جانشینوں کے لئے بہت دشوار کام چھوڑ گئے ہو۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ پندرہ روز علیل رہ کر منگل کی رات کو ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ / ۲۳ اگست ۶۳۴ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ وصیت کے مطابق حضرت اسماء بنت

Marfat.com

عمیسؓ نے غسل دیا۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبدالرحمان بن ابوبکرؓ نے قبر میں اتارا۔ آپ کی لحد حضرت رسول اکرمؐ کے بائیں جانب اس طرح بنائی گئی کہ آپ کا سر حضور اقدسؐ کے شانۂ مبارک تک آتا تھا وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی اور مدت خلافت دو برس تین ماہ اور گیارہ دن تھی۔ (۱۱ھ/۶۳۲ء تا ۱۳ھ/۶۳۴ء)

حضرت ابوبکرؓ نے حکومت کے دستور کی اساس قرآن مجید پر رکھی تھی۔ جب وہاں سے کوئی حکم نہ ملتا تو حدیث اور سنت نبوی کی طرف رُخ کرتے۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا، جس کے بارے میں حدیث سے بھی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کو طلب کرتے۔ اس مقصد کے لئے مہاجرین اور انصار میں مساوات قائم رکھتے۔

آپ نے پوری مملکت اسلامیہ کو صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر صوبے کا ایک حاکم مقرر کر دیا تھا۔ جس سے سختی سے باز پرس ہوتی تھی۔ آپ کے عہد حکومت میں صوبوں کے نام یہ تھے۔ مکہ، طائف، صنعاء، حضرموت، خولان، زبید و رمع، جند، بحرین، نجران، دومۃ الجندل، عراق، جرش، حمص، اردن، دمشق اور فلسطین۔ آپ عمال حکومت کی دلجوئی کرتے اور ان کا پورا احترام ملحوظ رکھتے۔

آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سب سے بڑے عامل تھے۔ بدعات کو آپ سختی اور طبعاً ناپسند کرتے اور ان کی روک تھام میں مصروف رہتے۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کو آپ نے اپنی زندگی کا بڑا مقصد بنا رکھا تھا۔ اس ضمن میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جمع قرآن تھا۔ جنگ یمامہ میں حفاظ قرآن کی بڑی تعداد کے شہید ہو جانے کے باعث حضرت عمرؓ کے مشورہ دینے پر قرآن مجید کو مختلف اشیاء، کپڑوں، درخت کی چھالوں اور کھجور کے پتوں پر جمع کروایا اور یوں پہلی بار قرآن کا مکمل نسخہ وجود میں آیا۔

حضرت ابوبکرؓ کا حلیہ حضرت عائشہؓ نے اس طرح سے بیان فرمایا ہے۔ "وہ گورے چٹے دبلے پتلے آدمی تھے۔ دونوں رخسار پُتے ہوئے تھے۔ کمر ذرا خمیدہ تھی۔ تہمد کمر پر رک نہیں سکتا تھا کھسک کر نیچے آجاتا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ پیشانی بلند، انگلیوں کے جوڑ گوشت سے خالی تھے، پنڈلیاں اور رانیں پُرگوشت نہیں تھیں۔ قد موزوں تھا۔ مہندی کا خضاب لگاتے تھے۔"

طبری میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کل چار نکاح کئے۔ دو اسلام سے پہلے اور دو اسلام لانے کے بعد۔ ازواج کے نام یہ تھے۔ قتیلہ بنت عبدالعزیٰ، ام رومان بنت عامر بن عمیرہ، اسماء بنت عمیس اور حبیبہؓ بنت خارجہ۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے پانچویں بیوی کی روایت بھی ہے کہ آپ نے بنو کلب کی ایک عورت ام بکر سے شادی کی تھی اور ہجرت کے وقت طلاق دے دی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی اولاد کی تعداد چھ تھی۔ تین لڑکے عبدالرحمان، عبداللہ اور محمد اور تین لڑکیاں اسماء، عائشہ اور ام کلثوم تھیں۔ عبدالرحمان نے صلح حدیبیہ کے وقت اسلام قبول کیا اور مدینہ آکر رہنے لگے۔ عبداللہ نے حضرت ابوبکر کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا۔ جب غار ثور میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت رسول اکرمؐ مقیم تھے تو عبداللہ ہی انھیں دن بھر کی خبریں پہنچاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے لبا ٹیت مدینہ پہنچنے پر عبداللہ حضرت ام رومانؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماء کو لے کر مدینہ آگئے۔ تیسرے صاحبزادے محمد حجۃ الوداع کے سال پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ اسماء بنت عمیس نے جب حضرت علیؓ سے نکاح کر لیا تو انہیں آغوش مرتضوی میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسماء بنت ابوبکر اسلام لانے والوں میں اٹھارہویں نمبر پر تھیں اور حضرت زبیر بن عوام کے نکاح میں تھیں۔ ان کے بطن سے عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔ حضرت عائشہؓ آنحضورؐ کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی

جنھیں علوم میں کمال [illegible]
حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے [illegible]
حضرت ابوبکرؓ نے امور خلافت [illegible] رکھی تھی۔ جس [illegible] کندہ تھی۔ "نعم القادر اللہ"۔

ابوبکر قندھاری سپہ سالار اور صوفی بزرگ۔ محمود غزنوی کے دور میں افغانستان سے ہندوستان تشریف لائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ سادات کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ سادات بلگرام اور سادات بیانہ ان کے ہمراہ آئے۔ قلعہ بیانہ راجستھان، جو اس زمانے میں دجے مندر گڑھ کہلاتا تھا، وہ انھی کے ہاتھوں فتح ہوا، جس کے لئے ایک دوہا مشہور ہے:

سمت گیارہ سو تہترا ، بھاگ تیج روے وار
دجے مندر گڑھ توڑیاں ابوبکر قندھار

روایت مشہور ہے کہ قلعہ کسی صورت فتح نہ ہو رہا تھا۔ کسی کو بشارت ہوئی کہ جس چھولداری میں چراغ جل رہا ہے، وہ اس قلعے کا فاتح ہے۔ دیکھا گیا تو وہ ابوبکر قندھاری کا خیمہ تھا۔ دوسرے دن حملہ ہوا اور قلعہ فتح ہوا۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ جب ابوبکر قندھاری نے حملہ کیا تو اپنا سر کاٹ کر اپنے ہاتھ پر رکھ لیا تھا۔ ہندوؤں میں مشہور تھا کہ ایسا بے سر آدمی قلعے کو فتح کرے گا۔ دو جگہ ان کے مزار ہیں۔ ایک جگہ وہ جہاں دفن ہوئے۔ اور ایک وہ جگہ جہاں شہید ہوئے۔ مرجع خلائق وہ جگہ ہے جہاں شہید ہوئے۔

ابوبکر وراق ملتان میں مدفون صوفی بزرگ، خواجہ معین الدین کے پیر بھائی اور خواجہ عثمانی کے خلیفہ تھے، لقب تاج العارفین ہے۔ اول اول قیام اجمیر شریف کے قریب موضع تاراگڑھ میں تھا۔ ایک مرید کی امداد کے لئے گھوڑے پر نکلے اور کفار سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ سر وہیں پڑا رہا اور گھوڑا آپ کا جسم لے موضع [illegible] (ملتان) میں ایک شخص امام الدین کے گھر کے باہر آن کھڑا ہوا۔ امام الدین نے آپ کی تدفین کا انتظام کیا۔ اس کی اولاد روضہ کی مجاور ہے۔ جسے اورنگ زیب نے ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔

وراق لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ کے پیر و مرشد آپ کو روزانہ ایک لکھا ہوا ورق دیتے، جسے دریا میں ڈالنے کا حکم ہوتا تھا۔ واپسی پر دریا سے ایک ورق ملتا تھا۔ جو آپ پڑھے بغیر اپنے مرشد کو دے دیا کرتے تھے۔ نہایت خدا رسیدہ اور عزلت گزین بزرگ تھے۔ مزار پر آج بھی عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

ابوبکرہ رضؓ (وفات ۵۱ھ/۶۷۱ء) صحابی رسولؐ، بہت سی احادیث کے راوی ہیں۔ پہلے طائف میں ثقیف کے غلام تھے، ۸ھ/۶۳۰ء میں حضور اکرمؐ کے محاصرۂ طائف کے دوران آپ سے آن ملے تھے۔ اسی لئے خود کو "عتیق النبی" کہتے تھے۔ بعد ازاں طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور حضور کے بعد مدینہ اور پھر بصرہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی زندگی ہی میں بیٹوں اور پوتوں کی تعداد سو سے اوپر ہو گئی۔ تمام عمر دینی علوم خصوصاً علم حدیث کی ترویج میں مشغول رہے۔ مسلم، ابوداؤد اور بخاری جیسے علماء نے انہیں ثقہ اور معتبر مانا ہے

ابوتاشفین اول عبدالرحمان بن ابی حمو۔ خاندان عبدالواد کا پانچواں [illegible] جمادی الاول ۸۰۱ھ/[illegible]

Marfat.com

[illegible] نے اپنے نام ابوتاشفین کو جو تخت کے وارث [illegible] تھا یا [illegible] نے [illegible] انہیں بھیج دیا اور اس طرح اسے اپنی سلطنت کو قسطنطنیہ اور بجایہ کے [illegible] کے بعد مشرق کی جانب وسعت دینے کی آزادی مل گئی۔ لیکن بنو حفص نے بنو مرین سے اتحاد کر لیا۔ اور مرینی سلطان ابوالحسن نے ابوتاشفین کے مقبوضات پر تسلط کر کے ۷۳۵ھ/۱۳۳۴ء میں تلمسان کا محاصرہ کر لیا۔ دو سال بعد پایہ تخت ایک حملے میں مفتوح ہو گیا اور بادشاہ لڑائی میں کام آیا۔

ابوتاشفین ثانی بن ابی حمّو موسیٰ خاندان عبدالواد کا بادشاہ۔ یہ ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور اس کے شباب کا زمانہ ندرومہ میں گذرا۔ ابوحمّو ثانی کے تونس کی طرف فرار کے بعد مرینی سلطان ابوعنان نے اسے فاس بھیج دیا۔ اور پھر تلمسان میں یہ ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء ہی میں واپس آسکا۔ باوجود ان مراعات کے جو اس کے والد نے اسے دے رکھی تھیں تخت حاصل کرنے کی بے صبری نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ابوحمّو کا خاتمہ کر دے۔ لیکن ابوحمّو جسے اوران میں محبوس کر دیا گیا تھا قید سے نکل بھاگا اور جب اسے حج پر بھیجا گیا تو وہ فتح کے پھریرے لہراتا ہوا فتح و کامیابی کے ساتھ تلمسان میں داخل ہوا۔ بالآخر تاشفین نے ایک مرینی فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس فوج نے ابوحمّو کو شکست دی اور ابوتاشفین کو ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں تخت نشین ہونے کا موقع مل گیا۔ مرینیوں کے باجگزار ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اسے تفویض تھے انھیں یہ پوری وفاداری سے سرانجام دیتا رہا۔ اس نے ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں وفات پائی۔

ابوتراب مٹی والا۔ حضرت علیؓ کا لقب، جو حضرت رسول اکرمؐ نے آپ کے زہد و فقر کے پیش نظر عطا کیا تھا۔ (نیز دیکھئے "علیؓ بن ابوطالب")

ابوجندلؓ صلح حدیبیہ کے وقت کفار کی قید سے بھاگ کر آنے والے معزز صحابی، سہیل بن عمر کے بیٹے تھے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ان کے والد قریش مکہ کی طرف سے صلح کے لئے آئے تھے۔ جب شرائط لکھی جا رہی تھیں تو ابوجندل، جو اسلام قبول کر چکے تھے اور جنھیں کفار نے بیڑیوں میں قید کر رکھا تھا حضورؐ کی خدمت میں پابہ زنجیر حاضر ہوئے اور اپنے زخم دکھا کر مدینے جانے کی درخواست کی۔ آنحضورؐ کو بھی اس کی حالت پر بے حد رحم آیا اور آپؐ نے سہیل سے اسے آزاد کر دینے کی درخواست کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہ کی مخالفت کے باوجود، صلح کی شرائط بموجب ابوجندلؓ کو کفار کے حوالے کر دیا تاکہ مسلمانوں کے ایفائے عہد پر کوئی حرف نہ آئے۔ چنانچہ ابوجندلؓ کفار کے ظلم و ستم کا شکار رہے۔ بعدازاں جب مسلمانوں نے عیص کے مقام پر ایک جائے پناہ بنالی تو یہ بھی وہاں چلے گئے اور معاہدے کے خاتمے پر مدینہ چلے آئے۔

ابوجہل ابوالحکم عمرو بن ہشام بن المغیرہ۔ قریش کے خاندان بنو مخزوم کا ایک فرد حضورؐ کا سب سے بڑا دشمن جو اپنی ماں ام الجلاس اسماء بنت مخربۃ کی نسبت سے ابن الحنظلیۃ بھی کہلاتا ہے۔ بنو مخزوم قریش کا ایک ممتاز خاندان تھا۔ قصیّ بن کلاب سے پہلے قریش کے تمام اعزازات اسے حاصل تھے۔ قصیؔ نے غالب آکر تمام اعزازات ان سے چھین لیے اور صرف قبہ یعنی خیمہ و خرگاہ کا انتظام اور اعنۃ یعنی سواروں کی سپہ سالاری کا اعزاز ان کے پاس رہ گیا۔

ابوجہل ۵۷۰ء میں یا اس سے کچھ بعد پیدا ہوا۔ اس کی والدہ اسلام لائیں اور ۱۳ھ ۶۳۵ء کے بعد تک زندہ رہیں۔ ہجرت نبویؐ سے چند سال قبل ابوجہل الولید بن المغیرہ کی جگہ بنو مخزوم اور ان کے حلیف قبائل کا سربراہ بن گیا تھا۔ الولید کے مقابلے میں ابوجہل رسول اللہؐ کا شدید دشمن تھا۔ اس لئے کہ عمر رسیدہ الولید کی نسبت رسول اللہؐ کے ہاتھوں مکے کے معاملات میں اس کی حیثیت زیادہ معرض خطر میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہاشم اور المطلب کے مقاطعے کا خاتمہ اس کی شکست تھی اور اُسے اس وقت ایک کامیابی حاصل ہوئی جب ابوطالب کے انتقال کے کچھ ہی عرصے کے بعد بنو ہاشم کی سرداری ابولہب کے ہاتھ آئی اور وہ ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط کی ترغیب پر آنحضرت (اپنے بھتیجے) کو پناہ دینے سے دستکش ہو گیا۔

ابن اسحاق سے مروی ہے کہ۔ "مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ صفا کے مقام پر تشریف فرما تھے۔ ابوجہل بن ہشام وہاں آیا۔ اس نے آپ کو ستایا، "گالیاں دیں" آپ کے دین کی مذمت کی اور کہا کہ تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔ لیکن رسول اللہؐ نے جواباً ایک لفظ بھی اُسے نہ کہا۔ عبداللہ بن جدعان التیمی کی ایک آزاد کردہ لونڈی صفا کے اوپر اپنے مکان میں بیٹھی تھی۔ اور یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ ابوجہل یہ کہہ کر اور رسول اللہؐ کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر پلٹا اور قریش کی چوپال میں جا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد حضرت امیر حمزہؓ بن عبدالمطلب کمان کاندھے پر ڈالے شکار کھیل کر واپس آئے۔ آپ قریش میں سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ جب آپ اس لونڈی کے گھر کے پاس سے گذرنے لگے تو اس لونڈی نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ اے ابوعمارہ! اگر تم کچھ دیر پہلے یہاں آئے ہوتے تو ابوالحکم بن ہشام یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تمہارے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ جو گستاخی اور بیہودگی کی ہے وہ تم دیکھ لیتے۔ اس نے انؐ کو ستایا اور گالیاں دیں اور بہت ہی بُرا سلوک کیا اور اس کے جواب میں محمدؐ نے اُسے کچھ نہ کہا اور وہ چلا گیا۔

یہ سنتے ہی امیر حمزہؓ پر شدید جوش اور غضب طاری ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے چل پڑے اور راستے میں کہیں بھی نہ رُکے۔ خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ان کی نظر ابوجہل پر پڑی۔ آپؓ سیدھے اس کے بالمقابل پہنچے اور اپنی کمان سے اس کے سر پر ایک شدید ضرب لگائی۔ وہ لہولہان ہو گیا اور بُری طرح زخمی ہوا۔ حضرت حمزہؓ نے فرمایا تو ان کو گالیاں دیتا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ میں ان کا ہم مذہب ہوں، ان کے عقائد کا قائل ہوں، اگر ہمت ہے تو اب کہہ، کیا کہتا ہے ۔۔۔ بنو مخزوم کے چند آدمی ابوجہل کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن ابوجہل نے انھیں روکتے ہوئے اعتراف کیا کہ اس نے واقعی محمدؐ سے نازیبا سلوک کیا ہے، اس کے بعد حضرت حمزہؓ سیدھے دربار رسالت مآب میں پہنچے اور ایمان لے آئے۔ اب کسی کی مجال نہ تھی کہ آنحضورؐ کو دق کرے۔"

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ آنے لگے تو راستے میں آپ کی مکہ کے ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے اس سے کہا۔ "کیا تم میرا پیغام جہاں میں بھیجوں پہنچا دو گے۔؟" اس نے کہا بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "تم اخنس بن شریق کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ محمدؐ تم سے کہتے ہیں کہ تم مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دو تاکہ میں اللہ کا پیام تم کو سناؤں۔" اُس شخص نے آپؐ کا پیغام اخنس کو جا کر دیا۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "میں چونکہ عرب کا حلیف ہوں اس لئے ان کی مخالفت میں کسی کو اپنے پاس نہیں بُلا سکتا۔" اس نے واپس آکر اخنس کا پیغام دے دیا۔ آپ نے فرمایا "تم پھر جا سکتے ہو؟" اس نے کہا ہاں۔ تو پھر آپ نے فرمایا۔ "تم سہیل بن عمرو کے پاس جاؤ اور کہو کہ تم سے محمدؐ کہتے ہیں کیا تم اُن کو اپنے پاس بلا سکتے ہو تاکہ وہ اللہ کا پیغام تم کو سنائیں۔" اس شخص نے آپ کا پیغام جا کر سہیل بن عمرو کو دیا۔ سہیل بن عمرو نے

Marfat.com

جواب کہلا بھیجا کر — بنی عامر بن لوی ، بن کعب کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے اس شخص نے بھی آکر آنحضورؐ سے کہہ دیا۔ آپؐ نے پھر اس سے کہا — "اب تم مطعم بن عدی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ محمدؐ تم سے کہتے ہیں کہ کیا تم پناہ دے سکتے ہو تاکہ وہ اپنے رب کے احکام اور پیام تم کو سنائیں ۔" مطعم بن عدی نے جواب دیا کہ ہاں میں اس کے لیے تیار ہوں۔ وہ مکہ میں آ جائیں — اس شخص نے جاکر رسول اللہؐ سے جاکر اس کی اطلاع کر دی

دوسرے دن صبح کو مطعم بن عدی اور اس کے بیٹوں اور بھتیجوں نے مسلح ہو کر [illegible] کیا اور وہ سبھی مسجد میں آ گئے۔ ابوجہل نے انھیں دیکھ کر پوچھا — "پیرو ہو یا پناہ دینے والے؟" مطعم بن عدی نے کہا — "محمدؐ کو پناہ میں نے دی ہے۔" ابوجہل بولا — "اچھا جسے تم نے پناہ دی اُسے ہم نے پناہ دی ۔" رسول اللہؐ مکے آ گئے۔ ایک دن آپ تشریف لائے تو مشرک کعبہ کے پاس جمع تھے ۔ ابوجہل نے آپؐ کو دیکھ کر کہا ۔" اے بنی عبدمناف یہ تمہارے نبی ہیں؟" اس پر عتبہ بن ربیع بولے ۔ "مگر اس بات سے انکار کیوں کیا جائے کہ ہم میں سے کوئی نبی یا بادشاہ ہو۔" نبی صلعم کو اس کی اطلاع دی گئی یا خود ہی آپؐ نے یہ بات سن پائی۔ آپؐ قریش کے پاس آئے اور فرمایا۔ "اے عتبہ بن ربیع ! یہ بات تم نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی حمایت میں نہیں کی بلکہ غرورِ قومی میں کہی ہے اور اے ابوجہل بن ہشام ! کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرے گا کہ تو ہنسے گا کم اور روئے گا بہت اور اے اہلِ قریش ! بہت جلد مجبوراً یا دل نخواستہ تم اس دعوت میں شرکت کرو گے جس سے اب تم انکار کرتے ہو ۔"

جب اہل قریش نے آنحضورؐ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھی تو آپس میں مل بیٹھے تاکہ مشورہ کریں ۔ اس محفل میں ابوجہل بن ہشام نے کہا کہ ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے جس پر اب تک تم میں سے کسی کا خیال نہیں گیا۔ اہل مجلس نے بیک زبان کہا ابوالحکم کہو تمہاری وہ تجویز کیا ہے ؟ ۔ ابوجہل نے کہا میری رائے یہ ہے کہ تم ہر قبیلہ میں سے ایک ایک نہایت دلیر ، نجیب اور شریف مرد کا انتخاب کر لو ۔ پھر اُن جوانمردوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک شمشیر براں دے دو ۔ یہ جماعت اس کے پاس جائے اور سب مل کر ایک ہی وار میں اُس کا کام تمام کر دیں ۔ اس طرح ہم کو ہمیشہ کے لئے اس سے نجات مل جائے گی اور چونکہ ایک جماعت بیک وقت اسے قتل کرے گی ۔ (نعوذ باللہ) اس لئے اُس کا قصاص تمام قبائل کے ذمے ہو گا ۔ کسی ایک کے ذمے نہ رہے گا ۔ اور بنو عبدمناف میں پھر یہ قدرت نہ ہو گی کہ اس کے لئے سب قبیلوں سے لڑیں ۔ وہ لامحالہ دیت قبول کرنے پر مجبور ہوں گے اور ہم خوشی سے اس کا خون بہا سب کی طرف سے ادا کر دیں گے ۔ اس تصفیہ پر مجلس برخاست اور منتشر ہو گئی ۔

اسی روز حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہؐ سے آکر کہا ۔ حضورؐ آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں ۔ چنانچہ حسبِ قرارداد عشاء کے بعد آپ کے دروازے پر جمع ہو گئے ۔ اور تاک میں لگے رہے کہ جب آپؐ سو جائیں تو وہ حملہ کر کے آپؐ کو ختم کر دیں (نعوذ باللہ) رسول اللہؐ نے جب دیکھا کہ کفار آ گئے ہیں تو انھوں نے حضرت علیؓ سے فرمایا ۔ "تم میرے بستر پر سو جاؤ اور میری سبز حضرمی اونی چادر اوڑھ لو ، تم کو اُن کی طرف سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا ۔" رسول اللہؐ جب سوتے تھے تو ہمیشہ اس چادر کو اوڑھا کرتے تھے ۔

محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ — " اس غرض سے جو لوگ جمع ہوئے تھے اُن میں ابوجہل بن ہشام بھی تھا ۔ یہ سب رسول اللہؐ کے دروازے پر جمع تھے ۔ ابوجہل نے اُس وقت اُن سے کہا ۔ محمدؐ مدعی ہے کہ اگر تم اس کی بات مان کر اس کے پیرو ہو جاؤ تو عرب اور عجم کے مالک ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے

اور [illegible] کو ان [illegible] کے لئے [illegible] دیئے جاؤ گے اور [illegible] گا ۔" اتنے میں رسول اللہؐ [illegible] آپؐ [illegible] ہاں ، میں یہ کہتا ہوں اور جو آگ میں جلائے جائیں گے ان [illegible] وہ مٹی ان پر پھینکی ۔ اللہ نے ان سب کو اندھا کر دیا ۔ آپؐ ان [illegible] تلاوت کرتے ہوئے جاتے تھے ۔ یٰسٓ ، قسم ہے قرآن کی جو حکمت [illegible] مرسل ہو اور سیدھے راستے پر ہو ۔ . . . اور ہم نے اُن کے سامنے اور عقب سے ایک [illegible] حائل کر دی اور پھر اُن (کفار) کو بند کر دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھ پاتے تھے ۔ جب آپؐ ان [illegible] سے فارغ ہوئے تو اُن (کفار) میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا کہ آپؐ نے اس کے [illegible] مٹی نہ ڈال دی ہو ۔ پھر آپؐ جہاں جانا چاہتے تھے چلے گئے ۔

حضرت اسمٰؓ بنتِ ابوبکر صدیقؓ بیان فرماتی ہیں کہ ۔ "رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے جانے کے بعد قریش کے کچھ لوگ جن میں ابوجہل بن ہشام بھی تھا ہمارے ہاں آئے اور ہمارے دروازے پر آن کر کھڑے ہو گئے ۔ میں اندر سے نکل کر ان کے پاس آئی ۔ انھوں نے پوچھا تمہارا باپ ابوبکرؓ کہاں ہے ؟ ۔ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرے ابو کہاں ہیں ۔ اس پر ابوجہل نے جو بہت ہی خبیث اور زشت خو تھا میرے گال پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ میرے کان کی بالی گر پڑی ۔

ابوجہل جنگ بدر میں ایک نوجوان مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا ۔ حضرت معاذؓ بن عمرو کا بیان ہے کہ سب سے پہلے وہ ابوجہل کے پاس پہنچے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنگ بدر کے دوران ایک جھاڑی کی اوٹ میں ابوجہل اور مشرکین کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا ۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ ابوجہل تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے ۔ میں نے یہ سنتے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ ضرور اس پر حملہ کروں ۔ میں فوراً اس پر جھپٹ پڑا اور موقع پاتے ہی میں نے اس پر حملہ کر دیا اور تلوار کی ایک ضرب سے نصف ساق سے اس کا پاؤں قطع کر دیا ۔ اس کے بیٹے عکرمہ نے میرے شانے پر وار کیا اور میرا ہاتھ اڑا دیا ۔ صرف جلد کے سہارے وہ میرے پہلو میں لٹکا رہا ۔ مگر اس زخم کی وجہ سے میں ابوجہل سے زیادہ نہ لڑ سکا ۔ تمام دن میں لڑتا رہا ۔ میرا بے کار ہاتھ میرے پیچھے جھولتا رہا ۔ جب اس کی تکلیف زیادہ ہونے لگی تو میں نے اس پر پاؤں رکھ کر اُسے جسم سے چیر کر الگ کر دیا ۔" اس واقعہ کے بعد معاذؓ زندہ رہے اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں وفات پائی ۔

جب ابوجہل زخمی پڑا ہوا تھا تو معوذؓ بن عفرا اس کے پاس سے گذرے ۔ انھوں نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا اور مردہ سمجھ کر آگے بڑھ گئے اور پھر لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ۔ اس کے بعد جب رسول اللہؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ابوجہل کو تلاش کرو ۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے گھٹنے پر زخم کا نشان ہو گا جو بچپن میں اسے میرے دھکا دینے سے لگا تھا ۔ عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ اسی زخم کے نشان پر میں نے ابوجہل کی لاش تلاش کی ۔ اس میں ابھی رمق جان باقی تھی ۔ میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا ۔ اس نے مکہ میں مجھے خوب مارا تھا ۔ پھر اس نے پوچھا کہ بتاؤ فتح کس کی ہوئی ہے ۔ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسولؐ کی ۔ اس نے مجھے کہا کہ لے بھیڑیں چرانے والے تو بہت اونچی جگہ پر چڑھا ہے ۔ پھر اس نے ابوجہل کا سر کاٹ لیا ۔ اور اسے رسول اللہؐ کی خدمت میں لے کر آیا اور عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ دشمن خدا ابوجہل کا سر ہے اور وہ سر آنحضرتؐ کے سامنے ڈال دیا ۔"

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ مشرکین کے مقتولین کو کنوئیں میں ڈال دیا جائے ۔ اور پھر وہ کنوئیں میں ڈال دیئے گئے [illegible] ہے کہ صحابہؓ نے وسطِ شب میں رسول اللہؐ کو یہ کہتے [illegible]

Marfat.com

... ابوجہل بن ہشام ... اسی طرح آپ ... ان کی لاشیں بدر کے کنوئیں میں ڈال دی گئیں تو آپ نے ... پھر فرمایا: "جو وعدہ ... نے سچا پایا۔ بے شک جو وعدہ میرے رب ... نے مجھ سے کیا تھا اسے میں نے سچا پایا۔" صحابہؓ نے آپؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ آپ ایسے جسموں کو پکارتے ہیں کہ جو گل سڑ گئے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: "جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے تم ان سے کچھ زیادہ نہیں سنتے البتہ ان میں جواب دینے کی استطاعت نہیں ہے۔"

ابوجہل نے دو شادیاں کی تھیں۔ ام مجالد سے حضرت عکرمہؓ پیدا ہوئے اور ان سے دو لڑکیاں۔ بڑی لڑکی جویریہؓ اور چھوٹی کا نام حنفاؓ تھا۔ یہ تینوں بچے مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

ابوحاتم بن حبان

(وفات ۳۵۴ھ) محمد تمیمی ابن حبان ابن احمد ابن حبان، محدث، فقیہہ اور عالم، اوائل عمر ہی سے تحصیل علم کے شوق میں عراق، شام، حجاز، خراسان، ماوراالنہر اور ترکستان کے سفر اختیار کیے۔ فقہ و حدیث میں ابوبکر محمد بن اسحاق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ علم طب اور نجوم میں بھی دسترس حاصل کی۔ سمرقند اور سایہ میں قاضی القضاہ کے عہدے پر بھی فائز رہے تحصیل علم کے بعد تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ حدیث، فقہ اور تاریخ پر مختلف تصانیف ہیں۔ سیستان میں انتقال کیا اور بست میں دفن ہوئے۔ اہم تصانیف "کتاب الصحابہ" (۵ جلدیں)، "کتاب التابعین" (۱۲ جلدیں)، "اتباع التبع" (۲۰ جلدیں) "اتباع التابعین" (۱۵ جلدیں)، "الفصل بین النقلہ" (۱۰ جلدیں) علل اوہام اصحاب التواریخ" (۱۰ جلدیں) ہیں۔

ابوحذیفہؓ

ہشیم بن عتبہ، صحابیٔ رسول، ابتدا میں سلام قبول کرلیا۔ بڑی خواہش کرتے تھے کہ باپ بھی مشرف بہ اسلام ہو جائے۔ مگر اسے یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ وہ جنگ بدر میں قریش کا سپہ سالار بنا اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ ابوحذیفہؓ حبشہ کو دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ وہاں سے لوٹ کر مدینہ ہجرت کی۔ عہد نبوی کے تمام اہم معرکوں میں شریک ہوئے۔ جنگ بدر میں تو اپنے باپ کو بھی للکارتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں شریک ہوئے اور اسی میں ۵۴ برس کی عمر میں شہادت پائی۔ ایک عظیم انسان اور بے مثل صحابی تھے۔ اخلاق حسنہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نہایت حق پسند اور حق گو تھے۔ مذہبی جوش اور حمیت سے بھرے تھے۔ اسی لئے تمام غزوات میں شریک رہے۔

ابوحفص

تاریخ میں کئی اہم شخصیتوں کی کنیت تھی۔ رسول اللہؐ کے ایک مشہور صحابی بھی ابوحفص تھے۔ ابوحفص البخاری، بخارا کے ایک مفتی تھے۔ انہیں ابوحفص کبیر کہا جاتا ہے اور ان کے بیٹے کو "صغیر" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دونوں اپنے دور کی اہم شخصیت تھے۔ ابوحفص عمر بن احمد ایک بہت بڑا مصنف تھا اس کی تصانیف کی تعداد ۳۳۰ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ "ترغیب"، "تفسیر" اور "مسند" بے حد اہم ہیں۔ اس نے ۳۸۵ھ/۹۹۶ء میں وفات پائی۔

ابوحفص عمر غزنوی، سراج الدین (وفات ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء) عربی کی ایک مشہور کتاب "زبدۃ الاحکام" کا مصنف تھا۔ اس میں اہل سنت والجماعت کے چار بڑے ... ائمہ اربعہ کے اختلافی احکام کا بیان ہے۔

ابوحفص عمر بن جمیع، ایک اباضی عالم تھا اس نے ۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء میں جربہ میں وفات پائی۔ اس نے المغرب کے اباضیہ کی پرانی کتاب "عقیدہ" کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔

ابوحفص عمر بن شعیب قرطبہ کا ایک باشندہ تھا۔ جس نے جزیرہ اقریطش میں ایک نئے خانوادے کی بنیاد رکھی۔ الربض کی بغاوت کے بعد جو قرطبہ میں ۲۰۲ھ/۸۱۸ء میں ہوئی، جسے الحکم اوّل نے سختی کے ساتھ فرو کیا تھا۔ چند ہزار اندلسیوں نے وہاں سے نقل وطن کرکے جزیرہ اقریطش میں اپنے سردار ابوحفص کی زیر قیادت ایک نیا اقتدار قائم کیا۔

ابوحفص عمر بن یحییٰ الموحد تھا اور ابن تومرت کا سب سے بڑا رفیق تھا۔ اسی کے پوتے امیر ابوزکریا نے ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں افریقہ میں موحدینہ خاندان کی اطاعت ترک کرکے "بنو حفص" کی بنیاد رکھی۔

ابوحمّو اوّل

موسیٰ بن ابی سعید عثمان بن یغمراس، خاندان عبدالواد کا چوتھا حکمران تھا جو ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں پیدا ہوا اور ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا، اپنے بھائی ابوزیان کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس نے سلطنت کو مستحکم کیا اور مغراوہ پر اپنا اقتدار از سرنو قائم کرنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بھی پیشقدمی کی۔ چونکہ اس کی زیادہ تر توجہ فوجی مہمات کی طرف رہی۔ اس لئے عوام کے ساتھ اس کا سلوک بہتر نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بیٹے ابوتاشفین نے اسے قتل کردیا۔

ابوحمّو ثانی

موسیٰ بن ابویعقوب بن عبدالرحمان بن یحییٰ بن یغمراس، خاندان عبدالواد کا ایک حکمران، ۷۲۲ھ/۱۳۲۳ء میں پیدا ہوا۔ جب مرینیوں اور حفصیوں کے تعلقات خراب ہوگئے تو اسے ایک لشکر کا سردار بنا دیا گیا۔ اس نے از سرنو تلمسان کو فتح کیا اور ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں وہاں کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں مرینیوں نے پھر قبضہ کرلیا۔ مگر دو ہی سال کے بعد ابوحمو نے اقتدار حاصل کرلیا۔ اس کا بیٹا ابوتاشفین ثانی بھی اس کا مخالف تھا۔ مگر ابوحمو مرینیوں کے ساتھ لڑتا ہوا ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء کو مارا گیا۔

ابوحمید ساعدیؓ

عبدالرحمان ساعدی، صحابیٔ رسول، ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ مدینہ کے قبیلہ خزرج کی شاخ ساعدہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُحد کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ امیر معاویہ کے آخری ایام خلافت میں وفات پائی۔ آپ کا شمار جلیل القدر انصار میں ہوتا ہے۔ اکثر احادیث کی روایات آپ سے منسوب ہیں۔ سنت رسولؐ کی پیروی آپ کا خاص شعار تھا۔ آپ نے آنحضور صلعم کے طریقہ نماز کو اپنایا تھا۔ دیگر اصحابہ نے یہ طریق آپ ہی سے سیکھا۔

ابوحنیفہ امامؒ

(۸۰ھ/۶۹۹ء - ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) النعمان ابوحنیفہ بن ثابتؒ بن زوطی بن ماہ، مسلمانوں کے امام اعظم، اہل سنت کا ایک فرقہ انھی کے نام پر حنفی کہلاتا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ آپ عجمی النسل تھے۔ آپ کے دادا زوطی کابل سے آئے تھے اور انھوں نے اسلام قبول کرکے نعمان نام رکھا۔ حضرت علیؓ نے انھیں اور ان کے بیٹے ثابت کو دعائے خیر دی تھی۔

امام ابوحنیفہ کا بچپن ایک پُرآشوب دور تھا۔ حجاج بن یوسف عراق کا حاکم تھا اور مذہبی تصادم اپنے عروج پر تھا۔ عبدالملک اور اس کے بعد ولید کے عہد سے وارد

Marfat.com

میں اکثریت ایسے ہی سفاک اور ظالم قسم کے حکمرانوں کی تھی۔ اس کے بعد سلیمان اور پھر عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اسلامی دنیا کو کسی قدر سکون نصیب ہوا۔ ظالم عمال حکومت معزول کر دیئے گئے اور علوم مذہبی کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ امام زہری نے احادیث کا مجموعہ مرتب کیا۔ غرضیکہ امام ابوحنیفہ کے لئے اب وہ موقع آیا کہ آپ تحصیل علم کی طرف مناسب توجہ دے سکیں۔ ان دنوں آپ کوفہ میں ایک قسم کا ریشمی کپڑا بنایا کرتے اور اس کی تجارت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ حماد (وفات ۱۲۰ھ) کے درسوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں آپ نے علم کلام اور فقہ کی طرف خصوصی توجہ دی۔ حماد کے انتقال کے بعد کوفہ میں فقہ پر سب سے زیادہ ممتاز حیثیت کے مالک آپ ہی تھے

امام اعظمؒ نے اگرچہ حماد کے علاوہ اور علماء سے بھی فقہ کی تحصیل کی۔ لیکن وہ اس فن خاص میں حمادؒ ہی کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حمادؒ کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ اگرچہ فقہ میں امام موصوف نے زیادہ تر حمادؒ ہی کا حلقۂ درس کافی سمجھا تھا۔ لیکن علم حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی۔ یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ بلکہ درایت کے ساتھ روایت کی ضرورت تھی۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے اس وقت نہایت پریشان اور غریب مرتبت تھیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے اساتذہ کو بھی دو چار سو سے زائد احادیث یاد نہ تھیں۔ اور یہ تعداد ضروری مسائل کے حل کے لئے بھی ناکافی تھی۔

علاوہ ازیں بہ طریق روایت اس قدر اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریقوں سے معلوم نہ ہو، اس کے مفہوم اور تعبیر کا ٹھیک تعین دشوار تھا۔ امام اعظمؒ کو حمادؒ کی صحبت اور پختگی عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا اس لئے نہایت سعی و اہتمام سے حدیثوں کو بہم پہنچانے پر آپ نے توجہ دی۔ تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا جس کے سامنے امام موصوف نے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو آپ کو ان مختلف اور متعدد درسگاہوں سے اگرچہ احادیث کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تاہم تکمیل کی سند حاصل کرنے کے لئے آپ نے حرمین میں جانا ضروری سمجھا جو علوم مذہبی کے اصلی اور بڑے مراکز تھے۔

جس زمانے میں امام اعظمؒ مکہ معظمہ پہنچے، درس و تدریس کا بہت زور تھا۔ عطاؒ بن ابی رباح کا حلقۂ درس سب سے زیادہ وسیع اور مستند تھا۔ امام موصوف استفادہ کی خاطر حاضر خدمت ہوئے تو عطاؒ بن ابی رباح نے آپ سے پوچھا۔

"تمہارا عقیدہ کیا ہے۔؟"

"میں اسلاف کو برا نہیں کہتا۔ گناہگاروں کو کافر نہیں سمجھتا، قضا و قدر کا قائل ہوں۔"

عطاؒ بن ابی رباح نے امام موصوف کو اجازت دے دی کہ وہ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوا کریں۔ روز بروز ان کی ذہانت طلباء کے جوہر ظاہر ہوتے گئے۔ اور پھر یہ عالم تھا کہ جب وہ حلقۂ درس میں جاتے تو [illegible] بن ابی رباح آپ کو اپنے پہلو میں جگہ دینے لگے امام اعظمؒ جب مدینہ منورہ پہنچے تو آپ سالمؒ بن عبداللہ بن عمرؓ بن خطاب اور سلیمان سے بھی ملاقی ہوتے۔ اور ان سے احادیث بھی روایت کیں۔ امام موصوف کی طلب علم کی مسافت گرچہ مدینہ منورہ تک محدود ہے، تاہم آپ نے تحصیل علم کا سلسلہ آخر زندگی تک جاری رکھا۔ آپ اکثر حرمین جاتے اور مہینوں وہاں پر قیام کرتے۔

حج کی تقریب پر ممالک اسلامیہ کے ہر گوشے سے بڑے بڑے اہل علم اور صاحبان کمال آکر جمع ہوتے۔ امام اعظمؒ اکثر ان لوگوں سے ملتے اور مستفید ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں تک کہ ظاہر بینوں نے آپ کو "قیاس" مشہور کر دیا تھا۔ ان ہی دنوں آپ کے شاگرد عبداللہ بن مبارک نے بیروت کا سفر کیا کہ امام اوزاعیؒ سے فن حدیث کی تکمیل کریں۔ [illegible] پوچھا۔ کوفہ میں ابوحنیفہ کون ہے [illegible] ابن مبارک نے کچھ جواب نہ دیا اور گھر چلے آئے۔ [illegible] اپنے ساتھ لیتے گئے۔ امام اوزاعیؒ نے وہ اجزا لے کر پڑھے، لکھا تھا۔ "قال النعمان بن ثابت" دیر تک غور سے دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ "یہ نعمان کون بزرگ ہیں؟"

"عراق کے ایک صاحب جن کی صحبت میں میں رہا ہوں،" جن کو آپ مبتدع بتاتے تھے امام اوزاعیؒ کو اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔ حج کے لئے جب امام اوزاعیؒ مکہ تشریف لے گئے تو امام اعظمؒ سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے عبداللہ بن مبارک بھی وہاں موجود تھے ان کا بیان ہے کہ امام اعظمؒ نے اس خوبی سے تقریر کی کہ امام اوزاعیؒ حیران رہ گئے۔ امام ابوحنیفہ کے جانے کے بعد مجھ سے کہا۔ "اس شخص کے کمال نے اس کو لوگوں کا محسود بنا دیا ہے، بلاشبہ میری بدگمانی غلط تھی، جس کا مجھے افسوس ہے۔" تاریخ شاہد ہے کہ امام اعظمؒ نے فن حدیث میں امام اوزاعیؒ کی شاگردی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے کہ آپ امام اوزاعی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔

سیدنا امام باقرؒ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابوحنیفہؒ دوسری بار مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ سیدنا امام باقرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا:

"ہاں تم ہی قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی احادیث کی مخالفت کرتے ہو۔"

"معاذ اللہ" امام اعظم نے نہایت ہی ادب سے عرض کیا "حدیث کی مخالفت کون کر سکتا ہے۔ آپ تشریف رکھیں تو کچھ عرض کروں۔" سیدنا امام باقرؒ تشریف فرما ہوئے تو درج ذیل گفتگو ہوئی۔

ابوحنیفہؒ: مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقرؒ: عورت۔

ابوحنیفہؒ: وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟

امام باقرؒ: مرد کا۔

ابوحنیفہؒ: میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہراً قیاس پر زیادہ ملنا چاہیئے۔" پھر عرض کیا "نماز افضل ہے یا روزہ؟"

امام باقرؒ: نماز

ابوحنیفہؒ: اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا واجب ہونی چاہیئے نہ روزہ کی حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتوے دیتا ہوں۔

سیدنا امام باقرؒ اس قدر خوش ہوئے کہ اٹھ کر امام اعظمؒ کی پیشانی چوم لی۔ امام ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ آپ اس خصوصیت سے مشہور ہیں کہ آپ کے شیوخ حدیث بے شمار تھے۔ ابوحفص کبیر کا دعوے ہے کہ امام اعظمؒ نے کم از کم چار ہزار اشخاص سے احادیث روایت کی ہیں۔ اندلس کے سوا اسلامی دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو امام اعظمؒ کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔ مختصراً یہ کہ آپ کی استادی کے حدود خلیفۂ وقت کے حدود مملکت کے برابر تھے۔

عباسی خلافت کا سلسلہ جنبانی جو ایک مدت سے ہو رہا تھا مروان الحمارؒ کے عہد میں نہایت زور پکڑ گئی۔ ابومسلم خراسانی نے تمام ملک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مروانی حکومت کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ چونکہ زیادہ تر فسادات کا مرکز عراق اور عراق میں بالخصوص کوفہ تھا۔ اور یہیں پر امام ابوحنیفہؒ تشریف فرما تھے۔ مروان الحمار نے یزید بن عمر بن ہبیرہ کو عراق کا گورنر مقرر کیا تو انہوں نے امام موصوف کو [illegible]

Marfat.com

[illegible] انکار کر دیا۔ یزید بن عمر نے کہا کہ جبراً آپ کو [illegible] بزرگوں نے بھی سمجھایا مگر آپ اپنے انکار پر ہی قائم [illegible] اگر یزید بن عمر کہے کہ مسجدوں کے دروازے گن دو تو بھی مجھے منظور نہیں [illegible] کسی مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر مہر لگا دوں۔

یزید بن عمر نے غصے میں آکر حکم دیا کہ ہر روز آپ کو دس دُرّے لگائے جائیں تاوقتیکہ آپ اس عہدے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوتی رہی لیکن امام اعظمؒ اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر یزید بن عمر نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ ۱۳۲ ہجری میں حکومت نے دوسرا پہلو بدلا یعنی خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہو گیا اور آل عباس وارثِ تخت وتاج ہوئی۔ اس خاندان کے پہلے حکمران ابوالعباس السفاح نے چار برس حکومت کی اور ۱۳۶ ہجری میں اس کا بھائی المنصور عباسی تخت نشین ہوا۔ السفاح اور المنصور اعتدال کی حدوں سے دور نکل گئے۔ خاص طور پر منصور نے یہ ستم کیا کہ سادات وعلویین کی بیخ کنی شروع کر دی۔ محمدؒ بن ابراہیمؒ کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ ان بے رحمیوں کی داستان بڑی طویل ہے اور پیش نظر مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

آخر تنگ آکر ۱۴۵ھ میں ان ہی مظلوم سادات میں سے محمد نفسؒ ذکیہ نے مدینہ منورہ میں خروج کیا اور نہایت بہادری سے لڑ کر جنگ میں کام آئے۔ تو ان کے بھائی ابراہیمؒ نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ امام اعظمؒ نے بھی ابراہیم کی تائید کی اور بجز اس کے کہ جنگ میں شریک نہ ہو سکے اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ ابراہیم بھی دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اب المنصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جنہوں نے ابراہیمؒ کا ساتھ دیا تھا ۱۴۶ ہجری میں اپنے پایۂ تخت بغداد پہنچ کر منصور نے امام اعظمؒ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً حاضر ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ دربار میں حاضر ہوئے تو ربیع نے کہ وہ حجابت کا عہدہ رکھتا تھا۔ آپ کو دربار میں پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دنیا میں آج سب سے بڑے عالم ہیں"

منصور: آپ نے کس سے تحصیل علم کی؟

ابوحنیفہ نے اپنے استادوں کے نام بتائے تو منصور نے آپ کے لئے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔

منصور: (غصے میں) تم جھوٹے ہو۔

ابوحنیفہ: اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ دعوے ضرور سچا ہے کہ میں عہدہ قضا کے اہل نہیں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی نہیں ہو سکتا۔

منصور نے قسم کھائی کہ تم کو یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا۔

ابوحنیفہ (قسم کھا کر) ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

ربیع: (غصے میں) ابوحنیفہ! تم امیر المومنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو۔

ابوحنیفہ: ہاں، کیونکہ امیر المومنین کو قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے

۱۴۶ھ میں المنصور نے امام اعظمؒ کو قید کر دیا۔ بلاشبہ اس کے پیچھے کچھ سیاسی اسباب تھے اور عباسی حکومت ان کے ان حالات سے خائف تھی جو آپ اہل بیت، نفسؒ ذکیہ اور ابراہیمؒ کے متعلق رکھتے تھے۔ منصور کو بحالت قید بھی آپ کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ امام ابوحنیفہؒ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ اس گرفتاری اور قید نے اُن کے اثر اور قبول عام کو کم کرنے کی بجائے اور زیادہ کر دیا تھا۔ منصور نے گمان کو قید کر رکھا تھا لیکن کوئی امراء ان کے ادب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔ قید خانے میں آپ کا سلسلۂ تعلیم بھی برابر جاری تھا۔ امام محمدؒ نے جو فقہ حنفی کے دست و بازو ہیں قید خانے ہی میں امام [illegible] سے تعلیم پائی۔

[illegible] ہجری میں آپ کو زہر دلوا دیا۔ جب آپ کو زہر کا اثر محسوس ہوا

تو آپ نے سجدہ کیا اور اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قاضی شہر حسن بن عمارہ نے غسل دیا۔ غسل سے فراغت ہوتے ہوتے لوگوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ پہلی نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اس پر آنے والوں کا سلسلہ ابھی قائم تھا۔ یہاں تک کہ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی اور عصر کے قریب آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ الخطیب لکھتا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ آپ کی نماز جنازہ پڑھا کئے۔ قبولِ عام کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی کہ سلطان الپ ارسلان سلجوقی ... نے ۴۵۹ھ میں آپ کی قبر پر ایک قبہ اور اس کے قریب ہی ایک مدرسہ تعمیر کر دایا۔ یہ مدرسہ مشہد ابوحنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے

امام اعظمؒ کے علم کی طرح آپ کی ذہانت اور طباعی بھی ضرب المثل تھی۔ اس غیر معمولی ذہانت نے عظیم الشان ذخیرۂ علم پر تصرف کر کے آپ کو بانیانِ علوم کی صف میں لا کھڑا کیا۔ امام ابن مبارکؒ کے الفاظ میں ۔ "آثار اور فقہ فی الحدیث کے لئے ایک "مقیاس صحیح پیدا کرنا وہ لازوال علمی کارنامہ ہے جو ہمیشہ امام ابوحنیفہؒ کے نام سے منسوب رہے گا۔" اس کو بعض محدثین نے "رائے" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اس "مقیاس" اور اس "رائے" نے فقہ کے متعدد ابواب مرتب کروائے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جس قدر مسائل مدون کئے۔ ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زائد ہے۔ امام اعظمؒ نے جس طریقے سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا تھا وہ نہایت وسیع اور دشوار کام تھا۔ اس لئے آپ نے اتنے بڑے اور اہم کام کو محض اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اسی غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چالیس نامور اشخاص منتخب کئے اور ان کی ایک مجلس بنائی۔

الطحاوی نے ان میں سے تیرہ کے نام دیئے ہیں۔ جن میں امام ابویوسفؒ ... اور امام زفرؒ دو انتہائی نمایاں شخصیتیں تھیں۔ اس طرح فقہ کا گویا ایک ادارہ علمی تشکیل پذیر ہوگیا۔ جس نے امام ابوحنیفہؒ کی سرکردگی میں تیس برس تک کام کیا۔ امام اعظمؒ کی زندگی ہی میں اس مجلس کے فتاوی نے حسن قبول حاصل کر لیا تھا۔ جیسے جیسے یہ فتاوے تیار ہوتے جاتے ساتھ ہی ساتھ تمام مملکت اسلامیہ میں پھیلتے جاتے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اصول تحقیق خود لکھے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"میں کتاب اللہ سے اخذ کرتا ہوں۔ اگر وہاں کوئی مسئلہ مجھے نہیں ملتا تو سنت رسول اللہ ﷺ سے لیتا ہوں اور جب وہاں بھی نہ ملے تو صحابہؓ میں سے کسی کا قول مان لیتا ہوں اور ان کا قول چھوڑ کر دوسروں کا قول نہیں لیتا۔ اور جب معاملہ ابراہیم، شعبی، ابن سیرین اور عطاء پر آجاتے تو یہ لوگ مجتہد تھے۔ اس وقت میں بھی ان ہی لوگوں کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔"

امام ابوحنیفہؒ اپنے افکار و خیالات کے متعلق اپنے شاگردوں سے بحث کیا کرتے تھے اور انہیں لکھوا بھی دیا کرتے تھے۔ لہذا ان ہی شاگردوں کی چند کتابیں، خصوصاً امام ابویوسفؒ کی "اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ" اور "الرد علی سیر الاوزاعی" "الشیبانی کی "الحج" اور موطاء امام مالکؒ کا نسخہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے اہم ماخذ ہیں۔ (رسمی اسناد "الشیبانی عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ" جو الشیبانی کی متعدد تصانیف میں پایا جاتا ہے، اور جو صرف شاگرد اور استاد کے عام تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس ضمن میں مفید مطلب نہیں ہے۔) جو عقائد خود ابوحنیفہؒ نے حمادؒ سے حاصل کئے ان کے بڑے ماخذ ابویوسفؒ کی "الآثار" اور الشیبانی کی "الآثار" ہیں۔ ابوحنیفہؒ کے جانشینوں کے ساتھ ان کے پیش رووں کا مقابلہ کر کے ہم ان کے ان کارناموں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو انہوں نے فقہ اسلامی کے فکر و عقیدے کو نشوونما دینے میں سرانجام دیئے۔

مجموعی طور پر امام ابوحنیفہؒ کا فقہی نکتہ اپنے ہمعصر ابن ابی لیلیٰ (...) کے فقہی فکر سے بدرجہا ارفع تھا۔ جو آپ کے عہد میں کوفے کے قاضی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ابن ابی لیلیٰ اور اس عہد کے عام کوفی طریق استدلال کا تعلق ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے ایک نظریاتی

Marfat.com

منظم کام انجام دیا۔ اور اصطلاحی فکر فقہ کو بھی معتدبہ ترقی دی۔ چونکہ آپ قاضی نہ تھے اس لیے ان کا فقہی فکر عملی مصالح سے اس حد تک مقید نہ تھا جس قدر ابن ابی لیلیٰ کا تھا اس کے ساتھ ہی وہ نظم ونسق عدالت کا اس قدر لحاظ نہ رکھتے تھے۔ عام طور پر امام اعظم کا مسلک باقاعدہ اور یک رنگ تھا۔ اور یہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کا فقہی تفکر اپنے سے بزرگ معاصرین کی بہ نسبت وسیع تر بنیادوں پر قائم ہے اور اس کا عملی انطباق زیادہ مکمل طور پر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اصطلاحی اعتبار سے بھی وہ زیادہ بلند، محتاط جامع اور منجھا ہوا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فقہی مسائل میں رائے اور قیاس کو اسی حد تک استعمال کرتے تھے۔ جس حد تک کہ ان کے زمانے کے دیگر فقہی مذاہب کا دستور تھا۔ اور وہ دیگر مذاہب مثلاً فقہائے مدینہ کی طرح خبر آحاد کی بنا پر روایتی عقیدے کو ترک کرنے پر بھی مائل نہ تھے یعنی کسی ایسی حدیث کی بنا پر جسے ایک زمانے میں صرف ایک شخص نے روایت کیا ہو۔ اس قسم کی احادیث امام ابوحنیفہ کی زندگی، یعنی دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں اسلامی دنیا میں رائج ہونے لگی تھیں۔ اور جب دو پشتوں کے بعد، زیادہ تر الشافعی کی بدولت خبر آحاد کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا، تو ابوحنیفہؒ پر خارجی وجوہ کی بنا پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ حدیث رسولؐ کے مزاحم ہوتے ہیں۔ مزید براں آپ پر یہ اعتراض بھی وارد کیا گیا کہ آپ فقہ کے قدیم مذاہب میں اپنی ذاتی رائے استعمال کرتے تھے اور ان کی طرف بہت سے ایسے اقوال منسوب کر دیے گئے جو متاخرین کے ذوق کے لیے سخت ناگوار تھے۔

اعتقادی دینیات کا ایک معقول عام طریقہ آپ سے منسوب ہے، جس میں جمعیت اسلامی، اس جمعیت کے اصول اتحاد، یعنی سنت نبوی، اور ان مسلمانوں کی اکثریت کے تصورات پر جو درمیانی راستے پر گامزن ہیں اور افراط و تفریط سے بچتے ہیں۔ بالخصوص زور دیا گیا ہے۔ اور جو دلائل عقلی سے زیادہ دلائل منصوصہ پر مبنی ہے۔ اس دینی مسلک کی ترجمانی "العالم والمتعلم" (جسے غلط طور پر ابوحنیفہؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔) میں اور "الصفقۃ الاسبط" میں کی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کے حلقے میں تصنیف ہوئیں۔ بعد کے ادوار میں اسی مسلک کی ترجمانی علمائے دین کی کتابوں میں سے ہوئی جن میں الطحاوی ([illegible]) (متوفی ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) کی "عقیدہ" اور ابواللیث سمرقندی ([illegible]) (متوفی ۳۸۳ھ/۹۹۳ء) کی عقیدہ، جو سوال وجواب کی شکل میں ہے، بھی شامل ہے۔ موخر الذکر کتاب ملایا اور انڈونیشیا میں بھی بہت مقبول ہے۔ حالانکہ یہ وہ علاقہ ہے جو فقہی امور میں مضبوطی سے شافعی مذہب کا پیرو ہے۔

اسی مکتبی روایت کی نشو و نما جیسے تحریک کے عوامی پس منظر میں ہوئی۔ جس میں امام ابوحنیفہ خود بھی شامل تھے۔ امام رازیؒ نے "مناقب الشافعی" میں لکھا ہے کہ ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی۔ "الفہرست" میں ابن ندیم نے آپ کی چار کتابوں کا نام لکھا ہے۔ "الفقہ الاکبر"۔ "عثمان البستی کے نام خط"۔ "العالم والمتعلم"۔ "الرد علی القدریہ"۔ "مسند" جو خوارزمی نے مرتب کی۔ اس کا ذکر "الفہرست" میں نہیں ہے۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد میں سے آپ کے بیٹے حماد اور پوتے اسماعیل نے جو قاضی بصرہ اور قاضی رقہ تھے (متوفی ۲۱۲ھ/۸۲۷ء) فقہ اسلامی میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ آپ کے اہم ترین شاگردوں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔ زفر بن الہذیل (متوفی ۱۵۸ھ/۷۷۵ء)، داؤد الطائی (متوفی ۱۶۵ھ/۷۸۱ء) ابویوسف، ابومطیع، الشیبانی، اسد بن عمرو (متوفی ۱۹۰ھ/۸۰۶ء) اور حسن بن زیاد لولوی (متوفی ۲۰۴ھ/۸۱۹ء) محدثین میں سے عبداللہ بن المبارک (متوفی ۱۸۱ھ/۷۹۷ء) امام اعظمؒ کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

خلافت عباسیہ میں [illegible] میں فتاوی ابی حنیفہؒ سارے [illegible] کے سیلاب بدتمیزی کے بعد جو خاندان برسر اقتدار آئے [illegible] سلجوقی، محمود غزنوی، جس کی فقہ حنفی پر کتاب "التفرید" [illegible] زنگی، مصر کے چرکسی، ہندوستان کے آل تیمور سب حنفی المذہب تھے [illegible] زیب کے عہد کی فتاوی عالمگیری "فقہ حنفی کی عمدہ کتاب ہے۔ سب سے آخر میں ترکی کے خلفا جن کی خلافت ۶۲۵ برس تک رہی عموماً امام اعظم کے مسلک پر تھے موجودہ افغانستان کی حکومت اور عوام حنفی المذہب ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اکثریت حنفیوں کی ہے۔

ابوحنیفۃ الدّینوری (دیکھیے: "دینوری، ابوحنیفہ")

ابوحیان التوحیدی

علی بن محمد بن العباس (غالباً التوحیدی کی نسبت توحید سے ہے جو کھجور کی ایک قسم ہے) امام تصوف، ادیب، فلسفی، فقیہ اور مورخ ان کے والد بغداد میں "التوحید" کھجور بیچا کرتے تھے۔ آپ ۳۱۰ھ اور ۳۲۰ھ (۹۲۲ء اور ۹۳۲ء) کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے۔ بہرحال چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں آپ نیشاپور، شیراز، واسط یا بغداد میں کہیں پیدا ہوئے۔ البتہ بغداد میں تعلیم پائی۔ نحو الصیرافی اور الرمانی سے پڑھا۔ شافعی فقہ قاضی ابوحامد المروالروذی سے اور حدیث ابوبکر الشاشیؒ سے پڑھی۔ علاوہ ازیں صوفی مشائخ کی صحبت سے بھی فیض پایا۔ پیشہ کتابت ان کا ذریعہ معاش تھا۔

یہ رے کے وزیر ابوالفتح بن العمید کے پاس قسمت آزمائی کے لیے پہنچے اور اس کے نام ایک پر تکلف خط بھی لکھا۔ لیکن اس وزیر کے خلاف ایک معاندانہ جذبات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ۹۷۰ء سے ابن عباد نے نقل نویس کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ یہاں بھی یہ کامیاب نہ رہے۔ جس کی بڑی وجہ یقیناً ان کے کردار کی ناسازگاری اور ان کا احساس برتری تھا۔ مثلاً انھوں نے اپنے آقا کے مکتوبات کے ضخیم مجموعے کو نقل کرنے میں "اپنا وقت ضائع کرنے" سے انکار کر دیا اور بالآخر انھیں برطرف کر دیا گیا۔ انھیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ بدسلوکی کی جا رہی ہے۔ اور اس کا انتقام انھوں نے ایک رسالہ "ذم یا مثالب یا اخلاق الوزیرین" لکھ کر لیا۔ جس میں ابوالفتح ابن العمید اور ابن العباد دونوں کی تضحیک کی گئی ہے۔

۹۶۱ء سے ۹۷۵ء کے دوران میں انھوں نے اپنی ادبی منتخبات کی کتاب "البصائر القدماء" جو دس جلدوں میں ہے تالیف کی جسے "البصائر والذخائر" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جلدیں آج بھی کتب خانہ استنبول میں موجود ہیں۔ یہ ۹۸۰ء کا واقعہ ہے کہ انھوں نے ابن مسکویہ ([illegible]) کو وہ سوالات بھیجے جن کا جواب اس نے اپنی کتاب "الہوامل والشوامل" میں دیا۔

۹۸۱ء میں جب یہ بغداد میں واپس آئے تو زید بن رفاعہ [illegible] الجوزجانی ریاضی دان نے ان کی سفارش عبدالرحمان بن احمد بن سعدان سے کی [illegible] سیاہ ہونے کی وجہ سے العارض بھی کہلاتا تھا۔ ابن سعدان [illegible]

Marfat.com

[illegible] المقابسات [illegible] مطبوعہ مصر ۱۳۴۳ھ) لکھنا شروع کی [illegible] کو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس دوران میں آپ ایک ایسے شخص کے پاس مسلسل جاتے رہے جو ان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔ یہ ابوسلیمان المنطقی تھے جنھیں یہ فلسفیانہ مسائل میں بالخصوص اور ہر نوعیت کے موضوع پر بالعموم سب سے بڑی سند اور حجت سمجھتے تھے۔ ابن سعدان کو صمصام الدولہ نے ۹۸۳ء میں اپنا وزیر بنایا تھا۔ ابن حیان اس وزیر کا حاضر باش درباری تھا اور اس کی شام کے وقت کی مجالس میں داخل ہوا کرتا تھا۔ جہاں انھیں لسانیات، ادب، فلسفہ اور درباری اور ادبی موضوعات پر وزیر کے بہت ہی متفرق سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ یہ اکثر موضوع زیر بحث پر ابوسلیمان کے افکار و خیالات بیان کردیا کرتے تھے

۹۸۵ء میں ابن سعدان معتوب ہوکر قتل کردیا گیا اور اب بظاہر ابوحیان بغیر کسی سرپرست کے رہ گیا۔ یہیں ان کی زندگی کے آخر دور کے حالات بہت کم معلوم ہیں لیکن بظاہر یہی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے آخری ایام مفلسی میں گذارے۔ انھی آخری سالوں میں انھوں نے اپنی کتاب "المقابسات" مرتب کی تھی۔ جو مختلف فلسفیانہ موضوعات پر ۱۰۶ مکالموں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ بمبئی میں ۱۸۰۹ء اور ایک نسخہ قاہرہ میں ۱۹۲۹ء میں طبع ہوا تھا۔

ان مکالموں میں بھی بڑا مقرر ابوسلیمان ہی ہے۔ لیکن ان میں بغداد کے فلسفیانہ حلقوں کے باقی سب ارکان بھی سامنے آتے ہیں۔ "المقابسات" اور "الامتاع والمؤانسة" کتابیں اس دور کی حیات فکری کے متعلق وسیع معلومات کے ذخیرے ہیں۔ اور علمائے بغداد کے افکار و عقائد کو از سر نو مرتب کرنے کے لئے بہت بیش قیمت ثابت ہوسکتی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ابوحیان نے اپنی کتابیں نذر آتش کردیں اس کی وجہ انھوں نے وہ کس مپرسی بتائی ہے جس میں آخری بیس برس انھوں نے بسر کئے قبرستان شیراز کی ایک گائیڈ بک میں درج ہے کہ ابوحیان کی قبر شیراز کے قبرستان میں ہے اور اس میں ان کی تاریخ وفات ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء درج ہے۔

ابوخطاب اسدی

محمد بن ابی زینب، رفض اور بدعت کا بانی، کوفے کا رہنے والا تھا۔ امام جعفر صادقؑ کے بڑے داعیوں میں سے ایک تھا۔ مگر گمراہ ہوکر کاذب عقائد کی تلقین کرنے لگا۔ نتیجۃً امام نے اس سے قطع تعلق کرلیا۔ کوفہ کے والی عیسیٰ ابن موسیٰ کے حکم پر اسے گرفتار کیا گیا۔ اس کے ستر پیروکار اس ہنگامے میں مارے گئے۔ اسے بھی سولی پر لٹکا کر اس کا سر خلیفہ منصور کے دربار میں بھیجا گیا۔ اسے ماننے والے نصیری کہلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیعوں کا اسماعیلی فرقہ اسی کی تعلیمات کی بنا پر ظہور میں آیا۔ مگر فاطمی دور کی اکثر تحریروں میں اس کی مذمت ہی کی گئی ہے۔

ابوخطاب معافری

عبدالاعلیٰ ابن السمح، اباضیوں کا پہلا منتخب امام یہ ان پانچ مبلغین میں سے ایک تھا، جسے اباضیوں کے پیشوا ابو عبیدہ نے المغرب بھیجا تھا۔ (دیکھئے "اباضیہ")، وہاں طرابلس میں اباضیوں نے ۷۵۷ء میں اسے اپنا امام منتخب کرلیا۔

ابوخطاب نے طرابلس کا سارا ملک فتح کرلیا اور بعد ازاں اسی شہر میں رہنے لگا۔ اس کی فتوحات کے پیش نظر افریقہ میں اباضی سلطنت قائم ہوگئی۔ مصر کے حاکم ابن الاشعث [illegible] اباضی سلطنت پر حملہ کیا۔ ابوخطاب مقابلے کے لئے نکلا مگر اپنے چودہ ہزار ساتھیوں سمیت مارا گیا اور ابن الاشعث نے قیروان پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

ابوخطار

حسام بن ضرار کلبی، اندلس کا والی، وہاں اس کا استقبال ہر طبقۂ فکر اور ہر گروہ نے کیا۔ اس نے قرطبہ پہنچتے ہی سب سے پہلے بربر قبائل کو رہا کیا۔ بعد ازاں کئی معزز ین کو مختلف حیلوں بہانوں سے جلا وطن کردیا۔ اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ نو آور شامیوں کا تھا۔ ابوالخطار نے انھیں جلا وطن کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور انھیں اندلس کے مختلف شہروں میں آباد کردیا۔ اس حکمت عملی کی بنا پر اندلس میں امن و امان کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں ابوخطار نے غیر جانبداری کے ساتھ حکومت کرنا چاہی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک فیصلے میں کسی یمانی کی طرفداری کرنے کی بنا پر اس کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں نے ثوابہ بن سلمہ کو نیا امیر نامزد کردیا۔ دونوں امیروں کی فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ادھر امیہ بن عبدالملک نے بھی حملہ کردیا۔ چنانچہ ابوخطار نے شکست کھائی اور ثوابہ امیر اندلس نامزد ہوگیا۔

ابوداؤدؒ، امام

(۲۰۲ھ/۸۱۷ء ـ ۲۷۵ھ/۸۸۹ء) سلیمانؒ ابن الاشعث مشہور محدث تھے۔ آپ نے تحصیل علم کے لئے دور دراز کے سفر کئے اور علم و تقوےٰ کے باعث شہرت پائی۔ بالآخر آپ نے بصرہ میں سکونت اختیار کرلی اس وجہ سے بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی نسبت ایک گاؤں سجستان سے ہے۔ جو بصرے کے قریب واقع ہے، نہ کہ ولایت سجستان سے۔

آپ کی اہم کتاب "سنن ابوداؤد" ہے جو صحاح ستہ کی تیسری کتاب ہے۔ امام موصوف نے اسے پانچ لاکھ احادیث سے انتخاب اور اقتباس فرمایا اور نہایت تحقیق تدقیق کے بعد ان میں سے صرف ۴۸۰۰ احادیث لے کر اپنی اس کتاب میں درج فرمائیں کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی یہ کتاب امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں پیش کی اور انھوں نے اسے پسند فرمایا۔ ابن داسہ کہتا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے یہ کتاب پانچ لاکھ روایتوں کے طومار میں سے چن کر مرتب کی تھی۔ اور اس کتاب میں بقول امام موصوف انھوں نے ایسی احادیث درج کیں جو صحیح ہیں یا بظاہر صحیح ہیں یا صحیح احادیث کے قریب ہیں۔

امام ابوداؤدؒ نے یہ بھی فرمایا تھا۔ "میں نے اپنی کتاب میں ان احادیث کی وضاحت کردی ہے جو بہت ضعیف ہیں اور جن کے بارے میں میں نے کچھ نہیں لکھا، وہ اچھی وصالح ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض دوسروں کی نسبت زیادہ مستند ہیں" یہ قول ان حواشی کے متعلق ہے جن میں آپ نے احادیث کے متعلق اپنی رائے دی ہے امام مسلمؒ حجاج القشیری نیشاپوری نے اپنی تالیف "صحیح مسلم" کے آغاز میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں جرح و تعدیل کے عام مسائل پر بحث کی ہے۔ لیکن امام ابوداؤدؒ پہلے محدث ہیں جنھوں نے ایسے مفصل حواشی لکھے ہیں جن سے آپ کے شاگرد ترمذیؒ کے لئے ان احادیث پر فرداً فرداً زیادہ منظم طریقے پر نقد و تبصرے کا راستہ کھل گیا جو انھوں نے اپنی جامع میں درج کئے ہیں۔

امام داؤدؒ بعض ایسے راویوں سے بھی احادیث نقل کرتے ہیں جن کا ذکر صحیحین میں نہیں ملتا۔ کیونکہ ان کا اصول یہ ہے کہ تمام ایسے راویوں کو ثقہ سمجھنا چاہیئے جن کے غیر ثقہ ہونے کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہیں۔ آپ کی تالیف میں زیادہ تر معزز، مباح اور ممنوع چیزوں کا ذکر ہے اور اسے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ابوسعید بن الاعرابی فرماتے ہیں "جو شخص قرآن اور سنن ابوداؤدؒ کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتا، وہ بھی ایک

Marfat.com

بڑا عالم ہے۔" محمد بن مخلد کہتے ہیں۔ "محدثین سنن ابوداؤدؒ کو اسی طرح بلا چون وچرا مانتے ہیں جس طرح قرآن کو۔"

ابوداؤد الطیالسیؒ (۱۳۳ھ/۷۵۰ء-۲۰۴ھ/۸۱۹ء) سلیمان داؤد ابن الجارود بصری مشہور محدث، ایرانی الاصل تھے۔ لیکن بصرے میں سکونت پذیر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی طرف منسوب "مسند" ان کی اپنی مرتبہ نہیں ہے۔ بلکہ خراسانیوں میں سے کسی نے اس میں وہ احادیث جمع کی تھیں جو امام موصوف سے یوسف بن حبیب نے بیان کی ہیں۔ "کشف الظنون" کا یہ قول کہ "سب سے پہلی مسند انہوں نے مرتب کی۔" درست نہیں ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ الطیالسیؒ کی اور مرویات بھی ہیں۔ روایت ہے کہ ان میں سے چالیس ہزار احادیث اصفہانیوں نے لکھی تھیں۔ امام موصوف کی یہ مسند کتب احادیث کے تیسرے طبقے میں شمار ہوتی ہے۔ یہ تیسرا طبقہ اُن جوامع اور مصنفات کا ہے جو امام بخاری اور امام مسلم کے زمانے سے قبل یا بعد میں تصنیف ہوئیں۔ اور وہ صحیح، حسن، ضعیف، معروف، غریب، شاذ، خطا وصواب اور ثابت ومقلوب ہر نوع کی احادیث پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ ان سے اجنبیت مطلقہ زائل ہو گئی ہے تاہم علمائے دین میں ان کی شہرت ومقبولیت ویسی نہیں ہو سکی جیسی کہ طبقہ اولی اور ثانیہ کی کتابوں کی ہوئی ہے۔ ان میں مختلف معیار کی کتابیں ہیں۔ بعض کتابیں بعض سے زیادہ قوی ہیں۔ ان کتابوں کے کچھ نام درج ہیں۔ مسند امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) سنن ابن ماجہؒ (متوفی ۲۷۳ھ) مسند دارمی (متوفی ۲۵۵ھ) مسند ابویعلی موصلی (متوفی ۳۰۷ھ) مصنف عبدالرزاق (متوفی ۲۱۱ھ) مصنف ابن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) مسند عبد بن حمید (متوفی ۲۴۹ھ) مسند ابوداؤد طیالسی (متوفی ۲۰۴ھ) سنن دارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) صحیح ابن حبان (متوفی ۳۵۴ھ) مستدرک حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) کتب بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) کتب طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) اور تصنیفات طبرانی (متوفی ۳۶۰ھ)۔

ابودجانہؓ آنحضرتؐ کے جاں نثار صحابی۔ سماک نام تھا۔ قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ ہجرت سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس کے بعد ہر غزوہ میں شرکت کی۔ خصوصاً اُحد کے میدان میں بے مثل شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ نبی کریم صلعم نے اس میدان کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی شمشیر کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا "کون ہے جو یہ شمشیر لے اور پھر اس کا حق بھی ادا کرے؟" یہ شمشیر ابودجانہؓ کے سپرد ہوئی۔ انھوں نے سر پر سرخ پٹی باندھی اور میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے لگے۔ چند مسلمانوں کی غلطی سے جب جنگ کا پانسہ پلٹا اور آنحضورؐ دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے۔ اس وقت جن چند جاں نثاروں نے آپؐ کی حفاظت کی، ان میں ابودجانہ بھی شامل تھے۔ جو تیر آنحضورؐ کی طرف آتا تھا، اس کا ہدف ان کا جسم بنتا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں جب لشکر اسلام خالد بن ولید کی قیادت میں مسیلمہ کذاب سے نبرد آزما ہوا تو ابودجانہؓ بھی ساتھ تھے۔ مسلمانوں کے بے پناہ جوش اور حملے کی تاب نہ لاکر مسیلمہ کذاب مع فوج کے ایک باغ میں گھس گیا۔ جس کے گرداگرد فصیل کھنچی ہوئی تھی اور دروازہ بند کر لیا۔ باغ میں داخل ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ابودجانہ نے کہا کہ مجھے اٹھا کر باغ میں پھینک دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ گرنے پر گو آپ کا پاؤں ٹوٹ گیا، مگر آپ نے دروازہ کھول دیا اور اسلامی فوج باغ میں داخل ہو گئی۔ مسیلمہ کذاب مارا گیا۔ اسلامی لشکر کو فتح ہوئی۔ مگر ابودجانہؓ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

ابوذر غفاریؓ نبی کریم صلعم نے [illegible] کیا جاتا ہے قبول اسلام [illegible] انہیں جب حضرت محمد صلعم کی بعثت کی خبر ملی [illegible] اسلام [illegible] خندق تک آپ اپنے قبیلہ میں رہے۔ اس کے بعد [illegible] تبوک کے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں آپ شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں آپ کو امراء کا طرز زندگی پسند نہ آیا۔ آپ کی تنقید سے امیر معاویہؓ بھی نہ بچ سکے۔ حضرت عثمانؓ کو اس امر کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپ کو مدینہ واپس بلا لیا۔ یہیں ذی قعدہ ۳۲ھ/جون ۶۵۲ء میں انتقال فرمایا۔

حضرت ابوذر غفاری ایک بہت بڑے زاہد اور صاحب کشف وحال تھے۔ طبیعت میں حلم اور انکساری تھی۔ نہایت عالم فاضل شخص تھے۔ ان سے ۲۸۱ احادیث کی روایت کی جاتی ہے۔ دولت اور اس کی تقسیم کے بارے میں ان کے نظریات کی طرف آج کل خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

ابوذؤیب الہذلی (دیکھیے "خویلد بن خالد")

ابورافعؓ اسلم نام تھا۔ حضرت عباس کے غلام تھے۔ بعد میں انھیں آنحضورؐ کے سپرد کر دیا گیا۔ حضرت عباس کے قبول اسلام پر انھیں آزاد کر دیا گیا تو رونے لگے۔ لوگوں نے کہا "یہ تو خوشی کا مقام ہے، تم رو رہے ہو۔" کہا "میں اس لیے رو رہا ہوں کہ آج میں قرب نبوت سے محروم ہو گیا ہوں۔" چنانچہ اس کے بعد بھی آستانہ نبوت کو نہ چھوڑا اور اسی طرح خدمت کرتے رہے۔ حضور کا خیمہ یہی نصب کرتے تھے۔ جنگ بدر کے بعد ابورافع مدینہ چلے آئے اور احد اور خندق وغیرہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ حضرت علیؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں فوت ہوئے۔ ان سے ۶۸ حدیثیں مروی ہیں۔

ابورغال ایک شخص، جس کی قبر پر مکہ میں پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ (دیکھیے "جمرہ") طبری اور احمدؒ بن حنبل کی روایت کے مطابق ابورغال قوم ثمود کا وہ واحد شخص تھا، جو ہلاک ہونے سے بچ گیا۔ ثمود کی تباہی کے وقت وہ مکہ میں موجود تھا۔ الاغانی کی ایک روایت کے مطابق یہ شخص طائف کے قبیلے بنو ثقیف کا جد امجد بیان کیا گیا ہے۔ الجاحظ اور المسعودی نے اسے بنو ثقیف کا مخالف قرار دیا ہے، جسے بنو ثقیف نے قتل کر دیا تھا۔ وہ کوئی بھی شخص تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ابرہہ کی مکہ کی جانب رہنمائی کی تھی۔ اسی لیے اب اس کی قبر پر پتھر مارے جاتے ہیں۔

ابوزیان تلمسان کے حکمران خاندان عبدالواد کے تین حکمران، جو تاریخ میں مشہور ہیں۔ ابوزیان اول (۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء - ۲۱ شوال ۷۰۷ھ/۱۴ اپریل ۱۳۰۸ء) کی بادشاہت کا آغاز ۲ ذی قعدہ ۷۰۳ھ/۶ رجب ۱۳۰۴ء سے ہوا۔ نام محمد بن ابی سعید عثمان بن یغمراسن تھا۔ اس نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اپنے دارالحکومت پر سے مرینی فوج کا محاصرہ اٹھا دیا۔

ابوزیان ثانی (قتل ۸۰۱ھ/۱۳۹۸ء) ابوحمو ثانی کا بیٹا تھا، جو باپ کی زندگی میں الجزائر کا والی تھا۔ محرم ۷۹۶ھ/نومبر ۱۳۹۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بھائی [illegible] عبداللہ نے پانچ ہی برس بعد اسے بے دخل کر کے [illegible]

ابوزیان ثالث، آخری سے پہلا حکمران تھا۔ [illegible]

Marfat.com

... ابو عبداللہ ... شکست کھائی، جس پر ابوزیان کے ... حاصل کرنا آسان ہوگیا۔ اس نے ۱۳ ذی قعدہ ۹۲۹ھ / ۲۷ مارچ ۱۵۴۳ء ... اپنی وفات ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء تک تلمسان پر حکومت کی۔

ابوزید بلخی مشہور مسلمان جغرافیہ دان۔ (دیکھیے "بلخی، ابوزید")

ابوسرایا ایک شیعہ باغی (دیکھیے "ابوالسرایا")

ابوسعود (۱۷ صفر ۸۹۶ھ / ۳۰ دسمبر ۱۴۹۰ء۔ ۵ جمادی الاوّل ۹۸۲ھ / ۲۳ اگست ۱۵۷۴ء) محمد بن محی الدین محمد بن العماد، خواجہ چلپی، مشہور مفسر اور شیخ الاسلام قسطنطنیہ کے قریب پیدا ہوئے۔ سلطان محمد ثانی کے آٹھ مدرسوں میں سے ایک میں، مدرس تھے۔ بروسہ، استنبول اور رومیلیہ میں قاضی رہے۔ ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء میں سلطان سلیمان اوّل نے انھیں مفتی اعظم بنا دیا۔ بقیہ زندگی انھوں نے اسی عہدے پر گزاری۔ وفات کے بعد استنبول میں ابوایوب انصاری کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

ابوسعود نے جو سب سے بڑا کام انجام دیا، وہ قانون کو شریعت اسلامی کے مطابق کرنا تھا۔ اس میں وہ خاصے کامیاب رہے اگرچہ وہ انتہا پسند صوفیوں کے خلاف قتل کا فتوے بھی دے دیتے تھے مگر راسخ العقیدہ صوفیاء کی قدردانی بھی کرتے تھے۔ ان کی تفسیر، جو زیادہ تر البیضاوی سے ماخوذ ہے۔ "ارشاد العقل السلیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی کئی شرحیں کی گئیں اور یہ متعدد بار طبع ہوئی۔

ابوسعید ابوالخیر (دیکھیے "ابوسعید فضل اللہ")

ابوسعید فضل اللہ (یکم محرم ۳۵۷ھ / ۷ دسمبر ۹۶۷ء۔ ۴ شعبان ۴۴۰ھ / ۲۲ جنوری ۱۰۴۹ء) ایران کے مشہور صوفی خراسان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ابوالخیر تھا، جو دوا فروش تھے۔ ابوسعید نے طریقت کا پہلا سبق ابوالقاسم بشر یاسین سے لیا، جو شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے ابوسعید کو بھی شاعری کی طرف راغب کیا۔ جوان ہونے پر آپ مرو میں عبداللہ حضری اور ابوبکر قفال کے درس میں شریک ہوئے۔ یہاں سے شافعی مذہب میں تکمیل کرنے کے بعد تفسیر، حدیث اور عقائد کی تعلیم کے لیے سرخس میں ابوعلی ظاہر کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ابوسعید مشہور صوفی ابوالفضل محمد بن حسن السرخسی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ ان کے حکم پر ایک اور بزرگ السلمی سے خرقہ حاصل کیا۔ ابوالعباس القصاب نے بھی انھیں خرقہ عطا کیا۔

علوم باطنیہ کی تکمیل کے بعد ابوسعید میہانہ لوٹ آئے اور بقیہ عمر نفس کشی اور زہد و طہارت میں گزاری۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں سنتِ رسولؐ کی پیروی کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتے رہے۔ چالیس سال تک زہد و ریاضت میں مصروف رہنے کے دوران میں ان پر خدمت درویشاں کی اہمیت منکشف ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے مسجدوں میں جھاڑو دینے، فقیروں کی خدمت کرنے اور غریبوں کی مدد کرنے کو اپنی زندگی کا نمایاں کارنامہ بنالیا۔ ان کا خاص ملکہ کشف قلوب تھا۔ اس کے ذریعے دشمنوں تک کے دلوں کے مخفی محرکات ان پر منکشف ہو جاتے۔ مریدوں کی ضیافتیں بڑے پرتکلف انداز میں کرتے تھے، اس لیے اکثر اوقات مقروض رہتے۔ تاہم انھوں نے اپنی ذات پر کبھی خرچ نہ کیا اور نہ ہی کوئی جائداد بنانے کی کوشش کی۔

ابوسعید سماع اور شاعری کے بے حد دلدادہ تھے۔ اکثر اوقات وجد کی حالت میں آکر کپڑے پھاڑ دیا کرتے تھے۔ منصور حلاج کی طرح وہ بھی حقیقت الٰہیات سے واقف تھے، مگر سوائے اس کے کہ "اس جبّے کے اندر اللہ ہے" سے زیادہ کچھ بھی زبان سے نہ نکالا۔ ابن سینا نے بھی شیخ ابوسعید سے ملاقات کی۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔

ابوسعید نے اپنی زیادہ تر زندگی قصبہ میہانہ میں گزاری، اس لئے میہنوی کہلائے۔ انھوں نے اپنے پیچھے پس ماندگان کی ایک بہت بڑی تعداد چھوڑی، جنھوں نے تقریباً ایک صدی تک مزار کی دیکھ بھال کی۔

شیخ ابوسعید کے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔

شعر: بزیر قبۂ تقدیس مست مستانند — کہ ہر چہ ہست ہمہ صورت خدا دانند

رباعی:
مجنوں تو کہ راز صحرا نشناخت،
دیوانۂ عشق تو سراپا نشناخت
ہر کس بتو رہ یافت ز خود گم گردید
آنکس کہ ترا شناخت خود را نشناخت

ابوسعید مجدّدی (وفات ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۱ء) ہندوستان کے صوفی اور صاحب کرامت بزرگ۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت شیخ سیف الدین کے واسطہ سے حضرت خواجہ محمد معصومؒ و حضرت امام ربانی سے ملتا ہے۔ ابتدائے عمر ہی سے طبیعت فقیری کی طرف مائل تھی۔ دس برس کی عمر ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ علوم ظاہری فقہ اور حدیث میں بھی کمال حاصل کیا۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے بھی فیض پایا۔ باطنی علوم کے لیے حضرت درگاہی شاہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور غلام علی شاہؒ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ پندرہ برس تک غلام علی شاہ کی خدمت میں رہے اور ان کے بعد خانقاہ مجددیہ میں ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ جب حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے تو وہاں کئی بزرگانِ دین سے ملے۔ واپسی پر ریاست ٹونک کے نواب نے اپنے پاس بلا لیا۔ وہیں بیمار ہوئے اور انتقال کیا۔ لحد مبارک دہلی میں حضرت غلام علیؒ کی خانقاہ میں بنائی گئی۔

ابوسفیان تاریخ اسلام میں مشہور تین اشخاص، جن میں سے ایک زمانہ قبل از اسلام میں جبل الرزادیہ میں البارہ کا بادشاہ تھا۔ یہاں ایک قلعہ بھی ابوسفیان کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اسے قتل کر دیا تو سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا۔

ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب حضرت رسول اکرمؐ کے چچا زاد بھائی تھے نام مغیرہ تھا۔ انھیں عام طور پر ابوسفیان بن حرب بن امیہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے، جو فتح مکہ تک بڑے دشمن اسلام رہے۔ ابوسفیان بن حارث بھی فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے غزوہ حنین و طائف میں شریک رہے۔ ۲۰ھ / ۶۴۱ء کو فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

ابوسفیان بن حرب، قریش کے کنبے "عبدشمس" کے ایک رکن تھے۔ ان کا نام صخر تھا اور ولادت عام الفیل سے دس سال قبل مکہ میں ہوئی۔ اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے مگر ان کے دل پر اسلام کی حقانیت واضح ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ ان کی مخالفت اتنی شدید نہ رہی جتنی کہ ابوجہل کی تھی۔ ابوسفیان ابوجہل اور اخنس کے بارے میں ایک

Marfat.com

واقعہ مشہور ہے کہ ایک رات ان تینوں نے آنحضرت صلعم کے دولت خانے کا رخ کیا۔ تینوں ایک دوسرے سے بے خبر تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر آنحضورؐ کی تعلیم ہے کیا؟ رات کا بیشتر حصہ ان کے کانوں میں قرآن مجید کی تلاوت کی آواز آتی رہی صبح سویرے تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وعدہ کیا کہ آئندہ وہ ادھر نہیں آئیں گے مگر اگلے روز پھر کوئی نامعلوم ساجذبہ انہیں در مصطفیٰؐ پر لے آیا۔ اس روز بھی انھوں نے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کی۔ مگر تیسرے روز وہ پھر چلے آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا ان کے دلوں پر کتنا اثر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

قریش کے قافلوں کی قیادت اکثر اوقات خود ابوسفیان کرتے تھے۔ ۲ھ/۶۲۴ء میں ان کا قافلہ شام سے لوٹ رہا تھا کہ انھیں مدینہ سے مسلمانوں کے حملے کا خدشہ پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اہل مکہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس پر ابوجہل ایک ہزار کا لشکر لے کر وہاں پہنچا۔ ابوسفیان پرامن رہنا چاہتا تھا مگر ابوجہل کی ضد اہل مکہ پر جنگ بدر کی تباہی لانے کا موجب بنی۔ ابوسفیان کا بیٹا حنظلہ اسی جنگ میں مارا گیا اس کے بعد ابوسفیان نے جنگ احد اور جنگ خندق میں کفار کے لشکر کی قیادت کی صلح حدیبیہ کی تنسیخ پر اظہار ندامت کے لئے اہل مکہ نے ابوسفیان ہی کو مدینہ بھیجا تاکہ معاہدے کی تجدید کی جا سکے۔ مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ فتح مکہ کے وقت ابوسفیان نے مکہ سے باہر آ کر اطاعت قبول کر لی تھی، جس پر اعلان ہوا تھا کہ ابوسفیان کا گھر بھی جائے امن ہے۔

مسلمان ہونے کے بعد ابوسفیان نے غزوہ حنین اور محاصرہ طائف میں شرکت کی جس میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ طائف میں لات کا مشہور بت توڑنے میں بھی ابوسفیان شریک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۲ھ/۶۵۳ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۸ برس کی تھی۔ ان کا بیٹا یزید ایک مسلمان سپہ سالار تھا اس کی وفات ۱۸ھ/۶۳۹ء کے بعد ابوسفیان کے دوسرے بیٹے حضرت معاویہؓ بنو امیہ کے پہلے خلیفہ بنے۔ ان کا بیٹا یزید تھا جس کے ساتھ حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت کو کربلا کا اندوہناک واقعہ پیش آیا۔

ابوسلمہؓ عبداللہ بن عبدالاسد، صحابی رسول۔ ان کی والدہ حضرت برہؓ رسول پاک صلعم کی پھوپھی تھیں۔ ہجرت حبشہ سے پہلے اپنی اہلیہ ام سلمہؓ سمیت مسلمان ہوئے حبشہ میں دونوں بار ہجرت کی۔ واپس آ کر مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ غزوہ بدر اور احد میں حصہ لیا۔ جنگ احد میں بازو پر زخم آیا، جس کی بنا پر ۳ جمادی الثانی ۴ھ کو وفات پائی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی اہلیہ ام سلمہؓ آنحضور صلعم کے نکاح میں آئیں۔

ابوطالبؓ (۳۵ قبل ہجری/۵۴۰ء - ۳ قبل ہجری/۶۲۰ء) عبدمناف بن عبدالمطلب ہاشمی قریشی، حضرت علی کے والد اور آنحضور صلعم کے چچا تھے اپنے باپ عبدالمطلب کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت کا حق ادا کرتے رہے۔ جب آنحضور صلعم آٹھ سال کے تھے تو آپؐ کے دادا عبدالمطلب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اس وقت حضرت ابوطالبؓ ہی نے آپؐ کو اپنی سرپرستی میں لیا۔ اور تادم آخر کفالت کا حق پوری طرح ادا کیا۔ وہ آپؐ سے اپنے بچوں سے بھی زیادہ محبت کرتے تھے۔ محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ "ابوطالب عبدالمطلب کے سب سے بڑے بیٹے نہ تھے تاہم عبدالمطلب نے اپنی زندگی ہی میں نبی کریمؐ کی کفالت انھیں سونپ دی تھی۔ حارث سب سے بڑے تھے مگر صاحب ثروت و دولت نہ تھے۔ عباس کے پاس دولت تھی لیکن ان پر اس کی محبت غالب تھی یہی وجہ ہے کہ [illegible] عبدالمطلب کی [illegible] ابوطالب [illegible] کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو ابوطالب [illegible] کی صعوبتیں اس امر میں مانع تھیں لیکن پیارے بھتیجے کے اصرار [illegible] میں بصرے کے سفر پر انہیں ساتھ لے لیا۔

حضرت ابوطالب کو غالباً اس سفر تجارت میں کوئی منفعت نہیں ہوا، اس لئے دوبارہ انھوں نے قصد نہیں کیا اور مکہ کی محدود زندگی ہی میں محصور رہے۔ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آنحضورؐ کی نکاح کی بات چیت بھی ابوطالب ہی نے کی اور ان کے نکاح کا خطبہ بھی ابوطالب ہی نے پڑھا۔

بعثت کے بعد ابوطالب نے خود تو اسلام قبول نہ کیا، مگر اپنے بھتیجے کی حمایت کرتے اور ان کی حفاظت کے لئے آمادہ رہے۔ ان حالات میں سرداران قریش ابو سفیان کی معیت میں ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کی مذمت اور ہمارے دین پر اعتراض کرتا ہے۔ اسے سمجھا دیجیے کہ ہم سے تعرض نہ کرے یا پھر اسے ہمارے حوالے کر دیجیے ہم خود نبٹ لیں گے۔ اس پر ابوطالبؓ نے آنحضرت صلعم کا یہ جواب سن کر کہ "بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں تب بھی اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ابوطالب نے کہا "بھتیجے! جاؤ اور جس کام میں لگے ہوئے ہو اسے سرانجام دو۔ میں بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا" یہی جواب اہل قریش مکہ کو بھی ملا۔ اس پر قریش نے ابوطالب کے سماجی مقاطعے کا اعلان کر دیا اور یہ خاندان ابوقبیس کی پہاڑی کے ایک درے میں محصور ہو گئے۔ جو شعب ابی طالب کے نام سے موسوم ہے۔ پورے تین برس تک آپ اس میں بھوک اور مصائب برداشت کرتے رہے۔ بالآخر خود کفار ہی کی کوششوں سے یہ مقاطعہ ختم ہوا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ابوطالبؓ انتقال کر گئے۔ اس وقت حضرت رسول اکرمؐ ۴۹ برس ۸ ماہ کے تھے۔ حضرت مسیبؓ کی ایک روایت ہے کہ آخری وقت میں آنحضورؐ نے کہا کہ "چچا کلمہ پڑھ لیجیے" مگر ان کے آخری الفاظ یہ تھے "عبدالمطلب کے مذہب پر" ابن حجر کے نزدیک اگرچہ حضرت ابوطالبؓ کا اسلام ثابت نہیں مگر حضرت عباسؓ کی روایت کے مطابق آخرت میں ابوطالبؓ کی سزا دراصل میں امداد رسولؐ کی وجہ سے تخفیف ہے۔ شیعی مسلک کے مطابق ابوطالبؓ نے مسلمانوں کی موت پائی تھی شبلی نعمانی بھی اس مسلک کے حامی ہیں۔

ابوطالبؓ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ یہ مسلمان ہوئیں اور ان سے طالب، ام ہانی، عقیل، جعفر، جمانہ، علی اور ام طالب پیدا ہوئیں۔ دوسری بیوی سے طلیق پیدا ہوا۔

ابوطالبؓ شاعر اور خطیب کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ایک چھوٹا سا دیوان بھی ان سے منسوب ہے جو طبع ہو چکا ہے۔ اس میں چار سو اکیس اشعار ہیں جن کے ساتھ ایک لامیہ قصیدہ بھی شامل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قصیدہ آپ کا کلام نہ ہو۔

ابوطلحہؓ انصاری صحابی، زید نام تھا، خاندان نجار کی شاخ عمرو بن مالک سے تعلق رکھتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانی میں مسلمان ہوئے۔ غزوہ احد میں حضرت رسول اکرمؐ کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے اور تیر چلاتے رہے۔ غزوہ حنین میں بیس [illegible] کو قتل کیا۔ حدیث میں ان کی فضیلت مہمان نوازی کی [illegible] مہمان کو کھانا کھلایا مگر خود بہانے سے اندھیرے میں بیٹھے [illegible]

Marfat.com

سکے عثمان کے عہد میں حمص میں مقیم ہوگئے۔ ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔

ابوعباس السفاح پہلا عباسی خلیفہ (دیکھیے سفاح، ابوالعباس)

ابوعبداللہ امام امام محمد بن حسن ابوعبداللہ (دیکھیے محمد بن حسن، امام)

ابوعبسؓ بن جبیر عبدالرحمان بن جبیر، ممتاز صحابی، خاندان حارثہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ہجرت سے قبل اسلام لائے اور کعبہ کے بتوں کو توڑنے میں حصہ لیا۔ غزوۂ بدر کے وقت ۴۸ برس کے تھے۔ بڑھاپے میں ایک آنکھ کی بینائی کھو گئی تھی۔ جس پر آنحضور نے اپنا عصا مرحمت فرمایا، جس کے سہارے چل پھر لیا کرتے تھے۔ ۳۴ھ کو فوت ہوئے۔ حضرت عثمان نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کا شمار ممتاز صحابہ محدثین میں ہوتا ہے۔ عالم، فاضل اور صاحب روایت تھے۔

ابوعبید البکری عبداللہ بن عبدالعزیز بن محمد بن ایوب، پانچویں صدی ہجری گیارہویں صدی عیسوی کا مشہور مسلمان جغرافیہ دان، تیس برس کی عمر میں اپنے باپ کے ساتھ قرطبہ چلا گیا۔ یہاں تھوڑے ہی دنوں میں ادیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ یہاں اس نے اندلس میں المرابطون خاندان کی عسکری اور سیاسی مداخلت کو غور سے دیکھا۔ یہیں شوال ۴۸۷ھ/اکتوبر ۱۰۹۴ء میں انتقال کیا۔

البکری کو تقریباً تمام علوم میں مہارت حاصل تھی۔ مگر اسے شہرت صرف جغرافیہ دان ہونے کی حیثیت سے ملی۔ اس کے علاوہ وہ الٰہیات اور نباتیات وغیرہ کا بھی عمدہ ذوق رکھتا تھا۔

ابوعبید کی جغرافیائی تصانیف صرف دو ہیں۔ ایک "معجم ما استعجم" اور دوسری "المسالک والممالک" ان میں سے پہلی کتاب زیادہ تر ایک فہرست کی حیثیت رکھتی ہے دوسری کتاب، جس کا ابھی ایک ہی حصہ دستیاب ہوا ہے، عام جغرافیے اور مسلم قومیت پر بحث کرتی ہے، اس میں مختلف مقامات کی سیاحتی معلومات درج ہیں۔

الٰہیات میں اس کے نام ایک کتاب منسوب ہے، جو پیغمبر اسلام کی رسالت کی نشانیوں کو بیان کرتی ہے اور نباتیات میں اس کی کتاب "النبات" اہم ہے اس سے ابن بیطار نے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔

ابوعبیدہؓ (۔۔ ۱۸ھ/۶۳۹ء) عامر بن عبداللہ بن جراح، صحابی و سپہ سالار ابتدا ہی میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ آنحضرت نے انھیں امین الامت کا لقب دیا تھا۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ مکہ میں کفار کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرنے کے بعد جب مدینہ ہجرت فرمائی تو حضرت کلثوم بن ہدم کے ہاں قیام فرمایا۔ تقریباً تمام غزوات میں شرکت کی۔

عہد رسالت ہی میں ابوعبیدہؓ مختلف سرایا کے سپہ سالار بنے۔ صلح حدیبیہ میں بطور گواہ دستخط کیے۔ غزوہ الفتح میں فوج کے ایک حصے کی قیادت ان کے سپرد تھی۔ آنحضورؐ انھیں مختلف جگہوں پر صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ نجران اور بحرین میں اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے۔ خلافت کے سوال پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی پیش کیا تھا۔ اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمر کے ساتھ آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایران اور شام کے محاذ پر اسلامی لشکر کی قیادت ابوعبیدہ ہی کے سپرد ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں خالد بن ولید کی جگہ شام کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا۔ ان کے کارناموں میں دمشق، حلب، حمص، حماۃ اور لاذقیہ کی فتح اہم ہے

حضرت ابوعبیدہ حمص میں تھے کہ انھیں ہرقل روم کے حملے کی اطلاع ملی چنانچہ آپ دمشق روانہ ہوئے۔ چونکہ جزیرہ حمص کی حفاظت نہیں کی جاسکتی تھی، اس لئے ابوعبیدہؓ نے جزیے کی ساری رقم اہل حمص کو واپس کر دی۔ اس کے بعد ہر کوئی جانتا ہے کہ جنگ یرموک میں ہرقل نے شکست کھائی اور شام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گیا۔

یرموک اور اس کے بعد انطاکیہ فتح کے بعد ابوعبیدہ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوگئے اس قبلہ اوّل کو حضرت عمرؓ کے آنے پر مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ھ میں عیسائیوں نے حمص پر دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ یہ آخری معرکہ تھا، جو حضرت ابوعبیدہؓ نے انجام دیا۔

۱۸ھ میں شام میں طاعون کی وبا پھیلی۔ حضرت عمر کے کہنے کے باوجود حضرت ابو عبیدہؓ وہاں سے نہ نکلے اور بالآخر اسی مرض کی لپیٹ میں آگئے۔ اور اسی میں بعمر ۵۸ برس انتقال کیا۔ ان کی قبر کے بارے میں صحیح معلومات موجود نہیں۔ شاید دمشق ہی میں دفن ہوئے۔

حضرت ابوعبیدہؓ صف اوّل کے صحابہ میں شامل تھے۔ انھیں مہاجرین اور انصار دونوں میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ زبردست سیاسی اور جنگی سوجھ بوجھ کے حامل تھے۔ اس لیے دونوں ابتدائی خلفاء نے ان کی صلاحیتوں سے کما حقہ فائدہ اٹھایا۔

فوجی اور انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ابوعبیدہؓ اسلام کی اشاعت اور تربیت الناس سے بھی غافل نہیں رہے۔ تقویٰ، سادگی، زہد اور انکسار، شجاعت اور ہمت کیساتھ ساتھ ان میں بے حد نمایاں تھا۔ اطاعت اللہ اور اتباع رسولؐ میں ہمیشہ پیش پیش رہے

ابوعثمان سعید (وفات ۲۷۳ھ/۹۰۲ء) ابوعثمان سعید بن اسلام مغربی، مشہور صوفی ولی کامل، شیخ ابوالحسن صائغ دینوری کے مرید اور شیخ ابوعلی کاتب کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ شروع میں بے حد دولت مند تھے۔ "انوار اصفیا" کے مطابق ایک کتے کی وفاداری دیکھ کر دنیاداری چھوڑ دی اور مجاہدہ شروع کر دیا۔ کامل تیس برس عبادت ریاضت کے بعد مکہ معظمہ کا قصد کیا۔ وہاں رہ کر مجاوری بھی کی اور حبیب مغربی اور ابو یعقوب نہرجوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ وہاں سے نیشاپور واپس آئے اور وہیں انتقال کیا۔ ابوعثمان حیری اور ابوعثمان لعنی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوعمرو ابراہیم زجاجی آپ کے مرید تھے۔

ابوعثمان سعید کے نزدیک تصوف علائق دنیاوی کو منقطع کرنا ہے۔ اس راہ میں صرف دو باتیں راہنمائی کرتی ہیں، نبوت اور حدیث نبوت۔ نبوت تو ختم ہوگئی حدیث نبوت باقی ہے اور مجاہدہ کا راستہ کھلا ہے۔ آپ کے نزدیک صوفی کے لیے لازم ہے کہ محنت و مشقت سے اپنے لیے رزق حلال پیدا کرے تاکہ امیروں سے رجوع کرے کیونکہ جو درویش امیروں سے رجوع کرتا ہے، اسے فلاح نہیں۔

ابوعلی رودباری رحؒ (وفات ۳۲۱ھ/۹۳۳ء) ابوعلی احمد بن محمد رودباری صوفی، محدث، فقیہ اور ادیب، شیخ جنید بغدادیؒ کے مرید اور "اخبار الصالحین" کے مطابق اپنے وقت کے امام، اپنی قوم کے سردار اور

Marfat.com

حضرت ابوعبداللہ رودباریؒ کے ماموں تھے، شیخ ابوعلی کاتب کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص میں ابوعلی رودباری سے زیادہ علم شریعت و حقیقت کو جمع نہیں دیکھا آپ بغداد سے مصر گئے اور وہیں وفات پائی۔ نزع کے وقت ایک شعر وردِ زبان تھا۔ "تیرے حق کی قسم جب تک تجھے دیکھتا رہوں گا تیرے سوا کسی پر محبت کی نظر نہ ڈالوں گا۔" (ترجمہ)

"تذکرۃ الاولیاء" میں ہے کہ ابوعلی رودباری کے نزدیک تصوف یہ ہے کہ صوفی صوف کا لباس پہنے اور نفس کو جفا اور بلا میں مبتلا کرے اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر رسولؐ کی سنت پر چلے۔

ابوعلی قلندر رحؒ مشہور صوفی اور قلندر (دیکھئے "بوعلی قلندر")

ابوعلی کاتب رحؒ (وفات ۳۴۶ھ/۹۵۷ء) صوفی بزرگ اور ولی کامل مصر کے مشائخ عظام میں سے تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ سلسلہ بیعت ابوعلی رودباریؒ کے ذریعے حضرت جنید بغدادیؒ تک پہنچتا ہے۔ ابوبکر مصری سے بھی فیض حاصل کیا۔ "انوار اصفیاء" کے مطابق مصر ہی میں وفات پائی۔

ابوفرج اصفہانی (۲۸۴ھ/۸۹۷ء — [illegible]) علی بن حسین بن محمد بن احمد القرشی، مورخ، ادیب اور شاعر، ایران میں پیدا ہوا۔ شیعی زیدی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ تعلیم بغداد میں حاصل کی اور اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ وہیں گذارا۔ مرنے سے پہلے دیوانگی میں مبتلا ہوا اور بغداد ہی میں فوت ہوا۔

اس کی سب سے اہم تصنیف "کتاب الاغانی" ہے، جس میں معروف مغنیوں کے نغمے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے عربی ثقافت کی ایک بہت بڑی تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے، اس کا پہلا ایڈیشن بولاق سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔

دوسری کتاب "مقاتل الطالبین واخبارہم" تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے اس میں آل ابوطالب کے نیک اور صالح افراد کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب تہران سے ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء اور قاہرہ سے ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی ہے

ابوقبیس ایک پہاڑی کا نام، جو مکہ معظمہ میں مسجد حرام سے چند سو میٹر کے فاصلے سے شروع ہوتی ہے۔ حجر اسود اس پہاڑی کی سمت نصب ہے یہ پہاڑی اچانک اس طرح بلند ہوئی ہے کہ اس سے ساری مسجد نظر آجاتی ہے اب اسے چاروں طرف سے عمارتوں نے گھیر رکھا ہے۔ کوہ صفا بھی اسی کے

Marfat.com

دامن میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی مکہ معظمہ کے مشرق میں واقع ہے۔
ابوقبیس کی وجہ تسمیہ کا علم نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ پہاڑی تاریخی لحاظ سے خاصی مشہور ہے۔ ۶۴ھ/۶۸۳ء میں خانہ کعبہ پر جس منجنیق کے ذریعے آگ برسائی گئی تھی، وہ اسی پہاڑی پر نصب تھی۔ قرون وسطیٰ میں اس کی چوٹی پر ایک قلعہ بنایا گیا تھا۔ اگرچہ اب اس کے نشانات باقی نہیں رہے۔ سنوسی سلسلے کا پہلا زاویہ ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۷ء میں اسی پر تعمیر ہوا تھا۔ اب پہاڑی پر سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی مسجد نظر آتی ہے۔ ایسی بہت سی مساجد پورے شہر میں موجود ہیں

ابوقتادہ (وفات ۵۴ھ/۶۷۴ء) حارث بن ربعی انصاری خزرجی، صحابیؓ رسول، ان سے ڈیڑھ سو احادیث کی روایت کی جاتی ہے۔ ہجرت سے دس سال قبل مدینہ میں پیدا ہوئے اور عقبہ ثانیہ کے بعد اسلام لائے۔ بہترین تیر انداز اور شہسوار تھے۔ اس لئے تمام غزوات میں بڑی بہادری سے لڑے۔ یہ پہلے شخص تھے، جنہوں نے مال غنیمت بیچ کر اپنے لئے ایک باغ خریدا شکار کا بھی بے حد شوق رکھتے تھے۔ مدینہ میں انتقال کیا۔ نماز جنازہ حضرت علیؓ نے پڑھائی۔

ابوقیس حرمہ رضؓ صحابیؓ رسول، جن کی روزہ داری کی حالت دیکھ کر یہ آیت نازل ہوئی کہ "تم طلوع فجر تک کھانا کھا سکتے ہو۔" بنو نجار میں سے تھے ابتدا ہی سے بت پرستی کے مخالف تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے قبل بھی ایک ایسی عبادت گاہ بنائی تھی جس میں کسی نجس مرد اور عورت کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہجرت کے بعد جب حضور اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو اگرچہ یہ ضعیف و ناتواں تھے، اس کے باوجود بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور اسلام سے مشرف ہوئے۔ نہایت پاک صاف زاہد اور عابد تھے۔ دن کو محنت مزدوری کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ روزہ رکھتے تھے۔ اس وقت تک سحری کے وقت کھانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ ان کی خراب حالت دیکھ کر ان کی اہلیہ حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سارا ماجرا بیان کیا۔ اس پر حکم باری نازل ہوا اور مسلمانوں کو صبح کے وقت کھانا پینے کی اجازت مل گئی۔

ابولہب ابولہب بن عبدالمطلب بن ہاشم، حضرت رسول اکرمؐ کا چچا اور بہت بڑا دشمن اسلام، اس کا نام عبدالعزیٰ تھا اور کنیت ابوعتبہ تھی۔ قرآن مجید میں اس کے نام پر ایک سورت بھی اتری جس میں اسے ملعون ٹھہرایا گیا ہے۔ ابولہب کے معنی ہیں "شعلے والا"۔

جب آنحضورؐ نے اہل مکہ کو دعوت اسلام دی تو ابولہب نے اٹھ کر کہا تھا "تو ہلاک اور رسوا ہو۔ کیا تو نے ہمیں اسی غرض سے جمع کیا تھا۔" آنحضورؐ خاموش رہے مگر قرآن کی ایک سو گیارہویں سورۃ اللہب نازل ہوئی۔

"ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹے اور وہ ہلاک ہوا۔ نہ اس کا مال کام آیا اور نہ اس کی جدوجہد۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔"

اگرچہ بعثت نبوی سے پہلے ابولہب کے تعلقات خوشگوار تھے اور آنحضورؐ کی صاحبزادیوں رقیہؓ اور ام کلثومؓ کا نکاح یا منگنی ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ ہونا بتایا گیا ہے۔ مگر اعلان نبوت کے بعد سے یہ شخص آنحضورؐ کا سب سے بڑا دشمن ہوگیا تھا۔ اس کے بیٹے عتبہ نے حضرت رقیہؓ کو طلاق دے دی۔ اگرچہ وہ بعد میں ۸ھ/۶۳۰ء کو مسلمان ہوگیا۔ اور عتیبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا۔ جب ابوطالب اور ان کا خاندان ایک گھاٹی میں محصور ہوگیا تو ابولہب نے بنی ہاشم سے علیحدگی اختیار کر لی مگر اس مقاطعے کے خاتمے اور ابوطالب کی وفات کے بعد خاندان کا سربراہ بن بیٹھا۔

غزوۂ بدر کے بعد ابولہب نے وفات پائی۔ وہ اس طرح مرا کہ چیچک سے اس کا سارا جسم داغ دار تھا۔ اس کے نزدیک کوئی نہ جاتا تھا، حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی اس پر وہی کوٹھڑی گرا دی گئی، جس میں اس کی لاش پڑی سڑ رہی تھی اس کی بیوی کی موت بھی بڑی دردناک اور سبق آموز ہے۔ وہ آنحضورؐ کے راستے میں کانٹے بچھایا کرتی تھی۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ اسے قیامت کے روز فرشتے کھجور کی رسی کے ساتھ گھسیٹتے پھریں گے، چنانچہ وہی ہوا اور لکڑیوں کے گٹھے کی رسی سے اس کا گلا گھٹ گیا، جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

ابومحجن ثقفی رضؓ ایک بہادر مسلمان سپاہی اور شاعر، عمرو نام تھا، سب سے آخر میں اسلام قبول کیا۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر کہیں شراب پی لی جس پر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے گرفتار کر کے اپنے مکان میں قید کر دیا۔ سعدؓ علالت کے باعث جنگ میں شریک نہ ہوسکے تھے البتہ چھت پر سے تماشا دیکھ رہے تھے ادھر ابومحجن قید خانے میں پڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا اور شعر پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں حضرت سعدؓ کی بیوی وہاں سے گذریں تو انھوں نے منت سے کہا کہ میری بیڑیاں کھول دو جنگ کے بعد میں شام کو خود آکر بیڑیاں پہن لوں گا۔ اس پر ان کا دل پسیج گیا اور انھوں نے اس کی بیڑیاں کھول دیں۔ ابومحجن قید خانے سے نکلا اور میدان جہاد میں شجاعت کے جوہر دکھانے لگا۔ حضرت سعد نے ایک نوجوان کو اس طرح بے جگری سے لڑتے دیکھا تو پوچھا کہ کون ہے۔ پتا چلا کہ وہ ابومحجن ہے جو جنگ کے خاتمے کے بعد قید خانے میں پھر سے آبیٹھا تھا۔ اس پر حضرت سعدؓ نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ مگر حضرت عمرؓ کے زمانے میں اکثر جلاوطنی کی سزا پاتا رہا۔ کیونکہ اس کے اشعار میں عام طور پر شراب کے جائز کرنے کا خیال ملتا ہے۔

ابومحمد حسین البغوی "مشکوٰۃ المصابیح" کے مؤلف (دیکھئے بغوی، ابومحمد)

ابومحی الدین الجزائر کے سربراہ مملکت (دیکھئے بومدین)

ابومدین شعیب (۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء — ۵۹۴ھ/۱۱۹۷ء) شیخ الشیوخ، صوفی بزرگ۔ اشبیلیہ کے قریب ایک قصبے قطنیانہ میں پیدا ہوئے آبائی پیشہ بافندگی تھا۔ تکمیل علم کے لیے شمالی افریقہ گئے اور فاس میں ابویعزیٰ اور علی بن حرزہم جیسے اساتذہ سے تحصیل علم کیا۔ پھر مشرق کی طرف سفر کے دوران میں انھوں نے الغزالی جیسے علماء سے بھی استفادہ کیا اور واپس آکر بجایہ میں سکونت اختیار کر لی یہیں انتقال کیا اور تلمسان کے نواح میں دفن ہوئے۔

ابن عربی کے نزدیک ابومدین کا درجہ شیخ الشیوخ کا ہے۔ ان کی قدر و منزلت کا زیادہ تر سبب ان کے اقوال ہیں۔ ان کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی واردات قلبی کو بڑے سلیس اور عمدہ طریقے سے لوگوں تک پہنچایا۔ ان کے ساتھ بہت سی کرامات بھی منسوب ہیں۔ تلمسان کے لوگ انھیں اپنے شہر کا داتا خیال کرتے ہیں ان کا مزار آج بھی مرجع ہر خاص و عام ہے۔

Marfat.com

ابومسعود بدری (وفات ۴۰ھ/۶۶۰ء) عقبہ نام، صحابی، عقبۂ ثانیہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔ بدر میں کچھ عرصہ رہنے کی وجہ سے بدری کہلائے۔ جنگ صفین میں حضرت علیؓ نے انھیں کوفہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس عہدے کے خاتمے کے بعد آپ مدینہ واپس لوٹ آئے۔ ان کی ایک لڑکی کی شادی حضرت امام حسین سے ہوئی۔ جن سے زیدؒ پیدا ہوئے

ابومسلم خراسانی (قتل ۱۳۷ھ/۷۵۴ء) ایک ایرانی جرنیل، جس نے امام ابراہیم بن محمد کے ایما پر خراسان میں بغاوت کا آغاز کیا۔ اور یوں عباسی خلافت کے لئے راہ ہموار کی۔ یکم شوال ۱۲۹ھ/۵ جون ۷۴۷ء کو اس نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ مرو پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اموی افواج کو پے در پے شکستیں دیں اور یوں پہلے عباسی خلیفہ سفاح کی خلافت کا اعلان ہوا جس کے بعد بھی ابومسلم والیٔ مملکت کی حیثیت سے موجود رہا۔ بنو عباس اس کی طاقت سے ہمیشہ خائف رہے چنانچہ خلیفہ المنصور نے اسے قتل کرا دیا۔

ابوموسیٰ اشعری (دیکھئے "اشعری، ابوموسیٰ")

ابونجیب سہروردی (دیکھئے "سہروردی، ابونجیب")

ابونعیم اصفہانی (رجب ۳۳۶ھ/فروری ۹۴۸ء - ۲۱ محرم ۴۳۰ھ/۲۲ اکتوبر ۱۰۳۸ء) احمد بن عبداللہ بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران، صوفی اور فقیہہ، اصفہان میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر سے جعفر خلدی اور الاصم سے تعلیم کا آغاز کیا۔ ۳۵۶ھ/۹۶۷ء میں عراق اور خراسان کا سفر کیا اور چودہ برس ہی میں ان کا شمار حدیث کے اساتذہ میں ہونے لگا۔ انہوں نے اصفہان ہی میں وفات پائی۔

ابونعیم کی کتاب "حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء" بے حد مشہور ہے جو انہوں نے ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں لکھی اور قاہرہ سے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ۶۴۹ صوفیا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسری بڑی تصنیف "اخبار اصفہان" ہے جو اصفہان کی ایک مختصر سی تاریخ ہے، اس میں بھی زیادہ تر علماء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ابوہذیل العلاف محمد بن الہذیل بن عبداللہ بن مکحول، معتزلہ فرقے کا پہلا متکلم عالم، بصرہ میں پیدا ہوا۔ تاریخ پیدائش ۱۳۵ھ/۷۵۲ء سے ۲۰۳ھ/۸۱۸ء کے درمیان کہیں ہوئی۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۸۱۹ء میں اس نے بغداد میں سکونت اختیار کی اور خلیفہ الواثق کے عہد میں فوت ہوا۔

ابوہذیل العلاف پہلا شخص ہے، جس نے الٰہیات میں نظری مباحثوں کا آغاز کیا۔ اس میں اس نے طبیعیات کے اصولوں اور تصورات خصوصاً روح، مادہ جنس، حواس وغیرہ کے حادث ہونے اور جوہر کے وجود کے تصور کو استعمال کیا تاہم اس نے زرتشت کے تصورات کو، جو عجمی مسلمانوں میں راسخ ہوتے چلے جا رہے تھے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح اس نے دہریت کا بھی پورے زور شور سے مقابلہ کیا۔

ابوہذیل کے نزدیک خدا ایک ہے اور مخلوق سے الگ ... ہونا ہر کمال ہستی ہے۔ لیکن اس کا جسم نہیں اور نہ ہی کوئی صورت اور کوئی حد ہے وہ علیم ہے اور قدیر بھی۔ حیّ اور قیوم بھی ہے اور ابدیت کے ساتھ ابدی ہے۔ اس کا علم اور قدرت عین ذات ہیں۔ وہ ہر جگہ حاضر ہے اور ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ حتیٰ کہ عالم آخرت میں بھی وہ ہر شے میں موجود اور غیر مرئی رہے گا۔ اسے ان مادی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

ارسطو کے نزدیک کائنات جسے خدا نے حرکت دی ہے ابدی ہے۔ اسی طرح حرکت بھی اپنے محرک یعنی خدا کے ساتھ ابدی ہے۔ ابوہذیل اس حرکت کو مخلوق بتاتا ہے، جو اپنی انتہا کو پہنچ کر رک جائے گی، اسی کے بعد اگلا جہان شروع ہوگا، جس کے بعد ہر شے دائمی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ جنت اور دوزخ بھی دائمی حیثیت کے مالک ہوں گے، جس میں بسنے والے ایک حالت سکون میں قائم ہو جائیں گے

ابوہذیل کے ان عقائد کا اثر زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ خود اس نے بھی اپنے عقائد کو منسوخ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ شر کے ارتکاب پر بھی قادر ہے لیکن اپنے خیر محض ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا۔ البتہ انسان شر کا ارتکاب کرتا ہے، جس پر وہ قادر بھی ہے۔

ابوہریرہؓ (وفات ۵۸ھ/۶۷۶ء) عمیر بن عامر، صحابیٔ رسول اور محدث، نام عبدالرحمٰن بن صخر بھی بتایا جاتا ہے۔ ہریرہ کا لفظ ہرہ (بلی) سے نکلا ہے۔ اس کنیت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ دل بہلانے کے لئے ایک بلی کا بچہ ہمیشہ ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اس لئے "ابوہریرہ (بلی والا)" کے نام سے مشہور ہوئے۔

۷ھ/۶۲۹ء میں جب آنحضور صلعم غزوۂ خیبر میں مصروف تھے تو ابوہریرہؓ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس تھی، مدینہ آئے تو اصحاب صفہ میں شریک ہو گئے۔ حضرت عمر کے دور میں بحرین کے عامل مقرر ہوئے۔ سن وفات ۵۷ یا ۵۹ھ/۶۷۹ء ہے۔ ولید نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے

اگرچہ صحابی کی حیثیت سے صحبت تھوڑا عرصہ حضورؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا لیکن آپؐ کے اقوال و احادیث کو ازبر کئے رہتے تھے۔ اس لئے آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ "ابوہریرہ" علم کا ظرف ہے۔

ابوہریرہؓ سے ۵۳۷۵ حدیثیں مروی ہیں۔ جن میں سے ۳۲۵ متفق علیہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے ان کی روایات ۳۱۳ صفحات میں قلم بند کی تھیں۔ امام ابوداؤد کے نزدیک ابوہریرہ کچھ فارسی بھی جانتے تھے اور انھیں تورات سے بھی واقفیت تھی۔ امام بخاری کی "کتاب العلم" میں ہے کہ ایک بار ابوہریرہؓ نے آنحضورؐ سے عرض کی کہ میں جو کچھ سنتا ہوں، بھول جاتا ہوں تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ جب میں کچھ کہوں تو تم اپنا جبہ پھیلا دیا کرو اور جب میں بات ختم کر چکوں تو اسے اپنے گرد لپیٹ لیا کرو۔ چنانچہ ابوہریرہ نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد سے وہ کبھی کوئی بات نہ بھولے۔

ابویزید بسطامیؒ (دیکھئے "بایزید بسطامی")

ابویعقوب یوسف مراکش کے الموحدون، مومنی خاندان کا دوسرا حکمران، عبدالمومن کا بیٹا جس نے ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء سے ۵۸۰ھ

۴م۱۱ء تک حکومت کی ... بڑے بھائی محمد کی ولی عہدی کا اعلان ہو چکا تھا، مگر اسے جو بالآخر حکومت پر براجمان ہونے کا موقع مل گیا۔ لیکن اس کے خلاف اکثر صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی۔ اس لیے اس نے امیر المومنین کا لقب اختیار نہ کیا یوسف کے دور میں پرتگالی فوجوں نے شہر بطلیوس پر حملہ کر دیا۔ یوسف نے اپنی ساری فوج جمع کی اور اندلس پہنچ گیا۔ قرطبہ میں بیٹھ کر اس نے معرکے کی قیادت شروع کر دی۔ اندلس میں اس کے تقریباً تمام معرکے ناکام ثابت ہوئے۔ ۵۷۰ھ/۱۱۷۵ء کے بعد یوسف واپس مراکش چلا گیا۔ اس کے بہت سے بھائی فوت ہو چکے تھے نیز مختلف قبائل نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ ادھر فرڈیننڈ نے بھی الموحدون کے ساتھ دوستی کا معاہدہ منسوخ کر دیا تھا۔ قشتالہ اور لیون کی مملکتوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ فرڈیننڈ ان کی مدد پر آیا۔ یوسف کے لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس دوران میں یوسف زخمی ہو گیا اور ۱۸ ربیع الثانی ۵۸۰ھ/ ۲۹ جولائی ۱۱۸۴ء کو اشبیلیہ کی شاہراہ پر فوت ہو گیا۔

ابو یوسفؒ، امام (۱۱۳ھ/۷۳۱ء – ۵ ربیع الاوّل ۱۸۲ھ/۲۷ اپریل ۷۹۸ء) یعقوب بن ابراہیم انصاری، فقیہہ، محدث اور مورخ، حنفی دبستان کے امام، اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد خاص، امام مالکؒ بن انس سے بھی فقہ اور حدیث میں تعلیم حاصل کی۔ بچپن انتہائی عسکمپرسی میں گذرا۔ ابن اسحاق سے "المغازی" سنتے تھے۔ دوبار کوفے سے بصرہ گئے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کے علم اور رتبے کا بڑا خیال رکھا اور انہیں بغداد میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور کیا۔ یہاں وہ اپنی وفات تک رہے۔ امام شیبانی، امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ ابن معین، طیالسی، مدینی اور جاحظ آپ کے شاگردوں اور پیرو کاروں میں سے تھے۔

امام ابو یوسف کی تصانیف میں سے صرف "کتاب الخراج" بچی ہے، جو ہارون الرشید کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس میں نظام عدل و نظام محاصل وغیرہ کی تفصیلات ہیں اس کے علاوہ کتاب الآثار" (کوفی احادیث کا مجموعہ)" کتاب اختلاف ابی حنیفہ و ابن لیلیٰ" (فقہ کے دو مکاتب خیال کا موازنہ) اور کئی مناظرانہ رسالے بھی منظر عام پر آئے ہیں۔

امام ابو یوسفؒ حنفی مسلک کے سب سے بڑے اور پرجوش مبلغ ہیں۔ اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ کے برعکس وہ احادیث پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں اور کئی مقامات پر ابوحنیفہؒ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود مسلک حنفیہ کے بانیوں میں گنے جاتے ہیں۔ ایک اہم بات جو ہمیں امام ابو یوسف کے فقہ میں نظر آتی ہے یہ ہے کہ ان کے ہاں استدلال کے عام طریقے اور تلخ مناظرے ملتے ہیں۔ چونکہ وہ اکثر اپنی رائے بدلتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کا اپنا کوئی دبستان قائم نہ ہو سکا۔ اور ان کے شاگردوں نے اکثر اوقات ان سے اختلاف کیا۔

ابو یوسف چشتی صوفی اور بزرگ (دیکھیے "چشتی، ابو یوسف")

ابو یوسف یعقوب مراکش کے الموحدون خاندان کا تیسرا حکمران، ابو یعقوب یوسف کا بیٹا، جس نے ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء سے ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء تک حکومت کی۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کا طرز حکومت آمرانہ تھا۔ تاہم عدل و انصاف کے لیے کوشاں رہا۔ اسی دوران میں بنو غانیہ کے المرابطون نے بجایہ پر قبضہ کر لیا۔ ابو یوسف نے فوراً جوابی قدم اٹھایا اور ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء کو الجزائر، بجایہ اور دیگر مقامات جو المرابطون کے قبضے میں چلے گئے تھے، از سر نو فتح کر لیے۔ اس وقت علی بن غانیہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، چنانچہ ابو یوسف ادھر بڑھا۔ علی محاصرہ چھوڑ کر توزر کی طرف پلٹا اور طرابلس کے قراقوش کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ ابو یوسف نے ان باغیوں کو دبانا چاہا لیکن شکست کھائی تاہم تین ہی ماہ بعد ۹ رشعبان ۵۸۳ھ/۱۴ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو اس نے الحمٰی کے مقام پر بدلہ لے لیا اور ایک بار پھر افریقہ کا سارا جنوبی حصہ اس کے قبضہ میں آگیا۔

ابو یوسف اپنے سارے دور حکومت میں باغیوں اور پرتگالیوں کے ساتھ لڑنے میں مصروف رہا۔ نیز اسے عیسائی ہسپانیہ کے خلاف بھی کئی مہمات لڑنا پڑیں الفانسو ہشتم نے اشبیلیہ پر حملہ کر دیا تھا۔ ۹ رشعبان ۵۹۱ھ/ ۱۸ جولائی ۱۱۹۵ء کو الارک کی مشہور جنگ ہوئی۔ جس میں ابو یوسف کو فتح نصیب ہوئی اور اس نے اشبیلیہ میں آکر المنصور باللہ کا لقب اختیار کیا۔

اس مہم کے بعد بھی ابو یوسف کئی مہمات میں مگن رہا مگر دو تین ہی برس بعد بیماری کی بنا پر اپنے بیٹے محمد کو ولی عہد مقرر کر کے سلطنت کے کاموں سے سبکدوش ہو گیا اور شاید ربیع الاوّل ۵۹۵ھ/ جنوری ۱۱۹۹ء میں فوت ہوا۔

ابو یوسف ایک قابل حکمران اور جری سپاہی تھا۔ اسے تعمیراتی کاموں کا بے حد شوق تھا، چنانچہ اکثر ہسپتال اور تعمیرات کے مراکز قائم کرتا رہتا۔ اس نے بہت ہی شاندار عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔ جن میں سے مراکش کی جامع مسجد الکتبیین اور رباط کی جامع حسان بے حد مشہور ہیں۔

اتاترک (۱۸۸۱ء – ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) غازی مصطفیٰ کمال پاشا، جمہوریہ ترکی کے بانی اور پہلے صدر سلونیکا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی رضا آفندی اور والدہ کا نام زبیدہ خانم تھا۔ والد سلونیکا میں عسکر ملیہ کے دفتر میں ملازم تھے۔ بعد ازاں تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ ابھی مصطفیٰ چھوٹے ہی تھے کہ والد انتقال کر گئے۔ والدہ نے ان کی پرورش دینی درسگاہ کی تعلیم سے شروع کی۔ محلے کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مصطفیٰ کمال نے شمسی آفندی کے مکتب میں داخلہ لے لیا جو جدید طرز کا نیا سکول تھا۔ ۱۸۹۵ء میں عسکری رشدیہ کا نصاب ختم کر کے انہوں نے مناستر کے فوجی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۹ء میں استنبول کے مدرسہ حربیہ اور ۱۹۰۲ء میں فوجی اکیڈمی میں داخلہ لیا۔

اتاترک کی فوجی زندگی کا آغاز ۱۱ جنوری ۱۹۰۵ء سے ہوتا ہے۔ جب وہ مرکز شام میں پانچویں فوج کے کمانڈر بنے۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی سے مصطفیٰ کمال کو سیاسی امور سے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ مدرسۂ حربیہ سے نکلتے ہی انھوں نے اپنے دوستوں سمیت ایک خفیہ سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی۔ جس کا علم سلطان عبدالحمید کے کارکنوں کو ہو گیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لیے اسے ختم کر دیا گیا۔ اپنے قیام شام کے دوران میں انہوں نے "وطن و حریت" کے نام سے ایک خفیہ انجمن قائم کی۔

۲۰ جون ۱۹۰۷ء کو مصطفیٰ کمال لفٹیننٹ ہو گئے۔ اور ماہ ستمبر میں تیسری فوج میں منتقل ہو کر سلونیکا آ گئے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء کو مصطفیٰ کمال کو ناظر کی حیثیت سے استنبول بلایا گیا۔ اسی سال ۶ ستمبر کو سلونیکا میں تیسری فوج کے پیدل افسروں کی اکیڈمی کے کمانڈر اور ۳۸ ویں پیادہ رجمنٹ کے کمانڈر مقرر ہوئے اس زمانے میں ارناؤط والبانیہ میں بغاوت رونما ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء کے آغاز ہی میں انہیں محمود شوکت پاشا کے نائب کی حیثیت سے اس مہم پر بھیجا گیا۔ جس میں کامیاب و کامران رہے۔

Marfat.com

۹ جنوری ۱۹۱۲ء کو مصطفیٰ کمال نے طرابلس الغرب میں طبروق کے حملے شروع کرنے کا انتظام کیا۔ کیونکہ ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اطالویوں نے طرابلس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس جنگ کے اختتام پر انہیں صوفیا میں ملٹری اتاشی مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں بخارسٹ، بلغراد اور چتینا میں بھی اسی عہدے پر فائز ہوتے۔ یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو انھیں لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی مل گئی اور ۲ اگست ۱۹۱۴ء کو انہیں ترکی کے اعلان جنگ کے ساتھ ہی پہلی عالمی جنگ میں شرکت کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور شہرت حاصل کی۔ گیلی پولی کے معرکے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اری بورلو کی فوجوں کی پوری کمان انھیں دے دی گئی۔ ۱۹ مئی ۱۹۱۵ء کو انھیں کرنل کے عہدے پر ترقی مل گئی۔

چونکہ اکثر اوقات ہائی کمان کی ہدایات کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی اکثر جواب طلبی ہوتی رہتی۔ انہوں نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے کوئی بھی آدمی نہیں۔ مگر ان کا استعفیٰ قبول نہ کیا گیا البتہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۶ء کو مصطفیٰ کمال نے ادرنہ میں پوری لشکر کی کمان شروع کر دی۔ ۱۰ اپریل کو انہیں جنرل کے عہدے پر ترقی ملی اور قفقاز کے محاذ پر متعین ہوئے۔ یہاں نمایاں کارنامے انجام دینے کے بعد انھیں شمشیر زریں کا تمغہ عطا ہوا۔

۵ جولائی ۱۹۱۷ء کو مصطفیٰ کمال ساتویں فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے عصمت پاشا کے ساتھ مل کر حکومت کو ملک کی خراب اور خستہ حالت کی طرف متوجہ کیا۔ نیز فوجوں کی مکمل قیادت اجنبیوں (جرمنوں) کے ہاتھ میں چھوڑ دینے کی مخالفت کی۔ ان تجاویز پر عمل کروانے اور حکومت کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر آپ نے ایک بار پھر اپنا استعفیٰ پیش کیا لیکن یہ منظور نہ ہوا۔ اس کے باوجود آپ رخصت لے کر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو استنبول چلے گئے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مصطفیٰ کمال ولی عہد وحید الدین کے ہمراہ جرمنی کے دورے پر گئے۔ یہاں سے بیس روز بعد واپسی ہوئی۔ ۷ اگست ۱۹۱۸ء کو انھیں فلسطین کی ساتویں فوج کا دوبارہ کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اور ۲۹ اکتوبر کو انھوں نے دشمن کے حملے کو حلب کے نواح میں ترکی کی موجودہ سرحدوں کی طرف پسپا کر دیا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مونڈروس کا متارکہ جنگ طے پایا اور اس کی رو سے جرمن فوجوں کو ترکی سے خارج کر کے انھیں یلدرم گروپ کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ سلطان سے گفت و شنید کے بعد انھیں پتا چلا کہ سلطان کو فوجی بغاوت کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ان دنوں فوجوں میں بھی سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ خود مصطفیٰ کمال بھی سیاسی سرگرمیوں کا محور تھے۔ انھی دنوں عصمت پاشا سے گفت و شنید ہوئی اور دونوں نے اناطولیہ چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔

۳۰ اپریل ۱۹۱۹ء کو نویں فوج کے مفتش مقرر ہوئے۔ سیواس، وان اور طرابزون کا علاقہ انہیں سپرد کیا گیا۔ ۱۵ مئی کو یونانیوں نے ازمیر پر حملہ کر دیا۔ مصطفیٰ کمال نے سلطان کو تسلی و تشفی دینے کے بعد اناطولیہ کا رخ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ خلیفہ کی فوجیں ناکام ہو چکی ہیں، ان کے حلیف اپنی طاقت کھو چکے ہیں اور ازمیر پر یونانیوں کا قبضہ ہو چکا ہے، حکومت، سلطنت اور خلافت کے الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں مصطفیٰ کمال کے نزدیک ان سب مصائب سے رہائی کا ایک ہی طریقہ ہے یعنی ایک نئی آزاد ریاست کی تشکیل۔ جس کے لئے انہوں نے باقاعدہ کام شروع کر دیا۔ قسطنطنیہ میں ایک مجلس شوریٰ منعقد کی گئی۔ ادھر حکومت نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ترکی کی حفاظت کی ذمہ داری کسی بڑی طاقت کے سپرد کر دی جائے۔ مصطفیٰ کمال کو اس ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے ... کچھ روز بعد ... کانفرنس میں شرکت کے لئے ... سے روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھتے ہوئے ... کانگریس منعقد کی، جس میں حریت اور آزادی کا پروگرام طے کیا گیا ... طول و عرض میں شائع کر دیا گیا۔ سلطان نے جواب طلبی کے لئے بلایا تو انہوں نے استعفیٰ لکھ بھیجا، اس کے فوراً بعد ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو آپ کانگریس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس مجلس میں یہ قراردادیں پیش کی گئیں۔

۱۔ حدود ملت کے اندر وطن کی وحدت کو تقسیم نہیں ہونے دیا جائے گا۔

۲۔ عثمانی حکومت کے معطل ہو جانے کی صورت میں پوری ملت مدافعت کے لئے تیار رہے گی۔

۳۔ اگر مرکزی حکومت آزادی کو برقرار نہ رکھ سکی تو اس عرصہ میں ایک عارضی حکومت کا نفاذ کانگریس کرے گی۔

۴۔ اس حکومت کی بنیاد عامل اور حاکم ہوگی۔

۵۔ غیر ملکیوں کو ایسے حقوق حاصل نہ ہوں گے، جن سے وہ سیاست پر اثر انداز ہوں۔

۶۔ کوئی حمایت یا سپردگی قبول نہ کی جائے گی۔

۷۔ کانگریس کے تمام ارکان حکومت کے کاروبار کو انجام دینے کی کوشش کریں گے

اس قرارداد کے بعد کانگریس کا اجلاس ۴ ستمبر کو سیواس میں ہوا۔ اس بار بھی مصطفیٰ کمال ہی صدر منتخب ہوئے۔ سیواس سے ایک اخبار ارادۂ ملیہ کے نام سے جاری کیا گیا اور ۱۲ اور ۱۳ ستمبر ۱۹۱۹ء کی درمیانی رات کو سب فوجی افسروں اور والیوں کے نام احکامات جاری کئے گئے کہ آئندہ وہ اپنے آپ کو صرف ہیئت تنفیذیہ کا تابع سمجھیں اور اس اقدام کی اطلاع سلطان کو بھی دے دی گئی۔

یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو فرید پاشا کی وزارت مستعفی ہو گئی اور علی رضا نئے صدر منتخب ہوئے۔ نئی حکومت سے بھی کہا گیا کہ وہ ارض روم اور سیواس کانگریس کو تسلیم کرے۔ اس کے جواب میں حکومت کے ساتھ یہ شرائط طے ہوئیں کہ

۱۔ مرکزی حکومت اور تشکیلات ملی میں اتفاق رہے گا اور آئندہ کوئی مناقشت نہ ہوگی۔

۲۔ وکلائے ملت کا انتخاب آزادانہ اور بلا کسی مداخلت کے ہوگا۔

۳۔ مرکزی حکومت کے موافق یا مخالف کوئی رشتے نہ رکھی جائے گی۔

۴۔ سیواس کانگریس کی قراردادیں، بشرطیکہ مجلس مبعوثین انھیں قبول کرے، اساسی طور پر درست سمجھی جائیں گی۔

۵۔ قسطنطنیہ میں مجلس ملی کا افتتاح ہوگا۔

ان شرائط کی رو سے ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو قسطنطنیہ میں اجلاس ہوا جس میں مصطفیٰ کمال ارض روم کی طرف سے وکیل ملت منتخب ہوتے۔ ۷ نومبر ۱۹۱۹ء کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ اگر حکومت نے فرانس کے ساتھ گفت و شنید کو منظور کر لیا تو حکومت کا نظام سنبھال لیا جائے گا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو مصطفیٰ کمال انقرہ میں داخل ہوئے اور وہاں اپنا دفتر قائم کر دیا۔ یہاں سے حاکمیت ملی نام کا جریدہ بھی شائع کیا۔ اسی اثناء میں عصمت پاشا بھی استنبول سے آ کر ان کے شریک کار ہو گئے۔

یونانیوں کے حملوں سے پریشان ہو کر علی رضا کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ آپ صالح

پاشا نے نئی وزارت بنائی۔ مجلس اقوام نے قسطنطنیہ پر رسمی قبضہ کر لیا اور قوم پرست ولانے مجلس کو برطرف کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے اس کے خلاف سب ملکوں اور قومی مجلسوں سے احتجاج کیا اور ساتھ ہی انقرہ میں ایک نئی مجلس ملی کے انعقاد کا بندوبست کیا۔

۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال نے انقرہ میں بیوک ملت مجلسی کا افتتاح کیا اور ۲۴ر اپریل کو صدر مجلس منتخب ہوئے اور اعلان کیا گیا کہ اب حکومت کی تنہا ذمہ دار یہی مجلس ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ۱۱ر مئی ۱۹۲۰ء کو حکومت استنبول کی طرف سے مصطفیٰ کمال کے لیے موت کی سزا کا حکم جاری کیا گیا، جو سلطان کی طرف سے ۲۴ر مئی ۱۹۲۰ء کو صادر ہوا۔

یونانیوں کے حملوں کو روکنے کے لیے مجلس آگے بڑھی اور مصطفیٰ کمال نے مجلس کی طرف سے علی فؤاد کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ مگر یونانی مسلسل آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ دوسری طرف عثمانی حکومت نے معاہدہ سیورے منظور کر لیا تھا۔

۲۸ر ستمبر ۱۹۲۰ء کو مجلس کی فوجوں کو آرمینیا میں فتح حاصل ہوئی۔ اور ۲۸ر اکتوبر کو آرمینیوں نے صلح کی درخواست کی۔ اس طرح جو صلح نامہ تیار ہوا وہ ترکی کی قومی حکومت کی طرف سے پہلا صلح نامہ تھا۔ انگریزوں سے باطوم کا شہر بھی لے لیا گیا۔

۲۰ر جنوری ۱۹۲۱ء کو مجلس نے فیصلہ دیا کہ حاکمیت بلا قید و شرط ملت کا حق ہے اور صرف بیوک مجلس ہی ملک میں حکومت کر سکتی ہے۔ لندن کانفرنس میں بھی مجلس ملی کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس میں بکر سامی نے شرکت کی مگر اس کانفرنس کی تجاویز کو مجلس نے رد کر دیا۔

۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء کو یونانیوں نے پھر حملہ کر دیا۔ اس بار ۱۲ر اگست سے مصطفیٰ کمال نے فوج کی کمان خود سنبھالی۔ ۲۳ر اگست ۱۹۲۱ء کو یونانی آگے بڑھے اور ترکی فوج کے ساتھ خونریز معرکہ شروع ہو گیا۔ اس جنگ میں جو جنگ سقاریہ کہلاتی ہے، یونانیوں کو مکمل شکست ہوئی۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال کو مارشل کا منصب اور غازی کا خطاب عطا ہوا۔ اس فتح کے دوررس اثرات پیدا ہوئے، جس کی روشنی میں اتحادی قوتوں کے ایک بڑے رکن فرانس نے ترکی میثاق ملی کو تسلیم کر لیا۔

اناطولیہ سے یونانیوں کے مکمل انخلاء کے لیے مصطفیٰ کمال نے گفت و شنید شروع کر دی۔ یونان اور مجلس اقوام کے ساتھ مذاکرات ہوتے رہے مگر ناکامی اٹھانے کے بعد مصطفیٰ کمال نے ترکی فوجوں کو آگے بڑھایا اور بالآخر ۹ر ستمبر ۱۹۲۲ء کو ترقی کی فوج ازمیر میں داخل ہو گئی اور اسی سال اس نے ترکی کی سرزمین کو پورے طور پر آزاد کرا لیا۔

اس عظیم کامیابی کے بعد مصطفیٰ کمال نے عثمانی حکومت کے خاتمے کے لیے اقدامات شروع کر دیئے۔ چنانچہ مجلس کی منظوری کے بعد ۴ر نومبر ۱۹۲۲ء کو استنبول کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۵ر نومبر ۱۹۲۲ء کو عصمت پاشا ترکی وفد کے قائد کی حیثیت سے لوزان میں اتحادیوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچے۔ ادھر خلیفہ کو بھی سیاسی اور قانونی اقتدار سے محروم کر دیا گیا

مصطفیٰ کمال نے اپنی ایک علیحدہ سیاسی جماعت "خلق فرقہ سی" (پیپلز پارٹی) بنائی اور ۶ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک اخباری کانفرنس منعقد کر کے اپنا سیاسی منشور واضح کر دیا۔

۲۳ر اپریل ۱۹۲۳ء کو لوزان کانفرنس کا دوبارہ اجلاس ہوا۔ اور ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو عہد نامہ پر دستخط ہو گئے، جس کی رو سے معاہدہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مجلس کی حکومت کے جمہوری ہونے کا اعلان ایک سو ایک توپوں کی گرج کے ساتھ کیا گیا، جس کی رو سے جمہوری حکومت کے پہلے صدر مصطفیٰ کمال بنے اور وزیر اعظم عصمت پاشا مقرر ہوئے۔ ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا اور عثمانی خاندان کو ترکی سے جلا وطن کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔

اب مصطفیٰ کمال نے ترکی حکومت اور معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنے نظریے کے مطابق جدید ترکی معاشرہ قائم کرنے کے لیے اقدامات شروع کر دیئے۔ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ ترکی کے آئین سے مملکت کا مذہب اسلام ہونے کی شق خارج کر دی۔ بعد ازاں مدارس کے نصاب تبدیل کیے گئے۔ مدارس میں مذہبی تعلیم کی ممانعت کر دی گئی۔ عورتوں کا پردہ ختم کر دیا گیا۔ عورتوں اور مردوں کے مشترکہ اجتماعات کو فروغ دیا گیا۔ قدیم یونانی اور ترکی لباس متروک قرار دیئے گئے اور لوگوں کو یورپی ٹوپی پہننے پر مجبور کیا گیا۔ ملک سے درویشوں، فقیروں اور مجذوبوں کا قلع قمع کرنے کی مہم چلائی گئی۔ پیری مریدی ممنوع قرار دے دی گئی۔ تمام تکیوں اور ڈیروں کو ختم کر دیا گیا۔

ترکی کی تاریخ کو نئے سرے سے مدون کروانے پر مصطفیٰ کمال نے سب سے زیادہ زور دیا۔ اس میں ترکی قومیت پر زور دیا گیا اور اس کا آغاز زمانہ قدیم سے کیا گیا۔ اسلامی تاریخ کو رد کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں انقرہ میں پہلی تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی رو سے فیصلہ کیا گیا کہ ترکی کی تاریخ محض عثمانی تاریخ نہیں بلکہ ترک قوم اس سے بہت پہلے موجود تھی۔

مصطفیٰ کمال نے جو دوسب سے زیادہ اہم کام کیے۔ وہ یہ تھے کہ نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی ممانعت کر دی گئی اور قرآن، نماز وغیرہ ترکی میں پڑھنے کا فیصلہ کیا گیا بلکہ ترکی زبان کا رسم الخط بھی عربی رسم الخط سے بدل کر رومن کر دیا گیا۔ اس کے لیے اکثر اوقات مصطفیٰ کمال خود ملک کے دورے کرتے اور لوگوں کو مثالوں کے ذریعے سمجھاتے مزید براں جمعہ کی رخصت منسوخ کر کے اتوار کی رخصت کا فیصلہ کیا گیا۔ ہجری اور رومی تقویم بھی منسوخ کر دی گئیں۔ ان کی جگہ عیسوی تقویم کا آغاز کیا گیا۔

Marfat.com

۳ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو استنبول میں مصطفیٰ کمال کا پہلا مجسمہ نصب ہوا اور یکم نومبر ۱۹۲۷ء کو انقرہ میں دوسرا مجسمہ نصب ہوا۔

۴ر مئی ۱۹۳۱ء کو غازی مصطفیٰ کمال تیسری بار صدر جمہوریہ ترکی مقرر ہوئے ۱۲ر جون ۱۹۳۲ء کو بادشاہ عراق امیر فیصل انقرہ آئے اور مصطفیٰ کمال سے ملاقات کی۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو یوگوسلاویہ کے بادشاہ الیگزنڈر نے مصطفیٰ کمال سے استنبول میں ملاقات کی۔ ۱۶ر جون ۱۹۳۴ء کو بادشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے انقرہ میں مصطفےٰ کمال سے ملاقات کی۔

۲۴ر نومبر ۱۹۳۴ء کو ترک مجلس کی طرف سے غازی مصطفیٰ کمال کو اتاترک کا خطاب دینے کی منظوری دی گئی۔ یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو انھیں چوتھی بار صدر جمہوریہ منتخب کیا گیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ اتاترک (ترکوں کا باپ) اپنی قوم سے جدا ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء کے آتے آتے اتاترک خاصے علیل ہو گئے۔ ۱۳ر مارچ کو سیکرٹری جنرل کی طرف سے صدر جمہوریہ کی علالت کا رسمی بلیٹن شائع ہونا شروع ہوا۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو انہوں نے اپنا وصیت نامہ تحریر کرایا جو ان کی وفات ۱۰ر نومبر ۱۹۳۸ء کے بعد ۲۵ر نومبر کو کھولا گیا۔ جس کی رو سے انھوں نے اپنے اثاثے کا بیشتر حصہ "انجمن لسان و ترک تاریخ" کے نام وقف کر دیا۔

۱۶ر نومبر ۱۹۳۸ء کو اتاترک کے جسد کو تابوت میں بند کیا گیا۔ ۱۹ر نومبر کو پروفیسر شرف الدین نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۲۱ر نومبر کو یہ تابوت استنبول کے اتینوگرافی میوزیم میں دفن کر دیا گیا۔ بعد ازاں انقرہ لے جایا گیا، اور اب وہیں ان کا مزار ہے۔ ۲۶ر دسمبر کو جمہوریہ ملیہ پارلیمان نے اتاترک کو ابدی صیف (ابدی قائد) کے لقب سے یاد کیا اور اپنے ایک مخصوص اجلاس میں اس لقب کو منظور کر لیا۔

اتاترک صحیح معنوں میں مصلح قوم تھے۔ اگرچہ انہوں نے مذہب کی بیجا مخالفت کی، مگر یہ انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ترکی قوم جسے یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا، ایک بار پھر ابھر کر سامنے آگئی۔ ترکی معاشرے میں دوررس تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس لئے اگر ترکی قوم نے انھیں اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب دیا تو یہ بالکل بجا تھا۔

اتحاد اکٹھا ہونا، بہم ہونا، ایک شے بن جانا۔ متکلمین کے نزدیک اتحاد کی دو اہم قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی اتحاد، دوسرا مجازی۔ حقیقی اتحاد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا اطلاق ایسی دو چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک ہو جائیں مثلاً دودھ یا تو پانی ہو جائے یا پانی دودھ ہو جائے۔ دوسری وہ جو نئی صورت اختیار کرے، مثلاً دو مختلف رنگ مل کر ایک نیا رنگ بن جائیں۔ مگر چونکہ متکلمین کے نزدیک دوسرا اتحاد ممکن نہیں کیونکہ نیا رنگ ایسا ہونا چاہیئے جس میں دونوں رنگوں کی خصوصیات بالکل نہ ہوں۔ اس لئے اس قسم کے اتحاد کا وجود ہی نہیں ہے۔

اتحاد مجازی کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شے کسی دوسری شے میں تبدیل ہو جائے۔ مثلاً پانی ہوا بن جائے۔ دوسرے کوئی شے اتحاد کر کے بالکل نئی شے بنا دے مثلاً دو رنگوں سے بننے والا رنگ ایک نیا رنگ ہوگا مگر سابقہ دونوں رنگ کی خصوصیات رکھتا ہے۔ تیسرا مجازی اتحاد کوئی نئی شکل اختیار کرنا ہے جیسے جن انسان کی صورت اختیار کر لے۔

صوفیاء کے نزدیک اتحاد مخلوق کا خالق سے مل جانا ہے۔ مگر بعض کے نزدیک چونکہ خدا کے سوا کوئی اور وجود حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لئے ہمہ اوست کے نظریے کی رو سے اتحاد وجود ہی میں نہیں آتا۔ کیونکہ اتحاد کے لئے لازم ہے کہ ملنے والی دونوں اشیاء علیحدہ علیحدہ وجود رکھتی ہوں۔ اس لئے صوفیاء کے نزدیک

اتحاد کا تعلق حقیقت ایمانی کے اعتبار [illegible]

اتسز (وفات ۹ جمادی الآخر ۵۵۱ھ / ۳۰ جولائی ۱۱۵۶ء) اتسز بن محمد، خوارزم شاہ، اپنے باپ کی جگہ خوارزم میں تخت نشین ہوا۔ سلطان سنجر کا باجگزار تھا، مگر اس سے چھٹکارا پانے کی ترکیبوں میں مصروف رہا۔ چنانچہ اس نے بحیرہ خزر سے بحیرہ ارال کے درمیان علاقے کو فتح کر لیا، جس کے بعد سنجر کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا۔ ۵۳۳ھ / ۱۱۳۸ء کو سنجر نے اسے شکست دی اور اپنے بھتیجے سلیمان بن محمد کو خوارزم شاہ بنا دیا۔ ایک اور مہم ۵۳۸ھ / ۱۱۴۳ء میں سنجر نے اتسز کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اتسز ایک بار پھر سنجر کا وفادار ہو گیا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد دریائے اترک کے کنارے فوت ہو گیا۔ وہ پہلا حکمران ہے، جس نے خوارزم کی مملکت کو مضبوط اور مستحکم کر دیا۔

آثار الشریف باقیات، خصوصاً حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات (دیکھیے "باقیات محمدیہ")

اثنا عشریہ بارہ والا۔ اصطلاحاً اہل تشیع کا وہ فرقہ، جو بارہ اماموں حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت علی زین العابدینؓ، امام محمد باقرؓ، امام جعفر صادقؓ، امام موسیٰ کاظمؓ، امام علی رضاؓ، امام محمد تقیؓ، امام علی نقیؓ، امام حسن عسکریؓ اور امام مہدی کو مانتا ہے۔ ان کے مقابلے میں دوسرا شیعی فرقہ اسماعیلیہ ہے جو پہلے چھ اماموں کو مانتا ہے۔

اثنا عشریہ کے عقیدے کے مطابق حضرت رسول اکرمؐ خاتم النبین ہیں اور حضرت علیؓ امام اوّل ہیں۔ آخری بارہویں امام مہدی کی ولادت ۱۵ر شعبان ۲۵۵ھ / ۳۰ر جولائی ۸۶۸ء کو ہوئی اور آپ ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے۔ چنانچہ ان کے دوبارہ آنے کا انتظار ہے۔

اب اس فرقے میں بھی کئی مکاتیب فکر پیدا ہو چکے ہیں۔ اور ان کے بھی کم از کم ایک درجن گروہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ ان کے علیحدہ نام ہیں اور سبھی خود کو اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ تاہم ان کے عقائد میں یہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ امام حسن عسکری فوت نہیں ہوئے محض غائب ہو گئے ہیں۔
۲۔ امام موصوف فوت ہو گئے ہیں اور لاولد ہیں۔ وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے
۳۔ امام موصوف نے اپنے بھائی جعفر کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔
۴۔ جعفر لاوارث انتقال کر گئے۔
۵۔ محمد بن جنید بن علی، امام برحق ہیں۔
۶۔ امام حسن عسکری کی وفات سے دو برس قبل ان کے صاحبزادے محمد المہدی پیدا ہوئے۔
۷۔ امام موصوف کے ہاں صاحبزادے پیدا تو ہوئے لیکن ان کی وفات کے آٹھ ماہ بعد۔
۸۔ امام موصوف لاولد فوت ہو گئے۔ اس لئے اب کوئی امام نہیں۔
۹۔ امام موصوف کے ایک فرزند ضرور تھے مگر وہ امام نہیں تھے۔
۱۰۔ امام کے متعلق علم نہیں کہ کیا وہ امام حسن کی اولاد میں سے ہیں یا نہیں
۱۱۔ امام علی رضا کے بعد کوئی امام نہیں آیا۔ اب صرف آخری امام کا انتظار ہے

Marfat.com

حاضر سٹاک "شاہکار کتب"

[redacted]

صحرانورد کے خطوط (اوّل)	میرزا ادیب	۳/۰۰
صحرانورد کے خطوط (دوم)	میرزا ادیب	۳/۵۰
مقدس نازنین (ناول)	مولانا عبدالحلیم شرر	۴/۰۰
علی گڑھ کے تین نامور فرزند	ڈاکٹر نسیم سوہدروی	۲/۰۰
محبت عظیم ہے (ناول)	گیرزیا ڈیلیڈا	۲/۵۰
اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں	علی اکبر	۳/۵۰
نقوش قائداعظم	پروفیسر رحیم بخش شاہین	۲/۵۰
بیاد قائداعظم	خواجہ ظفر نظامی	۲/۵۰
قاسم کی مہندی (افسانے)	سید قاسم محمود	۳/۵۰
پیغمبر صحرا	کے ایل گابا	۴/۰۰
نوجوان ورتھر کی داستان غم	گوئٹے	۲/۵۰
ری پبلک	افلاطون	۳/۵۰
تھیلما	میری کوریلی	۴/۰۰
قابوس نامہ	امیر کیکاؤس	۳/۵۰
دفاع پاکستان	منور مرزا	۳/۵۰
اقبال کا فلسفہ خودی	پروفیسر عثمان	۳/۵۰

[redacted]

یہ شاہکار تین انسائیکلوپیڈیا
ملک میں علمی ماحول کے خالق ہیں

شاہکار انسائیکلوپیڈیا معلومات
ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۳۰/۰۰ فی قسط ۳/۰۰

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۳۰/۰۰ فی قسط ۳/۰۰

شاہکار بے بی انسائیکلوپیڈیا
ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۲۵/۰۰ فی قسط ۲/۵۰

ایجنسی کی کتابیں

ڈرامائی انداز میں سیرت نبوی پر عظیم کتاب
محمد رسول اللہ
ڈاکٹر توفیق الحکیم کی شاندار تصنیف، عطیہ خلیل عرب کا بہترین ترجمہ ۲۵/

مؤرخین اسلام
ڈاکٹر غلام جیلانی برق
مجلد آفسٹ کاغذ، غیر مجلد نیوز کاغذ

دور جدید کے افسانہ نگار
مظفر محمد علی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ
قسطوں میں موت
۸/۰۰

Marfat.com

یکم فروری کے پانچ شاہکار

شاہکار جیبی کتاب (۱۳)

شاہکار تقویم عالم

فروری

اس ماہ میں رونما ہونیوالے اہم تاریخی واقعات، عظیم شخصیات، ایجادات
چار ہزار سالہ انسانی تاریخ کا روزنامچہ بہترین ریکارڈ الگ درج ہے۔ باتصویر

1/50

شاہکار جریدی کتاب (۵۲)

عرب دنیا کے ایک ممتاز عالم
اُستاذ محمد فتحی عثمان کی تصنیف

دین عمل

دورِ جدید کی مشہور عربی کتاب کا
براہِ راست اردو ترجمہ
از
ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

۳/۰۰

امیر علیؒ

کرنل

شاہکار قسط نمبر (۱۷)

بے بی انسائیکلوپیڈیا

پاکستانی بچوں کیلئے اُردو کا پہلا
رنگین، مفصل، معلوماتی انسائیکلوپیڈیا۔ قسط وار،
صفحات نمبر ۵۱۳ تا ۵۴۴

سالانہ: ۲۵/- — فی قسط ۲/۵۰،

شاہکار قسط نمبر (۱۰)

انسائیکلوپیڈیا معلومات

ذیلی وار ترتیب میں اردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا
باتصویر صفحات نمبر ۴۴۷ تا ۴۸۰،
پچاس سے زائد عنوانات پر معلوماتی مضامین

سالانہ: ۳۰/- روپے فی قسط ۳/-

Marfat.com

۸۷ مضامین

...قبول (گزشتہ سے پیوستہ)	اشربہ	اقامت
...ستنجار	اشرف جہانگیر سمنانی	اقبال، علامہ
...سحاق	اشرف علی تھانوی	اقرار
...سحاق بن ندیم	اشعث بن قیس	اقرع بن حابس
...سد، بنو (غزوہ)	اشعری، ابوالحسن	اقصیٰ، مسجد
...سرافیل	اشعری، ابوموسیٰ	اقطاع
...سرار	اشعریہ	اکبر، جلال الدین
...سرائیل	اشموئیل	اکل
...سرائیل (حکومت)	اصحاب الاخدود	الاحزاب، سورۃ
...سرائیل، بنو	اصحاب الایکہ	الاحقاف، سورۃ
...سقاط	اصحاب الحجر	الاخلاص، سورۃ
...سلام	اصحاب الرس	الاسود، حجر
...سلام آباد	اصحاب بدر	الاعراف، سورۃ
...ماء الحسنیٰ	اصحاب صفہ	الاعلیٰ، سورۃ
...الرجال	اصحاب فیل	الانبیاء، سورۃ
...بنت ابی بکر	اصحاب کہف	الانسان، سورۃ
...بنت عمیس	اصفہان	الانشراح، سورۃ
...عیل	اصنام پرستی	الانشقاق، سورۃ
...عیل، امام	اصول	الانعام، سورۃ
...یل اول	اضحیٰ	الانفال، سورۃ
...یل پاشا	اطاعت	الانفطار، سورۃ
...یل ثانی	اعتکاف	الباطنیہ
...یل شہید	اعراف	البروج، سورۃ
...یل صفوی	اعوذ باللہ	البقرہ، سورۃ
...لیم	افطار	البکری، ابوعبید
...شی	افغان	البلد، سورۃ
...کعب	افغانستان	البیرونی
	افغانی، جمال الدین	البینۃ، سورۃ
...لیت	اٹک	الپ ارسلان

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط نمبر (۴)
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود
مدیر : عطش دُرّانی

شائع شدہ اور آئندہ کتب کی [illegible]
آخری صفحے پر ملاحظہ کیجیے

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
شاہکار
پوسٹ بکس : ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

چراغ سے چراغ جلتے رہیں.....

اکثر قارئین کے حوصلہ افزاء خطوط ہمیں موصول ہوتے رہتے ہیں، جن میں "اسلامی" کے سائنٹیفک اسلوب اور فرقہ واریت سے اجتناب کے اصول کو سراہا جاتا ہے۔ ہماری کوشش بھی یہی ہوتی ہے کہ اسلامیات کو سادہ انداز میں عام قارئین اور طلبا تک پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر ممکن احتیاط برتی جاتی ہے تاکہ اسلامی علوم کی ترتیب و تدوین کا کام خالص تحقیقی انداز پر کیا جائے۔ اس کے باوجود کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی سقم رہ ہی جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی کوتاہی راہ پکڑ ہی لیتی ہے۔ اگرچہ اس انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل کے بعد ایک مکمل صحت نامہ شائع کیا جائے گا۔ تاہم سابقہ تین اقساط کی چند اہم ترامیم پیش ہیں۔

— "آب زمزم" نکالنے کے لیے ٹیوب ویل لگا ہوا ہے۔ "آزاد، ابوالکلام" کو مشرقی تعلیم والدہ نے نہیں، والد نے دلائی تھی۔ "آلِ رسولؐ" میں حضرت ماریہؓ سے ایک فرزند ابراہیم کا ذکر رہ گیا ہے۔ "آل عمران" کے جملہ "حضرت عیسیٰ اور ان کے پیروؤں" میں لفظ عیسیٰ کے بعد "کا" کا اضافہ کریجیے۔ "آمر باحکام اللہ" میں صلیبیوں نے "مکہ" نہیں، "عکہ" فتح کیا تھا۔ "ابراہیم بن عبداللہ" حضرت امام حسن کے پڑپوتے تھے۔ "ابراہیم بن محمدؐ" میں عثمان بن مظعون کا نام عثمان بن مطعون چھپ گیا ہے۔ "ابوایوب انصاری" ۱۲ھ میں نہیں، ۱۲ نبوی میں اسلام لائے۔ "احرام" میں تصویر کے عنوان میں جبل رحمت کی بجائے جمرہ چھپ گیا ہے۔ "احمدیہ جماعت" میں ایک سطر شائع ہونے سے رہ گئی ہے: "۱۹۷۴ء میں ان کے خلاف عامۃ المسلمین کی زبردست تحریک کے پیش نظر حکومت پاکستان نے انھیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا ہے"۔ "ازواج مطہرات" میں حضرت زینب حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کی نواسی تھیں —

یہ سعادت بھی شاہکار ہی کو حاصل ہے کہ اردو اسلامی ادب میں پہلی بار اس قسم کا باتصویر اور عام فہم انسائیکلوپیڈیا عوام تک پہنچایا جا رہا ہے۔ تاکہ ہر مسلمان اور اس کا گھر اسلامی تعلیمات سے ہمہ وقت آگاہ ہو سکے۔ یہ ایک چراغ ہے، جسے اس دور میں روشن کیا گیا ہے۔ جب کفر و الحاد کی آندھیاں ہر طرف سے اٹھ رہی ہیں۔ اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ چراغ سے چراغ جلاتے رہیں اور اس تحریک کو آگے بڑھانے میں شاہکار سے تعاون کریں۔ امید قائم ہے۔

آپ کا
عطش دُرّانی

تاریخ اشاعت : ۱۵ر جنوری ۱۹۷۶ء   ناشر : سید قاسم محمود۔ کلفٹن کالونی لاہور   طابع : تعمیر پریس، لاہور

Marfat.com

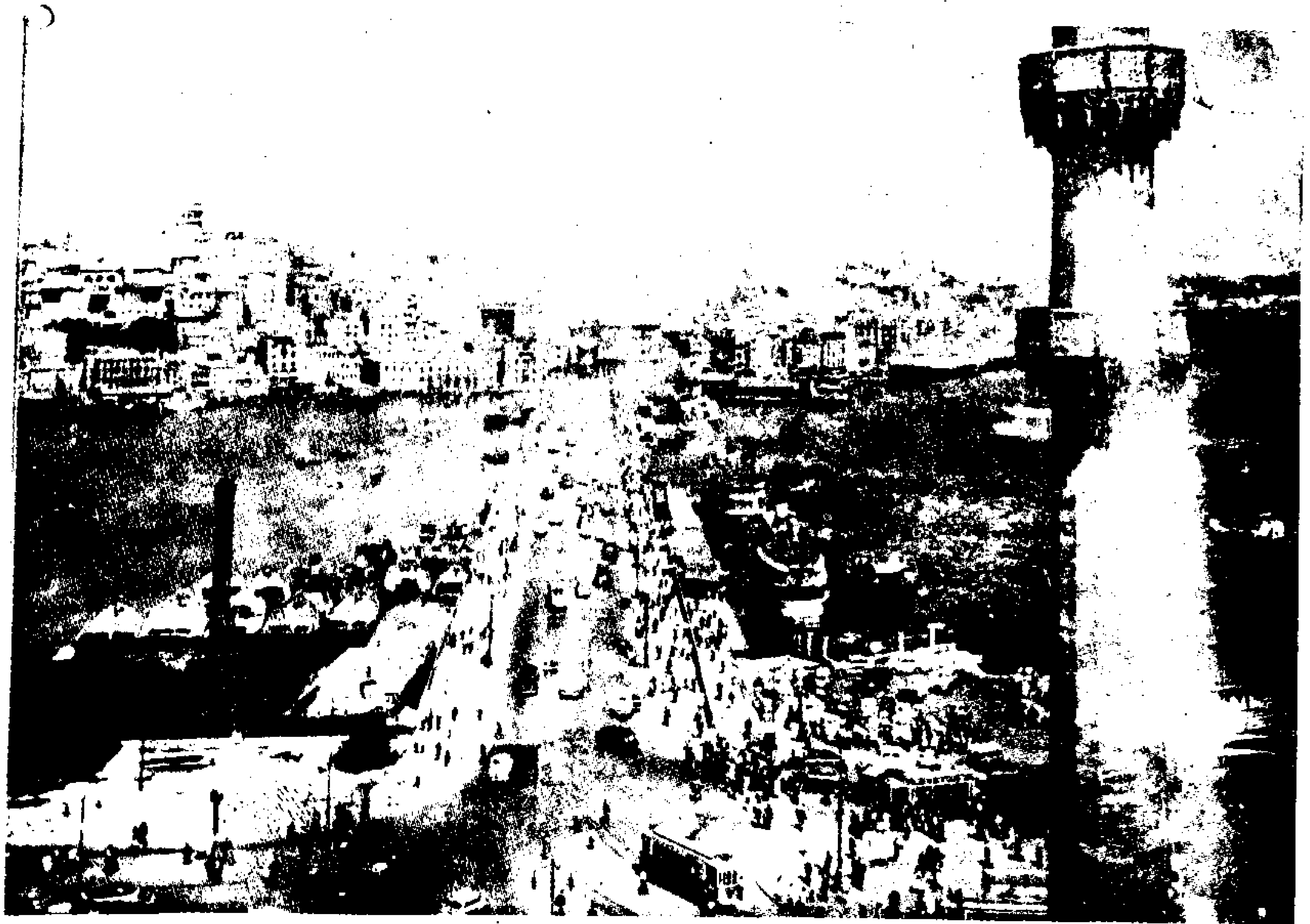

غلطہ پل جو بحیرہ باسفورس کے دونوں کناروں پر موجود شہر استنبول کو ملاتا ہے۔

استنبول کے اکثر بازار مسقف ہیں۔ ان میں سے بڑے بازار کی بنیاد محمد ثانی نے ڈالی تھی۔ ۱۰ جولائی ۱۸۹۴ء کو اسے زلزلے سے سخت نقصان پہنچا۔ اس سے ملا جلا بازار مصری بازار ہے۔ جسے سلیمان اوّل نے ۱۵۶۰ء میں بنایا تھا اور جسے آگ لگ جانے کے بعد ۱۶۰۹ء میں احمد اوّل نے دوبارہ پتھر سے بنایا۔ یہ جامع ینی کے قریب بندرگاہ کی جانب واقع ہے۔

استنبول ہوٹلوں اور سراؤں کا شہر ہے۔ قدیم ترین سرائیں ان سڑکوں پر ہیں جو بندرگاہ سے بڑے بازار کو جاتی ہیں۔ سرائے والدہ خان جو چار سو کمروں پر مشتمل ہے قدیم ترین سرائے ہے۔ اسے کوسم والدہ سلطان نے تعمیر کرایا تھا۔ ایسی تقریباً دو سو عمارتیں تھیں جنہیں کسی زمانے میں کاروان سرائے کی حیثیت حاصل تھی، مگر اب ناپید ہو چکی ہیں۔

قدیم ترین عمارتوں میں سب سے اہم شاہی محلات ہیں۔ بزنطینی عہد کے ویران شاہی محلات اب بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ اسلامی عہد کا سب سے قدیم محل محمد ثانی نے شہر کے عین درمیان کی تیسری پہاڑی پر تعمیر کرایا۔ ۱۸۰۷ء میں اسے گرا کر نئی عمارت "اس کی سرائے" کے نام سے تعمیر کی گئی۔ محمد فاتح کی تعمیر کردہ عمارات میں اب صرف چینی کوشک باقی ہے، جو ستمبر ۱۴۷۲ء میں بن کر تیار ہوئی۔ بعد کے سلاطین نے محلات کا ایک پورا سلسلہ قائم کیا۔ ان میں سے مشہور ترین بغداد کوشک ہے، جسے مراد رابع نے تعمیر کرایا ایجولی کوشک، بحیرہ مارمورا پر اقرباء کوشک، شاخ زریں پر ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر اب معدوم ہو چکے ہیں۔

استنبول مساجد کا شہر ہے۔ جہاں عثمانی عہد کا طرز تعمیر اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں آیا صوفیا کی مسجد، جو پہلے عیسائیوں کا گرجا تھی۔ اب عجائب گھر میں تبدیل ہو چکی ہے (دیکھئے "آیا صوفیا")۔ دیگر مساجد میں سلطان فاتح کی تعمیر کردہ جامع محمدیہ (تعمیر ۸۹۶ھ/۱۴۹۲ء) اہم ترین ہے۔ اس میں بہت سے دالان اور آٹھ مدرسے ہیں۔ اسی میں سلطان محمد فاتح کی قبر بھی ہے۔ ۱۷۷۱ء میں اس مسجد کی تعمیر نو ہوئی۔ مسجد بایزید ثانی جس میں اس کی قبر بھی ہے، بڑے بازار میں واقع ہے۔ یہ مسجد ۱۵۰۶ء میں تعمیر ہوئی جامع سلیمیہ کو سلیمان اوّل نے ۱۵۲۲ء میں مکمل کرایا۔ اس میں سلطان عبدالمجید اور سلیم اوّل کی قبریں ہیں۔ شہر کی سب سے اونچی اور شاندار مسجد جامع سلیمانیہ ہے۔ اسے سلیمان اوّل کی فرمائش پر ۱۵۵۰ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس سے وابستہ چار مدرسے اور ایک لنگر خانہ ہے۔ سلیمان اوّل، سلیمان ثانی اور احمد ثانی کی قبریں اس میں ہیں۔ احمد اوّل کی ۱۶۱۷ء کی تعمیر کردہ جامع احمدیہ آت میدان میں واقع ہے۔ اس میں احمد اوّل، عثمان ثانی، مراد رابع اور اس کی ماں کوسم والدہ کی قبریں ہیں۔ شاخ زریں کے ساحل پر جامع ینی ہے، جسے کوسم والدہ نے تعمیر کرایا۔ یہ مسجد ۱۶۶۴ء کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس میں محمد رابع، مصطفیٰ ثانی، احمد ثالث اور عثمان ثالث کی قبریں ہیں، مسجد نور عثمانیہ دوسری پہاڑی پر بڑے بازار کے پاس ہے، اسے محمود اوّل نے ۱۷۴۸ء میں شروع کیا اور عثمان ثالث نے ۱۷۵۵ء میں مکمل کیا۔ شہر کے اندرون حصہ میں مسجد لالہ لی ہے جسے ۱۷۶۴ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہاں سلیم ثالث کی قبر ہے۔

استنبول میں شاہی مسجدوں کے علاوہ کل پانچسو مساجد ہیں۔ جن میں آیا صوفیا کو چھوڑ کر چند ایک مساجد قابل ذکر ہیں۔ ان میں محمد فاتح کی تعمیر کردہ جامع زیرک محمود پاشا کی جامع مسجد، مراد پاشا کی جامع مسجد، بایزید ثانی کی جامع وفا، داؤد پاشا کی جامع مسجد مصطفےٰ پاشا کی جامع مسجد، علی پاشا کی جامع مسجد، مہر ماہ سلطان کی جامع مسجد، رستم پاشا کی جامع مسجد، محمد پاشا کی مسجد، مراد ثالث کی جامع فتحیہ، جراح محمد پاشا کی مسجد اور کلیسا جامع جسے بایزید ثانی کے عہد میں مسجد بنایا گیا، زیادہ اہم ہیں۔

Marfat.com

ساحل استنبول پر موجود جامع ذوالمباح۔

مزارات میں سے حضرت ایوب انصاری کا مزار گورستان ایوب میں ہے، جو ایوان سرائے کے سامنے واقع ہے۔ ۸۶۳ھ/۱۴۵۹ء میں اسی مقام پر محمد فاتح نے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ مقبرے کی آخری بار مرمت محمود ثانی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں کی۔ اس میں تبرکات و باقیاتِ نبوی موجود ہیں، جن میں سے آنحضورؐ کا نقشِ قدم اور عَلَم قابل ذکر ہیں۔ اس گورستان میں سلطان عبدالحمید اول، مصطفیٰ چہارم، محمود ثانی اور عبدالعزیز کے مقبرے بھی ہیں۔

قدیم شہر قسطنطنیہ کے گرد اگرد بزنطینی حکمرانوں نے فصیلیں قائم کی تھیں، جن میں سے اکثر منہدم ہو چکی ہیں۔ محمد ثانی نے فتح کے چند سال بعد ان کی مرمت کی اور سات برجوں کا قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۴ ستمبر ۱۵۰۹ء کے بڑے زلزلے نے انھیں نقصان پہنچایا تو بایزید ثانی نے ان کی مرمت کرائی۔ مراد رابع اور احمد ثالث نے بھی انھیں مرمت کرایا۔ مگر اب شکستہ حالت میں آثار قدیمہ کی حیثیت سے قائم ہیں۔

شاخ زریں پر غلطہ اور پیرا کے مابین سلطان محمود ثانی نے پہلی بار کشتیوں کا پل تعمیر کرایا تھا۔ اب وہاں پختہ پل موجود ہے۔ اس سے پہلے بزنطینی عہد میں داخلے کا یہ راستہ دشمنوں کے بیڑوں کو روکنے کے لیے ایک زنجیر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

استنبول کے عجائب گھروں میں آیا صوفیا کا عجائب گھر اور طوپ قپو کی سرائے (محل) اہم ہیں۔ یہاں رومی، بزنطینی اور عثمانی عہد کی سینکڑوں قیمتی اشیا رکھی گئی ہیں۔ خصوصاً سرائے طوپ قپو میں عثمانی سلطانوں کے آثار، جواہرات، ملبوسات اور اشیائے آرائش و تزئین کے علاوہ چینی، جاپانی، عربی اور یورپی عجائبات بھی رکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آثار قدیمہ کا ایک عجائب گھر اور ایک فوجی عجائب گھر بھی ہے، جہاں تمام متعلقہ اشیا موجود ہیں۔ آثار قدیمہ کا عجائب گھر "اوقاف" کہلاتا ہے، یہاں اسلامی اور ترکی آرٹ اور ادب کے بے شمار نمونے رکھے گئے ہیں۔

استنجاءؑ پاکیزہ ہونا۔ فقہ کی رو سے ہر مسلمان کے لیے قضائے حاجت کے بعد استنجاء واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک استنجاء پانی کے ساتھ کرنا مستحب ہے۔ تاہم مٹی کے ڈھیلے وغیرہ کافی ہیں۔ اگر نجاست زیادہ نہ ہو تو ڈھیلے سے استنجا کر لینا کافی ہے اور اگر یہ نفاستِ مزاج کے خلاف ہو تو ڈھیلوں کے بعد پانی سے استنجا کرنا واجب ہے۔ لیکن کاغذ، ہڈی، شیشہ، کھانے کی چیز، ٹھیکرا، نمک، گوبر اور دائیں ہاتھ وغیرہ سے استنجا کرنا ممنوع ہے۔

اسحاقؑ اللہ کے برگزیدہ نبی، حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے فرزند، حضرت سارہ کے بطن سے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ سے عمر میں چودہ یا بیس برس تک چھوٹے تھے۔ جبرون "الخلیل" میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کی بشارت سارہ کو پیرانہ سالی میں ملی۔

روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بے حد مہمان نواز تھے۔ جب تک بھوکوں اور ناداروں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا نہیں لیتے تھے۔ خود کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ پندرہ روز تک کوئی مہمان نہ آیا تو تین اجنبی وہاں آئے۔ قرآن مجید میں اس موقعے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: "کیا تیرے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر آئی ہے؟ جب وہ داخل ہوئے اور سلام کہا۔ اس نے جواب میں سلام کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں۔ پس وہ اپنے گھر والوں کی طرف چپکے سے گیا اور ایک موٹا بچھڑا لے آیا۔ سو اسے ان کے نزدیک کیا۔ کہا کیا تم کھاتے نہیں۔ ؟ (وہ کھانا نہیں کھا رہے تھے۔) پس دل میں ان سے ڈرا، انھوں نے کہا ڈرو نہیں! اور اسے ایک صاحبِ علم لڑکے کی خوشخبری دی تو اس کی عورت چیخ مار کر سامنے آئی اور اپنے منہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ میں تو بانجھ بوڑھی عورت ہوں۔" (الذریات - ۲۴ تا ۲۹)

اسرائیلی روایات میں بھی یہی ہے کہ چند لوگ آئے اور ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی خوشخبری دی۔ سارہ کے اسحاقؑ پیدا ہوئے اور جب وہ آٹھ دن کے ہوئے تو ابراہیمؑ نے ان کا ختنہ کرایا اور ابراہیمؑ اس وقت سو برس کے لگ بھگ تھے اور سارہ نے کہا، اللہ نے میرے لیے ہنسی مقدر فرمائی اور جو شخص میرا معاملہ سنے گا ہنسے گا۔ حضرت اسحاقؑ کچھ بڑے ہوئے تو عہد نامہ قدیم کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کی قربانی پیش کی۔ جب کہ مسلمانوں کے نزدیک یہ شرف حضرت اسماعیلؑ کو حاصل ہوا۔

میکفیلہ (جبرون) میں حضرت اسحاقؑ کا مقبرہ

Marfat.com

چالیس برس کی عمر میں حضرت اسحاقؑ کی شادی رفقا، نامی خاتون سے ہوئی جو حضرت لوطؑ کی بیٹی تھیں۔ بعض انہیں تویل کی بیٹی بتاتے ہیں۔ ان کے بطن سے عیسو اور پھر یعقوب پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے ملک میں قحط پڑا، جس پر حضرت اسحاقؑ فلسطین کے علاقے جرار میں اقامت پذیر ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ آخر عمر میں بیر السبع منتقل ہو گئے، جہاں "بیت ایل" کے نام سے ایک ہیکل تعمیر کیا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کی عظمت اور بزرگی کے لئے دعا فرمائی۔ جس کے نتیجے میں عیسو کو حکومت اور یعقوب کو نبوت آپ کی زندگی ہی میں مل گئی۔ آپ کا انتقال حبرون میں ہوا اور وہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ان کے مزار مکفیلہ کے غار میں ہیں۔ جس پر "الخلیل" کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے۔

اسحاق بن ندیم (جمادی الآخر ۲۹۷ھ/مارچ ۹۱۰ء — ۲۰ شعبان ۳۸۵ھ/۱۹ ستمبر ۹۹۵ء) محمد بن اسحاق بن ندیم وراق، مورخ اور خوشنویس۔ بغداد میں تعلیم پائی۔ عمر کا بڑا حصہ وہیں گذارا۔ اکثر علوم میں مہارت پیدا کی۔ کیمیاگری کا شغف بھی تھا۔ پیشہ کتب فروشی تھا۔ کتابوں کی تصحیح اور نقل کا کام کیا کرتے تھے۔ اسی لئے وراق کہلائے۔ ان کی تصنیف "الفہرست" دنیا کا پہلا اور بڑا گراں بہا تذکرہ ہے، جس میں چوتھی صدی ہجری تک عربی میں دستیاب کتابوں کی تفصیل ملتی ہے۔ صرف و نحو کی تدوین اور کلام اللہ کی تالیف کی بھی کچھ تفصیلات اس میں ہیں۔ "الفہرست" میں جن کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تاتاری حملے میں تباہ ہو گئیں۔ اس لئے اس تذکرے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

اسد، بنو (غزوہ) ایک عرب قبیلہ، جس کے ساتھ آنحضرت صلعم کو غزوہ پیش آیا۔ یہ خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ تھا جو شمال عرب کے اس مقام سے آیا تھا، جہاں کسی زمانے میں بنو طے آباد تھے۔ قبیلہ طے اور قبیلہ غطفان کے ساتھ ان کے مستقل اور پائدار تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ مگر عرصے کے بعد ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے، جنہیں اسلام ہی نے دور کیا۔

غزوہ احد کے بعد آنحضورؐ کو یہ خبر ملی کہ خویلد کے لڑکے طلیحہ اور بنی اسد کے سردار سلمہ اپنے قبیلے کو مدینہ پر حملہ کرنے اور مسلمانوں کا مال و متاع لوٹنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ انھیں یہ جرأت اس لئے ہوئی کہ وہ غزوۂ احد کے بعد مسلمانوں کو کمزور سمجھنے لگے تھے۔ آنحضورؐ نے حضرت ابو سلمہؓ کو ڈیڑھ سو مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ قبیلہ بنی اسد کی طرف جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت فرمائی کہ رات کو سفر جاری رہے اور دن میں نقل و حرکت کا راز پوشیدہ رہے اور غیر معروف راستے سے سفر کرنا چاہیئے۔ ابو عبیدہؓ سعدؓ بن ابی وقاص اور اسید بن حضیر بھی غزوہ میں شریک تھے۔ حضرت ابو سلمہؓ نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک روز بے خبری کے عالم میں بنی اسد پر حملہ بول دیا۔

یہ ۴ھ/۶۲۵ء کا واقعہ ہے۔ بنو اسد نے، جو قطن میں تھے، مسلمانوں سے شکست اٹھائی۔ ابو سلمہؓ خود وہیں ٹھہرے اور مسلمانوں کی ایک جمعیت کو مفرورین کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ بنی اسد کے کچھ لوگ گرفتار کر لئے گئے اور ان کا مال قبضے میں لے لیا گیا۔ خمس نکال کر غنیمت کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں نے کسی حد تک اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر لیا۔

روایت ہے کہ بنو اسد کے سردار طلیحہ نے مدینہ کے اس محاصرے میں حصہ لیا، جو عام طور پر غزوہ خندق کے نام سے مشہور ہے۔ رسول اللہ کے خلاف بہت سی ناکام لڑائیوں کے بعد بنو اسد میں قحط پڑ گیا اور طلیحہ نے ۹ھ/۶۳۰ء کے شروع میں مدینے میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ مگر آنحضورؐ کی زندگی ہی میں نبوت کا دعوےٰ کر دیا۔ فتنہ ارتداد کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید نے اسے شکست فاش دی اور پہلی بار اس کا علاقہ اسلامی ریاست میں شامل ہوا۔ طلیحہ نے دوبارہ اسلام قبول کرنے کے بعد عراق اور ایران کی مہمات میں حصہ لیا۔ چوتھی صدی ہجری /دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک بنو اسد نے حلہ اور خوزستان کے علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد سے یہ دو قبیلوں بنو مزید اور بنو دبیس میں تقسیم ہو گئے۔ سلطان محمد ثانی کے عہد کے بعد سے یہ ایک بار پھر متحد ہو گئے۔ آج کل یہ لوگ عراق میں مقیم ہیں۔ ان کا سردار شیخ سالم ہے، جسے ۱۹۲۵ء میں شاہ عراق فیصل کی مخالفت کے جرم میں گرفتار کر کے بلد روز میں جلاوطن کر دیا گیا۔

اسرافیل، ایک بزرگ فرشتے کا نام۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق خدا نے انہیں صور پھونکنے پر مامور کیا ہے۔ جب قیامت آئے گی اسرافیل صور پھونکیں گے، تو تمام لوگ ہلاک ہو جائیں گے اور دوبارہ صور پھونکیں گے تو حشر برپا ہو جائے گا اور سب مخلوقات زندہ ہو کر میدان حشر کی طرف دوڑیں گی۔

قرآن مجید میں صور پھونکنے کا ذکر ہے مگر اسرافیل کا نام کہیں نہیں آیا۔ طبری، نسائی اور غزالی وغیرہ نے صور پھونکنے کے تفصیلی احوال لکھے ہیں، عبرانی زبان میں بھی ایک فرشتے کا نام سیرافین یا سیرافیل ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ساتویں زمین سے بھی نیچے کھڑا ہے اور اس کا سر عرش پر پہنچ رہا ہے۔ اس کے چار پر ہیں جن میں سے ایک مشرق کو اور ایک مغرب کی سمت پھیلا ہوا ہے اس کے ذمے خدا تعالےٰ کے احکامات کو لوح محفوظ سے پڑھنا اور انہیں دیگر فرشتوں تک پہنچانے کا کام ہے۔ وہ دن میں دو تین بار اور رات کو تین بار دوزخ میں جھانکتا ہے اور غمزدہ ہو کر آنسو بہاتا ہے کہا جاتا ہے ذوالقرنین کی اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی، جب وہ بحر ظلمات کے پاس ایک پہاڑی پر کھڑا تھا اس کے منہ میں صور تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہودیوں کے ہاں صور پھونکنے کا عقیدہ نہیں پایا جاتا بلکہ یہ صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

اسراء رات کے وقت لے جایا گیا۔ اصطلاحاً اس کا تعلق قرآن مجید کے اس حوالے سے ہے، جس میں آنحضورؐ کے معراج کے بارے میں ذکر آتا ہے:

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی برکنا حولہ (بنی اسرائیل ۱) پاک ہے وہ ذات ہے، جس نے رات کے وقت اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر کرایا۔ جہاں ہم نے اپنی برکتیں نازل کیں۔

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق آنحضور صلعم معراج کی رات مکہ سے بیت المقدس کی طرف لے جائے گئے تھے اور وہاں سے آپؐ کو معراج نصیب ہوا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسراء اور معراج ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ معراج کا لفظ عروج سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر جانے کے ہیں اور اسراء رات کے وقت لے جانے کو کہتے ہیں گویا مکانی حیثیت سے یہ معراج ہے اور زمانی اعتبار سے اسراء

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معراج دو دفعہ ہوئی۔ ایک کا نام اسراء ہے اور دوسری کا معراج ان کے نزدیک اسراء مکہ سے بیت المقدس تک ہوا اور معراج زمین سے آسمان تک۔ معراج ابتدائے بعثت میں ہوئی اور اسراء ہجرت سے ایک یا دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ چنانچہ ابن سعودؓ، عائشہؓ اور ام سلمہؓ کی روایات میں صرف بیت المقدس تک جانے کا ذکر ہے۔ (نیز دیکھئے تفصیلی بحث بعنوان "معراج")

Marfat.com

اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا لقب، جس کا ذکر قرآن مجید میں صرف ایک بار آیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ہر قسم کا کھانا، بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا، سوائے اُن چیزوں کے جنہیں اسرائیل نے تورات کے نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا۔" (۳:۹۳)

عہد نامۂ عتیق میں حضرت یعقوب کے اسرائیل لقب رکھے جانے کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ اپنے بھائی کے پاس گئے اور ندی پار کرنے والے تھے تو ایک آدمی ان کے ساتھ رات بھر کشتی کرتا رہا دونوں میں سے کوئی بھی غالب نہ ہوتا تھا پو پھٹنے پر اس نے کہا: "مجھے جانے دے۔ کیونکہ پو پھوٹ چلی"۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہ دوں گا۔ تب اس نے اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا "یعقوب" اس نے کہا کہ تیرا نام آگے کو یعقوب نہ ہوگا۔ بلکہ اسرائیل ہوگا۔ کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا" (پیدائش ۳۲ - ۲۶ تا ۲۹)

اسرائیل کے معنی اللہ کی طرف راتوں کے وقت چلنے یا بڑھنے کے ہیں۔ اور شاید یہ لقب اسرائیل اس لئے پڑا کہ عہد نامہ عتیق کے مطابق حضرت یعقوب نے ایک بار خواب دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی زمین پر کھڑی ہے اور اس کا سرا آسمان تک پہنچا ہوا ہے اور خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں اور خداوند اس کے اوپر کھڑا کہہ رہا ہے کہ میں خداوند تیرے باپ ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا ہوں - میں یہ زمین جس پر تو لیٹا ہے۔ تجھے اور تیری نسل کو دوں گا۔ (پیدائش ۲۸ : ۱۳ - ۱۴)

حضرت یعقوب کی نسل بنو اسرائیل کہلائی۔ سینکڑوں برس ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد بیسویں صدی میں یہ قوم اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی قرآن مجید میں متعدد بار بنو اسرائیل کا باقاعدہ ذکر آیا ہے اور ایک سورت بھی اسی نام سے ہے۔ ان کا مذہب یہودیت ہے جس کی بنا پر انھیں یہودی کہا جاتا ہے۔ (نیز دیکھئے - "اسرائیل (حکومت)" "اسرائیل (نجوم)" "بنی اسرائیل (سورۂ)" "صیہونیت"، "یہودہ"، "یہودیت")

اسرائیل (حکومت) یہودیوں کی قوم اور ملک کا نام، جو ارض مقدس، فلسطین وغیرہ پر قابض تھی۔ ایشیا میں موجود یہ مملکت بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ ادھر ادھر برس تک بھٹکنے کے بعد یہودیوں کی موجودہ سلطنت اسرائیل کا قیام ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عمل میں آیا ہے۔ یہ قیام سرزمین عرب پر ایک غاصبانہ قبضہ ہے، جسے ابھی تک مسلمانوں اور ان کی حکومتوں نے تسلیم نہیں کیا۔

اسرائیل کے شمال میں لبنان، مشرق میں شام اور اردن، جنوب میں خلیج عقبہ، جنوب مغرب میں مصر کا صحرائے سینا اور مغرب میں بحیرہ روم واقع ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے اسرائیل کی حدود میں اضافہ ہوا اور اردن کا کچھ علاقہ بشمول یروشلم، شام کا سرحدی علاقہ اور مصر کے صحرائے سینا کا کچھ علاقہ ناجائز طور پر قبضہ میں کرلیا ہے۔

تاریخی پس منظر: مملکت اسرائیل کی تاریخ یہودیوں کی تاریخ ہے۔ جب حضرت طالوتؑ بنی اسرائیل کے بادشاہ ہوئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ فراعنۂ مصر کے پنجۂ استبداد سے نکال کر لائے اور انہیں ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ مگر بنی اسرائیل نہ مانے اور خدا کے حکم سے چالیس برس تک وادی تیہ میں بھٹکنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے مگر وہ کبھی بھی اپنی حکومت قائم نہ کرسکے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد آنے والے نبی شموئیل نے ۱۰۲۰ ق م میں حضرت طالوت (ساؤل) کو بادشاہ مقرر کردیا حضرت شموئیل نے یہودیوں کے بارہ قبائل کو متحد کر دیا جو اس سے پہلے قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے

طالوت کے بعد ان کے داماد حضرت داؤدؑ تخت نشین ہوئے۔ ان کے دورِ حکومت میں اسرائیلی فوجوں کو بہت کم سکون ملا۔ حضرت داؤدؑ نے تابوت سکینہ کو محفوظ کرنے کے لئے کہ اس میں حضرت یوسفؑ کی ہڈیاں اور کپڑے بند تھے، ہیکل تعمیر کرنے کا آغاز کیا اور ۱۰۱۵ ق۔م میں جب ان کا انتقال ہوا تو حضرت سلیمانؑ تخت نشین ہوئے۔ ان کی سلطنت ایک طرف یمن اور دوسری طرف فرات تک پھیل گئی ۱۰۱۲ ق۔م میں انہوں نے ہیکل کی تعمیر شروع کرائی۔ انہوں نے ایک مضبوط بحریہ بھی بنائی، جو نہایت فعال اور مستحکم تھی۔

حضرت سلیمانؑ کا انتقال ۹۷۵ ق۔م میں ہوا اور اس کے ساتھ ہی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ جنوبی سلطنت یہودیہ کا پایۂ تخت یروشلم تھا اور اس میں جنوبی فلسطین اور ادوم شامل تھا۔ شمالی سلطنت کا دارالحکومت سامرہ (نابلس) تھا اور یہ شمالی فلسطین اور مشرق اردن پر مشتمل تھی۔ اسرائیل کا حکمران یربعام بن نباط تھا۔ دونوں سلطنتیں عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہیں۔ یربعام کی حکومت بائیس برس تک رہی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ندب اسرائیل کا بادشاہ بنا۔ تیسرے برس اسے اخیاہ کے بیٹے بعشا نے قتل کیا اور اس کی جگہ حکومت کرنے لگا۔ اس نے چوبیس برس تک حکومت کی۔ اس کا بیٹا ایلہ اسرائیل کا حاکم بنا تو دو ہی برس کے بعد اس کے خادم زمری نے اسے قتل کرکے تخت پر قبضہ کرلیا۔ سات ہی روز بعد اسے اسرائیلیوں کے سپہ سالار عمری نے گھیر کر اپنے محل میں زندہ جلوادیا۔ عمری نے بارہ برس تک حکومت کی۔ اس کے بیٹے اخیاب نے بائیس برس تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں اسرائیل کی سلطنت بت پرستی کی طرف مائل ہوگئی تھی۔ شاہ ارام بن ہدد سلطنت اسرائیل پر حملہ آور ہوا۔ ان لڑائیوں میں اخیاب مارا گیا اور اس کا بیٹا اخزیاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی یورام تخت نشین ہوا۔ اس نے بارہ برس تک اسرائیل پر حکومت کی۔ اس کے دور میں بھی بن ہدد اسرائیل پر چڑھ آیا اور سامریہ کا محاصرہ کرلیا۔ مگر بہت جلد محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گیا اسے یاہو نے قتل کیا اور تخت نشین ہوا۔ یاہو کے زمانے میں سلطنت اسرائیل کی حدود کم ہونے لگیں۔ اس نے اٹھائیس برس تک حکومت کی، جس کے بعد اس کا بیٹا یہوآخز تخت نشین ہوا۔ اس نے سترہ برس حکومت کی۔ اس کے عہد میں ارامیوں کے

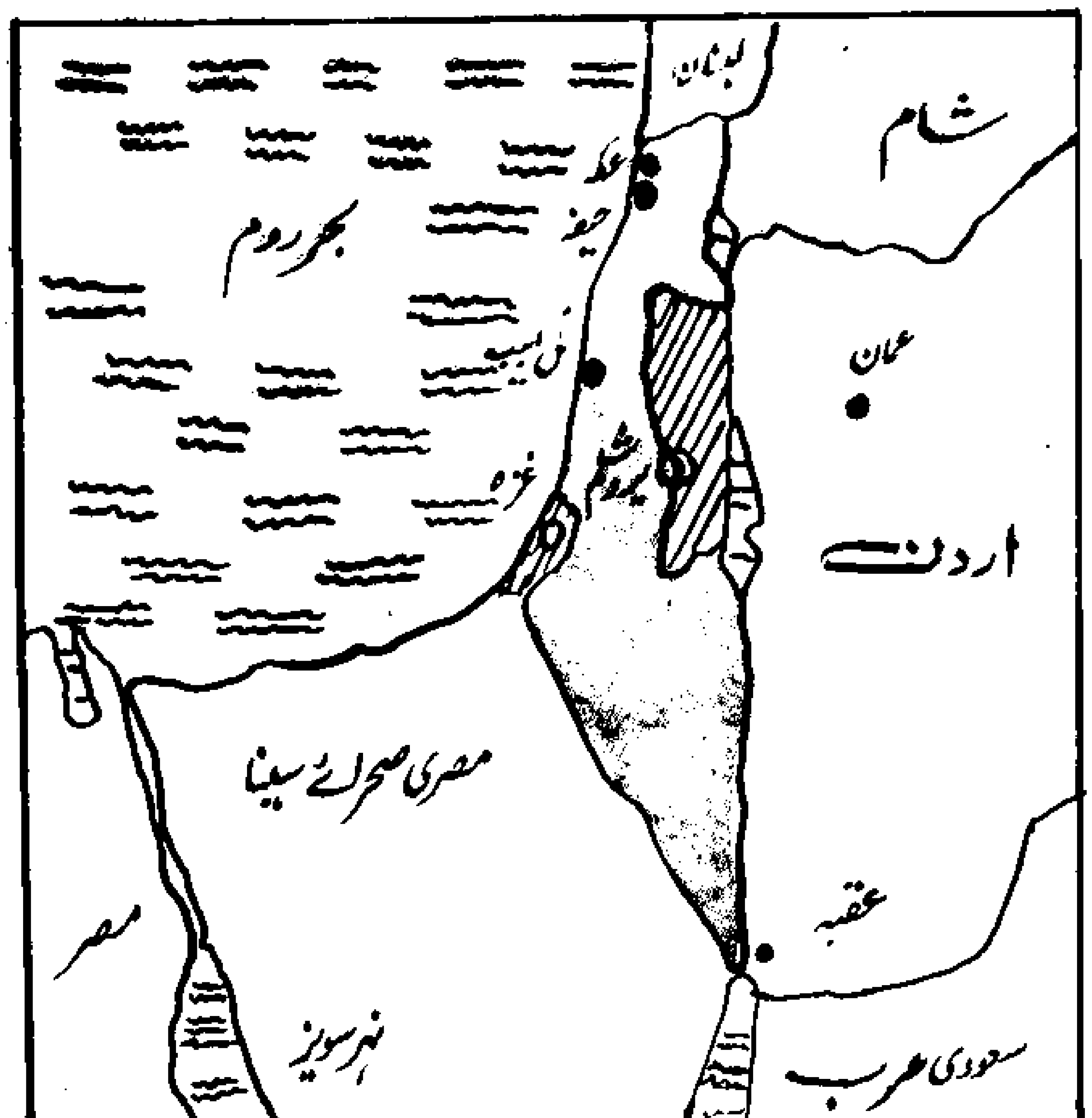

Marfat.com

قبضے سے اسرائیل کے اکثر علاقے واپس ہوئے۔ اس کے بعد اس کے بیٹے یوآس نے سولہ برس تک حکومت۔ اس نے یہودہ کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑیں اس کے بیٹے یربعام نے بھی ان جنگوں کو جاری رکھا۔ یربعام نے اکتالیس برس تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زکریا تخت نشین ہوا۔ اس نے صرف چھ ماہ ہی حکومت کی تھی کہ یبیس کے بیٹے سلوم نے اس کے خلاف سازش کر کے اسے قتل کر دیا اور تخت پر قبضہ کر لیا اس نے صرف مہینہ بھر حکومت کی کہ اسے بھی ایک شخص مناحم بن جادی نے قتل کر دیا اور اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس نے دس برس حکومت کی تھی کہ آشوریہ کا حکمران اسرائیل پر چڑھ دوڑا اور بے شمار دولت لے کر لوٹا۔ مناحم اسی غم میں مرگیا تو اس کا بیٹا فقحیاہ تخت پر بیٹھا۔

اس کے ایک سردار فقح بن رملیاہ نے اس کے خلاف سازشوں کا آغاز کر دیا۔ دو ہی برس بعد وہ اسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے دور میں آشوری بادشاہ تگلت پلاسر ایک بار پھر اسرائیل پر چڑھ دوڑا اور اس نے یونمہ، قادس، جلعاد اور نفتالی تک کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا اور یہودیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ فقح بن رملیاہ کے خلاف بھی سازشوں کا آغاز ہوا اور ہوسیع بن ایلہ نے اسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے کل نو برس حکومت کی۔ اس نے تگلت پلاسر کی اطاعت قبول کر لی۔ تگلت پلاسر نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے گرفتار کر لیا اور اس کی حکومت کے نویں برس اسرائیل پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اسرائیلیوں کو غلام بنا کر سامریہ سے نکالا اور آشوری شہروں میں لے گیا اور انکی جگہ بابلیوں کو سامریہ کے شہروں میں لا بسایا۔ اس وقت صرف یروشلم میں یہودیوں کی حکومت یہودہ قائم تھی۔ یہ سلطنت بھی عرصہ تک آشوریوں کی ماتحت رہی حتیٰ کہ آشوری بادشاہ نبوکدنضر نے یروشلم پر حملہ کر دیا۔ اس نے ہیکل سلیمانی کا نام و نشان تک مٹا ڈالا اور یہودہ کے بادشاہ صدقیاہ سمیت سارے یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ (دیکھیے "یہودہ")

عہد نامہ عتیق کی رو سے نبوکدنضر کے حملے کے ستر برس بعد شاہ فارس کسریٰ خورس نے بابل پر حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو آزاد کرایا۔ یہ لوگ اس کے ساتھ ہی اپنے شہروں کو واپس آئے۔ انھوں نے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کیا جسے نبوکدنضر کے فوجیوں نے ملیا ڈالا تھا۔ اس کے بعد سے بیسویں صدی تک کبھی بھی یہودیوں کو خود مختار حکومت نصیب نہ ہوئی ابتداً کچھ عرصہ وہ ایرانیوں اور پھر رومیوں کے ماتحت رہے۔ سکندر اعظم کی وفات کے بعد یروشلم یونانیوں کے قبضے میں آیا۔ یہودیوں کے لئے تباہی مقدر ہو چکی تھی۔ رومیوں اور یونانیوں کے پے در پے حملوں نے ان کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر ڈالی۔ اسی دوران میں حضرت عیسیٰؑ نے جنم لیا۔ انہوں نے یہودیوں کی اصلاح کے لئے تبلیغ شروع کی مگر یہودی جرائم جن کی گھٹی میں پڑ چکے تھے، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور انہوں نے عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کر دیا۔ ان کے بعد عیسائیت نے فروغ پایا اور یہودی اپنے تعصب اور احساس تفاخر کے تحت محدود ہوتے چلے گئے۔ قیصر روم نے یہودیوں کے نسلی تفاخر کو دبانے کے لیے یروشلم پر حملہ کیا اور اس کے سپہ سالار طیطس نے بیت المقدس کو جلا ڈالا جس میں ہزاروں یہودی بھی زندہ جل مرے۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ تباہی اتنی مکمل تھی کہ کوئی یہودی باقی نہ رہا، جو یہ بتا سکتا کہ ہیکل کا وجود کہاں تھا۔

۱۰۱ء سے لے کر ۲۳۶ء تک مختلف برسوں میں یہودی یروشلم میں دوبارہ آباد ہوئے انہوں نے عیسائیوں کو بے دریغ قتل کیا مگر اقتدار پھر بھی حاصل نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ ۳۲۶ء میں رومی حکمران قسطنطین نے بیت المقدس کو عیسائی ریاست میں شامل کر دیا۔ سارا شہر عیسائی ہو گیا۔ ۳۹۵ء میں بیت المقدس روم کی مشرقی سلطنت کا حصہ بنا۔ اس وقت

عکہ میں موجود ایک جامع مسجد

سے لے کر کامل ڈیڑھ صدی تک یہودیوں کی وجہ سے یہ شہر حرام کاری اور بدکاری کے عروج پر رہا۔ بالآخر رومی حکمران ہرقل نے انھیں نکال دیا۔ چنانچہ یہودیوں نے ایرانی بادشاہ خسرو ثانی کی پناہ لی اور اس کے ساتھ مل کر بیت المقدس سے عیسائی قبضہ ختم کرایا۔ چودہ برس بعد روم کے شاہ ہرقل نے عیسائیوں کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے حملہ کیا اور خسرو شاہ ایران کی فوجوں کو شکست دی۔ اصلی صلیب یروشلم لے گیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال باہر کیا۔

یہ وہ وقت تھا، جب عرب میں آفتاب نبوت ضیاء بار ہو چکا تھا اور فتح روم کی بشارت مل چکی تھی "سورۃ الروم" میں یہ بشارت موجود ہے، سرداران عرب مسلمانوں اور آنحضرت صلعم کا مذاق اڑاتے تھے۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد یہ بشارت شہادت میں تبدیل ہوئی اور ہرقل نے یروشلم پر قبضہ کر لیا تو سرداران عرب اور خصوصاً یہودیوں کے حوصلے پست ہو گئے شاہ ہرقل کی کامیابی سے لے کر ۶۳۷ء تک یعنی جب لیطاق نے ستر دن تک یروشلم کے محاصرے کے بعد یہ شہر مسلمانوں کے حوالے کیا، یہ شہر عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت سے لے کر، جب نبوکدنضر نے یہودیوں کو یروشلم سے نکالا، اب تک یہ لوگ مخصوص ذہنیت، متعصبانہ فطرت اور احساس برتری کی وجہ سے ہر دور میں معتوب رہے۔ یہ دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں میں بھٹکتے رہے، مگر الگ تھلگ رہنے کی خواہش کی وجہ سے کہیں بھی قومیت کے حقوق حاصل نہ کر سکے اور نہ کسی ملک کی قومی تحریک ہی میں شریک ہو سکے۔ علیحدگی کے اس احساس کے تحت خفیہ تحریکیں چلانا

Marfat.com

اور سازشیں کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ۔ چنانچہ صیہونیت بھی ان کی ایک خفیہ سازش اور تحریک ہے اور صیہونیوں سے مراد وہ یہودی ہیں ، جو صیہون (یروشلم کا ایک پہاڑ) کا رخ کرکے فلسطین میں قومی حکومت کے خواہاں اور اس مقصد کے لئے کوشاں رہے ۔ ۔ ۔

(دیکھئے صیہونیت)

صیہونیت کا منظم طور پر آغاز سترہویں صدی عیسوی میں ہوچکا تھا ۔ اس کا پہلا ہیڈکوارٹر وی آنا تھا ۔ ۱۸۵۴ء میں لندن کے ایک یہودی نے اسی مقصد کے لئے ایک کمپنی قائم کی اور ۱۸۷۶ء میں جارج ایلیٹ نے "چول سائن" کے نام سے ایک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا مقصد فلسطین میں یہود کی نوآبادیاں قائم کرنا تھا ۔ ۱۸۹۶ء میں وی آنا کے ایک یہودی صحافی ڈاکٹر ہرزل نے "ریاست یہود" کا ٹھوس تصور پیش کیا ۔ اس کی رہنمائی میں ۲۹ر اگست ۱۸۹۷ء کو سوئٹزرلینڈ کے شہر بیسل میں صیہونیوں کی کانفرنس ہوئی ۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں میں ہجرتِ فلسطین کی تحریک باقاعدہ شروع ہوگئی ۔ سب سے پہلے روس سے کچھ یہودی ارضِ مقدس پہنچے ۔ برطانیہ نے ان لوگوں کی بڑی مدد کی ۔ انگریزوں نے ترک سلطان عبدالحمید کے ساتھ ڈاکٹر ہرزل کی گفت وشنید میں یہودیوں کی خودمختاری تسلیم کرانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سلطان نے واضح الفاظ میں انکار کردیا ۔

۱۸۹۸ء میں یہودیوں نے سلطان عبدالحمید پر پھر سے بیرونی طاقتوں کا دباؤ ڈلوایا اور دوسری طرف اس کا تختہ الٹنے کی سازشوں میں بھی مصروف ہوگئے ۔ ۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر ہرزل کی موت کے بعد یہودیوں نے دونمہ اور فری میسن کی تحریکوں کے ذریعے اپنی سازشیں تیز تر کردیں اور بالآخر ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹ دیا گیا ۔ اس تاریخی انقلاب کے بعد ترکی میں جو وزارت بنی ، اس کے تین ارکان بصاریہ آفندی ، نسیم مزنک اور جاوید بے یہودی تھے ۔ انہوں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں یہودیوں کو ملکیتِ زمین کا حق دلا دیا ۔ برطانیہ نے بھی یہودیوں کا ساتھ دیا اور ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو یہودی وطن بنانے پر رضامندی کا اظہار کردیا ۔ یہ اعلان یا وعدہ تاریخ میں " اعلان بالفور" کے نام سے مشہور ہے ، جو برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ان الفاظ میں کیا :۔

"ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ صیہونیت ہمارے لئے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔"

اعلانِ بالفور کے ساتھ ہی دنیا کے تمام ممالک سے یہودیوں کا ایک سیلاب فلسطین کی طرف اُمڈ پڑا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے فلسطین میں آباد چھبیس سو یہودی تراسی ہزار کی ایک منظم اور خوشحال قوم میں تبدیل ہوگئے ۔ عربوں کی زمینیں دھڑا دھڑ ان کے نام منتقل ہونے لگیں ۔ اس موقع پر صیہونی لیڈر ڈاکٹر ویزمن نے کہا :۔

" اگرچہ ہم فلسطین کو خالص یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں ۔ اس کے باوجود جو عرب فلسطین میں رہنا چاہیں گے ۔ انہیں اس کی اجازت دی جائے گی ۔ لیکن جو نہ رہنا چاہیں گے ان کے لئے مصر ہے ، شام ہے اور موآب کی پہاڑیوں کے افق کے اُس پار وسیع صحرا ہے جہاں سے آ کر وہ یہاں آباد ہوئے تھے ۔"

برطانیہ کے سایہ عاطفت میں فلسطین میں یہود کی مسلسل درآمد جاری رہی ۔ حتیٰ کہ جب مجلس اقوام نے فلسطین کو انگریزوں کی نگرانی (انتداب) میں دیا ، تو اس وقت یہاں مسلمان عرب ۶۶ ہزار ، عیسائی عرب ۱۰ ہزار اور یہودی ۸۳ ہزار سے زیادہ تھے ۔ انتدابی فلسطین کی سرحدوں میں ۱۰۱۶۳ مربع میل کا خشک علاقہ بھی شامل تھا ۔ جب کہ مجموعی رقبہ ۱۰۴۳۵ مربع میل تھا ۔ برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سموئیل نے ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی ۔ تیس سالہ دورِ انتداب کے خاتمے پر یہود بمشکل ۵ء۶ فی صد اراضی کے مالک بن سکے تھے ۔ اس کے باوجود سموئیل نے یہودیوں کو حکومت کے نظم ونسق میں برابر کا شریک کرلیا اور ان کے سپرد تعلیم اور زراعت کے شعبے ہوئے ۔ یہودیوں کو زمینوں کی آبادکاری کے لئے قرضوں اور دوسری سہولتوں سے نوازا گیا ۔ سرکاری اراضی یہودیوں کو مفت دی گئی ۔ عربوں کے گاؤں کے گاؤں بے دخل کرکے وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں ۔ نتیجۃً ۱۹۳۶ء تک یہودیوں کی آبادی ساڑھے چار لاکھ سے اوپر ہوگئی ۔

یروشلم میں صیہونی چوک کا ایک منظر

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے فلسطین کو مجلس قانون ساز عطا کی ۔ اس کے بائیس ارکان میں سے صرف گیارہ مسلمان تھے ۔ عربوں نے اس ناانصافی پر ۱۹ر مارچ کو ہڑتال کردی ، جسے تشدد سے دبایا گیا ، مگر جب ہڑتال کے نتائج سامنے آئے اور خود انگریز افسر بھوکوں مرنے لگے تو انگریزوں نے ایک نئی چال چلی اور عرب شیوخ کی مداخلت پر ۱۶ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو یہ ہڑتال ختم ہوئی ۔

معاملات کو طے کرنے کے لئے لارڈ پیل کی قیادت میں ایک شاہی کمیشن قائم ہوا ، عربوں نے جس کا بائیکاٹ کیا ۔ مگر اس کمیشن نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت فلسطین کو یہودی اور عرب دو حصوں میں تقسیم کرنے اور بیت المقدس کے علاقے کو برطانیہ کے زیر انتداب رکھنے کی تجویز پیش کی ۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ اگر عرب نہ مانیں تو مارشل لا جاری کردیا جائے اور ان سے ہتھیار چھین لئے جائیں ۔ اس کے ردّعمل کے طور ۱۹۳۷ء میں شام کے ایک قصبہ بوزان میں عرب قومی کانفرنس ہوئی ، جس میں اعلان بالفور ، انتداب ، درآمد یہود اور تقسیم فلسطین کی مخالفت اور استرداد کا فیصلہ کیا گیا ۔ اس کے نتیجے میں قومی تحریک شروع ہوئی ، جسے سختی سے دبانے کی کوشش کی گئی ۔ عربوں نے تمام ظلم وستم مردانہ وار برداشت کئے ۔ اس پر برطانیہ نے عربوں سے وعدہ کیا کہ دس سال کے اندر اندر فلسطین میں ایک آزاد حکومت قائم کردی جائے گی ۔ مگر جونہی امریکا اتحادیوں کی صف میں شامل ہوا ، یہودیوں کو ایک اور مؤثر طاقت کی امداد مل گئی اور انہوں نے امریکا کی شہ پر عربوں کے خلاف قتل وغارت گری کی مہم شروع کردی ۔ ان کا تشدد اور تخریبی کاروائیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو خود برطانوی حکومت نے اپنے ایک بیان میں صیہونیت کی مذمت کی ۔

۲۹ر مارچ ۱۹۴۶ء کو برطانیہ اور امریکہ کی ایک مشترکہ کمیٹی " اینگلو امریکن " نے فوری طور پر ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخلے کی اجازت دے دی ۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا جائے ۔ اس موقع پر امریکا نے اپنی فوجی اور سیاسی خدمات پیش کرنے کا اعلان کیا ۔ مسلمانوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی مخالفت پر برطانیہ اس اجازت کو منسوخ کرنے پر مجبور ہوگیا مگر

Marfat.com

یہودیوں کے زیر اثر وہ اس معاملے کو اقوام متحدہ میں لے گیا۔

۱۵ رمئی ۱۹۴۷ء کو اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی برائے فلسطین قائم کیا۔ اس گیارہ رکنی کمیٹی میں سے کینیڈا، چیکوسلواکیہ، گوئٹے مالا، نیدرلینڈ، پیرو، سویڈن، یوراگوئے وغیرہ نے تقسیم فلسطین کا حل پیش کیا اور ہندوستان، ایران اور یوگوسلاویہ نے وفاقی حل تجویز کیا۔ جبکہ آسٹریلیا غیر جانبدار رہا۔ اس پر ۲۳ راگست کو دو ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ کمیٹی نمبر ایک کو تقسیم کے منصوبے کی تفصیلات طے کرنے کے لئے کہا گیا، جبکہ کمیٹی نمبر دو جو پاکستان، سعودی عرب، افغانستان، عراق، مصر، لبنان، شام اور یمن پر مشتمل تھی، تقسیم کی تجویز کا پابند رہتے ہوئے اپنی سفارشات مرتب کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس کمیٹی نے تقسیم کی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ مگر انصاف و امن کی علمبردار اس انجمن نے ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء کو ایک قرارداد کے ذریعے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ تینتیس ۳۳ ملکوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا، جبکہ تیرہ ۱۳ مخالف اور دس ۱۰ غیر حاضر تھے۔ امریکا اور روس نے تقسیم کی زبردست حمایت کی۔

اقوام متحدہ کی قرارداد کے فوراً بعد یہودیوں نے دہشت گردی کا آغاز کر دیا اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں سترہ ہزار عربوں کو شہید اور تقریباً تین لاکھ کو بے گھر کر دیا۔ ابھی جنرل اسمبلی کی بحث جاری تھی کہ ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے فلسطین سے دست کش ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ اسی وقت تل ابیب میں یہودیوں نے حکومت اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ اقوام متحدہ نے ابھی اس کی اجازت نہیں دی تھی مگر امریکا اور روس نے فوراً ہی اس حکومت کو تسلیم بھی کر لیا۔

حکومت قائم کرتے ہی یہودیوں نے نصف بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی عرب علاقوں پر بھی حملے کر دیئے۔ گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو یہودیوں کے اس ظلم و ستم سے بچانے کے لئے اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دیں۔ وہ تل ابیب تک پہنچنے ہی والی تھیں کہ بڑی طاقتوں نے اقوام متحدہ کی مداخلت کے ذریعے جنگ بند کرا دی۔ عرب لیگ نے ۱۱ رجون ۱۹۴۸ء کو عالمی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے عارضی صلح کے طور پر چار ہفتوں کے لئے جنگ بند کر دی۔ ۱۷ رستمبر کو اسرائیلیوں نے پھر جنگ چھیڑ دی اور جب پھر انھیں شکست ہونے لگی تو اقوام متحدہ کے ذریعے مارچ ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی کرا دی گئی۔ اس وقت اسرائیل چھہتر فیصد علاقے پر قبضہ کر چکا تھا

۱۴ رمارچ ۱۹۵۲ء کو یہودی ریاست کی حدود کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر عاری الکمان نے کہا تھا۔ "عظیم تر اسرائیل عراق سے سویز تک پھیلا ہوا ہے۔" اسرائیل کے لیڈر ڈیوڈ بن گوریان نے بھی کچھ انہی الفاظ میں اسرائیل سلطنت کی حدود کا تعین کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے مصر پر حملہ کیا، جس کے جواب میں مصر نے نہر سویز کو اسرائیلی جہازوں کے لئے بند کر دیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں ایک بار پھر عربوں اور اسرائیل کے مابین زبردست جنگ ہوئی۔ مصر نے خلیج عقبہ تک کے علاقے کی ناکہ بندی کر دی مگر امریکی امداد کے پہنچ جانے پر اسرائیل نے نہ صرف نہر سویز تک کے علاقے کو بلکہ شام کی پہاڑیوں، اردن کے خاصے علاقے اور پورے شہر یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس بار بھی اقوام متحدہ نے اسرائیل کے حق میں جنگ بندی کرائی۔

اگست ۱۹۶۹ء میں مسجد اقصیٰ کے نذر آتش کرنے کا واقعہ پیش آیا جس پر پورے عالم اسلام میں غم و غصے کی زبردست لہر دوڑ گئی۔ تمام عرب ممالک نے متحد ہونے کا فیصلہ کیا،

اسرائیل کا کہنا ہے کہ امن کی سیاسی شرائط جو عرب پیش کرتے ہیں، اسرائیل کے لئے ناقابل قبول ہیں اور جن شرائط پر اسرائیل امن کا خواہاں ہے، وہ عربوں کو پسند نہیں ۱۹۷۲ء میں مقبوضہ عرب علاقوں میں سے، جن میں دریائے اردن کے مغربی کنارے کے علاقے، غزہ اور گولان کی پہاڑیاں شامل ہیں، پچاس ہزار مسلمان روزانہ ان علاقوں سے عرب ممالک میں دھکیل دیئے جاتے رہے۔ اس پر اردن کے شاہ حسین نے فلسطین

فلسطین کے شہر غزہ کی ایک اہم شارع کا ایک منظر

Marfat.com

اور اردن کے وفاق کی تجویز پیش کی، جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد سے جناب یاسر عرفات کی پرجوش قیادت میں آزادیٔ فلسطین کے مجاہدین سرگرم عمل ہو گئے بلیک ستمبر جیسی تنظیموں نے اسرائیلیوں کو بطور یرغمال استعمال کر کے اپنے مطالبے منوانے کا آغاز کر دیا۔ جب کہ دوسری طرف اسرائیلی حکومت کو امریکا سے دھڑا دھڑ فوجی اور سیاسی امداد مل رہی ہے اور دنیا بھر سے لاکھوں یہودی اسرائیل پہنچ رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک اسرائیل میں یہودیوں کی تعداد پچیس لاکھ کے قریب پہنچ چکی تھی جو ۱۹۷۵ء میں تیس لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی ہے۔ جبکہ ۱۹۴۸ء میں پورے فلسطین میں صرف ساڑھے چھ لاکھ یہودی تھے۔

جغرافیائی و اقتصادی معلومات:- نام مملکت اسرائیل کا موجودہ رقبہ (جس میں مقبوضہ عرب علاقے شامل نہیں) ۷۹۹۲ مربع میل، ۲۰,۷۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ کل آبادی ۱۹۷۱ء میں تیس لاکھ چھیاسٹھ ہزار تھی۔ موجودہ دارالحکومت یروشلم ہے اور سب سے بڑا شہر سابق دارالحکومت تل ابیب ہے۔ عبرانی اور عربی وہاں کی عام زبانیں ہیں، سرکاری مذہب یہودیت ہے۔ ۱۹۷۲ء سے اسرائیل کا صدر شنیور زلمان اور وزیر اعظم مسز گولڈا میئر ہیں۔

اسرائیل کے تجارتی تعلقات زیادہ تر امریکا، مغربی جرمنی، اٹلی، برطانیہ، فرانس نیدرلینڈ، جاپان اور بلجیم کے ساتھ ہیں۔ درآمدات برآمدات کی نسبت زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل کو دنیا بھر کے یہودیوں کی مالی و اقتصادی مدد پہنچتی رہتی ہے معیشت کا زیادہ تر دارومدار ماہی گیری، زراعت، معدنیات اور صنعت پر ہے۔ اسرائیل کی سالانہ قومی آمدنی تین ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ یہ دنیا بھر کے تمام ممالک سے زیادہ ہے یعنی یہاں فی کس سالانہ آمدنی ۹۵۰ ڈالر ہے۔

اگرچہ اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن ہے، تاہم چند ممالک کو چھوڑ کر اکثر اسلامی ممالک اور ان کے حلیفوں نے اس کے ناجائز وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ پاکستان بھی ان ممالک میں شامل ہے اور عربی علاقوں پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کے خاتمے کے لئے کوشاں ہے۔

(نیز دیکھئے "اسرائیل بنو"، "صیہونیت"، "یہودہ")

اسرائیل، بنو: حضرت یعقوبؑ کی اولاد، جو ان کے لقب اسرائیل کی بنا پر بنو اسرائیل کہلائی۔ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں کی اولاد بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں تقسیم ہوئی:- ان بیٹوں کے نام یہ تھے۔ روبن، شمعون، لاوی، یہودہ، زبولون اشکار، دان، جد، آشر، نفتالی، یوسف، بنیامین۔ ان میں سے حضرت یوسفؑ پہلے ہی مصر میں غلام کی حیثیت سے موجود تھے اور جب انہیں فرعون مصر کے ہاں حکومت ملی تو ان کے والد حضرت یعقوب اپنے سارے بیٹوں اور ان کی اولاد کے ساتھ وہاں گئے۔ عہد نامہ عتیق کے مطابق بنو اسرائیل برومند کثیر التعداد اور نہایت زور آور ہو گئی اور وہ ملک ان سے بھر گیا۔

حضرت یوسف کی وفات کے بعد مصری لوگ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی طاقت کی بنا پر ان کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کرنا شروع کیا، ان سے سخت محنت لیتے اور ان کے بیٹوں کو مار ڈالتے۔ لہٰذا نرینہ بیٹوں کے قتل کا حکم فرعون مصر کی طرف سے باقاعدہ طور پر جاری ہوا تھا۔ مگر قدرت خدا کی کہ بنی اسرائیل کے لاوی قبیلے کے ہاں پیدا ہونے والا ایک بچہ فرعون کے ہاں پلا بڑھا۔ یہ موسیٰؑ تھے۔ انہیں خدا نے نبوت سے سرفراز کیا اور کتاب "تورات" دی۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائی اور خدا کے حکم پر مصر سے نکال لائے۔ عہد نامہ عتیق کی رو سے اس وقت بنی اسرائیل کے مردوں کی تعداد چھ لاکھ تھی اور انہوں نے مصر میں کل چار سو تیس برس گزارے تھے۔

بنی اسرائیل کے ہاں بارہ قبائل اور ان کے سرداروں کا ذکر قرآن مجید میں یوں آتا ہے:-

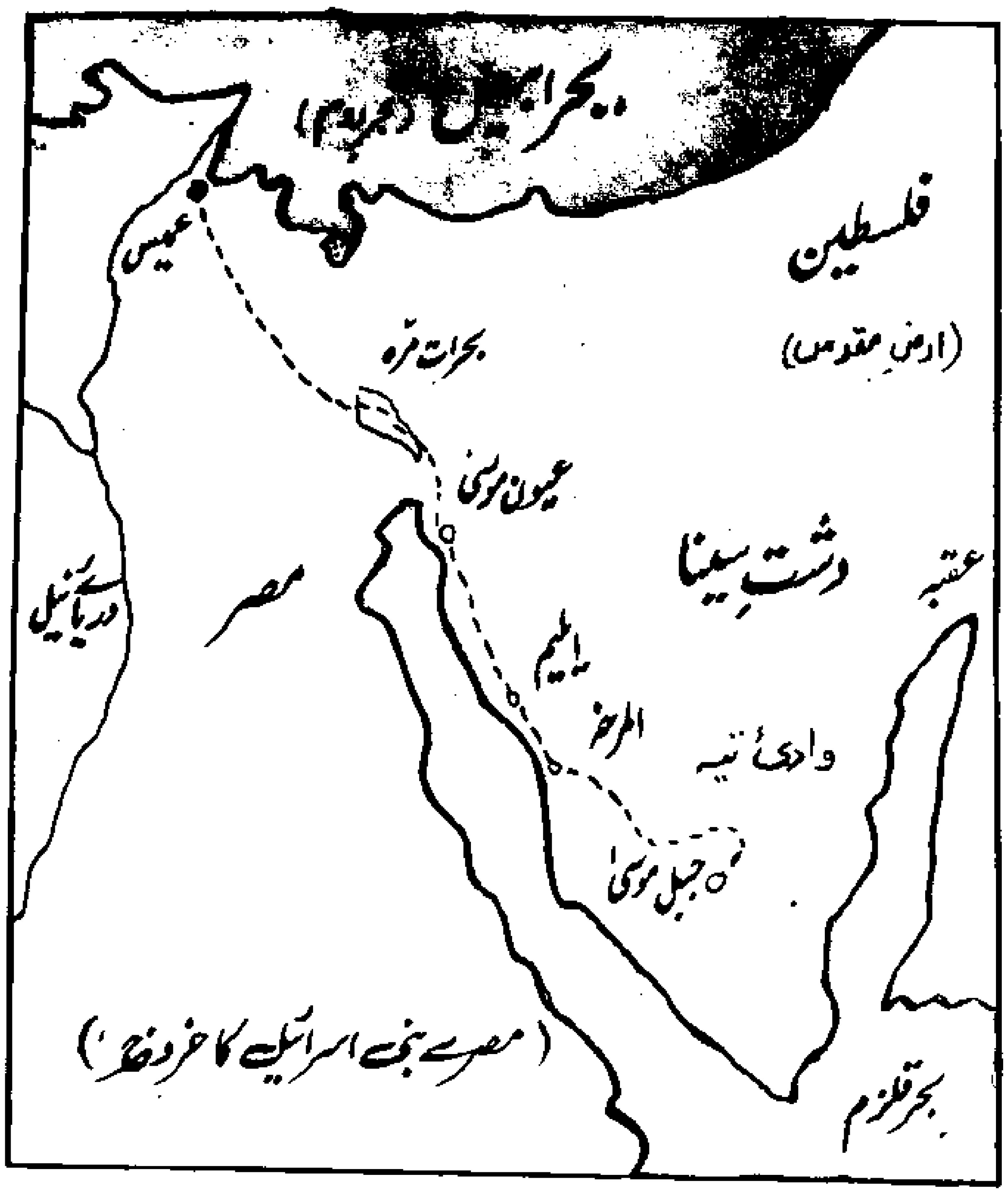

(مصر سے بنی اسرائیل کا خروج)

"اور یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا۔ اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اچھا مال کچھ اللہ کو دو گے تو میں بالضرور تمہاری برائیاں تم سے دور کروں گا اور بالضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پس جو کوئی تم میں سے اس کے بعد انکار کرے گا وہ بلاشبہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا۔" (المائدہ - ۱۲)

مصر سے نکلنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے خدا کے احکام پر چلنے کا وعدہ لیا، مگر پستیوں میں گری ہوئی اس قوم نے ہمیشہ نافرمانیاں کیں۔ جس پر بنی اسرائیل چالیس برس تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے۔ یہاں ان پر آسمان سے من و سلویٰ اترا کرتا تھا اور یوں خدا تعالیٰ نے اس قوم پر نعمتوں کی بارش کئے رکھی۔ اس دوران میں ان کی آزمائش بھی کی جاتی رہی تاکہ دیکھا جائے کہ وہ شریعت پر کتنا عمل کرتے ہیں، مگر یہ نافرمان قوم بداعمالیوں سے باز نہ آئی۔ حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰؑ خدا سے ہمکلام ہونے کے لئے کوہ طور پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں انہوں نے گائے کی پرستش شروع کر دی اور جب انھیں ان کی مقدس ارض موعود دکھا کر کہا گیا کہ یہ وہ ملک ہے۔ جس کا وعدہ تم سے کیا گیا تھا، سو اس میں داخل ہو جاؤ تو بنی اسرائیل، شرارت اور کاہلی جن کے وجود میں داخل ہو چکی تھی، کہنے لگے کہ موسیٰؑ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور اس ارض مقدس کے لوگوں سے لڑو۔ کیونکہ وہ بڑے جابر اور طاقتور لوگ ہیں۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ جب یہ ملک ان سے خالی ہو جائے گا تو ہم آ جائیں گے۔

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی خدا کو ناگوار گذری اور اس نے انھیں یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مر نہیں گئے، وہ وادی تیہ میں بھٹکتی رہی۔ طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصے میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ بتائی جاتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے جانشین نبی حضرت یوشعؑ کی سرکردگی میں بنی اسرائیل دشت سینا سے نکل کر ارض کنعان کی طرف بڑھے اور اس پر فتح حاصل کی۔ ابن اثیر کے مطابق یہ معرکہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر ان کا فاتحانہ داخلہ ہونے لگا تو اس

Marfat.com

نے حکم دیا کہ عزور نہ کرنا بلکہ توبہ استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا۔ مگر فتح کے بعد بنی اسرائیل کی سرشت غالب آئی اور خدا نے اپنے حکم کی خلاف ورزی پر ان پر عذاب نازل کردیا۔ یہ واقعہ سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

حضرت یوشع آخر عمر تک بنی اسرائیل کی نگرانی اور اصلاح حال میں مصروف رہے ان کے باہمی جھگڑوں کے تصفیے کے لئے قاضیوں کو مقرر کیا گیا تاکہ وہ آئندہ بھی اس طرح اپنا نظام قائم کر رکھیں۔ یہ نظام حضرت موسیٰؑ کی وفات سے تقریباً ساڑھے تین سو سال بعد تک قائم رہا کہ ان کے قبیلوں پر حکومت سردار کرتے اور ان کے فیصلے قاضی انجام دیتے اس عرصے میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لئے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے کبھی عمالقہ ان پر چڑھ آتے، کبھی فلسطینی، کبھی مدائنی حملہ آور ہوتے تو کبھی آرامی آجاتے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں انبیاؑ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا، جو حضرت عیسیٰؑ پر آکر ختم ہوتا ہے۔ ان کی صحیح تعداد کا علم خدا تعالےٰ کی ذات ہی کو ہے۔ مگر بعض کا ذکر عہد نامہ عتیق اور قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کی تاریخی ترتیب کا بھی صحیح علم نہیں طبری کی روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارونؑ اور ان کے بعد حضرت یوشعؑ منصب نبوت پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد جس ہستی کو نبوت کا درجہ ملا، وہ حضرت حزقیل تھے۔ ان کے نام قرآن مجید میں کہیں بیان نہیں ہوئے مگر مفسرین کی رو سے بعض قصوں کے ضمن میں ان کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ ان کے جانشین حضرت الیاسؑ (ایلیاہ) کا ذکر سورۂ انعام (۸۵)، اور سورۂ الصافات (۱۳۱ - ۱۴۳) میں آیا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو فنیقیوں کے دیوتا بعل زبوب کی عبادت سے روکا۔ ان کے چچا زاد بھائی الیسع بھی بنی اسرائیل پر مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید نے اگرچہ ان کے حالات پر روشنی نہیں ڈالی مگر

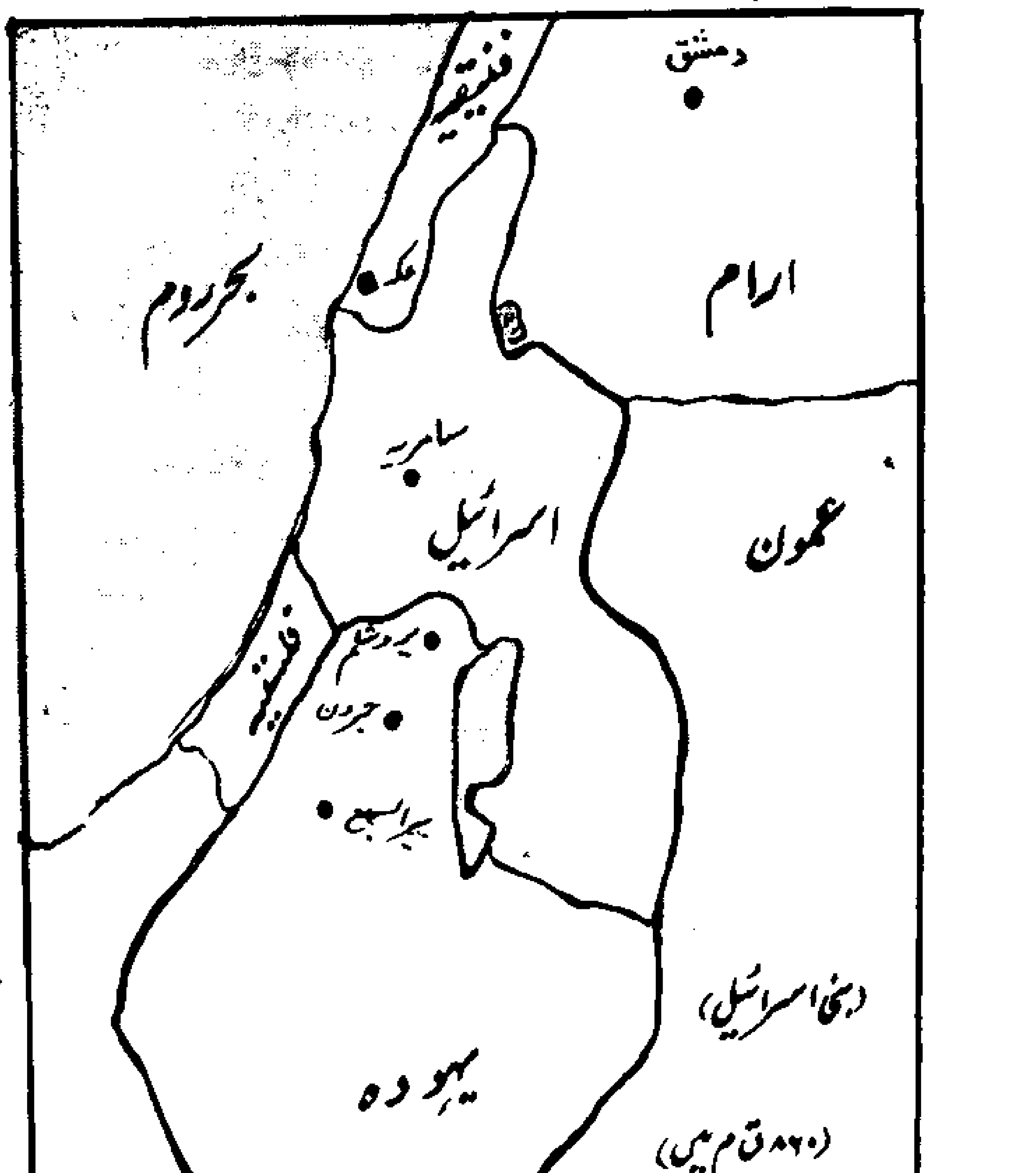

سورۂ انعام اور سورۂ صٓ میں ان کا نام ضرور آیا ہے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں عیلی کاہن کے زمانے میں عزہ کے فلسطینیوں نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور ان سے "تابوت سکینہ" کا مقدس صندوق چھین کر لے گئے جس میں بروایت تورات کا اصل نسخہ، اور حضرت یوسفؑ کا جسد تھا۔ اسی دور میں ان کے ایک قاضی اشمویلؑ کو اللہ کی طرف سے منصب نبوت عطا ہوا۔ ان کا عربی نام اسماعیل ہے۔ اس دور میں عمالقہ کے جالوت نامی بادشاہ نے بنی اسرائیل کو مغلوب کرکے ان کے بہت سے سرداروں اور معززین کو گرفتار کرلیا۔ بنی اسرائیل نے حضرت اشموئیلؑ سے درخواست کی کہ ان کا بھی ایک سلطان ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے خدا سے دعا مانگ کر بنیامین کی نسل سے ساؤل (طالوت) کو ان کا بادشاہ مقرر کردیا۔ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے اس مطالبے اور بعد ازاں ردّ وکد کا تفصیلی ذکر سورۂ بقرہ میں یوں آیا ہے:۔

"کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں، جس نے موسیٰؑ کے بعد اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ ہمارے لئے ایک حکمران مقرر کر دیجئے۔ نبی نے کہا۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا ہے تو تم لڑنے سے انکار کردو! سرداروں نے کہا۔ ایسا کیونکر ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے گھروں سے جا چکے اور اپنی اولاد سے علیحدہ کئے جا چکے ہیں! پھر جب ان کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب نے پیٹھ دکھلا دی اور اللہ بے انصافوں سے خوب واقف ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا۔ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو مقرر کردیا ہے، جب انہوں نے یہ بات سنی تو کہنے لگے، وہ ہم پر کیسے حکمران بن سکتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمران بننے کے حقدار ہیں۔ علاوہ بریں اسے مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے فرمایا! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کی قابلیت و استعداد میں تم پر اسے برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اسے وسعت عطا فرمائی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے، اپنا ملک دیتا ہے اور اللہ فراخی والا، جاننے والا ہے۔" (۲۴۶، ۲۴۷)

طالوت کے دور میں تابوت سکینہ بنی اسرائیل کو خود بخود واپس مل گیا۔ اس کے بعد طالوت اور جالوت کے درمیان جنگ بھی ہوئی، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ ان کے ایک نوجوان سپاہی داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا تو طالوتؒ نے انہیں اپنا داماد بنا لیا۔ ان کے بعد حضرت داؤدؑ ہی نبوت اور بادشاہت کے منصب پر فائز ہوئے۔ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ (۱۰۲، ۲۵۱)، نساء (۱۶۳)، مائدہ (۷۸)، انعام (۸۴ تا ۹۰) انبیاء (۷۸ تا ۸۲)، نمل (۱۵ تا ۴۴) سبا (۱۰، ۱۴) اور صٓ (۱۷ تا ۲۶، ۳۰ تا ۴۰) میں ان کا ذکر آتا ہے۔ ان پر کتاب "زبور" اتری ان کے بعد حکومت ان کے بیٹے سلیمانؑ کے ہاتھ میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں بھی نبوت کا مقام ملا۔ ان کے دور میں بنی اسرائیل کو بے حد قوت و دولت حاصل ہوگئی۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر سورۂ بقرہ (۱۰۲)، نساء (۱۶۳) انعام (۸۵) انبیاء (۷۸، ۷۹، ۸۱)، نمل (۱۵ تا ۳۰، ۳۶، ۴۴)، سبا (۱۲) اور صٓ (۳۰ - ۴۰) میں آیا ہے۔ سابقہ نبیوں کی طرح بنی اسرائیل نے حضرت سلیمانؑ پر بھی بہتان طرازیوں کا آغاز کردیا۔ انہیں جادوگر مشہور کیا گیا۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں اسرائیل اور یہودہ میں تقسیم ہوگئی۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہے۔ ان پر متواتر نبی مبعوث ہوتے رہے مگر یہ قوم اپنی سرکشی اور کج روی سے کبھی باز نہ آئی۔ حتیٰ کہ شاہ بابل بخت نصر نے ان کے شہروں کو لوٹا اور ان کی سلطنت کو ویران کیا۔ اس دوران میں ان کے ہاں حضرت ایوبؑ حضرت یونسؑ (یوحنا)، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جیسے پیغمبر آئے، جن کا ذکر قرآن مجید

Marfat.com

میں بھی آیا ہے۔ اس کے علاوہ عہد نامۂ عتیق میں بہت سے نبیوں اور رسولوں کا ذکر آتا ہے، جو وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر مبعوث ہوتے رہے۔ ان میں عزرا ایوب نحمیاہ، یسعیاہ یرمیاہ (ارمیاہ)، دانیال، زکریا اور ہوسیع اہم ہیں۔ اس سلسلے کے آخری نبی حضرت عیسیٰؑ تھے، جو رومی شہنشاہ، ہیرودِ اعظم کے عہد میں پیدا ہوئے۔ یہودیوں نے اس معصوم نبی کی تعلیمات کو نہ صرف یہ کہ جھٹلایا بلکہ انہیں صلیب پر بھی چڑھا دیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کوئی دو ہزار سال تک اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں ناجائز ذرائع اور اپنی سازشوں کی بدولت ارضِ مقدس میں اپنی غاصبانہ حکومت "اسرائیل" کے نام سے قائم کر لی، لیکن وہ ناپیدار ثابت ہو گی، کیونکہ اس کی بنیاد میں سازش اور بے انصافیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں ——

نیز دیکھئے:۔ "اسرائیل" ۔ "اسرائیل، حکومت" ۔ "بنی اسرائیل، سورہ"۔ "تالمود" "تورات"، "زبور"۔ "صیہونیت"۔ "عہد نامۂ جدید"، "عہد نامۂ عتیق"۔ "یہودہ" "یہودیت"۔

اسقاط گرانا، ساقط کرنا۔ اصطلاحاً حمل گرا دینے سے متعلق ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کے بارے میں صراحت کے ساتھ کوئی حکم نہیں آیا۔ البتہ تفاسیر اور علم فقہ میں اس کے بارے میں چند امور ملتے ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری کے مطابق جب بچے کے اعضاء بن چکے ہوں تو حمل گرانا ناجائز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نزدیک چار ماہ سے زیادہ کے حمل کو کسی تدبیر سے گرانا خونِ ناحق میں شمار ہوتا ہے۔ اکثر فقہا نے افلاس اور کثرت عیال کی صورت میں اس کے جواز کا فتوے دیا ہے۔ مگر چند روایات کے مطابق اگرچہ یہ قتل نہیں مگر اس سے اللہ کی رزاقیت پر عدم توکل ظاہر ہوتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ضبطِ تولید اور اسقاطِ حمل کی تدابیر گناہ میں شامل ہیں۔

اسلام صلح و امان، سلامتی اور اطاعت و فرمانبرداری کی حالت۔ اصطلاح میں دین کو اللہ تعالےٰ کے لئے خالص کرنا۔ یہ لفظ سلم سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ظاہری اور باطنی آفات سے بچے رہنا ہے۔ شریعت میں اسلام دو طرح سے ہے۔ ایک زبانی اقرار اور دوسرا دلی اعتقاد کے ساتھ خود کو اللہ تعالےٰ کے حضور سپرد کر دینا۔ مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو عبادت کو اللہ کے لئے خالص کرتا ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے۔

یہ فرمانبرداری اور اخلاص کیونکر ہوتا ہے؟ اس کا جواب دنیا کے اکثر مذاہب اور مکاتب فکر نے دیا ہے۔ لیکن اگر ہم مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ہر مذہب میں اسلام کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے۔ مگر ان میں موجود دیگر بدعات اور شرک کی وجہ سے ہم انہیں اسلام نہیں کہہ سکتے۔ نیز مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے سے یہ بات عیاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہر مذہب نے سلامتی کی راہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ سعی مختلف ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی قرآن مجید کی راہنمائی میں مکمل ہوئی ہے، جو حضرت محمدؐ کے قلب مبارک پر وحی ہوا۔ گویا اسلام وہ صراطِ مستقیم ہے، جو ہر مذہب نے دکھانے کی کوشش کی، مگر اس پر چھائی ہوئی کفر و الحاد کی دھند شریعتِ محمدی ہی کے باعث دور ہوئی اور اسلام نکھر کر سامنے آ گیا۔ اسی لئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا:۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً"۔ "آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں راضی ہوا۔" (المائدہ = ۳)

یہ آیت حجۃ الوداع کے روز میدان عرفات میں نازل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام پہلے سے موجود تھا، جو اپنے کمال اور عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں کامل ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ جو غرض مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی وہ اس دین کی وجہ سے پوری ہو گئی ہے۔ اب کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ آنحضرتؐ سے پہلے جتنے انبیاءؑ آئے، چونکہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف خاص خاص زمانوں میں مبعوث ہوتے تھے، اس لئے دین کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی، چنانچہ ایسے نبیؐ اور دین کی ضرورت تھی، جو پوری دنیا کو ایک راہ پر ڈال سکے۔ جس کی شہادت بائبل میں حضرت عیسیٰؑ نے یوں دی تھی، "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم انھیں برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ سچی روح آئے تو وہ تمہیں صداقت کی ساری راہ بتا دے گی۔" (یوحنا ۱۶ = ۱۲، ۱۳) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت محمدیؐ سے پہلے کوئی شریعت کامل نہیں ہوئی تھی کہ وہ ساری دنیا کا مذہب بن سکتی۔ چنانچہ "اسلام" کا نام شریعت محمدیؐ کا حق ٹھہرا۔

ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام وہ دین ہے، جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک پورا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کرے اور اس کی پیروی کرے۔ کیونکہ خدا کے قانون کے آگے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام ہی اسلام ہے اور قرآن مجید کے مطابق۔ "جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا، اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔" (آل عمران = ۸۵)

دین اسلام کی تعلیمات نہایت سادہ ہمہ گیر اور جامع ہیں۔ اسلام عقائد سے لے کر عمل تک، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ہر طرح سے ہدایات دیتا ہے، اس دنیا میں سیاسی، معاشرتی تمدنی اور اقتصادی زندگی کو بھی اتنی اہمیت حاصل ہے، جتنی اخلاقی نظام اور عبادات کی ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی اصول متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے اور حالات کے تحت قوانین مدون کئے جا سکتے ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظریہ ہے کہ یہ ساری کائنات کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں بلکہ منظم سلطنت ہے، جسے اللہ نے بنایا ہے، وہی اس کا مالک اور وہی اس کا حاکم ہے۔ اس کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ طبعی دنیا تو اللہ کے اس لگے بندھے اصولوں کے ماتحت چل رہی ہے جسے سائنس نے دریافت کرنا شروع کیا ہے، مگر اخلاقی دنیا میں انسان کو اپنا نائب بنایا، اسے علم اور تقدیس دی۔ تمام قوتیں اس کی مطیع کیں، مگر شیطانی اور بدی کی قوت اس کے آگے نہ جھکی اب نائب ہونے کی وجہ سے انسان کا فرض ہے کہ وہ صرف خدا کا ماتحت رہے خدا کی دی ہوئی اشیاء کو اس کے حکم اور مرضی کے مطابق استعمال میں لائے۔ اس کا عمل خدا کے دیئے ہوئے قانون کے مطابق ہو۔ اب اس امر نیابت کا تقاضا ہے کہ دنیا میں رہنے کے دوران میں انسان نے جو غلطیاں کی ہوں۔ اللہ کی دی ہوئی اشیاء کو امانت نہ سمجھا ہو۔ ان میں جو خیانت کی ہو اور بدی کی قوت کے آگے جتنا سر جھکایا ہو، اس کی اسے سزا ملے اور فرض کی ادائیگی جتنے احسن طریقے سے کی ہو اس کا انعام ملے۔

مذاہب عالم کا مطالعہ کریں تو ان میں سے کوئی بھی اپنی موجودہ شکل میں انسانی زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سے محیط نہیں کرتا۔ ان میں سے اکثر محض عبادات پر زور دیتے ہیں یا پھر انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی سے الگ کرتے ہیں۔ یہ محض دین اسلام کی برکت ہے کہ اس نے واضح طور پر ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کر دیا ہے۔

مکمل ضابطۂ حیات کی صورت میں اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک مکمل الہامی دین ہے، جب کہ دیگر مذاہب کی الہامی تعلیمات مسخ شدہ ہیں اور ان میں سے کوئی ایک اپنی صحیح صورت میں موجود نہیں۔ اسلام کی دوسری سب سے بڑی خصوصیت اس کا منظم ضابطہ ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ اس کی ہدایات سے محروم نہیں رہا کیونکہ اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں کہ محض عبادات پر زور دیا جائے اور یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہو کر رہ جائے۔ تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایمان اپنی کامل صورت میں موجود

Marfat.com

ہے۔ یہ ایمان خدا پر، اس کے رسولوں پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر اور حیات بعد الموت پر ہے۔ اس دین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے دین اور دنیا کی مصنوعی علیحدگی کو ختم کر دیا اور ترک دنیا کر کے تلاش خداوندی کو رد کر دیا۔ اسی لئے آنحضورؐ نے فرمایا "اسلام میں ترک دنیا کا کوئی مقام نہیں۔" نیز "دنیا سے اپنا حصہ بھلا نظر انداز نہ کرو۔" ایک اور خصوصیت جس سے اسلام کی امتیازی شان ابھر کر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ اس نے انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان بڑا توازن قائم کر رکھا ہے۔ یہ ہر انسان کو فرداً فرداً ذمہ دار ٹھہرا کر خدا کے سامنے جواب دہ بناتا ہے اور اسے ریاست میں گم ہونے سے روکتا ہے۔ دوسری طرف یہ فرد میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتا ہے اور انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ مالدار زکوٰۃ دیں فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں اور وقت پڑنے پر اسلامی ریاست کے تحفظ کے لئے جان کی قربانی تک پیش کر دیں۔ یہی وہ توازن ہے جسے آنحضورؐ نے عین اسلام کہا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

"میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عائلی زندگی بھی گذارتا ہوں، پس اللہ سے ڈرو۔ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے، ہر حق اس کے حقدار کو ادا کرو، روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو، اور سویا بھی کرو۔"

اسلام نے اعمال کی اساس ایمان کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا ایمان ہی اسلام ہے یا یہ اسلام کا جزو ہے۔ تاہم ایک امر یقینی ہے کہ عقیدہ بغیر ایمان و یقین کے، عمل کے لئے محرک نہیں بن سکتا۔

اسلام میں عقائد کو صریح الفاظ میں پانچ اصولوں پر مبنی رکھا گیا ہے، خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا و سزا کے دن پر ایمان۔ ان حقائق کا اقرار زبان سے کرنا اور یقین دل سے کرنا ضروری ہے۔ انسان سے اسلام کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ پھر ارکان اسلام پر عمل کرے جو تعداد میں پانچ بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی اللہ کی توحید اور آنحضورؐ کی رسالت کا اقرار اور تصدیق کرے۔ اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ سمجھے۔ اس کی عبادت نماز کی صورت میں ادا کرے۔ نفس کشی کے لئے رمضان کے روزے رکھے۔ مال محبت دور کرے اور غریبوں اور مساکین کی مدد کرے، جس کے لئے زکوٰۃ دے اور من حیث القوم واحدہ بیت اللہ کا حج کرے۔

بعض علماء کے نزدیک ارکان ایمان اسلام کے پہلے رکن کا جزو ہیں اور بعض علماء ارکان ایمان کو ارکان اسلام سے الگ جانتے ہیں۔ اس ضمن میں اہل تشیع کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام اور ایمان میں فرق یہ ہے کہ اسلام اقرار توحید اور تصدیق رسالت کا نام ہے۔ اس کے بعد نکاح، میراث اور تحفظ کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ایمان اس سے ایک درجہ بلند ہے۔ یہ اسلام کے دل میں بیٹھ جانے اور عمل کے اظہار کا نام ہے۔ اس کی مثال کعبے اور حرم سے یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص اگر حرم میں موجود ہے تو لازم نہیں کہ وہ کعبے میں ہو اور اگر وہ کعبے میں موجود ہے تو حرم میں اس کا ہونا لازم ہے۔ گویا اسلام لانے والے کا ایمان ظاہر نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے والے کا اسلام لانا ثابت ہے۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے اسلام اور ایمان کے اختلافات کا اظہار ہوتا ہے: "بعض عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ ہم اسلام لائے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔" (الحجرات: ۱۴)

ابن حزم، امام غزالی اور امام احمد بن حنبل جیسے علماء نے ان اختلافات پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگرچہ ایمان اور اسلام دل کی دو مختلف کیفیات اور واردات کا نام ہے مگر یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ یا ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں یا دونوں ایک ہی شے ہیں۔ قسطلانی کے نزدیک یہ حکماً جدا جدا نہیں، البتہ مفہوم میں مختلف ہیں۔ ایمان کا مفہوم تصدیق قلب ہے اور اسلام کا مفہوم اظہار عمل یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کو مسلم نہ کہا جائے اور مسلم کو مومن نہ کہا جائے۔

اسلام کے شرعی معنوں کی تشکیل مسند احمد کی بیان کردہ اس حدیث سے ہو جاتی ہے: حضرت عمرؓ سے روایت ہے۔ "ایک دن ہم رسول اللہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگاہ ایک شخص نمودار ہوا، جس کے کپڑے بہت اجلے اور سفید اور بال نہایت سیاہ تھے۔ اس شخص پر سفر کا کچھ اثر معلوم نہ ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ آنحضورؐ کے پاس پہنچ گیا اور اس نے اپنا زانو آنحضور صلعم کے زانو سے ملا دیا اور اپنی ہتھیلیاں زانوؤں پر رکھ کر عرض کرنے لگا۔

"اے محمدؐ! مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے؟" آپ نے فرمایا "اسلام یہ ہے کہ تو اس امر کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ تو نماز قائم کرے اور یہ کہ تو زکوٰۃ دے اور یہ کہ تو رمضان کے روزے رکھے اور یہ کہ اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔" اس شخص نے کہا "آپ نے درست فرمایا!" حضرت عمرؓ نے کہا کہ "ہم اس پر متعجب ہوئے کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی اس کی تصدیق کرتا ہے"۔ پھر اس نے پوچھا، "آپ مجھے ایمان سے واقف کیجیے!" آنحضورؐ نے فرمایا "ایمان یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت پر اور نیک و بد تقدیر پر ایمان لائے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس پر وہ شخص بولا "آپؐ نے سچ فرمایا۔" پھر اس شخص نے پوچھا "اب مجھے احسان کے بارے میں کچھ بتائیے!" آنحضورؐ نے فرمایا "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے، جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ حالت میسر نہ ہو تو کم از کم تو یہ محسوس کرے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" اسکے جانے کے بعد آنحضورؐ نے پوچھا۔ "اے عمرؓ! جانتے ہو کہ وہ سائل کون تھا؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اللہ اور اللہ کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔" اس پر آپؐ نے فرمایا "وہ جبریل تھا اور تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے آیا تھا۔"

اسلام کی اشاعت و تبلیغ کا فرض صرف رسولؐ ہی کے ذمے نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو آخری نبی کہہ کر یہ فرض پوری امت مسلمہ کو سونپ دیا گیا ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ کے بعد بھی تبلیغ دین کی کوششیں جاری رہیں۔ قرآن حکیم نے تبلیغ دین کے سلسلے میں واضح طور پر یہ ہدایت کر دی تھی کہ "اللہ کی راہ میں دعوت عقل و حکمت، موعظہ حسنہ اور بہتر طریقے سے بحث کے ذریعے دو۔" (النحل: ۱۲۵) مذہب قبول کرنے کے بارے میں کسی قسم کے جبر سے منع کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے "لا اکراہ فی الدین"۔ "دین میں کوئی زبردستی نہیں۔" (البقرہ: ۲۵۶)۔ یہ سچا ہے کہ حق کی حمایت میں تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جہاد کا مقصد لوگوں میں تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانا ہے۔

اسلام میں مذہب کسی خاص طبقے یا فرقے کی اجارہ داری نہیں۔ اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسلام میں تہتر فرقے ہوں گے اور ان میں سے صرف ایک اسلام پر ہوگا۔ اس کی بنا پر ہر فرقہ اور طبقہ خود کو صراط مستقیم پر سمجھتا ہے۔ مگر چونکہ تبلیغ اسلام کی تلقین ہر مسلمان کو کی گئی ہے اس لیے مسلمان جہاں کہیں گئے، تبلیغ کا کام بھی کرتے رہے۔ علماء، فقراء اور صوفیاء کا تو کام ہی تبلیغ دین تھا۔ تاجر اور سیاحوں کے علاوہ عام مسلمان بھی اس فریضہ کو ادا کرتے رہے ہیں۔

دین اسلام کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھی بلکہ دیگر مذاہب پر بھی اس کا اثر پڑا اور ان میں اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ مارٹن لوتھر نے عیسائیت میں

Marfat.com

اصلاح اسلام ہی سے متاثر ہو کر کی۔ ہندوستان میں اسلام ہی کے عقیدۂ توحید نے ہندومت کی صورت بدل کر رکھ دی۔ یہاں بھگتی تحریک سکھ مت اور آریا سماج تحریک نے اسلامی عقیدۂ توحید ہی سے متاثر ہو کر رواج پایا۔

اسلام کو پیش کرنے کا طریقہ چونکہ عقلی اور فکری ہے اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ عقلی دلائل ہی کے ذریعے اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسلام کی وسیع اشاعت کا سبب بھی یہی عقلی دعوت ہے اس کا اثر علمی و فکری دنیا پر بھی ہوا۔ یونانیوں نے کائنات کے بارے میں غور و فکر کی بنیاد استدلال کو بنا رکھا تھا، جبکہ قرآن مجید نے بار بار مشاہدہ تدبّر اور تجزیہ پر زور دے کر تجربی تحریک کو ابھارا، جس نے آگے چل کر جدید سائنس کو جنم دیا۔

یوں تو علوم عقلیہ اسلام سے پہلے بھی رائج تھے، لیکن ہر شخص محض اپنی ضرورت اور شوق کے مطابق جس علم کو چاہتا تھا اور جس قدر چاہتا تھا حاصل کرتا تھا۔ درسگاہیں قائم تھیں لیکن مذہب نے علم حاصل کرنے کی پابندی نہیں لگائی تھی۔ اسلام اور صرف اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے تمام علوم حاصل کرنا مذہب میں داخل کیا اور انہیں ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ تمام دنیا میں گھوم پھر کر مختلف علوم حاصل کرنا، انہیں قلم کے ذریعے ضبط تحریر میں لانا، کتابوں کی صورت میں محفوظ کرنا، اور علوم کی اشاعت کرنا مسلمانوں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ یہ اسلام ہی کا اثر تھا کہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ مشہور مستشرق بریفالٹ لکھتا ہے کہ اہل یورپ ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی طور پر اسلامی تہذیب و تمدن ہی کے ممنون منت ہیں۔

تفصیلات کے لیے دیکھیے متعلقہ مضامین نیز "ارکان اسلام"، "ایمان"، "جہاد" وغیرہ۔

اسلام آباد پاکستان کا وفاقی دارالحکومت، جس کے قیام کی سفارش فروری ۱۹۵۹ء میں صدر پاکستان محمد ایوب خاں کے قائم کردہ کمیشن نے کی اور اسے جون ۱۹۵۹ء میں منظور کر لیا گیا۔ فروری ۱۹۶۰ء میں اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا اور اکتوبر ۱۹۶۱ء میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

اسلام آباد کا شہر پنجاب میں راولپنڈی سے آٹھ میل شمال میں مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کے شمال مشرق کی سمت میں مشہور صحت افزا مقام مری ہے اور مغرب کی جانب ٹیکسلا کا تاریخی شہر ہے۔ اس وفاقی علاقے کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے، جو سطح سمندر سے ۱۶۵۰ سے دو ہزار فٹ تک بلند ہے۔ یہاں کی آب و ہوا معتدل اور مناظر انتہائی جاذب نظر ہیں۔ موسم سرما میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۶۲ء۳ ف اور کم سے کم ۳۰ء۹ ف ہوتا ہے گرمیوں میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۱۰۳ء۵ ف اور کم سے کم ۷۰ء۹ ف تک ہوتا ہے سالانہ بارش کی اوسط ۴۵ انچ ہے۔ اب تک یہاں کی کل آبادی ایک لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے۔

اسلام آباد سے پہلے پاکستان کا مرکزی دارالحکومت کراچی کو قرار دیا گیا تھا۔ پاکستان بنتے ہی کراچی میں سندھ کی صوبائی حکومت نے (زیر تعمیر) اپنے سکرٹریٹ کی عمارت خالی کر دی اور اس میں مرکزی سکرٹریٹ قائم کیا گیا۔ مگر کراچی کی آب و ہوا، اس میں بڑھتی ہوئی آبادی اور لوگوں کی تاجرانہ ذہنیت کی بدولت مرکزی حکومت کسی اور مقام پر منتقل ہو جانے کی کوشش میں لگ گئی۔ بقول صدر محمد ایوب خاں مرکزی حکومت کسی صحت بخش مقام کو منتقل ہو جانے پر غور کر رہی تھی اور اس سلسلے میں کراچی سے کوئی بیس میل دور ایک مقام گڈاپ کا نام لیا جا رہا تھا مگر بعض لوگوں کے دباؤ کے باعث کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ فوجی انقلاب کے بعد اس طرف توجہ دی گئی اور جنرل یحییٰ خاں کی نگرانی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا، جس نے راولپنڈی کے قریب ایک مقام کو اس کام کے لیے چنا۔

اس وقت اسلام آباد میں وفاقی اسمبلی، سکرٹریٹ، دیگر دفاتر، رہائشی سہولتوں اور بنیادی شہری ضرورتوں کے علاوہ اسلام آباد یونیورسٹی، پیپلز اوپن یونیورسٹی اور اٹامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ نیشنل اسمبلی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ دیگر کئی عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔ ان سب میں ایک چیز مشترک رکھی گئی ہے اور وہ ہے باغبانی اور شجر کاری۔ اسلام آباد کی سڑکوں، پارکوں اور عمارتوں کے علاوہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر بھی شجر کاری کی گئی۔ تاکہ ایک طرف تو سبزہ زاروں کا قیام عمل میں آئے اور دوسری طرف مسلمانوں کے قدیم ذوقِ باغبانی کا اظہار ہو۔

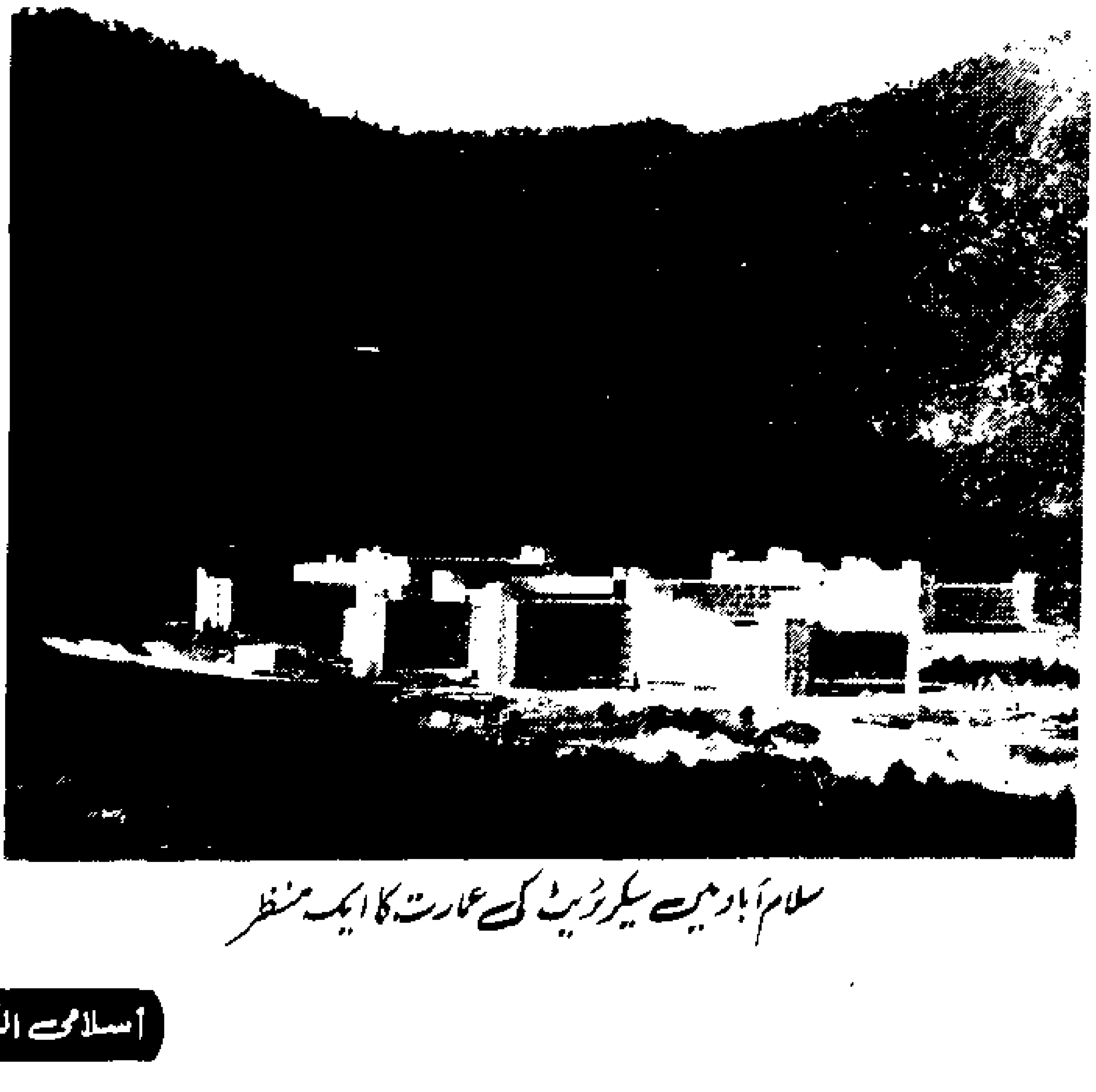

اسلام آباد میں سیکرٹریٹ کی عمارت کا ایک منظر

اسماء الحسنیٰ اچھے نام۔ اسمائے الٰہی۔ جو بقول امام راغب اصفہانی ہر لحاظ سے اچھے، مرغوب اور دل پسند ہیں۔ عام طور پر ان کی تعداد ننانوے تسلیم کی جاتی ہے قاضی سلیمان منصور پوری نے ۱۵۸ ناموں کی فہرست دی ہے۔ جبکہ بعض علماء کے نزدیک یہ تین سو اور بعض کے نزدیک ایک ہزار ہیں۔ اکثر علماء اور صحابہ کے نزدیک اللہ تعالےٰ کے ناموں کی تعداد انبیاء کی تعداد کے برابر ہے۔ کیونکہ ہر نبی کو ایک خاص اسم عطا کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے وہ خداوند تعالےٰ کی بارگاہ میں امداد کا طالب ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان ناموں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اللہ کے سب نام اچھے ہیں۔ اس لئے اسے اچھے ہی نام سے پکارو" (اعراف ۱۸۰)

اللہ کے یہ نام اس کی مختلف صفات کی بنا پر پکارے جاتے ہیں، مگر ان سے اس کی وحدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ نام اس کی ذات لاشریک ہی کی غمازی کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام سے قبل مختلف ناموں سے مختلف خداؤں کے وجود کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے ہاں تو ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہیں۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے، جس نے خدائے واحد کی ذات کی تبلیغ کی اور اسے "اللہ" کہا۔ یہ اس کا ذاتی نام ٹھہرا دیگر نام اس کی صفات اور کاموں کی بنا پر صفاتی اور فعلی کہلاتے ہیں۔ اکثر صوفیاء اور علماء کے نزدیک "اللہ" اسم اعظم ہے اور جب اللہ کی کوئی نہ کوئی صفت سامنے آتی ہے تو اس کے مطابق کوئی نہ کوئی لفظ بطور اسم استعمال کیا جاتا ہے۔

ذیل میں وہ اسمائے حسنیٰ دیے جاتے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم خود بھی اللہ تعالےٰ کی کسی صفت کے مطابق اس کا کوئی نام رکھ کر اسمائے حسنیٰ میں اضافہ کر سکتے ہیں؟ معتزلہ اور کرامیہ کے نزدیک ایسا جائز ہے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک یہ امر تو بہرحال ناجائز

Marfat.com

ہے کہ اپنی عقل و فہم کے مطابق اللہ تعالےٰ کا کوئی نام رکھیں تاہم اگر کسی ایسے مفہوم کا تعین ہو، جس سے ذات الٰہیہ پر کسی ایسے مفہوم کا اضافہ ہو سکے تو اس کا جواز پیدا ہوتا ہے کہ ہم کوئی نام رکھیں، ورنہ نہیں۔ نیز ایسے نام جن کی تصریح اللہ تعالےٰ کے کمال مطلق کے خلاف ہے، سو انہیں سرے سے رد کر دینا چاہیئے مثلاً ہم اللہ تعالےٰ کو عارف نہیں کہہ سکتے۔

ننانوے اسماء الحسنیٰ اور ان کا مفہوم جو شارحین نے دیا ہے، درج ذیل ہے ان میں سے ۲ سے ۱۴ تک اسماء کی ترتیب وہی ہے، جو قرآن مجید میں سورۂ حشر کی آیات ۲۲ تا ۲۴ میں دی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ نام آتے ہیں، جو باعتبار ترجیم ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اکیسویں سے چھبیسویں نام یعنی القابض سے المذل تک کا مادہ تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ مگر بعینہٖ نہیں اس لئے انہیں اسمائے حدیث خیال کیا جاتا ہے اور ان کا دو دو کا جوڑا ہے، جن کا مفہوم ایک دوسرے کی ضد ہے۔ اکثر فہرستوں میں اسم "الواحد" بھی موجود ہے۔ مگر امام غزالیؒ جیسے علماء نے اسے حذف کر دیا ہے یا پھر اگلے اسم "الاحد" سے ملا دیا گیا۔

۱۔ **اللہ** یہ خدا تعالےٰ کا ذاتی نام ہے۔ عربی کے علاوہ اور کسی زبان میں اللہ کا اسم ذات نہیں۔ (دیکھئے "اللہ")

۲۔ **الرحمان** - ۳۔ **الرحیم** بخشنے والا، رحم کرنے والا کہ اس کے سوا اور کوئی بخشنے والا نہیں۔ اہل عرب ان ناموں سے واقف نہیں تھے۔ (نیز دیکھئے "رحمت")

۴۔ **الملک** مالک، صاحب ثروت، بادشاہ، جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے جس کے سوا کوئی مالک حقیقی نہیں۔ وہی سچا اور حقیقی بادشاہ ہے، وہی شہنشاہ ہے۔

۵۔ **القدوس** پاک منزہ، ہر عیب سے مستثنیٰ۔ سب سے الگ ذات۔ حتیٰ کہ روح اور ملائکہ سے بھی ارفع اور پاک ذات ہے۔

۶۔ **السلام** سلامت رہنے والا اور مخلوق کی سلامتی رکھنے والا۔ راحت اور سکون دینے والا وہی ہے جو سلامتی دیتا ہے اور اسلام پر چلاتا ہے۔

۷۔ **المومن** حفاظت کرنے والا، امن دینے والا، کلیتہً مامون ذات۔ اپنی ذات کی گواہی خود دینے والا۔ وہی ایمان دیتا ہے اور وہی امن بخشتا ہے۔ فساد کو مٹانا اور دل کو اطمینان بخشتا ہے۔

۸۔ **المھیمن** نگہبان، مخلوق کے رزق اور موت سے واقف اور خیال رکھنے والا۔ لفظی معنی ہیں۔ چھپا لینے والا۔ گویا وہ اپنی رحمت میں مخلوق کو چھپا لیتا ہے اور اس کی نگہداشت کرتا ہے۔

۹۔ **العزیز** عزت والا۔ بے نظیر، صاحب قوت، یکتا۔ امام غزالی کے نزدیک نادر مشکل الحصول، جسے چاہے سزا دے۔

۱۰۔ **الجبّار** سب سے بڑا حاکم، بڑی قوت والا۔ بگڑے ہوئے کام بنانے والا۔ جس کی حکومت کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ جبر کے معنی درستگی کے ہیں۔ یعنی شکستہ دلوں کو ڈھارس دینے والا۔

۱۱۔ **المتکبر** بہت بڑا، جسکے مرتبے کو کوئی شے نہیں پہنچ سکتی۔ خاص و عام سے بے نیاز اور اس سے بلند و برتر کہ عقل و فہم اس کی قدر معلوم کر سکے۔

۱۲۔ **الخالق**:۔ خلق کرنے والا، اپنی مشیت و حکمت کے مطابق پیدا کرنے والا۔

۱۳۔ **البارئ**:۔ مخلوق کو پیدا کرنے والا۔ (مفہوم میں الخالق کے نزدیک) عدم سے وجود میں لانے والا۔

۱۴۔ **المصوّر** صورت دینے والا۔ ترتیب و تزئین کرنے والا۔ عدم سے وجود میں لانے والا۔ وہ ذات جس نے سب کو جُدا جُدا صورتیں عطا کیں۔

۱۵۔ **الغفار** گناہ بخشنے والا۔ سزا میں کمی کرنے والا۔ مخلوق کے عیب چھپانے والا، قصور معاف کرنے والا۔ غفر کے معنی چھپانے والے کے ہیں۔

۱۶۔ **القہّار** مغلوب کرنے والا، غالب کہ تمام عالم اس کی قدرت کے مقابلے میں عاجز اور مغلوب ہے۔ قہر کے معنی غلبہ کے ہیں۔ قاہر غلبہ رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ قہار سب سے زیادہ غالب۔

۱۷۔ **الوہّاب** بلا معاوضہ بہت کچھ اور مسلسل دینے والا۔ ہبہ یعنی عطیہ دینے والا۔ وہاب کا تعلق رحمت سے ہے۔

۱۸۔ **الرزاق** روزی پیدا کرنے اور مخلوقات تک پہنچانے والا۔ ہر ایک کو اپنی مشیت کے مطابق دینے والا۔

۱۹۔ **الفتّاح** فتح مند، رحمت کا دروازہ کھولنے والا، حکم سنا کر فیصلہ کرنے والا، انسانوں کے قلوب اور اذہان کھولنے والا۔

۲۰۔ **العلیم** ہر بات کو جاننے والا۔ خواہ وہ باتیں کھلی ہوں یا چھپی ہوں۔ علم دینے والے کو بھی علیم کہا جاتا ہے۔ وہ ذات جو جزئیات اور مستقبل کا مکمل علم رکھتی ہے

۲۱۔ **القابض** روک لینے والا، قبضے میں کر لینے والا۔ کائنات کی ہر شے پر محیط۔

۲۲۔ **الباسط** کشادہ کرنے والا۔ رزق وسیع کرنے والا۔ علم یا طاقت پھیلانے والا۔

۲۳۔ **الخافض**:۔ پست کرنے والا۔ کافروں کو عاجز کر دینے والا۔

۲۴۔ **الرافع**:۔ بلند کرنے والا۔ ایمان لانے والوں کو مرتبہ میں بڑھانے والا۔

۲۵۔ **المعز**:۔ عزت دینے والا۔ اپنی مخلوق کو طاقت اور عزت بخشنے والا۔

۲۶۔ **المذل**:۔ ذلت دینے والا۔ کافروں کا درجہ گھٹانے والا۔

۲۷۔ **السمیع** سننے والا۔ ہر ظاہر اور چھپی بات اور دعا کو سننے والا ہر مخلوق کی بات کو سننے والا، خواہ وہ مخلوق بے زبان ہو۔

۲۸۔ **البصیر** دیکھنے والا۔ ہر اچھے اور برے کام کو دیکھنے والا، مخلوقات کی نگرانی کرنے والا۔ ادراک رکھنے والا۔ بصارت دینے والا۔

۲۹۔ **الحکم**:۔ حکم دینے والا، اپنے احکامات کی بنا پر فیصلہ کرنے والا۔

۳۰۔ **العدل**:۔ انصاف کرنے والا، سب سے بڑا منصف۔

۳۱۔ **اللطیف** لطف اور مہربانی کرنے والا، باریک بین، نیکی اور نرمی کرنے والا۔ کرم کرنے والا نیتوں کو جاننے والا۔

۳۲۔ **الخبیر** خبر رکھنے والا، بھید جاننے والا، ہر ظاہر اور پوشیدہ بات اور کام سے آگاہ۔ جملہ واقعات کی خبر اسی ذات کو ہے۔

۳۳۔ **الحلیم** حلم والا، بردباری کرنے والا۔ گناہوں کو معاف کر دینے والا۔ جلد عذاب نہ دینے والا۔

۳۴۔ **العظیم** بزرگ و برتر۔ سب سے بڑا، جس کی بڑائی کو فہم انسانی بھی نہ پہنچ سکے اس عظمت والا، جس کے سامنے ہر بڑی شے ہیچ ہے

۳۵۔ **الغفور** مغفرت کرنے والا، چشم پوشی کرنے والا، مطلق بخشنے والا۔ بے انتہا بخشش کرنے والا۔

۳۶۔ **الشکور**:۔ قدردان، زیادہ اجر دینے والا۔ قبول کرنے والا۔ توفیق شکر دینے والا۔

Marfat.com

۳۷ ۔ العلی :۔ بلند مرتبہ ، بلند ترین درجے پر فائز ، جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا جو سب سے برتر ہے
۳۸ ۔ الکبیر :۔ سب سے بڑا بزرگ ترین ہستی ۔ زمان و مکان میں ارفع و اعلیٰ ۔
۳۹ ۔ الحفیظ :۔ مخلوقات کی حفاظت کرنے والا ۔ ہوشیار ، نگہبان ، جو ہمہ وقت محافظ ہے ۔
۴۰ ۔ المقیت زندگی کے لوازم دینے والا ، قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا ۔ ہر بات کو جاننے والا ۔ قوت دینے والا ۔ تقویت عطا کرنے والا ۔
۴۱ ۔ الحسیب حساب لینے والا ، فیصلہ کرنے والا ، توازن رکھنے والا ۔ کفایت کرنے والا وہی ذات کافی ہے ۔ اس کے سوا کسی اور کی پناہ کی ضرورت نہیں ۔
۴۲ ۔ الجلیل :۔ صاحب جلال ، بزرگ ، پُرشکوہ ۔
۴۳ الکریم کرم کرنے والا ، مہربان ، بخشش و عطا کرنے والا ۔ فیّاض ، خطا بخشنے والا ، صاحب کرامت ۔
۴۴ ۔ الرقیب :۔ نگہبان ۔ (الغزالی کے نزدیک اس کا مفہوم الحفیظ کے قریب ہے) سلامتی اور حفاظت دینے والا
۴۵ ۔ المجیب :۔ جواب دینے والا ، دعا سننے والا ۔ پکارنے والوں کی مدد کو پہنچنے والا ۔
۴۶ ۔ الواسع فراخ ، ہر جگہ موجود ، ہر شے اور ہر بات تک پہنچنے والا ۔ دنیا کی ہر شے پر قادر جس کا علم اور رحمت ہر شے کو محیط ہے ۔
۴۷ ۔ الحکیم حکمت والا ۔ (العلیم کا مترادف) حقائق و اسرار کا جاننے والا ۔ تدبیر کرنے والا ۔ دانش و حکمت دینے والا ۔
۴۸ ۔ الودود بہت زیادہ محبت کرنے والا ، دوستوں کا سب سے بڑا دوست ۔ وہ ذات جو محب بھی ہے اور محبوب بھی ۔ یہ اس کی صفت ہے ۔ ذات نہیں ۔
۴۹ ۔ المجید :۔ عالی شان ، اپنی ذات اور افعال میں بزرگ ، ثنا کا مستحق ۔
۵۰ ۔ الباعث :۔ دوبارہ زندہ کرنے والا ، مُردوں اور غافلوں کو اٹھانے والا ۔
۵۱ ۔ الشہید :۔ گواہ ، واقف ، ظاہر و باطن ہر حاضر ۔ علم اور خبر رکھنے والا ۔ علم اور خبر دینے والا
۵۲ ۔ الحق سچا ، حقیقی ، خدائی کے لائق ، واجب الوجود ، سچائی کا مالک ، جس کے سوا ہر شے باطل اور معدوم ہے ۔
۵۳ ۔ الوکیل بندوں کا کارساز ، ضرورتوں کا خیال رکھنے والا ۔ مرادیں پوری کرنے والا ۔ نعمتیں دینے والا ۔
۵۴ ۔ القوی :۔ قوت والا ، جس کے زیر قوت ہر چیز ہے ۔ نیز قوت دینے والا کہ تمام قوتیں اسی سے حاصل ہوتی ہیں ۔
۵۵ ۔ المتین :۔ استوار ، مستحکم جسے ہٹایا نہیں جا سکتا ۔ جس کے کاموں میں کسی شے کی رکاوٹ نہیں ۔
۵۶ ۔ الولی :۔ دوستوں کا مددگار ، ساتھی ، مالک و محافظ ، قریبی ، محبت کرنے والا ، بلند درجہ کا مالک ۔
۵۷ ۔ الحمید :۔ شکر اور تعریف کے لائق ، ثنا کا مستحق ، اپنی ذات و صفات کی تعریف کرنے والا تمام تعریفیں اسی ذات کے لئے ہیں ۔
۵۸ ۔ المحصی :۔ گھیرنے والا ، ہر شے پر محیط ، ہر شے کو جاننے والا ، صاحب ادراک
۵۹ ۔ المبدی :۔ پہلی بار پیدا کرنے والا ، خالق مطلق ۔
۶۰ ۔ المعید :۔ دوسری بار پیدا کرنے والا ، دوبارہ زندہ کرنے والا ۔
۶۱ ۔ المحی :۔ زندہ کرنے والا ، حیات دینے والا زندگی پیدا کرنے والا ۔ احیاء کرنے والا
۶۲ ۔ الممیت :۔ موت دینے والا ، خالق باری جو مارتا اور جلاتا ہے ۔
۶۳ ۔ الحیّ :۔ ہمیشہ زندہ ، (یہ نام صفات ذاتی میں شمار ہوتا ہے) نیز زندگی اسی سے ہے
۶۴ ۔ القیوم :۔ اپنی ذات پر قائم ۔ خود بخود قائم ، قائم رکھنے والا ۔

۶۵ ۔ الواجد :۔ غنی بے پرواہ ، جو کسی چیز کا محتاج نہیں ، اس کے پاس ہر شے ہے
۶۶ ۔ الماجد :۔ بزرگ ، درجے میں بلند ترین (مجید کے قریبی مفہوم میں)
۶۷ ۔ الواحد الاحد :۔ یکتا بے مثل ، اعلیٰ و بے نظیر جس کے سوا اور کوئی نہیں ۔ اور نہ کوئی اس کی مثل کو پہنچ سکتا ہے ۔ (یہ نام بھی اسمائے ذات میں شامل ہے ۔)
۶۸ ۔ الصمد :۔ منفرد ، بے پرواہ ، بلند اور محکم ، آمیزش سے پاک ، جس کی ذات سے کوئی شے نہیں نکلی اور جس کی سب کو احتیاج ہے ۔ مگر اسے کسی شے کی ضرورت نہیں ۔
۶۹ ۔ القادر :۔ قدرت والا ۔ غالب آنے والا ۔ اندازہ کرنے والا ۔ قیمت رکھنے والا ۔ سب پر غالب ۔
۷۰ ۔ المقتدر :۔ اقتدار رکھنے والا ، سب پر غالب ۔
۷۱ ۔ المقدم :۔ قریب کرنے والا ۔ نزدیک رکھنے والا ۔ سب سے آگے اور قریب ۔
۷۲ ۔ المؤخر :۔ دور رکھنے والا ، سب سے بعد اور دور کرنے
۷۳ ۔ الاوّل :۔ سب سے پہلے ۔ جس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی ۔
۷۴ ۔ الآخر :۔ سب سے بعد ، جس کے بعد کوئی شے نہیں ۔
۷۵ ۔ الظاہر :۔ کھلا ہوا ، معلوم ، جانا گیا ، پہچانا ہوا اور ظاہری اعمال کو جاننے والا ۔
۷۶ ۔ الباطن :۔ پوشیدہ ۔ صفات و کمال کے لحاظ سے مخلوقات کی نظر سے چھپا ہوا ۔ اور چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ۔
۷۷ ۔ الوالی :۔ کارساز ، مالک ، دوست رکھنے والا ، تسلط رکھنے والا ۔ تصرف رکھنے والا ۔
۷۸ ۔ المتعالی :۔ بہت بلند ، غلبے کے ساتھ بلند ۔ ہر ایک عالی مرتبے سے بلند ۔
۷۹ ۔ البر :۔ خیر مطلق ، نیکی کا منبع ، نیکی کی توفیق دینے والا ۔
۸۰ ۔ التوّاب :۔ توبہ کو قبول کرنے والا ، توبہ کرنے والوں کی طرف رجوع کرنے والا ۔
۸۱ ۔ المنتقم :۔ سزا دینے والا ، نافرمانوں کو برائیوں کا بدلہ دینے والا ۔
۸۲ ۔ العفو :۔ معاف کرنے والا ، نامۂ اعمال سے گناہوں کو ختم کرنے والا ۔ بخشنے والا چھوڑ دینے والا ۔
۸۳ ۔ الرؤف :۔ رحم دل بوجھ ہلکا کرنے والا (الغزالی کے نزدیک الرحمان کے قریبی مفہوم میں ۔)
۸۴ ۔ مالک الملک :۔ عالم کا مالک ، تمام مخلوق کا کامل مقتدر ، جسے پورے عالم پر خود مختارانہ اقتدار حاصل ہے ۔
۸۵ ۔ ذوالجلال والاکرام :۔ عظمت والا اور فیاضی والا ۔ (آمدی کے نزدیک اس کا مفہوم الجلیل کے قریب ہے)
۸۶ ۔ المقسط :۔ میزان کرنے والا ۔ انصاف کرنے والا ۔ مساوی کرنے والا ۔
۸۷ ۔ الجامع :۔ اکٹھا کرنے والا ، یوم حشر میں جمع کرنے والا ۔ اختلافات اور تضاد کو ختم کرنے والا ۔
۸۸ ۔ الغنی :۔ بے نیاز ۔ جسے کسی شے کی ضرورت نہیں ۔ عزت ، دولت ، اولاد کنبہ وغیرہ سے پاک ۔
۸۹ ۔ المغنی :۔ غنا کرنے والا ، مخلوق کو اس کی ضروریات دینے والا ۔ مخلوق کو اس کے کمال تک پہنچانے والا ،
۹۰ ۔ المانع :۔ (یہ نام صرف حدیث میں آیا ہے ۔) مصائب کو دور کرنے اور مخلوقات کی حفاظت کرنے والا ۔
۹۱ ۔ الضار :۔ ضرر پہنچانے والا اور (۹۲) النافع :۔ فائدہ پہنچانے والا ۔ ان دو ناموں کا جو فقط حدیث میں وارد ہوئے ، مفہوم یہ ہے "اللہ ہی ہے ۔ جس کی طرف سے

Marfat.com

خوش حالی اور مصیبت نازل ہوتی ہے۔"

۹۳ - المنور :- روشن، ظاہر، اپنی شہادت خود دینے والا - ہر شے کو وجود بخشنے والا۔

۹۴ - الہادی :- راہ دکھلانے والا - ہر قسم کی مخلوق کو خواب، الہام، وحی یا دیگر ذرائع سے اس کے انجام کی طرف رہنمائی کرنے والا۔

۹۵ - البدیع :- ہر شے کی ابتدا کرنے والا - خالق اوّل - جو ہر شے کی تخلیق سے پہلے موجود تھا۔

۹۶ - الباقی :- رہنے والا - ہر شے کے خاتمے کے بعد باقی رہ جانے والا ہمیشہ موجود

۹۷ - الوارث :- ہر چیز کا اس کے خاتمے کے بعد مالک، جس کے قبضے میں ہر شے ہے، ہر مخلوق اسی کی طرف جائے گی۔

۹۸ الرشید :- راستے پر ڈالنے والا - راہ دکھلانے والا - ہدایت کرنے والا۔

۹۹ - الصبور :- صبر سے کام لینے والا - سزا دینے میں دیر کرنے والا - (یہ نام فقط حدیث میں آیا ہے۔)

ان ننانوے پاک ناموں کے علاوہ اللہ تعالے کو کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱ الرّب :- درجہ کمال کو پہنچا ہوا، قرآن مجید میں یہ اسم بکثرت آیا ہے۔ اس کے معنی مالک، پالنے والا، سب سے بہتر پالنے والا، درجہ بدرجہ ترقی دینے والا اور درجہ کمال کو پہنچا ہوا کے لئے جاتے ہیں۔ وہ ذات جو تمام مخلوقات کو پالتی ہے اور ان کی پرورش کی نگہداشت کرتی ہے۔

۲ - الرازق :- رزق دینے والا (مفہوم میں رزاق کے قریب)

۳ - الکافی :- کفایت کرنے والا، جس کے سوا کوئی ذات احتیاج پوری نہیں کرتی - کمی پوری کرنے والا۔

۴ - القاہر :- غلبہ رکھنے والا، بلند و برتر ذات، قہار۔

۵ - الناظر :- دیکھنے والا، نگران، نگہبان، محافظ، منتظم۔

۶ - الصادق :- سچا، حق، وعدہ کا پکّا۔

۷ - الجمیل :- حسین، خیر کثیر عطا کرنے والا - حسن کثیر، خیر محض۔

۸ - الفاطر :- فطرت پیدا کرنے والا - پہلی پیدائش دینے والا - خالق کائنات۔

۹ - البرہان :- روشن اور واضح۔

۱۰ - الشدید :- گرہ دینے والا، قوی، غالب، شدت رکھنے والا۔

۱۱ - القریب :- نزدیک - ساتھی - ہمدرد، دوست، جس سے قریب تر اور کوئی ذات نہیں

۱۲ - القائم :- قائم رہنے والا، قائم رکھنے والا - حفاظت کرنے والا۔

۱۳ - الواقی :- بچانے والا، شر سے اور ٹوٹ پھوٹ سے بچانے والا۔

۱۴ - المنیر :- روشن کرنے والا، نور دینے والا، روشنی کا خالق، نور کا مبداء۔

۱۵ - الحافظ :- حفاظت کرنے والا - قائم و بحال رکھنے والا - نگہداشت کرنے والا

۱۶ - القدیم :- ہمیشہ سے موجود - سب سے قدیم ذات، جس سے پہلے کوئی نہیں۔

۱۷ - السامع :- سننے والا سمیع۔

۱۸ - المعطی :- عطا کرنے والا بخشش کرنے والا - انعام دینے والا۔

۱۹ - التام :- مکمل - جس میں کوئی نقص نہیں۔

۲۰ - العلام :- بہت زیادہ جاننے والا - علام الغیوب، پوشیدہ باتوں کو جاننے والا، علیم و خبیر۔

۲۱ - الابد :- جس کی کوئی انتہا نہیں، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۲۲ - الوتر :- یکتا، واحد، احد۔

۲۳ - الحنان : شفیق، رحمت کرنے والا۔

۲۴ - المنان :- احسان کرنے والا، جس کے کثیر انعامات کا بار مخلوق پر ہے۔

۲۵ - الکفیل :- ذمہ داری لینے والا، کفالت کرنے والا - حاجتیں پوری کرنے والا۔

۲۶ - المحیط :- چھایا ہوا، گھیرے ہوئے - ساری کائنات کا محافظ - جس کی قدرت ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۲۷ - الرفیع :- رفعت والا، بلندیوں والا بلندی عطا کرنے والا۔

۲۸ - الشاکر :- شکر والا، شکرگزاری قبول کرنے والا - شکر کی طاقت اور توفیق عطا کرنے والا۔

۲۹ - الاکرم :- شرف اور بزرگی والا - ہر شے پر کرم اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔

۳۰ - القدیر :- ہر فعل اپنی قدرت سے کرنے والا، ہر شے پر قادر۔

۳۱ - الخلاق :- بہت بڑا خالق، پیدا کرنے والا، تخلیق کرنے والا۔

۳۲ - الفاتح :- کھولنے والا، فتح و نصرت کے دروازے وا کرنے والا - دل و دماغ روشن کرنے والا۔

۳۳ - المثیب :- ثواب دینے والا - نیکی اور دعا کو قبول کرنے والا۔

۳۴ - العالم :- علم رکھنے والا - ہر شے کو جاننے والا - عالم مطلق۔

۳۵ - المولیٰ :- مددگار، احتیاج پوری کرنے والا - آقا، مالک، جو اعانت و نصرت عطا کرتا ہے

۳۶ - النصیر :- نصرت دینے والا - عون و مدد دینے والا، فتح عطا کرنے والا۔

۳۷ - ذوالطول :- جود و سخا والا، مہربان، رحیم

۳۸ - ذوالمعارج :- بلندیوں والا - عروج پر پہنچا ہوا۔

۳۹ - ذوالفضل :- فضل والا، بزرگی والا، افضل، متفضل۔

۴۰ - المبین :- وہ ذات جس کے ساتھ پیوستگی ہے - پاس آنے والا - ہر شے اسی سے پیدا اور آشکارا ہے۔

۴۱ - الالٰہ :- معبود، لائق عبادت (دیکھئے "اللہ")

۴۲ - المدبّر :- تدبیر کرنے والا - پس پردہ فاعل حقیقی۔

۴۳ - الفرد :- ذات واحدہٗ لاشریک - منفرد

۴۴ - السریع :- انتہائی سرعت کے ساتھ، تیار۔

۴۵ - المتفضل :- فضل کرنے والا، افضل ذات

۴۶ - الغافر :- چھپانے والا - مغفرت کرنے والا - بخشنے والا - غفور رحیم

۴۷ - القابل :- قبول کرنے والا - عبادت و ثنا کے لائق۔

۴۸ - الملیک :- مالک، بادشاہ - بلا شرکت غیرے قابض۔

۴۹ - المعین :- مدد رساں، اعانت کرنے والا۔

۵۰ - الحاکم :- حکمت والا، اصل حاکم۔

۵۱ - الغالب :- برتر، چھایا ہوا، قابض، غلبہ کا مالک۔

۵۲ - الاعلیٰ :- ہر شریک سے برتر، نہایت بلند اور اعلیٰ

۵۳ - الحفی :- بہت مہربان، ساری کائنات پر مہربان۔

۵۴ - المنعم :- انعام کرنے والا، نعمت دینے والا، عطا کرنے والا۔

۵۵ - المستعان :- مدد دینے والا (امام جعفر صادق کے نزدیک یہ اسم الحسنیٰ میں اہم ہے۔)

- قرآن مجید کی بعض آیات میں مندرجہ اسماء بھی ملتے ہیں۔

واسع المغفرۃ (مغفرت کو وسعت دینے والا)، اہل التقویٰ (تقویٰ کا مالک)، اہل المغفرۃ (مغفرت کا مالک)، احکم الحاکمین (سب حاکموں سے بڑھ کر حکم دینے والا) احسن الخالقین

Marfat.com

(سب سے بہتر تسلی کرنے والا) کاشف الضر (نقصان دور کرنے والا) اسرع الحاسبین (سب سے جلد حساب کرنے والا) المجیر (پناہ دینے والا) المرھوب (ہیبت والا) المستجار (جس سے پناہ مانگی جائے)، المستعان (جس سے عرض کیا جائے)، المعاذ (پناہ)، الملجا (ٹھکانا)، المنجی (نجات دہندہ)، المستغاث (فریاد سننے والا) دائم المعروف (ہمیشہ سے بخشش کرنے والا) قاضی الامور (معاملات کا فیصلہ کرنے والا) مقلب القلوب (دلوں کو بدل دینے والا)

(صفات الٰہیہ کے لئے مزید دیکھئے "اللہ")

اسماء الرجال ایک فن، جس میں حدیث کی تحقیق کے لئے راویوں کے سوانحی حالات پوری تنقید کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ فن سیرت نگاری و تذکرہ نویسی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اس فن کی ضرورت احادیث کی پرکھ اور تحقیق کے لئے پیش آئی اور بقول ڈاکٹر اسپرنگر "حضرت محمد صلعم کے حالات و واقعات جمع اور فراہم کرنے کے لئے مسلمان مصنفین اور محققین نے تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں کے سوانحی حالات و واقعات مرتب اور مدوّن کئے۔"

آنحضورؐ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کو مسلمانوں نے جس طرح سے محفوظ کیا، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسی کے واسطے سے احادیث بیان کرنے والوں کی سیرت اور حالات بھی تاریخ کا حصہ بنتے گئے۔ ان میں صحابہ کرام تابعین، تبع تابعین اور چوتھی صدی ہجری تک کے لوگ شامل ہیں۔ ان میں بارہ ہزار اشخاص وہ ہیں، جنہیں اپنی زندگی میں آنحضورؐ سے ملنے اور گفتگو کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک نے کوئی نہ کوئی فیض ضرور حاصل کیا، کوئی نہ کوئی بات ضرور دریافت کی اور اس کے سامنے آنحضورؐ کا کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور گذرا۔ یہ سب باتیں کسی نہ کسی نے آنحضورؐ کے اس فرمان کے مطابق کہ "مجھ سے جو کچھ سنو، دوسروں تک پہنچاؤ" آگے ضرور بیان کیں۔ شب و روز صحابہ کرام کا یہی کام تھا۔ ان کے بعد آنے والے تابعین کہلائے۔ انہوں نے صحابہ کے حوالے سے ان روایات کو آگے پہنچایا۔ ان کے بعد آنے والی نسل تبع تابعین کہلائی۔ وہ بھی اسی کام پر کمربستہ ہوگئی۔ یوں یہ سلسلہ ایک راوی سے دوسرے راوی تک چلتا رہا۔ محدثین نے، جنہوں نے اسے باقاعدہ علم کی حیثیت دی ان کا استناد کرنے اور سچ جھوٹ کی پرکھ کرنے کے لئے 'روایت کرنے والوں کے حالات و واقعات بھی جمع کئے' تاکہ تاریخ اسلام کا کوئی گوشہ ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہے۔

اسماء الرجال میں حدیث و سیرت کے راویوں کے زندگی کے حالات پر تنقید اور جرح کی جاتی ہے اور جو نقص یا عیب راوی میں پایا جائے، اسے صاف طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس امر میں کسی شخصیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اس سے محدثین اور محققین کا اصل مدعا یہ تھا کہ ہر حدیث کے متعلق دیکھا جائے کہ اس کا روایت کرنے والا اور بیان کرنے والا کس حیثیت اور دیانت کا شخص ہے۔ کہیں وہ جھوٹا اور فریبی، غیر معتبر یا بے ایمان تو نہیں۔

اس فن میں سب سے پہلی کتاب یحییٰ بن سعید القطان کی تصنیف کہی جاتی ہے۔ ان کا سال وفات ۱۹۸ھ/۸۱۲ء ہے۔ بعد میں یہ فن بڑھتا اور ترقی کرتا رہا۔ علامہ شبلی کے مطابق عقیلی، امام رازی، امام دارقطنی اور ابن عدی کی کتب رجال اگرچہ ناپید ہیں، مگر بعد کی تصنیفات کا بنیادی ماخذ یہی ہیں۔

فن اسماء الرجال کی قدیم ترین کتابوں میں "طبقات" ابن سعد کو اولیت حاصل ہے محدثین نے اسے نہایت مستند اور صحیح کتاب سمجھا ہے۔ اس میں آنحضورؐ، صحابہ اور تابعین کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے بعد اس فن کی نادر الوجود کتاب امام بخاریؒ کی "تاریخ" ہے، جو تین جلدوں (کبیر، اوسط اور صغیر) میں لکھی گئی۔ ان کے بعد امام مسلم نے "المفردات والوحدان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ ان کی زندگی ہی میں احمد بن عبداللہ العجلی (۲۶۱ھ/۸۷۵ء) نے اس فن میں ایک مفید کتاب "الجرح والتعدیل" لکھی۔ امام عبدالرحمان بن ابی حاتم الرازی (۳۲۷ھ/۹۳۹ء) کی کتاب کا نام بھی "الجرح والتعدیل" تھا۔ علامہ ابو احمد عبداللہ بن محمد ابن قطان (۳۶۵ھ/۹۷۶ء) کی کتاب "الکامل" اس فن میں وقیع تر سمجھی جاتی ہے اور سب سے زیادہ جامع اور مستند ترین کتاب "تہذیب الکمال" ہے جو علامہ مزی یوسف بن زکی کی تصنیف ہے علامہ ذہبی نے اس کی تلخیص کی ہے۔ صحاح ستہ کے راویوں کے بارے میں یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کی ایک شرح علامہ ابن حجر نے بھی لکھی، جس کا نام "تہذیب التہذیب" ہے۔ ان کے بعد اس فن پر لکھنے والوں میں سے ابن عبدالبر، بیہقی، ابن اثیر ابن جوزی حافظ نووی، علامہ سیوطی اور السخاوی اہم ہیں۔ اس کے بعد یہ دبستان ختم ہو جاتا ہے اور اسماء الرجال کی کتابوں کا انداز سیرت کی عام کتابوں کی مانند ہو جاتا ہے۔

اہل تشیع کے ہاں اس فن پر لکھنے والوں میں عبداللہ بن حسین الشستری، ابومحمد عبداللہ بن جبلہ الواقفی، ابوجعفر احمد بن محمد البرقی، ابوعبداللہ محمد بن الحسن المحاربی، ابوعمرو محمد بن عمر الکشی، ابن بابویہ القمی، ابن الکوفی، عبداللہ بن محمد بن عبداللہ المامقانی اور محمد استرآبادی قابل ذکر ہیں۔

اسماء بنت ابی بکرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی، ملقب بہ ذات النطاقین ہجرت سے ستائیس سال قبل قتیلہ بنت عبدالعزیٰ کے بطن سے مکہ معظمہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کا شمار اسلام لانے میں سبقت لے جانے والوں میں ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلعم نے اپنے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہجرت کا آغاز کیا اور مکے کے قریب غار ثور کو اپنا پہلا مسکن بنایا تو حضرت اسماءؓ رات کے وقت وہاں سامان خورد و نوش بہم پہنچایا کرتی تھیں۔ جب آنحضورؐ نے غار ثور سے مدینے کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس موقعہ پر سامان خورد و نوش باندھنے کے لئے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی تو حضرت اسماءؓ نے اپنی کمر سے پیٹی کھولی اور اس کے دو حصے کئے۔ ایک میں کھانا باندھا اور دوسرے سے مشکیزے کا منہ بند کیا۔ محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ دوسرا ٹکڑا اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ یہ ایثار آنحضورؐ کو پسند آیا اور آپ نے حضرت اسماءؓ کو "ذات النطاقین" کے خطاب سے نوازا۔

حضرت اسماءؓ کی شادی حضرت زبیرؓ بن عوام سے ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد آپؓ نے پہلے قبا میں قیام فرمایا۔ سال اوّل میں آپ کے بطن سے عبداللہ بن زبیرؓ جیسی عظیم شخصیت نے جنم لیا۔ یہ پہلے بچے تھے، جو کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بعد حضرت اسماءؓ کے ہاں کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ آخری عمر میں حضرت زبیرؓ نے شاید ان کی تیز مزاجی کے باعث انہیں طلاق دے دی۔ حضرت اسماءؓ اپنے صاحبزادے کے ہاں چلی آئیں اور تادم مرگ یہیں قیام فرمایا۔ ان کی زندگی ہی میں حضرت زبیرؓ واقعہ جمل سے واپس آتے ہوئے ابن جرموز کے ہاتھوں اور حضرت عبداللہؓ بن زبیر، حجاج بن یوسف کے مقابلے میں شہید ہوئے۔ ان کی لاش تین روز تک سولی پر لٹکتی رہی۔ حضرت اسماءؓ نے یہ منظر بڑے تحمل سے دیکھا۔ مگر چند ہی روز بعد خود بھی انتقال کر گئیں۔ آپؓ کا شمار جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔ آپؓ بڑی خوددار جرأت مند اور باہمت خاتون تھیں۔ حجاج جیسے ظالم و جابر کے دبدبے کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ طبعاً بڑی فیاض اور ہمدرد تھیں۔ ان کے زہد و ایثار کے بارے میں اکثر روایات ملتی ہیں۔

Marfat.com

اسمأ بنت عمیس قبیلہ کنانہ کی ایک خاتون صحابیہ، جن کا شمار اوّل اسلام لانے والوں میں ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ طیار کے نکاح میں آئیں۔ حبشہ کی ہجرت میں بھی شریک ہوئیں اور کئی برس تک وہاں اقامت پذیر رہیں۔ فتح خیبر کے بعد مدینہ آئیں۔ ۸ھ میں حضرت جعفرؓ طیار نے جنگ موتہ میں شہادت پائی تو اس کے کوئی چھ ماہ بعد آپ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے نکاح میں آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے انتقال کیا تو وصیت کے مطابق ان کی میت کو آپ ہی نے غسل دیا۔ اس کے بعد آپ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں اور ان کی شہادت کے بعد انتقال کیا۔

اسماعیل علیہ السّلام اللہ تعالےٰ کے پیغمبر، ذبیح اللہ، بنو قریش کے جدّ امجد، حضرت ابراہیمؑ کے بڑے فرزند، حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق ان کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی برس تھی۔ ان کے تیرہ یا چودہ برس بعد حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔

عبرانی زبان میں اسماعیل کو شموع ایل کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں۔ "اللہ کا سنا" گویا اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن کر انہیں فرزند عطا کیا۔ (دیکھئے "ابراہیمؑ")

حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ دو واقعات منسوب ہیں۔ ایک واقعہ ذبح و فدا اور دوسرا ان کے ذریعے چشمۂ زمزم کا وجود میں آنا۔ روایت کے مطابق حضرت اسماعیلؑ ذرا بڑے ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اللہ کی خوشنودی کے لیے ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بلا تامل خود کو اللہ کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ چنانچہ ان کا لقب "ذبیح اللہ" ٹھہرا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک یہ سعادت حضرت اسحاقؑ کو حاصل ہوئی تھی۔ لیکن خود اسرائیلی تصریحات کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کو ذبح کے لیے پیش کیا۔ جب کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے قبل حضرت اسمٰعیلؑ ہی اکلوتے فرزند تھے۔ قرآن مجید میں اس واقعے کا ذکر یوں آتا ہے:۔

"پس جب وہ مقام "سعی" پر پہنچے تو انھوں نے کہا، اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ حضرت اسماعیلؑ نے کہا، اے میرے باپ! آپ کو جو حکم ملا ہے، آپ اس کی تعمیل کریں ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔ پس جب دونوں نے خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا تو باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔ (اسوقت) ہم نے آواز دی، اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچا کر دکھایا اور ہم نیکو کاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ ایک آزمائش تھی اور ہم نے فدیہ کے طور پر ذبح عظیم سے اسے نوازا۔" (۳۷: ۱۰۱ تا ۱۰۷)

حضرت اسماعیلؑ نوجوان ہوئے تو اس وقت تک حضرت اسحاقؑ پیدا ہو چکے تھے شاید کسی خانگی چپقلش یا بیویوں کی رقابت کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ اللہ کے حکم سے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو عرب کے ریگزاروں میں اس مقام پر چھوڑ آئے، جسے آج مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق اس وقت حضرت اسماعیلؑ شیر خوار تھے اور ذبح و فدا کا واقعہ اس سے بعد کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ان کے لیے تھوڑا سا سامان خورد و نوش، کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک مشکیزہ چھوڑ گئے۔ جب یہ سامان ختم ہو گیا تو حضرت ہاجرہؑ ادھر اُدھر دوڑیں۔ اس عالم پریشانی میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے سات چکر لگائے۔ اسی اثنا میں اللہ کے حکم سے اس مقام پر زمزم کا چشمہ ابلنے لگا، جہاں حضرت اسماعیلؑ لیٹے ہوئے تھے۔ (دیکھئے "آب زمزم")

آب زمزم پر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کی ملکیت تھی اور آتے جاتے قبائل ان سے اشیائے خورد و نوش کے بدلے میں پانی حاصل کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک قبیلہ بنی جرہم تھا۔ جو وہیں آباد ہو گیا۔

محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنو جرہم کی ایک لڑکی کے ساتھ حضرت اسماعیل کا عقد ہوا اور اس مقام پر جہاں بعد میں کعبے کی تعمیر ہوئی، سکونت اختیار کر لی۔ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب ان سے ملنے آئے تو حضرت اسماعیلؑ وہاں موجود نہ تھے۔ آپ نے ان کی بیوی سے دریافت کیا، گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ جب تمہارے شوہر آجائیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور پیغام دینا کہ گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ حضرت اسماعیلؑ گھر آئے تو بیوی نے یہ پیغام دیا۔ اس کی تعمیل میں حضرت اسماعیلؑ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اسی قبیلہ کی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا۔ اتفاق سے حضرت ابراہیمؑ پھر ان سے ملنے کے لیے آئے۔ اس روز بھی حضرت اسماعیلؑ گھر پر نہیں تھے۔ ان کی بیوی نے بڑے سلیقے اور احترام کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کا خیر مقدم کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے وقت رخصت یہ پیغام دیا کہ جب شوہر آئیں تو کہنا، تمہارے گھر کی چوکھٹ بہت خوب ہے۔

اس دوسری بیوی سے حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے ہوئے۔ جن کی اولاد عرب میں پھیلی اور مستعربہ کہلائی۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے ساتھ مل کر خدا کا گھر تعمیر کرنا شروع کیا۔ اس وقت انہوں نے یہ دعا مانگی تھی "اے ہمارے رب! تو اسے ہم سے قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد سے ایک امّت پیدا کر، جو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں ہمارے مناسک سکھا اور ہماری توبہ قبول کر۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" (البقرہ ۲: ۱۲۷، ۱۲۹)

مشہور مورّخ ابو الفدا لکھتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کو قبائل یمن اور عمالیق کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ انہوں نے تمام عمر اللہ کا پیغام اہل عرب تک پہنچایا، اور انھیں بیت اللہ کے حج کے لیے دعوت دی۔ اسی بیت اللہ کے گرد بعد میں شہر بسا، جسے آج مکہ مکرمہ کہا جاتا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ ۱۳۷ برس کی عمر میں مکہ میں فوت ہوئے اور اپنی والدہ کے پاس حطیم میں مدفون ہیں۔

اسماعیلؒ، امام امام جعفرؒ صادق کے بڑے فرزند۔ والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ ان کے نام سے شیعوں کا ایک فرقہ اسماعیلیہ وجود میں آیا۔ اس کے نزدیک اسماعیل ساتویں امام ہیں۔ نہ کہ امام موسیٰ کاظم، جیسا کہ امامیہ (اثنا عشری) عقیدہ ہے۔ اسماعیل امام جعفر صادقؒ کی وفات سے پانچ سال قبل ہی ۱۴۳ھ / ۷۶۲ء میں مدینہ منورہ میں فوت ہو گئے اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے جبکہ اسماعیلیوں کے نزدیک امام جعفرؒ کی وفات کے پانچ سال بعد بھی امام اسماعیلؒ زندہ تھے (نیز دیکھئے "اسماعیلیہ")

اسماعیل اوّل (۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء - ۹۳۰ھ/۱۵۲۳ء) ایران کے صفوی خاندان کا بانی، سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے جا ملتا ہے۔ مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین (وفات ۱۳۳۴ء) بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کے جانشینوں میں سے شیخ ... نے شیعیت کا رنگ اختیار کیا۔ نیز شیخ کی بجائے شاہ کہلانے لگے ... کے ذریعے ترکمان فرمانروا جہان شاہ کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ ان کے ... ان کے بیٹے اور جانشین شیخ حیدر کا بھی یہی انجام ہوا۔ اور دوسرے ...

Marfat.com

جو اس وقت ایک برس کے تھے، مریدوں نے حفاظت میں رکھا۔

شاہ اسماعیل نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں اردبیل کا رخ کیا اور جہان شاہ کو گلستان کے مقام پر شکست فاش دی۔ باکو، ارزنجان اور تبریز پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ اسماعیل نے ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء کو رسم تاجپوشی ادا کی۔ نیز ایک حکم کے تحت سرکاری مذہب امامیہ قرار دیا۔ اس اعلان سے سنی رعایا بددل ہوگئی اور یوں اس کا عہد حکومت میں طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ ۱۵۱۴ء میں جا کر کہیں وہ اس قابل ہوا کہ اپنی حکومت کو مستحکم کر سکے۔ اس دوران میں تیموری حکمران بابر بھی اس کا حلیف رہا اور دونوں مل کر ہرات پر حملہ آور ہوئے۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے سُنیوں کے قتل عام کا حکم دے دیا، جس میں بڑے بڑے علماء مارے گئے۔ عثمانی ترکوں کے ہاں اس کے خلاف زبردست غم و غصہ کی لہر پائی جاتی تھی۔ جس کے نتیجے میں سلطان سلیم نے ایشیائے کوچک میں پیدا ہونے والی بغاوت میں ہزاروں شیعوں کو انتقاماً قتل کروا دیا اور بالآخر دونوں قومیں بھی آپس میں ٹکرا گئیں۔ تبریز کے قریب اسماعیل نے شکست کھائی اور ترکی لشکر تبریز پر قابض ہوگیا۔ اس کے باوجود ایران میں شیعی حکومت قائم رہی۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس شیعی سنی تصادم کی بدولت مسلمانوں کی قوت کو ضعف پہنچا، جس کے نتیجے میں یورپی اقوام کو ایران اور ترکی کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔ شاہ اسماعیل نے میروتھ میکسیمیلین اوّل کے ساتھ دوستانہ روابط قائم کیے تاکہ وہ عثمانیوں سے بدلہ لے سکے۔ دوسری طرف عثمانی حکومت بھی صفویوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہی۔

اسماعیل پاشا (۱۸۳۰ء - ۲ مارچ ۱۸۹۵ء) خدیو مصر، ابراہیم پاشا کا دوسرا بیٹا تعلیم پیرس میں حاصل کی۔ نوجوانی میں مختلف سفارتوں پر فائز رہا۔ ۱۸۶۱ء میں سوڈان کی ایک بغاوت فرو کی۔ دو سال بعد چچا کا جانشین ہوا اور والیٔ مصر بنا۔ ۱۸۶۶ء میں سلطان عبدالعزیز نے اسے خدیو مصر کا لقب عطا کیا اور آئندہ سے جانشینی کا حق صلبی بیٹے کو دیا گیا۔ ۱۸۷۳ء کے ایک فرمان کے مطابق اسے خود مختار بادشاہ بنا دیا گیا۔

اسماعیل پاشا ایک ترقی پسند حکمران تھا۔ اس نے رفاہ عامہ اور انتظام مملکت پر اتنا پیسہ خرچ کیا کہ ۱۸۷۶ء تک اس کا ملک دس کروڑ پونڈ کا مقروض ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ ۱۸۷۸ء میں ان غیر ملکیوں نے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا۔ جس نے اسماعیل پاشا کو محض آئینی حکمران بننے پر مکتفی کر دیا۔ اس کی وزارت میں انگریز اور فرانسیسی وزراء بھی شامل تھے۔ تاہم فروری ۱۸۷۹ء میں عرابی پاشا کی فوجی شورش کے پیش نظر اس نے یورپی وزراء کو معطل کر دیا۔ ۲۶ جون ۱۸۷۹ء کو اسے معزول کر دیا گیا۔ وہ قاہرہ سے نیپلز روانہ ہوگیا، جہاں اٹلی کے بادشاہ نے اسے اپنے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا۔ بعد ازاں وہ قسطنطنیہ چلا گیا۔ جہاں اس نے وفات پائی۔

اسماعیل ثانی ایران کا صفوی بادشاہ، اسماعیل اوّل کا پوتا اور شاہ طہماسپ اوّل کا بیٹا باپ کی وفات کے بعد قزلباشوں کی مدد سے قید خانے سے نکلا اور ۲۷ جمادی الاوّل ۹۸۴ھ/۲۲ اگست ۱۵۷۶ء کو تخت نشین ہوا۔ اسے سنگدل ہونے کی بنا پر باپ نے ولی عہد بنانے سے انکار کر دیا تھا اور ساڑھے انیس برس سے قہقہہ کے قلعے میں قید کر رکھا تھا۔ اگلے ہی برس اس نے خاندان کے تمام شہزادوں کو قتل کروا دیا۔ اس سے ایک سال بعد رمضان ۹۸۶ھ/نومبر ۱۵۷۸ء میں زہر خورانی کے باعث ہلاک ہوگیا۔

اسماعیل شہیدؒ، شاہ (۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ/۲۹ اپریل ۱۷۷۹ء - ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/۶ مئی ۱۸۳۱ء) سید احمد شہید بریلوی کے رفیق خاص۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بھتیجے اور شاہ عبدالغنی کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ تھا، جو مولوی علاء الدین پھلتی کی صاحبزادی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ابھی دس برس کے تھے کہ ۱۲ اپریل ۱۷۸۹ء کو آپ کے والد انتقال کر گئے۔ ان کے بعد آپ کے چچا شاہ عبدالقادر نے آپ کی پرورش اور تربیت کی۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی نواسی سے، جن کا نام کلثوم تھا، آپ کی شادی کر دی۔ نیز جائداد میں سے بھی ایک حصہ عطا فرمایا۔

شاہ اسماعیل بچپن ہی سے ذکی الطبع تھے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر ہی میں علوم رسمیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ بڑے بڑے علماء آپ سے راستے میں مسائل پوچھتے، جن کا جواب دینا بغیر کتابوں کے مشکل ہوتا تھا۔ لیکن آپ ایسا شافی جواب دیتے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ علوم کے ساتھ ساتھ وقت کے رواج کے مطابق فنون حرب بھی سیکھ لیے تھے۔

۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں جب سید احمد بریلوی نواب امیر خاں سے الگ ہو کر دہلی پہنچے تو شاہ اسماعیلؒ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کر لی۔ اس وقت سے لے کر دم آخر تک آپ نے سید احمد کا دامن نہ چھوڑا اور ساری زندگی انھی کی طرح تبلیغ دین، اعلائے کلمۃ الحق اور جہاد میں گذار دی۔ سید صاحب نے تنظیم جہاد کی غرض سے جتنے دورے کیے شاہ اسماعیل ان میں برابر کے شریک رہے۔

۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں حضرت سید احمد بریلوی کے ساتھ حج کا قصد کیا۔ وہاں انھوں نے "حجۃ اللہ البالغہ" کا درس دینا شروع کیا۔ دو سال بعد واپس وطن لوٹے اور سید احمد کے ساتھ مل کر انگریزوں اور سکھوں کے خلاف تحریک جہاد کا بھرپور آغاز کیا۔ ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو وہ سید صاحب کے ساتھ راہ خدا میں ترک وطن کر کے صوبہ سرحد کی طرف جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔

جہاد کے دوران میں وہ سید صاحب کے خاص مشیروں میں سے تھے۔ شرعی پہلو پر آپ ہی نے سید احمد کا انتخاب بطور امام کرایا۔ "جنگ شیدو" میں سید صاحب کی حفاظت حضرت شاہ اسماعیل نے اپنی جان پر کھیل کر کی اور "جنگ مردان" میں فتح انھی کی تدابیر کی بدولت حاصل ہوئی۔ نواب وزیر الدولہ کا بیان ہے کہ بعض اوقات بیماری کی تکلیف کے باعث دو دو دن تک سو نہ سکتے تھے۔ لیکن جب سید صاحب کا کوئی حکم کسی جنگی مہم کے لیے پہنچ جاتا تو فوراً ہتھیار سنبھال کر شیر کی طرح تیار ہو جاتے۔

شاہ صاحب نے معرکہ بالاکوٹ ہی میں شہادت پائی۔ آخری وقت ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں ننگی تلوار اور بھری بندوق لیے ہجوم میں گھس گئے اور اس کے بعد ان کی نعش ہی ملی۔ ان کا مقبرہ بالاکوٹ کی مغربی سمت مٹی کوٹ کے قصبے کے شمال مشرق میں ست بنے نالے کے پار واقع ہے۔

حضرت شاہ اسماعیلؒ کا ایک ہی بیٹا شاہ محمد تھا، جو حالت جذب میں ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں لاولد فوت ہوا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ورثے میں نہ چھوڑی، سوائے ان تصانیف کے، جو رد بدعت اور ترویج سنت کے لیے لکھی گئیں۔ ان میں سے "ردالاشراک" (عربی زبان میں شرک اور بدعات کے رد میں)، "تقویت الایمان" (اردو زبان میں ردالاشراک کی آیات و احادیث کا ترجمہ) "منصب امامت" (فارسی)، "ایضاح الحق الصریح" (فارسی) "رسالہ یک روزی" (فارسی زبان میں تقویت الایمان پر اعتراضات کا جواب)، "رسالہ اصول فقہ" (عربی)، "عبقات" (عربی میں حقائق تصوف کا ذکر) اور قصائد، نعتیں اور خطبات اہم ہیں۔ خطبات کا مجموعہ نواب صدیق حسن خان نے شائع کرایا۔

اسماعیل صفوی، شاہ:- ایران کا حکمران (دیکھیے "اسماعیل اوّل")

Marfat.com

اسماعیلیہ شیعوں کا ایک فرقہ جو سات اماموں کو مانتا ہے۔ اس لئے سبعیہ بھی کہلاتا ہے۔ اس کے اسماعیلی کہلانے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ امام جعفر صادقؒ نے اپنے بڑے فرزند اسماعیل کی جگہ دوسرے فرزند امام موسیٰ کاظمؒ کو ولایت عطا کی۔ اس پر ان کے ماننے والوں کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک سابق امامیہ جو اثنا عشری بھی کہلاتا ہے اور دوسرا سبعیہ یا اسماعیلی کہلایا جو اسماعیلؒ کی امامت کا قائل ہے۔ امام اسماعیلؒ چونکہ والد کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ اس لئے انہوں نے ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل کو ساتویں امام کی جگہ پر فائز تسلیم کر لیا۔ مختلف علاقوں میں یہ فرقہ مختلف ناموں سے مشہور ہوا۔ قرامطہ، دروزیہ اور باطنیہ اسی فرقے کی مختلف شاخیں ہیں۔ ایران میں اس فرقہ کے لوگ اسماعیلی یا آغا خانی ہندوستان میں خوجے اور بوہرے وغیرہ کہلاتے ہیں۔

اس فرقے کے عقائد کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے کہ مسیحؑ دوبارہ آئیں گے، جو مہدی موعود بھی ہوں گے۔ چنانچہ اہل تشیع نے حضرت علیؓ کی اولاد کو اس کا مستحق ٹھہرایا۔ ان میں سے ایک فرقہ کے نزدیک امامت اہل بیت ہی کا حق ہے، جو نسل در نسل چلتی ہے۔ یہ فرقہ امامیہ کہلایا۔ آگے چل کر یہ دو گروہوں اثنا عشری اور اسماعیلی میں تبدیل ہو گیا۔ اسماعیلیوں کے نزدیک اس سلسلے کے آخری امام محمد بن اسماعیل بن جعفر ہیں، جو امام جعفرؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد غائب ہو گئے ہیں۔ تقریباً سو برس تک یہ لوگ اسی عقیدے کے قائل رہے۔ ۲۷۶ھ/۸۹۹ء میں ان کے ایک قائد احمد بن قرمط نے بہت شہرت حاصل کی اور یہ لوگ قرامطہ کہلانے لگے۔ ۲۶۰ھ/۸۷۴ء میں جب اثنا عشریوں کے بارہ امام پورے ہو گئے تو اسماعیلیوں نے بھی اپنے عقائد میں تبدیلی اختیار کی اور امامت کے تسلسل کا دوبارہ اجراء کر دیا۔ اس ضمن میں جو لوگ پرانے عقائد پر قائم رہے قرامطہ کہلائے۔ اس نئے اسماعیلی عقیدے کو فاطمیوں نے اختیار کیا اور ۲۹۷ھ/۹۰۹ء میں شمالی افریقہ میں اپنی خلافت کی بنیاد ڈالی۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط تک یہ فرقہ اسلامی دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ خصوصاً ایران میں اسے خاصا استحکام حاصل تھا۔ یہیں اس کے مشہور علماء ابو حاتم رازی، ابو یعقوب السجستانی، حمید الدین کرمانی اور المؤید الشیرازی وغیرہ پیدا ہوئے۔ یہیں باطنیہ دروزیہ یا حاکمیہ مستعلیہ اور نزاریہ شاخوں نے جنم لیا۔ مصر اور شمالی افریقہ میں یہ فرقہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ غائب ہوا اور یمن، ایران اور ہندوستان میں پھیلنے لگا۔ گیارہویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی میں یمن کی جماعت سلیمان بن حسن کو اپنا امام یا داعی تسلیم کرنے لگی اور ہندوستان کی جماعت داؤد بن قطب شاہ کی تابع فرمان ہو گئی اور اسے اپنا ستائیسواں داعی تسلیم کر لیا۔

فاطمی خلیفہ المستنصر (وفات ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) کے بیٹے نزار کو تخت سے محروم کر دیا گیا تو اس کے حامی نزاری کہلائے۔ انہی میں سے ایک شخص حسن بن صباح کے نام سے مشہور ہے، جو نزار کے پوتے المہتدی کو الموت کے قلعے میں لے آیا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا القاہر باحکام اللہ حسن علانیہ طور پر تخت نشین ہو گیا۔ اس نے ظاہری عبادت کی جگہ باطنی عبادت کو فرض کیا۔ ادھر حسن بن صباح نے اپنے مریدوں کو فریب دینے کے لئے الموت میں ایک جنت بھی تعمیر کی۔ اس کے بعد علاء الدین، جلال الدین ثانی اور رکن الدین خورشاہ نے حسن ابن صباح کا منصب سنبھالا۔ یہ فرقہ سیاسی تحریکوں کی وجہ سے خطرناک تھا۔ اس کے اس زور و شور کا خاتمہ منگولوں نے کیا۔

رکن الدین خورشاہ کے بعد نزاریوں کی قوت ختم ہو گئی اور اس کے بیٹے شمس الدین محمد کو عوام الناس کی نظروں سے چھپا دیا گیا۔ بعد ازاں اس کے جانشین صوفی شیوخ کی صورت میں سامنے آتے رہے۔ انہوں نے صفوی خاندان کے ساتھ راہ و رسم بڑھائے اور بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ نادر شاہ کے عہد میں ان کا جانشین سید علی حسن بیگ تھا۔ تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ان کے ایک اور جانشین سید حسن علی نے وفات پائی تو اس کا جانشین اس کا بیٹا خلیل اللہ دوم ہوا۔ جو ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے حسن علی شاہ کی شادی فتح علی شاہ قاچار شاہ ایران کی بیٹی سے ہوئی اور وہ کرمان میں گورنر مقرر ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد بغاوت برپا ہونے کی وجہ سے انہیں ہندوستان آنا پڑا۔ تاریخ میں انہیں آغا خان اول کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بیٹے آغا علی شاہ آغا خاں دوم کے نام سے ۱۸۸۱ء میں جانشین ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں ان کے فرزند سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم کے نام سے جانشین بنے۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء میں وفات پائی تو ان کے پوتے کریم آغا خاں چہارم کے نام سے اسماعیلی فرقے کے انچاسویں امام چنے گئے۔ (دیکھئے "آغا خاں")

تاریخ کے ہر دور میں اسماعیلی فرقے کے عقائد مختلف نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس فرقے کے پیروؤں نے اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر عقائد میں تبدیلی روا رکھی ہو۔ تاہم اسماعیلیہ کے باطنی عقائد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تاویل ہے جس سے مراد قصص قرآن اور صور عبادات کے گہرے اندرونی معاملات کا انکشاف ہے اور یہ صرف اماموں ہی کا حق ہے۔ دوسرے حقائق جو علوم و فلسفہ نے منکشف کئے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ میں کوئی ایسی صفت نہیں۔ جن کا تصور حواس کے ذریعے سے پیدا ہو۔ مگر اس ہستی کو عقل فعال کے ساتھ کچھ اس طرح سے گڈمڈ کر دیا گیا ہے کہ نہ تو اس میں بطلیموسی تصور ملتا ہے اور نہ افلاطونی خیالات کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مذہب اور فلسفے کا ایک معجون مرکب تیار کر کے رکھ دیا ہے۔ جسے سمجھنے کی ضرورت کسی بھی مقلد کے لئے ضروری نہیں بلکہ یہ صرف امام کا کام ہے اور یہ ضروری نہیں کہ امام اس کا انکشاف بھی کرے۔ عام انسان صرف اسی صورت میں فلاح پا سکتا ہے کہ وہ امام کے ساتھ اپنا قریبی تعلق قائم کرے جو شخص امام وقت کو تسلیم کئے بغیر مر جائے اور وہ کافر کی موت مرے گا ان تصورات میں نزاریوں نے کسی حد تک ترمیم کی ہے۔ انہوں نے روحانی زندگی پر زور دیا ہے۔ تاہم ان کے نزدیک بھی دنیا کبھی امام سے خالی نہیں رہی۔ امامت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔

اسود:۔ خانہ کعبہ کی دیوار میں لگا ہوا مقدس پتھر۔ (دیکھئے "الاسود")

اسود بن کعب عنسی جھوٹا نبی، جس نے آنحضور صلعم کی زندگی ہی میں دین اسلام ترک کیا اور حاکم یمن بدھان یا باذام کی وفات کے بعد بزور حاکم بن بیٹھا۔ وہ جادوگری کا مدعی تھا اور ٹونے ٹوٹکوں سے کام لیتا تھا۔ اس کا دعوے تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے۔ الرحمان کی طرف سے کہتا ہے۔ اس کا اصلی نام عبہلہ بتایا جاتا ہے مزید برآں وہ ذوالخمار (گدھے والا) کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس وقت یمن کے لوگ اسلام کے دامن سے منسلک ہو چکے تھے۔ حاکم یمن کی درخواست پر آنحضورؐ نے اپنے عمال یمن بھیجے۔ اواخر ۱۰ھ/۶۳۲ء میں اسود عنسی نے قبیلہ مذحج کو ساتھ ملا کر بغاوت کر دی اور نجران سے آنحضورؐ کے دو عمال خالد بن سعید اور عمرو بن حزم نکال دیئے۔ اس وقت وہاں بدھان کا بیٹا شہر مقیم تھا۔ اسود نے اسے قتل کرا کر اس کی بیوی سے زبردستی شادی کر لی اور اس علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ آنحضورؐ نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی اور یہ فرمان بھجوایا کہ اگر ممکن ہو سکے تو اسود عنسی کو گرفتار کر لیا جائے۔ ورنہ کسی ترکیب سے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ

Marfat.com

اس کے رفقاء ہی میں سے چند لوگوں نے اس کی بیوی کے ساتھ مل کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا

اشبیلیہ سپین یا ہسپانیہ یا اندلس کا ایک شہر۔ اسی نام کے صوبے کا دارالحکومت۔ ۹۴ھ/ ۷۱۲ء میں اس پر مسلمانوں نے قبضہ کیا۔ یہ دریائے اعظم کے کنارے سپین کے جنوب مغربی ساحل پر واقع ہے۔ صدر مقام میڈرڈ اس سے ۳۵۵ میل شمال مشرق کی سمت واقع ہے یہاں زیادہ تر مسلمانوں کی تعمیر کردہ قدیم عمارات ہیں اور اسی لئے یہ شہر دنیا بھر میں مشہور ہے

اشبیلیہ کے فاتح موسیٰ بن نصیر نے یہاں عیسیٰ بن عبداللہ کو پہلا حاکم مقرر کیا تھا۔ مگر عیسائیوں کی شورش کے پیش نظر عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر اسے قطعی طور پر فتح کر کے اس کا عامل بن گیا۔ اس کے قتل کے بعد قرطبہ نے مرکزی شہر کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاہم یہ شہر بھی جو کبھی اشبیلیہ اور کبھی حمص کہلاتا، اندلس کے معمول ترین شہروں میں شمار ہوتا رہا۔ عبدالرحمن ثانی نے اس شہر کے گردا گرد ایک پختہ فصیل اور ایک بڑی مسجد بھی بنوائی۔ اسی کے عہد میں نارمن بحری لٹیروں نے ۲۳۰ھ/۸۴۴ء میں پہلی بار اس پر قبضہ کیا۔ چنانچہ اسے دوبارہ فتح کرنے کے بعد یہاں بحری جہازوں کا ایک بیڑا بھی رکھا گیا۔ عبدالرحمان ثالث کے دور میں یہ شہر بھی اسلامی سلطنت کے دور میں داخل ہو گیا۔

۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء سے عبادیوں کے خود مختار خاندان نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔

المعتمد کے دور میں اشبیلیہ اپنے دور کے بہترین علما و فضلا کا مرجع بن گیا۔ ۴۸۴ھ/ ۱۰۹۱ء میں مغرب کے حکمران یوسف بن تاشفین کی فوجوں نے اس پر قبضہ جمالیا۔ المعتمد کو جلاوطن کر دیا گیا۔ یوسف کا سپہ سالار سیر بن ابی بکر عرصے تک یہاں حکومت کرتا رہا۔ المرابطون کے بعد یہ شہر الموحدون کے قبضے میں رہا۔ ابو یعقوب یوسف عرصہ تک اس کا عامل رہا۔ اس کا بیٹا ابو یوسف المنصور بھی کافی مدت تک یہاں متمکن رہا۔ اسی اقامت کے دوران میں اس نے ابن رشد کو قید میں ڈلوایا۔

۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء میں المنصور کے جانشین الموحد محمد الناصر نے اشبیلیہ کی فصیل تلے وہ عظیم شکست کھائی جس نے آگے چل کر اندلس کا عیسائی مقبوضہ بننا ممکن کرنا تھا۔ ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء میں ابن ہود بن یوسف نے الموحدون کو اس شہر سے باہر نکال دیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ بالآخر ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۸ء کو فرڈیننڈ سوم نے اس شہر کو سولہ ماہ کے محاصرے کے بعد فتح کر لیا۔ مسلمانوں نے کئی بار شہر کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر سلطان ابوالحسن علی کی شکست فاش کے بعد یہ شہر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں سے چھن گیا اور فرڈیننڈ نے مسلمانوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔

کولمبس کی دریافت امریکہ کے بعد سے یہ شہر ہسپانوی تجارت کا اہم مرکز بن گیا۔ امریکہ کی طرف جانے والے جہاز یہیں سے روانہ ہوتے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں یہاں زرد بخار کی وبا پھیلی جس سے تقریباً تیس ہزار افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور ۱۸۱۰ء میں اس شہر کو فرانسیسی فوجوں نے تاراج کیا۔ ۱۹۳۶ء کی خانہ جنگی میں یہ قوم پرستوں کے قبضہ میں رہا اور اس کے بعد سے دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے ایک پرکشش مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا بھر میں یہ شہر اپنے میلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

اشتراکیت ایک اقتصادی نظام جسے ایک یہودی مفکر کارل مارکس نے پیش کیا۔ لینن اور اینجلز اس کے شارحین میں سے ہیں۔ اس کا فلسفہ جدلی مادیت اور میکانکی تصور حیات پر مبنی ہے۔ اس فکر کا پہلا عنصر تاریخ کی مادی تعبیر ہے۔ مارکس کے نزدیک کسی عہد کا معاشی نظام ہی اس عہد کی معاشرتی زندگی کی اصل بنیاد ہے۔ مذہب، تہذیب فلسفہ حیات، فنون لطیفہ سب اسی کا عکس ہیں۔ فکر معاش کی جستجو ہی انسان کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کو متحد و مربوط کرتی ہے۔ مذہب پیٹ کا تقاضا ہی بنیادی تقاضا ہے۔ چونکہ ایجادات ہر آن ترقی کرتی رہتی ہیں۔ اس لئے پیداوار کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ساتھ اخلاقی تصورات بھی بدل جاتے ہیں اور یوں اخلاقیات ایک اضافی قدر بن کر رہ جاتی ہے۔ صداقتیں اپنا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور یوں نیک و بد اور حق و باطل کی تمیز بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے

اشتراکیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر معاشی نظام جب ترقی کر کے ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے زمانے کے حالات پیداوار سے متصادم ہو جاتی ہیں اس نزاع کو طبقاتی کش مکش کا نام دیا گیا ہے۔ ہر انقلاب اسی کش مکش کا نتیجہ تھا۔

اشتراکیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہو۔ چنانچہ اس شے کی قیمت کا واحد حقدار صرف مزدور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ اس دور میں مزدور کو قیمتی آلات پیدائش خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی، اس لئے وہ مجبور ہے کہ صرف اس پر قناعت کرے، جو صنعت کار اسے بخش دے۔ جبکہ ایک شے کی اصل قیمت مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، جسے قدر زائد کہتے ہیں، حقیقتاً یہ مزدور کا حصہ ہے۔

اشتراکیت کا چوتھا اصول ریاست سے متعلق ہے۔ اس کے مطابق ریاست ایک ایسا ادارہ ہے، جس کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں، کہ دولت مندوں اور برسر اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی کرے۔ ہر معاشرتی ادارے کی طرح ہر سیاسی ادارہ بھی اس کے نزدیک مروجہ نظام معیشت کا خارجی اظہار ہے۔

اشتراکیت کے ان اصولوں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ عالم امثال و تصورات کی کوئی حقیقت نہیں۔ مادہ اور صرف مادہ ہی حقیقت اولیٰ و حقیقت آخر ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ مذہب اور تصوریت کا خاتمہ کر کے خالص مادی بنیادوں پر معاشرے کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے کیونکہ یہ مسائل زمین کے ہیں اور زمین ہی پر حل ہونے پائیں نہ کہ آسمان پر۔ اس فلسفے کی رُو سے سرمایہ دارانہ نظام کی دھجیاں بکھر کر رہ گئی ہیں اور ان ملکوں میں جہاں سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے، غریب عوام اور مزدوروں کا بھلا ہوا ہے۔ کیونکہ کارل مارکس کے نزدیک جب محنت کش عوام ہی کی تخلیقی کوششوں سے تہذیب و تمدن کی آسائشات وجود میں آتی ہیں تو تہذیب و ثقافت کی افادیت بھی ان کے حصہ میں ہونی چاہیئے۔ جبکہ ادھر سرمایہ داروں کے نزدیک سرمایہ ہی ارتقاء اور فروغ کا باعث ہے اور جب مزدوری کا تعین ہو جاتا ہے تو مزدور کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

خود اشتراکی معاشرہ میں الٹ اصول کارفرما ہے۔ وہاں مزدور کو صرف ضروریات زندگی بہم پہنچائی جاتی ہیں اور باقی منافع ریاست کے نام پر جمع کر لیا جاتا ہے۔ تمام پیداواری ذرائع اجتماعی ملکیت قرار پاتے ہیں اور ان سے حاصل شدہ افادہ اجتماعیت کے نام پر حکومت کے پاس جمع ہو جاتا ہے، جو اسے مختلف مدوں میں خرچ کرتی ہے۔

دین اسلام میں نہ تو سرمایہ داری کے موجودہ تصور کی حمایت ملتی ہے، اور نہ اشتراکی معاشرے کی روح نظر آتی ہے، جس میں مذہب اور اخلاق کا کوئی مقام نہیں۔ اسلام نے ذاتی ملکیت کی اجازت بھی دی ہے اور ساتھ ہی دولت کے ارتکاز کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک ذاتی ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اس اطمینان سے بہرہ مند ہو کہ معاشرے میں اسے اپنی فکری و عملی صلاحیتوں کے بل بوتے پر جو کچھ حاصل ہو، وہ اس کا اپنا ہے۔ غیروں کو اس میں سلب و نہب کا حق نہیں۔ مگر اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ کوئی شخص ذاتی ملکیت کی آڑ میں دوسروں کا استحصال کرے۔ اسلام نے ارتکاز دولت کو روکنے اور تقسیم دولت

Marfat.com

کے لئے بیع، وراثت، صدقات اور زکوٰۃ کے احکام نافذ کردیئے ہیں۔ کیونکہ اسلام یہ دیکھتا ہے کہ دولت کو کیونکر خرچ کرنا چاہیئے اور کس طرح سے یہ مستحق اور غریب لوگوں تک پہنچے۔ دولت جمع کرنے والوں کے لئے قرآن مجید میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے۔ انھیں اس دن کے عذاب الیم کی خوش خبری سنا دو، جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشت داغی جائے گی، یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو جو تم جمع کرتے تھے۔ اس کا مزہ چکھو۔" (توبہ ۹)

دولت کو خرچ کرنے کے لئے قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

"جو مال اللہ تعالےٰ نے فتح کے نتیجے میں دیہات والوں سے دلوایا ہے، وہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت داروں اور یتیموں اور حاجت مندوں کے لئے ہے تاکہ تم میں جو لوگ دولت مند ہیں، مال انھی کے ہاتھوں میں مرتکز ہوکر نہ رہ جائے۔" (حشر ۷)

جدید دور میں اشتراکیت کو اسلام میں سمونے کے لئے ایک اور اصطلاح وضع ہوئی ہے۔ "اسلامی سوشلزم"۔ اس کے علمبرداروں کا کہنا ہے کہ جدلی مادیت کا تصور ختم ہو رہا ہے۔ انسان اپنے ضمیر اور اخلاق سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے اب اشتراکیت لادینی نظام نہیں رہا۔ چونکہ اسلام دنیا کا سچا مذہب ہے، اس لئے اس کے پیروکاروں کو چاہیئے کہ محنت کشوں کے استحصال کے خاتمے کے لئے اشتراکیت کو اسلام میں سمو لیں اور یوں اسلامی سوشلزم کا نفاذ کردیں۔ جبکہ اکثر علمائے دین کے نزدیک اسلام کا اپنا ایک اقتصادی نظام ہے، جو سرمایہ داری، اشتراکیت یا اشتمالیت سے بڑھ کر ہے اس لئے اسلام اور سوشلزم (اشتراکیت) کی پیوندکاری ایک غلط اور معیوب بات ہے۔ ان کے نزدیک جب اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا تو کسی قسم کے "ازم" کی ضرورت نہیں رہے گی ـــ

اشربہ

پینا، پینے والی چیزیں۔ اسلام میں پانی پینے کے لئے آداب مقرر کئے گئے ہیں۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "لوگو! تم میں سے کوئی بائیں ہاتھ سے ہرگز کھانا نہ کھائے اور نہ بائیں ہاتھ سے پانی پیئے۔ کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔ (مسلم)

مشکوٰۃ شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ تین سانس میں پانی پیا کرتے تھے اور ہر سانس لینے میں پانی کے برتن کو منہ سے علیحدہ کرلیا کرتے تھے۔ نیز ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے مشک کے منہ سے پانی پینے کی ممانعت کی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی صلعم نے اس سے منع کیا ہے کہ آدمی کھڑا ہوکر پانی پیئے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسولؐ خدا نے فرمایا، جو شخص چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے، وہ اپنے پیٹ میں آتش دوزخ کو گھونٹ گھونٹ اتارتا ہے۔ حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ پانی پلانے کا آغاز دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے کرنا چاہیئے۔

اشرف جہانگیرؒ سمنانی

(۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء - ۲۷ محرم ۸۰۸ھ/۶ جولائی ۱۴۰۵ء) صوفی اور بزرگ، خراسان کے ایک مقام سمنان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد ابراہیم اس علاقے کے حاکم تھے۔ والدہ کا نام خدیجہ تھا جو احمد یسوی کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اور چودہ برس میں تمام علوم پر عبور حاصل کرلیا۔ راہ سلوک کی طرف مائل تھے، اس لئے اس دور کے مشہور صوفی علاء الدولہ سمنانی سے بیعت کی۔ روایت ہے کہ خواب میں ہونے والے ایک اشارے کی وجہ سے حکومت اپنے بھائی سلطان محمد کے سپرد کی۔ اور والدہ سے اجازت لے کر ہندوستان چلے آئے۔ ماوراالنہر سے ہوتے ہوئے بخارا اور سمرقند کے راستے اُچ شریف پہنچے۔ یہاں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے فیض حاصل کیا اور پھر دہلی روانہ ہوگئے۔ وہاں کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور بہار کے قصبہ منیر میں آئے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں مشہور بزرگ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کا جنازہ رکھا تھا۔ آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ بعد ازاں بنگال کا رخ اختیار کیا۔ اس وقت بنگال میں مشہور چشتی بزرگ شیخ علاء الدین علاء الحق مقیم تھے۔ آپ نے ان کی خدمت میں بارہ برس رہ کر خرقۂ خلافت اور جہانگیری کا لقب حاصل کیا۔

حضرت جہانگیر سمنانی مختلف علاقوں میں تبلیغ و ہدایت فرمانے کے بعد فیض آباد سے اسّی کیلو میٹر دور ایک قصبہ کچھوچھہ (روح آباد) میں مقیم ہوگئے۔ یہاں سے آپ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ، مدینہ، کربلا، نجف، ترکی، دمشق، بغداد، کاشان سمنان، مشہد اور غزنہ سے ہوتے ہوئے ملتان اور دہلی کے راستے واپس روح آباد پہنچے۔ اس دوران میں آپ نے گلبرگہ میں خواجہ سید گیسو دراز سے بھی ملاقات کی۔ آپ کا مزار روح آباد ہی میں ہے۔

آپ کی تعلیمات ان تین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ۱۔ "بشارت المریدین"۔ ۲۔ "مکتوبات اشرفی"۔ ۳۔ "لطائف اشرفی" آخری کتاب آپکے مرید نظام الدین یمنی کی تالیف کردہ ہے۔ آپ کے نزدیک وحدت کی دو اقسام مطلق اور باری ہیں۔ وحدت مطلقہ صرف ایک ذات ہے، جو اپنی صفات کے ساتھ موجود ہے۔ اور وحدت باری یہ ہے کہ خدا موجود تھا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ولی کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ جاہل نہ ہو اور شریعت کا پابند ہو۔ اس کی لطافت زبان، حسن اخلاق اور فیاضی وغنا اوصاف مصطفوی کے تابع ہو۔ ولی کے ملئے ضروری ہے کہ کسب معاش کے لئے کوئی نہ کوئی کام کرے اور کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرے۔

اشرفؒ علی تھانوی

(۱۲ ربیع الاوّل ۱۲۸۰ھ/۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء - ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ/۹ جولائی ۱۹۴۳ء) اشرف علی بن عبدالحق فاروقی ممتاز عالم دین اور صوفی، ہندوستان میں تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق تاریخ پیدائش ۵ ربیع الثانی ہے۔ بچپن ہی سے دینی علوم کی طرف مائل تھے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ حافظ حسین علی دہلوی سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تھانہ بھون آکر مولانا فتح محمد سے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں پھر دیوبند پہنچ کر باقی نصاب کی تکمیل مولانا منفعت علی سے کی اور فارسی زبان میں پورا عبور حاصل کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء میں یہاں سے فارغ التحصیل ہوکر کانپور کے مدرسہ فیض عام میں تدریس کا کام شروع کیا۔ وہیں مدرسہ جامع العلوم قائم کیا۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء ہی میں حج بیت اللہ کیا۔ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں دوبارہ حج کے لئے تشریف لے گئے اور کئی ماہ اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ واپس لوٹنے کے چند سال بعد ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء میں عمر بھر کے لئے تھانہ بھون میں سکونت پذیر ہوگئے۔

اس گوشۂ عافیت میں بھی طالبان ہدایت نے آپ کو تنہا نہ رہنے دیا۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے لوگ پروانہ وار آئے اور اس چشمۂ ہدایت سے فیض حاصل کرنے لگے۔ لوگوں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ حکومت نے قصبۂ تھانہ بھون کے لئے ایک مستقل ریلوے

Marfat.com

سٹیشن بنا دیا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل آپ کو معدہ و جگر کی تکالیف نے عاجز کر رکھا تھا۔ آخری دنوں میں بھوک بالکل ختم ہو گئی اور اسی عالم میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ نے دو نکاح کیے تھے۔ جن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کی تصانیف ہی آپ کا وہ قیمتی ورثہ سمجھی جاتی ہیں جن سے ہر مسلمان استفادہ کر رہا ہے۔

مولانا کو حکیم الامت اور مجدد الملت کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے علمی و دینی فیوض و برکات متنوع ہیں۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں، مجدد ہیں، مفسر ہیں، علوم و حکم کے شارح ہیں۔ اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدث تھے فقیہہ تھے، خطیب تھے اور شریعت و طریقت کے مجادلہ کا خاتمہ کرنے والے تھے، وہ مصلح امت تھے۔ ان کی تصانیف میں خواص کے لیے "تفسیر بیان القرآن" اور "شرح مثنوی مولانا روم" اور عورتوں کے لیے "بہشتی زیور" ایسی گراں بہا ہیں، جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے اسلامی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

مولانا کی تصانیف کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۹ء میں ان کے ایک خادم مولوی عبدالحق فتح پوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی، جو بڑی تقطیع کے ۹۰ صفحات کو محیط ہے۔ تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے وہ امام ابن جریر طبری، امام فخر الدین رازی، حافظ ابن جوزی اور حافظ جلال الدین سیوطی کے زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا کی بیشتر کتب اردو زبان میں ہیں۔ البتہ تیرہ یا چودہ رسائل و کتب عربی اور تین فارسی زبان میں ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں "سبق الغایات فی نسق"، "انوار الوجود"، "التجلی العظیم"، "حواشی تفسیر بیان القرآن"، "تصویر المقطعات"، "التلخیصات العشر"، "مائۃ دروس الخطب الماثورہ"، "وجوہ المثانی"، "سبع سیارہ"، "زیادات"، "جامع الآثار"، "تائید الحقیقۃ"، "خطبات الاحکام"۔ اور تین فارسی میں یہ ہیں۔ "مثنوی زیر و بم"، "تعلقات فارسی"، "عقائد بانی کالج"۔ ان میں سے نظم میں مولانا کی تصنیف صرف مثنوی ہے، جو طالب علمی کے زمانے میں لکھی۔

تجوید و قرأت و متعلقات قرآنی کے ضمن میں مولانا نے حسب ذیل تصانیف فرمائیں۔ "جمال القرآن"، "تجوید القرآن"، "رفع الخلاف فی حکم الاوقاف"، "زیادات علی کتب الروایات"، "وجوہات لافی الروایات"، "یادگار حق القرآن"، "متشابہات القرآن تراویح رمضان"، "آداب القرآن"، "وجوہ المثانی"، "تنشیط الطبع فی اجراء السبع"۔

مولانا کا سب سے بڑا علمی کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ یہ تفسیر بارہ جلدوں میں اڑھائی سال میں مکمل ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اضافے اور نظر ثانی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۵ء میں تھانہ بھون سے شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ سلیس و بامحاورہ اور حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ ہے، اور نیچے آیت کی تفسیر، جس میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح بھی کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی تراکیب کی تحقیق کی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادیؒ کی تفسیر "روح المعانی" پر اعتماد کیا گیا ہے۔

عورتوں کی ضروریات کے لیے اسلامی معلومات کا مکمل خزینہ "بہشتی زیور" کے نام سے دس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ بعد میں گیارہویں جلد "بہشتی گوہر" کے نام سے مردوں کے لیے لکھی یہ کتاب کئی بار پاکستان اور ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اب بھی اس کی مانگ بہت ہے۔

مولانا کے فتاوے کا ایک مجموعہ بھی گیارہ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ دیگر بے شمار کتب تفسیر، احادیث، منطق، کلام، عقائد اور تصوف پر ہیں۔ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے بھی آپ نے بے شمار کتب تحریر کیں۔ ان میں "اصلاح الرسوم"، "صفائی معاملات"، "اصلاح امت" اور "حیات المسلمین" اہم ہیں۔

اشعث بن قیس ابو محمد معدی کرب بن قیس۔ حضرموت کے کندہ کا سردار ۱۰ھ/۶۳۱ء میں ایک وفد کے ساتھ آنحضورؐ کی خدمت میں پیش ہوا۔ مگر آپؐ کی وفات کے بعد باغی ہو گیا۔ اسلامی فوج نے قلعہ النجیر میں اس کا محاصرہ کر لیا اور اسے قید کر کے مدینہ بھیج دیا۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے نہ صرف اسے معاف کر دیا۔ بلکہ اپنی بہن قریبہ کی شادی بھی اس سے کر دی۔ روایت ہے کہ شادی اس واقعہ سے پہلے ہو چکی تھی۔ بعد ازاں وہ شام اور عراق کی مہموں میں شریک ہوا۔ غزوہ تبوک میں اس کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی۔ شمالی عراق فتح ہونے کے بعد وہ کوفہ میں مقیم ہو گیا۔ شیعی روایات میں اسے پکا غدار کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے جنگ صفین میں حصہ لیا اور صلح کی بات چیت میں حضرت علیؓ کو اصول تحکیم منظور کرنے اور عراق کی جانب سے ابوموسیٰ اشعری کو حکم مقرر کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے حضرت امام حسنؓ کے عہد میں وفات پائی۔

اشعری، ابوالحسن (۲۶۰ھ/۸۷۴ء - ۳۲۴ھ/۹۳۶ء) ابوالحسن علی بن اسماعیل، مشہور عالم دین اور اہل سنت کے علم الکلام کے بانی، بصرے میں پیدا ہوئے۔ ابوموسیٰ اشعری کی نویں پشت میں سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کا شجرہ نسب یوں ہے۔ علی بن اسماعیل بن عبداللہ بن موسیٰ بن ابی بردہ بن ابی موسیٰؓ۔ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء سے پہلے وہ معتزلہ عقائد کے پیرو اور الجبائیؒ کے شاگرد تھے۔ روایت ہے کہ خواب میں انھیں آنحضور صلعم کی زیارت ہوئی اور آپؐ نے انھیں حکم دیا کہ صحیح سنت کی پیروی کریں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جامع بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر تبدیلیٔ عقائد کا اعلان کیا اور اہل سنت کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک اختیار کیا۔ آخری ایام میں بغداد میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔

۳۰۰ھ تک انھوں نے چونسٹھ کتابیں تحریر کیں۔ جن کی فہرست خود اپنی کتاب "العمد" میں دی ہے۔ اکیس کتابیں تالیف کیں۔ ابن عساکر نے ان کی تعداد چوبیس بتائی ہے۔ قاضی ابوالمعالی کا دعوےٰ ہے کہ انھوں نے تین سو کتابیں لکھیں، جو زیادہ تر ابتدائی کتابوں اور معتزلہ کے رد میں تھیں۔ مزید برآں خارجیہ، جہمیہ، شیعہ اور غیر مسلموں کے عقائد کے رد میں بھی کتابیں لکھیں۔ بڑی کتابوں میں سے صرف "مقالات الاسلامیان" ہم تک پہنچی ہے۔ جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی فرقوں اور اہلسنت والجماعت کے عقیدوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں علم کلام کے دقیق مسائل ہیں اور تیسرے حصے میں اسماء و صفات باری اور قرآن کے حق میں مختلف فرقوں کے اقوال بیان کیے گئے ہیں۔ دیگر چھوٹی چھوٹی کتابوں میں سے "الابانہ عن اصول الدیانہ"، "اللمع" اور "رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام" اہم ہیں۔

اشعری کے نزدیک اللہ کی صفات مثلاً علم، بصر، کلام وغیرہ ازلی و ابدی ہیں اور انھی کے ذریعے وہ عالم، بصیر اور متکلم ہے۔ اس لیے قرآن غیر مخلوق ہے۔ نیز اللہ کا دیدار آخرت میں ضرور ہوگا، مگر اس کی حقیقت اور کیفیت سے ہم ناواقف ہیں۔ ہر چیز اللہ کے اختیار اور ارادے کے تحت ہے۔ خیر و شر اللہ کی مشیت سے ہے۔ تاہم مسلمان اپنے جرم

Marfat.com

کی پاداش میں جہنم کے عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ (نیز دیکھئے "اشعریہ")

اشعری، ابوموسیٰ رضؓ عبداللہ بن قیس الاشعری۔ آنحضورؐ کے صحابی اور سپہ سالار، ہجرت سے چھ سات سال قبل یمن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے افراد قبیلہ ۷ھ/۶۲۸ء میں غزوہ خیبر میں آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ خدام رسالت میں شامل ہو گئے۔ ۸ھ/۶۳۰ء میں غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ ۱۰ھ میں معاذؓ بن جبل کے ساتھ یمن میں تبلیغ کے لئے بھیجے گئے۔ اور اسی علاقے کے عامل مقرر ہوئے۔ ۱۷ھ/۶۳۸ء میں حضرت عمرؓ نے انہیں بصرے کا عامل پھر ۲۲ھ/۶۴۲ء میں کوفہ کا عامل مقرر کیا، مگر جب مغیرہ کو ان کے منصب پر بحال کیا گیا تو انھیں دوبارہ بصرے کی ولایت پر بھیج دیا گیا۔ یہاں سے انھوں نے خوزستان کو فتح کیا۔ نیز الجزیرہ کی تسخیر میں بھی حصہ لیا۔ ۲۳ھ/۶۴۴ء میں انھوں نے کردوں کی ایک زبردست بغاوت کو فرو کر دیا اس اثنا میں کچھ لوگ ان کے مخالف ہو چکے تھے۔ ان کی شکایات دربار خلافت میں پہنچیں اور حضرت عثمانؓ نے انھیں کوفہ کا والی مقرر کر دیا۔ حضرت علیؓ نے انتخاب پر ابوموسیٰؓ نے کوفیوں کی طرف سے ان کی بیعت کی۔ مگر جنگ جمل میں غیر جانبدار رہے۔ جس کی بنا پر شیعان علیؓ نے انھیں شہر بدر کر دیا۔ چند ماہ بعد امیر المومنین نے انھیں امان دے دی۔ بعد ازاں جنگ صفین میں انھیں حضرت علیؓ کی طرف سے ثالث مقرر کیا گیا تاکہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے مابین تنازعہ کا حل تلاش کریں۔ حضرت علیؓ کے حق میں فیصلہ دینے کے بعد وہ مکہ معظمہ چلے گئے اور جب معاویہؓ نے بُسر کو مکہ پر قبضہ کرنے بھیجا تو وہ وہاں سے کوفہ چلے گئے۔ ان کی تاریخ وفات یقینی نہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۴۲ھ اور ۵۳ھ کے درمیان کہیں وفات پائی۔

اشعریہ ایک مکتب فکر، جسے اشاعرہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی اساس ابوالحسن اشعریؒ کی تعلیمات ہیں۔ اپنی عمر کے آخری دنوں میں اشعریؒ نے اپنے گرد بہت سے تلامذہ اکٹھے کر لیے اور یوں ایک دبستان وجود میں آگیا۔ اگرچہ اشعری حنبلی مسلک کے حامی تھے، مگر ان کے پیرو عموماً شافعی دبستان کے حامی رہے ہیں۔ جبکہ ان کے حریف زیادہ تر حنفی مسلک کے موید ہیں۔ بانیٔ مسلک کی وفات کے بعد الباقلانی وہ پہلا شخص ہے جس نے اشعریہ کے عقائد کو منضبط کیا۔ اس کے علاوہ ابن فورک، اسفرائنی، البغدادی، السمنانی الجوینی، الغزالی، ابن تومرت، الشہرستانی، فخر الدین رازی، الایجی اور الجرجانی اس مسلک کے ائمہ اور مشاہیر میں سے ہیں۔

پانچویں صدی گیارہویں صدی عیسوی تک اشاعرہ کے طریق کار میں تبدیلی واقع ہوئی اور امام غزالیؒ جیسے مجتہد و مجدد پیدا ہوئے۔ انہوں نے فلسفیانہ مباحث کا آغاز کیا۔ اس صدی کے سلاطین کے ہاتھوں اس مسلک کے پیروکاروں نے بہت اذیتیں اٹھائیں۔ مگر سلجوقیوں کے برسراقتدار آنے پر اور نظام الملک طوسیؒ جیسے وزیر کی سرپرستی حاصل ہونے کے بعد انھیں فروغ حاصل ہوا اور تقریباً آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی تک یہ مکتب فکر اہل سنت والجماعت کے ساتھ متحد رہا۔ الجرجانی کے بعد سے یہ دبستان بالکل ہی ختم ہو کر رہ گیا اور بالآخر علماء خود کو اشعریہ سے وابستہ کرنا معیوب سمجھنے لگے۔

اشموئیلؑ سموئیل یا سماعیل، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بعد بنی اسرائیل کے ایک اہم نبی، جنہوں نے اسرائیل کی حکومت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بائبل میں ان پر دو مستقل کتابیں بھی ان کے نام سے ہیں۔ ان کی رو سے ان کے باپ کا نام القانہ تھا، جو بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ اشموئیل رامہ کے مقام پر پیدا ہوئے بچپن عیلی کاہن کے پاس سیلا میں بسر ہوا۔ وہیں انھیں نبوت ملی اور انھوں نے بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کی راہ دکھانا شروع کی۔

اشموئیل وہ پہلے نبی ہیں، جن کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے ساؤل (طالوت) کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ بائبل میں آیا ہے کہ اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کے بیٹے آپ کے نقش قدم پر نہیں۔ اب آپ کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دیں، جو ہم پر حکومت کرے۔ چنانچہ انہوں نے الٰہی ہدایت کے مطابق ساؤل بن قیس کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔ پھر لوگوں کو آداب سلطنت بتائے اور اس کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ باسٹھ برس کی عمر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے

قرآن مجید میں بھی اشموئیلؑ کا ذکر ہوا ہے۔ اگرچہ ان کا نام نہیں لیا گیا۔ سورۂ بقرہ میں اس واقعے کا ذکر یوں آیا ہے:۔

"جب بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے ایک نبی سے کہا۔ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔" (۲۔۲۴۶)

مفسرین نے یہاں نبی اشموئیل ہی مراد لیا ہے۔ قرآن مجید نے ان کے مقرر کردہ بادشاہ کا نام طالوت بتایا ہے۔ جسے بائبل میں ساؤل لکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس انتخاب پر اعتراض کیا اور کہا یہ شاہی خاندان سے نہیں اور نہ اس کے پاس زیادہ دولت ہے۔ اللہ نے اس کا جواب یوں دیا۔ "اوّل تو اللہ نے اس کی نیکی اور تقوے کی وجہ سے اسے چنا ہے، دوسرے وہ علم زیادہ رکھتا ہے اور تیسرے اسے جسمانی قوت و طاقت حاصل ہے۔"

عہد نامہ عتیق میں سموئیل کے نام سے جو دو کتابیں شامل ہیں۔ ابتدا میں ایک تھی۔ ان میں کُل پینتالیس الواب ہیں، جن میں اسرائیل کی وہ تاریخ ہے، جو قاضیوں کے عہد کے اختتام سے شروع ہوتی ہے اور حضرت داؤدؑ کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے انداز تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت بعد کے زمانے کی تالیف ہے۔

اصحابؓ :۔ آنحضورؐ کے مجلس نشین، اصحاب رسولؐ، صحابہ کرام (دیکھئے "صحابہؓ")

اصحاب الاخدود "خندق والے لوگ" جنہوں نے ایمان لانے والوں کو آگ کے بڑے بڑے گڑھوں میں پھینکا تھا۔ قرآن مجید میں سورۂ البروج میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:۔

"مارے گئے اس خندق والے، جس میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی۔ جبکہ وہ اس کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے۔" (۸۵: ۴ تا ۷)

مفسرین نے اصحاب الاخدود کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔ ابن اسحاق لکھتا ہے کہ یہ واقعہ نجران کے عیسائیوں کو پیش آیا۔ کیونکہ یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے کوئی بیس ہزار حق پرستوں کو آگ کے گڑھوں میں زندہ جلا دیا۔ یہ واقعہ اکتوبر ۵۲۴ء میں پیش آیا، جس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد نجاشیوں نے یمن پر حملہ کر کے ذونواس اور اس کی سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔ دوسرا واقعہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک ایرانی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر لیے اور لوگوں کے لیے بھی محرمات سے نکاح کرنا حلال کر دیا۔ لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو اس نے

Marfat.com

مخالفین کو آگ کے گڑھوں میں پھنکوانا شروع کر دیا۔

ابن کثیر نے اصحاب الاخدود پر تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ایسے بہت سے واقعات گزرے ہوں۔ مثلاً ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ اخدود کا معاملہ ایک تو یمن میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین کے زمانے میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق میں بخت نصر کے زمانے میں پیش آیا، جس نے ایک بت بنا رکھا تھا اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اسے سجدہ کریں اور جو سجدہ نہ کرتا، اُسے آگ میں جھونک دیا جاتا۔۔۔۔ البتہ نجران میں جو واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی متعدد تحریرات میں نجران کے اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض عین زمانۂ واقعہ کی لکھی ہوئی ہیں اور عینی شاہدوں سے سن کر لکھی گئی ہیں۔ ان میں تین کتابوں کے مصنف پروکوپیس، کوسموس اور یوحنس ملالا اس واقعہ کے ہمعصر ہیں۔ جدید دور کا مؤرخ فلبی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے، جہاں "اصحاب الاخدود" کا واقعہ پیش آیا تھا۔

اصحاب الایکہ

"جنگل والے لوگ"، جن پر حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر چار مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ الحجر = ٧٨، سورۃ الشعراء = ١٧٦، سورۃ ص = ١٣ اور سورۃ ق = ١٤

بعض مفسرین نے اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کو ایک ہی قوم قرار دیا ہے اور بعض کے نزدیک یہ دو مختلف قومیں تھیں مگر ان پر ایک ہی نبی مبعوث ہوئے۔ مدین خلیج عقبہ کے قریب ایک بستی تھی، جسے حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے مدین نے آباد کیا تھا۔ اس کے قریب ہی کہیں اصحاب الایکہ تھے، جو شاید تبوک میں آباد ہوئے۔

یاقوت نے تبوک کا پرانا نام ایکہ رکھا ہے، جس کے گرد جنگل واقع تھا۔

اصحاب الایکہ کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:-

"اصحاب لئیکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب شعیب نے ان سے کہا تھا۔ کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے امانت دار رسولؐ ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے۔" انھوں نے کہا، "تو محض ایک سحرزدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں ہے، مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔" شعیبؑ نے کہا "میرا رب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔" انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخرکار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔" (الشعراء = ١٧٦ تا ١٨٩)

مولانا مودودی 'تفہیم القرآن' میں لکھتے ہیں کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ اس قوم کو اللہ کے عذاب نے آن لیا، جو بادل کی طرح ان پر چھایا رہا اور جب تک پوری قوم تباہ نہ ہو گئی، یہ عذاب ان پر نازل رہا۔

اصحاب الحجر

"پتھروں والے لوگ"۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے "اور حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور ہم نے انھیں اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے منہ پھیر لینے والے بنے، اور وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے۔ سو صبح ہوتے ہی انھیں سخت آواز نے آن لیا پس جو کچھ وہ کماتے تھے، ان کے کسی کام نہ آیا۔" (الحجر = ٨٠ تا ٨٣)

الحجر قوم ثمود کا مسکن تھا، جو پہاڑوں کو کھود کر مکان بناتی تھی۔ یہ علاقہ مدینہ کے شمال کی طرف واقع ہے۔ آج بھی اس علاقے کو الحجر اور مدائن صالح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت صالحؑ اس قوم پر مبعوث ہوئے تھے۔ قوم ثمود نے ان کو جھٹلایا اور راہ راست پر نہ آئی۔ جس کے نتیجے میں عذاب نے انھیں آن لیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے "ثمود")

اصحاب الرس

"کنوئیں والے لوگ"۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں دو بار آیا ہے۔ سورۃ فرقان ٣٨ اور سورۃ ق = ١٢ میں عاد، ثمود اور دیگر منکر قوموں کے ساتھ آیا ہے۔ ابن جریر طبری کی رائے میں اصحاب الرس دراصل اصحاب الاخدود ہی ہیں۔ ابن عساکر نے قوم عاد سے صدیوں پہلے گذرنے والی ایک قوم کو اصحاب الرس کہا ہے۔ جہاں ایک پیغمبر حنظلہؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس قوم نے نہ صرف انھیں جھٹلایا بلکہ انھیں قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کی پاداش میں وہ ہلاک کر دیے گئے۔ ابن ابی حاتم کے نزدیک یہ کنواں آذربائیجان کے قریب کہیں تھا اور قتادہ کے نزدیک یہ یمامہ کے علاقے میں فلج نامی بستی میں تھا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے اور یہ یمن میں آباد تھے۔

Marfat.com

اصحاب بدر "بدر والے لوگ"، اہل بدر، وہ صحابہؓ کرام، جنہوں نے آنحضورؐ کے ساتھ ملکر غزوۂ بدر میں حصّہ لیا۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر سورۂ آل عمران (۱۲۳) سورۂ انفال (۷ تا ۱۲، ۱۷، ۲۵، ۴۱، ۴۲) سورۂ التوبہ (۱۰۰) سورۂ الدخان (۱۶) سورۂ القمر (۴۵) اور سورۂ الحدید (۱۰) میں آیا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اصحاب بدر سے وعدہ کیا کہ وہ انھیں فتح اور غلبہ دے گا۔ حق بات ثابت کرے گا اور کافروں کی جڑ کاٹ دے گا (۸ = ۷) نیز ایک ہزار ملائکہ اصحاب بدر کی مدد کے لیے بھیجنا منظور فرمایا (۸ = ۹)، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ مدد کے لئے بھیج دیئے جائیں گے یا پانچ ہزار ملائکہ (۳ = ۱۲۴ تا ۱۲۵)۔ اللہ تعالےٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ اصحاب بدر کے دلوں کو ثابت و مضبوط کردیں اور اللہ تعالےٰ نے خود کفار کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈال دیا۔ ملائکہ کو مزید یہ حکم ملا کہ اہل بدر کے ساتھ مل کر کفار کی گردنوں پر تلوار ماریں اور ان کی پور پور کاٹ ڈالیں۔ (۸ = ۱۲)

اصحاب بدر کا درجہ دیگر اصحاب سے بلند کہا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں رفاعہ بن رافع سے روایت ہے کہ جبرئیلؑ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ پوچھا آپ اہل بدر کو مسلمانوں میں کیسا سمجھتے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ سب مسلمانوں سے افضل۔ جبرئیل نے بتایا کہ فرشتوں میں سے جو فرشتے بدر میں حاضر ہوئے، ان کا درجہ ملائکہ میں بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے اہل بدر کو دیکھا اور فرمایا اب تم جو چاہو کرو میں تمہیں بخش چکا ہوں۔ چنانچہ اصحاب بدر مغفور ہیں اور ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے گئے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اصحاب بدر کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے تو بیعت لیتے وقت سب سے پہلے اصحاب بدر سے بیعت لی۔

اصحاب بدر کی تعداد میں اختلاف ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ ۳۱۳ تھے۔ ان میں سے ۷۴ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ ان میں آٹھ کو آپؐ نے پیچھے لوٹا دیا۔ ان کے نام یہ ہیں:۔ عثمانؓ بن عفان، طلحہؓ بن عبیداللہ، سعیدؓ بن زید، ابولبابہ رفاعہؓ بن عبدالمنذر، عاصمؓ بن عدی، الحارثؓ بن الصمہ اور خوات بن جبیر۔ ان سب کو اصحاب بدر میں شریک سمجھا جاتا ہے۔

زرقانی نے شہدائے بدر کے ناموں کی فہرست دی ہے۔ وہ یہ ہیں، مہجعؓ بن صالح، عبیدہؓ بن حارث، عمیرؓ بن ابووقاص، عاقلؓ بن بکیر، عمیرؓ بن عبدعمیر، عوف یا عوذؓ بن عفرا، معوذؓ بن عفرا، حارثؓ بن سراقہ، یزیدؓ بن حارث، رافعؓ بن معلی عمیرؓ بن حمام، عمارؓ بن زیاد، مسعدؓ بن خثیمہ اور مبشرؓ بن عبدالمنذر۔ دیگر اصحاب بدر کے نام اور مختصر سوانحی حالات قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری نے اپنی کتاب "اصحاب بدر" میں دیئے ہیں۔ (نیز دیکھیے "بدر، غزوہ")

اصحاب صُفّہ "سائبان والے"، "چبوترے والے"، اہل صفہ، مسجد نبویؐ کے شمالی سرے پر موجود ایک چبوترے پر بیٹھنے والے فقرا کا ایک گروہ۔ انھیں تصوف اور زہد و تقوے کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اکثر صحابہؓ شغل دینی کے ساتھ ہر قسم کا کاروبار کرتے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت صلعم کی تربیت پذیری کے لیے وقف کردی تھی۔ یہ لوگ دن کے وقت بارگاہ نبوی میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترے پر سو رہتے۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی انھی لوگوں میں تھے۔ طلحہؓ بن عمرو سے روایت ہے، جب کوئی شخص آنحضورؐ سے ملنے کے لیے مدینہ میں وارد ہوتا اور کوئی اس کی جان پہچان والا مدینے میں ہوتا تو اس کے پاس ٹھہرتا ورنہ اصحاب صفہؓ کے پاس چلا جاتا۔

اصحاب صفہؓ ان مہاجرین کا نام تھا، جن کا کوئی گھر بار اور ذریعہ معاش نہ تھا۔ احادیث میں ان کے لیے اضیاف اسلام کے الفاظ استعمال ہوئے۔ یہ لوگ اپنا زیادہ تر وقت عبادات اور صحبت رسول میں بسر کرتے تھے۔ آنحضورؐ ان میں سے اکثر کو اپنے ساتھ شریک طعام کرتے تھے۔ حلیۃ الاولیاء میں ہے کہ آنحضورؐ صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے۔ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہے، وہ اصحاب صفہؓ میں سے ایک کو اپنے ساتھ شامل کرلے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اصحاب صفہ بھیک مانگنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ ان میں سے ایک گروہ جنگل میں جاکر لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور بیچ کر اپنے ساتھیوں کی خدمت کرتا۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ اصحاب صفہ کے پاس کھڑے ہوئے اور ان کی مفلسی اور مجاہدہ اور ان کے دلوں کا اس حالت میں خوش ہونا دیکھا تو فرمایا۔ اے اصحاب صفہ! تمہیں بشارت ہے۔ پس جو شخص میری امت میں سے، اس صفت پر باقی رہے گا، جس پر تم ہو۔ بشرطیکہ تم اس حالت پر راضی ہو۔ وہ جنت میں میرے رفیقوں میں سے ہوگا۔" قرآن مجید کی آیات البقرہ (۲۷۳، ۲۷۴)، الانعام (۵۲)، الکہف (۲۸) الشوریٰ (۲۹) میں انھی کے متعلق رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔

شیخ ابوعبدالرحمان سلمی نے اہل صفہؓ کی تاریخ لکھی ہے۔ جس میں سے حضرت داتا گنج بخش نے اصحاب صفہؓ کے بائیس ناموں کی ایک فہرست "کشف المحجوب" میں دی ہے۔ اس کی رُو سے بلالؓ بن رباح، سلمانؓ فارسی، ابوعبیداللہؓ بن عامر الجراح، عمارؓ بن یاسر، عبداللہؓ بن مسعود، مقدادؓ بن اسود، خبابؓ بن ارث، صہیبؓ بن سنان، عتبہؓ بن غزوان، زیدؓ بن خطاب، ابوکبشہؓ، کنانہؓ بن حصین، سالمؓ، عکاشہؓ بن محصن، مسعودؓ بن ربیع، ابوذرؓ غفاری، عبداللہؓ بن عمر، صفوانؓ بن بیضار، ابودرداؓ ابن عامر ابولبابہؓ بن عبدالمنذر اور عبداللہؓ بن بدر الجہنی اصحاب صفہؓ میں شمار ہوتے ہیں (نیز دیکھیے "تصوف"، "صوفی")

اصحاب فیل "ہاتھی والے لوگ"۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ الفیل میں یوں آیا ہے:۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا، کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کردیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے، جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر ان کا یہ حال کردیا، جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا۔" (۱۰۵ = ۱ تا ۵)

روایت ہے کہ صنعا کے والی ابرہہ نے عیسائیت کو پھیلانے کے لیے ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اس نے شاہ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔ اس کے اس اعلان پر کچھ عرب مشتعل ہوگئے۔ چنانچہ ابرہہ نے قسم کھائی کہ اب وہ کعبہ کو ڈھائے بغیر نہ رہے گا۔ اس اعلان کے بعد ابرہہ ہاتھیوں پر سوار فوج لے کر مکہؔ کی طرف روانہ ہوا۔ روایت ہے کہ اس کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی اور تیرہ ہاتھی تھے۔ جب وہ طائف کے نزدیک پہنچا تو ایک شخص ابورغال اس کے ساتھ ہولیا تاکہ مکہؔ کی طرف رہنمائی کرے۔ مکہ سے تین کوس کے فاصلے پر وہ شخص مرگیا اور عرب مدّتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ یہ شخص بنی ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔

Marfat.com

ابرہہ نے ایک ایلچی اہل مکہ کی طرف بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا بلکہ اس گھر کو ڈھانے آیا ہوں، جو عربوں کا مرکز و محور بنا ہوا ہے۔ اس وقت مکہ کے سردار عبدالمطلب تھے۔ انھوں نے جواب دیا، ہم ابرہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اللہ اپنے گھر کو خود ہی بچالے گا،" ایک اور روایت کے مطابق عبدالمطلب نے ابرہہ کو اس کام سے باز رہنے کے لیے ہر طرح سے ترغیب دی۔ مگر وہ نہ مانا۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ اس موقعے پر عبدالمطلب نے کعبے کا دروازہ پکڑ کر دعا مانگی "خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔"

یہ دعا مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی پہاڑوں میں چلے گئے اور دوسرے روز ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے بڑھا۔ مگر اس کا خاص ہاتھی محمود دیکا یک بیٹھ گیا۔ اسے آنکسوں سے کچو کے دیے گئے مگر وہ نہ ہلا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ (ابابیل) اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے آئے اور انھوں نے اس لشکر پر ان کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ سنگریزہ گرتا، وہ ہلاک ہو جاتا۔ ابن اسحاق اور عکرمہ کی روایت ہے کہ ان سے چیچک کا مرض پھیلا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عطاءؒ بن یسار کے نزدیک سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہوئے بلکہ کچھ بھاگتے ہوئے اور کچھ راستے میں مرے۔ ابرہہ بھی کہیں اور جا کر مرا۔

عربوں کے لیے یہ واقعہ بہت بڑا تھا۔ سب نے اسے اللہ تعالےٰ کی قدرت کا اعجاز کہا۔ بہت سے شعراء نے قصیدے کہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی ان ۳۶۰ بتوں کا ذکر نہیں کیا، جو خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ حضرت زبیرؓ بن عوام کی روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا۔ "قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔" جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہل عرب اسے عام الفیل "ہاتھیوں کا سال" کہتے ہیں۔ اسی سال آنحضورؐ کی ولادت ہوئی۔ عیسوی سن کے لحاظ سے یہ سال ۵۷۱ء ہے۔

یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ اس دور کے مؤرخین کے ہاں اچھی طرح محفوظ ہے۔ اگرچہ جدید دور کے مستشرقین لکھتے ہیں کہ واقعہ صرف یہ ہے کہ ابرہہ دمیول کی مدد کے لیے فوج لے کر نکلا، راستے میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہو گئی مگر اس ضمن میں وہ کسی قسم کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کرتے۔ (نیز دیکھیے "ابابیل" "ابرہہ")

اصحاب کہف والرقیم

"غار اور کتبے والے لوگ"۔ قرآن مجید میں ان کے بارے میں سورۂ الکہف میں ارشاد ہوا ہے "کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف والرقیم ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزین ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔" تو ہم نے انھیں اسی غار میں تھپک کر سال ہا سال کے لیے سلا دیا پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔

ہم ان کا اصل قصہ تمھیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے، جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیے جب وہ اٹھے اور انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے۔ (پھر انھوں نے آپس میں کہا۔) یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے۔ جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سر و سامان مہیا کر دے گا۔

تم انھیں غار میں دیکھتے تو تمہیں یوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اتر جاتا ہے۔ اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ جسے اللہ ہدایت دے، وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے، اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے۔ تم انھیں دیکھ کر یہ سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔ اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انھیں دیکھتے تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے کی دہشت بیٹھ جاتی۔

اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں ان میں سے ایک نے پوچھا "کہو! کتنی دیر اس حال میں رہے؟" دوسرے نے کہا "شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہوں گے۔" پھر وہ بولے۔ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گذرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو ہمارے یہاں موجود ہونے سے خبردار کر بیٹھے۔ اگر کہیں ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو سنگسار ہی کر ڈالیں گے۔ یا پھر زبردستی ہمیں اپنی قوم میں واپس لے جائیں گے اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ اس طرح ہم نے اہلِ شہر کو ان کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بے شک آکر رہے گی۔ اس وقت (لوگ) آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ "ان پر ایک دیوار چن دو۔ ان کا رب ہی ان کے معاملہ کو بہتر جانتا ہے۔" مگر جو لوگ ان کے معاملات پر غالب تھے۔ انہوں نے کہا "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔"

"کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہو! میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ پس تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور نو سال اور بڑھ گئے تم کہو! اللہ تعالےٰ ان کے قیام کی مدت زیادہ جانتا ہے، آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں۔" (۱۸: ۹ تا ۲۶)

اس قصّے کی تعبیر مختلف علماء نے مختلف صورتوں میں کی ہے۔ بعض کے نزدیک الرقیم اسی بستی کا نام ہے، جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا اور بعض کے نزدیک الرقیم سے مراد وہ کتبہ ہے، جو غار پر اصحاب کہف کی یادگار کے طور پر لگایا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک یہ وہی شہر ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے اور یہی شہر آگے چل کر "پیٹرا" اور عربی میں "بطرا" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مقام عرب کے شمال میں عقبہ کے قریب واقع ہے معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ اس دور میں عیسائی ہونا جرم تھا، جس کی سزا سے بھاگ کر اصحاب کہف غار میں جا چھپے تھے۔ مولانا مودودی کے نزدیک رقیم سے مراد کتبہ ہے۔ سریانی زبان میں ایک عیسائی پادری جیمس سروجی نے اس قصہ کو بیان کیا ہے۔ جسے طبری نے مختلف اسناد کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ جس شہر کے ظلم سے تنگ آکر وہ لوگ غار کی طرف آئے تھے۔ اس کا نام مفسرین نے افسس لکھا ہے، جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی ایک اہم بندرگاہ تھا۔ اس دور میں وہاں دقیوس نامی بادشاہ حکمران تھا۔ اس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک روم پر حکومت کی۔ پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کہف جاگے۔ اس کا نام تھیوڈوسیس بیان کیا جاتا ہے، ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک قیصر روم رہا۔ اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد جس ساتھی کو کھانا لانے کے لئے بھیجا اس کا نام مفسرین نے یملیخا بتایا ہے۔ اس حساب سے اصحاب کہف کی غار میں رہنے والی مدت ۱۶۹ سال بنتی ہے۔

جب اصحاب کہف کا ساتھی کھانا خریدنے شہر گیا تو وہاں کی دنیا بدل چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدن، لباس ہر شے میں تبدیلی آچکی تھی۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنے منفرد انداز کی بدولت تماشا بن گیا اور جب اس نے قدیم سکہ پیش کیا تو لوگوں پر سارا حال کھلا۔ یہ خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی اور لوگوں کا ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحاب کہف لیٹے تو ان کی روح پرواز کر گئی۔ چنانچہ لوگوں نے وہاں کتبہ لگا دیا۔

اصحاب کہف کی تعداد کیا تھی؛ اور وہ کتنے برس سوتے رہے۔ اس کے بارے میں کچھ اختلافات ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک چونکہ قرآن مجید میں آخری ذکر سات کی تعداد کا ہے اور اسے رد نہیں کیا گیا، اس لئے اصحاب کہف کی تعداد سات ہی تھی اور مدتِ خواب ۳۰۹ برس تھی۔ البیرونی نے ۳۰۰ شمسی اور ۳۰۹ قمری سال بیان کئے ہیں، جب کہ مولانا مودودی کے نزدیک یہ قول خدا کا نہیں بلکہ لوگوں سے منسوب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اس مسئلے پر بہت بحث مباحثہ کیا تھا کہ اصحاب کہف کی تعداد کیا ہے اور کتنے برس سوتے رہے۔ مگر قرآن حکیم نے ان باتوں کو سرسری کہا ہے اور واقعے کا اصل مدعا یہ ظاہر کیا ہے کہ نصیحت پکڑی جائے اور قیامت پر ایمان لایا جائے۔ تاہم قرآن مجید میں اس قصے میں کتبے (رقیم) کا اضافہ ہے، جو مسیحی روایات میں مذکور نہیں۔ چونکہ اصحاب کہف کے واقعے کے متعلق یہودیوں نے آنحضورؐ سے استفسار کیا تھا، اس لئے اس موقع پر سورۂ الکہف نازل ہوئی۔

اصفہان ایران کا ایک شہر، جو اپنی حسین مسجدوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک زمانے میں صفویوں کا دارالحکومت تھا۔ اسے بابل کے حکمران نبوکد نضر نے یہودیوں کو بسانے کے لئے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے حضرت عمرؓ کے دور میں ۱۹ھ/۶۴۰ء میں فتح کیا تھا۔ طبری کے نزدیک فتح کا سال ۲۱ھ/۶۴۲ء ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق ابوموسیٰ اشعریؓ نے نہاوند کے بعد اصفہان کو فتح کیا۔ المعتز کے عہد میں ایک بغاوت کے بعد ۲۴۴ھ/۸۶۱ء میں اسے دوبارہ فتح کیا گیا۔ اس بار شہریوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی۔

اس وقت وہاں ایک قلعہ نما عمارت موجود تھی۔ نیز شہر کے گرد فصیل تھی، جس میں چار دروازے اور ایک سو منارے تھے۔ شہر کے قرب و جوار میں چاندی، تانبے، جست اور سرمے کی کانیں تھیں۔

۳۰۱ھ/۹۱۳ء میں یہ شہر سامانیوں کے قبضے میں آیا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں غزنویوں کی قلمرو میں شامل ہوا۔ مغلوں کے حملے کے دوران میں شاہ خوارزم سلطان جلال الدین منگو کے زیر کمان اس شہر کی دیواروں تلے ایک بہت بڑی جنگ لڑی گئی۔ بعد میں یہ شہر منگولیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ تیمور نے یہاں ستر ہزار شہریوں کا قتل عام کیا۔ اس کے بعد کئی

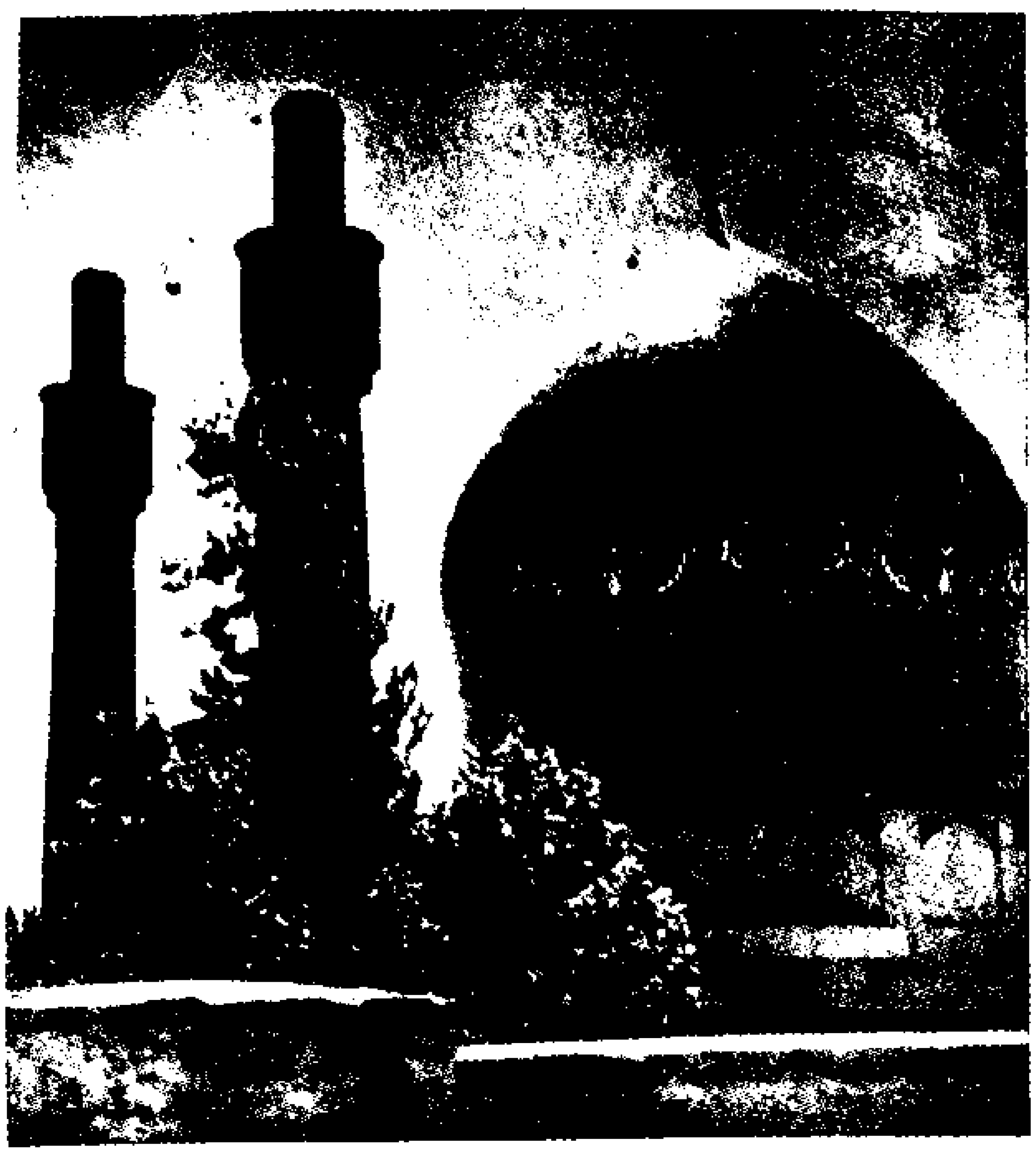

اصفہان میں مسجد مدرسہ مادر شاہ

حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں کا قتل عام جاری رکھا۔ نادر شاہ کے عہد میں (۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء) کہیں جا کر یہاں امن ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ شہر عالمی طاقتوں کی آویزش کا مرکز رہا۔ ۱۹۱۷ء میں اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تاریخ میں اس شہر کو پہلی بار کسی حکومت کا مرکزی شہر بننے کا شرف عباس اوّل (۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۸ء) کے عہد میں حاصل ہوا۔ اس نے ایک خوب صورت شہر بنا دیا۔ اس نے دریائے زندہ رود پر تین خوبصورت پل تعمیر کرائے۔ نیز ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کرائی۔ شاہ صفی اوّل نے اس پر چاندی کے پترے چڑھوائے۔ بعد کے کئی حکمرانوں نے یہاں خوب صورت عمارات تعمیر کرائیں۔ جن میں گھنٹہ گھر، شاہی محلات، کاروان سرائے، منار خواجہ عالم، قلعہ تبرک اور مدرسہ نادر شاہ وغیرہ اہم ہیں۔

بیسویں صدی کا اصفہان ایک صنعتی شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کپڑے کے بیشمار کارخانے قائم ہیں۔ نیز دھات کا بہترین کام ہوتا ہے۔ جس میں چاندی، تانبے اور جست کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔

اصنام پرستی بت پوجا، بُت پرستی۔ اسلام میں اسے شرک سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایک ناپاک فعل قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ الحج میں ارشاد ہوتا ہے

"پس بتوں کی گندگی سے بچو۔" (۲۲ – ۳۰)

گویا بت پرستی ایک طرح کی غلاظت ہے، جس سے پاک صاف انسان کو گھن آتی ہے۔ اسلام نے اس سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ معبود حقیقی غیر مرئی ہستی ہے اور اس کی تجسیم کرنا یا اس کا بت بنانا بھی غلط اور ناپاک فعل ہے، چہ جائیکہ بہت سے دیوی اور دیوتاؤں کے بت بنائے جائیں۔

بت یا مورتیاں بنانے کا رواج زمانہ قبل از تاریخ ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ایشیائے کوچک، مصر، عراق اور وادیٔ سندھ کے آثار قدیمہ سے ایسی مورتیاں ملی ہیں جن کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ مورتیاں زیادہ تر نسوانی ہوتی تھیں۔ شاید قدیم انسان کا خیال یہ تھا کہ خالق مطلق عورت کے روپ میں ہے۔

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں عبادات کے لیے کسی الوہی مظہر کی ضرورت محسوس ہوئی تو انسان نے مختلف نشانات سے کام لینا شروع کیا۔ بعدازاں مصوری نے اس کی جگہ لی اور پھر سنگ تراشی کی صورت سامنے آئی۔ جس کی بدولت انسان نے اپنے دیوی دیوتاؤں کے بت تراش کر سامنے رکھ لیے۔ ان بت پرستوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ بت کو خدا نہیں سمجھتے بلکہ ان کے ذریعے خدا کی تجسیم کی جاتی ہے اور ان سے خدا کی خدائی کا ظہور ہوتا ہے۔

بت پرستی کی رسوم کے متعلق ماہرین تاریخ و آثار متفق ہیں کہ یہ روم اور یونان سے شروع ہوئی۔ بلاشبہ اب بھی دنیا میں بت پرستی رائج ہے، خصوصاً ہندومت، جین مت اور بدھ مت میں۔ تاہم اس بارے میں بھی پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں بت پرستی کا مکمل آغاز اسرائیلیوں یعنی یہودیوں نے کیا۔ قرآن مجید اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنی اسرائیل ہی وہ قوم ہے، جس نے خدا کی واضح ہدایت کے باوجود گائے کے بچھڑے کی پوجا شروع کردی۔ مشہور یونانی مؤرخین ہیروڈوٹس اور یوسیبئس وغیرہ لکھتے ہیں کہ قدیم لوگ بت پرست نہیں تھے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کے لوگ بت بناتے اور ان کی پوجا کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کی بت پرستی کی تصریح موجود ہے۔ مگر خود یہودی اور عیسائی مؤرخین کا کہنا ہے کہ بت پرستی کی ابتدا صحیح معنوں میں تدیم یہودیوں سے ہوئی۔ آج بھی یہودی اور عیسائی مختلف بت بناتے اور اپنے معبدوں میں سجاتے ہیں

یوں تو بت پرستی دنیا بھر میں کسی نہ کسی طور رائج رہی، لیکن اس شرک کی پیٹ میں سب سے زیادہ ہندی، یونانی اور عرب اقوام آئیں۔ ہندوستان میں سینکڑوں دیوی دیوتاؤں کے بت تراشے گئے۔ دراوڑیوں، آریاؤں، برہمنوں اور بدھ مت کے پیروکاروں نے مذہبی عبادات کے لیے بُت کو اہم حیثیت دی۔ ہر ذات اور ہر گھرانے کے لیے علیحدہ بت پوجنا مذہب کا حصہ ٹھہرا اور یوں ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ تاہم ان کے تین بڑے دیوتا برہما، وشنو اور شیو تھے۔ بدھ مت اور جین مت میں گوتم بدھ اور مہاویر کے بت بنا کر پوجے گئے۔

یونانیوں کے ہاں انسانی شکل و صورت کے دیوتاؤں کے بت بنائے جاتے تھے۔ یہ تعداد میں بارہ تھے۔ ان میں سات دیوتا اور پانچ دیویاں تھیں۔ آسمان کے دیوتا کو یورانس اور زمین کی دیوی کو گے، کا نام دیا گیا تھا۔ دیگر دیوتا زیوس، پوزیڈان، اپالو، ہرمیس، ہیفیٹس، ایریس دا ئرنیس اور دیویاں ہیرا، ڈیمیٹر، آرٹیمس، ایتھنی اور ایفروڈائٹ تھیں۔

بت پرستی کے سلسلے میں عربوں کے طریقے مختلف تھے۔ ان میں بت پرستی کو فروغ عیسائیوں اور یہودیوں کی باہمی آویزش سے ہوا۔ عیسائیوں کے ہاں مصر و یونان کی بت پرستی کے آثار نمایاں تھے۔ کلیساؤں میں اکثر صنم رکھے ہوتے تھے۔ یہی چیز عربوں کے ہاں در آئی۔ اور ہر قبیلے نے عبادت کے لیے بت تراشنے شروع کر دیئے۔ انھیں صنم اور نصب کہا جاتا تھا۔ عام خیال تھا کہ یہ بت آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بت خدا اور بندگان خدا کے درمیان وسیلہ کا باعث ہیں۔ مرکزی اتحاد کی خاطر مختلف قبائل نے اپنے بت لا کر خانہ کعبہ میں رکھ دیئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد فتح مکہ کے وقت تین سو ساٹھ تھی۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ عربوں میں بت پرستی کا آغاز کرنے والا شخص عمرو بن لحی تھا، جو شام کی سرزمین میں تجارت کے لیے گیا۔ اسے عمالیقیوں کی بت پرستی پسند آئی اور وہ ان سے ہبل نامی ایک بت لے آیا جسے خانہ کعبہ کی چھت پر رکھ دیا گیا تاکہ عرب اس کی عبادت کریں۔ دوسرے بتوں میں سے لات قبیلہ ثقیف کا، عزیٰ بنو قریش و کنانہ کا، منات قبیلہ اوس اور خزرج کا، یغوث بنو غطیف کا، یعوق جنوبی عرب کے قبائل کا، سواع بنی ہذیل کا اور ود ایک جنگی دیوتا تھا۔ ان میں سے ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ ان کے بتوں کی پرستش طوفان نوح کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے ہو رہی تھی، جسے عربوں نے فروغ بخشا۔ اسلام نے نہ صرف بت پرستی کا قلع قمع کیا بلکہ عرب کی سرزمین کو ان بتوں کے وجود سے بھی پاک کر ڈالا۔

اُصول طریقہ، وزن، رکن، دلیل، علم عروض میں سبب، وتد اور فاصلہ کو اصول کہتے ہیں۔ علوم دینیہ میں مبادیات تحقیق و تشریح کا نام اصول رکھا گیا ہے۔ یہ تعداد میں چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس ان سے فقہ تشکیل پاتا ہے (نیز دیکھیے "اجماع"، "تفسیر"، "حدیث"، "فقہ"، "قرآن")

اضحیٰ:۔ دیکھیے "عیدالاضحیٰ"۔

اطاعت گردن جھکانا، فرمانبرداری کرنا۔ یہ خالص اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ اور پھر اسی کے حکم کے مطابق حاکم وقت اور امام کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ عمران میں ارشاد ہوا ہے:۔

"کہہ دے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" (۳ = ۳۲)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اور اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔" (۳ = ۱۳۲)

بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہر انسان پر فرض ہے۔

سورۂ النساء میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو۔" (۴ = ۵۹)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ کی اطاعت فرض ہے، اس کے بعد اس کے رسولؐ کا حکم ماننا ضروری ہے اور پھر اپنے حاکم یا امام کا حکم مانا جائے اللہ کی اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ اللہ پر ایمان کامل ہو اور عمل صالح کیا جائے اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ شریعت محمدی پر چلا جائے اور اطاعت رسولؐ کا جوا اپنی گردنوں پر رکھا جائے۔

رسولؐ کی اطاعت کا مطلب ہے کہ رسولؐ جو کچھ کہے، بلا چون و چرا تسلیم کیا جائے اور رسولؐ جو کچھ کرے، اس کی پیروی کی جائے۔ گویا اللہ کی کتاب کے بعد سنت رسولؐ کی پیروی فرض عین ہے۔

ایک گروہ تعزیہ میں مبتلا ہو کر یہ کہتا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت بھی شرک میں داخل ہے۔ جبکہ اس اطاعت کا حکم خود اللہ دے رہا ہے اور جب کہ ہم اللہ کی اطاعت رسول ہی کے واسطے سے کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے سے ہم نے اللہ کو پہچانا تو یقیناً ہم نے رسولؐ کو سچا مانا۔ گویا رسول جو کچھ کہتا اور کرتا ہے اللہ ہی کے حکم سے کرتا ہے۔ ثابت ہوا کہ اللہ کی اطاعت تبھی ہو سکتی ہے اگر رسول کی اطاعت کی جائے۔ اس کے بارے میں اللہ نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ سورۂ النساء میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہ یقیناً اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔" (۴ = ۸۰)

اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد امیر وقت کی اطاعت لازم ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے۔ "اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے، جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔" (مسلم)۔ مگر یہ اطاعت نیک اور اچھے کاموں میں ہے۔ برے کاموں میں نہیں۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: "معصیت میں کوئی اطاعت نہیں۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔" (بخاری و مسلم، نیز ابوداؤد)

Marfat.com

فرد کا ذاتی فعل نہیں بلکہ اس پر لازم ہے، خواہ وہ دل سے اپنے امیر کو ناپسند کرتا ہو۔ ارشاد نبوی ہے۔ "ایک مسلمان پر سمع و اطاعت لازم ہے، خواہ برضا و رغبت کرے یا بکراہت۔ تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ تب نہ تو سمع ہے نہ طاعت۔" (بخاری و مسلم)

امیرِ وقت کو قرآن مجید میں اولی الامر کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک ان سے مراد وہ امیر ہیں، جو نبی کریم صلعم کے زمانے میں مقرر کیے گئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ اہل بیت کے آئمہ اور بعض کے نزدیک امر معروف کرنے والے۔ ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے مراد فقہا اور اہل دین ہیں۔ امام راغب کے نزدیک اولی الامر میں انبیاء، حاکم، حکیم اور واعظ شامل ہیں۔

احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولی الامر کے احکام کی پابندی کی اصل بنیاد اتحاد ملت ہے۔ صحیحین میں ہے کہ جو شخص اپنے امیر کی کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر ہٹتا ہے، پھر مرتا ہے تو جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ گویا اگر امیر کوئی ایسا حکم بھی دے، جو کسی شخص کو ناپسند ہو تو بھی اسے ماننا پڑے گا۔ بشرطیکہ یہ حکم اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ آنحضور نے یہ بھی فرمایا کہ تم پر ایسے لوگ حکومت کریں گے، جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر، تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا، وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا، وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا "پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں۔؟" آپ نے فرمایا "نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔" (مسلم)

اعتکاف ٹھہر جانا، رک جانا، پابند ہونا۔ شرعی اصطلاح میں ایک طرح کی عبادت جو کچھ عرصے کے لیے دنیا سے کنارہ کش ہو کر مسجد میں ادا کی جاتی ہے رمضان کے آخری دنوں میں اس کا ادا کرنا، کتب میں نیک اور مستحسن قرار دیا گیا ہے فقہا کے نزدیک اس کی مدت کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ رمضان کا آخری عشرہ ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ بھی اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے

اعتکاف ایک مستحسن اور ثواب کا فعل ہے۔ اعتکاف کے لیے مسجد میں ایک علیحدہ جگہ مقرر کر کے صبح کی نماز پڑھ کر وہاں داخل ہوتے ہیں اور ضروری حاجت کے سوا مسجد سے باہر نکلنا ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ کسی کی عیادت کو بھی نہ جائیں۔ البتہ راستے میں گزرتے ہوئے کسی بیمار کی عیادت کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح دفن میّت اور نماز جنازہ کے لیے بھی باہر جانا درست نہیں۔ اس دوران میں قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا، دینی تعلیم دینا، حجامت و غسل کرنا، کپڑے بدلنا اور مختصر باتیں کرنا وغیرہ جائز ہے۔ لیکن بیوی کے ساتھ اختلاط کرنا منع ہے۔

اعتکاف کا آغاز عام طور پر رمضان کی اکیس تاریخ سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ لیلۃ القدر ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ یا ۲۹ ویں راتوں میں سے کوئی ایک ہے۔ اکثر علماء کا یہی خیال ہے، چونکہ لیلۃ القدر کی عبادت دیگر عبادتوں سے افضل قرار دی گئی ہے، اس لیے احتیاطاً اعتکاف کا آغاز ۲۱ ویں رمضان سے پہلے یعنی ۲۰ رمضان کی صبح سے کیا جاتا ہے اور اس کا اختتام عید کا چاند نظر آنے پر کیا جاتا ہے۔

اعراف عرف کی جمع، جس کے معنی بلند جگہ ہیں۔ قرآن مجید نے جنت اور دوزخ کے درمیان ایک حدِ فاصل کو اعراف کہا ہے۔ جہاں کچھ لوگ ہیں اور یہ بلند جگہ ہے۔ سورۂ الاعراف میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:۔

"ان دونوں گروہوں (جنت اور دوزخ والوں) کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر۔ یہ لوگ جنت میں داخل تو نہ ہوئے ہوں گے مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے، اے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجو۔" (۷: ۴۶، ۴۷)

حذیفہؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ کا خیال ہے کہ اعراف میں وہ لوگ شامل ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ بعض مفسرین اور مستشرقین کے نزدیک اعراف کے لوگ پہچاننے والے، نگران ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ یہ اشارہ انبیاء کی طرف ہو جو اس وقت بھی خیر کو شر سے علیحدہ رکھنے پر مقرر کیے جائیں گے "لسان العرب" میں حضرت ابن عباسؓ کا قول درج ہے کہ اعراف والے سرداران اہل جنت ہوں گے۔ واللہ علم بالصواب۔

اعراف، سورۃ :۔ قرآن مجید کی ایک سورت (دیکھیے "الاعراف" سورۃ)

اعلیٰ، سورۃ :۔ قرآن مجید کی ایک سورت (دیکھیے "الاعلیٰ" سورۃ)

اعوذ باللہ "اللہ کی پناہ مانگنا۔" قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے "اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم" پڑھا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ "میں شیطان مردود (رجیم) سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔" اس کا حکم قرآن مجید میں سورۂ النحل میں یوں دیا گیا ہے:۔

"پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔" (۱۶: ۹۸)

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور چند دیگر اصحاب کے نزدیک "اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطٰن الرجیم" پڑھنا بہتر ہے۔ امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ان اللہ ھو السمیع العلیم" کی ترکیب بہتر ہے۔ اسے بسم اللہ سے قبل پڑھا جاتا ہے

اعوذ باللہ پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ شیطان کے شر سے محفوظ کرے تاکہ اس کی وسوسہ اندازیاں اس ہدایت سے محروم نہ کر دیں، جو قرآن مجید سے حاصل ہوتی ہے۔ شیطان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرے۔

افطار :۔ (دیکھیے "روزہ")

افغان ایک قوم، جو پشاور اور کابل کے علاقوں میں رہتی ہے۔ عام طور پر یہ لفظ درانی اور ترین قبائل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جنہیں عام طور پر پٹھان سمجھ لیا جاتا ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ پٹھان کا اطلاق جو عامی لفظ پشتون یا پختون کی بگڑی ہوئی شکل ہے، پشتو زبان بولنے والے ان تمام قبائل پر ہوتا ہے، جو صوبہ سرحد میں رہتے ہیں۔ وہ افغان جو اس زمرے میں آتے ہیں، پٹھان کہلاتے ہیں، جبکہ افغانستان کے دیگر افغان فارسی بولتے ہیں۔ عام طور پر لوگ پٹھانوں اور افغانوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور

Marfat.com

جب پٹھانوں کا تذکرہ قبائل کا نسلی اختلاف نظر آتا ہے تو اسے افغانوں کا نسلی اختلاف قرار دیتے ہیں۔

افغان اپنا سلسلہ نسب اسرائیل کے پہلے بادشاہ طالوت (ساؤل) کے پوتے افغانہ سے ملاتے ہیں۔ اس کی نسل سے ایک شخص قیس عبدالرشید حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ اس کے تین بیٹے سربن، بتن اور غرغشت تھے۔ تمام افغان قبائل انھی کی اولاد ہیں۔

افغان قبائل میں سب سے زیادہ طاقتور قبیلہ درانی ہے، جو ہرات اور قندھار کی وادیوں میں آباد ہے۔ ان کے بعد غلزئی ہیں، جو جلال آباد تک کے علاقے میں آباد ہیں۔ اس کی ایک اہم شاخ سلیمان خیل ہے، جو موسم سرما میں سندھ کے زیریں علاقوں تک چلے جاتے ہیں اور موسم بہار میں واپس آجاتے ہیں، یہ بلوچستان کے ان علاقوں میں بھی آباد ہیں جہاں ترین اور کاکڑ آباد ہیں۔ دریائے کابل سے لیٹ ورتک کے علاقے پر مہمند قابض ہیں، سوات اور دیر کے علاقوں میں یوسف زئی اور مندان قبائل آباد ہیں۔ دریائے کرم کی بالائی وادی میں بنگش، اورکزئی اور خیبر و کوہاٹ کے دروں میں آفریدی آباد ہیں۔

افغانوں کی قدیم تاریخ ابھی تک پردۂ اخفا میں ہے۔ تاریخ میں ان کا ذکر پہلی بار چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ انھیں سیاسی قوت بارہویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی۔ جب ان کے علاقوں پر غزنوی حکمران تھے۔ یہ غوریوں اور مغلوں کی فوج کا ایک حصہ رہے۔ برنی لکھتا ہے کہ افغانوں نے پہلی بار ملتان میں محمد بن تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ان کے ایک سردار دولت خاں لودھی نے اقتدار حاصل کرنا شروع کیا اور ۱۴۵۰ء میں بہلول لودھی نے پہلی بار تخت دہلی پر قبضہ کیا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں لودھیوں کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ مگر شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۵ء تک کے مختصر عرصے کے لیے ایک بار پھر افغانوں کو حکومت پر بٹھا دیا۔ بعد میں اورنگ زیب نے انھیں جاگیریں دینا شروع کیں اور یوں ہندوستان میں آنے والے افغان رفتہ رفتہ مقامی آبادیوں میں گھل مل گئے۔

قندھار میں غلزئیوں کی ایک شاخ توخی نے اپنی خود مختاری برقرار رکھی۔ اسی میں سے ایک فرد ملجی کو اورنگ زیب نے تمام غلزئیوں کا سلطان تسلیم کیا۔ یہ لوگ امیر عبدالرحمان خاں کے عہد تک برسر اقتدار رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ابدالیوں (درانیوں) نے بھی ہرات اور قندھار میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ ۱۱۰۰ھ/۱۶۴۶ء کے لگ بھگ ان کے ایک سردار ملک سلیمان زیرک بن عیسیٰ نے اس سلطنت کو وسیع کیا۔ انھی میں سے ایک مشہور سردار احمد شاہ ابدالی تھا، جو ایران کے بادشاہ نادر شاہ کا سپہ سالار تھا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۷۳ء تک افغانستان میں افغانوں کی حکومت قائم رہی ہے۔ (نیز دیکھیے "افغانستان")

افغانستان ایشیا کا ایک ملک۔ اس کے شمال میں روس، شمال مشرق میں چین جنوب مشرق اور جنوب میں پاکستان اور مغرب میں ایران جیسے ممالک واقع ہیں۔ پورا ملک پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے۔ مشرق میں کوہ ہندوکش (۲۰ ہزار فٹ تک بلند)، کوہ بابا اور کوہ سپید (۱۵ ہزار فٹ تک بلند) کے سلسلے واقع ہیں۔ میدانی علاقے سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ جو سطح مرتفع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورے ملک میں چار بڑے دریا بہتے ہیں۔ ان میں سے آمو دریا شمال مشرقی پہاڑی سلسلے سے نکل کر روس کی سمت بہتا ہے۔ ہندوکش کے شمال میں زمین کی سطح آمو کی وادی کی طرف تیزی سے نیچے ہوتی چلی گئی ہے اور جنوبی جانب اس کے نشیب کے آخر میں سیستان کی ارتفاعی سطح واقع ہے جس میں بہتے ہوئے دریائے ہلمند اور دریائے ہامون ایک جھیل میں جا گرتے ہیں دریائے ہلمند کابل کے قریب دجوار سے نکلتا ہے۔ بائیں جانب سے دریائے ارگنداب بھی اس میں آملتا ہے۔ دریائے ہامون ایک طاس ہے، جو طغیانی کے زمانے میں جنوب کی طرف بے حد پھیل جاتا ہے۔ اس وقت صرف کوہ خواجہ ایک جزیرے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے دس سال میں ایک بار کبھی کبھی یہ طاس امنڈ پڑتا ہے اور پھر اس کا کچھ پانی ایک نالے کی راہ سے بہت زیادہ نشیبی علاقے گودزرہ میں جا پہنچتا ہے۔ کابل کے اردگرد سے ایک اور دریا بھی نکلتا ہے، جو دریائے کابل کے نام سے مشہور ہے اور مشرق کی سمت دریائے سندھ میں جا ملتا ہے۔

افغانستان ایک ایسا ملک ہے، جس میں دونوں طرح کے موسم مل جاتے ہیں سیستان کے علاقے گرمیوں میں گرم ترین ہیں اور پہاڑی سلسلے سردیوں میں سرد ترین ہوتے ہیں، جہاں تند برفانی طوفان بھی آتے ہیں، پہاڑوں پر عام طور پر صنوبر اور بلوط کے درخت اور عشق پیچاں اور گلاب کے پودے پائے جاتے ہیں۔ چھوٹی پہاڑیوں پر پستہ، زیتون، انگوزہ اور ہینگ کی پیداوار ہوتی ہے۔ عام میدانوں میں چنار، بید مجنوں، گل سوسن، گل لالہ، گلنار اور پھل دار درخت پائے جاتے ہیں۔

افغانستان سیاسی طور پر کابل، قندھار، سیستان، ہرات، ہزارستان، ترکستان بدخشاں اور نورستان کے صوبوں میں منقسم ہے۔ جہاں افغان تاجیک، ایرانی، منگولی اور ہند آریائی نسلوں کے لوگ بستے ہیں۔ یہ لوگ گیارہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ جن میں سے اکثریت پشتو اور فارسی بولتی ہے۔ قبول اسلام کے وقت سے پوری آبادی مسلمان ہے، جن میں سے بہت بڑی اکثریت سنیوں کی ہے۔ یہ لوگ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس لیے احمدیوں اور عیسائی مشنریوں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ تاہم ہندوؤں کے ساتھ رواداری برتی جاتی ہے۔

تاریخ: افغانستان ایک قدیم تاریخی ملک ہے۔ اگرچہ اسے موجودہ سیاسی ہیئت اٹھارویں صدی میں ملی۔ اس سے پہلے یہ مختلف سیاسی حصوں میں منقسم تھا، جن کے مابین کوئی سیاسی وحدت نہ تھی۔ ان علاقوں کو چھٹی صدی عیسوی قبل مسیح میں ایرانی بادشاہ کوروش یا خسرو نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ ۳۳۰ ق م میں سکندر اعظم نے انھیں فتح کیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد یوچی قبائل نے ان پر قبضہ کیا۔ ان کی حدود مملکت میں کابل، غزنی، پشاور اور سوات شامل تھے۔ ۴۰۰ء کے لگ بھگ یہ علاقے غزنہ کے چینیوں کے قبضے میں تھے۔ یہ تمام حکمران ایرانیوں کے باجگزار رہے۔ ۴۴۰ء میں چیونی، جنھیں اب یفتلی کہا جانے لگا، ایرانیوں پر حاکم ہوئے تو انہوں نے ایرانیوں سے خراج لینا شروع کیا۔ ایرانی حکمران نوشیرواں (خسرو اول) نے انھیں شکست دے کر ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک ان علاقوں کے امرا ایرانیوں کے باجگزار رہے۔ ۶۵۹ء سے ۷۵۱ء تک یہاں چینیوں کا تسلط برقرار رہا۔

یہ وہ دور تھا جب افغانستان میں ایرانی، ہندی اور چینی تہذیب اور مذاہب کا معجون مرکب تیار ہو رہا تھا۔ زرتشت، بدھ اور برہمن کے مذاہب یہاں جاری و ساری تھے گندھارا اور ارگنداب آرٹ اپنے عروج پر تھے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں احنف بن قیس نے ایرانی بادشاہ یزدگرد کو شکست دے کر افغانستان میں اس کا تعاقب کیا۔ اور خراسان کو فتح کر لیا۔ عہد عثمانی میں فتوحات کا دائرہ بڑھا تو عبداللہ بن عامر نے کابل فتح کر لیا۔ حضرت عثمانؓ نے احنف بن قیس کو مرو اور ہرات میں، خبیب بن قرہ الیربوعی کو بلخ اور طخارستان میں اور عبداللہ بن عمیر کو سیستان کا حاکم مقرر کیا۔ ۴۵ھ/۶۶۵ء تک مختلف امرا آتے رہے۔ جنھوں نے یہاں نہ صرف اسلام کی تبلیغ کی، بلکہ پچاس ہزار سے زائد عربوں کو بھی بسایا۔ ۷۵ھ/۶۹۴ء میں ان امرا کی باہمی مناقشت کے پیش نظر حجاج نے یہ ملک مہلب کے حوالے کر دیا۔ ۸۶ھ/۷۰۵ء میں قتیبہ بن مسلم خراسان کے والی مقرر ہوئے

Marfat.com

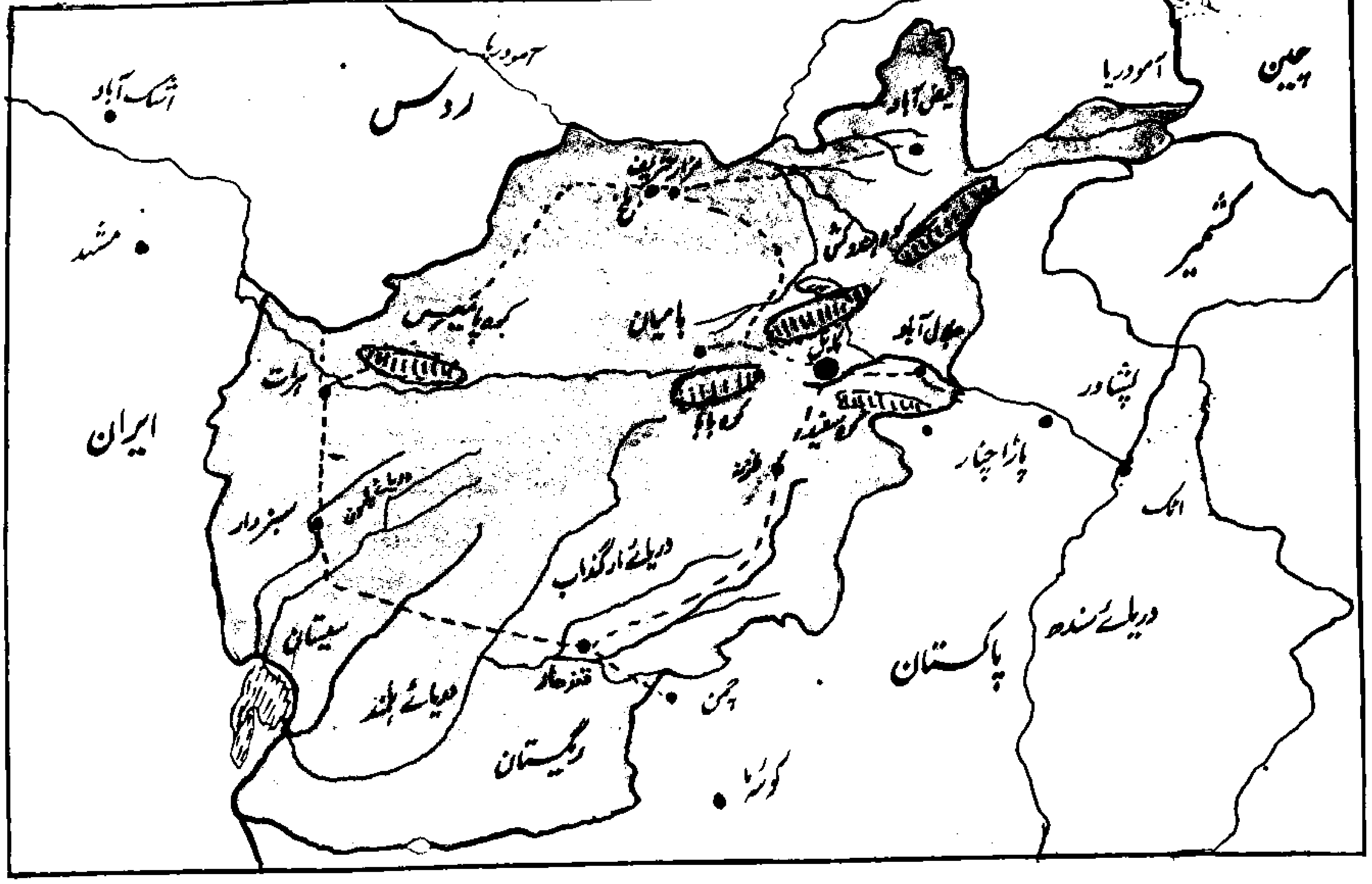

انہوں نے طخارستان کے علاقے میں تمام باغی عناصر کو کچل ڈالا۔ ان کی کوششوں سے ۹۶ھ/۷۱۴ء تک شمالی افغانستان ہر طرح کی مخالفت سے پاک ہوگیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی قتیبہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اموی خلیفہ ولید نے انھیں کسی ترکیب سے قتل کروا دیا۔ جنوبی افغانستان پر ۴۳ھ/۶۶۳ء میں حضرت معاویہؓ کی طرف سے عبدالرحمان بن سمرۃ حکمران تھا۔ اس نے ۴۴ھ/۶۶۴ء میں کابل فتح کیا۔ ۴۷ھ/۶۶۷ء میں یہاں کے والی ربیع الحارثی نے خواجہ حسن بصریؒ کی مدد سے یہاں اسلامی قوانین نافذ کیے۔ اس کے بعد سے کابل کئی بار فتح ہوا۔ ۹۶ھ/۷۱۴ء تک اسلامی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور افغانستان کے باشندے برابر مقابلہ کرتے رہے۔

جب بنو امیہ پر زوال آیا تو خراسان کا ایک با اثر شخص عبدالرحمان ابومسلم کو فے گیا اور عباسی امام ابراہیم کو خلافت کے حصول پر اکسایا۔ ۱۲۹ھ/۷۴۶ء میں اس نے مرو سے طخارستان تک کے باشندوں کی حمایت حاصل کرکے بنو عباس کی خلافت کا اعلان کردیا ۱۳۲ھ/۷۴۹ء میں بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ عباسیوں نے افغانوں کی بغاوتوں کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ۱۶۹ھ/۷۸۵ء میں تمیم بن سعید نے سیستان کا حاکم مقرر ہو کر کابل شاہ کے خلاف جنگ لڑی اور اس کے بھائی کو گرفتار کرکے عراق بھیج دیا۔ ۱۹۴ھ/۸۰۸ء میں ہارون الرشید اپنے لشکر کے ہمراہ خراسان آیا۔ اس وقت زد طہماسپ کی نسل سے حمزہ بن عبداللہ سیستان اور ہرات پر قابض تھا۔ وہ تیس ہزار کا لشکر لے کر نیشاپور کی طرف بڑھا۔ مگر خلیفہ کی وفات کے باعث لڑے بغیر لوٹ گیا۔

اس تمام عرصہ کے دوران میں اگرچہ افغانستان پر باقاعدہ اسلامی حکومت تو قائم نہ ہوئی مگر اسلامی تہذیب کی چھاپ پورے ملک کے طول و عرض پر لگ چکی تھی دین اسلام نے یہاں کے تمام مذاہب باطلہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی اور عربی زبان اور رسم الخط پورے ملک میں پھیل گیا تھا۔ عربی اور پہلوی کے اختلاط سے فارسی زبان نے جنم لیا۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً بلخ، ہرات، غزنہ اور زرنج میں اسلامی علوم کے مکاتب کھل گئے۔ اس سرزمین سے کئی مشہور صوفیا اور علماء نے جنم لیا۔ ان میں سے امام اعظم ابوحنیفہؒ، محمد بن کرام، ابو اسحاق جوزجانی، ابراہیم ادھم، ابوسلیمان موسیٰ، ابوداود سجستانی، ابومعشر بلخی، ابن قتیبہ مروزی، ابراہیم بن طہمان محدث باشانی اور ابراہیم بن رستم مروی قابل ذکر ہیں۔ کابل، غزنہ، بخارا، قندھار، ہرات، خراسان اور سمرقند کے شہروں کے مابین آزادانہ تجارت ہوتی تھی۔ یہاں کی مصنوعات پوری دنیا میں اہم تجارتی مقام رکھتی تھیں۔ زراعت، آب پاشی، کانکنی اور صنعت و حرفت کو عروج حاصل تھا۔ تاہم یہ علاقے مختلف حکمرانوں کے مخلوط طور پر باجگزار رہے۔ اموی اور عباسی خلفاء کے سکے بھی یہاں کے غیر اسلامی سکوں کے ساتھ رائج تھے۔ خراسان سے کابل تک کا علاقہ پنجاب اور سندھ ولایات عراق و عجم میں شامل تھا۔ اموی خلفاء کی طرف سے یہاں دو حاکم ہوتے تھے۔ ایک حاکم خراسان اور دوسرا حاکم کابل، جو پنجاب اور سندھ کا بھی والی ہوتا تھا۔ عہد عباسیہ میں یہاں تین والی مقرر کیے گئے تھے۔ خراسان، سیستان اور توران و مکران صحابہ کرام اور تابعین کو یہاں بطور قاضی مقرر کیا جاتا تھا، جو سیاسی اثر سے پاک فیصلے کیا کرتے تھے۔

۲۰۶ھ/۸۲۲ء سے عباسیوں کے مقرر کردہ امیر خراسان طاہر بن حسین نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد سے شمالی افغانستان آل طاہر کے ماتحت رہا۔ جنوبی و مشرقی اطراف پر ابھی تک کابل شاہی ہندو حکمران موجود تھے۔ ۲۵۹ھ/۸۷۲ء میں خوارجیوں کے ایک رکن یعقوب نے آل طاہر کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔ اور کابل، پشاور، ملتان، مکران وغیرہ کے تمام بادشاہوں کو اپنا مطیع بنالیا۔ وہ پہلا حکمران ہے، جس کی قلمرو میں موجودہ افغانستان کا تمام علاقہ شامل تھا۔ اس کے جانشین اہل صفاریہ کہلائے۔ ان پر غزنویوں

Marfat.com

غوریوں اور مغلوں نے وقتاً فوقتاً حملے کیے۔ مگر ۵۸۸ھ/۱۰۸۰ء تک یہاں صفاری حکمران رہے۔ خواہ انھیں مختلف سلطنتوں کا باجگزار بن کر رہنا پڑا۔

۲۷۵ھ/۸۸۸ء میں ماوراءالنہر کے امیر نصر بن احمد بن سامان کے بھائی اسماعیل نے ماوراءالنہر اور خراسان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۲۸۰ھ/۹۰۰ء میں اس نے طخارستان سے ہرات تک اور مغربی افغانستان کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء تک اس کی اولاد آلِ سامان کے نام سے افغانستان کے مختلف حصوں پر حکمران رہی۔ سامانیوں کے دور میں فارسی ادب اور زبان کے ساتھ ساتھ دین اور تمدن اسلام کابل تک پھیل گیا۔ تیسری صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں کوہ سلیمان پر افغانوں کے جدِ امجد عبدالرشید قیس کی حکومت تھی۔ اس کے تین بیٹے غرغشت، بٹنی اور سربن تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کوہ غور سے کوہ سلیمان تک کے علاقے پر قابض رہے اور کہا جاتا ہے کہ افغان قوم انھی تینوں کی اولاد میں سے ہے (دیکھیے: افغان) دریائے آمو اور وادی پرگوزگانیوں کے ایک خاندان فریغونیاں کی حکمرانی تھی۔ اس خاندان کا پہلا شخص احمد فریغونی ۲۸۰ھ/۹۰۰ء میں بلخ کا حکمران تھا۔ ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء تک اس کی اولاد گوزگان کے علاقے پر حکمران رہی۔ ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں جب سامانی حکمرانوں پر زوال آیا اور غزنہ پر لودی حکمران سبکتگین کی حکومت قائم ہو گئی تو فریغونیوں کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔ سبکتگین کے بیٹے محمود غزنوی نے شمالی افغانستان کو بھی فتح کر کے بلخ کو اپنا پایۂ تخت بنایا ۵۵۲ھ/۱۱۵۰ء تک موجودہ ملک افغانستان کا پورا علاقہ غزنویوں کی سلطنت میں شامل رہا۔ اگرچہ صفاری حکمران غزنویوں کے باجگزار کی حیثیت سے موجود رہے۔ اس دور میں یہاں سے ہندو مذہب اور تہذیب پوری طرح نابود ہو گئے اور اسلام پوری سلطنت میں رائج ہو گیا۔ اس عہد میں البیرونی، ابن سینا، ابن مسکویہ، ابوالفضل بیہقی، نصر اللہ، موفق ہروی ابوالحسن ہجویری (داتا گنج بخش)، فردوسی، طوسی، عنصری، منوچہری، سنائی، ناصر خسرو ابوالفرج رونی اور مختاری غزنوی جیسے فاضلین نے جنم لیا اس دور میں فنونِ لطیفہ اور مصنوعات نے بحیثیت مجموعی بے حد ترقی کی۔

غزنویوں کے ہاتھ سے نیشاپور اور بہت سے دیگر علاقے طغرل بیگ سلجوق کے ہاتھ میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ اس نے ۴۵۵ھ/۱۰۶۲ء تک سیستان سے بلخ و طخارستان کے علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس کی اولاد آلِ سلجوق یا سلاجقہ کہلائی۔ اس سلسلے کے ایک سلطان سنجر نے غزنوی حکمران بہرام ارسلان کے ماتحت غزنہ سے لاہور تک کے علاقے پر حکومت کی۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء میں اس کے اپنے باغیوں نے کر دیا۔ انھی میں سے ایک سردار اتسز نے اپنی حکومت قائم کر لی اور اس کا خاندان آلِ خوارزم شاہ کے نام سے ۶۱۳ھ/۱۲۱۵ء تک حکمران رہا۔ خوارزم شاہیوں اور غوریوں کے مابین کئی بار تصادم ہوئے۔ اس وقت سیستان کے امرا نے سر ابھارا۔ انھوں نے سلجوقیوں، غوریوں اور غزنویوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے تھے۔ خوارزم شاہیوں کے بعد انھوں نے سیستان پر خود مختارانہ حکمرانی کی۔ اس وقت غور پر غوری یا سوری حکمران تھے، جو یہاں حضرت علیؓ کے عہد سے حاکم چلے آتے تھے۔ ان میں قطب الدین حسن، جو سلاطین غور کا جدِ امجد تھا، ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں باغیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بیٹے عزالدین حسین اور سات پوتوں نے خراسان، غور، زابل، غزنہ، بامیان اور طخارستان پر خود مختارانہ حکومت کی۔ ان کے بعد ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء میں غیاث الدین تخت پر بیٹھا۔ اس نے بہت سے علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء میں اس کی سلطنت ہندوستان سے عراق تک پھیل چکی تھی اور خلیفۂ بغداد نے اسے قانونی حکمران تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بھائی سلطان محمد غوری کی سلطنت بنارس سے خراسان اور خوارزم سے بحیرۂ عرب تک پھیل چکی تھی۔ اس کی شہادت کے بعد غوری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مختلف علاقوں میں مختلف امرا کی حکومت قائم ہو گئی۔ انھی میں سے ایک سلطان قطب الدین ایبک نے چالیس روز تک غزنہ پر حکومت کی۔ اس کے بعد سے خوارزم شاہیوں نے شمالی علاقوں اور ملوک سیستان نے جنوبی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

غوریوں کا دور علمی و ادبی لحاظ سے افغانستان کا ایک سنہرا دور ہے۔ اس دور میں فنِ تعمیر نے بڑی ترقی کی۔ پشتو ادبی زبان بنی، امام فخرالدین رازی، نظامی عروضی، قاضی منہاج سراج، ابونصر فراہی، محمد عوفی وغیرہ اس دور کے مشاہیر میں سے ہیں۔

اس تہذیب کو، جو ابھی عروج کی طرف مائل تھی۔ ۶۱۶ھ/۱۲۲۰ء میں تاتاری حملہ آور چنگیز خاں نے اپنے گھوڑوں کے قدموں تلے روند ڈالا۔ اس وقت افغانستان کے علاقوں پر خوارزم شاہی حکمران تھا، تاتاریوں نے خوارزم شاہ کو شکست دے کر اسلامی مملکت کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔ علاءالدین کے بیٹے جلال الدین نے دو ہی برس بعد ایک لشکر جرار جمع کیا اور پروان کے مقام پر چنگیزی لشکر کو شکست دی۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں چنگیز خاں کی موت کے بعد افغانستان پر اس کا بیٹا طولی خاں حکمران ہوا۔ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک بار پھر اسلامی تمدن کو ملیامیٹ کرنا شروع کیا اور تاتاری قوانین نافذ کیے۔

تاتاریوں نے اپنے ہاں مسلمان مشیر بھی ملازم رکھے تھے، جو اسلامی احکام و آداب کی نگرانی کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاتاری تمدن کو بھی فروغ ہوا۔ چین کے فن نقاشی معماری اور پارچہ بافی کو رواج ہوا۔ اس دور کے فضلا اور علما میں مولانا روم، نصیرالدین طوسی، شیخ فریدالدین عطار، مولانا جامی، امیر حسینی غوری اور سلیمان حاکو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء میں تاتاری حکمران منگو خاں نے اپنے ایک درباری اور محمود غزنوی کے ننھیالی رشتہ دار ملک شمس الدین محمد بن ابی کرت کو سندھ سے خراسان تک کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کا خاندان آلِ کرت کے نام سے حکمران رہا۔ جس کا خاتمہ ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء میں تاتاری حکمران امیر تیمور نے کیا۔ تیمور نے اپنے پوتے محمد خاں کو کابل، غزنہ اور قندھار کا والی بنایا اور بیٹے شاہرخ کو ولایت خراسان کی بادشاہی دے دی۔ تیمور کی وفات کے بعد اس کے ایک اور پوتے خلیل بن میران شاہ نے غزنہ کی حکومت پر قبضہ کر لیا، جسے شاہرخ نے معزول کر کے افغانستان کے تمام علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لیے۔ اس کے جانشین عموماً آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ افغانستان کا آخری تیموری حکمران بایقرا خاں تھا، جس کی وفات ۹۱۱ھ/۱۵۰۶ء کے بعد تمام علاقے الگ الگ حکومتوں میں بٹنے لگے۔

آلِ تیمور کے عہد میں علوم و فنون شہرۂ کمال کو پہنچ گئے۔ اس دور کے فضلا میں سے مولانا جامی، حسین واعظ کاشفی، میر خواند، بہزاد اور عبدالرزاق سمرقندی قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور میں شہر ہرات اپنے عروج و کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اسی دور میں افغان قبائل دروں میں آباد ہوئے اور اسی دور میں شیخ آدم ملی نے تقسیم اراضی پر ایک کتاب لکھی۔

چنگیز خاں کی نسل سے ایک شخص شیبانی خان فرغانہ میں بابر کی تخت نشینی ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء کے وقت سمرقند پر قابض ہو گیا۔ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء میں اس کی بابر کے ساتھ جنگ ہوئی تو اس نے پسپا ہو کر افغانستان کے علاقوں کا رخ کیا۔ جہاں اس دوران میں ایلخانی خاندان حکمران تھا۔ اس کے بانی ذوالنون بیگ کو شکست دے کر قندھار پر قابض ہو گیا۔ کچھ عرصے کے لیے اس نے کابل پر بھی حکومت کی مگر ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں یہ شہر بابر کے قبضے میں چلا گیا۔ ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء میں ایران کی سلطنت صفویہ کے بانی اسماعیل اوّل نے خراسان پر حملہ کیا۔ مرو کے قریب شیبانی خاں مارا گیا۔ اور ہرات تک کا علاقہ اسماعیل صفوی کے قبضے میں چلا گیا۔ بابر نے اس کے ساتھ اتحاد کیا۔ جس پر ازبکوں نے بابر کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس دوران میں افغان قبائل نے بھی کروٹ لی اور متعدد مقامات پر بغاوت نے سر اٹھایا۔ جسے بابر نے سختی کے

Marfat.com

ساتھ کھیل دیا ۔

اگلے کئی برس تک کابل کا شہر ازبکوں، مغلوں، صفویوں اور افغانوں کی باہمی آویزش کا مرکز بنا رہا۔ شمالی علاقے پر مغلوں اور جنوبی خراسان پر صفویوں کا قبضہ تھا۔ ازبکوں نے ہرات پر قبضہ جما لیا تھا۔ فرید خاں (شیر شاہ) سوری (غوری) کے زیر قیادت افغانوں نے کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان کا تخت چھین لیا۔ اس وقت شہزادہ کامران بدخشان سے قندھار اور کابل سے سندھ تک کے علاقے پر حکمران تھا۔ ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے قندھار کو فتح کر لیا اور اگلے ہی برس کابل بھی اس کی دسترس میں آ گیا۔ یہیں سے اس نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کیا۔ اکبر کے عہد میں کابل پر شہزادہ محمد حکیم حکمران تھا۔ ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں اکبر کابل آیا اس کے بعد سے کابل کا علاقہ اکبری سلطنت کا مستقل حصہ بن گیا۔ ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء میں شاہ عباس صفوی نے قندھار کو فتح کر لیا۔ عہد اکبری کے آخری دور میں پشین کے ایک رئیس حسن خاں ترین کے بیٹے شیر خاں ترین نے صفوی اور مغل حکومتوں کے درمیان ایک پائدار حکومت قائم کر لی۔ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں شاہجہان نے قندھار کا شہر صفویوں سے واپس لے لیا۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں ایران کے شاہ عباس ثانی نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں افغان حکمرانوں نے اپنی سلطنت کو مستحکم کر لیا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں ایران کے نادر شاہ افشار نے افغانستان میں تیموری سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔ تاہم اس نے افغانوں کی حکومتوں کو پریشان نہیں کیا مگر کوہستان اور قندھار کے ابدالیوں کو جو کسی زمانے میں قندھار پر حکمران تھے اور اب ہرات کے حکمران تھے، ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں شکست دے کر ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ذوالفقار خاں ابدالی حکمران تھا۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں اس کے بھائی احمد خاں نے قندھار سے آ کر ہرات میں دوبارہ حکومت قائم کر لی۔ یہی احمد خاں بعد میں احمد شاہ درانی کے نام سے مشہور بادشاہ ہوا۔ اس وقت قندھار میں ہوتک حکمران تھے۔ انھیں تاریخ میں خلجی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے نادر شاہ افشار نے انھیں بھی شکست دے ڈالی۔ نادر شاہ نے کابل کو بھی فتح کیا۔ کابل ہی سے اس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ نادر شاہ کے قتل ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء کے بعد احمد خاں ابدالی، جو اس کا سپہ سالار بھی تھا۔ افغانستان کا بلا شرکت غیرے حکمران بن گیا۔

تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کا خاندان دُرّانی کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ شخص سدوزئی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے قندھار کو اپنا دارالسلطنت قرار دے کر اپنی حکومت کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ بہت جلد اس کی سلطنت میں کشمیر، لاہور، ملتان، بہاول پور اور سندھ کے اکثر علاقے شامل ہو گئے۔ وہ پہلا شخص ہے، جس نے افغانوں کی پہلی مستحکم حکومت قائم کی۔ اس نے افغانستان کو اتنا خوشحال بنا دیا کہ عوام اسے "بابا" کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ اس کے بیٹے اگرچہ باہمی مناقشت میں الجھے رہے۔ لیکن اس کے بعد سے افغانوں کی قومی حکومت کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا۔ اگرچہ احمد شاہ کے پوتے زمان شاہ کے بعد حکومت سدوزئی قبیلہ کے ہاتھ سے نکل کر بارک زئی خاندان کے ہاتھ میں چلی گئی اسے محمد زئی قبیلے کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک شخص فتح خاں سدوزئی حکمران محمود کا وزیر تھا۔ اس کے بھائی دوست محمد خاں نے شاہ محمود کو کابل سے نکال دیا اور افغانستان کا حاکم بن گیا۔ اس کے عہد میں ملتان، کشمیر اور ڈیرہ اسماعیل خاں سکھوں کے قبضہ میں چلے گئے اور پشاور اس کے بھائی سلطان محمد نے رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ سندھ کے امراء نے بھی اس علاقے کو افغانوں سے چھین لیا۔ اب دوست محمد ایک مختصر مگر مستحکم حکومت کا مالک ہو کر رہ گیا۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۹ء میں انگریزی فوجوں نے درہ بولان کے راستے قندھار پر چڑھائی کی اور اسے فتح کر کے شاہ شجاع کو حکمران بنا دیا۔ ایک سال کے بعد امیر دوست محمد خاں نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ افغانوں نے اس کے بیٹے محمد اکبر خاں کی سرکردگی میں جہاد کا آغاز کر دیا۔ انگریزی فوجوں کا ایک بڑا حصہ اور شاہ شجاع ان مجاہدین کے ہتھے چڑھ گیا۔ تاہم ۱۸۴۲ء میں کابل پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور انھوں نے امیر دوست محمد خاں کو دوبارہ تخت شاہی پر متمکن کر دیا۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے۔ اس کے بعد اس کے بیٹے شیر علی نے روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ جس کی بنا پر ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء تک انگریزوں اور افغانوں کے درمیان شدید جنگ ہوتی رہی۔ نتیجہ کے طور پر درۂ بولان اور وادی کرم کا کچھ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد کابل میں بغاوت برپا ہو گئی۔ جس کی بنا پر انگریزوں نے دوبارہ کابل فتح کر لیا۔ اب انھوں نے حکومت عبدالرحمان کے سپرد کی اور قندھار کو الگ ریاست کی حیثیت دے دی۔ کچھ عرصہ بعد شیر علی کے بیٹے محمد ایوب کی طاقت توڑنے کے بعد قندھار بھی عبدالرحمان کے حوالے کر دیا گیا اور ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں ساری انگریزی فوج ہندوستان واپس چلی آئی۔ عبدالرحمان نے افغانستان کو دفعتاً ایک خود مختار اور مستحکم مملکت بنا دیا۔ اس نے انگریزوں سے امداد بھی حاصل کیے رکھی۔ اور "ڈیورنڈ" لائن کو سرحد بھی تسلیم کرایا مگر اس کے بیٹے امیر حبیب اللہ نے سوات، چترال، وزیرستان، خیبر، چاغی، چمن، پشین، پاڑا چنار اور کرم کے علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔ نیز معاملات خارجہ بھی انگریزوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں اس کا بیٹا امان اللہ خان تخت نشین ہوا تو اس نے انگریزوں سے اپنے علاقے واپس لینے کے لیے جنگ شروع کر دی۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں روس نے حکومتِ افغانستان کو اپنے تعاون کا یقین دلایا، جس پر ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو برطانیہ نے افغانستان کی آزاد حکومت کو تسلیم کر کے معاملات خارجہ سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۲۳ء میں انتظامی آئین مرتب ہوا اور افغانستان کی تنظیم جدید اصولوں پر کی جانے لگی۔ ۱۹۲۶ء میں امان اللہ خان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ امان اللہ خاں کی بعض تجاویز اور قوانین کے نفاذ سے عوام بددل ہو گئے اور ایک تاجیک سردار حبیب اللہ بچہ سقا نے جنوری ۱۹۲۹ء میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ امان اللہ اٹلی کی طرف فرار ہو گیا۔ اس کے سپہ سالار محمد نادر خاں درانی نے ایک لشکر فراہم کر کے بچہ سقا کو گرفتار کر لیا اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا بچہ سقا کو سزائے موت دی گئی۔ اس کے بعد نادر شاہ نے ہر شعبہ میں اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دیں۔ اس نے قوم کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ اکثر اوقات خود اسناد تقسیم کیا کرتا تھا۔ اسی طرح کی ایک تقریب کے دوران میں امان اللہ خاں کے حامی ایک طالب علم نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ جس پر اس کے بھائیوں نے اس کے انیس سالہ بیٹے ظاہر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

۱۹۳۴ء میں افغانستان جمعیت اقوام کا رکن بنا۔ اگلے دو تین برس تک روس، ترکی، عراق اور ایران کے ساتھ تجارتی اور سیاسی معاہدے ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کی طرح دوسری عالمی جنگ میں بھی افغانستان غیر جانبدار ملک رہا۔ ۱۹۴۷ء میں روس اور ایران کے ساتھ سرحدی تنازعات طے کیے گئے۔ سیاسی نظام پارلیمانی بادشاہت قرار دیا گیا پاکستان قائم ہونے کے بعد افغانستان نے بھارت، برطانیہ اور روس کی شہ پر نام نہاد مسئلہ پختونستان کا آغاز کر دیا۔ جبکہ صوبہ سرحد انگریزوں کے زیر انتظام کرائی گئی رائے شماری کے تحت پاکستان میں شامل ہوا تھا۔ نیز یہ علاقہ کبھی موجودہ مملکت افغانستان کا حصہ نہیں رہا۔ ۱۹۶۲ء میں اس تنازعہ کی بنا پر کچھ عرصہ کے لیے پاکستان اور افغانستان کے سفارتی تعلقات بھی منقطع ہو گئے۔ اس وقت افغانستان کی وزارت عظمیٰ سردار داؤد خاں کے پاس تھی جو پاکستان کا سب سے بڑا مخالف اور مسئلہ پختونستان کا شدت سے حامی تھا۔ مگر اس کی سبکدوشی کے بعد تعلقات پھر سے بہتر ہو گئے۔ ظاہر شاہ نے اپنی توجہ زیادہ تر داخلی امور پر مبذول کر لی۔

Marfat.com

۱۹۷۳ء میں سردار داؤد خاں نے ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور وہاں سے بادشاہت کا خاتمہ کر کے جمہوری نظام قائم کر دیا۔ سردار داؤد کے صدر بننے کے بعد سے مسئلہ پختونستان ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا، جس سے دونوں ہمسایہ ممالک کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔

معیشت اور انتظامی امور:۔ ۱۹۷۵ء تک افغانستان میں آئینی امور متنازعہ فیہ بنے رہے ہیں۔ عوام کی اکثریت اور علماء و فوجی افسران صدر داؤد کی حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ موجودہ افغانستان کا کل رقبہ ۲۵۰،۰۰۰ مربع میل (۶۴۹۵۰۸ مربع کلومیٹر) ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی ایک کروڑ پچھتر لاکھ تھی۔ جس میں افغان یا پختون ۵۹ % ہیں۔ یہاں کا روپیہ افغانی ہے، جس میں دس گرام چاندی ہوتی ہے اور یہ سو پیسوں (پول) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں افغانستان نے کافی حد تک ترقی کی ہے۔ کابل یونیورسٹی ۱۹۳۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں مدارس اور کالج قائم کیے گئے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت ہے۔ عدالتی قوانین زیادہ تر شرعی ہیں۔ تجارت زیادہ تر روس، جرمنی، بھارت، برطانیہ اور پاکستان کے ساتھ ہوتی ہے۔ زیادہ تر برآمدات تازہ اور خشک پھلوں، روئی، اون اور کھالوں پر مشتمل ہے۔ پورے ملک میں سڑکیں ہی ذریعہ مواصلات ہیں۔ مگر ریلوے لائن ابھی تک قائم نہیں ہوئی۔ سامان تجارت ابھی تک اونٹوں اور ٹٹوؤں پر لایا جاتا ہے۔ مرکزی شہر اور دارالحکومت کابل ہے۔ جو سڑکوں کے ذریعے دیگر اہم شہروں قندھار، سبزوار، ہرات، بلخ، مزار شریف، فیض آباد اور جلال آباد سے ملا ہوا ہے۔

افغانی، جمال الدین، سید

(۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء – ۵ شوال ۱۳۱۴ھ/ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء) اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی، دنیائے اسلام کی نمایاں ترین شخصیت۔ بقول اقبال، مسلمانوں کے عظیم رہنما اور بقول براؤن مفکر، مصنف اور صحافی لیکن ان سے بڑھ کر یہ کہ ایک بہت بڑے سیاستدان۔ افغانستان کے ایک قصبہ اسعد آباد (ضلع کابل) میں پیدا ہوئے۔ ایک اور روایت کے مطابق اسعد آباد کا قصبہ ایران کے شہر ہمدان کے قریب واقع ہے۔ خاندان ترمذی، سادات سے اور حنفی مسلک کا پابند تھا۔ بچپن اور جوانی کے ایام کابل میں بسر ہوئے، جہاں آپ نے اٹھارہ برس تک تمام علوم دینی کی تحصیل سے فراغت حاصل کر کے فلسفہ اور سیاسیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستان میں بھی کچھ وقت گزارا اور یہیں سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ افغانستان واپسی پر آپ امیر دوست محمد خاں کے ساتھ ہرات کی مہم میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد آپ امیر محمد اعظم خاں کے وزیر رہے۔ انگریزوں کی سازش سے وہاں بغاوت ہوئی تو آپ ہندوستان واپس چلے آئے۔ یہاں دو ماہ بھی نہ ٹکنے دیا گیا تو آپ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں دوبارہ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں سے آپ قاہرہ گئے اور جامعہ ازہر کے علماء و شیوخ سے ملاقات کی۔ یہیں آپ نے "اسلامی قومیت" کے نظریے پر خطبات دینے شروع کیے۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں آپ قسطنطنیہ (استنبول) تشریف لے گئے۔ آپ کی شہرت اور عظمت کی بنا پر ترکی کے لوگوں نے آپ کو جگہ جگہ خوش آمدید کہا۔ یہاں آپ نے آیا صوفیا اور احمدیہ مسجد میں مختلف خطبات دیئے۔ ترکی کے شیخ الاسلام حسن فہمی کی رقابت کے پیش نظر آپ کو قاہرہ واپس آنا پڑا۔

قاہرہ میں سید جمال الدین افغانی نے تدریس کا شغل اختیار کیا۔ حکومت نے بھی آپ کی خدمات کو سراہا اور باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب آپ کا حلقۂ اثر بے حد وسیع ہو چکا تھا اور آپ کے نظریات کی تبلیغ زوروں شوروں پر تھی۔ آپ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر عربوں کے ہاں قومی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس سے اسلامی ملکوں میں انگریزوں کے مفادات پر ضرب پڑنے لگی۔ جامعہ ازہر میں آپ کے شاگرد اور دستِ راست محمد عبدہٗ تھے۔ بقول ڈبلیو ایس بلنٹ یہاں سے بھی آپ کو نکلنا پڑا اور آپ کو ہندوستان لے جایا گیا۔ حیدر آباد میں ایک مضمون بعنوان "دہریہ" لکھنے کی بنا پر آپ کو ہندوستان بھی چھوڑنا پڑا۔ اور آپ امریکا تشریف لے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں آپ لندن آئے اور پھر اپنے شاگرد محمد عبدہٗ کے پاس پیرس چلے آئے۔ یہاں کے مشہور اخبارات و جرائد نے آپ کی نگارشات شائع کرنا شروع کیں۔

پیرس ہی میں آپ نے رینان کے مقالہ "اسلام اور سائنس" کا رد لکھتے ہوئے واضح کیا کہ اسلام سائنس کی قطعاً مخالفت نہیں کرتا۔ آپ کی زیادہ تر نگارشات محمد عبدہٗ کے جاری کردہ عربی رسالے "عروۃ الوثقیٰ" میں شائع ہوتی تھیں۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۵ جمادی الاوّل ۱۳۰۱ھ/۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہ رسالہ وحدت اسلامی کے نظریے کا ترجمان تھا۔ جسے برطانوی مقبوضات میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود یہ طالبین تک پہنچتا رہا۔ اس کا آخری شمارہ ۲۶ ذی الحج ۱۳۰۱ھ/۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ یوں آٹھ ماہ میں اس کے کل اٹھارہ شمارے شائع ہوئے۔ مگر انھوں نے دنیائے اسلام میں گویا ایک آگ سی لگا دی۔ ہر طرف قومی تحریکوں کا آغاز ہونے لگا۔ شاہ ایران نے اس سے متاثر ہو کر سید جمال الدین کو اپنے ہاں بطور شاہی مہمان دعوت دی۔ اور پھر آپ کے مداحین اور مریدین کی کثرت کو دیکھتے ہوئے آپ کو وہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہاں سے آپ روس تشریف لے گئے۔ ۱۸۸۹ء میں پیرس کی ایک نمائش میں شاہ ایران سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ آپ نے اپنے نظریات اس پر واضح کیے، تو وہ آپ کو اپنے ہمراہ ایران لے آیا۔ آپ نے اس کے عدالتی نظام میں اصلاحات کی تجاویز پیش کیں، جس پر اس کا وزیر مرزا علی اصغر آپ کے مخالفین کی

Marfat.com

صف میں جا کھڑا ہوا۔ آپ نے عتاب شاہی سے بچنے کے لئے دور دراز قصبات کے دورے شروع کر دیئے اور بالآخر تہران میں شاہ عبدالعظیم کے مزار کی مجاورت کرنے لگے۔ سات ماہ بعد ایک شاہی فوجی دستے نے آپ کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور آپ کو پاپیادہ ترکی کی سرحد کی طرف لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ جہاں سے آپ انگلستان چلے گئے۔

ایران میں آپ کے ساتھ اس ظالمانہ رویئے پر زبردست احتجاج ہوا اور اسی سے ایک اصلاحی جماعت نے بھی جنم لیا۔ مارچ ۱۸۹۰ء میں جب ایران نے برطانوی فرموں کو تمباکو پر محصول معاف کیا تو سید جمال الدین نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔ نیز آپ نے سمرہ کے مجتہد مفتی مرزا حسن شیرازی کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی۔ جس کے نتیجے میں ایک فتوے جاری ہوا۔ اس کی رُو سے مسلمانوں پر تمباکو نوشی ممنوع قرار دے دی گئی۔ عوام نے اس فتوے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ نیز سید صاحب کے ایک جوشیلے مرید نے شاہ ایران محمد رضا شاہ کو ۱۱ مارچ ۱۸۹۶ء میں قتل کر دیا۔

اس اثناء میں سلطان ترکی عبدالحمید نے آپ سے قسطنطنیہ میں سکونت پذیر ہو جانے کی درخواست کی۔ نیز آپ کی رہائش کے لئے ایک مکان اور پچھتر ترکی پاؤنڈ کا ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ آپ وہاں چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں گذاری۔ آخری عمر میں سلطان نے آپ کو نظر بند کر دیا۔ اسی حالت میں آپ سرطان کے مرض میں مبتلا ہوئے اور وفات پائی۔ آپ کا مزار استنبول ہی میں ہے۔

سید جمال الدین کی تحریروں میں "دہریہ" (جدید مادیت کے خلاف)، "تتمۃ البیان" (افغانوں کی مختصر تاریخ)، بتروس البستانی کے "دائرۃ المعارف" میں "بابیوں" پر ایک مضمون "عروۃ الوثقیٰ" کے مضامین، "مقالات جمالیہ" کے نام سے فارسی مضامین السید الحسینی کے نام سے لکھے گئے متفرق مضامین اور مختلف زعماء کے نام لکھے گئے خطوط اہم مقام رکھتے ہیں۔

مشہور مستشرق ایچ آر گب کے نزدیک افغانی کو کسی قسم کی فکری گہرائی کا حامل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ایک اور مستشرق رینان کو افغانی ہی میں ابن رشد جیسا فلسفی نظر آیا۔ یہ آپ کی علمیت اور فکر کی دلکشی ہی تھی، جس نے آپ کے گرد ایسی ذہین اور عہد آفرین شخصیتوں کو اکٹھا کر دیا۔ جنھوں نے آگے چل کر اسلامی مذہب اور فکر کے احیائے جدید اور قومی تحریکوں کی رفتار تیز تر کرنے میں اہم حصہ لیا۔

آپ کی وفات کے چند برس بعد تک آپ کو محض ایک ناکام سیاسی رہنما سے بڑھ کر اور کچھ نہ سمجھا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ آپ کی سیاسی مصروفیات کی بناء پر لوگوں نے آپ کے دیگر پہلوؤں پر سے نظر ہٹا لی تھی۔ یہی نہیں کہ آپ نے اپنی زندگی تحریک اتحاد اسلامی کی مقبولیت اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں گذار دی۔ بلکہ دوسری طرف یہ ماننے کے لئے مواد موجود ہے کہ آپ کی اصلاحی فکر نے انیسویں صدی کے آخر میں پورے مشرق وسطیٰ میں جو تخم ریزی کی تھی۔ بیسوی صدی کے ابتدائی دور میں اس نے ایک پوری لہلہاتی فصل کھڑی کر دی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم اسلام کی تمام جدید تحریکوں کا مبدا و منبع افغانی کی تعلیمات ہی ہیں۔ بقول کینٹول سمتھ افغانی نے پہلی بار عالم اسلام کے لئے بڑھتے ہوئے مغربی تسلط کے خطرے کو پہچانا اور اس سے سب کو خبردار کیا۔ اور بقول علامہ اقبال اسلام کو بحیثیت ایک نظام فکر دنیا سے متعارف کرانے کا فریضہ سید جمال الدین افغانی ہی نے ادا کیا۔ اگر ان کی انتھک کوششیں صرف اسی امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوع انسانی کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے۔ تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے۔

ایران، ترکی، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کی ذہین شخصیات جس طرح سے افغانی سے متاثر ہوئیں، وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ محض ایک سیاسی رہنما نہیں بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ایک بہت بڑے مفکر کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اگرچہ آپ کی تحریریں بہت کم ہیں، مگر خود آپ ہی کے بقول آپ "زندہ کتابیں" تصنیف کرتے رہے۔ جنھوں نے عالم اسلام میں جدید رجحانات پیدا کیے۔

تجدیدیت کے علمبردار کی حیثیت سے افغانی نے سب سے پہلے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ اور اس کی بنیادی کمزوری کو پہچانا۔ اس سے آپ کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ فلسفے کے مطالعے کو بھی پوری ملت اسلامیہ کی روح بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ دوسرے علوم کے حصول کی طلب پیدا ہو۔ مگر محض جدیدیت کی خاطر انگریزوں سے مفاہمت آپ کے نزدیک غلط بات تھی۔ اسی لئے آپ نے سر سید اور ان کی تعلیمی تحریک پر زبردست تنقید کی۔

آپ نے مسلمانوں کے سیاسی و دینی تنزل کے دو اسباب تلاش کئے۔ ایک خارجی نوعیت کا یعنی مغربی ممالک کی استحصالی کارروائیاں، دوسرا داخلی یعنی مسلمانوں کا اسلامی اصولوں سے انحراف۔ سیاسی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان فوجی اعتبار سے طاقتور ہو جائیں۔ اور داخلی طور پر مسلمانوں کی اخلاقی، تعلیمی اور مذہبی اصلاح کے لئے ایک منظم تحریک کے تحت کام شروع کیا جائے۔ ان کے نزدیک جب تک مسلمان سائنسی تعلیم سے آراستہ نہیں ہو جاتے، انکی ترقی ممکن نہیں مسلمان حکومتوں کی کمزوری کے اسباب آپ کے نزدیک یہ ہیں کہ اولاً مسلمان سلاطین اپنی خود غرضی میں ایک دوسرے کی مخالفت اختیار کئے ہوتے ہیں۔ ہر مسلمان حکومت کا با اقتدار طبقہ قومی مفادات کو نظر انداز کئے جا رہا ہے۔ دوم علماء نے جدید دور کی ضروریات کو دین کے مطابق پورا کرنے کا فرض بھلا دیا ہے۔

اس تجزیے کے پیش نظر افغانی نے اتحاد اسلامی کے نعرے سے عالم اسلام کو روشناس کرایا۔ آپ کے نزدیک یہ اتحاد محض سیاسی نہیں ہوگا، بلکہ علماء کی ایک مرکزی تنظیم کی شکل بھی اس میں شامل ہوگی۔ آپ اس تنظیم کا مرکز بیت اللہ کو قرار دیتے تھے۔ تاکہ وہاں مختلف ممالک کے علماء اپنے اجتماعی اور اتحادی مسائل پر سوچ بچار کر سکیں اور کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کر سکیں۔

اِفک تہمت، بہتان۔ اصطلاح میں ایک واقعہ، حضرت عائشہؓ پر لگائے گئے بہتان کو کہا جاتا ہے۔ یہ بہتان ایک منافق عبداللہ بن ابی نے لگایا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ غزوہ بنی مصطلق میں حضرت عائشہؓ حضورؐ کے ہمراہ تھیں۔ واپسی پر سب لوگ ابھی مدینہ سے ایک منزل دور تھے اور رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حضرت عائشہؓ اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئیں ان کے آنے تک قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت ہودے میں بیٹھ جاتی تھیں اور چار آدمی اسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ چونکہ آپ جسمانی طور پر ہلکی پھلکی تھیں اس لیے کسی کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ آپ اس میں نہیں۔ جب آپ پلٹیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر آپ اس امید پر چادر اوڑھ کر لیٹ رہیں کہ کوئی نہ کوئی تو ڈھونڈنے آئے گا۔

صبح کے وقت وہاں سے صفوان بن معطل سلمی گذرے۔ انہوں نے آپ کو پہچان کر کہا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون" اور اپنا اونٹ آپ کے پاس بٹھا کر الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ اونٹ پر سوار ہو گئیں اور وہ پاپیادہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے

Marfat.com

وقت آپ لشکر میں پہنچ گئیں۔ اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دیئے۔ عبداللہ بن اُبی ان میں پیش پیش تھا۔ بعد میں حضرت ابوبکرؓ صدیق کی خالہ زاد بہن کے بیٹے مسطح بن اثاثہ نے بھی اس بات کو خوب ہوا دی۔ حسان بن ثابت، حمنہ بنت جحش اور دیگر چند مسلمانوں نے بھی اس بات پر یقین کر لیا۔

آنحضورؐ اس الزام سے سخت اذیت میں مبتلا تھے۔ آپؐ نے اپنے طور پر تمام تحقیقات کریں اور حضرت عائشہؓ کو بے قصور پایا تو مسلمانوں سے فرمانے لگے۔ "کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے، جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے سخت اذیت میں مبتلا کیا ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اس شخص میں، جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔" اس پر اسیدؓ بن حضیر اور بعض روایات کے مطابق سعدؓ بن معاذ نے اُٹھ کر کہا "یا رسول اللہ! اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں۔ ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔" یہ سن کر خزرجی اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ انصار کے دونوں قبائل اوس اور خزرج آپس میں لڑ پڑتے۔ آنحضورؐ نے انھیں ٹھنڈا کیا۔

اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔ آخر ایک روز آنحضورؐ حضرت عائشہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس پورے عرصہ میں آپؐ ان کے نہ بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا "عائشہ! مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری برأت فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔" حضرت عائشہؓ نے جواباً عرض کیا، "آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تو آپ لوگ نہ مانیں گے اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں، جو میں نے نہیں کی۔ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی۔ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ اب میرے لئے اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فصبر جمیل"

اس کے فوراً بعد آنحضورؐ پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو بے گناہ قرار دیا۔ سورۂ نور کی آیت ۱۱ سے ۲۱ تک اس موقع پر نازل ہوئیں، جن میں حضرت عائشہؓ کی برأت کا اظہار کیا گیا تھا۔

اقامت

دوسری اذان، جس سے نماز با جماعت شروع ہونے کا اعلان ہوتا ہے جب نماز کا آغاز کرنے کے لیے موذن یا کوئی دوسرا مسلمان امام کے پیچھے کھڑا ہو کر اذانِ اقامت کے کلمات ادا کرتا ہے۔ تو "حی علی الفلاح" کے بعد ایک کلمے "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ کرتا ہے، جسے حنفی مسلک کے تحت دوبار دہرایا جاتا ہے اکثر کتب فقہ میں اقامت کا کہنا سنت قرار دیا گیا ہے۔ حنفی مسلک میں اقامت کے کلمات تعداد میں اذان کے کلمات کے مطابق ہیں۔ دیگر مسالک میں انھیں اذان سے نصف تعداد میں دہرایا جاتا ہے اور مالکی مسلک کے مطابق اقامت کے کلمات یہ ہیں۔ اللہ اکبر (دوبار) اشھدان لا الہ الا اللہ (ایک بار)، اشھدان محمداً رسول اللہ (ایک بار) حی علی الصلوٰۃ (ایک بار)، اللہ اکبر (دوبار) لا الہ الا اللہ (ایک بار)۔

اقبال، علامہ شیخ محمد

(۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ / ۹ نومبر ۱۸۷۷ء – ۲۰ صفر ۱۳۵۷ھ / ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) جدید دنیائے اسلام کے بہت بڑے مفکر، فارسی اور اردو زبان میں مسلمانوں کے قومی شاعر۔ تصورِ پاکستان کے خالق، حکیم الامت، فلسفی، وکیل اور معلم۔ سیالکوٹ میں سپرو گوت کے کشمیری شیخ نور محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاندان اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوا۔ اور دادا مستقل طور پر سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ والد بزرگوار اگرچہ ان پڑھ تھے، لیکن مزاج صوفیانہ اور فلسفیانہ تھا۔ دست کاری ذریعہ معاش تھی اقبال کی پیدائش سے پہلے ایک ڈپٹی کے ہاں ملازم ہو گئے تھے۔ اقبال دو بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ پھر سکاچ مشن سکول سیالکوٹ سے میٹرک کیا۔ ایف اے کا امتحان سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ سابقہ تمام امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا تھا۔ بی اے میں انگریزی اور عربی کے مضامین میں دو طلائی تمغے حاصل کئے۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا اور اوّل آئے۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم میں مولانا میر حسن کی تربیت کا بڑا حصہ ہے۔ مولانا عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ پہلے سکاچ مشن سکول اور پھر کالج میں پڑھاتے تھے۔ اقبال میں جوہر قابل دیکھ کر انھوں نے ان پر خصوصی توجہ فرمائی۔ اقبال کو بھی ان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکومت نے ان کے لئے سر کا خطاب تجویز کیا تو انھوں نے اسے اس وقت تک قبول نہ کیا جب تک کہ مولانا کو شمس العلماء کا خطاب نہ دلا دیا۔ گورنمنٹ کالج میں اقبال کو اپنے استاد فلسفہ پروفیسر آرنلڈ سے خاصی عقیدت تھی۔ جن سے تعلق اتنا گہرا ہوا کہ ان کے انگلستان جانے کے بعد اقبال بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک سکالر مقرر ہوئے۔ نیز اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفہ کے استاد بھی رہے اسی زمانے میں انھوں نے علم الاقتصاد پر ایک کتاب بھی لکھی۔ ۳ جون ۱۹۰۳ء کو گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۰۵ء میں تین سال کی رخصت لے کر انگلستان چلے گئے۔

اقبال کی شاعری کا آغاز طالب علمی ہی سے ہو چکا تھا۔ شروع میں داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے۔ انہوں نے بہت جلد کہہ دیا کہ اصلاح کی گنجائش نہیں۔ ۱۸۹۵ء میں حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان پر ایک مشاعرے میں اقبال نے ایک طرحی غزل پڑھی۔ دہلی کے مرزا ارشد گورگانی اور لکھنؤ کے میر ناظر حسین ناظم یہاں موجود تھے۔ اقبال کے اس شعر پر مرزا ارشد تڑپ اٹھے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

۲۴ فروری ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کا جلسہ منعقد ہوا۔ اقبال نے اس کے لئے نظم "نالۂ یتیم" لکھی۔ یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ آنسوؤں کے دریا بہہ گئے۔ اور روپوں کی بارش ہونے لگی۔ اس کی ایک ایک مطبوعہ کاپی چار روپے میں فروخت ہوئی۔ اس کے بعد اقبال ہر جلسہ میں کوئی نہ کوئی نظم ضرور پڑھتے۔ ایسے ہی ایک جلسے میں اپنی شہرۂ آفاق نظم "ہمالہ" پڑھی۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے رسالہ "مخزن" جاری کیا، جس میں یہ نظم شائع ہوئی۔ گویا یہاں سے اقبال کی اردو شاعری کا عوامی آغاز ہوا۔ اور یہ سلسلہ ان کے انگلستان جانے تک جاری رہا۔

انگلستان میں کیمبرج یونیورسٹی اور جرمنی میں میونخ یونیورسٹی سے انھوں نے فلسفے میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ وہیں انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن، نکلسن اور سارلی سے استفادہ کیا۔ انھی دنوں وہاں سے بیرسٹر ایٹ لاء کے امتحانات بھی

Marfat.com

پاس کئے۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے جو مقالہ لکھا تھا وہ "ایران اور مابعد الطبیعات" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ لندن یونیورسٹی میں انہوں نے کچھ عرصہ تک ڈاکٹر آرنلڈ کی جگہ پر عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہیں کیکسٹن ہال میں اسلام پر ایک لیکچر بھی دیا اور وہیں ان کی فارسی شاعری کا آغاز ہوا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "آرنلڈ")

اقبال تین سال یورپ رہنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور وکالت کا آغاز کردیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر بھی تھے۔ حکومت آپ کی عظمت کی اس قدر معترف تھی کہ ہائیکورٹ کو اپنا کام دن کے پچھلے اوقات میں کرنا پڑتا تھا تاکہ اقبال کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے سکیں۔ اور ان کے مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔ ڈیڑھ برس کے بعد آپ نے پروفیسری بھی چھوڑ دی۔ تاہم آپ یونیورسٹی کے ساتھ ممتحن کی حیثیت سے منسلک رہے اور وکالت ہی کو بطور مستقل پیشہ اختیار کرلیا۔

یورپ سے واپس آکر اقبال کی قومی نظموں کا آغاز ہوچکا تھا۔ "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "شمع اور شاعر"، "خضر راہ" وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں آپ کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" شائع ہوئی۔ اور تین برس بعد "رموز بے خودی" شائع ہوئی ان کتابوں میں آپ نے اپنا مشہور فلسفہ خودی پیش کیا۔ اس کے بعد آپ کے فارسی اور اردو نظموں کے مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے۔ آخری مجموعہ ارمغانِ حجاز آپ کی زندگی میں تیار ہوا، لیکن وفات کے بعد چھپا۔

۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ نے علامہ اقبال کی ادبی خدمات کے پیش نظر "سر" کا خطاب دیا ۱۹۲۶ء میں آپ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں آپ مدراس حکومت کی درخواست پر جنوبی ہند تشریف لے گئے اور وہاں اسلامی افکار کی جدید تشکیل پر چھ لیکچر دیئے۔ جن میں بعد ازاں ایک لیکچر کا اضافہ ہوا اور یہ "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے انگریزی میں شائع ہوئے۔ ان کا اردو ترجمہ پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔

۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں آپ نے وہ تاریخی خطبہ پیش کیا۔ جس میں پہلی بار مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں آپ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن تشریف لے گئے۔ اور واپسی میں ہسپانیہ، ترکی اور فلسطین وغیرہ کی سیاحت کی۔ واپسی پر مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اسلامی نصب العین کے تحفظ اور مسلمانوں کے قومی حقوق کے حصول کے لئے سرگرم رہے۔ ۱۹۳۳ء میں سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کے ہمراہ حکومتِ افغانستان کی دعوت پر افغانستان گئے۔ وہاں افغانوں کی تعلیمی سکیم مرتب کی اور غزنہ و قندھار کے راستے واپس آئے۔ اسی سال دسمبر میں پنجاب یونیورسٹی نے اور اگلے سال علیگڑھ یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۱۹۳۵ء سے آپ کو گلے کا مرض شروع ہوا۔ جو جان لیوا ثابت ہوا۔ دسمبر ۱۹۳۷ء سے یہ بیماری زور پکڑ گئی اور بالآخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالم اسلام کا یہ بطل جلیل اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ کونسی آنکھ تھی، جو اس روز اشکبار نہ ہوئی۔ جب آپ کو بادشاہی مسجد لاہور کے زینے کے دائیں طرف سپرد خاک کیا گیا تو ایک انگریز افسر نے علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند دوست سے کہا "تم نے ہندوستان کے آخری مسلمان کو سپرد خاک کردیا۔"

علامہ اقبال جدید اسلامی دنیا کے سب سے بڑے مفکر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے افکار نے سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑ کر جگا دیا ہے۔ جمال الدین افغانی جس کام کے لئے عمر بھر سرگرم عمل رہے، علامہ اقبال کے کلام نے چند ہی برس میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ہندوستان سے عرب و ترک دنیا تک ہی نہیں بلکہ انگریزی اور لاطینی دنیا تک علامہ کا اثر پہنچ چکا ہے۔

علامہ کی تمام شاعری تصانیف ۱۹۷۳ء میں کلیات اقبال کے نام سے مجموعی طور پر شائع ہوچکی ہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ علیحدہ علیحدہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ "بانگ درا"۔ پہلی اردو نظموں کا انتخاب ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔
۲۔ "بالِ جبریل"۔ اردو نظموں کا انتخاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔
۳۔ "ضرب کلیم"۔ اردو نظمیں جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔
۴۔ "اسرار خودی" (فارسی مثنوی) ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔
۵۔ "رموز بے خودی" (فارسی مثنوی) ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔
۶۔ مجموعہ "اسرار و رموز" (دونوں مثنویوں کا مجموعہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا)
۷۔ پیامِ مشرق (فارسی نظم، جرمنی کے شاعر گوئٹے کے جواب میں ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی)
۸۔ زبورِ عجم (فارسی نظمیں)، جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔
۹۔ "جاوید نامہ" (فارسی نظم، اٹلی کے شاعر دانتے کے جواب میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔
۱۰۔ "مسافر" (فارسی) سفرنامہ افغانستان۔ تھوڑی تعداد میں چھپی
۱۱۔ "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" (فارسی مثنوی) پہلی بار ۱۹۳۶ء میں مسافر کے ساتھ چھپی۔
۱۲۔ "ارمغان حجاز" (فارسی اور اردو نظمیں) نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔
۱۳۔ "علم الاقتصاد" ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔
۱۴۔ "THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA" پہلی بار لندن میں شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۹ء میں "فلسفۂ عجم" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ایران میں مابعد الطبیعات کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ ہے۔
۱۵۔ The Reconstruction of Religious Thought in Islam یہ مشہور سات لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ جن میں پہلے چھ لیکچر ۱۹۳۰ء میں لاہور سے چھپے دوسری بار

Marfat.com

ساتویں لیکچر سمیت ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے اور تیسری بار اس کا اردو ترجمہ لاہور سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

۱۹۔ مکاتیب اقبال کے مختلف مجموعے اور ان کے علاوہ متعدد اردو انگریزی مضامین لیکچر اور نظمیں "باقیاتِ اقبال" کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

علامہ اقبال کے تمام افکار کا منبع و محور ایک ہی تصور ہے، جسے اقبال نے خودی کا نام دیا ہے۔ اس فلسفے کی تشریح میں اگرچہ شارحین میں اختلاف موجود ہے۔ تاہم یہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ اقبال کے فلسفہ میں خودی سے مراد وہ شعور ہے، جو خود شناس اور خود آگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو۔ لیکن یہاں شعور کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں بلکہ وہ چیز ہے، جس کا خاصہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے۔ یہ ایک نورانی قوت ہے، جو زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز ہے۔ یہ وہی قوت ہے، جو انسان کو مشکلات پر غالب آنے کی ترغیب دیتی ہے۔ "اسرار خودی" کے دیباچے میں خود علامہ نے بھی اس لفظ کی تشریح کر دی ہے:-

"یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم محض احساس نفس یا یقین ذات ہے۔" اس کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ ہے کہ وہ ہماری ذہنی حالتوں میں وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا کو چاہتی ہے اور انسان کو مقام حیوانیت سے نکال کر مقام ربوبیت کی طرف مائل کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی وہی ہے جو سچی بے خودی یعنی ہجرت الی الحق کی طرف مائل ہو جائے، انسانی ذات میلانات اور رجحانات کو چھوڑ کر اللہ تعالٰی کے احکام کا پابند ہو جائے اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی۔ "رموز بے خودی" میں فرد و ملت کے روابط اور ملت اسلامیہ کی زمانی و مکانی لا انتہائیت کی بحث ہے۔

اقبال نے یقیناً ایک ایسے دور کا آغاز کیا، جس کی ضرورت ملک و ملت ہی کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو بھی تھی۔ آپ نے اپنی شاعری میں پوری دنیا کو رازِ حیات سے آگاہ کیا۔ آپ کی دوررس نگاہیں دیکھ چکی تھیں کہ مغربی تہذیب جو آج نوع انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہو رہی ہے، دنیا کے لئے مفید نہیں۔ ان کی مخاطب ہر وہ قوم ہے، جو دنیا میں اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ان تمام اقوام کو آپ ایک عالمگیر اخوت میں جکڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو دوسرے لفظوں میں اسلام کا نام ہے۔

اسلامی تعلیمات کے فکری پہلوؤں کو سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے انہوں نے اپنے مشہور زمانہ چھ خطبات دیئے۔ اقبال کے نزدیک مذہب، فلسفہ اور سائنس کا اختلاف محض سطحی اور ظاہری ہے۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں اس پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام، جدید سائنس اور فلسفہ کے مابین ربط پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنے پیشرو فلاسفہ کی تقلید کی ہے۔ اس کوشش کی ابتداء الکندی نے کی تھی اور یہ سلسلہ اسی وقت سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اقبال نے اسلام کی جو جدید ترجمانی کی ہے، وہ محض قیاسی اور نظریاتی نہیں سراسر سائنسی اور تجرباتی ہے۔ الٰہ آباد کے اجلاس مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں خود فرماتے ہیں:-

"میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اس کی شریعت، اس کی سیاست اس کے تمدن، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ روح اسلام کے ساتھ اس وابستگی نے مجھے ایسی فراست عطا کی ہے، جس سے میں اس عظیم الشان حقیقت کا اندازہ کر سکتا ہوں، جو اسلام کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر حاصل ہے۔"

علامہ کے خطبات ہی کی بدولت اسلامی فکر کی روایت پھر سے تازہ ہوئی، جس کا سلسلہ پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اس فکر کی اساس قرآن مجید پر ہے۔ اہل یورپ اس امر کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ علم و فکر کی تاریخ میں اسلام کا نام نہ آنے پائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام بذات خود کوئی نظام فکر نہیں۔ "خطبات" میں اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا اور بتایا کہ درحقیقت فلسفے اور سائنس کا کمال وہیں ہو گا، جہاں سے اسلام کے نظام فکر کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو، جو سر دست ہمیں معلوم نہیں۔

اقرار اعتراف، ماننا، تسلیم کرنا۔ اسلامی قانون کے مطابق اقرار جرم کے بعد ملزم سزا کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ اقرار کی ضرورت نکاح، طلاق، رشتہ داری، تعلق مقدمات اور تسلیم اولاد کے ضمن میں ہوتی ہے۔ اقرار کرنے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ بالغ اور سلیم الحواس ہو نیز اس پر کسی قسم کا اخلاقی یا قانونی دباؤ یا خوف نہ ہو۔ اور وہ یہ اقرار اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کرے۔

اقرع بن حابس (وفات ۳۱ھ/۶۵۱ء) فراس بن حابس بن عقال بن محمد بن سفیان آنحضورؐ کے صحابی، زمانۂ جاہلیت کے عرب سربراہ، ثالث اور حکیم تھے۔ بنو تمیم میں سے تھے۔ اسلام لانے کے بعد فتح مکہ، غزوۂ حنین، اور محاصرۂ طائف میں شریک رہے۔ آنحضورؐ کے مقربین میں سے تھے۔ آپؐ نے انھیں بنو دارم بن مالک کے صدقات کی فراہمی کے لیے عامل مقرر فرمایا۔ جب بنو تمیم کے قبیلہ بنو عنبر کے چند قیدی مدینہ لائے گئے تو انھیں چھڑانے والے وفد کی قیادت اقرع ہی کر رہے تھے۔ انھوں نے شدتِ جذبات اور اضطراب میں آنحضور صلعم کو آوازیں دینا شروع کیں۔ اس پر سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جس کے بعد اقرع پشیمان ہوئے۔ تاہم انھی کی کوششوں سے بنو تمیم کا وفد مسلمان ہوا۔ وہ نجران کے وفد کو دیئے گئے امان نامہ کے شاہدوں میں شامل تھے۔ نیز خالدؓ بن ولید کے ساتھ جنگ یمامہ اور شرجیل بن حسنہ کے ساتھ دومۃ الجندل میں بھی شریک ہوئے۔ فتح انبار کے وقت مقدمۃ الجیش کی قیادت بھی اقرع کر رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں جوزجان فتح کیا اور وہیں وفات پائی۔

اقصیٰ، مسجد بیت المقدس (یروشلم) کی ایک عمارت۔ مسلمانوں کا قبلہ اوّل جس پر اسرائیل کی حکومت نے جون ۱۹۶۷ء میں قبضہ کر لیا اور پھر اس کی دیواریں گرانے کا آغاز کیا۔ ۲۱ راگست ۱۹۶۹ء کو یہودیوں نے اسے نذر آتش کرنے کی کوشش کی۔ اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں آیا ہے:-

"پاک ہے وہ رب، جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف۔" (۱۷: ۱)

مسجد اقصیٰ شہر کے مشرقی سمت ایک احاطہ میں واقع ہے، جسے مسلمان حرم شریف کے نام سے اور یہودی بیت المقدس کے نام سے پکارتے ہیں۔ قبۃ الصخریٰ اور دیگر مقدس مقامات بھی اسی میں واقع ہیں۔ یہ حرم چھتیس ایکڑ میں واقع ہے۔ جس جگہ مسجد اقصیٰ واقع ہے، یہودی روایات کے مطابق وہاں کبھی حضرت سلیمانؑ کا تعمیر کردہ ہیکل واقع تھا، جسے بابل کے بادشاہ نبوکد نضر نے چھٹی صدی قبل مسیح میں تباہ کر دیا تھا، ہیرود اعظم نے اس ہیکل کو از سر نو تعمیر کر دیا۔ لیکن ۷۰ء میں رومی حکمران طیطس نے اسے بھی پیوند خاک کر دیا۔ ۱۷ھ / ۶۳۸ء میں جب حضرت عمرؓ فاروق بیت المقدس میں داخل ہوئے تو اس جگہ پر ملبے اور غلاظت کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے وہ مقام تلاش کر کے

Marfat.com

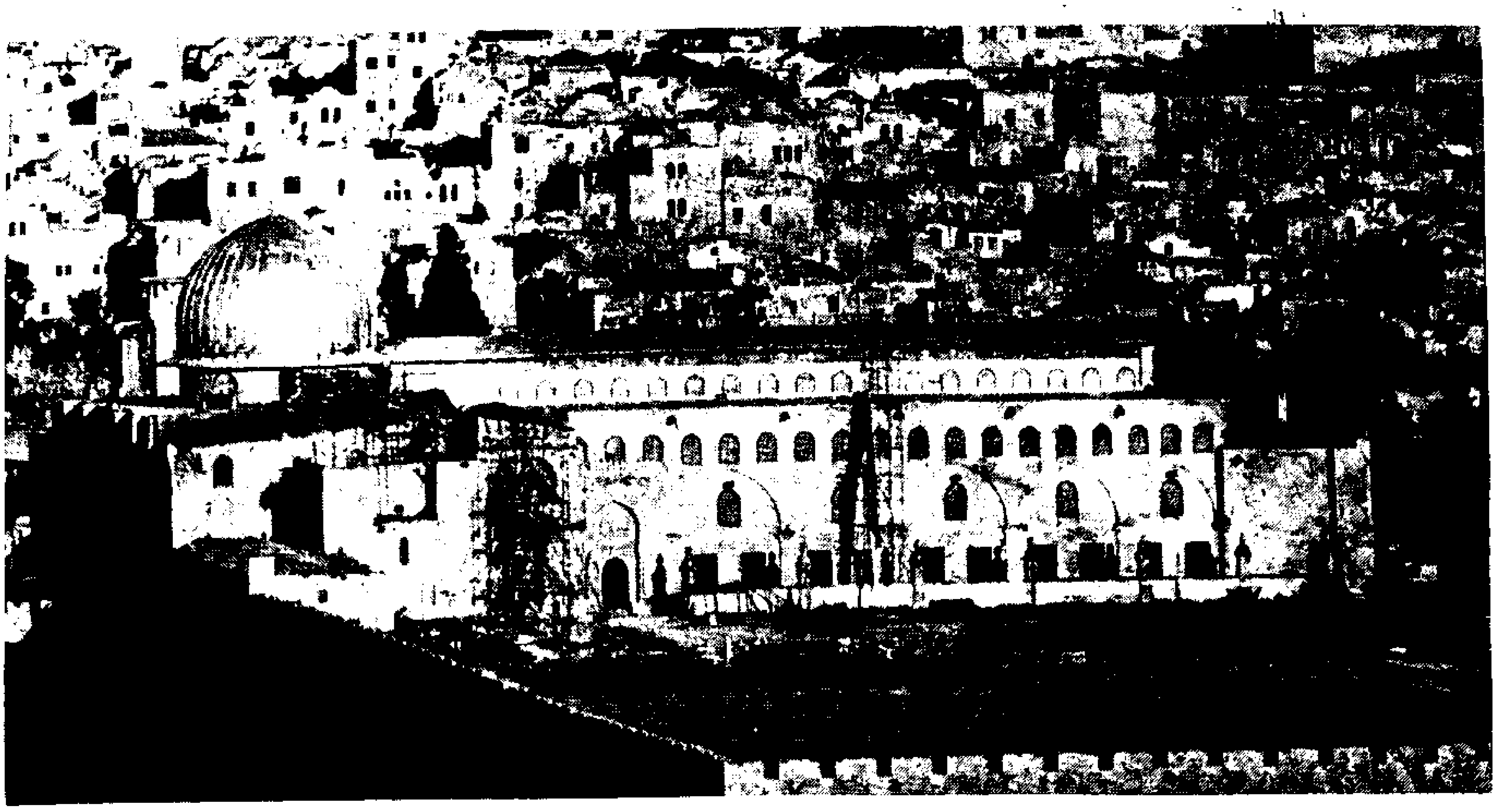

جہاں سے آنحضورؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے، گندگی کے اس ڈھیر کو اپنے ہاتھوں سے اٹھانا شروع کر دیا اور پھر فرمایا "آؤ! اسے مسجد کی جگہ بنالیں"۔ اس حکم پر حضرت بلالؓ نے یہاں پہلی اذان دی۔ اور حضرت عمرؓ نے نماز پڑھائی۔ آپ کے ایما پر یہاں ایک سادہ سی مستطیل شکل کی مسجد تعمیر ہوئی اور اس مقام پر جہاں سے آنحضورؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے، گنبد صخریٰ یا قبۃ الصخریٰ تعمیر ہوا۔ اکثر مغربی مصنفین گنبد صخریٰ ہی کو مسجد عمر کا نام دیتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ کی موجودہ عمارت کی تعمیر پانچویں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۷۲ھ/ ۶۹۰ء میں شروع کرائی۔ اس کے ادھورے کام کو اس کے بیٹے ولید نے مکمل کرایا۔ جس پر ولید کے سات سالہ محاصل خرچ ہوئے۔ اس کے چار مینار تھے، دروازوں پر سونے اور چاندی کی تختیاں تھیں اور یہاں تین سو خدمت گار مقرر کیے گئے تھے ۷۴۶ء کے زلزلہ میں عمارت کو نقصان پہنچا۔ خلیفہ المنصور نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ ۱۵۴ھ/ ۷۷۱ء میں وہ یہاں آیا۔ ایک اور زلزلے سے ایک بار پھر عمارت زمین بوس ہوئی تو منصور کے جانشین المہدی نے ۱۶۳ھ/ ۷۸۰ء میں اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔

اکثر جغرافیہ دان مسجد اقصیٰ سے مراد پورا رقبہ حرم لیتے ہیں، جس میں مینار، گنبد دالان، قبۃ الصخریٰ اور مسجد شامل ہیں۔ مقدسی لکھتا ہے کہ مسجد اقصیٰ بیت المقدس کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے۔ ایرانی مورخ ناصر خسرو لکھتا ہے کہ مسجد کی صحن عمارت بہت وسیع ہے۔ اس کی مغربی دیوار ایک سو بیس گز اور عرض ایک سو پچاس گز ہے۔ دو سو اسی سنگی کمانیں قائم ہیں۔ سنگ مرمر سے مسجد کی زینت بڑھائی گئی ہے مسجد کے طول یعنی مشرقی دیوار میں دس اور عرض یعنی شمالی دیوار میں پانچ دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ پیتل کا ہے۔

۱۴ جولائی ۱۰۹۹ء کو جب بیت المقدس عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تو انھوں نے صحن مسجد میں مسلمانوں اور یہودیوں کا خون بے تحاشا بہایا۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ میں بہت سی تبدیلیاں کیں اور اسے اپنی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں اسے عیسائیوں سے واگذار کرایا۔ اس نے عمارات کو پہلی حالت میں درست کرایا اور مسلمانوں نے اسے سات روز تک پانی اور عرق گلاب سے دھویا ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۲ء تک مسجد کی مرمت وسیع پیمانے پر ہوتی رہی لیکن اس کے نقشہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ موجودہ مسجد میں شمال کی طرف سات اور مشرق کی طرف ایک دروازہ ہے۔

۱۹۴۸ء تک فلسطین برطانیہ کے زیر انتداب رہا اور جب انگریز رخصت ہوئے تو یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی گولہ باری سے مسجد کی چوبی چھت، کھڑکیوں اور شمال مغربی دیوار کا ایک اہم حصہ شہید ہو گیا۔ نیز کئی عمارات بھی شہید ہوئے۔ جنگ بندی کے بعد حکومت اردن نے مسجد کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا مختلف اسلامی حکومتوں کے چندے سے ۱۹۵۸ء میں مرمت کا آغاز ہوا۔ مسجد کے گنبد پر سیسے کی جگہ المونیم اور پیتل کی آمیزش سے تیار کردہ خول چڑھایا گیا۔ اور بھی کئی تبدیلیاں کی گئیں مگر یہ اہتمام رکھا گیا کہ رنگ، سقیے اور جائے وقوع میں کوئی فرق نہ آئے۔

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے پورے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور ۲۷ جون کو اسے اسرائیلی حکومت کا ایک جزو قرار دے دیا۔ ۱۷ جولائی کو ان کے یہودی بریگیڈیر شلومو غدرین نے اعلان کیا کہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمان تعمیر کیا جائے گا۔ چنانچہ مسجد سے ملحقہ تمام عمارتوں کو مسمار کر دیا گیا۔ جبکہ ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ بیت المقدس کی سابقہ حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کو ایک المناک سانحہ پیش آیا۔ اس روز تقریباً چار گھنٹوں تک مسجد اقصیٰ میں آگ بھڑکتی رہی۔ اس سے جنوب مشرقی جانب چھت کا ایک حصہ گر گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یادگار منبر جل کر راکھ ہو گیا۔ اسرائیل نے اپنا جرم چھپانے کے لیے ایک شخص روہن کو آتش زنی کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور معمولی سزا دی گئی۔ لیکن اس سے یہودیوں کے ان عزائم کو نہیں چھپایا جا سکتا، جو ہیکل کی تعمیر نو سے تعلق رکھتے ہیں۔

Marfat.com

اقطاع حکومت کی طرف سے عطا کردہ زمین۔ اسلامی فقہ کی رُو سے آباد کار عُشر ادا کرنے تک اس زمین کا مالک ہوگا۔ اس کی کئی صورتیں ہیں کہ یا تو حکومت نے یہ قطعہ زمین اسے ہمیشہ کے لیے بخش دیا ہو یا پھر تاحیات عطا کیا گیا ہو اقطاع کا جواز صرف اس زمین پر ہوسکتا ہے۔ جو کسی ملکیت نہ ہو۔ مملوکہ زمینوں کا اقطاع جائز نہیں۔ غیر آباد زمین پر حکومت کو تین سال تک کوئی رقم ادا نہیں کی جاتی اگر اس دوران میں زمین آباد نہ ہو تو حکومت اسے واپس لے سکتی ہے۔ مفتوحہ زمین بھی اقطاع کے تحت دوسروں کو دی جاتی۔ وہ زمین جس کا کوئی وارث نہ ہوتا۔ حکومت کے قبضے میں چلی جاتی اور پھر اقطاع کے ذریعے کاشت کاروں کی ملک قرار دی جاتی اقطاع خراجی یا عشری ہوسکتا ہے۔ خراج کے تحت ایک علاقہ کسی کو خراج پر دے دیا جاتا تھا اور عُشر کے تحت کاشت کار پیداوار کا دسواں حصہ ادا کرتا تھا۔

اکبر، جلال الدین (۵ رجب ۹۴۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء — ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء) ابوالفتح، جلال الدین محمد اکبر ابن ہمایوں ابن بابر۔ ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا تیسرا حکمران۔ عمرکوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا۔ یہ دور ہمایوں کی جلاوطنی کا تھا۔ اکبر نوماہ کا تھا کہ ہمایوں ایران کی طرف فرار ہوا۔ اس دوران میں اکبر شہزادہ کامران کے پاس رہا۔ جو بعد ازاں اس کا مخالف ہوگیا۔ ہمایوں نے کابل میں اس پر فتح پائی اور یوں بیٹا واپس آیا۔ اکبر کی تعلیم کا مستقل انتظام تو نہ ہوسکا لیکن اس نے دیگر فنون حرب ضرور سیکھ لیے۔ نوجوانی میں اس کا اتالیق بیرم خاں جیسا سپاہی تھا۔

ہمایوں نے ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو وفات پائی تو بیرم خاں نے اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ ادھر عادل شاہ سوری کا وزیر ہیموں بقال پنجاب کی طرف بڑھا تاکہ مغلوں کو یہاں سے نکال دے۔ پانی پت کے قریب علی قلی خاں شیبانی نے اسے شکست دے کر اس کے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰ محرم ۹۶۴ھ/ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کے میدان میں دوسری بار بھی بقال نے شکست کھائی اور گرفتار ہوکر مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد دہلی اور آگرے پر اکبر کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اکبر نے اجمیر، گوالیار، لکھنؤ، الٰہ آباد، جونپور وغیرہ فتح کر لیے۔ بیرم خاں ۱۵۶۱ء میں مبارک خاں کے ہاتھوں مارا گیا تو تمام اختیارات اکبر کے ہاتھ میں آگئے۔

اکبر نے بیرم خاں سے ملک گیری اور عملی سیاست کے جو سبق سیکھے تھے انھیں استعمال میں لاتے ہوئے آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں مالوہ، گونڈوانہ، کالنجر، گجرات اور بنگال کے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لیے۔ نیز طاقتور سرداروں کی بغاوتوں کو سختی کے ساتھ کچل کر مستحکم مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر، ۱۵۹۱ء میں سندھ ۱۵۹۴ء میں بلوچستان اور ۱۵۹۵ء میں قندھار کو بھی فتح کیا اور بہت جلد بہت بڑے علاقے پر حکمران ہوگیا۔

سلطنت کو عسکری لحاظ سے مستحکم کرنے کے بعد اکبر داخلی معاملات کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے نظام سلطنت کو مضبوط بنایا۔ وزرا اور وکلا کی جماعت قائم کی۔ محاصل کا انتظام درست کیا۔ آزاد عدلیہ کو رواج دیا۔ اور علوم و فنون کی سرپرستی کی۔

اکبر نے کُل انچاس سال آٹھ ماہ حکومت کی۔ آخری عمر میں اسے بہت سے صدمات برداشت کرنے پڑے۔ راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کے بعد اسے اپنے عالم اور فاضل ساتھی ابوالفضل سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شہزادہ مراد اور شہزادہ دانیال کی موت نے بھی اسے بے حد کمزور کردیا۔ آخری وقت میں اس نے شہزادہ سلیم کو اپنا جانشین مقرر کیا اور تریسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوا۔

اکبر ایک ذہین فطین حکمران تھا۔ ناخواندہ ہونے کے باوجود بہت بڑا عالم تھا۔ انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں اس نے کئی ایجادات کیں۔ ان میں سب سے بڑی اس کا نظام محاصل تھا۔ اس کے تحت پچھلے دس سالہ جمع بندی کے تحت آئندہ دس کی سالہ جمع بندی کی گئی۔ لگان وصول کرنے کے قواعد مقرر ہوئے۔ زراعت کو ترقی دینے کے طریقے اور اصلاح مزارعین کے قوانین جاری ہوئے۔ حسابات کی حالت درست کی گئی۔ اکبر سے پہلے فوجیوں کو جاگیریں اور انعامات ملا کرتے تھے۔ اکبر نے پہلی بار تنخواہ دینے کا آغاز کیا۔ پورے ملک میں اصول انصاف کی سختی سے پابندی کرائی جاتی۔ اور کسی سے رو رعایت نہ کی جاتی۔ ہندوؤں کے فیصلے پنڈتوں کے سامنے اور مسلمانوں کے فیصلے قاضیوں کی عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ اوزان، پیمانوں، اشیائے خوردنی کی جانچ، انسداد گداگری اور انسداد جرائم، صوبوں میں محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔

مذہب میں اکبر کی ایک اختراع "دین الٰہی" کے نام سے مشہور ہے۔ اکبر نے اپنے دربار میں جن علماء کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی مختلف تجاویز کے ذریعے اکبر کو اس امر پر قائل کر لیا کہ تمام ادیان کے ملاپ سے ایک نیا دین رائج کیا جائے تاکہ حکومت کا استحکام زیادہ سے زیادہ ہوسکے۔ اگرچہ اس دین کے پیروکار اس کے اقربا تک ہی محدود رہے اور کاروبار سلطنت پر شرعی مسلمان امرا ہی چھائے رہے۔ تاہم ایک بات واضح تھی کہ اکبر ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی دل جوئی چاہتا تھا۔ اور یہی دین الٰہی کے قائم کرنے کی سبب بنی۔ لیکن عامۃ المسلمین نے اس نئے دین کو مسترد کر دیا۔

اکبر اہل علم و فضل کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ابوالفضل، فیضی، عبدالقادر بدایونی عبدالرحیم خانخاناں، نقیب خاں، نظام الدین بخشی، مُلا مبارک اور میر فتح اللہ شیرازی جیسے مشاہیر تھے۔ جنھوں نے علم و ادب کی کماحقہٗ خدمت کی، عُرفی، نظیری، شکیبی اور حیدری تبریزی جیسے فارسی کے شعرا اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ چونکہ اکبر نے فن تعمیر کی بھی قدردانی کی۔ اس لیے کئی مصوّر اور ماہر تعمیر بھی یہاں کھنچے آئے۔ ان میں میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد، اشرف خاں، ملا یوعلی، میر حسینی، رام داس، میاں چاند، محمد حسین کاشمیری اور تان سین جیسے ماہر موسیقی قابل ذکر ہیں۔ اکبر کی تعمیر کردہ عمارات میں مقبرہ ہمایوں (دہلی)، مقبرہ سلیم چشتی (سیکری) لاہور، الٰہ آباد فتح پور سیکری، آگرے اور اٹک کے قلعے قابل دید ہیں۔

اکل طعام۔ کھانا۔ قرآن مجید میں زمین کی عمدہ اشیاء جائز قرار دی گئی ہیں۔ ان میں سبزیاں، پھل گوشت، دودھ اور شہد قابل ذکر ہیں اور کچھ اشیاء حرام اور ناجائز ہیں۔ مثلاً سوؤر کا گوشت، بتوں کی نذر چڑھائی گئی چیزیں، خون، مردہ اور حرام جانور وغیرہ۔ گوشت صرف انھی جانوروں کا جائز ہے جو حلال ہوں اور انھیں ذبح کرکے گردن سے خون بہایا گیا ہو۔

کھانا صرف اسی قدر مباح ہے، جس سے آدمی کی قوت بڑھے اور آسودگی حاصل ہو اس سے زیادہ کھانا حرام ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہئیں، پھر بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کریں۔ کھانا دائیں ہاتھ سے کھایا جائے۔ اور دوران طعام خاموش رہا جائے اور صرف اپنے سامنے سے کھایا جائے۔ رزق کی عزت لازم ہے۔ اگر لقمہ دسترخوان پر گر جائے تو اسے اٹھا کر کھا لینا چاہیے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد الحمد اللہ کہنا چاہیے۔ ہاتھ کی انگلیاں چاٹ کر صاف کی جائیں اور اس کے بعد ہاتھ دھوئے جائیں۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے انگلیوں کے چاٹنے اور پیالے کو پونچھنے اور صاف کرنے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ یہ اس لیے کہ تمھیں معلوم

Marfat.com

نہیں کرکون سے لقمہ میں برکت ہے۔ کعبؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جناب رسولِ خدا تین انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا کرتے اور اپنے ہاتھ کو پونچھنے سے پہلے چاٹ لیا کرتے اور پھر اسے دھوڈالا کرتے تھے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کھانے کو برا نہیں کہا۔ اگر اچھا لگا کھالیا، ناپسند ہوا تو چھوڑ دیا۔ حضرت عمرؓ بن خطاب کہتے ہیں کہ جناب پیغمبرِ خدا نے فرمایا "مل کر کھانا کھایا کرو۔ الگ الگ نہ کھایا کرو۔ کیونکہ برکت جماعت کے ساتھ ہے۔"

احادیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے ڈکار لی۔ حضورؐ نے فرمایا جو لوگ دنیا میں بہت پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ وہ قیامت کے روز بہت بھوکے ہوں گے۔ نیز حضورؐ کا ارشاد ہے کہ رات کا کھانا کھاؤ، خواہ کچھ ناقص کھجوریں ہی ہوں۔ کیونکہ رات کا کھانا نہ کھانا، کمزوری لاتا ہے۔ جب تمہاری دعوت کی جائے تو اسے قبول کرو۔ اگر کسی شخص کی دعوت کی جائے اور وہ قبول نہ کرے تو اس نے اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کی اور جو بن بلائے گیا، وہ گویا چوری کرنے گیا۔ نیز فرمایا کہ جب تک سب لوگ نہ کھالیں، دسترخوان سے نہ اٹھیں۔ اشد ضرورت میں معذرت کرکے اٹھنا چاہیئے۔

الاحزاب، سورۃ قرآن مجید کی ۳۳ ویں سورت، جو غزوۂ احزاب شوال ۵ھ اور غزوہ بنی قریظہ ذی قعدہ ۵ھ اور حضرت زینب کے ساتھ آنحضورؐ کے نکاح سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں نو رکوع اور ۷۳ آیتیں ہیں۔

پہلے رکوع کا زمانۂ نزول غزوہ احزاب سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نبی کا تعلق مومنوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے۔ دوسرے اور تیسرے رکوع میں جنگ احزاب کا ذکر ہے۔ اس میں اصل غرض اس بات سے ہے کہ مسلمانوں کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے۔ اس لئے تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم مسلمانوں کے لئے ایک کامل نمونہ ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کا نمونہ کام دیتا ہے۔ چوتھے رکوع سے آیت نمبر ۳۵ تک دو مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو، جو اس تنگی و عسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ دنیا اور اس کی زینت یا خدا، رسول اور آخرت میں سے کسی کا انتخاب کرلیں۔ دوسرے حصہ میں اس معاشرتی اصلاح کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے، جس کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس اصلاح کی ابتدا نبی صلعم ہی کے گھر سے کرتے ہوئے ازواج مطہرات کو حکم دیا گیا کہ وہ وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور غیر مردوں کے ساتھ بات کرنے سے سخت احتیاط کو ملحوظ رکھیں۔ آیت ۳۶ سے ۴۸ تک کا مضمون حضرت زینبؓ کے ساتھ آنحضورؐ کے نکاح کے سلسلے میں ہیں تاکہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو آپؐ کے متبنیٰ بیٹے زیدؓ کی بیوہ سے نکاح کرنے کی صورت میں پیدا ہوئیں۔

آیت ۴۹ میں قانون طلاق کی ایک دفعہ بیان ہوئی ہے۔ آیت ۵۰ سے ۵۲ میں آنحضورؐ کو ان متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا، جو ازدواجی زندگی کے معاملے میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی تھیں۔ آخری آیات میں معاشرتی اصلاح کے دوسرے اقدامات بیان کئے گئے ہیں، جن میں ازواج مطہرات اور مومن عورتوں کے بارے میں پردے کے احکامات بھی شامل ہیں۔ نیز افواہ بازی اور بہتان تراشی پر زبردست زجر و توبیخ کی گئی ہے، جو منافقین نے اس وقت برپا کر رکھی تھی۔

الاحقاف، سورۃ قرآن مجید کی ۴۶ ویں سورت، احقاف کے معنی ٹیلے یا تودے کے ہیں۔ اس میں قوم عاد کی مثال دی گئی ہے۔ یہ کل چار رکوع اور ۳۵ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ہجرت سے تین سال پہلے کا ہے جب آنحضورؐ طائف سے واپس تشریف لائے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب آنحضورؐ کفار ان مکہ و طائف کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔ مگر اس پوری سورت میں کہیں بھی آنحضورؐ کے دلی جذبات کا علم نہیں ہوتا۔ اور یہی بات قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

اس سورت کا موضوع کفار کو ان گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کرنا ہے، جن میں وہ نہ صرف مبتلا تھے بلکہ بڑے اصرار اور عزم کے ساتھ ان پر جمے ہوئے تھے۔ اور الٹا اس شخص کو ہدف ملامت بنا رہے تھے جو انہیں ان گمراہیوں سے نکالنے کے لئے کوشاں تھا۔ توحید کی دعوت ان کے نزدیک باطل تھی۔ وہ قرآن کے متعلق یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ اس سورت میں انہی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی مدلل تردید کی گئی ہے اور کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم عقل و دلیل سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر قرآن کی دعوت اور محمد صلعم کی رسالت کو رد کروگے تو تم ہی تباہ و برباد ہوگے۔ نیز اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو یہ خوشخبری سنائی کہ انسان خواہ آپ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جن اس کے گرویدہ ہوگئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔

الاخلاص، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۲ ویں سورت۔ اس میں کل چار آیتیں ہیں اور یہ ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب ہمیں بتایئے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ جس میں خالص توحید بیان کی گئی ایسی بہت سی روایات احمد، ترمذی، بیہقی، بخاری اور طبری کے ہاں ملتی ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق یہودیوں کے ایک گروہ نے اللہ کی ربوبیت کے بارے میں سوال کیا تھا جس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ ایسی بہت سی دیگر روایات سے پتا چلتا ہے کہ مختلف مواقع پر لوگوں نے آنحضورؐ سے اللہ کی ماہیت و کیفیت دریافت کی تھی اور ہر موقع پر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انھیں جواب میں یہی سورت سنائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورت بہت ابتدائی زمانۂ نزول کی حامل ہے۔

سورۃ اخلاص کا مضمون اللہ تعالیٰ کی وحدت اور لاشریک ذات کو بیان کرتا ہے "کہہ دے! وہ اللہ ہے، یکتا، اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ (اور سب اس کے محتاج ہیں)، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

یہ وہ وقت تھا جب مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ اس کے اوتار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ خدا کو مانتے تھے، مگر وہ اس کی خدائی میں ایک بیٹے کو شریک کرتے تھے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ یہودیوں کے نزدیک بھی حضرت عزیرؑ خدا کے بیٹے تھے۔ جب ان تمام لوگوں کو اللہ وحدہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کہ وہ رب ہے کس قسم کا۔ جسے تمام ارباب کو چھوڑ کر ماننا چاہیے۔ قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے چند جملوں میں اللہ کی ہستی کا واضح تصور پیش کر دیا ہے۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایت ہے کہ آنحضورؐ نے مختلف مواقع پر لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت فضیلت کے اعتبار سے تہائی قرآن کے برابر ہے اسی مسلمان نماز میں اکثر اسی سورت کو پڑھتے ہیں۔

Marfat.com

الازہر، جامعہ ۔ مصر کی اسلامی یونیورسٹی (دیکھیے "ازہر جامعہ")

الاسود، حجر کالا پتھر۔ خانہ کعبہ میں لگا ہوا مقدس پتھر، جسے حاجی دوران طواف بوسہ دیتے ہیں۔ یہ خانہ کعبہ کی جنوب مشرقی دیوار میں قدآدم کے برابر نصب ہے۔ پتھر کا عرض تقریباً سات انچ ہے۔ قریب سے دیکھیں تو بارہ سے زیادہ ٹکڑوں میں منقسم نظر آتا ہے، جنھیں کسی مصالحہ سے جوڑا گیا ہو، شاید کسی زمانے میں یہ ٹوٹ گیا ہو اور اسے دوبارہ جوڑا گیا تھا۔ پتھر کی ماہیت معلوم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ امتداد زمانہ اور حجاج کے بوسوں سے اس کی سطح عجیب سی ہو چکی ہے اور رنگ بھی مٹیالا سا ہو چکا ہے۔ اس کے گرد چاندی کا گول چکر بنا ہوا ہے، جس میں سونے کی آمیزش کی گئی ہے۔

حجر اسود کہاں سے آیا؟ اس کی بابت مکمل معلومات حاصل نہیں۔ ابن عباسؓ کی ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ نے فرمایا کہ حجر اسود جنت سے آیا تھا۔ اس وقت یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔ "عہد نامہ عتیق میں بھی ایک پتھر کا ذکر آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہی ہو۔ کتاب زبور میں اشارہ ہے" وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا ہے، کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ یہ خداوند سے ہوا، جو ہماری نظروں سے عجیب ہے۔ (۱۱۸ : ۲۲، ۲۲) متی کی انجیل میں بھی اسی رد کیے گئے پتھر کا ذکر ہے کہ مسیحؑ نے بنی اسرائیل سے کہا "خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے، دی جائے گی۔ جو اس پتھر پر گرے گا، چور ہو جائے گا۔ پر جس پر وہ گرے گا، اسے پیس ڈالے گا۔ (۲۱ : ۴۲، ۴۳)۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسی پتھر کی طرف اشارہ کیا ہو، جسے حجر اسود کہا جاتا ہے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر اوّل ہی کے وقت سے یہ پتھر اس میں موجود تھا۔ ۶۰۶ء میں جب آنحضورؐ کی عمر ابھی پچیس برس تھی، سیلاب سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا اور قریش نے اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ جب دیواریں قدآدم کو پہنچ گئیں تو حجر اسود رکھنے کا مسئلہ آیا تو تو تکرار ہو کر جھگڑا ہو گیا۔ ہر قبیلے کی خواہش تھی کہ یہ سعادت اسے ہی نصیب ہو۔ رسول اللہؐ نے اس قضیے کو طے کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھا اور تمام سرداران قبائل سے کہا کہ وہ چادر کے کونے پکڑ کر اٹھائیں۔ چنانچہ سب نے مل کر چادر کو اٹھایا اور جب چادر اس مقام پر پہنچی، جہاں اسے رکھا جانا تھا تو آپؐ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے دیوار کعبہ میں نصب کر دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانے میں کعبے میں آگ لگ گئی، جس سے حجر اسود کے تین بڑے ٹکڑے ہو گئے۔ نیز کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں، جنھیں ابن زبیر نے چاندی میں مڑھوایا۔ ۱۲۶۸ھ میں سلطان عبدالمجید خلیفہ ترکی نے سونے کے فریم میں مرصع دیا۔ ۱۲۸۱ھ میں سلطان عبدالعزیز نے اسے چاندی کے فریم میں لگوایا۔ ۱۳۶۶ھ میں اس فریم کی اصلاح کی گئی۔

الاعراف، سورۃ قرآن مجید کی ساتویں سورت۔ اس میں چوبیس رکوع اور دوسو چھ آیات ہیں۔ چونکہ اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جو جنت اور دوزخ کے درمیانی علاقے اعراف میں ہوں گے۔ اس لیے اس کا نام اعراف رکھا گیا ہے اس سورت کا زمانہ نزول سورہ انعام کا ہے اور یہ آخری مکی سورتوں میں ہے۔

سورۂ الاعراف کا مرکزی مضمون نبوت کے مقام بلند سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانے میں کفار کی مخالفت عروج پر تھی۔ انہیں کہا گیا ہے کہ جو روش تم نے اختیار کر رکھی ہے، تم سے پہلے بھی کئی قوموں نے اختیار کی تھی۔ اس کا انجام انہیں مل گیا۔ آخری حصے میں دعوت کا رخ ان سے ہٹ کر اہل کتاب کی طرف پھر گیا اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اس تقریر میں یہودیوں سے بھی خطاب کیا گیا ہے اور آخر میں رسول کریمؐ اور صحابہ کو حکمت تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ انھیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور چیرہ دستیوں کے مقابلے میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے ہیجان میں مبتلا ہو کر ایسا اقدام نہ کریں، جو اصل مقصد کو ختم کر دے۔

مضمون کے لحاظ سے سورہ الانعام اور سورہ الاعراف کا تعلق ظاہر ہے۔ وہاں توحید کا موضوع زیر بحث ہے اور یہاں نبوت کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ توحید کے بعد نبوت کا ذکر لازم ہے۔ سورۂ انعام کے فوراً بعد سورۂ اعراف ترتیب میں آتی ہے۔ نظارۂ قدرت سے انسان جس توحید پر پہنچ سکتا ہے، وہ محض ایک خشک عقیدہ ہے۔ مگر نبوت جس توحید پر لا کھڑا کرتی ہے، وہ ایک شجر ثمر دار ہے۔

الاعلیٰ، سورۃ قرآن مجید کی ۸۰ ویں سورت۔ اس میں کل انتیس آیات ہیں اور یہ ابتدائی مکی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے اور یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے تعلق پیدا کرنے ہی سے انسان عالی مقام تک پہنچ سکتا ہے اس سورت کی چھٹی آیت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور نزول سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے الفاظ کہ "ہم تمھیں پڑھوا دیں گے، پھر تم نہیں بھولو گے"۔ یہ بتاتے ہیں کہ یہ اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب آنحضورؐ کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں تھی اور نزول وحی کے بعد آپؐ کو اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں آپؐ ان الفاظ کو بھول نہ جائیں۔

اس سورت میں توحید، آخرت اور ہدایات برائے رسولؐ منقول ہیں۔ ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کو ایسے نام سے یاد کیا جائے، جو اپنے معانی اور مفہوم کے لحاظ سے مکمل ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ کی ہستی کی ماہیت بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد آنحضورؐ کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کسی فکر میں نہ پڑیں۔ اس قرآن کو جو ان پر نازل کیا جا رہا ہے، حافظے میں محفوظ کر دینا اللہ تعالےٰ کا کام ہے۔ آخر میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ فلاح صرف نیک اور صالح لوگوں کے لیے ہے۔ اصل فکر آخرت کی کرنا چاہیے۔ کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت کی نعمتیں دنیا کی آسائشات سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

الانبیاء، سورۃ قرآن مجید کی اکیسویں سورت۔ اس میں انبیاء کرام کا ذکر ہونے کی بنا پر اس کا نام الانبیاء ہے۔ یہ لفظ کسی آیت میں نہیں آیا۔ اس میں سات رکوع اور ۱۱۲ آیات ہیں۔ اس کا زمانہ نزول مکے کا درمیانی دور ہے۔ یہ ہجرت حبشہ کے قریب قریب کہیں نازل ہوئی۔

سورت کی ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ لوگ خواب غفلت میں سوئے ہوئے ہیں اور انھیں آخرت کی کوئی پرواہ نہیں۔ جب انھیں کوئی جگانے والا آتا ہے تو یہ اسے پریشان کرتے ہیں۔ کبھی اس کی تعلیم کو افترا قرار دیتے ہیں۔ کبھی اسے شاعر قرار دیتے ہیں اور کبھی جادوگر۔ جب کہ رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتے ہیں۔ آگے چل کر انبیاء کی عظمت ان کے مخالفین کی ہلاکت، دشمنوں کے ہاتھوں سے ان کی نجات۔ اور متبعین کا وارث زمین ہونا مذکور ہے۔ خصوصاً عصمت انبیاء کا مضمون نہایت صفائی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ وہ قول و فعل دونوں میں اللہ تعالےٰ کی رضا کے ماتحت ہوتے ہیں۔ مضامین کا خاتمہ اس بات پر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم دنیا میں ناکام نہیں ہو سکتے اور آخر کار آپؐ

Marfat.com

کی قبولیت پھیلے گی۔ اس میں اسی بات کو واضح کیا گیا ہے کہ انبیاء اور راست باز ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں اور دشمنوں کے افترا کے باوجود حق غالب ہو کر رہتا ہے۔

اس سورت میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت و عفت کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تمام پیغمبر انسان تھے، خدائی کا شائبہ بھی ان میں نہیں تھا۔ ان پر بھی طرح طرح کے مصائب آتے اور ان کے مخالفین نے انھیں برباد کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے یہ کہ ان کا دین ایک تھا اور وہ وہی دین تھا جسے محمدؐ رسول اللہ پیش کر رہے ہیں۔ یہی اصل دین ہے، مگر لوگ گمراہ ہوئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اس کی پیروی میں ان کی نجات ہے، وہی زمین کے وارث بنیں گے، جو اس پر چلیں گے۔

الانسان، سورہ قرآن مجید کی ۷۶ ویں سورت۔ اس کا نام سورۃ "الدہر" بھی ہے یہ الفاظ ابتدائی آیت کے الفاظ "ھل اتی علی الانسان" اور "من الدھر" سے ماخوذ ہیں۔ اس میں دو رکوع اور اکتیس آیات ہیں۔ اس میں انسان کی روحانی ترقیوں کا ذکر ہے۔ اکثر مفسرین نے اسے مکی سورت قرار دیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ سورت ہے تو مکی مگر آیات ۸ تا ۱۰ مدینے میں نازل ہوئیں۔ امام رازی اور حافظ ابن کثیر جیسے مفسرین نے اسے مکی ہی لکھا ہے۔

اس کا موضوع انسان کو اس کی حیثیت یاد دلانا ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہ موجود نہ تھا۔ پھر ایک مخلوط نطفے سے اس کی ابتدا کی گئی۔ اس بات کی خبر کسی کو نہ تھی اور پھر اسے کئی مراحل سے گزار کر انسان بنایا گیا۔ اس کے بعد اُسے خبردار کیا گیا ہے کہ تیری تخلیق اسی طرح کر کے تجھے یہ ہم نے اس لیے بنایا کہ ہم دنیا میں رکھ کر تیرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے دوسری مخلوقات کے برعکس تجھے ہوش و گوش رکھنے والا بنایا گیا ہے تیرے سامنے نیکی اور بدی کے دونوں راستے رکھ دیے گئے ہیں۔ اب تو دکھا دے کہ تو کیا بننا چاہتا ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ نیک اور شاکر لوگوں کے لیے خدا کے ہاں اجر عظیم ہے۔ مختصراً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ وہ اعمال کیا ہیں، جن کی بنا پر وہ اس جزا کے مستحق ہوں گے۔

دوسرے رکوع میں آنحضورؐ کو مخاطب کر کے تین باتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کر رہے ہیں تاکہ کفار جان جائیں کہ نعوذ باللہ اسے محمدؐ خود اپنے دل سے نہیں گھڑ رہے بلکہ اس کے نازل کرنے والا "اللہ تعالیٰ" ہے اور یہ بات اس کی حکمت میں داخل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے رب کا فیصلہ ہونے میں خواہ کتنی دیر لگے، تم صبر کے ساتھ اپنا فرض ادا کیے جاؤ۔ تیسری بات یہ کہ شب و روز اللہ ہی کو یاد رکھو، نماز پڑھو اور اس کی عبادت میں گزارو۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار آخرت کو بھول چکے ہیں۔ انھیں یہ علم نہیں کہ انھیں خدا نے بنایا ہے، وہ چاہتا تو انھیں پیدا ہی نہ کرتا، یا ان کی شکلیں بگاڑ دیتا یا ہلاک کر کے کسی اور قوم کو اس کی جگہ لے آتا۔ یہ نصیحت کی بات ہے، اب جو چاہے اسے قبول کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ یقیناً اللہ بڑا علیم و حکیم ہے، اپنی رحمت میں جسے چاہتا ہے داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

الانشراح، سورہ:- دیکھیے "الم نشرح، سورہ"

الانشقاق، سورہ قرآن مجید کی ۸۴ ویں سورت۔ اس کا نام پہلی آیت سے مشتق ہے۔ اس میں پچیس آیات ہیں، انشقاق کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ یہ سورت مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی ظلم و ستم کا دور شروع نہیں ہوا۔ البتہ قرآن مجید کی دعوت کو جھٹلایا جا رہا ہے اور لوگ یہ ماننے سے انکار کر رہے ہیں کہ قیامت کبھی آئے گی۔

ابتدائی پانچ آیات میں قیامت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ کہ اس روز آسمان پھٹ جائے گا اور زمین اپنی تمام اشیاء نکال دے گی۔ یہ ان کے لیے رب کا حکم ہوگا۔ اگلی دس آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان شعوری یا لاشعوری طور پر اس کی طرف چلا جا رہا ہے، جہاں اسے رب کے سامنے پیش ہونا ہے۔ پھر سب انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جن کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ معاف کر دیے جائیں گے۔ دوسرے وہ جن کا نامۂ اعمال پیچھے سے پکڑایا جائے گا۔ وہ چاہیں گے کہ انھیں موت آ جائے۔ مگر مرنے کے بجائے وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ یہ بات اسی طرح سچ ہے جیسے شام کا ہونا یا رات کا آنا یا چاند کا کامل ہونا۔ ایسے لوگوں کو جو قرآن کو جھٹلاتے ہیں۔ سو انھیں دردناک عذاب کی خبر دے دی جائے۔

الانعام، سورہ قرآن مجید کی چھٹی سورت۔ اس کے رکوع ۱۷، ۱۸ میں بعض الانعام (مویشیوں) کی حرمت کے متعلق اہل عرب کے توہمات کی تردید کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "الانعام" رکھا گیا ہے۔ ترتیب نزول کے لحاظ سے یہ بہت پہلے کی مکی سورت ہے۔ اس میں بیس رکوع اور ۱۶۶ آیات ہیں۔ اس کا اصل مضمون توحید الٰہی بیان کرنا ہے۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ پوری سورت مکہ میں یک وقت نازل ہوئی تھی۔ حضرت معاذؓ بن جبل کی چچازاد بہن اسماءؓ بنت زید کہتی ہیں کہ جب یہ سورت آنحضورؐ پر نازل ہو رہی تھی اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے، میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ روایات میں اس کی تصریح بھی ہے کہ جس رات یہ نازل ہوئی۔ اسی رات کو آپ نے اسے قلم بند کرا دیا۔

چوپایوں کے متعلق اہل عرب میں عجیب مشرکانہ رسوم مروج تھیں۔ بعض اقسام کے جانوروں کو متبرک و معزز سمجھا جاتا تھا۔ ان کی یہ رسوم شرک کی حد تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اسلام نے توحید کی جو دعوت دی، وہ اس وقت تک پوری نہ ہو سکتی تھی۔ جب تک کہ ان مشرکانہ رسوم کی بیخ کنی نہ کی جائے۔

اس سورت کا اصل مضمون توحید الٰہی ہے اور اول تا آخر اسی ایک مضمون پر زور دیا گیا ہے۔ ہاں ضمناً کہیں رسالت کا ذکر آ گیا ہے۔ اسی ضمن میں جھوٹوں کی انجام کار ناکامی اور مومنین کی تدریجی کامیابی کا بھی ذکر ہے۔

پہلے رکوع میں شرک فی الذات کی تردید ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پیغام اور اس کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے۔ دوسرے رکوع میں شرک فی العبادات کی تردید کی گئی ہے۔ تیسرے میں بتایا گیا ہے کہ شرک ایک ایسی چیز ہے کہ مشرکوں پر بھی ایک وقت آئے گا کہ وہ خود مشرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ چوتھے میں مکذبین کے انجام

Marfat.com

کا، پانچویں عذاب استیصال کا ذکر ہے چھٹے میں توحید کے ماننے والوں پر احسان انعام کا ذکر ہے۔ ساتویں اور آٹھویں میں محاسبۂ اعمال اور اس کی غرض کو بیان کیا گیا ہے۔ نویں میں بتایا گیا ہے کہ اس مذہب توحید پر حضرت ابراہیم بھی قائم تھے اور ان کی اپنی قوم سے بحث کا ذکر کیا ہے۔ دسویں میں بتایا گیا ہے کہ سب انبیاء کا مذہب توحید ہی تھا۔ گیارہویں میں آنحضرت صلعم کی وحی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بارہویں میں اللہ تعالےٰ کی قدرتوں کا ذکر کرکے توحید پر دلیل دی ہے اور ساتھ ہی حق کی تدریجی کامیابی کا ذکر ہے۔ تیرہویں میں شرک کے مختلف پہلوؤں کا ابطال کیا گیا ہے اور اللہ تعالےٰ کا بی بی اور بیٹے سے پاک ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چودہویں میں پھر سے مشرکین کی مخالفت اور پندرہویں میں منصوبہ بازوں کے انجام کا ذکر ہے سولھویں اور سترہویں میں شرک اور مشرکانہ رسوم کا ابطال کیا گیا ہے۔ اٹھارویں میں ممنوع غذاؤں اور مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر کیا۔ انیسویں میں توحید کے عملی پہلو کو بیان کیا کہ غرض صرف ایک اقرار نہیں صرف مشرکانہ رسوم کا ترک کر دینا نہیں بلکہ صحیح اصول زندگی پر عمل پیرا ہونا توحید کا اصل مقصد ہے۔ نیز مال و جان کی حفاظت کے اصول بتائے گئے ہیں اور بیسویں میں بتایا گیا کہ توحید کامل کو عملی رنگ میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے تو اس کا عملی نمونہ حضرت محمدؐ ہیں اور اسی بلند مقام پر پہنچنے کے لئے ہر مسلمان کو کوشش کرنا چاہیئے اور سورت کا خاتمہ اگر ایک طرف ابطالِ کفارہ پر کیا تو دوسری طرف آخری الفاظ میں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ جب تم توحید کے ان اصولوں پر قائم ہو جاؤ تو تمھیں زمین میں بادشاہ بنا دیں گے۔ کیونکہ مخلوق کا خیر خواہ گروہ ہی ان پر حکومت کا اہل ہے اور ساتھ ہی ڈرایا بھی کہ اگر تم نے ان اصولوں کو ترک کر دیا تو وہ بادشاہت تم سے لے بھی لی جائے گی۔

موضوع کے لحاظ سے اس سورت کو ہم سات بڑے بڑے مضامین میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ شرک کا ابطال اور عقیدۂ آخرت۔

۲۔ عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور اس غلط خیال کی تردید کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔

۳۔ جاہلیت کے ان توہمات کی تردید، جن میں لوگ مبتلا تھے۔

۴۔ ان بڑے بڑے اصولِ اخلاق کی تلقین جن پر اسلام سوسائٹی کی تعمیر چاہتا ہے

۵۔ رسولؐ اکرم اور آپؐ کی دعوت کے خلاف لوگوں کے اعتراضات کا جواب

۶۔ طویل جدوجہد کے باوجود دعوت کے نتیجہ خیز نہ ہونے پر آنحضرت صلعم اور عام مسلمانوں کے اندر اضطراب اور دل شکستگی کی جو کیفیت پیدا ہو رہی تھی، اس پر تسلی دی گئی۔

۷۔ منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت اور سرشاری پر نصیحت اور تنبیہہ۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو اللہ کے رسولؐ کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفا کاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ظلم و ستم سے عاجز آ کر ملک چھوڑ چکی تھی اور حبشہ کی ہجرت کر گئی تھی۔ اس وقت آپؐ ہر قسم کے دنیوی سہارے سے محروم تبلیغ رسالت کا فریضہ ادا کرتے چلے جا رہے تھے۔

الانفال، سورۃ قرآن مجید کی آٹھویں سورت۔ اس میں دس رکوع اور ۷۵، آیات ہیں۔ انفال کے معنی مال غنیمت کے ہیں اور یہ سورت جنگ بدر میں ملنے والے مال غنیمت کی مناسبت سے نازل ہوئی۔ یہ سب سے پہلی جنگ ہے جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہوئی۔ اور اس میں دشمن سے مال غنیمت ہاتھ آیا اور قیدی بھی پکڑے گئے۔ ایسے مال کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ایک تجارتی قافلہ ابھی قریش کا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں سے بعض کا خیال تھا کہ اس قافلے پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا جائے۔ ملٔسے، قرآن مجید نے دنیا کا مال قرار دے کرنا جائز قرار دیا۔ اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ جنگ میں جو مال ملے وہ جائز ہے، لیکن مال کا حاصل کرنا اصل غرض نہیں بلکہ جنگ کی اصل غرض کچھ اور ہے۔

اس سورت میں جنگ بدر ہی کا ذکر کیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان جنگوں کا مقصد حصول مال نہیں بلکہ اصلاح و اطاعت ہے۔ آپس میں اصلاح کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ کا ذکر کرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ دو تو پکے مومن بنتے ہو اور پھر اصل مضمون جنگ بدر کی طرف عود کیا اور بتایا کہ جنگ بدر میں اللہ تعالےٰ حق کو ثابت کرنا چاہتا تھا اور یہ کہ دشمن جو اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں، ان کا استیصال کر دے۔ دوسرے رکوع میں جنگ بدر میں فتح کا اور ان اسباب کا جن سے فتح ہوئی ذکر ہے اور وہ محض اللہ تعالےٰ کی نصرت تھی۔ تیسرے میں پھر بتایا کہ فلاح کی حقیقی راہیں کیا ہیں اور مسلمانوں کو تنبیہہ فرمائی۔ چوتھے میں فرمایا کہ جنگ بدر کے بعد بھی کفار لڑائی میں نکلتے رہیں گے۔ مگر بالآخر مغلوب ہوں گے۔ اور مسلمان خانہ کعبہ کے متولی ہمیشہ کے لئے قرار دیئے جائیں گے۔ پانچویں میں بتایا کہ اجتماع بدر مصلحت الٰہی سے ہوا۔ ورنہ مسلمانوں میں اتنی طاقت تھی کہ اتنی بڑی جمعیت سے مقابلہ کے لئے نکلتے۔ چھٹے میں مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رہنے کی نصیحت کی تاکہ نصرت الٰہی کے جاذب بنیں۔ ساتویں میں کفار کی بدعہدیوں کا ذکر کیا۔ آٹھویں میں بتایا کہ دشمن کے مقابلے کے لئے ہر وقت مستعد اور تیار رہنا چاہیئے۔ نویں میں تسلی دی کہ کفار کی تعداد سے نہ گھبرائیں۔ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو دگنی اور دس گنی تعداد پر بھی غالب کر دکھائے گا۔ اور اسی میں آخر پر یہ بتایا گیا کہ قیدی یا مال غنیمت باقاعدہ جنگ کی صورت میں لئے جا سکتے ہیں۔ دسویں میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات قوی بتائے اور فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اگر کفار مسلمانوں پر زیادتی کریں تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں۔ سوائے اس صورت کے کہ ایسی کافر قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو۔ پھر قانون جنگ و صلح کے متعلق وہ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں، جن کی توضیح اس مرحلے میں دعوت اسلامی کے داخل ہو جانے کے بعد ضروری تھی تاکہ مسلمان اپنی صلح و جنگ میں جاہلیت کے طریقوں سے بچیں اور دنیا پر ان کی اخلاقی برتری قائم ہو اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام روزِ اوّل سے اخلاق پر عملی زندگی کی بنیاد رکھنے کی جو دعوت دے رہا ہے۔ اس کی تعبیر واقعی عملی زندگی میں کیا ہے پھر اسلامی ریاست کے دستوری قانون کی بعض دفعات بیان کی گئی ہیں، جن سے دارالاسلام کے مسلمان باشندوں کی آئینی حیثیت ان مسلمانوں سے الگ کر دی گئی ہے، جو دارالاسلام کی حدود سے باہر رہتے ہوں۔

الانفطار، سورۃ قرآن مجید کی ۸۲ ویں سورت۔ اس میں ۱۹۔ آیات ہیں۔ یہ مکی سورت ہے۔ انفطار کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے، جس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جو شخص چاہتا ہے کہ روز قیامت کو اس طرح دیکھ لے، جیسے آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے، تو وہ سورہ تکویر اور سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کو پڑھ لے۔"

Marfat.com

اس سورت میں قیامت آنے کی کیفیات درج کی گئی ہیں۔ پہلی تین آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے جب آسمان پھٹ جائے گا اور تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ بیان کیا گیا ہے جب قبریں کھول دی جائیں گی اور انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد احساس دلایا گیا ہے کہ انسان کو کس چیز نے دھوکے میں ڈال دیا تھا کہ اس کا حساب کتاب نہ ہو جب کہ انسان پر نگران مقرر ہیں، جو اس کے ہر فعل کو درج کر لیتے ہیں۔ یعنی جس چیز نے دھوکے میں ڈالا، وہ کوئی معقول دلیل نہیں ہے بلکہ ایک احمقانہ خیال ہے۔ اس روز یہ لوگ نہ بچ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرے گا اور پھر نیک لوگوں کو جنت کا عیش اور بدکار لوگوں کو جہنم کا عذاب نصیب ہوگا۔ اس روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ سوائے انسان کے اپنے عمل کے۔

البانیہ یورپ میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والی ایک بلقانی ریاست (ترکی زبان میں اسے آرناودلق کہتے ہیں) آج کل یہاں کمیونسٹ پارٹی حکمران ہے۔ سرکاری نام عوامی جمہوریہ البانیہ ہے۔ اس کے شمال اور مشرق میں یوگوسلاویہ جنوب مشرق میں یونان، جنوب میں بحیرہ روم اور مغرب میں آبنائے اوٹرنٹو (بحیرہ ایڈریاٹک) کے پار اٹلی واقع ہے۔ اس کا صدر مقام تیرانا ہے۔ کل رقبہ ۱۰۰، ۱۱ مربع میل (۲۸۷۴۸ مربع کلومیٹر) ہے۔ ۱۹۷۱ء میں کل آبادی ۲۲،۲۹،۰۰۰ تھی۔ یہاں البانوی زبان بولی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ یہاں کی بیس فیصد آبادی آرتھوڈکس عیسائی اور بارہ فی صد رومن کیتھولک ہے۔ البانیہ کا دو تہائی رقبہ پہاڑی ہے۔ دریا بہت کم بہتے ہیں۔ مغربی نشیبی علاقوں میں کچھ زرخیز میدان ملتے ہیں۔ بلند مقامات کی آب و ہوا سرد خشک ہے۔ البتہ ساحلی علاقوں میں گرم مرطوب آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ دروز یہاں کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔

تاریخ:۔ البانوی لوگ ترکوں کے نزدیک نسلی اعتبار سے دو گروہوں گیغ اور طوسک میں منقسم ہیں۔ یونانیوں کے زیر اثر ان کے ہاں بھی یونانی ثقافت کا رواج ہوا۔ چودھویں صدی عیسوی میں ترکوں نے اس علاقے پر حملے شروع کیے۔ یہ حملے کامل ایک صدی تک برقرار رہے اس دوران میں بہت سے البانوی باشندے نقل مکانی کر کے اٹلی اور یوگوسلاویہ کے علاقوں

دروز کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کا منظر

البانیہ کی اہم بندرگاہ ــ دروز کی جامع مسجد

کی طرف چلے گئے۔ ۱۶۹۰ء میں البانویوں نے زرخیز میدانوں میں آکر چھوٹے چھوٹے قطعات پٹے پر لے لیے اور یہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ عثمانی دستاویزات سے علم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا باقاعدہ راج ۷۹۰ھ/۱۳۸۶ء سے شروع ہوا اور اس میں استحکام پیدا ہوا۔ حکومت عثمانیہ میں اکثر عہدیدار البانوی تھے۔ جنہوں نے عوام کو زیادہ سے زیادہ سرکاری زمینیں دینا شروع کیں۔ اس طرح یہاں نیم خود مختار جاگیردار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ انھی میں ایک علی پاشا تھا۔ ۱۸۲۰ء میں جب مرکزی حکومت نے اس کے خلاف کارروائی کی تو اس نے بغاوت کر دی۔ اس کے جانشین محمود ثانی کو ۱۸۳۲ء میں عثمانیوں نے شکست دی۔

۱۲ رجون ۱۸۷۸ء کو البانویوں نے اپنی ایک سیاسی لیگ قائم کر لی۔ جسے عثمانیوں نے ۱۸۸۱ء میں منتشر کر دیا۔ مگر زیر زمین ان کی تحریکات جاری رہیں۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کے خلاف زبردست اعلانات کیے۔ اس کے ساتھ ہی کوہستانی قبائل نے بغاوت کر دی۔ جنگ بلقان کے باعث حالات بدل گئے اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی نومبر ۱۹۱۲ء میں ان کے ایک رہنما اسماعیل کمال نے البانیہ کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ۳ راگست ۱۹۲۰ء میں اٹلی کی حکومت نے البانیہ کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ ۱۹۲۴ء تک قومی حکومت داخلی معاملات میں الجھی رہی۔ ۲۴ ر دسمبر کے انتخابات میں مجلس مقننہ نے احمد زوغ کو پہلا صدر منتخب کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ۶ راپریل ۱۹۳۹ء کو اٹلی نے پہلی بار اس پر حملہ کیا تو زوغ ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس کے بعد سے البانیہ اٹلی کا ایک حصہ رہا۔

۱۹۴۲ء میں محاذ قومی آزادیٔ البانیہ نے کمیونسٹوں کے زیر اثر استحکام حاصل کر لیا۔ اس کا رہنما انور ہوگزا تھا۔ جس نے ۱۹۴۴ء میں ملک کا اقتدار حاصل کر لیا۔ روس نے البانیہ کو ہر قسم کی اقتصادی و سیاسی مدد دینا شروع کی۔ تاہم ۱۹۶۰ء کی روس چین جنگ میں البانیہ نے چین کی حمایت کی۔ اور اس کے بعد البانیہ نے چین کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے۔ ۱۹۶۲ء تک عملاً اقتدار انور ہوگزا کے ہاتھ ہی میں رہا۔ ۱۹۶۲ء میں البانیہ کے صدر ہاگزی لیشی تھے

اقتصادی معلومات:۔ البانیہ ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ جہاں تعلیم لازم ہے۔ تیرانا صدر مقام ہے، جہاں ایک یونیورسٹی قائم ہے۔ یہاں تیرہ ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں البانیہ کی تجارت زیادہ تر چین، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور مشرقی جرمنی کے ساتھ ہوتی ہے برآمدات میں ایندھن، معدنیات، دھاتیں، سبزیاں، پھل اور تمباکو شامل ہے۔ زرعی پیداوار میں گندم،

Marfat.com

اور محمود غزنوی کو مستقبل کے واقعات بتایا کرتا تھا۔ حساب میں اکائی، نسبت تناسب کے قاعدے، جذر نکالنے کا طریقہ اور قبلہ کی سمت کا تعین کرنے اور جیومیٹری کے بہت سے مسائل اسی کے دریافت کردہ تھے۔ اس نے زمین کا محیط ۲۴۷۷۹ میل نکالا تھا جو جدید پیمائش سے صرف ۹۰ میل کم ہے۔ اسی نے سب سے پہلے علم تقسیم الارض کا آغاز کیا۔ وہ ریاضی کی ایک شاخ کیلکولس کا بھی موجد تھا۔ طبیعیات میں اس نے مائعات کے خواص کا مطالعہ کیا اور بتایا کہ پانی فوارے میں کیوں چڑھتا ہے۔ نیز سطح ہموار کیوں رہتی ہے۔ اس نے قیمتی پتھروں، زمین کی مختلف تہوں اور چٹانوں اور معدنیات کی اقسام کا مطالعہ بھی کیا تھا اور زمین کی عمر بھی حساب لگا کر نکالی تھی۔

تاریخ اور مذاہب کے میدان میں البیرونی آنکھیں بند کرکے چلنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ اس کی ذات ادب اور سائنس کا سنگم تھی۔ ایک طرف عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، سریانی اور عبرانی زبانوں کا ماہر تھا اور دوسری طرف ریاضی کے پیچیدہ مسائل سے آگاہ تھا۔ اس نے ہر مذہب کا مطالعہ اس کی مقدس کتاب اور براہ راست اسی کی زبان میں کیا۔ اس کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اس نے اپنی طویل زندگی میں کبھی بھی سیاست میں حصہ نہ لیا۔ استغنا اس قدر تھا کہ اپنے علمی مشاغل کا معاوضہ ضروریات سے زیادہ لینا اپنی توہین سمجھا۔ اور یہی اس کی فضیلت کا باعث بنا۔ پاکستان میں ۲۶ نومبر سے ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء تک البیرونی کی یاد میں بین الاقوامی کانگریس منعقد ہوئی۔ جس میں اس عظیم دانشور کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

البیّنہ، سورۃ قرآن مجید کی ۹۸ ویں سورت۔ البینہ کا لفظ اس کی پہلی آیت ہی میں ہے۔ اس میں کل آٹھ آیات ہیں۔ اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابن زبیرؓ اور عطا بن یسار کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ حضرت عائشہؓ اسے مکی قرار دیتی ہیں۔ مگر نفس مضمون سے اس پر کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس سورت میں بتایا گیا کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری ہے۔

اس سورت کا موضوع آنحضورؐ کی رسالت کی صداقت ہے۔ یہاں انھیں کھلی دلیل قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول کو بھیجنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا کے لوگ، خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، جس کفر کی حالت میں مبتلا تھے اس سے ان کا نکلنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایسا رسول بھیجا جائے جس کا وجود خود اپنی رسالت پر روشن دلیل ہو۔ نیز اہل کتاب کی بعض گمراہیوں کی وضاحت کی گئی ہے کہ ان کے ان مختلف راستوں پر بھٹکنے کا واضح بیان ان کے پاس آچکا ہے۔ اب بھی اگر وہ بھٹکتے رہیں تو ان کے لیے جہنم کی آگ مقدر ہو چکی ہے اور جو صحیح دین کو اختیار کرے۔ خالص اللہ کی بندگی کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے تو اس کے لیے رب کے ہاں دائمی قیام کے باغ ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

الپ ارسلان (یکم محرم ۴۲۰ھ/۲۰ جنوری ۱۰۲۹ء — ربیع الاول ۴۶۵ھ/دسمبر ۱۰۷۲ء) عضد الدولہ، محمد بن داود چغری بیگ، سلجوقی سلطنت کا دوسرا حکمران۔ کم سنی ہی میں اپنے والد کے ساتھ جنگی مہموں میں شرکت کرنے لگا۔ بالخصوص آل غزنہ کے خلاف بڑی کامیابی سے افواج کی قیادت کی۔

۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں ایران میں ابراہیم ینال نے بغاوت کر دی۔ اس دوران میں الپ ارسلان نے اپنے چچا طغرل بیگ کی جان بچائی۔ تین سال بعد اپنے باپ چغری بیگ کی جگہ سنبھالی اور ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں طغرل بیگ کا جانشین بھی ہو گیا۔ کیونکہ طغرل بیگ لاولد تھا۔ اب تمام سلجوقی سلطنت اس کے ماتحت آچکی تھی۔ اس نے اپنے سوتیلے بھائی اور طغرل بیگ کے متبنیٰ سلیمان سے بڑی آسانی سے نجات حاصل کر لی۔ خلیفہ القائم نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور تمام امتیازات عطا کیے۔

ہرات کے مقام پر اپنے چچا بیغو کو اطاعت کرنے پر مجبور کر کے اپنے والد کے ایک چچازاد بھائی قتلمش کو شکست دی۔ اپنے بڑے بھائی قاورد سے بھی ۴۵۷ھ/۱۰۶۵ء سے ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء تک کئی بار جنگ کی اور آخر اسے مشروط طور پر کرمان کا حاکم رہنے دیا اور یوں اپنے عہد میں اس نے سلجوقی سلطنت کو بہت مضبوط کر دیا۔

الپ ارسلان کی زیادہ تر شہرت مغرب پر اس کے حملوں کی وجہ سے ہے۔ تخت نشینی کے کچھ ہی عرصے بعد اس نے بزنطینیوں اور گرجستانیوں کے خلاف مہموں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء میں اس نے آنی اور قرص پر قبضہ کر لیا۔ ان مہمات کی وجہ سے آذربائیجان کی سرحدیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں۔

ادھر بزنطینیوں نے اسلامی سلطنت کی شامی اور ارمنی سرحدوں پر جوابی حملے شروع کیے۔ جس پر ۱۰۶۹ء میں دونوں سلطنتوں کے درمیان کشمکش و تشدید کا آغاز ہوا۔

بزنطینیوں سے فارغ ہو کر الپ ارسلان اہل سنت کی حمایت میں فاطمی مصر کی طرف بڑھا اور راستے میں بزنطینیوں کے مقبوضات آرجیش ملازگرد وغیرہ کو بھی حاصل کرتا گیا۔ حلب میں مرداسی حکمران کو مطیع کرتے ہوئے وہ شام کی طرف بڑھا لیکن اسے بزنطینی شہنشاہ رومانوس کی سرکوبی کے لیے واپس ہونا پڑا جس نے آرمینیا پر حملہ کر دیا تھا۔ ذی قعد ۴۶۳ھ/اگست ۱۰۷۱ء میں وہ ملازگرد کے مقام پر بزنطینی لشکر سے نبرد آزما ہو گیا اور شام سے قبل ہی اس نے پہلی بار بزنطینی شہنشاہ کو اسیر کر لیا اور پھر جلد ہی یورپ میں ترک فتوحات کے لیے راستہ کھل گیا۔ بعد میں آنے والے حکمران اس پر فخر کرتے رہتے کہ ان کے اسلاف نے ملازگرد کے اس معرکے میں حصہ لیا تھا۔

ملازگرد کے معرکے کے بعد الپ ارسلان زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں قرہ خانیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں زخمی ہو گیا۔ اور عین جوانی کے عالم میں اپنے بیٹے ملک شاہ کو جانشین مقرر کر کے راہی ملک عدم ہوا۔

الپ ارسلان اگرچہ ایک مسلمان حکمران تھا اور اہل سنت کے نزدیک وہ کریم النفس اور دیندار قائد اور سپہ سالار تھا لیکن اس کا عہد اسلامی ثقافت اور تہذیب کا شاندار مرقع نظر نہیں آتا۔ البتہ اس کے عہد میں اس کے لیے ایک کتاب "ملک نامہ" تصنیف ہوئی تھی جس کے گمنام مصنف نے آل سلجوق کی اصل کا سراغ لگانے اور حالات لکھنے کی سعی کی تھی۔

عیسائی لوگ الپ ارسلان کو شجاع القلب اور فیاض کہتے تھے۔ اس کا خراسانی وزیر نظام الملک طوسی البتہ ایک مدبر شخص تھا۔ جس نے سلجوقی سلطنت کے نظم و نسق کو بہتر بنیادوں پر استوار کیا اور ایک کتاب "سیاست نامہ" لکھی۔ الپ ارسلان نے خراسان میں آل سلجوق کی بعض جاگیروں اور مقبوضات کو اپنے خاندان کے ممتاز شہزادوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس لیے اسے اپنی سلطنت کے اردگرد قائم ہونے والی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قائم ہونے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ البتہ وہ ان پر کڑی نظر ضرور رکھتا تھا۔

ترکی میں الپ ارسلان کے معنی بہادر شیر کے ہیں۔ اس کے بہادر ہونے میں کلام نہیں صورت شکل سے سچ مچ شیر معلوم ہوتا تھا۔ ملازگرد کا واقعہ بہت سخت تھا۔ رومانوس کے لشکر میں فرانس، نارمنڈی، مقدونیہ اور بلغاریہ کے سپاہیوں کے علاوہ بہت سے حبشی قبائل بھی شامل تھے۔ سلطان نے اس موقع پر سفید لباس پہنا، عطر لگایا۔ نماز پڑھی۔ پھر ترکمان لے کر بڑی بہادری سے لڑا اور پھر گرجستان، آرمینیا اور ایشیائے کوچک سلجوقی سلطنت میں شامل ہوئے اور ایشیا کا کوئی علاقہ رومیوں کے قبضے میں نہ رہا۔

Marfat.com

دُنیا بھر میں ارزاں ترین

شاہکار مطبوعاتِ شاہکار

ہر موضوع اور ہر زبان کے شاہکار قدیم و جدید

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو

انتہائی باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں

۱	حاجی مُراد (ناول)	ٹیوٹالسٹائی	۲/۵۰
۲	لوسٹوری (ناول)	ایرچ سیگل	۲/-
۳	غبارِ خاطر (مکاتیب)	مولانا ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۴	نوٹرے ڈیم کا کبڑا (ناول)	وکٹر ہیوگو	۲/۵۰
۵	داراشکوہ (ناول)	قاضی عبدالستار	۳/-
۶ ۷	ریو جولیٹ اور میکبتھ (دو ڈرامے)	ولیم شیکسپیئر	۳/۵۰
۸	سائنس سے بھی عجیب تر (سائنس)	صابر کلوروی	۲/-
۹	مہانِ بہار، آتشِ رفتہ (دو ناولٹ)	اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی	۲/-
۱۰	آوازِ دوست (مضامین)	مختار مسعود	۳/-
۱۱	بھوانی جنکشن (ناول)	جان ماسٹرز	۲/۵۰
۱۲	پولیس افسر کی ڈائری (جرم و سزا)	دلاور حسین لودھی	۲/۵۰
۱۳	شاہنامہ اسلام (حصہ اوّل)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۳/-
۱۴	چلتے ہو تو چین کو چلیئے (سفرنامہ)	ابن انشار	۲/۵۰
۱۵	علی اور نینو (ناول)	قربان سیّد	۲/۵۰
۱۶	تحریکِ پاکستان (عمرانیات)	شمیم احمد	۳/-
۱۷	صحرانورد کے خطوط (حصہ اوّل)	میرزا ادیب	۲/-
۱۸	النبی الخاتم (سیرت)	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	۲/۵۰
۱۹	شاہنامۂ اسلام (حصہ دوم)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۳/-
۲۰	فردوسِ بریں (ناول)	مولانا عبدالحلیم شرر	۲/۷۵
۲۱	ایمانیات (اسلامیات)	مولنس زبیری	۲/۲۵
۲۲	جین آئر (ناول)	شارلٹ برونٹے	۴/-
۲۳	شکست (ناول)	کرشن چندر	۳/-
۲۴	مجبور آوازیں (سیاست و معیشت)	کے ایل گابا	۴/-
۲۵	شاہنامۂ اسلام (حصہ سوم)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	۳/-
۲۶	قائدِ اعظم میری نظر میں	ایم اے ایچ اصفہانی	۴/-

مکتبہ شاہکار — پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور

Marfat.com

جس کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے

شاہکار خزینۂ معلومات

ایک کتاب جس میں کائنات کے ہر شعبے اور ہر موضوع پر بنیادی معلومات درج ہیں۔ فہرست مضامین کی ایک سرسری جھلک یہ ہے :۔

علم ہیئت سورج ۔ چاند ۔ سیارے اور ستارے ۔ آسمان اور زمین ۔ شہاب ثاقب ۔ پہلی آبادی ۔ کائنات کا آغاز اور ساخت ۔ پھیلنے والی کائنات ۔ نئی اور پرانی تحقیق ۔ ریڈیائی لہریں ۔ پرواز کی کہانی ۔ جدید آلات ۔

طبقات الارض طبقات ۔ چٹانیں ۔ سطح اور گہرائی ۔ آب وہوا ۔ برفانی ادوار ۔ زمین پر یا سمندر میں ۔ عجیب ڈراما ۔ انسان کا ارتقا ۔ مؤجد انسان ۔ سطحِ زمین ۔ اچانک تبدیلیاں ۔ زلزلے ۔ پہاڑ ۔ جھیل ۔ گیسیں ۔

طبعی جغرافیہ ہوائیں ۔ سائیکلون ۔ فضا اور عمل تبخیر ۔ بادل ۔ اولے ۔ برف ۔ اوس ۔ کہر ۔ بارش ۔ موسم ۔ سمندر ۔ موجیں ۔ طوفان ۔ جوار بھاٹا ۔ منطقے ۔ عرض بلد ۔ طول بلد ۔ انسان اور اس کی نسلیں ، پیشے ۔

طبعیات وکیمیا عناصر ۔ یورینیم ۔ ریڈیم ۔ ایٹم اور اس کی ساخت ۔ ایٹمی طاقت کے مراکز ۔ سائنس کے عجیب کرشمے ۔ دماغ کے اجزا کی زندگی اور موت ۔ کیمیا گری ۔

حیاتیات وتشریح خلیے کے افعال ۔ حرکت ۔ دوران خون ۔ بالیدگی ۔ بافتے ۔ نظام تنفس ۔ نظام ہضم ۔ غدود ۔ خون ۔ جگر ۔ گردے ۔ آنتیں ۔ اعصاب ۔ دماغ ۔ حرام مغز ۔ نظام تولید ۔ دل ۔ شریانیں ۔ نبض اور حواس ۔

نباتات بیج ۔ پتیاں ۔ پتے ۔ تنے ۔ پھول ۔ پودے ۔ پودوں کا نظام تنفس ۔ نظام ہضم ۔ نظام تولید ۔

نفسیات دماغ کی ساخت ۔ لاشعور اور تحت الشعور ۔ مدرکات ۔ جذبات ۔ احساسات ۔ عقل ۔ فریب نظر ۔ فریب خیال ۔ عادت ۔ تصور ۔ حافظہ ۔ تاثر ۔ توجیہ ۔ خواب ۔ شخصیت ۔ سیرت ۔ خودی ۔ انا ۔ احساس کمتری ۔ تحلیل نفسی ۔

مؤجدین بقراط ۔ جالینوس ۔ ہاروے ۔ کوپرنیکس ۔ نیوٹن ۔ ڈارون ۔ فرائیڈ ۔ ایسٹر ۔ پاسچر ۔ کیوری ۔ ایڈلر ۔ فورڈ ۔ آئن سٹائن ۔ اسٹیفن سن ۔ ایڈیسن ۔ ڈنلپ ۔ مارکونی ۔ فورڈ ۔ الیاس ۔

حکمائے مشرق ابن رشد ۔ ابن باجہ ۔ ابن طفیل ۔ ابن سینا ۔ ابن الہیثم ۔ جابر بن حیان ۔ ابونصر فارابی ۔ الکندی ۔ البیرونی

حکمائے مغرب گلیلو ۔ کپلر ۔ بوڈن ۔ جوزف ۔ لاپلاس ۔ ڈیکارٹ ۔ کامٹ ۔ برگسان ۔ اسپونزا ۔ گوئٹے ۔ بیتھوون ۔ شوپنہار ۔ لاؤتز ۔ تاؤ ۔ موتسی ۔ رسل ۔ اور حکمائے یونان ، سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، ورجل ، سسرو ۔

علوم جدیدہ کے بنیادی اصولوں اور معلومات کا باتصویر خزینہ

تصنیف: سیفی نوگانوی

پہلا حصہ ـــــ ۱۵ر فروری ۱۹۷۶ء ـــــ قیمت : ۳/۵۰

دوسرا حصہ ـــــ یکم مارچ ۱۹۷۶ء ـــــ قیمت : ۳/۵۰

Marfat.com

۵

۱۳۵ مضامین

الچگین	الطور	المرسلت	امان اللہ
التمش	العادیات	المریم	ام ایمن
التحریم	العصر	المطففین	امت
التغابن	العنکبوت	المعارج	ام حبیبہ
التکاثر	الغاشیہ	الملک	ام حرام
التکویر	الغ بیگ	الممتحنہ	ام حکیم
التوبہ	الفاتحہ	المنافقون	امداد اللہ
التین	الفتح	الم نشرح	ام دردا
الجاثیہ	الفجر	الموت	امر
الجاتیو	الفرقان	النازعات	ام رومان
الجزائر	الف لام میم	الناس	ام سلمہ
الجمعہ	الفلق	النباء	ام سلیم
الجن	الفیل	النجم	ام عطیہ
الحاد	القارعہ	النحل	ام عمارہ
الحاقۃ	القدر	النساء	ام کلثوم
الحج	القریش	النصر	ام ورقہ
الحجر	القصص	النمل	ام ولد
الحجرات	القصوا	الواح	ام ہانی
الحدید	القلم	الواقعہ	اُمّی
الحشر	القمر	الٰہ	امیر
الحمدُ للہ	القیامۃ	الہام	امیر حسینی
الحمراء	الکافرون	الیاس	امیر علی
الدخان	الکندی	الیاس دہلوی	امین
الرعد	الکوثر	الیسع	امین الحسینی
الروم	الکہف	ام الفضل	امین الرشید
الزخرف	الکیمیا	ام القریٰ	امیہ
الزلزال	اللہ	ام المومنین	امیہ بنو
الزمر	اللہ اکبر	امام	انبیاء
الشعراء	اللہب	امام باڑہ	انجیل
الشمس	اللیل	امامت	انجیل برناباس
الصف	الماعون	امام شاہ	اندلس
الصٰفٰت	المائدہ	اُمامہ	انڈونیشیا
الضحیٰ	المجادلہ	اِمامیہ	انسان
الطارق	المدثر	امان	

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط نمبر (۵)
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

ٹیلیفون : ۴۱۰۳ ۳۵
تار : "شاہکار"

مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود
مدیر : عطش درانی

شائع شدہ اور آئندہ کتب کا اعلان
آخری صفحے پر ملاحظہ کیجیے

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
شاہکار
پوسٹ بکس : ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

انسائیکلوپیڈیا "معلومات" کی آمد آمد .....

"اسلامی" کی قسط ۲ میں ہم نے قارئین سے استفسار کیا تھا کہ انسائیکلوپیڈیا "معلومات" کا آغاز الف ممدودہ کی قسطوں کی دوبارہ اشاعت سے کیا جائے یا نئے حرف الف مقصورہ سے؟ اس پر ہمیں طرح طرح سے آراء موصول ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر اجماع الف ممدودہ کے حق میں ہے۔

اس مسئلہ پر ہم نے بھی بہت غور کیا اور اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نئے قارئین کا خیال رکھتے ہوئے الف ممدودہ سے اشاعت کا آغاز کیا جائے۔ اب بڑے سائز میں ہونے کی وجہ سے الف ممدودہ کی سابقہ اٹھائیس قسطیں بارہ چودہ قسطوں میں آجائیں گی۔ یعنی پرانے ارکان اپنا سلسلہ ملانے کے لیے ایک سال اور ٹھہر سکتے ہیں۔ وہ ایسا سمجھ سکتے ہیں، گویا "معلومات" ابھی دوبارہ جاری نہیں ہوا۔ اور وہ الف مقصورہ سے اس قافلے میں شریک ہوسکتے ہیں۔ اب انشاء اللہ یکم مئی ۱۹۷۶ء سے اعداد و شمار اور متن کی مناسب تبدیلیوں، ترامیم اور اضافوں کے ساتھ انسائیکلوپیڈیا "معلومات" شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ عاشقان علم و ادب اس عظیم منصوبے کی تکمیل میں حسب سابق سرپرستی فرمائیں گے۔

بعض قارئین کا یہ خیال درست نہیں کہ "اسلامی" انسائیکلوپیڈیا کسی لحاظ سے بھی انسائیکلوپیڈیا "معلومات" کا بدل ہے۔ "اسلامی" ہمارے خصوصی موضوع وار انسائیکلوپیڈیاؤں میں سے ایک ہے: مثلاً "سائنس کا انسائیکلوپیڈیا"، "طب و صحت کا انسائیکلوپیڈیا"، "علوم عمرانی کا انسائیکلوپیڈیا"۔ یہ سب الگ الگ اپنے اپنے موضوع کے ماہرین کی زیر نگرانی مرتب ہو رہے ہیں اور جوں جوں تیار ہوتے جائیں گے، شائع ہو کر آپ کے پاس پہنچتے رہیں گے جبکہ "معلومات" ایک عمومی نوعیت کا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں "اسلامی" کے بہت سے موضوعات شاید ہی آئیں۔ ایک اور اہم موضوع کا انسائیکلوپیڈیا زیر قلم ہے، جس کا ابھی صیغہ راز میں رہنا بے حد ضروری ہے۔ بہرحال کام بہت ہو رہے ہیں۔ فکر نہ کیجیے! داد نہ دیجیے! تعاون فرمائیے۔ اس ملک میں ضعیف الاعتقادی اور جہالت کے سانپ کو مارنے والے آپ اور ہم ہی تو ہیں۔

[اشاعتی منصوبوں میں بعض اوقات بعض مجبوریوں کے تحت تبدیلیاں ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ ہماری کتاب "تین بڑے نفسیات دان" پریس جا رہی تھی کہ تمام کاپیاں ایک حادثے کا شکار ہوگئیں۔ کچھ ایسا واقعہ "خزینۂ معلومات" کے حصہ دوم کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اب یہ دونوں کتابیں کسی مناسب وقت پر پیش کی جائیں گی۔]

آپ کا
عطش درانی

تاریخ اشاعت : ۱۵ فروری ۷۶ء — ناشر : سید قاسم محمود — طابع : تعمیر پریس لاہور

Marfat.com

البلد، سورۃ قرآن مجید کی ۹۰ ویں سورت۔ ایک رکوع اور بیس آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ بلد شہر کو کہتے ہیں اور البلد سے مراد مکہ معظمہ ہے۔

اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے آرام کی جگہ نہیں ہے کہ وہ صرف عیش کرتا ہے بلکہ اس دنیا میں اس کی پیدائش مشقت کی حالت میں ہوئی ہے۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اس کے سامنے برائی اور بھلائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں اور ان میں سے ایک راستہ تو پستی کی طرف جاتا ہے اور اس پر جانے کے لئے کوئی مشقت نہیں اٹھانا پڑتی دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے۔ وہ ایک دشوار گذار گھاٹی کی طرح ہے۔ اس پر چلنے کے لئے انسان کو اپنے نفس پر بڑا جبر کرنا پڑتا ہے

آخر میں بتایا گیا ہے کہ وہ گھاٹی جس سے گذر کر آدمی بلندیوں کی طرف جا سکتا ہے، یہ ہے کہ آدمی ریاکاری اور جھوٹی نمائش پر خرچ کرنے کو چھوڑ کر اپنا مال یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرے۔ اللہ پر ایمان لائے اور ایمان والوں کے ساتھ شامل ہو کر خلق خدا پر رحم کھائے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ جو بھی یہ رویہ اختیار کرتا ہے وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہے اور جو اس کے مخالف راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا انجام آتش جہنم ہے۔ جس سے وہ نہیں نکل سکے گا۔

الپتگین (وفات ۳۵۲ھ/۹۶۳ء) غزنوی خاندان کا بانی، خراسان کے سامانی حکمران نوح کے زمانے میں سپہ سالار تھا" سیاست نامہ" کے مصنف نظام الملک طوسی لکھتے ہیں کہ وہ ایک ترک غلام تھا اور اسے احمد اسماعیل نے خریدا تھا۔ نوح کے زمانے میں اسے خراسان کی سپہ سالاری ملی۔ چنانچہ بادشاہ عبدالملک اول کے دور حکومت میں، اختیارات کی اصل باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اسے دارالحکومت سے دور کرنے کے لئے بادشاہ نے ذی الحجۃ ۳۴۹ھ/فروری ۹۶۱ء میں خراسان کا حاکم مقرر کر دیا۔ شاہ منصور ابن نوح نے اسے اپنے عہدے سے برطرف کر دیا تو وہ بلخ کی طرف ہٹ آیا۔ ربیع الاول ۳۵۱ھ/ مئی ۹۶۲ء میں اسے سامانی لشکر کو شکست دی اور خود غزنہ چلا گیا۔ اس نے یہاں کے حکمران کو معزول کر کے ایک خود مختار شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی۔

الپتگین ایک اچھا حوصلہ مند اور جری حکمران تھا۔ طوسی نے اپنی کتاب میں اسے بے مثل حکمران ظاہر کیا ہے۔ اس کے دور حکومت کی ایک مثال بہت مشہور ہے۔ جس میں اس نے یہ حکم نافذ کر دیا کہ کسی کو بغیر قیمت ادا کئے کوئی چیز نہیں لینی چاہیئے۔ ورنہ اسے سزا دی جائیگی

الپتگین کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق ابراہیم سامانیوں ہی کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد فوجی سردار بلکاتگین اور پری تگین وغیرہ تخت نشین ہوئے اور آخر میں الپتگین کے داماد سبکتگین کو شعبان ۳۶۶ھ/اپریل ۹۷۷ء میں تخت نشین کر دیا گیا۔

التمش (وفات ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء) شمس الدنیا والدین، ابوالمظفر ہندوستان میں خاندان غلاماں کا دوسرا حکمران، قطب الدین ایبک کا داماد اور جانشین، ترکستان میں قبیلہ البری کے رئیس ایل خاں کے ہاں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں بردہ فروشوں نے پکڑ کر بخارا میں صدر جہاں کے اقربا کے پاس فروخت کر دیا۔ چنانچہ ابتدائی تربیت وہیں ہوئی وہاں سے ایک شخص جمال الدین جست قبا نے اسے خرید کر ایک لاکھ جیتل میں سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ سلطان نے بیٹوں کی طرح پرورش کی اور اپنا داماد بنایا۔ گوالیار کی تسخیر کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ بعد ازاں بدایوں کا مالک بنا دیا۔

التمش نے اکثر معرکوں میں شجاعت و مردانگی، فراست اور فرزانگی کا ثبوت دیا۔ بارہا قطب الدین کے ہمرکاب دلیری و بہادری کے کارنامے دکھائے۔ بالآخر سلطان نے اسے امیر الامرا بنا دیا۔ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں ایبک ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ التمش بدستور بدایوں کا حاکم رہا۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں ایبک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ایک نااہل حکمران ثابت ہوا۔ سپہ سالار امیر اسماعیل اور دوسرے ارکان حکومت کی ترغیب پر التمش بدایوں سے دہلی پہنچا اور ۶۰۸ھ/۱۲۱۲ء میں تخت نشین ہو گیا۔

حاکم سندھ ناصر الدین قباچہ اور حاکم غزنہ تاج الدین یلدوز بغاوت پر تل چکے تھے جب خوارزم شاہ نے غزنہ پر قبضہ کیا تو یلدوز وہاں سے نکل کر پنجاب آیا اور ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں قباچہ کو شکست دے کر یہاں کا حاکم بن بیٹھا۔ یہاں سے اس نے دہلی کی طرف پیشقدمی کی مگر التمش سے شکست کھائی اور قید ہوا۔ ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء میں قباچہ نے بھی صلح کر لی۔ اس کے بعد التمش نے بنگال کے حاکم غیاث الدین عوض کو شکست دی اور اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے انتقال کے بعد عوض کا بیٹا حسام الدین خلجی حاکم بنگال بن بیٹھا۔ اس کی بغاوت فرو کرنے کے بعد التمش نے علاء الدین جانی کو حاکم بنایا اور ۱۲۲۰ء میں دہلی پہنچا۔

۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں التمش نے ریاست رنتھمبور کو فتح کیا۔ اس کے بعد [illegible] اوچ، گوالیار اور بنوں پر فوج کشی کی۔ دہلی واپس ہونے پر التمش بیمار ہوا اور اسی مرض [illegible] راہیِ ملک عدم ہوا۔ اس کا مزار مسجد قوت الاسلام دہلی میں موجود ہے۔

شمس الدین التمش ہندوستان کا پہلا مستقل حکمران تھا۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے مختلف ریاستوں کو ملا کر مملکت واحدہ کا تصور پیدا کیا۔ علم نوازی، تعمیرات، حسن انتظام اور رعایا پروری کے لحاظ سے اس نے اپنے ملک کو قابل فخر بنا دیا۔ بے شمار اہل علم و فضل اس کے دربار میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

التمش کا مقام اولیاء و اصفیاء کی صف میں خاصا بلند ہے۔ [illegible] ہے کہ اگرچہ بظاہر بادشاہی سے تعلق تھا۔ مگر دل سے وہ فقیر درست تھا۔ کم کھاتا، [illegible] راتوں کو عموماً بیدار رہتا۔ غلاموں اور نوکروں میں سے کسی کو کسی کام سے [illegible] گدڑی پہن کر رات کی تاریکی میں شہر کے اندر پھرتا۔ علما، صلحا اور صوفیا کی خدمت اپنے لئے باعث شرف سمجھتا۔ کتاب "طبقات ناصری" کے بیان کے مطابق التمش نے [illegible] مقابلے میں کردڑ بخشنے کا طریقہ جاری کیا ہوا تھا۔ نہایت عادل [illegible] حکمران تھا۔

التحریم، سورۃ قرآن مجید کی ۶۶ ویں سورت۔ [illegible] دو رکوع اور بارہ آیات [illegible] نام التحریم اس واقعہ سے لیا گیا ہے، جو آنحضرت [illegible] آیا یعنی واقعہ ایلاء۔ جس میں آپ نے ازواج مطہرات کے رویے [illegible] ناراضگی اختیار کر لی تھی۔ اس سورت کا نزول سنہ ۷ یا ۸ھ کے دوران [illegible] وقت ہوا تھا۔

سورت کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے "اے نبی! تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ تعالےٰ نے تمہارے لئے حلال کی ہے؟" اس کے بعد اس موضوع کو بیان کیا ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ عام انسان تو درکنار، خود اللہ کے نبیؐ کو بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ نبی کے اسوۂ حسنہ میں کوئی ایسی بات شامل نہ ہونے پائے۔ جو

Marfat.com

منشاء الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین بے لاگ ہے۔ یعنی ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے، جس کا وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔

التغابن، سورۃ قرآن مجید کی ۶۴ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۱۸ آیات ہیں۔ تغابن کے معنی کمی ظاہر ہونے کے ہیں، جو اعمال کے سلسلے میں انسان سے ہوگی۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس اور عطا بن یسار کہتے ہیں کہ پہلی تیرہ آیات مکی ہیں اور باقی پانچ مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مگر مفسرین کی اکثریت اسے مدنی قرار دیتی ہے۔

اس سورت کی پہلی چار آیات میں تمام انسانوں سے مخاطب ہو کر بتایا گیا ہے۔ اللہ ہی اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے۔ تمام اشیا اسی کی تسبیح کر رہی ہیں اسی نے تمھیں پیدا کیا۔ تمھاری صورت بنائی۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہوا اور کوئی مومن اور آخری وقت تمھیں وہیں پلٹنا ہے۔ اگلی چھ آیات میں ان لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے، جو قرآن کی دعوت نہیں مانتے اور اس کے بعد آخری آیات میں ان لوگوں سے خطاب ہے، جو اس دعوت کو مانتے ہیں۔ انھیں یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ دنیا کی ہر مصیبت اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ جو ثابت قدم رہتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے۔ نیز مومن کے لیے اس کا مال اور اس کے اہل و عیال ایک بہت بڑی آزمائش ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر انھی کی محبت انسان کو ایمان و اطاعت کی راہ سے منحرف کرتی ہے اس لیے اہل ایمان کو اپنے اہل و عیال سے ہوشیار رہنا چاہیے اور اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی راہ پر مال و دولت کو صرف کرنا چاہیے۔

التکاثر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۲ ویں سورت، اس میں کل آٹھ آیات ہیں۔ پہلی آیت کے لفظ تکاثر سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔ تمام مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کثرت مال و دولت کی خواہش اور ترغیب انسان کو اصل مقصد زندگی سے غافل رکھتی ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابو بریدہ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورت انصار کے دو قبیلوں بنی حارثہ اور بنی حرث کے بارے میں نازل ہوئی۔ دونوں قبیلوں نے ایک دوسرے کے مقابلے میں پہلے اپنے زندہ آدمیوں کی بڑائی بیان کی پھر قبرستان جا کر اپنے مرے ہوئے لوگوں کی بڑائی بیان کی۔ اس پر یہ ارشاد الٰہی نازل ہوا۔ مولانا مودودی کی رائے میں یہ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے فعل پر یہ سورۃ چسپاں کی گئی ہو۔

اس سورت میں لوگوں کو دنیا پرستی کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک زیادہ سے زیادہ جاہ و حشم حاصل کرنے، اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور ان پر فخر کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور انھیں علم نہیں، کہ وہ غفلت میں ہیں اور ایک نہ ایک روز ان نعمتوں کے بارے میں ضرور جواب طلبی کی جائے گی۔

التکویر، سورۃ قرآن مجید کی ۸۱ ویں سورت۔ اس میں ۲۹ آیات ہیں اور اس میں قیام مذاہب کی صف لپیٹنے کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کا نام التکویر ہے یہ سورت ابتدائی مکی زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے دو موضوع ہیں۔ آخرت اور رسالت پہلی چھ آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب سورج بے نور ہو جائے گا، جب تارے بکھر جائیں گے، جب پہاڑ اکھڑنے لگیں گے اور جب لوگوں کو اپنے مال و متاع کا ہوش نہیں رہے گا۔ جنگلوں کے بدحواس جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر بھڑک اٹھیں گے۔ پھر سات آیات میں دوسرے مرحلے کا ذکر ہے، جب روحیں از سرِ نو جسموں کے ساتھ جوڑ دی جائیں گی۔ نامۂ اعمال کھول دیئے جائیں گے۔ جرائم کی بازپرس ہوگی۔ آسمان کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور دوزخ جنت سب چیزیں نگاہوں کے سامنے عیاں ہو جائیں گی۔ اس وقت ہر انسان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ اس کے بعد رسالت کا مضمون بیان ہوا ہے۔ اس میں اہل مکہ کو کہا گیا ہے کہ تمھارے یہ رفیق (محمد صلعم) مجنوں نہیں اور نہ یہ کوئی بے پر ہانکتے ہیں۔ نہ کسی شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے۔ بلکہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے بزرگ پیغامبر کا بیان ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ پھر یہ لوگ کیوں نہیں سنتے؟ اور اس پیغام سے منہ موڑ کر کدھر چلے جا رہے ہیں۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔

التوبہ، سورۃ قرآن مجید کی نویں سورت۔ یہ البراءۃ کے نام سے بھی مشہور ہے اس میں کل ۱۶ رکوع اور ۱۲۹ آیات ہیں۔ البراۃ کا لفظ پہلی آیت میں ہے توبہ اس لحاظ سے کہ اس میں ایک جگہ بعض اہل ایمان کے قصوروں کی معافی کا ذکر ہے اور براۃ اس لحاظ سے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے یہ وہ سورت ہے جس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی۔ امام رازی کے بقول خود آنحضورؐ نے بسم اللہ نہیں لکھوائی تھی۔ اس کا زمانۂ نزول ۹ھ کے لگ بھگ ہے۔ اس میں پہلے پانچ رکوع حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر کر کے روانہ کرنے کے بعد نازل ہوئے۔ اگلے چار رکوع غزوہ تبوک کی تیاری کے وقت نازل ہوئے اور باقی آیات غزوہ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئیں۔ گویا پہلے پانچ رکوع سب سے بعد میں نازل ہوئے وہ امور جن کے پیش نظر سورۂ توبہ نازل ہوئی یہ تھے۔

۱۔ چونکہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ مخالف قوتوں اور قدیم نظام کا خاتمہ کر دیا جائے اور رسوم جاہلیت کا قلع قمع کیا جائے۔

۲۔ ہمسایہ ممالک کو دین حق کی دعوت دینا اور انھیں پرچم اسلام تلے لانا ضروری ہو چکا تھا۔

۳۔ داخلی امور پر توجہ دی جانا ضروری تھی۔ تاکہ منافقین کی بیخ کنی کی جائے۔ اسی لیے آنحضورؐ نے غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانے میں سویلم کے گھر میں آگ لگوا دی۔ جہاں یہ لوگ جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور اسی پالیسی کے تحت تبوک سے واپسی کے بعد مسجد ضرار کو ڈھانے اور جلانے کا حکم دیا۔

۴۔ مسلمانوں میں عزم صمیم بیدار کرنا اور کفر و اسلام کی کشمکش میں انھیں اسلام کے لیے جان و مال فدا کرنے کے لیے پرجوش بنانا۔

جیسا کہ اس سورت کے نام البراءۃ سے ظاہر ہے۔ پہلے رکوع میں کفار کی شرارتوں کا سدباب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان سے علیحدگی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بار بار کی عہد شکنی تھی۔ دوسرے رکوع میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کے ساتھ ابھی جنگ ہونے والی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیا تھا۔ تیسرے رکوع میں بتایا کہ مسلمانوں کو اسلام کی خاطر مالی و جانی قربانیاں دینا چاہئیں۔ چوتھے رکوع میں بتایا کہ اپنی کثرت پر کبھی ناز نہ کرنا۔ تمھیں صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت کامیاب کر رہی ہے۔ نیز فرمایا کہ مشرکوں کو خانہ کعبہ کے قریب نہ آنے دو۔ پانچویں رکوع میں اہل کتاب کی اسلام کے خلاف کوششوں کا ذکر کر کے مسلمانوں

Marfat.com

کے آخری غلبہ کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ چھٹے رکوع میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے۔ ساتویں میں منافقین کے پیچھے رہ جانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اسلام کو تباہ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آٹھویں رکوع میں منافقوں کی ایذا رسانی اور نویں میں نفاق کا انجام ناکامی بیان کیا گیا ہے۔ دسویں میں منافقوں سے جہاد کا اور گیارہویں میں ان سے کامل قطع تعلق کا حکم ہے۔ بارہویں اور تیرہویں میں منافقوں اور ان کے گروہوں کا ذکر کرکے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو دوہرا عذاب ملے گا۔ یہیں مسجد ضرار کا ذکر ہے۔ چودھویں اور پندرھویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ مومنوں کا خدا کے ساتھ کیا عہد ہے اور انھوں نے اپنی خدمات کو کس طرح سے انجام دینا ہے کہ آنحضورؐ دنیا کو گناہ اور ہلاکت سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ اسی پر سورت کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

التین، سورۃ قرآن مجید کی ۹۵ ویں سورت۔ اس میں آٹھ آیات ہیں۔ اس میں انجیر، زیتون، طور سینا اور امین کے شہر کو گواہ ٹھہرا کر انسان کو بہترین صورت پر پیدا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ اس کا موضوع جزا و سزا ہے۔ یہاں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو بہترین نمونے پر پیدا کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر نبوت جیسے بلند ترین منصب کے حامل لوگ پیدا ہوئے۔ یہ چیز کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں۔ پھر بتایا گیا کہ اچھے انسانوں میں کچھ برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو انسان اخلاقی پستی میں گر کر جانوروں سے بھی نیچ ہو گیا ہے۔ مگر وہ جو نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ مخلوق میں بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔ یہ خدا کا انصاف ہے اور وہ سب سے بڑا حاکم ہے۔

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی سورہ التین پڑھے اور آخری آیت کے اختتام پر پہنچے تو کہے بلیٰ وانا علیٰ ذٰلک من الشٰھدین۔ (ہاں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔)

الجاثیہ، سورۃ قرآن مجید کی ۴۵ ویں سورت، اس میں کل چار رکوع اور ۳۷ آیات ہیں۔ اس میں توحید و آخرت کے متعلق کفار مکہ کے شبہات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ سورت مکہ کے درمیانی دور میں نازل ہوئی تھی۔

سورت کے آغاز میں زمین و آسمان کی بے شمار نشانیوں کی طرف اشارہ کرکے بتایا گیا ہے کہ تم جدھر بھی نگاہ ڈالو گے، ہر چیز اسی کی توحید کی شہادت دے رہی ہوگی۔ اس ساری کائنات کو بنانے والا وہی اکیلا فرمانروا ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی خدمت میں آنے والی تمام اشیا اسی خدا کی نعمتیں ہیں اگر انسان عقل سے کام لے تو یقیناً پکار اٹھے کہ یہی خدا انسان کا محسن ہے۔ اس کے بعد کفار مکہ کو ان کی ہٹ دھرمی پر ملامت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل کی مثال دی گئی ہے کہ انھوں نے کلام الٰہی کی قدر نہ کی۔ تو یہ دولت ان سے چھن گئی پھر عقیدۂ آخرت سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ محض گمان ہے کہ انسان دوبارہ زندہ نہیں ہوگا۔ انکار آخرت ان لوگوں کے لیے تباہ کن ہے اور یہ لوگ گمراہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ

ان کے اعمال ان کے سامنے آچکے ہیں۔

الجایتو خدابندہ (وفات ۲۸ رجب ۷۱۶ھ / ۲۶ دسمبر ۱۳۱۶ء) ایران کا آٹھواں ایل خانی حکمران، ارغون خان کا پوتا تھا۔ چوبیس برس کی عمر میں ۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کا نام خربندہ تھا اور مذہباً عیسائی تھا۔ بعد ازاں مسلمان ہوا اور محمد خدابندہ نام رکھا۔ یہ غازان کا جانشین تھا۔ اس کی طرح اس نے بھی یورپ کی عیسائی سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار رکھے پہلے اس کا میلان شیعوں کی طرف تھا۔ بعد ازاں اس نے سنی مسلک اختیار کر لیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بعد میں شیعہ ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ علمی ادبی مشاغل کی قدر دانی کرتا تھا۔ تیرہ سال حکومت کرنے کے بعد فوت ہوا اور سلطانیہ میں مدفون ہوا۔ جسے اس نے پایۂ تخت بنا رکھا تھا۔ اس کا بیٹا ابوسعید آخری ایل خانی حکمران ثابت ہوا۔

الجزائر شمالی افریقہ میں موجود اسلامی ملک۔ جس کے شمال میں بحر روم، مشرق میں تیونس، جنوب میں نائیجیریا اور مالی اور مغرب میں مراکش واقع ہیں جنوب کا زیادہ تر علاقہ صحرا پر مشتمل ہے۔ کل رقبہ ۹۶۵، ۰۰، ۸ مربع میل (۲۲، ۲۲، ۱۶۴ مربع کلومیٹر) ہے۔ آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۰۰۰، ۳۴۶، ۱۴ تھی۔ سب سے بڑا شہر اور صدر مقام الجزیرہ ہے۔ زبان عربی ہے۔

تاریخ:- سولھویں صدی عیسوی میں اس علاقے پر ترکوں کی حکمرانی تھی۔ مسلمان یہاں ساتویں صدی عیسوی / پہلی صدی ہجری میں پہنچے تھے۔ ترکوں کے قبضے سے ایک صدی پہلے یہاں الموحدون کی حکومت تھی۔ ترکوں کی طرف سے یہاں پاشا حاکم مقرر ہوتے رہے۔ ان کے بعد آغا اور ڈے منتخب ہوتے جو تین تین سال تک حکومت کرتے تھے۔ ترکوں کو الجزائر کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور نظم و نسق کی درستی کا موقع نہ مل سکا۔ ہسپانیہ نے کئی بار اس پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ۱۸۱۶ء میں فرانس نے الجزائر پر پہلا حملہ کیا۔ ۱۸۳۰ء میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ سید محی الدین الحسنی نے مختلف ریاستوں کو باہم ملانے کی کوشش کی اور فرانس کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اس تحریک کو ان کے فرزند امیر عبدالقادر نے ۱۸۴۷ء تک سنبھالے رکھا۔ فرانس نے سازشوں کے ذریعے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور امیر عبدالقادر کو فرانس میں نظربند کر دیا گیا۔ جسے ۱۸۵۲ء میں نپولین سوم نے رہا کیا۔

اس زمانے میں الجزائر کی آبادی نصف لاکھ سے بھی کم تھی۔ حکومت فرانس نے یہاں آبادکاری کا سلسلہ شروع کیا۔ نیز مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کیں۔ اس

Marfat.com

الجزائر کے صدر مقام الجزیرہ کا ایک منظر

اثنار میں بھی مسلمانوں نے علم جہاد سرنگوں نہ ہونے دیا۔ ان کی تحریک آزادی برقرار رہی۔ جس کے دباؤ میں آکر حکومت فرانس نے الجزائر کو نظم ونسق کی داخلی خودمختاری دے دی۔ اگرچہ اس کی براہ راست باگ ڈور حکومت فرانس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ۱۸۶۵ء کے فیصلے کی رُو سے مسلمانوں کو فرانسیسی قومیت اختیار کرنے کا حق مل گیا۔ ۱۸۰۰ء میں شہر الجزائر کی پنچایت نے انقلابی سلطنت قائم کرلی اور مکمل مالی اور انتظامی آزادی ۱۹۰۰ء میں حاصل کرلی۔ ۱۹۳۹ء ۔ ۱۹۴۵ء کی جنگ میں الجزائر نے نمایاں حصہ لیا۔ یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو محاذ حریت وطنی نے فرانسیسی حکومت کے خلاف علانیہ جنگ شروع کردی ستمبر ۱۹۵۸ء میں قاہرہ میں آزاد الجزائر حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۶۲ء کو فرانسیسی اور آزاد حکومت کے مابین بات چیت شروع ہوئی۔ ۷ اپریل ۱۹۶۲ء کو عبدالرحمان فارس کی صدارت میں ایک عارضی حکومت قائم ہوئی اور اس کے حق میں استصواب کرایا گیا۔ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو صدر ڈیگال نے الجزائر کی آزادی کا اعلان کردیا۔ ۲۵ ستمبر کو مجلس ملی کے اجلاس میں فرحت عباس کو صدر اور بن بیلا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں بن بیلا کو صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کی فوجی بغاوت کے بعد کرنل محی الدین (بومدین) نئی حکومت کے سربراہ مقرر ہوئے۔

جغرافیائی اور اقتصادی معلومات:۔ الجزائر میں سفید بربر نسل کے لوگ بستے ہیں۔ کچھ ترک اور کچھ عرب ہیں۔ فرانسیسی آبادکار بھی یہیں بس گئے ہیں۔ یہاں مالکی فقہ رائج ہے۔ جس کا اپنا سلسلہ تصوف ہے۔ اسلام الجزائر کی معاشرتی زندگی کے اندر سرایت کرگیا ہے۔ زیادہ تر لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تل کے زرخیز میدانوں میں کہیں کہیں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ تین چوتھائی سرزمین میں گیہوں کی فصل اور زیتون کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں کھجور اور انجیر کے درخت بھی وافر تعداد میں ملتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر گیہوں، جو، جوار، آلو، تمباکو، کھجور، انگور، نارنگیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ چراگاہوں میں مویشی پالے جاتے ہیں۔ ملک کی برآمدات میں مٹی کا تیل اور کھجور ہیں۔ زیادہ تر تجارت فرانس، مغربی جرمنی، امریکا، اٹلی اور روس سے ہوتی ہے۔ ملک کے شمالی حصے میں ریلیں اور سڑکیں موجود ہیں۔ تیل، گیس، برقی اشیا اور فولاد کی صنعتیں قائم ہیں۔ ان تمام ذرائع کی بنا پر الجزائر ایک خوشحال ملک گنا جاسکتا ہے

الجمعہ، سورۃ قرآن مجید کی ۶۲ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور گیارہ آیات ہیں یہ سورت ھ کے قریب مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں نماز جمعہ کے احکامات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس سورت کے دونوں رکوع الگ الگ زمانوں میں نازل ہوئے۔ اس لیے ان کے مضامین بھی الگ الگ ہیں۔ پہلے رکوع میں یہودیوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ انھوں نے اس رسولؐ کو ماننے سے انکار کردیا ہے۔ انھوں نے تورات کے احکامات پر عمل نہ کیا اور آیات الٰہی کو جھٹلاتے رہے۔ اگر وہ واقعی اللہ کی چہیتی قوم ہے تو انھیں یقین ہوتا کہ اللہ کے ہاں بڑی عزت اور قدر ومنزلت کا مقام محفوظ ہے۔ یہ لوگ اپنے کرتوتوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوں گے۔ دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے سبت کے مقابلے میں مسلمانوں کو جمعہ کا دن عطا فرمایا اور یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں، جو یہودیوں نے سبت کے ساتھ کیا تھا۔

الجن، سورۃ قرآن مجید کی ۷۲ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۲۸ آیات ہیں۔ اس میں جنوں کا ذکر آتا ہے، جنھوں نے مکہ میں آنحضورؐ سے قرآن سنا اور پھر اپنے لوگوں میں جاکر اس کی تبلیغ کی۔ اس سورت کا زمانہ نزول آنحضورؐ کے سفر طائف سے تعلق رکھتا ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ بازار عکاظ تشریف لے جارہے تھے کہ راستے میں نخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی۔ اس وقت جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔ مزید روایات میں یہ مذکور ہے کہ آنحضورؐ سفر طائف کے بعد نخلہ میں ٹھہرے تھے۔

سورت کا موضوع جنوں کے قرآن سننے سے بحث کرتا ہے۔ ان کے ایک گروہ نے اسے غور سے سنا اور پھر کہا "ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے۔ جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔" ان لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ آسمان سے ہدایات ملنا بند ہوگئی ہیں اور وہ کوئی آسمانی خبر نہیں پارہے تو اس کی تلاش میں نکلے اور جب ہدایت سنی تو ایمان لے آئے۔ اس کے بعد آیت ۱۶ سے ۱۸ میں کہا گیا ہے کہ لوگ شرک سے باز آجائیں اور صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں تو ان پر اللہ کی نعمتوں کی بارش ہوگی۔

Marfat.com

ورنہ اللہ کی بھیجی ہوئی نصیحت سے منہ موڑنے کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت عذاب سے دوچار ہوں گے۔ پھر آیت ۱۹ سے ۲۴ تک کفار کو اس بات پر ملامت کی گئی ہے کہ جب اللہ کا رسولؐ دعوت کی آواز بلند کرتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں حالانکہ رسولؐ کا کام صرف اللہ کے پیغامات پہنچا دینا ہے۔ اگلی دو آیات میں کفار کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آج وہ رسولؐ کو بے یار و مددگار دیکھ کر اسے دبا لینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب انھیں علم ہو جائے گا کہ حقیقت میں بے یار و مددگار کون ہے۔ اس وقت کا رسولؐ کو بھی علم نہیں مگر وہ وقت ضرور آئے گا۔ آخر میں اللہ کے عالم الغیب ہونے کا ذکر ہے۔ وہ اپنے غیب سے کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ سوائے اس رسولؐ کے جسے اس نے منتخب کر لیا ہو۔ رسول بھی اللہ کے حکم سے سرمو اختلاف نہیں کرتا۔

الحاد

انحراف، کج روی، گمراہی، سیدھی بات سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرنا اگر تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کی بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں اسے الحد السہم الہدف کہتے ہیں۔

عام طور پر الحاد کے معنی کفر کے لئے جاتے ہیں۔ جبکہ الحاد وسط سے ہٹ جانے شدت اختیار کرنے اور منحرف ہونے کو کہتے ہیں اور یہ سب کچھ کفر کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ (دیکھئے "کفر") قرآن مجید میں سورۃ حٰم السجدہ میں بیان ہوتا ہے:

"جو لوگ ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں، وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں۔۔۔۔" (۴۱ : ۴۰) اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص آیات الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب نہ لے اور مختلف غلط معنی انھیں پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے وہ الحاد کا مرتکب ہوتا ہے۔ کفار مکہ قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لئے جو چالیں چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات میں تحریف و تعریف کرتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے۔ یہ لوگ ملحد اور مشرک تھے اور ہر معاملے میں راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ کی ذات کے ساتھ بھی الحاد کرتے تھے ان کے بارے میں قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے۔ اسے اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں الحاد کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔" (۷ : ۱۸۰)

خدا کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ خدا کو ایسے نام دیئے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، یا جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں یا جن سے اس کی ذات اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔ نیز مخلوقات میں سے کسی کا ایسا نام رکھنا جو صرف خدا کے لئے ہی موزوں ہو، الحاد ہی کہلائے گا۔ (نیز دیکھیے "شرک"، "کفر")

الحاقّہ، سورۃ

قرآن مجید کی ۶۹ ویں سورت، مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ اس میں دو رکوع اور باون آیات ہیں۔ اس کے نام میں اشارہ اس طرف ہے جو کچھ بدی کا اور اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق کا نتیجہ ہے، وہ کسی صورت میں نہیں ٹل سکتا۔ یہ وہ دور تھا جب کفار کی مخالفت نے اتنی شدت اختیار نہیں کی تھی۔

پہلے رکوع کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ قیامت کا آنا اور آخرت کا برپا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو ضرور پیش آئے گی اور جن قوموں نے بھی آخرت کا انکار کیا وہ بالآخر خدا کے عذاب کی مستحق ہو کر رہیں۔ دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کسی شاعر اور ساحر کا کلام نہیں یہ منجانب اللہ ہے اور رسول کو یہ طاقت نہیں کہ وہ اس کلام میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی گھٹائے یا بڑھائے۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ بھی سزا سے نہیں بچ سکے گا۔

الحج، سورۃ

قرآن پاک کی ۲۲ ویں سورت، اس میں دس رکوع اور ۷۸ آیات ہیں۔ اس میں حج کا موضوع بیان ہوا ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ مفسرین میں نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔ مولانا مودودی کے نزدیک اس کا ابتدائی حصہ مکہ میں ہجرت سے کچھ پہلے نازل ہوا اور ۲۵ ویں آیت سے آگے مدینہ میں نازل ہوئی۔

ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ حق کی مخالفت کرنے والی قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ نیز حق کی فتح یقینی ہے اور کوئی دنیا کی طاقت اس کی نصرت کو نہیں روک سکتی۔ اس کے تیسرے رکوع میں ان مسلمانوں کے اچھے انجام کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے۔ اس کے چوتھے رکوع میں فرضیت حج کا ذکر ہے۔ اگلے رکوع میں قربانی کی اصل غرض بتائی گئی ہے۔ چھٹے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ مالی قربانیوں کے ساتھ جان کی قربانی بھی دی جائے۔ کیونکہ اب اس کا وقت آ چکا ہے۔ اگلے رکوعات میں حق کے دشمنوں کو ان کے انجام سے باخبر کیا گیا ہے اور مومنوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی سب قوموں کو توحید کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ دین بھی اسی کی تعلیم دیتا ہے۔ نیز شرک کی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کو انجام خیر کی بشارت دی گئی ہے اور ساتھ ہی سمجھایا گیا ہے کہ کامیابی کا انحصار اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور لگانے پر ہے۔

الحجر، سورۃ

قرآن مجید کی ۱۵ ویں سورت۔ مکہ میں آخری زمانہ میں نازل ہوئی اس میں چھ رکوع اور ننانوے آیات ہیں۔

حجر کے معنی پتھر کے ہیں۔ اس سورت میں اس قوم کا ذکر ہے، جو مکہ کے قریب الحجر کی وادی میں رہتی تھی۔ الٓرا مجموعہ کی سورتوں میں اس کا چھٹا نمبر ہے اس سورت میں ایک تو ان لوگوں کو تنبیہہ کی گئی ہے جو آنحضرتؐ کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپ کی راہ میں طرح طرح سے مزاحم ہو رہے تھے۔ دوسری طرف آنحضورؐ کی تسلی اور ہمت افزائی بھی کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں قرآن کی ابدی حفاظت کا ذکر ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا ہے کہ شیاطین اس کو نابود نہیں کر سکتے۔ اگلے رکوعات میں بتایا گیا ہے کہ انسان شیطان کے پیچھے لگ کر زندگی کے مقصد کے حصول میں ناکام رہتا ہے اور متقی لوگ کامیاب رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی لوطؑ اور شعیبؑ کی قوموں اور قوم ثمود کی تباہی اور بربادی کا ذکر کر کے اسلام کے مخالفوں کو ڈرایا گیا ہے۔

الحجرات، سورۃ

قرآن پاک کی ۴۹ ویں سورت، اس میں دو رکوع اور اٹھارہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔ چوتھی آیت میں الحجرات کا لفظ آیا ہے اور یہی اس کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت میں مسلمانوں کو آداب سکھائے گئے ہیں جو انھیں اللہ اور رسولؐ کے معاملے میں ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ نیز ہدایت کی گئی ہے کہ ہر قسم کی افواہوں پر یقین نہ کر لینا چاہیے۔ اگر کسی فرد یا قوم کے بارے میں کوئی اطلاع ملے تو اس کی اچھی طرح سے تحقیق کرنی چاہیے، اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں جھگڑا ہو جائے تو مسلمان من حیث الجماعت ان میں اصلاح کی کوشش کریں اور ظالم گروہ کے خلاف جنگ تک کرنے کے لئے

Marfat.com

تیار رہیں۔ پھر مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ باتیں جو اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں اور آپس کے تعلقات کو بگاڑتی ہیں ان سے دور رہا جائے۔ یعنی ایک دوسرے کا مذاق اڑانے اور طعن و تشنیع کرنے سے منع کیا ہے۔ اس سورت میں قومی اور نسلی امتیازات کی یہ کہہ کر کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ آخر میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کا زبانی دعوے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ جبتک کہ عمل نہ ہو۔

الحدید، سورۃ یہ قرآن مجید کی ۵۷ویں سورت ہے مدینہ میں نازل ہوئی اس میں چار رکوع اور انتیس آیات ہیں۔ اس سورت میں الحدید (لوہے) کا ذکر ہے کہ جب لوگ حق کو نیست و نابود کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو پھر انبیاء کو بھی تلوار اٹھانا پڑتی ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں مالی قربانیاں دینے کے لئے آمادہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس زمانے میں سورت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کا کفار کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ برپا تھا۔ لہٰذا حکم دیا گیا کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ کی راہ میں خوب دل کھول کر مال خرچ کیا جائے۔ نیز یہ کہ مال خرچ کرنے کی قدر و قیمت مختلف مواقع کی نزاکت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے جو لوگ جتنے زیادہ کڑے وقت میں قربانی دیتے ہیں ان کا درجہ دوسرے لوگوں سے اتنا ہی زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال تو اللہ کے ذمہ ایک قرض ہے اور یہ کہ زندگی تو چند روزہ ہے پائیدار زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس دنیا میں راحت اور مصائب جو کچھ بھی آتے ہیں وہ اللہ کے ہاں پہلے سے لکھے ہوئے فیصلے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ مصیبت میں مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے اور آرام و آسائش ملنے پر اترا نہ جائے۔

الحشر، سورۃ قرآن مجید کی ۵۹ویں سورت۔ مدینہ میں نازل ہوئی اس میں تین رکوع اور چوبیس آیات ہیں۔ اس کو سورت بنی نضیر بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سورت میں بنی نضیر کی جلاوطنی کا ذکر ہے۔ یہ ان کی ریشہ دوانیوں اور شرارتوں کی سزا تھی جو وہ مختلف اوقات میں مسلمانوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ ابتدائی آیات میں لوگوں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ یہود کا ایک بڑا قبیلہ جس کی افرادی قوت مسلمانوں جتنی تھی اور جنگی سامان کی بھی ان کے پاس کوئی کمی نہ تھی چند روز کے محاصرے کی تاب نہ لا کر صدیوں کی آباد کی ہوئی بستی بغیر حزن ملال کے چھوڑ کر چلے جانے پر آمادہ ہو گیا اور یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ اور اسکے رسول سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

بعد کی آیات میں بتایا گیا کہ وہ زمینیں اور علاقے جو جنگ کے بعد مسلمانوں کے قبضے میں آئے ان کا کس طرح سے انتظام کیا جائے نیز منافقین کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کا مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ تھا جو انھوں نے بنی نضیر یا جنگ کے موقع پر اختیار کیا تھا۔

آخری رکوع میں بتایا گیا ہے کہ تقوےٰ اور فسق میں کیا فرق ہے اور ایمان لانے کا اصل تقاضا اور کیا اہمیت ہے۔!

الحمد، سورۃ:۔ قرآن مجید کی پہلی سورت۔ (دیکھئے "الفاتحہ، سورۃ")

الحمد للہ "اللہ کی تعریف ہے" یعنی تعریف کی مستحق صرف ذات الٰہی ہے۔ سورۃ فاتحہ کا آغاز انھی الفاظ سے ہوتا ہے۔ حمد وہ تعریف ہے، جو فضیلت کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ یعنی ان خوبیوں کی وجہ سے جو دوسرے کو مسخر کر لیتی ہیں۔ کسی کی تعریف دو وجوہ سے کی جاتی ہے ایک یہ کہ اس میں بجائے خود حسن و خوبی اور کمال ہو دوسرے یہ کہ وہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعتراف نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیوں کا ذکر کریں۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں حیثیتوں میں صاحب تعریف ہے۔ مسلمان جب کبھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہے خواہ وہ کھانے کے بعد ہو یا کسی کام کے اختتام پر ہو تو الحمد للہ کے الفاظ ہی استعمال کرتا ہے۔

الحمد کی تین قسمیں ہیں ۱۔ حمد قولی:۔ زبان سے شکر ادا کرنا۔

۲۔ حمد فعلی:۔ جسم کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرنا۔ جیسے نماز، روزہ۔

۳۔ حمد حالی:۔ اللہ کی تعریف خلوص دل اور سچی روح کے ساتھ۔

الحمراء غرناطہ (سپین) میں اسلامی تمدن کی یادگار عمارت، جس میں سرخ رنگ کا ایک قلعہ اور ایک محل اب تک ایستادہ ہیں۔ قلعہ کا ذکر پہلے امیر اندلس عبداللہ کے عہد (۲۷۷ھ/۸۹۰ء) میں ملتا ہے۔ محل کی تعمیر ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں محمد بن الاحمر نے شروع کرائی۔ اس کے اخلاف نے اس میں وسعت دی۔ چنانچہ ابو عبداللہ محمد (۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء)، ابو الحجاج یوسف اول (۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء)، اور محمد خامس (۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء) اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً یوسف اول نے اس کی آرائش و تزئین پر کروڑوں روپے خرچ کیئے۔

۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں جب اندلس سے اسلامی تہذیب کی صف لپیٹ دی گئی اور الحمراء عیسائیوں کے قبضے میں آیا تو انہوں نے اس کے قیمتی نوادر یا تو چوری کر لیئے یا انہیں جلا دیا۔ منقش دیواروں پر سفیدی کرا دی گئی اور بہت سے حصوں کو منہدم کر دیا گیا۔ چارلس پنجم (۱۵۱۶ء-۱۵۵۶ء) نے ایک حصے کو تڑوا کر وہاں اپنا محل تعمیر کرا لیا۔ ۱۸۱۲ء میں اس کے

الحمراء میں "فاعتہ السباع" کا منظر

Marfat.com

کئی مینار گرا دیئے گئے اور رہی سہی کسر ۱۸۲۱ء کے زلزلے نے پوری کر دی۔

الحمراء غرناطہ کی بیرونی سمت پہاڑی سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس کی دیواریں سرخ رنگ کی ہیں اور چکنی مٹی، چونے اور بجری سے تعمیر ہوئی ہیں۔ فن تعمیر کے لحاظ سے یہ اسلامی عہد کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اندرونی حصے میں پرتکلف نقش و نگار ہیں اور طغرائی گلکاری کی گئی ہے ان کے اوپر کتبات ہیں۔ جن میں مختلف اشعار اور آیات قرآنی درج ہیں۔

الحمراء میں داخل ہونے کے لئے باب العدل میں سے گذرنا پڑتا ہے، جسے ۷۴۹ھ / ۱۳۴۸ء میں یوسف اول نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے سامنے بائیں ہاتھ پر قلعہ کا منظر ہے اور دائیں طرف محل ہے۔ محل دو وسیع دالانوں پر مشتمل ہے۔ ایک "قاعۃ البرکت" کہلاتا ہے اس کے مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد "زکیتا" واقع ہے۔ دوسرا دالان "قاعۃ السباع" (شیروں کا صحن) ہے۔ فن کے لحاظ سے اس میں تعمیر شدہ حوض قابل ذکر ہے۔ صحن کے عین مرکز میں بارہ شیر ایک دائرے کی صورت میں ایستادہ ہیں اور ایک نلکی کے ذریعے پانی ہر ایک کے منہ سے خارج ہوتا ہے۔ اس کے قریب "ساحۃ الاختین" (دو بہنوں کا ایوان) اور "ساحۃ بنی سراج" (معتبروں کا ایوان) ہے۔ ایک طرف "ساحۃ السقف" (عدالت کا ایوان) ہے۔ محل کے جنوب میں محمد ثالث کی تعمیر کردہ ایک بڑی سی مسجد تھی۔ اس کی جگہ اب ماریا کا کلیسا تعمیر ہے۔ اگرچہ اس عمارت میں بہت سی تبدیلیاں روا رکھی گئی ہیں تاہم اسلامی عمارات میں سے اتنی قدیم عمارت کوئی نہیں جو اب تک اتنی اچھی حالت میں ہو۔ حکومت سپین نے محل کے اردگرد موجود باغ کو اور بھی زیادہ قابل دید بنا دیا ہے اور آج کل یہ ایک تفریح گاہ بنا ہوا ہے۔

الدُّخان، سورۃ قرآن مجید کی ۴۴ ویں سورت، مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں تین رکوع اور ۵۹ آیات ہیں۔ دُخان کے عام طور پر معنی دھواں کے ہیں۔ لیکن اس سورت میں اس سے مراد قحط اور خشک سالی لیا گیا ہے۔

جب قریش مکہ کی مخالفت حد سے بڑھ گئی تو آنحضرتؐ نے خدا سے دعا کی کہ حضرت یوسفؑ کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ آنحضرتؐ کا خیال تھا کہ شاید اس طرح ان کفار کو خدا یاد آئے۔ اللہ تعالے نے آپؐ کی دعا قبول کی اور پورے علاقے میں اس زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اُٹھے۔ چنانچہ قریش نے ابوسفیان کو آنحضرتؐ کی خدمت میں بھیجا اور آپؐ سے دعا کی درخواست کی کہ قوم کو اس بلا سے نجات دلائیں اس موقع پر یہ سورت نازل ہوئی۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید رسولؐ اللہ کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے نیز یہ کہ یہ ایک مبارک بات ہے کہ اللہ نے تم ہی میں سے ایک رسول اور کتاب تمہاری ہدایت کے لیے بھیجی۔ اور اب تم جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ رسول اللہ اور اس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے بالکل غلط ہے، پھر یہ کہ تم خود اللہ کو اس پوری کائنات کا خالق و مالک مانتے ہو اور زندگی اور موت کا بھی اسے ہی مختار مانتے ہو لیکن پھر بھی تم دوسروں کو معبود بناتے ہو حقیقت میں تمہارا رب ایک ہی ہے اور تمہیں اسی کی بندگی کرنی چاہیئے۔

یہ باتیں سمجھانے کے بعد قحط کے معاملے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور رسولؐ اللہ کو بتایا گیا کہ لوگ ایسی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں سے کہاں سبق لینے والے ہیں ان پر سے اب عذاب ٹل جائے گا تو ان کی گردنیں پھر پہلے کی طرح اکڑ جائیں گی اسی ضمن میں فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا کہ وہ بھی بار بار کی تنبیہہ کے بعد نہ سمجھ سکا اور آخر کار وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نمونہ عبرت بن کر رہا۔

سورت کے آخر میں آخرت کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا ایک حکیمانہ نظام ہے اور یہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں جو لوگوں سے کوئی محاسبہ ہی نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے سامنے ہر شخص جواب دہ ہے۔ نیز جو لوگ مجرم ہوں گے ان کا انجام بہت بُرا ہو گا اور جو اچھے کام کریں گے وہ کامیاب ہوں گے۔

الدّہر، سورۃ:۔ قرآن مجید کی ایک سورت (دیکھیے "الانسان، سورۃ")

الذّٰریٰت، سورۃ قرآن حکیم کی ۵۱ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ساٹھ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ ذاریات ان ہواؤں کو کہا جاتا ہے جو اڑا کر پھیلانے کا کام کرتی ہیں۔ یعنی بیج کو ایک جگہ سے اڑا کر دوسری جگہ پہنچا دیتی ہیں حق کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیلتا چلا جاتا ہے اور اس کے مخالف اسے نہیں روک سکتے۔ اس کا بڑا حصہ آخرت کے بارے میں ہے اور لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ نبیوں کی بات کو نہ ماننا اور اپنے جاہلانہ نظریات پر اڑے رہنا خود ان کے لئے تباہ کن بات ہے۔ نیز یہ کہ آخرت کے بارے میں جو کچھ نبی کہہ رہا ہے اس پر انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور نہ صرف نظام کائنات بلکہ اپنے وجود پر بھی نگاہ ڈال کر دیکھے کہ کیا اس علم کے صحیح ہونے کی شہادت ہر طرف سے دی جا رہی ہے یا نہیں۔

آخر " میں توحید کی دعوت دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں دوسروں کی بندگی کے لیئے پیدا نہیں کیا بلکہ اپنی بندگی کے پیدا کیا ہے۔ اور وہی اکیلا رب تمہارا رزاق ہے اس سلسلہ بیان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ اپنے انبیاء کا مقابلہ کسی معقول بنیاد اور حقائق پہ نہیں کرتے بلکہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی نبی اکرم کو کہا گیا ہے کہ ان جاہلوں سے التفات نہ کریں اور اپنی دعوت دیئے جائیں اور اگر نہ مانے تو ان کے حصہ کا عذاب بھی تیار ہے۔

الرّازی، فخر الدین:۔ مشہور مسلمان مفکر اور عالم (دیکھیے "رازی، فخر الدین، امام")

الرّازی، محمد بن زکریا:۔ مشہور مسلمان سائنسدان (دیکھیے "رازی، محمد بن زکریا")

الرّعد، سورۃ قرآن مجید کی ۱۳ ویں سورت جس میں چھ رکوع اور ۴۳ آیات ہیں۔ یہ الرٰا مجموعے کی چوتھی سورت ہے۔ سورت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ جب کہ آپ کے خلاف منصوبے ترقی پر تھے۔ لیکن آیت ۴۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی کامیابی اب دور دور تک ہونے لگی تھی۔ غالباً مدینہ میں اسلام پھیل جانے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے اکثر مفسرین نے اسے مدنی لکھا ہے۔ رسولؐ اللہ کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ایک مدت گذر چکی تھی اور مخالفین آپؐ کو طرح طرح کی تکالیف دینے اور آپؐ کے مشن کو ناکام کرنے کے لیئے طرح طرح کی چالیں چلتے رہے اور مسلمانوں کی دلی خواہش ہے کہ کاش کوئی ایسا معجزہ ہی انہیں دکھا دیا جائے تاکہ ان کے دل اس سے متأثر ہو جائیں اور یہ اسلام کو قبول کر لیں۔ اللہ تعالے نے مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ ہمارا یہ طریق کار نہیں اور اگر حق کے ان دشمنوں کی رسی دراز ہوتی ہے تو تمہارا یہ کام نہیں کہ تم اس بات سے گھبرا اٹھو۔ اس سورت کا مدعا شروع ہی سے بتا دیا گیا ہے کہ جو چیز رسولؐ اللہ پیش کر رہے ہیں وہی حق ہے اور جو لوگ اس کو نہیں مان رہے یہ ان کی غلطی ہے ساری

Marfat.com

سورت اسی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ نیز مخالفین کے اعتراضات کا جواب بلا ذکر دیا گیا ہے۔ اور مختلف طریق سے توحید، رسالت اور آخرت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اس کے ساتھ ہی اہل ایمان کو بھی جو برسوں کی طویل اور سخت جدوجہد سے تھکے جا رہے تھے اور بے چینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے تسلی دی گئی ہے۔

الروم، سورۃ قرآن پاک کی ۳۰ ویں سورت۔ چھ رکوعات اور ۶۰ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت کے آغاز میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند سال بعد وہ پھر غالب آجائیں گے اور لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوگا کہ اب روم کی سلطنت کا خاتمہ قریب ہے۔ وہی وقت مسلمانوں کے لئے اپنے دشمنوں پر غلبے کا ہوگا۔ اس سورت میں غلبہ اسلام کی صریح پیشگوئی ایک مقررہ وقت تک کے لئے کی گئی ہے۔ پہلے رکوع میں رومیوں کے مغلوب ہونے کے بعد غالب آنے کی پیشگوئی کر کے اس کی میعاد نو سال قرار دے کر اس بات کی تصریح کر دی گئی کہ مسلمانوں کی کامیابی کا وقت بھی یہی ہوگا۔

دوسرے رکوع میں مومن اور کافر کے انجام کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ تیسرے رکوع میں اللہ تعالےٰ کی قدرت کے نشانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور چوتھے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اسلام ہی فطرت انسانی کے قریب ہے اور جو مذہب فطرت انسانی کے قریب ہوتا ہے بالآخر وہی غالب آکر رہتا ہے۔

پانچویں اور چھٹے رکوع میں بتایا گیا کہ اسلام کے آنے سے ایک اچھے انقلاب کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ نیز یہ کہ حق کی مخالفت بالآخر دور ہو کر رہے گی۔

الزّخرف، سورۃ قرآن حکیم کی ۴۳ ویں سورت۔ اس میں سات رکوع اور ۸۹ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

زخرف کے معنی "سونا" کے ہیں۔ لوگ عموماً دنیوی سامانِ آرائش، مثلاً سونے چاندی مال و دولت پر فریفتہ رہتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ سورت کے آغاز میں کفار مکہ سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ لوگ اپنی شرارتوں اور غلط عزائم سے یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس قرآن کے نزول کو روک دیا جائے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے مخالفین کی وجہ سے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کے نزول کو روکا ہو۔ الٹا وہ مخالفین ہی ہلاک ہو گئے جو نبیوں کی جانوں کے درپے تھے۔ لہٰذا وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ رسول کی جان کا خاتمہ کر کے چین سے بیٹھ جائیں گے۔ بلکہ رسول خواہ زندہ رہے یا نہ رہے اللہ انہیں ضرور سزائیں دے کر رہے گا۔ دوسرے رکوع میں شرک کا ابطال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ شرک کے لئے نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ کوئی نقلی ۔

تیسرے رکوع میں کہا گیا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ رسول مالدار ہو لیکن اس کی نظر میں اس مال کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

چوتھے رکوع میں مخالفت رسول پر سزا کا ذکر ہے۔ پانچویں میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی مثال سے اسے واضح کیا گیا ہے۔

چھٹے رکوع میں بتایا ہے کہ اسرائیل جیسی برگزیدہ قوم بھی رسول کی مخالفت کر کے اللہ کی نظروں سے گر گئی ہے۔ اس لئے کوئی قوم خواہ وہ کیسی ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو۔ اللہ کے رسول کی مخالفت کر کے عزت کے مقام پر فائز نہیں رہ سکتی۔

آخری رکوع میں مخالفین رسول کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ ان کے لئے دنیا میں بھی ناکامی ہے اور آخرت میں بھی۔

الزّلزال، سورۃ قرآن پاک کی ۹۹ ویں سورت، اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیات ہیں مقام نزول کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن مسعودؓ، عطاء، جابر اور مجاہد کے نزدیک یہ مکی ہے لیکن قتادہ اور مقاتل کے نزدیک یہ مدنی ہے اور ابن عباسؓ سے بھی ایک دوسرا قول اس کے مدنی ہونے کی تائید میں ہے۔

اس سورت کا موضوع موت کے بعد دوسری زندگی کے بارے میں ہے جبکہ انسان کا سب کیا دھرا اس کے سامنے آجائے گا جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہوگا۔ ابتدائی آیات میں کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کس طرح واقع ہوگی اور وہ زندگی انسان کے لئے کیسی حیران کن ہوگی۔ آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ انسان جو اس زمین کو بے جان سمجھ کر نہ جانے اس پر کیا کچھ کرتا رہتا ہے اس وقت اللہ کے حکم سے یہ بول پڑے گی اور سب کچھ بیان کر دیگی آخر میں بتایا گیا ہے کہ انسان اس دن گروہ در گروہ اپنی قبروں سے اٹھ کر آئیں گے اور ان کو ان کے اعمال دکھا دیئے جائیں گے اور کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہوگی۔ ہر انسان وہاں اپنی ذرا سی نیکی اور بدی کا حساب بھی پالے گا۔

الزُّمر، سورۃ قرآن مجید کی ۳۹ ویں سورت، جو آٹھ رکوع اور پچھتر آیات پر مشتمل ہے مکہ میں ہجرت حبشہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اس میں زیادہ تر کفار قریش کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں اہل ایمان کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سورت میں آنحضرتؐ کی دعوت کا اصل مقصد بتایا گیا ہے کہ انسان خالصتاً اللہ کی بندگی اختیار کرے اس اصل الاصول کو بار بار مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے نہایت زوردار طریقے پر توحید کی حقانیت اور اسے ماننے کے عمدہ نتائج اور شرک کی غلطی اور اس کے برے نتائج کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر اللہ کی بندگی کے لئے ایک جگہ تنگ ہو جائے تو اس کی وسیع زمین میں اپنا دین اور ایمان بچانے کے لئے کہیں اور طرف نکل جانا چاہیئے اور اللہ تعالےٰ صبر کا بدلہ دے گا۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ کفار کو اس بات سے بالکل مایوس کر دو کہ ان کا ظلم و ستم صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔

الشّعراء، سورۃ قرآن حکیم کی ۲۶ ویں سورت۔ اس میں ۱۱ رکوع اور ۲۲۷ آیات ہیں قیام مکہ کے درمیانی دور میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں شعراء کا ذکر آیا ہے یہی اس کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت کے آغاز میں رسول اللہؐ کو کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کے پیچھے جو ایمان نہیں لا رہے اپنی جان کیوں گھلا رہے ہو۔ ان کے ایمان لانے کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں کوئی نشانی درکار ہے بلکہ یہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ ہے اور جب ان کے سامنے کوئی ایسی نشانی آجائے گی تو خود بخود انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو بات انھیں کہی جا رہی تھی وہ کیسی برحق تھی مگر معاملہ نشانیوں ہی کا ہے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور اسی مناسبت سے تاریخ کی سات قوموں کے حالات پیش کئے گئے ہیں جو اسی ہٹ دھرمی سے کام لیتے رہے تھے۔ یہ بات ذہن نشین کرا کر کہا گیا ہے کہ اب فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسی سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے ان کی حجتیں بھی ایک ہی طرح کی تھیں۔ آخر کار ان کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہوا۔ اس

Marfat.com

کے مقابلے میں تمام انبیاء کی تعلیم بھی ایک ہی تھی۔

آخری رکوع کی آیات میں کہا گیا ہے کہ اگر نشانیاں ہی دیکھنا ہیں تو خوفناک نشانیاں دیکھنے پر اصرار کیوں کرتے ہو۔ بلکہ ان کی بجائے قرآن کو دیکھو جو ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ آنحضرت کو دیکھو ان کے ساتھیوں کو دیکھو۔ کیا محمد اور ان کے ساتھی تمہیں ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے شاعر لوگ اور ان کے ساتھی ہوا کرتے ہیں اور تم ضد چھوڑ کر سیدھے راستے کی طرف آؤ جبکہ تم جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کا کاہن اور شاعر ہونے سے دور کا بھی واسطہ نہیں ـــــ

الشمس، سورۃ قرآن کریم کی ۹۱ ویں سورت ایک رکوع اور پندرہ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔

سورت کے ابتدائی حصہ میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح سورج اور چاند، دن اور رات زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح نیکی اور بدی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور ان کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو جسم، حواس اور ذہن کی مختلف قوتیں دے کر بالکل بے خبر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ ایک فطری الہام کے ذریعے سے انسان کے شعور میں نیکی اور بدی بھلے اور برے کا فرق اتار دیا گیا ہے نیز یہ کہ اگر انسان اچھے رجحانات کو ابھارے اور برے رجحانات کو دبائے تو فلاح پائے گا اور اگر اس کے برعکس کرے گا تو خسارے میں رہے گا۔

سورت کے دوسرے حصے میں قوم ثمود کی تاریخی نظیر کو پیش کرتے ہوئے رسالت کی اہمیت سمجھائی گئی ہے اور یہ کہ جب انھوں نے حضرت صالحؑ کو جو ان کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اپنے نفس کے شر میں مبتلا ہو کر جھٹلا دیا اور ان کا منہ مانگا معجزہ اونٹنی کی شکل میں سامنے آگیا اور پھر پوری قوم کے مشورے سے اسے قتل کر دیا تو پوری قوم تباہ کر کے رکھ دی گئی۔ اس واقعے کو پیش کرنے کا مقصد کفار مکہ کو یہ بتانا ہے کہ اگر انھوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو ان کا حال بھی یہی ہو گا۔

الصّف، سورۃ قرآن مجید کی ۶۱ ویں سورت اس میں دو رکوع اور چودہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

سورت کا اصل مضمون غلبہ دین اسلام ہے۔ یعنی یہی مذہب دوسرے تمام مذاہب پر غالب ہو کر رہے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینا ہوں گی ـــ

سورت کے آغاز میں اہل ایمان کو بتایا گیا ہے کہ اللہ کا غضب ان لوگوں پر ہوتا ہے جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ تو وہی لوگ محبوب ہیں جو راہ حق میں اپنی جانیں تک لڑا دیں۔

درمیانی آیات میں بتایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے ساز باز رکھنے والے منافقین اللہ کے نور کو بجھانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کر لیں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

آیات ۱۰ تا ۱۳ میں اہل ایمان کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ کامیابی کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچے دل سے ایمان لائیں۔

آخری آیت میں مؤمنین کو کہا گیا ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں ان کا ساتھ دیا۔ اسی طرح تم بھی اللہ کے مددگار بنو تاکہ کافروں کے مقابلے میں تم کو بھی ویسی ہی اللہ کی تائید حاصل ہو جیسے پہلے مؤمنین کو حاصل تھی۔

الصّٰفّٰت، سورۃ قرآن پاک کی ۳۷ ویں سورت۔ اس میں پانچ رکوع اور ۱۸۲ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا نام اس کی پہلی آیت والصّافات سے لیا گیا ہے۔

سورت کے پہلے رکوع میں توحید کے آخری غلبہ کا بیان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جس پیغمبرؐ کا تم مذاق اڑا رہے ہو عنقریب تم دیکھو گے کہ وہی تم سب پر غالب ہو گا۔

دوسرے رکوع میں موحدین اور مشرکین کے انجام کا ذکر اور مقابلہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور جھٹلانے والوں کو کس طرح کی سزا دی ہے۔ باقی کے رکوعات میں پہلے رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان کا بھی اسی طرح مقابلہ کیا گیا جس طرح یہ لوگ اس وقت آنحضرتؐ کا کر رہے ہیں مگر اللہ کو مصیبت کے وقت جس نے بھی پکارا اللہ نے اسے نجات دلائی۔ اسی سلسلے میں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا بھی ذکر ہے۔ اس سے مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ ایک مومن کو کس طرح اللہ کی رضا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آخری آیات میں یہ پیشین گوئی بھی کی ہے کہ رسول اللہ ہی آخر کار فتح مند ہوں گے اور مومنوں کو ان کے مخالفوں پر غالب کیا جائے گا۔

الضحیٰ، سورۃ قرآن کریم کی ۹۳ ویں سورت ایک رکوع اور گیارہ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں براہ راست آنحضورؐ سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ سورت نازل ہونے سے پہلے کچھ عرصہ تک وحی کے نزول کا سلسلہ رک گیا تھا۔ آنحضرتؐ کو پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں کوئی کوتاہی تو نہیں ہوگئی۔ اس سورت میں آپؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ نزول وحی کا سلسلہ کسی ناراضگی کی وجہ سے نہیں روکا گیا تھا بلکہ عنقریب تمہارا رب تمہیں خوش کر دے گا اور جن مصائب سے آپؐ کو سابقہ پیش آرہا ہے۔ اب تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ نیز یہ کہ تم نے یہ بات کیسے سوچی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا اور ہم تم سے ناراض ہیں نہیں بلکہ ہم تو تم پر شروع ہی سے مہربانیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تم یتیم تھے اور ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہتر انتظام کیا۔ تم ناواقف راہ تھے اور ہم نے تمہیں ہدایت بخشی تم نادار تھے ہم نے مالدار کر دیا۔ بھلا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نے تمہیں بھلا دیا ہو۔

آخر میں نبی کریمؐ کو بتایا ہے کہ جو احسانات تم پر کیے گئے ہیں۔ ان کے جواب میں تمہارا برتاؤ خلق خدا کے ساتھ بہتر ہونا چاہیئے اور اس طرح تمہیں ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

الطارق، سورۃ قرآن مجید کی ۸۶ ویں سورت اس میں ایک رکوع اور ۱۷ آیات ہیں مکہ میں ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کو مرنے کے بعد خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ دوسرا یہ کہ قرآن ایک قولِ فیصل ہے جس کو کفار کی کوئی چال نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

ابتدائی آیات میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی نگہبانی ایک علیم و خبیر ہستی نہ کر رہی ہو۔

بعد میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصل حقیقت کیا ہے وہ کس طرح گندے پانی کی ایک حقیر بوند سے پیدا کیا گیا ہے اور جو خدا ایک ایسی حقیر چیز سے انسان کو بنا سکتا ہے تو کیا وہ اس کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

Marfat.com

آخری آیات میں ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح بارش کا برسنا اور درختوں وغیرہ کا زمین سے اگنا کوئی کھیل نہیں اسی طرح سے قرآن جو باتیں پیش کر رہا ہے وہ بھی مذاق نہیں اور کفار جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی چالوں سے قرآن کی دعوت کو روک دیں گے اور اس کو زک پہنچا سکیں گے یہ ان کا خیال خام ہے اور اپنی شاطرانہ چالوں سے قرآن کو زک نہیں پہنچا سکتے۔

الطّور، سورۃ قرآن مجید کی ۵۲ ویں سورت اس میں دو رکوع اور ۴۹ آیات ہیں۔ مکّہ میں اس موقعہ پر نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعتراضات والزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

اس سورت میں کوہ طور کا ذکر آیا ہے جس پر حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملی تھی۔ یہی اس کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔

سورت کی ابتدائی آیات میں بتایا گیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ پر جو وحی کوہ طور پر اتاری گئی تھی اس کی مخالفت کرنے والوں کا جیسا انجام ہوا اگر کفارِ قریش بھی آنحضرتؐ کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی ہلاکت ہوگا۔ نیز رسول اللہؐ کو ہدایت کی گئی کہ مخالفین حق کی پرواہ کئے بغیر اپنی دعوت لوگوں کو پہنچاتے رہیں۔ آخری آیات میں بتایا گیا ہے کہ صبر کے ساتھ ان تکالیف اور مزاحمتوں پر مقابلہ کئے چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ نہ آجائے اور اس نے تمھیں اکیلا نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ برابر نگہبانی کر رہا ہے۔ جب تک فیصلے کی گھڑی نہ آجائے سب کچھ برداشت کرتے چلے جاؤ اور اپنے رب کی حمد و تسبیح سے قوت حاصل کرتے رہو یہی وہ بات ہے جو ان حالات میں دین کا کام کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

العٰدیات، سورۃ قرآن مجید کی سوویں سورت۔ اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ مگر حضرت انسؓ بن مالک اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ بقول مولانا مودودی سورت کا مضمون اور انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی پستی میں جا گرتا ہے نیز یہ کہ آخرت میں صرف ان کے ظاہری افعال ہی کی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں بھی جو کچھ چھپا ہوگا اس کی بھی جانچ پڑتال ہوگی۔ گویا انسان آخرت کی جوابدہی سے غافل ہو کر اپنے رب کا ناشکرا ہو گیا ہے اور وہ اس کی عطا کی ہوئی قوتوں کو ظلم وستم اور غارت گری کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ یہ جانتا ہوتا کہ قبروں سے ایک دن زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا تو اس کی یہ روش ہرگز نہ ہوتی جس میں وہ اب مبتلا ہے۔

العصر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۳ ویں سورت اس میں ایک رکوع اور تین آیات ہیں مکّہ میں نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اکثر کے نزدیک یہ مکّہ ہی میں نازل ہوئی۔

بقول سید مودودی یہ سورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر چند جچے تلے الفاظ میں معانی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جسے بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا جا سکتا ہے

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ وقت نکلا جا رہا ہے اور جو شخص اس کی قدر نہیں کرتا اور اس زندگی کی صورت میں جو مہلت اسے ملی ہے اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لا کر اچھے اعمال نہیں کرتا وہ سراسر گھاٹے میں ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک اس سورت کی اتنی اہمیت تھی کہ جب دو آدمی ملتے تو اس وقت تک جدا نہ ہوتے جب تک یہ سورت ایک دوسرے کو سنا نہ لیتے۔

العنکبوت، سورۃ قرآن مجید کی ۲۹ سورت، اس میں سات رکوع اور ۶۹ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت کی ایک آیت میں مشرکانہ عقائد اور اسلام کے مخالفین کی تدابیر کو عنکبوت (مکڑی کے جالے) سے تشبیہہ دی گئی ہے جس وجہ سے اس سورت کا نام عنکبوت رکھا گیا۔

سورت کے پہلے رکوع میں مومنوں کی تکالیف کا ذکر کیا گیا ہے جس میں وہ مبتلا تھے اور انھیں سمجھایا گیا ہے کہ جو تکالیف ان پر آرہی ہیں وہ اللہ تعالےٰ کی مصلحت سے ہیں۔ کیونکہ تکالیف و مصائب کے بغیر انسان کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔

نیز تعلیم دی گئی کہ انسان کو والدین کی فرمانبرداری کرنی چاہیئے اور اگر وہ ایمان کے خلاف کام کرنے کو کہیں تو ان کی یہ بات نہ مانی جائے۔

دوسرے، تیسرے اور چوتھے رکوع میں مختلف انبیاء کا ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ ان انبیاء کو بھی ایک عرصہ تک اپنے مخالفین کے ہاتھوں تکالیف اٹھانا پڑی ہیں۔ بالآخر اللہ نے انہیں کامیاب کیا۔

پانچویں رکوع میں کفار کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے لئے کہتے ہیں کہ ہم پر کیوں نہیں آرہا۔ انھیں بتایا گیا کہ اگر تمہاری روش یہی رہی تو عذاب ضرور آکر رہے گا۔

چھٹے رکوع میں بتایا گیا کہ اگر مصائب سے تنگ آجاؤ تو ایمان چھوڑنے کی بجائے جگہ چھوڑ کر اللہ کی وسیع زمین میں کہیں اور جا بسو، وہ جہاں بھی جائیں گے اللہ تعالےٰ ان کے رزق کا بندوبست فرمائے گا۔

آخری رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمام تکالیف عارضی ہیں اور ایک روز ختم ہو کر رہیں گی اور مومنین بالآخر کامیاب ہو کر رہیں گے۔

الغاشیہ، سورۃ قرآن مجید کی ۸۸ ویں سورت ایک رکوع اور ۲۶ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ غاشیہ کے معنی ڈھانک لینے والی چیز کے ہیں۔

اس سورت میں ان لوگوں کو جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے کہا گیا ہے کہ تمھیں اس آفت کا بھی علم ہے جو ساری کائنات پر چھا جائے گی اور انسان اس وقت دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا ایک جہنم میں سخت عذاب جھیلے گا تو دوسرا جنت میں مزے کرے گا۔ آیات ۱۷ تا ۲۰ میں اس بات کا ذکر ہے کہ کیا انسان اپنے اردگرد کی چیزوں سے جس کے ساتھ اس کو ہر وقت سابقہ پیش آتا ہے سبق نہیں لیتا کہ وہ کیسے بنائی گئی ہیں اور وہ خدا جو ان سب کا خالق ہے وہ اس بات پر کیوں قادر نہیں ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر سکے۔

آخری آیات میں رسول اللہؐ سے فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ ہٹ دھرم لوگ بات نہیں مانتے تو نہ مانیں آپؐ کا کام یہ نہیں کہ انھیں زبردستی منوا کر چھوڑیں، آپؐ تو صرف نصیحت کر دیں بعد میں اللہ تعالےٰ ان سے خود نمٹ لے گا۔ اور ایسے لوگوں کو سخت سزا دے گا۔

الغ بیگ، (۷۹۶ھ/۱۳۹۳ء ـ ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء) محمد تورغای ابن شاہرخ، تیموری سلطان۔ سلطانیہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ پندرہ برس کی عمر میں مازندران کا

Marfat.com

حاکم مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے باپ نے سمرقند بھی اسے دلا دیا۔ سمرقند کو اس نے بہت جلد اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا دیا۔ باپ کی وفات کے بعد ۲۵ ذی الحج ۸۵۰ھ/ ۱۲ مارچ ۱۴۴۷ء کو تخت کا وارث بنا۔ اس کے بیٹے عبداللطیف نے بھی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ الغ بیگ نے اسے معاف کر کے بلخ کا حاکم مقرر کیا اور دوسرے دعویداروں میرزا بابر اور علاء الدولہ سے بھی مصالحت کرنے کی کوشش کی۔

۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء میں خراسان کا سارا علاقہ بابر میرزا کے قبضے میں آگیا۔ علاء الدولہ کو اس نے تون کا حاکم مقرر کیا۔ بعد ازاں قید کر دیا۔ یہاں سے کسی طور فرار ہو کر علاء الدولہ اپنے بھائی محمد میرزا کے پاس سیستان پہنچا اور دونوں نے مل کر بابر میرزا پر حملہ کیا اور جام کے مقام پر شکست دی۔ ادھر عبداللطیف نے بھی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی حتی شاہ رخیہ کے مقام پر الغ بیگ نے شکست کھائی۔ اور ۱۰ رمضان ۸۵۳ھ/ ۲۷ اکتوبر ۱۴۴۹ء کو دو سال آٹھ ماہ کی حکومت کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔ بعد ازاں عبداللطیف بھی قتل ہو گیا۔

الغزالی، امام :- مشہور مسلمان مفکر، عالم (دیکھیے "غزالی، امام")

الفاتحہ، سورۃ قرآن مجید کی پہلی سورت ایک رکوع اور سات آیات پر مبنی ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی۔ اس سورت کے بہت سے نام ہیں۔ مثلاً ام القرآن، ام الکتاب، سبعاً من المثانی، سورۃ الدعاء، الصلوٰۃ، الشفاء، الکنز، الحمد وغیرہ امام سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں اس کے ۲۵ نام گنائے ہیں۔ صحیح احادیث میں اس کو سب سے عظمت والی سورت کہا گیا ہے۔ ہر نماز میں اس سورت کو دہرایا جاتا ہے۔

سورت کی پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی چار بڑی صفات ربوبیت، رحمانیت رحیمیت اور مالکیت کا ذکر ہے۔

چوتھی آیت میں بتایا گیا ہے کہ عبادت کے لائق صرف وہی ذات ہے جس ذات کی تعریف پہلی تین آیات میں آئی ہے اور اسی سے ہر قسم کی مدد مانگی جا سکتی ہے۔

آخری تین آیات میں راہ راست پر چلنے اور تفریط و افراط سے بچنے کی دعا ہے۔

اور بقول مولانا مودودی سورہ فاتحہ ایک دعا ہے بندے کی جانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔

الفارابی :- مشہور مسلمان مفکر اور سائنسدان (دیکھیے "فارابی، ابو نصر")

الفتح، سورۃ قرآن مجید کی ۴۸ ویں سورت۔ اس میں چار رکوع اور ۲۹ آیات ہیں مدینہ میں نازل ہوئی۔ صلح حدیبیہ میں جو عظیم الشان فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھی اسی فتح پر اس سورت کا نام ہے۔

ظاہراً یہ کوئی فتح نہ تھی بلکہ بہت سے صحابہ اس صلح پر مغموم تھے لیکن جب یہ سورت نازل ہوئی تو سب کے دل خوشی سے لبریز ہو گئے۔

پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ صلح حدیبیہ ایک کھلی فتح ہے جو اسلام کے لئے بہت سی برکتوں کا موجب ہوگی۔

دوسرے رکوع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مشکلات کے وقت ساتھ نہیں دیتے تھے اور ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے لئے سخت سزا تیار کی ہوئی ہے۔

تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہ صلح عظیم الشان اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ہے جو مومنین کو حاصل ہوں گی۔

چوتھے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ آخر اسلام دنیا کے تمام ادیان باطلہ پر غالب آکر رہے گا۔

الفجر، سورۃ قرآن مجید کی ۸۹ ویں سورت، ایک رکوع اور ۳۰ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ فجر کے معنی روشنی پھوٹنے کے ہیں۔

اس سورت کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فجر اور دس راتوں اور جفت اور طاق اور رخصت ہوتی ہوئی رات کی قسم کھا کر بتایا ہے کہ تم جس حق بات کا انکار کر رہے ہو کیا یہ چیزیں جن کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینے کے لئے کافی نہیں کہ یہ بات حق ہے اور کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ قیامت برپا کر کے انسان سے اس کے اعمال کی باز پرس کرے۔ چھٹی سے چودھویں آیات میں قوم عاد و ثمود اور فرعون کا انجام بتایا گیا کہ انھوں نے انکار کیا تو انھیں کیسی سزا دی گئی۔ اگلی آیات میں بتایا گیا ہے کہ نہ تو دولت کی فراوانی کوئی انعام ہے اور نہ رزق کی کمی کوئی سزا ہے بلکہ ان دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لیتا ہے۔ نیز یہ کہ لوگوں کا ناجائز طریقوں سے دولت اکٹھا کرنا ظلم و ستم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک روز ضرور حساب لے گا۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ آج جن لوگوں کو اس محاسبے کی سمجھ نہیں آرہی روز حساب وہ نادم ہوں گے اور کہیں گے کاش ہم دنیا میں اس کے لئے کوئی سامان کر لیتے مگر اس وقت اس ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نیز یہ کہ جن لوگوں نے خدا کی ہدایت کی پیروی کی ہو گی ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور ان کے لئے جنت ہے۔

الفرقان، سورۃ قرآن پاک کی ۲۵ ویں سورت اس میں چھ رکوع اور ۷۷ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہ فرقان تمام دنیا والوں کے لئے ہے۔ اسی رکوع میں کفاران قریش کے جو اعتراضات رسول اللہ کے بارے میں تھے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں ان تمام اعتراضات کا جواب موجود ہے جو کفار آئے دن رسول اللہ پر کرتے رہتے ہیں۔ نیز یوم فرقان یعنی جنگ بدر میں مخالفین کی قوت کو توڑنے کی پیشگوئی کی گئی ہے۔

چوتھے رکوع میں پہلی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی عرب کی اس حالت کو بیان کیا ہے جو آنحضرتؐ سے پہلے تھی وہ لوگ کس طرح حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے پانچویں رکوع میں آفتاب کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ جس طرح آفتاب کے طلوع ہونے سے سایہ گھٹتا چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح سے یہ دعوت جوں جوں پھیلے گی ظلم و ستم گھٹتا چلا جائے گا اور ایک روز صرف حق ہی کی روشنی ہوگی۔

چھٹے رکوع میں مومنین کو اپنی تربیت کرنے کے لئے اللہ نے اپنے خاص بندوں کی صفات بتائی ہیں نیز بتایا گیا ہے کہ یہ انقلاب کیسا عظیم الشان ہے کہ جس کی وجہ سے رسول اللہ اپنے پیروؤں کو پستی کی حالت سے نکال کر کس بلندی پر لے آئے ہیں۔

الف لام میم (الٓمٓ) قرآن مجید کی بعض سورتوں کے شروع میں آنے والے یہ حروف "مقطعات" کہلاتے ہیں۔ یہ چھ سورتوں البقرہ، آل عمران، العنکبوت، الروم، لقمان اور السجدہ کے شروع میں آتے ہیں۔ یہ حروف الفاظ کے تمام مقام بتائے جاتے ہیں۔ حروف کے ذریعے الفاظ کی طرف اشارہ

Marfat.com

کرنا تمام زبانوں میں مروّج ہے۔ عرب میں بھی یہ دستور تھا۔ مگر کوئی ایسا قاعدہ مقرر نہ تھا جس سے حروف کے معانی کی طرف اشارہ ہوتا، تاہم سامعین اس کا مطلب سمجھ لیتے تھے بعدازاں یہ اسلوب متروک ہوگیا اور مفسرین کے لیے ان کے معنی کا تعین کرنا مشکل ہوگیا۔ مولانا مودودی کے نزدیک ایک عام ناظر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔

الفلق، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۳ ویں سورت، ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے، مکہ میں نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کی رائے میں یہ مدنی ہے۔ سورت الفلق اور سورت الناس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا اگر ممکن ہو تو تمہاری نمازوں سے ان دونوں سورتوں کی قرأت چھوٹنے نہ پائے۔ ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے عقبہؓ بن عامر سے فرمایا "کیا میں تمہیں دو ایسی سورتیں نہ سکھاؤں جو ان بہترین سورتوں میں سے ہیں جنہیں لوگ پڑھتے ہیں انھوں نے کہا "یا رسولؐ اللہ ضرور" تو آپؐ نے یہی دو سورتیں پڑھیں نیز فرمایا کہ رات کو جب تم سونے لگو اور جب سو کر اٹھو تو ان سورتوں کو پڑھا کرو۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک بندے کے لئے سورہ الفلق سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے۔ اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو چار چیزوں سے پناہ مانگنے کی دعا کرنی چاہیے۔ اوّل ہر چیز کے شر سے جو اللہ نے پیدا کی ہے۔ مثلاً آگ پانی وغیرہ غرض یہ کہ ہر چیز۔ دوسرے اندھیرے سے پناہ مانگنے کے لیے کیونکہ تاریکی میں ہر قسم کے مصائب ہوتے ہیں تیسرے کام میں جو رکاوٹیں ڈالتے ہیں ان سے اور چوتھے مرحلے پر حاسدوں کے شر سے۔

الفیل، سورۃ قرآن پاک کی ۱۰۵ ویں سورت۔ ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں اصحاب فیل کی طرف اشارہ ہے۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ابرہہ نامی عیسائی بادشاہ جس نے شاہ حبش کی برائے نام پیروی اختیار کی ہوئی تھی۔ صنعاء میں ایک گرجا بنوایا اور چاہا کہ اہل عرب خانہ کعبہ کی بجائے اس گرجا میں جمع ہوا کریں تاکہ اس طرح سے آہستہ آہستہ انہیں عیسائی بنایا جاسکے۔ چونکہ اہل عرب نے اس گرجا کی کوئی پروا نہ کی تو اس نے خانہ کعبہ کو گرانا چاہا۔ اور ایک لشکر جرار لے کر جس میں ہاتھی بھی شامل تھے، مکہ پر چڑھائی کردی، قریش چونکہ اس کی فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، یہ کہتے ہوئے کہ "اے اللہ تو خود اپنے گھر کی حفاظت فرما" قریب کی پہاڑیوں پر چلے گئے۔

قبل اس کے کہ ابرہہ کا لشکر خانہ کعبہ تک پہنچے، اللہ تعالےٰ نے ابابیل کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو اپنے پنجوں اور چونچوں میں کنکریاں لاکر لشکر ابرہہ پر گراتے رہے۔ اور اس کا سارا لشکر کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہوگیا۔

اس سورت میں اللہ تعالےٰ نے یہ بتایا ہے اگر کفار قریش نے بھی رسولؐ اللہ کی دعوت کو دبانے کے لیے کسی طاقت سے کام لیا تو جس طرح اللہ تعالےٰ نے اصحاب فیل کو مٹا کر رکھ دیا تھا ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ (نیز دیکھئے "ابابیل، ابرہہ، اصحاب فیل")

القاء:۔ دل میں کسی بات کا اترنا (دیکھئے "وحی")

القارعہ، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۱ ویں سورت، اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں قیامت کا نقشہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ گھبراہٹ اور بدحواسی میں اس طرح بھاگے بھاگے پھر رہے ہوں گے۔ جیسے روشنی پر پروانے ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہیں۔ اس دن پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور دامن کے گالوں کی طرح بن جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی بتایا گیا کہ انسانوں کے حساب کتاب کے لیے اللہ تعالےٰ عدالت لگائے گا اور فیصلہ اس بات پر ہوگا کہ جس کے اعمال اچھے ہوں گے اور بُرے اعمال سے وزنی ہوں گے وہ لوگ عیش میں ہوں گے اور اس کے برعکس جن کے بُرے اعمال زیادہ ہوں گے اُن کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

القدر، سورۃ قرآن پاک کی ۹۷ ویں سورت۔ ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں ابتدائی آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کلام کو اللہ نے نازل کیا ہے۔ یہ رسولؐ اللہ کی اپنی تصنیف نہیں ہے۔

بعد کی آیات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جس رات میں اس قرآن کو نازل کیا گیا ہے، وہ بڑی عظمت اور قدر والی رات ہے، جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے اور اس رات کے علاوہ کبھی انسان کی بھلائی کے لئے ایسا کام نہیں ہوا تھا جو اُس رات میں ہوا ہے۔

آخری آیات میں بتایا گیا ہے کہ اس رات کو فرشتے اور جبرئیلؑ اپنے رب کی اجازت سے ہر حکم لے کر آتے ہیں۔ اور یہ رات شام سے صبح تک انسانوں کے لئے سراسر سلامتی کی رات ہے اور اس میں جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ سراسر بھلائی کے لئے ہوتے ہیں۔

القریش، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۶ ویں سورت۔ یہ ایک رکوع اور چار آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

چونکہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت ابرہہ اور اس کے لشکر کا انجام تمام قریش اور اہل عرب کو معلوم تھا کہ اللہ تعالےٰ نے کس طرح اپنے گھر کو بچایا۔ اس وجہ سے ملک بھر میں قریش کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ بلا خوف و جھجک عرب کے ہر حصہ میں اپنے تجارتی قافلے لے جاتے اور وہ کوئی ان سے الجھنے کی جرأت تک نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس سورت میں اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے ان چار مختصر آیتوں میں بتایا ہے کہ جب اہل مکہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ کا گھر ہے نیز یہ کہ اس نے اس گھر کے طفیل امن عطا کیا ہے اور ان کی تجارتیں فروغ پارہی ہیں مزید یہ کہ بھوک و ننگ سے بچا کر خوشحالی عطا کی ہوئی ہے تو پھر ان کو چاہیئے کہ اللہ ہی کی عبادت کریں اور بتوں کی پرستش سے باز آئیں۔

القصص، سورۃ قرآن مجید کی ۲۸ ویں سورت۔ اس میں نو رکوع اور ۸۸ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

قصص کے معنی ترتیب وار واقعات بیان کرنے کے ہیں۔ سورت کی آیت ۲۵ میں القصص کا لفظ آیا ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس سورت میں ان شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اس وقت رسولؐ اللہ کی رسالت پر کئے جارہے تھے اس سلسلے میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر کرکے بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ جو کچھ کرتا ہے اس کے لیے غیر محسوس طریقے سے اسباب فراہم کردیتا ہے۔ فرعون اس قوم کو تباہ کرنا چاہتا

Marfat.com

تھا جسے اللہ تعالیٰ برباد کرنا چاہتا تھا۔ کس طرح اس نے حضرت موسیٰؑ کی فرعون کے دربار ہی میں پرورش کرائی اور آخر کار فرعون کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے دوسرے رکوع میں حضرت موسیٰؑ اور قبطی کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں حضرت موسیٰؑ کے مصر سے نکلنے کا بھی ذکر ہے۔ تیسرے رکوع میں حضرت موسیٰؑ کے مدین جانے اور وہاں دس سال تک ٹھہرنے کا ذکر ہے۔ چوتھے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت سے سرفراز کرنا چاہتا ہے تو کسی جشن وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب تم رسولؐ اللہ کی نبوت کے بارے میں سوچتے ہو کہ انھیں بیٹھے بٹھائے کہاں سے نبوت مل گئی تو حضرت موسیٰؑ کے بارے میں غور کرو کہ راستے میں آگ لینے چلے تھے اور نبوت سے سرفراز ہوئے نیز یہ کہ جب خدا کسی بندے سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو اس کے پاس کوئی اتنا بڑا لاؤ لشکر نہیں ہوتا لیکن اس کے مقابلے میں بڑے بڑے ساز و سامان رکھنے والے بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ موسیٰؑ اور فرعون کی مثال تمہارے سامنے ہے۔

پانچویں رکوع میں کفار کے اس مطالبے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو وہ رسولؐ اللہ سے کیا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح آپ بھی اللہ کی نشانیاں دکھائیں۔ چنانچہ بتایا گیا کہ جس طرح فرعون نے وہ نشانیاں دیکھ کر اور انھیں جادو کہہ کر انکار کر دیا تھا اور پھر اس کی اُسے کیا سزا ملی تھی۔ تو کیا ضروری ہے کہ تم بھی وہی مطالبہ کر کے اپنی شامت کو آواز دو۔ سورت کے پانچویں رکوع میں حضرت موسیٰؑ کی آنحضرتؐ سے مماثلت کی گئی ہے اور ماحول کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ بالکل حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے زمانے جیسا ہو چکا۔ چھٹے رکوع میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ نہ صرف آنحضورؐ اور حضرت موسیٰؑ کی وحی میں بلکہ دوسرے انبیاء کی وحیوں میں بھی مماثلت ہے اور ان کی تعلیمات کے اصول بھی ایک جیسے ہیں۔

ساتویں رکوع میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو بزعم خود رہنما بن کر دوسرے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک سخت عذاب دیکھ کر رہیں گے۔

آٹھویں رکوع میں قارون کا ذکر ہے کہ اس نے بھی اپنے مال و دولت پر فخر کر کے دوسروں کو گمراہ کیا اس کا انجام کیسا ہولناک ہوا۔ سورت کے آخری رکوع میں کفار مکہ کے اس عذر کا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں گے تو ان کی قیادت و سیادت ختم ہو جائے گی۔ حکیمانہ انداز میں یہ بتایا گیا کہ دنیوی مفاد کی غرض سے حق اور باطل کا فیصلہ کرنا غلط ہے۔

القصواء حضرت رسول اکرمؐ کی سواری میں آنے والی اونٹنی کا نام۔ آنحضورؐ نے اسی پر مدینہ کی طرف سفر ہجرت فرمایا تھا۔ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی خاص مقصد کے لئے پال رکھا تھا۔ مدینہ میں ورود کے بعد القصواء آنحضرتؐ کو لئے ہوئے ایک جگہ پر بیٹھ گئی۔ جو دو یتیموں کی ملکیت تھی۔ آنحضورؐ نے وہ زمین خرید لی اور یہاں مسجد نبوی کی بنیاد رکھی۔

القلم، سورۃ قرآن مجید کی ۶۸ ویں سورت۔ اس کے دو رکوع اور ۵۲ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ اسے سورت "ن" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے نزول کے وقت آنحضورؐ کی مخالفت کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

سورت میں تین مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب، دوسرے مخالفین کو تنبیہہ اور نصیحت تیسرے آنحضورؐ کو صبر کی تلقین۔

ابتدائی آیات میں آنحضورؐ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپؐ کے مخالفین جو انھیں دیوانہ

کہہ رہے ہیں غلط ہے اور جس مرتبے پر آپ فائز ہیں وہ کوئی چھوٹا رتبہ نہیں اور تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔

اگلی آیات میں ایک مثال کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جس طرح ان باغ والوں نے اللہ کی نعمت پا کر ناشکری کی تھی اور اپنے ایک بہتر شخص کی بروقت نصیحت کو نہ مانا تھا یہاں تک کہ انھوں نے اس کی بربادی کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا۔ اسی طرح اگر تم نے بھی رسول اللہ کی ہدایت کو بروقت نہ مانا تو تمھیں بھی ایسے ہی عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ سورت کے دوسرے رکوع میں بتایا گیا کہ بھلائی خدا کے نیک بندوں کے لئے ہے۔ اور نافرمانوں کا انجام ذلت والا ہوگا۔ قرآن کو جھٹلا کر وہ عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

آخری آیات میں رسولؐ اللہ کو فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ کی راہ میں جو مصائب بھی آئیں انھیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہیں اور حضرت یونسؑ کی طرح بے صبری سے بچیں۔

القمر، سورۃ قرآن مجید کی ۵۴ ویں سورت۔ اس کے تین رکوع اور ۵۵ آیات ہیں اس سورت میں شق القمر کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ کفار مکہ ایسے لوگ ہیں جن پر سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ لوگ تاریخ سے کوئی سبق حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنی آنکھوں سے شق القمر جیسی واضح نشانیاں ہی دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ یہ لوگ اسی وقت مانیں گے جب قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس کے ساتھ انکے سامنے اقوام نوحؑ، عاد، ثمود، لوطؑ اور فرعون کا مختصراً حال بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ یہ قومیں ہدایت کو جھٹلاتی رہیں تو کیسے کیسے دردناک عذابوں سے دوچار ہوئیں۔ اب اگر تم نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو تم بھی اس عذاب عظیم سے نہیں بچ سکو گے۔

آخری آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قیامت کے لانے میں کسی بڑی تیاری کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا حکم ہوتے ہی برپا ہو جائے گی۔ لیکن یہ اپنے وقت پر ہی آئے گی اور کفار اپنی غلط اعمالیوں کا نتیجہ بھگتیں گے۔

القیامۃ، سورۃ قرآن مجید کی ۷۵ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۰ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں قیامت کا ذکر ہے اور منکرین آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک اعتراض اور شبے کا جواب دیا گیا ہے۔ دلائل کے ساتھ آخرت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ضرور آ کر رہے گی۔ نیز یہ کہ جو لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ وہ اپنی خواہشات کی بنا پر ایسا کر رہے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب تمہارا سارا کیا دھرا تمہارے سامنے ہوگا۔ اور جو تم اس دنیا میں کرتے رہے ہو۔ ساتھ ہی رسولؐ اللہ کو فرمایا گیا ہے کہ وہ وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں کیونکہ اس کو یاد کرانا اللہ کے ذمہ ہے۔

الکافرون، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۹ ویں سورت ایک رکوع اور چھ آیات پر مشتمل ہے۔ مفسرین میں اس کے مکہ میں نازل ہونے میں اختلاف ہے۔ لیکن اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ مکی ہے اس سورت کی اہمیت اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ فجر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ اخلاص کو پڑھتے تھے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹو تو یہ سورت پڑھ لیا

Marfat.com

کرو۔ اسی مضمون کی اور بھی کئی احادیث ہیں جو اس سورت کی اہمیت کے بارے میں ہیں
اس سورت میں توحید کا عملی رنگ پیش کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان تمام چیزوں کی عبادت سے بیزار ہیں جو کفار کرتے تھے۔ اس سورت میں اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ دین کے معاملے میں کافروں سے کسی قسم کی مصالحت نہیں کی جا سکتی اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خالصتاً اللہ کی عبادت کریں اور اس میں کسی قسم کی شرک کی آلائش نہیں ہونی چاہیے۔

الکندی (۱۸۵ھ/۸۰۰ء - ۲۵۲ھ/۸۶۶ء) ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن صباح الکندی، مشہور مسلمان سائنسدان، اسلامی دور میں فلسفے اور سائنس کا آغاز اسی سے ہوتا ہے، بصرے میں پیدا ہوا۔ والد بصرہ کا رئیس اور کوفے کا گورنر تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم بصرے ہی میں حاصل کی اور بعدازاں بغداد میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی۔ اس نے بہت جلد فلسفے اور سائنس پر مہارت حاصل کر لی اور المامون اور پھر المعتصم کا درباری مقرب بن گیا۔

بغداد میں الکندی کے ہمعصروں میں سے موسیٰ بن شاکر اور اس کے بیٹے اس سے عالمانہ چشمک رکھتے تھے۔ انھوں نے خلیفہ المتوکل سے کہہ سن کر اسے دربار سے نکلوا دیا۔ اپنی وفات سے پہلے کے بارہ برس اس نے گوشۂ عافیت میں بسر کیے اور بغداد ہی میں انتقال کیا۔

الکندی ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے ریاضی، طبیعیات، فلسفہ ہیئت، موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ وہ یونانی اور سریانی زبانوں کا ماہر بھی تھا۔ اس کی کتابوں کا زیادہ تر علم بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں استنبول سے دریافت ہونے والے ذخیرے سے ہوا۔ "الفہرست" میں اس کی تصانیف کی کل تعداد دو سو چالیس ہے۔ اس میں اس کا معروف رسالہ العقل بھی ہے۔ جس نے مغرب پر گہرا اثر ڈالا۔ ریاضی میں اس کی چار تصانیف اعداد اور ان کی خاصیتوں پر تھیں۔ بصریات پر اس کی مشہور کتاب اقلیدس کی بصریات کے نظرثانی شدہ نسخے پر مبنی ہے۔ دیگر کئی مباحث پر بھی اس نے رسالے تصنیف کیے۔ اس کی شہرت بعض سائنسی اور فلسفیانہ تحریروں کے لاطینی میں ترجمہ ہو جانے کے باعث مغرب میں بھی پھیل گئی۔ خصوصاً علم احکام نجوم کے باب میں اسے ایک لاثانی سند کی حیثیت حاصل ہے۔

الکندی ایمان و عقل کے باہمی تعلق پر اعتقاد رکھتا تھا۔ تاہم اس میں کچھ امتیازی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ فلسفے کے ضمن میں وہ اثینی مکتب نوفلاطونی کے نزدیک تر تھا۔ اور مذہب کے معاملے میں اس کی ہمدردیاں معتزلی علم کلام کے ساتھ تھیں۔ وہ علم کو الوہی اور انسانی کی اقسام میں بانٹتا تھا۔ پہلے کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی رسائی ان حقائق تک ہے۔ جہاں تک علم انسانی خود اپنے ذرائع سے کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا ایسے حقائق کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ گویا فلسفہ اور سائنس کو وحی کے تابع قرار دے دیا گیا۔ گویا الکندی نے ایک ایسے دبستانِ فکر کو جنم دیا، جو عقلی تناظر پر قائم ہے اور سلام کے مجموعی مشاہدۂ کائنات کی حدود میں رہتے ہوئے وجود میں آتا ہے۔ اس کے شاگردوں میں ابومعشر بلخی اور احمد ابن طیب السرخسی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اس کے اثر کو سائنس کے حوالے سے پھیلایا۔

الکوثر، سورۃ قرآن پاک کی ۱۰۸ویں سورت، ایک رکوع اور تین آیات پر مشتمل ہے مفسرین میں اس سورت کے نزول کے بارے میں اختلاف ہے اور بعض کے نزدیک یہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن اکثریت کے نزدیک مکی ہے۔

سورت کی شانِ نزول یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے دو صاحبزادے تھے۔ کچھ عرصے بعد دونوں وفات پاگئے تو کفارِ قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمدؐ تو ابتر ہو گئے یعنی ان کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں جو بعد میں ان کی وارث ہو گی اور آپؐ کے بعد اہل قریش اس مصیبت سے چھوٹ جائیں گے جس میں وہ اب مبتلا ہیں۔ کفار کی ان باتوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل کی اور آنحضورؐ سے فرمایا کہ کفار کی باتوں پر نہ گھبرائیں۔ عنقریب کامیابی آپؐ کے قدم چومے گی اور اللہ تعالیٰ وہ کچھ عنایت فرمائے گا جو کسی اور کو نہ ملا ہے اور نہ ملے گا اور یہ مخالفین جو ان دونوں خوشیاں منا رہے ہیں۔ ایک روز یہی بے نام و نشان ہوں گے۔

الکہف، سورۃ قرآن مجید کی ۱۸ ویں سورت۔ اس میں ۱۲ رکوع اور ۱۱۰ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔

یہ سورت مشرکین مکہ کے ان تین سوالوں کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے آنحضرتؐ سے کیے تھے۔ یعنی اصحاب کہف قصہ خضر و موسیٰ اور قصہ ذوالقرنین۔ یہ ایسے قصے تھے جن کا عرب میں چرچا تھا اور عیسائی ان سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے آنحضورؐ کا امتحان لینے کی غرض سے کہ آیا ان کے پاس غیب کا علم بھی ہے یا نہیں، یہ سوالات پوچھے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کے جوابات دیے بلکہ ان کو اس وقت کے حالات پر اسی مطابقت سے چسپاں کر دیا۔

اصحاب کہف کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بھی اسی توحید کے قائل تھے جس کی تبلیغ سلام کر رہا ہے اور ان کی قوم کا رویہ بھی قوم قریش کے رویہ سے مختلف نہ تھا۔ نیز مسلمانوں کو اس واقعے میں یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ اگر حالات اس قدر خراب ہو جائیں کہ دین کی تعلیمات پر عمل کرنا دشوار ہو جائے تو پھر انہیں کسی اور جگہ نکل جانا چاہیے۔ اس قصے میں یہ بات بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جس طرح اصحاب کہف کو موت کے بعد زندہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح تمام لوگوں کو مرنے کے بعد زندہ کیا جائے گا۔

قصہ خضر و موسیٰؑ میں یہ بات بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے وہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور جو کچھ اس دنیا میں ہو رہا ہے بالکل ٹھیک ہو رہا ہے قصہ ذوالقرنین میں بتایا گیا ہے تم لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی سرداریوں پر اکڑ رہے ہو۔ ذوالقرنین کو دیکھو وہ کتنا بڑا اور زبردست فرمانروا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی حقیقت کو نہیں بھولا تھا اور ہمیشہ اپنے خالق کے آگے جھکا رہتا۔

آخری آیات میں دوبارہ ان باتوں کو دہرایا گیا ہے جو آغاز میں کہی گئی ہیں یعنی توحید و آخرت حق ہیں اور تمہاری بھلائی بھی اسی میں ہے کہ تم انہیں تسلیم کرو۔
(نیز دیکھیے "اصحاب کہف")

الکیمیا کیمیاگری، علم کی ایک اہم شاخ، جسے مسلمانوں نے یونانیوں کے ہاں سے لیا اور دنیا کو جدید علم کیمیا کی صورت میں عطا کیا۔ اس علم کا آغاز اس نظریے سے ہوا کہ دنیا کی تمام اشیاء معدنیات، دھاتیں وغیرہ ارتقائی ہیئت کی حامل ہیں خصوصاً دھاتوں میں سب سے اعلیٰ ارتقائی صورت سونے کو حاصل ہے۔ دیگر ادنیٰ دھاتوں مثلاً تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے اس نظریے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اور یوں الٹے سیدھے تجربات کا آغاز ہو گیا۔
زمانہ قدیم میں کیمیاگروں کو ساحر، جادوگر وغیرہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ بعدازاں

Marfat.com

یہی لوگ حکیم، طبیب اور سیمیاسی وغیرہ کہلاتے۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی ایسی عمل انگیز شے ضرور موجود ہے، جسے دھاتوں کے ساتھ ملایا جائے تو وہ ترقی کر کے سونا بن جاتی ہیں۔ اس عمل انگیز یا بوٹی کا نام انھوں نے "سوما" رکھا اور پھر اس نامعلوم بوٹی کی تلاش میں دنیا کا کونا کونا چھان مارا۔ ان کیمیاگروں کا یہ خواب تو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا البتہ طب، ادویہ سازی اور علم کیمیا نے ضرور جنم لیا۔

الکیمیا کا آغاز قدیم یونانیوں کے ہاں تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح ہی سے ہو چکا تھا۔ مگر اس موضوع پر ان کی پہلی تحریریں تیسری صدی عیسوی ہی میں وجود میں آئیں۔ اس نظریے کی بنیاد میں ارسطو کا عناصر اربعہ کا نظریہ کام کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں یہ دنیا مٹی، پانی، آگ اور ہوا کے آمیزے سے بنی ہے۔ اسی دور میں کیمیاگر دو گروہوں عملی اور سیمیاسی میں تقسیم ہو گئے۔ عملی کیمیاگر تجربات اور ایجادات کی طرف مائل ہو گئے اور انھوں نے باقاعدہ علم کی بنیادیں رکھنا شروع کر دیں۔ مگر سیمیاسی قسم کے کیمیاگر الف لیلوی داستانوں کی مانند سوما بوٹی کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے لگے۔

مسلمانوں میں سے جس نے سب سے پہلے ان علوم کی طرف توجہ دی۔ وہ خالد بن یزید اموی تھا۔ اس نے فلسفہ اور کیمیا کی بعض کتابوں کے تراجم کیے۔ اس کے بعد دوسرا مشہور کیمیادان جابر بن حیان تھا۔ یہ خالد بن یزید کا شاگرد تھا۔ اس نے علم کیمیا پر خاصا کام کیا اس کی کتابوں کی تعداد سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے۔ اس نے تبخیر، تقطیر، تصعید اور قلماؤ کے مروجہ طریقوں کی اصلاح کی اور کشتہ سازی کا نیا طریقہ ایجاد کیا جو اسی کے نام سے مشہور ہے جابر سونا بنانے والی کیمیاگری کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تاہم اس نے ایسا تیزاب ایجاد کیا جو سونے کو بھی گلا دیتا تھا۔ علم کیمیا میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ شورہ اور گندھک کا تیزاب اور ماء الملوک (آب سلطانی) کی دریافت ہے۔ اس کے علاوہ اس نے گندھک کے مرکبات سے سنکھیا، سفیدہ وغیرہ کے علیحدہ کرنے کے طریقوں کو بھی مفصل طور پر بیان کیا۔ غرضیکہ علم کیمیا کا کوئی ایسا حصہ نہیں چھوڑا۔ جس پر اس نے تحقیقات نہ کی ہوں۔ کیمیا میں اس کی انھی خدمات کے پیش نظر اسے "بابائے کیمیا" کہا جاتا ہے۔

جابر بن حیان کے بعد مسلمانوں کا مشہور کیمیادان محمد بن زکریا رازی تھا۔ وہ عباسیہ کا ممتاز ترین عالم تھا۔ اس نے معدنی مادوں کی تقسیم نباتات، حیوانات، جمادات وغیرہ میں کی۔ اس کے برعکس جابر مادوں کو اجسام، نفوس اور ارواح میں منقسم کرتا ہے۔ علم کیمیا پر اس کی مشہور کتاب "کتاب الاسرار" ہے۔

اس دور میں الجاحظ، جس نے جانوروں کے فضلہ سے امونیا تیار کیا۔ الکاثی جس کی کتاب عرصہ تک علم کیمیا کی معیاری کتاب سمجھی جاتی رہی۔ ابن سینا، جس نے کیمیاگری کے سیمیاسی نظریے کو مسترد کیا اور کہا کہ کم قیمتی دھاتوں کو کسی صورت میں بھی سونے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، البیرونی اور طغرائی نے علم کیمیا پر بے شمار کتابیں لکھیں اگرچہ ان کے ساتھ ساتھ کیمیاگری کا قدیم نظریہ بھی قائم رہا اور لوگ اس پر بے تحاشا وقت دولت، صحت اور زندگی ضائع کرتے رہے۔ مگر دوسری طرف مسلمانوں نے علم کیمیا کا کوئی ایسا شعبہ نہیں چھوڑا، جس میں انھوں نے کچھ نہ کچھ کام نہ کیا ہو، تحقیقات نہ کی ہوں اور اس کے نظری و عملی پہلوؤں پر یکساں توجہ نہ دی ہو۔

رابرٹ بریفالٹ جیسا مستشرق لکھتا ہے کہ "عربوں کی تجربی تحقیق نے ان اسالیب کی بنیاد رکھی، جنھوں ریاضی تجزیہ کے ساتھ مل کر زمانۂ حال کے علم کیمیا کو جنم دیا۔ اس علم کی ابتدا ان عملیات سے ہوئی جو مصر کے ماہرین فلزات اور زرگر لوگ استعمال کرتے تھے۔ یعنی دھاتوں کو ملا کر مختلف قسم کی مرکب دھاتیں تیار کرنا، اور انھیں ایسے طریق سے رنگ دینا کہ وہ سونے سے مشابہ معلوم ہوں یہ عملیات مدت دراز تک پیشوایان مذاہب کے خفیہ اجارے کے طور پر محفوظ رکھے گئے تھے اور پراسرار افسوں، جادو، سحر وغیرہ کے ساتھ ملفوف تھے۔ لیکن جب وہ عربوں کے ہاتھ آیا تو ان میں تحقیق کا وسیع اور منظم جذبہ پیدا ہوا، جس سے عربوں نے تقطیر تبخیر اور تصعید کے طریقے ایجاد کیے۔ اس کے علاوہ الکحل، شورے کا تیزاب، گندھک کا تیزاب، الکلی، پارے کے نمک سرمہ اور بسمتھ کو دریافت کیا اور بعد کے مکمل علم کیمیا کی تحقیق کی بنیاد رکھی۔

اللہ معبود حقیقی، خالق و مالک کائنات، جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اللہ اس عظیم ہستی کا اسم ذات ہے، جو دونوں جہانوں کی پالنے والا ہے اور جو زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا یہ اسم موجود ہے اور یہ ۲۶۹۷ بار مذکور ہوا ہے۔ اس لفظ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی حرف الگ کر دیں اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مثلاً الف دور کرنے سے للّٰہ باقی رہے گا۔ پہلا لام دور کرنے سے لَہٗ رہ جائے گا۔ الف لام دور کر دینے سے لَہٗ اور الف لام لام دور کرنے سے ہُو رہ جائے گا۔ ہر حالت میں اس میں سے خدا کے پاک نام پر اطلاع ملتی ہے۔

یہ صرف اسی لفظ کی خوبی ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں خدا کی ہستی کا مفہوم دینے والا کوئی لفظ نہیں اور عربی زبان میں بھی یہ لفظ کسی اور ہستی کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ قدیم عربوں کے ہاں بھی اللہ اسی عظیم ہستی کے لیے مستعمل تھا۔ جو تمام دیوتاؤں کا خدا ہے۔ یہ بھی اسی لفظ کا اعجاز ہے کہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کے تمام حروف اور الفاظ اسی سے نکلتے ہیں۔ یہ بھی اس لفظ کی خاصیت ہے کہ اس پر تائے قسم وارد ہوتی ہے۔ ورنہ حرف "ۃ" بمعنی قسم اور کسی اسم پر وارد نہیں۔ یہ اسی اسم کا خاصہ ہے کہ الحمد کا استعمال اسی لفظ کے ساتھ ہوتا۔ الحمد للرحمٰن یا الحمد للرحیم کی ترکیب وجود میں نہیں آئیں۔

تفسیر کی رُو سے اللہ کا لفظ اوّل الهت سے مشتق ہے، جس کے معنی تسکین دینے کے ہیں۔ دوم اَلِہَ سے مشتق ہے، جس کے معنی وارفتگی کے ہیں۔ سوم لاہ سے مشتق ہے، جس کے معنی بلند شان کے ہیں۔ چہارم لاہ یلوہ سے مشتق ہے، جس کے معنی احتجاب کے ہیں۔ پنجم الہ الفصیل سے مشتق ہے، جس کے معنی احتیاج مند کے ہیں اور ششم الہ الہٗ سے بنا ہے، جس کے معنی "اس سے ڈرتا رہا" ہیں۔ البیضاوی نے چار اقوال درج کیے ہیں۔ ایک کے مطابق اللہ کا لفظ الٰہ سے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ ال کا اضافہ کر دیا گیا، جس سے اس میں خصوصیت پیدا ہو گئی۔ ال وہی معنی دیتا ہے، جو انگریزی میں THE کے ہیں۔ دوسرے قول کے مطابق یہ اللہ کی ذات کا اسم علم ہے اور اسی سے خاص ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ایک صفاتی نام تھا، مگر خدا کی ذات کے ساتھ مختص ہو کر رہ گیا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اصل میں یہ سریانی لفظ لاہا سے نکلا ہے۔ مگر اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت علیؓ کے بقول "اللہ کی صفات کے بارے میں تمام وصفی نام متحیر ہیں۔ زبانوں کے قواعد گم ہو کر رہ گئے ہیں۔"

قرآن مجید میں اللہ کا لفظ اسم ذات کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسلام سے پہلے معبود کے لیے الٰہ کا لفظ مستعمل تھا۔ یہ معبود خواہ باطل ہو یا حقیقی قرآن مجید میں بھی ذات باری کے لیے الٰہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ کا لفظ مالک کائنات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ قرآن مجید کی رُو سے دعا اور پرستش کے لائق اور نفع و ضرر کی مالک صرف

Marfat.com

ایک ... ہستی ہے۔ اور اس ہستی کا نام اللہ ہی ہے۔

قرآن مجید سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور ملتا ہے، جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں۔ کہیں اسے صرف محبت کہا گیا ہے اور کہیں وہ صرف رافع حاجات ہے۔ کہیں اس کی ذات کو تقسیم کر دیا گیا ہے اور کہیں اسے تجسیم، تشبیہ اور تناسخ سے آلودہ کیا گیا ہے۔ کہیں وہ نیلے آسمان کے پار کسی تخت پر براجمان نظر آتا ہے اور کسی مذہب کی رو سے اس نے انسانی بھیس اختیار کر لیا ہے۔ ان تمام تصورات کی تردید قرآن مجید نے اس طرح سے کر دی ہے کہ الٰہ صرف وہی ہو سکتا ہے، جو بے نیاز، بلند رتبہ والا، ہمیشہ قائم اور ہمیشہ رہنے والا ہو، جو قادر مطلق ہو اور حاکم اعلیٰ ہو۔ جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب، جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو، جو زندگی بخشنے والا وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو، جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو، اس کی بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں، اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو، وہی سب کا حساب لینے والا ہو، اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو۔ وہ نہ تو ہماری مادی اشیا جیسا جسم رکھتا ہے اور نہ اس کی صورت کو کسی شے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسی ہستی مطلق کا وجود بھی ہے؟ اٹھارہویں صدی کے مادہ پرستوں نے مادہ ہی کو اول و آخر قرار دیا تھا۔ انیسویں صدی کی سائنس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خدا کا تصور سرے سے ہی غلط ہے۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ بعض اوقات انسان فیصلہ کر دینے میں بہت جلدی کرتا ہے۔

جدید سائنس نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے کہ سائنس کے ثابت کردہ موجودہ اصول اور قوانین حتمی حیثیت نہیں رکھتے اور ان میں ہر نئی تحقیق سے تغیر و تبدل ظہور میں آتا ہے۔ اس کے پیش نظر سائنس کا نیا رجحان مذہب اور اللہ کے وجود کی سمت اشارہ کرنے لگا ہے۔ البرٹ آئن شٹائن جیسے بڑے سائنسدان کی رو سے تو مذہبی اور سائنسی نقطہ نظر کا ماخذ اور رہنما ہے۔ مشہور فلسفی جوڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے "ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے"۔

نظریہ ارتقاء کو ماننے والے بھی اس مسئلہ پر جتنا غور کرتے ہیں انھیں ایک خالق رب کی ضرورت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ان کے نزدیک کیا عقل اسے ماننے کو تیار ہے کہ ارتقاء محض ایک حادثے یا اتفاق کی بدولت واقع ہوا اور ایسا [illegible] خود بخود کیا ہے؟ کیا اس "خود بخود" قوت ہی کو ہم قدرتِ خداوندی قرار نہیں دے سکتے؟

قرآن مجید نے اس خالق باری کے وجود پر جس طرح سے استدلال کیا ہے، وہ ہمیشہ منکرین کے لیے رہنما کا کام دیتا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والا اللہ میں کوئی شک ہے؟" (۱۴ ۔ ۱۰)

اگر اس میں شک ہے تو ذرا غور کرو۔

"کیا وہ خود بخود بن گئے، یا اپنے پیدا کرنے والے وہ خود ہیں یا انھی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ نہیں بلکہ انھیں یقین نہیں (طور ۔ ۳۵، ۳۶)۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں، جن میں عموماً ذیل کی تین اقسام کے دلائل ہیں۔

۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۱۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۲۔ کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور [illegible] کا ہونا۔

اللہ کے تصور کے سلسلے میں اقوام عالم نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بقول مولانا نعیم صدیقی بہت سے جدید معاشروں میں بھی خدا کا تصور یہ رہا ہے کہ اگرچہ وہ آخری اقتدار کا مالک ہے، لیکن اسے اپنے بندوں کی زندگی اور مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اس نے محض تخلیق کا ایک کھیل رچا رکھا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے، جیسے کوئی بچہ پھلجڑی چھوڑ کر مزا لیتا ہے۔ خدا کے بارے میں یہ تصورات انسان کے ناقص شعور کے مظہر ہیں۔

قرآن مجید سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کی روزمرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے سے اتنا گہرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے، مختلف سرگرمیوں کے بھلے اور برے پہلو نمایاں کرتا ہے، قدم قدم پر ہدایات دیتا ہے۔ وہ کہیں عدل، احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے کہیں نفاق اور بزدلی اور مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ کہیں وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضا کو قائم رکھنے میں سبق دیتا ہے، کہیں رضاعت اور میراث کے معاملات میں انھیں پریشانیوں سے نکالتا ہے۔ کہیں آداب مجلس سکھاتا ہے۔ کہیں حدود و تعزیرات اور قوانین متعین کرتا ہے۔ الغرض دکھ درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین استاد ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ایسے خدا کو ماننے سے جو اعتماد، یقین اور پختہ شعور حاصل ہوتا ہے، وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے۔

"اللہ ایک ہی تو ہے، وہ بے نیاز ہے۔ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اس سے پیدا ہوا ہے۔ نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ (۱۱۲ ۔ ۱ تا ۴)، وہ لاشریک (۶ ۔ ۱۹) بے نظیر (۴۲ ۔ ۱۱) ہر نقص اور کمزوری سے پاک (۵۹ ۔ ۲۳) اس کے لیے نہ تھکن ہے (۵۰ ۔ ۳۸) نہ زوال نہ فنا (۵۵ ۔ ۲۶) نہ موت (۲۵ ۔ ۵۸)، نہ ہلاکت (۲۸ ۔ ۸۸)، وہ حی و قیوم، بزرگ و برتر ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ زندہ ہے، سب کا تھامنے والا۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اسی کا ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔ ایسا کون ہے، جو سفارش کرے اس کے پاس، مگر اجازت کے ساتھ۔ وہ جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ سب اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا کہ وہ چاہے اس کا علم (کرسی) آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور انھیں تھامنا اسے گراں نہیں اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔" (۲ ۔ ۲۵۵)۔

وہ ہر شے کا رب ہے (۶ ۔ ۱۶۴) جو چاہے پیدا کرے (۳ ۔ ۴۷) اور جیسے چاہے اضافہ کرے (۳۵ ۔ ۱) سب اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں (۳۰ ۔ ۲۶)، کوئی نہیں جو اس کی بندگی سے آزاد ہو (۱۹ ۔ ۹۳) اسی کے ہاتھ میں ہر شے کی حکومت ہے (۲۳ ۔ ۸۸) یہ ہے اللہ رب برحق (۱۰ ۔ ۳۲)۔ اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں (۱ ۔ ۲) وہی اول ہے، وہی آخر، وہی ظاہر ہے، وہی باطن (۵۷ ۔ ۳)۔ اسی کے لیے ہیں اسماء الحسنیٰ (۲۰ ۔ ۸) اسے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن۔ اس کے نام اچھے ہی ہیں۔ (۱۷ ۔ ۱۱۰)

قرآن مجید کے پیش کردہ تصور الوہیت اور اسماء الحسنیٰ اور صفات الٰہیہ سے تعبیر کرنے سے ذات باری کا ایک ایسا تصور قائم ہو جاتا ہے، جو ہر لحاظ سے مکمل، مرغوب، مطلوب اور ادراک و وجدان کے مطابق ہے۔ ہمارے حواس اور مشاہدات اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ اور یوں ایمان باللہ ایک اصول حیات کی صورت میں دلوں میں گہری جگہ پا لیتا ہے۔

یونانی فلسفہ اور عجمی اثرات کے پیش نظر مسلمانوں نے ذات الٰہیہ کی عقلی توجیہ کرنے

Marfat.com

کی کوشش کی۔ اس توجیہ میں کچھ لوگ تو بھٹک گئے اور کچھ نے ایسی ایسی موشگافیاں کیں، جو ہمیں حقیقت سے دور لے جاتی ہیں۔ عقلیت پسندوں کی طرح اہل تصوف نے بھی اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔ عقلیت پسندوں میں سرفہرست معتزلہ ہیں جنھوں نے جبر و قدر اور ذات و صفات کے مسائل پر منطقی اندازِ فکر کی روشنی میں ایک مکمل نظام فکر تیار کر لیا۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ اس تحریک کے خلاف ردّعمل شروع ہوا تو اشعری مکتب فکر نے جنم لیا۔ انھوں نے صفات کو عین ذات نہ مانا۔ یہ لوگ عقل کا ردّ نہیں کرتے تھے مگر انھوں نے یونانیت کے خلاف کامیابی کیساتھ احتجاج کیا۔ ان کے قائم کردہ تصورات آج بھی منکرینِ اسلام کے لئے قابل قدر ہیں۔ ان دونوں مکاتب کے بین بین ایک اور مکتبِ فکر ماتریدیہ نے جنم لیا۔ اہل تصوف کی طرف نظر کریں تو ان کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ہستی میں کامل یقین اس کی معرفت اور اس سے تقرب کی آرزو میں زندگی کا ایک اور ہی مسلک نظر آتا ہے، جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے اثبات اور معرفت کا راستہ علم اور عقل کی بجائے صوفیانہ وارداتِ قلبی کی بدولت طے ہوتا ہے۔ بعض امور پر آکر دونوں طرح کے اندازِ فکر کے ڈانڈے مل جاتے ہیں، مثلاً ابن عربی کے ہاں فلسفہ اور تصوف کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان سے نظریۂ وحدت الوجود منسوب کیا جاتا ہے۔ جس کی رُو سے وجود اور ہستی صرف اللہ کی ہے۔ باقی سب اسی کا ظہور ہے، چونکہ اس میں مخلوق کی انانیت اور انفرادیت کی نفی ہوتی تھی۔ اس لئے ایک ایسا ردّعمل شروع ہوا جسے آج عجمی تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے سب سے بڑے مبلغ حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کا پرتو ہے۔ مگر وہ خود اس سے الگ ہے۔ گویا ذاتِ الٰہیہ ہر شے کا عین نہیں۔

الٰہیات اسلامیہ پر کام کرنے والے دیگر مشاہیر میں امام غزالی، ابن حزم، ابن تیمیہ ابن خلدون اور الشہرستانی قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً ابن تیمیہ اور امام غزالی کا ذکر کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابن تیمیہ کی ذات میں تمام مکاتب فکر جمع ہو چکے تھے ان کے استنباطِ نتائج سے مغرب نے اور امام غزالی کی تصانیف سے فلسفۂ حاضر نے خاصا اثر لیا۔ جدید دور میں شاہ ولی اللہ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد علامہ اقبال آتے ہیں، جنھوں نے مشرق و مغرب کے افکار و خیالات، علمی و مذہبی رجحانات و تحریکات کا جائزہ لینے کے بعد الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کی۔ ان کے نزدیک ذات الٰہیہ ایک مطلق "انا" (خودی) ہے۔ ان سے ہمارا ذہن مولانا روم کی طرف جاتا ہے۔ جنھوں نے الٰہیات کے بنیادی اور متفق علیہ امور کو پیش کیا ہے۔

یہی وہ امر تھا، جس کی بنا پر ملت اسلامیہ مختلف مکاتب فکر میں بٹ گئی اور ان کے متبعین کی شدتِ پیروی نے فرقہ پرستی کو جنم دیا۔ تاہم ان سب کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور بنیادی امور میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ واحد ہے، موجود ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر وہ علیم و خبیر اور رحمان و رحیم ہے۔

(نیز دیکھئے "اسماء الحسنیٰ"، "توحید" اور دیگر متعلقہ عنوانات)

اللّٰہ اکبر، "اللہ بہت بڑا ہے" کلمۂ تکبیر۔ نماز اور اذان کے آغاز میں یہ کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ نیز حلال جانوروں کو ذبح کرنے کے شرعی حکم کو کرنے، اعلانِ جہاد کرنے اور اظہارِ تعجب کرنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (نیز دیکھئے "تکبیر")

اللّہب، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۱ ویں سورت۔ ایک رکوع اور پانچ آیات پر مشتمل ہے مکی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اسے سورۂ تبت بھی لیتے ہیں

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ حق سے دشمنی کرتے ہیں ان کا انجام ہلاکت ہے چنانچہ ابولہب جو آنحضرتؐ کا چچا تھا حق کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ جب آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے رشتہ داروں کو ڈراؤ تو آپؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر سب قبیلوں کو آواز دی جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے سے ایک دستہ حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم لوگ اسے سچ مانو گے سب نے کہا کہ ہم نے آپؐ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں تمھیں ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اس پر ابولہب نے کہا کہ تو ہلاک ہو۔ تو نے ہمیں ہر شخص اس لیے جمع کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوبؐ کی شان میں اس کی یہ گستاخی ناپسند آئی۔ اور یہ سورت نازل ہوئی۔ اس سورت میں ابولہب اور اس کی بیوی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان دونوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو شخص بھی حق کی مخالفت کرے گا اس کا یہی انجام ہوگا۔

اللّٰھُمَّ "یا اللہ"، "اے اللہ"۔ ندا یہ کلمہ جو مالک حقیقی کو پکارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اسے کبھی لاہم بھی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ تاکید اور سوال کے جواب کو سامع کے ذہن میں اتارنے کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ بعض مستشرقین کے نزدیک اللھم اصلاً عرب کے عام معبودوں سے مختلف اور بلند تر معبود (اللہ) کے لئے مخصوص تھا۔ عرب میں معاہدات کا آغاز عام طور پر باسمک اللھم سے کیا جاتا تھا۔

اللیل، سورۃ قرآن پاک کی ۹۲ ویں سورت۔ اس میں ایک رکوع اور اکیس آیات ہیں کہ میں نازل ہوئی۔

الیل کے نام میں اشارہ ہے کہ جس طرح رات اور دن ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح سے نیک کام کرنے والا اور نیکی کے لئے جدوجہد کرنے والا اس شخص سے بالکل مختلف ہے جو حق کو جھٹلاتا ہے۔ سورت کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی تو وہ ہے جو اپنا مال دیتا ہے اور پرہیزگاری اختیار کرتا ہے تیسرے یہ کہ اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرا شخص بخل کرتا ہے اور خدا کی رضا کی پرواہ نہیں کرتا نیز بھلی بات کو جھٹلاتا ہے۔ ان خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ پہلی تین خصوصیات کے حامل لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نیکی کی زندگی آسان کر دے گا۔ اور ان کے لئے نیکی کرنا آسان ہو جائے گا۔ اسی طرح سے دوسری قسم کی خصوصیات کے حامل لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ بدی کا راستہ آسان کر دے گا۔ اور ان کے لئے بدی کرنا اور نیکی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ آیت ۱۱ سے ۱۲ تک میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے رسول اور کتاب بھیج کر یہ بتا دیا ہے کہ سیدھا راستہ کونسا ہے اور ٹیڑھا کونسا۔ نیز یہ کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہے تم دونوں میں سے جس کو بھی طلب کرو گے وہی تمھیں مل جائے گی اور جو اس بھلائی کی دعوت کو جھٹلائے گا اس کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور جو اس بھلائی کو قبول کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ خوش کر دے گا اور خود بھی اس بندے سے راضی ہو جائے گا۔

الٓمٓ:۔ قرآن مجید کی مختلف سورتوں کے پہلے آنے والے حروف۔ (دیکھئے الف، لام، میم)

Marfat.com

الماعون، سورۃ قرآن مجید کی ۱۰۷ ویں سورت ایک رکوع اور سات آیات پر مشتمل ہے مکہ میں نازل ہوئی۔ بعض مفسرین نے اسے مدنی کہا ہے۔

ماعون کے معنی زکوٰۃ اور خیرات کے ہیں۔ اس سورت کے آخر میں یہ لفظ آیا ہے اسی کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتا۔ اس کے اندر اس قسم کی عادات پیدا ہوتی ہیں کہ وہ یتیم کو دھکے مارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا اور خیرات کو روکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی منافقین کا حال بتایا گیا ہے کہ جو لوگ محض دوسروں کو دکھانے کی خاطر نماز پڑھتے ہیں اور اس کی اصل روح سے ناواقف ہیں اور ایک بوجھ سمجھتے ہوئے یہ کام کرتے ہیں ان کے لئے تباہی ہے

اصل میں اس سورت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ عقیدہ آخرت کے بغیر مضبوط اور پاکیزہ کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔

الماوردی:۔ مشہور مسلمان مفکر۔ (دیکھیے "ماوردی")

المائدہ، سورۃ قرآن مجید کی پانچویں سورت۔ اس میں ۱۶ رکوع اور ۱۲۰ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔ مائدہ کے معنی "خوان" کے ہیں۔

جس زمانے میں یہ سورت نازل ہوئی اس وقت مسلمانوں کی ایک اپنی علیحدہ تہذیب بن چکی تھی۔ جو دوسروں سے بالکل الگ تھی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی نشست و برخاست، بول چال، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے بالکل مختلف ہو چکے تھے۔ چنانچہ مسلمان اب اس مقام پر تھے جہاں انہیں اسلامی تہذیب کو بالکل علیحدہ شکل دینے میں مزید تعلیمات اور ہدایات کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس سورت میں مسلمانوں کو اس بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

اس سورت میں مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے بارے میں مزید احکامات دیئے گئے ہیں مثلاً آغاز میں حلال و حرام کی قطعی حدود قائم کی گئی ہیں۔ اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ وضو، غسل اور تیمم کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔ عیسائیوں کے اس عقیدے کی اصلاح کی گئی ہے جو ان کا حضرت مسیحؑ کے بارے میں تھا۔ بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کے بیٹے یا خدا نہیں ہیں اگر اللہ انہیں اور ان کی ماں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اللہ کو اس ارادے سے باز رکھ سکتا۔

چور، باغی اور فسادی کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ نیز شراب، جوا قطعی حرام قرار دیا گیا قسم توڑنے کا کفارہ بتایا گیا اور گواہی کے سلسلے میں مزید چند باتیں بتائی گئی ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا ذکر کر کے مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ موسیٰؑ کی قوم کے لوگوں جیسا طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو کہہ دیا تھا کہ تم خود اور تمہارا اللہ جا کر ان سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

اب چونکہ مسلمان ایک حکمران گروہ بن چکے تھے اور طاقت اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے اس لیے بتایا گیا کہ وہ عدل پر قائم رہیں اور کسی دوسری قوم پر زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ نیز یہ کہ انہوں نے جو عہد اللہ سے کیا ہے اس پر کاربند رہیں اور اہل کتاب کی طرح اس عہد کو توڑ کر اس ذلت والے انجام سے دوچار نہ ہوں جو انجام انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام معاملات کے فیصلے کرتے وقت کتاب الٰہی کے پابند رہیں۔ اور منافقت سے کام نہ لیں۔

سورت کے آخری حصہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کو مخاطب کر کے ان کے غلط عقائد پر بحث کی گئی ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ اب بھی وہ اپنی پرانی روش کو ترک کر کے آنحضورؐ کی رسالت پر ایمان لے آئیں۔

آخری آیت میں بتایا گیا ہے کہ ساری زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ کے لئے ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

المجادلہ، سورۃ قرآن مجید کی ۵۸ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ۲۲ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

سورت کے پہلے رکوع میں ایک خاتون کا ذکر کیا گیا ہے جس نے اپنے شوہر کے ظہار کا معاملہ رسولؐ اللہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ ظہار کے شرعی احکامات بیان کئے گئے ہیں۔

دوسرے رکوع میں مسلمانوں کو مجلس کے آداب بتائے گئے ہیں اور ان برائیوں کو دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس میں پہلے لوگ اور اس وقت کے لوگ مبتلا تھے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر کسی کا اہم شخصیت کے ہاں جائے تو وہاں جم کر بیٹھ نہ جائے۔ کیونکہ اس بات سے آنحضورؐ کو بھی سابقہ پیش آتا تھا۔ اور کئی ضروری کام رک جاتے تھے۔

تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ سچے اور مخلص لوگ مسلم معاشرے میں کون سے ہیں۔ اور مخلص ہونے کا معیار بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کے بارے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے خواہ ان کا کوئی باپ، بھائی، بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ کی جماعت میں شامل ہونے کا شرف انہی کو ہے اور ان ہی سے اللہ تعالےٰ راضی ہے اور وہی فلاح پائیں گے۔

المدثر، سورۃ قرآن پاک کی ۷۴ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۵۶ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ کی ابتدائی سات آیات دوسری وحی کی ہیں جو آنحضورؐ پر نازل ہوئی۔ پہلی وحی کے نزول کے بعد کچھ عرصہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا۔ آنحضرتؐ بہت پریشان رہنے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس وقت آپؐ پر شدید غم و رنج کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ جبرئیلؑ آپؐ کے پاس آتے اور کہتے کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ آپؐ نے خود فرمایا ہے کہ ایک روز میں راستے سے گذر رہا تھا تو میں نے آسمان سے یکایک ایک آواز سنی اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آتا تھا آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر آ کر کہا کہ مجھے اڑھاؤ۔ مجھے اڑھاؤ۔ گھر والوں نے مجھے کمبل اوڑھا دیا۔ اس وقت یہ سورت نازل ہونا شروع ہوئی

سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اے "اوڑھنے والے" اٹھ اور خبردار کر اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر، نیز منکرین حق کو بتایا گیا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا برا انجام وہ قیامت کے روز دیکھیں گے۔ اسی رکوع میں اس شخص کا بھی ذکر ہے جس نے آنحضورؐ کو جادوگر قرار دیا تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ قوم سے انعام لینا چاہتا تھا حالانکہ وہ انعام کا نہیں جہنم کا سزاوار ہے

دوسرے رکوع میں جہنم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کیسی ہے اور کون سے لوگ اس کے مستحق ہیں۔ نیز کفار کے انکار کی اصل وجہ بتائی گئی ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اس لئے بے خوف ہیں اور اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کو کسی کے ایمان کی ایسی ضرورت نہیں کہ وہ کفار کی شرطیں پوری کرے۔ بلکہ قرآن تو ایک نصیحت ہے جو لوگوں کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ جو چاہے اسے قبول کرے۔ نیز اس بات کا صرف اللہ مستحق ہے کہ لوگ اس سے ڈریں اور وہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

Marfat.com

المرسلٰت، سورۃ قرآن مجید کی ۷۷ ویں سورت۔ اس میں ۲ رکوع اور پچاس آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ مراسلات سے مراد ہواؤں کی جماعتیں ہیں۔

سورت کے پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ قیامت جس کی خبر آنحضرتؐ نے لوگوں کو دی ہے ضرور آکر رہے گی۔ اس بارے میں دلائل بھی دیئے گئے ہیں کہ اللہ جو اس سارے نظام کو قائم کئے ہوئے ہے۔ اس کے لئے قیامت قائم کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ نیز کفار مکہ کے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ وہ قیامت کو تب مانیں گے جب وہ آئے گی۔ اس بارے میں کہا گیا ہے کہ قیامت کوئی کھیل اور تماشا نہیں ہے کہ جونہی اس کے دکھانے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ دکھا دی جائے۔ بلکہ اس کا ایک دن مقرر ہے اور جب لوگ اسے دیکھیں گے تو حواس کھو بیٹھیں گے۔

سورت کے دوسرے رکوع میں ان لوگوں کے بارے میں ذکر ہے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرکے اپنی عاقبت سنوار لی۔ اس کے ساتھ جیسا کہ قرآن کا اسلوب ہے ان لوگوں کو مخاطب کرکے جو آخرت کے منکر تھے کہا گیا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے لہذا جتنے مزے اڑانا چاہو، اڑا لو آخر انجام کار اس عذاب میں داخل ہوگے جو بہت المناک ہے۔

المریم، سورۃ قرآن پاک کی ۱۹ ویں سورت۔ اس میں چھ رکوع اور ۹۸ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ جب چند مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور جب ان کی پیشی نجاشی کے دربار میں ہوئی تو حضرت جعفرؓ طیار نے یہی سورت بھرے دربار میں پڑھی تھی۔

سورت کے پہلے رکوع میں حضرت یحییٰؑ کا ذکر ہے نہ صرف ان کی بے گناہی ثابت کی گئی ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے حضرت عیسٰیؑ ہی کافی نہ تھے بلکہ حضرت یحییٰؑ کو بھی اس قوم کی ہدایت پر مامور کیا گیا۔

دوسرے رکوع میں حضرت عیسٰیؑ کے حمل مریم میں آنے، پیدا ہونے اور نبی ہونے کا ذکر کرکے بتایا گیا ہے کہ وہ صرف انسان اور اللہ کے نبی تھے اس سے زیادہ ان کی حیثیت کچھ نہیں تھی۔

تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انہیں بھی اپنے اہل وطن کے ہاتھوں تنگ آکر اپنے وطن سے نکلنا پڑا تھا۔ دوسری طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہیں اور تم لوگ بالکل ان ظالموں کی مانند ہو جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کے گھر سے نکالا تھا۔ نیز ہجرت کرنے والوں کو یہ بھی بشارت دی گئی کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ وطن سے نکل کر ناکام اور تباہ و برباد نہیں ہوئے تھے بالکل اسی طرح مہاجرین کا انجام بھی اچھا ہی ہوگا۔

چوتھے رکوع میں مختلف انبیاء کا ذکر کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نبوت کا سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب سے انسان پیدا ہوا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگئی۔

پانچویں اور چھٹے رکوع میں کفار مکہ کی گمراہیوں پر تنقید کی اور آخر میں اہل ایمان کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ ان مخالفین اسلام کی کوششوں کے باوجود تم بالآخر اللہ کے محبوب بن کر رہو گے۔

المطففین، سورۃ قرآن مجید کی ۸۳ ویں سورت۔ ایک رکوع اور ۳۶ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں بے ایمان تاجروں کی اس ذہنیت کا ذکر ہے جس میں چیزیں تو پورے ناپ تول سے لی جاتی ہیں اور دیتے ہوئے گھٹا کر دیا جاتا ہے۔ نیز اسی طرح کی دوسری خرابیوں کی وجہ ان کا آخرت پر ایمان نہ ہونا قرار دیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اس وقت تک آدمی برائیوں سے بچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کا یہ ایمان نہ ہو کہ ایک روز اس نے اپنے خالق حقیقی کے پاس جانا ہے اور وہاں اس دنیا میں کئے گئے تمام اعمال کی جواب دہی ہونا ہے۔ نیز یہ کہ بدکار لوگوں کو آخرت میں سخت تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور ان کے مقابلے میں نیک لوگوں کے انجام کا بھی ذکر ہے۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ مخالفین جو آج اہل حق کی تحقیر و تذلیل کر رہے ہیں قیامت کے روز اپنا انجام بہت برا دیکھیں گے۔

المعارج، سورۃ قرآن مجید کی ۷۰ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۴ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں ایک طرف تو مومنوں کو بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ان صفات کو جن کا اس سورت میں ذکر ہے تزکیہ نفس کے لئے اپنے اندر داخل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لئے بہت بلند درجات ہیں۔ دوسری طرف ان کفار کو جو آنحضورؐ کی دعوت کا مسلسل انکار کئے چلے جا رہے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ کا عذاب مانگنے کی بجائے وہ بھی ان صفات کو اپنے اندر پیدا کریں۔

ابتدائی آیات میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ کو جھٹلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ وہ عذاب جس سے ہمیں ڈرایا جاتا ہے جلدی آئے۔ ان پر وہ عذاب ضرور آکر رہے گا اور جب وہ عذاب ان پر آجائے گا تو کوئی اسے ان پر سے ٹال نہیں سکے گا۔ لیکن اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرتؐ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ اگلی آیات میں قیامت کا نقشہ کھینچ کر بتایا گیا ہے، جس کا یہ منکرین مذاق اڑا رہے ہیں جب وہ ان پر واقع ہو جائے گی تو اس پر انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کیسی سخت چیز ہے اس وقت یہ لوگ اپنی عزیز سے عزیز ترین چیز اس کے فدیہ میں دینے کے لئے تیار ہوں گے مگر ان سے کوئی چیز اس عذاب کے بدلے میں قبول نہیں کی جائے گی اور اس عذاب سے وہ کسی طرح بھی نہیں بچ سکیں گے۔

سورت کی درمیانی آیات میں ان صفات کا ذکر ہے کہ جن کو اختیار کرنے والے اللہ کے ہاں بلند درجات پائیں گے۔ مثلاً خدا خوفی، آخرت پر ایمان، پابندی صلوٰۃ، خدا کے محتاج بندوں کا اپنے مال سے حصہ ادا کرنا، بدکاریوں سے اپنے دامن کو بچانا، امانت میں خیانت نہ کرنا، اپنے وعدوں کا پاس کرنا، سچی گواہی دینا وغیرہ۔

آخر میں کفار مکہ کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ اگر تم آنحضورؐ کا مذاق اڑانے اور تکالیف پہنچانے سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو اللہ اور رسولؐ کی فرمانبردار ہوگی۔ نیز رسول اللہ کو بتایا گیا کہ آپ ان لوگوں کی پرواہ نہ کریں، ورنہ انہیں اسی حالت میں پڑا رہنے دیں۔ حتیٰ کہ برا انجام دیکھ لیں۔

الملک، سورۃ قرآن مجید کی ۶۷ ویں سورت۔ اس کے دو رکوع اور تیس آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

سورت کے نام میں اشارہ اس طرف ہے کہ ایک خدا کا قانون ہی ساری دنیا میں چلتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔

اس سورت میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس کارخانہ قدرت میں جس میں کوئی

Marfat.com

نقص نہیں ملے گا اور جسے خدائے واحد ہی عدم سے وجود میں لایا ہے، بلا مقصد پیدا نہیں کر دیا گیا بلکہ وہ یہاں امتحان کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء کو بھیج کر لوگوں کو ان نتائج سے خبردار کیا گیا ہے جن سے آخرت میں واسطہ پڑے گا۔ اگر تم لوگ انبیاء کی بات مان کر اپنے اعمال درست نہیں کرتے تو تمہیں آخرت میں جو سزا ملے گی اس کے مستحق ہونے کا تم خود اعتراف کرو گے۔ نیز اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال سے جو وہ کرتے ہیں بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ ان کے دلوں کے حال تک سے واقف ہے۔ لہٰذا جو اس ان دیکھے خدا کی بازپرس سے ڈر کر اچھے اعمال کرے گا وہی بھلائی کا مستحق ہوگا۔

سورت کے آخری نصف حصہ میں بتایا گیا ہے کہ ان چیزوں سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہیئے جو ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے ہیں۔ ایک زمین ہی کو لے لو جس پر تم اطمینان سے چلتے پھرتے ہو اور اس سے اپنا رزق حاصل کرتے ہو۔ اس خدا ہی نے اسے تمہارا مطیع کیا ہوا ہے ورنہ اس میں ایسا زلزلہ آ سکتا ہے جو تمہیں بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ پرندوں کی طرف دیکھو کہ اللہ ہی ہے جو انہیں فضاؤں میں تھامے ہوئے ہے۔ اگر وہ تمہیں عذاب میں ڈال دے تو اور کون ہے جو تمہیں اس عذاب سے بچا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے کہ اگر وہ تمہارا رزق بند کر دے تو کوئی اور تمہیں دے سکے۔ چنانچہ لازماً تمہیں اپنے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ نبی کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ اس وقت کے آنے سے قبل تمہیں خبردار کر دے۔ نیز یہ کہ تم جو رسول اللہ اور ان کے اصحاب کی ہلاکت کی دعائیں مانگتے ہو اس سے تمہیں کیا چاہیئے وہ ہلاک ہوں یا نہ ہوں تم اپنی فکر کرو کہ اگر تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا تو تمہیں کون بچائے گا۔

سورت کے بالکل آخر میں کفار کے سامنے ایک سوال رکھ کر انہیں غور کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے کنوؤں کا پانی جس پر تمہاری ساری زندگی کا انحصار ہے زمین میں اتر کر غائب ہو جائے تو پھر اللہ کے سوا اور دوسرا کون ہے جو تمہیں لا کر دے سکتا ہے؟

الممتحنہ، سورۃ قرآن مجید کی ۶۰ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور تیرہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔

سورت کی دسویں آیت میں ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں ان کا امتحان لیا جائے۔ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام الممتحنہ رکھا گیا ہے۔

اس سورت میں ایک صحابی حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی جو انہوں نے اپنے اہل و عیال کو بچانے کی خاطر کی تھی۔ اس نے آنحضورؐ کے ایک نہایت اہم جنگی راز سے اہل مکہ کو مطلع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ کوشش بروقت ناکام نہ ہو جاتی تو فتح مکہ کے موقع پر بڑی تباہی کا باعث بنتی۔ چنانچہ اس سورت میں تعلیم دی گئی کہ مومنوں کا کفار کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق خواہ وہ کسی غرض کے لئے ہو ناجائز ہے۔

اس سورت میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ مسلمان عورت کے لئے کافر شوہر حلال نہیں ہے اور مسلمان مرد کے لئے کافر عورت جائز نہیں۔ یہ مسئلہ اس وقت بہت پیچیدگی پیدا کر رہا تھا جب کہ مکہ سے بہت سی مسلمان عورتیں ہجرت کر کے کسی نہ کسی طرح مدینہ پہنچ رہی تھیں اور اسی طرح مدینہ میں بہت سے مسلمان ایسے تھے جن کی بیویاں کافر تھیں اور مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔

اس سورت میں رسول اللہ کو ہدایت فرمائی گئی کہ جو عورتیں اسلام قبول کریں ان سے آپؐ ان بڑی بڑی برائیوں سے بچنے کا عہد لیں جو عرب معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان سے یہ اقرار لیا جائے کہ وہ بھلائی کے ان تمام طریقوں کو اختیار کریں جن کا حکم اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے۔

المنافقون، سورۃ قرآن مجید کی ۶۳ ویں سورت، اس میں دو رکوع اور گیارہ آیات ہیں۔ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں منافقوں کا ذکر ہے جو منہ سے کچھ کہتے تھے اور دل میں کچھ رکھتے تھے۔

سورت کے پہلے رکوع میں منافقین کے بارے میں ذکر ہے کہ وہ جب آنحضورؐ کے سامنے آتے ہیں تو قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یقیناً آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں لیکن انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ نیز بتایا گیا کہ یہ پکے دشمن ہیں ان سے بچ کر رہیں۔ اس رکوع میں آنحضورؐ کو مخاطب فرما کر کہا گیا کہ آپؐ خواہ ان کے لئے مغفرت کی کتنی ہی دعائیں کریں اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

دوسرے رکوع میں مومنوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو غافل ہو جائے گا وہی خسارہ مند ہوگا۔ قبل اس کے کہ جب مہلت پوری ہونے کا وقت آ جائے جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔ اللہ کی یہ سنت نہیں کہ وہ وقت پورا ہو جانے کے بعد کسی کو مزید مہلت دے۔

الم نشرح، سورۃ قرآن مجید کی ۹۴ ویں سورت۔ ایک رکوع اور آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔

ابتدا میں ان تین نعمتوں کا جو رسول اللہ کو دی گئی تھیں ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے آپؐ کو دل شکستہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا سینہ کھول دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جو بوجھ نبوت سے پہلے آپؐ کی کمر توڑے دے رہا تھا وہ اتار دیا۔ تیسرے یہ کہ آپؐ کا ذکر سب سے بلند کیا گیا ہے۔

ان نعمتوں کو گنوا کر رسول اللہ کو اطمینان دلایا گیا ہے یہ دور جس سے آپؐ کو اب واسطہ ہے لمبا نہیں ہے بلکہ اس تنگی کے دور کے ساتھ ہی آسانی کا دور بھی آنے والا ہے۔ سورت کے آخر میں رسول اللہ کو بتایا گیا ہے کہ ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے جو اس وقت آپؐ کو پیش آ رہی ہیں آپؐ اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر عبادت کی مشقت اور ریاضت میں لگ جائیں اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ سے لو لگا لیں۔

الموت قزوین سے شمال مشرق کی سمت واقع پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا قلعہ جو ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء سے ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء تک ایک نیم خود مختار ریاست کا مرکز اور حسن بن صباح کی بنائی ہوئی جنت رہا۔ کہتے ہیں کہ کسی دیلمی بادشاہ نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ حسن علوی نے ۲۴۶ھ/۸۶۰ء میں اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں اسماعیل نزاری فرقہ کے بانی حسن بن صباح نے اس پر قبضہ کیا۔ اس فرقے کو حشیشین بھی کہا جاتا ہے۔ ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں منگولوں نے حشیشین کو شکست دی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶۷۴ھ/۱۲۷۵ء حشیشین نے اسے دوبارہ فتح کیا۔ مگر بہت جلد یہ ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ آج کل یہ قلعہ کھنڈر ہو چکا ہے۔ تاہم اس کے ارد گرد کے علاقے اور صوبے کا نام الموت ہی ہے۔

النّازعات، سورۃ قرآن پاک کی ۷۹ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۶ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ نازع کے معنی اپنے آپ کو

Marfat.com

کھینچ کر نکال لینے والی جماعت۔

اس سورت میں قیامت اور حیات بعد الموت کے ثبوت دیئے گئے ہیں نیز بتایا گیا کہ رسولوں کو جھٹلانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

شروع سورت میں مختلف فرشتوں کی قسم کھا کر بتایا گیا ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی اور موت کے بعد دوسری زندگی ضرور آکر رہے گی۔ نیز لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ کام جسے تم ناممکن سمجھ رہے ہو اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی دشوار کام نہیں ہے، جس کے لیے کسی بڑی تیاری کی ضرورت ہو صرف ایک جھٹکا دنیا کے تمام نظام کو درہم برہم کر دے گا۔ اور دوسرے لمحے میں تم اپنے آپ کو اللہ کے سامنے موجود پاؤ گے اور وہ لوگ جو اس کا انکار کر رہے ہیں خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔ سورت کی آیت ۱۵ تا ۲۶ تک حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ مختصراً بیان کر کے لوگوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ رسول کو جھٹلانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا اس عظیم الشان کائنات کی تخلیق؟۔ نیز یہ کہ آخرت ہوگی تو انسان کے ابدی اور دائمی مستقبل کا فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ کس نے دنیا میں بندگی کی حد سے تجاوز کر کے دنیاوی فوائد اور لذتوں کو مقصود بنالیا۔ اور کس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے خوف سے اپنی ناجائز خواہشات کو پورا ہونے سے روکا۔ اس کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ قیامت کے آنے کا وقت صرف اللہ ہی کو معلوم ہے کسی اور کو نہیں۔ رسول کا کام صرف لوگوں کو خبردار کر دینا ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کی اپنی مرضی ہے کہ جو چاہے سیدھا راستہ اختیار کرے اور اپنے اعمال درست کرے اور جو چاہے شُتر بے مہار کی طرح چلتا رہے۔

الناس، سورۃ

قرآن مجید کی ۱۱۴ ویں اور آخری سورت یہ ایک رکوع اور چھ آیات پر مشتمل ہے۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت کے نام میں یہ اشارہ ہے کہ لوگوں کا حقیقی تربیت کرنے والا اور حقیقی بادشاہ صرف خدائے واحد ہے اور لوگوں کو اسی رب کی پناہ میں رہنا چاہیئے۔

اس سورت میں سورت الفلق کے مضمون کی تکمیل ہے۔ کیونکہ دونوں سورتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوئیں۔ اس سورت میں صرف ایک چیز سے پناہ مانگنے کی دعا ہے۔ یعنی خناس کے وسوسہ کی شرارت سے بتایا گیا ہے کہ شیطان کا وسوسہ سب سے زیادہ چیز ہے جو انسانوں کو خیرات سے محروم کر دیتا ہے۔ اس سورت میں شیطان کو خناس کہا گیا ہے۔ (نیز دیکھیے سورہ الفلق)

النّباء، سورۃ

قرآن مجید کی ۷۸ ویں سورت۔ اس میں دو رکوع اور ۴۰ آیات ہیں۔ النباء کے معنی اس خبر کے ہیں جس سے عظیم الشان فائدہ حاصل ہو۔

آنحضورؐ نے جب مکہ میں تبلیغ کا آغاز کیا تو دعوت کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی ایک یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسرے یہ کہ آنحضورؐ کو اللہ نے رسول مقرر کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس دنیا کا آخر کار ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد دوسرا عالم برپا ہوگا۔

ان تینوں باتوں میں سے اگرچہ پہلی بات اہل مکہ کو سخت ناگوار تھی لیکن پھر بھی وہ اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ جھگڑا صرف اس بات پر تھا کہ خدائی صفات میں اللہ کیساتھ اور بھی شریک ہیں۔

دوسری بات بھی اگرچہ وہ لوگ ماننے کو تیار نہ تھے۔ مگر یہ بات ان کے لیے ممکن نہ تھی کیونکہ نبوت سے چالیس سال پہلے کی زندگی آنحضورؐ نے انہی کے درمیان بسر کی تھی اور اس پوری زندگی میں انہوں نے آپؐ کو جھوٹا یا فریب کار یا اپنی نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ لہٰذا انہیں نہ صرف دوسروں کو باور کرانے میں بلکہ خود بھی اپنا یقین اس بات پر رکھنے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی کہ دوسرے تمام معاملات میں تو آپؐ سچے ہیں اور صرف نبوت کے دعوے میں جھوٹے۔ لیکن یہ دونوں باتیں ان کے لیے اتنی الجھن کی باعث نہ تھیں۔ جتنا کہ تیسری جونہی یہ بات ان کے سامنے پیش کی گئی انہوں نے سب سے زیادہ اس کا مذاق اڑایا۔

چنانچہ اس دور کی سورتوں میں بار بار اس مضمون کو دہرایا گیا ہے۔ اس سورت کے شروع میں آخرت کے منکروں سے پوچھا گیا ہے کہ یہ زمین جس پر تم چلتے پھرتے ہو اور یہ بلند و بالا پہاڑ جو تمہیں نظر آتے ہیں اور یہ کہ خود تمہیں عورتوں اور مردوں کے جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا۔ نیند جس سے تم کام کرنے کے قابل ہوتے ہو اور رات کا آنا جانا۔ آسمان جو مضبوطی سے قائم کیا گیا ہے۔ سورج جس کی بدولت روشنی اور حرارت ملتی ہے اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کو بھی دیکھ کر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ تمام چیزیں بلا مقصد نہیں بنادی گئیں کہ انسان جو چاہے کرے اور اس سے کوئی باز پرس ہی نہ کی جائے۔ لہٰذا فیصلے کا ایک دن ضرور اپنے مقررہ وقت پر آکر رہے گا۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہوگے گروہ در گروہ اپنا حساب دینے کے لیے آ کھڑے ہوگے۔ جو لوگ اس بات کے قائل نہیں انہیں جہنم کا ایندھن بننا ہے۔ نیز وہ جو اپنے آپ کو اس کائنات میں ذمہ دار اور جوابدہ سمجھ کر اچھے اعمال کرتے ہیں انہیں بتایا گیا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے انعام تیار کیا ہوا ہے جو ان کے اجر سے کہیں زیادہ ہوگا۔

سورت کے آخر میں اللہ کی عدالت کا نقشہ دکھایا گیا ہے کہ وہاں کوئی بلا اجازت اپنی زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ نیز بتایا گیا ہے کہ وہ وقت جس کے آنے کی تمہیں خبر دی جارہی ہے۔ ضرور آکر رہے گا۔ جو اسے مان کر سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہے اختیار کرے۔ ورنہ پھر پچھتانے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

النجم، سورۃ

قرآن مجید کی ۵۳ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ۶۲ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ نجم کے معنی ستارے کے ہیں۔ اس لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقبال کا ستارہ غروب ہونے کو ہے۔

سورت کے ابتدائی حصہ میں بتایا گیا ہے کہ آنحضورؐ بہکے ہوئے یا بھٹکے ہوئے آدمی نہیں ہیں اور وہ جو دعوت پیش کر رہے ہیں انھوں نے اپنے پاس سے گھڑی ہے۔ بلکہ وہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں خالصتاً وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔ اور جو حقیقتیں وہ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں ان کو انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

اس کے بعد کفارِ مکہ کے عقائد پر تنقید کی گئی ہے جو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ رکھے تھے۔ مثلاً لات، عزیٰ وغیرہ کو معبود ٹھہرانا۔ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنانا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اس ساری کائنات کا مالک و مختار اللہ ہی ہے اور وہ ہر نیک اور بد کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔ نیز اسی سورت میں وہ چند باتیں جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں بیان کی گئی تھیں بتائی گئی ہیں۔ تاکہ لوگ آنحضورؐ کی تعلیمات کو نرالی اور نئی تعلیمات نہ سمجھ بیٹھیں۔ ساتھ ہی عاد اور ثمود اور قوم نوحؑ اور قوم لوطؑ کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ اتفاقی حادثات کا نتیجہ نہ تھے۔ آخر میں لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ فیصلے کا وقت اب قریب آگیا ہے اور اسے کوئی

Marfat.com

نہیں ٹال سکتا۔ اور اب تمہیں بھی قرآن مجید اور آنحضورؐ کے ذریعے ان پہلے لوگوں کی طرح خبردار کیا جارہا ہے کہ جو روش تم لوگوں نے اختیار کی ہوئی ہے اس سے باز آجاؤ۔ نیز اس سورت کو جب کفار اور مسلمانوں کی محفل میں سنا کر آنحضورؐ نے سجدہ کیا تو تمام کفار بھی بے اختیار سجدہ میں گر پڑے۔

النحل، سورۃ

قرآن مجید کی ۱۶ ویں سورت۔ اس میں سولہ رکوع اور ۱۲۸ آیات ہیں۔ مکہ میں نازل ہوئی۔ نحل کے معنی شہد کی مکھی کے ہیں

سورت کا آغاز ایک تنبیہی جملے سے کیا گیا ہے کیونکہ کفار مکہ بار بار آنحضورؐ سے کہتے تھے کہ جب ہم تمہاری دعوت کو جھٹلا چکے ہیں تو وہ عذاب ہم پر کیوں نہیں آجاتا جس کی دہمکی ہمیں بار بار دی جا چکی ہے۔ ان کے اس مطالبے پر فرمایا گیا کہ خدا کا عذاب تو تمہارے سر پر تُلا کھڑا ہے۔ اب اس کے آجانے کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔ بلکہ جو مہلت دی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

دوسرے رکوع میں توحید الٰہی پر صحیفۂ قدرت کی شہادت بیان فرمائی ہے تیسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کا منکر ہی عملاً توحید کا منکر ہے۔ چوتھے رکوع میں اس حق کے خلاف جو وحی الٰہی کے ذریعے آیا ہے۔ کفار کی تدابیر کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

پانچویں رکوع میں مشرکین کے غلط بہانوں کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ عذر ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔

چھٹے رکوع میں حق کے دشمنوں کی سزا کا ذکر ہے اور بتایا گیا کہ کس قسم کے عذاب ان پر آئیں گے۔

ساتویں رکوع میں بتایا کہ فطرت انسانی شرک کو قبول نہیں کرتی۔ آٹھویں میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا سے ظلم کو دور کرنے اختلافات مذاہب کو دور کرنے کے لئے ہے۔ نویں رکوع میں وحی الٰہی کی ضرورت کو تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

دسویں رکوع میں اللہ نے اپنی مختلف نعمتوں کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کیا ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی تم لوگ دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔

گیارہویں رکوع میں بتایا گیا کہ قیامت کے برپا ہونے میں کوئی لمبا عرصہ درکار نہیں بلکہ ایک لمحہ میں اللہ تعالےٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔

بارہویں رکوع میں ان لوگوں کا ذکر کر کے جو آج حق کا انکار کر رہے ہیں بتایا گیا ہے کہ جب آخرت قائم ہوگی تو پھر ان منکرین کو کوئی حجت پیش کرنے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا۔ اور پھر نہ ہی توبہ و استغفار کرنے کا وقت ہوگا۔

تیرہویں رکوع میں قرآن کریم کی تعلیم کامل کا ایک نمونہ بتایا اور اس پر قیام کی ضرورت کو واضح کیا گیا۔ چودہویں رکوع میں وحی الٰہی کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ افترا نہیں ہے۔ پندرہویں رکوع میں کفار مکہ کو بتایا گیا کہ ان کی امن و اطمینان کی حالت ان کے کفر کی وجہ سے تبدیل کر دی جائے گی۔

سولہویں رکوع میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کر کے مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ انہیں تبلیغ میں کیا حکمت عملی اختیار کرنا چاہیئے۔ نیز بتایا گیا کہ اللہ کی معیت ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقوے سے کام لیتے ہیں اور دوسروں پر احسان کرتے ہیں۔

النساء، سورۃ

قرآن مجید کی چوتھی سورت۔ اس میں ۲۴ رکوع اور ۱۷۶ آیات ہیں مدینہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں عورتوں کے حقوق اور معاشرت اور خانہ داری کے بارے میں جس تفصیل سے کہا گیا ہے اور کسی سورت میں نہیں۔

سورت کے پہلے رکوع میں یتیموں کے حقوق اور ولیوں کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے رکوع میں حقوق وراثت پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں اور جن رشتہ داروں کے حقوق اسلام مقرر کرتا ہے بیان کئے گئے ہیں۔

تیسرے رکوع میں عورتوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں تعلیمات دی گئی ہیں۔ چوتھے رکوع میں ان عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ پانچویں رکوع میں کچھ نصیحتیں بیان کر کے بتایا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے اموال ناحق مت کھاؤ۔

چھٹے رکوع میں بتایا گیا کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ساتویں رکوع میں تزکیہ نفس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا کہ نماز تزکیہ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ نیز نماز، وضو اور تیمم کے بارے میں کچھ امور کا ذکر کیا گیا ہے۔

آٹھویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اپنے معاملات اہل لوگوں کے سپرد کرنے چاہئیں نیز اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے

اگلے رکوع میں بتایا گیا کہ جو اللہ اور رسول کے فیصلے کو نہ مانیں وہ منافق ہیں اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں ان کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ کن انعامات کے مستحق ہیں

دسویں رکوع میں بتایا گیا کہ حفاظت کے لئے جنگ کی ضرورت ہے لیکن منافقین مصائب سے بچنے کی خاطر جنگ سے جی چراتے ہیں۔ گیارہویں رکوع میں منافقین کا ہی حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح رسولؐ کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلاتے ہیں۔

بارہویں رکوع میں بتایا گیا کہ منافقین کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ تیرہویں رکوع میں مومن کے قتل کی سزا بتائی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا کہ ان لوگوں کا مرتبہ جو جہاد میں شامل نہیں ہوتے" اُن لوگوں سے بہت کم ہے جو جہاد میں شامل ہوتے ہیں

چودہویں رکوع میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی کمزوری کی بنا پر ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے۔

پندرہویں رکوع میں یہ بات بتائی گئی کہ جنگ کے میدان میں بھی نماز ترک نہیں کرنی چاہیئے اور دوران جہاد نماز ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ سولہویں اور سترہویں رکوع میں منافقین کے خفیہ مشوروں کا ذکر کیا گیا ہے

اٹھارہویں رکوع میں شرک کے ہر پہلو سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ انیسویں رکوع میں دوبارہ یتامیٰ اور عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی ہدایت کی گئی۔

بیسویں رکوع میں بتایا گیا کہ عدل کا دامن کبھی تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے خواہ اپنا ہو یا غیر ہو۔ نیز بتایا گیا کہ جو ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی راہ اختیار کرتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

اکیسویں رکوع میں منافقوں کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔ بائیسویں رکوع میں یہودیوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح انہوں نے ایک پاک دامن مریمؑ پر بہتان لگایا اور کس طرح حضرت عیسےٰؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اللہ تعالےٰ نے انؑ کو بخیریت ان کے ہاتھ سے بچا لیا۔

تیسویں رکوع میں آنحضورؐ کی صداقت کی طرف توجہ دلائی اور بتایا گیا کہ جس طرح دوسرے انبیاء سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا ہے اسی طرح سے اس نے اپنی رضا کی

Marfat.com

راہیں آنحضورؐ کے لئے کھول دی ہیں۔ نیز یہودیوں کی طرح عیسائیوں کے غلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انہوں نے بھی ایک بندے کو خدا بنالیا ہے۔

آخری رکوع میں بتایا گیا کہ حضرت مسیحؑ کی شان اللہ کے بندہ ہونے میں ہے نہ کہ خدا ہونے میں۔ اور ساتھ ہی پھر وراثت کا ایک مسئلہ چھیڑا گیا ہے۔

النصر، سورۃ قرآن مجید کی ۱۱۰ ویں سورت، ایک رکوع اور تین آیات پر مشتمل ہے۔ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ لیکن بلحاظ زمانہ یہ مدنی ہے اور بقول حضرت ابن عباس یہ قرآن مجید کی آخری سورت ہے جس کے بعد کوئی مکمل سورت آنحضورؐ پر نازل نہیں ہوئی۔

اس سورت میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آنحضورؐ کو ان کی وفات کی خبر دی گئی ہے یعنی اس سورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب عرب میں فتح اسلام مکمل ہو جائے اور لوگ فوج در فوج اس دین میں داخل ہونے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کار عظیم جس کے لئے آپؐ کو مبعوث کیا گیا تھا مکمل ہو چکا ہے اور اب آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرنے میں مشغول ہو جائیں اور دعا کریں کہ اس خدمت کے انجام دینے میں اگر کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو اسے اللہ معاف کر دے۔

النمل، سورۃ قرآن مجید کی ۲۷ ویں سورت۔ اس میں سات رکوع اور ۹۳ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔ نمل کے معنی چیونٹی کے ہیں۔ اس سورت میں چیونٹیوں کی وادی کا ذکر آیا ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں آخرت کا انکار سب چیزوں سے زیادہ رکاوٹ ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس کتاب کی تعلیمات پر عمل نہیں کر سکتا ہے

اس کے ساتھ ہی مختلف لوگوں کی ذہنیتوں کے چند نمونے بتلائے گئے۔ ایک نمونہ فرعون ثمود اور قوم لوط کے سرداروں کا ہے جو آخرت کی فکر سے بالکل بے نیاز تھے اور اللہ کی بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ اور جنہوں نے انہیں خیر کی طرف بلایا یہ انھی کے دشمن ہو گئے اور یہاں تک کہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر رہے۔ دوسرا نمونہ جو اس سورت میں پیش کیا گیا ہے حضرت سلیمانؑ کا ہے جن کو اللہ نے ہر طرح کی دولت و حکومت اور شان و شوکت سے نوازا تھا۔ اور جس کا سرداران مکہ کے پاس عشر عشیر بھی نہ تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جھکائے رکھتے تھے اور اپنے نفس کے غرور میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔

ایک تیسرا نمونہ جو اس سورت میں پیش کیا گیا ہے وہ ملکۂ سبا کا ہے جو عرب کی ایک دولت مند قوم پر حکمران تھی اور اُسے وہ تمام سامانِ عیش مہیا تھے جن کی وجہ سے ایک شخص غرور اور کبر میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اس پر بھی جب حق واضح ہو گیا تو پھر کوئی چیز اس کو قبول حق سے نہ روک سکی۔ پانچویں رکوع میں کفار مکہ کی اس مرض کو بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان میں یہ سب بگاڑ پیدا ہو رہا تھا اور وہ آخرت پر ایمان کا نہ ہونا ہے۔ اس بحث کا مقصد ان لوگوں کو جھنجھوڑنا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں رکوع میں مخالفین کے انکار کا ذکر کر کے وہ باتیں کہی گئی ہیں۔ جن سے ان لوگوں کا احساس بیدار ہو سکے اور انہیں غفلت برتنے کے نتائج سے متنبہ کیا گیا ہے۔

آخر میں قرآن کی دعوت یعنی ایک اللہ کی بندگی کو مختصر اور مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اس کو ماننا تمہارے لئے ہی بہتر ہے اور اس کا رد کرنا تمہارے لئے ہی نقصان دہ ہے۔

الواح تختیاں۔ اصطلاحاً وہ تختیاں جن پر مذہبی کتاب تورات لکھی گئی تھی۔ قرآن مجید میں سورۃ الاعراف میں اس کا ذکر یوں آتا ہے:۔

"اور ہم نے اس کے لئے الواح میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل فرض کر دی۔ سو اسے مضبوطی سے پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کی بہترین باتیں پکڑے۔ میں تمہیں نافرمانوں کا گھر دکھا دوں گا۔" (۷ : ۱۴۵)

ان تختیوں کی تعداد کیا تھی اور ان میں کن اشیاء کی تفصیل تھی۔ اس کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ عام طور پر ان کی تعداد سات سے دس تک بتائی جاتی ہے۔ نیز تورات میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز جن کی انہیں اس وقت حاجت تھی۔

(نیز دیکھئے "دس احکام")

الواقعہ، سورۃ قرآن مجید کی ۵۶ ویں سورت۔ اس میں تین رکوع اور ۹۶ آیات ہیں مکہ میں نازل ہوئی۔

اس سورت میں آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفار مکہ کے شبہات کو دور کیا گیا ہے ان کے لئے سب سے زیادہ ناقابل یقین چیز قیامت تھی۔ ان کے نزدیک یہ بات ایک افسانہ تھی کہ قیامت برپا ہوگی اور زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور جو لوگ مرت جائیں گے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ ان کے نزدیک یہ سب باتیں خیالی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اس سورت میں بتایا ہے کہ یہ واقعہ ضرور پیش آکر رہنا ہے اور جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو انسان تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ دوسرے داہنی بازو والے اور تیسرے بائیں بازو والے۔ بعد میں بتایا گیا کہ کامیاب و کامران ہونے والے مقربین دائیں بازو والے ہوں گے جو اللہ تعالےٰ کی طرح طرح کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے اور تیسرا گروہ جو بائیں بازو والا ہوگا وہ خسارے میں رہے گا اور برے عذاب میں پھنسا ہوگا یہ وہ شخص ہوگا جو اس دنیا میں آخرت کا منکر ہے۔

الٰہ معبود (جس کی عبادت کی جائے) یہ لفظ معبود مجازی اور معبود حقیقی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ معبود مجازی کے طور پر اسے دیوی دیوتاؤں اور فرضی خداؤں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور معبود حقیقی کے طور پر یہ اللہ تعالےٰ کے لئے بھی مستعمل تھا۔ عرب کے دور جاہلیت میں الٰہ اور اللہ کے الفاظ عام طور پر استعمال ہوتے تھے۔ الٰہ اسم نکرہ کے طور پر اور اللہ اسم معرفہ کے طور پر مستعمل تھا۔ عام طور پر اس ہستی کو الٰہ کہا جاتا تھا جو (۱) پراسرار ہو (۲) ملجا و ماویٰ ہو۔ (۳) آنکھوں سے غائب ہو۔ قرآن مجید میں کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ سے بیان کیا گیا ہے کہ الٰہ کہلانے کا مستحق صرف اللہ ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

الہام علم و ادراک کا ایک ذریعہ۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ الہام کے معنی کسی کے دل میں کوئی بات القاء کرنا کے ہیں۔ جب کہ اس کے لفظی معنی ہیں، "جذب کر دینا"۔

ابن خلدون نے الہام کو وجدان کی ایک صورت خیال کیا ہے۔ ابن حزم کے نزدیک الہام طبیعت کا مترادف ہے۔ ابن اثیر اور السیوطی نے لکھا ہے کہ الہام وحی کی ایک قسم ہے جس سے اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سرفراز کرتا ہے۔ گویا الہام من جانب

Marfat.com

نہ ہوتا ہے۔ یہ اس قسم کی وحی قرار دی جاتی ہے۔ جو الفاظ کی صورت میں نہیں بلکہ مفہوم کے طور پر دل میں اترتی ہے۔ زمخشری کے نزدیک الہام کے معنی عقل و فہم عطا کرنا ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں آیا ہے:۔

فالہمہا فجورہا و تقوٰیہا (۹۱: ۸) اس سے بھی الہام کے معنی اس خیال کے ہیں جو نیکی اور بدی میں تمیز کر سکتا ہے۔ امام غزالی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ الہام علم کا ایک ذریعہ ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ انسان کا نفس ناطقہ جب مجاہدات کے ذریعہ تزکیہ اختیار کر لیتا ہے تو اسے فرشتوں کے ساتھ اتصال حاصل ہو جاتا ہے جس قدر یہ اتصال قوی یا ضعیف ہوتا ہے، اسی نسبت سے اللہ تعالےٰ ایسے حقیقی علوم کے دروازے اس پر کھول دیتا ہے جو دوسروں کی مقدرت سے باہر ہوتے ہیں ایسی حالت میں بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس لطیف جسم سے بالکل علیحدہ ہو کر عالم مادیات کے تعلق سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے علوم غیب کے حصول کے پانچ ذرائع بتائے ہیں۔ جن میں پہلا ذریعہ الہام ہے۔ اس میں نفس انسانی کو عالم غیر مادی سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک یہ حالت کسبی نہیں اور نہ ہی محنت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ قدرت خداوندی کا عطیہ ہے اور وہ جسے چاہتا ہے اس میں ودیعت کر دیتا ہے۔ (نیز دیکھیے "وحی")

الہامی کتب :۔ (دیکھیے "آسمانی کتب")

الٰہی :۔ "میرے معبود"، "میرے اللہ" (نیز دیکھیے "اللہ"، "الٰہ")

الیاسؑ اللہ تعالےٰ کے ایک نبی۔ طبری کے بقول بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر دو جگہ (۶: ۸۵، ۳۷: ۱۲۳) پر نام کے ساتھ آیا ہے۔ ان آیات میں حضرت الیاسؑ کی نبوت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب بنی اسرائیل اللہ تعالےٰ سے برگشتہ ہو کر بعل دیوتا کے پرستار ہو گئے۔ سورہ انعام میں حضرت الیاسؑ کو حضرت نوحؑ کی اولاد میں سے قرار دیا گیا ہے۔ بعض روایات میں انھیں حضرت ادریسؑ ہی قرار دیا گیا ہے جب کہ قرآن مجید میں حضرت الیاسؑ اور حضرت ادریسؑ کا تذکرہ جدا جدا ناموں کے ساتھ ہوا تھا۔

عبرانی زبان اور بائبل میں ایلیاہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، جسے مفسرین نے الیاسؑ ہی کا نام قرار دیا ہے۔ ایلیاہؑ کا تعلق تشبہ نام کے کسی گھرانے سے تھا۔ آپ نے جلعاد کے مقام پر حکومت اختیار کر لی اور پوری زندگی دولت و ثروت اور جاہ و جلال سے بے نیاز ہو کر بسر فرمائی۔ ان کے زمانے میں آخیاب اسرائیل کا بادشاہ تھا۔ اس کی بیوی مشرک تھی اور اسی نے دیوتا بعل کی عبادت رائج کی۔ یہی زمانہ تھا جب ایلیاہؑ منظر عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے جلعاد سے آکر آخیاب کو نوٹس دیا کہ دیکھ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا۔ چنانچہ قحط برپا ہوا جو ساڑھے تین برس تک جاری رہا۔ آخیاب کے ہوش ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت ایلیاہؑ کو بلوایا۔ انھوں نے لوگوں کے سامنے ثابت کیا کہ بعل جھوٹا دیوتا ہے۔ اس کے بعد بارش کے لئے دعا مانگی جو فوراً قبول ہوئی۔ آخیاب کی بیوی ایزبل آپ کی دشمن ہو گئی۔ چنانچہ آپ وہاں سے نقل کر کے سینا پر چلے گئے۔ اسی زمانہ میں یہودہ کے حاکم یہورام نے آخیاب کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اور یہ اثرات وہاں سے نکل کر یہودہ میں بھی پھیلنے لگے۔ حضرت ایلیاہؑ نے یہاں بھی اپنا فریضہ ادا کیا۔ مگر وہ بھی نہ مانا اور عذاب الٰہی کا مستحق ٹھہرا۔ چند برس بعد حضرت ایلیاہؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے آخیاب اور پھر اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ نہ ہو سکا اور آپ کی بددعا سے آخیاب کا گھرانا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے اپنے اس نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے زمانہ میں یہودی بالعموم تین آنے والے نبیوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاسؑ، دوسرے مسیحؑ اور تیسرے "وہ نبیؐ"۔ جب حضرت یحییٰؑ کی نبوت شروع ہوئی اور انھوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا کیا تم مسیح ہو یا ایلیاہ یا وہ نبی؟ انھوں نے کہا میں ان الفاظ میں سے کوئی بھی نہیں۔ جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے تو یہودیوں نے یہی سوال ان سے کیا تو انھوں نے جواب دیا "ایلیاہ تو آچکا۔ مسیح میں ہوں اور "وہ نبیؐ" میرے بعد آئے گا۔"

الیاس دہلوی، مولانا ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء — ۲۲ رجب ۱۳۶۳ھ / ۱۴ جولائی ۱۹۴۴ء

مشہور عالم دین اور تبلیغی جماعت کے بانی۔ تاریخی نام اختر الیاس تھا۔ والد کا نام محمد اسماعیل تھا۔ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ بعد میں دہلی آبسے۔ والدہ مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی نواسی تھیں۔ خاندانی دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ بعد ازاں بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ اپنے ساتھ گنگوہ لے آئے اور خود ہی پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی آپ کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ گنگوہ اس وقت بڑے بڑے علماء و صلحا کا مرکز بنا ہوا تھا، چنانچہ اُن کی تعلیم و تربیت اسی مقدس ماحول میں ہوئی۔ طالب علمی کے زمانہ میں بہت سخت بیمار ہوئے۔ جب بیماری دور ہوئی تو پھر پڑھنا شروع کیا اور دیوبند میں شیخ الہند محمود الحسن صاحب سے ترمذی اور بخاری شریف کی سماعت کی۔

مولانا الیاس نے گنگوہ میں طالب علمی کے زمانہ ہی میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کر لی تھی۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں حضرت گنگوہی کے انتقال کے بعد، مولانا کا زیادہ تر وقت خلوت اور مراقبہ میں بسر ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے بڑا مجاہدہ کیا۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری کہتے تھے کہ مولانا الیاس سے تبلیغ و اشاعت دین کا جو کام لیا گیا اور انہیں جو مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اسی مجاہدے کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۱ء میں مظاہر العلوم سہارنپور میں بطور مدرس تقرری ہوئی۔ بعد میں اپنے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب کی وفات پر دہلی میں اپنے والد اور بھائی کی مسند اور مدرسہ کو سنبھالا۔

میواتیوں کو مولانا سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کیونکہ بہت سے میواتی ان کے والد اور بڑے بھائی کے شاگرد و مُرید تھے۔ انہوں نے مولانا سے میوات تشریف لے جانے کو کہا۔ میوات کا علاقہ غیر متمدن تھا اور اب تک تعلیم سے محروم تھا۔ مولانا نے اُن لوگوں کی بات اس شرط پر قبول کی کہ وہ میوات میں دینی مدرسے قائم کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام کرنے کی شرط قبول کی۔ اگرچہ یہ ان کے لئے بڑی دشوار گزار بات تھی۔ چنانچہ مولانا میوات تشریف لے گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد میوات کے علاقہ میں دینی مدارس کی تعداد سو کے لگ بھگ ہو گئی جو مولانا الیاس کے اخلاص اور سوز کا نتیجہ تھی۔ لیکن بعد میں مولانا کی طبیعت مکاتیب سے غیر مطمئن ہو گئی، کیونکہ طالب علم پڑھائی کے بعد اکثر اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتے تھے اور دین کی کوئی زیادہ خدمت نہیں کر سکتے تھے۔ اس بات کا ذکر مولانا نے سید عطاء اللہ بخاری سے بھی کیا ہے۔

۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء میں مولانا دوسرے حج کے لئے گئے۔ حج کے بعد کچھ عرصہ مدینہ میں رہے۔ اسی قیام کے دوران میں مولانا کو خواب میں امر ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔

Marfat.com

مولانا کے کچھ دن اس پریشانی میں گزرے کہ میں کمزور آدمی کیا کر سکوں گا۔ چنانچہ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء میں حج سے واپسی کے بعد تبلیغی گشت کیا اور لوگوں کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر اسلام کے اوّلین ارکان۔ کلمۂ توحید اور نماز وغیرہ کی تبلیغ کریں شروع شروع میں تو لوگوں میں کچھ حجاب رہا، بعد میں رفتہ رفتہ میواتی لوگ اس کام سے مانوس ہوئے اور میوات کے علاقے سے بہت سی تبلیغی جماعتیں باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئیں؛ مولانا کا خیال تھا کہ گھروں میں اور کاروبار میں رہ کر لوگ دین نہیں سیکھ سکتے۔ لہٰذا یہ کچھ عرصے کے لئے باہر رہیں۔ کچھ خود سیکھیں اور کچھ دوسروں کو سکھائیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب ان پڑھ میواتی گاؤں کے لوگ اہلِ دین کی خدمت میں رہ کر دین سیکھ کر آئے تو اُن کی حالت ہی بدل گئی اور اُن میں دین کا علم سیکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا۔

مولانا کا اس کام کے بارے میں نقطۂ نظر بہت بلند تھا۔ اُن کے سامنے صرف اتنی سی بات نہ تھی کہ صرف عوام الناس نماز، روزہ سیکھ جائیں اور ذکر واذکار کے پابند ہو جائیں بلکہ مولانا پُوری ملّتِ اسلامیہ کو بیدار کر کے، انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کو اسلامی بنانے کی فکر رکھتے تھے۔ خود مولانا کے الفاظ میں:

"ہماری اس تحریک کا اصل مقصد یہ ہے، اِسلام کے پُورے علمی وعملی نظام سے امت کو وابستہ کر دینا۔ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ ونماز کی تلقین وتعلیم گویا ہمارے پُورے نصاب کی ا ب ت ہے"

مولانا نے ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء میں نکاح کیا تھا۔ اولاد میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد یوسف اور ایک صاحبزادی تھی جو مولانا محمد زکریا سے بیاہی گئی۔

مولانا پست قد تھے۔ گندمی رنگ اور دُبلا جسم تھا۔ داڑھی گھنی تھی۔ زبان میں قدرے لکنت، آواز پُرجوش، طاقت ور اور عالی ہمت کہ تبلیغ کے سلسلے میں پہاڑیوں پر چڑھتے۔ تیز دُھوپ اور گرم لُو برداشت کرتے۔ مئی جون کی گرمی میں میوات کا دورہ کرتے۔ سخت سردیوں میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتے۔

مولانا الیاس کو دیکھ کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابۂ کرامؓ یاد آ جاتے ہیں۔

الیسعؑ ایک نبی۔ جو تورات کے مطابق ایلیاہؑ (الیاسؑ) کے بعد مبعوث ہوئے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر نام کے ساتھ دو جگہ (۶ = ۸۶ تا ۸۹) اور (۳۸ = ۴۸) پر آیا ہے۔ صاحب شریعت تھے۔ عہد نامہ عتیق میں انھیں الیشع لکھا گیا ہے۔ کتاب سلاطین اوّل کے ایلیاہؑ نے اپنی چادر سافط کے بیٹے الیشع پر ڈال دی۔ تب سے وہ ایلیاؑ کی خدمت میں رہنے لگے۔ سلاطین دوم میں الیسعؑ کے معجزات کا ذکر ملتا ہے۔ جب آپ کو بعثت ملی یورام شاہ اسرائیل تھا۔ اور آخزیاہ شاہ یہودہ اور وفات کے وقت یوآس شاہ یہودہ تھا۔ تاریخ سے تورات کے بیانات کی بہت کم تصدیق ہوتی ہے۔ تاہم یہ پتا چلتا ہے کہ الیسعؑ نے ارامیوں سے جنگ کے تاریک ایام میں بنی اسرائیل کی معاونت اور حوصلہ افزائی کی تھی۔

اُمِّ ابی ھریرہؓ امیمہ بنت صفیح بن حارث، مشہور صحابیہ، حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ آنحضورؐ نے خود ان کے مسلمان ہونے کے لئے دعا فرمائی تھی۔ ایک دن انہوں نے آنحضورؐ کی شان میں نامناسب الفاظ کہے۔ ابوہریرہ کو سخت صدمہ ہوا اور روتے ہوئے آپؐ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ میری ماں کے لئے دعا فرمائیے کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ اللہ نے یہ دعا قبول فرمائی۔

اُمّ الفضل رضؓ لبابہ بنت حارث بن حزن، مشہور صحابیہ، ام المومنین حضرت میمونہؓ اور حضرت اسماءؓ بنت عمیس کی بہن تھیں اور آپکی ماں ہند بنت عوف تھیں

آپ آنحضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے بیاہی گئیں۔ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ کے بعد ایمان لائیں۔ اپنے شوہر حضرت عباسؓ کے ایمان لانے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ آپ کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں میں فضل، عبداللہ معبد، عبیداللہ، قثم، عبدالرحمان اور بیٹی اُمِ حبیبہ ہیں۔ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں ... نماز جنازہ حضرت عثمان غنیؓ نے پڑھائی۔

آپ سے تیس احادیث مروی ہیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا "ام الفضلؓ، سلمیؓ میمونہ اور اسماءؓ چاروں مومنہ بہنیں ہیں۔" نہایت پرہیزگار اور عبادت گذار تھیں حضرت امام حسینؓ کو اپنا دودھ پلایا اور ان کی کفیل بن گئیں۔ اس وجہ سے سارا خاندان نبوت ان کی بہت عزت وتکریم کرتا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت ام الفضلؓ کو رسول کریمؐ کے ساتھ حج کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

اُمّ القریٰ بستیوں کا مرکز۔ عام طور پر مکہ معظمہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد بار (۶ = ۹۲)، (۴۲ = ۷)، (۲۸ = ۵۹) آیا ہے اکثر مفسرین کا قول ہے کہ اس سے مراد مکہ معظمہ ہی ہے۔ کیونکہ وہی قدیم دنیا میں ایک مرکزی شہر کی حیثیت رکھتا ہے بیت اللہ بھی وہیں ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا مرکزِ رجوع بھی وہی ہے۔ ابن درید کا قول ہے کہ مکہ معظمہ کو ام القریٰ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ دنیا کے وسط میں ہے۔ (نیز دیکھئے مکہ معظمہ

اُمّ الکتاب اصل کتاب، اساسی کتاب۔ عام طور پر اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ تین بار (۳ = ۷)، (۱۳ = ۳۹) (۴۳ = ۴) آیا ہے۔ تفسیر "روح المعانی" میں ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ بھی ہے۔ نیز وہ آیات جو اپنے مطالب کی توضیح کے لئے کسی دوسری چیز کی محتاج نہیں اور اپنی جگہ راسخ اور مستحکم ہیں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ام الکتاب اوّل تا آخر قرآن مجید ہے (نیز دیکھئے قرآن مجید)

اُمّ المومنین مومنوں کی ماں۔ اس کی جمع امہات المومنین ہے۔ یعنی مومنوں کی مائیں۔ یہ خطاب ازواج مطہرات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ سورۃ الاحزاب میں آیا ہے۔ "نبیؐ سے مومنوں کو اپنی جان سے زیادہ لگاؤ ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔" (۳۳ = ۶)

ام المومنین کا لقب آنحضورؐ کی ہر زوجہ مطہرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور پہلی بار حضرت زینبؓ بنت جحش کے نکاح (یکم ذی قعدہ ۵ھ / ۲۴ مارچ ۶۲۷ء) کے موقع پر استعمال ہوا۔ چونکہ آنحضورؐ کے بعد آپؐ کی ازواج کے ساتھ کسی اور کے نکاح کو منع قرار دے دیا گیا اور نہ ہی انھوں نے ایسا کیا اس لئے انھیں امہات المومنین کہا گیا ہے اور یہ حکم بھی دیا گیا کہ نبیؐ کے قرب میں رہ کر واجب ہے کہ ان کے گھروں میں اللہ کی اور دانائی کی باتیں ہوں۔

اُمّ الولد:۔ (دیکھئے "اُمّ ولد")

امام راہنما، ہادی، پیش رو، (جمع ائمہ) متکلمین کے نزدیک وہ شخص ہے، جو دین کو قائم رکھنے میں رسول اللہ کا خلیفہ (نائب) ہو۔ محدثین کے نزدیک امام سے مراد محدث اور

Marfat.com

شیعہ مفسروں کی اصطلاح میں حضرت عثمان رض کے حکم پر لکھے گئے قرآن مجید کے نسخے امام کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے لوح محفوظ، راستے اور علمبردار اشخاص کو بھی امام کہا جاتا ہے۔

امام کا لفظ خاصے وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ عام طور پر اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی پیروی کی جائے، جس کی اقتدا کی جائے۔ اس لحاظ سے متقی اور حق پرست قائدین امام کہلانے کے مستحق ہیں۔ مسجد میں نماز پڑھنے والے کو بھی امام کہا جاتا ہے اور جہاد میں سپہ سالار کو بھی امام ہی کہا جاتا ہے۔ نیز دینی علوم کے ان ماہرین کو بھی امام کہا جاتا ہے جنھوں نے اجتہاد سے کام لے کر فقہ، حدیث، تفسیر، کلام وغیرہ کی علمی بنیادیں استوار کیں۔

اہل تشیع کے نزدیک امام کا خطاب حضرت علی رض کے لیے مخصوص ہے۔ ان کا فرقہ اثنا عشری حضرت علی رض کے بعد ان کی اولاد میں سے پہلے گیارہ افراد کو امام برحق سمجھتے ہیں۔ فرقہ سبعیہ کے نزدیک اس کے مستحق پہلے سات امام ہیں۔ حضرات حسن رض اور حسین رض کو بھی ان ائمہ کرام میں شامل کیا جاتا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک امام کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔ چار امام مجتہد فی الشرع ہیں امام اعظم ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل۔ کچھ مجتہد فی المذہب ہیں امام ابن تیمیہ۔ امام ابو یوسف، امام ابو داؤد، امام بخاری وغیرہ۔ دیگر علمائے شریعت مثلاً امام غزالی، امام رازی وغیرہ۔ لغات و لسانیات کے کچھ علما بھی امام کہلاتے ہیں۔ مثلاً امام راغب اصفہانی۔

عام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ایک امام غائب ہیں جو قیامت کے نزدیک مہدی کی صورت میں ظہور پذیر ہوں گے۔ انھیں امام مہدی کہا جاتا ہے۔ امامیہ (اہل تشیع) کے نزدیک امام غائب ہر صدی میں پیدا ہوتا ہے۔ اسماعیلی فرقے میں تو امامت تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ (نیز دیکھیے "ابن تیمیہ"، "ابو حنیفہ"، "ابو داؤد"، "ابو یوسف"، "اثنا عشریہ"، "احمد بن حنبل"، "اسماعیل"، "اسماعیلیہ"، "امامت"، "امامیہ"، "بخاری"، "جعفر صادق"، "جوینی، امام الحرمین"، "حسن بن علی"، "حسن عسکری"، "حسین بن علی"، "رازی، فخر الدین"، "راغب اصفہانی"، "زین العابدین"، "علی رضا"، "علی نقی"، "غزالی"، "موسیٰ کاظم"، "مہدی امام")

امام الحرمین:۔ مشہور عالم اور مفکر امام جوینی کا لقب (دیکھیے "جوینی، امام الحرمین")

امام اعظم:۔ امام ابو حنیفہ کا لقب (دیکھیے "ابو حنیفہ"، "امام")

امام باڑہ (اماموں کا احاطہ)، امام کورٹ۔ برصغیر پاکستان و بھارت میں اہل تشیع کے مجالس خانے، جہاں محرم کی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ وہاں تعزیے بھی رکھے جاتے ہیں۔ اکثر اوقات اس عمارت کے تعمیر کرانے والے کا نام بھی بطور بانی لکھا جاتا ہے اور اس خاندان کے مقبرے بھی یہیں بنائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے امام باڑے عام طور پر لکھنؤ اور لاہور وغیرہ میں ہیں۔

امامت امام کا فریضہ، امارت، نماز پڑھانا، آنحضورؐ کی خلافت کے فرائض امامت کے لیے جس شخص کو منتخب کیا جائے۔ اس کے لیے عاقل بالغ، مرد اور آزاد ہونا ضروری ہے۔ اشعریہ کے نزدیک امام کا قریشی ہونا شرط ہے مگر خارجیہ اور معتزلیہ اس کے خلاف ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

نماز کی امامت کے لیے ایسے شخص کو مقرر کیا جانا چاہیے جو پرہیزگار، متقی، دانشمند، عاقل، عالم، بالغ، شجاع اور تندرست ہو۔ علما کا اس امر پر اجماع ہے کہ امام کا پیرو شریعت ہونا سب سے اہم شرط ہے۔ (نیز دیکھیے "امام")

امام تفسیر:۔ مشہور مورخ اور مفسر ابن جریر طبری کا لقب (دیکھیے "طبری، ابن جریر")

امام حدیث:۔ مشہور محدث امام بخاری کا لقب (دیکھیے "بخاری، امام")

امام حرمین:۔ مشہور عالم، جوینی کا لقب (دیکھیے "جوینی، امام الحرمین")

امام شاہ (۸۵۹ھ/۱۴۵۲ء۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) امام الدین عبدالرحیم بن حسن گجرات (بھارت) کے ست پنتھی فرقے کا بانی۔ اُچ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کے ابتدائی حالات کا علم نہیں۔ البتہ عہد شباب میں پنجاب سے گجرات چلا گیا اور وہاں کے کسانوں کو اپنا مرید بنانا شروع کیا۔ اسے ست پنتھی کتابوں کا مصنف بھی سمجھا جاتا ہے۔ وہیں احمد آباد کے قریب ہرانہ کے مقام پر فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نر محمد (نور محمد) مظہر امام قرار پایا۔ اس فرقے پر بہت جلد ہندو اثرات چھا گئے اور یہ ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ ہو کر رہ گیا۔

امام فقہ:۔ مشہور فقیہہ اور امام اعظم ابو حنیفہ کا لقب (دیکھیے "ابو حنیفہ، امام")

اُمامہؓ بنت ابو العاص آنحضورؐ کی نواسی، آپ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی بیٹی۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ آنحضورؐ نے سنگ سلیمان کا ایک ہار یہ کہہ کر ان کے گلے میں ڈالا تھا کہ اپنے خاندان میں اس ہار والا مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ نیز ایک بار آپؐ نے اس حالت میں نماز ادا کی تھی کہ وہ آپؐ کے دوش مبارک پر تھیں۔

امامہؓ کی پرورش ان کے والد کے بعد حضرت زبیرؓ نے کی اور حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد ان کا نکاح حضرت علی رض سے ہوا۔ ان کے بطن سے محمد الاوسطؒ پیدا ہوئے۔ حضرت علی رض کی شہادت کے بعد ان کا نکاح مغیرہ بن نوفل سے ہوا اور ان سے یحییٰ بن مغیرہ کی ولادت ہوئی۔ ان کا انتقال صفر کے مقام پر ہوا۔

امام مہدی:۔ (دیکھیے "مہدی امام")

امامیہ اہل تشیع کا ایک فرقہ، جس کے نزدیک سلسلہ نبوت کے خاتمے کے بعد امامت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک پہلے امام حضرت علیؓ ہیں۔ ان کے بعد حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور پھر امام زین العابدینؒ علی الترتیب امام ہیں۔ ان کے بعد امامیہ کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے اثنا عشریہ بارہ اماموں کا سلسلہ سبعیہ سات اماموں اور اسماعیلیہ حاضر سلسلہ کو مانتے ہیں۔ البغدادی نے امامیہ کے پندرہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ کاملیہ، محمدیہ، باقریہ، ناوسیہ، شمیطیہ، عماریہ، اسماعیلیہ، مبارکیہ، موسویہ، قطعیہ، اثنا عشریہ، ہشامیہ، زراریہ، یونسیہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ نزاریہ، قرامطیہ، زیدیہ

Marfat.com

کیسانیہ وغیرہ بھی کئی فرقے ہیں۔

امان حفاظت، پناہ، امن، جاں بخشی، عہد، ذمّہ۔ اگرچہ اسلام سے قبل بھی امان دینے کا رواج تھا۔ لیکن یہ امتیاز دین اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی کو امان دے تو پوری اُمت مسلمہ پر لازم ہو جاتا تھا کہ اس امان کو قائم رکھے۔ اس ضمن میں متعدد احادیث مروی ہیں۔ شرعاً اس پروانہ امان کو کہتے ہیں جس کی رُو سے کسی غیر ملکی دشمن یا غیر مسلم باشندے کی جان و مال ایک محدود مدت کے لیے محفوظ ہو جائے۔ یہ پروانہ حکومت کی طرف سے بھی جاری ہو سکتا ہے اور ہر آزاد و بالغ مسلمان مرد اور عورت بھی جاری کر سکتا ہے۔ بڑے علاقے کے لوگوں کو امام پروانۂ امان دے سکتا ہے۔ پھر وہ لوگ مامون ہیں۔ لیکن اگر امان لینے والے مسلمانوں کے خلاف مفاد کام کریں یا کسی جرم کے مرتکب ہوں تو ان کی امان ختم ہو جائے گی مگر انھیں جائے امن تک پہنچانے کا بندوبست کرنا لازم ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں، جن میں امان نامے جاری کیے گئے۔ جو تجارتی، ذاتی، سفارتی اور سیاسی غرضیکہ ہر قسم کے ہوتے تھے۔

امان اللہ خان (یکم جون ۱۸۹۲ء - ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء) شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کے تیسرے بیٹے لغمان میں پیدا ہوئے۔ جب ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو ان کے والد کو قتل کیا گیا تو وہ کابل میں موجود تھے۔ ان کے چچا سردار نصر اللہ خاں نے بادشاہت کا اعلان کر دیا مگر دارالحکومت پر ان کا قبضہ آڑے آیا اور یوں وہ تخت شاہی پر متمکن ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایک معاہدہ مرتب کیا جس کی رُو سے افغانستان پر سے برطانوی اثرات کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے افغانستان کو پہلا دستور عطا کیا اور ۱۹۲۶ء میں انھوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

امان اللہ خان صدق دل سے افغانستان کی ترقی چاہتے تھے۔ مگر عوام جدید اصلاحات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر میں شورش اور ہیجان برپا ہو گیا۔ بدنظمی کا ایک سیلاب سا امنڈ پڑا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء ایک قبائلی سردار حبیب اللہ بچہ سقّا نے بغاوت کر دی۔ امان اللہ خان نے اسے فرو کرنے کی بے حد کوشش کی۔ مگر ناکام رہے اور ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو تخت پر بچہ سقّا کا قبضہ ہو گیا۔ انھوں نے یورپ میں سیاسی پناہ حاصل کی پھر کبھی واپس نہ آئے اور وہیں سوئٹزرلینڈ میں انتقال کیا۔

اُمِّ ایمن رضؓ آنحضورؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کی کنیز، نام برکہ اور اُمِ ایمن کنیت تھی۔ آنحضورؐ کی پرورش بھی انہی نے کی۔ پہلا نکاح حضرت عبیدؓ بن زید سے ہوا۔ ان کے جنگ حنین میں شہید ہونے کے بعد آنحضورؐ نے ان کا نکاح زیدؓ بن حارثہؓ سے کر دیا۔ حبش کی طرف ہجرت کرنے والوں میں شامل تھیں۔ وہیں سے مدینہ ہجرت کی۔

آپ کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جو غزوات میں مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ آنحضورؐ آپ کی بڑی عزت کرتے تھے اور امی کہہ کر خطاب فرماتے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ یہ میرے اہل خانہ میں سے ہیں۔ حضرت اُمِ ایمن کے صاحبزادے ایمن بن عبیدؓ نے جنگ خیبر میں شہادت پائی تو آپ نے بڑے صبر و ضبط سے کام لیا۔

آنحضورؐ نے آپ کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ جب آپ کے خاوند حضرت عبیدؓ بن زید نے وفات پائی تو آنحضورؐ نے فرمایا "جو شخص جنت کی عورت سے عقد کرنا چاہے وہ اُمِ ایمن سے نکاح کرے۔"

آنحضورؐ کی وفات پر آپ بہت روئیں جب صحابہ نے تسلی دی تو کہنے لگیں کہ میں اس لئے روتی ہوں کہ آج وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی وفات پر فرمایا "آج اسلام کمزور پڑ گیا ہے۔"

آپ کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے پہلے شوہر سے ایمنؓ اور دوسرے شوہر سے حضرت اسامہؓ، جو کم عمری ہی میں صحابہ میں نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

اُمّت قوم، جماعت، جو کسی مشترک نصب العین کے لیے سرگرم عمل ہو۔ اس کے معنی دین، سنت، شریعت، مدت اور زمانہ کے بھی ہیں۔ یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بھی مستعمل ہے، جو نبی مبعوث کو مانتے ہیں۔ گویا کسی بھی نبی کے پیروکار اس کی اُمت کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے ایک معنی بے نظیر انسان اور خیر کی تعلیم دینے والے کے بھی ہیں۔ نسل انسانی کی وحدت کو بھی اُمت (ہی) قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرہ میں آیا ہے "سب انسان ایک ہی امت تھے۔ (۲ : ۲۱۳)

مسلمان بھی دینی اعتبار سے امتِ واحدہ کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید نے انھیں امتِ وسط قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں آیا ہے "اسی طرح ہم نے تمھیں امتِ وسط بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو۔ اور رسول تم پر گواہ ہو.... (۲ : ۱۴۳)، اس سے مراد ایک ایسی قوم ہے جو اوسط اور میزان کی طرف مائل رہتی ہے اور عدل و انصاف پر قائم رہتی ہے۔ نیز رسول کریمؐ کے بعد ان کی تعلیمات کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ اس لحاظ سے گویا امتِ وسط ایک زندہ شہادت ہے۔ جو اپنے قول و عمل، برتاؤ اور راست روی کو دنیا کے سامنے بطور مثال پیش کرے اور دنیا کی معصیت، ظلم اور گمراہی کا خاتمہ کرے۔

اُمِّ حبیبہ رضؓ (وفات ۴۴ھ/۶۶۴ء) ام المومنین رملہ بنت ابوسفیان بعثت نبوی سے سترہ سال قبل مکہ میں پیدا ہوئیں۔ والدہ کا نام صفیہ بنت ابوالعاص تھا حضرت امیر معاویہ کی سوتیلی بہن تھیں۔ پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا۔ دونوں نے اکٹھے اسلام قبول کیا۔ ہجرت حبشہ میں شرکت کی۔ شوہر کے عیسائی ہو جانے پر علیحدگی اختیار کر لی۔ آنحضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے شاہ حبش نجاشی کے ذریعے پیغام نکاح بھجوایا۔ نجاشی نے حضرت جعفر طیارؓ کو بلا کر رسم نکاح ادا کی۔ یہ زمانہ چھ یا سات ہجری کا ہے۔ اس وقت ام حبیبہؓ کی عمر چھتیس ۳۶ برس تھی۔ وہاں سے آپ مدینہ پہنچیں اور پھر آنحضورؐ کی خدمت ہی میں رہیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد سیاسی امور سے کنارہ کش رہیں۔ پہلے شوہر سے آپ کی ایک صاحبزادی حبیبہ پیدا ہوئیں جن کی پرورش آغوش نبوی میں ہوئی۔ آپ امیر معاویہؓ کے عہد میں فوت ہوئیں۔ آپ سے ۶۵ حدیثیں مروی ہیں۔ آپ نے تمام عمر زہد و تقویٰ میں بسر کی۔ اسلام کی خاطر ہجرت کی تکالیف برداشت کیں۔ ایسے وقت میں ایمان لائیں جب ان کے والد دشمنانِ اسلام کے قائد تھے۔ روایت ہے کہ فتح مکہ سے قبل ان کے والد ان سے ملنے آئے تو وہ رسول اللہ کے بستر پر بیٹھنے لگے۔ حضرت ام حبیبہؓ نے آپؐ کا بستر الٹ دیا۔ باپ کو یہ بات ناگوار گذری اور کہا تمھیں اس بچھونے پر اپنے باپ کا بیٹھنا بھی پسند نہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ رسولؐ پاک کے بستر پر ایک مشرک نہیں بیٹھ سکتا۔ ابوسفیان خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

اُمِّ حرام مشہور صحابیہ، مدینہ میں پیدا ہوئیں۔ باپ کا نام ملحان بن خالد اور ماں کا نام ملیکہ بنت مالک تھا۔ انصار کے مشہور قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار سے

Marfat.com

تھیں۔ ام سلیمؓ کی حقیقی بہن تھیں۔ آنحضورؐ کی رشتے میں خالہ تھیں۔ پہلا نکاح عمروؓ بن قیس انصاری سے ہوا جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد دوسرا نکاح عبادہؓ بن صامت سے ہوا۔ آنحضورؐ سے آپ کو بہت عقیدت تھی۔ اسلام کی سچی شیدائی اور راہ خدا میں شہادت کی آرزومند تھیں۔ آنحضورؐ جب قبا تشریف لے جاتے تو ام حرام کے گھر ہی کھانا کھا کر قیلولہ کرتے۔ ایک روز جب آپؐ بیدار ہوئے تو مسکراتے ہوئے فرمایا "ام حرام میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ میری اُمت کے کچھ لوگ جہاد کے ارادے سے کشتیوں میں سوار سمندر میں چلے جا رہے ہیں۔" تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ میرے لیے بھی آپ دعا کریں کہ میں ان میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر سکوں۔" آپؐ نے دعا فرمائی۔ اور جب حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ نے جزیرہ قبرص پر حملہ کرنے کے لیے ایک بحری بیڑہ تیار کیا۔ جس میں جلیل القدر صحابہ نے شرکت کی اور ام حرام بھی اپنے شوہر عبادہ بن صامت کے ساتھ شامل ہوئیں۔ فتح حاصل کرنے کے بعد جب مجاہدین واپس لوٹے ام حرام بھی سواری پر بیٹھنے لگیں تو جانور نے زمین پر گرا دیا اور آپ اسی صدمے سے وفات پا گئیں۔

پہلے شوہر سے دو لڑکے قیس اور عبداللہ پیدا ہوئے اور دوسرے شوہر سے ایک لڑکا محمد پیدا ہوا۔ آپ سے چند احادیث مروی ہیں۔ راویوں میں انس بن مالک جیسے محدثین ہیں۔

ام حکیم رضؓ مشہور صحابیہ، مکہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام حارث بن ہشام اور والدہ کا فاطمہ بنت ولید تھا۔ حضرت خالد بن ولید کی بھانجی اور قریش کے خاندان بنی مخزوم سے تھیں۔ ان کا خسر ابوجہل اور شوہر عکرمہ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ غزوہ احد میں انہوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف اپنے شوہر کے ہمراہ بڑے زور شور سے حصہ لیا۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقعہ پر اپنی والدہ فاطمہ بنت ولید کے ہمراہ مشرف باسلام ہوئیں۔ لیکن شوہر جان بچا کر یمن بھاگ گیا۔ جب آنحضورؐ نے عام معافی کا، اعلان فرمایا تو انہوں نے یمن جا کر اپنے شوہر سے سارا ماجرا سنایا اور وہ بھی اپنی جان بخشی کے متعلق سن کر آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ صدق دل سے اسلام قبول کیا اور جس شدت سے اسلام کی مخالفت کرتے تھے اسی جوش کے ساتھ اسلام کی خدمت شروع کی۔ کئی معرکوں میں نہایت جانبازیوں سے رومیوں کے خلاف جہاد کیا۔ اور آخر کار اجنادین کی لڑائی میں نہایت پامردی سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

دوسرا نکاح حضرت خالدؓ بن سعید بن عاص سے ہوا۔ یہ بھی بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کی عیسائیوں سے جھڑپیں ہو رہی تھیں اور مسلمان دمشق کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ ابھی دعوت ولیمہ سے لوگ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ رومیوں نے حملہ کر دیا۔ حضرت خالدؓ بن سعید تیر کی طرح مقابلے کے لیے نکلے اور نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ام حکیم یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھیں چنانچہ انھوں نے بھی نہایت جوش سے اپنے کپڑوں کو باندھا اور خیمہ کی چوب اکھاڑ کر لڑائی میں شریک ہو گئیں۔ اس معرکہ میں نو رومی آپ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوئے۔ اس معرکے کے بعد خلافت فاروقی کے عہد میں آپ جنگ یرموک میں بھی شریک ہوئیں۔ اور وہاں بھی دوسری خواتین کے ساتھ نہایت دلیری سے جنگ لڑی۔

امداد اللہ مہاجر مکی رحؒ (۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ / یکم جنوری ۱۸۱۸ء - ۱۳ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ / ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء)۔ بہت بڑے بزرگ۔ ولی کامل، صوفی عالم دین۔ نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمد امین تھا۔ نسب کے لحاظ سے فاروقی تھے۔ والد نے امداد حسین نام رکھا۔ لیکن مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی نے امداد حسین کی بجائے امداد اللہ کے نام سے نوازا۔ تاریخی نام ظفر احمد ہے۔ والدہ آپ کے دوسرے بہن بھائیوں سے زیادہ آپ سے محبت کرتی تھیں۔ ابھی سات سال کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کی پڑھائی پر کچھ خاص توجہ نہ دی خود تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے باطنی شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دی۔ اگرچہ بعض رکاوٹیں ایسی آئیں جو قرآن مجید حفظ کرنے میں مانع رہیں۔ سولہ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی نانوتوی رحؒ (جن سے آپ کا ننھیالی تعلق تھا) کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا اور اسی زمانہ میں چند مختصرات فارسی اور کچھ صرف و نحو کی تحصیل کی۔ مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی سے پڑھا۔ از حصن وحصین "ودفعۃ اکبر" مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے پڑھی۔ اسی زمانہ میں آپ نے خواب دیکھا کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ لیکن جلال کی وجہ سے قدم آگے نہیں بڑھتا۔ اچانک ان کے جدامجد حضرت بلاقی تشریف لائے اور ہاتھ پکڑ کر آنحضورؐ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آنحضورؐ نے ہاتھ لے کر حضرت میانجیوؒ کے حوالے کر دیا۔ اس خواب کے بعد ایک عرصہ تک اضطرار کی حالت میں رہے۔ کئی سال بعد ان کے ایک استاد مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی۔ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں لے گئے۔ چنانچہ ایک مدت تک حضرت میانجیوؒ کی خدمت میں رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور خلافت عطا ہوئی ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں زیارت حرمین شریف سے مشرف ہوئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کے ہاں قیام کیا اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضری دی اور دل کو تسکین نصیب ہوئی۔ واپسی میں چند روز مکہ مکرمہ میں قیام کیا اور ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں وطن واپس لوٹے۔ حج سے واپسی کے بعد اپنے پیر بھائی حافظ محمد ضامن کے شدید اصرار پر بیعت لینا شروع کی۔ علماء میں سب سے پہلے مولانا رشید احمد گنگوہی نے بیعت کی۔ ان کے علاوہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی آپ کے بھانجے، مولانا اشرف علی تھانوی مولانا احمد حسن کانپوری مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولوی صفات احمد غازی پوری، مولوی محمد شفیع، مولانا فیض الحسن سہارنپوری۔ مولانا محمد افضل ولائتی، مولانا عبدالسمیع بیدل، مولانا مفتی لطف اللہ علیگڑھی شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہم نے بیعت کی۔ علماء میں سے آپ کو مولانا قاسم نانوتوی سے خاص تعلق تھا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ جس طرح مولانا روم، شمس تبریز کی زبان ہیں اسی طرح اللہ تعالےٰ نے قاسم نانوتوی کو میری زبان بنایا ہے۔

۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں آپ نے ہندوستان سے بدنظمی کے باعث ہجرت کی اور زندگی کے باقی ۴۱ سال مکہ مکرمہ ہی میں گذارے۔ اسی وجہ سے آپ کو مہاجر مکی کہا جاتا ہے مکہ میں اسلامی ممالک کے جس قدر مشائخ مقیم تھے ان سب میں آپ کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ اکثر مشائخ آپ کی خدمت میں حاضری دے کر فیوض باطنی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ایک روایت میں آپ کے کشف کا ذکر ہے کہ خواجہ پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی حج کے لیے گئے اور مکہ میں آپ سے تبرکاً بیعت ہوئے اور مستقلاً وہیں رہنے کا اظہار کیا۔ آپ نے خواجہ صاحب کو اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہونے والا ہے تم ضرور اپنے وطن واپس جاؤ۔ اگر تم ہندوستان میں خاموش بھی بیٹھے رہو گے تو وہ فتنہ ترقی نہ کرے گا اور ملک میں سکون رہے گا۔ خواجہ پیر صاحب نے آپ کے اس

Marfat.com

کشف کو فتنۂ قادیانیت سے تعبیر کیا ہے چنانچہ انہوں نے قلم اور زبان سے قادیانیوں کے عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی۔

مرض الموت میں استغراق کے ساتھ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کروٹ بدلنا مشکل ہوگیا تھا۔ بھوک بالکل ختم ہوگئی تھی۔ وفات کے بعد آپ جنت المعلیٰ میں مولانا رحمت اللہ کی قبر کے ساتھ مدفون ہوئے۔

آپ کثیر المروت اور عظیم الاخلاق انسان تھے۔ کلام میں شیرینی تھی ہر ایک کے ساتھ باکمال بشاشت سے پیش آتے تھے اور جب کسی سے گفتگو کرتے تو تبسم آپ کے ہونٹوں پر کھیلتا رہتا تھا۔ اخلاق رذیلہ سے بالطبع نفرت تھی اور اتباع سنت گویا عادت بن گئی تھی۔ آپ حجاز سے واپس آئے تو ارشاد تلقین کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندوستان کو منور کردیا۔ بعض لوگ بظاہر تو کم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ سنت کی اتباع ہیں اور اپنی عملی زندگی کی وجہ سے وہ ایسا مقام حاصل کرلیتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے تربیت روحانی حاصل کرتے ہیں امت محمدیہ میں ایسے سینکڑوں افراد گذرے ہیں لیکن آفاقی شہرت رکھنے والی دو ہی شخصیتیں ہیں ایک مولانا جلال الدین رومی اور دوسرے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔

آپ کی تصانیف میں "مثنوی مولانا روم پر فارسی زبان میں حاشیہ" "غذائے روح" "جہاد اکبر" "مثنوی تحفۃ العشاق" "درنامہ غضبناک" "ارشاد مرشد" "ضیاء القلوب" "وحدۃ الوجود" "فیصلہ ہفت مسئلہ" "گلزار معرفت" "مرقومات امدادیہ" اور "مکتوبات امدادیہ" شامل ہیں۔

اُمّ درداؓ خیرہ بنت ابو حدرد، مشہور اور فاضل صحابیہ قبیلہ اسلم سے تعلق تھا حضرت ابو درداؓ کی زوجہ تھیں۔ عورتوں میں بڑی صاحب الرائے تھیں نہایت عابدہ اور سنت کی اتباع کرنے والی تھیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ابو درداؓ کی وفات سے دو سال پہلے ملک شام میں حضرت عثمان کی خلافت کے دور میں فوت ہوئیں۔

امر حکم، معاملہ، حالت۔ قرآن مجید (۷ = ۵۴)، (۱۶ = ۸۵)، (۱۹ = ۴۰)، (۵۴ ، ۵۰) میں امر اللہ کے معنی عذاب الٰہی، قیامت اور حکم ربی کے لئے گئے ہیں۔ زمخشری کے نزدیک حکمت اور تدبر کے معنی بھی مراد ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ۲، بار آیا ہے۔ اس سے بعض مقامات پر مفسرین اور مستشرقین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ عام طور پر اسے خلق کے معنوں میں نہیں لیا جاتا بلکہ اس کے مقابل تسلیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ انگریزی میں خلق اور امر کے لئے ایک ہی لفظ (CREATION) ہے اور خلق کے معنی پیدا کرنے اور امر کا مفہوم ہدایت اور رہنمائی کے طور پر لئے جاتے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک امر اور مشیت میں فرق ہے۔ بعض اوقات مشیت الٰہی کچھ اور ہوتی ہے اور امر الٰہی کچھ اور۔

اُمّ رومانؓ (وفات ۹ھ/ ۶۳۰ء) بنت عامر بن عویمر بن عبد شمس مشہور صحابیہ حضرت ابو بکرؓ کی زوجہ اور حضرت عائشہؓ کی والدہ بنو کنانہ کے خاندان فراس سے تھیں۔

پہلا نکاح عبداللہ بن حارث سے ہوا اور انہیں کے ساتھ مکہ آکر سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد عبداللہ بن حارث نے وفات پائی تو حضرت ابو بکرؓ نے نکاح کر لیا پہلے شوہر سے ایک لڑکا طفیل پیدا ہوا۔ حضرت ابو بکرؓ سے حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حضرت عبدالرحمان بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ہی مشرف باسلام ہوئیں اور سابقون الاولون میں شمار ہوئیں۔

وفات کے بعد آنحضورؐ نے آپ کو قبر میں اتارا اور فرمایا جو شخص عورتوں میں حور عین کو دیکھنا چاہے وہ ام رومان کو دیکھے۔

اُمّ سلمہؓ (۲۸ قبل ھ/ ۵۹۵ء - ۵۹ھ/ ۶۷۹ء) ام المومنین ہند بنت ابو امیہ حذیفہ بنی مخزوم سے تھیں۔ والدہ کا نام عاتکہ تھا۔ پہلا نکاح چچیرے بھائی ابو سلمہ بن عبد الاسد سے ہوا۔ آغاز نبوت ہی میں دونوں میاں بیوی اسلام لائے۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ اور اصلاح احوال کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئیں۔ جب مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت ملی تو ابو سلمہ کے ساتھ آپ بھی نکلیں لیکن سسرال والے ان کے بیٹے کو چھین کر لے گئے۔ دوسری طرف بنو مغیرہ آپ کے راستے میں حائل ہوگئے۔ چنانچہ ابو سلمہ نے اکیلے ہی ہجرت کی۔ آپ شام کو اس جگہ پہنچ جاتیں جہاں شوہر سے جدائی ہوئی تھی اور رو تی تھیں چند روز بعد بنو مغیرہ نے ان کا بچہ ان کے حوالے کردیا اور انہیں مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔

ابو سلمہؓ سے آپ کے دو لڑکے سلمہ اور عمر اور دو لڑکیاں زینب اور رقیہ تھیں۔

عدت گذرنے کے بعد نکاح کے بہت سے پیغام آتے رہے لیکن آپ انکار کرتی رہیں یہاں تک کہ آنحضورؐ نے آپ کو پیغام بھجوایا اور ۴ھ کو ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں۔ آپ آنحضورؐ کے آرام کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

امہات المومنین میں سب سے زیادہ عمر آپ ہی نے پائی۔ وفات کے بعد بقیع میں دفن ہوئیں۔ آپ بڑی بلند سیرت اور فیاض تھیں۔ نہایت دانا اور معاملہ فہم تھیں۔ فہم مسائل میں خاص ملکہ تھا۔ آنحضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ صنف نازک کی پوری تاریخ اصابت رائے میں ام سلمہ کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ مسند امام احمد بن حنبل میں آپ سے ۳۸۰ احادیث مروی ہیں۔

اُمّ سلیم رضی رملہ یا سہلہ بنت ملحان بن خالد، مشہور صحابیہ اُمّ حرامؓ کی بہن تھیں۔ ام سلیم اور ام انس کنیت تھی۔ غمصاء اور رمیصاء لقب تھا۔

پہلا نکاح مالک بن نضر سے ہوا جو ان کے ہم قبیلہ تھے۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ انہی سے پیدا ہوئے۔ شوہر مسلمان نہ ہوا بلکہ ان کے اسلام قبول کرنے پر خفا ہوا۔ یہی بات کشیدگی اختیار کر گئی۔ وہ ناراض ہو کر شام چلا گیا اور وہیں فوت ہوا۔ حضرت انسؓ کو آنحضورؐ کی خدمت میں پیش کرکے کہا کہ یارسول اللہ اس کو اپنے خادموں میں جگہ دیں۔

دوسرا نکاح ابو طلحہؓ سے ہوا یہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ نکاح کا پیغام بھیجنے کے بعد مسلمان ہوئے ام سلیم نے اپنا مہر اسلام قرار دیا۔ حضرت ابو طلحہ سے ام سلیم کے دو فرزند ابو عمیر اور عبداللہ پیدا ہوئے۔ حضرت صدیقؓ اکبر کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

آپ بڑی اولوالعزم اور شجاع صحابیہ تھیں۔ غزوات میں آنحضورؐ انہیں چند اور دوسری عورتوں کو اپنے ساتھ رکھتے یہ خواتین لوگوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

فتح خیبر کے موقع پر جب حضرت صفیہؓ بنت حی نے آنحضورؐ کے نکاح میں آنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو آنحضورؐ نے انہیں آپ ہی کے سپرد کیا کہ نہلا دھلا کر دلہن بنائیں۔ کیونکہ جنگ کی صعوبتوں نے حضرت صفیہ کو نہایت خستہ حال کردیا تھا۔

ام سلیمؓ اپنی جانثاری اور عقیدت کی وجہ سے آنحضورؐ کی نظروں میں بے حد محترم تھیں۔ آپؐ اکثر خود چل کر ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے مجھے ام سلیمؓ پر رحم آتا ہے۔

ایک مرتبہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ میں جنت میں گیا تو مجھے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی میں نے

Marfat.com

پوچھا یہ کون ہے تو لوگوں نے بتایا یہ غمصارؓ بنت ملحان ہیں۔
حضرت ام سلیمؓ سے حضرت انس عبداللہ ابن عباس۔ زید بن ثابت اور عمرو بن عاصم نے احادیث روایت کی ہیں۔ لوگ آپ سے اکثر مسائل دریافت کرتے تھے اور اسی طرح اپنے شکوک رفع کرتے تھے۔

امِ صادر :- مشہور صحابیہ۔ (دیکھئے سجاح "ام صادر")

امِ عطیہؓ

نسیبہ بنت حارث، مشہور صحابیہ، مدینہ میں پیدا ہوئیں۔ آنحضورؐ آپ پر بہت شفقت اور اعتماد کرتے تھے۔ ان خواتین میں سے تھیں جنہیں آپؐ غزوات میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ آپ سات غزوات میں شامل ہوئیں۔ آپ مجاہدین کے لیے کھانا پکاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ اگر لشکر اسلام میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو آپ نہایت تندہی سے اس کی تیمارداری کرتی تھیں۔
ان کی وفات کے بارے میں کہیں کچھ نہیں لکھا ہے اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ خلافتِ راشدہ میں حیات تھیں۔
ام عطیہ آنحضورؐ کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرتی تھیں اور آپؐ کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے صحابیاتِ رسولؐ میں انکا درجہ بہت بلند تھا۔
۸ھ میں جب آنحضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینب کی وفات ہوئی تو انہیں ام عطیہؓ ہی نے غسل دیا۔ آنحضورؐ نے ان کو نہلانے کا طریقہ بتایا۔ یہی وجہ ہے کہ غسل میت کے بارے میں ان کی حدیث بہت معتبر مانی جاتی ہے۔

امِ عمارہؓ

نسیبہ بنت کعب، مشہور صحابیہ بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہجرت نبوی سے تقریباً چالیس سال قبل مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں۔
پہلا نکاح زیدؓ بن عاصم سے ہوا۔ ان سے دو لڑکے عبداللہؓ اور حبیبؓ پیدا ہوئے دوسرا نکاح عزیہ بن عمرو سے ہوا اور ان سے بھی دو بچے پیدا ہوئے۔
جب آنحضورؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ میں دوسرے بارہ مدنی مسلمانوں کے ساتھ تبلیغ کے لیے بھیجا تو ان کی کوششوں سے جو لوگ پہلے پہل مسلمان ہوئے ان میں ام عمارہ بھی ہیں۔
غزوہ احد میں حضرت ام عمارہؓ اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کے ساتھ شامل تھیں اور مشکیزہ میں پانی بھر بھر کر مجاہدین کو پلاتی تھیں۔ اس غزوہ میں جب ایک مشکل مقام آیا تو یہ بھی تلوار اور ڈھال سنبھال کر آنحضورؐ کی حفاظت کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ اور کفار میں سے جب کوئی آنحضورؐ کے قریب حملہ کرنے کے لیے آتا تو اس کا وار اپنی ڈھال پر روکتیں اور اس کے گھوڑے کے پاؤں پر ایسا بھرپور وار کرتیں کہ وہ گر پڑتا۔ آنحضورؐ ان کے بیٹوں کو آواز دیتے تو وہ دونوں اپنی ماں کے قریب جا کر دشمن رسولؐ کو واصل جہنم کر دیتے۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ میں نے غزوہ احد میں ام عمارہ کو اپنے دائیں اور بائیں برابر لڑتے دیکھا ہے اسی غزوہ میں ابن قمیہ کے وار سے ام عمارہ کا کندھا زخمی ہو گیا۔ اور تیزی سے خون بہنے لگا۔ آنحضورؐ نے ان کے زخم پر پٹی بندھوائی اور کئی بہادر صحابہ کا نام لے کر فرمایا "آج ام عمارہ نے ان سب سے بڑھ کر بہادری دکھائی ہے۔" نیز فرمایا۔ "اے ام عمارہؓ جتنی طاقت تجھ میں ہے کسی اور میں کہاں ہو گی۔" آپ آنحضورؐ کی رحلت کے بعد بھی مسیلمہ کے خلاف جہاد میں شریک ہوئیں۔ اور اس معرکہ میں انہیں گیارہ زخم آئے اور ایک ہاتھ کلائی سے کٹ گیا ام عمارہ کی وفات کے بارے میں معلومات کہیں نہیں ملتیں۔ البتہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں آپ زندہ تھیں اور حضرت عمرؓ نے ایک قیمتی ذرکا دوپٹہ جو مال غنیمت میں آیا تھا انہیں عطا کیا تھا۔ آپ سے چند احادیث بھی مروی ہیں۔

امِ کلثومؓ بنت خدیجہؓ

(۶ سال قبل بعثت - ۹ھ/۶۳۰ء) آنحضورؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے بڑی اور حضرت رقیہؓ سے چھوٹی تھیں۔ مکہ میں پیدا ہوئیں۔ پہلا نکاح ابولہب کے بیٹے عتیبہ سے ہوا۔ لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ سورۂ لہب کے نازل ہونے کے بعد ابولہب کے کہنے پر عتیبہ نے طلاق دے دی۔
آپ کی پرورش آنحضورؐ اور حضرت خدیجہؓ کی آغوشِ شفقت میں ہوئی۔ حضرت سودہؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ بڑی بہن حضرت رقیہ کے انتقال کے بعد آپ کا نکاح ۳ھ/۶۲۴ء میں حضرت عثمانؓ سے ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر انیس سال تھی۔ شادی کے ساڑھے چھ سال بعد وفات پائی۔ آنحضورؐ کو آپ کی وفات سے بہت صدمہ ہوا۔ نماز جنازہ آپؐ ہی نے پڑھائی۔ آپ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

امِ کلثومؓ بنت عقبہ

مشہور صحابیہ۔ انتہائی ناساعد حالات میں اسلام قبول کیا۔ باپ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کا موقعہ ملا۔ اور گھر والوں کو خبر کیے بغیر پاپیادہ بنی خزاعہ کے ایک شخص کی معیت میں مدینہ چل دیں۔ جب گھر والوں کو اطلاع ہوئی تو ان کے دونوں بھائی تعاقب میں نکل پڑے خوش قسمتی سے ام کلثوم مدینہ پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے آنحضورؐ سے مطالبہ کیا کہ صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق ہماری بہن کو ہمیں واپس کر دیں۔ ام کلثوم نے فریاد کی کہ یا رسولؐ اللہ مجھے ان ظالموں کے چنگل میں دوبارہ نہ دیں۔ کیونکہ میرا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا آپؐ کو فکر ہوئی کیونکہ معاہدے میں عورت کی واپسی کا ذکر نہیں تھا۔ اسی وقت قرآن کی یہ آیت اتری "کہ اے مومنوں جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو۔ اللہ ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے حوالے نہ کرو۔"
آنحضورؐ نے ان کا نکاح اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثؓ سے کر دیا اور جب انہوں نے غزوہ موتہ میں شہادت پائی تو حضرت زبیر بن العوام سے ان کا دوسرا نکاح ہوا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمروؓ بن عاص کے عقد میں آئیں اس وقت حضرت عمروؓ بن عاص مصر کے حاکم تھے۔ نکاح سے ایک ماہ بعد ام کلثوم وفات پا گئیں۔ حضرت زبیر سے ایک لڑکی زینب اور حضرت عبدالرحمان بن عوف سے چار لڑکے ابراہیم، حمید، محمد اور اسماعیل پیدا ہوئے۔ ام کلثوم سے کئی احادیث مروی ہیں۔

امِ کلثومؓ بنت فاطمہؓ

(وفات ۴۹ھ/۶۶۹ء) حضرت علی کی صاحبزادی اور آنحضورؐ کی نواسی۔ پہلا نکاح حضرت عمر فاروقؓ سے ہوا۔ اور ایک لڑکے زید اور ایک لڑکی رقیہؓ کو جنم دیا۔ اہل تشیع ان کا نکاح حضرت عمرؓ فاروق کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کا دوسرا نکاح عون بن جعفر بن ابی طالب سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد محمد بن جعفر کے نکاح میں آئیں اور جب وہ بھی شہید ہو گئے تو عبداللہ بن جعفرؓ کے عقد میں آئیں۔

Marfat.com

اُمّ ورقہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا مشہور صحابیہ، انصار کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب آنحضورؐ نے مدینہ ہجرت کی تو انھوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر کی تیاری ہونے لگی تو امّ ورقہ نے بھی آنحضورؐ سے غزوہ میں شرکت کی اجازت مانگی اور شہادت کی آرزو کی۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ "تم گھر میں رہو۔ اللہ تم کو یہیں شہادت عطا کر دے گا۔" آپؐ کی یہ پیش گوئی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں پوری ہوئی۔

ام ورقہ قرآن پڑھی ہوئی تھی آنحضورؐ نے انہیں گھر کی عورتوں کا امام بنایا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت امّ ورقہ نے اپنے ایک غلام اور لونڈی سے فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو۔ ان دونوں کی نیت خراب ہو گئی۔ اور رات کو چادر ڈال کر اپنی مالکہ کو شہید کر ڈالا۔ حضرت عمر فاروقؓ صبح کو ان کی آواز نہ سن کر گھر میں گئے تو آپ کی نعش دیکھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے دونوں مجرموں کو پھانسی کا حکم دیا۔

اُمّ ولد وہ کنیز جو مالک کے بچے کو جنم دے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کنیزوں کے ساتھ نکاح کے بغیر تمتع جائز ہے۔ جبکہ اسلامی شریعت کی رو سے اس منع کرتی ہے۔ ان کے ساتھ نکاح ہی کیا جا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں اولاد پیدا ہو۔ ایسی کنیز آزاد قرار دی جاتی ہے۔ خواہ اس کا بچہ ساقط ہی کیوں نہ ہو، اسے نہ تو فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز وہ ترکے کی وارث ہوتی ہے گویا وہ مالک کی بیوی قرار دی جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے "کنیز")

اُمّہات المومنین مومنوں کی مائیں، ازواج مطہرات کا لقب (دیکھئے "ام المومنین" اور "ازواج مطہرات")

اُمّ ھانی رضی اللہ عنہا فاختہ بنت ابوطالب، حضرت علیؓ کی بہن، مشہور صحابیہ تھیں۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا ۸ھ کو فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام قبول کیا۔

نکاح ہبیرہ بن عمر مخزومی سے ہوا۔ لیکن وہ اسلام نہ لایا اور نجران کی طرف بھاگ گیا امیر معاویہ کے دور حکومت میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھیں۔ بیٹوں میں عمرو۔ ہانی یوسف اور جعدہ مشہور ہیں۔

فقہ میں دلچسپی رکھتی تھیں اور آنحضورؐ سے مختلف مسائل دریافت کرتی رہتی تھیں ام ھانی نے حضرت رسول اکرمؐ سے چھیالیس احادیث روایت کی ہیں راویوں میں حضرت علیؓ، عبداللہ بن عباس۔ عبداللہؓ بن حارث جیسے اصحاب شامل ہیں۔

اُمّی ناخواندہ، ان پڑھ، حضرت رسول اکرمؐ کا لقب، جو قرآن مجید میں دو بار (۷ : ۱۵۷، ۷ : ۱۵۸) آیا ہے۔ کیونکہ آپؐ نے کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ بعض نے امی کو عامی کے معنی میں لیا ہے۔ یعنی جو عامۃ الناس کی صفت پر ہو اور بعض کے نزدیک امی، اُم (ماں) سے منسوب ہے یعنی وہ شخص جو بچپن میں باپ کے سائے سے محروم ہو کر ماں یا دایہ کے پاس پرورش پائے اور اسے کوئی علم و فن یا نوشت و خواندہ سیکھنے کا موقعہ نہ ملے۔ اس طرح مجازاً ناخواندہ کو امی کہا جانے لگا۔ امام باقرؒ کے قول کے مطابق امیؐ کی نسبت "ام القرای" کی طرف ہے جو مکہ معظمہ کا لقب ہے اور آنحضورؐ کا مولد۔ چونکہ اہل مکہ بہ حیثیت مجموعی ناخواندہ اور ان پڑھ تھے اس لئے مجازاً ناخواندہ کو بھی امی کے لفظ سے پکارا گیا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے تصریحاً آنحضورؐ کی یہ صفت بیان کی ہے کہ "اس سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ ورنہ یہ باطل پرست یقیناً شبے میں پڑھ جاتے" (۲۹ : ۴۸) چنانچہ یہ آپؐ کی صفت مدح ہے جو کسی دوسرے میں نہیں۔ کہ کسی سے پڑھنا لکھنا سیکھے بغیر آپؐ پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ اور بلا شبہ امیؐ ہونا آپؐ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف دعوت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔

امیر فرماں روا۔ حاکم۔ سپہ سالار۔ احادیث میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا۔ آپؐ کے بعد کس کو امیر بنایا جائے؟ آنحضورؐ نے فرمایا "اگر ابوبکرؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے امین پاؤ گے" اسی طرح سے عبداللہ بن جحش الاسدیؓ کے بارے میں اوّل امیر فی الاسلام کے الفاظ آئے ہیں۔

انہیں آنحضورؐ نے ایک فوجی دستے کا قائد مقرر کیا تھا۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں مسلمانوں کے اجتماع کے بارے میں جو روایات ہیں ان میں امیر کا لفظ ملت اسلامیہ کے سربراہ اعلیٰ کے معنی میں آیا ہے۔ فوج کے ایک حصے کے سالاروں کو بھی امیر یا امیر الجیش یا امیر الجند کہا جاتا تھا۔ اسی طرح صوبے کے والیوں کو بھی امیر کہا جاتا تھا اور ان کے اپنے صوبے میں وہی اختیارات ہوتے تھے جو خلیفہ کو پوری مملکت میں حاصل ہوتے تھے۔ بنو عباس کے دور میں امیر کا کام زیادہ تر امن و امان کا قیام اور بروقت وصول محاصل ہوتا تھا۔ لوگوں کی بے اطمینانی کے باعث امیر معزول بھی ہو سکتا تھا۔

امیر الامراء۔ امیر اعلیٰ فوج کے سالار اعظم کو کہا جاتا تھا۔ ابتداء میں یہ عہدہ صرف اور صرف قیادت کے ساتھ مخصوص تھا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ فوجی زور پکڑتے چلے گئے اور خلفاء بے بس ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ یہ امراء حقیقی حکمران بن گئے اور خلفاء اپنے سابقہ اقتدار کا محض سایہ بن کر رہ گئے۔

امیر الحج :۔ حج کی غرض سے مکہ معظمہ جانے والے لوگوں کی جماعت کا سردار آنحضورؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ۹ھ / ۶۳۰ء میں امیر الحج بنایا تھا۔ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں آنحضورؐ نے بہ نفس نفیس امارت حج کے فرائض انجام دیئے۔ آپؐ کی وفات کے بعد یہ فریضہ خلفاء سے متعلق ہو گیا۔ خلفاء بذات خود سرانجام دیتے یا کسی عہدے دار کو اپنا قائم مقام نامزد کر دیتے تھے

امیر المسلمین :۔ مسلمانوں کا امیر۔ یہ لقب سب سے پہلے المرابطون نے امیر المومنین کے مقابلے میں اختیار کیا۔ المرابطون کو بنو عباس کی برتری تسلیم تھی اور اسے پسند نہ تھا کہ وہ خلیفہ کا لقب اختیار کرے۔ بعد میں افریقہ اور اندلس کے حکمران، جب وہ مکمل خود مختار نہ ہوتے تو یہ لقب استعمال کرتے۔

امیر المومنین :۔ مومنوں کا امیر یا حاکم۔ یہ لقب سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اختیار فرمایا۔

اہل تشیع کا فرقہ امامیہ "امیر المومنین" کا لقب صرف حضرت علیؓ سے مخصوص سمجھتا ہے اسماعیلیوں کا ہر فرقہ اسے اپنے اپنے مسلمہ خلفاء کے لئے استعمال کرتا ہے۔ زیدی شیعوں کے نزدیک ہر وہ علوی جو بزور شمشیر اپنے اقتدار کو منوا لے خود کو امیر المومنین کہلوا سکتا ہے۔

امیر حسینی (وفات ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء) حسین بن عالم بن ابی الحسین، "سیر العارفین" میں پورا نام صدر الدین احمد بن نجم الدین المعروف بہ سید حسین ہے۔ مشہور صوفی بزرگ غور (ہرات) کے ایک گاؤں کزلو میں پیدا ہوئے۔ نواح خراسان میں علم و عرفان کی

Marfat.com

ستمیں روشن کیں پھر ملتان تشریف لائے اور شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کی خدمت میں فیضیاب ہوئے۔ بیعت کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ بعض کے نزدیک شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور بعض نے شیخ ابوالفتح رکن الدین کا مرید بتایا ہے۔ سیر العارفین کے مطابق شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی کے مرید ہیں۔

نظم و نثر میں ان کی کئی ایک تصانیف ہیں جو مقبول خاص و عام ہیں۔ جن میں "نزہت الارواح" اور "طرب المجالس" "صراط مستقیم" نثر میں اور "زاد المسافرین" و "کنز الرموز" نظم میں بہت مشہور ہیں۔ یہ سب کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور ان کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں تمام کتابوں کا موضوع معرفت اور سلوک و طریقت ہے جو تصوف سے متعلق ہیں۔

امیر حمزہ رضا آنحضورؐ کے چچا (دیکھئے "حمزہ بن عبدالمطلب")

امیر علی، سید (۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء) قانون دان اور مصنف۔ اہل تشیع میں سے تھے۔ پہلے محسنیہ کالج ہگلی (جو کلکتہ کے نزدیک تھا) سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۳ء تک انگلستان میں تعلیم پائی اور بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۴ء میں بنگال ہائی کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد انگلستان میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی سرگرمیاں بہت سے میدانوں میں نمایاں تھیں مثلاً بحیثیت قانون اسلامی کے پروفیسر، وکیل، جج، سماجی کارکن۔ نیز حکومت کے نظم و نسق میں، سیاست میں اور مصنف کی حیثیت میں۔

ان کی بعض تصانیف اسلامی قانون کے سلسلے میں ANGLO - MOHAMMEDAN ۱۸۷۳ء میں جو انگریزوں کے عہد میں مدون ہوا تھا۔ مستند تصور کی جاتی تھیں۔

۱۸۸۳ء کی وائسرائے کونسل میں تین ہندوستانی ممبروں میں واحد مسلمان ممبر تھے۔

۱۹۰۹ء میں لندن کی پریوی کونسل کی قانونی کمیٹی کے پہلے ہندوستانی رکن مقرر ہوئے لندن میں برطانوی ہلال احمر سوسائٹی کے سرکردہ بانیوں میں سے تھے۔ کلکتہ میں نوعمر لڑکوں کے لئے ایک دارالاصلاح بھی قائم کیا تھا۔

۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور پہلی عالمی جنگ کے بعد لندن میں تحریک خلافت کے قائد بنے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ان کی شخصیت کو چار چاند لگانے والی ان کی ایک تصنیف "THE SPIRIT OF ISLAM" ہے۔ جسے وہ اپنی زندگی میں ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۲ء تک کئی بار ترامیم و اصلاح کے بعد شائع کرتے رہے، ان کی وفات کے بعد ان کی یہ تصنیف بہت مقبول ہوئی۔ مغربی ممالک اور اسلامی دنیا میں اس کا اب تک نمایاں اثر ہے۔ ترکی زبان میں بھی اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

دوسری اہم تصنیف A SHORT HISTORY OF THE SARACENS ہے جس میں گذشتہ اسلامی تاریخ کے بارے میں مغربی مفکرین کے غلط نظریات کو ختم کر کے ایک نیا انداز فکر دیا ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں دنیا کے سامنے اسلام کی حقانیت کو پیش کیا ہے اور نہ صرف یورپ میں اسلام کے متعلق ایک سازگار فضا تیار کی بلکہ مغرب زدہ مسلمانوں میں اسلام کو بنظر استحسان دیکھنے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔

امیر معاویہ رضہ صحابی اور پہلے اموی خلیفہ (دیکھئے "معاویہ بن ابوسفیان")

امین وہ شخص جس پر دوسرے لوگ اعتماد اور بھروسہ کر سکیں جسے بطور امانت کوئی چیز سپرد کی جائے۔ نگران۔ ناظم۔ آنحضورؐ کا لقب ہے جو مکہ میں قریش نے دیا تھا۔ امین الوحی حضرت جبرئیلؑ کا لقب ہے یعنی وہ جسے وحی سونپی گئی۔ یہ لفظ اکثر القاب میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مثلاً امین الدولہ۔ امین الدین۔ امین الملک اور امین السلطنت۔ نیز امین کی اصطلاح مختلف قابل اعتماد عہدے رکھنے والوں کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے

امین الحسینی (۱۸۹۳ء ۔ ۴ جولائی ۱۹۷۴ء) مفتی اعظم فلسطین، یروشلم کے حسینی خاندان میں مفتی طاہر الحسینی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ ازہر میں داخل ہوئے۔ وہاں سید رشید رضا، سعد زغلول پاشا اور مصطفیٰ المنفلوطی جیسے مشاہیر کا قرب حاصل کیا۔ یہیں درس جہاد حاصل کیا اور بقیہ تعلیم کے بہانے عثمانیہ فوجی کالج استنبول میں داخلہ لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر عثمانی فوج کے ۴۶ ویں ڈویژن میں کمیشن حاصل کیا۔ کچھ عرصہ کے لئے سمرنا یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے۔ فوجی ملازمت کے دوران میں بحیرہ اسود کے جنگی محاذ پر اہم خدمات بھی سرانجام دیں۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد آپ فلسطین واپس آ گئے۔ انہی دنوں فلسطین کے فتن اور مصائب کے دروازے کھل گئے۔ اعلان بالفور ہوا اور یہودیوں کی دھڑا دھڑ آمد کا آغاز ہو گیا۔ امین الحسینی نے ان کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا۔ برطانوی عدالت نے انہیں دس سال قید کی سزا سنائی۔ مفتی صاحب وہاں سے فرار ہو کر شام اور اردن کے دیہات میں تبلیغ جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں جب سزا منسوخ ہو گئی تو دوبارہ یروشلم تشریف لائے۔ انہی دنوں آپ کو اپنے بڑے مرحوم بھائی محمد کامل الحسینی کی جگہ مفتی اعظم مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے سپریم مسلم کونسل اور عرب اعلیٰ کمیٹی کی صدارت کی۔ ان ایام میں انہوں نے ایسے مشکل کام کئے کہ ان کے دشمن بھی ان کی صلاحیتوں کا لوہا مان گئے اور اپنے پرائے عش عش کر اٹھے۔ انہوں نے اس امر کے لئے سر توڑ کوشش کی کہ فلسطین اسرائیل نہ بن سکے۔ دنیا بھر کو اس قضیے کی طرف متوجہ کرنے کے لئے انہوں نے فلسطین ہی میں کانفرنسیں کرنا کافی نہ سمجھا بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی وفود بھیجے اور خود بھی شام، مصر، عراق، امارت خلیج، ایران، افغانستان اور ہندوستان کا دورہ کیا۔ ہر جگہ اسرائیلی ایجنٹ آپ کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ کئی بار آپ پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ زر و مال کے ذریعے انہیں خریدنے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر آپ جادۂ مستقیم پر گامزن رہے۔

۱۹۳۱ء میں مفتی اعظم نے بیت المقدس میں دس روزہ اسلامی کانفرنس طلب کر لی۔ تمام مسلمان ملکوں کے نمائندے یہاں پہنچے اور انہیں فلسطین میں یورپی عزائم اور صیہونی دسیسہ کاریوں کی تفصیلات کا علم ہوا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان سے علامہ اقبال مولانا غلام رسول مہر اور مولانا شوکت علی شامل تھے۔

۱۹۳۶ء میں مفتی اعظم اور ان کے شریک کار مجاہد شیخ عزالدین القسام نے فلسطین میں علم جہاد بلند کر دیا۔ اسے انگریزوں نے "بغاوت عظمیٰ" کا نام دیا۔ چھ ماہ کے اندر اندر برطانیہ کی حالت دگرگوں ہو گئی اور اگر اسے اندرونی سازشیں ختم نہ کر دیتیں تو ۱۹۳۶ء ہی میں فلسطین آزاد ہو جاتا۔ سعودی عرب، عراق، یمن، اردن وغیرہ کے سربراہان نے مفتی اعظم سے یہ جنگ ختم کرائی۔ برطانیہ نے کانفرنس کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لارڈ پل کمیشن آیا اور اس نے فلسطین کو مسلمانوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دینے کی سفارش

Marfat.com

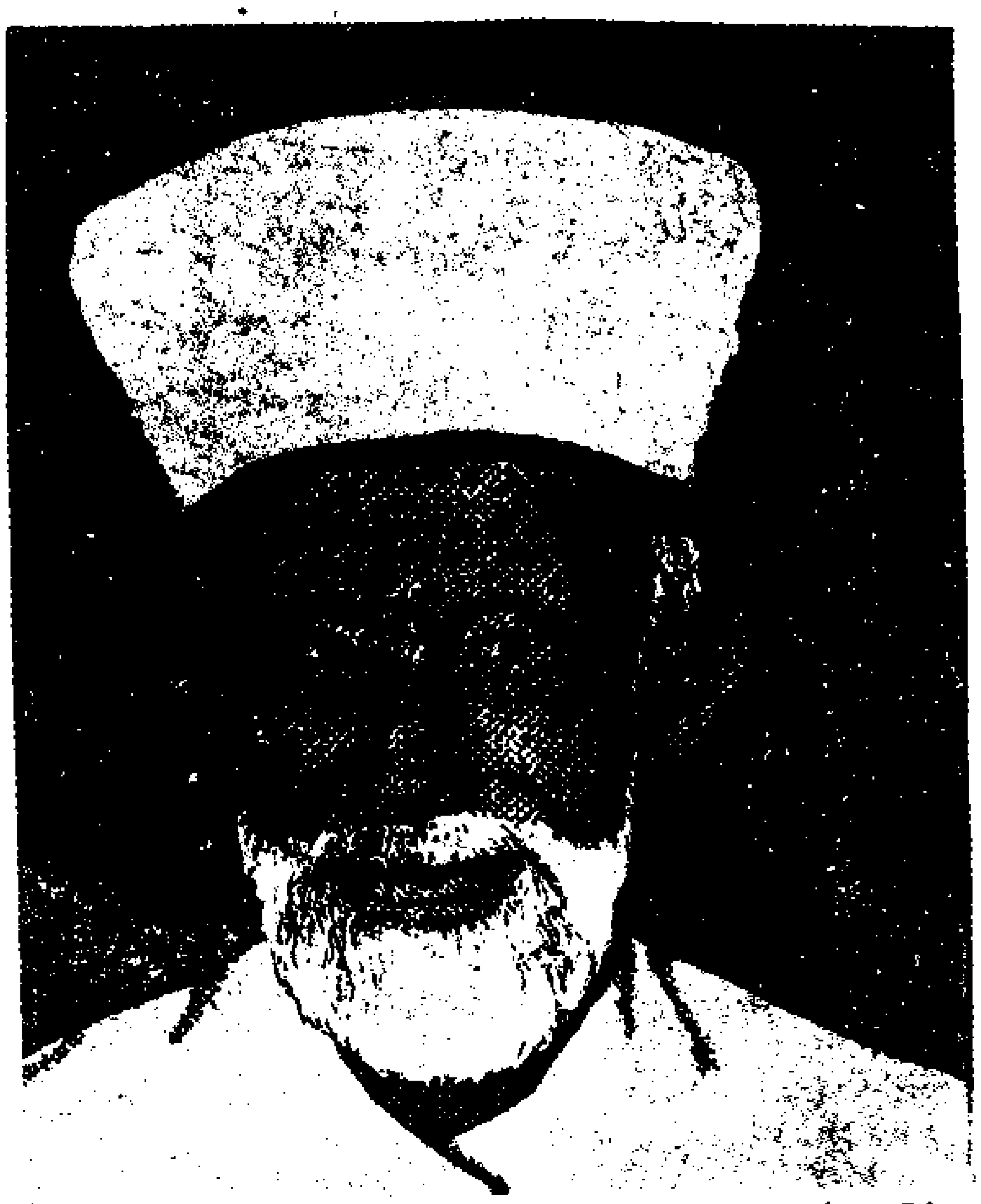

کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۷ء میں بغاوت کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔ برطانوی فوج نے مفتی اعظم کو گرفتار کرنے کے لیے ان کا محاصرہ کر لیا۔ مفتی اعظم اپنے دفتر سے نکل کر مسجد اقصےٰ میں چلے گئے۔ تین ماہ تک مسجد اقصےٰ کا محاصرہ رہا۔

ایک روز مفتی اعظم اس زبردست محاصرے سے نکل کر لبنان پہنچ گئے اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ ۱۹۴۶ء تک آپ ملک در ملک پھرتے رہے اور عالمی سیاست کے زیر اثر کہیں بھی جم کر کام نہ کر سکے۔ لبنان سے آپ شام چلے گئے اور دوسری جنگ عظیم میں جب فرانس نے انہیں برطانیہ کے حوالے کرنا چاہا تو آپ عراق پہنچ گئے۔ یہاں فلسطینیوں کی فوجی تنظیم کی اور شہر کو عربوں کی مدد کے لیے اکسایا۔ انگریزی جاسوس آپ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں آپ ایران چلے گئے۔ جب برطانیہ نے یہاں بھی حملہ کر دیا تو آپ افغانستان چلے گئے۔ یہاں قادیانیوں کی سازشوں کے پیش نظر آپ استنبول، صوفیا، بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری سے ہوتے ہوئے اٹلی جا پہنچے۔ مسولینی کو آپ نے اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے عربوں کی مدد کرے گا۔ نیز آپ نے لیبیا پر اٹلی کے قبضے کو ختم کرنے کا بھی وعدہ لیا۔ یہاں سے آپ جرمنی گئے اور صیہونی سازشوں کے خلاف بے پناہ کام کیا۔ مگر جرمنی جنگ ہار گیا اور آپ دل برداشتہ ہو کر سوئٹزرلینڈ اور پھر وہاں سے فرانس تشریف لے جا رہے تھے کہ ۱۹۴۶ء میں آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔

فرانس کی بدترین جیل میں آپ کے ساتھ تشدد کیا جانے لگا۔ نیز آپ پر نازیوں کے ایجنٹ ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ یوگوسلاوی حکومت نے ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کر دیا۔ مگر ایک روز پورا یورپ دنگ رہ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ مفتی اعظم جیل سے نکل کر قاہرہ پہنچ گئے ہیں۔

مفتی اعظم کی زندگی کا تیسرا دور ۱۹۴۶ء کے نصف سے شروع ہو کر ۱۹۷۴ء کے نصف پر آ کر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ آپ نے مصر اور لبنان ہی میں گزارا۔ مسلم کونفینشن کے رکن کی حیثیت سے آپ نے کئی بار پاکستان کے دورے بھی کیے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں بھی آپ نے شرکت کی اور پھر چند ہی ماہ بعد عالم اسلام کا یہ بطل جلیل اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

امین الرشید (۱۷۰ھ/۷۸۶ء۔ ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) عباسی خلیفہ۔ اپنے باپ ہارون الرشید کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ ہارون الرشید نے ۱۷۵ھ/۷۹۲ء میں پانچ سالہ امین کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ ۱۸۳ھ/۷۹۹ء میں اپنے دوسرے بیٹے مامون کو اپنا دوسرا ولی عہد نامزد کیا۔ جب ہارون الرشید نے ۱۹۳ھ/۸۰۹ء میں وفات پائی تو امین کو سلطنت کے طول و عرض میں خلیفہ تسلیم کر لیا گیا اور المامون اپنے علاقہ خراسان میں چلا گیا۔ ۱۹۵ھ/۸۱۰ء کے اواخر میں اس نے المامون کے باغی ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے بعد اپنے بیٹے اور اپنے تیسرے بھائی المعتصم کو بلا واسطہ خلیفہ نامزد کر دیا۔ اس کے بعد اس اقدام سے عراق اور خراسان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ آخر کار ۱۹۸ھ/۸۱۳ء ۲۴، ۲۵ محرم کی درمیانی شب میں مامون کے سپہ سالار طاہر بن الحسین کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ اس کے اس چار سالہ دور میں کوئی خاص کارنامہ نظر نہیں آتا۔

امیہ بن عبدشمس امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف قریش مکہ کے قبیلہ بنو امیہ کا مورث اعلیٰ عبدالمطلب بن ہاشم کا چچا زاد بھائی۔ طویل عمر پائی۔ سردار کی حیثیت سے امیہ بھی اپنے والد عبدشمس کی طرح مختلف جنگوں میں اہل مکہ کی قیادت کرتا رہا۔ کیونکہ ان کے جد امجد قصی نے جب مکہ میں شہری ریاست قائم کی تھی تو سپہ سالاری کی ذمہ داری اسی قبیلے کے حصہ میں آئی تھی اور امیہ کے بعد اس کے بیٹے حرب اور حرب سے اس کے بیٹے ابوسفیان کو منتقل ہوئی۔ ان کی اولاد بنو امیہ کہلاتی ہے۔

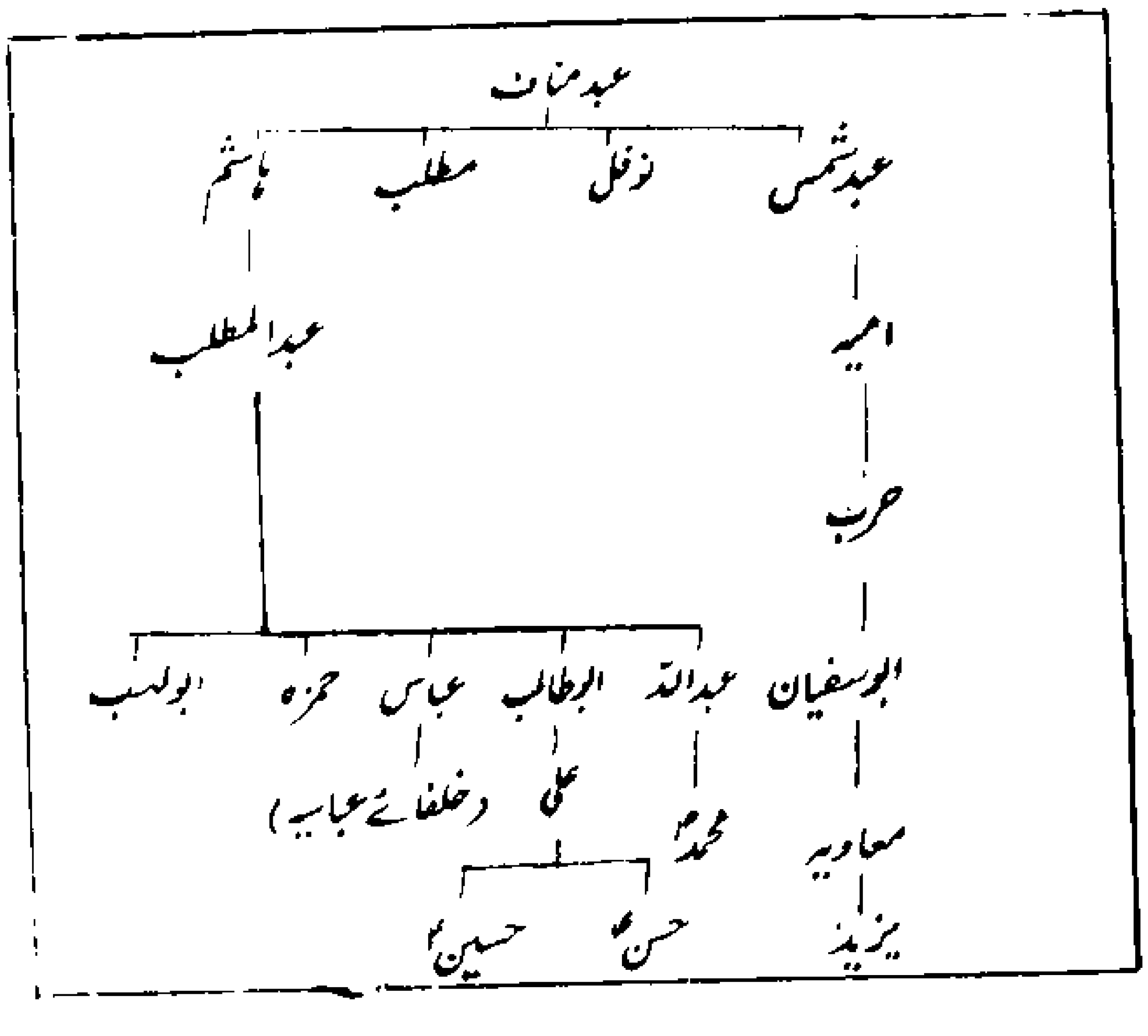

امیہ، بنو قریش کا ایک خاندان، جس سے اموی خلافت کا آغاز ہوا۔ امیہ بن عبدشمس اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ حضرت علیؓ کے دور حکومت میں معاویہؓ بن ابوسفیانؓ بن امیہ نے، جو اس وقت شام کے حاکم تھے، خودمختار حکومت کا اعلان کر دیا اور اموی خلافت کا آغاز کر دیا۔ حضرت علیؓ کے ساتھ اس کی جنگیں بھی ہوئیں۔ حضرت علیؓ کے بعد حضرت امام حسنؓ نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تو اسلامی حکومت امیر معاویہؓ کے ہاتھ آ گئی۔ معاویہ کے بعد اس کا بیٹا یزید حکمران ہوا۔ اس کے دور میں سانحہ کربلا پیش آیا اور حضرت امام حسینؓ شہید ہو گئے۔ یزید

Marfat.com

کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تین ماہ حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان کوئی اکیس برس تک اموی خلافت پر براجمان رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید دس برس تک حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان کوئی اکیس برس تک اموی خلافت پر براجمان رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید دس برس تک حکمران رہا۔ اس کے بعد سلیمان بن عبدالملک اور پھر عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ ہوئے عمر بن عبدالعزیز کے دو سالہ دورِ حکومت نے ایک بار پھر سے خلافت راشدہ کی یاد دلا دی۔ ان کے بعد یزید ثانی بن عبدالملک پھر ہاشم بن عبدالملک پھر ولید بن یزید بن عبدالملک پھر یزید ثالث بن یزید پھر ابراہیم بن ولید حکمران ہوئے۔ ان کے بعد مروان بن محمد بنو امیہ کا آخری خلیفہ ہوا۔ جس نے ۱۳۲ھ/۷۵۰ء تک حکومت کی۔ اس طرح خلافت بنی امیہ کے نوّے برس میں کل چودہ حکمران گذرے۔ ان کے عہد حکومت اسلامی سلطنت اتنی وسیع ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

انبیاء، سورۃ :۔ دیکھئے "الانبیاء، سورۃ"۔

انبیائے کرام وہ نیک بندے، جو خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے وقتاً فوقتاً اس دنیا میں آتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں بھیجا۔ اللہ کے یہ نیک بندے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ خدمت خلق کے لیے وقف کیے رہتے ان کے اس وعظ و نصیحت پر قوموں نے انہیں برا بھلا کہا اور تکلیفیں دیں مذاق اڑایا۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور بستی ایسی نہیں جس میں اس نے اپنا نبی اور رسول نہ بھیجا ہو (۳۵ : ۲۴) ہر نبی اور رسول ایک ہی تعلیم لے کر آیا۔ قرآن مجید نے بعض انبیاء کا ذکر کیا ہے اور بہت سے ایسے نبی ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ ایک حدیث میں انبیاء کی تعداد قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ قرآن اور دوسری آسمانی کتب میں جن انبیاء کا ذکر ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت آدمؑ۔ حضرت نوحؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت اسحاقؑ۔ حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت شعیبؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت ادریسؑ۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت داؤدؑ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت ہارونؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت زکریاؑ۔ حضرت یحییٰؑ حضرت یونسؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت اشموئیلؑ۔ حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت الیاس حضرت الیسع۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس کے علاوہ اور بہت سے انبیاء ایسے ہیں جن کا ذکر ہمیں قرآن میں نہیں ملتا۔ بعض حضرات نے زرتشت کنفیوشس۔ گوتم بدھ ذوالکفل وغیرہ کو بھی نبیوں میں شمار کیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے حکم ہے کہ وہ ان تمام انبیاء کی بعثت پر ایمان لائیں اور انہیں برحق جانیں۔

انجیل عیسائیوں کی مذہبی کتاب، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں اسے بشارت قرار دیا گیا ہے (۶۱ : ۶) یونانی زبان میں بھی اس کے معنی بشارت ہی کے ہیں۔ یہ وہ فرامین اور خطبات ہیں، جو یسوع مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں ارشاد فرمائے۔ انہیں آپ کی زندگی میں لکھا گیا یا نہیں، اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ذریعۂ معلومات نہیں۔ کیونکہ ابتداً میں حواریوں اور ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو لوگوں کے سامنے احکامات وارشادات بیان کر دیا کرتے تھے۔ بہرحال ایک مدت کے بعد جب ان معتقدین کو یہودیوں سے الگ امت قرار دے دیا گیا اور انہیں عیسائی کہا جانے لگا تو انہوں نے مسیح علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات پر کتابیں تصنیف کرنا شروع کیں جو ان مصنفین تک زبانی روایات کے ذریعے سے پہنچی تھیں۔ ہر فرقہ نے اپنی الگ کتاب تصنیف کی اور اسے انجیل کا نام دیا۔ جن کی تعداد چونتیس تک جا پہنچی۔ ان میں سے صرف ایک یعنی انجیل یہودیہ سریانی زبان میں لکھی گئی تھی، دیگر اناجیل یونانی زبان میں تھیں۔ ان اناجیل کی فہرست یہ ہے۔

طفولیت متیٰ، پطرس، اوّل یوحنا، دوم یوحنا، اندریاہ، فلپ، بارتھالوی اوّل توما، دوم توما، یعقوب، نیقودیس، متی آسن، مرقس (مصری) مرقس (عام) برناباس، لوقا، متی، متی ڈیئس، پال، لبی لیڈس، سرنتھس، ایبانی، یہودیہ جوڈ، مارشین، ناصرین، ٹاٹیان، ولن ٹینس، سی رنتھیس، اپلس، انکار ٹیٹس، ولادت مریم، جوڈرس اور کاملیٹ کی اناجیل۔

ان اناجیل میں سے کوئی بھی سنہ ۶۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں۔ مرقس کی انجیل ۷۰ء میں قلمبند ہوئی۔ انجیل یہودیہ تو اسی ابتدائی دور میں لاپتہ ہو گئی۔ ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ایسے مکاتیب کی ہے، جو حواریوں کے ساتھ منسوب ہیں۔ یہ تعداد میں ۱۱۳ تھے۔ آج کل عیسائیوں کے نزدیک بنیادی طور پر چار اناجیل مرقس، متی، لوقا اور یوحنا اور تیرہ مکاتیب مروج ہیں۔ باقی اناجیل اور مکاتیب ۳۲۵ء میں منعقد ہونے والی عیسائی پیشواؤں کی مجلس نیقیہ نے متروک قرار دے دیں۔ ان میں یوحنا کے مکاشفات شامل کر کے ان کا نام "عہد نامہ جدید" رکھا۔

موجودہ بائیبل میں شامل چاروں اناجیل ان یونانی زبان بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی ہیں، جو حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰؑ کے اقوال و اعمال کی تفصیلات زبانی ہی پہنچی تھیں۔ مزید یہ کہ ان اناجیل کا کوئی بھی اصل نسخہ اس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے، جس میں ابتداءً یہ تصنیف ہوئیں۔ اس معاملہ کو جو چیز خصوصاً مشتبہ بنا دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی اناجیل میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ یا غیر دانستہ طور پر تغیر و تبدل کو بالکل جائز سمجھتے رہے۔ یہ تغیرات صریحاً کچھ لوگوں نے بالقصد کیے جنہیں اصل کتاب میں شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا۔ بہت سے ایسے اضافے دوسری صدی عیسوی ہی میں کیے گئے۔

ان اناجیل میں بھی دس لاکھ سے زیادہ اور شدید اختلافات بلکہ تضادات موجود ہیں انھیں دور کرنے کے لیے بار بار کانفرنسیں منعقد ہوتی رہیں اور مستند نسخے شائع کیے جاتے رہے۔ اس کے باوجود اختلافات نمایاں رہے۔ ۱۵۴۵ء سے ۱۵۶۳ء تک منعقد کونسل ٹرینٹ نے ویلگٹ کے نسخہ کو الہامی قرار دے دیا اور ایک کمیٹی کے ذریعے ایک نئے نسخے کو مرتب کیا گیا مگر اس میں بھی بار بار ردوبدل کیا جاتا رہا اور ایک متن پر اتفاق کی بجائے اس میں اور بھی اختلافات در آئے۔ ۱۷۰۷ء میں مل اور ۱۷۵۱ء میں وٹیسٹائن نے یہ ثابت کیا ہے کہ انجیل زبردست تحریف و تصریف کا شکار ہوئی ہے۔

انجیل میں تحریف ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو سریانی اور یونانی زبانوں کے حروف کی مشابہت ہے۔ غافل انجیل نگاروں نے کسی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھ کر مفہوم میں اختلاف پیدا کر دیا۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر ایک انجیل نویس نے اسے اپنی جانب سے تذکرے کی صورت میں لکھا، جس سے صحیح تعلیمات

Marfat.com

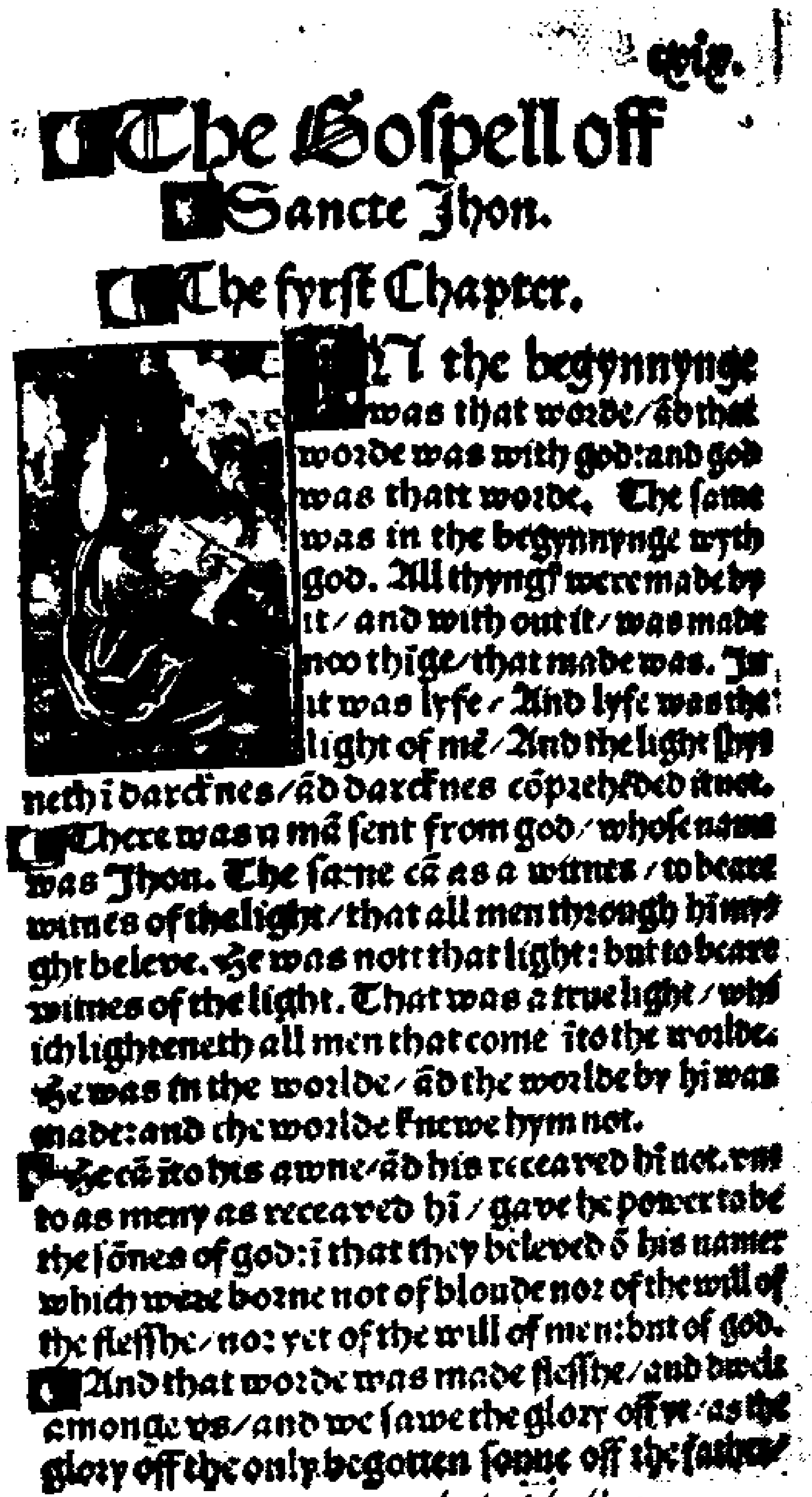
xiiij.

The Gospell off Sancte Jhon.

The fyrst Chapter.

In the begynnynge was that worde/ ād that worde was with god: and god was thatt worde. The same was in the begynnynge wyth god. All thyngs were made by it/ and with out it/ was made noo thinge/ that made was. In it was lyfe/ And lyfe was the light of mē/ And the light shyneth i darcknes/ ād darcknes cōprehēded it not.

There was a mā sent from god/ whose name was Jhon. The same cā as a witnes/ to beare witnes of the light/ that all men through him myght beleve. He was nott that light: but to beare witnes of the light. That was a true light/ which lighteneth all men that come ito the worlde. He was in the worlde/ ād the worlde by hi was made: and the worlde knewe hym not.

He cā ito his awne/ ād his receaved hi not. unto as meny as receaved hi/ gave he power to be the sonnes of god: i that they beleved ō his name: which were borne not of bloude nor of the will of the fleshe/ nor yet of the will of men: but of god.

And that worde was made fleshe/ and dwelt emonge vs/ and we sawe the glory off yt/ as the glory off the only begotten sonne off the father.

یوحنا کی انجیل کا ایک ورق

مسخ ہوکر رہ گئیں۔ تیسرا بڑا سبب یہ تھا کہ نکتہ چینوں نے جب مفہوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی تو از خود بہت سی تبدیلیاں کر دیں۔

انجیل کے موجودہ دور کے شارحین میں سے ایک بڑا طبقہ بائبل کو لفظ بلفظ خدا کی الہامی کتاب سمجھتا ہے۔ چند عیسائی علما ایسے بھی ہیں جو انجیل کو محض معتقدات اخلاق کی رہنما سمجھتے ہیں۔ جب اٹھارہویں صدی کے فلسفے نے حقیقی وحی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ اپنے مطالب کا اظہار ایسے طریق سے کرے جو ایک عام آدمی کے فہم کے عین مطابق ہو اور عہد نامہ جدید اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو ایک طبقہ ایسے آزاد خیال علما کا پیدا ہوا، جسے ٹوبنگن سکول کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق عہد نامہ جدید سینٹ پال کے خیالات کا آئینہ دار ہے اور زیادہ تر حضرت عیسےٰؑ کی زندگی کے آخری تین برسوں کے گرد گھومتا ہے۔ معاملات دنیا کا فقدان ہے اور کسی بھی طرح اسے اصل انجیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآن مجید میں جس انجیل کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ کتاب یا تعلیم ہے جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ امام رازی کے بقول زمانہ ابتری میں اصل انجیل ضائع ہوگئی۔ مولانا عبدالحق حقانی لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں دراصل تورات اور انجیل موجود نہ تھی چنانچہ قتادہ جیسے تابعین کے بقول انجیل سے وہ کتاب یا احکامات الٰہی مراد ہیں، جو حضرت عیسیٰؑ پر بذریعہ وحی نازل ہوئے۔

اب ہم اناجیل اربعہ کا تھوڑا سا ذکر کریں گے۔ ان میں انجیل مرقس قدیم ترین ہے۔ اس کا مصنف یونان کا ایک یہودی مارک تھا۔ یہ پال اور برناباس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ پھر اس نے پطرس کی رفاقت اختیار کر لی۔ پطرس کے قتل کے بعد مرقس نے یہ انجیل لکھی۔ اس کی تصنیف کا زمانہ ۶۵ء سے ۷۰ء تک کا ہے۔ یہ انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی۔ یہ سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ انجیل متی کے متعلق محققین کا خیال ہے کہ اس کا مصنف متی تھا۔ مگر اس کا لکھا ہوا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ موجودہ کتاب کسی اور کی لکھی ہوئی ہے اس کا زمانہ تالیف بھی ۶۵ء سے ۸۰ء کے درمیان ہے۔ پروفیسر ہارنک کے نزدیک یہ ۸۰ء سے ۱۰۰ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔ اس میں اٹھائیس ابواب ہیں۔ لوقا کی انجیل کا زمانہ تالیف ۸۰ء سے ۹۰ء کا ہے۔ اسے اٹلی کے باشندے لوقا نے لکھا تھا، جو پولوس کا طبیب بھی تھا۔ اس میں چوبیس ابواب ہیں۔ عہد نامہ جدید کا حصہ "رسولوں کے اعمال" بھی اسی کا تصنیف کردہ ہے۔ چوتھی انجیل اگرچہ حضرت عیسےٰؑ کے شاگرد یوحنا سے منسوب ہے لیکن جدید محققین کے نزدیک اس کا مصنف یوحنا کوئی اور شخص تھا جو ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا۔ اسلوب اور مضامین کے لحاظ سے یہ انجیل بالکل مختلف ہے۔ اس میں آسمانی حکومت کا ذکر ہے۔ نیز فلسفہ یونان کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۰ء سے ۱۴۰ء کا درمیانی دور ہے۔ ایک اور انجیل جس کا تذکرہ آج کل بہت زیادہ ہے اور جو اصلی انجیل کے زیادہ قرین ہے انجیل برناباس ہے۔ مگر عیسائی علما اسے سرے سے ماننے ہی سے انکار کرتے ہیں۔ (مزید دیکھیے "آسمانی کتب"، "انجیل برناباس"، "بائبل"، "عہد نامہ جدید"، "عیسےٰؑ"، "عیسائیت")۔

انجیل برناباس

حضرت عیسیٰؑ کے حواری برناباس کی لکھی ہوئی انجیل۔ قدیم عیسائی ادب میں اس کا ذکر ایک گمشدہ کتاب کی حیثیت سے ملتا ہے۔ مسیحی کلیسا نے جن اناجیل کو متروک قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک انجیل برناباس بھی تھی۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا تھا کیونکہ اس سے عیسائیت کا موجودہ ایوان منہدم ہو جاتا ہے۔ ۱۷۰۹ء میں شاہ پروشیا کے ایک مشیر کرومر کو اس کتاب کا نسخہ ایمسٹرڈم کے کسی کتب خانے سے ملا۔ یہ اطالوی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے یہ نسخہ شہزادہ آیوجین سالوئی کو تحفے کے طور پر دے دیا۔ ۱۷۳۸ء میں یہ آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کے شاہی کتب خانے میں منتقل ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کے ابتدا میں ہالینڈ کے مقام پر ڈاکٹر ہلم کو انجیل برناباس کا ایک اور نسخہ دستیاب ہوا۔ جو ہسپانوی زبان میں تھا۔ یہ نسخہ مشہور مستشرق جارج سیل کو ملا جس سے اس نے اپنے ترجمہ قرآن میں مختلف اقتباسات نقل کئے یہ نسخہ گم ہو چکا ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۱۷۸۴ء میں یہ ڈاکٹر ہیوٹ کے پاس آگیا تھا اور اس نے اپنے لیکچروں میں بتایا ہے کہ دونوں نسخوں میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے۔

۱۹۰۷ء میں اس نسخے کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر رینکس نے کیا۔ پھر مصر کے ایک عیسائی ڈاکٹر خلیل سعادت نے اسے عربی میں منتقل کر دیا۔ جو ۱۹۰۸ء میں سید رشید رضا نے شائع کیا۔ یہ عربی ترجمہ ہندوستان پہنچا تو مولوی محمد حلیم انصاری ردولوی نے اس کا اردو ترجمہ ۱۹۲۶ء میں لاہور سے شائع کیا۔

عیسائی ادب میں جہاں کہیں بھی انجیل برناباس کا ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے، جسے شاید کسی مسلمان نے

Marfat.com

تصنیف کر کے برناباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے، جو شاید اس لیے بولا جاتا ہے کہ اس میں جگہ جگہ صراحت آنحضورؐ کے متعلق پیشن گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اسے پڑھتے ہی علم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف ہرگز نہیں۔ دوسرے اس کا ذکر کہیں بھی مسلمانوں کے ہاں نہیں ملتا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم وغیرہ کسی نے بھی انجیل برناباس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ ابن ندیم کی "الفہرست" میں بھی اس کا تذکرہ موجود نہیں۔

دوسری طرف آنحضورؐ کی پیدائش سے پچھتر برس قبل پوپ گلاسیئس اول کے زمانہ میں گمراہ کن کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی، اس میں انجیل برناباس بھی شامل تھی۔ خود عیسائی محققین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قدیم عیسائی ادب میں انجیل برناباس کا ذکر ملتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ گلاسیئس اول نے انجیل برناباس کو گمراہ کن کیوں کہا تھا اور اس کا پڑھنا ممنوع کیوں قرار دیا گیا تھا؟ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس انجیل میں عام عیسائی نظریات کے خلاف مواد موجود تھا۔ اور یہ بات خود عیسائی علماء نے تسلیم کی ہے کہ شام، سپین، مصر وغیرہ کے ابتدائی کلیساؤں میں ایک مدت تک انجیل برناباس مروج رہی ہے۔

موجودہ بائبل کی اناجیل اربعہ لکھنے والا کوئی بھی شخص حضرت عیسٰیؑ کا حواری نہیں تھا اور نہ ان میں کسی نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے۔ نیز انہوں نے اپنی معلومات کی روایت کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ جب کہ انجیل برناباس کا مصنف کہتا ہے کہ وہ مسیح کے اوّلین بارہ حواریوں میں سے ایک ہے اور شروع سے آخر تک مسیح کے ساتھ رہا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سنے اقوال درج کر رہا ہے۔ "کتاب اعمال" میں لوقا نے برناباس کا ذکر کیا ہے۔

انجیل برناباس اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے کہ یہ اس شخص نے لکھی جو حضرت عیسٰیؑ کے عہد میں تھا اور اس میں ان کے متعلق زیادہ مواد ملتا ہے۔ نیز اس میں حضرت عیسٰیؑ کی زبانی پیغمبر آخر زماں کی تشریف آوری کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ اس میں صاف طور پر آنحضورؐ کو محمد رسول اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے

اندلس

اندلس ہسپانیہ کا بہت بڑا گنجان علاقہ جو بحر اوقیانوس آبنائے جبل الطارق اور بحیرہ روم سے ملحق ہے۔ مسلمانوں نے اس علاقے پر آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ اندلس کا نام کافی پرانا ہے۔ ۹۸ھ/۷۱۶ء کے ایک دینار پر عربی اور لاطینی الفاظ میں اندلس کے لیے لفظ ہسپانیہ استعمال کیا گیا ہے ہسپانوی لاطینی مورخ مسلم سپین اور مسیحی سپین کے لیے یہی نام سپانیہ یا ہسپانیہ استعمال کرتے ہیں لیکن عرب مصنف جب بھی الاندلس لکھتے ہیں تو اس سے مراد اسلامی سپین ہی لیتے ہیں۔ خواہ اس کی جغرافیائی حدود کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

طبعی محلِ وقوع:۔ جزیرہ نمائے آئی بیریا یورپ کے جنوب مغرب میں خشکی کا ایک وسیع و عریض ابھرا ہوا علاقہ شکل کے لحاظ سے پانچ گوشہ ہے ایک طرف یہ کوہستان پیرینیز (PYRENEES) کے ذریعے براعظم یورپ سے ملا ہوا ہے۔ اور بقیہ اطراف میں بحیرہ اوقیانوس اور بحیرہ روم سے ملحق ہے۔ اس کا سطحی رقبہ تقریباً ۲۲۹۰۰۰ مربع میل ہے۔ جزیرہ نمائے سپین یورپ کے سب سے زیادہ ہموار علاقوں میں سے ہے۔ اس کے بنیادی طور پر تین حصے ہیں۔ وسط میں ایک وسیع سطح مرتفع جس نے پورے رقبے کا کم از کم نصف حصہ گھیر رکھا ہے۔ شمال کی طرف کینبریا کا کوہستانی سلسلہ ہے۔ جنوب میں زلزلوں کی وجہ سے ایک بڑا تودہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ جس نے بالائی اندلس کا بہت بڑا حصہ گھیر رکھا ہے۔

آب و ہوا:۔ جزیرہ نما کی آب و ہوا خشک اور بالعموم معتدل ہے موسم سرما میں شدید سردی اور گرما میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ بارش عموماً بے قاعدہ ہوتی ہے اور سالانہ اوسط ۲۲ انچ اور دوسری طرف یعنی خشک سپین میں پندرہ انچ سے بھی کم ہوتی ہے، اس لیے زمین بنجر ہے۔ جزیرہ نما کے شمالی اور شمال مغربی حصے نیز عام طور پر بحر اوقیانوس کے قریب کے تمام ساحلی علاقے کا موسم معتدل رہتا ہے۔ کیونکہ اس تمام علاقے پر بادل چھائے رہتے ہیں۔ اس کی معدنیات میں سیسہ، چاندی، لوہا، تانبا، مینگنیز، سنگ مرمر اور پارہ ہیں۔ نیز اس میں مختلف قسم کے قدرتی نمک۔ شورہ، میگنیشیم، سلیکا کا نمک، گندھک، توتیا، سرمہ، پھٹکڑی اور کہربا بھی بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ خشک سپین میں سدا بہار صنوبر درخت صنوبر اور کارک شاہ بلوط کے درخت ملتے ہیں۔ لیکن مرطوب سپین میں وہی علاقے سال بھر جنگلوں اور چراگاہوں کی وجہ سے سرسبز و شاداب رہتے ہیں

تاریخ:۔ چوتھی صدی ہجری عیسوی تک اندلس اسلامی دنیا کا ایک ایسا حصہ تھا جس کے متعلق مشرقی دنیا کو بہت کم معلومات تھیں۔ قرطبہ میں مروانی خلافت کے شروع ہونے کے بعد سے اندلس کے حالات کی تدوین منظم طور پر ہوئی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ طوفان نوح کے بعد جب نئی دنیا بسائی گئی تو اس ملک میں جو قوم آباد ہوئی اس کا نام اندلش تھا بعد میں آنے والوں نے "ش" کو "س" سے بدل دیا۔ اندلس کی اس وقت کی آبادی مذہب مجوسی تھا۔ انہوں نے اپنے وقت میں بڑی ترقی کی۔ مگر جیسے ہر عروج کے بعد زوال لازمی ہوتا ہے۔ اس مجوسی قوم پر بھی زوال آیا۔ متواتر ایک سو سال تک بارش نہ ہونے کے سبب ساری قوم موت کی آغوش میں چلی گئی اور اس کی جگہ ایک نئی قوم نے لے لی۔ یہ افریقہ سے جلاوطن کی گئی تھی۔ یہ قوم صدیوں اندلش میں آباد رہی اس کی آبادی اتنی بڑھی کہ انگلستان تک جا پہنچی۔ اس قوم کے زمانہ میں طالقہ اندلس کا دارالسلطنت تھا یہ قوم پہلے تو خوب بڑھی اور پھلی۔ مگر ایک سو ستاون برس بعد اس کے قوے بھی مضمحل ہو گئے اور ایک نئی قوم نے جو روما سے اٹھی تھی۔ یہ ملک چھین لیا۔ اس قوم کے بادشاہ کا نام اشبانیہ تھا۔ اس کی وجہ سے اس ملک کا نام بھی اندلش کی جگہ اشبانیہ ہو گیا۔ علوش رومی نے اشبانی بادشاہوں کو ختم کر کے ان کی جگہ لے لی اور رومی کوئی تین سو سال تک اس ملک پر حکومت کرتے رہے۔ جب وہ کمزور ہوئے تو قوط قوم اٹھی۔ اس نے رومیوں کو اندلس سے نکال دیا طارق کے حملہ آور ہونے تک یہ قوم اندلس پر حکمران تھی۔ اندلس پر اس کے امراء حد سے زیادہ سہل انگار اور ظالم ہو گئے تھے۔

شوال ۹۲ھ/جولائی ۷۱۱ء میں طارق نے اندلس پر حملہ کیا اور ایک سال کے اندر اندر اس کے اکثر علاقوں کو فتح کر لیا۔ اس وقت سے لے کر عبدالرحمان الداخل کی حکومت قائم ہونے تک اسلامی فوج کے جو مسلمان امراء منتخب ہوئے۔ اور انہوں نے اندلس کے تمام علاقوں کو فتح کیا، ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ طارق بن زیاد! شوال ۹۲ھ/جولائی ۷۱۱ء سے جمادی الاوّل ۹۳ھ/ مارچ اپریل ۷۱۲ء تک

۲۔ عبدالرحمان، موسیٰ بن نصیر، ذوالحجہ ۹۵ھ/ستمبر ۷۱۴ء تک۔

Marfat.com

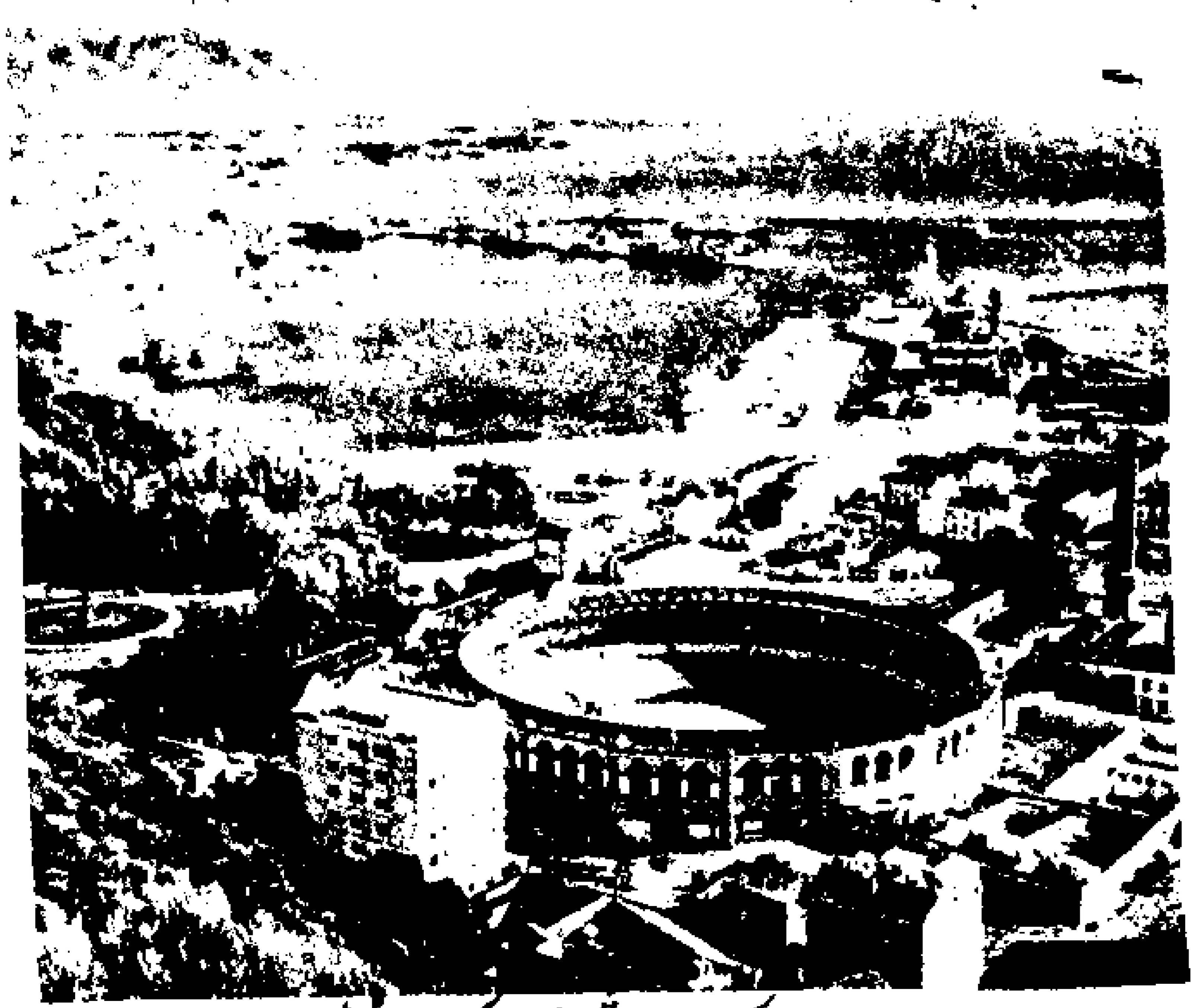

ملاغہ کے موجودہ شہر میں ایک سٹیڈیم

۳ - عبدالعزیز بن موسیٰ؛ ذوالحجہ ۹۷ھ / اگست ۷۱۶ء تک

۴ - ایوب بن حبیب اللخمی؛ ذوالحجہ ۹۸ھ / جولائی اگست ۷۱۷ء تک

۵ - الحرّ بن عبدالرحمان الثقفی؛ رمضان ۱۰۰ھ / مارچ اپریل ۷۱۹ء تک

۶ - السمح بن مالک الخولانی؛ ذوالحجہ ۱۰۲ھ / مئی ۷۲۱ء تک

۷ - عبدالرحمان (بن عبداللہ) الغافقی؛ صفر ۱۰۳ھ / اگست ۷۲۱ء تک

۸ - عنبسہ بن سحیم الکلبی؛ شعبان ۱۰۷ھ / دسمبر ۷۲۵ء، جنوری ۷۲۶ء تک

۹ - عذرہ بن عبداللہ الفہری؛ شوال ۱۰۷ھ / مارچ ۷۲۶ء تک

۱۰ - یحیٰ بن سلمہ الکلبی؛ ربیع الثانی ۱۰۸ھ / ستمبر ۷۲۶ء تک

۱۱ - عثمان بن ابی عبدہ؛ شعبان ۱۰۹ھ / نومبر ۷۲۷ء تک

۱۲ - عثمان بن ابی نسعة الخثعمی؛ ربیع الاوّل ۱۱۰ھ / جون جولائی ۷۲۸ء تک

۱۳ - حذیفہ بن الاحوص القیسی؛ محرم ۱۱۱ھ / اپریل ۷۲۹ء تک

۱۴ - الہیثم بن عبید الکلبی (الکنانی)؛ جمادی الاوّل ۱۱۳ھ / اگست ۷۳۱ء تک

۱۵ - محمد بن عبداللہ الاشجعی (عبدالملک)؛ شعبان ۱۱۳ھ / اکتوبر ۷۳۱ء تک

۱۶ - عبدالرحمان الغافقی؛ رمضان ۱۱۴ھ / اکتوبر ۷۳۲ء تک

۱۷ - عبدالملک بن قطن الفہری رمضان ۱۱۶ھ / اکتوبر نومبر ۷۳۴ء تک

۱۸ - عقبہ بن الحجاج السلولی (القیسی) صفر ۱۲۳ھ / دسمبر ۷۴۰ء تک

۱۹ - عبدالملک بن قطن الفہری؛ ذی قعدہ ۱۲۳ھ / ستمبر اکتوبر ۷۴۱ء تک

۲۰ - بلج بن بشر القشیری؛ شوال ۱۲۴ھ / ستمبر ۷۴۲ء تک

۲۱ - ثعلبہ بن سلامہ العاملی رجب ۱۲۵ھ / مئی ۷۴۳ء تک۔

۲۲ - ابوالخطار حسام بن ضرار الکلبی رجب ۱۲۷ھ / اپریل مئی ۷۴۵ء تک

۲۳ - ثوابہ بن سلمہ الجذامی؛ ربیع الثانی ۱۲۹ھ / دسمبر ۷۴۶ء، جنوری ۷۴۷ء تک۔

۲۴ - یوسف بن عبدالرحمان الفہری؛ ذوالحجہ ۱۳۸ھ / مئی ۷۵۶ء تک،

اندلس کی مروانی سلطنت ۱۳۸ھ / ۷۵۶ء تا ۴۲۲ھ / ۱۰۳۱ء تک قائم رہی ان امرائے اندلس کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

۱ - عبدالرحمٰن اوّل بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان ۱۳۸ھ / ۷۵۶ء تا ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء - اس وقت اندلس میں مسلمانوں کے لیے سیاسی حالات تسلی بخش نہ تھے - جنرل موسیٰ بن نصیر اور اس کے لڑکے عبدالعزیز کی موقوفی کے بعد حکومت دمشق نے مختلف گورنروں کو اندلس کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے بھیجا مگر ان میں سے کوئی بھی اندلس کے انتظامی مسائل کو اچھی طرح حل نہ کر سکا۔ ملک میں بدامنی بڑھتی گئی اور اندلس صحیح معنوں میں بدنظمی اور بدامنی کا اکھاڑہ بن گیا۔ اس نازک موقع پہ عبدالرحمان الاوّل ربیع الثانی ۱۳۸ھ / ستمبر ۷۵۵ء میں سپین کے ساحل پر اترا اور وہاں کے گورنر یوسف کو شکست دے کر دارالحکومت قرطبہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے عیسائی حکمرانوں کو شکست دی۔ جنگی قابلیت رکھنے کے باوجود بڑا رحم دل اور شستہ عادات کا مالک تھا۔ امور سلطنت کا کافی تجربہ رکھتا تھا۔ عیش پرستی سے نفرت تھی۔ علما کی سرپرستی کرتا تھا۔ قرطبہ کی جامع مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں وہ خود عام مزدوروں کی طرح ایک گھنٹہ روزانہ پتھر ڈھوتا تھا۔ پورے ملک میں اس نے سڑکوں کا جال بچھایا ڈاک کا بہترین انتظام کیا۔ ایک ٹکسال قائم کیا۔ قرطبہ میں کئی عالیشان محل اور مساجد تعمیر کرائیں۔ شہر کی حفاظت کے لیے اس کے گرد فصیل بنوائی۔ دریاؤں پر پل تعمیر کرائے اور زراعت کو فروغ دینے کے لیے آب پاشی کا انتظام کیا۔

۲ - (ابوالولید) ہشام اوّل بن عبدالرحمان؛ ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء تا ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء عبدالرحمان اوّل کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہشام اوّل تخت نشین ہوا۔ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سادہ لباس پہنتا تھا۔ پرہیزگاری اور نیکی کا مجسمہ تھا۔ منصف مزاج تھا۔ سادہ کپڑے پہن کر قرطبہ کے گلی کوچوں میں عوام کے صحیح حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے گشت لگایا کرتا تھا۔ امام مالک سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے اندلس میں مالکی مسلک کو فروغ دینے کی بہت کوشش کی۔ ہشام نے مطروح بن سلیمان کی بغاوت کو فرو کیا اور سرکش فرنگی قبائل کی سرکوبی کی۔

۳ - (ابوالمظفر المرتضیٰ) الحکم اوّل بن ہشام اوّل؛ ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء تا ۲۰۶ھ / ۸۲۲ء صاحب علم، دانش مند اور باہمت حکمران تھا۔ شان و شوکت کا دلدادہ اور شکار کا شوقین تھا۔ اس نے اندلس میں فوج کو منظم کیا۔ گھوڑوں کے لیے چراگاہوں اور چھاؤنیوں کا بندوبست کیا۔ اس کے عہد میں فرانسیسیوں نے اندلس کے اسلامی مقبوضات پر دست درازی شروع کی اور شارلیمین نے بھی فرانسیسیوں کی مدد کی مگر حکم نے عیسائیوں کو متعدد معرکوں میں شکست دے کر گسکنی کا علاقہ فتح کر لیا

۴ - عبدالرحمان ثانی بن الحکم اوّل ۲۰۶ھ / ۸۲۲ء تا ۲۳۸ھ / ۸۵۲ء - علم و فنون کا دلدادہ تھا۔ موسیقی سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ رفتہ رفتہ موسیقی سے دلچسپی اندلس کے عربوں کی قومی خصوصیت بن گئی۔ اس کے عہد میں رعایا فارغ البال تھی۔ ملک بھر میں عالیشان محلات، سڑکیں، شاہراہیں، مساجد، مدرسے اور شفاخانے تعمیر ہوئے ڈاک کا بہترین انتظام کیا گیا۔ ملک کے دفاع کے لیے ایک شاندار بحری بیڑہ تیار کرایا۔ قرطاجنہ اور قادلیس کے مقامات پر اسلحہ سازی کے کارخانے کھولے گئے۔ اس عہد کی شاندار تہذیبی روایات اور عربوں کی خوش وضعی کے انداز دیکھ کر یورپ والوں نے بھی اپنے تہذیبی ڈھانچے میں عربوں کا تہذیبی رنگ بھرا

۵ - محمد اوّل بن عبدالرحمان ثانی ۲۳۸ھ / ۸۵۲ء تا ۲۷۳ھ / ۸۸۶ء اس نے اندلس کی حکومت کو باقاعدہ اصولوں پر منظم کیا۔ ملکی انتظامات کے لیے قواعد و ضوابط

Marfat.com

مرتب کیے۔ مختلف مناصب پر متشرع لوگوں کو مقرر کیا۔ اس کے عہد میں حنبل فقہ کے پیروکاروں کو عروج نصیب ہوا۔ متعصب عیسائیوں اور باغیوں کے سلسلے میں اس نے باپ کی نرم روی کو ترک کر دیا۔ چنانچہ طارق کے عہد کے بعد سے جتنے گرجے عیسائیوں نے تعمیر کیے تھے انہیں موسیٰ بن نصیر کے عہدنامے کی رو سے مسمار کرا دیا۔ متعصب یولوجیس اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرایا۔ باغیوں اور بیرونی حملہ آوروں کو بری طرح شکست دی۔ اس کا عہد مسلسل بد امنی اور مصائب کا دور رہا۔ اندرونی بغاوتوں کے علاوہ ملک میں زلزلے وبا اور قحط سالی کی بلائیں نازل ہوتی رہیں۔ مگر ان مصائب سے بھی وہ نہ گھبرایا اور سلطنت کو روبہ تنزل ہونے سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔

۶۔ منذر بن محمد اوّل ! ۲۷۳ھ/۸۸۶ء تا ۲۷۵ھ/۸۸۸ء

چالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر جنگی معرکوں میں گذری تھی۔ اس لیے اسے مہمات ملکی کا تجربہ تھا۔ مگر اس کے عہد میں ملکی حالت بہت بگڑ گئی۔ سرحدی عیسائیوں نے سرحدی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ابن حفصون نے پھر سر اٹھایا۔ ابھی اس سے کشمکش جاری تھی کہ منذر کے سوتیلے بھائی عبداللہ نے سازش کر کے اسے مروا دیا

۷۔ عبداللہ بن محمد اوّل ! ۲۷۵ھ/۸۸۸ء تا ۳۰۰ھ/۹۱۲ء

اس کے دور میں ملک کی افراتفری بہت حد تک بڑھ گئی تھی۔ اندلس کے بہت بڑے حصے میں عرب امرا نے جابجا خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ اس کی حکومت کے ابتدائی پندرہ برسوں میں عیسائیوں نے جابجا شورشیں برپا کیں۔ آخری نو سال کچھ سکون سے گذرے اور تجارت زراعت اور صنعت کو ترقی نصیب ہوئی۔ ان خانہ جنگیوں کے باوجود مسلمانوں کے اندر اتنی ہمت باقی تھی کہ انہوں نے یورپ میں اپنی مہمات کو جاری رکھا۔ اور پیڈمانٹ۔ لنگوریا اور سوئٹزرلینڈ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ فرانس میں جوس۔ مارسیلز۔ گرینوبل اور نیس کے علاقوں کو بھی تسخیر کر لیا۔

۸۔ عبدالرحمان ثالث ! ۳۰۰ھ/۹۱۲ء تا ۳۵۰ھ/۹۶۱ء

عبداللہ نے اپنے بیٹوں کی موجودگی میں اپنے پوتے عبدالرحمان الثالث کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یہ اکیس سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی قابلیت اور سیاستدانی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ اپنے اخلاق و تدبر سے کچھ ہی عرصہ میں قرطبہ کے لوگوں اور اپنے رشتہ داروں کو اپنا حقیقی خیر خواہ بنا لیا۔ عیسائی حکمرانوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں۔ تجربہ کار جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بڑا عالم و فاضل بھی تھا۔ علم و ہنر کی سرپرستی کرنا وہ اپنا فرض عین سمجھتا تھا۔ اس کا پچاس سالہ عہد اندلس کی تاریخ میں اسلامی عہد کا سنہری دور ہے۔

۹۔ الحکم ثانی بن عبدالرحمان ثالث ! ۳۵۰ھ/۹۶۱ء تا ۳۶۶ھ/۹۷۶ء

یہ جب تخت نشین ہوا تو لیون۔ نویرہ اور قشتالہ کے کاؤنٹ نے جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ مگر حکم نے انہیں عبرتناک شکستیں دیں۔ اس نے نہ صرف اندلسی قلمرو کو مستحکم کیا بلکہ اسے وسعت بھی دی یہ بڑا علم دوست حکمران تھا۔ اس کے دربار میں علما اور فلسفیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

۱۰۔ ہشام ثانی ! ۳۶۶ھ/۹۷۶ء تا ۳۹۹ھ/۱۰۰۸ء اور دوبارہ ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء تا ۴۰۳ھ/۱۰۱۳ء

گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ کم سن تھا اس لیے وزیر طالع محمد بن ابی عامر اس کا سرپرست بنا۔ بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنے مخالف امراء کو قتل کرانے کے بعد خلیفہ کو نظر بند کر دیا اور اس طرح تمام سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ خلیفہ پر قابو پانے کے بعد طالع محمد بن عامر حاجب المنصور کے لقب سے ملک پر حکومت کرنے لگا۔ خطبے میں خلیفہ کے نام کے ساتھ اس کا نام شامل کر لیا گیا۔ تمام احکامات اسی کے

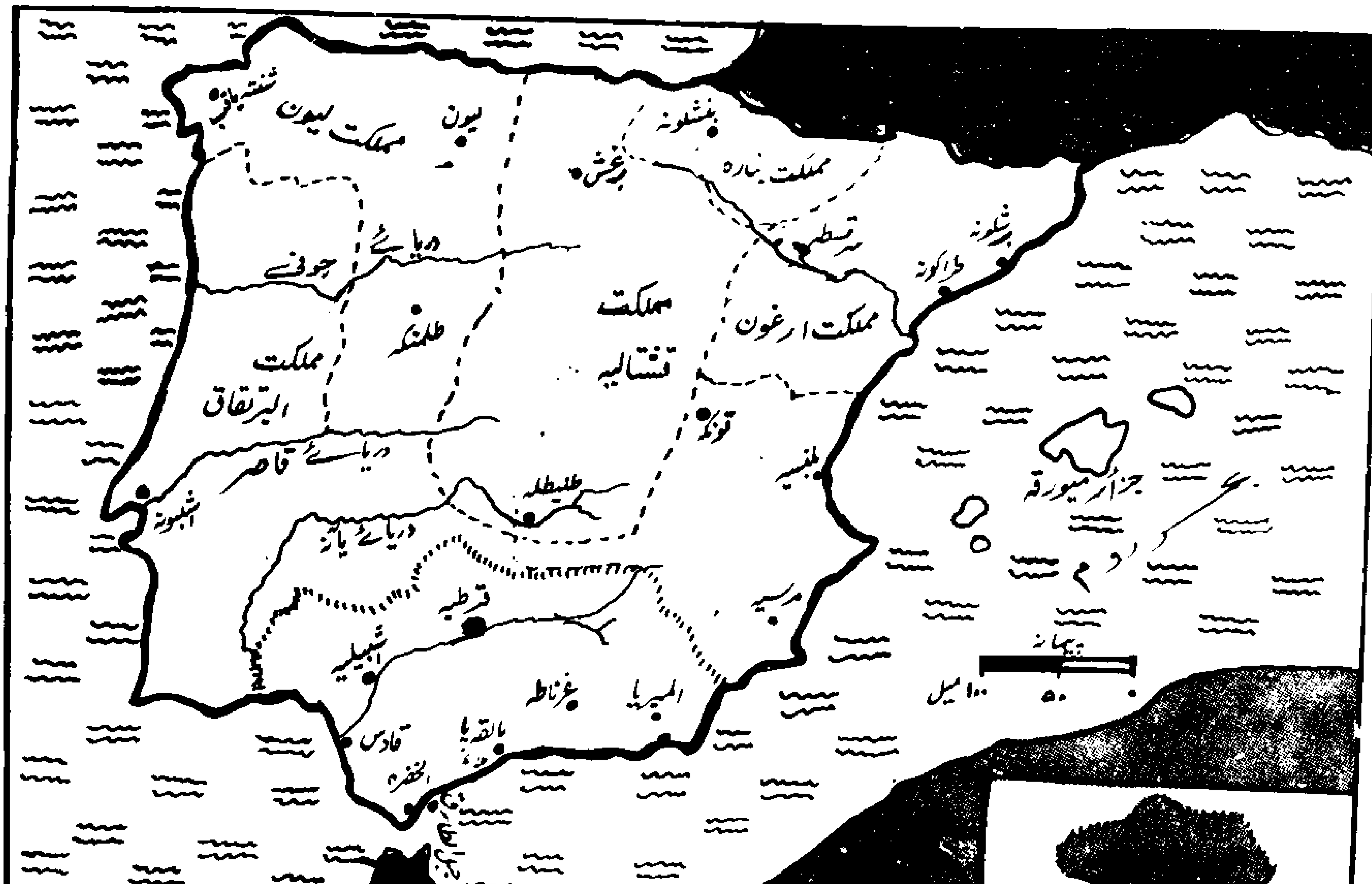

Marfat.com

نام سے جاری ہوتے تھے۔ ۳۹۴ھ/۱۰۰۲ء میں انتقال کیا۔

اندلس میں طوائف الملوکی اور اموی خلافت کا زوال: منصور حاجب کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عبدالملک کو ہشام ثانی نے اپنا حاجب مقرر کیا اور سیف الدولہ اور مظفر کے خطابات سے نوازا۔ چھ سال تک اس نے سلطنت کا وقار قائم رکھا۔ عیسائیوں کے خلاف آٹھ مرتبہ کامیابی سے جہاد کیا۔

۳۹۹ھ/۱۰۰۸ء میں وفات پاگیا۔ اس کے بعد ہشام نے اس کے بھائی عبدالرحمٰن بن منصور کو اپنا حاجب مقرر کیا۔ یہ بہت جلد سلطنت کا مختار کل بن گیا اور اس نے ہشام سے قرطبہ کی جامع مسجد میں اپنی ولی عہدی کا اعلان کرادیا۔ بنوامیہ کے حامیوں کو یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے عبدالرحمٰن ثالث کے پڑپوتے محمد ثانی بن ہشام بن عبدالجبار کو مہدی باللہ کے لقب سے ۳۹۹ھ/۱۰۰۹ء بار دیگر ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء تخت پر بٹھا دیا اور ہشام ثانی کو معزول کر دیا۔ عبدالرحمان بن منصور یہ خبر سنتے ہی قرطبہ واپس آیا مگر حالات پر قابو نہ پایا جا سکتا تھا۔ اس کے رفقاء میں سے ایک نے اس کا سر قلم کر کے محمد الثانی مہدی باللہ کے پاس بھیج دیا۔ اس طرح بنی عامر کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ محمد الثانی کے زمانہ میں بربریوں اور رعایا کے باہمی تعلقات بگڑ گئے۔ مہدی نے بربریوں کی طرف داری کی اس پر رعایا نے سلیمان بن الحکم بن سلیمان بن عبدالرحمان الثالث کو مستعین باللہ کے لقب سے ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء بار دیگر ۴۰۳ھ/۱۰۱۳ء تا ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء میں تخت پر بٹھایا۔ سلیمان نے عیسائی بادشاہ الفانسو کی مدد سے کو شکست دے کر قرطبہ پر قبضہ کر لیا۔ مہدی نے الفانسو سے ساز باز کر کے سلیمان کو شکست دی اور قرطبہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ان باتوں سے تنگ آ کر لوگوں نے مہدی کو قتل کر دیا اور ہشام الثانی کو دوبارہ اپنا خلیفہ بنالیا۔ ہشام نے واضح عامری کو اپنا حاجب مقرر کیا مگر سلیمان بن الحکم اور الفانسو نے مل کر ہشام کا قرطبہ میں محاصرہ کر لیا اور اسی دوران میں واضح عامری قتل ہوگیا اور ہشام کہیں روپوش ہوگیا۔ ان حالات میں سلیمان قرطبہ پر قبضہ کر کے دوبارہ خلیفہ بن گیا۔ اس کے زمانے میں جابجا خودمختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء تک سلیمان قرطبہ اور اس کے مضافات پر حکومت کرتا رہا۔ آخر مراکش کے ادریسی خاندان کے ایک نوجوان علی بن حمود نے سلیمان کو شکست دے کر قتل کر دیا اور قرطبہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مگر ایک سال بعد صقلبی غلاموں نے بغاوت کی اور اسے قتل کر دیا اور اس کے بھائی قاسم کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ مگر یحیٰی ابن علی نے کافی کش مکش کے بعد قاسم کو ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء میں شکست دے کر قید کر لیا۔ تقریباً نصف صدی تک سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود خاندان بنوحمود کے افراد اہل قرطبہ پر حکومت کرتے رہے۔ خیران جو شروع میں علی بن حمود کا خیر خواہ تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ علی بن حمود ہشام کی طرح خلیفہ بننا نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ منصور کی طرح ان کا حاجب بن سکتا ہے۔ اسے ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو خلافت کا دعوے کرے۔ بہت سے اندلسیوں نے اسے مدد دینے کا وعدہ کیا ان میں سے سرقسطہ کا حاکم منذر بھی تھا۔ جو خاندان بنی ہاشم کی یادگار تھا۔ چنانچہ منذر اور خیران نے ۴۰۸ھ/۱۰۱۸ء میں اپنے ہم خیال سرداروں کی ایک مجلس بلائی۔ عبدالرحمان رابع بن محمد بن عبدالملک بن عبدالرحمان ثالث کو خلیفہ چنا اور تینوں غرناطہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہوں نے زاوی کو خط لکھا کہ میں خلیفہ ہوں اور میری ماتحتی قبول کر۔ لیکن اس نے اس کا سخت جواب دیا۔ تو عبدالرحمٰن رابع نے جنگ کا ارادہ کیا۔ ادھر خیران اور منذر نے بھی انہیں اپنے مطلب کا آدمی نہ پاتے ہوئے بے وفائی کی اور میدان جنگ میں عبدالرحمان رابع کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے جاملے۔ عبدالرحمان کو دشمن کے آدمیوں نے قتل کر دیا۔ ادھر رجب ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء میں یحیٰی بن علی بن حمود نے اپنے چچا قاسم بن حمود کو شکست دی تو اہل قرطبہ نے خودمختار ہونے کے بعد پھر خواہش ظاہر کی کہ بنوامیہ میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے۔ چنانچہ ۴۱۴ھ/۱۰۲۲ء میں انہوں نے ایک مجلس منعقد کی اور تین آدمیوں کے نام خلافت کے لئے پیش کئے۔ جن میں سے عبدالرحمان خامس بن ہشام بن عبدالجبار کو خلیفہ چنا گیا۔ ابھی مسند خلافت پر بیٹھے سات ہفتے بھی پورے نہ گذرے تھے کہ عبدالرحمان خامس قتل کر دیئے گئے اور اس کے بعد محمد ثالث بن عبدالرحمان بن عبیداللہ بن عبدالرحمان ثالث (۴۱۴ھ/۱۰۲۴ء تا ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء) کو خلیفہ چن لیا گیا۔ اس بادشاہ نے دولت و مناسب تقسیم کر کے ناموری حاصل کرنا چاہی اس کا دورِ حکومت بہت قلیل رہا۔ لوگوں کا پہلے ہی خیال تھا کہ وہ ایک برا فرمانروا ثابت ہوگا اور یہی ہوا۔ ربیع الاول ۴۱۶ھ/مئی ۱۰۲۵ء کو ایک بلوہ ہوا اور لوگوں نے اس کے محل کا محاصرہ کر لیا اس نے زنانہ لباس پہن کر اور منہ پر نقاب ڈال کر دو عورتوں کے ساتھ محل سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کے ایک ساتھی نے اسے زہر دے کر ختم کر دیا اور چھ ماہ تک قرطبہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ ایک مجلس اپنے طرز پر شہر کا انتظام کرتی تھی۔ ملک کے حالات جس طریق سے دلدل پر آ گئے تھے وہ یہ تھا کہ کون مطلق العنان بادشاہ بنایا جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا بنی امیہ میں سے ایسا کوئی بادشاہ مل سکتا ہے۔ یہ تجربہ بھی عبدالرحمان کو خلیفہ مقرر کر کے کیا جا چکا تھا اور اب بنوامیہ میں سے کسی کے پاس فوجیں بھی نہ تھیں اس لئے یہ قرار پایا کہ سلطنت یحیٰی بن حمود کے سپرد کر دی جائے لیکن یہ فیصلہ بھی صحیح ثابت نہ ہوا۔ اور اب پھر بنوامیہ کے کسی فرد کی تلاش شروع ہوئی قرعہ فال ہشام ثالث بن محمد بن عبدالملک بن عبدالرحمان ثالث کے نام نکلا اور وہ ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں خلیفہ بن لیا گیا۔ قرطبہ کے لوگوں نے بیعت کر لی تین برس تک وہ اس راہ کی مشکلات کو دور کرتا رہا۔ بالآخر ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء تا ۱۲ ... ۱۰۳۱ء کو قرطبہ پہنچا۔ مجلس قرطبہ کی مجلس انتظامیہ نے شاہانہ طریقے پر استقبال کیا لیکن یہ بھی لوگوں کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا اور ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں تخت سے اتار دیا۔ یوں بنوامیہ کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اندلس میں قصر الزہرا کا بیرونی منظر

اندلس میں طوائف الملوکی دور

Marfat.com

۱۔ بنو حمود کا خاندان :۔ ان کا دور ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور تقریباً نصف صدی تک سیاسی اتار چڑھاؤ کے باوجود اس خاندان کے افراد اہل قرطبہ پر حکومت کرتے رہے۔ مگر ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں اشبیلیہ کے بادشاہ ابوالقاسم بن عباد نے بنو حمود کی حکومت کا خاتمہ کیا۔

۲۔ بنو عباد کا خاندان :۔ بنو عباد کی حکومت کا مرکز اشبیلیہ کا شہر تھا۔ جو خلیج بسکے سے ۶۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں قاضی ابوالقاسم محمد بن اسماعیل بن عباد لخمی نے اہل اشبیلیہ کی مرضی سے آزاد حکومت قائم کرلی۔ قاضی ابوالقاسم بیس سال تک حکومت کرتا رہا۔ ابوالقاسم کے بعد اس کا بیٹا ابوعمر عباد معتضد کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بدقسمتی سے غرناطہ کے بادشاہ سے لڑائی شروع کردی اور مسلمانوں کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء میں فرڈیننڈ اول نے اشبیلیہ پر یلغار کرکے اس کو اپنا باجگزار بنالیا۔ ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں معتضد کا بیٹا معتمد تخت نشین ہوا۔ اس نے عیسائی بادشاہ الفانسو کو خراج دینا بند کردیا۔ زلاقہ کے مقام پر عیسائیوں اور مسلمانوں کی زبردست جنگ ہوئی۔ جس میں عیسائیوں کو عبرتناک شکست ہوئی۔ ان کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ مگر مسلمانوں نے اس سے چنداں فائدہ نہ اٹھایا اور باہمی لڑائی جھگڑوں میں لگے رہے ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں بنو عباد کی حکمرانی کا دور ختم ہوگیا۔

۳۔ مرابطین کا دور :۔ گیارہویں صدی کے وسط میں دو نامور اشخاص یحییٰ بن ابراہیم اور عبداللہ بن یاسین علوم اسلامیہ کی تحصیل کی غرض سے مکہ معظمہ آئے۔ علوم کی تحصیل کے بعد ان اشخاص نے تبلیغ اسلام کی خاطر افریقہ کا رخ کیا جہاں کوہ اطلس کی اقوام ان کی پرہیزگاری سے متاثر ہوکر ان کی گرویدہ ہوگئیں یہاں ان لوگوں نے ایک حکومت کی بنیاد رکھی اور مرابطین کہلائے۔ زلاقہ کی لڑائی کے بعد تین سال کے اندر یوسف بن تاشفین نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور عیسائی علاقوں کو فتح کرکے انہیں مرابطین کی سلطنت میں شامل کرلیا۔ ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں اندلس مراکش کے مرابطین کا ایک صوبہ بن گیا۔ یوسف بن تاشفین نے پندرہ سال حکومت کی۔ یوسف کی وفات کے بعد ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء میں اس کا بیٹا علی بن یوسف تخت نشین ہوا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح مرد مجاہد ثابت ہوا اور پرتگال کے پایہ تخت لزبن اور متعدد عیسائی شہروں کو فتح کیا۔ ۵۳۷ھ/۱۱۴۳ء میں علی بن یوسف نے وفات پائی۔ علی بن یوسف کے بعد ابومحمد تاشفین مراکش کے تخت پر بیٹھا یہ تخت پر بیٹھتے ہی موحدین سے الجھ پڑا ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء میں ابومحمد عبدالمومن کے ہاتھوں سخت ہزیمت اٹھا کر انتہائی مایوسی کے عالم میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق ابراہیم تخت نشین ہوا مگر ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں عبدالمومن نے اسے شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں موحدین نے اندلس کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔

۴۔ موحدین کا دور حکمرانی :۔ محمد بن عبداللہ بن تومرت سلسلہ موحدین کا بانی تھا۔ ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تک اندلس کے تمام امراء نے عبدالمومن کی اطاعت کا حلف اٹھالیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابوسعید اندلس کا حاکم مقرر ہوا۔ کچھ مدت کے بعد یہ اپنے باپ سے ملنے گیا تو اس کی غیر حاضری میں ابراہیم نامی ایک سردار نے غرناطہ پر قبضہ کرکے موحدین کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ عبدالمومن نے جب یہ خبر سنی تو ایک زبردست بربری فوج ابوسعید کی امداد کے لیے روانہ کی۔ ابراہیم نے معافی مانگ لی اور ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء میں ان کی حکومت سارے ہسپانیہ میں محفوظ ہوگئی۔ ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء میں عبدالمومن کا انتقال ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یوسف تخت پر بیٹھا۔ اس نے بحیرہ روم کے متعدد جزیرے اپنی قلمرو میں شامل کیے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں سلطان یوسف نے وفات پائی۔ ابن رشد۔ ابن طفیل۔ ابوبکر ابن ماجہ جیسے نابغہ روزگار اشخاص اسی کے دور میں گزرے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان یعقوب تخت پر بیٹھا۔ ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء میں وفات پائی۔ اس کے عہد کی فتوحات اور لوگوں کی خوشحالی اسلامی اندلس کی عظمت کی آخری تصویر تھی۔ سلطان یعقوب کے بعد اس کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تخت نشین ہوا اور ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء میں فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے بیٹے سلطان یوسف ابویعقوب کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے بیٹے سلطان یوسف ابویعقوب کو اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء میں اس نے وفات پائی اس کے بعد اس کا بھائی عبدالواحد تخت پر بیٹھا لیکن نو ماہ کے بعد ہی اس کو قتل کردیا گیا۔ ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء تک موحدین کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

۵۔ بنو ہود کا خاندان :۔ ۶۲۵ھ میں ہود خاندان پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہوا اسی سال ہود خاندان کا ایک نامور رئیس محمد یوسف جو سرقسطہ کے چوتھے بادشاہ احمد مستعین کی پشت سے تھا۔ اشبیلیہ کا حکمران بن بیٹھا۔ اس کے بعد وہ غرناطہ مالقہ۔ اور قرطبہ کو فتح کرکے سارے اندلس کا بادشاہ بن گیا۔ ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء میں المیریہ کے حاکم ابن الرمیمی نے بغاوت کی، اس کی سرکوبی کے لیے محمد بن یوسف روانہ ہوا مگر راستے ہی میں دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس طرح بنو ہود کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

۶۔ غرناطہ :۔ غرناطہ کی سلطنت کا بانی یوسف ابن الاحمر تھا۔ اس نامور شخص نے ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں غرناطہ کی آزاد ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اگلے تیس

مسجد قرطبہ کا اندرونی دالان

Marfat.com

پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی
کے ملوک الطوائف

اشبیلیہ : بنی عباد

ابو القاسم محمد (اول) بن اسماعیل
(۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء تا ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء)
ابو عامر عباد بن محمد المعتضد
(۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء تا ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء)
ابو القاسم محمد بن عباد المعتمد
(۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء تا ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء)

قرطبہ : بنی جہور

ابو الحزم جہور
(۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء)
ابو الولید محمد بن جہور
(۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۵۷ھ/۱۰۶۴ء)
عبدالملک بن محمد
(۴۵۷ھ/۱۰۶۴ء تا ۴۶۲ھ/۱۰۷۰ء)
(قرطبہ سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا)

مالقہ : بنی حمود

ادریس اول
(۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء تا ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء)
یحیٰی (۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء)
حسن (۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء تا ۴۳۴ھ/۱۰۴۱ء)
ادریس ثانی ۴۳۴ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۳۹ھ/۱۰۴۷ء
محمد اول (۴۳۹ھ/۱۰۴۷ء تا ۴۴۵ھ/۱۰۳۵ء)
ادریس ثالث (۴۴۵ھ/۱۰۳۵ء)
ادریس ثانی (۴۴۵ھ/۱۰۳۵ء تا ۴۴۶ھ/۱۰۵۵ء)
محمد ثانی (۴۴۶ھ/۱۰۵۵ء/۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء)
(مالقہ کا الحاق سلطنتِ غرناطہ میں ہوگیا)

جزیرۃ الخضراء : بنی حمود

محمد ابن قاسم ابن محمد
(۴۲۶ھ/۱۰۳۵ء تا ۴۴۰ھ/۴۹-۱۰۴۸ء)
قاسم بن محمد (۴۴۰ھ/۴۹-۱۰۴۸ء تا ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء)
(جزیرۃ الخضراء سلطنت اشبیلیہ بنو عباد میں شامل کرلیا)

غرناطہ : بنی زیری

زاوی ابن زیری (۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء)
حبوس (۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء تا ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء)
بادیس (۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء تا ۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء)
عبداللہ (۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء تا ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء)

قرمونہ : بنی رزال

عبداللہ بن اسحاق (۴۳۴ھ/۴۳-۱۰۴۲ء)
محمد بن عبداللہ (۴۳۴ھ/۴۳-۱۰۴۲ء تا ۴۵۹ھ/۱۰۶۶ء)
ابن حیان کے مطابق، ابن عبداللہ (یعنی عبداللہ بن محمد) نے قرمونہ میں اس وقت حکومت کی جبکہ ہشام ثالث قرطبہ میں فرمانروا تھے۔
(۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء تا ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء)
اور ابن حیان ہی کے مطابق، ابن عبداللہ کا جانشین اسحاق بن عبداللہ ہوا۔

رندہ

ابو نور ابن ابی قرہ (۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء تا ۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
ابو نصر ابن ابو نور (۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
رندہ کا الحاق سلطنتِ اشبیلیہ سے ہوگیا۔

مورُور

نوح (۴۰۴ھ/۱۰۱۳ء تا ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء)
ابو مناد (۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء تا ۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
مورور سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

ارکش

ابن خزرون (۴۴۵ھ/۱۰۵۳ء)
ارکش سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل ہوگیا

ولبہ : بنی بکر

ابو زید محمد ایوب (۴۰۲ھ/۱۲-۱۰۱۱ء سے ابتدا ہوئی تا)
ابو المصعب عبدالعزیز (۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء)
ولبہ کا الحاق سلطنتِ اشبیلیہ سے ہوگیا۔

لبلہ : بنی یحیٰی

ابو العباس احمد ابن یحیٰی یحصبی
(۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء تا ۴۳۴ھ/۱۰۴۱ء)
محمد ابن یحیٰی یحصبی (یعنی ابو العباس کا بھائی) تا
فتح ابن خالد ابن یحیٰی (محمد بن یحیٰی کا بھتیجا) ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء
لبلہ سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

شلب : بنی مزین

ابو بکر محمد ابن سعید ابن مزین
(۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء تا ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء) تا
ابو الاصبغ عیسیٰ (۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء)
شلب کی ریاست اشبیلیہ کی سلطنت میں شامل کرلی گئی

شنت ماریۃ الغرب

ابو عثمان ابن ہارون
(۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء)
محمد ابن ابو عثمان سعید ابن ہارون
(۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء)
شنت ماریۃ الغرب ریاستِ اشبیلیہ میں شامل کرلیا گیا۔

مرتلہ

ابن طیفور (۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء)
مرتلہ، اشبیلیہ میں شامل کرلیا گیا۔

بطلیوس

سابور

بنی الافطس

ابو محمد عبداللہ ابن محمد ابن سلمہ (المنصور اول)
ابو بکر محمد (المظفر) ۴۶۱ھ/۱۰۶۸ء
یحیٰی (المنصور ثانی)
عمر (المتوکل) ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء

طیطلہ

یعیش (۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء)

بنی ذی النون

اسمٰعیل الظافر (۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء)
ابو الحسن یحیٰی بن الماموں
(۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تا ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء)

Marfat.com

یحییٰ بن اسماعیل ابن یحییٰ القادر
(۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء تا ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء)

سرقسطہ : بنی تجیب

منذر بن یحییٰ تجیبی (۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء)

بنی ہود:

ابوایوب سلیمان ابن محمد المستعین
(۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء تا ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء)
احمد المقتدر
(۴۳۸ھ/۴۷-۱۰۴۶ء تا ۴۷۴ھ/۱۰۸۱ء)
یوسف موتمن
(۴۷۴ھ/۱۰۸۱ء تا ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء)
احمد المستعین ثانی
(۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء تا ۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء)
عبدالملک عماد الدولہ (۵۰۴ھ/۱۱۱۰ء)

السہلہ

(دارالحکومت شنت ماریہ بنو رزین (بنی رزین
ابو محمد ہذیل اوّل ابن خلف ابن لب ابن
رزین ۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء سے
ابومروان عبدالملک اوّل ابن خلف
ابومحمد ہذیل ثانی عزّ الدولہ پسر ابومروان عبدالملک
اوّل۔ ابومروان عبدالملک ثانی حسام الدولہ تا یحییٰ۔
(۴۹۰ھ/۱۱۰۳ء تک۔

البونت : بنی قاسم

عبداللہ اوّل، ابن قاسم الفہری نظام الدولہ
(۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء)
محمد یمینُ الدولہ

احمد عضد الدولہ (۴۴۰ھ/۴۹-۱۰۴۸ء)
عبداللہ ثانی جناح الدولہ برادر احمد عضد الدولہ
(۴۴۰ھ/۴۹-۱۰۴۸ء تا ۴۹۲ھ/۱۰۹۸ء)

بلنسیہ

مبارک اور مظفر صقالبہ
لبیب صقلبی صاحب طرطوشہ
عبدالعزیز المنصور (۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء تا ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء
عبدالملک المظفر ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء تا ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء
ریاست بلنسیہ کا الحاق ریاست طلیطلہ سے ہوگیا۔
مامون (صاحب طلیطلہ) ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء تا ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء۔
بلنسیہ کا تعلق ریاست طلیطلہ سے قطع ہوگیا۔
ابوبکر ابن عبدالعزیز
(۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء تا ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء)
قاضی عثمان بن ابی بکر ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء)
قادر (سابق بادشاہ طلیطلہ) ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء تا ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء
ریاست بلنسیہ جمہوری حکومت ہوجاتی ہے۔
ابن جحاف ، صدر مجلس

دانیہ

ابوالجیش مجاہد الموفق (۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء)
علی اقبال الدولہ (۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء تا ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء)۔
مقتدر، صاحب سرقسطہ نے علی اقبال الدولہ کو تخت سے اتار دیا اور ریاست دانیہ کو سرقسطہ میں شامل کرلیا۔
مقتدر (صاحب سرقسطہ)

۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء تا ۴۷۴ھ/۱۰۸۱ء)

مرسیہ

خیران (صاحب المریہ)
(۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء تا ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء)
زہیر (صاحب المریہ)
(۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء تا ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء)
عبدالعزیز المنصور (صاحب بلنسیہ)
(۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء تا ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء)
عبدالملک المظفر (صاحب بلنسیہ)
(۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء تا ۴۵۸ھ/۱۰۶۵ء)
(اوپر کے آخری تین بادشاہوں کے زمانہ میں ابوبکر احمد بن طاہر مرسیہ کے حاکم رہے۔)
اُن کا انتقال ہوا (۴۵۶ھ/۱۰۶۳ء)
اُن کے بعد اُن کا فرزند ابوعبدالرحمٰن محمد ث جانشین ہوا
(۴۵۶ھ/۱۰۶۳ء تا ۴۷۱ھ/۱۰۷۸ء)
معتمد ، بادشاہ اشبیلیہ
ابن عمار
ابن رشیق (۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء)

المریہ

خیران (۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء)
زہیر (۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء تا ۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء
عبدالعزیز المنصور (صاحب بلنسیہ)
۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء تا ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء)
بنی صمادح: ابوالاحوص معن، ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء تا ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء۔ محمد معتصم ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء تا ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء۔ عزّ الدولہ (۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء)

سالوں میں اس نے المیریہ اور لارقہ کے علاقوں پر اپنے اقتدار کا سکہ بٹھا دیا۔ ۱۲۷۲ء میں اس نے وفات پائی۔ نصر بن یوسف اور اس کے انیس جانشینوں نے غرناطہ پر ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء سے ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء تک حکومت کی۔ کافی عرصے تک ان مسلمان حکمرانوں کا عیسائی بادشاہوں سے جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا جس کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔

غرناطہ کا اٹھارہواں حکمران سلطان ابوالحسن ایک باہمت اور دلیر شخص تھا وہ ۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ ۸۸۰ھ/۱۴۷۶ء میں جب فرڈی نینڈ نے ابوالحسن سے خراج کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ موجودہ وقت میں غرناطہ کی ریاست میں طلائی سکوں کی بجائے آہنی تلواریں عیسائیوں کی گردنیں قلم کرنے کے لیے ڈھالی جا رہی ہیں۔ وقت کے تقاضے کے سبب عیسائی بادشاہ نے چپ سادھ لی۔ مگر چھ برس بعد دونوں حکمرانوں میں جنگ چھڑ گئی ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء۔ سلطان ابوالحسن نے لوشہ کے مقام پر فرڈی نینڈ کو شکست فاش دی۔ اسی اثنا میں سلطان ابوالحسن کے بیٹے ابوعبداللہ نے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔ ابوالحسن مالقہ چلا گیا اور اسے پایہ تخت بنالیا۔

عیسائیوں نے اس بات سے فائدہ اٹھایا اور ایک شدید جنگ میں ابوعبداللہ کو شکست دے کر قید کرلیا۔ ابوالحسن پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اندھا ہوگیا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں اس نے اپنے بھائی ابوعبداللہ زغل کو تخت پر بٹھا دیا۔ انیسویں حکمران ابوعبداللہ زغل کے زمانہ میں عیسائیوں نے ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں غرناطہ پر فوج کشی

Marfat.com

کی لیکن شکست کھائی۔ مسلمانوں میں جنگ کرانے کے لیے انہوں نے ابوعبداللہ کو اپنی قید سے رہا کر دیا۔ اور وہ رہائی پاتے ہی اپنے چچا ابوعبداللہ زغل کے پایہ تخت مالقہ پر قابض ہو گیا۔ یوں چچا اور بھتیجے کے درمیان لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرڈی نینڈ نے مالقہ پر قبضہ کر کے ابوعبداللہ زغل کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور ابوعبداللہ سے غرناطہ اور قصر الحمراء کا مطالبہ کیا۔

ابوعبداللہ نے عیسائیوں سے جنگ کرنے پر کمر باندھی۔ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں فرڈی نینڈ اور ازابیلا کی متحدہ فوجوں نے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور تقریباً سات سال تک انہوں نے صلیبی بہادروں کو ناک چنے چبوائے۔ مگر سامان خوراک کی کمی کے باعث محصورین نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے اپنے سفیر کی وساطت سے غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کر دینے کے متعلق خفیہ معاہدہ کیا۔ جس پر یکم ربیع الاوّل ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء میں طرفین نے دستخط ثبت کر دیے۔ غرناطہ پر قبضہ کرنے کے بعد فرڈی نینڈ اور ازابیلا نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑنے شروع کر دیے۔ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی مہم کا آغاز ہو گیا۔ معمولی باتوں پر انہیں قتل کر دیا جاتا، ان کی جائدادیں ضبط کی جاتیں۔ اندلس کی مقدس مذہبی عدالت انہیں زندہ جلانے کا حکم دیتی رہی۔ تقریباً ایک صدی تک اندلس کے عیسائی حکمران مسلمانوں کو اپنے انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بناتے رہے اور یوں تقریباً ۸ سو سال تک اندلس پر پورے طمطراق سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان وہاں سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ یہ ایک تلخ مگر تاریخی حقیقت ہے۔ ۱۰۱۸ھ/۱۶۱۰ء میں عیسائی حکمرانوں نے تمام مسلمانوں کو اندلس سے ایک بار نکل جانے کا حکم دیا چونکہ ایک صدی سے عیسائی حکمران مسلمانوں کو اپنے انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان افریقہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

تہذیب و ثقافت:۔ دنیا کا کوئی بھی مورخ خواہ وہ کسی مذہب اور علاقے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جب مسلمان اندلس میں آئے تھے تو سارا یورپ جہالت تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ نہ کوئی عالم تھا نہ طبیب نہ کوئی کیمیا گر تھا۔ اور نہ کوئی سائنسدان۔ مسلمانوں نے آتے ہی اس ملک کی کایا پلٹ دی، ہر طرف علم و ہنر کی شمعیں روشن کیں، درس گاہوں کے ادارے کھولے، صنعت سازی کو عروج بخشا، زراعت میں حیرت انگیز ترقی کی۔ مسلمانوں نے اس ملک میں علم کی جو خدمت کی ہے اس کا ذکر تفصیل چاہتا ہے۔ اندلس کے مسلمان بادشاہ خود بڑے عالم اور علم دوست انسان تھے جس کا اندازہ ان باتوں سے لگایا جا سکتا ہے الحکم ثانی کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ جن میں سے اکثر مختلف فنون پر لکھی گئی تھیں جن میں سے اکثر مختلف فنون پر لکھی گئی تھیں، سرقسطہ کے بادشاہ المقتدر اپنے وقت کا سب سے بڑا سائنسدان اور ریاضی دان تھا۔ بطلیموس کے بادشاہ المظفر نے پچاس جلدوں میں ایک انسائیکلوپیڈیا تصنیف کیا تھا۔ ان بادشاہوں کو علم سے اتنی محبت تھی جتنی تاج و تخت سے یہی وجہ ہے کہ اندلس کی کوئی بستی ایسی نہ تھی جہاں مکتب موجود نہ ہو بارہویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں ایک ہزار بڑی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے ایسے تھے جہاں ثانوی اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابن

ہاتھی دانت پر کی گئی صناعی

رشد۔ زرقل۔ ابوالوفا، ۔ اسحاق اشبیلی۔ ابوالحسن علی۔ ابن ابی صلت۔ ابن یونس، الحازن۔ جابر کوفی جابر ابن افلح۔ ابن زہر۔ ابوالقاسم۔ ابن سعید الخطیب اور محمد التمیمی جیسے اساتذہ فن تعلیم و تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ جن کی نظیر دنیا آج تک پیدا نہ کر سکی۔

ہر یونیورسٹی کے ساتھ بڑے بڑے کتب خانے بھی ہوتے ان کتب خانوں میں ہر مضمون کی کتابیں جمع رہتیں ایک ایک مضمون پر ہزاروں کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ یہ کتب خانے بیک وقت اشاعت خانے بھی تھے۔ ایک ایک کتب خانے میں کئی کئی ہزار خطاط اور خوش نویس ملازم تھے۔ صرف شاہی کتب خانہ میں ایک وقت میں پانچ پانچ ہزار خطاط کام کرتے تھے۔ ہر قسم کے موضوع پر تحقیق و تصنیف کی جاتی۔ اندلس کے مسلمانوں کو زراعت کے فن میں جو کمال حاصل تھا وہ آج تک یورپ تک کسانوں کو نصیب نہیں ہوا۔

زراعت کی طرح اندلس کے مسلمانوں نے صنعت و حرفت میں بھی بہت ترقی کی۔ اس وقت بجلی کی بے پناہ قوت انسان کے کنٹرول میں نہیں آئی تھی۔ مسلمانان اندلس نے یہ کام پانی کی روانی سے لیا۔ وہ دریاؤں پر عجیب و غریب قسم کے بند باندھ کر پانی کو زمین کی سطح سے بہت اونچا اٹھا کر اسے آبشار کی صورت اور اس کی روانی میں جو شدت پیدا ہوتی اس سے اپنے کارخانے چلاتے۔ سب سے زیادہ شہرت کپڑا بننے میں پائی۔ ریشمی کپڑا بننے میں تو آج تک ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سارے اندلس میں ریشم بننے والے کارخانوں کی تعداد آٹھ سو تھی۔ ملاغہ اور امیریا میں ریشم کے سب سے بڑے کارخانے تھے۔ ان کا بنایا ہوا کپڑا ایک کروڑ کے قریب افراد استعمال کرتے تھے۔ گویا دنیا بھر میں کپڑا یہیں سے جاتا تھا۔

دنیا کا خوب صورت اور نفیس کاغذ بھی اندلس ہی میں تیار ہوتا تھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک بھر میں کتابوں کے تاجروں کی تعداد ایک لاکھ تھی تو کتنا کاغذ تیار ہوتا ہو گا۔ کاغذ تیار کرنے والی مشینیں پانی کے زور سے چلتی تھیں۔

یورپی تحقیق نے اندلس کی جس صنعت کو دنیا بھر میں بے مثل قرار دیا تھا۔ وہ ظروف سازی کی تھی شیشے، چینی اور دھات کے خوب صورت اور نفیس برتن دنیا بھر میں فروخت ہوتے تھے۔ خصوصاً ملاغہ اور المیریا کے برتنوں کی مثال کہیں

Marfat.com

نہیں ملتی ۔

لوہے کے صندوق بنانے میں بھی اندلس کے مسلمان ساری دنیا سے بازی لے گئے تھے۔ نیز ان کی چابیاں کوئی دوسرا آسانی سے تیار نہ کر سکتا تھا۔ ان صندوقوں پر صناعی اور گلکاری کی جاتی تھی۔ اندلس کے کاریگر فانوس بنانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ نیز خطاطی اور آرائش و تزئین ان کے دل پسند مشغلے تھے۔

فنِ تعمیر میں اندلس کے مسلمان دنیا بھر میں بازی لے گئے تھے۔ ان کی تعمیر کردہ عمارات آج بھی اسی شان و شوکت کے ساتھ ایستادہ ہیں۔ خصوصاً اشبیلیہ کا مینار، قرطبہ کی جامع مسجد، الحمرا کا محل، قرطبہ کا قصر الزہرا اور اندلس کی اکثر مساجد جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اندلس کے ان معماروں کو پتھروں کو نئی وضع سے تراشنے، جوڑنے اور نئے نئے مسالے لگانے میں کمال حاصل تھا۔ قرطبہ میں ان کی تعمیر کردہ سات سو مساجد میں سے آج صرف ایک مسجد باقی ہے۔ جسے حکومت سپین نے عجائب گھر بنا رکھا ہے۔

انڈونیشیا ایشیا کے جنوب مشرق میں واقع آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک۔ جو چار ہزار سے زائد جزیروں پر مشتمل ہے۔ خشکی کا کل رقبہ ۲۰۲۷۰۸۷ مربع کلومیٹر (۷۸۲۶۵۸ مربع میل) اور آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۱۹۲۳۲۹۹۴ ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں اعظم آسٹریلیا واقع ہے۔ قدیم ادوار میں اس کا نام جزائر شرق الہند تھا، جسے ۱۹۲۱ء میں حریت پسندوں نے انڈونیشیا کا نام دیا۔ تین بڑے بڑے حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) مغربی جزائر، جن میں جاوا، سماٹرا، بنکا، مادورا، بورنیو، بلتیوں وغیرہ شامل ہیں (۲) جزائر سونڈا جن میں بالی، لمبوک، سومبا، تیمور، رونی، فلورس اور سمباوا جیسے جزائر شامل ہیں۔ (۳) مشرقی جزائر، جن میں سلاویسی اور مالوکے جزائر شامل ہیں۔ (۴) مغربی ایریان، نیوگنی وغیرہ۔

انڈونیشیا کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت جکارتا ہے، جس کی آبادی ۱۹۷۱ء میں ۴۵۰۰۶۹۰۹ نفوس پر مشتمل تھی۔ سرکاری زبان انڈونیشی ہے۔ مذہباً مسلمان اکثریت میں ہیں۔ چند فیصد آبادی عیسائیت اور بدھ مت سے تعلق رکھتی ہے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء کے انتخابات کے بعد سے جنرل سہارتو صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے دوسری بار سربراہ مملکت ہیں۔ وزیر خارجہ آدم مالک ہیں۔

تاریخ :- انڈونیشیا کی تاریخ زمانہ قبل از تاریخ سے ہوتی ہے۔ ماہرین نسلیات کا خیال ہے کہ قدیم انسانی نسلیں جو بوزنے کی شکل و صورت رکھتی تھیں انڈونیشیا میں آباد تھیں۔ جاوا سے تقریباً ۵ لاکھ سال پرانے انسانی متحجرات ملے ہیں۔ اس وقت یہ ملک جزائر پر منقسم نہیں تھا اور برّاعظم ایشیا کا ایک جزو تھا۔ حجری دور میں یہاں سیاہ فام لوگ آباد ہوئے۔ ان کا مذہب مظاہر پرستی تھا۔ یہ نعشوں کی تدفین کرتے اور جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ پوری آبادی ایک سردار کے تحت ہوتی تھی۔ کوئی دو ہزار سال قبل مسیح میں ان کے ہاں کھیتی باڑی کا آغاز ہوا کوئی ۵۰۰ ق م میں کانسی کا استعمال شروع ہوا اور ۲۰۰ ق م میں ہند چینی سے آنے والے سوداگروں نے انہیں لوہے کا استعمال سکھایا۔ اسی زمانے میں ہندوؤں نے یہاں آنا شروع کیا اور ساتویں آٹھویں صدی عیسوی تک یہاں ہندومت اور بدھ مت کی ترویج ہوئی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں سری وجایا کی وسیع ہندو ریاست سماٹرا میں قائم رہی۔ اس دور کی سرکاری زبان سنسکرت تھی۔ اس سلطنت کا خاتمہ بدھ مت کے ایک پیرو سلینڈر کے ہاتھوں ہوا۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں یہاں فنون لطیفہ خصوصاً فن تعمیر نے خاصی ترقی کی یہاں کی ایک ریاست کیدری بھی قابل ذکر ہے، جو گیارہویں صدی عیسوی میں اپنے عروج پر تھی۔ اسی دور میں مسلمانوں نے ان جزائر پر قدم رکھا۔ اگلی دو صدیوں میں یہاں دین اسلام نے خاصا فروغ پایا اور اگرچہ یہاں ہندو ثقافت ہی کا دور دورہ رہا مگر دین اسلام جس حیرت انگیز طریقے سے یہاں پھیلا، اس پر آج بھی مستشرق انگشت بدنداں ہیں

انڈونیشیا میں اسلامی تبلیغ کے سب سے بڑے داعی شیخ عبداللہ عارف تھے۔ انہوں نے سماٹرا کے چند باشندوں کو مسلمان کیا۔ ان کے خلیفہ شیخ برہان الدین نے آچے کے علاقے میں مدرسہ قائم کیا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ۱۲۰۵ء میں یہاں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ چودہویں صدی عیسوی میں حجاز

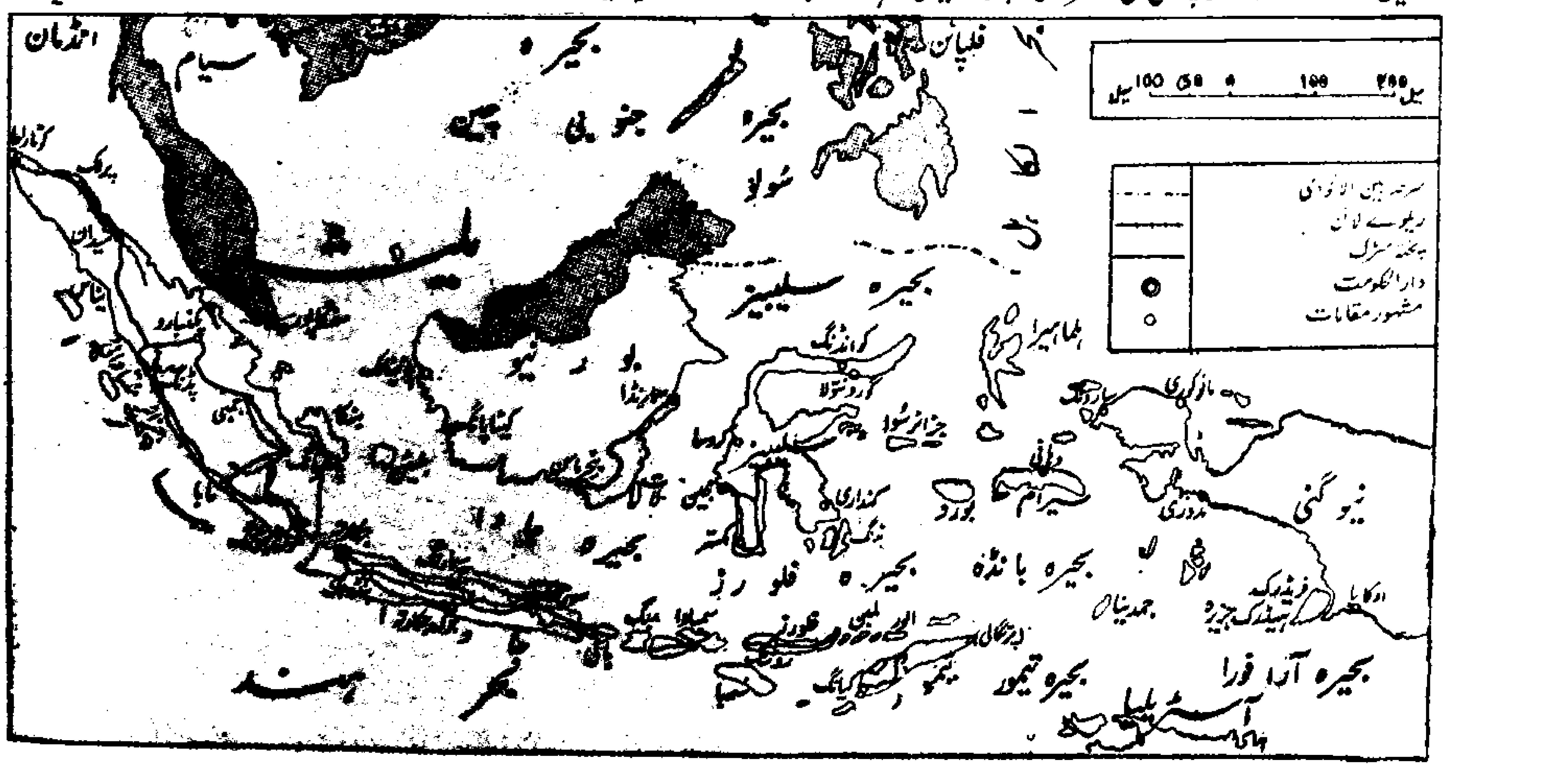

Marfat.com

سے شیخ اسماعیل کی قیادت میں کچھ مبلغین آئے۔ پندرہویں صدی کے آغاز تک یہاں کے مشہور علماء مولانا ابراہیم سونان فیل، سونان بوناگ، سونان کالی جاگا نے ۱۴۲۵ء میں جاوا کے حکمران مجاپاہت کو شکست دے کر یہاں پہلی اسلامی حکومت قائم کی اس کے تھوڑے ہی عرصہ میں دیگر جزائر میں بھی اشاعت اسلام کا آغاز ہوگیا۔

تیرہویں صدی میں انڈونیشیا میں مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ سلطنت سماٹرا میں قائم ہوئی تھی: یہاں کا راجا مسلمان ہوکر سلطان ملک الصالح کے نام سے مشہور ہوا۔ ۱۳۴۶ء میں جب ابن بطوطہ یہاں پہنچا تو ملک الصالح کا پوتا سلطان زین العابدین حکمران تھا۔ مسلمانوں کی دوسری بڑی سلطنت آچے ۱۴۹۶ء میں قائم ہوئی۔ ۱۸۷۴ء میں اس پر ولندیزیوں نے قبضہ کیا۔ ۱۹۰۷ء تک یہاں کے مسلمان ولندیزیوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے۔ جاوا میں قائم ہونے والی اسلامی سلطنت ۱۵۰۸ء تک باقی رہی تھی۔ ان کے علاوہ بورنیو، سلاویسی اور مالوکا وغیرہ میں بھی کئی اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں۔

۱۵۱۱ء میں شاہ پرتگال کے حکم سے آلبوقرق نے مالوکا پر حملہ کر کے وہاں پرتگالی حکومت قائم کرلی۔ اس نے ترناتے کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ ۱۵۹۵ء میں پرتگالی جاوا پہنچے۔ انھی دنوں ولندیزیوں نے بھی انڈونیشیا کا رخ کیا۔ انہوں نے تیمور کے علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی ان جزائر سے انہیں گرم مسالے کی صورت میں بے انتہا دولت حاصل ہورہی تھی ۱۶۱۹ء میں انہوں نے جکارتا کے قریب ایک قلعے کی تعمیر مکمل کرلی اور اس کے گرد بٹاویہ کا شہر بسایا۔ یہاں سے انہوں نے اسلامی سلطنتوں کے خلاف سازشوں کا آغاز کردیا۔ اس سے تنگ آکر ماترم کے سلطان آگنگ نے انھیں جاوا سے نکال دیا مگر اس کی وفات کے بعد ولندیزیوں کے اکھڑے ہوئے قدم ایک بار پھر جمنے لگے۔ ۱۶۱۴ء میں انہوں نے مکاسر پر قبضہ کیا۔ ۱۶۲۱ء میں باندا، ۱۶۸۳ء میں ترناتے اور امبون وغیرہ، ۱۶۸۵ء میں نیوگنی ۱۷۲۳ء میں بورنیو ۱۷۴۳ء میں بالی اور ۱۷۴۹ء میں تیمور کے جزائر ان کے قبضے میں چلے گئے۔ انہوں نے بٹاویہ کو اپنا دارالحکومت مان کر پورے انڈونیشیا کو چھ صوبوں میں تقسیم کر دیا اور اس پر حکومت کرنے لگے۔

۱۷۹۵ء میں ہالینڈ میں جمہوری حکومت قائم ہوئی تو کمپنی کو توڑ دیا گیا اور انڈونیشیا کے جزائر براہ راست ولندیزی حکومت کے ماتحت چلے گئے۔ ۱۸۱۱ء میں برطانیہ اور نپولین کی جنگ کے دوران میں لارڈ منٹو گورنر جنرل ہندوستان نے ایک بحری بیڑے کے ذریعے ملایا پر قبضہ کر کے ولندیزیوں کو انڈونیشیا سے نکال دیا۔ اگلے چھ برس تک سمفورڈ ریفلز انگریزوں کی طرف سے یہاں کا حاکم رہا۔ اس نے ملک کو ترقی کی طرف گامزن کیا۔

۱۸۱۶ء میں لنکا، ملایا اور شمالی بورنیو پر برطانیہ کا قبضہ اور جاوا سماٹرا اور دیگر مشرقی جزائر پر ہالینڈ کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۰۷ء تک مقامی مسلمان ان کے خلاف برسرپیکار رہے۔ مگر رفتہ رفتہ تمام جزائر ولندیزیوں کے ہاتھ آگئے اور انہوں نے ان کا نام ولندیزی شرق الہند رکھا۔ دیسی حکمرانوں کے اختیارات سلب کر لیے گئے اور غیرملکیوں کے ساتھ دیسی باشندوں کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ ۱۹۱۵ء میں گورنر کو مشورہ دینے کے لیے ایک کونسل قائم کی گئی جس کے اڑتیس ارکان میں سے پندرہ ملکی باشندے ہوتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ارکان کی کل تعداد اکسٹھ ہوگئی جن میں سے تیس ملکی ہوتے تھے۔

جکارتہ کی اہم شاہراہ، جو نہر کے ساتھ ساتھ ہے

انڈونیشیا میں آباد ہونے والے ان غیرملکیوں نے اسے اپنا ملک ہی بنا رکھا تھا اور کبھی یہ تصور بھی نہ کرتے تھے کہ ان کا اپنا ملک یورپ میں کہیں واقع ہے اس مقصد کے لیے انہوں نے مقامی لوگوں سے زمینیں خرید کر فارم قائم کرنا شروع کیے۔ تجارت اور صنعت تو پہلے ہی ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان زمینوں میں انہوں نے کافی، چائے، تمباکو، سنکونا، سیمل، ربڑ، کساوا، وغیرہ کاشت کی، ماہی گیری اور معدنیات کی طرف بھی توجہ دی گئی اور یوں اگرچہ دو تین صدیوں ہی میں انڈونیشیا ترقی کی راہ گامزن ہوگیا۔ مگر اس ترقی کا سارا ثمرہ ولندیزیوں ہی کو حاصل رہا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے مقامی لوگوں کے اندر آزادی کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں آچے کے ایک ممتاز عالم امام بونجول نے اعلان جہاد کر دیا۔ انہوں نے منگ کباؤ کے علاقے سے ولندیزیوں کو نکال دیا ۱۸۳۷ء میں وہ گرفتار ہوکر فوت ہوئے تاہم تحریک جاری رہی۔ ۱۸۲۵ء میں جاوا کے ایک شہزادے دیپونی گورو نے علم جہاد کو بلند کیا مگر ۱۸۳۰ء میں سازشیوں نے انہیں گرفتار کروا دیا۔ سماٹرا میں محمد سامان نے ۱۸۹۱ء تک اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ منگ کباؤ کے آخری حکمران بھی ۱۹۰۷ء میں لندیزی سازش کا شکار ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں آچے کے ایک اور عالم تیکو عمر نے اس سلسلے کو برقرار رکھا۔ ۱۸۹۹ء میں وہ شہید ہوگئے تو ان کی بیوہ اور تیکو محمد داؤد نے لڑائی جاری رکھی۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی بیوہ اور ۱۹۰۷ء میں تیکو محمد داؤد گرفتار ہوگئے اور یوں یہ تحریک آزادی ختم ہوگئی

تحریک مجاہدین کے اختتام سے قبل ہی کئی دوسری تحریکوں نے بھی جنم لے لیا تھا۔ انھی میں امداد باہمی کی تحریک، جو دیہاتیوں کے مابین خود بخود قائم ہوئی تھی ثانی تحریک، جسے ۱۸۹۰ء میں جاوا کے ایک باشندے ثامن نے کاشت کاروں کے مفاد کے لیے شروع کیا اور جو ۱۹۱۷ء میں فوج کی مدد سے دبا دی گئی تھی۔ اسلامی تجارتی انجمن جو ۱۹۰۸ء میں حاجی ثمن ہدی نے تجارت کی آزادی کے لیے شروع کی اور دیگر کئی مذہبی تعلیمی اور سیاسی تحریکوں میں شامل ہیں۔

۱۹۱۲ء میں اسلامی تجارتی انجمن کے رکن حاجی عمر سعید نے دینی اور معاشرتی اصلاح کے لیے ایک انجمن "شرکت اسلام" کے نام سے بنائی۔ جب اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوگئی تو انہوں نے سیاسی امور کی طرف توجہ دی۔ ۱۹۱۹ء

Marfat.com

میں اراکین کی تعداد ۲۵ لاکھ سے بڑھ گئی تو کامل آزادی کا نعرہ بلند کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اشتراکی عناصر نے "شرکت رعیت" کے نام سے علیحدہ جماعت قائم کر کے بغاوت کر دی۔ جسے دبانے کے بعد حکومت نے تمام جماعتوں کو ختم کر دیا۔ اس وقت کی بہت سی دیگر دینی جماعتیں مثلاً نہضۃ العلماء مجلس خلافت، جمعیت اتحاد اسلامی اور موتمر اسلامی شرق الہند قابل ذکر ہیں۔

۱۹۰۸ء میں انڈونیشی طلباء نے جمعیت شرق الہند قائم کی جسے ۱۹۲۴ء میں مجلس انڈونیشیا کا نام دیا گیا۔ اس کے صدر محمد حتا تھے۔ ان کی کوششوں میں یورپ میں ان کے کئی حامی پیدا ہو گئے۔

۱۹۲۸ء میں احمد سوکارنو کی قائم کردہ جماعت انڈونیشی قومی پارٹی نے ایک ملک، ایک قوم اور ایک زبان انڈونیشیا کا نعرہ بلند کیا۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں ان کے گرفتار ہو جانے کے بعد یہ جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ کئی ممتاز رہنما گرفتار ہو چکے تھے اور تمام جماعتوں میں پژمردگی پھیل رہی تھی۔ چنانچہ ایک رہنما حسنی تھمرین نے تمام جماعتوں کو متحد کر کے ایک وفاقی احزاب سیاسی انڈونیشیا (گاپی) کے نام سے قائم کیا۔ اس جماعت نے دوسری عالمی جنگ کے بعد اس امر پر غور کرنے کا وعدہ کیا، مگر وہ اپنے اس وعدے میں پوری نہ اتر سکی۔ اور سیاسی جماعتوں اور عوام نے دل برداشتہ ہو کر مجلس رعیت انڈونیشیا قائم کر لی۔

دوسری عالمی جنگ ہی کے دوران میں جاپان نے انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا۔

جاوا میں ربڑ نکالنے کا ایک منظر

اکثر ملکی رہنماؤں نے جاپان سے آزادی کا وعدہ لے کر اس کی مدد کرنا منظور کی یہ قبضہ ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ سوکارنو اور حتا کھلم کھلا جاپانیوں کی حمایت کرتے رہے اور ان کے معاون شہریر، آدم ملک اور شریف الدین نے ملک بھر میں خفیہ تنظیم کا جال پھیلا دیا۔ سوکارنو اور حتا نے جاپانیوں سے ہر قسم کی مراعات حاصل کر لیں جن میں انڈونیشی عوام کی فوجی تربیت بھی شامل تھی۔ ۱۹۴۴ء میں حکومت جاپان نے ملک کو آزادی دینے کی تدبیریں اختیار کرنا شروع کیں۔ اگلے برس انڈونیشی مجلس برائے اہتمام آزادی قائم ہوئی۔ جس نے سوکارنو کی تجویز پنچ شیلا (پانچ اصول) ۱۔ خدا پر ایمان۔ ۲۔ قومی آزادی۔ ۳۔ عوام کی حکومت۔ ۴۔ انسانیت کے اصولوں پر عمل۔ ۵۔ معاشرتی انصاف کا نفاذ) کو آزادی کی اساس بنایا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں کو شکست ہو گئی تو انڈونیشیا اتحادیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ مگر تین ہی روز بعد ۱۷ اگست کو انڈونیشی رہنماؤں نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ اگلے روز سوکارنو کو صدر اور حتا کو نائب صدر کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا اور ملک کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کر کے نظم و نسق قائم کر دیا گیا۔

ولندیزیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو اتحادیوں کی طرف لپکے اور بالآخر ان کی کوششوں سے ۲۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ماؤنٹ بیٹن کی زیر قیادت انگریزی فوج انڈونیشیا پر حملہ آور ہوئی۔ جاوا، سماٹرا اور بالی میں شدید جنگ شروع ہو گئی۔ سورابایا کے مقام پر انگریزوں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے پیش نظر دسمبر ۱۹۴۵ء میں روس نے انڈونیشیا کا مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔ ولندیزیوں نے نیم خود مختار ریاست کے قیام کی پیش کش کی۔ مگر حریت پسندوں کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور بالآخر اگست ۱۹۴۶ء میں ولندیزی کمیشن نے آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ۱۵ نومبر سے دونوں حکومتوں کے مابین مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر طے پایا کہ جاوا اور سماٹرا کے علاوہ دیگر جزائر میں ولندیزی حکومت قائم ہو گی، جو ہالینڈ کی حکومت کے ماتحت ہو گی۔ ولندیزیوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے پہلے انھیں نکالا گیا تو وہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے۔ انڈونیشی حریت پسند نہ مانے تو ولندیزیوں نے ۲۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو حملہ شروع کر دیا۔ سلامتی کونسل کے ایما پر ۵ اگست کو جنگ بند ہوئی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کے راضی نامہ رینویل کی رو سے جاوا اور سماٹرا کے کچھ علاقوں کے سوا باقی تمام علاقے ولندیزیوں کے پاس چلے گئے۔ محمد حتا نے ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو نئی وزارت بنائی تاکہ ولندیزیوں کے ساتھ مذاکرات قائم کیے جا سکیں۔ ولندیزیوں نے ہر قسم کے معاہدے بالائے طاق رکھتے ہوئے مئی ۱۹۴۸ء میں عارضی وفاقی حکومت قائم کر لی۔ جون اور ستمبر میں مصالحت کی چند کوششیں ناکام رہیں اور ۱۹ دسمبر کو ولندیزیوں نے جمہوریہ انڈونیشیا کے اکثر علاقوں پر حملہ کر دیا۔ سوکارنو، حتا اور شہریر گرفتار کر لیے گئے۔ وزیر مالیات ظفر الدین نے بکی تنگی میں عارضی حکومت قائم کر لی اور ملکی دفاع کو تیز تر کر دیا۔

۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو سلامتی کونسل نے فریقین کو جنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ سلامتی کونسل کے اصرار پر ہالینڈ نے ۷ مئی ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی، جمہوریہ کی بحالی اور ہیگ میں گول میز کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں ایک بیان جاری کیا۔ ۶ جولائی کو انڈونیشی رہنما رہا ہوئے اور ۱۱ اگست کو جاوا اور ۱۵ اگست کو سماٹرا میں جنگ بند ہو گئی۔ ۲۲ اگست سے ۲ نومبر تک ہیگ میں ہونے والی کانفرنس میں طے پایا کہ ۳۰ دسمبر سے قبل ہالینڈ، نیوگنی کے سوا تمام

Marfat.com

جزائر کا اقتدار جمہوریہ انڈونیشیا کو دے دے گا۔ یہ انتقال اقتدار ۲۷ دسمبر کو ہوا۔ ۱۴ دسمبر کو سوکارنو کو صدر منتخب کیا گیا۔ محمد حتا وزیر اعظم نامزد ہوئے۔ جکارتہ وفاقی دارالحکومت قرار پایا۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۰ء کو سیاسی جماعت ماشومی کے ایما پر تمام ریاستیں ایک متحدہ مملکت کی تشکیل پر رضامند ہو گئیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء کو نیا عبوری آئین منظور ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ انڈونیشیا وجود میں آگئی ۲۹ ستمبر کو اسے اقوام متحدہ میں رکنیت حاصل ہو گئی۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں پارلیمنٹ نے انتخابی قانون منظور کیا۔ جس کی رو سے ستمبر ۱۹۵۵ء میں انتخابات منعقد ہوئے۔ پارلیمنٹ کی ۲۷۲ نشستوں میں سے ماشومی نے ۵۷، قومی پارٹی نے ۵۷، نہضۃ العلما نے ۴۵ اور اشتراکی پارٹی نے ۳۹ نشستیں حاصل کیں۔ چنانچہ ماشومی کو حزب اختلاف میں رکھتے ہوئے باقی جماعتوں کی ایک مخلوط وزارت قائم کر دی گئی، ۱۹۵۹ء میں صدر سوکارنو نے دستور ساز اسمبلی اور ۱۹۶۰ء میں پارلیمنٹ توڑ دی۔ نیا دستور نافذ کیا گیا، جس میں صدر سوکارنو کو انقلاب کا عظیم قائد قرار دیا گیا اور ۱۹۶۳ء میں انہیں تاحیات صدر منتخب کر لیا۔ صدر سوکارنو کی اس حرکت پر ان کے تمام ساتھی ان سے الگ ہو گئے

۱۹۶۳ء میں برطانیہ نے بورنیو اور ملایا کے اشتراک سے ملائشیا کو جنم دیا۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے انڈونیشیا اقوام متحدہ سے مستعفی ہو گیا۔ امریکہ نے انڈونیشیا کی امداد بند کر دی۔ دوسری طرف روس نے امداد کے بہانے اشتراکی عناصر کو ابھارنا شروع کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اشتراکیوں نے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور چھ جرنیلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حکومت نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا اور ہزاروں اشتراکیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے ساتھ فوج نے صدر سوکارنو کے اختیارات بھی سلب کر لیے۔

۱۲ مارچ ۱۹۶۶ء میں جنرل سوہارتو نے صدر مملکت مقرر ہوئے۔ قومی محاذ توڑ دیا گیا اور اشتراکی پارٹی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ ۵ جولائی کو سوکارنو کی تاحیات صدارت اور ۲۵ جولائی کو وزارت عظمیٰ منسوخ کر دی گئی۔ نئی مجلس صدارت کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۱ اگست کو ملائشیا کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے گئے اور ۲۸ ستمبر کو انڈونیشیا دوبارہ اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ ۲۲ فروری ۱۹۶۷ء سے جنرل سوہارتو ملک کے باقاعدہ صدر بن گئے۔ مارچ ۱۹۶۸ء اور پھر مارچ ۱۹۷۳ء میں جنرل سوہارتو اسمبلی کے ذریعے صدر منتخب ہوئے انہوں نے ۲۷ مارچ ۱۹۷۳ء کو نئی کابینہ تشکیل دی۔

اقتصادی معلومات :- انڈونیشیا ۱۹ صوبوں پر منقسم ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں۔ آچے، شمالی سماٹرا، مغربی سماٹرا، ریو، جمبی، جنوبی سماٹرا، مغربی جاوا وسطی جاوا، مشرقی جاوا، مغربی کالی منتان، جنوبی کالی منتان، مشرقی کالی منتان، وسطی کالی منتان، شمالی سلاویسی، بالی، مغربی نوساتنگارا، مشرقی نوساتنگارا، مالوکا اور مغربی ایریان ان تمام علاقوں کی تعلیمی ترقی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء میں یہاں صرف چھ فیصد باشندے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور ۱۹۷۵ء میں صرف پرائمری سکول کے طلبا کی تعداد ڈیڑھ کروڑ ہو چکی تھی۔ جکارتا، بوگور، یوگ یکارتا، یی تنگی، بنجرماسین، امبون، میڈان، مکاسر، بینڈونگ، گاجہ میڈا سورابایا، حالانگ بالی، پاجاکمبوہ، پادانگ اور تونداانو میں یونیورسٹیاں ہیں۔ جہاں ایک لاکھ کے قریب طلبا اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بینڈونگ میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور یوگ یکارتا میں اسلامی یونیورسٹی قائم ہے۔

انڈونیشیا کے گاؤں کا ایک منظر

انڈونیشیا کا سکہ روپیہ کہلاتا ہے، جو پاکستانی دو پیسوں کے برابر ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہاں چاول دو کروڑ میٹرک ٹن مکئی، تیس لاکھ ٹن اور کسادا ایک کروڑ ٹن پیدا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ شکر قند، ناریل، کھجور، سنکونا، گنا، چائے کافی، کوکو، گرم مسالے، ساگودانہ اور تمباکو یہاں کی اہم پیداوار ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ربڑ یہیں پیدا ہوتی ہے۔

انڈونیشیا کی معدنیات میں پیٹرول، لوہا، نکل، تانبا، قلعی، مینگنیز، کوئلہ سونا، چاندی، ہیرے، چونا، فاسفیٹ اور باکسائیٹ اہم ہیں۔ مشرق بعید میں سب سے زیادہ پٹرول انڈونیشیا ہی میں نکلتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں یہاں ساڑھے تین کروڑ کیوبک میٹر پیٹرول نکالا گیا، جس کا ساٹھ فی صد منافع حکومت کے پاس اور باقی اینگلو ڈچ اور امریکی کمپنیوں کے پاس ہوتا ہے۔

ملک بھر میں جہاز سازی، کپڑا بننے، ربڑ، ٹائر، ٹیوب، سیمنٹ، کاغذ دیاسلائی، شیشے اور بجلی کا سامان تیار کرنے کے کارخانے قائم ہیں۔ جن سے ملک کی دس فیصد آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

ملک بھر میں ریلوں، سڑکوں، بحری اور ہوائی راستوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بحری بیڑہ تین سو جہازوں پر مشتمل ہے، جو جکارتا، ایمسٹرڈم، ہمبرگ اور لندن کے علاوہ اندرون ملک بھی چلتے ہیں۔

انڈونیشیا کی برآمدات میں ربڑ، چائے، کافی، تمباکو، ناریل، کھجور،

Marfat.com

انڈونیشیا کے بالی قبیلہ کا ایک لڑکا۔

پیٹرول، تیل اور دیگر معدنی اشیاء شامل ہیں۔ جب کہ درآمدات میں مشینری کپڑا، کاغذ، چاول اور کیمیائی اشیاء سرفہرست ہیں۔ زیادہ تر تجارت جاپان، امریکا، مغربی جرمنی اور فلپائن سے ہوتا ہے۔ ان ملکوں کی زیادہ تر مانگ ربڑ ہے، جو انڈونیشیا پوری کرتا ہے۔

انسان آدمی، ابن آدم، نسل انسانی سے تعلق رکھنے والا "اشرف المخلوقات" اس کی تخلیق اسی عالم آب وگل سے ہوئی ہے۔ جس کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

"اور ہم نے انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سے، سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا تھا پیدا کیا اور جنوں کو ہم نے تیز آگ سے پیدا کیا اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی، سیاہ متغیر کیچڑ سے پیدا کرنے والا ہوں اور جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اس کے لئے سجدہ کرنا اور سارے فرشتوں نے فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرے فرمایا! اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا؟ اس نے کہا مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں ایک انسان کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے سوکھی ہوئی مٹی سے، جو متغیر ہو چکی ہے، پیدا کیا ہے، کہا! تو اس سے نکل جا کیونکہ تو مردود ہو گیا ہے اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔ اس نے کہا! میرے رب تو مجھے اس دن تک مہلت دے، جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔ کہا گیا تجھے مہلت ہے، ایک معلوم وقت تک۔ اس نے کہا۔ میرے رب جس طرح تو نے مجھے گمراہ ٹھیرایا ہے (اسی طرح) میں انہیں زمین میں خوب صورت بن کر دکھاؤں گا اور ان سب کو ناکام رکھوں گا۔ سوائے تیرے خاص بندوں کے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے میری طرف کو، میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہو گا مگر وہ جاہلوں میں سے ہوں اور تیرے پیچھے جائیں، اور یقیناً ان سب کی جگہ دوزخ مقرر ہے اس کے سات دروازے ہیں ہر ایک دروازے کیلئے ان میں سے ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ متقی جنتوں اور چشموں میں ہوں گے ان میں سلامتی سے امن کیساتھ داخل ہو جاؤ اور جو ان کے دلوں میں کچھ کدورت ہوگی ہم اسے نکال دیں گے وہ بھائیوں کی طرح آمنے سامنے تختوں پر ہوں گے۔ انہیں ان میں کوئی تکلیف نہ ہوگی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے میرے بندوں کو خبر دیدے کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں اور یہ کہ میرا عذاب دردناک ہے" (۱۵ = ۲۶ تا ۵۰)

انسان کی جسمانی پیدائش کے نکات بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر زیر بحث آئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ جی اٹھنے میں شک ہے تو (غور کرو) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے، پھر لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے، جو لوہا اور ادھورا بن جاتا ہے تاکہ تمہارے لیے کھول کر بیان کر دیں اور ہم جو چاہتے ہیں رحموں میں ایک مقررہ وقت تک ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں کوئی ایسا ہے جو وفات پاتا اور کوئی تم میں سے وہ ہے، جو نکمی عمر (بڑھاپے) کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد وہ بے علم ہو جائے۔۔۔" (۲۲ = ۵)

"کیا انسان نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کئے پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟" (۷۵ = ۳۶ تا ۴۰)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے دیگر تمام مخلوقات میں اشرف ترین مقام دیا ہے اور اسے اپنی بہترین مخلوق قرار دیا ہے، جسے بہترین صورت و ہیئت میں پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ "التین" میں ارشاد ہوتا ہے: "یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا" (۹۵ = ۴) یہ بہترین صورت فرمان خداوندی کے مطابق خدا کی اپنی فطرت ہے حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا"۔ یہ صورت اللہ کی فطرت ہے۔ قرآن مجید میں یہ بیان ہوا ہے:۔

اللہ کی فطرت وہی ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی بنائی ہوئی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۳۰ = ۳۰)

بخاری شریف میں ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں۔"

ان مباحث سے انسان کی تخلیق، زمین پر اس کے منصب دین اور نظریہ حیات پر روشنی پڑتی ہے انسان نے کبھی بھی بذات خود یہ کوشش نہیں کی کہ اپنے مقصد تخلیق کو سمجھے۔ کبھی اس نے خود کو بالکل ہی بے بس اور مجبور مخلوق متصور کیا اور کبھی جبر و اختیار کا بے پناہ مالک بن بیٹھا۔ اسلام کے نزدیک ان دونوں انتہاؤں کے مابین اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اس مختصر سے عرصۂ حیات میں انسان خود کو ایک لمحے کے لئے بھی زندہ رکھنے پر قادر نہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ فرمان خداوندی بھی ہے کہ انسان کو اس کائنات میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور انہیں پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کیں، ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔" (۷)

انسان اس دنیا میں خدا کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس کائنات میں تصرف کرنے کا حقدار ہے۔ اس فرض نیابت کو ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکے دنیا کی اشیاء کو خدا کے احکام کی حدود میں رہتے ہوئے استعمال کرے انہیں امانت سمجھے۔ اپنے اعمال خدا کے قانون کے مطابق انجام دے اور قیامت کے روز جوابدہی کو پیش نظر رکھے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کسی خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے گویا اس کا کوئی اپنا نصب العین ہے، جس کے لئے اسے زندگی بسر کرنا ہے

Marfat.com

دنیا بھر میں ارزاں ترین

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو

شاہکار مطبوعات شاہکار

۱	حاجی مراد (ناول)	ٹیوٹا لسٹائی	2/50
۲	کستوری (ناول)	ایریچ سیگل	2/-
۳	غبار خاطر (مکاتیب)	مولانا ابوالکلام آزاد	3/50
۴	نوٹرے ڈیم کا کبڑا (ناول)	وکٹر ہیوگو	2/50
۵	دارا شکوہ (ناول)	قاضی عبدالستار	3/-
۶، ۷	رومیو جولیٹ اور میکبتھ (دو ڈرامے)	ولیم شیکسپیئر	3/50
۸	سائنس سے بھی عجیب تر (سائنس)	صابر کلوروی	2/-
۹	مہمان بہار، آتش رفتہ (دو ناولٹ)	اشفاق احمد، جمیلہ ہاشمی	2/-
۱۰	آواز دوست (مضامین)	مختار مسعود	2/-
۱۱	بھوانی جنکشن (ناول)	جان ماسٹرز	2/50
۱۲	پولیس افسر کی ڈائری (جرم و سزا)	دلاور حسین لودھی	2/50
۱۳	شاہنامہ اسلام (حصہ اول)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	3/-
۱۴	چلتے ہو تو چین کو چلیے (سفرنامہ)	ابن انشاء	2/50
۱۵	علی اور نینو (ناول)	قربان سعید	2/50
۱۶	تحریک پاکستان (عمرانیات)	شمیم احمد	2/-
۱۷	صحرانورد کے خطوط (حصہ اول)	میرزا ادیب	2/-
۱۸	النبی الخاتم (سیرت)	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	2/50
۱۹	شاہنامہ اسلام (حصہ دوم)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	3/-
۲۰	فردوس بریں (ناول)	مولانا عبدالحلیم شرر	2/75
۲۱	ایمانیات (اسلامیات)	مولنس زبیری	2/25
۲۲	جین آئر (ناول)	شارلٹ برونٹے	4/-
۲۳	شکست (ناول)	کرشن چندر	3/-
۲۴	مجبور آوازیں (سیاست و معیشت)	کے ایل گابا	4/-
۲۵	شاہنامہ اسلام (حصہ سوم)	ابوالاثر حفیظ جالندھری	3/-
۲۶	قائد اعظم میری نظر میں	ایم اے ایچ اصفہانی	4/-
۲۷	مقدس نازنین۔ ناول۔	عبدالحلیم شرر	4/-
۲۸	صحرانورد کے خطوط (دوم)	میرزا ادیب	3/50
۲۹	خزینۂ معلومات	سیفی نوگانوی	4/-
۳۰	علی گڑھ کے تین نامور فرزند	نسیم سوہدروی علیگ	2/-
۳۱	شاہنامہ اسلام (چہارم)	حفیظ جالندھری	3/-

شاہکار۔ پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور

Marfat.com

شاہکار جریدی کتابوں ـــ بے بی انسائیکلوپیڈیا ـــ اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے اجراء کے بعد

یکم مئی ۱۹۷۶ء سے

شاہکار کا ایک اور شاہکار

زیر ادارت: سید قاسم محمود

اُردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا

انسائیکلوپیڈیا معلومات

(قسط وار)

۱۲۵ سے زائد قدیم و جدید علوم و فنون کے پچہتر ہزار سے زیادہ معلوماتی مضامین

مذہب
اسلام، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، زرتشت، پارسیت، ہندومت، دیومالا، عقائد، دینیات

سائنس
طبیعیات، کیمیا، ریاضی، شماریات، حیاتیات، نباتیات، حیوانیات، فلکیات، ایجادات، اطلاقی سائنس

تاریخ
قدیم و جدید، آثارِ قدیمہ، اقوام اور نسلیں، جنگیں، فتوحات، سیاسی تاریخ، تمدنی تاریخ، فوجی تاریخ، قوموں کے عروج و زوال کی داستان

فلسفہ
یونانی فلسفہ، فلسفۂ اسلام، منطق، جمالیات، اخلاقیات، وجودیت، فوق الفطرت، عقل پرستی، فلسفے کے بڑے بڑے نظام و اصول

زندگی اور کائنات کے ٹھوس حقائق اور عالمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، سائنسی، علمی و ادبی، مذہبی اور تمدنی حالات و کوائف

ادب و فن
زبانیں، کلاسیکی ادب، جدید ادب، مشرقی ادب، مغربی ادب، تنقید، مصوری، موسیقی، فنِ تعمیر، فنونِ لطیفہ

معاشرتی علوم
انسانیات، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، نفسیات، قانون، طب و صحت، رسم و رواج، تہذیب، ثقافت

جغرافیہ
طبقات الارض، ارضیات، شہر و ممالک، دریا، پہاڑ، براعظم، معدومیات، بحریات، خاکے، نقشے اور ضروری تصاویر

شخصیات
ادیب، شاعر، مُوجد، سائنس دان، فلسفی، مورخ، سیاستداں، مُہم جو، جنہوں نے دُنیا بدل ڈالی

انفرادیت
برٹانیکا، انٹرنیشنل، چیمبرز، بُک آف نالج، ورلڈ، نیو ورلڈ، ایوری مین، ریڈرز ڈائجسٹ، آریانا، دائرۃ المعارف اور دوسرے انسائیکلوپیڈیا بڑے بڑے کروڑپتی اداروں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ لیکن "انسائیکلوپیڈیا معلومات" ایک اکیلا پاکستانی شہری کسی کی مدد کے بغیر شائع کر رہا ہے تاکہ پاکستان میں بھی وسیع بنیادوں پر علم کو فروغ ہو۔ اور ہماری قومی زبان حوالہ جاتی کتب سے مالا مال ہو۔

ارزاں ترین
"انسائیکلوپیڈیا معلومات" دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اپنے ہم رُتبہ انسائیکلوپیڈیاؤں کے مقابلے میں سب سے کم عمر، سب سے ارزاں اور سب سے تیز رفتار ہے۔ اندازاً پندرہ برس میں تکمیل پذیر ہوگا۔ مکمل انسائیکلوپیڈیا کی تیس جلدوں کی قیمت کم از کم ڈیڑھ ہزار روپے ہوگی جو عام پاکستانی یکمشت ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے آسان قسطوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ • اعلیٰ سفید کاغذ • خوبصورت کتابت، دیدہ زیب طباعت • سالانہ مع رجسٹری تیس روپے • قیمت فی قسط: تین روپے

ٹیلیفون: ۳۵۴۱۰۳ — **شاہکار پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور** — تار کا پتا: شاہکار

Marfat.com

۶

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

۹۰ مضامین

انسان پرستی	اونٹ	اینال
انسان کامل	اوہام جاہلیہ	ایوبؑ
انس بن مالک	اویس اوّل	ایوب بن ابی عتیمہ
انس بن نضر	اویس قرنی	ایوب خان
انشاء اللہ	اہرام مصر	ایوبیہ
انصار	اہل بیت	باب
انطاکیہ	اہل حدیث	بابا طاہر
انطالیہ	اہل حق	باب السلام
انفاق	اہل ذکر	باب النساء
انقرہ	اہل ذمہ	بابائی
انگشتری	اہل رائے	بابر
انور پاشا	اہل سنت	باب، علی محمد
انور شاہ کاشمیری	اہل کتاب	بابک خرمی
انہار جنت	ایاز	بابل
اوتاد	ایام بیض	بابیت
اوتار	ایام تشریق	باتو
اوحد الدین کرمانی	ایام نحر	باجہ
اورنگ زیب	ایبک، امیر	بادشاہ نبی
اورنوس	ایبک قطب الدین	بادشاہی مسجد
اوزاعی، امام	ایثار	بادلیس
اوزون حسن	ایجاب	باربروسہ
اوس، بنو	ایجی، عضد الدین	بارودی
اوقات نماز	ایران	بارہ سید
اوقاف	ایفائے عہد	بارہ وفات
اولاد	ایلاء	باطل
اولاد الشیخ	ایلخانیہ	باطنۃ
اولیہ، جنگ	ایل غازی	باطنیہ
اولیاء	ایلہ	باعباد
اولیا چلبی	ایمان	باعلوی
اولی الامر	ایمن بن خریم	باغ

Marfat.com

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط نمبر (۶)
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۲ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"
مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود
مدیر : عطش درانی

شائع شدہ اور آئندہ کتب کا اعلان
آخری صفحے پر ملاحظہ کیجئے
خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
شاہکار
پوسٹ بکس: ۱۷۵۴-لاہور

"اسلامی" اور "معلومات" ......؟

شاہکاریہ

شاہکار کے ایک معزز قاری کا مکتوب ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب "اسلامی" اور "معلومات" دونوں انسائیکلوپیڈیا ہیں اور جب "اسلامی" کے عنوانات "معلومات" ہی میں آجائیں گے تو پھر "اسلامی" کو خرید کر رکھنے سے فائدہ؟ کیوں نہ صرف "معلومات" ہی خریدا جائے؟

ایسا خیال کسی بھی طور حقیقت پر مبنی نہیں۔ اگرچہ یہ دونوں انسائیکلوپیڈیا ہی ہیں۔ لیکن اپنے موضوع اور وسعتِ موضوع کے لحاظ سے دونوں مختلف ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انسائیکلوپیڈیا کے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ "اسلامی" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اسلامیات، مذہبیات اور اخلاقیات جیسے مضامین میں قارئین کی خصوصی ضرورت پوری کرتا ہے۔ یہ خدمتِ اسلام کی عاجزانہ، مگر منظم اور مجتہدانہ کوشش ہے، نیز یہ انسائیکلوپیڈیا مختصر ہے اور بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔

دوسری طرف "معلومات" اندازاً پندرہ برس میں تکمیل پذیر ہونے والا اور اردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں دنیا بھر کی شخصیات، مقامات، علوم و فنون، سائنس، ٹکنالوجی اور ایجادات کا احاطہ کیا جائے گا۔ "اسلامی" کے تمام مضامین اس میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ محض چیدہ چیدہ عنوانات پر زیادہ مفصل اور وہ بھی عالمگیر نوعیت کے مضامین شامل ہوں گے۔ "اسلامی" کا مزاج اختصار ہے اور "معلومات" اپنے مزاج کے اعتبار سے مفصل ہے۔ گویا "اسلامی" کی اپنی جداگانہ اور منفرد حیثیت برقرار رہے گی۔

ہمارے علم دوست اور ادب نواز قارئین جانتے ہیں کہ تدوین و اشاعتِ علوم کی یہ راہیں کتنی کٹھن اور کیسی جاں گسل ہیں۔ ہم اہل جنون اگر ان راہوں پر چل پڑے ہیں تو یہ آپ سب کے تعاون کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اشاعتی میدان میں تو نہ جانے کب سے دھول اڑ رہی تھی۔ علم کے پیاسوں کے لیے ہر طرف جہل و ضعف کے لق و دق صحرا پھیلے ہوئے تھے۔ اب ہم سب مل کر اگر ایک قافلے کی صورت میں رواں دواں ہو گئے ہیں تو یہ صحرا بس چار دنوں کی بات ہے۔ اگر ہم قدم ملا کر آگے بڑھتے رہے تو تشنگی تمام کو نہ رہے گی۔ سراب یقیناً منزلِ مقصود میں بدل جائیں گے۔ انشاء اللہ ایک بار پھر ہم اپنے شاندار ماضی کی یاد تازہ کریں گے۔ یہی ہمارا نصب العین ہے، جو دور ہے مگر ناقابلِ حصول نہیں۔

آپ کا
عطش درانی

تاریخ اشاعت: ۱۵ مارچ ۱۹۷۶ء   ناشر: سید قاسم محمود   طابع: تعمیر پریس لاہور

Marfat.com

انسان پرستی انسان کی پوجا۔ انسان کو خالق اور رازق سمجھنا، انسان کے آگے سر جھکانا۔ زمانۂ قدیم میں مردہ انسانوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ روح کے بارے میں قدیم انسان کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اور جب چاہے جسم میں واپس آسکتی ہے۔ مردوں سے خوف محسوس ہونے لگا کہ نہ جانے یہ کب زندہ ہو کر واپس آجائیں اس لیے وہ ان کی ضروریات مادی ان کی قبروں میں رکھ دیتے تھے بلکہ اگر کوئی سردار یا بزرگ مرجاتا تو اس کی بیوی اور غلاموں کو بھی قتل کر کے اس کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ مردوں سے ڈرنا اور دنیاوی مصائب کو ان کی طرف منسوب کرنا شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مردوں کو فوق الفطری قوت تسلیم کیا جانے لگا۔

قدیم انسان کو بہت جلد اپنے فانی ہونے کا احساس ہو گیا۔ خوف نفسی نے اسے زندہ انسان کے احترام اور پرستش کی طرف مائل کیا۔ خصوصاً طاقتوروں اور سرداروں کو فوق الفطری قوتوں کا مالک سمجھا جانے لگا یہ احترام اس قدر بڑھا کہ ان کی طرف دیکھنا یا ان کی نشست پر بیٹھنا بے ادبی اور جرم قرار دیا گیا۔ سرداروں کے ساتھ ساتھ پروہتوں کاہنوں اور جادوگروں کی پرستش کا رواج بھی عام ہونے لگا۔

انسان پرستی کا باقاعدہ آغاز مصر سے ہوا۔ ان کے ہاں دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ مردہ پرستی بھی رائج تھی۔ یہ مردہ پرستی آگے چل کر انسان پرستی میں تبدیل ہو گئی مصر کے بادشاہ خود کو سورج دیوتا کا مظہر سمجھتے۔ بادشاہ کے جسم کو دیوتا کا جسم قرار دیا جاتا تھا، جو وفات کے بعد اوسیرس بن جاتا۔ قدیم مصر کی تحریروں سے ایسے خطابات کا پتہ چلتا ہے، جن میں بادشاہ کو خدا بلکہ اس سے اعلیٰ مرتبے کا حامل قرار دیا جاتا تھا دیوتاؤں کے مقابلے میں سب سے زیادہ قوی اور مقدس بادشاہ کی ذات تھی۔ مصری حکمرانوں میں فراعنہ خاندان کے اکثر بادشاہوں نے یہ القاب استعمال کر رکھے تھے۔ چند ایک فرعونوں کو چھوڑ کر دیگر تمام فراعنہ خدا بنے بیٹھے تھے۔ یہی حال بابل کے بادشاہوں کا تھا۔ ان میں سے نمرود کا ذکر اکثر صحائف میں آیا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ دیوتا انسانی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، چنانچہ وشنو، نرسنگھ کرشن، رام وغیرہ جیسے اوتار بھگوان ہی کا روپ قرار دیے گئے۔ نیز یہ بھی سمجھا گیا کہ بھگوان کسی بھی روپ اور کسی بھی ذات میں پیدا ہو سکتا ہے اور اسے دنیوی خواہشات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی بنا پر جوگیوں، سنیاسیوں اور ملنگوں کی پرستش بھی مروج ہوئی۔ یہی چیز آگے چل کر مسلمانوں میں در آئی اور بھنگیوں، ملنگوں اور مست و مجذوب لوگوں کے آگے سر جھکایا جانے لگا۔

مصر کے بعد شاہ پرستی سب سے زیادہ یونان اور پھر جاپان میں رہی قدیم یونانیوں میں ہر سال بادشاہ کی سالگرہ بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی تھی مرنے کے بعد بھی اس کی پوجا برقرار رہتی بلکہ اسے دیوتاؤں میں شامل کر لیا جاتا۔ ہومر کی کتابوں میں ایسے دیوتاؤں کا تذکرہ ملتا ہے جو انسان تھے اور اس کے باوجود غیر فانی سمجھے جاتے تھے ان کے متعلق یہ عقیدہ عام تھا کہ وہ قادر مطلق ہیں اور جب چاہیں۔ خود کو دنیا میں ظاہر کر دیں۔ قدیم یونان کے اس عقیدہ پر یونانی فلسفے نے کاری ضرب لگائی۔ تالیس، فیثاغورث، ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں کے افکار نے دیوتاؤں کو نظام کائنات سے بے دخل کر دیا۔ انسان کو مجبور محض قرار دے دیا گیا اور دیوتاؤں کے غیر فانی ہونے کے عقیدے کی جگہ عناصر اربعہ کی بقا نے لے لی۔

یونانیوں سے انسان پرستی اور شاہ پرستی کا عقیدہ رومیوں نے لیا۔ ان کے سلاطین مسجود خلائق بن گئے۔ سکندر اعظم کے باپ فلپ مقدونی کی پرستش اس کی زندگی ہی میں ہونے لگی تھی۔ اس نے شاہ پرستی کو باقاعدہ قانونی شکل دے دی۔ آگسٹس کے مرتے ہی سینیٹ نے فیصلہ صادر کر دیا کہ اسے خداؤں کے زمرے میں شامل کر لیا جائے۔ بادشاہ کی پرستش سے انکار کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔ آگے چل کر ان بادشاہوں کے باقاعدہ مجسمے تیار ہوتے۔

رومیوں کی طرح یورپ کی اکثر اقوام بھی انسان پرستی کی قائل تھیں۔ خصوصاً ٹیوٹانی لوگ دیوتاؤں کے بار بار انسانی روپ میں پیدا ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ بادشاہوں کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ ان کا زبردست احترام کیا جاتا تھا۔ ان کے عتاب سے بچنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جاتے۔ قربانیاں پیش کی جاتیں نذرانے چڑھائے جاتے۔

مشرق بعید میں انسان پرستی کی سب سے بڑی مثال بدھ مت کے پیروکاروں اور جاپانیوں کے ہاں ملتی ہے۔ بدھ مت کے پیروکاروں نے مہاتما بدھ کو خدا ہی کا مظہر قرار دے رکھا ہے۔ اور اس کے مجسموں کی پرستش کرتے ہیں۔ جاپانیوں کے ہاں بادشاہ کی پوجا اب تک رائج ہے۔ وہاں بادشاہ کو اماتر سو دیوی کی اولاد قرار دیا گیا اور یوں وہاں سب سے پہلے جس بادشاہ کی پوجا شروع ہوئی اس کا نام جیمو تمیو تھا۔ شاہی محل قومی مذہب کا مرکز بن گیا اور بادشاہ کو "آسمان کا بیٹا" قرار دے کر اختیارات اس کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ تاریخ میں اس سے بڑی مثال اور نہیں مل سکتی کہ آج سے اڑھائی ہزار سال پیشتر جس خاندان نے اپنا شجرہ نسب دیوتاؤں سے ملایا تھا، آج تک وہی خاندان وہاں اسی طمطراق کے ساتھ حکمران ہے۔

انسانِ کامل مکمل انسان۔ تصوف کی ایک اصطلاح جو انسانیت کے اعلیٰ ترین نمونے کے لیے استعمال ہوتی ہے "وہ انسان جس نے ذاتِ باری سے اپنی وحدت (یکتائی) کا احساس پورے طور پر کر لیا ہو، وہ انسان جو بعض اسمائے

Marfat.com

الٰہیہ سے متصف ہو۔" ابن عربی نے غالباً سب سے پہلے اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ عبدالکریم بن ابراہیم الجیلی کی ایک مشہور تصنیف کا نام "الانسان الکامل فی معرفتہ الاواخر والاوائل" ہے۔ انہوں نے اس نظریے کو بڑے اچھے اور باضابطہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک "ذات وہ ہے جس کی طرف اسماء صفات منسوب کئے جاتے ہیں۔ گویا ذات اور صفاتِ ذات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ موجود ہوں اور عین ممکن ہے وہ موجود نہ ہوں۔ موجود یا تو وجود محض (خدا) ہے یا وہ جس میں ممکن الوجود بھی شامل ہو (مخلوق اشیاء) وجود مطلق یا وجود محض اصل میں صفتِ ذات بلا انکشاف اسماء صفات و موزم سے عبارت ہے اور عمل انکشاف کا مطلب بساطت کے درجے سے نیچے اترنے کا عمل ہے ——

آخری درجہ تجلی ذات کا ہے جس سے انسان کامل میں الوہیت کے انداز پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس درجہ میں پہنچ کر وہ کائنات کا قطب اور اسے قائم و برقرار رکھنے کا وسیلہ بن جاتا ہے اور اس طرح خدائی اور انسانی دونوں صفتوں سے متصف ہو کر وہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان ایک رابطہ بن جاتا ہے۔ اس کا قلب اللہ تعالیٰ کے عرش کا۔ اس کی عقل اللہ تعالیٰ کے قلم (کلام) کی اس کا نفس لوح محفوظ اور فطرت عناصر کا مرادف بن جاتا ہے۔ اور وہ الحق ہو جاتا ہے"۔ اسی چیز کو علامہ اقبال نے بھی پیش کیا ہے۔ ؏

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

یہی بات قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور نہیں پھینکا تو نے بلکہ اللہ نے پھینکا۔" (۸:۱۷) آنحضورؐ تمام انسانوں میں اکمل ترین انسان ہیں۔ گویا انسانِ کامل آنحضورؐ کا خطاب ہے

انسؓ بن مالک (۱۰ قبل ہجری — ۹۳ھ) ماں کا نام امّ سلیم ہے۔ کنیت ابوحمزہ، قبیلہ خزرج سے تھے، صحابی خادمِ رسولؐ۔ امام، مفتی قاری، معلم قرآن، محدث، نامور راوی۔ ان کے والد مالک نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ والدہ اسلام لائیں ہجرت کے بعد انہیں آنحضورؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں اور خادم کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ انسؓ آنحضورؐ کی وفات تک آپؐ کی خدمت گذاری میں رہے۔ آنحضورؐ نے ان کی والدہ کے کہنے پر ان کے لئے دعا کی جو قبول ہوئی اور انہوں نے ایک لمبی عمر پائی۔ ان کی اولاد قریباً ایک سو کے قریب ہے بعض کے نزدیک اسّی ہے جن میں سے ۷۸ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ مشہور بصری محدث ابو عمیر عبدالکریم بن محمد بن عبداللہ بن حفص بن ہشام انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے لیکن کم سنی کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہ لیا۔ آٹھ جنگوں میں شرکت کی۔ بصرہ میں ۱۰۳ سال کی عمر میں صحابہ کرام میں سب سے آخر میں وفات پائی۔

حضرت انسؓ نے آنحضورؐ اور کبار صحابہ سے کثرت سے احادیث روایت کی ہیں قریباً سو راویوں نے ان سے روایت کی ہے۔ ان سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد ۲۲۸۶ ہے۔

انسؓ بن نضر صحابی۔ حضرت انسؓ بن مالک کے چچا اور مدینہ کے خاندان بنجار کے رئیس تھے۔ غزوہ احد میں جب آنحضورؐ تنہا میدان میں رہ گئے اور تمام جان نثاروں کے قدم اکھڑ گئے تو آنحضورؐ کو بچانے کے لئے آگے بڑھے تقریباً پورے جسم پر ۸۰ زخم کھائے۔ کفار نے ان کی لاش کو بری طرح مثلہ کیا۔ ان کی بہن ربیعہ بنت نضر نے ان کو انگلی سے پہچانا۔

انشاءاللہ "اگر اللہ نے چاہا" یہ الفاظ خواہش یا امید کے موقع پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ان الفاظ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ زمانہ مستقبل کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں تو اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے بارے میں قرآن مجید میں اس طرح سے آیا ہے۔ "کسی کام کی نسبت ہرگز نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے (۱۸:۲۳) اسی طرح قرآن مجید میں یہ الفاظ مختلف مواقع پر آئے ہیں "اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔" (۱۸:۶۹) (۱۱:۳۳) (۱۲:۹۹) (۳۷:۱۰۲)

انشراح، سورۃ (دیکھئے "الانشراح، سورۃ")

انشقاق، سورۃ :- (دیکھئے "الانشقاق، سورۃ")

انصار مددگار، اصطلاح میں وہ لوگ جو دین کی مدد کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :-

"اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو جیسے عیسٰیؑ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کون اللہ کے راستے میں میرے مددگار ہیں۔" (۶۱:۱۴) پھر ارشاد ہے :-

"جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا، جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، وہ سب آپس میں رفیق ہیں۔" (۸:۷۲)

یہ یثرب (مدینۃ النبی) کے اوس و خزرج قبائل کا اسلامی نام تھا۔ ملت اسلامی کی تشکیل کے بعد انصار ہی کو یہ فضیلت نصیب ہوئی کہ آنحضورؐ نے ان کی دعوت پر مدینہ ہجرت فرمائی۔ انہوں نے دین کی مدد کی اللہ اور اس کے رسولؐ کے مددگار بنے مہاجرین کو پناہ دی اور نصرت دین میں مال و جان سے جہاد کیا۔ انہیں یہ لقب اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

اوس و خزرج نامی دو قبیلے صدیوں سے یثرب میں آباد تھے۔ جن کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ بنو غسان کی طرح وہ بھی دراصل ایک قحطانی الاصل اور بنو کہلان کی ایک شاخ ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ بھی اہل مکہ کی طرح حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں اور جیسا کہ ان کا دعوےٰ ہے کہ بنو غسان کی طرح وہ بھی یمن سے حجاز آئے تھے اور یثرب میں آباد ہو گئے تھے۔ اوس و خزرج کی قریش مکہ سے بھی رشتہ داریاں تھیں اوس خزرج قبیلے بھی دوسرے عرب قبائل کی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور ان میں بھی کئی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں آخری لڑائی بُعاث میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ عرب جاہلیت میں قاعدہ تھا کہ جیسا موقع ہوتا قبائل ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے۔ چنانچہ اوس قبیلہ جب خزرج کے مقابلہ میں کمزور ہو گیا تو انہوں نے قریش کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کی اور چند سرداروں کو قریش کی خدمت میں مکہ بھیجا۔ آنحضورؐ کو معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ جس پر انہوں نے کہا

Marfat.com

یہ کام اس سے بہتر ہے جو ہم انجام دیتے آئے ہیں چنانچہ اگلے سال سالہ نبوی کو خزرج کے چھ افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ انصار کے قبول اسلام کی ابتدا تھی۔ سللہ نبوی کو بہتر افراد پر مشتمل ایک گروہ جس میں دو عورتیں بھی تھیں اور جس میں اوس خزرج دونوں قبائل کے افراد شامل تھے بیعت کے لیے آئے۔ حضرت عباسؓ نے ان سے کہا کہ آنحضورؐ تمہارے پاس آنا چاہتے ہیں اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی جواب دے دو۔ ان میں سے حضرت البراءؓ نے کہا کہ ہم لوگ تلواروں کی گود میں جوان ہوئے ہیں۔ ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ابوالہیثم نے کہا کہ یا رسول اللہ ایسا تو نہ ہوگا کہ آپؐ کو قوت و اقتدار حاصل ہو تو آپ ہمیں چھوڑ کر پھر مکہ واپس آجائیں۔ آنحضورؐ نے فرمایا نہیں میرا اور تمہارا خون ایک ہو چکا ہے تم مجھ سے ہو اور میں تم سے۔"

آنحضورؐ نے مکہ سے ہجرت کر کے یثرب میں قدم رکھا تو ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ آپؐ اس کے ہاں ٹھہریں۔ بالآخر مہمان نوازی کا یہ شرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا۔ پھر آپ نے انصار اور مہاجرین میں مواخات کا رشتہ قائم کیا اور دونوں کو اس طرح یکجا کر دیا جیسے وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ مسجد نبوی کی تعمیر سے فارغ ہو کر آنحضورؐ نے انصار کو طلب فرمایا اور مہاجرین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ "یہ تمہارے بھائی ہیں۔"

جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو مہاجرین کی طرح انصار نے بھی ہر غزوہ میں جان و مال سے حصہ لیا۔ انہوں نے بغیر کسی غرض اور ذاتی منفعت کے ہر نازک مرحلے پر آنحضورؐ کا ساتھ دیا۔ غزوہ بدر میں آنحضورؐ نے مہاجرین اور انصار سے خطاب فرمایا اور رائے طلب کی تو انصار خاموش رہے آپؐ کے دریافت کرنے پر بتایا کہ ہم سمجھے تھے کہ آنحضورؐ مہاجرین سے مخاطب ہیں کیونکہ انصار تو ہر حالت میں آپ کی نصرت و تائید کا عہد کر چکے تھے اور ہم تو ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں۔

طائف کے محاصرے کے بعد جعرانہ کے مقام پر آنحضورؐ نے قیام فرمایا اور حنین اور اوطاس کا مال غنیمت مؤلفۃ القلوب میں تقسیم کیا تو انصار میں سے بعض کو خیال گذرا کہ آنحضورؐ نے، قریش کے مقابلے میں ان کا حصہ کم رکھا ہے۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آنحضورؐ ان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ لہٰذا آپؐ نے وہیں انصار کے مجمع میں خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں فرمایا کہ "اے انصار کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اونٹ اور بکریاں تو لوگوں کے حصہ میں آئیں لیکن محمدؐ رسول اللہ کو تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔" اس فرمان پر انصار بے اختیار آب دیدہ ہو گئے۔ وہ خوش تھے کہ آنحضورؐ ان کے ساتھ مدینہ جا رہے ہیں انہوں نے اسلام کی تائید و نصرت کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اور اس راہ کی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں دی ہے۔

"انہیں مہاجرین سے محبت ہے۔ مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے۔ اس سے وہ تنگ دل نہیں ہوتے اگرچہ انہیں خود فاقہ برداشت کرنا پڑے جس نے اپنے نفس کو لالچ سے محفوظ رکھا وہ فلاح پانے والوں میں سے ہے۔" (۵۹ : ۹)

آنحضورؐ نے اپنی وفات سے قبل مہاجرین کو بالخصوص وصیت فرمائی کہ انصار سے اچھا برتاؤ کریں۔ آپؐ نے فرمایا "مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی لیکن انصار کم ہوتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے مجھے پناہ دی سو اپنے محسنوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ۔ اور ان کی خطاؤں سے درگذر کرو۔"

آنحضورؐ نے ایک اور ارشاد میں فرمایا ہے کہ "اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص انصار سے بغض نہیں رکھ سکتا۔"

انطاکیہ جنوب مشرقی ترکی کا ایک شہر دریائے عاصی کے کنارے بحیرہ روم کے ساحل سے چودہ میل دور واقع ہے۔ اس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب ہے۔ تین سو قبل مسیح میں سلیوکس اول نے اس کی بنیاد رکھی تھی ۶۴ قبل مسیح میں پومپی کے اس شہر پر قابض ہونے کے بعد سے ایشیا میں رومیوں کا سب سے اہم شہر اور سلطنت رومائی ایشیائی ولایات کا صدر مقام بن گیا۔ اس شہر کے انحطاط کی تاریخ ایران میں ساسانیوں کی سلطنت کے قیام سے شروع ہوتی ہے۔ جس نے دجلہ اور فرات کی وادی میں انطاکیہ کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت کو بہت گھٹا دیا تھا اور ایران کے پے درپے حملوں کا تختۂ مشق بنا دیا۔ شاہ پور اول نے اسے پہلے ۲۵۸ء میں اور پھر ۲۶۰ء میں فتح کیا اور یہاں کے بہت سے بسنے والوں کو ولایت سوسیانہ کے شہر جندی شاہ میں لے گیا۔ ۲۶۶ء سے ۲۷۲ء تک اس پر تدمیر کی ملکہ زنوبیہ کا قبضہ رہا۔ لیکن باوجود مسلسل داخلی جھگڑوں اور تباہ کن زلزلوں کے جو اس علاقے میں عموماً آتے رہے اس شہر کی زیب و زینت قائم رہی۔ آخر کار ۵۴۰ء میں خسرو اول (نوشیروان) نے اس کا محاصرہ کیا اور بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال کر دوبارہ ایرانی سلطنت میں منتقل کر دیا۔

قیصر روم جسٹینین نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا مگر ایرانی لشکروں نے اسے ۶۰۲ء اور ۶۱۱ء میں پھر تاراج کیا اور بالآخر ۱۶ھ/۶۳۷-۶۳۸ء میں عربوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ خلفائے اسلام کے ابتدائی دور میں اس کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ تاہم یہ شہر عربوں کے سرحدی فوجی نظام العواصم کا صدر مقام اور ایک علمی خطہ بنا رہا۔ ۲۶۵ھ/ ۸۷۸ء میں احمد بن طولون نے شمالی شام کے ساتھ اس شہر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور یہ ۲۸۵ھ/۸۹۸ء تک اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہا۔ پھر ۳۳۳ھ/۹۴۴ء میں سیف الدولہ آل حمدان کے قبضے میں آگیا۔ ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء میں بزنطینی سالار نے اسے فتح کر لیا اور ۴۷۷ھ/۱۰۸۴ء تک اس پر بزنطینی ڈیوک حکمرانی کرتے رہے بعد میں سلجوقی سلطان سلیمان بن قتلمش کے زیر نگیں آگیا اسی اثنا میں سلیمان کو اس کے ایک رشتہ دار نے ایک جنگ میں شکست دے کر مار ڈالا تو سلجوقی سلطان ملک شاہ کو مداخلت کرنا پڑی اور اس نے انطاکیہ کو اپنے ایک ترک امیر جس کا نام باغی تھا دے دیا۔ ۴۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں صلیبیوں نے یہ شہر اسی امیر سے چھینا تھا اور نارمن خاندان جو بوھیمان کی اولاد میں سے تھا یہاں حکومت کرنے لگا یہاں تک کہ ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء میں مملوک سلطان بیبرس بندق داری نے دوبارہ فتح کر کے تباہ و برباد کرا دیا۔ اس کے بعد انطاکیہ حلب کی مملوک نیابت میں رہا اور ۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی افواج نے اس پر قبضہ کر کے شام کے انتداب میں شامل کر لیا۔ ۱۹۲۸ء میں اسکندرونہ کی سنجاق کے لیے الگ حکومتی نظام قائم کیا گیا تو انطاکیہ اس کا صدر مقام بنا۔ لیکن فرانس نے یہ سنجاق ۲۳ جون ۱۹۳۹ء میں جمہوریہ ترکی کے حوالے کر دی۔ انطاکیہ میں حبیب النجار کی ایک درگاہ کے سوا مسلمانوں کی اور کوئی اہم یادگار باقی نہیں ہے۔

جدید انطاکیہ کا اہم حصہ دریائے عاصی (اورونٹس) کے مشرقی کنارے پر واقع

Marfat.com

ہے۔ جدید ترین علاقے مغربی کنارے پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ قدیم شہر کی گلیاں زیادہ تر تنگ ہیں۔ جدید شہر کی سڑکوں کا نظام بھی مناسب نہیں۔ عمارات زیادہ تر ایرانی طرز کی ہیں۔ ایک عجائب گھر بھی ہے، جہاں مسلمانوں کے اکثر باقیات جمع ہیں شہر کی معیشت کا انحصار زیادہ تر زراعت پر ہے، جو ملحقہ میدانوں میں ہوتی ہے اہم پیداوار گندم، کپاس، انگور، چاول، سبزیاں اور پھل ہیں۔ صنعتوں میں صابن سازی اور روئی بیلنے کے کارخانے اہم ہیں۔

انطالیہ بحیرہ روم کے ساحل اناطولیا خلیج کے شمال مغربی گوشے میں واقع ایک شہر جس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں تین چوتھائی مسلمان ہیں۔ قدیم کتابوں میں اتالیہ اور نئی یورپی زبانوں میں اوالیہ کے نام سے درج ہے۔ برگمر کے حاکم اتالوس ثانی کو اس شہر کا پہلا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا محل وقوع ایک ایسی خلیج کے سر پر ہے جو خشکی میں دور تک اندر چلی گئی ہے۔ لہٰذا یہ بحیرہ روم سے اناطولیا کے اندر جانے کے لیے بہت موزوں ہے۔ جنوبی اناطولیا کے پہاڑ جو عام طور پر ساحل سے بہت قریب اور متوازی چلے جاتے ہیں یہاں سیدھے اندر کی طرف رخ کر لیتے ہیں اور یوں ان کے درمیان خلیج کے سرے پر ایک وسیع سرسبز میدان نکل آتا ہے۔ یہ میدان دور تک پھیل گیا ہے۔ سمندر کے کنارے بیس تیس میٹر بلند پہاڑیاں ہیں ان پہاڑیوں کے درمیان ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ جس کے اندر از منہ وسطیٰ کے جہازوں کا اچھا خاصا بیڑا سما سکتا ہے۔ چونکہ اس کے آس پاس کے دوسرے قصبوں میں ایسے سازگار حالات موجود نہ تھے۔ اس لیے یہ شہر دوسرے قصبوں اور شہروں سے بہت جلد ترقی کر کے بازی لے گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سلطنت روما نے خاندان اتالوس کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اور اس طرح یہ سمندری قزاقوں کے قبضے میں آگیا۔ ۷۹ء قبل مسیح میں سرویلیوس نے ان ڈاکوؤں کا خاتمہ کر کے روما کی حکومت کا عملاً آغاز کیا بزنطینی زمانہ میں اس شہر نے بے حد ترقی کی اور بحیرہ روم کی بندرگاہ بن گیا مسلمانوں نے ابتدائی دور میں اسے اپنے بحری حملوں کی آماج گاہ بنائے رکھا اور بالآخر ۲۴۶ھ/۸۶۰ء میں المتوکل کے امیر البحر فضل بن قارن نے جو ترکی النسل تھا سمندر کی طرف سے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ گیارہویں صدی میں جب ترکوں نے سارے کا سارا اناطولیا فتح کر لیا تو شہر انطالیہ پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۱۰۳ء میں شہنشاہ کومنن کی فوجوں نے اسے دوبارہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ کچھ عرصہ بعد ترکوں نے پھر اس پر قبضہ جما لیا۔ ۱۱۲۰ء میں شہنشاہ نے پھر سے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ۱۱۸۱ء میں سلطان قلیج ارسلان ثانی نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن فتح نہ کر سکا۔ ۶۰۲ھ/۱۲۰۷ء میں سلطان غیاث الدین کیخسرو اوّل نے اس پر قبضہ کیا اور قبرص کا ولی جو فرنگیوں کی ایک جمعیت لے کر ساتھ رہا تھا، ناکام ہو گیا۔ لیکن ۱۲۱۵ء میں اس نے قبرص سے آکر انطالیہ پر قبضہ کر لیا اور ترکوں کو تہ تیغ کر دیا۔ لیکن اناطولیا کے سلطان عزالدین کیکاؤس اوّل نے دوبارہ انطالیہ پر فتح حاصل کر کے تمام فرنگیوں کو نیست و نابود کر دیا اس کے بعد ترکوں نے اس شہر کی مرمت کی۔ بندرگاہ کی پرانی گودی اور پشتوں کو دوبارہ بنایا۔ ساتھ ہی جہاز سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا۔ انطالیہ اناطولیا کے سلجوقیوں کے اس بیڑے کا مرکز بن گیا جو بحیرہ روم میں متعین تھا۔ یہاں کے ترک حاکموں کا لقب امیر السواحل یا ملک السواحل ہوتا تھا۔

جب سلجوقی حکمرانوں کا زوال ہوا تو یہ علاقہ حمید اوغلو خاندان کے ہاتھ آیا۔ تیرہویں صدی کے آخر میں الیاس بے کے بیٹے دندار بے نے انطالیہ پر قبضہ کیا اور ۱۳۶۱ء تک انہیں کی حکومت رہی حتیٰ کہ ۱۳۶۱ء میں قبرص کے بادشاہ پیٹر نے انطالیہ پر اپنا اقتدار جما لیا۔ اور حمید اوغلوی شکست کھا کر شمال کی طرف پسپا ہو گئے ۱۳۷۰ء میں محمد بے نے پھر انطالیہ پر قبضہ کر لیا۔

اولیا چلبی نے جو ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء میں اس شہر میں آیا تھا، انطالیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ شہر کے گرد ۴۰۰۰ قدم لمبی ایک فصیل تھی۔ اور فصیل میں اسی برج تھے۔ شہر کے اندر تین ہزار سے زائد مکان تھے۔ فصیل کے باہر شمال کی طرف بیس ترکی اور چار یونانی محلے تھے۔ شہر کے تین اطراف میں باغات تھے۔ بندرگاہ کم از کم دو سو جہازوں کے لئے ایک مکمل اور محفوظ جائے پناہ تھی۔ گیارہ بڑی مسجدیں، سات بڑے مدرسے، بہت سی خانقاہیں اور سرائیں تھیں سلجوقی زمانہ میں اس شہر کو جو اہمیت حاصل تھی وہ اس کے پرانے کھنڈرات سے معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر بعد کے زمانہ میں بالکل ہی کھنڈر ہو چکے ہیں۔

موجودہ انطالیہ سمندر سے سیدھی بلند ہوتی ہوئی چٹانوں کے درمیان ایک ہموار میدان میں واقع ہے۔ اگر سمندر سے دیکھا جائے تو قطار در قطار سرخ ٹائلوں کے سفید مکان اور ان کے گرد ہرے بھرے باغیچے اور پس منظر میں جو پہاڑ واقع ہیں بہت خوش نما نظارہ پیش کرتے ہیں۔ ساحل چٹانوں کے اوپر سے سمندر میں گرتے ہوئے آبشار اس منظر کو اور بھی دوبالا کر دیتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا بحیرہ روم کی امتیازی خصوصیات نمایاں ہیں۔ یہ میدان تین اطراف سے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ موسم گرما میں بہت گرم ہوتا ہے۔ اس لئے آبادی کا بہت بڑا حصہ موسم گرما گزارنے کے لئے آس پاس کی پہاڑی چراگاہوں اور گردو پیش کے باغوں میں چلا جاتا ہے اس موسم میں یہاں بارش نہیں ہوتی۔ موسم سرما خوشگوار اور معتدل ہوتا ہے۔

اب تک اس شہر کا بیرونی دنیا کے ساتھ رابطہ زیادہ تر سمندر کے راستے ہی سے ہے۔ بڑے بڑے جہاز پرانی بندرگاہ کے ساتھ باآسانی لنگر انداز ہو سکتے ہیں استنبول کے ساتھ ڈاک کے دخانی جہازوں کی آمدورفت باقاعدہ قائم ہے۔ غیر ملکی جہازوں کے ذریعے انطالیہ کا زیادہ تر رابطہ اٹلی، مصر اور شام کی بندرگاہوں سے قائم ہے۔

انعام، سورۃ:- (دیکھئے "الانعام، سورۃ")

اِنفاق کسی چیز کو ہاتھ سے نکال دینا۔ اصطلاح میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنا۔ اسلام میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ نماز کے ساتھ اس کا حکم دیا گیا ہے اور مومن کی نشانی بتائی گئی ہے۔ اگرچہ اللہ تعالےٰ کو کسی کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے۔ تاہم انفاق کو اللہ تعالےٰ نے قرض حسنہ سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ "کون ہے جو اللہ کو قرض دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔" (۲: ۲۴۵)

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ تم جو اپنے مال خرچ کرتے ہو اس سے تمہاری دولت میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز بتایا گیا کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ (۲: ۲۱۹) اس کے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا ضائع نہیں ہوگا بلکہ آخرت میں تمہارے لیے ذریعہ نجات بنے گا۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے

Marfat.com

جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا کرتا ہے (۲: ۲۶۱) گویا اللہ کے ہاں ایک کے بجائے سات سو گنا زیادہ ملے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ نہ کرنے والوں کے بارے میں قرآن مجید میں بڑی سخت وعید سنائی گئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے "دردناک سزا کی وعید دے دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔ (۹: ۳۴-۳۵)

انفاق کرنے کو اللہ کے تقرب کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

"اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول کی طرف سے دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔" (۹: ۹۹)

انفاق فی سبیل اللہ کا مصرف کیا کیا جائے۔؟

"والدین پر۔ رشتے داروں پر یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے (۲: ۲۱۵)

ایک اور آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ مگر تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔" (۲: ۲۷۳)

انفال، سورۃ:

(دیکھیے "الانفال، سورۃ")

انفطار، سورۃ:

(دیکھیے "الانفطار، سورۃ")

انقرہ انگورہ یا انگولا، جمہوریہ ترکی کا دارالحکومت اور اسی نام کا صوبہ۔ شہر انقرہ، بحیرۂ اسود سے ۱۲۵ میل کے فاصلے پر سطح سمندر سے ۲۸۰۰ فٹ بلند اور اردگرد کے علاقے سے ۵۰۰ فٹ بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں اتاترک نے اسے صدر مقام کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی کل آبادی آٹھ لاکھ کے قریب تھی اور صوبے کی کل آبادی پندرہ لاکھ کے قریب تھی۔ ان میں ستانوے فیصد مسلمان ہیں:۔

انقرہ دو حصوں قدیم اور جدید میں منقسم ہے۔ قدیم شہر پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر شدہ ہے یہ تنگ گلیوں کا بوسیدہ سا علاقہ ہے، جس کی اکثر خستہ حال عمارات رفتہ رفتہ جدید عمارات میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ تاہم ابھی تک بہت سی قدیم عمارات باقی ہیں۔ ان میں آگسٹس کا مقبرہ، رومی عمارات، حمام اور دیوان خانے، بازنطینی ستون۔ مساجد ارسلان، بیرام وغیرہ۔ انھی عمارات کے قریب انقرہ کا قومی عجائب گھر (۱۹۵۱ء) ہے، جس کے پاس ہی مسجد علاؤالدین ہے۔

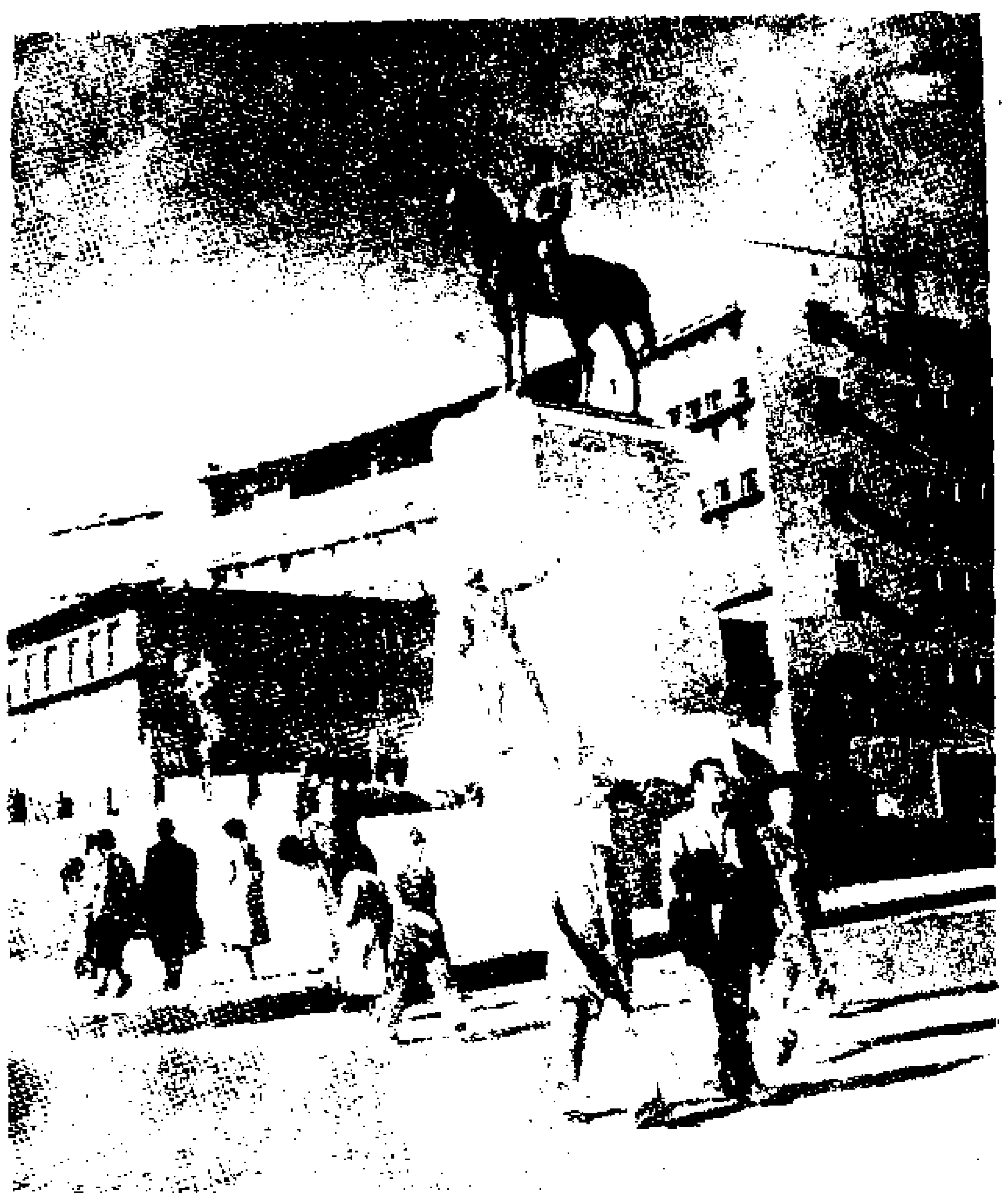

جدید شہر میں سب سے زیادہ قابل دید شے اتاترک کا مجسمہ ہے۔ پہاڑی کے مغرب ہی میں اتاترک کا مزار بھی ہے، جو ۱۹۵۳ء میں مکمل ہوا تھا۔ یہ شہر کے ہر حصے سے نظر آتا ہے۔ جدید شہر میں سرکاری دفاتر اور رہائشی کالونیوں کے علاوہ یونیورسٹی (قائم شدہ ۱۹۴۶ء)، قومی لائبریری، قومی تھیٹر، سٹیڈیم، ریڈیو سٹیشن، کالج اور سکول ہیں، انقرہ شہر ریل اور سڑک کے ذریعے استنبول اور ازمیر جیسے بڑے بڑے شہروں سے ملا ہوا ہے۔ شہر سے سولہ میل کے فاصلے پر ہوائی اڈا ہے۔ جہاں سے بین الاقوامی پروازیں چلتی ہیں۔

تاریخ:۔ انقرہ کی بستی زمانہ قبل از تاریخ سے موجود ہے۔ ۱۹۳۱ء میں یہاں حجری دور کے آثار ملے ہیں۔ دیگر کئی آثار سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے یہاں حتی مملکت قائم ہوئی۔ یہ اس کا صدر مقام تھا۔ اس وقت اس کا نام انکلا تھا۔ تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں یہاں فریجی قوم آباد تھی۔ ۳۳۴ ق م میں جب سکندر اعظم اپنی مہمات پر نکلا تو یہاں سے بھی گذرا۔ اس کی وفات کے بعد سے نصف صدی تک اس پر سلوکیوں کا قبضہ رہا۔ ان کے بعد غلاطی تیسری صدی قبل مسیح میں جزیرہ نمائے بلقان سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں رومی انقرہ میں داخل ہوئے اور انھوں نے غلاطیہ سمیت انقرہ کو روم کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ رومیوں کے عہد میں یہاں بہت سے معبد ایک سپوڈروم (آت میدان)، حمام اور شہنشاہوں کے لیے محل تعمیر کرائے گئے اور اس کو اہم فوجی مرکز بنایا گیا۔ رومی دور میں انقرہ اندلو کے متمدن ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔

۳۳۴ء سے ۱۰۷۳ء تک تقریباً سات سو سال سے زائد عرصہ انقرہ مشرقی رومی سلطنت کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس دوران میں یہ شہر نئی نئی عمارات سے مزین ہوا اور خاص طور پر ساتویں صدی عیسوی سے جب کہ انقرہ کو عربوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی از سر نو تعمیر جاری رہی۔ اس پر ساتویں صدی میں پہلا حملہ ایران کے شاپور اور بعد ازاں خسرو پرویز نے کیا ——— عربوں نے ۶۵۴ء میں انقرہ کو فتح کر لیا تھا لیکن وہاں قیام ... کہ ۸۰۶ء میں ہارون رشید

Marfat.com

کی فوجوں نے انقرہ پر از سرِ نو قبضہ کیا۔ ۸۳۹ء میں المعتصم اس پر قابض ہوا۔ ۱۰۷۱ء میں سلطان الپ ارسلان نے اسے ترکی کی سلطنت میں شامل کر لیا اور آہستہ آہستہ اس کے تمام علاقوں پر سلطنت ترکی کا تصرف ہو گیا۔ ۱۱۲۷ء میں یہ امیر غازی کے قبضہ میں آیا اور اس کے بیٹے محمد غازی کی وفات کے بعد انقرہ پر قونیہ کے سلجوقی حاکم مسعود اوّل کا قبضہ ہو گیا۔ مدت دراز تک حکومت کرنے کے بعد جب قلیچ ارسلان ثانی کی سلطنت کو اس کے گیارہ بیٹوں میں تقسیم کیا گیا تو انقرہ محی الدین مسعود کے حصہ میں آیا۔

۱۲۱۰ء میں عز الدین کیکاؤس انقرہ پر حکومت کرتا رہا اور ۱۲۱۹ء میں علاؤ الدین کیقباد حاکم ہوا جس کا دور سلجوقی سلطنت کا سنہری دور تھا۔ سلجوقی سلاطین انقرہ کی فوجی اہمیت سے واقف تھے اور اسی لئے وہ اس کی فصیلوں کے استحکام میں سعی و اہتمام کرتے رہے۔

تیرہویں صدی سے پہلے انقرہ میں اسلامی طرزِ زندگی نے زیادہ رواج نہ پایا تھا۔ نیز بعد کے ادوار میں بھی سلاطین نے یہاں خود مسجدوں یا مدرسوں کی قسم کی مذہبی یا ثقافتی عمارات نہیں بنائیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انقرہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا رہا اور اسے صرف ایک سرحدی شہر ہی سمجھا گیا

تیرہویں صدی کے آغاز سے تقریباً نصف صدی تک انقرہ پر ایلخانیوں کی بھی عمل داری رہی ۱۳۵۴ء میں ارخان غازی کے بیٹے سلیمان پاشا نے انقرہ کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور اس وقت انقرہ کا آخری ایلخانی والی ملک ناصر تھا۔

عثمانی سلطنت کی صوبہ بندی کے دنوں میں انقرہ اندلو کی بڑی ایالت کا صدر مقام مقرر ہوا۔ بعدازاں صدر مقام کوتاہیہ میں منتقل ہو گیا اور انقرہ صرف ایک صوبے کا مرکز رہ گیا۔ یہ صوبہ یا سنجاق عموریہ بھی کہلاتا تھا۔

سولہویں سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک انقرہ کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہوا۔ بالخصوص جنوب کی سمت خاص طور پر یہ رومی بازنطینی شہر کی حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اسے ایک اہم مرکزی شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

۱۶۴۸ء کے انقرہ کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان کے مطابق شہر کی اندرونی فصیل سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اس کے ایک دوسرے سے بلند چار طبقے تھے۔ پائیں شہر کی اطراف کو بھی جلالی حملوں کے خوف سے حصار بند کر دیا گیا تھا۔ بازار شہر کے بالائی حصہ میں تھے۔ انقرہ کی چراگاہیں اچھی نسل کے جانوروں خصوصاً بکریوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان بکریوں کی اون جس کی تعریف میں مقامی مصنفوں نے کہا ہے کہ وہ "دودھ کی طرح سفید" "ریشم کی مانند نرم اور ہیرے کی مثل چمک دار ہوتی ہے۔ کات کر اس کے دھاگے سے کپڑا بنا جاتا تھا اور یہاں کے لوگوں کا یہی ذریعہ معاش تھا اور اس کی ملک سے باہر مصر اور یورپ کے بازاروں میں بھی بہت مانگ تھی۔ ۱۸۱۲ء تک انقرہ میں کپڑا بننے کے تقریباً ایک ہزار کارخانے چل رہے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں کپڑے کے ایک دو کارخانے رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز انقرہ کی جو بکریاں جنوبی افریقہ میں لے گئے تھے ان کی پرورش ایک طبعی ماحول میں مکمل ضروری شرائط کے ساتھ عمل میں آئی۔ تو ان کی اون نے اس صدی کے اواخر میں منڈیوں میں خاص اہمیت حاصل کر لی اور پھر یہی تجربہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بھی ہوا اور نتیجہ میں انقرہ کی اون کی قیمت بالکل گھٹ گئی۔

چونکہ بلقان کی جنگ کے بعد روم ایلی کے صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے اس طرح نئی سرحدیں استنبول کے بہت قریب صرف ۵۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر رہ گئیں اور اسی زمانے میں یہ بات بھی مشکوک نظر آنے لگی کہ یہ بندرگاہ (استنبول) بحری سلطنتوں کے کسی حملے کا مقابلہ کر سکے گی۔

چنانچہ یہ تجویز مختلف طریقوں سے زیرِ غور رہی کہ عثمانی سلطنت بیرونی تعرضات سے محفوظ ہو۔ چنانچہ جب ۱۹۲۰ء میں استنبول پر فتح مند سلطنتوں کا قبضہ ہو گیا اور تشکیلات ملی کے لئے کوئی اداری مرکز تلاش کیا جانے لگا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک اعلان کے ذریعے پوری مملکت ترکیہ کو اس فیصلے کا پابند کر دیا گیا جو انقرہ کی "فوق العادت صلاحیت کی مالک" مجلس کے ایک اجتماع میں کیا گیا تھا اور اس فیصلے کے مطابق انقرہ مجلس ملیہ کبیر ترکی کی حکومت کا حقیقی مرکز بن گیا۔

جدید انقرہ:۔ انقرہ کو نئی ترکیہ کا مرکز بنانے کے فیصلے کے بعد اس کو آباد کرنے کے لئے بہت کچھ سعی و کوشش کرنا پڑی۔ لیکن آبادی کے کام کو ایک منظم لائحہ عمل کے مطابق آگے بڑھانا کہیں ۱۹۲۸ء میں جا کر ممکن ہوا۔ نئے انقرہ میں سب سے مقدم مجلس ملی کی عالیشان عمارت اس کے علاوہ سرکاری دفاتر کا ایک محلہ۔ باغیچوں والے مکان اور ایک ایسا ثقافتی محلہ تھا جس کے اندر زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی ادارے آ جائیں۔ اور شہر کے صنعتی حصے اس کے مضافات میں بنائے جائیں اور شہر کے مختلف حصوں کو ملانے کے لئے بڑی سڑکیں تعمیر کی جائیں۔ چنانچہ نیا انقرہ اسی طریق پر بنایا گیا ہے۔ پانی کی قلت کو دور کرنے کے لئے انقرہ سے شمالی سمت میں بارہ کیلومیٹر کی مسافت پر ایک بڑا بند تعمیر کیا گیا جو دو سو میٹر چوڑا اور اٹھائیس میٹر بلند ہے اور اس میں ایک سو تیس ملین کیوبک پانی جمع رہتا ہے۔ یہ بند ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ میں تعمیر کیا گیا ہے

حال میں انقرہ کی آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شہر ترقی کر رہا ہے۔ ۱۹۴۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک لاکھ ستاون ہزار دو سو باون تھی جو ۱۹۶۰ء میں ساڑھے چھ لاکھ ہو گئی

قلعہ انقرہ دو قلعوں پر مشتمل ہے۔ اندرونی قلعہ پہاڑی کے بلند تر حصے پر واقع ہے اور بیرونی قلعہ اندرونی قلعے کو شمال جنوب اور مغرب سے گھیرے ہوئے ہے۔ بیرونی قلعے کے تقریباً بیس برج تھے جن میں سے پندرہ برج اور ان کی درمیانی دیواروں کا ایک بڑا حصہ اب تک اچھی حالت میں باقی ہے۔ اس کے دو دروازے باہر کی جانب کھلتے ہیں۔ اندرونی قلعہ پہاڑی کی چوٹی کے پچاس ہزار مربع میٹر مستطیل شکل کے رقبے پر مشتمل ہے۔ بیرونی قلعے کی دیواروں کا ایک حصہ بیک وقت اندرونی قلعے کی شمالی حد بھی بناتا ہے۔ اندرونی قلعے کی دیواروں کے نچلے حصے سنگ مرمر اور سنگِ اسود کے ٹکڑے تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اندرونی قلعے کا محیط گیارہ سو پچاس میٹر ہے اور دیواریں چودہ سے سولہ میٹر تک بلند ہیں۔ دیواروں کے اوپر بیالیس برج ہیں جو پنج گوشہ ہیں اور آگے نکلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے انیس برج قلعے کی مغربی سمت کے ساتھ ایک ایسے جہازی بیڑے کا منظر پیش کرتے ہیں جو ایک قطار میں آگے بڑھ رہا ہو۔

انگشتری

انگوٹھی، خاتم؛ اسلامی شریعت کی رو سے مردوں کے لئے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے کیونکہ مردوں کے لئے سونے اور ریشم کا استعمال حدیث شریف میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ ایک چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے جس پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ کندہ تھے۔ آنحضورؐ اس انگوٹھی سے اپنے نام کی مہر کا کام لیتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ

Marfat.com

ایک چاندی کی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ میں پہنتے تھے۔"

موجودہ دور میں مسلمان اکثر دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں چاندی کی انگوٹھی استعمال کرتے ہیں۔ جس میں پتھر کا نگینہ جڑا ہوتا ہے۔ اسلام میں عورتوں کے لیے انگوٹھی پہننے پر خواہ وہ سونے کی ہو یا کسی اور دھات کی کوئی قید نہیں ہے۔

انور پاشا (۲۲ر نومبر ۱۸۸۱ء - ۴ر اگست ۱۹۲۲ء) مشہور ترکی حریت پسند، مجاہد اور سیاسی رہنما احرار ترکوں کا مشہور سالار جب ترکی نہایت ہی نازک دور سے گذر رہا تھا تو اس نے اپنے جانباز ساتھیوں کی مدد سے شدید خارجی اور داخلی خطروں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ والد کا نام احمد بے اور والدہ کا نام عائشہ۔ استنبول کے محلہ "دیوان یولو" میں ۲۲ر نومبر ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا۔ آبائی وطن مناستر تھا۔ استانبول کے مکتبہ حربیہ میں داخل ہوا اور فوجی افسروں کے تربیتی نصاب کے علاوہ جنرل سٹاف کے اعلیٰ نصاب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں ترکی کی تیسری فوج کے جنرل سٹاف میں بطور کیپٹن تقرر ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں میجر ہو کر تیسری فوج کے صدر مقام مناستر میں منتقل ہوا۔ یہیں پر انجمن اتحاد و ترقی کا رکن بنا۔

انور پاشا ہی کی کوششوں سے سلطان نے ۲۴ر جولائی ۱۹۰۸ء کو ۱۸۷۸ء کا دستور بحال کر دیا اور جب سلطان نے دستور ختم کرنا چاہا تو اسے معزول کر کے اس کے بھائی محمد رشاد خاں کو محمد خامس کے لقب سے ترکی کا سلطان بنانے والوں میں بھی انور پاشا ہی کا ہاتھ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں انور پاشا کو برلن کے ترکی سفارت خانے میں فوجی اتاشی مقرر کیا گیا۔ اس زمانے میں اس نے یہاں جرمن فوج کا مطالعہ کیا اور وہاں کی فوجی تربیت میں مہارت و استعداد پیدا کی۔ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے یکایک طرابلس پر حملہ کیا تو اس نے فوجی اتاشی کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور رضا کارانہ طور پر مملکت کے دور افتادہ حصے کی حفاظت کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ انور اور اس کے رفیق جن میں کمال اتاترک اور عصمت انونو خاص طور پر قابل ذکر ہیں بھیس بدل کر طرابلس پہنچے اور وہاں کے مقامی عربوں کو منظم کر کے اطالویوں پر یورش کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے ترکی پر حملہ کرا دیا تو انور پاشا طرابلس چھوڑ کر واپس وطن لوٹا اس وقت ترکی کا وزیر اعظم کامل پاشا تھا جو عملاً برطانیہ کا ہی آدمی تھا۔ برطانیہ نے اسے جنگ ملتوی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن انور پاشا اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس ایوان میں پہنچا جہاں کامل پاشا کی وزارت کا اجلاس ہو رہا تھا اور جا کر کہا کہ یا تو جنگ جاری رکھی جائے یا وزارت مستعفی ہو جائے۔ بات زیادہ بڑھ گئی اور بالآخر کامل پاشا اور اس کے ساتھی مستعفی ہو گئے اور نئی وزارت نے جنگ از سر نو شروع کر دی۔ اس طرح ترکوں نے اپنے کافی علاقوں کو بچا لیا۔

۴ر جنوری ۱۹۱۴ء کو سعید حلیم پاشا کی وزارت میں انور پاشا وزیر جنگ کے عہدے پر فائز ہوا اور پاشا کے خطاب سے نوازا گیا۔ وزیر جنگ ہونے کے بعد اس نے وسیع پیمانے پر فوجی اصلاحات شروع کر دیں۔ اسی اثنا میں پہلی عالمی جنگ پیش آ گئی اور اس میں ترکوں کے لیے اتحادیوں کے خلاف شرکت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اگرچہ پہلی جنگ عظیم میں انور اور اس کے رفقاء نے خوشی سے حصہ نہیں لیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جب استنبول پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا تو سلطان محمد سادس کے حکم سے (جو اتحادیوں کے زیر اثر تھا۔) ۱۹۱۹ء میں انور طلعت جمال اور ڈاکٹر ناظم کو جو کہ اس وقت ملک سے باہر تھے موت کی سزا سنائی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں باکو میں ہونے والی مشرقی قوموں کی ایک کانفرنس میں انور پاشا نے لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش کی نمائندگی کی۔ اس دوران میں انور پاشا برلن اور روس میں آتا جاتا رہا اور جب اسے یہ اطلاع ملی کہ یونانی فوجوں نے انقرہ پر حملہ کیا ہے تو یہ ماسکو سے باطوم پہنچا اور وہاں انجمن اتحاد و ترقی کے ایک اجلاس میں مجلس انقرہ سے اپیل کی کہ انجمن کے ارکان سے مخالفت کا برتاؤ ترک کر دیا جائے۔ اس لڑائی میں یونانی فوجوں کو سقاریہ میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا مصطفےٰ کمال کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

انتشار پسند بسمچیوں کو ساتھ ملانے کے لیے انور پاشا ۸ر نومبر کو افغانی سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ سٹالن آباد کے بسمچی رہنما ابراہیم نے اسے دھوکے سے گرفتار کر کے تقریباً چھ ہفتوں تک قید رکھا۔ دوسرے بسمچیوں نے اسے آزاد کرایا تو اس نے اسٹالن آباد پر حملہ کر کے ۱۴ر فروری ۱۹۲۲ء کو روسی فوج کو وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات پر جنگیں ہوتی رہیں۔ ۴ر اگست ۱۹۲۲ء کو چکن نامی گاؤں کے معرکے کے دوران میں انور پاشا نے شہادت پائی۔

انور پاشا کی شادی سلطان محمد خامس اور سلطان محمد سادس کی بھانجی امینہ ناجیہ سلطان سے ہوئی تھی۔ اولاد میں ایک بیٹا انور علی اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

انور ایک شجاع اور بہادر، نہایت خلیق۔ بردبار، شیریں گفتار نیک خصلت آدمی تھا۔ ۱۹۱۸ء میں انور پاشا نے جنوبی و عربی محاذ جنگ کا دورہ کیا۔ اس دوران میں اس نے مدینہ منورہ میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک خصوصی گاڑی میں مدینہ پہنچا۔ اسٹیشن پر سواری کا انتظام تھا لیکن انور نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم غلاموں کی حیثیت میں یہاں آئے ہیں۔ چنانچہ پیدل مسجد النبی گیا اور روضۂ اطہر کی زیارت کی۔

اس میں تنظیمی صلاحیتیں بے پناہ تھیں۔ اپنے دوستوں اور رفیقوں میں گہری اور پائیدار وفاداری پیدا کر لینے کا اس میں خاص ملکہ تھا اس کے حریف بھی اس کی دیانت اور حب الوطنی کے معترف ہیں۔ اگرچہ ترکی اس کی مادری زبان تھی لیکن اس کے علاوہ بھی کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ جن میں فرانسیسی، جرمن، انگریزی، عربی روسی زبانیں شامل ہیں۔

انور شاہ کاشمیری، مولانا (۲۷ر شوال ۱۲۹۲ھ / ۲۶ر نومبر ۱۸۷۵ء - ۲ر صفر ۱۳۵۲ھ / ۲۷ر مئی ۱۹۳۳ء) مشہور عالم دین اور محدث۔ والد کا نام مولانا محمد معظم شاہ تھا جو بہت بڑے عالم زاہد و عابد اور پیر تھے۔ موضع دودھواں (علاقہ لولاب کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور ابتدائی فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اعلیٰ صلاحیتوں کا ظہور بچپن ہی میں ہونے لگا تھا۔ ایک بزرگ نے انہیں دیکھ کر کہا کہ یہ بچہ بڑا عظیم الشان عالم ہو گا اور آئندہ زمانہ میں اس کی علمی عظمت مسلم ہو گی۔ انور شاہ کاشمیری نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ میں نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا اور بارہ سال کی عمر میں فتاوے دینے لگا تھا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں ہزارہ سے دیوبند آئے اور مولانا محمود الحسن، مولانا خلیل، مولانا محمد اسحاق، مولانا غلام رسول ہزاروی کی علمی صحبتوں سے چار سال تک استفادہ کیا۔ دیوبند سے فارغ ہو کر گنگوہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی بھی حاصل کیے۔

گنگوہ سے آپ دہلی آئے اور مدرسہ امینیہ میں مدرس اول مقرر ہو گئے۔ تین چار سال بعد کشمیر چلے گئے اور وہاں سے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے۔ حجاز سے

Marfat.com

واپسی پر بارہ مولا کے مقام پر ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور تین چار برس بعد دیوبند دارالعلوم میں مدرس ہو گئے۔ کئی برس تک بغیر تنخواہ کے حدیث کا درس دیتے رہے مولانا انور کاشمیری شادی کرانا نہیں چاہتے تھے تاکہ خانہ کعبہ کی طرف ہجرت کر سکیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے آپ کو ہندوستان میں رکھنے کی تجویز سوچی کہ آپ کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ گنگوہ کے سادات میں آپ کا نکاح کرا دیا۔

آپ ۲۵ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء تک دیوبند میں صدر مدرس رہے۔ اس کے بعد آپ نے دیوبند سے قطع تعلق کر لیا اور ڈابھیل میں جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے ۱۳۵۱ھ تک درس حدیث دیتے رہے اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دیوبند میں وفات پا گئے آپ کے سات لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔

شاہ صاحب نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ بہت کم دی۔ تاہم مندرجہ ذیل تصانیف اہم ہیں۔

۱۔ "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام"۔
۲۔ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح"
۳۔ "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین"۔
۴۔ "تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسےٰ علیہ السلام"۔
۵۔ "خاتم النبین" (فارسی)
۶۔ "فصل الخطاب فی مسئلہ ام الکتاب"
۷۔ خاتمۃ الکتاب فی فاتحۃ الکتاب (فارسی)

اس کے علاوہ آپ کی مشہور ترین تقریر فیض الباری سید بدر عالم میرٹھی نے چار جلدوں میں تحریر کی ہے۔ اسی طرح دوسری تقاریر العرف الشذی درس جامع ترمذی کی املا ہوئی جسے مولانا چراغ محمد نے اور "انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد" کو مولانا محمد صدیق نے منضبط کیا ہے۔

شاہ صاحب کا حافظہ بلا کا تھا۔ آپ کسی کتاب کا ایک مرتبہ مطالعہ کر لیتے اور جب کبھی برسوں بعد اس کتاب کے بارے میں کوئی بات چھڑتی تو اس کے مضمون کو حوالوں کے ساتھ اس انداز سے بیان فرماتے کہ سننے والے ششدر رہ جاتے۔

آپ نے خود ایک مرتبہ فرمایا کہ "جب میں کسی کتاب کا مطالعہ سرسری نظر سے کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا تب بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ ہو جاتے ہیں۔"

مولانا اشرف علی تھانوی نے شاہ صاحب کے بارے میں کہا ہے "میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل انور شاہ کاشمیری کا امتِ مسلمہ میں موجود ہے۔"

مولانا عبدالقادر رائے پوری نے فرمایا "واقعی حضرت شاہ صاحب" آیتہ من اللہ تھے۔ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے الفاظ میں میرے جیسا کم علم ان کے حالات کیا بیان کر سکتا ہے۔ البتہ صرف اتنا کہہ سکتا ہے کہ صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا یہ پیچھے رہ گئے۔" علامہ شبیر احمد عثمانی نے آپ کی وفات پر کہا تھا "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء شیخ عزالدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے۔ کیونکہ صرف زمانے کا تقدم و تاخر ہے ورنہ علامہ انور شاہ بھی چھٹی یا ساتویں صدی ہجری میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و محامد بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا آج انتقال ہوا ہے؟"

علامہ اقبال مرحوم نے لاہور کے ایک تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے"

آپ میں خدا ترسی حد درجہ کی تھی۔ اکثر ملنے والے بہت سی سنتوں کو شاہ صاحب کے عمل سے معلوم کر لیا کرتے تھے۔ آپ کے چہرہ سے اس وقت خاص طور پر خشیت الٰہی کا اظہار ہوتا تھا جب آپ اپنے وعظ میں خوف و خشیت والی آیات یا اشعار پڑھتے اس لمحے آپ کی آنکھیں خوف خداوندی سے تر ہو جاتی تھیں۔ آپ بڑے پر وقار اور متین تھے اس کے ساتھ وجاہت، دلکشی اور جاذبیت بھی آپ میں بدرجہ اتم موجود تھی ---

انہارِ جنت

جنت کے معنی باغ کے ہیں۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں جنت کی تعریف کی گئی ہے وہاں اس کے ساتھ نہروں کا ذکر بھی آیا ہے۔ باغ کی زینت اور لطف کو دوبالا کرنے کے لئے پانی کے ذخیرے کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ان نہروں میں سب سے زیادہ مشہور سلسبیل ہے۔ روایت ہے کہ ان نہروں میں بعض میں پانی رواں ہے جو ہمیشہ خوش ذائقہ رہے گا اور کبھی بدبودار نہ ہوگا اور بعض میں دودھ اور بعض میں شراب طہور بہتی ہوگی جو بہت خوش ذائقہ ہوگی اسی طرح شہد کی نہریں بھی ہوں گی۔ قرآن میں ان کی تعداد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے جنت کا سوال کیا کرو تو فردوس کا سوال کیا کرو۔ کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ اور درمیانی حصہ ہے اور وہیں سے جنت کی نہروں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ (صحیحین)

اواگون

اواگون :- ہندوؤں کا ایک عقیدہ (دیکھیے "تناسخ ارواح")

اوتاد

اوتاد کھونٹے اور ستون۔ صوفیاء کی ایک اصطلاح۔ ولایت کا ایک خاص درجہ جس میں چار اولیاء کو دنیا کے چاروں گوشوں کا محافظ تصور کیا جاتا ہے۔

اَوتار

اَوتار نیک، فرشتہ خو، مقدس، ولی، خدا رسیدہ آدمی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق خدا کا کسی جسم میں داخل ہو کر مخلوق کی اصلاح کے لئے دنیا میں آنا ہندو دھرم میں ویدی دیوتا وشنو کو خدائے بزرگ و برتر بتایا گیا ہے۔ اس کے حلقہ اثر میں بہت سے دیوتا شامل کر لیے گئے ہیں۔ مقامی دیوتا ہیرو حتیٰ کہ گوتم بدھ کو بھی وشنو کے حلقہ میں شامل کر لیا گیا اور یہ سب دیوتا وشنو کے اوتار کہلانے لگے۔ ان اوتاروں کی تعداد دس بتائی جاتی ہے جن میں سے نو آ چکے ہیں اور دسواں اوتار ابھی آئے گا۔ مشہور اوتار مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نرسنگھ :- یہ وشنو کا چوتھا اوتار ہے۔ یہ ہرنیہ کشیپ کا ایک خودسر راجہ تھا جو خدائی کا دعویدار تھا۔ لیکن اس کا لڑکا پرہلاد انتہائی دیندار تھا۔ جو خدا پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اس کے باپ نے اسے مروانا چاہا اور اسے پہاڑی کی چوٹی سے پھنکوا دیا لیکن کسی غیر مرئی قوت نے اسے روک لیا۔ بعد ازاں اسے زہر دیا گیا۔ اس پر زہر کا اثر بھی نہ ہوا پھر آگ میں ڈالا گیا۔ اور آگ بھی اسے جلا نہ سکی۔ تو اس نے اپنے لڑکے کو بلا کر پوچھا کہ تو میری برتری کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ لڑکے نے جواب دیا میں کائنات کے حکمران کو برتر جانتا ہوں۔ باپ یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا اور کہا کہ تیرا حکمران و

Marfat.com

مالک کہاں ہے؟ لڑکے نے کہا ہر جگہ ہے۔" اس نے تلوار ہاتھ میں لے کر پوچھا کہ کیا اس تاج میں بھی ہے؟" لڑکے نے کہا "ہاں" اس نے تاج کو تلوار سے دو ٹکڑے کر دیا۔ پھر کہا "کیا اس کھمبے میں بھی ہے؟" ہلانے پھر کہا "ہاں"۔ اس نے تلوار کو کھمبے پر بھی مارا اور کہا کہ "اپنے مالک سے کہہ کہ وہ تجھے بچائے۔" اس وقت وشنو کھمبے سے نکلا اور اس ظالم کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے سچے عاشق کو بچا لیا۔ ہولی کا تہوار اسی خوشی میں مناتے ہیں کہ نرسنگھ کو آگ نے نہیں جلایا۔

۲۔ رام چندر:۔ یہ ساتواں اوتار ہے۔ اس کا ذکر رامائن جیسی رزمیہ نظم میں کیا گیا ہے۔ یہ اجودھیا کے راجہ دسرتھ کا بڑا لڑکا تھا۔ لیکن اس کی سوتیلی ماں نے اپنے بیٹے بھرت کو تاج و تخت کا مالک بنوا دیا اور رامچندر کو جلا وطن کرا دیا۔ جلا وطنی کے دوران میں اس کی بیوی سیتا کو لنکا کے راجہ نے اغوا کر لیا۔ ہنومان کی مدد سے رام چندر نے لنکا پر حملہ کیا اور سیتا کو واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی واقعے کی یاد میں دسہرے کا تہوار منایا جاتا ہے۔ ہندو رام کی بڑی عزت کرتے ہیں اور مرتے وقت آخری لفظ جو ان کی زبان سے ادا ہوتا ہے رام ہے۔ رام کی پرستش وشنو کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔

۳۔ کرشن:۔ یہ وشنو کا آٹھواں اوتار ہے۔ یہاں وشنو کا تصور ترقی کے اعلیٰ درجے پر جا پہنچا ہے۔ اگرچہ کرشن کی پوجا بہت پہلے زمانے سے کی جاتی ہے۔ لیکن وشنو کا اوتار قرار پانے کے بعد اس کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ کرشن متھرا میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں متھرا کا راجہ بہت ظالم شخص تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک لڑکا اس کی چچی دیوکے بطن سے پیدا ہو گا اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ راجہ کے حکم سے دیوکے تمام بچے قتل کر دیئے گئے۔ دیوکی نے کرشن کو ایک چرواہے کی بیٹی سے بدل کر بچا لیا۔ کرشن نے چرواہوں میں پرورش پائی۔ ان کی بہادری کے تمام لوگ قائل ہو گئے تھے۔ چرواہوں کی لڑکیوں اور عورتوں کو کرشن سے عشق تھا اور ان ہی عورتوں میں سے رادھا تھی جو کرشن کی بیوی بنی۔ (نیز دیکھئے "پیغمبر")

اوحدالدین کرمانی (وفات ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) بہت بڑے صوفی اور عالم دین شیخ رکن الدین سنجاسی کے مرید تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی سے بھی بغداد میں قیام کے دوران میں خرقہ خلافت حاصل کیا۔ محی الدین ابن عربی کے پاس بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ نہایت سادگی پسند تھے۔ کئی ایک مرید بھی تھے۔ بعض کرامات کا جو ان سے صادر ہوئیں شیخ فریدالدین شکر گنج نے اپنی کتاب "راحت القلوب" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ شیخ فرید نے بھی آپ کی خدمت میں کچھ دن رہ کر فیض حاصل کیا۔ آپ اشعار بھی کہتے تھے۔ بغداد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

اورخان :۔ دوسرا عثمانی حکمران (دیکھئے "آرخان")

اورنگ زیب عالمگیر (۱۵ ذی قعدہ ۱۰۲۷ھ/۳ نومبر ۱۶۱۸ء۔ ۲۸ ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ/۳ مارچ ۱۷۰۷ء) ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا عظیم آخری تاجدار جس نے ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء سے ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء تک حکومت کی۔ وہ شاہجہان کا تیسرا بیٹا اور ملکہ ممتاز محل کے بطن سے تھا۔ گجرات میں دوحد کے مقام پر پیدا ہوا۔ عربی، فارسی، قرآن اور حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مادری زبان اردو تھی۔ تاہم اس نے ہندی اور ترکی میں بھی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۳۶ء میں شاہ جہان نے اسے دکن کا حاکم مقرر کیا۔ لیکن اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کی بغاوت کے موقع پر ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں اس نے دکن کی حکومت چھوڑ دی۔ اگلے برس اسے گجرات کا حاکم مقرر کیا گیا۔ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں شاہجہان نے اسے بلخ اور بدخشاں کے انتظام و انصرام کے لیے بھیجدیا۔ یہاں اس نے ازبک قبائل کی بہت سی بغاوتوں کو فرو کیا۔ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں وہ قندھار کی طرف بڑھا تاکہ اسے ایرانیوں کے محاصرے سے نجات دلائے۔ لیکن بدقسمتی سے قندھار اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ایرانیوں کے ہاتھ چڑھ چکا تھا۔ ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اسی برس اسے واپس دکن بھیج دیا گیا جہاں اس نے نظام محاصل کی تدوین نو کی۔ ۱۶۵۶ء میں اس نے گولکنڈہ اور ۱۶۵۷ء میں بیجاپور کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرنے کے لیے کامیاب حملے کیے۔ مگر شاہ جہان کے حکم سے ان مہمات کو ادھورا چھوڑ دینا پڑا۔ ستمبر ۱۶۵۷ء میں شاہ جہان بری طرح بیمار ہو گیا اور اس کے بیٹوں کے مابین حصول تخت کے لیے چپقلش بڑھ گئی۔ جون ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے شاہجہان کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا جہاں وہ اپنی وفات ۱۶۶۶ء تک نظر بند رہا۔ ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے عالمگیر کا لقب اختیار کر کے سلطنت مغلیہ پر فرمانروائی کا آغاز کر دیا۔

اورنگ زیب نے اپنی طویل تخت نشینی کے دور میں زیادہ وقت مختلف مہمات میں گذارا۔ ۱۶۶۲ء میں اس نے مغربی آسام کا محاصرہ کیا جو ۱۶۶۷ء میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۶۶۶ء میں اس نے چٹاگانگ اور ۱۶۶۷ء میں کابل کی بغاوتوں کو فرو کیا۔ خصوصاً کابل پر اسے زیادہ توجہ دینا پڑی۔ ۱۶۷۲ء اور ۱۶۸۱ء میں دوبارہ اسے پٹھانوں کی شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۶۷۹ء میں اس نے مروار (جودھپور) اور میواڑ (اودے پور) کی سلطنتوں پر دو کامیاب حملے کیے۔ ان میں سے مروار اس کے قبضے میں آ گیا۔ لیکن میواڑ کے ساتھ ۱۶۸۱ء میں معاہدہ امن طے ہوا۔ ۱۶۸۵ء میں اس نے بیجاپور اور ۱۶۸۶ء میں گول کنڈہ کی ریاستوں پر دوبارہ کامیاب حملے کیے اور انہیں سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ یوں پہلی بار سلطنت مغلیہ ساحل چٹاگانگ سے لے کر کوہ ہندوکش کے دامن تک پھیل گئی۔ اگلے کئی برس اس نے سلطنت کے انتظام و انصرام میں گذارے مگر بدقسمتی سے وہ ایک اچھا منتظم ثابت نہ ہو سکا۔ مرکز سے مسلسل غیر حاضری نے مقامی سرداروں کو سر اٹھانے کا موقع دیا۔ خصوصاً مرہٹوں نے اسے کبھی بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اکبر کے برعکس اورنگ زیب ایک پکا سنی العقیدہ مسلمان تھا۔ جب کہ اس کا بھائی دارا شکوہ ملحدانہ عقائد کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اسلامی قوانین کو اقوال آئمہ کی روشنی میں نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں نظام عدلیہ میں بے شمار تبدیلیاں کیں۔ مختلف قسم کے فتاویٰ کے مجموعے مرتب کرائے۔ اس بنا پر بہت سے آزاد خیال مسلمان اور متعصب ہندو اس کے مخالف ہو گئے۔ مسلمانوں کو سب سے بڑا اعتراض اس بات پر تھا کہ اورنگ زیب نے سکے پر سے کلمہ طیبہ کے حروف حذف کرنے کا حکم دیا تھا اور ہندوؤں کو اس بات سے چڑ تھی کہ اس نے ذبیحہ گائے اور ہندوانہ طرز سلام کے متعلق اکبر کے قوانین کو منسوخ کر دیا تھا۔ ہندوؤں نے اس پر بت شکنی اور مندر شکنی کے الزامات بھی عائد کیے ہیں۔

Marfat.com

اورنگ زیب چاہتا تھا کہ ہندوستان ایک صحیح قسم کی اسلامی سلطنت بن جائے جہاں غیر مسلم یا تو دین اسلام کو قبول کرلیں یا پھر ذمی بن کر رہیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے جزیہ کا نظام جاری کرنے کا حکم دیا جس پر غیر مسلم اکثریت اس کی مخالف ہوگئی اور جب وہ احمد نگر کے مقام پر فوت ہوا تو ہندوستان کے ہر گوشے میں کہیں نہ کہیں شورشوں نے سر اٹھایا ہوا تھا۔

شاہ جہاں نے آخری عمر میں سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ اس نے اپنی سلطنت کو مختلف بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا جس کی بنا پر اس کے بیمار ہوتے ہی ہر بیٹے نے پوری سلطنت پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ اگرچہ داراشکوہ ولی عہد تھا اور سلطنت کے سیاہ سفید کا مختار تھا لیکن اورنگ زیب سے بے حد خائف تھا۔ اس نے شاہ جہاں کو ہمیشہ اورنگ زیب کیخلاف بھڑکائے رکھا اور اس کی کوئی مہم بھی کامیاب نہ ہونے دی تھی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اورنگ زیب کے اعلان تخت نشینی کے ساتھ ہی داراشکوہ نے اورنگ زیب کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔ جس میں اسے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مہم کی فتح یابی کے فوراً بعد اورنگ زیب نے دوسرے بھائیوں کی طرف توجہ کی اور ان پر فتح حاصل کرنے کے بعد انتظام مملکت کی طرف متوجہ ہوا۔

اکبر اعظم کی پالیسی نے برصغیر میں اسلام کے وقار کو نقصان پہنچایا تھا۔ اورنگ زیب کی پالیسی اپنے پردادا کے رویے کے بالکل الٹ تھی۔ اکبر کے زمانے میں غیر اسلامی عناصر اتنی تقویت پکڑ چکے تھے کہ اسلام خطرے میں آگیا تھا اورنگ زیب کے زمانے میں ہندو احیائے نو کی تحریک پوری طرح نمودار ہو چکی تھی۔ اسلام کے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ دفاعی رویہ اختیار کیا جائے مجدد الف ثانی اور ان کے جانشین مذہبی سطح پر اسلامی احیائے نو کی تحریک چلا رہے تھے۔ اورنگ زیب مذہبی طور پر اس تحریک سے منسلک تھا اور اس نے اپنے نظریات کو سیاست میں بھی جاری و ساری کر رکھا تھا۔

عالمگیر نے ایسی تمام رسوم کو جو غیر اسلامی تھیں یا اسلام کے منافی تھیں بند کر دیا سب سے پہلے اس نے دربار میں اصلاحات کیں۔ سالگرہ اور تاجپوشی کے جشنوں میں سادگی پیدا کی۔ درباری نجومی موقوف کر دیئے۔ جھروکے میں بیٹھنے کی رسم ختم کر دی۔ جشن نوروز بند کر دیا۔ الٰہی تقویم منسوخ کر کے اسلامی تقویم رائج کی۔ اس کے علاوہ محرم کے جلوس وغیرہ بند کرائے۔ قماربازی عصمت فروشی شراب نوشی بند کر دی۔ موسیقی کے غیر معتدل اثر کی وجہ سے لوگ شمشیر و سنان بھول کر طاؤس و رباب میں گم ہو چکے تھے۔ عالمگیر نے موسیقی بھی بند کرا دی۔

مسلم عوام کو شریعت کا پابند بنانے کے لئے اس نے بڑے مستعد محتسب مقرر کئے۔ آئمہ مساجد کی تعظیم کی۔ اسلامی فقہ مدون کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے عالمگیر کی زیر سرپرستی فتاوٰئے عالمگیری مرتب کیا، جو بین الاقوامی شہرت کا مجموعہ ہے۔

اورنگ زیب پر ہندو کشی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کی پالیسی بلاشبہ اسلامی تھی لیکن اس نے ہندوؤں پر کبھی تشدد نہ کیا۔ مخالفین یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس نے جزیہ دوبارہ عائد کیا اور ہندوؤں کے مندر دوبارہ منہدم کرائے۔ اصل میں اورنگ زیب نے ٹیکس اسلامی شریعت کے مطابق لگائے۔ اس سلسلے میں اس نے اسی پرانے ٹیکس معاف کر دیئے۔ جزیہ اسلامی شریعت کے مطابق صاحب حیثیت ہندوؤں پر لگایا اور اس کی شرح بھی بہت معمولی تھی۔ اس کے سبب ہندو جبری فوجی بھرتی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ جب کہ اسلامی شریعت کے مطابق فوجی خدمت ہر مسلمان سے بالجبر لی جاسکتی ہے۔

اس کے بنارس کے فرمان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے صرف دو مندر گرائے جو بلا اجازت تعمیر کر لیے گئے تھے اس کے ساتھ ہی اس نے متعدد ہندو مندروں اور تیرتھوں کو زمین معافی کے طور پر دے دی۔ ہندوؤں پر تشدد اس کا مقصد نہیں تھا۔ ہندو بڑی تعداد میں سلطنت کے ملازم تھے۔ اس کا اپنا قول تھا کہ تقسیم مناصب مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ قابلیت کی بنیاد پر ہونی چاہیئے۔

عالمگیر بہت بلند کردار کا مالک تھا۔ اس کی زندگی اسلامی روایات کے عین مطابق تھی۔ وہ تمام مذہبی واجبات کا سختی سے پابند تھا۔ زندگی عیش و آرام سے کوسوں دور تھی۔ لباس اور خوراک بڑی سادہ تھی۔ اس نے سرکاری خزانہ کو ہمیشہ قومی امانت سمجھا اور کبھی ایک پیسہ نہ لیا۔ اپنے ذاتی مصارف پورے کرنے کیلئے وہ اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں سیتا اور قرآن شریف لکھتا اور اسی اصول پر اس نے تمام زندگی بسر کی وہ ایک صوفی تاجدار تھا۔ اس کا تصور حکومت بہت بلند تھا۔ وہ کہتا تھا کہ خدا مجھے اس دنیا میں اس لئے لایا کہ میں اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے زندہ رہوں اور محنت و مشقت اٹھاؤں۔ میرا فرض ہے کہ اپنی راحت کا خیال صرف اس حد تک کروں جس حد تک اسے میری رعایا کی خوشی حاصل ہو۔

اورنوس (وفات ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) ترک غازی، باپ کا نام عیسیٰ بیگ تھا۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء کے بعد سلطان آرخاں نے اسے اپنے بڑے بیٹے سلیمان پاشا کو بطور تیمار عطا کیا۔ اورنوس کا نام اس مددگار فوج کی فہرست میں موجود ہے جو آرخان نے اپنے بیٹے کی زیر قیادت کانتاکوزینوس کی مدد کے لئے بھیجی تھی۔ جس کا مقابلہ جان پنجم پلیولوغوس سے تھا۔ عثمانی مورخوں کے نزدیک ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء میں جب سلیمان پاشا نے درہ دانیال عبور کیا تھا اورنوس اس وقت اس کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ اس نے حاجی ایل بگی کے ساتھ شامل ہو کر ۷۶۳ھ/۱۳۶۲ء میں ادرنہ پر قبضہ ہونے والے معرکے میں حصہ لیا اور اس کے بعد اسے شہر اپسالا اور کوملجنہ پر جو ترا کیا میں ہے قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور ساتھ ہی مفتوحہ علاقوں کا اج بگی مقرر کیا اورنوس نے جنگ چرمن، جنگ مارترہ میں بھی شرکت کی۔

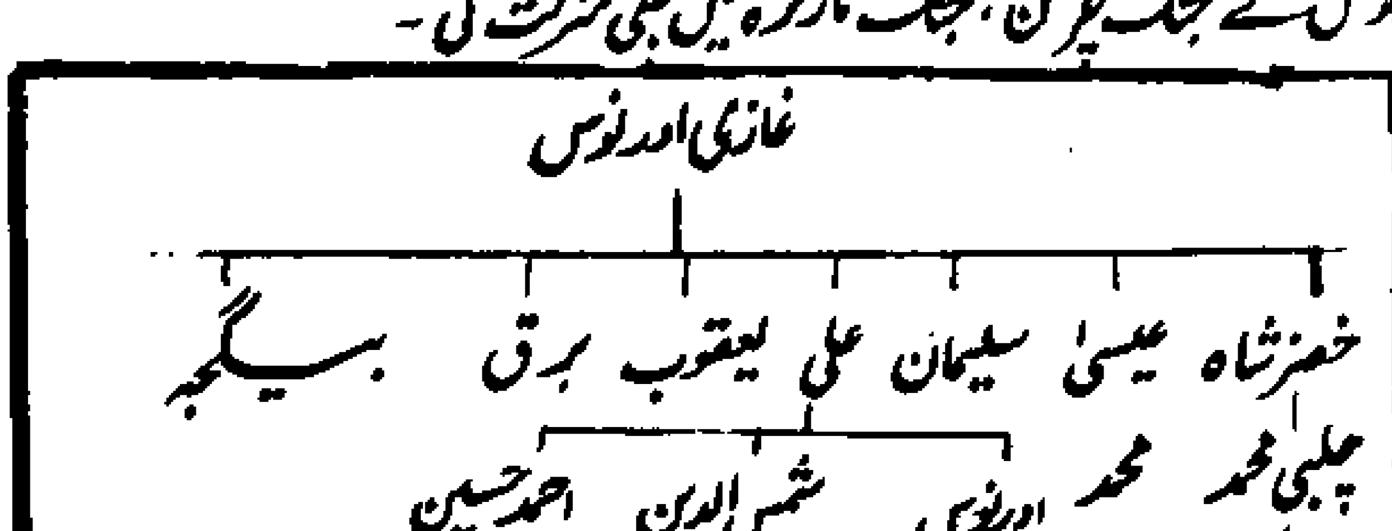

۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء میں اورنوس فرجک فتح کرنے نکلا۔ پوری اسکیجہ اور عورت حصاری کے علاقوں کو قبضہ میں لے کر ان پر خراج عائد کر دیا تو سلطان نے ۱۳۷۳ء میں اسے سیرس کا علاقہ انعام کے طور پر دیا جو خود اس نے فتح کیا تھا۔ ۷۸۴ھ یا ۷۸۰ھ، ۱۳۸۲ء یا ۱۳۸۵ء میں مقدونیۃ العظمیٰ کی تسخیر میں شریک ہوا۔ مناستر کو بھی فتح کیا وہ مراد اول کی آخری مہم میں اس کا مشیر تھا۔ اسکوب پر قبضہ کر کے اور بران قوصوہ کی مہم سے قبل دشمن کو ایک درہ کوہ میں کچل کر ناموری حاصل کی۔ ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں المورہ

Marfat.com

کی مہم میں ادرنہ ... ۱۳۹۶ء میں جنگ نکوپولی میں شریک ہوا اور ان فتوحات کو سر کرنے کے بعد اس نے البانیہ کی طرف قدم بڑھائے۔ جنگ انقرہ میں بھی شریک رہا۔ ایک لمبی عمر پانے کے بعد ینیجہ وار دار میں وفات پائی۔

اورنوس بے انتہا فیاض تھا۔ اپنی دولت کا بڑا حصہ خیراتی کاموں کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اورنوس کے سات بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں ان میں سے ایک کی شادی خلیل پاشا سے ہوئی جو چندرلی کا وزیر اعظم تھا۔ نویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں اورنوس میں جن لوگوں کے نام ملتے ہیں ان میں سب سے نمایاں نام عیسیٰ بن اورنوس کے بیٹے محمد کا ہے اس نے ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء میں دراج پر قبضہ کیا تھا۔ ایک اور مشہور نام خضر شاہ کے بیٹے اورنوس کے پوتے یوسف کا ہے جو سلیم اوّل کی مصر پر فوج کشی میں شریک تھا۔ یہ خاندان جو اورنوس اوغلری کے نام سے مشہور ہوا۔ روم ایلی پر حملوں میں اس نے بڑا نام پیدا کیا لیکن دسویں صدی کے وسط کے بعد قائدین عساکر کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو بیٹھا جبکہ عثمانی خاندان کے عروج میں اس خاندان کا بڑا ہاتھ تھا۔

اوزاعی، امام

(۸۸ھ/۷۰۷ء - ۱۵۷ھ/۷۷۴ء) ابوعمرو عبدالرحمان بن عمرو، مشہور فقیہہ اور عالم، دمشق میں پیدا ہوئے۔ اوزاعی نسبت دمشق کے ایک قصبے اوزاع سے ہے جو عرب کے کسی قبیلے کی وجہ سے اوزاع مشہور ہو گیا تھا۔ کیونکہ ابن حزم کے قول کے مطابق امام اوزاعی نے وہاں سکونت اختیار کی اور اسی وجہ سے مشہور ہوئے۔ حالانکہ آپ اوزاع قبیلے سے نہیں تھے۔ اپنی تعلیم کا کچھ دور یمامہ میں گذارا اور وہیں سرکاری ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد بیروت چلے گئے اور ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا مزار حنتوس میں ہے۔

انہوں نے امام زہری اور عطاء بن رباح سے حدیث روایت کی ہے۔ اور ان سے امام مالک اور سفیان ثوری نے روایت کی۔

اوزاعی کی تصانیف میں سے جو وہ اپنے شاگردوں کو قلم بند کرا دیتے تھے — "الفہرست" میں کتاب "السنن فی الفقہ" اور کتاب "المسائل فی الفقہ" کا ذکر ہے۔ انہوں نے ایک "مسند" بھی تالیف کی۔ ایک تصنیف "السیر" جو ان کے شاگردوں نے تیار کی تھی سترہویں صدی عیسوی میں موجود تھی۔

امام اوزاعی امام ابوحنیفہ کے ہم عصر تھے۔ ان کا مذہب قدیم عراقی فقہا کے مسلک کے بہت قریب آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک بھی جو عمل آنحضورؐ سے شروع ہوا اور جسے خلفائے راشدین نے قائم رکھا اور ان کے بعد بھی قائم رہا۔ سنت رسول ہے خواہ وہ آنحضورؐ سے باقاعدہ احادیث میں مروی ہوا نہ ہو۔ فقہ اسلامی کے جس طرح دوسرے دبستان آئمہ سے منسوب ہیں بالکل اسی طرح قدیم شامی فقہ کا دبستان الاوزاعی کے نام سے منسوب ہوا اور یہ مسلک نہ صرف شام بلکہ المغرب اور اندلس میں بھی رائج ہوا اور اوزاعی کے فتوے اندلس میں حکم بن ہشام کے دور تک چلتے رہے۔

امام اوزاعی کو بنو عباس کے دور میں بھی وہی احترام نصیب تھا جو امیہ کے دور میں تھا۔ ان کے شاگردوں میں سے ولید بن مزید بہت مشہور ہیں۔

اوزون حسن

(وفات ۸۸۲ھ/۱۴۷۸ء) حسن بیگ بن علی بیگ بن قرہ عثمان، ترکوں کے ایک شاہی خانوادے کا امیر۔ ایک بڑی ریاست کا بادشاہ اپنے بلند قد و قامت کی وجہ سے اوزون کہلاتا تھا۔ اس کی والدہ سارہ ایک مدبر خاتون تھی۔ ابتداً دیار بکر ان کا خاندانی مسکن تھا۔ والد کی وفات کے بعد اس کا بڑا بھائی جہانگیر تخت نشین ہوا۔ جس نے قرہ قوینلو کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ حسن بیگ نے جہانگیر کے مخالفوں کو شکست دی اور کردستان کے بیگوں کی کثیر تعداد کو مغلوب کر لیا۔ چونکہ حسن بیگ بھی جہانگیر سے ناراض تھا۔ اس فتح کے بعد اس نے ۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء میں قلعہ دیار بکر میں جہانگیر کو محصور کر دیا۔ لیکن والدہ کے کہنے پر واپس دیار بکر لوٹ گیا۔ جلد ہی حسن نے ارزنجان اور ترجان پر حملہ کر کے اپنے بھائی کے عامل عربشاہ کو وہاں سے نکال دیا اور اس کے بعد قرہ جہ طاغ پر حملہ کیا۔ ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء میں جہانگیر کے حلیفوں کو شکست کھانا پڑی اور جہانگیر نے اپنا بیٹا یرغمال کے طور پر دیا۔ دوسرے بھائی نے بھی حسن بیگ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی دریائے دجلہ کے کنارے قلعہ حصن کیفا ایوبی خاندان کے کرد ملکوں سے چھین کر اپنے لڑکے خلیل کو دے دیا اور اس کے بعد سعرت اور حتیم پر بھی قابض ہو گیا۔ اوزون حسن کو بہت جلد کامیابیاں حاصل ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں اس کا حریف جہان شاہ قرہ قوینلو جو اس وقت پورے ایران کا حاکم تھا۔ دیار بکر پر حملہ آور ہوا۔ یکم ربیع الثانی ۸۷۲ھ/۱۴۶۷ء کو جہان شاہ موش اور چپاخ چور پہنچ چکا تھا یہاں اوزون حسن کے بیٹے خلیل نے اس کی ہراول فوج کو شکست دی۔ سخت سردی کی وجہ سے جہان شاہ نے اپنی فوج کے اکثر سپاہیوں کو ان کے گھر واپس کر دیا۔ لیکن اوزون حسن نے ۱۲ ربیع الثانی ۸۷۲ھ/۱۱ نومبر ۱۴۶۷ء کو اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ جہان شاہ مارا گیا اور اوزون حسن نے میدان صاف پا کر وہ علاقے فتح کرنا شروع کر دیئے جن کا اب کوئی مالک نہ تھا وہ موصل ہوتا ہوا بغداد پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ادھر آذربائیجان میں جہان شاہ کے بیٹے حسن علی نے ایک کثیر فوج جمع کی اور اس کے ساتھ ہی ابوسعید تیموری سے بھی مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ بھی حسن علی کی مدد کو آ گیا۔ ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء کو ابوسعید گرفتار ہوا اور اس کے حریف شہزادے یادگار محمد بن سلطان محمد نے اسے قتل کر دیا، اس کی وفات کے بعد خراسان میں تیموری امراء کی حیثیت مقامی ہو کر رہ گئی تھی۔ اوزون حسن کے امراء نے بقیہ ایران پر بھی قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ہمدان پر اور موصل پر بھی امیر خلیل بیگ نے قبضہ کر لیا۔

اب اوزون خان ایشیا میں ایک بڑی طاقت بن گیا تھا جو عثمانیوں کی پیش قدمی کی راہ میں حائل تھی۔ تفلس سے واپسی پر تبریز کے مقام پر بیمار ہوا اور یہیں چوّن برس کی عمر میں وفات پائی۔

اوزون حسن کی تین بیویاں تھیں۔ بڑی ملکہ کا نام سلجوق شاہ بیگم تھا۔ اس نے کاروبار حکومت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔

دوسری بیوی کا نام دسپینا تھا۔ جس سے اوزون حسن نے چونتیس سال کی عمر میں شادی کی تھی۔ یہ عیسائی تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا یعقوب اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ تیسری بیوی کردام ولد تھی۔

اوزون حسن کے لڑکوں کے نام محمد۔ سلطان خلیل۔ یعقوب یوسف، زین العابدین ہیں۔

اوزون حسن بڑا عادل اور انصاف پرور بادشاہ تھا۔ اس کے انصاف و تقوے کی تعریف سب کرتے ہیں۔ اس نے بہت سے سلسلہ ہائے خیر شروع کیے تھے۔ تبریز میں اس کی بنائی ہوئی مسجد اب بھی موجود ہے۔

Marfat.com

اوس، بنو مدینہ منورہ کا ایک قبیلہ جو یمن سے نکلا اور یثرب (مدینہ) میں آبسا۔ اوس کے معنی عطیہ کے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں اوس لات اور اوس منات مشہور تھے۔ ایک اور قبیلہ خزرج تھا۔ اوس اور خزرج دونوں قبائل اسلام سے پہلے آپس میں لڑتے اور جھگڑتے رہتے تھے۔ یہ دونوں قبیلے اسلام سے قبل اپنی ماں قیلہ کے نام پر بنو قیلہ اور ہجرت نبوی کے بعد انصار کہلائے۔

ابن سعد کے مطابق ان کا نسب نامہ یہ ہے۔ اوس بن ثعلبہ بن عمرو بن عامر بن حارثہ بن امری القیس بن ثعلبہ بن مازن بن الازد بن الغوث بن بنیت بن مالک بن زید بن کہلان بن سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

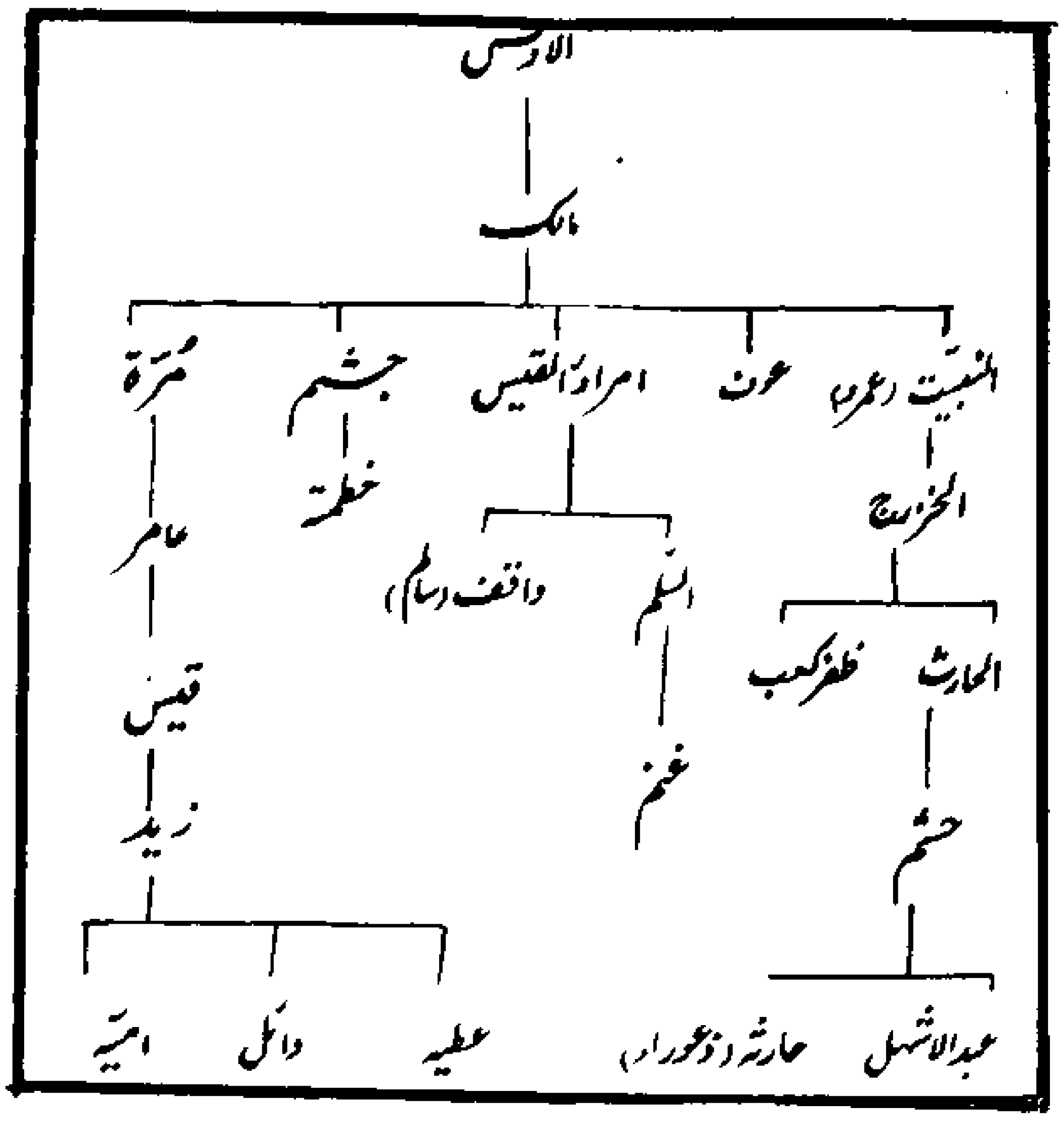

ہجرت سے قبل حضیر بن سماک بنو الاوس کا سردار تھا۔ جنگ بعاث میں حضیر مارا گیا۔ اگرچہ اس لڑائی میں اوس کے قبیلے نے خزرج کے قبیلے کو شکست دی تھی۔ اس کے بعد بھی دونوں قبیلوں میں صلح نہیں ہوسکی تھی لیکن مزید لڑائیوں کا سلسلہ بند ہوگیا۔ آنحضور ؐ نے پہلے خزرج اور پھر اوس سے گفت و شنید کی اور اس طرح دونوں قبیلوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اوس کی تعداد خزرج سے کم تھی لیکن بہادر اور قوی ہی تھے۔ جنگ بدر میں بھی دو سو تیس انصار میں سے ۶۱ اوسی تھے۔

بنی اوس کا مسکن مدینہ سے باہر کچھ فاصلے پر تھا اسلام نے انہیں کے بارے میں کہا ہے۔ اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ کے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے پس اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔ (۳:۱۰۳) (نیز دیکھئے "انصار")

اوقات نماز عبادت کرنے کے اوقات معراج کی رات آنحضور ؐ کی امت پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ ۱۔ فجر صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ۲۔ ظہر۔ سورج کے زوال سے لے کر سایہ کے ایک مثل تک بالاتفاق اور بعض ائمہ کے نزدیک دو مثل ہونے تک۔ ۳۔ عصر سایہ کے دو مثل ہونے سے شروع ہوکر غروب آفتاب تک۔ ۴۔ مغرب۔ غروب آفتاب سے لے کر غروب شفق تک۔ ۵۔ عشاء۔ غروب شفق سے لے کر صبح صادق تک رہتا ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں اوقات نماز کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اوقات نماز کے متعلق بارگاہ نبوی میں سوال کیا۔ آنحضور ؐ نے ارشاد فرمایا "دو روز تم ہمارے ساتھ نماز پڑھتے رہو، تو تم سمجھ لوگے چنانچہ آفتاب ڈھلنے کے بعد بلال کو اذان کا حکم دیا۔ اور سورج غروب ہونے پر نماز مغرب پڑھی اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھی۔ اس وقت شفق چھپ چکی تھی اور پھر دوسرے دن صبح صادق ہی میں نماز فجر ادا فرمائی اور اس دن بلال کو ظہر کی نماز کے لئے ذرا ٹھنڈے وقت اذان کہنے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد نماز عصر پہلے دن کے مقابلے میں ذرا دیر سے پڑھی پھر شفق غائب ہوجانے سے پہلے نماز مغرب پڑھی اور تہائی رات گذرنے پر عشاء پڑھی اور نماز فجر دن کے روشن ہونے پر ادا کی۔ اس کے بعد آنحضور ؐ نے فرمایا کہ وہ سائل جس نے نماز کے اوقات کے بارے میں پوچھا تھا کہاں ہے؟" اور فرمایا دونوں دنوں کی نمازوں کے اوقات کے درمیان تم کسی وقت بھی نماز ادا کرسکتے ہو۔

دیگر مذاہب میں نماز کے اوقات موجود ہیں۔ یہودیوں کے ہاں تین اوقات ملتے ہیں۔ زبور میں تین اوقات صبح دوپہر اور شام درج ہیں۔ (۵۵:۱۷)

اس طرح دانیالؑ کے بارے میں ہے کہ وہ ہر روز تین بار اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر خدا کے حضور اس کی شکر گذاری کرتا رہا۔ البتہ عیسائیوں کے ہاں یہ اوقات نہیں ملتے۔

اوقاف:۔ وقف کی جمع (دیکھئے "وقف")

اوّل: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام اور جب ھوالاول کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہیں۔ یہ لفظ کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ ۱۔ زمانی لحاظ سے مقدم ہو۔ ۲۔ رتبے کے لحاظ سے مقدم ہو۔ ۳۔ وضع اور نسبت کے لحاظ سے مقدم۔ ۴۔ کسی چیز کے بنانے میں جو پہلا مرحلہ ہو۔ (نیز دیکھئے "اسماء الحسنیٰ")

اولاد بال بچے۔ بیٹا بیٹی۔ نسل اولاد نہ صرف والدین کے مابین تعلقات استوار اور رشتہ محکم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ بلکہ انہیں خیر و برکت کا ذریعہ بھی کہا گیا ہے۔

اسلامی شریعت میں اولاد کی تعلیم و تربیت اور اس کی جسمانی اور اخلاقی صحت کے متعلق بہت سی ہدایات دی گئی ہیں۔ مثلاً جب لڑکا یا لڑکی پیدا ہو تو اسے نہلا دھلا کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر اقامت کہنا سنت ہے۔ اگر بچے میں برداشت کی قوت دیکھیں تو ابتدائی ایام ہی میں اس کی ختنہ کرا دینی چاہیئے۔ ورنہ جب اس میں قوت برداشت پیدا ہوجائے تو فوراً یہ کام کرے۔ بچے کی پیدائش سے ساتویں روز اس کا عقیقہ کرنا مسنون ہے۔ لڑکے کے لئے دو بکرے اور لڑکی کے لئے ایک بکرا ذبح کرنا ہوتا ہے۔ گوشت یا تو کچا ہی تقسیم کردیا جائے یا پکا کر احباب و فقراء کی ضیافت کردی جائے۔ اور بچے کے بالوں کے برابر چاندی وزن کرکے خیرات کردینا اور سر مونڈنے کے بعد زعفران یا صندل لگانا ثواب ہے۔ حسن سمرہ سے روایت ہے کہ آنحضور ؐ نے فرمایا کہ لڑکا اپنے عقیقے کے بدلے رہن ہے۔ ساتویں روز اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اور اسی روز اس کا نام رکھا جائے اور سر منڈوایا جائے۔ (ترمذی)

Marfat.com

زمانۂ جاہلیت میں عرب اولاد کے حقوق کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے بلکہ لڑکیوں کو تو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ اسلام نے اولاد کے بھی حقوق متعین کئے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:۔ "افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مارنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ (۱۷: ۳۱) تعلیم و تربیت اولاد کا بہت بڑا حق ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ "والدین کا بہترین عطیہ اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت ہے۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا کہ آدمی کا اپنی اولاد کو ادب دینا ایک صالح خیرات کرنے سے بہتر ہے۔ (ترمذی)

ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا "لوگو! اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو۔ جب وہ سات برس کے ہو جائیں اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ترک نماز پر انہیں مارو اور اس وقت ان کے سونے کی جگہ الگ الگ کر دو۔" (ابوداؤد)

شفقت و مہربانی بھی اولاد کا حق ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے حضرت حسنؓ کو چوما اور پیار کیا اس موقع پر اقرع بن حابس تمیمی بھی موجود تھے انہوں نے کہا میرے دس فرزند ہیں مگر میں نے تو ان میں سے ایک کو بھی کبھی نہیں چوما تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی پر مہربانی نہیں کرتا۔ اس پر خدا بھی مہربانی نہیں کرتا۔" (بخاری)

اسلام والدین پر اولاد کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ایک فریضہ کی صورت میں عائد کرتا ہے۔ سورۃ التحریم میں بتایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ (۶۶: ۶)

اولادالشیخ بنو حمویہ صوفیا اور شافعی فقہاء کا ایک ایرانی خاندان اس کی ایک شاخ ہجرت کر کے شام چلی گئی اور متاخر ایوبی سلاطین الکامل اور اس کے بیٹوں کے عہد سلطنت میں خوب شہرت حاصل کی۔ اس قبیلے کا سب سے پہلا بزرگ ابو عبداللہ محمد بن حمویہ الجوینی ہے جس نے ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء میں وفات پائی جو ایک بہت بڑے صوفی فقیہہ اور تصوف کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اس خاندان کی شہرت کا دار و مدار صدرالدین کے بیٹوں اور خصوصاً فخرالدین یوسف پر ہے۔ وہ ۵۸۰ھ/ ۱۱۸۴ء میں پیدا ہوا۔ اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ الکامل نے ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء میں اسے اپنا سفیر مقرر کیا۔ جلد ہی اس نے ایک ماہر مدبر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی۔ ۶۲۴ھ/ ۱۲۲۹ء میں ہوہن سٹائن شہنشاہ فریڈرک ثانی کے دربار میں الکامل کا سفیر رہا اور بعد میں شہنشاہ کا دوست بن گیا۔

الکامل کے آخری عہد میں فخرالدین یوسف کئی جلیل القدر عہدوں پر فائز رہا الصالح نجم الدین ایوب بن کامل نے اسے مصری فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ توران شاہ نجم الدین کا نائب سلطنت مقرر ہوا۔ ۶۴۷ھ/ ۱۲۵۰ء میں ایک جنگ میں کام آیا۔ اس کے دوسرے بھائی عمادالدین عمر۔ کمال الدین احمد اور معین الدین حسن نے بھی اپنی سیاسی سرگرمیاں الکامل کے آخری دور میں جا کر شروع کیں۔ الکامل کی وفات کے بعد یہ تینوں بھی شاہی مجلس کے رکن چن لئے گئے۔

اولجہ، جنگ ایک جنگ جو صفر ۱۲ھ/ اپریل ۶۳۳ء میں مسلمانوں نے ایرانیوں کے ساتھ حضرت خالدؓ بن ولید کی قیادت میں بصرے سے پچاس میل کے فاصلے پر لڑی تھی۔ اولجہ، کسکر کے قریب خشکی کا علاقہ تھا، اسے وُلجہ بھی کہا جاتا تھا۔ روم اور ایران کی زبردست سلطنتیں عرب کی دیرینہ دشمن تھیں۔

آنحضورؐ کی وفات کے بعد جب عرب کے اطراف میں فتنہ ارتداد اور فتنۂ منکرین زکوٰۃ کے باعث بدامنی اور افراتفری کا بازار گرم ہوا تو ان دونوں حکومتوں نے بھی اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ ہرقل قیصر روم نے شام میں اور اردشیر حکمران ایران نے عراق میں فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے انتہائی تدبر سے کام لے کر پہلے ہی مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی سرکردگی میں ایک دستہ فوج عراق کی طرف روانہ کر رکھا تھا۔ اب مثنیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عراق پر حملہ آور ہونے کی باقاعدہ اجازت مانگی اور کہا کہ خالد بن ولید کو ان کی امداد کے لئے روانہ کریں۔ چنانچہ خالد بن ولید مدعیان نبوت اور مرتدین کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد ابھی واپس نہ لوٹے تھے کہ راستے ہی میں فرمان خلیفہ کے مطابق فوجوں کا رخ عراق کی طرف پھیر دیا اور رابطہ میں مثنیٰ سے آکر مل گئے۔

جنگ ذات السلاسل اور جنگ قارن میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی اور ایران کی فوجوں کا بہت بڑا حصہ مارا گیا۔ اس تباہی خیز شکست کی خبر جب دربار ایران میں پہنچی تو اردشیر غم و غصہ سے بھپر گیا اور فوراً ایک نامور جنگ جو اندرزگر کے زیر قیادت ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ جب اولجہ پہنچا تو ایک اور بہادر بہمن جاذویہ کی سرکردگی میں دوسرا زبردست لشکر بھیجا۔ حضرت خالد بھی اطلاع پا کر مقابلے کے لیے یہاں آ گئے اور گھمسان کی جنگ شروع ہوئی اور آن کی آن میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ایرانیوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ ان کا سردار اندرزگر میدان جنگ میں پیاس کی شدت سے مر گیا۔ اس جنگ میں بہت سے عیسائی عربوں نے بھی شامل ہو کر ایرانیوں کی مدد کی تھی۔ ان کی بھی کثیر تعداد کام آئی۔

اولیاء ولی کی جمع، دوست رفیق، اصطلاحاً خدا رسیدہ اور اہل اللہ۔ اللہ تعالےٰ کے دوست جنہیں قرب خداوندی حاصل ہے قرآن مجید کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے۔ "سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقعہ نہیں ہے۔ (۱۰: ۶۲) (نیز دیکھیے "ولی")

اولیا چلبی (۱۰ محرم ۱۰۲۰ھ/ ۲۵ مارچ ۱۶۱۱ء - ۱۰۹۵ھ/ ۱۶۸۴ء) اولیا چلبی (قلمی نام) بن درویش محمد، مشہور مسلمان سیاح۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد کوتاہیہ سے ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ کے بعد استنبول آئے تھے۔ استنبول کے قریب قاضی کوئی میں چلبی کا ایک انگور کا باغ تھا جس کی وجہ سے اس کی مالی حالت اچھی تھی۔ اسی چیز نے اسے سیاحت کا شوق پورا کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد سات سال تک شیخ الاسلام حامد آفندی کے مدرسے کا طالب علم رہا گیارہ سال مدرسۃ القرآن میں قرأت کی مشق کرتا رہا اور قرآن مجید کو نہایت خوش الحانی سے پڑھنے میں شہرت حاصل کی۔ اسی وجہ سے سلطان مراد رابع کے شاہی دربار میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ ۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء میں دربار میں ایک سپاہی کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔

تقریباً چالیس برس سے بھی زیادہ عرصہ تک ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۰ء سے جب کہ اس نے استنبول میں سیاحت کرنی شروع کر دی تھی وہ اپنی ان حریل

Marfat.com

سیاحتوں کے حالات لکھتا رہا۔ جو اس نے کبھی نجی حالت میں اور کبھی سرکاری طور پر اور پھر امرائے دولت عثمانیہ کی ہم رکابی میں سلطنت عثمانیہ اور اس کے نواحی علاقوں میں کیں۔ اس نے یہ حالات "سیاحت نامہ" کی دس جلدوں میں درج کئے۔

جلد اوّل میں استنبول کے خاص شہر اور اس کے گردونواح کا جلد دوم میں برسہ، ازمید، باطوم، طرابزون، انجازیہ، اقریطش، ارض روم، آذربائیجان جارجیا وغیرہ کا۔

تیسری جلد میں دمشق، شام، فلسطین، ارومیہ، سیواس، کردستان آرمینیا، رومیلیا (بلغاریہ، دوبرجا) کا۔

چوتھی جلد میں وان، تبریز، بغداد، بصرہ وغیرہ کا۔

پانچویں جلد میں وان، بصرہ، اوکزکوف، ہنگری، روس، اناطولیہ، بروسہ دردانیال، ادرنہ (اڈریانوپل)، مولدیا، ٹرانسلوینیا، بوسینا، دلماتیہ، سوفیا وغیرہ کا۔

چھٹی جلد میں ٹرانسلوینیا، البانیا، ہنگری، اجار، بلغراد، ہونٹے گوربنا، رگوسا، مانٹی نیگرو، کینزسا، کروشیا کا۔

ساتویں جلد میں ہنگری، بودا، ارلاو، تمسوار، رینت، روم، تمصوارا)، ٹرانسلوینیا، ولاچیا، مالاویا، کریمیا، قازق، جنوبی روس، قفقاز، داغستان اور ازق کا۔

آٹھویں جلد میں ازق، کافا، باغیچہ سرائے (کریمیا) استانبول، اقریطش مقدونیا، یونان، ایتھنز، ڈوڈی کنسز، پیلوپونیس، البانیہ، دیلونا، البصان اوکریڈا، ادرنہ کا۔

نویں جلد میں (سفر حج بسوئے مکہ) جنوب مغربی اناطولیہ، سمرنا، ایفیسس مدینہ، مکہ اور سویز کا۔ اور۔

دسویں جلد میں مصر (تاریخی مقامات کی سیر کے ساتھ) قاہرہ، بالائی حصہ سوڈان، ایبے سینیا کا ذکر کیا ہے۔

اولیا چلپی نے مصر میں تقریباً آٹھ نو سال تک قیام کیا اور اپنے سفر نامے کی دسویں جلد بھی یہیں مکمل کی۔ اپنی زندگی کے آخری دن استانبول میں بسر کئے اور اپنی کتاب کی ترتیب میں مشغول رہا۔

اس کے سیاحت نامہ میں اگرچہ تفریحی باتیں بہت زیادہ ہیں اور اکثر تخلیقات میں اس کا تخیل کارفرما ہے۔ مبالغہ آمیزی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ تاہم ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ تصنیف تاریخ ثقافت، عوامی روایات اور جغرافیہ سے متعلق معلومات کا ایک بھرپور خزانہ ہے

اولی الامر صاحبانِ حکم۔ با اختیار لوگ۔ اولی الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں۔ ان میں ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علما، سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، ملکی انتظام کرنے والے حکام، عدالتی فیصلے کرنے والے جج یا تمدنی اور معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ، اور سردار شامل ہیں۔ یہ سب اطاعت کے مستحق ہیں۔ ان سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تم میں کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو۔ (۴: ۵۹)

اس آیت میں اولی الامر کے لئے مسلمان ہونا اور خدا اور رسول کا مطیع ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ان شرائط کو مختلف احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آنحضورؐ نے فرمایا۔

"مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے کچھ نہ سننا چاہیئے اور نہ ماننا چاہیئے۔"

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے صحابہ سے منجملہ دوسری باتوں کے اس بات کا بھی عہد لیا "کہ ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے دلیل موجود ہو۔"

گویا اولی الامر کا حکم اس صورت میں مانا جا سکتا ہے جب کہ وہ قرآن اور حدیث کے تابع ہو۔ اگر ایسا نہیں تو اس کا حکم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (نیز دیکھئے۔ "اطاعت")

اولیاء، نظام الدین:۔ دیکھئے ("نظام الدین اولیاء")

اونٹ شتر۔ جمل۔ اہل قرآن مجید میں کفار کی توجہ جہاں مختلف چیزوں کی تخلیق کی طرف دلائی گئی ہے۔ وہاں اونٹ کی خلقت کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے کہ کیا انہوں نے اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈال کر سوچا کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے۔ اور اس کو ٹھیک ٹھیک ان خصوصیات کے مطابق بنایا گیا جن خصوصیات کے جانور کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے۔" (۸۸: ۱۷)

اسلام میں اونٹ کی قربانی جائز ہے۔ اسے ذبح کرنے کے فعل کو نحر کہتے ہیں اونٹ کو بٹھا کر اگلی ٹانگوں کے درمیان میں گردن پر سے کاٹتے ہیں۔ یہاں سے اتنا خون ضرور نکلنا چاہیئے جو تین برتنوں میں آ سکے۔

اوہام جاہلیہ دور جہالت کے غلط عقائد، جو گمان کے علاوہ کسی دلیل پر مبنی نہیں ہوتے۔ نیز ایسے عقائد جو سراسر انسانی ذہن کی تخلیق ہوں اور انہیں کسی قسم کی وحی سے کوئی سند حاصل نہ ہو اسلام ایسے تمام باطل عقائد اور اوہام کی تردید کرتا ہے۔ ان عقائد کی بنا پر انسان شرک اور کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

یہ اوہام تقریباً ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں عربوں کے اوہام جاہلیہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں شگون لینا، جھاڑ پھونک ستارہ پرستی، بت پرستی، انسان پرستی جادو سحر اور قتل اولاد وغیرہ شامل ہیں۔

اوہام پرستی کا آغاز زمانہ قبل از تاریخ ہی سے ہوتا ہے۔ اس دور کا انسان تمام واقعات کو ان دیکھے اسباب کی طرف منسوب کیا کرتا تھا۔ قدیم آسٹریلیا کے لوگوں کے اوہام عجیب و غریب تھے۔ مثلاً قاتل کو تلاش کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ متوفی کی قبر کے پاس زمین کو صاف کر دیا جاتا تھا۔ ان پر جب کسی جانور کے

Marfat.com

اوہام جاہلیہ

پنجوں کے نشانات ملتے تو اس کے جانے کی سمت میں قاتل کے مسکن کا پتا ملتا تھا۔ اور مقتول کا کوئی عزیز اس سمت چل پڑتا۔ یہاں تک کہ راستے میں کوئی آبادی آجاتی، جہاں کے لوگوں کو وہ کھانے پر مدعو کرتا اور جسے بھی کھانے کے دوران میں کھانسی آجاتی، وہی قاتل سمجھ لیا جاتا۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا جاتا

یہ لوگ جادوگروں کو مادی قوتوں کے مالک سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ لوگ مرنے کے بعد سفید ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ تناسخ ارواح کے قائل تھے۔

جزائر مڈغاسکر کے لوگ سمجھتے تھے کہ ہر شے خدا ہے۔ یہ سرداروں، پروہیتوں اور جادوگروں کو مخصوص قوتوں کے حامل سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خداؤں نے انسان سے ہمکلام ہونے کے لئے سب سے پہلے پرندوں کو بھیجا تھا۔ افریقی قبائل کے نزدیک ان کے آباؤ اجداد کی روحیں سانپوں میں رہتی ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کسی شخص کو کرمچھ کاٹ لے یا اس پر چھینٹیں ڈال دے تو وہ معتوب اور مردود ہے۔ قدیم امریکا کے قبائل کا بھی یہی حال تھا۔

وادی سندھ کے قدیم باشندے درختوں میں روح کے وجود پر عقیدہ رکھتے تھے۔ قدیم آریا جادو، منتروں، جھاڑ پھونک اور لوٹے ٹوٹکوں پر ایمان رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی آواگون یا تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ ہندوؤں کے ہاں بہت سے اوہام نے رواج پایا۔ مثلاً اگر کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سفر میں تکلیف پہنچے گی اور اگر ہفتے کے روز نیا کام کیا تو راحت ہوگی وغیرہ۔

ایران کے زرتشتی، مانوی اور مزدکی مذاہب کے پیروکاروں کے ہاں عجیب اوہام بسے ہوئے تھے۔ مثلاً یہ کہ گوشت خوری روحانی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

قدیم عربوں کے اوہام جاہلیہ کے متعلق معلومات کا سب سے بڑا ماخذ قرآن مجید اور اس کی تفاسیر ہیں۔ اہل عرب میں یہ عقیدہ راسخ تھا کہ چاند کی بعض تاریخیں اچھے اور بعض برے شگون کی حامل ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں تیرہ تاریخ کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ ایک اور رسم ان کے ہاں یہ رائج تھی کہ جب حج کے لئے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ گھر کے پیچھے سے دیوار پھاند کر یا ایک کھڑکی سی بنا کر داخل ہوا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے اوہام پر ضرب لگائی گئی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

"لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں۔ نیز ان سے کہو: یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے ہو۔ نیکی تو اصل میں یہ ہے کہ آدمی اللہ کی ناراضی سے بچے۔ لہٰذا تم اپنے گھروں میں دروازے ہی سے آیا کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے (۲: ۱۸۹)

یہودیوں اور قدیم عربوں کے ہاں یہ رسوم رائج تھیں کہ ایام ماہواری میں عورت کو بالکل پلید سمجھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکایا ہوا کھایا جاتا تھا اور نہ اس کے ہاتھ سے پانی پیا جاتا تھا۔ گویا ان دنوں میں عورت اپنے گھر میں اچھوت قرار دی جاتی تھی۔ عربوں کے ہاں ٹونے ٹوٹکے اور شگون لینے کا اعتقاد عام تھا۔ کسی مصیبت یا تباہی کے نزول پر پتھر کی کنکریاں پڑھ کر پھونکی جاتیں۔ ان کے عقائد کی رو سے اس طرح بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ جانوروں کے بولنے اور اڑنے کو نیک اور منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی جانور کسی کام پر جاتے ہوئے کسی شخص کا راستہ بائیں سے دائیں کاٹ جاتا تو اسے نیک شگون خیال کرتے اور اسے "سانح" کہتے اور اگر دائیں سے بائیں طرف راستہ کاٹ جاتا تو ان کے نزدیک یہ بدشگونی تھی۔ اسے "بارح" کہا جاتا۔ مرنے والے کی قبر کے ساتھ اونٹ باندھ دیا جاتا تو بھوک اور پیاس سے مرجاتا۔ ایسے اونٹ کو "بلیہ" کہا جاتا۔ خشک سالی کو دور کرنے کے لئے پہاڑوں میں ایک گائے کو لے جایا جاتا تھا اور اس کی دم کے ساتھ سوکھی گھاس باندھ کر اسے آگ لگا دیتے تھے اور پھر گائے کو پہاڑوں میں ہانک دیتے۔

"خون کا بدلہ خون"، یہ قدیم عربوں کا خاص شعار تھا۔ ان کے عقیدہ کی رو سے اگر خون کے بدلہ میں خون نہ لیا جائے تو مقتول کے سر سے ایک چھوٹا سا کیڑا نکل کر آسمان میں "قصاص" "قصاص" چیختا رہتا ہے۔ اس کیڑے کو "ہامہ" اور "صدی" کہتے تھے۔

جانوروں کا دودھ دوہنا ان کے نزدیک عورتوں کے لئے معیوب تھا۔ اگر کسی قبیلہ کی کوئی عورت دودھ دوہتے ہوئے دیکھ پاتے تو وہ خاندان لوگوں کی نظروں سے ہمیشہ گر جاتا۔ جس آدمی سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا۔ اسے گرم ریت پر بٹھا دیتے مردہ جانوروں کا گوشت عموماً کھایا جاتا، جو اونٹنی بھیڑ یا بکری دس بچے جن لیتی۔ اسے چھوڑ دیا جاتا۔ اس کے مرنے پر اس کا گوشت صرف مردوں کے حصے میں آتا۔ عورتوں کو ایسا گوشت کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ کسی کام کی تکمیل پر اونٹوں کو کھلا چھوڑ دینے کی منت مانتے تھے۔ اگر کسی بکری کے مادہ بچہ پیدا ہوتا تو مالک اسے رکھ لیتا اور نر پیدا ہونے کی صورت میں اسے بتوں کی نذر کر دیا جاتا۔

قدیم عربوں کے ہاں قسم لینے کا طریقہ یہ تھا کہ آگ جلا کر نمک اور گندھک پیس کر ڈالتے۔ یہ آگ "ہولہ" کہلاتی۔ اس پر قسم کھائی جاتی۔ فال نکالنے کے لئے خانہ کعبہ میں سات تیر رکھے ہوئے تھے۔ ہر تیر پر ایک علامت بنی ہوئی تھی۔ یہ علامات بعض امور کی انجام دہی کے لئے اور بعض کاموں سے منع کرنے سے متعلق تھیں۔ ان تیروں سے فال نکالنے کو "ازلام" کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ بتوں کو جملہ قدرتوں کا مالک سمجھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ روح ایک چھوٹا سا جانور ہے، جو انسان کی پیدائش کے وقت جسم میں گھس جاتا ہے اور پرورش پاتا رہتا ہے، جب انسان مر جاتا ہے تو یہ جانور قبر کے گرد چیختا ہے۔ یہاں تک کہ ایک الو کے برابر ہو جاتا ہے۔

مشرکین عرب بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے تھے اور انہیں مقدس سمجھتے اور طرح طرح کے توہم پرستانہ عقائد ان کے ساتھ وابستہ کر دیتے تھے ایسے ہی چار جانوروں کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ المائدہ میں آیا ہے:

"بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام میں سے کوئی شے بھی خدا نے نہیں ٹھہرائی۔ لیکن جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، وہ اللہ پر جھوٹ کہہ کر افترا کرتے ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں، جو سمجھ بوجھ سے محروم ہیں۔" (۵: ۱۰۳)

مولانا مودودی "تفہیم القرآن" میں لکھتے ہیں کہ بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے تھے، جو پانچ دفعہ بچے جن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نر بچہ پیدا ہوا ہو۔ اس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا تھا نہ اس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا، نہ اس کا اون اتارا جاتا۔ اسے حق تھا کہ جس کھیت اور جس چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیئے۔ سائبہ اس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی منت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ کے نذر کر دیا گیا ہو۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ بچے دیئے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو۔ اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ اس بکرے کو کہتے تھے، جو کرّی

Marfat.com

کا پہلا نر بچہ ہوتا تھا، اسے خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا تھا۔ اگر نر اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نر کو ذبح کرنے کی بجائے چھوڑ دیا جاتا تھا اور اسی کا نام وصیلہ تھا۔ اگر کسی اونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا تو اس بوڑھے اونٹ کو حام کہہ کر چھوڑ دیا جاتا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفہ سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی۔ اسے بھی حام کہا جاتا تھا۔

غیر مرئی ارواح کو اہل عرب "جن" کہا کرتے تھے۔ جنوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ حسب خواہش ہر شکل میں نمودار ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ آج بھی اکثر مسلمانوں میں رائج ہے۔ عربوں کا جنوں کی بابت یہ خیال تھا کہ وہ جسم رکھتے ہیں۔ جن کے اوپر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں۔ جنوں کو اتنی قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جو شکل چاہیں اختیار کر لیں۔ ان کا مسکن ویرانے، پہاڑ، درخت، کنوئیں اور وادیاں بتلائے جاتے تھے۔ عربوں نے ان جنوں کی بہت سی قسمیں کر رکھی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک "غول" تھی۔ غول کے لفظی معنی حملہ کرنے یا برباد کرنے کے ہیں۔ یہ غول مذکر اور مؤنث دونوں جنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤنث جن سعلاۃ کہلاتے تھے۔

قدیم عربوں کا ایک اور وہم جو سب سے زیادہ قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رزق کی کمی اور اولاد کی زیادتی کے باعث یہ لوگ قتل اولاد کو جائز سمجھتے تھے۔ خصوصاً بیٹیاں پیدا ہوتیں تو انہیں اس باطل نظریے کے تحت زندہ دفن کر دیا جاتا تھا کہ وہ بیاہی جائیں گی اور ان کے ہاں داماد کا رشتہ جڑے گا۔

یہودیوں کے ہاں بھی عربوں کی طرح بہت سے اوہام رائج تھے۔ مثلاً نیا چاند نمودار ہونے پر قربانی پیش کرنا۔ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو متبرک اور مقدس سمجھنا وہ یہوواہ کا کفارہ بکروں کی صورت میں پیش کیا کرتے تھے اور ان بکروں کو جنگل کی طرف دھکیل دیا جاتا۔ یہ لوگ بیل، گائے اور سانپ کی پرستش کرتے تھے۔ اسرائیلی معابد میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی۔ اس آگ میں قربانی کے جانور پورے کے پورے ڈال دیے جاتے تھے عہد شکنی کی تلافی کے طور پر قربانی دی جاتی تھی۔ ہفتہ کا روز "سبت" کہلاتا تھا۔ یہ روز مقدس ہوتا تھا اور اس روز یہودی کوئی بھی کام نہ کرتے۔ ان کے یہاں سات کا عدد بہت مقدس سمجھا جاتا تھا۔ ہر ساتواں مہینہ اہم ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر ساتویں سال زمینیں بے کاشت چھوڑ دی جاتی تھیں۔ ہر پچاسویں سال جوبلی منائی جاتی۔ اس روز زمینیں اصل مالکوں کو لوٹا دی جاتیں۔ فال نکالنے کے لیے یہودی پانسہ پھینکتے تھے۔ نیز جادو ٹونے کا بھی ان کے ہاں عام رواج تھا۔

اگرچہ مذہب اسلام نے ہر طرح کے اوہام کو باطل قرار دیا ہے اور ان کی بیخ کنی کرنا چاہی۔ لیکن اکثر مسلمان آج بھی ان اوہام کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ناخواندہ اور نیم خواندہ طبقے کا تو ذکر کیا، خواندہ مسلمانوں کے ہاں بھی اوہام پرستی کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اوہام جاہلیہ کو اس طرح فروغ دینے میں صنف نازک کا بہت ہاتھ رہا ہے اور اسی چیز نے مسلمانوں میں تعویز گنڈے، دم درود اور جھاڑ پھونک کو رواج دیا ہے

اویس اوّل (۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء - ۷۷۵ھ/۱۳۷۴ء) خاندان جلائریا ایلکان کا دوسرا بادشاہ، باپ کا نام حسن بزرگ اور والدہ کا دلشاد خاتون بنت دمشق خواجہ چوپان تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ۷۵۶ھ/۱۳۵۶ء میں بغداد کا تخت نشین ہوا۔

اس وقت تبریز پر قبچاق کے خان جانی بیگ کا قبضہ تھا۔ ۷۵۹ھ/۱۳۵۸ء میں جب اویس کو معلوم ہوا کہ جانی بیگ اخی جوق کو اپنا نائب بنا کر چلا گیا تو اویس نے اس پر حملہ کر دیا اور تبریز پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بعض غلط حکمت عملیوں کی وجہ سے اسے دوبارہ بغداد کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں شیراز کے محمد مظفری نے اخی جوق کے خلاف لشکر کشی کر کے اسے تبریز سے نکال دیا۔ لیکن جونہی اسے معلوم ہوا کہ اویس اس کی طرف آ رہا ہے تو وہ وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور تبریز دوبارہ اویس کے قبضہ میں آ گیا۔

۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء میں بغداد کے والی خواجہ کی بغاوت پر اویس کو بغداد آنا پڑا۔ اور گیارہ مہینے تک بغداد میں قیام کر کے اس نے بغاوت کو فرو کیا۔ مغرب کی طرف بڑھا اور بیرام خواجہ کے بھائی سے موصل چھین لیا۔ اس کے بعد ماردین پر قبضہ کر لیا اور قرہ کلیسا کے راستے تبریز واپس آیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ والی شیروان دو مرتبہ قرہ باغ کے باشندوں کو اس کی غیر حاضری میں زبردستی شیرواں لے گیا ہے۔ چنانچہ اویس کے سپہ سالار بیرام بک نے کاؤس کو شیروان کے قلعے میں محصور کر لیا۔ جسے اویس نے تین ماہ بعد دوبارہ اپنے ایک باجگزار کی حیثیت سے بحال کر دیا

اویس نے تپ دق کی بیماری میں وفات پائی۔ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو بالکل ایرانی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اویس ایک جذباتی آدمی تھا۔ بہت حسین و جمیل تھا۔ جب وہ باہر نکلتا تو بغداد کے لوگ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق دوڑتے تھے۔ رحم دل عادل اور جری تھا۔ علم و ادب کا شائق تھا۔ وہ بلند مرتبہ خطاط انشا پرداز اور شاعر تھا۔

تبریز میں ایک بڑی شاندار عمارت "دولت خانہ" کے نام سے بنوائی۔ اس کے پانچ بیٹے حسن، جلال الدین حسین، شیخ علی، غیاث الدین احمد ناصر اور بایزید اور ایک بیٹی تندو تھی۔

اویس قرنی رح اویس بن عامر تابعین کے سردار یمن کے رہنے والے تھے۔ آنحضورؐ کی حیات میں موجود تھے اور غائبانہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ روایات کے مطابق اپنی ضعیف والدہ کی خدمت میں حاضر رہنے کی وجہ سے رسول اللہؐ سے ملاقات نہ کر سکے۔ ان کے حالات زندگی تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں۔ روایات کے مطابق اویس قرنی رح ۱۷ھ/۶۳۸ء میں یمن کی امدادی فوج میں مدینہ منورہ آئے اور حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات کی۔ پھر کوفہ چلے گئے اور گوشہ عزلت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ حضرت عمرؓ سے اویس رح کی دوسری ملاقات عرفات میں ہوئی اور اس کے بعد آذربائیجان کے معرکے سے لوٹتے ہوئے راستے میں اچانک بیمار ہو کر وفات پائی۔

بعض اقوال کے مطابق جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی جانب سے حصہ لیا۔ اور تقریباً چالیس زخم کھا کر شہید ہوئے۔ بعض کے نزدیک، دمشق میں وفات پائی اور بعض کے مطابق مکہ معظمہ میں۔

آپ زہد و عبادت کا پیکر تھے۔ طور طریقوں سے مجذوبانہ شان جھلکتی تھی۔ آنحضورؐ نے اویس قرنی رح کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ تابعین میں سب سے بہتر ہیں

اہرام مصر فرعونوں کے مقبرے، جو چوکور مخروطی شکل میں دریائے نیل کی وادی میں موجود ہیں۔ اس قسم کی تعمیرات کے نمونے مصر کے علاوہ سوڈان، ایتھوپیا، مغربی ایشیا، یونان، قبرص، اٹلی، ہندوستان، تھائی لینڈ، میکسیکو اور دیگر کئی جزائر میں ملتے ہیں۔

Marfat.com

اہرام مصر بہت سی ایسی تعمیرات کا سلسلہ ہے، جن کی مدت تکمیل مصر کے پہلے حکمران خاندان سے لے کر ۲۷۰۰ برس بعد تک کے بطلیموسی دور تک ہے خصوصاً ۲۳۰۰ ق۔م سے پہلے کی چار صدیاں اہرام کی تعمیر میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ عام طور پر یہ مقبرے اینٹوں یا چوکور پتھروں سے بنائے جاتے تھے۔ تیسرے خاندان کے بادشاہ جوزر کے عہد میں امحوطپ نامی ماہر تعمیرات نے پہلی بار ان میں چوکور پتھروں کا استعمال کیا۔ اس نے جوزر کے لیے جو اہرام تعمیر کیا، اس کی بلندی ساٹھ میٹر اور بنیاد پر لمبائی اور چوڑائی علی الترتیب ایک سو بیس اور ایک سو آٹھ میٹر تھی۔ چوتھے خاندان کے پہلے فرعون سنوفرو کا مقبرہ ۹۰ میٹر بلند اور ۱۸۸ میٹر لمبا چوڑا ہے۔

غزہ کے مقام پر موجود تین اہرام، قاہرہ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہیں یہ چوتھے خاندان کے تین فرعونوں خوفو، خعفری اور منکورے کے مقبرے ہیں۔ فرعون خوفو کا مقبرہ سب سے پرانا اور سب سے بڑا ہے۔ بنیاد پر یہ مربع شکل میں ہے جس نے تیرہ ایکڑ کے رقبے کو گھیر رکھا ہے، اس کا ہر ضلع ۲۳۰ میٹر ہے اور اصل بلندی ۱۴۶ میٹر ہے جو اب ۱۳۷ میٹر رہ گئی ہے۔ ہر سمت کا زاویہ ۵۱ درجے ہے۔ اس کی تعمیر زرد رنگ کے چونے کے پتھر سے ہوئی ہے۔ اس کے اندرونی ہال میں جہاں فرعون کی لاش رکھی گئی تقریباً ۲۳ لاکھ گرینائٹ کی سنگی اینٹیں چنی گئی ہیں۔ اندر داخل ہونے کے لیے شمال کی جانب زمین سے اٹھارہ میٹر بلند دروازہ ہے۔ جو ایک زمین دوز سرنگ میں کھلتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کی تعمیر پر ایک لاکھ مزدور کوئی بیس برس تک مصروف رہے تھے۔

دوسرے مصری اہرام میں سے ابوسر کے مقام پر پانچویں مصری خاندان کے

غزہ کی وادی میں موجود اہرام مصر

تین اہرام ہیں۔ ان میں سب سے بڑا نفر ریکیرکا ہے جو ۷۰ میٹر بلند ۱۰۶ میٹر لمبا چوڑا ہے۔ صقاریہ کے مقام پر پانچویں خاندان کے آخری بادشاہ، چھٹے خاندان کے چار بادشاہ اور تین ملکہ اور ساتویں خاندان کے فرعون رابی کے مقبرے ہیں۔ مغربی تھیبس کے علاقے میں موجود فرعون قینتوحوطپ کا اہرام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں نہ کوئی ایوان ہے اور نہ کوئی دروازہ ہے۔ اسی طرح لشط کے مقام پر سیسوترلیس اوّل کا اہرام بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی بیرونی دیواروں کے اندر ریت اور دوسرا ملبہ بھر دیا گیا تھا۔ تاکہ محنت کی بچت ہو۔

بارہویں فرعون خاندان کے اہرام دہشور، الاہون اور ہوارا میں موجود ہیں جو مٹی کی اینٹوں سے تعمیر کردہ ہیں۔ ابی ڈوس کے مقام پر اٹھارہویں خاندان کے پہلے بادشاہ آحمس اوّل نے اپنی بیوی تیطیسری کے لیے تعمیر کرایا تھا اس کے بعد چوبیسویں خاندان تک کسی اور فرعون نے ایسے مقبرے تعمیر نہیں کرائے۔ پچیسویں خاندان نے سوڈان میں اپنے لیے ایسے بہت سے اہرام بنوائے جن میں سے اکثر شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں۔

اہل بیت گھر والے، رشتہ دار، کنبے کے لوگ۔ اصطلاح میں آنحضورؐ کے گھر والوں کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اہلبیت کا لفظ دو جگہوں پر آیا ہے۔ "ابراہیم کے گھر والو، تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔" (۱۱:۷۳)

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔" (۳۳:۳۳)

اس سورت میں یہ اصطلاح ازواج مطہرات اور اولاد نبی کے لیے خصوصاً اور قریبی رشتہ دار کے لیے عموماً استعمال ہوئی ہے۔ البتہ بعض کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے اور وہ تمام کے تمام بنو المطلب بلکہ بنو ہاشم کو بھی اہل بیت میں شامل کرتے ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک اہل بیت سے مراد صرف آنحضورؐ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہیں۔ ابن جریر ترمذی، ابن المنذر، حاکم ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ "یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی۔ اس وقت گھر میں یہ چاروں حضرات موجود تھے آنحضورؐ نے ان چاروں کو کمبل میں لے لیا اور فرمایا کہ یہ میرے اہلبیت ہیں"

علامہ قرطبی اور حافظ ابن کثیر نے اہل بیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ ان چاروں حضرات کو بھی شامل کیا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ حضرت زینبؓ کی شادی کے موقع پر آنحضورؐ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے تو فرمایا "السلام علیکم اہل البیت و رحمۃ اللہ" (بخاری کتاب التفسیر آیت ۳۳:۳۲) (نیز دیکھیے "آل رسول")

اہل توحید: مسلمانوں کے ایک فرقہ معتزلہ کا لقب (دیکھیے "معتزلہ")

اہل حدیث ایک خاص مسلک کے پیروکار۔ ان کے علاوہ یہ ترکیب کبھی اہل الحدیث، اہل سنت، اہل الاثر، سلفی اور اثری کے معنوں میں اور کبھی اسی خاص مسلک کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

تقریباً تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں اس نام (اہل حدیث)

Marfat.com

کی ابتداء ہوئی۔ اگرچہ اس مسلک کے حامل کہتے ہیں کہ "یہ مسلک آنحضورؐ کے زمانے سے موجود ہے اور ہر دور میں موجود رہا۔" لیکن بطور ایک منظم اور مخصوص جماعت کے، اہل حدیث کی اصطلاح اور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند میں اس وقت اپنائی گئی جب بعض مخالف لوگوں نے انہیں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد کے ساتھ اشتراک کی بناء پر نجدی کہنا شروع کیا۔ مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی نے ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں ہندوستان میں اس مسلک کو پھیلایا اور ان کے سینکڑوں شاگردوں نے اسے تحریک کی شکل میں ملک کے دور دراز علاقوں میں پہنچا دیا۔

اہل حدیث حضرات کے نزدیک حدیث و سنت قرآن مجید کے ساتھ اسلامی شریعت کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ وہ دین و شریعت کے معاملات میں کسی شخص کی تقلید کے قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے پیروکار محمد بن عبدالوہاب کے ہم مسلک ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ نجدی امام احمد بن حنبل کے مقلد ہیں۔ لیکن یہ کسی امام کے مقلد نہیں۔

اس کے علاوہ توحید کے مسئلے میں بھی اہل حدیث کا ایک خاص تجریدی نظریہ ہے وہ ہر اس رسم اور عقیدے کے خلاف ہیں جو ذرا سا بھی توحید کے تصور پر اثر انداز ہوتا ہو۔ وہ انبیائے کرام کی عصمت اور عبودیت و بشریت کے شدت سے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک علم غیب صرف اللہ تعالےٰ کو ہے نیز مجالس میلاد و زیارت مقابر اور عرس وغیرہ سب بدعات ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو عالم الغیب نہیں مانتے۔ نہ انبیاء کو ان کی ظاہری قبروں میں زندہ مانتے ہیں۔ سوائے اللہ تعالےٰ کے کسی کو حاضر و ناظر نہیں جانتے۔

نماز میں رفع یدین کرتے ہیں۔ ہاتھ سینے پر باندھتے ہیں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتے اور آمین اونچی آواز سے کہتے ہیں۔ جہری نمازوں میں بسم اللہ بھی اونچی آواز سے پڑھتے ہیں۔ رمضان میں تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھتے ہیں۔ وتر نماز میں دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھتے ہیں۔ ایک ہی دفعہ تین طلاقوں کے قائل نہیں بلکہ ان تینوں کو ایک ہی طلاق تصور کرتے ہیں۔ اذان میں ترجیع و تثویب کے قائل ہیں۔

یہ مسلک بیسویں صدی کے آغاز میں ہند و پاک میں ایک تحریک کی شکل میں پھیلنا شروع ہوا۔ دہلی میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے ایک ملک گیر تنظیم قائم کی گئی جس نے مکتبوں اور درسگاہوں کے قیام اور مبلغوں کے وعظ اور جلسوں کے ذریعے پورے برصغیر میں اس مسلک کو عام کیا۔ اس وقت پاکستان میں جمعیت اہل حدیث کے نام سے ان کی مشہور تنظیم ہے۔

یہ لوگ شاہ ولی اللہؒ۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، سید احمدؒ بریلوی کو بھی اپنا ہم مسلک قرار دیتے ہیں۔

اہلِ حق

معزبی ایران میں ایک مذہبی گروہ ہے جس کے اکثر عقائد باطنی اور مخفی ہیں۔ حروفی فرقہ کے لوگ بھی اس اصطلاح کو اپنے لیے استعمال کرتے ہیں اسی طرح بعض صوفی لوگ بھی اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس فرقے کی بہت سی شاخیں ہیں۔ لیکن ان سب کے معتقدات میں کوئی وحدت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔

ان کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالےٰ یکے بعد دیگرے سات مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اس کی اس جلوہ گری کو لباس سے تشبیہ دی جاتی ہے جو وہ پہن لیتا ہے۔ ہر مرتبہ جب خدا کا اس طرح سے ظہور ہوتا ہے تو اس کی مشتی میں چار فرشتے ہوتے ہیں جو اس سے قوی طور پہ منسلک ہوتے ہیں۔

انفرادی نماز کا ذکر ان کے ہاں برائے نام ہے البتہ اجتماع کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ جس میں ہر قسم کی مشکلات کا حل مل جاتا ہے۔ یہ اجتماعات مقررہ وقفوں کے بعد نیز تمام اہم واقعات کے سلسلے میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان اجتماعات میں تلاوت قرآن پاک موسیقی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

مذہبی تقریبات پر مجالس ذکر منعقد ہوتی ہیں اور بعض درویشوں پر موسیقی کی دھنوں سے وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان پر حالت بے حسی بھی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اس حالت میں جلتے ہوئے کوئلوں پر چل سکتے ہیں اور انہیں اپنے ہاتھ میں اٹھا سکتے ہیں۔

ان کے ہاں ایک رسم "سبز نمودن" ہے جس کے معنی زندہ کرنا، نئی روح پھونکنا کے ہیں۔ چنانچہ ان اجتماعات کی لازمی خصوصیت نذر و نیاز ہے۔

"فرقان" میں چودہ قسم کی خون والی اور بے خون قربانیوں کا ذکر ہے۔ قربانی کے مراسم مقرر ہیں۔ مثلاً ہڈیوں سے گوشت جدا کر کے ہڈیوں کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے اور ابلا ہوا گوشت اور دوسری نذر و نیاز شکر روٹی وغیرہ حاضرین میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

ایک اور رسم "سرسپردن" ہے جس طرح ہر درویش کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک روحانی معلم (مرشد) ہو اسی طرح ہر اہل حق کا سر ایک پیر کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس رسم کو ادا کرتے وقت پانچ افراد جو فرشتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس بچے کے ارد گرد کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسم ادا کرنے والا سر کے صدقے میں ایک مسقطی جوز توڑ دیتا ہے پھر اسے تعویز کے طور پر چاندی کی ایک تختی کیساتھ جسے جوزہ کہتے ہیں۔ اس پر شیعی کلمہ شہادت لکھا ہوتا ہے پہن لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس بچے اور پیر (شیخ) کے درمیان خونی رشتے جیسا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

اخلاق کمال کو حاصل کرنے کے لئے ایک مرد اور عورت کے درمیان قرابت داری قائم کر دی جاتی ہے اور انہیں بہن بھائی کہا جاتا ہے۔ اس رسم کو شرطِ اقرار کہا جاتا ہے۔

ان کے نزدیک روزے صرف تین ہیں جنکو بڑی پابندی سے رکھا جاتا ہے یہ دن موسم سرما میں آتے ہیں۔

یہ لوگ مغربی ایران میں لُرستان، کردستان اور آذربیجان میں پائے جاتے ہیں۔ ویسے اہل حق کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ایران میں تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔ عراق میں کرکوک اور سلیمانیہ کے گرد و نواح ترکمان قبائل میں بھی یہ لوگ موجود ہیں۔ موصل میں بھی ان کی کچھ تعداد ہے۔

اہلِ ذکر

وہ لوگ، جن کا ذکر کیا گیا یا جو ذکر کرتے ہیں۔ ذکر کے معنی یاد میں لانے حفاظت کرنے، پند و نصیحت اور ثناء و تعریف کے ہیں۔ ذکر دو طرح کا ہوتا ہے۔ قلبی۔ لسانی

اہل ذکر کی ترکیب قرآن میں دو جگہ پر آئی ہے۔

سورۃ النحل میں کہا گیا ہے "اے محمدؐ ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے اہل ذکر سے پوچھ لو۔ اگر تم خود نہیں جانتے۔" (۱۶ : ۴۳)

سورۃ الانبیاء میں ہے۔ "اور اے محمدؐ تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں

Marfat.com

ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔" (۲۱: ۷)

قرآن مجید میں ذکر کا لفظ کئی جگہوں پر قرآن کے لئے آیا ہے۔ "یقیناً ہم نے ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (۱۵: ۹)

گویا اہل ذکر کے معنی قرآن مجید کے ماننے والوں کے بھی ہیں۔

امام جعفرؒ کا قول ہے کہ "اہل ذکر ہم ہیں" حضرت ابن عباسؓ، عبداللہ بن سلام اور سلمانؓ نے اہل ذکر سے مراد یہودی اور نصاریٰ لئے ہیں۔ امام بغوی کے نزدیک اہل ذکر سے مراد اہل کتاب میں سے جو ایمان لا چکے ہیں۔ الازہری اور الزجاج نے اہل ذکر سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جنہیں امتوں اور ادیان کا علم ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

مولانا مودودیؒ نے اہل ذکر سے مراد اہل کتاب ہی لیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل ذکر سے مراد وہ تمام علماء ہیں جنہیں قرآن مجید اور ادیان سابقہ کی کتابوں کا علم ہے۔

اہلِ ذمہ غیر مسلم، ذمیّ جو اسلامی ریاست میں رہیں اور جزیہ ادا کریں۔ جزیے کے عوض ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اسلامی ریاست کا فرض ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست میں اہل ذمہ مندرجہ ذیل حقوق رکھتے ہیں۔

۱۔ ذمیّ کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے گا تو اس کا قصاص اس طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمانوں کے قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔

۲۔ تعزیرات میں ذمیّ اور مسلمان کا درجہ برابر ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمیّ کو بھی دی جائے گی۔

۳۔ دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے حضرت علیؓ کا ارشاد ہے ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں۔" یعنی ان کے مال کی حفاظت ویسی ہی ہونی چاہیئے جیسی مسلمانوں کے مال کی ہوتی ہے

۴۔ ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا اس کو گالی دینا، مارنا پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے۔

۵۔ عقدِ ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوّں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں۔

۶۔ ذمیّ خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا مسلمان کو قتل کرنا وغیرہ بھی ان کے حق میں ناقص ذمہ نہیں ہے۔

۷۔ ذمیّوں کے شخصی معاملات ان کی شریعت کے مطابق طے کئے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ البتہ جن افعال کی حرمت ان کے مذہب میں بھی ثابت ہے۔ ان سے تو ہر حال میں انہیں روکا جائے گا۔

۸۔ خالص اسلامی آبادیوں میں ذمیوں کی جو عبادت گاہیں پہلے سے موجود ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے لیکن نئی عبادت گاہیں بنانے کا حق نہیں ہے

۹۔ وہ مقامات جو خالص اسلامی آبادی میں نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔

۱۰۔ جزیہ و خراج کی وصولی میں ذمیوں پر تشدد کرنا منع ہے۔ ان کے ساتھ نرمی کی تاکید کی گئی ہے اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے وہ نہ اٹھا سکیں۔ جزیہ کی مقدار مقرر کرنے میں بھی ان پر تشدد کرنا منع ہے۔

۱۱۔ جو ذمی محتاج اور فقیر ہو جائیں انہیں نہ صرف یہ کہ جزیہ معاف کر دیا جائے گا بلکہ ان کے لئے اسلامی خزانہ سے وظائف بھی مقرر کئے جائیں گے۔

۱۲۔ اگر کوئی ذمی مرجائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے ورثہ پر اس کا بار ڈالا جائے گا۔

۱۳۔ مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموالِ تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائے گا۔

۱۴۔ ذمیوں سے فوجی خدمت نہیں لی جا سکتی۔ دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کا فرض ہے۔

اہلِ رائے قیاس کرنے والے ذاتی رائے رکھنے والے۔ اہل حدیث اس اصطلاح کو اپنے مخالف فقہاء کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ رائے کا مطلب "صاحب رائے" تھا۔ فقہاء مسائل فقہی میں فیصلے کرنے کے لئے قیاس اور رائے سے مدد لیتے تھے اور اس کا اطلاق انسانی دلیل کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن اہل حدیث اس بات کو ناجائز سمجھتے تھے کہ رسولؐ اللہ سے مروی احادیث کو رائے کی بناء پر رد کر دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جو کسی خاص مسئلے میں اپنی ذاتی رائے کو دوسرے گروہ کے علماء کے مقابلے میں استعمال کرتے تھے اصحاب الرائے یا اہل الرائے کہا جانے لگا۔ اگرچہ فقہا میں کوئی دبستان بھی اپنے آپ کو اہل الرائے کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ اہل حدیث کے نقطہ نظر کے مطابق امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مقلدین اسی طرح امام مالکؒ اور ان کے مقلدین خاص طور پر اہل الرائے ہیں۔ اہل حدیث کے اس طعن کی وجہ سے یہ غلط خیال پیدا ہو گیا کہ اہل الرائے حنفیوں ہی کا لقب ہے۔ حالانکہ خود امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ کسی حدیث کے مقابلے میں میری رائے پتھر پر دے مارو۔ جبکہ امام شافعیؒ اور ابن قتیبہ وغیرہ کے نزدیک حنفی ہی اہل الرائے ہیں۔

اہلِ سنت والجماعت سنت رسولؐ اور آثار صحابہؓ پر عمل کرنے والے مسلمانوں کا سوادِ اعظم۔ اپنے جامع مفہوم میں اسلام کے دو بنیادی فرقوں میں سے ایک۔ جن لوگوں نے اسلامی جمہوریت و خلافت۔ سنتِ رسولؐ اور آثار صحابہؓ پر عمل پیرا ہونے کا دعوےٰ کیا اہلسنت کہلائے اور جو لوگ سنت سے انکار کرتے تھے، خوارج اور معتزلہ کہلائے۔ خوارج اور معتزلہ کا عروج دوسری صدی ہجری میں ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد یہ فرقے ختم ہو گئے۔ تاہم مسئلہ خلافت پر ایک اختلافی گروہ شیعان علیؓ کا تھا، جو آگے چل کر اہل تشیع یا شیعہ کہلائے۔ اہل سنت پیروکاروں کے معنی میں سنّی بھی کہلاتے ہیں۔ جبکہ خوارج اور معتزلہ کی تعلیمات آگے چل کر عراق اور ہندوستان میں نمودار ہوئیں۔ انہیں منکرین حدیث یا اہل قرآن کہا جاتا ہے۔ انکار سنت کا یہ دوبارہ آغاز تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی میں ہوا۔

Marfat.com

ہندوستان میں اس کی ابتدا کرنے والے سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی تھے۔ عام طور پر مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے اہل سنت والجماعت اور اہل التشیع ہیں۔ انہیں ماننے والے بالترتیب سنی اور شیعہ کہلاتے ہیں۔ جبکہ اہل سنت والجماعت بہت سے دیگر عقائد رکھنے والے لوگوں کو اپنے دائرہ میں شامل نہیں کرتے۔ البغدادی کے نزدیک اہل سنت وہ لوگ ہیں جو آنحضورؐ کے طریقے (سنت) اور اصحاب کے مسلک پر ہیں۔ اس نے اہل الرائے اور اہل حدیث ہر دو گروہوں کو شامل کیا ہے۔ "امام ابن تیمیہ نے اہل سنت والجماعت کو ائمہ اربعہ سے بھی پہلے کا قرار دیا ہے اور وہ صحابہ کی جماعت کو اسی گروہ میں شامل کرتے ہیں۔ الذہبی کے بقول ابوالحسن اشعری کی تحریک اشعریہ ماننے والوں نے خود کو اہل سنت والجماعت قرار دیا۔ ان کے بعد سے یہ اصطلاح عام ہوگئی۔

البغدادی نے اہل سنت والجماعت کے عقیدے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جو حدوث عالم، خالق کائنات کی وحدانیت، اس کے تشبیہ و تجسیم سے پاک ہونے اور انسانوں کے لئے کافی اور برحق ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ قرآن شریعت کے احکام کا ماخذ و منبع اور کعبہ ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان باتوں کے ساتھ انہیں کسی ایسی بدعت میں ملوث ہونا پسند نہیں، جو کفر کا باعث ہو۔"

البغدادی نے اہلسنت والجماعت کی آٹھ اصناف بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ ارباب علم جو توحید، نبوت، احکام، وعد و وعید، ثواب و عقاب، اجتہاد و امامت و قیامت کے بارے میں صحیح اور کامل معلومات سے بہرہ ور ہیں اور خوارج وغیرہ اور تشبیہہ و تعطیل کے معتقد متکلین سے الگ راہ پر چلے ہیں۔

۲۔ فقہا، جو قرآن و سنت اور اجماع صحابہ سے استنباط احکام کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان میں ائمہ کرام مالک، ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، شافعی، اوزاعی، ثوری وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ علمائے حدیث۔

۴۔ علمائے ادب و نحو، مثلاً خلیل بن احمد، ابوعمرو بن العلاء، سیبویہ، اخفش، اصمعی، المازنی اور ابوعبید وغیرہ۔

۵۔ مندرجہ بالا عقائد کے مفسرین اور قرا وغیرہ۔

۶۔ مندرجہ بالا مسلک کے مرید صوفیاء اور اولیاء کرام۔

۷۔ مجاہدین اور شمشیر بکف محافظین دین۔

۸۔ عام پیروکاران اہل سنت والجماعت۔

اس جماعت کے عقائد کو مختلف خلفاء اور سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی ہے مسلمانوں کی روایت ہے کہ خلفائے راشدین بھی اسی مسلک کے پیروکار تھے۔ المتوکل کے دور میں اس مسلک کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مصر اور شام میں صلاح الدین ایوبی اور اس کے وزیر القاضی الفاضل نے اس مسلک کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ مغربی افریقہ اور اندلس میں بھی اس مسلک کو سرکاری حمایت حاصل ہوئی۔ محمد بن تومرت جب اقتدار میں آیا تو اس نے بھی الموحدون میں اس مسلک کا نفاذ کیا۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی نے بھی اسے سرکاری مسلک کی حیثیت دی۔ یہی حال اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت اور ٹیپو سلطان کے قوانین میں ملتا ہے۔ پاکستان میں اکثریت حنفی اہلسنت کی ہے۔ لیکن یہاں کسی قسم کا سرکاری مسلک رائج نہیں پاکستان کے آئین میں جمہوریت کو سرکاری مسلک اور اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔

اہل صُفّہ:۔ آنحضورؐ کے وہ صحابی جو صوفیا کے زمرے میں آتے ہیں (دیکھئے "اصحاب صفہ")

اہل عبا:۔ (دیکھئے "آل عبا" و "آل رسولؐ" و "اہل بیت")

اہل عدل:۔ فرقہ معتزلہ کا لقب (دیکھئے "معتزلہ")

اہل قبلہ:۔ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والے مسلمان (دیکھئے "اسلام" و "مسلمان")

اہل قیاس:۔ اجتہاد و فقہ میں قیاس سے کام لینے والے۔ (دیکھئے "اہل الرائے")

اہل کتاب کتاب والے۔ اصطلاح میں اہل کتاب سے مراد کسی الہامی اور آسمانی کتاب کے ماننے والے لوگ۔ خصوصاً تورات اور انجیل کے ماننے والے۔

قرآن مجید اہل کتاب کو مشرکوں سے الگ گروہ قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔ "یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے دعوت حق قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں۔" (۲: ۱۰۵)

اہل کتاب سے اولاً مراد یہود و نصاریٰ ہیں پھر مجوسی، صابی اور دیگر اہل مذاہب ہیں۔ الشہرستانی یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب اور مجوسیوں اور مانویوں وغیرہ کو "مشبہ اہل کتاب" قرار دیتا ہے نیز جو کسی الہامی کتاب کے بغیر ہیں مثلاً صابی اور جو احکام و حدود شرعی کو نہیں مانتے مثلاً فلاسفہ و دہریان کا ذکر علیحدہ کرتا ہے۔

اسلام اپنے پیروکاروں کو پہلے تمام انبیاء اور کتابوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ "یہ سب اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں" (۲: ۲۸۵) تفسیر "روح المعانی" کے مطابق اس وقت تک کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تمام انبیاء اور کتابوں پر ایمان نہیں لاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی کتابوں میں تحریف ہوگئی ہے اور قرآن آنے کے بعد پہلی کتابیں منسوخ ہوگئی ہیں۔ (۱: ۲۹۸) اور "اب اس میں تمام ضروری اور قائم رہنے والی تعلیمات موجود ہیں۔" (۹۸: ۳) بخاری شریف میں ہے کہ آنحضورؐ کا اہل کتاب کے بارے میں فرمان ہے کہ نہ تو ان کی باتوں کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔

اسلام اہل کتاب کے ساتھ نہ صرف کھانا پینا جائز قرار دیتا ہے بلکہ ان کی عورتوں سے نکاح کی بھی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا ان قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔" لیکن یہ دونوں حکم بعض پابندیوں کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ کھانا کھانے میں اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی چھوت چھات نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حلال چیز ہو۔ شراب، سور وغیرہ نہ ہو۔ اسی طرح ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت بھی اس شرط پر دی گئی ہے کہ وہ محصنات (محفوظ عورتیں) ہوں لیکن مسلمان عورت کسی اہل کتاب مرد سے نہیں بیاہی جا سکتی۔ کیونکہ عورت کمزور ہوتی

Marfat.com

ہے۔ کہیں مرد ان کو دین بدلنے پر مجبور نہ کردے۔

ایاز (وفات ربیع الاول ۴۴۹ھ/ مئی ۱۰۵۷ء) ابوالنجم ایاز، ہندوستان کے مشہور سلطان محمود غزنوی کا محبوب امیر اور سپہ سالار۔ ابتدائی حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔ مورخ بیہقی کے مطابق یہ سلطان محمود کے ان آٹھ غلاموں میں سے تھا جن کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور ان کی خدمت و آسائش کے لیے خدمت گار مقرر کیے جاتے تھے۔ سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کے فرزند محمد کو جو غزنہ میں موجود تھا۔ تخت پر بٹھلانے والے امراء میں ایاز کا نام بھی شامل ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب اکثر علماء اور محل سرا کے غلام اس سے بدل ہو گئے تو ایاز نے سلطان محمود کے دوسرے بیٹے مسعود سے جا ملنے کا فیصلہ کیا۔ جو اس وقت رے کا فاتح اور غزنوی ایران کا والی تھا۔ اس نے محمد کے حاجب بزرگ علی دایہ کو اپنے ساتھ ملایا اور شاہی غلاموں کے ایک بڑے گروہ کو اپنی معیت میں لے کر اور محمد کے سپاہیوں کو شکست دے کر مسعود کے پاس نیشاپور پہنچا۔ مسعود ایاز کے اس عمل سے بہت خوش ہوا اور "بُست، مکران، قزدار" کا مالیہ اس صلے میں ایاز کو عطا کیا۔ ذی قعدہ ۴۲۷ھ/ اگست ۱۰۳۶ء میں جب مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا نائب السلطنت مقرر کیا تو امیر ایاز کو اس کا اتالیق بنا کر اس کے ساتھ لاہور بھیجا۔ تاریخ نویسوں کے بقول ایاز ہی اس ولایت کا اصل حکمران تھا۔ اس کو ولایت ہند کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ایاز تقریباً چھ سال دارالحکومت لاہور میں منصب اتابکی پر فائز رہا۔

ایاز کی قبر لاہور میں پرانی شہر پناہ کے باہر رنگ محل کے ساتھ سڑک کے کنارے ایک بلند احاطے میں بنی ہوئی ہے۔ شمالی بازو میں ایک مسقف (چھتا ہوا) دلان ہے۔ اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔

ایاز اسلامی دنیا اور خصوصیت کے ساتھ وسطی و جنوبی ایشیا میں بہت مشہور ہے۔ خوب صورتی کی وجہ سے سلطان محمود کا محبوب غلام ہونے کے ساتھ ساتھ آقا پرستی کی وجہ سے اس کا نام ضرب المثل بن گیا ہے۔ چنانچہ "زلف ایاز"۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" وغیرہ ضرب الامثال اسی ایاز سے متعلق ہیں۔ اس کے بارے میں ادب میں بہت سی حکایات بھی ملتی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ سلطان محمود کے پاس ایک بہت قیمتی اور بیش بہا موتی آیا اس نے اپنے ہر امیر سے اسے توڑنے کے لیے کہا لیکن ہر ایک نے ایسے گوہر یکتا کو توڑنے سے انکار کر دیا مگر جب اس نے ایاز سے اسے توڑنے کی فرمائش کی تو اس نے اسے فوراً توڑ دیا۔ اس سے ایاز کی حکم پرستی اور آقا پرستی ظاہر ہوتی ہے۔

ایام بیض روشن دن، قمری مہینے کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ ان دنوں چاند کی خوب روشنی ہوتی ہے۔ آنحضورؐ ایام ابیض کے روزے کبھی ترک نہ فرماتے تھے۔ خواہ گھر میں ہوں یا سفر میں۔ (مشکوٰۃ کتاب الصوم اداب روزہ نفل فصل الثالث حدیث ۴۴)

ایام تشریق ذی الحج کی گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں تاریخ وہ تین دن جو حاجی لوگ حج کے دوران قربانی کے بعد منا میں گذارتے ہیں ان دنوں کو ایام تشریق اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں اہل عرب، منا میں قربانی کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

ذی الحج کی نویں تاریخ سے لے کر تیرہویں تاریخ عصر تک فرض نمازوں کے بعد تکبیرات تشریق بآواز بلند پڑھی جاتی ہیں۔ وہ تکبیرات یہ ہیں۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔ یہ تکبیرات ہر مرد پر جو مقیم ہو اور باجماعت نماز پڑھے واجب ہیں۔ عورتیں اگر امام کے پیچھے نماز ادا کریں تو ان پر بھی پڑھنا واجب ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے۔

ایام نحر قربانی کے دن ذی الحج کی دسویں گیارہویں اور بارہویں تاریخیں قربانی انہی دنوں میں جائز ہے۔ (دیکھیے "قربانی")

ایبک، امیر صلخد (وفات ۶۴۶ھ/ ۴۹-۱۲۴۸ء) عزّ الدین ابوالمنصور ایبک المعظمی ایوبی سلطان شرف الدین عیسٰے کا مملوک تھا۔ جس نے ۶۰۸ھ/ ۱۲-۱۲۱۱ء میں ایبک کو حوران میں صلخد شہر اور اس کے ملحقہ علاقوں کا مختار کار مقرر کیا۔ سلطان شرف الدین کی وفات پر اس کے بیٹے الناصر داوٗد کے عہد میں دمشق کا نائب السلطنت بنا اور حکومت کے تمام سیاسی اور انتظامی امور کا مالک ہو گیا۔ الناصر کے چچا الملک الاشرف نے دمشق پر قبضہ کیا تو ایبک کو اس عہدے سے ہٹا دیا اور اس کے بعد اس پر غداری کے شبہ کی بنا پر اسے سیاسی اقتدار سے بالکل محروم کر دیا گیا۔ ایبک نے اپنے سلطان شرف الدین عیسٰے کی معیت میں صلیبی جنگوں میں بھی حصہ لیا۔

قاہرہ میں وفات کے بعد اس میت کو دمشق لا کر ایک مقبرے میں دفن کیا گیا یہ مقبرہ اسی کے لیے تعمیر ہوا تھا۔

ایبک کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ اس نے تین حنفی درسگاہیں دمشق میں اور ایک بیت المقدس میں تعمیر کرائی۔ ریگستان کا قلعہ الازرق اسی نے تعمیر کرایا۔ سالہ میں ایک بہت بڑی سرائے (خان ہالی)۔ اس کے علاوہ اس نے صلخد میں ایک سرائے، صلخد کے قلعے میں ایک برج اور صلخد کی مسجد میں محراب دار دالان اور مینار۔ قلعہ الازرق میں ایک حصار۔ زرعہ میں ایک خان۔ عاین میں ایک مسجد اور سالہ کی مسجد اس کی اہم تعمیرات ہیں۔

ایبک، قطب الدین (وفات ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء) ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ خاندان غلاماں کا بانی۔ ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہونے کی وجہ سے ایبک کہلاتا تھا۔ بعض کے نزدیک ایبک ترکوں کی ایک شاخ ہے قطب الدین ایک غلام تھا۔ بچپن میں اسے ترکستان سے نیشاپور لایا گیا اور حاکم نیشاپور نے اسے خرید کر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ جب چھٹی صدی ہجری/ بارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں سلطان معز الدین غوری کے پاس غزنین میں آیا تو وہ زمانہ اس کی جوانی کا زمانہ تھا۔ سلطان غوری نے اس کی قابلیت اور لیاقت دیکھ کر چھوٹے چھوٹے عہدے تفویض کیے۔

ترائین کی دوسری لڑائی کے بعد معز الدین سلطان غوری نے مملکت پاک و ہند کا نظم و نسق اور اس کی توسیع کا کام بڑی حد تک قطب الدین کے حوالے کر دیا۔ ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء میں ایبک نے ہانسی میں ہندوؤں کی بغاوت فرو کی۔ ہانسی کی از سر نو قلعہ بندی کی گئی۔ دریائے جمنا عبور کر کے ایبک نے بلند شہر اور میرٹھ پر قبضہ کر لیا اور جب اسے

Marfat.com

دہلی کے باجگزار راجہ کی خفیہ تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو دہلی پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر لیا ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں ایبک نے دہلی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ جب پرتھوی راج کے بھائی ہری راج نے چوہان راجپوتوں کی ایک فوج جمع کر کے رنتھمبور پر حملہ کیا تو ایبک فوج لے کر وہاں پہنچا اور چوہانوں سے رنتھمبور اور اجمیر خالی کرا لئے۔ ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں علی گڑھ فتح کیا۔ اور اس کے بعد اپنے آقا سلطان غوری کے ساتھ قنوج اور بہار کی مہموں میں شرکت کی بعد ازاں علی گڑھ اور اجمیر کی بغاوتوں کو فرو کرنے میں لگا رہا اور اجمیر کو پوری طرح سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۵۹۵ھ/۱۱۹۷ء میں ایبک نے کوہ آبو کے پاس جا کر ایک فوج کو شکست دی اور آگے بڑھ کر ان کی راجدھانی انہل واڑہ کو تاراج کیا لیکن دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے اس پر مستقل قبضہ نہ رہ سکا۔ ۵۹۵ھ/۱۱۹۷ء ہی میں بدایوں بنارس اور قنوج پر قبضہ ہو گیا۔ ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء میں اس نے چندیلوں کی راجدھانی کالنجر پر بھی فتح حاصل کر لی۔

مغربی پنجاب کے غیر آباد علاقوں میں مختلف قومیں رہزنی کرتی رہتی تھیں ان میں کھوکھر خاص طور پر مشہور تھے اور کبھی کبھی ان کی سرکشی بہت شدت اختیار کر جاتی تو سلطان کو خود ان کی تادیب کے لیے آنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ۶۰۱ھ/۱۲۰۵ء میں جب ان کی شورش بہت حد تک بڑھ گئی تو سلطان کو دوسری مہمات چھوڑ کر ایک بار پھر پنجاب کا رخ کرنا پڑا۔ اس مہم میں ایبک اور اس کی فوجوں نے بھی حصہ لیا۔ ان شورشوں کی سرکوبی کے بعد سلطان نے ایبک کو الملک کا خطاب دیا۔

سلطان غوری کے ترک افسروں میں قطب الدین ایبک۔ ناصر الدین قباچہ اور تاج الدین یلدوز نمایاں امتیاز کے مالک تھے۔ ایبک کی حیثیت ہندوستان میں حاکم اعلیٰ کی تھی اور اسے دوسرے ترک امراء پر فوقیت حاصل تھی سلطان کی وفات کے بعد سلطان محمود غوری نے ایبک کو خطاب اور چتر سلطانی بھیج کر باضابطہ ہندوستان کا با اختیار بادشاہ تسلیم کر لیا۔ چنانچہ لاہور والوں کی دعوت پر وہ دہلی سے لاہور آیا۔ چنانچہ ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ/۲۷ جون ۱۲۰۶ء کو ہندوستان کے سب سے پہلے مسلمان بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ اس سے پہلے ایبک کی اور اس کے ساتھ خود مملکت ہند کی قانونی حیثیت واضح نہ تھی۔ ایبک ابھی تک غلام تھا۔ چنانچہ سلطان محمود غوری کے شاہی فرمان کے بعد سلطان کا لقب عطا ہوا اور وہ قید غلامی سے بھی آزاد ہو گیا۔

قطب الدین ایبک کو شمال مغربی سرحد پر خطرے کی وجہ سے اکثر لاہور میں رہنا پڑا اسی دوران میں ایک بار شہر سے باہر چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہو گیا اور چار سال بعد وفات پا گیا۔ اس کا مقبرہ انارکلی بازار سے ملحقہ گلی میں ہے جو کہ قبہ دار تھا اور اب صرف قبر محفوظ رہ گئی ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے اس مقبرے کی دوبارہ تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔

ایبک بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ ہندوستان کی بیشتر فتوحات اس کے ہاتھ سے یا اس کی سرپرستی میں ہوئیں۔ وہ بڑا ہوشیار اور مستعد فوجی رہنما تھا۔ اپنی چار سالہ حکومت میں اس نے سلطنت دہلی کو بیرونی آفات سے بچانے کی پوری کوشش کی۔ بڑا فیاض تھا۔ جب انعام دینے پر آتا تو ہزاروں اور لاکھوں کی نوبت پہنچ جاتی۔ اس لیے وہ "لکھ بخش" کے لقب سے مشہور تھا۔

ایبک کی تعمیر کردہ وہ عمارتیں جو آٹھ سو سال کی طویل مدت کے بعد بھی کلی یا جزوی طور پر آج تک باقی ہیں، یادگار تہذیبی کارنامہ ہیں۔ ان عمارات میں مسجد قوۃ الاسلام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے مشرقی دروازے پر سال بناء ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) درج ہے۔ مسجد کا رقبہ پچاس ہزار مربع فٹ تھا جس کو التتمش نے تین گنا بڑا کر دیا جو اب ایک لاکھ چوالیس ہزار چار سو مربع فٹ میں ہے۔ صدر دروازے پر بیس فٹ قطر کا گنبد ہے

ایک رفیع الشان مینار بھی تعمیر کرایا جو عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا نام قطب مینار ہے۔ اور بقول فرگوسن یہ مسلمانوں کی فتح ہند کا علم تھا پتھوار کے اندر ایک محل قصر سفید کے نام سے تعمیر کرایا جو غالباً ایبک کی بادشاہی کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔

اس کے علاوہ ایبک کی دوسری بڑی شاندار اور پر تکلف تعمیر اجمیر کی جامع مسجد ہے۔ یہ مسجد ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء میں تعمیر ہوئی۔ یہ بھی مسجد قوۃ الاسلام کی طرح نقش و نگار سے مزین ہے اور اس کی نظیر کہیں اور نہیں ہے۔

ایثار

ایثار دوسرے کے فائدے کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا۔ دوسرے کو نفع پہنچانا۔ اپنے مال میں سے کچھ حصہ دوسرے کو دینا۔ یہ کمال سخاوت کا درجہ ہے۔ اسلام دوسروں کے لئے ایثار کی بہت زیادہ تعلیم دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"(وہ) مال جو بلا جنگ ہاتھ آیا ہے، وہ ان لوگوں کے لئے بھی ہے، جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی ایمان لا کر دارالہجرت میں مقیم تھے یہاں لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ وہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں (۵۹:۹)

ایثار کی مثالیں مسلمانوں میں عام ملتی ہیں۔ بخاری شریف میں ابراہیم ابن سعدؓ سے ایک روایت ہے جو انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ جب مہاجرین مدینہ میں آئے تو آنحضورؐ نے عبدالرحمانؓ بن عوف اور سعدؓ بن ربیع میں بھائی چارا کرا دیا تھا۔ سعدؓ بن ربیع نے عبدالرحمانؓ بن عوف سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ مالدار ہوں تم میرے مال کو نصف کر لو اور میری دو بیویاں ہیں تم انہیں دیکھو تمہیں ان میں سے جو اچھی لگے اس کا نام بتا دو میں اسے طلاق دے دوں اور جب عدت گذر جائے تو تم اسے نکاح میں لے آنا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جواب دیا کہ خدا تمہارے مال اور اہل میں برکت دے۔ مجھے تو کوئی بازار بتا دو کہ میں وہاں جا کر تجارت کروں چنانچہ لوگوں نے انہیں بنی قینقاع کا بازار بتا دیا۔

صوفیاء کے نزدیک ایثار یہ ہے کہ صحبت و رفاقت میں انسان اپنے ساتھی اور دوست کے حق کا خیال رکھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ایثار دوسروں کی مدد کرنا اور ساتھ ہی اس امر میں مشغول ہونا ہے جس کا اللہ تعالےٰ نے رسول اللہؐ کو حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ درگذر اختیار کیجیے اور نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض فرمایئے۔ یہ ایثار دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو صحبت میں، جیسا کہ اس کا اوپر ذکر آ چکا ہے اور دوسرے محبت میں۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی چیز کی خواہش کرے، جب اسے مل جائے تو اُسے ترک کر دے اور دوسرے شخص کو اپنے آپ پر ترجیح دے تو اللہ تعالےٰ اسے بخش دیتا ہے۔

ایثار خدا کی راہ پر کیا جاتا ہے، خواہ دوست کے لئے ہو، عام مخلوق کے

Marfat.com

لیے قوم کے لیے یا فی سبیل اللہ۔ نیز ایثار جان، مال، اولاد، علم، نفس اور جذبات وغیرہ سے بھی کیا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایثار کی سب سے بڑی مثال آنحضرتؐ کے رفیق غار حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پیش کی تھی کہ انھوں نے صحبت یار کے لیے گھر بار اولاد، مال و دولت غرضیکہ سب کچھ چھوڑ دیا اور پھر جب کبھی بھی داعیٔ اسلامؐ کو ضرورت محسوس ہوئی اپنے پاس موجود ہر شے لاکر آنحضورؐ کے قدموں میں رکھ دی۔ ایسی ہی مثالیں حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ غنی اور حضرت علیؓ مرتضٰے سے ملتی ہیں۔ اسلام کا یہ اولین دور صحابۂ کرامؓ کے ایثار و قربانی اور انفاق فی سبیل اللہ کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ (نیز دیکھیے "انفاق"، "جہاد"، "قربانی")

ایجاب و قبول

شرعی اصطلاح، جس کے معنی بیع یا نکاح کے وقت اقرار کے ہیں، یعنی بیع یا نکاح کے فریقین اقرار خرید و فروخت یا اقرار نکاح کے جو الفاظ دہراتے ہیں۔ انہیں ایجاب و قبول کہا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ میں نے فلاں چیز اتنے داموں میں تمہارے ہاتھ بیچی یا مرد کہے کہ میں اتنے مہر کے عوض تجھے نکاح میں لینا چاہتا ہوں یا عورت کہے کہ میں اتنے مہر کے عوض تمہارے نکاح میں آتی ہوں۔ یہ ایجاب کہلائے گا۔ یہ الفاظ فریقین کے وکیل بھی ادا کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف سے جو رضامندی ہوگی۔ اسے قبول کہا جاتا ہے۔ ایجاب و قبول کے الفاظ کا ماضی کے صیغے میں ہونا ضروری ہے۔ مستقبل کے صیغے میں ایجاب و قبول نہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میں تمہارے آگے یہ چیز فروخت کروں گا یا تم سے نکاح کروں گا تو یہ ایجاب نہ ہوگا اور اسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ میں تمہاری شے کو خریدوں گا یا تمہارے نکاح کو قبول کروں گا تو یہ قبول نہ ہوگا۔
(نیز دیکھیے "نکاح")

ایجی، عضدالدین

(۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء - ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) عضدالدین، عبدالرحمان الایجی بن احمد بن عبدالغفار بہت بڑا ماہر علم الکلام۔ فارس کے قصبہ ایج میں پیدا ہوا، شجرہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اسکے بعد درس و تدریس اور قضا کا شغل اختیار کیا مشرق کے اسلامی ممالک میں اسے شافعی مسلک کا سب سے بڑا عالم گنا جاتا تھا۔ وہ سلطان ابوسعید ایلخانی کا استاد بھی رہا ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء میں غیاث الدین محمد کے قتل کے بعد سلطانیہ سے شیراز آگیا۔ اور یہاں بھی اپنا درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنی مشہور ترین کتاب "المواقف" یہیں تالیف کی اور شیراز کے فرمانروا ابواسحاق اینجو کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کی۔ ۷۵۴ھ/۱۳۵۳ء میں جب مبارزالدین محمد نے شیراز پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تو شیراز کے بادشاہ نے الایجی ہی کو اس کے دربار میں بطور سفیر بھیجا۔ تاکہ جنگ رک جائے۔ مبارزالدین نے اس کا حد درجہ احترام کیا اور پچاس ہزار دینار خرچ کے لیے اور دس ہزار دینار خدام کے لیے دیئے۔ اگرچہ صلح نہ ہو سکی اور مبارزالدین نے شیراز کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے سے تنگ آکر الایجی شہر سے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آیا۔ مبارزالدین کے دربار میں بھی اسے ویسا ہی اعزاز و احترام حاصل رہا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب الایجی شبانکارہ چلا گیا تو وہاں کے حکمران اردشیر نے اسے گرفتار کر کے اردومیان کے قلعے میں قید کر دیا۔ اس نے اسی قلعے میں وفات پائی۔

الایجی کی بہت سی تصانیف ہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں

۱۔ تحقیق التفسیر فی تکثیر التنویر۔ ۲۔ الرسالۃ العضدیۃ فی علم الوضع۔ ۳۔ المواقف فی علم الکلام۔ ۴۔ العقائد العضدیۃ۔ ۵۔ شرح مختصر ابن الحاجب۔ ۶۔ اشراق التواریخ۔ ۷۔ رسالۃ الاخلاق۔

ایجی بڑا سخی اور بہت نیک دل آدمی تھا۔ حکمرانوں اور وزیروں کے عطیات کی بدولت بہت دولت مند تھا۔ اس دولت کو وہ طلبہ کی اعانت پر اور لوگوں سے حسن سلوک پر خرچ کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس کا شہرہ اس کی زندگی ہی میں دور دور تک پہنچ گیا تھا۔

ایران

مغربی ایشیا کا ایک اسلامی ملک، جو ۱۹۳۵ء تک فارس کہلاتا تھا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو حکومت تہران نے فیصلہ کیا کہ اس مملکت کا سرکاری نام ایران ہوگا۔ اس کے شمال میں روس اور بحیرۂ کیسپین، مشرق میں افغانستان اور پاکستان جنوب میں خلیج فارس اور مغرب میں عراق اور ترکی واقع ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۶۳۶۲۹۳ مربع میل (۱۶۴۸۰۰۰ مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۷۶ء کی مردم شماری کی رو سے ۳۰۰۵۱۰۰۰ ہے

ایران کے تین اطراف میں سوائے مشرقی سمت کے سات سے اٹھارہ فٹ تک بلند پہاڑ ہیں۔ وسطی علاقے میں کہیں کہیں صحرا ہیں۔ ملک بھر میں متعدد چھوٹی چھوٹی ندیاں ہیں۔ جہاں زراعت ہوتی ہے۔ اکثر علاقوں میں درجہ حرارت گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ باقی علاقے سطح مرتفع کے ہیں۔ جن میں قدیم قافلوں کے راستے اب بھی باقی ہیں۔ آمدورفت کے اکثر راستے مشرقی قفقاز، ارمیہ کے مغربی دروں سے، شہرزور اور حلوان کی گھاٹیوں سے اور بصرہ سے ہو کر گذرتے ہیں۔

موجودہ ایران کے بڑے بڑے شہر تہران (دارالحکومت)، آبادان، اہواز اصفہان، مشہد، رشد، شیراز اور ہمدان ہیں۔ جہاں ایرانی عربی اور ترکی نسلوں کے لوگ رہتے ہیں۔ دیہات میں زیادہ تر قدیم ایرانی نسلیں ہی آباد ہیں۔

ایران مذہباً شیعہ ملک ہے۔ تقریباً ۸۰ فیصد شیعہ فرقہ امامیہ سے اور پانچ فیصد اسماعیلیہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پانچ فیصد فرقہ شیخیہ اور نقطویہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض شہروں میں بابی اور بہائی بھی آباد ہیں۔ ماکو کے قریب کچھ یزیدی بھی رہتے ہیں۔ سنی مسلمان صرف کردوں، عربوں اور افغانوں میں ملتے ہیں۔ ان میں سے شافعی مسلمان صرف کردوں اور عربوں میں اور حنفی مسلمان ترکمانوں اور افغانوں میں ملتے ہیں۔ دیگر مذاہب میں سے مجوسی (زرتشتی) اہم ہیں۔ جو کچھ کچھ تعداد میں یزد کرمان، تہران، شیراز اور کاشان میں ہیں۔

تاریخ:۔ ایران کی تاریخ کا آغاز نویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے جب آریا نسل میڈیا کے علاقوں میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ بادشاہ رہے۔ ان کا آخری بادشاہ آستیاکس تھا۔ جس پر ہخامنشی خاندان کے کوروش اعظم نے فتح پائی اور ۵۵۰ ق م سے پورے ایشیائے کوچک پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کا جانشین کمبوجیہ تھا، جس نے ۵۲۹ ق م سے ۵۲۱ ق م تک حکومت کی۔ اس کا جانشین زرکسس تھا۔ وہ ۴۸۵ ق م سے ۴۶۵ ق م تک حکمران رہا۔ دوسرے حکمران اردشیر (۴۶۵ ق م سے ۴۲۵ ق م)، داریوس دوم ۴۲۴ ق م سے ۴۰۴ ق م تک، اردشیر دوم ۴۰۴ ق م سے ۳۵۸ ق م اردشیر سوم ۳۵۸ ق م سے ۳۳۸ ق م تک اور داریوش سوم ۳۳۶ ق م تا ۳۳۰ ق م تھے۔ ۳۳۰ ق م میں سکندر اعظم یونانی نے داریوس سوم کو شکست دی اور ہخامنشی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ سکندر کے بعد ایران سلیوکس کے حصے میں آیا اور ۱۸۵ ق م تک وہاں سلیوکی سلطنت قائم رہی۔

Marfat.com

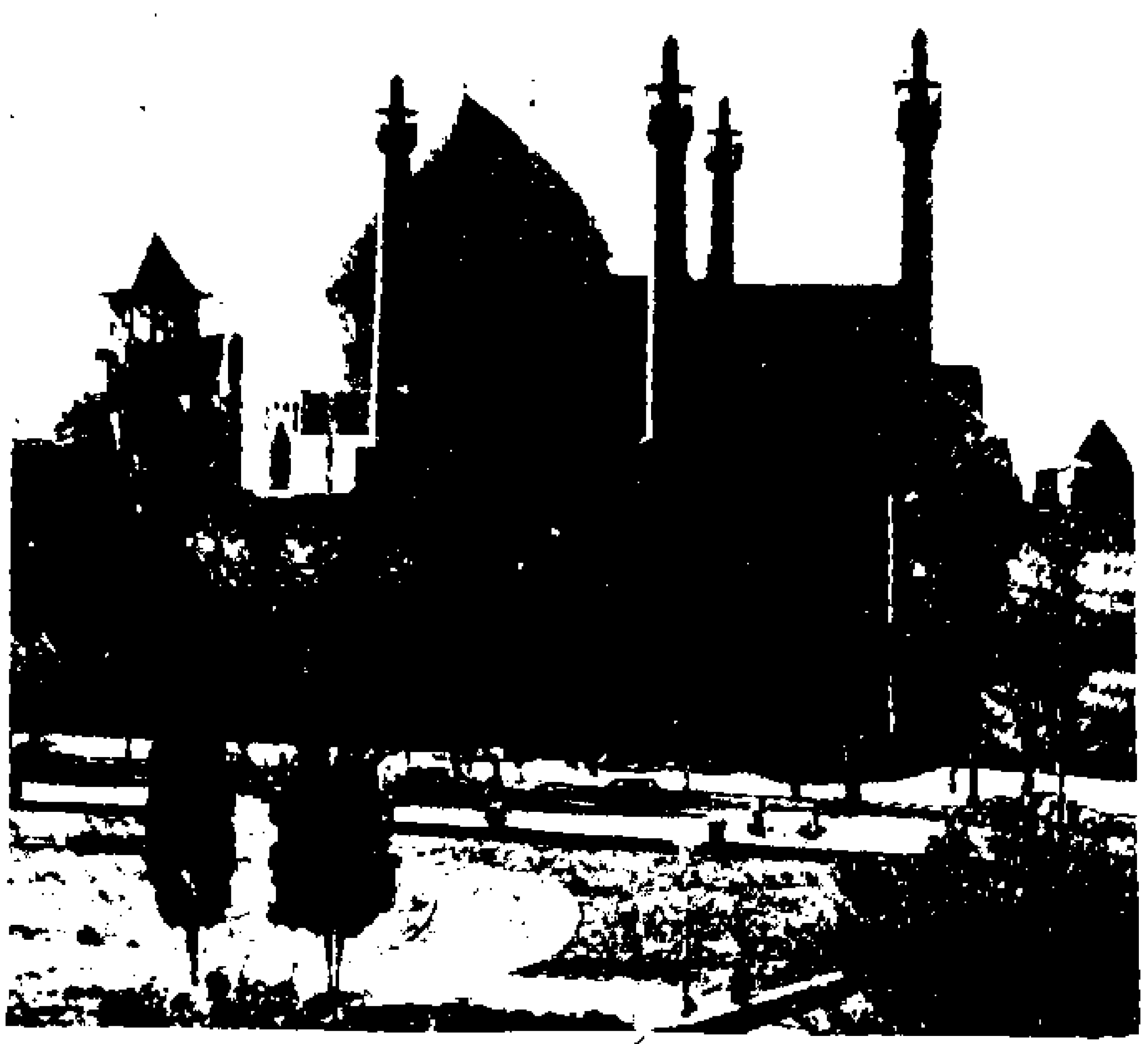

اصفہان کی شاہی مسجد

۲۴۹ ق م خراسان میں اشکانی خاندان کے مورث اعلیٰ ارشک اوّل نے اشکانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ کوئی پانچ صدیاں بعد اس سلسلے کے آخری بادشاہ اردوان کو ساسانیوں کے اردشیر بابک نے ۲۲۰ء میں شکست دی اور ساسانی عہد کی بنیاد رکھی۔ اس کے جانشین شاپور اوّل نے ۲۵۸ء میں ایشیائے کوچک پر چڑھائی کر کے انطاکیہ فتح کیا اور قیصر روم کو گرفتار کر لیا۔ اس خاندان کے دوسرے حکمران شاپور اعظم (۳۰۹ء تا ۳۷۹ء)، بہرام گور (۴۲۰ء تا ۴۴۰ء)، قباد (۴۸۷ء تا ۵۳۱ء) نوشیرواں عادل (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) خسرو پرویز (۵۹۰ء تا ۶۲۸ء) اور یزدگرد سوم (۶۳۴ء تا ۶۵۲ء) مشہور ہیں۔ خسرو پرویز کو آنحضور نے اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور یزدگرد سوم کو مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شکست دے کر فارس کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۴ھ/۶۳۵ء میں قادسیہ کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں شہر مدائن کو بھی فتح کر لیا۔ ۲۱ھ/۶۴۲ء میں نہاوند کا شہر بھی فتح ہوا اور یزدگرد وہاں سے فرار ہو کر اصفہان، اصطخر، کرمان اور سجستان کی راہ سے مرو پہنچا۔ یہاں ۳۱ھ/۶۵۲ء میں وہ ایک شخص مرزبان کے ہاتھوں مارا گیا۔ ۱۷ھ/۶۳۸ء میں ابوموسیٰ اشعری کی قیادت میں خوزستان فتح ہوا جس کے فوراً بعد شیراز، قم اور کاشان کے علاقے بھی مسلمانوں کے قبضے میں آئے ۲۴ھ/۶۴۴ء کو عبداللہ بن ہذیل کے ذریعے اصفہان فتح ہوا۔ اگلے تین برس میں ابوموسیٰ اور عثمان بن ابی العاص نے مل کر ارجان، شاپور، شیراز اور اصطخر فتح کیے۔ ایک اور مسلمان سپہ سالار عبداللہ بن عامر نے اصطخر کے بعد ۲۹ھ/۶۵۰ء میں خراسان پہنچے۔

حضرت علیؓ کے عہد میں ایرانیوں نے عربوں کی خانہ جنگی میں بھرپور حصہ لیا۔ مگر حضرت معاویہؓ کے دور میں مسلمان ایک بار پھر ایرانیوں کو دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دور میں مسلمان افغانستان تک پہنچ گئے۔

ایرانیوں کے ساتھ مسلمانوں کا طرز سلوک ان کے شایان شان ہی رہا تھا معاہدات میں ادائے خراج کے عوض مذہبی آزادی اور ذاتی املاک کی حفاظت دی جاتی تھی۔ پوری آبادی نے شاذ ہی اسلام قبول کیا۔ زیادہ تر زرتشتی مذہب کا زور رہا۔ ایرانی شہروں میں صرف مسلمان فوجی دستے ہی مقیم ہوئے تھے، جو پہلے وہاں مسجد تعمیر کرتے اور پھر سکونت اختیار کرتے تھے حجاج بن یوسف کے عہد تک ایران کی سرکاری زبان پہلوی فارسی ہی تھی۔ اس کے بعد سے یہاں کا نظم ونسق عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔ خلیفہ ہشام نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو یکساں حقوق دے کر یہاں کے مختلف عناصر کو باہم گھلنے ملنے میں بڑی مدد دی۔

۱۲۹ھ/۷۴۷ء میں ابومسلم خراسانی نے بغاوت کر کے نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔ جس کے فوراً بعد عباسی خلفاء کا دور شروع ہو گیا۔ ان کے عہد میں زرتشتی روایات اور نظریات نے زور پکڑا۔ دین اسلام میں ان عجمی اثرات کی بدولت اسلامی فکر کا رخ ایک اور ہی سمت مڑ گیا۔ ابومسلم کی بغاوت کے بعد سے اگرچہ اعلیٰ طبقے کے ایرانیوں نے دین اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ایران میں بہت سی فکری تحریکوں اور جھوٹی نبوت کے سلسلوں کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ سنباذ مجوسی (۱۳۷ھ/۷۵۵ء) استادسیس (۱۴۹ھ/۷۶۶ء)، المقنع (۱۶۱ھ/۷۷۷ء) بابک خرمی (۲۰۱ھ/۸۱۶ء) وغیرہ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ خلیفہ الہارون نے ان تحریکوں کو فرو کرنے میں خود حصہ لیا۔ اس کے بعد المامون تو ۲۰۲ھ/۸۱۷ء تک خراسان میں رہا۔ المامون کا سپہ سالار طاہر بن الحسین ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں خراسان کا والی مقرر ہوا۔ طاہر کے جانشین طاہریہ یا آل طاہر کے نام سے خراسان سے رے تک کے علاقے پر ۲۰۵ھ/۸۲۰ء سے ۲۵۹ھ/۸۷۲ء تک نیم خود مختار حکمران بن کر رہے۔ ان کے بعد صفاریہ خاندان حکمران ہوا، جب اس کے حکمرانوں نے بغداد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تو عباسیوں نے انہیں (۲۹۵ھ/۹۰۸ء) زبردست شکستیں دیں۔ اس کے فوراً بعد ایران میں کامل خود مختار حکومتیں وجود میں آنا شروع ہو گئیں۔ ان میں دلفیہ اور رودینی اہم ہیں۔ اس دور میں دیرپا حکومت زیاریہ کی تھی۔ جنہوں نے ۳۱۶ھ/۹۲۸ء سے لے کر ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء تک رے، اصفہان اور اہواز میں حکومت کی۔ اور بالآخر یہ سمٹ سمٹا کر طبرستان اور جرجان کے علاقوں تک رہ گئی۔ ان کے فوراً بعد خاندان آل بویہ نے عروج حاصل کیا۔ اس خاندان نے ۳۲۰ھ/۹۳۲ء میں بغداد کو خراج دینا بند کر دیا اس خاندان کے ایک رکن احمد بن بویہ نے ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں بغداد پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بھائیوں میں سے عضدالدولہ اور اس کا بیٹا بہاءالدولہ ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء تک عراق، فارس اور کرمان پر حکومت کرتے رہے۔ اس زمانے میں شمالی اور مغربی ایران پر ساجدیہ، مسافریہ، شدادیہ اور روادیہ وغیرہ خاندانوں کی حکمرانی رہی۔

دسویں صدی عیسوی میں غزنہ کے حکمرانوں الپتگین اور سبکتگین سے ایرانی حکمرانوں کے لیے خطرات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ محمود غزنوی (۳۸۸ھ/۹۹۸ء تا ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کو خراسان میں ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھنے کا موقع مل گیا۔ بعدازاں اس نے نصف سے زیادہ ایران پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ بغداد نے اسے یمین الدولہ کا خطاب دیا۔ اس کے عہد میں ایران میں علمی و تہذیبی روایات اپنے عروج پر پہنچیں۔ ابن سینا، البیرونی اور فردوسی جیسے مشاہیر اسی کے دربار سے منسلک تھے۔

۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں ترکوں نے آکر ایران میں بسنا شروع کیا۔ ان کے سلجوقی سردار طغرل نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں ایران پر حملہ کیا اور سترہ برس

Marfat.com

کے اندر اندر انہیں نے بغداد سے اپنی حکومت تسلیم کرالی۔ طغرل کا خاندان ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک سنجر کے عہد تک آل سلجوق یا سلاجقہ کے نام سے ایران پر حکمران رہا۔ ان کے دور میں بھی اہلسنت والجماعت کی روایات برقرار رہیں۔ نظام الملک طوسی اور امام غزالی آل سلجوق ہی کی سرپرستی میں کام کرتے رہے۔ اسی دور میں قلعہ الموت میں حسن بن صباح جیسے اسماعیلیوں نے قوت پکڑی جسے دبانے کی کوششیں ناکام رہیں۔ آل سلجوق کے بعد ایران کے مختلف علاقوں پر خوارزم شاہ اور غوری خاندان حکمران چنگیز خاں نے ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء کے بعد ماوراالنہر پر قبضہ کیا۔ تاتاریوں کے حملوں کے بعد اسلامی، عربی اور فارسی تہذیب و تمدن کے بہت سے آثار مٹ گئے۔

۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں خلافت بغداد اور اسماعیلی فرقے کی قوت کا خاتمہ ہوگیا سارا ایران تاتاریوں کے زیرنگیں آگیا۔ اب ایران پر ایلخانی حکمران تھے۔ جنہوں نے نئے سرے سے اسلامی علوم اور ادب کے فروغ میں دلچسپی لینا شروع کی۔

ایلخانیوں کے بعد ۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء سے لے کر ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء تک فارس اور کرمان کے علاقوں پر ان کے ملازم مظفری خاندان کی حکومت رہی۔ اس خاندان کا خاتمہ چنگیز خاں ہی کے نسل سے تعلق رکھنے والے حکمران تیمور نے کیا۔ ۷۷۲ھ/ ۱۳۷۲ء سے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء تک اس نے یکے بعد دیگرے بلخ، خراسان، سیستان، مازندران، آذربائیجان، عراق عجم اور بالآخر فارس پر قبضہ کرلیا۔ اس نے خراسان اور سیستان کی حکومت اپنے بیٹے شاہ رخ اور آذربائیجان کی حکومت اپنے بیٹے میراں شاہ کے سپرد کردی۔ باپ کی وفات کے بعد بیٹوں میں حصول تخت کے لئے جنگ چھڑ گئی، جس سے مغرب سے آنے والے قرہ قوینلو خاندان نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس خاندان نے ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء سے ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء تک ایران کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ۸۶۴ھ/۱۴۶۰ء سے ۹۱۲ھ/ ۱۵۰۶ء تک ایران پر مشہور تیموری سلطان حسین بایقرا حکمران رہا۔ اس کا پایہ تخت ہرات تھا۔ اور وہ خراسان، سیستان اور جرجان پر حکومت کرتا رہا۔

قرہ قوینلو خاندان کے قرہ یوسف نے ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں تبریز فتح کر کے اپنی حکومت قائم کی اور اس کے جانشینوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت بنالیا۔ ان میں سے ایک جہان شاہ تھا۔ جسے آق قوینلو خاندان کے سردار اوزون حسن نے ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء میں شکست دے کر ایران پر قبضہ حاصل کیا اور آخری تیموری بادشاہ ابوسعید کو بھی شکست دے کر پورے ایران پر قابض ہوگیا۔ اوزون حسن کے جانشینوں کا تصادم صفوی خاندان کے پیشواؤں سے ہوا اور ایران پر یہ خاندان قابض ہوتا چلا گیا۔ شاہ اسماعیل صفوی اول نے مستحکم حکومت قائم کی اور اہل تشیع کی حمایت اور اہل سنت کی زبردست مخالفت کی۔ صفوی خاندان نے ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء تک حکومت کی۔ اس خاندان نے اپنے طویل دور حکومت میں ایران کو مذہباً اور تہذیباً دیگر مسلمانوں سے الگ تھلگ رکھا۔ عباس اول (۹۸۵ھ/۱۵۸۷ء تا ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء) کے زمانے میں شاہی فوج کو تشکیل کیا گیا اور شیعی مسلک کی زبردست حمایت کی گئی یہی وجہ ہے کہ صفوی دور کا فارسی ادب بقول براؤن بالکل بے مایہ ہو کر رہ گیا۔ اسی کے عہد میں ایران نے پہلی بار مغربی ممالک برطانیہ، نیدرلینڈ اور فرانس وغیرہ سے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ عباس کے دیگر بہت سے کارناموں نے افغانوں کے اندر ایک خاص طرح کا ردعمل پیدا کردیا، جو بالآخر مملکت افغانستان کی صورت میں نمودار ہوا۔

۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں میر محمود کی افغان فوج نے اصفہان فتح کرلیا۔ جسے آٹھ برس بعد صفوی جانشین نادر قلی نے ختم کیا اور ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء میں نادر شاہ کے نام سے ایران کا بادشاہ بن گیا۔ مشہور افغان حکمران احمد شاہ درانی اس کا جانشین اور

Marfat.com

سپہ سالار تھا۔ ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور اصل طاقت شیراز کے کریم خاں زند کے ہاتھ آگئی۔ اس نے ایران کو ایک متحدہ حکومت بنا دیا۔ اس کے بیٹے نااہل ثابت ہوئے اور استرآباد کے قاچار قبیلے کے آغا محمد خاں نے پوری سلطنت پر قبضہ جما لیا۔ ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۶ء میں وہ تخت نشین ہوا اور ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء میں مارا گیا۔ اس کا خاندان ۱۹۲۵ء تک ایران پر حکمران رہا۔

ایران پر ترکیہ اور روس کے حملے اکثر ہوتے رہے تھے۔ نادر شاہ نے انہیں کئی بار پسپا کیا تھا۔ آغا محمد خاں نے بھی انہیں کئی ضربیں لگائیں۔ لیکن اس کے بعد انگلستان اور فرانس کی باہمی کش مکش نے ایران کو الجھا کر رکھ دیا۔ نپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایران سے دوستی چاہتا تھا، جبکہ یہ انگریزوں کے مفاد کے خلاف تھا۔ ۱۸۱۴ء میں انگلستان نے ایران کے ساتھ عہد نامہ طے کر لیا۔ ادھر روس کے ساتھ ایران کی جنگ شروع ہو چکی تھی اور ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء میں صلح نامہ ترکمان چائی کی رو سے ایران کو دریائے ارس کے شمال میں پورے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑے ۱۸۵۶ء میں ایران نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ تو برطانیہ نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ۱۸۵۷ء میں ان کے مابین صلح ہوئی جس کی رو سے ایران کو ہرات چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ روسی اثر اتنا بڑھ گیا کہ ایران کے بہت سے علاقے روس کے ہاتھ چلے گئے۔

ناصر الدین قاچار کے عہد حکومت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۹۶ء) میں ایران کے حالات پرسکون رہے۔ مگر مظفر الدین کے عہد میں روس اور برطانیہ کی مداخلت معاہدہ ۱۹۰۷ء کی صورت اختیار کر گئی۔ جس کی رُو سے ایران دو حصوں شمالی اور جنوبی میں بٹ گیا

ایران میں شیعی مسلک نے بہت سی راہیں نکالیں۔ یہاں بہت سے شیعی

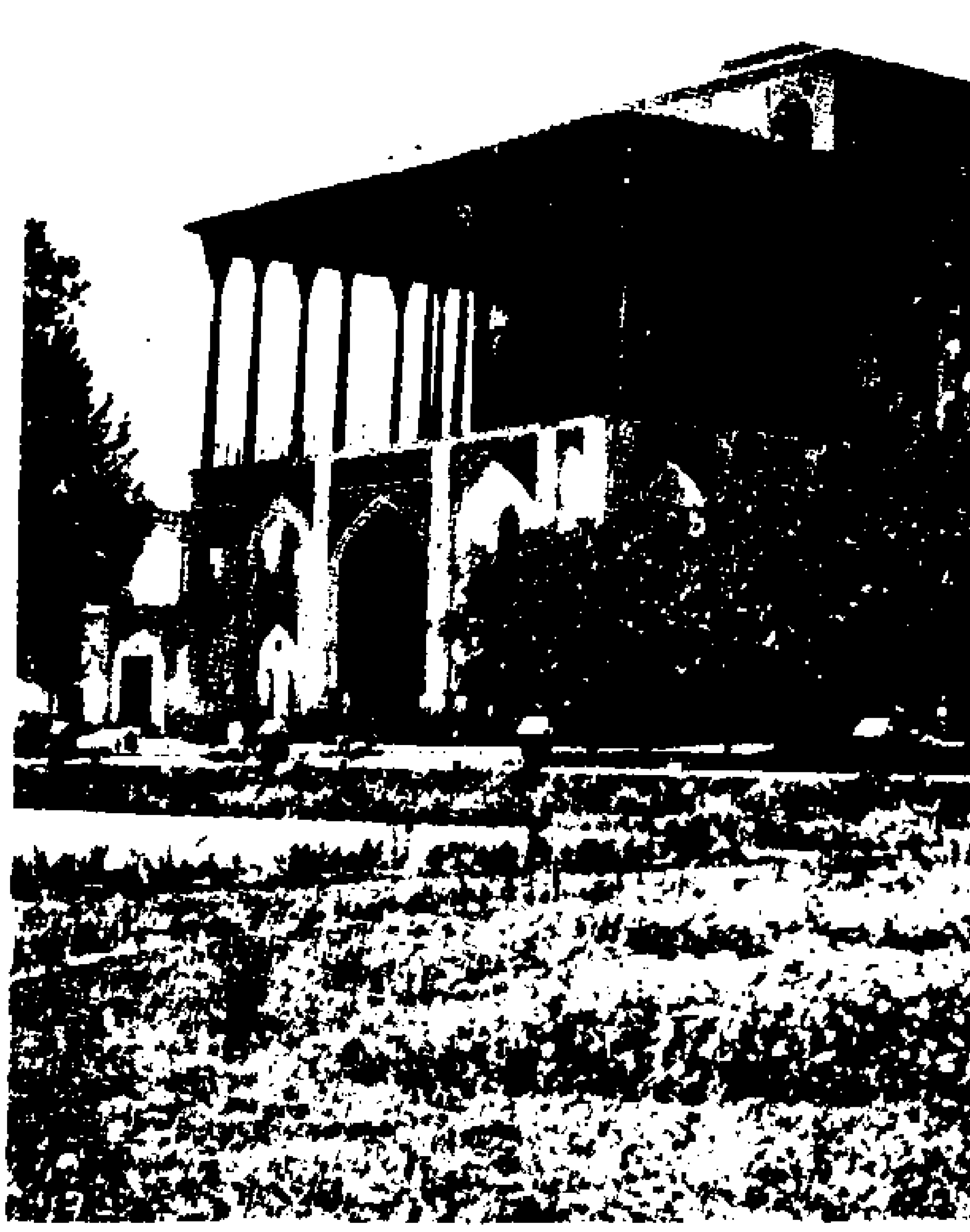

اصفہان میں شاہ عباس اول کا محل

فرقے نمودار ہوئے۔ ان میں شیخیہ اور بابی اہم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں نے بھی جنم لینا شروع کیا۔ مظفر الدین ہی کے عہد میں جمال الدین افغانی نے تحریک اتحاد اسلامی کی داغ بیل ڈالی۔ عوامی سیاست بھی بیدار ہونا شروع ہوئی۔ جس کے دباؤ کے تحت اکتوبر ۱۹۰۶ء میں بادشاہ کو دستوری حکومت کا افتتاح کرنا پڑا۔ انقلابی تحریکیں اپنے عروج کی طرف بڑھنے لگیں تو حکومت کو مجبوراً غیر ملکیوں کی مدد لینا پڑی۔ پہلی عالمی جنگ میں ایران غیر جانب دار رہا۔ ۱۹۱۰ء میں جب روسی طاقت کم پڑ گئی تو برطانوی افواج خلیج فارس میں اتر آئیں۔ جنگ کے خاتمے پر ایران مجلس اقوام کا رکن بن گیا۔

۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے ساتھ ایران کا معاہدہ ہوا اور اس سال سے ایران میں برطانوی سیادت قائم ہو گئی۔ ادھر انقلابی قوتیں بھی تیز تر ہو گئیں اور بالآخر سید ضیاء الدین اور رضا خان نے قوت کے بل پر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ رضا خاں وزیر جنگ بن گیا ۱۹۲۳ء میں اسے وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مجلس ملی نے احمد شاہ قاچار کو معزول کر دیا اور ۱۳ دسمبر ۱۹۱۵ء کو رضا خاں نے پہلوی کا لقب اختیار کر کے شہنشاہ و ایران ہونے کا اعلان کر دیا۔

رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت میں ایران نے خاطر خواہ ترقی کی اور جدیدیت کی طرف ٹھوس قدم اٹھایا۔ سابقہ تمام معاہدات منسوخ کر دیئے گئے۔ ملکی صنعت کو ترقی دی گئی۔ قومی بینک قائم کیا گیا اور آمدنی کے ذرائع قومیا لیے گئے۔ ۸ جولائی ۱۹۲۷ء کو سعد آباد کے معاہدے کی رو سے ایران، ترکی اور افغانستان کا اتحاد قائم ہو گیا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو رضا شاہ اپنے بیٹے محمد رضا کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔ اس وقت دوسری عالمی جنگ چھڑ چکی تھی اور ۲۶ اگست سے روسی اور برطانوی فوجیں ایران میں داخل ہو چکی تھیں۔ ایران نے اپنی سالمیت اور آزادی کے تحفظ کی ضمانت پر اتحادیوں کو ملک کے تمام ذرائع مواصلات سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانوی اور امریکی فوجیں رخصت ہو گئیں مگر روسی اٹے رہے۔ بالآخر سلامتی کونسل کے فیصلے کی رُو سے مئی ۱۹۴۶ء میں وہ بھی یہاں سے رخصت ہو گئے۔

محمد رضا شاہ پہلوی نے اپریل ۱۹۵۱ء میں ملک میں تیل کی صنعت کو قومیانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم تھا۔ بہت جلد دونوں کے مابین اختلافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ مصدق نے مجلس کو توڑ دیا اور شہنشاہ کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا لیکن اپریل ۱۹۵۵ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا اور شہنشاہ نے انتظامات خود سنبھال لیے۔

شہنشاہ محمد رضا خاں پہلوی کی زیر قیادت ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا ۱۹۶۲ء کے ایک فرمان کی رو سے ایران میں زبردست معاشرتی انقلاب لایا گیا۔ اسے "سفید انقلاب" کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کا آغاز شہنشاہ نے اپنے ہاتھ سے کیا اور سب سے پہلے اپنی ذاتی کو ششوں سے سرکاری اراضی کو کسانوں میں تقسیم کرنا شروع کیا۔ اس کی بنا پر اصلاحات اراضی کا مسودہ پیش کیا گیا۔ حد ملکیت مقرر کر دی گئی۔ جنگلات کو قومی ملکیت قرار دیا گیا۔ سرکاری کارخانے کے حصوں کو عوام میں فروخت کیا گیا۔ کارخانوں کے منافع میں مزدوروں کی شرکت کا اہتمام کیا گیا قانون انتخابات میں ترمیم کی گئی۔ نیز سپاہ دانش کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اصلاحات کی مخالفت اعلیٰ طبقے کی طرف سے ہوئی تو ۲۶ جنوری ۱۹۶۲ء کو شہنشاہ نے اسے

Marfat.com

عوام کے سامنے استصواب رائے کے لیے پیش کر دیا۔ جسے بھاری اکثریت نے منظور کیا۔

قانون اصلاحات اراضی کو دو مرحلوں میں نافذ کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں ہر زمیندار کل جائداد کا صرف دسواں حصہ اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ باقی جائداد حکومت نے خرید کر دوسرے مرحلے کے تحت کسانوں کے ہاتھ فروخت کر دی۔ زمینداروں کو ان کا معاوضہ دس سال میں دیا گیا اور کسانوں سے زمین کی قیمت پندرہ سال میں وصول کی گئی۔

دوسرا بڑا کارنامہ سپاہ دانش کا قیام تھا۔ اس سپاہ کا مقصد تعلیم بالغاں کا فروغ تھا۔ تاکہ جہالت اور بے علمی کے خلاف جہاد کر سکے گاؤں کے رہنے والوں کی بہبود و تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ انھیں معاشرت کے جدید طریقوں سے آشنا کیا جائے اور زراعت کے جدید طریقے سکھائے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ایران کی نصف آبادی خواندہ ہو چکی ہے۔

سپاہ دانش کے ساتھ ساتھ صحت اور آبادکاری کی سپاہ بھی قائم کی گئیں ان کے لیے نوجوانوں کو چار ماہ کی تربیت دی جاتی اور انھیں دیہات میں بھیج دیا جاتا تھا۔

اقتصادی و دیگر معلومات:- ایران ایک آئینی بادشاہت ہے، جس کا قانون ساز ادارہ "مجلس" ٣٠ دسمبر ١٩٠٦ء میں وجود میں آیا تھا۔ فروری ١٩٥٠ء میں سینیٹ کا قیام عمل میں آیا۔ ١٩٤٩ء اور ١٩٥٠ء کی ترامیم کی رو سے مجلس ملی کے ارکان کی تعداد ایک سو چھتیس سے بڑھا کر دو سو کر دی گئی اور ان کا عرصہ انتخاب چار سال قرار پایا۔ شاہ کو مجلس توڑنے کا اختیار حاصل ہے۔ ٢ مارچ ١٩٧٥ء کو شہنشاہ نے قومی سیاسی تحریک کا آغاز کیا۔ اپریل ١٩٧٥ء میں امیر عباس ہویدا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

ایران چودہ استانوں (صوبوں) پر منقسم ہے۔ یہ استان گیلان (صدر مقام رشت) مازندران (ساری)، مشرقی آذربائیجان (تبریز)، مغربی آذربائیجان (رضائیہ)، کرمان شاہ (کرمان شاہ)، خوزستان (اہواز)، فارس (شیراز)، کرمان (کرمان)، خراسان (مشہد)، اصفہان (اصفہان)، کردستان (سنندج)، سیستان، بلوچستان (زاہدان) تہران (تہران) اور سمنان (سمنان) ہیں۔ تمام استان ڈویژنوں پر منقسم ہیں جنھیں شہرستان کہا جاتا ہے۔ ہر شہرستان پر فرماندار حکومت کرتا ہے۔ یہ شہرستان مزید بخشوں پر منقسم ہیں، جن کا حاکم بخشدار کہلاتا ہے۔ یہ اضلاع کہلاتے ہیں، جو دہستانوں میں تقسیم کیے گئے ہیں، ان کے حاکم دہ دار کہلاتے ہیں۔

ایران سینٹو اور آر سی ڈی کا ایک اہم رکن ہے۔ ایران کا سرکاری مسلک شیعی اثنا عشریہ ہے۔ تمام مساجد اور مزار محکمہ اوقاف کے ماتحت ہیں اور تمام مدارس محکمہ تعلیم کے ماتحت ہیں۔ جولائی ١٩٤٣ء میں لازمی پرائمری تعلیم نافذ کی گئی تھی۔ ١٩٧٢ء میں تقریباً اسی فیصد بچے سکول جاتے تھے۔ اس وقت خواندگی کی شرح ٥٠٪ کے قریب ہے۔ نظام تعلیم پر فرانسیسی اثر غالب ہے۔ تہران یونیورسٹی ایران کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کے علاوہ شیراز، تبریز رضائیہ، اصفہان، مشہد اور اہواز میں بھی یونیورسٹیاں اور فنی تعلیم کے ادارے ہیں۔

ایرانی سکہ ریال ہے، جو سو دیناروں پر منقسم ہے۔ چوتھے پنجسالہ منصوبے ١٩٦٨ء تا ١٩٧٢ء پر چھ کھرب دس ارب ریال صرف کیے گئے۔ اس کا آٹھ فیصد تعلیم اور تیرہ فیصد زراعت پر صرف کیا گیا۔

ملک کی برآمدات میں مٹی کا تیل، اون، کپاس، ریشم، پھل، بادام خشک

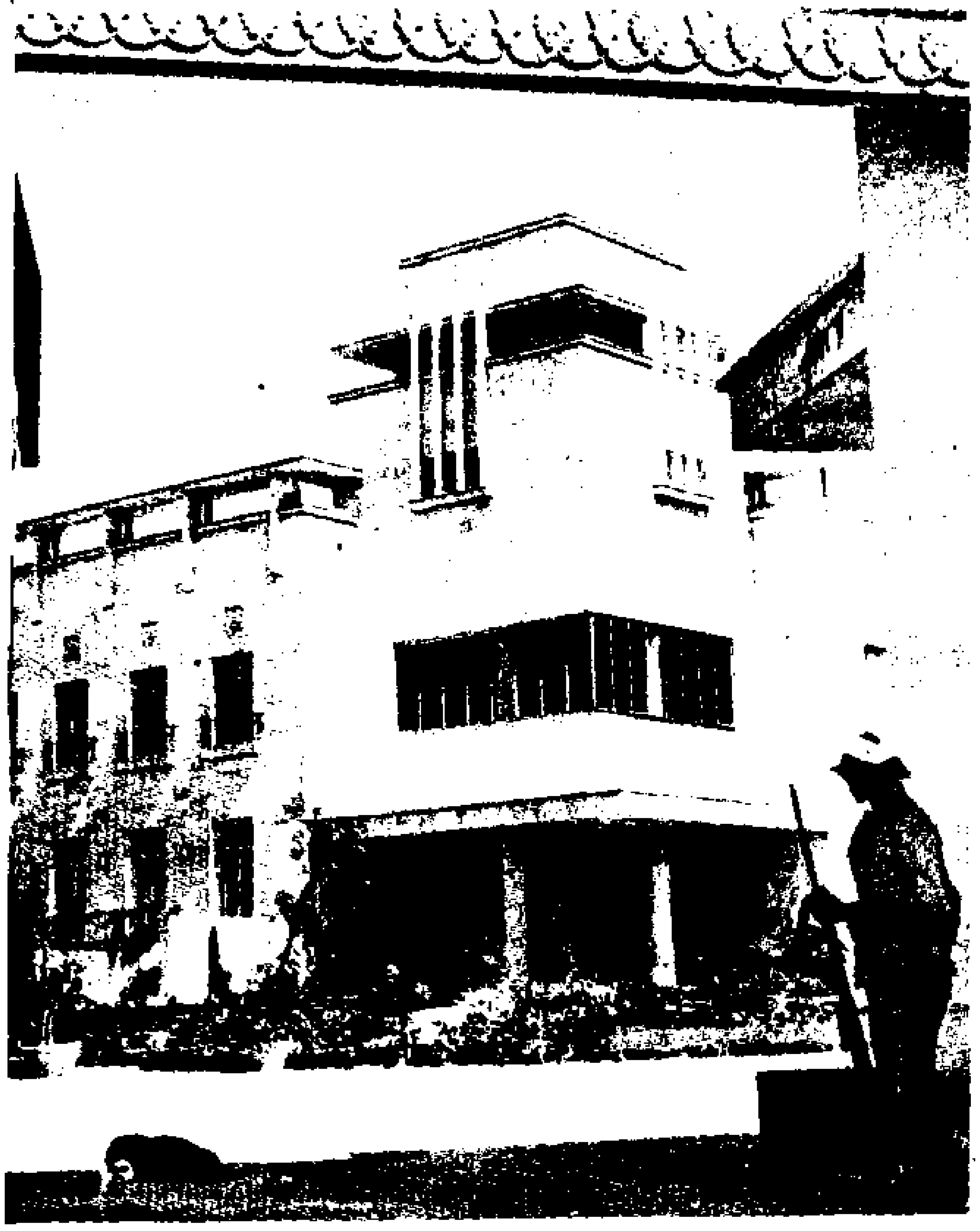

ایرانی شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کا محل

میوہ، سبزیاں، عمارتی لکڑی تانبا، کوئلہ، قالین، کھالیں، سمور، تمباکو اور پلاسٹک کی اشیاء شامل ہیں، زیادہ تر آمدنی مٹی کے تیل سے ہوتی ہے۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کے ساتھ ہوتی ہے ملک بھر میں ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ کئی کمپنیاں ہوائی اور بحری جہاز چلاتی ہیں۔ مجموعی لحاظ سے ایران ترقی پذیر ملکوں میں سب سے آگے ہے۔ (نیز دیکھیے "فارسی")

ایفائے عہد

وعدے یا عہد کا پورا کرنا۔ اسلام میں ایفائے عہد و وعدہ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:-

"اور اے پیغمبر) قرآن میں اسماعیل کا ذکر (بھی لوگوں سے بیان) کر کہ وہ وعدے کے بڑے سچے تھے اور (ہمارے) بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔" (١٩:٥٤)

حدیث میں آتا ہے۔ عبداللہ بن ابی الحمساء سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی بعثت سے پہلے ایک چیز خریدی تھی اور بیع کی کچھ قیمت میرے ذمے رہ گئی تھی میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ باقی قیمت اسی جگہ حاضر کرتا ہوں اور تین روز کے بعد وعدہ یاد آیا (گیا تو دیکھا) آپ اسی جگہ تشریف رکھتے ہیں۔ (مجھے دیکھ کر) فرمایا عبداللہ تو نے مجھے سخت تکلیف دی میں تین روز سے اسی جگہ بیٹھا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ (ابو داؤد)

وعدہ ایفا کرنے کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جو ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو اپنے بھائی سے جھگڑا مت کر اور نہ اس سے (اس درجہ) مزاح کر (جس سے اسے تکلیف ہو) اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کر جسے پورا نہ کر سکے۔ (ترمذی)

Marfat.com

ایلاء قسم کھانا۔ اصطلاح میں مرد کا قسم کھانا کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اگر مرد یہ قسم کھا لینے کے بعد چار مہینے کے اندر اندر اپنی عورت کے پاس چلا جائے تو وہ حانث ہو جائے گا۔ یعنی قسم ٹوٹ جائے گی اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ اور اگر چار مہینے گذر جائیں اور عورت کے پاس نہ جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت مرد سے جدا ہو جائے گی۔ کیونکہ اس عرصہ کا گذر جانا ہی عورت کے حق میں طلاق بائنہ ہے۔ مگر دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چار مہینے گذرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی اور عورت مرد سے جدا نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک مرد کو یہاں تک قید رکھا جائے گا کہ وہ یا تو عورت کی طرف رجوع کرے اور قسم کا کفارہ دے دے یا طلاق دے کر عورت کو چھوڑ دے۔ اس صورت میں اگر وہ طلاق دینے سے انکار کرے گا تو قاضی عورت کو طلاق دے دے گا۔

ایلاء کے بارے میں قرآن مجید میں یوں آیا ہے:۔

"جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں انہیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر (اس مدت میں) اگر رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کی ٹھان لیں تو بھی اللہ سنتا اور جانتا ہے۔" (۲: ۲۲۶) (نیز دیکھئے "طلاق")

ایلاف، سورۃ قرآن مجید کی ایک سورت، جس کا دوسرا نام سورت القریش ہے۔ (دیکھئے "القریش، سورۃ")

ایل خانیہ مغل خاندان جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری / تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں ایران پر حکمران رہا۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں ابوسعید کی وفات پر (کیونکہ اس کے اولاد نرینہ نہ تھی) اس خاندان کی اصل شاخ ختم ہو گئی۔

ایل خانیوں کی حکمرانی میں دریائے جیحون سے بحر ہند تک اور دریائے سندھ سے دریائے فرات تک کا علاقہ اور اس کے علاوہ ایشیائے کوچک کا بہت سا حصہ اور کوہ قاف کے علاقے بھی شامل تھے۔ بعد میں بعض مشرقی علاقے چغتائیوں کے قبضے میں آ گئے۔ ایل خانیوں نے جنوبی ایران اور ایشیائے کوچک کے ان خانوادوں کو بھی آہستہ آہستہ ختم کر کے ان کی جگہ اپنے عامل مقرر کر دیئے۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں سلطان مصر سے شام کا علاقہ لینے کی کوشش بھی کی جو اگرچہ ناکام رہی ان تمام خامیوں کے باوجود جو اکثر فرمانرواؤں کی انتظامی معاملے میں تھیں یہ دور ایران میں بڑا ترقی کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ غازان خان کے عہد میں جب فاتحین نے مکمل طور پر اسلام قبول کر لیا تو اس دور میں کئی نئے شہر آباد ہوئے۔ تبریز اور سلطانیہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ سلطانیہ میں الجائتو کے مقبرے جیسی عالیشان اور خوب صورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اس دور میں ایران میں تاریخ نویسی نے وہ ترقی کی جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس دور میں ہیئت۔ طب اور ریاضی کے علوم میں خاص طور پر ترقی ہوئی۔

ایلغازی ارتقی خاندان کے شمالی عراق عرب پر حکومت کرنے والے دو حکمران

۱۔ نجم الدین ایلغازی: ارتقی خاندان کا پہلا فرمانروا۔ باپ کا نام ارتق تھا۔ ایران کی سلجوقی سلطنت حاصل کرنے کے لیے تتش کا مددگار رہا۔ تتش کی شکست اور وفات کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ بیت المقدس کی طرف چلا گیا۔ جہاں سے مصریوں کے چالیس دن محاصرہ کرنے کے بعد نکلنا پڑا۔ ۴۸۹ھ/۱۰۹۶ء میں وہ نئے فرمانروا سلطان محمد کا رفیق بن گیا۔ جس نے ۴۹۴ھ/۱۱۰۰ء میں بغداد کا والی مقرر کر دیا۔ اور چار سال کے بعد اس عہدے سے معزول کر دیا گیا تو سلطان سے بگڑ بیٹھا۔ ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء وا۵۰۱ھ/۱۱۰۷ء میں ماردین کا نہایت اہم قلعہ فتح کیا۔ ۵۰۴ھ تا ۵۰۸ھ/۱۱۱۱ء تا ۱۱۱۵ء میں ایلغازی نے صلیبی جنگ میں شرکت سے نہ صرف انکار کر دیا۔ بلکہ انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرنے پر بھی راضی ہو گیا۔ اور تقریباً دس ہزار مسلمانوں کی فوج لے کر انگریزوں کی حمایت کے لئے آیا۔ اگرچہ جنگ نہ ہوئی۔ سلطان محمد کی وفات کے بعد اس کے بیٹے محمود کی جانشینی کے بعد ایل غازی نے سلجوقی حکومت سے تعلقات پیدا کر لئے۔ ۵۱۲ھ/۱۱۱۸ء میں حلب اس کے قبضے میں آ گیا۔ حلب پر حکمران ہونے کے بعد وہ فرنگیوں کا ہمسایہ بن گیا اور اب ان کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۵۱۳ھ/۱۱۱۹ء میں اس نے بیس ہزار فوج لے کر تل عفرین کی وادی میں فرنگیوں کی کم تعداد فوج کو زیر کیا۔ فرنگی فوج کی اکثریت یا تو قتل کر دی گئی یا کچھ کو قید کر لیا گیا انطاکیہ کا حاکم بھی مارا گیا۔ اس فتح کے بعد ایل غازی کی فوجی قابلیت کا دور دور چرچا ہو چلا تھا۔ یہاں تک کہ سلطان محمود نے عیسائی گرجستانوں کے خلاف اسلامی لشکر کی کمان اس کے سپرد کی۔ لیکن اس معرکے میں اس نے شکست کھائی اور تفلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء میں سلطان نے ان علاقوں کے علاوہ جو پہلے ایل غازی کے پاس تھے۔ میافارقین بھی اسے دے دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ساٹھ سال کی عمر میں رمضان ۵۱۶ھ/نومبر ۱۱۲۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

ایل غازی نے پہلی شادی طغتگین کی بیٹی ایل خاتون سے کی۔ دوسری شادی حلب کے سابق حاکم رضوان کی بیٹی فرخندہ خاتون سے کی جب کہ وہ حلب کا حاکم تھا۔ وہ بہت بہادر اور اولوالعزم آدمی تھا۔ وہ ان مسلمان امراء میں سے تھا جنہوں نے نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی سے پہلے شمال اور مشرق میں صلیبیوں کی یلغار کو روکا۔

۲۔ قطب الدین ایلغازی ثانی:۔ ارتقی خاندان کا دوسرا فرمانروا۔ اپنے باپ نجم الدین ایلغازی کے بعد ماردین، میافارقین اور راس العین کا حکمران) ۵۷۲ھ/۱۱۷۶ء میں جانشین بنا۔ اس نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کے لیے بیرہ کے ضلع کی طرف پیش قدمی کی۔ تاریخ میں اس کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ ۵۷۹ھ/۱۱۸۳ء میں اپنے ماموں سقمان ثانی اور موصل کے حاکم عزالدین مسعود اول کے اتحاد میں شامل ہو گیا کہ کسی طرح صلاح الدین کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ لیکن ماموں کی وفات کے بعد صفر ۵۸۰ھ/مئی ۱۱۸۴ء میں اس کی فوجیں سلطان صلاح الدین کی فوجوں میں شامل ہو گئیں۔ جمادی الآخر ۵۸۰ھ/ستمبر ۱۱۸۴ء میں اس نے وفات پائی۔ اس نے کانسی کے سکے جاری کئے اور اس پر خود کو ملک الامراء لکھوایا۔

ایلہ خلیج عقبہ کے شمالی سرے پر واقع ایک بندرگاہ، جس پر آج کل اسرائیل کا ناجائز قبضہ ہے۔ تورات میں اس کا نام ایلات ہے جو عربی میں ایلۃ ہے۔ عصیون جابر اور ایلات ایک ہی مقام کا نام ہے۔ اس پر حضرت سلیمانؑ کے عہد سے یہودیوں کا قبضہ ہو گیا اور چوتھی صدی قبل مسیح تک ان ہی کا قبضہ رہا۔ تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں جنوب مشرق کی جانب تھوڑے فاصلے پر اسے آباد کیا گیا۔ اسلامی فتوحات تک اسی مقام پر واقع تھا۔ بطلیموس کے زمانہ میں ایلہ بلاد عرب اور حبشہ کے درمیان تجارتی بندرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ رومیوں کے عہد میں یہ دسویں سرحد لشکر کی قلعہ نشین

Marfat.com

تَوج کا مقام ہاوہ ٢٢ ربیع ایلہ ایک اسقف کا صدر مقام بن گیا۔ ظہور اسلام سے کچھ پہلے یہ غسّان کے قبائلی ملوک کے علاقے میں شامل تھا۔ دورِ اسلامی میں ایلہ کا ذکر سب سے پہلے ٩ ھ/٦٣٠ ء میں آیا جب آنحضورؐ تبوک سے واپس آ رہے تھے تو اس شہر والوں نے اپنے اسقف یوحنا بن روبہ کی سرکردگی میں امن و امان کے ساتھ آنحضورؐ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور سالانہ ایک دینار فی مرد اور عورت جزیہ دینا منظور کیا تھا۔ جو کہ کل تین سو دینار بنتے تھے۔ مسلمانوں کے دور میں یہ جگہ مصر اور شام سے آنے والے حاجیوں کا مقام اتصال بن گیا جس کی وجہ سے یہاں تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ یہ شہر ملک شام کے متعلقات میں شمار ہوتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ نہایت خوشحال اور بارونق شہر تھا۔ ٤١٥ ھ/١٠٢٤ ء میں عبداللہ بن ادریس اور بنو الجراح کے کچھ آدمیوں نے ایلہ کو تاراج کیا اور کہا جاتا ہے کہ یہ شہر ٤٦٥ ھ/١٠٧٢-٧٣ ء میں زلزلے سے بالکل تباہ ہو گیا۔

ایلہ عرصہ دراز تک صلیبی جنگوں میں کش مکش کا مرکز بھی بنا رہا۔ شاید اسی وجہ سے اس کا زیادہ حصہ کھنڈروں کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ٥١٠ ھ/١١١٦ ء میں شاہ یروشلم بالڈون اوّل نے اس پر قبضہ جما لیا اور اس کو لاطینی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ ٥٦٦ ھ/١١٧١ ء میں سلطان صلاح الدین نے لاطینیوں کو اس سے نکال باہر کیا۔ مگر ٥٧٨ ھ/١١٨٢ ء میں کچھ عرصہ کے لئے دوبارہ اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا اور بالآخر ٥٧٩ ھ/١١٨٣ ء میں ایلہ مسلمانوں کے قبضہ میں مکمل طور پر آ گیا۔ اگرچہ اس کی حالت بہت زیادہ خراب و خستہ تھی۔ اس وقت اس شہر میں صرف ساحل کے قریب ایک قلعہ باقی رہ گیا تھا۔

ایلیا:۔ بائبل کی رُو سے اللہ تعالےٰ کے ایک برگزیدہ نبی (دیکھیے "الیاس")

ایمان کا مطلب ہے ماننا، اطمینان کرنا۔ تسلیم کرنا۔ امام راغب کے نزدیک اس کا مطلب ہے زبان سے اقرار کرنا، دل سے تصدیق کرنا اور عمل سے ظاہر کرنا۔ اسلامی اصطلاح میں ایمان کفر کی ضد ہے اور اسلام کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ مگر قرآن مجید کی بعض آیات سے اسلام اور ایمان الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایمان کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے "اللہ پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، اس کے فرشتوں پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان اور یوم آخرت پر ایمان"۔ مختلف احادیث سے بھی ایمان کی پانچ ہی شاخوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض دیگر روایات میں بہت سے نیک اعمال کو بھی ایمان میں شامل کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "ایمان کی ستر سے بھی زیادہ شاخیں ہیں اور ان میں اوّل ترین درجہ لا الٰہ الا اللہ کا ہے اور ادنےٰ ترین درجہ راستے سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دینا ہے، نیز حیا اور غیرت بھی ایمانی صفات میں بڑا مرتبہ رکھتی ہیں۔" (بخاری، مسلم)

کیا ایمان اور اسلام ایک ہی شے ہیں یا دو مترادف اصطلاحیں ہیں۔ اس کے لئے نیز دیکھیے "اسلام"۔ تاہم یہاں ایک بات واضح کرنے کی ضرورت ہے ایمان اسلام کا بنیادی جزو ہے اور ایمان کے بغیر اسلام مکمل نہیں ہوتا۔ گویا ایک شخص مسلمان تو ہے لیکن مومن تبھی ہو سکتا ہے جب اس کا ایمان کامل ہو۔ امام غزالی کے نزدیک اعمال صالح ایمان کو تقویت دیتے ہیں۔

بنیادی پانچ ایمانیات میں سب سے پہلا اللہ تعالےٰ پر ایمان ہے کہ وہ اس دنیا کا مالکِ حقیقی اور واحد ہے۔ وہی ہر ظاہر و باطن سے آگاہ اور مقصودِ عبادات ہے اس کے حکم کے مطابق ہمیں زندگی بسر کرنا ہے اور نیز ہمیں محاسبۂ اعمال اور ذات الٰہیہ کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔

دوسرا جزو یہ ہے خدا کے رسولوں پر ایمان لایا جائے کہ خدا اپنے احکامات انہی بندوں کے ذریعے ہم تک پہنچاتا ہے۔ یہ تمام انبیاء سچے، راست باز اور معصوم تھے اور بذات خود نیکی کا نمونہ تھے۔

تیسرا جزو یہ ہے کہ فرشتوں کے وجود پر ایمان لایا جائے۔ نیز یہ کہ فرشتے خدا اور رسولوں کے مابین قاصد اور سفیر ہیں اور نظام کائنات کو قانون الٰہی کے مطابق چلا رہے ہیں اور ہمارے اعمال کے نگران ہیں۔

چوتھا جزو یہ ہے کہ پیغمبروں نے خدا کے پیغام کو کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ ان کے وجود پر ایمان لایا جائے۔ جو کچھ ان کتابوں میں موجود ہے، اسے برحق اور راہِ ہدایت مانا جائے۔

پانچواں اور آخری جزو یہ ہے کہ دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے اور وہاں اعمال کی بازپرس کو برحق مانا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ روزِ جزا ہی انسانیت کی فلاح ہو گی۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے۔ اسلام کا انسان سے یہی مطالبہ ہے کہ وہ ایمان لائے کیونکہ اعمال کی اساس یہی ہے۔ اگر ہم عقلی طور پر ایمانیات کی توجیہ کریں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریہ ہے کہ:۔

١۔ کائنات کا نظام ایک ایسی ہستی چلا رہی ہے، جو اپنے ارادے اور تصرف میں بالکل آزاد ہے۔ وہی خالق ازل ہے، وہی قادر مطلق ہے۔

٢۔ نظام کائنات کو چلانے کے لئے اس ہستی ازل نے بے شمار دوسری ہستیاں پیدا کر رکھی ہیں، جو اس کائنات میں اس کے احکامات نافذ کر رہی ہیں

٣۔ انسان میں قدرت نے دو قوتیں خیر اور شر کی رکھی ہوئی ہیں اور اسے دونوں کے اختیار کی قوت ہے۔ تاہم اسے سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس خالق ازل نے چند بہترین انسانوں کو علم عطا کیا اور انہیں ہدایت کے لئے مامور کیا

٤۔ قادر مطلق نے انسان کو جو ہدایات دیں وہ کسی نہ کسی صورت میں کتاب یا صحیفے کی شکل میں ہیں۔

٥۔ بالآخر اس کائنات کو ختم ہونا ہے اور ہر فرد کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ گویا یہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ موت کے بعد چلے گی۔

اب رہی ان تمام باتوں کو ماننے کی تو اس کے بغیر چارہ نہیں کہ خواہ خدا کی حقیقت ہمارے سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اس کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے

، ملائکہ کا وجود سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن نظام کائنات کو چلانے والی چند ثانوی قوتوں کے وجود کو ماننا پڑتا ہے۔ پیغمبروں اور الہامی کتابوں پر خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے لیکن ان کے وجود سے منکر نہیں ہو سکتا اور اس بنا پر انہیں جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا کہ آخر دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم کے پیغمبر نے ایک سا پیغام ہی کیوں دیا ہے! رہا موت کے بعد کی زندگی اور محاسبۂ اعمال کا سوال تو اس کا جواب اتنی سی بات میں مضمر ہے کہ موجودہ انسانی زندگی ناکافی ہے کہ اس میں کسی قسم کا نظام اخلاق قائم ہو سکے اور کسی کے جرم کی پوری پوری سزا مل سکے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی دوسرا جہان ہو اور یہ زندگی موت کے بعد آئے تاکہ اعمال کا پورا پورا صلہ مل سکے۔

Marfat.com

اسلامی تہذیب و تمدن میں ایمانیات کا حصہ بنیادی ہے بقول مولانا مودودی ایمانیات کے تصور سے ایک عقلی نتیجے کے طور سے یہ قرار پایا ہے کہ انسان کی زندگی کا نصب العین اپنے خالق اور آقا کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس نصب العین کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے۔

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر اور ناہی حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے اختیار کو احکام خداوندی کے تابع کر دے۔

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انھی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے نامکمل نتائج سے دھوکا نہ کھائے۔

(نیز دیکھیے "آخرت"، "آسمانی کتب"، "ارکان اسلام" "اسلام" "توحید"، "تہذیب اسلامی"، "رسالت"، "عبادت"، "عقیدہ"، "عمل صالح"، "فرشتہ" اور دیگر متعلقہ عنوانات)

ایمن بن خریمؓ

صحابی، فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ مسلمانوں میں باہم جو جنگیں ہوئیں ان سے الگ تھلگ رہے۔ خلفائے بنو امیہ سے ان کے گہرے اور دوستانہ تعلقات تھے۔ خاص کر مروان سے بہت گہرے مراسم تھے اور وہ مروان کے دربار میں بلا روک ٹوک ہر وقت آتے جاتے تھے۔ اسی راہ و رسم کی بنا پر لوگ انہیں خلیل الخلفاء کہتے تھے۔ شاعر تھے لیکن صرف رزمیہ اشعار کہتے تھے۔ آپ نے آنحضورؐ سے چند احادیث روایت کی ہیں۔

اینال

سیف الدین العلائی الملک الاشرف سلطان مصر و شام۔ سلطان برقوق کا غلام۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء سے ۸۶۵ھ/۱۴۶۰ء تک حکمران رہا۔ سلطان برقوق نے اسے فوج کے مملوک دستے میں بھرتی کر لیا تھا۔ بعد ازاں سلطان کے بیٹے سلطان الناصر فرخ نے اسے آزاد کر کے جمدار کی فوج میں بھرتی کیا۔ ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں اس کو خاصکی کا عہدہ عطا ہوا۔ سلطان المویّد کی وفات پر دس مملوکوں کا امیر مقرر کیا گیا بعد ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء تا ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء سلطان برس بے کے عہد حکومت میں وہ اور بڑے عہدوں پر فائز ہوا۔ چنانچہ وہ رئیس طبلخانہ، رئیس نوبت، وغیرہ کے عہدوں پر فائز رہا ۸۳۱ھ ۱۴۲۸ء میں غزہ کا والی مقرر کیا گیا۔ ۸۴۰ھ/۳۷-۱۴۳۶ء میں صفد کا حاکم بنا۔ ۸۴۲ھ ۱۴۳۹ء میں قاہرہ واپس آیا اور سلطان چقمق نے اسے ایک ہزاری امیر لغیر کسی عہدے کے مقرر کیا۔ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء میں وہ اوادار کبیر بنا دیا گیا۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں سلطان چقمق کے بیٹے کی جگہ اینال کو ۷۳ سال کی عمر میں سلطان منتخب کیا گیا۔ اس کا دور حکومت بڑا خیر و برکت والا تھا۔ اس نے اپنے پیشروؤں کے ڈھالے ہوئے چاندی کے ناقص سکے واپس لے کر نئے اور بہتر سکے جاری کئے۔ ملک کے خارجی معاملات میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا۔ انہی تعلقات کی وجہ سے جو قبرص اور مصر کے مابین تھے۔ اینال یورپ کی سیاست میں بھی حصہ لینے لگا۔

اینال بہت نرم طبیعت اور رحم دل بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی رعایا پر عدل اور نرمی کے ساتھ حکومت کی۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے احمد کو اپنا جانشین تسلیم کر لیا تھا۔ وہ بڑا دور اندیش حاکم تھا۔ احمد سرکش مملوکوں پر قابو نہ پا سکا اور اس طرح وہ چار ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔

ایوبؑ

اللہ تعالےٰ کے ایک برگزیدہ نبی۔ جن کا صبر بہت مشہور ہے اور ضرب المثل بن چکا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے نسب سے تھے اور بقول ابن عساکر ان کی والدہ حضرت لوطؑ کی بیٹی تھیں۔ تورات کے اکثر محققین کے نزدیک حضرت ایوبؑ عربی تھے۔

قرآن شریف میں حضرت ایوبؑ کا ذکر سورۃ النساء، الانعام، الانبیاء اور صٓ میں آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ " مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔" ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اسے دور کر دیا۔ اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے اپنی خاص رحمت کے طور پر اور اس لئے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گذاروں کے لیے۔" (۲۱: ۸۳ تا ۸۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

" اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو۔ جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مارو! یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لئے۔ ہم نے اسے اس کے اہل و عیال واپس دیئے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر (اور ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک گٹھا لے اور اس سے مار دے اپنی قسم نہ توڑ۔ ہم نے اسے صابر پایا۔ بہترین بندہ اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہے۔ (۳۸: ۴۱ تا ۴۴)

عہد نامہ قدیم میں اس قرآنی شخصیت سے مماثلت رکھنے والی ایک شخصیت کا ذکر موجود ہے۔ بائیبل میں ان کا نام جوب (Job) ہے اور ان کی طرف ایک صحیفہ منسوب ہے۔ بائیبل میں جو کتاب ایوب کے نام سے منسوب ہے وہ بعد کی تصنیف ہے۔

حضرت ایوبؑ کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اسی وجہ سے آپ بہت زیادہ خیرات اور صدقات کرتے تھے۔ آپ غریبوں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے تھے بڑے مہمان نواز تھے۔ اجنبیوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ آپ کی زندگی میں بڑی بڑی آزمائشیں آئیں آپ ان آزمائشوں میں صابر نکلے اور کامیاب و کامران رہے۔

ایوبؑ کے بارے میں زیادہ تر معلومات بائیبل سے ماخوذ ہیں۔ کتاب "ایوب" میں درج ہے کہ "عوض کی سرزمین میں ایوب نامی ایک شخص تھا۔ وہ کامل اور صادق تھا اور خدا سے ڈرتا اور بدی سے دور رہتا تھا۔" (۱:۱) کتاب "تورات" اور "تواریخ" میں ایک اور نام یوباب آتا ہے۔ محققین کے نزدیک یہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ جب کہ تورات کے مطابق یوباب اور ایوب دو جدا جدا شخصیتیں ہیں یوباب بنی یقظان سے ہیں اور ایوبؑ بنی ادوم (عیسو) سے ہیں۔ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوبؑ عرب تھے۔ عرب میں ظاہر ہوئے اور کتاب "ایوب" اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔" سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایوبؑ بنی ادوم میں سے ہیں اور ان کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م کے درمیان ہے۔ ان کی تائید مشہور مورخ یعقوبی کے قول سے ہوتی ہے۔

Marfat.com

وہ لکھتا ہے کہ یوباب ہی ایوب صدیق بن زارح ہیں۔ بعض دیگر محققین کے نزدیک حضرت ایوب کا زمانہ ۱۵۰۰ ق-م سے ۱۳۰۰ ق م کی حدود میں ہے۔ امام بخاری نے "کتاب الانبیاء" میں حضرت ایوبؑ کا ذکر حضرت یوسفؑ کے بعد اور حضرت موسٰیؑ سے پہلے کیا ہے۔

قرآن مجید کے مندرجہ حوالہ جات سے یہ علم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب ایک پاک اور مقدس انسان تھے اور مصائب کے ذریعے ان کا امتحان لیا گیا تھا، جس میں وہ ضابر رہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایوبؑ تیرہ سال تک مصائب میں مبتلا رہے۔

اسرائیلیات کے مطابق شیطان حضرت ایوبؑ کی پرہیزگاری اور خداترسی سے جل بھن اٹھا۔ اس نے اللہ تعالےٰ سے حضرت ایوب کو آزمانے کے لیے اجازت مانگی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے تین مراحل میں حضرت ایوبؑ کو آزمانے کی اجازت دی گئی۔ سب سے پہلے ان کا سارا مال تباہ و برباد ہو گیا لیکن آپؑ نے اس پر صبر کیا تو پھر آپ کی ساری آل اولاد ختم ہو گئی۔ حضرت ایوبؑ نے اس پر بھی صبر کیا تو پھر ان کے جسم کو بیماری سے آزمایا گیا۔ سارے جسم میں کیڑے پڑ گئے اور کوئی ان کے قریب نہ آتا تھا۔ سوائے ایک بیوی کے جو ان کی خدمت گزار تھی۔ یہاں تک کہ آپ کو اس جگہ پر پھینک دیا گیا جہاں گندگی پڑتی ہے۔ اس وقت بھی بیوی نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا جب اس آزمائش میں بھی آپ کے پاؤں میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوئی تو شیطان نے آپ کو اس طرح بہکانے کی کوشش کی جس طرح حوا کے ذریعے آدمؑ کو بہکایا تھا لیکن آپ شیطان کی اس چال کو سمجھ گئے اور قسم کھائی کہ اگر بیوی نے شیطان کی بات پر کان دھرا تو اسے پیٹیں گے۔ بالآخر جبرئیلؑ اللہ تعالےٰ کا یہ پیغام لائے کہ آپؑ ایک کراماتی چشمے کے ذریعے اس مصیبت سے نجات پائیں گے۔ چنانچہ آپ نے اس چشمے کا پانی پیا اور اس میں نہائے اور اس طرح صحت یاب ہو گئے۔ آپ کا مال آپ کی جائیداد آپ کے بچے پہلے سے بھی دو چند ہو کر آپ کو واپس مل گئے۔ آپؑ کے اس صبر و تحمل سے صبرِ ایوب کی ترکیب نکلی ہے۔ اور اسی مقام پر جہاں آپ نے زندگی گزاری تھی، طبری کے بقول ۹۳ برس اور کتاب "سفرِ ایوب" کی رو سے ۱۴۰ برس میں وفات پائی۔

حضرت ایوبؑ حضرت یوسفؑ کے بعد نبوت پر سرفراز ہوئے تھے۔ ایک قول کے مطابق حضرت سلیمانؑ کے بعد آپؑ کا نمبر آتا ہے۔ آپ نے حوران میں اپنی قوم میں تبلیغ کی۔ یہ علاقہ عرب میں تھا اور غالباً یہ وہی علاقہ ہو گا جو قوم عاد کا مسکن تھا۔ دمشق کے نزدیک نوے کے مقام پر آپ کا مقبرہ زیارت گاہ خاص و عام تھا۔ یہاں پر اب تک وہ چٹان موجود ہے جس پر آپ نے اپنی آزمائش کا عرصہ گزارا تھا اور وہ چشمہ بھی ہے جس کے پانی سے غسل کر کے آپ تندرست ہو گئے تھے۔

روایتوں میں آیا ہے کہ جب لوگوں کے مختلف گروہ جنت میں داخل ہو رہے ہوں گے تو حضرت ایوبؑ "صبر کرنے والے لوگوں" کے سردار ہوں گے۔

ایوب بن ابی تمیمہ (وفات ۱۳۱ھ/۷۴۸ء) ابوبکر ایوب بن کیسان ابی تمیمہ، علم و فضل میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ عنزہ کے غلام تھے۔ ان کے ہم عصر تمام علماء اور فقہا ان کی علمی وجاہت کو تسلیم کرتے تھے خواجہ حسن بصری نے انہیں بصرہ کے اہل علم کا "سردار" کہا ہے۔ ان کا شمار بصرہ کے ممتاز ترین حفاظِ حدیث میں ہوتا تھا۔ ان کی مرویات کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچی ہے۔ بصرہ ہی میں طاعون کی بیماری سے وفات پائی۔

ایوب خاں، محمد (۱۴؍مئی ۱۹۰۷ء — ۲۰؍اپریل ۱۹۷۴ء) پاکستان کے سابق صدر اور فیلڈ مارشل ضلع ہزارہ (صوبہ سرحد) کے گاؤں ریحانہ کے ایک متوسط فوجی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد میرداد خاں ہوڈسن ہارس کے رسالدار میجر تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں پائی۔ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کر کے علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے۔ جون ۱۹۲۶ء میں فوجی تعلیم رائل ملٹری کالج سینڈہرسٹ (انگلستان) سے حاصل کر کے ۱۹۳۲ء میں برطانوی ہندی فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ ایک سال تک رائفل فیوسیلرز میں خدمات انجام دیں پھر پنجاب رجمنٹ میں کرنل کمانڈر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر برما کے محاذ پر بھیج دیئے گئے۔ وہاں اپنے دستے کے کمانڈر رہے ۱۹۴۷ء میں کرنل کے عہدے پر ترقی ملی۔

قیام پاکستان کے بعد کرنل محمد ایوب خاں کو وزیرستان میں بریگیڈیر مقرر کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں انہیں مشرقی پاکستان میں میجر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ جہاں وہ پہلے پاکستانی جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر ہوئے۔ تقریباً ۱۹۵۰ء کے وسط میں آپ پاکستان میں ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۷؍جنوری ۱۹۵۱ء میں آپ بری فوج کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے آپ بہت سے ملکوں کے خیرسگالی دورے پر گئے۔ ان میں ایران عراق، عرب، اردن، ترکی، امریکا، اسکنڈے نیویا وغیرہ اہم ہیں۔ وہاں آپ نے پاکستان کے لیے سیاسی و فوجی دوستی کی راہیں ہموار کیں۔ اسی بنا پر آپ کو پاکستان کی سیاست میں مداخلت کرنے کا موقع مل گیا۔

۱۹۵۴ء کے اواخر میں محمد علی بوگرا نے گورنر جنرل کی دعوت پر نئی وزارت تشکیل کی۔ اس میں سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خاں کو بھی شامل کیا گیا۔ اسی وزارت نے وحدتِ مغربی پاکستان کا منصوبہ تیار کیا۔ جب سکندر مرزا صدر پاکستان بنے تو انہوں نے ملکی سیاسی صورت حال کے پیش نظر، ۷؍اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کیا۔ جنرل محمد ایوب خاں کا تقرر سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کیا گیا مارشل لاء کے تحت تمام سیاسی جماعتیں خلافِ قانون قرار دی گئیں۔ سیاست دانوں پر "ایبڈو" کا قانون نافذ کیا گیا۔ تاکہ وہ دوبارہ سیاست میں داخل نہ ہوں۔ ملک کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر اندیشہ تھا کہ اگر سابقہ نظام سیاست بحال کیا گیا تو وہی ابتری پھیلی رہے گی۔ اور ملک کو چنداں کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یہ دیکھتے ہوئے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل محمد ایوب خاں نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ پرامن فوجی انقلاب برپا ہوا اور سکندر مرزا مستعفی ہو کر ملک سے باہر چلے گئے۔ اب جنرل محمد ایوب خاں پاکستان کے صدر بھی تھے۔

صدر محمد ایوب خاں نے جس تیزی سے ملکی صورت حال کو سنبھالا، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ خانہ جنگی سر پر مسلط تھی، ہر طرف لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ ملکی اقتصادیات کا دیوالیہ نکل چکا تھا اور قومی مستقبل خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ اس حالت میں صدر محمد ایوب خاں نے ملکی دانشوروں کو اجاگر کر کے ملک و قوم کے کام پر لگا دیا۔

۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۹ء کو فوج نے صدر جنرل محمد ایوب خاں کو اعلیٰ ترین عہدہ فیلڈ مارشل پیش کیا۔ اسی روز ملک میں بنیادی جمہوریت کا نظام قائم کیا گیا۔ جس کے تحت بالغ رائے دہی کے اصول پر دونوں صوبوں سے دس ہزار ارکان منتخب ہوئے۔ اگلے برس سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں آئین کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کی رپورٹ کی روشنی

Marfat.com

میں یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا نفاذ کیا گیا۔ یہ آئین جمہوری، وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا تھا۔ اس میں پاکستان کے دونوں صوبوں (مغربی اور مشرقی) کو مساوی نمائندگی دی گئی۔

۸ رجون ۱۹۶۲ء کو مارشل لاء ختم کر کے نیا آئین نافذ کیا گیا اور صدر ایوب نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا۔ سیاسی عہدہ صدارت پر فائز ہوتے ہی صدر ایوب نے ملکی اصلاحات نافذ کرنا شروع کیں۔ زرعی اصلاحات کے تحت ملک سے پہلی بار جاگیرداری کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ زمین کی حد ملکیت مقرر کی گئی۔ تقریباً سوا بائیس لاکھ ایکڑ رقبہ ڈیڑھ لاکھ کسانوں میں تقسیم کیا گیا۔ پانی، بیج اور کھاد کی تقسیم کا بہتر نظام قائم کیا گیا۔ مشینی کھیتی باڑی کو فروغ دیا گیا۔ ملک کے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچا دی گئی۔ سندھ طاس کا پرانا جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں بھارت اور پاکستان کے مابین دریائی پانی کا معاہدہ ہو گیا۔ جس کی رو سے ۱۹۷۰ء میں بھارت نے تین مشرقی دریا راوی، بیاس اور ستلج کا پانی بند کر لینا تھے۔ عالمی بینک سے پاکستان کو متبادل نہری نظام قائم کرنے کے لیے قرضہ دیا گیا اور یوں دنیا کے سب سے بڑے بند (منگلا اور تربیلا) اور سب سے بہتر نہری نظام وجود میں آئے۔ یوں ملک کا اقتصادی نظام پہلی بار صحیح بنیادوں پر استوار ہوا۔ ماہرین معاشیات نے صدر ایوب کے دور کو پاکستانی معیشت کا سنہری دور کہا ہے۔

جنوری ۱۹۶۵ء میں نئے آئین کے تحت دوبارہ انتخابات ہوئے۔ تقریباً اسی ہزار ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ صدر ایوب نے پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو کی اور اس کے صدر کی حیثیت سے انتخابات میں شریک ہوئے۔ تمام سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ متحدہ حزب مخالف قائد اعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو مشترکہ صدارتی امیدوار کی حیثیت سے سامنے لائی۔ اگرچہ صدر ایوب نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی لیکن مشرقی پاکستان اور خصوصاً ڈھاکہ میں محترمہ فاطمہ جناح بھاری اکثریت سے کامیاب رہیں۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے پاکستان کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان کی کمان میں پاکستان افواج نے بھارت کو زبردست شکست دی شکست خوردگی کے بعد بھارت اقوام متحدہ کی طرف امن کے لئے بھاگا اور بالآخر ۲۳ ستمبر کو سلامتی کونسل کی ہدایت پر جنگ بندی ہوئی۔

دونوں ملکوں کے مابین صلح کرانے کے لیے روس نے اپنی خدمات پیش کیں اور ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند میں صدر پاکستان محمد ایوب خاں اور وزیر اعظم بھارت لال بہادر شاستری نے دستخط کر دیئے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو صدر ایوب کے ہمراہ تھے۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کی فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء والی سرحدوں پر چلی گئیں۔ چونکہ اس اعلان سے مسئلہ کشمیر پھر سے کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اس لئے عوام میں بڑی مایوسی اور بددلی پھیل گئی۔ جگہ جگہ زبردست مظاہرے ہوئے۔ ائر مارشل اصغر خاں اور جسٹس محبوب مرشد عوام کی رہنمائی کے لئے میدان میں نکل آئے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو بھی جو اعلان تاشقند کے مخالف تھے عوامی رہنمائی کے لئے میدان میں آ گئے۔ حکومت نے مظاہروں کو دبانے کی کوشش کی، جس سے عوام کا یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ ان کے جمہوری حقوق سلب کر لئے گئے ہیں اور ملک میں نوکر شاہی کا دور دورہ ہے۔ ۱۹۶۷ء میں تمام مخالف سیاسی جماعتوں نے تحریک جمہوریت کا آغاز کیا۔

ادھر ۱۹۶۸ء کے اواخر میں صدر محمد ایوب خاں کی حکومت نے دس سالہ ترقیاتی جشن منایا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء کو سب جماعتوں کے نمائندوں نے آٹھ نکاتی جمہوری پروگرام پیش کیا اور کہا کہ جب تک انہیں پورا نہیں کیا جاتا وہ اگلے انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ یکم فروری کو صدر ایوب نے گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی پیشکش کی۔ ۲۲ فروری کو جمہوری مجلس عمل کی خواہش پر ملک گیر ہڑتال ہوئی۔ ۲۶ فروری کو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ جن میں ائر مارشل اصغر خاں اور جسٹس محبوب مرشد شامل تھے۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو (چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی) اور عبدالحمید بھاشانی (صدر نیشنل عوامی پارٹی) نے شرکت سے انکار کر دیا۔ عوامی لیگ کے صدر شیخ مجیب الرحمان نے بھی اپنا چھ نکاتی پروگرام پیش کر دیا تھا۔ انہیں کچھ ہی عرصہ پہلے اگرتلہ سازش کیس سے رہائی دلوائی گئی تھی۔

عوامی ردعمل کے طور پر پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ منظم ترین جماعتیں بن چکی تھیں ۱۷ مارچ کو بھاشانی نے "گھیراؤ جلاؤ" کا نعرہ لگایا۔ ملک بھر میں ہڑتالوں اور جلوسوں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ملک میں ہر طرف ابتری پھیل چکی تھی۔ چنانچہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب نے پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی صدر ایوب مستعفی ہو گئے اور آغا جنرل محمد یحییٰ خاں صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے سامنے آئے، جن کے دور اقتدار میں بھارت کے ساتھ جنگ ہوئی اور مشرقی پاکستان کا صوبہ پاکستان سے کٹ کر بھارت کی جھولی میں جا گرا

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کر دیا۔ اور تادم مرگ اپنے گھر پر ریٹائرڈ زندگی گذارتے رہے۔ پاکستان کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت میں دل کا دورہ پڑنے پر فوت ہوئے۔ انہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ان کے گاؤں ہی میں دفن کیا گیا۔

ایوب خاں ایک قابل اور مدبر شخصیت کے مالک تھے۔ علیگڑھ کے گریجوایٹ اور اعلیٰ فوجی تربیت یافتہ تھے۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑی دنیا کے بہترین نشانہ باز اور کمانڈر تھے۔ تدبر اور ذہانت میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے۔ اکثر اوقات اپنی تقریریں خود ہی تیار کرتے۔ انگریزی اور اردو میں روانی کے ساتھ بارعب لہجے میں تقریریں کیا کرتے۔ ان کی ہر تقریر بسم اللہ اور السلام علیکم سے شروع ہوتی

Marfat.com

دراز قد، مناسب اور مضبوط بدن، حسین، پرکشش اور بارعب چہرے کے مالک فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں دنیا بھر میں مقبول شخصیت تھے۔

صدر ایوب نے اپنی خودنوشت سوانح عمری انگریزی میں لکھی، جو اردو میں "جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی" کے نام سے ترجمہ ہوئی۔ اس کے مطالعے سے ہمیں ایک سچا مسلمان، دردمند پاکستانی، ماہر فوجی، مدبر سیاستدان اور شفیق رہنما نظر آتا ہے۔ اگر ان سے چند سیاسی غلطیاں نہ ہو جاتیں تو بلاشبہ وہ عظیم رہنما کہلا سکتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو جس غیر جانبدارانہ اصول پر کاربند کیا تھا۔ اس سے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند ہو گیا تھا۔ ان کے عہد حکومت کو دنیا بھر کے ماہرین معاشیات نے بلاشبہ بہترین دور کہا ہے ملک مہنگائی اور چور بازاری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور شاید یہ انھی کے تدبر کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں عام اشیائے خوردنی مہنگی ہونے کی بجائے سستی ہوتی چلی گئیں۔ اس بات سے انکار مشکل ہے کہ ان کے دور میں ملک نے زرعی اور صنعتی لحاظ سے بے مثل ترقی کی۔

چند ماہرین سیاسیات اور دانشوروں نے صدر ایوب کے دور اور ان کے آئین کو غیر جمہوری قرار دیا ہے۔ ان کی رائے میں صدر ایوب ایک آمر مطلق تھے اور اسی حیثیت سے ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے دور میں عوام کو سیاسی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان کی رائے کے بالمقابل کسی دوسری رائے کی کوئی اہمیت تھی۔ انہوں نے ہر امر کو طے کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھایا تھا مثلاً تعلیمی، زرعی، آئینی، اسلامی مشاورتی کمیشن وغیرہ اور انھی کمیشنوں کی رپورٹ میں ردوبدل کے بعد اصلاحات نافذ کیں۔ ان کے دور کو کمیشنوں کا دور بھی کہا جاتا ہے۔

ایوبیہ مسلمان حکمرانوں کا خاندان، جو چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں مصر، شام، فلسطین اور یمن پر حکمران رہا۔ اس خاندان کا بانی صلاح الدین ایوبی تھا۔ اس کا باپ نجم الدین ایوب بن شاذی بن مروان تھا۔ جو آرمینیا کا ایک معزز فرد تھا۔ دادا شاذی عراق میں جاگیردار تھا۔ یہیں صلاح الدین پیدا ہوا۔ ۵۶۶ھ/۱۱۷۱ء میں صلاح الدین نے فاطمیہ کو ختم کر کے ایوبی خاندان کی بنا رکھی۔ وہ نور الدین زنگی کا باج گزار تھا۔ اس کی وفات کے بعد صلاح الدین نے ہر جگہ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اسے خلیفۂ بغداد کی طرف سے بھی مصر و شام کی حکومت کی سند مل گئی۔ یہاں سے وہ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں شام آیا تاکہ صلیبیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حفاظت کرے۔ اس نے یروشلم کے عیسائی حکمرانوں کو فلسطین اور شام سے بے دخل کر دیا۔ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں اس نے ایک بار پھر بیت المقدس کو صلیبیوں سے آزاد کرایا۔

اپنے دور حکومت کے ابتدائی حصے میں صلاح الدین نے بازنطینیوں، نارمنوں اور اطالویں کے بحری بیڑوں کے خطرے کا سامنا کیا۔ ان کے ساتھ جنگوں میں اسے کبھی شکست نہیں ہوئی۔ ۲۲ شعبان ۵۸۸ھ/۲ ستمبر ۱۱۹۲ء کو صلح نامہ عکہ میں رچرڈ شیر دل کے ساتھ معاہدہ ہوا، جس کے بعد صلیبیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔

صلاح الدین کے بعد اس کا بھائی الملک العادل اور پھر بھتیجا الملک الکامل تخت نشین ہوئے۔ ان کا دور مجموعی طور پر امن و امان کا دور رہا ہے۔ لیکن الکامل کی وفات کے بعد خاندانی اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں العادل کے بیٹے الاوحد نے ارمنی علاقے کو ایوبی سلطنت میں شامل کر لیا۔ صلاح الدین ہی کے وقت سے سلجوقیوں اور ایوبیوں کے درمیان ٹکراؤ ہو رہے تھے۔ انہوں نے حلب کے ایوبیوں کی سرپرستی کی اور مصر کے ایوبیوں کے خلاف نبرد آزما ہو گئے دوسری طرف ایوبیوں کی توجہ صلیبیوں کی طرف مبذول تھی۔ صلاح الدین کے بعد ایوبیوں نے صلح کن پالیسی اختیار کر لی تھی۔ ۶۰۱ھ/۱۲۰۴ء میں العادل نے تمام ساحلی مقامات فرنگیوں کو لوٹا دیئے۔ حلب کے ایوبیوں نے مصر کے ایوبیوں سے بچنے کے لیے کبھی الجزیرہ، حمص اور حماۃ کے ایوبیوں کا وسیلہ تلاش کیا اور کبھی روم کے سلجوقیوں کا فرانس اور اٹلی کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات بحال ہو چکے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوبی سلطنتیں کبھی بھی شیر و شکر نہ ہو سکیں لیکن ان کے عہد میں اسلام نے کما حقہ، فروغ پایا۔ اعلیٰ پائے کے مدارس قائم ہوئے جس میں فقہ کے چاروں مسالک کا درس ہوتا تھا۔ تصوف کے سلسلوں کا بھی احترام کیا گیا۔ مختلف خانقاہیں تعمیر کرائی گئیں۔ قاضیوں اور علماء کو کاروبار حکومت میں زیادہ سے زیادہ شریک کیا جاتا تھا۔ ان کے عہد کا ایسا ہی ایک خاندان اولاد شیخ کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ الظاہر غازی کے عہد میں مشہور صوفی شہاب الدین سہروردی کے قتل کا واقعہ ظہور پذیر ہوا لیکن اس سے ایوبیوں کی مذہب پرستی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

الکامل کی وفات پر ایوبیوں کا حقیقی دور حکومت ختم ہو گیا۔ تاہم اس کے بعد العادل بھی ایک اچھا حکمران رہا۔ اس وقت کیفا کی حکومت اس کے بڑے بھائی الصالح کے پاس تھی۔ عملی طور پر الصالح ہی ایوبیوں کا آخری حکمران تھا۔ اس کا بیٹا توران شاہ اپنی فوج کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد، ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء مملوک نام کے نئے دور حکومت کا آغاز ہو گیا۔ اس حکومت کی داغ بیل ڈالنے والا درحقیقت الصالح ہی تھا۔ رفتہ رفتہ تمام علاقوں پر ایوبیوں کی حکومت ختم ہوتی چلی گئی۔ تفصیل کے لیے شجرہ دیکھیے۔ صرف حماۃ کی ریاست اپنے فرمانروا ابوالفدا کے باعث ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء تک قائم رہی۔ اس خاندان کا خاتمہ آق قیونلو خاندان کے ہاتھوں ہو گیا ——

باب دروازہ، داخلے کا ذریعہ، ٹوٹا ہوا حصہ، مقررہ حصہ، سمت، طرف، امام کا خاتم، اسلامی تعمیرات میں باب کا لفظ قلعوں اور مساجد کے دروازوں کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ نیز اسلامی تاریخ میں ایک مذہب کے بانی کا نام بھی ہے، جس کی بناء پر بابی مذہب نے جنم لیا۔ اس لقب نے علی محمد شیرازی کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ (دیکھیے "باب، علی محمد"، "بابیت")

دروازے کے معنوں میں باب دو طرح سے مستعمل ہے۔ نمبرا مساجد اور مقبروں کے لیے اور نمبر۲ قلعوں کے لیے۔ ابتدائی مساجد میں داخلے کے لیے کسی قسم کا دروازہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ تقریباً تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی تک کسی مسجد کا دروازہ تعمیراتی فن کا شاہکار نہیں تھا۔ یہ دروازے عموماً سادہ نوعیت کے ہوتے تھے۔ سب سے پہلا باب فاطمیوں کے عہد میں المہدیہ مسجد میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ۳۰۸ھ/۹۲۰ء میں تعمیر ہوئی۔ بعد میں اسی طرز کی تعمیرات مصر میں ہونا شروع ہوئیں۔ ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء میں حلب کے مدرسہ شادبخت کا دروازہ ایک نئی طرز پر تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد دروازے نئی نئی طرز پر بنائے جانے لگے۔ دمشق کی

Marfat.com

قلعوں کے نیم مدوّر دروازے

جامع القونیہ کا دروازہ ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں تعمیر ہوا۔ گہرے طاق نما دروازوں کے اوپر ایک ایک نیم گنبد ہوا ہوتا تھا۔ یہ طرز تعمیر شام میں آئی۔ گنبدوں کو سہارا دینے کے لیے نئی نئی تراکیب استعمال کی گئیں۔

بلند قوسی طرز کے دروازے چودہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہونا شروع ہوئے ایران میں اس قسم کے دروازے عام ہوتے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں ابوالنصر پارسا کے مقبرے کا دروازہ نہایت ہی قابل دید بنایا گیا۔ ہندوستان میں اسی کا طرز تعمیر مروج ہوا۔ اس میں ایک اونچا محراب دار کھانچا ہوتا ہے۔ داخل ہونے کا راستہ پیچھے کی طرف ہے۔ اس کے بازو دو منزلہ اور پینتالیس درجے کے زاویے پر کاٹ دیے گئے ہیں۔ ہر منزل میں ایک نوکدار محراب کا طاق ہے فتح پور سیکری اور دہلی کی جامع مساجد کے دروازے اسی طرح کے ہیں۔

قلعوں کے دروازے ابتدا میں سیدھے راستے ہوتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے دونوں طرف دو نیم مدوّر برج بنا دیے جاتے تھے۔ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں اخیضر کے مشہور قلعے میں دروازے کی ایک خاص طرز کو اختیار کیا گیا۔ اس میں داخلے کی تین میٹر چوڑی محراب کو دو مدوّر برجوں کے درمیان ۱۰ سنٹی میٹر پیچھے ہٹا کر بنایا گیا ہے۔ دونوں طرف بیس سنٹی میٹر چوڑی نالی ان برجوں کے اندرونی کونوں تک پہنچ گئی ہے۔ اس محراب کے پیچھے ۹۵ء۱ میٹر کے فاصلے پر ایک اور محرابی راستہ ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک غلام گردش ہے۔ جس پر سرنگ نما ڈاٹ کی چھت ہے۔ سیدھے دروازے، جو محرابی کھانچوں میں بنائے گئے۔ بعد کے قلعوں میں دروازے خم دار ہی بنائے گئے المغرب میں انہی دروازوں نے فروغ پایا۔

بابا - ایک مذہبی پیشوا، جس نے نبوت کا دعوے بھی کیا تھا (دیکھیے - بابائی)

باباطاہر (وفات ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء یا ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء) ایران کا صوفی شاعر اس کے متعلق معلومات "راحت الصدور" میں ملتی ہیں۔ سلجوقی سلطان طغرل اور حکیم ابن سینا سے صحبت رہی۔ باباطاہر کو بعض نے ہمدانی اور بعض نے لُری کہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ باباطاہر دونوں جگہ رہا ہو کیونکہ گیارہویں صدی عیسوی میں ہمدان اور لُرستان کے لوگوں میں بہت میل جول تھا۔ خرم آباد میں ایک محلہ باباطاہر کے نام سے موسوم ہے۔ باباطاہر کا مقبرہ محلہ تن بازار میں شہر کی شمال مغربی جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ہے۔ مقبرے کی عمارت معمولی سی ہے اور اس میں کوئی خاص بات نہیں اس کے پہلو میں اس کی عقیدت مند فاطمہ اور مرزا علی نقی کوثری کی قبریں ہیں

باباطاہر کی زبان جس میں اس نے رباعیات کہی ہیں۔ فصیح فارسی زبان کے قریب تر ہے۔ اس کی رباعیات میں ایک خاص علامت پائی جاتی ہے رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہے۔ باباطاہر کے کلام کے نام سے بعد میں جو مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں بہت سا حصہ بابا کے نام سے شامل کر دیا گیا ہے جو حقیقت میں بابا کا کلام نہیں ہے۔

باباطاہر اکثر اپنی شاعری میں اپنا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو آوارہ درویش اور قلندر ظاہر کرتا ہے جس کے سر پر گھر کی چھت نے کبھی سایہ نہ کیا ہو اور جو پتھر کو تکیہ بنا کر سوتا ہو اور جس کو روحانی پریشانیوں نے ستا رکھا ہو۔ باباطاہر کے کلام میں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے جذبات تر و تازہ ہیں اور عام صوفیانہ رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہیں۔ اس کی تشبیہات بے ساختہ ہیں۔ زبان و بیان میں سادگی ہے۔

باباطاہر ایک صوفی بھی تھا۔ وہ بائیس فلسفیانہ رسائل کا مصنف تھا آکسفورڈ اور پیرس میں باباطاہر کے اقوال کی شرحیں موجود ہیں۔ مکمل رسالہ الکلمات القصار، ارمغان کے ایڈیشن میں چھپ چکا ہے۔ جس میں ۳۶۸ عربی مقولے ہیں جو تیئس ابواب میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ اس رسالے نے صوفیا کے حلقوں میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

گوبینو کے مطابق فرقہ اہل حق کے لوگ بالخصوص باباطاہر کی صوفی ہونے کی حیثیت سے تعریف کرتے ہیں اور اس کی بہن بی بی فاطمہ کو بھی بہت قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں

بابا فرید گنج شکر پاکستان کے ایک بلند پایہ بزرگ اور ولی (دیکھیے - فریدالدین گنج شکر)

باب السلام امن کا دروازہ، مسجد حرام کے ایک دروازے کا نام ہے جو شرقی جانب ہے۔ جب قریش میں اس بات پر جھگڑا ہوا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ کون سا قبیلہ رکھے گا تو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے آنحضورؐ اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ پہلے یہ دروازہ باب بنی شیبہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ بنو شیبہ، شیبہ بن عثمان کا قبیلہ ہے۔ جسے آنحضورؐ نے خانہ کعبہ کی چابی عنایت فرمائی تھی۔ ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں اس کی موجودہ عمارت بنائی گئی۔

باب النساء عورتوں کا دروازہ، یہ لفظ آنحضورؐ کی ازواج مطہرات کے گھروں کے دروازوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ آنحضورؐ کے سوا کسی اور آدمی کو ان دروازوں سے گذرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دروازے اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ آنحضورؐ ان سے ہو کر آسانی کے ساتھ مسجد میں آجاتے تھے۔ ہر زوج مطہرہ کا گھر علیحدہ تھا۔

بابائی ایک مذہبی اور مجلسی تحریک کا نام جس کا پیشوا بابا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ تحریک ترکی میں مغول کے حملے سے کچھ عرصہ پہلے برپا ہوئی اور اس نے ایشیائے کوچک میں ترکی کے مراکز میں ہل چل مچا کر رکھ دی۔ اس تحریک کا ترکوں کی ثقافتی اور مجلسی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ تحریک ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی تک بہت زور پکڑ چکی تھی۔ اور سلطنت کا انتظامی اور ثقافتی ڈھانچہ اس تحریک سے

Marfat.com

وجود میں آچکا تھا جو ایرانی اثرات کا نتیجہ تھا۔ ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء کے قریب سرحد شام کے علاقے کفر سود سے ترکمانوں کے علاقوں میں ایک بابا جو خود کو نبی کہتا تھا آیا اور اس نے ان علاقوں میں وعظ تلقین شروع کر دی۔ دیہاتی اور سرحدی علاقوں کے ترکمان جو قدیم ترکی روایات کے زیادہ پابند تھے۔ اس تحریک کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ اور اسی طرح سے ترکمان عنصر اور حکومت کے درمیان اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ ان اختلافات کی وجہ سے سلجوقی حکومت بہت کمزور پڑ گئی۔ تو بابا (عوامی واعظ) نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور کئی بڑے لشکروں کو یکے بعد دیگرے شکست دی۔ آخر کار کرائے کے سپاہیوں کی مدد سے بابا کو شکست دی گئی اور قید کر لیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس تحریک کو دبایا نہ جا سکا۔

اس تحریک کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں سوائے اس کے کہ اس کے پیروکار سرخ ٹوپیاں کالے لبادے اور پاؤں میں کھڑاؤں پہنا کرتے تھے۔

بابر، ظہیر الدین محمد ابن عمر شیخ مرزا (۶ محرم ۸۸۸ھ/۱۴ فروری ۱۴۸۳ء - ۶ جمادی الاوّل ۹۳۷ھ/۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) ہندوستان کا پہلا مغل شہنشاہ والدہ کا نام قتلق نگار خانم تھا۔ باپ کی طرف سے اس کا نسب تیمور سے اور ماں کی طرف سے چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ فرغانہ میں پیدا ہوا۔ باپ کی وفات کے بعد رمضان ۸۹۹ھ/جون ۱۴۹۴ء میں فرغانہ کے تخت پر بیٹھا۔ ترکستان کے سیاسی حالات نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اپنے رشتہ داروں کی سنگدلی اور ناخدا ترسی کی وجہ سے وہ چند جاں نثاروں کے ساتھ دشوار گذار پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء تک اس نے سمرقند کے حاکم اور اپنے چچا سلطان احمد اور تاشقند کے حاکم اور اپنے ماموں سلطان محمود سے اپنی ریاست واپس حاصل کر لی۔ ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں اس نے فرغانہ کی ریاست کو اپنے اور اپنے بھائی جہانگیر کے درمیان تقسیم کر لیا۔ اسی سال اس کی شادی ہوئی۔ اگلے سال بابر نے سمرقند پر حملہ کر کے اسے شیبانی سے چھین لیا۔ لیکن ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء میں شیبانی نے بابر کو سرِپل کے مقام پر شکست دی۔ سمرقند پر حملہ کرنے سے پہلے بابر اندیجان اپنے بھائی کو دے آیا تھا۔ اس لیے اب اس کے لئے کوئی مقام نہیں رہ گیا تھا جہاں وہ واپس چلا جاتا۔ کابل پر قبضہ کرنے کے وقت تک بابر خانہ بدوشوں میں اپنی زندگی کے دن گذارتا پھرتا رہا۔ ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں اس نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ جمادی الآخر ۹۲۸ھ/مئی ۱۵۲۲ء میں قندھار اس کے قبضہ میں آگیا۔ اس وقت دہلی پر سکندر لودھی حکمران تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ ابراہیم نے ناتجربہ کار اور تیز طبیعت ہونے کی وجہ سے پٹھان سرداروں کو اپنا مخالف کر لیا تھا۔ چنانچہ دولت خان لودھی اور ابراہیم کے چچا عالم خاں نے بابر کو ابراہیم کے خلاف ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت۔ اس دعوت پر بابر نے ہندوستان پر پانچ حملے کیے۔ مغربی پنجاب پر بابر کا قبضہ پہلے چار حملوں میں ہو گیا تھا۔ آخری حملہ میں اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں جو پانی پت کی تیسری لڑائی کے نام سے مشہور ہے شکست دے کر دہلی اور آگرے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں وہ ہندوستان کا حکمران بن گیا ۹۳۳ھ/۱۵۲۷ء میں بابر نے رانا سانگا والی میواڑ کو شکست دی۔ ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء بابر نے گوگرہ اور گنگا کے مقام اتصال پر مشرقی افغانوں کو شکست دے کر اپنا اقتدار بنگال تک بڑھا لیا۔ اس کے فوراً بعد بابر نے آگرے میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہتے ہیں کہ ہمایوں ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گیا اور کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ تو ابو البقا نے صدقہ دینے کے لیے کہا۔ بابر نے کہا کہ ہمایوں کی جان کے بعد مجھے اپنی جان پیاری ہے اس لئے میں اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کا صدقہ دیتا ہوں شاید یہ صدقہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے۔ چنانچہ بابر نے علیحدگی میں خدا سے دعا کی کہ یا اللہ اس نذر کو قبول فرما لے۔ اس کے بعد اس نے ہمایوں کی چارپائی کے گرد تین چکر لگائے۔ اس روز سے ہمایوں کی صحت بحال ہونے لگی اور بابر پر بیماری کے آثار نظر آنے لگے اور بالآخر وہ اس بیماری سے وفات پا گیا۔ اس کی لاش کو پہلے آگرے میں بطور امانت دفن کیا گیا اور پھر کئی سال بعد کابل میں دفن کیا گیا۔ جو اب تک کابل میں ہے۔

بابر بڑا باہمت اور تلوار کا دھنی تھا۔ اس زمانے کی یورشوں اور دشمنوں پر اس کی یلغاروں میں اس کی کامیابیاں اس کی ان ہی صفات کی مرہون منت تھیں۔ اس میں گرنے کے بعد سنبھلنے کی ہمت۔ انتظام و اہتمام کی صلاحیت۔ بہادری۔ ہشاش بشاش طبیعت نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ ایک نہایت محتاط سپہ سالار تھا۔ ان تمام صفات کے ساتھ وہ ایک بہترین شاعر اور انشاپرداز بھی تھا "تزک بابری" اس بات کا ثبوت ہے۔ وہ باغوں اور گلزاروں کا نہایت شوقین تھا بابر کا اپنا وطن اندی جان دامن کوہ میں ایک بہت ہی خوب صورت شہر تھا۔ جہاں چشموں کے پانی کی بہتی ہوئی نہریں سرو و صنوبر کے بلند پایہ درخت اور گل و لالہ کے نکہت بار تختے فردوس بریں کا منظر پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بابر مناظر قدرت کا بہت ہی دلدادہ تھا۔ وہ قدرت کی ہر جمیل و حسین شے سے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا قدرت کے ان حسین و جمیل مناظر کی تلاش میں رہتا۔ جب ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس نے یہاں بھی ایسے ہی مناظر تلاش کرنا چاہے جو ہندوستان میں مفقود تھے۔ چنانچہ جب اس نے آگرہ کو اپنا پایہ تخت بنا لیا تو یہاں اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے چار باغ تعمیر کرایا۔ جو آج کل باغ ارم کے نام سے مشہور ہے بابر ان باغوں میں بلند مقامات پر بیٹھ کر وہاں سے دریاؤں کے بہنے، نہروں کے چلنے اور باغوں کے حسن کا نظارہ کرتا انھیں اپنے روزنامچے تزک بابری میں لکھتا

بابر کی تصانیف میں "تزک بابری" جس میں اس نے ترکی زبان میں اپنے بچپن سے لے کر آخری ایام کے حالات درج کیے ہیں۔ اس کی دوسری کتاب "عروض رسالہ سی" ہے جو علم العروض پر لکھا گیا ہے۔ تیسری تصنیف "مبین" ہے۔ یہ ایک مثنوی ہے اور اس میں حنفی فقہ کے بعض مسائل ہیں۔ بابر کی ایک اور تصنیف جو "رسالہ والدیہ" کے نام سے ہے، دراصل ان کے ایک خاندانی صوفی کی تصنیف ہے۔ بابر نے اس کا چغتائی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ بابر کی پانچویں تصنیف اس کا "دیوان" ہے جس کا اکثر حصہ ترکی زبان میں ہے اور جو نظم کی ہر صنف سخن پر مشتمل ہے اس میں چند نظمیں فارسی زبان میں بھی ہیں۔

باب، علی محمد ابن محمد رضا (یکم محرم ۱۲۳۵ھ/۲۰ اکتوبر ۱۸۱۹ء - ۲۸ شعبان ۱۲۶۶ھ/۹ جولائی ۱۸۵۰ء) علی محمد باب شیرازی ایران کی بابی تحریک کا بانی، اس کی والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا، شیراز کے ایک شیعہ گھرانے میں جس کا پیشہ تجارت تھا پیدا ہوا۔ دو سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ماموں آغا سید علی کی کفالت میں آیا۔ چھ برس کی عمر میں مکتب میں بیٹھا اور پانچ سال تک تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بزازی کا پیشہ شروع کیا۔ بائیس سال تک اسی کاروبار میں لگا رہا۔ اس کے بعد وہ باطنی اشغال۔ ریاضتوں اور مراقبوں میں مشغول ہو گیا۔ کیونکہ بچپن ہی سے اس کا ذہن وظائف اور مراقبوں کی طرف تھا۔ وہ بسا اوقات

Marfat.com

اپنے بچپن میں گرمیوں کے موسم میں گھنٹوں ننگے سر دھوپ میں کھڑا ہو کر وظائف پڑھتا رہتا تھا۔ ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں شیخ احسائی کے خلیفہ کاظم رشتی سے دو سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کے غالی مریدین میں شامل ہو گیا۔ کاظم رشتی کے عقیدے کے مطابق امام غائب کے ظہور کا وقت آ گیا تھا۔ کاظم رشتی نے اپنے مریدوں کو امام کی تلاش میں سارے ایران میں پھیلا دیا۔ اسی دوران میں اس کی موت کا وقت آ گیا اور وہ کسی کو اپنا جانشین بنائے بغیر مر گیا۔ اس کے ایک اور مرید نے جو علی محمد کا ہم مکتب بھی تھا، علی محمد کو حقانیت کا باب" قرار دیا۔ اسی وجہ سے بابی ملا حسین کو "اوّل من آمن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعے کے بعد علی محمد اپنے دوسرے پیر بھائیوں کو لے کر مراقبہ اور ریاضت کی غرض سے کوفے کی ایک مسجد میں چلا گیا۔ ۵۔ جمادی الاوّل ۱۲۶۰ھ، ۲۳ مئی ۱۸۴۴ء کو اس نے چوبیس پچیس سال کی عمر میں باب ہونے کا دعوے کر دیا۔ جب اس کے ماننے والوں کی تعداد اٹھارہ ہوئی تو اس نے انہیں "حی" کہنا شروع کیا۔ کیونکہ حی لفظ کے عدد بھی اٹھارہ ہیں اور خود کو ان میں شامل کرنے کے بعد اس مجموعے کو "واحد" اوّل کا نام دیا۔ اور جب اس کے تصدیق کرنے والے تین سو اکسٹھ ہو گئے تو ان کو "کل شیئ" کے نام سے موسوم کیا۔ جب اس کے مریدین کی تعداد کچھ بڑھ گئی تو اس نے اس روایت کو پورا کرنے کے لئے کہ امام غائب مکہ مکرمہ سے اپنے دعوے کا آغاز کرے گا، اپنے ایک مرید کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ کا قصد کیا اور اسلامی ممالک میں خطوط لکھے کہ لوگ کوفے میں جمع ہو جائیں لیکن اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا اور کسی نے بھی اس کی دعوت پر لبیک نہ کہی دو ماہ کے بعد وہ جدہ پہنچا اور اپنے قیام حرم کے دوران میں ایک کتاب، جس میں اپنی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا تھا، تصنیف کی۔ اس کی تمام حرکات پر حکومت کی نظر تھی۔ اور خاص طور پر اس کے پروگرام کے مطابق ایک خاص وقت پر ایک شہر میں ممالک اسلامیہ کے دور دراز کے لوگوں کو جمع کرنے والے پیغام سے سخت تشویش تھی لیکن اسی دوران میں اس کے پیروؤں نے اذان میں ایک کلمے میں اقرار کرتا ہوں کہ علی نبیل (علی محمد باب) سے پہلے آئینہ انفاس خداوندی ہے۔" کا اضافہ کیا اس پر عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور اس کے مریدوں کو گرفتار کر کے گورنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے انہیں سزا دے کر شہر سے نکال دیا۔ باب پر بعض پابندیاں بھی لگا دی گئیں۔ رمضان ۱۲۶۱ھ/۲۱ ستمبر ۱۸۴۵ء کو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اپنے دعوے کی تردید کر دی اور شیراز کی مسجد وکیل میں بھی اپنے باب نہ ہونے کا اعلان کرا دیا۔ اس کے ماموں کی ضمانت پر صرف اس کی نظر بندی کا حکم دے دیا گیا۔ بعد میں اسے اصفہان کے کچھ لوگ خفیہ طور پر اصفہان لے گئے لیکن ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں اسے دوبارہ گرفتار کر کے آذربائیجان کے کوہستانی قلعے ماہ کو میں قید کر دیا گیا۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء تک وہ اسی قلعے میں قید رہا اور یہیں اس نے "بیان" اور دلائل السبعہ" کتابیں تالیف کیں۔ اس قید کے دوران میں انہوں نے ایک کانفرنس بلائی جس کو بدشت کانفرنس کے نام سے موسوم کیا گیا جو بائیس روز جاری رہی۔ اس کانفرنس میں اس نے اپنے پیروکاروں کو مختلف القاب بھی عطا کئے۔ جب حکومت کو اس کانفرنس کا علم ہوا تو اس نے باب کو چہرلق جیل میں منتقل کر دیا۔ دوران سفر میں علی محمد نے اپنے دعوے سے توبہ کر لی۔ یہ قید پہلی قید سے زیادہ سخت تھی۔ تاہم اس کا مریدین سے خط و کتابت کا سلسلہ پوشیدہ طور پر جاری رہا۔ بدشت کانفرنس کے بعد ایران کے مختلف علاقوں میں زبردست فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ ایران کی وفات کے بعد تو فسادات کا بازار گرم ہو گیا۔ بابیوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ آئندہ برس دنیا میں باب کی حکومت ہوگی۔ اس ضمن میں انہوں نے عوام پر بہت ظلم و ستم ڈھائے۔ اگر کوئی گاؤں ان کے مطالبات پورے نہ کرتا تو اسے جلا کر راکھ کر دیتے تھے۔ شہنشاہ ایران کی وفات کے بعد باب نے مختلف علاقوں میں اپنے پیروکاروں کی امداد کے لئے مریدین کو بھیجا۔ جب ان لوگوں کی سرگرمیاں کافی حد تک بڑھ گئیں اور سارے ایران میں فسادات کا بازار گرم ہو گیا تو حکومت نے بابی تحریک کے سرغنہ کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ باب علی محمد کو قید خانے سے تبریز بلایا گیا اور اسے دو دوسرے ساتھیوں سمیت گولی سے اڑا دینے کی سزا دی گئی۔ ان کا جلوس تبریز کے بازاروں سے گذارا گیا تو راستے میں لوگ انہیں گالیاں دیتے اور مارتے پیٹتے تھے۔ ان میں سے ایک نے توبہ کر لی۔ اور بالآخر باب اور اس کے مرید محمد علی کو ۲۸ شعبان ۱۲۶۶ھ/۹ جولائی ۱۸۵۰ء میں تبریز چھاؤنی کے ایک چوراہے میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ کئی روز تک لوگ اس کے جسم کو بازاروں میں گھسیٹے پھرتے رہے۔ اور بعد میں شہر سے باہر پھینک دی گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے جانور کھا گئے اور بابیوں کے نزدیک اس کے مرید رات کی تاریکی میں اسے وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور پچاس سال بعد عبدالبہاء کے دور میں اس لاش کو ایران سے فلسطین لائے اور کوہ کرمل پر ایک جگہ دفن کر دی گئی یہ قبر اب بھی وہاں موجود ہے اور اسے مقام اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ مرنے سے ایک رات پہلے باب نے اپنے مریدوں کو تلقین کی تھی کہ "دوستو! کل جب تم سے میرے بارے میں استفسار کیا جائے تو تقیے سے کام لینا، میرا انکار کر دینا بلکہ مجھ پر لعنت بھیجنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تمہیں یہی حکم ہے۔"

قتل کے وقت باب کی عمر اکتیس سال سے کچھ زائد تھی۔ اس نے چھ سال تک ایران کی سیاسی فضا کو مکدر کئے رکھا۔ بائیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی اور ایک بچہ پیدا ہوا جو بچپن ہی میں مر گیا۔ اپنے باب ہونے کے دعوے سے پہلے اس نے اپنی تمام جائداد اپنی ماں اور بیوی کے نام کر دی تھی۔

اس کا عین اس وقت خاتمہ ہو گیا جب کہ ابھی وہ اپنے مذہب کی بنیاد ڈال رہا تھا اور اس کم وقتی کے سبب وہ اپنے ماننے والوں کو نہ تو آئندہ کے لئے ہدایات دے سکا اور نہ کوئی حتمی دستوران کے سامنے پیش کر سکا۔ چونکہ ابتداء ہی میں اس کی حکومت سے ٹکر ہو گئی تھی اس وجہ سے یہ ناکام ہی رہا۔ اس کے ماننے والوں کا سب سے قیمتی سرمایہ اپنے پیشوا کی محبت تھی۔ اس کی موت کے فوراً بعد اس کے ماننے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ اکثریت والی جماعت نے بہائی مذہب کو مستقل رنگ دے دیا اور اس طرح بابی مذہب کی تاریخ بہائیت اور ازلیت میں تقسیم ہو گئیں نبوت کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مامور من اللہ اور باب ہے۔ باب نے مرنے سے پہلے مرزا یحییٰ کو جسے اس نے صبح ازل کا لقب دیا تھا، اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ ازلی مرزا یحییٰ کو اپنا خلیفہ مانتے ہیں اور بہائی بہاء اللہ کو مانتے ہیں۔

بابک خرمی خرمی تحریک کا سرغنہ، ۸۱۳ء تا ۸۴۲ء میں خلیفہ المامون اور المعتصم کے دور حکومت میں ایک نیم مذہبی و سیاسی تحریک برپا ہوئی جس کا

Marfat.com

مسکن آذربائیجان تھا۔ یہ تحریک تقریباً ۲۰ سال تک عالم اسلام کے لئے شدید دردِ سر بنی رہی۔ یہ ان تحریکوں میں سے ایک تھی جو مزدکیوں نے ایران میں جاری کر رکھی تھیں اور جو ہر وقت بغاوت کا موقعہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ اس تحریک کی سرگرمیاں خفیہ تھیں۔ المسعودی کی روایت کے مطابق بابک کا اسلامی نام حسن تھا۔ الدینوری کے نزدیک اس کے باپ کا نام مطہر بن فاطمہ بنت ابی مسلم تھا۔ نیز الطبری کے قول کیمطابق بابک مطر نامی ایک صعلوک (کرائے کا سپاہی) کا ناجائز بچہ تھا۔ بابک کے مذہب اور نسب کے بارے میں مختلف فیہ روایات ہیں۔ ان روایات کی رو سے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ بابک کی پیدائش آذربائیجان میں ہوئی اور وہ دس سال تک اپنی ماں کے ساتھ ہی رہا۔ اس کے بعد ۱۰ سال کی عمر تک مویشی وغیرہ چراتا رہا اور بعد میں دوبارہ اپنی ماں کے پاس آ گیا۔

ایک دن جاویدان بن سہرک جو خرمی قائد تھا بابک کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اس کی ماں کے پاس سے اپنے ساتھ لے گیا۔ جاویدان کی بیوی کو بابک سے عشق ہو گیا تھا اور جب جاویدان اور ابو عمران میں جنگ ہوئی اور جس میں جاویدان بھی تیر لگنے سے وفات پا گیا تو جاویدان کی بیوی نے فوراً ایک افسانہ گھڑا کہ اس کے خاوند نے مرتے وقت اس سے یہ کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد میری روح بابک کے جسم میں داخل ہو جائے گی۔ لہٰذا تم پر اس کی اطاعت کرنا لازمی ہو جائے گی۔ اس طرح بابک خرمیوں کا قائد بن گیا۔ ۲۰۱ھ/۸۱۶ء میں اس نے بغاوت کر دی اور آذربائیجان کی مسلم آبادی پر حملہ کر دیا اور ان کی املاک کو خوب لوٹا۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کو بھی تہہ تیغ کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد خرمی اس کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے اور مسلمانوں کو مراغہ میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ جب بابک کی بغاوت نے بہت شدت اختیار کر لی تو المامون نے یحییٰ بن معاذ کو آرمینیا کا والی مقرر کر کے بغاوت کا قلع قمع کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یحییٰ کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں عیسیٰ ابن محمد آذربائیجان کا حاکم بنایا گیا۔ لیکن اسے بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ المامون کے بعد المعتصم نے اسحٰق بن ابراہیم کی قیادت میں خرمیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے افواج بھیجیں ان فوجوں نے خرمیوں کو شکست دی۔ ۲۲۰ھ/۸۳۰ء میں المعتصم نے افشین کو بابک کا مقابلہ کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ افشین کے بذ میں داخل ہونے کے بعد جو خونریز معرکے ہوئے ان میں خرمیوں کی بڑی تعداد تہ تیغ ہو گئی اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بابک نے راہ فرار اختیار کی اور اس کی کئی بیویاں اور بچے اسیران جنگ میں شامل ہوئے جب بابک فرار ہونے کے بعد اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا تو ایک کسان نے اسے پہچان کر والی اران کو اطلاع کر دی۔

بابک کو شکار کے بہانے افشین کے حوالے کر دیا گیا۔ چنانچہ افشین محرم ۲۲۳ھ دسمبر ۸۳۷ء میں بابک کو اپنے ساتھ لے کر سامرا میں بڑی شان کے ساتھ داخل ہوا اور اس وقت کے دستور کے مطابق عالم اسلام کے اس دشمن کو ہاتھی پر بٹھا کر اور پیادہ سوار فوج کی قطاروں میں سے گذار کر خلیفہ کے دربار میں لایا گیا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر دیا گیا اور اس کا سر خراسان بھیجا گیا اور مختلف شہروں میں تشہیر کی گئی۔ اس کا دھڑ سامرا کے ایک محلے میں لٹکا دیا گیا۔ بابک کی موت کے بعد خرمیوں میں سے اکثر مسلمان ہو گئے اور بعض نے قرامطہ اور اسماعیلیہ فرقوں کے مذہب کو اپنا لیا۔

بابک کی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مضبوط ارادے والا شخص تھا۔ قتل کرتے وقت جب اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو اس نے وہ خون اپنے چہرے پر لگا لیا تاکہ مرتے وقت انسان کے چہرے پر جو زردی چھا جاتی ہے وہ لوگوں کو دکھائی نہ دے تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ موت سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

بابک نے بڑی دولت اکٹھی کی تھی۔ اس کی بے شمار بیویاں تھیں جن کے ساتھ وہ شراب ولعب کی مجلسیں منعقد کرتا تھا۔

بابک اور اس کے پیروکاروں کے مذہب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ تناسخ ارواح کا تھا اور المقدسی کے قول کے مطابق اس کے پیرو بابک کو پیغمبر مانتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک دنیا میں ہر وقت ایک نبی موجود رہے گا۔ نیز نبوت کا منصب موروثی ہے۔ یا عمل تناسخ کے ذریعے منتقل ہوتا رہتا ہے۔

بابل: بیبیا یا بابلیون (موجودہ نام ہلہ) میسوپوٹیمیا (عراق) کا قدیم ترین شہر، جو سلامی تاریخ میں مشہور بادشاہ نمرود اور پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے وجود کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ شہر دریائے فرات کی ایک شاخ پر جنوبی عراق میں واقع ہے۔ بابلی حکمران حمورابی کے عہد سے یہ شہر دنیا بھر میں اہم حیثیت اختیار کر گیا۔ اس نے اٹھارہویں صدی قبل مسیح میں اسے اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ بعد میں آشوریوں اور اکادیوں کے حملوں کے دوران یہ شہر کئی بار تاخت و تاراج ہوا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح کا مشہور مورخ بادشاہ سارگان دوم اسے جلا ہوا شہر لکھتا ہے۔ اس نے یہ شہر دوبارہ تعمیر کرایا جسے سینا چرب نے ۶۸۹ ق۔م میں پھر زمیں بوس کر دیا۔ نیا شہر بادشاہ اسارہدون نے تعمیر کرایا۔ ۶۴۸ ق۔م میں آشوریہ کے بادشاہ آشور بنی پال نے اس کا محاصرہ کر کے اسے قبضہ میں لے لیا۔

قدیم بابل کے مشہور معلق باغ

Marfat.com

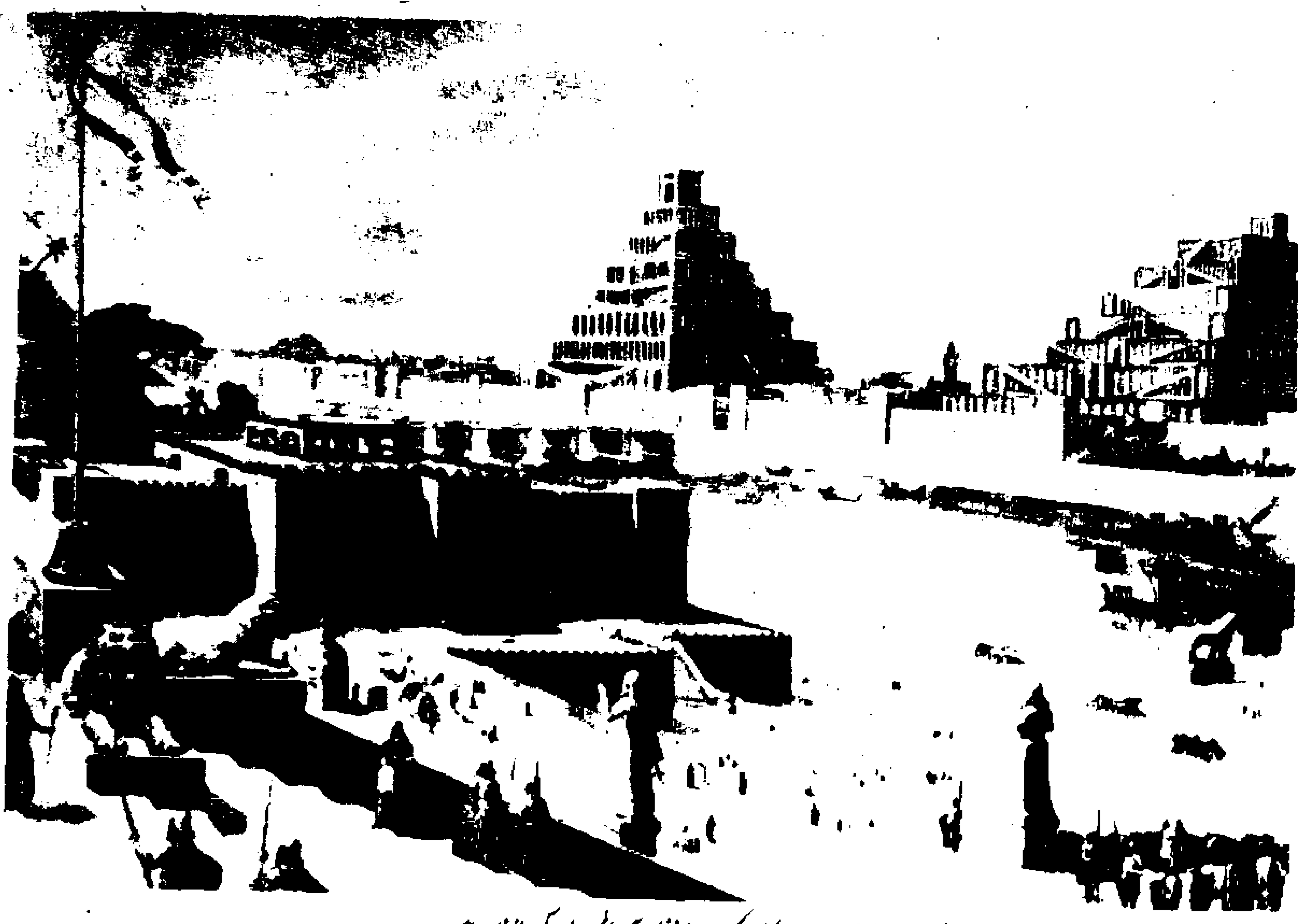

بابل کی قدیم تہذیب کا ایک منظر آرٹسٹ کی نظر میں

آشوری سلطنت کے خاتمہ کے بعد بابل پر آزاد اور خود مختار حکمرانوں نے عرصہ تک حکومت کی۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں بنوپلاسر اور پھر اس کے بیٹے بنوکدنصر (بخت نصر) کے دور میں بابل کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ اسی دور میں بابل میں پہلی بار یہودی قیدی لائے گئے جنہیں فارس کے بادشاہ داریوس اوّل نے رہائی دلائی۔ داریوس اوّل اور ارتخشت کے عہد میں بابل کو دوبارہ لوٹا اور جلایا گیا۔ لبعدازاں یونانیوں نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ سکندر اعظم اسی شہر میں بخت نصر کے محل میں مرا۔

بابل میں عرصہ دراز تک بت پرستی رائج رہی۔ وہاں کا سب سے بڑا دیوتا مردوک تھا۔ شمس اور عشتار بھی بلاشبہ بڑے دیوی دیوتاؤں میں سے تھے۔ دیوتاؤں کی کثرت کی وجہ سے اس شہر کا نام باب ایلی یا باب ایل (دیوتاؤں کا دروازہ) پڑا تھا، جو لبعدازاں بابل کہلایا۔ بابل ہی میں تاریخ انسانی کا تحریری آغاز ہوا۔ دنیا کا قدیم ترین رسم الخط میخی یا تکونی کہلاتا ہے۔

بابل اپنے صوبہ بابلیون کا مرکزی شہر تھا۔ اس صوبے میں جو آگے چل کر خود مختار سلطنت بنا، مشہور شہر اریدو (ابوشہرائین)، اُرُ (عریا حل المقایر)، لارسا (تل سنکارہ) ادب (بسمیاہ)، برسیپا (مزود)، بابل (حلہ)، کرتریا کتھا، اشنون اور دیر تھے۔

بابی علی محمد باب کے مذہب اور عقیدے کے پیرو۔ ان کا مذہب "بابائیت" کہلاتا ہے۔ (دیکھیے "باب، علی محمد"، "بابیت")

بابیت ایران میں بابیوں کی ایک مذہبی و سیاسی تحریک جس کا زمانہ انیسویں صدی کا پہلا ربع ہے۔ اس کا سرغنہ علی محمد باب تھا۔ جو اپنے آپ کو خدا کا نبی کہتا تھا۔ اور جس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرتا ہے اور اس پر وحی آتی ہے۔ اس کے بعد مرزا یحییٰ ملقب بہ صبح ازل اس کا خلیفہ بنا وہ بڑا نرم مزاج تھا اور حکومت سے بھی الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ اس تحریک نے ابتدا ہی میں حکومت سے ٹکر لے لی تھی۔ لیکن شاہ ایران پر ان کے قاتلانہ حملے کے بعد اس ٹکراؤ نے شدت اختیار کر لی۔ بابیوں نے سازش کر کے شاہ کو قتل کرا دیا اور یہ براہ راست اس قتل میں ملوث تھے۔ اس حملے کے بعد بابیوں کو مصائب اور مشکلات سے بہت زیادہ دوچار ہونا پڑا۔ اور جب حکومت نے ان کی گرفتاریاں شروع کیں تو بہت سے دوسرے ممالک میں چلے گئے اور اکثر نے بھیس بدل لیا۔ حسین علی نوری جو بہاء اللہ کے لقب سے ملقب تھا۔ گرفتار کر کے تہران بھجوا دیا گیا۔ صبح ازل بھاگ کر بغداد چلا گیا۔ بعد میں بہاء اللہ بھی ١٨٥٢ء میں وہاں چلا گیا۔ اور اس کے ساتھ بہت سے بابی بھی عراق چلے گئے۔ اس طرح سے بابیت کا مرکز ایران کی بجائے ترکی کے مقبوضات بن گئے۔ اس کے دس سال بعد بابیوں نے ایرانی حکومت کو پھر پریشان کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایران حکومت کی درخواست پر بہاء اللہ اور صبح ازل کو ترکی حکومت نے ادرنہ میں جلاوطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ یہ دونوں ١٨٦٤ء سے ١٨٦٨ء تک جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے اسی دوران میں دونوں میں ایک بات پر اختلاف ہو گیا۔ کیونکہ بہاء اللہ نے صبح ازل کو ادرنہ روانہ ہونے سے پہلے ایران جانے کے لیے کہا تھا۔ جسے اس نے ماننے سے انکار کر دیا اس طرح یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور بہاء اللہ کے پیروکار بہائی کہلائے اور صبح ازل کے پیچھے چلنے والوں کو ازلی کہا جانے لگا۔ بہائی اکثریت میں تھے دونوں نے ایک دوسرے کو زہر دینے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش تو اگرچہ کامیاب نہ ہو سکی لیکن صبح ازل کے بہت سے مریدوں کو بہائیوں نے زہر دے کر مروا ڈالا۔ ترکی حکومت نے ان کے اس باہمی فتنہ و فساد کو دیکھ کر بہاء اللہ کے ساتھیوں کو

Marfat.com

کو منتقل کر دیا اور ازلیین کو صقلیہ کی طرف بھیج دیا۔ ٢٩ را پریل ١٩١٢ء کو صبح ازل وفات پا گیا۔ اس نے آقا مرزا محمد ہادی کے لڑکے کو اپنا جانشین بنایا۔ بابیوں کی تعلیمات کے بارے میں کوئی واضح معلومات نہیں ملتیں۔ علی محمد شیرازی کے

دعوے باب کے پانچسال بعد ہی پیروکاروں میں اختلاف ہو گیا تھا اور اکثر نے اس بات کو قبول کر لیا تھا کہ باب نے نعوذ باللہ آنحضورؐ کے دور نبوت کو ١٢٦٠ھ/١٨٤٤ء میں ختم کر دیا ہے۔ انکے نزدیک باب کی فارسی کتاب "بیان" قرآن کی طرح اللہ کا کلام ہے، نیز باب کا مرتبہ پہلے تمام نبیوں سے بڑھ کر ہے، وہ قرآن مجید کا آخری شریعت ہونے سے انکار کرتے ہیں اور قرآن کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ حج بیت اللہ کا مقام بھی ان کے نزدیک مکہ معظمہ نہیں اور نہ ہی یہ لوگ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے نزدیک گذشتہ شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔ نماز روزہ اور دوسری عبادات اور نبیؐ پر درود و سلام بھی بیکار ہے۔ ان کے نزدیک ہر ہزار سال بعد شریعت تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہذا آنحضورؐ کی شریعت اب ختم ہو چکی ہے اب بابیت پر عمل کرنا لازم ہے اور یہ بھی ایک ہزار سال بعد بدل جائے گی۔

ان کے نزدیک آدمؑ سے باب کے عہد تک دنیا کی عمر ١٢٢١٠ سال ہے ان کے نزدیک قرآن نے توحید کا مضمون تو بیان کر دیا لیکن اس کی مکمل تشریح جس انداز سے باب نے کی ہے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

بابیوں کے عقیدے میں ہستی مطلق کے تین عالم ہیں۔ ایک جوہر یزدانی کا عالم ہے جو یکسر ناقابل فہم اور ادراک سے ماورا ہے۔ دوسرا کائنات اور انسانیت والا عالم۔ تیسرا عالم تمثال کا ہے یعنی وہ آئینہ شفاف جس میں انسان اللہ تعالٰی کو دیکھ سکتا ہے۔ ان کے ہاں انیس کا عدد بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے سال کو بارہ کی بجائے انیس حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے اور ہر مہینے کے انیس دن مقرر کیے۔

ان کے ہاں جرائم کی سزائیں انتہائی معمولی ہیں سب سے بڑی سزا قتل کی ہے اسی میں مقتول کے ورثا کو گیارہ ہزار مثقال سونا ادا کرنا اور متواتر انیس برس تک مقاربت سے پرہیز کرنا ہے۔ اس تحریک کی تاریخ دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے ایک دور وہ ہے جو اس مذہب کے شروع ہونے سے اس تشدد پر ختم ہوتا ہے جس کا سلسلہ ناصر الدین قاچار پر بابیوں کے قاتلانہ حملے سے شروع ہوا اور دوسرا دور وہ ہے جسے صلح پسندانہ دور کہا جا سکتا ہے اور یہ پہلے دور کے اختتام سے اب تک جاری ہے۔ بابیت کا دوسرا نام اہل بیان بھی ہے جو بابیوں کا لقب ہے۔

باتو، خانوادہ ایک خاندان جس نے روس کے مغربی علاقوں پر ٦٣٤ھ/١٢٣٦ء سے ٩٠٧ھ/١٥٠٢ء تک حکومت کی۔ اس کا مورث اعلیٰ باتو خاں چنگیز خان کے بڑے لڑکے جوجی کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس نے ١٢٣٦ء سے ١٢٤١ء تک وسیع تر علاقہ فتح کیا۔ ان فتوحات سے جو مغربی منگول سلطنت قائم ہوئی اس کا مرکز باتو نے پہلے اپنے آباد کردہ شہر سرائے قدیم اور پھر سرای جدید کو قرار دیا۔ ان شہروں میں منگول اور روسیوں کی مخلوط آبادیاں تھیں روسی اس نئی سلطنت کو اردوئے مطلا کہتے تھے۔ باتو نے ١٢٥٥ء میں وفات پائی۔ باتو کے بعد اس کا بھائی برکہ تخت پر بیٹھا، وہ پہلا منگول فرمانروا تھا جس نے اسلام کو قبول کیا اور اہلسنت مسلک کے تحت تاتاریوں کو دائرہ اسلام میں

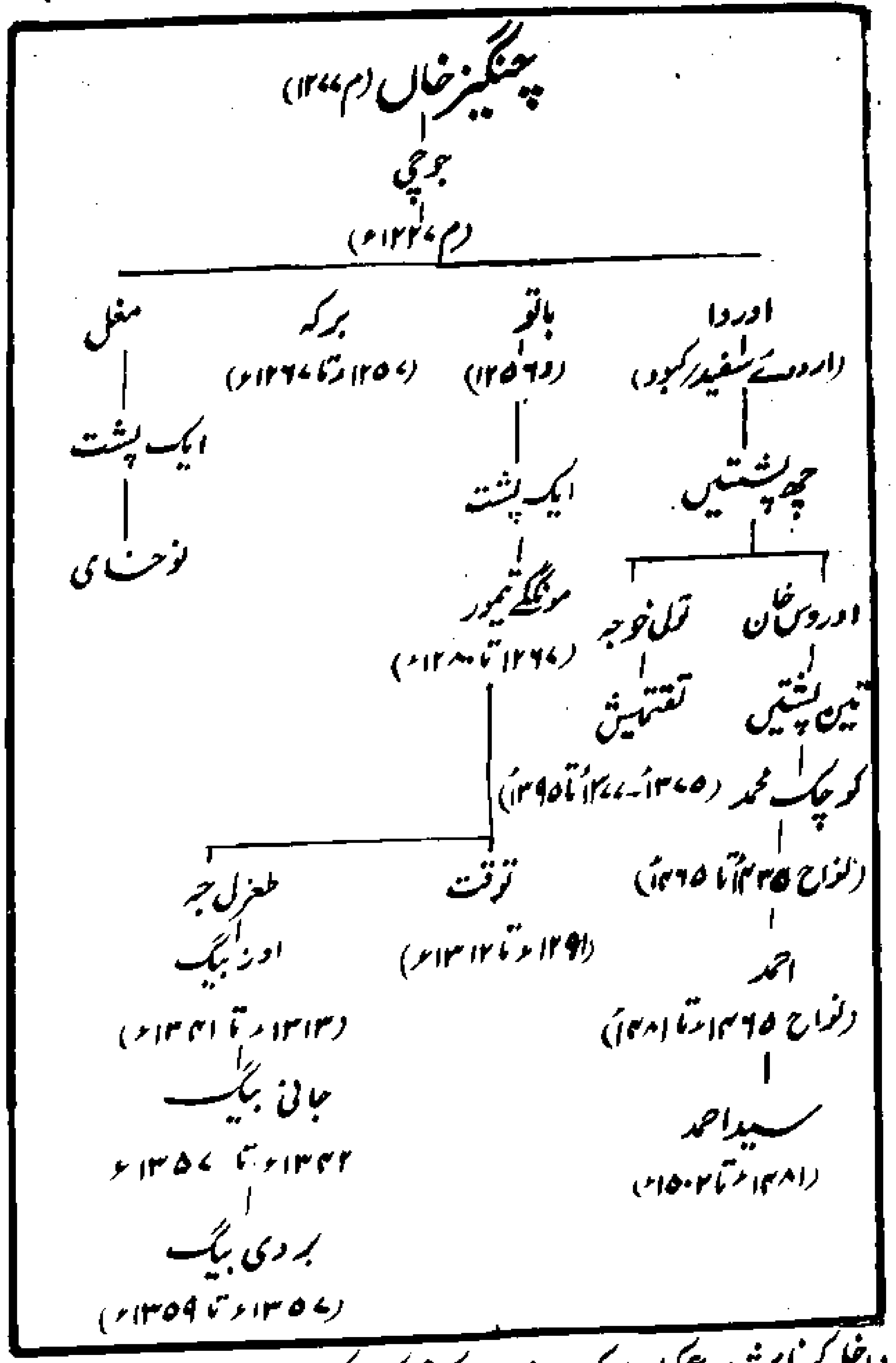

داخل کرنا شروع کیا۔ برکہ نے مصر کے مملوک حکمرانوں سے ایران کے منگول ایلخانیوں کے خلاف باہمی اتحاد کا ایک معاہدہ کیا۔ یہ منگول ابھی تک بدھ مذہب پر قائم تھے۔ اور ١٢٥٨ء میں انہوں نے خلافت بغداد کے خلاف جنگ کر کے برکہ کی دشمنی مول لے لی تھی۔

١٢٦١ء میں برکہ نے رومی شہنشاہ سے بھی ایک معاہدہ کیا۔ ان تمام دوستانہ معاہدوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلامی اثرات خصوصاً ترکی ثقافتی اثرات اردوئے مطلا تک پہنچ گئے۔

برکہ کے تمام جانشین سُنی مذہب کے پیروکار تھے۔ ١٢٩٩ء میں اس کا جانشین نوخائی ایک لڑائی میں مارا گیا تو آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی کے شروع میں سیاسی صورت حال بدل گئی۔ ایل خانی اب مسلمان ہو چکے تھے چنانچہ ١٣٢٣ء میں اردوئے مطلا اور ایل خانیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس صلح نامے کی وجہ سے مصر اور اردوئے مطلا کے درمیان تجارت میں بے حد کمی واقع ہو گئی۔ ١٣٣٥ء میں جب ایلخانی سلطنت کو زوال آ گیا تو اردوئے مطلا کو اوزبیگ کی سرپرستی میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا اوزبیگ مسلمان تھا اور اس نے والگا کے علاقے میں اسلام کی بنیاد کو مستحکم کرنے کی انتہائی کامیاب کوششیں کیں۔ اس کے بعد والگا کے تاتاریوں کی اکثریت سنی مسلک کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ مغربی ملکوں کی طرف سے مسیحیت کو پھیلانے کی کوششیں بالکل بے سود رہیں۔ اور وہ اردوئے مطلا کو متاثر نہ کر سکیں۔

اوزبیگ کے بعد جانی بیگ خان اور پوتے بردی بیگ خان نے آذربیجان کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس دور کے بعد اردوئے مطلا کے متعدد مدعیان

Marfat.com

حکومت کی باہمی آویزشوں نے اس سلطنت کو بے حد کمزور کر دیا اور بالآخر ۱۳۸۰ء
میں پہلی بار ایک روسی فوج نے تاتاری فوجوں کو شکست فاش دی۔
۱۳۷۵ میں اردوئے مطلا کے حکمران تقتمیش نے ساری سلطنت کو متحد
کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے ۱۳۹۱ء میں تیمور کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی
تیمور نے شہر سرای بھی برباد کر ڈالا۔ اب سالار ایڈگو اردوئے مطلا کا حکمران بنا اور
۱۴۱۹ء تک اس کی حفاظت کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس سلطنت کا شیرازہ
بکھرنے لگا اور بالآخر ۱۵۰۲ء میں اردوئے مطلا کو جواب اردوئے عظیم کے نام
سے مشہور تھی۔ آخری بار فیصلہ کن شکست ملی اور خانوادوں کا خاتمہ ہو گیا۔

باجہ دو شہروں کا ایک نام۔ ان میں سے ایک افریقہ میں اور دوسرا اسپین میں ہے۔ افریقہ کا شہر تونس میں مغرب کی سمت تقریباً ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ۵۰ ہزار ہے یہ قدیم ترین شہر ہے پورے اسلامی دور میں اسے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسے اناج کا گھر کہا جاتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس شہر کو افریقہ اور اندلس کے دوسرے شہروں سے ممتاز کرنے کے لیے باجۃ القمح (غلے والا باجہ) کہا جاتا ہے۔ البکری کے الفاظ میں یہ شہر القیروان سے تین دن کی مسافت پر واقع ہے عین الشمس کا چشمہ شہر کو سیراب کرتا ہے۔ شہر کی فصیل کو ایک اور بیرونی دیوار تعمیر کر کے مستحکم کر دیا گیا ہے اور اس بیرونی دیوار کے اندر شہر کے نئے محلے آگئے ہیں۔ قلعہ جو "القصبہ" کہلاتا ہے ایک قدیم عمارت ہے جسے پتھر کی مضبوط سلوں سے مضبوطی سے تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑی مسجد ایک ٹھوس عمارت ہے جس کے قبلے کی طرف شہر کی فصیل ہے۔ ایک بازنطینی قلعہ جو قیصر کے عہد میں کاؤنٹ پالوس نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے علاوہ اس شہر میں پانچ حمام متعدد مسافر سرائیں اور تین کھلے میدان ہیں جہاں غلہ منڈی لگتی ہے۔ سوائے شہر شاندار باغات سے پر ہے۔ اور ان باغات کو ندیاں سیراب کرتی ہیں
۷۶ھ/۶۹۵ء میں جب حسان بن النعمان نے قرطاجنہ کا محاصرہ کیا تو بازنطی سپاہ کے ایک حصے نے اسی شہر میں آکر پناہ لی اور جب حسان نے اس شہر کو بھی فتح کر لیا تو باجہ عرب لشکر کا ایک اہم فوجی مرکز بن گیا۔ الہروی کے قول کے مطابق اس شہر میں آنحضور؈ کے چچا زاد بھائی معبدؓ بن عباس نے وفات پائی۔ یہاں ان کا مزار بھی ہے

بنو اغلب کے دور حکومت میں باجہ تونس کے سارے شمال مغربی ضلع کا اہم صدر مقام بن گیا۔ فاطمیوں کے عہد میں ۳۳۵ھ/۹۴۶ء میں ابویزید صاحب الحماد کے بربری لشکر نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن یہ شہر اپنی زرعی پیداوار کی بدولت جلد ہی دوبارہ خوشحال ہو گیا۔ ترک عہد دسویں اور گیارہویں صدی ہجری/سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں اس شہر میں ایک مسجد تعمیر کی گئی اور اس کے علاوہ بعض یادگار عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں ایک قلعہ قابل ذکر ہے جس کا نام بار دو رکھا گیا۔

اس شہر نے متعدد عالموں فقیہوں شاعروں اور مقامی مورخوں کو پیدا کیا۔ اس شہر کے علاوہ تونس کے دو اور شہروں کا نام بھی باجہ تھا۔ اور ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے ایک "باجۃ الزیت" (تیل والا باجہ) اور دوسرے کو "باجۃ القدیمۃ" کہتے کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اوّل الذکر شہر ضلع رصعہ میں تیونس کے ساحل پر زیتون کے جنگل کے درمیان مہدیہ سے الجان جانے والی سڑک پر الجان سے تیرہ کیلومیٹر مشرق کی طرف واقع تھا۔ جس علاقے میں یہ شہر واقع تھا اسے اب بھی وادیٔ باجہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شہر بنو ہلال کے حملے تک بڑا خوشحال تھا۔ اس کے بعد اس پر زوال آنا شروع ہوا اور بنو حفص کے دور میں بالکل برباد اور ناپید ہو گیا۔ موخر الذکر باجۃ القدیمہ کے نام سے ایک چھوٹی سی بستی تھی جو اب ناپید ہو چکی ہے۔ یہ بستی موجودہ شہر منوبہ کے قریب تیونس کے شمال مغرب میں واقع تھی۔ اس بستی کی شہرت اس وجہ سے تھی کہ یہ بستی ایک جلیل القدر صوفی ابوسعید خلفہ بن یحییٰ التیمی الباجی کی جائے پیدائش ہے۔

اسلامی سپین (اندلس) کا ایک شہر اور ضلع بھی باجہ کے نام سے مشہور ہے، جو آج کل جنوبی پرتگال میں بیجا کہلاتا ہے۔ اس شہر کو موسیٰ بن نصیر نے ۹۳ھ/۷۱۲ء میں فتح کیا۔ ۱۴۶ھ/۷۶۳ء میں مصری فوج کے سالار العلاء بن المغیث نے بغاوت کر دی۔ ۲۳۰ھ/۸۴۴ء میں شمال یورپ کی ایک قوم وائکنگ نے بھی باجہ پر حملہ کیا تھا۔ بعد میں مقامی سترخاندان کے ایک خاندان طیفوریہ نے اپنی خود مختاری قائم کر لی اور کچھ مدت تک اپنی آزادی برقرار رکھی۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک باجہ شہر امارت شلب کے زیر نگین رہا۔ ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء میں یہ شہر اشبیلیہ کے بنو عباد کی عملداری میں چلا گیا۔ اس شہر کو بعض اوقات باجۃ الزیت بھی کہا جاتا رہا۔ موجودہ زمانے میں یہ شہر پرتگال کے صوبہ المستیجو کا صدر مقام ہے اور موجودہ دارالحکومت لزبن سے جنوب مشرق کی جانب پچانوے میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

بادشاہ نبی وہ نبی جو اپنے وقت میں حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں دو طرح کے نبی مبعوث فرمائے ہیں۔ ۱۔ معلم نبی مثلاً حضرت موسیٰؑ اور ۲۔ بادشاہ نبی مثلاً حضرت سلیمانؑ۔
معلم نبی کا جانشین کوئی نہیں ہوتا کیونکہ وہ نبوت کا کام ختم کر جاتا ہے۔ چونکہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اس لیے اگر اس کا کوئی جانشین ہو تو اس پر بھی وحی نازل ہونی چاہیے۔ پہلا نبی اس وقت اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے جب وہ فرائض نبوت پورے انجام دے چکتا ہے اور اس کے بعد فوراً اس کے جانشین نبی کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی۔ لیکن بادشاہ نبی کے انتقال پر فرائض نبوت کی بجا آوری کے لیے تو واقعی اس کا کوئی جانشین نہیں ہوتا۔ البتہ امور سلطنت میں اس کا جانشین ہونا ناگزیر ہے۔ آنحضور؈ بادشاہ نبی تھے۔ کیونکہ وہ نبی اور ختم الرسل ہونے کے علاوہ ایک مکمل اور بہترین مجموعہ قوانین بھی لے کر آئے تھے لہٰذا آپؐ کے وصال کے بعد امور سلطنت میں آپؐ کا جانشین ہونا قطعی طور پر لازمی تھا۔
بادشاہ نبیوں میں آنحضور؈ کے علاوہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام قابل ذکر ہیں۔

بادشاہی مسجد عالمگیری مسجد، لاہور پاکستان میں واقع دنیا کی سب سے بڑی مسجد اس کے صحن میں ایک لاکھ کے قریب افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ عید کی نماز کے موقع پر یہاں تقریباً پانچ لاکھ افراد کا اجتماع ہوتا ہے جو ارد گرد کے باغات میں دور دور تک صفوں کی صورت میں پھیلا ہوتا ہے۔ مسجد لاہور کے اکبری دروازہ کے سامنے مغرب کی جانب عام سطح زمین سے پندرہ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر لاہور کا شاہی قلعہ واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری

Marfat.com

ہے، جسے جلوخانہ بھی کہتے ہیں۔ مسجد اور یہ چاردیواری مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس لئے اسے عالمگیری مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ چاردیواری اورنگ زیب کی سرائے کہلاتی تھی۔ اس پر مغلیہ دور کا چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ منشی سجان رائے بٹالوی مصنف "خلاصۃ التواریخ" کی رائے کے مطابق اس پر ملتان کا خراج وقف تھا۔

مسجد کے دروازہ کے اردگرد حجرے ہیں، جہاں شاہی محافظ دستے رہا کرتے تھے، جب بادشاہ نماز پڑھنے جاتا تو یہ دستے گرز اور عصا اٹھا کر آگے آگے چلتے تھے مسجد کے صدر دروازہ میں داخل ہونے سے پیشتر بائیس سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں سب سے نچلی سیڑھی کا طول ۱۲۶ فٹ اور عرض ۹ ۱/۴ فٹ ہے اور سب سے اوپر والی سیڑھی کا طول ۷۹ فٹ اور عرض ۲۴ فٹ ہے۔ ان سیڑھیوں میں کابلی سنگ ابری استعمال ہوا تھا اور اب سنگ سرخ لگا دیا گیا ہے۔ سیڑھیوں کے دائیں بائیں حجروں کے آگے خالی چبوتروں پر علامہ اقبال اور سر سکندر حیات خاں کی قبریں ہیں۔

بادشاہی مسجد کا دروازہ شان و شوکت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ یہ سنگ رخام اور سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ ڈیوڑھی تقریباً مربع ہے، جس کا طول ۶۶ فٹ، ۶ انچ اور عرض ۶۲ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ اوپر دو منزلہ عمارت ہے، جس میں کبھی خطیب اور امام رہا کرتے تھے۔ مگر اب تبرکات اور باقیات محمدیہ برائے نمائش رکھے ہوئے ہیں۔ دروازے کی محراب کے دونوں جانب نہایت خوبصورت کنگرے بنے ہیں، جو سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر سے بنے ہیں۔ دروازے پر یہ طغرا درج ہے:

"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مسجد ابوالظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی

سنہ ہزار و ہشتاد و چہار ہجری اتمام یافت

باہتمام کمترین خانہ زاداں فدائی خاں کوکہ"

ڈیوڑھی سے گذرنے کے بعد وسیع صحن آتا ہے۔ جو تقریباً مربع ہے۔ اس کا طول شمالاً جنوباً ۵۲۸ فٹ ۸ انچ اور عرض شرقاً غرباً ۵۲۸ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس کا فرش پہلے پختہ اینٹوں کا تھا اور نمازیوں کی سہولت کے لئے سنگ موسیٰ اور سنگ رخام سے مصلے بنے تھے۔ اب سنگ سرخ کی سلیں لگا دی گئی ہیں۔

صحن کے عین وسط میں مربع شکل کا ایک حوض سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ اس کا ضلع ۵۰ فٹ ہے۔ حوض میں پانی ٹیوب ویل کے ذریعے لایا جاتا ہے۔ تازہ مرمت کے بعد حوض کے گرد جنگلہ لگا دیا گیا ہے۔ وضو خانہ صدر دروازے کے دائیں بائیں جانب والے حجروں کے اوپر بنا دیا گیا ہے، جہاں ۱۲۸ ٹونٹیوں کا انتظام ہے۔ پینے کے پانی کے نل علیحدہ لگائے گئے ہیں۔ حوض سے گذر کر دو زینے بلند ایک چبوترہ ۲۲۵ فٹ لمبا ۱۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مسجد کی عمارت شروع ہوتی ہے جسے درگاہ بھی کہتے ہیں یہ بلند محرابوں اور تین سفید سنگ مرمر کے گنبدوں پر مشتمل ہے۔ جن کے سنہرے کلس سورج کی روشنی میں خوب چمکتے ہیں۔ اس دالان کا طول ۲۲۵ فٹ اور عرض ۱۱۵ فٹ ہے اس کی کرسی مسجد کے فرش سے کوئی چھ فٹ بلند ہے۔ چھت نہایت خوب صورت ہے دیواروں پر مختلف قسم کے پتھروں اور رنگوں سے نقاشی اور پچی کاری کی گئی ہے۔ تمام عمارت قالبوتی ہے۔ اس میں لکڑی استعمال کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا خیال ہے کہ اس قسم کی پرچین کاری یعنی پتھر پر پتھر ہی کے نقوش بھرے گئے ہوں اور پھر

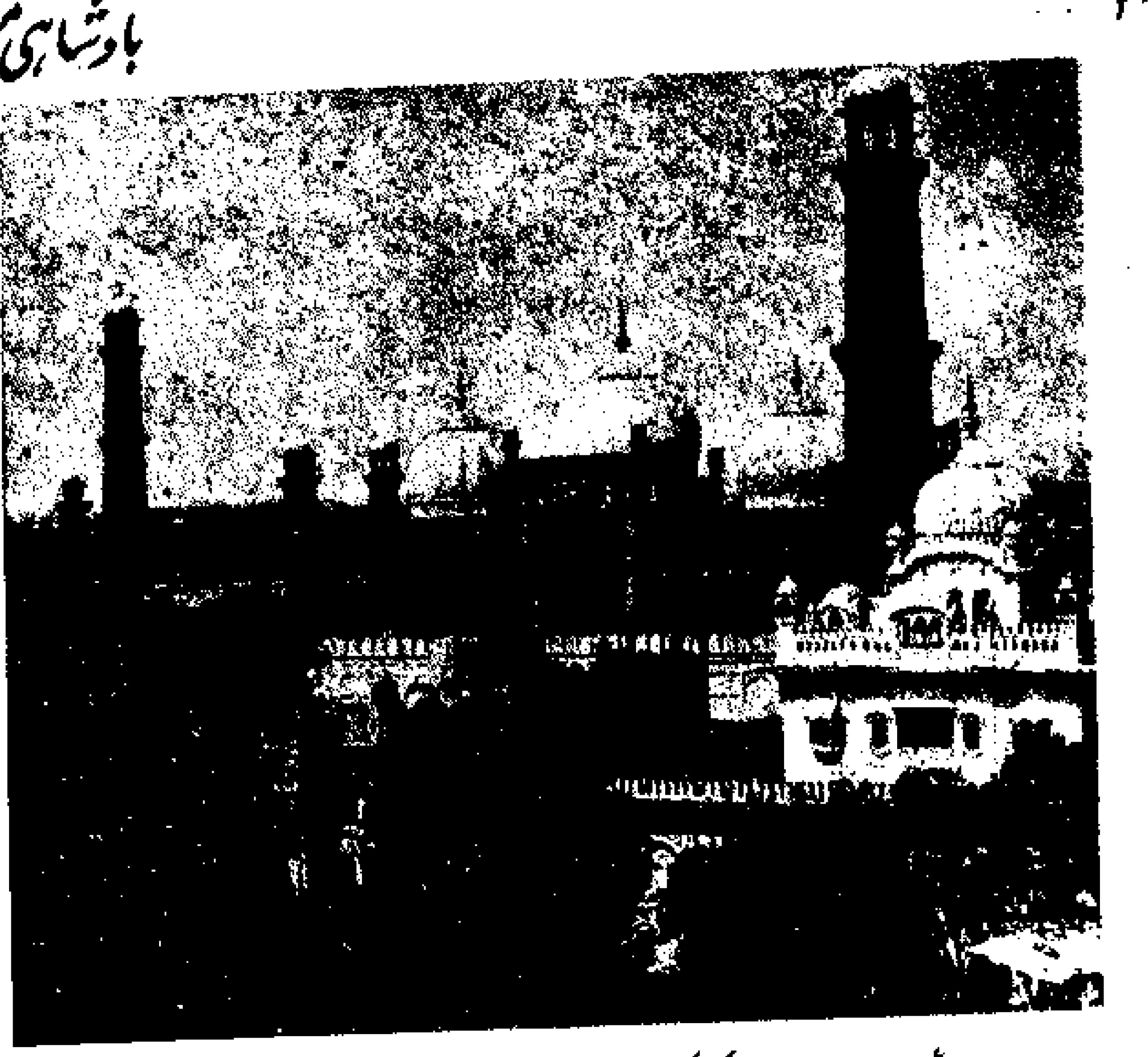

ابھرے ہوئے ہوں، دنیا بھر کی کسی عمارت میں نہیں ملتے۔

سب سے بڑے اور درمیانی گنبد کے نیچے سنگ مرمر کا بنا ہوا نہایت خوبصورت منبر ہے۔ جس پر چڑھ کر خطیب جمعہ اور عیدین کے خطبے پڑھتا ہے۔ مسجد کے اس حصے میں فرش پر مرمریں سلیں استعمال کی گئی ہیں دیواروں پر موٹی تہہ کی سترکاری جس میں سلیمی نقوش ابھرے ہوئے ہیں ازارہ سنگ ابری کا ہے۔ جس کا حاشیہ کالے اور زرد رنگ کے پتھر سے پچیکاری کیا ہوا ہے ایوان کے منڈیر پر کنگرے اور کونوں پر سنگ مرمر کی شرفہ دار برجیاں ہیں جو بہت خوب صورت معلوم ہوتی ہیں

مسجد کے چاروں کونوں پر چار نہایت بلند مینار کھڑے ہیں جو جے پوری سرخ پتھر سے بنے ہیں۔ یہ مینار اپنی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے اگرچہ سادہ ہیں مگر میلوں سے نظر آتے ہیں۔ اور مسجد کی عظمت اور خوب صورتی میں چار چاند لگاتے ہیں ہر ایک مینار کی بلندی ۱۷۶ فٹ ۴ انچ اور سیڑھیوں کی تعداد ۲۰۴ ہے۔ چوٹیوں پر سنگ مرمر کے گنبد بنے ہیں۔ چھتری والی منزل تنہا ۲۱ فٹ ۹ انچ بلند ہے اور آٹھ آٹھ ہشت پہلو ستونوں پر کھڑی ہے۔ یہ مینار مقبرہ جہانگیر کے میناروں سے کچھ عجیب نسبت رکھتے ہیں۔ اور اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ اگر کسی بھی مینار پر چڑھ کر مقبرہ کے میناروں کو دیکھا جائے تو وہ چار کی بجائے تین نظر آتے ہیں اور ایک اوجھل رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مقبرہ کے کسی مینار پر چڑھ کر دیکھا جائے تو شاہی مسجد کے بھی تین ہی مینار نظر آتے ہیں۔ ان میناروں کی چار چار منزلیں۔ دور باہر کی جانب سے ۶۰ فٹ اور اندر کی جانب سے ۴ ۱/۲ فٹ ہے۔ اوپر والی منزل جن پر گنبد دار چھت ہے۔ ۱۸۴۰ء کے زلزلہ میں ناکارہ ہو گئی تھیں۔ اس وجہ سے گرادی گئی تھیں اور میناروں کی بلندی ۱۴۴ فٹ رہ گئی تھی۔ اب تازہ ترین مرمت کے بعد اصلی حالت پر آ گئے ہیں اور ان پر روشنی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ یہ مینار لاہور کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۸۴۱ء میں جب شیر سنگھ نے قلعہ لاہور کے محاصرہ کے لئے اپنے آدمی متعین کئے تو انہوں نے انہی میناروں سے آتش بازی کر کے مہارانی چندی کور کی ڈوگرہ فوج کو شکست دی۔ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ کے قتل کے بعد جب سردار ہیرا سنگھ سندھانوالہ نے لاہور کا محاصرہ کیا تو اس نے بھی ان ہی میناروں پر زنبورہ توپیں نصب کیں اور قلعہ والوں کو شکست دے کر وزارت حاصل کی۔

سکھوں کے آخری دور میں مسجد کے صحن سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر اس کے دروازے بند تھے۔ انگریزوں کے آنے تک مسجد کی حالت انتہائی خراب

Marfat.com

خستہ ہو چکی تھی، ۱۸۵۶ء میں سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی اور اس میں ایک مرتبہ پھر سے اللہ کا نام گونجنے لگا۔

مسجد کے شمالی جنوب میں چھوٹے چھوٹے حجرے ہیں ان حجروں میں وہ طالب علم رہا کرتے تھے جو دور دراز علاقوں سے علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ مسجد کے نام پر جو جاگیریں وقف تھیں ان کی آمدنی ان طلباء کی خورد و نوش پر خرچ ہوتی تھی۔

مسجد کے شرقی دروازے پر ایک منزل میں آنحضورؐ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور غوث اعظمؒ کی چند یادگاریں تبرکا رکھی ہیں۔ جو شیشوں میں محفوظ ہیں۔ ان تبرکات کی مجموعی تعداد ۲۳ ہے۔ ایک آنحضورؐ کا سبز عمامہ مع ٹوپی ہے۔ ایک سبز جبہ، سفید پاجامہ، نعلین، نقش قدم مبارک، سفید علم جس پر قرآنی آیات منقوش ہیں۔ حضرت علیؓ کے قرآن مجید کا سیپارہ اوّل جو کوفی خط میں لکھا گیا ہے۔ عمامہ مع کلاہ اور ایک تعویذ اور حضرت سیدۃ النساء کا رومال جائے نماز، امام حسینؓ کا صندلی عمامہ، کلاہ، علم اور خون آلودہ رومال۔ جناب غوث اعظمؒ کا عمامہ، لحاف اور جائے نماز کربلائے معلیٰ کی سرخ مٹی اور خواجہ اویسؒ قرنی کا شکستہ دانت اور دیگر بہت سے تبرکات شامل ہیں۔

مورخین نے اس مسجد کی تاریخ بنا کے متعلق عجیب عجیب قصے بیان کئے ہیں ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جس جگہ مسجد واقع ہے یہاں دارا شکوہ کا وہ کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر ویدانت اور سنسکرت کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ جب دارا شکوہ قتل ہو گیا تو اورنگ زیب نے ان کتابوں کو اکبر آباد منگا کر مختلف علماء میں تقسیم کر دیا اور کتب خانہ کی عمارت جو کہ ایک شوالہ کی طرز پر بنی ہوئی تھی ڈھا کر یہ مسجد تعمیر کرائی

جسٹس محمد لطیف تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے اپنے روحانی پیشوا حضرت میاں میرؒ کے مزار کی عمارت کے لیے یہ پتھر جمع کیا تھا۔ جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ پتھر مسجد کی عمارت پر صرف کر دیا اور ایک سادہ سی عمارت میاں میر کے مزار پر بنا دی لیکن دوسرے نقادوں نے ان کی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ کیونکہ آپ کے مزار کی عمارت شاہجہانی دور کی عمارات سے ملتی جلتی بنی ہوئی ہے۔ نیز آپ نے اس مسجد بننے سے چالیس سال پہلے وفات پائی تھی۔ اس طرح کی کئی ایک اور روایات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر نے خاص اس مسجد کے لیے تمام پتھر اجمیر اور جے پور سے منگوایا تھا۔ اور اسے بڑے شوق سے بنوایا تھا اور اس میں نماز بھی ادا کی تھی۔ اس مسجد کی امامت و خطابت کے لیے حنفی عقیدہ کے نامور عالم مامور رہے ہیں۔

سکھوں کے غلط استعمال کی وجہ سے مسجد کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اس کا قبضہ مسلمانوں کو دلایا تو یہ کافی مرمت طلب تھی۔ فرش نماز پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور کے مسلمانوں نے مسجد کی صفائی اور روشنی کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۶۹ء میں خان بہادر برکت علی خان کی تحریک سے انجمن اسلامیہ قائم ہوئی جس نے مسجد کی انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر چندے کی اپیل کی۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء میں ہزاروں روپے کے صرف سے فقط دروازہ درست ہو سکا۔ اگلے سال حکومت نے پانچ ہزار روپیہ دینا منظور فرمایا اور شرط لگائی کہ اس کا دو چند چندہ لوگوں سے لیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہندو عیسائی اور سکھوں نے بھی چندے دیئے۔

۱۹۳۹ء میں مسجد کی خستہ حالی کے پیش نظر پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں نے سرکاری طور پر اس کی مرمت کا کام شروع کرایا، جو اکیس سال تک مسلسل ہوتا رہا اور ۱۹۶۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ انھوں نے اس مسجد کی مرمت کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلمان زمینداروں پر خاص ٹیکس لگایا۔ پہلے یہ کام محکمہ آثار قدیمہ کو سونپا گیا۔ لیکن بعد میں مرکزی محکمہ تعمیرات عامہ کو منتقل کر دیا گیا۔ آزادی کے بعد یہ کام صوبائی محکمہ تعمیرات نے انجام دیا۔

اس طرح مسجد کی مرمت اور تزئین و آرائش لاؤڈ سپیکر اور روشنی کے جدید انتظامات غسل خانوں اور وضو خانوں کی تعمیر معمولی کنوؤں کی بجائے ٹیوب ویل سے پانی کی بہم رسانی اور دیگر تبدیلیوں پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے یہ رقم مسجد کی تعمیر کی اصل لاگت سے دس گنا زیادہ ہے۔ مگر اس سے ایک بار پھر مسجد کو نئی زندگی نصیب ہو گئی ہے اور اب عمارت اپنی عمر سے زیادہ جوان دکھائی دیتی ہے۔

اس مسجد کی دیکھ بھال کا فریضہ پہلے انجمن اسلامیہ پنجاب سر انجام دیتی تھی اب صوبائی محکمہ اوقاف اس کا انتظام کرتا ہے اور مسجد کی ملحقہ املاک بھی اسی کے تصرف میں ہے۔

بادیس

(م ۳۷۴ھ/۹۸۴ء - ۳۰ ذی القعدہ ۴۰۶ھ/ ۱۰ مئی ۱۰۱۶ء) ابو مناد، **بادیس** نصیر الدولہ، بادیس بن المنصور بن بلقین بن زیری افریقہ کا تیسرا زیری حکمران ۱۶ ربیع الاوّل ۳۸۶ھ/ ۸ اپریل ۹۹۶ء کو تخت نشین ہوا۔ بادیس نے مشرقی افریقہ کا انتظام اپنے ایک نائب کو سونپ دیا اور خود زناتہ قبائل کے خلاف نبرد آزمائی شروع کی چنانچہ تیارت سے بڑھتا ہوا وہ طرابلس تک جا پہنچا۔

۳۸۹ھ/ ۹۹۹ء میں اسے مغراوہ کے امیر زیری ابن عطیہ کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار اس نے اپنے دشمن کو شکست دی۔ ۳۹۰ھ/ ۹۹۹ء سے ۴۰۶ھ/ ۱۰۱۵ء تک طرابلس کے علاقے میں فاطمیوں کی مداخلت کے خلاف نبرد آزما رہا۔ ۴۰۶ھ/ ۱۰۱۵ء میں اس نے المغرب میں القلعہ کے بانی حماد کی بغاوت کا خاتمہ کیا اور شلف کے میدان میں اسے فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ اگرچہ وہ چھ ماہ محاصرہ کرنے کے باوجود قلعہ فتح نہ کر سکا اور اسی مہم میں وفات پا گیا۔

باربروسہ

عربی اور ترکی زبان میں باربروسہ کے معنی سرخ داڑھی والے ملاح یا امیر البحر کے **باربروسہ** ہیں۔ مسلمانوں میں دو مشہور بھائی امیر البحر اور باربروسہ کے نام مشہور ہیں۔

۱۔ امیر البحر عروج باربروسہ

والد کا نام یعقوب تھا۔ جس کے چار بیٹے تھے۔ تین بیٹوں نے بحری فوج میں ملازمت اختیار کی جن میں سے عروج اور خضر جو بعد میں خیر الدین باربروسہ کے نام سے مشہور ہوا ہے بیحد ترقی کی اور امیر البحر کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے۔ عروج نے جنوبی یورپ کی عیسائی حکومتوں کے جنگی بیڑوں کو عبرتناک شکست دی اور ان کی بحری طاقت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

عیسائی دنیا کا سب سے بڑا مذہبی رہنما پوپ کہلاتا تھا۔ اس کا اپنا بہت مضبوط بیڑا تھا۔ یہ بیڑا اتنا مضبوط تھا کہ اب تک کسی مسلمان سلطنت نے اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کی تھی۔ ایک بار جب اچانک امیر البحر عروج کو پوپ کا بیڑہ بحیرۂ روم میں نظر آگیا تو ان سے رہا نہ گیا اور اسی وقت حملہ کر کے سارے جہاز گرفتار کر لئے اور یورپ کے سارے ملاحوں اور سپاہیوں کو بھی گرفتار کر لیا۔

Marfat.com

جس سے یورپ میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ امیر البحر عروج نے ان سارے ملاحوں کو جو ساری عیسائی دنیا کے قابل ترین ملاح تھے، تونس کی بحریہ کی ملازمت پیش کی جس کو انہوں نے قبول کر لیا اور اس طرح تونس کی بحری قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد عروج نے اپنے مختصر بیڑے کی مدد سے بحری ڈاکوؤں کی کئی ٹولیوں کو شکست دی۔ عروج نے تونس کی بندرگاہ کو جو دنیا کی بہترین بندرگاہوں میں سے ایک ہے اپنا مستقر بنایا۔ عروج کے یہاں پہنچنے کے بعد تونس کا ساحل محفوظ ہو گیا۔ آخر سلطان تونس نے، عثمانی سلطان سے اجازت لے کر عروج کو تونس کا امیر البحر بنا دیا۔ اس عہدے پر فائز ہوتے ہی عروج نے تونس کے بحری بیڑے کی تنظیم نو کی۔ جہاز سازی کے کارخانے کھولے۔ بحری علوم کی درسگاہیں قائم کرائیں۔ بندرگاہوں کی توسیع اور مرمت کرائی۔ اور عیسائی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی جنگ کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اس جنگ کی تیاری خاموشی سے کرنے کی بجائے علی الاعلان کی کیونکہ عروج چاہتا تھا کہ اسپین کی عیسائی حکومت کا پورا جنگی بیڑا ایک جگہ اکٹھا ہو جائے چنانچہ جبرالٹر کے قریب دونوں بیڑوں میں خوفناک تاریخی جنگ ہوئی جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور اسپین کی سمندری طاقت کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس فتح نے ساری دنیا میں عروج کا نام بہت مشہور کر دیا۔ اور سلطان تونس نے خوش ہو کر جربہ نامی ایک جزیرہ انہیں بخش دیا تاکہ وہ مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ عروج نے اپنے جہازوں کو جربہ میں رکھا جبکہ حلق الوید کی بندرگاہ میں تونس کے آٹھ سو جنگی جہاز ہر وقت اس کے حکم کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اسپین کے ساحل پر بوجیہ نامی ایک چھوٹی سی عیسائی ریاست تھی جس پر اسپین کی حکومت نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں کے حاکم نے عروج سے مدد کی درخواست کی۔ عروج نے سلطان تونس سے اجازت لے کر حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ اسپین کی بحری طاقت تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اسلئے بحری لڑائی کی نوبت نہ آئی اور اسلامی لشکر بوجیہ کے ساحل پر اتر گیا۔ عیسائیوں نے پسپا ہونے کے بعد ایک قلعہ میں پناہ لے لی۔ مسلمانوں کی فوجیں دس روز تک مسلسل گولہ باری کرتی رہیں۔ لیکن قلعہ کی فصیل بہت زیادہ مضبوط ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اس دوران میں امیر البحر عروج شدید طور پر زخمی ہو گیا اور اسے علاج کے لئے افریقہ بھیج دیا گیا۔ اسلامی فوج ناکامی کے ساتھ تونس سے واپس چلی آئی۔ عروج کی بیماری کے دوران میں اس کا بھائی خیرالدین باربروسہ اس پورے بیڑے کا انچارج بنا۔ اس نے جزیرہ جربہ پہنچ کر بحری بیڑہ درست کیا۔ اس عرصہ میں عروج صحت یاب ہو کر آ گیا اور دوبارہ اسپین کے ساحل کا رخ کیا۔

اس مرتبہ مسلمان قلعہ سر کرنے کی تیاریاں کر کے آئے تھے اور چند روز کی لڑائی کے بعد فتح کے آثار نظر آنے لگے لیکن اس وقت اسپین کی تازہ بحری کمک پہنچنے سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اور مسلمان لشکر کو پسپا ہونا پڑا۔ عروج نے حکم دے کر اپنے زائد جہازوں کو آگ لگوا دی تاکہ دشمن کے قبضہ میں نہ جائیں۔

۱۵۱۶ء میں امیر البحر عروج نے الجزائر کے دارالحکومت الجزیرہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اسی عرصہ میں مسلمانوں کی فوج میں ایک بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی جسے فرو کرنے میں کئی دن لگ گئے اور قلعے کے عیسائی حاکم نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر حاکم اسپین سے مدد منگوالی۔ جو سات ہزار فوجوں پر مشتمل تھی لیکن عروج نے اپنی حکمت عملی سے عیسائی بیڑے کو چار گھنٹے کے اندر اندر تباہ و برباد کر کے عیسائیوں کو عبرتناک شکست دی۔

اس فتح کے بعد عروج کی مقبولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس نے ایک بری فوج بھی تیار کی جس کی مدد سے سلطان سلیم کو شکست دے کر الجزائر پر قبضہ کر لیا اور اسپین والوں کے قبضے سے وہ تمام قلعے بھی لے لئے جن پر انہوں نے سلطان سلیم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر قبضہ کر لیا تھا۔ الجزائر پر قبضہ سے اسپین کے تجارتی بیڑوں کا کام بند ہو کر رہ گیا۔ وہاں کے تاجر اپنی حکومت پر دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ عروج کا زور توڑنے کے لئے کارروائی کرے مگر ان میں ہمت ہی باقی نہ تھی۔ بالآخر جب چارلس پنجم نے اسپین کی حکومت سنبھالی تو اس نے چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور اچانک جبکہ عروج بندرگاہ سے

سو سپاہی لے کر دارالحکومت سے دور شکار کے لئے گیا ہوا تھا، پندرہ ہزار بحری اور دس ہزار بری فوج کے ساتھ الجزائر پر حملہ کر دیا۔ عروج اپنی مختصر سی جمعیت کے باوجود مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔

یورپین مورخوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پندرہ سو آدمیوں میں سے ایک نے بھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ سب کے سب شہید ہو گئے اور انہیں میں امیر البحر عروج باربروسہ بھی شامل تھا۔ شہادت کے وقت اس کی عمر پینتالیس برس تھی۔

خیرالدین پاشا باربروسہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے اور عظیم ترین امیر البحر۔ وہ امیر البحر عروج کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے بھائی سے زیادہ شہرت پائی۔ لفظ باربروسہ حالانکہ دونوں کے نام کا جز تھا۔ مگر تاریخ میں جہاں صرف باربروسہ لکھا ہو، وہاں امیر البحر خیرالدین پاشا ہی مراد ہوتے ہیں۔ ابتدا میں وہ ذاتی جہاز لے کر بحیرۂ روم میں عیسائی تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے بعد میں جب ان کی طاقت بڑھ گئی تو انہوں نے افریقہ کے ساحلوں پر حملے شروع کئے اور الجزیرہ شہر اور آس پاس کے علاقے پر قبضہ کر لیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی حکومت نہیں چلا سکیں گے، انہوں نے یہ علاقے ترکی کے عثمانی سلطان سلیم کے حوالے کر دئے۔ سلطان سلیم مشہور عثمانی سلطان محمد فاتح کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا سلیمان اعظم قانونی تخت پر بیٹھا تو اس نے خیرالدین پاشا کو پورے عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر کیا۔

عثمانی ملازمت کے دوران انہیں سب سے پہلے شہنشاہ چارلس کے بیڑے پر حملے کا حکم دیا گیا۔ خیرالدین پاشا باربروسہ نے عیسائیوں کے اس زبردست بیڑے کو تباہ کر کے کورن پڑاس اور دوسرے ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اٹلی کے ساحلوں پر کئی حملے کئے اور بہت سا علاقہ فتح کر کے عثمانی سلطنت میں شامل کر دیا۔ چارلس کے مشہور امیر البحر اندریا ڈوریا کو انہوں نے متعدد بار شرمناک شکستیں دیں۔

اس عہد میں تونس کی الگ حکومت تھی لیکن شمالی افریقہ میں ملا ہوا اس سے الجزائر سلطنت ترکی کا علاقہ تھا۔ امیر البحر خیرالدین پاشا باربروسہ نے سلیمان اعظم کی ہدایت پر تونس پر حملہ کیا اور سلطان حسن کی بحری اور بری طاقت کو شکست دے کر اسے الجزائر میں شامل کر دیا۔ تونس کے حکمران سلطان حسن اور عیسائی شہنشاہ چارلس کے درمیان مشترکہ دفاع کا معاہدہ موجود تھا۔ اس کے تحت سلطان حسن نے اس سے مدد کی درخواست کی۔ عیسائی شہنشاہ چارلس پانچسو جہازوں کا زبردست جنگی بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا۔ عیسائی فوجوں کی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ خیرالدین پاشا کو شکست کھا کر تونس سے نکلنا پڑا۔ چارلس نے تونس میں تیس ہزار مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرا دیا۔ اور ہزاروں خاندان جان بچانے کے لئے عیسائی بن گئے۔

اس شکست کے بعد سلیمان اعظم نے مصلحتاً فرانس سے بحری معاہدہ کر لیا جس کے مطابق دونوں حکومتوں نے بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ دن بعد فرانس اور شہنشاہ چارلس کے درمیان ایک بڑی جنگ چھڑ گئی جس میں یورپ کی تقریباً تمام طاقتیں فوراً ... خیرالدین پاشا کو ایک مضبوط بیڑا دے کر فرانس کی مدد کے لئے روانہ کیا۔ وہ اپنی پچھلی شکست کا انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا اور ان کی بحری فوج کا جوش و خروش بہت بڑھا ہوا تھا۔ کارفو نامی ایک جزیرے میں چارلس کا بہت بڑا بحری اڈہ تھا۔ خیرالدین پاشا نے کارفو کا محاصرہ کر لیا اور چند ہی روز میں اسے فتح کر کے اس پر سلطان ترکی کا پرچم لہرا دیا۔ جنگ میں وینس کی حکومت بھی چارلس کی طرف سے شریک تھی۔ لہٰذا خیرالدین پاشا نے بحیرہ ایجین کے تمام جزیروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔ یہ سارے جزیرے وینس کے ماتحت تھے۔ کچھ عرصے بعد فرانس اور چارلس کے درمیان نیس کے مقام پر عارضی صلح ہو گئی مگر ترکی نے جو علاقے فتح کر لئے تھے ان پر اسی کا قبضہ رہا۔ اس جنگ میں ترکی کو بہت سے مفتوحہ علاقے، اہم بندرگاہ، اور ایسے جزیرے ہاتھ آئے جن کی وجہ سے سمندروں پر سلطنت عثمانیہ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

Marfat.com

۹۴۵/۱۵۳۸ء میں پوپ فرڈیننڈ نے جو ہنگری کا شہنشاہ بھی تھا۔ جمہوریہ وینس اور شہنشاہ چارلس سے مل کر ترکوں کے خلاف "اتحادِ مقدس" قائم کیا۔ پوپ نے ایک فتوے کے ذریعہ اس جنگ کو مذہبی لڑائی یعنی صلیبی جنگ قرار دیا۔ چنانچہ یورپ کی دوسری عیسائی حکومتوں اور عام لوگوں نے بھی اتحادیوں کی مدد کی۔ اس طرح جو بحری بیڑہ فراہم کیا گیا وہ عثمانی بیڑے سے کئی گنا زیادہ بڑا تھا۔ اس کی کمان عیسائی دنیا کا سب سے بڑا امیر البحر انڈریا ڈوریا کر رہا تھا۔

عثمانی بیڑے کے انچارج امیر البحر خیر الدین پاشا باربروسہ تھے۔ جزیرہ پریویسا کے قریب یہ مشہور تاریخی جنگ ہوئی جس میں اتحادی بیڑے کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ان کے سارے بحری مقبوضات ترکی کے زیرنگیں آ گئے۔ اسپین کے شہنشاہ چارلس کو اس شکست کا انتقام لینے کی فکر پڑ گئی۔ پھر الجزائر کی طرف سے نہ صرف اسپین بلکہ اپنے اطالوی ساحلی مقبوضات کے لئے بھی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ اس لئے ۹۴۶ھ میں اس نے ایک بڑا بحری بیڑہ الجزائر پر حملے کے لئے روانہ کیا لیکن خیر الدین پاشا نے اُسے بری طرح شکست دے کر بھگا دیا۔ اس سے اگلے سال فرانس نے نیس کا معاہدہ ختم کر کے چارلس کے خلاف اعلانِ جنگ دوبارہ کر دیا۔ اس جنگ میں بھی ترکی نے معاہدے کے مطابق فرانس کا ساتھ دیا اور خیر الدین پاشا نے شہر نیس فتح کر لیا۔ ترک بیڑے کی ان خدمات کے اعتراف کے طور پر شہنشاہ فرانس نے از خود اپنی طولون کی بندرگاہ ترکی کے حوالے کر دی۔

۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء تک خیر الدین پاشا نے بحیرۂ روم میں متعدد لڑائیوں میں حصہ لیا اور سب میں کامیابی حاصل کی۔ یورپ والے انہیں ناقابلِ شکست سمجھنے لگے اور پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ عیسائی ملاح اور سپاہی بحری فوج میں بھرتی کے وقت سے پہلے یہ شرط رکھنے لگے کہ انہیں باربروسہ سے لڑنے کو نہیں کہا جائے گا۔

۹۵۳ھ کے آخر میں امیر البحر خیر الدین پاشا باربروسہ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ترکی کو سب سے بڑی بحری طاقت بنا دیا تھا۔ بحیرۂ روم، بحیرۂ احمر اور بحیرۂ عرب میں ان کے نام کے ڈنکے بجتے تھے اور جبل الطارق سے لے کر ہندوستان کے مغربی ساحل تک ان کا نام انتہائی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ عیسائی تجارتی جہاز لوٹنے کا کام کیا کرتے تھے اس طرح انہوں نے بیشمار دولت اکٹھی کی تھی۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ کی ملازمت کے دوران میں بھی انہوں نے تنخواہ کے علاوہ انعام و اکرام میں بڑی دولت حاصل کی۔ شہنشاہِ فرانس نے بھی بہت کچھ دیا۔ یہ ساری دولت انہوں نے اپنے ساتھیوں میں بانٹ دی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کے سپاہی اور ملاح [illegible] ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اور جہاں اُن کا پسینہ گرتا وہاں خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ [illegible] اُن کی عمر نوے سال تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بیحد چاق و چوبند تھے اور [illegible] سے نہیں گھبراتے تھے۔

انتقال کے بعد سلطان نے ان کا مزار سمندر کے کنارے اس طرح سے بنوایا کہ اس کی لہریں ہر وقت مزار کی دیوار چومتی رہیں۔ درۂ دانیال میں شاخ زرّیں کے سرے پر بکشطاش میں انکا یہ مزار آج بھی موجود ہے اور ترکی کا بحری بیڑہ جب بھی درۂ دانیال سے گزرتا ہے تو دنیا کے اس عظیم امیر البحر کو سلامی پیش کرتا ہے۔

بارودی (۲۷ رجب ۱۲۵۵ھ/ ۶ اکتوبر ۱۸۳۹ء - ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) محمود سامی مصری سیاستدان۔ مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں "ایتای البارود" میں پیدا ہوا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء میں قاہرہ کے فوجی ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء میں باش جاویش (کوارٹر ماسٹر سارجینٹ) کا درجہ حاصل کر کے سکول سے فراغت لی۔ اسی زمانے میں اس نے ذوقِ شعر گوئی کی طرف خاص توجہ دی اور اس کو مصری ادبِ ثانیہ میں ایک رہنما کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نے اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ترکی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کا مطالعہ کیا۔ کچھ عرصہ قسطنطنیہ میں بھی گذارا جبکہ وہ مصری امورِ خارجہ کے سیکرٹری کی حیثیت سے وہاں مامور تھا۔ ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء میں البارودی خدیوِ مصر کی خاص شاہی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ محرم ۱۲۸۰ھ/ جولائی ۱۸۶۳ء میں پلٹن کمانڈر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور وہ خدیو اسماعیل کے محافظ دستے کا کمانڈر ہو گیا۔ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء میں جب وہ مصری فوجی وفد کے ساتھ جو فرانس اور لندن گیا تھا واپس آیا تو اس کو محافظ دستے کی تیسری رجمنٹ کا قائم مقام (لیفٹیننٹ جنرل) کے عہدے پر ترقی دی گئی اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کو محافظ دستے کی چوتھی رجمنٹ کا امیر الالای (کرنل) کا عہدہ مل گیا۔

البارودی اقریطش کی جنگ میں ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں شریک ہوا جہاں اس کی خدمات کے عوض اسے ترکی نشان "وسامِ عثمانی درجہ چہارم" عطا کیا گیا۔ کچھ مدت بعد خدیو اسماعیل نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں جنگ روس کے بعد اس کے کارہائے نمایاں کے عوض بریگیڈیر جنرل بنا دیا گیا۔ ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء سے ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں وہ عام فوجی افسروں کی تنظیم میں مشغول رہا اور اس دوران میں وہ وزیر اوقاف کے عہدے پر فائز رہا۔ اس دوران میں اس نے بہت سے رفاہِ عامہ کے کام کئے۔ مثلاً مساجد اور مکانات کی تعمیر کرائی۔ خدیوی کتب خانہ کی تعمیر شروع کرائی ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۱ء میں لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا اور نشانِ مجیدی سے نوازا گیا۔ نیز وزیر اوقاف کے علاوہ وزیرِ جنگ بھی مقرر کر دیا گیا۔

جب مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا تو تحریکِ آزادی کے قائدین کی جلاوطنی کے تحت بارودی کو بھی دوسرے رہنماؤں مثلاً عرابی پاشا اور شیخ محمد عبدہ کے ساتھ جلاوطن ہونا پڑا اور وہ سترہ سال تک ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۰ء تک جزیرہ سیلون میں رہا۔ اس دورِ جلاوطنی میں اس نے انگریزی کا مطالعہ کیا۔ عربی شاعری کی طرف توجہ دی۔ اس نے اپنے دیوان کا بیشتر حصہ یہیں مکمل کیا۔ اور جب وہ ۱۸ محرم ۱۳۱۸ھ/ ۱۰ مئی ۱۹۰۰ء میں جلاوطنی کے بعد مصر واپس آیا تو اس کے پاس منتخب اشعار کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ آخری عمر میں آنکھوں کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی تصانیف میں مختارات البارودی اور ایک دیوان ہے اوّل الذکر البارودی کی وفات کے بعد چار جلدوں میں چھپی۔ پہلی دو جلدیں ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں اور آخری دو جلدیں ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئیں۔
اس کا دیوان تین جلدوں پر مشتمل ہے جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

بارہ سید سید ابو الفرج کی اولاد، جو "سادات بارھہ" بھی کہلاتی ہے۔ یہ لوگ عراق کے شہر واسط کے رہنے والے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب زید شہید کے واسطے سے سترہویں پشت میں جا کر حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ ابو الفرج ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں اپنے بارہ بیٹوں کے ہمراہ ہندوستان آئے اور پٹیالے کے قریب چار گاؤں میں آباد ہو گئے۔ ان کے چار بڑے خاندان انہی چار گاؤں (چھت بنور، کنڈل، حسین جگ نیر یا مجھری) کے نام سے موسوم ہوئے۔

بارھہ کے لفظ کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ "باہر" سے مشتق ہے اور اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ان سادات نے دہلی کے "مینا بازار" کی عیاشی والی طرزِ زندگی سے بیزار ہو کر شہر سے باہر کی رہائش کو زیادہ پسند کیا اور بعض کے نزدیک یہ کہ یہ شیعہ تھے اور بارہ اماموں کو مانتے تھے

Marfat.com

طبقات اکبری الاشتیاک جہانگیری کے مطابق یہ ضلع مظفر نگر کے ان بارہ گاؤں سے مناسبت رکھتا ہے۔ جن میں یہ لوگ آباد تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں یہ سادات ہر بڑی مہم میں پیش پیش رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت تک یہ لوگ فوج میں مختلف عہدوں پر رہے ہیں۔ تاریخی شہرت رکھنے والے سید برادران اسی خاندان سے متعلق تھے۔ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی ربع میں انہیں "بادشاہ گر" کا لقب ملا۔ بہادر شاہ کے بیٹے شہزادہ عظیم الشان کے دور میں انہیں بہت عروج حاصل ہوا۔ ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں جاجرکی لڑائی میں انہیں جوانمردی کے جوہر دکھانے کے صلے میں الہ آباد اور پٹنے کی حکومتیں عطا ہوئیں۔ ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۳ء میں جب انہوں نے فرخ سیر کو تخت پر بٹھایا تو اس نے بھی انہیں بڑے بڑے اعزازات سے نوازا۔ فرخ سیر نے سات سال حکومت کے بعد جب لوگوں سے آنکھیں پھیرنا چاہیں تو انھوں نے اُسے تخت سے اتار پھینکا اور اندھا کر کے قتل کرا دیا۔ ۱۷۱۹ء میں بادشاہ گروں نے محمد شاہ کو بادشاہ بنایا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دربار میں ان کے خلاف سازشیں اٹھ کھڑی ہوئیں جن میں بادشاہ برابر کا شریک تھا۔ سادات نے جب اپنا اقتدار خطرے میں دیکھا تو انہوں نے نظام الملک کو، جو تورانی سرداروں کا قائد تھا، ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن ابھی ان کی فوج آگرے سے تھوڑے سے فاصلے پر تھی کہ حسین علی کو قتل کر دیا گیا۔ ۱۷۳۷ء میں جب روہیلوں نے جونسٹھ کو تباہ و برباد کیا تو ان دونوں بھائیوں کی اولاد کو قتل اور منتشر کر دیا۔ اب سادات کے اقتدار کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ برطانوی تسلط کے دوران ان کی اکثریت اپنے سابقہ گاؤں میں واپس آ گئی۔

بارہ وفات آنحضورؐ کا یوم وفات۔ یہ اصطلاح ۱۲۔ ربیع الاوّل کے لیے پاک و ہند میں بولی جاتی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آنحضورؐ کا یوم وفات ۱۲ ربیع الاوّل ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کی رائے میں یکم ربیع الاوّل آنحضورؐ کا یوم وفات ہے۔ ایک خیال کے مطابق بارہ وفات سے مراد یکم ربیع الاوّل سے ۱۲۔ ربیع الاوّل ہے یعنی ربیع الاوّل کے ابتدائی بارہ دن جن میں آنحضورؐ نے علیل ہو کر وصال فرمایا۔ اس روز گھروں اور مسجدوں میں فاتحہ خوانی ہوتی ہے اور نیازیں تقسیم کی جاتی ہیں۔

اس دن کو یوم عید میلاد النبی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ اس روز آنحضورؐ کی پیدائش مبارکہ بھی ہوئی تھی۔ مسلمان اب اس دن کو ایک خوشی کے طور پر مناتے ہیں۔ جگہ جگہ آنحضورؐ کی سیرت پر جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں مساکین اور یتیموں میں کھانے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بازاروں، دکانوں اور راستوں کو خوب آراستہ و پیراستہ کیا جاتا ہے۔ اور بہترین طریقے سے سجایا جاتا ہے پاکستان میں اس روز عام تعطیل ہوتی ہے۔ آپؐ کی وفات کے دن کی طرح آپؐ کی پیدائش کے دن میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک آپ کا یوم پیدائش ۹۔ ربیع الاوّل ہے

باریٔ:۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک (دیکھیے "اسما الحسنیٰ")

بازنطینی:۔ مشہور رومی سلطنت (دیکھیے "بزنطینی")

باسطٌ:۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے پاک ناموں میں سے ایک (دیکھیے "اسما الحسنیٰ")

باطل ناحق، جھوٹ حق اور باطل کا ہمیشہ سے اس دنیا میں وجود رہا ہے۔ جب حق پس پردہ ہوتا ہے تو پھر باطل ہی کا راج ہوتا ہے۔ لیکن باطل کی یہ خاصیت ہے کہ جب بھی حق سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے تو پھر باطل میدان سے بری طرح بھاگتا ہے۔ قرآن مجید میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو مٹنے والا ہی تھا۔" (۱۷:۸۱)

جو شخص حق کے ہوتے ہوئے باطل کی پرستش کرتا ہے اس کو باطل پرست کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اہل حق کو باطل کے مقابلے پر ڈٹ جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو باطل پرستوں کی سرکوبی ہی کرنی ہوتی تو وہ اس کام کے لیے اہل حق کا محتاج نہیں تھا۔ یہ کام تو اس کا ایک زلزلہ یا ایک طوفان چشم زدن میں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے پیش نظر تو یہ ہے کہ جو حق پرست ہوں باطل پرستوں سے ٹکرائیں اور ان کے خلاف جہاد کر کے اپنے آپ کو سونے کی طرح آگ کی بھٹی سے گذار کر زر خالص کریں۔

باطنٌ:۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے پاک ناموں میں سے ایک۔ (دیکھیے "اسماء الحسنیٰ")

باطن ایک وادی کا نام جو شمال مشرقی عرب میں ہے یہ وادی شمال مشرق کی جانب ۲۸۵ کلومیٹر لمبی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ بہتے ہوئے پانی والا قدرتی نالہ تھا جو وادی رمہ کے ذخیرے سے آتا تھا۔ یہ وادی غیر معمولی طور پر یکساں ہے۔ یہ کناروں سے دس یا تیرہ کلومیٹر اور تہ سے دو یا تین کلومیٹر چوڑی ہے۔ الباطن بصرہ سے حجاز جانے والی ایک تاریخی شاہراہ کے طور پر کام دیتی رہی ہے۔ چند آثار قدیمہ باقی رہ گئے ہیں اور ان میں نمایاں ترین آثار جو بیس گندے کنوئیں ہیں جو حفر الباطن نامی گاؤں کے پاس ہیں۔ حفر الباطن میں کل دو سو گھر اور ایک دارالامارت قلعہ ہے۔ اور یہ امارت مشرقی صوبے الدمام کے زیر انتظام ہے۔ ۱۹۲۲ء سے العقیر کے مقام پر ہونے والے معاہدے کے تحت وہ مقام جہاں الباطن اور اس کی معاون ندی العوجا آپس میں ملتی ہیں۔ سعودی عرب، کویت، عراق کی حدود کی ملنے کی جگہ ہے۔

باطنۃ مشرقی عرب کا ایک زیریں سطح کا ضلع۔ یہ ضلع خلیج عمان کے سمندر ساحل اور الحجر کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ شمال کی طرف خطمۃ ملاحۃ کی راس اور جنوب میں جبل ال عمر کے گاؤں اس کی حدود کا کام دیتے ہیں۔ اس ضلع کا عرض دس سے بیس میل ہے۔ ساحل کے قریب زمین ریتلی ہے اور اس میں کم گہرائی کے بکثرت کنوئیں ہیں۔ اس ضلع کے طول و عرض کو متعدد بہتی ہوئی ندیاں قطع کرتی ہیں جو ساحل کی طرف بہتی چلی گئی ہیں۔ الباطنۃ کے مفہوم میں پست سطح کے خطے کے معنی پوشیدہ ہیں۔ یہ کھجوروں کی کاشت اور ماہی گیری کے لیے ایک مخصوص خطہ ہے۔ اس کا اندرونی علاقہ چند نیم خانہ بدوش لوگوں اور ان کے مویشیوں کی کفالت کرتا ہے۔ سمندر کے کنارے کے ساتھ ساتھ کھجور کے درختوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے۔ اور جو بعض جگہ اندرونی علاقے میں سات میل دور تک اندر پھیل گیا ہے۔ یہ ضلع گیہوں، کپاس، جو، نیشکر، لوسرن، چارہ، آم، کیلے انجیر، خربوزے اور زیتون کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔ آب پاشی کا کام کنوؤں سے لیا جاتا جو کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

پالتو جانوروں میں بھیڑیں، بکریاں، گدھے اور اونٹ ہیں جو یہاں کے اونٹ کو عمانی نسل کے اونٹوں کی تینوں مشہور نسلوں سے زیادہ ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ چھوٹی گنتیوں

Marfat.com

سے ماہی گیری کا کام لیا جاتا ہے۔ اور بڑی کشتیاں تجارت کے لئے استعمال ہوتی ہیں جو خلیج فارس۔ جنوبی زنجبار اور پاکستان تک جاتی ہیں۔

ابوزید الانصاری اور عمرو بن العاص نے سب سے پہلے ۸ھ/۶۲۹ء میں الباطنۃ کو اسلام سے مشرف کیا۔ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں ایرانیوں نے اس علاقے کو دو مرتبہ اپنے حملوں کی آماجگاہ بنایا اور عرصہ تک اس علاقے پر قبضہ جمائے رکھا بالآخر ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں پرتگالیوں کی وجہ سے انہیں یہاں سے نکلنا پڑا۔ نادر شاہ کے دور میں ایرانیوں نے ایک مرتبہ پھر الباطنۃ پر قبضہ جمانا چاہا جا کال بوسعید کے احمد بن سعید کی مدافعت کی وجہ سے ناکام رہے۔

الباطنۃ کی مستقل آبادی ۱۹۰۸ء کے اندازے کے مطابق ایک لاکھ پانچ ہزار کے قریب تھی۔ آبادی کی اکثریت مذہبی اعتبار سے اباضی ہے۔ بلوچیوں اور حبشیوں کا میلان سنی مذہب کی طرف ہے۔

باطنیہ اسماعیلیہ فرقے کی ایک شاخ۔ یہ لوگ قرآن مجید اور احادیث ظاہری الفاظ کے "باطنی" معنوں پر زور دیتے ہیں۔ یعنی لفظی معنوں کو توڑ کر کے اور باطنی معنوں پر زور دیتے ہیں مثلاً ابو منصور العجلی کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ وہ "السموات" سے مراد امام اور "الارض" سے امام کے پیرو مراد لیتے ہیں۔

باطنیوں کے چار بنیادی تصورات ہیں۔

۱۔ باطن۔ ۲۔ تاویل۔ ۳۔ خاص و عام۔ ۴۔ تقیہ

ان کے خیال کے مطابق ہر مقدس متن کے کچھ باطنی معنی بھی ہوتے ہیں جو ظاہری معنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر نبی جس کو کتاب دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک وصی ہونا بھی لازمی ہے اور اس وصی کا کام یہ ہے کہ وہ خفیہ طریقے سے اس کلام کی تاویل قابل لوگوں کے ایک خاص گروہ جو اسے وصی مانتا ہو کے سامنے کرے۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک حضرت علیؓ آنحضورؐ کے وصی ہیں اور انہیں آنحضورؐ کے متقابل تاویل ملی ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک خواص جو باطن کو جاننے والے دوسرے عوام۔

ان کے نزدیک باطن محض اس لئے باطن نہیں کہ وہ ظاہر نہیں ہے بلکہ اس لئے بھی باطن ہے کہ وہ بھید ہے اور اس کا علم وحی کی ظاہری پیروی کرنے والوں کو نہیں ملتا۔

باطنیوں میں یہ عقیدہ خاص طور پر بار بار ابھرتا رہا کہ جو لوگ امام کے صحیح منصب اور باطن کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں ان کے لئے شریعت اور اس کے ظواہر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ (نیز دیکھئے: "اسماعیلیہ")

باعباد حضرمی علماء اور مشائخ کا خاندان؛ یہ خاندان حضرت ہودؑ کے حرم کا خادم ہے۔ اس خاندان کے ارکان میں زیادہ مشہور عبداللہ بن محمد عبدالرحمٰن باعباد الحضرمی — جس نے ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں وفات پائی ۲۔ محمد بن عمر بن محمد ابن عبدالرحمٰن جس نے ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء میں وفات پائی، ہیں۔ ان دونوں کے مزار شبام میں ہیں۔

باعثؒ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام (دیکھئے "اسماء الحسنیٰ")

باعلوی جنوبی عرب کے سادات اور صوفیاء کا ایک بڑا اور بارسوخ خاندان۔ اس خاندان کی نسبت ایک مشہور پردادے علوی سے ہے۔ اس خاندان کی اکثریت حضرموت میں شہر تریم کے قرب و جوار میں سکونت پذیر ہے۔ عیدروس۔ باقیہ۔ الجفری۔ الحبشی۔ السقاف المشالی (؟)، الشلی وغیرہ اس کی شاخیں ہیں۔ اس خاندان کی سب سے بڑی شاخ کے ممتاز ترین افراد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ علوی بن عبداللہ (یا عبیداللہ) بن احمد بن عیسیٰ المہاجر بن علی العریضی بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن زین العابدینؓ بن الحسینؓ بن علی ابن ابی طالبؓ۔ یہ اس خاندان کا مورث اعلیٰ ہے۔

۲۔ علی ابن علوی بن محمد بن علوی۔ یہ اس خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے تریم میں ۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء میں سکونت اختیار کی۔

۳۔ محمد بن علی۔ اس نے مشہور بندرگاہ رباط میں سکونت اختیار کی۔

۴۔ محمد بن علی بن محمد۔ ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء تا ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء یہ جنوبی عرب کے سلاسلِ تصوف کا مرجع و مرکز اور خاص علوی طریقے کا بانی تھا۔

۵۔ علوی بن محمد ۶۶۹ھ/۱۲۷۰ء یہ اور اس کا بیٹا عبداللہ باعلوی ۶۳۸ھ/۱۲۴۰ء۔ تا ۷۳۱ھ/۱۳۳۰ء دونوں بہت مشہور صوفی ہوئے ہیں۔

۶۔ محمد بن علی بن علوی ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء تا ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء تریم میں پیدا ہوا اور وہیں وفات پائی۔ اس نے حضرت ہودؑ کے مقبرے کے پاس ایک جگہ مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی وجہ سے لوگ اسے مولائے دویلہ (پرانے شہر کا ولی) کہتے تھے۔ اس کے بیٹے عبدالرحمٰن السقاف سے سقاف اور عیدروس شاخیں چلیں۔

۷۔ عمر بن عبدالرحمٰن بن محمد بن علی بن محمد بن احمد بن محمد ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء تا ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء اس نے الحمراء گاؤں میں سکونت اختیار کی۔ اس نے کتاب فتح اللہ الرحیم الرحمٰن فی مناقب عبداللہ بن ابوبکر بن عبدالرحمٰن لکھی۔

۸۔ احمد بن عبداللہ بن علوی بن حسن بن احمد بن محمد بن حسین بن علی بن محمد (م ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء) اس نے ایک تاریخی کتاب "تاریخ شنبل" لکھی۔

۹۔ عمر بن محمد بن احمد بن ابوبکر باشیبان ابن محمد اسداللہ بن حسن بن علی بن محمد ۸۸۱ھ/۱۴۷۶ء تا ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء۔ یہ تریاق القلوب الواف بذکر حکایات السادۃ الاشراف کا مصنف ہے۔ اس میں ۳۵۵ علوی سیدوں کے حالات درج ہیں۔

۱۰۔ محمد بن علی بن علوی بن محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ بن علوی ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء تا ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء۔ یہ الوسائل۔ النفحات۔ غرر البہاء الضوئی فی مناقب السادۃ بنی علوی۔ کتابوں کا مصنف ہے۔

۱۱۔ سلیم بن احمد بن شیخان بن علی بن ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ عبود بن علی بن محمد ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء تا ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء۔ اس کی تصنیفات میں سے مشہور ترین بلغۃ المرید و بغیۃ المستفید۔ الجواہر الخمس کے حصہ ۴-۵ کی شرح۔ السفر المسطور للدرایتہ فی درر المنثور للولایتہ۔ مصباح السر اللائح بمفتاح الجفر الجامع۔ غرر البیان عن عمر الزمان۔ البرہان المعروف فی موازین الحروف ہیں۔

۱۲۔ عقیل بن عمر بن عمران بن عبداللہ بن علی ابن عمر بن سلیم بن محمد بن عمر بن علی بن احمد بن ابن محمد ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء تا ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء۔ اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

العقیدہ۔ فتح الکریم الغافر فی شرح حلیۃ المسافر۔

۱۳۔ محمد بن زین بن سمیط علوی بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن محمد سمیط ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء تا ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء اس نے جو کتب لکھیں درج ذیل ہیں۔ غایۃ القصد و المراد۔ قرۃ العین۔ بہجۃ الفؤاد۔ لبّ اللباب۔ منظومات کا ایک دیوان۔

۱۴۔ اس خاندان کے قریبی زمانہ کے چند افراد کے نام یہ ہیں۔

(ا) عبداللہ بن حسین بن طاہر بن محمد الجاوری (م ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء)۔ اس نے سُلّم التوفیق الٰی محبۃ اللہ علی التحقیق جو مرقاۃ صعود التصدیق کی شرح ہے تصنیف کی۔

(ب) عبدالرحمٰن بن محمد بن عمر ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء یہ حضرموت کے مفتی اور بغیۃ المسترشدین کے

Marfat.com

تحفیق فتاوٰے بعض الائمۃ المتاخرین - غایۃ تلخیص المراد من فتاوٰے ابن زیاد کے مصنف ہیں۔

(ج) فضل بن علوی محمد بن سہل مولٰی الدویلہ (م ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء) اس کی تصنیف کردہ کتب یہ ہیں۔ سبیل الاذکار والاعتبار - عقد الفرائد من نصوص العلماء الاماجد۔

(د) ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن محمد المعروف بہ ابن شہاب ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء تا ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء اس کی تصانیف و کتابوں کے عنوانات کے ساتھ ہندوستان میں طبع ہوئیں۔

(ہ) محمد بن عقیل بن علی بن یحیٰ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء تا ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۱ء - یہ العطب الجمیل کا مصنف تھا۔

باغ چمن، چمن زار، گل زار، مرغزار، پھلواڑی، گلستان، بوستان، روضہ، جنت فردوس، حدیقہ، زمین کا وہ قطعہ جس کو جمالیاتی ذوق کے مطابق انسانی ہاتھوں سے درخت یا پھول یا آرائشی پودے و سبزہ اُگا کر آراستہ اور مزین کیا گیا ہو۔

باغات کو تہذیب انسانی میں ابتدا سے ہی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی پیدائش کے ساتھ ہی باغ کا بھی ذکر ملتا ہے قدیم ترین باغوں کے وجود کا ثبوت ہمیں مصر، چین اور یونان کی تاریخ کے مطالعے سے ملتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

"پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ۔" (۲: ۳۵)

کرۂ ارض پر باغات کا وجود مختلف صور و اشکال میں پایا جاتا ہے۔ ان مختلف صور و اشکال کے لیے لغت کی کتب میں کئی ایک الفاظ مختص کئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ عربی، فارسی اور رومی زبانوں سے متعلق ہیں۔

" اور خداوند نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدمؑ کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی۔" (کتاب پیدائش ۲: ۸ بعد)

قرآن مجید میں کئی بار مختلف جگہوں پر جنت اور باغات کا ذکر آیا ہے۔ وہ مقامات درج ذیل ہیں:۔

(۶۵:۵) (۶:۹۹، ۱۴۱) (۹:۷۲) (۱۳:۳۵) (۱۸:۳۱) (۱۹:۶۲) (۲۳:۱۸-۱۹) (۲۵:۱۵-۱۶-۲۴) (۲۹:۵۸) (۳۴:۱۶) (۳۵:۳۳) (۳۶:۵۵) (۳۸:۵۰-۵۱) (۴۷:۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹) (۴۳:۷۰-۷۱-۷۲-۷۳) (۵۵:۴۶ تا ۷۶) (۵۶:۲۱) (۶۲:۱۲) (۶۹:۲۱ تا ۲۴) (۷۶:۱۱ تا ۱۴) (۶۸:۱۹) (۸۸:۱۰ تا ۱۶)

مندرجہ بالا آیات میں باغات کے بارے میں جو باتیں بتائی گئی ہیں۔ مسلمانوں نے اس سے متاثر ہو کر باغات لگانے کے بارے میں خصوصی توجہ دی۔

اگرچہ اسلام سے قبل بھی بعض عرب حکومتوں کے زمانے میں محلات کے ساتھ باغات لگائے جاتے تھے۔ لیکن جس تیزی کے ساتھ مسلمانوں نے ان کی طرف توجہ دی وہ ان ہی کے حصہ کی بات ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ شام جو امیوں کا دارالخلافہ تھا اسلامی فن تعمیر اور ملحقہ باغوں کا مرکز تھا۔ اموی خلفاء نے شہروں سے باہر جابجا محل اور شکارگاہیں تعمیر کرائی تھیں۔ اور ان میں سے اکثر کے ساتھ باغ لگائے تھے ان باغوں کو دیواروں سے محصور کیا گیا تھا۔ چنانچہ قصر الحیر جس کو ۷۲۹ء میں ہشام نے تعمیر کرایا تھا اسی طرز کا ایک باغ قصیر عمرہ کے ساتھ تھا اس کو ولید اوّل نے ۷۱۲-۱۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ایک اور قصر المشتیٰ جو موسم سرما بسر کرنے کے لئے بنایا گیا تھا ولید ثانی نے بنوایا تھا جو شکار وغیرہ کا بڑا شوقین تھا۔ نیز خربۃ المنیہ نامی

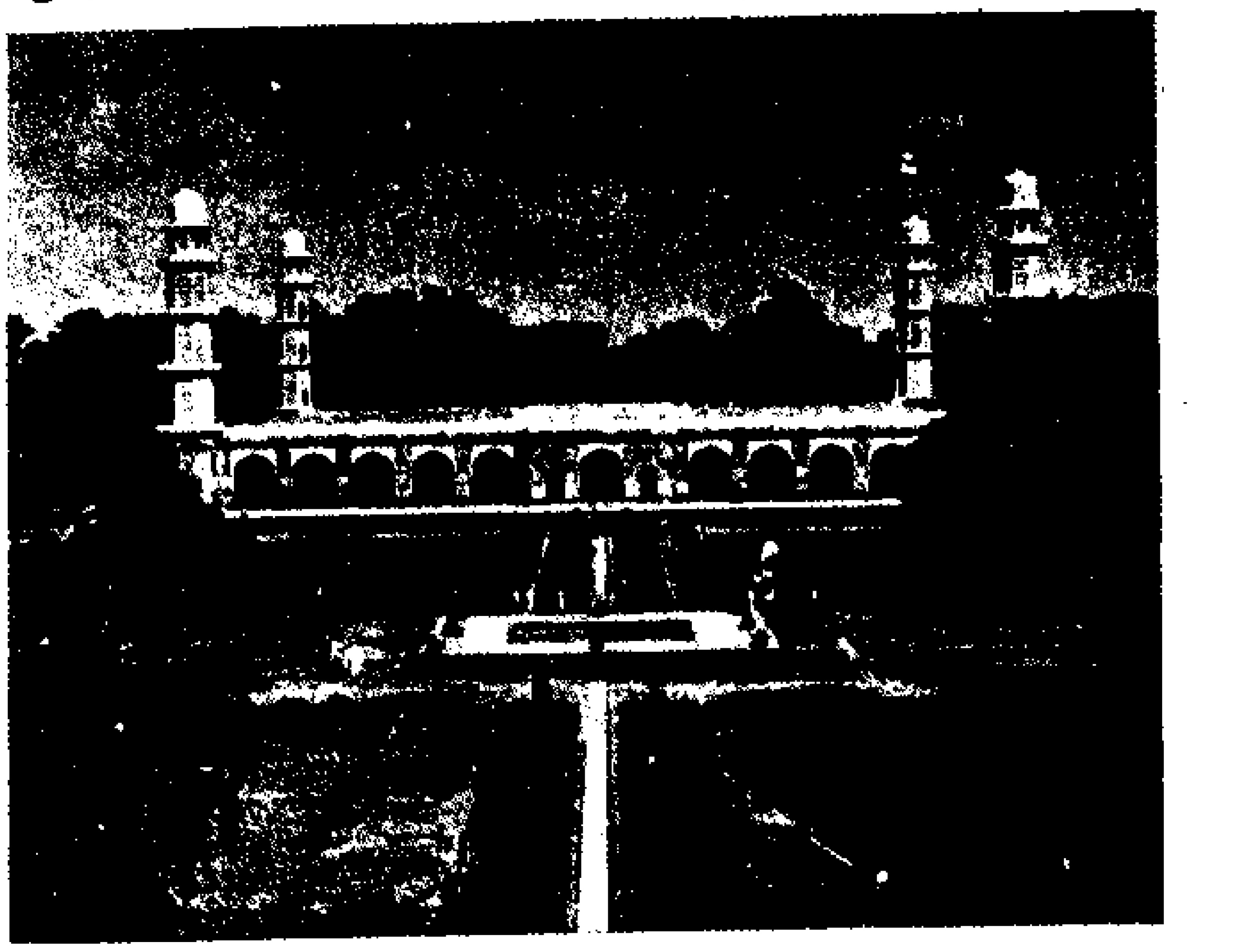

لاہور میں مقبرہ جہانگیر کے باغ کا ایک منظر

ایک اور باغ بھی ولید ثانی ہی نے تیار کرایا تھا۔ جب امویوں کا دور حکومت ختم ہو گیا اور ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل جس نے پہلے تو ایک باغ میں پناہ لی اور پھر اندلس پہنچ کر اموی سلطنت قائم کی تو اس نے اپنی حکومت کا نظام دمشق کے نمونہ پر ہی کیا۔ چنانچہ اندلس میں باغات لگانے کا کام جو اسلامی عہد میں ہوا اس کا اعتراف خود مغربی مورخوں نے کیا ہے۔ باغبانی میں اندلسی مسلمانوں نے جو بے مثال ترقی اور کامیابیاں حاصل کیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں علم نباتات کا وسیع علم تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان خلفاء نے یکے بعد دیگرے باغبانی کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے فن باغبانی میں بے انتہا شہرت حاصل کی اور اندلس میں باغات کی بہت زیادہ بہتات ہو گئی چنانچہ دریائے ایبرو اس وجہ سے پھلوں کا دریا کہلاتا تھا کہ اس وادی میں پھلوں کے بکثرت باغات تھے۔ سرقسطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، المریہ وغیرہ کے گردا گرد میلوں تک باغات پھیلے ہوئے تھے اور ان کی فصیلوں کے برج پر چڑھ کر دیکھنے والوں کو حدافق تک باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔ اندلس کے بڑے بڑے شہروں کے قریب پہنچ کر میلوں تک پھلدار باغات اور پھلواریوں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔

اموی خلفاء کی طرح عباسی خلفاء کو بھی باغات سے ایک خاص انس تھا۔ جب دریائے دجلہ پر بغداد تعمیر ہوا تو اس شہر میں بھی اور دوسری جگہوں پر بھی باغات لگائے گئے۔ عضدالدولہ کے پائیں باغ کی جو کہ بغداد میں تھا بڑی شہرت تھی۔ اس عہد کے مشہور باغوں میں بستان ظاہر۔ بستان حفص، بستان طاہر مشہور ہیں۔ جب منصور نے الرصافہ تعمیر کرایا تو اس میں باغات کا خاص خیال رکھا گیا اور وہ اسی شہر کا ایک اہم حصہ بنے

باغبانی کا یہ شوق بغداد سے غزنہ پہنچا اور وہاں بھی اسی شوق نے اسلامی اثرات کے تحت نشوونما پانا شروع کیا۔ چنانچہ غزنہ بھی کچھ عرصہ بعد عظیم الشان محلات اور باغات کا شہر بن گیا۔ اگرچہ مصر میں باغبانی کا رواج بہت پہلے سے تھا لیکن جب مسلمان ۱۸ھ / ۶۳۹ء میں وہاں پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے باغات کی طرف توجہ دی۔ فاطمی خلفاء کو بھی باغات لگانے کا شوق تھا۔

مغرب کے علاقوں افریقہ میں جس دور میں عباسیوں کی طرف سے اغلبی امیر حکومت کرتے تھے تو انہوں نے بربروں کے سارے علاقے میں بغداد کے طور طریقے رائج کر دیئے تھے۔ چونکہ عباسی خلفاء کے زمانہ میں باغات نے بہت ترقی کی تھی لہٰذا افریقہ میں بھی یہ شوق اسی شد و مد سے آیا۔ اسی دور میں مراکش میں

Marfat.com

مرسی بادشاہوں نے دیواروں سے گھرے ہوئے بہت سے سبزہ زار اور باغات تیار کیے۔ ایران میں باغبانی کا فن زمانہ اسلام سے بہت پہلے رواج پا چکا تھا۔ اور اس کا ثبوت عہد وسطیٰ کی ایرانی مصوری کے نمونوں میں پایا جاتا ہے لیکن دور عباسی میں جس طرح ایرانی زندگی عباسیوں کی طرز سے بود و باش سے متاثر ہوئی اسی طرح ایرانیوں کے فن باغبانی پر بھی عباسیوں کا اثر ہے۔ ایران میں ہر امیر غریب اپنے حالات کے مطابق اپنے اپنے گھروں کے ساتھ باغ بناتے تھے۔ جب تیموریوں کا دور ختم ہوا تو صفویوں نے بھی باغات کی روایات کو برقرار رکھا اور انہوں نے جابجا باغات لگوائے۔ جب اصفہان کو شاہ عباس نے اپنا دارالخلافہ تجویز کیا تو وہاں اور مزید باغات کا اضافہ ہوا۔ شیراز میں بھی بہت سے باغ لگوائے۔

پاک و ہند میں باغات کی اسلام سے قبل کوئی اہمیت نظر نہیں آتی۔ جب مسلمان فاتحین نے اس برصغیر میں قدم جمائے تو انہوں نے اپنے رہنے سہنے کے لیے محلات اور حفاظتی قلعے وغیرہ تعمیر کیے اور ان کی زیبائش کے لیے چھوٹے چھوٹے قطعات کی صورت میں پھلدار پودے لگائے۔ یہی چیز بعد میں باغات کے ارتقاع کا سبب بنی۔

فن باغبانی نے مغلوں کے عہد حکومت میں بہت زیادہ ترقی کی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جدت پسند طبیعتوں سے اس خطہ کو گلزار ارم بنا دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے جابجا نہریں کھدوائیں، جنگل کٹوا کر زمین صاف کرائی اور اس کو زراعت کے قابل بنایا۔

بابر مناظر قدرت کا بہت ہی دلدادہ تھا۔ فرغانہ اس کا وطن تھا جس کو قدرت نے عجیب و غریب مناظر سے مالا مال کر رکھا تھا۔ بقول بابر "یہ شہر حقیقت میں باغوں کا شہر تھا وہاں قدم قدم پر باغ اور چپہ چپہ پر باغیچے لگے ہوئے تھے۔" ان چیزوں نے بابر کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ جہاں بھی جاتا ان چیزوں کو تلاش کرتا۔ جب وہ ہندوستان میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس نے یہاں بھی اس قسم کے مناظر تلاش کیے۔ بابر سے پہلے یہاں کے باغات کچھ اچھی قسم کے نہ تھے۔ ان میں نہ تو کوئی بارہ دری ہوتی تھی جس میں آرام کیا جاتے اور نہ آہستہ آہستہ بہنے والے چشمے ہوتے تھے اور نہ فوارے۔ سٹوارٹ: یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ باغ کا جدید تصور یہاں مغلوں ہی کے ساتھ آیا۔

جنگ پانی پت میں اپنی شاندار فتح کی یادگار کے لیے بابر نے کوئی مینار یا عمارت تعمیر نہ کرائی بلکہ ایک باغ لگوایا۔ جسے کابلی باغ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری فتوحات کی یادگاریں بھی اس نے باغوں کی شکل ہی میں چھوڑیں۔ جب اس نے آگرہ کو اپنا پایہ تخت بنایا تو یہاں بھی اپنے مذاق کی تسکین کے لیے چار باغ تعمیر کرایا۔ جسے آج کل رام باغ کہتے ہیں۔ یہ باغ جمنا کے کنارے واقع ہے اور تیموریوں کے ذوق چمن سازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس باغ میں اس نے ہشت نشینی حمام، حوض، پانی کے جھرنے اور نہریں بنوائیں۔ بابر نے باغ ہشت بہشت اور زہرہ باغ تعمیر کرائے۔ ان کے بچے کھچے نشانات آج بھی آگرہ میں موجود ہیں۔ بابر کی تقلید اس کے امیروں نے بھی کی اور کئی باغ باغیچے لگوائے۔ بابر نے اپنے بیٹوں میں سے نصیر الدین ہمایوں کو تو اپنا جانشین بنایا اور دوسرے بیٹوں مرزا کامران اور مرزا عسکری کو الگ الگ صوبوں کا والی مقرر کیا۔ ہمایوں کو ہندوستان کے سیاسی حالات نے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اس کی عمر کا بیشتر حصہ دشت نوردی اور جلاوطنی میں بسر ہوا۔ اس لیے وہ فطرت پسندی کے جوہر کا مظاہرہ کہیں نہ کر سکا۔ البتہ مرزا کامران کے دو باغوں سے جو اس نے لگوائے ثابت ہوتا ہے کہ کامران کو بھی اپنے باپ کی طرح مناظر قدرت سے دل لگاؤ تھا۔ کامران نے لاہور آتے ہی دریائے راوی کے کنارے ایک باغ تعمیر کرایا۔ یہ باغ آگرے کے باغ زرافشاں کے نقشہ کے مطابق تھا۔

ہمایوں کے بعد اکبر اعظم تخت نشین ہوا۔ جو درحقیقت سلطنت تیموریہ کا بانی ہے اس نے حقیقی معنوں میں وہ تہذیب یہاں پر رائج کی جس پر آج برصغیر پاک و ہند ناز کر رہا ہے۔ اس نے لاہور اور کشمیر میں کئی باغ لگوائے۔ جن کے اب فقط نام باقی رہ گئے ہیں۔ جہانگیر بابر کی طرح فنون لطیفہ کا دلدادہ اور باغوں کا شیدائی تھا وہ جہاں کوئی حسین و جمیل منظر دیکھتا اس کا قلم ایک ماہر مصور کے موقلم کی طرح اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا۔ چنانچہ اس نے بھی فن باغ کی طرف خاص توجہ دی اور کشمیر کا شالامار باغ اور ویری ناگ۔ کابل کا باغ شہر آرا۔ لاہور کا باغ دل افروز اسی نے تعمیر کرائے تھے۔

شاہجہان جہانگیر کا بیٹا تھا وہ عمارات کا دلدادہ تھا مگر مناظر قدرت سے اسے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا جہانگیر کو۔ اس نے لاہور میں شالامار باغ اور آگرہ میں روضہ تاج محل، گنج لافانی، انبالے کا باغ پنجور، برھان پور میں زمین باغ وغیرہ یادگاریں چھوڑیں۔ کشمیر اور دلی میں بھی اس نے کئی باغ لگوائے۔

شاہجہان حقیقی معنوں میں باغوں کا زبردست معمار ہے اس کے لگائے ہوئے باغ اگرچہ آج اپنی اصلی عظمت اور حسن صورتی کھو چکے ہیں لیکن پھر بھی سیاحان عالم سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اس فن کو اگرچہ چنداں فروغ حاصل نہ ہوا مگر اورنگ زیب نے بھی باغات کا شوق اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کا ملکہ ورثہ میں پایا تھا۔ احمد آباد میں اس نے ایک لافانی یادگار رابعہ درانی کے روضے کی صورت میں چھوڑی ہے۔

کشمیر کو قدرتی مناظر کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ وادی کشمیر کی بہترین آب و ہوا۔ پانی کی فراوانی اور چاروں طرف پہاڑوں کی ڈھلانیں باغوں کی تعمیر کے لیے قدرتی طور پر مواقع پیدا کرتی ہیں۔ ان سے مغل بادشاہوں نے فائدہ اٹھا کر کشمیر کو فردوس بر روئے زمین بنایا۔ اکبر جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں باغوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ قائم رہا جو دنیا بھر میں اپنے حسن ترتیب نہروں کی تقسیم اور ان کے کنارے عمارات کی زیبائی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ کشمیر کے ان باغوں میں ڈل جھیل، چشمہ شاہی، نشاط باغ اور شالامار باغ بہترین باغ ہیں۔

لاہور میں شالامار باغ کا ایک منظر۔

Marfat.com

شاہکار بک کلب

کم ازکم پچیس روپے (زیادہ پر قید نہیں) علی الحساب بذریعہ بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر جمع کرا کر ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو اپنی پسند کی شاہکار جریدی کتابیں اور انسائیکلوپیڈیا گھر بیٹھے بصیغہ رجسٹری حاصل کیجئے۔ پیشگی رقم جمع کرانے والے مستقل ارکان کو دس فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ وی پی پی منگوانے والے ارکان کو یہ رعایت نہ دی جائے گی۔ البتہ دونوں صورتوں میں محصولڈاک بذمہ شاہکار ہوگا۔ ہر کتاب بصیغہ رجسٹری ارسال کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

شاہکار بک کلب کے ارکان کو دس فیصد رعایت

عالمی سیرت کانفرنس کے موقع پر ایک عظیم الشان کتاب

محمد رسول اللہ ﷺ

تصنیف: ڈاکٹر توفیق الحکیم ۔ ترجمہ: عطیہ خلیل عرب

"اس کتاب کا مطالعہ جوانوں کے لیے خصوصاً اور عوام کے لیے عموماً بہت مفید ہوگا۔" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۹۷۶ء کی سب سے خوشنما کتاب

قیمت: -/۲۵ روپے ★

چالیس ہزار کاپیاں اب تک چھپ چکی ہیں

پاکستان کی سبز کتاب

مرتبہ: سید قاسم محمود

مختلف موضوعات کے تحت قائداعظم کے فرمودات کا مفید مجموعہ۔ خوبصورت جیبی کتاب۔ قائداعظم کے جشنِ صدسالہ کے دوران اہل پاکستان کے لیے بہترین تحفہ ۱۹۷۶ء کی سب سے کثیرالاشاعت کتاب

★ قیمت: دو روپے

تقسیم کنندگان برائے کل پاکستان

شاہکار بک کلب پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کے طلبا کے لیے

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا

بے بی انسائیکلوپیڈیا

زندگی اور کائنات کے ہر موضوع پر، بچوں کے ذہن کے مطابق ردیف وار ترتیب میں ڈھائی ہزار عنوانات پر مضامین ۔ باتصویر، رنگین آفسٹ طباعت۔ قسط وار

ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے

• قیمت فی قسط: ڈھائی روپے ۔ • سالانہ چندہ مع رجسٹری: -/۲۵ روپے

شاہکار پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

Marfat.com

شاہکار جریدی کتابوں ـــــ بے بی انسائیکلو پیڈیا ـــــ اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے اجراء کے بعد

یکم مئی ۱۹۷۶ء سے

شاہکار کا ایک اور شاہکار

زیرِ ادارت: سیّد قاسم محمود

اُردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلو پیڈیا

انسائیکلو پیڈیا معلومات

(قسط وار)

۱۲۵ سے زائد قدیم و جدید علوم و فنون کے پچھتر ہزار سے زیادہ معلوماتی مضامین

مذہب
- اسلام — عیسائیت
- یہودیت — بدھ مت
- زرتشت — پارسیت
- ہندو مت — دیو مالا
- عقائد — دینیات

سائنس
- طبیعیات — کیمیا
- ریاضی — شماریات
- حیاتیات — نباتات
- حیوانیات — فلکیات
- ایجادات . اطلاقی سائنس

تاریخ
- قدیم و جدید — آثارِ قدیمہ
- اقوام اور نسلیں — جنگیں
- فتوحات — سیاسی تاریخ
- تمدنی تاریخ — فوجی تاریخ
- قوموں کے عروج و زوال کی داستان

فلسفہ
- یونانی فلسفہ — فلسفۂ اسلام
- منطق — جمالیات
- اخلاقیات — وجودیت
- فوق الفطرت — عقل پرستی
- فلسفے کے بڑے بڑے نظام و اصول

زندگی اور کائنات کے ٹھوس حقائق اور عالمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، سائنسی، علمی و ادبی، مذہبی اور تمدنی حالات و کوائف

ادب و فن
- زبانیں — کلاسیکی ادب
- جدید ادب — مشرقی ادب
- مغربی ادب — تنقید
- مصوری — موسیقی
- فنِ تعمیر — فنونِ لطیفہ

معاشرتی علوم
- انسانیات — عمرانیات
- سیاسیات — معاشیات
- نفسیات — قانون
- طب و صحت — رسم و رواج
- تہذیب — ثقافت

جغرافیہ
- طبقات الارض — ارضیات
- شہر و ممالک — دریا
- پہاڑ — براعظم
- معدنیات — بحریات
- خاکے، نقشے اور ضروری تصاویر

شخصیات
- ادیب — شاعر
- مُوجد — سائنس دان
- فلسفی — مورخ
- سیاستدان — مُہم جو
- جنہوں نے دُنیا بدل ڈالی

انفرادیت

برٹانیکا، انٹرنیشنل، چیمبرز، بُک آف نالج، ورلڈ، نیو ورلڈ، ایوری مین، ریڈرز ڈائجسٹ، آریانا، دائرۃ المعارف اور دوسرے انسائیکلو پیڈیا بڑے بڑے کروڑپتی اداروں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں. لیکن "انسائیکلو پیڈیا معلومات" ایک اکیلا پاکستانی شہری کسی کی مدد کے بغیر شائع کر رہا ہے تاکہ پاکستان میں بھی وسیع بنیادوں پر علم کو فروغ ہو، اور ہماری قومی زبان حوالہ جاتی کتب سے مالا مال ہو۔

ارزاں ترین

"انسائیکلو پیڈیا معلومات" دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اپنے ہم رُتبہ انسائیکلو پیڈیاؤں کے مقابلے میں سب سے کم عمر، سب سے ارزاں اور سب سے تیز رفتار ہے. اندازاً پندرہ برس میں تکمیل پذیر ہوگا. مکمل انسائیکلو پیڈیا کی تیس جلدوں کی قیمت کم از کم ڈیڑھ ہزار روپے ہوگی جو عام پاکستانی یکمشت ادا نہیں کر سکتا. اس لیے آسان قسطوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ • اعلیٰ سفید کاغذ • خوبصورت کتابت، دیدہ زیب طباعت • سالانہ مع رجسٹری تیس روپے • قیمت فی قسط: تین روپے

ٹیلیفون: ۳۵۴۱۰۳ — شاہکار پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور — تار کا پتا: شاہکار

Marfat.com

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط نمبر (۷)

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۲ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳

تار : "شاہکار"

مدیر اعلیٰ : سیّد قاسم محمود

مدیر : عطش درّانی

نائب مدیر : شریف اصلاحی

شائع شدہ اور آئندہ کتب کا اعلان آخری صفحے پر ملاحظہ کیجیے

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

شاہکار

پوسٹ بکس : ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

نئے کام، نیا عزم ......

انشاءاللہ پندرہ روز بعد" انسائیکلوپیڈیا معلومات" کی پہلی قسط آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ سچ پوچھیے تو اس کی اشاعت آپ ہی کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ہم نے تو آغاز بڑی ہی بے سروسامانی کے ساتھ کیا تھا ...... ہم کام کرتے رہے، پوری محنت، لگن اور تندہی کے ساتھ اور آپ .... پذیرائی کرتے رہے، پورے خلوص، محبت اور دیانت کے ساتھ۔ کام بڑھا تو ہاتھ بٹانے والوں کا بھی اضافہ ہوا۔

اب ہمارے کام نے ادارے کی سی صورت اختیار کرلی ہے تو ہم اپنے سب سے بڑے اور عظیم الشان منصوبے" انسائیکلوپیڈیا معلومات" کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ یہ اردو کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا ہے، جو تمام علوم و فنون پہ حاوی ہے۔ یقیناً یہ اردو زبان کی توسیع، ترقی اور ترویج میں اہم کردار ادا کرے گا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، تاریخ ادب میں اردو کی ایسی منظم اور بے لوث خدمت کبھی نہیں ہوئی۔ اب یہ ارباب ذوق کا کام ہے کہ وہ تحسین و تنقید کے ساتھ ہماری ہمّت افزائی کریں اور ہماری کوتاہیوں سے ماوراء ہوکر، ہمیں اپنے کام کو جاری و ساری رکھنے کا حوصلہ بخشیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری قوم علم و ادب سے کتنی لگن اور اردو زبان سے کس قدر محبت رکھتی ہے؟

انسائیکلوپیڈیا کی مستند اور صحیح تدوین میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جاتا۔ یہ ذرا فنّی نوعیّت کا کام ہے۔ چونکہ ہمارے بعض قارئین ان امور کو پوری طرح سے سمجھ نہیں پاتے، اس لیے ابجدی ترتیب میں بعض عنوانات کا اندراج نہ پاکر مغموم ہوجاتے ہیں۔ انھیں یقین رکھنا چاہیئے کہ "اسلامی" کی تکمیل تک اس میں ہر ضروری عنوان پر مضمون آچکا ہوگا۔ اس میں لحاظ صرف یہ برتا گیا ہے کہ کسی بھی عنوان پر مضمون اس کے مشہور اور معروف نام کے ساتھ ہوتا ہے۔ بات صرف تقدیم و تاخیر کی ہے۔ مثلاً اعلیٰحضرت احمد رضا خاں بریلوی پر مضمون ہمارے ہاں "بریلوی" کے تحت موجودہ قسط میں آیا ہے جبکہ دیگر حوالہ جاتی کتب میں کہیں " رضا بریلوی" اور کہیں " فاضل بریلوی" کے تحت آیا ہے جو ابجدی ترتیب میں بہت دیر سے آتے ہیں۔ یہ اصول " معلومات" میں نہیں برتا گیا۔ اس میں ہر مضمون ابجدی ترتیب میں پہلے عنوان ہی کے تحت آئے گا۔

" اسلامی" میں ہمارے نئے معاون جناب محمد شریف اصلاحی، خلوص، محنت اور لگن کے اسی جذبے کے ساتھ شریک ہوئے ہیں جو اہلِ "شاہکار" کا طغرائے امتیاز ہے۔ جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے، موصوف جامعۂ پنجاب سے ایم اے (اسلامیات) ایم اے (عربی) کی سند رکھتے ہیں۔ اس راہِ پرخطر میں ہم اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

آپ کا :

عطش درّانی

تاریخ اشاعت : ۱۵ اپریل ۱۹۷۶ء   ناشر : سید قاسم محمود   طابع : تعمیر پریس لاہور

Marfat.com

باغ فدک ایک باغ جس کی آمدنی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ (نیز دیکھئے "فدک")

باغی بغاوت کرنے والا۔ نافرمان۔ سرکش۔ پھرا ہوا۔

اِصطلاح میں جب کوئی جماعت اپنا مسلک جُدا ایجاد کرکے، رائے عامہ کے خلاف اور مسلمانوں سے اپنا علیحدہ تشخص قائم کرے۔ باغی کہلاتی ہے۔

اگر باغی اطاعتِ امیر سے سرتابی نہ کریں اور نہ ہی مسلمانوں سے الگ یکجائی قوت حاصل ہو بلکہ اِدھر اُدھر متفرق طور پر آباد ہوں اور مُسلمانوں کا اُن پر اقتدار و اختیار ہو تو اُن کے ساتھ لڑائی نہیں کی جا سکتی۔ جب خارجی حضرت علیؓ کے خلاف ہو گئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہم تمہیں تین رعائتیں دیتے ہیں:

۱۔ مساجد میں نماز اور عبادتِ ربّی سے نہیں روکا جائے گا۔

۲۔ تمہارے ساتھ لڑائی کی ابتدا نہ کی جائے گی۔

۳۔ جب تک تم ہمارے معاون ہو تمہیں مالِ غنیمت میں سے حصّہ ملنا بند نہ ہوگا۔

اس علاقے میں جہاں اہلِ حق اور اُن کی آبادیاں ملی جلی ہوں۔ اگر یہ لوگ اپنے عقیدے کی اشاعت کرتے پھریں تو امیر کا فرض ہے کہ وہ انہیں عقیدے کے فساد اور ان کے باطل نظریے سے آگاہ کرے تاکہ حق اور موافقت اہلِ حق کی طرف لوٹ آئیں اور اگر ان میں سے کوئی شخص زیادہ فتنہ میں حصہ لیتا ہو تو اسے امیر تنبیہاً سزا دے سکتا ہے۔ مگر قتل اور حد کا حکم نہ دے گا۔

اگر باغی جماعت اطاعتِ امیر سے باہر ہو کر حقوقِ واجبہ کی ادائیگی سے رک جائے محصولاتِ ملکی کی وصولی اور احکام جاری کرنے لگے اور خواہ اس جماعت نے کسی کو اپنا امیر چنا ہو یا نہ چنا ہو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اگر اہلِ ایمان کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تم ان میں صلح کرادو۔ اگر ان میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہو تو جس کی زیادتی ہو تم اس سے لڑو تاکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے تب ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرادو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (۴۹: ۹)

"فان بغت احدا ھما علی الاخری" اس آیت کی دو توجیہیں ہیں ایک تو یہ کہ جنگ میں زیادتی کرکے باغی ہو جائے یا پھر صلح سے روگردانی کرکے باغی ہو جائے اور فقاتلوا التی تبغی سے مراد یہ ہے کہ تلوار کے ساتھ لڑو تاکہ وہ بغاوت و مخالفت سے باز آجائیں اور اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آنے کے معنی ایک تو صلح کی طرف لوٹ آنے کے ہیں جس کا اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے اور یہ سعید بن جبیر کی رائے ہے اور قتادہ کی رائے کے مطابق اپنے اور دوسروں کے حقوق میں قرآن و حدیث کی طرف رجوع کریں اور فان فاءت کے معنی ہیں بغاوت چھوڑ دیں۔ نیز عدل کے ساتھ صلح کرانے کا مطلب یہ ہے کہ اگر امیر کی طرف سے کسی شخص کو بغاوت فرو کرنے کے لیے مقرر کیا جائے تو اسے چاہیے کہ جنگ سے پہلے باغیوں کو ڈرائے، دھمکائے اور معذرت کرنے کا موقع دے۔ اگر پھر بھی باز نہ آئیں تو مقابل ہو کر لڑے اچانک حملہ آور نہ ہو اور نہ ہی شب خون مارے۔

باغیوں سے جنگ اور مشرکین مرتدین سے جنگ میں آٹھ چیزیں مختلف ہیں۔

۱۔ باغیوں کو سرکشی سے روکنا مقصود ہوتا ہے۔ قتل و ہلاک کرنا مقصود نہیں ہوتا اور مشرکوں و مرتدوں کا قتل بھی مقصود بالذات قرار دینا جائز ہے۔

۲۔ اگر باغی سامنا کریں گے تو قتل کیے جائیں گے ورنہ نہیں اور مرتدوں اور مشرکوں کو ہر طرح قتل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ باغیوں کے زخمی قتل نہیں کیے جائیں گے اور مشرک و مرتدوں کے زخمی قتل کرنا جائز ہیں۔

۴۔ باغیوں کے قیدی بند کیے جائیں گے۔ قتل نہیں کیے جا سکتے۔ جبکہ مشرکوں اور مرتدوں کے قیدی قتل کیے جا سکتے ہیں۔

۵۔ باغیوں کا نہ تو مال لوٹا جا سکتا ہے اور نہ اولاد کو لونڈی غلام بنایا جا سکتا ہے

۶۔ باغیوں کے ساتھ جنگ کرنے میں مشرک حلیف یا ذمیوں سے مدد نہیں لی جا سکتی جب کہ دوسروں کے مقابلے میں ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔

۷۔ باغیوں سے ایک معینہ مدت تک یا روپیہ لے کر صلح نہیں کی جا سکتی اور اگر صلح کرلی گئی تو اس کا ایفاء ضروری نہیں ہے اگر ان سے لڑنے کی قدرت نہیں تو حصولِ قدرت کا انتظار کرتا رہے۔ لیکن دوسروں کے ساتھ معاہدے کا احترام لازمی ہے۔

۸۔ باغیوں پر منجنیق وغیرہ نصب نہ کی جائے اور ان کے مکانات کو جلایا جائے لیکن اگر اہلِ حق محصور ہو جائیں اور اندیشہ ہو کہ باغی تباہ کر دیں گے تو ان کے قتل کا ارادہ کرنا اور ان پر منجنیق نصب کرنا جائز ہے۔ باغیوں کے ہتھیار اور سواریوں سے نفع نہ اٹھایا جائے۔ بلکہ جنگ کے دوران میں بھی ان کی چیزوں کو ان کے خلاف استعمال میں نہ لایا جائے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک لڑائی جب تک باقی رہے اس وقت تک باغی ان چیزوں سے منتفع ہو سکتے ہیں۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد ان کا مال انہیں لوٹا دیا جائے گا۔

مقتول باغیوں کو غسل بھی دیا جائے اور ان کی نماز بھی پڑھی جائے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک سزاً نماز نہ پڑھی جائے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے نزدیک اہلِ حق باغی مقتول کا وارث ہو سکتا ہے کیونکہ وہ حق پر ہے لیکن باغی قطعاً اہلِ حق کا وارث نہیں ہو سکتا۔

باقلانی (۳۳۸ھ/۹۵۰ء - ۴۰۳ھ/۱۰۱۳ء) محمد بن طیب بن جعفر ایک بڑے عالمِ دین اور علم الکلام کے امام، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کی۔ ابوبکر بن مالک القطیعی۔ ابو محمد بن ماسی اور ابو احمد الحسین بن علی النیشا سے حدیث کی سماعت کی۔ ابو عبداللہ بن مجاہد الطائیؒ سے علم النظر کی تحصیل کی۔ بغداد کی جامع المنصور میں انھوں نے بہت بڑا حلقۂ درس قائم کیا۔ مسلک کے لحاظ سے حنبلی تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے شافعی اور بعض نے مالکی لکھا ہے۔

باقلانی کو اشاعرہ میں بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ انھوں نے امام الاشعری کے مباحث کو مرتب کیا اور مقدمات عقلیہ وضع کیے اور دلائل عقلیہ کو عقائدِ ایمانیہ کے لیے قواعد و معیار ٹھہرایا۔ اس طریق استدلال کو کمال کی بلندی تک پہنچایا۔ نیز اسی طریق استدلال کی وجہ سے نظری اور دینی علوم کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

باقلانی نے معتزلہ کے رد میں حدیث کی بہت خدمت کی ہے۔ نیز علم الکلام پر کتابیں لکھی ہیں۔ انہیں استنباطِ مسائل میں بڑی مہارت تھی۔ حاضر جوابی اور زود فہمی ان کی خاص صفات تھیں۔ عضد الدولہ کے دربار میں معتزلہ سے ان کے مناظروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

ان کی تصانیف میں ۱۔ اعجاز القرآن۔ ۲۔ التمہید فی الرد علی الملحدۃ المعطلۃ و الرافضۃ والخوارج والمعتزلۃ۔ ۳۔ کتاب الانصاف فی اسباب الخلاف۔ ۴۔ کتاب البیان عن الفرق بین المعجزات والکرامات۔ ۵۔ کتاب الاصول الکبیر فی الفقہ۔ بہت

Marfat.com

مشہور ہیں۔ —

باقیؒ: — اللہ تعالیٰ کے ننانوے پاک ناموں میں سے ایک (دیکھئے "اسماء الحسنیٰ")۔

باقیات محمدیہ م آثار الشریف اصطلاح میں اس سے مراد آنحضورؐ کے باقی ماندہ تبرکات ہیں۔ عربی زبان میں اثر شریف کا لفظ نشان کے معنوں میں مستعمل ہے چنانچہ اثر شریف کے معنی آنحضورؐ کے نشانات و تبرکات مثلاً موئے مبارک، دندان مبارک، آپؐ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں، بعض ظروف جو آپؐ کے استعمال میں رہے، آپؐ کا عمامہ، چادر اور خاص طور پر قدم مبارک کے نشانات وغیرہ کے ہیں۔ یہ عام زیارت گاہوں اور بعض مساجد میں ایسی بہت سی باقیات آنحضورؐ سے منسوب ہیں۔ مسلمانوں کو ان چیزوں سے دلی لگاؤ اور خاص انسیت ہے۔ ایسی باقی ماندہ نشانیوں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے ہاں "ذخیرہ" بھی کہا جاتا ہے۔ باقیات محمدیہ تمام دنیا کے مختلف ممالک میں کہیں نہ کہیں ضرور محفوظ ملتے ہیں۔ پاکستان میں بادشاہی مسجد لاہور میں موجود سبز عمامہ مع ٹوپی ایک سبز جُبہ، سفید پاجامہ، نعلین مبارک آنحضورؐ سے منسوب ہیں۔ اسی طرح ایک موئے مبارک اور بعض دیگر تبرکات جامع مسجد دہلی میں ہیں۔ سری نگر کشمیر میں بھی آپؐ کا موئے مبارک درگاہ حضرت "بل" میں محفوظ ہے۔ ایک چادر مبارک (بردہ شریف) جو آپؐ نے حضرت کعبؓ کو عنایت فرمائی تھی اور ایک تلوار استنبول کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

باقی باللہؒ (۵ر ذی الحجہ ۹۷۱ھ/۱۴ر دسمبر ۱۵۶۳ء — ۲۵ر جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ/۲ر جولائی ۱۶۰۳ء) ابو المؤید رضی الدین محمد باقی باللہ ایک بلند پایہ صوفی اور ہندوستان میں سلسلہ نقشبندیہ کے بانی۔ والد کا نام قاضی عبدالسلام تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد ملا صادق حلوائی کی خدمت میں حاضر ہوئے بعد میں ان کے ساتھ سمرقند گئے۔ وہیں ان میں تصوف کا ذوق پیدا ہوا۔ مرشد کامل کی جستجو میں کئی سفر کئے اور مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ بخارا میں خواجہ امکنگی کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے کمال محبت اور بڑی محنت کے ساتھ انہیں نقشبندی سلسلے کی تعلیم دی اور فرمایا کہ مملکت ہند کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہاں جاکر خلق خدا کو فیضیاب کرو۔ چنانچہ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں دوبارہ ہندوستان آئے ایک سال لاہور میں قیام فرمانے کے بعد مستقل طور پر دہلی آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ دہلی میں ان کا قیام تین چار سال سے زائد نہیں رہا۔ اس دوران میں بھی طبیعت علیل ہی رہی۔ آخر کار ۴۱ سال کی عمر میں دہلی ہی میں وفات پائی۔

اگرچہ حضرت باقی باللہ ہندوستان میں صرف چار پانچ سال رہے۔ وہ بھی بیماری کی حالت میں گذرے لیکن اس قلیل مدت میں انہوں نے نقشبندیہ سلسلے کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔ خوش قسمتی سے انہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسا مرید میسر آگیا۔ جس نے اس سلسلے کو اور بھی مستحکم کیا۔

اکبر کے دین الٰہی اور اسی طرح کے دوسرے احکامات نے اگرچہ عام مسلمانوں کو تو اتنا متاثر نہیں کیا تھا لیکن اونچے طبقے میں جو دربار کے زیادہ قریب تھا خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ حضرت باقی باللہ نے اس طرف خاص توجہ دی اور ان کی یہ کوششیں کامیاب رہیں۔ ان کے خلفاء میں سے حضرت مجدد الف ثانی، شیخ تاج الدین سنبھلی، شیخ اللہ داد، خواجہ محمد نور اور مرزا حسام الدین احمد خاص طور پر مشہور ہیں۔

اولاد میں دو صاحبزادے خواجہ عبیداللہ اور خواجہ عبداللہ تھے۔ جنہیں حضرت مجدد کی تربیت حاصل ہوئی۔

باکو بحر خزر کے مغربی ساحل پر جزیرہ نمائے آبشاران میں واقع ایک روسی قصبہ اور ضلع۔ اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ملتیں۔

مشہور مورخ المسعودی نے باکو کا ذکر ایک بندرگاہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ نیز اس نے باکو کے سفید پیٹرول اور آتش فشاں پہاڑوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ المقدسی نے باکو کو شیروان سے بالکل الگ ایک مقام بتایا ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ بہتر معلومات عبدالرشید بن صالح الباکوی نے ۸۰۶ھ/۱۴۰۴ء میں دی ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ "یہ شہر چٹانوں پر اور سمندر کے بالکل قریب پتھر سے بنا ہوا تھا۔ آب و ہوا تو اچھی تھی لیکن پانی کی قلت تھی۔ اسی باعث علاقہ زرخیز نہ تھا۔ چنانچہ سامان خورد و نوش شیروان اور موقان سے منگایا جاتا تھا۔

باکو بیشتر اوقات شیروان کے ماتحت بھی رہا یہ کچھ عرصہ عثمانی ترکوں کے ماتحت رہا اور ۱۸۰۶ء میں اس پر مکمل طور پر روسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس وقت اس کی آبادی پانچ ہزار تھی۔ ۱۸۷۲ء میں باکو نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ ۱۸۸۳ء میں اسے ریلوے کے ذریعے ماوراء النہر اور روس کے اندرونی علاقوں سے ملا دیا گیا۔

۱۸۷۹ء میں اس کی آبادی ایک لاکھ بارہ ہزار کے قریب تھی۔ ۱۹۰۷ء میں جب پائپ لائن مکمل ہوگئی تو باکو اور باطوم کا آپس میں رابطہ قائم ہوگیا۔ انقلاب روس سے پہلے اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب تھی اور روسی تیل کا ۹۵ فیصد حصہ یہیں سے مہیا ہوتا تھا۔

۲۸ر اپریل ۱۹۲۰ء کو اس پر سرخ فوج نے قبضہ کیا۔ اور یہ آذربائیجان کی جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ کا صدر مقام ہوگیا۔ اس شہر نے اشتراکی حکومت کے تحت بہت ترقی کی ۱۹۳۹ء میں یہ شہر پورے اشتراکی رفاقیہ کا پانچواں شہر بن گیا۔ اور اس کی آبادی ۸۰۹۳۰۰ تھی۔ اس وقت یہ ایک بہت بڑا اور جدید ترین صنعتی شہر ہے اور تیل کی صنعت کے علاوہ یہ ایک اہم تعلیمی مرکز بھی ہے۔ اس وقت اس کی آبادی سترہ لاکھ کے قریب ہے۔

بالاکوٹ پاکستان میں صوبہ سرحد کا ایک مشہور تاریخی قصبہ تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ کے شمال مشرقی گوشہ میں وادی کاغان کے آغاز پر واقع ہے۔ یہ علاقہ ابتدائی زمانہ ہی سے کوہستان کے لئے ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔ اسے سید احمد شہید کے سکھوں کے خلاف جہاد کی وجہ سے خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا رقبہ ۲۵۷۴ ایکڑ ہے۔ کل آبادی دس ہزار ہے۔ گرد و پیش کے مناظر کے لحاظ سے بالاکوٹ وادی کاغان ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔

قصبہ ایک پشتے پر آباد ہے جو جنوب کی سمت سے چھ سات سو فٹ بلند ہے اور مشرقی جانب اس سے بھی زیادہ ہے۔ شمال اور مغرب کی طرف یہ پشتہ ڈھلوان ہوتا ہوا کھیتوں سے مل گیا ہے۔ اس کے عام مکان پہاڑی آبادیوں کی طرح درجہ بدرجہ ہیں۔ یعنی نچلے مکانوں کی چھتیں اوپر کے مکانوں کے صحن ہیں۔ بازار اور گلیاں تنگ اور پیچ دار ہیں۔ مکان چھوٹے چھوٹے ہیں جن کی بلندی بہت کم ہے۔

بالاکوٹ میں ابتداء میں تین مساجد تھیں۔ مسجد بالا۔ مسجد متوسط۔ مسجد زیریں مسجد بالا سے سید احمد شہید نے سکھوں پر حملہ کیا تھا۔ انگریزوں کے عہد میں بالاکوٹ کے قرب و جوار میں نئی آبادیاں بنائی گئیں۔ مثلاً پشتے کے ساتھ نیچے کی طرف ایک ڈاک بنگلہ، تھانہ، ڈسپنسری اور سکول بن گئے۔ سید احمد شہید کی قبر بھی اسی جگہ

Marfat.com

پر ہے۔ ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی گئی ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بالاکوٹ کے زیریں حصے میں کئی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اب وہاں در نہایت ہی عمدہ بنگلے یعنی ہوسٹل اور ریسٹ ہاؤس ہیں۔ تھانے اور بعض دوسری عمارتوں کو بھی از سر نو چوکور پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ سید احمد شہید کے مزار اور احاطے پر پلستر کرا دیا گیا ہے اور قبر کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی لگی ہوئی ہے۔ احاطے میں بہت سی قبریں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مکانوں کی تعمیر قطاروں کی شکل میں کی گئی ہے۔ اب بالاکوٹ لکڑی کی تجارت کا مرکز بن گیا ہے۔

۱۸۳۱ء سے پہلے بالاکوٹ میں صرف ایک زیارت گاہ "بالا پیر" کا مزار تھا۔ موجودہ یادگاروں میں ۱۔ مسجد بالا یا مسجد کلاں، جس میں جنگ سے پیشتر مجاہدین نماز ادا کرتے تھے اور اسی مسجد سے نکل کر سید احمد نے سکھوں پر حملہ کیا۔ ۲۔ مسجد زیریں اس مسجد میں بھی سید صاحب صبح کے وقت کچھ دیر ٹھہرے تھے۔ ۳۔ واصل خاں کی حویلی ۴۔ میدان جنگ جو بالاکوٹ کے میدان جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ ۵۔ شاہ اسماعیل شہید کا مزار۔ ۶۔ سید احمد شہید کا مزار قابل دید ہیں۔

بالغ پہنچنے والا۔ اصطلاح میں وہ شخص جو جوانی کو پہنچ گیا ہو بالغ کا لفظ لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ احکام شرعیہ کا عامل ہونے کے لیے بالغ ہونا لازمی شرط ہے۔ یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ جہاد وغیرہ کے احکام انسان کے بالغ ہونے پر ہی فرض ہوتے ہیں۔ اسلامی قانون میں بلوغت مرد اور عورت دونوں کے لیے جسمانی قویٰ کی تکمیل پر موقوف ہے۔ مرد کے بالغ ہونے کی علامت احتلام اور عورت کے لیے حیض ہے۔ اگر یہ علامات نہ پائی جائیں تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک لڑکے کے لیے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لیے بارہ سال۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک دونوں کے لیے پندرہ سال کی عمر شرط ہے۔ مالکیوں کے نزدیک یہ عمر اٹھارہ سال حنبلیوں اور شافعیوں کے نزدیک پندرہ سال ہے۔

اسلام میں پورے قانونی حقوق کے لیے فرد کا بالغ ہونا شرط ہے۔ صوفیا کے نزدیک آدمی اس وقت تک بالغ نہیں ہوتا جب تک اس میں چار خصلتیں کامل نہ ہوں یعنی اقوال، افعال، معارف اور اخلاق حمیدہ اس کے بعد ہی انسان کمال بلوغ کو پہنچتا ہے۔

ہر باشعور بالغ پر مذہبی فرائض کی انجام دہی لازم ہوتی ہے اور وہ حدود و قصاص میں مسئول ہے۔ لیکن معاملات اور ملکیت کے حقوق و فرائض کے سلسلے میں محض عاقل بالغ ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لیے رُشد یعنی صلاحیت اور فعل و عمل میں ذمہ داری کا احساس بھی ضروری ہے۔ حنفیوں کے علاوہ دوسرے مذاہب فقہ نے عاقل بالغ کو اس کے مال پر قابض بنا دینے کی عمر کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک پچیس سال کی عمر میں اس کا مال اسے مل جانا چاہیئے۔ مالکیوں کے نزدیک عورت کے لیے بلوغ اور عاقل کی شرط کے علاوہ کسی کے عقد میں آنا یا ولی کا اسے باضابطہ اجازت دینا بھی لازمی ہے۔

° قرآن میں بالغ کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے (۲:۹۵) (۶۸:۳۹) (۵۹:۲۴) ط

"بانت سعاد" کعب بن زہیر کی لکھی ہوئی مشہور نعت، اسے "قصیدۃ البردہ" اور "قصیدۃ اللامیۃ" بھی کہا جاتا ہے۔

۸ھ/۶۳۰ء میں فتح مکہ کے بعد کعب کے بھائی بجیر نے مشورہ دیا کہ مدینے چلے جاؤ یا کہیں اور پناہ لو کعب نے اس کا جواب نظم میں دیا اور اپنے بھائی کو قبول اسلام پر ملامت کی۔ گردش زمانہ کے تحت جب کعب ہر طرف سے مایوس ہو کر مدینہ منورہ میں آیا تو آنحضورؐ فجر کی نماز کے بعد مسجد ہی میں تشریف فرما تھے اور صحابۂ کرام بھی آپ کے گرد جمع تھے کعب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رسائی پائی۔ اس موقعہ پر کعب نے سب کے سامنے اپنا یہ مشہور قصیدہ پڑھا۔ جس میں اس نے آپؐ کے کریمانہ حسن سلوک کی تعریف کی ہے۔ اس موقعہ پر آنحضورؐ نے کعب کو اپنی چادر مبارک بھی عنایت فرمائی تھی۔ اس وجہ سے اسے قصیدہ بردہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس قصیدے میں ۵۸ اشعار ہیں۔ یہ قصیدہ اپنی خصوصیت کے لحاظ سے قبل اسلام کے قصیدوں کے مطابق ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں بھی کی گئی ہیں۔

بانس بریلی:۔ اتر پردیش (ہندوستان) کا ایک شہر (دیکھئے "بریلی")

باہلہ قدیم عربوں کا ایک حضری اور نیم حضری قبیلہ۔ اس قبیلے کا علاقہ ریاض سے مکہ کو سیدھی جانے والی شاہراہ کے دونوں طرف واقع ہے۔ باہلہ مالک بن اعصُر کے ایک بیٹے کی ماں تھی۔ باہلہ کے دو بڑے قبیلوں قتیبہ اور وائل کے درمیان سیاسی مخالفت تھی۔ یہ دونوں قبیلے ابنا دخان کے عرف سے معروف تھے۔ یہ زمانہ جاہلیت میں عزیٰ بت کو پوجتے تھے۔ ان کی سکونت یمامہ میں تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے بعد یہ لوگ بصرے سے چار میل دور بئر الحضیر میں جا بسے۔ اسلامی عہد میں اس قبیلے کے بعض افراد نے بہت ناموری پائی۔ ان میں ابو امامہ الصدی بن عجلان حدیث کے راوی ہیں سلمان بن ربیعہ کبار تابعین میں سے تھے جنہوں نے آذربائیجان کی فتوحات میں نمایاں حصہ لیا۔ اور کوفے کے قاضی بھی رہے۔ قتیبہ بن مسلم الباہلی مشہور فاتح، سپہ سالار ا خراسان کے حاکم رہے۔ عمرو بن مسلم الباہلی اور بصرہ کے مشہور عالم الاصمعی بھی اسی خاندان سے تھے۔

باہلی (وفات ۲۳۱ھ/۸۵۵ء) ابو نصر احمد ابن حاتم، ایک عرب ماہر لسانیات اور مصنف پہلے بغداد میں رہتا تھا پھر اصفہان چلا گیا۔ بعد میں بغداد ہی میں سکونت اختیار کی ابو زیاد۔ الاصمعی اور ابو عبیدہ کا شاگرد تھا۔ بغداد میں وفات پائی۔ اس نے درختوں پودوں، پرندوں، اونٹوں، گھوڑوں، اناجوں وغیرہ پر مختلف کتابیں لکھیں۔ اس نے سب سے پہلے ٹڈیوں پر کتاب لکھی تھی۔ اس کی اکثر تصانیف ضائع ہو گئیں۔ مشہور تصانیف میں "ضرب الامثال"، "اعلام" اور "غلط العوام" ہیں۔

باہُو سلطان:۔ برصغیر پاک و ہند کے ایک مشہور صوفی۔ (دیکھئے "سلطان باہو")

بائبل "کتاب"، عیسائیوں اور یہودیوں کی مقدس اور مذہبی کتاب۔ یہ دراصل بہت سی کتابوں کا مجموعہ ہے، جن میں زبور، تورات اور انجیل بھی شامل ہیں۔ کتاب دو بڑے حصوں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید پر مشتمل ہے۔ "عہد نامہ عتیق" میں حضرت عیسیٰؑ سے قبل کے تذکرے، تاریخیں، صحیفے اور مذہبی کتابیں جو تعداد میں ۳۹ ہیں شامل ہیں اور "عہد نامہ جدید" میں چار اناجیل، رسولوں کے اکیس خطوط، رسولوں کے اعمال اور یوحنا عارف کا مکاشفہ دیئے گئے ہیں۔

یہ تمام کتابیں صدیوں میں تیار ہوئیں اور بائبل میں شامل ہوتی رہیں۔ یہ زیادہ تر تین زبانوں عبرانی، آرامی یا یونانی میں لکھی گئیں۔ ان کے مصنفین اپنے زمانے کے

Marfat.com

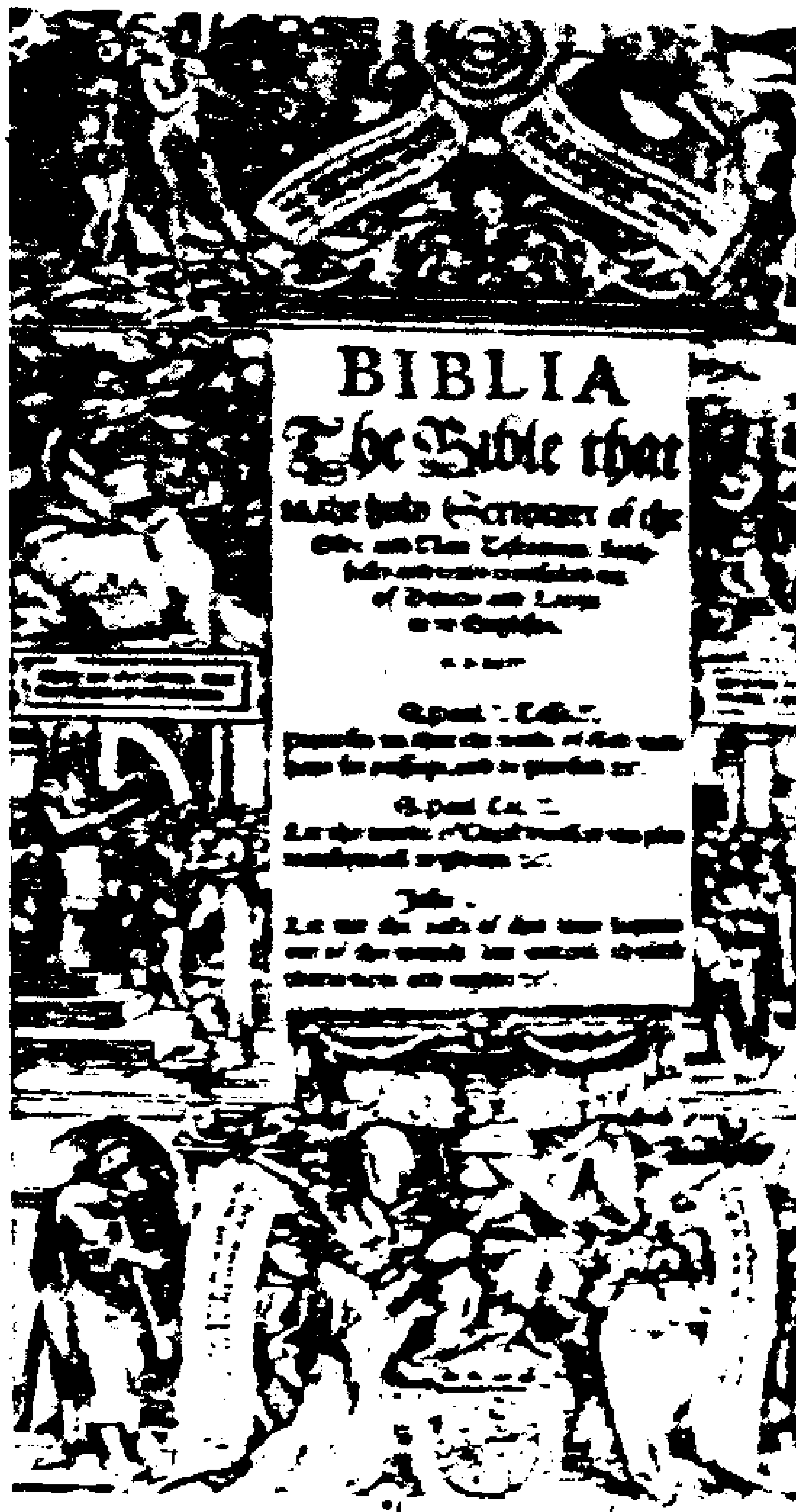

بائبل کا ولندیزی نسخہ (۱۶۳۷ء)

عالم فاضل لوگ تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نبی نہیں تھا۔ زبور، توراۃ اور انجیل کے نام سے جو کتابیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی اپنی طرف سے لکھی ہوئی ہیں۔

مغرب میں بائبل کو محض مذہبی کتاب کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ اس کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے اور اس کا مطالعہ باقاعدہ نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس کی بہت سی تمثیلیں، محاورے اور روزمرے مغربی زبانوں میں عام ہیں۔ اگرچہ بائبل کو ایک ادب پارے کی حیثیت کبھی بھی حاصل نہیں ہوئی۔

بائبل کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ زیادہ تر پچھلی دو صدیوں میں ہوا ہے۔ یونانی زبان میں عہد نامہ عتیق کا سب سے پہلا ترجمہ تیسری صدی قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن بائبل کا مکمل ترجمہ سب سے پہلے ۴۰۴ء میں لاطینی زبان میں ہوا۔ جسے پوپ کلیمنٹ ہشتم کے نام پر ۱۵۹۲ء میں کلیمنٹ ولگیٹ کا نام دے کر شائع کیا گیا۔ انگریزی زبان میں اس کے تراجم سولھویں صدی ہی میں شروع ہوئے۔ عہد نامہ جدید کا مکمل انگریزی ترجمہ ۱۵۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ پوری بائبل کا ترجمہ ۱۵۳۵ء میں شائع ہوا اور مستند ترین ترجمہ ۱۶۱۱ء میں شائع ہوا۔ جرمن زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ۱۴۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ فرانسیسی میں مکمل ترجمہ ۱۵۳۰ء میں، اطالوی زبان میں ۱۴۷۱ء میں اور ہسپانوی زبان میں ۱۷۹۳ء میں پہلا مکمل ترجمہ شائع ہوا۔

مشرقی زبانوں میں اٹھارہویں صدی تک بائبل کے تراجم صرف شامی، آرمینی، قبطی، فارسی اور عربی میں ہوئے تھے۔ مشرق بعید اور ہندوستان میں پہنچنے والے مشنریوں نے یہاں کی زبانوں میں تراجم کا آغاز کیا۔ ۱۷۱۵ء میں گرنڈلر نے تامل میں عہد نامہ جدید اور شلز نے ۱۷۵۸ء میں ہندوستانی (دکھنی اردو) میں یوحنا کی انجیل کا ترجمہ کیا تھا اس کے بعد دنیا بھر کی زبانوں میں بائبل کے ترجمے ہونے لگے جن کے لیے بائبل سوسائٹیاں مصروف عمل تھیں۔ ۱۹۹۰ء تک دنیا بھر کی ۱۹۹ زبانوں میں بائبل کے مکمل ترجمے شائع ہو چکے تھے۔

(نیز دیکھیے "انجیل"، "توراۃ"، "زبور"، "عہد نامہ جدید"، "عہد نامہ عتیق")

بایزید انصاری

(۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء - ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) پیرروشان یا پیر تاریک؛ پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک عجیب و غریب صوفی، افغانوں کی تحریک روشنائیہ کے بانی، باپ کا نام عبداللہ اور ماں کا نام امینہ تھا۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ نسلاً پٹھان اور قبیلہ ارمڑ سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ابھی سات سال کے تھے کہ عبداللہ نے بایزید کی ماں کو طلاق دے دی۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم گھریلو کام کاج میں مصروفیت کی وجہ سے نامکمل ہی رہ گئی تاہم جب کبھی موقع ملتا تو تھوڑا بہت مطالعہ کر لیتے تھے۔ ان کی زیادہ تر توجہ صوفیانہ ریاضتوں اور دوسرے مذہبی فرائض کی معلومات حاصل کرنے کی طرف رہی۔ چنانچہ سولہ برس کی عمر میں خواجہ اسماعیل سے ملاقات ہوئی۔ بایزید خواجہ اسماعیل کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے والد انہیں قاضی بنانا چاہتے تھے۔ بالآخر ایک روز بایزید نے اپنے والد سے کہا کہ میں دین کے معاملے میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گا اسکے بعد انہوں نے خواجہ اسماعیل کے مریدین کی طرح سوکھی روٹی کھانا اور کم سونا شروع کر دیا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے بایزید کا جوگیوں کی صحبت میں رہنے کا بھی ذکر کیا ہے ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ خود بھی پیر کامل ہیں۔ چنانچہ انہیں خواب نظر آنے لگے۔ ایک خواب میں انہوں نے خضرؑ سے ملاقات کی اور ان سے آب حیات لے کر پیا۔ اس واقعے کی یاد ان کے مرید روزہ رکھ کر مناتے ہیں۔ اسی دوران میں انہیں غیب سے آوازیں سنائی دینے لگیں اور اس طرح انہوں نے روحانی ترقی کے مختلف مدارج طے کیے۔ اب بایزید ذکر خفی میں منہمک ہو گئے اور ایک عرصہ تک اسم اعظم کا ورد بھی کیا۔ اکتالیس سال کی عمر میں انہیں تبلیغ کا حکم ملا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان جانے کا قصد کیا لیکن قندھار ہی سے واپس جنوبی وزیرستان آ گئے۔ جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے ایک زمین دوز حجرہ تیار کرا کے اپنی بیوی اور چند دوسرے مریدین کے ساتھ چلہ کشی شروع کی۔ پانچ سال کی چلہ کشی کے بعد بایزید نے دوسرے لوگوں کو معرفت کی دعوت دینا شروع کی۔ اس دعوتی تحریک کو شروع کرتے ہی بایزید کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مخالفت میں ان کے والد، بھائی اور والد کے شاگردوں نے خاص طور پر حصہ لیا۔ وہ بایزید کو ناقص علم کے ساتھ کلام الٰہی کی تفسیر کا حق نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح اس کے دعوئے مہدویت اور الہام ربانی پر بھی معترض تھے۔ نیز دوسرے مسلمانوں کو کافر یا منافق کہنے پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ بایزید ان اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہے اور ان کے مریدوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ بایزید انہیں اپنے خلفاء بنا کر تبلیغ کے لیے مختلف مقامات پر بھیجتے۔ جہاں کسی مقام پر ان کا مقامی پیروں سے جھگڑا بھی ہو جاتا۔

Marfat.com

بایزید نے تبلیغ کا کام شروع کیا تو ان کی بہت زیادہ مخالفت ہوئی۔ تاہم ان کی قبائل بنگش تک رسائی ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے اورکزئیوں تیراہیوں اور آفریدیوں کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اسی طرح پشاور سے گذرتے ہوئے وہاں کے بیشمار قبائل کے لوگ اس کے حامی اور مرید ہو گئے۔ بالآخر ان کے خلاف کابل کے دربار میں شکایات پہنچیں تو بایزید نے اپنے جوابوں سے لوگوں کی تسلی کی اور اس طرح انہیں پشاور جانے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح ان کے ایک داعی نے قندھار کے علاقے میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور وہاں چند سال تبلیغ کرنے کے بعد حیدرآباد سندھ کے نزدیک سیدپور کے مقام پر اپنا تبلیغی مرکز قائم کیا۔ بایزید نے اپنی دعوت پھیلانے کے لیے امراء اور علماء کے پاس اپنے داعی بھیجے ان میں سے ایک داعی شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی بھیجا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض دوراندیش لوگوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ لگا کر یہ تصور قائم کر لیا کہ اب بایزید خونریزی کرنے پر آمادہ ہے۔ نیز ان کے بعض مریدوں نے ایک قافلے کو جو ہندوستان سے کابل جا رہا تھا طیش میں آ کر کہ یہ لوگ بایزید کا مذہب اختیار نہیں کرتے لوٹ لیا۔ کابل کے حکام نے ان پر حملہ کیا اور ان مریدوں کے گاؤں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے ان کے بچوں کو قید کر لیا۔ بایزید نے اس واقعے کے بارے میں جب احتجاج کیا تو حاکم پشاور کو بایزید کی گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ لیکن وہ بچ کر یوسف زئی کے علاقے میں ایک پہاڑی پر چلے گئے اور جب اس علاقے کا بھی محاصرہ کر لیا گیا تو وہ کامیابی سے مقابلہ کرتے ہوئے تیخر کے علاقے میں جا پہنچے۔ ان جنگوں کے شروع ہونے کے ڈھائی سال بعد بایزید نے وفات پائی۔ انہیں پہلے ہشت نگر (وزیرستان) میں دفن کیا گیا۔ بعدازاں بڑے بیٹے نے نعش وہاں سے نکلوائی اور بھٹہ پور میں جو کانی گرم (قدیم وطن) سے کچھ فاصلے پر تھا، دفن کی گئی۔

بایزید نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں جن میں انہوں نے اپنے فرقے کے اصول و عقائد کو بڑی تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان میں "خیرالبیان"، "مقصودالمومنین"، "صراط التوحید" اور "حال نامہ" بہت مشہور ہیں۔

بایزید کی اولاد میں سات لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ ان کے نام شیخ عمر۔ کمال الدین۔ خیرالدین۔ نورالدین۔ جلال الدین۔ اللہ داد۔ دولت خان اور کمال بی بی ہے۔ بایزید کے بعد ان کا بیٹا شیخ عمر خلیفہ ہوا۔

بایزید کے نزدیک اللہ کی حقانیت کا ماننا فرض عین ہے۔ اس معرفت کے بغیر اطاعت عبادت، خیرات اور عمل صالح، خدا کی نظروں میں غیر مقبول ہیں اور یہ معرفت پیر کامل کے توسط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک پیر کامل وہ ہے، جو صاحب شریعت، طریقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت ہو۔ ہر انسان پر اس پیر کامل کی تلاش اور اطاعت فرض ہے۔ اس کی اطاعت اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت ہے۔ یہ پیر کامل خود بایزید ہے جیسے یہ بات خوابوں اور الہاموں میں بتائی گئی ہے۔ نئے سالکوں کے لیے تو حجرہ نشینی، سال بھر میں ایک بار چلہ کشی، ذکر خفی، مراقبے اور اس طرح کی دوسری ریاضتوں پر زور دیا گیا ہے۔

بایزید نے اپنی تعلیمات کا خلاصہ "صراط التوحید" میں لکھا ہے۔ آغاز میں انہوں نے سرداروں اور امیروں کو تین نصیحتیں کی ہیں۔ پہلی نصیحت عقل کی فضیلت اور خالق کائنات کی قدرت پر غور و فکر کرنے اور معرفت کے حصول میں کوشاں ہونے کے بارے میں ہے۔ دوسری نصیحت میں علم باطن کے حصول ضرورت شیخ شریعت کے اوامر و نواہی اور تقوے، خوف و رجا سے بہرہ ور ہونے پر زور دیا گیا ہے تیسری نصیحت میں صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے تزکیہ نفس کو ضروری قرار دیا ہے:۔

بایزید نے ہر مرید کے لیے حسب ذیل مراتب طے کرنے ضروری قرار دیئے۔

۱۔ شریعت:۔ شریعت کے اوامر و نواہی کی پوری پوری تقلید اور قرآنی احکام و سنت کی پیروی۔

۲۔ طریقت:۔ شرعی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسری عبادتوں کی طرف بھی توجہ دینا۔ کیونکہ شریعت اور طریقت ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔

۳۔ حقیقت:۔ ایک لمحے کیلئے بھی ذکر خفی، طہارت قلب اور یاد خدا سے خالی نہ رہنا۔

۴۔ معرفت:۔ جس کی بنیاد قوت عقل و فکر اور مشاہدے پر قائم ہے۔

۵۔ قربت:۔ جو بلند مراتب طے کرنے اور نفس پر قابو پا لینے کا نام ہے۔

۶۔ وصلت:۔ انسان اپنی ہستی کو بھلا کر اپنے اندر صفات الٰہیہ پیدا کرے۔

۷۔ وحدت:۔ توحید میں خود کو فنا کر کے ذات حق کو دل میں بسا لینا۔

۸۔ سکونت:۔ محو و تحقیق کی آخری منزل۔

بایزید کے مریدوں نے اس کی تعلیمات کو ایک تحریک کی شکل دی۔ اسے انہوں نے تحریک روشنائیہ کا نام دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تحریک کا مقصد افغانوں کی ایک داخلی اور خودمختار حکومت قائم کرنا تھا۔ لیکن خود بایزید کی تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد پٹھانوں میں تزکیہ نفس، حسن اخلاق، بلندیٔ سیرت و کردار، تفکر و تعقل اور حصول علم کے جذبات ابھارنا تھا۔ ابتداء میں اس تحریک کا مرکز کانی گرم (وزیرستان) ہی تھا۔ یہاں ان کے مریدوں میں ملا ارزانی۔ ملا عمر۔ ملا علی محمد۔ ملا پائندہ۔ ملا دولت اکوزئی اور ملا دولت مہمند زئی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ تحریک کا دوسرا مرکز کلہ ڈھیر (ضلع مردان) تھا یہیں سے بایزید نے مختلف لوگوں کو دعوت نامے بھجوائے جن میں اخوند درویزا کے مرشد سید علی غواص بھی شامل ہیں۔ ان دونوں مشاہیر کے درمیان مناظرے بھی ہوئے۔ بایزید کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد عمر نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی۔ کتاب "تذکرہ الابرار والاشرار" کا بیان ہے کہ یوسف زئی قبیلے نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ ان کے درمیان جنگ ہوئی۔ جس میں بایزید کی بیوی اور بچے قید کیے گئے۔ بیوی کو ایک میراثی کے سپرد کر دیا گیا اور بایزید کی نعش کا تابوت توڑ کر کچھ ہڈیاں جلا دی گئیں اور کچھ کو دریا کے سپرد کر دیا گیا۔ بایزید کا چوتھا لڑکا جلال الدین جلالہ تھا، جو ۹۶۶ھ/۱۵۵۸ء میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے اکبر سے رعایتیں حاصل کیں اور بعدازاں اسی کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد تحریک روشنائیہ کا علم بایزید کے پوتے یعنی شیخ عمر کے بیٹے شیخ احداد نے سنبھالا۔ اس نے ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء تک آفریدی، اورکزئی اور سوری قبائل کے ساتھ مل کر اکبر کے ساتھ جنگ کی احداد کی وفات کے بعد اس کے لڑکے عبدالقادر نے سلطنت کا دعوٰے کیا، وہ بھی مارا گیا۔ اس کی لڑکی کی شادی شاہجہان نے اپنے وزیر سعداللہ خاں سے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک روشنائیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

بایزید انصاری کی شخصیت ہمیشہ متنازع فیہ رہی ہے۔ ان کے حامی انہیں پیر روشان اور ان کے مخالفین انہیں پیر تاریک کا خطاب دیتے ہیں۔ ان کے مریدوں کے نزدیک یہ ولی کامل اور مخالفوں کے نزدیک کافر مطلق تھے۔ اس دور کی ایک کتاب "حالنامہ" سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں بایزید کے مخالفین ان پر یہ اعتراضات کرتے تھے:۔

۱۔ بایزید نے علم حاصل نہیں کیا۔ پیر نہیں رکھتا اور غیر شرعی کلمات کہتا ہے۔

۲۔ وہ خود کو ہادی اور رہنما کہتا ہے۔

۳۔ وہ الہام ہونے کا دعوٰے کرتا ہے۔

Marfat.com

۴ ۔ اس کے نزدیک دیگر مخلوق منافق ہے۔
۵ ۔ وہ اپنے والدین اور عزیزوں کی عزت نہیں کرتا۔

ان باتوں کا جواب بھی بایزید نے تسلی بخش دیا تھا۔ اور مناظروں میں کبھی بھی شکست تسلیم نہ کی۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک بلند پایہ مقرر اور خطیب بھی تھے۔ نیز وہ ایک صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ ان کے طرز نگارش کی خوبیوں نے نہ صرف ان کے معتقدین کو بلکہ ان سے مخالفین کو بھی متاثر کیا تھا۔

بایزید اوّل (۷۵۸ھ/۱۳۵۴ء – ۱۲ شعبان ۸۰۵ھ/۸ مارچ ۱۴۰۳ء) بایزید یلدرم ولد مراد اوّل ترکی میں آل عثمان کا ایک جلیل القدر سلطان ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں ایک صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں قرہ مانیوں کے خلاف جنگ میں شجاعت اور بہادری دکھانے پر اسے یلدرم کا لقب ملا۔ اسی شہرت کی بنا پر اماسیہ کا والی مقرر کیا گیا۔ جمادی الآخر ۷۹۱ھ/جون ۱۳۸۹ء میں مراد اوّل قوصوہ کے میدان میں سخت زخمی ہونے پر اسے جانشین مقرر کیا گیا۔ اسی اثنا میں اناطولیہ کے باج گزار امرا نے بغاوت کر دی۔ چنانچہ اس نے فوراً دارالحکومت بروصہ کا رخ کیا۔ سرپا والوں نے صلح کر لی اور سردار لازار جو مراد اوّل کے ساتھ جنگ کرتا ہوا میدان کارزار میں مارا گیا تھا، کی بیٹی اولیویا کو بایزید کے عقد میں دے دیا نیز ایک امدادی فوج بھی بھیجنے کا وعدہ کیا۔

۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء میں بایزید فلاڈلفیا کو فتح کرنے اور ترکی ریاستوں کا اناطولیا سے الحاق کرنے میں مصروف رہا۔ اسی عرصہ میں اس نے قونیہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایشیائے کوچک کی اکثر ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں۔ اب بایزید نے باقیماندہ علاقے پر بھی قبضہ کرنا چاہا۔ سب سے پہلے ایدین پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ پھر منتشا اور صاروخان کا رخ کیا۔ اور انہیں بھی سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ ان فتوحات کے بعد اس نے درہ دانیال کو عبور کیا اور ادرنہ چلا گیا۔ سات ماہ کے محاصرے کے بعد وال قسطنطنیہ کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس نے والاچیا کا رخ کیا اور اسے بھی اپنا باج گزار بنا لیا۔ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں بایزید نے اپنے بڑے لڑکے کو بلغاریہ کی طرف روانہ کیا۔ بلغاریہ کا جنوبی حصہ سلطنت عثمان کے تحت مراد اوّل کے وقت سے چلا آتا تھا بایزید نے شمالی حصہ پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہا۔ شاہ سلیمان نے مقابلہ کیا لیکن تین ہفتے کے محاصرے کے بعد بایزید ترنوو پر قابض ہو گیا۔ اب پورے علاقے پر عثمانیوں کا تسلط ہو گیا تھا۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں بایزید نے سیواس سمسون اور اماسیہ کی طرف اپنی فوجیں روانہ کیں اور ان علاقوں کو بھی فتح کر لیا۔ اب صرف قسطمونی سلطنت باقی تھی جہاں دوسری مفتوحہ ریاستوں کے امرا جا کر پناہ لیا کرتے تھے بایزید نے اس پر بھی حملہ کیا اور اناطولیہ کی اس آخری ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں اس نے ہنگری پر حملہ کیا اور راستے میں ٹیٹل بلکرک تشور، کراشوڈا اور مہدیہ کے قلعوں پر بھی قبضہ جمایا۔ بایزید کی ان فتوحات نے ہنگری اور وینس کو ایک اتحادی معاہدہ طے کرنے اور یورپ میں ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا چنانچہ ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں جب بایزید قسطنطنیہ فتح کرنے کی مہم میں مشغول تھا۔ تو صلیبیوں نے نکوپلس کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں عبرتناک شکست دی اس کے بعد بایزید اناطولیا کی طرف لوٹا اور آق چای کے میدان میں قرہ مان اوغلو کو ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء میں شکست دے کر قتل کر دیا۔ اس علاقے کو قونیہ میں ضم کر دیا گیا۔

اس جنگ کے بعد بایزید کے بعض فوجی افسروں نے ایشیائے کوچک کے مشرق میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور اس طرح سلطنت عثمانیہ کی سرحد جا ملی تھی۔ پہنچ گئی تھی۔ دوسری طرف تیمور کی حکومت پہلے ہی ان علاقوں میں قائم ہو چکی تھی اب دونوں سلطنتوں کے ہم سرحد ہو جانے کی وجہ سے ان کے درمیان تصادم ہونا ناگزیر تھا تیمور کے بعد بایزید ہی کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت تھی۔ بایزید نے اپنی طاقت کے نشے میں تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا۔ اور سرحدی جھگڑوں کے علاوہ ایک دوسرے کے باغیوں کو اپنے ہاں پناہ دینے سے دونوں ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ آخر کار نوبت جنگ تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہو کر سیواس کا محاصرہ کر لیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس شہر پر قبضے کے بعد بایزید اور تیمور کے درمیان خط و کتابت دوبارہ شروع ہوئی۔ جس کے نتیجے میں دونوں فریقین نے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کر لیا۔ چنانچہ ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ تیمور نے فوجی نقطۂ نظر سے میدان کے بہترین حصے پر پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیمور کی عصبیت ابھارنے کی چال نے بایزید کی فوج کا ایک حصہ اس سے توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جنگ شروع ہوئی تو تیمور کی فوجی قابلیت اور اس کی فوج کی کثرت کے سامنے بایزید کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں بالآخر بایزید نے راہ فرار اختیار کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اور گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے تین بیٹے میدان جنگ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بیٹا گرفتار ہو گیا اور ایک کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

بایزید کو قید کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ تیمور نے اسے عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ اور بہت سی نصیحتیں کیں۔ بایزید نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تیمور نے بایزید کے رہنے کے لیے ایک خیمہ اپنے نزدیک نصب کرایا۔ نیز اس کی بیوی بیٹی اور بیٹے کو بھی اس کے پاس بھجوا دیا۔ بایزید کو اس کی سابق عظمت و سطوت کی یاد نے ایک لمحہ بھی چین نہ لینے دیا۔ اور وہ اسی غم میں مبتلا ہو کر آٹھ ماہ بعد وفات پا گیا۔ تیمور نے اس کے بیٹے کو آزاد کر کے بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ کو روانہ کی۔ جہاں اسے سابق تاجداران عثمانی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

بایزید ایک نہایت ہی قوی اور بہادر تاجدار تھا۔ موت نے صرف بایزید کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی موت سلطنت عثمانیہ کی موت تھی کیونکہ اس کے بعد سلطنت عثمانیہ کا استحکام ہمیشہ خطرے میں رہا اور یہ سلطنت مائل بہ زوال رہی۔

بایزید بسطامی رح (۱۲۸ھ/۷۴۶ء – ۲۶۱ھ/۸۷۴ء یا ۲۶۴ھ/۸۷۸ء) ابویزید طیفور ابن عیسیٰ ابن سروشان، تیسری صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ، بسطام میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سروشان نے مجوسی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا بایزید رح کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تصوف کی تعلیمات ابوعلی السندی سے حاصل کیں۔ ابوعلی السندی عربی نہیں جانتے تھے۔ بایزید نے انہیں قرآن کی چند آیات سکھائیں۔ جس کے بدلے میں انہوں نے بایزید کو تصوف کے رموز سے آگاہ کیا۔ اور وہ تصوف کے انتہائی درجے تک پہنچے۔ احادیث نبوی ؐ کے متعلق ان کی روایات نہایت اعلیٰ تھیں۔ انہوں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ تاہم ان کے پانچ صد کے قریب اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ یہ اقوال ان لوگوں نے نقل کیے ہیں جو بایزید سے ملے تھے

Marfat.com

یا ان کے حلقہ ارادت میں تھے۔

بایزیدؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں بارہ سال جنگلوں میں اپنے نفس کے حق میں لوہار بنا رہا۔ اور نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدہ کی آگ سے نرم کر کے ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا۔ اور پانچ سال تک اپنے نفس کو آئینہ بنانے میں صرف کیے اور طرح طرح کی عبادات و ریاضات سے اس آئینے کو خوب چمکاتا رہا۔ پھر ایک سال اسے اغیار کی نظر سے دیکھا۔ پھر بھی اسے عزور اطاعت کے بھروسے اور عمل کی خود پسندی میں مبتلا پایا۔ تو پانچ سال اور کوشش کی پھر جب دیکھا تو مردہ تھا۔ چنانچہ چار تکبیر نماز جنازہ پڑھی اور فارغ ہوا۔" ان کی قبر بسطام میں شہر کے عین درمیان مرجع خلائق ہے۔ ۷۱۳ھ/۱۳۱۳ء میں ایلخانی سلطان الجائتو محمد خدا بندہ نے ان کے مزار پر ایک قبہ تعمیر کرایا تھا۔

بایزیدؒ ایک باطنی صوفی تھے۔ وہ معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ وہ نوع انسان کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے ان کی جگہ خود تکلیف اٹھانے کے لئے تیار تھے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بایزیدؒ کی ذات بابرکات ہم میں ایسی ہے جیسے جبرائیلؑ کی فرشتوں میں۔ نیز تمام سالکان راہ توحید کی انتہا آپ کی ابتدا ہے۔"

شیخ احمد حضرت خضرویہ کہتے ہیں کہ "میں نے اللہ تعالےٰ کو خواب میں یہ فرماتے سنا کہ سب لوگ مجھ سے کچھ طلب کرتے ہیں لیکن بایزید مجھ سے مجھ ہی کو طلب کرتا ہے۔"

بایزید پیر روشان افغانوں کی ایک مذہبی اور قومی تحریک کا بانی۔ (دیکھیے "بایزید انصاری")

بایزید ثانی (۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء۔ ۱۰ ربیع الاول ۹۱۸ھ/۲۶ مئی ۱۵۱۲ء) ترکی کی سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا، محمد ثانی کا بیٹا اور جانشین تھا۔ باپ کی زندگی میں اماسیہ کا حاکم رہا۔ چھوٹا بھائی جم کرمانیہ کا حاکم تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دونوں میں تخت نشینی کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ ینی چری (سرکاری فوج) نے بایزید کو تخت پر بٹھا دیا۔ جم نے علم بغاوت بلند کیا بالآخر شکست کھائی اور مصر کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے مصری فوج کی مدد کے ساتھ دوبارہ واپس آیا۔ لیکن اس بار بھی منہ کی کھانا پڑی۔ اس بار اس نے روڈس کا رخ اختیار کیا۔ مبارزین روڈس نے ایک بھاری رقم (پینتالیس ہزار دوکات سالانہ) کے عوض جم کو اپنے ہاں نظر بند کر لیا اور بایزید سے یہ رقم حاصل کرتے رہے۔ تیرہ سال کی اسیری کے بعد اس شہزادے کو مار ڈالا گیا۔

بایزید ثانی کا عہد حکومت فتوحات اور توسیع سلطنت کے لحاظ سے اہمیت نہیں رکھتا۔ ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں باجگزار ریاست ہرزگووینا کو بایزید نے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

ہنگری سے کئی سال تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا بالآخر دونوں حکومتوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء میں مولداویہ کی مہم کے دوران میں قلعہ کلیہ اور قلعہ آق کرمان پر بھی بایزید کا قبضہ ہو گیا۔ البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء میں چھڑی، اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ زیادہ اہم تھی۔ مملوکوں کے خلاف جنگ میں ناکامیوں نے بایزید کو اپنی فوج کے نئے سرے سے مسلح کرنے کے بعد وینس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں وینس کے بیڑے کو زبردست شکست دے کر لیپانٹو کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں موڈن۔ کورن اور نیویرنو مورہ یا میں ترکوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ نیز ۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء میں اہل وینس نے تمام ترکی مقبوضات سے دستبردار ہو کر صلح کر لی۔

اس اثنا میں صفویہ نامی مذہبی فرقے کے رہنما اسماعیل نے ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں فتوحات کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور سارے ایران پر قابض ہو گیا۔ چنانچہ بایزید کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ایشیائے کوچک کے بڑے بڑے علاقے ترکوں کی اطاعت سے نہ نکل جائیں۔ اس خطرے کے پیش نظر بایزید نے ۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء میں بہت سے عناصر کو ایشیائے کوچک سے موریا کے فتح کیے ہوئے علاقوں میں منتقل کرنے کا حکم دیا ۹۰۳ھ/۱۵۰۷ء میں بایزید کو اپنی مشرقی سرحد پر بڑی تعداد میں فوجیں متعین کرنا پڑیں۔

اسی زمانہ میں سلطنت عثمانیہ میں خانہ جنگی کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بایزید کے تین بیٹوں نے اپنے باپ کے سامنے ہی تخت نشین ہونے کا فیصلہ کیا۔ بایزید احمد کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ مگر سلیم فوج میں مقبول تھا۔ وہ اپنی فوج دریائے ڈینیوب کے پار لے آیا۔ اور بایزید سے بلقان کے ایک صوبے کی حکومت کا مطالبہ کیا۔ بایزید نے اس کی خواہش کو بادل نخواستہ قبول کر لیا۔ بعد کے حالات نے سلطان بایزید کو سلیم کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس فیصلے کے بعد عزلت نشینی کے لئے بایزید نے دموتکہ کی طرف کوچ کیا لیکن راستے ہی میں وفات پائی۔

بایزید یلدرم :۔ عثمانی سلطان۔ (دیکھیے "بایزید اول")

بایسنغر (۲۱ ذوالحجہ ۷۹۷ھ/۲۵ ستمبر ۱۳۹۳ء۔ ۷ جمادی الاول ۸۳۷ھ/۱۹ دسمبر ۱۴۳۳ء) غیاث الدین بن شاہ رخ بن تیمور استرآباد کا حاکم۔ ہرات میں پیدا ہوا۔ باپ نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں دربار کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کرایا قرہ یوسف حاکم تبریز کی وفات پر ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں تبریز پر قبضہ کر لیا۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء میں استرآباد کا حاکم بنا۔ ساری عمر تخت پر نہ بیٹھا۔ اور پوری زندگی عیش و عشرت میں گذاری جس کی وجہ یہ بھی کہ نجومیوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ چالیس سال سے زائد زندہ نہیں رہ سکتا چھتیس برس کی عمر میں وفات پائی۔ اور گوہرشاد کے مقبرے میں دفن ہوا۔

بایسنغر بہت بڑا ماہر فن تھا۔ اور ہر فنکار کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے کتب خانے میں چالیس خطاط ہر وقت مخطوطات کی نقل کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

اسی نام کا ایک اور بادشاہ ایران کے آق قویونلو خاندان سے تھا۔ وہ سلطان یعقوب کا بیٹا تھا۔ اس نے مختصر عرصہ حکومت کی اور اس کے چچازاد بھائی رستم نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

بپتسمہ اصطباغ، عیسائیت میں اس کے معنی بچے کو زرد رنگ میں رنگنے کے ہیں۔ یہ رسم یہودیوں کے ہاں چلی آ رہی تھی کہ جب کوئی شخص ان کے مذہب کو اختیار کرتا تو یہودی اسے غسل دیتے تھے۔ اس غسل سے ان کے نزدیک اس شخص کے سارے گناہ دھل جاتے تھے۔ اور گویا وہ زندگی کا ایک نیا رنگ اختیار کر لیتا تھا۔ بعد میں یہی رسم عیسائیوں نے بھی اختیار کر لی۔ اور اسے اپنی اصطلاح میں اصطباغ کہنے لگے۔ یہ اصطباغ نہ صرف ان لوگوں کو جو ان کے مذہب میں داخل ہوتے ہیں دیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کے ہاں ہر نومولود بچے کو زرد رنگ کے پانی میں

Marfat.com

غسل دے دیتے ہیں ان کے نزدیک گویا اس طرح بچے پر عیسائیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس رسم کو صبغہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :-
"کہو اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا۔" (۲ : ۱۳۸) یعنی اللہ کا رنگ (طور طریقہ) اختیار کرو جو کسی پانی سے نہیں چڑھتا بلکہ اس کی بندگی کا طریقہ اختیار کرنے سے چڑھتا ہے۔

بتانی، ابو عبد اللہ (۲۴۴ھ / ۸۵۸ء - ۳۱۷ھ / ۹۲۹ء) ابو عبد اللہ محمد بن جابر ایک بہت بڑا مسلمان ہیئت دان، حران کے قریب پیدا ہوا خاندان صابی مذہب سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ مسلمان تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی الرقہ میں گذاری۔ ۲۶۴ھ / ۸۷۷ء سے اس نے اجرام فلکی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا شروع کیا اس مطالعے کی غرض سے اسے بغداد جانا پڑا جہاں سے واپسی پر وہ قصر الجص کے مقام پر انتقال کر گیا۔

اس کی تصانیف ہیں ۱۔ کتاب معرفۃ مطالع البروج فی ما بین ارباع الفلک، ۲۔ رسالہ فی تحقیق اقدار الاتصالات، ۳۔ شرح المقالات الاربع لبطلیموس، ۴۔ الزیج۔
سب سے اہم تصنیف الزیج ہے جو علم ہیئت پر ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔ اس رسالے میں مشاہدات کے نتائج درج ہیں۔ بارہویں صدی میں اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ ۱۲۸۲ء میں الفونسو دہم شاہ قشتالہ نے اس کا عربی سے ہسپانوی زبان میں ترجمہ کرایا۔ اس نے اس کتاب میں بطلیموس کے نظریے کو بالکل رد کیا ہے۔ سورج کے ظاہری زاویہ دار قطر کے انحراف اور سالانہ گرہنوں کے امکان کو ثابت کیا ہے۔ نیز رویت ہلال کی شرائط کا ایک نیا اور بہت ہی نادر نظریہ پیش کیا ہے۔

بت پرستی :- بتوں کی پوجا کرنا۔ (دیکھیے "اصنام پرستی")

بت تراشی بت بنانا۔ مٹی یا پتھر کے صنم تراشنا۔ اسلام میں اس قسم کے آرٹ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بت تراشی کسی بھی صورت میں اسلامی رو ح کے مطابق نہیں کیونکہ اس سے بت پرستی جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے۔
جہاں تک بت تراشی کے آرٹ کے آغاز کا تعلق ہے۔ یہ زمانہ قدیم ہی سے چلا آرہا ہے۔ تہذیب کے آغاز سے بھی بہت قبل کے انسان نے تصویر کشی اور بت تراشی کا آغاز کر دیا تھا۔ مذہبی رسوم کو ادا کرنے کے لئے معبود کی ضرورت پیش آئی تو جاہل انسان نے تصویر اور بت کو اس کا متبادل اور مترادف ٹھہرایا۔ رفتہ رفتہ یہی تصاویر اور بت لوگوں نے معبود ٹھہرا لیے۔
فرانس کے ڈیگڈ ایعنی غاروں سے جانوروں کے بت ملے ہیں، جنھیں زمانہ قبل از تاریخ کا انسان پوجا کرتا تھا۔ یورپ کے علاوہ افریقہ اور ایشیا سے بھی ایسے شواہد ملے ہیں۔
قدیم مصر میں عام طور پر فرعونوں کے مجسمے تراشے جاتے تھے۔ جنھیں فرعون کی قائم مقام حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ انھیں سجدہ کرنا، فرعون ہی کو سجدہ کرنا ہوتا تھا اس دور میں مردوں کے ساتھ ان کے مجسموں کو بھی دفن کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بت تراشی کے فن نے خاصا عروج حاصل کیا۔
میسو پوٹیمیا (عراق) کے علاقے میں سمیری، بابل، آشوری، کلدانی اور فارسی تہذیبوں میں بت تراشی کو ایک فن کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت ابراہیم کے وطن عُر میں بت تراشی کا فن چار ہزار سال قبل مسیح سے رائج تھا۔ یہاں آدمیوں اور جانوروں کے بت بنائے جاتے تھے۔ جس کے لئے پتھر، مٹی، دھات اور لکڑی وغیرہ استعمال کی جاتی تھی۔
نینوا شہر میں ۸۰۰ قبل مسیح کا دور بت تراشی کا نمایاں دور تھا۔ تقریباً ہر گھر میں بت سجے ہوتے تھے۔ جنگی واقعات کو مجسموں کی شکل دینا اسی دور سے شروع ہوا۔
قدیم یونان میں بت تراشی کا فن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مقدونیہ اور کریٹ کی ریاستوں میں انیسویں صدی قبل مسیح ہی میں خوب صورت مجسمہ سازی ہوتی تھی۔ مجسمہ سازی میں یونانی ماہرین اس قدر آگے بڑھ چکے تھے کہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یونان علوم کا باغ ہے اور مجسمہ سازی اس باغ کا خوبصورت ترین پھول ہے۔ انھوں نے سنگ مرمر اور ہاتھی دانت کے خوبصورت بت تراشے۔
یونان سے یہ فن ایران پہنچا اور یہاں فرہاد جیسے مشہور مجسمہ ساز پیدا ہوئے یہیں سے یہ فن ہندوستان آیا۔ سکندر اعظم کے حملوں کے بعد شمالی ہندوستان میں گندھارا آرٹ نے جنم لیا۔ بدھ مت کے پیروکاروں نے اس فن کو ترقی دی۔ کرشن، رام وغیرہ کے مجسموں کے ساتھ ساتھ مہاتما بدھ کے مجسمے بھی تراشے گئے۔ ہندوستان سے یہ فن بدھ مت کے پیروکاروں کے ہمراہ چین اور جاپان میں گیا۔ اگرچہ قدیم چینی ادوار شانگ اور چاؤ میں بھی بت تراشی کے عمدہ نمونے نہیں ملتے لیکن ہن دور جو دوسری صدی قبل مسیح سے شروع ہوا چینی مجسمہ سازی کے عروج کا دور تھا۔ اسی دور میں جاپانی مجسمہ سازی کا آغاز ہوا جو آج تک پورے جوش و خروش سے جاری ہے۔
یورپ میں یونانیوں کے بعد رومیوں کا دور آیا اور پھر عرصہ دراز تک اسلامی فتوحات کی وجہ سے بت تراشی کا فن عنقا رہا۔ یورپ کے تاریک دور میں کہیں کہیں رومی آرٹ کی بازگشت سنائی دے جاتی تھی۔ پندرہویں صدی عیسوی میں فرانس میں اس فن کا احیا ہوا اور پھر اس نے باقاعدہ سنگ تراشی کے فن کی حیثیت اختیار کر لی۔
قدیم عربوں کے ہاں بت تراشی بطور فن کبھی رائج نہیں رہی۔ وہ بت پرست تو تھے لیکن بت تراش نہیں تھے۔ ان کے ہاں بت دوسرے ملکوں سے آتے تھے خانہ کعبہ میں رکھے گئے تین سو ساٹھ بت زیادہ تر بابل، آشور اور مصر کے علاقوں سے آئے تھے

بتلیس :- مشرقی اناطولیہ کا ایک مرکزی شہر۔ (دیکھیے "بدلیس")

بتول کنواری، تارک الدنیا، جدا، منفرد۔ اصطلاحاً حضرت فاطمہ بنت محمدؐ کا لقب جنھیں شرف اور بزرگی کی بدولت دیگر خواتین سے ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ (دیکھیے "فاطمۃ الزہرہ")

بجایہ الجزائر کا ایک مشہور شہر اور بندرگاہ، جبل جاریہ کی نچلی ڈھلانوں پر تعمیر کیا گیا ہے۔ البکری نے اس شہر کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ ایک بہت پرانا شہر اور خوشگوار سرمائی مقام ہے۔ جہاں اہل اندلس آباد ہیں۔" گیارہویں صدی عیسوی میں بنو حماد نے بجایہ پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ چنانچہ الناصر حمادی نے اپنے نام پر اس کا نام الناصریہ رکھا۔ اس کی توسیع کی اور ایک محل بنوایا ۴۹۲ھ / ۱۰۹۰ء میں المنصور نے اس شہر کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ اس نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی۔ باغات لگوائے۔ امیمون اور قصر الکوکب کے نام سے دو محل تعمیر کرائے۔ پانی کا بہتر طریق پر انتظام کیا گیا۔ بجایہ کی بندرگاہ کی وجہ سے اس شہر کے سمندر پار کے ممالک سے تجارتی اور ثقافتی روابط قائم تھے۔ اسی وجہ سے اس شہر نے ایک

Marfat.com

ایسے مرکز کی حیثیت حاصل کر لی جو علم و ہنر اور تہذیب و تمدن میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اور اس کی تہذیب کی شعاعیں یورپ کی عیسائی دنیا بالخصوص صقلیہ اور اطالیہ میں پھیلیں ۔

۵۴۶ھ/۱۱۵۲ء میں اس شہر پر عبدالرحمان کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس طرح اب یہ مراکش کا صدر مقام بن گیا۔ لیکن نئے فرمانرواؤں کو کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں بنو غانیہ نے بجایہ پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اور انہوں نے دولت مرابطون کو بحال کرنے کے لئے اپنی فوج کو وہاں اتارا۔ ان کی نظر میں یہ شہر ایک جنگی مستقر تھا۔ بعد میں الموحدون نے اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ ان کے بعد بجایہ تونس کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے تلمسان کے سلطان عبدالواد نے بھی اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہا۔ اور اس مقصد کے لئے اس پر کئی حملے بھی کئے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ان تمام حملوں کے باوجود اس شہر کی حیثیت ایک دولت مند تجارتی شہر ہی کی رہی ۔

۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء میں پیڈرو دی نوارو نے بجایہ پر حملہ کیا۔ اب یہ ایک ہسپانوی شہر بن گیا۔ اہل ہسپانیہ اس پر ۴۵ سال تک قابض رہے۔ لیکن اس سارے عرصہ میں انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اور بالآخر انہیں یہ سارا علاقہ واپس کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ تمام علاقہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بعد میں بجایہ الجزائری ترکوں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۳۳ء میں جب فرانسیسی فوج اس شہر میں داخل ہوئی تو شہر ایک معمولی سی بستی کی حیثیت رکھتا تھا، جس کی آبادی دو ہزار تھی۔ موجودہ شہر بجایہ میں ماضی کے بہت کم نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ جن سے اس شہر کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ قلعہ برل نے قصر الکوکب کی جگہ لے لی ہے۔ اور قصر اللؤلؤ کی جگہ اب بر جیہ کے فوجی حجرے بن گئے ہیں۔ ماضی میں یہ شہر اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا، جتنا اب ہے۔

بجکم (وفات ۲۱ رجب ۳۲۹ھ/۲۱ اپریل ۹۴۱ء) ایک ترک امیر جو اصلاً غلام تھا یہ ماکان کا خادم تھا۔ بعد میں طبرستان اور جبال کے حاکم مرادویج کا ملازم ہو گیا اور مرادویج کے قتل کے بعد ترک غلاموں کا سردار بنا۔ ۳۲۴ھ/۹۳۶ء میں جب خلیفہ الراضی نے ابن الرائق کو امیر الامرا بنایا تو بجکم اس کا دست راست بن گیا۔ ۳۲۵ھ/۹۳۶ء میں جب خلیفہ اور بجکم بغداد واپس آئے تو اسے مشرقی صوبوں کا والی مقرر کیا گیا۔ بجکم نے البریدی کی فوجوں کو دو مرتبہ شکست دی اور سارے خوزستان پر قابض ہو گیا۔ البریدی نے بھاگ کر بصرے میں پناہ لی۔ اس فتح کے بعد ابن الرائق نے بجکم کو واپس بلا لیا۔ البریدی نے فارس میں خوزستان کو دوبارہ واپس لینے کی کوشش کی۔ ادھر ابن الرائق نے البریدی سے معاہدہ کر لیا کہ اگر دار الخلافت اس کے ہاتھ آگیا تو واسط کی ولایت البریدی کو مل جائے گی۔ دوسری طرف ابن الرائق کے سابق وزیر ابن مقلہ نے اس سے بدلہ لینے کی خاطر بجکم سے خط و کتابت شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی خلیفہ الراضی سے سفارش کر کے بجکم کو ابن الرائق کا جانشین بنوا دیا۔ بعد میں بجکم نے ابن مقلہ کو ابن الرائق کے حوالے کر دیا۔ ۳۲۶ھ/۹۳۸ء میں فوجوں کی تنخواہ وصول کرنے کے بہانے بجکم نے بغداد کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ جب بجکم بغداد میں داخل ہو گیا تو ابن الرائق نے اپنی جان بچانے کے لئے اسے امیر الامرا بنا دیا۔ ۳۲۷ھ/۹۳۸ء میں بجکم کو موصل کے گورنر حسن بن عبداللہ سے مالی واجبات ادا نہ کرنے پر مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسری طرف ابن الرائق ایک فوج لے کر بغداد میں داخل ہو گیا جو اس شرط پر کہ طریق الفرات اور عواصم وغیرہ کی حکومت اسے عطا کی جائے، بغداد چھوڑنے پر رضامند ہو گیا۔

اس طرح ۹۳۹ء میں خلیفہ اور بجکم دوبارہ دار الخلافت بغداد میں آگئے۔ البریدی کو واسط کی حکومت مل گئی اور البریدی نے اپنی ایک لڑکی بھی بجکم سے بیاہ دی۔ لیکن بجکم اور البریدی میں تھوڑے ہی عرصے بعد اختلافات پیدا ہو گئے۔ ۳۲۸ھ/۹۴۰ء میں بجکم نے البریدی کو وزارت کے عہدے سے ہٹا دیا۔ ۳۲۹ھ/۹۴۰ء میں جب الراضی فوت ہوا تو بجکم واسط میں تھا۔ خلیفہ المتقی نے اسے امیر الامراء کے عہدے پر قائم رکھا۔ ۹۴۱ء میں بجکم کو واسط سے اپنے نائبین کی مدد کے لئے جانا پڑا۔ راستے میں معلوم ہوا کہ البریدی کو شکست ہو گئی ہے چنانچہ بجکم نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ واپسی پر بجکم ایک کرد کے ہاتھوں مارا گیا۔

بجکم عربی زبان جانتا تھا۔ وہ علماء کا ادب کرتا تھا۔ اسے اقتدار اور دولت دونوں کی آرزو تھی۔ چنانچہ ان کے حصول کے لئے وہ دھوکہ فریب رشوت ستانی اور سخت گیری سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اپنی رعایا کی خوشحالی کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا۔ اس نے قحط کے دوران میں واسط میں ایک ضیافت خانہ اور بغداد میں ایک شفا خانہ بھی تعمیر کرایا۔

بجہ خانہ بدوش قبائل، جو دریائے نیل سے لے کر بحر احمر تک مصر، سوڈان، اور اریٹریا کے علاقوں میں آباد ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا پہلا ٹکراؤ اور معاہدہ ہشام کے دور حکومت میں ہوا۔ اس معاہدہ کی رو سے ان کے اور مصر کے درمیان باقاعدہ تجارت قائم ہو گئی۔ یوں مسلمانوں کو ان کے حملوں سے تحفظ مل گیا بعد میں جب انہوں نے دوبارہ مصر پر حملے شروع کئے اور سونے اور زمرد کی کانوں کا خراج دینا بند کر دیا تو فوج کا ایک دستہ روانہ کیا گیا جس نے انہیں شکست دی اور ان کے سردار نے خلیفہ المتوکل کے دربار میں جا کر دوبارہ اطاعت کی۔ بقول یعقوبی بجہ کی چھ سلطنتیں تھیں۔ آٹھویں صدی ہجری/چودہویں صدی عیسوی میں جب سونے کی کانیں ختم ہو گئیں۔ اور نیل کے بالائی حصے پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تو بجہ قبائل بالعموم ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے۔ ۱۵۱۷ء میں جو علاقہ بجہ سے گزرنے والی متعدد سڑکوں کے ذریعے سوڈانی نیل سے ملا ہوا تھا عثمانیوں کے قبضے میں آگیا۔ لیکن انیسویں صدی میں یہ بندرگاہ بجہ کے قبضہ میں آگئی۔ جب اہل مصر نے نیل کے متصل سوڈان کے علاقے فتح کر لیے تو بجہ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ۱۸۸۳ء میں عثمان بن ابی بکر دقنہ نے بجہ کی تمام سرکاری چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۹۱ء میں ایک مصری اور انگریزی فوج نے جب اس علاقے پر قبضہ کر لیا تو اس دور میں قبائلی تنظیم کی نئے سرے سے طرح ڈالی گئی اور رفتہ رفتہ پرانا طریقہ زندگی بدل گیا۔

اس زمانہ میں ان کے بڑے بڑے قبیلے عبابدہ، بشارین، امرار، حدندوہ اور بنو عامر تھے۔ بنو عبابدہ آج کل عربی بولتے ہیں۔ ان کی گذر اوقات زیادہ تر اونٹوں مویشیوں، بھیڑ بکریوں پر ہے۔ اس وجہ سے جگہ جگہ چراگاہیں پھیلی پڑی ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل جمہوریہ سوڈان کو یہ خاص مسئلہ بھی درپیش ہے کہ بجہ قبائل کو سوڈانی ریاست میں پورے طور پر کس طرح شامل کیا جائے۔

بچہ سقا (وفات ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء) حبیب اللہ بچہ سقا، ایک تاجیک ڈاکو جو افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کے خلاف باغیوں کا سرغنہ تھا۔ امان اللہ نے ۱۹۲۶ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس نے یورپ کے ممالک میں سیاحت کی غرض سے دورہ کیا۔ واپس وطن آ کر اس نے نئے دستور اساسی کے نفاذ اور معاشرتی اور تعلیمی اصلاحات کا نفاذ کیا تو افغانستان کے عوام ان جدید اصلاحات

Marfat.com

کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نیز امان اللہ کا ماسکو جانا برطانوی حکومت کو ناگوار گزرا۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے ہندوستان کے سرحدی قبائل میں شورش برپا کرادی اور اس حکومت کی شہ پر ایک تاجیک ڈاکو بچہ سقا نے دامن کوہستان سے پیش قدمی کر کے جنوری ۱۹۲۹ء میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ اور حبیب اللہ کا لقب اختیار کر کے بادشاہ بن گیا۔

امان اللہ خان نے کابل سے بھاگ کر قندھار میں پناہ لی اور وہاں اس نے دوبارہ کابل حاصل کرنے کی کوشش کی جسے بچہ سقا کے حامیوں نے ناکام بنا دیا۔ سارے ملک میں بدنظمی کے سیلاب امڈ رہے ہوئے تھے۔ سپہ سالار محمد نادر خان فرانس میں علاج کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ ملک کی یہ حالت دیکھ کر وہ کمزوری ہی کی حالت میں واپس آیا اور حکومت کا آخری فیصلہ قومی نمائندوں کے سپرد کیا۔ بچہ سقا کو بھی یہی پیش کش کی گئی کہ اپنا معاملہ فوجی نمائندوں کے حوالے کر دے۔ لیکن وہ اس بات پر راضی نہ ہوا۔ بالآخر کئی ماہ کی مسلسل ناکامی کے بعد نادر خان نے ایک لشکر تیار کیا۔ جس نے نادر خان کے بھائیوں کی سرکردگی میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ ۱۲ جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ/۱۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو قومی نمائندوں نے محمد نادر خان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ حبیب اللہ (بچہ سقا) نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ —

بحر العلوم (۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء – ۱۷۳۲ء – ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/۱۳ اگست ۱۸۱۰ء) ملا عبدالعلی محمد بن نظام الدین، انیسویں صدی کے ایک بلند پایہ عالم دین، بحر العلوم لقب تھا۔ ان کا سلسلہ نسب خواجہ عبداللہ انصاری ہروی سے ملتا ہے۔ فرنگی محل میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ اپنے والد کی زیر نگرانی سترہ سال کی عمر میں تمام علوم اسلامی پر عبور حاصل کر لیا۔ والد کی وفات کے بعد ملا کمال الدین (جو ان کے والد کے شاگرد تھے) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ بعد میں لکھنؤ میں ایک مدرس اور مصنف کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا۔ لکھنؤ سے شاہجہان پور چلے گئے اور یہاں بیس سال مقیم رہے۔ اس کے بعد رام پور میں مقیم ہوئے اور چار سال بعد بہار اور پھر وہاں سے مدراس چلے گئے۔ مدراس جاتے وقت ان کے ساتھ چھ سو طالب علم تھے۔ یہاں پہنچنے پر والا جاہ نے ان کے اور تلامذہ کے لیے ایک عالیشان مدرسہ بنوایا۔ بحر العلوم کا لقب مدراس ہی میں والا جاہ نے عطا کیا تھا۔ بعض کے نزدیک انہیں یہ لقب شاہ ولی اللہ نے دیا تھا۔

مولانا عبدالعلی نے دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ علوم باطنیہ کی بھی اپنے والد محترم سے آشنائی حاصل کی تھی۔ تصوف میں وہ ابن العربی کے مسلک سے تعلق رکھتے تھے ان کی سخاوت، جرأت، ترک لذات اور زہد کی لوگ بڑی تعریف کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ تعلیم و تعلّم اور تصنیف و تالیف میں گذارا۔ بقول مولانا عبدالحی لکھنوی "ہندوستان کے اندر آئندہ زمانہ میں ان کا ثانی پیدا ہونا محال ہے"۔ انہوں نے عربی زبان اور فارسی زبان میں بہت سی اعلیٰ پایہ کی کتب تصنیف کیں۔

مولانا نے مدراس ہی میں وفات پائی اور شہر کی مسجد والا جاہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

ان کی تصانیف میں ۱۔ شرح سلّم العلوم۔ ۲۔ التعلیقات علی شرح سلم العلوم۔ ۳۔ الحاشیہ علی الحاشیہ الزاھدیۃ الجلالیہ۔ ۴۔ الحاشیۃ الحاشیہ الزاھدیۃ القطبیۃ۔ ۵۔ الحاشیہ علی الصدرا۔ ۶۔ التعلیقات علی الافق المبین۔ ۷۔ العجالۃ النافعہ۔ ۸۔ الحاشیہ الزاھدیۃ علی الامور العامۃ۔ ۹۔ الحاشیہ علی شرح العقائد الدوانی۔ ۱۰۔ شرح مقامات المبادی۔ ۱۱۔ الحاشیہ علی الشرح المواقف۔ ۱۲۔ فواتح الرحموت۔ ۱۳۔ رسالۃ الارکان الاربعہ ۱۴۔ تنویر المنار شرح المنار ۱۵۔ تکملہ شرح التحریر۔ ۱۶۔ رسالۃ تقسیم الحدیث۔ ۱۷۔ شرح المجسطی۔ ۱۸۔ رسالۃ التوحید الکافیۃ لصوفی المتقی۔ ۱۹۔ ہدایۃ الصرف بہت مشہور ہیں۔ —

بحرق (۸۶۹ھ/۱۴۶۵ء – ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک جنوبی عرب کے ایک عالم دین اور صوفی، حضرموت میں پیدا ہوئے۔ تعلیم عدن اور زبید میں پائی۔ کچھ عرصہ شحر کے قاضی رہے۔ بعد میں عدن میں مقیم ہو گئے اور حاکم امیر مرجان کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ اپنے مربی کی وفات کے بعد ہندوستان چلے گئے اور گجرات کے سلطان کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ بعد میں دربار سے مصاحبت ختم کر لی اس کے تھوڑے دنوں بعد احمد آباد میں وفات پائی۔

تصانیف ۱۔ مواھب القدوس فی مناقب ابن العیدروس۔ ۲۔ حلیۃ البنات والبنین فیما یحتاج الیہ من امر الدین۔ ۳۔ عقد الدار فی الایمان بالقضاء والقدر۔ ۴۔ العقد الثمین فی ابطال القول بالتقبیح والتحسین۔ ۵۔ التبصرۃ الاحمدیۃ فی السیرۃ النبویۃ ۶۔ ترتیب السلوک الی ملک الملوک۔ ۷۔ العروۃ الوثقیٰ مع شرح الحدیقۃ الانیقۃ۔

تلخیصات میں الاسرار النبویہ۔ ۲۔ ذخیرۃ الاخوان۔ ۳۔ متعۃ الاسماع اس کے علاوہ کتاب الاوائل، المقاصد الحسنہ، الترغیب والترھیب کی بھی تلخیص کی ہے۔ مختلف شروح کی تلخیص میں ۱۔ العقیدۃ الشافیہ۔ ۲۔ تحفۃ الاحباب وطرفۃ الاصحاب۔ ۳۔ نشر العلم فی شرح لامیۃ العجم ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے حساب۔ علم الہیئت اور طب پر بھی چھوٹے چھوٹے رسائل تصنیف کیے ہیں۔ —

بحرین خلیج فارس کی ایک ریاست، جو جزیرہ نمائے قطر اور سعودی عرب کے درمیان ایک مجموعہ الجزائر پر مشتمل ہے۔ اس کا کل رقبہ ۲۵۵ مربع میل، آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق بائیس ہزار ہے۔

بحرین کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں خاص معلومات نہیں ملتیں۔ تقریباً پچاس سال سے محققین اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔ قدیم کھدائی کرنے والوں کے خیال کے مطابق یہاں موجود آثار قدیمہ فنیقیوں کے زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ بعض محققین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ بحرین وہی مقام ہے جسے عراق کی میخی دستاویزات میں دلمن بتایا گیا ہے۔ یونانی اور لاطینی ماخذوں سے بھی اس کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ عرب کی عوامی روایات میں بحرین کے کچھ گم شدہ عرب قبائل کا ذکر ملتا ہے۔ آنحضورؐ کے زمانہ میں بحرین کی آبادی میں بنو عدنان کے قبیلہ عبدالقیس کی اکثریت تھی۔ آنحضورؐ نے جب العلاء بن الحضرمی کو مشرق کی طرف مہم جوئی کے لیے بھیجا تو بحرین ایک ایرانی حاکم کے ماتحت تھا۔ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں خارجیوں نے نجدہ بن عامر اور ابو فدیک کی زیر قیادت بحرین میں اپنی حکومت کا ایک مرکز قائم کیا۔ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں عباسیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ جب قرامطہ نے سر اٹھایا تو انہیں بحرین میں اپنے جاں نثار مل گئے۔ ۳۱۷ھ/۹۳۰ء میں وہ حجر اسود مکہ معظمہ سے بحرین لے آئے جو تقریباً بیس سال تک وہاں پڑا رہا۔ چنانچہ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء تک بحرین انہی کے قبضہ میں رہا۔ اور پھر ابو البہلول العوام بن الزجاج نے عباسی خلیفہ کے نام پر دوبارہ صحیح العقیدہ اسلامی حکومت قائم کر کے قرامطہ کو شکست دی۔ ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء

Marfat.com

میں بحرین اور قطیف پر فارس کے سلغری اتابک ابوبکر بن سعد کی فوج نے قبضہ کر لیا۔ ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں عامر ربیعہ کی ایک شاخ بنی عصفور کے تحت بحرین آزاد ہوگیا۔

۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں یہ جزیرہ ہرمز کے حکمران کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں عامر ربیعہ نے بحرین کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں پرتگالی بحرین پہنچے اور اس کے کچھ عرصہ بعد بحرین پر پرتگالیوں کا تسلط ہوگیا۔ اور تقریباً اسی سال تک وہ اس پر قابض رہے۔ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں شاہ عباس اوّل کے عہد میں بحرین ایرانیوں کے قبضہ میں آگیا اور وہ اس پر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک حکومت کرتے رہے۔ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں احمد بن خلیفہ نے نصر آل کو بحرین سے نکال دیا اور خاندان خلیفہ کی حکومت وہاں قائم کر دی آج تک یہی حکومت قائم ہے۔ موتیوں کی قیمتی تجارت پر مسقط والوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ بحرین والوں نے ان سے تجارتی مقابلہ شروع کر دیا۔ اسی بنا پر مسقط کے ماضی حکمران بحرین پر حملہ آور ہوتے رہے۔ انہوں نے پہلا حملہ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں کیا آل سعود نے آل خلیفہ کا ساتھ دیا۔ لیکن بحرین کے آل خلیفہ کی آل سعود سے زیادہ دیر تک نہ بن سکی بالآخر آل خلیفہ نے ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں حکومت برطانیہ سے معاہدے کیے جن کی رُو سے بحرین پوری طرح سے برطانیہ کی گود میں چلا گیا۔ ایران برطانیہ کے اس اقتدار کے خلاف جو اسے بحرین میں حاصل ہوگیا۔ تقریباً ایک صدی سے احتجاج کر رہا ہے اور بحرین کی سیادت کا دعوے دار ہے۔

بحرین میں مسلمان کل آبادی کا ننانوے فیصد ہیں۔ جن میں سنی اور شیعہ کی تعداد مساوی ہے۔ المنامہ اس کا دارالحکومت ہے جو شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس کے دوسرے جزیرے جن پر بحرین مشتمل ہے ستره۔ البنیہ صالح۔ ام الصبان۔ جدا اور ام نعسان ہیں۔ آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ اوسطاً سالانہ بارش سات سینٹی میٹر ہوتی ہے اس میں کئی بہنے والے چشمے ہیں۔ جن سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ کھجور۔ برسیم اور سبزیاں یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ ایک عرصہ قبل یہاں کی سب سے بڑی صنعت سمندر سے موتی نکالنا تھی اور تقریباً پانچ سو کشتیاں اس کام میں مصروف رہتی تھیں۔ ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں بین الاقوامی کساد بازاری اور جاپان کے مصنوعی موتیوں سے اس صنعت کو بہت بڑا دھچکا لگا۔

آج کل زمین سے تیل نکالنے کی صنعت نے بہت ترقی کی ہے۔ ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء سے تیل کی اوسط پیداوار روزانہ تین ہزار پیپے ہے۔ ماہی گیری بھی یہاں کے لوگوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔ یہاں کی چھوٹی صنعتوں میں کشتی سازی۔ کشتیوں کی مرمت۔ بادبان سازی اور جال بننا ہے۔ تجارت کو فروغ دینے کے لئے ۱۳۷۷ھ/۵۸-۱۹۵۷ء میں ایک آزاد بندرگاہ کھولی گئی ہے۔ المحرق میں ایک ہوائی اڈا ہے جہاں بین الاقوامی ہوائی کمپنیوں کے جہاز مقررہ وقت پر اترتے رہتے ہیں۔ ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء میں شیخ سلیمان نے سعودی عرب سے ایک دوستانہ معاہدے کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان سمندری حد متعین کر دی ہے۔ بحرین کا موجودہ سربراہ شیخ عیسیٰ بن سلیمان ہے جو ۲ نومبر ۱۹۶۱ء میں مسند نشین ہوا۔ حکومت کا نظم ونسق مختلف عہدے دار مجلس مشاورت کی مدد سے چلاتے ہیں۔ ملک میں وزارتی نظام رائج ہے۔ ۱۹۷۴ء میں یہاں کل ۱۱۲ سکول تھے۔ جن میں ۵۶ ہزار طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔

بحرین دو سمندر، ایک شیریں اور خوش ذائقہ، دوسرا تلخ اور کھاری۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر مندرجہ ذیل مقامات پر آیا ہے۔

"اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے۔ پینے میں خوشگوار اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے۔ مگر دونوں سے تم تر و تازہ گوشت حاصل کرتے ہو۔ پہننے کے لئے زینت کا سامان نکالتے ہو اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جاتی ہیں۔ تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔" (۱۲:۳۵)

"اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ایک رکاوٹ ہے جو انہیں خلط ملط ہونے سے روکے ہوئے ہے۔" (۵۳:۲۵)

"دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اے جن و انس تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔" (۵۵: ۱۹ تا ۲۲)

"اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کئے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے۔" (۶۱:۲۷)

"جب کہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا۔ جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں۔ ورنہ چلتا ہی رہوں گا۔" (۶۰:۱۸)

محمد ثانی نے فتح قسطنطنیہ کے بعد اپنے لئے "سلطان البرین والبحرین" کا لقب اختیار کیا تھا۔ آل عثمان کے بعض سلاطین نے بھی یہ لقب اختیار کیا ہے۔

بحوث، سورۃ:۔ قرآن پاک کی ایک سورۃ (دیکھئے "التوبہ، سورۃ")

بحیرا ایک عیسائی راہب اور عالم تورات و انجیل، جس سے آنحضورؐ کی ملاقات بعمر بارہ سال ہوئی۔ بچپن میں آنحضورؐ اپنے چچا ابوطالب کی معیت میں ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ملک شام کے سفر پر گئے۔ اس قافلے نے بصریٰ میں پڑاؤ کیا تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گرجا تھا جس میں بحیرا نامی ایک راہب رہتا تھا۔ روایت ہے کہ اس راہب نے ایک بادل دیکھا جو آنحضورؐ پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ نیز جس درخت کے نیچے آپؐ نے قیام کیا اس کی سرسبز و شاداب ٹہنیاں بھی آپؐ پر جھکی ہوئی تھیں۔ بحیرا نے یہ دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ یہ تو وہی نبی ہے جس کے بارے میں الہامی کتابوں میں خبر دی گئی ہے اس راہب نے تمام اہل قافلہ کی دعوت کا انتظام کیا۔ قافلے والے آنحضورؐ کو کم عمری کی وجہ سے سامان کے پاس چھوڑ کر راہب کے ہاں گئے۔ راہب نے پوچھا کہ تم لوگوں میں سے اور کوئی یہاں نہیں آیا۔ قافلے والوں نے جواب دیا صرف ایک بچہ سامان کے پاس چھوڑ کر آئے ہیں۔ راہب نے آنحضورؐ کو بلا کر دسترخوان پر بٹھایا۔ اس دوران میں وہ آپؐ کو بڑے غور و خوض سے دیکھتا رہا۔ جب سب لوگ کھانا کھا کر چل دیئے تو بحیرا راہب آپؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے مختلف سوالات کئے۔ اس نے آپؐ سے لات و عزیٰ کے بارے میں پوچھا جن سے آپؐ نے بیزاری کا اظہار کیا۔ قافلے والے یہ تمام باتیں دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ابوطالب نے بھی ڈر سا محسوس کیا اور راہب سے کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ راہب نے جواب دیا کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ اس کا باپ تو زندہ نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ابوطالب نے ساری تفصیل بتائی۔ راہب نے ابوطالب سے کہا کہ تم اب وطن واپس چلے جاؤ اور یہودیوں سے محتاط رہنا۔ نیز بتایا کہ یہ بچہ ایک دن بڑا عظیم الشان انسان بنے گا۔ اس کے حالات ہماری کتابوں میں درج

Marfat.com

ہیں۔ اس کے بعد ابوطالب آنحضور ؐ کو کسی سفر پہ لے کر نہیں گئے۔

یہ واقعہ تاریخ اور حدیث کی تمام کتابوں میں کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ درج ہے اور مورخین اور محدثین کی کثرت کے پیش نظر بحیرا راہب سے آنحضور ؐ کی ملاقات کا واقعہ تو درست ہے لیکن بعض تفصیلات میں اختلاف ہے۔ جن کی محدثین اور علماء نے مختلف وضاحتیں کر دی ہیں۔ بحیرا راہب کے بارے میں اس سے زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔

بحیرۃ چرے ہوئے کانوں والی اونٹنی یا بھیڑ اور بکری۔ جاہلیت کے اوہام میں سے ایک رسم۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے۔

بحیرۃ اور سائبۃ اور وصیلۃ اور حام میں سے کوئی ایک چیز بھی خدا نے نہیں ٹھہرائی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ اللہ پر جھوٹ کہہ کر افترا کرتے ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ سے محروم ہیں (۵: ۱۰۳)

(نیز دیکھیے "اوہام جاہلیہ")

بخارا روس میں جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ ازبکستان کا ایک شہر اور اسی نام کا صوبہ۔ اسلام سے قبل بخارا شہر کا ذکر شاذ ہی ملتا ہے۔ اسلامی ماخذ میں بخارا کے مقامی حکمران خاندان کو بخار خدات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جس سے وہاں کی صغدی زبان میں شاہ بخارا مراد ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں نے سب سے پہلے ۵۴ھ/۶۷۴ء میں عبیداللہ بن زیاد کی سپہ سالاری میں حملہ کیا۔ ۹۱ھ/۷۱۰ء میں قتیبہ بن مسلم اپنے دشمنوں کو شکست دے کر شاہ بخارا کے لقب سے تخت نشین ہوا اور بخارا میں اسلامی حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں۔ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں امرائے خراسان نے اپنا صدر مقام نیشاپور منتقل کر لیا۔ تو بخارا کا نظم و نسق ماوراالنہر کے باقی حصوں سے الگ ایک والی کی تحویل میں رہا جو طاہریوں کو براہ راست جواب دہ ہوتا تھا۔ اہل طاہر کے زوال کے بعد بخارا سامانیوں کی ماتحتی میں آ گیا اور نصر بن احمد سامانی (جو سمرقند پر حکومت کر رہا تھا۔) کا چھوٹا بھائی اسماعیل بخارا کا والی بن گیا۔ اور پھر اسکے بھائی نصر کی وفات پر ماوراالنہر کا سارا علاقہ بھی اسی کے قبضے میں آ گیا۔ اور خلیفہ نے بھی اسی کو امیر خراسان بنا دیا۔ یوں بخارا ایک بہت بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہو گیا اگرچہ بخارا کے رقبے میں کئی مرتبہ توسیع کی گئی لیکن وہ جب بھی نئے سرے سے تعمیر کیا گیا پرانے ہی محل وقوع پر تعمیر ہوا۔ بخارا کے جغرافیہ نویسوں نے تین بڑے حصے کئے ہیں۔ ۱۔ قلعہ۔ ۲۔ خاص شہر۔ ۳۔ مضافات شہر۔

قلعہ پرانے زمانے سے اسی جگہ واقع ہے جہاں اب ہے۔ بخارا خدات کا محل یہیں واقع تھا۔ اسی قلعے میں قدیم ترین جامع مسجد تھی جو قلعہ کے دروازہ پر واقع تھی۔ یہ قلعہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری/بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں کئی مرتبہ تباہ ہو کر نئے سرے سے تعمیر ہوا۔

عربوں کی فتح کے وقت پورا شہر صرف شہرستان پر مشتمل تھا۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں ارسلان خان نے شہرستان میں ایک نئی جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔ قلعے کے محل کے علاوہ ریگستان میں بھی ایک محل موجود تھا جو عربوں کے زمانے سے پہلے کا تھا۔ ابونصر نے بھی ایک محل اس جگہ بنوایا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر بہت گنجان آباد تھا۔ سامانیوں کے زوال کے بعد بخارا کی قدیم سیاسی اہمیت بھی بہت کم ہو گئی۔ لیکن اس انحطاط کے زمانہ میں بھی بخارا اسلامی علم و دانش کا مرکز رہا۔ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں علماء کے ایک خاندان نے آل برہان کے نام سے ایک دینی حکومت قائم کی۔ قطوان کی جنگ ۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء کے بعد بخارا پہ فراختائی فرمانروا سربراہ خاندان کے ذریعے حکومت کرتے رہے۔

۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں ایک عوامی بغاوت کی وجہ سے انہیں اس شہر سے نکلنا پڑا۔ اور یہ شہر محمد بن تکش خوارزم شاہ کے زیر حکومت آ گیا۔ ۶۱۶ھ/۱۲۲۰ء میں چنگیز خان نے بخارا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے حملے سے شہر تباہ و برباد ہو گیا۔ لیکن جلد ہی بخارا نے پھر سے اپنی پرانی شان و شوکت حاصل کر لی۔

۶۷۱ھ/۱۲۷۳ء میں ایران کے مغول ایلخان اباقا نے بخارا پر قبضہ کیا تو یہ شہر پھر تباہ و برباد ہو گیا۔ بعد میں دوبارہ تعمیر ہوا۔ ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء میں بخارا ایک بار پھر ایران کے مغولوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔

۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء کے اختتام پر بخارا پر ازبکوں کا قبضہ ہو گیا اور روس کے انقلاب تک اس پر انہیں کا قبضہ رہا۔ ان کی بدولت بخارا دوبارہ سیاسی و فکری زندگی کا مرکز بن گیا ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء تا ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء کا زمانہ اس شہر کے لئے ایک عظیم الشان زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں بخارا پر نادر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۸۵ء میں روسی ماوراالنہر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے اور امیر بخارا نے بھی کئی بار شکست کھانے کے بعد روسیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ یہاں کا آخری مسلمان فرمانروا امیر عالم تھا۔

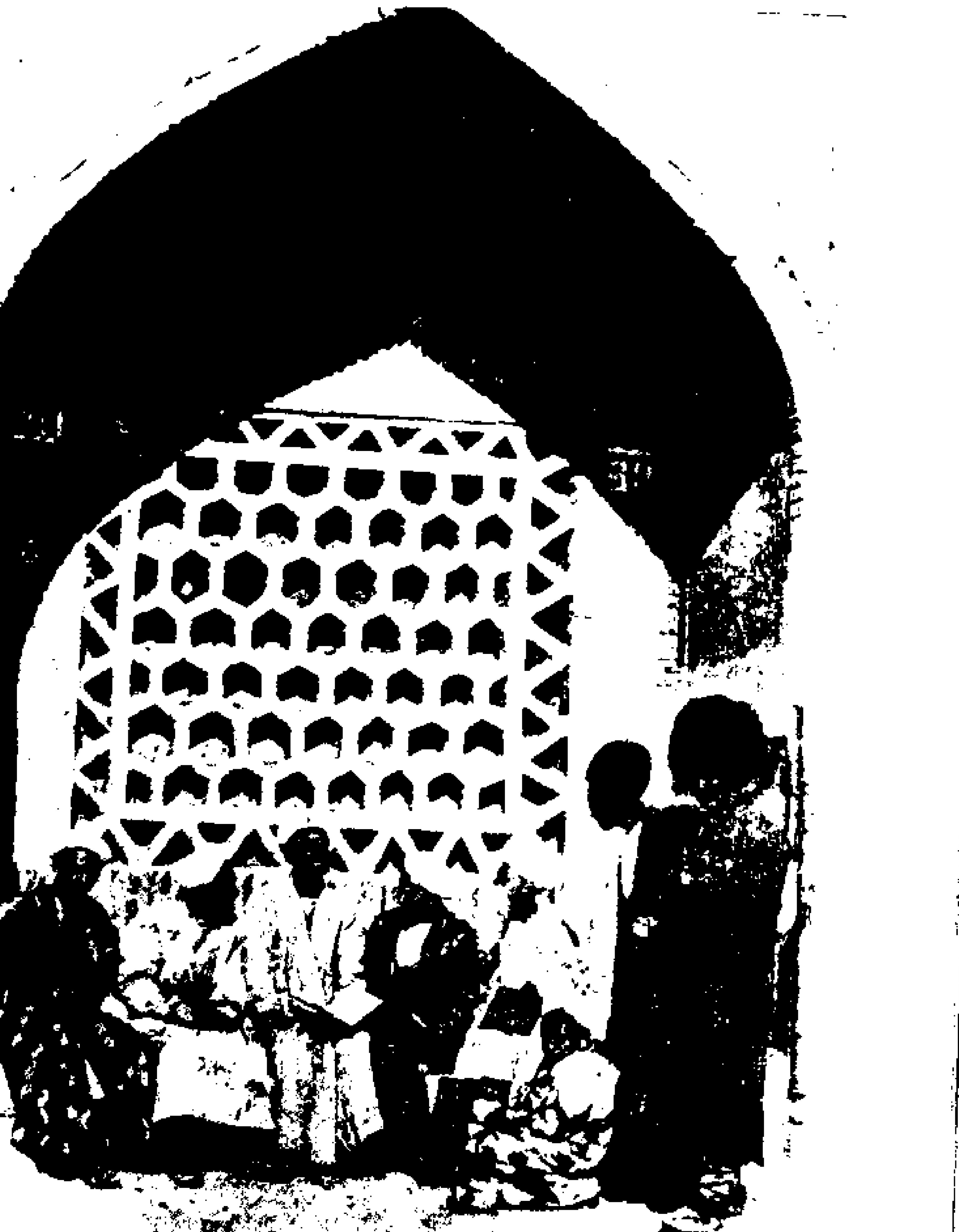

بخارا کی ایک مسجد کے زیر سایہ مسلمان محو تلاوت۔

Marfat.com

۱۹۱۰ء میں اپنے والد عبدالاحد کا جانشین بنا تھا۔ جب انقلاب روس برپا ہوا تو اس نے افغانستان میں پناہ لی۔ انقلاب کے بعد بخارا ازبکستان کا ایک صوبہ بن چکا ہے۔ جس کا صدر مقام تاشقند ہے۔

بخارا میں مساجد اور مسلمانوں کے مدرسوں کو تالے ڈال کر بند کر دیا گیا ہے۔ یہاں کی آبادی میں عرب، افغان اور یہودی ملے جلے ہیں۔

بخارسٹ جمہوریہ اشتراکیہ رومانیہ کا دارالحکومت، یہ دریائے ڈینیوب سے پچاس کیلومیٹر شمال میں ایک ندی پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۹۷۰ مربع میل اور آبادی ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کی رو سے سولہ لاکھ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہ شہر ولاشیا کا پایہ تخت بن گیا۔ ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء میں رادو نے جو سلطان محمد ثانی کی وساطت سے تخت پر بیٹھا تھا۔ اپنے آپ کو اس شہر میں ترکی کی قلعہ نشین فوج کی حفاظت میں خوب مستحکم کر لیا تھا۔ دو سو سال تک یہ شہر رومانوی حکمرانوں کے باب عالی کے ساتھ وابستہ رہا۔ سولہویں صدی کے خاتمے پر بخارسٹ پر سنان پاشا کا تسلط ہو گیا۔ ترکوں کے خلاف بغاوتوں، مختلف وباؤں اور آتش زدگیوں کی وجہ سے اس شہر کی تاریخ بڑی پر آشوب ہے۔ ۱۸۷۷ء میں جب معاہدہ برلن پر دستخط ہوئے تو اس شہر پر سے ترکی کی سیادت بالکل ختم ہو گئی۔

اس شہر کے ابتدائی حالات کے بارے میں معلومات بالکل مفقود ہیں۔ مختلف ماخذوں سے یونانی، ارمنی اور مقامی تاجروں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے قریب اس شہر میں بارہ ہزار کے قریب مکانات تھے۔ لیکن پندرہ سال بعد ان کی تعداد چھ ہزار رہ گئی۔ اولیا چلبی نے اس کے بارہ ہزار مکانوں اور ایک ہزار دکانوں کا ذکر کیا ہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں بخارسٹ کی کل آبادی پچاس ہزار تھی اور انیسویں صدی کے اوائل میں اس کی آبادی پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان کم و بیش ہوتی رہی۔

تین سو سال تک یہ شہر ترکی سلطنت میں شامل رہا اور اسی وجہ سے بخارسٹ نے ایک ایشیائی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ شہر یونانی زبان کی تعلیم کے لئے ایک اہم مرکز بن گیا۔ جب اس پر آسٹریلیا اور روس کا قبضہ ہوا تو یہاں مغربی اثرات پھیلنے لگے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ شہر رومانیہ کے سیاسی اتحاد کے لئے جدوجہد کا مرکز بن گیا۔ اور اسی جدوجہد کی بدولت مولداویا اور ولاشیا کا اتفاق ظہور میں آیا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ شہر رومانیہ کی نئی سلطنت کا دارالحکومت بنا۔ ۱۸۶۶ء میں شہزادہ چارلس کے تخت پر بیٹھنے کے بعد اس شہر میں وسیع پیمانے پر تعمیرات کا کام شروع ہوا اور اسے قلیل عرصے میں یورپ کے صدر مقامات میں ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس شہر کی فصیل جو گیارہ سال میں تعمیر ہوئی یورپ کی مضبوط ترین فصیل خیال کی جاتی تھی۔ یہ فصیل ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۶ء کے عرصہ میں تیار ہوئی لیکن ۱۹۱۶ء میں جرمن حملے کی تاب نہ لا سکی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بخارسٹ پر جرمن قابض ہو گئے۔

یہ شہر تعلیم، تجارت اور صنعت کا اہم مرکز ہے۔ ایک یونیورسٹی اور ایک قومی کتب خانہ ہے جو مشرقی علوم کی کتابوں کے لئے بہت مشہور ہے۔ پٹرول، عمارتی لکڑی اور زرعی پیداوار بالخصوص گندم اور مکئی کی ایک بڑی منڈی ہے۔ شراب کشید کرنے، پٹرول صاف کرنے، چمڑا رنگنے، تیل نکالنے اور مختلف مشینیں تیار کرنے کے بیسیوں کارخانے ہیں۔ شہر سے چار میل دور ایک ہوائی اڈا ہے۔ یہاں ہر سال حیات بعد کے لئے ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔

جدید بخارسٹ کا ایک منظر۔

جدید بخارسٹ میں بلند و بالا عمارتوں نے قدیم طرز تعمیر کی جگہ لے لی ہے۔ قدیم شاہی محل اگرچہ اب بھی موجود ہے، مگر اب وہاں رومانیہ کا عجائب گھر قائم کر دیا گیا ہے۔

بخاریؒ، امام محمد (۱۳؍شوال ۱۹۴ھ/۲۰؍جولائی ۸۱۰ء - یکم شوال ۲۵۶ھ/۳۱؍اگست ۸۷۰ء) ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم ایک بہت بڑے عالم اور امام حدیث بخارا میں پیدا ہوئے۔ والد حدیث کے ثقہ راویوں میں سے تھے۔ امام بخاری ابھی بچے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کی زیر نگرانی پرورش پائی جو بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ بچپن میں آنکھوں کی بینائی ضائع ہو گئی تھی۔ لیکن والدہ کی گریہ زاری اور دعاؤں کے سبب اللہ تعالےٰ نے بینائی کو دوبارہ بحال کر دیا۔ بچپن ہی میں انھیں علم سے بہت زیادہ رغبت تھی۔ قدرت کی طرف سے حافظہ بھی کمال کا عطا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم بخارا کے جلیل القدر اساتذہ محمد بن سلام بیکندی، محمد بن یوسف بیکندی، عبداللہ بن محمد مسندی اور ابراہیم بن الاشعث سے حاصل کی۔ امام بخاری نے بلا کا حافظہ پایا تھا گیارہ برس کی عمر تھی کہ علامہ داخلی جیسے متبحر عالم اور محدث کو ایک سند پر ٹوک دیا اور تصحیح کرا دی۔ سولہ سال کی عمر میں عبداللہ بن المبارک اور وکیع ابن الجراح کی کتابوں کو حفظ کیا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں سولہ روز بغداد میں رہے اور اس مختصر عرصے میں پندرہ ہزار سے زائد احادیث حفظ کر لیں۔

Marfat.com

امام بخاری نے علم کے سلسلے میں شام، مصر اور جزیرہ کا دو مرتبہ اور بصرے کا چار مرتبہ سفر کیا۔ چھ سال مکہ میں سکونت اختیار کی۔ کوفے اور بغداد میں تو کثرت سے آنا جانا رہا۔ انھوں نے ایک ہزار سے زائد شیوخ سے حدیث لکھی۔ انھیں چھ لاکھ احادیث یاد تھیں۔

امام بخاریؒ نے روسی ترکستان کے ایک شہر خرتنگ میں باسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اُنکے علم و فضل کا اعتراف صرف متاخرین ہی کو نہیں بلکہ ان کے دور کے اساتذہ اور شیوخ نے بھی انھیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کی ذہانت اور حافظے کا اعتراف علوم و فنون حدیث کے ماہرین نے بھی کیا ہے۔

امام بخاریؒ امام مجتہد کے بلند مقام پر فائز تھے اور بقول ابن حجر عسقلانیؒ، "فقہ حدیث میں دنیا کے امام ہیں۔ انہیں علل حدیث میں بڑی مہارت تھی۔ دوسرے سے احادیث لینے میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ ان کے بارے میں روایت ہے، انہیں معلوم ہوا کہ ایک دور دراز مقام پر ایک شخص آنحضورؐ کی احادیث بیان کرتا ہے۔ چنانچہ کئی کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ شخص خالی توبڑا ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے بھاگے ہوئے جانور کو بلا رہا ہے امام بخاریؒ اس سے ملے بغیر دل میں یہ سوچ کر واپس چلے آئے کہ جو شخص ایک جانور کو دھوکہ دے سکتا ہے وہ مجھے بھی دھوکہ دے سکتا ہے۔

امام بخاریؒ کی تصانیف میں صحیح بخاری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تصانیف التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر، کتاب الضعفاء الصغیر، الادب المفرد، جزء رفع الیدین، جزء قراۃ، التاریخ الاوسط، کتاب الاشربہ، اسامی الصحابہ، برالوالدین، التفسیر الکبیر، الجامع الکبیر، خلق افعال العباد، کتاب العلل، فقایہ الصحابہ والتابعین، کتاب المسند الکبیر، کتاب الوحدان، کتاب المبسوط، کتاب الہبہ، سنن الفقہاء شیخہ، کتاب الفوائد ہیں۔ (نیز دیکھیے "بخاری شریف")

"بخاری شریف" احادیث کا ایک مجموعہ جو امام محمد بن اسماعیل البخاری کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا نام "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ و ایامہ" ہے۔ اسے جامع یا الجامع اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ہر قسم کے مسائل کی احادیث مثلاً عقائد، احکام، آداب، تفسیر، تاریخ، سیر، شمائل، فتن، علامات قیامت، مناقب و مثالب درج ہیں۔

امام بخاری نے جب اپنے سے پہلے محدثین کے احادیث کے مجموعوں کو پڑھا تو انھوں نے محسوس کیا کہ عام آدمی کے لیے ان سے استفادہ کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ ان کتابوں میں ہر قسم کی ضعیف، شاذ، منکر بلکہ بسا اوقات موضوع روایات بھی درج ہو گئی تھیں چنانچہ امام بخاری اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک مجموعہ ایسا ہونا چاہیے جو صرف صحیح احادیث پر مشتمل ہو۔ ان کے اس عزم کو ان کے استاد اسحاق بن راہویہ نے اور بھی مضبوط کر دیا۔ انہی دنوں امام بخاری نے ایک خواب بھی دیکھا کہ وہ آنحضورؐ کو پنکھا جھل رہے ہیں۔ علماء نے اس کی تعبیر یہ کی کہ امام بخاری آنحضورؐ کی طرف غلط طور پر منسوب روایات کو دور فرمائیں گے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایک روز امام بخاری اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھے۔ وہاں ذکر ہوا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر اللہ تعالے کسی شخص کو یہ توفیق دے کہ وہ سنن میں ایک ایسا مختصر تیار کرے جس میں فقط اعلیٰ درجے کی صحیح احادیث درج ہوں تاکہ عمل کرنے والا بلا خوف و تردد اور مجتہدین کی طرف مراجعت کئے بغیر اس پر عمل پیرا ہو سکے۔ امام بخاری کے دل میں استاد کی یہ بات جاگزیں ہوئی اور سولہ سال کی محنت شاقہ کے بعد چھ لاکھ احادیث کے اس ذخیرے میں سے جو ان کے پاس موجود تھا، یہ کتاب تالیف کی اور اس میں صحیح ترین احادیث پر اکتفا کیا۔"

امام بخاریؒ خود فرماتے ہیں: میں نے اس کتاب کو کعبے میں بیٹھ کر مرتب کیا۔ ہر حدیث کے لکھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتا اور استخارہ کرتا۔ جب یقین ہو جاتا تو میں اسے "الجامع الصحیح" میں درج کر لیتا۔ پھر جب حدیثوں کو ان کے مضمون کے مطابق ترتیب دینے کا ارادہ کیا تو مدینہ منورہ میں قبر مبارک اور منبر رسولؐ کے درمیانی مقام میں اس اہم کام کو سرانجام دیا۔

امام بخاریؒ نے "جامع" کے مکمل ہونے پر اسے اپنے شیخ علی بن مدینی، احمد بن حنبل، ابن معین وغیرہم کی خدمت میں پیش کیا تو سب نے اس کی تحسین کی۔ اور اس کی صحت کی شہادت دی۔ البتہ صرف چار احادیث پر اختلاف کیا۔ وہ بھی تحقیق کے بعد امام بخاریؒ کی شرائط پر صحیح ہیں۔ متاخرین نے اس کتاب کی جملہ روایات پر صحت کا حکم لگایا ہے۔

امام بخاری کی حسن نیت اور انتھک کوشش کا نتیجہ تھا کہ یہ جامع اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی زندگی ہی میں اسے نوے ہزار آدمیوں نے امام بخاریؒ سے بلاواسطہ سنا۔

محدثین اور علمائے امت نے اس کتاب کو قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامیہ میں صحیح ترین کا لقب دیا ہے۔ صحاح ستہ میں بخاری شریف کا پہلا نمبر ہے اس کے بارے میں دارقطنی کا قول ہے "اصح الکتاب بعد کتاب اللہ الباری الجامع الصحیح البخاری"۔

وقت شدت خوف دشمن، سختی، مرض، قحط سالی اور دیگر بلاؤں میں اس کتاب کا پڑھنا تریاق کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ امت اسلامیہ میں ختم قرآن کی طرح ختم بخاری شریف کا بھی رواج ہے۔

بخاری شریف کی ایک خاص خصوصیت اس کے عنوانات کے ابواب کی ایک صحیح انداز سے ترتیب ہے، جس سے امام بخاری کی وسعت علمی اور مہارت فقہ کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ہر باب کا آغاز قرآنی آیات سے کرتے ہیں اور ان سے فقہی احکام کو مستنبط کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ صحیح بخاری کی مرویات کی کل تعداد مع مکررات، تعلیقات اور متابعات کو شامل کر کے ۹۰۸۲ ہے صحیح بخاری میں موصول احادیث بلا تکرار ۲۶۰۲ ہیں عجیب بات ہے کہ ابواب کی تعداد اس سے زیادہ یعنی ۳۴۵۰ ہے۔

اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اسکی ان شروح تعلیقات اور حواشی سے ہو سکتا ہے۔ جو ہر دور کے علماء اس کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے لکھتے رہے ہیں اور تیسری صدی ہجری سے لے کر آج تک اس کتاب پر علماء کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ بخاری شریف کی شروح و حواشی کی تعداد دو سو سے زائد ہے علمائے حدیث نے حافظ ابن حجر العسقلانی کی شرح "فتح الباری" کو بہترین شرح قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری کے مختلف زبانوں میں

Marfat.com

ترجمے کیے گئے ہیں۔ اردو زبان میں بخاری شریف کے ترجمے اور شروح میں مولوی وحید الزمان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کتاب کے افادی پہلو کے پیش نظر علماء نے اس کے کئی مفتاح مرتب کیے ہیں۔ اس کتاب کے موجودہ دور میں کئی مختصر نسخے بھی شائع کیے گئے ہیں۔

بخت خان (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء-۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) محمد بخش ابن عبداللہ ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں آزاد فوجوں کا سپہ سالار اعظم، بخت بلند کا خطاب بہادر شاہ ظفر نے عنایت کیا۔ سلطان پور (اودھ) میں پیدا ہوا۔ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں "آٹھویں پیدل توپ خانہ" فوج میں بطور صوبیدار شامل ہوا۔ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۲ء جنگ افغانستان کے دوران میں نہایت شاندار کارنامے سرانجام دیے اور ان شاندار خدمات کے صلے میں بہت سے تمغوں اور امتیازات سے نوازا گیا۔ بخت خان نے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء میں بریلی کو برطانوی تسلط سے آزاد کرا کے خان بہادر خان کو "نواب ناظم" بنایا تو اسے بریگیڈیر کا عہدہ ملا۔ نیز ۲ جولائی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے اسے شاہی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنا کر فرزند کے خطاب سے نوازا۔ ۹ جولائی ۱۸۵۷ء میں دس ہزار فوج کے ساتھ انگریزوں کو شکست فاش دی۔ اسی کے ایما پر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ شائع کیا گیا۔ بعض خود غرض افراد اور شہزادوں کی وجہ سے جو بخت خان کے مخالف تھے، انگریزوں سے خفیہ طور پر گٹھ جوڑ کرنے پر شاہی فوجوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور آخر کار ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء میں بخت خان دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلا گیا۔ اس کے بعد بخت خان کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ملتیں۔ ایک روایت اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ وہ اودھ کے قصبۂ نواب گنج میں ۱۸۵۹ء میں مارا گیا۔

بخت خان تقریباً چالیس سال تک فوجی ملازم رہا۔ یورپی مورخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ ایک بلند قامت، نہایت ذہین اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔

بخت نصر بوکد نصر یا نبوکد ریزر، قدیم سلطنت بابل کے تیسرے خاندان کا دوسرا بادشاہ۔ باپ کا نام نبوپلاسر (بخت پلاسر) تھا۔ قدیم میخی خط میں اس کا نام "نیبوکدوری اُسر" مندرج ہے۔

بخت نصر کے باپ نے جدید بابل سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ ۶۲۵ قبل مسیح سے آشوریوں کی طرف سے بابل کا گورنر تھا۔ اسی سال اس نے آشوریوں کی اطاعت کا جوا گلے سے اتار پھینکنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۶۰۹ ق۔م میں اپنے بیٹے بخت نصر کے ساتھ مل کر مشترکہ حکومت شروع کر دی۔ ۶۰۵ ق۔م میں نبوپلاسر کی وفات کے بعد بخت نصر بلا شرکت غیرے بابل کا حکمران بن گیا۔

بخت نصر کلدانی نسل سے تھا۔ اس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی نسل سے تھا۔ اس کی شادی ماد کی ایک شہزادی امو ہیا سے ہوئی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے طاقت اور استحکام کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ بہت جلد وہ اردگرد کی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اسرائیل اور یہودہ کی سلطنتوں پر بھی زبردست حملے کیے۔ ۵۹۸ ق۔م میں اس نے یروشلم سمیت پوری سلطنت یہودہ پر قبضہ کر لیا۔ یہودہ کا بادشاہ صدقیاہ اس کا قیدی بن کر رہا۔ ۵۸۷ ق۔م میں بخت نصر نے ایک اور حملہ کیا اور یہودیہ کے تمام شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح سے پیوند خاک کیا کہ ان کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو وہ گرفتار کر کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ ایک روایت کے مطابق اٹھارہ ہزار قیدی بخت نصر کی قید میں رہے۔

بخت نصر نے ۵۶۱ ق۔م میں وفات پائی۔ بائیبل میں اس کا نام تقریباً ایک سو مرتبہ آیا ہے۔ اس سے ایک تقویم کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ بائیبل میں کتب تواریخ میں بخت نصر کی فتح یروشلم کا ذکر اس طرح سے کیا گیا ہے۔

"یہویقیم پچیس برس کا تھا، جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے گیارہ برس یروشلم میں سلطنت کی اور اس نے وہی کیا، جو خداوند اس کے خدا کی نظر میں برا تھا۔ اس پر شاہ بابل نبوکد نضر نے چڑھائی کی اور اسے بابل لے جانے کے لیے اس کے بیڑیاں ڈالیں اور نبوکد نضر خداوند کے گھر کے کچھ ظروف بھی بابل کو لے گیا اور انہیں بابل میں اپنے مندر میں رکھا۔

یہویاکین آٹھ برس کا تھا۔ جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے تین مہینے دس دن یروشلم میں سلطنت کی اور اس نے وہی کیا، جو خداوند کی نظر میں برا تھا اور نئے سال کے شروع ہوتے ہی نبوکد نضر بادشاہ نے اسے خداوند کے گھر کے نفیس برتنوں کے ساتھ بابل کو بلوا لیا اور اس کے بھائی صدقیاہ کو یہوداہ اور یروشلم کا بادشاہ بنایا۔

صدقیاہ اکیس برس کا تھا، جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے وہی کیا۔ جو خداوند اس کے خدا کی نظر میں برا تھا۔ اور اس نے یرمیاہ نبی کے حضور جس نے خداوند کے منہ کی باتیں اس سے کہیں، عاجزی نہ کی۔ اور وہ اس نبوکد نضر بادشاہ سے بھی، جس نے اسے خدا کی قسم کھلائی تھی، بغاوت کی اور وہ گردن کش ہو گیا۔ اس نے اپنا دل ایسا سخت کر لیا تھا کہ خداوند اسرائیل کے خدا کی طرف رجوع نہ لایا۔

————— انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں کی ہنسی اڑائی۔ یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ وہ کسدیوں کے بادشاہ (نبوکد نضر) کو ان پر چڑھا لایا۔ جس نے ان کے مقدس گھر میں ان کے جوانوں مردوں، کنواریوں اور بڈھوں کو تلوار سے قتل کیا ————— اور جو تلوار سے بچے، وہ ان کو بابل لے گیا اور وہاں وہ اس کے اور اس کے بیٹوں کے غلام رہے۔ جب تک کہ فارس کی سلطنت شروع نہ ہوئی۔" (تواریخ دوم ۳۶: ۵ تا ۲۱)۔ قرآن مجید میں اس واقعے کا ذکر یوں آیا ہے:۔

"آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے، جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے یہ ایک وعدہ تھا، جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔" (۱۷: ۵)

مولانا مودودی "تفہیم القرآن" میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہولناک تباہی ہے جو آشوریوں اور اہل بابل کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر نازل ہوئی۔ حضرت یسعیاہؑ اور حضرت یرمیاہ کی کوششوں کے باوجود یہ لوگ بت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ان پر حملہ کر دیا۔

بخت نصر ایک اچھا منتظم، بہترین سپہ سالار، خوفناک جنگجو اور قابل حکمران تھا

Marfat.com

اس نے ارد گرد کی تمام سلطنتوں پر اپنی طاقت کی دھاک بٹھادی تھی۔ بابل کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اسے خوب صورت بنانے کی طرف بھی توجہ دی تھی۔ اس کا انتظام سلطنت دور جدید کے کسی بھی نظام کا مقابلہ کرسکتا ہے آبپاشی اور زراعت کے لئے نہریں کھدوانے کا آغاز اسی سے ہوا تھا۔

بختیار کاکیؒ (۵۸۲ھ/۱۱۰۶ء - ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) قطب الدین بختیار کاکی۔ والد کا نام سید کمال الدین۔ مشہور صوفی بزرگ۔ حسینی سادات میں سے تھے اوش میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ دو سال کی عمر تھی کہ والد وفات پاگئے والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ پانچ سال کی عمر میں مولانا ابوحفص سے جو ایک نہایت ہی صالح بزرگ تھے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ چنانچہ انہوں نے ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی علوم اور سلوک کے آداب و طریق کی بھی تعلیم حاصل کی۔ اور بچپن ہی سے ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہنے لگے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ جب اوش میں تشریف لائے تو ان سے بیعت کی اور ابھی سترہ سال کے تھے کہ خرقہ خلافت بھی حاصل کرلیا۔

حضرت بختیار کاکیؒ نے اپنے ملفوظات میں اپنے مختلف سفروں اور مشائخ کی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ غزنی کے سفر میں آپ نے ایک صاحب نظر بزرگ سے ملاقات کی۔ پھر بغداد تشریف لے گئے جہاں شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ اوحدالدین کرمانی، خواجہ ابو یوسف چشتی، ابو اللیث سمرقندی۔ شیخ برہان الدین چشتیؒ اور شیخ محمد اصفہانی سے شرف صحبت نصیب ہوا۔ بغداد میں معلوم ہوا کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی ہندوستان کا قصد کیا۔ اور اپنے پیر و مرشد کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے پھر مرشد نے اجمیر سے دہلی جانے کا حکم دیا۔ دوران سفر ملتان میں مشہور بزرگ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی سے ملاقات کی۔ دہلی پہنچنے پر سلطان شمس الدین التمش نے استقبال کیا۔ جن دنوں آپ کا قیام کیلوکھری میں رہا۔ سلطان ہفتے میں دو مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ سلطان کے بار بار عرض کرنے پر شہر دہلی کے اندر قیام کرنے پر رضامند ہوگئے اور ملک عین الدین کی مسجد میں مقیم ہوئے۔ اہل دہلی کی خاص محبت اور انسیت کی وجہ سے تمام عمر یہیں بسر کی۔

حضرت بختیار کاکیؒ میں استغنا کی شان بے انتہا تھی۔ اگرچہ بادشاہ وقت ان کا ارادتمند تھا لیکن اس کے باوجود ان کے گھر میں اکثر فاقہ رہتا۔ جب کئی کئی فاقوں کی نوبت آجاتی تو ان کی حرم ایک پڑوسن سے خورد و نوش کا سامان ادھار لے لیتی تھیں ایک روز اس پڑوسن نے طنز سے کہا کہ اگر میں تمہیں قرض نہ دوں تو تمہارے بچے بھوکوں مرجائیں جب آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے پڑوسن سے قرض لینے کو منع کردیا اور کہا کہ حجرہ کے طاق میں سے جس قدر کاک کی ضرورت ہو نکال لیا کرو۔ اور بچوں کو کھلا دیا کرو۔ اسی وجہ سے ان کا لقب کاکی مشہور ہوا۔

آپ کو سماع (قوالی) سے بے انتہا رغبت تھی۔ اکثر سماع کی مجلسیں منعقد کرایا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں ایک شعر سے آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور آپ سات روز بے ہوش رہے۔ نماز کے وقت ہوش آجاتا اور بعد میں پھر وہی کیفیت طاری ہوجاتی۔ اسی طرح ایک اور محفل سماع میں قوالوں نے جب یہ شعر پڑھا ؎

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جان دیگر است

تو آپ پر وجد طاری ہوگیا اور تین روز تک یہی حالت رہی بالآخر اسی عالم میں وفات پاگئے نماز جنازہ سلطان التمش نے پڑھائی۔

آپ کے نام سے ایک دیوان اور ایک کتاب "فوائد السالکین" مطبوعہ ہے۔ اس کتاب میں آپ نے تصوف اور سلوک کی تعلیمات مدرج کی ہیں۔

ان کے خلفاء میں شیخ فریدالدین گنج شکر۔ سید بدرالدین غزنوی۔ شیخ برہان الدین بلخی۔ شیخ ضیاءالدین رومی۔ شمس الدین التمش۔ شیخ بابا سنجری بحر صیا۔ مولانا فخرالدین صحرائی۔ شیخ محمود بہاری۔ مولانا محمد باجزی۔ سلطان نصیرالدین غازی۔ قاضی حمیدالدین ناگوری۔ مولانا شیخ محمد ہیں۔

ان کا مزار جامع مسجد دہلی سے گیارہ میل دور پرانی دہلی میں قصبہ مہرولی میں واقع ہے۔ یہ قصبہ عام طور پر قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے یہاں بہت سے ولی اللہ مدفون ہیں۔ مزار کھلا ہوا، کچا اور بہت وسیع ہے جس کے چاروں طرف سنگ کا جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہے۔

بخل کنجوسی۔ تنگ دلی۔ اسراف کی ضد اپنے حاصل کئے ہوئے مال کو وہاں خرچ کرنے سے روکنا جہاں اسے روکنا نہیں چاہیے۔ بقول مولانا مودودیؒ "بخل سے مراد وہ بخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیہ جمع کرکے رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے نہ اپنے بال بچوں پر بلکہ بخل سے مراد راہ خدا میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صرف نہ کرنا ہے۔ اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر اپنے عیش و آرام پر اپنی دل چسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر لٹاتا ہے مگر کسی نیک کام کے لئے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا۔ یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام و نمود، حکام رسی یا کسی اور قسم کی کتنی منفعت حاصل ہوگی۔"

بخل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان خود اپنی چیزوں کو روک لے اور انہیں ضرورت کی جگہ پر صرف نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ اوروں کو بھی ایسا کرنے کی تلقین کرے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"اور ایسے لوگ بھی اللہ کو پسند نہیں ہیں جو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں۔ ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۴:۳۷)

مندرجہ بالا آیت میں بخل کو کفر نعمت کہا گیا ہے۔

اسلام جو تعلیمات اس بارے میں اپنے پیروکاروں کو دیتا ہے ان کی روشنی میں انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنی جائز ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اسے رفاہ عامہ کے لیے نکھلا رکھے۔

"پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں کہو! جو کچھ تمہاری ضروریات سے زیادہ ہو۔" (۲:۲۱۹) لیکن بخل اس تعلیم کی ضد ہے۔

انسان اپنے بخل ہی کی وجہ سے دوسروں کی ضروریات اور تکالیف کا کوئی احساس نہیں کرتا۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دولت کسی طرح بھی صرف نہ ہو اور اگر ہو تو صرف اسی کی اپنی ذات پر۔ اس طرح بخیلوں کی وجہ سے دولت ایک خوشحال معاشرے میں ممد و معاون بننے کی بجائے ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے۔

"دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں۔ انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے

Marfat.com

وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو" (۹: ۳۵)

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا گیا "جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے۔ اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے نہیں یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ (۳: ۱۸۰)

بخل سے رذالت۔ خیانت۔ بے مروتی۔ بے رحمی۔ بدسلوکی۔ خود غرضی۔ تنگ نظری، کم ہمتی۔ حرص اور طمع وغیرہ قسم کی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں بخل اور بخیل کی بڑے سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے: "جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو چکنا چور کرنے والی جگہ پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی۔ (اس حالت میں کہ وہ) اونچے اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے)۔ (۱۰۴: ۱ تا ۹)

نیز "جو شخص یتیم کو دھتکارتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا وہ دین کو جھٹلاتا ہے۔" (۱۰۷: ۱ تا ۳)

نیز "اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ اور فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اکساتے ہیں۔ (۵۷: ۲۳، ۲۴)

بخیل کی سب سے بڑی مثال قرآن مجید میں قارون کی دی گئی ہے جو بخل کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

"یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰؑ کی قوم کا ایک شخص تھا پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پھول مت! اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو اس نے کہا، یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔ کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے۔ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔ ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے "کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے یہ تو بڑا نصیبے والا ہے۔" مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے "افسوس تمہارے حال پر اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔"

آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔ (۲۸: ۷۶ تا ۸۱)

بخل کی شدت ایمان کو بھی ضائع کر کے رکھ دیتی ہے اور اسی بخل کی وجہ سے دلوں میں نفاق پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

"جب انہیں اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا تو اس میں بخل سے کام لیا اور اعراض کرتے ہوئے پھر گئے۔ سو اللہ نے انہیں بدلہ دیا کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا۔ (۹: ۷۶، ۷۷)

سورۃ محمد میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جو قوم بخل سے کام لیتی ہے اس کی بساط زندگی لپیٹ دی جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ (۴۷: ۳۸)

احادیث میں بھی بخل کی مذمت کی گئی ہے۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ سچے مومن میں دو خصلتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بدخلقی (ترمذی)

ایک دوسری حدیث میں بخل کو سب سے بڑی بیماری کہا گیا ہے۔ (بخاری)

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ بخیل جنت کا وارث نہیں ہو سکتا (احمد، المسند)

آنحضورؐ سے جو دعائیں منقول ہیں ان میں سے ایک دعا یہ بھی ہے کہ اے اللہ! مجھے بخیل ہونے سے بچا۔ (بخاری)

بَدَاء

(۱) ظاہر ہونا، وجود میں آنا۔ اصطلاح میں کسی امر کے سلسلے میں نئی یا دوسری رائے کا وجود میں آنا۔ الجوہری کے بقول پہلی رائے کو بدل کر نئی رائے قائم کرنا۔ الفراء نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "پہلی رائے یا ارادے سے مختلف دوسری رائے یا ارادہ ظاہر ہونا۔ عربوں میں ایسا شخص جس کے دماغ میں بہت سی آراء پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ محتاط اور دور اندیش سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کو "ذو بدوات" کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کا تقدیر کے مسئلے سے بہت گہرا تعلق ہے اور بداء تقدیر معلق کی ایک قسم ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

"پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ان کی رائے ظاہر ہوئی۔" (۱۲: ۳۵)

اہل تشیع کے نزدیک اس سے مراد افعال باری تعالیٰ میں ایسے افعال کا ظہور پذیر ہونا ہے جو کسی مصلحت سے پہلے پوشیدہ تھے اور صاحب "صافی شرح اصول الکافی" کے بقول بداء کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی ہیں کسی چیز کا صادر ہونا اور جب اللہ کی جانب سے ہو یا یں طور کہ پہلے اس کے ظہور پذیر ہونے کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اس صورت میں بداء کا مقصد امام زمان کے ظن (گمان) کو زائل کرنا یا علم کو پختہ کرنا ہے۔

۲۔ کسی شخص کو ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کا علم پہلے سے امام زمان کو بھی نہ تھا۔

۳۔ کسی شخص کے لئے کوئی ایسا عجیب و غریب امر ظہور پذیر ہو جو اس سے پہلے اکثر لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

۴۔ کسی شخص کے لئے ایسی شے کا ظہور پذیر ہونا جو پہلے اس سے پوشیدہ تھی۔

شیعی عقائد میں اسے بڑی اہمیت ہے۔ امام ابو عبداللہ سے روایت ہے کہ اس وقت تک کوئی نبی نہ بھیجا گیا جب تک کہ اس نے اللہ کے لئے ان پانچ باتوں بداء، مشیت سجود، عبودیت اور اطاعت کا اقرار نہ کر لیا۔

بعض مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ بداء کو بطور عقیدہ سب سے پہلے مختار نے پیش کیا۔ اس عقیدے کی سب سے زیادہ مخالفت یہود نے کی چونکہ وہ شریعت کے نسخ کے قائل نہ تھے۔ اس لئے علمائے یہود نے اس سلسلے میں مسلمان علماء سے مناظرے بھی کئے ہیں۔

بدایوں

بداؤں یا بدایوں ہندوستان کے صوبہ اترپردیش کا ایک شہر اور ضلع ہے۔ یہ شہر دریائے سوت کے مشرقی کنارے پر بریلی سے ۲۷ میل جنوب مغرب کی سمت واقع ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۶۱ء میں ساٹھ ہزار تھی۔

روایت کے مطابق اس شہر کی بنا ۹۰۵ء میں ایک ہندو راجہ بدھ نے ڈالی تھی۔ ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء میں اسے مسعود سالار غازی نے (جو محمود غزنوی کا بھانجا یا بھتیجا تھا۔) فتح کیا۔ ۵۹۳ھ/ ۱۱۹۷ء میں قطب الدین ایبک نے

Marfat.com

اس پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ ۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء میں التتمش نے تاج الدین یلدوز کو لاہور کے قریب شکست دی اور گرفتار کر کے بدایوں بھیج دیا۔ خلجیوں کے زمانہ میں بدایوں چھاؤنی کی صورت اختیار کر گیا۔ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں جلال الدین خلجی ایک لشکر جرار لے کر ملک چھجو کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بدایوں پہنچا۔ ۷۸۶ھ/ ۱۳۸۵ء میں فیروز تغلق نے اردگرد کے قبائل کی بغاوت کو فرو کر کے قبول خان شیروانی کو بدایوں کا فوجی گورنر مقرر کیا۔ ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں سلطان علاء الدین نے تخت سے دستبردار ہونے کے بعد اپنی بقیہ ساری عمر بدایوں ہی میں گزاری اور اسی شہر میں وفات پائی۔

بدایوں کو اکبر کے عہد میں صوبہ دہلی کی ایک سرکار بنا دیا گیا۔ اور یہاں تانبے کے سکے ڈھالنے کے لیے ایک دارالضرب قائم کیا گیا۔ ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء میں اس شہر میں ایک زبردست آتش زدگی ہوئی جس میں سارا شہر جل گیا اور آبادی کی ایک بڑی تعداد جل کر ہلاک ہو گئی۔ شاہجہان نے بدایوں اور سنبھل کو ملا کر ایک سرکار بنا دیا اور اس کا نام کٹھیر رکھا۔ بریلی اس کا صدر مقام بنایا گیا مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بدایوں پر روہیلوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۱۹۲ھ/ ۱۷۷۸ء میں بدایوں اودھ کے نوابوں کے قبضے میں آ گیا اور ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں اس پر انگریز قابض ہو گئے۔ ۱۸۳۸ء میں اسے ضلع کی حیثیت دی گئی۔

بدایوں مشہور مورخ عبدالقادر بدایونی کا مسکن تھا۔ نظام الدین اولیاء اور رضی الدین حسن الصغانی کی ولادت بھی اس شہر میں ہوئی۔ اس شہر میں چند تاریخی عمارات میں پرانا قلعہ ہے جو اب بالکل کھنڈر بن چکا ہے۔ مسجد قطبی، جامع مسجد شمسی کے علاوہ کئی ایک مساجد اور مقبرے ہیں ان میں سلطان علاء الدین کا مقبرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

بدایوں کا موجودہ شہر بداؤں کے نام سے مشہور ہے، جو بریلی سے متھرا کے درمیان ریلوے لائن پر واقع ہے۔ یہاں پر چھوٹی صنعتوں کی چند فیکٹریاں ہیں۔ ضلع بداؤں کی کل آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۱۲۱۰۲۲۶ تھی جو گنگا کی وادی میں دو ہزار مربع میل میں آباد ہے۔ فصلوں میں زیادہ تر گندم جو، باجرہ اور جوار پیدا ہوتے ہیں۔

بدایونی، عبدالحامدؒ، مولانا (۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء - ۱۶ جمادی الاوّل ۱۳۹۰ھ ۲۱ جولائی ۱۹۷۰ء) ممتاز عالم دین اور خطیب مقرر۔ والد کا نام حکیم محمد عبدالقیوم تھا۔ والدہ سید بہار الدین دہلوی کی صاحبزادی تھیں۔ بدایوں میں پیدا ہوئے۔

مولانا عبدالحامد بدایونی اہل سنت والجماعت کے ممتاز اکابر میں سے تھے۔ انہوں نے تحریک خلافت۔ تحریک پاکستان۔ تحریک شدھی۔ تحریک ختم نبوت۔ عالم اسلامی کے اتحاد اور مسئلہ کشمیر کو عالم اسلام میں روشناس کرانے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ انہیں مولانا محمد علی جوہرؔ۔ مولانا شوکت علی۔ نواب محمد اسماعیل خاں۔ نواب لیاقت علی خان۔ قائد اعظم۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی وغیرہم کے ساتھ مل کر کام کرنے کا شرف حاصل ہے ۱۹۴۵ء میں قائد ملت لیاقت علی خاں کے ایما پر حیدر آباد دکن گئے۔ اور نواب میر عثمان علی خان تاجدار دکن سے ملے اور قائد اعظم محمد علی جناح کی ملاقات کے لیے راہ ہموار کی۔ ۱۹۴۶ء میں مکہ معظمہ پہنچ کر مسلمانان عالم کو تحریک پاکستان سے آگاہ کیا۔ مولانا ابوالحسنات قادری کی وفات پر جمعیت علمائے پاکستان کے صدر بنے۔

فالج کے حملے سے کراچی میں وفات پائی اسی جگہ مدفون ہوئے۔ مولانا ایک پرجوش اور شعلہ بیان مقرر تھے آواز میں ترنم تھا۔ تقریر اس انداز میں جھوم جھوم کر اس طرح سے کرتے کہ سارا مجمع جھوم اٹھتا۔ مولانا سچے صوفی مشرب مسلمان تھے آنحضورؐ کے آستانہ پاک سے گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بائیس حج کیے۔ ان کی تصانیف میں: اسلام کا معاشی نظام اور سوشلزم کی مالی تقسیم۔ اسلام کا زراعتی نظام۔ تصحیح العقائد۔ عبادات اسلامی۔ کتاب و سنت غیروں کی نظر میں۔ تاثرات روس۔ دعوۃ آزادئ کشمیر۔ حرمت سود۔ عائلی قوانین۔ الجواب المشکور فی اشد القبور۔ مشہور ہیں۔

بدایونی، عبدالقادر (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء تا ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) ایک مشہور عالم اور مورخ۔ والد کا نام ملوک شاہ تھا۔ ریاست جے پور کے قصبہ ٹوڈا میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے لیے سنبھل میں شیخ حاتم اور شیخ ابوالفتح کی شاگردی اختیار کی۔ بعد میں اپنے والد کے ساتھ آگرہ چلے گئے۔ اور وہاں شیخ مبارک کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ قاضی ابوالمعالی سے فقہ حنفیہ پڑھی۔ والد کی وفات کے بعد ۹۶۹ھ ۱۵۶۱ء میں بدایوں آ گیا۔ ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء سے پٹیالہ میں حسین خان کی ملازمت میں بحیثیت صدر نو سال صرف کیے۔ ۹۸۱ھ/۱۵۷۴ء میں ایک شاہی طبیب کی کوشش سے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اکبر نے اسے بحیثیت بست سوزی منصب دار گھوڑوں کو داغ دینے کا حکم دیا۔ جب ابوالفضل کو اکبر کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تو اس کے سامنے بدایونی کا چراغ نہ جل سکا۔ اس نے دل برداشتہ ہو کر دربار سے تعلق ختم کر لیا۔ بعد میں ایک مرتبہ پھر اس نے دربار میں اپنا سابق مرتبہ حاصل کرنا چاہا لیکن ناکامی ہوئی۔ کیونکہ ابوالفضل کے زیر اثر اکبر کا ذہن جس طرح سے بدلا اور دربار اکبری میں الحاد کا جو نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بدایونی کا اسلامی ذہن اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ دربار سے قطع تعلق کے باعث قریب تھا کہ اس سے زمین بھی چھن جاتی لیکن خواجہ نظام الدین کی سفارش اور کوششوں سے اس کی زمین محفوظ رہی اور اکبر کے بعد اس سے برابر علمی خدمات لیتا رہا۔

بدایونی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ کتاب الحدیث۔ ۲۔ نامۂ خرد افزا۔ ۳۔ رزم نامہ۔ ۴۔ ترجمہ راماین۔ ۵۔ تاریخ الفی۔ ۶۔ نجات الرشید۔ ۷۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی کے ترجمہ تاریخ کشمیر کی اصلاح اور اختصار۔ ۸۔ رشید الدین کی جامع التواریخ کا ملخص ترجمہ۔ ۹۔ بحر الاسمار کی تکمیل۔ ۱۰۔ منتخب التواریخ وغیرہ۔

بدخشاں روسی ترکستان کا ایک شہر اور علاقہ، جو آمو دریا کے بالائی علاقے میں بائیں کنارے پر واقع ہے۔ بدخشاں ایک قسم کے لعل کا نام ہوتا ہے جو اسی علاقے میں ملتا ہے۔ اسی بنا پر اس کا نام بدخشاں پڑا۔ مارکوپولو لکھتا ہے کہ بدخشاں اس علاقے کا نام ہے اور لعل کا نام علاقے کی نسبت سے ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس علاقے پر منگولوں نے قبضہ کیا۔ طبری کے مطابق ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں اس علاقے میں اسلامی فتوحات ہوئیں۔ پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں مشہور شاعر ناصر خسرو یہاں آیا اور اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کی۔ اگلی چار صدیوں تک یہ علاقہ مقامی شاہی خاندان کے زیر اثر رہا تیموری سلطنت کے ساتھ اس کا الحاق تیمور کے پڑپوتے ابو سعید کے عہد میں ہوا اس کے بعد

Marfat.com

صدی عیسوی میں ازبکوں نے اس علاقے پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو بدخشاں کے تخت پر بٹھایا، جسے ۹۳۵ھ/۱۵۲۹ء میں واپس بلا لیا اور سابق حاکم مرزا خان کے بیٹے سلیمان کو بدخشاں کا حاکم تسلیم کر لیا۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء میں اس کے پوتے شاہ رخ نے اسے نکال باہر کیا۔ ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں بدخشاں کو ازبکوں نے عبداللہ خاں کی سرکردگی میں فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہاں ازبکوں کی حکومت قائم ہوئی۔ ان کے شہزادے میر کے لقب سے یاد کیے جاتے رہے۔ ۱۸۷۳ء میں حکومت افغان نے ازبک میر محمود شاہ کو معزول کر کے کابل بھیج دیا تو اس علاقے کو افغانستان میں شامل کر لیا گیا تاہم عملاً اس پر روس کا عمل دخل رہا۔

۱۸۹۱ء کی ایک فوجی جھڑپ کے بعد روس نے مشرقی پامیر کا تمام علاقہ قبضے میں کر لیا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۹۵ء کو برطانیہ اور روس کے درمیان ہونے والے معاہدے کی رو سے بدخشاں شہر کو چھوڑ کر باقی علاقہ روس کے سپرد کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں روس میں "خود مختار علاقہ گورنو بدخشاں" قائم کیا گیا اور اسے ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء میں سوویت جمہوریہ اشتراکیہ تاجکستان کا حصہ بنا دیا گیا۔

بدخشاں کا علاقہ اپنے لعل، زمرد، نیلم، فیروزہ، سونے اور تانبے کی دولت کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس معدنی دولت سے روس بے حد فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے صنعتی کارخانے بھی قائم ہیں۔ گورنو بدخشاں کا مرکزی مقام خاروغ ہے۔ اس علاقے کی معیشت زیادہ تر قدیم طرز پر استوار ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں باغات اور ریشم کی افزائش کے سلسلے بھی شروع کیے گئے ہیں۔

بدر سعودی عرب کا ایک مقام، جہاں کفر اور اسلام کے مابین پہلی جنگ ہوئی۔ اس علاقے کا نام ایک چشمے کی وجہ سے پڑا۔ جو مدینہ منورہ سے کوئی اسی میل مکہ کی جانب واقع ہے۔ بدر اور مدینہ کے درمیان نخلستان ہیں جو میٹھے پانی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے زمانہ قدیم میں قافلے ادھر سے ہو کر گزرتے تھے۔ بدر کا پانچ میل لمبا اور چار میل چوڑا میدان چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ساڑھے پانچ میل لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا ہے۔ یہاں ریتلی چٹانیں اور گھاٹیاں ہیں۔ پہاڑوں کے دوسری طرف دس میل کے فاصلے پر بحر احمر ہے۔

جس مقام پر آنحضورؐ کا خیمہ نصب ہوا تھا، اب وہاں ایک جامع مسجد ہے۔ قریش مکہ کے پڑاؤ کے مقام پر اب نخلستان واقع ہے۔ ترکی دور کے والی حجاز شریف عبدالمطلب کا بنایا ہوا قلعہ بھی کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کئی مساجد بھی ہیں، جن میں سے اکثر ویران ہو چکی ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں یکم ذی قعدہ کو بدر کے مقام پر میلہ لگتا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ یہاں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ مگر زیادہ تر لوگ میلے کی وجہ سے آتے تھے۔ اس وقت یہاں بنو حمزہ آباد تھے۔ ان کی ایک شاخ بنو غفار تھے۔ آج بھی یہاں ہر جمعے کو مسلمانوں کا میلہ لگتا ہے۔

بدر، غزوہ مسلمانوں اور کفار قریش کے مابین پہلی جنگ، جو ۲ھ/۶۲۴ء کو ہوئی۔ ہجرت کے بعد بھی جب کفار نے آنحضورؐ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا تو مسلمان کفار سے لڑنے پر مجبور ہو گئے۔

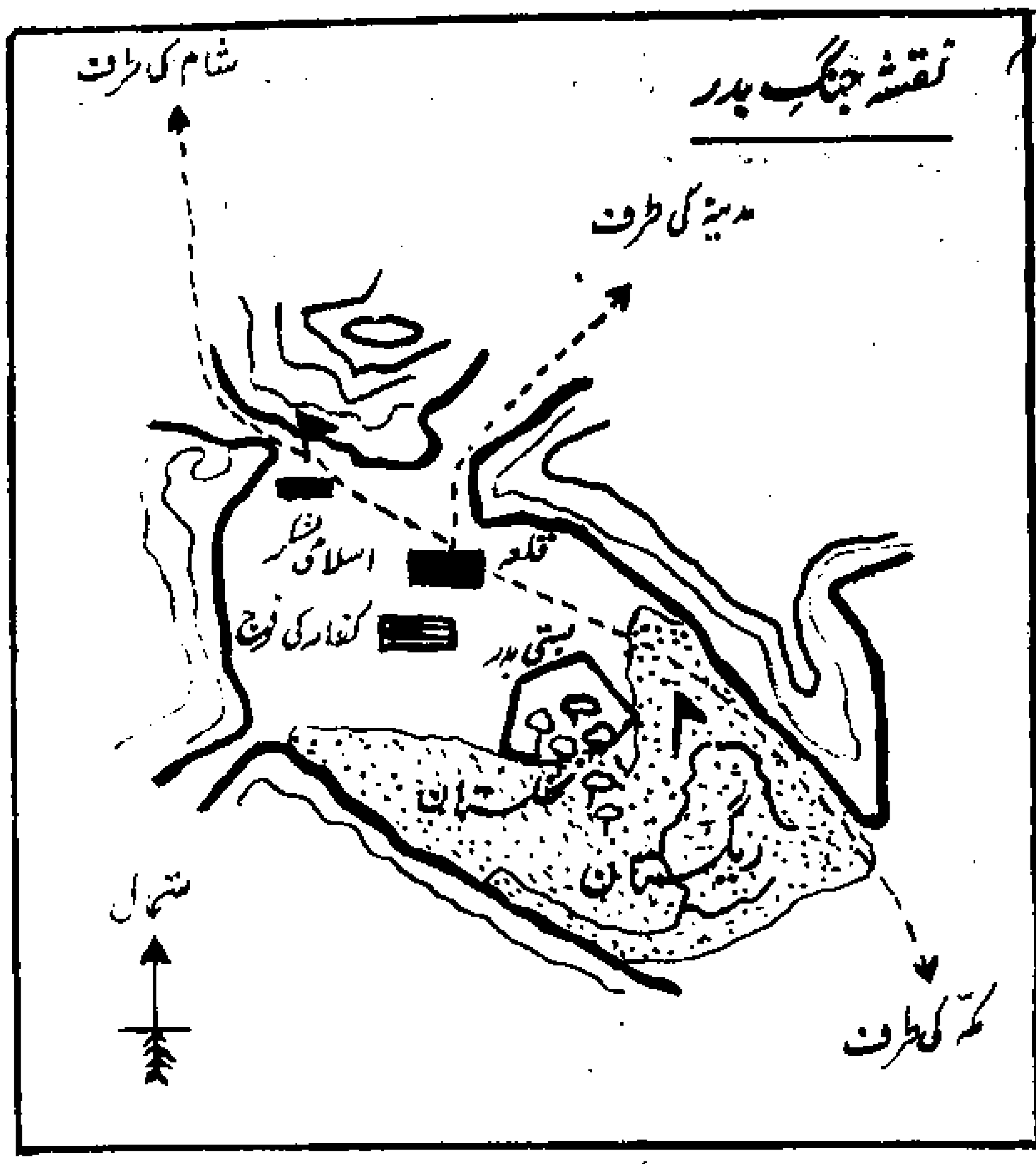

یثرب (مدینہ) میں مسلمانوں کے روز افزوں استحکام سے اہل مکہ کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کا زور توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کی وجوہات یہ تھیں۔

۱۔ وہ کعبہ کی پاسبانی کے مدعی تھے۔ بت پرستی ان کا دین تھا اور اس کی حفاظت وہ اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ وہ عرب کی روحانی پیشوائی سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

۲۔ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے انھیں ہر سال حج کے دنوں میں بے شمار منافع حاصل ہوتا تھا۔ اسلام کی مخالفت نہ کر کے وہ یہ منافع کھونا نہیں چاہتے تھے۔

۳۔ مسلمانوں کی ہجرت ان کے لیے ذلت انگیز شکست تھی۔ کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا تھا۔

۴۔ انھیں ڈر تھا کہ مسلمانوں کی قوت بڑھنے سے مکہ پر حملہ یقینی ہے۔

۵۔ اہل اسلام پر مکہ، اس کے اطراف اور جنوبی علاقوں میں تجارت بند تھی۔ اس کے باوجود مسلمان تاجروں نے اطراف عرب میں اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ اس لیے اہل قریش کو اپنی تجارت ڈوبتی نظر آئی۔

۶۔ کرز بن فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر غارت کی۔ آنحضورؐ نے خود بدر تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

۷۔ عبداللہ بن حجش کو حضورؐ نے ایک دستہ دے کر گشت کے لیے بھیجا۔ اس دستے نے قریش کے ایک تجارتی قافلہ پر حملہ کر کے عبداللہ بن الحضرمی کو ہلاک کر دیا۔ آپؐ نے خبر ہونے پر اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

۸۔ قریش نے عبداللہ بن حضرمی کے قتل کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور زور و شور سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ابو سفیان ایک تجارتی قافلہ لے کر شام گیا۔ واپسی پر اسے مسلمانوں کی طرف سے قافلہ لوٹ لینے کا اندیشہ ہوا۔ اس نے یہ اطلاع مکہ بھجوائی تو اہل مکہ نے ایک ہزار جوان عتبہ بن ربیعہ کی کمان میں مدینہ کی طرف بھیجے۔

جب آنحضورؐ کو دشمن کے منصوبوں اور مکہ سے لشکر کی روانگی کی اطلاع ملی تو آپؐ نے صحابہ کبار سے مشورہ کیا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ نے تقاریر

Marfat.com

گیں۔ بعد میں انصار کی طرف سے سعد بن عبادہؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم آپؐ سمندر میں کود نے کا حکم دیں تو کود پڑیں۔" ساتھیوں سے مشورہ کے بعد آنحضورؐ تین سو سے کچھ زائد جان نثاروں کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ ابھی قریش کا لشکر بدر سے کافی دور تھا کہ ابوسفیان راستہ بدل کر آگے نکل گیا اور قریش لشکر کو یہ پیغام بھیجا کہ میں خطرہ سے نکل آیا ہوں۔ اس پر لشکر میں اختلاف ہو گیا۔ بعض واپس جانا چاہتے تھے۔ اور بعض مثلاً ابوجہل وغیرہ جنگ کرنے پر بضد تھے، لیکن بنو زہرہ حضورؐ کے ننھیالی خاندان نے ابوجہل کی بات نہ مانتے ہوئے پچاس آدمیوں سمیت علیحدگی اختیار کر لی۔

۱۷ رمضان ۲ھ/۱۴ مارچ ۶۲۳ء میں دونوں لشکر میدان بدر میں داخل ہوئے اسلامی لشکر شمال کی طرف اور قریشی لشکر جنوب کی طرف اترا۔ آنحضورؐ نے بڑی دانشمندی سے پانی کے چشمے پر قبضہ کر لیا۔

حکیم بن حزام اور عتبہ بن ربیعہ چاہتے تھے کہ جنگ ٹل جائے۔ حکیم بن حزام ابوجہل کے پاس واپسی کی تجویز لے کر گیا تو اس نے عتبہ بن ربیعہ کو بزدلی کا طعنہ دیا۔ اس پر عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو لے کر مبارزت کے لیے نکلا۔ مقابلہ پر تین انصاری آئے تو عتبہ نے یہ کہتے ہوئے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا کہ ہمارا مقابلہ قومی مثیلوں سے ہے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کو بھیجا۔ مقابل کے تینوں مشرک ہلاک ہو گئے۔ حضرت عبیدہؓ زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔ اس کے بعد لشکر قریب تر ہو گئے۔ ایک طرف شیطانی ہجوم ہتھیاروں میں غرق تھا۔ اور دوسری طرف اللہ کے فرمانبردار بندے اور توحید کے پروانے تھے۔ آپؐ نے سائبان میں رقت سے بھرپور دعا کی۔ "اے اللہ اپنا وعدہ پورا کر، کیا تو چاہتا ہے کہ آج کے بعد تیرا نام نہ لیا جائے۔؟" بے خودی میں چادر مبارک کندھے سے گر گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے اٹھا کر آپؐ کے کندھوں پر دوبارہ رکھا۔ اور عرض کی۔ آپؐ بہت زاری کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائیں گے۔" اس کے بعد وہ آیات نازل ہوئیں جن میں فرشتوں کی مدد کا وعدہ کیا گیا تھا۔

یہ لڑائی دنیا کی عجیب ترین لڑائی تھی۔ بھائی بھائی کے خلاف اور باپ بیٹے کے سامنے تلوار سونتے ہوا تھا۔ مقابلہ بڑے زور و شور سے ہو رہا تھا۔ آنحضورؐ نے مٹھی بھر کنکریاں قریش کی طرف پھینکیں اور مجاہدین کو بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا دشمن حواس کھو بیٹھے۔ فرشتے مدد کے لیے میدان میں آئے۔ اور مشرکین کے سردار کھیت ہونے لگے۔ ابوجہل کو دو انصاری نوجوانوں نے قتل کیا۔ حضرت زبیرؓ کے سامنے ایک آہن پوش آیا جس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ آپؓ نے نیزہ اس کی آنکھوں میں مارا اور اس کے سینہ پر پاؤں رکھ کر اسے نکالا۔ نیزہ مڑ گیا تھا۔ حضورؐ نے یہ نیزہ یادگار کے طور پر کافی عرصہ تک محفوظ رکھا۔

مشرکین بھاگ نکلے اور ستر مردے چھوڑ گئے۔ ستر مشرکین گرفتار ہوئے۔ مال غنیمت میں بہت سے اونٹ اور تقریباً تیس گھوڑے ہاتھ لگے۔

آپؐ نے مشرکین کے سب مردے ایک گڑھے میں دفن کیے۔ فتح کی خوشخبری دو قاصدوں کے ذریعے مدینہ بھیجی۔ لوگ یہ سن کر حیران ہوئے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ مگر جب قیدی پہنچے تو وہ بے حد حیران ہوئے۔

اسیران جنگ مدینہ پہنچے تو حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے ان کے بارے میں مشورہ کیا۔ بعض صحابہ قتل کے حق میں تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہاں تک کہا کہ ہر مسلمان اپنے قرابت دار کی گردن خود مارے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے دی جو آپؐ نے منظور فرمائی۔ فدیہ کی رقم اسیروں کے مقدور کے مطابق طے ہوئی زیادہ سے زیادہ مشرح چار ہزار درہم تھی۔ عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کو قتل کروا دیا گیا۔ آپؐ نے دیگر قیدیوں کو صحابہؓ میں تقسیم کر کے ان سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا۔

قیدیوں میں سے سہیل بن عمرو بے مثل مقرر تھا۔ وہ آنحضورؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے اس کے دانت اکھاڑنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار فرمایا کہ اگر میں اس کا بدن بگاڑوں گا تو اللہ تعالیٰ میرا بدن بگاڑے گا۔ شاید کسی مجلس میں یہ ایسی گفتگو کرے جو تمہیں بری نہ لگے۔" آنحضورؐ کی یہ پیشگوئی آپؐ کی وفات کے بعد پوری ہوئی۔ فتنہ ارتداد کے خلاف مؤثر اور پرجوش خطبے سہیلؓ نے دیئے۔

جو قیدی فدیہ نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں مفت رہا کیا گیا جو پڑھے لکھے تھے ان کے بارے میں دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا کر آزاد ہو جانے کا فیصلہ ہوا۔

بدرالدینؒ بدر (وفات ۲۷ رجب ۸۴۴ھ/۲۲ دسمبر ۱۴۴۰ء) بدرالدین بدر عالم ابن فخرالدین ثانی، سلسلہ جنیدیہ کے ایک صوفی میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے پردادا شیخ فخرالدین زاہد نے ایک بہت بڑی خانقاہ قائم کی ہوئی تھی۔ ان کے دادا شیخ شہاب الدین حق گو کو محمد بن تغلق نے قتل کرا دیا تھا۔ انہوں نے روحانی تعلیم اپنے والد اور سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ سید جلال الدین بخاری سے حاصل کی۔

شیخ شرف الدین یحییٰ نے انہیں بہار آنے کی دعوت دی۔ مگر جب بہار پہنچے تو شیخ کا انتقال ہو چکا تھا۔ پہلی شادی بہار کے ایک ہندو گھرانے میں کی۔ دوسری شادی جونپور کے حکمران خاندان میں ہوئی۔ مشرقی بنگال میں انہوں نے ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اور سنارگاؤں (ڈھاکہ) میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ کچھ عرصہ چاٹگام میں بھی قیام رہا۔ سمندروں اور دریاؤں پر حکمرانی ان کے خاندان کی خاص روحانی صفت مانی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگالی ملاح سمندر میں کشتی ڈالنے سے پہلے ایک نعرہ "اللہ۔ نبی۔ پانچ پیر۔ بدر۔ بدر" لگاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سنارگاؤں (ڈھاکہ) کے پانچ پیر کے ساتھ مل کر پانی پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ فخرالدین زاہد نے ایک جماعت کو دریائے جمنا میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ ان کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک چٹان پر تیرتے ہوئے چاٹگام پہنچے تھے۔ بہار اور بنگال کے باشندوں کو ان سے بڑی عقیدت ہے۔ انہوں نے بہار میں وفات پائی اور ان کا مقبرہ چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔

بدرالدین بن قاضی (یکم محرم ۷۶۰ھ/۳ دسمبر ۱۳۵۸ء – شوال ۸۱۹ھ/۱۸ دسمبر ۱۴۱۶ء) ایشیائے کوچک کا ایک مشہور فقیہہ اور صوفی نیز اشتراکی رہنما، والد کا نام قاضی غازی اسرائیل تھا۔ سمارنہ میں پیدا ہوا۔ زمانہ شباب ادرنہ میں گذارا۔ فقہ اسلامی کی تعلیم اپنے والد اور دیگر علماء یوسف اور شاہدی وغیرہ سے حاصل کی۔ تکمیل علم کا شوق بردسہ میں کھینچ کر لے گیا۔ وہاں منطق اور علم ہیئت پڑھا۔ اس کے بعد بیت المقدس میں ابن العسقلانی سے فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ آ کر مبارک شاہ المنطقی۔ حاجی پاشا طبیب۔ علی بن محمد السید الشریف الجرجانی جیسے علماء اور فضلاء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء میں حج کا قصد کیا اور حج سے واپس آنے کے بعد مملوک سلطان برقوق کے بیٹے فرج کا اتالیق مقرر ہوا۔ مملوک سلطان کے دربار میں اس کی ملاقات صوفی شیخ حسین اخلاطی سے ہوئی۔ ان سے تصوف سیکھا۔ کے سلسلے میں

کا ہی حاصل کی۔ اور شیخ کی وفات کے بعد ان کا جانشین ہوا۔ لیکن اپنے پیر بھائیوں سے اختلافات کی وجہ سے قاہرہ چھوڑ کر ایشیائے کوچک کی جانب تبلیغ کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس نے ابن العربی کے نظریات کی تبلیغ شروع کردی۔ نیز اس نے مشترکہ ملکیت کے نظریے کی بھی تبلیغ کی۔ جس کی وجہ سے ایشیائے کوچک کے بہت سے مفلوک الحال لوگ اس کے مرید ہوگئے۔ ۱۴۱۱ء میں جب سلطنت موسیٰ نے اسے قاضی عسکر بنایا۔ جب سلطان محمد اول نے فتح حاصل کی تو اس نے اسے انتہائی ذلت آمیز رویے کے ساتھ جلاوطن کردیا۔ چنانچہ ازنیق میں وہ ایک بار پھر تصنیف و تدریس میں مشغول ہوگیا۔ اسی زمانہ میں اس کا تعارف اشتراکیت کی ایک خفیہ تحریک سے ہوا۔ اور جس کی بدولت ۱۴۱۶ء میں ایک بہت بڑی بغاوت رونما ہوئی۔ اس تحریک کا نظریاتی اعتبار سے بدرالدین کو سربراہ کہا جاتا ہے۔ بغاوت سختی سے دبادی گئی۔ اور شاہی فوج بدرالدین کو گرفتار کرکے گھسیٹتی ہوئی سرس لے گئی۔ چنانچہ مقدونیہ میں اس پر مقدمہ چلا اور غداری کے الزام میں برسرعام پھانسی دے دی گئی۔

بدرالدین نے پچاس کے قریب جامع کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں سے اکثر فقہ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ تصوف پر اس کی اہم ترین کتابیں "واردات" اور "نورالقلوب" ہیں۔ اس کے تین بیٹے احمد۔ اسماعیل اور مصطفیٰ تھے۔ اس کے پوتے خلیل بن اسماعیل نے اس کے حالات زندگی پر ایک کتاب لکھی ہے۔

بدر عالم بہار (ہندوستان) کے ایک ولی (دیکھئے "بدرالدین بدر")

بدعت نئی بات یا نئی رسم نکالنا۔ یعنی ایسی بات نکالنا جس کا کتاب و سنت تو کجا آثار صحابہ تک میں پتا نہ چلتا ہو۔

بدعت اور اجتہاد میں زمین آسمان کا فرق ہے، بدعت ضلالت (بدی) ہے اور اجتہاد دین کی ضرورت ہے۔ دین میں نئی بات نکالنا کوئی معمولی برائی نہیں ہے۔ اس پر شدید وعید اس لئے آئی ہے کہ بدعت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اللہ اور رسول ؐ سے کچھ ایسی باتیں بیان کرنے سے رہ گئیں جن کے کرنے سے آخرت میں بڑا ثواب ہوگا۔ اور آخرت میں ترقی ہوگی۔ آنحضور ؐ کو بدعت سے نہ صرف نفرت تھی بلکہ ایذا اور تکلیف بھی ہوتی تھی۔ بدعت ایک مہلک اور متعدی مرض ہے۔ اس کے مریضوں سے دور رہنا چاہیئے۔ قیامت کے دن آنحضور ؐ اپنی امت کے بدعتیوں کو دیکھ کر فرمائیں گے۔ "جنہوں نے میرے بعد دین میں کوئی تبدیلی کی اور بدعت پھیلائی وہ مجھ سے دور رہیں۔"

بدعت کے بارے میں آنحضور ؐ نے فرمایا۔ "جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا۔ "بہترین باتوں کی کتاب قرآن ہے اور بہترین راستہ محمد ؐ کا راستہ ہے اور بدترین امور وہ ہیں جو دین میں نئے نکالے جائیں۔ اور دین میں ایجاد کی ہوئی ہر نئی چیز گمراہی ہے۔" (مسلم)

حضرت فضیل بن عیاض ؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص صاحب بدعت سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کا عمل ختم کردے گا اور اس کے قلب سے ایمان کی نورانیت سلب کرلے گا۔ اے مخاطب تو جب کسی کو اس راستہ پر چلتا دیکھے تو تو دوسرا راستہ اختیار کرلے۔

حضرت عمر فاروق ؓ کے ایک قول کی بنا پر بدعت کی دو قسمیں "النہایہ" میں بیان کی گئی ہیں ۱۔ بدعت حسنہ ۲۔ بدعت سیئہ۔ جو نئی بات اچھی ہو اور قرآن و سنت اجماع یا اثر کے خلاف نہ ہو وہ بدعت حسنہ ہے اور جو ان ماخذوں کے خلاف ہو وہ بدعت سیئہ ہے۔ تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروق ؓ نے اس بدعت کے حسنہ ہونے کا ایک نکتہ اور اصول بتادیا ہے۔ تراویح آنحضور ؐ کے زمانہ میں بھی پڑھی جاتی تھی اور جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی۔ مگر آنحضور ؐ نے باجماعت تراویح کے طریق پر ہمیشہ عمل نہیں فرمایا۔ یہ پورا سلسلہ مسنون تھا۔ حضرت عمر ؓ نے اس طریقہ مسنونہ کو ہمیشہ کے لئے جاری کردیا۔

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال میں قائم نہیں رہتی اس میں اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پچھلی امتوں نے شرک و بدعات اور احداث فی الدین کے ذریعے دین کو مسخ کردیا تھا۔ بدعت کوئی ایسی ہلکی اور معمولی برائی نہیں ہے۔ جسے نظرانداز کردیا جائے

بدلیس مشرقی اناطولیہ کا ایک مرکزی شہر جو دریائے تبلیس کے کنارے جھیل وان سے ۱۵ کلومیٹر جنوب مغرب کی سمت واقع ہے۔ گنجان اور کچی پکی عمارتوں سے بنا ہوا یہ شہر پہاڑوں کی ڈھلانوں اور دریا کے ٹاپوؤں پر واقع ہے۔ سخت قسم کی آب و ہوا رکھتا ہے۔ تاریخ میں سب سے پہلے سکندر اعظم کے حملے کا علم ہوتا ہے۔ اس شہر کا نام سکندر کے سپہ سالار بلیس کے نام پر رکھا گیا ہے مسلمانوں نے اسے حضرت عمر ؓ کے دور خلافت میں فتح کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد یہ بزنطینی سلطنت میں شامل کرلیا گیا تو حضرت امیر معاویہ ؓ نے اسے دوبارہ فتح کیا مگر ان کے بعد یہ پھر ہاتھ سے نکل گیا۔ اور عہد عباسیہ میں ہاتھ آیا۔ حمدانیہ اور مروانیہ کے خاندان کے دور حکومت میں ایک سرحدی شہر بن گیا۔ مروان کے عہد میں مختلف کرد قبیلے یہاں آباد ہوگئے۔ ۱۰۸۴ء میں جب فخرالدولہ محمد بن جہیر دیار بکر کا حاکم بنا تو اس نے مروانیوں کی حکومت کا خاتمہ کرکے ان کے علاقے کو ترکوں میں تقسیم کردیا۔ چنانچہ بدلیس محمد بن دلمج کے حصہ میں آیا۔ اور اس کی اولاد اس پر ۱۱۹۲ء تک حکمران رہی۔ اس کے بعد یہ شہر اخلاط کے امیر نے قبضہ کرلیا۔ ۱۲۰۷ء میں ان دونوں شہروں پر ایوبیوں کا قبضہ ہوگیا۔ انھوں نے اس علاقے میں کردوں کی ایک بڑی تعداد لاکر آباد کردی۔

۱۲۲۹ء میں جب اخلاط جلال الدین خوارزم شاہ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا تو بدلیس خوشحال ہوگیا۔ یہ شہر علم و فضل کا ایک خاص مرکز بن گیا۔ انیسویں صدی تک اس علاقے پر مختلف ادوار میں تیموریوں، قراقوینلو، آق قوینلو، صفویوں اور عثمانیوں کا قبضہ رہا۔

۱۸۷۷ء/۱۸۷۸ء کی جنگ میں یہ ایک صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ اس وقت اس کی آبادی ایک لاکھ آٹھ ہزار تھی۔ جس میں ستر ہزار مسلمان تینتیس ہزار ارمن چار ہزار شامی یعقوبی عیسائی اور ایک ہزار یزیدی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اس پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں بے حد کمی ہوگئی۔

۱۹۵۰ء میں اس شہر کی آبادی گیارہ ہزار ایک سو باون تھی۔ جب ترکی میں جمہوریت قائم ہوئی تو بدلیس کے چاروں سنجاق کے الگ الگ صوبے بنا دیئے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں بدلیس کو دوبارہ ولایت بنادیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں اس کی آبادی ایک لاکھ تھی۔

بدو خانہ بدوش، گلہ بان، چرواہے، خصوصاً عرب کے صحرائی علاقوں کے لوگ، جو تلاش معیشت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے ہیں۔ صحراؤں میں یہ تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح سے آباد ہیں۔ ۱۱۰۰ ق م میں انہوں

Marfat.com

نے اونٹ سے کام لینا شروع کیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ سے صرف دو تین صدیاں پہلے گھوڑا ان کے استعمال میں آیا۔ اس وقت یہ لوگ کاشت کاری، گلہ بانی اور تجارت کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ اسلام سے قبل عربوں کی بدوی زندگی اپنے عروج پر تھی۔ انہیں اہل بادیہ کہا جاتا ہے۔ ان کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم بحر ہند کے کنارے آباد ہے اور سامی زبان بولتی ہے۔ دوسری قسم کے بدو دریائے دجلہ و فرات کے قریبی صحراؤں میں آباد ہیں اور کاشت کاری کرتے اور مویشی پالتے ہیں۔ تیسری قسم کے بدو صحراؤں کے کناروں پر آباد ہیں یہ زیادہ تر چرواہے ہیں۔ چوتھی قسم کے بدو خالص بدو کہلاتے ہیں جو صحراؤں میں آباد ہیں۔ اونٹوں کا زیادہ تر استعمال یہی بدو کرتے ہیں۔ ان کا قدیم ترین قبیلہ صلیب ہے، جو شمالی عرب کے معزز بدویوں کے درمیان رہتے ہیں۔

بدو عام طور پر نقل و حرکت میں رہتے ہیں۔ بکری کے بالوں سے بنا ہوا سیاہ خیمہ ان کے لئے گرمی سردی، دھوپ اور بارش سے بچاؤ کا سامان کرتا ہے۔ ہر خیمہ دو حصوں زنان خانہ اور مردان خانہ پر منقسم ہوتا ہے۔ برتن عموماً دھات اور لکڑی کے ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں اکثر قہوہ پینے کے لئے چینی کے پیالوں کا ایک سیٹ بھی ہوتا ہے۔ ان کا لباس ڈھیلا ڈھالا اور کشادہ ہوتا ہے۔ جو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رہتا ہے۔ ان کی عورتیں عام طور پر نقاب پہنتی ہیں۔

بدو قبائل عام طور پر ایک ہی خاندان کے مختلف افراد پر مشتمل ہوتے ہیں یہ لوگ شجاعت اور قصاص کے اصولوں پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ مذہباً سنی مسلمان ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے زیادہ تر مالکی ہیں اور کچھ حنبلی ہیں جو سارے کے سارے وہابی ہیں۔

عربوں کی طرح دیگر قوموں میں بھی بدوی (خانہ بدوش) ہیں جو گلہ بانی، زراعت اور چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ ان میں سے وہ بدوی جو گھوڑے پالتے ہیں۔ منگولیا کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نیم منظم لٹیرے اور جنگجو ہوتے تھے۔ انہوں نے کئی بار اپنے مسکن سے نکل کر اردگرد کے علاقوں پر یورش کی۔ ہلاکو خان اور چنگیز خان ایسے ہی منگول بدوؤں کے سردار تھے عربوں اور خصوصاً مسلمانوں کو اہل یورپ نے عموماً بدویوں کے خطاب سے پکارا ہے۔ اس کے لئے وہ مور (MOOR) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سپین کے فاتح مسلمانوں کو مور ہی کہا گیا ہے۔ حالانکہ بدو صرف خانہ بدوش لوگوں کو کہا جاتا ہے، جو صحرائے عرب میں آباد ہوئے تھے۔ اور کبھی کبھی شہروں کے اردگرد بھی آ بستے تھے۔ مگر مقامی بستیوں کے عرب مثلاً مکہ، یثرب، طائف صنعا وغیرہ کے لوگوں کو کبھی بھی بدو نہیں کہا گیا۔ نیز ان میں کافر بھی تھے۔ مسلمان بھی، یہودی بھی اور عیسائی بھی۔ اس لئے محض مسلمانوں کو بدو کا خطاب دینا نسلی اور مذہبی تعصب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

بدوی، احمد: مصر کے ایک بڑے صوفی اور بزرگ (دیکھئے "احمد بدوی")

بدھستوا بدھ مت میں اوتار کا نام ہے۔ یہ بدھ سے نچلا درجہ ہے۔ یہ ایسے شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو نروان (اعلیٰ جنم) میں داخل ہونے والا ہو یعنی بدھ بننے والا ہو لیکن کسی وجہ سے اس درجے کو نہ پہنچا ہو۔ بدھ مت کے فرقے مہایان میں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ بدھستوا اس لئے بدھ کا مرتبہ حاصل نہ کر سکے کیونکہ وہ مصیبت زدہ انسانوں سے بے حد متاثر تھے اور ان ہی کی ہمدردی کی وجہ سے انہوں نے نروان کا قدم نہیں اٹھایا۔ بدھ بن جانے کے بعد وہ ان کی امداد نہیں کر سکتے کیونکہ نروان کے بعد مکمل فنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بدھستوا آسمان سے مصیبت زدوں کی نگرانی کرتے ہیں اور اکثر اوقات مختلف بھیس میں زمین پر ان کی مدد کرنے آتے رہتے ہیں۔ بدھستوا کی اعلیٰ محبت اور ہمدردی کے بے شمار افسانے مشہور ہیں، جن میں وہ مصیبت زدوں کی نجات کے لئے کام کرتے ہیں۔

سب سے پہلا بدھستوا گوتم تھا۔ ان کے بعد بھی بے شمار بدھستوا آتے رہے ہیں کچھ عرصہ سے تین بدھستواؤں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ پہلا بدھستوا میتریا ہے، جو رحمدل ہے۔ اس کے بہت سے بت تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کی مورتی ایک موٹے آدمی کی ہوتی ہے، جو ہنس رہا ہوتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ اور دوسرے میں تھیلا ہوتا ہے۔ مہایان عقیدے کے مطابق یہ بدھستوا پانچ ارب ستر کروڑ سال بعد اس دنیا میں پھر آئیں گے۔ دوسرا بدھستوا منجو سری کہلاتا ہے۔ یہ حیرت اور عقل کا مجسمہ ہے۔ اس کی پیشانی پر پانچ بل دکھائے جاتے ہیں۔ اسے گوتم کا نزول پیشرو اور کبھی کبھی ان کا چہیتا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ تیسرا اوالوکتسوار کہلاتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ محترم ہے اسے رحم اور مہربانی کا مجسمہ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانیت کو مصائب اور آلام سے بچانے کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔ اس کی پرستش برعظیم ہند و پاک میں تیسری سے بارہویں صدی عیسوی تک بڑے زوروں پر تھی تبت میں اسے دلائی لامہ کا نام دیا گیا ہے۔ آٹھویں صدی سے قبل چین میں اس کی پرستش کے آثار نہیں ملتے۔ یہاں اسے نسوانی شکل و صورت دی گئی ہے۔ اور کوان ین نام دیا گیا۔ جاپان میں اسے کوان نون کہتے ہیں۔

بدھستوا کے عقیدے سے بدھ مت میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ اسی کے ذریعے مشرکانہ عقائد نے اس مذہب میں راہ پالی۔ قدیم بدھ مت میں خود غرضانہ نجات کا حصول ہی بنیادی مقصد ہے۔ جس کی وجہ سے ہمدردی اور تعاون نام کو نہ تھا۔ لیکن بدھستوا کے عقیدے نے اس خامی کو دور کر دیا۔ عبادات کا طریقہ بھی رائج ہوا۔ بدھستوا معبود بن گئے۔ راہب پروہتوں کے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ خانقاہیں مندر بن گئیں۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں پجاری جمع ہو جاتے۔ عبادت کی رسوم اور اوقات مقرر ہوئے بدھستوا کو بدھ کا مظہر کہا گیا ہے، جو اعلیٰ حقیقی شے ہے۔ پوری کائنات جس بدھ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے دھیانی بدھ کہا جاتا ہے۔ اس سے پانچ دھیانی بدھستوا پیدا ہوئے ہیں۔ ہر بدھستوا کے لئے اس دنیا میں ایک انسانی بدھ موجود ہے۔ (نیز دیکھئے "بدھ گوتم" - "بدھ مت")

بدھ، گوتم (۵۶۳ ق.م - ۴۸۳ ق.م) مہاتما گوتم بدھ، ہندوستان کے قدیم مذہب بدھ مت کے بانی، اجودھیا (نیپال) کے راجہ سدھودان کے بیٹے تھے جو کپل وستو کے مقام پر حکومت کرتا تھا۔ یہ خاندان سلیا (کھشتری) سے تعلق رکھتا تھا۔ گوتم بدھ کپل وستو کے قریب ترائی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ والدین نے سدھارد (کامیاب) نام رکھا۔ ساتویں روز والدہ مایا انتقال کر گئیں۔ بچپن میں گوتم نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی۔ وید پڑھی اور سنسکرت زبان میں مہارت پیدا کی۔ سولہ سال کی عمر میں یسودھا نامی عورت سے شادی ہوئی۔ دس سال تک خوشگوار شاہانہ زندگی بسر کی۔ ایک لڑکا راہل بھی پیدا ہوا۔

بچپن ہی سے گوتم کے مشاہدات انسانی زندگی کے بارے میں بہت گہرے

Marfat.com

تھے۔ انھوں نے ایک مریض، ایک بوڑھے اور ایک میت کو دیکھ کر محسوس کیا کہ انسانیت مصائب اور آلام سے گھری ہوئی ہے۔ انھوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شاہی محل کی پرتعیش زندگی، بے شمار دولت، حکومت، بیوی کی الفت اور بچے کی محبت بھی انھیں اس امر سے باز نہ رکھ سکی اور انتیس برس ہی کی عمر میں وہ ان تمام مسرتوں کو ٹھکرا کر حقیقی مسرت کی تلاش میں جنگل کی طرف چلے گئے ان کی اس کوشش کو نروان حاصل کرنے کی کوشش کہا گیا ہے۔ انھوں نے دو مذہبی راہبوں سے تعلیم حاصل کی لیکن حقیقت کا پتا نہ چل سکا۔

گوتم کی رہبانیت کی یہ زندگی چھ برس کو محیط ہے۔ بالآخر ایک پیپل کے درخت تلے بیٹھے گیان دھیان کرتے ہوئے اچانک ان پر "انکشاف" ہوا اور انھوں نے زندگی کے ان مسائل کا "حل" دریافت کر لیا۔ اس روز سے انھیں بدھ (روشنی پانے والا) کہا جانے لگا۔ اور اس درخت کو، جس کے تلے انھوں نے نروان حاصل کیا تھا۔ بدھی ورکش کہا گیا۔

زندگی کے بقیہ برس گوتم نے تبلیغ میں گزارے۔ ان کے بہت سے پیرو ان کے ساتھ اس تبلیغ میں شامل ہوئے۔ انھیں بھکشو کہا جانے لگا۔ آخری عمر میں ایک راہب دیوادات نے گوتم کی مقبولیت ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

گوتم بدھ کے نزدیک یہ دنیا تین طرح کے مصائب سے گھری ہوئی ہے۔

۱۔ رنج والم، جن سے انسان آئے دن دوچار ہوتا رہتا ہے۔ جن میں بیماری بڑھاپا اور موت بہت اہم ہیں۔

۲۔ عارضی زندگی، یعنی دنیا فانی ہے اور کسی چیز کو قرار حاصل نہیں۔

۳۔ غیر حقیقی۔ دنیا کی تمام چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ کیونکہ اگر یہ حقیقی ہوتیں تو فانی نہیں ہو سکتیں۔

ان مصائب کی روشنی میں گوتم نے زندگی کی چار اعلیٰ صداقتیں "آریہ ستیہ" بتلائی ہیں:-

۱۔ زندگی دکھ ہے۔

۲۔ دکھ کا سبب خواہشات ہیں۔

۳۔ خواہشات سے خود کو بچایا جائے۔

۴۔ سخت ریاضت اور بے جا تعیش کا درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

گوتم کے نزدیک انسان کے مصائب نہ صرف زندگی میں برقرار رہتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی سکھ نہیں ملتا اور وہ دوسرے وجود میں دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان سے بھی بڑھ کر مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گویا یہ بدھی اواگون کا نظریہ ہے اس کے نزدیک انسان پانچ عناصر سے مل کر بنتا ہے۔ ۱۔ مادی جسم۔ ۲۔ احساسات ۳۔ شعور۔ ۴۔ رجحانات۔ ۵۔ افکار و تصورات۔ جب انسان مر جاتا ہے تو یہ عناصر بکھر جاتے ہیں۔ صرف اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو نئے عناصر کو پیدا کرتے ہیں جن سے نئی شخصیت وجود میں آتی ہے۔

فہم و فراست کے لئے گوتم مطالعہ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی اصولوں کی پابندی بھی لازمی قرار دی گئی ہے اسکے نزدیک غور و فکر کے ذریعے اس زنجیر کو کاٹ دینا چاہیئے۔ جس نے اس وجود کو باندھ رکھا ہے۔

خواہشات سے بچنے کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آٹھ باتوں کی تاکید کی گئی ہے۔

۱۔ صحیح علم و عقیدہ — خیالات ہر قسم کے مغالطے سے پاک ہوں۔

تھائی لینڈ میں مہاتما بدھ کے پاؤں کے نشان کی خانقاہ

۲۔ صحیح ارادہ — زندگی کا صحیح مقصد سامنے ہو۔

۳۔ صحیح کلام — گفتگو واضح اور نرم ہو۔

۴۔ صحیح عمل — امانت اور دیانت کے ساتھ ہر کام کیا جائے۔

۵۔ صحیح سلوک — کسی جاندار کو تکلیف نہ دی جائے۔

۶۔ صحیح جدوجہد — خود پر قابو پایا جائے۔

۷۔ صحیح یادداشت — تمام تجربات کو ہر وقت ذہن نشین کیا جائے۔

۸۔ صحیح غور و فکر — زندگی کی گہرائیوں کے متعلق غور و فکر۔

ان آٹھوں کو حاصل کرنے کے لئے چار مرحلے بنائے گئے ہیں۔

۱۔ داخلہ کا مرحلہ۔ جب انسان یہ عہد کر لیتا ہے کہ وہ اس طریقے کو اپنائے گا۔ خواہ کامیابی کے لئے اسے ایک یا زیادہ جنم حاصل کرنا پڑیں۔

۲۔ ایک بار پھر آنے کا مرحلہ۔ جب انسان آخری جنم سے پہلے ایک جنم لیتا ہے۔ اس وقت انسان کے فاسد خیالات دور ہو جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر انسان بہت کچھ ترقی کر لیتا ہے۔

۳۔ تیسرا مرحلہ آخری جنم کا ہے۔ اس میں باقی ماندہ توہمات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد کوئی جنم نہیں۔

۴۔ چوتھا مرحلہ حقائق کی آگاہی اور موت کا درمیانی وقفہ ہے۔ موت کیساتھ ہی انسان نروان حاصل کر لیتا ہے۔

گوتم کا کہنا ہے کہ خلوص اور محبت کی زندگی بسر کر کے ہر کس و ناکس اعلیٰ ترین نجات یعنی مکتی حاصل کر لیتا ہے۔ (نیز دیکھیے "بدھ ستوا"، "بدھ مت")

بدھ مت ایک مذہب، جس کا بانی گوتم بدھ تھا۔ یہ دراصل ہندوستان کے برہمنی مذہب کی ترقی یافتہ صورت ہے، جو چھٹی صدی قبل مسیح میں

Marfat.com

برہمنی مذہب کے نقائص کو دور کرنے کے لئے وجود میں آیا۔ گیارہویں صدی عیسوی تک یہ مشرق بعید میں پوری قوت سے پھیلا۔ اگرچہ بعدازاں بہت سے بدھ مسلمان ہو گئے مگر آج بھی یہ پوری دنیا کی آبادی کا گیارہ فیصد ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ بدھ برما (۹۰٪)، تھائی لینڈ (۹۰٪)، لنکا (۷۰٪) اور جاپان (۶۰٪) میں ہیں۔ جبکہ چین میں ۱۷٪، ہندوستان میں ۱٪ اور بنگلہ دیش میں ۱٪ ہیں۔ علاوہ بریں فلپائن انڈونیشیا، نیپال، کمبوڈیا، لاؤس اور تبت میں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں اور کچھ تعداد یورپ اور امریکہ میں بھی آباد ہے۔

فلسفہ:۔ بدھ مت بنیادی طور پر ہندو مت ہی کی ایک صورت ہے۔ کثرت پرستی اور ذات پات کی تقسیم ایسی بنیادی چیزیں تھیں، جو ہندو دھرم کی اشاعت پر ضرب کاری لگا رہی تھیں۔ بدھ مت نے سارا زور ان ہی نقائص کو دور کرنے پر صرف کر دیا۔ ہندو مت کے مذہبی احکامات میں فلسفیانہ افکار کی آمیزش سے بدھ مت نے جنم لیا جس چیز نے اس مذہب کو مشکل بنا دیا وہ اس کا طریق عبادت و تزکیہ نفس تھا۔ تنظیم، مطالعہ غور و فکر اور مراقبہ وغیرہ ایسے دشوار گزار رستے ہیں، جن پر گامزن ہونے کے لئے راہبوں کی ایک مخصوص جماعت میں شامل ہونا پڑتا ہے۔

بدھ مت میں دیوتاؤں کی عبادت پس منظر میں چلی گئی ہے۔ نجات کے حصول کے لئے ریاضت کو بنیادی جزو قرار دیا گیا ہے۔ دنیا کو سراسر فریب اور دھوکا بتلایا گیا ہے۔ ترک دنیا کے بغیر نجات کا حصول ناممکن ہے۔ یہ مذہب دراصل ماورائے طبیعیات اور اخلاقی رجحانات کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف تو اس میں اپنشد کے بتلائے ہوئے اصولوں کو منطقی طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرف ہندو دھرم کی کثرت پرستی کے باعث پیدا ہونے والی اخلاقی الجھنوں کے خلاف ایک ردِ عمل ہے۔ چنانچہ بدھ مت میں خدا کی ہستی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار بندھے ٹکے قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی عبادت کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ عبادت، قربانی، توبہ، کفارہ وغیرہ کا سرے سے کوئی تصور موجود نہیں۔

گوتم نے اپنی تعلیمات میں آٹھ باتوں کے صحیح ہونے کی تاکید کی تھی۔ وہ یہ ہیں علم، ارادہ، کلام، عمل، سلوک، جدوجہد، یادداشت، غور و فکر۔ اس راستے پر گامزن ہونے والوں سے بدھ مت چند چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ شہری زندگی کو خیرباد کہہ دیں۔ گھر، خاندان، پیشہ، سماج وغیرہ سب کو چھوڑ کر یا تو تنہائی کی زندگی بسر کی جائے یا تارک الدنیا لوگوں کی مصاحبت اختیار کی جائے۔ جائے رہائش کا آبادی سے دور ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے لباس بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ جو تین کپڑوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک تہ بند ایک کرتے کی قسم کا کپڑا اور ایک چادر شامل ہے۔ سر اور داڑھی کے بال بالکل مونڈ دیئے جاتے ہیں۔ خوراک بھیک مانگ کر حاصل کی جاتی ہے۔ محنت اور مزدوری ممنوع قرار دی گئی ہے۔ بھیک مانگنے کے آداب مقرر ہیں۔ ابتدا میں گوشت خوری کی اجازت تھی۔ بعدازاں یہ ممنوع قرار دے دی گئی۔

اس راہبانہ زندگی میں ہر شخص داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے رنگ و نسل ذات پات وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ البتہ چند لوگوں پر اس کے دروازے ضرور بند ہیں مثلاً غلام اور مخصوص بیماریوں میں مبتلا۔

ان راہبوں کو بھکشو کہا جاتا ہے۔ ان کے لئے دس اصول مقرر ہیں، جن پر انہیں سختی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ یعنی قتل، سرقہ، زنا، جھوٹ، منشیات، شام کا کھانا رقص و سرود۔ آرائش و زیبائش۔ بلند مسند اور سونا چاندی وغیرہ سے اجتناب۔ ان کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی کئی چیزیں ہیں۔ جن سے اجتناب ضروری ہے۔ بھکشو کے لئے حکم ہے کہ وہ ہر مہینے میں دو بار احتسابِ نفس کرے اور دیکھے کہ کہیں ان احکامات کی خلاف ورزی تو نہیں ہوئی۔ احتسابِ نفس کے دن کو "اپاستھ" یعنی روزے کا دن کہا جاتا ہے۔ ان تمام عبادتوں کا صلہ صرف داخلی سکون اور اطمینان "نروان" ہے۔

چونکہ ایسی سخت ریاضت ہر کوئی نہیں کر سکتا اس لئے عام لوگوں کے لئے پہلی پانچ چیزوں سے اجتناب اور نیک چلنی کی زندگی بسر کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ نروان تو حاصل نہیں کر سکیں گے مگر اگلی زندگی میں بھکشو کا مرتبہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ہندوستان میں بدھ مت ہی وہ پہلا مذہب ہے، جس نے عورت کو مذہبی امور کی ادائیگی میں شریک کیا۔ ورنہ برہمنوں نے تو اسے مذہبی معاملات سے بہت دور رکھا تھا۔

کتب:۔ ابتدا میں گوتم بدھ کی تعلیمات سینہ بسینہ چلتی رہیں۔ گوتم کی وفات کے بعد انہیں کتابوں کی صورت میں مدون کیا گیا۔ بدھ مت کے پیروؤں کے مابین مذہبی اختلافات ختم کرنے کے لئے مگدھ کے قریب ایک مقام راجگاہ میں اجتماع ہوا اور گوتم کے چیلوں نے اس موقع پر گرو کے احکامات سنائے۔ ایک شاگرد کسیاپ نے گرو کے فلسفیانہ اقوال لوگوں کے سامنے دہرائے۔ ایک اور شاگرد اوپالی نے ضابطہ ... و قوانین لوگوں کے سامنے پیش کئے۔ نیز ان حالات کی نشاندہی بھی کی جن کے تحت قوانین وضع کئے گئے تھے۔ اور سب سے مشہور شاگرد انند نے گوتم کی مختلف تقاریر کو دہرایا جو بعد میں سُت کہلائیں۔ یہ تمام امور طے کئے گئے لیکن انہیں لکھا نہ گیا۔ ۲۴۲ ق۔م میں اشوک نے انہیں ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ ابتدا میں دو حصے "ونیان پٹاک" اور "ست پٹاک" لکھے گئے۔ اول الذکر میں راہبانہ زندگی کے اصول بیان ہوئے اور موخر الذکر میں گرو کی تقاریر اور تعلیمات درج کی گئیں۔ بعدازاں تیسرا حصہ "ابی دھرم پٹاک" بھی شامل کیا گیا اور اس کتاب کا نام "تری پٹاک" رکھا گیا۔ ابتدا میں اسے پالی زبان میں لکھا گیا۔ جو اس دور کی عوامی زبان تھی۔ بعدازاں گوتم کی تعلیمات کے خلاصے کے طور پر دھم پد اس کے نام سے ایک اور کتاب لکھی گئی جو دراصل "ست پٹاک" کی تلخیص تھی۔

تاریخ:۔ ہندوستان میں برہمنوں کے مذہب نے ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری اور ذات پات کی تفریق کی وجہ سے عوام نالاں تھے۔ اس نئے مذہب کی غیر معمولی خصوصیات نے عوام کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر یہ حیرت انگیز رفتار کے ساتھ مشرق بعید میں پھیلتا چلا گیا۔ تین سو سال قبل مسیح میں یہ مذہب شمالی ہندوستان پر چھا چکا تھا۔ ہندو بادشاہ اشوک (۲۷۳ ق۔م تا ۲۳۲ ق۔م) نے بدھ مت قبول کر لیا تو اس کی سرکاری اشاعت کا آغاز ہو گیا۔ اشوک نے پتھروں اور ستونوں پر کتبے لکھوائے۔ اس وقت بہت سے راہب اور برہمن بھی شاید سرکاری اثر یا خوف کے باعث اس میں داخل ہو گئے۔ جس کی بنا پر بداعتقادیوں نے جنم لیا۔ ان کے انسداد کے لئے اشوک نے ایک کونسل طلب کی، جس میں مذہب کی تطہیر عمل میں آئی۔ اشوک نے مبلغین کی ایک جماعت بھی بھیجی، جو جنوبی ہند اور لنکا کے علاوہ جنوبی اور مشرقی ایشیا میں بدھ مت پھیلانے کا سبب بنی۔ اشوک کے بعد کنشک نے بھی اس مذہب کی اشاعت کی۔ اس نے بدھوں کی چوتھی کانفرنس منعقد کرائی، جس میں بدھ مت پر تشریحی اور تفسیری قسم کی کتابیں لکھی گئیں۔

Marfat.com

بدھ مت کے عروج کا زمانہ چھٹی سے آٹھویں صدی عیسوی تک ہے۔ اس دور میں ہندومت کی امتیازی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور ہندوستان میں ہر طرف بدھ مت ہی چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ رفتہ رفتہ برہمنوں نے اسے بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ۸۰۰ء سے ۹۰۰ء تک ایک برہمن کماریل بھٹ نے ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا۔ بدھوں پر زبردست مظالم روا رکھے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان سے بدھ مت سرے ہی سے غائب ہو گیا۔ صرف اڑیسہ بہار اور کشمیر کے علاقوں میں کہیں کہیں اس کے پیروکار موجود تھے۔ بارہویں صدی عیسوی میں اسلام کے آنے کے بعد یہ مذہب سرزمین ہندوستان سے عنقا ہو گیا۔ تاہم دیگر ممالک مثلاً تبت، چین، جاپان، اور مشرق بعید کے اکثر ممالک میں اس مذہب کو اپنایا گیا تبت میں یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی میں پہنچا چین میں یہ بہت پہلے سے موجود تھا مگر یہاں اس مذہب کی اشاعت بڑی سست رفتاری سے ہوئی۔ اس کی وجہ یہاں تاؤمت اور کنفیوشس مت کا اثر تھا۔ ایک وقت آیا کہ عوام نے تینوں مذاہب کو بیک وقت قبول کر لیا۔

چینی بدھ مت کثرت پرستی اور ابا پرستی کا شکار رہے۔ گوتم ان کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔ دیگر دیوتا ان کے آبا و اجداد ہیں۔ اگرچہ یہاں قدیم بدھ مت کے احیاء کے لیے بڑی کوششیں کی گئیں مگر اس تحریک سے سوائے ایک نئے فرقہ "ووری کیان" کے جنم لینے کے اور کچھ بھی وجود میں نہ آیا۔ یہ فرقہ سولہویں صدی میں بہت طاقتور بن گیا یہ لوگ گوتم پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر اس کی پرستش نہیں کرتے۔ گوتم کی مورتی رکھنے کے شدید مخالف ہیں۔ پاکیزگی کے حصول کا ذریعہ ان کے نزدیک صرف دھیان یا مراقبہ ہے ان کے یہاں پجاری کا وجود نہیں۔ اس میں کسی حد تک تاؤمت کے اثرات موجود ہیں۔

چین سے بدھ مت کوریا پہنچا اور ساتویں صدی کے اوائل میں یہ جاپان میں پروان چڑھا۔ شنٹو مذہب والوں کے دیوتاؤں کو انھوں نے بدھستوا کا درجہ دیا۔ مذہبی معاملات میں جاپان عرصہ تک چین کا دست نگر رہا۔ لیکن بعد ازاں خود کفیل ہو گیا۔ ۱۸۶۸ء تک بدھ مت سرکاری مذہب کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن بعد ازاں شنٹو مذہب نے یہ خصوصیت اس سے چھین لی۔

ہندوستان میں بدھ مت اب صرف بنگال کے علاقے یا نیپال وغیرہ میں موجود ہے البتہ لنکا میں اس مذہب کی جڑیں بے حد مضبوط ہیں۔ وہاں نفیس خانقاہیں تعمیر ہیں۔ بے شمار رسومات نے بھی راہ پالی ہے۔ مورت کی پرستش کا آغاز ہو گیا ہے۔ گوتم کی مورت خانقاہوں کا اہم جزو ہے۔ ان خانقاہوں کو ویرا کہتے ہیں۔ ہر ویرا میں پیپل کا ایک درخت ضرور ہوتا ہے۔ یہاں عبادت کا طریقہ یہودیوں کی طرح کا ہے۔ لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور راہب مقدس کتابیں پڑھ کر حاضرین کو سناتے ہیں۔

فرقے:۔ بدھ مت کے دو بڑے فرقے مہایان اور ہنایان ہیں۔ کنشک کے دور میں بلائی گئی کونسل سے جو مذہب وجود میں آیا اسے مہایان یعنی "بڑی گاڑی" کا نام ملا جبکہ اس کے مخالفوں یعنی قدیم بدھ مت والوں کو ہنایان یعنی "چھوٹی گاڑی" کا نام دیا جاتا ہے مہایان ایک ایسا مذہب ہے، جس میں عوام کی تکالیف کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس امر کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ بدھ مت میں انسانی جذبات کو متاثر کرنے والے امور شامل کیے جائیں۔ کیونکہ بدھ مت کے بنیادی اصول ایک فلسفی کو تو مطمئن کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے دلدادہ لوگوں کی تعداد ہر زمانے میں کم رہی ہے بدھ مت میں اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے دور دراز کے باشندے بھی اس اصلاح یافتہ مذہب میں شامل ہو گئے۔ مہایان نے بدھ مت میں خدا کے تصور کو داخل کیا۔ جس کے بارے میں انھوں نے دعوے کیا کہ وہ بدھ کی صورت میں نمودار ہوا تھا اس کی غیر مرئی صورت علم کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ علم یا بدھی بھی تین صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ پہلی دھرم کایا کہلاتی ہے، یعنی دنیا کی عارضی نمو کے پیچھے کوئی دائمی اور غیر فانی شے موجود ہے۔ لیکن دھرم کایا جب خود کو ظاہر کرنا چاہتا ہے تو کوئی نہ روپ دھار لیتا ہے، جو نرمان کایا کہلاتا ہے۔ تیسری صورت سمبھوک کایا کی ہے۔ یعنی یہ رحمت کی قوت ہے جو گوتم کے پیروؤں میں کام کرتی رہتی ہے۔ ان تینوں کو استری کایا کہا جاتا ہے۔ خدا کو انھوں نے بدھستوا کا نام دیا ہے ان کے عقیدے کی رو سے بدھستوا گوتم کے علاوہ اور بھی صورتوں میں آتا رہا ہے۔ چنانچہ جاپان کے مہایان فرقے میں اس وجہ سے کثرت پرستی نے راہ پالی ہے۔ تاہم اس کا ازالہ اخلاقی اصولوں کی صورت میں کر دیا گیا ہے مہایان نے نروان کے حصول کے بعد کی زندگی کا واضح تصور پیش کیا ہے۔ گوتم نے نروان ہی کو اصل مقصد قرار دیا تھا۔ جبکہ مہایان نے آخرت اور جزا کا تصور بھی پیش کیا ہے۔

مہایان نے صرف اخلاقی اور سماجی اصولوں ہی کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اعلیٰ دماغ اور تعلیم یافتہ طبقے کے لیے بھی تسکین کا سامان ہے۔ گوتم نے فلسفیانہ خیالات کی توضیح و تشریح کے لیے بے شمار موضوعات پر بحث کے دروازے کھول دیئے، جس کی وجہ سے مہایان فلسفہ نہایت دقیق ہو گیا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ دنیا ویسی نہیں جیسی ہمیں نظر آتی ہے۔ ایک طبقے کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ دنیا کا وجود صرف ہمارے ذہن میں ہے، خارج میں نہیں۔ چنانچہ گوتم نے وجود کی جو تین بنیادی صفات بیان کی تھیں۔ (۱) مصیبت زندگی۔ (۲) عارضی پن (۳) غیر حقیقی پن۔ ان کی جگہ یہ تین نئی صفات ۱۔ خالی پن۔ ۲۔ بے صفتی۔ ۳۔ بلا خواہش وجود۔

یہ مذہب شمالی علاقوں نیپال، تبت، چین، منچوریا، کوریا، منگولیا اور جاپان میں بے حد مقبول ہوا۔ تبتی مہایان زندہ بدھوں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے پروہت کو "لاما" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ گوتم کی روح لاما میں حلول کر گئی ہے یا گوتم بدھ ان لاماؤں کے بھیس میں بار بار جنم لیتے ہیں۔ تبتی مذہب میں ہندو دیوتاؤں کی پرستش بھی شامل ہو گئی ہے۔ چین میں مہایان نے تاؤمت اور کنفیوشس کے ساتھ اشتراک کر لیا۔ یہاں کثرت پرستی کا آغاز ہوا۔ چینی راہب عام طور پر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں بالعموم بچپن ہی میں خانقاہوں میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں انہیں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ لوگ جلوس کی صورت میں خیرات مانگنے نکلتے ہیں۔ ان کا لباس پیلے رنگ کا ہوتا ہے اور سر ہفتے میں کئی بار مونڈا جاتا ہے۔ جاپان میں مہایان سے ایک اور فرقے زین بدھی نے جنم لیا۔ اس کا دعوے ہے کہ مقدس کتابوں کے ذریعے حق تک رسائی ممکن نہیں البتہ حق و صداقت ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ اس کے جاننے کے لیے یوگ اور سادہ زندگی کی ضرورت ہے۔ وہ ہدایت کا ذریعہ وجدان کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خوشی اور رنج دونوں صورتوں میں عزت اور وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

ہنایان اس کے برعکس قدامت پسند فرقہ ہے۔ یہ جنوبی علاقوں لنکا، برما، سیام وغیرہ میں پھیلا۔ اس نے کسی حد تک گوتم کی تعلیمات کو برقرار رکھا ہے۔ یہاں راہب وہی تین کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ جن کی تعلیم گوتم نے دی تھی۔ کسی حد تک مقامی عقائد مثلاً بت پرستی وغیرہ بھی اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ نروان کے متعلق ہنایانا فرقے والوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد روح کو مکمل سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مذہب کی نمایاں خصوصیت سادگی ہے۔ سوائے چند بڑے بڑے شہروں مثلاً کولمبو

Marfat.com

کینڈی، رنگون اور بنکاک کے، ان کی خانقاہیں سادہ طرز تعمیر کی حامل ہیں۔ البتہ لنکا کے ہنایان کے ہاں نفاست اور آرائش نے جگہ پالی ہے۔ ان کی مذہبی کتابیں پالی زبان میں ہیں۔ (نیز دیکھیے "بدھ ستوا"، "بدھ"، "گوتم")

بدی برائی۔ بدخواہی۔ شر۔ متضاد اچھائی نیکی خیر اسلام نے بدی یا شر کا کوئی مستقل وجود نہیں مانا ہے بلکہ بدی چونکہ محض ان قویٰ کے غلط استعمال کا نام ہے جو اللہ تعالےٰ نے دیئے ہیں۔ اس لئے بدی اور نیکی کا خالق ایک ہی ہے۔ کیونکہ جو چیزیں اچھے استعمال کے لیے پیدا کی گئی ہیں انہی کے برُے استعمال کا نام بدی ہے۔

زرتشت کے مذہب میں بدی اور نیکی کے دو الگ الگ خالق تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے بدی کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انسان غالب نہ آسکے۔ بلکہ انسان کی ساری جدوجہد کی اصل غرض یہی ہے اور یہی اس کا نصب العین بھی ہونا چاہیئے کہ وہ بدی پر غالب آئے اور ایسے لوگوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے بدی پر غلبہ حاصل کیا۔

نیکی سے روکنے والے شیاطین بدی کو اب خوب صورت کرکے بتاتے ہیں کہ بدکار سمجھتے ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں اور جب انسان بدی میں بہت زیادہ مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اسے اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح نور فطرت بالکل دب جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "ان کے دلوں پر اس نے زنگ لگا دیا ہے جو وہ کام کرتے تھے۔" (۸۳:۱۴) پس انسان کے اپنے عمل جس طرح دل پر زنگ لگاتے ہیں، مہر بھی کر دیتے ہیں۔ زنگ کا لگنا پہلا درجہ ہے اور مہر لگ جانا آخری درجہ۔ آنحضورؐ نے فرمایا "جب بندہ گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ داغ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرے تو اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ اور گناہ کرتا چلا جائے تو وہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ (ترمذی)

گویا وہ روشنی جو اللہ تعالےٰ نے اس کے اندر رکھی تھی بدی کے سبب بالکل دب جاتی ہے۔ اگرچہ یہ بات ضرور ہے کہ بدی میں خواہ انسان کو کتنا ہی لطف اور حظ کیوں نہ ملے فطرت صحیحہ اسے ملامت کرتی رہتی ہے اور خواہ یہ فطرت صحیحہ بدی کے غلبہ سے کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو گئی ہو۔

بدی کے نتائج جب انسان کے سامنے آئیں گے تو اس وقت وہ شخص گویا قرآن کی اس آیت کا مصداق ہوگا: "یقیناً تو اس سے غفلت میں تھا تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے ہٹا دیا پس تیری نگاہ آج تیز ہے۔" (۵۰:۲۲) اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ نتائج بد تو یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں مگر انسان کی آنکھوں پر ایک پردہ پڑا رہتا ہے اور وہ لذات دنیا میں مشغول ہونے کی وجہ سے انہیں نہیں دیکھتا۔

بدی کی سزا کے متعلق اللہ تعالےٰ کا قانون یہ ہے کہ جب وہ کچھ نیکیوں کیساتھ ملی رہتی ہے اس وقت تک کھلے طور پر بدی کی سزا ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک قوم کی کثرت بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے نتائج کھلے رنگ میں بھی ظاہر ہو جاتے ہیں اس قوم کی تباہی لازمی ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ایسی بہت سی قوموں کا ذکر موجود ہے جنہیں اپنی بدکاریوں کی وجہ سے تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ قرآن مجید نے بدی کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اسے دور کرنے کے لئے بہترین طریق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ (۲۳:۹۶)، اور یہ بہترین طریق بعض اوقات بالمقابل نیکی کا اختیار کرنا ہے اور بعض اوقات صرف بدی سے درگذر کرنا۔ اسی طرح بعض اوقات اس پر ملامت کرنا اور بعض اوقات اس کی سزا دینا ہے۔ (نیز دیکھیے "شر"، "گناہ")

بدیعُ :۔ اللہ تعالےٰ کے پاک ناموں میں سے ایک (دیکھیے "اسماء الحسنیٰ")

بدیع الدین شاہ مدارؒ (۱۵/۱۵/ ۱۳۱۵ء۔ ۱۰ رجمادی الاوّل ۸۴۴ھ، ۷ راکتوبر ۱۴۴۰ء) شاہ مدار بدیع الدین قطب المدار بن سید علی، ہندوستان کے ایک مشہور ولی، حلب میں پیدا ہوئے۔ ان کے نسب میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ کی اولاد میں سے تھے اور بعض انہیں یہودی النسل بتاتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک وہ امام محمد باقرؒ کی نسل سے تھے۔ ان کی تعلیم بڑے اچھے طریقے سے کی گئی۔ ان کے متعدد مرشد تھے جن میں سے شام کے صوفی طیغور الدین بھی تھے۔

شاہ مدار نے ایک دنیا کی سیر و سیاحت کی۔ کئی بار حج کئے۔ ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے بغداد، نجف اور کاظمین کی زیارت کی۔ انہوں نے کانپور سے چالیس میل دور مکن پور نامی گاؤں میں سکونت اختیار کی اور یہیں وفات پائی۔

شاہ مدار بہت ہی خوب صورت تھے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رکھتے تھے جونپور کا سلطان ابراہیم شاہ ان کی بڑی عزت و احترام کرتا تھا۔ اس نے ان کی قبر پر نہایت شاندار مزار تعمیر کرایا۔ عرس کے موقع پر عقیدت مند پیدل چل کر آتے ہیں اور لمبے لمبے بانسوں پر رنگ برنگے کپڑے اور رومال وغیرہ باندھ کر لاتے ہیں انہیں شاہ مدار کی چھڑیاں کہا جاتا ہے۔ ان کے پیرو مداری کہلاتے ہیں۔ اور پاک و ہند کے دیہات و قصبات میں اپنے شعبدے وغیرہ دکھاتے پھرتے ہیں

بُدیلؓ بن ورقا (وفات ۱۰ھ/ ۶۳۱ء) صحابی۔ قبیلہ بنو خزاعہ کے سردار تھے، جو مکہ معظمہ کے نزدیک سکونت رکھتا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کے حلیف تھے۔ اور کفاران قریش کے منصوبوں سے مسلمانوں کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ جب آنحضورؐ عمرے کے ارادے سے مکہ تشریف لائے تو قریش نے احابیش کے اجتماع میں اعلان کیا کہ آپؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک لشکر تیار کیا۔ اس موقع پر بدیل اپنے چند رفقاء کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر آئے اور قریش کے منصوبوں سے آپؐ کو آگاہ کیا۔ آنحضورؐ نے ان کے ذریعے قریش کو پیغام بھجوایا کہ مسلمان جنگ کے لئے نہیں آئے محض عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں اور اس کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے آنحضورؐ کا یہ پیغام قریش کو پہنچا دیا اور اس کے بعد کچھ سفیروں کے تبادلے ہوئے اور آخر صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا گیا۔

فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں بدیلؓ نے اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام کے وقت بدیلؓ کی عمر ستانوے سال کی تھی۔ لیکن بال سیاہ تھے۔ آنحضورؐ نے انہیں دعا دی کہ خدا تمہارے جمال اور بالوں کی سیاہی میں ترقی دے۔

بدیلؓ ایک اچھے سیاستدان اور مدبر تھے۔ شروع ہی سے آنحضورؐ کے

Marfat.com

حلیف رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے بدیلؓ کے گھر کو بھی امان کا مقام قرار دیا فتح مکہ کے بعد بدیلؓ نے غزوہ حنین میں شرکت کی اور اس موقع پر مال غنیمت اور مشرک قیدیوں کی نگرانی انھی کے سپرد ہوئی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر وہ آنحضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ اور آپؐ کے ارشاد کے مطابق منیٰ میں روزہ نہ رکھنے کا اعلان کرتے پھر رہے تھے۔

حضرت بدیلؓ کو آنحضورؐ نے ایک خط بھی تحریر فرمایا تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

انھوں نے آنحضورؐ کے وصال سے قبل وفات پائی۔ اولاد میں عبداللہؓ نافعؓ اور ایک تیسرا بیٹا تھا جو حضرت عثمانؓ کے محاصرین میں شامل تھا۔ ان سے تین احادیث روایت کی جاتی ہیں۔

بڈشاہ (دورِ حکومت ۸۲۲ھ/۱۴۲۰ء - ۸۷۲ھ/۱۴۷۰ء) زین العابدین شاہرخ مرزا بڈشاہ یعنی بڑا بادشاہ کشمیر میں شاہ میری سلاطین کا آٹھواں حکمران، والد کا نام سلطان سکندر تھا۔ نوجوانی میں مولانا کبیر شاہی خان سے تفسیر اور حدیث پڑھی۔ ۱۳۹۹ء میں جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ اپنے والد کی طرف سے تیمور کی خدمت میں تحفے تحائف لے کر حاضر ہوا اور اس کے ساتھ ہی سمرقند چلا گیا۔

وہاں سات سال بسر کرنے کے بعد واپس لوٹا۔ ۸۱۹ھ/۱۴۱۷ء میں اپنے بڑے بھائی علی شاہ کا وزیر اعظم بنا۔ ۸۲۱ھ/۱۴۱۹ء میں اس نے علی شاہ سے حکومت چھین لی علی شاہ نے اپنے خسر (جموں کے راجہ) سے مل کر کشمیر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اوڑی کے مقام پر بڈشاہ نے اسے شکست فاش دی اور باقاعدہ طور پر تخت نشین ہو گیا بڈشاہ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد خان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ اور اس کی وفات کے بعد اپنے بیٹے حیدر خان کو وزیر اعظم بنایا۔ اس کی سلطنت پشاور سے سرہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے دہلی کو فتح کرنے کی بھی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ۱۴۶۰ء اور ۱۴۷۰ء کے درمیانی عرصہ میں اس نے کاشغر، لداخ، سکردو اور کلّو کے علاقے فتح کیے وہ پنجاب کو فتح کرنے کے دوران میں امرتسر بھی ٹھہرا۔ باون سال حکومت کرنے کے بعد اس نے وفات پائی۔ اس کا مزار قبرستان سلاطین سری نگر میں ہے

ابوالفضل لکھتا ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے تک کا علاقہ بڈشاہ کے زیر اثر تھا۔ اس کی فوج ایک لاکھ پیدل اور تیس ہزار سوار افراد پر مشتمل تھی۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ایک ضابطہ قانون بنایا اور خاص خاص قوانین پیتل کی تختیوں پر کندہ کروا کر مختلف شہروں اور دیہات میں لگوا دیئے۔ اسے عمارتیں، باغات اور پل بنانے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے جامع مسجد بارہ مولا، جامع مسجد سری نگر مسجد کاڈہ یار، جامع مسجد نوشہرہ، خانقاہ چرار شریف، خانقاہ برخوردار سری نگر خانقاہ شیخ العالم خانقاہ سید مدنی، باغ زینہ گر، باغ نوشہرہ، باغ زینہ پور، باغ زینہ کوٹ وغیرہ اور پلوں میں زینہ کدل، پل نالہ مار، بڈشاہی ہفت پل وغیرہ تعمیر کرائے۔

ویری ناگ پر اس نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کرائی جو زینہ لنکا کے نام سے مشہور ہے۔ نوشہرہ میں بارہ منزلہ دربار عام بنوایا جسے زینہ دب کہتے ہیں۔

اس کے بیرونی ممالک سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن میں خراسان، ترکستان آذربائیجان، گیلان، سیستان، ترکی، مصر، دکن، مالوہ، خاندیش، گجرات اور سندھ شامل ہیں۔

بڈشاہ علم دوست بادشاہ تھا۔ فارسی، تبتی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ اس کا ایک بڑا ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس نے دارالحکومت میں ایک بہت بڑا دارالعلوم قائم کیا، جس میں دوسرے ممالک کے طلبا تعلیم پاتے تھے

اگرچہ بڈشاہ ایک نرم دل بادشاہ تھا لیکن قانون کے معاملے میں وہ اپنے بیٹے اور بھائی سے بھی رعایت نہ کرتا تھا۔ اس نے غلاموں کو داغنے کا رواج ختم کرایا غیر مسلموں سے بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اس نے وہ تمام قوانین، جو ہندوؤں کے خلاف تھے منسوخ کر دیئے۔ ہندوؤں سے جزیہ لینا بھی بند کر دیا۔ اس نے ہندو پنڈتوں کے وظائف مقرر کیے۔ ہندوؤں کی دلجوئی کی خاطر گاؤکشی بھی بند کرادی۔ کئی پرانے مندروں کی مرمت کرائی۔ ہندوؤں سے عہد لیا کہ اپنے مذہبی قوانین کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ان کے لیے ہندو عدالتیں قائم کیں۔ ہندوؤں کی کتابوں کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اسی وجہ سے اسے ہندی میں بڑشاہ (ہندوؤں کا بادشاہ) بھی کہا جاتا ہے۔

روایت ہے کہ اس نے کئی مرتبہ زینہ لنکا میں چلہ کشی کی اور لوگوں کو کشف و کرامات دکھائے۔ اکثر لوگ اسے ولی سمجھتے تھے۔ اس کی نگاہ کبھی کسی نامحرم عورت پر نہ پڑی تھی اور وہ شاہی خزانے سے کچھ نہ لیتا تھا۔ عوام کے حالات کا پتا لگانے کے لیے راتوں کو بھیس بدل کر شہر میں گھوما کرتا تھا۔

بڈشاہ کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سے اولاد نرینہ نہ تھی۔ دوسری بیوی سے چار بیٹے تھے۔ اس کے بعد حاجی خان سلطان حیدر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

بَرّ: اللہ تعالیٰ کے ننانوے پاک ناموں میں سے ایک (دیکھیے "اسماء الحسنیٰ")۔

براءؓ بن عازب (۱۳ قبل ہجری/۶۱۰ء - ذی قعدہ ۷۲ھ/مارچ ۶۹۲ء) صحابی کنیت ابو عمارہ، بنو حارثہ سے تعلق تھا۔ مدینہ میں اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر اور احد میں کم عمری کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے لیکن ان کے بعد تقریباً پندرہ غزوات میں اور دیگر اسلامی جنگوں میں بھی شرکت کی۔ رے اور قزوین کو انھی نے اسلامی مقبوضات میں شامل کیا۔ مسلمانوں کے مابین ہونے والی جنگوں میں انھوں نے حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں شرکت کی۔

آخر عمر میں کوفہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ اس دوران میں ان کی بینائی جاتی رہی۔ کوفے میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے تھے جو کوفہ کے محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔

براءؓ بن مالک (وفات ۲۰ھ/۶۴۰ء) صحابی رسولؐ۔ حضرت انسؓ بن مالک کے بھائی تھے۔ ہجرت سے پیشتر اسلام قبول کیا۔ غزوہ بدر کے سوا ہر غزوے میں شریک ہوئے۔ صلح حدیبیہ میں بیعت رضوان کے موقع پر آنحضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جنگ یمامہ میں (جو مسیلمہ کذاب کے ساتھ ہوئی تھی) انھوں نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ جنگ کے دوران میں انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے اس باغ میں پھینک دو جس میں مسیلمہ محصور ہو کر لڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دشمنوں کی صفوں میں جا گھسے۔ سخت حملہ کیا۔ اور بہادری سے لڑتے ہوئے باغ کا دروازہ کھول دیا اس طرح مسلمان باغ میں داخل ہو گئے۔ اس روز ان کے جسم پر اسی سے زائد زخم آئے اور حضرت خالدؓ بن ولید ایک ماہ تک ان کے زخموں کی مرہم پٹی

Marfat.com

کرتے رہے۔ اور بالآخر شفا پائی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جب عمر فاروقؓ کے حکم کے مطابق لشکر لے کر بصرہ کے محاذ پر گئے تو براءؓ بھی اس لشکر میں شامل تھا۔ عراق میں معرکۂ حریق میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے۔ ۲۰ھ میں تستر (فارس) کے محاصرے کے دوران میں انہوں نے اسلامی لشکر کے میمنہ (دائیں بازو) کی قیادت کی جب مسلمانوں نے سرنگ کے ذریعے شہر میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا تو حضرت براءؓ حضرت مجزاۃؓ کو ساتھ لیے ہوئے شہر کے وسط میں جا نکلے موخرالذکر کو تو دشمنوں نے نکلتے ہی ایک پتھر مار کر شہید کر دیا لیکن انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تقریباً ۱۸۰ کافروں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد شہید ہوئے۔

حضرت براءؓ آنحضورؐ کے صحابۂ خاص میں سے تھے۔ ہر وقت کی صحبت کے باعث سینکڑوں احادیث سننے کا موقع ملا تھا۔ مختلف کتب حدیث میں ان سے کئی احادیث روایت ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی بہادری کے سبب انہیں "اسد" کا خطاب دیا تھا۔

براءؓ بن معرور صحابیٔ رسولؐ۔ ابوبشر کنیت۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ اور رئیسِ قبیلہ تھے۔ آنحضورؐ نے ان کو بنوسلمہ کا نقیب مقرر فرمایا۔ ۶۲۲ء میں حج کے موقع پر جو بہتر انصار آنحضورؐ کی بیعت کرنے آئے تھے، ان میں سے سب سے زیادہ معمر یہی تھے۔ ان سب کی طرف سے آنحضورؐ کی حفاظت و نصرت کا عہد انہوں نے ہی کیا تھا۔ یہ پہلے ہی سے خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بعد میں آنحضورؐ کے ارشاد کے مطابق بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ مرنے سے پہلے وصیت کی کہ میری میت قبلہ رخ رکھنا۔ آنحضورؐ کی ہجرت مدینہ سے ایک ماہ پہلے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ہجرت کے بعد آنحضورؐ نے ان کی قبر پر صحابہ کی معیت میں دعائے مغفرت کی۔ اور ان کے بیٹے حضرت بشرؓ کو جو بدری صحابی تھے ان کی جگہ بنوسلمہ کا سردار نامزد فرمایا۔ حضرت براءؓ نے وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرے مال کا تیسرا حصہ رسول اللہؐ جس طرح چاہیں استعمال میں لائیں۔ چنانچہ آنحضورؐ نے وہ مال ان کے وارثوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کے بھائی قیسؓ بن معرور بھی صحابی تھے۔

براءۃ آزاد ہونا۔ بیزاری کا اظہار کرنا۔ بری ہونا۔ کسی ذمہ داری اور پابندی سے سبکدوش ہو جانا۔ نیز قرآن مجید کی نویں سورت کا نام بھی ہے جسے "سورۃ التوبہ" بھی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ تین مرتبہ آیا ہے "اعلان براءۃ ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان مشرکین کیلئے، جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔" (۹:۱) یہ اعلان اس وقت نازل ہوا جب آنحضورؐ حضرت ابوبکرؓ کو حج کے لئے روانہ کر چکے تھے۔ ان کے پیچھے جب یہ فرمان نازل ہوا تو صحابہ کرام نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اسے ابوبکرؓ کو بھیج دیجئے۔ تاکہ وہ حج میں اس کو سنا دیں لیکن آپؐ نے فرمایا کہ اس اہم معاملے کا اعلان میری طرف سے میرے ہی گھر کے کسی آدمی کو کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس خدمت پر مامور کیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمادی کہ حاجیوں کے مجمع عام میں اسے سنانے کے بعد حسب ذیل چار باتوں کا اعلان بھی کر دیں ۱۔ جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دینِ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔ ۲۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہ آئے۔ ۳۔ بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔ ۴۔ جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کا معاہدہ باقی ہے یعنی جو نقضِ عہد کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ان کے ساتھ مدت معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔ قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہوا۔

"کیا تمہارے کفار کچھ ان لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لئے کوئی براءۃ (معافی) لکھی ہوئی ہے۔" (۵۴:۴۳)

اسی طرح سورۃ الممتحنہ میں ہے۔ "ہم تم سے اور ان سے، جن کی تم عبادت کرتے ہو، براءۃ کرتے ہیں (یعنی بیزار ہیں)" (۶۰:۴) (نیز دیکھئے "سورۃ توبہ")

بُراق شب معراج میں آنحضورؐ کی سواری۔ قرآن مجید کی آیت کے ضمن میں مفسرین نے بُراق کا ذکر کیا ہے۔

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی۔ تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے (۱۷:۱) کے ضمن میں مفسرین نے براق کا ذکر کیا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے اس سواری کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ایک جانور ہے جو خچر سے کچھ چھوٹا اور گدھے سے ذرا بڑا سفید رنگ کا تھا اس کا نام براق تھا۔ اس کا ایک ایک قدم حدِ نظر تک رکھا جاتا تھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح)

اس کی مزید تفصیل یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کا رنگ سفید تھا یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ لمبا تھا (مسلم) اس کے کان لمبے تھے۔ (ابن سعد) اس کے دو پر تھے۔ (مجمع البحار)

بعض احادیث میں ہے کہ جب آنحضورؐ اس پر سوار ہونے لگے تو جبرائیلؑ نے فرمایا کہ اے براق بخدا ایسا بلند مرتبت انسان تجھ پر کبھی سوار نہیں ہوا آنحضورؐ سے قبل دوسرے انبیاء نے بھی اس پر سواری کی ہے۔

بہت سے مصوروں نے اس کی تصویر کشی کی ہے اور بالآخر اس کو ایک پری نما گھوڑے کی شکل دے دی گئی۔

براکلمان (۱۸۶۸ء۔۱۹۵۶ء) جرمنی کا مشہور مستشرق، روسٹوک میں پیدا ہوا اس کی شہرت اس کی جرمن کتاب "تاریخ ادب عربی" کی وجہ سے ہے، جس کا عربی ترجمہ عبدالحلیم النجار مصری نے ۱۹۵۹ء میں مصر سے شائع کیا۔ نیز اس نے "طبقات الکبیر" کی تین جلدیں ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۷ء مرتب کر کے شائع کرائیں اسی طرح اس نے تیس کے قریب اسلامی کتب مرتب اور مدون کر کے شائع کیں ان میں زکریا رازی کے پچانوے رسائل۔ ابن اثیر کی کتاب کامل اور طبری کی تاریخ ملوک کے تعلق پر مقالہ، دیوان لبید، ابن جوزی کی کتابیں، ابن حزم کی "طوق الحمامہ" استنبول، پیٹروگراڈ، آیاصوفیا، برسلاؤ اور ہیمبرگ جیسے شہروں کے کتب خانوں کی فہرستیں اور تاریخ الشعوب والدول الاسلامیہ (پانچ جلدوں میں) شائع کیں۔ اس نے لائڈن سے چھپنے والے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں بھی ایک سے زیادہ مقالات لکھے۔ نیز اس نے برسلاؤ، برلن، کونزبرگ اور ہالہ کی یونیورسٹیوں میں بھی کام کیا۔ بہت سے جدید محققین اور مصنفین نے اس کی مطبوعات سے

Marfat.com

قائمہ اٹھایا ہے

برامکہ بنی برمک۔ مشہور ایرانی خاندان جس کے افراد سلطنت عباسیہ کے ابتدائی دور میں کاتب اور وزیر رہے۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ بلخ کے آتشکدہ نوبہار کا متولی برمک تھا۔ اس کا بیٹا خالد برمکی عالم و فاضل، دانا، مدبر، اولوالعزم اور بہادر تھا۔ عباسی تحریک کو اس سے بہت تقویت ملی۔ پہلی صدی ہجری میں نوبہار اور اس کے بڑے پجاریوں کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ نوبہار پر امیر معاویہ کے زمانے میں حملہ کیا گیا۔ ۱۰۷ھ/۷۲۵ء میں خلیفہ ہشام کے عہد میں برمک کی کوشش سے اسے دوبارہ بسایا گیا۔ بعض کے نزدیک برمک نے اسی دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ بعد میں اس کے بیٹے خراسان سے عراق چلے گئے اور بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ خالد اور اس کے بھائیوں سلیمان اور الحسن نے یہیں اسلام قبول کیا۔

خالد بن برمک:۔ خالد کے ابتدائی حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔ سب سے پہلے عباسی تحریک کے سلسلے میں اس کا نام آتا ہے۔ خلیفہ السفاح کے عہد میں اسے وزیر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ خلیفہ کی نظروں میں اس کا مرتبہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی بیٹی کو خلیفہ کی بیوی نے اور خلیفہ کی بیٹی کو اس کی بیوی نے دودھ پلایا۔ خالد کو فارس کا گورنر بھی مقرر کیا گیا۔ جہاں وہ دو سال تک مقیم رہا۔ اس کے بعد اسے طبرستان کا والی مقرر کیا گیا اور تقریباً سات سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے نام کے سکے بھی ملتے ہیں جو تقریباً ۱۵۰ھ/۷۶۷ء اور ۱۵۴ھ/۷۷۱ء کے ہیں اس نے قلعہ اُستونا وند پر جو ماوند کے قریب ہے، قبضہ کر لیا۔ اور وہاں ایک شہر منصورہ بسایا۔ خالد کو موصل کے صوبے کا والی بھی بنایا گیا۔ سمالو کے محاصرے میں بھی اس نے اور اس کے بیٹے یحیٰ نے بڑا نام پیدا کیا۔ ۱۶۵ھ/۷۸۲ء میں پچھتر سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(۲) یحیٰ برمکی:۔ اس نے بھی حسن قابلیت سے دربار میں بہت رسوخ حاصل کر لیا تھا مہدی نے اسے اپنے بیٹے ہارون کا اتالیق بنایا۔ جب ہارون الرشید تخت نشین ہوا تو اس نے وزارت کے لئے یحیٰ بن خالد کا انتخاب کیا۔ وہ شروع ہی سے اپنے والد کا نائب رہا۔ ۱۵۸ھ/۷۷۵ء میں آذربائیجان کا والی مقرر ہوا۔ مہدی کے آغاز خلافت تک اپنے والد ہی کے ساتھ علاقہ فارس میں رہا۔ ۱۶۱ھ/۷۷۸ء میں ہارون کے زمانہ شہزادگی میں اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ الہادی کا خیال تھا کہ یحیٰ ہارون کا طرفدار ہے اور اسے تخت سے دستبردار نہ ہونے پر اکساتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس نے یحیٰ کو قید کرا کے موت کے گھاٹ اتار دینے کا حکم دیا۔ جس رات اسے سزائے موت ملنے والی تھی اسی رات الہادی اپنے محل میں مُردہ پایا گیا۔ ہارون نے تخت نشین ہوتے ہی امور سلطنت کا انتظام اس کے سپرد کر دیا اور وزیر کا لقب دیا۔ اس نے اپنے دو بیٹوں کو بھی اپنے انتظامی اور سرکاری فرائض میں شامل کر لیا۔ یحیٰ اس عہدے پر ۱۷۰ھ/۷۸۶ء سے ۱۸۷ھ/۸۰۳ء تک فائز رہا۔ اس دوران میں وہ حقیقت وہ حکومت کے تمام اداروں کا سربراہ رہا۔ اس کا تعلق ہارون سے اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس نے اپنی ذاتی مہر بھی اس کے حوالے کر دی تھی۔ یحیٰ کے چار بیٹے تھے فضل، جعفر، موسیٰ اور محمد۔ موخر الذکر دو بیٹوں کا کوئی کارنامہ قابل ذکر نہیں ہے۔ تاہم فضل اور جعفر خاصی اہمیت رکھتے ہیں:۔

(۳) فضل برمکی:۔ ہارون کا رضاعی بھائی تھا۔ ہارون نے اسے متعدد عہدوں پر فائز کیا۔ ۱۷۶ھ/۷۹۲ء میں یا اس سے کچھ عرصہ قبل اسے ایران کے مغربی صوبوں کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ بعد میں خراسان کا والی بنایا گیا۔ اس نے کابل کے علاقے میں امن و امان قائم کیا اور ایک مقامی لشکر بھرتی کیا جس کا ایک حصہ بغداد بھیجا۔

۱۸۱ھ/۷۹۷ء میں جب اس کا باپ حج کے لئے گیا تو اس کی عدم موجودگی میں سلطنت کا انتظام اسی کے سپرد ہوا۔ ہارون نے اسے امین کا معلم بھی مقرر کیا فضل کی شہرت جس رفتار سے بام عروج کو پہنچی اسی رفتار سے وہ خلیفہ کے التفات سے محروم ہو گیا۔ ہارون اس سے اتنا ناراض ہوا کہ تمام عہدے اس سے چھین لئے۔

(۴) جعفر برمکی:۔ غیر معمولی قابلیت اور کمالات کے باعث اپنے تمام بھائیوں سے برتر تھا۔ ہارون کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ۱۷۶ھ/۷۹۲ء میں وہ مغربی صوبوں کا والی بنا۔ خراسان کا عارضی طور پر گورنر مقرر کیا گیا۔ خلیفہ کے ذاتی محافظ دستے کا سردار بنایا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاک اور ٹکسال کے محکمے بھی اسی کے سپرد ہوئے۔ اسے المامون کا اتالیق بھی مقرر کیا گیا۔ وہ خلیفہ کا منظورِ نظر بھی تھا۔

۱۸۶ھ/۸۰۲ء میں جب خلیفہ حج کر کے واپس آیا تو اس نے برامکہ کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ یکم صفر ۱۸۷ھ/۲۸ جنوری ۸۰۳ء کی رات کو جعفر کو قتل کرا دیا گیا اور اس کی لاش کافی عرصہ تک بغداد میں منظر عام پر لٹکتی رہی۔ یحیٰ کو بھی نظر بند کر دیا گیا۔ بعد میں اسے بھی الرقہ میں قیدی کی حیثیت میں اس کے دوسرے بیٹوں کے پاس جہاں وہ قید تھے بھیج دیا گیا۔ اور اسی قید میں ۱۹۰ھ/۸۰۵ء میں یحیٰ نے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ۱۹۳ھ/۸۰۸ء میں الفضل نے پینتالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور الفضل اور اس کے بھائیوں کو قید کر لیا گیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔

برامکہ نے یہاں تک عروج حاصل کیا کہ وہ سلطنت کے سارے نظم و نسق پر چھا گئے۔ اہل علم اور ارباب کمال کے لئے خزانے کا منہ کھول دیا۔ اور رعایا ان پر جان چھڑکنے لگی۔ جب ہارون کی حیثیت صرف ایک کٹھ پتلی کی ہو گئی تو برامکہ نے پر پرزے نکالے وہ اس حد تک خودسر ہو گئے کہ خلیفہ کے احکام کو بھی بالائے طاق رکھنے لگے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہارون کو ضرورت کے لئے خزانہ سے معمولی رقم بھی ملنا مشکل ہو گئی۔ ان تمام باتوں کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ برامکہ کو عباسیوں کے حریف ائمۂ اہل بیت کے ساتھ عقیدت تھی۔ اور وہ ان سے ایسا سلوک کرنے لگے جو عباسی سیاست کے لئے نقصان دہ تھی۔

برامکہ نے حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر اپنے ہی خاندان کو مامور کر دیا تھا۔ اس وجہ سے رعایا انہی کو بادشاہ سمجھنے لگی تھی۔ اس وجہ سے ہارون کے دل میں سخت بدگمانی پیدا ہوئی۔ ان وجوہات کی بناء پر برامکہ زوال پذیر ہو گئے۔

براؤن، ای جی (۷ فروری ۱۸۶۲ء - ۵ جنوری ۱۹۲۶ء) ایڈورڈ گرینول براؤن، صفِ اوّل کا مستشرق۔ ۱۸۸۴ء میں طب کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ اسلامی ادبیات سے شغف ہونے کی بنا پر فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کی تحصیل کی۔ ۱۸۸۲ء میں وہ السنہ شرقیہ میں اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد بارتھولومیوز کے ہسپتال میں طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے چلا گیا۔ یہاں سے کیمبرج یونیورسٹی نے اُسے عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے بلا لیا۔ تو اس نے طب کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ ۱۸۸۷ء میں وہ ایران آیا اور کامل ایک برس تک یہاں رہ کر مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران" لکھی اس سال کی سرگزشت بھی "ایک سال ایرانیوں کے ساتھ" کے نام سے

Marfat.com

لکھی۔ دوسری کتابوں میں "انقلاب ایران" ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک کے ایران کی سرگزشت ہے۔ "ایران جدید میں پریس اور شاعری" میں آزادی پسند شعراء کا کلام ہے۔ بابی مذہب کی کتاب "مقالہ سیاح" کا متن اور ترجمہ اس نے ۱۸۹۱ء میں شائع کرایا۔ اسی طرح میرزا حسین ہمدانی کی کتاب "تاریخ جدید" کا ترجمہ ۱۸۹۳ء میں اور میرزا جانی کاشانی کی کتاب "نقطۃ الکاف" کا متن ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔ ان کے علاوہ تذکرۃ الشعراء (۱۹۰۵ء) "تاریخ طبرستان (۱۹۰۵ء)" "تذکرہ لباب الالباب" (۱۹۰۳ء) کے متن شائع کیے۔ ۱۹۱۹ء میں نظامی عروضی سمرقندی کے "چہار مقالہ" کا ترجمہ شائع کرایا۔ فارسی کے بعض نامور شعراء کے منتخب کلام کا ترجمہ "بیاض فارس" کے نام سے ۱۹۲۷ء میں شائع کیا۔

ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۰۴ء میں اپنے دوست ای جی گب کی یاد میں "گب میموریل ٹرسٹ" قائم کیا۔ ٹرسٹ کے زیر اہتمام متعدد ضخیم کتابیں اور تراجم شائع کیے۔ اس کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر گیارہ اقوام کے مستشرقین نے اپنے محققانہ مضامین کا مجموعہ "عجب نامہ" مرتب کر کے ۷ فروری ۱۹۲۲ء کو براؤن کے نام معنون کیا۔

براہوئی۔ پاکستان میں قلات ڈویژن کے باشندے، جو براہوئی زبان بولتے ہیں۔ یہ تیس سے کچھ زیادہ قبائل پر مشتمل ہیں یہ خود کو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ گوجر اقبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ چونکہ براہوئی کے لفظی معنی پہاڑی آدمی کے بھی ہیں، اس لیے کچھ لوگوں کے نزدیک یہ نام محض علاقائی نسبت سے ان قبائل کو دیا گیا ہے۔ اکثر مورخین نے انھیں کرد، ایرانی گوجر، ترک مغول اور بلوچ بتایا ہے۔ گریرسن کے نزدیک چونکہ ان کی زبان دراوڑی ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ یہیں کے مستقل باشندے یعنی دراوڑی ہی ہوں۔ ان قبائل میں رئیسانی، شاہوانی، رند، مری بگٹی، لونشیروانی، مینگل، بزنجو، مگسی، دیناری اور زہری مشہور ہیں۔

براہوئیوں کی معاشرتی تنظیم طبقہ وار ہے۔ یعنی سب سے پہلے خاندان (پرا) کی تشکیل ہوتی ہے، جس کا سربراہ آمر مطلق ہوتا ہے۔ جب بہت سے خاندان مل کر رہیں تو وہ برادری (شلوار) کی تشکیل کرتے ہیں برادری کا قائد مقتدر ہوتا ہے۔ بہت سی برادریوں کے اجتماع کو ٹھکر کہا جاتا ہے اور اس کے قائد کو سردار کہا جاتا ہے۔ اس طرح ایک قبیلہ ٹھکروں، شلواروں اور پروں کی طبقاتی تنظیم کے طور پر تشکیل پاتا ہے۔ اپنے اسی اٹل معاشرتی نظام کی وجہ سے براہوئی معاشرہ شکست و ریخت سے بچا رہا ہے۔

براہوئیوں کا معاشرتی نظام نو اصولوں پر مبنی ہے۔ (۱) انتقام لینا (۲) پناہ گزین کی حفاظت کرنا (۳) امانت داری (۴) مہمان نوازی (۵) عورت یا بچے کو مارنے سے اجتناب (۶) مجرم کو اس کے قبیلے کی عورت کی سفارش پر معاف کر دینا۔ (۷) کسی بزرگ کے مزار پر کسی کو نہ مارنا (۸) کوئی عورت قرآن مجید سر پر رکھ کر یا ملا یا سید آجائے تو لڑائی بند کر دینا۔ (۹) سیاہ کار مرد و عورت کو قتل کر دینا وغیرہ۔ اس نظام میں عورت کی توقیر ایک خاص مقام تک کی جاتی ہے عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔

اسلام سے قبل براہوئیوں کا مذہب مظاہر پرستی تھا، جن میں آتش پرستی قابل ذکر ہے۔ یہ لوگ انتہائی مذہب پرست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو قرآن مجید کی بے حد عزت و توقیر کرنے لگے۔

جس دور میں منگولوں کی یلغاریں اپنے عروج پر تھیں براہوئی قبائل نے خود کو متحد کر کے ایک "میر" کے ماتحت کر دیا۔ پہلا میر، میر قمبرانی تھا۔ جس نے نہ صرف قبائلی تنظیم اندر دستور برقرار رکھا اور اسے مستحکم بنایا بلکہ جاٹوں کے ساتھ لڑ کر ان کے بہت سے علاقے بھی چھین لیے۔ اس وقت سے لے کر ۱۶۲۶ء تک کی براہوئی تاریخ بہت الجھی ہوئی ہے۔ اس عرصے میں کم و بیش چار میر مشہور ہیں۔ میرو، عمر، بجار اور حسن۔ یہی لوگ ریاست قلات کو تشکیل کرنے والے تھے۔

۱۶۶۶ء سے میر احمد خاں اول کی زیر قیادت ریاست قلات کا دوسرا مستحکم دور شروع ہوا۔ میر نصیر خان اول (۱۷۴۹ء — ۱۷۹۴ء) کے دور میں یہ ریاست اپنے عروج پر تھی۔ اس نے خانی نظام کو فروغ دیا۔ جس میں میر کے ماتحت محض چند خان ہوتے تھے۔ جو کئی قبیلوں کے حکمران ہوا کرتے تھے۔ یہ میر بلوچوں میں اتنا مقبول ہوا کہ آج تک اسے ولی اور بزرگ سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۱۷ء سے بلوچستان پر انگریزوں کا قبضہ ہونا شروع ہوا تو محراب خان دوم براہوئیوں کا پہلا شہید بنا۔ انگریزوں نے قلات پر قبضہ کرنا چاہا، مگر عوام کی مخالفت ہمیشہ ان کی مدافعت کرتی رہی۔ تاہم میر محمود خاں دوم کے دور تک انگریزی اقتدار اس علاقے پر چھا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں سر شمس شاہ میر محمود خاں دوم وزیر اعظم بنا۔ اس کے خلاف سردار محمد خاں گرگناڑی، سردار محمد خاں بزرک زئی، سر بدار نورالدین مینگل اور سردار سلطان محمد نے بغاوت کر دی۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے نورالدین مینگل کو گرفتار کر لیا تو یہ تحریک بظاہر ختم ہو گئی اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس تیزی سے ابھری کہ انگریزوں نے مجبور ہو کر سردار نورالدین کو رہا کر دیا۔ ۱۹۳۳ء سے میر احمد یار خان ریاست کے خان ہوئے اور انھوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۴۷ء سے اس علاقے پر توجہ دی گئی۔ کراچی سے کوئٹہ تک خضدار کے راستے ایک سڑک، مستونگ اور خضدار میں ڈگری کالج بنائے گئے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد میں بھی اس علاقے کی ترقی پر زور دیا گیا لیکن ۱۹۷۳ء کی بگٹی تحریک کے بعد سے یہاں ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ریاست قلات کا علاقہ مکران سے کوئٹہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کوہ کرتھار ہے۔ جس کا قریبی علاقہ سراسر پہاڑی ہے۔ اسے سراوان اور جنوبی میدانی علاقے کو جھلاوان کہتے ہیں۔ بیشتر آبادی خانہ بدوش ہے۔ بقیہ لوگ وادیوں اور کاریزوں کے قریب آباد ہیں۔ اقلیت انتہائی امیر اور اکثریت انتہائی غریب ہے بارش بے حد ہوتی ہے۔ اسی لیے دور دور تک بے آب و گیاہ میدان، ٹیلے اور صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔

براہوئی زبان و ادب ا۔ براہوئی زبان دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ یہ نہ تو جدید زبانوں کی طرح پیچیدہ گرامر کی مالک ہے اور نہ چینی جاپانی زبانوں کی طرح یک لفظی ہے، یہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کو باہم اس طرح سے جوڑ دیتی ہے کہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ

Marfat.com

نہیں بولتے، البتہ ایک معنی مزید پیدا کر دیتے ہیں۔ اس زبان کا زیادہ تر دارومدار انھی مرکبات پر ہے۔ زبان پر فارسی کا بے حد اثر ہے۔ اس کی لغت میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار الفاظ ہیں اور عام زندگی میں دو تین ہزار الفاظ ہی مستعمل ہیں۔ یہ زبان تقریباً بیس لاکھ براہوی بولتے ہیں۔

براہوی کا کلاسیکی ادب زیادہ تر غیر تحریری ہے۔ ریورینڈ میئر نے ۱۹۰۷ء میں اس ادب کی طرف توجہ کی اور سترہ کہانیاں، ایک ناول اور آٹھ نظمیں جمع کیں۔ ۱۹۱۵ء میں لاہور سے "تحفۃ العجائب" چھپی، جو براہوی ادب کی قدیم ترین کتاب ہے اسے براہوی کے ایک بہت بڑے عالم مولانا نبو خان نے مرتب کیا۔ اس میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد بہشت، دوزخ، فوائد علم دین، نماز، ایمان، فقہ، مسائل اور ادعیہ درج ہیں۔ اشاعت اسلام کے لیے اس زبان کا استعمال سب سے پہلے ملا ملک داد نے کیا تھا۔ اس کی تصنیف کا اتنا اثر ہوا کہ نصیر خان نوری نے ۱۷۶۶ء میں متعدد شرعی اصلاحات نافذ کیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں درخان سے ایک تحریک اٹھی، جس نے اشاعت اسلام کے لیے بہت کام کیا۔ انیسویں صدی میں یہاں عیسائی مبلغین آئے، ان کے رد کے طور پر محمد فاضل ریسانی جیسے شیخ پیدا ہوئے، جنھوں نے پہلے تو انگریزوں اور ان کے حواریوں کو تاخت و تاراج کیا، پھر سندھ میں ہمایوں کے دینی مدرسے اور عبدالغفور ہمایونی سے درس پا کر درخان پہنچے اور درس و تدریس کے علاوہ روحانی فیض کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کے مریدوں میں سے محمد عبداللہ، ملا نبو خان، عبدالحی وغیرہ نے تصانیف کے انبار لگا دیئے۔ عبدالحی نے قرآن مجید کا براہوی ترجمہ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء میں شائع کرایا۔ ان کے صاحبزادے بھی کثیر تعداد کتابوں کے مصنف تھے۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی مشنریاں کروڑوں روپوں کے اسراف اور سرکاری سرپرستی کے باوجود ایک بھی براہوی کو عیسائی نہ بنا سکیں۔ (نیز دیکھیے "بلوچ")

بربر ایک قوم اور علاقہ جو مصری سرحد سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک ہے۔ زمانہ قدیم میں ایک عربی قبیلے کو بربر کہا جاتا تھا جو دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ اس علاقے کو بحر خاب بھی کہا جاتا تھا۔ اس کے حاکم سنار کے فنج سلطان کے باجگزار رہے۔ بربروں کا یہ علاقہ ایک اہم تجارتی مرکز رہا تاہم انیسویں صدی کے اوائل تک اس علاقے میں بہت کم آمد و رفت ہوتی رہی۔ ۵/ مارچ ۱۸۲۱ء کو ترکی اور مصری فوجوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اپریل ۱۸۸۴ء سے مہدی سوڈانی کے زیر اہتمام اس علاقے کا نظم و نسق ایک فوجی حاکم کے سپرد تھا۔ یہاں کا آخری مہدوی حاکم محمد الزکی عثمان تھا۔ ستمبر ۱۸۹۷ء میں ان کے علاقے پر انگریزی اور مصری فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

بربری مصری سرحد سے لے کر دریائے نائیجر کے موڑ تک آباد ہیں۔ یہ تین مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ انھیں بربری بولیاں کہتے ہیں۔ یہ قوم زمانہ قدیم ہی سے یہاں آباد ہے۔ عام طور پر قدیم افریقی قبائل کو بھی بربری کہا جاتا رہا ہے۔ چونکہ یہ ہمیشہ منتشر رہے۔ اس لیے کسی ایک علاقے کی قوم کو بربری نہیں کہا گیا۔ عرف عام میں افریقہ کے کالے وحشیوں کو بربری کا نام دیا گیا۔ مگر جب بربری علاقوں میں گورے رنگ کی نسلوں کا بھی سراغ ملا تو یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ بربری کوئی واحد نسل ہیں چنانچہ اب شمالی افریقہ کے بسنے والے قدیم خانہ بدوش باشندوں کو بھی بربری کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

۴۲ ق م میں افریقہ پر رومی سلطنت کا قبضہ ہوا جو پانچویں صدی عیسوی تک رہا۔ اس دوران میں بربروں پر رومی تمدن کی چھاپ لگ گئی۔ تاہم باوجود ان اثرات کے سماجی طور پر یہ نیم وحشی اور اکھڑ مزاج کے حامل رہے۔ چنانچہ ظلم و تشدد کو بربریت کا نام دیا جانے لگا۔ جو آج بھی مستعمل ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کے اواخر تک پورا بربری علاقہ آغوش اسلام میں آ گیا انھوں نے جوق در جوق اسلام قبول کیا اور پھر بڑی تیزی سے اس کی تبلیغ کی۔ ان کے دو حکمران خاندانوں المرابطون اور الموحدون نے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے شمالی افریقہ پر اپنی حکومت قائم کی۔ ان لوگوں نے نویں صدی عیسوی میں جا کر کہیں اسلام قبول کیا تھا۔ انھیں عبداللہ بن یاسین المرابطی نے اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا تھا۔ بہت جلد ان حکمرانوں کی فتوحات دیگر علاقوں پر بھی محیط ہو گئیں۔ ابوبکر بن عمر نے شہر مراکش کی بنیاد رکھی اور ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء کے فوراً بعد یوسف بن تاشفین نے عیسائیوں کو عبرتناک شکستیں دے کر پورے اسلامی اندلس پر قبضہ کیا، یہ حکمران المرابطون کہلائے۔ ان کے خلاف ردعمل کے طور پر دیگر بربر عبدالمومن کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں المرابطون کو مغلوب کر کے الموحدون کے نام سے سلطنت قائم کر لی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد بربروں میں پھوٹ پڑ گئی اور صرف ایک صدی میں یہ خاندان بھی مٹ گیا۔ نیز مراکش، تلمسان اور بجایہ وغیرہ میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کے آتے آتے بربر ایک بار پھر اپنے نیم صحرائی اور نیم وحشی تمدن کی طرف لوٹ گئے۔ اور ان کے پاس اسلام کے چند ابتدائی تصورات کے سوا اور کچھ نہ رہا۔

آج کل بربر قبائل لیبیا، تیونس، الجزائر، صحرا، مراکش اور موریطانیہ میں آباد ہیں۔ لیبیا میں یہ کل آبادی کا چوبیس فیصد ہیں اور ان کی زبان عربی ہے۔ تیونس کے بربر قبائل ابھی تک اپنی بولی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ الجزائر کے بربر بھی اپنی قدیم زبان بولتے ہیں۔ اور یہ کل آبادی کا تیس فیصد ہیں۔ مراکش میں کل آبادی کا دس سے پندرہ فیصد کے علاوہ باقی تمام بربر ہیں، جن میں سے نصف ابھی تک قدیم زبان اور تہذیب کے ساتھ زندہ ہیں۔ صحرا، موریطانیہ اور دیگر افریقی علاقوں کے بربر ابھی تک قدیم وحشی تہذیب کو اپنائے ہوئے ہیں۔

بربہاریؒ (وفات ۳۲۹ھ/۹۴۱ء) ابو محمد الحسن بن علی بن خلف بربہاری بغداد کے ایک مشہور عالم دین۔ حنبلی فقیہ، حدیث کے عالم۔ حنبلی فقہ کی تعلیم امام احمد بن حنبل کے شاگرد رشید ابوبکر المروذی سے حاصل کی۔ معتزلہ اور شیعہ کے خلاف مہم چلانے پر خلیفہ نے انھیں گرفتار کرنے کا حکم دیا مگر وہ روپوش ہو گئے۔ اسی عالم میں وفات پائی اور اپنی بہن کے گھر دفن ہوئے۔

بربہاری عقل کے استعمال کے مخالف نہیں تھے بلکہ اسے ایک نعمت سمجھتے تھے۔ وہ ظاہر کے مقابلے میں باطن کو قطعی طور پر مسترد نہیں کرتے بشرطیکہ اس باطن کی بنیاد قرآن و سنت پر قائم ہو۔ خلافت کے بارے میں وہ قریش کے حق کے زبردست حامی تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حکمران طبقے کی اطاعت پر بھی زور دیتے تھے۔ سوائے اس صورت میں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو۔ وہ تلوار کے ذریعے امن قائم کرنے کے مخالف تھے ان کے نزدیک قانون اور امن عامہ کی بحالی کے لیے "دعوت امن"، "نصیحت" اور "امر بالمعروف" سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنے اصول و عقائد میں بڑے پختہ تھے

Marfat.com

انہوں نے معتزلہ اور شیعہ کے خلاف شخصی طور پر زبردست مہم چلائی۔

ان کے حامیوں کی شورش نے الراضی کے ابتدائی دورِ خلافت میں انتہائی شدت اختیار کر لی اور حنبلیوں کی قانونی دفعات کو نافذ کرنے کی غرض سے تجارتی کاروبار میں مداخلت کی۔ شراب فروشوں اور گانے والوں پر حملے کیے۔ آلات موسیقی کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ اس ہنگامے کے بعد خلیفہ کے سرکاری عہدے داروں نے بربہاری کے حامیوں کو لوگوں سے ملنے، تعلیم دینے اور مسلمانوں کو کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے روک دیا جو حنبلی عقیدہ رکھتا ہو۔ جب ان کا جوش و خروش ان پابندیوں سے بھی کم نہ ہوا تو خلیفہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت حنبلیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ خلیفہ کے اس فرمان سے حنبلی مناظرے کچھ عرصہ کے لیے رک گئے۔ مگر ۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں اس کے حامیوں نے بغداد میں اپنی شورش تیز کر دی، جو بربہاری کی موت کے بعد ختم ہوئی۔

بربہاری کی تصانیف میں "کتاب السنہ" خاصی مشہور ہے جو ایک عقیدے کی نمائندہ کتاب ہے۔ اس کتاب کا متن قاضی ابوالحسین کی تصنیف "طبقات" کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ انہوں نے اپنی دوسری کتاب "العقیدہ" میں تمام بدعات کو مذموم قرار دیا ہے۔ دلائل اور بڑے پرزور انداز میں اس دین عتیق کی طرف لوٹنے کی تلقین کی ہے۔ جس پر پہلے تین خلفاء کے عہد میں عمل ہوتا رہا۔

برتن ستھرا ظروف جن میں کھانے پینے کی اشیاء رکھی جائیں۔ اسلام میں انہیں صاف رکھنے کا حکم دیا گیا ہے نیز بتایا گیا کہ ایسے برتن، جو محض آرائش اور تعیش کے کام آئیں اور جن سے بے جا امارت ظاہر ہو ممنوع ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آتش دوزخ کو گھونٹ گھونٹ کر کے اتارتا ہے۔ دوسری حدیث میں چاندی اور سونے کے برتن میں کھانے پینے کی ممانعت ہے۔

آنحضورؐ نے کھانے کے بعد برتن کو انگلی سے صاف کرنے کا حکم فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ تمہیں نہیں معلوم کہ کون سے لقمے میں برکت ہے۔

ایک بار آپؐ کے سامنے بھیگے ہوئے ٹکڑوں کا برتن لایا گیا فرمایا "لوگو! پہلے آس پاس کے کنارے سے لو کیونکہ برکت برتن کے بیچ میں سے اترتی ہے۔" (ترمذی)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب رات کا آغاز ہو تو اپنے پانی کے برتنوں کو ڈھانک دیا کرو اور ڈھانکتے وقت خدا کا نام لیا کرو۔ اور اگر ڈھانکنے کے لیے کوئی چیز نہ پاؤ تو لکڑی وغیرہ ہی عرضاً رکھ دیا کرو۔" (بخاری)

آنحضورؐ نے جب شراب کی حرمت کا حکم دیا تو جن برتنوں میں عرب شراب ڈالتے تھے ان کے استعمال کی بھی ممانعت کر دی تھی۔

بُردہ شریف اونی کپڑے کی دھاری دار چادر جو آنحضورؐ اوڑھا کرتے تھے۔ اس قسم کی ایک چادر خصوصی شہرت کی حامل ہے جو آپؐ نے کعبؓ بن زہیر کو ان کے ایک قصیدے پر بطور انعام عطا فرمائی۔ بعد میں حضرت امیر معاویہؓ نے یہ چادر حضرت کعبؓ کے بیٹے سے خرید کر محفوظ کر لی تھی۔ خلفائے بنو امیہ کے بعد بنو عباس کے خلفاء کے خزانہ میں بھی محفوظ رہی اور بغداد پر قبضہ کے بعد ہلاکو نے اسے جلوا دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دراصل چادر اب صحیح قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔

البوصیری کے مشہور قصیدے کو [illegible] لیے کہا جاتا ہے کہ آنحضورؐ نے خواب میں [illegible] پر ڈال دی تھی۔ بوصیری مفلوج تھا، [illegible] شفایاب ہو گیا چنانچہ اس نے یہ قصیدہ لکھا۔ عربی کی کسی اور نظم کو اتنی شہرت [illegible] ہے آج کل بھی اسے ردِّ بلیات کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کی بیسیوں سے زائد شرحیں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔

اس قصیدے کا پورا نام "الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ" ہے۔ لیکن "البردۃ" کے نام سے مشہور ہے۔

برزالی، علم الدین (جمادی الآخر ۶۶۵ھ/ ۱۱ اپریل ۱۲۶۷ء — ۴ ذی الحج ۷۳۹ھ/ ۱۳ رجب ۱۳۳۹ء) علم الدین القاسم بن محمد بن یوسف ایک شامی مورخ اور عالم حدیث بربر قبیلہ بنو برزال سے تھا۔ شام میں پیدا ہوا۔ علماء کے گھرانے سے اس کا تعلق تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے والد اور دوسرے مشہور علمائے دین سے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی۔ علم دین کی تحصیل کے لیے اس نے شام کے دوسرے شہروں اور مصر کا سفر کیا۔ عمر بھر اس کے طلب علم کے شوق میں کمی نہ آئی۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ دمشق کی جامعات میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے گزارا کئی بار خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ خلیص کے مقام پر وفات پائی۔ اس کے تمام بچے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بہت سے شاگرد اور عقیدت مند تھے جن میں الذہبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

البرزالی غیر معمولی طور پر دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ بہت خوب صورت منکسر المزاج اور اپنے علم اور کتابوں کے بارے میں بے حد فیاض تھا۔ بہترین خطاط تھا۔

اس کی تصانیف کی کوئی فہرست نہیں ملتی اور نہ ہی اس کی کوئی کتاب ہی اب تک چھپ سکی۔ اس کی ایک کتاب تاریخ کبیر کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ ایک کتاب "المنتقیٰ" ہے جو مخطوطے کی شکل میں ہے۔ ایک "معجم" جو اس نے اپنے اساتذہ کے حالات پر لکھی ہے، دمشق میں محفوظ ہے۔ حدیث کے موضوع پر اس کی تصانیف بانکی پور میں محفوظ ہیں۔

بَرزَخ حائل، درمیانی، وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو، مانع ہو، رکاوٹ ہو، حدیث میں "قبر" کا لفظ مجازاً عالم برزخ کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد وہ عالم ہے، جس میں روح موت کی آخری ہچکی سے لے یوم حشر میں دوبارہ جی اٹھنے تک رہے گی۔ یہ فارسی لفظ پردہ کا معرب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انسانوں کے اور دنیا کے درمیان ایک روک ہے جو انہیں واپس نہیں جانے دے گی اور قیامت تک یہ دنیا اور آخرت کے درمیان کی اس حد فاصل میں ٹھہرے رہیں گے۔

بقول مولانا مودودی "مرنے کے بعد قیامت تک کا زمانہ خالص عدم اور نیستی کا زمانہ نہیں جیسا کہ بعض کم علم لوگ گمان کرتے ہیں بلکہ اس زمانے میں جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے، کلام کرتی ہے اور کلام سنتی ہے، جذبات و احساسات رکھتی ہے، خوشی اور غم محسوس کرتی ہے اور اہل دنیا کے ساتھ بھی اس کی دلچسپیاں باقی رہتی ہیں۔"

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ عالم عدم محض کا عالم ہے جس میں کوئی احساس

Marfat.com

اور شعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب ثواب نہ ہوگا۔ لیکن قرآن اس عقیدے کی نفی کرتا ہے۔ جب آدمی مر کر عالم برزخ میں چلا جاتا ہے تو ہر نیک و بد کو موت کی ساعت سے لے کر قیامت تک نیک اور بد انجام دکھایا جاتا رہتا ہے۔ قرآن مجید میں فرعون اور آل فرعون کے بارے میں ارشاد ہے کہ "ایک سخت عذاب ان کو گھیرے ہوئے ہے یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو" (۲۳: ۴۵ - ۴۶)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص بھی مرتا ہے اسے صبح و شام اس کی آخری قیام گاہ دکھائی جاتی رہتی ہے خواہ وہ جنتی ہو یا دوزخی، اس سے کہا جاتا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں تو اس وقت جائے گا۔ جب اللہ تجھے قیامت کے روز دوبارہ اٹھا کر اپنے حضور بلائے گا۔"

قرآن مجید میں ایک مقام پہ آتا ہے "یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجائے گی تو کہنا شروع کرے گا کہ اے میرے رب مجھے اس دنیا میں واپس بھیج دیجئے جسے میں چھوڑ کر آیا ہوں امید ہے کہ اب میں نیک عمل کروں گا۔ ہرگز نہیں یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ بک رہا ہے۔ اب ان سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ دوسری زندگی کے دن تک حائل ہے (۲۳: ۹۹، ۱۰۰)

تصوف میں برزخ کا اطلاق مرشد کی صورت پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی صورت خدا تعالےٰ اور مرید کے درمیان واسطہ ہوتی ہے مرید خدا کی عبادت کرنے کے وقت اپنے مرشد کی صورت اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر کر لیتے ہیں اور اس کی برکت سے انہیں بارگاہ ایزدی میں قرب حاصل ہو جاتا ہے۔

برزخ کا اطلاق اس خط پر بھی ہوتا ہے جو بہشت اور دوزخ کے درمیان حدِ فاصل ہوگا۔

قرآن مجید میں چند اور جگہوں پر بھی برزخ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً "اور وہی ہے جس نے دریاؤں کو ملایا، ایک کا پانی میٹھا مزے دار اور ایک کا کھاری کڑوا اور دونوں میں ایک روک اور آڑ بنا دی"۔ (۲۵: ۵۳)

"اسی نے (اس طرح کے کھاری اور میٹھے) دو سمندر بنا نکالے کہ آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے"۔ (۵۵: ۱۹ تا ۲۰)

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اشارہ شط العرب کے میٹھے پانی کی طرف ہے جو کھاری سمندر میں ملے بغیر دور تک بہتا چلا گیا ہے۔ یہاں رکاوٹ سے مراد قانون فطرت ہے جو خدا کا قائم کردہ ہے۔

برشلونہ اسلامی اندلس (سپین) کا ایک شہر جو اب برسلونا کہلاتا ہے۔ رومی دور میں یہ شمال مشرقی ہسپانیہ کا دارالحکومت تھا۔ ادریسی اور البکری نے اس کا ذکر کیا ہے ان کی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ برشلونہ ان کے زمانہ میں ایک بڑا شہر تھا۔ جس کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی اور اس کی بندرگاہ چٹانوں سے پُر تھی۔ شاہ افرنجہ اپنے اسی دارالحکومت میں رہتا تھا۔

اس شہر کو ۹۶ھ/۷۱۴ء تا ۹۸ھ/۷۱۶ء میں عبدالعزیز بن موسےٰ بن نصیر کی سپہ سالاری میں مسلمانوں نے فتح کیا۔ عربی میں اس شہر کو برشنونہ کہتے ہیں ۸۰۱ء میں شارلیمان کے بیٹے لوئی نے اسے فتح کیا اور اس کے بعد افرنجی سلطنت کے

برشلونہ کی قدیم عمارتیں آج بھی قائم ہیں۔

ہسپانوی سرحدی علاقے کا دارالحکومت بن گیا۔

۲۴۲ھ/۸۵۶ء میں برشلونہ پر عربوں کا قبضہ ہوا لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ ۳۴۷ھ/۹۵۸ء میں آخری بار المنصور اعظم نے اسے فتح کیا۔ لیکن ۴۰۴ھ/۹۸۷ء میں یہ ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بالآخر بارہویں صدی میں اسے کونٹ سر سے مملکت ارغون میں شامل کیا گیا۔

آج کل برسلونا شمال مشرقی سپین کا ایک اہم شہر اور صوبہ ہے۔ جسے ۱۸۳۳ء سے یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ یہ ایک اہم بندرگاہ، تجارتی مرکز اور عیسائی بشپ کا شہر ہے۔ شہر کی آبادی ۱۹۷۱ء میں بیس لاکھ کے قریب تھی۔ شہر کا قدیم حصہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں رومی اور اسلامی طرز تعمیر کے بیشتر نمونے آج بھی نظر آتے ہیں۔ جدید شہر میں پارک، عجائب گھر اور یونیورسٹی واقع ہے۔ یہاں کی زیادہ تر برآمدات ریشم، اون اور روئی کی اشیاء، کھاد اور کاغذ ہیں۔

برصیصا ایک عیسائی راہب اور نیم تاریخی شخصیت۔ اس کا زمانہ سینٹ انطونی کا عہد قرار دیا جاتا ہے ابن بطوطہ نے طرابلس اور اسکندریہ کے درمیان ایک قصر "برصیصا العابد" دیکھا تھا۔ ارامی زبان میں برصیصا کے معنی اعلیٰ ترین منصب کاہن کے ہیں۔ مسلمان مصنفین کے ہاں برصیصا سے مراد وہ راہب ہے جس نے ایک طویل عرصے تک زہد و تقویٰ کی زندگی اختیار کئے رکھی اور پھر شیطان کی بار بار کی ترغیب کے تحت زیر ہوگیا اور اس طرح خدا کے وجود سے منکر

Marfat.com

ہوگیا۔ اس حالت کے بعد شیطان اسے اکیلا چھوڑ کر علیحدہ ہوگیا۔

اس روایت کا تعلق قرآن مجید کی اس آیت سے بتایا جاتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ریہ ایسے ہیں، جیسے شیطان کی وہ حالت جب وہ انسان سے کہے تو کفر کر اور جب وہ کفر کرے تو کہے میں الگ ہوں تجھ سے، میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو رب ہے سارے جہان کا (۵۹: ۱۶) لیکن یہ توجیہ عجیب سی نظر آتی ہے۔

اس آیت کی تفسیر کا تعلق خواہ نسل انسانی سے ہو یا کسی ایک خاص گروہ یا آدمی سے، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ البتہ علامہ طبری اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں انسان ایک خاص شخص کے معنی میں لیا گیا ہے جو یا تو کوئی راہب ہے یا عابد یا کوئی عیسائی پادری ہے۔ اس شخص کی کہانی ہر جگہ تقریباً ایک سی ملتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تین بھائی ایک بیمار عورت کو ایک متقی اور نیک انسان کے سپرد کرکے ایک سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ ان کے بعد وہ متقی یا راہب شیطان کے بہکاوے میں آکر گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے بعد میں اپنے اس جرم کو چھپانے کے لئے اس عورت کو قتل کر دیتا ہے اور ایک پوشیدہ مقام پر اس کی لاش کو دفن کر دیتا ہے۔ جب اس عورت کے بھائی سفر سے واپس آتے ہیں تو شروع میں اس راہب کی بات کا یقین کر لیتے ہیں کہ ان کی بہن طبعی موت مری ہے لیکن شیطان ان کے خواب میں آکر راہب کا جرم فاش کر دیتا ہے۔ جب راہب کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جرم فاش ہو گیا ہے تو وہ بہت خوفزدہ ہوتا ہے۔ اس وقت شیطان اس کے پاس آکر کہتا ہے کہ اگر تو مجھے سجدہ کرے اور خدا کا انکار کر دے تو میں تجھے بچا لوں گا اور جب راہب یہ بھی کر گذرتا ہے تو شیطان اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ الطبری کے بعد کے راویوں کے ہاتھ برصیصا کا نام لگا اور انھوں نے اس کہانی کے مرکزی کردار پر برصیصا کا نام چسپاں کر دیا۔

برغش (دور حکومت ۷ اکتوبر ۱۸۷۰ء تا ۲۷ مارچ ۱۸۸۸ء) برغش بن سعید بن سلطان زنجبار کا سلطان۔ اس نے پہلے ۱۸۵۶ء میں اپنے والد کے انتقال پر اور پھر ۱۸۵۹ء میں حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی انگریزوں کی مداخلت کی وجہ سے ناکام رہا اور دو سال تک بمبئی میں رہا۔ بالآخر ۱۸۷۰ء میں اپنے بھائی کی وفات پر تخت پر بیٹھا۔ ۱۸۷۳ء میں برغش غلاموں کی تمام منڈیاں بند کرنے اور دوسرے ممالک بلکہ اپنی حدود مملکت میں بھی غلاموں کی برآمد بالکل ممنوع کر دینے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ برطانوی حکومت نے اس کی تخت نشینی کی حمایت کی تھی اس لئے ایک برطانوی ایجنٹ کرک برغش کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ زنجبار کی ایک باثر شخصیت بن گیا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ برطانوی ایجنٹ واپس گیا۔

افریقہ کے عقبی علاقے میں برغش کا اقتدار نہ ہونے کے برابر تھا۔ ۱۸۷۷ء میں ساحل اور وکٹوریا نائی آنزا کے درمیانی علاقے کی ترقی کے سلسلے میں مراعات کے سوال پر جب سر ولیم میکنن سے بات چیت ناکام ہو گئی تو برغش کے ہاتھ سے اندرون ملک میں اپنا اقتدار قائم کرنے کا بہترین موقع بھی نکل گیا.

اور برطانیہ نے اس کی یہ تجویز بھی کہ بادشاہت ہمیشہ اسی کے خاندان میں رہے گی مسترد کر دی تو ۱۸۸۴ء میں جرمنی کے ایجنٹ نے ان سرداروں سے (جن کے علاقے تپورہ اور راجی جانے والی تجارتی شاہراہ کے ساتھ ساتھ واقع تھے۔) بارہ معاہدے کر کے انہیں اپنے زیر حفاظت لے لیا۔ جبکہ برغش ان کی سیادت کا دعوے دار تھا۔ نیز جب برغش نے اس پر احتجاج کیا تو اس کے جواب میں جرمنی کے پانچ جنگی جہاز وہاں بھیج دیئے اور برغش کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد برطانیہ، جرمنی اور فرانس نے اپنے اپنے نمائندوں کا ایک کمیشن بھیجا جس نے برغش کے مقبوضات کی حدود متعین کیں اور برغش کو برطانیہ کے دباؤ کے تحت یہ فیصلہ ماننا پڑا اس کے کچھ عرصہ بعد عمان کے ایک سفر سے واپسی پر اس کا انتقال ہو گیا۔

برغش ایک نہایت ہی قابل اور باہمت بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے ملک کے لئے بہت کچھ کیا۔ عوام کی بہتری کے لئے اس نے سستے غلے درآمد کرنے کا انتظام کیا اور میٹھے پانی کا بھی بندوبست کیا۔ لیکن برطانیہ کی پالیسیوں کے سامنے اس کی کچھ نہ چل سکی۔

برق بابا ایک ترک درویش جسے باراق بابا کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ایک سلجوقی شہزادہ تھا۔ ایک یونانی پادری نے اسے عیسائی بنایا تھا۔ بعدازاں دوبارہ مسلمان ہوا اور برق کا خطاب پایا۔ عربی ماخذوں سے اس کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ اس کا باپ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار تھا اور اس کا چچا ایک مشہور کاتب تھا۔

برق بابا نے ایلخانیوں کے عہد میں کافی شہرت حاصل کی۔ اس کے مریدوں کو برقی کہا جاتا ہے۔ وہ ترکی سے ایران گیا اور وہاں اس نے غازان اور الجایتو پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ دمشق پہنچا۔ اس کے بعد یروشلم گیا اور بعد میں ایران واپس آگیا۔ ۷۰۷ھ/۱۳۰۷ء میں اس نے الجایتو کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ اسے تبلیغ کے لئے گیلان بھیج دے۔ وہاں چند مخالفوں نے اسے قتل کر دیا۔

برکات چار شریفین مکہ مکرمہ جو برکات کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ (۱) برکات اول ا۔ ابن حسن بن عجلان۔ اس کا تعلق قتادہ بن ادریس کی ساتویں پشت سے تھا۔ شریفین مکہ کے آخری سلسلے کا بانی۔ جوانی میں ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء سے ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء تک اپنے والد کے ساتھ حکومت میں شریک رہا۔ والد ضعف العمری کے سبب تخت سے دستبردار ہو گیا تو اپنے بھائیوں کی مخالفت کے باوجود ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء سے ۸۴۵ھ/۱۴۴۲ء تک مکہ کا حکمران رہا۔ ۸۴۵ھ/۱۴۴۲ء میں خاندان کے لوگوں نے اسے تخت سے سبکدوش کر دیا۔ لیکن اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ دوبارہ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء سے ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء تک حکومت پر قابض رہا۔ برکات اول کے بعد اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا اس کا دور حکومت ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء تا ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء ہے۔

برکات ثانی:- یہ برکات اول کا پوتا تھا۔ اپنے والد کے عہد حکومت میں شریک سلطنت رہا۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء سے ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء تک اپنے بھائیوں سے برسرپیکار رہا۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء میں اسے مصر میں نظر بند کر دیا گیا بالآخر ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں اسے بحال کر دیا گیا اور اس طرح ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء سے ۹۳۱ھ/۱۵۲۵ء تک یہ شریف مکہ رہا۔

برکات ثالث:- ابن محمد ابراہیم جو ذوی (قبیلہ) برکات کے مورث اعلیٰ کا پرپوتا تھا۔ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں محمد ابن سلیمان نے کئی ایک بڑی اہم اصلاحات کیں۔ جن کا مقصد یہ

Marfat.com

تھا کہ قدیم امرا نے طبقوں کے مقابلے میں عزیبوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے یہ ۸۹۳ھ/۱۴۸۲ء اپنی وفات کے وقت تک برسراقتدار رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سعید تخت نشین ہوا۔

برکات رابع :- ابن یحییٰ، برکات ثالث کا پوتا۔ اس نے دو ماہ سے بھی کم مدت تک حکومت کی۔ اپنے باپ کی حکومت سے دستبرداری کے بعد مسند نشین ہوا۔ لیکن قبیلہ زید نے اسے شکست دی اور دونوں باپ بیٹا بھاگ کر مصر چلے گئے۔

برکت نمو، افزائش، برطھوتری، اسلامی روایات میں اس سے رفعت، عظمت خیر اور بھلائی کا مفہوم بھی لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اللہ تعالےٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف کی ۵۴ویں آیت میں ارشاد ہے۔ "بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا پروردگار" اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں۔ بے حد و حساب خیرات اس سے پھیل رہی ہے اور وہ بہت بلند و برتر ہستی ہے۔ کہیں جاکر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی۔ اس کی یہ بھلائی و رفعت ہمیشہ ہے۔ عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال آئے۔

عام میل جول میں لفظ مبارک استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالےٰ تمہارے کام اور مال میں برکت دے۔

برکھارٹ (۲۴ر نومبر ۱۷۸۴ء - ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء) ایک نامور مستشرق اور سیاح سوئٹزرلینڈ کے مشہور شہر لوازن کے قریب گاؤں کرخنگارٹن میں پیدا ہوا۔ ہیمبرگ اور جرمنی میں عربی اور علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ تین سال تک لندن اور کیمبرج میں مزید تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۰۹ء میں حلب (شام) پہنچا۔ یہاں اپنے قیام کے دوران میں اس نے ترکی زبان سیکھی۔ اور قرآن مجید کے مطالب اور فقہ اسلامی میں خاص دسترس پیدا کی۔ یہاں اس نے دو سال تک قیام کیا اس کے بعد اس نے شیخ ابراہیم بن عبداللہ اللوزانی کا نام اختیار کر کے مصر کا قصد کیا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں حج کیا اور دو تین ماہ مکہ مکرمہ میں گذارے اور مدینہ منورہ کی زیارت کرتے ہوئے ۱۸۱۵ء میں قاہرہ پہنچا۔ جہاں بیمار ہوا اور وفات پائی۔ اسے قاہرہ ہی میں دفنایا گیا۔

برکھارٹ کے مختلف مقالوں اور مضامین کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے جو تقریباً ساڑھے تین سو مجلدات کی شکل میں کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

برکیارُق (۴۸۰ھ/۱۰۹۵ء - ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء) ایک سلجوقی سلطان ملک شاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں باپ کی وفات کے وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی۔ سوتیلی ماں نے اپنے ایک چار سالہ لڑکے کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ ملک شاہ کے مشیر نظام الملک کے ساتھیوں نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ برکیارق کے خلاف ہو گئے ہیں تو وہ اسے اصفہان سے اغوا کر کے اپنے مرکز رے میں لے گئے اور وہاں اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف برکیارق کے ماموں اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی تخت کا دعوے دار ہونے کا موقع مل گیا اور اس طرح ایک پیچیدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ بالآخر برکیارق غالب آیا۔ اور ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء کے بعد سے خلیفہ نے اسے اپنی سلطنت کے عراقی صوبوں اور ایران کی سرزمین مرتفع کا حکمران تسلیم کر لیا۔ لیکن برکیارق کے مصائب مکمل طور پر ختم نہ ہو سکے۔ محمد اور سنجر کو جو اس کی سوتیلی ماں سے تھے نظام الملک کے بیٹے مؤید نے انہیں ورغلایا کہ وہ برکیارق کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکیں اور بغاوت کر دیں۔ فریقین کے معتدل عناصر کی کوششوں سے ایک معاہدہ ہے پایا۔ اس معاہدے کی رُو سے محمد کو "ملک" کا خطاب ملا اور اسے برکیارق کے زیر سایہ آذربائیجان کا جس میں آرمینیا بھی شامل تھا۔ حکمران بنا دیا گیا اور برکیارق کو بلا شرکت غیرے سلطان تسلیم کر لیا گیا۔ محمد کو یہ معاہدہ پسند نہ آیا اور اس نے دوبارہ لڑائی شروع کر دی لیکن آخر کار اسے مجبور ہو کر آرمینیا کی طرف بھاگنا پڑا۔ برکیارق بیمار تھا اور لڑائی سے تنگ آچکا تھا۔ اس لیے وہ سلطنت کی عملی تقسیم پر راضی ہو گیا۔ اصفہان، نصف عراق اور آذربائیجان سے لے کر شام تک کے پورے سرحدی علاقے کا فرمانروا محمد کو تسلیم کر لیا گیا۔ برکیارق نے ۴۹۸ھ/۱۱۰۵ء میں ۲۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے دور سے حسن بن الصباح کے اسماعیلی نزاریوں نے فائدہ اٹھایا۔ اور شمالی ایران کے پہاڑوں اور اصفہان کے قرب و جوار میں موجود ناقابل تسخیر قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

برگوی، محمد بن پیر علی (۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء - ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) ایک ترک عالم۔ بالی کسری میں پیدا ہوا۔ بعض نے تاریخ پیدائش ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء بیان کی ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ بعد میں استنبول چلا گیا۔ جہاں اس نے محمد افندی اور قاضی عسکر عبدالرحمان افندی سے تعلیم کی تکمیل کی۔ بعد میں استنبول کے مدارس میں پڑھاتا رہا اور اسی دوران میں شیخ عبدالرحمان قرہ مانی سے بیعت کی۔ اسی دوران میں فوج میں بھی ملازمت اختیار کر لی۔ جلد ہی وہ ان تمام مصروفیات کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا لیکن اپنے مرشد کے حکم پر تبلیغ و تدریس کا سلسلہ منقطع نہ کیا اور جب عطاء اللہ افندی نے برگی میں اپنے مدرسے میں اسے بطور استاد رکھنا چاہا تو اس نے منظور کر لیا اور برگی کی نسبت سے اسے برگوی کہا جاتا ہے۔ یہیں پر طاعون کی بیماری سے وفات پائی۔

برگوی امام ابن تیمیہ کی طرح ہر بدعت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ وہ مذہبی معاملات میں بڑا متشدد تھا۔ اور اپنے اسی تشدد کی وجہ سے شریعت سے ذرا سا انحراف بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ کسی کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وزیر اعظم محمد پاشا کی بعض بے قاعدگیوں کی اصلاح کرنے کی خاطر استنبول کا سفر کیا۔

اس کی تصانیف میں "وصیت نامہ" بہت مشہور ہے۔ اس کتاب کی کئی ایک شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب مذہبی مسائل کے بارے میں اب بھی ترکی عوام کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ برگوی نے صرف و نحو پر بھی دو کتابیں تصنیف کیں ان میں سے ایک کا نام "اظہار" ہے دوسری کا "العوامل" یہ دونوں کتابیں ایک عرصہ دراز تک مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ ایک کتاب

Marfat.com

" الطریقۃ المحمدیہ " ہے اس کتاب میں برگوی کے عربی مواعظ اور خطبے ہیں۔ یہ کتاب اہل علم میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کتاب کی شرحیں خادم بی محمد افندی اور عبدالغنی النابلوسی نے لکھی ہیں۔

برناباس حضرت عیسیٰؑ کا حواری جس نے ان کے بعد انجیل لکھی جو انجیل برناباس کے نام سے مشہور ہے۔ برناباس کے متعلق لوقا کی کتاب اعمال میں یوں ذکر آتا ہے۔ اور یوسف نامی ایک لاوی تھا جس کا لقب رسولوں نے برناباس یعنی نصیحت والا بیٹا رکھا تھا اور جس کی پیدائش کپرس (قبرص) کی تھی۔ اس کا ایک کھیت تھا جسے اس نے بیچا اور قیمت لا کر رسولوں کے پاؤں پر رکھ دی۔" (۴ : ۳۶ - ۳۷) یہ وہی شخص تھا جس نے پولس کا تعارف دیگر حواریوں سے کرایا۔ کتاب عمل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پولس اور برناباس عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے ہم سفر رہے۔ اور انہوں نے ایک ساتھ تبلیغ عیسائیت کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد اچانک دونوں کے درمیان کسی موضوع پر سخت تکرار ہوئی اور برناباس مرقس کو لے کر کپرس (قبرص) کی طرف روانہ ہوا اور غالباً وہیں اس کا انتقال ہوا۔

عیسائی علماء برناباس کو ایک مرتد عیسائی کی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک برناباس کی لکھی ہوئی انجیل کا کوئی وجود نہیں اور اگر یہ لکھی بھی گئی تھی تو استبداد زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو گئی اور موجودہ دریافت شدہ نسخہ دراصل کسی مسلمان کی تصنیف ہے۔ (دیکھئے "انجیل برناباس")

برنی، ضیاء الدین (۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء - ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء) ہندوستان کا ایک مورخ۔ اس کا باپ مؤید الملک سلطان جلال الدین کے بیٹے ارکلی خان کا نائب تھا۔ جو بعد میں برن کا نائب اور خواجہ بن گیا تھا۔ ضیاء الدین برنی کے تعلقات دہلی کے امراء کے ساتھ خوشگوار تھے۔ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں برنی کی عمر اتنی ضرور تھی کہ اس زمانے کی مجالس و محافل کے بارے میں یادداشتیں ذہن میں محفوظ رکھ سکے۔

برنی تقریباً سترہ سال اور تین ماہ تک سلطان محمد بن تغلق کا درباری رہا جب فیروز خان تغلق تخت نشین ہوا تو برنی کو دربار سے برطرف کر دیا گیا اور کچھ مدت کے لئے اسے ایک قلعے میں قید رکھا گیا۔ برنی نے اپنی عمر کا باقی حصہ بڑی کس مپرسی اور غربت میں گذارا وہ اس دور میں تصنیف و تالیف میں مشغول رہا۔ ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء کی کچھ مدت بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اسے غیاث پور میں نظام الدین اولیاء کے مزار کے قرب وجوار میں دفن کیا گیا۔

ضیاء الدین برنی کی تصانیف میں مشہور ترین چار ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی اس کتاب میں برنی نے خلفائے راشدین کو معیاری فرمانروا تسلیم کرتے ہوئے اپنے دور کے بادشاہوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ ہونے کی صورت میں اسلام ان پر کیا فرائض عائد کرتا ہے۔ یہ کتاب بلبن کے دور سے لے کر فیروز تغلق کے عہد تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں اس نے علاؤالدین خلجی کو اس اعتبار سے ایک کامیاب بادشاہ شمار کیا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو مطیع کیا، فتنہ و فساد پر غلبہ حاصل کیا اور شراب کو ممنوع قرار دیا۔

اپنی دوسری کتاب فتاوئے جہانداری میں برنی نے بادشاہوں کو شریعت نافذ کرنے، کفار کا استیصال کرنے اور حضرت صاحب لقوٰۃ لوگوں کو ملازم رکھنے کی نصیحت کی ہے اور انہیں شاہانہ جلال کے ساتھ ساتھ خدا خوفی اور عجز و نیاز اختیار کرنے پر بھی ابھارا ہے تیسری کتاب "نعت محمدی" اور چوتھی "اخبار برمکیان" ہے۔

بروج :- قرآن مجید کی ۸۵ ویں سورت (دیکھئے "البروج، سورۃ")

برونئی بورنیو اور فلپائن کے درمیان موجود ایک سلطنت، یہ سنگاپور سے کوئی ساڑھے سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۲۲۲۶ مربع میل (۵۸۰۰ کلومیٹر) ہے۔ آبادی ۱۹۷۳ء میں ۱،۷۵،۴۰۰ رہی ہے جس کا ۶۰ فیصد مسلمان ہیں۔ دارالحکومت کا نام بھی برونئی ہے، جو دریائے برونئی کے دہانے سے نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

تاریخ :- برونئی کا پہلا مسلمان سلطان اوانگ الک بیتر تھا۔ ۱۴۰۵ء/۱۴۲۵ء میں وہ سلطان محمد شاہ سے ملاقات کرنے ملاکا گیا تو اسلام کی سادہ تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس کے عہد میں ایک بزرگ سلطان برکت برونئی آئے اور انہوں نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ اسی مبلغ نے برونئی میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور اسلامی قوانین نافذ کرائے۔

برونئی پر سولہویں صدی عیسوی میں ولندیزیوں نے قبضہ کیا اور ۱۸۸۸ء میں یہ برطانیہ کی سرپرستی میں چلا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں اس کی عنان حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور سلطان محض آئینی حکمران تھا۔ ۱۹۶۳ء میں برونئی کو ملائیشیا میں شامل کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اب تک یہ برطانوی دولت مشترکہ کے ماتحت ایک خود مختار سلطنت ہے۔

برونئی کا موجودہ آئین ۲۹ ستمبر ۱۹۵۹ء سے سلطان کی طرف سے نافذ شدہ ہے ۶ فروری ۱۹۶۵ء کو اس میں ترمیم ہوئی، جس کے تحت مقننہ کے انتخابات ہوئے۔ یہ اکیس ارکان پر مشتمل ہے، جن میں سے دس منتخب اور پانچ نامزد ہوتے ہیں کابینہ کا سربراہ سلطان ہوتا ہے۔ ۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ۲۸ ویں سلطان کو معزول کر کے اس کے بیٹے حسن البولکیہ معزالدین کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ یکم اگست ۱۹۶۸ء کو اس کی تاجپوشی کی رسوم ادا ہوئیں۔

اقتصادی اور دیگر معلومات :- برونئی کی آب و ہوا منطقہ حارہ سے تعلق

برونئی کی نئی جامع مسجد (۱۹۵۸ء)

Marfat.com

رکھتی ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ دارالحکومت اور مضافات میں رہتا ہے۔ اندرونی علاقے میں زیادہ تر جنگلات ہیں۔ جن کی وجہ سے عمارتی لکڑی کثرت سے دستیاب ہے۔ چاول اور ربڑ اہم پیداوار ہے۔ معیشت کا زیادہ تر دارومدار مٹی کے تیل پر ہے۔ جو اس کی برآمدات کا ترانوے فی صد ہے۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کیساتھ ہوتی ہے۔

بُرہان قطعی دلیل، حجت۔ بقول امام راغب "بُرہان وہ دلیل ہے جو تمام دلائل میں سب سے زیادہ قوی اور پختہ ہو۔ نیز یہ دلیل ہمیشہ صدق و یقین اور قطعیت کی متقضی ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں بھی "برہان" قطعی حجت اور روشن دلیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً

"ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔" (۲: ۱۱۱)

"کیا اسے (اللہ کو) چھوڑ کر انھوں نے دوسرے خدا بنا لیے، اے محمدؐ ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل" (۲۱: ۲۴)

"اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ان کاموں میں حصہ دار ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔" (۲۷: ۶۴)

"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے ایسے کافر کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔" (۲۳: ۱۱۷)

"اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے پھر کہیں گے کہ "لاؤ اب اپنی دلیل" اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔" (۲۸: ۷۵)

"یہ دو نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔" (۲۸: ۳۲)

"وہ (زلیخا)، اس کی طرف بڑھی اور یوسفؑ بھی اس کی طرف بڑھتا۔ اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔" (۱۲: ۲۴)

اسی طرح اللہ کے رسولوں، ان کے معجزوں، دین سلام اور قرآن کریم کو بھی نور اور برہان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"لوگو، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیل روشن آگئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔" (۴: ۱۷۴)

حدیث میں صدقے کو بھی برہان کہا گیا ہے کیونکہ دل اور مال کا بڑا گہرا رشتہ ہے اور جو شخص آسانی سے راہ خدا میں اپنا مال دیتا ہے تو یہ اس کے پاکیزہ دل اور سخی ہونے کی دلیل ہے۔

برہان کے اصطلاحی معنی منطقی استدلال اور قیاس کے ہیں۔ فلاسفر اور متکلمین نے برہان کو منطقی استدلال اور قیاس کے معنی میں بکثرت استعمال کیا ہے

برہان الدینؒ، غریب (۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء-۲۰ صفر ۷۳۸ھ/۸ ستمبر ۱۳۳۷ء) ہندوستان کے ایک بزرگ، صوفی، جو قطب المدار اور بایزید ثانی کے القابات سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ الزار الاصفیاء میں آپ کا شجرہ نسب اس طرح سے درج ہے۔ برہان الدین غریب بن شیخ محمد بن محمود بن ناصر ہانسوی بن سلطان منظفر بن سلطان ابراہیم بن شیخ ابوبکر بن شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرشید بن شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالسلام بن امام اعظم ابوحنیفہؒ۔

آپ کا خاندان روحانی لحاظ سے بہت اونچے مقام پر فائز تھا۔ جو ہانسی میں آباد تھا۔ حضرت برہان الدین کی پیدائش ہانسی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا سے پائی۔ وقت کے جید علماء سے فقہ، معانی، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کا شمار اس زمانے کے جید علماء میں ہوتا ہے۔ ساری عمر شادی نہیں کی۔

طریقت میں محبوب الٰہیؒ سے فیض پانے کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ جن کے مریدوں میں امیر خسرو، امیر حسن سجزی، مولانا ابراہیم طشت دار، سید خاموش، خواجہ مبشر اور سید حسین وغیرہ تھے۔ انھوں نے شیخ برہان الدین کو باورچی خانے کا نگران مقرر کیا۔ جب شیخ برہان الدین نے سلوک و منزلت کی تمام منزلیں طے کر لیں تو حضرت محبوب الٰہی نے آپ کو اپنی خلافت سے نوازا۔ بایزید کا خطاب آپ کو انھوں نے ہی دیا تھا۔ شیخ صاحب کو بھی اپنے مرشد سے حد درجہ محبت تھی۔ اور آپ ان سے جدا ہونا گوارا نہ کرتے تھے۔ جب آپ کے بھائی منتخب الدین کا انتقال ہوا تو مرشد نے آپ کو دکن جا کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ تو آپ نے عرض کی کہ نعلین مبارک سے جدا ہو جاؤں گا مرشد نے فرمایا نعلین ساتھ لے جاؤ پھر عرض کی مجلس سے الگ ہو جاؤں گا۔ مرشد نے حکم دیا کہ جتنے لوگ مجلس میں حاضر ہیں انہیں بھی ساتھ لے جاؤ۔ اس وقت سات سو کے قریب افراد مجلس میں موجود تھے۔ چنانچہ آپ ان سب کو ساتھ لے کر دولت آباد روانہ ہو گئے اور اٹھائیس انتیس سال وہاں پر قیام کرنے کے بعد وفات پائی۔ آخر عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ تین سال تک بیمار رہے لیکن عبادت و ریاضت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ آپ کا مزار روضہ خلد آباد میں ہے بعض کے نزدیک آپ نے ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء میں وفات پائی۔

آپ اور آپ کے ساتھیوں نے دکن میں نہ صرف بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا بلکہ عام مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی حالت کو بھی سدھارا۔

آپ کی شخصیت بہت جاذب تھی۔ آپ کا کلام عشق آمیز اور گفتگو دل فریب اور پُر تاثیر تھی۔

سماع سے آپ کو بے حد انسیت تھی۔ برھان پور کو جب ناصر خان فاروقی نے آباد کیا تو اسے آپ ہی کے نام پر موسوم کیا۔

ایک مرتبہ اپنے مریدوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "دنیا سائے کی مانند ہے جب آدمی سائے کی طرف منہ کرتا ہے تو وہ آگے ہی آگے چلتا ہے اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو سایہ پیچھے پیچھے آتا ہے۔"

آپ اپنے مریدوں کو اکثر نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کی راحت کے لیے کوشاں رہیں۔ آپ فرماتے ہیں جس طرح ایک درخت خود تو دھوپ میں کھڑا رہتا ہے اور دوسروں کو سایہ دیتا ہے۔ لکڑی خود جلتی ہے اور دوسروں کو آرام پہنچاتی ہے۔ اسی طرح آدمیوں کو بھی چاہیے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچائے۔

Marfat.com

آپ کے ملفوظات میں سے "حصول الوصل"، "ہدایت القلوب"، "نفائس الانفاس" اہم ہیں۔ ایک رسالہ جو "رسالہ غریب" کے نام سے موسوم ہے آپ کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔

برہان الدین، قطب عالم (۱۷ رجب ۷۹۰ھ/۱۹ جولائی ۱۳۸۸ء – ۸ ذوالحجہ ۸۵۷ھ/۱۰ دسمبر ۱۴۵۳ء) ابو محمد برہان الدین بن ناصر الدین مخدوم جہانیاں، سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ، قطب عالم اور ثانی مخدوم جہانیاں کے نام سے مشہور تھے۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) کے مشہور و معروف مشائخ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اُچ شریف (بہاولپور) میں پیدا ہوئے ابھی دس سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے چچا شاہ راجو قتال نے اپنے ذمہ لے لی۔ چودہ سال کی عمر میں ان کے چچا نے "ارشاد اہل گجرات" کا کام ان کے ذمہ لگایا اور انھوں نے گجرات ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں پٹن گئے۔ جہاں سلطان مظفر اول بڑی عزت و احترام سے پیش آیا۔ یہیں پر انھوں نے مولانا علی شیر گجراتی کی خدمت میں علوم ظاہری کا مطالعہ کیا۔ ۸۱۳ھ/۱۴۱۱ء میں احمد آباد کے قریب اساول کہنہ کی بستی میں قیام پذیر ہوئے لیکن بعد میں بٹوہ میں سکونت اختیار کر لی اور اپنی وفات تک یہیں رہے۔

ان کے شیوخ میں شیخ احمد کھٹو بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے خرقہ خلافت عطا کیا تھا۔ اپنے شیوخ سے فیض حاصل کرنے کے بعد قطب عالم نے گجرات اور احمد آباد کے لوگوں کی رشد و ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عالم اور ان کے مریدین نے سلسلہ سہروردیہ کو بہت ترقی دی۔ اہل گجرات میں ان کے بارے میں بہت سی کرامات مشہور ہیں۔ اہل گجرات کے احمد شاہی سلاطین ان کے بہت زیادہ معتقد تھے۔ جہانگیر اور اس کے بعد کے اکثر مغل شہنشاہ مشائخ گجرات سے فیض حاصل کرتے رہے اور ان کی اولاد کو مختلف مناصب سے نوازتے رہے ہیں۔

برہان الدین نے گجرات سے چھ میل دور بٹوہ میں وفات پائی۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کا مزار امرائے گجرات نے بنوایا تھا۔ اور اب تک اہل گجرات کے لئے زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ان کی اولاد میں بارہ بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں۔

برہان الدینؒ، مرغانی (۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء – ۱۴ ذی الحج ۵۹۳ھ/۲۸ اکتوبر ۱۱۹۷ء) ابو الحسن علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل۔ لقب برہان الدین ایک مشہور حنفی فقیہی عالم۔ صوبہ فرغانہ کے شہر مرغنان میں پیدا ہوئے شجرہ نسب حضرت ابو بکرؓ صدیق سے ملتا ہے۔

تحصیل علم کی خاطر آپ نے مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے فیضان حاصل کیا۔ سمرقند میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے آپ نے اپنی زندگی ہی میں شہرت کی اعلیٰ منازل طے کر لی تھیں۔ امام، فقیہہ حافظ، محدث، جامع العلوم، ضابطہ الفنون، محقق اور فاضل وغیرہ کے الفاظ آپ کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔

علامہ عبد الحی لکھنوی نے آپ کو حنفی علماء کے صاحب ترجیح علماء میں شامل کیا ہے۔ یعنی وہ علماء جو حسن درایت کی بنا پر بعض روایات کو بعض پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

آپ کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ کتاب مجموع النوازل ۲۔ کتاب التجنیس والمزید ۳۔ کتاب فی الفرائض ۴۔ کتاب المنتقیٰ ۵۔ مناسک الحج ۶۔ ہدایہ المبتدی ۷۔ کفایۃ المنتہی ۸۔ الہدایہ

لیکن جو شہرت اور عظمت "ہدایہ" کو نصیب ہوئی وہ دوسری کتب کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہ کتاب حنفی مسلک کے مطابق تحریر کی گئی ہے دوسرے ائمہ کے مسائل کا تذکرہ بھی دیا گیا ہے ساتھ ساتھ ان کے دلائل بھی ہیں لیکن مصنف نے دوسرے ائمہ کے دلائل کے شافی و کافی جواب دے کر اپنے مسلک کی تائید کی ہے۔

"ہدایہ" بدایۃ المبتدی کی شرح اور کفایۃ المنتہی کی تلخیص ہے۔ آپ نے اس کتاب کی ابتدا ۵۷۳ھ میں کی اور پورے تیرہ برسوں میں اس کی تکمیل ہوئی اس عرصے میں آپ مسلسل روزے رکھتے رہے اور گھر والوں کو بھی اس کا علم تک نہ ہوا اس کا انگریزی ترجمہ وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ہوا اور ۱۷۹۱ء میں لندن میں شائع ہوا۔ فارسی ترجمہ مولوی غلام یحییٰ خان نے کیا جو ۱۸۰۷ء میں کلکتہ میں شائع ہوا ان کی کتاب "فرائض العثمانی" کا انگریزی ترجمہ ہدایہ ملٹن کے نام سے مشہور ہے

ایک رسالہ جو فقہ پر قلم بند کیا گیا بدایۃ المبتدیٰ کے نام سے تصنیف کیا۔ یہ رسالہ مختصر ہے بعد میں اس رسالے کی ایک مفصل شرح کفایۃ المنتہی کے نام سے لکھی جو اسی (۸۰) جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مصر کے کتب خانے میں قلمی نسخے کی شکل میں موجود ہے۔

بریدہؓ بن حصیب (وفات ۶۰ھ/۶۸۰ء یا ۶۳ھ/۶۸۳ء) ابو عبد اللہ بریدہؓ بن حصیب صحابی رسولؐ، قبیلہ اسلم بن افصیٰ کے سردار تھے۔ جب آنحضورؐ ہجرت کے لئے مدینہ تشریف لا رہے تو راستہ میں بستی العمیم میں ٹھہرے۔ اسی وقت حضرت بریدہؓ اسی خاندانوں کے ساتھ جو ان کے ہمراہ تھے ایمان لائے۔ بعض روایات کے مطابق غزوہ بدر کے بعد اسلام قبول کیا۔ غزوہ احد کے بعد بریدہؓ مدینے میں آ بسے۔ اور تمام غزوات میں شامل رہے۔ ۹ھ/۶۳۰ء میں بنو اسلم اور بنو غفار سے صدقات وصول کرنے پر مامور کیا گیا اور اس کے بعد انہیں غزوہ تبوک میں بنو غفار اور بنو اسلم کو شرکت کی دعوت دینے کے لئے بھیجا گیا۔

آنحضورؐ کی وفات کے بعد بریدہؓ مدینے ہی میں مقیم رہے۔ بعد میں جب بصرہ آباد ہوا تو وہاں ایک مکان بنا کر رہنے لگے۔ اس کے بعد فوج کے ساتھ خراسان چلے گئے اور مرو میں سکونت اختیار کر لی وہیں وفات پائی۔

حضرت بریدہؓ بڑے صاف گو منصف مزاج اور خدا ترس تھے۔ آپ سے تقریباً ایک سو پچاس احادیث مروی ہیں۔

بریرہ (رضؓ) صحابیہ رسولؐ۔ حضرت عائشہؓ کی آزاد کردہ لونڈی۔ حضرت بریرہؓ کا آقا ایک غیر مسلم تھا۔ جسے انھوں نے اس شرط پر راضی کر لیا تھا کہ اگر وہ نو (یا پانچ) سالانہ قسطیں یک مشت ادا کر دیں تو آزاد ہو جائیں گی۔ اپنے آقا سے یہ شرط منوا لینے کے بعد وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور مدد کی درخواست کی۔ حضرت عائشہؓ نے انہیں پوری رقم ادا کر کے خرید لیا اور آزاد کر دیا لیکن انھوں نے حضرت عائشہؓ کی خدمت ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا نکاح ایک حبشی غلام مغیث سے ہوا تھا۔ اور آنحضورؐ نے انھیں مغیث کے ساتھ رہنے

Marfat.com

کی سفارش بھی کی۔ لیکن جب انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تو انھیں حکم دیا گیا کہ ایک مطلقہ عورت کی طرح عدت پوری کریں اور مغیثؓ ان کی جدائی میں مدینہ کی گلیوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔

حضرت بریرہؓ سے چند احادیث مروی ہیں اور وہ حضرت عائشہؓ، ابن عباسؓ اور عروہ ابن زبیرؓ سے روایت کرتی ہیں۔ ان کا انتقال یزید اوّل کے عہد میں ہوا۔

بَرّی، امام عبد اللطیف (وفات ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء) راولپنڈی (پاکستان) کے ایک صوفی بزرگ۔ والد کا نام شاہ محمود تھا۔ موضع جراہاں کرسال ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت کی طرف مائل تھے۔ والد نے بھینسیں چرانے کا کام سپرد کیا۔ اس کام کے ساتھ ساتھ ریاضت و عبادت میں مشغول رہے۔ آپ کے والد نے بعض مخالفتوں کی وجہ سے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر باغ کلاں علاقہ گولڑہ ضلع راولپنڈی میں سکونت اختیار کر لی اور آپ کو تعلیم کے حصول کے لیے کیمبل پور کے موضع غور غشتی میں بھیج دیا۔ آپ نے حضرت حیات المیر قادری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جو حضرت غوث الاعظم کے پوتے تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ ادائیگی فریضہ حج کے لیے حرمین الشریفین تشریف لے گئے۔ واپسی پر اس جگہ پر جہاں آج کل اسلام آباد ہے مقیم ہو کر رشد و ہدایت کا آغاز کیا۔ آپ کے فیض سے لاکھوں افراد بہرہ مند ہوئے۔ ان ہی کی کوششوں سے یہاں دو قبیلوں ڈھونڈ اور ستی میں اسلام پھیلا۔ ان کا گاؤں "چورپور" اب "نورپور" کہلاتا ہے۔ صاحب حدیقۃ الاولیا آپ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"شاہ لطیف بری قادری بزرگان پنجاب سے تھے۔ حضرت کے ہزاروں خوارق و کرامات مشہور ہیں۔ آپ بڑے عابد و زاہد، گوشہ نشین، مست و مجذوب تھے۔ ہزاروں مرید مدارج تکمیل کو پہنچے۔ آپ نے نعمت باطنی حضرت حیات المیر "زندہ پیر" سے پائی۔ جو غوث الاعظم کے پوتوں سے ہیں۔"

آپ کے خلفاء میں شاہ بہلول قادری ہیں جن سے سلسلہ بہلول شاہی چلا۔ ان کے علاوہ شاہ حسین بھی آپ کے خلفاء میں سے ہیں۔

بریلویؒ، احمد رضا خاں (۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ/۱۴ جون ۱۸۵۶ء۔ ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ/۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء) اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی قادری بن مولانا نقی علی خاں بن مولانا رضا علی خاں بن مولانا حافظ کاظم علی خاں بن مولانا شاہ محمد اعظم خاں، ہندوستان کے بہت بڑے عالم دین متبحر فاضل، بلند پایہ صوفی اور شاعر تھے۔ بریلی (اتر پردیش) کے محلہ جسولی میں پیدا ہوئے۔ محمد نام رکھا گیا۔ تاریخی نام المختار (۱۲۷۲ھ) تجویز ہوا۔ دادا نے احمد رضا نام رکھا، جس میں خود مولانا نے عبد المصطفیٰ کا اضافہ کیا۔ ان کے معتقدین انہیں "اعلیٰ حضرت" اور "فاضل بریلوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مولانا کا خاندان افغانستان کے قبیلہ بڑیچ سے تعلق رکھتا تھا، جو کئی پشتوں تک حکومت مغلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ مولانا محمد اعظم خاں امور سلطنت سے علیحدہ ہو کر بریلی تشریف لائے اور وہیں اقامت اختیار کی۔ مولانا شاہ رضا علی اپنے دور کے بے مثل عالم اور ولی کامل تھے۔ اسی مذہبی فضا اور پرتقدس ماحول میں اعلیٰ حضرت نے چار پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا۔ اردو فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد میزان منشعب وغیرہ کی تعلیم جناب مرزا غلام قادر بیگ سے حاصل کی، پھر تمام دینیات کی تعلیم اپنے والد ماجد سے مکمل کی۔ ۱۴ شعبان ۱۲۸۶ھ/۱۹ نومبر ۱۸۶۹ء میں تمام علوم دینیہ و عقلیہ مثلاً اصول، کلام، تاریخ جغرافیہ، ریاضی، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی سند حاصل کر کے منصب افتاء پر فائز ہوئے۔ ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۷ء میں حضرت شاہ آل رسول مارہروی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، علویہ وغیرہ میں دوسرے مشائخ سے اجازت حاصل کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے شیخ احمد بن زینی، شیخ عبد الرحمان مکی، دحلان مکیؒ، شیخ حسین بن صالح مکی اور شیخ ابو الحسین احمد النوری سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نے بعض علوم میں معاصرین علماء سے اور بعض میں ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے کمال پیدا کیا۔ خصوصاً علم ریاضی اور علم نجوم و ہیئت میں ذاتی مطالعے سے دسترس حاصل کی۔

۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ قیام مکہ کے دوران میں شافعی عالم شیخ حسین بن صالح ان سے بے حد متاثر ہوئے اور تحسین و تکریم کی۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی کتاب "الجوہرہ" کی شرح صرف دو روز میں "النظرۃ الرضیہ فی النیرۃ الوضیہ" کے نام سے لکھ دی۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء میں دوبارہ زیارت حرمین شریفین کے لیے گئے۔ اس بار وہاں کے علماء کے لیے نوٹ کے ایک مسئلے کا حل "کفل الفقیہ" کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس کے علاوہ ایک اور تالیف "الدولۃ المکیہ" بھی لکھی۔ اس میں مسئلہ غیب پر محققانہ بحث ہے۔ انھی تصانیف کی بنا پر بعض علمائے حرمین نے آپ کو "مجدد ماۃ" لکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے تمام عمر فتویٰ نویسی، فقہ، نعت گوئی اور علم ریاضی میں تصنیف و تالیف پر صرف کی۔ آپ کی عمر کے آخری دور میں سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ عین اسی وقت گاندھی جی نے مسلم ہندو اتحاد کا راگ الاپنا شروع کیا اور ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کا آغاز کر دیا۔ یہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔ جس نے بروقت مسلمانوں کو ہندو چال سے آگاہ کیا اور اتحاد کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ بعد کے حالات نے اس بات کا ثبوت مہیا کر دیا کہ ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ دو قومیں بستی ہیں۔ آپ کے معتقدین نے جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ اس کا دوسرا نام جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ رکھا گیا۔ جماعت رضائے مصطفیٰ کے ارکین نے شدید مسلم اتحاد کے لیے دن رات کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بانی نعیم الدین مراد آبادی تھے۔

اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی نے بریلی شریف میں "جامعہ منظر الاسلام" کی بنا ڈالی تھی۔ جہاں سے آپ کے خلفاء تربیت پا کر جاتے تھے۔ آپ کے خلفاء دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ صرف حرمین میں آپ کے خلفاء کی تعداد تیس تھی۔ ان میں سید عبد الحی، شیخ حسین جمال مکی، شیخ صالح کمال مکی، سید اسماعیل خلیل مکی، سید مصطفیٰ خلیل مکی، ضیاء الدین احمد مدنی وغیرہ پاک و ہند میں حامد رضا خاں، سید محمد عبد السلام مولانا محمد ظفر الدین بہاری، محمد امجد علی اعظمی، سید نعیم الدین مراد آبادی، سید احمد اشرف گیلانی، محمد دیدار علی الوری، مولانا مفتی غلام جان ہزاروی، مولانا ابو البرکات سید احمد قادری مولانا عبد العلیم میرٹھی وغیرہ اہم ہیں۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا حسن رضا خاں، مولانا حامد رضا خاں، مولانا محمد رضا

Marfat.com

خاں، مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا عبدالرشید عظیم آبادی، مولانا شاہ غلام محمد بہاری، مولانا ظفرالدین بہاری، مولوی امجد علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے دو فرزند تھے۔ حامد رضا خاں اور مصطفیٰ رضا خاں۔ آپ کا مزار بریلی شریف کے محلہ سوداگران میں "دارالعلوم منظر الاسلام" کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ جہاں ہر سال ۲۴، ۲۵ صفر کو عرس منعقد ہوتا ہے۔

مولانا نے پچاس سے زائد علوم و فنون میں تقریباً ایک ہزار کتابیں لکھیں۔ "تذکرہ علمائے ہند" میں ان کی تصانیف کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان میں سے "فتاویٰ رضویہ" بارہ ضخیم جلدوں میں، "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" قرآن کریم کا سلیس اور رواں ترجمہ اور جد الممتار" علامہ ابن عابدین شامی کی کتاب "ردالمحتار" کا پانچ مبسوط جلدوں میں عربی حاشیہ نہایت اہم ہیں۔

اعلیٰ حضرت بچپن ہی سے تقویٰ، طہارت، اتباعِ سنّت، پاکیزہ اخلاق اور حسن سیرت کے اوصاف سے مزیّن ہو چکے تھے۔ صرف تیرہ چودہ برس کی عمر میں آپ جلیل الشان عالم عظیم المرتبت فاضل ہو گئے اور پھر چون برس تک مسلسل دینی اور علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے سب کام حب الٰہی کے ماتحت تھے۔ نہ کسی کی تعریف کرتے، نہ کسی کی ملامت کا خوف کھاتے۔ آپ کے خادم کا بیان ہے کہ اعلیٰ حضرت چوبیس گھنٹے میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے آرام فرماتے اور باقی تمام وقت تصنیف و کتب بینی اور دیگر خدماتِ دینیہ میں صرف فرماتے۔ علامہ اقبال آپ کے ہم عصر تھے اور آپ کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ ان کے فتاویٰ، ان کی ذہانت، فطانت، کمالِ فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں۔ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں اپنے دور کے امام ابوحنیفہ ہوتے۔

علوم دینیہ کے فاضل ہونے کے ساتھ شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے لیکن ان کا ذوقِ سلیم حمد و ثنا اور نعت و منقبت کے علاوہ اور کسی صنفِ سخن کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ان کے کلام میں عالمانہ وقار ہے۔ قرآن و حدیث کی ترجمان ہے۔ سوز و ساز اور کیف و سرور ہے۔ آپ کے مشہور زمانہ سلام کی گونج پاک و ہند کے کسی بھی گوشے سے سنی جا سکتی ہے

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ان کے بعض مخالفین کا یہ خیال ہے کہ احمد رضا خاں نے دین اسلام میں کسی نئے فرقے کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ بات کسی بھی طور حقیقت پر مبنی نہیں۔ انھوں نے صرف مسالک اربعہ کے تحفظ کی کوشش کی تھی۔ البتہ یہ درست ہے کہ علماء کی اس جماعت کو عرف عام میں رضا خاں بریلوی سے عقیدت کی بنا پر بریلوی کہا جاتا ہے اور دوسروں سے بعض مسائل میں اختلاف کی بنا پر ان کا الگ تشخص قائم ہو گیا ہے۔ انہوں نے تحفظ اقدارِ اسلامیہ کے لئے بریلی سے جو تحریک شروع کی، اسے بریلوی تحریک کا نام دیا گیا ہے۔

(نیز دیکھیے "بریلوی تحریک")

بریلوی تحریک برعظیم پاکستان و بھارت میں اہلسنت کے ایک گروہ کی تحریک جو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی سے منسوب ہے اور جس کا آغاز بریلی شہر سے ہوا۔ اس گروہ کو "حزب الاحناف" بھی کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے یہ پیروکار اگرچہ الگ فرقے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن بعض مسائل میں دوسرے مسالک سے اختلاف کی بنا پر ان کا الگ تشخص قائم ہو گیا ہے۔ یہ اسلاف میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خیالات سے متفق ہیں اور محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید کے بعض افکار کے خلاف ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے یہ حنفی ہیں اور بنیادی طور پر وہابی اور دیوبندی مسلک کے ردّعمل کے طور پر ایک تحریک کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔

بریلوی تحریک کا آغاز "جامعہ منظر الاسلام" بریلی سے ہوا۔ جس کی بنیاد اعلیٰ حضرت نے ڈالی تھی۔ بریلی کے بعد اس تحریک کا دوسرا بڑا مرکز مراد آباد تھا۔ جہاں ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں شیخ محمد نعیم الدین مراد آبادی نے "دارالعلوم نعیمیہ" کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کی۔

صحیح معنوں میں بریلوی تحریک کا آغاز ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء سے ہوتا ہے۔ جب گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔ اعلیٰ حضرت نے اس سے اختلاف کیا اور مسلمانوں کو اس اتحاد کے مضرات سے آگاہ کیا۔ ان کے معتقدین نے "جماعت رضائے مصطفیٰ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس" کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ جس کا دوسرا نام "جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ" رکھا گیا۔

۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی بریلوی تحریک اپنے زوروں پر آ گئی۔ چنانچہ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا چار روزہ اجلاس (۲۷ تا ۳۰ اپریل) بنارس میں منعقد ہوا۔ اس میں متفقہ طور پر مطالبہ پاکستان کی حمایت کی گئی۔

سیاسی محاذ سے قطع نظر بریلوی تحریک کا تشخص بطور مسلک بھی کیا جاتا ہے۔ آزاد خیال، فطرت پسند اور سائنٹیفک طرز فکر بریلوی حضرات کے نزدیک مردود ہے خصوصاً وہ ندوۃ العلماء، دیوبند اور علیگڑھ جیسی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہابی، نجدی اور دیوبندی ایک ہی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ انہیں اہل سنت سے نہیں گردانتے اور اکثر اوقات ان عقائد کے حامل افراد پر فتویٰ کفر بھی صادر کیا گیا ہے۔

برعظیم پاکستان و بھارت میں ان کی سینکڑوں درسگاہیں ہیں۔ جن میں سے اکثر اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے ناموں سے منسوب ہیں۔ لاہور میں جامعہ نظامیہ رضویہ جامعہ نعیمیہ اور دارالعلوم انجمن حزب الاحناف، کراچی میں دارالعلوم امجدیہ اور جامعہ تبلیغیہ ملتان میں مدرسۂ انوار العلوم، لائلپور میں مدرسہ مظہر الاسلام اور جامعہ رضویہ، مراد آباد (بھارت) میں جامعہ نعیمیہ اور بریلی میں مدرسہ منظر الاسلام قابل ذکر ہیں۔

بریلوی عقائد سے دیگر مسلمان اختلاف رکھتے ہیں خصوصاً دیوبندی عقائد کی رو سے یہ بدعتیں ہیں اور قابل مذمت ہیں۔ جبکہ بریلوی حضرات کے نزدیک یہ ایمان کا جزو اور عین اسلام ہیں۔ عقائد میں بریلوی تقلید کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک عقائد صرف وہی ہو سکتے ہیں، جو قدیم مجتہدین نے وضع کئے تھے۔ غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے مجتہد امام کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک عقائد کے لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک ایک ہیں۔ ان میں فرق صرف فروعی مسائل میں اختلاف سے ہے۔

بریلوی عقائد میں توحید سے مراد ہے مراد اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اس کے محبوب پیغمبر آخر الزمان آنحضور صلعم کی عزت و عظمت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم بالذات ہے اس کے بتائے بغیر کسی کو ایک حرف کا علم بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا علم اس کی صفت ہے اور واجب ہے۔ وہ ہر ترکیب، زمان و مکان اور ہر عیب سے پاک ہے۔ وہ ہر چیز کا ہمیشہ سے جاننے والا ہے۔ اس کا علم واجب اور قدیم ہے۔

انبیائے کرام رب کا آئینہ ہیں آواز اور زبان ان کی ہوتی ہے اور کلام رب کا ہوتا

Marfat.com

ہے۔ عام انبیاء مرد اور بشر تھے۔ جن، فرشتہ، عورت وغیرہ نبی نہیں ہوتے۔ نیز نبی ہمیشہ اعلیٰ خاندان سے اور عالی نسب ہوتا ہے اور نہایت عمدہ اخلاق کا مالک ہوتا ہے نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ نبوت عطائے الٰہی ہے کوئی شخص اپنی عبادات اور اعمال سے نبوت کا درجہ نہیں پا سکتا۔

آنحضورؐ آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد نبوت کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا آنحضورؐ انسانوں میں سے تھے۔ مگر مظہر نور خدا تھے۔ اس لیے آپؐ کو بشر کہنا یا بھائی یا برابری کے لقب سے پکارنا حرام ہے۔ آپؐ بشر ظاہری تھے۔ اور یہ بشریت دوسروں سے مختلف تھی۔ آپؐ کے جسم مبارک کا سایہ تک نہ تھا۔ اور آپؐ کے پسینے سے خوشبو آتی تھی۔ آپؐ کو پانچ غیبوں کی جزئیات کا علم دیا گیا تھا۔ آپؐ کا علم ساری خلقت سے زیادہ ہے۔ آپؐ کو حقیقت روح اور متشابہات قرآن کا بھی علم عطا ہوا تھا۔ نیز آپؐ کو لوح محفوظ پر لکھے ہوئے تمام واقعات کا بھی علم تھا۔ آپؐ تمام مخلوق الٰہی میں بڑے عالم ہیں۔ آپؐ کے کسی وصف پاک کو ادنیٰ چیزوں سے تشبیہ دینا یا ان کے برابر بتانا صریح توہین ہے اور یہ کفر ہے۔ آنحضورؐ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ روز قیامت آپؐ شفاعت کریں گے۔ نیز اس دنیا میں بھی آپؐ مسلمانوں کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ آپؐ سے مدد مانگنا اور یا رسول اللہ کا نعرہ لگانا جائز ہے۔

اولیائے کرام نور خدا سے دیکھتے ہیں۔ انہیں بالواسطہ انبیائے کرام سے کچھ علوم غیب ملتے ہیں۔ وہ درجے میں نبوت سے کم ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی معجزات اور کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ ان کی کرامات موت کے بعد بھی بدستور رہتی ہیں وہ بھی حاضر و ناظر ہوتے ہیں اور ان سے بھی مدد مانگی جاتی ہے۔ اگرچہ حقیقی مدد خدا سے مانگی جاتی ہے لیکن اولیاء اسی کے مظہر ہیں اور مدد مانگتے ہوئے انہیں وسیلہ بنایا جاتا ہے۔

صوفیاء اور اولیاء امت کے ستون ہوتے ہیں۔ چالیس ابدال ہر وقت دنیا میں موجود ہوتے ہیں، جو آفتوں کو ٹالتے رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے خلق کی حیات، روزی اور تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔

بدعت دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ بدعت حسنہ کی تین اقسام جائز، مستحب اور واجب ہیں۔ اسی طرح بدعت سیئہ کی دو اقسام ہیں۔ مکروہ اور حرام مثلاً فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا اور عمدہ عمدہ کھانوں میں وسعت کرنا جائز ہے۔ مسافر خانوں اور مدرسوں کا بنانا مستحب ہے۔ علم نحو کا سیکھنا اور اصول فقہ کا جمع کرنا واجب ہے اور مسجدوں کو فخریہ زینت دینا مکروہ اور جبریہ مذہب اختیار کرنا حرام ہے

بریلویوں کے نزدیک جائز امور میں بلند آواز سے درود شریف پڑھنا یا ذکر کرنا، اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دینا، نیاز دینا، ان سے مدد مانگنا، ایصال ثواب کرنا بدنی اور مالی عبادات دوسرے مسلمانوں کو بخشنا، فاتحہ، تیجہ، چالیسواں وغیرہ کرنا۔ میت کے لیے دعا کرنا، خواہ وہ نماز جنازہ سے پہلے ہو یا تدفین کے بعد ہو۔ جنازے کے آگے کلمہ طیبہ یا درود شریف پڑھنا، میت کے ساتھ بزرگان دین کے تبرکات غلاف کعبہ، شجرہ یا عہد نامہ رکھنا، تدفین کے بعد اذان دینا، پختہ قبر بنانا اولیاء اور مشائخ کے مزار بنانا، قبروں پر پھول چڑھانا اور چراغ جلانا۔ اولیاء اللہ کے نام پر جانور پالنا، عبدالنبی یا عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا، اچھے اچھے کھانوں پر ختم دلانا اور گیارہویں شریف وغیرہ کا ختم دلانا شامل ہیں۔

مستحب امور میں محفل میلاد منعقد کرنا، ولادت پاکؐ کی خوشی منانا، اس کے ذکر کے موقع پر خوشبو لگانا، گلاب چھڑکنا، شیرینی تقسیم کرنا، غرضیکہ خوشی کا اظہار کرنا۔

اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا، ان کے تبرکات، لباس اور بال وغیرہ کو بوسہ دینا۔ اور ان کی تعظیم کرنا، موذن کے اشہد ان محمد الرسول اللہ کہنے پر سننے والوں کا دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا شامل ہیں۔

یہ عقائد صرف بریلوی تحریک ہی کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہوئے بلکہ عامۃ الناس میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ بریلوی مکتب فکر نے اسے جلا بخشی اور تقویت عطا کی۔ (نیز دیکھیے "بریلوی، احمد رضا خاں")

بریلی ہندوستان کے صوبہ اترپردیش کے دو مشہور شہر۔ ایک رائے بریلی اور دوسرا بانس بریلی کہلاتا ہے۔ رائے بریلی سے سید احمد شہید نے اپنی تحریک جہاد کا آغاز کیا اور بانس بریلی میں اعلیٰحضرت احمد رضا بریلوی نے اپنے مدرسہ "جامعہ منظر الاسلام" کی بنا ڈالی، جہاں سے بریلوی تحریک کا آغاز ہوا۔ رائے بریلی کے لیے دیکھیے عنوان "رائے بریلی"۔

بانس بریلی شہر دہلی سے ایک سو تیس میل جنوب مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہ روہیل کھنڈ ڈویژن اور ضلع بریلی کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہاں کی آبادی سوا تین لاکھ تھی جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔

بانس بریلی کی بنیاد ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء میں رکھی گئی۔ اس کے نزدیک ہی بانس کا ایک قدیم جنگل ہے، جو اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ مغل بادشاہ اکبر نے یہاں ایک قلعہ بنوایا تھا۔ بعد میں اس قلعے کے گرد لوگ بسنا شروع ہو گئے اور یہ ایک قصبے کی شکل اختیار کر گیا۔ شاہجہان کے دور میں اسے روہیل کھنڈ کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوؤں نے یہاں سے مغلوں کے صوبے دار کو نکال کر حکومت خود سنبھال لی مگر بہت جلد ان میں پھوٹ پڑ گئی اور حکومت کی باگ ڈور ایک روہیلہ سردار علی محمد خاں کے ہاتھ آ گئی۔ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں حافظ رحمت خاں اس کا جانشین بنا۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں سعادت یار خاں وزیر اودھ کے ماتحت اس شہر کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں یہ شہر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء اور ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۲ء میں یہاں زبردست ہندو مسلم فسادات ہوئے اور ۱۸۵۸ء تک یہ شہر انگریزوں کی عملداری سے باہر رہا۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں کی اکثر مسلمان آبادی پاکستان ہجرت کر گئی۔

بریلی کی قابل ذکر عمارات میں جامع مسجد (تعمیر شدہ ۱۶۶۷ء) مقبرہ رحمت خاں (۱۷۷۵ء) کمپنی باغ اور مرزائی باغ اہم ہیں۔

بریلی سڑکوں اور ریل کے ذریعے اردگرد کے تمام شہروں سے ملا ہوا ہے۔ یہ دہلی سے لکھنؤ جانے والی ریلوے لائن کا جنکشن ہے۔ یہاں کی اہم صنعت شکر سازی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ماچس، کپڑے اور کپڑوں سے بننے والی مصنوعات خصوصاً ٹینٹ اور دریاں بنانے کی فیکٹریاں بھی کام کر رہی ہیں۔

ضلع بریلی ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے جو جنوب کی طرف بتدریج ڈھلوان ہوتا جاتا ہے۔ ضلع کی کل آبادی ۱۹۷۱ء میں بیس لاکھ کے قریب تھی جو ۱۵۹۱ مربع میل پر آباد ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز ہے اور گنگا سے نکلنے والی نہروں سے سیراب ہوتی ہے۔ اہم فصلیں گندم، چاول اور گنا ہیں۔

روہیل کھنڈ ڈویژن بجنور، بدایوں، مراد آباد، پیلی بھیت، رام پور، شاہجہانپورہ اور بریلی کے ضلعوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۹۷۱ء میں ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی۔

Marfat.com

بزرگ امید، کیا (وفات ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء) قلعہ الموت کا اسماعیلی حاکم جو ۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء سے ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء تک یہاں کا حاکم رہا۔ اس نے قلعہ مین اور سرداروں کی معیت میں حسن بن صباح کے لیے فتح کیا کیونکہ اس پر جن لوگوں کا قبضہ تھا انہوں نے اسماعیلیوں کے ساتھ معاہدہ توڑ کر سلجوق امیر نوشتگین شیرکو وہاں بلانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد بزرگ امید نے وہاں کے مقامی مزدوروں کو بیگار میں پکڑ کر اس قلعے کو از سر نو تعمیر کرایا اور پانی وغیرہ کا بندوبست کرکے ایک عمدہ باغ بھی لگوایا۔ اس نے اسی قلعے میں ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء میں ترک کے حملے کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

حسن بن صباح نے اپنی وفات کے وقت ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء میں بزرگ امید کو اپنے فرقے کا داعی اور اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس کے دور حکومت میں اسماعیلی ریاست نے نئے حملوں کے باوجود اپنی خود مختاری قائم رکھی۔ اس نے کئی جدید جنگی قلعے تعمیر کرائے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کیا محمد داعی بنا۔ اور پھر اس کی اولاد الموت کا ایک سربرآوردہ خاندان بن گئی تھی۔

برنطینی بازنطینی یا بوزنطی، مشرق روم (دائمی) کی ایک سلطنت اور اس سے متعلقہ چیزوں کا نام جو قرون وسطیٰ کی سب سے بڑی یورپی سلطنت تھی اس سلطنت کی بنیادیں قدیم رومی سلطنت میں گڑی ہیں۔ اس سلطنت نے اسلامی ترکی معماروں کا بڑی حد تک مقابلہ کیا اور تاریخ تہذیب پر انمٹ اور گہرے نقوش چھوڑے۔ گیارھویں صدی میں اس کا تمدن تنزل اور شوکت کے عروج پر تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد لاطینیوں اور نارمنوں کے حملوں کے بعد یہ سلطنت کمزور ہونا شروع ہوئی اور بالآخر سولھویں صدی کے بعد زوال پذیر ہوگئی۔

عام طور پر قسطنطین اعظم اول (م ۳۲۴ء تا ۳۳۷ء) کو اس سلطنت کا پہلا حکمران سمجھا جاتا ہے اور قسطنطین یازدہم (۱۴۴۹ء–۱۴۵۳ء) کو اس کا آخری حکمران گردانا جاتا ہے ان کے حکمران ارکیڈیس نے ۳۹۵ء میں یونانی شہر بزنطیم کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یوں ایک طرح سے اسی کے عہد سے بزنطینی سلطنت کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دور میں اہل روما اور فارس کے درمیان زبردست جنگیں ہوتی رہیں۔ جن کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ طلوع اسلام کے وقت فارس اور روم ہی دو بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، جو آپس میں ٹکرا کر اس قدر کمزور اور پست حوصلہ ہوگئیں کہ بہت جلد مٹھی بھر مسلمانوں نے انہیں شکست فاش دینا شروع کردی۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بحیرہ روم میں کامیابیاں حاصل کرنا شروع کردیں اور بزنطینی صوبوں مثلاً شام، مصر اور شمالی افریقہ کو فتح کرلیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمانوں نے ایشیائے کوچک، ترکی، پر چڑھائی کردی۔ قسطنطین پنجم (۷۴۱ء – ۷۷۵ء) نے کسی قدر سخت مدافعت کا مظاہرہ کیا۔ اور مسلمانوں کو اس کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑا۔ تاہم مسلمانوں نے استنبول (قسطنطنیہ) پر قبضہ کرلیا۔ اور دوسری طرف بلغاریوں نے بزنطینی سلطنت پر دھاوے بولنا شروع کردیئے۔ کچھ عرصہ بعد اس کے حصے بخرے ہونا شروع ہوگئے اور یہ سلطنت لاطینی شہنشاہوں کی عملداری میں چلی گئی۔

۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں اسلامی سلطنت عثمانیہ کی بنا پڑی۔ ارطغرل کا بیٹا عثمان خان اول تخت نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور

آٹھویں صدی عیسوی کی اسلامی تعمیرات میں بزنطینی آرٹ کی ایک جھلک۔ دمشق کی اموی جامع مسجد

Marfat.com

ایشیائے کوچک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے اس سے بہتر موقع عثمان کو نہیں مل سکتا تھا لیکن اس نے اپنی زیادہ تر توجہ بزنطینی علاقوں کی طرف مبذول رکھی۔ اور اس کے چند ایک اسباب تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ خود اس کی جاگیر بزنطینی سرحد سے متصل واقع تھی۔ اور بزنطینی سلطنت کی کمزوری روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری وجہ اسلام کی تبلیغ تھی۔ بزنطینیوں سے برسرپیکار ہونے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ عثمان کے لئے دوسری جانب قدم بڑھانے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ سلجوقی امراء جنہوں نے خود سر حکومتیں قائم کرلی تھیں طاقت میں اس سے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ عثمان نے تخت نشین ہوتے ہی حملے شروع کردیئے۔ ابتداء میں اس کی لڑائیاں مدافعانہ تھیں بزنطینی قلعہ دار دولت سلجوقیہ کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہتے تھے۔ سلطان قونیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے عثمان کو ان حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھنا پڑا اور پہلے ہی سال قراجہ حصار کا معرکہ پیش آیا۔ عثمان نے اس قلعہ کو فتح کرکے بزنطینیوں کو آئندہ کے لئے متنبہ کردیا۔ سلطان علاءالدین نے قراجہ حصار اور اس کے قرب وجوار کا سارا علاقہ جو عثمان نے بزور شمشیر حاصل کیا تھا جاگیر کے طور پر عثمان کو بخش دیا۔ ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء میں جب سلجوقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو عثمان ایک آزاد اور خود مختار فرمانروا بن گیا۔ اس طرح سلجوقی امراء اور عثمان کے درمیان جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود عثمان کی نظر بزنطینی سلطنت کے زرخیز مقبوضات پر مرتکز رہی۔

دوسرے ترک سرداروں نے بزنطینی قلعداروں سے اتحاد کرکے اس کے مقبوضات پر حملہ آور ہوئے۔ اس طرح جنگ کا جو سلسلہ ۶۹۷ھ/۱۲۹۸ء میں چھڑا وہ ابتداً عثمان کی طرف سے بالکل مدافعانہ تھا۔ اس نے ان سب حملہ آوروں کو شکست دی اور بزنطینی قلعے یکے بعد دیگرے فتح کیے۔ اور بالآخر ینی شہر پر قبضہ کرکے اسے اپنی سلطنت کا پایہ تخت بنالیا۔ ۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء میں عثمان کو نکومیدیا سے متصل قیون حصار کے مقام پر پہلی بار شہنشاہ قسطنطنیہ کی باقاعدہ افواج سے مقابلہ پیش آیا جس میں عثمان کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور اس طرح بزنطینی قلعے پے در پے مسخر ہوتے چلے گئے۔ بروصہ، نائسیا اور نکومیدیا کے گرد عثمان کی فوجی چوکیوں کا ایک مضبوط حصار قائم ہوگیا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے بزنطینیوں نے تاتاریوں کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ لیکن عثمان کے لڑکے آرخان نے انہیں شکست دی اور بزنطینیوں کی امید کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔

۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء میں عثمان نے بروصہ کا محاصرہ کیا جو بزنطینیوں کا ایشیائے کوچک میں ایک نہایت ہی اہم شہر تھا۔ یہ محاصرہ تقریباً دس سال تک رہا اور بالآخر محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ اور اس طرح ایک اہم بزنطینی شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

اس کے بیٹے آرخان نے تخت نشین ہوتے ہی نکومیدیا پر قبضہ کرلیا۔ اب بزنطینی سلطنت کے ایشیائی مقبوضات میں صرف ایک ہی بڑا شہر نائسیا باقی رہ گیا تھا جو اپنی عظمت و اہمیت کے لحاظ سے قسطنطنیہ سے دوسرے درجے پر تھا۔ آرخان نے اسے بھی ۷۳۰ھ/۱۳۳۰ء میں فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اگرچہ آرخان نے اس شہر کے باشندوں کو عام اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنا تمام مال واسباب لے کر دوسرے شہر میں چلے جائیں لیکن بروصہ کے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی بکثرت مسلمان ہوگئے اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہے۔

۱۴۵۳ء میں مراد دوم نے قسطنطنیہ (استنبول) کو فتح کرلیا اور اس کے ساتھ ہی بزنطینی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

بزنطینی سلطنت نے تہذیب و تمدن پر جو نقوش چھوڑے، وہ انمٹ ہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ عنوان "روم" کے تحت ملے گا۔ تاہم اتنا ضرور درج کیا جاسکتا ہے کہ بزنطینی آرٹ اور طرز تعمیر نے اسلامی تمدن کو بے حد متاثر کیا اور ان کی تعمیرات پر بھی بزنطینی فن تعمیر کا اثر چھا گیا۔ جن میں محراب اور گنبد کی صورتیں شامل ہیں۔ یہ اثرات پندرہویں صدی عیسوی تک اپنے عروج کو پہنچ چکے تھے۔ خصوصاً آرمینیا بلقان، روس اور ترکی میں اب بھی اس تہذیب کے اثرات ملتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی آرٹ اور فن تعمیر زیادہ تر بزنطینی آرٹ اور فن تعمیر کا مرہون منت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ (نیز دیکھیے "تعمیرات"، "روم")

بساسیری، ابوحارث

(وفات ۸ر ذوالحجہ ۴۵۱ھ/۱۵ جنوری ۱۰۶۰ء) ایک ترک غلام جو عہد آل بویہ کے آخری دور کا اعلیٰ فوجی قائد تھا۔ اس کا پہلا آقا فارس کے ایک مقام بسا کا رہنے والا تھا۔ اسی لیے ابوحارث کا لقب بھی بساسیری پڑا۔ بہاءالدولہ نے اسے خرید لیا اور بتدریج وہ ترقی کرتے کرتے بلند ترین منصب تک پہنچا۔ سب سے پہلے اس کا نام رحبال الدین اور موصل کے عقیلیوں کے مابین ۴۱۹ھ/۱۰۲۵ء تا ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء میں ہونے والی جنگوں کے درمیان آتا ہے۔ جن میں بساسیری نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ بغداد میں اس کا ایک طاقتور دشمن خلیفہ کا وزیر رئیس الروسا ابن المسلمہ تھا۔ جس نے طغرل بیگ سے پینگیں رابطہ قائم کر لیا تھا۔ جب ترک سرداروں اور خلیفہ کے درمیان اختلافات ہوئے تو بساسیری نے ابن المسلمہ پر طغرل کے حامی غزوں کو طلب کرنے کا الزام لگایا۔ اس نے فاطمی خلیفہ سے قاہرہ جانے کی اجازت مانگی تو خلیفہ نے فاطمی امداد کے سے بساسیری کی درخواست منظور کرلی۔ اور لکھا کر بغداد کو میرے نام پر مسخر کیا جائے۔ المستنصر نے بساسیری کو رحبہ کا گورنر مقرر کردیا اور پانچ لاکھ دینار، اتنی ہی مالیت کے کپڑے، پانسو گھوڑے دس ہزار کمانیں اور ایک ہزار تلواریں نیزے اور تیر بھیجے ۴۴۸ھ/۱۰۵۷ء میں بساسیری نے سنجار کے علاقے پر حملہ کیا اور ایک خونریز لڑائی کے بعد فتح پائی اور اس طرح موصل میں بھی فاطمی خلیفہ المستنصر کو خلیفہ تسلیم کرلیا گیا۔ بعد میں طغرل نے جوابی حملہ کیا اور دوبارہ موصل پر اس کا قبضہ ہوگیا اور بساسیری رحبہ لوٹ آیا۔ ادھر ابراہیم اینال اپنے بھائی طغرل کی سلطنت پر قبضہ جمانا چاہتا تھا اس نے بساسیری کو خط لکھا اور بھائی کی سلطنت لینے کے لئے اس سے روابط بڑھائے تاکہ فاطمیوں کی مدد حاصل ہوسکے۔ بساسیری نے چار ماہ محاصرہ کرنے کے بعد حصار موصل فتح کرلیا۔ اور دوبارہ رحبہ واپس لوٹ آیا۔ طغرل نے دوبارہ موصل کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں بساسیری شہر بغداد کے مغربی حصہ میں چار سو سواروں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس نے جمعہ کے روز مسجد منصور میں فاطمیوں کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور مسجد رصافہ میں بھی خلیفہ مستنصر کی خلافت کا اعلان کرایا۔ اگرچہ عباسی خلیفہ قائم نے قصر خلافت کی قلعہ بندی کررکھی تھی۔ لیکن بساسیری کو نہ صرف کرخ کے شیعوں کی حمایت حاصل تھی بلکہ بہت سے سنی بھی مال غنیمت کے لالچ میں آکر اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ یکم ذی الحجہ ۴۵۰ھ/۱۹ جنوری ۱۰۵۹ء کو بساسیری نے قصر خلافت پر حملہ کرکے اپنا قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد بساسیری نے

Marfat.com

واسط اور بصرہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ مستنصر چاہتا تھا کہ بساسیری عباسی خلیفہ القائم کو اس کے حوالے کرے لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا تو اسے بساسیری پر بہت غصہ آیا۔ بساسیری کی قاہرہ سے ہر قسم کی امداد بند کر دی۔ ادھر طغرل سے بھی بساسیری کا معاملہ طے نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ۴۵۱ھ/۱۰۶۰ء میں بغداد سے کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ طغرل نے اس کا پیچھا کیا۔ دونوں کے مابین جنگ ہوئی اور وہ الفرات کے مقام پر مارا گیا۔

بستانی لبنان کا ایک خاندان، جس نے ادبی لحاظ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس خاندان کا تعلق مارونی فرقے سے تھا۔ اس خاندان کے چند مشہور علماء یہ ہیں۔

۱۔ **پطرس البستانی:**۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں بیروت کے ایک گاؤں الدبیۃ میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام پولس بن عبداللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم ایک مسیحی مدرسے میں حاصل کی۔ ۱۸۴۰ء میں بیروت کے امریکی مشن ہائی سکول میں داخل ہوا۔ یہیں پر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا۔ ۱۸۶۰ء میں عبیہ میں عربی کا مدرس ہوا۔ دو سال قیام کرنے کے بعد بیروت چلا گیا اور وہاں پر اس نے انجیل کا عبرانی سے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۸۳ء میں بیروت ہی میں اس جہان سے چل بسا۔

اس کی تصانیف میں ۱۔ "کشف الحجاب" (فی علم الحساب) جو اس نے عبیہ میں اپنے دو سالہ قیام کے دوران میں لکھی۔ ۲۔ انجیل کا عبرانی سے عربی میں ترجمہ۔ ۳۔ "محیط المحیط" عربی زبان کی فیروز آبادی کی القاموس میں اضافے کر کے دو جلدوں میں تیار کی۔ ۴۔ "قطر المحیط" میں "محیط المحیط" کا اختصار کیا گیا جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ ۵۔ "الجنۃ والجنینۃ" یہ دو مجلے تھے جو لبعد میں ماہنامہ "الجنان" میں مدغم ہو گئے۔

۶۔ "قاموس الاعلام" اس میں بستانی نے مختلف لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ "دائرۃ المعارف" یہ البستانی کا ایک عظیم کام تھا، جو عربی ادب میں اس کے پیش روؤں کے تجربوں پر مبنی تھا۔ یعنی تمام اقسام علوم کا ایک ضخیم مجموعہ معلومات۔ اس کی چھ جلدیں مکمل طور پر طبع ہو چکی تھیں اور ساتویں جلد کی طباعت شروع ہو چکی تھی کہ بستانی چل بسا۔ اس کے بعد یہ دائرہ گیارہ جلدوں تک شائع ہو سکا جس میں اس کے بیٹوں اور دوسرے لوگوں کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ آخری جلد عنوان "عثمانیہ" تک پہنچی تھی جو ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی تھی۔

۲۔ **سلیمان البستانی:**۔ (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۵ء) لبنان کے گاؤں بکشتین میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا مطران سے حاصل کی۔ لبعد میں پطرس البستانی کے قائم کئے ہوئے مدرسہ الوطنیہ میں بڑے بڑے اساتذہ سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں ماہنامہ "الجنۃ" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوا۔ دائرۃ المعارف میں بھی مضامین لکھے بعد میں قاسم زہیر نے اسے بصرے بلا کر ایک نئے ادبی مجلے کی ادارت اس کے سپرد کی۔ لیکن یہ کام ایک سال تک جاری رہ سکا۔ اس کے بعد اس نے مختلف عرب ممالک کی سیاحت کی اور ۱۸۸۵ء میں بیروت آ گیا یہاں پر اس نے دائرۃ المعارف کا کام سنبھالا۔ ۱۸۸۷ء میں مصر چلا گیا اور وہاں اس کی عربی مختصر نویسی کی ایجاد کا بہت خیر مقدم کیا گیا۔ اس نے ایران و ہندوستان کی بھی سیاحت کی اور ان دونوں ملکوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس نے بغداد اور قسطنطنیہ کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۰۴ء میں اپنی مشہور کتاب "الیاذہ ھومیروس" جو "الیڈ" کا منظوم عربی ترجمہ ہے قاہرہ سے شائع کرائی اور اس طرح عرب کے شعراء کے ذہنوں کو یونانی شاعری سے آشنا کیا۔ ادب عربی ۱۹۰۰ء میں

وہ بیروت کے نمائندے کی حیثیت سے نوجوان ترکوں کی مجلس ملی میں شامل ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں سینیٹ کا رکن منتخب کیا گیا اور اس بلند پایہ جماعت کا دوسرا صدر چنا گیا۔ بعد میں اپنے اس منصب سے استعفیٰ دے کر سوئیٹزرلینڈ چلا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۲۵ء میں اس نے وفات پائی۔

۳۔ **ودیع البستانی** (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۴ء) لبنان کے ایک گاؤں رببہ میں پیدا ہوا۔ اس نے مشرقی ادب کا مطالعہ کیا اور مشرق و مغرب کے دور دراز ممالک کی سیاحت کی۔ اور اس طرح اپنے علم کو وسعت دی۔ ہندوستان اور فلسطین میں بھی کافی عرصہ قیام کیا۔ اسرائیلی غاصبانہ تحریک کے خلاف مختلف مضامین لکھے۔ رباعیات عمر خیام اور داستان مہابھارت کے ایک بڑے حصہ کا عربی میں ترجمہ کیا۔

بعض افراد نے اس ادب دوست خاندان کی اعلیٰ روایات کو اب بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ جن میں بطرس البستانی، جو بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں ادب کا پروفیسر ہے اور "ادباء العرب اور التوابع والزابع" کا مصنف ہے۔ اسی طرح سعید البستانی ہے جو پیرس یونیورسٹی میں عربی کا استاد ہے۔

بُسرؓ بن ارطاۃ ایک عرب سپہ سالار اور صحابیٔ رسولؐ، قریش کی شاخ بنو عامر سے تھے۔ ہجرتؐ سے دس سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے۔ تشیعی روایات میں انھیں صحابہؓ کرام میں شامل نہیں کیا جاتا۔

شام کی طرف جو امدادی فوج حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں گئی تھی اس میں حضرت بُسرؓ شامل تھے۔ اور وہاں پر انہوں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فتح افریقہ میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں ان کی بہادری کے سبب دعا دی تھی اور انعام سے بھی نوازا تھا۔ مسلمانوں کی باہمی جنگ میں انہوں نے امیر معاویہؓ کا ساتھ دیا۔ جنگ صفین میں بھی وہ شامی لشکر میں شامل تھے جب عمرؓو بن العاص نے مصر کو امیر معاویہؓ کے لئے دوبارہ فتح کیا تو بُسرؓ نے ان کی اعانت کی۔

یمن میں انہوں نے عبیداللہ ابن عباس کے دو نوعمر بیٹوں کو ہلاک کیا جب حضرت حسنؓ نے خلافت سے دستبرداری اختیار کی تو اس وقت ایک جمعیت امیر معاویہؓ کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ بسرؓ اس ہراول فوج کے سپہ سالار تھے۔ اس صلے میں انہیں بصرہ کا عامل بنایا گیا۔ وہ عراق میں ایک قلیل عرصہ رہے۔ اس کے بعد بسرؓ نے بزنطینی سلطنت کے خلاف کئی بحری مہمات کی قیادت کی۔ ۵۰ھ/۶۷۰ء میں امیر معاویہؓ نے انہیں اپنا نائب مقرر کیا اس دوران میں یہ کبھی سپہ سالار اور کبھی امیر البحر کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ امیر معاویہؓ کی وفات تک ان کے دربار میں رہے۔ ولید کے عہد حکومت میں انہوں نے افریقی فوج کشی میں دوبارہ حصہ لیا۔ بعض کے نزدیک انہوں نے عبدالملک کے دور میں مدینہ میں ایک طویل عمر پا کر وفات پائی۔ ان کی اولاد میں بڑے نامور محدث گزرے ہیں جن سے امام بخاری اور امام مسلم نے صحیحین میں روایت کی ہے۔

بسرؓ کی شخصیت بڑی نمایاں تھی۔ وہ قدیم طرز کے بدوی سرداروں کا نمونہ تھے۔ سخت گیر کے طور پر مشہور تھے۔ انہیں جب حضرت علیؓ کے حامیوں کے مقابلے میں اندرون عرب بھیجا گیا تو وہ بڑی بے جگری سے لڑے اور حجاز میں مخالفینِ عثمانؓ کے ٹھکانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ بنو امیہ کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔

Marfat.com

بسط (پھیلاؤ، بڑھانا) تصوف کی ایک اصطلاح، جو قبض کی متضاد ہے اور اس کا اطلاق اس روحانی کیفیت پر ہوتا ہے جسے حال کہا جاتا ہے۔ اور جو مقام امید میں طاری ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

"تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور بڑھانا بھی اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ (۲: ۲۴۵)

صوفیاء کے نزدیک حال کا شخصی اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک احساس مسرت ہے جو صوفی کو اللہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ صوفیا کی نظر میں بسط کا درجہ قبض سے کم تر ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کو خدا کا وصل حاصل نہ ہو جائے اور انسان اس کی ذات میں گم نہ ہو جائے اس وقت تک یا اس نے سوا کوئی اور احساس مناسب ہی نہیں۔ جنید بغدادیؒ نے بسط کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "خوف خدا مجھ میں قبض پیدا کرتا ہے اور اس کی بارگاہ سے امید مجھ میں بسط پیدا کرتی ہے جب وہ خوف کے ذریعے مجھ میں قبض پیدا کرتا ہے تو میں اپنی خودی سے باہر ہو جاتا ہوں لیکن وہ رجا (امید) کے ذریعے مجھ میں بسط پیدا کرتا ہے تو میں اپنی خودی میں واپس آجاتا ہوں۔"

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں "قبض سے مراد ہے حالت حجاب میں دل کا سکڑ جانا اور بسط سے مراد ہے حالت کشف میں اس کا پھیل جانا۔"

ابن الفارض نے اس صوفی نکتے کو اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے جس کا مطلب ہے "بسط" کے حال میں جو رحم ہے، میں اس میں سراپا خواہش بن جاتا ہوں اس کی وجہ سے تمام دنیا کی خواہشات وسیع ہو جاتی ہیں۔ "قبض" کی حالت میں جو وحشت ہوتی ہے اس میں مجسم ہیبت بن جاتا ہوں اور جس کسی پر میری نظر پڑتی ہے اس کی گردن میرے سامنے احتراماً جھک جاتی ہے۔

بسطامی، بایزیدؒ:۔ ایک بزرگ صوفی (دیکھئے "بایزید بسطامی")

بسم اللہ (خدا کے نام سے (آغاز) ایک آیت کے ابتدائی الفاظ۔ پوری آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے جس کے معنی ہیں شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ قرآن مجید میں سوائے "سورۃ التوبہ" کے ہر سورۃ کا آغاز اس کلمے سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ متن قرآن میں یہ آیت ایک مقام پر مکمل کلمے کی شکل میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کے ضمن میں آئی ہے: "یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے اور یہ اللہ کے نام سے شروع ہوتا ہے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے (۲۷: ۳۰)

دوسری جگہ اختصار سے آئی ہے: حضرت نوحؑ نے لوگوں سے کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اس کا چلنا اور لنگرانداز ہونا اللہ کے نام سے ہے۔ (۱۱: ۴۱)

فقہ اسلامی میں کلمہ بسم اللہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے کہ آیا وہ ان سورتوں کی ایک آیت یا جز ہے یا نہیں۔ اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس بنا پر قرآن کی آیات میں بھی اختلاف ہے۔

قراء حضرات سورۃ التوبہ کے سوا ہر سورۃ کے شروع میں بسم اللہ کا پڑھنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ البتہ جب مسلسل تلاوت قرآن ہو رہی ہو اور ایک سورت کے بعد دوسری سورت شروع ہو تو اس سورت میں بسم اللہ پڑھنے میں قراء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک بغیر بسم اللہ پڑھے دو سورتوں کا وصل جائز ہے اور بعض کے نزدیک ناجائز۔

جہری نمازوں میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے۔ حنفیوں کے نزدیک بسم اللہ اونچی آواز کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیئے۔ نیز اس مسئلہ میں بھی علماء میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن ہے یا نہیں اس مسئلے میں علماء کے تین مسلک ہیں۔ جن میں سے ایک مسلک معتدل ہے اور دو انتہا پسند ہیں۔

بسم اللہ پڑھنا حصول برکت کی غرض سے، کھانا کھانے سے پہلے، پانی پینے، کپڑے پہننے سے پہلے غرض ہر کام کے شروع میں شعار دین میں سے ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ "جس کام کو بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ ادھورا اور بے برکت ہو جاتا ہے۔" نیز ذبیحہ کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا چاہیئے اور جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔

بسیطؒ:۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے پاک ناموں میں سے ایک (دیکھئے "اسماالحسنیٰ")

بشارت خوشخبری، مژدہ، بقول مولانا مودودی "مایوسی، مرعوبیت اور پژمردگی کے مقابلے میں پُرامید بنانا حوصلہ بڑھانا اور مایوسی کو دور کرنا بشارت دینے کے لفظ میں یہ سب معنی شامل ہیں۔"

قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہوں پر آیا ہے۔ مثلاً:

"اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔" (۱۰: ۸۷)

اسی طرح دیگر مقامات پر ارشاد ہے۔

"اور اے نبی بشارت دے دے عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو۔ جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو انکے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے، اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" (۲۲: ۳۴ - ۳۵)

"اور اے نبی بشارت دے دے نیکوکار لوگوں کو۔" (۲۲: ۳۷)

"اس دن جب تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا (ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لئے۔ جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔" (۵۷: ۱۲)

ایک جگہ بشارت کے لفظ کے بغیر ارشاد ہے:۔

"تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو۔ اللہ

Marfat.com

کی جماعت کے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں (۵۸ : ۲۲)

غرض قرآن میں بشارت کا ذکر انہی معنوں میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے۔ "اور ہم نے اس (ابراہیم) کو اسحاق کو بشارت دی۔" (۳۷ : ۱۱۲) یہاں بھی بشارت کا لفظ خوشخبری کے معنوں ہی میں استعمال ہوا ہے

بشر آدمی، انسان اس کے لغوی معنی جسم کثیف کے ہیں جس کی ظاہری سطح کسی چیز سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ بقول مولانا مودودی انسان کی تخلیق کے بعد یہ لفظ انسان ہی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کا ذکر مٹی کے پتلے کے طور پر بھی آتا ہے جو بال و پر سے عاری ہو۔ یعنی جس کی جلد دوسرے حیوانات کی طرح اون، صوف یا بالوں اور پروں سے ڈھکی نہ ہو۔

قرآن مجید میں یہ لفظ کئی بار استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

"جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا" میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔" (۳۸ : ۷۱) اور اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:۔

"کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے وہ برتر اور حکیم ہے۔" (۴۲ : ۵۱)

اور کہیں منکرین نبوت کی اس دلیل کے سلسلے میں جس میں وہ کہتے تھے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ آیا ہے۔

"بستی والوں نے کہا تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم جھوٹ بولتے ہو۔" (۳۶ : ۱۵) (نیز دیکھیے "انسان")

بشر بن براءؓ رضی اللہ عنہ صحابی رسولؐ۔ قبیلہ خزرج کی ایک شاخ بنو سلمہ سے تھے۔ مدینہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے والد کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا اور بیعت عقبہ کے موقعہ پر آنحضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بدر۔ احد خندق اور خیبر کے غزوات میں بھی شریک رہے۔ خیبر میں جب ایک یہودیہ نے آنحضورؐ کو زہر ملا بھنا ہوا گوشت کھانا چاہا تو آنحضورؐ نے تو چکھ کر زہر معلوم کر کے گوشت تھوک دیا لیکن بشرؓ نے کھا لیا اور اسی کے اثر سے وفات پا گئے۔ بعض کے نزدیک گوشت کھانے کے فوراً بعد انتقال کیا اور بعض کے نزدیک ایک سال بیمار رہنے کے بعد وفات پائی۔ بشرؓ بڑے پرجوش اور بہادر مسلمان تھے۔ تیر اندازی میں بڑے مشہور تھے۔ آنحضورؐ انہیں قبیلہ بنو سلمہ کے سید کے نام سے یاد فرماتے تھے۔

بشر بن غیاث (م ۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء) ابو عبدالرحمان بشر بن غیاث بن ابی کریمہ ابو عبدالرحمان مرجیہ فرقے کا ایک مشہور عالم۔ فقہ کی تعلیم امام ابو یوسف سے حاصل کی۔ حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ اور دوسرے محدثین سے حدیث کی سماعت کی۔ الٰہیات میں وہ فرقہ مرجیہ کے مسلک کا حامی تھا۔ قرآن کو مخلوق کہتا تھا چونکہ خلق قرآن کا عقیدہ سب سے پہلے صراحۃً جہم بن صفوان نے پیش کیا تھا اسی وجہ سے بشر کو جہمی بھی کہا جاتا ہے نیز معتزلہ عقیدہ بھی قرآن کے بارے میں یہی تھا۔ اس بنا پر اسے معتزلی بھی کہا گیا ہے۔

بشر نے ایمان کی تعریف یوں کی ہے۔ "دین اسلام کا قلب و زبان سے اقرار کرنا ایمان ہے۔ اور جو شے تصدیق نہیں وہ ایمان بھی نہیں۔" اس کے نزدیک "خدا کی نافرمانی کے تمام افعال گناہ کبیرہ ہیں۔"

مشیت الٰہی کی بھی اس نے دو الگ قسمیں بتائی ہیں۔ تقدیر کے بارے میں اس کا مسلک دو انتہا پسندانہ عقیدوں جبریہ اور قدریہ کے بین بین ہے اور یہی مسلک اہل سنت والجماعت کا بھی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اسے معتزلہ سے الگ گردانتے ہیں۔

بشر کے بارے میں کئی روایات بیان کی جاتی ہیں ایک روایت میں ہے کہ اس کے عقائد کی وجہ سے اس پر جبر و تشدد کیا گیا اور تقریباً وہ بیس سال تک روپوش رہا۔ ایک روایت میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام شافعیؒ اپنے قیام بغداد کے دوران میں بشر اور ان کی والدہ کے ہاں مقیم رہے۔ بعض روایات کے تحت بشر نے زندگی کے آخری ایام راسخ العقیدہ سنی کی حیثیت میں بسر کی۔ اگرچہ حنبلی انہیں مسلمانوں کا رئیس الملاحدہ (کافروں کا امام) ہی خیال کرتے ہیں۔

بشر بن معتمر معتزلہ عقیدہ کا ایک عالم۔ بغداد میں پیدا ہوا۔ وہاں سے بصرہ گیا۔ بصرے میں اس نے بشر بن سعید اور ابو عثمان الزعفرانی سے معتزلہ مذہب کے اصول سیکھے۔ معمر بن عباد السلمی بھی اس کے اساتذہ میں سے تھا۔ جب بصرے سے واپس بغداد آیا تو اس نے بہت سے لوگوں کو معتزلی مذہب کے پیروکار بنا دیا۔ جس پر ہارون الرشید نے اسے قید میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے زمانۂ اسیری میں مذہب معتزلہ کے تین بنیادی اصولوں "عدل"، "توحید"، "وعید" پر بیس ہزار کے قریب اشعار نظم کیے۔ یہ اشعار زندان سے نکل کر زبان زد عام ہو گئے تو ہارون الرشید نے اسے مزید قید میں رکھنا مناسب خیال نہ کیا۔ کیونکہ قید کے دوران میں لوگوں پر اس کا اثر زیادہ تھا۔

بشر ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا خطیب بھی تھا اس نے مصنفوں اور شاعروں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا ہے "شاعر کو الفاظ کا خفیہ تاثر محسوس کر لینا چاہیے اور ایسے نفیس و جمیل الفاظ منتخب کرنا چاہئیں جو سادہ اور ادائے مطلب میں واضح ہوں۔"

بشر نے معتزلی مذہب پر کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں سے چند اجزا محفوظ رہ گئے ہیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے التولد (افعال زائیدہ) پر بحث کی ہے اس کے نزدیک عقل جونہی بلوغت کی حد تک پہنچتی ہے وہ نیکی اور بدی میں کسی وحی کے بھی پہلے تمیز کر سکتی ہے اور اسی وجہ سے کسی خوبی یا عدم خوبی کا انحصار انسانوں پر ہی ہوتا ہے۔ اس کے قول کے مطابق "اس شخص کی خوبی زیادہ ہے جو خود اپنے ہی وسائل سے نیکی کرتا ہے۔ بہ نسبت اس کے جسے خدا کے فضل سے مدد ملی ہو۔" اس کے نزدیک توجہ کرنا بے سود ہے۔ جب تک توبہ کے ساتھ یہ ارادہ اور عزم نہ ہو کہ دوبارہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا اور اس پر مزید اصرار نہیں کیا جائے گا۔

بشر کے شاگردوں میں سے ابو موسیٰ المردار، ثمامہ، احمد بن ابی دواد وہ لوگ ہیں جو بعد میں معتزلہ عقائد اور تعلیمات کے استاد بنے۔

بشر حافی (۱۵۲ھ/ ۷۶۹ء - ۲۲۷ھ/ ۸۴۱ء) ابو النصر بشر بن حارث بن عبدالرحمان عراق کے ایک صوفی بزرگ، مرو کے قریب ایک گاؤں ماہرسام یا بکرد میں پیدا ہوئے۔ ان کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں۔

Marfat.com

وہ ایک محدث تھے اور غالباً حدیث کے شوق میں انہوں نے کئی ایک سفر بھی کیے جب پہلی دفعہ بغداد پہنچے تو کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مالک بن انس رضؓ کے حلقہ درس میں بھی بیٹھے اور ان کے ساتھ حج کے لیے سفر کعبہ کا سفر بھی کیا۔ بعض حضرات نے ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شاگردی میں بھی رہے۔ ان کے تصوف اختیار کرنے کے بارے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک شخص اسحاق المغازلی نے ایک خط میں ان سے پوچھا کہ اگر تمہاری بصارت اور سماعت جاتی رہے اور تم تکلے بنانے کے قابل نہ رہو تو کیسے روزی کماؤ گے۔ اس روز سے انہوں نے پاکیزہ زندگی گذارنے کا عہد کر لیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی تعلیمات سے ترک تعلق کرکے اپنی لکھی ہوئی احادیث کو دفن کر دیا اور اپنی پوری توجہ تصوف پر مبذول کر دی۔ ان کے صوفیانہ زہد و تقوے کی بنیاد شریعت اسلامی تھی۔ اہل بیت سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا احترام امام احمد بن حنبل اور المامون دونوں کی نظروں میں بہت زیادہ تھا۔ بشر اپنی زاہدانہ زندگی کے باوجود اللہ تعالےٰ کی کبریائی کے سامنے ہمیشہ ڈرتے رہے۔ ان کی تعلیم تھی کہ انسان فقر کو صبر و سخاوت کے ساتھ قبول کرے۔ ان کے نزدیک کسی انسان کی یہ خواہش کہ لوگوں میں اس کے نیک کاموں کا چرچا ہو دنیادارانہ ذہنیت کا مظہر ہے اور وہ اس معاملے میں اس قدر حد سے گذر چکے تھے۔ لوگ ان کی تعلیمات کو بہت حد تک ملامتیہ فرقے کی تعلیمات کے قریب شمار کرتے ہیں۔ بشر عمل کو علم پر سبقت دیتے تھے۔ ننگے پاؤں رہنے کی وجہ سے انہیں حافی کہا جاتا ہے۔ بغداد میں وفات پائی۔

بشیر خوشخبری دینے والا۔ بشارت دینے والا۔ آنحضورؐ کے ناموں میں سے ایک۔

قرآن مجید میں آنحضورؐ کے لیے بشیر کا لفظ کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آنحضورؐ کو لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اس بات کی خوشخبری کہ اگر انسان نیک عمل کرے گا تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے جہاں وہ آرام و سکون کی زندگی گذارے گا۔ نیز اس بات کی خوشخبری کہ جو لوگ اس دنیا میں نیک عمل کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے جو انہیں جنت کی صورت میں ملے گا۔

قرآن مجید میں بشیر اور نذیر دونوں الفاظ ایک ساتھ آنحضورؐ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً سورۃ سبا میں ہے۔

"اور ہم نے تجھے سب لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (۳۴ : ۲۸)

بشیرؓ بن سعد (وفات ۱۲ھ/۶۳۳ء) صحابی رسولؐ۔ مدینہ کے قبیلہ بنو خزرج سے تھے۔ سابقون الاولون میں سے تھے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر موجود تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور دو موقعوں پر سپہ سالار بھی بنائے گئے ان میں سے ایک تو ۷ھ/۶۲۸ء میں بنی مرہ کے خلاف مہم پر انہیں سردار بنا کر فدک کی طرف بھیجا گیا۔ لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور زخمی ہوئے دوسری مرتبہ بنو غطفان کے خلاف بھیجا گیا۔ اس مہم میں بشیرؓ کامیاب رہے اور بہت سامان غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ جب آنحضورؐ صلح حدیبیہ کے مطابق عمرے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت بشیرؓ اس مسلح دستے کے سردار تھے۔ جو آنحضورؐ کی حفاظت کے لیے ساتھ گیا تھا۔ اسی طرح ثقیفہ بنو ساعدہ میں جب انصار اور مہاجرین اکٹھے ہوئے تو انہوں نے انصار کی بجائے قریش کے دعوے کی حمایت کی۔ اور انصار میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ انہوں نے عراق کی مہم میں بھی شرکت کی اور جب حضرت خالدؓ بن ولید نے الحیرہ فتح کیا تو حضرت بشیر اس معرکے میں بھی شریک تھے انہوں نے عین التمر کے مقام پر وفات پائی۔ ان کے بارے میں اس بات کی وضاحت نہیں ملتی کہ آیا وہ میدان جنگ میں شہید ہوئے یا زخمی ہو کر بعد میں وفات پائی۔

حضرت بشیرؓ ان صحابہ میں سے تھے جنہیں لکھنا آتا تھا۔ نعمان بن بشیرؓ انھی کے بیٹے تھے۔

بشیر شہاب ثانی (۱۱۸۰ھ/۱۷۶۷ء ـ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) ابن قاسم بن عمر حیدر شہابی۔ ایک لبنانی امیر۔ غزیر میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ نوجوان ہوتے ہی اس نے سیاست میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے اور لبنان کی گورنری کے لیے لوگوں کی نظریں بشیر پر پڑنے لگیں ۱۷۸۸ء میں سیدون، طرابلس، شام اور دمشق کے ترک بادشاہوں کے عائد کردہ بھاری ٹیکسوں سے تنگ آکر لبنان کے گورنر امیر یوسف شہاب نے ملک کے ممتاز افراد پر مشتمل ایک وفد کو مشورت کے لیے طلب کیا اور اسی اجلاس میں لوگوں کی رائے کے مطابق بشیر کا گورنر لبنان کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔

بشیر ایک ذہین، محتاط اور دور اندیش انسان تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے جنبلاطوں اور امرا کے ذریعے نکد سرداروں کو قتل کرایا۔ بعد میں جنبلاطوں کی مدد سے ارسلان امرا کو لبنان چھوڑنے اور کہیں پناہ گزین ہونے پر مجبور کر دیا اور پھر جنبلاطوں کو ۱۸۲۴ء میں شکست دے کر بھگا دیا۔ اور مقامی دستوں کو مضبوط کرکے انہیں تمام فلسطین میں سب سے زیادہ طاقتور فوج بنا دیا۔ دوسری طرف عیسائی بطریقوں اور اسقفوں کو کثیر امدادی رقمیں دے کر فرانسیسی قونصل کی حمایت حاصل کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا دین بھی تبدیل کر لیا اور عیسائی ہو گیا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مقامی ترکوں کی سازشوں کا خاتمہ کرکے لبنان کی تاریخی خود مختاری محفوظ کرلے۔ چنانچہ جس وقت نپولین نے فلسطین میں پیش قدمی کی تو اس نے ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے واضح طور پر نہ تو اس کی حمایت کی اور نہ مخالفت اور جونہی فرانسیسی فوجیں مصر کی طرف ہٹیں اس نے وزیر اعظم سلطنت عثمانیہ کے مستقر العریش جا کر ایک شاہی فرمان حاصل کر لیا۔ جس کی رُو سے لبنان براہ راست باب عالی کے ماتحت آگیا۔ اگرچہ وزیر اعظم کی وفات کے بعد اس فرمان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی اور بشیر کو دوسرے ذرائع اختیار کرنا پڑے۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء میں باب عالی کے سفیروں نے محمد علی پاشا حاکم مصر کے خلاف بشیر سے مدد حاصل کرنا چاہی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور لبنانی فوجیں نے طرابلس میں عثمان پاشا سے لڑیں اور دمشق پر چڑھائی کرنے والے لشکر میں بھی شامل ہوئیں۔ نیز شمالی جانب حلب تک مصری لشکر کے سلسلہ رسد اور عقب کی حفاظت کی۔ اس کے صلے میں محمد علی پاشا نے لبنان کے قدیم حقوق تسلیم کر لیے اور وعدہ کیا کہ وہ داخلی مسائل میں براہ راست مداخلت نہیں کرے گا۔ لیکن بدقسمتی سے محمد علی پاشا کو جب فوج کے لیے مزید آدمیوں اور روزافزوں اخراجات کے لیے مزید روپے کی ضرورت پیش آئی۔ تو اس نے

Marfat.com

لبنانیوں پر بھی ٹیکس لگانے کا حکم دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لبنان کے اندر شورش برپا ہوگئی اور کئی ہزار مصریوں کا خون بہا۔ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں مشرقی لبنان کے اندر مصریوں کو ایک بار پھر تباہ و برباد ہونا پڑا۔

۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں اتحادی بحریہ کے دستے لبنانی سمندروں میں پہنچ گئے۔ اور ایک ترکی فوج خلیج جونیہ کے کنارے اتر آئی۔ لبنانی فوج نے (جس نے امیر بشیر کے خلاف بغاوت کر دی تھی) ترکی اور سیلی پوش دستوں کے ساتھ مل کر ابراہیم پاشا کو شکست دے کر بشیر ثالث کو لبنان کا گورنر بنانے کا اعلان کر دیا۔ بشیر ثانی نے اپنے آپ کو برطانیہ کے حوالے کر دیا جسے جلا وطن کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد بشیر کو ایشیائے کوچک میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس کا انتقال یہیں ہوا۔ اسے غلطہ (استنبول) کے ارمنی کیتھولک کلیسا میں دفن کیا گیا۔ اور جب ۱۹۴۷ء میں لبنان کو آزادی مل گئی۔ تو لبنان کی جمہوری حکومت نے ۱۹۴۷ء میں اس کی لاش منگوا کر بیت الدین کے خاندانی گورستان میں دفن کی۔

بصرہ؟ اسلامی ممالک میں موجود تین شہروں کا نام۔ ان میں سے شام کا شہر عام طور پر "بُصریٰ" لکھا جاتا ہے۔ دوسرا شہر عراق میں شط العرب کے کنارے بغداد سے شمال مشرق میں ۴۲۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ موجودہ دور میں اس کا محل وقوع کچھ اور ہوگیا ہے۔ تیسرا شہر مراکش میں ہے، جس کا نام عراق کے شہر بصرہ کے نام پر رکھا گیا ہے۔

عراق کے شہر بصرہ کے بارے میں خیال غالب یہ ہے کہ نئی اسلامی بستی دراصل آباد جوار دشیر نامی ایرانی بستی تھی، کے آثار و کھنڈرات پر بنائی گئی۔ ۱۴ھ/۶۳۵ء میں آنحضورؐ کے صحابی عتبہؓ بن غزوان قدیم ایرانی چوکی کے انہی کھنڈرات پر خیمہ زن ہوئے تھے۔ ۱۶ھ/۶۳۸ء میں حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے اس مقام کو فوجی چھاؤنی کا درجہ دے دیا گیا۔ اور چھاؤنی قصبے کی شکل اختیار کر گئی۔ شروع شروع میں یہاں کے لوگ سرکنڈوں کے جھونپڑے بنا کر رہتے تھے۔ بعد میں کچی اینٹوں سے اس کی تعمیر ہوئی۔ زیاد بن ابیہ کے عہد میں یہ ایک پختہ اینٹوں والے قصبے کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ ۱۵۵ھ/۷۷۱ء۔ ۷۷۲ء تک یہ قصبہ کافی ترقی کر گیا اس وقت یہاں ایک جامع مسجد، دار الامارۃ، شہر پناہ اور گرداگرد ایک خندق تھی

عراقی بصرہ شروع ہی سے فاتح عربوں کے لیے فوجی بھرتی کا ایک مرکز رہا ہے۔ چنانچہ اہل بصرہ نے جنگ نہاوند میں جو ۲۱ھ/۶۴۲ء میں ہوئی حصہ لیا اس کے علاوہ اصطخر، فارس، خراسان اور سجستان کی تسخیر میں بھی شریک رہے۔ اس قصبے میں ۳۶ھ/۶۵۶ء میں جنگ جمل لڑی گئی۔ ۳۷ھ/۶۵۷ء میں جنگ صفین کے موقعہ پر اہل بصرہ حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑے۔ یہیں سے خارجیوں نے جنم لیا۔ ۴۱ھ/۶۶۲ء میں حضرت امیر معاویہؓ نے اس شہر پر نئے سرے سے اپنی حکومت کو بحال کیا اور ۴۵ھ/۶۶۵ء میں زیاد کو وہاں کا امیر مقرر کیا۔ زیاد کی وفات کے بعد ۶۴ھ/۶۸۳ء میں بصرہ میں شدید فسادات برپا ہوئے اور مختلف شورشیں برپا رہیں۔ بنو امیہ ان شورشوں کو دبانے میں مصروف رہے۔ جب عباسیوں کا دور آیا تو بصرہ بھی ان کے زیر نگیں ہوگیا۔

اس دور میں بصرہ کی حیثیت میں کافی کمی آئی اس کی وہ نیم خود مختار حیثیت ختم ہوگئی جو اسے شروع سے حاصل تھی۔ اس دوران میں بصرہ میں وقتاً فوقتاً سماجی قسم کی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ان بغاوتوں کی وجہ سے اس علاقے میں دہشت اور خوف و ہراس کا دور جاری رہا۔ ان بغاوتوں میں سب سے بڑی بغاوت قرامطہ کی تھی جس نے ۳۱۱ھ/۹۲۳ء میں بصرہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ بصرہ جب بنو مزید کے زیر اقتدار آیا تو اس نے اپنی خوشحالی دوبارہ حاصل کر لی۔ ان کے گرد و نواح کے بدویوں نے یہاں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے برباد کیا۔ بقول ابن حوقل متعدد عمارات منہدم کر دی گئیں۔ ایک مسجد (جو مسجد علیؓ کے نام سے مشہور ہے) نیز حضرت طلحہؓ، زبیرؓ، ابن سیرینؒ اور حسن بصریؒ کے مزارات کے سوا قدیم بصرے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ قرون وسطیٰ میں بصرہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ یہ ایک تجارتی مرکز بھی تھا۔ اسلحہ سازی کے کارخانوں نے بصرہ کو ایک صنعتی مرکز بنا دیا تھا۔ ایک اعتبار سے یہ ایک زرعی مرکز بھی تھا کیونکہ یہاں بہت سی اقسام کی کھجوریں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بصرہ دینی اور علمی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ یہیں سے عربی صرف و نحو نے جنم لیا۔ اور اس شہر نے بڑے بڑے صرفی و نحوی پیدا کیے۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں بصرہ شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بعض پرانی عمارات باقی تھیں لیکن بصرہ شہر اپنی پرانی جگہ سے موجودہ مقام پر منتقل ہونا شروع ہوا جو پہلے مقام سے بارہ میل دور تھا۔ ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں یہ علاقہ تمام عراق کے ساتھ ایک قلیل عرصے کے لیے شاہ اسماعیل کی ایرانی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس بصرہ اپنی نئی حالت میں بڑی نہر کے ساتھ دو میل اوپر کی جانب واقع تھا۔ اور اس میں نہری بندرگاہ تھی۔ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں عراق پر عثمانی فتح کا بصرہ پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔

بارھویں، تیرھویں صدی ہجری / اٹھارویں، انیسویں صدی عیسوی میں بصرہ جنوبی عراق کا صدر مقام اور ملک کی واحد بندرگاہ رہا۔ کھجور کی تجارت کا مرکز اور عرب، خوزستان اور خلیج فارس کے شہزادوں کے لیے دروازے کا کام دیتا رہا ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں بصرہ کو "ولایت" قرار دیا گیا اور اس کے ممتاز خاندانوں اور شخصیتوں میں بڑھتی ہوئی عرب قومیت کا ظہور ہوا۔ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں عراق پر برطانیہ کے قبضہ کے دوران میں بصرہ نے بہت زیادہ ترقی کی اور وہ ایک جدید شہر کی صورت اختیار کر گئی۔ بندرگاہ کو جدید ترین طرز پر تعمیر کیا گیا۔ شط العرب کے دہانے پر ایک گہری سدوبار کھودی گئی۔ شہر کے مضافات کو مختلف سڑکوں اور عمارتوں سے آراستہ کیا گیا۔ اسے عراق ریلوے کا آخری اسٹیشن قرار دیا گیا۔ اور ایک بہترین ہوائی مرکز بھی بنایا گیا۔

عراق حکومت کے تحت ایک "لوا" کا صدر مقام قرار دیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کی آبادی دو لاکھ تھی۔ ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء میں تیل کا ایک بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ اس کے بعد "لوا" میں کئی ذخائر دریافت ہوئے۔ جس سے بصرہ نے صنعتی میدان میں بہت جلد ترقی کی۔ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں مفتیہ میں تیل کو صاف کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا۔ اور اس طرح تیل کی بدولت بصرہ ایک مالدار شہر بن گیا۔ اس وقت بصرہ عراق کی خارجی تجارت کا اہم مرکز ہے۔ شہر کے ارد گرد بہت سے کارخانے موجود ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں شہر کی کل آبادی ساڑھے چار لاکھ تھی۔

بصرہ لوا (صوبہ) کویت کے ساحل سے لے کر ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ ۴۷۴۴ مربع میل کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کا زیادہ تر رقبہ صحراؤں پر مشتمل ہے۔ تاہم مزروعہ علاقے میں کھجور، چاول اور باجرے کی اچھی خاصی پیداوار ہوتی ہے۔

Marfat.com

علم وادب کے شاہکار مرکز

"شاہکار" کی مطبوعات اگر آپ کے پاس موجود ہوں تب بھی آپ اپنے شہر کے "شاہکار مرکز" پر ضرور تشریف لے جایئے۔ آپ کو "شاہکار" کی نمائندگی کا پورا اختیار ہے۔ ان سے مل کر آپ کو خوشی ہو گی۔

احمد پور شرقیہ:۔ اسلامی کتب خانہ۔ رحمان بکسیلرز
فردوس بکڈپو۔
اسماعیل آباد:۔ کالونی بک سٹال
اوستا محمد:۔ پاک نیوز ایجنسی۔ قاضی عبدالجلیل
اوکاڑہ:۔ فردوس نیوز ایجنسی
ایبٹ آباد:۔ پاکستان نیوز ایجنسی۔ ریاض نیوز
ایجنسی میر محمد بکسٹال ورائٹی
بک سٹال۔ یونیورسٹی بک ایجنسی
بصیر پور:۔ محمد شعبان عاجز
بنوں:۔ قاری حضرت گل
بوریوالہ:۔ طاہر نیوز ایجنسی
بھائی پھیرو:۔ سید علی محمد نیوز ایجنسی
بھکر:۔ مکتبہ معینیہ رضویہ۔ کھوکھر
نیوز ایجنسی۔
بہاول پور:۔ کیپٹل نیوز ایجنسی
بہاول نگر:۔ خالد محمود، عبدالخالق چشتی
بیلا:۔ پاک نیوز ایجنسی
پاک پتن:۔ مہر آباد نیوز ایجنسی
پپلاں:۔ ملک نیوز ایجنسی
پتوکی:۔ حاجی نیوز ایجنسی
پشاور:۔ افضل نیوز ایجنسی (چوک یادگار)
پلندری:۔ صوفی علی محمد
پنجگولہ:۔ نیشنل بک سٹال۔
پھلروان:۔ جنجوعہ نیوز ایجنسی
پیر محل:۔ سلیم اختر نیوز ایجنٹ
ٹانڈلیانوالہ:۔ محمد سعید نیوز ایجنٹ
تربت:۔ پاک نیوز ایجنسی
ترار کھل:۔ سردار محمد رستم خان
ٹنڈو آدم:۔ نوشاد نیوز ایجنسی
ٹنڈو الہیار:۔ نصرت علمی سٹور
ٹھٹھہ:۔ محمد ہارون نیوز ایجنٹ
ٹوبہ ٹیک سنگھ:۔ ملک محمد امین
جام شورو:۔ این۔ اے چیٹھہ
جڑانوالہ:۔ الممتاز لائبریری مسلم بکسٹال
جہانیاں:۔ خاک برادرز
جھڈو:۔ شیخ محبوب علی
جھنگ صدر:۔ شیخ محمد حسین

جہلم:۔ شمع بکسٹال، جی ٹی ایس اڈہ
جوہر آباد:۔ مکتبہ جوہر، کتابستان
جیکب آباد:۔ شاہین بکڈپو، عبداللہ اینڈ برادرز
نشاط نیوز ایجنسی۔
جیس آباد:۔ حافظ رحمت اللہ لطفی۔
چشتیاں:۔ چشتیاں کتاب گھر، مکتبہ نشاۃ۔
اسلامیہ شیخ محمد کبیر۔
چک جھمرہ:۔ سردار نیوز ایجنسی
چکوال:۔ سلطانی نیوز ایجنسی۔ فردوس
بکڈپو۔ مکتبہ رشیدہ۔
چوا سیدن شاہ:۔ سید فاروق حسین۔
چنیوٹ:۔ سردار نیوز ایجنسی۔
چیچہ وطنی:۔ طیب کتب خانہ۔ کتب خانہ رحمانیہ
حافظ آباد:۔ طالب حجازی نیوز ایجنٹ
حاصل پور:۔ اسلام الدین نیوز ایجنٹ
حسن ابدال:۔ خالد بکڈپو۔ مغل سٹورز
حضرو:۔ محمد ساجد نیوز ایجنٹ
حویلی لکھا:۔ ندیم بک سٹال۔
حویلیاں:۔ الطاف نیوز ایجنسی
حیدر آباد:۔ مشتاق نیوز ایجنسی (ہیرآباد پیلس)
خان پور:۔ چودھری بشیر امانت علی اینڈ برادرز
خانیوال:۔ ریلوے بکسٹال۔ کتب خانہ اشرفیہ
کتب خانہ صدیقیہ۔
خضدار:۔ پاک نیوز ایجنسی و سٹیشنرز
دینا:۔ سید نیوز ایجنسی
ڈگری:۔ سندھ بک سینٹر
ڈھرکی:۔ پاکستان نیوز ایجنسی
ڈھنگوالی:۔ ایم۔ دائی خان نیوز ایجنٹ
ڈیرہ اسماعیل خان:۔ اقبال برادرز۔
راجہ برادرز۔ خاور برادرز
قمر بکسٹال
ڈیرہ غازیخان:۔ محمد رمضان ساجد۔
ملک اللہ بخش
راجن پور:۔ افتخار کتاب گھر۔ طارق نیوز ایجنسی
راولپنڈی:۔ اتفاق نیوز ایجنسی (اخبار مارکیٹ)
راولاکوٹ:۔ محمد اشرف خان
ربوہ:۔ مبشر بک ایجنسی

روہڑی:۔ چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔
رحیم یار خان:۔ چودھری امانت علی۔
ساہیوال:۔ فضل نیوز ایجنسی
سامارو:۔ شوقین نیوز ایجنسی
سرگودھا:۔ پاکستان سٹینڈرڈ بک سٹال
ظفر بکڈپو۔ انصار بک سٹال
سمہ سٹہ:۔ محمد طارق نیوز ایجنٹ
سکھر:۔ حسینی بکڈپو۔ علی گڑھ بک سٹور۔
خورشید لائبریری۔ سکھر بک ہاؤس
عجائب سٹورز۔ مکتبہ جمہور محسن برادرز
اشفاق بک ڈپو۔
سکرنڈ:۔ رسول جو، حسن جو۔
سیالکوٹ:۔ ماڈرن بک ڈپو۔ ملک اینڈ سنز
سانگھڑ:۔ اسلامی کتب خانہ
سٹھارجہ:۔ مصطفےٰ اینڈ برادرز
سنبڑیال:۔ ملک شہزاد علی نیوز ایجنٹ
سمندری:۔ محمد سلیمان حیدر نیوز ایجنٹ
سوہاوہ:۔ مرزا نیوز ایجنسی
شجاع آباد:۔ سجاد الدین نیوز ایجنٹ
شکارپور:۔ مرتضیٰ ابڑو اینڈ برادرز۔
مکتبہ مشعل راہ۔
شکرگڑھ:۔ عوامی نیوز ایجنسی
صادق آباد:۔ چودھری برادرز
صادق گڑھ پیلس:۔ عبدالشکور شمیم۔
عارف والا:۔ الہلال نیوز ایجنسی بشیر بکڈپو
خالد بکڈپو۔ محمد اکرام بٹ۔
عمرکوٹ:۔ خان محمد خان نیوز ایجنٹ
غازی:۔ فرنٹیر بک ایجنسی
فاروقہ:۔ گلفام جنرل سٹور
فقیروالی:۔ محمد امین نعیم۔ قاسم نیوز ایجنسی۔
فورٹ سنڈیمن:۔ جدید کتاب گھر۔
کوئٹہ:۔ گوشہ ادب۔
کمالیہ:۔ راناولی محمد نیوز ایجنٹ۔
کیمبل پور:۔ خزینۂ علم وادب
کتب خانہ مقبول عام۔
کرک:۔ قیصر نیوز ایجنسی
کراچی:۔ طاہر نیوز ایجنسی

کوٹلی:۔ شمع بک ایجنسی۔
کندکوٹ:۔ فیض محمد بلوچ۔
کھور:۔ ڈاکٹر جی ایچ آزاد اینڈ سنز
کبیروالا:۔ حفیظ بک ہاؤس۔
کلورکوٹ:۔ طارق نیوز ایجنسی
گجرات:۔ طارق محمود نیوز ایجنٹ۔
گوجرہ:۔ مظفر نیوز سروس۔
گوجر خان:۔ شاہین نیوز ایجنسی
گلگت:۔ پیرزادہ محمد حسین شاہ اینڈ سنز
گدو:۔ میاں غلام نبی نیوز پیپر ایجنٹ
لالہ موسیٰ:۔ شفقت نیوز ایجنسی۔ قریشی برادرز
لاڑکانہ:۔ پاکستان بک ڈپو۔
لالیاں:۔ طاہر برادرز نیوز ایجنسی
لیاقت پور:۔ بدر نیوز ایجنسی۔
لاہور:۔ شمشاد نیوز ایجنسی۔
لائل پور:۔ مکتبہ افکار اسلامی۔
ملتان:۔ عزیز بک سٹال، حرم گیٹ۔
میرپور میتھلو:۔ رمیش بکڈپو۔
میرپور خاص:۔ سندھ کتاب گھر۔
منگلا:۔ سید خورشید انور نیوز ایجنٹ
میرپور:۔ اعظم نیوز ایجنسی
مانسہرہ:۔ بلال نیوز ایجنسی
مظفر گڑھ:۔ نیشنل نیوز ایجنسی
مظفر آباد:۔ پاکستان بک سٹال
مٹھن کوٹ:۔ اشفاق نیوز ایجنسی
ہاشمی بک ڈپو۔
ملکوال:۔ سرفراز نیوز ایجنسی
میاں چنوں:۔ دارالادب نیشنل نیوز ایجنسی
میانوالی:۔ نیازی نیوز ایجنسی۔ ریلوے بکسٹال
نارووال:۔ بٹ اینڈ برادرز
نواب شاہ:۔ سلیمان برادرز
واربرٹن:۔ سیال نیوز ایجنسی
واہ کینٹ:۔ قاضی نیوز ایجنسی
وزیر آباد:۔ ریلوے بکسٹال
وہاڑی:۔ وہاڑی نیوز ایجنسی
ہالہ:۔ اسلامک نیوز ایجنسی
ہری پور:۔ امجد نیوز ایجنسی
ہارون آباد:۔ عمران بک سٹال۔

Marfat.com

شاہکار جریدی کتابوں ـــــ بے بی انسائیکلوپیڈیا ـــــ اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے اجراء کے بعد

یکم مئی ۱۹۷۶ء سے

شاہکار کا ایک اور شاہکار

زیرِ ادارت: سید قاسم محمود

اردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا

«انسائیکلوپیڈیا معلومات»

۱۲۵ سے زائد قدیم و جدید علوم و فنون کے پچھتر ہزار سے زیادہ معلوماتی مضامین

مذہب
اسلام — عیسائیت
یہودیت — بدھ مت
زرتشت — پارسیت
ہندو مت — دیو مالا
عقائد — دینیات

سائنس
طبیعیات — کیمیا
ریاضی — شماریات
حیاتیات — نباتیات
حیوانیات — فلکیات
ایجادات، اطلاقی سائنس

تاریخ
آثارِ قدیمہ — قدیم و جدید
جنگیں — اقوام اور نسلیں
سیاسی تاریخ — فتوحات
فوجی تاریخ — تمدنی تاریخ
قوموں کے عروج و زوال کی داستان

فلسفہ
فلسفۂ اسلام — یونانی فلسفہ
جمالیات — منطق
وجودیت — اخلاقیات
عقل پرستی — ذوق الفطرت
فلسفے کے بڑے بڑے نظام و اصول

زندگی اور کائنات کے ٹھوس حقائق اور عالمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، سائنسی، علمی و ادبی، مذہبی اور تمدنی حالات و کوائف

ادب و فن
کلاسیکی ادب — زبانیں
مشرقی ادب — جدید ادب
تنقید — مغربی ادب
موسیقی — مصوری
فنونِ لطیفہ — فنِ تعمیر

معاشرتی علوم
عمرانیات — انسانیات
معاشیات — سیاسیات
قانون — نفسیات
رسم و رواج — طب و صحت
ثقافت — تہذیب

جغرافیہ
ارضیات — طبقات الارض
دریا — شہر و ممالک
براعظم — پہاڑ
بحریات — معدنیات
خاکے، نقشے اور ضروری تصاویر

شخصیات
شاعر — ادیب
سائنس دان — موجد
مورخ — فلسفی
مہم جو — سیاستداں
جنہوں نے دنیا بدل ڈالی

انفرادیت

برٹانیکا، انٹرنیشنل، چیمبرز، بک آف نالج، ورلڈ، نیو ورلڈ، ایوری مین، ریڈرز ڈائجسٹ، آریانا، دائرۃ المعارف اور دوسرے انسائیکلوپیڈیا بڑے بڑے کروڑپتی اداروں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ لیکن "انسائیکلوپیڈیا معلومات" ایک اکیلا پاکستانی شہری کسی کی مدد کے بغیر شائع کر رہا ہے تاکہ پاکستان میں بھی وسیع بنیادوں پر علم کو فروغ ہو، اور ہماری قومی زبان حوالہ جاتی کتب سے مالا مال ہو۔

ارزاں ترین

"انسائیکلوپیڈیا معلومات" دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اپنے ہم رتبہ انسائیکلوپیڈیاؤں کے مقابلے میں سب سے کم عمر، سب سے ارزاں اور سب سے تیز رفتار ہے۔ اندازاً پندرہ برس میں تکمیل پذیر ہوگا۔ مکمل انسائیکلوپیڈیا کی تیس جلدوں کی قیمت کم از کم ڈیڑھ ہزار روپے ہوگی جو عام پاکستانی یکمشت ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے آسان قسطوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ • اعلیٰ سفید کاغذ • خوبصورت کتابت، دیدہ زیب طباعت • سالانہ مع رجسٹری تیس روپے • قیمت فی قسط: تین روپے

ٹیلیفون: ۳۵۴۱۰۳ — **شاہکار پوسٹ بکس ۱۷۵۴ لاہور** — تار کا پتا: شاہکار

سرورق: ایشین آرٹ پریس، ۱۲، میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط ○ وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیرِ اعلیٰ : سیّد قاسم محمود

• مدیر : عطش دُرّانی

• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳

تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

مکتبۂ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

ایک چراغ تھا نہ رہا.....

یہ قسط پریس جا رہی تھی کہ خبر آئی . جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے وائس چانسلر اور ممتاز عالم دین مولانا سیّد ابوبکر غزنوی کا لندن میں انتقال ہو گیا ہے . اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن . وہ برطانیہ میں جشنِ اسلام کے سلسلہ میں افتتاحی تقریب ' عالمی اسلامی کانفرنس ' میں شامل ہونے والے پاکستانی وفد کے رکن تھے اور ۱۴ اپریل کی رات کو ایک حادثہ میں شدید زخمی ہونے کے بعد لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں زیر علاج تھے . ۲۵ اپریل ۱۹۷۶ء کو راہیٔ ملک عدم ہو گئے .

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی اگرچہ اہل حدیث گھرانے سے تعلق رکھتے تھے (وہ مولانا سیّد داؤد غزنوی کے فرزند تھے) لیکن ہمارے نزدیک ان کا سب سے بڑا علمی اور دینی وصف ان کا سائنٹیفک طرزِ فکر اور رنگِ اجتہاد ہے . وہ راسخ العقیدہ مسلمان اور روشن خیال دینی دانشور تھے . صوفیا سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے اتحاد کے لیے کوشاں رہتے تھے . دینی اور مروجہ تعلیم (ایم . اے ، ایل ایل بی) حاصل کرنے کے بعد موصوف عرصے تک اسلامیہ کالج اور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ اسلامیات کے صدر رہے . الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں جو جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی صورت میں پوری ہوتی نظر آ رہی تھیں .

ان کے انتقال سے جہاں پاکستان ایک ممتاز ماہرِ تعلیم اور عالم دین سے محروم ہو گیا ہے وہاں ملّتِ اسلامیہ بھی ایک ایسے ستون سے محروم ہو گئی ہے جو یقیناً احیائے دین کے لیے نئی بنیادیں بہم پہنچاتا . ہماری دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے اس عالم جوانی ہی میں اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے ، اُسے اُن پُرعزم طلبا دسے پُر کرے جو اُن کی روشنی کو لے کر آگے چلیں .

مرحوم ہماری اس کاوش (اسلامی انسائیکلوپیڈیا) کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی . ان کے بقول ہمارا یہ کام اسی سمت کی نشاندہی کرتا ہے ، جو اقبال کے پیشِ نظر تھی یعنی الٰہیاتِ اسلامیہ کی جدید تشکیل . خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلام کی اس عاجزانہ خدمت کا اہل بنائے رکھے . (آمین !)

آپ کا

عطش دُرّانی

• تاریخِ اشاعت : ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء • ناشر : سیّد قاسم محمود . کلفٹن کالونی . لاہور • طابع : الجدّہ پریس ، لاہور

Marfat.com

بُصریٰ ۱ جنوبی شام کا ایک شہر۔ آج کل اسے بصریٰ الحریری قصبے سے ممتاز کرنے کے لیے بصریٰ اسکی شام کہتے ہیں۔ یہ صوبہ حوران کے زرخیز میدان نقرہ میں اردن کی موجودہ سرحد سے انیس میل شمال کی جانب اس سڑک پر ہے جو درعہ اور سلخد کو ملاتی ہے۔ یہ قدیم ترین شہر ہے سب سے پہلے اس شہر کا ذکر چھٹی صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ اسکے ماخذ میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک قدیم اور مستحکم شہر تھا اس کے گرد عرب بادشاہوں (نبطیوں) نے دمدمے بنا دیئے تھے۔ توریت کی کتاب مکابیس میں اس شہر کو بصورہ کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۰۵ء تا ۱۰۶ء میں جب کارنیلیس نے قدیم نبطی سلطنت کا رومن سلطنت کیسا تھ الحاق کیا تو بصریٰ کو رومن سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اور ٹراجن کی تحریک پر بصریٰ کی از سر نو تنظیم کی گئی لیکن اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ شہر رومیوں نے بنایا تھا۔ ملالس کے نزدیک اس شہر کی بنیاد آگسٹس نے رکھی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں بصریٰ ایک مستحکم شہر بن گیا۔ اس شہر نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور بوسترا کے نام سے صوبہ عرب کی حکومت کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اہم تجارتی مرکز بھی بن گیا۔ اس میں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں تھیں جن کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ بزنطینی عہد میں بصریٰ کی حیثیت ایک سرحدی منڈی کی تھی۔

صدر مقام ہونے کی وجہ سے بصریٰ میں ملکی عمال اور عہدے داروں کی کثیر آبادی تھی۔ اسی دور میں یہاں پر حضرت مریم، سرجیوس اور بعض گمنام پادریوں کے کنیسے بنا گئے۔ یہاں ایک بڑا گرجا بھی تعمیر ہوا۔ اس گرجے کی محراب اور دیواریں اب تک باقی ہیں۔ روایت ہے کہ اس گرجے میں بحیرا راہب کا مسکن تھا جس نے آنحضورؐ کے پیغمبر ہونے کی گواہی دی تھی۔ جب بصریٰ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور بنو امیہ کی سلطنت قائم ہو گئی تو اس شہر کی پہلی اہمیت جو اسے ایک صوبائی صدر مقام اور سرحدی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے حاصل تھی ختم ہو گئی۔ سلجوقیوں کے دور حکومت میں اس شہر کی نئے سرے سے مرمت ہوئی کیونکہ قرامطہ نے اسے تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سلاطین سلجوق یہاں کی مساجد وغیرہ کی وقتاً فوقتاً درستی اور مرمت کراتے رہے۔

ایوبیوں کے دور حکومت میں فوجی نقطۂ نظر سے اس شہر میں از سر نو تعمیرات ہوئیں۔ ان تعمیرات میں بصریٰ کا قلعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں منگولوں کے حملوں کے دوران میں یہ شہر تباہ ہو گیا۔ اس شہر کی آبادی بہت کم ہو گئی اور یہ بالکل گمنام سا ہو کر رہ گیا۔ پندرہویں صدی میں اس شہر کو دوبارہ اہمیت حاصل ہوئی۔ جب عثمانی ترکوں کو اس شہر پر قبضہ حاصل ہو گیا تو بصریٰ ایک چھوٹا سا صوبائی شہر بن گیا۔ دسویں صدی ہجری اور سولہویں صدی عیسوی میں اسے حوران کے دارالحکومت میں منتقل کر دیا گیا۔

آج کل بصریٰ نفیس گیہوں کی کاشت کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس شہر کو آثار قدیمہ کا شہر کہا جاتا ہے۔

بصری، رابعہؒ :۔ قرون وسطیٰ کی ایک مشہور ولیہ کاملہ (دیکھیے "رابعہ بصری")

بصری، خواجہ حسنؒ :۔ ایک مشہور صوفی (دیکھیے "حسن بصری، خواجہ")

بصیرُ :۔ اللہ تعالےٰ کے پاک ناموں میں سے ایک نام۔ (دیکھیے "اسماء الحسنیٰ")

بطال غازی سید ابو محمد عبداللہ، ایک افسانوی کردار، جس کا ذکر عربی اور ترکی رزمیہ کہانیوں میں آتا ہے۔ عام طور پر اسے مسلمانوں کا ایک سپہ سالار قرار دیا جاتا ہے۔ جو بزنطینیوں کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا۔ مختلف قوموں نے اسے اپنے گمنام ہیرو کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ بطال کے معنی بہادر کے ہیں اور شاید ہر بہادر سپاہی کو لقب دیا جاتا رہا ہے۔ تاریخی طور پر صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاویہ بن ہشام کے ہراول دستے کے سالار کی حیثیت سے ۱۰۹ھ/۷۲۸ء میں جنجرہ کا فاتح ہوا۔ کچھ لوگ اسے انطاکیہ کا باشندہ قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے شام کا رہنے والا بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بطال غازی ایک گمنام سپاہی ہے جس کے فوجی کارناموں کو عربی اور ترکی ادب میں لوک حیثیت حاصل ہے۔

بطروجی نورالدین ابو اسحاق۔ اندلس کا ایک عرب ہیئت دان، ابن طفیل کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے نظریہ ہیئت میں ارسطو کے فلسفے سے رجوع کیا ہے اگرچہ اس انداز فکر کی ابتداء ابن باجہ، ابن طفیل اور جابر بن افلح کر چکے تھے۔ اس نظریے میں قوت محرکہ کے اصول کو دوسری بار داخل کیا گیا ہے۔ نیز اس میں سے فلک التدویر اور دوائر خارج از مرکز کے تصور اور اس نظریہ کو جس کی رو سے آسمانی دوائر مختلف محوروں پر گھومتے ہیں اور اس عمل سے حرکت لولبی پیدا کرتے ہیں۔ ترک کر دیا گیا۔

یہ اصول بطروجی نے اپنی کتاب "کتاب فی الہیئت" میں بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

بطلیموس یونانی مفکر، فلسفی اور سائنسدان۔ یونانی شہر برقی میں پیدا ہوا اور اسکندریہ میں درس دیتا رہا۔ ۱۰۸ء سے ۱۲۷ء کے دوران میں فوت ہوا۔ اس کی کتاب "المجسطی" نے مسلمان سائنسدانوں پر خاصا اثر ڈالا ہے علم ہیئت کے ضمن میں سارٹن کے بقول اس کتاب کو سب سے پہلے سہل طبری نے عربی میں ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ علم نجوم، مدار تاروں، زائچوں، کرہ فلکی کے ۳۶۰ درجوں، جغرافیہ، موسیقی، مناظر اور قیمتی پتھروں پر اس کی تقریباً تمام کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا اور پھر انہی سے لاطینی اور دیگر زبانوں میں تراجم ہوئے۔

بطلیوسی (۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء - رجب ۵۲۱ھ/جولائی ۱۱۲۷ء) ابو محمد عبداللہ بن محمد بن السید۔ ایک مشہور اندلسی فلسفی اور نحوی بطلیوس میں پیدا ہوا۔ ابن رزین اس کا مخالف تھا۔ چنانچہ وہ اس کا معتوب ہونے کی وجہ سے بلنسیہ میں آکر پناہ گزین ہو گیا تھا۔ یہاں اس کا ایک بڑا مشہور و معروف شاگرد تھا۔ جس کا نام ابن بشکوال تھا۔ بطلیوسی تقریباً بیس کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں
۱۔ ابن قتیبہ کی ادب الکاتب کی شرح۔ ۲۔ کتاب الحدائق۔ ۳۔ فہرسہ۔ ۴۔ شرح موطا امام مالک۔ ۵۔ المعری۔ ۶۔ الانصاف۔ اس نے بلنسیہ میں وفات پائی۔

بُعَاث مدینہ کے جنوب مشرقی حصہ میں بنو قریظہ کے علاقے میں واقع ایک مقام۔ جہاں تقریباً ۶۱۷ء میں مدینے کے قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے کنبوں میں جنگ ہوئی۔ اس میں ایک طرف تو قبیلہ اوس جس کے طرف دار دو یہودی قبیلے قریظہ اور النضیر اور ایک بدوی قبیلہ مزینہ تھا۔ اور ان کا سردار

Marfat.com

حضیر بن سماک تھا۔ دوسری طرف خزرج قبیلے کی ایک بڑی تعداد اور بنو جہنیہ اور بنو اشجع کے کچھ بدوی تھے۔ ان کا سردار عمرو بن النعمان تھا۔

اس جنگ میں دونوں اطراف کے سردار ہلاک ہو گئے اور قطعی فیصلہ نہ ہوا۔ ایک عارضی صلح پر اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

بَعَث بھیجنا، روانہ کرنا، برپا کرنا، مسلط کرنا۔ نبی یا رسول مبعوث کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

بعث بعد الموت کا عقیدہ اجزائے ایمان میں شامل ہے۔
(تفصیل کے لیے دیکھیے "آخرت"، "برزخ"، "حیات بعد الموت")
بَعثت کے معنی نبی یا رسول مبعوث کرنا۔ (دیکھیے "نبوت")

بَعل خاوند، آقا، مالک۔ وہ پودا یا درخت جو زمین کے اندرونی آبی ذخائر سے سیراب ہوتا ہے۔ نیز حضرت الیاس ؑ کی قوم کے دیوتا کا نام قرآن مجید میں یہ لفظ شوہر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

"اور ان کے بعل (شوہر) جنہوں نے طلاق دی ہے) اگر عدت کے اس زمانے کے اندر اصلاح حال کے لیے آمادہ ہو جائیں تو وہ انہیں اپنی زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔" (۲: ۲۲۸)

۲۔ "وہ بولی ہائے افسوس! کیا اب میرے ہاں اولاد ہو حالانکہ میں بڑھیا ہو گئی ہوں اور یہ میرا بعل (شوہر) بھی بوڑھا ہو چکا ہے" (۱۱: ۷۲)

۳۔ "اور اپنی زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپوں پر یا اپنے خاوندوں کے باپوں پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر" (۲۴: ۳۱)

یہ لفظ واحد جمع دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مشرکین کے دیوتا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے: "کیا تم احسن الخالقین کو چھوڑ کر (مشکل پڑنے پر) بعل کو پکارتے ہو۔" (۳۷: ۱۲۵)

بے آب کاشت کے لیے بھی بعل یا بعلی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور یہ لفظ ابتدائی ہجری صدیوں میں غیر سیراب مزروعہ زمین کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اور فقہ میں یہ لفظ پیداوار پر معینہ زکوٰۃ یا صدقے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کی قانون عامہ کی تصانیف میں بعل کا لفظ زمین کے لگان (خراج) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

دیوتا کی حیثیت سے بعل کی پوجا بنی اسرائیل کے علاوہ بھی بہت قدیم قوموں میں رائج رہی ہے۔ خصوصاً یہ اہل کنعان کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ بنی اسرائیل بعض اوقات اس دیوتا کی پرستش کے شکار رہے۔ اسے یہوہ اور ہدد کا نام دیا گیا ہے۔ شمال شام کے علاقے راس شمرا سے ملنے والی مٹی کی تختیوں سے علم ہوتا ہے کہ بعل دیوتا کو موت و حیات، خوراک، زراعت اور مویشیوں کا دیوتا تھا۔ اسے بارش برسانے اور فصلیں اگانے کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا حریف دیوتا ایل کہلاتا تھا

بعلبک لبنان کا ایک چھوٹا سا شہر۔ جو بقاع کی سطح مرتفع کے کنارے تقریباً تین ہزار آٹھ سو پچاس فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور باغوں کے ایک نخلستان سے گھرا ہوا ہے۔ بعلبک ریلوے لائن اور سڑک کے ذریعے بیروت

بعلبک کے کھنڈرات۔ بعل دیوتا کا مندر۔

اور دمشق سے ملا ہوا ہے۔ زراعت اور سیاحت یہاں کے خاص ذرائع آمدنی ہیں۔ اس کی آب و ہوا کی تر و تازگی اور مرغزاروں کی تعریف پر اکثر عرب مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے۔ جس کے کھنڈرات آج بھی اس شہر میں اکثر پائے جاتے اور انہی کھنڈرات کی وجہ سے یہ شہر مشہور بھی ہے۔

اس شہر کے نام کے بارے میں کئی باتیں منسوب ہیں بعض کے نزدیک یہ سامی دیوتا بعل کے نام پر رکھا گیا ہے۔ سکندر اعظم کے بعد اس مقام کو ہیلیو پولس کا نام دیا گیا۔ یہ شہر چونکہ دمشق سے حمص کو جانے والی شاہراہ پر مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے یہ تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ عیسائیوں اور عربوں کی فتح کے بعد یہ شہر قلعے کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ اور اس کی اہمیت زیادہ تر فوجی ہو گئی۔

۱۶ھ/۶۳۷ء میں ابو عبیدہ ؓ نے جب دمشق فتح کیا تو اس کے تھوڑے عرصے کے بعد بعلبک پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ جو بعد میں دمشق کے اموی مقبوضات میں شامل رہا۔ جب عباسی خلفاء کا زمانہ آیا تو یہ ان کے اقتدار میں آ گیا۔ ۳۶۱ھ/۹۷۲ء میں فاطمی خلیفہ المعتز نے یہاں اپنا ایک عامل مقرر کیا۔ ۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں بزنطینی حکمران جان زمسکس کا اور ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں حلب کے بادشاہ صالح ابن مرداس کا اس شہر پر قبضہ رہا۔ اس کے بعد سلجوقی سلطان تتش نے ۴۶۸ھ/۱۰۷۵ء میں اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۵۰۳ھ/۱۱۱۰ء بعلبک بوریوں کے قبضہ میں آ گیا۔ ۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء میں اس پر زنگی کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس نے اسے صلاح الدین ایوبی کے والد ایوب کے قبضے میں دے دیا۔ ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں نور الدین نے اسے دوبارہ فتح کیا۔

۵۷۰ھ/۱۱۷۴ء میں بعلبک پر صلاح الدین کا قبضہ ہو گیا اور اس نے اس شہر کو اپنے

Marfat.com

مختلف درباریوں اور خاندان کے بعد افراد کو یکے بعد دیگرے جاگیر کے طور پر دیتا رہا۔ ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں بعلبک مصریوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اگرچہ مصری مملوکوں سے قبل منگول بھی اس شہر کو فتح کر چکے تھے اور چند ماہ ان کا قبضہ بھی اس شہر پر رہا۔ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں یہ شہر عثمانی ترکوں کے قبضے میں چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ شہر لبنان ریاست کے سابق فرانسیسی حکومت کے زیر انتداب آگیا اور اب جمہوریہ لبنان کا ایک شہر ہے۔ ۱۹۵۶ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی گیارہ ہزار سات سو تھی۔

جس زمانے میں اس شہر میں ہیلیوپولسی تثلیث کو فروغ دیا گیا تو اس سے کئی شاندار خانقاہیں وجود میں آئیں۔ آج بھی ان یادگاروں کا بڑا حصہ (جن میں دو بہت بڑے اور لمبے چوڑے مندر، دو صحن (جن کے بڑے بڑے دروازے ہیں) اور حصار شہر شامل ہیں، دیکھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈالتی ہیں۔ عربوں کے دور میں ان عمارتوں کو ایک مضبوط قلعے کی شکل دی گئی۔ قدیم آثار کو دیکھنے سے قرون وسطیٰ میں عربوں کی فوجی تعمیرات کے نہایت دلچسپ آثار نظر آتے ہیں۔ راس العین کی چھوٹی مسجد اور شہر کے اندر بڑی مسجد جو قلعے کے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ اس شہر کی پرانی یادگاروں میں سے ہیں۔

بغداد

بغداد عراق کا ایک مشہور شہر اور دارالحکومت۔ یہ شہر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ بغداد کے نام کے بارے میں مختلف خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا نام ایک بت بغ کے نام پر رکھا گیا ہے اور بعض کے نزدیک بغداد دراصل باغ داد ہے، یعنی وہ باغ جہاں نوشیرواں مظلوموں کی دادرسی کرتا تھا۔ بعض کے نزدیک یہ ایک آرامی لفظ ہے جس کے معنی بھیڑوں کا باڑہ کے ہیں۔ ابو جعفر المنصور نے ۱۴۵ھ/۷۶۲ء میں ساسانی گاؤں بغداد کی جگہ پر ایک شہر بسایا اور اس کا نام مدینۃ السلام رکھا۔ المنصور نے اس شہر کی تعمیر پر ایک بیان کے مطابق ایک کروڑ اسی لاکھ دینار خرچ کئے تھے اور ایک بیان کے مطابق دس کروڑ درہم خرچ کئے تھے۔ شروع زمانے میں بغداد ایک بڑا قلعہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک بڑی اور گہری خندق تھی۔ اس کے بعد اینٹوں کا ایک پشتہ اور پھر اس کی پہلی فصیل تھی۔ اس کے آگے کچی اینٹوں کی ایک فصیل تھی اور ہر دو دروازوں کے درمیان اٹھائیس بڑے برج تھے اور ہر دروازے پر ایک قبہ بنا ہوا تھا جہاں سے سارا شہر نظر آتا تھا۔ اس فصیل کے بعد ایک چوڑا میدان تھا جس میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک تیسری سادہ سی دیوار تھی اور اس کے اندر یہ عمارات بنی ہوئی تھیں۔ قصر خلافت، جامع مسجد، متعدد دیوان، خلیفہ کی اولاد کے مکانات اور دو سقیفے شہر کو دو سڑکوں کے ذریعے چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ سڑکیں یکساں فاصلہ رکھنے والے دروازوں سے آتیں اور وسط شہر میں ایک دوسرے کو قطع کرتی تھیں۔ شہر کے شمال مشرق میں باب خراسان اس کے مقابل جنوب مغرب میں باب البصرہ شمال مغرب میں باب الشام اور جنوب مشرق میں باب الکوفہ تھے۔ اس طرح اندرونی حلقے میں جانے کے لئے پہلے خندق کو پار کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد پانچ دروازوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یعنی باہر کی دیوار کے دو دروازے دو بڑی فصیل کے عظیم دروازے اور ایک اندرونی دیوار کا دروازہ۔ باب الذہب کے نام سے جو محل تیار ہوا تھا اس میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا اور چھت تک کی تزئین طلائی کام سے ہوئی تھی

الف لیلوی شہر بغداد کا مرکزی چوک

بغداد نے ترقی کی منازل بہت جلد طے کریں اور وہ کثرت عمارات، تجارتی چہل پہل اور ثروت و آبادی میں بڑھتا چلا گیا۔ یحییٰ برمکی نے ایک شاندار محل قصر ابن کے نام سے بنوایا۔ جعفر نے بغداد کے زیریں حصے میں ایک بڑا پُرتکلف محل تیار کرایا۔ الامین نے قصر الخلد کے نام سے ایک محل تیار کرایا۔ ملکہ زبیدہ نے دریائے دجلہ کے کنارے ایک مسجد بنوائی۔ ایک اور شاندار مسجد شمال میں اپنے محلہ قطیعہ ام جعفر میں تعمیر کرائی۔ اسی ملکہ نے قصر الخلد کے قریب ایک محل قصر القرار کے نام سے تعمیر کرایا۔ بغداد کو شعراء نے فردوس ارضی کہا ہے۔ اس کے حیرت انگیز باغ سرسبز دیہات، اونچے اونچے عالیشان محلات جن کے دروازے اور ایوان اعلیٰ درجے کے نقش و نگار سے آراستہ اور نفیس و پُرتکلف فرش و فروش سے مزین تھے۔ بہت مشہور ہیں۔

بغداد کو امین اور مامون کے باہمی جنگ و قتال کے زمانہ میں بہت نقصان پہنچا۔ چودہ ماہ کے سخت محاصرے کے بعد اور اہل شہر کی انتہائی ثابت قدمی سے تنگ آکر طاہر نے مقابلہ کرنے والوں کے گھر تباہ و برباد کرنے کا حکم دیا تو بغداد کے محلے کے محلے تباہ ہو گئے۔ بقول طبری اور المسعودی بغداد کی ساری شان و شوکت جاتی رہی۔ بعد میں المامون کے عہد میں بغداد نے دوبارہ اپنی شان و شوکت بحال کر لی۔ بغداد کو ترکوں کے ہنگاموں سے بھی بہت نقصان پہنچا۔ ۲۵۱ھ ۸۶۵ء میں المعتز کی فوج نے سال بھر بغداد کا محاصرہ کئے رکھا۔

۲۷۸ھ/۸۹۱ء میں معتمد نے جب اپنی سکونت مستقل طور پر بغداد میں کر لی تو اس نے اس شہر کی طرف بھی توجہ دی۔ المعتضد نے اس کے شمال مشرق میں ایک قصر ثریا تعمیر کرایا اور ایک زمین دوز راستے کے ذریعے قصر الحسنی سے ملا دیا۔ ۲۸۹ھ/۹۰۱ء میں المکتفی نے قصر التاج تعمیر کرایا۔ ایک مسجد جامع القصر بھی تعمیر کرائی جب المقتدر کا دور حکومت آیا تو بغداد میں شاہی محلات اور نئی نئی عمارات کا اضافہ ہوا۔ اس دور میں بغداد تجارت کا بھی ایک اعلیٰ مرکز بن گیا تھا۔ یہاں تجارتی منڈیاں قائم کی گئیں اور ہر جنس تجارت کا الگ بازار بنایا گیا۔ منڈیوں کی نگرانی کے لیے محتسب مقرر کئے جاتے تھے۔ یہاں کے سوتی اور ریشمی کپڑے خصوصاً رومال اور عمامے وغیرہ کی دوسرے ممالک میں بڑی مانگ تھی۔ اس دور میں بغداد آبادی کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی شہر بن گیا تھا۔ یہاں مختلف نسلوں، رنگوں اور مذہبوں کے لوگ آباد تھے۔ اس کی آبادی کی تعداد کا اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ مساجد اور

Marfat.com

حماموں کی تعداد کے بارے میں بھی مبالغے پائے جاتے ہیں۔
الموفق کے زمانہ میں تین لاکھ مساجد اور ساٹھ ہزار حماموں کا ذکر ملتا ہے یہ ۲۸۴ھ
۹۹۲ء میں حماموں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی اور روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ ایک حمام دو سو گھروں کے کام آتا تھا۔ مسجد کے رقبے کی پیمائش کے پیش نظر جمعۃ الوداع کے دن جامع المنصور اور جامع رصافہ میں نمازیوں کی تعداد کا اندازہ چونسٹھ ہزار کیا گیا ہے چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہاں کی آبادی کا اندازہ پندرہ لاکھ بیان کیا گیا ہے۔

بغداد ایک زمانہ میں مسلمانوں کی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی مساجد علوم کے بڑے مرکز تھے۔ یہاں ایک بیت الحکمت تھا جس میں دوسری زبانوں کی کتب کے ترجمے کیے جاتے تھے۔ جب مدارس کا دور شروع ہوا تو سب سے زیادہ مدارس بغداد ہی میں تھے۔

۳۰۸ھ / ۹۲۰ء میں کرخ کی آتشزدگی سے بغداد کو کافی نقصان پہنچا۔ ۳۲۳ھ
۹۳۴ء کی آتشزدگی کے آثار تو ایک عرصے تک نظر آتے رہے ہیں۔

آل بویہ کے دور حکومت میں بغداد زوال پذیر ہو گیا عضد الدولہ کے زمانہ میں یہ شہر بد حالی کا شکار تھا۔ عضد الدولہ نے حکم دیا کہ مکانات اور بازار نئے سرے سے تعمیر کیے جائیں۔ نیز اس نے جامع مسجدوں کی تعمیر بھی نئے سرے سے کرائی۔
ان تمام باتوں کے باوجود آل بویہ کے دور میں بغداد نے کوئی خاص ترقی نہ کی۔

فصیل سے بغداد کے باہر زبیدہ خاتون کا مقبرہ

عوام کی شورشوں اور مسلمانوں کے فرقوں کے باہمی اختلافات نے بغداد کو بہت نقصان پہنچایا اور اس کے ساتھ ساتھ اس شہر کو آتشزدگی، سیلاب اور جنگوں کی تباہ کاریوں سے بھی کافی نقصان پہنچا۔ حکومت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ نظم و ضبط قائم رکھنا اس کے بس میں نہ تھا۔

۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں بغداد پر منگولوں نے حملہ کیا یہ حملہ بڑا سخت تھا۔ بغداد کے باشندے ایک ہفتے سے زیادہ تک بے دریغ قتل کیے جاتے رہے۔ مقتولوں کا اندازہ آٹھ لاکھ سے بیس لاکھ تک لگایا گیا ہے۔ الغرض پورے بغداد میں ایک تباہی مچا کر رکھ دی گئی۔ اور بغداد کی ثقافت کو سخت نقصان پہنچا۔ اس کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی اور یہاں کی معیشت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی۔

اب بغداد صرف ایک صوبے کا صدر مقام ہو کر رہ گیا۔ ۸۰۳ھ / ۱۴۰۰ء میں تیمور نے بغداد پر دوسری بار حملہ کیا۔ یہ حملہ پہلے حملے سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ باشندوں کا بے دریغ قتل عام کیا گیا اور بہت سی سرکاری عمارتیں اور محلے ویران کر دیئے گئے۔ یہ حملہ بغداد کی ثقافت پر ایک کاری ضرب تھی۔ ۸۱۳ھ / ۱۴۱۰ء میں بغداد قرہ قوینلو ترکمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ترکمانوں کی عملداری میں اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ بہت سے باشندے شہر کو خیر باد کہہ گئے۔ بار بار سیلاب آنے سے بڑی تباہی پھیلی۔ ۸۴۱ھ
۱۴۳۷ء میں المقریزی نے بغداد کا نقشہ یوں بیان کیا ہے "بغداد تباہ ہو گیا۔ اس میں کوئی مسجد نہیں رہی نہ جمعہ ہوتا ہے نہ کوئی بازار رہے۔ اس کی اکثر نہریں خشک ہو چکی ہیں اب اسے شہر مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے۔"

۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں یہ شہر شاہ اسماعیل صفوی کے قبضے میں آ گیا تو ایرانیوں اور عثمانیوں میں اس کے قبضے کے لیے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ۹۷۸ھ / ۱۵۷۰ء میں بغداد میں مراد پاشا نے نئے سرے سے کچھ مساجد اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔

۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء تا ۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۴ء بغداد پر نیم مختار ۲۴ پاشاؤں کی حکومت رہی۔ اس زمانہ میں شہر کی دیواروں اور مسجدوں کی مرمت کرائی گئی۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں حسن پاشا کا تقرر ہوا تو بغداد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وہ ینی چریوں کا زور توڑنے کے لیے مملوکوں کو لایا۔ اور اس طرح مملوکوں کے اقتدار کی بنیاد پڑی حسن پاشا کے بعد اس کا بیٹا احمد پاشا تخت نشین ہوا تو اس نے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جس نے بغداد کی قدر و منزلت بڑھا دی۔ ۱۷۴۷ء میں احمد پاشا کی وفات کے بعد اہل قسطنطنیہ نے دوبارہ بغداد پر اپنا قبضہ جمانا چاہا لیکن مملوکوں کی مزاحمت آڑے آئی۔ ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء میں سلیمان پاشا پہلا مملوک تھا جو بغداد کا والی بنایا گیا۔ ۱۲۴۷ھ
۱۸۳۱ء سے عثمانی عہد کے خاتمے تک بغداد براہ راست حکومت قسطنطنیہ کی ماتحتی میں رہا۔ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں مدحت پاشا نے ایک جدید نظام ولایت جاری کیا اور ولایت کو سات سنجاقوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس نے بغداد شہر کی فصیلیں گروا دیں۔
۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء تک بغداد تین ایالتوں موصل، بصرہ اور بغداد کا صدر مقام تھا
۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء میں موصل اور ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء میں بصرہ علیحدہ کر دیئے گئے اور بغداد تین متصرفلکوں کا صدر مقام رہ گیا۔ ۱۸۵۳ء میں اس کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار تھی
۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء میں اس کی آبادی کا اندازہ ستر سے اسّی ہزار تک ہے۔ ۱۳۳۶ھ
۱۹۰۸ء میں بغداد کی آبادی دو لاکھ کے قریب تھی۔ موجودہ بغداد بہت کچھ بدل چکا ہے اب وہ شمال کی طرف اعظمیہ اور کاظمین سے مشرق میں ہندسے جنوب میں دجلہ کے بڑے موڑ سے اور ادھر المطار المدنی اور قریبی مضافات منصور اور مامون کے شہروں سے جا ملا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی آبادی چار لاکھ چھیاسٹھ ہزار سات سو تینتیس

Marfat.com

تھی جو ۱۹۶۷ء میں بائیس لاکھ ستر ہزار ہو گئی۔ قدیم عمارتوں کی طرز کی بجائے شہر کے باہر نئے مکان مغربی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ پرانی آبادیوں کی طرز رفتہ رفتہ بدلتی جا رہی ہے۔ چار پختہ پل تعمیر ہو گئے ہیں۔

یہ شہر ایک معاہدے کی وجہ سے بھی جو معاہدہ بغداد کے نام سے مشہور ہے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ معاہدہ ترکی، عراق، ایران، پاکستان اور برطانیہ کے درمیان ۲۴ فروری ۱۹۵۵ء میں طے پایا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے غیر ملکی جارحیت کا مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت کئے بغیر ایک دوسرے کا باہمی تحفظ کرنے کی کوشش کی جانا قرار پائی ہے۔ ۱۹۵۹ء کے بعد عراق کے الگ ہو جانے اور امریکا کی رکنیت اختیار کر لینے سے بغداد کی بجائے انقرہ کو اس معاہدے کا مرکز بنایا گیا ہے اور اس کا نام سینٹو رکھا گیا ہے۔

بغداد خاتون زوجہ امیر حسن جلائری جو شیخ حسن بزرگ کے نام سے مشہور ہے بغداد خاتون تاتاری حاکم امیر الامراء چوبان کی بیٹی تھی۔ امیر حسن سے اس کی شادی ۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء میں ہوئی۔ یہ زمانہ ابوسعید بن الجائتو کی بادشاہت کا تھا۔ سلطان ابوسعید بغداد خاتون سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس نے کوشش کی کہ امیر حسن اسے طلاق دے دے لیکن امیر چوبان نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ چنانچہ ابوسعید نے غیاث الدین کرت سے ۷۲۷ھ/۱۳۲۷ء میں امیر چوبان کو قتل کرا دیا۔ اور اس کے بعد ابوسعید نے بغداد خاتون کو امیر حسن سے طلاق دلا کر خوب دھوم دھام سے شادی کی۔ بغداد خاتون نے جلد ہی بڑے اثر و رسوخ کا مقام حاصل کر لیا اور اسے "خداوندگار" (فرمانروا) کا لقب ملا۔ ابوسعید کچھ عرصے تک بالکل بغداد خاتون کے قبضے میں آ گیا۔ بعد ازاں دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے جس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ امیر حسن بغداد خاتون سے مل کر سلطان ابوسعید کو قتل کرانے کی سازش کر رہا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ۷۳۴ھ/۱۳۳۳ء میں ابوسعید نے بغداد خاتون کی بھتیجی دلشاد خاتون سے شادی کر لی تو دلشاد بیگم ابوسعید کی منظور نظر ہو گئی۔ اس بات نے بغداد خاتون کو بہت کبیدہ خاطر کیا اور ابوسعید بھی اس سے ناخوش رہنے لگا۔ جب ۱۳ ربیع الآخر ۷۳۶ھ/۳۰ نومبر ۱۳۳۵ء کو ابوسعید کا اچانک انتقال ہو گیا تو بغداد خاتون پر یہ شبہ کیا گیا کہ اس نے ابوسعید کو زہر دے کر مارا ہے۔ بایدو خان نے جو ابوسعید کا جانشین ہوا اسی شبے کی بناء پر بغداد خاتون کو قتل کرا دیا۔

بغدادی الخطیب:۔ ایک مشہور عالم دین۔ (دیکھئے "خطیب البغدادی")

بغدادی، عبدالقاہر (وفات ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء) ابو منصور عبدالقاہر ابن طاہر الشافعی البغدادی شافعی مسلک کے مشہور عالم دین والد انھیں تعلیم کے لئے نیشاپور لے گئے فارغ ہونے کے بعد عبدالقاہر نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے شاگردوں میں خراسان کے علماء و فضلاء کی ایک کثیر تعداد تھی۔ عبدالقاہر سترہ مضامین کی تعلیم دینے کی قابلیت رکھتے تھے۔ جن میں سے فقہ، اصول، حساب، قانون، وراثت خاص طور پر ان کے قابل ذکر مضامین ہیں جب نیشاپور میں ترکمانوں نے فتنہ و فساد کا بازار گرم کر دیا تو عبدالقاہر وہاں سے اسفرائین چلے گئے اور کچھ عرصہ بعد وہیں انتقال کیا۔

وہ بے حد دولتمند تھے۔ اہل علم کی بڑی مدد کیا کرتے۔ فقہ حساب اور وراثت کے موضوع پر ان کی تصانیف بہت مقبول تھیں۔ ان میں سے اکثر ضائع ہو گئی ہیں۔ تصانیف میں "کتاب الملل والنحل"، "اصول الدین"، "الفرق بین الفرق"، "اغلاط ابی الہذیل"، "اغلاط ابن کرام" مشہور ہیں۔

بُغطوری مُقرِن بن محمد، اباضی مورخ اور سوانح نگار۔ بغطورہ (لقطورہ) میں پیدا ہوا۔ یہ ابویحییٰ توفیق بن یحییٰ اجناونی اور محمد عبداللہ بن محمد بن عبداللہ مجولی (جو فرقہ اباضی کی تاریخ و سیر کے دو علماء تھے) کا شاگرد تھا۔ بغطوری نے ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء۔ ۱۲۰۳ء میں اباضی مشاہیر کی سوانح پر مشتمل ایک اہم تصنیف قلم بند کی۔ یہ کتاب ان مشاہیر کی سوانح تھی جو جبل نفوسہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ کتاب "کتاب سیر مشائخ نفوسہ" اور زیادہ تر "السیر" کے نام سے مشہور تھی۔ آج کل یہ ناپید ہے۔ شماخی نے اسے اپنی کتاب "کتاب السیر" کا بنیادی ماخذ بنایا تھا۔

بغوی، رکن الدین (وفات ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء ابن خلکان کے مطابق ۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء) ابو محمد الحسین رکن الدین بن مسعود، محی السنۃ لقب، شافعی مذہب کے عالم، محدث اور مفسر ہرات کے قریب ایک گاؤں بغ یا بغشور میں پیدا ہوئے۔ فقہ کی تعلیم قاضی الحسین بن محمد مرالرودزی سے حاصل کی انہوں نے محدثین کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ بغوی نے مروالروز میں وفات پائی۔

قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کی بے شمار تصانیف ہیں لیکن جس کتاب نے ان کی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں وہ "مصابیح السنہ" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مضامین کی ترتیب کے لحاظ سے احادیث جمع کی ہیں۔ انہوں نے ہر باب میں پہلے "صحیح احادیث" جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے لی ہیں اس کے بعد "حسن" سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی سے لی ہیں۔ ان کا اس کتاب کے بارے میں یہ دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی "منکر" یا "موضوع" حدیث نہیں ہے۔ اسناد کو بھی حذف کر دیا گیا ہے۔ بغوی نے خود اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے "کہ اس کتاب کا مقصد پابند شرع لوگوں کے لیے ایسا مواد فراہم کرنا ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ان کی مدد کر سکے۔" بعد میں اس کتاب کو ولی الدین نے مرتب کیا اور اس کا نام "مشکوٰۃ المصابیح" رکھا۔ یہ بڑی مقبول کتاب ہے۔

بغوی کی دوسری اہم تصانیف میں قرآن مجید کی تفسیر "معالم التنزیل" ہے جو تفسیر بغوی کے نام سے بھی مشہور ہے ایک اور کتاب شرح السنت ہے (نیز دیکھئے "مشکوٰۃ المصابیح")

بقاء وفناء تصوف کی اصطلاح، جو دراصل دو مختلف اور متضاد اصطلاحوں پر مشتمل ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں۔

قرآن مجید میں یہ دونوں الفاظ یوں آئے ہیں:۔

"جو کچھ زمین پر ہے وہ فنا ہو جانے والا ہے اور صرف تیرے پروردگار کی ذات کو بقا ہے۔ جو بڑی شان اور بزرگی والا ہے۔ (۵۵:۲۷)

لغوی اعتبار سے بقاء و فناء کے معنی اور تصوف کے معانی میں فرق ہے۔ لغت کے اعتبار سے بقاء تین قسم کی ہے۔

اوّل، وہ بقاء کہ کسی چیز کا اوّل بھی فنا میں ہو اور آخر بھی فنا میں ہو جیسا کہ یہ عالم ناسوت کہ وہ ابتدا میں بھی نہ تھا اور انتہا میں بھی نہ ہوگا۔ اور فقط اس وقت باقی ہے

Marfat.com

دوسرے وہ بقا کہ پہلے کبھی نہ تھی اور بعد میں موجود ہو گئی اور کبھی فانی نہ ہو گی جیسے بہشت و دوزخ اور عالم عقبیٰ اور اس کے رہنے والے کہ ابتداء میں نہ تھے نیست سے ہست ہوئے اور ان کی ہستی پر کبھی عدم طاری نہ ہو گا۔

تیسری وہ بقا کہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی یعنی کوئی ایسا وقت نہیں ہوا کہ وہ نہ تھی اور نہ کوئی ایسا وقت ہو گا کہ وہ نہ ہو وہ ذات حق اور اس کی صفات ازلی و ابدی کی بقا ہے وہ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے اور اس کی بقا سے مراد اس کے وجود کا ہمیشہ رہنا ہے۔ کوئی بھی اس کی صفات میں اس کے ساتھ شریک نہیں۔

گویا فنا کا علم یہ ہے کہ انسان جان لے کہ دنیا فانی ہے اور بقا کا علم یہ ہے کہ آدمی جان لے کہ عقبیٰ باقی ہے۔

لیکن اہل طریقت کی اصطلاح میں فنا و بقا یہ ہے کہ جب جہالت فانی ہو جائے تو ضرور علم باقی ہوتا ہے اور جب معصیت یعنی نافرمانی ہو جاتی ہے تو طاعت یعنی بندگی باقی ہوتی ہے اور جب بندہ اپنی بندگی کا علم حاصل کر لیتا ہے تو ذکر حق کے باقی رہنے سے اس کی غفلت فنا ہو جاتی ہے۔ گویا فنا و بقا ان کے نزدیک برے اوصاف کو ساقط کر کے نیک صفات پر قائم ہونا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق "فنا و بقا" کی اصطلاح نافذ کرنے والا ابو سعید الخراز ہے۔ ان کے بقول "فنا" سے مراد بندہ کا اپنی بندگی کو دیکھنے سے فانی ہو جانا ہے۔ اور بقا سے مراد بندہ کا مشاہدہ الٰہی کے ساتھ باقی رہنا ہے۔ (نیز دیکھیے "فنا")

بقالی :۔ (وفات ۵۸۸ھ/۱۴۸۰ء) ابراہیم بن عمر، جس نے قدیم حکماء کی سوانح اور رمل پر مختلف رسالے لکھے۔ اس نے قرآن شریف کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی جو اب ناپید ہے۔

بقراط :۔ (پیدائش ۴۶۰ قبل مسیح) ایک مشہور و معروف یونانی طبیب۔ اسے طب کا بابائے آدم بھی کہا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے قریب جزیرہ قوس میں پیدا ہوا۔ اس نے طب کی ابتدائی تعلیم ایکلیپس کے مشہور کلیسا میں حاصل کی بعد ازاں حصول تعلیم کے لئے دور دراز کا سفر کیا۔ تھریس، تھسلی اور ایتھنز کی درسگاہوں میں تدریس میں مشغول رہا اور لریسہ کے مقام پر عین جوانی کے عالم میں فوت ہو گیا۔ مشرقی دانشوروں میں بقراط کی بہت شہرت تھی۔ وہ بقراط کی بہت سی تصانیف سے واقف تھے۔ عربی میں اس کی تصانیف کے مشہور مترجم حنین بن اسحاق، قسطا بن لوقا، عیسیٰ بن یحییٰ اور عبدالرحمٰن بن علی تھے۔ مسلمان اطباء نے اس کی کتابوں سے بہت سی معلومات حاصل کیں۔

حنین نے اس کی کتاب "وبائی امراض کی کتاب" کا ترجمہ کیا۔ اس کی تصنیف "بخاروں اور امراض شدیدہ میں غذا" کا ترجمہ عیسیٰ بن یحییٰ نے کیا اور اس کا عربی نام "کتاب الامراض الحادۃ" رکھا۔ مشرقی دانشوروں نے اس عظیم یونانی طبیب کی کتابوں کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ شروح اور حواشی بھی لکھے۔ عرب مصنفین بقراط کا زمانہ اسکندر سے تقریباً سو سال قبل بتاتے ہیں۔ "تاریخ الحکماء" کے مطابق بقراط کی سکونت حمص میں تھی بعد میں دمشق میں قیام پذیر ہو گیا۔

بقراط کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے ایک مرتبہ ایرانی مملکت میں ایک وبا نے تباہی برپا کر رکھی تھی۔ ایران کے بادشاہ ارتخشتا نے بقراط کو جو قوس میں مقیم تھا بہت کچھ اعزاز و اکرام اور بھاری رقمیں پیش کیں اور اس وبا کے لیے اس کی خدمات حاصل کرنا چاہیں لیکن بقراط نے یہ کہہ کر اپنی خدمات پیش کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے ملک کے دشمنوں کی خدمت نہیں کرے گا بلکہ اس کا اولین فرض اپنے ہموطنوں کی خدمت ہے۔

بقر عید :۔ مسلمانوں کا ایک تہوار۔ (دیکھیے "عید الاضحیٰ")

بقرہ، سورۃ :۔ قرآن مجید کی دوسری سورت (دیکھیے "البقرہ سورۃ")

بقلیہ عراق میں عام مسلمانوں سے مختلف ایک فرقہ جسے بورانیہ بھی کہا جاتا ہے اس فرقے کو عام طور پر قرامطہ سے منسلک سمجھا جاتا ہے ابو حاتم نامی ایک شخص نے شرعی ارکان کی پابندی کو ختم قرار دیا اور اس کے ساتھ ہی لہسن، پیاز اور چقندر کھانے اور جانور ذبح کرنے کی بھی ممانعت کر دی۔

اس فرقے نے ۳۱۴ھ/۹۲۶ء میں اپنے متعدد قائدین اور خاص طور پر مسعود بن حریث اور عیسیٰ بن موسیٰ کی زیر قیادت ابو طاہر کی مہم فدات کے زمانے میں کوفے اور واسط کے علاقوں میں بڑا عروج حاصل کیا۔ ابتدا میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی لیکن بعد میں خلیفہ مقتدر باللہ کے سالار ہارون بن غریب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

بقی بن مخلد (۲۰۱ھ/۸۱۶ء – ۲۷۶ھ/۸۸۹ء) ابو عبدالرحمان اندلسی قرطبہ کے ایک مشہور مفسر اور محدث۔ انہوں نے مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں مختلف ائمہ حدیث خصوصاً امام احمد بن حنبل اور ابوبکر بن ابی شیبہ سے حدیث کی تحصیل کی۔ حصول علم کے لیے وہ چونتیس سال تک مشرق میں قیام پذیر رہے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد دو سو چھتر بنتی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر واپس قرطبہ پہنچے۔ جہاں تھوڑے سے عرصے میں انہوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ اور جلد ہی اندلس کے مجتہد اور امام کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان کے حلقۂ درس کی سارے قرطبہ میں دھوم مچ گئی۔ مجتہد ہونے کے باوجود ان کا رجحان حنبلی مکتبہ فکر کی طرف تھا۔ فقہی اختلافات اور دوسروں کی رقابت کی وجہ سے ان کے لئے موت کی سزا تجویز کی گئی جو امیر مراد اول کی مداخلت سے ختم کر دی گئی۔

وہ اپنے زمانے کے ایک ایسے عالم تھے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بڑے صالح اور عابد و زاہد تھے۔ بقول عبداللہ الزاہد "انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے زہد و تقویٰ کے باعث بڑی شہرت پائی۔ اور تقدس کے درجے تک جا پہنچے"

ابن حزم نے بقی کو حدیث کے میدان میں امام بخاریؒ اور دوسرے نامور محدثین کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں لیکن اس وقت ناپید ہو چکی ہیں۔

بقیع الغرقد :۔ مدینہ منورہ کا ایک قدیم قبرستان (دیکھیے "جنت البقیع")

بکا :۔ رونا پیٹنا۔ واویلا کرنا۔ (دیکھیے "آہ و بکا")

بکتاشیہ ترکی درویشوں کا ایک سلسلہ جس کے بانی حاجی بکتاش ہیں ان کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ تر افسانوی روایات سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں

Marfat.com

صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں حاجی بکتاش خراسانی کا ظہور اناطولیا کے زمرہ درویشاں میں ہوا اور وہ درویش غالباً بابا اسحاق کے مرید تھے۔ جنہوں نے ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں بغاوت کی۔ فواد کوپرولو کی تحقیق کے مطابق یہ سلسلہ حاجی بکتاش کے اپنے حلقہ مریدین سے معرض وجود میں آیا۔ بہرحال یہ سلسلہ آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی میں موجود تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شیخ سلسلہ بالم سلطان "پیر دوم" نے اس سلسلہ کو اس کی معین شکل دی۔ مغربی ترکستان ترک درویشوں کے اداروں کو ان کے مخصوص خدوخال احمد لیسوی نے دیئے تھے۔ اناطولیا میں یہ ادارے وسیع ہوتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں بدعتی رجحانات بھی داخل ہونے لگے۔ بعض علاقوں میں ان لوگوں نے عیسائیوں کو بھی اپنے سلسلہ میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جنوبی اناطولیا اور البانیا میں ایک مخلوط قسم کا مذہب پیدا ہوگیا۔ جو اسلامی اور عیسائی عناصر پر مشتمل تھا۔

بکتاشی اسلامی رسوم و عبادات حتیٰ کہ نماز تک سے غایت درجے کی لاپرواہی برتتے ہیں لیکن شیعی عقائد کے حامل ہیں۔ وہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور خصوصاً امام جعفر صادق کا بڑا احترام کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کو آنحضورؐ اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ ملا کر ایک طرح کی تثلیث کے قائل ہیں۔ یکم محرم تا دس محرم ماتمی راتیں مناتے ہیں فضل اللہ کی تالیف "جاویدان" اور فرشتہ اوغلو کی تصنیف "عشق نامہ" ان کے نزدیک قانون شرعی کا درجہ رکھتی ہیں۔

جب ان کے گروہ میں کوئی نیا شخص داخل ہوتا ہے تو اس موقع پر شراب روٹی اور پنیر تقسیم کرتے ہیں۔

بکتاشی لوگ اپنے روحانی پیشواؤں کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں ان میں کچھ لوگ تمام عمر شادی نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کرنے کی خاطر اپنے کانوں میں بالیاں پہنے رہتے ہیں ان کا مرشد اعظم علیحدہ ہوتا ہے۔

یہ لوگ کسی ایک تنہا خانقاہ کے صدر کو بابا اور اس سلسلے میں مکمل طور پر داخل ہونے والے کو درویش کہتے ہیں۔ جس نے پہلی قسم اٹھائی ہو اسے محب اور جو ابھی اس سلسلے میں داخل نہ ہوا ہو اسے عاشق کہتے ہیں۔

یہ لوگ ایک خاص قسم کی ٹوپی پہنتے ہیں جو چار گوشیہ یا بارہ گوشیہ ہوتی ہے چار کے عدد سے ان کا اشارہ چار ابواب شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی طرف ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے وہ لوگوں کے بھی چار طبقات بناتے ہیں۔ عابد، زاہد، عارف اور محب۔ بارہ کا عدد بارہ اماموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ تسلیم طاشی (سنگ تسلیم)، جس پر بارہ گول ابھری ہوئی لکیریں ہوتی ہیں گلے میں پہنتے ہیں۔

بکتاشیہ سلسلے کی بڑی بڑی خانقاہیں چار حصوں پر مشتمل ہیں۔

۱۔ میدان اوی، اصل خانقاہ جس میں عبادت گاہ بھی ہوتی ہے۔

۲۔ الملک اوی، تنور خانہ اور مستورات کے رہنے کی جگہ۔

۳۔ آتش اوی، باورچی خانہ۔

۴۔ مہمان اوی، مہمان خانہ۔

بکتاشیوں کے اس درویشی سلسلہ نے ترک عوام کے دینی رجحانات پر گہرا اثر کیا۔ بکتاشیوں نے عثمانی حکومت کے خلاف درویشوں کی متعدد بغاوتوں میں بھی حصہ لیا ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۶ء میں سلطان محمود ثانی نے ینی چری فوجوں کو تباہ کیا تو جماعت بھی جو ینی چریوں سے منسلک تھی متاثر ہوئی۔ ان کی بہت سی خانقاہیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ ۱۹۲۵ء میں تمام درویش سلسلوں کے ساتھ بکتاشیہ سلسلے کو بھی ختم کر دیا گیا۔ آج کل یہ لوگ جزیرہ نمائے بلقان اور خاص طور پر البانیا میں موجود ہیں۔ جہاں ان کی بڑی خانقاہ تیرانہ میں ہے۔ سرکاری گنتی کے مطابق ۱۹۵۲ء میں ترکی میں ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔

بکر، بنو:۔ ایک عربی قبیلہ۔ (دیکھئے "بکر بن وائل")

بکر بن وائل ایک عربی قبیلہ، جو دراصل بہت سے قبائل پر مشتمل ہے۔ بنو بکر بھی انھی میں شامل ہیں۔ بنو ثعلبہ، بنو عجل، بنو قیس اور بنو حنیفہ بھی چند ایسے ہی قبائل ہیں۔ جو مجموعی طور بنو بکر ہی کہلاتے ہیں۔ بکر بن وائل کے لوگ یمامہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ ان کے درمیان اکثر خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے خانہ بدوشی اختیار کر لی تھی بنو بکر اور بنو تغلب کے درمیان ایک طویل خانہ جنگی کہیں چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں جا کر ختم ہوئی۔ بنو بکر عراق کے وسیع میدانوں میں آباد ہو گئے اور دس سال بعد بنو تمیم اور بنو یربوع الحزن میں خیمہ زن ہوئے۔ بنو عجل مغرب میں کوفہ کے قریب، بنو شیبان خلیج کویت کے قریب اور بنو قیس راس العین کے قریب آباد ہوئے۔ یہ لوگ گاہ بگاہ عربی نخلستانوں بحرین وغیرہ کی طرف جاتے رہتے تھے۔ ۶۰۵ء میں ذوقار کی مشہور جنگ لڑی گئی جس میں بنو شیبان نے ایرانی دستوں کو مار بھگایا یہ مقام عین صید اور البوغر کے درمیان طف میں واقع ہے۔ اس جنگ کے فوراً بعد ایرانیوں نے بنو بکر کو دبا لیا اور بنو بکر اور بنو تمیم کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ بنو بکر کے کچھ قبائل نے عیسائیت اختیار کر لی آنحضورؐ نے یمامہ کے والی ہوذہ بن علی کو دعوت اسلام دی تو اس نے تمسخر کیا۔ الحجر میں اس کا جانشین مسیلمہ تھا۔ انہی لوگوں میں ذہل بن شیبان کے ایک قائد مثنیٰ ابن حارثہ نے اسلام قبول کیا اور حضرت خالدؓ بن ولید کے ساتھ الحیرہ کو اسلام کے لیے فتح کیا۔ انہوں نے شام کی مہمات میں بھی کارنامے انجام دیئے۔

۶۴۲ء میں بنو عجل اور بنو حنیفہ نے جنگ نہاوند میں حصہ لیا۔ ۶۸۴ء میں بنو بکر اور بنو تمیم کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی۔ ۶۹۰ء میں کہیں جا کر بنو بکر کو اطمینان نصیب ہوا۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے آتے آتے بنو بکر صرف کوفے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بنو عجل خانہ بدوش ہی رہے اور بنو شیبان کوفے کے قریبی چشموں میں منتقل ہو گئے۔ اور بعد میں موصل کے قریب آباد ہو گئے۔ نویں صدی عیسوی میں انہوں نے موصل کے میدانی علاقوں پر حملے کئے تو ۸۹۳ء میں خلیفہ المعتضد نے ان کے خلاف ایک مہم روانہ کی۔ جس کے بعد وہ غائب ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد تمام قبائل بنو بکر ربیعہ کے نام سے ظاہر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ سعودی حکمران آل سعود اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بکری، ابو عبید:۔ ایک مشہور جغرافیہ دان۔ (دیکھئے ابو عبید البکری)

بکیر بن ہامان ابوہاشم بکیر بن ہامان خلافت بنو امیہ کے آخری زمانہ میں عباسی تحریک کا داعی۔ سجستان کا رہنے والا تھا۔ ۱۰۲ھ / ۷۲۰ء میں خلافت بنو امیہ کا مخالف ہو گیا اور میسرہ العبدی کی جماعت کے ساتھ ہو گیا۔ میسرہ کی وفات کے بعد ۱۰۵ھ / ۷۲۳ء میں جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں اس کے سپرد ہوئیں اس نے خراسان میں اپنے بہت سے معاونین پیدا کئے ۱۰۷ھ / ۷۲۵ء میں خراسان میں داعیوں کی ایک جماعت روانہ کی جو خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ کے حکم سے موت کے

Marfat.com

گھاٹ اتار دی گئی ۔ ۱۱۸ھ/۷۳۶ء میں بکیر نے عمار بن یزید کو ایک جماعت کا سردار بنایا جس نے مرو میں اپنا صدر مقام بنایا اور خداش کا لقب اختیار کیا۔ لیکن جب اس نے خرمیہ فرقے کے عقائد اختیار کر لیے تو اسد بن عبداللہ والی صوبہ کے حکم سے اسے بھی قتل کر دیا گیا۔

چنانچہ ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں بکیر کو خداش کے عقائد کا علانیہ رد و تکذیب کرنے کے لیے مرو بھیجا گیا۔ ۱۲۴ھ/۷۴۱ء میں جب بکیر عراق واپس آیا تو اسے گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد ۱۲۶ھ/۷۴۳ء میں امام محمد کی وفات کا اعلان کرنے اور بنو عباس کے حامیوں سے امام محمد کے بیٹے ابراہیم کی بیعت لینے کے لیے خراسان پہنچا۔ عراق واپس آنے کے چند ہی روز بعد ابوسلمہ حفص بن سلیمان کو اپنا جانشین نامزد کر کے انتقال کر گیا۔

بگوی بگہ (علاقہ بھیرہ، ضلع سرگودھا پاکستان کے رہنے والے۔ نیز علماء کا ایک خاندان جو پنجاب پر رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں خاصا مشہور ہوا۔ ان میں زیادہ مشہور علماء یہ ہیں ۔

۱۔ **مولانا غلام محی الدین بگوی** :۔ ابن حافظ نور حیات بن حافظ محمد شفا بن حافظ نور محمد بگوی محرم ۱۲۱۰ھ/جولائی ۱۷۹۵ء میں بگہ میں پیدا ہوئے ۔ بچپن ہی سے خاموش طبع تھے ۔ مختصر سے عرصہ میں حافظ حسن صاحب سے قرآن مجید پڑھ لیا ۔ نوجوانی ہی میں اپنے چھوٹے بھائی احمد الدین بگوی کو ساتھ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا اور وہاں بارہ برس تک مختلف علماء مثلاً مولانا محمد اسحٰق، شاہ عبدالعزیز وغیرہ سے تحصیل علم کرتے رہے ۔ وہیں شاہ غلام علی کے ہاتھ پر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے بیعت ہوئے ۔

وطن واپسی پر خود کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیزالدین کی فرمائش پر لاہور آئے اور مسجد بازار حکیماں میں شمع علم فروزاں کی ۔ صبح و شام درس و تدریس سے کام تھا۔ ان سے فیض پانے والوں نے پنجاب بھر میں دینی درسگاہیں قائم کیں ۔ لاہور میں آپ کا قیام تیس برس تک رہا۔ جس میں ہزاروں تشنگان علم کو سیراب کیا۔ آخری ایام میں بیمار ہو کر وطن تشریف لے گئے اور چودہ برس بیمار رہ کر ۴ شوال ۱۲۷۲ھ/۲۲ جون ۱۸۵۶ء کو انتقال کیا۔ آپ کے دو بیٹے مفتی غلام محمد بگوی اور مولانا عبدالعزیز بگوی علمی دنیا میں بڑے مشہور ہوئے ۔ اوّل الذکر عرصہ تک شاہی مسجد لاہور کے خطیب رہے ۔ اور دوسرے بھیرہ کی جامع مسجد میں خطیب رہے ۔

۲۔ **مولانا احمد الدین بگوی** :۔ مولانا غلام محی الدین بگوی کے چھوٹے بھائی ۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے ۔ چھ برس تک ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرتے رہے ۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں بڑے بھائی کے ساتھ دہلی روانہ ہو گئے ۔ ابتدا میں بھائی سے اور پھر ان کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ۔ شاہ غلام علی کے مرید ہوئے ۔ عمر کا زیادہ تر حصہ بگہ اور لاہور میں بھائی کے ساتھ رہے ۔ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء مستقلاً بھیرہ ضلع سرگودھا میں مقیم ہو گئے ۔ اپنے بھائی سے ٹھیک تیرہ برس بعد ۱۳ شوال ۱۲۸۶ھ ۱۹ جنوری ۱۸۷۰ء کو انتقال کیا ۔ آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ خصوصاً ملا جامی، خیالی، مطول، اور صرف میر کی شروح مصیں ۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی غلام قادر بھیروی، حافظ ولی اللہ اور حکیم تاج محمود قابل ذکر ہیں ۔

۳۔ **مفتی غلام محمد بگوی** :۔ مولانا غلام محی الدین بگوی کے فرزند ارجمند ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں بگہ میں پیدا ہوئے ۔ شاہ عبدالغنی کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک ہوئے ۔ ان کی وفات کے بعد خواجہ محمد سلیمان تونسوی سے فیض حاصل کیا ۔

اس زمانے میں شاہی مسجد لاہور پہلے تو سکھوں کا اصطبل رہی ۔ اور پھر انگریزوں کے پاس چھاؤنی کی حیثیت سے رہی ۔ مولانا نے مسجد خالی کرانے کے لیے ایک تحریک کا آغاز کیا جو کامیاب ہوئی اور مسجد واگزار ہو گئی ۔ مولانا شاہی مسجد کے پہلے خطیب اور ولی مقرر ہوئے مسجد کی رونق دوبالا ہوئی تو یہیں دارالافتاء قائم کیا گیا۔ جہاں اہلسنت کے علماء کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا۔ اس دور میں اس مسلک میں شائع ہونے والی ہر کتاب پر مولانا بگوی کی مہر تصدیق ثبت ہوتی ۔ مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا محمد ذاکر بگوی، مولانا محمد عالم آسی امرتسری اور مولانا غلام دستگیر قصوری آپ سے اکثر استفادہ کرتے ۔ آپ نے ۴ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ/۲۹ ستمبر ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا اور بگہ میں دفن ہوئے ۔

آپ کے دو صاحبزادے مولوی محمد رفیق بگوی (وفات ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء) خطیب جامع بگہ اور مولانا محمد شفیع بگوی خطیب شاہی مسجد، بڑے عالم دین، خدا ترس اور متقد فقیہ تھے ۔

۴۔ **مولانا محمد ذاکر بگوی** :۔ مولانا غلام محی الدین بگوی کے پوتے اور مولانا عبدالعزیز بگوی کے صاحبزادے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کرنے کے بعد طبیہ کالج دہلی کا رخ کیا، جہاں حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تعلیم پائی ۔ واپسی پر مولانا غلام محمد بگوی کے پاس لاہور میں قیام پذیر ہوتے ۔ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں لاہور کے مدرسہ حمیدیہ نیلا گنبد میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے ۔ طبعاً صوفی منش تھے ۔ اس لیے ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں خواجہ محمد دین سے بیعت کر کے سلسلہ چشتیہ سے منسلک ہو گئے ۔ آپ لاہور میں شاہی مسجد کے خطیب تھے ۔ پرنس آف ویلز کے جلوس شاہی میں معزز مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ ۱۳ ربیع الاوّل ۱۳۳۴ھ/۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء کو آپ نے چند روز بیمار رہنے کے بعد انتقال کیا ۔ میت لاہور سے بھیرہ پہنچائی گئی، جہاں آپ کو بگہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا

بگوی خاندان کے دیگر علماء میں مولانا عبدالعزیز بگوی بھیرہ کی جامع مسجد کے خطیب اور دینی درسگاہ کے مہتمم رہے ۔ الحاج نصیر الدین بگوی، شفیق احمد بگوی اور ظہور احمد بگوی علمی اعتبار سے بہت بلند مرتبہ کے علماء تھے ۔ لاہور کی دینی اور علمی تاریخ میں ان بگوی علماء کا اہم حصہ ہے ۔ ستر برس تک کوئی دینی فیصلہ، فتوے یا کتاب اس وقت تک مستند اور مسلم نہیں ہوتی تھی، جب تک کہ ان علماء میں سے کسی ایک کی مہر تصدیق ان پر ثبت نہ ہوتی ۔ انھوں نے سکھوں سے حقوق کی بازیابی، انگریزوں سے کشمکش اور مسلمانوں کی علمی راہنمائی کا واقعی حق ادا کر دیا تھا۔

بلا تصوف کی اصطلاح، جس کے معنی اولیاء کے جسم کو طرح طرح کی تکالیف بیماریوں اور ابتلاء میں ڈالنے کے ہیں ۔

بندے پر جس قدر مصیبت زیادہ قوی ہوتی ہے اسے اللہ تعالےٰ کا قرب بھی اسی نسبت سے زیادہ حاصل ہوتا ہے ۔ کیونکہ مصیبت اولیاء کا لباس، برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیاء کی غذا ہے ۔ آنحضور نے فرمایا ہے: "ہم انبیاء کا گروہ سب لوگوں سے زیادہ مصیبت میں ہوتے ہیں ۔" نیز فرمایا "سب سے زیادہ مصیبت میں انبیاء ہوتے ہیں پھر اولیاء پھر وہ لوگ جو زیادہ بزرگ ہیں ۔"

بقول حضرت داتا گنج بخشؒ "بلا اس رنج کا نام ہے جو بندہ مومن کے دل اور جسم پر ظاہر ہو اور جس کی حقیقت نعمت ہو اور اس لیے کہ اس کا بھید بندہ پر پوشیدہ ہوتا ہے اس کے رنج برداشت کرنے کی وجہ سے اسے ثواب حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن وہ مصیبت جو کافروں پر پڑتی ہے، بلا نہیں ہوتی بلکہ بدبختی ہوتی ہے اور کافروں کو بدبختی سے شفا نہیں ہوتی پس بلا کا مرتبہ امتحان کے مرتبہ سے زیادہ بزرگ ہے

Marfat.com

کیونکہ امتحان کا اثر صرف عقل پر پڑتا ہے۔ اور بلا کا اثر دل اور جسم دونوں پر ہوتا ہے"۔

بلاذری (۲۰۳ھ/۸۱۹ء - ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) ابوالحسن، احمد بن یحییٰ ابن جابر بن داؤد، ایک عرب مورخ ماہر انساب، جغرافیہ نگار، شاعر اور خوشنویس غالباً بغداد میں پیدا ہوا۔ بعض کے نزدیک وہ ایرانی النسل ہے اور اس کی تعلیم عربی میں ہوئی۔ بعض اسے عربی النسل قرار دیتے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ بغداد میں گذارا۔ تحصیل علم کی خاطر دمشق، انطاکیہ اور حمص بھی گیا۔ المدائنی ابن سعد اور مصعب الزبیری جیسے مشہور مورخین کی شاگردی اختیار کی۔

خلیفہ المتوکل سے اس کے دوستانہ مراسم تھے وہ المعتز کا اتالیق رہا جعفر بن قدامہ اور ابن ندیم بھی اس کے شاگردوں میں تھے۔ بلاذری کا دربار میں اثر و رسوخ بظاہر المستعین کے عہد تک قائم رہا لیکن المعتمد کے دور حکومت میں اس کی قسمت کا ستارہ بڑی سرعت کے ساتھ غروب ہونا شروع ہوا۔

بلاذری کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ اس نے شام، الجزیرہ (عراق) اور تکریت میں کافی عرصہ تک سیاحت کی۔ مرنے سے پہلے جنون کا شکار ہو گیا تھا۔

بلاذری کی تصانیف میں دو عظیم کتابیں جو مرور زمانہ کے ہاتھوں سے بچ گئی ہیں۔ "فتوح البلدان" اور "انساب الاشرف" ہیں۔ "فتوح البلدان" ایک مختصر تاریخ ہے جس کا آغاز غزوات نبوی سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا شمار تاریخ اسلام کے ابتدائی اہم ماخذوں میں ہوتا ہے۔ بلاذری نے چالیس جلدوں میں ایک مبسوط تاریخ لکھنی چاہی تھی لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

بلاذری کی دوسری کتاب "انساب الاشراف" ایک بہت ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اس کی ترتیب "انساب وار" دی گئی ہے۔ اس کتاب کا آغاز آنحضور ؐ کے حالات زندگی سے ہوتا ہے اور اس میں آپ ؐ کے اہل بیت سے لے کر ولید بن عبدالملک کے دور تک کے تاریخی حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔

بلاط الشہداء ایک جنگ، جو چارلس مارٹل کی زیر قیادت فرنگی فوجوں اور اندلس کے عامل امیر عبدالرحمان بن عبداللہ کے درمیان ۱۱۴ھ/۷۳۲ء میں لڑی گئی۔

اس جنگ کے لئے "بلاط الشہداء" کی اصطلاح پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے اندلسی مورخوں نے استعمال کرنا شروع کی۔ ابن حیان نے اس جنگ کو "وقعۃ البلاط" کا نام دیا ہے۔

زمانہ وسطیٰ کے عرب مورخوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمان اور ان کے امیر عبدالرحمان وہاں شہید ہو گئے۔

یورپی مورخوں اور جدید عرب مورخوں کے پیش نظر اس جنگ کا صحیح محل و قوع ایک خاص مسئلہ رہا ہے۔

متون کے مطالعے، پائسٹرز اور طورس کے درمیانی خطے کی چھان بین سے محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ لڑائی پائسٹرز کی رومی شاہراہ پر شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً بیس کلومیٹر پر لڑی گئی۔

بلال ؓ بن رباح آنحضور ؐ کے موذن، صحابی۔ جنھیں ان کی والدہ کی نسبت سے بلال ابن حمامہ بھی کہتے ہیں۔ اور عام مسلمانوں میں وہ بلال حبشی کے نام سے مشہور ہیں۔ مکہ مکرمہ میں سراۃ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بعض روایات میں امیہ بن خلف کے غلام بتائے گئے ہیں۔ سابقون الاولون میں سے تھے۔ کافر کا غلام ہونے کی وجہ سے انہوں نے سخت تکالیف اٹھائیں اور خصوصاً امیہ بن خلف نے تو انہیں بہت ایذائیں پہنچائیں۔ حضرت بلال ؓ ان تمام مصائب کو بڑے صبر کے ساتھ جھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر ؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ اس کے بعد سے بلال ؓ آنحضور ؐ کی خدمت میں رہے۔

ہجرت کے بعد آنحضور ؐ نے ابورویحہ ؓ سے ان کا سلسلہ مواخات قائم کر دیا جب ہجرت کے پہلے سال نماز کے لئے اذان کہنے کا فیصلہ کیا گیا تو انہیں موذن مقرر کیا گیا۔ بلال ؓ آنحضور ؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل رہے۔ غزوہ بدر میں انہوں نے امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو قتل کیا۔ وہ آنحضور ؐ کے موذن کے علاوہ آپ ؐ کے عصا بردار، خازن اور ذاتی خادم بھی تھے۔

فتح مکہ کے موقعہ پر کعبے کی چھت پر چڑھ کر پہلی دفعہ اذان کہنے والے بھی بلال ؓ ہی تھے۔ وہ آنحضور ؐ کے بعد حضرت ابوبکر ؓ کے عہد خلافت میں بھی موذن رہے لیکن حضرت عمر ؓ کے دور خلافت میں شام کی مہمات میں جا ملے اور بقیہ زندگی وہیں بسر کی۔ بعض روایات کی رو سے آنحضور ؐ کے وصال کے بعد ہی سے موذن کا منصب چھوڑ دیا تھا اور صرف دو موقعوں پر اذان کہی تھی۔ یہ دونوں موقعے رقت انگیز تھے۔

حضرت بلال ؓ کا قد لمبا اور کسی قدر جھکا ہوا تھا۔ رنگ سیاہ چہرہ پتلا اور بال گھنے تھے۔ جن میں بہت سے بال سفید تھے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے مختلف روایات کی رو سے انھوں نے ۱۷ھ/۶۳۹ء یا ۱۸ھ/۶۴۱ء یا ۲۰ھ/۶۴۲ء یا ۲۱ھ/۶۴۳ء میں وفات پائی اور حلب یا دمشق یا داریا میں دفن کیے گئے حضرت بلال کو ان کی زندگی ہی میں بڑی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ صحابہ کرام ؓ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ حضرت عمر ؓ انہیں سیدنا بلال ؓ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بلال حبشی ؓ :۔ آنحضور ؐ کے صحابی و موذن (دیکھئے "بلال بن رباح")

بلبن، غیاث الدین (دور حکومت ۶۶۴ھ - ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء تا ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء) سلطنت دہلی کا فرمانروا، خاندان غلاماں کا ایک نامور بادشاہ ترکوں کے قبیلہ بری سے تعلق رکھتا تھا۔ بلبن کا باپ اپنے قبیلے میں اچھی حیثیت کا مالک تھا۔ لڑکپن میں اسے منگول پکڑ کر لے گئے اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ ایک روایت کے مطابق بلبن منگولوں کے حملے میں گرفتار ہوا اور بغداد میں خواجہ جمال الدین بصری نے خرید ا جو اسے دہلی لے آئے۔ یہاں شمس الدین التتمش نے اسے خرید لیا اور اس کی ذہانت و قابلیت کی بنا پر اپنے غلامان چہل گانہ میں شامل کر لیا۔ رضیہ سلطانہ نے بلبن کو امیر شکار بنایا۔ بہرام نے اسے ریواڑی اور ہانسی بطور جاگیر عطا کی۔

مسعود اور ناصر الدین محمود کی حکومت میں بلبن کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہوئی یہ دونوں بادشاہ اس کے داماد تھے۔ خود بلبن التتمش کا داماد تھا۔ اس طرح بلبن کا گھرانہ التتمش کے گھرانے میں مدغم ہو چکا تھا۔ ناصر الدین محمود نے بلبن کو نائب بنایا۔ اس سے قبل بلبن منگولوں کے حملوں کو کامیابی سے روک چکا تھا اور سرکش امراء کے خلاف اپنے حسن تدبر اور سیاست کا سکہ بٹھا چکا تھا۔ نائب ہو کر وہ سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد دہلی کے تخت پر بیٹھا

Marfat.com

بلبن کی نظر میں بادشاہ کا مقام بہت اعلیٰ اور ارفع تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "بادشاہی نام ہے عزت وعظمت اور حرمت وحشمت کا" وہ سمجھتا تھا کہ جب بادشاہ کی ارفع حیثیت تسلیم نہ ہوگی لوگوں میں اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اپنے کردار اور اخلاق کو سدھارا تاکہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس نے عام لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اپنے امراء مصاحبین اور افسروں کے انتخاب میں وہ خاندانی وجاہت پر بہت زور دیتا تھا۔

بلبن نے اپنے مخالفوں اور سرکشوں کو بڑی سختی سے دبایا۔ جس نے ذرا بھی سر اٹھایا بلبن نے اسے کچل کر رکھ دیا۔ اپنی سلطنت کو منگولوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شمالی اور شمال مغربی سرحدوں کو خوب مستحکم کیا ۶۶۹ھ/۱۲۷۰ء میں خود لاہور آکر شہر اور قلعے کو از سر نو مستحکم کیا اور ان سرحدوں کو اپنے لڑکے شہزادہ محمد کے سپرد کیا۔

التتمش کے بعد تیس سال تک سلطنت دہلی افراتفری کا شکار رہی۔ بلبن نے امن وامان قائم کرنے کے لیے مؤثر انتظامات کیے اس نے اپنے آپ کو حالات سے باخبر رکھنے کے لیے خفیہ خبر رسانی کا انتظام کیا۔ ہر صوبے اور ہر شہر میں خبر رساں مقرر کیے۔ ان کے ذریعے بلبن اپنے امراء، گورنروں اور افسروں کے حال اور کام سے مطلع رہتا۔ نیز ملک کو قزاقوں اور رہزنوں سے پاک کرنے کے لیے بڑے بڑے اقدامات کیے اور اودھ کے بڑے بڑے جنگل کٹوا کر بدایوں اور [illegible] آباد وغیرہ کو قزاقی سے پاک کیا۔

طغرل خان حاکم بنگال جو بلبن کا غلام تھا اور جسے اس کی شجاعت کی وجہ سے حاکم بنگال بنایا گیا تھا، [illegible] میں علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان مغیث الدین کے لقب سے [illegible] حکمران بن بیٹھا۔ بلبن نے اس کی سرکوبی کے لئے پہلے تو سرداروں کو بھیجا لیکن جب وہ طغرل سے شکست کھا کر واپس آیا تو خود بلبن اس [illegible] بڑھا۔ جب طغرل نے یہ خبر سنی تو جنوب مشرق کی طرف بھاگ نکلا۔ بعد ازاں گرفتار ہو کر قتل [illegible] بلبن نے بڑی سختی اور درشتی سے اس بغاوت کو ختم کیا۔ طغرل کے مددگاروں کو گرفتار کر کے بلبن نے سخت سزائیں دیں۔ اور اپنے بیٹے بغرا خان کو بنگال کا گورنر بنایا۔ ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء میں بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد جو بارہ تیرہ سال سے شمالی اور شمال مغربی سرحدوں پر منگولوں کے حملوں کا دفاع کر رہا تھا ایک مقابلے میں شہید ہو گیا۔ شہزادہ محمد کی شہادت نے بلبن کی کمر ہمت توڑ دی۔ بلبن کو اس صدمے نے آگھیرا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بلبن کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت بلبن کی عمر اسی سال سے زیادہ تھی اور مدت حکومت بیس سال تین ماہ تھی۔

بلبن ایک غیر معمولی شخصیت کا انسان تھا۔ جس شان وشوکت اور دبدبہ سے اس نے بادشاہت کی وہ بہت کم فرمانرواؤں کو نصیب ہوئی ہے۔ اس نے اپنے آہنی عزم سے سلطنت دہلی کو قوت اور وقار بخشا۔ یہ بات بھی از حد مستحسن اور قابل تعریف ہے کہ جہاں سرکش اور شورش پسند لوگ اس کی درشت مزاجی اور سخت گیری سے کانپتے تھے وہاں عام رعایا کے لیے وہ مشفق باپ کی طرح تھا اس کی موت پر رعایا اور امراء نے چالیس روز تک سوگ منایا۔ بلبن نے سلطنت دہلی کو ایسے زمانے میں محفوظ و مامون رکھا جب منگولوں نے ساری اسلامی دنیا کو تہ وبالا کر رکھا تھا۔

بلبن کی نظر میں سلطنت کا استحکام اس کی توسیع سے زیادہ وقعت رکھتا تھا۔ وہ ایک مدبر اور باہمت سپہ سالار اور بعد میں ہوش مند اور رعب وجلال والا حکمران ثابت ہوا۔ وہ شوکت ودبدبہ کو لازمہ جہانداری سمجھتا تھا۔ وہ ایک نیک اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ مشائخ اور اہل علم کا احترام کرتا تھا۔ علماء اور مواعظ کی مجالس میں شریک ہوتا تھا۔ اسے ہندوستان کے عظیم معماروں میں شمار کیا گیا ہے۔

بلخ افغانستان کا ایک قدیم شہر جنوب میں واقع پہاڑیوں کے دامن سے دو میل اور دریائے آمو (جیحون) سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے آثار اب بھی مزار شریف کے ایک گاؤں کے اطراف میں موجود ہیں۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد بلخ نام کا شہر ایک یونانی باختری ریاست کے صدر مقام کی حیثیت سے سامنے آیا۔ ۶۲۹ء میں ایک چینی بدھ بھکشو ھوان سانگ یہاں آیا اس کے قول کے مطابق اس شہر میں بلحو کی تقریباً ایک سو عبادت گاہیں تھیں"۔ ابوزید البلخی نے اپنی کتاب "مسالک الممالک" اور تاریخ بلخ میں اس شہر کو اسلام سے پہلے بدھ مت کا مرکز بتایا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت ۳۲ھ/۶۵۲ء میں اخنف بن قیس نے اس شہر کا محاصرہ کر کے اسے تاراج کیا۔ لیکن اسے امان مل گئی اور دستبرد سے محفوظ رہا۔ ۴۲ھ ۶۶۲ء میں قیس بن ہیثم نے پورے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور نوبہار جو بدھ مت کے مندروں کا مجموعہ تھا کو تباہ کر دیا۔ برمک کو جو نوبہار پر حکومت کرتا تھا اپنی جاگیر کو بچانے کے لیے عربوں کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔ سیستان اور طاس طہند کے بادشاہ نیزک ترخان نے بھی بظاہر اسلام قبول کر لیا جو بعد میں مرتد ہو گیا۔ اور اس نے بلخ کو عربوں کے قبضے سے نکال لیا۔ ۹۶ھ/۷۱۵ء میں اس شہر پر مسلمانوں کے مکمل قبضہ ہو جانے سے پہلے اس پر مختلف لوگوں کا قبضہ رہا۔ ۱۰۷ھ/۷۲۵ء میں اسد بن عبداللہ والی خراسان نے اپنی محافظ فوجوں اور صوبائی حکومت کو مرو سے بلخ منتقل کر دیا اور اس شہر کی تعمیر شروع کرائی۔

۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں بلخ پر سامانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ سامانیوں کے دور حکومت میں اس شہر نے بہت ترقی کی اور بلخ ماوراءالنہر، ترکستان اور ہندوستان کی باہمی تجارت کا مرکز بن گیا۔ اس دور میں یہ شہر دو حصوں میں بنا ہوا تھا۔ اندرون شہر شہرستان یا مدینہ کہلاتا تھا۔ اور ربض (مضافات شہر) ایک بڑی نواحی بستی تھی۔ اس کے گرد فصیل تھی۔ ایک بڑی دیوار بھی تھی جس میں سات دروازے تھے۔ شہر کی ایک بڑی مسجد شہرستان میں تھی۔ بڑے بڑے بازار ربض میں تھے۔

المقدسی کے بقول۔ دوسرے ایرانی شہروں کے مقابلے میں بلخ کی سڑکیں زیادہ چوڑی تھیں۔ اس کی مسجدیں خوبصورتی میں بے نظیر ہیں اس کے گھروں کے صحن دندانقان کے علاوہ خراسان کے تمام شہروں کے صحنوں سے زیادہ کشادہ تھے۔ ۴۳۱ھ/۱۰۴۰ء میں بلخ پر چغری بیگ نے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلجوقیوں کا اس شہر پر ہوا۔ ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء میں غزوں نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ بلخ کے گورنر امیر قماج نے ایک نئی جگہ ہموار میدان میں شہر کو از سر نو تعمیر کرایا۔

۵۹۴ھ/۱۱۹۸ء تک یہ شہر قراختائیوں کے ہاتھوں میں رہا اور اس کے بعد غوریوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء میں خوارزم شاہ نے بلخ پر قبضہ جما لیا۔ ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں اس شہر کو چنگیز خان نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں کپک خان نے اسے پھر سے تعمیر کرایا۔ جب اس شہر پر تیمور کا قبضہ ہوا تو قدیم ربض (مضافات) بھی از سر نو تعمیر ہوا۔ ان تعمیرات کی وجہ سے ہرات اور سمرقند کے بعد بلخ وسط ایشیا کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔

Marfat.com

ازبکوں کے دورِ حکومت میں پرانے بلخ کے شمال مشرق میں نئے بلخ کے نام سے ایک قصبہ بنا یا گیا۔ محمود بن ولی نے ان تمام تفریح گاہوں، باغوں، محلوں، نہروں، مسجدوں، مدرسوں کے مفصل حالات لکھے ہیں جو بلخ میں ازبک خوانین کے عہد میں بنائے گئے۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں بلخ کو زوال آنا شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ یہ شہر ویران ہوتا چلا گیا۔ شہر کی آبادی کا بڑا حصہ شہر مزار شریف میں منتقل ہو گیا اور بلخ کے بجائے یہ نیا شہر آباد ہو گیا۔ یوں بلخ کی حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی رہ گئی تھی۔ جس میں صرف چند سو مکان تھے۔ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں احمد شاہ ابدالی کے وزیر اعظم شاہ ولی خان نے بلخ ذخشاں کے علاقوں یعنی افغانستان کے شمالی حصے کو سلطنت احمد شاہی میں شامل کر لیا اور وہاں افغانی حکام متعین کر دیئے۔

۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء سے موجودہ زمانے تک مزار شریف اور بلخ افغانستان کی ایک ولایت ہیں۔ مزار شریف میں ایک گورنر مقرر ہوتا ہے جو پوری ولایت پر حکمرانی کرتا ہے۔ اب بلخ مزار شریف کی ولایت میں ایک ضلع ہے جو مزار شریف سے بائیس کلومیٹر اور کابل سے ۴۴۳ کلومیٹر ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی گیارہ سو پچاس میٹر ہے۔

نئے بلخ کی بنا ۱۳۱۲ھ/۱۹۳۳ء میں افغانستان کے وزیر داخلہ گل محمد خاں نے ڈالی نئے شہر کو وزیر آباد کہا جاتا ہے۔ اس میں بازار، حکومتی مراکز اور تجارت خانے بنائے گئے ہیں۔ ضلع میں دولت آباد، کشندہ، شورتپہ، چمتال اور متعدد دوسرے مواضع شامل ہیں یہاں کے رہنے والے ازبک، تاجیک اور پختون ہیں۔ جوازبکی، فارسی اور پشتو زبان بولتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں شہر کی آبادی تیرہ ہزار تھی۔ بلخ کی اہم پیداوار گیہوں، جو، جوار، باقلا، ماش لوبیا، چنا اور کپاس وغیرہ ہیں۔

یہاں کا مشہور پھل خربوزہ ہے جو بہت شیریں ہوتا ہے۔ قرہ قلی، قالین، شال برک، ریشمی ابرہ یہاں کی مشہور مصنوعات ہیں جو دوسرے ممالک میں بھیجی جاتی ہیں پالتو جانوروں میں گھوڑے بہت مشہور ہیں۔ لوگوں کا پیشہ زراعت اور قرہ قلی بھیڑیں پالنا قالین بافی اور گھوڑے پالنا ہے۔

یہاں موسم گرما میں سخت گرمی اور موسم سرما میں سخت سردی پڑتی ہے۔ بلخ میں بہت سے قدیم بزرگان اسلام کے مزار موجود ہیں جن میں خواجہ ابو النصر پارسا، خواجہ عکاشہ رض، امام محمد حنیفہ رح امام ابو حفص شیخ الاسلام، امام ابو عبداللہ اسماعیل، ابو القاسم انصاری امام ضحاک فقیہ حنفی، شفیق بلخی اور بعض کے نزدیک حضرت علی رض کا مزار بھی ہے لیکن لوگ اسے فرضی مزار کہتے ہیں۔

بلخی، ابو القاسم (وفات ۳۱۹ھ/۹۳۱ء) عبداللہ بن احمد بن محمود معتزلی عالم بلخ میں پیدا ہوا۔ اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بغداد میں گذارا۔ بغداد میں اس نے ابو الحسن الخیاط معتزلی سے علم حاصل کیا۔ اس نے نسف میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس نے بلخ ہی میں وفات پائی

بلخی اگرچہ معتزلی عقائد سے اتفاق کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ معتزلہ کے اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اللہ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں۔ اس کا نظریہ تھا کہ عدم وجود، جس میں وجود کی صلاحیت ہے ایک خارج از وجود مسلمہ شے یعنی ایک جوہر بسیط ہے۔ وہ ذرّے کو محدود اور ذاتی صفات سے معرا سمجھتا تھا۔ جسم کی صفات چونکہ ذرات کے مجموعے سے حاصل ہوتی ہیں لہٰذا وہ واجب نہیں بلکہ حادث ہیں۔ اس نے احساس اور تاثر میں فرق کیا ہے۔ اس کے نزدیک اختیاری فعل قطعیت اور تذبذب کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ دونوں باتیں انسان ایسی ناقص ہستی کا خاصہ ہیں بخلاف اس کے ذات باری میں یہ بالکل معدوم ہیں۔ امامت کے بارے میں اس کا نظریہ تھا کہ امامت قریش ہی کا حق ہے اور انہی کو ملنی چاہیئے لیکن اگر اس سلسلے میں کسی سازش کا اندیشہ ہو تو غیر قریشی بھی امام بن سکتا ہے۔

بلخی، ابو زید (۲۳۶ھ/۸۵۰ء۔ ذیقعدہ ۳۲۲ھ/اکتوبر ۹۳۴ء) احمد بن سہل ایک مشہور عالم اور جغرافیہ نویس۔ صوبہ خراسان میں بلخ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سجستان کا ایک مدرس تھا۔ فکری لحاظ سے فرقہ امامیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ نوجوانی میں اس نے مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عراق کا سفر کیا۔ اور آٹھ سال تک عراق میں مقیم رہا۔ اس نے الکندی کی شاگردی بھی اختیار کی اور قریبی ملکوں کی سیاحت بھی کی۔ اس نے عراق میں فلسفہ، نجوم ہیئت، طب اور علوم طبیعیات کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مذہبی علوم کو بھی پڑھنا شروع کر دیا اور دونوں میں مہارت پیدا کر لی۔ الشہرستانی نے بلخی کا شمار حکمائے اسلام میں کیا ہے۔

بلخی نے تقریباً ساٹھ کے قریب کتابیں لکھی ہیں۔ یاقوت نے چھپن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تصانیف میں "نظم القرآن"، "صور الاقالیم" (الاسلامیہ) "مصالح الابدان والانفس" اور "صورۃ ماموئیہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بلد، سورۃ:۔ قرآن مجید کی ۹۰ ویں سورت۔ دیکھیے "البلد، سورۃ"۔

بَلعَام:۔ ایک غیر اسرائیلی عالم یا پیغمبر دیکھیے "بلعم بن باعور"

بَلعَم بن باعور ایک غیر اسرائیلی عالم یا پیغمبر، جو بائیبل کی رُو سے ایک مستجاب الدعوات شخص تھا۔ جسے بالاق، شاہ موآب نے اس لیے طلب کیا تھا کہ وہ بنو اسرائیل کے حق میں بددعا کرے۔ لیکن خدا کے حکم سے اس کی زبان سے بار بار ان کے حق میں دعا ہی نکلی۔ (گنتی: ۲۲ تا ۲۴)

نیز انہی روایات کی رو سے بعد ازاں بلعم کے کہنے پر مدیانیوں نے اپنی عورتوں کو بنو اسرائیل کے پاس بھیجا تاکہ وہ آمادہ گناہ ہو کر عتاب الٰہی کے مورد ہوں۔ چنانچہ اسی پاداش میں دوسرے مدیانیوں کے ساتھ بلعم بھی نیخاس بن الیعزر بن ہارون کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اسرائیلی روایات کے مطابق بلعم، ادوم کا بادشاہ بالع بن بعور، ارام کا باپ قموئیل اور یعقوب کا خسر لابن ایک ہی شخص تھا۔

قرآن مجید میں کسی مقام پر بھی بلعم بن باعور کا نام نہیں آیا۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں "اور اے محمدؐ، ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا۔ مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے۔ مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت اس کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں

Marfat.com

تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں۔ (۷: ۱۷۵، ۱۷۶)

ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے طبری نے جو روایات بیان کی ہیں ان کی رو سے بلعم بنی اسرائیل یا مدینۃ الجبارین میں سے یا اہل یمن یا کنعانیوں میں سے تھا۔

مولانا مودودی اس آیت کے ضمن میں "تفہیم القرآن" میں لکھتے ہیں "ان الفاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور کوئی متعین شخص ہوگا جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی یہ انتہائی اخلاقی بلندی ہے کہ وہ جب کبھی کسی کی برائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر اس کی بری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اسے رسوا کیے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ اس لئے نہ قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے مفسرین نے عہد رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کیا ہے۔ کوئی بلعم بن باعور کا نام لیتا ہے کوئی امیہ بن ابی الصلت کا اور کوئی صیفی بن الراہب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردہ میں ہے جو اس تمثیل میں پیش نظر تھا۔ البتہ یہ تمثیل ہر اس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔ وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا۔ یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اس رویہ سے بچتا جسے وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے لیکن وہ دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا۔ خواہشات نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس نے ان کے آگے سر ڈال دی۔"

انجیل کی رُو سے بلعم نے نہ صرف خود گمراہی اختیار کی بلکہ بالاق کو بتوں کی قربانیاں کرنے اور زناکاری کی بھی تعلیم دی۔ (پطرس ۲: ۱۵)

بعض کے نزدیک بلعم علمائے بنی اسرائیل میں سے تھا اسے حضرت موسیٰؑ نے دعوت دین دینے کے لئے مدین کے بادشاہ کے پاس بھیجا جس نے اسے کئی گاؤں اور بہت سا انعام واکرام دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور اس نے دین موسوی ترک کر دیا۔

بلعمی

(وفات ۱۰ صفر ۳۲۹ھ/۱۴ نومبر ۹۴۰ء) دو سامانی وزراء جو اس نسبت سے مشہور ہوئے

(۱) ابوالفضل محمد بلعمی بن عبیداللہ جو عبداللہ البلعمی التمیمی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ بلعمی نسبت کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بعض کے نزدیک یہ نسبت بلعان سے ہے جو مرو کے قریب ایک مقام تھا۔ ابوالفضل بلعمی سامانی امیر اسماعیل بن احمد کا وزیر تھا۔ ۳۱۰ھ/۹۲۲ء میں نصر ثانی بن احمد کا وزیر مقرر ہوا۔ نصر کا وزیر بننے سے پہلے ابوالفضل کا ذکر بہت کم ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا اکثر ذکر کیا گیا ہے بقول اسطخری بلعمی کے مرو میں مکانات تھے اور بخارا میں ایک دروازہ بھی اس کے نام سے موسوم ہے۔ وہ ۱۰ صفر ۳۲۹ھ/۱۴ نومبر ۹۴۰ء کو فوت ہوا۔ بلعمی نہایت قابل اور عالی انسان تھا۔ جن ماخذوں میں اس کا ذکر موجود ہے تمام کے تمام اس کی لیاقت کا احترام کرتے ہیں۔ علماء کی حد سے زیادہ عزت کرتا تھا اور ان سے بڑی مروت کے ساتھ پیش آتا تھا۔

(۲) ابو علی محمد بن محمد۔ ابوالفضل محمد بلعمی کا بیٹا تھا۔ عبدالملک اول کے آخری عہد میں حاجب تھا۔ الپتگین کے اثر و رسوخ سے وزیر بن گیا۔ بعد میں منصور اول جو عبدالملک اول کا جانشین تھا دوبارہ وزیر مقرر ہوا اور اسی کے حکم سے طبری کی مشہور تاریخ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ فارسی نثر کی قدیم ترین تصانیف میں سے ہے۔ اس نے اس ترجمے میں سلسلہ اسناد کو حذف کر دیا ہے اور وہ ایک ہی واقعے کو کئی بار متبادل بیانات کے تحت نہیں لاتا جیسا کہ طبری نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ یہ ایک ایسی نئی بات تھی کہ بعد کے آنے والے عرب مورخین نے اس طرز کو اختیار کیا ہے۔

بقول گردیزی ابو علی محمد بلعمی نے ۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک اس نے مندرجہ بالا تاریخ کے کافی عرصے بعد وفات پائی۔

بلغاریا

جنوب مشرقی یورپ کی ایک ریاست جو جزیرہ نما بلقان کی شمال مغربی ریاست تھی۔ تقریباً مستطیل شکل کے اس ملک کو شمال میں رومانیہ سے دریائے ڈینیوب جدا کرتا ہے۔ اور مشرق میں بحیرہ اسود اسے ایشیا سے الگ کر دیتا ہے۔ جنوب اور مغرب میں ترکی۔ جرمنی اور یوگوسلاویہ کی کچھ کچھ سرحدیں اس سے ملتی ہیں

بلغاریہ کی نسبت ایک ترکی النسل قوم بلغار سے ہے جس نے اوائل قرون وسطیٰ میں دریائے والگا اور دریائے ڈینیوب کے کنارے دو ریاستوں کی بنیاد ڈالی۔ اس قوم کا تذکرہ پہلی بار ۴۸۱ء میں ملتا ہے۔ جب انہوں نے گاتھوں کے ساتھ لڑائی میں شہنشاہ زینو کی مدد کی تھی۔ ۶۴۲ء میں خان کورت کی وفات کے بعد غالباً نئی معرکہ ہوئی۔ سلطنت خزر کے دباؤ کے تحت بلغاروں کے اتحاد کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا ایک حصہ دسویں صدی عیسوی تک دریائے کبن کے کنارے اور میاوٹس میں اپنی قدیم آبادیوں ہی میں مقیم رہا۔ بلغاروں نے تاریخ میں کوئی اہم کارنامہ سر انجام نہیں دیا۔ بعد ازاں یہ لوگ اس علاقے میں آباد ہونے والی دوسری قوموں میں مدغم ہو گئے۔ اور اپنی الگ حیثیت ختم کر بیٹھے۔ بلغاریوں کا دوسرا گروہ ۶۷۹ء میں اسپرخ کی زیر قیادت دوبروجہ پر حملہ آور ہو کر موسیہ کے بزنطی صوبے میں ایک خودمختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس قوم نے کلیسائے یونان کی مسیحیت قبول کر کے ۸۶۵ء میں بلقان میں ایک مستحکم ریاست قائم کی۔ جو دریائے ڈینیوب سے بحیرہ ایڈریاٹک تک پھیلی ہوئی تھی

ایک گروہ دریائے کاما اور والگا کے سنگم کے قریب آباد ہو گیا۔ جہاں انہوں نے فن لینڈ کے باشندوں کو اپنا مطیع کر لیا اور ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اسی گروہ کو عربی ماخذ میں بلغار لکھا جاتا ہے۔

۳۱۰ھ/۹۲۲ء میں خلیفہ مقتدر باللہ نے شاہ بلغار کے پاس جو سفارت بھیجی اس میں ابن فضلان جیسا مورخ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد بلغار کے حالات کے بارے میں اور بھی بہت سے ماخذ ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں البیرونی، بیہقی، ابن ندیم، ابن بطوطہ، ابن الاثیر، ابوالفدا وغیرہ ہیں۔

بلغار کئی گروہوں میں منقسم تھے۔ مسلمان مصنفین نے ان کا ذکر مختلف ناموں کے تحت کیا ہے جو برصولہ، اسکل، بلکار، قبیلہ سوار، البرنجار وغیرہ ہیں۔

بلغاریا میں اسلام پہلے پہل وسط ایشیا سے پہنچا۔ ۱۰۱۸ء سے ۱۱۸۶ء کے مابین بزنطینی سلطنت میں ضم ہو جانے کے بعد بلغاریا کی حیثیت دو صوبوں کی رہ گئی۔ ایک صوبہ بلغاریا دوسرا اسپریڈیان۔ ۱۱۸۵ء تا ۱۲۷۹ء ڈینیوب کے نچلے علاقے میں کمانوں کے حملے اور ان کے وہاں آباد ہو جانے سے بلغاریا سلطنت کے قیام کا راستہ ہموار ہو گیا۔ جو دوسری بلغاروی سلطنت کہلانے لگی۔

۱۲۶۲ء میں بزنطینی شہنشاہ مائیکل ہشتم نے بلغاریوں سے انکیالس اور مسمبریہ چھین کر دوبروجہ میں اناطولی ترکوں کو لا بسایا جنہوں نے عزالدین کیکاؤس ثانی کی معیت

Marfat.com

میں برنطہ میں پناہ لی تھی۔ اناطول کے غازی" ترکوں کا بلغاریوں سے واسطہ اس وقت پڑا جب آیدین اوغلو امور قانتا قوزن کا حلیف بنا۔ ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء میں امور نے قانتا قوزن کو پہلے بلغاروی زار ایون الیگزنڈر کے خلاف مدد دی۔ آل عثمان کو جنہوں نے قانتا قوزن کے حلیف کی حیثیت سے امور کی جگہ لے لی، ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء میں بلغاریوں سے واسطہ پڑا بلغاروی قانتا قوزن کے حریف یان پیجم کی حمایت میں تھے۔ ایک عام رائے یہ ہے کہ ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء میں بزنطینیوں اور بلغاریوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کا تعلق عثمانیوں اور بلغاریوں کے معاہدے سے تھا۔ ۷۶۶ھ/۱۳۶۵ء میں زار ایون الیگزنڈر نے اپنی سلطنت کو اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک بیٹے کو ودین کا حکمران بنا دیا اور دوسرے کو ترنووو کی حکومت دے دی۔ اسی سال ہنگری نے ودین پر قبضہ کر لیا اور ترنووو پر بھی دست درازی کی۔ چنانچہ ششمن نے ودین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے عثمانیوں سے فوجی امداد مانگی اس نے اپنی بہن بھی عثمانی سلطان مراد اوّل کے نکاح میں دے دی۔ چنانچہ عثمانی فوج ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں فتوحات حاصل کرتی ہوئی بلقان کے بڑے دروں تک جا پہنچی۔ ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء میں نِش پر بھی عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں جب مراد اوّل نے سربیا پر چڑھائی کی اور اس نے دیکھا کہ اس کے باجگزار یعنی بلغاریا میں ششمن اور دوبروجہ میں ایون اس کا ساتھ نہیں دے رہے تو اس نے اپنے عقب کے تحفظ کے لئے علی پاشا کی کمان میں ایک فوج روانہ کی ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء میں علی پاشا نے پرودیدینہ ونچی، مدیرہ اور شمنی پر قبضہ کر لیا۔ اور یخشی بیگ کو ابن دوبروجہ کے مقابلے پر روانہ کیا جو درنہ میں مقیم تھا اور خود سلطان کے پاس یان لبلی میں چلا آیا۔ ششمن بھی سلطان کی خدمت میں معافی مانگنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنے وعدے کے مطابق سلسترہ عثمانیوں کے حوالے نہ کیا۔ اس پر علی پاشا، ششمن کے دارالحکومت ترنووو کے سامنے آن دھمکا۔ کفار نے شہر کی کنجیاں اسے پیش کر دیں۔

۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں بایزید نے ترنووو پر بزور شمشیر قبضہ کیا۔ اور دوبروجہ اور سلسترہ کو بھی تسخیر کر لیا۔ لیکن ششمن کو باجگزار کی حیثیت سے نکہ بولی میں رہنے دیا۔ بعد میں ششمن نے سجسمنڈ کے سامنے دستِ طلب دراز کیا یہی بات بایزید کے ٹرانسلوانیا پر حملے کا باعث بنی اور بالآخر ۷۹۸ھ/۱۳۹۶ء میں جنگ نکہ بولی نے بلغاریہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور اگلے برس تک بلغاریہ ترکوں کے قبضہ میں آ گیا۔

۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تک بلغاریہ پر عثمانیوں کا بہت گہرا رنگ چڑھ گیا مشرقی بلغاریہ

صوفیا میں بنیا باشی جامع مسجد کا ایک منظر

میں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں تھی۔ ۸۵۹ھ/۱۴۵۵ء میں بلغاریہ جو ویدین، سلسترہ، نکوبولی اور ودین کے سنجاقوں میں منقسم تھا، جو روم ایلی کی ایالت یا صوبے میں داخل تھے۔ گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں نکوبولی اور سلسترہ کے سنجاق اوزی کی نئی ایالت میں شامل کر دیئے گئے اور اس جدید صوبے کا صدر مقام اوزو اور سلسترہ تھا۔

۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء میں بلغاریا میں سلطنت عثمانیہ کا مخصوص نظم و نسق رائج کر دیا گیا دورِ عثمانی سے قبل کا عسکری گروہ پیشتر عثمانیوں کی عسکری تنظیم میں مدغم ہو گیا اور بلغاریہ عوام کو ذمی رعایا کی حیثیت دے دی گئی۔ ۱۴۵۰ء سے ۱۵۹۵ء تک بلغاریا بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں سے بالکل محفوظ رہا۔ بلغاروی قصبے بالخصوص قصبہ صوفیہ اور سلسترہ جو روم ایلی جانے والی بڑی بڑی شاہراہوں پر واقع تھے۔ فوجی اور تجارتی مراکز ہونے کی وجہ سے بہت ترقی کر گئے۔ ان شہروں میں نئے مسلمان محلے بسائے گئے۔ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں ٹیکس بڑھائے گئے تو بلغاروی رعایا نے مقامی اہل کاروں اور سپاہیوں کے استحصال کی شکایات کرنا شروع کر دیں ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں ترنوو کے مقام پر پہلی عوامی شورش برپا ہوئی۔ سنان پاشا نے اس بغاوت کو فرو کیا۔ لیکن اس کے بعد سے بلغاریا کی رعایا پر بیرونی دشمن سے جب وہ حملہ کرتا تو اس کے ساتھ مل جاتی تھی اور جب وہ حملہ آور واپس جاتے تو بلغاروی رعایا کے بڑے بڑے گروہ اس کے ساتھ ہو لیتے جبکہ عثمانی حکومت انہیں ہر طرح سے مطمئن کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ مختلف زمانوں میں مختلف شہروں کی رعایا مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہو گئی۔ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں ستر اسی ہزار بلغاروی سربیا میں آباد ہونے کے لئے روس کی فوج کے ساتھ چل دیئے ۱۸۶۱ء میں دس ہزار بلغاروی اپنا وطن چھوڑ کر کریمیا میں جا بسے۔

Marfat.com

اٹھارہویں صدی کے آخری پچاس سالوں میں بلغاریا میں "اعیان" خاص طور پر مشہور ہو گئے تھے۔ یہ اعیان بلغاریا کی رعایا سے مالگذاری وصول کرنے کے ٹھیکیدار اور سرکاری اراضی پر قابضوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی ذاتی فوجیں بھی رکھنا شروع کر دیں۔

ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاسبان اوغلی عثمان نامی ایک فوجی نے بلغاریا کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور ۱۷۹۷ء سے ۱۸۰۶ء تک بلغاریا پر حکمرانی کرتا رہا۔ بالآخر سلطان محمود ثانی نے ان اعیان کا خاتمہ کر کے بلغاریا میں مرکزی حکومت کا نظم و نسق قائم کیا۔ ۱۸۴۷ء میں بلغاریا کی ازسرِ نو تشکیل کی گئی اور اسے سلسترہ، ودین ورنش کی ایالتوں (صوبوں) میں تقسیم کر دیا گیا۔ صوبائی مجالس شوریٰ قائم کی گئیں اور بلغاروی نمائندوں کو بھی نمائندگی دی گئی لیکن ان تمام اصلاحات سے بلغاروں کی بے چینی ختم نہ ہو سکی اور بغاوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں ودین کے علاقے میں ایک زبردست بغاوت برپا ہوئی۔

اکثر مبصروں نے ان بغاوتوں کی وجہ یہ بتائی ہے کہ بلغاریا میں ایک تہائی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور قلبہ، ودین، شمنی، روسچق، رازغراد، درنہ، پلونہ عثمان بازار، اسکی جمعہ، یکی زغرہ کے شہروں میں مسلمان اکثریت میں اور گبروو، نش، صوفیہ، ترنووا اور ترین او اسی اقلیت میں تھے۔ جب جنگ کریمیا کے بعد عثمانی حکومت نے بلغاریا میں ستانوے ہزار چرکسی اور تقریباً ایک لاکھ تاتاری لا کر بسا دیے تو ان کے اور بلغاروں کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ بلغاروی غلامیوں نے اسے خوب ہوا دی۔ چنانچہ اسی زمانے میں بلغاری انقلابیوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا نتیجہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء کی عظیم بغاوت کی صورت میں نکلا۔ اور ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء کی روم اور روس کی جنگ کا سب سے بڑا میدان بلغاریا بنا۔ اس کے سبب سے مسلمان آبادی جنوب کی طرف منتقل ہو گئی۔ اسی دوران میں معاہدہ سان سٹیفانو کے تحت روس نے کوشش کی۔ دریائے ڈینیوب سے بحیرہ ایجین تک ایک عظیم بلغاریا حکومت بنائی جائے۔ لیکن اس معاہدے

صوفیا (بلغاریا) میں واقع الیگزنڈر نیوسکی کیتھیڈرل

کی جگہ معاہدہ برلن نے لے لی۔ جس کے تحت بلغاریہ ایک ریاست "بلغاریا امارتی" پر سلطان کی سیادت تسلیم کر لی گئی اور صوبہ مشرقی رومیلی کو خود مختاری دے دی گئی۔ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں ایک انقلاب کے نتیجے میں یہ دونوں علاقے متحد ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب استنبول کے بعد فرڈیننڈ اور آسٹریا کے فرانسس جوزف اوّل کے مابین مفاہمت ہو گئی۔ ۵ راکتوبر ۱۹۰۸ء کو فرڈیننڈ نے بلغاریا کی آزادی کا اعلان کر دیا اور "زار" کے لقب سے تخت نشین ہو گیا۔

۱۷ رمارچ ۱۹۱۲ء کو بلغاریا اور سربیہ کے مابین اور ۲۹ رمئی ۱۹۱۲ء کو بلغاریا اور یونان کے مابین چند خفیہ معاہدے ہوئے تاکہ ترکی کے متروکات کو باہم تقسیم کیا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ان اتحادیوں نے ترکی پر یلغار کر دی اور ۳۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو ترکی اپنے تمام یورپی مقبوضات سے دستبردار ہو گیا۔

۱۹۱۸ء میں فرڈیننڈ کو تخت سے اتار دیا گیا اور زار بورس سوم ۱۹۴۳ء تک حکومت پر فائز ہوا۔ اس کے بعد زار سائمن دوم تخت نشین ہوا۔ جسے ۸ رستمبر ۱۹۴۶ء کو جمہوری استصواب رائے کے سامنے سر جھکانا پڑا اور یوں بلغاریا ایک جمہوریہ قرار پائی۔

۱۵ رستمبر ۱۹۴۶ء کو بلغاریا کی قومی اسمبلی نے ریاست کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔ سابقہ آئین کی جگہ (جو ۱۸۷۹ء سے نافذ تھا) نیا آئین نافذ کیا گیا جو ۱۸ رمئی ۱۹۷۱ء تک کار آمد رہا۔ جب ایک اور نیا آئین منظور کر لیا گیا۔

نئے آئین کی رو سے ایک ایوانی مقننہ عمل میں آئی۔ عاملہ کونسل میں چیئرمین، دو اوّل نائب چیئرمین اور چار نائب چیئرمین ایک سیکرٹری اور سترہ ارکان پر مشتمل ہے جنہیں قومی اسمبلی منتخب کرتی ہے۔ قومی اسمبلی چار سو ارکان پر مشتمل ہے جو پانچ برس تک کے لیے منتخب ہوتی ہے۔ آئینی طور پر سربراہ مملکت کوئی نہیں عاملہ کی کونسل ہی انتظام حکومت چلاتی ہے۔ تاہم ۱۹۷۱ء کے انتخابات کی رو سے ژیوکوف کونسل کے چیئرمین ہیں۔

اقتصادی و دیگر معلومات :- بلغاریا کا کل علاقہ ۴۲۸۲۳ مربع میل (۱۱۰۹۱۱ مربع کلومیٹر) ۱۹۷۴ء کی مردم شماری کی رو سے یہاں کی آبادی ۸۷۰۶۰۰۰ ہے جن میں ۶۰۸ بر ترک ۸۸ بر بلغاری ہیں۔ کل آبادی کا صرف سات فیصد مسلمان ہیں۔ تمام مسلمان ایک مفتی اعظم اور ۹ علاقائی مفتیوں کی ایک مجلس کے ماتحت ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں بلغاریا میں کل ۱۱۸۰ مساجد تھیں، جہاں باقاعدہ جماعت ادا کی جاتی ہے ملک میں عقیدہ کی آزادی ہے، لیکن حکومت کے مذہبی فنڈ سے صرف عیسائیوں کو امداد فراہم کی جاتی ہے۔

بلغاریا میں سات سے سولہ سال تک کے بچوں کے لیے تعلیم لازم اور مفت ہے۔ ۱۹۷۴ء میں یہاں ۷۶۹۲ کنڈر گارٹن سکول (۳۴۵۸۲ طلبار) ۹۳۲ ابتدائی سکول، ۲۲۳۰ پرائمری سکول، ۱۷۵ ثانوی سکول، ۱۱ پیشہ ور سکول، ۲۶۵ ٹیکنیکل کالج، ۲۵ عام کالج ۲۴ اعلیٰ تعلیمی ادارے اور تین یونیورسٹیاں ہیں۔ دو برس کی فوجی خدمت (تین برس بحریہ) لازمی ہے۔

اقتصادیات کا دارومدار زراعت پر ہے۔ مزید براں جنگلات، ماہی گیری پٹرولیم اور معدنیات کی صنعتیں آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کے ساتھ ہے۔ ۱۹۷۴ء میں دونوں مملکتوں کے درمیان تجارتی معاہدہ ہوا، جس کے تحت معیشت، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں دس برس تک ایک دوسرے کی معاونت کی جائے گی۔

Marfat.com

بلغراد یوگوسلاویہ (سابقہ سردیا) کا دارالحکومت۔ دریائے ڈینیوب اور دریائے ساوا کے سنگم پر واقع ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی سات لاکھ ستر ہزار تھی۔ اس مقام پر کلٹی سکورڈیسی نے ایک بستی آباد کی تھی اور سلطنت روما کے عہد تک اس شہر کا نام سنگیڈونیم رہا۔ نویں صدی عیسوی میں بلغاریوں نے اپنے دور حکومت میں اس شہر کا نام سلاوی زبان میں رکھا۔ ترکوں کے دور میں اسے بلغراد کہا جانے لگا۔

پہلی عالمی جنگ میں بلغراد وسطی یورپ سے مشرق قریب کو جانے والی شاہراہ پر ایک اہم قلعہ بند شہر تھا۔ ایک اہم جنگی مقام ہونے کی وجہ سے گذشتہ زمانے میں یہ اہم تاریخی واقعات کا مرکز رہا۔ قرون وسطیٰ میں اس شہر پر بزنطینی، بلغار، ہنگری اور سرب کے مختلف فرمانروا حکومت کرتے رہے۔ ۱۴۲۷ء میں سربیا کے بادشاہ سٹیفان لزاروچ کی وفات کے بعد بلغراد پر ہنگریوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور تقریباً سو سال تک ترکوں کے حملوں سے ہنگری کی جنوبی سرحدوں کی حفاظت کے لئے اس شہر کو خاص اہمیت حاصل ہے

بلغراد پر مسلمانوں نے سب سے پہلا حملہ ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء میں کیا اور چھ ماہ تک اس شہر کا محاصرہ کئے رکھا۔ دوسرا حملہ ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء میں سلطان محمد ثانی نے ایک لشکر جرار، جنگی بیڑے اور ایک بھاری توپ خانے کے ساتھ کیا۔ بلغراد نے بڑی استقامت سے اس شدید حملے کا مقابلہ کیا اور ترکوں کو ایک بار پھر محاصرہ اٹھانا پڑا۔ نیز بلغراد نے مسیحی دنیا کی بیرونی فصیل کے طور پر شہرت حاصل کر لی۔ بالآخر ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں ترکی فوج ایک لمبے محاصرے کے بعد بلغراد میں داخل ہو گئی۔ سردیا کے لوگوں کو قسطنطنیہ میں آباد کر دیا اور سروی جنگی جہازوں کے عملے کو ترکی جنگی جہازوں پر بھیج دیا۔ سمندریہ کے سنجاق کا صدر مقام بلغراد بنا کر بالی بے کو یہاں کا گورنر بنا دیا گیا۔ بلغراد فتح کرنے کے بعد ترکوں نے اسے اور مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ اسے توپ خانے سے آراستہ کیا گیا۔ اور ایک جنگی بیڑے سے بھی لیس کر دیا گیا۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں بلغراد مشرقی وضع اختیار کر گیا۔ مسلم آبادی میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ اس کی وجوہات ایک تو انتظامی اور حفاظتی فوج کا وہاں قیام تھا۔ دوسرے ترکی کے کئی مقامات سے تاجر لوگوں کا وہاں آکر بس جانا تھا اور تیسرے مقامی آبادی کا اسلام قبول کر لینا تھا۔ ۹۵۹ھ/۱۵۵۲ء میں بلغراد ایک تجارتی مرکز بن گیا۔ ۱۶۳۲ء میں ایک پاپائی سیاح کے مطابق بلغراد میں آٹھ ہزار گھر تھے جن میں ساٹھ ہزار افراد بستے تھے۔ ۱۶۶۰ء میں یہاں کے باشندوں کی تعداد ۹۸ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ یہاں فوج کے غذائی سامان کے بڑے بڑے ذخائر، توپوں کی مرمت کے کارخانے اور ایک بارود سازی کا کارخانہ تھا۔ اولیا چلبی کے بیان کے مطابق قلعے کے اندر کی مسجد جو سلطان سلیمان نے بنوائی تھی اور شہر کے نچلے حصے میں محمد پاشا کی بنوائی ہوئی مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شہر میں آٹھ مدرسے اور نو حدیث کی درسگاہیں تھیں۔

۱۰۹۹ھ/۱۶۸۸ء میں بلغراد آسٹریا کے قبضے میں چلا گیا لیکن دو ہی سال بعد ترکوں نے اس شہر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۷ء میں ترکوں کو سیوائے کی یوجین کے زیر قیادت شاہی فوجوں نے شکست دی اور ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء میں جب بلغراد پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا تو یہ شہر شمال سردیا کا دارالحکومت بن گیا۔

صلح نامہ بلغراد کی رو سے ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں جب دریائے ساوا اور دریائے ڈینیوب سرحد قرار دے دیئے گئے تو ایک بار پھر بلغراد ترکوں کے قبضہ میں تھا اور یہ یینی چریلیں کا ایک سرحدی حفاظتی مقام ہو کر رہ گیا۔

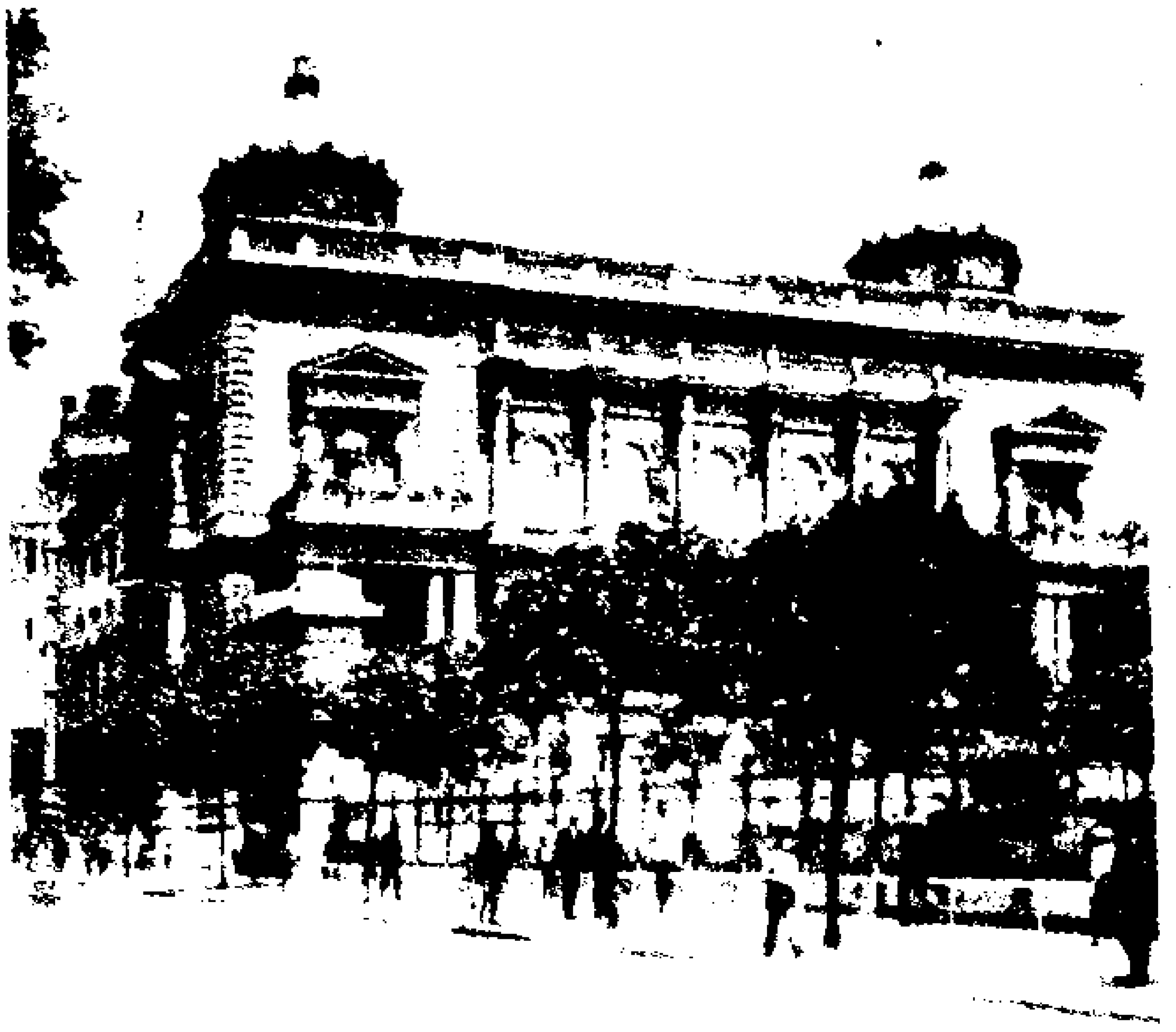

بلغراد کا شاہی محل۔

۱۷۹۱ء کے صلح نامہ کی رو سے ینی چریوں کو بلغراد سے نکال دیا گیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد سلطان سلیم ثالث انہیں بلغراد واپس آنے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۸۰۴ء میں سردیوں نے ینی چریوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور ۱۸۰۶ء میں باغیوں نے بلغراد پر قبضہ کر لیا۔ اور ۱۸۱۳ء تک بلغراد پر حکمران رہے۔ ۱۸۱۵ء میں سردیوں نے ایک اور بغاوت کی تو ترکوں کو ان سے ایک معاہدہ کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ بلغراد سردیا کا شہر بنتا چلا گیا۔ بالآخر ۱۸۶۷ء میں بلغراد سردیا کے حوالے کر دیا گیا اور اس طرح وہ سردیا کا دارالسلطنت بن گیا۔ بلغراد میں ترکی عہد کی عمارات میں سے صرف چند ایک یادگار کے طور پر باقی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد ہے، ایک مقبرہ باقی رہ گئے ہیں۔ اس دور کی عمارات کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔ جن کے نام وہاں کے باشندوں سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ بلغراد میں آج کل جو مسلمان آباد ہیں وہ ۱۹۱۸ء کے بعد بوسنہ، ہرسک، مقدونیہ اور یوگوسلاویہ کے دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

بلقان ریاستوں کا ایک مجموعہ، جو البانیا، بلغاریا، یونان، یوگوسلاویا سردیا اور یورپ کے ترکی مقبوضات پر مشتمل تھا۔ بلقان ترکی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کی آب و ہوا وسطی یورپ کی سی ہے۔ یعنی سخت اور جنوبی علاقے معتدل آب و ہوا کے حامل ہیں۔

۶۸۰ء میں بلغار نامی ایک ترک قوم بحر اسود کے شمال سے آئی اور ڈینیوب کے زیریں علاقے میں آباد ہو گئی۔ نیز اس نے سلافیوں پر عسکری امراء کی حکومت قائم کر کے بلقان میں ایسی مملکت کی بنیاد رکھی جو بزنطینی سلطنت کی پہلی حریف بنی۔

بلقان میں اسلام غالباً ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء میں ایک اناطولی بزرگ صاری صالتق کے ذریعے پہنچا۔ چودہویں صدی عیسوی میں بلقان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن میں ہمیشہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد عثمانی سلطان ان حلیف ریاستوں کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔ ۷۷۳ھ/۱۳۷۱ء میں بایزید اوّل نے اپنے ماتحت ممالک پر براہ راست قبضہ کرنے کے بعد ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ بلقان میں واحد سلطنت قائم کر دے۔ چنانچہ بایزید اوّل نے ۱۳۹۳ء اور ۱۳۹۶ء کے

Marfat.com

اسلام کے آفاقی اصولوں نے اہل بلقان کا دل موہ لیا تھا۔ اس بات کو مستشرقین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جب عثمانی ترکوں کا زمانہ زوال شروع ہوا تو بلقان یورپ کی بڑی طاقتوں کی سازشوں کا مرکز بن گیا جن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ بلقان پر سے ترکوں کا تسلط ختم کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے سب سے اہم واقعہ جنگ بلقان ۱۹۱۲ء کا ہے اور دوسرا اہم واقعہ پہلی جنگ عظیم کا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے ترکی کا اثر بلقان پر کم سے کم ہوتا چلا گیا اور یہ سارے علاقے جو ترکوں کی سلطنت میں شامل تھے خود مختار ہوتے چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اتحاد بلقان کی بنیاد پڑی یہ ایک سیاسی تنظیم تھی جس کی بنیاد ۱۹۳۴ء میں رکھی گئی اور اس میں چار بلقانی ممالک یوگوسلاویہ، رومانیہ، یونان اور ترکیہ شامل تھے۔ جس کا مقصد مشترکہ مفادات کی حفاظت اور باہمی دفاع تھا لیکن اتحاد بلقان کے ممالک کے ان بلند و بانگ دعووں کے باوجود جو اتحاد کے وقت کئے گئے تھے یہ ممالک کبھی بھی باہم مل کر مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے تمام ممالک جارحانہ حملوں کا شکار ہو گئے۔ اب ترکی

بلقانی ریاستیں ۱۸۷۸ اور ۱۹۱۳ میں (اور ترکی کی حدود)

بخارسٹ (رومانیا) کا نیشنل بینک

ایتھنز (یونان) کی پارلیمانی عمارت۔

درمیان بلغاریا، مقدونیہ اور تھسلی کو تسخیر کیا اور قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ جب تیمور نے بایزید اول پر ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں فتح حاصل کر لی تو ترکوں کے ہاتھ سے اناطول میں اکثر مقبوضہ علاقے نکل جانے کے بعد صرف بلقان ہی ایسا مقام باقی رہ گیا تھا جسے وہ اپنا ٹھکانہ بنا سکتے تھے چنانچہ آئندہ کے لیے اور نہ عثمانی سلاطین کی اصل دارالحکومت کی شکل اختیار کر گیا۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب لاطینی بلقان سے نکال دیئے گئے تو ان کی جگہ مقامی تاجروں نے جن میں مسلمان یونانی اور اہل اغوسہ شامل تھے لے لی۔ چنانچہ بلقان کی تجارت نے عثمانیوں کی سرپرستی میں بے پناہ ترقی حاصل کر لی۔ نیز عثمانی دور میں بلقان میں ایک بار پھر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو گئی۔

بلقان میں اسلام کی اشاعت عام طور پر کسی جبر یا سرکاری دباؤ کے تحت نہ تھی بلکہ

البانیا کے دارالحکومت تیرانا کا ایک منظر۔

اور یونان کے سوا دیگر ریاستیں روس کے زیر اثر ہیں۔

۹ راگست ۱۹۵۴ء کو بلیڈ (یوگوسلاویہ) کے مقام پر ترکی، یونان، یوگوسلاویہ کے مابین باہمی اتحاد، سیاسی تعاون اور فوجی امداد کا ایک معاہدہ طے پایا جو بلقان پیکٹ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ معاہدہ بیس سال کے لیے کیا گیا۔ لیکن عملاً اتحاد تعاون اور امداد کی صورت کبھی پیدا نہ ہو سکی۔

بلقیس ایک خوب صورت اور ذہین عورت کا نام، جو ملکہ سبا کے نام سے بھی مشہور ہے اس کے باپ کا نام شراحیل بن مالک تھا جو یمن کا بادشاہ تھا۔ بعض نے اس کے باپ کا نام الہدہاد بن شرحبیل بھی لکھا ہے وہ اور اس کی قوم سورج کی پرستش کرتی تھی لیکن حضرت سلیمانؑ نے اسے ایک خط لکھ کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف مدعو کیا۔ بحث کے بعد یہ طے پایا کہ سلیمان کا امتحان لیا جائے۔

بلقیس کا ذکر زلیخا کی طرح نام لیے بغیر قرآن مجید میں بڑے مختصر مگر جامع انداز میں آیا ہے۔ "کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ اس (ہُدہُد) نے آ کر کہا میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ (حضرت سلیمانؑ) کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں میں نے وہاں ایک عورت دیکھی ہے جو اس قوم کی حکمران ہے اسے ہر طرح کا سرو سامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے" (۲۷، ۲۲، ۲۳)

"سلیمانؑ نے کہا "ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔"

ملکہ بولی "اے اہل دربار میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے اور وہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور اللہ رحمان ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔" (خط سنا کر ملکہ نے کہا "اے سرداران قوم میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو! میں کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی۔" انہوں نے جواب دیا "ہم طاقتور اور لڑنے والے لوگ ہیں آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔"

ملکہ نے کہا "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔"

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمانؑ کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا گیا ہے تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔"

سلیمانؑ نے کہا "اے اہل دربار تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں!" جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں ایسی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔" جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں۔" جونہی سلیمانؑ نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے لیے ہی مفید ہے۔ ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"

سلیمانؑ نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اسکے سامنے رکھ دو دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے۔" ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ وہ کہنے لگی "یہ گویا وہی ہے۔ ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا۔ اسے (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لیے اس نے اپنے پائنچے اٹھا لیے۔ سلیمانؑ نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور اب میں نے سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔" (۲۷، ۲۷ تا ۴۴)

ملکہ سبا کا یہ قصہ بائبل کے عہد عتیق و جدید اور روایات یہود میں مختلف طریقوں سے آیا ہے۔ "اور جب سبا کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمانؑ کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے اور وہ بہت بڑے جلو کے ساتھ یروشلم میں آئی۔ جب وہ سلیمان کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارے میں جو اس کے دل میں تھیں اس سے گفتگو کی۔ سلیمانؑ نے ان سب کا جواب دیا...... اور جب سبا کی ملکہ نے سلیمانؑ کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دستر خوان کی نعمتوں اور اس کے

Marfat.com

ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور ساقیوں اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے گھر جاتا تھا دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ سچی خبر تھی جو میں نے تیرے کاموں اور تیری حکمت کی بابت اپنے ملک میں سنی تھی تو بھی میں نے وہ باتیں باور نہ کیں جب تک خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا اور مجھے تو آدھا بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ کیونکہ تیری حکمت اور اقبال مندی اس شہرت سے جو میں نے سنی بہت زیادہ ہے۔ خوش نصیب ہیں تیرے لوگ اور خوش نصیب ہیں تیرے یہ ملازم جو برابر تیرے حضور کھڑے رہتے اور تیری حکمت سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے ایسا خوشنود ہوا کہ تجھے اسرائیل کے تخت پر بٹھایا۔۔۔۔۔۔ اور اس نے بادشاہ کو ایک سو بیس قنطار سونا اور مسالے کا بہت بڑا انبار اور بیش بہا جواہرات دیئے۔ اور جیسے مسالے سبا کی ملکہ نے سلیمانؑ بادشاہ کو دیئے ویسے پھر کبھی ایسی بہتات کے ساتھ نہ آئے۔۔۔۔ اور سلیمان بادشاہ نے سبا کی ملکہ کو سب کچھ جس کی وہ مشتاق ہوئی اور جو کچھ اس نے مانگا دیا۔ پھر وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔ (۱ سلاطین۔ ۱۱۱۔ ۱۳۔ ۱)

اس ملکہ کی تصویر جو ہمارے سامنے آتی ہے اس سے وہ ایک اعلیٰ درجے کی ذہین، مدبر اور دور اندیش حکمران خاتون کے ساتھ ساتھ تواضع اور خوش خوئی کی صفات سے بھی متصف نظر آتی ہے۔

بعض روایات کی رُو سے حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس سے شادی کر لی اور اسے اس کے ملک پر بطور ایک حکمران برقرار رکھا۔ اس سے محبت کرتے تھے اور ہر ماہ ایک بار اس کے پاس ملنے جاتے تھے۔ اس سے اولاد بھی ہوئی۔

بلقینی مصری علماء کا ایک خاندان۔ اس خاندان کا جدامجد صالح العزبیہ کے علاقے میں بلقینہ کے مقام پر آباد ہوا۔ اسی وجہ سے یہ خاندان جو نسلاً فلسطینی تھا بلقینی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کے مشہور ترین اشخاص یہ ہیں:

۱۔ **عمر بن رسلان بن ناصر:** ۔ (۱۲ ر شعبان ۲۴ ۷ھ/ ۲ر اگست ۱۳۲۴ء - ۱۰ ر ذی قعدہ ۸۰۵ھ/ یکم جون ۱۴۰۳ء) ابو حفص الکنانی۔ قاہرہ کے مشہور ترین علماء سے تعلیم پائی۔ ابن عقیل نے جو اس کا استاد تھا، اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی اور جب ابن عقیل ایک مختصر وقت کے لئے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوا۔ وہ اس کے نائب کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ ۷۶۵ھ/ ۱۳۶۳ء میں وہ مصر کے دارالعدل میں قاضی مقرر ہوا اور اس نے اپنے زمانے کے ایک نامور فقیہہ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ کچھ عرصے کے لئے قاضی القضاۃ کے عہدے پر بھی فائز رہا۔ اسے شیخ الاسلام کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ بعض لوگ اسے آٹھویں صدی ہجری کا مجدد مانتے ہیں۔ اس نے ہرات میں ایک مدرسے کی بنیاد بھی رکھی۔ عمر بن رسلان اپنی کوئی تصنیف مکمل نہ کر سکا۔

۲۔ **بدرالدین محمد بن عمر:** ۔ (۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء - ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء) یہ عمر بن رسلان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ ۷۶۹ھ/ ۱۳۶۷ء میں قاضی عسکر اور مفتی دارالعدل کے عہدوں پر اپنے باپ کا جانشین بنا۔

۳۔ **جلال الدین عبدالرحمان بن عمر:** ۔ (۷۶۳ھ/ ۱۳۶۲ء - ۸۲۴ھ/ ۱۴۲۱ء) ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء میں قاضی عسکر کے عہدے پر اپنے بڑے بھائی محمد کا جانشین ہوا بڑی ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ۸۰۴ھ/ ۱۴۰۱ء میں جلال الدین شافعی قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوا اور وفات تک کچھ وقفوں کے ساتھ اسی عہدے پر فائز رہا۔

۴۔ **صالح بن عمر:** ۔ (۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء - ۸۶۸ھ/ ۱۴۶۴ء) علم الدین، ابوالبقا۔ یہ عمر بن رسلان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۲ء سے ۸۶۸ھ/ ۱۴۶۴ء تک آٹھ بار مختلف اوقات میں قاہرہ میں شافعی قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہا۔ یہ کئی مدارس میں معلم بھی رہا۔ سخاوی اور سیوطی فقیہہ اس کے شاگرد تھے۔ اس نے اپنے والد کی نامکمل تالیفات کی تکمیل کی اور اس کی سوانح عمری بھی لکھی اس نے ایک کتاب تفسیر پر اور کئی احادیث پر لکھیں۔

۵۔ **ابوالسعادات بدرالدین بن محمد:** ۔ (۸۱۹ھ/ ۱۴۱۶ء یا ۸۲۱ھ/ ۱۴۱۹ء - ۸۹۰ھ/ ۱۴۸۵ء) عمر رسلان کا پوتا تھا۔ ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء میں اپنے باپ کے انتقال پر قاضی العسکر بنا۔ ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۶ء میں شافعی قاضی القضاۃ کے عہدے پر چار ماہ تک فائز کیا گیا۔

بلگرام ہندوستان کے ضلع ہردوئی کا ایک بہت پرانا قصبہ۔ اس شہر نے بڑی عظیم شخصیتوں کو جنم دیا۔ شروع میں اس مقام پر بھٹھیرے آباد تھے جنہیں قنوج کے حملہ آور راجپوتوں نے یہاں سے نکال دیا۔

بلگرام کو ۴۰۹ھ/ ۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے زمانے میں قاضی محمد یوسف نے فتح کیا۔ غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد ہندوؤں نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دیا۔ سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت میں ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء میں ایک مضبوط شاہی فوج کا دستہ لے کر سید محمد صغروی نے راجا سری کو شکست دی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ مغلیہ دور حکومت میں بلگرام قنوج کی سرکار کا ایک پرگنہ تھا۔ ۹۴۸ھ/ ۱۵۴۱ء میں یہاں پر ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان ایک زبردست جنگ لڑی گئی جس میں ہمایوں کی فوجیں بالکل تباہ و برباد ہو گئیں۔

بلگرام کی مشہور ترین شخصیات میں عبدالواحد بلگرامی، عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد، سید علی بلگرامی، عمادالملک، سید حسن بلگرامی، سید مرتضیٰ الزبیدی وغیرہ ہیں۔

سبحان رائے بٹالوی کے بقول اس قصبے کی آب و ہوا عمدہ ہے۔ باشندے عقل و دانش سے بہرہ مند اور موسیقی میں باکمال ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رُو سے بلگرام کی کل آبادی ۲۵ ہزار کے قریب ہے۔

بلگرامی، آزاد: ہندوستان کا ایک مورخ، تذکرہ نگار اور شاعر (دیکھیے "آزاد بلگرامی")

بلگرامی، سید علی (۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء - ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء) شمس العلماء سید علی بلگرامی بن سید زین الدین حسن۔ پٹنہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیننگ کالج لکھنؤ میں دو سال گزارے۔ پھر ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج میں داخل ہو کر بی اے کیا۔ اور سنسکرت میں امتیاز حاصل کیا ۱۸۷۶ء میں یورپ کا سفر کیا۔ جہاں انہوں نے جرمنی اور فرانسیسی زبان میں بھی تخصص حاصل کیا اور اس کے ساتھ ہی کیمیا، طبیعات اور معدنیات وغیرہ کے مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ واپسی میں اٹلی میں چند ماہ گزارے اور اطالوی زبان سیکھی۔ بنگالی زبان پہلے ہی جانتے تھے۔ حیدرآباد

Marfat.com

میں انہوں نے مرہٹی، تلنگی زبان بھی سیکھ لی۔ غرض وہ چودہ زبانیں جانتے تھے۔ اور ایسے لہجے میں بولتے تھے گویا یہ ان کی مادری زبانیں ہیں۔ یورپ سے واپسی پر انسپکٹر معدنیات مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری ملی۔ ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے۔ انہوں نے سنسکرت، فرانسیسی اور جرمنی زبان میں لکھی گئی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کی اپنی تصنیف کردہ کتابوں سے ان کے کیے ہوئے تراجم کہیں زیادہ ہیں۔ انگلستان سے واپس آکر وہ ہندوستان کے ضلع ہردوئی میں مقیم ہو گئے اور اپنی ساری توجہ علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف مبذول کر دی۔

"تمدن ہند" اور "تمدن عرب" ان کے دو بڑے شاہکار ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ انہوں نے ان کتابوں کا اردو میں ترجمہ اس انداز سے کیا ہے، گویا یہ ترجمہ نہیں بلکہ ان کی اپنی تصانیف معلوم ہوتی ہیں۔ ان تراجم کے علاوہ بلگرامی رسالہ در تحقیق کلیلہ و دمنہ کے مصنف بھی ہیں۔

بلگین (وفات ۲۱ ذوالحجہ ۳۷۳ھ/۲۵ مئی ۹۸۴ء) بن زیری بن مناذ افریقہ کا پہلا زیری فرمانروا جس نے صنہاجہ کے امیر کی حیثیت میں فاطمی خلفاء کی بہت زیادہ خدمات انجام دیں اور ان خدمات کے صلے میں انہوں نے اسے افریقہ کا عامل نامزد کر دیا۔ بلگین ہمیشہ مغربی وسطی کی مہمات میں مصروف رہتا تھا اس لیے اس نے قیروان اور مشرقی افریقہ کا نظم و نسق ایک نائب امیر کے سپرد کر دیا۔

۳۴۹ھ/۹۶۰ء میں اس نے الجزائر، ملیانہ اور میڈیا کے شہروں کی بنیاد رکھی۔

۳۵۸ھ/۹۶۸ء میں ابو خزر کے خلاف جنگ لڑی اور ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں زناتہ کو شکست دی۔ ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں مسلہ اور زاب کے باغی عامل جعفر بن علی بن حمدون الاندلسی نے اس کے باپ زیری کو قتل کر دیا۔

۲۰ ذوالحجہ ۳۶۱ھ/۲ اکتوبر ۹۷۲ء کو بلگین کو ابوالفتوح یوسف کے لقب سے صقلیہ اور طرابلس کے علاوہ فاطمی سلطنت کے پورے مغربی علاقے کا حاکم بنا دیا گیا۔ اس نے المغرب میں بھی کئی مہمات سر انجام دیں ۳۶۴ھ تا ۳۶۵ھ/۹۷۴ء تا ۹۷۵ء اس نے کتامہ سے جنگ کی اور طرابلس، سرت اور اجدابیہ کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ ۳۶۸ھ تا ۳۷۳ھ/۹۷۹ء تا ۹۸۴ء میں اپنی آخری مہم میں بلگین نے فاس سجلماسہ اور بصرہ فتح کر لیے اور برغواطہ کو بھی شکست دی، واپسی پر اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا المنصور تخت نشین ہوا۔

بلند شہر ہندوستان کے صوبہ اترپردیش کا ایک شہر اور ضلع جو مشرق کی سمت آگرے اور علی گڑھ سے میرٹھ جانے والی بڑی سڑک پر واقع ہے شہر کالی ندی کے کنارے جو شہر کے پاس بہتی ہوئی گذرتی ہے ایک اونچی جگہ پر آباد ہے اور اسی اونچائی کے سبب اسے بلند شہر کہا جاتا ہے۔ اس شہر کا قدیم نام اس کے فرضی بانی اھی برن کے نام پر برن تھا۔

۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے اسے فتح کیا۔ یہاں کے ہندو راجہ نے سلطان کی اطاعت کر لی اور اپنے دس ہزار رعایا کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ بعد میں اس کی اولاد نے اسلام ترک کر دیا۔ ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک نے اس شہر کو فتح کر کے اپنے داماد اور جانشین التمش کو دے دیا۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں یہ شہر کسانوں کی بغاوت کا مرکز بن گیا۔ سلطان نے بغاوت فرو کرتے ہوئے اس علاقے کے اردگرد کا تمام علاقہ ویران کر دیا۔ مغلیہ دور حکومت میں اس شہر میں امن و امان رہا۔ اور اورنگ زیب کے عہد حکومت میں یہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی میں مرہٹے شہر کو تباہ و برباد کر کے خود اس پر قابض ہو گئے۔ ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں یہ شہر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران میں اس شہر کی حالت بڑی ابتر اور خوفناک رہی۔ تاہم انگریزی حکومت کو یہاں سے نکال دیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور ولی داد خان کے ہاتھ میں چلی گئی۔ یہاں کے عوام انگریزوں کے سخت دشمن ثابت ہوئے اور تقریباً پانچ ماہ کی مزاحمت کے بعد یہ شہر دوبارہ انگریزوں کے قبضے میں آیا۔

بلند شہر میں بعض قدیم مساجد اور مقبرے ہیں۔ ان میں سے ایک درگاہ خواجہ لال برنی کی ہے جو ۵۹۰ھ/۱۱۹۳ء کی اسلامی فتح کی یادگار میں تعمیر ہوئی۔

۱۹۷۱ء میں اس شہر کی آبادی پچاس ہزار تھی۔ اس میں ایک کالج ہے جو آگرہ یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ اب یہ اندرونی اور بیرونی تجارت کا ایک روبہ ترقی مرکز ہے۔

ضلع بلند شہر دوآب گنگ و جمن کے میدانوں میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۸۸۷ مربع میل اور آبادی پچیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر رقبہ مزروعہ ہے جہاں گندم، جو، کن، مکئی اور کپاس پیدا ہوتی ہے۔ مغلیہ دور سے اب تک یہ علاقہ خوشحال رہا ہے۔

بلنسیہ ہسپانیہ کا ایک شہر جو آبادی کے لحاظ سے سپین کا تیسرا بڑا شہر ہے دریائے توریا وادی الابیض کے دونوں کناروں پر جزیرہ نما کے مشرقی حصے میں بحیرہ روم کی بندرگاہ العزاد سے تین میل دور واقع ہے۔ ایک ریلوے لائن کے ذریعے میڈرڈ سے ملا ہوا ہے۔ یہ شہر اسی (بلنسیہ) نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے۔ شہر کے چاروں طرف سرسبز و شاداب ہورٹا ڈی ویلنسیا کا میدان پھیلا ہوا ہے۔ بلنسیہ کو دریائے توریا سیراب کرتا ہے۔ اپنے محل وقوع کے دلکش ہونے کے سبب یہ شہر عہد اسلامی کے مشرقی ہسپانیہ کا دارالحکومت چلا آتا ہے۔

۱۳۸ ق م میں رومیوں نے بلنسیہ شہر کی بنیاد رکھی۔ روم کے ایک حاکم علی جونیس بروٹس نے یہاں قدیم جنگ آزماؤں کی آبادی قائم کی جو حکومت روما کے وفادار تھے۔ بعد میں یہاں کے باشندوں نے سرٹوریوس اور پامپی کی لڑائی میں سرٹوریوس کا ساتھ دیا۔ ۷۵ ق م میں پامپی نے بلنسیہ کو جزوی طور پر تباہ کر دیا لیکن آگسٹس کے دور حکومت میں اس شہر نے اپنی خوشحالی دوبارہ حاصل کر لی۔ ۴۱۳ء میں بلنسیہ پر مغربی قوطیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۹۶ھ/۷۱۴ء میں طارق بن زیاد نے جب اس شہر پر قبضہ کیا تو یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ عہد اسلامی میں اس شہر کا شمار عرب ثقافت کے اعلیٰ ترین مراکز میں ہوتا رہا۔ اس زمانے میں بلنسیہ ایک صوبے کا صدر مقام تھا اور قرطبہ کے خلیفہ کا مقرر کیا ہوا والی وہاں کا نظم و نسق چلاتا تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ شہر ایک خودمختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت بن گیا۔

بلنسیہ کی ایک خودمختار اسلامی ریاست کی بنیاد ۴۰۱ھ/۱۰۱۰ء میں مبارک اور مظفر نے جو اس ضلع میں آبپاشی کے نگران تھے رکھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد مبارک

Marfat.com

کا انتقال ہوگیا تو مظفر کو بلنسیہ سے نکال دیا گیا اور وہاں کے باشندوں نے ایک صقلبی کو حکمران کے طور پر چن لیا۔ اس کا نام لبیب تھا۔ کچھ مدت کے بعد بلنسیہ کی ریاست عبدالعزیز بن عبدالرحمان کے قبضے میں آگئی۔ اور وہ ۴۵۲ھ/۱۰۶۱ء تک بلنسیہ پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس دوران میں بلنسیہ ایک خوشحال ریاست رہی۔ لیکن بلنسیہ نے جب سے ایک خودمختار اسلامی ریاست کا درجہ حاصل کیا تھا عیسائیوں کی نظریں اسے دوبارہ فتح کرنے پر لگی ہوئی رہتیں۔ چنانچہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک تخت نشین ہوا تو فرڈیننڈ اوّل نے بلنسیہ پر حملہ کردیا۔ عبدالملک نے شاہ طلیطلہ سے مدد طلب کی لیکن اس نے بلنسیہ آکر عبدالملک کو تخت سے اتار کر خود قبضہ کرلیا اور ریاست بلنسیہ کو سلطنت طلیطلہ میں شامل کرلیا۔ ۴۶۷ھ/۱۰۷۵ء میں جب شاہ طلیطلہ المامون نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا یحیٰ عبدالقادر تخت نشین ہوا جو نااہل ثابت ہوا چنانچہ بلنسیہ نے اپنی خودمختاری دوبارہ حاصل کرلی یحیٰ القادر نے شاہ قشتالہ الفانسو ششم سے مدد مانگی لیکن ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء میں ریاست طلیطلہ پر بھی الفانسو کا قبضہ ہوگیا۔ اس طرح بلنسیہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ بعد میں المرابطون نے ہسپانیہ پہنچ کر بلنسیہ کو اسلامی حکومت کے تحت لانے کی کوشش کی لیکن راڈرک دیاز ڈی ویوار کے مقابلے میں جو تاریخ میں السید کے نام سے مشہور ہے ناکام رہا۔ السید کے مرنے کے بعد اس کی بیوی المرابطون کے حملوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ اور آخر کار اس نے بلنسیہ کو نذر آتش کردیا۔ تاکہ مسلمان جب [illegible] شہر کو بالکل تباہ و برباد پائیں۔ اس طرح ۴۹۵ھ/۱۱۰۲ء میں مسلمان [illegible] داخل ہوئے المرابطون کی طرف سے متعدد والی بلنسیہ پر بارہویں صدی [illegible] نصف تک حکومت کرتے رہے۔ بالآخر زوال قرطبہ کے دو سال بعد بلنسیہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا اور ۲۸ ستمبر ۱۲۳۸ء میں ارغون کے جیمز اوّل نے اسے فتح کرلیا۔ ۱۴۷۹ء میں بلنسیہ پر فرڈیننڈ دوم کا قبضہ ہوگیا۔ اور تب سے یہ سلطنت ہسپانیہ کا ایک اہم شہر رہا۔ ۱۹۷۱ء میں بلنسیہ کی آبادی ۶۵۳۲۰۰ تھی۔

بلوچ پاکستان کے علاقہ بلوچستان میں رہنے والے، ایک قوم۔ ذات، قبائل جنہیں مختلف ادوار میں بلوص، بعلوث اور بلوش کے ناموں سے پکارا گیا۔ انہیں عام طور پر براہوئی سے علیحدہ قبائل قرار دیا جاتا ہے اور بنیادی طور پر انہیں مکرانی اور سلیمانی گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

سکونت کے لحاظ سے بلوچ وادی بلوص کے جو شام میں حلب کے قریب ایران کی سرحد کے ساتھ واقع ہے رہنے والے ہیں اور نسبی لحاظ سے بلوص مزدو کا لقب تھا جو بابلی سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا۔ وادی بلوص ایک اجاڑ وادی تھی عرب و شام کے کئی قبائل یہاں آباد تھے جو روم کی دراز دستیوں کی وجہ سے نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے ایک سردار حبیب بن مسلمہ کی سربراہی میں ایک لشکر اس وادی میں بھیجا۔ چنانچہ یہ فوج وادی بلوص کو ختم کرنے کے بعد وہیں پر آباد ہو گئی۔ بعد میں یہی لوگ بلوص اور پھر بلوچ کہلائے۔

بعض محققین نے بلوچ قوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے بلوچ اور براہوئی اور یہ دونوں سامی الاصل ہیں۔ بلوچوں کے نسب میں بھی اختلاف ہے۔ کسی نے انہیں ترکمان نسل سے کہا ہے کسی نے ایرانی نسل سے اور بعض کے نزدیک یہ عرب ہیں۔ کچھ لوگ انہیں راجپوت بھی قرار دیتے ہیں۔ لیکن دور حاضر کی تحقیقات کے لحاظ سے بلوچ آریا ہیں۔ خود بلوچی اپنے آپ کو امیر حمزہ کی اولاد میں سے بتاتے ہیں اور یہ کہ وہ حلب سے آئے ہیں۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں بلوچوں کا ذکر کیکاؤس اور کیخسرو کی افواج کے سپاہیوں کی حیثیت سے کیا ہے اور بلوچوں کی انفرادی خصوصیات بھی بیان کی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قوم ایرانی بلوچستان اور مکران میں قدیم زمانہ سے اپنی انفرادی خصوصیت کے ساتھ چلی آرہی ہے۔

نور احمد خان فریدی نے اپنی تحقیقات میں یہ بات ثابت کی ہے کہ بلوچ قوم سامی النسل ہے اور ان کا اصل وطن بحیرہ خزر اور بحیرہ اسود کا درمیانی اور ساحلی علاقہ ہے۔ یہاں سے بلوچ دشت لوط اور کرمان میں منتقل ہوئے اور مختلف ادوار میں ان کے قافلے مکران کی طرف ہجرت کرتے رہے۔

بلوچوں میں رند، کورائی، لاشار، ہوت، جتوئی اور بلیدی وغیرہ قبائل خالص عربی النسل ہیں اب عربی اور عجمی قبائل کی تمیز کرنی بڑی مشکل ہے۔

امرت لال عشرت کے مطابق بلوچ گیارہویں صدی کے لگ بھگ سیستان اور مکران کے علاقوں میں آکر آباد ہوئے۔ تیرہویں صدی کے شروع میں جب چنگیز خان کا حملہ ہوا تو بلوچی بھی مشرقی مکران اور سندھ کی سرحد تک منتشر ہوگئے اور کچھ عرصے بعد برصغیر کی شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ کوہ سلیمان کے سلسلے پر قابض ہوگئے پندرہویں اور سولھویں صدی میں کچھ بلوچی قبائل پنجاب اور سندھ میں بھی مقیم ہوگئے۔ ان کی یہ ہجرت تیمور کے حملے سے بابر کے حملے تک کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ مکران سے آگے یہ لوگ قلات کے ان بے آب و گیاہ پہاڑی ٹیلوں پر قابض ہوگئے۔ جن پر آج کل براہوئیوں کا عمل دخل ہے۔ بعض براہوئی قبیلوں نے قلات پر قبضہ کر کے بلوچوں کو سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں کی طرف دھکیل دیا۔ یہ واقعہ بلوچی قوم کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے اس حادثے کے بعد سے یہ قوم دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ اور اب مغربی اور مشرقی بلوچوں کے درمیان قلات کے براہوئی نظر آتے ہیں۔

جب شہنشاہ ہمایوں نے چونسہ کے مقام پر شیر شاہ سے شکست کھائی اور وہ دشت نوردی کے عالم میں ادھر اُدھر مارا پھر رہا تھا تو بلوچوں کے امیر نے اس کی مدد کی جس کا ذکر "ہمایوں نامہ" میں موجود ہے۔ جب ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان پر چڑھائی کی تو اس کی فوج میں چالیس ہزار بلوچ تھے۔

بلوچ عربوں کی طرح قبائلی نظام کے قائل ہیں۔ یہ شہری اور قصباتی بھی ہیں۔ خانہ بدوش بھی۔ ان کے اپنے قبیلے سے محبت اور شیفتگی بے مثل ہے۔ بلوچ قبیلے کے لیے "تمن" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا ہے جس کا حکم ماننا ہر فرد کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں خواہ جنگ ہو یا صلح یا کوئی اور معاملہ سردار کا حکم حرف آخر ہوتا ہے۔ جس قبیلے کا سردار نہیں ہوتا اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلوچوں میں خون کی پاکیزگی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ عربوں کی طرح بلوچوں میں بھی نسب ناموں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بلوچ قبیلے تین طبقوں میں تقسیم ہیں۔ ۱۔ سردار قبائل۔ ۲۔ متوسط قبائل۔ ۳۔ زیر دست قبائل۔

ان کے ہاں عورت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جنگ اور لڑائی کے وقت بھی عورتوں پر ظلم اور ان کی بے حرمتی کرنا کمینگی اور بزدلی خیال کی جاتی ہے اگر دو قبیلے لڑ رہے ہوں تو عورت کے دخل دینے پر لڑائی بند ہو جاتی ہے۔ بلوچ عورتیں بلند کردار، بے حد دلیر اور جفاکش ہوتی ہیں۔ ان کا لباس شائستگی کا عمدہ نمونہ ہوتا ہے یہ کھلا اور ڈھیلا لباس پہنتی ہیں۔

بلوچ مرد بندوق، تلوار، خنجر، تیر کمان اور گھوڑوں کی سواری کے بڑے شیدائی ہوتے ہیں۔ تیر کمان کی جگہ اب پستول اور گھوڑے کی جگہ جیپ نے لے لی۔ ان کی غذا بہت سادہ ہوتی ہے۔ گوشت کو خاص طریقے سے پکاتے ہیں۔

Marfat.com

اسے اپنی زبان میں بچی کہتے ہیں۔ بلوچ خون کا بدلہ خون کے قائل ہیں۔ جو بلوچ قتل کا بدلہ نہ لے سکے اسے بزدل اور نامرد سمجھا جاتا ہے اگر بلوچ کسی کو پناہ دے دیں تو اس کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ (نیز دیکھیے "براہوئی" "بلوچستان"، "بلوچی")

بلوچستان پاکستان کا ایک صوبہ۔ سطح مرتفع پر مشتمل یہ خطہ ۲۵ درجے سے ۳۲ درجے ۶ منٹ بلد شمال اور ۶۱ درجے سے ۶۸ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس خطے کے شمال میں کوہ سلیمان کے مختلف سلسلے ہیں جو افغانستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ حد فاصل کا کام دیتے ہیں۔ مشرق میں کیرتھر اور پب کی پہاڑیاں اسے صوبہ سندھ سے جدا کرتی ہیں۔ مغرب میں ایران اور جنوب میں بحیرہ عرب ہے۔ بلوچستان اور افغانستان کی سرحدات سو بیس میل لمبی ہے۔ بحیرہ عرب کے ساتھ بلوچستان کی سرحد چار سو ستر میل ہے اور بلوچستان اور ایران کی مشترکہ سرحد پانچ سو بیس میل ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے یہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے (یعنی یہ ایک لاکھ بتیس ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا ہے جبکہ اس کی آبادی انتہائی کم یعنی ۱۹۷۲ء میں صرف ۲۴ لاکھ تھی)۔ بلوچستان کی آب و ہوا گرمیوں میں گرم خشک اور سردیوں میں سرد خشک ہے۔

بلوچستان کا علاقہ ایران اور پاکستان کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ ایرانی بلوچستان کا صدر مقام ایرانشہر ہے جو پہلے فہرج کہلاتا تھا۔ پاکستان میں اس کا سب سے اہم مرکز قلات ہے۔ یہ ایک قدیم ترین علاقہ ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر ملا کا نام کے تحت ملتا ہے اسلامی عہد سے پہلے کے اس علاقے کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ غالباً بلوچی مغربی بلوچستان (مکران) میں اس وقت داخل ہوئے جس زمانے میں کرمان پر سلجوقیوں نے حملہ کیا۔ (نادر شاہ افشار وہ پہلا شخص تھا جس نے کوئٹہ اور قلات کے انتظامی ڈویژنوں کو بلوچستان کا نام دیا)۔

۳۲۵ ق۔م میں جب سکندر اعظم ہندوستان فتح کر کے ایران لوٹا تو وہ بلوچستان کے راستے ہی سے واپس آیا۔ سکندر اعظم کے بعد بلوچستان سلطنت باختر کا ایک حصہ بن گیا۔ ۴۰۴ء میں بلوچستان ساسانی خاندان کے ایک حکمران بہرام گور کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ جس کا دور حکومت ۴۰۴ء تا ۴۲۷ء ہے۔ ۵۹۱ء سے ۶۲۸ء تک بلوچستان ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کی سلطنت میں شامل رہا۔ ۶۲۵ء میں بلوچستان پر سندھ کے برہمن راجہ چچ کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے بلوچستان کی حدود متعین کیں اور بلوچستان کا دفاع مضبوط کرنے کے لئے قلعے بھی تعمیر کرائے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت ۲۳ھ/۶۴۴ء میں جب عربوں نے کرمان کا علاقہ فتح کیا تو کرمان کے قریبی پہاڑوں میں بلوچ نامی لوگ پائے جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حکیم بن جبلہ کو سندھ اور بلوچستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے ان علاقوں کی طرف بھیجا گیا تو انہوں نے اس علاقے کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کی جس سے اس علاقے کے بارے میں کئی معلومات بہم پہنچی ہیں۔

۳۹ھ/۶۵۹ء میں حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت حارثؓ بن مرہ العبدی کو بلوچستان میں بھیجا اور انہوں نے یہاں کچھ علاقے فتح کئے۔ حضرت حارثؓ قلات میں لڑتے ہوئے اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت شہید ہوئے۔ بالآخر حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ۴۴ھ/۶۶۴ء میں مکران مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور عربوں نے اسے اپنا فوجی مستقر بنا لیا اور مکران کے قرب و جوار کے علاقوں

ایک بلوچ اپنے اونٹ کے ساتھ ۔ [illegible] اور بلوچستان کے سنگلاخ ریگستان ۔

کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عبداللہؓ بن سوار نے جو مکران کی جنگ کے لئے آئے تھے قلات کے کچھ علاقے فتح کر لئے۔ لیکن جب وہ دمشق سے مکران واپس لوٹے تو یہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ یہاں انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان کے بعد حضرت سنان بن سلمہ سپہ سالار ہو کر آئے۔ اور انہوں نے دوبارہ مکران کو فتح کر کے شہر کو نئے سرے سے آباد کیا۔ بعد میں حضرت ابوالاشعث کو مکران کا حاکم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے قلات کو فتح کیا اور بولان کے درے تک سارا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ۸۹ھ/۷۰۸ء میں جب راجہ داہر کا مقابلہ کرنے کے لئے محمد بن قاسم ہندوستان آیا تو اس زمانے میں بلوچستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور راستے محفوظ تھے۔ مساجد آباد تھیں اور پہاڑی علاقوں میں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ بلوچ گیارہویں صدی عیسوی کے آخری دس برسوں میں اپنے سردار جلال خان کی سرکردگی میں مکران میں داخل ہوتے۔ اس وجہ سے مکران کو بلوچستان کا نام دیا گیا۔ ان کی آمد سے پہلے مکران پر منگولوں کی حکومت تھی۔ بلوچوں نے انہیں شکست دی۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی یہاں بلوچ آباد تھے۔

بلوچستان پر امیر جلال خان کی اولاد تقریباً ساڑھے تین سو سال حکمران رہی۔ پندرہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے دو قبیلے رند اور لاشاری وسطی بلوچستان کی طرف بڑھے۔ آخر امیر چاکر خان رند کے عہد میں سارا بلوچستان بلوچوں کے زیر نگیں آ گیا۔ امیر چاکر خان رند نے خضدار، درہ مولا، کندھاوا، کچھی کے میدان، درہ بولان، ڈھاڈر اور سبی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بلوچستان براہیوں کے قبضے میں آ گیا۔ کیونکہ امیر چاکر خان کے بعد بلوچستان افراتفری کا شکار رہا اور اس افراتفری کے دوران میں ایک براہوئی سردار میر احمد ثانی نے بلوچستان پر قبضہ کر لیا۔ براہوئی شاخ سے یکے بعد دیگرے پانچ سردار حکمران ہوئے۔ ۱۷۳۰ء میں سندھ کے حکمران میاں نور محمد نے بلوچستان پر قبضہ کر لیا لیکن ۱۷۳۲ء میں نادر شاہ نے بلوچستان عبداللہ خان کے وارثوں کو دلوا دیا۔

Marfat.com

۱۸۴۰ء میں انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت ہوئی کیونکہ انگریز بلوچستان کے معاملات میں دخل دینے لگ گئے تھے جو بلوچوں کو پسند نہ تھی۔ اس بغاوت میں انگریز فوجیوں کو قتل کیا گیا اور سپہ سالار کو گرفتار کر لیا۔ اس اثنا میں انگریزوں نے اپنی فوجی قوت اکٹھی کر کے بغاوت کو کچل دیا اور بلوچوں کو شکست دی۔ دسمبر ۱۸۴۰ء میں انگریزوں اور نصیر خان ثانی کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ اور انگریزوں نے نصیر خان کو قلات کا خان تسلیم کر لیا۔ اس دور میں بلوچستان کا سارا انتظام حکومت کے انگریز ایجنٹوں کے ہاتھ میں آگیا اور خان برائے نام حکمران رہ گئے۔

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو بلوچستان تین انتظامی یونٹوں میں تقسیم تھا۔ ۱۔ برطانوی بلوچستان جو براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت تھا۔ ۲۔ ایجنسی مقبوضہ جو بالواسطہ حکومت برطانیہ کے ماتحت تھا اور ان مقبوضات میں انگریز ایجنٹ متعین تھے ۳۔ انتظامی حصے جن میں قلات، خاران، مکران اور لس بیلہ کی ریاستیں شامل تھیں اور ان پر خان اور نواب حکومت کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں یہاں سے ۸۰ ہزار ہندو اور سکھ ترک وطن کر کے بھارت چلے گئے۔ اور ان کی جگہ ۳۰ ہزار مہاجرین بلوچستان میں آ بسے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو بلوچستان کی علیحدہ صوبائی حیثیت ختم کر کے اسے وحدت مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا اور یہ براہ راست صوبہ مغربی پاکستان کے ماتحت رہا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں وحدت مغربی پاکستان کو توڑ دیا گیا تو بلوچستان کو اس کی علیحدہ صوبائی حیثیت واپس ملی۔ کوئٹہ کو اس کا صوبائی مقام ٹھہرایا گیا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد سے پاکستان میں چار قومیتوں کا نعرہ لگایا جانے لگا۔ جس میں بلوچستان کو بھی ایک قومیت ٹھہرایا گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہنما عبدالولی خان اس نعرہ کو اچھالنے میں مصروف تھے۔ صوبائی تعصبات کو خوب ہوا دی گئی اور اگرچہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت قائم تھی۔ مجبوراً وہاں وفاقی راج قائم کرنا پڑا۔ جس پر مینگل اور مری قبائل بغاوت پر اتر آئے۔ ان کے ساتھ دیگر کئی قبائل بھی شامل ہو گئے۔ حکومت نے فوج کے ذریعے اس بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں سینکڑوں باغی ہلاک ہو گئے۔

بڑے غور و فکر کے بعد وفاقی حکومت نے اندازہ لگایا کہ بلوچستان کا مسئلہ سیاسی سے کہیں زیادہ معیشتی ہے، چنانچہ بلوچستان کی معیشی ترقی کے لیے اقدامات تیز تر کر دیئے گئے۔ جس سے وہاں کے سرداری اور شیشک نظام پر چوٹ پڑی۔ چنانچہ قبائلی سردار ایک بار پھر بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بذات خود تفصیلی دورہ کیا اور وہاں سرداری نظام کا پورے طور پر خاتمہ کر دیا۔

نظام جرگہ :- بلوچستان کا ایک اہم نظام جرگہ ہے جو نصیر خان اول کے عہد سے چلا آ رہا ہے۔ اس میں قبائلی سردار مل کر انتظام حکومت چلاتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل جرگہ کو شاہی دربار کہا جاتا تھا۔ اس میں بلوچی اور براہوئی قبائل مساوی طور پر شریک ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے اس سرداری نظام کو ختم کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی گئی ہیں، تاہم قبائلی سردار ابھی تک اس امر کی مزاحمت کر رہے ہیں

اقتصادی اور دیگر معلومات :- بلوچستان میں درہ بولان اور درہ مولا دو مشہور درے ہیں۔ انہی سے حملہ آور یہاں داخل ہوتے رہے کوئٹہ بلوچستان کا صوبائی مرکز ہے، جو وادی شال کے وسط میں واقع ہے اس کے شمال میں پشین واقع ہے۔ جنوب مشرق میں لس بیلہ اور مغرب میں چاغی خاران، پنجگور اور دوسری وادیاں ہیں۔ پہاڑوں میں کوہ سلیمان، کوہ سیاہان کوہ مالک سیاہ، کوہ کیر تھر، کوہ پب، کوہ چاغی، اور راس کوہ ہیں۔ مشہور شہروں میں کوئٹہ کے علاوہ چمن قلات، سبی، لورالائی، پشین، خضدار، مستونگ، چمن اور زیارت ہیں۔

بلوچستان دو ڈویژنوں کوئٹہ اور قلات پر مشتمل ہے، جو مزید سات اضلاع پر منقسم ہیں۔ آبادی کی اکثریت بلوچوں کی ہے جو ستر فیصد کے قریب ہیں۔

بلوچستان زیادہ تر صحراؤں اور خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ زرخیز علاقوں میں سیب، کھجور، خوبانی، ناشپاتی، انگور وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ معیشت کا دار و مدار زیادہ تر کوئلہ اور قدرتی گیس پر ہے۔ کوئلہ سبی اور کوئٹہ کے قریب سے نکلتا ہے اور قدرتی گیس سوئی کے مقام سے نکلتی ہے، جو پورے پاکستان کو مہیا کی گئی ہے۔ جدید تحقیقات کی رو سے بلوچستان میں پٹرول کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ جنہیں نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ (نیز دیکھئے "براہوئی"، "بلوچ"، "بلوچی")

بلوچی (زبان) بلوچستان کے بلوچ قبائل کی زبان۔ یہ فارسی سے بھی قدیم تر زبان ہے۔ اگرچہ بعض کے نزدیک بلوچی فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے۔ بعض کتبات جو کھدائی کے دوران میں دستیاب ہوئے ہیں ان کا رسم الخط اوستی زبان سے ملتا ہے۔ انہی کتبات میں بلوچی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں گویا یہ ایک علیحدہ زبان ہے جو صوتی لحاظ سے قدیم پہلوی زبان کے بہت قریب ہے پاکستان میں بلوچی زبان کے مختلف لہجے ہیں لیکن ان میں دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک مشرقی بلوچوں کی زبان اور دوسری مغربی بلوچوں (مکران) کی زبان۔ ان میں تھوڑا سا صوتی اختلاف بھی ہے۔ مثلاً مشرقی زبان میں "ورع" کھانا کہا جاتا ہے تو مغربی زبان میں "ورگ" کہا جاتا ہے۔ جب بلوچستان پر انگریزوں کی عملداری قائم ہوئی تو انہوں نے بلوچی پر بھی کچھ تحقیقی کام کیا۔ بلوچی کے قواعد ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ۱۹۰۷ء میں لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبان کے قدیم ادب پر مشتمل کتاب بلوچوں کی عوامی شاعری کے عنوان سے شائع کی۔ اس کتاب کو بلوچی کے کلاسیک میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

۱۹۱۰ء میں ایک انگریزی بلوچی لغات شائع کی گئی۔ بلوچی ادب پر اردو زبان میں سب سے پہلی "بلوچی ادب" کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں سلیم خان گمی نے لکھی۔ ۱۹۶۹ء میں عطا شاد کی کتاب "بلوچی نامہ" شائع ہوئی۔ جب ۱۸۴۵ء میں انگریز پورے بلوچستان پر قابض ہو گئے تو اس دور میں بلوچی شعراء کا میلان تصوف اور اخلاقیات کی طرف ہو گیا۔ اس وجہ سے اس دور کی شاعری زیادہ مذہبی ہے۔ اور اس دور کی شاعری میں نعتوں، معجزوں اور مدحوں کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ ملا ابراہیم اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا نعت گو شاعر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ابراہیم شعبانی نے مذہبی رہنماؤں کی توصیف میں نظمیں لکھیں اور لشکر خاں جسکانی نے خلفائے راشدین سے متعلق نظمیں اور حمد و نعت وغیرہ لکھیں۔ انگریزی دور میں رحم علی مری، ملا عمر مری، پنجو بنگلانی، غلام محمد بالاچانی اور جیکھا بزدار نے قومی اور مذہبی نظمیں لکھیں۔

نثری ادب میں آزادی سے پہلے درخوانی علماء نے بلوچی میں مذہبی کتابیں شائع کیں۔ اس دور میں بائیبل کے ایک حصے کا بلوچی ترجمہ بھی کیا گیا اور بیسویں صدی کے اوائل میں حضور بخش جتوئی نے بلوچی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ قیام

Marfat.com

پاکستان کے بعد سے بلوچی ادب نظم و نثر کے میدانوں میں قابل ذکر ترقی کر رہا ہے۔

بلوغ المرام احادیث کا ایک انتخاب، جو فقہی ابواب کے طرز پر ایک شاندار انتخاب ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حدیث کی مشہور کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان وغیرہ سے انتخاب کیا ہے۔ یہ کتاب متوسط ضخامت کی ہے لیکن ترتیب و انتخاب کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ اس کتاب میں حافظ ابن حجر نے اسلامی تمدن، اقتصادیات، معاشیات کے اصولوں کے پیش نظر ان احادیث کو ترتیب دیا ہے۔ "بلوغ المرام" کو "باب الطہارۃ" سے شروع کیا گیا ہے، جو اسلامی تمدن کی تمہید اور سب سے پہلی کڑی ہے۔ اس کتاب کی افادی حیثیت کے پیش نظر علماء نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں جن میں سے بعض شرحیں عربی زبان میں ہیں اور بعض فارسی زبان میں۔

"بلوغ المرام" کی نواب صدیق حسین خان نے دو شرحیں عربی اور فارسی میں کی ہیں۔ ان کی فارسی شرح کا نام "مسک الختام" ہے۔ جو درس نظامی کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ "بلوغ المرام" کا اردو زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

بلوغت :- بالغ ہونا۔ (دیکھیے "بالغ")

بلھے شاہ سید محمد عبداللہ شاہ عرف بلہ شاہ، بھلی شاہ، بلھے شاہ، پنجابی زبان کے مشہور صوفی شاعر اور بزرگ، والد کا نام سخی شاہ محمد درویش تھا۔ آبائی وطن بہاولپور کا مشہور گاؤں اُچ گیلانیاں تھا یہاں پیدا ہوئے بلھے شاہ کے سن پیدائش اور وفات کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں ہے بعض کے نزدیک ۱۰۹۶ھ/۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں وفات پائی بقول آسبورن ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔ "خزینۃ الاصفیاء" میں ان کی تاریخ وفات ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء ہے۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے ان کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو قلمی نسخے کی شکل میں ہے اور اس پر بلھا شاہ قادری کی مہر کے ساتھ ۱۱۸۱ھ کی مہر لگی ہوئی ہے اس صورت میں انکی وفات ۱۱۷۱ھ نہیں مانی جا سکتی۔ بلھے شاہ کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔ ان کے والد نامساعد حالات سے مجبور ہو کر پانڈو گاؤں میں آباد ہو گئے اور گاؤں کی ایک مسجد کی امامت اور درس کی ذمہ داری قبول کر لی اور بلھے شاہ کو تعلیم کے لیے قصور میں خواجہ غلام مرتضیٰ قصوری کے پاس بھیج دیا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بلھے شاہ مسجد کوٹ قصور کے طلباء میں سے تھے۔ خواجہ صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دو عجیب شاگرد ملے ہیں ایک بلھے شاہ جس نے علم حاصل کر کے سارنگی پکڑ لی اور دوسرا سید وارث شاہ جس نے عالم ہو کر ہیر رانجھا کے گیت لکھنے اور گانے شروع کر دیے۔

بلھے شاہ بچپن ہی سے تصوف کی طرف مائل تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد پورے ہندوستان میں فتنہ و فساد برپا ہونے لگا اور مغلوں کی سلطنت پر زوال آگیا۔ یہ اثرات پنجاب میں دوسرے تمام علاقوں سے زیادہ محسوس ہوئے بلھے شاہ کی حساس طبیعت میں ان حالات نے اور بھی زیادہ اضطراب پیدا کر دیا اور وہ مرشد کامل کی تلاش میں نکل پڑے۔ اسی تلاش مرشد میں بلھے شاہ لاہور پہنچے اور شاہ عنایت قادری لاہوری سے جو اونچی مسجد اندرون بھاٹی گیٹ میں مقیم تھے۔ بیعت کی اور اپنے مرشد کی وفات کے بعد بلھے شاہ قصور آ گئے۔ اور تا عمر تک قصور ہی میں رہے۔ ان کا مزار یہیں ہے جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔ ان کا عرس ہر سال ۱۰ر شعبان کو ہوتا ہے۔

بابا بلھے شاہ نے اپنی تمام زندگی زہد و تقشف میں گذاری۔ ساری عمر شادی نہ کی۔ صاحب "خزینۃ الاصفیاء" نے ان کے بارے میں لکھا ہے "وہ شاہ عنایت کے عظمائے خلفاء میں سے تھے۔ عابد و زاہد تھے۔ صاحب جذب و سکر و عشق و محبت و وجد و سماع تھے اور توحید میں بلند مرتبہ کلام پیش کرتے تھے۔ ان کے پنجابی اشعار معارف و توحید سے پر ہیں۔ خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ ان کی کافیوں کو قوال اصفیاء کی مجلسوں میں گاتے ہیں۔ ان کے خوارق اور کرامتیں زبان زد خلائق ہیں۔

"دائرہ معارف اسلامیہ" میں بلھے شاہ کی صوفیانہ زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "پہلا دور وہ ہے جو وہ مرشد کی تلاش میں سرگرداں تھے اور تصوف کے مختلف مکاتب فکر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا دور "فنافی المرشد" ہونے کا ہے جب وہ مرشد کو وسیلہ نجات سمجھتے اور اس کی صورت میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں اس دور میں انہوں نے ہندو فلسفے سے آگاہی حاصل کی۔ تیسرا دور وہ ہے جب ان کا جذبہ بے پناہ اور عشق بیکراں ہو جاتا ہے۔ اور وہ رسمی مذہب اور سطحی عقائد کی دیواریں توڑتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں ان کی شاعری نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔

جب بلھے شاہ نے شاعری شروع کی اور مرشد کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اسے پسند نہ کیا۔ بلکہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ مگر جب انھوں نے ان کے اشعار سنے تو ان کی ناراضگی دور ہو گئی۔ اور وہ بلھے شاہ کی عالی دماغی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ پیر و مرشد نے شاگرد کی کافیوں میں علم و معرفت اور حکمت کی باتیں دیکھیں تو انہیں شاعری کرنے کی اجازت دے دی۔ مرشد کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلھے شاہ نے سینکڑوں کافیاں کہہ ڈالیں۔ یہ کافیاں پنجاب کے مختلف علاقوں میں بڑی مشہور و مقبول ہیں ان کافیوں میں بلھے شاہ نے تصوف اور معرفت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ انہی کافیوں کے طفیل بلھے شاہ کو لافانی شہرت نصیب ہوئی۔

بلھے شاہ ایک مقبول عام صوفی شاعر تھے۔ ان کے سارے کلام میں صوفیانہ شاعری کی آزاد خیالی اور توکل و غنا کا رنگ ہے۔ توحید باری تعالیٰ اور عشق حقیقی ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ اور اس موضوع کو انہوں نے متنوع انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کا کلام کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کلام کے مطبوعہ نسخے ان ناموں سے چھپے ہیں۔

"قانون عشق" حصہ اوّل، دوم، "کافی ہاتے حضرت بلھے شاہ قصوری" "کافیاں میاں بلھے شاہ"، "کافیاں بلھے شاہ لاہور" "کلیات بلھے شاہ"

نمونہ کلام کے طور پر دو کافیاں درج ذیل ہیں۔ ان میں علمائے سو کی طرف اشارہ ہے:-

پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر   قرآن کتاباں چار چوفیر
گردے چانن وچ انھیر   باجھوں رہبر خبر نہ سار
علموں بس کریں او یار
اکو الف ترے درکار
پڑھ پڑھ نفل نماز گذاریں   اچیاں بانگاں چانگاں ماریں
منبر چڑھ کے وعظ پکاریں   تینوں کیتا حرص خوار

Marfat.com

بماکو جمہوریہ مالی کا دارالحکومت اور مملکت سوڈان کا سب سے بڑا شہر جو مغربی افریقہ میں واقع ہے۔ بماکو دریائے نائیجر پر واقع ہے۔ جہاں ڈکر نائیجر ریلوے ختم ہوتی ہے اور جہاں دریائے نائیجر کی جہاز رانی کے قابل دو شاخوں کا باہم ملاپ ہوتا ہے۔ یہ شہر چونکہ ساحل اور ملک کے جنوبی حصے اور سوڈان و سینیگال کے ملانے والی شاہراہوں پر واقع ہے اس وجہ سے بماکو ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ بماکو میں ہوائی جہازوں کا ایک بڑا اڈا ہے۔

آج کل اس شہر کو افریقہ میں ایک اہم مرکزی مقام حاصل ہے، اس کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ جو ۱۸۸۳ء میں آٹھ سو تھی اور ۱۹۶۷ء میں ایک لاکھ ستر ہزار ہو گئی۔ اسے بما نامی ایک شکاری نے بسایا تھا۔ بعد میں اس کے جانشین نے جس کا نام نیاری تھا اس شہر کا نام بماکو رکھا۔ بماکو کی آبادی اس وقت بڑھنا شروع ہوئی جب اس میں پہلے پہل۔ پھر درا اور توات کے لوگوں نے آکر سکونت اختیار کی۔ یہی لوگ اپنے ساتھ اسلام بھی لے کر آئے۔ یہ شہر چار حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ۱۔ نیاریلا ۲۔ توریلا ۳۔ بزوبلا ۴۔ دروبلا موجودہ شہر کی بنا بھی یہی چار حصے ہیں۔

اس شہر کی شہرت دریائے نائیجر پر ایک مضبوط مستحکم قلعے کی تھی۔ جو جلد ہی فرانسیسیوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور ۱۸۸۳ء میں انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اس وقت سے بماکو سوڈان میں فرانسیسیوں کی جنگی کارروائیوں کا مرکز بن گیا۔ اور اس کی آبادی میں سوڈانیوں اور سینیگالیوں کا برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح بماکو نے ایک عظیم فوجی، علمی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔

بماکو ایک اسلامی شہر ہے لیکن اس کے اسلام پر ولیئتہ کا رنگ غالب ہے جس میں اکثر اوہام پرستی کے قدیم عقائد بھی پائے جاتے ہیں۔ بماکو کبھی بھی اسلامی تبلیغ کا مرکز نہیں رہا۔ اس شہر میں قادریہ اور تیجانیہ سلسلے ایک مدت سے قائم ہیں۔ آج کل یہاں کی اکثریت [illegible] نے یہاں ایک جماعت قائم کی ہے جس کا مقصد مقامی اسلام کو توہمات اور رسوم و رواج سے اور مختلف بدعتوں سے پاک کرنا ہے۔ اس تحریک کو دیکھتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں اس شہر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگی۔

بماکو میں بہت کم عمارات تھیں اور اسی وجہ سے یہاں کوئی قدیم یادگار باقی نہیں ہے۔ ۱۸۸۳ء میں فرانسیسیوں نے یہاں کے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۰۴ء میں اسے فرانسیسی سوڈان کی نوآبادی کا صدر مقام قرار دیا گیا۔ تجارتی علاقے ریلوے سٹیشن کے گرد واقع ہیں۔ آبادی اور دریا کے درمیانی علاقے میں باغات کثرت سے ہیں۔ شہر کی اکثر عمارتوں میں کولوبہ کا سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی منڈی بماکو ہی ہے۔ یہاں ایک چیمبر آف کامرس اور ایک بڑی جامع مسجد بھی ہے۔

ممبئی بھارت کا ایک شہر جو کہ ممبئی ۱۹۶۰ء تک اسی نام کے صوبے کا صدر مقام اور اس کے بعد نئے صوبے مہاراشٹر کا صدر مقام ہے۔ یہ بھارت کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہر کی آبادی ساٹھ لاکھ کے قریب ہے جو ۶۰۳ مربع کلومیٹر میں آباد ہے۔ شہر کا ایک چوتھائی حصہ سطح سمندر سے بھی نیچے ہے جسے پہاڑوں کے سلسلے نے سمندری لہروں کی یلغار سے بچا رکھا ہے۔ سمندر میں [illegible] لمبا اور چار پانچ کلومیٹر چوڑا ایک جزیرہ ہے۔ جہاں ممبئی شہر کا زیادہ تر حصہ آباد ہے۔ اسی لیے عام طور پر اس شہر کو جزیرہ ممبئی کہا جاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء سے پہلے زیادہ تر آبادی اور صنعتی مراکز اسی جزیرہ میں واقع تھے۔ چنانچہ آبادی کو ساحل سے

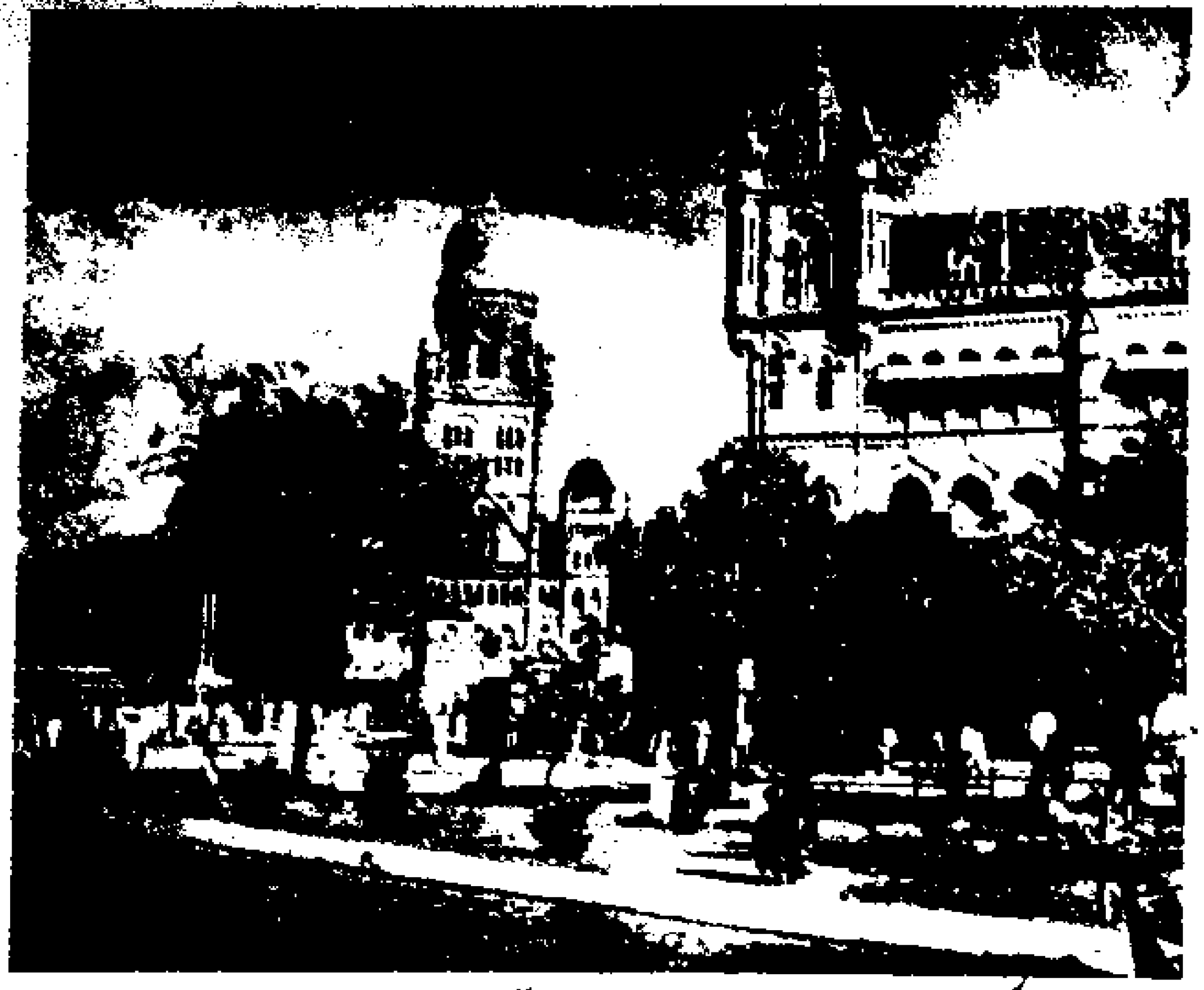

ممبئی کی مشہور شاہراہ پر واقع سرکاری دفاتر

ادھر لانے کے لیے عظیم تر ممبئی کا منصوبہ بنایا گیا۔ جس پر ۱۹۶۱ء تک عمل درآمد ہوتا رہا۔

ممبئی کا نام ممبا بائی یا ممبا دیوی سے اخذ کیا گیا ہے، جو ہندوؤں کی ایک اہم دیوی ہے۔ ازمنہ قدیم سے چودھویں صدی عیسوی تک یہ شہر ہندومت کا بہت بڑا مرکز رہا۔ ۱۳۴۸ء میں یہ سلطنت گجرات میں شامل کر لیا گیا اور ۱۵۳۴ء میں پرتگیزوں کے قبضے میں جانے سے پہلے مسلمان حکمرانوں کے ماتحت رہا۔ ۱۵۳۴ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے یہ شہر پرتگیزوں کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے ۱۶۶۱ء میں اسے انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کو ملکہ کیتھرائن کے جہیز میں دے دیا۔ ملکہ کیتھرائن پرتگال بادشاہ کی بیٹی تھی۔ جس کے ساتھ چارلس دوم نے ۱۶۶۱ء میں شادی کی۔ مزید دو برس تک یہ شہر انگریزوں کے حوالے نہ کیا جا سکا۔ ۱۶۶۵ء میں بمشکل اس پر بادشاہ انگلستان کے نام پر قبضہ ہوا۔ ۲۷ مارچ ۱۶۶۸ء کو شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دس پاؤنڈ سالانہ کرایہ پر دے دیا گیا۔ ۱۶۷۲ء میں سورت کے صدر جیرالڈ آنگر نے اپنے سرکاری دفاتر یہاں تعمیر کر لیے۔ اور یوں ممبئی کی اصل اور مرکزی حیثیت کا آغاز ہوا۔ اس وقت ممبئی چھوٹے چھوٹے سات جزائر پر مشتمل تھا جنہیں مشرق کے صحت افزا جزیرے کہا جاتا تھا۔ ۱۶۷۷ء میں اس شہر کی آبادی ساٹھ ہزار تھی جو ۱۸۹۱ء میں آٹھ لاکھ تک جا پہنچی۔

اس درمیانی عرصہ میں ممبئی نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ انگریزی عہد میں اسے باب ہندوستان سمجھا جاتا تھا اور یہ یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارت کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہاں ریلوے سٹیشن قائم کیا گیا۔ ۱۸۵۳ء میں ممبئی کو تھانہ اور ۱۸۶۴ء میں بڑودہ اور وسطی ہندوستان سے ملا دیا گیا۔ دو برس بعد وکٹوریہ ٹرمینس قائم ہوا۔ امریکی خانہ جنگی کے دوران (۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک) ممبئی کو روئی کی تجارت میں اجارہ داری حاصل ہوئی اور یہ شہر ہندوستان بھر کے تاجروں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۸۵۴ء میں ایک پارسی رہنما کاوس جی نانا بھائی نے یہاں روئی بیلنے کا پہلا کارخانہ قائم کیا۔ اگلے پانچ برسوں میں یہاں پچاس کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ اسی دور میں جمشید جی ٹاٹا نے یہاں لوہے کے ذخائر دریافت کیے اور بلا شرکت غیرے فولاد کے کارخانوں کا مالک بن گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اس کے بیٹے سر دوراب جی ٹاٹا نے یہاں پن بجلی کا کارخانہ لگایا جس سے ان کے بڑے بڑے کارخانے حرکت میں آتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ممبئی میں بڑی بڑی عمارات وجود میں آ چکی تھیں۔ بیسویں صدی کے وسط تک ممبئی میں تقریباً ہر صنعت کا کارخانہ قائم ہو چکا تھا۔ جس کی بنا پر ۱۹۷۰ء تک یہاں کی آبادی پچاس لاکھ سے متجاوز کر گئی۔

Marfat.com

بمبئی کی آبادی میں مذہبی تناسب: ہندو ۷۰٪، مسلمان ۱۵٪، عیسائی ۶٪، جینی ۲٪، پارسی ۲٪، یہودی ۱٪، سکھ ۰٫۵٪ اور باقی دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت خارجہ کا ایک تہائی کاروبار بمبئی میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر برآمدات تیل اور اس کی مصنوعات، کپاس، اون، میگنیز، موٹر وہیکل اور تعمیراتی ساز و سامان پر مشتمل ہیں۔

صوبہ بمبئی میں مہاراشٹر اور گجرات کے اکثر علاقے شامل تھے۔ برطانوی راج کے آخری ایام میں بمبئی ایک خود مختار صوبہ تھا۔ جسے ۱۹۶۰ء کے بعد دو صوبوں گجرات اور مہاراشٹر میں تقسیم کر دیا گیا۔ اب بمبئی شہر صوبہ مہاراشٹر کا دارالحکومت ہے۔

بنا، حسن:۔ مصر کے ایک عالم، مجاہد اور "اخوان المسلمین" کے بانی (دیکھئے حسن البنا)

بنارس اترپردیش (بھارت) کا ایک شہر اور ڈویژن۔ قدیم ترین ہندو شہر۔ جو راجا کاشی کی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہ دریائے گنگا کے بائیں کنارے کلکتہ سے ۴۲۱ میل شمال مغرب میں اور دہلی سے ۵۰۸ میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی چھ لاکھ تیس ہزار تھی۔

یہ شہر کوئی چار ہزار سال پرانی تاریخ کا حامل ہے۔ ۲۰۰۰ ق۔م میں آریا یہاں آئے اور یہ ان کا مذہبی اور سیاسی مرکز بنا۔ بدھ مت کے ظہور سے پہلے یہ شہر ململ، ریشمی کپڑے، عطریات اور ہاتھی دانت کے کام کی وجہ سے مشہور تھا۔ چندرگپت (۲۹۶ ق۔م) کے عہد میں یہ شہر مگدھ ریاست کے ماتحت آیا اور اشوک (۲۳۲ ق۔م) کے عہد میں یہ بدھ مت کا مرکزی شہر بن گیا۔ پہلی صدی عیسوی میں کابل کے حکمران کنشک نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اگلے ایک ہزار برس تک یہ بدھ مت اور ہندو تہذیب کا اہم مرکز رہا۔

۱۰۳۳ء میں بنارس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۱۹۴ء میں اسے محمد غوری نے دوبارہ فتح کیا۔ اکبر کے عہد میں یہاں دوبارہ ہندو تہذیب کا احیا ہوا۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی یہ شہر اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس دور میں یہاں مشہور فلسفی اور شاعر رامانند، بھگت کبیر اور تلسی داس وغیرہ نے جنم لیا۔ اسی دور میں مسلمان جولاہوں نے یہاں نفیس ترین ململ بننے کے فن کو عروج بخشا۔

مغلیہ دور کے زوال کے ساتھ ہی بنارس میں ہندو راج کا آغاز ہو گیا۔ منسا رام پہلا حکمران تھا۔ جس نے نیم خود مختار حکومت قائم کی۔ اور ۱۷۲۵ء تک اسے مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بیٹے بلونت سنگھ نے بنارس کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت دے ڈالی۔ اس عہد سے مرہٹوں، بدھوں، نیپالیوں اور ہندوؤں نے بنارس میں اپنی تعمیرات کا آغاز بڑے زور شور کے ساتھ کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں بنارس کی علیحدہ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ اور پربھو نرائن سنگھ کو پورے اختیارات حاصل ہو گئے۔ مگر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں بنارس کی یہ حیثیت ختم کر کے اسے صوبہ اترپردیش میں شامل کر دیا گیا۔

بنارس ڈویژن۔ بنارس، مرزاپور، جون پور، غازی پور اور بلیہ کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ ضلع بنارس میں ۱۹۲۱ گاؤں اور بارہ شہر شامل ہیں۔

بنانی فاس کا ایک خاندان، جس میں بڑے نامور علما پیدا ہوئے۔ ابتدا میں یہ خاندان یہودی تھا۔ اس خاندان کے نامور مسلمان علما مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **ابوعبداللہ محمد بن عبدالسلام**:۔ (وفات ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء) یہ مغرب اور مشرق ہر دو میں مروجہ مالکی مذہب اور اس کی روایات کا عالم تھا۔ اس کا حلقہ تلامذہ بے حد وسیع تھا۔

اس کی تصانیف میں زیادہ تر مشہور یہ ہیں۔ "الفہرسہ" اس زمانے کے فقہی اور قانونی مطالعے کا ایک اہم ماخذ ہے۔ ۲۔ الشاذلی کی کتاب "الحزب الکبیر" کی شرح۔ ۳۔ کلاعی کی کتاب "کتاب الاکتفاء" کی شرح۔

۲۔ **ابوعبداللہ محمد بن حسن بن مسعود**:۔ (وفات ۱۱۹۴ھ / ۱۷۸۰ء) مالکی فقیہ، خطیب اور امام۔ اس کی تصانیف میں ۱۔ "الفتح الربانی"۔ ۲۔ زرقانی کی "مختصر خلیل بن اسحاق" پر تعلیقات۔ ۳۔ سنوسی کی شرح "مختصر المنطق" پر حاشیہ ۴۔ مسلم کی شرح۔ ۵۔ کتاب الفہرسۃ" اہم ہیں۔

۳۔ **مصطفیٰ بن محمد بن عبدالخالق**:۔ (وفات ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء) اس نے تفتازانی کی مختصر پر "التجرید" کے نام سے تعلیقات لکھیں جو کئی بار شائع ہوئیں۔

۴۔ **محمد بن محمد بن محمد العربی بن عبدالسلام**:۔ (وفات ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء) ابو محمد بن عبدالسلام کا پڑپوتا تھا۔ مکے میں مالکی مفتی رہا۔ اس کی تصانیف میں شرح صحیح البخاری ہے۔

۵۔ **محمد**:۔ (وفات ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۵ء) فرعون کے نام سے مشہور تھا۔ کتاب الرہائن کا مصنف ہے۔ یہ کتاب کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

بن بیلا احمد بن بیلا الجزائر کے سابق صدر، دوسری جنگ عظیم میں الجزائر کی چھٹی رجمنٹ میں شریک ہوئے اور شاندار خدمات سرانجام دیں جس سے خوش ہو کر جنرل ڈیگال نے بن بیلا کو ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز دیا لیکن جب انہوں نے فوج میں کمیشن حاصل کرنے کی درخواست دی تو ان کے فرانسیسی جرنیل نے ان کی درخواست پر لکھا "بن بیلا ذہین ہے مگر خطرناک شخص ہے لہٰذا درخواست مسترد کی جاتی ہے"۔

بن بیلا دو مرتبہ فرانسیسیوں کی قید میں رہے۔ پہلی مرتبہ جیل سے بھاگ کر مصر چلے گئے یہیں پر ان کی ملاقات بومدین سے ہوئی اور انہوں نے بومدین کو سیاست میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔

دوسری مرتبہ مراکش جاتے ہوئے انہیں جہاز سے اتار کر گرفتار کیا گیا۔ جہاں سے ۱۸ مارچ ۱۹۶۲ء کو رہائی ملی۔

اگرچہ الجزائر میں جو انقلاب آیا اس کے لئے باقاعدہ اور منظم چھاپہ مار جنگ کا آغاز یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو ہوا لیکن جہاد آزادی دراصل ۱۴ جون ۱۸۳۰ء کو شروع ہو چکا تھا جب فرانس نے الجزائر میں تسلط کے ارادے سے قدم رکھا تھا چھاپہ مار جنگ کی قیادت محاذ آزادی کے رہنما کر رہے تھے جن میں بن بیلا، یوسف بن خدہ، کرنل تیاتی، محمد خضر، آیت احمد وغیرہ شامل تھے۔ چار سال بعد بالآخر کامیابی نے مجاہدین کے قدم چومے اور فرانس کا صدر ڈیگال الجزائر کو ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو آزادی دینے پر مجبور ہو گیا۔ آزادی کے بعد الجزائر میں پہلی عبوری حکومت قائم کی گئی۔ اس کے وزیر اعظم یوسف بن خدہ تھے۔ اگست ۱۹۶۲ء میں بن بیلا نے فوج کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنے تمام ساتھیوں کو جن میں یوسف بن خدہ، کرنل تیاتی، محمد خضر اور آیت احمد وغیرہ شامل تھے اپنے راستے سے صاف کر دیا۔ بن بیلا کے خلاف بغاوت بھی ہوئی لیکن باغی ناکام رہے اور بومدین نے جو فوج کے کمانڈر انچیف تھے بن بیلا کے اقتدار کی حفاظت کی۔ اور باغی عناصر کو ختم کر کے رکھ دیا۔

Marfat.com

۸ ستمبر ۱۹۶۳ء کو نیا آئین منظور ہوا اور وزیر اعظم بن بیلا کو پانچ سال کے لئے صدر منتخب کیا گیا۔ مگر ۱۹ جون ۱۹۶۵ء کی رات کو ساڑھے تین بجے کے قریب وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف بومدین نے جو نائب صدر بھی تھا، بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور بغیر کسی خون خرابے کے حکومت پر قابض ہو گیا۔

صدر بومدین نے بن بیلا کو گرفتار کر کے فوجی نگرانی میں دے دیا۔ اور کہا کہ بن بیلا کا وہی حشر ہو گا جو ایک آمر کا ہونا چاہیے۔ بن بیلا کے خلاف مقدمہ چلایا جائے گا۔ آج کل بن بیلا کسی نامعلوم مقام پر نظر بند ہیں۔

بن بیلا نے اپنے مختصر دور حکومت میں ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی انہوں نے تمام کارخانوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔

بنت :- بیٹی، دختر کے لیے عربی لفظ (دیکھیے "اولاد"، "دختر")

بندر پہلوی بحیرۂ خزر پر ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ، جو انزلی کے نام سے بھی موسوم رہی۔ ۱۹۲۶ء میں رضا شاہ پہلوی نے تخت نشین ہونے کے بعد اسے بندر پہلوی کا نام دیا۔ یہ بندرگاہ بحیرۂ خزر اور تازہ پانی کی جھیل مرداب کے درمیان ایک خلیج کے مغرب میں زمین کے آگے نکلے ہوئے ایک ٹکڑے پر واقع ہے۔ خلیج کے مشرق میں غازیان نامی ایک پرانی بستی ہے۔ بندرگاہ سے ایک سڑک پل پر سے ہوتی ہوئی غازیان تک جاتی ہے۔ اور وہاں سے رشت جو ساحلی علاقے کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہے تک چلی گئی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اس کی آبادی ۵۹،۰۳۷ تھی۔ اکثر باشندے شیعہ ہیں۔ موجودہ صدی کے دوسرے ربع میں خلیج کو ایک محفوظ بندرگاہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس بندرگاہ سے زیادہ تر تجارت روس کیساتھ کی جاتی ہے۔ روس کے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہ بندرگاہ بین الاقوامی حوادث کا مرکز رہی ہے۔ بحیرۂ خزر پر دوسری بندرگاہ بندر شاہ کہلاتی ہے، جو غیر اہم ہے۔

بندر عباس ایران کے ساحل پر جزیرہ ہرمز سے ۱۶ کلومیٹر شمال مغرب میں واقع بندرگاہ، اس کا شہر چٹیل ریتلی زمین پر آباد ہے چونکہ یہ خلیج فارس کے بین دہانے پر واقع ہے۔ اور یزد، کرمان، لار، شیراز اور اصفہان کی طرف جانے والے تجارتی راستوں کا نقطۂ اختتام ہونے کی وجہ سے اس بندرگاہ کی تجارتی اور جنگی اہمیت ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ اس بندرگاہ پر سمندر کے پایاب ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے جہازوں کو گودی سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہونا پڑتا تھا اور سامان کشتیوں کے ذریعے اتارا اور لادا جاتا رہا ہے۔ اب اسے کھود کر گہرا کر دیا گیا ہے۔

یہ شہر ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں شہرو کے محل وقوع پر یا اس کے نزدیک واقع ہے۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں اس کے قریبی جزیرے جرون کو ہرمز کہا جانے لگا تو شہرو کو جرون کا نام دے دیا گیا۔ اور جب ہرمز ایک تجارتی مرکز بن گیا تو جرون کی اہمیت بھی سامان چڑھانے کے مرکز کی حیثیت سے بڑھ گئی۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں جرون پر بھی پرتگیزیوں کا قبضہ ہو گیا ۱۶۱۵ء میں ایرانیوں نے اسے پرتگیزوں سے چھین لیا اور سات سال بعد برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بحری بیڑے کی مدد سے پرتگیزوں کو ہرمز سے بھی نکال باہر کیا۔ کمپنی کی ان خدمات کے صلے میں شاہ عباس اول نے جرون میں ایک کارخانہ لگانے کی اجازت دی۔ شاہ عباس چاہتا تھا کہ یہ شہر اس کی سلطنت کی سب سے بڑی بندرگاہ بن جائے اسی لیے اس نے اس کا نام بھی بندر عباس رکھا۔ چنانچہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی، ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسیوں کے آجانے سے یہ شہر واقعی ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ بن گیا۔

۱۶۷۴ء میں بقول تاورنیئر اس شہر میں ۱۴۰۰ سے ۱۵۰۰ تک مکانات تھے ۱۷۲۲ء میں روسی اور ترکی حملوں کے سبب اور ملک کی اندرونی شورشوں اور بغاوتوں کی وجہ سے یہ شہر اپنی رونق کھو بیٹھا۔ ۱۷۵۰ء میں پلاٹیئرنڈ کے بقول اس شہر کی خوشحالی ختم ہو چکی تھی اور ہر دس گھروں سے نو گھر غیر آباد اور ویران ہو چکے تھے اس کے بعد جب ولندیزی اور انگریز ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے بندر عباس کو چھوڑ دیا تو اس شہر کی ساکھ اور بھی گر گئی۔ ۱۷۹۳ء میں یہ شہر سلطان عمان کو ٹھیکے پر دے دیا گیا اور ۱۸۶۸ء میں دوبارہ ایرانیوں کا اس پر قبضہ ہو گیا۔

موجودہ دور میں بندر عباس کو پہلے جیسی خوشحالی دوبارہ حاصل ہو گئی۔ ۱۹۶۷ء میں اس کی آبادی ۱۹۳۰۰۰ تھی۔ بڑی مساجد دو ہیں جن میں سے ایک شیعوں کے لیے ہے اور دوسری سنیوں کی ہے۔ یہاں مچھلی کو ڈبوں میں بند کرنے کا ایک بڑا کارخانہ بھی لگایا گیا ہے حال ہی میں یہاں سے مٹی کا تیل دریافت ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے شہر ترقی کی طرف گامزن ہو گیا ہے۔ حال ہی میں ایک ہوائی اڈہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

بندونگ انڈونیشیا میں صوبہ مشرقی جاوا کا صدر مقام۔ یہ سطح سمندر سے دو ہزار تین سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ شہر تعلیمی مرکز ہے جس میں دو یونیورسٹیاں ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں کونین، کپڑا، ادویات، ربڑ کی اشیا اور مشینری ہے۔

پہلی افریقی ایشیائی کانفرنس جو ۱۹۵۵ء میں بلائی گئی تھی۔ اسی شہر میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کانفرنس کا نام بندونگ کانفرنس ہے بندونگ کی کل آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۹ لاکھ ۷۳ ہزار اور ۱۹۷۲ء کے مطابق گیارہ لاکھ تھی۔

بندونگ کانفرنس انڈونیشیا کے شہر بندونگ میں ہونے والی افریقی اور ایشیائی ممالک کی پہلی کانفرنس، جس میں ۲۹ ممالک کے وزرائے اعظم اور نمائندے شریک ہوئے۔ بندونگ کا شہر جاوا سے تھوڑی دور ایک پُر فضا مقام ہے۔ ۱۹۵۵ء میں یہاں یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس انڈونیشیا نے بلائی تھی۔ اس میں شریک ہونے والے ممالک کا رقبہ ۶۳ لاکھ ۲۹ ہزار مربع میل اور آبادی ایک ارب چالیس کروڑ تھی۔ اس کانفرنس کے لیے حسب ذیل مقاصد کا اعلان کیا گیا۔

۱۔ ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں اشتراک و تعاون کا جذبہ پیدا کرنا۔ ان کے مشترکہ مفادات کے لیے کام کرنا اور ان کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کی فضا قائم کرنا۔

۲۔ ان ممالک کے سماجی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل اور تعلقات پر غور کرنا۔

۳۔ ایشیائی اور افریقی عوام کی خود مختاری اور قومیت پر غور کرنا۔

۴۔ نئے حالات میں ایشیا اور افریقہ کے عوام کے حالات پر غور و خوض کرنا اور یہ دیکھنا کہ عالمی امن اور اشتراک و تعاون کو مستحکم کرنے کے لئے وہ کیا مدد کر سکتے ہیں۔

کانفرنس کے اختتام پر شریک ممالک نے الجزائر، مراکش، تیونس، مغربی نیوگنی

Marfat.com

فلسطین اور عدن کی آزادی کا مطالبہ کیا اور ہر قسم کے نوآبادیاتی نظاموں اور نسلی امتیازات کو انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا۔ ایٹمی اسلحہ کو تہذیب اور انسانیت کی مکمل تباہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے ان کے خاتمے اور ان پر پابندی عائد کرنے پر زور دیا۔

آخری مشترکہ اعلان نامے میں کہا گیا کہ دنیا کے تمام ملک رواداری اور فراخی کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کریں اور ان دس اصولوں کی روشنی میں دوستانہ تعاون کی فضا پیدا کریں۔

۱۔ انسانی حقوق کے منشور کا احترام۔ ۲۔ تمام قوموں کی خود مختاری۔ ۳۔ نسلی امتیازات کا خاتمہ۔ ۴۔ عدم مداخلت۔ ۵۔ انفرادی یا اجتماعی معاہدے کرنے کا حق۔ ۶۔ ایسے دفاعی معاہدے جن سے بڑی طاقتیں فائدہ نہ اٹھائیں۔ ۷۔ حملے کی دھمکی سے گریز۔ ۸۔ تنازعات کا پرامن حل۔ ۹۔ باہمی تعاون اور مساوات۔ ۱۰۔ بین الاقوامی ذمہ داریوں کا احترام۔

بندہ:۔ غلام، نوکر (دیکھئے "عبد")

بندہ نواز:۔ ہندوستان کے ایک صوفی بزرگ (دیکھئے "گیسو دراز")

بن غازی لیبیا کا دوسرا دارالحکومت، جو طرابلس (تری پولی) کے ساتھ مشترک ہے۔ یہ شہر مغربی میدان میں ایک ساحلی پٹی پر واقع ہے اسے ساحلی جھیلوں نے خشکی سے جزوی طور پر منقطع کر دیا ہے۔ اس کی بندرگاہ شمالی اور مغربی ہواؤں کی زد میں ہے اور اس کے آس پاس کے علاقے خشک اور بنجر ہیں بن غازی کا قصبہ یوسپیریڈس کے مقام پر آباد کیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد پانچویں صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے رکھی تھی۔ بعد میں بطلیموس ثالث شہنشاہ مصر کے دور حکومت میں یہ آبادی اس کی بیوی برینکہ کے نام پر برنیک مشہور ہوگئی۔ اس شہر کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی اور ازمنہ وسطیٰ میں اس پر ایسا زوال آیا کہ یہ بالکل ہی مٹ گئی۔

موجودہ شہر بن غازی کی تاریخ کا آغاز پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوتا ہے جب طرابلسی زلیتن اور مسراتہ کو خیر باد کہہ کر یہاں آباد ہوگئے۔ بن غازی کا نام سیدی غازی جو ایک ولی اللہ تھے کے نام پر ہے۔ بعد میں عثمانی سلطنت کے دیگر ممالک سے نقل مکانی کرکے آنے والوں کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان نقل مکانی کرکے آنے والوں میں اقریطشیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو یونانیوں کے ہاتھوں اپنا جزیرہ اقریطش کے فتح ہوجانے کے بعد ۱۸۹۷ء میں جوق در جوق یہاں پہنچے تھے۔ ان کے علاوہ طرابلس کے یہودی اور برقہ کے مختلف حصوں کے قبائلی اور نخلستانوں کے باشندے بھی تھے۔ اور قلیل سی تعداد یورپ کے لوگوں کی بھی تھی۔ ۱۹۰۰ء میں یہاں کی آبادی پندرہ ہزار کے قریب تھی۔

جب ۱۹۱۱ء میں اطالوی بن غازی اور طرابلس میں داخل ہوئے تو انہوں نے چند معمولی شہری آبادیوں کے علاوہ اس پورے علاقے کو مکمل طور پر بدویوں کا علاقہ پایا جہاں نخلستانوں سے باہر ایک گاؤں تک نہ تھا پوری آبادی نیم خانہ بدوش اور خانہ بدوش چرواہوں اور گلہ بانوں پر مشتمل تھی ۱۹۱۱ء میں یہاں کی آبادی ۱۴ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ابتداء میں یہ ایک ترکی ولایت کا مرکز تھا اور اب لیبیا کی نوآبادی کے حصے کا صدر مقام بنا۔ بن غازی ریل کے ذریعے جنوب میں سلوک اور مشرق میں المرج سے ملا ہوا ہے۔ ملک کے اندر سے ادھر ادھر جانے والی تمام سڑکیں یہاں آکر ختم ہوجاتی ہیں۔ یہاں پر ایک نئی بندرگاہ بنائی گئی ہے جسے پشتوں کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا ہے یورپ کے شہروں کی طرح اس قصبے کے لئے بلدیاتی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ پرانا قصبہ ۵۰۰ میٹر لمبے اور ۴۰۰ میٹر چوڑے ایک چوکور قطعہ زمین کے اندر آباد ہوا تھا۔ ایک جامع مسجد جو سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر کرائی گئی تھی پھر نئے سرے سے بنائی گئی ہے نیا مضافاتی قصبہ پرانے قصبے کے جنوب میں بسایا گیا ہے۔

۱۹۳۸ء میں بن غازی کی آبادی ۶۶۸۰۰ تھی اور اس میں اطالویوں کی تعداد ۲۲۰۰۰ تھی۔ اس کی بندرگاہ بڑی مصروف بندرگاہ تھی۔ ۴۲-۱۹۴۱ء کے آخر کی بمباری سے اور اطالویوں کے نکل جانے سے بن غازی کو بہت نقصان پہنچا۔ اطالویوں کے اخراج کے بعد بن غازی سرنیکا کا بڑا شہر اور دوسرا شہر لیبیا کے سلطان کا دارالحکومت اور قیام گاہ ہوگیا۔ اس کی اہمیت جو بندرگاہ کی حیثیت سے تھی ختم ہوگئی ہے اس کے ہوائی اڈے کی اہمیت زیادہ تر فوجی نقطۂ نظر سے ہے۔ ۱۹۵۴ء میں بن غازی کی آبادی ۶۳ ہزار تھی۔ جن میں یہودیوں اور یورپیوں کی ایک تھوڑی سی تعداد کے سوا سب مسلمان تھے۔ ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۰۸۰۰۰ تھی۔ شہر میں پانی کی سپلائی اور بجلی کی قلت ہے۔ جس پر حکومت خاص توجہ دے رہی ہے۔

بنگال بنگالہ یا بنگال، قدیم ہندوستان کا ایک صوبہ، جو ۱۹۴۷ء کے بعد دو حصوں مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال (بھارت میں) تقسیم ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کی حیثیت اختیار کرلی۔ بنگال لفظ بنگا سے نکلا ہے، جو اس علاقے میں آباد ایک غیر آریائی قوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ پال اور سین راجاؤں کے عہد میں دریائے گنگا کے ڈیلٹا کو بنگالہ کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی جنوبی علاقہ بنگال کہلاتا تھا۔ البتہ مغلیہ دور میں موجودہ تمام علاقہ بنگالہ کہلاتا تھا۔ یہ سیلابوں، طوفانوں اور بارشوں کی سرزمین ہے۔ جہاں چاول، پٹ سن اور ایسی دوسری استوائی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔

آریاؤں کے دور میں بنگال (۱۲۰۰ ق۔م سے ۴۰۰ ق۔م) کی تاریخ اندھیرے میں ہے۔ صرف سکندر اعظم کے حملے کے بعد یونانی ماخذوں سے کچھ پتا چلتا ہے کہ یہاں سیونی حکمران تھے، جو سکندر اعظم کے مقابلے کے لیے متحد ہوئے۔ اس دور میں بنگال کو ونگا کہا جاتا تھا۔ گپت خاندان کے تین راجا گوپ چندر، دھرم دت اور سماچار دیو ۵۲۵ء سے ۵۷۵ء تک یہاں حکمران رہے۔ ۶۰۶ء میں ایک باجگزار راجا مہاسامنت نے شمالی اور مغربی بنگال پر مشتمل ریاست گوڑ کی بنیاد رکھی۔ اس کی موت کے بعد بدھ راجا ہرش وردھن نے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا اور ۶۴۲ء کے بعد کشمیر کا راجا للتیہ یہاں پر قابض ہوگیا۔

۷۴۳ء میں ایک بدھ خاندان پال نے یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے بانی گوپال کے بیٹے دھرم پال کے زمانہ ۷۷۰ء تا ۸۱۰ء میں یہ سلطنت ہمالیہ، مالوہ اور برار تک کے علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹے دیوپال کے عہد میں یہ ایک بہت بڑی سلطنت بن چکی تھی۔ جس کا ذکر المسعودی نے بھی کیا ہے۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں ہیمنت سین نے پال خاندان کی حکومت کا خاتمہ کرنے کی کوشش شروع کردی اور رادھا میں ایک خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس کے بیٹے وجے سین (۱۰۹۵ء تا ۱۱۵۸ء) نے پورے بنگال کو اپنی ریاست میں شامل

Marfat.com

کرایا۔ ۱۱۷۹ء میں اس کا بیٹا لکشمن سین تخت پر بیٹھا۔ جس نے عمر کے آخری حصے میں بڑی پریشانیاں اٹھائیں اور مسلمانوں سے شکست اٹھانے کے بعد ۱۲۰۶ء میں ڈھاکے کے قریب فوت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی بنگال پر سے سین خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۱۹۹ء میں قطب الدین ایبک کے ایک ترک سپہ سالار نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کو وسعت دینے کے لیے بنگالہ کی طرف کوچ کیا اور ۱۲۰۱ء میں سین راجا کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہوگیا اور بغیر جنگ کیے ندیا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ذرا ہی بعد ورِیندر اور گور پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور یہ چھوٹی ریاست بعد میں گور کی ایک بڑی خودمختار حکومت بن گئی۔ ۱۲۰۵ء میں اختیار الدین محمد سپہ سالار کی قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد علی بن مردان بنگال کا والی مقرر کیا گیا۔ ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد علی بن مردان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اس طرح بنگال کا پہلا مسلمان بادشاہ بنا۔ ۱۲۱۱ء میں علی بن مردان کے قتل کے بعد حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بنگال کا بادشاہ بنا۔ اس کے زمانے میں بنگال نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اس نے حدودِ سلطنت کو وسیع کیا۔ ۱۲۱۹ء میں جہازوں کا ایک بیڑہ بنایا گیا۔ ۱۲۲۵ء میں جب سلطان التتمش نے بہار و بنگال پر حملہ کیا تو اس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی لیکن سلطان کی واپسی پر غیاث الدین نے بہار کے صوبیدار کو مار بھگایا۔ چنانچہ التتمش کے لڑکے ناصر الدین نے لکھنوتی پر چڑھائی کر کے غیاث الدین کو مار دیا اور اس طرح بنگال کی آزاد بادشاہت کو ختم کر دیا۔

۱۲۲۷ء سے ۱۲۸۷ء تک بنگال سلطنت دہلی کا ایک حصہ رہا اور متعدد صوبیدار بنگال کا انتظام کرتے رہے۔

بلبن کے عہد میں بنگال کے صوبہ دار طغرل نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن بلبن اسے شکست دے کر اور اپنے بڑے لڑکے بغرا خاں کو بنگالہ کا حاکم بنا کر دہلی واپس آیا اور اس وقت سے بنگال کی صوبہ داری موروثی ہوگئی۔ یہ صوبیدار دہلی کی سیادت تسلیم تو کرتے تھے لیکن اپنے صوبے کے معاملات میں خودمختار ہوتے تھے۔

محمد تغلق کے آخری ایام میں حکومت میں والیانِ بنگال نے سیادتِ دہلی کا جوا اپنی گردن سے اتار ڈالا اور محمد تغلق کو ان کی خودمختاری اور آزادی ماننا پڑی۔

آزاد مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں بنگال نے بڑی ترقی کی۔ بہت سی تعمیرات ہوئیں۔ مملکت بنگال کو وسعت دی گئی۔ مغربی آسام، کوچ بہار اور جاج نگر کے اقطاع اور شمالی و جنوبی بہار کا پٹنے تک کا علاقہ ان کے زیرِ اقتدار رہا۔

۱۳۵۴ء تک مشرقی بنگال خودمختار رہا اور ۱۳۵۲ء میں مغربی بنگال کی الیاس شاہی سلطنت کا ایک جز بن گیا۔ لیکن ۱۳۵۴ء ہی میں فیروز تغلق نے بنگال پر حملہ کر کے لکھنوتی کے مغرب کا سارا علاقہ دہلی سلطنت میں شامل کر لیا۔ تاہم الیاس شاہ نے اپنی سلطنت کامروپ، ناگرا اور ورِندرا (راجشاہی اور دیناج پور) تک بڑھا لیا۔ الیاس شاہ کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ حکمران ہوا اور تینتیس سال حکومت کی۔ ۱۳۸۹ء میں سکندر شاہ اپنے بیٹے غیاث الدین کے ہاتھوں ایک جنگ میں مارا گیا۔ چنانچہ ۱۳۸۹ء میں غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ بنگال پر ۱۴۸۶ء تک سوائے چند برسوں کے الیاس شاہی سلطنت قائم رہی۔ یہ سلاطین بنگالی نہ تھے لیکن ہر دلعزیز تھے۔

الیاس شاہی سلاطین نے حبشیوں کی بے انتہا سرپرستی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن امیروں کی وجہ سے سلطنت چلتی تھی ان کا زور کم ہوگیا اور آخرکار حبشی سلطنت قائم ہوگئی۔ جو ۱۴۸۶ء سے ۱۴۹۳ء تک رہی۔ یہ دور بنگال کی تاریخ کا تاریک دور ہے اسکے بعد ۱۴۹۳ء سے ۱۵۳۸ء تک بنگال پر حسین شاہی خاندان کے لوگ حکومت کرتے رہے۔ سید حسین جو علاء الدین حسین شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ ایک عرب تھا لیکن اس نے بنگالیوں کی زبان اور تہذیب کی سرپرستی کی اور بنگال میں نئے سرے سے فتوحات اور تعمیرات کے دور کا آغاز ہوا۔ حسین شاہ سے مسلمان اور ہندو دونوں خوش تھے۔ ۱۵۱۹ء میں حسین شاہ نے وفات پائی۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین نصرت شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ۱۵۳۲ء میں نصرت شاہ کو اس کے غلام نے قتل کر دیا اس کے بعد اس کے دو بیٹے حکمران ہوئے۔ انہی دنوں میں شیر خان سوری نے بنگال پر حملہ کیا۔ اس وقت ہمایوں مغربی ہند کی شورشیں فرو کرنے میں مصروف تھا۔ شیر خان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بہار کا حاکم بن بیٹھا۔

۱۵۳۸ء میں بنگال افغانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۵۳۸ء میں ہمایوں نے گور پر قبضہ کر لیا۔ اور بنگال کو جزوِ سلطنت بنانے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ہمایوں کو یہاں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ۱۵۳۹ء میں چوسا کے مقام پر اس نے شیر شاہ سے شکست کھائی۔ اس کے بعد شیر شاہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے بنگال کا رخ کیا اور گور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۷۵ء میں بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہوا لیکن افغان اکبرِ اعظم کے دورِ حکومت میں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ جہانگیر نے پہلے مان سنگھ کو اور بعد میں اسلام خان کو بنگال کا ناظم مقرر کیا۔ اس کے عہد میں حدودِ سلطنت میں بھی توسیع ہوئی۔ کوچ، بہار، کامروپ، ضلع ڈھاکہ کا جنوب مشرقی حصہ، مدناپور، سنار گاؤں، بارہ بھوئیاں، جیسور وغیرہ کا علاقہ مغل بنگال میں شامل کر لیا گیا شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں اس سال تک مغل بنگال میں امن و امان قائم رہا اور آسام اور اڑیسہ کی طرف بنگال کی سرحد بڑھی۔ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں اس کا پوتا عظیم الشان بنگال کا صوبیدار تھا۔ ۱۷۱۷ء میں فرخ سیر نے مرشد قلی خان کو بنگال کا صوبے دار بنایا۔ ۱۷۲۷ء میں مرشد قلی خان کی وفات کے بعد اس کا داماد شجاع الدولہ بنگال کا صوبیدار بنایا گیا جس نے ۱۷۳۹ء میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا سرفراز علاؤ الدولہ کے لقب سے بنگال کی مسند پر بیٹھا ۱۷۴۰ء میں سرفراز علی وردی کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں مارا گیا اور اس طرح علی وردی نے بنگال کی گدی پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی نے وفات پائی اور اس کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ بنگال کے تخت پر بیٹھا۔ سراج الدولہ کو پہلے ہی دن سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جن میں اس کے جاہ طلب رشتہ دار، امراء، وزراء اور انگریز شامل تھے۔ اس نے بڑی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا۔

سراج الدولہ نے اپنے خلاف اٹھنے والی تمام شورشوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ۱۷۵۶ء میں اس نے کلکتہ پر حملہ کر کے انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ لیکن انگریزوں نے اپنی ہزیمت اور شکست کا بدلہ لینے کے لیے بااثر ہندوؤں اور میر جعفر جیسے غدار مسلمانوں کو ساتھ ملا کر سراج الدولہ کا تختہ الٹنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ پلاسی کے مقام پر انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔ جس میں میر جعفر جیسے غداروں کی وجہ سے اسے شکست اٹھانا پڑی۔ اس کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا جو انگریزوں کی کٹھ پتلی کے طور پر حکومت کرنے لگا۔ اس نے ہر طرح

Marfat.com

سے کمپنی کا حرص پیدا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ انگریزوں نے اسے سبکدوش کر دیا اور اس کی جگہ اس کے داماد میر قاسم کو بٹھا دیا۔ جو ایک قابل حکمران تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد انگریزوں نے اسے بھی معزول کر کے دوبارہ میر جعفر کو بحال کر دیا۔ میر جعفر کی موت کے بعد اس کے بیٹے کو گدی پر بٹھا دیا گیا، جو انگریزوں کا محض وظیفہ خوار تھا۔

میر جعفر کے مرنے کے بعد نوابی ختم ہو گئی اور لارڈ کلایو نے کمپنی کے لیے بنگال بہار اور اڑلیسہ کی دیوانی حاصل کی۔ فوج کا اختیار کمپنی نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ لیکن کلایو اچھا منتظم ثابت نہ ہو سکا اس کی دوعملی کے باعث بنگال کی خوش حالی جاتی رہی ۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۰ء میں سخت قحط پڑا۔ اس قحط میں ایک تہائی آبادی ختم ہو گئی۔ ۱۷۷۴ء میں کلایو نے خودکشی کر لی۔ اور اس کی جگہ وارن ہیسٹنگز بنگال کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے دور میں مسلم قانون کی جگہ انگریزی قوانین نافذ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا مزید نقصان ہوا۔ کیونکہ دفتروں میں انگریزی زبان رائج کی گئی جبکہ مسلمان اس زبان سے ناآشنا تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے میں اس زبان کی تعلیم حاصل کر کے زیادہ ملازمتیں حاصل کر لی تھیں اس دور میں انگریزوں کے خلاف کئی تحریکیں اٹھیں جو پوری طاقت سے کچل دی گئیں۔ ان میں حاجی شریعت اللہ کی تحریک خاص طور پر مشہور ہے۔

تقسیم بنگال:- جب لارڈ کرزن وائسرائے بن کر آیا تو اس نے بنگال کے بڑے صوبے کو تقسیم کر کے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر ایک الگ صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جاتی تھی۔ اور مغربی بنگال میں بہار اور اڑیسہ کے رہنے والوں کی۔ مسلمان اس تقسیم کے حق میں تھے لیکن ہندو اس کے مخالف تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس تقسیم کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن ان تمام احتجاجات کے باوجود ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کر دی گئی۔ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے نام سے دو صوبے بن گئے نئے صوبے مشرقی بنگال کا رقبہ ۱۰۶۵۰۰ مربع میل تھا اور اس میں آسام، مشرقی اور جنوبی بنگال چاٹگانگ، ڈھاکہ، راجشاہی اور مالدہ اضلاع شامل تھے۔ ڈھاکہ نئے صوبے کا دارالحکومت قرار پایا۔ دوسرے صوبے کا صدر مقام کلکتہ بنایا گیا۔ اس تقسیم پر ہندوؤں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور بالآخر دسمبر ۱۹۱۱ء میں خود شاہ انگلستان نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا۔

تحریک پاکستان:- ۱۹۰۶ء میں سر سلیم اللہ نے ڈھاکے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کانفرنس بلائی جہاں ہند کے مسلمانوں کی ایک جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور یہی جماعت بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ سر سلیم اللہ کے بعد بنگال میں کوئی بڑا مسلمان لیڈر نہ رہا۔ تاہم بنگالی مسلمان اب بیدار ہو چکے تھے اور یہاں تک کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ایک قرارداد جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہے پاس کی گئی جس میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا گیا۔

۱۹۴۱ء میں فضل الحق نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر کے مہا سبا کے لیڈر شیاما پرشاد مکرجی کے ساتھ مل کر ایک مخلوط وزارت قائم کی۔ اس وزارت کے دور میں بنگال ایک قحط کا شکار ہوا جس میں لاکھوں بنگالی اس قحط سے مر گئے۔

آزادی ہندوستان:- ۱۹۴۷ء تک حکومت برطانیہ کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس نے ہندوستان چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا گیا۔ کانگرس نے ہندوستان کی تقسیم منظور کر لی لیکن پاکستان کو ہمیشہ کے لیے کمزور کرنے کے لیے اس نے پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم کر دیا ۱۴ اگست کو جب پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا تو اس روز متحدہ بنگال کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی نے مشرقی بنگال کو خواجہ ناظم الدین کے اور دوسرے روز مغربی بنگال

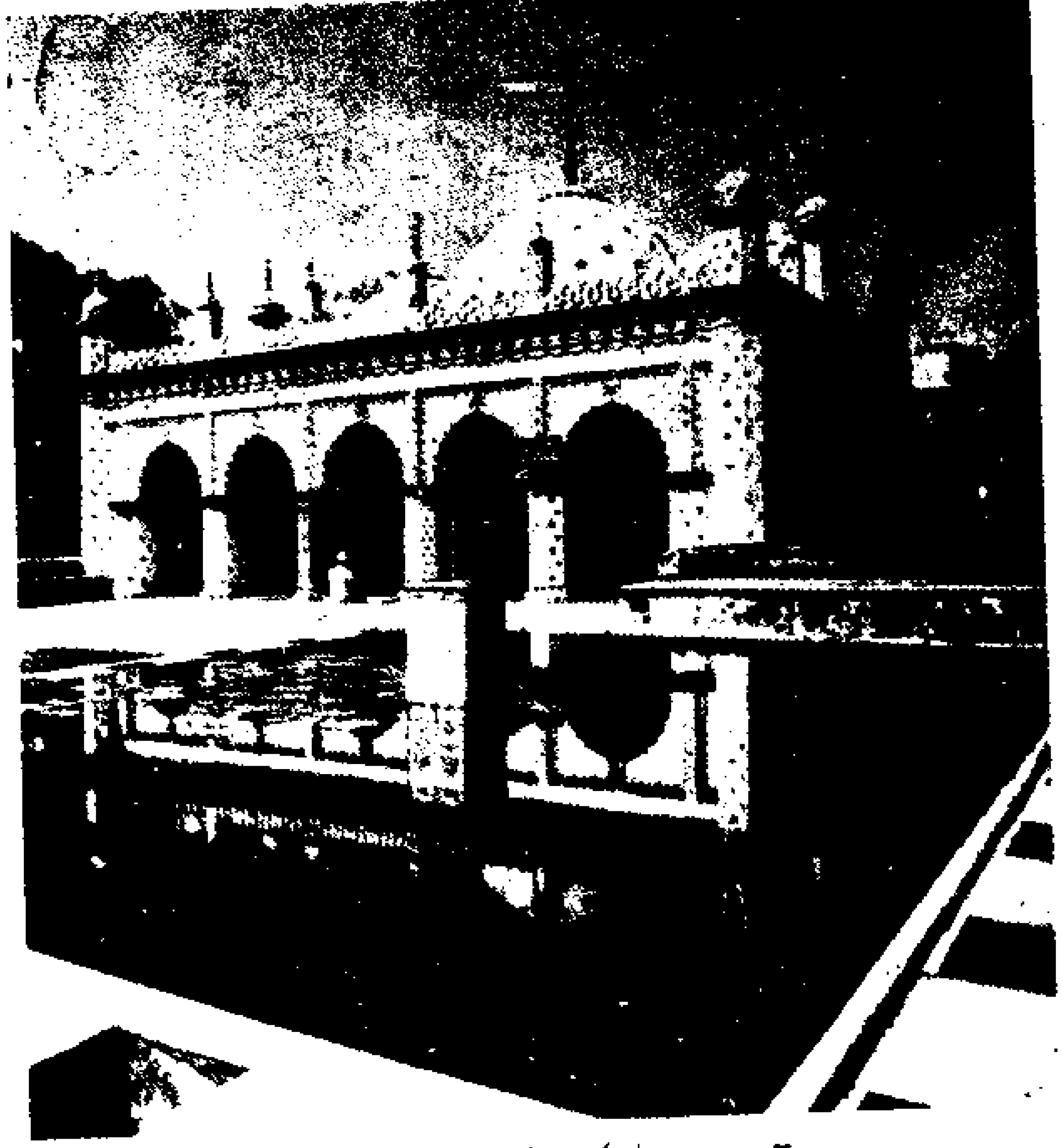

ستارہ مسجد ڈھاکہ کا ایک منظر۔

پی۔ سی گھوش کے حوالے کر دیا اور اس طرح تقریباً دو سو سال کی غلامی کے بعد اس ملک پر دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

مشرقی پاکستان:- ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مشرقی بنگال اور سلہٹ کا ضلع ملا کر مشرقی پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان متحدہ پاکستان کا ایک صوبہ رہا۔ جسے باقی صوبوں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کی نسبت زیادہ حقوق حاصل رہے۔ (نیز دیکھیے "مشرقی پاکستان")

بنگلہ دیش ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کو پاکستانی فوجوں نے بھارت اور بنگلہ دیش تحریک کی متحدہ فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو مشرقی پاکستان ایک خود مختار ریاست بنگلہ دیش کے وجود میں ڈھل گیا۔ شیخ مجیب الرحمان اس کے پہلے وزیر اعظم بنے

بنگال میں اشاعت اسلام:- بنگال ہندومت اور بدھ مت کے زیر اثر تھا۔ نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک بدھ مذہب کے پیرو پال خاندان اور ہندومت کے پرستار سین راجاؤں کی حکومتیں رہیں۔ ۷۰۰ء سے بنگال کی سب سے قدیم اور بڑی بندرگاہ چاٹگام کے راستے دنیا کے ہر گوشہ عرب، عجم، مصر، عراق ترکی اور چین سے سیاحوں، مورخوں، مجاہدوں اور تاجروں کے علاوہ صوفیوں اور درویشوں کی آمد شروع ہوئی۔

بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی متعدد وجوہات ہیں۔ ۱۔ بیرونی ممالک سے مسلمانوں کی آمد، ۲۔ مسلمانوں کی نسل میں ترقی۔ ۳۔ مقامی باشندوں کا قبول اسلام۔ محمد بن بختیار خلجی کے حملے ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء سے قبل بھی چاٹگام کے نواح میں عرب تاجروں کی آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ پہاڑپور اور مینامتی سے ملنے والے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان ہارون رشید کے وقت سے آباد تھے۔ محمد بن بختیار خلجی کے زمانے میں بیرونی مسلمانوں کی آبادی پندرہ بیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کی فتح بنگال سے بہت پہلے جن صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی ذات بابرکات کے علوم و فیوض اور کشف و کرامات سے بنگال کا چپہ چپہ متاثر ہوا ان میں احمد بن محمد معروف بہ شیخ المدار (م ۱۱ محرم ۴۴۱ھ) اور اسماعیل بن سید نیشاپوری (۱۷ شعبان ۴۶۶ھ) کا تذکرہ ملتا ہے۔

Marfat.com

اشاعت اسلام میں سلاطین، علما اور صوفیا کا بڑا حصہ ہے۔ سلاطین نے حکومت قائم کر کے علما کی سرپرستی اور صوفیا کی اعانت کی۔ مدارس جاری کیے، مسجدیں تعمیر کرائیں خانقاہیں بنوائیں اور ایک خالص مسلم معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ احمد بن بختیار خلجی کے بعد یہاں کا نقشہ حضرت سید محمد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے ایک مکتوب (۱۴۰۵ء) بنام سلطان ابراہیم شاہ میں نظر آتا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔

سرزمین بنگال کتنی اچھی سرزمین ہے۔ جہاں مختلف مقامات سے بے شمار مشائخ اور فقرا آئے۔ جنھوں نے اسے اپنا وطن بنا لیا ہے۔ مثال کے طور پر "دلیو گاؤں" کو لیجیے۔ جہاں شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کے ستر ممتاز مرید ابدی نیند سو رہے ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کے کئی اور بزرگ "مہیش" میں مدفون ہیں۔ یہی حال "دلوتلہ" میں سلسلہ جلیلیہ کے بزرگوں کا ہے۔ "نارکول" کے مقام پر بھی شیخ المشائخ اور شیخ احمد دمشقی کے بعض بہترین رفقاء کے مزاروں کا پتہ چلتا ہے۔ سلسلہ قادریہ کے بارہ بزرگوں میں سے ایک حضرت شرف الدین طولیہ کا مزار "سنار گاؤں" میں ہے۔ حضرت شرف الدین بہاری آپ کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ ان کے بعد حضرت پیر بدرالدین بدر عالم زاہدی اور متعدد دوسرے اولیائے کرام گذرے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگال کے شہروں کا تو ذکر ہی کیا کوئی قصبہ اور کوئی قریہ ایسا نہ تھا جہاں بزرگان دین نہ پہنچے ہوں اور آباد نہ ہوئے ہوں۔

جن بزرگ اور صوفیا نے بنگال میں اسلام کی اشاعت میں حصہ لیا ان کا مختصر تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں حضرت سید سمنانیؒ سارے ہندوستان کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے بنگال پہنچے ان ایام میں شیخ علاء الدین چشتیؒ کا چشمۂ فیض سارے بنگال میں جاری ساری تھا۔ حضرت سمنانی آپ کی خدمت میں بارہ سال تک رہے۔ آپ سے بیعت کی اور منصب خلافت پر فائز ہوئے آپ سمنان (عراق) کے رہنے والے تھے۔

شیخ بابا آدم شہیدؒ:- ان بزرگان دین میں سے ہیں جو ابتدائی دور میں یعنی مسلمانوں کی فتح بنگال سے صدیوں پہلے سرزمین عرب سے بنگال میں وارد ہوئے اور دین حق کی تبلیغ اور اشاعت میں اپنی زندگی گذار دی۔ اس وقت رامپال پر سین خاندان کے راجہ بلال سین کی حکومت تھی۔ بابا آدم مکہ معظمہ میں یاد الٰہی میں مصروف تھے۔ راجہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ایک مسلمان نے آپ کی خدمت میں فریاد اور مدد کا طالب ہوا۔ آپ تقریباً چھ سو مریدین کے ساتھ رامپال تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کی آمد سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچی اور وہ گائے کی قربانی بھی کرنے لگ گئے۔ راجہ نے برہم ہو کر آپ کو شہید کرادیا۔

شاہ سلطان رومیؒ:- گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ضلع میمن سنگھ کے ایک گاؤں مدن پور میں سکونت پذیر تھے۔ بڑے صاحب کشف درویش تھے آپ کی کرامات کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ میمن سنگھ کے راجہ کچھ نے آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔

شاہ سلطان بلخیؒ:- بلخ کے فرمانروا اصغر کے ولی عہد تھے۔ والد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے لیکن آپ نے تاج و تخت کے مقابلے پر فقیری کو ترجیح دی اور عازم سفر ہوئے۔ دمشق کے زمانہ قیام میں حضرت شیخ توفیق سے بیعت کی اور شیخ کی صحبت سے مستفیض ہو کر بحری راستے سے بنگال پہنچے۔ پہلے سندیپ پھر ہری رام نگر میں قیام فرمایا جہاں کا راجہ کالی دیوی کی پوجا کرتا تھا راجہ نے آپ کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور اسی کے باعث وہ آپ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا وزیر مسلمان ہوگیا۔ اس کے بعد آپ سلطان بگرہ کے ایک گاؤں مہستان پہنچے وہاں کے راجہ اور اس کی بہن شیلا دیوی نے انھیں حق پرستی کے سبب قتل کروانا چاہا۔ آپ نے ان کا مقابلہ کیا اور نہ صرف راجہ اور اس کی بہن کو قتل کیا بلکہ ان کے راج پاٹ کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ آپ نے یہیں سکونت اختیار کرلی اور مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔

شیخ جلال الدین تبریزی سہروردیؒ:- سرزمین بنگال کے ان اولیاء اللہ میں سے ہیں جو علوم باطنی اور ظاہری دونوں میں دسترس رکھتے تھے ولادت تبریز میں ہوئی۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں شروع میں آپ صاحب ثروت ہی نہیں تاجدار مملکت بھی تھے لیکن تجلیات الٰہی کے آگے دنیاوی بادشاہت ہیچ نظر آئی۔ تاج و تخت اپنے فرزند کے سپرد کر کے منزل سلوک کی طرف گامزن ہوئے۔ حضرت شہاب الدین کے مرید خاص تھے۔ سات سال تک شیخ کی صحبت میں رہے۔ دہلی کا بادشاہ سلطان التمش بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھا۔ اور آپ کی مجلس میں حاضری دیتا تھا۔ آپ نے حقیقت و معرفت کی جستجو میں دہلی، ملتان، بدایوں، اودھ، بہار اور بنگال کے سیر و سیاحت فرمائی اور ہر جگہ بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے بنگال کا ایک گاؤں پنڈوہ ہندوؤں کا مقدس مقام تھا۔ وہاں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی آپ کی آمد سے نہ صرف پنڈوا اور اس کے قرب و جوار میں شمع ہدایت روشن ہوئی بلکہ بنگال کے اکثر ضلعوں میں بھی بت پرستی کا قلع قمع ہوگیا۔ بت خانوں کی جگہ مسجدوں اور خانقاہوں نے لے لی۔ آپ ہی کے طفیل بنگال میں سلسلہ سہروردیہ جاری ہوا بندرگاہ دیومحل جو آپ کی آمد سے قبل بت پرستوں کا گڑھ تھی۔ آپ کی سکونت کے بعد خدا پرستوں کی سجدہ گاہ بن گئی۔

شاہ جلال دکنیؒ:- حضرت شاہ علی بغدادی سے تقریباً سو سال پہلے بنگال تشریف لائے تھے اصل وطن گجرات تھا۔

حضرت پیارا:- حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز کے خلیفہ خاص تھے۔ مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ آپ موتی جھیل ڈھاکہ میں ایک گنبد کے نیچے مدفون ہیں آپ ہی کی وجہ سے سلسلہ نظامیہ کا جال سارے بنگال میں پھیلا۔

سلطان بایزید بسطامیؒ:- نویں صدی عیسوی کے آخر میں ایران سے نصیر آباد تشریف لائے۔ شہر چاٹگام سے پانچ میل کے فاصلہ پر شمال جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چلہ کیا اور سخت ریاضت و عبادت کے بعد اکملیت حاصل کی اور مخلوق خدا کی اصلاح میں مشغول ہوگئے۔

بدر عالم زاہدیؒ:- بنگال کے اولیاء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اصل نام بدرالدین اور لقب بدر عالم ہے۔ ۷۴۰ھ میں چاٹگام تشریف لائے مدتوں قیام فرمانے کے بعد بہار چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

آپ کی روحانی کرامات کے ساتھ ساتھ مادی کارنامے بھی قابل ذکر ہیں روایت ہے کہ دیناج پور کے راجہ مہیش نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی تو آپ نے گوڑ کے حاکم سلطان حسین شاہ کی مدد سے اس راجہ پر چڑھائی کی اور اسے شکست دے کر اس کے علاقے کو مسلم ریاست میں شامل کرلیا۔ آپ کا فیضان اراکان، اکیاب (برما) اور ملایا کے ساحلوں تک پہنچا ہوا ہے۔ چاٹگام، کومیلا اور نواکھلی کے ملاحوں کو آپ سے بے انتہا عقیدت ہے۔ جب ملاح عازم سفر ہوتے ہیں تو پیر بدر کا نام ان کے ورد زبان ہوتا ہے۔

مخدوم شاہ دولہ شہیدؒ:- قعد یمن کے رہنے والے آپ کا سلسلہ نسب حضرت معاذ بن جبل سے جا ملتا ہے اپنے والد کے کہنے پر تبلیغ اسلام کے شوق میں بنگال کی طرف روانہ ہوئے۔ بہار کے راجہ نے جب آپ کی آمد کی خبر سنی تو بہت چراغ پا ہوا اس نے پہلے آپ کو تنبیہ سے مریدوں سمیت نکل جانے کا حکم دیا لیکن آپ نے دین اسلام کا تبلیغی کام اور تیزی سے شروع کر دیا اس پر اس نے

Marfat.com

آپ کو اور آپ کے مریدین کو شہید کر دیا۔ آپ کا مزار شہداد پور میں ہے۔

"شیخ سراج الدین المعروف شیخ اخی سراج":۔ درویش کامل اور باکرامت تھے۔ علوم باطنی اور علوم ظاہری دونوں میں دسترس رکھتے تھے۔ "انوار اصفیا" میں ان کے بارے میں لکھا ہے "کہ تمام ہندوستان میں آج تک دو بزرگوں شیخ نصیر الدین اودھی اور شیخ اخی سراج کے سلسلے جاری ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہیں گے"۔

"شیخ علاء الحق والدینؒ":۔ تلاش حق میں سرزمین پنجاب سے وادیٔ بنگال میں وارد ہوئے۔ شیخ سراج الدین کے خاص مرید تھے اور ان کا شمار بنگال کے اولیاء کبار میں ہے۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی، طلباء کی تعلیم کا انتظام، مسافروں کے رہن سہن اور غرباء اور مساکین کی امداد کے لیے آپ کی زندگی وقف تھی۔

"سید العارفینؒ":۔ آپ اشاعت اسلام کے سلسلے میں شمالی ہند کے کسی علاقے سے بنگال تشریف لائے۔ اور باقر گنج میں مقیم ہو کر اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے علاوہ شاہ قمیص، "شاہ عبدالرحیم" "شاہ نعمت اللہ" "بت شکن" "شاہ لوری" "شاہ محمد دائم اللہ" "شاہ علی بغدادی" "شاہ اسماعیل غازی" "بدیع الدین شاہ مدار" ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔

بلاشبہ مسلم فاتحین نے اپنی فتوحات سے اسلام کی اشاعت کے لیے ایک فضا پیدا کی لیکن جن لوگوں نے یہاں کے عوام کے قلوب کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا اور جن کی بدولت اس خطہ میں اسلام کی بہار آئی وہ اصل میں بنگال کے یہی صوفیائے کرام تھے۔ جن کی اخلاقی قوت کا لوہا عوام بادشاہوں سے زیادہ مانتے تھے اور جن کی تبلیغ کے خلوص کا اندازہ اس دور کی تاریخ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی حیات طیبہ سے عملی طور پر اسلام کو پیش کیا جس کا نتیجہ تھا کہ اسلام بنگال کے چپے چپے میں پھیل گیا اور آج صدیاں گذر جانے پر بھی جب کہ بنگال کے عوام اپنے ملوک و سلاطین کو بھول چکے ہیں۔ عوام کے قلوب پر جن لوگوں کی عظمت کے نقوش قائم ہیں وہ یہی صوفیائے کرام ہیں۔

علماء نے نہ صرف سلاطین کو وقتاً فوقتاً اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تلقین کی بلکہ اشاعت علم دین کیلئے متعدد مدرسے قائم کئے۔ لوگوں کو فارسی اور اور بنگلہ میں دینی و دنیوی تعلیم دی برہمنوں کے ساتھ مذہبی مناظرے کئے اور اکثر ایسا ہوا کہ علماء سے شکست کھانے کے بعد ان برہمنوں نے اہل خاندان اور عقیدت مندوں کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ ہندوؤں نے اپنے دھرم کو بچانے کے لئے اسلام کا سخت مقابلہ کیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات اور خوبیوں کو اپنے مذہب سے بہتر سمجھتے تھے۔ راجا کنس کے بیٹے جدو نے اسلام قبول کر لیا اور جلال الدین کے نام سے بنگال پر حکومت کرتا رہا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب ان با اثر لوگوں نے اسلام قبول کیا تو اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ مسلمان فرمانرواؤں کی رواداری اور رعیت پروری علماء اور صوفیاء کی دین داری اور پاکیزہ اخلاق و اطوار کے علاوہ اشاعت اسلام کا حلقہ وسیع ہونے کا سب سے بڑا سبب خود اسلام کی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی یہ خوبی تھی کہ اس میں شامل ہو کر سب برابری ہو جاتی تھی۔ جبکہ ہندوؤں میں ذات پات کی تمیز کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ قبول اسلام سے انہیں معاشرتی مساوات اور ترقی کے دروازے کھلے نظر آئے تو وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ مشرقی بنگال

سنہرا مسجد چٹاگانگ کا ایک منظر۔

کے تاثرک ہند اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح بدھ مت کے پیرو سین راجاؤں کے عہد سے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے چلے آرہے تھے۔ انہیں بھی اپنی نجات کی صورت اسلام قبول کرنے میں نظر آئی اور اس طرح بنگال میں اسلام کی اشاعت کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔

اسلام کا اثر بنگال تمدن پر بھی پڑا کیونکہ بیرون ملک سے جو مسلمان بنگال میں آ کر آباد ہوتے انہوں نے یہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے نومسلموں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے ناطے کئے اور اسطرح بنگالی مسلمانوں کی جو نئی نسل پیدا ہوئی اس کی معاشرت اور رہن سہن کا ڈھنگ اسلامی اقدار کے مطابق ڈھل گیا عقائد کے لحاظ سے یہ لوگ بیرونی مسلمانوں سے بھی زیادہ کٹر تھے اور اپنے تمام معاملات میں قرآن و حدیث کی پابندی پر زور دیتے تھے۔ حکومت کی طرف سے قوانین شریعت کے نفاذ کی بدولت سب مسلمان ایک مشترکہ ثقافتی اخلاقی اور آئینی سانچے میں ڈھل گئے اور انہی اسلامی تعلیمات کی بدولت ان کے اخلاق و روابط میں ایسا انقلاب رونما ہوا کہ کٹر سے کٹر ہندو بھی اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ (نیز دیکھئے۔ "بنگلہ دیش"، "بھارت"، "پاکستان"، "مشرقی پاکستان"، "ہندوستان"

بنگلہ بنگالیوں کی مادری زبان، جو ۱۹۴۷ء سے پہلے کبھی بھی سرکاری یا دفتری زبان نہ بن سکی۔ سلاطین بنگال کے دور میں بھی عربی اور سرکاری زبان فارسی کی مساوی حیثیت نہ رکھتی تھی البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد اشاعت دین اور سیاسی بیداری پھیلانے کے سلسلے میں بنگلہ زبان سے بڑا کام لیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک اردو مسلمانان ہند کی مشترکہ قومی زبان سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی قومی انفرادیت اور جداگانہ ثقافت کو برقرار رکھنے کے لئے بنگلہ زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا، لیکن ۱۲۰۱ء میں جب مسلمانوں نے سرزمین بنگال پر اپنے قدم رکھے تھے تو ایک ادبی اور تہذیبی زبان کے طور پر بنگلہ زبان کا کوئی مقام نہ تھا۔

اس زبان کا اصل سرچشمہ قدیم پراکرت ہے اور اس کے ارتقائی مراحل پراکرت اور اپ بھرنش ہیں بنگلہ کی ابتدائی شکل گوڑاپ بھرنش تھی۔ جو ڈاکٹر شہید اللہ کے بقول گوڑا پراکرت سے نکلی تھی اور مگدھی پراکرت کی بہن تھی۔ یہی گوڑ کا مردپ اپ بھرنش آسامی اور بنگلہ زبانوں کی ماں ہے۔ بنگلہ کی ابتدائی ارتقاء کی تاریخ اور پیدائش کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی البتہ تحقیق سے اتنا پتہ ضرور ملتا ہے کہ ۹۵۰ء اور ۱۲۰۰ء کے درمیانی عرصہ میں یعنی مسلمانوں کی آمد سے قبل

Marfat.com

یہ ادب کی کسی نہ کسی نوع میں مستعمل تھی۔ یہ عام استعمال کی زبان تھی اور اسی بناء پر اس میں بعض کول دراوڑی اور منڈا عناصر بھی داخل ہو گئے۔ بنگلہ پر جن زبانوں کا اثر ہے ان میں منڈا زبان اور سنسکرت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۳۵۰ء میں جب مسلمان حکمرانوں نے بنگال کے مختلف قطعات کو ایک انتظامی مرکز کے تحت بنگال کی شکل دی تو بنگلہ زبان ایک تہذیبی زبان کے طور پر نمایاں ہوئی۔ پندرہویں صدی عیسوی کے شروع میں یہ زبان اس حد تک ترقی یافتہ ہو چکی تھی کہ اس میں مختلف النوع احساسات اور افکار کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں نے بنگلہ کو عربی، فارسی اور ترکی کے کثیر التعداد الفاظ سے روشناس کرایا۔ اٹھارویں صدی میں بنگلہ شعراء کا ایک پورا دبستان منظر عام پر آیا۔ انہوں نے فارسی محاورے کو اپنا اسلوب خاص بنایا اور اسی لیے یہ "دوبھاشی" اسلوب کہلاتا ہے۔ جب انگریزوں نے بنگال میں قدم رکھے تو بنگلہ زبان کے ذخیرہ الفاظ میں ان کے اثرات بھی داخل ہوئے۔ مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد انگریز برسر اقتدار آئے تو بنگلہ نے ان کے زمانے میں بھی خوب ترقی کی۔ فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں اور مارش من اور کیری نے بنگلہ لغت سے اسلامی اثرات کو خارج کر دینا ضروری سمجھا۔ دوسری طرف انگریزوں نے مغربی علوم کے لیے درسگاہیں قائم کیں تو ہندوؤں نے تعلیم کے میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح ہندو مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ کر کہیں آگے نکل گئے۔ جب ہندوؤں نے زندگی کے جملہ شعبوں میں کام آنے والی نثر کی ایک مؤثر زبان بنانے کا بیڑہ اٹھایا اور یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے بنگلہ زبان اپنانے اور اس میں جدید ادب تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ یہ زبان ایسے بے شمار الفاظ سے محروم ہو چکی ہے جو ان کے معاشرے میں استعمال ہوتے ہیں اور ان الفاظ کی جگہ اس میں سنسکرت سے ماخوذ ان گنت الفاظ شامل ہو چکے ہیں۔

بیسویں صدی میں بنگلہ میں عام بول چال اور غیر ملکی زبانوں خصوصاً انگریزی سے الفاظ ترکیبیں حتیٰ کہ محاورے بھی قبول کیے اور اس طرح "کتھیا بھاشا" یا بول چال کی بنگلہ کا ادب میں استعمال ہونے لگا۔

لیکن جونہی نذر الاسلام نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو لغوی اور نحوی اعتبار سے زبان کے مروجہ سانچوں میں انقلاب آ گیا۔ نذر الاسلام نے عربی اور فارسی کے کثیر الفاظ بلکہ بعض اوقات فارسی ساخت کے جملے بھی استعمال کیے۔

بنگلہ زبان و ادب پر مسلمانوں کے جو اثرات پڑے انہوں نے زبان و ادب میں جو حصہ لیا اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کو دور متوسط دوسرے دور کو دور جدید اور تیسرے دور کو پاکستانی دور کہا جا سکتا ہے۔

دور متوسط میں مسلمانوں کے ادبی کارنامے پانچ اصناف میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۔ فارسی زبان سے رومانی داستانوں کے بنگلہ میں تراجم۔ ۲۔ رومانی داستانیں ۳۔ رزمیہ نظمیں۔ ۴۔ مذہبی اور اخلاقی شاعری۔ ۵۔ گیت اور لوک ادب۔

جہاں تک بیانیہ نظموں کی پہلی چار اصناف کا تعلق ہے مسلمانوں نے ان کی مروجہ ہیئت میں نمایاں تبدیلی کی ہے۔ پہلے ان نظموں کے آغاز میں شاعری اور فنون لطیفہ کی دیوی سرسوتی اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی تعریف و ثنا کی جاتی تھی مسلمانوں نے اس کے بجائے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں حمد و نعت کو اختیار کیا۔ حتیٰ کہ ہندوؤں نے بھی اپنی نظموں میں اسی اسلوب کی پیروی کی۔ نثر میں مخصوص اسلامی الفاظ اور تراکیب استعمال کی جانے لگیں۔

مسلمانوں نے فارسی حکایات کے ترجمے یا انہیں آزادانہ بنگلہ میں منتقل کر دینے کا کام شروع کر دیا۔ اس زبان کا پہلا مسلمان شاعر شاہ محمد صغیر ہے جس نے جامی کی یوسف زلیخا کا آزاد ترجمہ کر کے بنگلہ میں ڈھالا۔ اسی طرح آلاول نے نظامی کے سکندر نامہ اور ہفت پیکر کو ترجمے کے ذریعے بنگلہ کا جامہ پہنایا۔

تاریخی داستانوں میں وہ تصانیف ہیں جن میں تاریخ کو زیادہ حقیقت پسندانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ان روایات کا سب سے بڑا پہلا اہم شاعر سید سلطان ہے جو اعلیٰ شاعرانہ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے نوی بنگش میں سیرت نبویؐ کو اپنا آغاز موضوع بنایا اور تکوین عالم کا آغاز کر کے اپنی نظم کو امام حسینؓ کی کربلا میں شہادت تک کا واقعہ بیان کیا ہے۔

اس زمانے میں قدامت پسند علماء مذہبی تصانیف میں بنگلہ کو اظہار کا ذریعہ بنانے کے مخالف تھے۔ لہٰذا مصنفین پر یہ بات بھی ثابت کرنا لازم ہو گیا کہ تبلیغ دین بنگلہ زبان میں کامیابی اور مؤثر انداز سے کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ شاعروں نے خالص اخلاقی شاعری کے ذریعے براہ راست تبلیغ کا انداز اختیار کیا۔ عبدالحکیم کا "شہادت نامہ" بنگلہ میں خالص اخلاقی شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ عبدالحکیم نے بنگلہ میں اشاعت اسلام کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت کی ہے وہ کہتا ہے کہ بنگال میں عربی اور فارسی کے بعد اسلام کی زبان بنگلہ ہے جو لوگ عربی اور فارسی نہیں جانتے انہیں اسلامی ادب کا مطالعہ بنگلہ میں کرنا چاہیے ورنہ وہ کبھی ایمان سے واقف نہیں ہو سکیں گے اور بدستور تاریکی میں رہیں گے۔" اس کے زمانے میں اشاعت اسلام کی روایت ایک مسلم حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کا زمانہ ۱۶۲۰ء سے ۱۶۹۰ء تک کا ہے۔

اٹھارویں صدی میں متعدد مصنفین اسلامی ادب کی مختلف اصناف کی تخلیق میں مصروف تھے۔ یہی وہ دور ہے جب اس ملک میں بنگلہ کے قدم جم گئے اور مسلمان مصنفین اسی کے انداز میں لکھنے لگے۔ ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں، جن میں اس انداز کی تقلید کی گئی ہے۔ مثلاً انبیا وانی، قصص الانبیاء، نماز مہتیہ، چیت ایمان، احکام الجامع وغیرہ۔

برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوؤں کو ایک نیا معاشرتی و سیاسی مقام نصیب ہوا اور انہوں نے تعلیم حاصل کر کے ادب میں نئی نئی روایات قائم کیں۔ مغربی تہذیب و تمدن کا تمام تر اثر ہندوؤں نے قبول کیا۔ انہوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور اپنے آپ کو ان کے لیے بخوبی تیار کر لیا۔ ان میں اپنی اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کا جذبہ بھی پیدا ہوا اور بنگلہ نثر وجود میں آئی۔ ان کے مقابلے میں مسلمان انیسویں صدی کے اواخر تک دور متوسط کی روایت پر ہی عمل کرتے رہے۔ البتہ ۱۸۵۰ء کے بعد چند ایک مصنفین کے سوا سبھی مسلمانوں کو یہ روایات اختیار کرنا پڑیں۔

جب مسلمان مصنفین نے قلم اٹھایا تو انہوں نے دیکھا کہ اس دوران میں ایک ایسی نثر ترقی کر گئی ہے جس کی زبان ان کی روزمرہ بول چال سے بالکل مختلف ہے مغرب سے درآمدہ ناول کی روایت روز افزوں مقبول ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ماضی قریب کی بجائے ماضی بعید یعنی اسلامی زندگی کی انتہائی عظمت و شان کے زمانے کو اپنا موضوع بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ اقتدار کا ایک ایسا پیمانہ تلاش کیا جائے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو اور دوسری طرف اس کی روشنی میں ان کے لیے ایک ایسا اعلیٰ نصب العین متعین ہو جائے جو ہندوؤں کے آدرش رام راج کا متبادل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں آنحضورؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی سوانح عمریاں بھی اور شائع کی گئیں۔ یہ دور جذباتی انداز فکر اور انداز بیان کا تھا۔ چنانچہ اسی دور

Marfat.com

کے تمام مسلمان مصنفین کے ہاں یہی مصلحانہ طرز ناصحانہ انداز اور جذباتی لہجہ نمایاں ہے۔

بنگلہ نثر میں مذہبی ادب پیدا کرنے کے رجحان کو اسی رجحان کا ایک سلسلہ سمجھنا چاہیے۔ جس کے تحت قبل ازیں مذہبی افکار و عقائد کو منظوم شکل میں پیش کیا جاتا رہا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی ادبی تخلیقات بطور مجموعی اگر ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو ان کے مساوی ضرور تھیں۔ مسلمان حکمران باہر سے آکر بنگال میں آباد ہوئے تھے اور ساری مہذب دنیا پر عربی اور فارسی کا سکہ رواں تھا بہرکیف مسلمانوں نے بنگلہ ادب کی سرپرستی کی اور کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد انہوں نے بنگلہ کو اپنی مادری زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ مذہبی خیالات رکھنے والے افراد نے بھی محسوس کیا کہ اگر بنگلہ کو موقع دیا جاتا تو وہ بھی مذہبی اقدار کی نشر و اشاعت میں فارسی اور اردو کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ بہرحال اب وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے بنگلہ میں بنیادی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اسلام اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ اسی سبب سے آج بنگلہ بھی مذہبی افکار کی نشر و اشاعت میں ویسی ہی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ جیسی کہ اردو البتہ ابھی اس میں اردو کے برابر سرمایہ پیدا نہیں ہو سکا۔

بنگلہ دیش سابق مشرقی پاکستان جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی جارحیت کی وجہ سے پاکستان سے کٹ کر ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ (بنگلہ سرکار کے طور پر قیام ریاست کی تاریخ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے۔) یہ ریاست مشرقی بنگال اور ضلع سلہٹ پر مشتمل ہے۔ اس کے شمال مشرق اور مغرب میں بھارت جنوب مشرق میں برما اور جنوب میں خلیج بنگال ہے۔ اس کا رقبہ ۵۵۱۲۶ مربع میل (۱۴۲۷۷۶ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۴ء) ۷۱۳۱۶۵۱۷ ہے۔ صدر مقام ڈھاکہ ہے جس کی آبادی (۱۹۷۴ء) تیرہ لاکھ کے قریب ہے۔ دوسرے بڑے شہر چٹاگانگ کپتائی، کھلنا، باریسال، کومیلا، نرائن گنج، راجشاہی، میمن سنگھ اور سیدپور ہیں ۱۹۷۶ء میں بنگلہ دیش کے صدر ابوسادات صائم ہیں۔

تاریخ:۔ بنگلہ دیش، بھوک، قحط اور سیلابوں کی سرزمین ہے۔ پٹ سن چاول، نیل اور چائے کا مرکز ہونے کے باوجود وہاں کی معیشی حالت دگرگوں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہاں کی بے حساب اور روز افزوں آبادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اقتصادی حالات کی وجہ سے اہل بنگال کبھی بھی مرکز کے وفادار نہیں رہ سکے۔ بنگال اور مشرقی پاکستان کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ بنگلہ دیش کبھی بھی معیشی اور سیاسی مصائب کے چنگل سے نہیں نکل سکا۔

۱۹۰۶ء میں بنگال سے مسلم لیگ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ نواب سلیم اللہ اور فضل حق چوہدری جیسے مشاہیر نے تحریک پاکستان میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ لیکن حالات گذرنے کیساتھ ساتھ اہل بنگال کی مقامی عصبیت اپنا رنگ دکھاتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی پانے کے ساتھ ہی بنگلہ دیش پاکستان کے ایک صوبے "مشرقی پاکستان" کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ مگر حسین شہید سہروردی کی جماعت عوامی لیگ نے فوراً بنگالی زبان کو قومی بنانے کا نعرہ الاپنا شروع کر دیا، جسے قائد اعظمؒ نے بامر مجبوری تسلیم کر لیا۔ یہیں سے علیحدگی کے عناصر نے جنم لینا شروع کیا۔ اسی جماعت کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو ۱۹۶۸ء میں صدر پاکستان محمد ایوب خاں نے علیحدگی کی ایک سازش کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس سازش کا نام "اگرتلہ سازش کیس" رکھا گیا۔ انھی دنوں ایوب خان کے خلاف ایک ملک گیر تحریک کا آغاز ہوا۔ جس کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کرنا پڑا۔ انہوں نے آتے ہی علیحدگی کا چھ نکاتی پروگرام پیش کیا۔ جس میں مرکز کے پاس سوائے امور خارجہ کے کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔

انتخابی تحریک شروع ہوئی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ عوامی لیگ نے کل تین سو نشستوں میں سے ۱۶۷ نشستیں حاصل کیں۔ اب دو متضاد قوتیں برابر آچکی تھیں۔ شیخ مجیب الرحمان نے اپنی اس اکثریت کے بل بوتے پر عوامی تحریک کا آغاز کر دیا۔ جس سے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی اور متوازی حکومت کا آغاز ہو گیا۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو صدر پاکستان جنرل محمد یحییٰ خاں نے شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کر لیا۔ انہیں مغربی پاکستان لایا گیا اور فوج کو نظم و ضبط قائم کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ عوامی لیگ کے نیم تربیت یافتہ رضاکاروں نے بھارت سے امداد کی خواہش کی اور "مکتی باہنی" کے نام سے ایک چھاپہ مار فوج تشکیل دے کر پورے صوبے میں پھیل گئی۔ اگست ۱۹۷۱ء کے قریب پاکستانی فوجوں نے حالات پر قابو پا لیا۔ مگر مکتی باہنی اور دیگر باغی عناصر بھارت کی پناہ میں چلے گئے۔ جسے بہانہ بنا کر ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستانی فوجوں کی کمک اور رسد بند ہو گئی۔ بیرونی اور اندرونی دشمنوں کی وجہ سے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں پاکستانی فوجوں نے صلح کے لیے ہتھیار ڈال دیئے۔ بھارتی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہو گئیں اور مشرقی پاکستان کا صوبہ پاکستان سے کٹ گیا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے بنگلہ دیش حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ پاکستان میں نظام حکومت جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے خیرسگالی کے طور پر شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر دیا۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں شیخ مجیب الرحمان بنگلہ دیش کے پہلے صدر بنے۔ ۱۲ جنوری سے ابوسعید چودہری کو بنگلہ دیش کا صدر اور شیخ مجیب الرحمان

Marfat.com

سیلابوں کی سرزمین بنگلہ دیش میں ڈھاکہ شہر کا ایک سیلابی منظر۔

کو وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ بھارت کے ساتھ دوستی اور تعاون کے پچیس سالہ معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ شیخ مجیب کو "بنگ بندھو" (بنگال کے دوست) کا خطاب دیا گیا۔

شیخ مجیب الرحمان کے سامنے بنگال کی تباہ حالی، اقتصادی بدحالی و بھوک اور سیلابوں کے بے شمار مسائل کے علاوہ سیاسی اور انتظامی نوعیت کے مسائل بھی تھے۔ بنگلہ دیشی سکہ "ٹکہ" ایک ہی برس میں پچاس فیصد کم قیمت کا ہو گیا۔ قحط اور بدحالی سے ہزاروں بنگالی موت کے گھاٹ اترنے لگے تو عوامی لیگ کی مخالف جماعتیں سرگرم ہو گئیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کے صدر عبدالحمید خاں بھاشانی نے نئے انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ ۵ر نومبر ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی نے نئے آئین کی منظوری دے دی جو ۱۶ر دسمبر سے عمل میں آیا۔ نئے انتخابات کی تاریخ مارچ ۱۹۷۳ء رکھی گئی۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک روس تھا۔ جس نے جنوری ۱۹۷۲ء ہی میں اسے تسلیم کر لیا۔ برطانیہ نے فروری میں اسے تسلیم کر لیا اور بنگلہ دیش اپریل ۱۹۷۲ء میں دولت مشترکہ کا رکن بن گیا۔ پاکستان نے اس وقت تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا جب تک شیخ مجیب الرحمان نے بھارت پر یہ دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ پاکستان کے ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کو روکے رکھے۔

دسمبر ۱۹۷۳ء میں صدر ابو سعید چودھری کے مستعفی ہونے پر جنوری ۱۹۷۴ء میں محمد اللہ کو نیا صدر منتخب کیا گیا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کی پہلی مردم شماری ہوئی۔ اس کی رپورٹ جون ۱۹۷۴ء میں شائع کی گئی۔ جس کے مطابق بنگلہ دیش کی آبادی ۷،۱۳،۱۶،۵۰۰ تھی جو ۱۹۶۱ء کے مقابلے میں ۴۰ء۲ ٪ زیادہ ہے۔

۲۲ر فروری ۱۹۷۴ء کو شیخ مجیب الرحمان پاکستان میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنے آئے۔ جس کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو ڈھاکہ گئے تاکہ بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ قید میں موجود ۱۹۵ محب وطن پاکستانیوں کو رہا کرایا جا سکے۔ مگر ان کی گفتگو ناکام رہی۔

جولائی ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش کو سیلاب نے آگھیرا جس سے کوئی ۲۲ ہزار مربع میل کا رقبہ زیر آب آ گیا۔ کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں اور ملک کو زبردست قحط نے آگھیرا تقریباً ایک تہائی آبادی اس مصیبت کا شکار ہوئی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف سیلاب سے ۱۵ سو افراد ہلاک ہوئے۔ ایک اور بڑی مصیبت جو اس کے فوراً بعد آ کھڑی ہوئی، خانہ جنگی تھی۔ بھوکے عوام شیخ مجیب الرحمان اور اس کی حکومت سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ مظاہروں، ہڑتالوں اور قتل و غارت پر اتر آئے۔ ان ہنگاموں میں کوئی پندرہ ہزار افراد مارے گئے۔ اور کوئی دو ہزار لاپتہ ہو گئے۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو ملک بھر میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ جسے روکنے کے لئے مجیب حکومت کو سخت اقدامات کرنے پڑے۔

۱۴ر اور ۱۵ر اگست ۱۹۷۵ء کی درمیانی شب کو، جب پاکستان کا ۲۸واں یوم آزادی منایا جا رہا تھا بنگلہ دیش کے چند محب وطن فوجی عناصر نے شیخ مجیب الرحمان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ایک ہنگامے میں انہیں، پورے خاندان سمیت ہلاک کر دیا گیا۔ جناب مشتاق احمد خوندکر (کھنڈکر) کو نیا سربراہ مملکت منتخب کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ۳ر نومبر کو حکومت کا بھی تختہ الٹ دیا گیا۔ اور چند ہنگاموں کے بعد ۷ر نومبر کو فوج نے جمہوری صدارتی نظام قائم کر دیا۔ اب (۱۹۷۶ء) میں بنگلہ دیش کے صدر ابو سادات صائم ہیں۔ ان کے دور اقتدار میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہو گئے ہیں۔ بھارت نواز عناصر کہیں زیر زمین جا چکے ہیں۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے اختلافات فرخا بند کی تعمیر کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ جس سے بھارت کا مقصد دریائے گنگا کے پانی سے بنگلہ دیش کو محروم کرنا اور پانی کا رُخ کلکتہ کی طرف موڑنا ہے۔

اقتصادی اور دیگر معلومات:- بنگلہ دیش بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ ۱۹۷۲ء میں چاول کی پیداوار ایک کروڑ نوے لاکھ میٹرک ٹن، پٹ سن ۹ لاکھ ۶ ہزار میٹرک ٹن، چائے ۲۷ ہزار میٹرک ٹن، گنا سات کروڑ میٹرک ٹن، آلو ۸ لاکھ میٹرک ٹن پیاز دو لاکھ میٹرک ٹن، گندم ۹۲ ہزار میٹرک ٹن، تمباکو ۲۹ ہزار میٹرک ٹن تھی۔ زیادہ تر برآمدات چائے اور پٹ سن پر مشتمل ہیں۔ جو برطانیہ، بلجیم، مغربی جرمنی، فرانس کو بھیجی جاتی ہیں۔

بنگلہ دیش کے باشندے مچھلی اور چاول بطور غذا استعمال کرتے ہیں۔ چاول کی ملکی پیداوار بہت کم ہے۔ چنانچہ ہر سال کروڑوں ٹن چاول درآمد کیا جاتا ہے۔ جبکہ مچھلی وافر مقدار میں ملتی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں پکڑی جانے والی تازہ پانی کی مچھلی سات لاکھ بیس ہزار

Marfat.com

بھوک سے بلکتے ہوئے بچے۔ بوڑھے اور جوان بنگالی۔

ٹن اور سمندری مچھلی ایک لاکھ ٹن تھی۔

بنگلہ دیش میں تقریباً ۸۶۶۰ مربع میل کا رقبہ جنگلوں پر مشتمل ہے جن سے سالانہ ڈیڑھ کروڑ مربع فٹ عمارتی لکڑی برآمد ہوتی ہے۔ اس میں بانس اور بید شامل ہیں۔ ان جنگلوں سے ساڑھے چھ ہزار من خالص شہد بھی برآمد ہوتا ہے۔

بنگلہ دیش کی صنعت میں اس وقت کپڑے کے ۲۲ کارخانے، چینی کی سات فیکٹریاں ماچس کی اٹھارہ فیکٹریاں، شیشے کے کام کی سات فیکٹریاں کاغذ کا ایک کارخانہ، پٹ سن کے اٹھائیس کارخانے اور ایلومینیم کے ۲۸ کارخانے موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر چالو حالت میں نہیں۔

ٹیٹاس کے مقام پر قدرتی گیس کا ذخیرہ دریافت ہوا ہے، جسے ڈھاکہ لے جا کر صاف کیا جاتا ہے۔ خلیج بنگال میں سمندر کی تہ کے نیچے پٹرول کے ذخائر ملے ہیں جن سے استفادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ملک کا زیادہ تر حصہ آبی راستوں پر مشتمل ہے۔ دریائے برہم پتر، دریائے پدما اور دریائے میگھنا میں جہازرانی ہوتی ہے۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں کشتیاں چلتی ہیں۔ کہیں کہیں سڑکیں اور ریلوے لائنیں بھی قائم کی گئی ہیں۔ پختہ سڑکوں کی کل لمبائی چار ہزار میل اور ریلوے لائن کی کل لمبائی پونے دو ہزار میل ہے۔

بنگلہ دیش کا سکہ "ٹکہ" کہلاتا ہے، جو پاکستانی روپے کے برابر قرار دیا گیا تھا۔ مگر اب عالمی منڈی میں اس کی قیمت بہت حد تک گر چکی ہے۔ (نیز دیکھیے "بنگال"، "بنگلہ" "پاکستان"، "مشرقی پاکستان")۔

بنگن پلے جنوبی ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست جو ۱۹۴۸ء میں ریاست مدراس میں ضم ہوگئی۔ اس ریاست کو ایک خاص اہمیت یہ حاصل تھی کہ یہ جنوبی ہند کی واحد ریاست تھی جس کا فرمانروا مسلمان تھا اور شیعہ عقائد رکھتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اس کی آبادی ۴۴۶۳۱ تھی اور رقبہ ۲۷۵ مربع میل تھا۔ اس کا فرمانروا خاندان اپنا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے شاہ عباس ثانی اور ماں کی طرف سے شہنشاہ عالمگیر سے ملاتا تھا۔ اس خاندان کا جد امجد میر طاہر علی ترک وطن کر کے ایران سے بیجاپور آیا جہاں ایک خاندانی جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کی بیوہ نے چار بیٹوں کے ساتھ ارکاٹ کے مغل فوجدار سے پناہ طلب کی اس کے بیٹوں میں سے ایک نے بنگن پلے کے جاگیردار کی پوتی سے شادی کر لی۔

بنگن پلے پر مختلف فرمانرواؤں کی حکومت رہی۔ ۱۹۴۳ء میں بنگن پلے وجیانگر کی ریاست کے ایک بڑے حصے کے ساتھ بیجاپور کے زیر اقتدار آیا تو یہاں آصف جاہی حکومت قائم ہوگئی۔ بعد میں یہ ریاست حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی ماتحتی میں رہی۔ ۱۷۹۰ء میں حسین کے خاندان کے کسی فرد نے سلطان ٹیپو کے فوجدار کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۰۰ء میں اس پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۳۹ء تک یہ مدراس کے ماتحت رہی اور اس کے بعد سے اس کا انتظام برطانوی حکومت ہند نے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا ۱۸۷۶ء میں جاگیردار کو نواب کا خاندانی لقب دیا گیا۔ ۱۸۹۷ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ہز ہائی نس کا خطاب دیا۔ ۱۹۴۸ء میں نواب میر فضل علی خان کے دور میں اس ریاست کو ریاست مدراس میں ضم کر دیا گیا۔

بنو بیٹے۔ ابن کی جمع بنون ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے ن حذف ہوگیا۔ اور بنو رہ جاتا ہے۔ جس کے بعد کسی قبیلے کے جد امجد کا نام بطور مضاف الیہ آتا ہے۔ جیسے بنو امیہ، بنو عباس، بنو اسرائیل وغیرہ۔ اسی طرح "بنو بکر"، "بنو شیبان"، "بنو تغلبہ" "بنو عجل"، "بنو حنیفہ" اور بنو تمیم کے لیے (دیکھیے "بکر بن وائل")

بنو اسرائیل:- حضرت یعقوبؑ کی اولاد، بنی اسرائیل (دیکھیے "اسرائیل بنو")

بنور بھارت کے صوبہ مشرقی پنجاب کا ایک قدیم شہر جو انبالہ سے نو میل اور سرہند سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا قدیم نام وہنی پور تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بنی پور اور بالآخر بنور ہوگیا۔

بنور کا ذکر سب سے پہلے بابر نے کیا ہے کہ یہ علاقہ سفید حنبلی کے پھولوں اور عطر کے لیے مشہور ہے اور آج بھی یہ چیز بنور کی شہرت کے لیے بالکل اسی طرح ہے ایک روایت کے مطابق اس کا قدیم نام پشپا نگری یا پشپاوتی تھا جس کے لغوی معنی پھولوں کا شہر کے ہیں۔ بنور کو خاندان سادات کے دور میں خاص شہرت حاصل تھی۔ ۱۹۴۷ء تک یہاں پر زیادہ تر آبادی سادات ہی کی تھی یہ سادات ہلاکو کے ہاتھوں تباہی بغداد کے بعد ہجرت کر کے بھارت چلے آئے تھے۔ سید فرمانروا خضر خان کے والد ملک سلیمان خان کا مزار ۱۹۴۷ء تک اس شہر میں موجود تھا۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی میں ایک سکھ حملہ آور بندہ بیراگی نے اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳ء میں بنور کو رئیس پٹیالہ الا سنگھ نے فتح کر لیا جو ۱۹۵۶ء تک اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہا اور جب ریاست پٹیالہ مشرقی پنجاب کے نئے صوبے میں مدغم کر دی گئی تو بنور بھی صوبہ مشرقی پنجاب کا ایک شہر شمار ہونے لگا۔

بنور میں مغلوں اور سکھوں نے اس کے استحکام کے لیے دو قلعے بھی تعمیر کرائے تھے۔ جن کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ بنور کے کھنڈر جاٹ تک جو بنور سے چار میل دور ایک قدیم اور ویران شہر ہے چلے گئے ہیں سید آدم بنوری اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ موجودہ شہر کی آبادی کوئی اڑھائی لاکھ کے قریب ہے۔

بنوری، آدم:- ایک صوفی بزرگ (دیکھیے "آدم بنوری")

بنوری، ابو عبداللہؒ (وفات ۱۳ شوال ۱۰۵۳ھ / ۲۵ دسمبر ۱۶۴۳ء) معز الدین آدم بن سید اسماعیل۔ شیخ احمد سرہندی کے خلیفہ خاص۔

Marfat.com

بنور کے رہنے والے تھے۔ اپنا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملاتے ہیں۔ ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء میں اپنے دس ہزار مریدین کو لے کر لاہور آئے تو شاہجہان نے وزیر اعظم علامہ سعد اللہ خاں اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو ان کی اتنی کثیر تعداد کے ساتھ لاہور میں آمد پر تحقیقات کرنے پر مامور کیا گیا۔ شاہجہان شیخ بنوری کے جواب سے مطمئن نہ ہوا اور انہیں لاہور سے بنور اور پھر بنور سے مکہ معظمہ کی طرف بغرض حج نکل جانے کو کہا۔

بنوری اپنی زندگی کے پہلے حصے میں کچھ عرصہ فوج میں صیغۂ جزرسانی کے محکمے میں ملازمت کی لیکن ان کے زہد اور تقویٰ کے سبب ملازمت کا سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ پہلے حاجی خضر روغانی کے حلقۂ ارادت سے وابستگی اختیار کی اور پھر انہیں کے مشورے سے حضرت شیخ احمد سرہندی کی بیعت کی۔ انہوں نے صوفیاء فقراء کی تلاش میں ملتان، انبالہ، پانی پت، شاہ آباد، سرہند، لاہور اور سامانہ کا سفر کیا۔ ان کی تعلیم کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے انہیں امی عامی کہا ہے اور بعض کے نزدیک وہ اچھے حد سے تعلیم یافتہ تھے۔

بنوری نے مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ کے قریب دفن ہوئے۔ ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ انتقال کے وقت ان کے عقیدت مندوں کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ مذہبی تعلیم اتنی زیادہ نہ تھی۔ ان کا رویہ متشدد تھا حکام سلطنت سے نفرت تھی چنانچہ وہ ہر وقت تنقید و اعتراض کا ہدف بنتے رہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اپنے مسلک اور مقصد پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ ان کے خلفاء میں تقریباً ایک سو کے لگ بھگ افراد کا نام لیا جاتا ہے جن میں حافظ عبداللہ اکبرآبادی جو شاہ ولی اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے روحانی پیشوا اور سید علم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

بنوری کی تصانیف میں سے مشہور ترین ۱۔ نکات الاسرار جس میں تصوف کے دقیق مسائل پر بحث کی گئی ہے اور ان کی شرح تصوف کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ ۲۔ خلاصۃ المعارف (دو جلدیں) فارسی زبان میں ہے ۳۔ سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہیں۔

بنوری، محمد یوسف، مولانا

(ولادت ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ/ ۸ مئی ۱۹۰۸ء) سید محمد یوسف بن محمد زکریا بن میر مزمل شاہ بن میر احمد شاہ بنوری پاک و ہند کے ایک بہت بڑے عالم دین، شیخ الحدیث اور مصنف پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد، ماموں اور اپنے علاقے کے دوسرے علماء سے حاصل کی۔ کابل بھی گئے اور وہاں کے علماء سے فیض حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت پانے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند کا سفر اختیار کیا اور دارالعلوم دیوبند میں تکمیل تعلیم کی۔

آپ کے اساتذہ میں حافظ عبداللہ بن خیر اللہ پشاوری۔ مولانا عبدالقدیر قاضی القضاۃ جلال آباد کابل۔ شیخ محمد صالح قیلنوی افغانی اور مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری وغیرہم ہیں۔ مولانا انور شاہ کاشمیری سے آپ نے دورہ حدیث کیا اور سند حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انور شاہ کاشمیری کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہیں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔

۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء میں ڈابھیل کی مجلس علمی کی طرف سے حجاز، مصر، یونان ترکی کا سفر کیا۔ دوران سفر میں آپ نے وہاں کی بڑی بڑی اور علمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہیار سندھ کے ارباب حل و عقد کے شدید اصرار پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو چھوڑ کر دارالعلوم میں شیخ التفسیر اور شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور تین سال تک یہ خدمت سرانجام دینے کے بعد کراچی تشریف لے گئے۔ وہاں سے حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا۔ حج سے واپسی پر نیو ٹاؤن کراچی نمبر ۵ میں ایک علمی ادارہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور اب اس مدرسہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔

علامہ بنوری عربی زبان کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ شاعرانہ ذوق رکھتے ہیں اور بہترین نعتیں لکھی ہیں جو ایک علمی رسالے "الاسلام" میں چھپ چکی ہیں۔

آپ اردو، فارسی، پشتو اور عربی چاروں زبانوں کے ادیب اور شاعر ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں آپ دمشق کی مجلس علمی کے ممبر ہیں۔

تصوف میں آپ مولانا اشرف علی تھانوی کے مجاز صحبت ہیں ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں جب آپ مکہ مکرمہ گئے تو وہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ حضرت مولانا محمد شفیع الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے نوازے گئے۔

تصانیف میں آپ کی مشہور ترین کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عوارف المنن مقدمہ معارف السنن (عربی)
۲۔ معارف السنن شرح جامع ترمذی (عربی) (چھ جلدیں)
۳۔ بغیۃ الاریب فی احکام القبلۃ والمحاریب (عربی)
۴۔ نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ انور (عربی) (مولانا انور شاہ کاشمیری کی سوانح)
۵۔ یتیمۃ البیان فی مشکلات القرآن (عربی)
۶۔ تسخیر کائنات اور اسلام (اردو)
۷۔ ختم نبوت۔

ان کے علاوہ جن کتابوں پر آپ نے مقدمے لکھے ہیں وہ بجائے خود ایک تصنیف ہیں۔ ان میں سے فیض الباری شرح بخاری۔ مقدمہ مشکلات القرآن۔ مقدمہ عبقات، مقدمہ عقیدۃ الاسلام بنزول عیسیٰؑ۔ مقدمہ نصب الرایہ لتخریج الہدایہ مقدمہ مقالات الکوثری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بنوں

پاکستان کا ایک شہر اور ضلع، جو صوبہ سرحد میں واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء میں شہر کی آبادی ۱۲،۵۱۶ اور ضلع کی آبادی ۳۰۷،۳۹۳ تھی، ۱۹۷۲ء میں شہر کی آبادی ۵۳ ہزار اور ضلع کی آبادی ساڑھے پانچ لاکھ کے قریب تھی۔

بنوں کا شہر انگریزوں نے آباد کیا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں ایک فوجی افسر لیفٹیننٹ ہربرٹ ایڈورڈز نے اسے آباد کیا اور اس کا نام ایڈورڈ آباد رکھا جو بعد میں اس وادی کے قدیم نام اور قبیلے بنوچیوں کے نام پر بنوں کہلایا اس وادی پر زمانۂ قدیم سے مختلف حملہ آوروں کی یورشیں ہوتی رہیں۔ محمود غزنوی کے بعد دو صدیوں تک یہ علاقہ مغلوں کے پاس رہا ۱۷۳۸ء میں اسے نادر شاہ افشار ایرانی نے فتح کیا اور پھر احمد شاہ درانی کی فوجوں نے اسے پامال کیا۔ ۱۸۲۳ء میں لاہور کے سکھ راجا رنجیت سنگھ نے اس وادی پر قبضہ کیا اور پہلی جنگ کے بعد ۱۸۴۹ء میں یہ علاقہ برطانیہ کے قبضے میں آگیا تو شہر بنوں کی بنا رکھی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس شہر نے کوئی حصہ نہیں لیا۔

بنوں شہر بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہاں گرم کپڑے کی ایک مل بھی ہے جس کی وجہ سے یہ ایک تجارتی مرکز بن گیا ہے۔ شہر کے قریب ہی اکرہ نام کا ایک ٹیلہ ہے جس کے پاس سے یونانی دور کے آثار قدیمہ ملے ہیں۔

Marfat.com

بنی :۔ اولاد، قبیلہ کے لیے عربی لفظ۔ (دیکھیے "بنو")

بنی اسرائیل :۔ حضرت یعقوب کی اولاد، بنواسرائیل (دیکھیے "اسرائیل بنو")

بنی اسرائیل، سورۃ قرآن مجید کی ۱۷ ویں سورت۔ اس میں ۱۲۔ رکوع اور ۱۱۱ آیات ہیں۔ مکی دور کی آخری سورتوں میں سے ہے۔

اس سورت کا نام اسرا بھی ہے۔ اس کی پہلی ہی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ سورۃ معراج کے موقع پر نازل ہوئی جو ہجرت سے ایک سال قبل پیش آیا تھا۔ سورت کی ابتدا آنحضورؐ کے واقعہ معراج سے کی گئی ہے اور اس واقعہ میں مسجد اقصیٰ کا ذکر کرکے بتایا گیا ہے کہ وہ برکات جو بیت المقدس سے تعلق رکھتی تھیں اور جن کے ساتھ بنی اسرائیل کو مخصوص کیا گیا تھا اب وہ برکات آنحضورؐ اور امت محمدیہؐ کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہیں۔ معراج نبوی میں گویا عروج اسلام کا ذکر کرکے مضمون کا رُخ بنی اسرائیل کے دو مرتبہ فساد عظیم برپا کرنے اور ان پر دو مرتبہ سزا آنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ذکر سے ایک طرف تو بنی اسرائیل کو سمجھانا مقصود ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے۔

دوسرے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ اعلیٰ اغراض زندگی کو ترک کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی قومیں دنیا میں بھی تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور اسی ضمن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا ہر ایک عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ نتائج یہاں انسان کی نظر سے مخفی رہتے ہیں اور قیامت کے روز کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ دنیا میں بھی جب کوئی قوم حد سے تجاوز کرتی ہے تو یہ نتائج کھلا رنگ اختیار کرکے سامنے آجاتے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے رکوع میں عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور بار بار کرایا گیا ہے کہ یہی اعلیٰ اغراض زندگی ہیں جن کی طرف انسان کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ اسی تعلیم میں توریت کی بھی ساری تعلیم آگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تیسرے رکوع میں دوسروں سے نیکی کرنے کی تعلیم دی گئی ہے چوتھے رکوع میں دوسرے کے ساتھ برائی کرنے سے روکا ہے۔

پانچویں رکوع میں توحید کا مضمون شروع کرکے آخرت پر ایمان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر جب تک آخرت میں اعمال کی جزا و سزا پر پورا یقین نہ ہو اخلاق فاضلہ حاصل نہیں ہو سکتے۔

چھٹے رکوع میں اسی قانون جزا و سزا کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے عذاب خداوندی کے آنے کا قانون بتایا گیا ہے۔

ساتویں رکوع میں آنحضورؐ کے مخالفین پر عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

آٹھویں رکوع میں کفار کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو وہ آنحضورؐ کے خلاف کرتے تھے۔ دکھوں اور تکلیفوں کے بعد آنحضورؐ کو بادشاہت اور دولت کا لالچ دینا اور بالآخر آپؐ کے قتل کا منصوبہ۔

نویں میں حق کی کامیابی کی عظیم الشان بشارت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ باطل پرستی اب اس ملک سے ایسی دور ہو گی کہ پھر دوبارہ نہ آئے گی اور ضمناً یہ بھی سمجھا دیا کہ دنیا میں روز بروز توحید کا غلبہ ہوتا چلا جائے گا۔

دسویں رکوع میں قرآن پاک کے اعجاز عظیم کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ظاہر پرست مخالفین ظاہری کامیابی اور مال و دولت ہی کو معیار صداقت ٹھہرانے میں غلطی پر ہیں۔

گیارہویں رکوع میں انکار رسالت اور اس کی سزا کر کے

بارہویں رکوع میں پھر شریعت موسوی اور اس کی صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شریعت محمدیہ اور اس کی حقانیت کا ذکر کیا ہے اور آخری آیات میں سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری نبی عیسیٰؑ کے متعلق عقیدہ ابن اللہ کا رد کیا ہے۔

بقول مولانا مودودیؒ اس سورت میں تنبیہہ، تفہیم اور تعلیم تینوں ایک متناسب انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔

تنبیہہ کفار مکہ کو کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل اور دوسری قوموں کے انجام سے سبق لو اور خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر سنبھل جاؤ اور ضمناً بنی اسرائیل کو بھی تنبیہہ کی گئی ہے کہ پہلے جو سزائیں تمہیں مل چکی ہیں ان سے عبرت حاصل کرو۔

تفہیم کے پہلو میں بڑے دلنشیں طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ انسانی فلاح کا مدار دراصل کن چیزوں پر ہے۔ نیز توحید، معاد، نبوت اور قرآن کے برحق ہونے کی دلیلیں بڑے دل نشیں انداز میں دی گئی ہیں۔

تعلیم کے پہلو میں اخلاق اور تمدن کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر زندگی کے نظام کو قائم کرنا دعوت محمدی کے پیش نظر تھا اور یہ گویا اسلام کا منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال پہلے اہل عرب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔"

بنیامین حضرت یعقوبؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ بنیامین اور حضرت یوسفؑ ایک ہی ماں سے تھے اور حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

قرآن مجید میں ان کا ذکر بغیر نام دیئے کیا گیا ہے۔

"یوسفؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا دیکھتے نہیں کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں" .... یہ لوگ یوسفؑ کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھو گیا تھا۔) اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ جب یوسف ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا۔ "بادشاہ کا پیمانہ ہمیں نہیں ملتا۔" (اور ان کے جمعدار نے کہا) "جو شخص لا کر دے گا۔ اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے۔ اس کا میں ذمہ لیتا ہوں۔" ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔" انہوں نے کہا "اچھا اگر تمہاری بات جھوٹ نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟" انہوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔" تب یوسفؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کر دی، پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی۔ اس طرح ہم نے یوسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی .... ان بھائیوں نے کہا "یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں۔ اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسفؑ) بھی چوری کر چکا ہے۔ یوسفؑ ان کی یہ بات سن کر پی گیا۔ (۱۲: ۵۸، ۷۷)

بنیامین کے قبیلے کا شمار بنو اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں ہوتا تھا۔ اگرچہ ان کی تعداد

Marfat.com

بہت کم تھی۔ اسی طرح بنیامین کی اولاد میں اسرائیلی سردار بھی ہو گذرے ہیں جن میں طالوت بن قیس الدباغ اور یشبوشت بن طالوت قابل ذکر ہیں۔

بواط، غزوہ ایک مہم جو آنحضورؐ کو ۲ ھ میں پیش آئی۔ مگر اس میں جنگ تک نوبت نہیں پہنچی۔ دراصل ہجرت کے بعد سے مشرکین نے نوزائیدہ اسلامی ریاست کے خلاف طاقت آزمائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ وصال نبویؐ تک دس برس کی مختصر مدت میں آنحضورؐ کو تقریباً مسلسل حالت جنگ میں رہنا پڑا۔ دشمن کے مقابلے میں چوکنا رہنے کی ہر وقت ضرورت تھی۔ آپ صحابہ کرامؓ کے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے مختلف اطراف میں روانہ فرماتے رہتے تھے۔ بعض مہمات میں آنحضورؐ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ ربیع الاوّل ۲ ھ میں آپ دو سو مہاجرین کو لے کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کو خالف کرنے کی غرض سے بواط تشریف لے گئے۔ سعدؓ بن معاذ مدینے میں نائب مقرر ہوئے لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور آپؐ چند روز بعد واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ تاہم مورخین نے اس مہم کو غزوہ ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔

بوٹی شاہ انیسویں صدی عیسوی کا ایک مورخ۔ غلام محی الدین لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ بطور تاریخ نویس شہرت پائی۔ اس کی مشہور ترین کتاب تاریخ پنجاب ہے جو اس نے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں لکھی یہ تاریخ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایک خاتمے کا باب ہے۔ اس کے مقدمے میں پنجاب کی وجہ تسمیہ اور وہاں کے جغرافیائی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں سدومن سے راجے رتھور تک کے حالات درج کئے ہیں۔ تیسرے باب میں سکھوں کے گرونانک سے گرو گوبند سنگھ اور اس کی اولاد کا ذکر ہے۔ اور باب چہارم میں سکھ سرداروں اور مہاراجاؤں کے جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد برسر اقتدار آئے۔ حالات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اس کے پانچویں باب میں رنجیت سنگھ کے تسلط اور انگریزوں کی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مصنف کا دعوٰی ہے کہ اس سے پہلے پنجاب کے حالات اس قدر تفصیل سے کسی دوسری کتاب میں درج نہیں ہیں۔

بوحمارہ (۱۸۶۵ء/۱۲۷۹ھ - یکم رمضان ۱۳۲۷ھ/۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء) جلالی بن ادریس مراکش کا ایک باغی۔ کوہستان زرہون میں پیدا ہوا۔ انجنیئری کی تعلیم حاصل کی اور حکومت کے ایک معمولی شعبے میں ملازم ہو گیا۔ لیکن جلد ہی بعض الزامات کی بنا پر اسے ملازمت سے سبکدوش کر کے قید کر دیا گیا۔ بعد میں وہ الجزائر چلا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں واپس آ گیا اور اپنا نام تبدیل کر کے مولائی عبدالعزیز کا بھائی ہونے کا دعوٰی کر دیا اسی بنا پر قبیلہ غیاطہ کی بہت سی شاخوں نے اسے اپنا سلطان تسلیم کر لیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد بعض دوسرے قبیلے بھی اس کے ہمنوا بن گئے۔ ۱۹۰۲ء میں تازا کے مقام پر تخت نشین ہوا۔ یہ اکثر گدھی پر سوار ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا لقب بوحمارہ پڑ گیا۔

مولائی عبدالعزیز نے اس کے خلاف ۱۹۰۲ء میں بعض مہمات روانہ کیں لیکن انہیں شکست ہوئی۔ بالآخر ۱۹۰۳ء میں شریفی عساکر نے اسے فاس کے قریب شکست دی اور اس کے دارالحکومت پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن بوحمارہ نے دوبارہ اپنی شکست خوردہ فوج کو جمع کیا اور دوا ور سرغنوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے ساتھ اس نے اہل ہسپانیہ سے بھی بات چیت شروع کر دی اور یقین دلایا کہ اس علاقے میں انہیں کان کنی کے لئے مراعات مل سکتی ہیں۔

۱۹۰۸ء میں اس نے تازا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور فاس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ نئے سلطان مولائی عبدالحفیظ نے کئی بار فوجیں بھیجیں۔ بالآخر ۱۹۰۹ء میں وہ بوحمارہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بوحمارہ کو گرفتار کر کے ایک پنجرے میں بند کر کے فاس کے بازاروں میں پھرایا گیا۔ اور بعد میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور نعش کو جلا دیا گیا۔

بودلہ پیر (وفات ربیع الثانی ۱۰۶۰ھ/اپریل ۱۶۵۰ء) ہندوستان کے ایک بزرگ صوفی بہبود علی نام تھا بودلہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ والد بہت امیر کبیر تھے جو اپنی وفات کے بعد بہت سا مال و دولت چھوڑ گئے تھے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے ساری دولت خدا کی راہ میں دے کر راہ فقر اختیار کی۔ اور حضرت شاہ معین الدین علی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف ہو گئے۔ سلطان عبداللہ شاہ قطب شاہ کے عہد میں حیدرآباد تشریف لائے اور محلہ دبیرپورہ میں سکونت اختیار کر کے خلق خدا کو فیض پہنچانے میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے معجزات اکثر کتب میں درج ہیں۔ دبیرپورہ دروازہ میں آپ کا مزار ہے ربیع الثانی میں آپ کا سالانہ عرس مبارک بڑے شاندار طریقے سے منایا جاتا ہے۔

بوران تاریخ کی دو مشہور عورتیں۔ ایک خلیفہ المامون کی زوجہ اور دوسری خسرو پرویز کی بیٹی۔ خلیفہ المامون کی بیوی کا نام خدیجہ اور بوران لقب تھا اس کا باپ حسن بن سہیل تھا جو المامون کا ایرانی وزیر تھا۔ صفر ۱۹۲ھ/دسمبر ۸۰۷ء میں پیدا ہوئی۔ دس سال کی عمر میں مامون سے نکاح ہوا۔ اور رخصتی کی رسوم رمضان ۲۱۰ھ/دسمبر ۸۲۵ء میں واسط کے قریب حسن بن سہیل کی اپنی جاگیر میں فم الصلح کے مقام پر ادا کی گئی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ جن دنوں شادی کی رسوم ادا کی گئیں۔ ان دنوں بوران کا باپ وزیر نہیں تھا۔ لیکن مامون کی خواہش تھی کہ اس خاندان سے اپنی وابستگی کا اظہار بڑے عمدہ طریق سے کرے۔ اسی موقعہ پر بوران نے ابراہیم بن المہدی کی سفارش بھی کی تھی۔ بوران نے تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بوران کی رہائش اس محل میں تھی جو جعفر برمکی کی ملکیت تھا اور بعد میں قصر الحسن کے نام سے مشہور ہوا حسن نے یہ محل بوران کو جہیز میں دے دیا تھا۔ بوران کے انتقال کے بعد یہ محل خلیفہ کی ملکیت میں آ گیا۔

بوران یا بوران دخت، خسرو پرویز کی بیٹی اور ساسانی ملکہ اس نے ۶۳۰ء میں ایک مختصر مدت تک حکومت کی۔

بورنو نائیجیریا اور سوڈان کا ایک علاقہ، اس کا جغرافیائی لحاظ سے کبھی واضح تعین نہیں ہو سکا۔ اس کا رقبہ پینتالیس ہزار نو سو مربع میل ہے۔ ایک وسیع ریتلے میدان پر مشتمل ہے۔ اس کا پانی وہ ندیوں میں بہتا ہے جو جھیل شاد کے دلدلی کناروں پر جا کر اس علاقے کے شمال مشرق کرنے پر باہم مل جاتی ہیں۔ عہد قدیم میں دریائے شری کو بورنو کی مشرقی سرحد خیال کیا جاتا تھا اور بلاد بگرمی سے بورنو کو جدا کرتا تھا اس علاقے پر جرمن قابض تھا ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد عارضی طور پر یہ علاقہ

Marfat.com

برطانیہ عظمیٰ کی حفاظت میں دے دیا گیا تھا۔ بعد میں اسی صوبے میں بورنو اور دکوہ کے شیوخ کی ریاستیں اور کچھ دوسرے انتظامی حلقے بھی شامل کر دیئے گئے۔

بورنو کی قدیم تاریخ سلطنت کانم کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ بورنو کا سب سے پہلا بادشاہ شہنشاہ کانم سیف نامی ایک شخص تھا۔ عہد قدیم میں اس خطے کی حکمران جماعت کو معنی کہا جاتا تھا اور یہ حکمران جماعت سفید رنگ والی تھی۔ اس کی اصل کا تعلق طوارق سے ہے جنہوں نے اپنے شمال کی تبو قوم کو اپنے اندر ضم کر لیا اور سلطنت کانم کی بنیاد ڈالی۔ انہی حکمرانوں نے سلطان بری بری کو یہاں آباد ہونے کی اجازت دی۔ اس سلطنت نے گیارہویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں یہ اسلامی سلطنت بہت طاقتور ہو گئی تھی۔ اور اس کا اثر شمال مشرق میں مصر اور جنوب میں دکوہ تک پہنچ گیا تھا۔ ابن خلدون نے شاہ کانم اور مالک بورنو کا ذکر کیا ہے اور بورنو سے مراد بحیرہ شاد سے دکوہ تک کا علاقہ مراد ہے ۱۳۸۹ء میں خاندان سیف کو اس کے ایک اور قریبی قبیلے نے کانم سے مار بھگایا۔ نیز بعد میں قبائلی نقل و حرکت سے کنوری قوم بحیرہ شاد کے مغرب میں آگے تک بڑھ گئی اور ۱۴۷۰ء میں دریائے یوبی پر نگر رگمو کی بنیاد رکھی اسے بورنو کی مملکت اور کنوری قوم کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ جو تین سو سال تک ان کا دارالحکومت رہا۔ ۱۵۰۰ء میں ان کنوریوں نے بگجی کو دوبارہ فتح کر لیا۔ اور اپنے سابقہ ملک کانم کو بھی بورنو کا ایک صوبہ بنا لیا۔

سولہویں صدی عیسوی میں بورنو کی سلطنت کافی دور تک پھیل گئی۔ جن حکمرانوں نے بورنو کی حدود سلطنت کو وسعت دی ان میں سب سے زیادہ اہم مے ادریس امۂ تھا۔ جس نے کانو جیسے دور دراز علاقے تک لشکر کشی کی اور تبو کے قبائل کو بھی اپنا مطیع بنا لیا۔ بورنو پر اس کے بعد دو سال تک سکوت کا زمانہ رہا۔ بعد میں چند ایک عوامل ایسے پیش آئے جس نے بورنو کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ ان عوامل میں ایک تو سات سالہ قحط ہے اور دوسرے اہل مراکش کی سنغ کی فتح سے جو ابتری عام پھیل گئی تھی اس کے اثرات بھی بورنو تک پہنچے۔ نیز انیسویں صدی کے شروع میں جب فلانیوں نے مغرب میں آگے تک جہاد کیا تو بورنو ان اثرات سے بھی متاثر ہوا۔ ۱۸۰۸ء میں بورنو کے فلانی گجبہ میں اکٹھے ہو گئے احمد بن علی کو شکست دی اور اس کے دارالحکومت نگر رگمو کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ مے احمد کانم کی طرف بھاگ نکلا جہاں اس نے وہاں کے ایک رئیس کانمی سے امداد طلب کی اس نے مے احمد کو دوبارہ بحال کر دیا اور فلانیوں کو باہر نکال دیا لیکن مے احمد کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کو شکست دینے کے لیے پھر آموجود ہوئے۔ یہاں سے بورنو کی جدید تاریخ کا آغاز شروع ہوتا ہے۔

الکانمی نے بنو فلانی اور لبغرمی پر پھر فتح پائی اور سیف کے قدیم خاندان کو رسمی بادشاہوں کے طور پر بحال کر دیا۔ لیکن خود کُکوہ پر قابض ہو گیا۔ ۱۸۳۵ء میں اس کے انتقال پر اس کا بیٹا عمر اس کا جانشین بنا۔ اس نے بنو فلانی سے صلح کر لی۔ اسی گفت و شنید کے دوران میں عمر کی غیر حاضری میں سیف کے شاہی خاندان نے وادی کے حکمران کو بلا کر کانم کے خاندان کو باہر نکالنے کی سازش کی جو ناکام رہی اور سیف خاندان کا آخری وارث ابراہیم لڑائی میں مارا گیا۔ اب عمر بورنو کا قانونی حکمران بن گیا۔ اس نے مے کی بجائے شہو (شیخ) کا لقب اپنایا اور کانم بو کے نام سے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس نے کُکوہ کو دوبارہ تعمیر کرایا جو وادی کے لوگوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا تھا وادی کے ساتھ مسلسل جنگ نے بورنو کو بہت کمزور کر دیا تھا اور زِندر کا خطہ آزاد ہو گیا۔

۱۸۹۳ء میں رباح ایک بڑی فوج کے ساتھ بورنو میں داخل ہوا۔ اس نے کُکوہ کو ختم کیا اور دکوہ میں فوجی حکومت قائم کی۔ ۱۹۰۰ء میں رباح نے فرانسیسی فوج کے ہاتھوں شکست کھائی اور مارا گیا۔ رباح کا بیٹا فضل اللہ جو مغرب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں نائجیریا میں گجبہ کے مقام پر ایک معرکے میں کام آیا۔ بعد میں فرانسیسی حکام نے شہو بکر جرباہی کو لا کر خاندان کانمی کو بحال کر دیا۔ ۱۹۰۷ء میں شہو بکر سیدگری کے قریب بررہ میں مقیم ہو گیا۔ جو اب تک بورنو کا دارالحکومت چلا آ رہا ہے دکوہ جرمن کیمرونز کا حصہ ہو گیا تھا۔ جو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمنی کے شکست کھا جانے کے بعد انجمن اقوام نے برطانیہ اور فرانس کی تحویل میں دے دیا اور دکوہ برطانیہ کے علاقے میں آیا۔

بورنو میں کنوری، فلانی، الحوصہ، شوہ عرب اور کچھ دوسرے قبائل کے لوگ رہتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں بورنو کی کل آبادی ۱۱۱۸۳۹۰ تھی۔ کنوری، فلانی، شوہ عرب اور الحوصہ قبائل کا مذہب اسلام ہے۔ فقہی مذہب مالکی ہے۔ طریقت میں قادریہ اور تجانیہ کے حامی سب سے زیادہ ہیں۔ صوبے کے جنوبی اور جنوب مشرقی پہاڑی علاقوں میں رہنے والے قبائل بیشتر لا مذہب ہیں۔

میدوگری میں ایک مستقل ہوائی اڈا ہے۔ پہلے زمانے میں غلاموں اور ہاتھی دانت کی تجارت ہوتی تھی۔ اب مونگ پھلی، کھالوں، گوند، روئی وغیرہ کی تجارت ہوتی ہے۔

چونکہ یہ خطہ نہ ہی صنعتی ہے اور نہ اس میں شہر ہیں۔ اس کی آبادی کا زیادہ تر پیشہ زراعت ہے۔

بورنیو جزائر شرق الہند کا دوسرا اور دنیا کا تیسرا سب سے بڑا جزیرہ۔ سیاسی اعتبار سے بورنیو تین جداگانہ یونٹوں میں تقسیم ہے۔ جس میں سے پہلے دو برطانوی دولت مشترکہ کا حصہ ہیں اور ایک انڈونیشیا جمہوریہ کا حصہ ہے۔ اس جزیرے کے بڑے انڈونیشی حصے کو کلی من تن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو انڈونیشی جمہوریہ کا ایک صوبہ ہے اور برطانوی حصہ برطانوی کارنی بورنیو اور مشرقی ملایا پر مشتمل ہے کل رقبہ ۱۵ ہزار مربع میل ہے۔

انڈونیشی بورنیو کے مشہور دریا کاپیوس، بارلٹو اور مہاکام ہیں۔ بورنیو کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق پچاس لاکھ اور ۱۹۷۴ء کے مطابق ساٹھ لاکھ ہے۔ جس میں سے انڈونیشی بورنیو کی آبادی تقریباً چار لاکھ ہے۔

اسلامی مطالعات کے نقطۂ نظر سے اس جزیرے کی اہمیت بہت کم ہے کیونکہ بورنیو کے اندرونی علاقے کی تقریباً کل آبادی بے دین ہے۔ ساحلی علاقوں میں اسلام اور عیسائیت کا کچھ نفوذ ہو گیا ہے۔ اور اب آہستہ آہستہ بورنیو کے اندرونی علاقوں کی طرف پھیل رہا ہے۔ ۱۹۴۲ء سے سیاسی حالات عیسائی مذاہب کی بجائے اسلامی تبلیغ کے لئے سازگار ہو گئے۔ مسلمانوں کی سرگرمیوں کا اہم مرکز مغربی ساحل پر پونتیانک ہے۔ (نیز دیکھیے "انڈونیشیا")

بوزجانی، ابوالوفا: ایک مسلمان ریاضی دان (دیکھیے "ابوالوفا البوزجانی")

بوزنطیہ: سلطنت روم کا نام (دیکھیے "بزنطینی سلطنت")

Marfat.com

بُوسعید جو عمان اور زنجبار کا حکمران خاندان اس خاندان کا بانی احمد بن سعید تھا جو عمان کے یَعرُبی امام سیف بن سلطان ثانی کے تحت صحار کا والی ہوگیا تھا۔ اس نے نادر شاہ کے سپہ سالار محمد تقی خان شیرازی کے حملے کے وقت صحار کا بڑی کامیابی کے ساتھ بچاؤ کیا۔ بعد میں اپنی حکمت عملی اور جنگی قوت کی بدولت احمد بن سعید عمان کا مالک بن گیا۔ غالباً ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں اس نے امام کا لقب اختیار کیا۔ بعض کے نزدیک ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں یہ لقب اپنایا۔ احمد ترکوں کا طرفدار تھا اور اس وجہ سے ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں اس نے بصرے کو بچانے میں ترکوں کی مدد کی تھی۔ اس نے ہندوستان کے بحری قزاقوں کو دبانے میں بھی اقدامات کیے اور اپنے دور میں تجارت کو فروغ دیا۔

۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں احمد کا بیٹا سعید تخت نشین ہوا لیکن وہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چنانچہ حکومت سے کنارہ کش ہوگیا اور اختیارات اپنے لڑکے حامد کے سپرد کرکے الرستاق میں چلا گیا جہاں غالباً ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

حامد نے ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۱ء میں وفات پائی۔ اور اس کے بعد اس کا چچا مسمی سلطان اس کا جانشین ہوا۔ جس نے چاہبار، ہرمز، گشم، بندرعباس اور بحرین کو فتح کیا ایران نے چاہبار اور بندرعباس بوسعید کو پٹے پر دے دیے۔ اس نے برطانیہ کو بندرعباس میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت دی۔ اس کو وہابیوں کی طرف سے بڑا خطرہ تھا

۱۲۲۰ھ/۱۸۰۴ء میں سلطان لنگہ کے نزدیک ایک بحری لڑائی میں کام آگیا اور اس کے بعد تخت حاصل کرنے کے لیے جنگ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بالآخر بدر بن سیف نے وہابیوں کی مدد سے تخت پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اسے سعید بن سلطان نے قتل کرا دیا اور اپنے بھائی سالم کے ساتھ مل کر حکومت کرنے لگا۔ جب ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں سالم کا انتقال ہوگیا تو سعید اکیلا حکمرانی کرنے لگا۔ سعید اپنے خاندان کا ممتاز ترین فرمانروا تھا۔ وہ برطانیہ کا پکا حلیف تھا۔ خاندانی نزاع کی وجہ سے قیس بن احمد نے صحار کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اور اس علاقے نے خود مختاری حاصل کرلی۔ دوسری طرف وہابیوں سے اسے اکثر حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے بعض اوقات تو انہیں کچھ دے دلا کر اپنا پیچھا چھڑانا پڑتا تھا اور بعض اوقات برطانیہ کی مداخلت کی دھمکی دلا کر۔ اس نے زنگی اور غلاموں کی تجارت پر پابندی عائد کردی۔ نیز اس نے اپنے افریقی مقبوضات کو ترقی دے کر ایک تجارتی مملکت میں تبدیل کردیا۔ سعید جب تخت پر بیٹھا تو اس کے زیر اقتدار صرف زنجبار کا ایک حصہ اور اسی طرح مانیا اور لامو کا کچھ حصہ تھا۔ اس نے اپنی حکومت عرب اور سواحلی نوآبادیوں میں مقدشو سے راس ڈنگا ڈو تک پھیلا لی

سعید کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ثوینی مسقط پر اور اس کا لڑکا ماجد زنجبار پر قابض ہوگیا۔ ان کا جھگڑا لارڈ کیننگ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے زنجبار پر ماجد کا قبضہ بحال رہنے دیا اور ایک خاص رقم جو خراج کی تعریف میں نہیں آتا تھا۔ ثوینی کو ہر سال ادا کرنے کو کہا۔ ماجد کے بعد برغش اس کا جانشین ہوا۔ مشرقی افریقہ میں جرمنوں کا نفوذ ہو جانے کی وجہ سے ایک انگریزی فرانسیسی جرمن جماعت کو بوسعیدی مملکت کی حدود متعین کرنے کے لیے تحقیقات پر مامور کیا گیا۔ اور بعد میں اس جماعت کے فیصلے کے مطابق برغش کو زنجبار، پیما اور چھوٹے چھوٹے جزیرے جو ان سے بارہ میل کے فاصلے کے اندر واقع ہوں۔ جزیرہ نمائے لامو، لنگی سے کمینی تک کا ساحلی علاقہ دس میل اندر تک کسمیو، براوا، مرکہ، مقدشو اور ورشیخ کا حاکم تسلیم کرلیا گیا۔

۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں ایک اور انگریزی اور جرمنی سمجھوتے کے تحت دریائے امبا کے شمالی جانب کے مقبوضات جرمن نے خرید لیے اور ساحلی تقریباً سارے کا سارا علاقہ انگریزوں کی سیادت میں آگیا۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں انتظام نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ اور ایک انگریز وزیر اعلیٰ مقرر کردیا گیا۔

۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء اور ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء میں برغش نے اقتدار چھیننے کی کوشش کی اور اسی دوسری کوشش کے دوران میں ایک انگریزی جہاز نے اس کے محل پر گولہ باری کرکے اس کا خاتمہ کردیا۔

۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء تا ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں علی بن حمود چونکہ کم عمر تھا۔ اس لئے ایک انگریز وزیر اس کا نائب السلطنت رہا۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں زنجبار کی ذمہ داری برطانوی محکمہ خارجہ سے محکمہ مستعمرات کی طرف منتقل کردی گئی۔

ثوینی جو عمان پر قابض تھا قتل کردیا گیا۔ اس کے قتل کا شبہ اس کے بیٹے سالم پر کیا گیا اور تھوڑے ہی دن حکومت کرنے کے بعد عزان بن قیس نے اسے وہاں

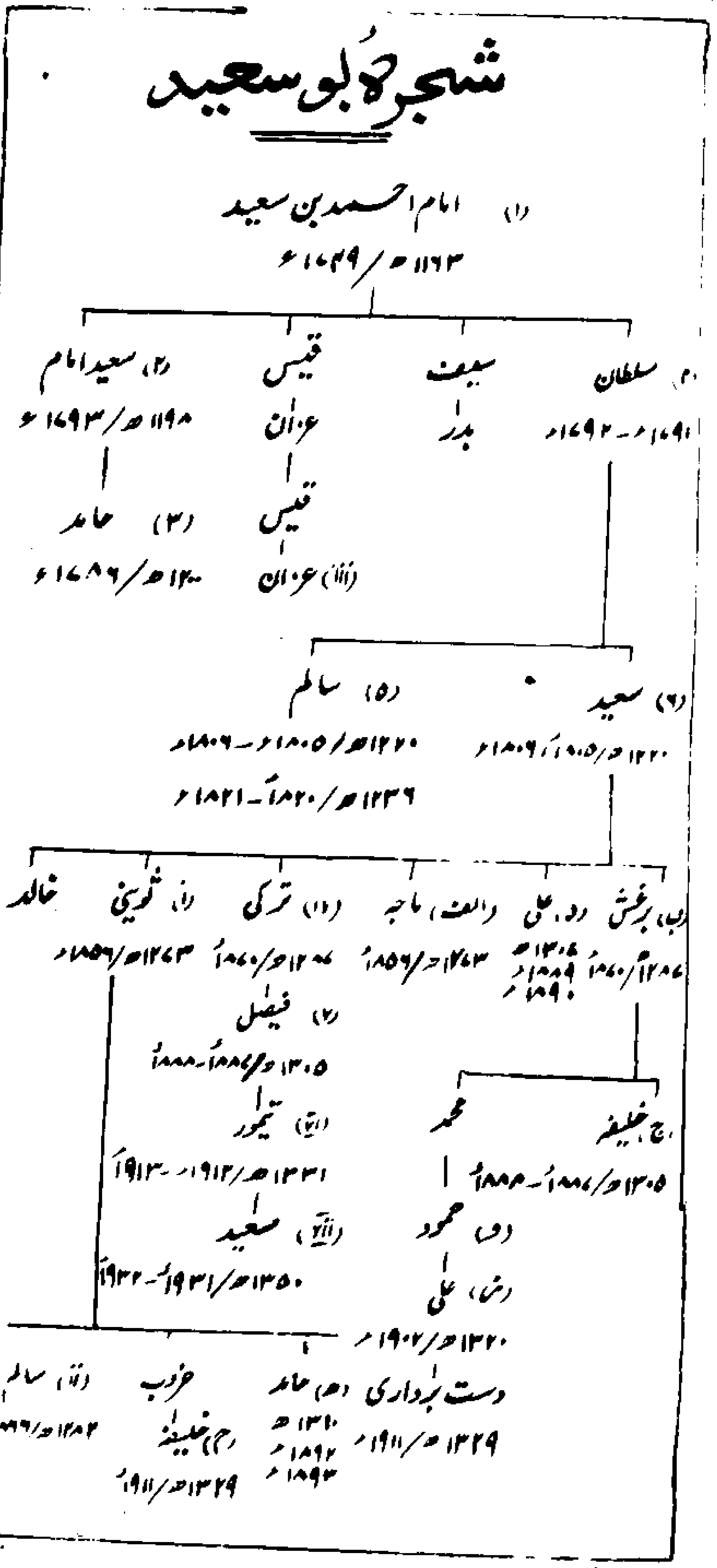

Marfat.com

سے نکال دیا لیکن عزان بھی خانہ جنگی میں کام آگیا۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں ترکی اور عزان کا بھائی ابراہیم مل کر عمان پر حکومت کرنے لگے۔ صحار ابراہیم کے حصہ میں آگیا لیکن دو سال بعد ترکی نے اس سے چھین لیا۔ اسی زمانے میں بندر عباس کو دوبارہ اجارے پر لے لیا اور چاہبار پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں عیسےٰ بن صالح کے زمانے میں ایک مخالفانہ تحریک شروع ہوئی۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں سالم الخروسی کو امام منتخب کرکے ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء میں باغیوں نے مسقط پر حملہ کر دیا جسے ایک ہندوستانی فوج کے دستے کی مدد سے بچایا گیا اور سالم کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے جانشین نے سید تیمور سے معاہدہ کر لیا اور اس معاہدے کی رو سے اندرون ملک کے قبائل کو خود مختاری مل گئی۔ عمان جدید میں ظفار اور سلطان کشم اور راس الخیمہ کے شیخ کے علاقے اور صحرا کی سرحدیں شامل ہیں۔ بخیرہ کے اردگرد ایک محافظ قلعہ اور مامون ریاست ہے جس میں ایک معاہدے کی رو سے جنگ نہیں ہوتی۔

درج ذیل شجرہ نسب میں اردو ہند سے عمان اور زنجبار دونوں کا حاکم رومن ہندسے فقط عمان کا حاکم اور حروف تہجی فقط زنجبار کا حاکم ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

بوسنہ یوگوسلاویہ کے اندر ایک علیحدہ عوامی جمہوریہ جو بوسنیا اور ہرزگودینا کے جغرافیائی اور تاریخی خطوں پر مشتمل ہے۔ بوسنیا اور ہرزگودینا کا کل رقبہ ۵۱۱۲۹ کلومیٹر ہے۔ یہ یوگوسلاویہ کے مغربی اور زیادہ تر کوہستانی خطے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس میں معدنی ذخائر جنگلات اور آبی قوت بکثرت ہے ملک کے زیادہ بڑے شمالی حصے کو بوسنیا اور دریائے نرتوا کے طاس سمیت جنوبی اضلاع پر مشتمل علاقے کو ہرزگودینا کا نام دیا جاتا ہے۔ بوسنیا نامی دریا کے منبع اور بالائی طاس کے اردگرد ایک ضلع کے آثار ملے ہیں جو بوسنہ کہلاتا تھا۔ پے در پے ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ تغیرات کے بعد یہ خطہ آخر کار ایک نئی مملکت کا مستقل جزو بن گیا اور یہ نئی مملکت بوسنہ نام سے موسوم ہوئی۔ ترکوں کے عہد حکومت میں بوسنیا عثمانی سلطنت کا ایک سنجاق تھا۔

۱۸۷۸ء سے ۱۹۱۸ء تک بوسنیا اور ہرزگودینا کا موجودہ علاقہ آسٹریا کی حکومت کے ماتحت رہا۔ ۱۹۲۹ء میں یوگوسلاویہ میں پارلیمانی حکومت کی بساط الٹ جانے کے بعد وہاں ایک آمرانہ حکومت قائم ہوگئی۔ اس حکومت کے دور میں پورے ملک کو تقسیم کرکے نو بڑی انتظامی وحدتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس تقسیم سے بوسنیا اور ہرزگودینا کے علاقے کے بعض حصے دوسری وحدتوں میں شامل کر دیئے گئے۔ موجودہ زمانے میں یوگوسلاویہ کے اندر ایک علیحدہ عوامی جمہوریہ بوسنیا و ہرزگودینا بنادی گئی۔

عوامی جمہوریہ بوسنیا و ہرزگودینا کی یوگوسلاویہ کی دوسری جمہوریتوں کی طرح اپنی الگ ایک عوامی مجلس قانون ساز ہے جس کی مجلس عاملہ اور اعلیٰ سرکاری دفاتر سراجیو میں ہیں اور یہی مقام اس جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ملک کو بارہ اضلاع اور ایک سو چونتیس پرگنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

بوسنیا اور ہرزگودینا میں اسلام ترکی حکومت کے قائم اور مضبوط ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ترکوں نے بوسنیا پر پہلا حملہ ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں شاہ تورتکو کے عہد حکومت میں کیا۔ دوسرا حملہ ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء میں کیا گیا۔ لیکن ترکوں کو شکست اٹھانا پڑی۔ دوسرے ہی سال بوسنیا کی فوج نے سربیا کے والی لازار کی زیر قیادت جنگ قوصوہ میں حصہ لیا۔ جنگ کے دوران میں سلطان مراد کو بہت شدید زخم آیا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ لیکن شہزادہ بایزید فتح پانے اور ڈیوک لازار کو گرفتار کرنے کے بعد بادشاہ

زگرب (یوگوسلاویہ) کی ایک مارکیٹ

ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد ڈیوک کے جانشینوں نے ترکوں کی سیادت قبول کرلی سربیا کے باجگزار ہو جانے سے بوسنیا کی حیثیت اور بھی کمزور ہوگئی اور اس کے بیشتر حصے پر آزاد امراء کا قبضہ ہوگیا۔ ۷۹۴ھ/۱۳۹۱ء میں جب ترکوں نے سکوپ کو فتح کیا تو ایک ایسا سرحدی علاقہ تشکیل میں آگیا جس کے ڈانڈے بوسنیا اور سربیا سے ملتے تھے۔ ۱۴۲۰ء میں جب تورتکو ثانی نے اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد ترکوں کی سیادت تسلیم کرلی تو ترکوں نے بوسنیا کے بادشاہوں کو بھی خراج ادا کرنے کا پابند بنایا ترکوں کا اس تمام علاقے پر آہستہ آہستہ اثر بڑھتا چلا گیا ۸۶۷ھ/۱۴۶۲ء میں جب بوسنیا کے بادشاہ نے خراج دینے سے انکار کر دیا تو ترکی فوجوں نے سلطان کی قیادت میں بوسنیا پر حملہ کرکے بوسنیا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ہنگری کے بادشاہ نے بوسنیا پر چڑھائی کرکے بوسنیا کا ایک حصہ ہنگری میں شامل کر لیا۔ بوسنیا کا پہلا سنجاق بے محمد بے منت ارغلو تھا۔ ۸۷۴ھ/۱۴۶۹ء میں ہرزگودینا کی سنجاق کی بنیاد پڑی اور اس کا بقیہ حصہ ترکوں نے ۸۸۶ھ/۱۴۸۲ء میں فتح کیا۔ بوسنہ کی سنجاق کا صدر مقام سراجیو میں تھا۔ جہاں دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں سنجاق بے غازی خسرو بے نے نہایت شاندار عمارات تعمیر کرائیں ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں خسرو وہاں حاکم سنجاق کی حیثیت سے آیا۔ اس زمانے میں سراجیو کا شہر ایک وسیع اور اہم مقام کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

۹۹۰ھ/۱۵۸۰ء میں بوسنیا کی ایالت تشکیل دی گئی اور اس کا صدر مقام بانالوقہ مقرر ہوا۔ جو سات سنجاقوں پر مشتمل تھا۔ بعد میں یہ ایالت آٹھ سنجاقوں پر مشتمل ہوگئی۔ ہرزگودینا کا نام پندرہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ جب ایک امیر نے اپنے دور کے شاہ بوسنیا کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا بعد میں یہ علاقہ ہرزگ کی سرزمین کہلانے لگا۔

بوسنیا کو جب ترکوں نے فتح کر لیا تو پھر انہوں نے اس میں اپنا معاشرتی نظام بھی رائج کیا جو سختی سے ایک مرکزی حکومت اور ان کے اپنے عسکری اور جاگیرداری آئین پر مشتمل تھا۔

اس زمانے میں بوسنیا میں اسلام کی خوب ترویج و اشاعت ہوئی اور دوسری طرف اشاعت اسلام کی وجہ حکمران مذہب کو تمام طبقوں یعنی کسانوں ،

Marfat.com

جاگیرداروں اور شہری لوگوں میں اپنے پیرو اور طرفدار حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی اور چونکہ امرائے بوسنیا اور ہرزگودینا نے اکٹھے اسلام قبول کیا تھا اس لئے انھیں اپنی جاگیریں بدستور رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ترکی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد بوسنیا کا شہر ترقی کرنے اور بڑھنے لگے۔

ترکی کاریگری کی خصوصیات بوسنیا کے پہلے دور کی دستکاری کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ چنانچہ چرم سازی، زرگری اور ان صنعتوں میں جو عسکری ساز و سامان تیار کرنے اور شہری لوگوں کی ضروریات مہیا کرنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہت زیادہ ترقی ہوئی اور ان اسباب کی بنا پر بوسنیا اور ہرزگودینا کے شہروں نے بہت ترقی کی۔ اس کے علاوہ ان شہروں میں مساجد، تکیے اور دینی مدارس کثرت سے تعمیر ہوئے نیز کتب خانے بنے جو مساجد اور مدارس سے ملحق ہوتے تھے۔ الغرض بوسنیا کے شہر ترکی قوت کے حصار اور اسلامی ثقافت کے رکن رکین بن گئے۔

۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں اس سنجاق میں پچیس ہزار سے زائد عیسائیوں کے مکانات اور تیرہ سو سے زائد عیسائی بیواؤں کے مکانات تھے اور چار ہزار سے زائد غیر شادی شدہ مسیحی مرد تھے۔ جس کے مقابلے میں مسلمانوں کے تقریباً چار ہزار پانچ سو مکانات اور دو ہزار تین سو سے زائد غیر شادی شدہ مرد تھے۔

دسویں صدی ہجری/ سولھویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں بوسنیا کے خاص خاص شہروں نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔

بوسنیا کی ایالت کے انتظامی ڈھانچے اور حدود نے گیارہویں صدی ہجری/ سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں جو متعین صورت اختیار کر لی تھی تقریباً اس صدی کے اواخر تک اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوا۔ لیکن بارہویں صدی ہجری/ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ترکی کی نئی اصلاحات نے بوسنیا کے مسلمانوں میں لازماً غصہ پیدا کیا۔ اور اس بنا پر شورشیں اور بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انہی شورشوں اور بغاوتوں سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں کسانوں کی شورشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۷۵ء میں ایک بڑی بغاوت کا آغاز ہوا۔ جس میں عیسائی کسانوں کے ساتھ ساتھ آغاؤں اور بیگوں نے بھی حصہ لیا۔ اس بغاوت کے موقع پر دول یورپ نے مداخلت کی اور سان شفانو کے معاہدے میں یہ بات واضح طور پر قرار پائی کہ ترکی بوسنیا اور ہرزگودینا کو خود مختاری دے دے۔

چنانچہ موتمر برلن کی شرائط کے تحت بوسنیا اور ہرزگودینا کو آسٹریا ہنگری کی امانت میں دے دیا گیا۔ بوسنیا اور ہرزگودینا کی آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۷ لاکھ تھی۔ یہاں کے لوگ سربوکروٹ زبان بولتے ہیں۔ قومیت کے لحاظ سے یہ لوگ سرب، کروٹ اور تیسرے وہ جو اپنی قومیت واضح نہیں کرتے میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں ۳۲٫۲ فیصد مسلمان ہیں۔

۱۹۴۵ء سے ملک کی بڑھتی ہوئی صنعت کاری کی وجہ سے بوسنیا اور ہرزگودینا میں متعدد صنعتی کارخانے اور ادارے قائم کیے گئے ہیں صنعت کان کنی کو عہد جدید کے مطابق بنا کر وسعت دی گئی ہے۔
ذرائع مواصلات اور خصوصاً ریل کے معاملے میں یہ ابھی پیچھے ہے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں تہذیبی پسماندگی موجود ہے۔ آسٹریا ہنگری کی حکومت نے فرقہ وارانہ مدارس کا خاتمہ کیے بغیر سرکاری نگرانی میں ابتدائی مدارس قائم کیے۔ ۱۹۱۱ء سے لازمی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ لیکن جو مدارس اس مقصد کے لیے قائم کیے گئے ہیں ان میں صرف پڑھائی کے قابل عمر کے بچوں کی ۵۵٫۱۸ فیصد کو تعلیم دی جا سکتی تھی۔ ۱۹۳۸ء - ۱۹۳۹ء میں ابتدائی تعلیم کے مدارس کی تعداد صرف ایک ہزار بانوے تھی۔ چنانچہ اس وقت بڑے پیمانے پر خواندگی پھیل رہی ہے اور مزید اس طرف توجہ دی جا رہی ہے
بوسنیا پر ترکی فتح کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ بوسنیا اور ہرزگودینا میں مسلمانوں کی قومی اور نجی دونوں قسم کی طرز زندگی ترکی حکومت کے عہد میں ویسی ہی ہو گئی جیسی کہ سلطنت عثمانیہ کے دوسرے شہروں میں تھی۔ اس لیے اس ثقافت کے خدوخال اپنی خصائص و حدود کے اعتبار سے زیادہ تر شہری تھے۔ اگرچہ ترکوں کے بعد اور بالخصوص یوگوسلاویہ کا ایک حصہ بن جانے کے بعد مشرقی ثقافت کے اثرات زائل ہونے لگے لیکن مشرقی طریق زندگی کے بہت سے خدوخال مثلاً رہن سہن، گھر کے ساز و سامان اور بعض پرانی رسموں میں اب تک پائے جاتے ہیں۔

اسلامی ثقافت کے دیرپا نقوش فن تعمیر اور شہری منصوبہ بندی کے میدان میں پائے جاتے ہیں۔ بوسنیا اور ہرزگودینا میں فن تعمیر کی اسلامی طرز کی نفیس ترین یادگاروں کا آغاز ترک حاکموں کے دور سے ہوتا ہے۔ ان یادگاروں میں فوچہ کی مسجد الدزہ۔ مسجد غازی خسرو بیگ، سراجیوو کی مسجد علی پاشا، مدرسہ غازی خسرو بیگ سراجیوو کا برسہ بزستان نیز بہت سی اور یادگاریں ہیں۔

ترکی، عربی اور فارسی زبان کے الفاظ و محاورات کی بہت بڑی تعداد بوسنیا اور ہرزگودینا میں روزمرہ کے استعمال میں ہے اور خاص کر جہاں سربی کروٹ بولی جاتی ہے اس خطے میں زیادہ رائج ہیں۔

بوسنیا اور ہرزگودینا میں اسلامی تعلیم و ثقافت کے گہوارے جو دوسرے ترکی علاقوں کی طرح "مکتب" "مدرسے" اور مذہبی ادارے ہوا کرتے تھے۔ یہ مکتب اور مدرسے بدستور مذہبی تعلیم گاہوں کی حیثیت سے جاری رہے۔ ۱۹۰۹ء کے قانون نافذہ کے ضوابط کے مسلمان بچوں کی "مکتبوں" میں حاضری لازمی تھی اور کوئی مسلمان بچہ پہلے مکتب میں پڑھے بغیر قانونی مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۸۸۷ء میں شرعی قانون اور شرعی عدالتوں کے ہونے والے قاضیوں کے لیے ایک درسگاہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

نئے یوگوسلاویہ میں اسلامی مذہبی فرقے کی حیثیت اور حقوق کا تحفظ آئین میں ضروری دفعات کے ذریعے کرا دیا گیا ہے۔ مذہبی تنظیمات حکومت سے علیحدہ کر دی گئی ہیں کیونکہ مذہبی معتقدات کو ایک نجی معاملہ سمجھا گیا ہے۔ مذہبی فرقے اپنے مذہبی عمال اور عملے کی تربیت کے لیے سکول چلا سکتے ہیں۔

بُوشَہر یا بوشیر۔ ایران کے صوبہ فارس کا ضلع اور شہر جو ایک لمبے اور تنگ جزیرہ نما کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ ۱۷۳۴ء تک بوشہر کی حیثیت ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھی یہاں تک کہ نادر شاہ نے اسے خلیج فارس میں اپنی بحریہ کا مستقر بنایا اور اسے بندر نادریہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے بعد اس شہر میں ایک بہت بڑا جنگی جہاز بنانے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ جہاز بنانے کا تجربہ ناکام

Marfat.com

رہا لیکن نادر شاہ کے اس شہر کی طرف توجہ دینے سے یہ خوب پھولنے پھلنے لگا اور جس زمانے میں انگریزوں اور ولندیزیوں کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے بندر عباس سے اپنے کارخانے اس شہر میں منتقل کر لیے تو اس شہر کو تجارتی اعتبار سے بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کریم خاں زند کے عہد حکومت میں ایران کا دارالحکومت شیراز کو قرار دیا گیا۔ چونکہ بوشہر شیراز کے ساتھ ایک تجارتی شاہراہ کے ذریعے ملا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوشہر نے ملک کی مرکزی بندرگاہ کی حیثیت اختیار کر لی اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ ۱۷۷۵ء میں ابراھام پارسنز کے قول کے مطابق اس شہر کی آبادی تقریباً بیس ہزار تھی۔ اور تقریباً دو تہائی آبادی بصرے کی مہم پر گئی ہوئی تھی۔

برطانیہ اور ایران کی مختصر سی جنگ کے دوران میں دسمبر ۱۸۵۶ء میں برطانوی فوج نے اس شہر پر قبضہ کر لیا جو مارچ تک قائم رہا۔ برطانیہ کا بوشہر سے تعلق تھا بعد میں یہ تعلق سیاسی بھی ہو گیا اور یہ شہر خلیج فارس میں پولیٹیکل ریذیڈنٹ کا صدر مقام بن گیا تھا۔ یہ تعلق وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مستحکم تر ہوتا چلا گیا اور شہر کی تجارت میں دوسرے ممالک بھی حصہ لینے لگے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی ربع میں بوشہر میں برابر خوشحالی قائم رہی یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں ٹرانس ایرانین ریلوے کے مکمل ہو جانے اور بندر شاپور اور خرم شہر کے ترقی پا جانے کی وجہ سے اسے ملک کی بڑی بندرگاہ کی حیثیت حاصل نہ رہی اور ۱۹۴۱ء میں اس شہر کی آبادی پندرہ ہزار رہ گئی۔

بوصیر مصر میں کئی مقامات کا نام، جہاں یونانی دیوتا اوسیرس کو خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا۔ دریائے نیل کی شاخ دمیاط کے مغربی کنارے پر الغربیہ کے صوبے میں واقع ایک مقام بوصیر کہلاتا ہے۔ ازمنہ وسطی میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور ایک قریبی بستی بنا سے ملا ہوا تھا۔ قدیم زمانے میں یہ خاصا مشہور تھا۔ یہاں ایک اسقف رہتا تھا۔

قرون وسطی میں جس بوصیر کو بوصیر قوریدس کہا جاتا تھا کم از کم گیارہویں صدی ہجری سترہویں صدی عیسوی میں بوصیر الملق کے نام سے مشہور ہے۔ اور درمیانی مصر کی مغربی پٹی کے اندر صوبہ فیوم کے مدخل پر واقع ہے۔ اس قصبے کے اردگرد ایک صوبہ بوصیریہ کے نام سے وجود میں آ گیا تھا جو چند ہی روز قائم رہ سکا۔ بہت سے مقامات کا نام بوصیر ہونے کی وجہ سے اس کا صحیح تعین کرنا بہت دشوار ہے۔ اموی خلیفہ مروان ثانی نے جہاں انتقال کیا تھا اس بوصیر کے بارے میں زیادہ تر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ وہ بوصیر الملق ہی تھا۔

بوصیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایسے فرعون کے جادوگروں کا وطن تھا اور یہاں کے باشندے جادوگری میں مشہور تھے۔ اس وقت اس بوصیر کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اب ایک بوصیر دفنو صوبہ فیوم میں واقع ہے۔

بوصیری (یکم شوال ۶۰۸ھ یا ۶۱۰ھ/۷ مارچ ۱۲۱۲ء یا ۱۲۱۴ء - ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء) ابو عبداللہ شرف الدین محمد بن حماد عربی شاعر اور صوفی۔ بربری نسل کے قبیلہ صنہاجہ کی ایک شاخ بنو حبنون سے تھے۔ ان کا باپ بوصیر کا رہنے والا تھا۔ اس وجہ سے بوصیری کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں۔ تعلیم کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ بلبیس میں کاتب کے عہدے پر خدمات سر انجام دیتے رہے۔ کوئی خاص نمایاں شہرت حاصل نہ کی آخری عمر میں ٹانگ کی پنڈلی ٹوٹ گئی اور معذور ہو گئے۔ اس دوران میں قاہرہ میں قیام پذیر رہے اور بقول سیوطی اور حاجی خلیفہ ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء-۱۲۹۶ء اور ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء اور ۱۲۹۵ء میں قاہرہ میں وفات پائی اور امام شافعی کے مقبرے کے قرب میں دفن کیے گئے۔

بوصیری کو سیرت سے خاص لگاؤ تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مناظرے کا بڑا شوق تھا اور اسی شوق کے سبب انہوں نے انجیل اور تورات کا براہ راست مطالعہ کیا۔ انہوں نے اپنے اشعار میں مخالفین کا رد انہیں کی مقدس کتابوں سے کیا ہے۔ خطاطی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اگرچہ تصوف اور شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ تھا لیکن جب سے زین الدین یعقوب بن زبیر کی قربت حاصل ہوئی تو آنحضورؐ کی مدح میں شاندار قصائد لکھنے شروع کیے۔ یہی نعتیہ قصائد بوصیری کی شہرت کا باعث بنے۔ صوفیا کے ہاں بوصیری کا بڑا درجہ ہے بوصیری نے طریقت میں ابوالحسن شاذلی کے خلیفہ ابوالعباس المرسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔

بوصیری کی شاعری کو دو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کے دو قصیدے جو سفر حج سے قبل کا دور ہے۔ ۱۔ "اللامیۃ فی الرد علی النصاری والیہود" ۲۔ "ذخر المعاد فی معارضۃ بانت سعاد" ہیں اور حج سے واپسی کے بعد کے دور کا مشہور قصیدہ "بردۃ" ہے۔

بوعلی سینا:۔ دنیائے اسلام کا ایک نامور طبیب (دیکھیے "ابن سینا")

بوعلی قلندرؒ (۶۰۵ھ/۱۲۰۸ء - ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ/۳ ستمبر ۱۳۲۴ء) شیخ ابو علی شرف الدین بن سالار فخر الدین ہندوستان کے بزرگ اور مجذوب اولیاء میں سے ایک۔ آپ کا شجرہ نسب امام ابو حنیفہؒ سے ملتا ہے۔ "الزار الاصفیاء" میں آپ کا شجرہ نسب اس طرح درج کیا گیا ہے۔ شیخ شرف الدین بن سالار فخر الدین بن سالار حسن بن دانک بن امام اعظم ابو حنیفہؒ۔ آپ کے والد ماجد ۶۰۰ھ/۱۲۰۴ء میں عراق سے ہندوستان آئے جو بڑے متبحر اور جید عالم دین تھے۔ ان کی پہلی شادی حضرت بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان کی وفات پا جانے کے بعد دوسری شادی مولانا سید نعمت اللہ ہمدانی کی ہمشیرہ بی بی حافظہ سے ہوئی۔ انہی کے بطن سے بوعلی قلندر نے جنم لیا۔ آپ نے کم سنی ہی میں تمام علوم پر دسترس حاصل کر لی اور تقریباً بیس سال تک دہلی میں قطب مینار کے پاس درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ دہلی کے بڑے بڑے علماء آپ کے متبحر علمی کے قائل تھے۔ لیکن جب آپ نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا تو اہل مدرسہ کو خیر باد کہہ دیا اور کتابیں دریا میں پھینک کر ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ پر جذب و سکر کی حالت طاری ہو گئی۔ پانی پت کے مضافات باگھوتی اور بڈھا کھیڑا میں سکونت اختیار کر لی۔

"معارج الولایت" کے مؤلف نے بوعلی قلندر کو خواجہ بختیار کاکیؒ کا خلیفہ لکھا ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی حضرت نظام الدین اولیاء سے بھی ارادت و خلافت منسوب ہے۔

قیام پانی پت کے دوران میں حضرت خواجہ شمس الدین ترک اپنے خلیفہ

Marfat.com

کے حکم سے بو علی قلندر کے ہاں قیام پذیر ہوئے تھے۔

حضرت شیخ جلال الدین محمود پانی پتی بھی شیخ بو علی قلندر ہی کے فیض نظر سے راہ طریقت پر گامزن ہوئے تھے۔ روایت ہے کہ کم سنی کے زمانے میں شیخ جلال الدین گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرے انہیں دیکھ کر بو علی قلندر نے فرمایا: زہے اسپ وزہے سوار۔ چنانچہ آپ کی یہ آواز کانوں میں پڑتے ہی شیخ جلال الدین بے خود ہو گئے گھوڑے سے نیچے گر پڑے۔ اور اسی وقت گریبان چاک کر کے جنگل کی راہ لی۔ چالیس سال جنگل میں پھرتے رہے تب وطن واپس آئے تو شیخ بو علی قلندر سے بیعت کے لئے مصر ہوئے۔ لیکن آپ نے فرمایا اے فرزند عزیز تمہاری مشکل دوسرے شخص سے حل ہو گی۔ چنانچہ جب شمس الدین ترک پانی پتی کا ورود پانی پت میں ہوا تو آپ نے شیخ جلال الدین کو ان کے پاس ارادت کے لئے بھیجا اور وہ آگے چل کر ان کے خلیفہ ہو گئے۔ وفات کے بعد آپ کرنال میں مدفون ہوئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اعزا و اقارب نے ایک رات پوشیدہ طور پر نعش مبارک کو پانی پت میں لے جا کر دفن کر دیا۔ چنانچہ کرنال، پانی پت، بڈھا کھیڑا اور بالکھوں میں آج بھی آپ کے معتقدین کا ہجوم رہتا ہے۔

آپ کی زندگی کرامات اور وفات کے بارے میں بے شمار روایات ہیں۔ حتیٰ کہ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ پانی پت یا کرنال کا مزار فی الواقع انہیں کا ہے۔

آپ کی تصانیف میں عشق الہٰی کے موضوع پر آپ کے مکتوبات اور دو مثنویاں ہیں جو کلام قلندر کے نام سے مشہور ہیں۔

بوگرا بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کا ایک شہر اور ضلع۔ دریائے کراتویہ کے کنارے پر واقع ہے۔ غالباً یہاں کے باشندوں کی اکثریت ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ اکثر دیہاتوں کے نام اب تک ہندوانہ ہیں حالانکہ وہاں کوئی ہندو آباد نہیں۔

تقسیم ہند سے قبل تمام بنگال میں اس شہر کے مسلمانوں کی تعداد تمام علاقوں سے زیادہ تھی اور ان میں اکثر وہ نومسلم ہیں جو پہلے کوچ یا راج بنسی کہلاتے تھے وہ شمالی علاقوں میں آباد تھے۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں راجہ مان سنگھ نے بوگرا ضلع کو دوبارہ فتح کیا۔ اس نے شیر پور میں مٹی کا ایک کچا قلعہ تعمیر کیا اور اس کا نام سلیم نگر رکھا۔

بوگرا شہر اور ضلع میں اکثر سیلاب اور طوفان آتے رہتے ہیں جو بعض اوقات بڑے ہولناک ہوتے ہیں ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء کے ایک طوفان نے اس ضلع میں بہت تباہی مچائی۔

۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں اس شہر میں ڈیڑھ گھنٹے میں اٹھارہ انچ بارش ہوئی تو سارا شہر غرقاب ہو گیا۔ بوگرا کو اکثر زلزلوں سے بھی واسطہ رہا۔ اور ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۷ء کے شدید زلزلوں سے جان و مال کو بہت نقصان پہنچا۔ خصوصاً ۱۸۹۷ء کے زلزلے میں تو پختہ اینٹوں کے بہت سے مکانات تباہ ہو گئے تھے ۱۹۵۱ء میں بوگرا شہر کی آبادی پچیس ہزار تین سو تھی اور بوگرا ضلع کی آبادی بارہ لاکھ پانچ سو اٹھاسی تھی۔

بوگرا شہر میں بوگرا محل اب چوہدری خاندان کی قیام گاہ ہے۔ یہ جگہ دلچسپ اور قدیم ہے۔ ضلع بوگرا اور مہاستھان میں آثار قدیمہ کثرت سے ہیں۔

بومدین ہواری (بومدین) الجزائر کے موجودہ سربراہ گوئیلا مریا کے مقام پر ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ (۲۲ صفر ۱۳۴۹ھ/۲۳ اگست ۱۹۲۷ء) محمد بوخاروبا البوحی الدین ابتدائی تعلیم قسطنطین کے ایک اسلامی ادارے میں حاصل کی۔ پھر مصر میں قاہرہ کی جامعہ الازہر میں تعلیم پائی ہے۔ قاہرہ میں ان کی ملاقات بن بیلا سے ہوئی اور انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی دسمبر ۱۹۵۴ء میں فرانس کے خلاف جنگ چھڑنے کے ایک ماہ بعد انہوں نے مذہبی تعلیم سے اپنا رخ فوجی تعلیم کی طرف موڑ لیا اور مراکو میں مزید فوجی ٹریننگ حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں مغربی گوریلا یونٹ میں شمولیت اختیار کی۔ تین سال بعد سارے مغربی محاذ کے انچارج ہو گئے۔ ترقی کرتے ہوئے ۱۹۵۸ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں تیونس میں فوج برائے قومی آزادی کے چیف آف جنرل سٹاف مقرر کئے گئے۔ ۱۹۶۲ء میں احمد بن بیلا کی وزارت میں وزیر دفاع کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور گوریلا فوج کو جدید لڑائی کے طریقے سکھانے پر مامور کئے گئے۔ جلد ہی احمد بن بیلا سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اسوقت بومدین ملک کے وزیر دفاع اور نائب صدر کے عہدے پر فائز تھے۔ اور وہ انقلابی کونسل کے سربراہ اور وزارتی کونسل کے چیئرمین مقرر ہوئے۔

۱۹ جون ۱۹۶۵ء میں ان کی قیادت میں ملک میں ایک انقلاب آیا۔ صدر احمد بن بیلا کو معزول کر کے کسی خون خرابے کے بغیر مسند اقتدار پر قبضہ کر لیا گیا۔ ۱۱ جولائی ۱۹۶۵ء کو بومدین نے صدارت کا عہدہ سنبھالا۔

صدر بومدین نے ستمبر ۱۹۷۳ء میں الجزائر میں غیر جانبدار ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کی صدارت کی۔ غیر جانبدار ملکوں کے سربراہوں کی چوتھی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے مشرق وسطیٰ کے مسئلے پر تیسری دنیا اور افریقی رائے عامہ کی تنظیم میں بڑا اہم کردار انجام دیا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب سربراہوں کی چھٹی کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا جو الجزائر میں ہوئی تھی۔

الجزائر فوج کی تنظیم میں جتنا حصہ بومدین کا ہے کوئی دوسرا رہنما اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بومدین ہی نے ۱۹۶۲ء کے موسم گرما میں اس وقت کے وزیر اعظم یوسف بن خدہ کا تختہ الٹا تھا۔ اور پھر جب ستمبر ۱۹۶۲ء میں باغی فوجوں نے الجزائر

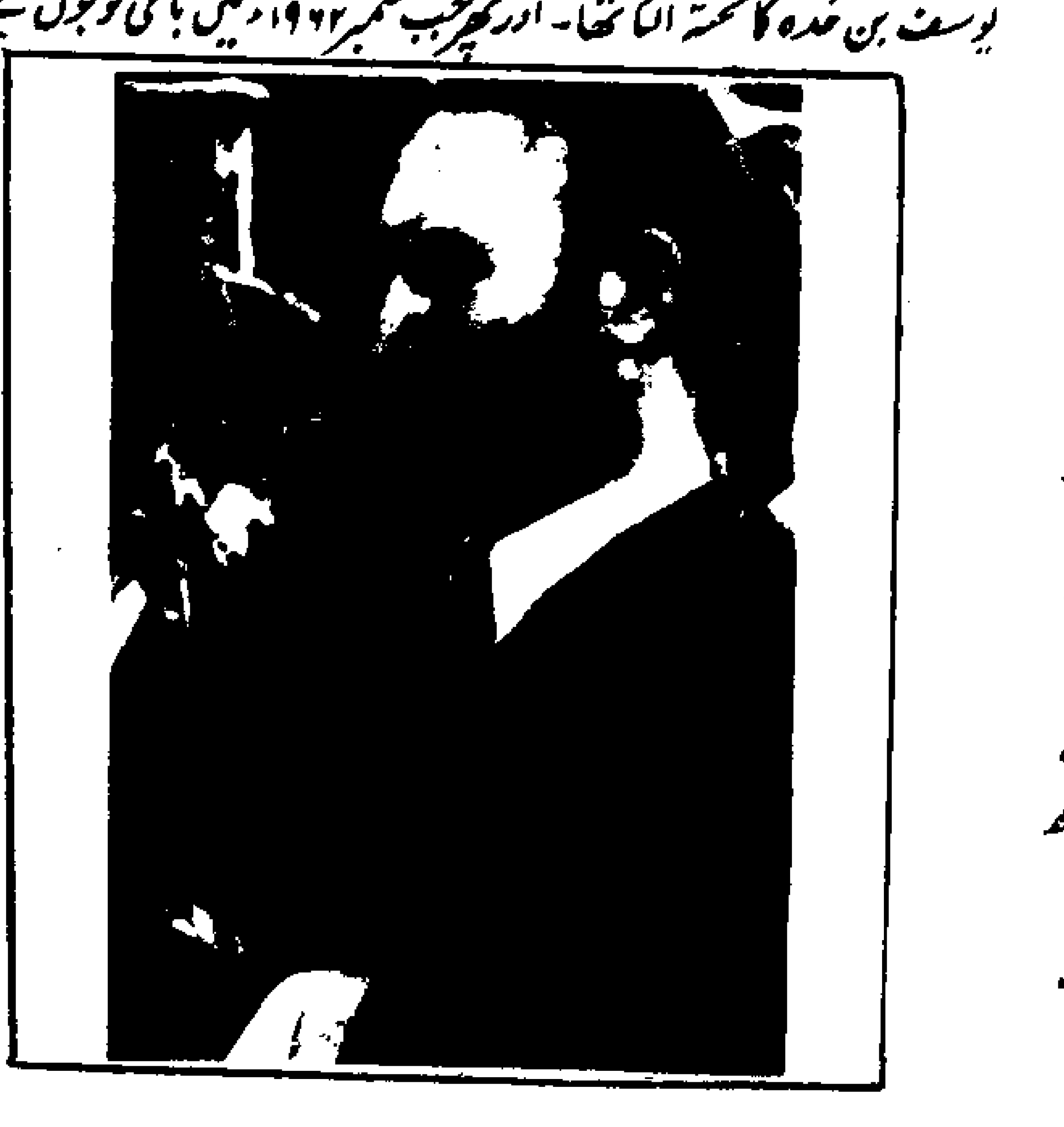

Marfat.com

پر قبضہ کرلیا تو بومدین ہی نے صدر احمد بن بیلا کے اقتدار کی حفاظت کی اور باغی عناصر کا قلع قمع کیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں عواص کے پہاڑی علاقے میں حریت پسندوں نے جب فرانسیسیوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی تو بومدین چھاپہ مار دستوں کے کمانڈر کی حیثیت سے اس میں پیش پیش تھے۔

آج کل الجزائر کی ترقی میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں اور اپنے اس وعدے کو جو صدر بننے کے بعد تقریر میں عوام سے کیا تھا پورا کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان کا وعدہ عوام کے لیے روٹی، کپڑا، سکول اور معاشیاتی ترقی کا تھا۔

بوہرہ تاجر، بیوپاری، عرف عام میں مغربی ہندوستان کا ایک مسلم فرقہ یہ لوگ بیشتر اسماعیلی فرقے کے شیعہ ہیں۔ بوہرہ کے معنی تاجر، بیوپاری کے ہیں۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹ ہزار ۹ سو ۲۵ ہندوؤں اور ۲۵ جین مت کے پیروؤں نے اپنے آپ کو بوہرہ شمار کرایا ہے اور مسلمان بوہروں کی تعداد ایک لاکھ چھیالیس ہزار دو سو چھپن تھی۔ موجودہ وقت میں غالباً ان کی تعداد پاک و ہند میں ڈیڑھ لاکھ اور تمام دنیا میں دو لاکھ کے قریب ہوگی۔

بوہرے دو بڑی جماعتوں میں تقسیم ہیں ایک بڑی جماعت جو سب سے اکثریت میں ہے شیعہ بوہروں کی جماعت ہے جو سب تاجر ہیں اور دوسری بڑی جماعت سنی بوہروں کی ہے جن میں اکثریت کسانوں اور کاشت کاروں کی ہے۔ اسماعیلی بوہرے یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے عرب اور مصر سے نکل کر ہند میں پناہ لی تھی۔ اگرچہ بوہروں کی اکثریت اپنے گروہ سے باہر شادی نہیں کرتی لیکن حال ہی میں سلیمانی بوہروں کے ہاں سنیوں، اثنا عشری شیعوں، ہندوؤں اور یورپ والوں سے بھی باہمی شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوئے ہیں۔

بوہروں کی اکثریت ہندو نسل سے تعلق رکھتی ہے ان کے آباؤ اجداد کو اسماعیلی مبلغوں نے اسلام سے روشناس کرایا تھا۔ غالباً پہلا مبلغ عبداللہ نامی ایک شخص تھا۔ جسے فرقہ مستعلیہ کے امام نے یمن سے جنوبی ہندوستان میں ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء میں بھیجا تھا ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء تک اس فرقے کا پیشوا یمن میں رہتا تھا اور بوہرے اس کی زیارت کرنے کے لیے یمن میں جاتے تھے اپنی آمدنی کا عشر ادا کرتے اور اپنے قضیوں کا فیصلہ کراتے تھے۔ ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء میں یوسف بن سلیمان یمن سے ہندوستان آ گیا اور سدھ پور (بمبئی) میں قیام پذیر ہوگیا۔

اس کے بعد ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں داعی داؤد بن عجب شاہ کا انتقال ہوگیا تو اس فرقے میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ گجرات کے بوہروں نے جو اکثریت میں تھے داؤد بن قطب شاہ کو اس کا جانشین منتخب کیا۔ مگر دوسرے گروہ کے لوگوں نے سلیمان نامی ایک شخص کو اپنا پیشوا تسلیم کرلیا۔ سلیمان کی وفات بھی احمد آباد میں ہوئی۔ دونوں حریفوں کی قبریں قریب قریب ہیں اور دونوں کے پیرو اپنے اپنے طور پر دونوں کا احترام کرتے ہیں جن لوگوں نے سلیمان کی جانشینی کو قبول کیا وہ سلیمانیہ کہلاتے ہیں ان کا داعی یمن میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا ایک کارندہ رہتا ہے جسے "منصوب" کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان کا مرکز بڑودہ میں ہے۔ جو لوگ داؤد کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں ان کا پیشوا بمبئی میں رہتا ہے جس کا صدر مقام سورت ہے۔ سورت میں ایک عربی مدرسہ ہے جو درس سیفی کے نام سے مشہور ہے۔ آج کل اس گروہ کے داعی سید طاہر سیف الدین کے بیٹے ہیں جو "ملاجی صاحب" یا "سیدنا صاحب" کے لقب سے پکارے جاتے ہیں ان کے مریدان کی بہت عزت و تکریم کرتے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد ایک خاص انداز میں اظہار عجز و نیاز کرتی ہے جیسے تقبیل الارض (زمین بوسی) کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ رسم فاطمیوں کے دور سے چلی آ رہی ہے۔ اس زمین بوسی کی رسم میں اور نماز کے سجدے کی شکل میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ نمازوں کے ادا کرنے میں مقامی عہدیدار عوام کی رہنمائی کرتے ہیں انہیں "عامل" کہا جاتا ہے یہ "عامل" ملاجی صاحب مقرر کرتے ہیں۔ ان کے فرائض وہی ہیں جو سنیوں کے قاضیوں کے ہوتے ہیں۔

بوہرہ جماعت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ پیشوں کے لحاظ سے اپنے الگ الگ گروہ بنا لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعلقات بہت کم رکھتے ہیں نہ ہی دوسرے مسلمانوں میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ داؤدی فرقے سے الگ ہوکر دو اور چھوٹے فرقے بن گئے ہیں۔ ۱۔ علیہ بوہرے - ۲۔ ناگو شیتیے۔

علیہ بوہرے ۱۶۲۴ء میں بڑے ملا شیخ آدم کے پوتے علی کی گدی نشینی کے دعوے کے طرفدار تھے۔

دوسرا گروہ جو ناگو شیتیے کے نام سے مشہور ہے ۱۷۸۹ء میں علیہ فرقے سے الگ ہو گئے تھے اور گوشت کھانا گناہ سمجھتے ہیں۔

بوہرے اپنی مذہبی کتب کو چھپاتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بعض فقہ اور فلسفے کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی طور پر کوئی مفصل تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔

بویہ، بنو ایک اہم ترین حکمران خاندان جس نے ایران کی سطح مرتفع بجز عراق خراسان اور ماوراء النہر کے علاقے پر حکومت کی۔ اس خاندان کا نام بویہ سے ماخوذ ہے۔ جو ان تین بھائیوں کے باپ کا نام تھا۔ یہ لوگ دیلمیوں کی آبادی میں شامل تھے جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا۔ بویہی ابتدا میں اپنے ایک ہم وطن ماکان بن کاکی کے پیرو تھے۔ بعد میں مرداویج کے ساتھ مل گئے تاکہ دونوں باہم ہوکر طبرستان کی زیدی ریاست سے مقابلہ کریں۔ لیکن جب علی کچھ دن کے لیے اصفہان کا مالک ہوا اور پھر مستقل طور پر فارس کا حکمران ہو گیا تو اس نے مرداویج سے نجات حاصل کرنے کے لیے سنی خلیفہ سے منظوری اس شرط پر حاصل کرلی کہ اس صوبے پر اس کی حکومت قائم رہے گی۔ بویہیوں کے سب سے بڑے بھائی علی نے فارس پر قبضہ جمائے رکھا اور اس کی دوسرے بھائی الحسن نے سائے الجبال پر اپنا قبضہ کرلیا۔ تیسرے بھائی احمد نے کرمان اور خوزستان کو اپنے زیر نگیں کرلیا۔ چنانچہ ان مستحکم قلعوں پر قبضہ کر لینے کے بعد بویہی دوسری جماعتوں کے ساتھ اقتدار کے حصول کی کشمکش میں شریک ہو گئے۔ بالآخر ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں احمد بغداد میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے وہاں جو نظام حکومت قائم کیا وہ ۴۴۷ھ/۱۰۵۵ء تک قائم رہا۔ ان تینوں بویہیوں نے بعد میں اپنے لیے القاب حاصل کیے۔ ان میں احمد نے معز الدولہ، علی نے عماد الدولہ اور الحسن نے رکن الدولہ کا لقب اختیار کیا۔ ان کے وفات پا جانے پر عضد الدولہ کو جو رکن الدولہ کا بیٹا تھا اس خاندان بویہ کا سردار قرار دیا گیا۔ عضد الدولہ نے خاندان بویہ میں مکمل اتفاق اور اتحاد قائم کیا۔

عراق کی ولایت نے جو بویہیوں کے تحت تھی خلافت عباسیہ کی اس آخری

Marfat.com

مستحکم پناہ گاہ میں حکومت کا وہی طرز جاری رہنے دیا جو دیگر مقامات پر مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ عراق کی ولایت کو ایک خاص اہمیت بھی حاصل تھی اور وہ یہ کہ بغداد خلافت کا مرکز تھا۔ بویہیوں نے اس پر قبضہ کر کے انتظام حکومت میں کوئی خاص تبدیلی نہ کی۔ کیونکہ وہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور انہیں یہ معلوم تھا کہ شیعہ اقلیت میں ہے اور اگر بغداد سے خلافت ختم بھی کر دیں تو وہ کسی اور جگہ سے نمودار ہو جائے گی۔ چنانچہ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ اسے اپنے اقتدار میں رکھا جائے اور اس میں جو سنی ہیں ان پر ان کے اقتدار کا جواز باقی رہے۔ اور دوسرے بیرونی دنیا سے ان کے سیاسی تعلقات مضبوط ہو جائیں اس لیے کہ سنی حکمرانوں کی اب عزت بھی کی جاتی تھی اور اخلاقی اعتبار سے ان کا اقتدار بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بویہیوں نے ہمیشہ اپنا ظاہری طرز عمل ایسا رکھا جیسے وہ سچے دل سے خلافت عباسیہ کے جواز کو تسلیم کرتے تھے۔ اگرچہ بویہیوں نے بلا امتیاز شیعوں اور معتزلیوں کو اپنے اندر قبول کیا لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اثنا عشری رہے چنانچہ بویہیوں نے کبھی یہ منصوبہ نہ بنایا کہ شیعہ سنیوں پر ظلم و ستم کریں۔ یہ دونوں فرقے ان کی فوج میں شامل تھے۔ بویہیوں نے شیعت کو ایک تنظیم کی صورت دی اور ایک حد تک ان کے عقائد کا ایک ڈھانچہ بھی تیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت سنی اپنے چار مسلکوں کو مسلم مسلک تسلیم کرانے پر زور دے رہے تھے تو اہل تشیع میں سے بعض علماء اور بغداد کے دو بھائیوں الرضی اور المرتضیٰ جو بغداد کے شریف تسلیم کیے جاتے تھے شیعت کو بھی ایک پانچویں مسلک کی حیثیت سے امت کے نظام میں داخل کرانے میں زور دے رہے تھے۔ انہی بویہیوں کے دور میں معز الدولہ نے "عاشورا" کے ماتم کی رسم کھلم کھلا جاری کی اور اسے ایک مذہبی فریضہ قرار دیا۔ "غدیر خم" کی بنیاد ڈالی۔ علوی مشہدوں کو مزین اور آراستہ کیا گیا۔ شیعی مدرسے بنائے گئے۔ مسجدوں میں شیعی طریقے سے عبادت کی جانے لگی اور اذان کا شیعی طریقہ جاری کیا گیا۔

اگرچہ آل بویہ کی حکومت ابتداء ہی سے قوی اور مضبوط نظر آتی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بعض کمزوریاں ایسی بھی تھیں اور بالآخر انہی کمزوریوں کی وجہ سے اس خاندان کو زوال آیا۔ ان کمزوریوں میں کچھ اندرونی پیدا ہوئی تھیں اور کچھ بیرونی تھیں جن میں ایک تو سمندری تجارت کا اضطراب انگیز انقلاب تھا۔ کیونکہ ۱۰۰۰ء کے قریب بحر ہند کی طرف سے مغرب کے ساتھ جو تجارت کی جاتی تھی اس کا راستہ خلیج فارس کے راستے سے نہیں رہا بلکہ اس کا رُخ بحر قلزم کی طرف بدل گیا۔ ان کے علاوہ فاطمیوں کا اقتصادی غلبہ اور ان سب کمزوریوں سے بڑھ کر وہ خانگی اور خلقی کمزوری تھی جو ان کے علاوہ اسی زمانے کی مشرق قریب کی بہت سی حکومتوں میں مشترک تھی۔ زوال کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ بویہیوں کی قوت منتشر تھی۔ ابتداء ہی سے ان کے تین گروہ الگ الگ ریاستوں پر متمکن تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی حکومت متحد نہ تھی۔ ان کی کمزوری اور بے بسی سے کسی حد تک خلافت کو فائدہ پہنچا کیونکہ خلیفہ کو ان کے خاندانی جھگڑوں میں حکم بننا پڑتا تھا اور اس طرح خلیفہ کا کھویا ہوا اقتدار اور اثر واپس مل گیا۔

۱۰۵۵ء میں طغرل بیگ کسی مزاحمت کے بغیر بغداد میں داخل ہو گیا اور اس نے بویہی الملک الرحیم کو گرفتار کر لیا۔ فارس نے بھی اطاعت کر لی اور اس طرح بویہی خاندان کی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

بہ آفرید بن فروزدین۔ ایران کا ایک جھوٹا مدعی نبوت۔ عہد بنو امیہ کے تقریباً آخری دور میں ایران میں نیشاپور کے ضلع خوات کے مقام پر اس نے ایک مذہبی فتنہ کھڑا کیا اور نبوت کا جھوٹا دعوے کر کے اپنے اردگرد بہت سے مریدین کا جمگھٹا اکٹھا کر لیا۔ تقریباً سات سال تک چین میں جا کر رہا۔ بعد میں اپنے وطن واپس آ کر لوگوں سے اس بات کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندہ کر کے آسمانوں سے بھیجا ہے۔

اس کے بارے میں ایک روایت ہے کہ اس نے مرنے کا بہانہ کیا اور ایک قبر جو اس نے اپنے لیے بنوائی تھی، اس میں ایک سال تک دفن رہا اور بعد میں اپنے دوبارہ زندہ ہونے کو ایک معجزے کے طور پر پیش کیا۔

اس نے اپنے بارے میں زرتشتی ہونے کا دعوے کیا اور اپنے عقائد کی فارسی زبان میں ایک شرح لکھی بعد میں اس نے اسلامی تعلیمات سے کچھ شعائر اور محرمات کو اختیار کر لیا۔ اس کی تعلیمات میں شراب، غیر شرعی ذبیحہ اور محرمات سے نکاح کی ممانعت تھی۔ اس نے دن میں سورج کی طرف منہ کر کے سات نمازیں پڑھنے کا حکم دیا اور زکوٰۃ کو ضروری قرار دیا۔

ابومسلم نے دیکھا کہ یہ تحریک نومسلموں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ تو اس نے بہ آفرید کو مجبور کیا کہ وہ اسلام کی طرف رجوع کرے اور عباسیوں کے مقصد کے حصول میں امداد دے لیکن وہ جب اپنے مذہب کی تبلیغ سے باز نہ آیا تو ۱۳۱ھ ۷۴۹ء میں ابومسلم کے حکم سے اسے اس کے مریدین کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے پیرو جو باقی رہ گئے تھے وہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی تک پائے جاتے تھے وہ اس کے دوبارہ ظہور کا انتظار کرتے رہے ہیں۔

بہاء الحق :۔ پاک و ہند کے ایک ولی۔ (دیکھیے "بہاء الدین زکریا")

بہاء الدین (۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء – ۶۳۱ھ/۱۲۳۴ء) ایک عرب دانشور۔ ابوالمحاسن یوسف ابن رفیع ابن تمیم بہاء الدین موصل میں پیدا ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بغداد میں ایک مدرسے میں مدرس رہا اور پھر موصل میں پروفیسر ہو گیا۔ ۱۱۸۸ء میں حج بیت اللہ کے بعد اس نے صلاح الدین کی ملازمت اختیار کر لی جو فلسطین میں عیسائیوں سے برسرِ پیکار تھا۔ اس نے جلد ہی سلطان کی خوشنودی حاصل کر لی۔ اور مستقل سلطان کے دربار کے ساتھ منسلک رہا۔ وہ مختلف سفارتخانوں اور حکومت کے مختلف عہدوں پر اپنی خدمات سرانجام دیتا رہا۔

بہاء الدین فوج کا قاضی بھی رہا اور بعد میں یروشلم کا قاضی بنا دیا گیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد اس نے اس کے بیٹے ملک الظاہر سے دوستی بڑھا لی جس نے اسے حلب کا جج مقرر کر دیا۔ ملک الظاہر کے بعد اس کا بیٹا ملک العزیز تخت نشین ہوا۔ ابھی وہ نابالغ تھا۔ اس لیے سارا اقتدار بہاء الدین کے ہاتھ میں آ گیا۔

بہاء الدین نے سلطان صلاح الدین کی ایک سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ جو ۱۷۵۵ء میں لیڈن سے شائع ہوئی ہے۔

بہاء الدین، زکریا ملتانی (۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء – ۷ صفر ۶۶۱ھ/۲۱ دسمبر ۱۲۶۲ء) سلسلہ سہروردیہ کے پاک و ہند کے ایک درویش

Marfat.com

اور ولی کامل۔ آپ کے والد کا نام وجیہ الدین محمد تھا۔ آپ کا تعلق قبیلہ ہبادی اسدی (قریشی) سے ہے۔ پروفیسر مولوی محمد شفیع نے آپ کا خاندانی نسب نامہ یوں بیان کیا ہے۔ ابومحمد زکریا بن وجیہ الدین محمد بن کمال الدین شاہ علی قریشی بن سلطان محمد جلال الدین بن سلطان علی قاضی بن شمس الدین محمد کردردی بن سلطان حسین بن سلطان عبداللہ بن الحسین بن سلطان مطرف بن سلطان خذیمہ بن امیر ہاشم بن امیر تاج الدین بن امیر عبدالرحیم بن عبدالرحمان بن ہبار بن اسد بن ہاشم بن عبدالمناف۔

آپ کی ولادت بمقام کوٹ کروڑ ضلع مظفرگڑھ میں ہوئی۔ "سفینۃ الاولیاء" اور آئین اکبری میں ولادت کا سال ۵۶۵ھ لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں ۵۷۸ھ بتایا گیا ہے۔

آپ کی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید مع ہفت قرأت کے حفظ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا۔ تاہم تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور آپ ایک عرصے تک علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل میں مصروف رہے آپ نے تعلیم کی خاطر خراسان، بخارا، مدینہ منورہ اور فلسطین کے بڑے بڑے علمی مراکز کا سفر کیا۔ اپنے قیام مدینہ منورہ کے دوران میں ممتاز محدث شیخ کمال الدین یمنی سے حدیث کی تکمیل کی اور کئی سال آنحضورؐ کے روضہ اطہر پر ذکر و فکر میں گذارے پھر بیت المقدس تشریف لے گئے اور انبیا علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے بعد بغداد گئے اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ سترہ روز شیخ کی خدمت میں حاضر رہ کر اس تھوڑی سی مدت میں اس قدر نعمت حاصل کی جو دوسرے درویشوں کو برسوں کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔ شیخ نے خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا۔ خرقہ عطا کرنے کے بعد شیخ نے آپ کو رخصت کیا اور فرمایا کہ ملتان جاکر رہو اور اس ملک کے باشندوں کو فیض پہنچاؤ۔

"انوار غوثیہ" میں آپ کا سلسلہ طریقت اس طرح درج ہے:۔

"شیخ بہاءالدین زکریا، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ضیاءالدین ابوالنجیب سہروردی، شیخ وجیہ الدین سہروردی، شیخ ابوعبداللہ، شیخ اسود احمد دینوری، شیخ ممتاز علی دینوری، خواجہ جنید بغدادی، خواجہ سری سقطی، خواجہ معروف کرخی، خواجہ داؤد طائیؒ، خواجہ حبیب عجمی، حضرت امام حسنؓ، حضرت علیؓ، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔"

آپ ملتان میں تقریباً پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ تک خلق خدا کو فیض پہنچانے میں مصروف رہے۔ آپ کی خانقاہ جو ایک شاندار عمارت ہے۔ جس میں مقیمین اور زائرین کے رہنے کے لیے الگ الگ جگہیں ہیں۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں صوفیانہ تلقین کا ایک بہت بڑا مرکز بن گئی تھی۔ سلطان شمس الدین التمش نے آپ کو شیخ الاسلام کے عہدے پر مقرر کیا۔ اور یہ عہدہ ایک مدت تک آپ کے خاندان میں قائم رہا۔

شیخ بہاءالدین کے سلسلے کو زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں فروغ حاصل ہوا اگرچہ ان کے مریدین ہرات، ہمدان اور بخارا میں بھی تھے بطور صوفی ان کی شہرت ان کی وجدانی ذہانت کی بنا پر تھی۔ جس سے آپ اپنے مریدوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے تھے۔ آپ بہت سے معاملات میں اپنے ہم عصر چشتی صوفیاء سے مختلف تھے مثلاً۔

آپ اپنے گرد ہر طرح کے لوگوں کو جمع نہیں ہونے دیتے تھے اور جوالقوں اور قلندروں کی شاذ ہی آپ تک کوئی رسائی ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ آپ کے اور شیخ فریدالدین گنج شکر کے درمیان گہری محبت تھی۔ بابا فرید کہتے ہیں کہ ایک بار برادرم بہاءالدین نے فرمایا کہ زہد تین چیزوں کا نام ہے جس میں یہ نہیں ہیں وہ اسے زاہد کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ اوّل دنیا کو پہچاننا، اور اس سے مایوس ہونا۔ دوم اولاد کی خدمت کرنا اور اس کے حقوق کی نگہداشت کرنا، سوم آخرت کی طلب کرنا اور اس کے حصول میں لگاتار کوشاں رہنا۔

حضرت بہاءالدین زکریا کو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی خزانوں سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ آپ کے یہاں زراعت و تجارت بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھی۔ بہت سے ملازم اور کارندے تھے۔ اس کی آمدنی ایک لنگر خانے پر صرف ہوتی تھی جہاں سینکڑوں بندگان خدا رزق حاصل کرتے تھے۔

آپ کی اپنی غذا محض قلیل ہوتی تھی اتنی کہ قوت بحال رہے۔ البتہ علمائے کرام اور مشائخ کے لئے دستر خوان پر اہتمام کرتے تھے۔ روزہ کم رکھتے تھے، لیکن طاعت و عبادت کثرت سے کرتے تھے۔ ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ بدن کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی ترک گناہ میں اور دین کی سلامتی کثرت درود میں ہے۔

ایک بار فرمایا کہ آدمی میں اصل چیز دل ہے۔ جب دل کی اصلاح ہو جاتی ہے تو آدمی کے بدن کی بھی اصلاح ہو جاتی ہے۔ دل کی بھی حیات اور ممات ہے، شغل دنیا کی کثرت سے دل میں اندیشے داخل ہو کر اسے سیاہ کر دیتے ہیں اور یوں دل مردہ ہو جاتا ہے۔

حضرت کی ایک مشہور کرامت زبان زد خلائق ہے کہ آپ نے اپنے روحانی تصرف سے دریائے چناب میں ڈوبتی ہوئی ایک کشتی کو بچا دیا۔ چنانچہ آج بھی اکثر ملاح کشتی کھیتے ہوئے "دم بہاءالحق" کا نعرہ لگاتے ہیں۔

آپ کسی کو اپنے سامنے جھکنے نہیں دیتے تھے اگرچہ سلسلہ چشتیہ میں زمین بوسی عام تھی۔

آپ فرمانرواؤں اور ان کے عہدیداروں سے گہرے روابط رکھنے کے قائل تھے۔

آپ سماع کے قائل نہ تھے۔

آپ کا قرون وسطیٰ کی سیاسیات پر گہرا اثر تھا۔ چنانچہ ملتان پر اقتدار قائم رکھنے میں انہوں نے التمش کو بڑی مدد دی اور اس کا دیا ہوا اعزازی لقب شیخ الاسلام بھی قبول کیا۔ ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں جب منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا۔ اور ہرات کا حکمران بھی ان کے ساتھ مل گیا تو شیخ نے اپنے پاس سے حملہ آوروں کو ایک لاکھ دینار کی رقم پیش کی اور انہیں محاصرہ اٹھا لینے پر رضامند کر لیا۔

بقول شیخ محمد نور بخش "حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی بلاد ہند میں رئیس الاولیاء تھے علوم ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے احوال و مقامات میں کامل تھے ان سے اکثر اولیاء اللہ کے سلسلے چلے، لوگوں کو رشد و ہدایت فرمائی اور ان کو کفر سے ایمان کی طرف معصیت سے طاعت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لائے اور وہ شان عظیم کے مالک تھے۔

آپ کے سال وفات کے بارے میں اختلاف ہے "راحت القلوب" میں ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء اور "اخبار سہروردیہ" اور "تذکرہ علمائے ہند" میں ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء ہے۔ "آئین اکبری" اور "اذکار ابرار" میں ۶۶۵ھ/۱۲۶۷ء اور سفینۃ الاولیاء" تاریخ فرشتہ" اور "نزہتہ الخواطر" وغیرہ میں ۶۶۶ھ/۱۲۶۹ء ہے۔

آپ ملتان میں ایک بڑے شاندار مقبرے میں مدفون ہیں اس پر نصف دائرے کی شکل کا گول گنبد ہے اور چینی کی خوبصورت کاشی سے مزین کیا گیا ہے۔

Marfat.com

تواریخ ضلع ملتان اور ملتان گزیٹیر کے بیان کے مطابق آپ نے اپنا مقبرہ خود تعمیر کرایا تھا۔ آپ کا عرس ۷ر صفر المظفر کو منعقد ہوتا ہے۔

آپ کی اولاد میں سات فرزندوں کے نام ملتے ہیں۔ شیخ صدرالدین (عارف) شیخ قطب الدین، شیخ شمس الدین، شیخ شہاب الدین، شیخ علاؤالدین (یحییٰ) شیخ برہان الدین (احمد) شیخ ضیاءالدین (حامد)۔

آپ کے بے شمار مریدین تھے۔ آپ کے بڑے بڑے خلفاء میں سے شیخ صدرالدین (عارف)، سید جلال الدین بزرگ بخاری، حسن افغان، سید عثمان معروف بہ لعل شہباز سندھی، شیخ امیر حسینی، شیخ فخرالدین عراقی، خواجہ کمال الدین مسعود وغیرہ ہیں۔

بہاءالدین، شیخ

(۹۰۷ھ/۱۳۸۸ء۔ ۱۴ر ذی قعدہ ۹۱۲ھ/۲۸ر مارچ ۱۵۰۶ء) دہلی کے ایک بزرگ۔ شاہ باجن چشتی برہان پوری کے نام سے مشہور ہیں۔ والد کا نام حاجی معزالدین تھا۔ آپ کا نسب حضرت عمر فاروق سے جا ملتا ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اور بعد میں مخدوم شیخ رحمت اللہ مانڈوی کے سلسلہ ارادت میں شامل ہوئے اور بیعت کی۔ شیخ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے اور برہان پور خاندیس میں سکونت اختیار کی جس کے بارے میں عالم رویا میں اشارہ ہوا تھا۔ ۱۲۱ سال کی عمر میں وفات پائی اور برہان پور میں دفن ہوئے۔ آپ کی ذات علوم ظاہری اور باطنی کے فیوض کا مرکز تھی۔ بادشاہ نے آپ کے لیے ایک خانقاہ اور مسجد بنوادی۔ ایک کتاب علم سلوک وحقائق فارسی زبان میں آپ کی علمی یادگار ہے۔

آپ نے ایک کتاب جوادراد کے متعلق ہے تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ یہ دراصل صوفیانہ رنگ کی ایک نقلی تصنیف ہے۔

بہاءالدین نقشبندی

، مشہور ولی اور سلسلہ نقشبندیہ کے بانی (دیکھئے نقشبند محمد بن بہا)

بہاءاللہ

(۲ر محرم ۱۲۳۳ھ/۱۲ر نومبر ۱۸۱۷ء۔ ۲ر ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ ۲۸ر مئی ۱۸۹۲ء) مرزا حسین علی نوری بن مرزا عباس عرف مرزا بزرگ ایران کے بہائی مذہب کا بانی۔ ایران کے قصبہ نور میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کی نو بیویاں تھیں۔ جن کے ہاں تیرہ بچے تھے مرزا یحییٰ صبح ازل اور مرزا حسین علی بہاءاللہ مرزا عباس کے بچوں میں سے تھے جن سے بابی مذہب کے دو فرقے بنے۔

بعض نے اس کی پیدائش تہران میں بتائی ہے۔ باپ کی وفات کے وقت بہاءاللہ کی عمر ۲۲ سال تھی۔ ۱۸۴۴ء میں علی محمد باب نے جونہی دعویٰ الہام اور باب ہونے کا دعوے کیا تو بہاءاللہ نے شروع ہی سے اسے تسلیم کرلیا۔ اگرچہ باب کے ماننے والوں نے بہاءاللہ کا نام شامل نہیں کیا۔

بابیوں اور حکومت ایران کے فوجی دستوں کی جنگ میں جو جنگِ قلعہ شیخ طبرسی کے نام سے مشہور ہے شرکت کے لئے بہاءاللہ نے اپنے بھائی صبح ازل اور ساتھیوں کے ساتھ بغداد کا رخ کیا۔ بغداد پہنچنے کے کوئی ایک سال بعد ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بہاءاللہ اکیلا کردستان کے صحرا سلیمانیہ کے پہاڑ سرگلو پر چلا گیا اور اپنی زندگی کے دو سال نہایت تنگی اور عسرت میں بسر کئے

اس عرصے میں وہ اپنے ساتھیوں سے خط وکتابت کرتا رہا۔ آخرکار صبح ازل نے اسے بغداد واپس بلوایا۔ یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کے بھائی صبح ازل کی قیادت میں بابی تحریک گویا ختم ہوکر رہ گئی ہے تو اس نے اپنے یظہرہ اللہ ہونے کا دعوے کیا اور بابی تحریک کی زمام عملاً اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بابی تحریک میں نئے سرے سے جان ڈالی۔ چونکہ صبح ازل ایک صلح جو اور نرم طبیعت کا مالک تھا وہ حکومت سے ٹکر نہیں لینا چاہتا تھا۔ بہاءاللہ نے تحریک کو اپنے ڈھنگ پر ڈالنا چاہا جو ایرانیوں کے لئے نقصان دہ تھا چنانچہ حکومت ایران نے ترکی کی حکومت کو لکھا کہ بہاءاللہ کو بغداد سے جو ایرانی سرحدوں کے قریب ہے کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ کیونکہ وہ اپنے زمانہ قیام بغداد میں خفیہ طور پر جاہل اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور بعض دفعہ اس نے بغاوت بھی برپا کرنے کی کوشش کی ہے اور ملا آقا دربندی کے قتل میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ دونوں حکومت کے باہم مشورے سے ۱۸۶۳ء میں بہاءاللہ کو اس کی دونوں بیویوں اور بچوں اور اس کے کچھ پیروکاروں سمیت بغداد سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا گیا۔ بقول نبیل جب بہاءاللہ نے یظہرہ اللہ کا دعوے کیا تو اس کی عمر پچاس سال تھی۔

بغداد سے قسطنطنیہ منتقل ہوتے وقت اس نے ایک باغ میں بارہ روز قیام کیا۔ اس باغ کو بہائی باغ رضوان کا نام دیتے ہیں اور ان دنوں کو ایام عید رضوان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اگست ۱۸۶۳ء میں یہ قافلہ کرکوک، موصل اور دیار بکر سے گذرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا۔ وہاں چار ماہ قیام کیا پھر ادرنہ کی طرف کوچ کیا۔ ادرنہ کو بہائی ارض السر کہتے ہیں۔ کیونکہ اس جگہ قیام کے دوران ہی میں بہاءاللہ نے اپنے مخفی ارادے واشگاف کر دیئے تھے جنہیں وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ یہاں پر اس نے اپنے دعوے کی راہ ہموار کر لینے کے بعد بابیوں کو دعوت دی کہ اسے یظہرہ اللہ تسلیم کریں۔ چنانچہ اس کے اس دعوے کو صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ صبح ازل قدامت پسند تھا۔ جبکہ بہاءاللہ ترقی پسند۔

پس یہی وہ وقت تھا جب کہ بابی تحریک دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ بہائیوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ باب کا اصل قائم مقام تو بہاءاللہ ہی تھا لیکن حکومت اور عوام کو دھوکا دینے کے لیے باب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ صبح ازل کو اپنا نائب نامزد کرے تاکہ لوگوں کی توجہ بہاءاللہ سے ہٹ جائے اور وہ محفوظ رہے۔ ان اختلافات کی بناء پر بابیوں میں قتل وغارت کا سلسلہ بھی چل پڑا۔ اور ایک دوسرے کو زہر دینے کی کوششیں بھی کی گئیں جب حالات نے بڑی ناگفتہ بہ صورت اختیار کر لی تو حکومت ترکی نے صبح ازل کو قبرص اور بہاءاللہ کو عکہ (فلسطین) میں منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۵ر اگست ۱۸۶۸ء کو بہاءاللہ اور اس کے دوسرے ۷۰ ساتھی عکہ پہنچے۔ جہاں انہیں قلعہ عکہ میں قید کر دیا گیا۔ بعد میں ان کے قیام کے لئے کئی مختلف جگہیں بدلی گئیں۔ اور ۱۸۷۷ء تک یہ لوگ قید وبند کے مصائب میں مبتلا رہے اور آخرکار ۱۸۸۰ء میں بہجی میں ان لوگوں کو ٹھکانہ مل گیا۔ جہاں ۸ر مئی ۱۸۹۲ء میں بہاءاللہ بیمار ہوگیا اور ۲۸ر مئی کو پچھتر سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

بہاءاللہ کی دو بیویوں سے ہر ایک سے چھ چھ بچے تھے۔ بہاءاللہ نے پہلی بیوی کے بڑے لڑکے کو غصن اعلیٰ کا لقب اور دوسری بیوی کے بڑے لڑکے کو غصن اکبر کا لقب دیا تھا۔ ان دونوں کے باہمی جھگڑوں نے بہائی مذہب کو بڑا نقصان پہنچایا۔

نیز دیکھیے "بابیت" "باب علی محمد" "بہائیت"

Marfat.com

دنیا بھر میں ارزاں ترین

۱۔ حاجی مُراد ٹالسٹائی ۲/۵۰
۲۔ نوسٹوری ایریچ سیگل ۲/-
۳۔ غبارِ خاطر مولانا ابوالکلام آزاد ۳/۵۰
۴۔ نوٹرے ڈیم کا کبڑا وکٹر ہیوگو ۲/۵۰
۵۔ داراشکوہ قاضی عبدالستار ۳/-
۶} رومیو جولیٹ ۔ میکبتھ ۳/۵۰
۷}
۸۔ سائنس سے بھی عجیب تر صابر کلوروی ۲/-
۹۔ مہمانِ بہار ۔ آتش رفتہ اشفاق احمد جمیلہ ہاشمی ۳/-
۱۰۔ آوازِ دوست مختار مسعود ۳/-
۱۱۔ بھوانی جنکشن جان ماسٹرز ۲/۵۰
۱۲۔ پولیس افسر کی ڈائری ولادحسین لودھی ۲/۵۰
۱۳۔ شاہنامہ اسلام (اوّل) حفیظ جالندھری ۳/-
۱۴۔ چلتے ہو تو چین کو چلیئے ابن انشا ۲/۵۰
۱۵۔ علی اور نینو قربان سعید ۲/۵۰
۱۶۔ تحریکِ پاکستان شمیم احمد ۳/-
۱۷۔ صحرانورد کے خطوط (اوّل) میرزا ادیب ۳/-
۱۸۔ النبی الخاتم مناظر احسن گیلانی ۲/۵۰

۱۹۔ شاہنامہ اسلام (دوم) حفیظ جالندھری ۳/-
۲۰۔ فردوسِ بریں عبدالحلیم شرر ۲/۷۵
۲۱۔ ایمانیات مونس زبیری ۲/۲۵
۲۲۔ جین آئر برونٹے ۴/-
۲۳۔ شکست کرشن چندر ۳/-
۲۴۔ مجبور آوازیں کے ایل گابا ۴/-
۲۵۔ شاہنامہ اسلام (سوم) حفیظ ۳/-
۲۶۔ قائداعظم میری نظر میں اصفہانی ۴
۲۷۔ مقدس نازنین عبدالحلیم شرر ۴/-
۲۸۔ صحرانورد کے خطوط (دوم) میرزا ادیب ۳/۵۰
۲۹۔ خزینہ معلومات سیفی ٹونکاٹوی ۴/-
۳۰۔ علیگڑھ کے تین نامور فرزند نسیم سوہدری ۲/-
۳۱۔ شاہنامہ اسلام (چہارم) حفیظ ۳/-
۳۲۔ محبت عظیم ہے ۔ گیرزیا ڈیلیڈا ۲/۵۰
۳۳۔ نقوشِ قائداعظم پروفیسر شان ۲/۵۰
۳۴۔ اردو کی آخری کتاب ابن انشا ۲/۵۰
۳۵۔ رحمتِ عالم، سید سلیمان ندوی ۲

ہر موضوع اور
ہر زبان کے شاہ کار
قدیم و جدید

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو
انتہائی باقاعدگی سے
شائع ہورہے ہیں

Marfat.com

حوالہ جاتی کتب شائع کرنے والا

پاکستان میں سب سے بڑا اشاعتی ادارہ

مکتبۂ شاہکار

ہر ماہ تین انسائیکلوپیڈیا باقاعدگی سے پیش کر رہا ہے۔

پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کے طلبا کے لیے

بے بی انسائیکلوپیڈیا

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا

زندگی اور کائنات کے ہر موضوع پر، بچوں کے ذہن کے مطابق ردیف وار ترتیب میں ڈھائی ہزار عنوانات پر مضامین

باتصویر۔ رنگین، آفسٹ طباعت۔ قسط وار

قیمت فی قسط: ۲/۵۰ روپے ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے : سالانہ چندہ مع رجسٹری: -/۲۵ روپے

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے

ردیف وار ترتیب میں چار ہزار سے زائد عنوانات پر مختصر مگر جامع مضامین جن میں اسلامیات کے ہر موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر قسط میں تقریباً ایک سو مضامین۔ جابجا تصاویر، نقشے اور خاکے۔

قیمت فی قسط: -/۳ روپے ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے : سالانہ چندہ مع رجسٹری: -/۳۰ روپے

اردو کا سب سے بڑا

انسائیکلوپیڈیا معلومات

عمومی انسائیکلوپیڈیا

۱۲۵ سے زائد قدیم و جدید علوم و فنون کی بنیادی معلومات، زندگی اور کائنات کے ٹھوس حقائق اور عالمی، سیاسی، سائنسی معاشرتی، علمی و ادبی، مذہبی اور تمدنی حالات و کوائف، نقشے، اعداد و شمار، خاکے، ضروری تصاویر۔ ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے کا انسائیکلوپیڈیا آسان قسطوں میں۔

قیمت فی قسط: -/۳ روپے ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے سالانہ: -/۳۰ روپے

سرورق: الشرف آرٹ پریس، ۱۷، میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط (۹) وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود
• مدیر : عطش درانی
• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۲
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۲۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

شاہکار کے قارئین ....

خدا کے فضل سے شاہکار کو دنیا بھر میں نرالے قارئین میسر ہوئے ہیں۔ رنگا رنگ خیالات اور قسم ہا قسم کے نظریات کے حامل یہ لوگ شاہکار کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک اپنی پتوار کی بساط استعمال کرتا ہے۔ ادھر ہماری بھی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ناؤ کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اس کشمکش کے دوران میں بھی ہم اس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ جذبات کے آبگینے سلامت اور عقائد کے سراب قائم رہیں، اور ہم ہر مکتب فکر کے خیالات کو من وعن پیش کر سکیں۔

اس بات پر ہم سے اختلاف کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے جناب رفیع الدین ہاشمی فرماتے ہیں:

"آپ کہتے ہیں کہ انسائیکلوپیڈیا کو کسی بھی مضمون کے بارے میں اپنی رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ غیر جانبداری دنیا میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔"

ایک اور صاحب علم و ذوق جناب غلام فرید کی رائے بھی اس ضمن میں پیش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یا تو ایک عنوان کو زیر بحث لائیے ہی نہیں یا پھر اس انداز سے کہ کسی خوارجی، کسی معتزلی، کسی شیعہ، کسی وہابی، کسی سنی، کسی بریلوی، کسی دیوبندی، کسی حنفی، حنبلی، مالکی، شافعی، کسی قرامطی، کسی اسماعیلی، کسی نیچری یا کسی اور فرقہ کا عقیدہ تعصب کے کلہاڑے کا نشانہ نہ بنے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں تو ان لوگوں کی رائے بھی درج کیجیے، جو انہیں انسانی صلب سے مانتے ہیں اور ان کی موت کے قائل ہیں۔ اگر امام مہدی پر بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ حوالہ جات بھی لکھیں جن کی رُو سے کسی مہدی کی آمد ممکن نہیں۔ قارئین کو ساون کا اندھا نہ بنائیے انہیں ہر تحریر پڑھنے کا موقع دیں۔"

ہمارے خیال میں غلام فرید صاحب کا مکتوب ہم پر وارد اعتراضات کا ازالہ کر دیتا ہے۔ اسلامی کے مرتبین کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ صحیح اور سادہ انداز میں ہر مکتبۂ فکر سے متعلق معلومات پیش کر دیں۔ اس سے غرض نہیں کہ صحیح کون ہے اور غلط کون؟ یہ فیصلہ کرنا ائمہ کرام اور مجتہدین کا کام ہے۔ امید ہے کہ قارئین ہمارے اس جذبے کو سراہیں گے۔

آپ کا:
عطش درانی

• تاریخ اشاعت: ۱۵ جون ۱۹۷۶ء • ناشر: سید قاسم محمود، کلفٹن کالونی، لاہور • طابع : الجدہ پریس، لاہور

Marfat.com

بھاٹیا بھٹّا واہن، پاکستان کا ایک قلعہ بند شہر، جو صادق آباد سے نو میل شمال کی جانب واقع ہے۔ اس کا ذکر پہلی مرتبہ چچ نامہ میں چچ کے برہمن راجا کی معرکہ آرائیوں کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس کا محل وقوع عام طور پر الور اور ملتان کے درمیان بتایا گیا ہے۔ بھٹیوں کی قبائلی تاریخ میں اس شہر کی بنیاد راجا بھٹی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اس شہر کی تاریخ بنیاد تقریباً دوسری صدی عیسوی بتائی گئی ہے

۹۵ھ/۷۱۳ء میں جب محمد بن قاسم سندھ سے فتح کے قدم بڑھاتا ہوا ملتان کی طرف جا رہا تھا تو اس نے الور کو چھوڑ دیا اور بھاٹیا پر حملہ کیا۔ اس قلعے کی محافظ فوج نے معاہدہ اطاعت اور ٹیکس کی شرائط پر ہتھیار ڈال دیئے

مسلمانوں کی اس فتح کے بعد بھاٹیا پر امن وسلامتی اور خوشحالی کا دور آیا۔ بھاٹیا کا شہر اور قلعہ دونوں البیرونی کے عہد تک پر رونق تھے۔ اس کا ذکر ملتان، الور اور اس وقت کے دریائے سندھ کی دو شاخوں کے وسط میں ایک اہم منزل کے طور پر آتا ہے۔

العتبی بھاٹیا کا مقام دریائے سندھ کے مشرق میں ملتان کے نزدیک بتاتا ہے اور سلطان محمود غزنوی کی مہم کا ذکر ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء کے سلسلے میں کرتا ہے کہ سلطان نے اس قلعے پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ راجہ چپکے سے بھاگ نکلا اور جب اسے گرفتار کیا جانے لگا تو اس نے خودکشی کر لی۔

وہ لکھتا ہے سلطان محمود جب سیستان کے معاملات کا تصفیہ کر چکا تو اس نے بھاٹیا فتح کرنے کے منصوبے کی تکمیل کا فیصلہ کیا چنانچہ وہ دریائے سیہون اور صوبہ ملتان کو عبور کر کے بھاٹیا کے سامنے لشکر لے آیا۔ شہر کی فصیل بہت اونچی تھی.... اس کے گرد خندق تھی جو بہت گہری اور چوڑی تھی اور اس کے چاروں طرف ایک وسیع حصار بنا ہوا تھا جس میں علاقے کے دفاع کے لئے بڑے طاقتور سپاہی اور جنگجو ہاتھی متعین تھے۔ اس کا راجا جسے اپنے سپاہیوں کی بہادری پر بڑا اعتماد تھا مقابلے کے لئے قلعے سے باہر نکل آیا۔ تین روز کی جنگ کے بعد مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

محمود غزنوی کے بعد ۵۷۱ھ/۱۱۷۵ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے اُچ اور بھاٹیا پر حملہ کیا تاکہ شورش پسند بھاٹیا قبیلے کو سزا دے اس مہم میں وہ کامیاب رہا۔ اور اپنے سپہ سالار علی کرماخ کو اُچ اور ملتان کا گورنر مقرر کیا۔

۱۴۹۰ء میں تیمور کے پوتے مرزا پیر محمد نے بھی بھاٹیا پر جو اس زمانے میں بھائی واہن کے نام سے مشہور تھا حملہ کیا اور پورے شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد بھاٹیا شہر بھٹا قبیلے کے عروج سے ترقی کر گیا اور اس کا نام بھٹا واہن پڑ گیا۔ اس زمانے سے آج تک اس کا یہی نام ہے۔

۱۸۰۰ء میں جب دریائے سندھ نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تو یہ شہر اپنی مرکزی اور عسکری نوعیت کھو بیٹھا۔ ابوالفضل اور فیضی کی جائے پیدائش بھی یہی شہر ہے۔

بہادر شاہ اوّل (۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ/۱۴ اکتوبر ۱۶۴۳ء۔ ۲۰ محرم ۱۱۲۴ھ/۲۷ فروری ۱۷۱۲ء) ابو نصر سید قطب الدین محمد شاہ عالم مغلیہ خاندان کا ایک تاجدار، اورنگ زیب عالمگیر کا دوسرا بیٹا تھا جو رحمت النساء عرف نواب بائی کے بطن سے تھا برہان پور (حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوا۔ بڑے بھائی محمد سلطان کی موت کے بعد تخت کا وارث بنا۔ یہ اعلان ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں کیا گیا۔ شعبان ۱۰۸۶ھ/اکتوبر ۱۶۷۵ء میں شاہ عالم کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۶۶۳ء کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے اسے دکن میں مامور کر دیا۔ اس نے بیجاپور کی سلطنت کے خلاف مہم میں حصہ لیا۔

۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء میں اس کی سرداری میں ایک لشکر گوا بھیجا۔ لیکن پرتگیزیوں سے اس کا بگاڑ ہو جانے کے سبب اسے ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد اسے بیجاپور اور گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کے خلاف مہم پر مامور کیا گیا۔ جہاں اس نے ابوالحسن سے مصالحت کر لی۔ عالمگیر نے اس صلح اور مصالحت کو اپنے خلاف ایک سازش سمجھ کر اسے بیٹوں سمیت گرفتار کر لیا۔ ۱۶۹۵ء میں اُسے رہا کر کے آگرے کا صوبے دار بنایا گیا۔ ۱۶۹۹ء میں وہ صوبہ کابل کا والی بنا جہاں عالمگیر کی وفات تک اسی منصب پر مامور رہا۔ اس عرصے میں اس کے بڑے بیٹے ملتان اور ٹھٹھے کے حاکم رہے۔ اپنے والد عالمگیر کی وفات کی خبر سنتے ہی ۱۸ ذی الحج ۱۱۱۸ھ/۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء کو دہلی پہنچا۔ لاہور پہنچ کر بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق دکن کے صوبے اعظم شاہ کو دے دیئے۔ ۱۲ جون ۱۷۰۷ء کو آگرے کے قریب پہنچا۔ ۱۸ جون ۱۷۰۷ء کو اعظم شاہ اور اس کا بیٹا بیدار بخت بہادر شاہ کے مقابلے میں آئے اور جاجو کے قریب ایک خونریز لڑائی میں مارے گئے۔ ۱۴ جنوری ۱۷۰۹ء میں بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بھائی کام بخش نے بھی حیدر آباد دکن کے قریب شکست کھائی اور مارا گیا۔

اب بہادر شاہ کو اپنے خاندانی حریفوں سے چھٹکارا مل چکا تھا۔ اس کے دور حکومت میں تین اہم مسئلے ایسے تھے جو اس کی الجھن اور پریشانی کا سبب بنے رہے ان میں سے ایک مرہٹوں کا، دوسرا سکھوں کا اور تیسرا راجپوتوں کا مسئلہ تھا۔

۱۷۱۰ء میں بہادر شاہ کو سکھوں کی بغاوت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ راجپوتوں سے مصالحت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ گرو بندا نامی ایک شخص نے سکھوں کی بغاوت کو از سر نو زندہ کر دیا اس نے وزیر خان کو قتل کر کے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ اور مشرقی پنجاب میں تہلکہ مچا دیا۔ بہادر شاہ نے لوہگڑھ پر دھاوا بول دیا۔ ۱۷۱۲ء میں گرو بندا کو شکست دی لیکن گرفتار نہ کر سکا۔

بہادر شاہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام لاہور میں بسر کئے اور یہیں وفات پائی۔ بعد میں اس کی میت کو دہلی لے جایا گیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے فوراً بعد اس کے چار بیٹوں معز الدین جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہان شاہ میں تخت پر قبضے کرنے کیلئے لڑائی شروع ہوئی۔ اور آخر کار معز الدین جہاندار شاہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔

بقول اِروِن "بہادر شاہ اگرچہ بہت بڑا بادشاہ نہ تھا۔ لیکن خاصا کامیاب تھا" بہادر شاہ خلیق، عالم و فاضل، پرہیزگار، بہادر اور متحمل مزاج انسان تھا۔ بڑا فیاض تھا کسی کی درخواست کو رد نہیں کرتا تھا۔ اس کی تین بیویاں تھیں جن کے نام مہر النساء بیگم، عزیز النساء خانم اور نور النساء بیگم تھے۔

بہادر شاہ ثانی (۲۷ شعبان ۱۱۸۹ھ/۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء۔ ۱۴ جمادی الاوّل ۱۲۷۹ھ/۷ نومبر ۱۸۶۲ء) ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی خاندان مغلیہ کا آخری بادشاہ اور اردو کا ایک بہترین شاعر اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا جو لال بائی کے بطن سے تھا۔ اس کا سلسلہ نسب گیارہویں پشت پر شہنشاہ بابر سے ملتا ہے۔ دہلی میں پیدا ہوا۔

۱۲۵۲ھ/۱۸۳۷ء کو قلعہ دہلی میں اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اس کا اقتدار صرف لال قلعے یا قلعہ معلیٰ دہلی کی چہار دیواری کے اندر تک محدود تھا اور اس کی حیثیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک وظیفہ خوار کی سی تھی۔ کمپنی سے اسے ایک لاکھ

Marfat.com

روپیہ ماہانہ بطور وظیفہ لیتا تھا اور دوسری جاگیروں اور شہر کے چند مکانات سے بادشاہ کی آمدنی ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ تھی۔ بعض معاملات کی بنا پر جن میں ولی عہدی کا بھی ایک اہم معاملہ تھا۔ بہادر شاہ اور انگریزوں کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی تھی تقریباً اسی زمانے میں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی ہندوستانی فوج نے انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے علم آزادی بلند کیا اور انگریز افسروں کو تہ تیغ کر کے دلی چلے آئے۔ یہاں آکر ان حریت پسندوں نے بہادر شاہ کو اپنا سربراہ بنا لیا اور انگریز کے خلاف معرکہ آرا ہونے کی تیار کرنے لگے۔ بہادر شاہ چونکہ انگریزوں سے پہلے ہی نالاں تھا اور وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس کے انتقال کے بعد برائے نام بادشاہت کا عہد نامہ بھی ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے مغلیہ خاندان کی عظمت پارینہ کے دوبارہ احیاء کے لئے اور ہندوستان کو غیر ملکیوں کے استحصال سے بچانے کے لیے ان حریت پسندوں کی قیادت کو قبول کر لیا اور ہندوستان کے تمام روسا اور والیان ریاست کو غیر ملکی حکمرانوں کو ملک بدر کرنے کے لیے متحدہ اقدام کرنے کے لیے لکھا۔ بادشاہ کی اس دعوت پر بعض زمینداروں اور رئیسوں نے لبیک کہی اور بعض نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اگرچہ بہادر شاہ کی بادشاہت کا دلی میں اعلان کیا جا چکا تھا لیکن پھر بھی حریت پسند لشکریوں پر بادشاہ کا مکمل قبضہ نہیں تھا اور یہ فوج نوجوان شہزادوں اور بالخصوص مرزا مغل کے زیر اثر تھی دلی میں حریت پسندوں نے انگریزوں کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا غداران وطن و قوم کے سبب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ رہے۔ ۲۰ ستمبر کو انگریزی فوج حریت پسندوں کو شکست دینے کے بعد دلی پر قابض ہو گئی۔ مسلمان سپہ دار بخت خان بھاگ کھڑا ہوا۔ اور بہادر شاہ نے مرزا الٰہی بخش کے بہکانے پر (جو شاہی خاندان ہی کا ایک فرد تھا لیکن در پردہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا) بخت خان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ الٰہی بخش کے ساتھ مل کر انگریزوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ کسی طرح جلد سے جلد بہادر شاہ کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ جنگ آزادی کا خاتمہ ہو سکے۔ ورنہ بخت خاں کی معیت میں بادشاہ دیر تک آزادی کی جنگ جاری رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ نے مقبرہ ہمایوں میں پناہ لی اور انگریزوں نے اس کی اطلاع پاتے ہی مقبرے کا محاصرہ کر لیا۔

۲۲ ستمبر کو بہادر شاہ نے جان بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے دیا۔ انگریز میجر ہڈسن نے سوائے جواں بخت شہزادے اور زینت محل شہزادی کے باقی سب شہزادوں کو قتل کرا دیا اور سر جان لارنس نے بادشاہ کو ایک سال تک ذلت و خواری کے ساتھ قید میں رکھا۔ ۱۸۵۸ء میں لارنس نے بادشاہ پر بغاوت کا جھوٹا مقدمہ چلایا اور بالآخر ۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ کو قید کر کے رنگون بھجوا دیا گیا۔ بادشاہ کے ساتھ اس کی دو بیویاں شہزادہ جواں بخت اور چند متعلقین کو رہنے کی اجازت دی گئی۔ بہادر شاہ نے رنگون ہی میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا۔

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ مغل بادشاہوں میں بہادر شاہ زیادہ مہذب شائستہ اور نیک تھا۔ بقول چارلس مٹکاف۔ "وہ شاہزادوں میں سب سے زیادہ قابل احترام اور سب سے زیادہ لائق شہزادہ تھا۔" اس کے دربار کی تہذیب سارے ملک کی تہذیب کے لئے ایک نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ بہادر شاہ میں تعصب نام کو نہ تھا اس وجہ سے وہ ہر قوم و ملت کے لوگوں میں مقبول تھا۔

بہادر شاہ ایک اچھا شاعر تھا۔ تخلص ظفر تھا۔ محمد ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتا تھا۔ مرزا غالب اس کے درباریوں میں سے تھے۔ اردو ادب میں بہادر شاہ ظفر کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ بہادر شاہ کا کلام بڑا پُرسوز ہے اور خاص طور پر جو غزلیں اس نے اپنی جلا وطنی اور قید کے زمانے میں کہی ہیں بہت زیادہ پُردرد ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ اعلیٰ درجے کا خطاط اور ماہر موسیقی بھی تھا۔ عمارتوں کی تعمیر اور باغوں کی ترتیب کے بارے میں اس کا ذوق بہت سلجھا ہوا تھا۔ سارا دن لکھنے پڑھنے اور تلاوت کلام پاک میں گذارتا تھا۔

اس کی تصانیف میں "شرح گلستان" اور اردو کے چار دیوان بہت زیادہ مقبول ہیں۔

بہادر شاہ ظفر:۔ آخری مغل تاجدار (دیکھئے "بہادر شاہ ثانی")

بہادر شاہ گجراتی (وفات ۳ رمضان ۹۴۳ھ/۱۴ فروری ۱۵۳۷ء) مظفر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا۔ گجرات کا والی۔ بڑے بھائی سکندر سے ناراض ہو کر جونپور چلا گیا تھا۔ جب مظفر شاہ ثانی نے ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں وفات پائی تو بہادر شاہ جونپور ہی میں تھا۔ چنانچہ باپ کے انتقال کی اطلاع ملتے ہی اس نے گجرات کا رخ کیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ سکندر کو اس کے چھوٹے بھائی محمود شاہ نے قتل کر دیا ہے اور خود گجرات کے تخت پر جانشین ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس نے گجرات پہنچ کر مسلمان سرداروں سے مدد لی اور محمود شاہ کو سلطنت سے محروم کر کے ۲۶ رمضان ۹۳۲ھ/۷ جولائی ۱۵۲۶ء کو انہلواڑہ پٹن کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

بہادر شاہ آزاد اور خود مختار گجرات کا آخری طاقتور سلطان تھا۔ ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء میں بہادر شاہ نے علاء الدین عماد الملک کے ساتھ مل کر احمد نگر کے برہان نظام شاہ پر حملہ کیا اور اگلے سال احمد نگر پر قبضہ کر لیا۔ ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء میں اس نے مالوہ پر حملہ کر کے سندھ پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور ۹۳۸ھ/۳۲-۱۵۳۱ء میں اجین، بھیلسا اور رائسین کے راجپوت قلعوں پر بھی بہادر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ ۹۴۱ھ/۱۵۳۵ء میں اس نے دوسرے حملے میں چتوڑ پر بھی قبضہ جما لیا۔

۹۴۱ھ/۱۵۳۵ء میں اس کا اور مغل بادشاہ ہمایوں کا باہمی ٹکراؤ ہوا۔ ہمایوں نے مالوہ تسخیر کر لیا اور بہادر شاہ شکست کھا کر کھمبات چلا گیا۔ چنانچہ ہمایوں نے اس

Marfat.com

کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تو بہادر شاہ نے پرتگیزوں سے مدد چاہی پرتگیزوں کے گورنر کے زیر قیادت دیو کو فتح کرنے کی کوشش میں شکست کھا چکے تھے چنانچہ اب انہیں مغلوں کے خلاف بہادر شاہ کی مدد کرنے کے وعدے پر قلعہ بسین مل گیا اور انہیں دیو کے مقام پر قلعہ بنانے کی اجازت مل گئی۔ بہادر شاہ کو پرتگیزوں سے جو برائے نام امداد حاصل ہوئی تھی اس کے باوجود ہمایوں نے اس کے دارالسلطنت احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ لیکن شیر شاہ کے خطرے کے پیش نظر ہمایوں نے گجرات سے ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء میں واپسی ہی میں اپنی خیر جانی۔ چنانچہ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہادر شاہ نے مغل فوجوں سے جو منتشر اور غیر متحد ہو چکی تھیں اپنی سلطنت کا بیشتر علاقہ واپس لے لیا اس کے بعد اس نے اپنی توجہ پرتگیزوں سے ان حقوق کو واپس لینے کی طرف دی جو حقوق وہ دیو کے مقام پر انھیں دے چکا تھا۔

بہادر شاہ نے سنا کہ جہازوں کا ایک بیڑا جس میں چار پانچ ہزار پرتگالی ہیں بندر دیو میں آیا ہے۔ چنانچہ بہادر شاہ فوراً کمک لے کر وہاں پہنچا۔ پرتگیزوں نے جب اس کی آمد کی خبر سنی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بہادر شاہ سے لڑ کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کسی بہانے سے بہادر شاہ کو گرفتار کرنا چاہیئے۔ دوسری طرف بہادر شاہ انہیں بندر دیو سے نکال دینا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اس مقصد کے لئے پرتگیزیوں کے افسر کو بلایا۔ جس نے بیماری کا بہانہ کر کے آنے سے انکار کر دیا تو سلطان نے خود اس کی ملاقات کو جانے کا قصد کیا۔ چنانچہ بہادر شاہ اپنے جہاز میں سوار ہو کر مخالفوں کے جہاز کے پاس پہنچا۔ پرتگیزوں نے اسے اپنے جہاز میں آنے کی دعوت دی۔ جب بہادر شاہ ان کے جہاز میں گیا تو اس نے وہاں غداری اور بے وفائی کا رنگ دیکھا چنانچہ اس نے فوراً واپس لوٹنے کا قصد کیا۔ لیکن پرتگیزی فوجوں نے اس کا پیچھا کیا۔ بہادر شاہ نے ان کے جہاز سے اپنے جہاز میں کودنا چاہا تو پرتگیزی امیر البحر نے اپنا جہاز پیچھے ہٹا دیا اور بہادر شاہ بجائے اپنے جہاز میں کودنے کے سمندر میں گر کر ڈوب گیا۔ بہادر شاہ نے گیارہ سال حکومت کی

پرتگیزوں کو چرسے کی برابر زمین دینے کا قصہ اسی بادشاہ کے دور کا ہے قصہ یہ ہے کہ پرتگیزوں نے چرسے کے برابر زمین مانگی۔ بعد میں چرسے کے باریک باریک ٹکڑے کر کے اس کے طول کے برابر زمین حاصل کی اور پھر اس علاقے میں ایک مضبوط سنگین حصار بنا کر توپیں نصب کر دیں اور یوں ملک پر قبضہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

بہادر نظام شاہ

احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا آخری بادشاہ، والد کا نام ابراہیم نظام شاہ تھا جس کی وفات ذی الحج ۱۰۰۳ھ اگست ۱۵۹۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد احمد نگر میں بہت سے گروہ بن گئے۔ جنہوں نے اپنے اپنے برائے نام بادشاہ قرار دے لئے۔ اس وقت احمد نگر پر میاں منجو کا قبضہ تھا۔ اس نے بہادر نظام کو جو اس وقت ایک شیر خوار بچہ تھا، بادشاہ تسلیم کر لیا۔ شہزادے کے مخالفوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ میاں منجو نے گجرات کے حاکم سلطان مراد سے مدد طلب کی اور وعدہ کیا کہ اگر اس کی مدد سے کامیابی ہوئی تو وہ سلطنت مغلیہ کا باجگزار ہو جائے گا۔ سلطان مراد نے بھی اس شرط کو منظور کر لیا اور احمد نگر پر بڑی جمعیت کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ قبل اس کے کہ شاہی فوج مدد کو پہنچتی وہ اپنے حریفوں کو مغلوب کر چکا تھا۔ اب میاں منجو سلطان مراد سے مدد مانگنے پر بہت پچھتایا اس غرض سے کہ اسے سلطنت مغلیہ کا باجگزار نہ بننا پڑے۔ اس نے شہزادہ مراد کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ شہر کو چاند بی بی جو بہادر نظام کی پھوپھی تھی کی نگرانی میں دے کر نصیر خاں کے سپرد کیا اور خود لشکر فراہم کرانے اور قطب شاہ والی گولکنڈہ اور احمد شاہ والی بیجاپور سے کمک طلب کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۵ء میں سلطان مراد نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ چاند بی بی نے اس محاصرے کی بڑی ہمت سے مدافعت کی۔ اس نے خود چہرے پر نقاب ڈال کر سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے۔ آخر کار سلطان مراد نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں قلت رسد اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے متحدہ فوج کی آمد کی وجہ سے چاند بی بی سے خراج قبول کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔

۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمد نگر کو فتح کر لیا اور بہادر نظام شاہ کو اس کے خاندان سمیت گوالیار کے قلعے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قید کر دیا گیا۔

بہادر یار جنگ

(۲۸ ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ/۳ فروری ۱۹۰۵ء - ۴ رجب ۱۳۶۴ھ/ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء) حیدر آباد دکن کے نواب، مسلمانوں کے رہنما اور تحریک پاکستان کے پرجوش مبلغ اور خطیب، خطاب قائد ملت اور لسان الامت تھا والد کا نام نواب نصیب یار جنگ تھا۔ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ اصلاً ایک افغانی قبیلے سدوزئی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ جن کا نام بھی محمد بہادر خان تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں ہندوستان آئے اور قصبہ بارہ بستی ریاست جے پور میں سکونت اختیار کر لی۔ نواب سکندر جاہ کے عہد میں یہ لوگ حیدر آباد دکن پہنچے مرہٹوں کی شورشوں سے نجات حاصل کرنے میں حکومت وقت کا بڑی دلیری سے ساتھ دیا اور اس کے عوض تقریباً ۴ لاکھ کی جاگیر دو ہزار سوار اور بہت سے اعزازات سے نوازے گئے۔ آصفجاہی سلاطین سے اس خاندان کی وفاداری ہمیشہ غیر متزلزل رہی اور ہر دور میں ان کے اعزازات میں ترقی ہی ہوتی گئی۔

چنانچہ نواب بہادر یار جنگ نے ایک بڑے اونچے گھرانے میں آنکھیں کھولیں سات روز کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کے بعد نانی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور چودہ سال تک نواب کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہیں۔ مشرقی علوم کی تحصیل میں آپ نے بڑے بڑے جید علماء کی صحبت سے استفادہ کیا اور بہت جلد ان علوم میں مہارت حاصل کر لی۔ مغربی علوم حاصل کرنے کے لئے شہر کی عوامی درسگاہوں میں داخلہ لیا جہاں امراء کے بچے بالعموم شریک ہوتے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ اس وقت میٹرک کے طالب علم تھے چنانچہ تعلیم کا سلسلہ ترک کرنا پڑا اور اپنی آبائی جاگیر کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں۔ آپ نے کفایت شعاری اختیار کی اور سادہ سے سادہ زندگی کو اختیار کیا۔ ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء میں بیت اللہ کا حج کیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد پورے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا اور حجاز فلسطین، شام، مصر، ترکی، ایران، وسط ایشیا اور افغانستان کے بارے میں بالتفصیل اپنے تاثرات بیان کئے۔ اسی بنا پر خواجہ حسن نظامی نے آپ کو ابن بطوطہ ہند کے لقب سے نوازا۔

نواب صاحب نے تبلیغ اسلام کو اپنا مشن بنایا۔ ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس تبلیغ اسلام کی بنا ڈالی اور مسلسل تین ماہ تک حیدر آباد کے گاؤں گاؤں میں دورے کئے مشقتیں برداشت کیں اور تقریباً بیس ہزار انسانوں تک اسلام کی روشنی پہنچانے کا باعث بنے۔ آپ نے دیہات میں اضلاع میں اور شہروں میں تبلیغ کے لئے تنخواہ یاب مبلغین مقرر کئے۔ نواب ان سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے اور ضروری ہدایات

Marfat.com

دینیات آپ کو قرآن مجید سے خاص شغف تھا کر برسوں فجر کی نماز کے بعد اپنی ڈیوڑھی کی مسجد میں تفسیر کا درس دیتے رہے۔ قضیہ کے ساتھ تاریخ اسلام سے مسلمانوں کی ناواقفیت کو دور کرنے کے لئے آپ نے اپنی بصیرت افروز تقاریر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

بقول حمید الدین الصدیقی کتنی موہ لینے والی شخصیت تھی۔ جلال و جمال کی رعنائیوں کا پیکر۔ جلال میں کوہ آتش فشاں اور جمال میں نرم رسبک رو چشمہ۔ جس کے سینے میں چیتے کا جگر تھا اور جس کی نظر شاہین کی نظر تھی۔ اقبال کے مرد مومن کا جیتا جاگتا پیکر ایسا میر کارواں تھا جس کی نگاہ بلند جس کا سخن دلنواز تھا جو خاکی تھا لیکن سیمابی صفت سے مزین تھا اور جس کی سرشت میں کوئی دھتا بل تھی۔ نواب بہادر یار جنگ جب محو گفتگو ہوتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ کلام پاک کی تفسیر بیان کرتے تھے۔ تو چہرے سے فرشتوں کا تقدس ٹپکتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اردو میں قرآن حکیم نازل ہو رہا ہے۔

نواب صاحب کا خیال تھا کہ منجملہ اور کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ غفلت نظام عسکریت سے بے اعتنائی ہے۔ چنانچہ جب علامہ مشرقی نے مسلمانوں کی عسکری تنظیم و تربیت کے لیے خاکسار تحریک کا آغاز کیا نواب مرحوم اس تحریک سے وابستہ ہو گئے اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ لیکن جب علامہ مشرقی کے سیاسی رجحانات میں ضعف آگیا اور ان کی گاندھی سے مفاہمت ہوئی تو نواب صاحب نے خاکسار تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مجلس اتحاد المسلمین جو ۱۹۳۳ء سے پہلے ایک مذہبی جماعت تھی نواب صاحب کی کوششوں اور توجہات کی بدولت ریاست حیدر آباد کے مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت بن گئی۔ نواب پہلی بار ۱۹۳۹ء میں مجلس کے صدر منتخب کئے گئے اور پھر ہر سال ملت نے آپ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔

نواب بہادر یار جنگ کا شمار برعظیم پاک و ہند کے ان عظیم المرتبت مشاہیر میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی ہندی مسلمانوں کے مذہبی تہذیبی اور فکری اقدار کے تحفظ اور اتحاد المسلمین کے لئے وقف کر دی تھی۔ آپ ایک سچے مسلمان تھے اور عاشق رسول تھے اور مجلس اتحاد المسلمین اور تحریک پاکستان پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے۔ قرآن مجید کی تبلیغ ان کی زندگی کے اولین مقاصد میں سے ایک تھا۔

جابر وظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا نواب مرحوم کا جزو ایمان تھا۔ آپ سچے معنوں میں "میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند" کی زندہ تفسیر تھے۔

آپ نے تحریک پاکستان کے سلسلہ میں بے انتہا قربانیاں دیں۔ آپ کا شمار قائد اعظم محمد علی جناح کے قریب ترین ساتھیوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ ہی کی تحریک پر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بہار ہندوستان کا ایک شہر اور اسی نام کا صوبہ۔ اس صوبے کے مغرب میں اتر پردیش اور مدھیا پردیش شمال میں نیپال، مشرق میں بنگال اور بنگلہ دیش اور جنوب میں اڑلیسہ واقع ہے۔ بہار اشوک سلطنت کا مرکز تھا عام طور پر اسے گلشن ہند کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت پٹنہ ہے عہد قدیم میں بہار بدھ مت کا گہوارہ تھا۔

یہ صوبے کا نام شہر بہار کے نام پر رکھا گیا ہے۔ بہار شہر آج کل کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس کے ارد گرد بدھ مت کی خانقاہیں تھیں۔ یہ صوبہ انگریزوں کے زمانے میں ۱۷۶۵ء سے بنگال کے حاکم کے تحت رہا۔ ۱۹۱۲ء میں بہار اور اڑلیسہ کو بنگال سے جدا کر کے دو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا اور بہار کا انتظامی حیثیت سے اڑلیسہ کے ساتھ الحاق کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں بہار اور اڑلیسہ کو دو علیحدہ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو صوبہ بہار بھی ایک الگ مستقل صوبہ بن گیا۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں صوبے کی حدود نئے سرے سے متعین کی گئیں۔ صوبہ بہار کا موجودہ کل رقبہ ۶۷۱۹۸ مربع میل ہے اور آبادی چھ کروڑ کے قریب ہے۔

۵۸۹ھ/۱۱۹۴ء میں اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے شہر بہار کو فتح کیا اور وہ قطب الدین ایبک کے زیر سیادت اسی کے قبضے میں رہا۔ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں محمد بن تغلق نے بہار کو دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء میں بہار کو جون پور سے ملحق کر دیا گیا۔ ۸۹۳ھ/۱۴۸۸ء میں سکندر لودھی کے حملے کے بعد بہار کو دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد دوبارہ شاہان بنگال کے قبضے میں چلا گیا۔ اور جب تک مغلوں کا بنگال پر قبضہ نہیں ہوا بہار ان کے قبضے میں رہا۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں اکبر کے عہد میں بہار کو ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ جس میں آٹھ سرکاریں تھیں اور بہار صوبہ بنگال کے تحت تھا اس صوبے کا صدر مقام شہر بہار تھا۔ جسے نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں شیر شاہ نے بدل کر پٹنہ کو صدر مقام قرار دیا اس کے دور میں یہ علاقہ اودھ اور بنگال کے درمیان حد فاصل کا کام دیتا تھا۔ اکبر کے ابتدائی عہد حکومت میں بہار پر ایک افغان سلیمان کیرارانی نامی حکومت کرتا تھا۔ لیکن ۱۵۷۶ء سے بنگال اور بہار دونوں اکبر کے زیر اقتدار آگئے اور اس وقت سے ۱۷۶۵ء تک بہار مغلوں کے قبضے میں رہا۔ ۱۷۶۵ء میں بہار جب بنگال کے ساتھ ملحق تھا انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی اکثریت بہار سے مشرقی پاکستان ہجرت کر گئی جن میں سے اکثر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ موجودہ شہر بہار کی آبادی ۱۹۷۴ء میں ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔

صوبہ بہار کی یادگار عمارات میں مقبرہ شیر شاہ سوری بڑی شہرت کا حامل ہے

یہ مقبرہ ایک عظیم مصنوعی جھیل کے عین درمیان پچاس میٹر بلندی پر موجود ہے۔ یہ [illegible] کے عہد حکومت میں سب سے بڑے ماہر تعمیرات علی وال خان نے بنایا تھا اس کے علاوہ رہتاس کا قلعہ جو شیر شاہ نے ایک ہندو راجہ سے چھینا تھا۔ اور ایک جامع مسجد کی تعمیر بھی شیر شاہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ مونگیر کا قلعہ بھی ایک یادگار عمارت ہے۔ اس کے علاوہ پالامو کے قلعے اور نیا قلعہ جو اپنے شاندار ناگپوری دروازے پر نازاں ہے۔ مخدوم شاہ دولت کا مزار بھی جو چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے لائق تحسین ہے۔

بہار کو اسلامی دور میں علمی اور ثقافتی لحاظ سے ایک مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

اس صوبے میں جو بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں ہندو اکثریت کی بولیاں بھوج پوری میتھلی اور ماگھی (بہاری) کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں مسلمانوں کی زبان اردو ہے، انتظامی کاروبار اور تعلیم کی زبان ہندی ہے۔

موجودہ دور میں بہار کی اقتصادی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کوئلے کی کانیں اور لوہے کے بڑے بڑے صنعتی کارخانے اور مراکز ہیں۔

اس صوبے میں گرمی شدت سے پڑتی ہے اور جاڑا اعتدال سے ہے۔ یہاں کی پیداوار میں خاص طور پر چاول بہت زیادہ مشہور ہے۔ گندم، جو، باجرہ پٹ سن اور گنا یہاں کی خاص پیداوار ہے۔

بھارت ہندوستان، انڈیا۔ ایشیا کا ایک ملک، جو ہندوستان کے ایک بڑے رقبے پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں نیپال اور چین، مشرق میں بنگلہ دیش، برما اور بھوٹان، جنوب میں بحر ہند اور مغرب میں پاکستان واقع ہے۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا اور ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک آزاد ریاست بنا۔ یہ مختلف صوبوں اور ریاستوں کا ایک مجموعہ ہے، جسے انڈین یونین کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۱۷۸۹۹۵ مربع میل (۳۰۵۳۵۹۷ مربع کلومیٹر) اور آبادی کا تخمینہ ۱۹۷۶ء میں ۵۶ کروڑ لگایا گیا۔ (اس میں سکم اور مقبوضہ کشمیر شامل نہیں۔)

بھارت ایک جزیرہ نما ملک ہے، جو ایشیا کے انتہائی جنوب میں واقع ہے خط سرطان اس کے عین وسط سے گزرتا ہے۔ اس کے انتہائی شمال میں ہمالیہ کا سلسلہ ہے، جو چین اور بھارت کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ ہمالیہ کے نیچے دوآبہ گنگا و جمنا کی زرخیز وادی ہے۔ جس کے جنوب میں صحراؤں کا علاقہ ہے۔ انتہائی جنوب میں یہ ایک جزیرہ نما کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جہاں آب و ہوا استوائی ہے۔ جنوبی کونے پر بحر ہند میں لنکا واقع ہے، جس کے ساتھ بھارت کے گہرے تعلقات ہیں۔

بھارت اکیس صوبوں اور نو ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے۔ دہلی بھارت کا دارالحکومت ہے، جس کی آبادی (۱۹۷۱ء) ۳۶ لاکھ کے قریب ہے صوبوں اور بڑے شہروں کی آبادی خاکے میں ملاحظہ کریں۔

بھارت میں وفاقی جمہوری پارلیمانی نظام حکومت ہے۔ ہر صوبہ ایک گورنر کے ماتحت ہوتا ہے۔ صدر حکومت پارلیمان کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے۔ پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ایوان بالا راجیہ سبھا کہلاتا ہے، جس میں ۲۲۸ منتخب اور ۱۲ نامزد ارکان ہوتے ہیں۔ ہر صوبے اور علاقے کی مقننہ اپنے منتخب نمائندے [illegible] ہے۔ یہ مستقل ادارہ ہے، جسے کبھی توڑا نہیں جا سکتا۔ تاہم ایک تہائی اراکین ہر دوسرے سال ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ ایوان زیریں پانچسو منتخب اراکین پر مشتمل ہوتا ہے اسے لوک سبھا کہا جاتا ہے۔ یہ ارکان بالغ رائے دہی کے ذریعے براہ راست عوام منتخب کرتے ہیں۔ ۲۵ اراکین ملحقہ علاقوں سے بھی منتخب ہوتے ہیں۔ پارلیمان کی اکثریتی جماعت کا سربراہ وزیر اعظم مقرر ہوتا ہے۔ بھارت کی موجودہ وزیر اعظم بیگم اندرا گاندھی ہیں جو ۸ر نومبر ۱۹۸۰ء سے دوبارہ فائز ہیں۔ بھارت کے صدر فخر الدین علی احمد ہیں۔ جو ۲۴ر اگست ۱۹۷۴ء سے صدر منتخب ہوئے ہیں۔

تاریخی پس منظر:۔ بھارت کی تاریخ کو عام طور پر ہندوستان کی تاریخ سمجھا جاتا ہے، یہ ایک بہت بڑی علمی غلطی ہے۔ ہندوستان اور اس کی تاریخ کا وجود ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ختم ہو گیا تھا۔ آج ہندوستان کی تاریخ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، لنکا، نیپال بھوٹان اور سکم کی تاریخ ہے۔ اس لئے مؤرخین اس بھارتی دعوے کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ سابقہ ہندوستان کی تاریخ بھارت کی تاریخ ہے۔

ہندوستان ایک جغرافیائی خطے کا نام ہے، جس میں بھارت کی طرح اور بھی کئی ممالک موجود ہیں۔ اہل فارس نے یہ خطاب دریائے سندھ کی وادی میں رہنے والوں کو دیا تھا۔ جسے بعد ازاں پورے برصغیر کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ مسلمان کبھی بھی ہندوستان کو ایک ملک نہیں سمجھتے رہے۔ ۱۸۵۸ء کے بعد سے انگریزوں نے اس لفظ کو بطور ملک استعمال کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان ایک واحد ملک قرار دیا جانے لگا۔ یہ اتنی بڑی تاریخی غلطی ہے، جسے آج بھی بھارتی حکمران دہرا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک بھارت دراصل ہندوستان ہی ہے اور پاکستان کا خدانخواستہ کوئی حقیقی وجود نہیں۔

تاریخی پس منظر کے طور پر ہم اس خطے کی تاریخ کا مختصراً ذکر کر سکتے ہیں، جو بھارتی حدود میں واقع ہے۔ یہ تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب آریا قبائل یہاں حملہ آور ہوئے۔ اور یہاں موجود قدیم باشندوں "دراوڑیوں" کو محکوم بنا لیا۔ ایسا تقریباً [illegible] سال قبل مسیح میں ہوا۔ آریوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن سے لے کر زبان، ادب اور مذہب تک کو بدل ڈالا۔ ۵۰۰ ق۔م تک اس علاقے میں برہمن مت کا پرچار ہوتا رہا۔ ان کی مذہبی کتابیں وید کے نام سے سنسکرت زبان میں لکھی جانے لگیں۔ آریوں کا مرکزی مقام ہستن پور تھا جو دہلی کے قریب واقع ہے۔ یہیں سے انہوں نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ ۸۰۰ ق۔م سے ۵۵۰ ق۔م تک آریا مگدھ تک یعنی موجودہ صوبہ بہار تک پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ویدوں کی شرحیں لکھی گئیں اور اپنشدوں کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں ذات پات کا نظام پیدا ہوا۔ اسی دور میں جین مت اور بدھ مت نے جنم لیا۔

۳۲۷ ق۔م میں سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن وہ پنجاب سے آگے نہ بڑھ سکا ۳۲۱ ق۔م میں موریا سلطنت کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بانی چندر گپت موریا نے پہلی بار شمالی ہندوستان کو متحد کر کے پاٹلی پتر (پٹنہ) کو مرکزی مقام بنایا اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ اشوک (۲۷۳ ق۔م تا ۲۳۲ ق۔م) تھا۔ ۱۸۴ ق۔م میں موریا حکومت ختم ہو گئی اور باختر کے یونانی حکمران پنجاب پر قابض ہو گئے۔ وادی گنگا میں پشیہ مترنے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ ۷۲ ق۔م میں ختم ہو گئی۔

دوسرا بڑا خاندان جس نے ہندوستان میں بہت بڑی سلطنت قائم کی، کنشک تھا۔ اس خاندان کے بانی کنشک نے ۷۸ء میں کابل سے لے کر بنارس تک ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر لی۔ یہ خاندان ۱۷۶ء میں ختم ہوا۔ اس کے بعد مدت تک کوئی بڑی سلطنت نہیں ملتی۔ البتہ ۳۲۰ء سے ۵۳۵ء تک کے ایک لمبے عرصے کے لئے گپت خاندان برسر اقتدار آیا، جس نے پاٹلی پتر (پٹنہ) ہی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ شمالی ہند سے لے کر دکن تک اور مشرقی بنگال، آسام وغیرہ سے لے کر قندھار تک کے حکمران

Marfat.com

اس کے تابع تھے۔ اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران بکرماجیت (۳۷۵ء تا ۴۱۳ء) تھا اس نے مالوہ، گجرات اور سوراشٹر بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد یہ خاندان زوال پذیر ہوتا چلا گیا۔ اس خاندان کے عہد میں برہمن مت کو از سر نو فروغ حاصل ہوا۔

۵۰۰ء سے ۵۵۳ء تک وسط ایشیا پر سفید ہن قابض رہے۔ ان کے بادشاہ مہرگل کا مرکز حکومت سیالکوٹ تھا۔ لیکن یہ وسطی ہندوستان پر بھی حکمران تھا۔ اس وقت تھانیسر اور راجپوتانہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں جو مسلمانوں کی آمد تک قائم رہیں۔

۷۱۱ء میں مسلمان سپہ سالار محمد بن قاسم نے دیبل (بندرگاہ) کو فتح کر لیا اور پھر تین ہی برس میں اس نے مالوہ، راجپوتانہ، مارواڑ اور ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ نویں صدی عیسوی کے آنے تک یہ اسلامی حکومتیں خودمختار ہو چکی تھیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمود غزنوی نے جو غزنہ کا حکمران تھا، ہندوستان پر حملے کئے۔ ۱۰۲۵ء میں اس نے سومنات (گجرات) پر مشہور حملہ کیا اور یہاں اسلامی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد محمد، مسعود، مودود، علی، عبدالرشید، فرخ زاد، ابراہیم، مسعود، بہرام شاہ، خسرو شاہ اور خسرو ملک غزنوی خاندان کے یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔

۱۱۷۵ء میں شہاب الدین محمد غوری نے ملتان پر حملہ کیا پھر اُچ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۷۷ء میں گجرات پر چڑھائی کی۔ ۱۱۸۶ء میں لاہور فتح کیا اور ۱۱۹۲ء میں تھنیسر کو زیر نگیں کیا ۱۱۹۳ء میں اس نے رائے پتھورا کو شکست دے کر دہلی پر فتح حاصل کی۔ ۱۱۹۵ء میں قنوج کے راجہ جے چند کو شکست دے کر قنوج سے بنارس تک حکومت کی۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رضیہ بیگم، ناصر الدین محمود، غیاث الدین کیقباد خاندان غلامان کے نام سے حکمران ہوا۔

معز الدین کے وزیر فیروز خلجی نے جلال الدین کے لقب سے حکومت سنبھالی اس نے مالوہ پر دوبارہ تسلط حاصل کیا اور اس کے بھتیجے علاء الدین نے گوالیار کو فتح کیا۔ ۱۲۹۶ء میں علاء الدین تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بے حد وسیع کیا۔ یہاں تک کہ بنگال سے گجرات اور پنجاب سے دکن تک اسی کا ڈنکا بجنے لگا۔ اس لحاظ سے وہ ہندوستان بھر کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔

غیاث الدین تغلق ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث ۱۳۲۰ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے پوری سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا اور اس کے حاکم مقرر کئے۔ اس کے بعد محمد تغلق، فیروز شاہ تغلق، محمد شاہ اور محمود شاہ حکمران ہوئے۔ ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۰ء تک حاکم پنجاب خضر خان اور اس کی اولاد سلاطین خاندان کے نام سے حکومت کرتے رہے اس خاندان نے دہلی کے سوا باقی علاقوں کی حکومت کھو دی۔ اس پر محمد شاہ کے سپاہی بہلول لودھی نے پنجاب اور پھر دہلی کی حکومت پر قبضہ کیا اور لودھی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس نے جونپور پر فتح حاصل کی۔ اس کے بیٹے سکندر لودھی نے اپنی حکومت کو مالوہ سے بنگال تک وسعت دی۔ اس کے فرزند ابراہیم لودھی نے گوالیار کے قلعے پر قبضہ کیا۔ ۱۵۲۶ء میں مغل حکمران بابر نے پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی اور ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھی۔

بابر نے راجپوتانہ کے راجہ سانگا کو زبردست شکست دی اور حدود سلطنت کو جونپور سے بنگال تک وسیع کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا اور اس نے مختلف صوبوں کی حکومتیں اپنے بھائیوں میں تقسیم کر کے کالنجر کا محاصرہ کر لیا۔ پھر باغیوں کی گوشمالی کے لئے جونپور اور چنار گڑھ کی راہ لی۔ جہاں سے وہ شیر شاہ کو مغلوب کر کے واپس آیا۔ ۱۵۳۲ء میں بہادر شاہ والئ گجرات سے جنگ آزما ہوا۔ اسی دوران میں بہار میں شیر شاہ

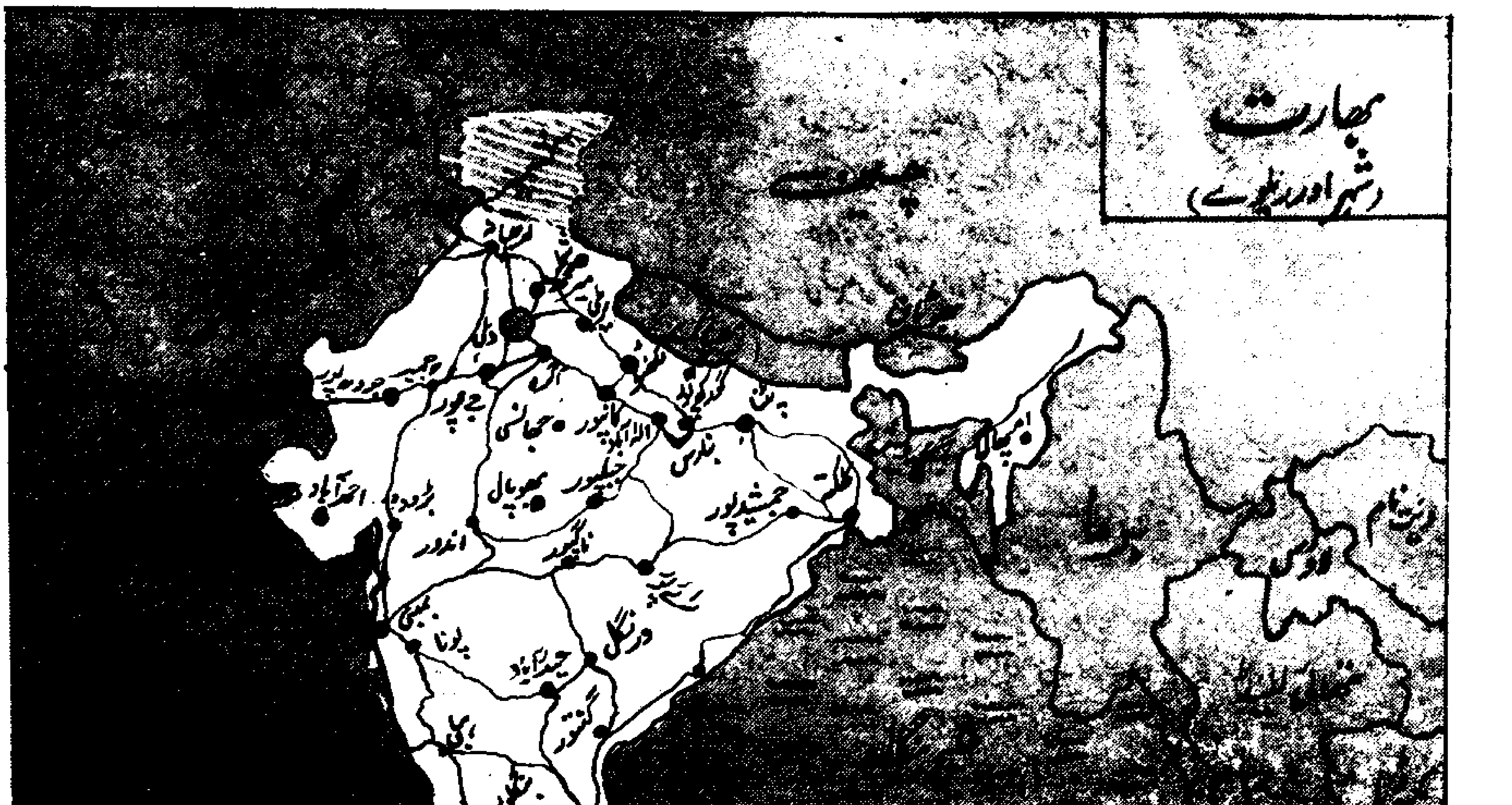

نے بغاوت کر دی۔ ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر پنجاب اور پھر سندھ چلا گیا۔ جہاں امر کوٹ کے مقام پر اس کا بیٹا اکبر پیدا ہوا۔ اس دوران میں شیر شاہ نے سوری خاندان کے نام پر بنگال، بہار، جونپور، آگرہ، دہلی، پنجاب، مالوہ اور راجپوتانہ پر حکومت کی۔ ۱۵۴۰ء میں وہ کالنجر کا قلعہ فتح کرتے وقت فوت ہوا۔ اس کے بعد سلیم شاہ، محمد شاہ عادل، ابراہیم سوری اور سکندر سوری حکمران ہوئے۔

۱۵۴۵ء ہی میں ہمایوں ایران سے قندھار آیا اور افغانستان کے اکثر علاقوں کو فتح کرتا ہوا لاہور کی طرف آیا۔ ۱۵۵۴ء میں اس نے سرہند کے قریب سکندر سوری کو شکست دی اور دہلی اور آگرہ کو فتح کر لیا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں فوت ہوا تو اس کا بیٹا اکبر تخت نشین ہوا۔ اس کے سرپرست اور وزیر بیرم خاں نے ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں ہیمو بقال کو شکست دی۔ اس کے بعد اکبر نے گجرات، بہار، بنگال کشمیر، قندھار، برار، خاندیش اور احمد نگر کو دوبارہ فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کیا۔ ۱۶۰۵ء میں اس کا بیٹا سلیم، جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی سلطنت مغلیہ کو استحکام حاصل رہا۔ اس کے بیٹے شاہ جہان کے عہد (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) تک سلطنت کے استحکام کا یہی حال تھا۔ مگر شاہجہان کے بیمار ہوتے ہی اس کے بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان حصول تخت کے لیے جنگیں چھڑ گئیں۔ اس سرپھٹول نے سلطنت مغلیہ کے استحکام کو نقصان پہنچایا اور اگرچہ اورنگ زیب نے ۱۷۰۶ء تک زبردست حکومت کی۔ مگر اس کے بعد مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور مغلوں کا اقتدار محض دہلی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اورنگ زیب کے بعد جہاں دار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، شاہ عالم دوم اور اکبر دوم یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ ۱۸۲۷ء میں اس کا بیٹا بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھا اور ۱۸۵۷ء تک دہلی پر حکمران رہا۔

اورنگ زیب کے عہد میں یورپی تاجر ہندوستان پہنچنے لگے اور انہوں نے کالی کٹ اور مدراس میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ ان میں ولندیزی، فرانسیسی اور پھر انگریز قابل ذکر ہیں۔ ولندیزی تو زیادہ تر مشرق بعید کی طرف متوجہ رہے لیکن فرانسیسیوں اور انگریزوں نے ملکی سیاست میں عمل دخل شروع کر دیا۔ خصوصاً جنوبی ہند کی ریاستیں دکن، میسور اور کرناٹک ان طاقتوں کی آویزشوں کا شکار رہیں۔ اس جوڑ توڑ میں انگریز کامیاب رہے۔ انھوں نے بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد جنوبی ہند کی طرف توجہ دی۔

لارڈ ویلزلی ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل رہا۔ اس کے عہد حکومت میں میسور کے حکمران ٹیپو سلطان شہید سے آخری جنگ ہوئی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کی شہادت پر جنوبی ہند پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس وقت دکن میں نظام خاندان حکمران تھا جو اب انگریزوں کا باجگزار بن کر رہ گیا۔ سلطنت میسور انگریزوں نظام اور مرہٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئے۔ مرہٹے اس وقت شمالی ہندوستان پر قابض تھے۔ بعدازاں مرہٹوں سے بھی جنگ ہوئی۔ پھر کارنوالس اور منٹو یکے بعد دیگرے گورنر جنرل بنے۔ اس دوران میں کچھ عرصہ سر جارج بارلو بھی حکومت کرتا رہا۔ منٹو نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے معاہدہ کر کے دریائے ستلج کو دریائی سرحد بنا لیا (۱۸۰۹ء)۔ ہیسٹنگز نے انگریزی حکومت کی سرحدیں بڑھائیں۔ ۱۸۲۴ء میں برما سے پہلی جنگ ہوئی۔ جو دو سال جاری رہی۔ ۱۸۳۵ء میں شہنشاہ دہلی کا نام سکوں سے خارج کر دیا گیا۔

لارڈ آکلینڈ (۱۸۳۶ء–۱۸۴۲ء) کے زمانے میں افغانستان سے جنگ ہوئی

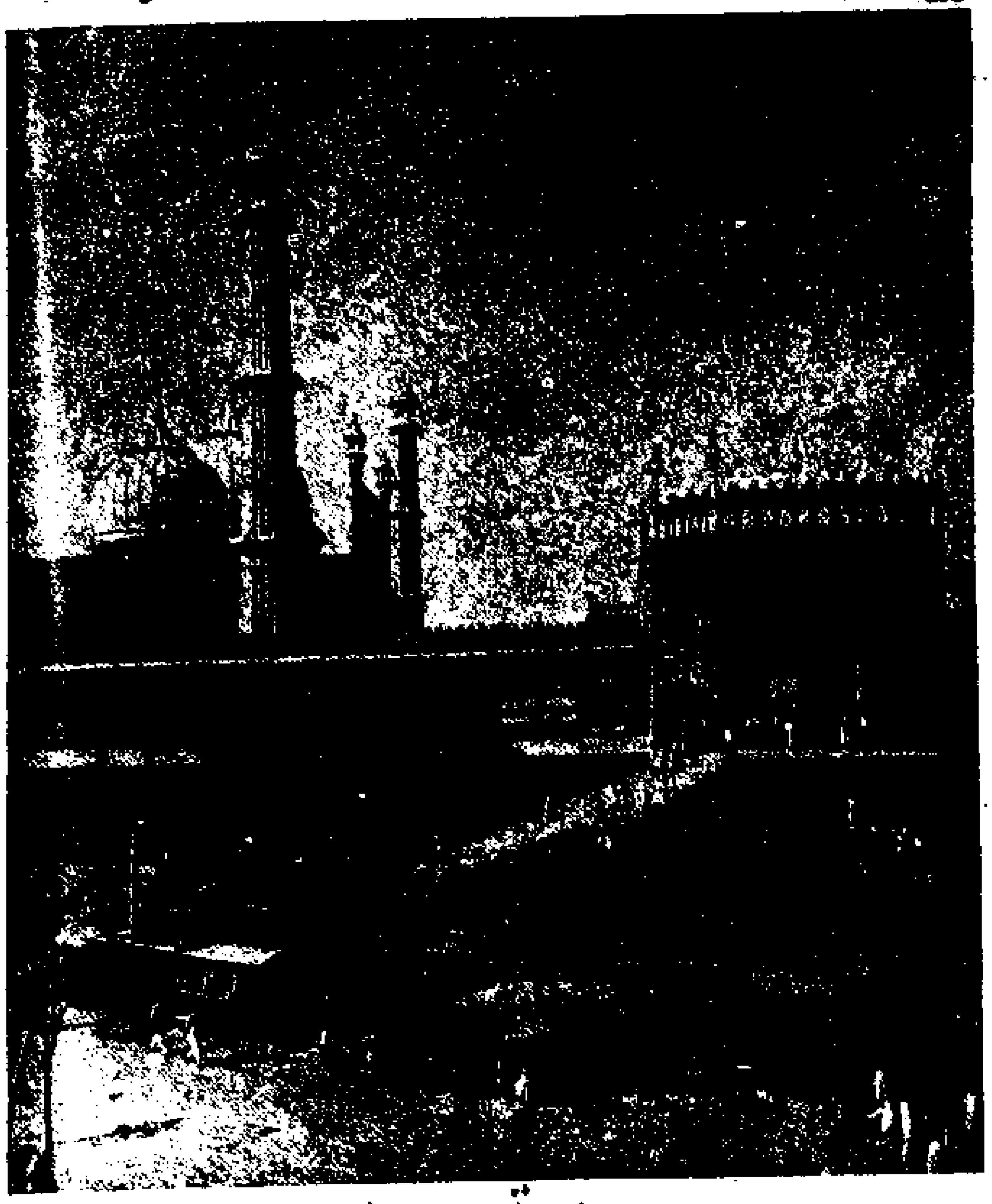

جامع مسجد دہلی (تعمیر شدہ ۱۶۵۸ء)

جس کا آخری فیصلہ لارڈ ایلن برا (۱۸۴۲ء – ۱۸۴۴ء) کے عہد میں ہوا۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ ہو گیا۔ بعدازاں سکھوں سے جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں پورا پنجاب انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ ادھر برما کا علاقہ بھی انگریزی قبضے میں آ گیا۔ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کی سلطنت بھی ختم کر دی گئی۔ لارڈ ڈلہوزی نے بہت سے راجاؤں اور رئیسوں کے علاقے انگریزی عملداری میں شامل کر لیے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے بعض فوجیوں اور رہنماؤں نے انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ شروع کی۔ جسے عام طور پر غدر کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اس میں زبردست نقصان اٹھانے اور بڑی کشمکش کے بعد دہلی اور لکھنؤ پر قبضہ کیا آخری مغل شہنشاہ کو رنگون بھیج دیا گیا جہاں وہ نومبر ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔ بے شمار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت سے رہنماؤں کو قید کر کے جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا۔

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور ہندوستان کا نظام براہ راست حکومت برطانیہ نے سنبھال لیا۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی پہلی سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ جسے زیادہ تر حمایت ہندوؤں کی حاصل تھی۔ ۱۸۹۲ء میں مقننہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے بنا۔ اسی زمانے میں انجمن ہائے امداد باہمی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس سے دیہی زندگی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ۱۹۰۵ء میں کرزن نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اس پر بنگالی ہندوؤں نے شورش برپا کی۔ ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم منسوخ کر دی گئی۔ اسی سال دہلی میں جارج پنجم کی تاج پوشی کی رسم ادا ہوئی۔ نیز دارالحکومت کلکتہ کی بجائے دہلی کو قرار دیا گیا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جسے پہلی اسلامی سیاسی جماعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ [illegible]

Marfat.com

نے اس کے ایک جلسے منعقدہ الٰہ آباد میں قیام پاکستان کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور میں قیام پاکستان کی قرارداد پیش کی گئی۔ جس کی رُو سے مسلم اکثریت والے علاقے ایک آزاد ریاست قرار پانے تھے۔

۱۹۰۹ء میں جو آئینی اصلاحات ہوئیں۔ انہیں منٹو مارلے اصلاحات کہا جاتا ہے ان میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔

آل انڈیا نیشنل کانگریس کے چند اہم رہنماؤں میں جے بی کرپلانی، مولانا ابوالکلام آزاد، قائداعظم، سوبھاش چندر بوس، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد، حکیم اجمل خاں، دیش بندھو داس، مسٹر سی آر داس، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر ایم اے انصاری، مسز سروجنی نائیڈو، مولانا محمد علی اور مہاتما گاندھی ہیں، ان سب نے وقتاً فوقتاً کانگریس کے جلسوں کی صدارت کی۔

۱۹۳۷ء میں بہت سے صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوگئیں۔ مگر جب ۱۹۳۹ء میں انگریزوں نے ہٹلر کے خلاف اعلان جنگ کیا تو کانگریسی وزرا مستعفی ہوگئے اور انہوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر کانگریسی لیڈروں نے مرکز میں وزارت بنانا منظور کرلیا۔ اس وزارت کے برسراقتدار آتے ہی ہندو اکثریت کے علاقوں میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔

۱۹۴۲ء میں کرپس مشن ہندوستان آیا۔ تقسیم ہند کی تجویز اصولاً پہلے اسی نے تسلیم کی۔ کانگریس پورے ہندوستان کو ایک ملک قرار دیتی تھی اور مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ اگر کوئی صوبہ متحدہ ہندوستان میں نہ رہنا چاہیے۔ تو اسے اختیار حاصل ہونا چاہیے

۱۹۴۵ء میں برما کو الگ نوآبادیاتی حیثیت دے دی گئی۔ اسی سال برطانیہ میں لیبر پارٹی برسراقتدار آئی جو شروع ہی سے کانگریس کی حامی تھی۔ مسلم لیگ نے کانگریس کو انتخابا لڑنے کا چیلنج دیا۔ ۱۹۴۶ء میں عام انتخابات ہوئے، جن میں کانگریس کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا، جس نے تقسیم ہند کا مسودہ پیش کیا۔ مسلم لیگ نے اسے قبول کرلیا۔ لیکن کانگریس نے اسے توڑ مروڑ کر منظور کیا۔ کانگریس نے آسام کو بنگال سے علیحدہ علاقہ قرار دیا۔

۲۴ راگست ۱۹۴۶ء کو برطانیہ نے ہندوستان میں عبوری حکومت بنانے کا اعلان کیا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں یہ حکومت کانگریس کے سپرد کردی گئی۔ اکتوبر میں نواب حمیداللہ خاں فرمانروائے بھوپال نے گاندھی سے اس مسودہ پر دستخط لے لئے۔ جس میں گاندھی جی نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نمائندہ ترین جماعت تسلیم کرلیا۔ ۱۲ راکتوبر کو لارڈ ویول نے کیبنٹ مشن پلان کی مسلم لیگی تعبیر و تشریح کے مطابق، عبوری حکومت میں مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کو وزارت سنبھالنے کے لئے مدعو کیا اور مسلم لیگی بلاک نے وزارتیں سنبھال لیں۔ کانگریس نے اہم وزارتوں پر خود قبضہ رکھا۔ وزارت خارجہ پر پنڈت جواہر لال نہرو، وزارت دفاع پر سردار بلدیو سنگھ اور وزارت داخلہ پر سردار پٹیل براجمان ہوئے۔ ادھر مسلم لیگ کے نوابزادہ لیاقت علی خاں کو وزارت خزانہ کا منصب ملا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن کانفرنس ہوئی، جس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم اور لیاقت علی خاں نے شرکت کی۔ اور کانگریس کی طرف سے جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی سیاسی تقسیم کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا

۲۰ رفروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ ایک جغرافیائی سلسلہ ہے۔ اس کے تاریخی فیصلے کے مطابق ۱۔

بھارت کی سیاسی تقسیم — رقبہ اور آبادی

علاقہ	صدر مقام	رقبہ (کلومیٹر)	آبادی (ہزاروں میں) ۱۹۷۱ء
ریاستیں (صوبے)			
آسام	دیس پور	۷۸۵۲۳	۱۴۶۰۰
آندھرا پردیش	حیدرآباد	۲۷۵۲۸۱	۴۳۳۹۰
اترپردیش	لکھنؤ	۲۹۴۳۶۶	۸۸۲۹۹
اڑیسہ	بھونیسوار	۱۵۵۸۲۵	۲۱۹۳۵
بنگال	کلکتہ	۸۸۵۶۳	۴۴۴۴۰
بہار	پٹنہ	۱۷۴۰۳۸	۵۶۳۵۲
پنجاب	چندی گڑھ	۵۰۳۷۶	۱۳۵۵۱
تامل ناڈو	مدراس	۱۳۰۳۵۷	۴۱۱۰۳
تری پورہ	اگرتلا	۱۰۴۵۳	۰۱۵۵۶
جموں کشمیر	سری نگر	متنازعہ علاقہ	
راجستھان	جے پور	۲۴۳۲۷۴	۲۵۷۲۴
کرناٹک	بنگلور	۱۹۱۷۵۷	۲۹۲۶۳
کیرالا	تری واندرم	۳۸۸۵۵	۲۱۳۴۷
گجرات	احمد آباد	۱۹۵۹۸۴	۲۶۶۹۸
منی پور	امپھال	۲۲۳۴۶	۱۰۷۰
مدھیا پردیش	بھوپال	۴۴۳۴۵۲	۴۱۴۵۰
میگھالیہ	شیلانگ	۲۲۴۴۵	۹۸۳
مہاراشٹر	بمبئی	۳۰۷۷۶۲	۵۰۴۱۲
ناگالینڈ	کوہیما	۱۶۵۲۷	۵۱۶
ہریانہ	چندی گڑھ	۴۴۰۵۶	۹۹۷۱
ہماچل پردیش	شملہ	۵۵۶۷۳	۳۴۶۰
ملحقہ علاقے			
آرونا چل پردیش	شیلانگ	۸۱۴۲۶	۴۴۵
انڈیمان، نکوبار	پورٹ بلیئر	۸۱۲۰	۱۱۵
پانڈیچری	پانڈیچری	۴۶۹	۴۷۱
چندی گڑھ	چندی گڑھ	۲۶	۸۹
دادر، نگر حویلی	سلواسا	۴۹۱	۷۴
دہلی	دہلی	۱۴۸۶	۴۰۶۶
گوا، دمن، دیو	پنجم	۳۶۹۳	۸۵۷
لکشا دویپ	کوارتی	۳۲	۰۳۲
میزورم	حزو	۲۱۲۳۰	۴۰۰

۱۔ برطانوی حکومت اپنے قطعی ارادے کا اعلان کرچکی ہے کہ ممالک ہندوستان کا اقتدار وہیں کے ذمہ دار ہاتھوں میں منتقل ہوگا۔ اس کی تعمیل میں جون ۱۹۴۸ء سے زیادہ تاخیر نہیں کی جائے گی۔

۲۔ حکومت کو اعتراف ہے کہ اس بات کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا کہ کسی آئین پر وہاں کی تمام سیاسی جماعتیں متفق ہو جائیں۔

۳۔ برطانوی حکومت اعلان کرتی ہے کہ تاریخ موعود تک یا تو وہ ہندوستان کی کی ایک مرکزی حکومت کو اقتدار سونپ دے گی یا بعض صوبائی حکومتوں کو جسطرح بھی ممکن ہوا، اقتدار دے دیا جائے گا۔

کانگریس اس امر پر رضامند ہو چکی تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے نام سے علیحدہ حیثیت حاصل کر لیں لیکن پنجاب اور بنگال کے وہ اضلاع جہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں کانگریسی علاقوں کے ساتھ ملحق کر دیئے جائیں۔

تاریخ ۱-۳ جون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آزادیٔ ہند کا مژدہ سنایا۔ جس کی رُو سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ہندوستان دو آزاد مملکتوں پاکستان اور بھارت میں تقسیم ہو گیا۔ کانگریس نے عملاً لارڈ ماونٹ بیٹن ہی کو اپنا گورنر جنرل بنائے رکھا بھارت دولتِ مشترکہ برطانیہ کا رکن رہا اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۹ء کو لندن میں ہونے والی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں تسلیم کیا کہ بھارت خود کو برطانوی ملکہ کے زیر سایہ سمجھتا ہے۔ ۱۷ مئی ۱۹۴۹ء کو بھارت کی قانون ساز اسمبلی نے اس امر کی توثیق کر دی کہ بھارت برطانوی تاج کے زیر سایہ دولت مشترکہ کا ایک رکن ملک ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو بھارتی آئین منظور ہوا اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے نافذ ہو گیا۔ اس آئین کی رُو سے ۵۲۶ ریاستوں کے "متحدہ ہندوستان" کو جمہوریہ بھارت کا نام دیا گیا۔ ریاستوں کی تعداد تیس کر دی گئی۔ گورنر جنرل کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔ اور ملک میں وزارتی نظام نافذ کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء تک اس آئین میں چالیس کے قریب ترامیم ہو چکی ہیں۔ اس آئین کی رُو سے بھارت کی سرکاری زبان ہندی اور رسم الخط دیوناگری قرار پایا۔ انگریزی کو ۱۹۶۵ء تک متبادل سرکاری زبان رہنے دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں لسانی ترمیم کا ایک بل منظور کیا گیا، جس میں انگریزی اور ہندی دونوں کو سرکاری زبانیں قرار دیا گیا دیگر زبانوں مثلاً آسامی، بنگالی، گجراتی، کناڈا، کشمیری، ملائیلم، مرہٹی، اڑیا، پنجابی سنسکرت، سندھی، تامل، تلگو اور اردو کو آئین کے آٹھویں گوشوارے میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں بھارت نے کشمیر اور پھر حیدر آباد اور جونا گڑھ جیسی ریاستوں پر فوج کے بل بوتے پر قبضہ کر لیا، جو یا تو پاکستان کے ساتھ الحاق کر رہی تھیں یا کرنے والی تھیں۔ اس وقت سے ۱۹۷۶ء تک اگرچہ مرکزی حکومت پر کانگریس ہی برسر اقتدار رہے لیکن آزادی کے فوراً ہی بعد اس جماعت کی مقبولیت میں کمی آنا شروع ہو گئی۔ اور دائیں اور بائیں بازو کے عناصر زور پکڑتے چلے گئے۔ خصوصاً کمیونسٹ گروہ کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا۔ پنجاب میں سکھوں نے بمبئی میں مہاراشٹر صوبے

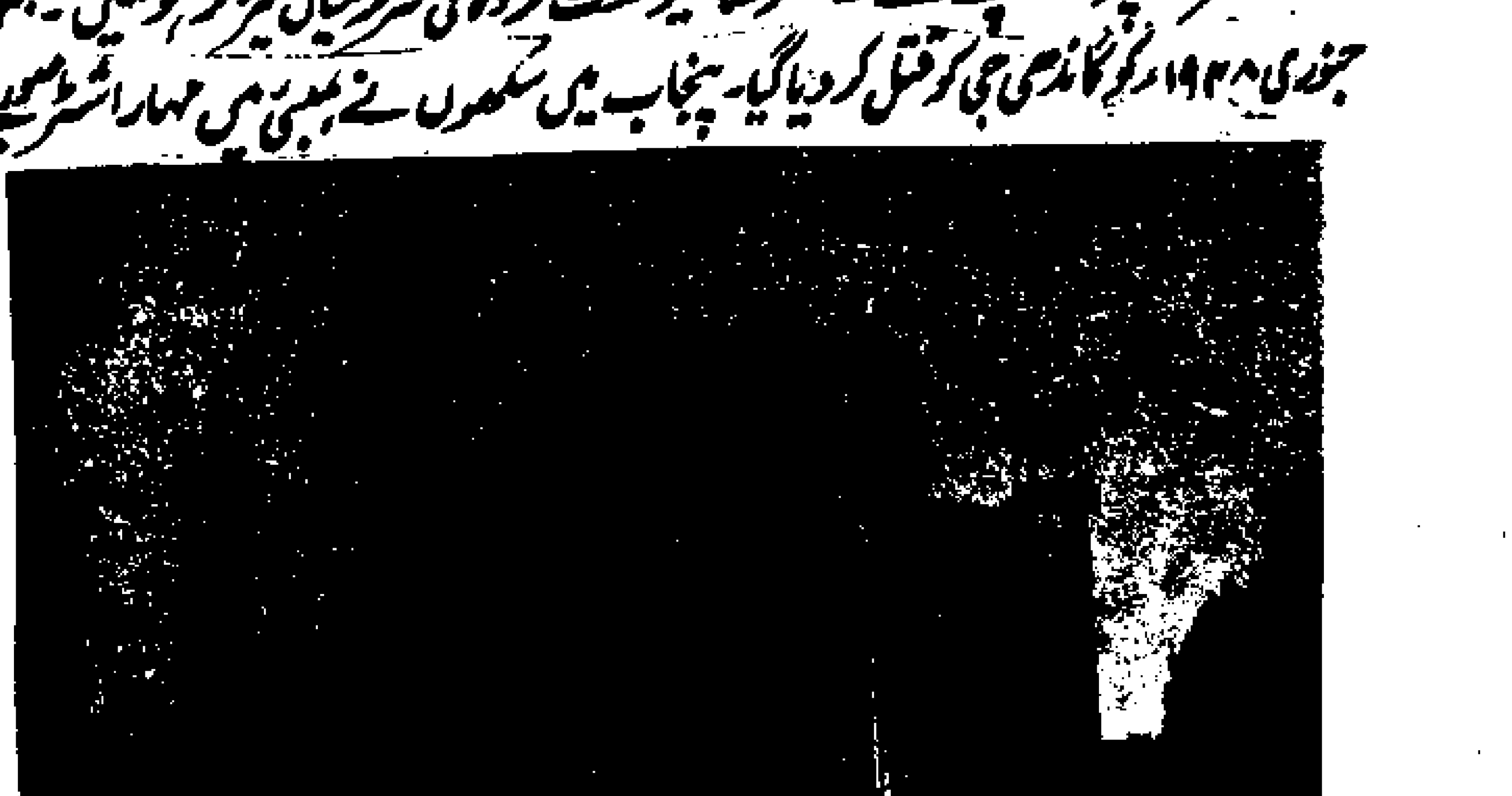

تاج محل آگرہ کا خوبصورت دروازہ

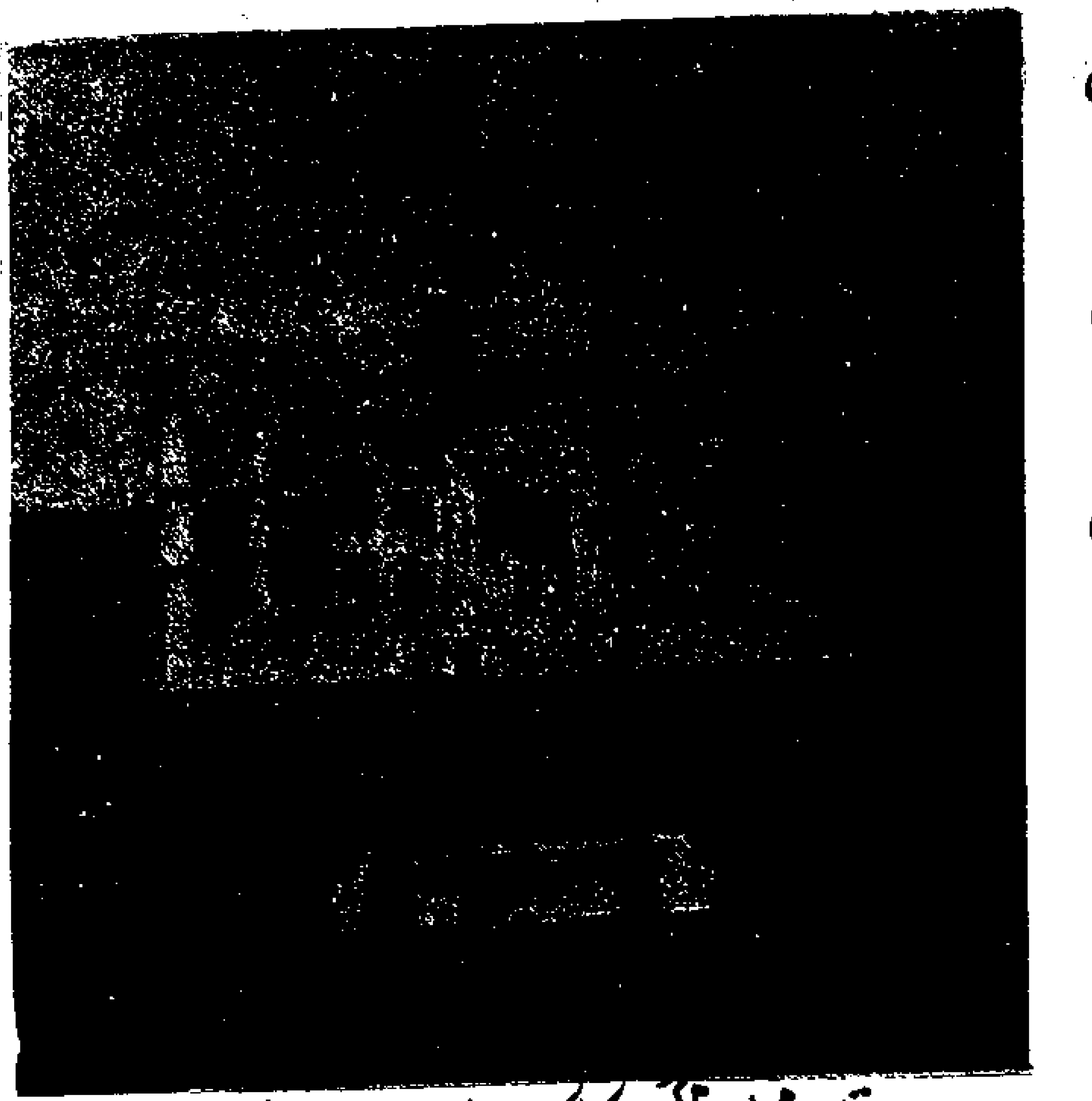

تاج محل آگرہ کا ایک خوبصورت منظر

کے حامیوں اور شمال مشرقی علاقوں میں ناگا قبائل نے اپنے حقوق کے لئے فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم بنے۔ خوش قسمتی سے انھیں زیادہ مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں بڑے بڑے رہنما یا تو راہی ملک عدم ہوئے یا پھر وزارتوں سے مستعفی ہو گئے۔ مثلاً پٹیل اور ابوالکلام آزاد فوت ہو گئے اور امبیدکر، دیش مکھ اور مکرجی جیسے وزرا مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء میں پنڈت نہرو نے انتقال کیا تو لال بہادر شاستری وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ ان کے دور اقتدار میں بھارت نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر حملہ کیا، اس جنگ میں بھارت کے بہت سے علاقے پاکستان کے قبضے میں چلے گئے۔ بالآخر روس نے دونوں ملکوں میں صلح کرائی جنوری ۱۹۶۶ء میں تاشقند کے مقام پر معاہدہ ہوا۔ جس پر دستخط کرنے کے فوراً بعد وزیر اعظم شاستری انتقال کر گئے۔ اب وزارتِ عظمیٰ پنڈت نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کے پاس آئی۔ اس وقت سے لمحہ جاریہ (۱۹۷۶ء) تک وہی اس عہدے پر براجمان ہیں انہوں نے بزعم خود اپنے عہدے میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یعنی ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے ساتھ جنگ چھیڑ کر اس کے ایک حصے مشرقی پاکستان کو اس سے کاٹ کر ایک آزاد حکومت "بنگلہ دیش" کی حیثیت دلوائی۔

اقتصادی اور دیگر معلومات: بھارت ایک غیر مذہبی لادینی جمہوری وفاقی ملک کہلاتا ہے۔ لیکن یہاں ہندو مذہب کے پیروکار اکثریت میں یعنی ۸۲٫۶۷٪ ہیں اور ملکی سیاست، معیشت، ثقافت اور تہذیب پر انہی کی اجارہ داری ہے۔ دیگر مذاہب کے پیروکاروں میں مسلمان ۱۱٫۲۱٪، عیسائی ۲٫۶۰٪، سکھ ۱٫۸۹٪، بدھ (۰٫۷۱٪) جین ۰٫۴۷٪ اور دیگر مذاہب (۰٫۴۲٪) ہیں۔

تعلیمی لحاظ سے بھارت ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ شرح خواندگی ۳۰٪ ہے تعلیمی منصوبہ بندی صوبائی حکومتوں کا کام ہے۔ تاہم مرکزی حکومت بجٹ کا ایک حصہ اور بنیادی پالیسی مہیا کرتی ہے۔ مرکزی حکومت ہندی زبان کی ترویج، اشاعت اور تحفظ کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ مرکزی حکومت کے ساتھ ۴۹ خود مختار تعلیمی ادارے وابستہ ہیں، جن میں پانچ قومی یونیورسٹیاں اور ایک قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق و تربیت شامل ہے۔

Marfat.com

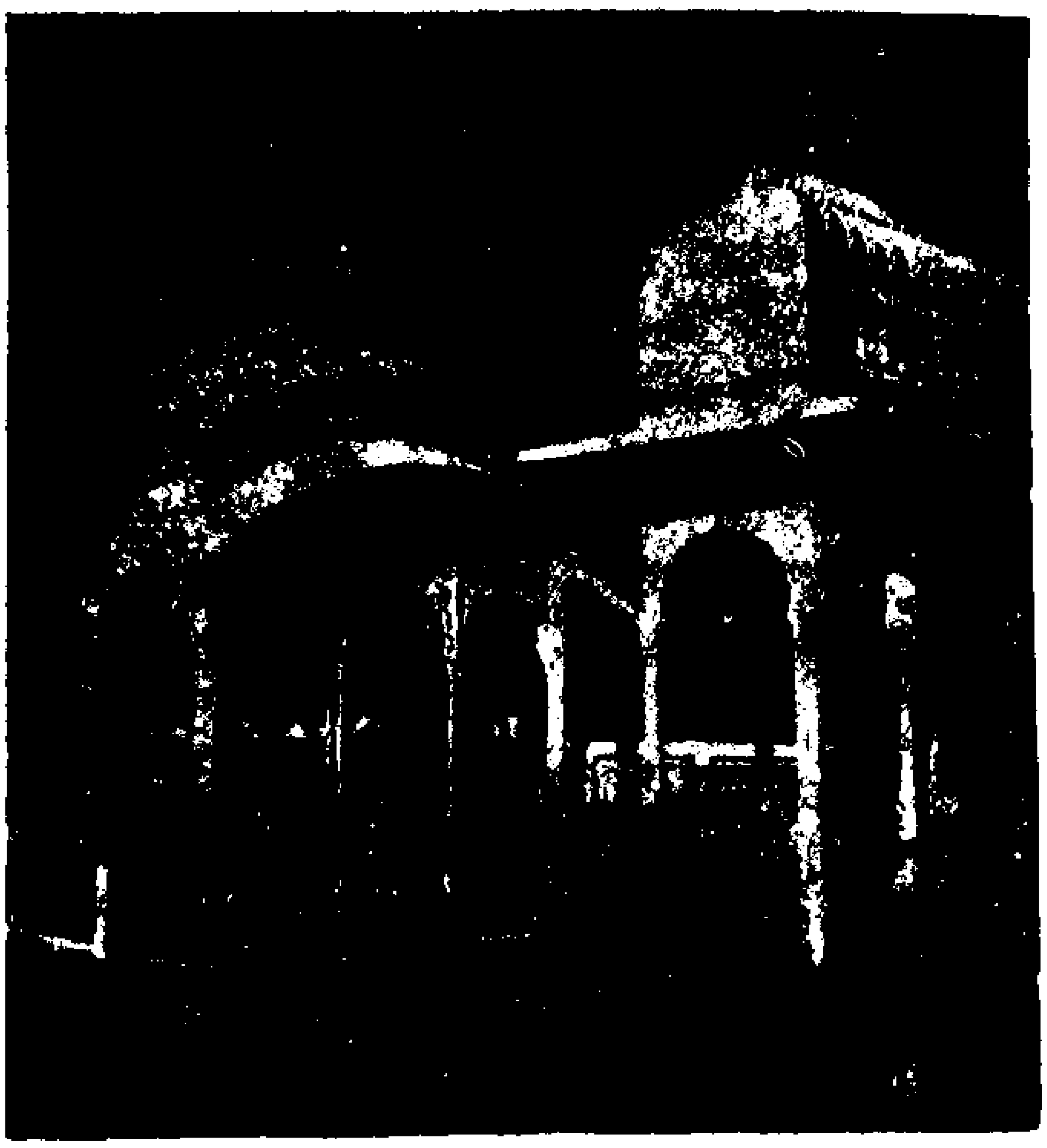

جے پور کا ایک قدیم مندر

۱۹۷۴ء میں پورے ملک میں ۹۶ یونیورسٹیاں، ۱۰ تعلیمی ادارے، نونیم تعلیمی ادارے، ۱۳۰ ٹیکنالوجی اور انجنیئرنگ کے ڈگری تعلیمی ادارے اور ۲۸۴ ڈپلوما ٹیکنالوجی کے ادارے ہیں۔ ۲۲۲۷ پیشہ وارانہ تعلیمی ادارے ۲۱۲۹۲۶ خصوصی تعلیمی ادارے۔ ۱۲۲۸۰۱ سیکنڈری، ۴۰۲۶۲۸ پرائمری اور ۴۷۳ ابتدائی سکول ہیں۔

بھارتی سکہ روپیہ ہے۔ جو ۱۹۵۴ء سے اعشاری نظام میں منقسم ہے۔ اس کی بنیادی اکائی پیسہ کہلاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں بھارت کی کل زیرگردش کرنسی ۴۰۰۶ کروڑ تھی۔ بھارت قرض کا بے حد مقروض ہے۔ صرف ریاست ہائے متحدہ امریکا کے ۴۶۲ کروڑ روپے، برطانیہ کے ۴۶ کروڑ روپے، مغربی جرمنی کے ۴۰۸ کروڑ روپے، روس کے ۲۵۳ کروڑ روپے اور عالمی بینک کے ۴۵۲ کروڑ روپے بھارت کی طرف واجب الادا ہیں۔

بھارتی بجٹ کا زیادہ تر حصہ فوجی تیاریوں پر صرف ہوتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں کل دفاعی اخراجات ۱۰۳۰ کروڑ روپے تھے۔ جب کہ کل اخراجات ۴۱۲۴ کروڑ روپے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں بھارتی فوج کی کل تعداد ۸۲۶۰۰۰ ہے۔ جو دو توپ خانے ۱۴ پیادہ اور دس پہاڑی ڈویژن ۵ آزاد آرمڈ بریگیڈ، ۷ آزاد پیادہ اور ایک پیراشوٹ بریگیڈ پر مشتمل ہے بحریہ کے کل افسر ۳ ہزار ہیں، جو چار آبدوزوں، تین تباہ کن جہازوں، دو عمومی بیڑوں، دو آبدوز شکن بیڑوں دو چھوٹے آبدوز شکن بیڑوں، تین طیارہ شکن بیڑوں، چھ لڑاکا بیڑوں، آٹھ روسی جہازوں چھ ساحلی محافظ جہازوں، آٹھ میزائیل کشتیوں، ۷ گشتی کشتیوں، ۵ طیارہ بردار وں، ۴ سروے جہازوں اور ایسے ہی دس دیگر جہازوں پر مشتمل ہے۔ فضائیہ میں دو ہزار طیارے اور ۴۵ سکوارڈن شامل ہیں، جن پر پانچ ہزار افسر کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے محفوظ آرمڈ ڈویژن، بحری بیڑے اور فضائی سکوارڈن ہیں جو سرکاری اعداد و شمار میں شامل ہیں۔

بھارت ایک زرعی ملک ہے، جس پر ملک کی ستر فیصد آمدنی کا دارومدار ہے۔ اجناس کی پیداوار ملکی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔ چنانچہ ہر سال باہر سے درآمد کرنا پڑتی ہیں۔ جس کے بدلے میں چائے اور پٹ سن برآمد کی جاتی ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں کل پیداوار چاول ۳۸۶۳۳ ہزار میٹرک ٹن، گندم ۲۴۹۲۳ ہزار میٹرک ٹن، مکئی ۶۲۲۸ ہزار میٹرک ٹن، چینی ۱۲۳۰۹۸ ہزار میٹرک ٹن اور جوار، باجرہ ۱۰۳۲۸ ہزار میٹرک ٹن تھی۔ تقریباً ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ہیکٹر رقبہ پر غلہ کاشت ہوتا ہے اور تقریباً اتنا ہی بارانی اور سیلابی زمین کاشت ہے۔ معدنیات میں باکسائیٹ، چینی مٹی، کرومائیٹ، کوئلہ، لوہا، تانبا، سونا، چاندی، مینگانیز، پٹرولیم اور جست اہم ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں کوئلے کی صنعت کو قومیا لیا گیا۔ صنعتوں میں ٹیکسٹائل پہلے نمبر پر ہے۔ دیگر ریشم، اون اور دھاتوں کی صنعتیں اہم ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں

بھارت کے چند مشہور شہروں کی آبادی۔ ہزاروں میں (۱۹۷۱ء)

آگرہ (۶۳۸)	بنگلور (۱۶۴۸)	چندی گڑھ (۲۳۳)	کلکتہ (۷۰۰۵)
اجمیر (۲۶۳)	بہار (۱۰۱)	حیدرآباد (۱۷۹۹)	کوچین (۴۳۹)
اجین (۲۰۹)	بھاگلپور (۱۷۳)	دربھنگا (۱۳۲)	گنٹور (۲۳۰)
احمد آباد (۱۵۸۸)	بہرام پور (۱۱۸)	دہرہ دون (۲۰۰)	گوالیار (۴۰۷)
احمد نگر (۱۱۷)	بھوپال (۳۹۲)	دلی (۳۶۳۰)	گورکھپور (۲۳۰)
اکولا (۱۶۹)	بھوبنیشور (۱۰۶)	راجکوٹ (۳۰۰)	گوہاٹی دیسپور (۱۲۳)
الہ آباد (۵۱۴)	بیجاپور (۱۰۳)	رامپور (۱۶۲)	گیا (۱۸۰)
امپھال (۱۰۱)	بیکانیر (۱۸۹)	رانچی (۲۵۶)	لدھیانہ (۴۰۱)
امرتسر (۴۳۳)	پٹنہ (۴۹۰)	رائے پور (۲۰۶)	لکھنؤ (۸۲۶)
امراوتی (۱۹۴)	پٹیالہ (۱۵۲)	روہتک (۱۲۵)	متھرا (۱۴۱)
انبالہ (۱۰۳)	پونا (۸۵۳)	سالم (۳۰۸)	مدراس (۲۴۷۰)
اندور (۵۷۳)	تھانہ (۱۷۰)	سورت (۴۷۲)	مدورائے (۵۴۸)
اودے پور (۱۶۳)	جالندھر (۲۹۶)	سہارنپور (۲۲۶)	مراد آباد (۲۰۲)
اورنگ آباد (۱۵۱)	جام نگر (۲۱۵)	شاہجہانپور (۱۴۳)	مالیگاؤں (۱۹۲)
بردوان (۳۵)	جبل پور (۵۳۴)	علیگڑھ ([illegible])	منگلور (۲۱۴)
بڑودہ (۴۶۸)	جل گاؤں (۱۰۷)	غازی آباد (۱۲۸)	میسور (۳۵۶)
برہان پور (۱۰۵)	جمشید پور (۴۶۵)	فرخ آباد (۱۱۲)	ناگپور (۸۶۶)
بریلی (۳۲۶)	جودھپور (۳۱۹)	فیروزآباد (۱۳۴)	نظام آباد (۱۱۵)
بلگام (۲۱۴)	جھانسی (۱۹۸)	فیض آباد (۱۱۰)	ویلور (۱۳۸)
بمبئی (۵۹۶۹)	جے پور (۶۱۳)	کانپور (۱۲۷۳)	
بنارس (۵۸۴)		کرنول (۱۳۷)	

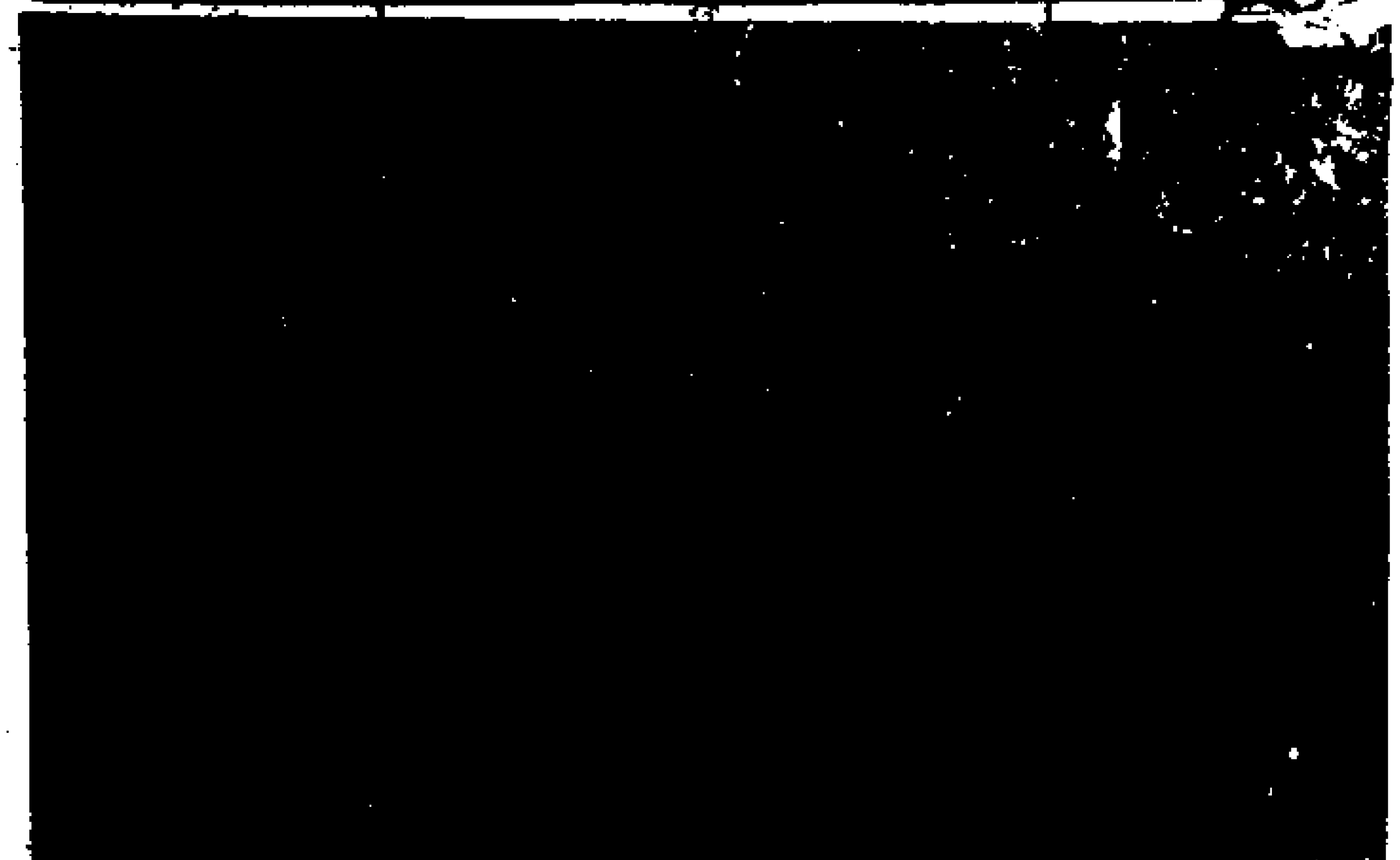

امرتسر کا مشہور گوردوارہ

Marfat.com

لوہے اور فولاد کی صنعت کو ترقی دیا گیا۔ جو تقریباً ایک کروڑ ٹن سالانہ فولاد اور اس کی اشیا تیار کرتی ہے۔ بھارت کی تجارت دنیا کے اکثر ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔ برآمدات میں پہلے نمبر پر جاپان ہے۔ اس کے بعد امریکا پھر روس اور برطانیہ کا نمبر آتا ہے۔ درآمدات میں امریکا پہلے نمبر پر ہے۔ اس کے بعد ایران، پھر جاپان، روس اور برطانیہ کا نمبر آتا ہے۔ برآمدات میں کپڑا، پٹ سن، چمڑا، لوہا، چائے، مچھلی، پھل، تمباکو اور ان کی مصنوعات اہم ہیں۔ درآمدات میں پٹرولیم، مشینری، گندم، چاول، کھاد، فولاد، برقی اشیا، کیمیاوی اشیا اور ان کی مصنوعات اہم ہیں۔

بھارت میں ریلوے لائن کی کل لمبائی ساٹھ ہزار کلومیٹر ہے اور سڑکوں کی کل لمبائی ۱۲،۸۸،۲۸۸ کلومیٹر ہے۔ ہوائی اڈوں کی کل تعداد ۸۴ ہے۔ جہاں بھارت کے ۲۸۲ طیارے اترتے چڑھتے ہیں۔ ان اڈوں میں سے چار بمبئی، کلکتہ، دہلی اور مدراس بین الاقوامی پروازوں کے اڈے ہیں۔

بہاری، غلام یحیی ایک عالم دین۔ باپ کا نام نجم الدین تھا صوبہ بہار کے ایک گاؤں "باڑہ" میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ البتہ ان کی کتاب میں ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کا اندازہ لگایا گیا ہے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے مختلف مدارس میں حاصل کی۔ تکمیل علوم مدرسہ منصوریہ میں مولانا باب اللہ جونپوری سے کی۔ طریقت میں شیخ بدرالعالم ساواموی سے فیض حاصل کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ لکھنؤ میں مدرس مقرر ہوئے اور برسوں تک تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعد میں دہلی میں مرزا مظہر جانجاناں سے طریق نقشبندی میں اجازت حاصل کی اور پانچ سال تک ان کی خدمت میں رہنے کے بعد خلافت سے نوازے گئے۔ بعد میں لکھنؤ آ گئے اور شیخ پیر محمد لکھنوی کے زاویے میں مسجد شیخ محمود قلندر کے قریب سکونت اختیار کی۔ اور ظاہری علوم کی تدریس ختم کر دی۔ نیز علوم عقلیہ کو بالکل بھلا دیا۔ اور باطنی علم کی تعلیم دینے میں مصروف ہو گئے۔ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں اور صاحب "نزہتہ الخواطر" کے بقول ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء ہے۔ یہیں پر مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں دو رسالے خاص طور پر مشہور رہے اور درس نظامی کے نصاب میں داخل ہیں۔

۱۔ حاشیہ شرح "سلم العلوم"۔ ۲۔ لباب الھدیٰ فی اللیل والدجیٰ۔ ۳۔ "کلمۃ الحق" (یہ کتاب تصوف کے بارے میں ہے۔)

بہاری، محب اللہ (وفات ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) ایک عالم دین، والد کا نام عبدالشکور عثمانی تھا۔ صوبہ بہار میں محب علی پور کے قریب موضع کڑا میں پیدائش ہوئی۔ ان کے آباؤ اجداد باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مولانا قطب الدین انصاری سے حاصل کی اور کچھ کتابیں قطب الدین شمس آبادی سے پڑھیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر دکن چلے گئے۔ اس زمانے میں اورنگ زیب دکن کے مقامی حکمرانوں سے معرکہ آرائی میں مصروف تھا۔ اورنگ زیب نے مولانا محب اللہ بہاری کی علمی لیاقت اور خصوصاً فقہ کی مہارت سے متاثر ہو کر انہیں لکھنؤ کا قاضی مقرر کیا۔ ۱۰۹۷ھ/۸۶-۱۶۸۶ء میں انہیں حیدرآباد کا قاضی بنایا اور اس کے بعد اورنگ زیب کے پوتے رفیع القدر کا استاد مقرر کیا گیا۔ جب شاہ عالم کو صوبہ کابل کا صوبے دار مقرر کیا گیا تو محب اللہ بھی کابل چلے گئے۔ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں جب شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے لقب سے تخت پر بیٹھا تو اس نے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا اور فاضل خان کے لقب سے نوازا۔ اس کے تھوڑی مدت بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی تصانیف ہیں ۱۔ سلم العلوم۔ ۲۔ مسلم الثبوت۔ ۳۔ الجوہر الفرد۔ ۴۔ رسالۃ المغالطۃ العامتہ الورود۔ ۵۔ رسالہ فی اثبات انّ مذہب الحنفیۃ ابعد عن الرای من مذہب الشافعیۃ ہیں۔ پہلی تین تصانیف پاک و ہند میں دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔

بہاول پور پاکستان کا ایک شہر اور کمشنری۔ شہر دریائے ستلج کے بائیں کنارے پر پشاور کراچی کی ریلوے لائن پر واقع ہے پہلے یہ ریاست بہاولپور کا صدر مقام تھا۔ جو دریائے ستلج، پنجند اور سندھ کے بائیں کنارے پر تین سو میل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا عرض اوسطاً ۴۰ میل تک صحرا میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کی بنیاد سندھ کے داؤد پوتا خاندان کے دوسرے حکمران نے رکھی تھی جس کا نام محمد بہاول خان تھا۔ اس نے ۱۷۴۸ء میں بہاولپور شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنے نام [illegible] سے موسوم کیا۔ یہ حکمران خاندان جو اپنے مورث اعلیٰ عباس کی نسبت سے عباسی بھی کہلاتا ہے اٹھارویں صدی کے اواخر میں افغان بادشاہوں کی سیادت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان عباسیوں کا بغداد اور مصر کے عباسیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۱۸۳۸ء میں اس خاندان نے انگریزوں کے ساتھ [illegible] معاہدہ کر لیا۔

پاکستان بننے کے بعد ۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یہ ریاست پاکستان میں شامل ہو گئی ۱۹۵۵ء میں بہاولپور ریاست کا جداگانہ وجود ختم کر دیا گیا اور یہ ریاست صوبہ مغربی پاکستان میں مدغم ہو گئی۔ ۱۹۶۹ء میں اس شہر کی آبادی ۱۴۷،۰۰۰ تھی۔ بہاولپور شہر میں دو بڑے بازار ہیں۔ جو ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ایک بڑا محل ہے جو ۱۸۹۱ء میں نواب بہاولپور دوم نے بنوایا تھا۔ اب یہ محل سرکاری دفاتر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک نیا محل نواب صادق نے بنوایا ہے۔ جو رہائش کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید عمارات میں لائبریری، سٹیڈیم، صادق ایجرٹن کالج، جامعہ اسلامیہ بہاولپور اور ایک بڑا ہسپتال ہے۔ ایک چڑیا گھر، عجائب گھر اور ایک اردو اکیڈمی بھی موجود ہے۔ یہاں صابن بنانے کی ایک بڑی فیکٹری ہے۔ یہ گیہوں، جوار، کپاس اور کھجور کی بڑی منڈی ہے۔

بہاولپور کمشنری میں ۱۹۵۱ء میں دو اضلاع بہاولپور اور رحیم یار خان تھے ۱۹۵۴ء میں بہاولنگر ضلع کو بھی شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں ضلع بہاولپور کی آبادی ۴،۵۵۲،۳ تھی۔ ۱۹۵۵ء میں جب مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنایا گیا تو بہاولپور کو بہاولنگر اور رحیم یار خان کے ساتھ ایک ڈویژن (کمشنری) بنا دیا گیا اس کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۵،۴۰۶۶ تھی۔

بہائیت بابی مذہب کا ایک فرقہ یہ اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک الگ مذہب ہے اور اس کے پیروا پنے مذہب کو دنیا کے دوسرے تمام مذاہب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ بہائیت کی تعلیمات اور اعتقادات کا بہت بڑا حصہ

Marfat.com

اسماعیلی عقائد و تعلیمات سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد مرزا حسین علی نوری ملقب بہ بہاءُاللہ نے رکھی تھی۔ بہاءُاللہ کا لقب اسے علی محمد باب نے دیا تھا۔ کیونکہ یہ بابی مذہب کا پیروکار تھا۔

باب نے اپنے بعد مستقبل قریب میں ایک شخص کی بعثت کی خبر دی جسے اس نے یظہرہ اللہ کا نام دیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ایک شخص مرزا اسداللہ خوئی نے یظہرہ اللہ کا دعوے کر دیا۔ بہاءاللہ اور صبح ازل نے اس کی مخالفت کر کے اسے قتل کرا دیا۔ بعد میں بہت سے بابیوں نے یظہرہ اللہ ہونے کا دعوے کیا لیکن کسی کو بھی خاص اہمیت حاصل نہ ہوئی۔

جب ۱۲۶۵ھ میں بہاءاللہ اپنے قافلے سمیت جو جنگ قلعہ شیخ طبرسی میں شرکت کے لئے جا رہا تھا گرفتار ہو گیا اور حکومت نے تحقیقات کے لئے پورے قافلے کو آمل کی طرف روانہ کیا تو بہاءاللہ نے راستے میں موقع پا کر تمام تحریریں دریا برد کرا دیں۔ اور آمل پہنچ کر اپنے مختلف ساتھیوں کو مختلف بہانوں سے رہا کرا دیا۔ تاہم خود قید میں رہا۔ یہ بہاءاللہ کی دوسری گرفتاری تھی۔ تیسری گرفتاری ۲۸ شوال ۱۲۶۸ھ/۱۵ اگست ۱۸۵۲ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۸۵۲ء میں اور بعض کے نزدیک ۱۸۶۱ء میں یا پھر بقول مرزا جواد جو ایک بہائی مصنف ہے ۱۸۶۳ء میں بہاءاللہ نے من یظہرہ اللہ ہونے کا دعوے کیا۔ اس کے اس دعوے کو صبح ازل اور بعض دوسرے بابیوں نے رد کر دیا۔ لیکن بابیوں کی اکثریت نے اس کا یہ دعوے تسلیم کر لیا۔

باب کے دعوے کی طرح بہاءاللہ کا دعوے بھی بڑا پیچیدہ ہے اور اسے سمجھنا بہت دشوار ہے۔

بہائیوں کا بہاءُاللہ کے بارے میں کچھ اس طرح کا تصور ملتا ہے کہ گویا بہاءُاللہ ہی خدا تھا۔ جس نے انسانیت کا جامہ پہن لیا تھا۔ بہائیت کی مذہبی کتب میں پہلے انبیاء کو بھی ظہور الٰہی قرار دیا گیا ہے اور قرآن کریم کی آیت "وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔" (۲۱ : ۲۳) کو صفات الٰہیہ میں سے قرار دیا گیا ہے۔ بہائیوں کے نزدیک یہی صفت بہاءاللہ کو حاصل تھی۔ نیز بہاءُاللہ کا اپنے بارے میں یہ بھی دعوے تھا کہ وہ "اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جوابدہ نہیں ہے اور سب جوابدہ ہیں۔" "وہ زندگی کا میدان ہے۔" "وہ اللہ ہے۔" "وہ تمام الٰہی اسماء و صفات کا منبع ہے۔" "وہ خود ہی ذاکر اور خود ہی مذکور تھا۔" "وہ وہی ہے جو موسیٰ سے کوہ طور پر ہمکلام ہوا تھا۔"

چنانچہ بہائیت کی تعلیمات کے مطابق بہائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد اسے خدا ہی مانتی ہے۔

بہائیت کا امریکہ میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا مبلغ ڈاکٹر ابراہیم جارج خیراللہ تھا جس نے بہاءاللہ کو بطور خدا ہی پیش کیا ہے۔ امریکا میں بہائی مذہب اختیار کرنے کے لئے جو بیعت فارم شائع کیا گیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں "اے اعظم (عبدالبہا) خدا کا نام لے کر میں بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے خالق و برتر و توانا خدا کی توحید کا اقرار کرتا ہوں اور خدا کے انسانی شکل میں ظاہر ہونے پر میرا ایمان ہے۔"

بہائیوں کے نزدیک بہاءُاللہ کی آمد پر بعثت انبیاء کا دور ختم ہو چکا ہے اور یہ دور آدم سے بہاءُاللہ تک ہے۔ بہاءُاللہ کے بعد پہلے انبیاء کی تمام شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں اور اب صرف بہائی شریعت پر ہی عمل کر کے نجات مل سکے گی۔

بہائیت میں اجتماعی عبادت کی کوئی مشکل متعین نہیں ہے۔ البتہ ارجنٹی ۱۹۱۲ء میں عبدالبہا نے شکاگو کے قریب ایک "مشرق الاذکار" کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ اس عمارت کو بہائی مذہب کی عبادت گاہ سمجھنا چاہیئے۔ ایک "مشرق الاذکار" ۱۹۰۲ء میں اشک آباد (روس) میں بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ بہائیوں کا قبلہ عکہ ہے۔ اور سال میں انیس روزے فرض ہیں جو ۲ مارچ سے شروع ہو کر ۲۰ مارچ تک ہیں۔ روزے کا وقت طلوع شمس سے غروب شمس تک ہے۔ ان کی کتاب الاقدس میں زکوٰۃ کے نصاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ لیکن نصاب کا ذکر نہیں کیا۔

بہائیت میں معاشرتی مسائل کے بارے میں بھی تعلیمات دی گئی ہیں ان میں بلا مذہب و ملت حتیٰ کہ مشرکین سے بھی شادی کو جائز قرار دیا گیا ہے ایک وقت میں دو بیویاں رکھی جا سکتی ہیں لیکن عبدالبہا نے اس تعداد ازدواج کو ختم کر دیا ہے بہائی شریعت میں مہر ۹۵ مثقال مقرر کیا گیا ہے۔ زنا کی سزا ۹ مثقال ہے اور دوسری مرتبہ زنا کی سزا ۱۸ مثقال ہے

بہائی سال میں پانچ عیدیں مناتے ہیں۔ ۱۔ بہاءاللہ کے ظہور پر عید رضوان ۲۔ عید بعثت باب۔ ۳۔ عید میلاد بہاءاللہ۔ ۴۔ عید میلاد باب۔ ۵۔ عید نوروز

بہائی تعلیمات میں اخفائے راز کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے اور بہائیوں کے ہاں اپنی دولت، اپنے سفر کی منزل مقصود اور اپنے مذہب کے چھپانے کی تلقین پائی جاتی ہے۔

بہائیوں میں ولی امراللہ کا عہدہ موروثی ہے لیکن باپ کے بعد لازماً بڑا بیٹا اس کا جانشین نہیں ہوتا۔ بلکہ باپ اپنی زندگی میں اس عہدے کے لئے خاندان کے کسی فرد کو نامزد کر دیتا ہے۔ تاہم اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ بہائی مذہب کا رئیس اعلیٰ ہمیشہ بہاءاللہ کی اولاد میں سے ہو۔ (نیز دیکھئے۔ "بہاءاللہ")

بہائی، محمد آفندی

(۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء - ۱۳ صفر ۱۰۶۴ھ/۲ جنوری ۱۶۵۴ء) عثمانی فقیہ اور ایک عالم دین۔ والد کا نام عسکر عبدالعزیز آفندی تھا جو روم ایلی کا قاضی تھا اور دادا کا نام سعدالدین تھا جو ایک مورخ کی حیثیت سے مشہور تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ مذہبی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرس ہو گیا۔ اس کے بعد سالونیکا کا قاضی بنا۔ اور پھر ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں حلب کا قاضی مقرر ہوا۔ اسے تمباکو پینے کا بے حد شوق تھا اور اس زمانے میں تمباکو نوشی کو ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء میں قاضی کے عہدے سے برطرف ہو کر قبرص میں جلاوطنی کے دن گذارنے لگا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء میں اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں شام کا ملا بنا دیا گیا۔ اور پھر ادرنہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں استنبول کا قاضی مقرر ہوا۔ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں اسے پہلی مرتبہ شیخ الاسلام کا عہدہ دیا گیا۔ اس نے درویشوں کے مولویہ اور خلوتیہ سلسلوں کو جو مراعات دیں نیز اس کے تمباکو اور قہوے کے استعمال پر اور درویشوں کے رقص و سماع کے بارے میں اس کی رواداری پر راسخ العقیدہ مسلمان اس کے مخالف ہو گئے۔ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء میں ازمیر کے قاضی اور وہاں کے برطانوی قونصل کے درمیان کچھ تنازعہ رونما ہوا تو اس نے برطانوی قونصل کو اس کے گھر پر نظر بند کر دیا۔ چنانچہ سفارتی مراعات کی اس خلاف ورزی

Marfat.com

پر اس کی موقوفی عمل میں آئی۔ ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں اسے دوبارہ اس کے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔ اور تادم وفات پھر وہ اسی عہدے پر قائم رہا۔

بہائی ایک عالم دین اور شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہے۔ اگر وہ تمباکو نوشی کی عادت میں مبتلا نہ ہوتا تو اس کا شمار ملک کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا۔

بہائی نے اپنی تصانیف میں نظمیں اور فتاوے چھوڑے ہیں۔ اس کا مشہور ترین فتوے وہ ہے جس میں اس نے تمباکو نوشی کو جائز قرار دیا ہے۔

بہتان تہمت، افتراء۔ ایسا جھوٹ جو سننے والے کو متحیر کر دے۔ وہ عیب جو آدمی میں نہ ہو۔ یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو وہ اس کی طرف منسوب کرنا۔ یہ فعل صرف اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو بلکہ ایک ایسا جرم بھی ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی اسے مستلزم سزا قرار دیا جائے۔

قرآن مجید میں بہتان کا لفظ مختلف جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کر لو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دے دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے۔" (۴:۲۰)

"پھر جس نے کوئی خطا یا گناہ کر کے اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دیا اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔" (۴:۱۱۲)

سورۃ احزاب میں فرمایا گیا ہے۔

"اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انھوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔" (۳۳:۵۸)

"کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔" (۲۴:۱۶)

آنحضورؐ سے پوچھا گیا کہ "غیبت کیا ہے" آپؐ نے فرمایا "تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو۔" عرض کیا گیا "اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو" آپؐ نے فرمایا "اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔" (ابو داؤد، ترمذی)

بھٹائی، عبداللطیف (۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء - ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) سندھ کے ایک معروف صوفی شاعر اور ولی اللہ، والد کا نام سید حبیب تھا۔ سندھ میں مٹیاری کے قریب بالا نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کا بچپن اپنے گاؤں ہالہ حویلی میں اور شباب کا زمانہ کوٹڑی میں گذرا لیکن اس کے بعد آپ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ایک ریت کے ٹیلے (بھٹ) پر گذارا۔ اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ بچپن ہی سے آپ کا رجحان دین اور تصوف کی طرف تھا۔ بڑے ہوئے تو فقیروں اور صوفی منش بزرگوں میں بیٹھنا اور ذکر و فکر کرنا ان کا محبوب مشغلہ ٹھہرا۔ خدا رسیدہ ہستیوں سے ملاقات کی خاطر سفر کیا اور اس سلسلے میں ملتان، جیسلمیر، لس بیلا، مکران، کچھ اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں کا سفر کیا اور مختلف بزرگان دین سے ملاقاتیں کیں اور فیض حاصل کیا۔

آپ ہر وقت دین اسلام کی تبلیغ میں سرگرم رہتے تھے۔ آپ کے زمانے میں سندھ کے علماء فرقہ پرستی کا شکار تھے۔ جب آپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو مصمم ارادہ کر لیا کہ اس تفرقہ بازی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کے سامنے اسلام کی اصل روح اور اسلامی تعلیم کا صحیح نقشہ پیش کیا اور اسلام کے صحیح اصولوں کی تبلیغ شروع کی۔ آپ کی ان تعلیمات کی وجہ سے عام لوگ اسلام کی صحیح اور سچی تعلیم سے واقف ہوئے اور انھوں نے ہندوانہ رسم و رواج ترک کر دیئے۔

آپ سندھی زبان کے ایک اچھے شاعر تھے۔ اپنی شاعری میں آپ نے صوفیانہ تعلیمات دی ہیں۔ آپ پر جلال الدین رومی کے صوفیانہ افکار کا بڑا گہرا اثر تھا۔ یہ رنگ آپ کی نظموں میں اکثر پایا جاتا ہے آپ نے اکثر لوک کہانیوں کو عارفانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس طرح سندھی ادب میں آپ کو ایک خاص مقام حاصل ہے بھٹائی کی نظمیں ان کے مریدوں نے اکٹھی کر کے ایک کتاب "رسالو" میں جمع کر دی ہیں۔

آپ کا عرس مبارک ہر سال ۱۴ صفر کو منایا جاتا ہے۔ آپ کا مزار سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑو نے تعمیر کرایا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد حکومت مغربی پاکستان نے مقبرے کے ساتھ ایک ثقافت مرکز قائم کیا ہے۔ جس کا مقصد شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہے۔

آپ طبعاً سادگی پسند تھے۔ گفتگو سادہ مگر شیریں اور پرسوز ہوتی تھی عجز و انکساری ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اشعار سے فطری لگاؤ تھا۔ آپ کے عرس کے موقع پر لوگ ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر ٹولی آپ کا کلام اپنی مخصوص طرز میں ترنم کے ساتھ پڑھتی ہے۔ آپ کے کلام کی مقبولیت اور شہرت کی تین خاص وجوہات ہیں ایک یہ کہ آپ کے کلام میں بے حد سوز و گداز ہے جو صوفیانہ رنگ سے مزین ہے۔ دوسرے اس میں شعریت و موسیقیت غایت درجہ موجود ہے۔ اور تیسرے آپ نے اپنے علاقے کی رومانی داستانوں پر مشتمل شاعری کی ہے جو نہایت دلچسپ، مشہور اور مقبول عام ہیں۔

بھٹنڈہ سابق ریاست پٹیالہ کا ایک شہر جو اب بھارت کے صوبہ پنجاب میں مدغم ہو گئی ہے یہ پرانا شہر بھاٹیا راجپوتوں کا مرکز تھا۔ زمانہ قدیم میں یہ شہر گھگر ندی کے ایک معاون نالے پر واقع تھا اور اس کے ارد گرد کی زمین غیر آباد تھی۔ لیکن جنگی اہمیت کے وہ راستے جو ملتان سے راجستھان اور وادی گنگ کی طرف جاتے تھے اس کی زد میں تھے۔ ان راستوں میں کئی تاریخی مقامات مثلاً پانی پت اور اندرا پت وغیرہ تھے۔ یہی وہ راستے تھے جن سے شمال مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملے کئے۔

مسلمانوں کے دور سے پہلے یہ شہر وکرم گڑھ کے نام سے مشہور تھا بھٹنڈہ سے تیس میل دور سرہند کے راستے میں ایک جنگل کا ذکر ملفوظات تیموری میں ملتا ہے یہ جنگل اکبر بادشاہ کی شکار گاہ تھا۔ بھٹنڈہ اور اس کے گرد و پیش میں جٹیوں کی آبادی کثرت سے تھی۔

اسے ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں محمود غزنوی نے فتح کیا۔ بھٹنڈہ کا راجا بجے رائے محمود غزنوی کے محاصرے کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے قلعے سے بھاگ نکلا۔ اور خودکشی کر لی۔

محمود غزنوی کی یہی فتح بالواسطہ ہندوستان کے سامانہ، انبالہ اور حصار کے خطے میں اسلام کے تعارف کا نشان آغاز ہے۔

۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں شہاب الدین غوری نے بھٹنڈہ فتح کیا۔ جب محمد غوری واپس غزنہ چلا گیا تو اس کے نائب حکمران پر جو بھٹنڈہ میں سلطان محمد غوری کی طرف

Marfat.com

سے مامور تھا، پرتھوی راج نے حملہ کرکے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ تیرہ مہینے کے محاصرے کے بعد قلعہ راجپوتوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں ایبک کی وفات کے بعد ناصرالدین قباچہ نے بھٹنڈہ پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے اس پر خاندان غلاماں کے بادشاہوں کا قبضہ رہا ہے۔ ۶۳۰ھ/۱۲۳۹ء میں بھٹنڈہ کے حاکم ملک اختیارالدین التونیہ نے بغاوت کردی۔

۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں بھٹنڈہ پر ناصرالدین محمود کا قبضہ ہوگیا اس نے ملک شیرخان کو بھٹنڈہ کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے بعد سے بھٹنڈہ کا ذکر تاریخ میں شاذ ہی ملتا ہے۔

۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء میں بھٹنڈہ کا نام تاریخ میں ایک بار پھر آتا ہے جب کہ اسے پٹیالہ کے راجہ آلا سنگھ نے فتح کیا۔ اس کے بعد سے بھٹنڈہ اس کی اولاد کے قبضے میں رہا اور ۱۹۵۶ء میں یہ سارا علاقہ بھارت میں مدغم ہوگیا۔

یہ شہر ایک بارونق تجارتی منڈی ہے۔ اس کی مشہور پیداوار گندم، چنے، کپاس اور گنا ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اس ضلع کی کل آبادی بارہ لاکھ کے قریب تھی۔

بھٹنڈہ کے آثار قدیمہ میں شیرشاہ سوری کا بنوایا ہوا ایک قلعہ ہے جو ایک سو ایک فٹ بلند ہے۔ اس کے ۳۶ برج ہیں اب یہ قلعہ بڑی خستہ اور شکستہ حالت میں باقی رہ گیا ہے۔ دروازے کی محرابوں میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ چکی ہیں۔

بھٹو، ذوالفقار علی (۵ جنوری ۱۹۲۸ء —) وزیراعظم پاکستان، والد کا نام سرشاہنواز بھٹو ہے، جو ریاست جوناگڑھ کے وزیراعظم تھے۔ لاڑکانہ سندھ کے ایک گاؤں گڑھی بھٹو میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان ساڑھے تین سو سال سے آباد تھا۔ میٹرک تک تعلیم کیتھیڈرل ہائی سکول بمبئی میں پائی۔ بچپن ہی سے حافظہ بہت اچھا تھا۔ برکلے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ مزید تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی اور مڈل ٹیمپل سے بیرسٹری کی ڈگری لی۔ ساؤتھمپٹن یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کے پروفیسر کے عہدے پر ان کی تقرری ہوئی۔ لیکن بھٹو اپنے والد کی بیماری کے سبب وہاں پروفیسر کے فرائض انجام نہ دے سکے اور پاکستان واپس آگئے۔ پاکستان آکر اپنی گھریلو جائداد کی دیکھ بھال اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اس کے ساتھ ہی وکالت کرنے کے لئے کراچی میں دفتر کھولا۔ ایک طرف تو جائداد کی ذمہ داریاں تھیں اور دوسری طرف وکالت کے کیسوں میں روز بروز اضافہ تھا۔ چنانچہ بھٹو نے وکالت کا پیشہ ترک کردیا۔ اور سندھ مسلم کالج میں بین الاقوامی قانون کی تعلیم دینے لگے۔

اسکندر مرزا بھٹو گھرانے کا پرانا دوست تھا۔ اس دوران میں سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان سے ذوالفقار علی بھٹو کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں بھٹو کو پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے ساتھ بھیجا گیا اور مارچ ۱۹۵۸ء میں پاکستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے جنیوا میں اقوام متحدہ کے بحری قوانین کے متعلق ہونے والے اجلاس میں بھیجا گیا۔ جہاں انہوں نے بہت شاندار طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔

جب سکندر مرزا اور ایوب خاں نے جمہوری حکومت کا خاتمہ کیا تو حکومت چلانے کے لئے ایسے ذہین اور سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کی تلاش شروع ہوئی۔ جن کا فوج سے کوئی تعلق نہ ہو۔ چنانچہ صوبہ سندھ کی نمائندگی کے لئے ذوالفقار علی بھٹو کو چنا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ وزیر تجارت مقرر کئے گئے۔ اور ۱۹۶۱ء میں امور اقلیت، قومی تعمیرات اور اطلاعات کے وزیر کے عہدے پر فائز ہوئے [illegible] وسائل اور امور کشمیر کی نئی وزارت کا کام سنبھالا [illegible]

۱۹۶۳ء میں محمد علی بوگرا کے بعد بھٹو کو وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ اس دوران میں بھٹو نے چین کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوران میں بھٹو نے سلامتی کونسل میں جو تقریر کی تھی وہ ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو معاہدہ تاشقند کے موقع پر ایوب اور بھٹو کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس معاہدے سے پوری قوم کی طرح بھٹو کو بھی سخت مایوسی ہوئی تھی۔ چنانچہ بھٹو نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔

ملک کے طول و عرض میں ایوب آمریت کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے تو ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا۔ بعدازاں دیگر سیاسی دباؤ کے تحت انہیں رہا کیا گیا تو انہوں نے اپنی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جس نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں دوسری پارٹیوں سے کہیں زیادہ نشستیں حاصل کیں۔

مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہوجانے کے بعد ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا اقتدار پیپلز پارٹی کے حوالے کردیا گیا اور ذوالفقار علی بھٹو نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، سپریم کمانڈر افواج پاکستان اور صدر پاکستان کے عہدے سنبھال کر ملک کی ازسرنو تعمیر کا بیڑا اٹھایا۔

۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو نیا آئین نافذ ہوجانے کے بعد بھٹو وزیراعظم پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے اور تاحال (۱۹۷۶ء) فائز ہیں۔

بھٹو نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا بھر کی اہم شخصیت ہیں۔ انہوں نے ایک ڈوبتی ہوئی قوم کو جس انداز سے سہارا دیا، ان سے سیاسی اختلاف رکھنے والے بھی اسے سراہتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ہر مکتبۂ فکر کے سیاست دانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے متفقہ آئین تیار کروایا، جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے جو معیشی اور سیاسی دباؤ پاکستان پر آن پڑا تھا۔ اسے اپنے تدبر اور سیاست سے انہوں نے ختم کر دیا۔ بھارت سے نوے ہزار جنگی قیدیوں کی واپسی۔ صلح و امن کی فضا پیدا کرنا، ملکی معیشت کا استحکام، اسلامی اتحاد کی کوششیں، اقوام عالم میں پاکستان کا وقار، بنگلہ دیش کے ساتھ دوستانہ تعلقات، ملکی اقتصادی و زرعی پالیسیاں جیسے کارنامے انہیں ایک پاکستانی لیڈر کی حیثیت سے نمایاں کرتے ہیں۔

بہجت، مصطفےٰ افندی (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء — ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) عثمانی عہد کا ایک عالم اور طبیب۔ والد کا نام خواجہ محمد امین شکری تھا جو وزیراعظم خیراللہ افندی کا بیٹا تھا۔ تعلیم دینی درسگاہوں میں حاصل کی اور فارغ ہونے کے بعد مدرس ہوگیا۔ اس نے علم طب میں مخصوص شہرت حاصل کی اور ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں وہ سلطان کا طبیب اعلیٰ بن گیا۔ اپنی زندگی میں اس نے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ مثلاً ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں اسے سلطان کے اعلیٰ طبیب کے عہدے سے برطرف کردیا گیا۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء میں دس سال بعد اس کا دوبارہ اسی عہدے پر تقرر ہوا۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں اسے جلاوطن کیا گیا۔ لیکن اسی سال دوبارہ اپنے پہلے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء میں اسے مجلس محلات سلطانی کا رکن بنایا گیا۔ اس کے علاوہ وہ اور بہت سے اہم مذہبی اور قانونی منصبوں پر فائز رہا۔ ان مناصب میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں ملائے ازمیر۔ ملائے مصر، قاضی عسکر اناطولی، قاضی عسکر روم [illegible]

Marfat.com

اس نے یورپی زبانوں بڑی محنت سے سیکھیں اور مغرب کی طبی اور سائنسی کتابوں کے متعدد اہم تراجم کئے۔ ان تراجم میں بقراط کی تاریخ طبیعی اور ہیضہ، چیچک کا ٹیکہ لگانے پر جینر کا کتابچہ اور آتشک اور خارش کے موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ اس نے مصر پر فرانس کے قبضے کی تاریخ "مظہر التقدیس" کا ترکی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام تاریخ مصر رکھا ایک طرف تو بہجت طب قدیم کے دبستان کے آخری اطبا میں سے تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ ترکی میں یورپی طرز کی طب جدید کے پیشروؤں میں سے بھی تھا۔ اس کی نگرانی میں ایک جدید ہسپتال بنایا گیا اور ایک نیا میڈیکل سکول کھولا گیا۔ اس سکول میں یورپی اساتذہ باہر سے بلائے گئے تھے۔ اس کام میں اس کا بھائی حکیم باشی عبدالحق اس کا معاون تھا۔

بہرام

ساسانی خاندان کے چوتھے، پانچویں، چھٹے، بارہویں اور چودھویں بادشاہ کا نام۔

بہرام اوّل:۔ ساسانی خاندان کا چوتھا فرمانروا۔ ہرمز کا بیٹا تھا۔ ۲۷۳ء میں ایران کے تخت پر بیٹھا اور تین سال تین ماہ حکومت کر کے ۲۷۶ء میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کے بارے میں تاریخ میں بہت کم واقعات ملتے ہیں۔ اس کے دور کا سب سے اہم واقعہ مشہور مصور مانی کا قتل ہے۔ اس نے زردشتی مذہب کے پیشواؤں کو مانی کے خلاف کل اختیارات دے دیئے تھے:

بہرام اوّل بڑا نرم دل اور فیاض شہزادہ تھا۔ رعایا اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

بہرام ثانی:۔ بہرام اوّل کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ۲۷۶ء میں ایران کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے دور حکومت میں روم اور ایران میں دوبارہ لڑائی ہوئی اس نے آرمینیا اور عراق کا علاقہ رومیوں کے حوالے کر دیا تاکہ صلح ہو جائے اور وہ اپنے بھائی ہُرمزد گشتاں شاہ گورنر خراسان کی بغاوت کو ختم کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے جو اپنے لئے ایک عظیم الشان ریاست کی بنیاد رکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ۲۹۳ء تک کل سترہ سال حکومت کی۔

بہرام ثالث:۔ اپنے باپ بہرام ثانی کی وفات کے بعد ۲۹۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا تایا اس کا مخالف تھا۔ اس نے بہرام ثالث کو شکست دی اور اس کے بھائی نرسی کو اس کی جگہ تخت پر بٹھایا۔ اس نے کل چار ماہ حکومت کی۔

بہرام رابع:۔ خاندان ساسانیہ کا بارہواں حکمران۔ شاہ پور اعظم ثانی کا بیٹا تھا۔ ۳۸۸ء میں ایران کے تخت پر بیٹھا۔ یہ اپنے پیش رو حکمرانوں سے کمزور واقع ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دور حکومت میں امراء نے دوبارہ وہی اقتدار حاصل کر لیا جس سے شاہ پور ثانی نے انہیں محروم کر دیا تھا۔ اسی کے دور حکومت میں آرمینیا کو روم اور ایران کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور اس طرح آرمینیا کا بڑا حصہ ایران کے قبضے میں آ گیا۔ ۳۹۹ء میں اپنی فوج کی بغاوت فرد کرنے کی کوشش میں ایک تیر لگنے سے مر گیا۔ اس کے دور اقتدار کا زمانہ بعض تاریخ نویس ۱۱ سال اور بعض ۱۵ سال بیان کرتے ہیں اس کے بعد یزدجرد اس کا جانشین ہوا۔

بہرام خامس:۔ خاندان ساسانیہ کا چودھواں ایرانی بادشاہ تھا۔ تاریخ ایران میں بہرام گور کے نام سے مشہور ہے۔ یزدجرد اوّل کا بیٹا تھا اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ۴۲۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے حیرہ کے لخمی عرب بادشاہ المنذر اوّل کی زیر قیادت تربیت حاصل کی تھی اور اسی بادشاہ کی مدد سے اس نے ان امراء سے ایران کا تخت واپس لیا جنہوں نے اس کے بڑے بھائی کو قتل کر کے اس خاندان کے کسی دوسرے فرد کو تخت پر بٹھا دیا۔

بہرام گور کو اپنی فیاضی، شجاعت و مردانگی، محصولوں کی تخفیف، عشق و محبت کی زندگی اور سیر و شکار کے کارناموں کی وجہ سے عوام میں بہت زیادہ ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی۔

اس نے مرو کے علاقے کے وحشی لوگوں کے خلاف ایک مہم کی خود قیادت کی۔ اس کے دور حکومت میں ایران اور بزنطینی سلطنت کے درمیان ایک مختصر جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ایران کو شکست نصیب ہوئی۔ بعد میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ صلح نامہ ہوا جس کی رو سے ایران میں عیسائیوں کو مذہبی آزادی مل گئی۔ ۴۳۸ء میں ایک شکار کا تعاقب کرتے ہوئے مر گیا۔

بہرام سقا

بہرام بردوانی، فارسی زبان کے ایک صوفی شاعر، آپ کا سلسلہ نسب بخارا کے چغتائی ترکوں سے ملتا ہے۔ آپ کے بچپن اور تعلیم کے حالات تاریخ میں بہت کم ملتے ہیں۔ آپ کی عادت تھی کہ مسافروں زائروں اور حاجیوں کو فی سبیل اللہ پانی پلاتے تھے اور مجذوبانہ زندگی بسر کرتے تھے آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ہمایوں نے ۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء میں اکبر کی رسم ختنہ پر قندھار میں جشن منایا، اسی زمانے میں آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی

بہرام بردوانی ہندوستان میں اس زمانے میں آئے جب ہمایوں اپنی جلاوطنی کے بعد دوبارہ بادشاہ ہوا تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں آگرہ میں مقیم تھے بقول عبدالقادر بدایونی "وہ اپنے چند مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ اکبر آباد میں مفت پانی پلاتے پھرتے تھے اور ساتھ ساتھ شعر کہتے جاتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی دور میں آپ پر رافضی ہونے کا الزام لگا۔ جس کی انہوں نے اپنے اشعار میں تردید کی ہے۔ اور اسی بات سے بددل ہو کر وہ اکبر آباد کو چھوڑ کر چلے گئے ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں بردوان چلے گئے اور تین روز بعد وفات پا گئے۔ بقول عبدالقادر بدایونی آپ نے اپنی شاعری کے بہت سے دیوان جمع کئے لیکن جب ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی تو انہیں دھو دیتے اس کے باوجود ان کے دیوان کے دو نسخے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتے اور ایک نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں موجود ہے۔

آپ کا مقبرہ بردوان میں ہے اس کے احاطے میں نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن کی قبر ہے۔ آپ کی درگاہ پر جو کتبہ نصب ہے اس پر سن وفات ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء درج ہے۔

بہرام شاہ غزنوی

غزنی کا ایک سلطان، سلطان مسعود سوم کا بیٹا تھا والدہ کا نام مہر عراق تھا۔ سلطان مسعود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا شیرزاد تخت نشین ہوا۔ لیکن بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شیرزاد طبرستان چلا گیا اور پھر وہاں سے حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ حج سے واپسی پر ملک ارسلان نے اسے قتل کرا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس زمانے میں بہرام شاہ تکین آباد میں مقیم تھا۔ ملک ارسلان کی تخت نشینی کے بعد بہرام شاہ وہاں سے کرمان چلا گیا۔ جہاں اس کے چچا سنجر نے اسے خلعت بخشا اور ایک

Marfat.com

اشکر جرار لے کر بہرام شاہ کے ہمراہ ملک ارسلان کی فوجوں سے مقابلے کے لیے نکلا ۔ ۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء میں سنجر غزنہ میں داخل ہوگیا ۔ اور بہرام شاہ کو غزنہ کا تخت نشین کرادیا ۔ سنجر نے سلاطین غزنویہ کے تمام خزانے اپنے قبضہ میں لے لیے ۔ بہرام شاہ پر بھی ایک ہزار دینار یومیہ خراج مقرر کیا ۔

جب سنجر غزنی سے واپس آگیا تو ملک ارسلان نے ہندوستان کی فوجوں کی مدد سے بہرام شاہ پر حملہ کیا ۔ سنجر نے ۵۱۱ھ/۱۱۱۸ء میں بلخ سے بہرام شاہ کی مدد کے لیے دوبارہ فوج بھیجی اور ملک ارسلان کو قید کرلیا ۔ کچھ عرصہ بعد رہا کر دیا لیکن دوبارہ بغاوت کے آثار دیکھ کر اسے قتل کرادیا ۔

بہرام شاہ نے تخت نشینی کے وقت سنجر کو ایک ہزار دینار یومیہ خراج دینے کا وعدہ کیا تھا جو بہت زیادہ تھا ۔ چنانچہ ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء سے اس نے یہ خراج بند کردیا تو سنجر ایک فوج لے کر غزنی چڑھ آیا ۔ بہرام شاہ نے معافی مانگ لی ۔ اس کے بعد بہرام شاہ کی غوریوں سے جنگیں چھڑ گئیں ۔ ان جنگوں کے دوران میں ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء میں غزنی پر غوریوں کا قبضہ ہوگیا ۔ ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں بہرام شاہ نے دوبارہ غزنی سلطنت پر قبضہ کرلیا ۔ اس کے بعد جب علاء الدین حسین غور کا حاکم بنا تو وہ ایک بہت بڑی فوج لے کر غزنی پر حملہ آور ہوا اور بہرام شاہ کو شکست فاش دی ۔ بہرام شاہ کو یہ شکست ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں ہوئی ۔ لیکن ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں بہرام شاہ نے ایک مرتبہ پھر غزنہ پر قبضہ کرلیا ۔

بہرام شاہ ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء کے بعد ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء تک زندہ رہا ۔ بہرام شاہ کے دربار میں بڑے بڑے اہل قلم اور شعراء جمع رہتے تھے ۔ اس کے دس بیٹے تھے ۔ بہرام شاہ نے ۳۵ سال حکومت کی ۔

بہرام شاہ معز الدین دہلی کا سلطان ۔ شمس الدین التمش کا تیسرا بیٹا ۔ التمش کا ولی عہد ناصر الدین محمود فوت ہوگیا ۔ تو رضیہ سلطانہ کی گرفتاری کے بعد ترک امراء نے اس کے بھائی بہرام شاہ کو اس شرط پر کہ اتگین اس کا نائب مملکت ہوگا ، دہلی کے تخت پر بٹھایا لیکن اتگین کو جسے بہرام شاہ نے تین ماہ بعد ہی قتل کرادیا ۔

اس کے بعد بہرام نے کوئی نائب مقرر نہیں کیا لیکن اس کے امیر حاجب بدر الدین سنقر نے بڑا اقتدار حاصل کرلیا ۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ اور وزیر کسی کو بھی خیال میں نہ لاتا تھا ۔ اس نے دہلی کے بعض علماء کو اپنے ساتھ ملا کر بہرام کو تخت سے اتارنے کی کوشش کی ۔ جب بہرام کو اس سازش کا علم ہوا تو اس نے سنقر کو بدایوں جلاوطن کر دیا لیکن وہ بادشاہ کی بغیر اجازت دہلی واپس آیا تو بہرام نے اسے قتل کرادیا ۔ چنانچہ اتگین اور سنقر کے بعد دیگرے قتل ہونے سے ترک امراء جنہوں نے بہرام کو تخت پر بٹھایا تھا بہرام کے مخالف ہوگئے ۔ انہی دنوں منگولوں نے لاہور پر چڑھائی کردی ۔ بہرام کی طرف سے اختیار الدین جو لاہور کا گورنر تھا ، منگولوں کا مقابلہ نہ کرسکا ۔ اور اس طرح لاہور پر منگولوں کا قبضہ ہوگیا ۔

بہرام شاہ نے دہلی سے اپنے وزیر مہذب الدین کی سرکردگی میں کمک بھیجی ۔ مہذب الدین نے راستے میں فوج کو بہرام کے خلاف اکسایا اور بہکایا کہ وہ لاہور جانے کے بجائے دہلی کو پلٹ پڑی ۔ اور دہلی کا محاصرہ کرلیا ۔ ادھر شہر کے اندر بھی وزیر کے ساتھیوں نے افراتفری مچادی یہاں تک کہ فوج نے شہر پر قبضہ کرلیا اور بہرام کو گرفتار کرکے ۱۲۴۲ء میں قتل کر دیا ۔ اس طرح بہرام صرف دو سال حکومت کرسکا ۔

بہرام گور ۔ ایک ایرانی حکمران (دیکھئے : بہرام [illegible])

بہشت ۔ جنت کے لئے فارسی لفظ (دیکھئے : جنت)

بھگت کبیر ۔ ایک ہندی شاعر (دیکھئے : کبیر بھگت)

بہلول دانا ۔ ایک مجذوب صوفی (دیکھئے : بہلول مجنون)

بہلول لودھی (دور حکومت ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء ۔ ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء) دہلی کا ایک بادشاہ جس نے لودھی خاندان کی بنیاد رکھی ۔ بہلول ملک کالا کا بیٹا تھا اور سرہند کے سلطان شاہ لودھی کا بھتیجا تھا ۔ اس کے چچا اسلام خان نے اس کی قابلیت سے متاثر ہوکر اسے سرہند میں اپنا جانشین مقرر کیا ۔ بہلول جب سرہند کا گورنر ہوا تو اس نے اپنی پوزیشن اتنی مضبوط کرلی کہ محمد شاہ سید نے اس کے خلاف فوج بھیجی تو وہ شکست کھا کر واپس ہوئی ۔ اس فتح کے بعد بہلول نے اپنی طاقت بڑھانا شروع کردی ۔ بہلول کی سرکردگی میں لودھیوں نے اتنا زور پکڑا کہ لاہور ، دیپالپور ، حصار اور سنام پیان کا قبضہ ہوگیا ۔ بہلول نے سلطان کا لقب اس وقت اختیار کیا جب وہ دہلی پر اپنی ناکام مہم سے لوٹ گیا تھا ۔

علاء الدین کے عہد میں لودھیوں کا اقتدار اور بھی بڑھ گیا ۔ پانی پت ، کیتھل ، ساپری اور بیانہ پٹھانوں کے ہاتھوں میں آچکے تھے ۔ علاء الدین کی کمزوری اور بے ہمتی کے باعث دہلی پر بھی بہت جلد بہلول کا قبضہ ہوگیا ۔

۸۴۹ ۔ ۸۵۰ھ/۱۴۴۵ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوگیا تو امراء نے اس کی جگہ اس کے بیٹے کو علاء الدین عالم شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھادیا ۔ علاء الدین نے ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں جواب عالم شاہ کہلاتا تھا دہلی کو خیرباد کہہ کر بدایوں کو اپنا پایہ تخت بنالیا ۔ چنانچہ بہلول نے دہلی پر قبضہ جمالیا ۔ اس وقت دہلی پر عالم شاہ کا وزیر حمید خان برسر اقتدار تھا اور بہلول جانتا تھا جب تک اسے راستے سے نہ ہٹایا جائے گا اس کی حکومت مکمل نہیں ہوسکتی ۔

علاء الدین کے بعض امراء بہلول لودھی کی حکومت سے خوش نہ تھے ۔ چنانچہ وہ بعض عناصر کو اکساتے رہتے تھے ۔ انہوں نے پہلے تو علاء الدین کو بہلول سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا لیکن جب وہ آگے نہ بڑھا تو انہوں نے سلطان محمود شرقی کو دہلی پر حملہ کرنے پر اکسایا ۔ ۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء میں محمود نے ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کا محاصرہ کرلیا ۔ لیکن کامیابی حاصل نہ کرسکا اور شکست کھائی ۔ اس کے بعد بھی بہلول کا مقابلہ جونپور کے شرقی فرمانرواؤں سے ہوتا رہا ۔ یہاں تک کہ آخری فرمانروا سلطان حسین شرقی نے شکست کھائی ۔ اور بنگال کی طرف بھاگ نکلا ۔ اس طرح بہلول کی حکومت بہار تک قائم ہوگئی ۔ بہلول نے اپنے لڑکے باربک شاہ کو جونپور کا حاکم مقرر کیا جب کالپی ، دھول پور اور باری کے حکام نے بھی اطاعت قبول کرلی تو بہلول نے گوالیار کا رخ کیا ۔ وہاں کے راجہ نے اسی لاکھ تنکہ پیش کرکے اطاعت قبول کرلی وہاں سے واپسی میں جلالی کے پاس ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء میں ملاولی کے مقام پر فوت ہوگیا ۔ بہلول کے بعد اس کا بیٹا خان سکندر لودھی کے لقب سے تخت نشین ہوا ۔

بہلول لودھی اگرچہ سلطنت کے عہد زوال میں برسر اقتدار آیا ۔ پھر بھی وہ اس کا شمار بڑے سلاطین میں ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس نے سلطنت میں [illegible]

دہلی اور شمالی ہند میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پھر سے قائم کیا۔ اس کی تمام عمر جنگوں میں گذری۔ اور اسے کبھی انتظامی اصلاحات کا وقت نصیب نہ ہوا۔ ذاتی طور سے اس میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ غرور اور تکبر سے بالکل بے بہرہ تھا۔ وہ بہت فراخدل اور نیک طبع واقع ہوا تھا۔ ایک بار جنگ کے دوران میں شرقی سلطان کی ملکہ اس کے ہاتھوں گرفتار ہوگئی۔ اس نے بڑی حفاظت اور احترام کے ساتھ جونپور بھجوا دیا۔ وہ علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔

بہلول مجنونؒ

کوفہ کے ایک مجذوب صوفی۔ بقول ابن جوزی بہلول ۱۸۸ھ ۸۰۴ء میں ہارون الرشید سے کوفے میں ملا تھا۔ اور شاید اس نے خلیفہ کو کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں۔

تقریباً چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ نام ایک افسانوی روایت بن گیا اور دانشمند دیوانوں کو بہلول کہا جانے لگا۔ اس سے بعض اشعار جن میں نصیحتیں بھی کی گئی ہیں نیز طرح طرح کے محاضرات، سبق آموز اور مذہبی حکایات منسوب کر دیں۔

بہلول مجنون کا ذکر سب سے پہلے علامہ جاحظ کی کتاب "البیان" میں ملتا ہے جس میں ایک سادہ لوح شخص اور راستہ چلنے والوں کے سوقیانہ تمسخر کا ہدف بنتے دکھایا گیا ہے اور شیعہ فرقے کا ایک فرد بتایا گیا ہے۔

اس شخص سے الذہبی اور ابن تغری بردی نے احادیث کی چند روایات کو بھی منسوب کیا ہے لیکن غالب رائے یہ ہے کہ بہلول نامی چند محدثین کو یہاں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

بہلول مجنون کو عام طور پر "بہلول دانا" (ہوشیار دیوانہ) بھی کہا جاتا ہے لوگ اسے ہارون الرشید کا مسخرہ بتاتے ہیں۔ قہوہ خانوں میں اس کی ظرافت اور نکتہ سنجی کی اکثر حکایات بھی مشہور ہیں۔

بہلول کی قبر بغداد میں بتائی جاتی ہے اور اس پر ۵۰۱ھ/۱۱۰۷ء کا کتبہ موجود ہے۔ لی سٹرینج نے اسے مجذوبوں کا سلطان قرار دیا ہے۔ اور ایک "نفس مطمئنہ" بتایا ہے۔

بہمن جادویہ

ایک ایرانی ماہر جنگ اور سپہ سالار۔ ۱۳ھ/۶۳۴ء میں حضرت عمرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابوعبیدہؓ کو سالار فوج بنا کر حضرت مثنیٰؓ کے ساتھ عراق کی مہم پر روانہ کیا۔ مثنیٰؓ کو حیرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے اہل عراق کو مسلمانوں کیخلاف بھڑکا دیا ہے۔ منظم اور مسلح ٹڈی دل ایرانی فوج خراسان کے حاکم اور نامور بہادر رستم کے زیر کمان میدان کارزار میں کودنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ رستم کو مثنیٰؓ کے حیرہ پہنچنے کی خبر ملی تو اس نے ایک بھاری فوج حیرہ کی طرف دوسری زبردست جمعیت سپہ سالار نرسی کے زیر سرکردگی کسکر کی طرف اور تیسرا لشکر جرار نامور سردار جابان کے ماتحت نشیبی فرات کی سمت روانہ کیا۔

نمارق میں ابوعبیدہؓ اور جابان کے درمیان مڈبھیڑ ہوئی اور مسلمانوں نے ایرانیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ ایرانی مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ادھر کسکر میں نرسی تیس ہزار فوجوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ جابان بھی شکست کھانے کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ ادھر سے رستم نے بھی بہادر جالینوس کے زیر قیادت سرفروش جنگ جوؤں کا ایک لشکر جرار نرسی کی مدد کے لیے بھیجا۔ مگر یہ لشکر ابھی راستے میں تھا کہ ابوعبیدہؓ سقاطیہ کے مقام پر نرسی کے مقابلے میں آ اترے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ نرسی حضرت ابوعبیدہؓ کے حملے کی تاب نہ لا کر فرار ہوگیا اس کی فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔

جالینوس نرسی کی شکست کی خبر سن کر باقشیا میں ٹھہر گیا۔ ابوعبیدہؓ نے وہاں پہنچ کر اس پر حملہ کیا اور وہ بھی مات کھا کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔

جالینوس کی شکست کی خبر ایران کے دربار اور دارالحکومت میں برق غضب بن کر گری۔ رستم غصے سے سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ چنانچہ اس نے امرائے سلطنت کے مشورے سے ماہر جنگ اور نامور سپہ سالار بہمن جادویہ کو تین ہزار فوج تین سو جنگی ہاتھی اور ضروری ساز و سامان دے کر عربوں سے انتقام لینے کے لیے روانہ کیا اور ایرانیوں کا متبرک نشان فتح درفش کاویانی بھی ساتھ کر دیا۔ بہمن جادویہ نے دریائے فرات کے کنارے قس ناطف میں چھاؤنی ڈالی۔ اور ابوعبیدہؓ نے دوسرے کنارے پر مروحہ میں فوج اتار دی۔ ابوعبیدہؓ فوج لے کر دریائے فرات کے اس پار چلے گئے اور جنگ کا بازار گرم ہوگیا۔ اس جنگ میں چار ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا اور چھ ہزار ایرانی مارے گئے۔ بہمن جادویہ فتح کے پھریرے اڑاتا چلا گیا۔

بہمنی سلطنت

دکن (ہندوستان) کی ایک آزاد ریاست۔ محمد بن تغلق کے اواخر عہد میں دکن کے امیران صدہ نے بغاوت کر کے دکن کے اہم مقام دولت آباد (دیوگیر) پر قبضہ کر لیا۔ اور ایک آزاد ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اس ریاست کے سب سے پہلے حکمران اسماعیل مخ کو سلطان ناصر الدین اسماعیل شاہ کے لقب سے ۱۳۴۵ء میں منتخب کر لیا گیا۔ لیکن وہ اس منصب سے عہدہ برآ نہ ہو سکا چنانچہ ۵ جمادی الاول ۷۴۸ھ/۱۳ اگست ۱۳۴۷ء کو انہوں نے حسن گنگو کو اپنا سلطان چنا۔ حسن کا سلسلہ نسب چونکہ ایران قدیم کے بادشاہ بہمن شاہ بن اسفندیار سے ملتا تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو بہمنی کہتا تھا اور اسی مناسبت سے یہ نئی سلطنت بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔

حسن گنگو کو دولت آباد میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی تعمیر کردہ مسجد میں تاج خسروی پہنایا گیا اور وہ سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ کے لقب سے تخت شاہی پر جلوہ گر ہوا۔

اس نے گلبرگہ کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اپنی سلطنت کو چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم کر کے اپنے وفادار ساتھیوں کو ان پر مقرر کیا۔ اندرونی حالات درست کر کے اس نے اپنی سلطنت کی توسیع شروع کی۔ قندھار، بیدر اور ملکھید فتح ہو کر بہمنی حدود میں شامل ہو گئے۔

محمد بن تغلق کی وفات کے بعد بہمنی سلطنت کی بنیاد مضبوط تر ہوگئی۔ اس کے جانشین فیروز شاہ نے دوبارہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن پورا نہ کر سکا۔ علاء الدین بہمنی نے اب یکسو ہو کر اپنے ہمسایہ علاقوں پر توسیعی حملے شروع کیے۔ گوا، ڈابھول کولھاپور اور تلنگانہ کا کچھ حصہ فتح ہو کر بہمنی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر سلطان علاء الدین بہمنی کا انتقال ہو گیا۔ سلطان نے مرنے سے پہلے اپنے بڑے لڑکے محمد شاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ علاء الدین کے انتقال کے وقت بہمنی سلطنت کی حدود شمال میں دریائے دین گنگا اور جنوب میں دریائے کرشنا

Marfat.com

تک پھیل چکی تھیں۔ علاء الدین میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک سلطنت کے بانی اور اچھے بادشاہ میں ہونا لازمی ہیں۔ اس نے اپنی مسلسل کوششوں سے بہمنی سلطنت کو مستحکم اور وسیع کیا۔

بہمنی سلطنت کو ایک منظم کل کی شکل میں مربوط کرنے کا سہرا محمد شاہ اول کے سر ہے۔ ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء میں اس نے اپنی والدہ کے ذریعے خلیفہ مصر المعتضد باللہ سے اس امر کی رسمی سند حاصل کر لی کہ وہ اپنے نام کا سکہ جاری کرے اور خطبہ جمعہ میں اس کا نام لیا جائے۔ وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا۔ اور اپنے روزمرہ کے دربار کا تزک و احتشام ایک عظیم الشان سلطنت کے حکمران کی حیثیت کے مطابق قائم رکھتا تھا۔

محمد شاہ بھی اپنے باپ کی طرح دلیر اور اولوالعزم تھا۔ پڑوس کی ہندو ریاستوں تلنگ اور وجیا نگر سے اس کی سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ تلنگ کے خلاف اس نے تقریباً دو سال لشکر کشی کی۔ بالآخر وہاں کے راجہ کنہیا نے صلح کی درخواست کی اور گولکنڈہ کا قلعہ ۲۲ لاکھ روپیہ اور اپنا طلائی تخت محمد شاہ کے حوالے کیا۔ اس کے بعد وجیا نگر سے جنگ چھڑ گئی۔ راجہ ہری ہر نے اپنی طاقت کے نشے میں سلطان کے سفیر کو قتل کرا دیا۔ اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ حملہ کر کے محمد شاہ کی سلطنت کے رائچور دوآب کے علاقے کو تاخت و تاراج کر دیا۔ محمد شاہ کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بھی فوج لے کر آگے بڑھا دریائے تنگ بھدرا کے کنارے جنگ ہوئی۔ جس میں ہندوؤں نے شکست کھائی۔ اور محمد شاہ نے انتقاماً وجیا نگر قلعہ پر چڑھائی کر کے قرب و جوار کے علاقے کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ راجہ کو مغلوب ہو کر صلح کی درخواست کرنا پڑی۔ جسے محمد شاہ نے منظور کر لیا۔ اس نے بہمنی سلطنت کو چار صوبہ جات میں تقسیم کیا اور ہر صوبے کا ایک گورنر مقرر کیا۔ ان چار صوبوں کے مراکز دولت آباد، برار، احسن آباد، گلبرگہ اور محمد آباد بیدر تھے۔

بہمنی سلطنت کے سلطان محمد شاہ نے ۱۳۷۲ء میں تقریباً ساڑھے سترہ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد تخت پر بیٹھا۔ اس نے ایرانی اور ترکی امراء کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کیا۔ جس کے باعث دکنی امراء کو شکایت پیدا ہوئی۔ مجاہد نے وجیا نگر پر حملہ کیا لیکن بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے چچا داؤد نے اسے مروا دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا لیکن وہ بھی جلد ہی مارا گیا۔

اس کے بعد محمد شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ وہ دوسرے بہمنی بادشاہوں سے مختلف تھا۔ وہ بڑا امن پسند اور سادہ مزاج تھا۔ بیت المال کو قوم کی امانت سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے شاہانہ شان و شوکت یا ذاتی عیش و آرام پر کوئی فضول خرچی نہ کرتا تھا اسے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا بہت خیال تھا۔ اس نے دکن کو علوم و فنون کا مرکز بنانے کی پوری کوشش کی۔ اس نے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں وہ علم و ادب کا بڑا قدردان تھا۔ اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر دور دور سے علماء اور فضلاء آ کر اس کے دربار کی زینت بنے۔

محمد شاہ ثانی کے عہد میں نہ کوئی بیرونی حملہ ہوا اور نہ اندرونی بغاوت۔ آخری عہد میں اپنے لڑکوں کی سازش سے وہ بہت پریشان اور آزردہ خاطر ہوا۔ بالآخر اس نے ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء میں وفات پائی۔ وہ بہمنی خاندان کے قابل ترین سلاطین میں سے تھا۔ اس کے دور حکومت میں ماوراءالنہر کے وسطی ایشیا، ایران اور ملک عرب کے جری اور تنومند انسانوں کی ایک رو آئی جو بالآخر اس سرزمین کی آبادی کا ایک عنصر بن گئے۔ ان میں ادیب، علماء، دست کار، تاجر، سپاہی اور ماہرین فن تعمیر سب کے سب دکن کی طرف کھنچے چلے آئے تھے اس کے بعد اس کے دو لڑکے یکے بعد دیگرے قلیل سی مدت کے لیے حکمران ہوئے۔ بالآخر امراء نے علاء الدین حسن کے پوتے فیروز خان کو بلایا۔ اس نے [illegible] کر کے [illegible] تخت [illegible] بہمنی نے ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء میں تاج شاہی پہنا۔ ابھی ایک سال ہی گزرا [illegible] کہ راجہ ہری ہر دوم نے رائچور دوآب پر حملہ کر دیا۔ فیروز شاہ بھی فوج لے کر نکلا۔ دریائے کرشنا کے کنارے دونوں فوجیں جمع ہوئیں۔ بہمنی افواج نے دریا عبور کر کے راجہ کے لشکر پر زبردست حملہ کیا۔ راجہ اپنی فوج کے ساتھ فرار ہو گیا۔ سلطان نے وجیا نگر تک ان کا تعاقب کیا۔ اس مہم میں بے شمار مال غنیمت فیروز کے ہاتھ لگا ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں وجیا نگر کے راجہ سے دوبارہ لڑائی چھڑ گئی۔ اس مرتبہ فیروز شاہ نے بانکاپور پر قبضہ کر کے ساٹھ ہزار ہندوؤں کو گرفتار کر لیا۔ راجہ کو مجبور ہو کر صلح کرنا پڑی اور اس نے اپنی لڑکی سلطان کے حرم میں دی۔ اس کے علاوہ تاوان جنگ بھی ادا کیا۔ ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں فیروز شاہ نے پنگل کا محاصرہ کیا۔ وجیا نگر سے پھر لڑائی چھڑ گئی۔ دو سال کی بے سود کوشش کے بعد فوج میں وبا پھیل جانے کے باعث سلطان کو میدان سے ہٹنا پڑا۔ ہندوؤں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر بہمنی سرحد میں داخل ہو کر مسلمانوں کا بڑی بے دردی سے قتل عام کیا۔ سلطان کے دل پر اس بات کا بہت گہرا صدمہ ہوا اس کی صحت خراب ہو گئی۔ اور اسی بیماری کی حالت میں ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد احمد شاہ جو فیروز کا بھائی تھا تخت نشین ہو گیا۔

اگرچہ فیروز کا پورا عہد حکومت وجیا نگر کے راجہ اور اس کے اتحادی مثلاً راجمندری اور کھیرلا سے نبرد آزمائی میں گزرا لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس عہد کی ایک خصوصیت مختلف ثقافتوں کا امتزاج تھی۔ وجیا نگر کی آویزش کا نتیجہ دو دلچسپ واقعات تھے۔ جن کے اثرات لازماً دکن کی ثقافت پر مرتب ہوئے۔ ایک تو سلطان کی اپنی شادی وجیا نگر کی شہزادی کے ساتھ ہوئی تھی جو نہایت دھوم دھام کے ساتھ رچائی گئی۔ اور دوسرے شہزادہ حسن خان کی شادی پرتھال کے ساتھ ہوئی جو مدگل کے ایک زرگر کی بیٹی تھی اور اپنی خوش گفتاری کے لیے شہرت رکھتی تھی۔

فیروز شاہ کی خواہش تھی کہ وہ مغربی اسلامی ممالک کے بہترین اشخاص کو اپنے ہاں بلائے۔ اس نے اس غرض کے لیے مصطفیٰ آباد، دابل اور چول کی بندرگاہوں سے بہمنی جہاز روانہ کیے تاکہ علماء کو ملک دکن میں لائیں ان نئے مسلم آبادکاروں کے اثر کو خالص ہندوانہ اثر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا اور دکنی تہذیب کی شاندار عمارت انہی دو ثقافتوں کے امتزاج سے بنی۔ فیروز شاہ خود ایک اچھا خوشنویس تھا۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبیعیات اور اصطلاحات تصوف پر پورا عبور رکھتا تھا۔ اور تلنگو، کنڑی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور کئی دوسری زبانوں کا ماہر تھا۔

فیروز شاہ کے بعد اس کا بھائی احمد شاہ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا۔ احمد شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے تو اپنا دارالسلطنت بیدر میں منتقل کیا۔ بیدر کا قلعہ سلطان احمد شاہ اول کی غیر معمولی یادگار ہے۔ فیروز شاہ کے عہد حکومت کے اواخر میں بہمنی فوجوں کو وجیا نگر کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ اب احمد شاہ نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے جنوب کی طرف فوج کشی کی۔ اور دریائے تنگ بھدرا کے کنارے ہندو افواج سے معرکہ ہوا۔ پہلے ہی حملے میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور راجہ نے فرار ہو کر وجیا نگر کے قلعے میں پناہ لی۔

Marfat.com

احمد شاہ نے وجیا نگر کو تباہ و برباد کر کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مجبوراً راجہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ احمد شاہ نے ورنگل کے راجہ کو شکست دے کر اس کے راج کا بڑا حصہ بھی بہمنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس نے مالوہ کے مسلمان حکمرانوں کو بھی شکست دی۔ اور اس لڑائی میں بہت سا مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ احمد شاہ نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل حکومت کا تمام کاروبار اپنے لڑکے ظفر خان کے سپرد کردیا وہ ۸۳۸ھ/ ۱۴۳۵ء میں انتقال کرگیا۔ یہ سلطان بھی اصحاب علم کی صحبت کا بڑا شوقین تھا۔ بیدر کو جو بعد میں بہمنی سلطنت کا پایہ تخت بنا اسی سلطان نے آباد کیا تھا

احمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا علاء الدین ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے بھائی محمد شاہ نے بغاوت کردی جو بڑے کشت و خون کے بعد فرو ہوئی۔ سلطان نے کونکن کے علاقے پر ایک مہم بھیجی جو کامیاب رہی لیکن اس لڑائی کے نتیجہ میں خاندیش اور گجرات سے لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں بھی بہمنی فوجیں کامیاب رہیں وجیانگر کے راجہ نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا اور انہیں جاگیریں عطا کیں۔ اس تیاری کے بعد بغیر کسی وجہ کے راجہ نے بہمنی سلطنت پر حملہ کردیا۔ لیکن ناکام رہا اور سلطان کو خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح ہوئی۔ امراء سلطنت میں ملکی اور غیر ملکی تفریق پہلے سے چلی آرہی تھی۔ دکنی امراء عموماً سنی تھے غیر ملکی امراء جن میں ترک اور ایرانی مغل شامل تھے عموماً شیعہ تھے۔ چنانچہ اختلافات پیدا ہوئے۔

علاء الدین بڑا سلجھا ہوا اور ذی فہم بادشاہ تھا۔ وہ طبعاً عیش پسند تھا لیکن اس نے کبھی اپنی عیش پسندی کو اپنے فرائض کی تکمیل میں حارج نہ ہونے دیا۔ وہ خود مذہبی شعائر کا پابند نہ تھا لیکن اس نے اپنی رعایا کے مذہبی اور اخلاقی حالات درست کرنے کی پوری کوشش کی۔ اپنی مملکت میں مکمل امن وامان قائم کیا۔ علاء الدین کے بعد چند روز کے لئے اس کا چھوٹا بیٹا حسن تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کا بڑا بھائی ہمایوں اسے ہٹا کر خود تخت نشین ہوگیا۔

ہمایوں بڑا سخت گیر، درشت مزاج اور مغلوب الغضب فرمانروا تھا۔ انسان کے خون کی اس کے آگے کوئی قیمت نہ تھی۔ وہ لوگوں کو معمولی معمولی باتوں پر مروا دیا کرتا تھا۔ جب اسے اپنے خلاف ایک سازش کا علم ہوا تو اس نے سازش کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر مروا دیا۔ اس کے ملازمین نے اسے نشہ کی حالت میں قتل کر کے رعایا کو اس کے ظلم وستم سے نجات دلائی۔ اس کی موت ۸۶۵ھ/۱۴۶۱ء میں واقع ہوئی۔ ہمایوں نے مرنے سے پہلے اپنے جانشین کا انتخاب خواجہ جہاں، محمود گاواں اور ملک شاہ کے سپرد کردیا تھا۔ ان تینوں نے سلطان مرحوم کے آٹھ سالہ بچے نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ حکومت کا اصل انتظام اس کی والدہ مخدومہ جہان اور محمود گاواں کے سپرد تھا۔ ان دونوں نے بڑی مشکل سے ملک کے حالات درست کئے اور ہمایوں کی مردم آزادی کے اثرات کو دور کیا۔ ایک سال بعد نظام شاہ کی اچانک موت واقع ہوگئی۔ امراء نے اس کے بھائی محمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

چونکہ محمد شاہ ثالث بھی کم عمر تھا اس لئے حکومت کا انتظام کچھ عرصہ مخدومہ جہان اور خواجہ جہان نے سنبھالا۔ بعد میں محمد شاہ اور مخدومہ جہان نے خواجہ جہان کو مروا دیا اور اس کا منصب محمود گاواں کے سپرد کردیا۔ محمود گاواں نے جس دیانت، لیاقت اور بے لوثی سے اپنے فرائض کو انجام دیا اس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملیں گی۔ وہ بہت سادہ طبیعت کا انسان تھا۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ مصارف خیر میں خرچ کرتا تھا۔ رات کو بھیس بدل کر گشت کرتا اور لوگوں کے حالات معلوم کرتا۔ اس نے بیدر میں ایک بڑا مدرسہ بھی قائم کیا۔ اس نے بہمنی سلطنت کی حدود کو وسعت دی اور نظام حکومت کو سدھارا۔ بعض لوگوں میں محمود گاواں کی ہر دلعزیزی اور اثر و اقتدار نے رشک وحسد کی آگ بھڑکا دی۔ انہوں نے بغاوت آمیز مضمون کے ایک جعلی خط پر اس کی مہر ثبت کرا کے سلطان کو نشہ کی حالت میں دکھایا۔ سلطان نے بغیر تحقیق وتفتیش کے محمود کو قتل کرا دیا۔ بعد میں جب سلطان کو محمود کی بے گناہی کا علم ہوا تو اسے بہت صدمہ ہوا اور ایک سال کے اندر ہی ۱۴۸۲ء میں سلطان کا بھی انتقال ہوگیا۔

محمود گاواں کے ساتھ ہی بہمنی سلطنت کا استحکام اور امن رخصت ہوگیا۔ محمد شاہ کے بعد محمود شاہ بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ لیکن بڑے ہو کر اس کی عادتیں خراب ہوگئیں۔ وہ اپنا اکثر وقت بھانڈوں اور نقالوں میں گذارتا تھا۔ اس کی ان عادتوں کا اثر حکومت کے نظم ونسق پر بھی بہت برا پڑا چنانچہ بیجاپور، احمد نگر، برار اور گولکنڈہ میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ محمود کے پاس صرف بیدر کا علاقہ رہ گیا اور وہاں بھی وہ برائے نام بادشاہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد چار اور بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ لیکن ان کی حیثیت بھی کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۵۲۶ء میں آخری سلطان کلیم اللہ نے بیدر سے بھاگ کر بیجاپور میں پناہ لی تو امیر برید نے بھی بیدر میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ اس طرح بہمنی سلطنت رفتہ رفتہ ناپید ہوگئی اور اس کی جگہ پانچ سلطنتوں نے لے لی۔ یہ پانچ سلطنتیں مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ برار میں عماد شاہی سلطنت۔
۲۔ احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت۔
۳۔ بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت۔
۴۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت۔
۵۔ بیدر میں برید شاہی سلطنت۔

بھنبھور سندھ اور بلوچستان کا وہ خطہ جو دوسری صدی ہجری/ آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ سے عراق تک تجارتی شاہراہ ہونے کی بنا پر مشہور ہوچکا تھا اس شہر کا نام عشقیہ داستان سسی پنوں سے وابستہ ہے۔ پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں جب سندھ میں عربوں کے اقتدار کا خاتمہ ہونے لگا تو یہ تجارتی شاہراہ اور اس کی یاد ایک افسانے کی حیثیت اختیار کرگئی اور داستان سسی پنوں اسی یاد کا شاخسانہ ہے۔

بھنبھور شہر کی شہرت سسی پنوں کی داستان سے ہوئی۔ اس شہر کا نام سب سے پہلے میر محمد معصوم بکری نے اپنی مثنوی حسن وناز (جو داستان سسی پنوں کا فارسی ترجمہ ہے) میں کیا ہے۔

سندھی شاعری میں شاہ عبدالکریم کی صوفیانہ ابیات میں سے چند ایک میں اس شہر کا ذکر آتا ہے۔ ویسے تاریخی ماخذوں میں اس شہر کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر ان کھنڈروں کا کھوج لگایا جائے جن کو عوامی تخیل نے بھنبھور قرار دیا ہے تو یہ کھنڈر یقینی طور پر دیبل بندرگاہ کے معلوم ہوتے ہیں جسے ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ دیبل عربوں کے دور حکومت میں سندھ کی اہم بندرگاہ رہا۔ حال ہی میں محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے ان کھنڈروں کی کھدائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں وہ اس نظریے کی مزید تائید کرتے ہیں کہ عوام جن کھنڈروں کو بھنبھور سمجھتے ہیں وہ اصل میں دیبل کی مشہور بندرگاہ کے کھنڈرات ہیں۔ اس شہر کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔

Marfat.com

بھوپال

بھوپال ہندوستان کے صوبہ مدھیا پردیش کا صدر مقام اور سابقہ ریاست شہر ایک ریتلے پتھر کی پہاڑی پر دو خوشنما جھیلوں کے کنارے سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

بھوپال کو ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء میں دوست محمد خان نے بسایا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ فتح گڑھ کے نام سے تعمیر کیا تھا۔ اس شہر کے دو حصے ہیں ۱۔ شہر خاص۔ اس کے اردگرد ایک فصیل ہے۔ یہ فصیل دوست محمد نے بنوائی تھی۔ ۲۔ جہانگیر آباد اور احمد آباد کے جدید محلے اور مضافات جو بعد میں جہانگیر محمد خان اور احمد علی خان کی یادگار قائم رکھنے کے لیے تعمیر کرائے گئے۔

بھوپال شہر کو ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں نواب فیض محمد خان نے ریاست کا صدر مقام بنایا تھا۔

۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء، ۱۸۱۳ء، ناگپور اور گوالیار کی فوجوں نے بھوپال پر حملہ کر دیا اور بری طرح شہر کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ جب نذر محمد خان ایک مختصر سی مدت کے لیے بھوپال کا فرمانروا بنا تو اس نے اس شہر کو نئے سرے سے بحال کرایا۔ شہری آسائش کے بہت سے کام شروع کر دیئے تھے۔ سلطان شاہجہان بیگم نے بعض شاندار عمارتوں کا اضافہ کیا جن میں قصر تاج محل اور تاج المساجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسلامی علوم کی سرپرستی فرمائی۔ دونوں جھیلوں کے کنارے تقریباً اکثر حکمرانوں نے محلات کی قطار کھڑی کر دی تھی۔ جھیلوں کے اوپر شہر کے بے قاعدہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ان مکانات کے ساتھ کہیں کہیں وسیع باغات ہیں۔ لیکن ان سب پر قدسیہ بیگم کی جامع مسجد اپنا الگ رنگ جمائے ہوئے ہے۔ ۱۹۷۱ء میں شہر کی کل آبادی تین لاکھ بانوے ہزار تھی۔

ریاست :۔ یہ حیدر آباد کے بعد سب سے اہم مسلم ریاست تھی۔ اس کی بنیاد دوست محمد خان نے رکھی تھی۔ دوست محمد خان ملازمت کی تلاش میں دلی گیا وہاں شہنشاہ دہلی بہادر شاہ اوّل سے اپنی خدمات کے صلے میں اور کچھ اپنی کوششوں سے بیرا سیہ کا پرگنہ پٹے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اپنی غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے ایک بہت بڑے علاقے پر اپنے قدم جما لئے۔ شہر بھوپال اور قلعہ فتح گڑھ کی بنیاد رکھنے کے بعد مغلوں کی مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی لڑائی کا آغاز کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد خان جانشین ہوا جسے یار محمد خان نے جلد ہی نکال باہر کیا۔ اس کے بعد فیض محمد خاں جانشین بنا۔ اس کے زمانے میں بھوپال کی ریاست کا آدھا علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مرہٹہ پیشوا باجی راؤ اول کے قبضے میں چلا گیا۔ فیض محمد خان کے بعد اس کا بھائی حیات محمد خان جانشین بنا۔ اس کے بعد وزیر محمد خان جو اپنے آپ کو حاکم بننے کا اہل ثابت کر چکا تھا ریاست کا حاکم بنا۔ ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء میں وزیر محمد خان کا لڑکا نذر محمد اس کا جانشین ہوا اس نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے انگریزوں نے ذمہ لیا کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے محفوظ رہے گا۔ اس کے صلے میں ریاست کی فوج پنڈاریوں کے استیصال میں انگریزوں کی مدد کرے گی۔

نذر محمد کی شادی غوث محمد کی بیٹی قدسیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کے انتقال کے بعد ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء میں قدسیہ بیگم نے اپنی نابالغ بیٹی سکندر بیگم کے نگران کی حیثیت سے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پچیس سال بعد سکندر بیگم باقاعدہ طور پر مسند نشین ہوئی اور اس سے ایک طویل اور نامور سلسلہ بھوپال کی بیگموں کا چلا جو اس وقت جا کر ختم ہوا جب سلطان بیگم نے ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں برضا و رغبت ریاست سے دست بردار ہو کر اپنے بیٹے حمید اللہ خان کو اپنی جگہ مسند نشین کر دیا۔ یہی نواب حمید اللہ خان ریاست بھوپال کے آخری فرمانروا تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھوپال ابتدا میں مرکزی حکومت کے زیر انتظام رہا۔ ۱۹۴۹ء میں بھارت میں مدغم کر دیا گیا۔ سابق نواب کو جو ایک عام شہری سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ پنشن دے دی گئی۔ ان کے جیب خرچ کے لیے گیارہ لاکھ سالانہ کی رقم منظور کی گئی۔ نواب حمید اللہ خان کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہو گیا تو ان کے بعد ان کی دوسری بیٹی ساجدہ سلطان بیگم کو ان کا جانشین تسلیم کیا گیا۔

بھوپال ریاست کا کل رقبہ ۶۹۰۰ مربع میل تھا اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس ریاست کی کل آبادی ۸۴۰۳۴۴ تھی۔

بہوتی (وفات ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) شیخ منصور بن یونس بہوتی ایک نامور حنبلی عالم دین جس کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کا ہے۔ مدیریہ عزبیہ میں بہوت نامی ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس میں کئی ایک حنبلی علماء پیدا ہوئے۔

شیخ منصور بہوتی کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں وہ قاہرہ میں فقہ کی تعلیم دینے میں مشغول رہا اور وہیں انتقال کیا لوگ اس کے زہد و تقویٰ اور کریمانہ اخلاق کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب تعلیم بہت مقبول تھا۔ لوگ دور دور سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس آتے تھے۔

اس کے شاگردوں میں محمد بہوتی اور محمد ابن ابی سرور بہوتی ابوبکر بن ابراہیم الصالحی وغیرہ ہیں۔

بہوتی ایک صاحب تصنیف عالم تھا۔ اس کی کتاب ابھی تک مصر میں فقہ حنبلی کے نصاب درس میں شامل ہے۔

اس کی تصانیف میں ۱۔ "زاد" جو ابن قدامہ کی "المقنع" کا خلاصہ ہے۔ ۲۔ "الاقناع" ایک شرعی دستور العمل جو حنابلہ کے ہاں ایک مستند اور مسلم تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۳۔ الاقناع کی شرح جو کشاف کے نام سے تین جلدوں میں ہے ۴۔ محمد بن علی المقدسی کی المفردات کی شرح نظم میں لکھی مشہور ہیں۔

بھیروی، غلام قادر، مولانا (وفات ۱۹ ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ/۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء) ایک راسخ العقیدہ عالم دین۔ والد کا نام غلام حیدر تھا جو بڑے متبحر عالم تھے۔ بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر ہی میں حصول کی خاطر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور پاک و ہند کے مختلف مدارس دینیہ سے اکتساب علم کرتے رہے۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا غلام محی الدین بگوی، مولانا احمد دین بگوی، مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ اہم ہیں۔

حصول تعلیم کے بعد دہلی سے لاہور آئے اور بھاٹی دروازے کی "اونچی مسجد" میں وعظ فرمانے لگے۔ بعد ازاں بیگم شاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں انگریزوں کی خواہش کے مطابق ایک فتویٰ نہ دیا اور کالج کو خیرباد کہہ دیا۔ بعد ازاں مدرسہ نعمانیہ میں دین کی تعلیم دینے لگے اور اسی عالم مصروفیت میں انتقال کیا۔ مولانا سلسلہ چشتیہ میں خواجہ شمس الدین سیالوی سے بیعت تھے۔ قادری سلسلے اور فلسفہ وحدت الوجود کے زبردست حامی تھے سخت اور کڑے اعتقادات کے حامل تھے۔ وہابیوں، اہل تشیع اور احمدیوں (مرزائیوں) کے

Marfat.com

سخت مخالف تھے۔ مسلک حنفی کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔

مولانا بھیروی ایک بڑے مصنف بھی تھے انہوں نے گیارہ کتابیں لکھی ہیں جو نصابی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں چھوٹے چھوٹے جملوں اور آسان زبان میں اعتقاد کے اہم مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان تصانیف میں ۱۔ نماز حضوری۔ ۲۔ نماز ضروری۔ ۳۔ حقیقت انوار محمدیہ۔ ۴۔ شمس الحنفیہ بجواب نور الحنفیہ۔ ۵۔ جوہر ایمانی ۶۔ عکازہ در صلوٰۃ جنازہ۔ وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ کے تلامذہ میں پیر جماعت علی شاہ، مفتی غلام احمد اور مولانا محمد عالم آسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی اولاد میں مولانا رفیع الدین، مولانا زین العابدین اور دو صاحبزادیاں تھیں۔

بھیرہ پاکستان کا ایک بہت پرانا شہر۔ ضلع سرگودھا میں دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر برارہ کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ ابتدا میں اس کا نام راجا بھدر اسین کے نام پر بھدر روی نگر تھا۔ بعض نے اس شہر کا ذکر بتیبہ یا بھدیہ کے نام سے کیا ہے۔ جب سکندر اعظم ۳۲۶ قبل مسیح میں پنجاب پر حملہ کرنے کے لئے آیا تو بھیرہ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر تقریباً اسی جگہ آباد تھا جہاں ان دنوں احمد آباد کی بستی ہے۔ اس کے گیارہ سو سال بعد بابر کے زمانے میں بھی یہ شہر مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ محققین کی رائے کے مطابق سکندر نے پورس سے لڑائی کے وقت اپنا فوجی پڑاؤ قدیم بھیرہ کے نواح میں ڈالا تھا اور اصل جنگ دریا کے بائیں کنارے پر موجود بھیرہ کے نواح میں لڑی گئی۔

اس شہر کو شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں دریا کے بائیں کنارے پر ایک مسجد اور ایک بزرگ کے مزار کے گرد تعمیر کرایا تھا۔ عتبی کے بقول اس شہر کو سلطان محمود غزنوی نے انند پال کے ایک ماتحت راجا بجے رائے سے چھینا تھا۔ بھیرے کو ۱۲۲۱ء میں چنگیز خان کے ایک سپہ سالار تورتائی نے جلال الدین خوارزم کا تعاقب کرتے ہوئے فتح کیا تھا۔ ۱۳۹۸ء میں جود پہاڑیوں کے راجاؤں کے ساتھ بھیرہ کا راجا بھی امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بابر نے ۱۵۱۹ء میں ہندوستان پر اپنے حملے کے دوران یہاں بھیرہ کے باشندوں پر چار لاکھ شاہرخی سکے کا تاوان عائد کیا تھا۔ اکبر کے عہد حکومت میں اس شہر میں تانبے کے سکوں کی ٹکسال قائم کی گئی تھی۔

شہر بھیرہ پاکستان کی ایک تحصیل کا صدر مقام اور علمی و ادبی مرکز ہے۔ بہت سے علماء اور صوفیاء اس شہر سے تعلق رکھتے تھے۔

بھیک :- خدا کے نام پر مانگی ہوئی چیز (دیکھئے "گداگری")

بئر السبع بیرشیبا، جنوبی فلسطین (اسرائیل) کا ایک شہر، جو یروشلم سے جنوب مغرب کی طرف پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر وہ چشمے تھے جن کے متعلق روایت ہے کہ انہیں حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے ہاتھوں سے کھودا تھا۔

آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی سے یہ جگہ غیر آباد تھی۔ یہاں تک کہ ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں ترکوں نے اسے دوبارہ آباد کیا اور اپنی جنوبی مملکت کے لئے اداری مرکز بنا کر دوبارہ آباد کیا۔ ترکوں کے یہ قدم اٹھانے کی وجہ مصری اور فلسطینی سرحد سے متعلق وہ اختلاف تھا جو انہیں حکومت برطانیہ سے پیدا ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بئر السبع پر ترک اور برطانوی فوجوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جن دنوں یہ علاقہ برطانیہ کے زیر انتظام تھا۔ اس کی تحصیل فلسطین کے تقریباً نصف علاقے پر مشتمل تھی۔ اور اس میں تقریباً پچھتر ہزار سے ایک لاکھ بدوی آباد تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اس شہر کی آبادی تین ہزار ہو چکی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی ۷۰ ہزار سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ء سے یہ شہر اسرائیل میں شامل ہے اور نجیب تحصیل کا صدر مقام ہے۔

بئر زمزم :- زمزم کا کنواں (دیکھئے "آب زمزم")

بئر معونہ مدینہ منورہ کا ایک کنواں جو بنو سلیم کی ملکیت تھا۔ یہ علاقہ بنو عامر اور حرہ بنو سلیم کے درمیان واقع ہے اس کے آس پاس کا علاقہ بھی اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں بئر معونہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ کفار نے ایک سازش اور غداری کر کے بہت سے بلند مرتبہ اصحاب رسول کو جن میں حفاظ اور قراء شامل تھے شہید کر دیا تھا۔

یہ واقعہ ماہ صفر ۴ھ کا ہے کہ بنو عامر کا ایک معزز سردار ابو براء عامر بن مالک انکلابی آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی لیکن وہ اسلام نہ لایا اور نہ ہی اس کا انکار کیا۔ پھر اس نے عرض کی یا رسول اللہ اگر آپ اپنے کچھ صحابہ کو اہل نجد کی طرف بھیجیں جو انہیں اسلام کی دعوت دیں تو مجھے امید ہے وہ اسلام لے آئیں گے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد کی طرف سے ان لوگوں کے بارے میں خدشہ ہے۔ ابو براء نے کہا کہ میں ان کی ضمانت دیتا ہوں چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ ستر صحابہ کا ایک وفد بھیج دیا۔ جب یہ وفد بئر معونہ کے علاقہ میں قیام پذیر ہوا تو انہوں نے حضرت حرام بن ملحان کو آنحضورؐ کا خط مبارک دے کر بنو عامر کے سردار کے پاس بھیجا۔ عامر نے خط پڑھے بغیر قاصد کا سر قلم کر دیا اور اپنے قبیلے کو وفد پر حملہ کرنے کو کہا لیکن انہوں نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ ابو براء نے مسلمانوں کو اپنی حفاظت و حمایت میں لے رکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے بنو سلیم کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ تمام مسلمان لڑتے ہوئے شہید ہو گئے صرف حضرت کعب بن زید زخمی ہو کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ آنحضورؐ اور صحابہؓ کو شہدائے بئر معونہ کا بڑا دکھ ہوا اور آپؐ تقریباً ایک ماہ تک ہر نماز میں شہدائے بئر معونہ کے قاتلوں کے لئے بددعا کرتے رہے۔ یہ سانحہ ۲۰ صفر ۴ھ / یکم اگست ۶۲۵ء کو پیش آیا۔

بئر میمون مکہ مکرمہ کے قریب ایک کنواں۔ یہ کنواں اسلام کے ابتدائی دور میں مشہور و معروف تھا۔ آج کل اس کا نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ نہ ہی یہ بات کلی طور پر معلوم ہے کہ آیا بئر میمون برباد ہو گیا ہے یا کسی دوسرے نام سے آج بھی جاری ہے۔ اس کا محل وقوع مسجد حرام اور منیٰ کے درمیان منیٰ سے قریب تر قرار دیا جاتا ہے۔ طبری نے اس کنوئیں کے مقام پر ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء میں خلیفہ المنصور کی وفات کے جو حالات لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنواں حدود حرم کے اندر تھا اور عراق سے آنے والے حاجیوں کی راہ پر واقع تھا۔ ایک اور تاریخی شہادت کے مطابق یہ کنواں مکے کے شمال میں مر الظہران کے پاس تھا۔ بقول ہمدانی یہ کنواں دنیا بھر کے دو قدیم کنوؤں میں سے ایک تھا اور البکری کے

Marfat.com

بقول یہ کنواں چاہ زمزم سے کہیں زیادہ قدیم تھا۔ عہد نبوی میں یہ میمون بن الحضرمی کی ملکیت تھا۔

بئر میمون مکّے کے لئے آب رسانی کے اس نظام سے وابستہ تھا جو سب سے پہلے ملکہ زبیدہ نے تیار کرایا۔ ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں حاکم اربل مظفر نے مرمت کے بعد اس کنوئیں کو دوبارہ آباد کیا۔

بیان بن سمعان کوفے کا ایک شیعی رہنما۔ بقول النوبختی ابن کرب کے شاگرد حمزہ بن عمارہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے تھے۔

محمد بن حنفیہ کی امامت کے بارے میں وہ نہایت عجیب وغریب نظریات رکھتا تھا۔ اس نے محمد کے بیٹے ابو ہاشم کی امامت قبول کی اور امام محمد باقر کا مخالف ہو گیا۔ امام محمد باقر کی وفات کے بعد مغیرہ بن سعید بھی ان کی جماعت کو چھوڑ کر بیان کے ساتھ آملا۔ کچھ عرصے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا

جس کی وجہ سے یہ دونوں اپنے چند متبعین سمیت گرفتار کر لیے گئے اور ۱۱۹ھ/۷۳۷ء میں ہشام کے والی خالد القشیری نے انہیں زندہ جلوا دیا۔

بیان کے معتقدوں نے بظاہر ایک جماعت بیانیہ نام سے بنائی تھی۔ جن کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ لوگ اماموں کی نبوت کو نور ربانی کے ایک ذرہ باطنی سے منسوب کرتے تھے۔ اور موت کے بعد بہت سے مذہبی بزرگوں کی بازگشت کا اعتقاد بھی رکھتے تھے۔ بعض لوگ بیان کو بھی امام مسجد سمجھتے تھے اور وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیت ھذا بیانٌ للناس سے سند لاتے تھے۔

بیان قرآن پاک کے لفظی تشبیہی معنی سکھایا کرتا تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا ایک نورانی ذات ہے۔ چہرے کے سوا جس کے تمام اعضاء وجوارح بالآخر معدوم ہو جائیں گے۔

بیبرس اوّل (۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء - ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء) مصر میں دولت بحریہ کا چوتھا سلطان اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ان قپچاق ترک غلاموں کی جماعت میں تھا۔ جنہیں ایوبی سلطان الملک الصالح نے خریدا تھا۔ اس کا پہلا آقا ایدکین بندقدار تھا۔ اس کا ذکر تاریخ میں سب سے پہلے ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں ایک قیدی کی حیثیت سے آتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آقا کے ساتھ قید تھا۔ لعد میں وہ سلطان

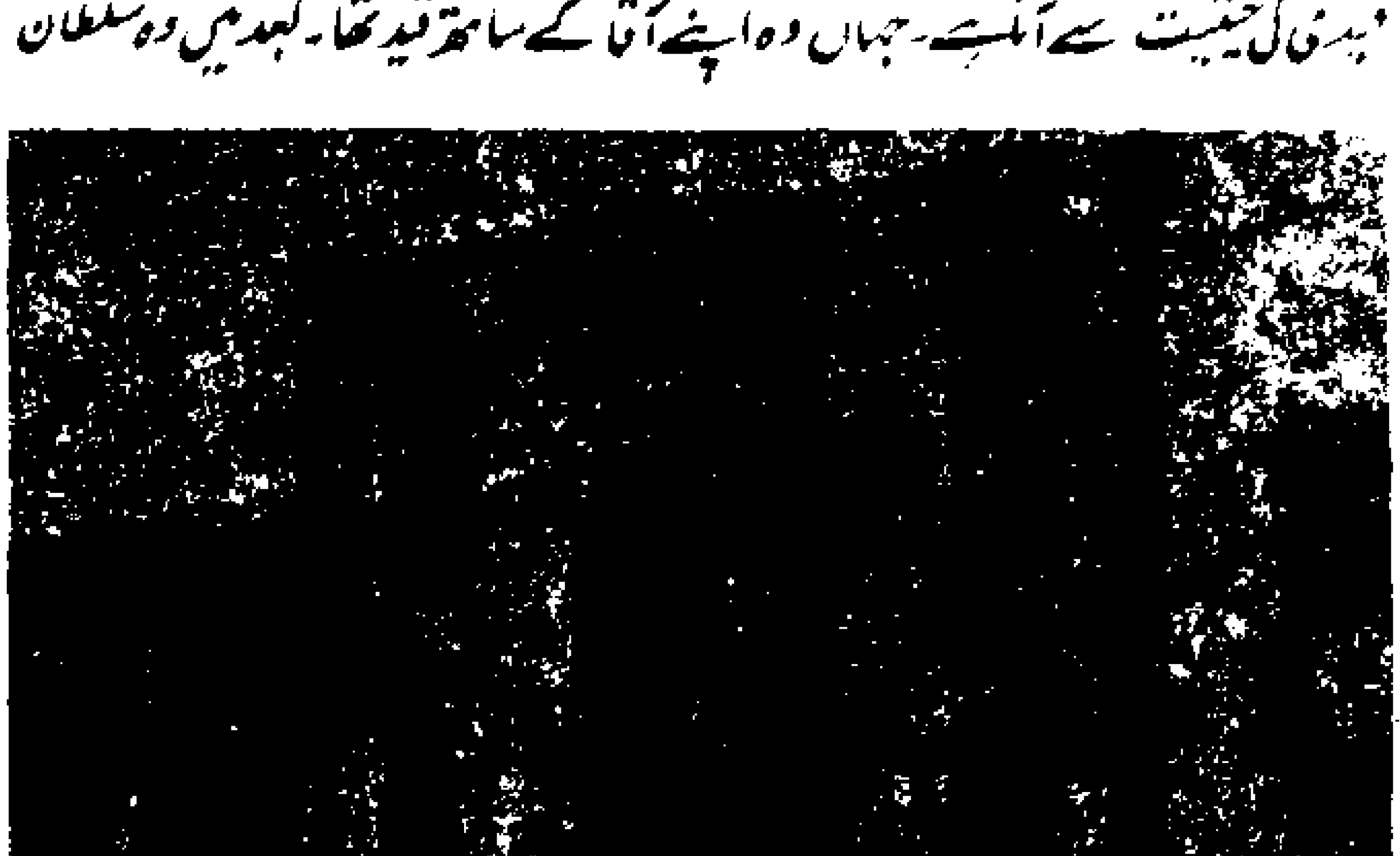

قاہرہ میں سلطان بیبرس اول کا مزار

مصر کی طرف سے شام میں مصروف پیکار نظر آتا ہے۔ جہاں اسے سخت فوجی تربیت کا زمانہ گزارنا پڑا۔ اس نے منصورہ کے میدان جنگ میں مصری فوج کی قیادت سنبھالی اور یہ اس کا پہلا جنگی کارنامہ تھا۔ اس کی یہ مہم فارس کور کی فیصلہ کن فتح اور فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی گرفتاری پر منتہی ہوئی۔ اسی موقعہ پر بیبرس ہی کی شہ پر ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء میں توران شاہ کو قتل کیا گیا۔

۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں سلطان قطز کو اس کے خیمے میں قتل کر دیا گیا تو بیبرس الملک الظاہر کا لقب اختیار کر کے مصر کے تخت پر مسند نشین ہوا۔

بیبرس بڑا بہادر جرأت مند اور اولوالعزم حکمران تھا اور جنگوں میں بنفس نفیس شریک ہوتا تھا۔ اس نے ایک طرف تو عالم اسلام کو متحدہ قیادت عطا کی اور دوسری جانب فرنگیوں کے خلاف فاتحانہ جنگ لڑی۔ اس کے حملے بھرپور اور غیر متوقع ہوتے تھے۔ وہ ہر مفتوحہ علاقہ کے ایک ایک چپے کو جلد ہی دفاع کے قابل بنا دیتا تھا۔

بیبرس نے داخلی طور پر ملک کی از سر نو تنظیم میں غیر معمولی ہم آہنگی اور توازن پیدا کیا۔ ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء کے بعد سے سلطان نے اپنی آئندہ کی جارحانہ کارروائیوں کے اہم مقامات کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس نے حمص سے حوران تک ہر اس قلعے کو جسے منگولوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ مرمت کرا کے استعمال کے قابل بنایا۔

بیبرس ملکی حالات سے باخبر رہتا تھا۔ اسے ہفتے میں دو مرتبہ ملک کے ہر ایک حصّہ کی معلومات ملتی رہتی تھیں۔

اس نے اسلحہ خانوں کو نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے ایوبی شہزادوں کے مقبوضات کی قطع وبرید کا آغاز کیا۔ سلطان خود حلب گیا اور دمشق میں اس مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء میں کرک کا رخ کیا اور ایوبی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء میں سلطان نے حمص کے علاقے کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں بندرگاہ قیساریہ فتح ہو گئی۔ اس کے بعد ارسوف کی بندرگاہ پر بھی سلطان کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ۶۶۶ھ/۱۲۶۸ء میں سلطان یافہ کے اس علاقے کی طرف متوجہ ہوا جو مملکت غیر سے گھرا ہوا تھا اور وہ ایک روز بھی سلطان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس طرح یافہ ایک ہی دن میں فتح ہو گیا۔ چند ہفتوں بعد مسلمانوں کا شاتی اور بیوفورٹ پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اب مسلمان فوجیں اچانک لاطینی سلطنت کے شمالی سرے کے پاس نمودار ہو گئیں۔ اور انطاکیہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس فتح کے بعد اس کے قرب وجوار کے قلعے بھی مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ یہ فتح مسلمانوں کے لیے بڑی شہرت کا سبب بنی۔ ۶۶۹ھ/۱۲۷۱ء میں دو ماہ کے دوران میں سفیثہ کے مستحکم مقامات اور کرک اور عکار کے قلعے بھی فتح ہو گئے۔

مورخین یہ بات کہتے ہیں کہ سلطان غیر متوقع طور پر پہنچ جاتا تھا اور راستے میں اپنا رُخ تبدیل کر لیتا تھا۔ تاکہ کسی کو پہلے سے یہ علم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء میں سلطان بیبرس نے وفات پائی۔

سلطان کے سترہ سالہ دور میں شام میں مجموعی طور پر اڑتیس دفعہ فوج کشی کی گئی۔ اس سلطان کے دور حکومت میں مستعدی ایک شاندار مثال نظر آتی ہے۔

بیبرس ثانی (وفات ۱۰ ذی قعدہ ۷۰۹ھ/۱۶ اپریل ۱۳۱۰ء) رکن الدین المنصوری۔ مصر کا مملوک سلطان جو چرکسی نسل سے تھا۔ یہ سلطان قلاوون کے مملوکوں میں سے تھا۔ سلطان محمد بن قلاوون کے پہلے عہد میں اس کا تقرر استادار کی حیثیت سے ہوا۔ سلطان کتبغا نے ترقی دے کر اسے ایک ہزار رسالہ کا

Marfat.com

کا سپہ سالار بنا دیا۔ جب ۶۹۸ھ/۱۲۹۸ء میں سلطان قتل ہوا تو اس نے اور اس کے ایک اور حریف سالار نے محمد بن قلاوون کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ یہ دونوں آپس میں دشمن تھے۔ لیکن اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ بادشاہ کے نام پر جس کی عمر چودہ سال تھی حکومت کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جو بھی اہم اقدام ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے عرب مؤرخین ان دونوں امیروں کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

دس سال بعد محمد ان دونوں کی سرپرستی سے تنگ آ کر تخت سے دست بردار ہو گیا۔ بیبرس کے ساتھ سالار سے زیادہ مملوک تھے۔ چنانچہ وہ ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء میں اکیلا سلطنت کا وارث بن بیٹھا۔ اور اسی موقع پر اس کی اصل کمزوری بھی ظاہر ہو گئی۔ چنانچہ ۷۰۹ھ/۱۳۱۰ء میں محمد تیسری مرتبہ تخت پر قابض ہو گیا۔ بیبرس بھاگ نکلا لیکن گرفتار ہو گیا۔ اور اسے قاہرہ میں ہلاک کر دیا۔

بیبرس منصوری (وفات ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) ایک مملوک سپہ سالار اور مؤرخ وہ قلاوون کا مملوک تھا اور اس نے قلاوون کی فوج کے ساتھ ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء میں شامی فرنگیوں کے خلاف ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں شلوم اور سلیشیا کی مہموں میں ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں انطاکیہ کے محاصرے میں اور ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء میں کیلیکیا کی ایک اور مہم میں حصہ لیا۔

۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء میں سلطان قلاوون نے بیبرس کو الکرک کے صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں سلطان کے جانشین نے اس کو اس عہدے سے علیحدہ کر دیا چنانچہ اس کے بعد وہ مصر لوٹ آیا۔ یہاں اس نے مغولوں کے خلاف مہموں میں حصہ لیا۔ ۶۹۳ھ/۱۲۹۳ء میں جب محمد سلطان منتخب ہوا تو اس نے بیبرس کو سپہ سالار مقرر کر دیا اور رئیس عدالت کا اعلیٰ عہدہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد وہ کئی سال تک عسکری اور انتظامی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ بیبرس کی زندگی بھی محمد سلطان کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ محمد سلطان دوبار تخت سے معزول ہوا۔ اس کے ساتھ بیبرس بھی اپنے عہدے سے ہٹا دیا جاتا رہا۔ بیبرس محمد سلطان کا بڑا پرجوش حامی تھا۔ اس نے سلطان کو بحال کرانے میں بڑی جدوجہد کی۔ جب سلطان ۷۰۹ھ/۱۳۱۰ء میں پھر متمکن تخت ہوا تو اس نے بیبرس کو بہت سے اختیارات دے دیئے۔ ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں سلطان نے اسے اپنے بعد سب سے بڑے عہدے پر فائز کیا اور اسے مصر کا نائب السلطنت بنا دیا۔ ۷۱۲ھ/۱۳۱۲ء میں بیبرس کو اس عہدے سے معزول کر کے اسکندریہ کے سرکاری قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

بیبرس نے اس قید خانے میں پانچ برس گذارے۔ یہیں اس نے اسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔

بیبرس ایک نہایت متقی مسلمان تھا۔ دینی کتب کے مطالعے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ اپنی مصروفیات میں سے تاریخی کتب لکھنے کا وقت بھی نکال لیتا تھا۔

اس کی تصانیف میں "زبدۃ الفکرۃ فی تاریخ الہجرۃ" اہم ہے۔ یہ ایک عام تاریخ اسلام ہے جو گیارہ جلدوں میں ہے اور ہر صدی کے لحاظ سے تالیف کی گئی ہے۔

بی بی پاک دامناں :- لاہور کی مشہور عابد و زاہد خواتین (دیکھئے "پاک دامن بیبیاں")

بیت الحرام حرمت والا گھر۔ وہ جگہ جس کا حد سے زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔ مکہ میں جس جگہ خانہ کعبہ موجود ہے اسے کو بیت الحرام کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس کی عظمت اس لئے ہے کہ قرآن مجید کے مطابق اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے کی تھی۔ (نیز دیکھئے "کعبہ" اور "مسجد حرام")

بیت الخلاء بول و براز سے فراغت پانے کا کمرہ۔ بیت الخلا کا رُخ اس طرح سے ہونا چاہیئے کہ جب آدمی فراغت کے لئے بیٹھے تو وہ قبلہ رُخ نہ ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے حضرت ابوایوبؓ انصاری سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب تم بیت الخلاء میں بیٹھو تو نہ قبلے کی طرف منہ کرو اور نہ پیٹھ"

آداب بیت الخلاء میں سے یہ بھی ہے جب آدمی بیت الخلاء میں داخل ہو تو وہ یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (متفق علیہ) "اے اللہ میں تجھ سے جنوں اور جنیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔"

اسی طرح جب انسان فارغ ہو کر بیت الخلاء سے نکلے تو کہے غُفْرَانَکَ۔ اے اللہ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں۔ (ترمذی)

بیت العتیق پرانا گھر، قدیم گھر۔ خانہ کعبہ جو عبادت الٰہی کے لئے دنیا میں سب سے پہلا مقام اور مکان ہے جسے حضرت آدمؑ نے خدا کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ (نیز دیکھئے "کعبہ"، "مسجد حرام")

بیت اللہ اللہ کا گھر، جہاں اللہ کی عبادت کی جائے۔ اصطلاحاً خانہ کعبہ مسلمان ہر سال بیت اللہ کی زیارت کے لئے یہاں آتے ہیں اسلامی روایات کے مطابق دنیا میں یہ پہلا خدا کا گھر ہے۔ مسلمان دوسرے مناسک حج کے علاوہ کعبہ

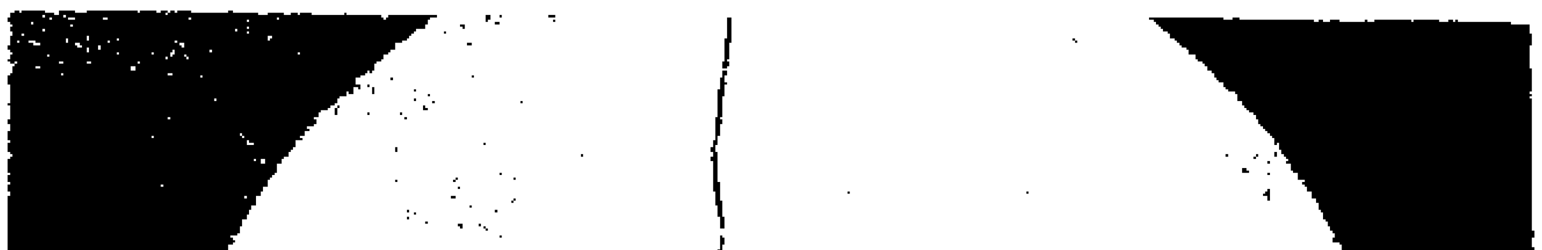

Marfat.com

کے گرد سات چکر لگاتے ہیں اور حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ (نیز دیکھئے "کعبہ" اور "مسجد حرام"۔)

بیت المال مال کا گھر۔ سرکاری خزانہ، شاہی خزانہ۔ شرعی اصطلاح میں اس کے معنی کسی مسلم ریاست کے "خزانے" کے ہیں۔ یعنی وہ مال جس کا کوئی خاص مالک نہ ہو۔ عام لوگوں کا حصہ ہو۔ اور جس سے ہر مستحق کو مدد دی جائے۔
بیت المال آنحضورؐ کے عہد مبارک سے کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے چونکہ عہد نبوی میں مال جمع کرنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی اس لئے اس مقصد کے واسطے کوئی الگ مکان نہیں بنایا گیا تھا۔ جو کچھ آتا وہ مسجد میں ڈھیر کر دیا جاتا اور مستحق لوگوں کو دے دیا جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی بیت المال کی یہی صورت رہی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بیت المال باضابطہ طور پر وجود میں آیا۔
پہلے پہل بیت المال کا لفظ اس محفوظ جگہ کے لئے بولا جاتا تھا جہاں اموال یا اسباب کو حقداروں میں تقسیم کرنے سے پہلے عارضی طور پر رکھا جاتا تھا۔ بیسری ہجری میں جب "دیوان" کا ادارہ بھی اس میں شامل کر دیا گیا تو بیت المال کے مفہوم میں سرکاری خزانے کا تصور شامل ہو گیا۔
اہل سنت والجماعت کے نزدیک امام یا سربراہ کو جو بیت المال کا رئیس ہوتا ہے، بیت المال کے یہ اختیارات بحیثیت امام جماعت کے حاصل ہوتے ہیں، کسی ذاتی یا شخصی اقتدار و اختیار کا نتیجہ نہیں ہوتے۔
بیت المال آمدنی کے ذرائع حسب ذیل ہیں۔
۱۔ مال زکوٰۃ۔ جو سرکاری طور پر مالداروں سے وصول کیا جاتا ہے۔
۲۔ خمس غنائم۔ جنگی لوٹ کے مال کا پانچواں حصہ۔
۳۔ معادن اور دفائن۔
۴۔ لاوارث مال۔
۵۔ جزیہ یعنی وہ ٹیکس جو غیر مسلم رعایا پر لگایا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دوران میں مرکز کے علاوہ صوبوں کے صدر مقام پر بیت المال قائم کئے گئے تھے اور ان کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔ ہر صوبے کی آمدنی وہاں کے بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور حکومت کے اخراجات پر جو کچھ خرچ ہوتا تھا اس کے بعد بقایا رقم مرکزی بیت المال میں جمع کرائی جاتی تھی۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد بیت المال ایک شاہی خزانہ بن گیا اور اس کا زیادہ حصہ بادشاہوں اور خلفاء کی شان و شوکت پر صرف ہونے لگا۔

بَیت المَعمُور بھرا گھر۔ آباد مکان۔ خانہ کعبہ اور دیگر مساجد، جو نمازیوں اور عابدوں سے آباد ہیں اور یہ معابد دنیا کے ہوں یا آسمانوں کے۔ اصطلاحاً خانۂ کعبہ کے عین اوپر ساتویں آسمان پر ملائکہ کا ایک عبادت خانہ ہے۔ جہاں پر فرشتے کثیر تعداد میں طواف اور عبادت کرتے رہتے ہیں۔ آنحضورؐ نے معراج کی رات اس جگہ کی زیارت کی تھی۔

بیت المقدس پاک گھر، امت مسلمہ کا قبلہ اول، یروشلم اور اس کی عبادت گاہ جس کی بنیاد حضرت داؤدؑ نے رکھی اور تکمیل حضرت سلیمانؑ نے کی۔ عام طور پر شہر یروشلم کو بھی بیت المقدس ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ان شہروں میں سے ایک ہے جنہیں نوع انسانی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جس کا ذرہ ذرہ مقدس ہے۔ اکثر انبیاء اسی شہر میں مبعوث ہوئے۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے یکساں متبرک ہے۔ آنحضورؐ ہجرت کے بعد صحابہ کرام کو ساتھ لے کر سترہ ماہ تک اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ جب آپؐ معراج کے لئے گئے تو یہی مقام آپؐ کی پہلی منزل بنا۔ اسی مقام پر آنحضورؐ نے سابق انبیاءؑ کی امامت کرائی۔ یہاں حضرت داؤد، حضرت سلیمانؑ اور کئی دوسرے انبیاءؑ کے مقابر ہیں۔
حضرت داؤدؑ نے شہر مقدس پر ۳۳ سال حکومت کی۔ اس تمام عرصے میں اسرائیلی فوجوں کو سکون بہت کم ملا۔ البتہ ان جنگوں کا نتیجہ بنی اسرائیل کے حق میں اس لئے بہت زیادہ مفید رہا کہ بنی اسرائیل جو قبائلی عصبیت کا شکار تھے۔ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک قوم بن گئے۔ حضرت داؤدؑ کی دلی خواہش تھی کہ وہ ایک معبد بنائیں لیکن اسرائیلی روایات کے مطابق انہیں خواب میں بتایا گیا کہ اللہ کا مستقل گھر ان کے بیٹے کے عہد میں تعمیر ہوگا۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے تخت نشین ہونے کے بعد ۱۰۱۲ ق۔م میں اس معبد کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ عمارت اسی جگہ تعمیر ہوئی جسے حضرت داؤدؑ نے منتخب کیا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر سات سال تک مسلسل جاری رہی اور دو لاکھ افراد اس کی تعمیر میں مصروف رہے۔ بعد میں یہ عمارت ہیکل سلیمانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ بائیبل کی تصریح کے مطابق ہیکل سلیمانی فن تعمیر کا ایک شاہکار تھا۔ جس کی لمبائی ۹۰ فٹ چوڑائی ۳۰ فٹ اور اونچائی ۴۵ فٹ تھی۔ اس کے اندر پاک ترین جگہ بنائی گئی۔ جہاں تابوت سکینہ رکھا گیا۔
حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی ریاست دو حصوں میں بٹ گئی اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل فواحش، حرامکاری اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے ایک اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرنی شروع کر دی۔
رحبعام بن سلیمانؑ کو تخت پر بیٹھے پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ شاہ مصر سی شاق نے یروشلم کی طرف پیشقدمی کی اور بغیر مزاحمت کے شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ ہیکل سلیمانی اور عبادت گاہ کی تمام قیمتی چیزیں شاہی خزانوں کے ساتھ لوٹ کر لے گیا۔
حزقیاہ نے (۷۰۴ ق م سے ۷۰۰ ق م) نے اپنے دور میں ہیکل سلیمانی کی عظمت کو بحال کیا۔
یہود کی پہلی قومی تباہی و بربادی بخت نصر کے ہاتھوں ۵۹۸ ق م میں ہوئی۔ اس تباہی میں نہ صرف ہیکل سلیمانی کا نام و نشان مٹ گیا بلکہ دیگر صحائف کے ساتھ ساتھ تورات بھی غائب ہو گئی۔ بخت نصر کے اس حملے کے بعد تابوت سکینہ ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔
۵۳۵ء میں ایران کے پہلے کسریٰ نے بابل کو فتح کیا تو اس نے یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ جب یہودی یروشلم واپس آئے تو انہوں نے یشوع بن یوصدق اور زروبابل بن سالتی ایل کی قیادت میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر دوبارہ شروع کی۔ ۵۱۶ ق۔م میں یہ تعمیر مکمل ہوئی۔
۶۳ ق۔م میں رومی جنرل پومپیائی نے شہر کا محاصرہ کر کے ہیکل کو دوبارہ تباہ کر دیا۔ لیکن ہیرود اعظم کے دور میں، جو رومی شہنشاہ کے باجگزار کی حیثیت سے یہاں کا بادشاہ بنا۔ بیت المقدس نے دوبارہ سلیمانؑ کے عہد کی عظمت حاصل کر لی۔ اس بادشاہ نے ہیکل سلیمانی کو از سر نو عظمت بخشی بقول کیتھی ہیرود کے وسیع کردہ ہیکل کا رقبہ تقریباً ایک ہزار مربع فٹ تھا اور شان و شوکت میں سلیمانؑ

Marfat.com

احاطۂ حرم کی زیارتیں

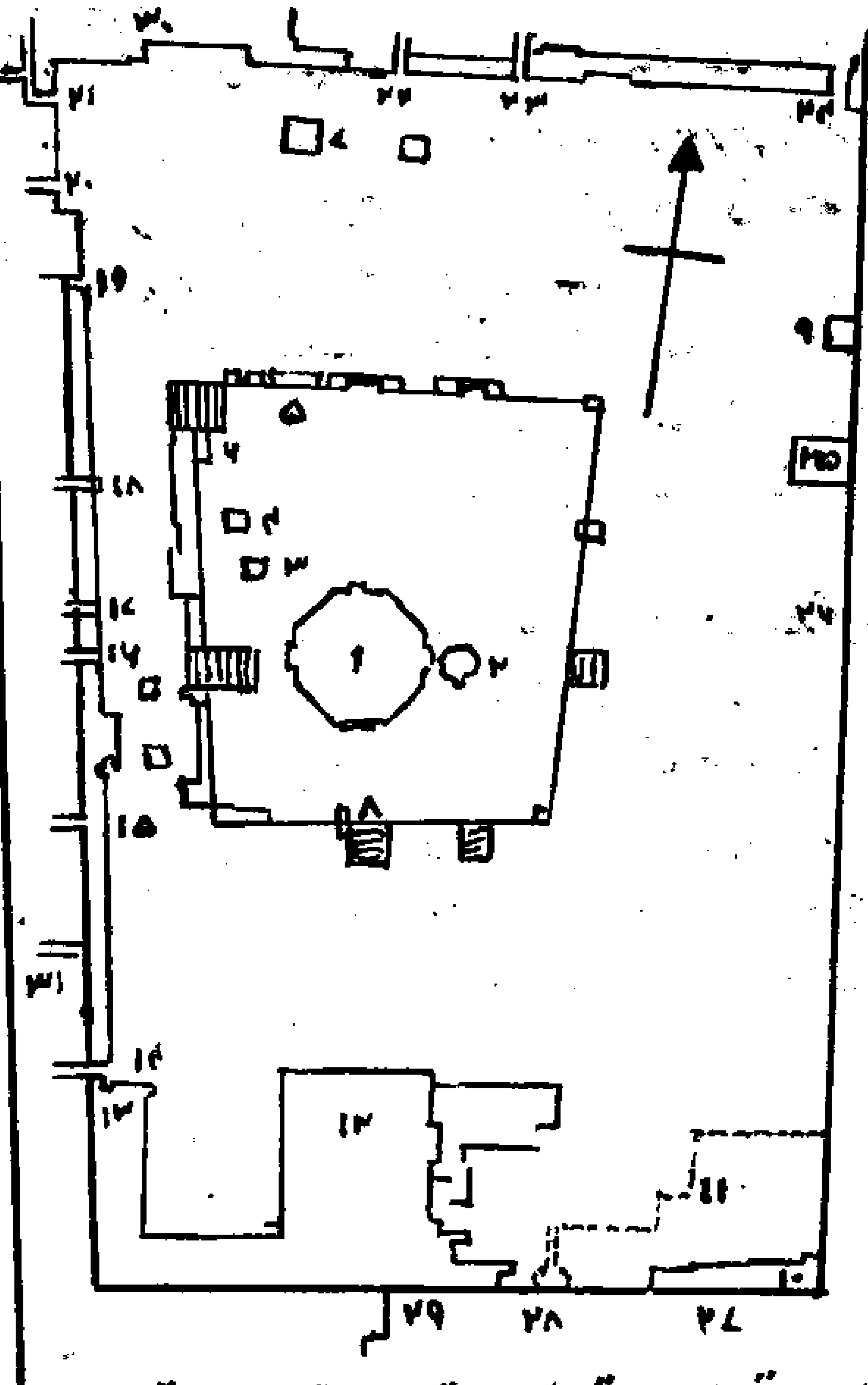

۱۔قبۃ الصخرہ ۲۔قبۃ السلسلہ ۳۔قبۃ المعراج ۴۔قبۃ النبی ۵۔قبۃ الارواح ۶۔قبۃ الخضر الیجا ۷۔قبۃ سلیمان ۸۔کھلا منبر ۹۔تخت سلیمان ۱۰۔مہد عیسیٰ ۱۱۔اصطبل سلیمان ۱۲۔مسجد الاقصیٰ ۱۳۔باب النبی ۱۴۔باب المغاربہ ۱۵۔باب السلسلہ ۱۶۔باب المطارہ (داریش) ۱۷۔باب القطانین ۱۸۔باب الحدید ۱۹۔باب الناظر ۲۰۔باب الزوایا ۲۱۔باب الغوازہ ۲۲۔باب السقر ۲۳۔باب التوبہ ۲۴۔باب الاسباط ۲۵۔باب الذہب ۲۶۔باب القدیم ۲۷۔اکہرہ دروازہ ۲۸۔تہرہ دروازہ ۲۹۔دوہرہ دروازہ ۳۰۔۱۹۱۸ء سے قبل ترک افواج کا مستقر ۳۱۔یہودیوں کا مقام گریہ۔

کے تعمیر کردہ ہیکل سے کسی طرح کم نہ تھا۔

۷۰ء میں جب رومی شہنشاہ، طیطس شہر میں داخل ہوا اور رومی سپاہی یہودیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہیکل کے اندرونی صحن میں داخل ہوئے تو ایک یہودی نے جلتی ہوئی مشعل ہیکل کے اندر پھینک دی جس سے ہیکل میں آگ بھڑک اٹھی اور یہ جل کر راکھ ہو گیا۔ اس مرتبہ ہیکل کی تباہی خود یہودیوں کے ہاتھوں کی گئی۔ ۱۳۵ء میں جب دوبارہ معبد (ہیکل) تیار ہوا تو رومیوں نے اسے گرا کر اس کی جگہ ہل چلا دیے۔ ۱۳۶ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے اسے دوبارہ آباد کیا۔ اور شہر کا نام پہلے ایلیا اور پھر کیپی ٹولینا قرار دیا۔ اس بات کو فرنگی مؤرخین اور ماہرین آثار قدیمہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہیرو ڈ کے تعمیر کردہ ہیکل تباہ ہو جانے کے بعد صدیوں تک اس جگہ پر ملبے اور غلاظت کے ڈھیر پڑے رہے۔ یہودیوں سے نفرت کی بنا پر تمام کوڑا کرکٹ اسی جگہ پھینکتے تھے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا۔ بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے حضرت عمرؓ کے حکم سے ان کھنڈرات پر ایک مسجد کی تعمیر ہوئی۔ ایک قدیم سیاح آرکلف نے بھی ایک سادہ سی مسجد کا ذکر کیا ہے جو ۶۷۰ء میں مقدس مقامات کی زیارت کے لیے بیت المقدس آیا تھا۔ تقریباً اس کے سادہ سی تعمیر کے پچاس سال بعد اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۷۲ھ/۶۹۰ء میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی بنیاد اٹھائی۔ یہ خلیفہ قبۃ الصخرہ کی تعمیر ہی مکمل کر سکا۔ مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا کام جو ادھورا رہ گیا تھا ولید بن عبدالملک نے مکمل کرایا۔

وہ مقدس مقامات جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدتوں کا مرکز ہے اکثر و بیشتر شہر کی مشرقی پہاڑی پر ایک احاطہ میں ہیں جس کو مسلمان حرم شریف اور یہودی بیت لحم کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔ ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف ۳۶ ایکڑ پر مشتمل ہے۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ اسی حرم میں ہیں۔ حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں۔ جنہیں مسلمان محراب کہتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔ حرم شریف میں چار حوض وضو کے لیے اور پانچ منبر واعظین کے لیے ہیں مستورات کے لیے تین مقصورے ہیں۔ اندرونی و بیرونی دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔ ۱۹۶۷ء میں مولانا شبیر علی نے حرم شریف کا طول ۱۲۰۰ گز عرض ۶۶۰ گز ہے اور دروازے چودہ بتائے ہیں۔ احاطۂ حرم کے اندر جو زیارتیں ہیں ان میں مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کے علاوہ مندرجہ ذیل عمارات ہیں۔

(۱) **مغارۃ الارواح**:۔ قبۃ الصخرہ کے نیچے چٹان کی جنوبی سمت گیارہ سیڑھیوں سے ایک غار میں اترتے ہیں۔ اسے مغارۃ الارواح کہتے ہیں۔ تہہ خانے کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ بقول ابن حوقل اور اصطخری چٹان کے نیچے کا کمرہ نہ مربع ہے نہ گول بلندی میں قد آدم جتنا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت زکریاؑ کی قبر اسی غار میں ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ غار ایک خلا تھا اور چٹان کے نیچے ایک کنواں تھا اسے بیر الارواح کہتے تھے۔ بعد ازاں اس کنویں پر دیوار بنا دی گئی۔ اس غار میں مختلف انبیاء کی جائے عبادت کو محرابوں سے مخصوص کیا گیا ہے شمالی حصے میں مقام خضرؑ اور جنوبی کونے میں مقام داؤدؑ ہے۔ ایک مقام کے بارے میں جسے مقام النبی کہا جاتا ہے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے یہاں نوافل ادا کیے تھے اس غار میں موئے مبارکؐ اور نقش پائے مبارکؐ بھی ہیں جو اس غار کے جنوب مغربی کونے میں ایک الماری میں محفوظ ہیں۔ اس الماری کے سامنے ایک صندوق میں آنحضورؐ اور حضرت عمرؓ کے علم محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس غار میں ایک وقت میں پچاس ساٹھ آدمی سما سکتے ہیں۔

(۲) **قبۃ السلسلہ**:۔ بقول مقدسی حرم شریف کے وسط صحن میں ایک چبوترہ اٹھا ہوا ہے جس کے چاروں طرف کافی چوڑی سیڑھیاں ہیں چبوترے پر چار گنبد بنے ہوئے ہیں۔ ان میں قبۃ السلسلہ، قبۃ المعراج اور قبۃ النبیؐ کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں جو سنگ مرمر کے ستونوں پر بغیر دیواروں کے قائم ہیں۔ بقول ابن فقیہ قبۃ الصخرہ کے مشرق کی جانب قبۃ السلسلہ بیس ستونوں پر کھڑا ہے اس کے سامنے مشرق ہی کی طرف حضرت خضرؑ کا مقام عبادت ہے اس کے شمالی رخ پر قبۃ النبیؐ اور مقام جبرائیلؑ ہیں اور چٹان کے برابر قبۃ المعراج ہے۔ یہ قبہ زیادہ

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

پائیدار اور مستحکم نہ تھا اس لئے بار بار زلزلوں سے متاثر ہوتا رہا اور تعمیر ہوتا رہا۔ اس چبوترے کے دوسرے قبوں قبۃ النبیؐ، قبۃ المعراج اور قبۃ جبرئیل کے بارے میں ابن عبدربہ نے لکھا ہے۔

۱۔ وہ گنبد جہاں سے آنحضورؐ آسمان پر تشریف لے گئے۔
۲۔ اس مقام کے اوپر کا گنبد جہاں آنحضورؐ نے انبیاء سابقین کے ہمراہ نماز ادا فرمائی۔
۳۔ معبد جبرئیل۔

(۳) مہد مسیحؑ:۔ احاطہ حرم شریف کے جنوب مشرقی گوشے میں قدم آثار پر ایک چھوٹی سی زمین دوز مسجد جس کا طول و عرض ۲۰ گز × ۵۴ گز ہے۔ مہد مسیح کے نام سے موسوم ہے۔ ابن عبدربہ نے اسے محراب مریم بنت عمران اور مقدسی نے محراب مریم و زکریا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مہد مسیح میں پرانے زمانے سے ایک پنگوڑا زمین میں گڑا ہوا ہے۔ جسے حضرت عیسیٰؑ کا پنگوڑا کہا جاتا ہے۔ اسی پنگوڑے کو مسجد کی محراب بنا دیا گیا ہے۔ محراب مریم اور محراب زکریا اس کے مشرقی پہلو میں ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ایک ستون پر انگلیوں کے نشانات ہیں جن کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت مریمؑ نے درد زہ کی شدت میں اس پتھر کو زور سے پکڑا تھا۔ اور یہ انہی کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ مہد عیسیٰؑ کے مغرب میں اصطبل سلیمان ہے اور دونوں کے درمیان ایک دروازہ ہے۔ محراب داؤد اب ختم ہو چکی ہے۔ البتہ اس کے قریب کرسی سلیمانؑ قد آدم بلند چٹان کی صورت موجود ہے۔

(۴) سلیمانؑ کا مصلےٰ:۔ باب حطہ میں دائیں سمت ایک دروازہ مسجد کے شمال میں واقع ہے۔ ان دونوں دروازوں کے درمیان چار ستونوں پر یہ قبہ اور محراب ہے جسے مصلےٰ سیدنا سلیمانؑ کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں روایت ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے دوران میں آپ اسی جگہ بیٹھ کر فیصلے فرماتے تھے۔

(۵) روضہ سلیمانؑ:۔ حرم شریف میں گنبد صخرہ کے مشرق میں تین سو قدم کی دوری پر بیرونی دیوار کے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دو جانب جالی دار کھڑکیاں ہیں۔ جن سے قبر مبارک دیکھی جا سکتی ہے۔ کمرے کے ساتھ ہی حضرت سلیمانؑ کا وہ قید خانہ ہے جہاں پر شریر جنات کو قید و بند رکھا جاتا تھا۔

(۶) دیوار براق:۔ اس کے بارے میں روایت ہے کہ معراج کی رات آنحضورؐ نے یہاں براق باندھا تھا۔ اس کے علاوہ حرم میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے جو عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

(۷) مزار مولانا محمد علی جوہر:۔ مسجد صخرہ کے سامنے مغرب کی طرف ایک بند کمرے میں واقع ہے۔ جس کے باہر عربی زبان میں لکھا ہے۔
"اللہ تعالےٰ مومنوں کو ان کی جان و مال کے بدلے جنت دے گا۔ یہ مجاہد عظیم مولانا محمد علی جوہر کی قبر ہے۔"

(۸) دیوار گریہ:۔ حرم شریف کی مغربی دیوار میں ایک ٹکڑا جو پچاس فٹ لمبا ہے دیوار گریہ کہلاتا ہے۔ یہودیوں کا اس کے بارے میں یہ دعوےٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کی باقیات میں سے ہے اور وہ یہاں آ کر گریہ و زاری کرتے ہیں مسلمان اسے البراق کا نام دیتے ہیں۔ کیونکہ معراج کی رات آپؐ اس جگہ براق سے اترے اور یہیں براق کو باندھا تھا۔

بیت لحم: فلسطین کا ایک قصبہ جو بیت المقدس سے تقریباً [illegible] سمندر سے [illegible] کی بلندی پر چونے کے پتھر والے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔

یہ مقام چوتھی صدی عیسوی سے برابر مسیحیوں کی زیارت گاہ ہے۔ بعد ازاں یہ مقام حضرت مسیحؑ کی ولادت گاہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی نظر میں بھی محترم ہو گیا۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کھجور کے درخت کی بھی نشان دہی کی ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ مریم کی آیت ۲۳ تا ۲۵ میں آیا ہے۔

نیز حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی قبور کا ذکر بھی کیا ہے جو یہاں موجود ہیں۔

ان جغرافیہ نویسوں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کی اس محراب کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس مقام پر آپؓ نے فلسطین فتح کرنے کے بعد اس طرف سے گذرتے وقت نماز ادا کی تھی۔

چونکہ یہ مقام بیت المقدس سے بہت قریب ہے اس وجہ سے اسے اتنی زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ پہلی صلیبی جنگوں میں جب جرمنوں کا اس سے الحاق ہوا تو انہوں نے ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں یہاں ایک قلعہ بنوایا۔ اس کے بعد ۱۱۱۰ء میں یہاں ایک مسیحی مرکز بنانے کی اجازت حاصل کی گئی۔ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے جب فلسطین کو نئے سرے سے فتح کیا تو یہ علاقہ بھی سلطان کے قبضے میں آ گیا۔ بعد میں الملک الکامل اور فریڈرک دوم کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کے تحت یہ علاقہ بھی عیسائیوں کو واپس دے دینا پڑا۔

آج کل بیت لحم ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں مسلمانوں کی تھوڑی سی اقلیت ہے۔ مذہبی ادارے اور جدید قسم کے مکانات کثرت سے ہیں۔

بیٹا:۔ (دیکھئے، ولد۔)

بیٹھنا:۔ (دیکھئے۔ نشست۔)

بیٹی:۔ (دیکھئے، دختر)

بیجاپور: جنوبی ہند میں صوبہ مہاراشٹر کا ایک مشہور شہر اور اسی نام کی سابق ریاست جو بمبئی سے تقریباً ۲۵۰ میل جنوب مشرق میں واقع ہے شہر ۵۸۶ھ/۱۱۹۰ء تا ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء تک یادو راجاؤں کا صدر مقام رہا۔ یہاں تک کہ اسے ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء میں علاء الدین خلجی نے فتح کیا۔ ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں یوسف نامی شخص نے جو سلطان مراد ثانی کا بیٹا سمجھا جاتا ہے۔ بیجاپور کی مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور یہاں ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ یوسف نے گوا پر بھی قبضہ کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اور عادل شاہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ لقب ان کا خاندانی لقب بن گیا۔ بعد میں یہ خاندان عادل شاہی خاندان کہلایا۔

۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء میں عادل شاہ تخت پر بیٹھا اس نے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کئے۔ ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے متحدہ فوجی دستوں نے وجیانگر کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کی وفات کے بعد ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ تخت پر بیٹھا۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں ابراہیم کے انتقال کے بعد محمد عادل شاہ مسند نشین ہوا اس کے دور حکومت میں مرہٹوں نے شیواجی کی سرکردگی

بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کا مقبرہ "گول گنبد"۔

میں بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ اور بہت سے اہم قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء میں اورنگ زیب نے اپنے زمانہ شہزادگی میں بیجاپور پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کیا لیکن شاہجہان کی بیماری کی خبر سن کر اسے محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اور اس کے تیس سال بعد، ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں سکندر عادل شاہ کے زمانے میں جو عادل شاہی خاندان کا آخری فرمانروا تھا اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر لیا۔ اورنگ زیب نے اپنی عمر کے آخری حصّے میں کام بخش کو بیجاپور کی حکومت پر متعین کیا جس نے اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء میں یہ علاقہ نظام حیدرآباد کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ جس نے ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء میں یہ علاقہ ساٹھ لاکھ روپے کے عوض مرہٹوں کے حوالے کر دیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں اس علاقے پر انگریزوں نے قبضہ کر کے راجا ستارہ کے حوالے کر دیا جو ریاست ختم ہو جانے کے بعد برطانیہ کے مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں بیجاپور ایک ضلع قرار دیا گیا۔ جس کا ایریا ۶۵۹۰ مربع میل تھا اور اس ضلع کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۶۵۸۴۵۲ تھی۔

۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء میں بیجاپور میں طاعون کی متعدی وبا کے علاوہ کئی ایک قحط بھی پڑے ہیں۔ یہ قحط ان برسوں میں پڑے۔ ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء۔ ۱۷۱۸ء، ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء۔ ۱۸۱۹ء، ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء۔ ۱۸۲۵ء، ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء۔ ۱۸۳۳ء، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء۔ ۱۸۵۴ء، ۱۲۶۰ھ/۱۸۶۳ء۔ ۱۸۶۴ء، ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء۔ ۱۸۶۷ء۔

باربار کے ان قحطوں نے اچھے خاصے بستے ہوئے شہر کی آبادی کم کر کے اسے چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹے سے قصبے میں بدل دیا۔ اس وقت سے آج تک یہ غیر آباد محلات اور تاریخی کھنڈروں کا ایک شہر ہے۔ ۱۹۷۱ء میں بیجاپور شہر کی کل آبادی ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔

بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین فن اور علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے انہوں نے فن تعمیر کو دکن کے دوسرے تمام حکمرانوں سے زیادہ ترقی دی۔ اسی وجہ سے دہلی کے سوا ہندوستان کے تمام دوسرے شہروں کے مقابلے میں بیجاپور کی عمارتیں نہایت عالیشان ہیں۔ بیجاپور کی ان عمارات میں مکہ مسجد، مسجد کریم الدین، بہمنی وزیر خواجہ جہاں کی مسجد جامع مسجد یوسفی، مسجد اخلاص خان، گنبد والی مسجد، مسجد سید علی شہید پیر، گگن محل، شاہ درگ، دچارواڑ، شاہ پور اور بانکپور کے قلعے، مقبرہ علی اور جامع مسجد علی، ملکہ جہاں کی مسجد، بخاری مسجد، روضہ ابراہیم جو عادل شاہیوں کی سب سے بڑی عمارت ہے آنند محل، [illegible]، اندا مسجد، مسجد لاگنبد، مہتر محل، مسجد افضل خان، مزار گروا گنبد ملکہ مسجد وغیرہ ہیں۔

بیدر بھارت کی سابقہ ریاست میسور کا ایک شہر اور ضلع۔ شہر بیدر حیدرآباد سے شمال مغرب میں ۶۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگرچہ تاریخی آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر بہت قدیم ہے۔ مسلمانوں کے قبضے سے پہلے بھی یہ شہر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

اس شہر کے بارے میں تاریخ میں جو بات ملتی ہے یہ ہے کہ اس پر ۱۳۲۲ء میں الغ خان نے قبضہ کیا اور اسے دہلی کی قلمرو میں شامل کر دیا۔ جب محمد بن تغلق شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اسے دکن کی بغاوتوں سے واسطہ پڑا۔ آخر ۱۳۴۶ء میں دکنی سرداروں نے امیر اسماعیل مخ کو اپنا فرمانروا چن لیا۔ اور دولت آباد میں اسے تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد امیر صدہ حسن گنگو کو جسے محمد تغلق نے ظفر خان کا خطاب دیا تھا۔ بہمن شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ اور بہمنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء میں شہاب الدین احمد شاہ ولی نے سلطنت بہمنیہ کا پایہ تخت بیدر منتقل کر دیا۔ اور اس کا نام اپنے بیٹے محمد کے نام پر محمد آباد رکھا۔ اگرچہ بیدر صدیوں پرانا شہر تھا مگر بہمنی دور کے ابتدا میں بھی یہ کافی اہمیت رکھتا تھا۔ فوجی اعتبار سے بھی اس کا محل وقوع ہمیشہ اہم رہا ہے۔

اس شہر میں آٹھ بہمنی بادشاہوں نے حکومت کی۔ محمود گاواں نے اسے علما اور فضلا کا مرکز بنانے میں بہت زیادہ خدمات انجام دیں۔

۸۹۶ھ/۱۴۹۱ء میں جب بہمنی سلطنت تقریباً ناپید ہو گئی تو بیدر میں محمد قاسم برید سلطان محمود شاہ بہمنی پر بہت حد تک حاوی ہو چکا تھا۔ لیکن کسی بھی صدر بیدر کو خود مختار ہونے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بیدر میں محمد قاسم کے پوتے علی برید نے آخری بہمنی فرمانروا کلیم اللہ کی وفات کے بعد اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور تقریباً ۱۶۱۹ء تک بیدر پر بریدی فرمانروا حکمرانی کرتے رہے۔ ان فرمانرواؤں میں قاسم برید الملک، امیر برید وزیر اعظم اور علی برید شاہ، ابراہیم برید شاہ، قاسم برید شاہ، امیر برید شاہ، مرزا علی برید شاہ، میرزا امیر برید شاہ تھے۔ ۱۶۱۹ء میں ابراہیم عادل شاہ نے بیدر پر قبضہ کر کے اس شہر کو عادل شاہی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح بیدر ۱۶۵۶ء تک سلطنت بیجاپور کا جز و رہا۔ اس کے بعد اس شہر کا سلطنت مغلیہ کے ساتھ الحاق ہو گیا۔ ۱۷۲۴ء میں بیدر آصف جاہی سلطنت کی عملداری میں آگیا۔

یہ شہر دکن کے مختلف تمدنوں کا گہوارہ رہا ہے اور اس میں بہمنیوں، بریدیوں، مغلوں اور آصف جاہیوں کے ادوار کی عمارات ملتی ہیں۔

مختلف ادوار میں اس شہر کو مختلف نام دیئے گئے ہیں جو محمد آباد، ظفر آباد، محمد آباد بیدر ہیں آج کل اسے بیدر یا بیدر شریف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں اس کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ بیدر ضلع ۲۰۰۱ مربع میل پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی آٹھ لاکھ کے قریب تھی۔

بیدل، عبدالقادر (۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء — ۴ صفر ۱۱۳۳ھ/۵ دسمبر ۱۷۲۰ء) ایک عظیم مفکر، فارسی گو شاعر اور عارف کامل۔ اصل وطن توران تھا۔ بعض کے نزدیک ان کی پیدائش پٹنہ میں ہوئی۔ اور بعض نے بخارا میں بتائی ہے۔ والد کا نام میرزا عبدالخالق تھا اور چغتائی قبیلے سے تعلق تھا۔ ان کے والد نے نوعمری ہی سے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ وہ سلسلہ قادریہ کے ایک بزرگ شیخ

Marfat.com

کمال سے بیعت تھے۔ بیدل کی تعلیم و تربیت میں شیخ کمال کا بھی بڑا حصہ ہے۔ بیدل کے والدین کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا اور ان کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا نے کی۔ انہوں نے اپنے ماموں میرزا ظریف سے تفسیر پڑھی۔ ماموں کی وفات کے بعد دہلی چلے آئے اور وہاں مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۹ء میں شہزادہ اعظم شاہ کی فوج میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن جلد ہی مستعفی ہو گئے۔ شاہ عالم بہادر شاہ اور بادشاہ فرخ سیر نے اپنے عہد میں ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ جب سادات بارہہ نے فرخ سیر کو قتل کرایا تو بیدل نے اس کی تاریخ وفات کہی۔ اس پر سادات آپ سے بھی انتقام لینے کی سوچنے لگے۔ چنانچہ آپ لاہور چلے آئے اور واپس اس وقت آئے، جب سادات بارہہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ دہلی میں وفات پائی۔

بیدل نے تقریباً ایک لاکھ اشعار کہے ہیں۔ انیس قصائد ہیں۔ جن کے اشعار کی تعداد دو ہزار ہے اور وہ تمام کے تمام آنحضورؐ اور حضرت علیؓ کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔

میرزا بیدل کے مزاج میں استغنا تھا۔ وہ ایک بلند حوصلہ اور درویش صفت انسان تھے۔ انہوں نے بے نیازی کی زندگی بسر کی۔ تصوف کو بہترین لائحۂ عمل سمجھتے رہے۔ ان کے تمام فلسفیانہ نظریات کا مقصد صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کی عظمت کو ثابت کیا جائے۔ انہیں ذات الٰہی سے بے پناہ محبت تھی اور اس کے بعد وہ ہر چیز کو بیکار سمجھتے تھے۔ میرزا بیدل کے نزدیک یہ جذبہ محبت بھی انسان کے ارتقائے ذات کا سبب تھا۔ انہوں نے صوفیوں کے احوال و مقامات اور ان کے اخلاق حسنہ کو خوبی کے ساتھ اپنے کلام میں بیان کیا ہے کہ یہ باتیں خود بخود دل میں گھر کر جاتی ہیں۔ وہ تمام ائمۂ تصوف سے متاثر تھے۔ لیکن ان کا علم تصوف زیادہ تر ابن عربی کا مرہون منت ہے۔

بیدو خان ایران کا چھٹا ایلخانی حکمران، یہ طراغائی کا بیٹا اور ہلاکو خان کا پوتا تھا۔ بیدو خان صفر ۶۹۴ھ / اپریل ۱۲۹۵ء میں ایران کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے پیشرو گیخاتو کو ۶۹۴ھ / ۱۲۹۵ء میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا اس کے بعد باغیوں نے بیدو خان کو تخت نشینی کی دعوت دی مگر اس کا دوسرا چچا زاد بھائی غازان جو ایلخان ارغون کا بیٹا اور گیخاتو کا بھتیجا تھا۔ اس کے مقابلے کیلئے خراسان سے لشکر لے کر اپنے چچا کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں نکل آیا لیکن دونوں میں ایک عارضی سی صلح ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد جب دوبارہ لڑائی شروع ہوئی تو اس کا فیصلہ غازان کے حق میں ہوگیا اور غازان نے نوروز کی تحریک سے جو غازان کا سپہ سالار تھا اسلام قبول کر لیا اور اس طرح اسے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوگئی۔ بیدو خان کے طرفداروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور جب وہ بھاگنے کی فکر میں تھا تو اسے قتل کر دیا گیا۔

بیدو خان نے کل سات ماہ حکومت کی۔ بعض کے نزدیک اس نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

بیرامیہ صوفیاء کا ایک سلسلہ، جس کی بنیاد حاجی بیرم ولی نے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں رکھی۔

صوفی روایت کے مطابق آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ذکر خفی اور حضرت علیؓ کو ذکر جلی کا حکم دیا تھا۔ [illegible] بعد ان لوگوں کے [illegible] ایک گروہ آق شمس الدین کا پیرو ہے۔ وہ ذکر جلی کو ترجیح دیتا ہے۔ اسے بیرامیہ شمسیہ کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ عمر ددہ کو اپنا پیشوا مانتا ہے اس نے ذکر، درود وغیرہ سب کچھ ترک کر دیا ہے اور اپنے آپ کو ملامیہ بیرامیہ کہلاتا ہے۔ بعد میں ایک اور گروہ پیدا ہوا جو جلوتیہ کہلاتا ہے۔

اس طریقے میں ابتدا ہی میں وحدت الوجود کے نظریے سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تمام افعال خدا کی طرف سے ہیں۔ نیز یہ افعال صفات کے مظہر ہیں اور صفات روح کے مظاہر ہیں۔ جبکہ وجود صرف ایک ہی ہے۔

یہ لوگ سفید نمدے کی چھ کونوں والی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ اس کا پہننے والا تمام اشیائے موجودہ کی حقیقت سے واقف ہے۔

۱۹۲۵ء میں جب ترکی میں ایسے تمام طریقے اور سلسلے ختم کیے گئے تو اس طریقے کے خاص خاص مراکز استنبول، انقرہ، ازمیدہ اور قسطمونی میں قائم تھے۔

بیرم خان (وفات ۱۴ جمادی الاول ۹۶۸ھ / ۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء) مغلیہ دربار کا ایک نہایت ممتاز سردار۔ خانخاناں لقب۔ والد کا نام سیف علی بیگ تھا جو غزنہ کا گورنر تھا۔ اور بابر کی وفات کے بعد اس نے ہمایوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بیرم خان بدخشاں میں اور بعض کے نزدیک غزنہ میں پیدا ہوا۔ وہ بہارلو قوم کا ترکمان تھا اس کے آباؤ اجداد نے خاندان تیموریہ کی بڑی خدمت کی۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد وہ بلخ چلا گیا اور بیرم خان نے بلخ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اور دربار کے آداب سے اچھی طرح واقف تھا۔ سولہ سال کی عمر میں ہمایوں کی ملازمت اختیار کی جب کہ ہمایوں بدخشاں کا گورنر تھا۔ بعد میں وہ ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آیا اور چوسا و قنوج کی لڑائیوں میں شرکت کی۔ ان جنگوں میں ہمایوں نے بری طرح شکست کھائی۔ بیرم خان جان بچا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ اس نے کچھ عرصہ گجرات کے بادشاہ سلطان محمود کے ہاں ملازمت کی لیکن ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں وہ جون کے مقام پر ہمایوں سے دوبارہ جا ملا۔ اس وقت ہمایوں اپنے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ بیرم خان نے ہندوستانی مہموں کے دوران میں شاہی افواج کے سپہ سالار کی حیثیت سے ہمایوں کے لیے کئی ایک فتوحات حاصل کیں۔ ان سب سے بڑی فتح ماچھی واڑے کے مقام پر سکندر شاہ سوری کی شکست تھی۔

۹۶۲ھ / ۱۵۵۴ء میں بیرم خان کو شہزادہ اکبر کا اتالیق مقرر کیا گیا اور خان بابا کا لقب دیا گیا۔ جب اکبر کو پنجاب کا حاکم بنایا گیا تو بیرم خان بھی پنجاب آگیا۔ جب ہمایوں کی اچانک وفات کی اطلاع پنجاب پہنچی تو بیرم خان نے اینٹوں کا عارضی تخت بنا کر اکبر کی تاجپوشی کا اعلان کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب ہیموں بقال نے جو سوری کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ دہلی پر حملہ کیا تو ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس لڑائی میں بیرم خان کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے ہیموں کو قتل کرا دیا۔ ہیموں کی شکست کے بعد اکبر کا ہندوستان پر مکمل قبضہ ہوگیا۔ اس وقت بیرم خان اقتدار و اختیار کے انتہائی عروج پر تھا۔ چونکہ اکبر ابھی کم سن تھا اس لیے وہ اکبر کی طرف سے پوری سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔ اسی دوران میں بیرم خان نے سلیمہ سلطان بیگم سے جو اکبر کی پھوپھی زاد بہن تھی شادی کر لی اور اس طرح وہ شاہی

خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ اس وجہ سے بیرم خان کی شخصی عظمت اور اقتدار میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

بیرم خان چونکہ اکبر کی تفریحات میں دخل دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ شاہانہ طور اطوار اختیار کرے۔ چنانچہ ان باتوں سے اکبر کی جانب سے اپنے اتالیق کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار ہونا شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں بیرم خان سے ایک غلطی یہ بھی ہوئی کہ اس نے دہلی کے رہنے والے ایک شخص شیخ گدائی کمبوہ کو صدر الصدور مقرر کر دیا یہ بات تورانی سرداروں کو بہت ناگوار گذری اور وہ بیرم خان کے خلاف ہو گئے۔ ان تمام باتوں نے اکبر کے خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ چنانچہ اکبر اور بیرم کے باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور یہ کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ جب بیرم خان نے اپنے خلاف ہوا کا یہ رُخ دیکھا تو اس نے لڑائی کے ذریعے اس قصے کو ختم کرنا چاہا۔ چنانچہ وہ حج کے بہانے سے جالندھر آیا اور جالندھر پر قبضہ جمانا چاہا چنانچہ شاہی فوجوں اور اس کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جس میں بیرم خان کو شکست ہوئی۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اکبر سے معافی چاہے۔ شہنشاہ اکبر نے اسے نہ صرف معافی دے دی بلکہ پچاس ہزار روپیہ سالانہ پنشن بھی مقرر کر دی۔ اس کے بعد بیرم خان نے اکبر سے حج کے لیے جانے کی اجازت مانگی۔ اور حج کے ارادے سے گجرات گیا لیکن ایک شخص مبارک خاں لوہانی نے جس کے باپ کو بیرم خان نے شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں لڑائی میں قتل کر دیا تھا۔ بیرم خان کو قتل کر دیا۔ اس کی تجہیز و تکفین بھی اچھی طرح نہ کی جا سکی۔ بعد میں بیرم خان کی وصیت کے مطابق اس کی نعش کو مشہد منتقل کر دیا گیا اور امام موسیٰ رضا کے روضے کے متصل ایک اونچے گنبد کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

بیرم خان نے اپنے بعد ایک چار سالہ لڑکا عبدالرحیم خانخاناں چھوڑا۔

بیرم خان علماء کا بڑا قدردان تھا۔ وہ بڑا ذہین عالم، فاضل تھا ترکی اور فارسی زبانوں کا اچھا شاعر تھا۔ اس کے مخالفین بھی اس کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔

بیروت جمہوریہ لبنان کا دارالحکومت اور بڑی بندرگاہ۔ ابتداء میں بیروت راس کے شمالی کنارے پر آباد تھا۔ لیکن اب پوری سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ قدیم ترین شہر ہے۔ زمانہ تاریخ سے قبل بھی یہاں پر انسان آباد ہے۔

تاریخ میں بیروت کا ذکر سب سے پہلے پندرہویں صدی قبل مسیح میں ملتا ہے۔ جب یہاں فرعون مصر تو تمس سوم (THUTMOSE III) حکمران تھا چودہویں صدی قبل مسیح میں تل العمارنہ میں جو تختیاں ملی ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کا حکمران عمیونرا تھا اور اس شہر کا نام "بروتہ" تھا۔ اس زمانے میں یہاں تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس کے بعد یہ مقام مصر یا عراق سے آنے والی فوجوں کی گذرگاہ رہا۔ تیرہویں صدی قبل مسیح میں اسی راستے سے رعمسیس دوم آیا اور سالویں صدی قبل مسیح میں آشور کے بادشاہ آسارحدون کا بھی اسی راستے سے گذر ہوا۔

۱۴۰ قبل مسیح میں یہ شہر سوریہ کے غاصب ترلیفون کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے بعد رومیوں اور اطالویوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہو جانے کی وجہ سے اس بندرگاہ کو بڑی ترقی حاصل ہوئی اور بیروت کی اہمیت مشرق و مغرب کے درمیان ایک رابطے کی ہو گئی۔

۱۴ قبل مسیح میں رومی بادشاہ آگسٹس کے نام پر مارکس اگرپا نے اس شہر

بیروت کا اہم اور مرکزی چوک

پر قبضہ کیا تو اسے دوبارہ تعمیر کرایا اور ایک رومی نو آبادی کا درجہ دے گیا۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ شہر ایک علمی مرکز بن گیا۔ اور یہاں کی جامعہ قانون کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی اس شہر کو ایتھنز، اسکندریہ اور قیساریہ کا ہم پایہ سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ چوتھی صدی عیسوی میں فینیقیہ کے اہم ترین شہروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ جولائی ۵۵۱ء میں بیروت ایک زلزلے اور سیلاب سے تباہ و برباد ہو گیا۔ بعد میں جسٹینین نے اس کے کھنڈرات پر نئے سرے سے عمارات تعمیر کرائیں ۱۴ھ/۶۳۵ء میں جب مسلمان فوجیں حضرت ابوعبیدہؓ کی سرکردگی میں اس شہر میں داخل ہوئیں۔ تو یہ شہر رومی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ نے ایران سے لوگوں کو بلا کر بیروت کے گرد و نواح میں بسایا۔ ریشم کی صنعت نئے سرے سے ترقی کر گئی۔ اور دوسرے ممالک سے تجارتی رابطہ قائم ہو گیا۔ ۳۶۴ھ/۹۷۵ء میں بیروت کو جان زمسکز نے فتح کر لیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد فاطمیوں نے اس شہر کو واپس لے لیا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان شمالی سمت سے آنے والے صلیبی مجاہدین نے بیروت میں ٹھہر کر رسد فراہم کی۔ اور بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد یہاں سے واپس چلے گئے۔

۵۰۳ھ/۱۱۰۹ء میں بالڈون اوّل نے خشکی اور سمندر دو جانب سے بیروت کی ناکہ بندی کر دی اور اسے فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیروت کو دوبارہ فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلی مرتبہ ناکام رہا۔ لیکن دوسری مرتبہ ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں بیروت کو فتح کر لیا۔ ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء میں آئی بلینز نے اس کو دوبارہ فتح کر لیا۔ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں الاشجاعی نے دمشق سے آ کر بیروت پر قبضہ جما لیا۔ مملوک حکمرانوں کے زمانے میں اس شہر کو صوبہ دمشق کی ایک اہم ولایت سمجھی جاتی تھی۔ مملوکوں نے بیروت کا دفاع مضبوط کیا اور یہاں ایک برج بھی تعمیر کرایا۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں بیروت ایک بار پھر مغربی تاجروں کی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ سولہویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں

Marfat.com

بیروت نے بہت زیادہ ترقی کی۔ ترکوں اور روسیوں کی جنگ کے دوران میں بیروت پر گولہ باری ہوئی تھی۔ کچھ عرصے کے لیے بیروت روسیوں کے قبضے میں رہا۔ اس شہر کی ترقی کا دور ۱۸۶۰ء سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اسے لبنان کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

بیروت میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان میں عربوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۹۷۱ء کے مطابق ۲۰۰۰،۰۰۰ تھی۔ یہاں پر امریکی، فرانسیسی اور لبنانی تین یونیورسٹیاں ہیں اور ہر قوم کے متعدد علمی ادارے ہیں۔ عرب ممالک میں یہ شہر ایک بڑا علمی اور فکری مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تجارتی لحاظ سے اس شہر کو مرکزیت حاصل ہے۔ بیروت کی بندرگاہ شام اور اردن سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں پر ایک بین الاقوامی ہوائی اڈا ہے۔

بیرونی ایک مشہور مسلمان سائنس دان اور ماہر ارضیات و تاریخ، لسانیات ریاضی و نجوم۔ (دیکھیے "البیرونی")

بیستون بہستون، ایک پہاڑ جو بغداد سے ہمدان جانے والی شاہراہ پر کرمان شاہ سے تقریباً تیس کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔

مسلمان اسے عجائب عالم میں سے ایک سمجھتے تھے۔ سڑک سے بہت بلندی پر ایک عمودی پہاڑی جس پر دارا اعظم کا مجسمہ اور مشہور کتبہ جس پر تین زبانوں قدیم فارسی اکدی اور عیلامی میں میخی خط کی تحریریں ہیں۔ ابوزید بلخی اور اس کا اتباع کرنے والے مصنفوں کے ہاں ان کتبوں کا ذکر ملتا ہے۔ مجسمے میں ایرانی شہنشاہ اپنے وزیر کے ہمراہ کھڑا ہے اس کا بایاں پاؤں باغی مُغ گوماتا کی پیٹھ پر رکھا ہے سامنے نو باغی سردار رسی میں بندھے کھڑے ہیں اوپر خداوند اہورمزدا کی شبیہ کندہ ہے اور بادشاہ دائیں ہاتھ سے اسے سلام کر رہا ہے۔

ابن حوقل دارا اور اس کے قیدیوں کے مجسموں کی عجیب و غریب توجیہ کرتا ہے اور انہیں استاد اور شاگردوں کے مجسمے بتاتا ہے۔ اکثر مسلمان مصنفین کا خیال یہ ہے کہ یہ مجسمے شیریں اور خسرو ثانی کے ہیں۔

بیضاء سفید، روشن، چمک دار، عام طور پر یہ لفظ اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے مختلف مقامات کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یاقوت نے بیضا نامی سولہ مختلف جگہوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نام کے مقامات میں سب سے اہم ترین مقام ایرانی شہر البیضاء ہے جو فارس کے صوبہ شیراز کے شمال اور اصطخر کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا اصلی نام نسا تھا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں یہ اصطخر جتنا بڑا تھا۔ بہت سے اہل علم اس شہر کے ساتھ منسوب ہیں۔ ایک اور شہر لیبیا کا سابق دارالحکومت الزاویۃ البیضاء ہے۔ (دیکھیے بیضاء الزاویہ)

بیضاء، الزاویہ لیبیا کا ایک شہر اور ڈویژن، محمد بن علی السنوسی ادریسی نے جو صوفیہ کے سلسلہ سنوسیہ کے بانی ہیں۔ ۱۸۴۳ء میں درنہ کے نزدیک جبل اخضر میں الزاویۃ البیضاء کے نام سے ایک زاویہ قائم کیا جو بعد میں ایک خود کفیل بستی بن گیا۔

یہ علاقہ قدیم سرینیکا کا ایک حصہ ہے۔ ۔۔۔ ۱۹۵۱ء ۔۔۔ العزب اور برقہ میں فرانس فزان میں اپنے اختیارات سے دستبردار ہو ۔۔۔ حکومت عمل میں آئی۔ ۱۹۶۳ء میں لیبیا کے آئین میں بعض تبدیلیاں کی گئیں جن کی رو سے وفاقی حکومت کی جگہ ایک مرکزی حکومت نے لے لی۔ اور اس کا صدر مقام بیضا قرار دیا گیا اور ڈویژن کی آبادی دو لاکھ کے قریب تھی۔ موجودہ شہر کو صرف ڈویژن کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۷۳ء میں شہر کی آبادی پچاس ہزار تھی۔

بیضاوی (وفات ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء یا ۶۹۲ھ/۱۲۹۳ء) ناصر الدین ابوالخیر عبد اللہ بن عمر بن محمد ایک مشہور شافعی عالم دین اور مفسر بیضا میں پیدا ہوئے۔ والد فارس کے قاضی القضاۃ تھے۔ آپ نے قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیراز ہی کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ ان کی شہرت ایک جید عالم کی حیثیت سے بھی ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام میں دسترس حاصل تھی۔ ان کی قبر شیراز میں ہے۔

بیضاوی نے تفسیر، قانون، فقہ، علم الکلام اور صرف و نحو کے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف تفسیر قرآن ہے۔ جو انوار التنزیل و اسرار التاویل کے نام سے لکھی گئی ہے۔ عام طور پر اسے تفسیر بیضاوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تفسیر زمخشری کی "الکشاف" کی تلخیص اور ترمیم شدہ صورت ہے کیونکہ وہ معتزلی خیالات کے مطابق لکھی گئی تھی۔ اہل سنت کے نزدیک یہ بڑے پائے کی تفسیر ہے اور درس نظامی میں شامل ہے۔ بیضاوی کی دوسری تصانیف میں منہاج الوصول، غایۃ القصوٰی لب الالباب فی علم الاعراب، مصباح الارواح اور نظام التواریخ (فارسی) اہم ہیں۔

بیع خرید و فروخت، یہ لفظ لغات اضداد میں سے ہے۔ یعنی وہ لفظ جو دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بیع شراء کی ضد ہے لیکن اس کے معنی خریدنا کے بھی ہیں اور فروخت کرنا کے بھی۔

قرآن کریم میں یہ لفظ تقریباً پندرہ جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

شرع کی اصطلاح میں بیع سے مراد یہ ہے کہ فریقین اپنی خوشی سے مال کا تبادلہ مال سے کریں۔

بیع کے دو رکن ہیں۔ ایک ایجاب دوسرا قبول۔ یعنی فریقین میں سے ایک کا یہ کہنا کہ میں یہ چیز اس قیمت میں دینا چاہتا ہوں اور دوسرے کا یہ کہنا کہ مجھے قبول ہے۔

بیع کی چند شرائط ہیں۔

۱۔ فریقین ذی عقل اور نفع و نقصان کو سمجھ سکتے ہوں یعنی ان میں سے کوئی مجنون یا بے شعور بچہ نہ ہو۔

۲۔ بائع و مشتری کم از کم دو ہوں۔ ایک ہی نہ ہو۔

۳۔ قبول ایجاب کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف ہو تو پھر از سر نو ایجاب ہونا چاہیے۔

۴۔ مبادلہ کی دونوں چیزوں میں مالیت ہو۔

۵۔ جس چیز کا سودا ہو رہا ہو وہ موجود ہو معدوم نہ ہو۔

۶۔ وہ چیز فی نفسہ مملوک نہ ہو۔

۷۔ بائع کی ملکیت میں ہو۔

۸۔ ایسا مال ہو جو شرعاً قابل قیمت اور سپردگی کے لائق ہو۔

۹۔ فریقین ایک دوسرے کی بات سنتے ہوں۔

Marfat.com

۱۰۔ ایجاب و قبول دونوں ایک مجلس میں ہوں۔
۱۱۔ چیز اور اس کی قیمت معلوم ہو۔
۱۲۔ فائدہ متوقع ہو۔

بیع کی اقسام مختلف اعتبارات سے بہت سی ہیں۔ اگر سامان تجارت کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسی بیع کی چار اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ بیع مقایضہ۔ سامان کے بدلے سامان۔
۲۔ بیع صرف۔ نقد کا نقد سے تبادلہ۔
۳۔ بیع سَلَم۔ جس میں قیمت نقد وصول کر لی جاتی ہے اور جنس بعد میں ادا ہوتی ہے۔
۴۔ بیع مطلق۔ دست بدست قیمت اور مال تجارت کا تبادلہ۔

اس طرح اگر مال تجارت موجود ہو تو وہ بیع حاضر کہلاتی ہے ورنہ بیع غائب۔

قیمت کے لحاظ سے بھی بیع کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ بیع مساومہ۔ جس میں پہلی قیمت کا کوئی لحاظ نہ ہو۔
۲۔ بیع مرابحہ۔ جس میں پہلی قیمت کچھ منافع کے ساتھ ملحوظ ہو۔
۳۔ بیع تولیہ۔ جس میں پہلی قیمت پوری پوری بلا منافع ملحوظ ہو۔
۴۔ بیع وضیعہ۔ جس میں پہلی قیمت بقدرے تخفیف ملحوظ ہو۔

صحت اور عدم صحت کے لحاظ سے بیع کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بیع صحیح ۔ ۲۔ بیع باطل ۔ ۳۔ بیع مکروہ ۔ ۴۔ بیع فاسد۔

بیع کی بہت سی اقسام ایسی ہیں جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں۔ شریعت نے ان میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔ ان بیوع میں سے بعض یہ ہیں۔

بیع الحبل۔ یعنی یہ سودا کرنا کہ فلاں مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے بیچ دیا جائے۔

بیع الحصاۃ۔ کنکری کی بیع مثلاً بائع کہے ان کپڑوں میں سے جس پر میری یہ کنکری جا گرے وہ فروخت کرتا ہوں۔

بیع الملامسہ۔ اندھیرے میں کسی لپٹے ہوئے کپڑے کو ٹٹول کر خرید لینا اس شرط پر کہ پھر واپس نہ کروں گا۔

بیع منابذہ۔ بیچنے والا کسی چیز کو خریدنے والے کی طرف پھینک دے اور سمجھے کہ بیع ہو گئی۔

بیع القاء الحجر۔ مشتری کسی چیز پر کنکر رکھ دے اور اسی سے بیع مکمل سمجھی جائے۔

بیع مزابنہ۔ ان کھجوروں کو جو ابھی درخت پر ہوں کٹی ہوئی کھجوروں کے عوض دینا۔

بیع المنابحۃ۔ کوئی سودا اس شرط سے طے کرنا کہ اگر یہ سودا ہو جائے تو اس سے پہلے لیا ہوا فلاں قرضہ از خود ختم ہو جائے گا۔

بیع الوفا بیع کی ایک قسم کا نام۔ اسے بیع المعاملہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ قرضدار اپنے قرض خواہ کو کہے یہ چیزیں اپنے قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں بشرطیکہ جب میں قرض ادا کر دوں تو یہ چیز واپس لے لوں گا۔

یہ بیع فاسد ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بیع فی الحقیقت رہن ہے اور بعض اس بیع کو جائز کہتے ہیں۔ (نیز دیکھئے "رہن")

بیعت اطاعت کا عہد۔ مرید بننا۔ بیعت کی اصطلاح بیع سے نکلی ہے جس کے لغوی معنی بیچ دینا کے ہیں۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد کسی پیغمبر، ولی یا صاحب نسبت بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے گناہوں سے تائب ہونا اور اس بزرگ کی اطاعت کا اقرار کرنا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جسے انجام دے کر کوئی شخص یا جماعت کسی دوسرے شخص کے اقتدار کو تسلیم کر لے۔

بیعت کے دو بڑے مقاصد ہوتے ہیں ایک تو اصولاً کسی عقیدے سے وابستگی اور کسی شخص کی تعلیم کو قبول کرنا ہے۔ دوسرے معنی کسی کی حاکمیت کو تسلیم کرنا۔

بیعت کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی قائم شدہ حکومت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی جائے۔

قانونی لحاظ سے بیعت ایک قرارداد اور ایک معاہدہ ہے۔ اس میں ایجاب و قبول اور باہمی رضامندی ضروری ہے۔

بیعت کی اصل یہ ہے کہ آنحضورؐ ہر اس شخص سے جو داخل اسلام ہوتا بیعت لیا کرتے تھے اور اس سے برے اعمال کے ترک کرنے اور اچھے کام کرنے کا عہد لیتے تھے

طریقہ بیعت اپنی ظاہری صورت کے ساتھ ایک معنویت بھی رکھتا ہے۔ جسے تصوف کی زبان میں رابطہ یا نسبت کہتے ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور تک مسلمان خلیفہ وقت کی بیعت کرتے تھے لیکن جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو بزرگوں نے لوگوں سے احکام خداوندی کی تعمیل کے لئے بیعت لینا شروع کر دی۔ بیعت لینے کا سلسلہ آج بھی صوفیاء میں جاری ہے۔

بیعت رضوان ایک ایسا اقرار نامہ جس پر اللہ تعالے نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا یہ اقرار نامہ صلح حدیبیہ سے کچھ دیر پہلے وقوع پذیر ہوا۔ آنحضورؐ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے ارادے سے آئے تھے اور مکہ سے چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو اپنا ایلچی بنا کر قریش مکہ کے پاس بھیجا کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کو طواف اور عمرے کی اجازت دی جائے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو کسی بات سے غرض نہ ہوگی۔ اہل قریش نے حضرت عثمانؓ کو کچھ دیر کے لئے روک لیا۔ اسی دوران میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ ادھر ان کے واپس نہ آنے سے مسلمانوں کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا۔ اب چونکہ نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ چکی تھی اور مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا کہ وہ بد عہدوں کے ساتھ جنگ کریں اس لئے آنحضورؐ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اس امر پر بیعت لی۔ چودہ سو مسلمانوں کی تمام جمعیت نے آپؐ کے دست مبارک پر مر مٹنے کی قسم کھائی۔ اس بیعت کو بیعت رضوان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت محض افواہ تھی۔ تو مسلمان ارادہ جنگ سے باز آ گئے۔

قرآن مجید میں اس بیعت کا ذکر یوں آیا ہے۔

"اے نبیؐ! جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے۔ وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔" (۴۸ : ۱۰)

"اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا۔ جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں کا حال اسے معلوم تھا۔ اس لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی انہیں انعام میں قریبی فتح بخشی"۔ (۴۸ : ۱۸)

بیعت عُقبہ اولیٰ وہ اقرار جو ۱۲ نبوی میں یثرب کے بارہ آدمیوں نے آنحضورؐ کے دست مبارک پر کیا۔ جب مکہ اور طائف کے مشرکین نے آنحضورؐ کو دل برداشتہ کر دیا تو اللہ تعالے نے اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک نیا باب کھول دیا۔ یثرب سے ہر سال لوگ حج کرنے مکہ مکرمہ آتے تھے۔ آنحضورؐ نے ان لوگوں کے

Marfat.com

سامنے اسلام پیش کیا۔ مدینہ کے لوگ یہودیوں سے ایک نئے نبی کے آنے کی پیشگوئیاں سنتے رہتے تھے۔ جب آنحضورؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ وہی رسول ہے جس کا ذکر یہودی علماء اکثر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قبیلہ خزرج کے چھ افراد نے ۱۱ نبوی میں اسلام قبول کر لیا اور مدینہ جا کر اسلام کا پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ اگلے سال حج کے موقع پر یثرب کے بارہ افراد مکہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آنحضورؐ کے ہاتھ بیعت کی۔ یہ بیعت چونکہ عقبہ کے مقام پر لی گئی تھی اسلئے اسے بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جن باتوں پر آنحضورؐ سے بیعت کی تھی وہ یہ ہیں۔ ۱۔ ہم خدائے واحد کی عبادت کیا کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ۲۔ ہم چوری اور زنا کاری نہیں کریں گے۔ ۳۔ ہم اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔ ۴۔ ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کیا کریں گے۔ ۵۔ ہم نبی کی اطاعت ہر اچھی بات میں کیا کریں گے۔ ان بارہ افراد کے نام یہ ہیں۔ ابوامامہ، عوف بن الحارث رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، معاذ بن حرث، ذکوان بن عبدقیس، خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابوالہیثم، عویم بن ساعدہ۔ اس کے بعد آنحضورؐ نے مصعب بن عمیر کو مسلمانوں کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لیے یثرب روانہ کیا۔

بیعت عقبہ ثانیہ وہ بیعت جو عقبہ کے مقام پر ۱۳ نبوی میں اہل یثرب نے آنحضورؐ کے ہاتھ پر کی۔ بیعت عقبہ اولیٰ کے اگلے سال حج کے موقعہ پر مدینہ منورہ سے ۷۵ افراد مکہ آئے اور انہوں نے عقبہ کے مقام پر آنحضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اسی موقع پر مدینہ کے لوگوں نے آپؐ کو دعوت دی کہ آپؐ اور آپؐ کے رفقاء مدینہ تشریف لے چلیں وہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے زیادہ کام ہو سکے گا۔ آنحضورؐ نے آمادگی ظاہر کی۔ حضرت عباسؓ بھی وہاں موجود تھے مگر ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "لوگو تمہیں معلوم ہے کہ قریش مکہ محمدؐ کے جانی دشمن ہیں۔ اگر تم ان سے کوئی عہد باندھنے لگو تو پہلے سمجھ لینا کہ یہ نازک اور مشکل کام ہے محمدؐ سے عہد و پیمان کرنا سرخ اور سیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ ورنہ بہتر ہے کہ کچھ بھی نہ کرو۔"

ان لوگوں نے عباسؓ کو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں آنحضورؐ سے عرض کی کہ کچھ آپؐ ارشاد فرمائیں۔ آپؐ نے انہیں خدا کا کلام پڑھ کر سنایا پھر آپؐ نے فرمایا

۱۔ کیا تم دین حق کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے؟

۲۔ اور جب میں تمہارے شہر میں جا بسوں، کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی مانند کرو گے۔؟"

ان لوگوں نے پوچھا "ایسا کرنے پر ہم کو کیا معاوضہ ملے گا؟"

آنحضورؐ نے فرمایا۔ "بہشت"

انھوں نے دوبارہ عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں یقین دلا دیجیے کہ حضورؐ ہمیں کبھی نہ چھوڑیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "نہیں میرا جینا، میرا مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔"

اس آخری فقرے کو سنتے ہی یہ لوگ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ براءؓ بن معرور نے سب سے پہلے بیعت کی۔ یہ بیعت بیعتِ عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت کے بعد آنحضورؐ نے ان میں [illegible] اور ان کا نام نقیب رکھا اور انہیں اہل یثرب میں تبلیغ اسلام کا [illegible]

بیمارستان ہسپتال۔ جدید محاورے میں اس کا اطلاق پاگل خانے پر ہوتا ہے عربوں کے قول کے مطابق سب سے پہلے ہسپتال کی بنیاد مصر کے اساطیری بادشاہ مناقیوش نے یا بقراط نے رکھی تھی۔ جالینوس نے بیمارستان کی ایجاد بقراط کی طرف منسوب کی ہے۔

ولید بن عبدالملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے عالم اسلام میں سب سے پہلے بیمارستان تعمیر کیا اور اس میں اطباء کو ملازم رکھا۔ مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیماروں کو باقی آبادی سے علیحدہ رکھنے سے متعلق کچھ انتظامات کیے گئے۔ اس خیال کی مزید تائید مسلم ہسپانیہ میں قرطبہ کے ایک محلے ربض المرضیٰ (بیماروں کی بستی) سے ہوتی ہے۔

اسلام میں ہسپتالوں کے قیام پر جندیشاپور کے مدرسہ طب اور ہسپتال کا اثر بھی پڑا ہے۔ اس ادارے کی بنیاد ساسانیوں نے رکھی تھی۔ جندیشاپور سے رابطے کے اثرات ہارون الرشید کے عہد حکومت میں ظاہر ہوئے جس نے ایک عیسائی طبیب جرائیل بن بختیشوع کے سپرد بغداد میں ایک بیمارستان بنانے کا کام کیا۔ اسی ہسپتال کے ایک ماہر دواساز کو بھی بغداد بلایا گیا۔ بغداد کا ہسپتال جنوب مغربی مضافاتِ شہر میں نہر کرخایا پر واقع تھا۔

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے شروع میں کثرت سے بیمارستان بنائے جانے لگے۔ ان ہسپتالوں کی نگرانی کے لئے وزیر خزانہ علی بن عیسےٰ نے ابوعثمان سعید بن یعقوب دمشقی کے سپرد کی تھی بعد میں سنان بن ثابت کو بغداد اور دیگر مقامات کے ہسپتالوں کا منتظم عمومی مقرر کیا گیا۔

اس زمانے کے بیمارستانوں میں ایک بیمار المحرم کے علاقہ حربیہ میں ایک بیمارستان مقتدری باب الشام میں۔ ایک بیمارستان ابن الفرات کے نام سے درب المفضل میں اور اسی طرح مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی ایک بیمارستان السیدہ جو دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ اسی طرح الرّیؔ کا بیمارستان اور بیمارستانِ عضدی شامل ہیں جس میں ۲۴۔ اطباء تھے۔

ان بیمارستانوں کی آمدنی کا ذریعہ وہ اوقاف تھے جنہیں ارباب اختیار و اہل ثروت اسی مقصد کے لئے قائم کر دیتے تھے۔

مسلمانوں کے دور میں بڑے بڑے بیمارستانوں میں ایک کی بنیاد نورالدین زنگی (۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء تا ۵۶۹ھ/۱۱۷۵ء) نے دمشق میں رکھی۔ ان ہسپتالوں میں مریضوں کے نام رجسٹروں میں درج کیے جاتے تھے اور وہ اخراجات بھی جو مریضوں کی ادویات اور غذا پر صرف کیے جاتے تھے روزانہ ان رجسٹروں میں درج ہوتے تھے

مصر میں سب سے پہلا بیمارستان احمد بن طولون نے ۲۵۹ھ/۸۷۲ء میں بنایا۔

شمالی افریقہ میں ایک پہلا اور بڑا بیمارستان سلطان یعقوب نے المنصور الموحدی نے مراکش میں تعمیر کرایا۔ اس سلطان کا دور حکومت ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء تا ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء تھا۔ اس نے بڑے بڑے اطباء کا تقرر کیا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے پاگلوں، کوڑھیوں اور اندھوں کے لیے بھی اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں بیمارستان قائم کیے۔ بعد میں آنے والے مراکشی سلطانوں نے بھی ان بیمارستانوں کو نہ صرف قائم رکھا۔ بلکہ ان میں مزید اضافے کئے۔ لیکن [illegible]

علاء الدین نے جب ہسپتالوں پر صرف ہونے والے محاصل کو اپنے تصرف میں لے لیا تو ان کی حالت گرنے لگی۔

کوڑھیوں کو شہر سے باہر جذامہ نام کے خاص محلوں میں رکھا جاتا تھا۔ تونس میں سلطان ابو فارس نے ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء میں مفلس مسلمانوں کے لئے ایک ہسپتال کی بنیاد رکھی۔

ترکی میں سب سے پہلا ہسپتال اور مدرسہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں قیصری کے مقام پر بنایا گیا۔ اس کے بعد سیواس، دیوریری، چانکیری، قسطمونی، قونیہ، توقاد، ارزروم ارزنجان، ماردین اور اماسیہ کے علاقوں میں قائم کئے گئے ان ہسپتالوں میں ہر قسم کے مریضوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ اناطولیہ میں پہلا ہسپتال ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں بروسہ میں دارالشفائے یلدرم کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا۔ ادرنہ میں مراد دوم کے عہد میں ایک کوڑھی خانہ تعمیر ہوا۔ سولھویں صدی عیسوی میں استنبول میں تین بڑے ہسپتال قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ کئی اور بیمارستان مختلف مقامات پر تعمیر کئے گئے جو عثمانی سلطنت کے اہم ترین بیمارستانوں میں سے تھے۔ ترکوں نے دوسرے مقامات کے علاوہ صرف استنبول میں تقریباً ستر بیمارستان قائم کئے تھے۔

بیوہل (۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء – ۱۳۵۱ھ/۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء) ایک مشہور مستشرق۔ کوپن ہیگن کے مقام پر پیدا ہوا اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ عربی، صرف و نحو اور تاریخ لغات سامیہ میں تخصص حاصل کیا۔ ۱۸۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اس کے اساتذہ میں پروفیسر فلائشر اور پروفیسر دیتیس جیسے اساتذہ شامل ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کوپن ہیگن کی یونیورسٹی میں عہد نامہ عتیق پڑھانے کے لئے بطور استاد اس کی تقرری ہوئی۔ ۱۸۸۹ء میں اس نے مصر، فلسطین، شام اور ترکی کا سفر اختیار کیا۔ ۱۸۹۰ء میں اسے جرمنی کی لائپزگ یونیورسٹی میں عہد نامہ عتیق کے پروفیسر کی حیثیت سے چنا گیا۔ یہاں کے عرصہ قیام کے دوران میں اس نے قاموس عبری پر استدراکات لکھے۔

۱۸۹۸ء میں اسے کوپن ہیگن یونیورسٹی میں السنۂ سامیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے واپس بلایا گیا۔ یہاں اس نے ڈنمارک کی زبان میں آنحضورؐ کی سیرت پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۹۱۱ء میں اسے کوپن ہیگن یونیورسٹی کے ریکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جہاں اس نے ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

اس کی اکثر تصانیف یروشلم اور قدیم فلسطین کے جغرافیے کے موضوع پر ہیں اس کے علاوہ مشاہیر اسلام اور اہم مقدس مقامات کے جغرافیائی حالات کے بارے میں کئی ایک مقالات لائڈن کے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں شائع ہوئے ہیں۔

بیّنہ واضح ثبوت۔ روشن دلیل۔ شہادت، قانونی اصطلاح میں گواہی جو شرعی عدالت مدعی سے طلب کرتی ہے۔ گویا گواہوں کی دلیل اور ان کی شہادت بیّنہ کہلاتی ہے۔ حدیث میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے۔ "مقدمے میں مدعی کا فرض ہے کہ وہ گواہ پیش کرے اور اگر وہ گواہ پیش نہ کرے تو مدعی علیہ سے حلف اٹھوایا جائے۔"
(بخاری کتاب الرہن)

زبانی شہادت یا تمسکات وغیرہ سے جس ثبوت کی تحقیق ہو جائے اسے بھی بیّنہ کہا جاتا ہے۔

شریعت میں حجت کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ بیّنہ ۔ ۲۔ اقرار ۔ ۳۔ نکول یعنی جب مدعی بیّنہ پیش نہ کر رہا ہو تو مدعی علیہ کا حلف اٹھانے سے انکار ہو۔ قاضی کا فرض ہوتا ہے کہ بیّنہ کی توثیق کی صورت میں جب کہ دوسری قانونی شرائط بھی پوری ہو رہی ہوں۔ بیّنہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ بعض لوگ اقرار کے مقابلے میں بیّنہ کو زیادہ قوی نہیں سمجھتے۔ لیکن علامہ ابن حزم اس کے مخالف ہیں۔

بیّنہ، سورۃ:۔ قرآن مجید کی ۹۸ ویں سورت (دیکھئے "البینہ، سورۃ")

بیوہ وہ عورت جس کا خاوند انتقال کر جائے۔ عورت کو خاوند کے مر جانے پر چار مہینے دس دن تک سوگ منانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس عرصے کو عدت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خاوند کے علاوہ کسی کا سوگ تین دن سے زیادہ نہیں۔ اگر بیوہ حاملہ ہو تو وہ وضع حمل تک عدت گذارے گی۔ اور اس کے بعد اسے حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔

اگر خاوند کی اولاد نہ ہو تو بیوہ کو اپنے خاوند کی جائداد کا چوتھا حصہ ملتا ہے اور اگر خاوند کے اولاد ہو خواہ کسی دوسری بیوی سے ہو تو بیوہ کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔

بیوہ عورت سے زمانہ عدت میں نکاح کی درخواست بالصراحت کرنا منع ہے
(نیز دیکھئے "عدت")

بیوی زوج، بیگم، رفیقۂ حیات، منکوحہ وہ عورت جو کسی مرد کے نکاح میں آجائے عربی میں زوج کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بیوی کو خاوند کے لئے اور خاوند کو بیوی کے لئے لباس کہا گیا ہے۔ (۲: ۱۸۷) یعنی جس طرح لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا۔ بلکہ دونوں کا باہمی تعلق اور اتصال بالکل غیر منفک ہوتا ہے اسی طرح بیوی اور خاوند کا تعلق ہے۔ قرآن میں بہترین بیوی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں
اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں"

آنحضورؐ نے فرمایا "بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔" (مشکوٰۃ کتاب النکاح)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا "جو عورت پانچوں وقت کی نماز پڑھے ماہ رمضان کے روزے رکھے۔ اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھے۔ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اسے اختیار ہے جنت کے جس دروازے سے جانا چاہے چلی جائے۔" (مشکوٰۃ : کتاب النکاح)

ایک حدیث میں عورت کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

آنحضورؐ نے فرمایا "عورتوں کے ساتھ بھلائی کیا کرو اس لئے کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں جو ٹیڑھی چیز ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھی چیز اوپر کا حصہ ہے اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو پسلی کو توڑ دے گا اور اپنے حال پر چھوڑ دے گا تو اس کا ٹیڑھا پن دور نہ ہوگا۔ اس لئے عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہی مناسب ہے۔" (مشکوٰۃ : باب النکاح)

ایک اور حدیث میں فرمایا۔

Marfat.com

"کامل مومن وہ ہے جس کا خلق اچھا ہو اور تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی سے اچھی طرح پیش آئے۔" (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

ایک مسلمان ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کر ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔" (۴ : ۳)

آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

"جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل و انصاف نہ کرے قیامت کے دن وہ اس طرح آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ گرا ہوا ہو گا۔" (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

آنحضورؐ نے جس وقت وفات پائی۔ اس وقت آپؐ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں۔ اور ان میں سے آٹھ کی باری مقرر تھی (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ بیوہ عورت کے بعد جب کوئی شخص کنواری عورت سے نکاح کرے تو سات روز تک کنواری بیوی کے پاس رہے اور پھر باری مقرر کر دے اور جب کنواری کے بعد کسی بیوہ سے شادی کرے تو تین دن اس کے پاس رہے اور پھر باری مقرر کر دے۔ (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

ایک موقع پر آپؐ نے شوہر پر بیوی کے حقوق کے بارے میں فرمایا کہ "جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ اس کے منہ پر نہ مارا کرو اور برا نہ کہو۔ اور علیحدگی اختیار نہ کرو مگر گھر کے اندر" (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا "اپنی بیویوں کو نہ مارا کرو۔" چنانچہ حضرت عمرؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا عورتیں اپنے شوہروں پر غالب ہو گئی ہیں ان کی جرأت و دلیری بڑھ گئی ہے۔ آپؐ نے بیویوں کو مارنے کی اجازت عطا فرما دی۔ اس کے بعد بہت سی عورتیں آنحضورؐ کی بیویوں کے پاس جمع ہوئیں اور اپنے خاوندوں کی شکایتیں کیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا "میری بیویوں کے پاس بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کی شکایت کرنے آئی ہیں تم میں سے وہ شخص اچھا نہیں ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرے۔" (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

یہاں تک کہ خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ "عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔"

بیوی کے لیے خاوند کے انتقال کر جانے پر چار ماہ اور دس دن کا سوگ رکھا گیا ہے۔ اس عرصے میں نہ تو وہ رنگین کپڑا پہنے نہ سرمہ لگائے نہ خوشبو کو چھوئے اور نہ مہندی لگائے۔

آنحضورؐ بیویوں کے بارے میں نہایت عدل سے کام لیتے تھے۔ آپؐ اپنی بیویوں کی باری مقرر فرماتے اور عدل سے کام لیتے اور فرمایا کرتے۔ "اے اللہ میں نے جو یہ باریاں مقرر کی ہیں یہ میری تقسیم ہے۔ اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں اور جس چیز کا تو مالک ہے میں مالک نہیں۔ اس چیز پر تو مجھ کو ملامت نہ کر۔" (مشکوٰۃ؛ کتاب النکاح)

بیہقی، ابوالفضل (وفات صفر ۴۷۰ھ / اگست ۱۰۷۷ء) محمد بن الحسین ایک ایرانی مورخ بیہق کی سرزمین کے گاؤں حارث آباد میں جو آج کل خراسان میں ہے، پیدا ہوا۔ نیشاپور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے کچھ عرصے بعد غزنی کے دربار میں ملازم ہو گیا اور عمر کا بیشتر حصہ وہیں گزارا۔ ابوالفضل محکمہ مراسلات کے صدر کے معتمد اور اہم دبیروں میں سے تھا۔ کبھی کبھار دربار کے اہم خطوط بھی تیار کرنا پڑتے تھے۔ عبدالرشید کے عہد میں وہ محکمہ مراسلات کا مہتمم اعلیٰ ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد معزول کر دیا گیا۔ بعد میں اس الزام میں کہ اس نے بیوی کو مہر ادا نہیں کیا قید کر دیا گیا۔ رہا ہوا تو عبدالرشید کے قتل کے بعد طغرل برا نے اسے بھی دوسرے درباریوں کے ساتھ دوبارہ قید کر دیا۔ اس قید سے نجات حاصل کرنے کے بعد اس نے دوبارہ کسی سرکاری محکمے میں ملازمت نہیں کی۔ یہاں تک کہ وفات پا گیا۔

فارسی زبان کے مورخ ہونے کی حیثیت سے اس کا مقام بہت بلند ہے اس نے اپنے دور کے واقعات کہ جن کا وہ خود چشم دید گواہ ہے۔ نہایت سچائی کے ساتھ لکھا ہے اس کی تحریر میں فصاحت و ادبیت ہے۔

اس کی سب سے اہم تصنیف جامع التواریخ ہے جو تیس جلدوں میں ہے۔ اسے لوگوں نے اور کئی نام بھی دیئے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کتاب کی ہر جلد کا علیحدہ نام تھا۔ جو کسی نہ کسی غزنوی بادشاہ کے نام کے ساتھ منسوب تھی۔ اس کتاب میں انیس سال کے واقعات قلم بند ہیں۔ موجودہ زمانے میں اس کتاب کی پانچ جلدیں محفوظ ہیں اور وہ بھی ناقص حالت میں ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کی دوسری تصانیف میں "مقامات ابونصر مشکان" اور "زینۃ الکتاب" ہے۔

بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین (۳۸۴ھ / ۹۹۴ء – ۴۵۸ھ / ۱۰۶۶ء) ایک مشہور محدث اور شافعی فقیہ۔ آپ بیہق میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تحصیل علم کی خاطر بہت سے ملکوں کا سفر کیا اور ایک سو کے قریب شیوخ سے استفادہ کیا۔ حدیث ابوالحسن محمد بن الحسین، الحاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ اور دیگر اساتذہ سے پڑھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد غزنی کے دارالعلوم میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہے۔

عمر کے آخری حصہ میں نیشاپور میں سکونت اختیار کر لی۔ تدریس حدیث اور اپنی کتابوں کی نقل کرانے میں مصروف ہو گئے۔

آپ کے بارے میں ایک بات عام طور پر مشہور ہے کہ ممتاز محدث ہونے کے باوجود آپ ترمذی، نسائیؒ اور ابن ماجہ کی تالیفات سے واقف نہیں تھے۔

آپ نے نیشاپور میں وفات پائی۔ بعد میں آپ کی میت کو بیہق لایا گیا اور خسروجرد میں دفن کیا گیا۔

آپ ایک زاہد کامل اور قانع بزرگ تھے، حدیث کے ضمنی فنون اور علم رجال سے خوب واقف ہونے کی وجہ سے آپ حدیث پر بحث کرنے میں خوب مہارت رکھتے تھے دوسری قابل قدر کتاب "المبسوط" ہے۔ جس میں آپ نے امام شافعیؒ کے اصول فقہ جمع کئے ہیں۔ اور جو اس قدر جامع ہے کہ بعد میں اس موضوع پر کسی کو قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

آپ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ جن میں کتاب السنن الکبریٰ دس جلدوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ یہ ترتیب اور جامعیت کے لحاظ سے ایک بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں جو احادیث بیان کی گئی ہیں وہ اکثر احکام کے بارے میں ہیں۔ دوسری تصانیف میں مناقب الشافعی، کتاب الاسماء والصفات

کتاب معرفۃ السنن والآثار اور کتاب المدخل خاص طور پر مشہور ہیں۔

بیہقی، ظہیر الدین (۴۹۹ھ/۱۱۰۶ء - ۵۶۵ھ/۱۱۷۰ء) ابوالحسن علی بن زید۔ ایک ایرانی مصنف۔ سبزوار میں جو بیہق ضلعے کا انتظامی مرکز تھا پیدا ہوا۔ اس کا خاندان پہلے سے ممتاز اور معزز چلا آرہا تھا۔ جس کے افراد الحاکمی کا لقب اختیار کرتے تھے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم نیشاپور اور مرو میں حاصل کی۔ اور زندگی کا بیشتر حصہ خراسان میں گذارا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے بیہق کا قاضی بھی رہا۔ لیکن جلد ہی اس عہدے سے مستعفی ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اس نے الجبرا اور علوم نجوم کا مطالعہ بھی کیا۔

وہ ایک کثیر التعداد کتب کا مصنف تھا بقول یاقوت اس نے ستر سے زائد کتب تصنیف کی تھیں۔ اس کی مشہور تصانیف میں تاریخ بیہق، صوان الحکمۃ کا تتمہ (عربی)، جوامع الاحکام (جو فقہی علم نجوم پر فارسی زبان میں ہے) ہیں۔

پاپائیت پوپ کے زیر انتظام، پوپ کا طریق کار، پوپ کی حکومت، جب قسطنطین اعظم نے عیسائیت کو روما کا سرکاری مذہب قرار دیا تو رومی حکومت مقدس حکومت بن گئی۔ اور کلیسا کا انتظام پانچ پادریوں (پیٹری آرچ) کے ہاتھ میں آگیا۔ جنہیں پوپ کہا گیا۔ مغرب میں روم اور مشرق میں قسطنطنیہ (استنبول) کا پوپ اہم تھے۔ ان کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوگئی تو ۱۰۵۴ء میں دونوں کلیسا الگ ہوگئے۔ مغرب میں رومن کیتھولک اور مشرق میں یونانی کلیسا دو الگ اداروں کی حیثیت سے وجود میں آئے۔

پوپ گریگوری اوّل (۵۴۰ء تا ۶۰۴ء) نے رومی کلیسا کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے بعد پاپائی نظام کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ پورا یورپ پوپ کے دائرہ کار میں آگیا اور اسے دینی و دنیاوی امور میں غیر محدود اختیارات حاصل ہوگئے۔ اس کی نافرمانی کو ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا۔ اس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈبلیو ڈی فادر انگھم لکھتا ہے کہ پاپائیت کلیسا پر بری طرح چھائی ہوئی تھی اور سیاست پر جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ دونوں آزادی اور حریت کے جانی دشمن تھے۔ ظاہراً دونوں میں زبردست مشابہت تھی۔ عوام کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان کے سروں پر مذہبی عہدیداروں کا ایک لمبا سلسلہ مسلط تھا، جو علاقائی اسقف سے لے کر پوپ تک جا پہنچتا تھا۔ پوپ خود کو پطرس کا جانشین اور حضرت عیسیٰؑ کا نائب کہتا تھا۔ اس کا اقتدار ربانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

پاپائیت کے مظالم کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے پوپ کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ کچھ نے تو مذہبی ٹیکس دینے سے انکار کیا اور تعلیم یافتہ طبقے نے ان کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جن کا مطالعہ پوپ نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ پوپ نے انہیں باغی قرار دے کر انہیں دردناک سزائیں دیں۔ اس سے کلیسا کے خلاف نفرت اور بھی بھڑک اٹھی۔

سب سے زیادہ مخالفت پوپ لوئی دہم کے جاری کردہ معافی ناموں کی خرید فروخت کے سلسلے میں ہوئی۔ لوئی سوم ایک عالیشان گرجا بنانا چاہتا تھا جس کے لیے زر خطیر کی ضرورت تھی۔ اس رقم کو جمع کرنے کے لیے اس نے معافی ناموں کی فروخت کا طریقہ رائج کیا۔ ان معافی ناموں کو نہ صرف پادری فروخت کرتے تھے بلکہ تاجروں نے باقاعدہ طور پر ان کی ایجنسیاں قائم کر رکھی تھیں۔ گناہوں کے نرخنامے بھی مقرر تھے۔ مختلف گناہوں کی معافی کے لیے الگ الگ قیمتیں مقرر تھیں۔ مثلاً اسقاط حمل کے لیے ۲½ شلنگ، عدالت میں جھوٹی گواہی کے لیے ۹ شلنگ، چوری ۱۲ شلنگ، عصمت دری کرنے پر ۹ شلنگ، زنا اور قتل پر ۷½ شلنگ، لونڈی رکھنے پر ۱½ شلنگ۔

معافی نامے میں جو عبارت درج ہوتی تھی، وہ بڑی دلچسپ ہے۔ ان میں لکھا ہوتا تھا:۔

"تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ اپنے مقدس رحم سے تمہیں آزاد کر دے۔ میں اس کی، اور اس کے بابرکت شاگرد پطرس پولس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رُو سے، جو انہوں نے مجھے عطا فرمائی ہے، تمہیں آزاد کرتا ہوں اور سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں۔ پھر تمہارے ہر ایک گناہ، حدود شکنی اور زیادتی سے، خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور شدید کیوں نہ ہوں۔ میں تم سے وہ سزا اٹھا لیتا ہوں، جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی۔ تاکہ تم جب مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ ہوں۔ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔"

پاپائیت کی رُو سے پادری تمام عمر کنوارے رہتے ہیں۔ انہیں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ آج بھی رومن کیتھولک چرچ میں یہی رسم جاری ہے۔

پاپائیت کا خاتمہ کرنے کے لیے جہاں سیاست والوں اور اہل علم نے بے انتہا کوششیں کیں، وہاں خود اہل مذہب بھی مخالفت پر اتر آئے۔ کلیسا کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے کئی مصلحین میدان میں آئے۔ ان میں بارہویں صدی کا پیٹر والڈو، چودہویں صدی کے جان ٹولر اور جان وائی کلف اور سولہویں صدی کا مارٹن لوتھر قابل ذکر ہیں۔ مارٹن لوتھر ان سب میں نمایاں اور امتیازی حیثیت کا مالک ہے ۱۵۱۱ء میں وہ روم گیا اور اس نے پوپ کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پوپ روحانی قوت کا مالک نہیں۔ چنانچہ واپس آنے پر اس نے پوپ کی زبردست مخالفت شروع کر دی۔ ۱۵۱۷ء میں اس نے پوپ کے معافی نامے دینے کے اختیار پر شدید نکتہ چینی کی۔ ۱۵۱۸ء تک پورا یورپ لوتھر کے خیالات سے واقف ہو چکا تھا۔ اس سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ پاپائیت کے حامیوں نے لوتھر کو قید کر دیا رہائی کے بعد اس نے رہبانیت ترک کر کے شادی کر لی اور اس طرح جرمنی میں ایک نیا کلیسا پروٹسٹنٹ وجود میں آگیا، جو پاپائیت اور رومن کیتھولک کا زبردست مخالف تھا۔

عوام تو پہلے ہی پاپائیت سے نالاں تھے۔ چنانچہ بہت جلد رومن کیتھولک کی جڑیں اکھڑنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے ہوئے اس فرقے میں بھی اصلاح کی کوششیں کی جانے لگیں۔ نتیجتاً پاپائیت کمزور پڑتی چلی گئی۔

لوتھر کے بعد دیگر مصلحین میں سوئٹزرلینڈ کے الریچ زونگلی اور فرانس کے جان کالون کا تذکرہ ضروری ہے۔ کالون کے عقائد نے تو انسانی اختیار کو بالکل ختم کر دیا اس کا کلیسا "اصلاح یافتہ" کہلاتا ہے۔ اسی طرح سکاٹ لینڈ اور انگلستان میں بھی اصلاحی ترامیم کی بہت سی کوششیں ہوئیں۔ جس سے بہت سے کلیسا وجود میں آئے۔ جن کی وجہ سے عیسائیت میں قدیم پاپائی نظام تقریباً مفلوج ہو کر رہ گیا۔ (نیز دیکھئے پادری، پوپ)

پادری فادر، باپ، بڑا، بزرگ۔ عیسائیوں کا مذہبی پیشوا۔ کلیسائی نظام میں بشپ کا ماتحت ہوتا ہے۔ اس کے فرائض میں عبادات، انجیل مقدس کی تبلیغ اور مذہبی رسومات کی ادائیگی شامل ہوتی ہے وہ دیگر سماجی تقاریب میں کلیسا کے نمائندے کی

Marfat.com

حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔ رومن کیتھولک کلیسا میں پادری عمر بھر کنوارا رہتا ہے۔ اسے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جبکہ مشرقی کلیسا میں پادری پر شادی لازمی ہوتی ہے۔ لیکن آرتھوڈکس اور قدامت پسند کلیساؤں میں پادری رنڈوا ہونے پر دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ (نیز دیکھئے "پاپائیت"، "پوپ"، "عیسائیت")

پارسی مذہب زرتشت کے قدیم ایرانی پیرو۔ آتش پرست۔ پارسیوں کا اصل مسکن ایران تھا۔ ان کی مذہبی کتاب ژند ہے۔ یہ لوگ ثنویت کے عقیدے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک نیکی اور بدی کے دو علیحدہ خالق ہیں۔ نیکی کے خالق کو وہ یزداں اور بدی کے خالق کو اہرمن کہتے ہیں۔ وہ آگ، چاند، سورج اور ستاروں کو یزداں کے مختلف مظاہر قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے عبادتخانوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے۔

پارسی اپنے مُردوں کو نہ تو زمین میں دفناتے ہیں نہ ہی آگ میں جلاتے ہیں بلکہ ایک اونچی عمارت پر رکھ دیتے ہیں۔ جہاں جانور انہیں اپنی خوراک بناتے ہیں دنیا بھر میں پارسیوں کی کل تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔

جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تو پارسیوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا مسلمانوں نے انھیں مجوس کا نام دیا۔

ان میں سے گذشتہ تیرہ صدیوں میں اکثریت نے اسلام کو قبول کر لیا ہے۔ کچھ ہندوستان بھاگ آئے۔ کچھ لوگ اب بھی فارس میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ کراچی، پونا، بمبئی، سورت میں آباد ہو گئے۔ ان کی سب سے زیادہ تعداد سورت میں مقیم ہے یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں آکر سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی تو اس وقت ان کے گماشتے دو پارسی ہی تھے۔ اور جب انگریزوں نے ہانگ کانگ، شنگھائی، اور کینٹن کو اپنے زیر اقتدار کیا تو پارسیوں کی ایک بڑی تعداد ان علاقوں میں بحیثیت سوداگر پہنچی اور خوب دولت کمائی۔

پارسی رفاع عامہ کے کاموں پر بہت پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ پاک و ہند میں بھی یہ لوگ امیر کبیر ہیں اور بڑے بڑے کاروبار کے مالک ہیں۔ (نیز دیکھئے "آتش پرستی")

پاسبان اوغلو (۱۱۷۱ھ/۱۷۵۸ء – ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ/۲۷ جنوری ۱۸۰۷ء) عثمان بن عمر آغا، ودین کا ایک باغی پاشا۔ آبائی وطن بوسنہ (طوزلہ) تھا۔ اس کے دادا پاسبان آغا کو ۱۷۳۹ء میں آسٹریا کے خلاف جنگی خدمات کے صلے میں بلغاریہ میں ودین کے پاس دو گاؤں ملے تھے۔ عثمان کا باپ عمر آغا ان کا موروثی زمیندار ہونے کی وجہ سے سرکردہ لوگوں میں سے تھا لیکن اس کی سرکشی کی وجہ سے وہاں کے گورنر نے اسے قتل کرا دیا تھا۔ عثمان اپنی جان بچا کر البانیا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن ۱۷۸۸ء کی لڑائی میں اس نے ایک رضاکار کی حیثیت سے حصہ لیا اور وطن واپس آگیا۔ دوسری بار ودین کی طرف پلٹ آیا جہاں سے اس نے اپنے ساتھیوں کی معیت میں افلاق اور سربیا پر حملے شروع کر دیئے۔ جب سلطان نے اسے اس کی اس حرکت پر سزا دینا چاہی تو اس نے اطاعت کا جوا اپنے سر سے اتار کر پہاڑوں میں پناہ لے لی اور اپنی جماعت کی مدد سے ودین کو فتح کر لیا اور اس صوبے کا حاکم بن بیٹھا۔

۱۷۹۵ء میں اس نے بلغراد کے حاکم پر حملہ کیا۔ کیونکہ یہ سلیم ثالث کی اصلاحات کا حامی تھا۔ باب عالی نے پاسبان اوغلو کے مقابلے کے [illegible] رہیں۔ چنانچہ صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔

باب عالی نے چونکہ ودین کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا اس لیے اس نے ودین کے حاکم کو شہر سے نکال باہر کیا اور مشرق میں بلغاریہ کے کئی شہر [illegible] ہو گئیں لیکن ورنا میں ان فوجوں نے شکست کھائی۔

۱۷۹۸ء میں باب عالی نے حسین پاشا کی زیر قیادت ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج پاسبان اوغلو کے مقابلے کے لیے بھیجی۔ جب یہ فوج شہر کو فتح نہ کر سکی اور اسے کافی نقصان اٹھا کر واپس ہونا پڑا تو باب عالی نے اس شکست اور نپولین کے حملہ مصر سے مجبور ہو کر پاسبان اوغلو سے برائے نام صلح کر لی۔

اگرچہ باب عالی نے پاسبان اوغلو کے تمام پچھلے قصور معاف کر دیئے تھے لیکن اس نے ۱۸۰۳ء میں پھر باب عالی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۸۰۴ء میں سربیا والوں کی بغاوت کی وجہ سے ترکوں کی توجہ اس کی جانب سے ہٹ گئی۔ اور خود پاسبان اوغلو کو خود اپنے مقبوضہ علاقے کے مغربی حصے میں پنٹزود کی شورش کو فرو کرنے کے لیے لڑنا پڑا۔ ۱۸۰۶ء میں روسی فوجیں ڈینیوب کے بائیں کنارے پر نمودار ہوئیں تو پاسبان اوغلو نے اپنی خدمات باب عالی کو پیش کیں۔ لیکن جب باب عالی نے اس کی خدمات کو ٹھکرا دیا تو اس نے ارادہ کیا کہ اب وہ روس اور سربیا کے متحدہ حملوں کے خلاف صرف اپنے ملک کی حفاظت کرے گا۔ لیکن اس عرصے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

پاسبان اوغلو ایک قابل اور مدبر شخص تھا۔ چنانچہ ان چیزوں کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کی کمزور حالت نے بھی اس کی قسمت یاوری کی۔

پاسے آچے کے شمال ساحل پر جو سماٹرا میں واقع ہے ایک ضلع۔ یہ علاقہ مشرق میں دریائے جمبو آچے سے شروع ہو کر مغرب میں دریائے پاسے کے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہے ہر ریاست کا ایک سردار ہوتا ہے۔

آچے کا شہر قرون وسطیٰ میں ایک بحری تجارتی راستے پر واقع تھا جو ہندوستان سے چین کو جاتا تھا۔ یہاں اسلام اسی راستے سے ہندوستان سے آیا اور اس نے اس ساحل پر اپنے مضبوط قدم جما لئے۔ یہ جزائر شرق الہند میں اسلام کا پہلا قدم تھا۔ پاسے کسی زمانے میں مشرقی ایشیا کی ایک مشہور مملکت تھی۔ الملک الصالح جس نے ۱۲۹۷ء میں وفات پائی۔

وہ اسلامی سلطنت کا بانی تھا اور اس نے اس ملک میں اسلام پھیلایا۔ اس کی قبر دریائے پاسے کے بائیں کنارے پر سمندر کے قریب ہے۔ اور تقریباً اسی جگہ سلطنت کا پائے تخت تھا۔ دوسرا پائے تخت سمدرا میں تھا۔ ابن بطوطہ دو مرتبہ ایک بار چین جاتے ہوئے اور پھر واپسی میں یہاں آیا۔ اس زمانے میں پاسے خوشحال ساحلی خطہ تھا۔ یہاں کے بادشاہوں کا طرز زندگی ہندوستان کے بادشاہوں کی طرح تھا۔

ابن بطوطہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ اس وقت کا بادشاہ بڑا پر جوش مسلمان تھا۔ اسے علوم کا بے حد شوق تھا۔ اس نے ساحل کے عقبی علاقے میں کئی فتوحات حاصل کیں۔ پاسے میں لین دین کے لئے [illegible] سکے اور چین کا خام سونا استعمال ہوتا تھا۔

۱۳۶۵ء سے قبل پاسے کو جاوا کی ہندو سلطنت مجاپاہت کی حاکمیت تسلیم

کرنا پڑی۔ ۱۵۲۱ء میں پرتگالیوں نے پاسے پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اور اسے ایک قلعہ بند بستی بنا دیا۔ لیکن ۱۵۲۴ء میں آچے کے سلطان نے انہیں نکال باہر کیا۔ اس وقت سے یہ علاقہ سلطنت آچے کے تحت ایک صوبے کی حیثیت اختیار کر گیا۔

پاسے کے مسلمان علماء اور مبلغین نے جاوا اور ملایا کے جزائر پر کافی اثر ڈالا۔

یہاں کی پیداوار میں چاول، سیاہ مرچ اور ابریشم کے کیڑے قابل ذکر ہیں پرتگال سیاہ مرچ کے لئے ہی یہاں آئے تھے۔

پاشا ترکوں کا سب سے بڑا اعزازی لقب۔ یہ لقب صرف فوجیوں کے لئے ہی استعمال نہ ہوتا تھا بلکہ بعض غیر عسکری اور دیوانی حکام کو بھی اس لقب سے نوازا جاتا تھا۔ یہ لقب سب سے پہلے تیرہویں صدی عیسوی میں استعمال ہوا۔ یہ لفظ عورتوں کے لئے بھی استعمال ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاشا کا لقب تیرہویں صدی کے آخر میں رئیسوں کے خاص خاص افراد کے ناموں کے ساتھ بڑھا دیا گیا۔ ان رئیسوں نے ایشیائے کوچک میں چھوٹی چھوٹی موروثی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔

عثمانیوں میں افراد پاشا کے لقب سے ملقب تھے۔ اس ضمن میں اتنی بات ضرور ہے کہ پاشا کا لقب ابتداہی سے ارباب سیاست کو دیا جاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد پاشا کا لقب دو منصب داروں یعنی صوبے کے امیر الامراء اور پایۂ تخت کے وزراء کے لئے استعمال ہونے لگا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ پاشا کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ بڑے وزیر پر کیا جانے لگا۔

سلیم پاشا کی سلطنت میں یورپ ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں تھیں یہ ولایتیں ایک سو تریسٹھ علاقوں پر منقسم تھیں۔ جنہیں لوا (صوبہ) کہتے تھے۔ ہر ولایت کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا۔ جسے "سہ اسپ دمہ" نشان عطا ہوتا تھا۔ ایسے پاشا کا منصب ایک وزیر کے منصب کے برابر ہوتا تھا۔ بالعموم پاشاؤں کا تقرر ہر سال ہوتا تھا لیکن اگر کوئی پاشا اتنا طاقتور ہوتا کہ اسے برطرف کرنے میں باب عالی کو بغاوت کا اندیشہ ہوتا یا وہ دیوان عالی کے بعض وزراء کو اپنا طرفدار بنائے رکھتا تو ایک ہی شخص کئی کئی سال تک بلکہ کبھی عمر بھر تک اپنے عہدے پر مامور رہتا۔ انتظام کے سلسلے میں پاشا کی مدد کے لئے باب عالی کی طرف سے دو یا تین آدمی مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ لوگ اعیان کہلاتے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے خاتمے پر مناصب کی یہ ترتیب ختم کر دی گئی اور جمہوریہ ترکیہ نے پاشا کا لقب صرف اہل فوج کے لئے رہنے دیا۔ لیکن ۱۹۲۴ء سے فوج میں بھی پاشا کی جگہ جنرل نے لے لی۔

پاکپتن پاکستان میں ضلع ساہی وال کا مشہور قصبہ اور تحصیل سابق نام اجودھیا ہے۔ جو دریائے ستلج کے دائیں کنارے سے آٹھ میل دور واقع ہے۔ اس مقام کو بابا فرید گنج شکر کی نسبت سے خاص شہرت حاصل ہے بابا فرید گنج شکر اپنی وفات تک اسی جگہ سکونت پذیر رہے اور یہیں ان کی تبلیغ کی وجہ سے پنجاب کے بڑے بڑے قبیلے جن میں سیال، راجپوت وٹو وغیرہ شامل ہیں اسلام لائے ان کے مزار پر لوگ دور دراز سے زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اس قصبے کو زمانہ قدیم سے تاریخی حیثیت حاصل رہی ہے پہلے اس کا نام اجودھن تھا۔ اور چالوکیا خاندان کے راجاؤں کا دارالحکومت رہا۔ شہنشاہ اکبر نے بابا فرید گنج شکر کے مزار کی وجہ سے اسے پاک پتن کا نام دیا۔

۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ملتان فتح کیا تو پاک پتن پر بھی لشکر کشی کی۔ ایک زمانے میں پاک پتن کی حیثیت ایک تجارتی منڈی کی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں یہاں پر میونسپلٹی قائم کی گئی تھی۔ یہاں کی لاکھ بنانے کی صنعت بہت مشہور ہے۔ عمدہ کپڑا بننے کا مرکز ہے۔ یہاں کی لنگیاں، کھیس وغیرہ مشہور ہیں۔ پاکپتن شہر کی آبادی بیس ہزار کے قریب ہے۔

پاک دامن بیبیاں باکمال عابد و زاہد بیبیاں، جن کی تعداد چھ بتائی جاتی ہے لیکن ان میں سے دو خاص طور پر افسانوی حیثیت سے مشہور ہیں "تحقیقات چشتی" میں ان بیبیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ چھ بیبیاں جن میں ایک بی بی حاج حضرت علیؓ کی بیٹی تھی اور پانچ بیبیاں حضرت علیؓ کے بھائی حضرت عقیل کی صاحبزادیاں تھیں۔ واقعہ کربلا کے بعد اپنی جان بچا کر لاہور آگئیں تھیں۔ لاہور میں اس زمانے میں ہندو راجگان کی حکومت تھی اس لئے وہ ان کے خوف سے دعا کر کے زمین میں سما گئیں۔" بعد میں اس کے بارے میں تفصیلی حالات سے ظاہر ہوا ہے کہ ان بیبیوں کے نام تاج، حاج حور، نور، گوہر اور شہباز تھے اور ان میں نہ کوئی حضرت علی کی صاحبزادی تھی اور نہ حضرت عقیل کی۔

"تاریخ جلیلہ" میں تحقیقات چشتی کی اس تحقیق پر بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ جب لاہور میں کوئی مسلمان ہی نہ تھا تو ان بیبیوں کو ادھر کا رخ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسرے یہ عورتیں تنہائی اور بے کسی کے عالم میں اتنی دور صحیح سلامت کس طرح پہنچ گئیں۔ جبکہ لاہور کی نسبت کوفہ، شام یا حرمین الشریفین میں جا کر زیادہ محفوظ رہ سکتی تھیں اور وہاں کے لوگ ان کی زبان بھی سمجھتے تھے۔

ان بیبیوں کے بارے میں دوسری روایت یہ ہے جو صاحب "حدیقۃ الاولیاء" نے "تذکرہ حمیدیہ" کے حوالے سے بیان کی ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں کرمان سے ایک عابد و زاہد بزرگ سید احمد توختہ لاہور میں آکر قیام پذیر ہوئے۔ ان کی چھ بیٹیاں تھیں۔ بی بی حاج، بی بی تاج، بی بی نور، بی بی حور، بی بی گوہر اور بی بی شہباز یہ سب بیبیاں بڑی عابد و زاہد تھیں۔ اپنے والد کی وفات کے بعد فصیل سے گھرے ہوئے لاہور کو چھوڑ کر اس علاقے میں قیام پذیر ہو گئیں جہاں اب یہ قبرستان واقع ہے۔

صاحب حدیقۃ الاولیاء اور صاحب تاریخ جلیلہ اس بات پر تو متفق ہیں کہ بی بی تاج اور حاج کا واقعہ کربلا سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ حضرت علی اور حضرت عقیل کی صاحبزادیاں ہیں۔ لیکن وہ لاہور کی اس عام روایت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بیبیاں دشمنوں کے خوف سے اپنی عزت و عصمت کو بچانے کے لئے زمین میں زندہ سما گئیں۔ عوام میں یہی روایت مشہور ہے۔

بابا خاکی کی اولاد ان خواتین کے مزاروں کی مجاور ہے ان مزاروں کے ساتھ سلاطین وقت نے کچھ اراضی بھی وقف کر دی تھی۔ یہ مزار گڑھی شاہو لاہور میں ایک قدیم ترین قبرستان میں موجود ہیں۔ یہ قبرستان بی بی پاکدامناں کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس قبرستان کا آغاز کس زمانے سے ہوا۔

پاکستان دنیا کا واحد اسلامی ملک، جو اسلام کے نام پر سرزمین ہندوستان میں قائم ہوا۔ یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تحریک آزادی کی ایک طویل کش مکش

Marfat.com

کے بعد معرض وجود میں آیا۔ قیام کے وقت اس کے دو حصے مشرقی اور مغربی پاکستان تھے مشرقی پاکستان سابق مشرقی بنگال تھا، جس کے شمال مشرق اور مغرب میں بھارت جنوب مشرق میں برما اور جنوب میں خلیج بنگال واقع ہے۔ مغربی پاکستان سابق صوبہ جات، پنجاب، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور کشمیر پر مشتمل تھا۔ اس کے شمال میں چین، مشرق میں بھارت، جنوب میں بحیرہ عرب، مغرب میں ایران اور شمال مغرب میں افغانستان اور روس آباد ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے ایک الگ ملک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اور مغربی پاکستان ہی موجودہ پاکستان ہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر واحد صوبہ مغربی پاکستان بنا دیا گیا۔ جسے یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو توڑ کر پھر سے چار صوبے بنا دیئے گئے۔ اب پنجاب میں سابقہ ریاست بہاولپور، سندھ میں کراچی اور لس بیلا کے اضلاع اور سرحد میں تمام شمالی ریاستیں شامل کر دی گئی ہیں۔ بلوچستان کو باقاعدہ صوبہ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ کشمیر ابھی تک بھارت کے قبضے میں ہے۔ صرف ایک تہائی علاقہ آزاد ہے جو آزاد کشمیر کے نام سے نیم خود مختار حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان ایک اسلامی وفاقی جمہوری پارلیمانی مملکت ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳،۱۰،۴۰۳ مربع میل (۸۰۰،۰۰۰) مربع کلومیٹر اور آبادی ۱۹۷۲ء میں ۶۴۸۹۲ ہزار ہے۔ (اس میں جموں، کشمیر، گلگت، بلتستان، جوناگڑھ، مناودر اور سابق مشرقی پاکستان کی آبادی شامل نہیں) کل آبادی کا ۸۸.۱۰ فیصد مسلمان ہیں۔ ۸.۵ فیصد ہندو، ۴.۹۱ فیصد اچھوت ذاتیں، ۸ فیصد عیسائی اور ۴ فیصد بدھ ہیں۔

اپنے محل وقوع کے لحاظ سے پاکستان تمام عالم اسلام کی امیدوں کا مرکز ہے۔ یہ بری، بحری اور فضائی راستوں کے ذریعے تمام اسلامی ممالک سے ملا ہوا ہے۔

سطح کے لحاظ سے پاکستان تین بڑے طبعی خطوں، پہاڑی، میدانی اور سطح مرتفع میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑی علاقہ پاکستان کے شمال اور مغرب میں واقع ہے۔ شمال کی طرف ہمالیہ کے سلسلے واقع ہیں۔ کشمیر، گلگت، چترال، ہنزہ، کاغان اور سوات کی خوبصورت وادیاں اسی خطے میں موجود ہیں۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے۔ ٹو اسی علاقے میں واقع ہے۔ بلند پہاڑ سارا سارا سال برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ جن سے نکلنے والے دریا کبھی خشک نہیں ہوتے۔ مغربی پہاڑی سلسلوں میں سرحد اور بلوچستان کے سلسلے کوہ سفید، کوہ سلیمان اور کوہ کیرتھر واقع ہیں۔ بارش کی کمی کے باعث یہ پہاڑ بنجر اور بے آب و گیاہ ہیں

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کی آبادی ہزاروں میں (۱۹۷۲ء)			
اسلام آباد	۷۷	قصور	۱۰۳
بہاولپور	۱۳۴	کراچی	۳۴۶۹
پشاور	۲۷۳	کوئٹہ	۱۵۶
جھنگ	۱۳۶	گجرات	۱۰۰
حیدرآباد	۶۲۴	گوجرانوالہ	۳۶۶
راولپنڈی	۶۱۵	لاہور	۲۱۴۸
ساہیوال	۱۱۵	لائلپور	۸۲۰
سرگودھا	۲۰۳	مردان	۱۰۹
سکھر	۱۵۹	ملتان	۵۴۴
سیالکوٹ	۲۱۴	واہ	۱۰۹

میدانی علاقہ پاکستان کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس میں پنجاب اور سندھ کے علاقے آتے ہیں۔ اس علاقے میں سندھ، جہلم، چناب، راوی، ستلج اور دریا بیاس جیسے دریا بہتے ہیں۔ یہ انتہائی زرخیز علاقہ ہے۔ جہاں دریاؤں اور نہروں کا جال بچھا ہوا ہے، جو دنیا بھر میں آب پاشی کا بہترین نظام ہے۔ بہاولپور کے علاقے میں کہیں کہیں ریگستان واقع ہیں، جو سندھ کے زیریں علاقوں میں جا کر بڑی وسعت اختیار کر جاتے ہیں۔ تاہم نہروں کے ذریعے ان علاقوں کو زرخیز بنایا جا رہا ہے۔ سطح مرتفع کوہستان نمک کے شمال میں پوٹھوہار اور کوہ سلیمان کے مغرب میں بلوچستان میں واقع ہے۔ پوٹھوہار کا علاقہ راولپنڈی، جہلم اور کیمبل پور کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ بارانی ہے۔ یہاں مٹی کا تیل، کوئلہ اور دیگر ایسی معدنیات ملتی ہیں۔ بلوچستان کی سطح مرتفع سخت اور خشک پہاڑی ہے۔ اس کے عین وسط میں نمکین جھیل ہے۔ سارا علاقہ بنجر ہے۔

پاکستانی نسلیں پاکستان میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر آریا ہیں۔ کچھ لوگ سامی اور عربی نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں شمال میں گلگت اور بلتستان کے لوگ دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جو خدوخال کے لحاظ سے منگول سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں اسلام ترکستان کے راستے سے آیا۔ اس علاقے کے جنوب میں کشمیری آباد ہیں۔ ان میں اسلام حضرت عبدالرحمان بلبل شاہ اور سید میر علی ہمدانی نے پھیلایا۔ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے لوگ پٹھان کہلاتے ہیں۔ یہ پشتو زبان بولتے ہیں اسلام کے شیدائی اور انتہائی غیور ہیں۔ پنجاب میں مختلف نسلیں آباد ہیں۔ ان میں قدیم دراوڑی، آریا اور سامی نسلیں ہیں۔ یہ لوگ بہت سی ذاتوں میں تقسیم ہیں۔ پاکستان کے تقریباً ہر علاقے اور نسل کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ پنجابی زبان بولنے کی وجہ سے یہ ایک ہی نسل پنجابی معلوم ہوتے ہیں۔ صوبہ سندھ میں قدیم دراوڑی نسل اور سامی نسل کے امتزاج سے موجودہ نسل وجود میں آئی۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا بلوچستان میں دو نسلیں بلوچ اور براہوی آباد ہیں۔ ایران کی سمت ایک تنسل مکرانی ہے۔ جو بلوچی نسل سے مشابہ ہے۔

اقلیتیں اور مذاہب: پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ جن میں اہل سنت حنفی کثرت میں ہیں۔ دیگر مذاہب کے پیروکار اقلیت شمار ہوتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعد ازاں مرزا غلام احمد کے پیروکار ہوئے اور احمدی، قادیانی یا مرزائی کہلائے۔ ۱۹۷۴ء سے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جا چکے ہیں۔ پاکستان میں اقلیتوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ چاروں صوبائی اسمبلیوں میں ان کی الگ الگ نشستیں مخصوص ہیں۔ اقلیتی امور کے لئے الگ ڈویژن قائم کیا گیا تاکہ ان کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے۔ اقلیتی فرقوں کی عبادت گاہوں اور مذہبی عمارات کی دیکھ بھال پر حکومت کروڑوں روپیہ صرف کر چکی ہے۔ ان کے طلبہ کو ہر سال وظائف بھی ملتے ہیں سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کے لئے حصے مقرر ہیں۔

تاریخی پس منظر: پاکستان کا تاریخی پس منظر اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان باقاعدہ طور پر ۹۳ھ/۷۱۲ء میں داخل ہوئے اور یہ داخلہ محمد بن قاسم کی زیر قیادت سندھ میں ہوا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی مسلمان جنوبی ہند کے ساحلوں میں بس چکے تھے۔ لیکن اسلام کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں کا دوسرا داخلہ شمالی ہند کے راستے سے ہوا اور محمود غزنوی نے محمد بن قاسم کے بعد پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ان شمالی علاقوں پر جو اب پاکستان کہلاتے ہیں، متعدد حملے کئے اور موجودہ پاکستان کا اکثر علاقہ اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اور یہاں پر مسلمانوں نے ایک حکومت قائم کی۔

Marfat.com

پاکستان کے ڈویژن اور اضلاع کی آبادی ہزاروں میں (۱۹۶۲ء)

ڈویژن و کمشنری	ضلع	کل آبادی	مرد	عورتیں
پشاور مرد = ۲۸۸۸ عورتیں = ۲۶۵۹ کل = ۵۵۴۷	ہزارہ	۲۰۲۵	۱۰۴۵	۹۸۰
	مردان	۱۲۲۲	۶۳۴	۵۸۸
	پشاور	۱۷۱۱	۹۰۱	۸۱۰
	کوہاٹ	۵۸۹	۳۰۸	۲۸۱
ڈیرہ اسماعیل خان مرد = ۵۵۰ عورتیں = ۴۹۳ کل = ۱۰۴۳	ڈیرہ اسماعیل خان	۴۷۵	۲۵۳۰	۲۲۲
	بنوں	۵۶۸	۲۹۷	۲۷۱
مالاکنڈ مرد = ۹۳۸ عورتیں = ۳۱۸ کل ۱۲۵۶	مالاکنڈ	۱۸۲	۹۴	۸۸
	دیر	۵۳۵	۲۷۴	۲۶۱
	سوات	۹۳۶	۴۸۸	۴۴۸
	چترال	۱۵۹	۸۲	۷۷
قبائلی علاقے	پشاور، کوہاٹ، بنوں، باجوڑ، مہمند، خیبر، کرم، وزیرستان	۲۵۰۷	۱۲۹۱	۱۲۱۶
راولپنڈی مرد = ۱۰۱۶ عورتیں = ۴۶۷۳ کل = ۵۶۸۹	راولپنڈی	۱۷۵۱	۹۴۱	۸۱۰
	کیمبل پور	۹۸۴	۵۱۱	۴۷۳
	جہلم	۱۰۵۲	۵۵۳	۴۴۹
	گجرات	۱۹۰۲	۱۰۱۱	۸۹۱
سرگودھا مرد = ۴۸۸۷ عورتیں = ۴۱۰۰ کل ۸۹۸۷	سرگودھا	۲۱۰۵	۱۱۱۸	۹۸۷
	میانوالی	۱۰۹۵	۵۷۶	۵۱۹
	لائلپور	۴۲۳۳	۲۲۶۷	۱۹۶۶
	جھنگ	۱۵۵۴	۸۲۶	۷۲۸
لاہور مرد = ۵۱۶۶ عورتیں = ۴۵۰۶ کل = ۹۶۷۲	لاہور	۳۷۶۲	۲۰۱۹	۱۷۴۳
	گوجرانوالہ	۲۰۵۸	۱۰۹۸	۹۶۰
	شیخوپورہ	۱۵۶۲	۸۳۶	۷۲۶
	سیالکوٹ	۲۲۹۰	۱۲۱۳	۱۰۷۷
ملتان مرد = ۵۰۱۸ عورتیں = ۴۴۷۷ کل ۹۴۹۵	ملتان	۴۰۱۰	۲۱۳۷	۱۸۷۳
	مظفرگڑھ	۱۵۴۸	۸۲۵	۷۲۳
	ڈیرہ غازی خان	۱۱۲۸	۵۹۸	۵۳۰
	ساہیوال	۲۸۰۹	۱۴۵۸	۱۳۵۱
بہاولپور مرد = ۳۰۴۴ عورتیں = ۲۶۳۰ کل = ۵۶۷۴	بہاولپور	۲۱۲۵	۱۱۰۰	۱۰۲۵
	بہاولنگر	۱۸۱۹	۱۰۲۶	۷۹۳
	رحیم یارخان	۱۷۳۰	۹۱۸	۸۱۲
خیرپور مرد = ۲۶۶۳ عورتیں = ۲۳۷۶ کل ۵۰۳۹	خیرپور	۷۱۵	۳۸۳	۳۳۲
	سکھر	۱۳۶۴	۷۲۴	۶۴۰
	جیکب آباد	۶۹۴	۳۶۸	۳۲۶
	لاڑکانہ	۹۲۱	۴۸۷	۴۳۴
	نواب شاہ	۱۳۴۵	۷۰۱	۶۴۴
کراچی مرد = ۲۰۴۶ عورتیں = ۱۶۴۹ کل = ۳۶۹۵	کراچی	۳۵۶۰	۱۹۷۵	۱۵۸۵
	لس بیلہ	۱۳۵	۷۱	۶۴
کوئٹہ مرد = ۶۸۲ عورتیں = ۶۲۵ کل ۱۳۰۷	کوئٹہ	۴۹۵	۲۶۱	۲۳۴
	سبی	۴۰۲	۲۰۸	۱۹۴
	لورالائی	۱۸۵	۹۸	۸۷
	ژوب	۱۶۰	۸۲	۷۸
	چاغی	۶۵	۳۳	۳۲
قلات مرد = ۵۲۲ عورتیں = ۴۴۵ کل = ۹۶۷	قلات	۳۲۰	۱۷۶	۱۴۴
	کچھی	۲۷۰	۱۴۵	۱۲۵
	خاران	۷۵	۴۰	۳۵
	مکران	۳۰۲	۱۶۱	۱۴۱
وفاقی علاقہ	اسلام آباد	۲۳۵	۱۳۰	۱۰۵

نوٹ: اس آبادی کے تخمینے میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ جموں و کشمیر شامل نہیں

Marfat.com

پشاور سے بنگال کے علاقے کو زیر نگیں کر لیا۔

اس کے بعد قطب الدین ایبک نے خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی، جو لقریبا اشتہ سال،

چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں محمد غوری کی قیادت میں ترکوں اور افغانوں نے مغربی سرحدوں پر حملہ شروع کیا اور تیرہویں صدی کے آغاز میں تک قائم رہی۔

ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے شروع میں سلطان ایبک کے زمانے میں محمد بن بختیار خلجی نے بنگال کو فتح کیا۔ خاندان غلاماں کے بعد خلجی آئے اور ان کے بعد تغلق برسر اقتدار آئے۔ اس خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق تھا۔ جس نے بنگال پر چڑھائی اور مشرقی صوبوں کو از سر نو سلطنت میں شامل کیا۔ سادات خاندان اور پھر ایک مستقل اور مضبوط حکومت مغلیہ خاندان نے قائم کی۔ بابر اس خاندان کا بانی تھا اس کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ لیکن وہ سارا عرصہ اپنے بھائیوں سے لڑتا اور ان کی بغاوتیں فرو کرتا رہا۔ اس عرصے میں شیر شاہ سوری نے جو افغان تھا۔ حکومت حاصل کر لی اور ہمایوں کو ہندوستان سے نکال دیا۔ یہ اچھا مسلمان بادشاہ تھا لیکن پانچ سال کی قلیل مدت حکومت کی اور اس مختصر عرصے میں سارا شمالی ہندوستان زیر نگیں کر لیا۔ اس کے بعد اس کے فرمانروا بہتر ثابت نہ ہوئے۔ اس دوران میں ہمایوں نے صفیوں کی مدد سے جو ایران پر حکمران تھے، حکومت حاصل کی۔ اس کے بعد اکبر کم سنی میں ملک کا فرمانروا بنا۔ اس نے ایک عجیب وغریب دین نکال کھڑا کیا۔ اور اسے دین الہٰی کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے اس الحاد کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بڑی کوششیں کیں۔ جہانگیر کی پالیسیاں بدل گئیں۔ اس تحریک کا اثر شاہجہان پر بہت پڑا۔ اس نے اسلامی پالیسیاں بنائیں اس کا اثر اپنی پوری آب وتاب سے اورنگ زیب پر پڑا۔ جس نے اسلامی شریعت کے قوانین نافذ کیے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس تحریک کا آخری امین دکن کا حکمران ٹیپو سلطان تھا۔

اورنگ زیب نے پورے ہندوستان پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ لیکن اس کے آنکھیں بند کرنے کے بعد ہی اس کے جانشین اتنی بڑی سلطنت کو نہ سنبھال سکے۔ ایرانی حکمران نادر شاہ نے حملہ کر کے مغلوں کی صدیوں کی اکٹھی کی ہوئی دولت اور ان کے وقار کو نقصان پہنچایا اور اس تہذیب کو خاک میں ملا دیا۔ یہ تو ایک سیاسی کمزوری تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں اخلاقی اور معاشی کمزوری روز بروز آتی چلی گئی اور بالآخر یہ قوم غلامی کی پستی میں جا گری۔

ایک غیر قوم انگریز نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور ہندوستان کو اپنی تجارتی منڈی بنائے رکھا۔ یہاں سے ساری دولت سمیٹ سمیٹ کر انگلستان لے جانا شروع کر دی اور ہندوستان جو سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور تھا۔ آن کی آن میں خاک میں مل گیا۔ اب یہاں پر مسلمانوں کی سیاسی اخلاقی مذہبی اور معاشرتی حالت روبہ زوال ہو چکی تھی۔ اس زوال کو اور مسلمانوں کی اس کمزوری کو محسوس کرنے والے بزرگ اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ تھے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کی اور مغلوں کی ختم ہونے والی حالت کو سنبھالا دینے کی پوری کوشش کی۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے وہ پورے ہندوستان پر حکمرانی کرنے کے اہل ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ کے بعد اس تحریک کو شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی نے سنبھالا دیا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی جو آگ بھڑکی یہ اسی تحریک کی وجہ تھی جس نے غیر ملکی تسلط کے خلاف آواز بلند کی

لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی۔ انگریز مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں ہی سے حکومت چھینی تھی۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو پوری طرح سے مفلوج کر دینے کا پروگرام بنایا۔ ان پر تعلیمی اداروں کو بند کر دیا۔ ملازمتیں اور عہدے و مناصب مسلمانوں سے چھین کر ہندوؤں کو دے دیئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان معاشی طور پر بالکل دیوالیہ ہو گئے۔ اور معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہ رہا۔ یہ حالت انیسویں صدی کے دوران میں پیدا ہوئی تھی۔ ان حالات میں ایک بزرگ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی اور ایک تحریک چلائی۔ سر سید کے ساتھ ساتھ دیگر علماء کی بھی کوششیں جاری تھیں۔ سر سید کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کے تنزل اور پستی کا بغور مطالعہ کر کے یہ تحریک شروع کی۔ اگرچہ علیگڑھ کوئی سیاسی تحریک نہیں تھی لیکن بعد میں اس نے سیاسی رنگ بھی اختیار کر لیا۔ سر سید کا خیال تھا کہ مسلمان ابھی اس حالت میں نہیں ہیں کہ انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں لہٰذا انہیں پہلے جدید علوم سے آراستہ کیا جائے۔ تاکہ جدید وقدیم دونوں علوم سے مسلمان آراستہ ہو کر انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط کو اپنی گردن سے اتار پھینکنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ایک فلسفہ ہے کہ جب کوئی قوم روبہ تنزل ہو تو یا تو وہ قوم بالکل مٹ جاتی ہے یا پھر وہ سنبھلنے کی کوشش کرتی ہے اور اگر وہ وہی حربے استعمال کرنا سیکھ لے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے حریف سے شکست کھائی ہو تو وہ قوم پھر اپنے دشمن کے مقابل کھڑی ہو سکتی ہے اور دشمن کے تسلط سے چھٹکارا پا سکتی ہے

ایک انگریز مسٹر ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی ابتداً میں مسلمان اور پارسی عمائدین بھی اس میں شامل تھے۔ لیکن مسلمانوں کے رہنما سر سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے یہ جانچ لیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ دغا کریں گے اور سیاسی حقوق کے مطالبے میں یہ ہندو مسلم اشتراک مفید ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے جو بھی حقوق اور فوائد حاصل ہوں گے۔ ان پر ہندو اپنی کثرت تعداد، بہتر تعلیم اور قومی تنظیم کے باعث قابض ہو جائیں گے۔ ان وجوہات کی بناء پر وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی ترجمانی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کرتی رہی۔

بنگال میں مسلمانوں پر ہندو قابض تھے اور ان کا معاشی طور پر پورا پورا قبضہ تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ۱۹۰۵ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس پر ہندوؤں نے مظاہرہ کیا۔ تقسیم بنگال سے ہندوؤں کو نئے صوبے میں اپنی برتری اور اجارہ داری ہاتھ سے نکلتی نظر آئی تو انہوں نے اسے اپنے قومی اتحاد پر ضرب کاری قرار دیتے ہوئے سخت ناراضی کا اظہار کیا اور اس کے خلاف ایک ہندوستان گیر تحریک چلا دی۔ کانگرس نے جگہ جگہ احتجاجی جلسے کئے اور بنگالی ہندو تشدد اور دہشت پسندی پر اتر آئے۔ انہوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا۔ ایک طرف تو وہ انگریز افسروں کو گولی کا نشانہ بنانے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں کے تعلقات بگڑنے لگے۔ مسلمانوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو قدرے نفع پہنچ رہا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سر سید کا خیال ٹھیک تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور اگر کچھ دور چلیں گے بھی تو عین وقت پر ہندو مسلمانوں کو دھوکہ دیں گے۔

چنانچہ ۱۹۰۶ء میں سر آغا خان کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد شملے میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا۔ اور اپنے سیاسی مطالبات پیش کئے۔ انہوں نے وائسرائے

Marfat.com

سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے طریق انتخاب جداگانہ ہونا چاہئیں۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا۔

اسی سال نواب وقار الملک نے نواب آف ڈھاکہ کے ساتھ مل کر ملک کے بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بلایا اور ڈھاکہ میں مسلمانان ہند کے حقوق کی حفاظت کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

اس طرح ۱۸۵۷ء میں مستقل اسلامی حکومت کی بحالی کا جو خواب پریشان ہوا تھا اس کی تعبیر کا واضح آغاز ہو گیا۔ اس وقت مسلم لیگ میں زیادہ تعداد اعتدال پسند مسلمانوں کی تھی۔ اور ان کی کوششیں اس امر پر مرکوز تھیں کہ برادران وطن سے ایسا سمجھوتا ہو جائے جو مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کے تحفظ پر مبنی ہو تاکہ سب متحد ہو کر آزادی ملک کے لیے جدوجہد کر سکیں۔

منٹو مارلے سکیم میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملنے کے باعث ہندو بہت برافروختہ تھے۔ ۱۹۱۰ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں ہوا تو باہمی کشیدگی دور کرنے کے لیے ہندو مسلم رہنماؤں کی ایک کانفرنس ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں قومیں ایک مطمح نظر پر متحد ہو جائیں۔ یہ کانفرنس ہندو لیڈروں کی ضد کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔

مسلمان اب حوصلہ مندی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس لکھنؤ میں بلایا گیا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی دعوت دی گئی۔ اس کے بعد محمد علی جناح جلد ہی مسلم لیگ کے صف اوّل کے رہنما بن گئے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے نام سے ایک معاہدہ عمل میں آیا اور کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک عدم تعاون ناکام ہو گئی۔ محمد علی جناح نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۲۰ء میں آئینی حقوق کی آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔

تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں مسلمانوں نے بڑی شاندار قربانیاں دیں۔ یہ سب قربانیاں دراصل ہندوستان کی آزادی، اسلامی سلطنتوں کی بقا اور اپنی قومی حیثیت کے تحفظ کے لیے تھیں۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں قائد اعظم کی زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ جس میں مسلم لیگ کے رہنماؤں کا اختلاف دور ہو گیا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم نے مستقبل کے ہندوستان میں مسلم انفرادیت کے تحفظ کے لیے وہ تجویز پیش کی جو چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور جسے آزادی کے حصول تک مسلمانوں کے قومی مطالبات کی حیثیت حاصل رہی۔ اس میں ملک کے لیے وفاقی دستور، صوبوں کی کامل خودمختاری، صوبائی مجالس قانون

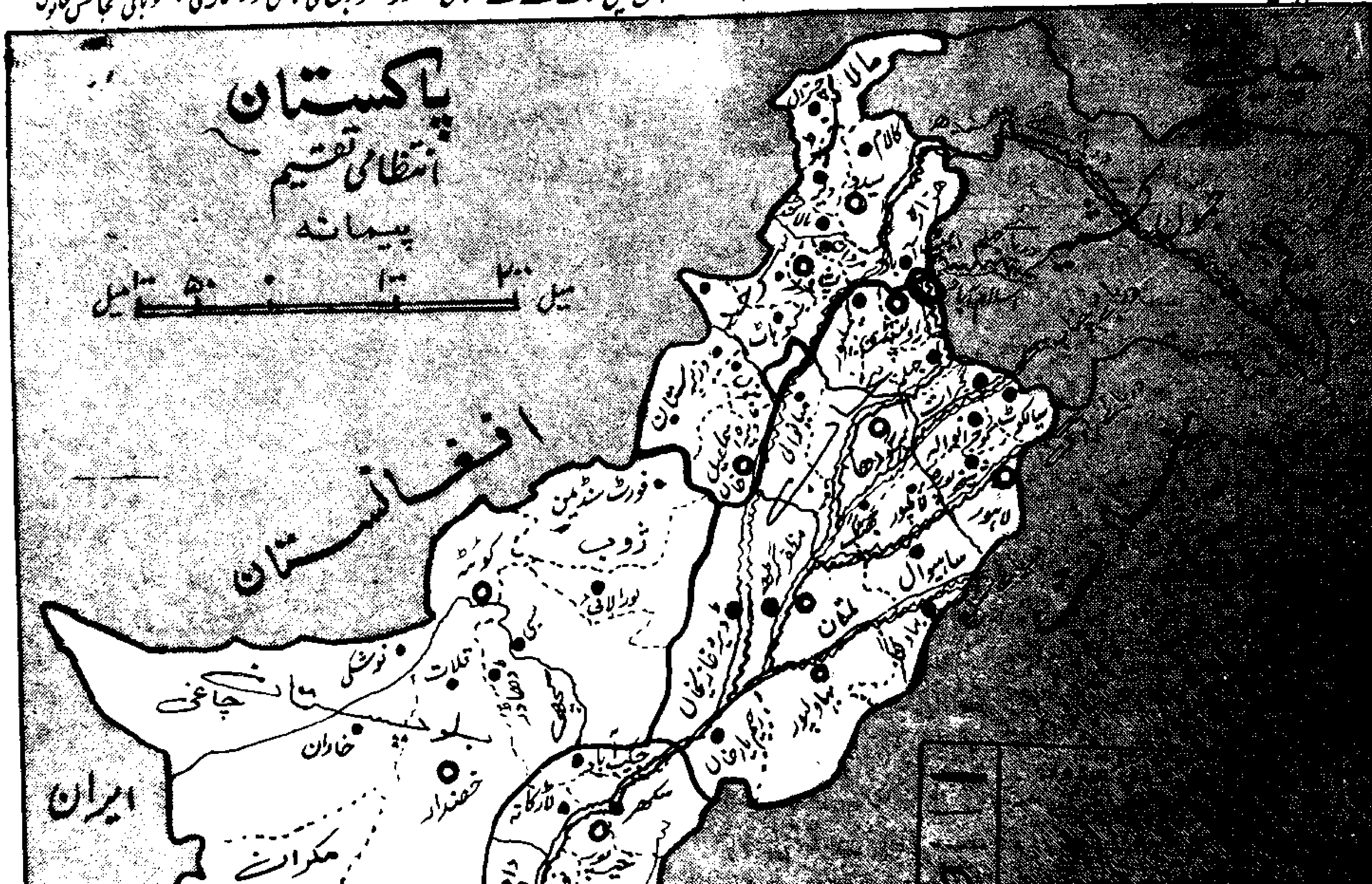

Marfat.com

ساز میں اقلیتوں کی کافی اور مؤثر نیابت اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی جائز نیابت کے تحفظ، مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، ہر صوبے کی کابینہ وزارت میں مسلمانوں کی ایک تہائی نیابت، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات کے نفاذ، سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی، سرکاری ملازمتوں اور ذمے دار عہدوں پر تقرر کے وقت مسلمانوں کے مناسب حصے کا لحاظ تمام ملتوں کے لیے ضمیر و مذہب کی آزادی اور اسلامی تہذیب و تمدن اور تعلیم و زبان وغیرہ کی حفاظت و ترقی کا مطالبہ کیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ الٰہ آباد میں ہوا۔ علامہ اقبال نے خطبہ صدارت دیا۔ جس میں علامہ نے فرمایا "میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں مدغم دیکھ رہا ہوں۔ خواہ وہ حکومت برطانیہ کے اندر رہے یا آزاد" اس کے بعد ۱۹۳۱ء۔ ۱۹۳۲ء میں دو گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ جن میں قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر نے شرکت کی۔

۱۹۳۷ء میں کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تاہم دونوں جماعتیں نئے دستور کو غیر اطمینان بخش اور ناقابل قبول ٹھہراتی رہیں۔ مسلم لیگ نے اپنا نصب العین یہ متعین کیا کہ موجودہ صوبائی حق خود اختیاری اور وفاقی نظام کو بدل کر جمہوری حکومت خود اختیاری قائم کی جائے۔ اور جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعے وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسری طرف کانگرس نے یہ طے کیا کہ دستور جدید کے ماتحت انتخاب میں ضرور حصہ لیا جائے۔ لیکن کونسلوں میں پہنچ کر اس کے نفاذ کو بے اثر بنا دیا جائے۔

انتخابات میں ہندو اکثریت کے تمام صوبوں میں کانگرس کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ ان میں کسی دوسری جماعت کی مدد کے بغیر وزارتیں بنا سکتی تھی۔ تاہم اس سے قبل کانگرسی رہنماؤں نے حکومت سے اس امر کی یقین دہانی چاہی کہ دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے گورنروں کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ برتے نہیں جائیں گے شروع میں یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور ان صوبوں میں عارضی طور پر غیر کانگرسی حکومتیں قائم کر دی گئیں۔ لیکن جلد ہی اس اندیشے کے پیش نظر کہیں کانگرس کے عدم تعاون سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو جائے۔ بنگال اور پنجاب کے سوا تمام صوبوں کانگرسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں صوبائی نوعیت کی مضبوط اور منظم جماعتوں نے مسلم لیگ کے امیدوار بھاری تعداد میں کامیاب ہوئے اور دستور کے مطابق وزارتوں میں اہم اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنا لازم تھا لیکن کانگرس نے اس معاملے میں مسلم لیگ کو بالکل قطعاً نظر انداز کر دیا اس قسم کی ناقابل عمل شرائط پیش کیں جن سے اسمبلی میں مسلم لیگ کا وجود ہی ختم ہو جاتا تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ نے اکثر صوبائی مجالس میں حزب اختلاف کی نشستیں سنبھال لیں۔ اس زمانے میں نہرو نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ۱۔ کانگرس۔ ۲۔ حکومت برطانیہ ہیں۔

اس طرح اس نے نہ صرف مسلم لیگ بلکہ مسلمانان ہند کے جداگانہ قومی وجود سے ہی انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے جواب دیا "کہ نہیں، تیسری پارٹی مسلمان اور مسلم لیگ ہے"۔ اور کانگرس کو یو۔پی میں مسلمانوں کی پانچ نشستوں پر ہونے والے ضمنی انتخابات میں مقابلہ کرنے کا چیلنج دیا۔ کانگرسی وزارتیں قائم ہوتے ہی پھر تلخی شروع ہو گئی اور یہاں تک مسلمانوں کے خلاف کانگرسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگرس کے جھنڈے لہرائے۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ

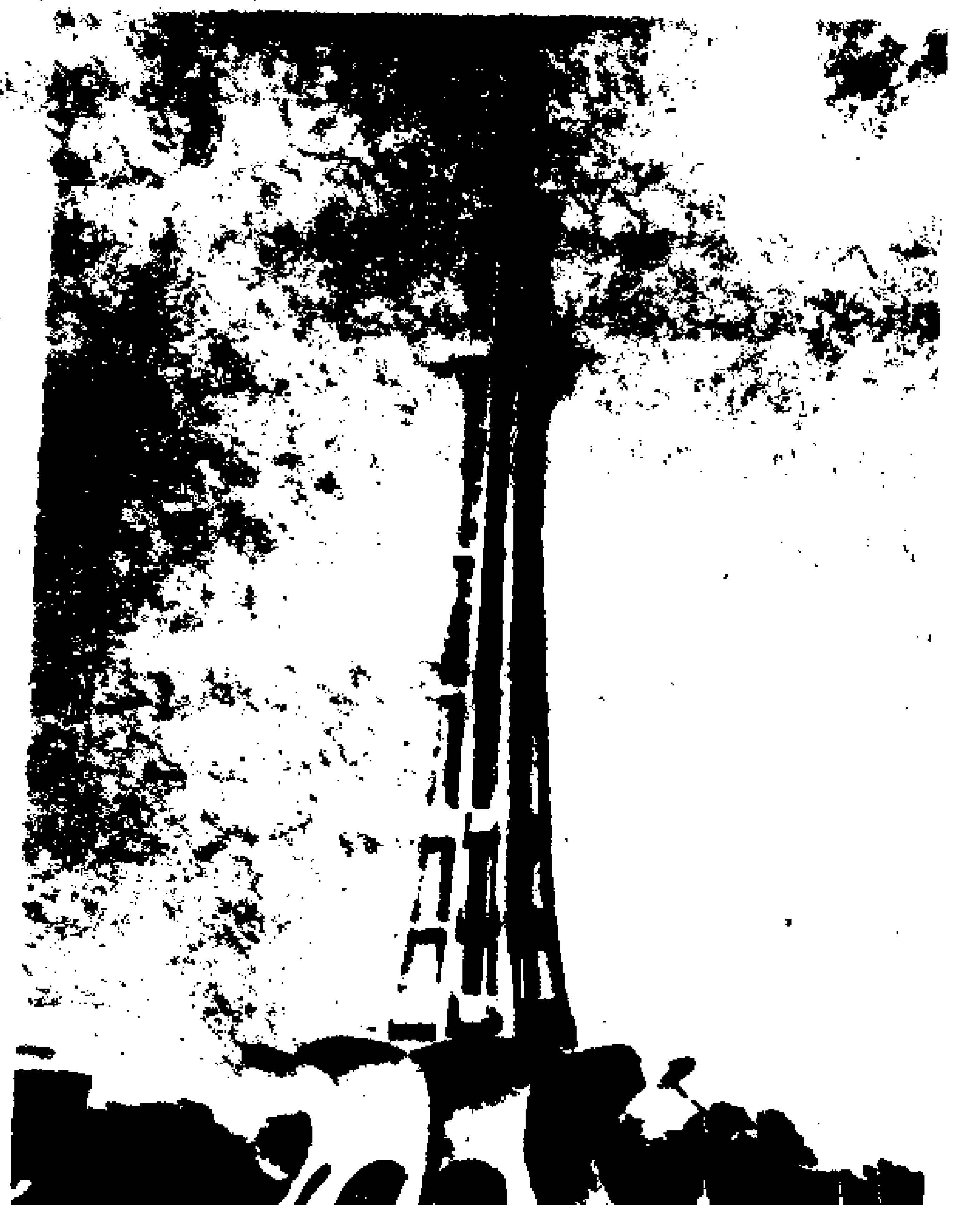

مینار پاکستان لاہور کا ایک منظر

قرار دیا۔ تعلیم کے میدان میں واردھا سکیم اور ودیا مندر سکیم نافذ کرنے کی کوشش کی اردو کو ہر شعبے سے بے دخل کیا جانے لگا۔ الغرض اس نے بڑے اہتمام سے مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور انہیں اس ملک میں اکثریت کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔ اس طرز عمل کا جواب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو نہایت تیزی اور سرگرمی سے منظم کیا جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے تنظیم کا کام پوری تندہی سے شروع کر دیا۔ ادھر علامہ اقبال نے قائداعظم پر یہ زور دیا کہ وہ مسلمانوں کو دین کی خاطر جمع کریں۔ مسلمان سیاست کی بنا پر جمع نہیں ہوں گے اس وقت سے قائداعظم نے دین کو سامنے رکھا۔ قائداعظم نے اپنے نظریات بدل دیئے اور انہوں نے دین کے نام سے کام شروع کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ کانگرس نے حکومت برطانیہ سے مقاصد جنگ کی وضاحت چاہی اور اس شرط پر اپنی حمایت کا یقین دلایا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ مسلم لیگ نے ایک طویل قرارداد میں اعلان کیا کہ جب تک حکومت برطانیہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی شکایات کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرے مسلم لیگ اس وقت تک جنگ میں حکومت برطانیہ کی حمایت نہیں کر سکتی۔ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے حکومت کی پالیسی کا اعلان کیا جس میں بتایا گیا کہ اختتام جنگ پر ملک معظم کی حکومت ہندوستانیوں کے مطالبے کی روشنی میں اور ہندوستانیوں کی مختلف پارٹیوں، فرقوں اور مفاد کے نمائندوں اور والیان ملک کے مشورے اور تعاون سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ ۱۴؍ نومبر ۱۹۳۹ء میں کانگرس کی تمام ۱۱ حکومتوں نے استعفے دے دیئے۔ تو مسلمانوں نے یوم نجات منایا۔ ۱۹۴۰ء کے

Marfat.com

آغاز میں انگلستان کے ایک اخبار میں قائد اعظم کا ایک بیان شائع ہوا جس میں انھوں نے انگریزوں پر یہ واضح کیا کہ ہندومت اور اسلام دو مختلف تہذیبوں کی نیابت کرتے ہیں اور اپنے بنیادی عقائد اور طرزِ زندگی دونوں اس قدر مختلف ہیں جتنی کہ یورپی اقوام۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا ۲۷واں سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم نے دو قومی نظریے کی پوری طرح وضاحت کی اور اس کی روشنی میں ملک کے آئینی مسئلے کا حل تجویز کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی کہ قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے مسلمان ایک قوم ہیں۔ اور چاہیے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو، ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست و دولت ہو۔

چنانچہ ۲۳ مارچ کو ایک کھلے اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی۔ جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی کانگرس اور اس کی ہمنوا جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ مخالفین کہتے تھے کہ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے اور ناقابل تقسیم ہے اکثر ہندوستانی مسلمانوں کے اجداد ہندو تھے۔ اور تبدیل مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی۔ مسلم لیگ کی طرف سے ان اعتراضات کے بڑے مدلل جوابات دیئے گئے۔ قائد اعظم نے جون ۱۹۴۰ء میں وائسرائے سے ملاقات کی اور اس پر زور دیا کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کوئی آئینی تجاویز پیش نہیں کرے گی۔

اس زمانے میں اتحادیوں کو جرمنی کے مقابلے میں پے در پے پسپائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور برطانوی حکومت ہندوستان سے ہر ممکن امداد کی خواہاں تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے منصفانہ اور مکمل حل کے لئے سر سٹیفورڈ کرپس کو خاص تجاویز دے کر بھیجا جو دو حصوں پر مشتمل تھیں۔ ان تجاویز کو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیا۔ کانگرس نے جنگ عظیم کی صورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ اس تحریک سے الگ تھلگ رہی کیونکہ اس تحریک نے متشددانہ شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی دوران میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریت کے صوبوں بنگال، آسام، سندھ اور سرحدی صوبے میں وزارتیں قائم کر کے مسلمانوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد گاندھی نے یہ تسلیم کر لیا کہ مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی موثر ثابت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اجاریہ فارمولے کے تحت جس میں مطالبہ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کرنے کے علاوہ یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ایک کمیشن مقرر ہوگا جو مسلم اکثریت کے علاقوں کی حدبندی کرے گا اور وہاں کے عوام بالغ رائے دہی کے اصول پر فیصلہ کریں گے کہ آیا وہ ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں گاندھی جی قائد اعظم سے ملاقات کرنے کیلئے تیار ہو گئے دونوں رہنماؤں کے درمیان اٹھارہ روز تک مذاکرات جاری رہے۔ لیکن کوئی قابل عمل صورت نہ نکل سکی۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم کے خاتمے پر حکومت برطانیہ کی طرف سے لارڈ ویول ملک کی آئینی گتھی سلجھانے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی جو ناکام رہی لیکن اس کانفرنس کی ناکامی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دونوں جماعتوں کے دعوے انتخاب کے ذریعے ہی پرکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کی ابتدا میں انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے کل ووٹوں کا ۷۵ فیصد حاصل کیا۔ مرکزی اسمبلی کی تیس کی تیس سیٹیں حاصل کیں اور صوبائی اسمبلیوں میں ۴۹۲ مسلم نشستوں میں سے ۴۲۵ نشستیں جیت کر یہ بات ثابت کر دی کہ وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

اس عرصے میں برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت بن چکی تھی جو ہندوستان کو جلد سے جلد آزادی دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے ایک وفد ہندوستانی رہنماؤں سے انتقال اقتدار کے بارے میں مشاورت کرنے بھیجا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۴۶ء کو اس وفد نے سیاسی مذاکرات شروع کئے۔ ۱۶ مئی کو وفد نے نئے منصوبے کا اعلان کیا اگرچہ مسلم لیگ اس منصوبے سے غیر مطمئن تھی۔ لیکن اس میں قیام پاکستان کی بنیاد موجود ہونے کی بنا پر اسے منظور کر لیا۔

۱۶ جون کو وزارتی وفد نے چھ کانگرسی، پانچ مسلم لیگی، ایک سکھ اور ایک عیسائی اور پارسی کو نئی مجلس عاملہ میں نمائندگی کے لئے چنا۔ مسلم لیگ نے یہ فیصلہ قبول کر لیا لیکن کانگرس نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کی کونسل نے یہ اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے راست اقدام کیا جائے اس اعلان پر کانگرس نے مجبوراً اعلان کیا کہ اس نے وزارتی سکیم پوری کی پوری تسلیم کر لی ہے۔ اسی اثنا میں دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آگیا۔ مسلم لیگ نے ۷۸ میں سے ۷۳ نشستیں جیتیں کانگرس نے نو کے علاوہ تمام غیر مسلم نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ کانگرس کو عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دی گئی جسے اس نے منظور کر لیا۔ قائد اعظم نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کی نظر میں ہندو قوم کی جماعت کو وزارت بنانے کی دعوت دے کر وائسرائے نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی توہین کی تھی۔

۱۶ اگست کو مسلم لیگ نے یوم راست اقدام منایا۔ جس میں حکومت کی غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ مسلم لیگ کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ چنانچہ قائد اعظم نے اس شرط پر حکومت میں شرکت منظور کر لی کہ اگر کانگرس کو اس کے حصے کے ارکان میں ایک مسلمان کو نامزد کرنے کا حق دیا جا رہا ہے تو مسلم لیگ کو بھی یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے حصے میں سے پس ماندہ اقوام یا دوسری اقلیتوں کے کسی شخص کو نامزد کرے۔ مخلوط حکومت بن جانے کے بعد بھی مسلم لیگ اور کانگرس کی آویزش جاری رہی۔

قائد اعظم، لیاقت علی خان، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے وائسرائے کے ہمراہ لندن جا کر ملک معظم کی حکومت سے گفت و شنید کی لیکن وہاں پر بھی دونوں لیڈروں میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ آئین ساز اسمبلی نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء سے اپنا کام شروع کر دیا اب لیبر گورنمنٹ کے لئے سخت دشواری کا سامنا تھا۔ کیونکہ نہ تو وہ چاہتی تھی کہ کانگرس کو عبوری حکومت سے علیحدہ کر کے مظاہروں کا سلسلہ شروع کرائے اور نہ ہی مسلم لیگ سے استعفے کا مطالبہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم نے ۲ فروری کو اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک حکومت برطانیہ تمام اختیارات ایک ایسی ہندوستانی حکومت کے حوالے کر دے گی۔ جسے عوام کی حمایت حاصل ہو اور ساتھ ہی انتقال اقتدار کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ ۲۲ مارچ کو نئے وائسرائے نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا اور کانگرس و مسلم لیگ کے قائدین سے بات چیت شروع کی۔ اس نے ایک منصوبہ بھی تیار کیا جس کی توثیق ۱۰ جون کو مسلم لیگ کونسل نے اور ۱۴ جون کو کانگرس کمیٹی نے کر دی۔ ۱۵ جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ نے آزادی ہند کے قانون کی منظوری دے دی۔ ۱۸ جولائی کو شاہ برطانیہ نے اسے منظور کر لیا۔ کانگرس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا گورنر جنرل چن لیا تھا۔ مسلم لیگ نے قائد اعظم کو گورنر جنرل چنا۔ اس انتخاب سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو سخت مایوسی ہوئی۔ اور اس نے ہر معاملے میں پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی دونوں مملکتوں کی سرحدوں کی حدبندی کے لئے ایک کمیشن سر ریڈکلف کی قیادت میں قائم کیا گیا۔ ریڈکلف نے انتہائی جانبداری سے کام لیتے ہوئے وہ علاقے جنھیں پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ ہندوستان میں شامل کر دیئے۔ اس ناانصافی کی سب سے

Marfat.com

بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز اور ہندو شروع سے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ جب معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ تقسیم ملک کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تو انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اسے کمزور کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے۔

الغرض ۷ راگست کو قائد اعظم کراچی پہنچے اور ۱۱ راگست کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ ۱۴ راگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی آکر مملکت پاکستان کے اختیارات قائد اعظم گورنر جنرل پاکستان کے حوالے کر دیئے اور اس طرح ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو آگ اور خون کی ہولی سے گزر کر پاکستان ایک سب سے بڑی اسلامی مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

دو قومی نظریہ:۔ وہ نظریہ جس کی اساس پر مملکت پاکستان کی تعمیر کی گئی اسے انتہائی سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان ہندوؤں سے قطعاً ایک علیحدہ قوم ہیں۔

قائد اعظم نے اس بارے میں ایک دفعہ فرمایا تھا: "جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہ رہا۔ وہ جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔"

یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ اسلام اور ہندو دھرم دو مختلف نظام ہائے زندگی ہیں۔ زبان و ادب، فنون لطیفہ، فن تعمیر، نام و نسب، اقدار و تناسب، قانون و اخلاق، مذہب و عبادات، رسم و رواج گویا ہر معاملے میں اسلام کا ایک علیحدہ نقطۂ نظر ہے۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قدیم آریاؤں کے بعد سرزمین ہند پر جس قوم نے بھی یلغار کی وہ کچھ عرصے بعد اپنی انفرادیت کھو بیٹھی اور صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم تھی جس نے ہر دور میں اپنا تشخص برقرار رکھا۔ اگرچہ ان کی اس انفرادیت کو ختم کرنے کے لیے اور انہیں اپنے اندر ضم کرنے کے لیے ہندو ہمیشہ مختلف محاذوں سے حملے کرتے رہے۔ اکبر کے عہد میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن چونکہ ہر دور میں مسلمانوں میں اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ دین اسلام کی تجدید و احیاء کے لیے آ کر ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔

۱۹۳۰ء میں اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے الہ آباد میں علامہ اقبال نے فرمایا: "اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ۔ ۔ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات و تمدن کے تحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

اس خطبے میں علامہ اقبال نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کرنے کی تجویز پیش کی جسے بعد میں چوہدری رحمت الٰہی نے پاکستان کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

اس دو قومی نظریے کی بنیاد پر ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا۔

تاریخ:۔ قیام پاکستان کا اعلان ۱۴ ر اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کیا گیا۔ جس کے فوراً بعد حد بندی کی گئی۔ مسلمانوں کو اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ گورداسپور اور سلہٹ کے بہت سے علاقے پاکستان سے کاٹ لیے گئے۔ مشرقی پنجاب اور دوسرے ہندو اکثریت کے علاقوں میں ہزاروں کی تعداد میں

مسجد وزیر خان لاہور کا دروازہ

مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ مسلمان مہاجرین کی آمد اور غیر مسلموں کے چلے جانے سے پاکستان میں کئی معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہو گئے۔

پاکستان کے سب سے پہلے گورنر جنرل قائد اعظم مقرر ہوئے۔ نئی مملکت کی تنظیم وفاقی آئین کے خطوط پر استوار ہوئی۔ پاکستان میں ناکافی سازوسامان، مکانوں کی نایابی اور سب سے بڑھ کر کارکنوں کی کمی تھی۔ ادھر ہندوستانی لیڈر اس نئے ملک کو ختم کرنے کی فکر میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد بھیج دی جائے تاکہ اس کی نئی حکومت قائم ہی نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے مشرقی پنجاب، دہلی اور شمالی یوپی کو مسلمانوں سے خالی کرانا شروع کر دیا۔

نیا ملک زیادہ تر ان حصوں پر مشتمل تھا، جو انگریزوں کے دور میں صنعتی طور پر پس ماندہ تھے۔ حد بندی کمیشن کے صدر ریڈکلف نے مسلم اکثریت کے بعض اہم علاقے بھارت کو دے دیئے۔ بھارت کی کشمیر پر بالادستی قائم کرنے کے لیے اس سے ملحقہ ضلع گورداسپور اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اہم نہری ہیڈ ورکس جو فیروز پور اور مادھوپور میں تھے۔ جہاں سے پاکستانی علاقوں کو پانی فراہم ہوتا تھا بھارت کے حوالے کر دیئے تو پانی کا جھگڑا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

جب پاکستان بنا تو برطانوی ہند کی فوج بھی دونوں ملکوں کے درمیان تقسیم ہوئی جو فوجیں پاکستان کے حصے میں آئیں اس وقت وہ یا تو بھارت میں تھیں یا بیرونی ملکوں میں متعین تھیں۔ پاکستان کی یہ مجبوری دیکھ کر بھارت نے کشمیر میں اپنی فوجیں اتار کر اس پر قبضہ کر لیا اور پاکستان منہ دیکھتا رہا۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی اسے گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر خوش قسمتی سے ابنائے وطن کو بابائے قوم کی قیادت میسر تھی سب سے اہم مسئلہ کشمیر پر بھارت کے حملے سے پیدا ہوا۔ آزادی کے بعد قائد اعظم

Marfat.com

[illegible] بحیثیت [illegible] مہلت ملی تاہم انہوں نے اس قلیل مدت میں بھی وطن عزیز کے بہت سے مسائل اپنی دور اندیشی سے حل کر دیئے۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین کو مرکزی وزارت نے نیا گورنر جنرل منتخب کیا۔ لیاقت علی خان اگرچہ قائد اعظم کے زمانے ہی سے وزیر اعظم تھے لیکن عملاً نظم و نسق قائد اعظم کی وفات کے بعد ہی لیاقت علی خان کے ہاتھ میں منتقل ہوا۔ وہ پارلیمانی حکومت کے عہد جلیلہ کے لئے طبعاً موزوں تھے۔ اس سے پہلے وہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے۔ قائد اعظم کی وفات کے دو ہی روز بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب سارے اسلامی ممالک میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ پنڈت نہرو کی ہدایات کے تحت بھارتی فوجوں نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا اور نظام حیدر آباد کی ملی بھگت کے تحت مسلمانوں کی ایک زبردست سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

دستور ساز اسمبلی کی قرارداد مقاصد سے ہوئی۔ جس میں کہا گیا کہ پاکستان کی حکومت اسلامی ہوگی اور اس کے آئین و قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔

خواجہ صاحب کے دور میں بہت سے ممالک سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے اور ان تمام ممالک کے سفارت خانے پاکستان میں قائم ہوئے۔

جولائی ۱۹۵۱ء میں آنا فانا بھارت کی فوجوں کا بیشتر حصہ پاکستان کی سرحد پر جمع ہو گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر پاکستان افواج نے بھی نقل و حرکت شروع کی اور اپنی سرحدوں کے قریب معمولی مقدار میں کیمپ لگا دیئے۔ جنگ سر پر منڈلاتی نظر آتی تھی۔ مگر حکومت کے پاکستان کے تدبر کے باعث جنگ رک گئی۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے اپنی کابینہ کے مشورے پر گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزارت عظمیٰ کے فرائض سنبھال لئے اور ان کی جگہ پاکستان کے وزیر خزانہ ملک غلام محمد گورنر جنرل مقرر کئے گئے۔ خواجہ ناظم الدین اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے بطور سربراہ حکومت زیادہ کامیاب نہ ہو سکے ان کے عہد میں غلے کی کمی پیدا ہو گئی۔ سرکاری ملازمین سیاست میں دخل دینے لگے اور آئین سازی کی رفتار سست پڑ گئی۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کی ابتدا ہوئی۔ اس تحریک سے پنجاب میں نظم و نسق کی صورت حال بہت بگڑ گئی۔ چنانچہ مارشل لاء لگا کر پنجاب میں امن و امان بحال کیا گیا۔ تحریک ختم نبوت وزیر اعظم کی حیثیت کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے مداخلت کر کے خواجہ ناظم الدین کو وزارت سے برطرف کر دیا اور محمد علی بوگرا کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ محمد علی بوگرا نے مرکزی مقننہ میں دونوں صوبوں (مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان) کی نمائندگی کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک سکیم تیار کی جو اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع کی گئی۔ انہی دنوں گورنر جنرل غلام محمد اور مرکزی حکومت کے بعض لیڈروں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تو غلام محمد نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ اور حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے نئے وزیر مقرر کر دیئے۔

۲۸ مئی ۱۹۵۵ء میں نئی آئین ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ جس کے ۸۰ ارکان تھے۔ اس مرتبہ جب مسلم لیگ نے محمد علی بوگرا کو اسمبلی میں پارٹی لیڈر نہ چنا تو وہ وزارت عظمیٰ سے الگ ہو گئے۔ اور چوہدری محمد علی نے متحدہ محاذ اور مسلم لیگ پر مشتمل ایک مخلوط وزارت بنائی۔

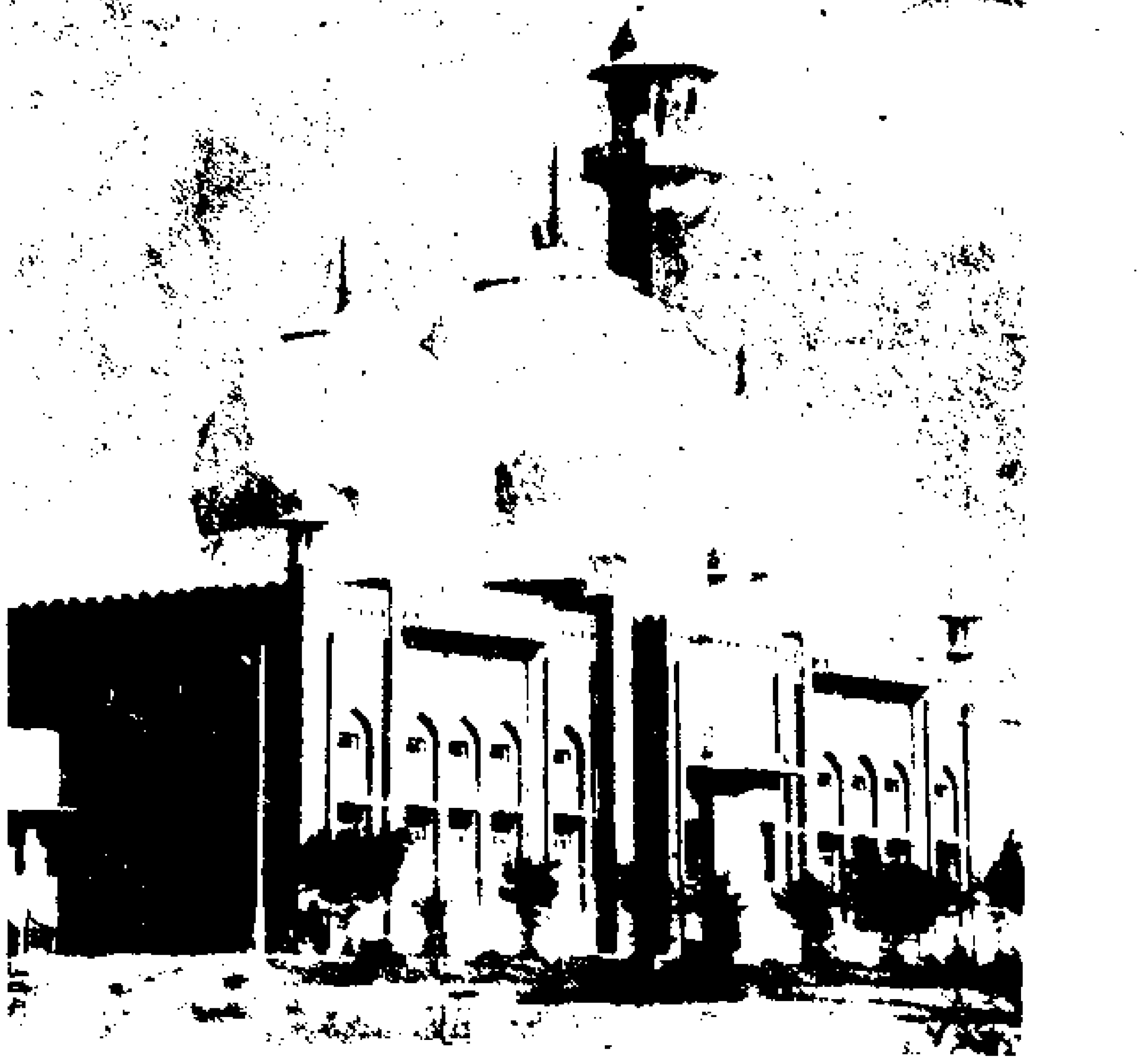

جامع مسجد واہ چھاؤنی کا ایک منظر

چوہدری محمد علی نے جب وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا تو پاکستان کو بنے آٹھ سال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کا آئین نہیں بن سکا تھا۔ چنانچہ حکومت نے مغربی پاکستان کو جو چار صوبوں اور کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا مشرقی پاکستان کی طرح واحد صوبہ قرار دیا۔ اس بات کا اعلان نومبر ۱۹۵۴ء میں وزیر اعظم کی طرف سے کیا گیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۵۵ء میں آئین ساز اسمبلی نے وحدت مغربی پاکستان کا قانون منظور کیا جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو نافذ العمل ہوا۔

ملک غلام محمد کو اپنی مسلسل علالت کے باعث اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا اور ۱۷ اگست ۱۹۵۵ء کو ان کی جگہ پاکستان کے وزیر داخلہ میجر جنرل سکندر مرزا گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو آئین کا مسودہ قانون محمد علی نے آئین ساز اسمبلی میں پیش کیا۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نیا آئین نافذ ہوا۔ جس کی رو سے پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار پایا اور سکندر مرزا گورنر جنرل کی جگہ پاکستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے لیکن بعض ناسازگار حالات کی وجہ سے چوہدری محمد علی نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ حسین شہید سہروردی نے کابینہ کی تشکیل کی۔

اس کے بعد چندریگر اور ملک فیروز خان نون نے یکے بعد دیگرے قلمدان وزارت سنبھالا بحیثیت مجموعی فیروز خان نون کا مختصر دور وزارت بے یقینی، جوڑ توڑ اور انتشار کا دور تھا مشرقی پاکستان میں سمگلنگ کا دور دورہ تھا۔ افراط زر غلے کی کمی اور زر مبادلہ کے ضیاع جیسے مسائل نے خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ اب حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات کو صدارتی فرمان کے ذریعے دستور کو معطل کر کے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ سکندر مرزا نے جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کو عملی طور پر ختم کر دیا گیا۔ چونکہ دو اشخاص کے برسر اقتدار رہنے سے ملکی نظم و نسق میں خلل پیدا ہونے لگا تھا اس لئے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا محمد ایوب خان کے حق میں صدارت سے دستبردار ہو گئے اور ایوب خان نے صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔

Marfat.com

ایوب خان کے اس دور کو تاریخ میں امن وسکون کے سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نئی کابینہ فوجی جرنیلوں اور شہری اکابر پر مشتمل تھی۔ وزیر اعظم کے عہدے کو ختم کر دیا گیا۔ اور ایوب خان کے وزراء نے صدارتی کابینہ کے طور پر کام شروع کر دیا۔

یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا اعلان کیا گیا۔ جو ایک جمہوری، وفاقی، ایک ایوانی اور صدارتی طرز حکومت کا دستور تھا۔ اس دستور میں ملک کے دونوں حصوں کو مساوی نمائندگی حاصل تھی۔

۸ رجون ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں مارشل لاء ختم کر دیا گیا اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا۔

جنوری ۱۹۶۵ء میں صدارتی انتخاب ہوا جس میں ایوب خان ایک بار پھر صدر منتخب ہو گئے۔

۱۹۶۵ء کے شروع میں بھارتی فوج نے رن کچھ میں پاکستانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تو پاکستانی افواج بھی حرکت میں آگئیں۔ انہوں نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے اعلان جنگ کئے بغیر مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی سترہ روز تک جاری رہی۔ اس دوران میں پاکستانی افواج نے شجاعت، استقلال اور جواں مردی کا اور عوام نے اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ بھارتی حملہ سے بھارت کی فوجوں نے جو محدود علاقہ اپنے قبضے میں پہلے دن لے لیا تھا وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ لیکن دوسری طرف پاکستانی افواج نے بھارت کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۲۳ ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو یہ جنگ سلامتی کونسل کی ہدایت پر بند کر دی گئی۔ ۱۰ ر جنوری ۱۹۶۶ء کو روسی وزیر اعظم کوسیجن کی وساطت سے دونوں ملکوں کے سربراہوں کے درمیان معاہدہ تاشقند کے نام سے ایک معاہدہ طے کرایا جس کی رو سے دونوں ملکوں کی فوجیں اپنی پرانی سرحدوں پر واپس چلی گئیں اور تنازعے کو باہمی بات چیت کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا گیا۔ جنگ کے دوران میں کشمیر کے بارے میں معاملہ کچھ سلجھتا دکھائی دیتا تھا لیکن اعلان تاشقند کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ اس سے عوام بے دلی اور مایوسی کا شکار ہو گئے اور جگہ جگہ اعلان تاشقند کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے جنہیں سختی سے دبا دیا گیا۔ اب عوام نے ایک بار پھر سیاست دانوں سے توقعات وابستہ کریں

۱۹۶۷ء میں پانچ جماعتوں پر مشتمل ایک جماعت تحریک جمہوریت پاکستان کے نام بنائی گئی۔ جس نے آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ اس اتحاد میں پہلے جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، قومی جمہوری محاذ، نظام اسلام پارٹی اور عوامی لیگ شامل تھیں۔ لیکن ۱۹۶۹ء کے شروع میں نیشنل عوامی پارٹی، جمعیت علماء اسلام اور چھ نکاتی عوامی لیگ بھی شامل ہو گئیں۔ ۸ ر جنوری کو ان تمام جماعتوں نے جمہوری مجلس عمل قائم کی اور اپنے آٹھ نکات کے پورا نہ ہونے تک انتخابات سے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔

جب مظاہروں نے شدت اختیار کی تو ایوب خاں نے حزب اختلاف سے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے بارے میں گفتگو کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے لئے حزب اختلاف نے چند شرائط پیش کیں۔ ایوب خان نے ۲۱ ر فروری کو آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہ لینے کا اور سیاسی قیدیوں مجیب الرحمان بھٹو اور ولی خان کی رہائی کا اور ہنگامی حالات کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ۲۶ ر فروری کو گول میز کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں ذوالفقار علی بھٹو اور بھاشانی نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور تمام ملک میں ایک افراتفری مچ گئی۔ خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہنگاموں اور بلووں کی ایک رو چل نکلی۔

ان حالات میں یاسی انتشار [illegible] چنانچہ ہنگاموں اور بلووں کے پیش نظر ملک میں ۲۵ مارچ [illegible] ایوب خان نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا اور جنرل یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی۔ ملکی آئین کو منسوخ کر دیا گیا اور مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا۔ نئی فوجی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ملک میں جمہوریت کو بحال کر دے گی۔ اس نے وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر دیا۔ اور ۳۱ ر مارچ ۱۹۷۰ء کو قانونی ڈھانچہ جاری کیا جس کے مطابق دسمبر ۱۹۷۰ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات شروع ہوئے۔ اس انتخاب میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے نمائندے کثرت سے کامیاب ہوئے۔ اقتدار کے مسئلے پر مغربی اور مشرقی پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے مابین اختلافات شروع ہو گئے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ جس کے نتیجے میں شر پسندوں اور غداروں کے خلاف فوجی کارروائی عمل میں لانا پڑی۔ اس پر نومبر ۱۹۷۱ء میں ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ۱۶ ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے بڑے نامساعد حالات میں ہتھیار ڈال دیئے اور پورے مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا قبضہ ہو گیا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار بھٹو پاکستان کی قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت میں صدر مملکت اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی ہدایت پر وفاقی وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے ۱۰ ر فروری ۱۹۷۳ء کو اسمبلی میں آئینی بل پیش کیا۔ جسے قومی اسمبلی نے ۱۲۵ ووٹوں سے منظور کر لیا کسی نے مخالفت میں ووٹ نہیں ڈالا۔ حزب اختلاف نے بھی آئین کی حمایت کی۔ پاکستان کی مختصر اور متنوع تاریخ میں متفقہ طور پر نئے آئین کی منظوری انوکھی بات ہے اس سے پہلے کبھی متفقہ طور سے کوئی آئین تیار نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کوئی آئین براہ راست عوامی نمائندوں نے مرتب کیا۔ اس آئین کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

یہ آئین اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی جمہوری وفاقی پارلیمانی ہے اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اس کے دیباچے میں یہ درج ہے کہ "اس حقیقت کے پیش نظر کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد کائنات پر مختار کل ہے اور پاکستان کے عوام جو اختیارات اس کی بتائی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے ان کی حیثیت ایک مقدس امانت کی ہے جس میں اسلام کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں پر مکمل عمل کیا جائے جس میں مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق بنائیں اور اسلام کے تقاضے پورے کریں گے۔"

پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم دونوں مسلمان ہوں گے اور انہیں یہ اعلان بھی کرنا پڑے گا کہ وہ قرآن کو آخری کتاب اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانتے ہیں اس کے علاوہ پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام کے بنیادی تصورات کے مطابق ڈھالنے کا موقع فراہم کرنے اور انہیں قرآن وسنت کا مفہوم سمجھنے میں مدد دینے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔ اور سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ تمام قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق بنایا جائے گا۔

یہ آئین وفاقی ہے اور وفاق پاکستان کے چار حصے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان ہیں مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ وفاقی پارلیمانی دو ایوانوں سینیٹ اور قومی اسمبلی پر مشتمل ہے آئین میں پاکستان کی قومی زبان اردو قرار دی گئی ہے

Marfat.com

عوامی حکومت :- جب ذوالفقار علی بھٹو نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اس وقت ملک کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سقوطِ ڈھاکہ سے پوری قوم نڈھال ہو چکی تھی۔ ۹۰ ہزار سے زائد فوجی ہندوستان کی قید میں تھے۔ چنانچہ عوامی حکومت نے بلا تاخیر نئی اصلاحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس حکومت نے مختلف شعبوں میں مندرجہ ذیل اصلاحات کیں۔

ا :- یکم مارچ ۱۹۷۲ء کو زرعی اصلاحات کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔

- انفرادی ملکیت اراضی کی حد ۱۵۰ ایکڑ نہری اور ایک ہزار ایکڑ بارانی زمین مقرر ہوئی۔

ان اصلاحات پر عملدرآمد کرنے کے لئے ایک وفاقی لینڈ کمیشن اور صوبوں میں الگ الگ زرعی کمیشن قائم کئے گئے۔ یہ کمیشن ۱۹۷۲ء سے لے کر نومبر ۱۹۷۴ء تک زرعی اصلاحات کے تحت ۱۶ لاکھ ۱۵ ہزار ۱۹۱۳ ایکڑ فاضل زمین حاصل کر چکا ہے اور اس میں ۵ لاکھ ۲۷ ہزار ۱۶۴ ایکڑ اراضی بے زمین کاشت کاروں میں مفت تقسیم کی جا چکی ہے۔

ب :- ۱۰ فروری ۱۹۷۲ء کو نئی لیبر پالیسی کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ جس کے تحت مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے متعدد انقلابی اقدامات کئے گئے۔ نئی مزدور حکمت عملی کے تحت مقررہ اوقات کار سے زائد کام کی زائد اجرت اور دورانِ کار محنت کشوں کی موت یا ناکارہ یا زخمی ہو جانے کے مفت معاوضہ اور دیگر مراعات کی فراہمی۔ منافع میں مزدوروں کا حصہ ۲½ فیصد سے بڑھا کر ۴ فیصد کر دیا گیا۔ تمام مزدوروں کو بڑھاپے کی پنشن اجتماعی بیمہ اور گریجویٹی کی سہولیات بھی دی گئی ہیں۔

اگر کارخانے عارضی طور پر بند ہوں گے تو محنت کشوں کو اس مدت کی پوری تنخواہ ملے گی۔

کسی کارکن کی موت واقع ہو جانے پر ۵۰ روپے سے لے کر ۵۰۰ روپے تک کفن دفن کے اخراجات کے طور پر دیئے جائیں گے۔

محنت کشوں کو ملازمتوں کا تحفظ حاصل ہو گا۔ ان کی حق رسی کے لئے لیبر عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

ج :- ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا جس کے تحت پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک تعلیم مفت کر دی گئی۔

تمام نجی کالجوں اور سکولوں کو یکم ستمبر اور یکم اکتوبر سے قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ نئی تعلیم پالیسی کے تحت صوبہ پنجاب میں ۹۶ کالجوں اور ۳۴۰ سکولوں کو صوبہ سندھ میں ۹۷ کالج اور ۱۳۴۰ سکولوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا۔

پانچ نئے بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن قائم کئے گئے سیدو شریف، ملتان اور سکھر میں نئی یونیورسٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔

اسلام آباد میں ایک اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ خط و کتابت کے کورسوں کے ذریعے ٹیوٹوریل، ٹیلی ویژن، فلم اور ریڈیو کے ذریعے سے تعلیم بہم پہنچائے گی۔

تعلیم بالغاں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

د :- اس کے علاوہ حکومت نے انتظامی اصلاحات، صنعتی اصلاحات بنکاری اصلاحات اور صحت کی اصلاحات کر کے ملکی زندگی میں بہت سے اچھے کام کئے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک بہترین پالیسی حج کی ہے۔ جس کے ذریعے ہزاروں افراد کو حج کی سعادت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔

کراچی میں مہٹہ پیلس کا ایک منظر

خارجہ پالیسی :- پاکستان کی خارجہ پالیسی دنیا میں پاکستان کی نئی حیثیت اور اس کے نئے کردار کی مظہر ہے اس خارجہ پالیسی کے ذریعے عوامی حکومت نے اپنے دورِ اقتدار کے پہلے چار سالوں میں خارجہ پالیسی کے بڑے بڑے مقاصد حاصل کئے ہیں۔ اس دور میں اسلامی سربراہوں کی ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ۳۷ ممالک شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ایسے مسائل اٹھائے گئے۔ جن کا سامنا عالمِ اسلام کو ہے۔ امریکہ نے پاکستان کو اسلحہ کی سپلائی پر دس برس سے جو پابندی عائد کر رکھی تھی وہ ہٹالی گئی۔ پاکستان، بھارت کے ساتھ براہ راست مقابلہ میں سلامتی کونسل کا رکن منتخب ہو گیا۔ بنگلہ دیش کے ساتھ نئے دوستانہ تعلقات بحال ہو گئے۔

موجودہ حکومت کا سب سے اہم کارنامہ قادیانی مسئلہ کا حل ہے۔ یہ ایک نوے سال پرانا مسئلہ تھا جسے ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے قومی اسمبلی میں پیش کیا۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں ایک بین الاقوامی سیرت کانگرس پاکستان کے شہر کراچی اور ہر صوبائی دارالحکومت میں منعقد کی گئی۔ بعد ازاں اسے سیرت فاؤنڈیشن کے نام سے مستقل ادارے کی حیثیت دے دی گئی۔

اقتصادی و دیگر معلومات :- پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ تقریباً ۸۰٪ لوگوں کا روزگار زراعت سے وابستہ ہے۔ پاکستان کا کل قابل کاشت رقبہ ۱۰ کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ ہے۔ جس میں سے ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ ایکڑ رقبہ زیر کاشت ہے۔ اس میں سے بارانی اور سیم زدہ رقبے کو چھوڑ کر کل رقبہ ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ سے فصلیں اٹھائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں دو بڑی فصلیں ہوتی ہیں جو ربیع اور خریف کہلاتی ہیں۔ ربیع فصل موسم سرما کی فصل ہے، جس میں گندم، جو، چنے، سرسوں وغیرہ شامل ہیں۔ فصل خریف موسم گرما کی فصل ہے۔ جس میں چاول، مکئی، جوار، باجرہ اور گنا شامل ہے۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان میں گندم ۴۰۰، ہزار میٹرک ٹن چاول ۲۲۰۲ ہزار میٹرک ٹن، مکئی ۶۴۸ ہزار میٹرک ٹن، گنا ۲۱۰ ہزار میٹرک ٹن اور کپاس ۶۹۰ ہزار میٹرک ٹن پیدا ہوئی تھی۔ دیگر اہم فصلوں میں جو، جوار، باجرہ، دالیں، پٹ سن، تیل نکالنے کے بیج، تمباکو، سبزیاں اور پھل شامل ہیں۔

پاکستان کا نہری نظام دنیا کا بہترین نظام ہے۔ ۱۹۶۰ء میں بھارت اور

Marfat.com

پاکستان کے درمیان سندھ طاس کے معاہدے پر دستخط ہوئے تھے۔ جس کی رو سے ۱۹۷۰ء کے بعد سے بھارت تین مشرقی دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی کے پانی کو روک کر اپنے استعمال کے لئے مختص کرے گا۔ چنانچہ ایک فنڈ قائم کیا گیا، جس میں آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، نیوزی لینڈ، امریکا اور برطانیہ نے بین الاقوامی بینک کے ذریعے پاکستان کو ایک ارب امریکی ڈالر کی امداد دی تاکہ پاکستان اپنا متبادل نہری نظام قائم کر لے۔ اس مقصد کے لئے ۴۰۰ میل لمبی نہریں اور دریائے سندھ پر بند تعمیر کئے جانے تھے۔ چنانچہ پاکستان نے دریائے سندھ پر تربیلا بند کے علاوہ غلام محمد بیراج اور لائلپور بیراج، نیز دریاؤں کے مابین پانی کی تقسیم کے لئے نہریں تعمیر کریں۔ بھارت نے مشرقی دریاؤں کا پانی روک لیا تو ان میں دریائے سندھ کا پانی ڈال کر زرعی ضرورت پوری کی جانے لگی۔ اسے سندھ طاس منصوبے کا نام دیا گیا۔ پاکستان کے بند اور بیراج میں تونسہ، راول، سہاں، رسول، چراہ، منگلا، تربیلا، ٹانڈا، گریل، خانپور بارام، سملی، گدو، سکھر، غلام محمد، حب، وارسک، خارکی، رارکو اور کرم گڑھی قابل ذکر ہیں۔ نہروں میں لوئر چناب، اپر چناب، لوئر جہلم، اپر جہلم، لوئر باری، اپر باری، ستلج، بہاول، دوان، صدیقیہ، عباسیہ، پاکپتن، دیپالپور، تھل، لائلپور بیراج، کوٹری اور لنک نہریں قابل ذکر ہیں۔ ان میں تربیلا ڈیم دنیا کا سب سے بڑا بند اور نہر لائنڈ بیراج سب سے بڑی نہر ہے

سندھ طاس کے منصوبے کے تحت فروری ۱۹۵۸ء میں واپڈا کا محکمہ قائم کیا گیا۔ اور مئی ۱۹۶۲ء میں دریائے جہلم پر منگلا بند کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ یہ بند ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں دریائے سندھ پر تربیلا کے مقام پر دنیا کا سب سے بڑا بند تعمیر کیا جانے لگا۔ اس بند کو ۱۹۷۵ء میں مکمل ہو جانا تھا لیکن سرنگوں کی خرابی اور ناقص تعمیر کی وجہ سے ابھی (۱۹۷۶ء) تک زیر استعمال نہیں آیا۔ سندھ طاس منصوبے کے تحت ۴۰۰ میل لمبی لنک نہریں تعمیر کی گئیں۔ ان میں سات بڑی اور کئی چھوٹی نہریں شامل ہیں۔ (۱) رسول قادر آباد نہر جہلم کا پانی چناب میں لے جاتی ہے (۲) قادر آباد بلوکی نہر چناب کا پانی راوی میں لے جاتی ہے۔ (۳) بلوکی سلیمانکی نہر راوی کا پانی ستلج میں لے جاتی ہے۔ (۴) چشمہ، جہلم نہر سندھ کا پانی جہلم میں لاتی ہے (۵) سدھنائی میلسی بہاول نہر سندھ جہلم اور چناب کا پانی ستلج میں نکلنے والی اسلام ہیڈورکس کی نہروں تک لے جاتی ہے۔ (۶) تونسہ پنجند نہر سندھ کا پانی پنجند تک لاتی ہے (۷) تریموں سدھنائی نہر سندھ جہلم اور چناب کا پانی راوی میں لاتی ہے۔ اس منصوبے کے تحت جو بیراج بنائے گئے ہیں یہ ہیں (۱) سندھ پر چشمہ بیراج، جہلم پر رسول بیراج، چناب پر قادر آباد بیراج، راوی پر سدھنائی کے قریب ایک بیراج، ستلج پر میلسی کے قریب بیراج۔

صنعتی میدان میں بھی پاکستان نے کافی ترقی کی ہے۔ آبادی کا دس فیصد صنعتی ملازم ہے۔ پاکستان کی سب بڑی صنعت کپڑے کی ہے۔ ۱۹۷۳ء میں پیداوار سوتی کپڑا ۶۲ کروڑ گز، سوتی دھاگہ ۶۵ کروڑ پونڈ، سیمنٹ ۲۰ لاکھ ٹن اور چینی چار لاکھ ٹن تھی

پاکستان کی تجارت زیادہ تر امریکا، برطانیہ، بلجیم، بلغاریہ، چین، چیکوسلواکیہ، ہنگری، انڈونیشیا، اردن، پولینڈ، روس، مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک اور افریقہ کے تمام ممالک کے ساتھ ہوتی ہے۔

برآمدات میں کپاس، اون، کھالیں، چاول، تیل نکالنے کے بیج اور سبزیاں شامل ہیں۔ درآمدات میں مشینری، لوہا، فولاد، گاڑیاں، ادویہ، کیمیائی اشیاء، گھڑیاں، بجلی کا سامان، کوئلہ اور کتابیں شامل ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان نے چھ ارب سوا کی برآمدات اور چھ ارب اکتیس کروڑ روپے کی درآمدات کی تھیں۔

پاکستان کی معدنیات میں کوئلہ، کرومائیٹ، تانبا، [illegible] سرمہ، نمک، گندھک، سنگ مرمر، ابرق، باکسائٹ، چونے کا پتھر، جپسم، پٹرولیم، قدرتی گیس اور یورینیم اہم ہیں۔

پاکستان کے ذرائع مواصلات میں ریلوے کی کل لمبائی ۵۴۲۶ میل ہے جس پر کل ۸۶۰ سٹیشن ہیں۔ اعلیٰ سڑکوں کی کل لمبائی ۲۱۴۶۸ میل اور کچی سڑکوں کی کل لمبائی ۲۲۵۰۰ میل ہے۔ ہوائی راستے پاکستان میں دنیا بھر کے علاوہ اندرون ملک اہم اور بڑے بڑے شہروں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ ڈاک خانوں کی کل تعداد ۸۵۰۰ ہے۔ اور تار گھر ۱۲۵۰ ہیں۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ تاہم صوبوں کو ان کی صوبائی زبانیں استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، جو پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی اور سرائیکی ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان میں پرائمری سکولوں کی تعداد ۴۰ ہزار تھی، جن میں ۴۴ لاکھ بچے زیر تعلیم تھے۔ اور ایک لاکھ پانچ ہزار اساتذہ پڑھا رہے تھے۔ سیکنڈری سکول ۴۰۷۶ تھے۔ جن میں ۱۲ لاکھ طلبا داخل تھے۔ اور ۹۰ ہزار اساتذہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان میں عام کالجوں کی کل تعداد ۳۶۲ تھی، جن میں دو لاکھ طلبا زیر تعلیم تھے۔ پاکستان میں عام تعلیم کی نو یونیورسٹیاں پنجاب (لاہور)، ملتان، اسلام آباد، پشاور، گومل (ڈیرہ غازی خان)، ہزارہ (ایبٹ آباد)، سندھ (حیدر آباد)، کراچی اور کوئٹہ میں۔ انجنیئرنگ کی ایک یونیورسٹی لاہور میں، زراعت کی لائلپور اور اسلامیات کی بہاولپور میں ہیں۔ پاکستان میں پیشہ وارانہ کالجوں کی تعداد ۴۲، فنی کالجوں اور درسگاہوں کی تعداد ۱۲۶، تربیت اساتذہ کے کالجوں اور اداروں کی تعداد ۸۰ اور تربیت اساتذہ کے سکول ۵۳ ہیں۔

دفاعی لحاظ سے پاکستان کی بری فوج ۱۳ پیادہ، دو آرمڈ اور دو آزاد ڈویژنوں پر مشتمل ہے۔ فوجیوں کی کل تعداد ۳ لاکھ ۹۵ ہزار ہے۔ بحریہ میں تین ڈیزل آبدوزیں ۶ عام آبدوزیں، چار تباہ کن جہاز، دو آبدوز شکن فریگیٹ، چار تیز رفتار پیڈو کشتیاں، ایک سروے جہاز، دو ساحلی دفاعی جہاز اور چند دیگر جہاز اور کشتیاں شامل ہیں۔ بحریہ کی کل تعداد ۹۵۰ افسروں اور ۹۰۵۰ سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ فضائیہ میں بی بمبار کینبرا طیاروں کا ایک سکواڈرن، سیبر جیٹ کے ۵ سکواڈرن اور چند دیگر طیاروں پر مشتمل ہے۔ کل ۲۷۵ ہوائی جہاز اور سترہ ہزار فوجی ہیں۔

پاکستان میں پانی کی بے شمار طاقت ہے، جسے بجلی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ دریائے سندھ اور دریائے کابل پر ایسے بے شمار منصوبے تعمیر کئے گئے ہیں، جہاں پن بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں پن بجلی کی کل پیداوار سات لاکھ کلوواٹ ہے۔ مزید براں بھاپ اور گیس سے ایک لاکھ کلوواٹ اور ڈیزل سے پچاس ہزار کلوواٹ اور دیگر مقامی ذرائع سے دو لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے بڑے بڑے بجلی گھر وارسک، مالاکنڈ، درگئی، رسول، منگلا، تونسہ، رورٹی، چیچوکی ملیاں، شادیوال، شندی پور، ملتان، کوئٹہ، حیدر آباد، لائلپور، شاہدرہ، گدو، سکھر، کراچی اور جام شورو کے مقامات پر ہیں۔ حال ہی میں کراچی میں ایٹمی قوت سے چلنے والا ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے ایسے پانچ اور بجلی گھر پاکستان میں مختلف مقامات پر بنائے جا رہے ہیں۔

پاکستان میں سوئی (بلوچستان)، ڈیرہ غازی خان اور خیرپور کے مقامات پر قدرتی گیس کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ پاکستان بھر میں ۵۵ فیصد گیس صنعتی اداروں میں ۳۶ فیصد بجلی گھروں میں اور ۹ فیصد عام گھریلو استعمال میں آ رہی ہے۔ (نیز دیکھئے "بنگال"، "بنگلہ دیش" "بھارت"، "مشرقی پاکستان"، "مغربی پاکستان"، "ہندوستان")

Marfat.com

دنیا بھر میں ارزاں ترین

۱- حاجی مُراد ٹالسٹائی ۲/۵۰
۲- لَوسٹوری ایریچ سیگل ۲/-
۳- غبارِ خاطر مولانا ابوالکلام آزاد ۳/۵۰
۴- نوٹرے ڈیم کا کبڑا وکٹر ہیوگو ۲/۵۰
۵- دارا شکوہ قاضی عبدالستار ۳/-
۶-۷} رومیو جولیٹ - میکبتھ ۳/۵۰
۸- سائنس سے بھی عجیب تر صابر کلوروی ۲/-
۹- مہمانِ بہار - آتشِ رفتہ اشفاق احمد، یحییٰ ہاشمی ۳/-
۱۰- آوازِ دوست مختار مسعود ۳/-
۱۱- بھوانی جنکشن جان ماسٹرز ۲/۵۰
۱۲- پولیس افسر کی ڈائری دلاور حسین یوسفی ۲/۵۰
۱۳- شاہنامہ اسلام (اوّل) حفیظ جالندھری ۳/-
۱۴- چلتے ہو تو چین کو چلیے ابن انشا ۲/۵۰
۱۵- علی اور نینو قربان سعید ۲/۵۰
۱۶- تحریکِ پاکستان شمیم احمد ۳/-
۱۷- صحرا نورد کے خطوط (اوّل) میرزا ادیب ۳/-
۱۸- النبی الخاتم مناظر احسن گیلانی ۲/۵۰

۱۹- شاہنامہ اسلام (دوم) حفیظ جالندھری ۳/-
۲۰- فردوسِ بریں عبدالحلیم شرر ۲/۷۵
۲۱- ایمانیات مونس زبیری ۲/۲۵
۲۲- جین آئر برونٹے ۴/-
۲۳- شکست کرشن چندر ۳/-
۲۴- مجبور آوازیں کے ایل گابا ۴/-
۲۵- شاہنامہ اسلام (سوم) حفیظ ۳/-
۲۶- قائدِ اعظم میری نظر میں اصفہانی ۴/-
۲۷- مقدس نازنین عبدالحلیم شرر ۴/-
۲۸- صحرا نورد کے خطوط (دوم) میرزا ادیب ۳/۵۰
۲۹- خزینہ معلومات سیفی تونگانوی ۴/-
۳۰- علیگڑھ کے تین نامور فرزند نسیم سوہدروی ۲/-
۳۱- شاہنامہ اسلام (چہارم) حفیظ ۳/-
۳۲- محبت عظیم ہے - گیرازیا ڈیلیڈا ۵۰
۳۳- نقوشِ قائدِ اعظم ریئس ۲/۵۰
۳۴- اردو کی آخری کتاب ابن انشا ۲/۵۰
۳۵- رحمتِ عالم، سید سلیمان ندوی ۲/-
۳۶- اسرائیل، علی اکبر ۲/۵۰

ہر موضوع اور
ہر زبان کے شاہ کار
قدیم و جدید

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو
انتہائی باقاعدگی سے
شائع ہو رہے ہیں

Marfat.com

حوالہ جاتی کُتب شائع کرنے والا

پاکستان میں سب سے بڑا اشاعتی ادارہ

مکتبہ شاہکار

ہر ماہ تین انسائیکلوپیڈیا باقاعدگی سے پیش کر رہا ہے۔

بے بی انسائیکلوپیڈیا

پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کے طلبا کے لیے

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا

زندگی اور کائنات کے ہر موضوع پر: بچوں کے ذہن کے مطابق ردیف وار ترتیب میں ڈھائی ہزار عنوانات پر مضامین باتصویر۔ رنگین، آفسٹ طباعت۔ قسط وار

قیمت فی قسط: ۲/۵۰ روپے — ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے: سالانہ چندہ مع رجسٹری: ۲۵/- روپے

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے

ردیف وار ترتیب میں چار ہزار سے زائد عنوانات پر مختصر مگر جامع مضامین جن میں اسلامیات کے ہر موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر قسط میں تقریباً ایک سو مضامین۔ جابجا تصاویر، نقشے اور خاکے۔

قیمت فی قسط: -/۳ روپے — ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے: سالانہ چندہ مع رجسٹری: -/۴۰ روپے

انسائیکلوپیڈیا معلومات

اُردو کا سب سے بڑا عمومی انسائیکلوپیڈیا

۱۲۵ سے زائد قدیم و جدید علوم و فنون کی بنیادی معلومات، زندگی اور کائنات کے ٹھوس حقائق اور علمی، سیاسی، سائنسی، معاشرتی، علمی و ادبی، مذہبی اور تمدنی حالات و کوائف، نقشے، اعداد و شمار، خاکے، ضروری تصاویر۔ ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے کا انسائیکلوپیڈیا آسان قسطوں میں۔

قیمت فی قسط: -/۳ روپے — ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے — سالانہ: -/۴۰ روپے

سرورق: ایشین آرٹ پریس، ۱۴، میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط (۱۰) وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیر اعلیٰ : سیّد قاسم محمود

• مدیر : عطش درانی

• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳

تار : "شاہکار"

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

مکتبہ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴- لاہور

شاہکاریہ

علمی سفر اور تحقیق کے سنگِ میل.....

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عقیدت کے باعث شخصیات کے احوال و آثار محض محاضرات، خارق عادات اور کرامات وغیرہ کا تذکرہ بن کر رہ جاتے ہیں جن سے تاریخی واقعات میں غلو کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اصولِ تحقیق کی رو سے سب سے پہلے سابقہ ماخذ کے بارے میں تشکک کا مفروضہ قائم کیا جاتا ہے پھر اپنے سوال کے مطابق ماخذ کی پرکھ کی جاتی ہے استناد کے بعد استنباطِ نتائج کی باری آتی ہے اور یوں کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے ایک سچے محقق کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے نتیجے پر اڑے رہنے کی بجائے نئی تحقیقات کا منتظر رہے اور جیسے ہی کوئی نئی تحقیق پورے طور پر اور ہر پہلو سے صحیح ہو کر سامنے آئے وہ اسے تسلیم کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر سے کنارہ کش ہو جائے خواہ اس کی پرانی عقیدت کا محل دھڑام سے آگرے۔

چنانچہ اسی لئے سرورق کے آخری صفحے پر "مباحث" کے عنوان سے قارئین کے علمی و تنقیدی خطوط چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جو قارئین کرام متنازعہ موضوع سے متعلق اظہارِ خیال کرنا چاہیں ان کے لئے صلائے عام ہے تاکہ علمی سفر کے دوران میں تحقیق کے سنگِ میل بھی آتے جاتے رہیں۔

قسط نمبر ۴ میں ہم نے قسط نمبر ۱ تا ۳ کی چند اہم ترامیم پیش کی تھیں۔ اس بار قسط نمبر ۴ تا نمبر ۹ کی ترامیم پیش ہیں۔ براہ کرم اصلاح فرما لیجئے۔

ص ۱۴۸، کالم ۲، سطر ۳ جملہ یوں ہے " تابوت سکینہ میں بائبل کی رو سے حضرت یوسف کا جسد اور کپڑے بند تھے "

ص ۱۵۳، کالم ۲، سطر ۲ "چوتھی صدی عیسوی" کی بجائے "چوتھی صدی قبل مسیح" ہے۔

ص ۱۶۱، کالم ۲ "اسماعیل اوّل" کے مضمون میں تاریخ پیدائش ۱۸۴۷ء کی بجائے ۱۴۸۷ء درج کیجئے۔

ص ۱۹۰، کالم ۲ "آخری سے پہلی سطر" انتیسواں" کی بجائے "انتالیسواں" پڑھیئے۔

ص ۲۱۰، کالم ۲ " المجادلہ، سورة " کا نام " المحادلہ، سورة " چھپا ہوا ہے

ص ۲۲۴، کالم ۲، سطر ۱۱ مصطفٰے منفلوطی کا نام " مصطفٰے منظوطی" معلوم ہوتا ہے؟

ص ۲۲۵، کالم ۲، "اہلِ بیت" پر مضمون میں تیسرا پیرا "اس سورت میں" کی بجائے "اس صورت میں" سے شروع ہوتا ہے۔

ص ۳۲۷، کالم ۲، سطر ۳۱ "ہندو مسلم اتحاد کے لئے" کی بجائے "ہندو مسلم اتحاد کے خلاف" ہے

ص ۳۲۸، کالم ۲، سطر ۱ "شاہ عبدالعزیز" کی بجائے "سید احمد شہید" ہے۔

ص ۳۶۲، کالم ۲، " بندونگ کانفرنس " کے ممالک کا رقبہ ایک کروڑ ۳۶ لاکھ ۲۹ ہزار مربع میل تھا

ص ۴۲۳، آبادی کے خاکے میں حیدر آباد ڈویژن کی آبادی شائع ہونے سے رہ گئی ہے درج کر لیجئے:

کل : ۵۳۶۶ مرد = ۲۸۳۶ عورتیں = ۲۵۳۰ ضلع دادو (مرد ۴۲۵ - عورتیں ۳۷۹) ضلع ٹھٹھہ (مرد ۳۹۰ عورتیں ۳۲۷) ضلع سانگھڑ (مرد ۳۶۴ - عورتیں ۳۱۵) ضلع تھرپارکر (مرد ۵۳۳ - عورتیں ۴۶۸) ضلع حیدر آباد (مرد ۱۱۵۴ - عورتیں ۱۰۴۸)

ص ۴۲۶، کالم ۱، سطر ۳ قائد اعظم کی تاریخ وفات یکم جولائی ۱۹۴۸ء شائع ہو گئی ہے تصحیح کر لیجئے (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء)

تاریخ اشاعت: ۱۵ جولائی ۱۹۷۶ء * ناشر: سیّد قاسم محمود * طابع: ریاض حسین، الجدہ پرنٹرز لاہور

Marfat.com

پاکیزگی :- صفائی۔ (دیکھئے طہارت)

پالمائرا :- دمشق کا ایک شہر (دیکھئے تدمر)

پانی ماء، آب، دنیا کا ایک اہم مرکب، جو سلسلہ حیات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں پانی کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے۔" (۲۱ : ۳۰)

دوسری جگہ اس مطلب کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر، جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے" (۲۴ : ۴۵)

علماء نے سات قسم کے پانی کو پینے اور طہارت حاصل کرنے کے لئے جائز قرار دیا ہے۔۔۔ بارش کا پانی۔ چشمے کا پانی، کنوئیں کا پانی، اولوں کا پانی، برف کا پانی، سمندر کا پانی، دریا کا پانی۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے "آنحضورؐ سے جنگل کے گڑھوں کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جہاں جنگل کے جانور آ کر پانی پیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر پانی دو قلے ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔" (قلہ دو مشکوں کے برابر ہوتا ہے۔)

ایک اور حدیث میں جو ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے۔ آنحضورؐ سے راہ مکہ و مدینہ کے درمیان حوضوں کے پانی کے متعلق دریافت کیا گیا جن سے درندے اور کتے بھی پانی پیا کرتے تھے کہ ان کا پانی مطہر ہے تو آپؐ نے فرمایا۔ جانوروں کے پینے سے پانی پاک ہی رہتا ہے۔ (مشکوٰۃ : کتاب طہارۃ)

پانی پینے کے آداب کے ضمن میں مندرجہ ذیل احادیث ہیں :-

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا تم میں سے کوئی بائیں ہاتھ سے ہرگز کھانا نہ کھائے۔ اور نہ بائیں ہاتھ سے پانی پیے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضورؐ پانی پینے کے درمیان تین مرتبہ سانس لیتے۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے (مسلم)

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا ہے جو شخص چاندی کے برتن میں پینے کی کوئی چیز پیتا ہے تو اس کا یہ پینا اس کے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھڑکائے گا۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے پانی کے برتن میں پانی پیتے وقت سانس لینے اور پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے (ابو داؤد)

پانی پت بھارت کے ضلع کرنال کا ایک قصبہ اور اسی نام کی تحصیل، دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہے۔ قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کی تاریخ مہابھارت کے زمانے سے پہلے کی ہے۔ پانڈوں اور کوروں کی جنگ میں جو میدان مقابلے کے لئے منتخب کیا گیا وہ پانی پت ہی تھا۔ بقول سر سید احمد خاں دہلی کے راجہ ڈنڈپالی نے پانی پت بسایا اور اس نے ۷۰ قبل مسیح سے ۹۱ قبل مسیح تک یہاں راج کیا۔ یہ عین ممکن ہے کہ پانی پت کی قدیم آبادی ویران ہو گئی ہو اور عمارات تباہ و برباد ہو گئی ہوں اور بعد میں راجہ ڈنڈپالی نے اسے از سر نو بسایا ہو۔ بعد کے زمانے میں راجہ ارجن نے شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان قلعہ بنایا اور شہر کے چاروں طرف مضبوط فصیل تیار کرائی جس کے پندرہ دروازے تھے۔ آج کل قلعہ ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جو کافی وسیع ہے۔

پانی پت ہمیشہ شمال مغربی دروں سے ہندوستان پر حملہ کرنے والوں کی جولانگاہ رہا ہے۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں یونانیوں نے اس پر حملے کئے اور لوٹ مار کر کے آگے چلے گئے۔ ان کے بعد وسط ایشیائی قومیں مختلف ادوار میں (۱۵۰ قبل مسیح سے ۴۰۰ء تک) اس پر حملے کرتی رہیں۔

۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء میں محمود غزنوی نے پانی پت اور تھانیسر پر حملہ کیا۔ محمود کی واپسی پر ہندو راجہ دوبارہ اس علاقے پر قابض ہو گیا۔ ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں محمود غزنوی کے لڑکے مسعود نے دوبارہ اس علاقے پر قبضہ کیا۔ ۴۳۴ھ/۱۰۴۳ء میں پانی پت پر دوبارہ ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔

جس زمانے میں عرب شام ایران اور عراق سے مسلمانوں کے مختلف خاندان ہندوستان کے مختلف شہروں میں آئے۔ تو پانی پت اپنی بہتر آب و ہوا کے لحاظ سے ان لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور آہستہ آہستہ یہ مقام اہل علم کا مرکز اور صوفیاء و اولیاء کا مسکن بن گیا۔

پانی پت کی عظمت کا زمانہ خاص طور سے وہ تھا جب شاہ شرف بو علی قلندر یہاں تصوف، سلوک اور روحانیت کا درس دے رہے تھے۔ چنانچہ اس وقت پانی پت ہندوستان کے منتخب بزرگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہاں سات سو علماء و فضلاء موجود تھے۔

پانی پت کی سیاسی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلّم ہے کہ یہاں پر ہمیشہ قوموں، سلطنتوں اور حکومتوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ مثلاً ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دی۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء میں اکبر نے ہیمو کی فوجوں کا قلع قمع کیا اور آخری بار ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو احمد شاہ درانی نے شکست دی۔

اس شہر کی سیاسی اہمیت کی وجہ اس کا محل وقوع تھا۔ کیونکہ شمال مغربی دروں سے جو بھی حملہ آور ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی پر حملہ کرتا تھا پانی پت اس کے راستے میں پڑتا۔

۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء میں پانی پت انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۸۲۴ء میں پانی پت کو ضلع بنا دیا گیا۔ کرنال اور سونی پت اس کی تحصیلیں قرار پائیں۔ بھارتی حکومت نے کرنال کو ضلع بنا کر پانی پت کو اس کی تحصیل قرار دیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں پانی پت کی آبادی اسی ہزار کے قریب تھی۔

پٹنہ بھارت میں ریاست بہار کا ایک شہر، ضلع اور ڈویژن کا صدر مقام دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر آباد ہے۔ پٹنہ شہر کی آبادی ۱۹۷۱ء میں چار لاکھ ۹۰ ہزار تھی۔ ۱۹۱۲ء میں برطانوی ہند کا صوبہ بہار اور اڑلیسہ دو حصوں میں تقسیم ہوا تو پٹنہ بہار اور اڑلیسہ کا صدر مقام بنایا گیا۔

یہ قدیم شہر ہے یہ قدیم تاریخی مقام پاٹلی پتر کی جگہ آباد ہوا۔ اشوک کے عہد میں پاٹلی پتر اس سلطنت کا صدر مقام تھا جو ہندوکش سے خلیج بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۵۴۱ء میں پٹنہ کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ جبکہ شیر شاہ سوری نے اسے پہلی بار بہار کا دارالحکومت بنایا۔ مغلوں کے دور میں پٹنہ ایک تجارتی مرکز اور بہار کا دارالحکومت تھا۔ پٹنہ کے جنوب مغربی حصے میں پاٹلی پتر کے کھنڈر دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سو ستونوں والا ایک

Marfat.com

ایوان بھی ہے جو مہاراجہ اشوک نے بنوایا تھا۔

۱۹۱۴ء میں پٹنہ میں ایک ہائیکورٹ بنائی گئی اور ۱۹۱۷ء میں ایک یونیورسٹی قائم ہوئی پٹنہ کا بڑا حصہ خاص شہر پر مشتمل ہے۔ جو دریا کے کنارے نو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کی تجارت کا مدار مقامی پیداوار پر ہے۔ یہاں کی بڑی بڑی عمارات میں گورنمنٹ ہاؤس، سیکرٹریٹ، کونسل چیمبرز، عجائب گھر اور ہائیکورٹ ہیں۔

قدیم عمارات میں سے ایک مسجد صحیح و سالم ہے۔ جس کا صحن سنگ مرمر کا ہے۔ یہ مسجد ۱۴۹۹ء میں بنگال کے حاکم حسین شاہ نے بنوائی تھی۔ اس کے علاوہ شیر شاہ سوری کی مسجد اور جہانگیر کے بیٹے شاہزادہ پرویز کی مسجد بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک عمارت جو "گولا" کے نام سے مشہور ہے خاص اینٹ سے بنی ہوئی ہے جو ۱۷۸۶ء میں بنی تھی۔ یہ عمارت سو فٹ بلند ہے۔ یہاں ایک کتب خانہ "خدا بخش کتب خانہ" کے نام سے ہے جو دنیا کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتب خانے میں آنحضور ﷺ کی پیدائش سے لے کر موجودہ زمانے تک کی اسلامی تصانیف محفوظ ہیں۔

ضلع پٹنہ کا رقبہ ۲،۰۶۸ مربع میل ہے اور تقریب قریب سارا ضلع ایک ہموار میدان ہے۔

پٹنہ ڈویژن میں پٹنہ، گیا اور شاہ آباد کے اضلاع شامل ہیں۔ ڈویژن کا کل رقبہ ۱۱۲۳۸ مربع میل ہے۔

یہ ڈویژن دریائے گنگا کے جنوبی کنارے واقع ہے۔ کل آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔

پٹنی تھائی لینڈ کا ایک ضلع اور صدر مقام جو جزیرہ نمائے ملایا کے مشرقی ساحل پر تھائی لینڈ کے انتہائی جنوب میں واقع ہے۔

یہ علاقہ کوہستانی ہے۔ صرف ساحل پر ایک میدانی پٹی ہے۔ اس کا رقبہ ۱۲ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔

پٹنی کا نام پہلی بار سولھویں صدی میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جب پرتگیزوں نے تجارت کی غرض سے یہاں آنا شروع کیا۔ یہ صدیوں سے سیام کے تحت تھا ۱۳۵۰ء میں پورا جزیرہ نمائے ملکا سیامی حکومت کے تحت تھا۔ پٹنی بھی اسی دوران میں فتح ہوا۔ ۱۵۱۱ء میں جب پرتگیزوں نے شہر ملکا فتح کیا تو انہوں نے پٹنی میں بھی تجارت شروع کر دی۔

یہ بات کہ یہاں کے باشندوں نے اسلام کب قبول کیا۔ پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ ۱۶۰۰ء میں یہ ایک اسلامی ملک ہو گیا تھا اور اس وقت اس پر ایک ملکہ حکمران تھی۔ عوامی روایات کے مطابق اس سرزمین کا فاتح چاؤسری بنگسا تھا۔ اس نے پہلے خود اسلام قبول کیا۔ اور سلطان احمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ پھر اس نے سارے ملک کے لوگوں کو مسلمان کیا۔ بعد میں اس نے ملکا کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔

مقامی باشندے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ جامع مساجد عام مساجد سے مختلف ہیں یہاں خاندانی امور سے متعلق قوانین میں شریعت کا اتباع کیا جاتا ہے اور دوسرے معاملات میں سیاسی قوانین کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں۔

پٹھان: پختون یا پشتون، پختو یا پشتو بولنے والے (دیکھئے "افغان")

پچوی، ابراہیم (۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء - ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء) ایک ترک مورخ بلقان کے قصبہ پچوی میں پیدا ہوا۔ بوسنیا اور ہنگری میں اس کے اجداد کی جاگیریں تھیں۔ تقریباً چودہ سال کی عمر میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ اپنے چچا زاد پاشا حاکم اودفن کے ہاں رہنے لگا۔ بعد میں اپنے ایک اور رشتہ دار محمد پاشا کے ہاں رہنے لگا۔ ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ء میں فوج میں ملازمت کر لی اور سنان پاشا کے ہنگری معرکوں میں حصہ لیا۔

۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں جب لالا محمد پاشا وزیر اعظم بنا تو پچوی مختلف عہدوں پر اپنی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ محمد پاشا کے انتقال کے بعد اس کے جانشین نے پچوی کو اناطولی میں وہاں کے سنجاقوں کے حالات لکھنے کے لئے بھیجا بعد میں دفترداری کے عہدے پر فائز ہو کر روم ایلی چلا گیا۔ پچوی شٹول وائزن برگ کا متصرف اور تسوار کا دفتر دار بھی رہا۔ ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں اس نے سرکاری ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور بقیہ زندگی اپنے پیدائشی وطن میں گذاری۔

جوانی ہی میں اسے تاریخ دانی کا شوق تھا۔ اس نے جو کتب تالیف کی ہیں انہیں اپنی معلومات اور مشاہدے کی بنا پر لکھا ہے اگرچہ ابتدائی تصانیف میں وہ اپنے پیشرو ترک تاریخ دانوں پر اعتماد کرتا تھا۔ اس کی تصانیف سلیس سادہ اور صاف زبان میں ہیں جو قلمی نسخوں کی صورت میں موجود ہیں۔ اس کی ایک تصنیف تاریخ پچوی کے نام سے مشہور ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سلطان سلیمان اعظم کی تخت نشینی سے مراد چہارم کی وفات تک کے زمانے کے حالات تحریر ہیں۔

پرتگال جنوب مغربی یورپ کا ایک ملک جو عرصہ تک اسلامی اندلس کے ماتحت رہا اس کے شمال اور مشرق میں سپین کے صوبے گلیشیا، لی یان، ایکسٹرا ماڈورا اور اندلوسیا اور جنوب اور مغرب میں بحر اوقیانوس ہے۔ پرتگال کی سرحد کو پہاڑ اور اس کے چار دریا سپین سے جدا کرتے ہیں۔

بارہویں صدی عیسوی سے قبل پرتگال کی تاریخ سپین کی تاریخ کا ایک حصہ رہی ہے اس لئے پرتگال کے بارے میں اس دور کی معلومات سپین کی تاریخ ہی میں مل سکتی ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں آزاد پرتگال کا قیام عمل میں آیا۔ غالباً مسلمانوں کی فتوحات کے وقت پرتگال کا تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ تاریخ

Marfat.com

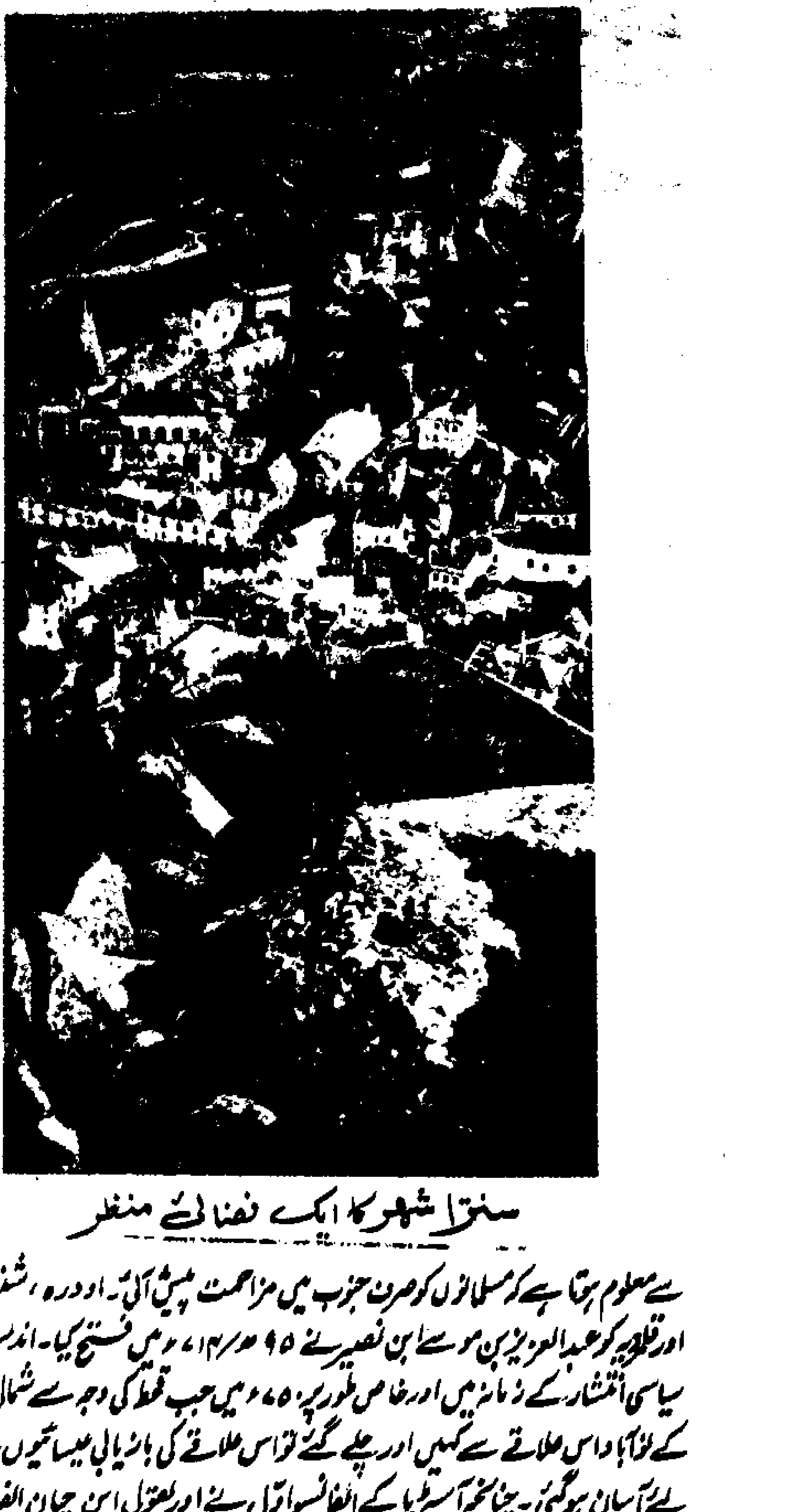

سنترا شہر کا ایک فضائی منظر

سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو صرف جنوب میں مزاحمت پیش آئی۔ اودرہ، شنترین اور قلمریہ کو عبدالعزیز بن موسےٰ ابن نصیر نے ۹۵ھ/۷۱۴ء میں فتح کیا۔ اندلس کے سیاسی انتشار کے زمانہ میں اور خاص طور پر ۷۵۰ء میں جب قحط کی وجہ سے شمال مغرب کے لوگ آباد اس علاقے سے کہیں اور چلے گئے تو اس علاقے کی بازیابی عیسائیوں کے لیے آسان ہو گئی۔ چنانچہ آسٹریا کے الفانسو اوّل نے اور بقول ابن حیان الفانسو کے بیٹے فرؤلا نے موجودہ پرتگال کے مغربی شمالی حصّے پر قبضہ کر لیا لیکن یہ عارضی تھا بالآخر الفانسو سوم کے دورِ حکومت میں پرتگال پر عیسائیوں کا پوری طرح قبضہ ہو گیا لیکن وہ پورے علاقے کو اپنے قبضے میں رکھنے میں ناکام رہے۔ ۲۶۴ھ/۸۷۷ء میں قلمریہ پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ لیکن ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں منصور نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ لزبن ابھی تک خلافت کے ماتحت تھا اور ۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء میں مہدی اس کا سربراہ بنا۔ بعد میں طوائف الملوکی کے دور میں یہ شہر افطسی حکمرانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ حکمران خاندان اندلس کا مغربی علاقہ حاصل کرنے کے لئے اشبیلیہ کے عبادی خاندان سے برسرِ پیکار تھا۔ جب ۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء میں قلمریہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو صرف اشبونہ ایک مسلم علاقے کی حیثیت سے رہ گیا۔

۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء میں پرتگال کے پہلے بادشاہ الفانسو نے ان دونوں کو فتح کر لیا۔

۱۱۸۵ء سے قبل پرتگیزوں نے ہمّت سے جنوبی علاقے پر قبضہ کر لیا۔

اس علاقے میں عربی زبان اور عربی تمدن کی جڑیں بہت گہری ہو چکی تھیں عہدِ خلافت میں کئی صوبوں کے اضلاع جن میں صدر مقام، عامل اور حفاظتی فوج متعین ہوتی تھی کُلّی یا جزوی طور پر پرتگال کے علاقے میں واقع تھے۔ انتہائی جنوبی ضلعے اکشونبہ کے ساتھ ہی شمال کی سمت میں موجودہ بکیسو، النبو کی جگہ بجہ کا ضلع (کورہ) تھا۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی یہی تھا۔ اس کے بھی شمال میں اشبونہ یا لزبن کا ضلع تھا۔ جس میں شنترین اور قنبذاق شامل تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قلمریہ بھی کسی کورے کا صدر مقام ہو

پرتگال میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں آخری کش مکش ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں ہوئی یہ آخری کش مکش ابو یعقوب یوسف الموحد کی کوشش تھی۔ اس حملے میں مسلمانوں نے ڈٹ کر پرتگالیوں کا مقابلہ کیا ساحر کار الموحد کے عقب لشکر پر پرتگالیوں کے ایک حملے میں ابو یعقوب کے کاری زخم آیا اور وہ اشبیلیہ کو واپس جاتے ہوئے یابرہ کے قریب اپنے خالقِ حقیقی کو جا ملا۔ پرتگال میں یہ شکست عام توقعات کے خلاف تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں موحدین کی قوّت و ناموری کا ستارہ بلندی پر تھا۔ چنانچہ ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء میں العقاب کے مقام پر عیسائیوں نے فتح حاصل کی جس میں پرتگالی فوجوں نے حصّہ لیا تھا ۱۲۴۹ء میں شلب پر عیسائیوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ اور الغرب پر سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ موجودہ پرتگال میں الغرب مسلمانوں کا آخری مقبوضہ تھا۔ ایک اور جنگ کے دوران میں جو ۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء میں رود سلادو کے کنارے لڑی گئی۔ اس میں بھی اگرچہ اندلسیوں نے پہلے حملے میں پرتگیزوں پر بڑا دباؤ ڈالا اور ان کی صفیں الٹ کر رکھ دیں لیکن بالآخر یہ میدان بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اس کے بعد اندلس کے مغرب میں اسلامی حکومت کا دوبارہ قیام ناممکن ہو گیا۔

موجودہ پرتگال میں مذہبی آزادی ہے۔ ۹۵ فیصد رومن کیتھولک عیسائی ہیں اس کے علاوہ پروٹسٹنٹ، یہودی اور دوسری اقلیتیں ہیں۔ اگرچہ ۱۹۱۰ء میں ایک جمہوریہ بن جانے کے بعد چرچ غیر آباد اور مذہبی امور کی مناہی اور سکولوں میں مذہبی تعلیم ختم کر دی گئی تھی لیکن ۱۹۲۶ء کے انقلاب کے بعد گرجوں کی دوبارہ مرمت اور تعمیر شروع ہوئی۔

پرتگال کو مقامی انتظامیہ کے لحاظ سے ۲۲ ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر انتظامیہ کا سربراہ ایک گورنر ہے۔ پرتگال بڑی حد تک زراعتی ملک ہے۔ یہاں کی پیداوار میں گندم، چنا، مکئی، چاول خاص طور پر مشہور ہیں۔ اس ملک کی کل آبادی ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۸۶۱۱۶۰۰ تھی۔

پردہ حجاب، عورت کا غیر مردوں سے ستر چھپانا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: "اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے اور وہ اپنے سینوں پر اوڑھنی کے بُکّل مار لیا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بھائی، بھتیجے، بھانجے، اپنی عورتیں اپنے غلام وہ مرد خدمت گار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے وہ لڑکے جو ابھی عورتوں کی پردہ کی باتوں سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں۔ نیز ان کو حکم دو کہ، وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ مارتی چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے اس کا اظہار ہو۔" (۲۴ : ۳۱)

"اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں۔ اور ستائی نہ جائیں۔" (۳۳ : ۵۹)

Marfat.com

نہ اپنے بناؤ سنگھار کو دکھاتی نہ پھرو۔ (۳۳/۳۳)

لئے پیغمبر کی بیویو! اپنے گھروں میں جمی (بیٹھی) رہو اور اگلے زمانہ جاہلیت کے رسم بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو۔ (۳۳/۳۳)

پردہ کے احکام میں آنحضورؐ نے فرمایا:۔

"ام المومنین ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ اور حضرت میمونہؓ آنحضورؐ کے پاس بیٹھی تھیں اتنے میں ابن ام مکتومؓ (ایک نابینا صحابی) آئے اور سیدھے آنحضورؐ کے پاس پہنچے تو آپؐ نے فرمایا کہ ان سے پردہ کرو۔ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا، کیا یہ نابینا نہیں۔؟ نہ وہ ہمیں دیکھیں گے نہ ہمیں پہچانیں گے۔ آنحضورؐ نے جواب دیا کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم انھیں نہیں دیکھتی ہو۔" (ترمذی)

زمانہ جاہلیت میں پردہ اور حجاب کوئی چیز نہ تھی لیکن اسلام کے بعد جوں جوں مسلمانوں کے تمدن و معاشرت کی بنیاد پڑتی گئی اس کے متعلق مناسب احکام نازل ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ شریعت نے مسلمانوں کے شرم وحیا اور حفظ ننگ و ناموس کی پوری پوری حد بندی کر دی۔

عورت کا ستر سوائے چہرے اور ہاتھوں کے باقی پورا جسم ہے۔ استثنائی صورتحال میں مثلاً کوئی مریضہ کسی طبیب کے زیر علاج ہو، یا کوئی عورت کسی مقدمہ میں قاضی کے سامنے بحیثیت گواہ یا بحیثیت فریق پیش ہو یا کسی آتش زدہ مقام میں کوئی عورت گھر گئی ہو یا پانی میں ڈوب رہی ہو یا اس کی جان یا آبرو کسی خطرے میں مبتلا ہو۔ تو پردے سے رخصت ہے۔

امام محمد بن سیرینؒ نے جب سورۃ احزاب کی آیت ۵۹ پر عمل کرنے کا طریقہ حضرت عبیدہ بن سفیان بن الحارثؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی، ناک اور ایک آنکھ کو چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

امام رازی اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"جاہلیت میں اشراف کی عورتیں اور لونڈیاں کھلی پھرتی تھیں اور بدکار لوگ ان کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شریف عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اوپر چادر ڈالیں

صحابہ کرامؓ کے مبارک دور سے لے کر آٹھویں صدی تک ہر زمانے میں اس آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا ہے اور احادیث سے بھی یہی ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد سے عہد نبویؐ میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی تھیں۔ اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج ختم ہو گیا تھا ——

(نیز دیکھئے "حجاب")

پرہیزگاری:۔ حلال و حرام کی تمیز اور حرام سے اجتناب کرنا۔ (دیکھئے "تقویٰ")

پڑاؤ ٹھہرنے کی جگہ۔ وہ کھلے مقامات جو لوگوں کے بازار لگانے یا سفر کی منزلوں کے لئے تجویز کئے جائیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ جس کا تعلق جنگل اور بیرونی میدانوں سے مخصوص ہو۔

۲۔ جس کا تعلق لوگوں کے مکانوں اور زمینوں سے ہو۔

۳۔ جس کا تعلق شارع عام اور راستوں سے ہو۔

مندرجہ بالا عام اقسام کی تشریح یہ ہے۔

پہلی صورت میں جو قافلوں کے گذرنے اور مسافروں کے آرام لینے کے لئے ہو دور ہونے اور قافلوں کی ضرورت کی وجہ سے سلطان اس میں کوئی تصرف نہ کرے صرف اس کی نگرانی اور پانی کا بندوبست کرے اور لوگوں کو وہاں ٹھہرنے دے جو قافلہ پہلے آکر اترے وہ واپس جانے تک وہیں ٹھہرنے کا مستحق ہے۔ بعد میں آنے والے کا حق اس کے بعد ہوگا۔ آنحضورؐ نے فرمایا ہے منیٰ اس کا پڑاؤ ہے جو پہلے پہنچ جائے۔ (مشکوٰۃ آداب حج)

یہی حکم خانہ بدوش لوگوں کا ہے جو گھاس، چارے و پانی پر ٹھہرتے پھرتے ہیں کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

دوسری قسم وہ زمین جس میں لوگ وطن بنانے کی غرض سے آکر ٹھہریں اس میں سلطان کا یہ فرض ہے کہ اگر ان کے یہاں رہنے سے مسافروں کے لئے تکلیف اور دقت ہو تو ان لوگوں کو اترنے سے قبل اور بعد میں ہر حال میں روک دے اور اگر مسافروں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو تو پھر اسے اختیار ہے چاہے تو اجازت دے چاہے روک دے۔ جیسے حضرت عمرؓ نے بصرہ اور کوفہ کو آباد کرتے ہوئے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ تیسری قسم کے بارے میں ایک حدیث ہے جسے کثیر بن عبداللہ کے دادا نے روایت کیا ہے۔ کہ ہم حضرت عمرؓ کے ساتھ ۷ ھ کو عمرہ کرنے کے لئے چلے تو راستے میں تالاب والوں نے آپؐ سے مکہ اور مدینہ کے درمیان مکانات بنانے کی اجازت چاہی کیونکہ اس سے پہلے وہاں مکانات نہ بنے تھے۔ آپؐ نے اجازت دے دی اور شرط یہ لگائی کہ مسافر پانی اور سائے کے زیادہ مستحق ہوں گے۔

پسر جمہوریہ انڈونیشیا کے صوبہ کالی منتان کا ایک حصہ جو مشرقی بورنیو میں واقع دریائے پسر یا کندلو کی وادی پر مشتمل تھی۔

اس علاقے میں زیادہ تر تین قسم کے لوگ آباد ہیں۔ جن میں ڈیک، جزائر سلادیسی کے تارک الوطن بنجاری اور بگنی، ساحل پر ماہی گیروں کی ایک نسل جو باجو کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۱۲۵ مربع کلومیٹر تھا۔

۱۹۳۶ء سے پہلے قبیلہ ڈیک کے نو ہزار افراد میں سے چار ہزار مسلمان ہو چکے تھے۔

روایات کے مطابق پسر کو ایک عرب توان سید نامی نے اسلام سے روشناس کرایا۔ اس نے پسر کے حاکم کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس وجہ سے بھی یہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام کو قبول کیا۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ پسر میں صرف ایک مسجد ہے اور اس کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی عبادت گاہیں ہیں۔ مسلمان مولویوں کی تعداد بھی کم ہے۔ ان لوگوں میں حج کا شوق بھی بہت کم ہے۔

مذہبی پیشواؤں کی آمدنی کا ذریعہ زکوٰۃ اور فطرہ ہیں جو ماہ رمضان کے آخر میں ہر شخص حسب استطاعت دیتا ہے اس علاقے میں اسلامی تقویم رائج ہے۔ یہاں کے باشندوں کی عائلی زندگی اب کسی حد تک اسلامی رسوم کے مطابق مرتب ہو گئی ہے۔

پسرور پاکستان میں ضلع سیالکوٹ کا ایک پرانا شہر۔ سیالکوٹ سے ۱۹ میل دور جنوب میں نارووال سے امرتسر جانے والی شاہراہ پر واقع ہے بابر کے دور میں ایک باجوہ جاٹ پسر سندھو نے آباد کیا تھا۔ ایک زمانے میں اس شہر کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ اس کی قدیم اور پر رونق آبادی کے آثار اس کے گرد و نواح میں آج بھی باقی ہیں۔ ایک تالاب جو شہنشاہ جہانگیر کے دور میں بنایا گیا تھا اب بھی موجود ہے۔ ایک نہر دارا شکوہ نے بنوائی تھی جس میں نالہ ڈیک کا

Marfat.com

بالا [illegible]

یہاں ایک صوفی بزرگ میاں برخوردار کا مزار ہے جس کی زیارت کے لئے محرم کے مہینے میں اکثر لوگ آتے ہیں۔ ایک اور بزرگ مہر منگا کی قبر بھی ہے جو شمال جانب ٹیلے کے اوپر واقع ہے۔ چونکہ اکثر شہروں کو جانے والی سڑکیں یہاں سے گذرتی تھیں اس لئے اس شہر کو تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہاں میونسپل کمیٹی قائم ہوئی۔

پسنتری پسنتری، جاوا اور مادورا کے جزائر میں دینیات کے طلبہ کی تربیت گاہوں کو کہتے ہیں۔

جزائر شرق الہند میں تمام مسلمانوں کے لیے ابتدائی تعلیم (قرآن مجید اور فرائض کی تعلیم) ضروری ہے جاوا اور مادورا کے بڑے دیہات اور شہروں میں بعض اساتذہ بچوں کو مساجد میں یا اپنے گھروں میں یا بعض عمارتوں میں جمع کر کے درس قرآن مجید دیتے ہیں۔ اکثر اوقات دور دور کے طلبا ان سے استفادے کی خاطر آ کر ان کے پاس ٹھہرتے ہیں اور علم حاصل کرتے ہیں۔

لیکن پسنتری کا اطلاق ان اعلیٰ دینی تعلیم و تربیت کے اداروں پر ہوتا ہے جو کئی عمارتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ گاؤں سے باہر بنائے جاتے ہیں لیکن تقریباً گاؤں کے ایک محلے کے برابر ہو جاتے ہیں۔ ان اداروں کے لیے بعض دین دار لوگوں نے اوقاف قائم کر دیے ہیں۔ بعض اوقات حکومت بھی بعض دیہات کو لگان وغیرہ سے معافی کے حکم نامے جاری کرتی رہتی ہے جو بعد میں ان اداروں کا حق بن جاتا ہے۔ اس عمارت میں سب سے پہلے تو معلموں کے مکانات ہوتے ہیں پھر درس کے کمرے ایک مسجد، طلبہ کے حجرے اور چاول رکھنے کے کمرے ہوتے ہیں۔ طلبہ کے حجروں کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے طالب علم صرف بیٹھ سکتا ہے۔ کیونکہ طلبہ عموماً لیٹ کر مطالعہ کرتے ہیں ایک حجرے میں کئی طلبہ رہتے ہیں۔

ان اداروں میں طلبہ کی زندگی کا معمول یہ ہوتا ہے کہ فجر کی نماز معلم خود پڑھاتا ہے بعد میں سب شاگردوں کو ایک ایک کر کے سبق دیتا ہے سبق کے بعد طالب علم اپنی اقامت گاہوں میں واپس جا کر سبق یاد کرتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا کھانے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ کھانے کے بعد ظہر کی نماز کو جاتے ہیں۔ بعد ازاں نمازوں کے علاوہ جو بھی وقت ملتا ہے اس میں طلبہ اپنا سبق دہراتے رہتے ہیں۔ اونچے درجوں کے طلبہ کو معلم اکٹھا پڑھاتا ہے۔ عشاء کے بعد طلبہ سو جاتے ہیں۔

ولندیزیوں کے دور حکومت میں یورپی طرز کے جو مدارس قائم کیے گئے ہیں ان میں دینی تعلیم نہیں دی جاتی۔ آج کل ایسے نجی مدرسوں کا رواج بڑھ رہا ہے۔ جہاں دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

پشاور پاکستان کا سرحدی شہر جو تحصیل، ضلع، ڈویژن اور صوبے کا صدر مقام بھی ہے، دریائے باڑہ کے بائیں کنارے کے قریب جمرود سے گیارہ میل دور درہ خیبر کے داخلے پر واقع ہے۔ ابتداء میں ایک حفاظتی فصیل اس کے گرد تھی۔ جس کے سولہ دروازے تھے۔ شہر کے مغرب میں دو میل کے فاصلے پر چھاؤنی ہے۔ قدرتی طور پر چاروں اطراف سے مسلسل پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے صرف مشرقی جانب اٹک کے سامنے کچھ حصہ کھلا ہے۔ پشاور شہر اور چھاؤنی کا کل رقبہ ۹ مربع میل ہے۔ اور اس کی آبادی ۱۹۷۲ء میں ۲۷۳۰۰۰ تھی۔ ضلع پشاور

مسجد مہابت خان پشاور کا مینار

کا کل رقبہ ۱۶۶۴ مربع میل اور آبادی ۱۹۷۲ء میں ۱۷۱۲۰۰۰ تھی۔ تاریخ میں پشاور کا ذکر سب سے پہلے ریاست گندھارا کے ایک حصے کی صورت میں ملتا ہے جو ایک بدھ سلطنت تھی۔ سکندر اعظم کے حملے کے بعد پشاور کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ۳۲۶ ق م میں سکندر کی فوجیں جن دو علیحدہ راستوں سے دریائے سندھ تک پہنچی تھیں ان میں ایک راستہ درہ خیبر تھا۔ اگرچہ یونانیوں کے اس پہلے حملے نے پشاور پر کچھ بھی اثرات نہیں چھوڑے۔ سکندر کی واپسی کے بعد بدھ مت پشاور اور کابل تک پہنچ گیا۔ ساتویں صدی کے اواخر میں پشتون یہاں آئے جنہوں نے آتے ہی حاکمان لاہور سے دریائے سندھ تک کا میدانی علاقہ چھین لیا اس کے بعد دریائے سندھ کے مغرب اور دریائے کابل کے جنوب کے درمیانی پہاڑی علاقے پر بھی قابض ہو گئے۔

دسویں صدی عیسوی میں جب سبکتگین نے لاہور کے راجے جے پال کو شکست دی تو پشاور غزنویوں کے قبضے میں آ گیا اور گیارہویں صدی کے پہلے ربع تک محمود غزنوی نے ہندوستان پر اپنے حملوں کے دوران میں پشاور کو چھاؤنی بنائے رکھا۔ اس کے بعد تقریباً سو سال بعد تک یہ علاقہ غزنہ کا صوبہ بنا رہا۔

غزنویوں کے بعد یہاں پر مختلف حکمران حکومت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۵۰۵ء میں درہ خیبر کے راستے بابر حملہ آور ہوا۔ اس نے باجوڑ اور سوات کو بھی اپنا مطیع بنایا۔ لیکن مغل ان قبائل پر پوری طرح قابو نہ پا سکے۔ اکبر نے اپنے دور حکومت میں ان کی شورشوں پر قابو پانے کے لئے میدانی علاقوں میں جگہ جگہ فوجی قلعے تعمیر کئے۔ اسی زمانے میں یوسف زئی، منڈیر اور خٹکوں کی شورشیں رونما ہوئیں۔ ۱۶۶۸ء میں پشتونوں نے بھاری جمعیت کے ساتھ پشاور پر قبضہ جما کر دہلی اور افغانستان کا راستہ منقطع کر دیا اور ایک عرصے تک پورے میدانی علاقے پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ اورنگزیب تخت نشین ہوا تو اس علاقے کو زیر کرنے کے لئے اپنی سرکردگی میں فوج لے کر آیا تقریباً دو سال تک اس کی یہ جدوجہد جاری [illegible]

Marfat.com

علاقے کو فتح کر لیا۔ ۱۷۳۸ء میں پشاور پر نادر شاہ کا قبضہ ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد سدوزئی درانیوں نے احمد شاہ کے زیر تسلط قندھار میں اپنی حکومت قائم کی تو پشاور پر بھی ان کا مکمل قبضہ قائم ہوا۔ ۱۸۱۵ء میں یہ سارا علاقہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوا کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۲ء تک یہاں کا نظم و نسق ایک انگریز جرنیل اوٹیبلا کے ہاتھ میں رہا۔ ۱۸۴۹ء میں یہ وادی انگریزوں کی مملکت میں شامل کر دی گئی اور اسے پنجاب حکومت کا انتظامی ضلع بنا دیا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے نام سے ایک علیحدہ صوبہ بنایا گیا۔ اور پشاور اس صوبے کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۹۵۵ء میں یہ صوبہ دوسرے صوبوں کے ساتھ وحدت مغربی پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں جب اس وحدت کو توڑ دیا گیا تو اسے دوبارہ صوبہ بنا دیا گیا۔ اب پشاور صوبہ سرحد کا دارالحکومت ہے۔

پشاور ڈویژن کی کل آبادی ۱۹۷۲ء میں ۴،۷۵۵،۰۰۰ تھی۔ اس علاقے کی پیداوار میں گیہوں، مکئی، گنا، چاول، دالیں، سرسوں کے بیج، تمباکو، وغیرہ اہم ہیں۔ یہاں خصوصاً دیہاتی آبادی کے نوے فی صد لوگوں کی بولی پشتو ہے۔

پشاور شہر میں ایک یونیورسٹی، لاء کالج، ایجوکیشن کالج، میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج، زرعی کالج، کامرس کالج اور آرٹس و سائنس کالج ہیں۔ ایک ہوائی اڈا ہے۔ پشاور شہر میں بہت سی مساجد ہیں جن میں شاہجہان کے عہد کی جامع مسجد مہابت خان، جو سب سے بڑی اور شہر کے اندر واقع ہے، مسجد گنج علی خان، مسجد دلاور خان، مسجد خواجہ معروف اور مسجد قاسم خان بہت مشہور ہیں۔

پشاور کے قابل دید مقامات میں قلعہ بالا حصار، شاہی باغ، وزیر باغ، کمپنی باغ (جناح پارک)، عجائب گھر، اسمبلی ہال، میونسپل ہال، اسلامیہ کالج، وارسک پن بجلی گھر، درہ خیبر، درہ کوہاٹ اور آثار قدیمہ میں پنج تیرتھ، شاہ جی کی ڈھیری اور گورکٹری اہم ہیں۔

یہاں کے باشندے بیاہ شادی، موت، خیرات، صدقات وغیرہ کے معاملات اسلام کے مطابق کرتے ہیں۔ پیروں، درویشوں، اولیاء اللہ کی بہت زیادہ عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس علاقے کے لوگ انتہائی باغیرت، دلیر، جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ بامروت اور مہمان نواز ہیں۔

پشتو پختو یا پشتو ایک زبان جو پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کے ضلعوں ایجنسیوں، ریاستوں اور بلوچستان کے ایک حصے میں بولی جاتی ہے یہ ایک قدیم زبان ہے جو آریوں کی آمد سے پہلے پشتون (پٹھان)، اپنے قدیم وطن پشتون خوا میں بولتے تھے۔ پشتو بولی کے علاوہ یہ پشتونوں کے دستور و آئین حیات کا نام بھی ہے

پشتونوں میں بھی نہ جانے کون کونسی قومیں آکر آباد ہوتی رہیں۔ اور انہی میں مدغم ہوتی چلی گئیں اور ایک وقت میں ان کے ساتھ مل کر سب پشتون ہو گئے۔ اس آمد و اتصال کا اثر قدرتاً زبان پر بہت زیادہ پڑنا چاہیے۔ کیونکہ دوسری قومیں بھی اپنے ساتھ بہت سے الفاظ لائی ہوں گی۔ پشتو کی بنیاد بھی وہی زبان ہے جو تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں باختر قدیم اور وسط ایشیا میں بولی جاتی ہوگی۔ کیونکہ اوستا، پہلوی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور دیگر ملحقہ علاقوں کی پراکرتوں میں پشتو کے سینکڑوں الفاظ آج بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ تحریری شکل میں پشتو ادب صرف عربی رسم الخط میں سامنے آیا جس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطان محمود غزنوی کے ایک وزیر احمد بن حسن میمندی نے کی تھی۔ لب و لہجہ اور صوتیات میں یہ عربی اور عبرانی سے مختلف ہے۔

پشتو کے لیے عربی حروف تہجی کافی نہیں تھے اس لیے کچھ حسب ضرورت حروف بڑھا لیے گئے لیکن یہ حروف نئے وضع نہیں کیے گئے بلکہ عربی حروف پر چند ایک علامتیں بڑھا دی گئیں اور یوں اپنا مطلب پورا کر لیا گیا۔ پشتو ادب کی ابتدا دوسری صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوتی ہے۔ اور اس اعتبار سے اسے چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ وہ ادوار یہ ہیں۔

۱۔ ۲۰۰ھ تا ۱۰۰۰ھ ۲۔ ۱۰۰۰ھ تا ۱۲۰۰ھ ۳۔ ۱۲۰۰ھ تا ۱۳۰۰ھ ۴۔ ۱۴۰۰ھ تا دور حاضر۔

پشتو ادب دو صنفوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ عوامی ۲۔ علمی۔ عوامی ادب میں قصے کہانیاں، کہاوتیں، پہیلیاں، مقولے، لوریاں، مرثیے اور ٹپے وغیرہ اہم ہیں۔

جدید معلومات کے مطابق پشتو کتابی ادب کی تاریخ ۱۳۹ھ/۷۵۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس پہلے دور میں جو دسویں صدی ہجری تک کا ہے نمایاں ادبی شخصیتیں امیر کروڑ سوری، ابو محمد ہاشم سروانی، بیٹ بابا، شیخ اسماعیل سڑبنی، شیخ رضی لودی، خوشبون، شیخ اسعد سوری، شیخ عیسیٰ مشوانڑی، شکارندوی، شیخ تامینی، سلیمان ماکو، بابو جوتک، شیخ متی، حضرت شیخ بختیار کاکی، احمد بن سعید لودی، شیخ ملکیار غرشین، شیخ ملی یوسف زئی، شیخ کتہ متیزی، اکبر زمینداوری، سلطان بہلول لودی، خلیل خان نیازی، شیخ محمد صالح، بی بی رابعہ قندھاری، پیر روشان (بایزید انصاری)، خواجو ملیزی، بی بی زرغونہ خاتون، شیخ تیمن، شیخ بستان بڑیچ، زرغون خان، دوست محمد کاکڑ، شیخ ارزانی، اخون چالاک خٹک، ملا عبدالوہاب (اخوند پنجو بابا)، نعمت اللہ ہروی اور اللہ یار الکوزی ہیں۔

مندرجہ بالا افراد میں بایزید انصاری زیادہ اہم ہیں۔ انہوں نے تصوف اور طریقت میں کئی کتابیں لکھیں جن میں سب سے اہم کتاب خیرالبیان ہے جس کی پشتو عبارت بآسانی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے۔

دوسرا دور پہلے دور کے مقابلے میں پشتو ادب کے لیے زیادہ بہتر رہا اس دو سو سال کے عرصے میں پشتو ادب نے کافی ترقی کی۔ اس دور کے مشہور ادیب اخوند درویزہ (جنہوں نے درسی طرز پر فارسی مسجع و مقفیٰ قسم کی پشتو نثر میں کئی کتابیں تالیف کیں جن میں مخزن الاسلام، تذکرۃ الابرار والاشرار اور ارشاد الطالبین ہیں۔) اس کے علاوہ اس دور کے ادیبوں اور شاعروں میں ملا الف ہو، ارزانی، علی محمد مخلص، مرزا خان انصاری، دولت اللہ لوانڑی، واصل، امیر، اخون، قاسم پاپین خیل مصنف "فوائد شریعت"، بابو جان لغمانی، خوشحال خان خٹک (جس نے پشتو انشا و املا دونوں میں بڑی اصلاح کی ہے اور پشتو نثر کو بہت سادہ رواں اور سلیس طرز میں ڈھالا۔) اشرف خان ہجری، عبدالقادر خٹک (جو ایک بلند پایہ عالم، ادیب اور شاعر تھے ان کی تصانیف میں گلدستہ (گلستان سعدی کا پشتو ترجمہ) یوسف زلیخا "چہل حدیث" کا پشتو ترجمہ اور "نصیحت نامہ" ہیں۔ صدر خان خٹک، سکندر خان گوہر خان، بہرام خان، بی بی حلیمہ، خواجہ محمد بنگش، رحمان بابا، عبدالحمید مہمند، محمد افضل خان خٹک، معز اللہ مہمند، کامگار خان خٹک، علی خان، کاظم خان شیدا، شیخ محمد قاسم، ملا نور محمد، مولانا احمد شاہ وغیرہ ہیں۔

اس دور کے پشتو ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ

Marfat.com

اس دور میں پشتو ادب عربی اور فارسی کا غلبہ زیادہ ہو گیا تھا۔ تیسرے دور میں جو ایک صدی کے قریب قریب کا زمانہ ہے۔ احمد شاہ ابدالی سے شروع ہوتا ہے اس دور میں پشتو نظم و نثر لکھنے والوں میں احمد شاہ درانی، سدوزئی، تیمور شاہ، میاں عمر (جو ایک بلند پایہ اہل قلم تھے۔) ملا عبدالرشید، اخون گدا، سعادت خان، قاسم علی آفریدی، نواب حافظ رحمت خان (مصنف گلستان رحمت) امیر محمد انصاری، حافظ امپوری، عبدالعظیم رانڑی زئی، حضرت عبیداللہ میاں گل، خوشحال شہید، نواز خٹک بیدل، مرزا خان، صدیق اخون زادہ، بابا سید گل، میاں نعیم، احمد کلاچوی، محمد رفیق، بنجیب، مراد علی صاحبزادہ مصنف تفسیر یسیر، دوست محمد خٹک (جس نے واعظ کاشفی کی مشہور تفسیر حسینی کا تفسیر بدر منیر کے نام سے پشتو ترجمہ کیا اور نظم میں بحر العلوم اور اخلاق احمدی کے نام سے دو مثنویاں لکھیں۔) عبدالکریم کاکڑ، خواجہ رزاق اللہ، امام الدین، ملا حسن، معین الدین، مطیع اللہ، سپینہ خاتون، بی بی نگہ خاتون، سید حسین، معز الدین خٹک مصنف رلقۃ الاسلام، میاں محمد فہیم کاکاخیل فیض اللہ اخونزادہ مصنف ذخیرۃ القراء، خان زمان، دوستم وغیرہ ہیں۔

ان مصنفین و شعرا کے ہاتھوں پشتو ادب کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد کی لکھی ہوئی کتابوں میں بلحاظ موضوع اور نفس مضمون دینیات اور اخلاقیات کا اثر غالب ہے۔

چوتھے دور کے اہل قلم حضرات میں حبیبی، خادم، بینوا، مجروح، الفت، ریشتین، پیرزادہ سید عبداللہ شاہ، مولوی میر احمد شاہ رضوانی، میاں محمد یوسف، میاں حسیب گل کاکاخیل، مولوی عبدالمجید افغانی، منشی احمد جان، قاضی رحیم اللہ سید راحت اللہ زاخیلی، میاں آزاد گل کاکاخیل، حافظ محمد ادریس، میجر ایس اے رحمان، نصر اللہ خان نصر، مولانا عبدالقادر، امیر حمزہ شینواری، عبدالحلیم اثر، سمند خان میاں سید رسول رسا، دوست محمد خان کامل، فضل حق وغیرہم ہیں اس دور میں پشتو ادب میں فکر و نظر کے زاویے بدلے ہوئے ہیں۔ علوم جدید سے متصف ادیب نغمہ و بلبل اور کاکل پیچاں کے چکر سے نکل کر زندگی کی نئی راہوں پر گامزن ہیں اور اب ان میں نئے نئے افکار و خیالات جنم لے رہے ہیں۔ اس جدید دور میں پشتو ادب میں اب سیاست، صحافت، ناول، افسانہ، ڈرامہ، تنقید و تبصرہ، مقالہ نگاری فن لغت نویسی وغیرہ شامل ہو گئی ہیں۔

پشتو اکیڈمی کے تحت پشتونوں اور پشتو زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر تحقیق کی جا رہی ہے۔

پکتھال، محمد مارماڈیوک (۷ اپریل ۱۸۷۵ء – ۱۸ مئی ۱۹۳۶ء) ایک مستشرق، جنہوں نے بعد ازاں اسلام قبول کر لیا لندن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ مادری زبان کے علاوہ فرانسیسی اطالوی، جرمن، ہسپانوی اور عربی زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ جغرافیے اور لسانیات سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ۱۸۹۴ء میں پکتھال کو شام اور مصر میں زندگی گزارنے کا موقع ملا تو انہوں نے یہاں پر اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ اسلامی طرز زندگی کے مشتاق ہوتے چلے گئے۔ بعد ازاں سوئٹزرلینڈ میں بہ امر مجبوری سکونت اختیار کرنا پڑی۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرومر کی دعوت پر دوبارہ مصر گئے اور ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ بیروت کے قیام کے دوران میں پکتھال نے عربی بولنا سیکھا۔

۱۹۱۳ء میں ترکی گئے۔ جہاں انہوں نے ترکی کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ان دنوں ترکی کی حالت بہت گر چکی تھی۔ اور یورپ اسے تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اسلام نے پکتھال کے دل میں اپنی حقانیت کو تسلیم کرا لیا تھا چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں کچھ عرصے لندن میں ادارہ معلومات اسلامی سے منسلک رہے۔ ۱۹۲۰ء میں عمر سبحانی کی دعوت پر بمبئی چلے گئے۔ جہاں بمبئے کرانیکل کی ادارت شروع کی اور ۱۹۲۴ء تک اس کے مدیر رہے۔ بعد ازاں نظام دکن کے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور چادر گھاٹ ہائی سکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا مقصد غیر اسلامی دنیا کو اسلامی ثقافت اور علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا۔ تقریباً دس سال تک اس رسالے سے منسلک رہے اور بڑے خلوص اور لگن کے ساتھ یہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں وہ حیدرآباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو کر لندن چلے گئے۔ لیکن یہاں بھی رسالہ "اسلامک کلچر" کی ادارت جاری رہی۔ بالآخر لندن ہی میں ایک مختصر سی علالت کے بعد وفات پائی اور وہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ بقول پروفیسر کرنیکو حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ مغرب میں اسلام کی اشاعت کے لیے کام کرتے رہے اور ملسے میں انہوں نے ایک انجمن کی بنیاد بھی رکھی۔ وہ ایک قابل اعتماد دوست اور پکے مسلمان تھے۔

پکتھال کو تصنیف و تالیف کا شوق اپنے دادا اور نانا سے وراثت میں ملا تھا ان کی تصانیف میں "SAID THE FISHERMAN"،
"ORIENTAL ENCOUNTERS"،
"THE CHILDREN OF THE NILE"، "VEILED WOMEN" مشہور ہیں۔

ان میں انہوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارے میں اپنے مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ اپنی کتاب "With the Turk in war time" میں ترکی کے حالات بیان کیے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی کو مرد بیمار سمجھ کر یورپ کی تمام طاقتیں ہڑپ کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔

جنگ عظیم کے دوران میں انہوں نے تین کتابیں Tales from five chimneys، The House of war، Knights of Araby شائع کیں۔

ایک کتاب "The cultural side of Islam" کے نام سے شائع کی جو ان خطبات کا مجموعہ تھی جو پکتھال نے ۱۹۲۷ء میں مدراس میں سالانہ اسلامی خطبات کے سلسلے میں دیے تھے۔

پکتھال کی ایک سب سے اہم اور عظیم تصنیف قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے "The Glorious Quran" کے نام سے شائع ہوا۔ نظام دکن نے ۱۹۲۸ء میں انہیں دو سال کی رخصت اس مقصد کے لیے دی تاکہ وہ ترجمے کے کام کو مکمل کر سکیں۔ یہ ترجمہ صحت، سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے مقبول ترین ہے

پگڑی:۔ عمامہ، دستار، طرہ۔ (دیکھیے "دستار")

Marfat.com

پلونہ شمالی بلغاریہ کا ایک مشہور شہر جو ویٹ ندی کی گہری وادی میں واقع ہے۔ یہ شہر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور ودین، نیقیہ، صوفیا اور کوہ بلقان کے دروں کو جانے والی شاہراہیں جہاں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں اسکے مقام پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ جنگی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

یہ شہر ترکوں کے عہد میں بسایا گیا۔ لیکن اس کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں۔ اور جو معلومات ملتی ہیں وہ بھی باہم متضاد ہیں۔

اولیاء چلبی اور حاجی خلیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ شہر نیقیہ کی سنجاق میں ایک ضلع کا صدر مقام تھا۔

جب اولیاء چلبی سترہویں صدی میں یہاں آیا تو پلونہ میں دو ہزار مکانات اور ایک ویران جنگی قلعہ ایک دارالعلوم سات مدرسے، تکیے اور چھ سرائیں تھیں۔

بقول سامی بک ترکی حکومت کے آخری زمانے میں پلونہ میں ستر ہزار باشندے اور اٹھارہ مساجد تھیں۔

اس شہر کو عالمگیر شہرت جنگ روس و ترکی کے دوران میں حاصل ہوئی جو ۱۸۷۷ء تا ۱۸۷۸ء تک جاری رہی۔ عثمان پاشا نے اس کے چاروں طرف مٹی کی مستحکم اور وسیع دیواریں بنوائیں۔ روسیوں نے تین بار پلونہ حاصل کرنے کی کوششیں کیں لیکن انہیں ہر بار بہت بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ان ناکامیوں کے بعد اتحادیوں نے باہم مل کر پلونہ کا باقاعدہ محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کی قیادت روسی سپہ سالار سباستوپول خود کر رہا تھا۔ عثمان پاشا اس مرتبہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے جان کی آخری بازی لگانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اس نے اپنے سے تین گنا فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن چند گھنٹوں بعد جب عثمان زخمی ہو گیا تو ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ عثمان پاشا نے ۴۰ ہزار فوج کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے۔

سقوط پلونہ کے ساتھ ہی روسیوں کے لیے ادرنہ اور آگے سان سٹیفانو تک کا راستہ کھل گیا۔

آج کل پلونہ تجارت کا مرکز ہے یہ ایک سرکل کا صدر مقام ہے۔ یہاں پر سب سے زیادہ تجارت مویشیوں اور شراب کی ہوتی ہے ایک عجائب گھر ہے جسے دیکھ کر روس و ترکی کی جنگ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

پناہ:۔ امن، عافیت، خیر، حفاظت، حمایت (دیکھئے "اعوذ باللہ")

پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین۔ پاکستان کا ایک صوبہ۔ پاک و ہند کا وہ علاقہ جس میں دریائے ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم بہتے ہیں۔ یہ سب دریا مٹھن کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ میں آکر گرتے ہیں، جو پنجاب کی مغربی حدود بناتا ہے۔ پنجاب کی حدود مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پنجاب کا مغربی حصہ پاکستان کے صوبہ پنجاب پر مشتمل ہے۔ اور مشرقی حصہ بھارت کے تین صوبوں، ہماچل پردیش، پنجابی صوبہ اور ہریانہ صوبے پر مشتمل ہے۔ عہد مغلیہ سے قبل اور شہنشاہ اکبر سے پہلے تک اس علاقے کو صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ لیکن شہنشاہ اکبر کے دور سے پنجاب کا نام کثرت سے استعمال ہونے لگا۔

پنجاب کے مغرب میں تھل، جنوب میں چولستان کے صحرا ہیں۔ ہڑپہ اور ٹیکسلا کے کھنڈرات اس کی قدیم تہذیبوں کے امین ہیں۔ چار ہزار سال قبل مسیح میں یہاں دراوڑی اور ہڑپہ تہذیب موجود تھی۔ ہڑپہ کے کھنڈرات آج بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں آریہ پنجاب میں آئے اور [illegible] ٹیکسلا کے کھنڈرات ان کی تہذیب کے لئے موجود ہیں۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں سکندر اعظم [illegible] فتح کرنے کے بعد پنجاب کی طرف بڑھا اور دریائے جہلم کے کنارے راجہ پورس کو شکست دے کر یونانیوں کا اقتدار قائم کیا۔ لیکن سکندر کی واپسی کے جلد ہی بعد چندر گپت موریہ نے انہیں پنجاب سے نکال باہر کیا اور موریہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

پنجاب پر مسلمانوں نے پہلا حملہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں مہلب بن ابی صفرہ نے کیا اگرچہ اس حملے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا لیکن ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں محمد بن قاسم نے پنجاب کے جنوب مغربی حصے کو اسلامی قلمرو میں شامل کر لیا اور محمود غزنوی کے پنجاب پر حملے کے وقت تک ملتان پر عربوں کا قبضہ رہا۔ اگرچہ پنجاب میں مسلمانوں کا صحیح طور پر قبضہ محمود غزنوی کے دور میں ہوا۔ جب ۳۹۲ھ/۱۰۰۱ء میں محمود نے جے پال کو شکست دے کر دریائے جہلم کے کنارے نندنہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن پنجاب کے ہندو حکمرانوں کے آئے دن کے حملوں کا خاتمہ کرنے کے لئے محمود نے پنجاب کا الحاق ۴۱۳ھ ۱۰۲۲ء میں سلطنت غزنی سے کر دیا اور لاہور میں اپنے خادم خاص ایاز کو صوبیدار مقرر کیا۔ سلطان محمود غزنوی کے بعد اس کے جانشین پنجاب پر حکومت کرتے رہے۔ ۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا اور اسطرح پنجاب پر غوریوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ چنانچہ محمد غوری کی وفات کے بعد اس علاقے پر خاندان غلاماں حکومت کرنے لگا۔ قطب الدین ایبک اس خاندان کا پہلا خود مختار سلطان تھا۔ جس نے مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی۔

ایبک نے اپنا پایہ تخت دہلی کو بنا لیا۔ لیکن اسے اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے زیادہ تر پنجاب ہی میں رہنا پڑا۔ اس کی وفات بھی لاہور ہی میں ہوئی خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں بھی پنجاب کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی نے پنجاب پر لودھیوں کی عملداری قائم کی۔ ۱۵۲۴ء میں خاندان مغلیہ کے بانی بابر نے پنجاب آکر شاہی فوج کو شکست دی اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ شیر شاہ سوری نے بھی پنجاب پر قبضہ کیا جسے ہمایوں نے ۱۵ سال جلاوطنی کے بعد دوبارہ اپنے تصرف میں لے لیا۔ اکبر کے دور حکومت میں پنجاب سیاسی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم تھا ایک حصہ براہ راست مغلوں کے کنٹرول میں تھا اور دوسرا حصہ جو

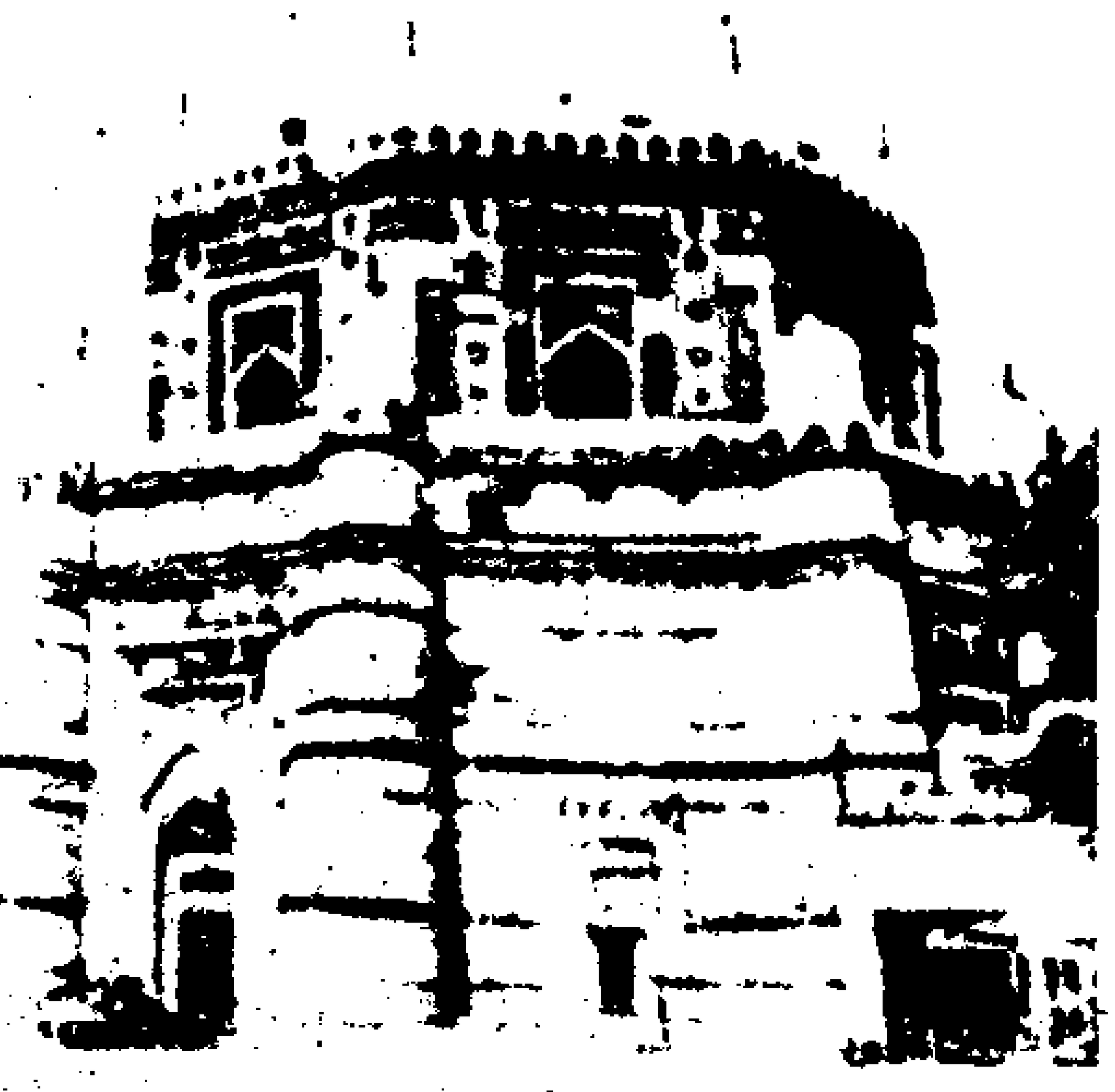

ملتان میں شاہ رکن عالم کا مزار

Marfat.com

شمالی جانب تھا چھوٹی چھوٹی طرح ریاستوں میں خود مختار راجاؤں اور سرداروں کے درمیان تقسیم تھا۔ لیکن اکبر کے عہد حکومت میں یہ تمام علاقہ سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا تھا۔ دور مغلیہ ہی میں پنجاب میں سکھ ایک موثر اور مستحکم قوت بن گئے تھے۔

اورنگ زیب کے بعد سکھوں کا پنجاب میں بہت زور ہوگیا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں سکھوں نے رنجیت سنگھ کی قیادت میں پنجاب پر قبضہ کر لیا اور تقریباً ۴۰ سال تک پنجاب پر حکمرانی کرتے رہے۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا اور ۱۹۴۷ء تک پنجاب پر بھی انگریز کا اقتدار رہا۔ پنجاب سے جب سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کیونکہ سکھوں نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ رویہ اختیار کئے رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی نے مسلمانوں پر سے سکھوں کا ظلم ختم کرنے کے لئے ان کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے پنجاب مندرجہ ذیل قسمتوں اور اضلاع پر مشتمل تھا۔

۱۔ انبالہ جس میں انبالہ، شملہ، حصار، رھتک، کرنال، گوڑگانوں کے ضلعے شامل تھے۔

۲۔ جالندھر جس میں جالندھر، ہوشیارپور، کانگڑہ، فیروزپور، لدھیانہ کے اضلاع شامل تھے۔

۳۔ لاہور جس میں لاہور، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گورداسپور کے اضلاع شامل تھے۔

۴۔ ملتان جس میں ملتان، منٹگمری، لائلپور، جھنگ، مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خاں کے اضلاع تھے۔

۵۔ راولپنڈی جس میں راولپنڈی، جہلم، گجرات، سرگودھا، اٹک، میانوالی کے اضلاع شامل تھے۔

تحریک پاکستان میں پنجاب کے مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ ۱۸۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک پنجاب پر براہ راست سرکار برطانیہ کی حکومت رہی۔ لیکن مسلم لیگ کے ہلالی پرچم کو پنجاب کے مسلمانوں ہی نے سربلند رکھا۔ انگریزوں نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں مسلمانوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں خاکساروں پر سر عام گولی چلائی گئی۔ قرارداد پاکستان لاہور میں منظور ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں ایک بار پھر خاکساروں پر گولی چلی۔ پنجاب کے علماء صوفیاء اور طلباء نے نظریۂ پاکستان کی ترویج میں حتی المقدور حصہ لیا۔ اور جب ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا تو واہگہ اور گنڈا سنگھ کے راستوں سے پاکستان آنے والے لاکھوں مہاجرین کا خیر مقدم کیا۔

تقسیم کے وقت انبالہ اور جالندھر کے اضلاع کے علاوہ ضلع گورداسپور اور تحصیل چونیاں کا نصف حصہ بھارت کے علاقے میں چلا گیا، جسے مشرقی پنجاب کا نام دیا گیا۔ پاکستان میں موجود پنجاب کو ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کو صوبہ پنجاب وحدت مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا اور یہ یکم جولائی ۱۹۷۰ء تک غیر صوبائی حیثیت کا حامل رہا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء اور نومبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ابتدائی اور اہم محاذ پنجاب ہی کی سرحد پر کھولے گئے تھے۔ ۱۹۷۰ء سے ایک بار پھر پنجاب کو اس کی صوبائی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ریاست بہاولپور اس صوبے میں ضم کر دی گئی اور لاہور اس کا صدر مقام ٹھہرا۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد بھی پنجاب میں راولپنڈی سے چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اسلامی کانفرنس بھی پنجاب (لاہور) میں منعقد ہوئی۔

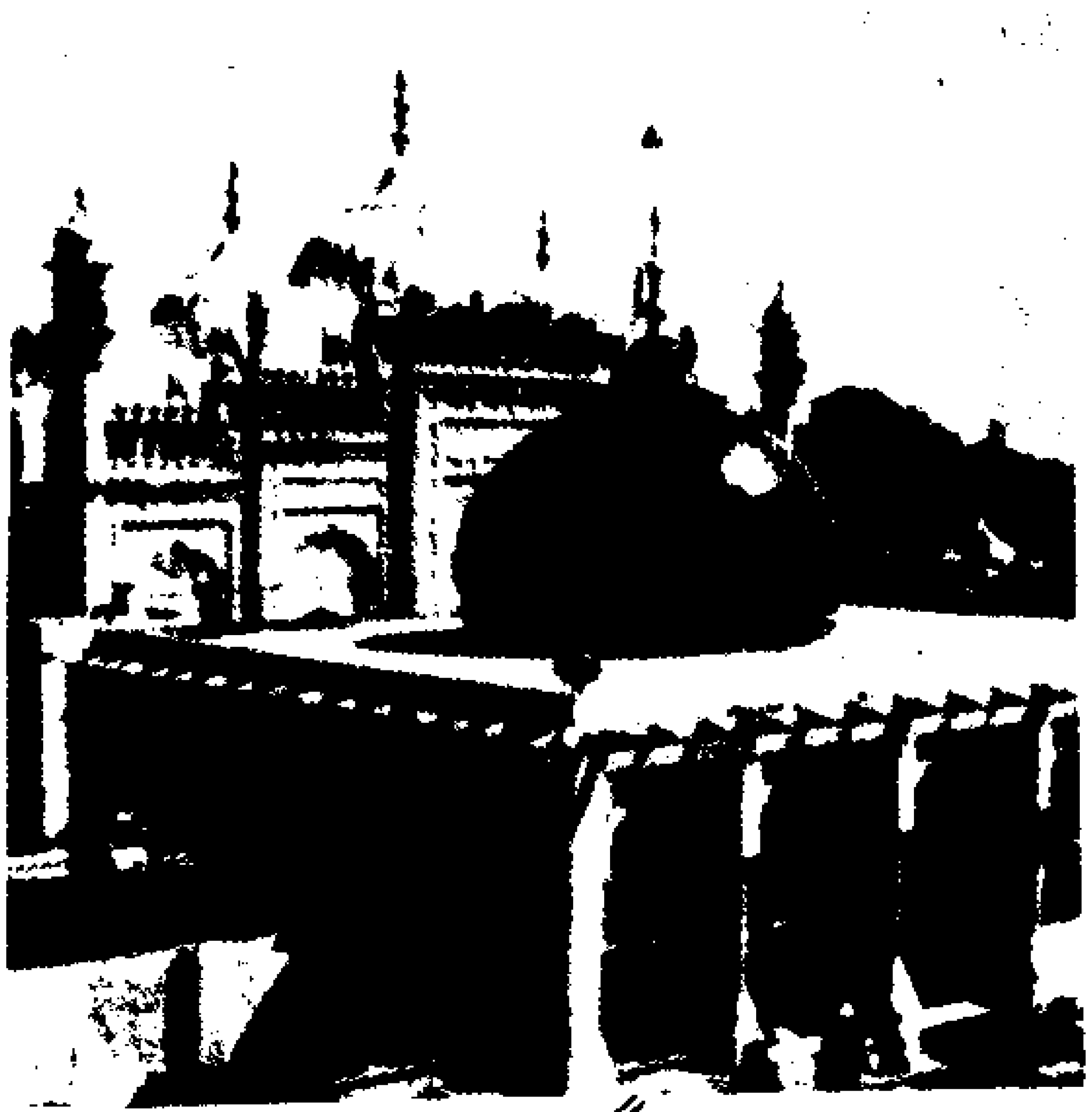

لاھور میں داتا گنج بخش کا مزار

پنجاب ہمیشہ اہل اللہ صوفیاء کرام کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ داتا گنج بخش، شاہ ابوالمعالی، پیر مکی، میاں میر، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، شاہ مقیم، بہاء الدین زکریا، شاہ شمس سبزواری، شاہ رکن عالم، بابا فرید، شاہ دولہ گجراتی، شاہ عنایت قادری، بلھے شاہ، سلطان باہو، شاہ جمال، مہر علی شاہ، شیخ قلندر شاہ سہروردی امام بری، سائیں شیر محمد، سید قطب علی شاہ اور سید محمد عبداللہ شاہ نے اسی سرزمین میں مشعل رشد و ہدایت روشن کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی سے اس خطہ کو منور کیا۔ آج بھی ان بزرگان دین کا فیض جاری ہے۔

اقتصادی اور دیگر معلومات:۔ پنجاب ایک زرعی علاقہ ہے۔ ہند و پاکستان کے چھ مشہور دریا اس سرزمین کو سیراب کرتے ہیں۔ جن پر بند باندھ کر نہریں نکالی گئی ہیں، جو دنیا کا بہترین نظام آبپاشی کہلاتی ہیں۔ دنیا کے دو بڑے بند تربیلا اور منگلا ہیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں چھوٹے بڑے بند موجود ہیں، جو آبپاشی کے علاوہ برقی قوت بھی مہیا کرتے ہیں۔

پاکستان کے صوبہ پنجاب کی آبادی ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق تین کروڑ ساٹھ لاکھ اور بھارت کے صوبہ پنجاب کی آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے پاکستانی پنجاب میں مسلمان پچانوے فیصد اور بھارتی پنجاب میں مسلمان صرف دس فیصد ہیں پاکستانی پنجاب کا صدر مقام لاہور اور بھارتی پنجاب کا چنڈی گڑھ ہے۔

پنجاب کی زرعی پیداوار میں گندم، مکئی، چاول، گنا اور کپاس سر فہرست ہیں مویشیوں میں گائے، بھینس، بیل، بکری، گدھا، گھوڑا، بھیڑیں، اونٹ اور خچر عام پالے جاتے ہیں۔ پنجاب کا تقریباً دس فیصد رقبہ صحرا، دس فیصد سطح مرتفع اور پانچ فیصد جنگلات پر مشتمل ہے۔ جہاں سے عمارتی اور پختہ قسم کی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ درختوں میں شیشم، کیکر، چیل، دیودار وغیرہ اہم ہیں۔ (نیز دیکھئے "بھارت" "پاکستان"؛ "پنجابی")

پنجابی پنجاب کے باشندوں کی زبان، جو دہلی سے لے کر خیبر تک اور پشاور و سوادی کاغان سے لے کر جموں و کشمیر تک کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اگرچہ اس زبان کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے جو در اصل اس کی مختلف بولیاں ہیں۔ مثلاً بھٹیالی، پوادھی، دوآبی، بالوی، پہاڑی، سرائیکی، ریاستی، ملتانی، چھاچھی

Marfat.com

پوٹھوہاری، شاہ پوری، ماجھی، ہندکو وغیرہ ہیں۔ تاہم ادبی اظہار کے لیے ایک ہی ٹکسالی زبان استعمال کی جاتی ہے جو لاہوری اور سرائیکی کے مابین ہے۔

اس زبان کے لیے پنجابی کا لفظ ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۵۸ء میں حافظ برخوردار نے پہلی مرتبہ "مفتاح الفقہ" میں استعمال کیا ہے۔ پنجابی کی ابتدا اور بناوٹ کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے بقول باوا بدھ سنگھ "پنجابی کا جسم سنسکرتی ہے لیکن اس کا باس بدلتا رہتا ہے۔ جب سنسکرت بگڑی تو پراکرت بنی اور پراکرت سے اپ بھرنش اور اس سے پنجابی"

یہ چونکہ ایک وسیع خطے کی زبان ہے اور یہ بات ایک حقیقت ہے کہ جو زبان جتنا زیادہ جغرافیائی رقبہ رکھتی ہوگی تو اس کے لہجے اور محاورے میں بھی اتنا ہی فرق ہوگا۔ اسی فرق کی وجہ سے موجودہ دور میں ان الگ الگ محاوروں کو الگ الگ زبانوں کا نام دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جنہیں در اصل بولیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا مسلمان صوفیاء اور علماء نے عوام میں اسلام کی تبلیغ کے لیے پنجابی کو اپنایا۔ چنانچہ یہ زبان خالص دینی اور صوفیانہ تصانیف سے بڑھ کر ادبی کتابوں تک جا پہنچی۔

پنجابی زبان کو پانچ مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادوار مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ ۱۵۲۶ء سے قبل کا دور۔

۲۔ باباگورونانک کا دور۔

۳۔ ۱۵۲۶ء تا ۱۶۰۰ء تک کا دور۔

۴۔ ۱۶۰۰ء تا ۱۸۴۹ء تک کا دور۔

۵۔ ۱۸۴۹ء کے بعد کا دور۔

موہن سنگھ نے پنجابی ادب کا آغاز ناتھ جوگیوں سے کیا ہے۔ موہن سنگھ کی رائے میں قدیم پنجابی وہی اپ بھرنش ہے جو پشاچی کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور میں پنجابی ادب میں جوگیوں اور مسلمانوں دونوں کا حصہ ہے۔ جوگی شعراء میں چرپٹ ناتھ گورکھ ناتھ، چورنگی ناتھ، پورن بھگت، رتن ناتھ اور حاجی بابا رتن ہیں۔ اور مسلمانوں میں سعود سعد سلمان، بابا فرید شکر گنج، خواجہ امیر خسرو وغیرہ ہیں۔

دوسرا دور باباگورونانک کا ہے جو اپنی جگہ علیحدہ باب ہے۔ یہ دور ۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۰ء تک کا ہے۔ بابا نانک سکھ مذہب کے بانی تھے۔ اور ان کا کلام پنجابی کا اولین مستند شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے جو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی مذہبی تعلیمات کو پنجابی نظم میں ڈھالا ہے تاکہ لوگ ہدایت پا سکیں۔

تیسرے دور میں پنجابی کے بلند پایہ شعراء ملتے ہیں۔ ان میں شاہ حسین، جن کی کافیاں مشہور ہیں۔ دمودر، پیلو، سلطان باہو، حافظ برخوردار، احمد گوجر، چھجو بھگت لاہوری سقرا شاہ، عبداللہ لاہوری، درویش محمد، دولت علی، مولوی عبدالحکیم، کمال الدین بھٹو، عبدالرحمان منہاس، حکیم درویش، شاہ طرلیف، پیر محمد کاسبی اور حافظ معز الدین ہیں۔

پنجابی ادب کا چوتھا دور وسعت کے لحاظ سے پہلے ادوار سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس دور میں پنجابی نثر کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس دور کی نثر اتنی ترقی یافتہ نہیں لیکن اس دور میں علمائے دین نے آنحضورؐ کی سیرت پر کئی رسالے تصنیف کیے۔ پنجابی زبان کے قواعد لکھے گئے۔ اس دور کی شاعری زیادہ تر مذہبی یا پھر رزمیہ نوعیت کی ہے۔ اس پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔ اس دور کے شعراء اور ادیبوں میں وارث شاہ، بلھے شاہ، علی حیدر، خواجہ فرد فقیر، ہاشم شاہ مقبل، قادر یار، احمد یار، حامد شہابت کوی، عبدالحکیم بہاولپوری، میاں لطف علی، شاہ محمد، مولوی محمد مسلم مصنف عجائب القصص ہیں۔

پنجابی ادب کا پانچواں دور ۱۸۴۹ء سے بعد کا ہے اس دور میں انگریزی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو بھی قبول عام ہونا شروع ہوا۔ ہندوؤں نے اردو کی مخالفت شروع کر دی اور اس رد عمل کے طور پر مسلمانوں نے اس زبان کو اپنی قومی اور ملی زبان کا درجہ دے دیا۔ چنانچہ پنجاب کے مسلمانوں نے بھی اپنی مقامی زبان سے دلچسپی کم کر دی۔ اور ان کے مقابلے میں سکھوں نے پنجابی کے حق میں شدت اختیار کی۔ اس دور میں انگریزی اور اردو ادب کے اثرات سے پنجابی بھی متاثر ہوئی۔ اور اس کے ادب میں نئی نئی اصناف کی سرپرستی بھی ہوئی۔ نثر کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم پنجاب کے بعد مشرقی پنجاب پنجابی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ لیکن وہاں کا ادب گورمکھی رسم الخط میں ہے جس وجہ سے مغربی پنجاب والوں نے اس سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ اس دور میں پنجابی ادب میں دو بالکل الگ روایتیں پائی جاتی ہیں ایک قدیم روایت جس کے تحت سید فضل شاہ کی "سوہنی مہینوال" اور میاں محمد بخش کی "سیف الملوک"، ہدایت اللہ کے دوہڑے، چومصرعے اور باراں ماہے، خواجہ غلام فرید کی صوفیانہ شاعری، مولوی غلام رسول کی "احسن القصص" اور "داستان امیر حمزہ"، محمد بوٹا گجراتی کا قصہ مرزا صاحباں، سر شہاب الدین، فیروز دین شرف، بابو کرم امرتسری، استاد گام، سائیں مولا بخش، عشق لہر، سوختہ امرتسری، مولا بخش کشتہ، عبدالغنی وفا، لال دین قیصر، فیروز سائیں عارف، جوشوا فضل دین، استاد دامن کی شاعری اہم ہے دوسری جدید روایت جو انگریزی اور اردو ادب کے زیر اثر ہے اور جس کی وجہ سے پنجابی شاعری میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہو گئیں جو عالمی ادب میں مختلف ادبی تحریکوں کی وجہ سے وجود میں آئی تھیں۔ ان جدید شعراء میں معمر لوگ بھی شامل ہیں اور نوجوان بھی۔

قدیم پنجابی ادب پر مذہبی خصوصاً اسلامی رنگ غالب ہے۔ لیکن دور جدید میں بھی اس میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ حافظ محمد لکھوی نے تفسیر محمدی کے نام سے قرآن مجید کا منظوم پنجابی ترجمہ مع تفسیر اور "الزاع مولوی بارک اللہ"، "الزاع طہری" "احوال الآخرت"، "زینت اسلام" اور "سیف السنۃ" لکھیں، مولوی حبیب اللہ فیروز دین نے "تفسیر قرآن" لکھی۔ میاں جان نے "تیسویں پارے" مولوی نور محمد نے "سورۃ الملک" غلام کبریا اور ظہور الدین اکمل نے "سورۃ رحمٰن"، عبدالکریم قریشی نے "سورۃ الفاتحہ"، مولوی محمد عالم نے سورۃ اخلاص، فیل، کہف، ضحیٰ، کوثر کی حیات محمد واعظ نے "نویں پارے تک" اور محمد علی فائق نے نویں پارے سے تیسویں پارے تک "تفاسیر لکھیں۔

پنجابی ادب کی دوسری دینی تصانیف میں ظہور الدین اکمل کی "شرح کافیہ" مولوی محبوب عالم کی "ستر المومنات"، "ترتیب الصلوٰۃ"، "شرح قصیدہ مالی" "شرح خلاصہ کیدانی"، "ہدایت نامہ و عقد نامہ"، "آداب الفقراء" نجم الدین فائز کی کتاب "المناقبات"، عبدالکریم قریشی کی "روح المیلاد فی ذکر المیلاد"، "صلح نامہ حدیبیہ" "تاریخ فتح مکہ" نور الحسن خام کی "ستر النساء"، مولوی دلپذیر بھیروی کی "قصص المحسنین" "وعظ دلپذیر" "گلزار چہار یار"، "الزاع دلپذیر" میاں محی الدین مہدی کی "فقہ اکبر بسد تقلید"، "شرح نجات المومنین"، امام الدین واعظ کی "حقوق الزوجین" عبدالکریم گھیالوی کی تصنیف "نجات المومنین" جس کی شرح میر سید مخدوم نے لکھی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کے نثر میں بھی ترجمے ہوئے جن میں سے نبی بخش حلوائی، عبداللہ چکڑالوی، میاں محمد چٹو کے ترجمے خاص طور پر مشہور ہیں۔

جدید دور میں معیاری پنجابی ادب کو ترقی دینے کے لیے باقاعدہ ادبی محفلیں

Marfat.com

اور سنگتیں قائم ہو چکی ہیں۔ ماہنامہ "پنج دریا" اور "پنجابی ادب" اس کی ترویج و اشاعت کے لیے میدان عمل میں ہیں۔ پنجابی کی مقامی بولیوں میں سرائیکی نے اپنی علیحدہ ادبی حیثیت حاصل کر لی ہے اور یوں رفتہ رفتہ پنجابی زبان صرف لاہور ہی تک محدود ہو رہی ہے۔

پنج پیر پاک و ہند میں پانچ پیروں کا عقیدہ، جسے پانچ پیر اور پنج کڑی بھی کہتے ہیں ان پڑھ مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ عام ہے۔ یہ ترکیب غالباً ہندی مسلمانوں ہی نے وضع کی ہے تاکہ پنجتن کے ساتھ پنجکڑی بھی مماثل ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے تن کو پیر سے بدل دیا۔

پنج پیر یا پانچ پیروں کا صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا کہ اس مجموعے میں کون کون سے بزرگ شامل ہیں۔ کیونکہ مختلف مقامات میں اس ترکیب میں مختلف بزرگ شامل ہیں۔ مثلاً پنجاب میں اس پنج کڑی میں خواجہ قطب الدینؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ نظام الدین اولیاؒ، نصیر الدین ابوالخیرؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ شامل ہیں۔ ایک دوسری ترکیب میں بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، شاہ رکن عالمؒ، شمس تبریزؒ جلال مخدومؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ شامل ہیں۔

پنج پیر کے نام سے ایک پہاڑی پاکستان کے صوبہ سرحد میں یوسف زئی کے علاقے میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی سطح سمندر سے ۲۱۴۰ فٹ اونچی ہے۔ اس کی چوٹی ۴۰۹۰ فٹ ہے جہاں پر پنج پیر کی زیارت ہے۔ یہ مقام ہندوؤں اور عام مسلمانوں کی عقیدت گاہ ہے۔ ہندو اسے پانچ پانڈوؤں سے نسبت دیتے ہیں۔ اسی طرح ضلع ہزارہ میں ایبٹ آباد کے مقام پر ایک تکیہ پنج پیر کے نام سے موجود ہے۔

آج سے تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے بنگال میں ان پڑھ مسلمانوں اور نیچی ذات کے ہندوؤں میں پنج پیروں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں جگہ جگہ پنج پیروں کی درگاہیں ہیں۔ آج کل بھی لوگ ان درگاہوں کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس علاقے کے ملاح آج بھی کشتی پانی میں ڈالنے سے پہلے ایک نعرہ "اللہ، نبی، پنج پیر بدر بدر بدر" لگاتے ہیں وہ مشہور بزرگ بدر کو پنج پیروں میں سب سے بلند درجہ دیتے ہیں اور سمندر یا دریا کے راستے جب کبھی کوئی طویل یا خطرناک سفر درپیش ہوتا ہے تو یہ ملاح مندرجہ ذیل دعا مانگتے ہیں۔ جس میں پنج پیروں سے ارادت کا اظہار ہوتا ہے

"ہم تو بچے ہیں،
لیکن غازی (پیر) ہمارے نگہبان ہیں۔
ہمارے سامنے گنگا دریا ہے۔
پانچ پیرو ہم آپ کو پکارتے ہیں۔
بالخصوص آپ کے سردار بدر کو۔"

پنج پیر کے عقیدے کے حامل لوگوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ یہ پیر اگرچہ جسمانی طور پر انتقال کر گئے ہیں لیکن روحانی طور پر زندہ ہیں اور مافوق الفطرت قدرت رکھتے ہیں۔ اس قدرت کی وجہ سے وہ اپنے ماننے والوں کی مدد کرتے ہیں۔

بہار اور مغربی بنگال میں اس خیال کے لوگ اپنے گھروں میں ایک کمرہ مخصوص کر لیتے ہیں۔ کمرے کے شمال مغربی گوشے میں ایک چوکی پر چھوٹا سا چبوترہ ان کی نمائندگی کرتا ہے۔ چبوترے کے قریب چوکی پر ٹین کا ایک پنجہ جس پر پانچ انگلیوں کے نشان پنج پیروں کی نمائندگی کرتی ہیں رکھا ہوتا ہے۔ اس چبوترے پر چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے اسلام میں اس طرح کے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان شرفا اور اونچی ذات کے پڑھے لکھے ہندو پانچ پیروں کی پوجا نہیں کرتے جدید دور میں رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ختم ہو رہا ہے۔

پنج تن عام طور پر اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ ہیں۔ عام مسلمان خصوصاً اہل تشیع مختلف حاجات اور ضروریات میں انہیں وسیلہ خیال کرتے ہیں اور "پنجتن پاک" کے نعرے سے تقویت اور مدد حاصل کرتے ہیں۔

پنج دِہ سوویٹ روس کی جمہوریہ ترکمان میں ایک گاؤں، ایک سرسبز قطعہ جو رود کشک کے مشرق میں کشک اور مرغاب کے سنگم پر واقع ہے۔ اس علاقے کے باشندے چند قبیلوں میں تقسیم تھے۔ اس علاقے کو ۱۸۸۵ء کے ایک دردناک حادثے سے جو پنج دہ حادثہ کے نام سے مشہور ہے شہرت حاصل ہوئی۔ اس معرکہ میں افغان فوج نے روسی فوج کے ہاتھوں بہت زیادہ نقصان اٹھایا۔ انیسویں صدی میں اس علاقے میں جمشید اور ہزارہ قبائل آباد تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب مرو پر روس کا قبضہ ہو گیا تو روس اور برطانیہ میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ اس بات چیت کے نتیجے میں افغانستان کی شمالی حد کے تعین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ روسی اس بات پر مصر تھے کہ پنج دہ کے باشندے آزاد ہیں۔ جبکہ انگریزوں کا موقف یہ تھا کہ وہ افغانستان کی رعایا ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں ارساری قبیلے کے لوگ یہاں سے نقل مکانی کر گئے اور ان کی جگہ سرک ترکمانوں نے لے لی۔ اگرچہ یہ علاقہ کئی قبائل کے قبضے میں رہا لیکن تمام کے تمام قبائل اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ وہ افغانی علاقہ میں تھے اور حکومت افغانستان کو خراج دیتے تھے انگریزوں کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ بادغیس کا علاقہ ایک عرصے تک افغانوں کے پاس رہا تھا۔ چنانچہ جب امیر عبدالرحمان کی افغان محافظ فوج نے پنج دہ پر قبضہ کیا تو روسی حکومت نے فوراً احتجاج کیا۔ اسی عرصے میں جبکہ افغانستان کی شمالی حد کے تعین کے لیے لندن میں گفت و شنید ہو رہی تھی، افغانستان کی سرحد پر کئی واقعات پیش آئے۔ ۲۹ مارچ ۱۸۸۵ء کو روسیوں نے افغان سرحد پر حملہ کر دیا۔ جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا لیکن یہ طے پایا کہ افغانستان پنج دہ کا علاقہ روس کو دے کر اس کے بدلے ذوالفقار کا علاقہ لے لے۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں حد بندی مکمل ہو گئی اور روس اور افغانستان کے درمیان ایک معین سرحد تسلیم کر لی گئی۔

پنگولو لغوی معنی سربراہ، مکھیا اور کارفرما کے ہیں سابق جزائر شرق الہند میں پنگولو دینی وغیر دینی امور کے ناظم اعلیٰ کو کہتے تھے۔ لیکن جزائر جاوا اور مادورا میں مسجد کے ایک عہدے دار کو یہ نام دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں مذہب کے سرکاری نمائندوں کی تنظیم مقامی انتظامیہ کے عملے کی طرح کی جاتی تھی۔ اور پنگولو اپنے علاقے کا حاکم ہوتا تھا۔ نائب حکومت جو سب سے اعلیٰ انتظامی حاکم ہوتا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو پنگولو ہوتا تھا۔ مسجد کے عمال کی بھی درجہ وار طبقہ بندی ہوتی تھی۔ ولایت کے صدر مقام کا پنگولو تمام علاقے کی مساجد کے تمام عملے کا صدر ہوتا تھا۔ ... نماز وغیرہ کا انتظام کرنے والا بھی گاؤں کی حکومت کا ایک رکن ہوتا تھا۔

اس عہدے پر تقرری تمام مقام حکمران کرتا تھا اور ریاستوں میں ... ریاست کرتے تھے۔ لیکن ریاستوں میں بھی ان کے فرائض وہی تھے۔

پنگولو کے فرائض مختلف جگہوں پر مختلف تھے ... ہوتا تھا جو اس کی موجودگی میں ہوتا تھا۔ طلاق و رجوع کا فیصلہ کرنا ...

Marfat.com

بعدازاں ان تمام کاموں کی فیس مقرر کی گئی جو پنگولوں اور اس کے عملے کی آمدنی کا باضابطہ تھیں۔ زکوٰۃ بھی پنگولوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھی۔ صدر مقام کا پنگولو قاضی کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔ جزائر شرق الہند ولندیزی مقبوضات کی رو سے پنگولو کی حاضری کو عدالت میں اس وقت لازمی قرار دیا گیا تھا۔ جب مسلمان دیوانی اور فوجداری مقدمات میں بطور ملازم سرکاری عدالتوں میں حاضر ہوتے تھے۔ ان امدادی پنگولوں کی تعداد ہر عدالت کی ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی تھی۔

پوپ لاطینی لفظ ہے جس کے معنی باپ کے ہیں۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں پوپ کا خطاب کسی بھی پادری کے لیے استعمال کر لیا جاتا تھا۔ لیکن بعدازاں یہ لقب روم کے بشپ کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ اہل برطانیہ میں عیسائیت کی ترویج کے فرائض روم کے عیسائی پادریوں نے سرانجام دیے تھے چنانچہ جوں جوں برطانیہ میں عیسائیت کو غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ ایسے ہی ان پادریوں کو بھی عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی چلی گئی اور ان کا تقدس بڑھتا چلا گیا۔ پاپائے روما اہل برطانیہ کا سب سے بڑا روحانی پیشوا بن گیا۔ اور جب روم میں کلیسا نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا تو برطانیہ میں بھی پاپائے اعظم کی دھاک بیٹھ گئی۔

قرونِ وسطیٰ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہو گئی۔

ایک طرف تو سیاسی قوت تھی اور دوسری طرف مذہبی اثر اور دولت، ان چیزوں نے کلیسا کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا اور ہر شخص نہ صرف کلیسا کا محتاج اور اسی کے رحم و کرم پر تھا بلکہ شاہی دربار کے احکام و قوانین بھی کلیسا ہی کی وساطت سے طے پاتے تھے۔ نیز جب بہت سی وحشی اقوام مثلاً گوتھ، ہنس، گال، فرینک وغیرہ نے رومی پوپ کے ذریعے عیسائیت قبول کی تو اس سے پوپ کی قوت میں خاصا اضافہ ہوا۔ پورا یورپ پوپ کے زیر اثر آ گیا۔ دینی اور دنیوی طاقت کا منبع پوپ ہی کی ذات تھی۔ اس لیے اسے غیر محدود اختیارات حاصل ہو گئے اس کی نافرمانی کو ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا۔ پوپ کی ہر بات قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور جو اس کی حکم عدولی کرتا تھا اسے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن پوپ نے اس قوت، دولت اور اثر کا زیادہ بہتر استعمال نہ کیا وہ حضرت مسیح کی سادہ اور بے تکلف زندگی چھوڑ کر عیش و عشرت میں گھر گئے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے ذرائع اختیار کیے۔ یہاں تک کہ پوپ نے جنت کے سرٹیفکیٹ بیچنے شروع کر دیے۔

پوپ کی قوت کا استعمال صرف یہ رہ گیا کہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگائیں اور ان اختلافات میں اس درجہ بڑھ گئے کہ معمولی سا اختلاف رکھنے والوں کو موت کی سزا دے دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے خاص عدالتیں قائم کی گئیں جنہیں احتسابی عدالت کہا جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک ان عدالتوں نے تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار افراد کو مختلف سزائیں دیں۔ ان میں صرف ۲۲ ہزار رہ گئے تھے جنہیں دہکتی آگ میں ڈالا گیا۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں گلیلیو جیسے ماہر سائنسدان بھی شامل تھے۔

عوام پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے تو ان میں پوپ کے خلاف نفرت نے جنم لیا۔ اور ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے پوپ کے اقتدار کو ختم کرنے کی تحریکیں چلائیں۔ ان لوگوں میں پیٹر والڈو، جان ٹولر، مارٹن لوتھر، جیسے افراد تھے جنہوں نے عوام کو پوپ کے اقتدار سے نجات دلائی۔ (نیز دیکھیے: پاپائیت)

پوپر سینٹ ولیم پوپر ایک بلند پایہ مستشرق تھا (زرسعدی) میں ۱۸۶۴ء کو پیدا ہوا نیویارک میں جامعہ کولمبیا میں پروفیسر گوٹائل سے اور سٹراسبرگ کی یونیورسٹی میں پروفیسر نولڈکے جیسے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ مشرقی ممالک میں سیر و سیاحت کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب وطن واپس آیا تو کیلیفورنیا کی یونیورسٹی میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۲۲ء میں سامی زبانوں کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرری عمل میں آئی۔

پروفیسر پوپر کو عربی زبان پر بہت عبور حاصل تھا۔ اسے خاص طور پر مصر کے مملوکوں کے عہد سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اس نے ابن تغری بردی جو ایک مشہور مصری مورخ تھا کی دو کتابوں "النجوم الزاھرۃ فی ملوک مصر والقاھرۃ"، "حوادث الدھور" کو بڑی محنت اور کاوش کے بعد شائع کیا۔ اس نے یہ کام اتنے محققانہ انداز سے کیا کہ اسے اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ایک ولندیزی مستشرق یون بول نے النجوم الزھرۃ کی اشاعت شروع کی تھی۔ لیکن وہ دو جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ پوپر نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور ۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۰ء تک یہ کتاب متواتر بریل کے مطبع خانے سے بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ دوسری کتاب حوادث الدھور مسلسل دس بارہ سال کے عرصے میں چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔

پوکاک (۱۶۰۴ء—۱۶۹۱ء) ایڈورڈ پوکاک انگلستان کا ایک مشہور عربی دان مستشرق اس کا باپ ایک پادری تھا۔ پوکاک نے اپنی ابتدائی عمر ہی سے عربی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ تکمیل تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی سے کی۔ اسے ولیم بیڈویل جیسے فاضل اساتذہ کی شاگردی نصیب ہوئی۔ ۱۶۳۰ء میں پوکاک نے مشرقی ممالک کا سفر کیا۔ پانچ سال حلب (شام) میں گزارے اور یہاں کئی ایک علماء سے دوستی قائم کی۔ نیز شیخ فتح اللہ سے عربی کی تحصیل کی۔

۱۶۳۶ء میں وطن واپس آئے تو آکسفورڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے عربی کی ایک مسند قائم کی اور پوکاک کو سونپ دی۔ چنانچہ پوکاک نے اپنے افتتاحی خطاب میں عربی زبان و ادب کی اہمیت اور ان کے مطالعے کی ضرورت پر زور دیا۔

۱۶۳۶ء ہی میں پوکاک دوبارہ مشرقی ممالک کے دورے پر نکلا اور اس مرتبہ استنبول میں تقریباً تین سال گزارے جہاں اس نے نئی نئی معلومات حاصل کیں۔ ۱۶۴۱ء میں دوبارہ آکسفورڈ واپس آ گیا اور اپنی بقیہ عمر یونیورسٹی ہی میں علمی کاموں میں صرف کر دی آکسفورڈ یونیورسٹی میں پوکاک نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ ابوالفرج کی تاریخ سے اقتباسات لے کر ان پر لسانی، ادبی اور تاریخی حواشی لکھے

۲۔ طغرائی کی مشہور نظم "لامیۃ العجم" کا ترجمہ کیا اور اس پر تبصرہ لکھا۔

۳۔ ابوالفرج ابن العبری کی "مختصر فی الدول" کی تاریخ کا متن ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

اس کے ان علمی کارناموں کی شہرت سن کر دور دراز کے لوگ عربی علوم کی تحقیقات کے لیے آکسفورڈ آنے لگے۔

پوکاک نے اپنی اولاد میں چھ بیٹے چھوڑے تھے۔ اس کے بڑے لڑکے نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر عربی علوم میں تخصص حاصل کیا۔ پوکاک کی وفات کے بعد اس کی عربی کتابوں کا سارا ذخیرہ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں منتقل ہو گیا۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

پولستان ۔ یورپ کا ایک ملک، جو مسلمانوں کی قلمرو میں رہا (دیکھئے پولینڈ)

پولینڈ مشرقی یورپ کا ایک جمہوری ملک جہاں کچھ عرصہ تک مسلمانوں کی عملداری رہی اس کے شمال میں بحیرہ بالٹک اور جنوب میں سوڈیٹن اور کارپاتھین پہاڑ ہیں۔ اس میں بہنے والے دریا وسچولا، وارٹا اور ڈرد وغیرہ بحیرہ بالٹک میں گرتے ہیں۔ یہ ایک زرعی ملک ہے اور زمین کے ستر فیصد رقبے پر کاشت ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اس ملک نے صنعت و حرفت اور جہازرانی میں کافی ترقی کی۔ اس ملک میں کئی بندرگاہیں ہیں جن میں ڈینبرگ مشہور ترین ہے۔

۱۳۸۶ء میں پولینڈ اور لتوانیا متحد تھے یہی وجہ ہے مسلمانوں کی تاریخ میں لتوانیا اور پولینڈ کا ذکر مشترکہ طور پر کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی کے آخر میں اردوئے طلائی کے تاتاری مسلمانوں نے لتوانیا میں آکر سکونت اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس دور میں مسلمانوں کے ساتھ یہاں کے لوگوں کا رویہ بہی خواہانہ تھا۔ مسلمانوں کو نہ صرف مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ مراعات بھی دی گئی تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کی تاریخ شروع زمانے سے پولینڈ کی تقسیم تک لتوانیا کے ساتھ وابستہ رہی اسی وجہ سے انہیں لتوانیائی تاتار کا نام دیا گیا ہے۔

۱۳۸۶ء میں پولینڈ اور لتوانیا کا آپس میں ادغام ہو گیا تو پولینڈ کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت یہ ایک جاگیردارانہ وفاق تھا اور یہاں کے باشندوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ یہ روسی ریاستیں لتوانیا کی جانب خاص طور پر کشش رکھتی تھیں اور لتوانیا کو التون اوردو پر ترجیح دیتی تھیں۔ اس زمانے میں لتوانیا ایک بڑی ریاست تھی جو گالیشیا کو چھوڑ کر سارے مغربی روس میں پھیل چکی تھی تاتاریوں کی لتوانیا میں موجودگی کا تذکرہ سب سے پہلے پولینڈ اور لتوانیا کے ادغام کے وقت ملتا ہے۔ بقول داکوفسکی جو ایک پولستانی مورخ تھا "لتوانیا کے گرینڈ ڈیوک کے جلو میں اس کے ذاتی محافظ فوجی سپاہیوں میں ایک تاتاری دستہ بھی ہوتا تھا۔"

۱۳۹۵ء میں تقتمش نے امیر تیمور سے آخری شکست کھائی تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت لتوانیا آکر پناہ گزیں ہوا۔ تاریخی اعتبار سے لتوانی تاتاریوں کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آلتون اردو کی یادگار ہیں۔ لتوانیا میں تاتاری سولہویں صدی کے آخر تک لتوانیوں کے حسن سلوک سے مستفید ہوتے رہے۔ انہیں مکمل مذہبی آزادی تھی مساجد کے لیے امام اسلامی ممالک سے بلائے جاتے تھے۔ حج پر جانے کی اجازت تھی۔

اندرونی معاملات میں انہیں قانون شریعت پر عمل کرنے کا حق تھا۔ ایسے مقدمات قاضی سنتے تھے جو اکثر مساجد کے امام ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنی مرضی سے اسلامی عدالت کے بجائے ملک کی عام عدالتوں سے بھی رجوع کر سکتے تھے۔ جہاں لتوانی قانون لاگو تھا۔ آلتون اردو سے ترک وطن کر کے لتوانیا میں آکر بسنے کے بعد انہیں ان جاگیروں کے برابر جاگیریں دی گئیں جو وہ اپنے وطن میں چھوڑ کر آئے تھے۔ سترہویں صدی میں جب یہ خاندان ختم ہوا تو تاتاریوں پر مظالم بھی شروع ہو گئے۔ مساجد کی تعمیر ممنوع ہو گئی۔ تاتاریوں پر ۱۶۵۵ء تا ۱۶۶۰ء کا دور بڑا مشکل دور تھا جبکہ ولنو پر ماسکو کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور پولینڈ پر سویڈن نے حملہ کر دیا۔ اس دوران میں بہت سے تاتاری بھاگ کر ترکی میں پناہ گزین ہو گئے۔ جب پولینڈ کی صورت حال سنبھل گئی تو ان میں سے کچھ واپس بھی چلے گئے۔ البتہ اس دور میں تاتاریوں کی

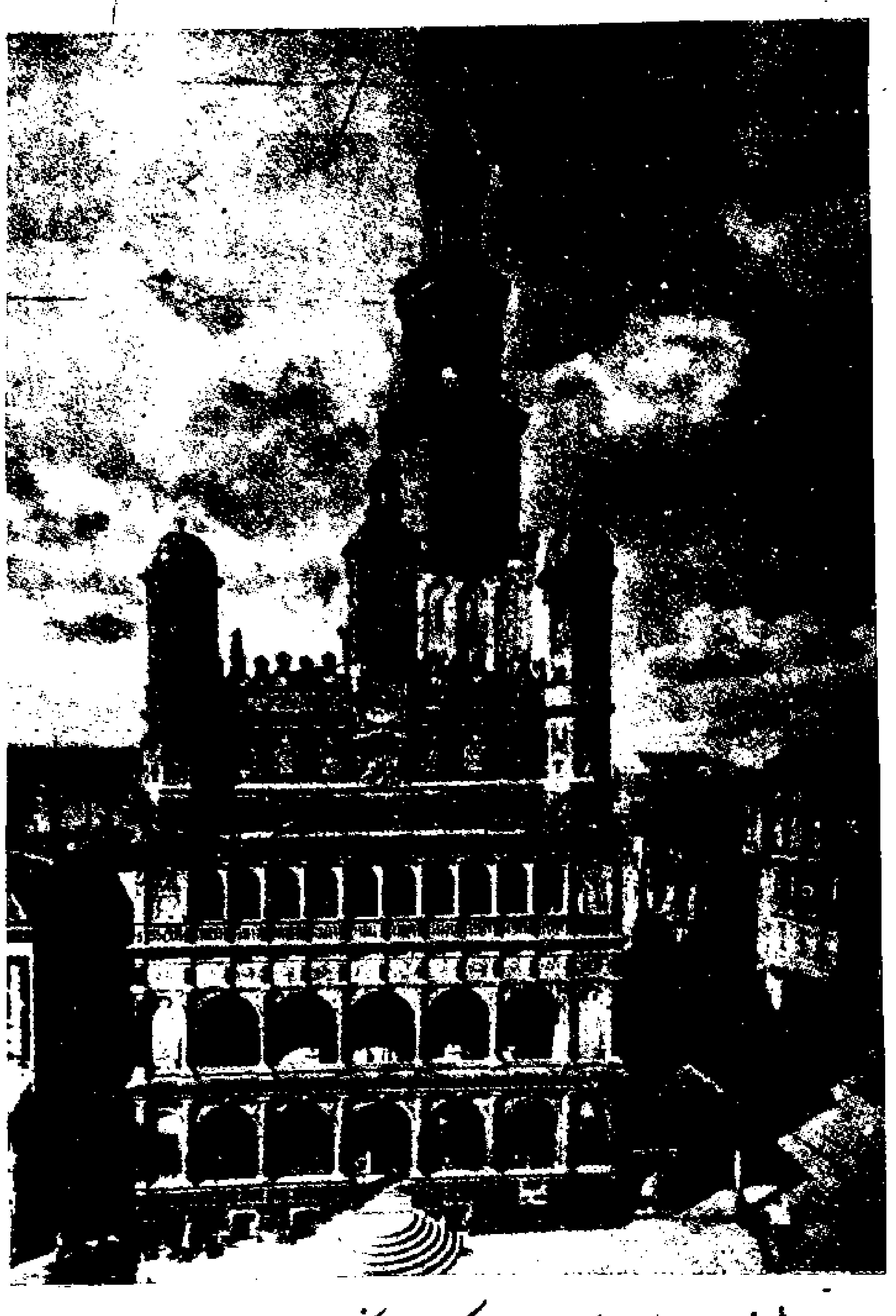

ٹاؤن ہال پوزنان کی تاریخی عمارت

تعداد کافی حد تک کم ہو گئی۔ ۱۷۰۲ء کی خانہ جنگی کے دوران میں بھی ترکی کی طرف انکی نقل مکانی کا پتہ چلتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں جب پولینڈ میں باقاعدہ فوج رکھی گئی تو تاتاریوں کی ایک بڑی تعداد اس فوج میں شامل تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جرنیل ایک تاتاری تھا۔ پولینڈ کے آخری بادشاہ سٹینسلاس آگسٹس نے تاتاریوں کے پرانے امتیازات بھی بحال کر دیئے۔ ۱۷۹۴ء میں جب پولینڈ آخری بار تقسیم ہوا تو تاتاری روس کے ماتحت آگئے۔ یہاں کی ملکہ کیتھرائن دوم نے بھی وسیع مذہبی رواداری کا ثبوت دیا۔ اس نے انہیں پولینڈ کا ساتھ ترک دینے کی ترغیب دی اور ۱۷۹۴ء میں ایک فرمان کے ذریعے اس نے اپنی سلطنت کی ملکی اور فوجی تمام ملازمتوں کے دروازے تاتاریوں کے لیے کھول دیئے۔ اس کے بیٹے پال اول نے ۱۷۹۷ء میں سواروں کا ایک دستہ قائم کیا۔ جس میں صرف تاتاری ہی شامل تھے چنانچہ اس دور میں تاتاریوں نے تعلیم کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہ دی اور فوج کی ملازمت کو ترجیح دی۔ اس بات کا ثبوت پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں ملتا ہے جس میں روسی فوج میں بیس تاتاری جرنیل تھے۔ چھوٹے افسروں اور سپاہیوں کا شمار ہی مشکل ہے۔ ۱۸۶۳ء تک تاتاریوں پر پولستانی تہذیب غالب تھی جب وہ روس کے تحت آگئے تو روسی اثرات قبول کرنا شروع کر دیئے۔ ان کی زبانیں بھی دو ہو گئیں ایک پولستانی اور دوسری روسی۔

سولہویں صدی میں تاتاریوں کی تہذیب خاصی بلند تھی جس کا پتہ مذہبی ادب

Marfat.com

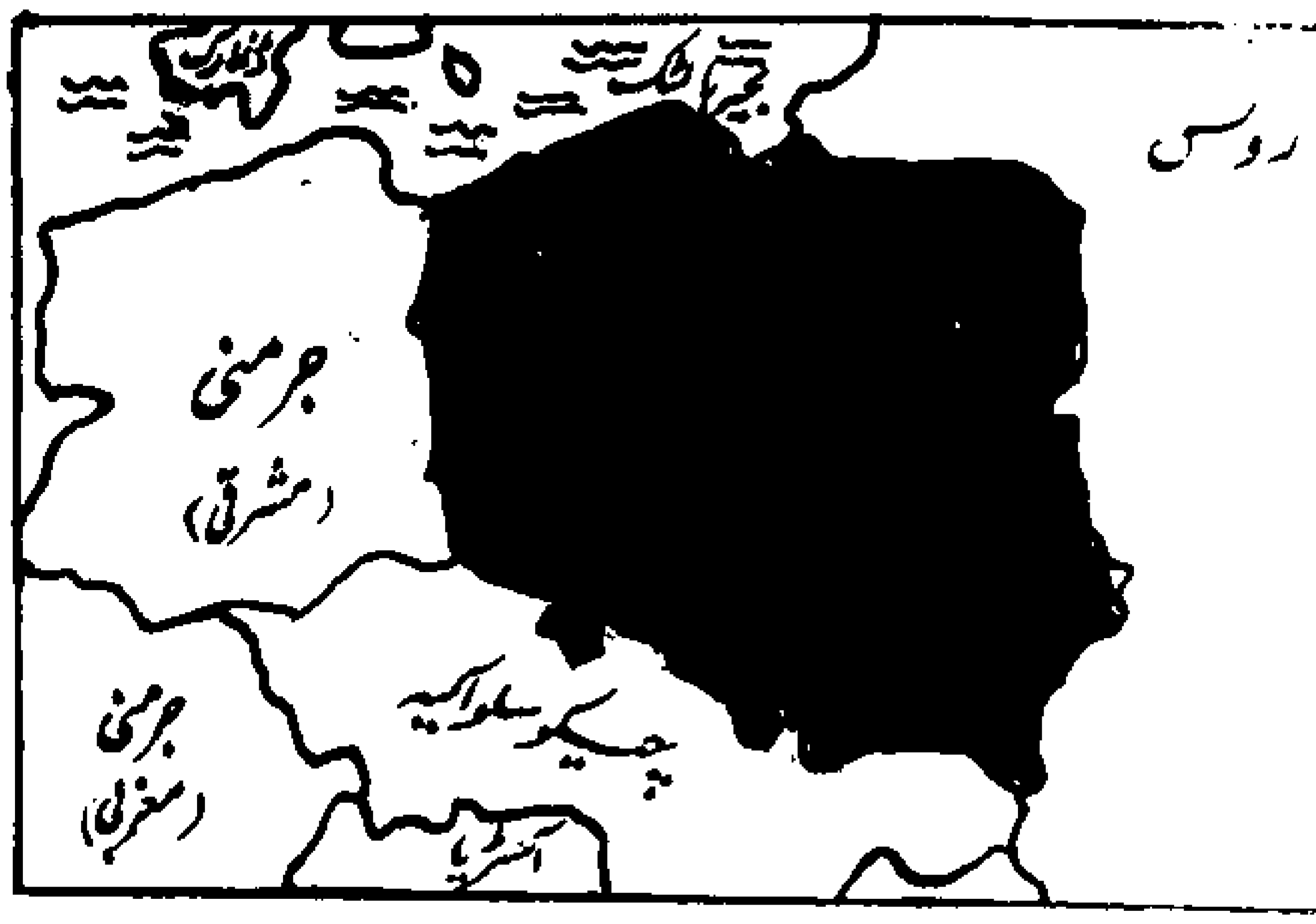

سے جاتا ہے جو سفید روسی اور پولستانی زبان میں عربی رسم الخط میں تھا۔ اس ادب میں عربی زبان و خط سکھانے کی کتابیں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر، سیرۃ النبیؐ کتب تاریخ و دینیات پر کتابیں تھیں۔

سترہویں صدی کے ہنگاموں کے بعد سے بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کا معیار تہذیب گرنا شروع ہو گیا۔ اب مسلمانوں کے امام بہت کم تعلیم یافتہ رہ گئے جو صرف نماز پڑھا سکتے تھے۔ چنانچہ نوجوان مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی۔ جب ۱۹۱۹ء میں پولینڈ کا دوبارہ احیاء شروع ہوا تو مسلمانوں کا معیار تہذیب بھی بلند ہونے لگا۔ حکومت نے قدیم رواداری پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کو مکمل آزادی دے دی۔ ۱۹۲۵ء میں یہاں کے مفتی یعقوب شنکیے وچ کو مسلمانوں کا صدر مقرر کر کے مکمل طور پر اندرونی خود مختاری عطا کر دی گئی۔ مسلمانوں کو انتظامی اور فوجی ہر محکمے میں پوری مساوات کے ساتھ قبول کیا جاتا تھا۔ وارسا کی عبوری اشتراکی حکومت نے روس سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت ان تاتاری مسلمانوں کو پولینڈ کی رعایا بن جانے کا حق مل گیا۔

پولینڈ اور لتوانیا نے متحد ہو کر امیر تیمور کے خلاف قدم اٹھایا تو ان کے لئے عثمانی ترکوں کے دل میں ہمدردی پیدا ہو گئی اور یہ ہمدردی آگے چل کر مفادات کے اشتراک کی وجہ سے عثمانی ترکوں اور ان کے درمیان باہمی دوستی کا رنگ اختیار کر گئی۔ چنانچہ عثمانی ترکوں نے ہر مشکل اور آڑے وقت میں اس دوستی کو نبھایا اور ترکیہ پولینڈ کا واحد مددگار رہا۔ اگرچہ پولینڈ کا ترکیہ کے ساتھ ایک جیسا سلوک نہیں رہا۔ لیکن ترکیہ والوں پر اس چیز کا اثر بہت کم ہوا۔ یہاں تک کہ جب ۱۷۶۸ء تا ۱۷۷۴ء روس اور ترکی میں جنگ ہوئی تو پولینڈ اس میں عملاً شریک نہیں ہوا تو ترکوں کو اس جنگ میں شکست ہوئی تو پولینڈ کے بھی ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن ترکی دنیا کا واحد ملک ہے جس نے پولینڈ کی اس تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ۱۹۱۹ء میں پولینڈ کا احیاء ہوا تو ترکی کے اس سے دوستانہ تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے۔

پولینڈ کا رقبہ ۱۲۰۹۲۴ مربع میل (۳۱۲۶۷۷ مربع کلومیٹر) ہے۔ یہ ۱۷ صوبوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۹۷۴ء میں ۳۳۵۰۰۰۰۰ ہے۔

وارسا کے شاہی محلے اور شاہی چوک

پونا بھارت کے صوبہ مہاراشٹر کا ایک شہر اور ضلع جو سطح سمندر سے ۱۸۵۰ فٹ بلند ہے اور بمبئی سے ۱۱۹ میل جنوب مشرق میں ہے۔ یہ شہر مٹھا اور مولا ندیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ تیسری صدی عیسوی تک پونا دکن کی آندھرا حکومت میں شامل تھا۔ دکن پر خلجی اور تغلق حملوں کے بعد یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اور اس کے بعد سے مسلمانوں کے مقبوضات میں شامل رہا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں مرہٹہ قوت کو جو نشو و نما ہوئی وہ اسی علاقے میں ہوئی اور تقریباً سو سال تک یہ شہر مرہٹہ طاقت کا مرکز رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اس علاقے پر بھی برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس پونا ہی میں ہوا تھا۔ پونا کی کل آبادی ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۸۵۳۲۲۶ تھی۔

پونا ضلع کا کل رقبہ ۶۰۲۲ مربع میل اور ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۲۴۶۵۰۸۰ تھی۔

پونا میں ایک یونیورسٹی ہے۔ کاغذ کا ایک بڑا کارخانہ اور کپاس کا ایک کارخانہ ہے۔

پونتیاک انڈونیشی بورنیو میں دریائے کپواس کے ڈیلٹے کی ایک ریاست اور اس کے صدر مقام کا نام جو خط استوا پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۵۴ مربع کیلومیٹر ہے۔ شریف عبدالرحمان نے ۱۷۷۲ء میں شہر کی بنیاد رکھی اس کے باپ شریف حسین نے ۱۷۳۵ء میں متن میں سکونت اختیار کی۔ بعد ازاں وہ یہاں وزیر کے عہدے پر فائز ہوا۔ عبدالرحمان ایک ڈیاک عورت کے بطن سے تھا اور اپنی ابتدائی عمر ہی سے باعزم اور باہمت تھا۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ سلطان اس کا مربی تھا لیکن اس نے پہلے میپاوا اور اس کے بعد پلیم بنگ اور بنجرماسین میں اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور اسی وجہ سے بعد میں اسے یہ مقام چھوڑنا پڑا۔ میپاوا اور بنجرماسین کی شہزادی سے شادی کرنے کی وجہ سے عبدالرحمان بہت دولت مند ہو گیا تھا دوسرے اسے میپاوا میں کرائی کامیابی بھی نصیب نہ ہوئی تھی چنانچہ اس نے لنڈک اور کپواس کے سنگم کے دہانے پر ایک غیر آباد علاقے میں ایک شہر بسانے کا فیصلہ کیا۔

یہ علاقہ تجارت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ بہت جلد اس شہر نے بوگنی، ملاوی اور چینی تاجروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی اور بہت تیزی سے ترقی کی۔

عبدالرحمان نے تجارت پر مناسب محصول عائد کر کے اسے باضابطہ بنایا۔ رعایا کے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کا ایک سردار مقرر کیا۔ بعد میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنٹام یا میں متن سے مغربی بورنیو کے علاقے پر تمام حقوق خرید لیے تو عبدالرحمٰن سے اس کمپنی کے نمائندے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس نے پونتیاک اور سنگاؤ کی ریاستیں اسے بطور جاگیر عطا کر دیں۔ ۱۷۷۲ء میں بوگنیوں کے سلطان راجہ حاجی نے اسے سلطان

کا خطاب دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شریف قاسم ان ریاستوں کا سلطان بنا تو اس نے دربار کے عربی رسوم اور آداب کو جدید طریقوں سے بدلا۔

پونتیاک مسلمانوں کا شہر ہے اور اسی نسبت سے یہاں سے حاجیوں کی کافی تعداد حج کے لئے خانہ کعبہ جاتی ہے

آبادی کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ دوسرا بڑا ذریعہ روزگار جنگلات ہیں یہاں کی اشیائے برآمد میں ناریل، سیاہ مرچ، سابودانہ، ربڑ اور رو ٹین ہیں جو سنگاپور اور جاوا کو بھی بھیجی جاتی ہیں۔ چاول، کپڑا اور دوسری چیزیں درآمد کی جاتی ہیں۔ تجارت پیشہ رگ زیادہ تر چینی ہیں۔

پونتیاک کی سلطانی ریاست ولندیزیوں کی سیادت میں خود مختار تھی۔ ۱۸۵۵ء میں شرق الہند کی ولندیزی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت سلطان کو ایک مقرر رقم ملتی تھی اور ریاست کی عدالت اور پولیس کا انتظام سلطان کے ذمے ہوتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ولندیزی حکومت کے ساتھ ایک طویل معاہدے میں باہمی روابط کا نئے سرے سے تعین کیا گیا۔ یہاں کی آبادی ملادی، ڈیاک، فرنگی، چینی اور دوسرے باشندوں پر مشتمل ہے۔ ملادی اصطلاح: عرب النسل، جاوی، بوگنی اور ڈیاک تمام مقامی مسلمانوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اندرون ملک کے ڈیاک ابھی تک غیر مسلم ہیں۔

پونتیاک ایک تجارتی مرکز کے علاوہ صحت افزا مقام بھی ہے اور مزید ترقی کر رہا ہے۔

پھل ثمر، میوہ جات جنکا ذکر قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الرحمٰن میں ہے۔

"زمین کو اس نے سب مخلوقات کے لئے بنایا۔ اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔" (۵۵: ۱۰، ۱۱)

"دونوں باغوں میں دو چشمے رواں ہیں۔ اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے؟ دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں۔" (۵۵: ۵۰ تا ۵۲)

"ان میں بکثرت پھل اور کھجوریں اور انار ہیں۔" (۵۵: ۶۸)

قرآن میں ایک اور جگہ جنت کے پھلوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔

"ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیئے جاتے تھے۔" (۲: ۲۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جو پھل کھانے کو دیئے جائیں گے وہ کوئی اجنبی پھل نہ ہوں گے جن سے جنتی لوگ نامانوس ہوں بلکہ شکل و صورت میں انھی پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے جن سے وہ دنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وہ ان سے بدرجہا بڑھے ہوں گے۔ دیکھنے میں آم اور انار ہی ہوں گے جنہیں اہل جنت دیکھتے ہی پہچان لیں گے مگر مزے میں دنیا کے آموں اور اناروں سے کہیں زیادہ ہونگے کرہ ارض پر پھل سینکڑوں قسم کے ہوتے ہیں۔ موسم کے لحاظ سے بھی پھل کے مختلف انواع و اقسام اور مدارج ہوتے ہیں۔ انہیں نعمت خداوندی کہا جاتا ہے۔ غذائی اعتبار سے پھل اپنے اندر اعلیٰ درجے کی خوبیاں رکھتا ہے۔ یہ ایسی غذا ہے جس سے کوئی مضرت نہیں پہنچتی۔ حکماء نے مختلف پھلوں سے مختلف بیماریوں کے علاج بتائے ہیں۔

پھلواروی، جعفر شاہ، سید اردو کے مشہور عالم۔ (دیکھیے: جعفر شاہ پھلواروی)

پیالہ پاشا (۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء) ایک عثمانی امیر البحر نوار (ہنگری) میں پیدا ہوا۔ کروٹ نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ باپ کا نام عبدالرحمان تھا۔ وہ لڑکپن میں استانبول کی سرائے میں ایک خدمت گار کی حیثیت سے قپوجی باشی تک ترقی کر گیا۔

۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں امیر البحر بنا اور سنجق بے کا خطاب ملا۔ ۹۶۵ھ/۱۵۵۹ء میں اسے بیلربای کا عہدہ دیا گیا اور وزیر اعظم رستم پاشا کے بھائی سنان پاشا کے عہدے پر اس کی تقرری کی گئی۔

اس نے جربہ کی تسخیر اور دوسری بڑی بحری فتوحات کیں۔ سلطان سلیمان نے اس کی شادی اپنی پوتی جوہر سلطان سے کی اور اس کے پانچ سال بعد اسے اوج طوغ وزیر ملک کے عہدے کے نشان سے نوازا گیا۔ اس دوران میں اس نے سمندر میں بہت سے معرکے سرانجام دیئے اور وہ عثمانی سلطنت کا عظیم ترین امیر البحر شمار ہونے لگا۔

پیالہ پاشا نے نیپلز کے گرد ساحل پر فرانسیسی سفیر دارامون کی شہ پر چھاپے مارے رجیو کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں البہ کا محاصرہ کیا مگر ناکام رہا۔ اس کے بعد الجزائر کی مستحکم بندرگاہ وہران کو فتح کر لیا اور اگلے سال بزنا کی بندرگاہ پر بھی قبضہ جما لیا۔ اس سے اگلے سال ڈیڑھ سو بادبانی جہازوں کے ساتھ جزیرہ میورقہ پر حملہ کیا۔ اور نیپلز کے قریب سورنتو کو جلا کر تباہ کر دیا۔ ۱۵۶۰ء میں اس نے سب سے بڑا بحری کارنامہ تسخیر جربہ سرانجام دیا۔ ۱۵۶۴ء میں ایک چٹانی جزیرہ نما ہسپانویوں سے لے لیا تاکہ مالٹا کی تسخیر کی تیاری کر سکے مگر اس معرکے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۵۶۶ء میں جب سلطان سلیمان نے ہنگری پر چڑھائی کی تو پیالہ پاشا استنبول کی بندرگاہ کا نگران تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے وہ جزیرہ خیوس اور ساحل اپولیا پر حملہ کر کے جزیرے اور بندرگاہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس جزیرے کی فتح کے بعد پیالہ پاشا کو اس کے خسر سلیم ثانی نے امیر البحر کے عہدے سے سبکدوش کر دیا کیونکہ اس پر الزام تھا کہ جزیرہ خیوس کے مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ اس نے خود رکھ لیا ہے۔ ۱۵۷۰ء میں پیالہ پاشا نے شاہی دربار میں دوبارہ اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے تینہ کو فتح کر کے اسے قبرص کی فتح میں شامل کر لیا۔

اس نے استنبول میں وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کی دولت کا بڑا حصہ شاہی خزانے میں لے لیا گیا اور کچھ اس کی بیوہ اور بچوں کو دے دیا گیا۔

اسے استنبول کے محلہ قاسم پاشا کی مسجد میں جو خود اس نے تعمیر کرائی تھی دفن کیا گیا۔

پیر:۔ بزرگ، بوڑھا، استاد، شیخ (دیکھیے "مرشد")

پیر بابا (وفات ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء) سید علی غواص پیر بابا ابن سید قنبر علی پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک بزرگ، صوفی۔ وطن خندس تھا۔ والد شاہان وقت سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دنیاوی منصب وجاہ کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ دادا سید احمد نور بہت اونچے پائے کے بزرگ تھے جو خندس اور بدخشاں میں عوام کی رشد و ہدایت میں مصروف رہے۔ پیر بابا کو بچپن میں ان کے گھر والے دیوانہ کہتے تھے۔ ان کے دادا کو ان سے خاص انس تھا۔

"تذکرۃ الابرار والاشرار" میں ان کا نسب نامہ اس طرح درج ہے۔ علی بن قنبر علی سید احمد نور بن یوسف نور بن محمد نور بخش ترمذی بن احمد نعیم بن براق بن احمد مشتاق بن شاہ الوہاب بن حامد بن محمود بن اسحاق بن عثمان بن جعفر بن عمر بن محمد بن حسام بن شاہ ناصر بن امیر علی بن عبدالرحیم بن محمود مکی بن مہدی بن حسن عسکری بن علی نقی بن محمد تقی بن امام

Marfat.com

موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین بن علیؓ۔

ابتدائی تعلیم اپنے دادا سے حاصل کی اور شرح ملا جامی تک انھی سے تکمیل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ تصوف سے آگاہی بھی انہی سے حاصل کی اور سلسلہ کبرویہ میں اجازت لی۔

پیر بابا کے والد چونکہ دنیادار انسان تھے اور انہیں شاہی دربار میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اکثر اپنے بیٹے کو شاہی لباس پہنا کر دربار میں لے جاتے تھے۔ پیر بابا کی طبیعت کو قرار نہ تھا چنانچہ ایک مدت بعد حصول علم اور روحانیت کی طلب میں پانی پت آئے۔ اور شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کے مزار پر حاضری دی اس کے بعد ایک نامعلوم جگہ پر عبادت الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ بعد میں آپ کے والد آپ کی تلاش میں اس مقام پر آ پہنچے تو آپ نے اپنے والد سے مزید سفر کی اجازت لی اور پرگنہ مانک پور میں شیخ سلیونہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہیں پر شیخ موصوف سے علم کی مزید تحصیل کی اور "ہدایہ" تک تعلیم حاصل کی۔ بیعت ہونے کی بھی خواہش ظاہر کی لیکن شیخ موصوف نے بیعت کے سلسلے میں اجمیر والے شیخ سالار رومی کی طرف رہنمائی کی۔

شیخ سالار رومی نے پیر بابا کو تصوف اور سلوک کی منازل طے کرائیں۔ "خزینۃ الاصفیا" میں آپ کو نظام الدین تھانیسری کا مرید اور خلیفہ بتایا گیا ہے۔ لیکن "تذکرہ الابرار والاشرار" میں سالار رومی سے بیعت ہونے کا ذکر ہے جو آپ کے ایک مرید اخوند درویزا نے لکھی ہے وہ لکھتے ہیں: "میں ایک طویل مدت تک آپ (پیر بابا) کی خدمت میں رہا اور میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ آپ کے قدموں میں بسر کیا۔ چونکہ حضرت متقدمین مشائخ کی طرف سے پانچ خانوادوں میں مجاز تھے۔ ان میں سے ایک خانوادے میں آپ کو اپنے دادا کی طرف سے اجازت تھی اور چار میں شیخ سالار رومی کی طرف سے۔"

یہ سلسلے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سلسلہ کبرویہ، ۲۔ سلسلہ چشتیہ، ۳۔ سلسلہ سہروردیہ، ۴۔ سلسلہ شطاریہ

۵۔ سلسلہ ناجیہ حلاجیہ۔

پیر بابا کو اپنے شیخ سالار رومی نے خدمت دین کے لئے پہاڑی علاقے کی طرف جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے کشمیر کا ارادہ کیا اور راستے میں کچھ مدت گجرات میں قیام کیا جہاں بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔ پھر آپ اپنے شیخ کی زیارت کے لئے اجمیر آئے تو دیکھا کہ شیخ وفات پا چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں سے آپ پشاور آئے کچھ عرصہ وہاں ہی سکونت اختیار کی پھر وہاں سے علاقہ یوسف زئی کے موضع سدم میں گئے اور یہاں پر لوگوں کو دین کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

یہیں پر انہوں نے شادی کی اور مستقل سکونت اختیار کی۔ پیر بابا نے لوگوں کو بایزید انصاری اور پیر جال کی تحریک روشنائی کی گمراہیوں سے آگاہ کیا۔ انہی کی مخالفت کی وجہ سے بایزید انصاری جو پیر روشان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ پیر تاریک کے نام سے پکارے جانے لگے۔

پیر بابا اور ان کے خلیفہ اخوند درویزا نے تحریک روشنائی کی مخالفت کے جو دلائل دیئے ہیں وہ یہ تھے۔

۱۔ بایزید ہر موجود شے کو خدا کہتا تھا اور مخلوقات صوری کو ذات خدا جانتا تھا۔

۲۔ بعث کا منکر تھا اور اپنے مریدین کو اس کی تلقین کرتا تھا۔

۳۔ بایزید اور اس کے خلفاء پر تیسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ محرم عورتوں سے خلوت میں بیعت لیتے تھے اور انہیں اپنی خلافت دیتے تھے نہ صرف یہ بلکہ انہیں آراستہ کر کے شہر شہر اپنے ساتھ لے کر پھرا کرتے تھے۔

۴۔ پیر بابا کے نزدیک بایزید کی تصنیف "خیر البیان" کفر و الحاد سے بھری پڑی تھی۔

۵۔ بایزید پر ایک اعتراض یہ تھا کہ وہ عقیدہ تناسخ کا قائل تھا۔ چنانچہ یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات کی بناء پر پیر بابا نے اس تحریک کی ڈٹ کر مخالفت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان الزامات اور اعتراضات میں بعض تو ایسے ہیں جن کا ثبوت سوائے پیر بابا اور ان کے خلیفہ کے اور کہیں نہیں ملتا اور بعض ایسے ہیں کہ ان کی بناء پر بایزید انصاری کو کافر اور ملعون اور ملحد ٹھہرانا بڑی زیادتی ہے۔

پیر بابا اپنی عمر کے آخری حصے میں پاچاکلے (بنیر علاقہ) میں سکونت پذیر ہو گئے اسی مقام پہ پیر بابا کے نام سے مشہور ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ آپ کا مزار بھی اسی مقام پہ ہے جو زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کا مزار درہ کڑاکڑ سے دس میل دور ایک ندی کے کنارے پر آباد ہے۔

آپ کی اولاد میں دو لڑکے سید عبداللہ اور سید قاسم اور تین لڑکیاں بیان کی جاتی ہیں۔

پیر پگارا پاکستان میں سندھ کے روحانی پیشواؤں کا لقب جن کا ایک مرکز پیر جو گوٹھ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر سابق خیرپور اور دریائے سندھ کے درمیان گھرے ہوئے علاقے میں واقع ہے اور دوسرا مرکز سانگھڑ میں ہے جو صحرائے تھار کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

پیران پگارا کے سلسلے کا آغاز سات پشت پہلے ہوا۔ جب سندھ کا یہ عظیم گھرانہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ چنانچہ ایک بھائی کو آنحضورؐ کا جھنڈا اور دوسرے بھائی کو آنحضورؐ کی دستار مبارک ملی۔ چنانچہ پہلے بھائی کا سلسلہ "پیر جھنڈا" کے نام سے مشہور ہوا۔

دستار مبارک (پگڑی) کی وجہ سے دوسرا سلسلہ پگارا کہلایا۔

موجودہ گدی نشین شاہ مرداں شاہ پیر صاحب پگارا ہفتم ۲۲ر نومبر ۱۹۲۸ء کو پیر جو گوٹھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید صبغۃ اللہ تھا جو پیر صاحب پگارا ششم کے نام سے مشہور تھے۔ وہ اپنے زندگی میں انگریز سامراج سے برسر پیکار رہے۔ اس خاندان نے ہمیشہ اسلام کے لیے اعلیٰ خدمات سرانجام دی ہیں۔ ڈیڑھ سو برس قبل جب برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی مشہور عوامی تحریک "تحریک مجاہدین" کا آغاز ہوا اور سید احمد شہید راجپوتانہ کے راستے سندھ سے ہوتے ہوئے شمال مغربی کہساروں کی طرف نکلے تو سندھ میں اسی خاندان نے انہیں ہر ممکن مدد کا یقین دلایا اور سندھ میں یہی گھرانہ اس تحریک کا مرکز قرار پایا۔

جنگ عظیم دوم میں پیر صاحب پگارا ششم نے برطانوی استعمار پر ضرب کاری لگانے کے لیے مسلح جدوجہد کی جو خالص عوامی تحریک تھی اور جس کا رابطہ برعظیم کی آزادی کے رہنماؤں سے تھا۔ لیکن آزادی کے اس عظیم مجاہدانہ منصوبے کا علم قبل از وقت انگریزوں کو ہو گیا اور انہوں نے پیر صاحب پگارا کی اس تحریک کو نہایت بے دردی سے کچل ڈالا۔ آپ کو گرفتار کر لیا گیا اور آپ کے مرکز کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا۔ پیر صاحب پگارا ششم کو انگریز کی فوجی عدالت نے سزائے موت دی اور سزا کے بارے میں آپ کو چند گھنٹے پہلے مطلع کیا گیا جس کو آپ نے بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے، نوافل ادا کرتے ہوئے بخوشی قبول کیا۔ چنانچہ آپ کو پھانسی دے کر شہید کر دیا گیا اور آپ کی حر تحریک کو

پکڑ لیا گیا۔

پیر صاحب کے خلاف جب فوجی اقدام ہوا تھا تو انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا اور ان کے اہل خانہ کو کراچی سے جا کر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ بعد میں آپ کے دونوں صاحبزادوں شاہ مردان شاہ اور نادر شاہ کو جن کی عمر بالترتیب تیرہ اور گیارہ سال تھی، پہلے علی گڑھ اور پھر برطانیہ لے جایا گیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دوران تعلیم انہیں اپنے خاندانی پس منظر تاریخ اور روایات کو فراموش کرنے کی تعلیم دی جاتی رہی۔

پیر صاحب پگاڑا ہفتم نے ابتدائی تعلیم سندھی میں حاصل کی نیز اردو، سندھی، انگریزی، عربی، لاطینی میں بھی مہارت حاصل کی۔ ملک واپس آنے پر دینی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۲۳ سال کی عمر میں ۴ فروری ۱۹۵۲ء میں گدی نشین ہوئے کیونکہ پاکستان بن جانے کے بعد اس خاندان کی سابقہ خدمات کے صلے میں انہیں وطن واپس بلایا گیا اور گدی پیر صاحب پگاڑا کو بحال کر دیا گیا۔ پیر پگاڑا فی الوقت پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہیں۔

پیر تاریک:۔ پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک بزرگ (دیکھئے "بایزید انصاری")

پیر جھنڈا:۔ علم والا پیر (دیکھئے "جھنڈا پیر")

پیر روشان:۔ پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک بزرگ (دیکھئے "بایزید انصاری")

پیر مانکی (؟ — ۱۹ رشعبان ۱۳۲۲ھ / اکتوبر ۱۹۰۴ء) پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک مشہور صوفی بزرگ۔ عبدالوہاب۔ والد کا نام مولانا ضیاءالدین تھا جو ضلع پشاور کے موضع اکوڑہ خٹک کے رہنے والے تھے۔ جب اس علاقے پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جانے لگے تو آپ کے والد بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ بداش میں سکونت اختیار کی۔ یہاں انہوں نے ایک مسجد کی امامت اختیار کر لی۔ اس ہجرت میں آپ بھی اپنے والد کے ساتھ شامل تھے۔

اس زمانے میں حضرت عبدالغفور اخوند صاحب کے عرفان و تصوف کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ طلب حق اور معرفت الٰہی کا شوق آپ کو بھی ان کے قدموں میں کھینچ لایا۔ ان کی صحبت میں آپ نے تصوف کی منازل طے کیں اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں جب انگریزی فوج نے مالاکنڈ اور علاقہ سوات پر قبضہ کرنے کی نیت سے پیش قدمی کی تو آپ نے بھی جنگ امبیلہ میں اخوند صاحب، صاحب خانزیان سوات اور بنیر کے ساتھ شامل ہو کر محاذ امبیلہ پر انگریزوں کے خلاف شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے حضرت اخوند سوات نے آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے خوش ہو کر آپ کو خلافت عطا فرمائی۔ خلافت ملنے کے بعد آپ اللہ کے دین کی تبلیغ اور سربلندی میں مشغول ہو گئے مریدین کی ایک جماعت ہر وقت آپ کے ساتھ رہتی اور آپ اس علاقے کے گاؤں اور قصبوں میں پہنچ کر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ موضع کمی خیل میں پانی کی کمی تھی اس لیے آپ نے اپنے مرشد کے حکم کے بموجب مانکی شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔ جہاں آپ کا سالانہ عرس ۲۸ رجب المرجب کو ہوتا ہے۔

آپ نے عوام کو توحید پر قائم رہنے اور مختلف توہمات کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں بہت جدوجہد کی اور اس راہ میں آپ کو بہت سی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ نے کسی بھی بڑی سے بڑی مخالفت کی پرواہ نہ کی۔

آپ کی زندگی کا سب سے اہم پہلو آپ کا نظام اصلاح و تربیت تھا۔ آپ نے غلط اور فاسد نظریات کی اصلاح اور انسانیت کی اخلاقی سطح بلند کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے آپ کی شہرت اس علاقے میں دور دور تک پھیل گئی۔ چنانچہ دور دراز سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

مانکی شریف میں سکونت کی وجہ سے آپ پیر مانکی شریف کے نام سے مشہور تھے۔ مغربی تہذیب سے انتہائی نفرت تھی۔ سادگی آپ کا شعار تھا آپ کھدر کا بنا ہوا لباس پہنتے تھے۔

آپ کی اولاد میں پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ آپ کے بہت سے خلفاء تھے۔ مشہور خلفاء میں عبدالحق ثانی، عبدالقیوم، صاحبزادہ صاحب خویشگی، کابل ملا صاحب، میاں صاحب کاکڑک، گنڈیری ملا صاحب رانی زئے، دکن ملا، یار حسین ملا صاحب، عبدالحنان، حاجی صاحب بنوں، مولانا تاج الدین، مولانا محمد اعظم وغیرہ ہیں۔ مریدین کی تعداد بے شمار تھی۔ آپ کی تصانیف میں احکام المذاہب اور ہدایت الابرار مشہور ہیں۔

پیر مکی (م ۶۱۲ھ / ۱۲۲۵ء) سید عزیزالدین پیر مکی۔ لاہور (پاکستان) کے ایک مشہور صوفی بزرگ وطن بغداد تھا۔ ۱۲ سال مکہ معظمہ میں رہے اسی نسبت سے پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مکہ معظمہ سے آپ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر اعتکاف کی نیت سے لاہور آئے۔ آپ کے سامنے ہی سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور پر یورش کی۔ اس وقت پنجاب پر خسرو ملک غزنوی کی حکومت تھی خسرو نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ابھی ایک سال تک کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ دوسرے برس شہاب الدین نے لاہور پر اور بعد ازاں رائے پتھورا کے دارالحکومت پر بھی قبضہ کر لیا۔

بقول صاحب "خزینۃ الاصفیاء" آپ ۳۶ سال تک لاہور میں مقیم رہے اور وفات کے بعد یہیں دفن ہوئے آپ نے زندگی بھر تدریس علوم کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزارہا لوگ آپ کے وعظ و نصیحت سے مستفیض ہوتے رہے۔

"تحقیقات چشتی" میں لکھا ہے کہ کوئی پیر مکی کو حضرت علی ہجویری کا استاد بتاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ محمود غزنوی کے ساتھ لاہور آئے۔

آپ کا مزار بقول صاحب "تحقیقات چشتی" شاہجہان کے حکم سے تعمیر ہوا جو ٹیکسالی اور بھاٹی دروازوں کے درمیان واقع ہے اور مرجع خاص و عام ہے۔ سالانہ عرس ۱۰ ربیع الاول کو ہوتا ہے۔

پیری، محی الدین (وفات ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء) ایک عثمانی جہاز ران اور نقشہ کشی کا ماہر۔ یہ یونانی الاصل تھا۔ والد کا نام حاجی حقیری تھا۔ اس نے اپنے چچا کمال رئیس کے ساتھ کئی ایک بحری سفر کئے اور بعد میں خیرالدین باربروسہ کے ماتحت خاص امتیاز حاصل کیا۔ پیری نے ان مہموں کے دوران میں بحر روم کے ملکوں کے متعلق بہت واقفیت حاصل کر لی تھی۔ کچھ عرصے بعد مصر کا قپودان بنا۔ اور اس حیثیت میں نہر سویز سے خلیج فارس اور بحیرہ عرب تک جہازی سفر کئے ۹۵۴ھ / ۱۵۴۷ء میں اس نے عدن پر قبضہ کیا۔ بعد ازاں مسقط کی بندرگاہ کو فتح کیا۔ اس

Marfat.com

کے بعد ہرمز کا محاصرہ کیا لیکن واپس بصرے لوٹ گیا۔ ادھر والی البصرہ باب عالی کو مہم ناکام ہونے کی اطلاع دے چکا تھا۔ چنانچہ باب عالی سے پیری کو قتل کر دینے کا حکم آیا۔ جس کے تحت ۹۵۹ھ/۱۵۵۲ء میں یا ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

محی الدین پیری جہاز رانی پر ایک کتاب کا مصنف ہے کتاب کا نام "بحریہ" ہے۔ اس کتاب میں ان تمام سواحل کا حال لکھا ہوا ہے جن کا اس نے سفر کیا تھا۔ اس نے پایاب سمندروں، لنگر ڈالنے کے مقامات، رودوں اور خلیجوں، آبناؤں اور بندرگاہوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

پیری ایک نقشہ نویس بھی تھا۔ اس نے اپنی ایک اٹلس سلطان سلیمان کو پیش کی تھی۔ اس کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک نقشہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں خلیل ادھم بے کو کتب خانہ سرای استنبول میں ملا ہے اس نقشے پر پیری محی الدین کے ۱۵۱۳ء کے دستخط موجود ہیں۔ یہ نقشہ ایک جھلی پر شوخ رنگوں سے بنا ہوا ہے اور ترکی زبان میں عبارت لکھی ہوئی ہے۔

پیشوا دکن کے سیواجی کا وزیر اعظم۔ مرہٹوں کے سرداروں کا لقب۔ سیواجی کو اورنگ زیب نے دہلی میں نظر بند کر رکھا تھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے بہادر شاہ نے اسے اپنے ملک (دکن) جانے کی اجازت دی۔ جہاں اس وقت اس کی چچی تارا بائی مرہٹوں پر حکمرانی کر رہی تھی۔ سیواجی نے تارا بائی کو شکست دی۔ تو مرہٹوں نے اسے اپنا راجہ تسلیم کر لیا۔ اس راجہ کی ایک مجلس تھی جو حکومت کے نظم و نسق کے چلانے میں راجہ کی مددگار ہوتی تھی۔ اسی جماعت میں ایک عہدہ پیشوا یا مکھیا پردھان کا ہوتا تھا۔ سیواجی نے سارا انتظام سلطنت بالاجی وشوا ناتھ کے سپرد کر دیا جو اس وقت پیشوا کے عہدے پر فائز تھا۔ رفتہ رفتہ بالاجی وشوا ناتھ تمام سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تو اس نے پیشوائی کے عہدے کو بھی موروثی بنا لیا۔ بالاجی وشوا ناتھ کو عموماً پہلا پیشوا شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ان مرہٹہ حکمرانوں کے سلسلے کا حقیقی بانی تھا۔ جو آہستہ آہستہ ستارا کے راجاؤں کی جگہ خود مرہٹہ جمعیت کے سردار بن گئے تھے۔ اس سے پہلے چھ اور پیشوا گذر چکے تھے۔ جن کے نام شام راج نیل کنٹھ ارکر، مورو ترمبک پنگلے نیل کنٹھ مرشور پنگلے، پرس رام ترمبک پرتی نیدھی، بہرو مرشور پنگلے اور بال کرشنا واسدیو تھے۔

بالاجی پیشوا کا زمانہ ۱۷۱۴ء تا ۱۷۲۰ء ہے۔ اس زمانے میں مغلیہ سلطنت پر بادشاہ گر سید چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے بالاجی وشوا ناتھ کو دہلی بلا کر اس کی خدمات کے عوض اسے دکن کے چھ صوبوں سے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کی اجازت دی یعنی دکن سے مال گذاری کا ¼ حصہ محصول کی شکل میں اور ایک زائد محصول مالگذاری کا ⅒ لگانے کی اجازت دی۔ یہ گویا ایک قسم کا خراج تھا جو مسلمان اپنی کمزوری کے سبب مرہٹوں کو ادا کرتے تھے۔ اس سے مرہٹوں کا اقتدار بہت زیادہ بڑھ گیا اور انہیں مغلوں کے معاملات میں دخل دینے کا بہانہ مل گیا۔

بالاجی بڑا باتدبیر سردار تھا اس نے مرہٹوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ چوتھ کا دو تہائی حصہ مرہٹہ سرداروں میں تقسیم کر دیا کرتا اور صرف ایک تہائی سرکاری خزانے میں داخل ہوتا تھا۔

باجی راؤ پیشوا:۔ (۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۰ء) بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا مقرر ہوا۔ وہ مرہٹوں کا سب سے بڑا پیشوا تھا۔ اس کے عہد میں مرہٹوں کی سلطنت بہت وسیع ہو گئی۔ کیونکہ اس نے مزید علاقے فتح کیے ...... کی تھی وہ چاہتا تھا کہ مرہٹوں کو منظم کرکے سب سے پہلے دکن پر تسلط جمایا جائے اس کے بعد شمالی ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ باجی راؤ فوراً مغلیہ سلطنت کو تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔ ۱۷۵۹ء میں باجی راؤ کے بیٹے بالاجی راؤ کے عہد میں مرہٹوں نے اٹک کے قلعے پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

ابتداء میں دکن کے صوبے دار نظام الملک سے اس کے معرکے ہوتے رہے نظام الملک نے مرہٹوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر اس نے باجی راؤ سے صلح کر لی۔ اس کے بعد مرہٹوں نے مالوہ، گجرات اور بندھیل کھنڈ پر حملے کیے۔ اور وہاں سے چوتھ وصول کی۔ اس طرح مرہٹوں کا اقتدار دکن کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بھی قائم ہو گیا۔ باجی راؤ کے تدبر اور فتوحات کے باعث مرہٹوں کی سلطنت دور دور تک پھیل گئی۔

بالاجی باجی راؤ:۔ (۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۱ء) بالاجی نے مرہٹہ سلطنت کو اور بھی زیادہ ترقی دی۔ اس کی فوجیں ہندوستان کو کرناٹک سے لے کر پنجاب تک تاراج کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں عبرتناک شکست کھائی۔ اس شکست سے پیشوا کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ مرکزی حکومت بہت کمزور ہو گئی اور مرہٹوں کے تمام ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب پریشان ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اتنے طاقتور نہیں ہوئے جتنے اس جنگ سے پہلے تھے انگریزوں نے مغلوں اور مرہٹوں کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ تمام ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

پیشوا کی موت کے بعد جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے مرہٹوں کی طاقت کو بہت کمزور کر دیا۔

مادھو راؤ پیشوا:۔ (۱۷۶۱ء تا ۱۷۷۲ء) اس کے دور حکومت میں سندھیا نے ۱۷۷۱ء میں ایک بار پھر شمالی ہندوستان پر مرہٹہ اثر قائم کر دیا اور شاہ عالم مغل شہنشاہ مرہٹوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا

نرائن راؤ پیشوا:۔ مادھو راؤ کے بعد اس کا بھائی نرائن راؤ ۱۷۷۲ء تا ۱۷۷۳ء پیشوا بنا جو اپنے چچا کی شہ پر قتل کر دیا گیا۔ اس دور میں مرہٹے دو مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے ایک رگھوبا کے حامی تھے جو پیشوائی کا مدعی تھا اور دوسرا گروہ مادھو راؤ نرائن کے حق وراثت کا حامی تھا۔

مادھو راؤ نرائن:۔ (۱۷۷۴ء تا ۱۷۹۵ء) نرائن راؤ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا۔ یہ مرہٹوں کا چھٹا پیشوا تھا۔

باجی راؤ دوم:۔ (۱۷۹۶ء تا ۱۸۱۸ء) یہ ساتواں اور آخری پیشوا تھا جب نانا فرنویس ۱۸۰۰ء میں فوت ہوا تو ہلکر اور دولت راؤ سندھیا کے درمیان پونا کے اقتدار اعلیٰ کے لئے کش مکش شروع ہو گئی۔ اس کش مکش میں پیشوا بسین بھاگ گیا جہاں اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کی حفاظت میں دے دیا۔ بسین کے معاہدے کی رو سے وہ اس نے اپنے آپ کو پیشوا کا محافظ قرار دیا جو ایک امدادی فوج رکھنے اور انگریزوں کو اپنے دوسرے ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ تنازعات میں ثالث بنانے پر راضی ہو گیا۔ اسی دوران میں بدقسمتی سے پیشوا ایک بے اصول انسان ترمبک جی کے زیر اثر آ گیا۔ چنانچہ جب ریذیڈنٹ الفنسٹن نے اطلاع دی کہ پیشوا انگریزوں کے خلاف مرہٹہ قوت کو منظم کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے تو پیشوا سے

Marfat.com

صلحنامہ پونا پر زبردستی دستخط کرا لیے گئے۔ لیکن باجی راؤ اس مرتبہ بھی اس صلحنامہ پر پورا نہ اترا۔ جونہی لارڈ ہیسٹنگز نے مرہٹوں کے کچلنے کے لیے قدم بڑھایا۔ پیشوا نے بغاوت کر دی۔ اور برطانوی ریذیڈنسی کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ آخرکار پیشوا کی فوجوں نے شکست کھائی۔ انگریزوں نے اس کی پیشوائی ختم کر دی اور اسے وظیفہ دے کر بٹھور میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔

پیغمبر:- پیغام پہنچانے والا۔ (دیکھیے "نبی")

پیلا (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء — ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء) شارل پیلا ایک مشہور و معروف فرانسیسی عربی دان مستشرق۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پیرس کے مدرسہ السنہ شرقیہ میں عربی پڑھانے پر مامور ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں پیرس یونیورسٹی میں عربی زبان کا پروفیسر بنایا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر لیوی پروونسال نے پیرس میں ایک رسالہ (ARABICA) نکالا تو شارل پیلا کو اس کی مجلس ادارت میں ایک رکن کی حیثیت سے جگہ دی۔ اس رسالے میں عربی ادب پر قابل قدر مضامین لکھے جاتے تھے اور بہت سی کتابوں پر تبصرے کیے جاتے تھے۔ پیلا پروفیسر لیوی کے انتقال کے بعد اس کی جگہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے فرانسیسی ایڈیشن کا ایڈیٹر بنایا گیا اور آخر دم تک یہ فرائض سرانجام دیتا رہا۔

پروفیسر پیلا نے علامہ جاحظ کی تصانیف اور اس دور کے علمی حالات کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا تھا۔ مرنے سے چند سال پیشتر وہ المسعودی کی کتاب "مروج الذھب" کا ایک جدید ایڈیشن تیار کرنے میں مشغول تھا لیکن بے وقت موت نے اس کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا۔

پروفیسر پیلا نے پچپن سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں:-

۱۔ جاحظ کی کتاب "تربیع والتدویر"

۲۔ "لینگویج اینڈ لٹریچر" جس کا موضوع عربی زبان اور اس کا ادب ہے

۳۔ جاحظ کی "کتاب التاج" کا فرانسیسی ترجمہ۔

پینا:- شرب (دیکھیے "پانی"، "شرب")

پینانگ پلاؤ پینانگ۔ ملائشیا وفاق کا ایک جزیرہ، جس کا رقبہ ۲۷۶ مربع کیلومیٹر ہے۔ ایک آبنائے اسے اندرون ملک سے جدا کرتی ہے یہ آبنائے تین سے سولہ کیلومیٹر چوڑی ہے۔ پینانگ شہر شمال مشرقی راس پر ملائشیا کے ساحل سے چار میل دور واقع ہے۔

۱۷۸۶ء میں یہ جزیرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے کپتان لائٹ نے کیدہ کے سلطان سے ایک سالانہ رقم کے عوض لے کر یہاں نوآبادی کی بنیاد رکھی۔ کپتان لائٹ کو یہ امید تھی کہ یہ جزیرہ مشرقی سمندروں کی منڈی بن جائے گا۔ لیکن اس کی یہ غرض پوری نہ ہو سکی اور تھوڑے عرصے بعد اسے ایک تعزیری بستی بنا دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء تک اسے ہندوستان کے کالے پانی کی حیثیت حاصل رہی۔ ۱۸۰۵ء میں اسے ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ ۱۸۲۶ء میں جب سنگاپور اور ملاکا کو ملایا گیا تو اس کا صدر مقام اسے بنایا گیا اور اسے یہ حیثیت ۱۸۳۲ء تک حاصل رہی۔ ۱۸۶۷ء میں ایک نئی شاہی نوآبادی بنائی گئی تو یہ ایک ریذیڈنٹ کے زیر انتظام آ گیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب ملائشیا آزاد ہوا تو اسے بھی وفاق میں شامل کر لیا گیا۔

پینانگ کی بندرگاہ جہازوں کی آمدورفت کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ اس کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھی ہے۔ اب اس جزیرے میں ہر جگہ آمدورفت کے راستے بن گئے ہیں۔ یہاں کی آبادی میں زیادہ تر چینی اور تامل ہیں جزیرہ نمائے ملایا اور سماٹرا سے آئے ہوئے ملائی لوگ خاصی تعداد میں ہیں۔ یہاں کے لوگ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔

تابع:- پیرو، پیچھے چلنے والا، شاگرد، معتقد۔ (دیکھیے "تابعین")

تابعین تابع یا تابعی کی جمع۔ حدیث کی اصطلاح میں تابعین ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو آنحضورؐ کے صحابہ کرامؓ کے بعد ہوئے اور کسی نہ کسی صحابی سے ملاقات کی۔ ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو اگرچہ آنحضورؐ کے زمانے میں موجود تو تھے لیکن آپؐ کو دیکھ نہیں سکے تھے۔ بعض آپؐ کی حیات مبارک میں اتنے چھوٹے تھے کہ براہ راست آپؐ سے روایت یاد رکھنے کے قابل نہ تھے۔

تابعین کے بعد میں آنے والوں کو علم حدیث میں تبع تابعین کا نام دیا گیا ہے لیکن تبع تابعی کے لیے بھی تابعی کا جاننا شرط ہے۔

احادیث کے درجات قائم کرنے میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ حدیث کی روایت کرنے والا تابعی زیادہ صاحب اعتبار ہے یا کم نیز ان کی تعداد کو بھی اس ضمن میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

حضرت حسن بصری کا شمار طبقہ اولیٰ کے مشہور تابعین میں ہوتا ہے۔

تابوتِ سکینہ ایک صندوق جس میں یہودیوں کے تبرکات ہیں۔ قرآن مجید میں اس صندوق کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکون قلب کا سامان ہے۔ جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جسے اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں۔" (۲:۲۴۸)

بنی اسرائیل اس صندوق کو اصطلاحاً عہد کا صندوق کہتے تھے۔ بائبل کے مطابق ایک لڑائی کے موقع پر فلسطی مشرکوں نے اس صندوق کو بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں آخرکار انہوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پر رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔

بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب یہ صندوق ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت جواب دے گئی اور ہر ایک اسرائیلی یہ سوچنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے دور ہو گئی اور اب ہمارے برے دن آ گئے۔ (بحوالہ سموئیل ۱، باب ۴-۶ : ۲۰۱)

اس صندوق میں کیا تھا بائبل کے مطابق اس میں حضرت یوسف کا جسد مبارک اور بائبل ہی کی بعض روایات کی رو سے ہڈیاں اور کپڑے تھے اور اسے حضرت موسیٰ مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

قصص الانبیاء میں ہے کہ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ، حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے عصا، و پیراہن اور من کا مرتبان محفوظ تھے

Marfat.com

فلسطینیوں نے اسے اسرائیلیوں سے چھین کر اپنے مندر "بیت دجون" میں رکھ دیا تھا۔ قرآن مجید میں اس کے بارے میں تصریح ہے کہ جب اسرائیلیوں کے ہاتھوں سے یہ صندوق نکل گیا تو فرشتے اس کی حفاظت پر مامور رہتے۔ اور اس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات تھے۔ جن میں پتھر کی وہ تختیاں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ جسے حضرت موسےٰؑ نے لکھوا کر بنی لاوی کی حفاظت میں دیا تھا نیز ایک بوتل جس میں "من" بھر کر محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ آنے والی نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں ان کے باپ دادوں پر کیا گیا تھا اور غالباً حضرت موسےٰؑ کا عصا بھی اسی صندوق کے اندر تھا۔

جب طالوت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو یہ صندوق بھی بنی اسرائیل کو دوبارہ واپس مل گیا۔

حضرت داؤدؑ کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس صندوق کے لیے ایک مستقل گھر بنائیں تاکہ یہ محفوظ رہے لیکن اسرائیلیات کے مطابق انہیں بتایا گیا کہ یہ گھر ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے عہد میں تعمیر ہوگا۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرتے رہے اور اپنے بیٹے کے کام کو آسان کرنے کی خاطر اس کام میں متواتر مصروف رہے بالآخر حضرت سلیمانؑ نے اپنے مبارک عہد میں یہ گھر تعمیر کیا جو ہیکل سلیمانی کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت سلیمان نے ربیوں اور خادموں کے لیے بھی رہائش گاہیں بنائی تھیں اس کے باوجود بعد میں آنے والے بادشاہ نے اس ہیکل کی بارہ دریوں اور برامدوں میں اضافہ کیا۔ حتیٰ کہ تابوت سکینہ کا کمرہ ان مختلف عمارتوں میں چاروں طرف سے گھر گیا۔

۵۹۰ ق-م میں جب بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو تباہ و برباد کیا اور جلا کر راکھ کر دیا تو اس افراتفری میں تابوت سکینہ بھی غائب ہو گیا اور آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔

تاتار ایک قوم کا نام جنہیں تتار اور تتر بھی لکھتے ہیں۔ بقول تھامس یہ قوم بیکال کے جنوب میں آباد تھی اور کیرولین تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب منگولیا میں قتائیوں کی سلطنت قائم ہو گئی تو ترکوں کو منگولیا سے نکال دیا گیا اور مغول قبائل نے ان کی جگہ لے لی۔ علاقہ الورکان جو ترکوں کا مسکن تھا پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے ملک میں شامل تھا۔ تاتاریوں کی زبان ترکوں سے مختلف تھی۔

بارتولڈ نے انھیں تغزغز کا جزو بتایا ہے اور گردیزی نے قوم کیماک کا جو دریائے ارتش پر آباد تھے۔ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کی مغول فتوحات کے زمانے میں تمام دنیا میں ہر جگہ ان فاتحین کو تتر کہتے تھے۔ یہی نام ابن اثیر نے چنگیز خان کے پیشرووں کے لیے استعمال کیا ہے۔ بقول رشید الدین چنگیز خان کی فتوحات کے بعد بہت سے لوگ جنہوں نے اس کی اطاعت کو تسلیم کر لیا تھا اپنے آپ کو مغول کہنے لگے تھے۔ ان سے پہلے زمانے میں تاتاری بڑے طاقتور تھے اور یہی وجہ ہے کہ عرب، ہندوستان، چین، اسپین میں ترکوں کو آج تک تاتار کہا جاتا ہے چنگیز خان کے عہد کے بعد منگولیا اور وسط ایشیا میں تاتار کا لفظ بالکل متروک ہو کر رہ گیا۔

تیمور کے حملے کے زمانے میں یہ لوگ اماسیہ اور قیصریہ کے درمیان خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی مجموعی تعداد تیس چالیس ہزار کنبوں پر مشتمل تھی۔ تیمور نے انہیں بایزید کے مشورے سے وسط ایشیا میں کاشغر کے جنوب مغرب میں ایسک کول میں آباد کر دیا۔ تیمور کے مرجانے کے بعد یہ لوگ دوبارہ ایشیائے کوچک میں آ بسے ۱۴۱۹ء میں انہیں بلقان کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

زمانہ مابعد میں روس اور مغربی یورپ میں اکثر تاتار کا لفظ عثمانیوں کے سوا تمام ترکی الاصل امم کے لیے استعمال ہوتا ہے بعد میں تاتار کا لفظ دریائے والگا کے طاس میں ترکی بولنے والوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا جو تازان سے استرخان تک، کریمیا اور سائبیریا کے ایک حصے میں آباد تھے۔

چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں طمغاچ (چین) کے پہاڑوں سے وحشی تاتاریوں کا ایک قیامت خیز طوفان اٹھا جو سارے وسط ایشیا اور روس پر چھا گیا۔ اور انہوں نے چند ہی سال میں تمام اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ لاتعداد مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالے گئے۔ بڑے بڑے شہروں میں سناٹا چھا گیا اور وسط ایشیا کے طول و عرض میں جہاں تہذیب و تمدن کے پھول برستے تھے ویرانی و بربادی کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ غرض دنیائے اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک خاک اڑنے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں اشتراکی سوویٹ جمہوریہ کے قیام کے بعد اس کے صدر مقام قازان کی آبادی میں نصف سے کچھ کم تاتار ہیں۔

تاج الدین بن زکریا ہندوستان کے ایک بزرگ صوفی۔ شہر سنبھل میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے مرشد کامل کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ ناگور اور اجمیر بھی گئے۔ ایک مدت بعد شیخ اللہ بخش شطاری گڑھ مکتیسر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ لنگر خانے کے لیے لکڑیاں لانے اور پانی بھرنے کا کام آپ کے سپرد تھا۔ شیخ کی صحبت میں آپ نے سلوک کی منازل طے کیں اور عشقیہ، قادریہ، چشتیہ اور مداریہ طریقے کی اجازت حاصل کی۔ آپ دس سال تک شیخ کی خدمت میں رہے۔ بعد میں حضرت خواجہ محمد باقی سے بھی فیض حاصل کیا اور دس سال تک اُن کی خدمت میں رہے حضرت خواجہ نے آپ کو نقشبندی سلسلے کی اجازت مرحمت فرمائی — حضرت خواجہ کی وفات کے بعد آپ نے ہندوستان کے شہروں، عراق اور عرب کا سفر کیا۔ اور آخر میں مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی۔ حجاز میں ایک بڑی تعداد آپ کی صحبت میں رہ کر نقشبندیہ سلسلے سے فیضیاب ہوئی۔

بقول صاحب اسراریہ آپ نے ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء میں وفات پائی اور حرم مکہ معظمہ میں اس رباط کے اندر جو آپ نے خود بنایا تھا دفن کیے گئے۔

آپ کی تصانیف میں نفحات الانس کا عربی ترجمہ، تعریب رشحات عین الحیاۃ کا عربی ترجمہ۔ رسالہ طریقۂ نقشبندیہ، صراط مستقیم، نفحات الالٰہیہ، جامع الفوائد، رسالہ درباب انواع طب، آداب المریدین مشہور ہیں

شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کا ذکر شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں ایک مکتوب آپ کے نام ہے — سید مرتضیٰ بلگرامی نے آپ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ آپ نے بصرے یمن، احساء، نجد اور حجاز میں سلسلہ نقشبندیہ کو پھیلایا اور آپ کے مرید بڑی تعداد میں تھے

آپ کی اولاد میں دو لڑکے محمد حارث اور محمد معاذ تھے۔ محمد حارث تو آپ کے انتقال سے پانچ روز پہلے مکہ ہی میں وفات پا گئے تھے۔ دوسرے صاحبزادے

Marfat.com

۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں ہندوستان آئے اور شاہجہان کی خدمت میں مکہ کے تبرکات بھی پیش کیے۔

آپ کے ہزارہا مریدین تھے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

استاد احمد ابوالوفا، شیخ محمد مرزا ابن محمد المعروف السروجی الدمشقی، امیر یحییٰ ابن علی پاشا، شیخ عبدالباقی بن الزجاجی الزبیدی، شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرحمان، شیخ محمد علان، شیخ ابراہیم بن حسن، شیخ ابوبکر بن سعید بن ابی بکر الحضرمی، شیخ عبیداللہ بن محمد باقی، سید محمود بن اشرف الحسینی امروہی۔

تاج الدین حسین (۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء - ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء) ہندوستان کے ایک صوفی بزرگ والد کا نام سید عارف علی تھا جو خاندان سادات مودودیہ میں سے تھے۔ سہسوان ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ آپ کو علوم ظاہری پر بھی عبور تھا۔ اور علوم باطنی میں بھی کامل تھے۔ آپ ابتدار میں ریاست رامپور اور پھر دہلی میں شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالعزیز سے کسب کمالات کر کے اپنے وطن واپس آئے۔ اور تقریباً پچاس سال تک گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی۔

آپ نے ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار سہسوان میں مرجع خاص و عام ہے۔ تاج الدین حسین کا شمار اکابر اولیاء میں ہوتا ہے۔ آپ علوم ریاضی تصوف اور فارسی زبان کے علامہ تھے۔ آپ کو امراء اور والیان ملک نے اکثر اپنے پاس آنے کی دعوت دی لیکن آپ کہیں نہیں گئے۔

تاجیک قدیم مسلمان ایرانیوں کا نام۔ یہ لقب ترک کے مقابلے میں استعمال ہونے لگا۔ شروع میں ایرانی لوگ مسلمان فاتحین کو تازیک کے نام سے پکارتے تھے۔ ایرانیوں کے نزدیک جو بھی ایرانی مسلمان ہو جاتا تھا تو وہ بھی عرب بن جاتا۔ چنانچہ ترکوں کے یہاں جب تاجیک کا لفظ پہنچا تو اس کے معنی "مسلمان" یا "دارالاسلام سے آنے والا" کے تھے۔ چونکہ غیر ترک مسلمانوں میں ایرانیوں کی اکثریت تھی۔ اس لیے جب یہ لفظ وہاں پہنچا تو اس کے معنی ایرانی کے ہو گئے۔ اس دور میں ایرانی بھی خود کو تازیک کہنے لگ گئے تھے۔

ترک اور تاجیک کے درمیان جو فرق ہے اس پر اکثر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بات عام طور پر کہی گئی ہے کہ ترک اور تاجیک کے باہمی تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے اور کوئی تاجیک کسی ترک پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا۔

تاتاریوں کے ہاں جو دریائے والگا کے کنارے آباد تھے تاجیک کا لفظ سوداگر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

آج کل تاجیک کا لفظ کبھی کبھی خالص فارسیوں کو ممیز کرنے کے لیے یا مشرقی ایرانیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور استرآباد اور یزد کے درمیانی علاقے کو ان کی مغربی حدود سمجھا جاتا ہے۔

ان لوگوں کو ترکستان میں ازبکوں کے دور میں بتدریج میدانوں سے بیدخل کر کے پہاڑوں کی طرف نکال دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل روس ترکستان کے تمام ایرانیوں کو تاجیکوں ہی میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب تاجکستان میں خود مختار جمہوریت قائم ہوئی تو اس میں تاجیکوں کی تعداد ۷۱۵۳۲۰۸ تھی

تادلا مراکش کا ایک ضلع جو ام الربیع اور وادی العبید کی سطوح مرتفع پر مشتمل ہے۔ اس علاقے میں عربی النسل اور لیفتہ، بنی جبران، بنی زمور، سماعلتہ، بنی موسیٰ نیم خانہ بدوش قبیلے آباد ہیں۔ ان قبیلوں کے مرکزی مقامات وادزم، بجداد، دارالدریذوح ہیں۔

وادی ام الربیع کے وسط میں آیت ربلوع قوم آباد ہے اور اس قوم کے تمام قبیلے مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عربوں اور بربروں کی مخلوط نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان قبائل میں گطایہ، سمگت، بنی مادان اور بنی ملال ہیں جن کے بڑے مراکز قصبہ تادلا اور قصبہ بنی ملال ہیں۔

وسطی اطلس کی مغربی ڈھلان پر شمال سے جنوب کی سمت میں آیت سری، آیت عطا، آیت لوزید، آیت عیاط اور آیت عتاب بربر قبیلے آباد ہیں۔

زمانہ قدیم میں تادلا میں آباد لوگوں کا مذہب عیسائی یا یہودی تھا۔ ۱۷۳ھ/۷۸۹ء میں جب ادریس ثانی نے یہ علاقہ فتح کر لیا تو بقول صاحب "روض القرطاس" اسے یہاں پر مسلمان عیسائیوں اور یہودیوں کے مقابلے میں بہت کم ملے۔ یہاں بڑی بڑی یہودی آبادیاں تھیں۔ تادلا کو ادریس ثانی کے بیٹوں نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اور یہ شہر احمد کے حصے میں آیا تھا۔ کچھ عرصے بعد تادلا بنو یفرن کی سلطنت میں آ گیا۔ بعد میں یہ علاقہ مرابطین کے قبضے میں آگیا۔ ۵۲۶ھ/۱۱۳۱ء میں عبدالمومن الموحدی کا تادلا پر قبضہ ہوا۔ جو اس وقت فاس اور مراکش کی درمیانی شاہراہ پر وسط میں واقع تھا۔ اس شہر میں عرب اور بربر قبائل اکثر فتنہ و فساد اٹھاتے رہتے تھے۔ ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں مرینی سلطان یعقوب نے تادلا پر حملہ کیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا۔ بنو سعد کی آمد کے موقع پر ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں تادلا میں ایک بار پھر جنگ ہوئی۔ بنی مرین کے اس جنگ میں پاؤں اکھڑ گئے۔ چنانچہ تادلا پر بنو سعد قابض ہو گئے لیکن اسی صدی میں تادلا زاویہ دلاد کے زناگہ بربروں کی مملکت کا ایک صوبہ بن گیا۔ علوی سلطان الرشید نے ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں دلائیوں کا زاویہ تباہ کر دیا ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں تادلا مراکش کے صوبوں کی تقسیم کے بعد مولائے اسماعیل کے بیٹے مولائے احمد کے حصے میں آیا

تاریخ علم تاریخ۔ اصطلاح میں اس علم کا نام ہے جس کے ذریعے نبیوں، بادشاہوں، فاتحوں اور مشہور شخصیتوں کے حالات اور گذرے ہوئے مختلف زمانوں کے عظیم الشان واقعات وغیرہ معلوم ہو سکیں۔

تاریخ دراصل انسانیت کا حافظہ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں کے بلکہ کل نوع انسانی کے پچھلے تجربات کا دفتر محفوظ رکھ کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ ان تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حال کا جائزہ لے اور اپنے مستقبل کو آزمودہ بھلائیوں سے درست اور آزمودہ برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

تاریخ کے اس دفتر کا جائزہ لینے کے لیے تین نقطہ نظر ممکن ہیں۔ ایک نقطہ نظر محض معروضی مطالعے کا ہے یعنی واقعات اور حالات جیسے کچھ بھی گذرے ہیں انہیں جوں کا توں دیکھا جائے۔

دوسرا نقطہ نظر قوم پرستانہ مطالعے کا ہے یعنی اہم واقعات کو اس نسل یا اس قوم یا اس ملک کی حمایت کے جذبے سے دیکھیں جس سے ہمارا تعلق ہے۔ اسی لحاظ سے نتائج اخذ کریں اور اسی لحاظ سے اشخاص و اقوام کے متعلق رائے قائم کریں۔

تیسرا نقطہ نظر مقصدی اور اصولی ہے یعنی ہم نسلی اور قومی تعصبات سے

Marfat.com

بالاتر ہو کر مجرد انسانی فلاح و سعادت کو مقصود ٹھہرا کر اور نیک و بد کا ایک بے لاگ معیار سامنے رکھ کر نسل انسانی اور اس کے مختلف اجزا کے کارناموں کو جانچیں اور بے لاگ ہی رائے قائم کریں۔

پہلا نقطہ نظر خاص مورخانہ ہے اور اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس طرح کے مطالعے سے صحیح واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں مگر بجائے خود مفید نتیجہ

دوسرے نقطہ نظر میں بڑی جاذبیت ہے۔ بلا مبالغہ تاریخ کے ۹۸ فی صد طالب علموں کو اسی نقطہ نظر کی جاذبیت اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ کیونکہ ہر طالب علم بہرحال کسی نہ کسی نسل یا قوم یا ملک سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی خود غرضی وسعت اختیار کر کے بآسانی شخصی خود غرضی سے قومی خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے اس لیے وہ اپنے اور اپنی قوم ہی کے نقطہ نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ لیکن دنیا میں اکثر جھوٹ اسی مطالعے کی بدولت پھیلے ہیں۔ اکثر ظلم اکثر بے انصافیاں و خونریزیاں اور قومی و نسلی عداوتیں اسی کی بدولت برپا ہوئی ہیں۔ اکثر بروں کو اچھا۔ اکثر شیطانوں کو مرکز پرستش اسی مطالعے نے بنایا ہے۔ اکثر اچھوں کو برا اور اکثر نیکوکاروں کو لعن طعن کا ہدف اسی مطالعے کی بدولت ٹھہرایا گیا ہے۔ انسانیت کو مجروح کرنے اور زمین کو فساد سے بھرنے میں تاریخ کے اس طرز مطالعہ کا کچھ کم حصہ نہیں ہے۔ یہ مرض دنیا میں ترقی کر کے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اب ان اغراض کے لیے تاریخیں گھڑی جاتی ہیں۔ تاکہ نئی نسلوں میں دوسروں کے خلاف بغض پیدا کیا جا سکے۔

رہا تیسری قسم کا مطالعہ تو وہ یقیناً سب سے بہتر ہے مگر اس کے صحیح و نتیجہ خیز ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ بجائے خود انسانی فلاح و سعادت کا نظریہ درست اور نیک و بد کا معیار صحیح ہو۔ دوسرے یہ کہ واقعات جن پر استدلال کی عمارت اٹھائی جاتی ہے معروضی مطالعے کے ذریعے اخذ کیے گئے ہوں نہ کہ اپنے نظریے کو سامنے رکھ کر ان کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا گیا ہو۔

اسلام چونکہ کسی خاص قومیت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مسلک ہے جو مطلقاً انسان اور اس کی سعادت سے تعلق رکھتا ہے اور ان تعصبات سے اسے کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے جو انسانوں کی نسلی قومی اور جغرافیائی نفسیات سے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا تاریخ میں اس نے یہی آخری رویہ اختیار کیا ہے۔"

عربی اور فارسی تاریخ نگاری کے ارتقا کے سلسلے میں اسے چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ابتدائے تاریخ نگاری سے تیسری ہجری تک۔

۲۔ تیسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک

۳۔ چھٹی صدی ہجری کے آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے آغاز تک۔

۴۔ دسویں صدی ہجری سے تا حال۔

اسلام سے قبل کی آخری صدی کے واقعات کی یاد کو پہلی صدی ہجری میں داستانوں کی صورت میں بیان کیا جاتا تھا۔ یہی داستانیں قدیم تاریخ عرب سمجھی جاتی تھیں اس قسم کی داستانوں کو وہب بن منبہ اور عبید بن شریۃ کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ قدیم عربوں میں تاریخی حسن اور نظری تناسب کے ادراک کا فقدان تھا۔ بعد کے مصنفین نے ان کے بیانات کو اپنی تصانیف میں شامل کر لیا۔ مثلاً ابن اسحاق عبید کے راویوں میں سے تھا اور عبدالملک بن ہشام نے وہب کی کتاب "التیجان" کو اس کی موجودہ صورت میں نشر کرنے کے لیے مرتب کیا۔

دوسری صدی ہجری میں قبائلی روایت کا میدان جو صرف راوی اور نساب کے لیے ہی مخصوص تھا، ماہرین لسانیات کی جولانگاہ بن گیا۔ انھوں نے علم تاریخ کی شاندار خدمات سرانجام دیں اس قسم کی سرگرمیوں کا نمونہ ابوعبیدہ نے پیش کیا اس نے تقریباً دو سو موضوعات پر رسائل تصنیف کیے۔ اگرچہ ان میں سے ایک بھی اس کے نام سے ہم تک نہیں پہنچا۔ لیکن ان میں سے اکثر مابعد کی تصانیف میں شامل کر لیے گئے۔

اس قسم کا کام ہشام بن محمد الکلبی نے بھی سرانجام دیا جو اس کے والد نے جمع کیا تھا۔ ہشام نے اسے ترتیب دیا اور اسے پھیلایا۔ اس نے تاریخی ماخذ سے وہ تاریخی معلومات جمع کیں جو شہر الحیرہ اور ملوک حیرہ سے متعلق تھیں۔ علمی تاریخ نویسی کی طرف یہ ایک نہایت اہم قدم تھا۔

عربی زبان میں علمی تاریخ نویسی کی ابتدا آنحضورؐ کی سیرت اور سرگرمیوں کے مطالعے سے وابستہ ہے۔ اس علم کے منبع کا پتا خاص طور پر ان احادیث سے لگتا ہے جو آنحضورؐ کے غزوات سے متعلق ہیں اور جنھیں اصطلاح میں مغازی کہا جانے لگا۔ یہ اصطلاح ابتدائی زمانے کی سیرت کی کتابوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔ ان کتابوں کے لکھنے والوں کا مرکز اولین مدینہ تھا۔ بعد میں دوسری جگہوں پر بھی مغازی لکھنے والے نظر آنے لگے۔ چونکہ یہ علم احادیث سے مربوط تھا اس وجہ سے تاریخی معلومات کے تخصص میں اور ان کی تنقیدی صحت میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ چنانچہ دوسری صدی کے مغازی نگاروں نے جو جامع مواد رکھتے ہیں۔ ابان بن عثمان اور عروہ بن الزبیر ہیں جو کتب مغازی کے مصنف ہیں۔ بعد کے زمانے میں کئی محدث ایسے گزرے جو احادیث مغازی کے جمع کرنے میں مشہور و معروف تھے۔ ان میں خاص طور پر محمد بن مسلم ابن شہاب الزہری ہیں۔ ان کے بعد تین اور مولفوں نے مغازی پر کتابیں ترتیب دیں جن میں مشہور ترین کتاب سیرۃ محمد ابن اسحاق بن یسار ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں وسیع تر تصور پیش کرتا ہے۔ اس میں اس نے نہ صرف آنحضورؐ کی سیرت قلم بند کی بلکہ اس میں تاریخ نبوت لکھنے کا بھی اہتمام کیا۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں زمانہ جاہلیت کی تاریخ ابتدائے آفرینش سے لکھی گئی۔ دوسرے حصے میں آنحضورؐ کے پہلے سن ہجری تک کے حالات قلم بند ہیں۔ تیسرے حصے میں المغازی میں آپؐ کی وفات تک کے حالات ہیں۔ یہ کتاب زمانہ جاہلیت اور صدر اسلام کی تاریخ پر ایک مستند کتاب سمجھی جاتی رہی۔ لیکن اس کتاب کے تمام کے تمام نسخے ضائع ہو گئے اور اس طرح سے تاریخی میدان ایک تلخیص کے لیے خالی رہ گیا جسے ایک مصری مؤلف عبدالملک ابن ہشام نے مرتب کیا۔ ابن اسحاق کے جانشینوں میں ایک محمد بن عمر واقدی ہے جس نے نہ صرف مغازی نبیؐ کے موضوع پر کتابیں لکھیں بلکہ اسلامی تاریخ کے کئی حوادث پر بھی قلم اٹھایا اور ایک بڑی تاریخ جو "کتاب التاریخ الکبیر" کے نام سے مشہور ہے تصنیف کی جو عہد ہارون تک کے حالات پر مبنی ہے واقدی کے مواد کا بہت بڑا حصہ اس کے اپنے کاتب محمد ابن سعد نے آنحضورؐ، صحابہ کرام اور تابعین کی سیرت نگاری میں استعمال کیا ہے۔ اس کی تصنیف کا نام طبقات ابن سعد ہے۔ اس تصنیف کا وہ حصہ جس کی آخری ترتیب و تدوین اس نے خود کی۔ "سیرت النبیؐ" تھا۔ اس میں بھی خاص طور پر وہ ابواب جو صفت اخلاق النبی اور علامات النبوۃ پر ہیں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہی ابواب بعد میں آنے

Marfat.com

والی کتب شمائل و دلائل کا پیش خیمہ ہیں۔

دوسرا دور تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اس کے آغاز میں ادب کے بڑھتے ہوئے معیار اور کاغذ کی ایجاد نے ادب کے ہر شعبے میں ایک نئی جان ڈال دی۔ ۱۷۸ھ/۷۹۴ء میں بغداد میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔ چنانچہ قدیم ترین مخطوطات جو ہم تک پہنچے ہیں اسی زمانے سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد المدائنی کی طرف منسوب ہونے والے دو سو تیس رسالوں میں سے اکثر اس کی زندگی ہی میں کتابت میں آگئے۔ ان رسالوں میں اہم ترین خلافت کی تاریخ سے متعلق بڑی تصانیف تھیں۔ اس زمانے سے "تاریخ نویسی اسلامی تہذیب وتمدن کا جزو بن گئی" وسیع معنی میں تاریخی تالیفات کی ابتدا، جس میں سیرت کے مواد مذکورہ بالا مفرد رسائل اور دوسرے ماخذ کو ملا جلا کر ایک مربوط تاریخی بیان مرتب کیا گیا۔ تیسری صدی کے زمانہ وسط سے ہوئی۔ چنانچہ اس طرز کا سب سے پہلا مؤلف احمد بن یحییٰ بلاذری ہے۔ اس دور کی امتیازی تالیف تاریخ عالم ہے۔ جس میں ابتدائے آفرینش سے لیکر تمام دنیا کی تاریخ کا خلاصہ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر خالص اسلامی تاریخ کے مقدمے کے طور پر مذکور ہے۔ اس مطابعت میں ابو حنیفہ الدینوری اور ابن واضح الیعقوبی جیسے مؤلفین نے قلم اٹھایا۔ یعقوبی کی کتاب کو تو تاریخ عالم کی بجائے تاریخی انسائیکلوپیڈیا کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی صنف میں ابن قتیبہ کا کتابچہ "تعلیقات" المعروف بہ "کتاب المعارف"، اور حمزۃ الاصفہانی اور المسعودی کی تالیفات بھی شامل ہیں۔ المسعودی کا شمار عربی میں لکھنے والے اکابر مورخین میں ہوتا ہے۔ اس کی بڑی تصانیف ضائع ہوگئی ہیں۔ اس طرز کی تصانیف سے ایک نئے فکری عنصر نے عربی تاریخ نویسی میں جنم لیا۔

۳۱۰ھ/۹۲۳ء میں محمد بن جریر طبری کی مشہور کتاب "تاریخ الرسل والملوک" میں قدیم تاریخی روایات نقطہ عروج پر نظر آتی ہیں۔ وہ اسلامی تاریخی روایات میں بھی اسی تفصیل اور تنقید کا حامل نظر آتا ہے جیسا کہ اپنی تفسیر میں۔

تیسری صدی ہجری میں عربی تاریخ نویسی کا قدیم دور ختم ہوگیا اور علم تاریخ کو بجائے خود ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ تیسری صدی سے چھٹی صدی ہجری کے نصف تک تاریخ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور اس میدان میں کافی حد تک ترقی ہوئی۔ چوتھی صدی ہجری کے نصف اوّل کے بعد سیاسی تاریخ نویسی کا کام زیادہ تر سرکاری عمال اور درباریوں میں منتقل ہوگیا تو تاریخ نگاری کے ڈھانچے میں یہ تبدیلی ہوئی کہ اب مفصل اسناد کی بجائے صرف مجملاً ماخذوں کا ذکر کیا جانے لگا۔ بعض مصنفین نے تو اسناد کا ذکر کرنا بالکل ہی ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ قدیم دینی تصور کو جس کی وجہ سے علم تاریخ کو ایک خاص مقام حاصل ہوا تھا۔ متروک قرار دے دیا گیا۔ اسلوب کی اس تبدیلی سے ایک اور نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ ابتدائی زمانے میں تو علم تاریخ کے مطالعے کی ضرورت مذہبی اور دینی وجوہات کی بنا پر بتائی جاتی تھی اب اس کی جگہ تاریخ کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے بھی ضروری قرار دیا جانے لگا۔ اس دور میں اگرچہ سیاسی تاریخ نویسی کا میدان محدثین اور علمائے عمال حکومت کے لیے خالی کر دیا تھا لیکن سیرت نگاری کا وسیع میدان ابھی تک ان کے قبضے میں تھا۔ اس دور کی ایک ممتاز صنف علما و مشاہیر کے تراجم کے معجم ہیں اس قسم کی کتاب بہت ضخیم ہوا کرتی تھی جیسے الخطیب بغدادی کی تصنیف جو چودہ جلدوں میں ہے۔ اسی طرح ابن عساکر کی تصنیف "تاریخ" نہایت ہی جامع کتاب ہے۔

"ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی کے احیاء کی کوشش تو چوتھی صدی ہجری دسویں صدی عیسوی میں ایرانی خاندانوں کے عہد میں شروع ہوئی۔ اس دور میں جو تاریخی کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئیں ان میں سے بہت سی قدیم ترین کتابیں عربی تصانیف کے ترجموں اور خلاصوں پر مشتمل تھیں۔ لیکن اگلی صدیوں میں جوں جوں ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا توں توں وہ اپنے ساتھ فارسی زبان کو بھی لیتے گئے چنانچہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں ان ممالک میں بھی فارسی زبان میں تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ ہندوستان میں فخر الدین مبارک شاہ نے تاریخیں لکھیں۔

"تاریخ نگاری کے اس تیسرے دور میں ایرانی ترکی ثقافت کے علاقے میں عربی کی جگہ فارسی نے لے لی اور چونکہ ہندوستان میں بھی توسیع اسلامی کی وجہ سے فارسی رواج پاگئی تو ان ممالک میں فارسی تاریخ نگاری کا رواج بڑی تیزی سے شروع ہوا۔ اگرچہ عربی میں بھی تاریخ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ابن الاثیر کی "الکامل" اسی دور کی ایک تصنیف ہے۔ اس دور میں عربی تاریخ نویسی کا مرکز شام میں منتقل ہوگیا تھا اس وقت کے تاریخ نویسوں میں عماد الدین الاصفہانی ابو شامہ، بہاء الدین شداد ہیں تاریخ نویسی کی سرپرستی مملوک سلاطین کے عہد میں بھی ایوبیوں کے زمانے کی طرح جاری رہی اور مملوکوں دور حکومت کی آخری صدی میں تاریخ کے دبستان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہوگیا۔ اس خاص صنف کے ایجاد کرنے والوں میں تقی الدین المقریزی، العینی، ابو المحاسن، ابن تغری بردی، علی بن داؤد الجوہری، شمس الدین سخاوی، جلال الدین سیوطی، ابن ایاس احمد بن زنبل ہیں۔

ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں ابن الاثیر کی اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن الفوطی کی "مجمع آداب فی معجم الالقاب" جو پچاس جلدوں میں تھی ان کتابوں میں ہر زمانے کے مشاہیر کے حالات جمع کیے گئے تھے۔

دسویں صدی ہجری میں چونکہ تمام اسلامی دنیا مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئی مثلاً عربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں مراکو کی حد تک کا علاقہ عثمانی ترکوں کے زیر نگین تھا ایران میں صفویوں نے شیعی حکومت قائم کرلی تھی۔ وسط ایشیا میں ازبکی ریاستیں معرض وجود میں آگئیں۔ ہندوستان خاندان مغلیہ کے ہاتھ میں آگیا۔ چنانچہ اس انقلاب کی وجہ سے نئی ثقافتی جماعت بندیاں عمل میں آئیں اور ان کا علم تاریخ پر بھی اثر پڑا خاص طور پر عربی زبان کی تاریخ نویسی پر تو بہت اثر ہوا۔ اور عربی زبان میں تاریخ نویسی دم توڑنے لگی۔ اگرچہ چند معمولی قسم کی تاریخیں مثلاً الدیار البکری، الجنابی وغیرہ ضبط تحریر میں آئیں۔ لیکن اس زمانے میں قدیم طرز کی عربی تاریخ نویسی کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ اس دور کے قابل ذکر مصنف عبد الرحمٰن الجبرتی اور حیدر احمد الشہابی، المقری التلمسانی ہیں۔

جب غزنویوں نے ہندوستان فتح کر کے دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا تو اس زمانے سے یہاں ایرانی طرز کی تاریخ نویسی کی ابتداء ہوئی۔ اس زمانے کی تصانیف میں ضیاء الدین برنی کی تصنیف خاص اہمیت رکھتی ہے۔

"تاریخ نگاری کے چوتھے دور میں ہندوستان میں تین مختلف ادبی اسلوبوں کا باہم اتصال ملتا ہے۔ ایک ہندی فارسی روایت کا اسلوب دوسرا دبستان ہرات کا روایتی اسلوب اور تیسرا اسلوب نئی طرزوں کا دھارا ہے۔

چنانچہ جس روایت کا رواج غزنویوں کے عہد میں ہوچکا تھا وہ پہلی مرتبہ واضح طور پر شہنشاہ اکبر کے عہد میں نظر آتی ہے۔ اس کوشش میں نظام الدین احمد اور عبد القادر بدایونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں خاص طور پر بدایونی کی تاریخ جو

Marfat.com

ایک غیر سرکاری تصنیف ہے اور جس میں مشاہیرِ ہند کی تراجم نگاری اور سیاسی واقعات کا اندراج دونوں باتیں شامل ہیں۔ بعد میں محمد قاسم فرشتہ نے اسلامی تاریخ کے میدان کو بہت زیادہ وسعت دی۔ تقریباً گیارہویں صدی میں ہندوستانی تاریخ نویسی نے اپنی منزل کو پالیا۔ اس دور میں ہندو مصنفین نے بھی اس میدان میں کوششیں شروع کیں۔ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی اسلامی ہند کی تاریخ میں پیوست کر دیا۔ اس دور میں مغل بادشاہوں کے لئے قدیم تواریخ کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا۔ اسی دور میں ان بادشاہوں کے عہد کی تواریخ بھی سرکاری طور پر قلم بند ہوئیں جن میں ابوالفضل علامی کی "آئینِ اکبری"، جہانگیر کی خود نوشت "تزکِ جہانگیری" اور اس سے قبل بابر کی "تزکِ بابری"، شاہجہان کے عہدِ حکومت کی تاریخ جس کی دو جلدیں عبدالحمید اور تیسری جلد اس کے شاگرد محمد وارث نے لکھی۔ اورنگ زیب کے عہد کے حالات محمد کاظم، محمد ساقی مستعد خان نے تحریر کئے۔ محمد ہاشم خوافی کی تصنیف "تاریخ آلِ تیمور" اور امیر حیدر حسین بلگرامی کی "سوانح اکبری"۔ غلام حسین کی تصنیف "مغلیہ خاندان کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی تاریخ"۔ "تاریخ رشیدی"، "ہمایوں نامہ"، شیخ محمد علی حزیں کا "تذکرۃ الاحوال" اور مرزا محمد بن معتمد خان کا "عبرت نامہ" ہیں۔ "نزہۃ الخواطر" جو تاریخ کے ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے عربی زبان میں آٹھ جلدوں میں ہے۔ اسی دور کا ایک شاہکار ہے۔

جب برِ عظیم پاک و ہند میں فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تو مختلف تواریخ کے بھی اردو میں تراجم کئے گئے اور رفتہ رفتہ اس زبان میں بھی تاریخ کے موضوع پر ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اردو زبان میں تاریخ کی مشہور مشہور کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔ لیکن ان میں اکثریت کا موضوع سیرت ہے۔

۱۔ "اصح السیر فی ہدی خیر البشر" (دو جلدیں)، مصنف ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری
۲۔ "رحمۃ للعالمین" (تین جلدیں)، قاضی محمد سلیمان منصور پوری
۳۔ "سیرۃ النبی" (چھ جلدیں)، مولانا شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
۴۔ "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔
۵۔ سیرۃ المصطفیٰ (تین جلدیں) مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔
۶۔ عہدِ نبوی کے میدان جنگ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔
۷۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔
۸۔ "محسنِ انسانیت"۔ نعیم صدیقی۔
۹۔ "تاریخِ اسلام"۔ معین الدین ندوی
۱۰۔ "تاریخِ اسلام"۔ اکبر شاہ نجیب آبادی
۱۱۔ "جذب القلوب" (تاریخ مدینہ) عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ محمد صادق۔
۱۲۔ "دربارِ رسول کے فیصلے"۔ عبداللہ المالکی ترجمہ حکیم عبدالرشید۔
۱۳۔ "رسالت خاتم النبیین" (دو جلدیں) سید عبدالحمید الخطیب ترجمہ محمد عادل قدوسی
۱۴۔ "زاد المعاد" (چار جلدیں)، حافظ ابن قیم ترجمہ رئیس احمد جعفری۔
۱۵۔ "سید العرب"۔ عمر ابو النصر ترجمہ محمد احمد پانی پتی
۱۶۔ "سیرت ابن ہشام" (دو جلدیں) عبدالملک بن ہشام ترجمہ قطب الدین احمد محمودی
۱۷۔ "الشفاء"۔ قاضی عیاض ترجمہ حافظ احمد علی۔
۱۸۔ "عدالت النبوی کے فیصلے" عبداللہ المالکی مترجم غیر مذکور۔

(نیز دیکھئے "ادب، اسلامی")

اسلام کی تاریخ۔ اسلام کن ادوار میں کہاں کہاں پھیلا۔ عام طور

تاریخِ اسلام ۱ پر مسلمانوں کی عام سیاسی تاریخ کو تاریخِ اسلام کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے علمی غلطی ہے۔ اسے ہم صرف مسلم تاریخ یا مسلمانوں کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ سے مراد فقط دینِ اسلام کی تاریخ ہے۔ جس میں اگرچہ سیاسی تاریخ بھی شامل ہے لیکن اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

تاریخ اسلام کا مختصر ترین جائزہ لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام سرزمین عرب سے اٹھا اور بہت جلد عراق، شام، افریقہ کے علاوہ ایران کے راستے ہندوستان اور مشرق بعید تک پہنچ گیا۔ عام طور پر چونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا اس لئے زیادہ تر سیاسی تاریخ ہی اسلامی تاریخ کی جگہ لیتی رہی۔ حالانکہ اسلام ایک ایسا دین ہے، جس میں جبر نہیں۔ سلاطین اسلام نے کبھی بھی عیسائیوں کی طرح خود کو کسی پوپ کے ماتحت مخصوص نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے عیسائی مشنریوں کی طرح کبھی اشاعتی مشن قائم کئے۔

اسلام کا باقاعدہ اعلان کا آغاز ۱۰ قبل ہجری/۶۱۲ عیسوی سے ہوا ہے۔ صرف دس برس میں پورا عرب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ اور تقریباً چالیس برس تک مسلمان سیدھے سادے انداز میں دین کی پیروی کرتے رہے۔ آنحضورؐ کے صحابہ میں تفسیرِ آیات، قرآنی و فقہی مسائل میں اختلافات ہوتے تھے لیکن یہ زیادہ تر فروعی قسم کے تھے۔ مگر خلفائے راشدین کے زمانے میں مختلف ممالک ایران، عراق، شام، افریقہ وغیرہ اسلام کے زیرِ نگیں آ گئے تو مختلف نسلوں اور مذاہب نے اسلام میں دخل اندازی شروع کر دی۔ جس سے اصولی اختلافات وجود میں آئے۔

اصولی اختلافات کی رو سے مسلمانوں میں سب سے پہلے ایک سیاسی گروہ شیعانِ علی کہلایا۔ بظاہر یہ لوگ حضرت علیؓ کے طرف دار تھے۔ لیکن دراصل یہ عراق عجم کے ان تصورات کے حامل تھے، جو شخصی وراثت و حکومت کو جائز سمجھتے تھے۔ عام مسلمانوں کا یہ خیال اور اس پر عمل تھا کہ امام یا خلیفہ کا انتخاب عوام کی کثرتِ رائے سے ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ امام کی تقرری منجانب اللہ کرنے پر مصر تھے۔ بعد ازاں انہوں نے فروعی اور فقہی مسائل کے علاوہ اصولی مسائل میں بھی اختلافات کرنا شروع کر دیئے اور یوں یہ الگ فرقہ شیعہ کہلائے، جو آگے چل کر مزید کئی فرقوں میں بٹ گیا۔ اسی دور میں ایک اور فرقہ خوارج نے جنم لیا۔ ابتدا میں یہ لوگ بھی حامیانِ اہلِ بیت تھے لیکن جنگ صفین میں انہوں نے حضرت علیؓ پر جنگ کرنے کے لئے دباؤ ڈالا۔

ایرانی اثرات کے ماتحت اسلامی تصوّف میں بھی کئی رنگ آئے۔ ان صوفیاء نے دنیا سے بے رغبتی پر زور دیا۔ دولت اور تعیش سے کنارہ اور دنیا داری کو حرام سمجھنا ان کی تعلیم تھی۔ دوسری طرف یونانی تصورات بھی اسلام پر اثر انداز ہوئے اور اس کے زیرِ اثر مامون الرشید کے عہد میں ایک اور فرقہ معتزلہ پیدا ہوا۔ اس فرقے نے عقل ہی کو سب سے بڑی کسوٹی قرار دیا۔ اس کے ردِعمل کے طور پر فرقہ اشعریہ نے جنم لیا۔ یہ لوگ بھی فلسفے کے سہارے چلتے تھے۔ بعد ازاں یہی لوگ اہلِ سنت والجماعت کہلائے۔ ان میں بڑے بڑے علماء اور امام گزرے ہیں۔

اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے جداگانہ کام کئے۔ انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے اسلامی فقہ کو ایک حد تک مکمل کر دیا اور ایسے تمام مسائل جو پیش آ چکے تھے یا آنے والے تھے ان سب کا حل پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ان چاروں میں سے

Marfat.com

کسی ایک کے پیروکار ہو گئے اور یوں اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ آج بھی اہل سنت کے ہاں یہی چار فقہی مذاہب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی رائج ہیں۔ اس تقلید کا نتیجہ فرقہ پرستی کی صورت میں نکلا۔ مناظرات کا بازار گرم ہو گیا۔ فروعی مسائل پر سر پھٹول ہونے لگے۔ جس سے عوام میں مذہب اور اس کے پیشوا سے بیزاری اور بے توجہی عام ہو گئی۔

فلسفہ کو مختلف فرقوں نے استعمال کرنا شروع کیا تو اسے غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی اور بے شمار مسلمان فلسفی اور سائنس دان پیدا ہوئے۔ جنہوں نے مشرق و مغرب میں شہرت پائی۔ یہ لوگ عقلیت پسند کہلائے۔ جبکہ اشاعرہ اور دیگر فرقوں کے اکثر علماء متکلمین کہلاتے تھے۔ جو فلسفہ کی چوکھٹ میں اسلام کو فٹ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں ملحد قسم کے فلسفی اور جذبۂ ایمانی سے خالی علماء پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ عام مسلمانوں کے جذبات دینی بھی سرد پڑ گئے اور وہ میدان جہاد میں شمشیر بکف ہونے کی بجائے مناظروں اور محفلوں میں ایک دوسرے سے سر بگریباں ہونے لگے۔

فلسفہ کے ردّ عمل کے طور پر تصوّف کو عروج حاصل ہوا۔ جس میں قلبی واردات اور احساسات کو علم کا منبع ٹھہرایا گیا۔ فلسفی عقل کے ذریعے خدا کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے تو صوفیاء نے دل کو اس کام کے لئے مقرر کر دیا۔ ایرانی اور پھر ہندی اثرات کے تحت تصوف میں بہت تبدیلیاں آئیں۔ پہلی دو صدیوں کے بعد سے تصوف میں زیادہ تر زرتشتی اثرات، نوافلاطونی وحدت الوجود، بدھی نروان اور ویدانت کے فقر و فاقہ کو بنیادی عناصر قرار دے دیا گیا۔ تصوف میں بھی چار مشہور سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ ہیں۔ تصوف کے زیر اثر بیعت شیخ، رہبانیت، چلہ کشی، قبر پرستی، کشف و کرامات اور بعد ازاں بہت سی بدعات اسلام میں در آئیں۔ چونکہ صوفیاء عوام کے زیادہ قریب تھے۔ اس لئے عوام میں ان باتوں نے بڑی راہ پائی ان امور کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ایسے لوگ بھی آتے رہے۔ جنہوں نے اصلاح و تزئین کی کوشش کی۔ عمر بن عبدالعزیز، امام غزالی، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، محمد بن عبدالوہاب، سید احمد بریلوی، جمال الدین افغانی، سر سید اور علامہ اقبال جیسے لوگوں نے مسلمانوں کو پھر سے صراط مستقیم پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس امر میں بعض مصلحین نے سختی، درشتی اور تنگ نظری سے بھی کام لیا۔ جس کی وجہ سے وہ مطعون ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کو دیگر عناصر کے اثرات سے پاک کرنے اور اس کی تشکیل و تدوین نو کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ آج کے دور میں یہ ضرورت جتنی بڑھ گئی ہے۔ اس سے پہلے شاید اس میں اتنی شدت کبھی نہیں تھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولا جائے اور بقول علامہ اقبال اسلامی فکر کی روایت پھر سے تازہ کی جائے اور مذہبی علوم کو سائنس کی زبان میں یعنی سائنٹیفک انداز سے سمجھا جائے۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک الگ مادی دنیا کا کوئی ایسا وجود نہیں، جس کی جڑیں روحانی دنیا میں نہ ہوں اور جو ناپاک اور ناقابل التفات ہو۔ یہ دنیاوی مظاہر ہی ہیں، جن میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے ان مظاہر سے کنارہ کشی نہیں کی جا سکتی تا وقتیکہ ان مظاہر کو بنیاد مانا جا سکتا ہے کہ یہ بذات خود غیر اہم ہیں۔

اسلام کی سیاسی، دینی اور علمی تاریخ کا ایک سنین وار جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے اس میں دیئے گئے سنین کے لئے حتی الامکان استناد کی کوشش کی گئی ہے تاہم دیگر جگہوں پر درج سنین کا ان سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ واقعات کے اندراج کے ضمن میں محض زیادہ سے زیادہ اہم واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام کب، کہاں اور کس طرح پھیلا تو اس کی تاریخ مختلف ملکوں، شہروں اور شخصیات کے ساتھ اجمالاً دے دی گئی ہے۔ وہاں سے استفادہ کیا جائے۔ نیز تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف، اسلامی فرقوں وغیرہ پر الگ الگ مضامین کے علاوہ "علم" کے عنوان کے تحت بھی کسی قدر معلومات دی گئی ہیں۔ مضمون میں مسلم تاریخ کا ایک تقابلی خاکہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ جس سے مختلف ادوار میں مختلف علاقوں میں برسر اقتدار خاندانوں کا علم ہوتا ہے۔

اسلامی سیاسی و دینی واقعات کا ایک مختصر جائزہ

(سنین وار)

ہجری سن	عیسوی سن	واقعات
۵۴ ق قبل ہجری یا ۵۳ ق۔ھ	۵۶۹ء یا / ۵۷۰ء	ولادت آنحضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔
۵۰ ق۔ھ	۵۷۳ء	واقعہ شق صدر
۴۸ ق۔ھ	۵۷۵ء	وفات بی بی آمنہؓ
۴۶ ق۔ھ	۵۷۶ء	وفات عبدالمطلب
۲۰ ق۔ھ	۶۰۳ء	ولادت علیؓ
۱۹ ق۔ھ	۶۰۴ء	کعبہ کی تعمیر نو۔ حجر اسود آنحضورؐ کے فیصلے کے مطابق رکھا گیا۔
۱۴ ق۔ھ	۶۰۹ء	ابتدائے نزول وحی۔ ولادت عائشہؓ
۱۰ ق۔ھ	۶۱۳ء	اعلان دعوت اسلام۔
۹ ق۔ھ	۶۱۴ء	ہجرت حبشہ۔
۸ ق۔ھ	۶۱۵ء	عمرؓ و حمزہؓ کا قبول اسلام
۴ ق۔ھ	۶۱۹ء	وفات خدیجہؓ
۲ ق۔ھ	۶۲۱ء	معراج۔ بیعت عقبہ اولیٰ
۱ ق۔ھ	۶۲۱ء	بیعت عقبہ ثانیہ
یکم ہجری	۶۲۲ء	ہجرت مدینہ، مسجد قبا کی بنیاد، اذان کی ابتداء
۲ ہجری	۲۴-۶۲۳ء	فرض جہاد، فرض صوم رمضان۔ غزوۂ بدر
۳ھ	۶۲۵ء	غزوۂ احد۔
۴ھ	۶۲۵ء	غزوات ذات الرقاع، بیر معونہ، بنی نضیر، ذات الرجیع واقعہ افک، احکام تیمم
۵ھ	۶۲۶ء	غزوات دومۃ الجندل، بنی مصطلق، خندق۔
۶ھ	۶۲۷ء	غزوات خیبر، بنی لحیان، ذی قرد، صلح و عمرۂ حدیبیہ
۷ھ	۶۲۸ء	مکاتیب رسولؐ بنام مقوقس و دیگر امراء
۸ھ	۳۰-۶۲۹ء	فتح مکہ، غزوہ حنین۔
۹ھ	۳۱-۶۳۰ء	آیت ربوٰا۔ ابوبکرؓ امیر الحج
۱۰ھ	۶۳۱ء	غزوہ تبوک، حجۃ الوداع۔
۱۱ھ	۶۳۲ء	وصال نبویؐ، آغاز خلافت ابوبکر صدیقؓ۔
۱۳ھ	۶۳۴ء	وفات ابوبکر صدیقؓ و خلافت عمر فاروقؓ۔
۱۴ھ	۶۳۵ء	فتح دمشق، بعلبک، حمص و انطاکیہ
۱۵ھ	۶۳۶ء	واقعہ یرموک، جنگ قادسیہ۔
۱۶ھ	۶۳۷ء	تعمیر بصرہ و کوفہ، فتح بیت المقدس

Marfat.com

۲۱ھ / ۶۴۲ء — فتح نہاوند، وفات خالدؓ بن ولید
۲۲ھ / ۶۴۳ء — فتح طرابلس۔
۲۳ھ / ۶۴۴ء — شہادت عمر فاروقؓ۔ آغاز خلافت حضرت عثمان غنیؓ
۲۸ھ / ۶۴۸ء — فتوحات افریقہ، قبرص، آذربائیجان وغیرہ۔
۳۲ھ / ۶۵۲ء — ایران میں اسلامی سلطنت کا قیام، وفات ابو دردا و عبدالرحمٰن بن عوف و عباسؓ و عبداللہ بن مسعودؓ و ابوذر غفاریؓ۔
۳۵ھ / ۶۵۵-۵۶ء — وفیات ابو طلحہ انصاریؓ و عامرؓ، شہادت عثمانؓ۔ خلافت علیؓ
۳۶ھ / ۶۵۶ء — وفیات سلمان فارسیؓ، طلحہؓ و زبیرؓ۔ واقعہ جمل۔
۳۷ھ / ۶۵۷ء — واقعہ صفین، عہد نامہ تحکیم
۴۰ھ / ۶۶۰ء — شہادت علیؓ، خلافت حسینؓ، اعلان خلافت امیر معاویہؓ
۴۴ھ / ۶۶۴ء — فتح کابل۔
۴۹ھ / ۶۶۹ء — وفات امام حسنؓ۔
۵۴ھ / ۶۷۴ء — وفات اسامہؓ بن زید، فتوحات بخارا و سمرقند
۶۰ھ / ۶۸۰ء — وفات معاویہؓ و خلافت یزید۔
۶۱ھ / ۶۸۰ء — واقعہ کربلا، شہادت حسینؓ
۶۲ھ / ۶۸۱ء — فتح خوارزم و سمرقند۔
۶۴ھ / ۶۸۳ء — وفات یزید بن معاویہ، ترمیم کعبہ، خلافت مروان۔
۶۵ھ / ۶۸۵ء — خلافت عبدالملک بن مروان۔
۷۳ھ / ۶۹۲ء — شہادت عبداللہؓ بن زبیرؓ، وفات اسماء بنت ابی بکرؓ، کعبہ کا تعمیر نو
۸۰ھ / ۶۹۹ء — پیدائش امام جعفرؒ صادق و امام ابو حنیفہؒ، وفات عبداللہ بن جعفر طیارؓ۔
۸۶ھ / ۷۰۵ء — خلافت ولید بن عبدالملک۔ تسخیر ماوراء النہر، روم، صاغان وغیرہ
۹۲ھ / ۷۱۱ء — محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ، فتح سندھ، طارق سپین میں فتح اندلس۔
۹۶ھ / ۷۱۵ء — وفات خلیفہ ولید، خلافت سلیمان، چین اور کاشغر پر حملہ
۹۹ھ / ۷۱۷ء — عمرؒ بن عبدالعزیز کی خلافت
۱۰۱ھ / ۷۲۰ء — شہادت عمر بن عبدالعزیزؒ، خلافت یزید ثانی۔
۱۰۵ھ / ۷۲۴ء — خلافت ہشام
۱۰۷ھ / ۷۲۶ء — فتح قیساریہ
۱۱۰ھ / ۷۲۸ء — جنگ ارض روم۔ وفات حسن بصریؒ
۱۲۵ھ / ۷۴۳ء — وفات خلیفہ ہشام، خلافت ولید ثانی۔
۱۲۶ھ / ۷۴۴ء — خلافت یزید ناقص، خلافت ابراہیم، خلافت مروان ثانی
۱۲۹ھ / ۷۴۷ء — ابو مسلم خراسانی کا اعلان بغاوت
۱۳۰ھ / ۷۴۷ء — فتنہ اباضیہ
۱۳۲ھ / ۷۴۹ء — خلافت عباسیہ (ابو العباس السفاح) کا آغاز، خلیفہ مروان ثانی کا قتل۔
۱۳۵ھ / ۷۵۲ء — وفات رابعہ بصریؒ۔
۱۳۶ھ / ۷۵۴ء — خلافت منصور عباسی، جنگ نصیبین، عبدالرحمان الداخل سپین پہنچا اور اموی حکومت کی بنیاد رکھی۔

۱۴۸ھ / ۷۶۵ء — وفیات جعفر صادق و ابن ابی لیلیٰ
۱۵۰ھ / ۷۶۷ء — استاد سیس کا دعوٰے۔ وفات امام ابو حنیفہؒ
۱۵۳ھ / ۷۷۰ء — افریقہ میں اباضیوں کے خلاف زبردست مہم۔
۱۵۷ھ / ۷۷۳ء — وفات امام اوزاعی۔
۱۵۹ھ / ۷۷۵ء — خلافت مہدی، حکیم مقنع نے دعوٰے اخدائی کیا۔ مصنوعی چاند نکالا اور خودکشی کرلی۔
۱۶۱ھ / ۷۷۷ء — مسجد نبوی میں توسیع، وفات سفیان ثوریؒ۔
۱۶۲ھ / ۷۷۹ء — وفات ابراہیم بن ادھم و قاضی ابوبکر بن ابی سبرہ
۱۶۶ھ / ۷۸۲ء — تعمیر مسجد الحرام مکہ
۱۶۹ھ / ۷۸۵ء — خلافت الہادی
۱۷۰ھ / ۷۸۶ء — خلافت ہارون الرشید
۱۷۲ھ / ۷۸۸ء — سپین میں وفات عبدالرحمان و خلافت ہشام اوّل
۱۷۶ھ / ۷۹۲ء — فتح ارض روم۔
۱۷۸ھ / ۷۹۴ء — عباسی خلافت میں یحییٰ برمکی کی وزارت اور کل اختیارات
۱۷۹ھ / ۷۹۵ء — وفات امام مالک و حماد البصری۔
۱۸۰ھ / ۷۹۶ء — وفات ہشام اوّل
۱۸۳ھ / ۷۹۹ء — وفات موسیٰ کاظم
۱۸۷ھ / ۸۰۳ء — جعفر برمکی کے قتل سے برامکہ کا زوال۔
۱۹۰ھ / ۸۰۵ء — ہارون کی فتوحات روم، وفات یحییٰ برمکی۔
۱۹۳ھ / ۸۰۹ء — وفات ہارون، خلافت امین الرشید
۱۹۸ھ / ۸۱۳ء — قتل امین و خلافت مامون الرشید
۲۰۰ھ / ۸۱۵ء — عباسیوں کی مردم شماری۔
۲۰۱ھ / ۸۱۶ء — ظہور بابک خرمی
۲۰۴ھ / ۸۱۹ء — ابتدائے دولت عثمانیہ، وفات امام شافعیؒ
۲۰۵ھ / ۸۲۱ء — بنیاد دولت طاہریہ
۲۱۲ھ / ۸۲۷ء — فتنہ خلق القرآن۔
۲۱۸ھ / ۸۳۳ء — وفات عبدالملک بن ہشام، وفات المامون، خلافت المعتصم
۲۲۳ھ / ۸۳۷ء — بابک خرمی کا قتل۔
۲۲۹ھ / ۸۴۲ء — واثق کی تخت نشینی۔
۲۳۲ھ / ۸۴۷ء — وفات واثق، خلافت المتوکل۔
۲۳۸ھ / ۸۵۲ء — سپین میں وفات عبدالرحمان ثانی، حکومت محمد اوّل۔
۲۴۰ھ / ۸۵۴ء — سندھ میں حکومت ہباری
۲۴۱ھ / ۸۵۵ء — وفات امام احمد بن حنبلؒ
۲۴۵ھ / ۸۶۰ء — وفات ذوالنون مصری۔
۲۴۷ھ / ۸۶۱ء — قتل متوکل۔ خلافت المنتصر
۲۴۸ھ / ۸۶۲ء — وفات المنتصر و خلافت المستعین
۲۵۲ھ / ۸۶۶ء — قتل المستعین و خلافت المعتز
۲۵۴ھ / ۸۶۸ء — دولت طولونیہ۔ دولت صفاریہ ایران کی ابتدار
۲۵۵ھ / ۸۶۹ء — قتل المعتز، و خلافت المہتدی، وفات علی نقی امام۔
۲۵۶ھ / ۸۷۰ء — قتل المہتدی، خلافت المعتمد، وفات امام بخاری۔

Marfat.com

۲۵۹ھ / ۸۷۳ء — پہلے مسلمان سائنسدان الکندی کی وفات۔
۲۶۰ھ / ۸۷۳ء — وفات حسن عسکری، امام
۲۶۱ھ / ۸۷۵ء — وفات امام مسلم و بایزید بسطامی
۲۶۸ھ / ۸۸۲ء — وفات احمد بن طولون۔
۲۷۳ھ / ۸۸۶ء — وفات محمد اندلسی، حکومت منذر اموی، وفات ابن ماجہ
۲۷۵ھ / ۸۸۸ء — وفات المنذر و حکومت عبداللہ بن محمد اموی، وفات ابوداؤد
۲۷۸ھ / ۸۹۱ء — قرامطہ کی بغاوت، وفات موفق عباسی۔
۲۷۹ھ / ۸۹۲ء — وفات المعتمد، خلافت المعتضد، وفات ابوعیسیٰ ترمذی
۲۸۰ھ / ۸۹۳ء — وفات دارمی۔
۲۸۹ھ / ۹۰۲ء — وفات المعتضد، خلافت المکتفی
۲۹۵ھ / ۹۰۸ء — وفات المکتفی و خلافت المقتدر
۲۹۷ھ / ۹۰۹ء — ابتدائے دولت فاطمیہ
۲۹۸ھ / ۹۱۱ء — وفات جنید بغدادی۔
۳۰۰ھ / ۹۱۲ء — خلافت عبدالرحمان ناصر اندلسی۔
۳۰۱ھ / ۹۱۳ء — منصور حلاج کا دعوےٰ "انا الحق" اور گرفتاری
۳۰۳ھ / ۹۱۵ء — وفات نسائیؒ۔
۳۰۹ھ / ۲۲-۹۲۱ء — مصر پر عباسیوں کا قبضہ، حلاج کا قتل۔
۳۱۰ھ / ۹۲۳ء — وفات طبری مورخ
۳۱۱ھ / ۹۲۳ء — وفات محمد بن زکریا الرازی، قرامطہ نے حاجیوں کا قتل عام کیا
۳۱۷ھ / ۹۲۹ء — وفات ابوالقاسم البغوی، قرامطیوں نے مکہ میں قتل عام کیا اور حجر اسود نکال کر لے گئے۔ قرطبہ علمی مرکز بنا۔
۳۲۰ھ / ۹۳۲ء — قتل المقتدر، خلافت القاہر البغدادی
۳۲۲ھ / ۹۳۴ء — معزولی القاہر و خلافت الراضی۔
۳۲۴ھ / ۹۳۵ء — وفات ابوالحسن اشعری۔
۳۲۹ھ / ۹۴۰ء — وفات الراضی و خلافت ابراہیم المتقی
۳۳۳ھ / ۹۴۴ء — معزولی المتقی و خلافت المستکفی
۳۳۴ھ / ۹۴۵ء — قتل المستکفی و خلافت المطیع
۳۳۸ھ / ۹۴۹ء — بغداد میں شیعہ سنی فسادات
۳۳۹ھ / ۹۵۰ء — وفات ابونصر فارابی، حجر اسود واپس لایا گیا۔
۳۴۷ھ / ۹۵۸ء — عراق و شام پر روسیوں کا حملہ۔
۳۴۹ھ / ۹۶۰ء — کثیر تعداد ترکوں کا قبول اسلام۔ معزالدولہ نے بغداد کی بہت سی مساجد بند کرادیں۔
۳۵۰ھ / ۹۶۱ء — وفات عبدالرحمان ناصر و خلافت مستنصر الاموی
۳۵۲ھ / ۹۶۳ء — نوحہ، ماتم اور مراسم محرم کی ابتداء۔ عید غدیر کی ابتداء۔ غزنہ پر الپتگین کا قبضہ
۳۵۶ھ / ۹۶۶ء — سرکاری طور پر جبری ماتم، قتل ابوالفرج اصفہانی۔
۳۵۷ھ / ۹۶۸ء — المتقی کی وفات۔ عراق و شام میں بدامنی۔
۳۶۱ھ / ۹۷۲ء — مصر میں جامعہ ازہر کی بنیاد رکھی گئی۔
۳۶۶ھ / ۹۷۶ء — وفات المستنصر و خلافت ہشام ثانی الاموی۔
۳۷۸ھ / ۹۸۸ء — بغداد میں دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ تعمیر ہوئی۔

وفات ابونصر سراج صوفی۔
۳۸۰ھ / ۹۹۰ء — ہندوستان میں راجہ جے پال اور سبکتگین کی پہلی جنگ۔
۳۸۵ھ / ۹۹۵ء — وفات امام دارقطنی
۳۸۹ھ / ۹۹۹ء — محمود غزنوی کی تخت نشینی
۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء — محمود غزنوی کا ملتان پر حملہ۔
۳۹۸ھ / ۱۰۰۷ء — بغداد میں فسادات۔ وفات ابونصر کلاباذی، سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے۔
۳۹۹ھ / ۱۰۰۸ء — محمود غزنوی کا انند پال پر حملہ۔ معزولی ہشام ثانی و خلافت محمد مہدی الاموی۔
۴۰۰ھ / ۱۰-۱۰۰۹ء — محمود غزنوی کا نگر کوٹ پر حملہ۔ خلافت المستعین دوبارہ خلافت محمد مہدی دوبارہ، خلافت ہشام دوبارہ۔
۴۰۱ھ / ۱۰۱۱ء — سندھ میں سومرہ حکومت۔ محمود غزنوی کا ملتان پر قبضہ
۴۰۴ھ / ۱۰۱۴ء — الحاکم فاطمی نے بے پردہ عورتوں کو قتل کروا کے دریا میں پھینکوا دیا۔
۴۰۸ھ / ۱۰۱۸ء — خلافت عبدالرحمان الرابع اندلس۔
۴۱۱ھ / ۱۰۲۱ء — حکومت الظاہر فاطمی۔
۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء — ایک مصری باطنی نے حجر اسود کو ہتھوڑا مار کر توڑ دیا۔
۴۱۴ھ / ۱۰۲۳ء — خلافت عبدالرحمان الخامس و خلافت محمد المستکفی (اندلس)
۴۱۶ھ / ۱۰۲۵ء — محمود غزنوی نے سومنات توڑا۔
۴۱۸ھ / ۱۰۲۷ء — خلافت ہشام ثالث (اندلس)
۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء — وفات محمود غزنوی، تخت نشینی مسعود غزنوی۔ اندلس میں طوائف الملوکی کا آغاز۔
۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء — وفات ابوبکر اصفہانی و ابن سینا۔
۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء — آل سلجوق کی ابتداء (رکن الدین)
۴۳۳ھ / ۱۰۴۱ء — تخت نشینی مودود غزنوی۔
۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء — مراکش و الجیریا میں دوبارہ عباسی خطبہ
۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء — فتنہ و قتل بساسیری۔
۴۵۹ھ / ۱۰۶۶ء — مدرسہ نظامیہ بغداد کی ابتداء، الپ ارسلان کی حکومت
۴۶۱ھ / ۱۰۶۹ء — جامعہ دمشق میں آتشزدگی۔
۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء — وفات خطیب البغدادی۔
۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء — الپ ارسلان کا انتقال اور حکومت ملک شاہ سلجوق۔
۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء — طلیطلہ پر عیسائیوں کا قبضہ، وفات امام الحرمین الجوینی۔
۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء — حرمین میں عباسیوں کا خطبہ، عیسائیوں پر یوسف بن تاشفین کی فتح۔
۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء — شہادت نظام الملک الوزیر، وفات ملک شاہ سلجوقی۔
۴۹۱ھ / ۱۰۹۸ء — انطاکیہ اور حمص پر صلیبی قبضہ، وفات ابوالحسن کرخی، صلیبی جنگیں۔
۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء — عیسائیوں نے شام اور حمص میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔
۴۹۴ھ / ۱۱۰۰ء — حسن بن صباح کی قیادت میں فدائیوں کا عروج۔
۴۹۷ھ / ۱۱۰۳ء — فرنگیوں کا عکہ پر قبضہ

Marfat.com

نقشہ تاریخ اسلام
سقوطِ بغداد سے پہلے

Marfat.com

نقشہ تاریخ اسلام
سقوطِ بغداد کے بعد

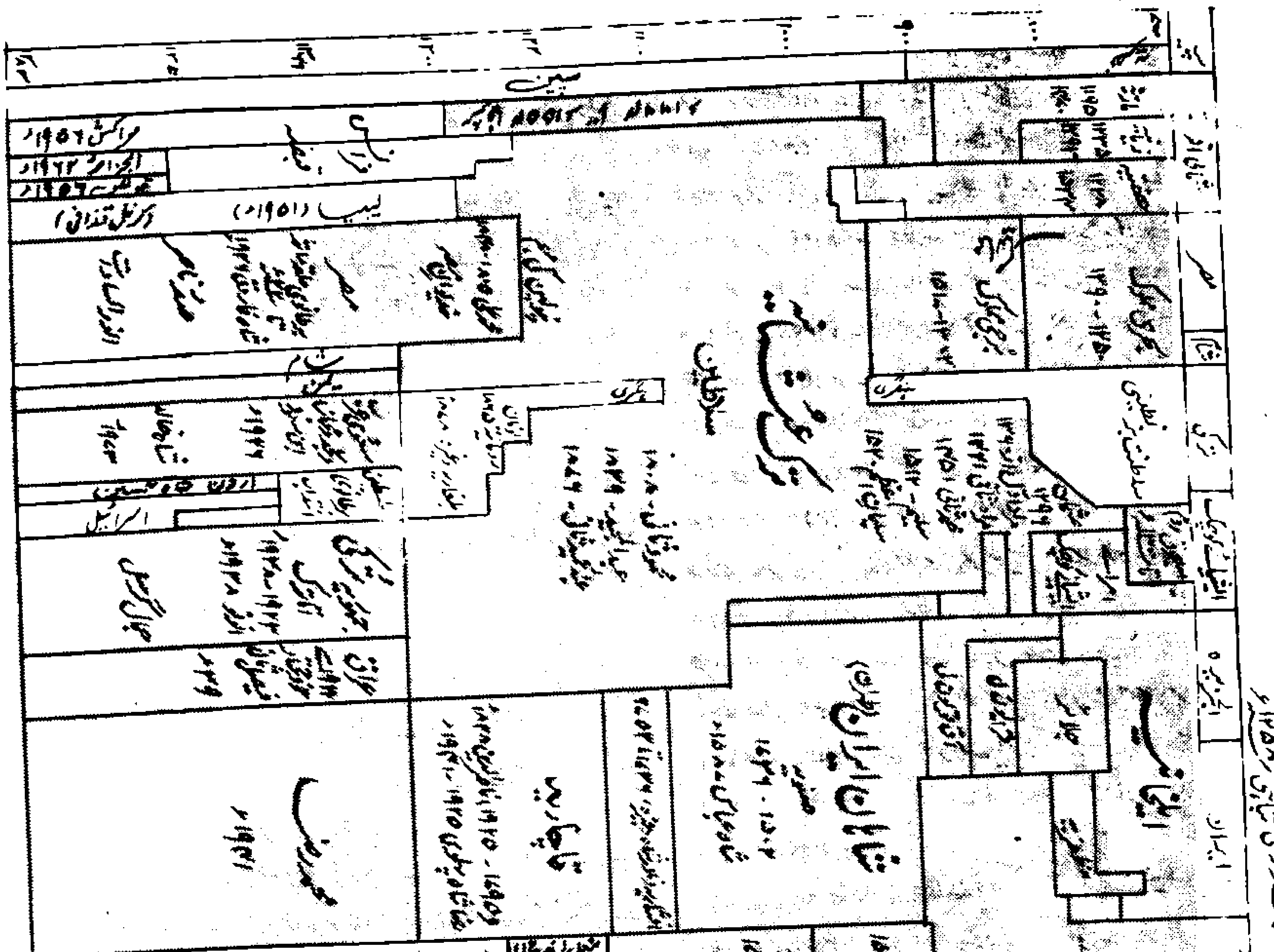

اسلامی انسائیکلو پیڈیا

Marfat.com

۵۰۰ھ / ۱۱۰۶ء — وفات یوسف بن تاشفین۔
۵۰۳ھ / ۱۱۰۹ء — طرابلس پر فرنگیوں کا قبضہ۔
۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء — وفات امام غزالی۔
۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء — وفات ابن رُشد
۵۲۴ھ / ۱۱۲۹ء — وفات محمد بن تومرت المہدی۔ وخلیفہ آمر باحکام اللہ فاطمی۔
۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء — سلطان سنجر اور تاتاریوں کے درمیان جنگ۔
۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء — نورالدین محمود زنگی نے فرنگیوں سے تین قلعے واپس لے لیے۔
۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء — دمشق پر نورالدین زنگی کا قبضہ
۵۵۸ھ / ۱۱۶۳ء — نورالدین زنگی کی فرنگیوں پر فتح۔ وفات عبدالمومن والی المغرب
۵۶۱ھ / ۱۱۶۵ء — بغداد میں رافضیوں کی بے اعتدالیاں۔
۵۶۲ھ / ۱۱۶۶ء — وفات شیخ عبدالقادر جیلانی
۵۶۴ھ / ۱۱۶۹ء — حکومت صلاح الدین ایوبی۔
۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء — آخری فاطمی امام العاضد کی معزولی اور عباسی خطبہ کا اجراء
۵۷۰ھ / ۱۱۷۴ء — شام پر صلاح الدین کا قبضہ
۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء — شہاب الدین غوری کا ملتان پر قبضہ
۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء — پرنس آرنات کی مدینہ کی طرف فوج کشی اور عزالدین فرخ شاہ کی کامیاب مدافعت۔
۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء — وفات ایلغازی
۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء — شہاب الدین غوری کا لاہور پر قبضہ
۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء — صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا۔
۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء — شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج میں جنگ اور اگلے برس شہاب الدین کو فتح
۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء — صلاح الدین ایوبی کی وفات۔
۵۹۴ھ / ۱۱۹۷ء — علاؤالدین خوارزم شاہ کا بخارا پر قبضہ۔ بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا۔
۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء — دہلی پر شہاب الدین غوری کا قبضہ
۶۰۱ھ / ۱۲۰۴ء — ملک العادل ایوبی اور فرنگیوں میں صلح۔
۶۰۲ھ / ۱۲۰۵ء — قطب الدین ایبک کی حکومت
۶۰۶ھ / ۱۲۰۹ء — وفات فخرالدین رازی
۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء — قتل غیاث الدین محمود، وفات قطب الدین ایبک، تخت نشینی آرام شاہ۔
۶۲۰ھ / ۱۲۲۳ء — شہادت فریدالدین عطار
۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء — وفات بختیار کاکی۔
۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء — وفات خواجہ معین الدین اجمیری۔ تخت نشینی رکن الدین فیروز شاہ دہلی۔
۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء — حکومت رضیہ سلطانہ (دہلی)
۶۳۷ھ / ۱۲۴۰ء — حکومت معزالدین بہرام شاہ۔
۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء — وفات ابن عربی و بدیع الدین شاہ مدار
۶۳۹ھ / ۱۲۴۲ء — حکومت علاؤالدین مسعود دہلی۔
۶۴۲ھ / ۱۲۴۵ء — شہادت شمس تبریزی۔

۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء — ہلاکو خاں نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا اور خلیفہ المستعصم کو شہید کر دیا۔
۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء — وفات بابا فرید گنج شکر۔ حکومت غیاث الدین بلبن وفات داتا گنج بخش (۶۶۵ھ)
۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء — وفات مولانا روم و خواجہ نصیرالدین طوسی
۶۷۶ھ / ۱۲۷۸ء — وفات حمیدالدین ناگوری
۶۸۱ھ / ۱۲۸۲ء — وفات ابن خلکان
۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء — وفات غیاث الدین بلبن، حکومت کیقباد (دہلی)
۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء — حکومت جلال الدین خلجی
۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء — وفات علاء الدین صابر کلیری۔
۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء — وفات سعدی شیرازی
۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء — حکومت علاء الدین خلجی
۶۹۹ھ / ۱۳۰۰ء — تخت نشینی عثمان بانی دولت عثمانیہ ترکیہ۔
۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء — حکومت قطب الدین مبارک خلجی، قتل کافور ملک
۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء — حکومت غیاث الدین تغلق
۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء — وفات بوعلی قلندر
۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء — حکومت محمد تغلق۔ وفات نظام الدین اولیاؒ و امیر خسرو دہلوی
۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء — وفات امام ابن تیمیہ
۷۳۵ھ / ۱۳۳۴ء — وفات برہان الدین غریب
۷۴۷ھ / ۱۳۴۶ء — حسن گنگو بہمنی بانی دولت بہمنیہ ہوا۔
۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء — حکومت فیروز تغلق
۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء — وفات نصیرالدین چراغ دہلی۔
۷۶۱ھ / ۱۳۶۰ء — تخت نشینی مراد اوّل (عثمانی)
۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء — وفات فیروز تغلق و حکومت محمد تغلق
۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء — ابوبکر شاہ دہلی۔ حکومت متوکل (سہ بارہ)، وفات حافظ شیرازی
۷۹۲ھ / ۱۳۸۹ء — تخت نشینی، بایزید یلدرم عثمانی۔
۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء — حکومت مظفر شاہ گجراتی۔
۷۹۸ھ / ۱۳۹۶ء — نکوپلس کی جنگ میں بایزید یلدرم نے متحدہ یورپی فوجوں کو شکست دی۔
۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء — تیمور لنگ کا حملہ دہلی، وفات ظاہر برقوق
۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء — تخت نشینی محمد اوّل (عثمانی)
۸۰۶ھ / ۱۴۰۴ء — وفات شیخ راجو قتال
۸۰۸ھ / ۱۴۰۵ء — وفات ابن خلدون۔
۸۱۳ھ / ۱۴۱۰ء — وفات غیاث الدین سلطان بنگال و مظفر شاہ گجراتی
۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء — تخت نشینی مراد ثانی عثمانی، حکومت مبارک شاہ ثانی (دہلی)
۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء — وفات خواجہ گیسو دراز و ابن سیطار
۸۲۶ھ / ۱۴۲۴ء — وفات نعمت اللہ ولی۔
۸۴۲ھ / ۱۴۳۸ء — وفات سلطان ابراہیم شرقی۔

Marfat.com

۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء — وفات احمد بن ارسلان
۸۵۲ھ / ۱۴۴۹ء — وفات امام ابن حجر عسقلانی
۸۵۴ھ / ۱۴۵۱ء — دہلی پر بہلول لودھی کا قبضہ
۸۵۷ھ / ۱۴۵۲ء — وفات بہاءالدین نقشبند۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا۔
۸۶۳ھ / ۱۴۵۹ء — وفات قطب شاہ گجراتی۔
۸۸۶ھ / ۱۴۸۱ء — تخت نشینی بایزید ثانی عثمانی
۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء — غرناطہ پر عیسائیوں کا قبضہ۔
۹۰۷ھ / ۱۵۰۲ء — ایران میں صفوی حکومت کی ابتداء (اسماعیل صفوی)
۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء — وفات جلال الدین سیوطی
۹۱۵ھ / ۱۵۱۰ء — حکومت ابراہیم لودی
۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ء — وفات یوسف عادل شاہ بانی دولت بیجاپور، وفات احمد شاہ گجراتی۔
۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء — تخت نشینی سلیم اول عثمانی و آغاز خلافت عثمانیہ
۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء — سماٹرا میں مسلم حکومت (علی شاہ) کی ابتداء
۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء — خلافت سلیمان قانونی عثمانی
۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء — جنگ پانی پت اور ہندوستان میں بابر کی حکومت کا آغاز
۹۳۳ھ / ۱۵۲۷ء — بہمنی سلطنت کا خاتمہ
۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء — وفات بابر و حکومت ہمایوں
۹۴۴ھ / ۱۵۳۷ء — وفات شیخ عبدالقدوس گنگوہی
۹۴۶ھ / ۱۵۴۰ء — ہمایوں کا فرار اور ہندوستان پر شیر شاہ سوری کی حکومت
۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء — وفات شیر شاہ سوری و حکومت اسلام شاہ
۹۶۰ھ / ۱۵۵۲ء — تعمیر مسجد حرم۔ حکومت محمد عادل شاہ سوری
۹۶۱ھ / ۱۵۵۴ء — حکومت ابراہیم شاہ سوری
۹۶۲ھ / ۱۵۵۵ء — ہمایوں کی مراجعت
۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء — وفات ہمایوں، حکومت اکبر، خاتمہ سوری حکومت
۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء — قتل ہیموں بقال۔
۹۶۸ھ / ۱۵۶۱ء — قتل بیرم خان
۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء — وفات محمد غوث گوالیاری
۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء — خلافت سلیم ثانی عثمانی
۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء — خلافت مراد ثالث عثمانی۔
۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء — وفات طہماسپ صفوی اول، وفات بحر العلوم بدرالدین غزی۔
۹۹۵ھ / ۱۵۸۷ء — اکبر نے کشمیر فتح کیا۔
۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء — احمد نگر کی حکومت کا خاتمہ
۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۳ء — وفات شیخ مبارک ناگوری۔
۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء — خلافت محمد ثالث عثمانی۔ وفات علامہ فیضی۔
۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۶ء — وفات عبدالقادر بدایونی
۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء — قتل شیخ ابوالفضل علامی
۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء — وفات خواجہ باقی باللہ دہلی، خلافت احمد اول عثمانی

۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء — وفات محمد قاسم فرشتہ (مورخ)
۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء — خلافت مصطفیٰ اول عثمانی۔
۱۰۲۷ھ / ۱۶۱۸ء — خلافت عثمان ثانی۔
۱۰۳۱ھ / ۱۶۲۲ء — دوبارہ خلافت مصطفیٰ اول عثمانی
۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ء — خلافت مراد الرابع
۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء — وفات شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی
۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء — وفات عبدالرحیم خانخاناں
۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء — وفات جہانگیر حکومت شاہجہان
۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء — وفات میاں میر لاہوری
۱۰۴۹ھ / ۱۶۴۰ء — خلافت ابراہیم عثمانی
۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء — وفات شیخ عبدالحق محدث دہلوی
۱۰۵۵ھ / ۱۶۴۵ء — وفات ملکہ نور جہاں و منیر لاہوری
۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء — خلافت محمد رابع عثمانی
۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء — وفات حاجی خلیفہ مصنف "کشف الظنون"
۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۸ء — معزولی شاہجہان و حکومت اورنگ زیب عالمگیر
۱۰۷۱ھ / ۱۶۶۱ء — قتل سرمد۔ پرتگالی تاجروں کی ہندوستان میں آمد
۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء — وفات شاہ ولی اللہ
۱۱۰۲ھ / ۱۶۹۰ء — خلافت احمد ثانی۔
۱۱۰۶ھ / ۱۶۹۴ء — خلافت مصطفیٰ ثانی۔ وفات شائستہ خان امیر الامراء
۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء — خلافت احمد ثالث
۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء — وفات اورنگ زیب عالمگیر۔ حکومت بہادر شاہ اول ہندوستان میں ولندیزیوں کی آمد۔
۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء — حکومت جہاندار شاہ (دہلی)، و حکومت فرخ سیر (دہلی) ہندوستان میں یورپی تاجروں کی ہر طرح کی آزادی۔
۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء — انقلابات کا سال۔ دہلی میں یکے بعد دیگرے رفیع الدرجات رفیع الدولہ اور روشن اختر محمد شاہ کی حکومتیں۔
۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء — وفات میرزا بیدل۔ ولایت برہان الملک اول نواب اودھ
۱۱۳۹ھ / ۱۷۲۷ء — وفات سردار دوست محمد خان بانی ریاست بھوپال
۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء — خلافت محمود اول عثمانی۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج
۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء — ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ اور دہلی میں قتل عام
۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء — ایران میں نادر شاہ افشار کا قتل۔ احمد شاہ ابدالی کا عروج۔
۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء — ایران میں احمد شاہ ابدالی، درانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ دکن میں وفات آصف جاہ اول
۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲ء — کریم خان زند نے ایران میں صفوی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔
۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء — ہندوستان میں حکومت عزالدین عالمگیر دوم۔
۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء — ترکی میں خلافت عثمان ثالث
۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۷ء — بنگال میں جنگ پلاسی اور شہادت نواب سراج الدولہ
۱۱۷۱ھ / ۱۷۵۸ء — خلافت مصطفیٰ ثالث۔
۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء — دہلی میں حکومت شاہجہاں سوم و شاہ عالم دوم پنجاب میں مرہٹوں کا عروج۔

Marfat.com

۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء ـ پانی پت کی تیسری لڑائی، احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کی تباہی۔

۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء ـ وفات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء ـ خلافت عبدالحمید اول عثمانی

۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء ـ وفات حیدر علی و تخت نشینی ٹیپو سلطان (ریاست میسور)

۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء ـ خلافت سلیم ثالث

۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء ـ وفات فیض اللہ بانی ریاست رامپور

۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۶ء ـ ایران میں قاچاری حکومت کی ابتداء (آقا محمد)

۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء ـ مصر میں نپولین نے مملوکوں کو شکست دی۔ قاہرہ پر قبضہ کر لیا اور جامع مسجد میں نماز ادا کی۔

۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء ـ شہادت ٹیپو سلطانؒ۔ ہندوستان میں انگریزی راج۔

۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء ـ مصر میں محمد علی پاشا گورنر بنا

۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء ـ دہلی میں حکومت اکبر دوم

۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء ـ خلافت مصطفےٰ رابع عثمانی

۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء ـ خلافت محمود ثانی

۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء ـ وفات عبدالعلی بحرالعلوم

۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء ـ مصر نے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔

۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء ـ وفات عبدالعزیز محدث دہلوی

۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء ـ روس نے ترکی پر حملہ کر دیا۔

۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء ـ بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد بریلوی و مولانا سید اسماعیل سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء ـ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی حکومت۔ انگریزوں نے بادشاہ دہلی کے اختیارات میں کمی کر دی۔

۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء ـ خلافت سلطان عبدالمجید اوّل

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء ـ افغانستان کے امیر شجاع الملک کا قتل۔

۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء ـ انگریزوں نے دوست محمد خاں کو بادشاہ افغانستان تسلیم کر لیا۔

۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء ـ الجزائر پر فرانس کا قبضہ

۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء ـ وفات محمد علی پاشا (خدیو مصر)

۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء ـ معزولی واجد شاہ (اودھ) کشمیر میں ڈوگرہ راج کا آغاز

۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء ـ میرٹھ سے ہندوستان کی جنگ آزادی کا آغاز

۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء ـ دہلی پر انگریزی قبضہ، بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور ہندوستان پر براہ راست تاج برطانیہ کی حکومت۔

۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء ـ وفات بہادر شاہ ظفر (رنگون میں قید)

۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء ـ وفات مفتی صدرالدین دہلی۔

۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء ـ خلافت مراد خامس عثمانی۔ خلافت عبدالحمید ثانی۔

۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء ـ روس اور ترکی کے درمیان جنگ۔ سرسید کی تحریک علیگڑھ

۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء ـ وفات محمد قاسم نانوتوی۔

۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء ـ وفات آغا خاں اوّل۔ حکومت عبدالرحمان (افغانستان)، تیونس پر فرانس کا قبضہ

۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء ـ شہادت مدحت پاشا۔ روسی بیڑہ قسطنطنیہ پہنچا۔ مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ

۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء ـ وفات مہدی سوڈانی۔

۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء ـ وفات عبدالحی فرنگی محلی و نواب کلب علی خاں

۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء ـ وفات واجد علی شاہ (کلکتہ)

۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء ـ وفات نواب صدیق حسن بھوپال۔

۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء ـ وفات فیض الحسن سہارنپوری

۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء ـ وفات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ اُم درمان میں انگریزوں اور درویشوں کی جنگ

۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء ـ مڈغاسکر پر فرانس کا قبضہ، قتل ناصرالدین قاچار۔ وفات سید جمال الدین افغانی۔ ترکی میں نوجوان ترک تحریک کا آغاز

۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء ـ وفات سر سید احمد خاں۔ سرحدی قبائل میں ہنگامہ آرائی

۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء ـ وفات امیر عبدالرحمان خاں۔ حکومت حبیب اللہ خاں (کابل) ایران کے بحری ساحل پر روس کا قبضہ۔

۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء ـ وفات رشید احمد گنگوہی۔ تقسیم بنگال۔ ہندوستان میں مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) شاہ افغانستان اور انگریزوں میں دوستی کا معاہدہ

۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء ـ ایران کی آزادی روس اور برطانیہ کے ہاتھوں ختم۔

۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء ـ احمدیت (قادیانیت) کے مبلغ مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات۔ ترکی میں دستوری حکومت کا قیام۔

۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء ـ معزولی عبدالحمید ثانی، خلافت محمد خامس عثمانی۔ ایران میں اینگلو پرشین آئل کمپنی کا قیام

۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء ـ اٹلی نے لیبیا پر قبضہ کر لیا۔ جنگ طرابلس بلقان کا آغاز، فرانس اور بلجیم میں کانگو کا بٹوارا (۱۹۱۰ء)

۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء ـ وفات حاجی عابد حسین بانی دارالعلوم دیوبند و ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء ـ وفات شبلی نعمانی۔ جنگ عظیم اوّل کا آغاز

۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء ـ وفات الطاف حسین حالی

۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء ـ وفات وقار الملک۔ شریف مکہ نے برطانیہ کی شہ پر ترکوں سے بغاوت کر دی۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین میثاق لکھنؤ

۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء ـ برطانیہ کا یروشلم پر قبضہ۔ خلافت محمد سادس عثمانی۔

۱۳۳۷ھ / ۱۹۱۹ء ـ حکومت امان اللہ خان (کابل) ہندوستان میں رولٹ ایکٹ۔ جلیانوالہ باغ، امرتسر میں جنرل ڈائر نے گولی چلوائی۔

۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء ـ شام کی آزادی، شہادت انور پاشا۔ وفات شیخ الہند محمود الحسن قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء ـ وفات احمد رضا خاں بریلوی۔ مراکش میں محمد بن عبدالکریم "مجاہد ریف" کا جہاد آزادی، ہندوستان میں قومی تحریکات کا آغاز۔ مولانا محمد علی جوہر وفد کے ساتھ انگلستان گئے۔ شاہ سعود نے ملک حجاز اور نجد کے سلطان ہونے کا دعوے کیا۔ جنگ سقاریہ میں ترکوں نے یونانیوں کو شکست۔

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء ـ خلافت عبدالمجید ثانی۔ سعودی عرب میں شاہ فیصل ابن سعود کا اقتدار۔

۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۴ء ـ ترکوں اور اتحادیوں کے مابین معاہدہ لوزان۔ معزولی خلافت

Marfat.com

عبدالمجید ثانی۔ ایران میں قاچاری حکومت کا خاتمہ۔ سعودی سلطان کا حجاز پر مکمل قبضہ۔ مصطفیٰ کمال اتاترک ترکی کے صدر منتخب ہوئے۔ سعد زاغلول مصر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ وفات نواب وقار الملک۔

۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء — ایران میں رضا شاہ پہلوی برسر اقتدار آگئے۔

۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء — برطانیہ نے نجد و حجاز کی آزادی تسلیم کر لی۔ وفات حکیم اجمل خان

۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء — قائد اعظم نے چودہ نکات پیش کیے۔ بچہ سقہ کا افغانستان میں عروج۔ امان اللہ خان کا فرار اور نادر شاہ کی حکومت (افغانستان)

۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء — وفات مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے جلسہ الہ آباد میں تصور پاکستان پیش کیا۔

۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء — آزادی عراق۔

۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء — نادر شاہ (افغانستان) کا قتل اور محمد ظاہر شاہ کا اقتدار

۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء — قائد اعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی۔

۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء — آزادی مصر۔ وفات ڈاکٹر مختار انصاری

۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء — تقسیم فلسطین کی تجویز برطانیہ کے پیل کمیشن نے شائع کی۔

۱۳۵۷ھ — ۱۹۳۸ء — وفات علامہ اقبال و اتاترک و مولانا شوکت علی۔ دوسری جنگ عظیم کا آغاز (۱۹۳۹ء)

۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء — مسلم لیگ نے لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی۔ تاسیس جماعت اسلامی (۱۹۴۱ء)

۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۳ء — وفات اشرف علی تھانوی و مولانا الیاس، فلسطین و شرق اردن پر برطانیہ اور فرانس کا قبضہ۔ سنگاپور پر جاپانی فوجوں کا قبضہ (۱۹۴۲ء)

۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء — وفات بہادر یار جنگ۔ عرب لیگ قائم ہوئی۔

۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۵ء — دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی۔ فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ ایران سے روسی اور امریکی فوجوں کا انخلاء۔ مصر کے وزیر اعظم احمد ماہر پاشا کا قتل۔ ہندوستان میں کرپس مشن کی آمد۔ انڈونیشیا آزاد ہوا۔

۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء — آزادی لبنان و شام و اردن۔ ہندوستان میں عبوری حکومت کا قیام۔

۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء — قیام پاکستان۔ کشمیر پر بھارت کا حملہ، دکن اور جوناگڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق۔

۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء — وفات قائد اعظم، حیدر آباد دکن پر بھارت کا حملہ اور قبضہ کشمیر میں جنگ بندی۔ فلسطین میں اسرائیل کا قیام۔ عرب اسرائیل جنگ۔ خواجہ ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل بنے۔

۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء — مصر میں اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا کی شہادت۔ شام میں پہلا فوجی انقلاب۔ وفات شبیر احمد عثمانی۔

۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء — وفات حسرت موہانی۔ الجزائر میں جنگ آزادی کا آغاز۔ لیبیا آزاد ہوا۔ سوڈان آزاد ہوا۔ اردن میں شاہ عبداللہ کا قتل اور شاہ حسین کا اقتدار۔ ڈاکٹر مصدق نے ایران تیل کمپنی کو قومیا لیا۔ شہادت نوابزادہ لیاقت علی خاں، پاکستان (۱۹۵۱ء)

۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۲ء — شاہ فاروق (مصر) کی جلاوطنی اور جنرل نجیب برسر اقتدار آئے

۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۳ء — عراق میں فیصل دوم کی تخت نشینی۔

۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء — وفات سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء) جمال ناصر مصر کے صدر بنے جنرل نجیب کی علیحدگی۔

۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۵ء — میثاق بغداد (سینٹو) میں پاکستان، ترکی، ایران اور عراق شامل ہوئے۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات بگڑ گئے۔ سکندر مرزا پاکستان کے گورنر جنرل بنے۔

۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء — سوڈان، مراکش اور تیونس کی آزادی۔ اسرائیل کا مصر پر حملہ پاکستان کے پہلے صدر سکندر مرزا بنے۔ مصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء — اردن کی کامل آزادی۔ وفات آغا خان سوم، ملائشیا آزاد ہوا۔

۱۳۷۷ھ / ۵۸ - ۱۹۵۷ء — ملایا کی آزادی۔ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر و شام) کا قیام۔ سوڈان پر فوجی حکومت کا قبضہ۔ عراق پر عبدالکریم قاسم کا قبضہ اور فیصل شاہ عراق کا قتل، لبنان میں ہنگامے۔

۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء — تیونس کی آزادی۔ پاکستان میں مارشل لاء۔ جنرل ایوب خان برسر اقتدار آئے۔ وفات ابوالکلام آزاد۔ موریطانیہ کی آزادی

۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء — آزادی کیمرون۔

۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء — آزادی صومالیہ سینیگال، وسطی افریقہ، نائیجیریا اور کویت۔

۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء — شام اور مصر کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ بحرین آزاد ہوا۔ ترکی میں عدنان مندریس کو پھانسی دے دی گئی۔

۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء — پاکستان میں نئے آئین کا نفاذ۔ وفات علامہ مشرقی۔ یمن میں امامت ختم ہو گئی۔ الجزائر آزاد ہوا۔ یمن میں عبداللہ سلال کا فوجی انقلاب

۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء — یمن میں جمہوریت۔ آزادی زنجبار، عراق میں صدر قاسم کا قتل

۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء — بومحی الدین (بومدین) نے بن بالا کی حکومت (الجزائر) الٹ دی پاکستان اور بھارت میں جنگ۔

۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء — اعلان تاشقند۔ شام میں بعث پارٹی کا اقتدار (نورالدین عطاسی صدر بنے)

۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء — اسرائیل کا مصر پر حملہ۔ صحرائے سینا پر قبضہ

۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء — پاکستان میں مارشل لاء، ایوب خان مستعفی ہو گئے۔ جنرل یحییٰ خان نے صدارت سنبھالی۔ سوڈان میں جعفر نمیری کا فوجی انقلاب لیبیا میں فوجی انقلاب۔ مسجد اقصیٰ میں یہودیوں نے آگ لگا دی

۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء — مصر میں صدر ناصر کا انتقال۔

۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء — مشرقی پاکستان پر روس اور امریکہ کی ملی بھگت سے بھارت کا حملہ اور قبضہ۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت۔

۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء — شیخ مجیب الرحمان کی رہائی، پاکستان دولت مشترکہ سے الگ ہو گیا۔ شملہ میں پاک بھارت مذاکرات۔

۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء — پاکستان میں نئے آئین کا نفاذ۔ مصر اور دیگر عرب ممالک پر اسرائیل کا حملہ۔ عربوں کا تیل کو پہلی بار معاشی ہتھیار بنانا، پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی۔ افغانستان میں سردار داؤد نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔

Marfat.com

۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء - لاہور میں تمام اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس - پاکستان نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا - شمالی یمن میں کرنل ابراہیم حمیدی کا انقلاب - وفات مفتی اعظم امین الحسینی - قادیانیوں کو پاکستان حکومت نے غیر مسلم اقلیت قرار دیا -

۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء - بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) میں فوجی انقلابات، شیخ مجیب الرحمان کے قتل پر پاکستان کے ساتھ بہتر تعلقات، شہادت شاہ فیصل ابن سعود - نائیجریا میں فوجی انقلاب -

۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء - پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس -

تازا شرقی مراکش کا ایک شہر جو فاس کے شمال مشرق میں ساٹھ میل کے فاصلے پر نشیب میں واقع ہے - قرون وسطیٰ میں اس علاقہ کو مغرب اقصیٰ اور مغرب وسطیٰ کے درمیان حد فاصل کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے -

تازا میں تاریخ سے قبل زمانہ کی آبادیاں دریافت کی گئی ہیں - آٹھویں تا دسویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ نیم بدوی مکناسہ بربروں کے ایک گروہ کے قبضے میں تھا - اس زمانے میں تازا کی آبادی کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی ابن خلدون کے نزدیک انہی لوگوں نے رباط "تازا کی بنیاد رکھی - لیکن تاریخی طور پر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ تازا میں ایک مستحکم شہر اور رباط کی بنیاد موحدین نے رکھی - ۵۲۸ھ/۱۱۳۳ء میں عبدالمومن بالائی اطلس پر قبضہ کر لینے کے بعد نشیب تازا میں پہنچا - چنانچہ اس کی تعمیر کرائی ہوئی فصیل کا ایک حصہ اب بھی باقی ہے -

۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں تازا پر مرینیوں نے قبضہ کر لیا - مرینیوں نے بھی تازا کے دفاعی استحکام کی طرف زیادہ توجہ دی انہوں نے دوبار یہاں کی بڑی مسجد کی مرمت کرائی اور مدارس قائم کئے - چنانچہ ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء میں جب سلطان تلمسان ابو حمو ثانی نے تازا پر حملہ کیا اور اس کا ایک ہفتے تک محاصرہ کیا تو اہل تازہ نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا - یہاں تک کہ اسے پسپا ہونا پڑا -

بقول حسن بن محمد الوزان زیاتی" سولہویں صدی میں تازا سلطنت کا تیسرا بڑا شہر تھا - اس کا انتظام سلطان فاس کے دوسرے بیٹے کے سپرد تھا اور اس کی آبادی تقریباً پانچ ہزار خاندانوں پر مشتمل تھی - اس شہر کو جو چشمے پانی مہیا کرتے تھے ان کی حفاظت کی خاطر بنی سعد کے ایک شریف نے ایک برج تعمیر کرایا تھا جو آج بھی فصیل کے جنوب مشرقی کونے میں واقع ہے -

تاشقند روس کا ایک بڑا شہر اور ریاست ازبکستان کا صوبہ جو نخلستان چرچک میں واقع ہے - اور سیر دریا کے داہنی طرف کی معاون ندیوں میں سے ایک ندی کے کنارے آباد ہے - اگرچہ ازبکستان کا دارالحکومت سمرقند ہے لیکن وسط ایشیا میں سب سے بڑا شہر ہونے کی وجہ سے تجارت و تعلیم میں تاشقند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے - کل وسط ایشیا کی اقتصادی موتمر کے اجلاس یہیں پر ہوتے ہیں

یونانی اور رومی ماخذ کے مطابق دریائے سیحون کے کنارے پر خانہ بدوش ترک آباد تھے - قدیم چینی ماخذ میں یو - نی کی سرزمین کا ذکر موجود ہے جسے بعد میں تاشقند ہی کا علاقہ قرار دیا گیا ہے - اس کے بعد اس سرزمین کو چرچی کا نام دیا گیا - چاچ میں جو حکمران ہوتے تھے ان کی حکومت دوسرے ملکوں کی طرح پورے ملک پر نہیں ہوتی تھی دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی میں جب عرب اس علاقے پر حملہ آور ہوئے تو یہاں ملک شاش حکمرانی کرتا تھا - اور اس کا دارالحکومت طار بند تھا - ۱۵۰ء میں چینی گورنر کاؤ سی این چی نے شاش کو قتل کر دیا تو اس کے بیٹے نے عربوں سے مدد مانگی - ابومسلم نے زیاد بن صالح کو مدد کے لئے بھیجا - اس نے چینیوں کو ۱۳۳ھ/۷۵۱ء میں دریائے طلاس کے کنارے شکست دی اس لڑائی کی وجہ سے مسلمانوں کی وسط ایشیا میں ایک دھاک سی بیٹھ گئی - عہد خلافت میں ترکوں اور اسلام کے درمیان شاش کا علاقہ بطور سرحد سمجھا جاتا تھا - ۱۹۱ھ/۸۰۶ء میں اس علاقے پر ترک قابض ہو گئے - البتہ مامون کے عہد میں شاش کا علاقہ دوبارہ اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا - ۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں ایک شخص ابوالعباس یحییٰ ابن اسد شاش کا حاکم بنا ۲۲۵ھ/۸۴۰ء میں نوح بن اسد نے اسفیجاب کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا - اس زمانے میں شاش میں ایک نہر جاری کی گئی ـــــــ

اس علاقے کے لئے تاشقند کا لفظ سب سے پہلے البیرونی نے اپنی تاریخ الہند میں استعمال کیا ہے - یہ نام سکوں پر سب سے پہلے مغل عہد میں کندہ کیا گیا - مغول سلطنت کے زوال کے بعد تاشقند تیمور اور سال تیمور کی مملکت میں آ گیا - ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں یہ شہر خان مغول یونس کے قبضے میں آیا - خان یونس کے بعد اس کا بیٹا محمود خان اس علاقے کا حاکم بنا - ۱۵۰۳ء کے بعد تاشقند پر ازبکوں کا قبضہ ہو گیا - اور یہ ازبکوں کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا - اس کے بعد چند صدیوں تک یہ علاقہ کبھی ازبکوں اور کبھی قازاق کے ماتحت رہا - ۱۷۲۳ء میں تاشقند کو قلماقوں نے فتح کر لیا تو اس پر قلماقوں کی حکومت قائم ہو گئی - بسا اوقات حکومت پر فوجوں کا قبضہ بھی رہا -

ان صدیوں میں تاشقند بڑی خونریز لڑائیوں کا مرکز بنا رہا - ۱۸۶۵ء میں اس پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا - چنانچہ اس علاقے کو سیر دریا کے پورے علاقے کا دارالحکومت اور ترکستان کے گورنر جنرل کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے اس کی رونق دوچند ہو گئی - پرانے شہر کے ساتھ ساتھ ایک نیا شہر آباد کیا گیا - جس میں سرکاری حکام رہتے تھے -

۱۸۷۷ء میں دونوں شہروں کو باہم ملا کر ایک شہر بنا دیا گیا اور دونوں کی بلدیہ مشترک کر دی گئی - ۱۸۹۰ء میں اس شہر کی کل آبادی ۱۵۵۶۷۳ تھی - تاشقند کو پاک و ہند میں جنوری ۱۹۶۶ء میں اس بنا پر بڑی شہرت حاصل ہوئی کہ اس شہر میں پاک و ہند کے درمیان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد صدر پاکستان ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم شاستری کے درمیان ملاقات ہوئی اور روس کے وزیر اعظم کوسیجن کی مساعی سے ایک معاہدہ طے پایا - جو معاہدہ تاشقند کے نام سے مشہور ہے - اس معاہدے میں طے پایا کہ دونوں ملک اپنے مسائل آپس کی بات چیت سے طے کریں گے - اسی رات وزیر اعظم شاستری کا اسی شہر میں انتقال ہو گیا

۱۹۶۶ء کے وسط میں اس علاقے میں خوفناک زلزلے آئے - اور ایک مدت تک ان کا سلسلہ جاری رہا جن کی وجہ سے شہر کو کافی نقصان پہنچا -

۱۹۲۰ء میں یہاں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی - یہاں وسط ایشیائی زرعیت کا ایک بڑا کتب خانہ اور ایک بڑا عجائب خانہ ہے -

تاشقند شہر کی کل آبادی ۱۹۵۹ء کی مردم شماری کے مطابق ۹۱۱۰۰۰ تھی پورے صوبے کی آبادی ۲۲۶۳۰۰۰ تھی -

تالمود یہودیوں کی ایک مقدس کتاب - اس کتاب میں حضرت ہارون کی اولاد کے اقوال جمع کئے گئے ہیں - اقوال کے ساتھ راویوں کے نام بھی درج ہیں - ان اقوال کو یہودا ربی نے جمع کیا - اس کا نام مشناہ رکھا - بعد میں

Marfat.com

اس کی تشریح اور توضیح میں جمارا نامی حصہ کا اضافہ کیا گیا۔ ان دونوں حصوں کے مجموعے کو تالمود کہتے ہیں۔

مشناہ کے بارے میں یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ اقوال بطور وحی حضرت موسیٰ پر نازل ہوئے تھے۔

تالمود دو ہیں ایک فلسطینی اور دوسری بابلی تالمود۔ فلسطینی تالمود بابلی کی نسبت آسان اور مختصر ہے جس میں تاریخ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں بابلی تالمود بہت طویل اور دقیق ہے۔ نیز معلومات کے لحاظ سے بھی اسے خاص اہمیت حاصل نہیں۔

تالمود جمہور یہود کے لیے عہد نامہ عتیق کے بعد سب سے زیادہ اہم کتاب ہے۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی یہودیوں میں ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس فرقے کو کریم کا نام دیا گیا۔ جس کے لفظی معنی پڑھنے والے کے ہیں۔ یہ لوگ ان زبانی روایات کے منکر ہیں، جن پر تالمود کا انحصار ہے۔ یہ فرقہ یہود مذہب اور قوانین کا ماخذ صرف عہد نامہ عتیق ہی کو قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک توراۃ کی تعلیم کے منافی تمام احکام ناقابل التفات ہیں۔

تاؤمت

چین کا ایک مذہب جس کا بانی لاؤزے تھا۔ لاؤزے نے اپنی کتاب "تاؤتہ کنگ" میں لکھا ہے کہ خوشحال زندگی گذارنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تاؤ کی پیروی کی جائے۔ لیکن اس نے اس کتاب میں تاؤ کی تشریح کسی جگہ بھی نہیں کی۔ اسی وجہ سے تاؤ کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں اور انہوں نے اس کے کئی ایک معنی بتائے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی امن کے راستے اور طریقے کے بتائے ہیں اور بعض کے نزدیک تاؤ کے معنی بولنے اور گفتگو کرنے کے ہیں۔ اہل یورپ کے نزدیک اس کے معنی عقل کے ہیں

تاؤ کے بارے میں جو صفات بتائی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس کی ایک اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے۔ چنگ زی کے بقول (جو اس مذہب کا مستند مصنف بتایا جاتا ہے۔) کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب تاؤ موجود نہ ہو۔ لاؤزے کے نزدیک تو تاؤ کا تصور خدا سے پہلے بھی موجود تھا۔

۲۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کوئی جگہ بھی ایسی نہیں جہاں وہ موجود نہ ہو۔

۳۔ کائنات کی عظمت اور شان و شوکت اسی کے دم سے ہے اور وہ نہایت باریک سے باریک چیز میں بھی موجود ہے

۴۔ ننھے ننھے کیڑوں کو بھی اسی نے زندگی بخشی ہے اور چاند و سورج اپنے اپنے مدار پر اسی کی وجہ سے گھومتے ہیں۔

۵۔ تاؤ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ اس کی اپنی کوئی آواز ہے وہ غیر مرئی ہے لیکن تمام اجسام کا وہی خالق ہے اور تمام آوازیں اس نے بنائی ہیں اور اس سے کوئی چیز خالی نہیں۔

۶۔ وہی تمام مخلوقات کا روزی رساں ہے لیکن وہ غیر متحرک ہے۔

۷۔ وہ مشخص نہیں ہے اور ناقابل تقسیم ہے۔ ہر ایک پر مہربان ہے۔

ہوائی نان زو جو تاؤ فلسفے کا ماہر ہے تاؤ کی صفات کے بارے میں لکھتا ہے "تاؤ ہی آسمان کو سہارا دینے والا اور زمین کا بچھانے والا ہے۔ جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ جس کی بلندی ناپی نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تمام کائنات اس کے قبضہ قدرت میں وہ بے حد لطیف اور باریک ہے۔ ہر شے میں اسی طرح موجود ہے۔ جس طرح پانی دلدل میں ہوتا ہے پہاڑوں کی بلندی اور غاروں کی پستی تاؤ ہی کے دم سے قائم ہے جانوروں کا چلنا پرندوں کا اڑنا، چاند اور سورج کی روشنی، ستاروں کی گردش سب اسی کے فیض کے کرشمے ہیں۔ بہار کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہی چلاتا ہے اور برسات کی سہانی بارش وہی برساتا ہے۔ پرندوں کے انڈے وہی دلاتا ہے اور ان انڈوں سے بچے وہی نکالتا ہے۔ جب درختوں سے پتیاں نکلتی ہیں۔ انڈوں سے بچے اور عورتوں کے رحم سے بچے پیدا ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب کام اپنے آپ ہو رہے ہیں کیونکہ کرنے والے کا ہاتھ ہمیں نظر نہیں آتا۔ تاؤ دھندلے سے سائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے جسم نہیں اس کے ذرائع غیر محدود اور پوشیدہ ہیں لیکن تمام چیزوں کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے اس سے کبھی کوئی بے کار اور غیر مفید کام نہیں ہوا۔"

لاؤزے کا نظریہ تاؤ بہت مبہم اور غیر فہم ہے وہ خود کہتا ہے کہ تاؤ کے متعلق معلومات حاصل کرنا یا اس تک پہنچنا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ جو لوگ تاؤ کے متعلق کچھ بتاتے ہیں وہ اس کی بابت کچھ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ اس کے متعلق گفتگو نہیں کرتے۔

تعلیمات:۔ تاؤ مذہب کی تعلیمات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ ہستی اعلیٰ کا تصور:۔ تاؤ کے ہستی اعلیٰ ہونے میں دو گروہوں کی مختلف آراء ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک تاؤ ہی ہستی اعلیٰ ہے لیکن دوسرے گروہ کے مطابق لاؤزے جس ہستی اعلیٰ کا عقیدہ رکھتا ہے اس کا تعلق تاؤ سے نہیں ہے اصل میں یہ غلط فہمی تاؤی ادب کے ایک لفظ "ا" سے پیدا ہوئی ہے جس کے معنی پیدا کرنے یا بدلنے کے ہیں لیکن اس کے معنی غلط طور پر خالق کے لیے جاتے ہیں چنانچہ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ اس سے مراد وہ ہستی ہے جو تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ ایسی ہستی کو اعلیٰ ہستی کہنا درست نہیں۔ چنانچہ تاؤی ادب میں تاؤ کو خدا کا حریف قرار دیا گیا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی ہستی اعلیٰ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ب۔ اخلاق:۔ تاؤ مذہب میں انسان کو کائنات کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے اس لیے تمام شعبہ حیات میں انسان بھی دوسری چیزوں کی طرح عالمگیر تاؤ کا مظہر ہے اس کا نظریہ انسان صرف علمی ہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد اخلاقیات پر قائم ہے۔ اور انھی اخلاقیات کے باعث انسان خود کو فطرت سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس طرح فطرت کے یہ قوانین جن کے سامنے وہ سر جھکا دیتا ہے، اس کے لیے عزت و احترام کا باعث بن جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ فطرت کے کسی کام میں قصداً ارادۃً کو دخل نہیں ہے۔ اس لیے انسان کے تمام اعمال بھی ارادے کے بغیر سرزد ہونے چاہئیں اور چونکہ فطرت میں انفعال ہے اس لیے منصوبہ بندی، تدابیر، جوڑ توڑ، دوا دوش، خواہش اور تمنا وغیرہ سب کی سب انسانی فطرت کے منافی ہیں۔ تاؤ مذہب میں وہ کام جو کسی سعی و ارادہ سے کیے جاتے ہیں۔ زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ اس لیے سخاوت، راست بازی اور حسن اطوار کے مقابلے میں رحم، میانہ روی اور پاک بازی کا شمار اخلاقیات میں ہوتا ہے۔

نیز زندگی چونکہ مسلسل جدوجہد کا نام ہے اس لیے اس سے بچنے کے لیے تاؤ مذہب کے پیروترک دنیا کر کے پہاڑوں میں پناہ لینے کو مستحسن خیال کرتے ہیں

Marfat.com

"تاؤمذہب کے اخلاق میں خواہشات اور جذبات پر قابو پانے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بقول لاؤزے جو دوسرے پر غالب آتا ہے وہ قوی ہے اور جو خود اپنے آپ پر غالب آجائے وہ قوی تر ہے۔
دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہ جائے۔ لالچ سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں اور حرص سے بڑھ کر کوئی وبال نہیں ہے۔
تاؤمذہب میں انسانوں کا قتل کرنا اور جنگ میں فتح پانا کوئی قابل فخر بات نہیں وہ قیدیوں کو سزا کے طور پر قتل کرنے کو بھی اچھا نہیں سمجھتا۔

ج۔ **نظریہ حیات بعد الموت**:۔ تاؤمت میں موت ایک اچھی اور خوشگوار چیز ہے یہ ایک لازمی امر ہے اور اس سے ڈرنا بیکار ہے۔ موت ایک خوشگوار تبدیلی کا نام ہے۔ موت ہر جاندار کی زندگی کا انجام ہے۔
موت اور زندگی میں وہی تعلق ہے جو آنے اور جانے میں ہے۔ چنانچہ اس دنیا سے چلے جانے کے معنی دوسری دنیا میں پیدا ہونے کے ہیں۔ انسان زندگی سے محبت کرکے ایک فریب میں مبتلا ہے۔ انسان موت کی ہولناکیوں سے واقف ہے لیکن موت کے بعد کی راحتوں سے ناواقف۔ انسان کی زندگی کا تابناک پہلو یہی ہے کہ موت ازل ہی سے تمام انسانوں کا نوشتہ تقدیر بنی ہوئی ہے۔
موت نیکوں کے لئے سکون اور بروں کے لئے پردہ ہے۔ مردے وہ ہیں جو اپنے گھروں کو پہنچ چکے ہیں اور زندہ بھٹکے پھرتے ہیں۔
مرنے کے بعد کی زندگی میں نیک لوگ نہایت ہی آرام کی زندگی بسر کریں گے اور بروں کو مزید برائی کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔

تاؤمت کی مقبولیت:۔ اگرچہ تاؤمت کی تعلیمات لوگوں کی فہم سے بالاتر تھیں لیکن اس کے بانی کے بعد چینیوں نے سحر و فسوں کو بھی مذہب میں داخل کر دیا تھا جس کے چینی عوام قدیم زمانہ سے دلدادہ تھے۔ دوسرے فطرت پرستی نے عوام کو اس مذہب کی طرف راغب کیا نیز ارواح خبیثہ کے عقیدے کی وجہ سے اس مذہب نے چینیوں میں خاص مقبولیت حاصل کر لی۔
اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب شہنشاہ سین نے کنفیوشش کے پیروؤں پر مظالم ڈھائے اور ان کی مذہبی کتابوں کو جلا ڈالا تو تاؤمت کو اس کی حمایت حاصل تھی کیونکہ وہ بھی ابدی زندگی کا خواہاں تھا۔ تاکہ چین پر ہمیشہ حکومت کر سکے۔ اس لئے شہنشاہ نے تاؤمت کو باقی رہنے دیا چنانچہ کنفیوشش مذہب کے عارضی طور ختم ہو جانے کے بعد اس مذہب کو ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔

تاؤمت اپنے بانی کے بعد:۔ تاؤمت ایک فلسفیانہ مذہب تھا عوام اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ لاؤزے کے بعد اسکے پیروؤں نے اس کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ تاؤمت کا مقابلہ چونکہ کنفیوشش مذہب سے تھا جو اس کے مقابلے میں عام فہم تعلیمات رکھتا تھا۔ اس لئے فلسفیانہ خیالات کی جگہ اد نٰی قسم کے نظریات کو دے دی گئی۔ لاؤزے کے خیالات کی تشریح عجیب و غریب طریقوں سے کی جانے لگی۔ لاؤزے کی تعلیم تھی کہ انسان فطرت کے منفعلانہ اتحاد کے ذریعہ غیر فانی بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس عقیدے نے عملی صورت اختیار کر لی اور تمام کوشش اب اس بات پر صرف ہونے لگی کہ کسی طرح حیات جاودانی کا نسخہ ہاتھ لگ جائے۔ چنانچہ لاؤزے کے انتقال سے تقریباً پانچ سو سال بعد جنگ تاؤلنگ نامی ایک شخص نے ایک ایسا شربت تیار کیا جس کے پیتے ہی انسان ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جاتا تھا۔ اس شخص نے عوام میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ لوگ اسے معبود کے طور پر پوجنے لگے۔
اس مذہب کی فلسفیانہ تعلیمات کی وجہ سے سحر و فسوں نے اس مذہب میں راہ پالی اور اس کا ایک اہم جزو بن گیا۔ لوگ ٹونوں اور ٹوٹکوں کے قائل ہو گئے۔ لوگوں کے عقائد اس قسم کے ہو گئے کہ اگر کوئی شخص خاص راکھ یا کوئی مقدس تحریر اپنے پاس رکھے تو اس پر کسی طرح کوئی آفت اثر نہیں کرتی۔ ان میں بہت سے دیوتا پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے چوہے سانپ اور نیولے کو بھی اپنا معبود بنا لیا۔ ارواح خبیثہ کا عقیدہ ان لوگوں میں عام ہو گیا یعنی یہ کہ ارواح خبیثہ انسان کے درپے آزار ہیں لاؤزے کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تعلیمات کے خلاف کام کرنے کو عین اتباع قرار دیا گیا۔ دنیا میں یہ واحد مذہب ہے جس میں اس کے پیروؤں نے اپنے بانی مذہب کی تعلیمات کو اس قدر متضاد معنی پہنائے جو کسی اور مذہب میں نہیں۔

بانی مذہب:۔ لاؤزے اس مذہب کا بانی تھا۔ اس کا اصل نام لی پیہ یانگ تھا۔ وہ کنفیوشس کا ہم عصر تھا۔ وہ ریاست سو میں ۶۰۴ ق م میں ایک غریب چینی گھرانے میں پیدا ہوا۔ کم سنی ہی میں اس نے شاہی کتب خانے کے محافظ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ یہاں اسے مطالعہ کتب کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ اس نے جب اپنی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا شروع کیا اور ان کی تبلیغ شروع کی تو لوگ اسے لاؤزے کے نام سے پکارنے لگے جس کے معنی بوڑھے فلسفی کے تھے۔
سیاسی حالات کی وجہ سے وہ ملازمت ترک کر دینے پر مجبور ہو گیا بلکہ نوے سال کی عمر میں اسے وطن کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔
لاؤزے نے ایک کتاب جو پچیس صفحوں پر مشتمل تھی تاؤتہ کنگ کے نام لکھی تھی جو چین کی سرحد عبور کراتے ہوئے سرحد کے محافظ نے اس سے لے لی۔ سرحد عبور کرنے کے بعد وہ نامعلوم مقام پر چلا گیا اور اس کے بعد حالات کہ اس نے کہاں اور کس تاریخ کو وفات پائی کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکے۔
لاؤزے کے نزدیک نیک شخص وہ ہے جو سب سے محبت کرے اور کسی سے بھی نفرت نہ کرے اسی وجہ سے اسے اپنے ہم عصر مفکر کنفیوشس سے اس بات میں اختلاف تھا کہ وہ بروں سے نفرت کرتا تھا۔ اور اس حق میں تھا کہ بروں کے ساتھ برا سلوک کرنا چاہیئے۔ جبکہ لاؤزے کا خیال تھا
"جو لوگ میرے ساتھ نیکی کرتے ہیں میں ان کے ساتھ نیک رہتا ہوں جو لوگ میرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتا ہوں اس طرح برے سے برا آدمی بھی درست ہو جاتا ہے اور جو لوگ میرے ساتھ خلوص سے پیش آتے ہیں میں ان کے ساتھ خلوص سے پیش آتا ہوں اور جو لوگ خلوص نہیں برتتے ہیں ان کے ساتھ بھی مخلصانہ رویہ رکھتا ہوں۔ اس طرح پوری دنیا مخلص بن جاتی ہے۔"

مذہبی کتاب:۔ جب لاؤزے نوے سال کی عمر میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر چینی سرحد پر پہنچا تو اس کے ایک قدردان افسر نے اسے اس وقت تک سرحد پار کرنے نہیں دی جب تک اس نے اپنی تعلیمات کا خلاصہ ایک کتاب کی شکل میں لکھ کر اس کے حوالے نہ کر دیا۔ لاؤزے نے اس کتاب کا نام "تاؤتہ کنگ" رکھا جس کے معنی عقل سکھانے والی کتاب کے تھے۔ یہ کتاب صرف پچیس صفحات پر مشتمل تھی

اسلامی [illegible]
Marfat.com

اس کتاب کا بڑا حصہ مختصر ہونے کی وجہ سے ناقابل فہم ہے صرف تھوڑا حصہ آسان اور عام فہم ہے۔

اس کتاب میں اس سے زیادہ تر اس بات پر زور دیا ہے کہ خوشحال زندگی بسر کرنے کا طریقہ تاؤ کی پیروی کرنے میں ہے۔

تاویل اصل کی طرف لوٹنا۔ اصطلاحاً حقیقی معانی کی طرف رجوع کرنا، توضیح کرنا یا تفسیر کرنا۔ گویا تفسیر اور تاویل ایک دوسرے کے مترادف ہیں ابتدائی زمانے میں اور تقریباً چوتھی صدی عیسوی تک تاویل کا لفظ تفسیر کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تفسیری ادب میں ہمیں ابن قتیبہ کی تفسیر تاویل مشکلات القرآن اور ماتریدی کی تفسیر تاویلات القرآن ملتی ہیں۔ ان کتابوں کے ناموں میں تاویل کا لفظ تفسیر کے معانی ہی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ایک جگہ آیات قرآنی کے حقیقی معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (۳: ۷)

ایک دوسری آیت تاویل کا لفظ کسی واقعے کی اصل حقیقت کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"اس نے کہا بس میرا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ اب میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہوں جن پر تم صبر نہ کر سکے۔ (۱۸: ۷۸)

ایک اور مقام پر یہ لفظ تعبیر رویا کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

"لوگوں نے کہا یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔ ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تعبیر بتاتا ہوں مجھے ذرا (قید خانے تک) بھیج دیجئے" (۱۲: ۴۴، ۴۵)

علماء تاویل اور تفسیر میں تھوڑا سا یہ فرق کرتے رہے کہ لفظ تفسیر کا استعمال مشکل الفاظ اور مفردات کے لئے اور تاویل کا لفظ جملوں اور معانی کی توضیح کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ فرق تمام علماء کے نزدیک نہیں تھا۔

بعد میں آنے والے فقہاء نے تاویل کے معنی کسی آیت یا حدیث کے ایسے معنی استنباط کرنا جو الفاظ کے ظاہری معنی سے مختلف ہوں کر دیئے۔ چنانچہ علماء کی عبارات میں اس قسم کی عبارت تصریح کے طور پر اکثر ملتی ہے۔ جیسے "یہ آیت یا حدیث اتنی صریح ہے کہ اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔"

چنانچہ کسی آیت یا حدیث کے ظاہری معنی اور اس کے تاویلی معنوں میں یہ فرق ہوا کہ تاویل کے لئے کسی دلیل یا قرینے کی ضرورت نہیں۔

بعد میں مسلمانوں میں ایسے فرقوں نے جنم لیا جنہوں نے تاویل کو اپنے ذاتی رجحانات و میلانات کے جواز کے لئے ایک آلہ کار بنا لیا یہاں تک کہ وہ قرآن مجید کی محض مجازی اور تمثیلی تفسیر تک کرنے لگے۔ اور انہوں نے ظاہری معنی اور روایتی تفاسیر کو اپنے لئے ناقابل قبول قرار دیا۔ یہ لوگ تاویل کے مفہوم اور استعمال میں حد سے تجاوز کر گئے اور آیات کی طرح طرح سے تاویلیں کرنے لگے۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن مجید کے ایک معنی ظاہری ہیں اور ایک باطنی معنی ہیں اور پھر اپنی آراء کو جو اسلام کے سراسر منافی تھیں اسلام پر چسپاں کرنے لگے

تاہرت الجزائر کا ایک قدیم شہر جو وہران کے موجودہ مرکز کی مشرقی سرحد پر واقع تھا ادریسی نے اس نام کے دو بڑے شہروں کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہرت قدیم، تاہرت جدید۔ تاہرت قدیم یہ شہر رومیوں کے دور کا ایک قدیم شہر تھا جو کسی مقامی خاندان کا صدر مقام تھا اور بزنطینی سلطنت کا باجگزار تھا۔ آج کل یہ مقام تجارت کا صدر مقام ہے۔ جو اپنے پرانے کھنڈرات پر تعمیر کیا گیا ہے۔

تاہرت جدید تیارت کے جنوب مغرب میں چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آج کل اس کی گذشتہ شان و شوکت کے چند آثار ملتے ہیں۔ یہ شہر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اباضی اماموں کا مرکز رہا۔ عبدالرحمان بن رستم نے قیروان سے فرار ہو کر اسی مقام پر پناہ لی تھی۔ اس نے ۱۴۴ھ/۷۶۱ء میں اس شہر کی بنیاد ڈالی۔ یہ شہر چونکہ ایسے مقام پر آباد تھا جہاں بدوی اور شہری آبادی کا اتصال تھا۔ چنانچہ یہ بہت جلد ایک تجارتی منڈی بن گیا۔ لوگ دور دور سے یہاں آ کر آباد ہونے لگے۔ انہوں نے مکانات اور بہترین بازار بنوائے۔ یہاں تک کہ لوگ اس شہر کو "العراق الصغیر" کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ نیز یہ شہر خوارج کی سلطنت کا پایۂ تخت تھا جس کی بنیاد مذہب پر تھی اور یہاں کے لوگوں کی زندگی سخت مجاہدانہ تھی۔

البکری نے اس شہر کے چار دروازوں اور قلعے کا ذکر کیا ہے۔ ۲۹۶ھ/۹۰۸ء میں ایک شیعہ داعی ابوعبیداللہ نے تاہرت کو فتح کر کے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا اس وقت سے بربروں کے عہد تک اس کی اہمیت کم رہی۔ موجودہ دور میں یہ ایک بار پھر تجارت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

تَبَالہ ایک قصبہ جو شمالی یمن کے مغرب میں مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں عسیر کے اندرونی علاقے میں واقع ہے۔ ادریسی کے قول کے مطابق یہ قصبہ مکہ معظمہ سے چار روز کی مسافت پر اور عکاظ کی منڈی سے تین دن کی مسافت پر اور ایک وادی کے نشیب میں آباد ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں پانی کی کثرت ہے۔ اس قصبے کی وجہ تسمیہ روایتوں میں یہ ہے کہ عمالقہ کی ایک عورت تبالہ سے یہ نام ماخوذ ہے۔ یہ قصبہ بہت قدیم ہے۔ اس جگہ کے لوگ زمانہ جاہلیت میں ایک پتھر کے بت کی پوجا کرتے تھے۔ آنحضورؐ نے جریر بن عبداللہ البجلیؓ کو وہاں بھیجا اور انہوں نے اس بتکدے کو مسمار کر کے باب مسجد تبالہ کی دہلیز بنا دیا۔

سرسبز و شاداب ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ اخضر کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ڈویبر کے مطابق تبالہ مقام حصین ہے جو کہ معظمہ کے زیر نگیں تھا۔ اور اس میں مستقل وسائل آب پاشی ہونے کی وجہ سے اناج کے کھیتوں اور کھجور کے درختوں کی بہتات تھی۔ اس کی زرخیزی کو بدویوں کے ہاتھوں کافی نقصان پہنچا۔ خلیفہ عبدالملک کی فوجوں نے جب اس علاقے پر قبضہ کیا تو اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی حجاج کو اس علاقے کا والی مقرر کیا گیا لیکن اس نے اس کی حقارت کے سبب اس میں داخل ہونا بھی مناسب نہ سمجھا اور باہر سے واپس لوٹ گیا۔

تبالہ ایک تجارتی مرکز تھا۔ تاریخ اسلام میں اس قصبے کی شہرت اس وجہ سے ہے کہ یہ ان شہروں میں ہے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔

Marfat.com

تبت چین کا ایک صوبہ اور سابق ملک اس کے جنوب میں آسام، بھوٹان، سکم اور نیپال مغرب میں کشمیر اور ہندوستان کے پنجاب کی ریاستیں ہماچل پردیش اتر پردیش۔ شمال میں سنکیانگ اور مشرق میں چین کے صوبے کانسیو اور سیچوان ہیں۔ لہاسا اس کا دارالحکومت ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۲۱۰۰۰ مربع کیلو میٹر اور ۱۹۵۳ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی ۱۲۷۳۰۰۰ تھی۔ اس کے بعد سے حکومت چین نے اپنے ملک کی آبادی کو کبھی سامنے نہیں آنے دیا۔

بقول یعقوبی ۹۹ھ/۷۱۷ء میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں الجراح بن عبداللہ الحکمی تبت کے وفد کی یہ درخواست والی خراسان کے پاس لے کر گیا کہ تبت میں ایک اسلامی مبلغ بھیجا جائے۔ چنانچہ سلیط بن عبداللہ کو مبلغ کی حیثیت سے تبت بھیجا گیا۔ بعد میں تبت کے بادشاہ نے خلیفہ المہدی کی اطاعت قبول کرلی۔ المامون کے عہد میں تبت کے بادشاہ نے اسلام قبول کرلیا۔ اور سونے کا ایک بت جس کی وہ پرستش کرتا تھا ثبوت کے طور پر خلیفہ کی خدمت میں بھیجا۔ مامون نے اس بت کو مکہ میں لوگوں کو دکھانے کے لیے بھیجا کہ تبت کے بادشاہ نے اسلام قبول کرلیا ہے۔

شمالی ہند اور وسط ایشیا پر نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں جب اسلام کو قطعی کامیابی حاصل ہو چکی تو اس کے بعد مسلمان بادشاہوں نے تبت پر حملہ کیا۔ اور نویں صدی ہجری کے اواخر میں بلور اور تبت کے وہ علاقے جو بدخشاں اور کشمیر کے درمیان ہیں کاشغر کے والی ابوبکر کے جرنیل میرولی نے مطیع کرلیے۔ اور جب ۱۵۱۴ء میں سعید خان نے ابوبکر کو شکست دے کر باہر کیا تو تبت (لداخ) کے قلعوں پر تبتیوں کا قبضہ ہوگیا۔ سعید خان کے عہد حکومت (۱۵۱۴ء تا ۱۵۳۳ء) میں تبت، لداخ اور ملحقہ علاقوں پر، ۱۵۱۷ء میں میر مزید نے حملہ کیا اور ۱۵۳۲ء میں خود خان نے حیدر مرزا کی معیت میں حملہ کیا۔ ۱۵۴۸ء میں حیدر مرزا نے شاہ کشمیر کی حیثیت سے لداخ اور بلتستان پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت بلتستان تبت میں شامل تھا۔ لیکن اس ملک میں اسلام کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ سولہویں صدی کے نصف تک تبت غزنی ب

تبت کے دارالحکومت لہاسا میں دلائی لاما کا محل

اسلام ایک سیاسی طاقت بن گیا تھا۔ خپلو کے حاکم علی میر شیر خان نے حارے بلتستان کو زیر کرکے وہاں سے بدھ مت کے آثار ختم کر دیئے۔ بعد میں اس نے لداخ کو بھی فتح کیا۔ اس نے اسکردو شہر بھی آباد کیا جو بلتستان کا دارالحکومت ہے۔

۱۶۸۲ء کے قریب وسطی تبت پر قلماق حکمران تھے۔ مشہور و معروف خواجہ آپاق اپنے خان اسمٰعیل سے ناراض ہو کر لہاسا چلے گئے۔ ان کی درخواست پر دلائی لامہ نے انہیں خان قلماق کے نام پروانہ راہداری دیا۔ بوشوکتو نے خوجہ کو ساتھ لیکر ایک فوج کے ساتھ کاشغر پر حملہ کردیا اور اسماعیل خان کو قید کرکے خوجہ کو بادشاہ بنا دیا۔

آخری چند صدیوں میں تبت کے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلق بہت کم رہا۔

۱۹۱۳ء میں جمہوریہ چین نے تبت کو چین کا ایک صوبہ ہو جانے کا اعلان کردیا۔

۱۹۵۱ء میں حکومت تبت کے نمائندوں اور چین کی کمیونسٹ پارٹی کے درمیان پیکنگ میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق کمیونسٹ حکام نے تبت میں پرانے نظام کو نہ بدلنے اور دلائی لامہ کے اختیارات اور اس کے امور کی حسب سابق عزت کرنے کا یقین دلایا۔ ۱۹۵۹ء میں دلائی لامہ کے ہندوستان میں جان بچا کر بھاگ آنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں یہ ایک خود مختار علاقہ بن گیا۔

تبریز ایران کی ولایت آذربائیجان کا ایک بڑا شہر جو اس کے زرخیز میدان کے مشرقی کونے میں واقع ہے۔

بقول ارمنی مورخ وردان اسکالی ارمنی خسرو (۲۱۷ء تا ۲۳۳ء) نے ساسانی بادشاہ اردشیر اول کے خلاف انتقامی جذبے کے ماتحت ایرانی علاقے میں اس شہر کی بنیاد رکھی ایک روایت کے مطابق ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے تبریز کو ۷۹۱ء میں بسایا۔ لیکن بلاذری اور ابن فقیہ کے نزدیک تبریز کی تعمیر جدید الرواد الازدی نے کرائی تھی اور اس کے بیٹوں اور بھائیوں نے شہر کے گرد دیوار بنوائی تھی۔

تبریز میں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں اور جن زلزلوں سے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچا وہ ۲۴۴ھ/۸۵۸ء، ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء میں آئے۔ ۲۴۴ھ/۸۵۸ء کے زلزلے سے یہ شہر بالکل تباہ و برباد ہوگیا۔ چنانچہ المتوکل کے دور میں ۲۴۴ھ/۸۶۱ء تک یہ شہر نئے سرے سے تعمیر ہوا۔ اس کے بعد یہ شہر مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتا رہا ۴۳۴ھ/۱۰۴۲ء میں تبریز ایک مرتبہ پھر زلزلے کے باعث تباہ و برباد ہوگیا۔ ۴۳۸ھ/۱۰۴۶ء میں ناصر خسرو نے تبریز میں سیف الدولہ ابو منصور وھسودان کو بادشاہ پایا۔

۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں ابو منصور وھسودان نے طغرل کی اطاعت قبول کرلی۔

المقدسی نے تبریز کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کا معاصر ابن حوقل ۳۶۷ھ/۹۷۷ء میں تبریز کو آذربائیجان کا سب سے زیادہ آباد شہر بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "خرید و فروخت بکثرت ہوتی تھی اور یہاں ارمنی پارچات بنانے کے کارخانے ہیں۔"

ابن مسکویہ نے بھی تبریز پر قلم اٹھایا ہے وہ لکھتا ہے۔ "تبریز ایک شاندار شہر ہے۔ اس کے گرد مضبوط فصیل ہے اور یہ باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے باشندے شجاع جنگجو اور امیر ہیں۔"

ناصر خسرو نے ۴۳۸ھ میں شہر کا کل رقبہ ۱۴۰۰ × ۱۴۰۰ قدم لکھا ہے۔ عہد سلاجقہ میں تبریز کا ذکر بہت کم سننے میں آیا ہے۔ سلطان برکیارق اور اس کے بھائی محمد کے مابین تنازعہ ہوا تو برکیارق تبریز کے جنوبی پہاڑی علاقے میں چلا گیا بعد میں صلح ہونے پر یہ شہر محمد کے حصے میں آیا۔ ۵۱۰ھ میں سلطان محمود نے تبریز میں خاصا وقت گذارا اس کی وفات

Marfat.com

کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین مسعود نے اس شہر پر قبضہ کر لیا لیکن داؤد بن محمد نے مسعود سے یہ شہر چھین لیا اور تبریز میں رہ کر ایک وسیع سلطنت پر حکمرانی کرتا رہا۔ ۶۱۰ھ میں مغلوں نے تبریز کا محاصرہ کر لیا۔ اور ایک کثیر رقم بطور فدیہ لے کر واپس جانے پر رضامند ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہر سال یہ روش اختیار کر لی۔ ۶۲۲ھ میں جلال الدین خوارزم شاہ تبریز میں داخل ہوا۔ اور چھ سال تک حکمرانی کرتا رہا۔

۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں ہلاکو خان بغداد کی فتح کے بعد آذربائیجان آیا اور مراغہ میں سکونت اختیار کی۔ ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء میں ہلاکو شمالی قفقاز میں برکای کی فوجوں سے شکست کھانے کے بعد تبریز واپس آیا۔ ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء میں ہلاکو نے تبریز کو ملک صدر الدین کی مستقل نظامت میں دے دیا۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۵ء میں اباقا کے دور حکومت میں تبریز کو پایۂ تخت قرار دیا گیا۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء میں جلائر (ایلخانی) خاندان تبریز پر عروج پذیر ہوا۔ ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں جب تیمور نے ایران پر پہلی مرتبہ حملہ کیا تو سلطانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ سمرقند واپس چلا گیا۔ اس کے سب سے بڑے دشمن توقتمش خان نے ۷۸۷ھ/۱۳۸۵ء میں ایک مہم آذربائیجان کے خلاف بھیجی تو حملہ آوروں نے تبریز پر قبضہ کر لیا لیکن سلطان احمد جلائر تبریز پر قابض ہوا ہی تھا کہ اسے تیمور نے ۷۸۸ھ/۱۳۸۶ء میں پھر نکال دیا اور تبریز کے باشندوں پر ایک تاوان لگایا۔ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں الوس ہلاگو کی ایالت کا پایۂ تخت تبریز کو قرار دیا گیا اور میران شاہ کو یہ ایالت تفویض کی گئی۔ میران شاہ کے بعد اس کے لڑکے مرزا عمر کو تخت ہلاگو کی ایالت تفویض ہوئی۔ ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء میں اوزون حسن نے تبریز کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے دور میں تبریز ایک بہترین شہر تھا یہاں خوب رونق تھی۔ تمام ملکوں کے سفراء یہاں آتے تھے۔ اوزون حسن کے بعد اس کا بیٹا یعقوب تبریز کا حاکم ہوا۔

۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں اسماعیل اوّل نے تبریز پر قبضہ کیا۔ یہ صفوی خاندان سے تھا۔ ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں جنگ چالدران کی وجہ سے عثمانیوں کے لیے تبریز کا راستہ کھل گیا چنانچہ لزون کی لڑائی کے بعد سلطان سلیم کا تبریز پر قبضہ ہو گیا۔ ترکوں نے بڑی نرم پالیسی اختیار کی انہوں نے صرف ان خزانوں پر قبضہ کیا جو ایرانی بادشاہوں نے جمع کر رکھے تھے۔ سلطان سلیم نے صرف ایک ہفتہ تبریز میں قیام کیا۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں مراد ثالث کا وزیر اعظم اور عثمان پاشا چالیس ہزار فوج لے کر تبریز پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے بڑھا چنانچہ ستمبر کے مہینے میں ترکوں کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ عثمان پاشا نے تبریز کی حفاظت کے لیے مربع شکل کا ایک قلعہ بنوایا۔ یہ قلعہ چھتیس روز میں تیار ہوا تھا عباس اوّل کے مرنے کے بعد ترکوں اور ایرانیوں میں باہمی کشمکش از سر نو شروع ہوئی یہاں تک کہ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں سلطان مراد رابع نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور تبریز پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ مراد رابع کے ہاتھوں سارا شہر تباہ و برباد ہو گیا تھا لیکن اس سلطان کے دور میں تبریز نے پہلے سے کہیں زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس زمانے میں تبریز کی آبادی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ تھی۔

بقول شاردان ۱۶۷۳ء میں جب شاہ سلیمان اوّل کا زمانہ تھا تبریز کی آبادی تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ تھی۔ پندرہ ہزار مکان تھے اور تقریباً اتنی ہی دکانیں۔ یہ واقعی ایک بہت بڑا اور اہم شہر ہے۔ اگرچہ ان معلومات میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس شہر کے بارے میں یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ اس وقت ایک خاص اہمیت کا حامل تھا ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں نادر شاہ تبریز میں داخل ہوا۔ نادر شاہ نے آذربائیجان کا صوبہ امیر ارسلان کے سپرد کر دیا تھا۔ نادر کی وفات کے بعد ابراہیم خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا لیکن جلد ہی نادر شاہ کے پوتے شاہرخ کے ہاتھوں مارا گیا۔

۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں زلزلے کی وجہ سے تبریز کو ایک بار پھر نقصان پہنچا۔ ۱۱۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں قاچار خاندان کے بانی آقا محمد نے آذربائیجان پر قبضہ کیا تو اس نے تبریز کو حسین خان دنبلی کی جاگیر میں شامل کر دیا۔

۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں عباس مرزا تبریز کا حاکم بنا اس کے وقت سے تبریز ولی عہد سلطنت ایران کی رسمی قیام گاہ کے طور پر رہا۔ انیسویں صدی کے آخر تک تبریز کے اندر کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۹ء تک اس شہر کی تاریخ بہت پر آشوب رہی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب رضا خان بطور ایک نئے گورنر جنرل کے تبریز آیا تو اس نے یہاں پھیلی ہوئی بد نظمی کو ختم کیا۔ یہی گورنر جنرل بعد میں ایران کا بادشاہ بنا تبریز کے قدیم ترین آثار قدیمہ مغل دور کی یادگاروں میں سے ہیں۔ یہ آثار ویران ہو چکے ہیں صرف نیلی مسجد کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔

تبریز کی آبادی ۱۹۷۴ء میں پانچ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب یہ شہر قالین، خشک پھلوں، روئی اور چمڑے کی تجارت کی وجہ سے مشہور ہے۔

تبریزی، جلال الدین بنگال کے ایک صوفی بزرگ ابوالقاسم کنیت تھی۔ ایرانی النسل تھے۔ تبریز میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں پرورش پائی۔ آپ نے پہلے شیخ ابوسعید تبریزی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ پھر ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور فیوض باطنی حاصل کیے۔

جلال الدین تبریزی ابتدا میں بڑے پرشکوہ بادشاہ تھے۔ اچانک عشق الٰہی سے آپ کا دل روشن ہوا اور بادشاہت اپنے بیٹے کے سپرد کر کے شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ شیخ کی عزت اس قدر کیا کرتے تھے کہ مکہ معظمہ کے سفر کے دوران میں شیخ کی سواری کے ساتھ سخت گرمی اور دھوپ میں پیدل چلے جاتے تھے اور پاس ادب کی خاطر اونٹ پر سوار نہ ہوتے تھے ایک اور روایت میں ہے کہ سفر کے دوران میں آپ شیخ کے لیے انگیٹھی اور دیگچی لے کر چلتے تھے تاکہ جب شیخ کھانا طلب کریں تو گرم کھانا دے سکیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضری کے دوران ہی میں آپ کی ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہوئی۔ دونوں میں بہت زیادہ محبت تھی۔ جب بہاء الدین ملتان چلے گئے تو آپ ان سے جدا ہو کر دہلی تشریف لے آئے جہاں پر سلطان شمس الدین التمش نے آپ کا استقبال کیا اور آپ کی بڑی خاطر مدارت کی۔

اس کے بعد آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات کے لیے گئے بعد ازاں ایک واقعہ کے بعد آپ نے دہلی کو چھوڑ دیا اور بدایوں میں آ کر سکونت اختیار کر لی۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور ایک لمبے عرصے تک مقیم رہے آپ کے بہت سے فیوض و برکات سے اہل بدایوں مستفیض ہوئے۔ بدایوں میں آپ نے علی کو اپنا خلیفہ بنا کر ادھر کا رخ کیا۔ اور بہار سے ہوتے ہوئے بنگال پہنچے یہاں آپ نے پنڈوہ میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کی اس وقت گوڑ کے تخت پر لکشمن داس قابض تھا۔ آپ نے پنڈوہ میں ایک مسجد بنوائی، باغ لگوایا اور ایک خانقاہ قائم کی جس میں ہزاروں مسافروں اور غریبوں کو کھانا ملتا تھا۔ بنگال میں بہت سے مقامی یوگیوں نے آپ سے مناظرے کیے بعد میں یہ تمام یوگی اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے اور اسلام قبول کر لیا۔

Marfat.com

بنگال میں اتنا بانی جوق در جوق آپ کے ہاتھ پر حاضر ہو کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ جس وقت آپ پنڈوہ میں داخل ہوئے اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ کسی مسلمان کو وہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن آپ تن تنہا وہاں رہ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے صدیوں کا کفر گڑھ ایک انقلاب سے دوچار ہو گیا۔ لوگ آپ کی تعلیمات اور قوتِ روحانی سے متاثر ہو کر جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے پجاریوں کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ یہاں کا عظیم الشان بت خانہ آہستہ آہستہ اپنی شان کھو بیٹھا اور بالآخر مسمار کر دیا گیا۔ اس شہر میں جہاں پہلے مندر ہی مندر تھے اب ان کی جگہ مساجد نظر آنے لگیں۔ بنگال میں آج مسلمان کی جو کثرت نظر آتی ہے وہ سب آپ کی برکات اور فیوض کا نتیجہ ہے۔

آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے خزینۃ الاصفیاء کے مطابق آپ نے ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء میں وفات پائی۔ لیکن تذکرہ اولیائے ہند میں آپ کا سن وفات ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء ہے۔

آپ کی جائے وفات کے بارے میں سیر العارفین میں لکھا ہے کہ آپ کے جائے قیام کو دیوا محل کہتے ہیں جہاں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ آپ نے اس بت خانے کو توڑ کر وہاں تکیہ بنا دیا۔ آپ کا مقبرہ بھی یہیں ہے۔ آپ کی روحانیت اور شخصیت کا بنگال کے معاشرے پر بہت گہرا اثر پڑا۔ پنڈوہ میں بہت سی عمارتیں خانقاہ جلال تبریزی کے نام سے ہی مشہور ہوئیں۔ ماہ رجب میں ہر سال یکم سے بائیس تک آپ کا عرس ہوتا ہے۔

تبریزی، شمس الدین

تبریزی، شمس الدین:- ایک صوفی بزرگ۔ (دیکھئے شمس الدین تبریزی)

تبسہ

تبسہ الجزائر کا ایک شہر۔ یہ جبال مُعدّا سمر اور جبل دکان کے گنجان پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ پہاڑی ندیوں سے آب پاشی کی وجہ سے یہ غلے کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہے۔ شہر کے اردگرد باغوں کی بہتات ہے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے یہ شہر ایک تجارتی منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ شہر کے قرب وجوار میں نمک کی کانوں کی وجہ سے اس کی رونق اور بھی دوبالا ہو گئی ہے۔

۲۵ قبل مسیح میں آگسٹس نے اسے اپنی تیسری فوج کا صدر مقام بنایا تھا۔ اس زمانے میں رومی افریقہ میں قرطاجنہ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل تھی۔ بعض مصنفوں نے اس کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ بتائی ہے۔ اس کے بعد اس شہر کی حالت دن بدن گرنے لگی۔ بالآخر یہ بالکل زوال پذیر ہو گیا۔ چوتھی صدی عیسوی تک اس کی یہی حالت رہی۔ یہاں تک کہ پانچویں صدی میں بزنطینیوں کا اس پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ سلیمان کے عہد میں اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ ۵۹۷ء میں بربروں نے تبسہ پر قبضہ کر لیا۔ ۶۸۲ء میں یہ عربوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس شہر پر اغلبی، فاطمی، زیری اور موحدین مختلف ادوار میں حکمران کرتے رہے۔ بعد میں بنو حفص کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ اور صدیوں تک وہی اس پر حکمران کرتے رہے۔ سولہویں صدی میں ترکوں نے تبسہ کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ترکوں نے یہاں بلاد تونس کی سرحدوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک فوج تعینات کی۔ تبسہ میں مختلف قومیں آباد ہیں ان میں رومی اور بیکاریہ کے باشندوں کے کنبے بلاد تونس اور بلاد الجرید کے مہاجر اور قلعہ کے محافظ فوج کے سپاہیوں کی اولاد ہیں۔ جنہوں نے مقامی عورتوں سے جنم لیا ہے۔ آخری عنصر دوسروں پر غالب آ گیا ہے۔ انہوں نے آبادی کی اکثریت کو حنفی مسلک کا پیروکار بنا دیا ہے۔

جب فرانسیسیوں نے ۱۸۳۷ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو ترکی قلعہ گیر فوج نے تونس کی طرف راہ فرار اختیار کی اور شہر بالکل غیر محفوظ رہ گیا۔ اس صورت حال کے خاتمے کے لئے عمائدین شہر نے فرانسیسیوں سے مدد طلب کی۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں یہاں ایک مستقل فوج رہنے لگی اور اس طرح چھاؤنی کے قرب میں ایک یورپی نوآبادی معرض وجود میں آ گئی۔ یہاں کی آبادی کی اکثریت کاشت کاری کرتی ہے جس میں مقامی اور یورپی دونوں قومیں شامل ہیں۔

تبع تابعین

تبع تابعین تابعین کے بعد آنے والے علم حدیث کی اصطلاح میں تبع تابعین سے مراد وہ بزرگ ہیں جنہیں تابعین کا شرف زیارت نصیب ہوا ہو اور وہ خود بھی مومن ہوں اور اسلام ہی پر وفات پائی ہو اور ان کی صحبت سے متمتع ہوئے ہوں۔ بالفاظ دیگر تبع تابعین صحابہؓ کی تیسری کڑی ہیں۔ آنحضورؐ نے صحابہ تابعین اور تبع تابعین کو امت کے بہترین افراد قرار دیا ہے

تبلیغ

تبلیغ لغوی معنی انتہا یا آخری ٹھکانے تک پہنچانا ہیں۔ دینی اصطلاح میں اس کے معنی اللہ تعالےٰ کا پیغام دوسرے بندوں تک پہنچانا ہیں۔ قرآن مجید میں تبلیغ کے لئے ابلاغ کا لفظ بھی ہے۔ بقول پروفیسر آرنلڈ اسلام دراصل ایک تبلیغی مذہب ہے۔ جس نے اپنے آپ کو تبلیغ کی بنیادوں پر قائم کیا اسی کی قوت سے ترقی کی اور اسی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ تبلیغ غیر مسلم اور مسلم دونوں کو ہو سکتی ہے۔

چونکہ اسلام روحانی ہی نہیں بلکہ مادی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس لئے ہر عہد میں اسلام کی تبلیغ کی ضرورت رہی ہے اور آج کے زمانے میں تو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

تبلیغ اسلام کی ضرورت صرف اس لئے نہیں ہے کہ اس میں دنیا والوں کا فائدہ ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں ہر مسلمان کی بہتری اور فلاح ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"قسم ہے زمانے کی، یقیناً انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے نیک کام کئے۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔" (سورۃ العصر)

چنانچہ اگر نیکی کی تبلیغ رک جائے تو قوم گھاٹے میں رہتی ہے۔ نیکی محض ٹھہراؤ کا نہیں حرکت کا نام ہے۔ اگر اس میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا نہ کی جائے تو یہ سکڑتی ہے۔ اور جلد یا بدیر ختم ہو جاتی ہے۔

تبلیغ کے دو اجزا ہیں (۱) نیکی کی اشاعت (۲) برائی کا روکنا۔ تبلیغ کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے کچھ احکامات دیئے ہیں۔

"تم میں ایک جماعت تو ایسی ہونی ہی چاہیئے جو نیکی کی دعوت دے بھلائی کا حکم دے۔ اور برائی سے روکے اور وہی لوگ فلاح یاب ہیں۔" (۳:۱۱۴)

آنحضورؐ نے تبلیغ کی بہت تاکید فرمائی۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔

"مجھ سے پیغام سن کر آگے پہنچا دو چاہے یہ ایک آیت ہی ہو۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تمہیں اچھائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالےٰ تم پر عذاب بھیج دے۔

Marfat.com

پھر تم اسے پکارو گے اور تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔" (ترمذی)

قرآن مجید میں ایک مقام پر آتا ہے۔

"تم بہترین اچھی جماعت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔" (۳: ۱۱۰)

آنحضور کو ہر چیز سے زیادہ تبلیغ عزیز ہوتی تھی اور اسی کی خاطر آپ نے بڑے بڑے دکھ اٹھائے۔

تبلیغ کے دو طریقے ہیں۔ ۱۔ زبانی ہدایت۔ ۲۔ اخلاقی کشش۔

زبانی تبلیغ نہایت صبر و تحمل اور حسن کلام سے ہونی چاہیئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلا اور ان کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔" (۱۶: ۱۲۵)

یعنی انسان کسی کو تبلیغ کرے تو اسے نرم قول، دل سوزی، اخلاص، ہمدردی شفقت اور حسن اخلاق سے کام لینا چاہیئے۔

۲۔ اخلاقی کشش۔ اسی انسان کا کلام دوسرے کے دل پر اثر کرتا ہے جو اپنے کہنے پر عمل پیرا بھی ہو۔ مبلغ کا کلام ہزار شیریں ہو لیکن اس کا اخلاق دلآویز نہ ہو تو وہ اثر نہیں کرتا۔

جب ہم اشاعت اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند، ایران، عرب، مصر، افریقہ، چین، جزائر ملایا، ممالک تاتار اور ترکستان میں اسلام صرف تبلیغ ہی کی وجہ سے پھیلا۔ آج اسلام کی وہ فتوحات جنہیں شمشیری کہا جا سکتا ہے۔ دنیا سے مٹ گئی ہیں اسپین ختم ہو چکا صقلیہ مٹ گیا یونان تباہ ہو گیا۔ مگر وسط افریقہ، جاوا، سماٹرا اور جزائر ملایا اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی زندگی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے۔ یہ تبلیغ ہی کی وجہ تھی کہ جب ایک طرف بغداد میں قتل عام جاری تھا۔ تو دوسری طرف سماٹرا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ سے اسلام مٹایا جا رہا تھا لیکن دوسری طرف جاوا میں اس کا علم بلند ہو رہا تھا۔ ایک طرف تاتاری اس کو مٹا رہے تھے لیکن دوسری طرف خود ان کے دلوں کو اسلام فتح کر رہا تھا۔

تبنی گود لینا، متبنیٰ بنانا، لے پالک بنانا، کسی لڑکے یا لڑکی کو اپنی فرزندی میں لینا متبنیٰ بنانے کا رواج اکثر قوموں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے باوجود مسلمانوں میں کمال درجہ کی اخوت پیدا کرنے کے تعلقات نسبی میں اس تعلق کو حائل نہ ہونے دیا۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ جس بچے کو متبنیٰ بنا لیتے۔ وہ بالکل ان کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا اور لوگ اسے اسکے حقیقی باپ کے نام سے بھی نہیں پکارتے تھے۔ اسے وراثت میں بھی حقدار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا جیسے حقیقی بہن کے ساتھ اس کے مر جانے کے بعد یا اپنی بیوی کو طلاق دے دینے کے بعد منہ بولے باپ کے لئے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ رسم اسلامی قوانین وراثت اور نکاح و طلاق سے ٹکراتی تھی۔

قرآن مجید میں تبنی کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"اور نہ اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے.... منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک منصفانہ بات ہے۔" (۳۳: ۴، ۵)

"اور پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا۔ تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے۔ جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔" (۳۳: ۳۷)

"(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔" (۳۳: ۴۰)

اسلام تبنی کے بارے میں جو ہدایات دیتا ہے وہ یہ ہیں ایک تو منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے منہ بولے باپ کی وراثت میں سے حقیقی اولاد کے طور پر حصہ نہیں پا سکتے زیادہ سے زیادہ انہیں حق وصیت میں سے حصہ مل سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر منہ بولا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دے دے یا اس کے مر جانے کے بعد وہ بیوہ ہو جائے تو منہ بولا باپ اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اور اس طرح منہ بولے باپ کی حقیقی بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسے بیٹے کا نکاح ہو سکتا ہے۔

اسلام میں کسی کو متبنیٰ بنانا منع نہیں ہے۔ حضرت زیدؓ آنحضورؐ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ اسلام نے صرف متبنیٰ کے حقوق کے بارے میں چند حدود متعین کر دی ہیں۔ تاکہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو سکے۔

تبو ایک قوم جو صحرائے اعظم کے شرقی حصے میں آباد ہے۔ یہ لوگ بہت وسیع علاقے میں آباد ہیں۔ جس کے مشرق میں صحرائے لیبیا، مغرب میں ہجر (ان دونوں کے درمیان یہ علاقہ واقع ہے۔) شمال میں فزان کا علاقہ اور جنوب میں چاڈ ہے۔ تبو کی بہت بڑی تعداد فزان کے علاقہ قطرون اور الکفرہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تبیستی، برکو، بورڈو اور واڈائی کے شمالی حصے اور بحر الغزال میں بھی یہ لوگ آباد ہیں۔ کانم اور کوار کے نخلستان میں ان لوگوں کی اکثریت ملتی ہے۔ یورپین انہیں تو بو کہتے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے ان کے دو گروہ بالکل جدا پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر پست قد اور سانولے رنگ کے ہیں۔ ان میں کچھ بدوی ہیں اور کچھ شہری لیکن اکثر غریب اور بدحال ہیں۔ ان کی آمدنی کے ذرائع کھجور اور غلے کی کاشت ہے۔ جو اندی کی سیراب وادیوں میں کی جاتی ہے لیکن ان کا خاص پیشہ لوٹ مار ہے۔ جب کبھی انہیں موقع ملتا ہے یہ غارت گری سے نہیں چوکتے۔ یہ لوگ تھکان اور بھوک کی سختیوں کے عادی ہو گئے ہیں۔

یہ لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہیں اشراف اور عوام۔ تیدا میں یہ قبیلے یا تو مطلق الاختیار حاکم ہیں یا پھر محکوم۔ حاکم قبائل تیدا غزہ، گوندہ اور ترزبہ ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کے درمیان سوڈانیوں کی طرح حداد بالکل الگ طبقہ ہے۔ انہیں نچلی ذات کے انسان تصور کیا جاتا ہے اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

مذہب کے اعتبار سے یہ لوگ مسلمان ہیں لیکن مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مسلمان ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کیونکہ ان کی رسوم انتہائی غیر اسلامی ہیں تیبستی برکو اور بحر الغزال کے لوگ کٹر عقیدے والے ہیں۔ انہوں نے یورپی لوگوں کے داخلے اور اثر و نفوذ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔

ان لوگوں کو ایک زمانے تک بربر خیال کیا جاتا رہا ہے۔ بعد میں انہیں بربر دا خیال کیا جانے لگا۔ موجودہ زمانے میں انہیں سوڈان کے باشندے تسلیم کیا گیا ہے جہاں سے صحرا میں دھکیل دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے کانم کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

Marfat.com

نیسویں صدی کے نصف میں انہیں اولاد سلیمان اور طوارق کے متواتر حملوں سے اپنا بچاؤ کرنا پڑا۔ ان کے بارے میں سترہویں اور اٹھارویں صدی سے پہلے یقینی معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

تبوک ایک شہر جو درب الحج پر واقع ہے اور مدینہ کا ریلوے سٹیشن ہے۔ یاقوت کے قول کے مطابق یہ مدینہ منورہ سے بارہ دن کی مسافت پر ہے۔ یہ ریتلے میدان کی معمولی سی اونچائی پر واقع ہے۔ یہاں کی اہم ترین عمارت حاجیوں کا قلعہ ہے جو ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کی تعمیر کردہ ایک مسجد ہے۔

اس مسجد میں خوب صورت ترشے ہوئے پتھر لگائے گئے ہیں۔ آنحضورؐ کے زمانہ مبارک میں یہ علاقہ بلاد عرب کی شمالی سرحد کے خط پر واقع تھا اور اس کے دوسری طرف بزنطینی سلطنت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ ۹ھ میں جب آنحضورؐ نے شمالی علاقوں کے خلاف غزوہ شروع کیا تو یہ علاقہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہو گیا۔ آنحضورؐ جب مسلمانوں کا لشکر لے کر یہاں پہنچے تو رومی منتشر ہو گئے۔ تو آپؐ نے اس مہم کو ترک کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ آنحضورؐ نے اس علاقے میں تقریباً دس راتیں اور بقول ابن سعد بیس راتیں بسر کیں۔ اس عرصے میں یہاں کے لوگوں سے آپؐ کی بات چیت ہوئی۔ آپؐ نے انہیں دعوت اسلام دی اور وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

تبوک، غزوہ ایک غزوہ جس کی تیاری رجب ۹ھ/نومبر ۶۳۰ء میں کی گئی۔ اگرچہ سلطنت روم کے ساتھ مسلمانوں کی کش مکش کی ابتدا فتح مکہ سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ لیکن ۸ھ/۶۲۹ء میں جب موتہ کے مقام پر مسلمانوں کے تین ہزار مجاہدین شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرائے اور رومیوں کو شکست فاش دی تو دوسرے ہی سال قیصر روم نے غزوہ موتہ کی شکست کا داغ دھونے کے لئے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار بھی فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ آنحضورؐ نے دشمنان اسلام کی ان تیاریوں کو دیکھتے ہوئے بلا تامل قیصر روم کی عظیم الشان طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔

جن حالات میں اس غزوے کی تیاری کی گئی وہ بڑے دگرگوں تھے۔ ملک میں قحط سالی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ فصلیں پکنے کے قریب تھیں۔ سواریوں اور جنگی ساز و سامان کا بندوبست نہایت دشوار تھا۔ سرمائے کی بے حد کمی تھی۔ ان حالات میں جب کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک کے ساتھ مقابلہ درپیش تھا آنحضورؐ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ گھڑی دعوت حق کے لئے زندگی یا موت کے فیصلے کی گھڑی ہے، جنگ کی تیاری کا اعلان عام کر دیا۔ مسلمانوں کو پورا پورا احساس تھا کہ وہ جس تحریک کے لئے ۲۲ سال سے جدوجہد کر رہے ہیں اس کے لئے فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ چنانچہ اس احساس کے ساتھ مسلمانوں نے انتہائی جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سر و سامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ الغرض ۹ھ کو تیس ہزار مجاہدین کا ایک لشکر تیار ہو گیا۔ بہت سے مسلمان سواری کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ کیونکہ سواریوں کی کل تعداد دس ہزار تھی اور ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرمی کی شدت ایک علیحدہ مسئلہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے جس عزم اور ہمت کا ثبوت اس موقعہ پر دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب مسلمان تبوک کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ قیصر روم اور اس کے مددگاروں نے مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی فوجوں کو سرحدوں سے ہٹا لیا چنانچہ لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی۔ مسلمانوں کو اس موقع پر جو اخلاقی فتح حاصل ہوئی آنحضورؐ نے اسے اس مرحلے پر کافی سمجھا اور سرحد شام میں داخل ہونے کے بجائے آپ نے ۲۰ دن تبوک ہی میں قیام کر کے ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنت روم اور مسلمانوں کے علاقے کے درمیان واقع تھیں انہیں سلطنت اسلامی کا باجگزار اور تابع کر لیا اور اس طرح مملکت اسلامی کی حدود رومی سلطنت کی سرحد تک وسیع ہو گئیں اور جن عرب قبائل کو شہنشاہان روم عرب کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے۔ اب ان کا بیشتر حصہ مسلمانوں کا معاون بن گیا۔

تتش، تاج الدولہ (۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء - ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء) ملک شام کا ایک سلجوقی حکمران۔ الپ ارسلان کا بیٹا۔ جب اس کے بھائی ملک شاہ نے ۴۷۱ھ/۱۰۷۹ء میں اسے شام کی حکومت دے دی تو اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ حلب کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا محاصرہ کر لیا لیکن ناکام رہا۔ حلب سے واپسی کے بعد بزاعہ اور البیرہ وغیرہ کو جو اس کے اردگرد کے مالک تھے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ تتش کی غیر موجودگی میں حلبیوں نے مسلم بن قریش سے مدد مانگی جس نے مرداسیوں کے حکمران خاندان کو وہاں سے نکال کر ملک شاہ سے اپنی حکومت تسلیم کرا لی۔ لیکن تتش کو یہ بات ناگوار گذری۔ تتش کو اس دشمن سے اس وقت چھٹکارا حاصل ہوا جب وہ سلیمان کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اب تتش کا ایک اور حریف سلیمان رہ گیا تھا لیکن سلیمان ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں تتش کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ لیکن پھر بھی حلب اس کے قبضے میں نہ آسکا۔ کیونکہ ملک شاہ نے اپنے دوست آقسنقر کو دے دیا۔ چنانچہ تتش نے ان کے خلاف ہونے کی بجائے دوستی ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور انہوں نے متحد ہو کر ملک شام میں نمایاں کامیابیاں حاصل بھی کیں۔ ملک شاہ کی وفات کے بعد دونوں ترکی امیر تخت کے دعوے دار تتش کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں جب برکیارق اپنے باپ کے جانشین کے طور پر آگے آیا تو دونوں ترکی امیر اس کے ساتھ مل گئے۔ اور تتش کو اکیلا چھوڑ دیا۔ تتش نے امیروں سے اس بات کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ ادھر ان امیروں نے بھی اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ دونوں فوجوں میں تل السلطان کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ جس میں تتش ان پر غالب آگیا۔ اس نے دونوں امیروں کو قتل کروا دیا۔ برکیارق کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی۔ اس لئے وہ اصفہان کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں اسے سمجھایا گیا کہ اب دونوں دعویداران تخت کے درمیان صرف تلوار ہی فیصلہ کر سکتی ہے چنانچہ برکیارق کے تحت اردگرد کے علاقوں سے فوجیں اکٹھی ہونا شروع ہو گئیں اور دشلیو کے مقام پر دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ تتش کے سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ آخر اس لڑائی میں تتش داد شجاعت دیتا ہوا آقسنقر کے ایک سپاہی کے ہاتھوں مارا گیا۔

تثلیث عیسائیوں کا ایک عقیدہ۔ جس کے تحت روح القدس جبرائیل، خدا اور حضرت عیسیٰؑ یہ تینوں خدا ہیں لیکن انہیں نہ ایک خدا کہا جا سکتا ہے نہ تین خدا۔ یہ ایک میں تین ہیں اور تینوں میں ایک ہے۔

بقول ریورنڈ ٹھامس ولیم ناکس "عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک عجیب قسم کا مرکب

Marfat.com

ہے جس میں مذہبی خیالات تو بائیبل کے ہیں۔ لیکن ایک آزئی فلسفے کی صورتوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ اس عقیدے کا مواد یہودی ہے اور مسئلہ خالص یونانی اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ سراسر فلسفیانہ تھا یعنی ان تینوں اقانیم (باپ بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کس نوعیت کا ہے۔ چنانچہ ۳۲۵ء میں جب نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا تو بیٹے کی الوھیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔

قرآن مجید میں اس عقیدے کا ابطلان کیا گیا ہے۔

"اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی) پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ "تین" ہیں۔ باز آ جاؤ یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے وہ بالاتر ہے۔ اس بات سے کہ کوئی اس کا بیٹا ہے۔ (۴: ۱۷۱)

عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ عیسائیوں کے لئے یہ مسئلہ کہ عقیدہ توحید کے باوجود عقیدہ تثلیث کو اور عقیدہ تثلیث کے باوجود عقیدہ توحید کو کسطرح نبا ہیں، ایک ناقابل حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اس عقدے کو حل کرنے میں سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اس عقیدے کی مختلف تعبیرات پر بنے اور ایک گروہ نے دوسرے گروہ کی تکفیر کی۔ اللہ تعالےٰ نے اس مسئلے کا حل یہ بتایا ہے کہ وہ غلو سے باز آ جائیں۔ مسیح اور روح القدس کے بارے میں انہوں نے جو غلو اختیار کیا ہے ان کی الوہیت کا تخیل چھوڑ دیں اور صرف اللہ کو واحد الٰہ تسلیم کر لیں۔

قرآن میں ایک اور جگہ اس عقیدے کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

"یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے۔ حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اسے دردناک سزا دی جائے گی (۵: ۷۳)

تجارت سوداگری۔ بیوپار۔ اسلام میں ایک معزز ذریعہ حصول رزق ہے آنحضورؐ نے بذات خود تجارت کی ہے۔ عرب کی خوشحالی کا سارا دارومدار بھی تجارت ہی پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں ایک سورت میں عرب معاشرے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

"قریش کی حفاظت کی وجہ سے۔ ان کے جاڑے اور گرمی کے سفروں کی وجہ سے پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا۔ اور خوف سے امن دیا۔ (۱۰۶: ۱تا۴)

اس سورت میں قریش کے ان تجارتی سفروں کا ذکر ہے جو وہ گرمی اور سردی میں کیا کرتے تھے۔

اسلام کا منشا یہ ہے کہ تجارت پوری ایمانداری سے کی جائے اور اس میں دھوکے فریق کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ چنانچہ احادیث میں بھی آنحضورؐ نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"آنحضورؐ نے فرمایا نہایت سچا اور دیانت دار تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔" (مشکوٰۃ)

اس کے مقابلے میں بد دیانت تاجر کے بارے میں ارشاد ہے۔

"تاجر لوگوں کا حشر فاجروں کے ساتھ ہوگا۔ مگر جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی نیکی کی اور سچ بولا۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"سوداگر فاجر ہیں۔" اس پر کسی نے کہا یا رسول اللہؐ کیا اللہ تعالےٰ نے خرید و فروخت کو حلال نہیں کر دیا۔" آپؐ نے جواب دیا یقیناً۔ وہ بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں اور گناہ کرتے ہیں۔ (احمد)

"اگر کوئی شخص ناقص مال نقص ظاہر کئے بغیر فروخت کرے گا تو اللہ تعالےٰ اس سے ہمیشہ بیزار رہے گا۔ اور فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت بھیجیں گے۔" (ابن ماجہ)

تجارت میں اس بات کو بہت زیادہ مستحسن خیال کیا گیا ہے کہ تاجر کشادہ دل اور دل جوئی کرنے والا ہو۔ ناپ اور تول میں پورا اور تولنے میں (گاہک کو دیتے ہوئے) جھکتا تولے۔ (ابن ماجہ)

"کسب حلال جہاد ہے۔ اور اگر تم اسے اپنے بال بچوں اور قرابت داروں پر خرچ کرتے ہو تو یہ صدقہ ہے اور بے شک جائز تجارت سے کمایا ہو۔ ایک درہم ان دس درہموں سے افضل ہے جو دوسرے طریقوں سے کمائے گئے ہوں۔" (ابن ماجہ)

تجارت میں باہمی رضامندی ضروری ہے اور لینے والے یا دینے والے پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہونا چاہیئے۔

اسلام اس چیز کو بھی غلط کہتا ہے کہ تاجر اپنے مال تجارت کی عمدگی ظاہر کرنے کے لیے قسمیں کھائے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔

"قسموں کے ذریعے مال فروخت تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی برکت اٹھ جاتی ہے (بخاری باب ۲۶)

بعض چیزیں جن کا استعمال منع ہے یا جو نجس ہیں شریعت نے ان کی تجارت ممنوع قرار دی ہے۔ مثلاً شراب، سود، کتے اور بت وغیرہ کی تجارت۔

اسلام کے نزدیک کاروبار تجارت مذہب کے تابع فرمان ہے۔ اگر اسلام کے قوانین کے مطابق تجارت کی جائے تو وہ عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے صحابہ کرام اکثر تجارت کرتے تھے۔

تجانیہ صوفیا کا ایک سلسلہ جس کا بانی ابوالعباس احمد بن محمد التجانی تھا۔ اس سلسلے کا بانی احمد عین ماضی نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ والدین ایک بیماری سے وفات پا گئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ بعد میں فاس اور ابیض کا سفر بھی اسی مقصد کے لئے کیا اور وہاں پانچ سال تک علم کی تحصیل کی۔ بعد میں تلمسان، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور قاہرہ کا سفر بھی کیا۔ اس دوران میں وہ قادریہ طیبیہ اور خلوتیہ سلسلوں میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں اس نے محمود الکردی کے ایما پر ایک نیا سلسلہ قائم کیا۔ قاہرہ سے وہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں بوسمغون کے نخلستان میں آیا یہاں اس کے قول کے مطابق خواب میں آنحضورؐ نے اسے یہ نیا سلسلہ جاری رکھنے کا حکم فرمایا۔ یہاں سے احمد ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں فاس چلا گیا۔ یہیں اس نے ۱۲۳۰ھ

Marfat.com

۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔

تجانیہ کے پیروکاروں کو احباب کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی اور طریقے میں داخل نہیں ہوسکتے۔ اس سلسلے کے پیروکاروں کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کی جائے۔ ذکر کے ضمن میں یہ چند مخصوص کلمات کو مخصوص اوقات میں بار بار دہراتے ہیں۔

احمد کی وفات کے بعد اس کے پیروکاروں میں اختلافات بڑھ گئے۔ تماسین زاویہ کا شیخ علی بن عیسیٰ جسے احمد نے خود خلیفہ نامزد کیا تھا اس کے دونوں بیٹوں محمد اصغر اور محمد اکبر کو لے کر عین ماضی آگیا کیونکہ جس محل میں احمد رہتا تھا وہاں ایک نئے امیر یزید بن ابراہیم کا قبضہ ہوگیا تھا۔ سیدی علی بن عیسیٰ احمد کے بیٹوں کو عین ماضی میں چھوڑ کر خود تماسین چلا گیا۔ جب محمد کبیر ایک حملے میں مارا گیا تو اس نے محمد صغیر کو تجانیہ سلسلے کی اشاعت و تبلیغ کی ہدایت کی۔ اس کی تبلیغ اور اشاعت کے صلے میں یہ سلسلہ بہت پھیل گیا۔ اور اس کی دولت و طاقت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ لیکن اب انہوں نے فوجی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرانسیسیوں نے الجزائر پر حملہ کیا تو انہوں نے ان کے خلاف مقابلے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

۱۸۳۶ء میں امیر عبدالقادر نے جو فرانسیسیوں کو ملک سے باہر نکالنا چاہتا تھا تجانیہ سلسلے کے پیروکاروں کی امداد چاہی تو ان کے امیر نے جواب دے دیا کہ میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اور ذکر و فکر کی خاموش زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔

علی بن عیسیٰ نے جب ۱۸۴۴ء میں تماسین میں انتقال کیا تو اس کے بعد اس کا بیٹا باقی شیخ چنا گیا۔ اور اس کے انتقال پر علی کا پوتا محمد العید اس سلسلے کا شیخ بنا اس کے بعد اس کے دو بیٹے احمد اور البشر اس سلسلے کے شیخ بنے۔

اگرچہ اس سلسلے کی اشاعت مصر، عرب اور ایشیا کے دوسرے شہروں میں بھی ہوئی لیکن جو ترقی اسے فرانسیسی افریقہ میں نصیب ہوئی اور کسی جگہ پر نہیں ہوئی ایک مبلغ محمد الحافظ بن مختار نے اس سلسلے کی نشر و اشاعت نہایت کامیابی سے کی اس نے مراکش کے انتہائی جنوب کے اہل صحرا میں اس سلسلے کو روشناس کرایا اور ایک بڑی تعداد اس سلسلے میں داخل ہوئی۔ ایک اور مبلغ الحاج عمر نے فرانسیسی گنی میں اس سلسلے کی اشاعت کی۔ جہاں جہاں یہ سلسلہ موجود ہے وہاں وہاں اس نے قادریہ سلسلے کی جگہ لے لی ہے۔

تجانیہ سلسلے کے اعمال و اشغال کے سب سے اہم مجموعے کا نام "جواہر المعانی و بلوغ الامانی فی فیض الشیخ التجانی" ہے۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب مشہور بزرگوں کے تراجم کی معجم ہے۔ اس کا نام "کشف الحجاب" ہے۔

تجرّد تنہائی، علیحدگی، اصطلاح میں غیر ازدواجی زندگی بسر کرنا۔ ایسے شخص کو مجرد کہا جاتا ہے۔ جو شخص اہل و عیال کے حقوق ادا کر سکے اس کا نکاح نہ کرنا خلاف سنت ہے۔ تجرد کی زندگی گذارنا شہوانیات کو اپنے دل میں پالنا ہے جس سے بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

صوفیا کے نزدیک جو شخص مخلوق میں رہنا چاہے اس کے لئے نکاح کرنا لازمی ہے کیونکہ یہ جزو معاشرہ ہے اور جو شخص مخلوق سے علیحدہ رہنا چاہے اس کے لئے تجرد کی زندگی گذارنا بہتر ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا "چلو چلو! عبادت میں تیز گام ہو جاؤ۔ کیونکہ مجرد لوگ تم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔" (کشف المحجوب)

حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ "جب خدا کسی بندے سے بھلائی چاہتا ہے تو اسے اہل و عیال میں مشغول نہیں کرتا" ... بر جو دالے ہلاک اور برباد ہوتے ہیں۔

آنحضورؐ کے اس فرمان کے تحت "دو سو برس بعد زمانہ میں سب لوگوں سے بہتر وہ شخص ہوگا جو کم حال ہوگا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ کم حال کون ہوتا ہے آپؐ نے فرمایا جس کے اہل و عیال نہ ہوں۔" (کشف المحجوب)

چنانچہ مشائخ طریقت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مجرد و درویش سب پر فضیلت رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نفس کی آفات سے محفوظ رہیں۔ اور شہوانیات کے مرتکب نہ ہوں۔ جب عورتیں اس کے نزدیک بہت ہی محبوب ہوں اور جنس لطیف کا حسن و جمال اس کی طبیعت پر گہرا اثر کرے تو اس کے لئے تجرد کی زندگی گذارنے کی بجائے نکاح کر لینا اچھا ہے۔

بقول حضرت علی ہجویری "طریقت کی بنیاد مجرد رہنے پر رکھی گئی ہے نیز مجرد آدمی کے لئے یہ شرائط ہیں کہ آنکھ کو ناشائستہ امور کے دیکھنے سے روکے اور نہ سننے کے لائق باتوں کو نہ سنے اور نہ سوچنے کے قابل باتوں کو نہ سوچے اور شہوت کی آگ کو بھوک کے ذریعے سے بجھائے اور دل کو دنیا سے اور اس کے حوادث میں مشغول ہونے سے محفوظ رکھے اور اپنی خواہش نفس کو علم اور الہام نہ کہے اور شیطان کے شعبدہ کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت میں مقبول ہو۔

تجلّی تصوف کی اصطلاح۔ حق تعالیٰ کے انوار کا ذات حق کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے والے لوگوں کے دل میں ایسے طور سے اثر انداز ہونا کہ اس وجہ سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ دل سے حق تعالیٰ کو دیکھ سکیں۔ "کشف المحجوب" میں حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں۔ "اس دلی رویت حق اور عینی رویت حق کے درمیان یہ فرق ہے کہ دل میں جلوۂ حق پانے والا اگر چاہے تو حق کو دیکھ لیتا ہے۔ اگر نہ چاہے تو نہیں دیکھتا یا کبھی دیکھتا ہے اور کبھی نہیں دیکھتا۔ لیکن عینی رویت والے بہشت میں اگر حق کو نہ دیکھنا چاہیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ تجلی پر پردہ کا آنا جائز ہے لیکن رویت پر حجاب روا نہیں۔"

اس دنیا میں حق تعالیٰ کی عینی رویت ناممکن ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "اور جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جب تک کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں۔ پس تم کو ہولناک آواز نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے۔" (۲:۵۵)

چنانچہ جونہی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ان ستر آدمیوں کو جنہیں حضرت موسیٰؑ منتخب کر کے اپنے ساتھ اللہ کی تجلی دکھانے لے گئے تھے۔ اپنی تجلی دکھائی تو پہاڑ میں زلزلہ آگیا اور وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

تجوید تحسین یعنی آراستہ کرنا، درست کرنا۔ اصطلاح میں اس سے مراد فن قرأۃ ہے جس کے تحت حروف قرآن کریم کے صحیح مخرج کے مطابق پڑھا جاتا ہے اور حروف کے ادا کرنے میں آواز نہ زیادہ زوردار ہوتی ہے نہ کمزور اور نہ کوئی لغزش و غلطی ہوتی ہے۔

تجوید کی تین قسمیں ہیں۔ ترتیل، حدر اور تدویر۔ ترتیل سے مراد الفاظ کو آہستگی کے ساتھ ان کے مطالب پر غور و خوض کرتے ہوئے پڑھنا ہے۔

حدر سے مراد جلد اور تیز پڑھنا ہے۔

تدویر سے مراد اعتدال کے ساتھ پڑھنا ہے۔

تجوید سے سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے زبان لحن یعنی لغزش اور غلطی سے محفوظ رہے۔ فن تجوید کے تحت سب سے پہلے تمام حروف تہجی کے مخارج بتائے جاتے ہیں۔ یعنی کسی حرف کا صحیح مخرج کیا ہے۔ پھر حروف کو ان کے صحیح مخارج سے نکالنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اصول و قواعد یعنی وقف امالہ اور ادغام کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔

تجہیز و تکفین میت کی آخری رسوم۔ مختلف مذاہب میں کفن دفن کے مختلف طریقے ہیں۔ اسلامی روایات کے مطابق جب آدمی مر جائے تو اس کی آنکھیں بند کر کے عموماً ایک پٹی اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے سر کے اوپر باندھ دی جاتی ہے۔ تاکہ اس کا منہ کھلا نہ رہے اور مکھی وغیرہ اندر داخل نہ ہو۔ مرنے والے کے پیٹ پر بھی کچھ وزن رکھ دینا چاہیے تاکہ پیٹ پھول نہ جائے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ جامع ابوداؤد میں ہے جب حضرت طلحہؓ بیمار ہوئے تو آنحضورؐ عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا میرا خیال ہے طلحہؓ کی وفات کا وقت آ گیا ہے لہٰذا مجھے خبر کر دینا۔ ان کی تجہیز و تکفین میں جلدی کرنا کیونکہ مسلمان میت کو اس کے گھر والوں میں رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ (مشکوٰۃ) جب تک میت کو غسل نہ دیا جائے اس کے نزدیک قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔

میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے۔ جب میت کو غسل دینے کے لیے تخت پر لٹایا جاتا ہے تو اس سے پہلے تخت کو تین سے سات بار تک صندل یا لوبان کی دھونی دی جاتی ہے۔ میت کو اس طریقے سے تخت پر لٹایا جاتا ہے کہ اس کا رُخ قبلے کی طرف ہو۔ نیز غسل باپردہ جگہ پر دیا جاتا ہے تاکہ غسل دینے والے اور اس کام میں مدد دینے والوں کے علاوہ اور کوئی نہ دیکھے۔ غسل کا پانی اگر میسر ہو تو بیری کے پتے یا صابن یا سجی ڈال کر گرم کیا جاتا ہے۔ حضرت عطیہؓ سے روایت ہے۔ ہم آنحضورؐ کی بیٹی کو غسل دے رہے تھے کہ آنحضورؐ تشریف لائے اور فرمایا اس کو تین یا پانچ بار اور اگر مناسب سمجھو تو اس سے زیادہ بار غسل دینا اور بیری کے پتوں کے پانی سے غسل دینا۔ آخری بار پانی میں کافور ڈال دینا۔" (مشکوٰۃ) غسل دینے والے کو چاہیے کہ پہلے میت کے استنجے کی جگہ سے مٹی کی چھوٹی ڈلیوں سے نجاست صاف کرے۔ پھر کپڑے کی تھیلی ہاتھ میں پہن کر میت کا پانی سے استنجا کرے۔ اس تھیلی کو اتار پھینکے۔ پھر ہاتھ دھو کر اپنی انگلی پر کپڑا لپیٹ کر میت کے دانتوں اور ہونٹوں پر پھیرے پھر ناک کے نتھنوں میں پھیرے میت کے منہ اور ناک میں پانی نہ ڈالے۔ پھر باقی وضو کرا دے اور وضو سے پہلے میت کے پہنچوں تک ہاتھ نہ دھوئے۔ اگر سر اور ڈاڑھی کے بال ہوں تو صابن وغیرہ سے دھوئے۔ اس کے بعد میت کو بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں طرف تین مرتبہ پانی سر سے پاؤں تک ڈالے اور میت کا سارا جسم ہاتھ سے مل کر دھوئے صرف ستر کی جگہ کپڑے کی تھیلی پہن کر دھوئے۔ پھر میت کو دائیں کروٹ پر لٹا کر بائیں طرف سے تین مرتبہ پانی بہائے اور پہلے کی طرح اس کا بدن ہاتھ سے مل کر دھوئے۔ اس کے بعد میت کی پشت کو غسل دینے والا اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں یا سینے سے ٹیک لگا کر میت کو بٹھائے۔ اور میت کا آہستہ آہستہ پیٹ نیچے کو ملے اگر اس کے پیٹ میں سے کوئی گندگی نکلے تو اسے دھو ڈالے۔ دوبارہ وضو اور غسل کا اعادہ نہ کرے۔ پھر میت کو بائیں کروٹ لٹا کر داہنے طرف سے سر سے پاؤں تک تین مرتبہ پانی بہائے۔ یہ تیسرا غسل کہلاتا ہے۔ اس کے بعد میت کے بدن کو کپڑے سے پونچھ ڈالے اور اس کی ہتھیلیوں، تلوؤں، پیشانی، ناک اور دونوں گھٹنوں پر کافور لگائے۔ نیز ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں خوشبو عطر وغیرہ لگائے۔

میت کو کفن دینا فرض کفایہ ہے۔ سنت کے مطابق مردوں کے لیے کفن تین کپڑے ہیں۔ تہ بند، چادر اور قمیص۔ کفن کفایت دو کپڑے ہیں تہ بند اور چادر۔ کفن ضرورت ایک کپڑے پر اکتفا جائز ہے جو میت کے تمام جسم کو ڈھانک لے۔ عورت کے لیے پانچ کپڑے مستحب ہیں۔

کفن سفید اور سوتی کپڑے سے بنانا مستحب ہے۔

شہید کے لیے غسل اور کفن کی ضرورت نہیں ہوتی اور خون آلود کپڑوں ہی میں نماز جنازہ پڑھ کر تدفین کر دی جاتی ہے۔ اگر کپڑے جو اس کے بدن پر ہوتے ہیں کفن مسنون سے زیادہ ہوں۔ (یعنی مرد کے تین اور عورت کے پانچ) تو اتار لیے جاتے ہیں۔ اور اگر کم ہوں، تو انہیں سنت کے مطابق کر دیا جاتا ہے۔
(نیز دیکھیے "تدفین"، "جنازہ"، "کفن")

تجیب، بنو ایک خاندان جو فتح اندلس کے وقت ارغون میں آباد ہوا تھا۔ اس خاندان کے کئی افراد اندلس کے عہد اسلامی میں بہت مشہور ہوئے۔ اور انہوں نے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ یہ خاندان دو شاخوں میں بٹ گیا۔ بنو ہاشم جن کا مرکز سرقسطہ میں تھا اور بنو صمادح جو المریہ میں سکونت رکھتے تھے۔ اس خاندان کا سردار عبدالرحمان بن عبدالعزیز تجیبی جو امیر محمد اول کے عہد (۲۳۹ھ/۸۵۲ء تا ۲۷۳ھ/۸۸۶ء) میں تھا، بنو تجیب پر پورا پورا اقتدار رکھتا تھا۔ عبدالرحمان نے ارغون کے ایک خاندان بنو کسیٰ کے اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں بنو تجیب پہلے تو قرطبہ کے باجگزار بنے پھر سرقسطہ کے خود مختار حکمران بنو ہاشم کی اطاعت قبول کر لی۔ اور جب تک بنو ہاشم حکمران رہے بنو تجیب ان کے مطیع رہے۔

تجیب کی دوسری شاخ بنو صمادح کو عبدالرحمٰن نے پہلے ہی ارغون سے نکال دیا تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں ابوالاصبغ معن بنو صمادح کے سردار نے المریہ کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابویحییٰ محمد حکمران بنا اور ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء تک تقریباً پچاس سال حکمرانی کرتا رہا۔ اس کا دور حکومت نہایت شاندار تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا احمد معز الدولہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ لیکن وہ جلد ہی مرابطین سے شکست کھا گیا۔ بعد میں مرابطین نے اشبیلیہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ تو وہ بجایہ چلا گیا اور وہیں حالت گمنامی میں انتقال کر گیا۔

تحریر:- لکھائی۔ (دیکھیے "رسم الخط")

تحریف حروف بدلنا۔ تغیر و تبدل کرنا۔ اصطلاح میں تحریف سے مراد یہود و نصاریٰ کا اپنی الہامی کتابوں میں تغیر و تبدل کرنا ہے۔

تحریف دو قسم کی ہے۔ ۱۔ تحریف لفظی۔ ۲۔ تحریف معنوی۔

تحریف لفظی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو عبارت میں کی جائے اور تحریف معنوی یہ ہے کہ عبارت کے صحیح معنی تو کچھ اور ہوں لیکن ان کی جگہ اپنے مطلب کے معنی مراد لیے جائیں۔

Marfat.com

یہود و نصاریٰ نے اپنی الہامی کتابوں میں دونوں قسم کی تحریف کی ہے۔

قرآن مجید میں ان کی اس خرابی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

"پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خود سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی (۲:۷۵)"

یہاں تحریف سے مراد تحریف لفظی ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

"پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت لے لیں۔ پس ان کے لئے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا۔ اور ان کے لئے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں۔ (۲:۷۹)

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تورات و انجیل میں اہل کتاب نے دل کھول کر تحریف کی ہے۔ علمائے اسلام نے اس بارے میں بہت سے دلائل دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ اہل کتاب کی موجودہ کتب تحریف شدہ ہیں۔ اس بات کا اعتراف خود ان لوگوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ ایک مفسر پادری ڈملو نے جس نے بائبل کی انگریزی میں ایک تفسیر لکھی ہے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ موسیٰؑ کی کتابیں حضرت موسیٰؑ کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اصل تحریروں میں کمی بیشی کر کے بنا لی گئی ہیں۔ وہ لکھتا ہے :۔

"مگر غور سے تحقیق کرنے پر ماننا پڑتا ہے کہ کتب خمسہ میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس پرانے خیال سے کہ موجودہ صورت میں یہ موسیٰؑ کی کتابیں ہیں مطابقت نہیں کھاتیں۔" اپنے اس دعوے کی تائید میں اس مفسر بائبل نے کئی ایک مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ موسیٰؑ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں۔"

یہی مفسر اناجیل میں تحریف لفظی کا اقرار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"پچھلی صدیوں میں ہم مقدس الفاظ کی حفاظت میں اس احتیاط کا خیال نہیں پاتے جو عہد نامہ قدیم کے پہنچانے میں پایا جاتا ہے۔ ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض اوقات وہ الفاظ درج نہ کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونا چاہئیں تھے۔ وہ ایک ناقابل اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض اوقات اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس میں وہ خود ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالہ جات کے علاوہ قریباً چار ہزار نسخے عہد نامہ کے یونانی نسخے موجود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہے۔"

تحریم، سورۃ :۔ قرآن مجید کی ایک سورت (دیکھئے "التحریم، سورۃ")

تحفہ ایک شخص کا کسی دوسرے شخص کو محبت کے ساتھ کوئی چیز دینا۔ (دیکھئے۔ "ہدیہ")

تحکیم، معاہدہ ایک معاہدہ جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ہوا۔ جنگ صفین میں شامی لشکر کو جب اپنی شکست یقینی دکھائی دینے لگی تو حضرت امیر معاویہؓ پریشان ہوئے۔ عمروؓ بن العاص نے آپ سے کہا کہ لوگوں کو فوراً حکم دو کہ وہ نیزوں پر قرآن مجید بلند کریں اور بلند آواز سے نعرہ لگائیں کہ یہ کتاب ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے۔

چنانچہ جب شامی لشکر نے اس فرمان پر عمل کیا اور حضرت علیؓ کے لشکر نے قرآن کو نیزوں پر بلند دیکھا تو لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت علیؓ نے لوگوں کو سمجھایا کہ یہ صرف ایک چال ہے لیکن لشکر علیؓ کی اکثریت نے جس میں خوارج کی ایک بڑی تعداد شامل تھی تلواریں میان میں رکھ لیں اور مجبوراً حضرت علیؓ کو لڑائی بند کرنا پڑی۔ اشعثؓ بن قیس کو حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا گیا تاکہ قرآن کو نیزوں پر اٹھانے کی غرض معلوم ہو سکے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے انہیں بتایا کہ "ہم اور تم دونوں خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کریں ایک شخص کو تم اپنی طرف سے منتخب کرو اور ایک کو ہم اپنی طرف سے منتخب کرتے ہیں۔ ان دونوں سے حلف لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کریں گے اس کے بعد جو فیصلہ وہ دیں گے اس پر ہم اور تم دونوں راضی ہو جائیں۔"

چنانچہ حضرت علیؓ کے لشکر نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو اور حضرت امیر معاویہؓ کے لشکر نے عمروؓ بن العاص کو حکم تجویز کیا۔

عمروؓ بن العاص نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اقرار نامہ تحریر کرنے کے لئے کہا جو اسی وقت تحریر میں آیا۔ اس معاہدے کی رو سے (۱) دونوں ثالث کتاب و سنت کے مطابق جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کو منظور ہوگا۔ (۲) جب تک فیصلہ نہ ہو جنگ بند رہے گی۔ (۳) ثالث چھ ماہ کے اندر اندر فیصلہ سنا دیں گے۔ (۴) فیصلہ کسی ایسی جگہ پر سنایا جائے گا جو عراق اور شام کے درمیان ہو۔ اس معاہدے کو معاہدہ تحکیم کا نام دیا گیا۔

تحلی کسی اچھی قوم کے ساتھ صرف قول میں مشابہت پیدا کرنا لیکن عمل نہ کرنا۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔ "ایمان اچھی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے اور ان جیسے بننے کی آرزو کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ دل میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو یقین جم جائے اس یقین کی عمل کے ساتھ تصدیق کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔" گویا اپنے آپ کو کسی جماعت کے ساتھ اس کے حقیقی عمل کے بغیر اس کے مانند بنانا تحلی ہے (کشف المحجوب)

تختجی ایک فرقے کا نام جس کا رجحان زیادہ تر شیعہ مذہب کی طرف ہے۔ اس فرقے کا مرکز اناطولیہ ہے۔ مگر اس کے پیرو زیادہ تر ایشیائے کوچک کے مغربی حصے میں ملتے ہیں۔ ان کا پیشہ مویشی پالنا۔ زراعت کرنا، اور لکڑی کاٹنا ہے۔ تختجی کے لفظی معنی لکڑہارے کے ہیں۔ اور غالباً ان کا نام اسی پیشے کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے۔ اس فرقے کی ابتدا کب ہوئی اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے بارے میں جو کچھ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایرانی آباد کار ہیں۔ اور سولھویں صدی کے آخر میں ایران سے مغربی اناطولیہ میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے عقائد صفوی تھے۔

یہ لوگ شاہ اسماعیل کے زمانہ عروج سے پہلے ایشیائے کوچک میں کافی تعداد میں پھیل گئے تھے۔ اس زمانے میں صفویہ اور تختجی کے رسم و رواج اور عادات میں بہت حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔

ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ یہ لوگ شراب پیتے اور سور کا گوشت

Marfat.com

کھاتے ہیں۔ ان کی بعض رسوم اصطباغ جیسی رسوم کی یاد دلاتی ہیں۔ ایرانی اور عیسائی مہمانوں کی بہت زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ مگر ترکوں کے لیے اچھے جذبات نہیں رکھتے۔ ان کے نام عام طور پر علی اور اسماعیل کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سردیاں ساحل پر گذارتے ہیں اور گرمیوں میں اپنے مویشیوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔

یہ لوگ ترکی سلطنت کی حدود سے باہر ہیں۔ اور کچھ عرصہ پہلے تک انہیں پرانے دستور کے مطابق ایرانی سمجھا جاتا تھا۔

تخلّی تصوف کی اصطلاح' ان اعمال و اشغال سے اجتناب کرنا جو بندے کو اللہ تعالٰی کا قرب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ بقول حضرت داتا گنج بخش" ان مانعین قرب اللہ میں سے ایک دنیا ہے۔ دوسری مانع چیز عقبیٰ کی محبت تیسری چیز خواہش نفس کی پیروی اور چوتھی چیز خلقت کی صحبت ہے۔

تخلیق پیدا کرنا۔ تکوین عالم یعنی آسمان اور زمین اور مخلوقات کو پیدا کرنا۔ تخلیق کے بارے میں آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

سب سے پہلے اللہ تھا۔ اس سے پہلے کوئی شے نہ تھی۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور لوح محفوظ پر ہر چیز لکھی (بخاری)

انسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن میں کہا گیا ہے۔ "اور ہم نے انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سے۔ سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکی تھی۔ پیدا کیا۔ اور جنوں کو ہم نے تیز آگ سے پیدا کیا۔ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی، سیاہ متغیر کیچڑ سے پیدا کرنے والا ہوں اور جب میں اسے تکمیل کو پہنچا دوں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اسے سجدہ کرنا (۱۵: ۲۶ تا ۲۹)

قرآن مجید میں ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے۔

"انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ایک ست سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔ (۳۲: ۷، ۸)

ایک اور جگہ انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے۔

"ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔" (۲۲: ۵)

سورہ مومنوں میں ارشاد ہے۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ (۲۳: ۱۲، ۱۳)

تخلیق کائنات کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔

"خدا ہی تو ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں، سب کو چھ ایام میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا اور اس کے سوا تمہارا نہ کوئی دوست ہے، نہ سفارش کرنے والا، کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ وہی آسمان سے زمین تک ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ پھر وہ ایک روز جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار برس ہوگی، اس کی طرف صعود کرے گا۔ (السجدہ: ۴، ۵)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

"کہو! تم اس سے انکار کرتے ہو، جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اس کا مدمقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہان کا مالک ہے اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی۔ اور اس میں سامان معیشت مقرر کیا چار دن میں۔ طلب گاروں کے لیے مساوی پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں۔ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کا حکم بھیجا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے مزین کیا اور محفوظ رکھا۔ یہ زبردست علیم کے اندازے ہیں (حٰم السجدہ: ۹ تا ۱۲)

بقول سرسید یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تخلیق کائنات یونہی بس اچانک ہو گئی ہو اور اس میں کوئی قانون، ضابطہ، تنظیم یا اصول مقرر نہ ہو۔ جب کہ قرآن مجید میں بھی یہی ارشاد ہوا ہے:۔

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، ان کو کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (الدخان: ۳۸، ۳۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

"ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے، مبنی بر حکمت اور ایک وقت مقررہ تک کے لیے پیدا کیا ہے اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے، اس سے منہ موڑ لیتے ہیں" (الاحقاف: ۳)

یہود و نصاریٰ کے نزدیک تخلیق کائنات بس اچانک صرف سات دنوں میں ہو گئی ان کے نزدیک یہ زمینی دن تھے۔ عہد نامہ عتیق میں کتاب پیدائش میں ان سات دنوں کے احوال کچھ یوں بیان کیے گئے ہیں۔

"خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو پہلا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے درمیان فضا ہو تاکہ پانی پانی سے جدا ہو جائے۔ پس خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے جدا کیا اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے فضا کو آسمان کہا اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو دوسرا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں اور پھلدار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی میں بیج رکھیں اور پھل دار درختوں کو جن کے بیج ان کی جنس کے موافق ان میں ہیں، اگایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو تیسرا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیّر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں، زمانوں، دنوں اور برسوں کے امتیاز کے لیے ہوں اور وہ فلک پر انوار کے لیے ہوں کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور ایسا ہی ہوا۔ سو خدا نے دو

Marfat.com

بڑے نیّر بنائے۔ ایک نیّر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیّر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو فلک پر رکھا کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور دن پر اور رات پر حکم کریں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چوتھا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں کو کثرت سے پیدا کرے اور پرندے زمین کے اوپر فضا میں اڑیں اور خدا نے بڑے بڑے دریائی جانوروں کو اور ہر قسم کے جاندار کو جو پانی سے بکثرت پیدا ہوئے تھے۔ ان کی جنس کے مطابق اور ہر قسم کے پرندوں کو ان کی جنس کے موافق پیدا کیا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے ان کو یہ کہہ کر برکت دی کہ پھلو اور بڑھو اور ان سمندروں کے پانی کو بھر دو اور پرندے زمین پر بہت بڑھ جائیں اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو پانچواں دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ زمین جانداروں کو ان کی جنس کے موافق چوپائے اور رینگنے والے جاندار اور جنگلی جانور ان کی جنس کے موافق پیدا کرے اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے جنگلی جانوروں اور چوپایوں کو ان کی جنس کے موافق اور زمین کے رینگنے والے جانوروں کو ان کی جنس کے موافق بنایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں۔ اختیار رکھیں۔

اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری ان کو پیدا کیا اور خدا نے ان کو برکت دی اور کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو۔ اور سمندر کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں، اختیار رکھو۔ اور خدا نے کہا کہ دیکھو میں تمام روئے زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت، جس میں اس کا بیج دار پھل ہو، تم کو دیتا ہوں یہ تمہارے کھانے کو ہوں اور زمین کے کل جانوروں کے لیے اور ہوا کے کل پرندوں کے لیے اور ان سب کے لیے جو زمین پر رینگنے والے ہیں جن میں زندگی کا دم ہے کل ہری بوٹیاں کھانے کو دیتا ہوں۔ اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو چھٹا دن ہوا۔

سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا۔ ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا، ساتویں دن فارغ ہوا اور خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا۔ کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے، جسے اس نے پیدا کیا اور بنایا، فارغ ہوا۔

یہ ہے آسمان اور زمین کی پیدائش، جب وہ خلق ہوئے۔ جس دن خداوند خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا اور زمین پر اب تک کھیت کا کوئی پودا نہ تھا اور نہ میدان کی کوئی سبزی اب تک اگی تھی۔ کیونکہ خداوند خدا نے زمین پر پانی نہیں برسایا تھا اور نہ زمین جوتنے کو کوئی انسان تھا۔ بلکہ زمین سے کہر اٹھتی تھی اور تمام روئے زمین سیراب کرتی تھی اور خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ تو انسان جیتی جان ہوا۔ (باب اول، دوم)

عہد نامۂ عتیق کے اس بیان کو متضاد اور متناقض خیال کیا جاتا ہے اور اس میں بیان شدہ امور کو بعینہٖ تسلیم کر لینے میں تامل ہوتا ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید میں بھی اگرچہ تخلیق کائنات کی مدت چھ ایام قرار دی گئی ہے۔ لیکن ہر یوم کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ زمین کے ہزاروں سال کے برابر ہے۔ تاہم یہ ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں آتا کہ تخلیق کائنات کا عمل تفصیلی طور پر کیونکر ہوا۔ ابتدائے آفرینش اور ارتقائے نسل کے سائنسی نکات کیا تھے؟ ان کے بارے میں یہاں بحث نہیں کی گئی۔ بلکہ یہ امر انسان کے فکر و تعقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ وہ خود غور کرے۔ البتہ تخلیق کی چند معروف نشانیاں بتا کر مقصد تخلیق کی وضاحت کی گئی ہے اور وہ ہے خدا کی طرف پلٹنا، اس کا شکر ادا کرنا اور عبادت کرنا۔ تمام کائنات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ انسان وجود میں آسکے اور زندہ رہ سکے اور انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ رازہائے قدرت کا کھوج لگائے — کائنات پر تصرف کرے اور شان ربوبیت کی معرفت حاصل کر کے نیابت الٰہی کا فرض ادا کرے۔ یہی اس کی آزمائش ہے۔ اسلام نے اس کے حصول کے طریقے کا نام تقویٰ رکھا ہے۔ (نیز دیکھئے "آدم"، "ارتقاء"، "انسان"، "تقویٰ")

تدفین مُردوں کو دفن کرنا۔ مختلف مذاہب میں اس کے لیے مختلف طریق رائج ہیں۔ دنیا کے اکثر علاقوں کے لوگ اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں۔ قدیم مذاہب کے پیروکاروں میں سے اکثر اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کرنے کے ساتھ ان کی دل پسند چیزیں بھی رکھ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مُردوں کو ان اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائل آج بھی ان رسوم کو اپنائے ہوئے ہیں۔ قدیم مصر میں تدفین کے طریقے مختلف ادوار میں مختلف رہے ہیں۔ قدیم ترین رسم کے مطابق مُردے کو بائیں کروٹ لٹا کر اس کا منہ شمال یا جنوب کی طرف کر دیا جاتا تھا۔ بعض جگہوں پر نعشوں کو گلا سڑا کر ان کی ہڈیاں الگ الگ دفن کرنے کا رواج تھا۔ عام طور پر مصری قبرستان ریگستان کے سروں پر ہوتے تھے۔ بادشاہوں کی قبروں پر اہرام تعمیر کیے جاتے تھے۔ جن کے اندر منقش کمرے ہوتے تھے۔ عام طور پر انہیں تابوتوں میں بند کر کے دفن کیا جاتا تھا۔ یہی حال قدیم چینیوں کا تھا۔ وہ بھی اپنے مردوں کو دفن کرنے کے ساتھ استعمال کی چیزیں بھی رکھ دیتے تھے۔ دیگر اقوام کی طرح وادیٔ سندھ کی دراوڑی قوم بھی اپنے مُردوں کے ساتھ برتن، زیورات، آرائش کی چیزیں رکھ دیتی تھی۔

یہودیوں کے ہاں مُردے کے پاس لوگ دعائیں پڑھتے ہیں۔ پھر انہیں معمولی کپڑوں میں لپیٹ کر تابوت میں بند کر دیا جاتا ہے۔ تدفین کے بعد سات روز تک سوگ منایا جاتا ہے۔ عیسائی بھی کم و بیش تدفین کے یہی طریقے استعمال کرتے ہیں۔

اسلام میں میت کا دفن کرنا فرض کفایہ ہے۔ لحد قبر بنانا سنت ہے۔ اگر کہیں پر زمین نرم نہ ہو تو صندوقی قبر بنانا بھی درست ہے۔

"حضرت عروہؓ بن زبیرؓ سے روایت ہے مدینہ منورہ میں دو گورکن تھے ان میں ایک تو لحد قبر کھودا کرتا تھا اور دوسرا صندوقی۔ چنانچہ صحابہ نے فیصلہ کیا کہ جو شخص پہلے آجائے وہ اپنے مطابق قبر کھودے تو پہلے لحد قبر کھودنے والا آیا اور اس نے آنحضورؐ کی قبر کھودی۔" (مشکوٰۃ) ایک اور حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص مرض الموت میں کہنے لگے۔ میرے دفن کے لئے لحد قبر کھودنا اور اس پر کچی اینٹیں رکھ دینا جو آنحضورؐ کے لیے کیا گیا۔" (مشکوٰۃ)

Marfat.com

حضرت شاہ مدارؒ اور مداری

بزمِ عاشقانِ مدارِ اعظم کی طرف سے چند خطوط قسط نمبر ۸ کے مضمون "بدیع الزمان شاہ مدار" کے بارے میں ہمیں موصول ہوئے ہیں بزم کے صدر جناب پیرزادہ سید آلِ حسن قادری کا ارشاد ہے:

"آپ نے کروڑوں وابستگانِ سلسلہ شاہ مدارؒ کو بازی گر بنا دیا ہے جبکہ ایک گروہ بادن ڈاکوؤں کا تھا، جو حضرت شاہ مدارؒ کے اوصافِ حمیدہ سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اس کے بعض افراد بازی گر تھے لیکن ہزاروں کی تعداد میں جو لوگ عرب سے حضرت کے ہمراہ آئے تھے انہیں بھی آپ نے بازی گر بنا دیا ہے دوم آپ کا نسب نامہ مشکوک کیا گیا ہے۔"

جناب ڈاکٹر سید جنید امیاں طالب کا فرمان ہے "یہ مضمون ماضی کے کتب و تواریخ کے حقائق کے منافی تصور کرتا ہوں۔ نسب حضرت شاہ مدار کا حضرت امام جعفر بن صادق بن امام محمد باقر سے ہے جس میں کوئی تفریق نہیں۔ محمد طیفور شامی اور بایزید بسطامی ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ شام میں مزار شریف ہے اس لئے شامی مشہور ہوئے اور ابو بایزید بسطامی کنیت کے اعتبار سے کہلاتے۔ حضرت سید بدیع الدین احمد قطب المدار کے والد حضرت سید قطب الدین علی تھے جو شہر حلب قصبہ چنار میں قیام پذیر تھے اور بنی عباسیہ کے خلیفہ متوکل علی باللہ کی جانب سے شام کے قاضی القضاۃ تھے پیدائش کی تاریخ "صاحب عالم" ہے یکم شوال ۲۴۲ھ

انہوں نے سات سفر ہند کے کئے پہلا سفر ۲۶۲ھ میں کیا۔ راجا پیر اہل سامری اس موقع پر مشرف بہ اسلام ہوا اور ۳۰۴ھ میں بیت اللہ شریف آپ کے ہمراہ گیا۔ دوسرے سفر میں اجمیر کے جوگی ناتھ کے جادو کے چنے خود اور تمام مریدوں کو کھلاتے۔ جادوگر مع بادن گورت گوجروں کے مسلمان ہوا۔ اسی طرح راجہ جسونت سنگھ، راجہ زور آور سنگھ اور ڈاکوؤں کے کئی گروہ مشرف بہ اسلام ہوتے۔ ایک گروہ بادن ڈاکوؤں پر مشتمل تھا جو مشرف بہ اسلام ہو کر بازی گری پر اتر آیا وہ بادن گولی کے نام سے معروف ہے۔

اس کے علاوہ حضرت کے ہمراہ ہزاروں کی تعداد میں اہلِ سادات اور دیگر قبیلوں کے لوگ ہند آئے جن کی اولاد کروڑوں کی تعداد میں برصغیر کے گوشے گوشے میں پائی جاتی ہے جو خود کو حضرت شاہ مدار کا پیرو کہتی ہے۔ ہم آپ کو پانچ سو صدی ہجری کی تصنیف "حصول صمدیت" کا اردو ترجمہ اور مابعد کی کتب و تاریخ کی زیارت کرواتے ہیں۔"

جناب مبارک علی نے عرس قطب المدار کا ایک پوسٹر ارسال کیا ہے جس کی رو سے حضرت شاہ مدار کی تاریخ پیدائش یکم شوال ۲۴۲ھ اور تاریخ وفات ۱۷ جمادی الاول ۸۳۸ھ یعنی عمر ۵۹۶ سال ہے۔ وصال مکنپور میں ہوا تھا۔ جمادی الاول کا چاند اور مہینہ شاہ مدار کے چاند اور مہینہ کے نام سے مشہور ہے۔ جو لباس آپ نے پہنا کبھی میلا نہ ہوا، نہ پھٹا، نہ پرانا ہوا۔ دائم الصوم اور مجرد رہے۔ آپ کے جسم پر مکھی نہ بیٹھتی تھی اور ہنوز دربار کے اندر نہیں جاتی۔ مزار کے اندر قدرتی روشنی ہے چراغ کی حاجت نہیں۔ مزار کے گنبد کا سایہ نہیں آپ زندہ شاہ مدار کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ کیا وہ ۲۴۲ھ ہی میں پیدا ہوئے یا ۴۴۲ھ میں؟ یا ۷۱۵ھ میں؟ کیا واقعی اتنی لمبی عمر (۵۹۶ برس) پائی؟ کیا وہ خرق عادات جو ان سے منسوب ہیں صحیح ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تاریخ میں دو یا زیادہ شخصیتیں مدار کے نام سے گذری ہوں اور ان کے حالات آپس میں یوں گڈ مڈ کر دیئے گئے ہوں کہ وہ ایک ہی شخصیت بن کر رہ گئے؟ کیا حضرت ابوہریرہؓ کی اولاد میں سے کوئی اور قطب مدار تھے جو ۲۵۰ھ/۸۶۴ء میں حلب میں پیدا ہوئے؟ اور حضرت امام محمد باقر کی نسل سے کوئی اور شاہ مدار تھے جو ۴۴۲ھ/۱۰۵۱ء میں یا ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں پیدا ہوئے دائرۃ المعارف اسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی) کے مقالہ نگار نے اس آخری تاریخ کو صائب گردانا ہے۔

قارئین کرام! ہمارا مضمون اور حضرت شاہ مدار کے معتقدین کے خیالات اور مباحث آپ کے سامنے ہیں۔ اس علمی مباحثے کے لئے "اسلامی" کے صفحات حاضر ہیں۔ براہ کرم اپنی تحقیقات سے ہمیں سرفراز کرتے ہوئے ان امور پر روشنی ڈالئے کہ :-

۱- حضرت شاہ مدار کون تھے؟ ان کا نسب، تاریخ پیدائش، وفات اور حالاتِ زندگی کیا تھے؟

۲- مداری کا لقب کیونکر چلا اور کس شخصیت کیلئے پہلی بار استعمال ہوا؟

۳- عام شعبدہ باز کو مداری کیوں کہا جاتا ہے؟

۴- کیا یہ ایک ہی شخصیت کا نام ہے یا سلسلۂ مداریہ کے بہت سے بزرگوں کا مضمون واحد ہو گیا ہے؟

Marfat.com

حوالہ جاتی کتب شائع کرنے والا

پاکستان میں سب سے بڑا اشاعتی ادارہ

مکتبہ شاہکار

ہر ماہ تین انسائیکلوپیڈیا باقاعدگی سے پیش کر رہا ہے۔

بے بی انسائیکلوپیڈیا

پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کے طلبا کے لیے

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا

زندگی اور کائنات کے ہر موضوع پر، بچوں کے ذہن کے مطابق ردیف وار ترتیب میں

باتصویر۔ رنگین، آفسٹ طباعت۔ قسط وار

قیمت فی قسط: ۲/۵۰ روپے ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

ہر پاکستانی گھرانے کے لیے

ردیف وار ترتیب میں چار ہزار سے زائد عنوانات پر مختصر مگر جامع مضامین جن میں اسلامیات

کیا گیا ہے۔ ہر قسط میں تقریباً ایک سو مضامین۔ جا بجا تصاویر، نقشے اور خاکے

قیمت فی قسط: -/۳ روپے ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

انسائیکلوپیڈیا معلومات

اردو کا سب سے بڑا

۱۲۵ سے زائد قدیم و جدید علوم و فنون کی بنیادی معلومات، زندگی اور کائنات کے

معاشرتی، علمی و ادبی، مذہبی اور تمدنی حالات و کوائف، نقشے، اعداد و شمار

دو ہزار روپے کا انسائیکلوپیڈیا آسان قسطوں میں۔

قیمت فی قسط: -/۳ روپے ہر پہلی تاریخ کو شائع

Marfat.com

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط (۱۱) وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیرِ اعلیٰ : سید قاسم محمود
• مدیر : عطش درانی
• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۲
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبۂ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

شاہ مدارؒ ... پہلا زاویۂ نظر

قسط نمبر ۱۰ میں "مباحث" کے عنوان سے ہم نے "شاہ مدار اور مداری" کے موضوع پر جناب ڈاکٹر چند امیاں طالب اور ان کے چند ساتھیوں کے خطوط پر قارئین سے رائے مانگی تھی۔ تعجب ہے کہ سوائے جناب چند امیاں کے اور کسی قاری نے اب تک اس امر کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ انہوں نے جو خطوط اور لٹریچر ہمیں ارسال فرمایا ہے، اس کا لب لباب یہ ہے :-

• حضرت شاہ مدارؒ کے حالات مختلف کتابوں میں تقریباً ایک سے ملتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ماخذ کتاب "مدار اعظم" ہے۔ اس کے علاوہ رسالہ "الیاس"، "مرآۃ مداری"، "گلزار مدار"، "حی المدار"، "سفینۃ الاولیاء"، "حصول صمدیت"، "لطائف اشرفیہ" وغیرہ بھی اہم ہیں۔

• باون ڈاکوؤں کے گروہ میں سے صرف دو افراد نے بازی گری شروع کی اور بعد ازاں سبھی بازی گر بن گئے۔

• حضرت شاہ مدارؒ ایک ہی شخصیت کا نام ہے دوسری کسی شخصیت کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے : سید بدیع الدین احمد شاہ مدار بن قاضی قطب الدین علی بن بہاء الدین احمد بن ظہیر الدین احمد بن اسمٰعیل احمد بن اسمٰعیل بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر۔ ہندوستان میں شاہ مدار کی آمد کی تاریخ ۲۴۲ھ ہے جسے بعض لوگوں نے ان کی تاریخ پیدائش قرار دیا ہے۔

• شاہ مدار نے لمبی عمر پائی اور ایسا ہونا انہونا ممکن ہے۔ ایسی اور بھی کئی مثالیں کتابوں میں درج ہیں اور راقم نے خود بھی ایسی ایک مثال دیکھی ہے، انہوں نے ۱۵۰۰ء میں تین سو سال سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔

• شاہ مدار کو ایک لباس آنحضورؐ نے عطا فرمایا تھا جو کبھی میلا نہیں ہوا اسی طرح کبھی کھانے پینے کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۳ ربیع الثانی ۲۶۲ھ کو پیش آیا۔

• دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے عدمِ واقفیت اور سیاسی تخالف کی بنا پر ان تمام باتوں کو جھٹلایا ہے جبکہ مختلف شخصیتوں مثلاً میر جعفر علی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی، دارا شکوہ، ڈاکٹر ٹامس اور قاضی شہاب الدین وغیرہ نے ان واقعاتِ کبر سنی اور مافوق الفطرت کارناموں کا ذکر کیا اور تصدیق کی ہے۔

• دو سو سے زائد مقامات کے نام حضرت شاہ مدار سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت شاہ مدار بیک وقت کئی مقامات پر موجود تھے۔ مثلاً موجودہ ساہیوال دراصل شاہ وال تھا۔ کیونکہ اس کے چک نمبر ۹ میں حضرت شاہ مدارؒ نے قیام فرمایا تھا۔ یہاں اکبر بادشاہ نے ان کا دربار تعمیر کرایا تھا۔

جناب ڈاکٹر چند امیاں طالب کی نگارشات اور ہمارے سابقہ سوالات قارئین کے سامنے ہیں۔ ان کی تائید کرنے والوں کی کمی نہیں اور وہ بھی بے شمار ہیں جو ان سے حد درجہ اختلاف رکھتے ہیں۔ اس علمی تحقیقی مسئلے کے حل کے سلسلے میں قارئین سے مزید غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے۔ امید واثق ہے کہ گرما گرم مباحث کے بعد حقیقت سامنے آجائے گی۔

آپ کا : عطش درانی

تاریخ اشاعت : ۱۵ اگست ۱۹۷۶ء ناشر : سید قاسم محمود طابع : ریاض حسین، الجدہ پرنٹرز - لاہور

Marfat.com

قبر اتنی لمبی اور چوڑی ہونی چاہیے کہ میت کو اس میں سمانے کی تنگی نہ ہو۔ میت کو قبر میں جتنے بھی لوگ بخوبی اتار سکتے ہیں اتارتے ہیں۔ اس بارے میں کوئی خاص تعداد متعین نہیں ہے۔

آنحضورؐ کو چار اشخاص حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور ان کے دو لڑکوں بیٹوں فضیلؓ اور صہیبؓ نے قبر مبارک میں اتارا تھا۔

قبر میں اتارنے والے نیک، صالح اور قوی ہونے چاہئیں۔

عورتوں کو دفناتے وقت قبر پر پردہ کرنا مستحب ہے۔

میت کو قبر میں رکھتے ہوئے بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پڑھتے ہیں۔

میت کو قبر میں رکھنے کے بعد کفن کے بند حصن (گرہیں) کھول دی جاتی ہیں۔

میت کو قبر میں داہنی کروٹ پر قبلہ رخ لٹا کر مٹی یا ڈھیلے کا تکیہ لگانا فتاویٰ عالمگیری اور کشف الغطاء میں درج ہے۔

میت کو قبلے کی طرف سے قبر میں داخل کرنا مستحب ہے۔ اگر زمین بہت زیادہ نرم ہو یا ریتلی ہو اور قبر نہ بن سکے تو میت کو لوہے، لکڑی یا پتھر کے تابوت میں رکھ کر گاڑنا درست ہے۔ لیکن اس میں مٹی کا فرش بنانا اور اس کے اندر بھی مٹی لگا دینا سنت ہے۔ جب قبر کا منہ اینٹوں یا تختوں وغیرہ سے بند کر دیتے ہیں تو پھر قبر کے سرہانے تین لپ مٹی ڈالنا سنت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے ایک جنازے میں نماز پڑھی پھر اس کی قبر کے سرہانے آکر تین لپ مٹی ڈالی۔ (مشکوٰۃ) جب پہلی بار مٹی ڈالتے ہیں تو مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ پڑھتے ہیں دوسری مٹی ڈالتے ہوئے فِیْھَا نُعِیْدُکُمْ اور تیسری بار مِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی پڑھتے ہیں۔

دفن کرنے کے بعد قبر پر پانی چھڑکتے ہیں۔ اس کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے سرہانے سے پاؤں تک قبلے کی جانب تین بار چھڑکتے ہیں اور پھر اسی طریقے سے دوسری جانب۔ حدیث شریف حضرت جابرؓ سے روایت ہے آنحضورؐ کی قبر پہ پانی چھڑکا گیا پانی چھڑکنے والے بلالؓ تھے۔ انہوں نے سر کی طرف سے چھڑکنا شروع کیا۔ اور پاؤں تک لے گئے۔ (مشکوٰۃ) قبر سے نکلی ہوئی مٹی قبر پہ ڈالی جاتی ہے۔

قبر کو اونٹ کے کوہان کی شکل میں بنانا چاہیے۔ حضرت سفیان تمارؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضورؐ کی قبر مبارک اونٹ کے کوہان کی مانند دیکھی (مشکوٰۃ المصابیح) (نیز دیکھیے "تجہیز و تکفین"، "جنازہ"، "کفن")

تدلس (TEDELLES) ایک شہر جو الجزائر کے ساحل پر دریائے سباؤ کے دہانے سے مشرق میں چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

شہر دو حصوں میں منقسم ہے جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ ایک حصہ دیسی محلے پر مشتمل ہے۔ اس محلے کے بازار تنگ ہیں۔ دوسرا محلہ یورپی ... کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۱۷۵ فٹ کی بلندی پر ہے۔ بہتر انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس محلے کے نیچے بندرگاہ ہے جہاں جہاز بحفاظت لنگر انداز ہو سکتے ہیں اور گرد کا علاقہ باغات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور اس علاقے میں زراعت خوب ہوتی ہے۔

رومیوں کے دور میں اس جگہ پر شہر روسکوداآباد تھا۔ جس کے آثار حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ عرب فتوحات کے دوران میں یہ شہر تباہ ہوا۔ یہ ایک عرصے تک ویران و بے آباد پڑا رہا۔

بنو حماد نے بجایہ کو پایۂ تخت بنایا تو اس شہر نے اپنے محل وقوع کے لحاظ سے تجارتی اور فوجی اہمیت حاصل کر لی۔ بنو حماد کی طرف سے اس شہر میں ایک حاکم رہتا تھا اور شہر کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ ۴۹۶ھ/۱۱۰۲ء سلطان منصور نے المریہ کے ایک شہزادے کو جس نے افریقہ میں آکر پناہ لی تھی۔ اس شہر کا حاکم مقرر کیا۔

ادریسی نے شہر کے ایک بلند مقام پر واقع ہونے اور اس کے اردگرد ایک مضبوط فصیل کا ذکر کیا ہے۔

بنو حماد کے بعد اس شہر پر ۶۲۲ھ/۱۲۲۵ء میں موحدین کا قبضہ ہو گیا بعد میں موحدین، بنی زیان، بنی حفص اور بنی مرین اس شہر کے لیے جھگڑتے رہے اور آخر کار بنی مرین اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے۔ بعد میں جب الجزائر کے باشندوں نے ہسپانیہ کی اطاعت قبول کر لی تو تدلیس کے باشندوں نے بھی ہسپانیہ کا اقتدار قبول کر لیا۔ ۱۵۱۷ء میں (بابا) عروج نے اسے دوبارہ فتح کیا اور ترکوں نے یہاں ایک قلعہ بند فوج مقرر کی۔ اور اسے فوجی مرکز کی حیثیت دی اگرچہ سمندری راستوں کے ذریعے رسل و رسائل کا الجزائر سے سلسلہ برابر قائم رہا۔ ۱۸۴۴ء کو فرانسیسیوں کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ اس وقت یہ شہر ایک بے رونق قصبے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں یہاں پر ایک یورپی نو آبادی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۷۱ء کی شورش میں بربری قبائل نے خشکی کے راستے سے اس شہر کی ناکہ بندی کر دی۔ لیکن سمندر کے راستے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہنے کی وجہ سے شورش پسندوں کا شہر پر قبضہ نہ ہو سکا۔ یہ شہر بہت دور افتادہ مقام پر آباد ہے۔ رسل و رسائل کے ذرائع کی مشکلات کی وجہ سے یہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔

یہاں کی مجموعی آبادی چالیس ہزار ہے جس میں اکثریت دیسی باشندوں کی ہے۔ زبان عربی بولی جاتی ہے۔

تدلیس عیب کا چھپانا۔ اصطلاح حدیث میں حدیث کے کسی عیب کو چھپانا۔ اس کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ تدلیس فی الاسناد۔

۲۔ تدلیس فی المتن۔

۳۔ تدلیس فی الشیوخ۔

تدلیس فی الاسناد کی سات صورتیں ہیں۔

اوّل محدث اپنے شیخ کی سند سے ایک حدیث روایت کرے جس سے اس نے اور احادیث بھی روایت کی ہیں لیکن ایک مدلس حدیث اس نے براہ راست اپنے شیخ سے روایت نہیں کی بلکہ ایک ایسے شخص سے روایت کی ہے جس نے اس شیخ سے سنی تھی۔

دوم۔ راوی ان تمام رواۃ کے نام سلسلہ وار بیان کرتا ہے جس میں وہ حدیث اس تک پہنچی ہو لیکن اس سلسلۂ رواۃ میں ان راویوں کا نام حذف کر دے جن کے بارے میں ضعیف راوی ہونے کا امکان ہے۔

سوم۔ راوی ایک نام یا کئی نام اس شیخ کے نام کے ساتھ بیان کرے لیکن دراصل اس نے اس سے پہلے سے یہ حدیث نہیں سنی۔

Marfat.com

چہارم۔ راوی حدثنا کہہ کر کچھ دیر کے لئے وقفہ کرے اور اس کے بعد اس شخص کا نام بیان کرے جس سے اس نے وہ حدیث نہیں سنی۔

پنجم۔ ایک شخص کسی دوسرے کو روایت حدیث کی اجازت دے دیتا ہے گو یہ شخص اس شیخ کے زیر درس نہ رہا ہو۔

ششم:۔ راوی حدثنا یا اخبرنا کے بغیر اسناد بیان کر کے اس حدیث کو اپنے شیخ کے نام سے منسوب کر دیتا ہے۔ گو اس نے اپنے شیخ سے وہ حدیث نہیں سنی ہوتی۔

ہفتم:۔ راوی کسی مشہور و معروف مقام کا ذکر کرے لیکن اس کی اس سے وہ مراد نہ ہو بلکہ اسی نام کے کسی دوسرے مقام سے اس کی مراد ہو۔

۲۔ تدلیس فی المتن۔ راوی حدیث بیان کرتے ہوئے اس میں اپنی یا کسی دوسرے شخص کی عبارت شامل کر دیتا ہے۔ جس سے لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ وہ متن بھی اصل حدیث کا جزو ہے۔

۳۔ تدلیس فی الشیوخ یہ ہے کہ محدث روایت کرے کہ اس نے یہ حدیث فلاں شیخ سے سنی ہے لیکن شیخ کا عام مشہور نام نہ بتائے۔ اور اس کا غیر معروف لقب یا کنیت بیان کر دے اور یہ اس وجہ سے کرتا ہے کہ شاید اس کا شیخ ضعیف محدث ہو اور اس طرح وہ اس عیب کو چھپانا چاہتا ہے۔

سبط ابن العجمی نے لکھا ہے کہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء کے بعد تدلیس کا کوئی واقعہ شاذ ہی ہوا ہو۔

سب سے پہلے تدلیس کے موضوع پر ابو علی الحسن کرابیسی نے قلم اٹھایا تھا۔

تدمر پالمائرا یا پالمیرا۔ عراق کا ایک شہر جو دمشق سے شمال مشرقی جانب، ایک نخلستان میں واقع ہے۔ یہاں گرمی ناقابل برداشت حد تک پڑتی ہے۔ سردیوں میں بعض اوقات برف پڑتی ہے۔ یہ شہر بہت قدیم ہے۔ بارہویں صدی قبل مسیح کے کتبات سے اس کی قدامت کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعد میں اس کا نام سن عیسوی کے آغاز سے کچھ پہلے سامنے آتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ یہ شہر حضرت سلیمانؑ نے آباد کیا عربوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس شہر کے بنانے میں جنوں نے حضرت سلیمانؑ کی مدد کی اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ملکہ بلقیس نے حضرت سلیمانؑ سے تدمر میں ملاقات کی تھی اور وہیں دفن ہوئی۔

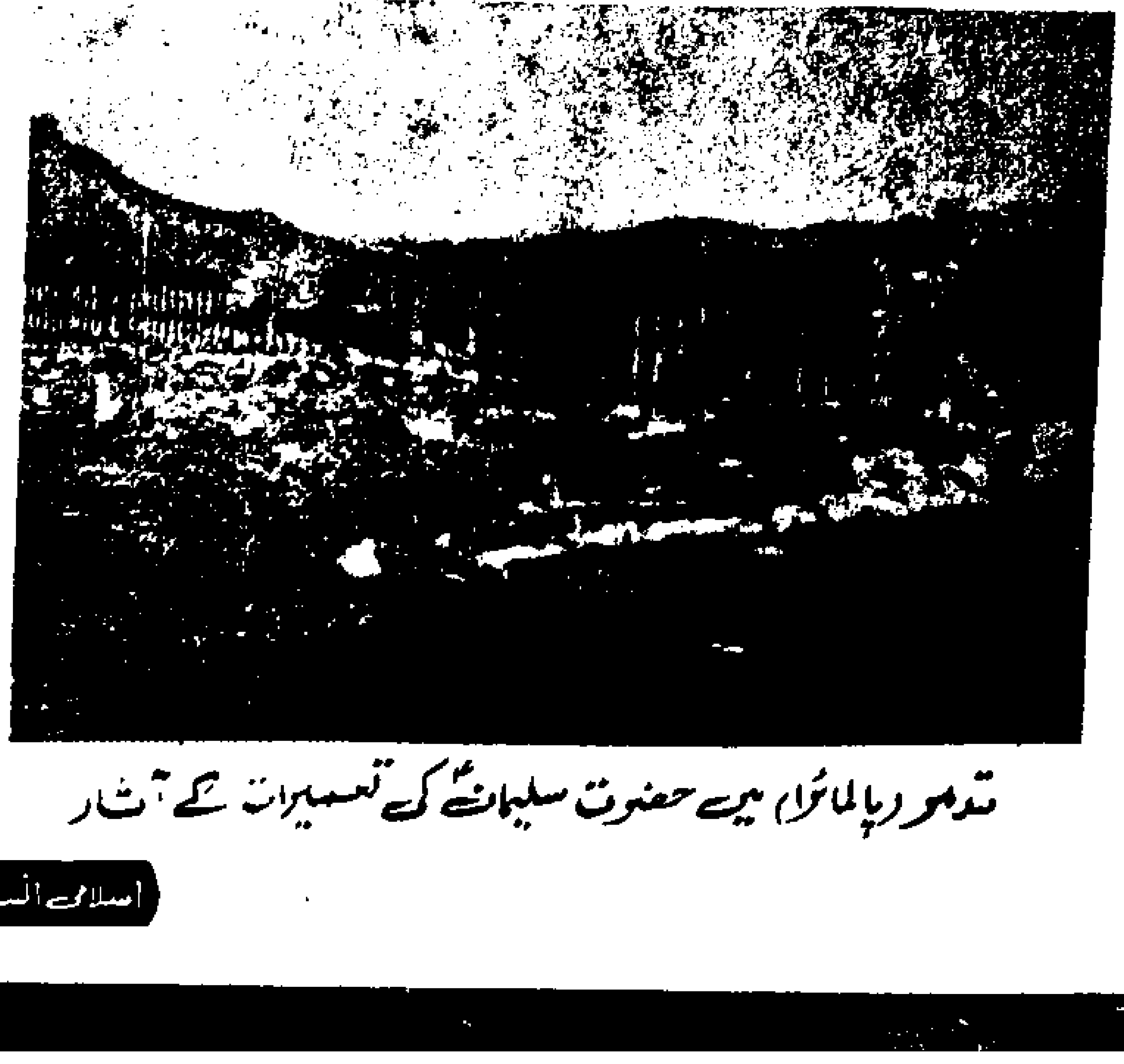

تدمر (پالمائرا) میں حضرت سلیمانؑ کی تعمیرات کے آثار

سلطنت روم میں شامل ہونے کے بعد یہ شہر ایک خاص اہمیت حاصل کر گیا اور تجارتی مرکز بن گیا۔

تیسری صدی عیسوی میں اہل تدمر ایک اور سلطنت کے بارے میں سوچنے لگے جس کا دارالحکومت تدمر ہو۔ چنانچہ یہاں کے حاکم نے اہل ایران کو اپنی خدمات پیش کیں جب انہوں نے اس کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا تو وہ روم کے ساتھ مل گیا اور ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ قیصر روم نے خوش ہو کر اسے روم کے تمام مشرقی مقبوضات عطا کر دیئے۔ ۲۶۶ء میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا وبالاتوس اس کا جانشین ہوا لیکن پورے اختیارات اس کی بیوہ زینوبیا کے ہاتھ میں تھے۔ کچھ عرصے بعد تدمر نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چنانچہ ۲۷۰ء میں ایک جنگ ہوئی اس میں زنوبیا نے شکست کھائی۔ لیکن جب اہل تدمر نے دوسری بغاوت کی تو اورلیان نے اس شہر کو پوری طرح مسمار کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس شہر کی ساری عظمت ختم ہو گئی۔ بعد میں اس کی شہر پناہ کو دوبارہ تعمیر کرایا گیا۔ اسی زمانے میں یہاں پر عیسائیت پھیلنے لگی۔

اس شہر کو مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں فتح کیا۔ پہلے تو یہاں کے باشندوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بعد میں انہوں نے اس شرط پر کہ انہیں ذمیوں کے حقوق دیئے جائیں ہتھیار ڈال دیئے۔ بعد میں یزید کے زمانے میں ان لوگوں نے بغاوت کر دی۔ تو یزید نے دمشق فتح کرنے کے بعد وحیہ کو انکے مقابلے کے لئے بھیجا۔ اور اس نے اس علاقے کو قطعی طور پر مطیع کر لیا۔ جب مروان ثانی خلیفہ بنا تو یہاں کے باشندے اس کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ چنانچہ مروان نے اس شہر پر فوج کشی کی اور فصیل کا ایک حصہ گرا دیا۔ یہاں تک کہ یہاں کے باشندوں نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ۱۰۸۹ء میں اس شہر میں ایک زلزلہ آیا جس نے اسے سخت نقصان پہنچایا الدمشقی نے اس شہر کے بے شمار کھنڈرات کے ساتھ ایک جامع مسجد کا بھی ذکر کیا ہے جس کی چھت پندرہ پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ جب ممالک مشرق میں ایک عظیم زوال آیا تو یہ شہر بھی اس زوال کا شکار ہو گیا۔ یہاں کے باشندے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے لگے۔ ۱۶۷۸ء میں حلب کے انگریزی کارخانے کے ارکان نے اس شہر کا دوبارہ پتہ لگایا۔ اب شہر پھر سے آباد ہو چکا ہے۔

تُدمیر اندلس کا ایک صوبہ جس کا مرکز بنی امیہ کے دور کے خاتمے تک مرسیہ تھا۔ (TODMIR) جب عربوں نے ہسپانیہ فتح کیا تو گورنر تھیوڈومیر مرسیہ میں شاہ طلیطلہ کا نمائندہ تھا۔ عرب مصنفین کے نزدیک تدمیر اسی گورنر کے نام کا معرب ہے۔ تھیوڈومیر اور موسیٰ بن امیر کے مابین معاہدہ ہوا تھا۔ عرب جغرافیہ دانوں نے تدمیر کو جیان اور البیرہ کے صوبوں کے ساتھ واقع بتایا ہے۔ اور اس صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں لورقہ، یولہ، لقنت، قرطاجنہ اور مرسیہ بتائے ہیں۔ تدمیر کی اسلامی تاریخ مرسیہ کے ساتھ ملتی ہے (نیز دیکھئے: مرسیہ)

تراویح وہ نماز جو رمضان کی راتوں میں عشاء کے بعد پڑھتے ہیں۔ آنحضورؐ تراویح کی رغبت دلایا کرتے تھے مسلم شریف کی ایک حدیث کے مطابق آپؐ نے فرمایا جو ایک پختہ ایمان و اعتقاد کیساتھ رمضان میں قیام کریگا اسکے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور اس کی ترغیب دلاتے ہوئے آپؐ کا وصال ہو گیا۔ (مسلم)
آنحضورؐ نماز تراویح کا بہت ثواب بیان فرماتے تھے لیکن اس کے ساتھ

Marfat.com

اس بات کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ تراویح فرض نہیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے:

"آپؐ نے مسجد میں بورے کا ایک حجرہ بنایا۔ وہاں کئی رات نماز پڑھی حتیٰ کہ لوگ جمع ہو گئے اور ایک رات آواز نہ آئی تو خیال ہوا کہ آپؐ سو گئے۔ بعض نے کھانسنا شروع کیا تاکہ آپ تشریف لے آئیں۔ تب آپؐ نے فرمایا۔ تمہارا شوق تراویح کے متعلق یہی رہنا چاہیے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ نماز فرض نہ ہو جائے اور اگر فرض کر دی جاتی تو تم نہ پڑھ سکتے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

حدیث میں ہے کہ لوگ مدینے کی مسجد میں فرداً فرداً یا گروہوں میں نماز تراویح ادا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے ایک قاری کی امامت میں باجماعت نماز تراویح کی ابتدا کی۔ (بخاری)

امام مالکؒ کے نزدیک تراویح کی چھتیس ۳۶ رکعتیں ہیں اور یہ نماز سنت نمازوں میں سے ہے۔

اہل حدیث نماز تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھتے ہیں جبکہ حنفی بیس رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اہل تشیع کے نزدیک رمضان کے مہینے میں ایک ہزار نفل رکعتیں پڑھنا مستحب ہیں۔ نماز تراویح بدعت نہیں ہے کیونکہ نماز تراویح کی اصل تہجد کی شکل میں شریعت میں موجود ہے اور آنحضورؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ رمضان میں نماز تہجد کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی اہمیت کی خاطر اسے اول شب میں کر دیا۔ تاکہ جو لوگ پچھلے وقت نماز کے لیے نہیں اٹھ سکتے وہ بالکل محروم نہ رہ جائیں۔ نیز اس کی ایک نظیر وتر نماز میں موجود ہے جو دراصل نماز تہجد ہی کا حصہ ہے مگر تمام لوگوں کی خاطر اسے اول شب میں رکھ دیا گیا۔ اس کا اول شب میں رکھنا خود آنحضورؐ کا عمل ہے۔

تراویح کی نماز میں لوگ رمضان کی راتوں میں ایک یا اس سے زیادہ بار قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہیں۔

زیادہ مصروف آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ نماز تراویح تھوڑے وقت میں ادا کرے۔

تراویح کا لفظ ترویحہ سے نکلا ہے جس کے معنی ایک دفعہ آرام لینا کے ہیں۔ نماز تراویح میں چونکہ چار رکعتوں کے بعد کچھ دیر کے لیے ٹھہرتے ہیں اور آرام لیتے ہیں اسی وجہ سے اسے تراویح کہا جاتا ہے۔

تربت جام ایران کے شمال مشرق میں ایک مقام جو خراسان کی ولایت میں ہے اور افغانستان کی سرحد کے قریب ہے۔ مشہد سے ۹۶ میل کے فاصلے پر ہری رود کی ایک معاون ندی کے کنارے واقع ہے۔

یہاں کے باشندے جامی کہلاتے ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں یہاں تقریباً چار ہزار کنبے آباد تھے۔ زراعت ان کا پیشہ تھا۔ بیٹ کے بقول یہ لوگ حاکم ضلع کے ماتحت تھے۔ یہاں ایک پرانے زمانے کا قلعہ بھی ہے۔ گاؤں کے مشرق میں شیخ الاسلام احمد جامی کا مقبرہ ہے۔ انہیں کے نام پر یہ مقام موسوم ہے اس مقبرے پر تیمور اور اس کے جانشینوں نے کئی مرتبہ حاضری دی۔

زمانہ وسطیٰ میں اس مقام کا نام بوزجان تھا۔ تاریخ میں اکثر علماء کی نسبت بوزجانی عام ہے۔ موجودہ دور میں تربت جام بخش تربت جام کا مرکز ہے اور بخش شہرستان مشہد میں شامل ہے۔

بمقول اصطخری اس شہر سے ۱۸۰ مواضعات متعلق تھے۔ اور یہ ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں آباد تھا۔

ترتیل قرآنی اصطلاح۔ جس کے معنی قراء کے نزدیک قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کے ہیں۔ اصطلاحات جرجانی میں ترتیل کے معنی مخارج حروف کی رعایت رکھنا اور وقوف و اوصال اور آیات و مد کی حفاظت کرنا ہیں۔ بعض کے نزدیک ترتیل آواز کو پست کر کے نرم اور لہجے میں خوش آوازی سے قرآن کا پڑھنا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر اس طرح سے آیا ہے۔

"اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔" (۷۳: ۴)

ترجمان ترک صوفیا کی ایک اصطلاح۔ ان صوفیاء کے ہاں ترجمان کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ کسی سلسلے کا کوئی رکن جو نئے مرید کو اپنے سلسلے میں داخل کرتے ہوئے اور اس کے اصولوں کی تفہیم کے وقت روحانی ترجمان کے طور پر اس کے ہمراہ رہتا ہے۔

بکتاشیہ سلسلے میں جب کوئی نیا مرید داخل ہوتا ہے تو اسے دو ترجمان شیخ کی خدمت میں لے جاتے ہیں ان کے ساتھ گیارہ افراد اور بھی ہوتے ہیں جو اماموں کے نمائندے کہلاتے ہیں۔ چنانچہ اس موقعہ پر دونوں ترجمان نئے آنے والے کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کی طرف سے وہ کلمات جو مرید کو اس موقع پر پڑھنے پڑتے ہیں۔ پڑھتے ہیں ان ترجمانوں اور بعض عمال کے فرائض تقریباً ملتے جلتے ہیں جنہیں یا ترجمان المقدم کہا جاتا ہے۔

ترجمان کا دوسرا مفہوم ان صوفیاء کے نزدیک وہ خاص دعائیں ہیں جو خاص موقعوں پر پڑھی جاتی ہیں۔ نیز بکتاشیوں کے خفیہ لفظ یا جملے کا نام بھی ترجمان ہے۔

ترک ایک قوم۔ جس کا ذکر سب سے پہلے چھٹی صدی عیسوی میں ایک خانہ بدوش کی حیثیت سے آتا ہے۔

اس قوم نے چھٹی صدی میلادی میں منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے بحیرۂ اسود تک ایک بدوی سلطنت قائم کی۔ اس کا بانی تومن تھا۔ اس کے بھائی استیمی نے مغرب میں فتوحات حاصل کیں چینی ان دونوں سلطنتوں کو شمالی ترکوں اور مغربی ترکوں کی سلطنتوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۶۰۰ء میں جب چینی خاندان سوئی برسر اقتدار آیا تو ان دونوں سلطنتوں میں اس خاندان کے زیر اثر تفرقہ پیدا ہو گیا۔ ۶۳۰ء میں شمالی ترک سلطنت اور ۶۵۹ء میں مغربی ترک سلطنت کو ایک بار پھر آزادی نصیب ہو گئی۔ اور ترکوں نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیا۔

چینی ترکوں کا تعلق ہونگ نو کی اولاد کے ساتھ جوڑتے ہیں جو ہن نژاد تھا بقول ٹامسن ترک نے کئی قوت والے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نام پہلے ایک قبیلے کا تھا۔ بلکہ ایک حکمران خاندان کا نام کہنا بہتر ہوگا۔ کتبوں میں بھی ترک میرے لوگوں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ترکوں کے ساتھ اغز یا تغزغز کا ذکر بھی اکثر ملتا ہے کبھی توان کی حیثیت ترکوں دونوں کے دشمنوں کی ملتی ہے اور کبھی ان کی حیثیت حامیوں کی ہوتی ہے۔

۷۴۵ء میں منگولیا کی حکومت اوغز کے ہاتھوں سے نکل کر ... پر ایغوروں کا قبضہ ہو گیا۔ ان کے قبیلوں کی تعداد نو تھی۔ چنانچہ کچھ اوغوز تو قدیم ... ایغور ...

Marfat.com

کے ماتحت رہ گئے۔ اور بعض مغرب اور جنوب کی سمت جا کر آباد ہو گئے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں ایک قبیلہ شاتو بھی شامل تھا جو ابتداً مغربی ترکوں میں سے تھا۔ یہ لوگ ساتویں صدی عیسوی میں برکول جھیل کے کنارے آباد تھے۔ ۸۰۸ء کے بعد جب تبتیوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا تو یہ لوگ چین میں چلے گئے۔ جہاں انہیں ہوانگ چاؤ کی بغاوت کو فرو کرنے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دسویں صدی میں ھونان کے صوبے میں ان ترکوں نے تین حکمران خاندانوں کی بنیاد ڈالی، جو تھوڑے عرصے تک قائم رہی۔ سغدیوں نے چینیوں اور ترکوں کے درمیان مذہب مانویت کی اشاعت کی۔

۸۴۰ء میں ان ادیغوروں نے جو منگولیا سے نکال دیئے گئے تھے دو نئی سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ ایک کانچو میں اور دوسری بیش بلق میں اس علاقے کو، جو اب چینی ترکستان کہلاتا ہے، ترکی تہذیب میں ڈھالنے والے سب سے پہلے اویغور ہی ہیں۔ عرب کاشغر اور ان سب ممالک کو جو اس کے مشرق میں واقع ہیں شروع سے خالص ترکی علاقے سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان دو ترکی سلطنتوں میں سے ۱۰۲۸ء میں کانچو پر قبیلہ تنگ کا قبضہ ہو گیا اور دوسری منگولوں کے عہد تک قائم رہی۔ اس سے پہلے قتائی خاندان کے حکمران اباؤکی نے قرغیزوں کو منگولیا سے نکال باہر کیا تھا یہ قرغیز ترکی النسل قوموں میں سے آخری تھے اور ان پر فتح پانی حقیقت میں منگولیا میں ترکی حکومت کے خاتمے کی علامت تھی۔

بزنطینی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۷۶ء میں ترکوں نے خاکنا ئے کریمیا کو فتح کر لیا تھا لیکن یہاں ان کی حکومت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور ۵۹۰ء کے قریب اس علاقے پر بزنطینی دوبارہ قابض ہو گئے۔

اس کے چند سال بعد ترکوں کی بزنطینیوں اور ایرانیوں سے جنگ چھڑ گئی جب ترکوں نے قوم الان کو فتح کر لیا تو ترکی سلطنت کی سرحدیں ساسانی سلطنت کی نہ صرف وسطی ایشیا میں بلکہ بحر خزر کے مغرب میں بھی آ ملیں۔ ترکوں نے ساتویں صدی میں بہت زیادہ قوت حاصل کر لی۔ چنانچہ ساسانیوں نے ترکوں کیخلاف دربند کی دیواریں تعمیر کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ترک ہمسایوں کیخلاف بحر خزر کے مشرقی علاقوں میں بھی مدافعتی قلعے تعمیر کئے۔ صوبہ جرجان کی محافظت کے واسطے سد آہنی بنائی۔ لیکن ان کے یہ اقدامات ترکوں کی پیش قدمی کو نہ روک سکے

۹۸ھ/۷۱۶ء میں عربوں اور ترکوں کے درمیان جنگ میں جرجان کے ترکوں کی قیادت دھستان کے صول نامی ایک دہقان نے کی تھی۔ ایک کتاب الاغانی کی رو سے رود گرگان کے ترکوں نے ایرانیوں کی زبان اور مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے غالباً چھٹی صدی عیسوی میں ساسانیوں ہی کے زمانے میں وہ اس علاقے کو فتح کر چکے ہوں گے۔ اسی ماخذ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔ آمو دریا کے جنوب میں جو جنگیں ہوئیں، ان میں ترک ہی غالب رہے لیکن کچھ عرصے بعد آخری ساسانی بادشاہ اور ان کے سرپرست ترکوں کو عربوں کے خلاف محاذ آرائی میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ عربوں کی طرف سے امن و آشتی کی سفارشیں ترکوں کے پاس بھیجی گئیں۔ خلیفہ ھشام نے ترکوں کے بادشاہ کو دعوت اسلام بھی دی تھی۔

اگرچہ ابتدائی ہجری صدیوں میں ترکی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی لڑائی کے علاوہ ان کے علاقے پر فوج کشی بھی کی گئی۔ لیکن مسلمانوں کی جنگی کامیابیوں کا ترکوں کے قبول اسلام پر بہت کم اثر پڑا۔ چنانچہ آنحضور ؐ نے حبشیوں کے بارے میں جو حکم دیا تھا "کہ جب تک وہ تم سے تعرض نہ کریں تو تم بھی ان سے تعرض نہ کرو" کا اطلاق ترکوں پر بھی کیا گیا۔

بالآخر چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ترکوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ ۳۸۲ھ/۹۹۲ء میں مسلمان ترک پہلی بار بخارا میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے اور اس سے بڑھ کر ایشیائے کوچک کی فتح تھی جو سلجوقی ترکوں کے ہاتھوں پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں انجام پائی۔

ترکوں کے علیحدہ علیحدہ قبائل کے نام اور ان کی عادات و اطوار کے بارے میں تفصیلی معلومات چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ملتی ہیں جو عرب جغرافیہ نویسوں کی کوششوں کی مرہون ہیں۔

الیزدیلی نے پانچ قبائل کا ذکر کیا ہے جو ایک ہی زبان بولتے تھے۔ تغزغز، خرخیز، کیماک، غزلیغی، اوغز اور خزلخ تھے۔ ان میں سے خرخیز دوسرے ترک قبائل کے مقابلے میں انتہائی شمال مشرق میں آباد تھے۔ اور اوغز اور قرلخ (قرلق) وسطی ایشیا میں بلاد اسلام کے نزدیکی ہمسائے تھے۔

محمود کاشغری نے کل قبیلوں کی تعداد بیس بتائی ہے، جو دس دس قبیلوں میں جنوبی اور شمالی دو حصوں میں تقسیم تھے۔ مشرق سے مغرب کو آتے ہوئے دس قبیلے یہ تھے۔ بجنک، قفجاق، اغز، یماک، بشغرت، بسمیل، قای، یباقو، تتار، قرقز اور جنوبی گروہ کے دس قبیلے۔ چگل، تخسی، یغما، اغراق، جرق، جمل، ایغر، تنگت، ختای، تو غاچ تھے۔ شمالی قبائل میں قای، یباقو، تتار اور بسمیل کی اپنی اپنی علیحدہ زبان تھی۔ لیکن وہ ترکی زبان بھی اچھی طرح سے بولتے تھے۔ جنوبی قبائل میں سے سوائے جمل کے دوسرے قبیلے ترکی زبان نہیں بول سکتے تھے۔

ایک خاقون یا آلِ افراسیاب کے زمانہ عروج میں ایک کثیر التعداد ترکی قوم نے اسلام قبول کیا۔

بعد کے زمانے میں وہ ترک جو زیادہ تر مغرب میں آباد تھے اسلام لائے ایک ترکی قبیلے نے جو قشلاق اور بلغار کے علاقے سے متصل تھا۔ ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء میں اسلام قبول کیا۔ ابن اثیر کے بقول ان کے دس ہزار خیمے تھے۔

وسطی ایشیا میں کامیابی سے اسلام کی تبلیغ کی گئی۔ اسقرہ ختاوی کی سلطنت قائم ہو جانے سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ تاہم مشرقی یورپ کے ترکوں میں منگول دور سے قبل اسلام کی تبلیغ ترک گئی لیکن بہت کم لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ قرہ ختائی حکومت کے قیام کے وقت خان بلاساغون کی ریاست ان علاقوں میں انتہائی شمالی اسلامی علاقہ تھا اور جب اس سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو اس وقت بھی دریائے ایلی کے شمال میں مسلمانوں کی حکومتیں موجود تھیں۔ ایشیائے کوچک اور آذربائیجان میں ترکی تہذیب و تمدن سلجوقیوں کے ذریعے پہنچا۔ غالباً یہاں ترکوں کو پہلے اس لئے آباد کیا گیا تھا کہ وہ سرحد کی حفاظت اور بزنطی اور گرجستانی سلطنت کی بڑھتی ہوئی قوت کے خلاف جنگ کریں۔

نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں سلطان صلاح الدین ترکوں کے مصر میں متعدد دستے لایا۔ اور ان میں سے بعض وہاں سے شمالی افریقہ اور سپین میں بھی پہنچے۔ منگول سلطنت کا قیام منگولوں کی نسبت ترکوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوا۔ بیشتر منگول ترکوں میں ضم ہو گئے۔ اور اس طرح انہوں نے نہ صرف ترکوں کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ خصوصیت کے ساتھ سیاسی حیثیت سے ان کے لئے باعث تقویت بھی بنے۔

Marfat.com

چودہویں صدی میں ترکوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد التون اردو کی سلطنت کی تاسیس کو ترکوں کی سیاسی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس صدی کے آخر تک اس سلطنت نے پوری طرح ترکی رنگ و روپ اختیار کرلیا۔ اس سلطنت کے بعد تین نئی تاتاری سلطنتیں قائم ہوگئیں۔

لفظ تاتار جو پہلے مغلوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، اب ایک ترکی قوم کا نام ہوگیا اور کریمیا میں خود ترک بھی اسے استعمال کرنے لگے۔ روس میں لفظ تاتار کو زیادہ وسیع مفہوم دے دیا گیا۔ سب غیر عثمانی ترکوں کو روسی علما اور ان کے تتبع میں عام طور پر اروپی تاتار کہا جانے لگا۔ اور اس طرح ایک ترکی تاتاری اصطلاح بن گئی۔

مغرب میں عثمانی ترکوں کے علاوہ ترکمان سیاسی تاریخ میں بڑے نمایاں رہے ہیں۔ قرہ قویونلو اور آق قویونلو کی سلطنتوں کو پندرہویں صدی میں خاصا اقتدار حاصل تھا۔ ممالیک کی سلطنت میں بھی دیار بکر سے غزہ تک بہت سے ترکمان قبائل موجود تھے۔ وسطی ایشیا میں ترک اپنی کوئی علیحدہ مملکت کبھی قائم نہ کرسکے لیکن ان کی آزادی ہمیشہ برقرار رہی۔ اور جو ۱۸۸۴ء میں شمال سے روسیوں کی پیش قدمی اور جنوب سے افغانوں کی یلغار کی بدولت ختم ہوگئی۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں ترکمانوں کو وسطی ایشیا کی اور قازاق و قرغیز کی ترکی قوموں کی طرح قلماقوں کے حملوں سے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ترکمانوں میں سے اب بھی کچھ لوگ سٹاروپول میں رہتے ہیں۔ یلسے کے کنارے کرغز جو وہاں اٹھارویں صدی کے شروع تک آباد رہے۔ اسلام سے بالکل غیر متاثر رہے اور یہی حال ان ترکی قبائل کا ہے جو آج کل ینسے میں رہتے ہیں اور جنہوں نے روسی انقلاب کے بعد خکس کا نام اختیار کرلیا۔

جزیرہ نمائے بلقان اور بحر اسود کے شمالی ساحل سے لے کر چینی سرحد تک کے تمام ممالک سولہویں صدی کے نصف اول میں مسلم ترکوں کے زیر حکومت تھے۔ سترھویں صدی میں روس نے یہ تجویز بنالی تھی کہ شمالی ایشیا کے سب ممالک روس اور چین کے درمیان تقسیم ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ترکی نے ایک زبان کی حیثیت سے روسی حکومت کے تحت نئی ترقی کی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے اور خاص طور پر ۱۹۲۴ء سے جبکہ قومیت کے اصول پر عمل شروع ہوا ہے، اشتراکی روس میں قومیت ہی کی بنا پر خود اسی اپنی حکومت کے ماتحت اور اپنی اپنی روش ارتقاء کے خطوط پر ترکی اقوام کی جمہوریتیں قائم ہوگئیں۔ اوزبک اور ترکمان جمہوریتیں جمہوریات اشتراکیہ کے اتحاد کے جداگانہ حصے ہیں۔ اور آذربائیجان کی جمہوریت وفاق میں شامل ہے۔ سات خود مختار جمہوریتیں قدیم تاتار، چواش بشکر، تاتار، قازاق، قرغیز اور یاقوت متحدہ جمہوریہ روسیہ اشتراکیہ کی ارکان ہیں۔ چار خود مختار علاقوں قراچای، بلکر، کبردن، قرہ قلپاق اور خطہ اویرات میں بھی ترکوں کی اکثریت ہے۔

موجودہ دور میں ترک ان مختلف علاقوں میں تقسیم ہیں۔

۱۔ جمہوریہ ترکی میں زیادہ تر آبادی ترکوں کی ہے۔ ۱۹۵۴ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد دو کروڑ سے زائد تھی ان کی زبان ترکی تھی۔

۲۔ ایران میں آذربائیجان کے صوبے میں ترکوں کی اکثریت ہے۔ اس کے علاوہ خراسان، جنوبی ایران میں قبیلہ کاشقائی اینالو اور بہارلو ترک قبائل آباد ہیں ان کی صحیح تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اندازاً بیس لاکھ ہے۔

۳۔ چین میں سوویٹ تخمینے کے مطابق چالیس لاکھ پچاس ہزار ہے جن میں سے چالیس لاکھ ترک صوبہ سنکیانگ میں رہتے ہیں۔

۴۔ افغانستان میں بھی چند ہزار اوزبک اور کچھ تعداد ترکمانوں کی مشرقی افغانستان میں آباد ہے۔

۵۔ جمہوریہ اشتراکیہ روس میں ترکوں کی تعداد ۱۹۳۹ء کے مطابق ایک کروڑ نوے لاکھ سے کم نہیں تھی۔ ۱۹۳۹ء کے بعد بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کی تفصیلات ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکیں۔

(نیز دیکھئے: "ترکستان"، "ترکی"، "ترکیہ")

ترکالہ ایک یونانی شہر۔ جو مغربی تھسلی میں وولوس اور کلبکہ ریلوے لائن پر واقع ہے۔ یہ شہر ترکالوس کی سیراب وادی میں سطح سمندر سے ۴۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔

ترکالہ پر یونانیوں کا قبضہ ۱۸۸۱ء میں ہوا۔ ان سے پہلے سلطنت عثمانیہ کی مقبوضات میں تھا۔ اور ۷۹۸ھ/۱۳۹۵ء میں سلطان بایزید اول نے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا تھا۔ سلیمان اعظم کے دور حکومت میں جب یہودیوں کو بوڈاپسٹ سے نکالا گیا تو انہیں اسی شہر میں بسایا گیا۔ بعد میں یہ شہر طرخان اوغلو کی جاگیر میں دے دیا گیا۔ یہ خاندان عثمانی امراء میں سے تھا ابن طرخان نے یہاں ایک مدرسہ اور مسجد بنوائی۔ یہاں ایک سرکاری قاضی بھی مامور تھا۔ شہر میں چار بڑی جامع مساجد تھیں جو غازی طرخان، عثمان شاہ بیگ، حاجی مصطفٰی اور حسین آغا کی جامع کے نام مشہور تھیں۔ عثمان شاہ بیگ کی مسجد مشہور معمار سینان نے بنائی تھی۔ یہ مسجد آج کل کھنڈرات کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ شہر میں بزنطی حکومت کا بلند قلعہ اور اس کے اطراف میں باغوں کی کثرت ایک خوشنما منظر پیش کرتے ہیں۔

اس شہر میں مشہور و معروف لوگوں کے مقابر میں سے جلال الدین بابا، سنان بابا رمضان افندی، جعفر افندی اور آتی قالقان ہیں۔ مسلمان اب اس شہر کو چھوڑ گئے ہیں۔ اب یہاں یونانی اور یہودی آباد ہیں۔

قدیم ترکالہ موجودہ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ شہر میں اسقلپیوس کا مشہور ہیکل ہے۔

ترکستان ترکوں کے رہنے کی جگہ۔ چھٹی صدی میں جب ترک پہلے پہل نکلے تو آمو دریا تک آپہنچے۔ چنانچہ ساسانی بادشاہوں کے زمانے میں ترکستان کی سرحد آمو دریا کے ساتھ ہی شمال سے شروع ہوجاتی تھی اہل ایران کے لئے ترکستان کی جنوبی سرحد جو ایران کی سرحد کے سامنے تھی خاص توجہ کا مرکز تھی۔

ایران اور ترکستان کے درمیان سرحد کا تعین طبری کی ایک حکایت کے مطابق ایرش نے ایک تیر پھینک کر کر دیا تھا اور اس کے مطابق آمو دریا کو سرحد قرار دیا گیا تھا۔

بقول سبیوس ارمنی آمو دریا کا دہر دٹ ترکستان میں تھا۔

عربوں نے ترکوں کو شمال کی سمت میں کافی دور تک دھکیل دیا تھا چنانچہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے جغرافیہ دانوں نے ترکستان کی سرحد کا تعین ماوراءالنہر سے کیا ہے اور ترکستان میں ان علاقوں کو شمار کیا جو ماوراءالنہر کے

Marfat.com

شمال و مشرق میں تھے۔ یاقوت نے جند اور کند کے علاقوں کو ترکستان میں شمار کیا ہے۔ جو سیر دریا کے زیریں حصے میں آباد تھے۔ اس نے ترکستان کی سرحد کی ابتداء فرغانہ کے شہر کاسان سے بتائی ہے۔ اور شہر ختن کو بھی ترکستان کا ایک شہر شمار کیا ہے۔

ازبکوں کی فتوحات نے سولھویں صدی میں آمو دریا کے جنوب میں ایک اور ترکستان پیدا کیا۔ بعض سیاحوں نے درہ آق رباط کو اس ترکستان کی جنوبی سرحد قرار دیا ہے۔ جبکہ دوسرے سیاح درہ حاجی کک کو اس کی سرحد شمار کرتے ہیں۔

سفرناموں اور ادبی کتب میں روسی، چینی اور افغانی ترکستان کو عام طور پر علیحدہ علیحدہ شمار کیا گیا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں روسی ترکستان میں گورنر جنرل کا عہدہ قائم کیا گیا اور اس کا صدر مقام تاشقند قرار دیا گیا۔

پروفیسر مشکتوف ۱۸۸۶ء میں ترکستان کو جغرافیائی حدود دینے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس نے طاس ترکستان کے تحت وسط ایشیا کے وسطی پہاڑوں اور طاس بحیرہ خزر اور سطح مرتفع ایران کو شامل کیا ہے۔

انقلاب روس کے بعد جمہوریہ ترکستان چند سال قائم رہی۔ ۱۹۲۴ء میں جب قومیت کا اصول حتمی طور پر نافذ ہوگیا تو ملک کا مشہور نام (ترکستان) ترک کر دیا گیا اور ازبکستان، ترکمنستان اور تاجکستان جیسی اصطلاحوں نیز ترکستان کی جگہ وسط ایشیا کی اصطلاح نے لے لی۔

ایک شہر بھی ترکستان کے نام سے ازبکوں کے عہد حکومت میں سیر دریا کے وسطی حصے میں آباد تھا لیکن آج کل اس شہر کے آثار نہیں ملتے۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس شہر کو یسی کا نام دیا جاتا تھا۔ بزرگ صوفی یسوی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ جن سے سلسلہ یسویہ کا آغاز ہوا۔ جب تیمور نے اس شہر میں آپ کا عالیشان مقبرہ بنوایا تو اس شہر کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس بزرگ کو حضرت ترکستانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ روسی فتوحات کے زمانے میں اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ ہزار تھی۔ ۱۹۰۸ء میں آبادی پندرہ ہزار تھی جو آج کل پچاس ہزار کے قریب ہے۔

ترکمان

وسط ایشیا میں رہنے والے ترک۔ ان کے لئے یہ نام پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی سے استعمال ہونا شروع ہوا۔ ابوالفضل بیہقی کے نزدیک ترکمان ترکی لفظ اوغز کے مترادف ہے۔ عربی کتب جغرافیہ میں ترکمانوں کا ذکر المقدسی کے ہاں ملتا ہے۔ اس نے ان کا ذکر سیرام کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے متعدد شہروں کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔

کاشغری کے بعد کے زمانے سے ترک اور ترکمان کی اصطلاحیں دو مختلف گروہوں کے لئے استعمال ہونے لگیں۔ کیونکہ مغرب کی طرف ہجرت کر جانے سے ترکمانوں کی زبان اور ان کے خدوخال اس حد تک تبدیل ہو گئے کہ دوسرے ترکوں کے ساتھ ان کی مماثلت بالکل معدوم ہوگئی۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے سیاسی حادثات نے ترکمانوں کو بھی مغربی ایشیا میں بڑے پیمانے پر منتشر ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ منگولوں کے عہد تک اوغز نام کی بجائے ترکمان نام کا رواج نہیں ہوا تھا۔ بقول رشید الدین ان اوغز قبائل کی تعداد چوبیس تھی۔ محمود کاشغری کے ہاں اکیس نام رشید الدین کے ناموں سے مشترک ہیں۔ لیکن کاشغری بھی ان قبائل کی تعداد چوبیس ہی مانتا ہے۔

جب ان ترکمانوں نے مغربی ایشیا کی طرف ہجرت کی ان میں اپنے نسلی نام استعمال کرنے کا رواج آہستہ آہستہ موقوف ہوتا چلا گیا اور وہ خود کو ترکمان کے نام سے موسوم کرنے لگے۔

ابن بطوطہ نے عثمانیوں کو بھی ترکمان ہی کہا ہے۔ خلیل الظاہری نے نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے ان ترکمانی قبائل کی فہرست دی ہے جو غزہ سے دیار بکر تک کے علاقے میں آباد تھے۔ مغربی ایشیا میں جن ترکمانی ریاستوں کو خاص اہمیت حاصل تھی ان میں قرہ قویونلو اور آق قویونلو خاندانوں کی تھی۔

ترکمانوں نے منگولوں کے عہد کے بعد بھی اپنا قدیم نسلی نام برقرار رکھا اگرچہ موجودہ دور میں ان کے قدیم قبائلی ناموں میں سے بہت کم نام باقی رہ گئے ہیں موجودہ دور کے اہم ترکمان قبائل تکہ، گوکلن، یموت، ارساری، سرلق وغیرہ ہیں۔

ترکمان کبھی بھی اپنی علیحدہ حکومت قائم نہیں کر سکے۔ اس لئے انہوں نے مختلف حکومتوں مثلاً ایران، خوارزم، بخارا، افغانستان کے علاقوں میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن ان تمام حکومتوں میں انہوں نے اپنی آزادی قائم رکھی۔ بسا اوقات ان کے خلاف فوجیں روانہ کی گئیں۔ جنہیں ترکمانوں نے شکست دی۔ ترکمانوں کا ایک قومی شاعر مخدوم قلی تھا جو قبیلہ گوکلن سے تعلق رکھتا تھا۔ جس نے اپنی شاعری میں ترکمانوں کو ان کی قومی وحدت کا احساس دلایا ہے۔

سترہویں صدی کے آخر میں ان کی ایک جماعت منگیشلاک سے ہجرت کر کے بحر خزر کے شمال میں روسی علاقے میں جا کر آباد ہوگئی جہاں وہ اب تک دریائے مینچ کے طاس اور دریائے کوربہ کے علاقے میں آباد ہیں۔

۱۸۸۵ء میں روسیوں نے انہیں زیر کر لیا۔ بعد کے برسوں میں جب سرحدوں کے تعین کے لیے جو معاہدے ہوئے ان کے ذریعے روس، ایران اور افغانستان کے مابین ترکمان علاقوں کی موجودہ تقسیم عمل میں آئی۔ ابتدا میں روسی ترکمانی علاقے کا انتظام ایک علیحدہ ضلع کی حیثیت سے تھا لیکن انقلاب کے بعد جب مختلف قومیتوں کے مسئلے کا فیصلہ ہوا تو اس علاقہ کو ایک سوویتی اشتراکی جمہوریت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ۱۹۲۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس علاقے کی آبادی دس لاکھ تھی۔ جس میں ترکمان سات لاکھ تھے۔ ایران اور افغانستان میں ترکمانوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ ارسطوف کے اندازے کے مطابق ۱۸۹۶ء میں ان کی تعداد اسی ہزار تھی جن میں سے پچاس ہزار افغانستان میں اور تیس ہزار ایران میں تھے۔

موجودہ دور میں ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں ترکمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ ہے جن میں اکثریت قازقستان اور ازبکستان میں آباد ہے ایران اور افغانستان میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ کچھ تعداد عراق اور شام میں بھی آباد ہے لیکن اناطولیا (ترکی) میں کثیر تعداد آباد ہے۔ ترکمانوں کی زبان ترکی سے بہت زیادہ قریب ہے۔

ترکمان سنی العقیدہ مسلمان ہیں لیکن اکثریت اسلام سے زیادہ متاثر نہیں ہے۔ ان ترکمانوں نے ہمیشہ بدوی زندگی گذاری۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی اپنی سلطنت قائم نہ کر سکے۔

Marfat.com

ترکی ترکوں کی زبان ۔ اس میں قدیم ترین تحریر آٹھویں صدی کی ہے ۔ جب وسطی ایشیا کے ترکوں نے اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے اویغور الفبا کی جگہ عربی ابجد اختیار کر لی ۔ ایک خاندان یا قرہ خانیوں کے ممالک میں بھی جو مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے وسط ایشیا کی ترکی ادبی زبان جو صد اسلامی کے ساتھ مخصوص ہے پروان چڑھی ۔ اس زبان کی قدیم ترین دستاویزکدات غو بلگ (علم سعادت بخشی) ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کی ایک ادب آموز نظم ہے ۔ جسے یوسف خاص حاجب نے تصنیف کیا تھا ۔ عتبۃ الحقائق کو جسے ہم بارہویں صدی کی تصنیف کہہ سکتے ہیں رباعیات پر مبنی ہے ۔ یہ ادیب احمد کی ادب آموز تصنیف ہے ۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ترکی تصوف کے بانی احمد یسوی کی تصنیف "حکمت" ملتی ہے ۔

اس دور کے ادبی مواد میں قرہ خانی عہد کی ادبی زبان کے عناصر ان مقامی بولیوں سے وجود پذیر ہوئے جو اب تک زندہ ہیں ۔

چودہویں صدی میں ایک منظوم رومان "خسرو شیریں" ہے ۔ جو نظامی کی اسی نام کی مثنوی کی مطابقت میں لکھا گیا ہے ۔

چودہویں صدی عیسوی کی ایک مشہور تصنیف "قصص الانبیاء" ہے جس میں نظم کے ٹکڑے بھی ہیں اور جو قرہ خانی زبان سے بہت زیادہ قریب ہے ۔

چودہویں اور پندرہویں صدی کے ترکی ادب میں سب سے زیادہ ترقی عثمانی اور چغتائی ادبی زبانوں نے کی ۔ چغتائی زبان کی نشو و نما تیموریوں کے ممالک میں ہوئی ۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی کے شروع میں خانان خوقند اور خیوہ کی ریاستوں کے ادب میں چغتائی نثر اور نظم کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ موجودہ زمانے میں چغتائی زبان ازبکستان میں ازبکی ادبی زبان سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے

آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی کے چند ترک شعراء کے نام ہم تک پہنچے ہیں ۔ تیمور کے زمانے میں امیر سیف الدین سیفی کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ ترکی اور فارسی میں نہایت عمدہ اشعار کہتا تھا ۔ نویں صدی ہجری پندرہویں صدی عیسوی میں ایک اور شاعر میر حیدر مجذوب تھا جس نے نظامی کی "مخزن الاسرار" کا جواب لکھا تھا ۔ اسی دور کی ایک اور تصنیف "معراج نامہ" مع ترکی ترجمہ "تذکرۃ الاولیا" ہے جس کے مصنف فریدالدین عطار ہیں ۔ ازبکوں کے عہد میں صوفی اللہ یار مقبول ترین شعراء میں سے ہے ۔ اس کا عہد اٹھارویں صدی کے اوائل تک کا ہے ۔ بعد میں وہی ادبی زبان جو ازبکوں کے دور میں لکھی جاتی تھی موجودہ زمانے تک چینی ترکستان کاشغریہ میں لکھی جاتی ہے ۔ یہاں کی اہم تصنیف حیدر مرزا کی "تاریخ رشیدی" ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے اور اس کے دو ترکی ترجمے موجود ہیں ۔ یہاں پر تصنیف ہونے والی ایک اور تاریخ جو ملا موسیٰ سیرامی نے لکھی ہے تاریخ امانیہ کے متعلق ہے ۔

بیسویں صدی میں یورپی اثرات کے باعث ازبکوں میں ایک نئے ترکی ادب کی بنیاد پڑی جسے جدید چغتائی ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

عثمانی ترکی :- عثمانی ترکی، ترکی زبانوں کے جنوب مغرب یا ترکمان گروہ کی ایک شاخ ہے ۔ پندرہویں صدی کے آخر سے عثمانی ترکی ایک ایسے ادب اور ثقافت کی زبان رہی ہے جس کی مختلف صورتیں اس زبان کی چار سو سالہ زندگی میں نہایت مستحکم ہو گئی ہیں ۔ اسی وجہ سے اس کا شمار اسلامی دنیا کی اہم زبانوں میں ہونے لگا اور اب اس کا مقام عربی فارسی سے دوسرے درجے پر ہو گیا ۔

قدیم ادبی زبان میں عربی اور فارسی سے مستعار الفاظ کی بھرمار ہے ۔ دوسری ترکی زبانوں کی طرح عثمانی ترکی میں بھی شروع ہی سے مذہب اور ثقافت سے متعلق متعدد ایسے غیر ترکی الفاظ نظر آتے ہیں جو فارسی اور عربی سے اخذ کئے گئے ہیں لیکن ادبی زبان میں عربی فارسی کے مستعار الفاظ کے استعمال کے خلاف ردّ عمل کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا جب ترکی ادب پر یورپی اثر نے زور پکڑا ۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے سادہ تر زبان استعمال کرنے پر زور دیا ان میں ایک سلیمان پاشا تھا ۔ دوسری شخصیت احمد وفیق پاشا کی تھی ۔ اس زمانے میں جدید تر اسلوبوں سے کام لیا گیا چنانچہ جس تناسب سے عثمانی سلطنت اس صدی کے آخر میں اپنے سیاسی بحران سے قریب آتی گئی اسی تناسب سے اس زبان میں لوگوں کی دلچسپی بھی بڑھتی گئی ۔

۱۹۲۸ء میں ترکیہ میں سرکاری طور پر عربی ابجد کی بجائے لاطینی ابجد جاری کر دی گئی ۔ عثمانی ادب دراصل ارغز ترکوں کا ادب ہے جو سلجوقی عہد میں ایشیائے کوچک میں آ کر آباد ہوئے تھے ۔ اس ادب نے سلجوقیوں کے عہد سے آج تک ارتقاء کی بہت سی منازل طے کی ہیں ۔ سولہویں صدی سے یہ ادب ترکی میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے ۔

عثمانی ادب کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

۱ ۔ اسلامی ادب ۔

۲ ۔ یورپی ادب ۔

۳ ۔ قومی ادب ۔

اسلامی ترکی ادب :- بارہویں صدی میں اسلامی ثقافت نے بڑے بڑے شہروں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا ۔ ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء میں جب قرمان اوغلو محمد بک نے قونیہ پر قبضہ کر لیا تو اس نے حکم دیا کہ دیوانی کاروبار میں صرف ترکی استعمال کی جائے ۔ پھر اس نے ترکی کے سوا کسی اور زبان کا استعمال نہ صرف دیوانی کاروبار میں بلکہ نجی کاروبار میں بھی ممنوع قرار دے دیا ۔ چنانچہ انہی سب اسباب کا نتیجہ تھا کہ ہم ترکی ادبی تصانیف کو تیرہویں صدی کے دوران میں ظہور پذیر ہوتے دیکھتے ہیں ۔ اس صدی کی تصانیف میں جو ہم تک تاریخی حوالوں سے پہنچی ہیں "قصہ شیخ صنعان" منظوم شکل میں ہے ۔ یہ ایک نامعلوم شخصیت کی تصنیف ہے دوسری اور تصنیف "صلصال نامہ" نظم و نثر میں ہے ۔ جس کا مصنف شیاد عیسیٰ ہے ۔ اس میں صلصال دیو سے حضرت علی رضؓ کے معرکوں کا ذکر ہے ۔ تیسری تصنیف "دانشمند نامہ" جو ابن علاء کی تصنیف ہے ۔ یہ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں لکھی گئی ۔

عربی اور ایرانی تصوف کے زیر اثر ترکی صوفیا نے بھی ترکی زبان کی طرف توجہ دی تاکہ اسلام کی دعوت زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچا سکیں ۔ چنانچہ ان لوگوں میں مولانا جلال الدین رومی ، سلطان ولد ، احمد فقیہ اور ان کے شاگرد شیاد حمزہ خاص طور پر مشہور ہیں ۔ حمزہ جو احمد فقیہ کا شاگرد ہے خاص طور پر مشہور ہے ۔

یہ ادبی اسلوب چودہویں صدی میں بھی انہی راہوں پر گامزن تھا جن پر تیرہویں صدی میں جاری تھا ۔ اس صدی میں اناطولیا کا ایک بڑا حصہ سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں آ گیا تھا اور ایشیائے کوچک کے متعدد حاکم نہ تو عربی تہذیب سے آشنا تھے نہ ہی ایرانی تہذیب سے چنانچہ اس دور میں عوام کی زبان کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ترکی زبان میں کتابیں لکھی گئیں اور کئی عربی اور فارسی کتابوں کے ترکی میں تراجم کئے گئے اس صدی کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں ۔

Marfat.com

۱۔ تفسیر بر سورۃ فاتحہ" "سورۃ اخلاص" یہ ایک نامعلوم شخصیت کی تفاسیر ہیں جو ابن ایناتگ کی فرمائش پر لکھی گئی۔

۲۔ قصہ امام حسنؓ و حسینؓ" جسے تقیب ادغلی نے نظم میں لکھا ہے۔

۳۔ قصص اولیاء۔ مصنف کا نام معلوم نہیں ایک اور کتاب "کلیلہ و دمنہ" کا مصنف مسعود نامی ایک شخص ہے جس نے محمد بک کے بیٹے ادمور بک کے لئے اس کتاب کو ترکی زبان میں ڈھالا تھا۔ "بازنامہ" جسے محمد بن محمد برجینی نے فارسی سے ترجمہ کیا تھا۔ ایک اور کتاب "الباسیہ" محمد بن محمود شیروانی نے پہلے عربی میں لکھی۔ بعد میں اس نے ترکی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں "قابوس نامہ" اور "مرزبان نامہ" کا بھی ترکی زبان میں ترجمہ ہوا۔

۔ تفسیر سورۃ الملک" جس پر مصنف کا نام درج نہیں ایک اناطول امیر خضر بن گرل بک کے حکم سے لکھی گئی تھی۔

انقرہ کے ایک مصنف مصطفیٰ بن محمد نے اورخان کے سب سے بڑے بیٹے سلیمان پاشا کے لئے سورۃ الملک کی تفسیر لکھی گئی۔ اسی دور کی تصانیف میں داستان مقتل حسین از شیاد، مثنوی مہرووفا، مناجات از خواجہ ادغلی، فتح قلعہ سلاسل از معاذ ادغلی، مناقب الاحرار فی مقالات الاخیار از احمد بن درویش۔ مثنوی بعنوان حکایت کنعان وشمعون از علی، منتخب الشفاء از اسحاق بن مراد، کشف المعانی جو شاطبی کا منظوم ترجمہ ہے محمد بن عاشق سلیمان ترجمہ منطق الطیر از گلشہری ہیں۔

پندرہویں صدی کی مشہور تصانیف میں محمد بن عمر الحلبی کے تراجم الفرج بعد الشدہ مناقب امام اعظم، ترجمہ مرصاد العباد از قاسم بن محمود، صدایہ اور وقایہ کے تراجم از دولت ادغلی یوسف، ترجمہ گلشن راز از شیخ الوان شیرازی، ترجمہ مثنوی مولانا روم ترجمہ تاریخ ابن کثیر، سلجوق نامہ از یازیجی زادہ علی، مناہج الانشار از یحییٰ بن محمد، ترجمہ تفسیر انفس الجواہر از ابوالفضل موسیٰ، ابواللیث کی تفسیر، ترجمہ جامع الحکایات از ابن عرب شاہ ہیں۔

تصوف میں نئے نئے صوفی طریقوں کے وجود میں آنے سے صوفیانہ ادب کی اہمیت بڑھتی گئی۔ چنانچہ تصوف کی بڑی بڑی تصانیف گلشن راز، مرصاد العباد فصل المطالب، تذکرۃ اولیاء کے ترجموں کے ساتھ ساتھ مثنوی ہائے مناجات نامہ فتوت نامہ، عبرت نامہ، الست نامہ، حیرت نامہ ایسی تصانیف ملتی ہیں۔ اس دور میں سلیمان چلپی کی "مولد" سیرت کی مشہور نظم ہے جسے لوگ صدیوں تک پڑھتے رہے اس نظم میں ترکی ادب کے ایک شاہکار کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔

اس صدی میں ترکی نظم و نثر میں ایرانی اسلوب کا بہت اثر پڑا۔ اور معاملہ یہاں تک بڑھا کہ فارسی نظم و نثر کی تقلید ترکی ادب میں ایک فیشن بن گیا۔

سولہویں صدی میں سروری، شودی، ابن کمال اور ریاضی جیسے علماء کی کوششوں سے فقہ اللغۃ پر مشتمل شرحیں، معاجم اور نحوی کتابیں لکھی گئیں اس دور میں بھی ترکی زبان و ادب بدستور عربی اور فارسی سے الفاظ و تراکیب مستعار لیتی رہی بے شمار کتابیں عربی اور فارسی سے ترکی میں ترجمہ ہوئیں۔ اس دور کی نثر ثقیل تر اور مصنوع تر ہوگئی۔ فارسی کی پیروی میں سادہ ترین خیالات کو تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگیوں میں الجھا دیا گیا۔ یہ اسلوب نگارش اس دور کے بڑے بڑے انشاء پردازوں میں پایا جاتا ہے۔ سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو تعلیم یافتہ طبقہ نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن جہاں تک اس طرز نگارش کا تعلق ہے اسے صرف ضخیم کتابوں کے دیباچوں تک ہی روا رکھا گیا

چنانچہ اس دور میں بہت سی ادبی، تاریخی، مذہبی یا اخلاقی تصانیف نہایت سادہ زبان میں لکھی گئیں۔ عوام الناس کے لئے لکھی جانے والی مذہبی کتب میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ان میں نہایت سادہ زبان استعمال کی جائے باقی اور فضولی کی نثر سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

اس صدی میں صنف تاریخ کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ ان تصانیف میں ادریس بدلیسی کی تاریخ آل عثمان، سعدالدین کی تاج التواریخ، لطفی پاشا کی تاریخ اور آصف نامہ، عالی کی کنہ الاخبار، نصیحۃ السلاطین، قواعد المجالس اور مناقب ھنروران خاص طور پر مشہور ہیں۔

اس دور کے مشہور شعراء میں قل محمد، اکسوز دوہ، خیال، کوراوغلی، چریانلی آرمودلو، قل چولخہ، گدا مصطو۔ صوفی شعراء میں یونس امرہ، احمد ساربان، اولیس مختفی، سید سیف اللہ خلوتی ہیں۔

سترہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کے سیاسی زوال کے باوجود ذہنی اور ادبی زندگی کی رفتار بدستور جاری رہی۔ البتہ ارباب سیاست میں بہت کم لوگ ادب کے سرپرست رہ گئے تھے۔ اس صدی میں مدارس کے انحطاط اور اس ناقدری کے باوجود کچھ قابل علماء ابھی تک مزید باقی رہ گئے تھے۔ ان علماء میں صاری عبداللہ، اسماعیل انقروی، اسحاق خواجہ سی اور احمد افندی شامل ہیں اس صدی میں دینی اور صوفیانہ کتابوں اور مختلف سلسلوں سے متعلق اخبار اولیاء اور سبق آموز تصانیف بڑی تعداد میں لکھی گئیں جو اکثر نظم میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ آنحضورؐ کی مدح میں نعتیں، حدیث اربعین اور مولدوں کے منظوم تراجم اکثر ملتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں بھی ادب و ثقافت کی وہی روش رہی جو گذشتہ صدیوں میں تھی۔ نظم و نثر میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اس دور میں نثری ادب کا رحجان آہستہ آہستہ سادگی کی طرف مائل ہوگیا۔ عثمان زادہ تائب نے نثر میں مبالغہ آمیز تصنع کے خلاف علانیہ طور پر آواز بلند کی۔ اس دور میں تاریخی کتابیں صف اول میں آتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی سیرت اور تاریخ کی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

انیسویں صدی کی ابتداء میں عثمانی ادب کا معیار بہت زیادہ گر گیا اور یہ حالت دور تنظیمات تک قائم رہی۔ زبان کو سادہ اور سلیس بنانے کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ اس دور کے عوامی ادب کے نمائندوں میں ہیچ امین، قیز احمد حاجی موذن، کور حافظ وغیرہ تھے۔

ترکی ادب کے دوسرے دور میں جسے یورپی دور کا نام دیا جاتا ہے ترکی صحافت نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ اس دور میں یورپی زبانوں خاص طور پر فرانسیسی سے ادب اور سائنس کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ اور یوں ترکی زبان میں سادگی و سلاست کا آغاز ہوا۔ جدید ادب کی مشہور ترین شخصیتیں شناسی اور دو اس کے دو شاگرد نامق کمال اور ضیا پاشا تھے اس دور میں اخبار نویسی، سیاسی اور ادبی تنقید، ناٹک، مغربی ادبی تصانیف، ترجموں، ناولوں اور فلسفیانہ مقالوں کا آغاز ہوا۔ اس دور میں کئی ایک مصنفین اور مفکرین نے ملک کی ثقافتی نشوونما میں حصہ لیا۔ جن میں مشہور شخصیات احمد جودت پاشا، احمد وفیق پاشا، سلیمان پاشا، احمد مدحت افندی، شمس الدین سامی بک کی ہیں نامق کمال کے شاگرد عبدالحق حامد نے شعر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے

Marfat.com

ترکی شاعری میں گیت اور تمثیل کو داخل کیا۔

ترکی ادب کا تیسرا دور قومی ادب کا دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں ترکی زبان کو سادہ بنانے کی مہم دوبارہ شروع کی گئی۔ اور ضیا گوک آلپ نے ایک انجمن اتحاد و ترقی کے نام سے اس تحریک کا آغاز کیا۔ چنانچہ بیسویں صدی میں زبان کو اور زیادہ سادگی میں ڈھالا گیا۔ فن برائے فن کی جگہ فن برائے زندگی نے لے لی۔ اس دور کا ادب معاشرے کے سب طبقوں کی زندگی اور خصوصیات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس دور کے شعرا میں فاروق نافذ، اورخان سیفی، انیس بہیج، یوسف ضیا، خالد فخری، نجیب فاضل وغیرہ مشہور ہیں۔

ترکیہ ایک مسلمان ملک جو یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں واقع ہے مشرق قریب کی ایک جمہوریہ جس کا کل رقبہ ۲۹۶۱۸۵ مربع میل ہے۔ جس میں سے ۹۰۶۸ مربع میل یورپ میں اور باقی ایشیا میں واقع ہے اس کے مشرق میں جمہوریہ اشتراکیہ روس اور ایران ہے جن کی سرحدیں بالترتیب ۳۶۷ میل اور ۲۹۲ میل لمبی ہیں۔ جنوب میں عراق اور شام کی ۲۳۵ میل اور ۴۹۰ میل تک متصل سرحدیں چلی گئی ہیں۔ مغرب میں یونان اور بلغاریہ کی سرحدیں ۱۲۷ میل اور ۱۲۴ میل تک چلی گئی ہیں۔ مشرق میں بحر اسود ہے۔

ترکی یورپ اور ایشیا کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انقرہ جدید ترکی کا دارالحکومت ہے۔

ترک جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی۔ تین سو سال بعد یہ سلطنت وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی۔

چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں ترکوں نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی۔ جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لیکر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا بانی تومن تھا۔ اس کے بھائی استغمی نے مغرب میں فتوحات حاصل کیں۔ دونوں بھائی الگ الگ حکمران تھے۔ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں ان دونوں حکومتوں کو سلطنت چین کی اطاعت قبول کرنا پڑی لیکن ۶۳ھ/۶۸۲ء میں شمالی ترکوں نے چین سے گلو خلاصی کرالی اور انہیں ایک بار پھر خود مختاری حاصل ہوگئی یہ خود مختاری ۱۲۶ھ/۷۴۴ء تک حاصل رہی۔ تا آنکہ ۱۲۱ھ/۷۳۵ء میں عربوں نے نصر بن سیار کی قیادت میں اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اوّل کے عہد خلافت سے شروع ہوئے۔ اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے بخارا، سمرقند، خوارزم، فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کے ترکی علاقے فتح کرکے وہاں اسلامی حکومتیں قائم کیں۔

آل سلجوق کا مورث اعلیٰ کاشغر کے ترک قبائل کا ایک رئیس تھا۔ جس کا نام دقاق تھا۔ سلجوق اس کا لڑکا تھا جو اپنے غیر مسلم ترک فرمانروا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا۔ اور یہاں وہ اور اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر بخارا کے قریب ایک مقام جند میں سکونت پذیر ہوا۔ اس نے غیر مسلم ترکوں پر فتوحات حاصل کرکے اپنی قوت بہت بڑھالی۔ اس نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے

بلسک شہر کی مسجد اور رباط (۱۳۵۰ء)

ارسلان، میکائل اور موسیٰ چھوڑے۔ سلطنت سلجوقیہ کے وارث میکائل کے تین لڑکے بیغو، طغرل اور جغرو بیگ قرار پائے۔ لیکن سلطنت کی فرمانروائی طغرل بیگ کو ملی۔ جس نے اپنی قوت اور زور بازو کا لوہا گرد و پیش کے تمام ممالک سے منوالیا۔ اس نے خراسان، جرجان، طبرستان اور خوارزم کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ طغرل ہی نے خلیفہ قائم بامراللہ کے حکم پر بغداد میں آل بویہ کا خاتمہ کیا تو بغداد میں بھی آل سلجوق کا اثر قائم ہوگیا۔ خلیفہ نے اسے سلطان مشرق و مغرب کا خطاب دیا۔ اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیار بکر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد الپ ارسلان کے عہد میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہوگئے۔ ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں عدن اور یمن بھی ملک شاہ نے فتح کرکے سلطنت سلجوق میں شامل کرلئے۔ اس طرح پانچویں سے ساتویں صدی ہجری تک خلیفہ بغداد کے ایشیائی مقبوضات کا بیشتر حصہ آل سلجوق ہی کے زیر نگیں رہا۔

ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی کی ابتداء میں شاہان خوارزم کی قوت عروج پر تھی وہ ایران، خراسان اور شام و عراق میں آل سلجوق کے بیشتر مقبوضات پر قابض ہوچکے تھے۔ اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اسی دوران میں چنگیز خان نے سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا۔ اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگ گئے۔ انھی ترک [illegible] میں جو اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے۔ ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا [illegible] ترک قبیلے کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں شام کی [illegible] جا رہا تھا دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہوگیا۔ یہ قبیلہ بھی منتشر ہوگیا۔ جو لوگ باقی رہ گئے وہ ارطغرل کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور سلطان علاءالدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہوگئے۔ سلطان علاءالدین نے ارطغرل کی بہادری کے کارناموں کے صلے میں دریائے سقاریہ کے بائیں جانب معوت کا زرخیز علاقہ جاگیر میں عطا کیا۔ ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں اپنی فتوحات سے اپنی شجاعت کا سکہ بزنطینی حکمرانوں کے دلوں میں بٹھادیا اس سے پہلے بزنطینی قلعہ داروں سے سلجوقیوں کو اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی

Marfat.com

تھی۔ سلطان علاءالدین کے لئے ایک جاگیردار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا تشویش کا باعث بننے کی بجائے اطمینان کا سبب بنا۔ اس نے ارطغرل کو مزید انعامات دیئے اور اپنا نائب مقرر کیا۔ ارطغرل نے اپنے زور قوت اور دولت سلجوقیہ کے تفرق و انتشار کے باوجود کبھی خود مختاری کا دعوٰے نہیں کیا۔ ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں ارطغرل نے وفات پائی تو اس کا بڑا لڑکا عثمان خان اوّل اس کا جانشین ہوا۔ یہی سلطنت عثمانیہ کا بانی اور پہلا تاجدار ہے۔ اس نے اپنے اڑتیس سالہ دور حکومت میں عثمانی سلطنت کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کیا۔ اس وقت سلطنت عثمانی کا طول ۱۲۰ میل اور عرض ۶۰ میل کے قریب تھا۔ اس کے ابتدائی دور حکومت میں ایک مسجد شہر میں تعمیر ہوئی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے۔ عثمان نے ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں وفات پائی۔

عثمان اوّل نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھوٹے بیٹے اورخان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ چنانچہ اورخان ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں ۴۲ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اورخان نے اپنے پینتیس سالہ دور حکومت میں عثمانی مقبوضات کو بہت زیادہ وسعت دی۔ اس نے نہ صرف ایشیائے کوچک کے بقیہ بزنطینی علاقوں پر قبضہ کرلیا اور بعض ترکی ریاستیں مملکت عثمانی میں شامل کرلیں۔ بلکہ یورپ میں داخل ہو کر تھریس کا ایک حصہ بھی فتح کرلیا جو براعظم یورپ میں عثمانی فتوحات کا شاندار مقدمہ تھا۔ اس نے ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں وفات پائی۔

اورخان کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا مراد چالیس سال کی عمر میں عثمانی سلطنت کا فرمانروا بنا۔ اس میں ملک گیری کی وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ابتدائی عثمانی فرمانرواؤں میں تھیں۔ اس کی غیر معمولی فوجی قابلیت نے ایک قلیل مدت میں یورپ کی متعدد مملکتوں کو عثمانی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اور بہترین انتظام حکومت سے ان فتوحات کو سلطنت کا ایک مستقل جزو بنا دیا۔ مراد اوّل کے عہد حکومت میں بلغاریا سربیا اور بوسنیا پر دولت عثمانیہ کا تسلط قائم ہوگیا۔ اور اس کا دائرہ اقتدار دریائے ڈینیوب تک جا پہنچا۔ مراد اوّل نے ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں وفات پائی۔

مراد کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا بایزید اوّل یلدرم تخت نشین ہوا۔ اس کا دور حکومت ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء سے ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تک ہے۔ اس کے دور میں سربیا نے سلطنت عثمانیہ کی باجگزاری اختیار کرلی۔ ایشیائے کوچک کی اکثر ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوچکی تھیں۔ بایزید نے باقیماندہ ریاستوں کو جن میں ایدین، امتنشا اور صاروخان تھیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا۔ چنانچہ اب ترک بحیرہ آزر کے ساحل تک پہنچ گئے۔

بلغاریا کا شمالی حصہ ابھی تک ترکوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا۔ بایزید کے دور میں پورے ملک پر سلطنت عثمانیہ کا تسلط ہوگیا۔ کرمانیہ کی فتح کے بعد آل سلجوق میں سے کوئی بھی آل عثمان کا مقابل نہ رہا۔ اس کے علاوہ عثمانی فوجوں نے ولاچیا، اسٹاکریا اور ہنگری پر حملے شروع کئے۔

بایزید کے عہد حکومت ہی میں تھسلی، فوسیس، مُوریس اور لوکریس پر بھی سلطنت عثمانیہ کا اقتدار قائم ہوگیا۔

بایزید کے دور حکومت کے آخری دو سالوں میں اسے اتنی زبردست شکست اٹھانا پڑی کہ اس کی تمام فتوحات پر پانی پھر گیا۔ اور کچھ دنوں کے لئے سلطنت عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی۔ اس تباہی و بربادی کا سبب وہ آویزش بنی جو بایزید اور تیمور کے درمیان پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس آویزش کے تحت نہ صرف بایزید کا خاتمہ ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ بھی نیست و نابود ہوگئی۔ تیمور نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلی گئیں تھیں دوبارہ انہیں واپس کردیں۔ اور ایشیائے کوچک کا کوئی علاقہ آل عثمان کے ہاتھ میں باقی نہ رہا۔

بایزید کا عہد حکومت ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء میں انقرہ کی لڑائی کے دوران میں گرفتاری کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کے بعد گیارہ سال کے عرصے میں اس کے لڑکے عیسےٰ، محمد، سلیمان اور موسیٰ سلطنت کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور اس دور کا خاتمہ ہوگیا۔

دوسرا دور محمد اوّل کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے جو بایزید اوّل کا بیٹا تھا۔ اس کا دور حکومت ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء تا ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء کا ہے۔ اگرچہ سلطنت عثمانیہ پر یہ وقت بڑا کٹھن تھا لیکن اس نے اپنی غیر معمولی قوت بقا کا ثبوت دیا اور دو کم بارہ سال کے قلیل عرصے میں نہ صرف اپنے تمام قدیم مقبوضات واپس لے لئے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ رونما ہوئی۔ اگرچہ اس کے عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ میں کوئی توسیع نہیں ہوئی۔ تاہم جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کی تباہی جس حد تک جا پہنچی تھی اور مسلسل گیارہ سال کی خانہ جنگیوں سے جو مزید خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ ان کے پیش نظر محمد اوّل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سلطنت کے کسی صوبے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اگرچہ ایشیائے کوچک کی ترکی ریاستوں پر پوری طرح قبضہ اس کے مختصر دور میں نہیں ہوسکا لیکن اس نے ان سب کو زیر کرکے دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک بار پھر وابستہ کردیا۔ انہی وجوہات کی بنا پر اسے سلطنت عثمانیہ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

محمد اول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مراد ثانی ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں تیموری حملے کے تمام اثرات مٹا دیئے اور سلطنت عثمانیہ کو گویا از سر نو قائم کر کے مستقل و مستحکم کیا۔ مراد ثانی نے ایشیائے کوچک کی ان ترکی ریاستوں کی طرف توجہ دی۔ جو تیموری حملے کے بعد سلطنتِ عثمانیہ سے بالکل آزاد ہو گئی تھیں۔ مراد نے ان تمام ریاستوں کو سلطنت عثمانیہ کا مطیع و باجگزار بنا لیا۔ اس طرح ایشیائے کوچک میں آلِ عثمان کا دوبارہ وہی اقتدار قائم ہو گیا جو جنگ انگورہ سے پہلے تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سالونیکا اور سرویا کو بھی فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں مراد نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد فاتح تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء سے ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء تک ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں قسطنطنیہ فتح ہو کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا۔ اس فتح کے بعد محمد فاتح نے یونان کا رُخ کیا لیکن سلطان کے پہنچنے سے پہلے ہی باجگزاری اور فرمانبرداری کا عہد کیا۔ اسی فاتح کے عہد میں ترکوں کا سرویا پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ بوسنیا، موریا، کرمانیہ طرابزون اور سنیوپ، یونانی مجمع الجزائر، کریمیا، ولاچیا، البانیا، ہرزیگووینا، وینس اور ڈانوب کے علاقوں پر عثمانی سلطنت کا تسلط قائم ہو گیا۔

محمد فاتح کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا بایزید ثانی ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء تک حکومت کی۔ اس نے ہرزیگووینا کو جو اب تک ایک باجگزار حکومت تھی اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ اسی کے عہد حکومت میں بحری فتوحات کے ضمن میں موریا میں وینس کے تین قلعے لزار، موڈن اور کورن بھی فتح ہو گئے۔

۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں بایزید ثانی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سلیم کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا اور ۴۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ سلیم اول نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں اس نے سلطنت عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کر دیا۔ اس کے دورِ حکومت میں اگرچہ یورپین مقبوضات میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن ایشیا میں دیار بکر، کردستان، شام، مصر اور عرب کا ایک بڑا حصہ جس میں حرمین شریفین بھی تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے تسلط میں آ گئے

سلیم کا دور محض سلطنت مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کی قوت آزمائی کا دور نہیں تھا بلکہ حقیقتاً اس کا تعلق دنیائے اسلام کے عام انتشار اور پراگندگی سے تھا۔ جب سے خلافت عباسیہ مصر میں منتقل ہوئی تھی اس وقت سے اسلام کی متحدہ سیاسی قوت پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ خلیفہ کا اقتدار محض رسمی رہ گیا تھا۔

دنیائے اسلام کی یہ حالت سلیم سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ضعف و انتشار کا سب سے بڑا سبب خلافت اور سلطنت کا دو علیحدہ علیحدہ شخصیتوں میں تقسیم ہو جانا ہے۔ اور اسلام کے اس اقتدار کو قائم کرنے کے لیے اس کے نزدیک ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہستی میں جمع کر دینا نہایت ضروری تھا۔ اور چونکہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقتور اس وقت تک کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہ تھی۔ اور دفاع و جہاد کا فرض جو منصب خلافت کا پہلا مقصد ہے ڈیڑھ سو سال سے وہی ادا کر رہی تھی۔ اس لیے دنیائے اسلام کی امامت کا حقدار بھی اس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ چنانچہ جب سلیم کا مصر کی فتح کے بعد حجاز پر بھی اقتدار قائم ہو گیا تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مگر حقیقتاً بغیر کسی اختیار و اقتدار

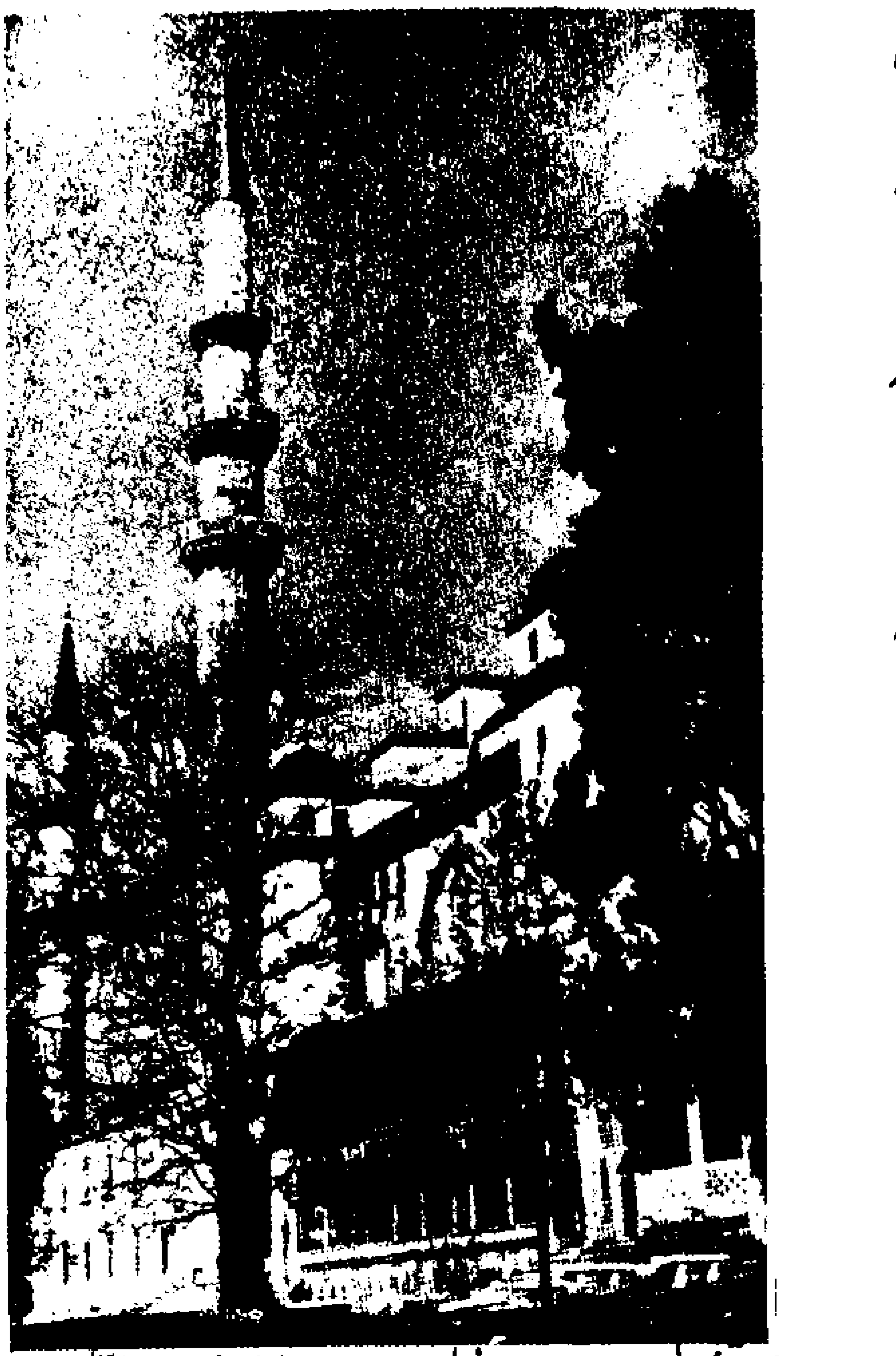

استنبول میں موجود نیلی مسجد (سلطان احمد اول)

کے زندگی بسر کر رہا تھا خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی سلیم کو تفویض کر دیئے اور مقامات مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں اور بعض آثار نبویہ بھی اس کے سپرد کر دیئے۔ اس تاریخ سے سلاطین عثمانیہ خلیفہ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے۔ منصب خلافت پر فائز ہو جانے کے بعد سلطان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا۔

سلیم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیمان اول قانونی ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں خلافت کے منصب پر فائز ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء تک جاری رہا۔ اس کا دورِ حکومت نہ صرف سلطنت عثمانیہ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت قوت اور خوشحالی کے لحاظ سے حدِ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد جزائر قبرص پر اور کریٹ کے علاوہ اس میں کوئی اہم اضافہ نہ ہوا۔ یہ سلطنت بودا سے بصرہ تک اور بحر کاسپین سے بحر روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور یورپ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس میں شامل تھے۔ شمال میں ازف کی دیواریں روس کے مقابل سلطنت عثمانیہ کی سرحد کی حفاظت کرتی تھیں۔ جنوب میں عدن کی پہاڑی نے سلاطین کی حکومت عرب کے جنوبی ساحل پر مستحکم کر دی تھی۔ انہیں بحر ہند میں با اثر بنا دیا تھا اور بحر احمر پر کامل اختیار دے رکھا تھا...... سلطان کا یہ فخر کوئی بے جا نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرمانروا تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے۔ الغرض سلیمان نے اپنے طویل عہدِ حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو حدِ کمال

Marfat.com

تک پہنچا دیا تھا۔ جس کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

سلیمان اعظم کے بعد سلیم ثانی ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء میں سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔ وہ سلطنت جو تین سو سال پہلے اناطولیا کی چند جاگیروں پر مشتمل تھی اور سلیمان کے عہد میں کو معظم سے بودا تک اور بغداد سے الجزائر تک پھیل گئی تھی۔ سلیم ثانی کی نااہلی کی وجہ سے زوال پذیر ہونے لگی۔ اس زوال کے اسباب داخلی اور خارجی دونوں تھے۔ روس کی سلطنت جو اس سے پہلے اپنے دور وحشت کی منزلیں طے کر رہی تھی سولہویں صدی سے مہذب اور طاقتور سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی اور دولت عثمانیہ کی ہمسایہ سلطنت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا تصادم ناگزیر ہو گیا یورپ کی جن حکومتوں نے سولہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ پر حملے شروع کر دیئے ان میں روس سب سے آگے تھا۔ لیکن اگر نظام سلطنت میں اندرونی طور پر فساد پیدا نہ ہوتا تو سے یورپ کی سلطنتوں کا اتحاد کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔

سلیم ثانی وہ پہلا فرمانروا تھا جو میدان جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ اس نے اپنے مختصر دور کو بادہ نوشی اور عیش پرستی میں ضائع کر دیا۔

سلیم ثانی کے بعد اس کا بڑا لڑکا مراد ثالث تخت نشین ہوا۔ اس کا ابتدائی چار سالہ دور محمد صوقولی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے اس چار سالہ دور میں عثمانی سلطنت نے اہم فتوحات حاصل کیں۔ بقول لارڈ ایورسلے "سلطنت عثمانیہ اپنے کمال عروج کو سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے آخری سال میں نہیں بلکہ صدر اعظم محمد پاشا صوقولی کے عہد وزارت کے آخری سال میں پہنچی۔ کیونکہ سلیمان کے بعد بھی اس بارہ سالہ مدت میں جب صوقولی عملاً سلطنت کا فرمانروا تھا دولت عثمانیہ نے اہم فتوحات حاصل کیں جن میں جزیرہ قبرص، صوبہ تونس، مملکت جارجیا اور سلطنت ایران کے بعض زرخیز حصے شامل تھے۔ یہی سلطنت عثمانیہ کی آخری فتوحات تھیں۔ اس کے بعد صرف کریٹ ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں فتح ہوا ورنہ ہر طرف زوال کے آثار نمایاں طور پر شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ ہمسایہ حکومتوں کا عثمانی مقبوضات پر قبضہ ہونا شروع ہو گیا۔

۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں مراد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ابتدائی دور میں سلطنت عثمانیہ اپنے عروج کی آخری منازل کو چھو چکی تھی۔ مراد میں اسے برقرار رکھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ لیکن محمد پاشا صوقولی کے بعد جس نے سلطنت عثمانیہ کو سلیمان کے بارہ سال بعد تک وسیع سے وسیع تر کر دیا تھا اور جس کے تدبر نے سلطنت عثمانیہ کے نظام حکومت میں پیدا شدہ خرابیوں کو سلیم ثانی کے عہد میں نمایاں نہ ہونے دیا۔ وہ خرابیاں اس کی موت کے بعد یک دم سامنے آ گئیں۔ جن کا سدباب مراد کے بس کی بات نہیں تھی

۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء میں مراد کا بڑا لڑکا محمد ثالث تخت نشین ہوا۔ اس کے دور حکومت میں ایشیائے کوچک میں ایک بغاوت برپا ہوئی جو نے صدر اعظم سیدکالا پاشا اور سلطنت کے خلاف تھی۔ اس بغاوت میں زیادہ تر ایشیا کے جاگیری دستے جو فوج کا ایک حصہ تھے اور جنہیں اب فراری کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا پیش پیش تھے۔ اس بغاوت کے دوران میں شاہ عباس نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت عثمانیہ پر ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں حملہ کر دیا اور گذشتہ عہد میں جو صوبے سلطنت ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے انہیں واپس لے لیا۔ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں محمد ثالث کے انتقال کے بعد احمد اول کا بڑا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اور ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء تک فرمانروائی کرتا رہا۔ اس کے دور حکومت میں ایران سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا جس میں ترکوں کا ہی زیادہ نقصان ہوا۔ صلحنامہ سیتواتورک سے جو اس کے عہد حکومت کے تیسرے سال ہوا تھا، یہ بات واضح ہو گئی کہ اب دولت عثمانیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب وہ زوال کا شکار ہونے والی تھی۔

احمد اول کے بعد ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء میں اس کا بھائی مصطفیٰ اول تخت پر بیٹھا اور اپنی نااہلی کی وجہ سے تین ماہ سے زیادہ عرصہ مسند حکومت پر فائز نہ رہ سکا۔ چنانچہ ارکین سلطنت نے اسے معزول کر کے احمد اول کے بڑے بیٹے عثمان ثانی کو چودہ سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا۔ اسے اپنے دور حکومت میں ترکوں کی مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنا پڑی۔ مختصر عرصے میں فوج اس کی مخالف ہو گئی چنانچہ ۱۶۲۲ء میں اسے برطرف کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ بعد ازاں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اور دوبارہ مصطفیٰ اول کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن اسے ایک سال سے زائد حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ یہ قلیل مدت بھی سلطنت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اسی دوران میں ایران سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ بغداد اور بصرہ بھی سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔

مصطفیٰ اول کے بعد سلطنت عثمانیہ کی باگ ڈور مراد رابع کے ہاتھ میں آئی جو ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ابتدائی نو سال تک حکومت کی باگ ڈور اس کی والدہ کے ہاتھ میں رہی جو ایک بڑی قابل اور زیرک عورت تھی۔ اس نے اپنے آٹھ سالہ دور حکومت میں عمائدین سلطنت میں پیدا شدہ انتظامی خرابیاں نیز فوج کی بغاوت کو ختم کر دیا۔ اس کے دور حکومت میں ایران اور سلطنت عثمانیہ کے مابین ایک صلحنامہ ہوا جس کے تحت ایران ایرانیوں کو واپس کر دیا گیا۔

۱۰۴۹ھ/۱۶۴۰ء میں مراد رابع کا بھائی ابراہیم سلطنت عثمانیہ کا وارث بنا اس نے تھوڑے ہی عرصے میں مراد کے کارناموں پر پانی پھیر دیا۔ اگرچہ اس کا عہد حکومت اندرونی انتشار کے باوجود بیرونی فتوحات کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ اس کے عہد حکومت میں دو معرکے پیش آئے۔ اور دونوں میں سلطنت عثمانیہ کو فتح حاصل ہوئی۔ ان میں ایک ازف کی مہم تھی اور دوسری کریٹ کی۔

ابراہیم کے بعد ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء میں اس کا بیٹا محمد رابع جب تخت نشین ہوا تو اس کی عمر سات سال تھی۔ اس کا دور حکومت ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء تک پھیلا ہوا ہے اس کے ابتدائی دور حکومت سے ۱۶۷۶ء تک عنان حکومت ایسے وزیروں کے ہاتھ میں رہی جنہوں نے دولت عثمانیہ کی عظیم خدمات انجام دیں لیکن بعد میں جب سلطان نے اس عہدے پر قرہ مصطفیٰ کا تقرر کیا تو وہ سود مند ثابت نہ ہوا۔ چنانچہ اس کی نااہلیت کی وجہ سے ویانا میں ترکوں کو زبردست شکست ہوئی۔ اس شکست نے تمام یورپ کو بیک وقت سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اس شکست سے تمام معرکوں میں ترکوں کے قدم اکھڑتے گئے۔ اسی سلطان کے عہد میں الجزائر اور تونس کی حکومتوں نے بھی دولت عثمانیہ سے گلوخلاصی کرالی اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں محمد رابع کے بعد اس کا بھائی سلیمان ثانی تخت نشین ہوا۔ جس نے کل چار سال حکومت کی۔ اس کے دور حکومت میں آسٹریا کی فوجیں مقدونیہ تک آ پہنچیں اور وہاں کے عیسائی باشندے اپنے بطریق کی قیادت میں انہیں مدد پہنچا رہے تھے۔ اب گویا سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات کے قلب پر حملہ شروع ہو گیا تھا۔ ترکی اور تاتاری فوجوں نے جرمنی آسٹریا اور رابانیا کی متحدہ فوجوں کو دو معرکوں میں شکست دے کر مقدونیہ اور اس کے گردونواح کے ان تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا جو آسٹریا کی فوجوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی احمد ثانی ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء میں سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔ اس کے عہد میں جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جمہوریہ وینس

Marfat.com

سے لڑائی کے دوران میں جزیرہ ساخز سلطنت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گیا۔
۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء میں احمد ثانی کی وفات پر محمد رابع کا بیٹا مصطفےٰ ثانی تخت پر بیٹھا۔ یہ ایک دانشمند اور بیدار مغز سلطان تھا۔ اس نے ابتدائے عہد میں بڑی ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا اور متعدد اہم فتوحات حاصل کیں لیکن زنتا کی شکست کے بعد سلطنت کی فوجی قوت اتنی کمزور ہوگئی کہ آسٹریا سے مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔

مصطفےٰ ثانی کی معزولی کے بعد احمد ثالث ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا اور ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس کے ۲۷ سالہ دور میں سلطنت عثمانیہ کو آسٹریا، روس، وینس اور ایران سے متعدد معرکے پیش آئے لیکن معاہدہ پسارووچ کی رُو سے مقبوضات کا وہ حصہ جو ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا ازف اور موریا کی واپسی اور ایرانی فتوحات نے نہ صرف اس کی تلافی کردی بلکہ بحیثیت مجموعی سلطنت کے رقبہ میں اضافہ کردیا۔

۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں احمد ثالث کی سبکدوشی کے بعد سلطان مصطفےٰ ثانی کا بیٹا محمود اوّل سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا ہوا۔ اس کے دور حکومت میں جہاں تک یورپ کی سلطنتوں کا تعلق ہے دولت عثمانیہ سے ان کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۷۴۳ء میں ایران سے پھر جنگ چھڑ گئی جو تین سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۷۴۶ء میں تقریباً انہی شرائط پر ختم ہوئی جو سلطان مراد رابع کے عہد میں دونوں فریقوں کے درمیان طے پائی تھیں۔ حکومت کو بعض اوقات ان مطلق العنان والیوں کی سرکشی کو بھی دبانا پڑا۔ بغاوت کا سب سے زیادہ اثر صوبہ مصر میں تھا جو بتدریج دولت عثمانیہ کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔

محمود اوّل کی وفات کے بعد اس کا بھائی عثمان ثالث ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء میں تخت نشین ہوا۔ اور تین سال کی مختصر مدت تک حکومت کی۔ اس کے دور حکومت میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا اور سلطنت کا نظم ونسق بالکل محمود اوّل کی پالیسی کے مطابق چلتا رہا۔

۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء میں سلطان احمد ثالث کا بیٹا مصطفےٰ ثالث تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں روس سے مقابلہ پیش آیا۔ اس لڑائی میں عثمانی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور دریائے ڈینیوب کے شمال میں جتنے عثمانی قلعے تھے ان پر روس کا قبضہ ہوگیا۔ انگلستان کی سیاست دولت عثمانیہ کے لئے دورخی تھی۔ ایک طرف تو وہ روس کو جنگ میں پوری پوری امداد دے رہا تھا۔ دوسری طرف دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھر رہا تھا۔

مصطفےٰ ثالث کے بعد اس کا بھائی عبدالحمید اوّل ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۴ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۷۸۲ء میں کیتھرائن نے جوزف کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی۔ اس اسکیم کی بنیاد یہ تھی کہ روس اور آسٹریا متحد ہو کر ترکوں کو ان کے تمام یورپی مقبوضات سے نکال دیں۔ ان کے نکل جانے کے بعد ان علاقوں کی تقسیم میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ اگرچہ اس اسکیم پر عملدرآمد کرنے کا ان میں کبھی حوصلہ نہ ہوسکا۔ لیکن ۱۷۸۳ء میں روس کا کریمیا پر قبضہ ہوگیا اور یہ علاقہ سلطنت روس میں شامل کرلیا گیا۔ سلطان عبدالحمید اوّل کے بعد مصطفےٰ ثالث کا بیٹا سلیم ثالث ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء میں فرمانروا بنایا گیا۔ اس کے عہد حکومت میں بھی روس سے جنگ بدستور جاری رہی۔ اس نے تازہ دم فوجیں روس کے مقابلے میں روانہ کیں لیکن وہ بھی ناکام رہیں۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ مثلاً ہنگری، ٹرانسلوینیا اور کریمیا میں عثمانی حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ بحر اسود اور بحر ازف کے شمالی ساحلی علاقوں سے بھی ترک دستبردار ہوگئے تھے۔ سلطنت کے بہت سے صوبوں پر سلطان کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ شام میں دروزیوں اور لبنان اور فلسطین کے پہاڑی باشندوں نے تقریباً خود مختاری حاصل کرلی تھی۔ سلیم کے زمانہ اقتدار میں وہابیوں نے شام پر از سر نو حملہ شروع کردیا۔ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں انہوں نے مکہ معظمہ اور مدینہ

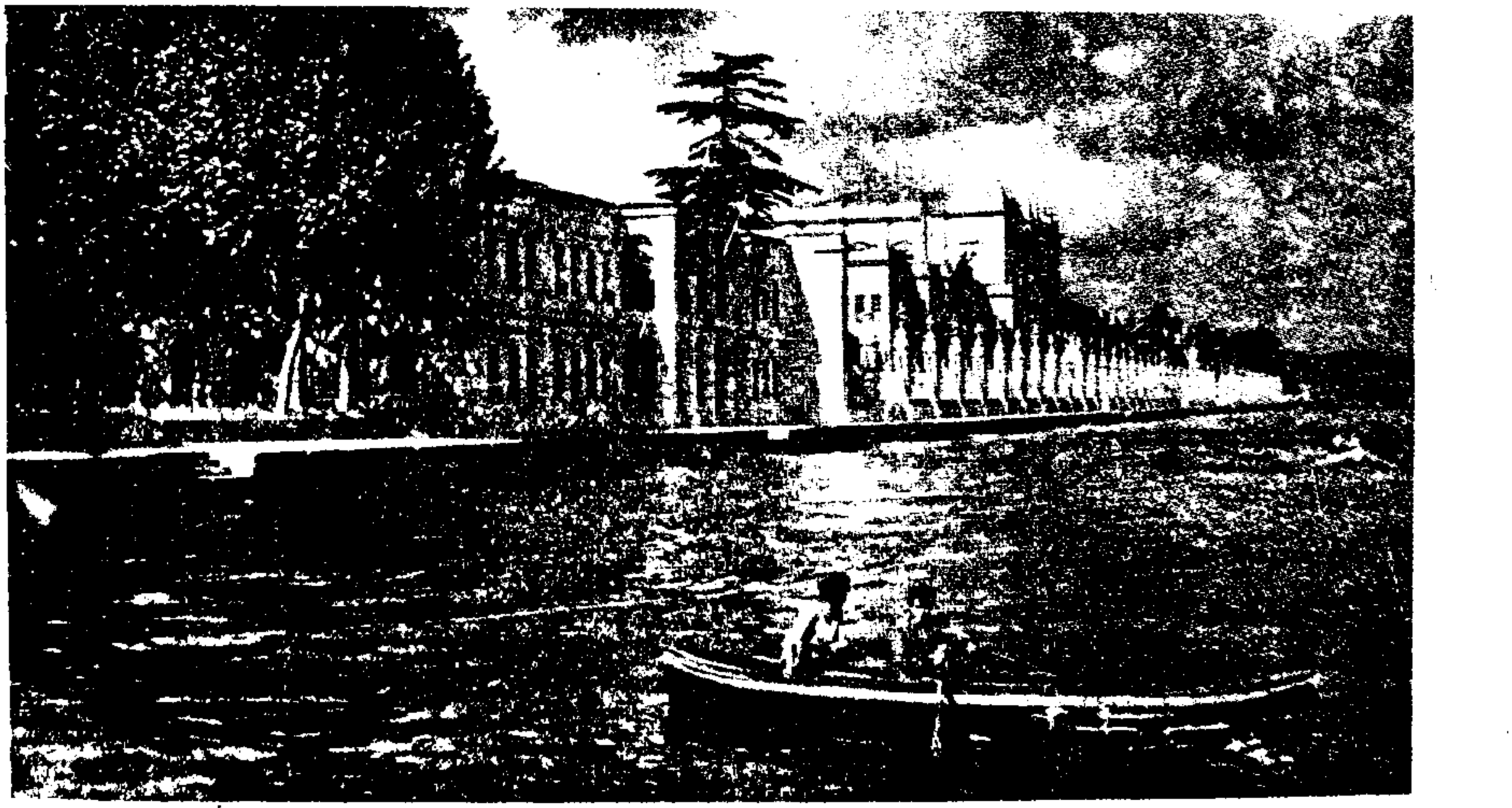

بحیرۂ باسفورس کے کنارے واقع محل ذرالماح۔ استنبول میں صدر ترکیہ کی سرکاری رہائش گاہ؛

Marfat.com

منورہ پر قبضہ کر کے تمام عرب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سرویا نے بھی عثمانی سلطنت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور خودمختاری حاصل کر لی۔

اٹھارویں صدی کے آواخر میں سلطنت عثمانیہ بحیثیت مجموعی اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات کی شدت کے ساتھ مخالفت ہوئی اور فوج نے علانیہ بغاوت کر دی۔ لیکن ان اصلاحات سے جو نئی روح پیدا ہو گئی تھی وہ پھر کبھی فنا نہ ہوئی۔ دولت عثمانیہ کے آئندہ فرمانرواؤں نے سلیم ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالحمید اوّل کے اصلاحی کارناموں کا سنگ بنیاد سلیم ہی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔

۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں سلطان عبدالحمید اوّل کا بیٹا مصطفےٰ رابع سلطنت عثمانیہ کا وارث بنا۔ اس نے صرف تیرہ ماہ حکومت کی۔ ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں مصطفےٰ کا بھائی محمود ثانی تخت نشین ہوا۔

محمود ثانی نے اپنے دورِ حکومت میں ایک تو ینی چری فوج کا بالکل خاتمہ کر دیا دوسرے اس نے یورپی نظام کے مطابق اپنی جدید فوج کی تعداد بڑھا کر چالیس ہزار کر لی۔ وہ اس فوج کو اڑھائی لاکھ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن روس نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اور سلطان کی ان فوجی اصلاحات کو شروع ہی میں ختم کروا دیا۔

۱۸۲۶ء میں روس نے پر زور مطالبہ کیا کہ ایشیا کے بعض قلعے جو اس کے دعوے کے مطابق صلح نامہ بخارسٹ میں اسے دیئے جا چکے تھے فوراً دے دیئے جائیں۔ مولداویا اور ولاچیا کے باشندوں کو قبل بغاوت کے تمام حقوق دیئے جائیں۔ سربیا والوں کے سیاسی حقوق بلا تاخیر منظور کئے جائیں۔ چنانچہ محمود کو مجبوراً ان مطالبات کو ماننا پڑا اور ۱۸۲۶ء میں اس نے معاہدہ آق کرمان پر دستخط کر دیے۔

یورپ کی عیسائی طاقتوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دولت عثمانیہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں لندن، انگلستان، فرانس اور روس کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ جسے سلطان محمود نے ٹھکرا دیا۔ موریا میں یونانی باغیوں کے خلاف ابراہیم پاشا کی عظیم الشان کامیابی، روس، فرانس اور انگلستان کی نظروں میں خار بن کر کھٹکنے لگی۔ انہوں نے یونان کی امداد کے لیے اپنے جنگی بیڑے روانہ کئے اور ابراہیم پاشا کو پیغام بھجوایا کہ اب باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ اور فوج لے کر واپس لوٹ جائے۔ ابراہیم پاشا نے انکار کر دیا۔ تو ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو اتحادی بیڑوں کے کمانداروں نے ابراہیم پاشا کی غیرموجودگی میں سارے ترکی بیڑے کو تباہ کر دیا۔

سلطان محمود ثانی کے بعد اس کا بڑا بیٹا عبدالمجید خان اوّل ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کی تخت نشینی کے چند روز بعد خبر آئی کہ محمد علی پاشا نے ترکی بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلطان نے اس سے صلح کی بات چیت شروع کی۔ محمد علی نے شرط پیش کی کہ مصر، شام، طرابلس، کریٹ اور اطنہ کی پاشائیاں اسے وراثتاً دے دی جائیں۔ فرانس، روس، آسٹریا اور پرشا کے سفیروں نے سلطان کو دول عظمیٰ کی وساطت سے یہ معاملہ حل کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ۱۵ جولائی ۱۸۴۰ء کو لندن میں سلطنت عثمانیہ، انگلستان، روس، آسٹریا اور پرشا میں ایک معاہدہ طے ہوا۔ جس میں سلطان اور محمد علی کے درمیان صلح کی شرائط طے کی گئیں۔ اتحادیوں نے محمد علی کو الٹی میٹم دیا کہ دس روز کے اندر اندر سلطان سے اظہار اطاعت کر کے شام سے فوجیں واپس بلا لے اور اس کے بدلے مصر کی حکومت اس کی نسل کے لیے اور شام کی حکمرانی اس کے لیے تاحیات مستقل ہو جائے گی۔ ورنہ شام کی پاشائی اس سے چھین لینے کے علاوہ مصر کی پاشائی بھی صرف اس کی زندگی تک محدود کر دی جائے گی۔ محمد علی نے فرانس کی امداد کے بھروسے پر اس تجویز کو ٹھکرا دیا تو عثمانی فوجوں نے اتحادیوں کی زبردست امداد سے قلعے پر قلعہ فتح کرتے ہوئے شام کو زیرنگیں کر لیا۔ جب محمد علی نے یہ دیکھا تو اس نے اس شرط پر صلح کر لی کہ مصر کی حکومت اس کے اور اس کی اولاد کے لیے مستقل کر دی جائے۔ نیز مصر کی سالانہ آمدنی کا چوتھائی حصہ خراج کے طور پر دینا قبول کیا۔

اس کے بعد اتحادیوں اور دولت عثمانیہ کے درمیان ایک جداگانہ معاہدے کی رُو سے قرار پایا کہ ترکی جہازوں کے سوا کسی دوسری حکومت کے جنگی جہازوں کو دردانیال اور آبنائے باسفورس میں داخل ہونے کا اختیار نہیں۔

اسی زمانے میں روس نے انگلستان کو ساتھ ملا کر دولت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس کے سامنے ایک سکیم پیش کی جسے انگلستان نے مسترد کر دیا۔ پھر روس نے دولتِ عثمانیہ سے چند مطالبات کی تکمیل کے لیے کہا لیکن سلطان عبدالمجید نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر روس نے جنگ چھیڑ دی لیکن روس کو شکست کھانا پڑی۔ ۲۸ مارچ ۱۸۵۴ء کو انگلستان اور فرانس نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بالآخر فروری ۱۸۵۶ء کو پیرس میں سلطنت عثمانیہ انگلستان، فرانس، روس، آسٹریا، سارڈینیا اور پرشا کے درمیان ایک صلح نامہ قرار پایا جس کی خاص دفعات یہ تھیں۔

۱۔ ان حکومتوں نے باب عالی کو باقاعدہ مجلس دول یورپ کا رکن بنا لیا۔ اور اس کی آزادی اور مقبوضات کی سالمیت کے لیے بالاتفاق ذمہ داری لی۔

۲۔ دول یورپ نے واضح اعلان کیا کہ انہیں دولت عثمانیہ کے داخلی امور میں دخل دینے کا مجموعی یا انفرادی طور پر کوئی حق حاصل نہ ہو گا۔

۳۔ بحیرہ اسود تمام اقوام کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیا گیا لیکن جنگی جہازوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔ روس اور سلطنت عثمانیہ کو اس کے ساحلوں پر اسلحہ خانہ قائم کرنے کی بھی ممانعت کر دی۔ فریقین کے تمام مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے گئے۔ چنانچہ قارص سلطنت عثمانیہ کو لوٹا دیا گیا اور ریاست کی جنوبی بسرابیا کا علاقہ جو روس نے لے لیا تھا۔ مولداویا کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور مولداویا اور ولاچیا پر دولت عثمانیہ کی حکومت بدستور قائم رکھی گئی۔ روس ان ریاستوں کی حمایت کے حق سے دستبردار ہو گیا۔ ان ریاستوں کو خوداختیاری کے حقوق عطا کئے گئے۔

سلطان عبدالمجید کے بعد ۱۸۶۱ء میں اس کے بھائی سلطان عبدالعزیز نے تخت حکومت کو زینت دی۔ اس کا دورِ حکومت ۱۸۷۶ء تک جاری رہا۔ اس کے دورِ حکومت میں ۱۸۶۷ء میں مولداویا اور ولاچیا نے مل کر رومانیہ کی ریاست قائم کر لی اور ۱۸۶۸ء میں جرمن شہزادہ چارلس کو اس کا حکمران مقرر کیا۔ حالانکہ یہ صلحنامہ پیرس کے صریحاً خلاف ورزی تھی۔ سربیا نے بڑی طاقتوں کی شہ پر سلطنت عثمانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ بلغراد اور دوسرے سرویٔ قلعوں سے اپنی فوجیں نکال لے۔ سلطان نے معاہدہ پیرس کی رُو سے اسے مسترد کر دیا لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث ان قلعوں سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں اور

یعنی سربیا آزاد ہوگیا۔

یونانی فسادیوں نے کریٹ کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے لیے وہاں بغاوت کے شعلے بھڑکا دیے۔ سلطان نے اس بغاوت پر قابو پا ہی لیا تھا کہ یورپ کی بڑی طاقتیں خیر اندیشی کا پروانہ لے کر میدان میں آدھمکیں۔ اور پیرس میں کیے گئے ایک فیصلے کے مطابق کریٹ کو حکومت خود اختیاری کے بعض حقوق عطا کر دیے۔

۱۸۷۰ء میں روس نے فرانس اور جرمنی کی جنگ سے فائدہ اٹھا کر معاہدہ پیرس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحیرۂ اسود پر پھر سے قبضہ کر لیا۔

روس نے دولت عثمانیہ کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جمعیت سلافیہ کی بنیاد ڈالی جس نے سلافی قوموں میں روسی ادبیات کی اشاعت کا آغاز کیا تھوڑے ہی عرصے میں اس جمعیت نے یہاں تک ترقی کی کہ ریاست بلقان کے تمام عیسائی جمعیت سلافیہ کے زیر علم جمع ہوگئے۔ اور بغاوت کا پرچم لہرانے کے لئے اس کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ یہ جمعیت روس کے اعیان حکومت پر مشتمل تھی۔ اس سے پہلے بلقان کی سلافی قومیں بلغاری، لوسین وغیرہ یونانی کلیسا کے ماتحت ہونے کی بنا پر یونانی ہی خیال کی جاتی تھیں لیکن اس تحریک سے ان میں قومی بیداری پیدا ہوئی اور انہوں نے یونانیوں کے مقابلے میں ایک جداگانہ ہستی قائم کرنے کی کوشش کی۔ روس کے سفیر نے سلطنت عثمانیہ سے زبردست سفارش کر کے ۱۸۷۰ء میں سلطان سے ایک فرمان کے ذریعے بلغاریہ میں کلیسائے یونان سے آزاد ایک قومی کلیسا قائم کرنے کی اجازت دلا دی۔ اس طرح بلقان میں ایک جدید قومیت کی داغ بیل ڈال دی گئی۔

۱۸۷۲ء میں فواد پاشا اور عالی پاشا کی وفات سے انتظام سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا اور بدنظمی و شورش کا بازار گرم ہوگیا۔ ان پاشاؤں کی زندگی میں تو روسی سفیر کی دال نہ گل سکی تھی اب اسے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور اس نے گہری چالوں سے کام لے کر جدید صدر اعظم محمود ندیم پاشا کو اپنے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا لیا اور سلطنت عثمانیہ گویا روس کی حکومت بن گئی۔

روس برابر مخالفانہ سرگرمیوں کو ہوا دے رہا تھا۔ آسٹریا چاہتا تھا کہ بوسنیا اور ہرزیگوینا پر خود قبضہ کرے۔ چنانچہ دونوں سلطنتوں نے مؤثر تدبیروں سے کام لے کر دونوں صوبوں میں بغاوت برپا کرا دی۔

چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۵ء کو سلطان نے باغیوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا تو روس جرمنی اور آسٹریا کے حکمرانوں نے ایک جگہ جمع ہو کر چند فیصلے کیے جو اندراسی نوٹ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

اس نوٹ میں بتایا گیا کہ بوسنیا اور ہرزیگوینا کے باشندوں کو کامل مذہبی آزادی عطا کی جائے مسلم اور غیر مسلم رعایا سے یکساں سلوک کیا جائے۔ ان صوبوں سے جو ٹیکس لیے جائیں وہ انہیں صوبوں کی مقامی ضروریات پر صرف کیے جائیں وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا نے بھی بغاوت کے ضمن میں ہرزیگوینا کی ہاں میں ہاں ملا دی اور سرویا، مونٹی نیگرو اور بلغاریا پر بھی بغاوت کے پرچم لہرانے لگے۔

بلغاریا میں جب بغاوت برپا ہوئی تو وہاں کے حکام نے سلطان سے قیام امن کے لئے فوجی دستے بھیجنے کی درخواست کی لیکن روسی سفیر راستے میں پھر حائل ہوگیا۔ اور وہاں فوج نہ بھیجی جا سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے عیسائی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا بے تحاشا قتل عام کیا۔

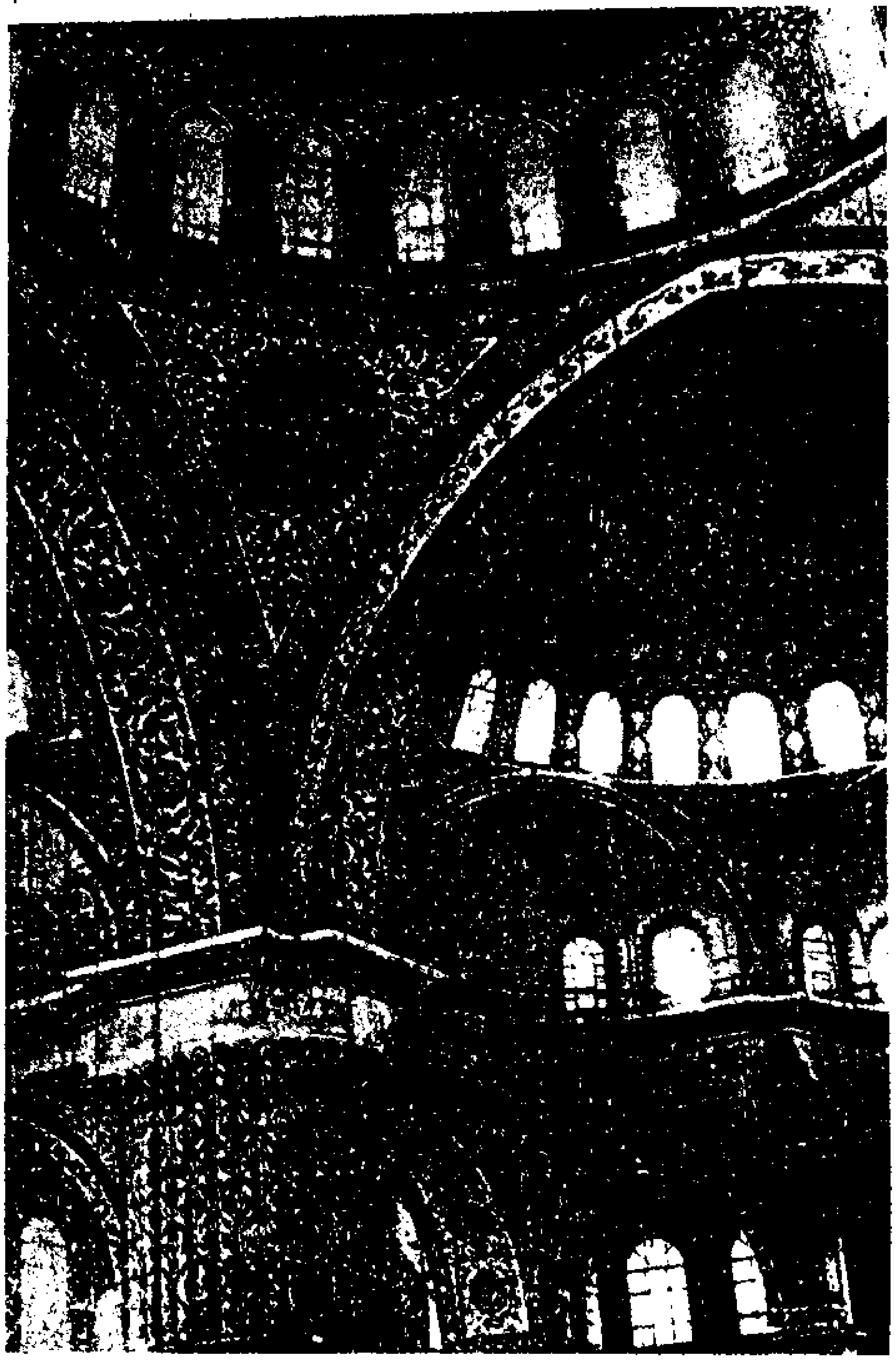

نیلی مسجد (استنبول) کا اندرونی والان

۱۸۷۶ء میں اراکین سلطنت نے سلطان عبدالعزیز کو برطرف کر کے اس کے بیٹے سلطان مراد خامس کو سلطنت عثمانیہ کا وارث بنایا۔ لیکن وہ چونکہ پہلے ہی اعصابی مریض تھا اس لئے تین ماہ بعد تخت سے برطرف کر دیا گیا۔

ستمبر ۱۸۷۶ء میں مراد خامس کا بھائی عبدالحمید ثانی سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء کو دستور اساسی کے اعلان کے روز قسطنطنیہ میں بڑی طاقتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ بوسنیا، ہرزیگوینا اور بلغاریا کے حکمران دولت عثمانیہ پہلے پانچ سال تک بڑی طاقتوں کی منظوری سے مقرر کرے۔ لیکن ترکوں نے اسے منظور نہ کیا تو انہوں نے دولت عثمانیہ کو لکھا کہ اگر یہ تجویز ایک ہفتے کے اندر اندر منظور نہ کی تو وہ قسطنطنیہ سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۷۷ء میں وہ قسطنطنیہ سے چل دیے۔

۱۸۷۷ء میں روس نے پھر جنگ چھیڑ دی جس میں ترکوں کو پسپا ہونا پڑا ۳۱ جنوری کو ایک صلحنامے پر فریقین کے دستخط ہوئے۔ ۳ مارچ کو دونوں مملکتوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا، جو معاہدہ سان سٹیفانو کے نام سے موسوم ہوا۔

۱۳ جون کو معاہدہ برلن کے نام سے بڑی طاقتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو دولت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات کے لیے ایک تباہ کن معاہدہ

Marfat.com

بعد ہوا۔ عثمانی صوبوں کی جگہ یونان، سربیا، بلغاریا، رومانیہ اور مونٹی نگرو کی خالص العنان حکومتیں معرض وجود میں آگئیں اور باقیماندہ صوبوں میں بھی آزادی حاصل کرنے کی تحریک چل نکلی۔

افریقہ کی ساحلی حکومتیں سلطنت عثمانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر علم خود اختیاری بلند کرتی چلی گئیں اور دول مغرب ان پر بری طرح جھپٹ پڑیں۔ چنانچہ مصر پر انگلستان نے قبضہ جمایا۔ تونس اور الجزائر فرانس کے قبضے میں آئے اور طرابلس اٹلی کے حصے میں آیا۔

۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی کے بعد اس کا بھائی محمد خامس سلطنت عثمانیہ کا فرمانروا بنا۔

۱۹۱۰ء تک حکومت اٹلی یہی اعلان کرتی رہی تھی کہ وہ دولت عثمانیہ کے کسی حصے پر نظر ہوس نہیں ڈالے گی۔ لیکن اس اعلان کے تقریباً دس ماہ بعد اس نے سلطنت عثمانیہ سے جنگ چھیڑ دی اور پچاس ہزار کا ایک لشکر طرابلس پر چڑھائی کر دی۔ تاہم اس جنگ میں اٹلی کو منہ کی کھانی پڑی اطالویوں نے اس شکست کے بعد ترکوں پر انتہائی وحشیانہ مظالم توڑنا شروع کر دیئے جب یہ بھی نہ نے پر نہ بیٹھا تو بحری جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور ۱۹۱۲ء میں رہوڈس اور بحیرہ آژ کے بعض جزیروں پر قابض ہو گئے۔ اسی دوران میں بلقان میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور سلطان کو ان حالات سے مجبور ہو کر اٹلی سے صلح کرنا پڑی دونوں ممالک کے درمیان ایک صلحنامہ ہوا جو لوزان کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی رو سے طرابلس اٹلی کے قبضے میں چلا گیا۔ اٹلی نے وعدہ کیا کہ وہ بحیرہ آژ (ایجین) کے مفتوحہ جزائر سلطنت عثمانیہ کو واپس کرے گا لیکن اٹلی کا یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوا۔

۱۹۱۲ء میں ایک طرف تو بلقانی ریاستیں متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دوسری طرف ترکوں کی اندرونی حالت انتہائی نازک ہو رہی تھی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ بلقان میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ ۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو سلطنت عثمانیہ سربیا اور بلغاریا کے درمیان ایک عارضی صلح ہوئی لیکن یونان اور مونٹی نگرو سے لڑائی جاری رہی۔ اس وقت تقریباً تقریباً سارا تھریس اور اپائرس کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ یورپ میں صرف ادرنہ، سقوطری قسطنطنیہ اور یانینا ان کے پاس رہ گئے تھے۔ ان کا بھی دشمن نے محاصرہ کر رکھا تھا۔ ار جنوری ۱۹۱۳ء میں لندن کی صلح کانفرنس میں طے پایا کہ ادرنہ ریاست ہائے بلقان کے حوالے کر دیا جائے اور آژ جزائر کا معاملہ دول عظمیٰ کے فیصلے پر چھوڑ دیا جائے صدر اعظم کامل پاشا دول عظمیٰ کے اس فیصلے کو ماننے کے لیے تیار تھا۔ لیکن انور بے نے اس یادداشت کو پھاڑ دیا جو کامل پاشا کی طرف سے دول عظمیٰ کو بھیجی جانے والی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے موجودہ وزارت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے نتیجے میں نئے سرے سے جنگ چھڑ گئی۔ ۲۶ مارچ کو بلغاریا نے ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۲۰ جولائی کو ادرنہ واپس ترکوں کے پاس آگیا۔ ۲۹ ستمبر کو سلطنت عثمانیہ اور بلغاریا کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے دولت عثمانیہ کے پاس ادرنہ دلیمو ٹیکا اور قرق کلیسا باقی رہ گئے اور باقی سارا علاقہ ریاست ہائے بلقان کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی تو ترکوں کو مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔

۱۔ سلطنت عثمانیہ ان پابندیوں سے جو یورپی طاقتوں نے مراعات خصوصی کے نام سے ان پر عائد کر رکھی تھیں آزاد ہونا چاہتی تھی۔ ترک اتحادیوں کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن اتحادی روس کی وجہ سے انھیں اپنے مقاصد ملنے کے روادار نہ تھے۔ چنانچہ ترکوں کو ان کے مخالف کا ساتھ دینا پڑا۔

۲۔ روس عرصہ دراز سے ایسے وقت کی تلاش میں تھا کہ جونہی اسے موقع ملے وہ قسطنطنیہ کو ہڑپ کر جائے۔ چنانچہ ترکوں کے لیے روس کی مخالف طاقتوں کا ساتھ دینا لازمی تھا۔

۳۔ اتحادیوں نے ہمیشہ دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کے لیے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی اور اقتصادی برتری قائم و استوار کر دیں اس وجہ سے بھی ترکوں کو ان کے مخالف فریق کا ساتھ دینا پڑا۔

۴۔ ترکوں کا ایک بااقتدار فریق جرمن کا ساتھ دینا چاہتا تھا کیونکہ جرمن روس کا دشمن اور روس دولت عثمانیہ کا دشمن تھا۔ انور پاشا جرمن سے اتحاد کرنے میں پیش پیش تھا۔ اگست ۱۹۱۴ء کے معاہدے میں جو قسطنطنیہ میں جرمنی اور دولت عثمانیہ کے درمیان طے پایا ترکوں نے انگلستان اور فرانس کے متعلق غیر جانبدار رہنے کا اظہار کیا۔ وہ صرف روس کے مقابلے میں جرمنی کی حمایت کے طلبگار تھے

۵۔ ترکی ابھی تک فرانس اور انگلستان کے بارے میں غیر جانبدار تھا لیکن برطانیہ نے انگلستان میں جو تعمیر ہونے والے ترکی جہاز، جن کی رقم بھی ادا کر دی گئی تھی جرمن کے اعلان جنگ کے ہوتے ہی ضبط کر لیے حالانکہ ترکی ابھی تک برطانیہ کے مقابلے میں نہ آیا تھا۔ چنانچہ ترکوں کو جرمنی کا ساتھ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ جنگ کے شروع میں دولت عثمانیہ نے دس لاکھ سے زیادہ فوج میدان جنگ میں روانہ کی تھی جس میں چار لاکھ ستائیس ہزار مقتول اور چار لاکھ مجروح ہوئے۔ ایک لاکھ تیرہ ہزار قیدی لاپتا ہوئے۔ مالی نقصان بھی بے انتہا ہوا۔ اب جنگ کے اختتام پر ترکی کے حلیف بلغاریا نے اتحادیوں سے غیر مشروط اظہار اطاعت کر دیا تھا۔ جرمنی خود جنگ سے دست کش ہو رہا تھا۔ ان حالات میں ترکی کے لیے اتحادیوں سے صلح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

۱۹۱۸ء میں محمد خامس کا بھائی محمد سادس تخت نشین ہوا۔ اس دوران میں جو ترک مثلاً انور پاشا، جمال پاشا اور انجمن اتحاد و ترقی کے بہت سے رکن جو اتحادیوں کی شرائط پر متفق نہیں ہو سکتے تھے وطن عزیز کو خیرباد کہہ گئے۔

ترکوں کی فوجی طاقت کی شکست و ریخت اور عام بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر اتحادی ان خفیہ معاہدوں کی تکمیل کرنے لگے جو دوران جنگ میں کیے گئے تھے چنانچہ معاہدہ قسطنطنیہ، معاہدہ لندن اور معاہدہ سائیکس پیکو کی شرائط کے مطابق دولت عثمانیہ کے مقبوضات پر قابض ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں نے یونانیوں کو سمرنا پر بھی قابض ہونے کا حکم دے دیا۔ سمرنا پر یونانی قبضے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح دولت عثمانیہ کے پورے طول و عرض میں پھیل گئی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے منعقد ہوئے اور دیکھا دیکھ مملکت کے گوشے گوشے میں قومی تحریک کی لہر دوڑ گئی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ترکی اور فرانس میں ایک معاہدے کے تحت فرانس نے سلیشیا کا علاقہ ترکی کے حوالے کر دیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء میں معاہدہ لوزان کی رو سے مشرقی تھریس، ادرنہ اور قسطنطنیہ بھی ترکی سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔ اس تحریک کی روح رواں مصطفےٰ کمال پاشا تھے۔ چنانچہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوئی۔

مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کر دی گئی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۴ء کے بعد سے ترکی

Marfat.com

ایک جمہوری سلطنت قرار دی گئی۔ آئین میں جمہوریت کا سربراہ صدر مقرر کیا گیا جس کی مدت صدارت چار سال قرار پائی۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا پہلے صدر جمہوریہ قرار پائے اور ۱۹۳۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۱۹۲۵ء میں روس کے ساتھ غیر جانب داری، عدم جارحیت اور بین الاقوامی تعاون کا معاہدہ ہوا۔

۱۹۳۰ء میں یونان سے معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں ترکی لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) کا رکن بنا۔

۱۹۳۷ء میں عراق، ایران اور افغانستان کے ساتھ باہمی دوستی کا معاہدہ ہوا۔ اسی سال عصمت انونو پندرہ سال وزیر اعظم رہنے کے بعد وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے۔ اور جلال بایار وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء میں عصمت انونو ترکی کے دوسرے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۳۹ء میں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے فرانس نے اسکندرونہ کا علاقہ ترکی کو واپس کر دیا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو ترکی عرصہ دراز تک غیر جانبدار رہا۔

۱۹۴۳ء میں عصمت انونو دوسری مرتبہ صدر منتخب ہوئے اور سراج اوغلی وزیر اعظم بنائے گئے۔

۱۹۴۴ء میں ترکی جرمنی سے تعلقات ختم کر کے جنگ میں شریک ہو گیا جنگ کے اختتام پر ترکی اقوام متحدہ کا رکن بنا۔

۲۲ر مئی ۱۹۵۰ء میں جلال بایار صدر ترکیہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں ترکی نیٹو کا رکن بنا۔

۱۹۵۵ء میں معاہدہ "بغداد" ہوا جو عراق سے تعاون اور دفاع کا معاہدہ تھا۔ بعد ازاں جس میں برطانیہ، ایران اور پاکستان بھی شامل ہو گئے۔ اور جب انقلاب عراق کے بعد ۱۹۵۸ء میں سینٹو کا نام دیا گیا۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر انقرہ میں ہے۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۱ء جمال گرسل ترکی کے صدر بنے ان کے عہد میں ۲۱ر جولائی ۱۹۶۴ء کو عالم اسلام کے تین بڑے ممالک پاکستان، ایران اور ترکی کے درمیان اس دائمی رشتہ اخوت کی تجدید ہوئی جسے نامساعد حالات نے کمزور کر دیا تھا یہ اتحاد عالم اسلام کی طرف ٹھوس قدم تھا۔ جس سے عالم اسلام میں ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ آر، سی، ڈی (علاقائی تعاون برائے ترقی) کے نام سے ایک معاہدہ طے پایا۔

۲۹ر مارچ ۱۹۶۶ء کو جودت سنائے ترکی کے نئے صدر منتخب ہوئے۔

۶ر اپریل ۱۹۷۳ء سے فہری کوروتورک ترکی کے صدر ہیں۔ اور سلیمان دیمریل وزیر اعظم ہیں۔

اقتصادی و دیگر معلومات:۔ ترکی ایشیا اور یورپ کے وسط میں ایک انتہائی اہم ملک ہے۔ صدر مقام انقرہ ہے۔ ترکی کی آبادی ۱۹۷۶ء میں ۴ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ جس میں تین کروڑ ترک، پچیس لاکھ کرد، چار لاکھ عرب، اور باقی دیگر اقوام یونانی، آرمینی اور یہودی وغیرہ آباد ہیں۔ قانونی طور پر مذہبی آزادی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی مردم شماری کی رو سے ترکی میں مسلمان تین کروڑ چودہ لاکھ تھے۔ باقی عیسائی، یہودی اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیمی لحاظ سے ترکی ایشیا بھر میں سب سے آگے ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ مخلوط تعلیم کا رواج ہے۔ تین یونیورسٹیاں استنبول میں۔ تین انقرہ۔ ایک ایک یونیورسٹی

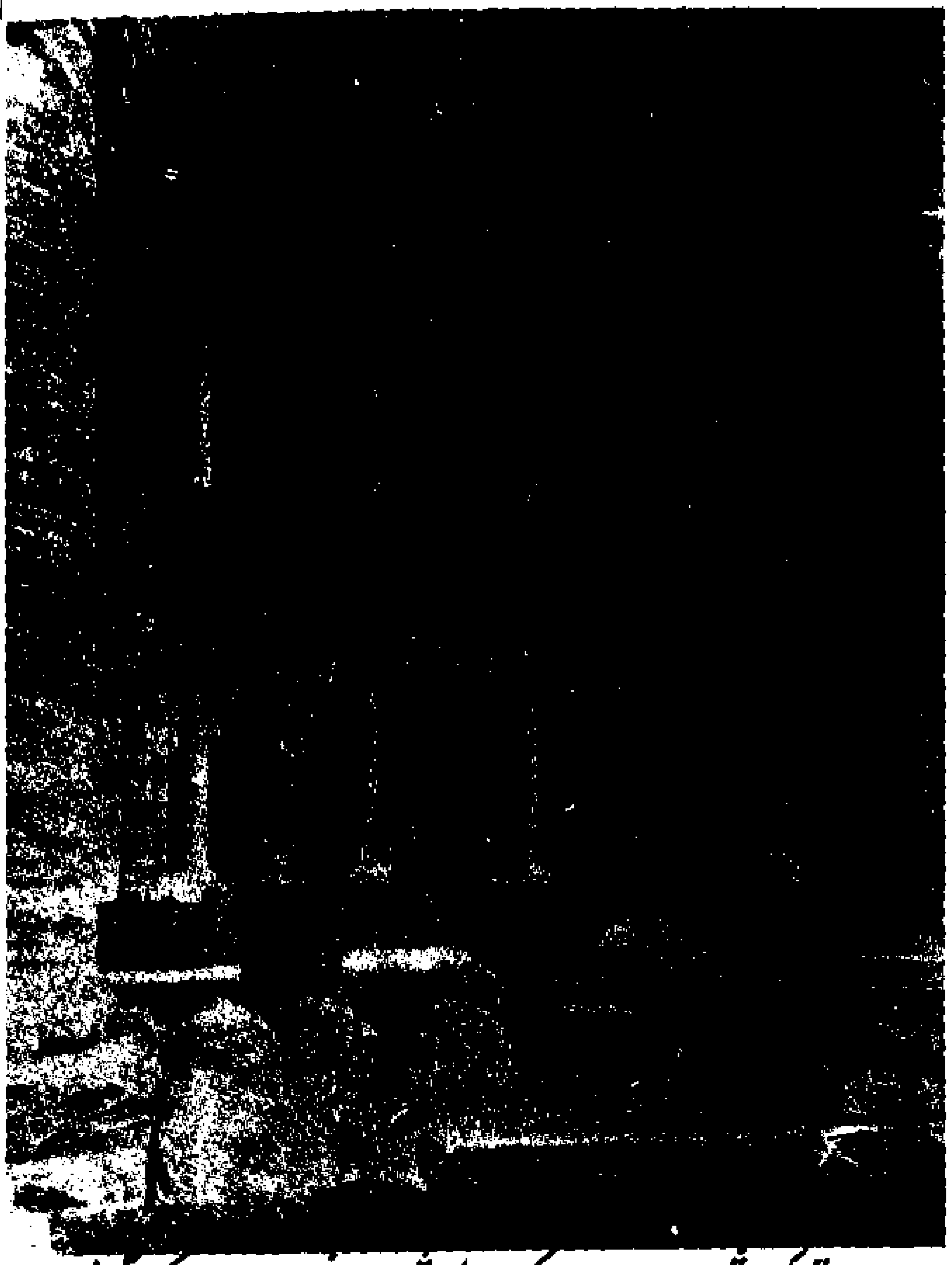

قدیم ترکی شہر (اصحاب کہف کا شہر) افسوس کے آثار

ازمیر، ارض روم، ترابزون اور سیواس میں قائم ہیں۔ خواندگی کا تناسب ۱۹۲۷ء میں ۱۰٪، ۱۹۳۵ء میں ۲۰٪، ۱۹۴۵ء میں ۳۰٪، ۱۹۶۵ء میں ۴۸٪ اور ۱۹۷۰ء میں ۴۹٪ تھا۔ سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم ترکی ہے۔ جسے یکم نومبر ۱۹۲۸ء سے لاطینی (رومن) رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ عربی رسم الخط اور عربی زبان کی تدریس و اشاعت ممنوع ہے۔ مساجد میں بھی سرکاری طور پر عربی زبان کی جگہ ترکی کو اختیار کیا گیا ہے۔

ترکی کا سکہ لیرا کہلاتا ہے۔ جو سو قروش میں تقسیم ہوتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ۲۲ ارب لیرا کی درآمدات اور ۱۲ ارب لیرا کی برآمدات کی گئیں۔ اس سے ترکی کی درآمد اور برآمدی توازن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ درآمدات میں مشینیں، لوہا، فولاد، تیل، کپڑا اور دیگر ریشے، ادویہ اور رنگ و روغن اہم ہیں۔ برآمدات میں تمباکو، پھل، کپاس، معدنیات اور جو، جوار، باجرہ وغیرہ شامل ہیں۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

ترکی کی معیشت کا زیادہ تر دار و مدار زراعت پر ہے۔ ۱۹۷۰ء میں زرعی پیشہ افراد کی تعداد ایک کروڑ تھی۔ اور تقریباً سولہ لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ زیر کاشت تھا۔ اہم پیداوار تمباکو، گندم، جو، جوار، باجرہ، مکئی، کپاس، پھل، خشک پھل، انجیر، بادام، ناریل وغیرہ ہیں۔ معدنیات میں کوئلہ، گندھک، خام لوہا، تانبا اور پٹرولیم اہم ہیں۔ دیگر صنعتوں میں کھال، اون، سیمنٹ، کاغذ، بجلی اور فوجی سامان کی صنعتیں اہم ہیں۔ دریاؤں سے پیدا کردہ پن بجلی کی مقدار ۵۶ ارب کلوواٹ ہے ملک بھر میں ریل اور سڑکوں کا جال بچھا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ترکی کی ریل کی کل پٹڑی ۸۱۳۳ کلومیٹر اور سڑکوں کی کل لمبائی ۶۰ ہزار کلومیٹر تھی۔ مجموعی طور پر

Marfat.com

ترکی ایک ترقی پذیر ملک ہے۔

ترمذ روسی ترکستان کا ایک شہر، جو آمو دریا کے شمال کنارے پر دریائے سرخان کے دہانے کے قریب واقع ہے۔ اس شہر کی بنیاد بقول حافظ ابرو سکندر اعظم نے رکھی تھی۔ اگرچہ قدماء کے ہاں اس بات کا ذکر موجود نہیں۔

جب مسلمان وہاں پہنچے تو ترمذ میں بدھ مت عروج پر تھا اور وہاں ایک ہزار کے قریب بھکشو موجود تھے۔ اس زمانے میں ترمذ ایک بہت بڑے حکمران کے ماتحت تھا جو شاہ ترمذ کے لقب سے مشہور تھا۔ اس زمانے میں دریا کے کنارے ایک مستحکم قلعہ تھا۔ ترمذ کو ۷۰ھ/۶۸۹ء میں موسیٰ بن عبداللہ بن خازم نے فتح کیا اور تقریباً پندرہ سال تک اسلامی حکومت سے بغاوت کر کے اس پر قابض رہا۔ یہاں تک کہ ۸۵ھ/۷۰۴ء کے آخر میں عثمان بن مسعود نے مفضل بن مہلب کے حکم سے اسے فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کیا۔

مقدسی کے بقول ترمذ آمو دریا پر ایک اہم بندرگاہ تھی۔ یہاں کشتیاں بنا کر باہر بھیجی جاتی تھیں۔ یہاں کا صابن مشہور تھا۔

سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں یہ شہر دوسرے شہروں کی طرح جو دریائے جیحون کے شمال میں تھے۔ بلخ کے تابع رہا اور غزنی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ ۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء میں جب ماوراءالنہر کی حکومت قرہ ختائیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو بھی ترمذ پر سلجوقیوں ہی کا قبضہ رہا۔ ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں سلطان سنجر نے ترمذ ہی میں پناہ لی۔ اس کے بعد قرہ ختائیوں کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ ۶۰۱ھ/۱۲۰۵ء میں عمادالدین عمر جو غوریوں کی طرف سے بلخ کا حاکم تھا، ترمذ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بہرام شاہ یہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ لیکن ایک سال بعد ہی خوارزم شاہ محمد نے ترمذ فتح کر کے قرہ ختائیوں کو لوٹا دیا۔ جب سلطنت قرہ ختائی کو زوال آگیا تو یہ شہر خوارزم شاہ کی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ ۶۱۷ھ/۱۲۲۱ء میں منگولوں کے ہاتھوں یہ شہر بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔

ابن بطوطہ جب بلخ پہنچا تو ترمذ کی حالت بہتر ہو چکی تھی۔ جبکہ بلخ ابھی کھنڈرات ہی کی شکل میں تھا۔ ترمذ اپنے پہلے مقام سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر دوبارہ آباد ہوا۔ اور اس کی حیثیت ایک اہم اور بڑے شہر کی تھی۔ باشندے خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ منگول حملے کے بعد ترمذ کو مدینۃ الرجال (مردوں کا شہر) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء میں خلیل سلطان نے ترمذ کہنہ کو دوبارہ تعمیر کروایا۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی سے ترمذ ازبکوں کی حکومت میں شامل رہا۔

بلخ کی لڑائی میں جو ازبکوں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان زمانہ شہزادگی میں ہوئی ترمذ پر ہندوستانی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔

بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں یہ شہر شیر علی کے قبضے میں آگیا۔ بعد کے زمانے میں فسادات کی وجہ سے یہ شہر ایک بار پھر تباہ و برباد ہوا۔ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۸ء میں محمد رحیم خان نے اس شہر کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ لیکن اس شہر کی قسمت میں ایک بار پھر بربادی و تباہی لکھی تھی۔

تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے وسط میں ترمذ کہنہ کے کھنڈرات کے قریب حصار اور صالح آباد جو بخارا کے امیر کے علاقے تھے ... ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں ترمذ کے کھنڈرات سے تقریباً ... میل کے فاصلے پر ایک روسی قلعہ تعمیر ہوا جو آہستہ آہستہ شہر بن گیا۔ اس وقت ترمذ میں زیادہ آبادی روسیوں کی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں ترمذ ریلوے کا افتتاح ہوا۔ لیکن انقلاب کے دوران میں یہ ریلوے لائن تباہ کر دی گئی۔ جسے اب دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے۔

ترمذ کے آثار قدیمہ میں ابوعبداللہ محمد بن علی کا مقبرہ جو نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا تھا، ایک نفیس ترین عمارت ہے اس کا شمار وسط ایشیا کی خوبصورت ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ ترمذ نے کئی ایک مشہور ہستیوں کو جنم دیا جنہوں نے اسلامی دنیا میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔ ایسی ہی مشہور شخصیتوں میں سے ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی ہیں جو محدث اور عالم دین تھے ان کی تصنیف کو صحاح ستہ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

دوسری شخصیت ابوعبداللہ محمد بن علی ترمذی ہیں جو امام بخاری کے ہم سبق تھے۔

ترمذی، ابوعبداللہ (وفات ۲۸۵ھ/۸۹۸ء) محمد بن علی بن حسین الحکیم خراسان کے عالم دین، محدث، فقیہ اور صوفی۔

آپ کے حالات کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ آپ کے مزار پر جو کتبے ہیں ان سے "تذکرۃ الاولیا" اور "نفحات الانس" میں درج معلومات کی تصدیق ہوتی ہے علاوہ ازیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ بھی بعض انہی شیوخ کے شاگرد تھے جن سے امام بخاری نے تلمذ کیا تھا۔

آپ کی تصانیف کی تعداد تیس سے اوپر بنتی ہے۔ ان تصانیف میں "نوادر الاصول" "ختم الولایہ" (جن میں آپ نے بعض مسائل کی تفسیر اور وضاحت تصوف کے رنگ میں کی ہے۔ مثلاً نور محمدی کا ازل سے موجود ہونا۔ حقیقت آدمیت، علم ملائکہ، ولایت کے معیار وغیرہ) "علل العبودیہ"، "شرح الصلوٰۃ"، "الحج واسرارہ"، "کتاب الفروق"، "کتاب الاکیاس" وغیرہ مشہور ہیں۔

تصوف کی تاریخ میں آپ سب سے پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طبقات صوفیہ پر پہلی کتاب لکھی۔ ابن العربی آپ کی تصانیف کو تین سو سال بعد بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس طرح وہ شیخ اکبر کے پیشرو ہیں۔

ترمذی، ابوعیسیٰ (۲۰۹ھ/۸۲۴ء - ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن ضحاک السلمی مشہور محدث اور عالم دین۔ آپ کی نسبت ترمذ سے ہے آپ کے دادا اصلاً مروزی الاصل تھے کسی وجہ سے ترمذ آکر آباد ہو گئے تھے۔

آپ کے ابتدائی حالات زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں کہا جاتا ہے کہ پیدائشی نابینا تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ آپ نے احادیث جمع کرنے کے لیے خراسان، عراق اور حجاز کے طویل سفر کیے۔

آپ کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، قتیبہ بن سعید، علی بن حجر، محمد بن بشار وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ آپ کا حافظہ بلا کا تھا۔ حاکم نے عمرو بن علک کا ایک قول بیان کیا ہے کہ امام بخاری کے بعد ابوعیسیٰ علم، حافظے اور زہد و ورع میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے حافظے کے بارے میں ایک روایت ہے۔

Marfat.com

آپ فرماتے تھے کہ میں نے شیخ کی روایات کے دو اجزاء ان سے نقل کئے۔ لیکن اب تک انہیں پڑھ کر سنانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے راستے میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوگئی تو میں نے شیخ سے ان اجزاء کی قرأت کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمالیا اور کہا کہ ان اجزاء کو ہاتھ میں رکھیں میں پڑھتا جاتا ہوں اور تم مقابلہ کرتے جاؤ۔ میں نے جب ان اجزاء کو تلاش کیا تو وہ اتفاقاً میرے پاس نہیں تھے چنانچہ میں نے دو سادے کاغذ ہاتھ میں پکڑ لئے اور سننے میں مشغول ہوگیا۔ اسی دوران میں شیخ کی نظر ان کاغذوں پر پڑی تو وہ ناراض ہوکر فرمانے لگے "کیا تو مجھ سے مذاق کرتا ہے۔" پس میں نے انہیں تمام قصہ کہہ سنایا اور عرض کی کہ اگرچہ وہ اجزاء میرے پاس نہیں ہیں تاہم لکھے ہوئے اجزاء سے مجھے زیادہ یاد اور محفوظ ہیں۔ شیخ نے فرمایا اچھا سناؤ تو میں نے وہ سب احادیث سنا دیں۔ شیخ نے تعجب کیا تو میں نے عرض کی اب کی بار پھر امتحان لے لیں تو انہوں نے چالیس احادیث اور پڑھیں جنہیں میں نے صحیح صحیح سنا دیا تو شیخ نے فرمایا میں نے تجھ جیسا محنتی نہیں دیکھا۔

امام ترمذی نے جابجا اپنے آپ کو اہل حدیث میں شمار کیا ہے اور جامع ترمذی میں اپنی مستقل رائے پیش کی ہے۔ اکثر علماء نے انہیں شافعی اور حنبلی کہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ مقلد نہ تھے بلکہ خود امام اور مجتہد تھے۔

آپ سے بے شمار تلامذہ نے استفادہ کیا ہے۔ ان تلامذہ میں سے احمد بن عبداللہ المروزی، ہیثم بن کلیب الشاشی، محمد بن احمد بن محبوب، احمد بن یوسف النسفی، اسعد بن حمدویہ، داؤد بن نصر ابزودی، محمد بن منذر الفروی، ابوذر محمد بن ابراہیم، ابو محمد حسن بن ابراہیم، ابوالحسن دانزری، محمد بن سفیان خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ اگرچہ امام بخاری کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن امام بخاری نے بھی آپ سے دو احادیث کا سماع کیا ہے۔ آپ کی تصانیف میں۔

"الجامع الترمذی (ترمذی شریف)" "کتاب العلل الصغیر"، "علل الکبیر" "کتاب التاریخ"، "کتاب الزہد"، "کتاب الاسماء والکنیٰ"، "کتاب الشمائل النبوۃ" شامل ہیں۔ "جامع ترمذی" آپ کی مشہور ترین کتاب ہے۔

آپ کا انتقال ترمذ میں ہوا۔ لیکن بقول سمعانی اور یاقوت آپ نے ۲۷۵ھ / ۸۸۹ء میں قریہ بوغ میں جو ترمذ سے چھ فرسخ کے فاصلے پر تھا انتقال کیا۔ (نیز دیکھئے "ترمذی شریف")

ترمذی، امام: مشہور محدث (دیکھئے "ترمذی، ابوعیسیٰ")

ترمذی، برہان الدین ایک بزرگ صوفی جو سید حسین ترمذی، سید سرداں اور برہان الدین محقق کے ناموں سے مشہور ہیں۔ مولانا بہاؤالدین ولد کے مرید تھے۔ کچھ مدت مولانا سے علم ظاہری کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مجاہدے اور ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ یہاں تک کہ ترمذ ہی میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کے بہت سے عقیدت مند بھی یہاں آپ کے پاس سکونت پذیر ہوگئے۔ جب مولانا بہاؤالدین ولد کا قونیہ میں انتقال ہوگیا تو آپ ۶۲۹ھ / ۱۲۳۲ء میں قونیہ چلے گئے۔ یہاں پر جلال الدین رومی کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہنے۔ جو ابھی نو عمر تھے اور فقہ و ادب کے طالب علم تھے۔ نو سال بعد آپ قیصریہ میں جاکر معتکف ہوگئے۔ منگولوں کے قتل عام کے دوران میں آپ اسی جگہ پر موجود تھے۔ جو سلجوقوں کی طرف سے اس علاقے کے والی اور آپ کے مرید خاص شمس الدین اصفہانی نے آپ کی وفات کے بعد تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور اسی نے آپ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔

آپ کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بقول اولیاء چلپی آپ کا انتقال ۶۷۴ھ/۱۰۸۱ء میں ہوا۔

آپ کو فرقہ مولویہ کی روایات میں جو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہی آپ کی شہرت کا خاص باعث ہے۔

"ترمذی شریف" کتب احادیث کے مجموعہ "صحاح ستہ" کی ایک اہم کتاب اس کے مصنف ابوعیسیٰ محمد بن سورہ ترمذی ہیں۔ خطیب بغدادی اور امام حاکم نے جامع ترمذی کو الصحیح کے نام سے یاد کیا ہے۔ کیونکہ جامع میں ضعیف احادیث بھی ہوتی ہیں۔ حافظ ابن اثیر نے جامع الاصول کے مقدمے میں جامع ترمذی کے بارے میں لکھا ہے۔ "اس کا شمار الصحیح میں ہے۔ اس کی ترتیب اچھی ہے اور تکرار کی قلت ہے۔

ترمذی کے بارے میں علمائے اندلس نے ایک بہترین قصیدہ کہا ہے۔

بقول شاہ عبدالعزیز صاحب "بستان المحدثین" "فن حدیث میں امام ترمذی کی جامع بعض وجوہ سے جملہ کتب احادیث سے احسن ہے۔ اولاً حسن ترتیب عدم تکرار دوم مذاہب کا بیان اور ان کے ادلہ کا ذکر سوم، انواع حدیث میں صحیح و ضعیف، غریب اور معلل وغیرہ کا بیان چہارم راویوں کے نام کنیت والقاب اور علم رجال کے متعلق دیگر فوائد بیان کرنے کی وجہ سے۔

صحت و شہرت کے اعتبار سے اہل علم نے کتب احادیث کو پانچ طبقوں میں شمار کیا جاتا ہے جامع ترمذی ان میں سے دوسرے طبقے کی کتاب ہے۔ صحاح ستہ میں صحیح مسلم کے بعد اسے دوسرا مقام دیا جاتا ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حدیث کے مختلف علوم کی نشاندہی ملتی ہے جس سے اس کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً۔

۱۔ اصناف فوائد پر کتاب کی تالیف و ترتیب کے ساتھ بیان سند۔ ۲۔ تصحیح حدیث ۳۔ سقم روایت کا بیان ۴۔ تعدد طرق کار کا ایراد۔ ۵۔ جرح رواۃ۔ ۶۔ تعدیل رواۃ، ۷۔ راویوں کے نام کا تعین۔ ۸۔ راویوں کی کنیت کا ذکر۔ ۹۔ بیان وصل۔ ۱۰۔ بیان قطع۔ ۱۱۔ معمول بہ کا اظہار، ۱۲۔ متروک کا ایضاح۔ ۱۳۔ رد و قبول آثار کے متعلق علماء کا اختلاف۔ ۱۴۔ تاویل حدیث میں اختلاف۔ ترمذی شریف میں بخاری اور مسلم کے مقابلے میں احادیث بہت کم ہیں اور تکرار بھی ان سے کم ہے۔

جامع ترمذی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کے سلسلے میں امام ترمذی نے چار شرطوں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

۱۔ وہ روایات لائی جائیں جو صحیح ہوں نیز صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے موافق اور ان کی شرائط کے مطابق ہوں۔

۲۔ جو امام ابوداؤد اور نسائی کی شروط کے موافق ہوں اور یہ کہ امام ابوداؤد اور امام نسائی کے ہر اس راوی سے جس کے ترک پر اجماع نہ ہو روایت لیں گے۔

۳۔ صرف اس ضعیف روایت کو لیا جائے جو حسن لغیرہ کے قبیل سے ہو کیونکہ اس کے ساتھ سلف کی ایک جماعت کے مسلک کی مطابقت ہوتی ہے۔

Marfat.com

۴۔ طبقہ اولیٰ کے رواۃ کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ طبقہ اولیٰ اور ثانیہ سے زیادہ روایات لی ہیں۔ طبقہ ثالثہ اور رابعہ سے نسبتاً کم اور طبقہ خامسہ سے استشہاداً یا شاذونادر اعتبار کے طور پر روایت لی ہے۔

ترمذی شریف ہر زمانے کے علماء میں متداول رہی ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن کی تعداد پچیس کے قریب ہے۔ ان میں سے مشہور مشہور شروح یہ ہیں۔

۱۔ عارضۃ الاحوذی :۔ حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ الاشبیلی کی۔
۲۔ المنقح الشذی :۔ حافظ ابوالفتح محمد بن محمد کی جو سیدالناس الشافعی کے نام سے مشہور ہیں اور ائمہ حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔
۳۔ شرح الزوائد :۔ حافظ عمر بن علی بن احمد کی ہے۔ جنہوں نے بکثرت شروح اور علوم حدیث پر کتابیں لکھی ہیں۔
۴۔ قوت المغتذی :۔ حافظ جلال الدین سیوطی کی ہے جو فن حدیث کے بہت ماہر تھے
۵۔ مختصر الجامع :۔ نجم الدین محمد بن عقیل الباسی نے لکھی۔
۶۔ ایک شرح ابوالحسن بن عبدالهادی کی ہے جو چالیس اجزاء پر مشتمل ہے۔
۷۔ معارف السنن :۔ علامہ محمد یوسف بنوری نے لکھی ہے چھ جلدوں میں ہے۔
۸۔ التعلیقات علی الترمذی :۔ جو شیخ احمد بن شاکر نے لکھی ہے۔ اس شرح کے ساتھ جامع ترمذی کے متن کی تصحیح کا التزام بھی کیا گیا ہے۔
۹۔ هدیۃ الالمعی بنکات الترمذی :۔ علامہ ابوالطیب محمد شمس الحق نے لکھی ہے
۱۰۔ تحفۃ الاحوذی :۔ یہ شرح علامہ محمد عبدالرحمان محدث مبارک پوری کی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

جامع ترمذی حدیث کی وہ کتاب ہے جو ہر زمانے میں درس نظامی کا ایک حصہ رہی ہے اور اسی وجہ سے مقبول عام ہے۔

ترنم، مولانا غلام محمد (۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۰ء — ۱۸ محرم ۱۳۷۹ھ / ۱۸ جولائی ۱۹۵۹ء) ایک عالم دین، خطیب، طبیب، شاعر و نعت گو والد کا نام عبدالعزیز تھا۔ امرتسر کے ایک غریب کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پروفیسر عبدالرحیم اور مولانا مفتی عبدالصمد خان کاشمیری سے حاصل کی۔ بعد میں قالین بافی اور شال بافی کے فن میں خوب مہارت حاصل کی۔ اور کچھ عرصہ اسی کو ذریعہ معاش بنائے رکھا۔ چند سال بعد مولانا کا دل اس کام سے بھر گیا چنانچہ آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ دی اور حکیم فیروزالدین طغرائی کی خدمت میں حاضر ہوئے منشی فاضل، ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ نیز شاعری میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

علامہ محمد عالم آسی سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں۔ دینی علوم کی تحصیل کے بعد حکیم حاجی محمد علی، حکیم محبوب عالم اور حکیم فتح چند سے طب کی کتابیں پڑھیں اور خاص دسترس حاصل کی۔

آپ بلا کے خطیب تھے لوگ آپ کی تقریر سننے کے لئے جوق در جوق حاضر ہوتے۔ بہت سی خستہ حال مساجد آپ کی سحر بیانی کی وجہ سے جامع مساجد میں تبدیل ہو گئیں۔ کیونکہ آپ شہر کے کسی علاقے کی مسجد میں جا کر خطبہ دینا شروع کر دیتے تھے اور لوگ وہیں پہنچنا شروع کر دیتے۔

آپ ایک ایسے خطیب تھے کہ ذرا سی دیر میں لاکھوں کے مجمع کو ہنسا دیتے اور ذرا سی دیر میں رونے پر مجبور کر دیتے تھے۔

آپ مسلم ہائی سکول شریف پورہ میں مدت تک اسلامیات کے استاد رہے۔ فارغ وقت میں مطب کرتے تھے لیکن آپ کا مطب مفت شفاخانے کی حیثیت رکھتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں جامعہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ اہل سنت والجماعت حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا خصوصاً تحریک پاکستان میں آپ نے بہت کام کئے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ اور سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس مسجد کو جو بہت تنگ تھی اور جس میں نہ دھوپ سے بچاؤ تھا نہ بارش سے آپ کی ترغیب دلانے پر ایک بہترین جدید مسجد کی شکل دی گئی۔

آپ ایک عرصے تک جمعیۃ العلمائے پاکستان پنجاب کے صدر رہے۔ تحریک ختم نبوت کے دوران میں آپ چھ ماہ سے زائد عرصہ تک قید میں رہے۔

وفات سے تین سال قبل ذیابیطس کا مرض لاحق ہوا۔ جس سے دل بڑھ گیا آخری دو ماہ میں مرض نے شدت اختیار کر لی۔ آخر کار اسی مرض نے انہیں موت تک پہنچا دیا۔

مولانا ترنم کا مزار قبرستان میانی صاحب میں ہے جہاں ہر سال جولائی کے آخری اتوار کو عرس ہوتا ہے۔ آپ کی مصروفیات نے آپ کو تصنیف و تالیف کا موقع نہ دیا۔ اس لئے کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں چھوڑی۔ البتہ آپ کے کلام کو مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔

تَرْوِیَہ لغوی معنی سیراب کرنا، پانی فراہم کرنا، اصطلاح میں ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو یوم ترویہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس روز حاجی مکہ معظمہ میں نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد احرام باندھے منیٰ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ چونکہ منیٰ اور عرفات میں پانی نہیں ملتا اس لئے وہ اپنے ساتھ پانی لے لیتے ہیں۔

اس دن کو یوم النقلہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس روز حاجی لوگ منیٰ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے ترویہ کو رؤیۃ سے مشتق مانا ہے ان نزدیک اس کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ حضرت جبرئیل نے اس روز حضرت ابراہیمؑ کو مناسک حج دکھائے تھے یا یہ کہ اس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب سے ہے جس میں آپ نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالےٰ کی راہ میں قربان کرتے دیکھا تھا۔

تزکیہ نفس نفس کو پاک صاف اور منزّہ کرنا۔ اصطلاح میں نفس کو غلط رجحانات و میلانات سے موڑ کر، نیکی اور خدا ترسی کے راستے پر ڈال دینا اور اس کو درجۂ کمال پر پہنچنے کے لائق بنانا۔ جیساکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے

"اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور پرہیزگاری اس پر الہام کر دی یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا۔ وہ جس نے اسے (گناہوں میں) چھپا دیا۔" (۹۱: ۷ تا ۱۰)

بقول مولانا امین احسن اصلاحی صحیح شعور کے ساتھ نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو مغلوب کرنے کا یہ جہاد قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔

جب ہم تزکیہ نفس کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے معنی اور مفہوم یہ ہے

Marfat.com

کہ نفس کے اندر جو غیر متوازن رجحانات پیدا ہو گئے ہیں، ان کی غلط اٹھان، جاہلی عادات و اخلاق نے اس کے اندر جو کجیاں اور ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں، انہیں درست اور ہموار کیا جائے۔ شیطانی اور نفسانی قوتوں کی چالوں نے اس پر جو پست ہمتی اور بزدلی طاری کر رکھی ہے اس کا علاج کیا جائے۔

اسلام نے تزکیۂ نفس کی اہمیت اور ضرورت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے اللہ تعالے کی غرض و غایت انسانی نفوس کا تزکیہ ہی ہے۔

قرآن مجید میں ابراہیم کی زبانی ہے :

"اے اللہ ان لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔" (۲ : ۱۲۹)

ایک اور جگہ پر اللہ تعالے نے آنحضور کی بعثت اور اس کا مقصد بیان فرمایا ہے :

"چنانچہ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تمہی میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔" (۲ : ۱۵۱)

سورۂ جمعہ میں بھی آپ کی بعثت کی غرض یہی بتائی گئی ہے :

"وہی خدا ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔" (۶۲ : ۲)

ان آیات میں آنحضور کی بعثت کا مقصد تزکیہ ہی قرار دیا گیا ہے اور جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرمایا :

"اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمہیں کیا خبر! شاید وہ تزکیہ حاصل کرنے آیا ہو۔" (۸۰ : ۱ تا ۳)

حضرت موسیٰ کی بعثت کا بھی اہم مقصد تزکیہ ہی قرار دیا گیا :

"فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہو کہ کیا تیرے اندر کچھ رغبت ہے کہ تو تزکیہ حاصل کرے۔" (۷۹ : ۱۷ ، ۱۸)

تزکیۂ نفس ہر شخص کی فلاح و نجات اخروی کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔ چنانچہ اسی چیز کے پیش نظر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

"یقیناً فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو گناہوں میں دھنسا دیا۔" (۹۱ : ۹ ، ۱۰)

مندرجہ بالا آیات سے دین اسلام میں تزکیۂ نفس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ گویا تزکیۂ نفس کی حیثیت غایت و مقصد کی ہے جبکہ دوسری تمام چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تزکیۂ نفس کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا افادہ ہوتا ہے اور اسی کے وہ اسرار و حقائق ہیں جو نبی کے ذریعے سے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ تزکیہ کی حیثیت دینی اعتبار سے محض ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لئے ایک ناگزیر ضرورت اور عزیمت کے طور پر ہے۔ گویا یہ نجات اور فلاح آخرت کے لئے ایک ضروری شرط ہے جسے پورا کئے بغیر انسان آخرت میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

علم تزکیہ صرف نفس کے منفی پہلو ہی سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس کا اصل کام یہ ہے کہ نفس کی ہر پہلو سے ایسی تربیت کرے جس سے نفس "نفس مطمئنہ" بن جاتا ہے یعنی نفس مطمئنہ تزکیہ نفس کا اصل مقصود ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے :

"اے نفس مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔" (۸۹ : ۲۷ ، ۲۸)

تزکیہ کا مطمح نظر صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ انسانی نفس کبھی نہ کسی شکل میں راہ پر لگ جائے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر نفس کو خوب سے خوب تر بنانے کی بھی جدوجہد میں لگا رہتا ہے۔ تزکیہ صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ انسان کو خدا اور اس کی شریعت کا کچھ علم حاصل ہو جائے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہمیں خدا اور اس کے صفات کی سچی اور پختہ معرفت حاصل ہو جائے۔ اس کے پیش نظر صرف یہی نہیں کہ انسانی عادات کسی حد تک سنور جائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان مکارم اخلاق کے پیکر مجسم بن جائیں وہ انسانوں کے اندر رقت و لطافت اور سوز و گداز کی گھلاوٹ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

تزکیہ چاہتا ہے کہ انسان نفس خدا اور اس کے رسول کے حکم کو اس طرح بجا لائے جس طرح اس کا حق ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم خدا کو ان تمام صفات کے ساتھ مانیں اور زندگی کے ہر گوشہ میں اللہ تعالے کے تمام احکامات کی پیروی کریں۔

ایک حدیث میں آنحضور کی ایک دعا کا ذکر آتا ہے :

"اے اللہ! میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطا کر اور پاکیزہ کر تو ہی وہ بہترین ہستی ہے جو اسے پاکیزہ کرے، تو ہی اس کا سرپرست اور مولا ہے۔" (مسلم، احمد، نسائی۔)

تسبیح کا لفظ ذو معنی ہے۔ اس کے ایک معنی پاکی بیان کرنا ہیں اور دوسرے معنی سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ کوشش کرنا ہیں۔ اللہ کی تسبیح کرنے سے مراد ان تمام عیوب اور نقائص اور کمزوریوں سے جو مشرکین اپنے شرک اور انکار آخرت کی وجہ سے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس ذات بے ہمتا کے پاک اور منزہ ہونے کا اعلان و اظہار کرنا ہے۔

تسبیح زبان سے بھی ہوتی ہے اور دل سے بھی۔ اس کے کئی مراتب ہیں ادنیٰ مرتبہ تو زبان سے تسبیح کرنا ہے اور اعلیٰ درجہ زبان اور دل دونوں سے تسبیح کرنا ہے۔

قرآن مجید میں تسبیح کے بارے میں کئی مقامات پر ذکر آیا ہے۔ مثلاً فرشتوں کا بارگاہ الٰہی میں عرض کرنا "آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لئے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" (۲ : ۳۰)

"پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو۔ مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔" (۱۷ : ۴۳ ، ۴۴)

ایک دوسری آیت میں بتایا کہ بے جان مخلوق خدا کی تسبیح کس طرح کرتی ہے۔ "بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں۔" (۱۳ : ۱۳)

"اے محمدؐ! اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں اس کی حمد کے ساتھ اسی کی تسبیح کرو۔" (۲۵ : ۵۸)

Marfat.com

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:-

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔" (٣٣ : ٤٢)

ایک دوسری جگہ حکم دیا گیا۔

"اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو۔ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں بھی اس کی تسبیح کرتے رہو۔" (٧٦ : ٢٥، ٢٦)

غرض اسی طرح بہت سی آیات میں خدا کی تسبیح و تقدیس کرنے کا ارشاد ہوا ہے۔ تسبیح کے بارے میں احادیث میں بھی آیا ہے۔

حضرت سمرہ بن جندب سے روایت ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب سے بہتر وہ کلام ہے جس میں خدا کی تسبیح کی گئی ہو۔" (مشکوٰۃ)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص ایک دن میں سو مرتبہ خدا کی تسبیح کہے اس کے سب گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت جابر سے روایت ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ تسبیح کہنے والے کے لئے جنت میں کھجور کا درخت لگایا جاتا ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

قرآن مجید میں جس جگہ حمد و تسبیح کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد نماز ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ایک حدیث میں تسبیح کے کلمات کے بارے میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ غریب مہاجرین نے حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ مالدار لوگ تو بڑے درجے لوٹ لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا "کیا ہوا" انہوں نے عرض کی کہ وہ بھی نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں مگر وہ صدقہ کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم نہیں کر سکتے۔ آنحضورؐ نے فرمایا "کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں کہ جسے اگر تم کرو تو تم دوسرے لوگوں سے بازی لے جاؤ گے؟ - وہ عمل یہ کہ تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ الحمد للہ اور اللہ اکبر کہا کرو۔"

ایک روایت میں سبحان اللہ اور الحمد للہ ٣٣ - ٣٣ مرتبہ اور اللہ اکبر ٣٤ مرتبہ آیا ہے۔

نماز میں بھی رکوع اور سجدے میں کم سے کم تین مرتبہ تسبیح کہنا سنت ہے رکوع میں سبحان ربی العظیم اور سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے ہیں۔

تسمیہ:- بسم اللہ کا دوسرا نام۔ (دیکھئے "بسم اللہ")

تسنیم لغوی معنی بلند کرنا ہیں۔ اصطلاح میں بہشت کے ایک چشمے کا نام ہے جو بلندی سے بہتا ہوا آتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "بے شک نیک لوگ بڑے مزے میں ہوں گے اونچی مسندوں پر بیٹھے نظارے کر رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر تم خوشحالی کی رونق محسوس کرو گے۔ ان کو نفیس ترین سربند شراب پلائی جائے گی۔ جس پر مشک کی مہر لگی ہو گی جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں، وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں گے۔ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہو گی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس کے پانی کے ساتھ مقرب لوگ شراب پئیں گے۔" (٨٣ : ٢٢ تا ٢٨)

قبر کو ارنٹ کے کوہان کی طرح بالشت بھر اونچا کرنا امام اعظم کے نزدیک تسنیم مسنون ہے۔ آنحضورؐ کی قبر مبارک کو باتفاق صحابہ بلند کیا گیا تھا۔

تشبیہ تمثیل۔ الگری۔ اصطلاح میں ذات خداوندی کے بارے میں خود ایسے نظریات رکھنا جو مسلمہ عقائد سے بالکل مختلف ہیں اور اسلام کے نزدیک گناہ کبیرہ میں شمار ہوتے ہیں یہ نظریات مندرجہ ذیل ہیں۔

١۔ تمثیل و تجسیم۔ اس سے مراد خدا کو انسان جیسا سمجھنا۔

٢۔ تعطیل۔ اس سے مراد خدا کی صفات کی قطعاً نفی کرنا۔

تشبیہ کے ان دو نظریات کے باعث مسلمانوں میں بڑی سخت نزاع بپا رہی ہے۔ خدا کی ذات کا مسئلہ دین کا اساسی مسئلہ ہے۔ اگرچہ دونوں متنازعہ فریقوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن مجید کی آیات سے دلائل دیئے ہیں کہ لفظ تشبیہ کا استعمال بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ قرآن میں ایک جگہ تشبیہ کی بجائے تمثیل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔

"کائنات کی کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔" (٤٢ : ٩)

اکثر علماء تنزیہ باری تعالےٰ یعنی براۃ عن الاوصاف الجسمانیہ کے قائل ہیں اور تشبیہ کے حامی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی تنزیل یعنی وحی قرآن کی بناء پر تثبیت (تشبت یعنی تعینات صفاتی) کے قائل ہیں۔ تعطیل کے نہیں۔

تشبیہ سے اللہ تعالےٰ کی تنقیص لازم آتی ہے۔ تشبیہ اس لئے مردود ہے کہ وہ بت پرستی اور کفر کی طرف لے جاتی ہے اور تعطیل اس لئے کہ وہ: الحاد و مشرک کا پیش خیمہ ہے۔

تشریق:- دھوپ میں گوشت سکھانا۔ (دیکھئے "ایام تشریق")

تَشَہُّد شہادت کا کلمہ پڑھنا۔ اصطلاح میں اس سے مراد دعا ہے جو دوران نماز قعدہ میں پڑھی جاتی ہے۔ دعا یہ ہے:-

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

"سب بندگیاں زبان کی اللہ کو ہیں اور سب بندگیاں بدن کی اور سب بندگیاں مال کی۔ سلامتی ہو تم پر اے نبی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے بندوں پر جو نیک ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود (عبادت کے لائق) مگر اللہ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے ہیں اس کے رسول ہیں"

تشہد کی اس صورت کو ابن مسعودؓ نے بیان فرمایا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی اسی تشہد کو اختیار کیا ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت شدہ تشہد اختیار کیا ہے جو یہ ہے۔

اَلتَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ ... الخ

اس روایت کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔ "آنحضورؐ ہمیں تشہد اس طرح سکھاتے تھے جس طرح آپؐ ہمیں قرآن کی کوئی سورت پڑھایا کرتے تھے۔ (مسلم)

ایک تشہد ابن عمر سے مروی ہے اور اسے امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

التحیات للہ الزاکیات للہ الطیبات الصلوات للہ السلام علیک...
تشہد کا اطلاق خود قعدہ پر آتا ہے۔ دو رکعت والی نماز کے علاوہ ہر نماز میں تشہد دو مرتبہ آتا ہے۔ ایک مرتبہ دوسری رکعت میں اور ایک مرتبہ آخری رکعت میں۔

تصدیق و تصور مسلمان فلسفیوں کے نزدیک علم منطق کی دو اقسام ہیں۔ ان میں ایک تصور کا علم ہے اور دوسری قسم تصدیق کا علم ہے۔ اگرچہ علم منطق کی یہ تقسیم صرف یونانی فلسفیوں کے نزدیک نہیں ہے اور پہلی بار مسلمانوں کے ہاں ہی ظاہر ہوئی۔

کسی شے کی ماہیت کا ادراک بغیر اس کے کہ اس ماہیت پر حکم لگایا جائے، تصور ہے۔ نیز تصوری علم کا ذریعہ حد یا تعریف ہے اور جب دو یا دو سے زیادہ تصورات پر انہیں موضوع اور محمول کی حیثیت سے طرفین قرار دے کر نفی یا اثبات کا حکم لگایا جائے تو اسے تصدیق کہتے ہیں۔

اس نظریے کے مطابق تصور تصدیق پر زمانی اعتبار سے سبقت رکھتا ہے کیونکہ انسان کے ذہن میں خیالی تصور پہلے آتے ہیں اور بعد میں انہیں نفی یا اثبات کے حکم سے جوڑا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ جس رشتے سے تصورات ذہن میں جوڑے جاتے ہیں وہ بھی خارج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

اس نظریے پر ایک بہت بڑا اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ تصورات کے مابین جو حکمی نسبت قائم ہوتی ہے وہ کبھی یقینی ہوتی ہے اور کبھی ظنی اور جس کا جواب مطابقتی نظریہ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے بعد کے دبستان رواقیہ میں ایک نئے نظریے نے جنم لیا۔ جس کے مطابق ایک قضیے کے تصورات یا مواد تو خارج سے آتے ہیں لیکن ان کے مابین حکمی نسبت قائم کر کے تصدیق بنانا ذہن کا کام ہے۔ اس ذہنی فعل کو فلاسفہ رواقی تیقن اور تصدیق کا نام دیتے ہیں۔ اسلام میں متکلمین متاخرین میں ان دونوں نظریوں کا ملاپ ہوا اور نہایت ہی دلچسپ بحثیں پیدا ہوئیں۔

تصدیق کے معنی ذہنی نقطہ نظر سے علم دینیات میں نبی کی دعوت تسلیم کرنا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ ان معنوں میں تصدیق ایک قلبی فعل ہے۔ عام علماء اور متکلمین کے نزدیک یہ ایک اختیاری فعل ہے جس کا کرنا یا نہ کرنا انسان کے بس میں ہے۔ لیکن معتزلہ اور فلاسفہ کے نزدیک معتبر دینی تصدیق اور اعتقاد کی بنیاد عقلی معرفت پر ہے۔

تصور: علم منطق کی ایک قسم (دیکھیے "تصدیق و تصور")

تصوف مسلم فکر کا ایک اہم مکتب۔ لغوی طور پر یہ لفظ بعض کے نزدیک صُوف سے نکلا ہے، جس کے معنی اُون کے ہیں۔ یعنی اون پہننے والے یا گدڑی پوش صوفی کہلائے اور ان کا فکر تصوف ٹھہرا۔ بعض نے اسے صُفّہ سے مشتق ٹھہرایا ہے کیونکہ اصحاب صُفّہ نے اپنی زندگیاں خدمت دین کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ بعض اسے صفا (پاک) سے مشتق قرار دیتے ہیں اور بعض کے خیال میں یہ یونانی لفظ سوف سے نکلا ہے، جس کے معنی حکمت وغیرہ ہیں۔

تصوف کی ماہیت:۔ تصوف کی تعریف جامع و مانع نہیں ہے۔ ہر صوفی کے نزدیک اس کا مفہوم ذاتی ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں: "تصوف ایک صفت ہے، جس میں بندہ قائم ہے۔" کسی نے پوچھا: "بندہ کی صفت ہے یا خدا کی؟" آپ نے فرمایا: "وہ حقیقت میں خدا کی صفت ہے اور ظاہر میں بندے کی۔ یعنی درحقیقت تصوف بندہ کی بشری صفت کے فنا ہونے کا تقاضا کرتا ہے تاکہ وہ خدا کی صفت کے ساتھ باقی رہے۔

بقول ابوالحسن نوریؒ "تصوف نفس کی ہر لذت کو چھوڑ دینا ہے۔" حصریؒ کے نزدیک "تصوف مخالف کی کدورت (آلودگی) سے باطن کو پاک کرتا ہے۔"

"حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں، تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے۔ یعنی سخاوت رضا، صبر، اشارہ، غربت، صوف پہننا، سیر، فقر۔ سخاوت حضرت ابراہیمؑ کی اقتدا ہے۔ رضا حضرت اسماعیلؑ کی اقتدا ہے۔ صبر حضرت ایوبؑ کا اتباع ہے۔ اشارہ حضرت زکریاؑ کا اتباع، غربت یحییٰؑ کی پیروی، سیاحت حضرت عیسیٰؑ کی۔ صوف پہننا حضرت موسیٰؑ کی پیروی اور فقر آنحضورؐ کی سنت ہے۔"

تصوف کیا ہے؟:۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف عملی طور پر وہ طریقۂ حیات ہے۔ جس کا مقصود ذات خداوندی سے بلاواسطہ رابطہ پیدا کرنا ہے۔ اس رابطے کے حصول کے لیے ہر شخص کو چند روحانی تجربات میں سے گذرنا پڑتا ہے، جنہیں واردات قلب کہتے ہیں۔ صوفیا کا علم ان کے نفس کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے جسے مشاہدے یا کشف کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ علم مشاہدات اور واردات تک تو صحیح رہتا ہے۔ لیکن اسے الفاظ کا جامہ پہنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ تجربات اور مشاہدات الفاظ و بیان کا جامہ پہن کر آتے ہیں تو نہ صرف صوفیاء بلکہ حکماء کے لیے بھی ایک الجھن کا باعث بن جاتے ہیں۔ تضادات ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں، مختلف سوالات مثلاً خدا اور انسانوں کے مابین کس قسم کا تعلق ہے؟ وحدت اور کثرت کے ڈانڈے کس جگہ اور کس طرح ملتے ہیں؟ انسان لافانی اور ماورائے عقل ہستی کا مشاہدہ کس طرح کر سکتا ہے؟ محسوسات اور مشاہدات کی حد تک تو شاید انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ ہستی مطلق کا ادراک کامل کرے، لیکن جب بھی اس حقیقتِ مطلقہ کو الفاظ کا لباس پہنایا جائے گا۔ تو اس کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر سے اوجھل اور تفہیم سے ماوراء رہ جائے گا۔ یوں صداقت میں کذب کی آمیزش ہو کر اختلافات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ان مشکلات سے بچنے کے لیے صوفیاء نے اصطلاحات کا سہارا لیا لیکن ان کی تشریح میں بھی اختلافات پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب اور مکتبِ فکر کے لوگوں نے ان واردات تصوف کو اپنے رنگ میں بیان کیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی، یہودی، یونانی، ہندی، چینی اور اسلامی تصوف ایک دوسرے سے باسانی تمیز کیے جا سکتے ہیں۔

تصوف اور مذہب:۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصوف نے مذہب کے ساتھ تعلق کیسے قائم کیا ہے؟ اور کن حالات میں صرف توحیدی مذاہب میں نمودار ہوا ہے۔؟ اس کا جواب اکثر یوں دیا جاتا ہے کہ ہر مذہب حقیقی معنوں میں تصوف ہے یا اس پر مبنی ہے۔ اگر تصوف سے مراد یاد خدا سے بلاواسطہ تعلق کا احساس ہے تو ہر مذہب کی بنیاد اسی اساس پر قائم ہے۔ اگر انسان اور خدا کے درمیان جذبۂ اتحاد اور محبت کو اہمیت نہ دی جائے تو مذہب محض چند بے جان رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم تصوف اور مذہب کے مابین تمیز کر سکتے ہیں مذہب انسان کے تمام داعیات و ضروریات کی تسکین چاہتا ہے۔ گویا داخلیت و خارجیت دونوں پہلوؤں سے مذہب زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔ جبکہ تصوف محض داخلیت کا نمائندہ ہے اور داخلی و جذباتی زندگی ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف مذہب کے داخلی پہلو پر توجہ مرکوز کرنے اور اسے اس حد

Marfat.com

تک منجانب لانے کا نام ہے کہ یہ مذہب سے جدا ایک مکتب کی صورت اختیار کر جب تا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ تصوف مذہب سے بہت دیر میں جا کر پیدا ہوا اور وہ بھی توحیدی مذہب میں۔ کثرت پرستی میں انسان اور خدا ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ تھے۔ انسان کے دیوتا اس کی شکل و صورت میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ایسے اسطوری دور میں داخلیت یا تصوف کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی پھر ایک دور آیا جس میں خدا کو علیم و بصیر ہونے کے ساتھ ساتھ لافانی، ماوراء اور لامحدود اور انسان کو فانی، کمزور اور محدود قرار دیا گیا۔ یہ فرق اتنی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا کہ تصوف ابھر ہی نہ سکا۔ تاہم اسی دور میں ہمارے سامنے وحی آتی ہے جو خدا اور انسان کے مابین اس دوئی کی خلیج کو پاٹ دیتی ہے۔ وحی انسان کو نصب العین بتاتی ہے۔ اس کے بتائے راستے پر چلنے سے یہ دوری ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب نیک اعمال انفرادی سے سماجی صورت اختیار کر جاتے ہیں اور انسان ان احکامات وحی کی پیروی محض ایک میکانکی طریقے سے کرنا شروع کر دیتا ہے تو قلب میں ایک روحانی خلا باقی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ وہ دور ہوتا ہے، جب تصوف کا آغاز ہوتا ہے اور انسان اس کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے کہ وہ دوئی اور کثرت کو ختم کر کے حقیقی وحدت تک جا پہنچے۔ گویا ایک طرح سے یہ اسطوری دور کی طرف مراجعت کا نام ہے جب دوئی ناپید تھی اور انسان کے ہر طرف، آمنے سامنے وحدت کارفرما تھی۔ لیکن وحی نے انسان اور خدا کے درمیان تمیز پیدا کر دی اور من و تو کی تمیز پیدا ہو گئی، جسے ختم کرنے کے لئے تصوف سامنے آیا۔ اگرچہ صوفیاء وحی سے منکر نہیں ہوتے، لیکن وہ اپنے الہامات اور مشاہدات قلبی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وحی کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوتا اور انسان اور خدا کا تعلق کسی دور میں بھی ختم نہیں ہو سکتا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تصوف کی صحیح اور اصل صورت اسلام اور دائی اسلام کے بعد ہمارے سامنے آتی ہے۔ گویا تصوف کا آغاز بجا طور پر خاتم نبوت کے بعد ہوتا ہے اور یوں انسان اور خدا کے تعلق کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

متصوفانہ واردات:۔ تصوف کا بہترین مظہر وہ تجربہ ہے۔ جہاں صوفی ایک جذب و انہماک کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر صوفیاء نے اس تجربے کو بیان کرتے ہوئے، اسے نور سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جب وہ اس واردات کا تجربہ حاصل کرتے ہیں تو انہیں یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہر طرف سے ایک ملکوتی نور میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اسی نور کے باعث وہ حقیقت کا علم حاصل کرتے ہیں۔ یہ علم استدلالی نہیں بلکہ عینی ہوتا ہے۔ اس منزل میں آ کر قرب خداوندی کا وہ احساس پیدا ہوتا ہے، جس کے لئے صوفیاء نے حلول، اتحاد اور وصول کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ اس حالت میں خودی اور انفرادیت کا احساس کلی طور پر محو ہو جاتا ہے۔ اور انسان ہر شے کو فراموش کر کے صرف ذات خداوندی اور اس کے انوار کے مشاہدات میں منہمک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس انہماک اور استغراق کے باعث صوفی ایک غیر معمولی قوت کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس دیدار ذات کے بعد اس کی خودی میں کمال وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ پرانے تصورات اور محرکات تقریباً ختم ہو جاتے ہیں اور زندگی کا ایک عظیم تر دور شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے سامنے بلند تر مقاصد ہوتے ہیں۔

خودی اور نفی خودی:۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ تصوف نفی خودی کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ صوفی صرف خود فراموشی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ نفسیاتی طور پر احساس خودی کا ایک انتہائی نصب العین کا تجزیہ ہے اگرچہ انسان اپنے ساتھ ہی وجود کو خدا سے ساتھ ہی کے وجود میں پیش کرتا ہے اور اس سے وصل کا خواہاں ہوتا ہے تاہم یہ تمام سپردگی کے عمل میں انسان کی قوت ارادی کا اظہار ہوتی ہے اور یہ انفرادیت اور خودی کا اظہار ہے۔ جس سے بہتر مظاہرہ شاید ممکن نہیں کیونکہ کے خیال میں صوفی اپنی خودی اور انفرادیت کو نئے سرے سے محسوس کرتا ہے۔ جس میں وہ دنیا کی ہر پابندی سے بے نیاز اور آزاد ہو جاتا ہے۔ بقول فلاطینوس ایک واحد دوسرے واحد سے دوچار ہوتا ہے۔

تصوف اور سائنس:۔ رسل ایک جگہ لکھتا ہے کہ تاریخ فلسفہ میں سب سے زیادہ تجربیت پسند انسان صرف صوفی ہی ہے۔ وہ اپنے تجربات اور واردات کو ہر قسم کے خارجی معیار پر پرکھتا اور جانچتا ہے۔ اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ خالص معروضی حقیقت تک پہنچ سکے۔ جیسے عام علمی زبان میں بیان کر سکے اور یہی طریق کار سائنس کا ہے۔ اب سائنس کا یہ فرض ہے کہ وہ صوفیانہ واردات کا کھوج لگائے اور ان تمام مشاہدات معروضات کی صورت میں پیش کر دے جو اب تک شخصی اور ذاتی رہی ہیں اور شاید یہی معراج علمیت ہے۔

ذاتی واردات اور اختلافات:۔ ولیم جیمز کے نزدیک ہر متصوفانہ واردات اور تجربہ ناقابل بیان ہوتا ہے۔ اس تجربے میں جو کچھ واردات اس پر گزرتی ہے، وہ اسے خود تو محسوس کرتا ہے اور الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن چونکہ اس کا مواد محسوسات کی دنیا سے متعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے مادی لباس پہنانا محال ہوتا ہے۔ اس پر غور کرنے سے ہمیں پتا چلے گا کہ صرف متصوفانہ واردات ہی نہیں، ہر جذباتی تجربہ بھی ذاتی ہوتا ہے، جس میں یہ صفت موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر جذباتی تجربہ بھی بعینہٖ دوسرے تک منتقل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً محبت کے جذبات کے بارے میں کسی دوسرے کو سمجھانا محال ہے۔ عشق کسی استدلال کا محتاج نہیں ہوتا بطور تجربہ اور واردات وہ ایک ذاتی اور انفرادی کیفیت ہے، جس میں کوئی دوسرا شامل نہیں۔ یہاں ایک اور مثال بھی بہتر رہے گی۔ مثلاً گلاب کے پھول کی خوشبو جس طرح سے ایک شخص نے محسوس کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا بعینہٖ محسوس نہ کرتا ہو کیونکہ اشتراک احساس صرف الفاظ اور تشبیہات کا محتاج ہے۔ جبکہ تشبیہ کا مشاہدہ بھی ایک انفرادی اور ذاتی فعل ہے اور یوں ہم پھول کی خوشبو کے متعلق اپنے احساسات اور خیالات دوسرے تک پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف متصوفانہ تجربہ ہی نہیں بلکہ ہر جذباتی تجربہ ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں اختلافات کا سرزد ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ گویا جس حقیقت کا ادراک صوفی کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کے مادی لباس، الفاظ و تشبیہات سے ماوراء ہوتا ہے۔

محبت اور فنا:۔ صوفی کا تعلق اس ذات باری کے ساتھ ایک گہرے جذبے پر قائم ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ اتنا جامع اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ اس میں کوئی اور جذبہ نہیں سما سکتا۔ اسے محبت اور عشق کا نام دیا گیا۔ ایسی محبت کی مثالیں اکثر صوفیاء کے ہاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اس محبت کی خاطر تمام دنیاوی تعلقات سے منہ موڑ لیا حتیٰ کہ بعض نے اولاد کی محبت کو بھی اس کے منافی جانا۔ تاہم بعض صوفیاء کے نزدیک اسی محبت میں مخلوق سے محبت شامل ہے۔ صوفی جب محبت خداوندی سے سرشار ہوتا ہے تو اسی کا ایک مظہر مخلوق خداوندی سے محبت بھی ہوتا ہے۔ جس کے باعث وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے۔

محبت ایک انفعالی جذبہ ہے۔ اسی بنا پر محققین کے نزدیک صوفی اپنے

Marfat.com

آپ کو کسی دوسری قوت کے مقابلہ میں ایک آلہ کار سمجھتا رہی ہو انسان کے اعمال اور افعال گویا اس کے اپنے نہیں بلکہ دوسری شخصیت کے ہیں۔ لیکن یہ انفعالیت محض عارضی ہوتی ہے۔ محبت جلد ایک عملی فعالیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی محبت و وابستگی کی کیفیتوں کے مجموعے کا نام بن جاتی ہے۔ وارفتگی حالت میں بیخودی پیدا ہو جاتی ہے جسے صوفیاء فنا کا نام دیتے ہیں۔ اس میں من و تو کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ دوئی کی جگہ یکتائی اور وحدت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اسی بناء پر اکثر صوفیاء کے ہاں وحدت الوجود کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس احساس کے باوجود صوفی خود کو ذات باری میں گم نہیں کر دیتا بلکہ اس میں ایک عمیق ترین تخلیقی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے ذریعے وہ معروضات پیش کرتا ہے اور لوگوں کو نئی اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ برگساں کے نزدیک صوفی یوں محسوس کرتا ہے گویا صداقت اپنے مصدر و منبع سے اس کے تمام وجود میں سرایت کر رہی ہے اور اس کے سارے جسم میں محبت ہی محبت کارفرما نظر آتی ہے۔ اسی ملکوتی محبت سے وہ تمام انسانوں سے بلا امتیاز محبت کرتا ہے۔ خدا کی صفت تخلیق کا عکس اس کی ذات میں منعکس ہو کر اسے بلند ترین تخلیقی کارناموں پر ابھارتا ہے۔ جس کے ہر پہلو میں انسانیت سے محبت موجزن نظر آتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو برگساں کی نظر میں مذہب کو جمود، سکون اور رہبانیت سے نکال کر نئی زندگی اور حرکت بخشتے ہیں۔

تصوف قبل از اسلام:۔ تصوف کی ابتداء کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا بڑا مشکل ہے۔ شاید اس نے سب سے پہلے فارس میں اپنا مقام بنایا۔ زرتشتی عقائد رفتہ رفتہ دنیا بھر میں پھیلتے چلے گئے اور پھر ایک طرف تو شام اور مصر کی راہ سے یونان میں اور دوسری طرف چین اور ہندوستان میں داخل ہوئے۔ تاہم وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تصوف کا بنیادی ماخذ کہاں ہے۔ مختصراً یونانی، چینی عیسائی، یہودی اور پھر اسلامی تصوف کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یونانی تصوف:۔ یونان میں صوفیانہ تصورات کا آغاز ایک نیم دیومالائی شخص آرفینس سے ہوتا ہے اس وقت مغربی ایشیا میں سامی افکار اور زرتشتی عقائد پھیلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے رفتہ رفتہ عمومی رسوم کی صورت اختیار کر لی۔ فلسفیانہ افکار نے عقلیت پسند ذہنوں کو ان رسوم سے بدگمان کر دیا۔ انہوں نے ایک طرف تو خیر و شر کی بنیادی اقدار کی تلاش شروع کر دی تو دوسری طرف شر سے محفوظ رہنے کے طریقوں کی تلاش کی۔ اسی ماحول میں آرفینس کی باطنی رسوم نے جنم لیا۔ اس نے زہد و اتقاء کی بنیاد قرار دے کر ذاتی تجربے اور اس کی فکری توجیہات کی اشاعت شروع کی اس نے تاریخ میں پہلی بار خانقاہیں قائم کیں۔ اس سے یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ اگر روح جسم کی بندشوں اور مادی حدود سے آزاد ہو جائے تو اس کی قوتوں میں بے حد اضافہ ہو گا۔ اسی چیز نے تصوف اور رہبانیت کا آغاز کیا۔ ان کے ہاں آواگون کا فلسفہ بھی کارفرما تھا۔ وجہ ہو سکتا ہے کہ ہندی اثرات کے تحت وہاں پہنچا ہو۔ آرفینس کے بعد یونانی شاعر پنڈار ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس نے جنت کا تصور بھی پیش کیا۔ اس سے فیثاغورث، سقراط اور افلاطون بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ فیثاغورث نے ان رسوم کی نیت اور روح کو بے حد اہمیت دی۔ آرفینس کے نزدیک نجات کے لیے مجاہدہ و ریاضت کافی ہے۔ جس میں فنا یا قرب الٰہی کا مقام بھی آتا ہے۔ فیثاغورث نے اس مقصد کے لیے جذبات کی برانگیختی کو ختم کرنے کا حکم دیا۔ وہ بھی آواگون کا قائل رہا۔ آرفینس کے نزدیک روح جسم میں مقید ہے اور انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی فطری نورانیت سے محروم ہو گیا ہے۔ جبکہ فیثاغورث نے اسے انسان کی بھلائی اور عروج و ارتقاء کا ایک ذریعہ سمجھا، اور اسے بلند ترین روحانی قوتوں کے حصول کا ایک ذریعہ جانا لیکن یہ بھی کہا کہ افزائش نسل کا سلسلہ ختم کرنا چاہیے تاکہ انسان مادی دنیا کی قید سے نجات حاصل کر سکے

یونان کے بعد اسکندریہ میں نوفیثاغورثی فلسفہ قائم ہوا۔ جس کی رو سے خدا روح اور جسم تین مختلف چیزیں ہیں۔ خدا نے روح کو جو خیر مطلق تھی جسم میں مقید کر دیا ہے جو شر ہے چنانچہ جسمانی جذبات اور خواہشات پر قابو پانا ہی روح کی معراج ہے۔ چنانچہ اس کے حصول کے لئے زہد، عبادت اور صوفیانہ رسوم کو رواج دیا گیا۔

فیثاغورث کے بعد یونان کا بڑا فلسفی فلاطینوس تھا۔ اس کے نزدیک خدا ہر شے سے بالا اور ماوراء ہے۔ اس کے نزدیک دو عالم ہیں۔ ایک محسوسات اور دوسرے معقولات کا۔ روح محسوسات کے عالم سے تعلق رکھتی ہے اور انسان کی بلند ترین حیثیت کا انحصار صرف روح پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تصویر کشی کا مخالف تھا۔ اس فلسفی صوفی کا اثر یہی عیسائی، یہودی اور اسلامی تصوف پر بے حد ملتا ہے۔

یہودی تصوف:۔ یہودیوں کے ہاں ظاہری رسوم کی پابندی کو زور دیا گیا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہاں تصوف پنپ نہ سکا۔ یونانی اثرات کے تحت یہودیوں کے ہاں بھی تصوف نے جنم لیا۔ جس کا بہترین نمائندہ حکیم فیلو ہے۔ اس نے مذہب اور فلسفہ دونوں کا مطالعہ کیا اور ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گویا وہ ایک طرح سے متکلمین میں سے تھا۔ اس کے بعد یہودی تصوف زیادہ تر اسلامی تصوف کے زیر اثر پیدا ہوا۔ جسے قبالہ کا نام دیا گیا ہے۔ عام طور پر یہودی تصوف میں خدائے خالق اور خدائے مطلق کے دو جداگانہ وجود ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک تورات کا خدا خدائے خالق ہے لیکن حقیقی خدا اس سے ایک علیحدہ ہستی ہے۔ جو انسانوں کی عقل سے ماوراء ہے۔ اسے خدائے خالق کو انہوں نے حقیقی خدا کا مشاہدہ مرکب قرار دیا۔ چنانچہ ان کا تصوف مشاہدہ عرش تک محدود رہا۔

عیسائی تصوف:۔ عیسائی تصوف کی بنیادیں بابلی اور مصری باطنیت میں گھری ہوئی ہیں۔ بابلی صوفیاء کے نزدیک کائنات کے تمام واقعات نہ تو قوانین فطرت اور نہ انسانی ارادے سے ظاہر ہوتے ہیں، بلکہ دیوتاؤں کے فیصلے کا نتیجہ ہیں۔ یہ دیومالائی فیصلے باطنی اسرار ہیں، جو انسان ایک خاص قسم کے عمل سے پا سکتا ہے۔ اسی بناء پر بابل میں صوفیانہ حلقے قائم ہوئے۔ یہی چیز یونان میں دیومالا کی صورت اختیار کر گئی۔ ادھر بابل اور مصر میں اس چیز نے نجوم اور دیگر خرافات کی صورت اختیار کر لی ایران سے اہرمن اور یزدان کی کشمکش کا فلسفہ بھی بابل میں آن وارد ہوا۔ ان تمام فلسفوں کے معجون مرکب نے مصر کے باطنی نظام پر اثر ڈالا۔ اور یوں وہاں تصوف کا رواج ہوا۔ ہرمیس کے نوشتے قدیم صوفیانہ تحریک میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہرمیس فیلو کا ہمعصر تھا۔ اس کے نزدیک انسان فطری طور پر لافانی اور ابدی وجود ہے۔ چونکہ وہ مادی دنیا میں ملوث ہو چکا ہے، اس لئے اس کی ابدیت ختم ہو گئی اور وہ موت کا شکار ہو گیا۔ جنسی عمل اور توالد و تناسل ہی ہبوط آدم کا باعث ہے۔ اس لعنت سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے کہ انسان مادی اور جسمانی تقاضے پوری طرح دبا دے۔ ہرمیس کے نزدیک وہ انسان جو علم رکھتا ہے وہ خدا کی مانند ہے اور موت اسے کبھی نہیں چھوئے گی۔ یہ علم خیر و شر کی تمیز کا علم نہیں۔ بلکہ اپنے نفس کا عرفان ہے اور یہ عرفان تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات خدا اور انسان کے درمیان

Marfat.com

ایک واسطے کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ کائنات خدا کی شبیہ کا عکس ہے۔ اور انسان اس کائنات کی پیدائش۔ انسان اس وسیلے کے بغیر خدا کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہی تصورات بعد میں عیسائیت نے اپنا لئے۔ اور انہوں نے کائنات کی بجائے مسیح کو وسیلۂ نجات قرار دے دیا۔

عیسائیت میں مذہب کا تصور بالکل داخلی اور ذاتی ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ حواری مسیح کے لقب سے بہت سے صوفیا حضرت عیسیٰؑ کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے اس فقرے "آسمانی بادشاہت تمہارے اندر ہے جو کوئی اپنے نفس کو پہچان لے گا۔ وہ اسے پالے گا" سے عیسائی تصوف کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تصوف کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان بلاواسطہ خدا کے ساتھ تعلق قائم نہیں کر سکتا اور یہ واسطہ صرف مسیحؑ ہے۔ جبکہ اسلام نے خدا اور بندے کے درمیان کسی کو واسطہ نہیں ٹھہرایا۔

عیسائی تصوف کا بانی پولوس ہے۔ اس نے اپنے مکاشفے کے بعد سے اپنی تعلیمات کی تبلیغ کی۔ حضرت عیسیٰؑ کی ذات کے متعلق اس نے جو تصور پیش کیا، وہ یونانی فکر، یہودی اور مروجہ مشرکانہ مذاہب کے تصورات کی آمیزش تھی۔ اس کے نزدیک عیسیٰؑ ایک روحانی وجود ہے، نورانی، مختار کل، جو دلوں کے خفیہ راز سے واقف ہے۔ وہ سب انسانوں کے لئے قابل پرستش ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ خدا کی طرح لوگوں پر فضل کی بارش کرے۔

پولوس کے بعد دوسری اہم شخصیت کلیمنٹ ہے۔ وہ یونانی فلسفے اور تمام قدیم و جدید مذاہب سے پوری طرح آشنا تھا۔ اس کے نزدیک خدا کا تصور بالکل سلبی ہے۔ جس میں فلاطینوس کا اثر نمایاں ہے۔ خدا تک پہنچنے کے لیے وہ تین منزلیں بتاتا ہے۔ پہلی منزل طہارت ہے جس میں انسان خود کو نفسانی خواہشات سے آزاد کرا لیتا ہے۔ دوسری منزل منطقی تجزیہ ہے۔ یہ ایک عقلی علم ہے، جس میں انسان مادی اشیاء کو ان کی صفات سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ تیسری منزل میں مسیح کی وسیع ذات میں داخل ہوتا ہے اس سے بھی ہمیں یہ علم نہیں ہوگا کہ خدا کیا ہے۔؟ البتہ ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ وہ کیا نہیں ہے؟ یہ علم سلبی ہوگا۔ اثباتی نہیں۔

عیسائی تصوف کی دوسری اہم شخصیت آگسٹائن ہے۔ اس نے عیسائیت، مانویت فلسفہ اور سائنس غرضیکہ ہر علم اور مکتب فکر کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے اعلان کیا کہ انسان فطرتاً گناہگار ہے اور نیکی و بدی اختیار کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات شر انگیز نہیں اور اگر کوئی شخص انہیں پورا کرتا ہے تو وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ عیسائیت میں تنزلیت اور رہبانیت نے جنم لیا۔ آگسٹائن کے نزدیک جذب و مشاہدے کا راستہ انسانی زندگی کا بہترین اور بلند ترین مقصد ہے اور یہ مشاہدہ اسی دنیا میں ممکن ہے۔

اسلامی تصوف

آغاز:۔ اسلام میں تصوف کی اصطلاح غالباً تیسری صدی ہجری میں اہل بغداد نے رائج کی تھی سا امام قشیری کے بقول یہ لفظ دوسری صدی ہجری میں جاری ہوا۔ اس کا سرچشمہ آنحضورؐ کی ذات مبارک ہے۔ اور آپ ہی سے یہ علم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ کو ملا۔ ان سے حضرت سلمان فارسیؓ اور حسن بصریؒ نے استفادہ کیا۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلا شخص جسے صوفی کے لقب سے نوازا گیا، کون تھا۔ بقول صاحب "کشف الظنون" سب سے پہلا صوفی ابوہاشم تھا۔ جنہوں نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی بقول مولانا جامی وہ شخص جس نے سب سے پہلے تصوف کی تعلیم دی۔ ذوالنون مصری تھے، جس کا انتقال ۲۴۵ھ میں ہوا۔

صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگی کی بنیاد خوف خدا اور رسولؐ کی محبت پر رکھی تھی۔ سادگی میں تمام صحابہ اعلیٰ رتبے کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں شریعت اور طریقت یعنی دین اور تصوف دو جداگانہ چیزیں نہ تھیں۔ رفتہ رفتہ جب سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا تو علوم و حال ظاہری اور باطنی اصلاح میں تمیز کی جانے لگی۔ اور تصوف کو شریعت سے ہٹ کر ایک جداگانہ حیثیت حاصل ہوگئی۔

صوفیا کے نزدیک اسلامی علوم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ظاہری علوم سے مراد شریعت ہے اور باطنی علوم سے مراد علم تصوف ہے۔ رفتہ رفتہ عام مسلمانوں اور صوفیوں کے نظریات میں نمایاں فرق ہوتا چلا گیا۔ علماء کی تمام تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ ظاہری یا خارجی عنصر کی اصلاح کی جائے۔ لیکن صوفیوں کے نزدیک قلب و روح کی تطہیر ہی قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔

دو گروہ:۔ اسلامی تصوف شروع ہی میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا:۔ ۱۔ الٰہی صوفیا ۲۔ ہمہ الٰہی (ہمہ اوستی) صوفیا۔ اولین صوفیا پر نوافلاطونیت، نوفیثا غورثیت اور عیسائیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ الٰہی صوفیا تھے۔ بعد ازاں جب زرتشتی، مانوی، ہندی اور بدھی اثرات اسلام میں شامل ہوئے تو ہمہ الٰہی صوفیا کا گروہ پیدا ہوا۔ بایزید بسطامیؒ کے زمانے سے اسلامی تصوف کے دھارے نے ہمہ الٰہیت کی طرف بہنا شروع کر دیا۔ حضرت بایزیدؒ، حلاج، قشیری، شہاب الدین سہروردی، ابن عربی اور عبدالکریم جیلی ہمہ الٰہی تھے۔

مشہور صوفیا:۔ اسلامی تصوف کے معماروں تو تمام مسلم صوفیا ہیں لیکن ان میں مندرجہ ذیل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حضرت علیؓ (وفات ۶۶۱ء)، حضرت رابعہ بصریؒ (۸۰۱ء) معروف کرخیؒ (۸۲۱ء) بایزید بسطامیؒ (۸۷۴ء) ابراہیم بن ادھمؒ (۸۷۵ء) جنید بغدادی (۹۱۰ء) ابن منصور حلاج (۹۲۱ء) ابوبکر شبلیؒ (۹۴۶ء) قشیریؒ (۱۰۷۲ء) عبدالقادر جیلانیؒ (۱۱۶۶ء) شہاب الدین سہروردیؒ (۱۱۹۱ء) فریدالدین عطارؒ (۱۲۲۹ء) ابن عربیؒ (۱۲۴۰ء) رومیؒ (۱۲۷۳ء) شبستریؒ (۱۳۲۰ء) بہاءالدینؒ (۱۳۸۸ء) عبدالکریم جیلی (۱۴۰۶ء) جامی (۱۴۹۲ء) اور ہندوستان میں علی ہجویری داتا گنج بخشؒ (۱۰۷۲ء) خواجہ معین الدین چشتی (۱۲۳۴ء) بختیار کاکیؒ (۱۲۳۶ء) فریدالدین گنج شکرؒ (۱۲۶۵ء) نظام الدین اولیاءؒ (۱۳۲۴ء) احمد سرہندیؒ (۱۶۲۴ء) وغیرہ اہم ہیں۔

تصانیف:۔ مسلمان صوفیا بڑے عالم فاضل ہستیاں ہوتے تھے۔ ہر وقت ان کے گرد طالبان علم کا ہجوم رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مختلف کتابیں لکھیں۔ ان کی اہم ترین تصانیف یہ ہیں۔

"اللمع فی التصوف" از ابونصر سراج (وفات ۹۸۸ء) "کشف المحجوب" از داتا گنج بخشؒ، "رسالہ قشیریہ" از قشیری۔ "احیاء العلوم" از غزالی "عوارف المعارف" از شہاب الدین سہروردی۔ "منطق الطیر" از فریدالدین عطار۔ "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" از ابن عربی۔ "حدیقہ" از حکیم سنائی۔ "مثنوی" از رومیؒ۔ "گلشن راز" از شبستریؒ۔ "انسان کامل" از عبدالکریم جیلی "لمعات" اور "لوامع لوائح" از جامی۔ "کتاب التعرف" از امام کلاباذی۔ "مکتوبات امام ربانی" از احمد سرہندیؒ وغیرہ۔

تعلیمات:۔ صوفیوں کا نقطۂ نظر مختصراً یہ ہے کہ ہستی باری تعالےٰ ایک لامعرف، غیر تعین پذیر، غیر انقسام پذیر اور ماوراے ادراک وحدت۔ اکثر صوفیا یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ عین حسن ہے۔ جسے اصطلاحاً کمال کہتے ہیں۔ اور بعض اسا دے کو، بعض نور

Marfat.com

کو (یعنی عالم کو) اللہ تعالےٰ کا عین قرار دیتے ہیں۔ پہلے مکتب خیال کے پیرو شفیق بلخی، ابراہیم بن ادہم اور رابعہ بصری ہیں۔ دوسرے مکتب فکر کے پیروؤں میں ممتاز ترین شخصیت ابن منصور حلاج کی تھی۔ تیسرا مکتب شہاب الدین سہروردی کا اور چوتھا مکتب فکر ابن عربی کا ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالےٰ کی صفات اس کے عین سے الگ ہیں۔ یہ اس کی وحدت انعکاسات یا جلوہ ہائے ذات ہیں۔

جہاں تک دنیائے حقیقت کا تعلق ہے یہ ایک عکس اور باری تعالیٰ کی صفات ممیز عین العین پر مشتمل ہے۔ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ اس کی برعکس تمام اشیاء چونکہ ہستی باری تعالےٰ کے انعکاسات، صدورات یا حسب مراتب صفا اس کے کمال یا حسن کی تجلیاں ہیں، وہ فی نفسہا اپنی اصل سے قرب و بعد کے اعتبار سے حسین اور سزاوار محبت ہیں۔

روح انسانی بھی اللہ تعالےٰ کا ایک صدور ہے، جیسے شعاع آفتاب کی صدور ہے جسطرح شعاع قبل اشعاع سے پہلے آفتاب کے ساتھ ایک تھی۔ اس طرح روح انسانی بھی روح بننے سے پہلے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایک تھی۔ مادّے کے ساتھ خلاف طبع اتصال نے ذرات گرد و غبار کے ساتھ شعاع نور کے اتصال کی طرح اسے ایک ممیز شکل دے دی ہے، انسان ایک کائنات اصغر ہے۔ جس میں باری تعالےٰ کی تمام صفات ناتمام صورت میں جلوہ گر ہیں۔ اسی لئے کائنات میں انسان کا مقام یکتا اور بے مدیل ہے۔

ہر شے کی طرح انسان بھی اپنی اصل میں دوبارہ جا ملنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ یہ اضطراب و بے قراری، درجہ اشکال سے گذر جانے کے بعد یہ تڑپ، اور حسن کامل کے ساتھ مل کر ایک ہو جانے کی یہ تمنا ہی دراصل عشق ہے۔ عشق ہی تمام مذاہب کی روح رواں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ کا مقام نہ مندر ہے، نہ مسجد اور نہ کلیسا بلکہ وہ تو قلب انسانی ہے۔

عشق کا مقصود حقیقی جمال الٰہی ہے۔ لیکن اس حد تک پہنچنے کے لئے صوفی پر لازم ہے کہ وہ پہلے حسان عالم سے عشق کرے اور ان کے مراقبے میں رہے اور ایسے عمل کرے جو محبوب کے پسند خاطر ہوں۔ سلوک کی راہ میں صوفی متعدد منازل و احوال سے گذرتا ہوا جب محبوب کے حسن کامل کے حضور میں پہنچا دیتا ہے تو اس وقت تمام صفات زائل ہو جاتی ہیں اور صوفی کی ہستی اپنے محبوب حقیقی کی ہستی میں مل کر ایک ہو جاتی ہیں

جنت وصل یا تقرب کا سرور ہے اور جہنم درد کا نام ہے۔ صوفی اس راہ کے تمام شدائد و مصائب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ کیونکہ اس کا نزول اس کے محبوب کی طرف سے ہوتا ہے۔ صوفی پر لازم ہے کہ محبوب میں فنا ہو جانے کے لئے محبوب کی تقلید کرے۔

طریقۂ تصوف :۔ چونکہ انسانی زندگی کا مقصد تلاش حق ہے اور حق روشنی ابد تاریکی کے ستر ہزار پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس لئے حق کے متلاشی کے لئے ضروری ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے نہایت ریاضت اور محنت سے کام لے۔ حق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے صوفیا نے سات منزلوں کے نام بتائے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں :۔

(۱) عبودیت (۲) عشق (۳) ایذاء (۴) معرفت (۵) وجد (۶) حقیقت اور (۷) وصل۔

اس روحانی سفر میں طالب حق جسے اصطلاح میں سالک کہا جاتا ہے۔ سات منازل طے کرتا ہے۔ بعض صوفیاء نے چار منازل گنوائی ہیں۔

(۱) شریعت (۲) طریقت (۳) معرفت اور (۴) حقیقت یہاں شریعت سے مراد اطاعت خدا اور اطاعت رسولؐ ہے۔ عبادت کے ذریعے انسانی ذہن کی جلا ہوتی ہے۔ اس کے بعد سالک دوسرے مرحلے یعنی طریقت میں داخل ہوتا ہے جس میں شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ ایسے ایک مرشد کی تلاش کرنا چاہیئے جو اسے ضبط نفس کی تلقین کر سکے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر طالب حق تیسری منزل یعنی معرفت میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کا قلب اس قابل ہو جاتا ہے کہ حق کا علم حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی چوتھی اور آخری منزل حاصل ہو جاتی ہے، جو حقیقت ہے۔

اس سفر میں سالک کو ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی اطاعت اسی طرح کرنا ہوتی ہے، جس طرح محبوب حقیقی کی۔ راہِ عشق میں کوئی منطق نہیں چلتی یہاں بلا چون و چرا تعمیل حکم کرنا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک رہبر ناقص اسے راستے سے بھٹکا دے۔ اس لئے اس پر لازم ہے کہ ایک سچے راہبر کی تلاش کرنے میں اپنی پوری سمجھ بوجھ سے کام لے اور اس کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط ملحوظ رکھے۔

الہٰی صوفیا فنا فی اللہ کی باتیں نہیں کرتے بلکہ وہ تجلی رب یا تقرب الٰہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مرشد کی تعلیم کا پہلا زینہ ریاضت اور مجاہدہ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں اصولی اور تفصیلی مجاہدہ۔ اصولی کے اصول چار ہیں۔ قلت کلام۔ قلت طعام۔ قلت منام۔ قلت اختلاط مع الانام۔ مجاہدۂ تفصیلی کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اخلاقِ حمیدہ حاصل کرنا۔ دوسری قسم اخلاقِ ذمیمہ سے بچنا۔ اخلاقِ حمیدہ یہ ہیں۔

۱۔ توبہ :۔ گناہ کو یاد کر کے افسوس کرنا اور نادم ہونا اور ترک کر دینے کا عہد کرنا۔

۲۔ صبر :۔ ہوائے نفسانی پر غالب آنا۔

۳۔ شکر :۔ نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنا اور پھر خوش ہو کر اس کی اطاعت کرنا۔

۴۔ رجا :۔ فضل اور مغفرت اور جنت و نعمت کے انتظار میں قلب کو راحت ہونا اور ان کے حصول کی کوشش کرنا۔

۵۔ خوف :۔ عتاب و عذاب کے خیال سے دل کو دردمند کرنا۔

۶۔ زہد :۔ فانی چیزوں کی خواہشات کو ترک کر کے آخرت کی طرف مائل ہونا۔

۷۔ توحید :۔ یہ یقین رکھنا کہ بدون ارادہ خدا کے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

۸۔ توکّل :۔ صرف وکیل یا کارساز پر قلب کا اعتماد رکھنا۔

۹۔ محبت :۔ طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس سے حقیقی لذت حاصل ہو

۱۰۔ شوق :۔ محبوب کو اس کے کمال کے ساتھ دیکھنے کی خواہش کرنا۔

۱۱۔ انس :۔ محبوب کی معلوم وجوہ پر نظر کر کے قلب کو سرور حاصل ہونا۔

۱۲۔ رضا :۔ حکم قضاء پر اعتراض نہ کرنا۔

۱۳۔ نیّت :۔ دل کا ایسی چیز کی طرف ابھرنا جسے اپنے نفع کے موافق سمجھنا۔

۱۴۔ اخلاص :۔ اطاعت میں صرف اللہ کے تقرب و رضا کا قصد رکھنا۔

۱۵۔ صدق :۔ جس مقام کو حاصل کریں، اسے کمال تک پہنچائیں۔

۱۶۔ مراقبہ :۔ ذات پاک کا دل سے دھیان رکھنا۔

Marfat.com

۱- ذکر:- معلومات سابقہ کو ملا کر غیر معلوم باتوں تک پہنچنا۔

اخلاق ذمیمہ جن سے بچنا لازم ہے

۱- آفات لسانی:- فضول تکرار، گالی گلوچ، بدگوئی، لعنت، خوشامد، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنا۔
۲- شہوت:- بطن و فرج کی لذات
۳- غضب:- انتقام لینے کے لئے دل کا جوش میں آنا۔
۴- حقد:- دل کی گرانی جو انتقام نہ لے سکنے کی صورت میں قائم رہتی ہے
۵- حسد:- کسی کی اچھی حالت دیکھ کر جلنا اور اس کے زوال کا خواہاں ہونا۔
۶- حبِ دنیا:- ان دنیوی اشیاء کی خواہش، جن سے آخرت میں کچھ فائدہ نہ ہو
۷- بخل:- شرعاً لازم مصارف میں تنگی کرنا۔
۸- حرص:- مال وغیرہ کے ساتھ دل کو لگانا۔
۹- حب جاہ:- لوگوں کے نزدیک قابل تعظیم بننے کی خواہش کرنا۔
۱۰- ریا:- شہرت اور نیک نامی کی غرض سے لوگوں کو دکھا کر طاعت کرنا۔
۱۱- تکبر:- خود کو صفات کمال میں دوسروں سے بڑا سمجھنا۔
۱۲- عجب:- اپنے کمال کو اپنی طرف منسوب کرنا اور زوال کا خوف نہ کرنا۔
۱۳- غرور:- کسی نفسانی خیال پر طبیعت کا مائل اور قلب کا مطمئن ہونا۔

تصوّف کے مختلف سلسلے

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں صوفیاء نے تزکیۂ نفس کے مختلف طریقے وضع کئے جو سلسلہ یا خانوادہ کہلاتے ہیں۔ ان سلسلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن کی آگے چل کر بہت سی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر شاخ کا ایک بانی ہے۔ ہر سلسلے کا منبع حضرت علیؓ کی ذات ہے۔ صرف ایک سلسلہ نقشبندیہ ایسا ہے جس کی ابتداء حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہوتی ہے۔

زیادہ مشہور سلسلے یہ ہیں:-

سلسلۂ قادریہ:- اس سلسلے کے بانی عبدالقادر جیلانیؒ ہیں انہوں نے اس سلسلے کی بنیاد مشہور صوفی حضرت جنیدؒ کی تعلیمات پر رکھی۔ اس سلسلے میں ورد و شریعت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ سماع کے خلاف ہیں۔ ذکر جلی اور ذکر خفی دونوں کو جائز سمجھتے ہیں۔

سلسلۂ نقشبندیہ:- اس کے بانی خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں۔ اس کی بنیاد بایزید بسطامیؒ کی تعلیمات پر رکھی گئی۔ پاک و ہند کے مسلمان اس سلسلے سے خواجہ باقی باللہؒ کے ذریعے متعارف ہوئے۔ شیخ احمد سرہندی نے اس سلسلے کو مزید ترقی دی۔ یہ لوگ مراقبے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سماع کے مخالف [illegible] اذکار میں بھی ذکر خفی کو جائز سمجھتے ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ:- اس سلسلے کی بنیاد خواجہ ممشاد دینوری ہیں۔ لیکن اس [illegible] معین الدین چشتیؒ کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں [illegible] سے مقبول ہوا۔ اس سلسلے میں کلمہ شہادت [illegible] بطور پر لفظ اللہ کے ورد کی بڑی تاکید کی [illegible]

سلسلۂ سہروردیہ:- اس [illegible] بانی ابوالنجیب سہروردی ہیں۔ اس سلسلے میں [illegible] ذکر کے الله ہو کہنے کی تاکید کی جاتی ہے یہ لوگ سماع

کی جگہ [illegible] اسلام [illegible]

اسلام، تصوف اور دیگر مذاہب

[illegible] تصوف [illegible] میں جب بعض [illegible] نے تصوف سے عداوت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد [illegible] عشری اور [illegible] تیسری صدی ہجری میں تصوف کے [illegible] کی۔ اہل سنت والجماعت نے صوفیاء کے خلاف [illegible] سے کام لیا۔ [illegible] تصوف کو بعض [illegible] ہوتے رہے۔ ان میں حضرت [illegible] تصوف [illegible] نے دوسرے معتزلہ اور اہل ظاہر نے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت نے معتدل تصوف کو کبھی اسلام سے خارج نہیں کیا بلکہ انہوں نے [illegible] ابوطالب مکی کی قوت القلوب، امام غزالی کی احیاء علوم الدین [illegible] سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کی ہے۔ [illegible]

[illegible] اسلامی تصوف [illegible] مکاتب فکر سے اثر قبول کیا [illegible] گیا۔ گولڈزیہر کے خیال میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمان صوفیوں کے [illegible] ہندو فلسفیوں اور جوگیوں میں اسلام کے بنیادی تصورات [illegible] اور اخوت انسانی [illegible] ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں [illegible] کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اسلام [illegible] اسلام ہی کی طرف [illegible] داود، پیر بھان، لال داس، بابا لال [illegible] اسلامی تصوف کے نمایاں [illegible]

[illegible] تصوف پر بھی اسلامی تصوف [illegible] کتاب "[illegible]" ابن عربی کی فتوحات [illegible] صلیبی کی [illegible] مسلمان صوفیوں سے حاصل کردہ [illegible] صدی میں [illegible] فارسی کی صوفیانہ شاعری سے گہرے [illegible] چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمی تصوف کی [illegible] اسلامی تصوف [illegible] اور اس نے عالمی تصوف کی راہ [illegible] اور متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

[illegible]

شکل، صورت، شبیہ۔ اسلام میں تصاویر کی حرمت آنحضرت [illegible] تصویر [illegible] ارشادات، صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہائے اسلام کے [illegible] کی رو سے مسلّم [illegible] ہے۔

[illegible] حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ [illegible] تشریف لے گئے آپ نے فرمایا تم لوگوں میں سے کون [illegible] نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جسے [illegible] اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص [illegible] کے لئے حاضر ہوں چنانچہ وہ گیا مگر اہل مدینہ کے خوف سے یہ کام [illegible] [illegible]

Marfat.com

جا ، حضرت علیؓ کہنے لگے میں تمہیں اسی کام کے لیے بھیج رہا ہوں جس پر آنحضرتؐ نے مجھے بھیجا تھا۔ واپس آکر انہوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کر دیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ (مسلم و مسند احمد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ رحمت کے فرشتے کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔" (مسلم، ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا پھر آپؐ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا (مسلم، بخاری)

اسی مضمون کی کئی اور احادیث ہیں جن سے تصویر کی حرمت ثابت ہے۔ تصاویر کے بارے میں آنحضورؐ نے آخر کار امت کے لیے جو درثہ چھوڑا اس کا پتا صحابہ کرام کے اس عمل سے چلتا ہے جو انہوں نے اس معاملے میں اختیار کیا۔ کیونکہ اسلام کے مسلمہ اصولوں میں معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد آنحضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کر دیا ہو اور آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ کا کسی طریقے پر عمل کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ نے امت کو اسی طریقے پر چھوڑا تھا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمہارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

حنش الکنانی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی پولیس کے کوتوال سے کہا تم جانتے ہو کہ میں کس مہم پر بھیج رہا ہوں؟ اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا، یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور ہر قبر کو زمین کے برابر کردوں۔" (مسند احمد)

ابن عربی نے لکھا ہے کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر اجماع ہے قطع نظر اس کے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف بچیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں۔

امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیے پر اگر تصویر ہو تو اسکے استعمال کی اجازت ہے مگر دیوار یا چھت پر جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا اعزاز ہوگا۔ بخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے لیے ہوگی۔

حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ زمانہ تابعین کے علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ فرش اور تکیے میں تصویر کا ہونا اس (تصویر) کے لئے باعث ذلت ہے نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اونچی جگہ پر لگائی گئی تصویر حرام اور قدموں میں جسے پامال کیا جاتے، جائز ہے۔ (فتح الباری)

تصویر کشی: تصویر کھینچنا۔ (دیکھیے "مصوری")

تطفیف، سورۃ: قرآن مجید کی ۸۳ ویں سورۃ۔ (دیکھیے "المطففین")

تعز: جنوبی عرب کا ایک شہر۔ جو سطح سمندر سے ۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور جبل صبر کی شمالی ڈھلان پر تعمیر کیا گیا ہے۔ ترکی عہد حکومت میں یہ شہر تعز یہ کے سنجاق یعنی ضلع کا صدر مقام تھا۔

مقامی روایات کی رُو سے یہ شہر زمانہ جاہلیت میں آباد کیا گیا تھا۔ بقول ابن مجاورؒ اصحاب کہف کے علاوہ خواب کا مقام جبل صبر ہی کا ایک غار ہے۔

حاجی خلیفہ صاحب "جہان نما" کے نزدیک تعز کا بانی ایوبی خاندان کا بادشاہ ظہیر الدین ابو الفوارس تغتگین تھا۔ جو ۵۷۹ھ/۱۱۸۳ء میں یمن آیا۔

ایک روایت میں تعز کی بنیاد ایک ولی سے منسوب ہے۔ اس روایت کے مطابق یہ مقام پہلے بادشاہوں کا مسکن تھا۔ بعد میں ایک مشہور و معروف سنی ولی اور تعز کے صاحب کرامت بزرگ اسماعیل ملک نے القاہرہ کے ٹیلے پر اپنی مسجد اور قبر تیار کرائی۔ بعد ازاں اسی مقام پر ایک قلعہ تعمیر ہوا اور شہر بھی آباد ہو گیا۔

یاقوت کے زمانے ۱۲۲۹ء میں تعز یمن کا ایک بڑا اور مشہور قلعہ تھا اور عدینہ اس کے مضافات میں تھا۔

رسولی خاندان کے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اس شہر کو بہت زیادہ شہرت اور خوشحالی حاصل ہوئی۔ انہوں نے یہاں پر پانچ مدرسے بنوائے۔ ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں ایک لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ یہ کتب خانہ ایک مدرسے میں تھا جسے المؤید داؤد ۱۲۹۶ء تا ۱۳۲۱ء نے قائم کیا تھا۔

۱۵۱۶ء میں حسین الکردی نے تعز کو فتح کیا یہ مملوک سلطان قانصوہ الغوری کا سپہ سالار اور امیر البحر تھا۔ ۱۵۴۵ء میں تعز پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵۹۰ء میں ترکوں سے صنعاء کے اماموں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ان صدموں کے اٹھانے کے بعد تعز کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی تھی بقول فرانسیسی طبیب دلاگرو دیئر" یہ ایک پرانا شہر ہے۔ جس کی خوبصورت دیواریں ترکوں نے تعمیر کی ہیں۔ قلعہ میں تیس توپیں ہیں۔ اب یہ قلعہ سرکاری قید خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔"

۱۹۲۵ء میں جب صنعا کے امام ترکوں کے جانشین ہوئے تو ان کے عہد میں اس شہر کے سابقہ تمام نقصانات کی تلافی ہو گئی۔ بعد میں تعز پر ذو محمد کا قبضہ ہو گیا جو ایک زبردست قبیلہ تھا۔ ایک عرصے تک یہ شہر انہی کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک ابراہیم پاشا کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۳۵ء میں مصریوں نے اس شہر پر اپنا تسلط قائم کیا جو ۱۸۴۰ء تک قائم رہا۔ ۱۸۷۱ء میں جب ترکوں نے یمن کو دوبارہ فتح کیا تو تعز بھی ترکوں کے زیر نگیں آگیا۔ ۱۸۹۲ء میں یہ شہر زیدیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن اگلے سال ہی اس پر ترکوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء کی صلح کے بعد ترکوں کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ اور امام صنعا کے دائرہ حکومت میں آگیا۔

شہر کے گرداگرد ایک فصیل ۱۹ سے ۲۰ فٹ اونچی ہے اور ۲۸ سے ۳۰ فٹ تک چوڑی ہے۔ یہ فصیل ایک غیر مساوی الاضلاع مستطیل کو گھیرے ہوئے ہے جو شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے۔

اس مستطیل کے جنوب مشرقی پہلو میں ایک ڈھلوان چٹان ہے جس کی بلندی ۴۷۰ فٹ ہے۔ چوٹی پر قلعہ القاہرہ ہے جو اب کھنڈر ہو چکا ہے شہر کی فصیل کے پانچ دروازے ہیں۔

یہاں ایک بہت بڑی منڈی ہے یہاں پر شہر کے ایک منزلہ مکانات تھے جو اب کھنڈر بن چکے ہیں اور ان کی جگہ اب جھونپڑیوں نے لے لی ہے۔ چند خوبصورت مساجد ہیں جن میں ایک مسجد اشرفیہ ہے۔ جس کا بانی رسولی خاندان کا بادشاہ اسماعیل بن العباس تھا۔ یہ مسجد خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ شہر کی جامع مسجد المظفریہ ہے جو جبل صبر کی ڈھلان پر واقع جو ایک وسیع اور شاندار مسجد ہے۔ ان کے علاوہ دوسری مساجد میں عبدالہادی کی مسجد، مسجد شیخ موسیٰ، مسجد شیخ افضل جو شاندار مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ مسجد مجدبیہ، مسجد شرف الدین خاص طور پر قابل دید ہیں۔

Marfat.com

تعز میں پانی کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ چنانچہ یہاں پر بہت سے باغات، کھیت اور مرغزار ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور باغ سلیمان پاشا کا ہے اس باغ کا نام برکۃ حبیب ہے۔

تعز کے اردگرد کے میدانی علاقے میں خوب کاشت کاری ہوتی ہے۔ جبل صبر بھی ایک باغ نباتات ہے۔ جس کی نیچی ڈھلانوں پر ہر قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں تعز کی آبادی پچاس ہزار کے قریب تھی۔

تعزیت کسی کے مرنے پر صبر کی تلقین اور اظہار ہمدردی کرنا۔ حضرت معاذؓ کے ایک فرزند کا انتقال ہوگیا تو آنحضورؐ نے انہیں ایک تعزیت نامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

"شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ یہ تعزیت نامہ محمدؐ رسول اللہ کی طرف سے معاذؓ بن جبل کے نام ہے۔ تم پر سلامتی ہو۔ میں اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اللہ تمہارے اجر کو اور زیادہ کرے اور صبر عطا فرمائے اور ہمیں اور تمہیں شکر کی توفیق دے۔ ہماری جانیں ہمارے اموال اور ہمارے اہل و عیال سب کچھ اللہ کی خوش آئند بخششیں ہیں اور اس کی ودیعت کردہ عاریتیں ہیں۔ تمہیں رشک و مسرت کے ساتھ اس سے سرفراز کرتا رہا اور بڑے اجر کے عوض تم سے اسے واپس لے لیا یہ واپسی اجر ہے۔ صلوٰۃ، رحمت، اور ہدایت ہے لہٰذا اگر تم اسے کار ثواب سمجھتے ہو تو صبر سے کام لو تمہاری بے صبری تمہارے اجر و ثواب کو ضائع کر کے تمہیں نادم نہ کرنے پائے یہ سمجھ لو کہ بے صبری کا ماتم نہ مرے ہوئے کو واپس لا سکتا ہے نہ غم کو دور کر سکتا ہے اور ہونے والا حادثہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ والسلام"

ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ تعزیت مستحب ہے۔ لیکن اس کے وقت میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دفن کرنے سے پہلے تعزیت سنت ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک دفن کے پہلے اور دفن کے بعد تین دن تک سنت ہے نیز امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک تعزیت کے لئے بیٹھنا مکروہ ہے۔

تعزیر باز رکھنا، منع کرنا، تنبیہہ و تادیب کر کے کسی کو احکام پر قائم کرنا۔ اصطلاح میں تعزیر سے مراد وہ سزائیں ہیں جنہیں کتاب و سنت نے متعین نہیں کیا بلکہ حاکم وقت اس کے ایما پر قاضی موقع کے اعتبار سے یا ضرورت کے مطابق متعین کر سکتا ہے۔ یہ سزائیں تعزیر کے ضمن میں آتی ہیں۔

تعزیر اور حد میں یہ فرق ہے کہ تعزیر میں بندوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس میں بندہ تصرف کر سکتا ہے۔ اس کی سزا کم و بیش کی جا سکتی ہے اور اسے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دُرّوں کی سزا کو قید میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن حد اللہ تعالےٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ اس میں بندہ اپنے تصرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ حد کا شمار حقوق اللہ میں ہوتا ہے۔ جبکہ تعزیر کا شمار حقوق العباد میں ہوتا ہے۔ قصاص بھی اس لحاظ سے حقوق العباد کے ضمن میں آتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی بندے کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو مجرم کو معاف کر دے

تعزیر ایسے گناہ کے لئے مشروع ہے جس میں حد اور کفارہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے گناہ کے باعث جس میں تعزیر دی جاتی ہے، تعزیر کا مستحق ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک اسے تعزیر دینا واجب ہی نہیں بلکہ جائز ہے اور حاکم اس امر میں مختار ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر حاکم تعزیر دینے میں مصلحت سمجھتا ہو تو اس کے لئے تعزیر دینا واجب ہے۔ ورنہ نہیں۔ امام مالک کے نزدیک ہر صورت میں واجب ہے۔

اگر حاکم کسی کو تعزیر دے اور وہ اس سے مر جائے تو امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد کے نزدیک حاکم پر خون بہا دینا لازم نہیں آئے گا۔ امام شافعی کے نزدیک واجب ہے۔

تعزیر کی سزا حد کی سزا سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے اور یہ مسلک امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ تعزیر حاکم کی رائے پر موقوف ہے اور اگر وہ حد کی سزا سے بھی زیادہ سزا دینا چاہے تو اس کے لئے جائز ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تعزیر کی سزا زیادہ سے زیادہ ۳۹ کوڑے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بیس کوڑے ہیں۔

تعزیر اور حد کی طرح تعزیر اور تادیب میں بھی فرق ہے۔

تعزیر ایک اصطلاح بن چکی ہے جس کے متعلق امیر المومنین یا حاکم وقت کی طرف سے قاضی یا کوئی اور عہدیدار نوعیت جرم متعین کرنے کے بعد اس کی مناسب سزا نافذ کرتا ہے۔ اس کے برعکس تادیب قانونی سزا نہیں ہے مثلاً استاد کا شاگرد کو سزا دینا اور باپ کا بیٹے کو سزا دینا تادیب کہلاتے ہیں۔

تعزیہ اردو میں حضرت امام حسینؓ کے روضے کی شبیہ کو تعزیہ کہا جاتا ہے اسے سونے چاندی، لکڑی، بانس، کپڑے اور کاغذ وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اہل تشیع تعزیہ کو غم اور سوگ کی علامت کے طور پر جلوس کی شکل میں نکالتے ہیں اور کربلا تک لے جاتے ہیں اور بعض امام باڑوں میں یہ کشادہ اور مخصوص چبوتروں پر رکھے جاتے ہیں۔

عراق میں تعزیہ کو شبیہ کہتے ہیں۔ ہر علاقے کے تعزیوں میں اس علاقے کی خصوصیات صنعت و کاریگری کے بڑے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

بناوٹ کے لحاظ سے ان کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً

ضریح:۔ وہ تعزیہ جو بالکل حضرت امام حسینؓ کے روضے کی نقل ہوتی ہے ضریح کہلاتا ہے۔ نظام دکن، والیٔ رامپور، راجہ محمود آباد اور کراچی کے بعض خاندانوں میں یہ ضریحیں موجود ہیں۔

بنگلہ:۔ اس کی شکل و صورت محمل ناقہ یا عماری فیل سے مشابہ ہوتی ہے اس قسم کے تعزیے لکھنؤ اور اس کے مضافات میں بنتے ہیں۔

مومی:۔ بانس کی تیلیوں پر مندرجہ بالا دونوں شکلوں میں سے کسی ایک کا ڈھانچہ بنا کر اس پر موم چڑھایا جاتا ہے۔

جَو کے تعزیے:۔ تعزیے کے ڈھانچے پر مٹی کی ہلکی تہہ جما کر گیہوں یا جو کے دانے ایک خاص انداز سے چپکائے جاتے ہیں۔ دس پندرہ دن میں ان میں سے چھوٹے چھوٹے پودے نکل آتے ہیں۔ اور تعزیہ بالکل سبز ہو جاتا ہے۔ جلوس کے دوران میں ان پر پانی چھڑکتے ہوئے چلتے ہیں۔ تعزیہ کے سب سے نچلے حصے کو تخت، اوپر والے کو حظیرہ اس سے اوپر والے کو تربت اور سب سے اوپر والے حصے کو علم کہتے ہیں۔

تعزیے ۲۹ ذی الحج سے ۹ محرم تک آراستہ و پیراستہ کر کے ایک خاص مقام پر رکھے جاتے ہیں۔ یہ مقامات مختلف ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں مثلاً عزاخانہ

Marfat.com

تعزیہ خانہ یا امام باڑہ یا عشور خانہ، امام خانہ، چبوترہ جہاں امام صاحب۔

تعزیہ اگرچہ اہلِ تشیع کے نقطۂ نظر کی شے ہے ان کے نزدیک نہایت اہم مقام رکھتا ہے لیکن بعض سنیوں اور ہندوؤں میں بھی اسے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

تعزیے رکھنے والی جگہوں پر مجالس ماتم، سوز خانی، مرثیہ خوانی، فضائل اہلِ بیت، مصائب و واقعات کربلا پر تقاریر وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تعزیہ کا رواج سولہویں صدی میں ہوا۔ شہنشاہ عالمگیر کے زمانے میں تعزیہ اور جلوس تعزیہ کا رواج تھا۔ عالمگیر ہی نے تعزیہ کے جلوس میں شمشیر زنی کو ممنوع قرار دیا تھا۔

دکنی ریاستوں میں عزاداری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ مجلس، ماتم جلوس، تعزیہ، امام باڑے قائم ہوئے۔ الغرض تیرہویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی تک پورے ہندوستان میں تعزیہ داری عام ہوگئی تھی۔

برعظیم پاک و ہند میں تعزیے کا عام رواج ہے۔ لکھنؤ، رامپور، جے پور وغیرہ میں تعزیے کا جلوس یوں نکلتا ہے گویا گھر سے کسی معزز آدمی کا جنازہ نکل رہا ہو اس جلوس میں ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، فوجی باجے، ماتمی جھنڈیاں، باوردی سپاہی، ماتم دار اور تعزیہ دار برہنہ سر، ماتمی لباس پہنے، سروں پر خاک ڈالے آنسو بہاتے سینہ کوبی کرتے چلتے ہیں۔

ایران میں تعزیے کا رواج نہیں شبیہ یا تمثیل رائج ہے۔ عراق میں علم اور ذوالجناح نکالے جاتے ہیں۔ کشمیر، نیپال اور افریقہ میں تعزیہ داری میں وہی انداز اختیار کیا جاتا ہے جو پاکستان میں ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

دسویں محرم تعزیوں کو تعزیہ دار سروں یا کاندھوں پر اٹھا کر جلوس کے ساتھ کربلا کی طرف جاتے ہیں۔ کربلا پہنچ کر قابلِ دفن تعزیوں کو کربلا میں دفن کر دیتے ہیں۔ ورنہ انہیں باقی تبرکات کے ساتھ محفوظ کر کے واپس لے آتے ہیں۔

تعصّب بلاوجہ کسی کے خلاف ہونا یا کسی مذہبی خیال یا عقیدے سے محض بربنائے مخالفت، روگردانی کرنا۔ تعصب انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی تعصب عقل و استدلال کا دشمن ہوتا ہے۔ اسلام نے تعصب کے بارے میں بڑے سخت احکامات دیئے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا "اپنی قوم کی ناحق بات پر مدد کرنا عصبیت ہے۔" (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا "جو شخص قوم کی (بیجا) حمایت کی طرف لوگوں کو بلائے (یعنی اس بات کی تحریک پیدا کرے کہ لوگ مبتلائے تعصب ہو جائیں) وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو شخص قوم کی حمایت (بے جا) کے لیے لڑے وہ ہم میں سے نہیں اور جو حالت تعصب میں مر جائے وہ ہم میں سے نہیں (ابوداؤد)

ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص اپنی قوم کی ناحق اور ناروا بات پر مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ جیسا ہے جو اونچی جگہ سے (کنوئیں میں) گر کر ہلاک ہو جاتا ہے (اور) پھر دُم پکڑ کر کھینچا جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

تعصب ایک ایسی بیماری ہے کہ اگر قومیں تعصب میں مبتلا ہو جائیں تو ان کی ترقی رک جاتی ہے۔ مذہب میں تعصب کا شدید تمدن کے فساد کا باعث ہوتا ہے

تعلیم کسی کو کچھ بتانا، پڑھانا، سکھانا۔ تعلیم کے وسیع مفہوم میں وہ تمام معلومات و تجربات شامل ہیں جو گرد سے لیکر قبر تک ہر فرد باضابطہ یا بے ضابطہ طور حاصل کرتا ہے یا اسے حاصل کرائے جاتے ہیں۔ ماہرینِ تعلیم کے نزدیک اپنے تجربے کو دوسرے تک بعینہٖ منتقل کرنا تعلیم کہلاتا ہے۔

مہذب انسان کے لئے تعلیم ہمیشہ سے ایک اہم ترین ضرورت رہی ہے افلاطون کے نزدیک تعلیم کا مقصد افراد کی قدرتی صلاحیتوں کو دریافت کرکے ان کو نشوونما دینا ہے تاکہ ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جا سکے۔

ارسطو کہتا ہے کہ "انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ روح دو طرح کی ہوتی ہے یعنی روح فعالی اور انفعالی۔ تعلیم وہ ہے جو روح فعالی اور روح انفعالی کی تربیت کر سکے۔ روح فعالی کی تربیت کے لیے سائنس اور فلسفہ اور روح انفعالی کے لیے موسیقی ادب اور اخلاق کی تعلیم دی جائے۔" وہ مملکت کی اصلاح اور استحکام کے لیے تعلیم کو ضروری سمجھتا ہے۔

بقول ملٹن "تعلیم وہ عمل ہے جو کسی فرد کو زمانہ امن و جنگ میں انفرادی اور اجتماعی فرائض کو منصفانہ طور پر اور ہنرمندی سے انجام دینے کے قابل بنائے"

جان ڈیوی نے تعلیم کی تعریف اس طرح سے کی ہے۔

"یہ تجربے کی مسلسل تعمیر نو کا نام ہے۔ جس سے تجربے کے معنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جس کے طفیل بعد میں پیش آنے والے تجربات کا رُخ معین کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔"

جان سٹوارٹ کے نزدیک۔

"تعلیم وہ معاشرتی عمل ہے جس کے ذریعے کوئی نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو موجودہ ثقافت منتقل کرتی ہے۔ تاکہ وہ نہ صرف حاصل کردہ ترقی کا معیار برقرار رکھ سکے بلکہ ممکن ہو تو اسے بلند بھی کرے۔"

افلاطون کے نزدیک "تعلیم اس عمل کا نام ہے جو معاشرے کو متوازن تنظیم عطا کرتا ہے۔"

اسلام نے تعلیم کا مقصد اللہ کا صالح بندہ بنانا بیان کیا ہے۔ یعنی انسانوں کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رُخ پر ڈالنا اور انہیں ذہنی جسمانی، عملی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گذار بندے بنکر رہیں۔ کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں نیز انفرادی عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ان کے خالق و مالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کما حقہٗ عہدہ برا ہو سکیں۔

اسلام نے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے کی جتنی پرزور ہدایت کی ہے اس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"ہم نے اسے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے اب چاہے تو وہ شکر گذار بن جائے اور چاہے تو ناشکرا" (۷۶:۳)

"خدا سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جنہیں علم سے نوازا گیا ہے" (۳۵:۲۸)

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

"اللہ ان لوگوں کے درجات بلند کرے گا جو تمہارے درمیان ایمان اور علم رکھتے ہیں۔ (۵۸:۱۱)

حدیث میں تعلیم کی اہمیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

Marfat.com

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔" (ابن ماجہ)

"علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ" (البیہقی)

"جو علم حاصل کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔ جب تک واپس نہ آجائے۔" (ترمذی)

"مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔" (مشکوٰۃ)

"میری تعلیم لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک ہی آیت ہو۔" (بخاری)

"جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔" (ترمذی اور ابو داؤد) ایک اور جگہ پر لوگوں کو حکم دیا گیا۔

"لوگ اپنے پڑوسیوں کو لازماً تعلیم دیں انہیں وعظ و نصیحت کریں اچھی باتوں کی تلقین کریں بری باتوں سے روکیں اسی طرح لوگوں کو اپنے پڑوسیوں سے علم حاصل کرنا ہوگا۔ اور اپنے اندر سمجھ پیدا کرنا ہوگی ورنہ میں ان لوگوں کو بہت جلد دنیا میں سزا دوں گا۔" (طبرانی)

"تمہارے پاس اطراف زمین سے لوگ علم دین سیکھنے آئیں گے تم ان کو بھلائی کی تلقین کرنا" (ترمذی)

اسلام کے نزدیک تعلیم کا مقصد انسان کو خلافت ارضی کا اہل بنانا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو افراد کو علم و بصیرت کی دولت عطا کرے یعنی انہیں زندگی کے ابدی روحانی حقائق اور سائنسی اور معاشرتی علوم کے بنیادی حقائق کو سمجھنے کے قابل بنائے۔ اور افراد کو عمل پر آمادہ کرے۔ روحانی حقائق کو سمجھ کر وہ عبادت کی لذت سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ سائنسی حقائق کا علم انہیں فنی اور تکنیکی مہارتوں پر قدرت عطا کر سکتا ہے اور معاشرتی حقائق کو سمجھ کر وہ قوم کی خدمت پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ وہ افراد کو رضائے الٰہی کا اس حد تک دلدادہ بنا دے کہ وہ اس کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام سائنس کی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ سراسر غلط ہے اسلام تو خود مشاہدات و تجربات کے ذریعے تسخیر کائنات کا سبق دیتا ہے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے وہ انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ ان سے فائدہ اٹھائے۔ تسخیر کائنات کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ کرنا اور فطرت کے قوانین کا علم ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں بار بار تحقیق و تفتیش پر زور دیا گیا ہے اور انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ مظاہر قدرت مثلاً چاند، تارے، موسموں کے تغیر و تبدل زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کریں۔ چنانچہ مسلمانوں کی روایات یہ ہیں کہ علم و حکمت دنیا کے جس گوشے میں ملے اسے ہر قیمت پر حاصل کیا جائے۔ (نیز دیکھئے "درس گاہ"، "درس نظامی"، "علم")

تعمیر: بنانا۔ (دیکھئے "فن تعمیر")

تعویذ: نقش، وہ کاغذ ہے، جسے لکھ کر گلے یا بازو میں دفع بلیات کے لئے ڈالتے ہیں (دیکھئے "حمائل")

تغابن، سورۃ: قرآن مجید کی ایک سورت (دیکھئے "التغابن سورۃ")

تغا تیمور: جرجان کا مغل حکمران [illegible] تک تخت پر بیٹھا۔ باپ کا نام سُدی تھا۔ اس کا دادا بابا بادشاہ ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں دس ہزار کنبوں کے ساتھ خراسان آیا۔ اور اس نے الجایتو خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں اس نے خوارزم پر چڑھائی کی۔ بعد میں مشرقی قپچاق کے خان اوزبک کی شکایت پر الجایتو نے بابا اور اس کے بیٹے کو قتل کرا دیا۔ لیکن اس کا قبیلہ مازندران میں سکونت پذیر رہا۔

جب ابو سعید ایلخانی نے وفات پائی تو حسن بزرگ جلائری نے محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ جلد ہی حسن بزرگ کے امیروں کی آپس میں نااتفاقی ہو گئی اور ان میں سے کئی ایک خراسانی امیروں کی مدد سے تغا تیمور کے پاس پہنچے اور ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء میں اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہت سنبھالنے کے بعد تغا تیمور اپنے امراء کے ساتھ آذر بائیجان کی طرف بڑھا جہاں موسیٰ اس کے ساتھ آملا۔ چنانچہ دونوں نے ایران کو آپس میں تقسیم کر لینے کی تجویز طے کی لیکن حسن بزرگ نے انہیں شکست دی۔ اب تغا تیمور بسطام کی طرف ہٹ گیا یہاں وہ مازندران اور خراسان کے علاقوں پر حکمرانی کرنے لگا۔

۷۴۱ھ/۱۳۴۱ء میں تغا تیمور نے عراق پر ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ اسے الجایتو خان کی اولاد کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن اس بار بھی ابہر کے مقام پر اس نے شکست اٹھائی۔ سربداروں نے خراسان پر قبضہ کر لیا اور ارغون شاہ والی نیشاپور کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ وجیہہ الدین مسعود سربدار نے تغا تیمور کی فوجوں کو دریائے اترک پر شکست دی۔ مغل گاؤں کو قتل کیا اور کچھ عرصے تک جرجان پر بھی قابض رہا۔ اب تغا تیمور کی بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ اگرچہ سربدار سال میں ایک مرتبہ ملازمت و تجدید عہد کے لئے تغا تیمور کے دربار میں حاضر ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ اس قسم کی حاضری کے موقع پر ۷۵۴ھ/۱۳۵۳ء سربدار یحییٰ کرابی نے تغا تیمور کو سلطان دوین کے مقام پر قتل کر دیا۔

تغا تیمور کو عمارات بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے مشہد میں خوبصورت عمارات بنوائیں۔ اس کے عہد کے جو سکے دستیاب ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکے نہ صرف آمل، مشہد، قزوین وغیرہ میں مضروب ہوئے بلکہ بصرہ اور بغداد میں بھی مضروب ہوتے تھے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تغا تیمور کو ایک وسیع علاقے پر اقتدار حاصل تھا۔

تغزغز: ایک ترکی النسل قوم (دیکھئے "ترک")

تغلب، بنو: عربوں کے ایک قبیلے کا نام۔ قدیم عرب قبائل ربیعہ میں سے بنو وائل اہم ترین قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کے مورث اعلیٰ کا اصل نام دثار تھا۔ ایک روز دثار کے باپ نے اس کی کامیابی کے بارے میں کہا تغلب (تو غالب آئے گا) اسی روز سے اس کا نام تغلب پڑ گیا۔ اور اسی سے اس قبیلے کا نام بنو تغلب ٹھہرا۔ بعض کے نزدیک اس قبیلے کا نام اس کے مورث اعلیٰ کی مندرجہ بالا روایت سے بھی قدیم ہے۔ قدیم شعراء کے نزدیک تغلب وائل کی بیٹی کا نام تھا۔

جب قبائل میں افتراق پیدا ہوا تو بنو ربیعہ کے ساتھ بنو تغلب بھی کوہستان نجد، حجاز اور تہامہ کی سرحدوں پر قابض ہو گئے جہاں سے آہستہ آہستہ الجزیرہ میں منتقل ہوتے رہے یہاں تک کہ عہد اسلامی کے شروع تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس علاقے

Marfat.com

کو بعد میں دیارِ ربیعہ کا نام دیا گیا۔ حرب بسوس کے زمانے میں بنو بکر اور بنو تغلب نجد ہی میں آباد تھے۔ بنو تغلب کے علاقے کی حدود متعین کرتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ علاقہ ملک شام کی سرحد کے قریب تھا اور بنو تغلب اس کے شمالی حصوں میں آباد تھے۔ چھٹی صدی عیسوی تک یہ قبیلہ اسی علاقے میں آباد رہا لیکن وہ بتدریج دریائے فرات کے زیریں حصے کے ساتھ ساتھ آباد ہوتے رہے۔

زمانہ جاہلیت میں الانبار کے شمال میں کباث میں بنو تغلب کی ایک منڈی تھی۔ پہلی صدی ہجری میں ان کا مرکز وسطی الجزیرہ تھا۔ ان کی کچھ تعداد منبج اور رصافہ کے مقامات پر خیموں میں رہتی تھی۔ جنوب میں عین التمر اور جبل البِشر (والاحقۃ) تک اور خفان والعذیب کے درمیان بھی ان لوگوں کی بستیاں تھیں۔ بنو تغلب کا ایک گروہ دجلہ پار کر کے آذربائیجان میں جا کر بس گیا تھا۔

بنو تغلب کا ذکر سب سے پہلے شاپور ثانی کے عہد میں آتا ہے جس نے بکر و تغلب کے علاقے پر حملہ کیا تھا۔ یہ علاقے ایران اور شام کے درمیان واقع تھے۔ شاپور نے ان میں سے بعض کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے بحرین، کرمان، توج اور الاصوانہ کے علاقوں میں آباد کیا۔ نجد کے خلاف اپنی مہم کے دوران میں ابرہہ حمیری نے زہیر بن جناب الکلبی کو بکر اور تغلب کا امیر مقرر کیا۔ جب دونوں قبیلوں نے حمیریوں کا جوا اپنی گردن سے اتارنے کی کوشش کی تو سلان اور خزازہ کی لڑائیاں ہوئیں۔ قضہ کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد بنو تغلب بکھر گئے۔

بنو تغلب کی چند جنگوں کا حال بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ ذوقار کی جنگ میں تغلب نے اپنے سردار نعمان بن زرعہ کی قیادت میں شرکت کی۔ اخطل نامی شاعر نے اپنے دیوان میں تحریر کیا ہے کہ بکر بن وائل نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی تھی اور یہ بات بنو بکر بن وائل اور بنو تغلب بن وائل دونوں کے لئے باعث افتخار تھی۔

اسلام کے ظہور سے قبل نصرانیوں سے ملاپ کی وجہ سے بنو تغلب میں عیسائیت نے بھی قدم جما لئے تھے۔ اس سے قبل وہ ایک دیوتا اوال کی پرستش کرتے تھے۔ جب ان میں تبلیغ اسلام کی کوششیں کی گئیں تو ان کے ایک چھوٹے سے فریق نے جو طے کے ساتھ رہتا تھا ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ ۹ھ میں بنو تغلب کا ایک وفد مدینے میں آیا۔ ان میں سے بعض مسلمان تھے اور بعض عیسائی رہتے۔ عیسائیوں نے آنحضورؐ سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب ہی پر قائم رہیں گے لیکن اپنی اولاد کو عیسائی نہیں بنائیں گے۔

۱۱ھ میں ردہ کی لڑائیوں کے دوران میں سجاح (جھوٹی نبوت کی دعویدار) جس نے بنو تغلب کے درمیان ہی مسیحی ماحول میں پرورش اور تربیت پائی تھی تغلب اور تمیمیوں کی ایک بڑی تعداد لے کر یمامہ کی جانب روانہ ہوئی۔ اور انہیں کے ساتھ رہتے ہوئے عراق میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ ان تغلبیوں نے ۱۲ھ میں عین التمر کے مقام پر ایرانیوں کی حمایت میں مسلمانوں سے مقابلہ کیا۔ چنانچہ اس معرکے میں حضرت خالدؓ بن ولید نے انہیں تہ تیغ کر دیا۔ اور ان کے سردار عقہ کو بھی قتل کرا دیا۔ تغلبیوں نے اپنے سردار کا بدلہ لینے کے لئے ایک اور مہم میں حصہ لیا۔ اس مہم میں ایرانیوں نے بڑے پیمانے پر تیاری کی تھی۔ تغلبیوں کا سردار هذیل بن عمران مقام المصیخ میں خیمہ زن ہوا۔ حضرت خالدؓ بن ولید ان پر فوج کے تین دستوں سمیت ٹوٹ پڑے اور ان میں سے چند ایک کے سوا کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ پھر الثنی میں آپؓ نے ربیعہ بن بجیر التغلبی کی فوج کو مار بھگایا اور ربیعہ کی بیٹی کو حضرت علیؓ نے خرید لیا جو اسیر ہو کر مسلمانوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے زمیل کے ایک اور پڑاؤ پر بھی چھاپہ مارا لیکن ہلال بن عقہ وہاں سے بھاگ نکلا اور رضاب کی طرف چلا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے جب حضرت خالدؓ بن ولید نے ملک شام کی طرف یلغار کی تو المصیخ اور الحصید کے مقام پر مرتد تغلبیوں کو موجود پایا جو ربیعہ بن بجیر کے تحت تھے آپؓ نے انہیں شکست دی۔ مندرجہ بالا واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تغلبیوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔

بنو تغلب کا ایک وفد حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں عبداللہ کے سفارتی وفد کے ساتھ مدینے آیا تھا۔ جس نے حضرت عمرؓ سے علیحدہ ایک معاہدہ کیا۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں پہلے تو بنو تغلب محبان علیؓ میں سے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بنوامیہ کے ہم نوا بن گئے اور جنگ صفین میں امیر معاویہؓ کی طرف سے لڑے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے انہیں کوفے میں آباد کر دیا۔ حرّہ کی جنگ میں تغلبیوں نے یزید کا ساتھ دیا۔ اور مرج راہط میں مروان کے طرفدار بنے۔

۶۴ھ/۶۸۸ء میں جب عمیر ان الحباب اپنے سلیمیوں سمیت دریائے خابور کے کنارے آبسا اور وہ ان تغلبیوں سے برسرپیکار ہوا جو اس علاقے میں خیمہ زن تھے تو چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد ایک زبردست جنگ جو ماکسین کے مقام پر ہوئی اس میں تغلبیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ یہ جدال و قتال تغلب کے آخری اہم واقعات میں سے تھا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی چند واقعات پیش آتے رہے مثلاً جب روح بن صالح ہارون الرشید کی طرف سے بنو تغلب کے صدقات کا محصل بنا تو پہلی ہی مڈبھیڑ میں تغلبیوں نے اسے قتل کر دیا، جس کا بدلہ اس کے بھائی حاتم نے ۱۰۱ھ/۸۰۰ء میں تغلب سے بڑی بے رحمی سے لیا۔ اس واقعے کے سات سال بعد بنو تغلب نے ایک بغاوت کی۔

بنو تغلب ۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء میں تاتاریوں کے خلاف کامیابی سے جنگ کرتے ہوئے اور فتح یاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ نویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے اس قبیلے کا ذکر تاریخ کے اوراق سے غائب ہو جاتا ہے۔

بنو تغلب زراعت پیشہ تھے جنہوں نے بدووں کے طور طریقے اپنا لئے تھے الجزیرہ میں وہ گھوڑوں کو تربیت دینے اور پرورش کرنے میں مشہور تھے۔ وہ ملاح بھی تھے اور کشتیوں کی تجارت سے انہوں نے خوب دولت اور شہرت کمائی تھی۔ بقول تبریزی "اگر اسلام کا ظہور کچھ عرصہ بعد ہوتا تو بنو تغلب نے لوگوں کو نگل لیا ہوتا"۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس طاقتور اور اونچی ناک والے قبیلے کے ساتھ بردباری اور حلم سے کام لیتے رہے۔

شراب نوشی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے مخالفین انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے۔

اس قبیلے میں کئی مشہور شاعر گذرے جن میں کلیب مہلہل، فرزل، السفاح الخنس بن شہاب، الفنون، عمرو بن کلثوم، جابر بن حنی، عمیرہ بن جعیل، کعب بن جعیل الاخطل، العتابی وغیرہ بہت بلند پایہ شاعر تھے۔

بنو تغلب کی زبان رومیوں کے قریب ہونے کی وجہ سے خالص نہ تھی۔

تغلق، بنو ایک خاندان جس نے سلطنت دہلی پر تقریباً ۹۴ سال حکومت کی بقول مورخ فرشتہ۔ تغلق اصل میں تُلغ تھا جو ترکی لفظ ہے اور جس کے

Marfat.com

معنی بزرگ بار بڑے کے ہیں۔ اہل ہند نے اسے الٹ کر تغلق کر دیا۔"

اس خاندان کا نام اس کے بانی غیاث الدین تغلق کے نام سے ماخوذ ہے جو قرونیہ ترکوں میں سے تھا۔ اس کا باپ ترک اور ماں ہندی النسل تھی۔ اس خاندان کے فرمانرواؤں کا شجرہ مندرجہ ذیل ہے۔

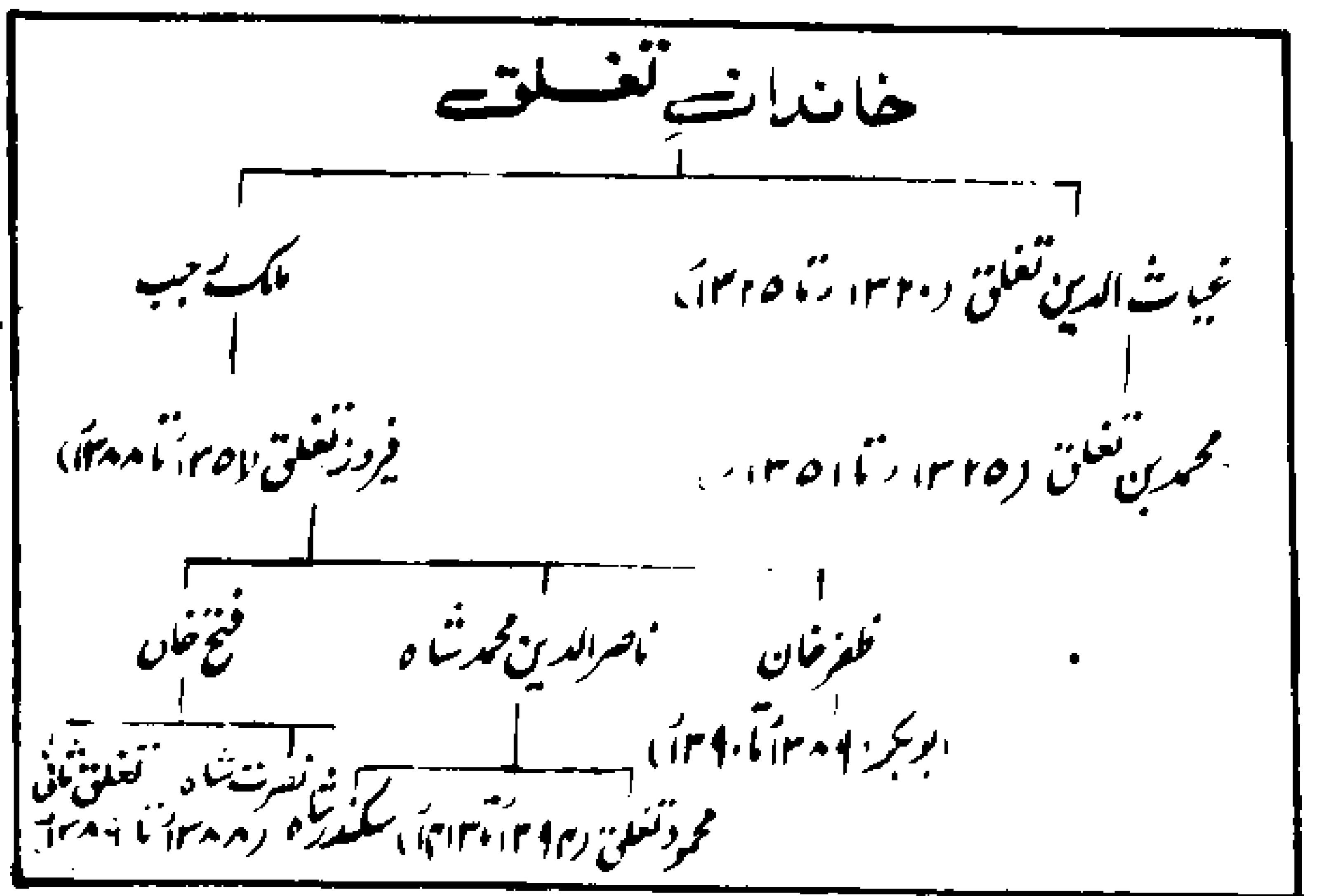

غیاث الدین تغلق (دورِ حکومت ۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۵ء) دہلی میں تغلق سلطنت کا بانی۔ فخر الدین نام غازی ملک لقب تھا۔ ترکوں کے قبیلہ قرونیہ سے تھا۔ اس کی ماں ہندی النسل تھی۔ شروع میں یہ ایک سوداگر کے اصطبل میں ملازم تھا۔ بعد میں سلطان علاء الدین خلجی کے بھائی الغ خان کے پیادوں میں شامل ہو گیا۔ وہاں سے ترقی کرتے ہوئے سوار فوج کا افسر اعلیٰ بن گیا۔ منگولوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے لڑائیاں لڑیں اور تقریباً ۲۹ مہموں میں حصہ لیا۔ اسی بنا پر اسے غازی ملک کا خطاب ملا۔ سلطان علاء الدین کے عہد حکومت میں دیپالپور کے اہم سرحدی صوبے کا گورنر اور کماندار رہا۔ خسرو کو شکست دینے کے بعد غیاث الدین کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ جب اس نے عنان حکومت سنبھالی تو ملکی اور معاشرتی نظام درہم برہم تھا۔ اس نے بڑی سمجھداری اور تدبر سے کام لیا۔ اور ہر چیز میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔

سلطنت کے انتظامی اور مالیاتی امور کو درست کر کے تغلق نے سلطنت کی توسیع کی طرف توجہ کی۔

"تلنگانہ کے راجہ پرتاپ اور دیوتائی نے دہلی کے ابتر حالات سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۳۲۱ء میں تغلق نے الغ خاں ولی عہد سلطنت کو تلنگانہ کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ یہاں کے راجہ نے صلح کی درخواست کی۔

۱۳۲۲ء میں سلطان نے الغ خاں کو دوبارہ ورنگل کی مہم پر بھیجا۔ ہندوؤں نے مقابلہ کیا لیکن بہت جلد مغلوب ہو گئے۔ راجہ اپنے خاندان سمیت گرفتار ہوا اور اس طرح تلنگانہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔ ورنگل سلطان پور کے نام سے اس صوبے کا صدر مقام بنا۔

۲۵-۱۳۲۴ء میں بنگال میں بغرا خان کے لڑکوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ تغلق نے موقع غنیمت جانا اور بنگال پر فوج کشی کی۔ ناصر الدین نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ لکھنوتی کا علاقہ ناصر الدین کے حوالے کر دیا گیا۔ سنار گاؤں اور ست گاؤں کے علاقے سلطنت میں شامل کر لیے۔ واپسی میں سلطان نے ترہت کا قلعہ فتح کیا۔ ترہت سے سلطان غیاث الدین دہلی روانہ ہوا۔ اس نے اپنی آمد کی پیشگی اطلاع اپنے بیٹے الغ خان کو بھیج دی۔ الغ خان نے سلطان کے استقبال کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ اور دہلی سے کچھ دور افغان پور کے مقام پر سلطان کے قیام کے لیے عارضی طور پر ایک محل تعمیر کرایا، کہ رات کو سلطان اس محل میں آرام کرے اور صبح جلوس کی شکل میں شہر میں داخل ہو۔ بدقسمتی سے اچانک محل کی چھت گر گئی اور سلطان اس کا بیٹا اور چار دوسرے آدمیوں کے ساتھ چھت کے نیچے دب کر فوت ہو گئے۔

غیاث الدین تغلق نے کل پانچ سال حکومت کی، لیکن اس نے اس تھوڑے سے عرصے میں ایک وسیع، خوشحال اور پُرامن سلطنت قائم کر لی تھی۔

وہ ایک قابل منتظم اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ شریعت کا پابند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ساری ہندو مسلم رعایا برسر روزگار ہو۔ اس کے عہد میں چوروں اور ڈاکوؤں نے چوری اور نقب زنی چھوڑ کر کاشت کاری اختیار کر لی تھی۔ اس کے دور میں راستے اور شاہراہیں محفوظ تھیں لیکن اسے کچھ زیادہ مہلت نہ مل سکی۔

محمد بن تغلق :- (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا الغ خان محمد بن تغلق کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اسے ایک وسیع سلطنت اور مال و دولت سے پُر خزانے ورثہ میں ملے تھے۔ وہ خود ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ تعلیمی اعتبار سے وہ تمام سلاطین دہلی پر فوقیت رکھتا تھا۔ وہ ادیب، خطیب حافظ قرآن اور عالم باعمل تھا۔ طب، ریاضی اور نجوم سے بخوبی واقف تھا۔ اسے منطق میں بھی ایک خاص مقام حاصل تھا۔

محمد بن تغلق کی طبیعت میں ندرت اور اختراع کا مادہ بہت تھا۔ اور اس نت نئے منصوبے اور ضابطے بنانے کا شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے منصوبوں نے ہر طبقے کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور ابتدائی دس سالہ حکومت کے بعد اس کی بقیہ زندگی ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں گزری۔ ۱۳۵۱ء میں جب وہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سندھ پہنچا تو اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور چند روز بعد انتقال کر گیا۔ سندھ اور بنگال کے صوبے محمد بن تغلق کے عہد ہی میں مرکز سے الگ ہو چکے تھے۔

اس کے مزاج میں بلا کی انتہاپسندی تھی۔ جب اس پر فلسفے کا غلبہ ہوا تو وہ الحاد کے قریب پہنچ گیا اور دین سے منکر ہو گیا۔ جب اس پر مذہبی جذبہ غالب ہوا تو اس نے اتنا غلو کیا جو نمازیں نہیں پڑھتے تھے انہیں قتل کرا دیتا تھا۔

فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) یہ سالار رجب کا فرزند تھا جو سلطان غیاث الدین کا چھوٹا بھائی تھا۔ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو غیاث الدین تغلق ہی نے اس کی پرورش اور تربیت کی۔ جہانبانی اور کشورکشائی کے اصول اس نے غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے عہد میں سیکھے۔

سولہ سال کی عمر میں محمد بن تغلق نے اسے نائب امیر مقرر کر کے نائب باربک کا خطاب دیا۔ سلطان ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ سلطان نے بوقت رحلت وصیت کی کہ اس کی وفات کے بعد فیروز شاہ اس کا جانشین ہوگا۔

فیروز شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی ان تمام علاقوں کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا جو سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت میں سلطنت دہلی کے حلقۂ اثر سے آزاد ہو گئے ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے سندھ کے صوبے کو مسخر کر لیا۔ لیکن بنگال کی تسخیر میں ناکام رہا۔ اس کا دور حکومت رفاہی کاموں کے لیے مشہور ہے۔ اس نے ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ سلطان فیروز تغلق ایک نیک دل، شریف طبع اور رعایا پرور حکمران تھا۔ اس نے رعایا کو آسائش پہنچانے کے لیے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ ملک میں کنوؤں اور نہروں کا جال بچھا کر رعایا کی خوش حالی میں اضافہ کیا۔ بقول صاحب تاریخ فرشتہ فیروز شاہ نے زراعت کو ترقی دینے کے لیے پچاس

Marfat.com

بند بنوائے، بیس مساجد، بیس مدارس، بیس محلات، دو سو کے قریب شہر بسائے سو شفا خانے پانچ مقبرے اور دس مینار بطور یادگار تعمیر کیے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کے بعد اس کا پوتا تغلق بن فتح خان ۱۳۸۸ء میں سلطان غیاث الدین تغلق ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ وہ ایک ناتجربہ کار اور خام طبع نوجوان تھا۔ جلد ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے چچا زاد بھائی ابوبکر بن ظفر خان کو قید کرا دیا۔ اس پر بعض امرا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ان کی بغاوت کی وجہ سے تغلق ثانی کو تخت و تاج کے علاوہ زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑے

۱۳۸۹ء ابوبکر تغلق مسند نشین ہوا تو اس کے چچا محمد بن فیروز نے تاج و تخت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ شہر سے باہر لڑائی ہوئی۔ جس میں محمد کو شکست ہوئی اور وہ دوآب کی طرف بھاگ نکلا۔ اگرچہ ابوبکر نے محمد کو شکست دے دی تھی لیکن دہلی میں اس کی حیثیت مخدوش تھی اس نے اپنے ایک حامی بہادر ناہر کے پاس پناہ لی اس کی عدم موجودگی میں محمد چند امرا کی دعوت پر دہلی میں داخل ہوا اور ۱۳۹۰ء میں ناصر الدین محمد شاہ تغلق کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ شاید ناصر الدین محمد حالات کو سنبھال لیتا لیکن جنوری ۱۳۹۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات کے چند ماہ بعد امرا نے محمد شاہ کے دوسرے لڑکے محمود کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے ناصر الدین محمود تغلق کا لقب اختیار کیا۔

دوآب کے حالات مخدوش تھے سلطان نے ملک سردار خواجہ جہاں کو ملک الشرق کا خطاب دے کر دوآب اور مشرقی اضلاع کا حاکم مقرر کیا۔ خواجہ جہاں نے جونپور میں اپنا علیحدہ دار الحکومت بنا لیا اور ارد گرد کے علاقوں پر تسلط جما کر شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اسی اثنا میں گجرات، مالوہ اور خاندیش بھی دہلی کی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چند امرا نے سلطان فیروز شاہ کے پوتے نصرت خان کو بادشاہ بنا دیا۔ اب دہلی میں دو بادشاہ تھے۔ ایک پرانی دہلی کا اور دوسرا فیروز آباد کا۔ ان دونوں بادشاہوں کی حیثیت شطرنج کے مہروں کی سی تھی اصل اقتدار امرا کے ہاتھ میں تھا، جو باہم دست و گریباں رہتے تھے۔

چنانچہ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کے دہلی پہنچتے ہی نصرت خان کو وہاں سے بھگا دیا گیا تھا۔ محمود تغلق اور ملو نے تیمور کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ محمود گجرات کی طرف نکل گیا۔ تیمور کے واپس چلے جانے کے بعد محمود دوبارہ بادشاہ بن گیا۔ لیکن اب اس کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں تھی۔ مکمل اقتدار ملو کے ہاتھ میں تھا۔ محمود نے ۱۴۱۳ء میں کیتھل کے مقام پر وفات پائی۔ اس کے انتقال کے بعد تغلق خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

تغلق شاہ:۔ خاندان تغلق کا ایک فرمانروا۔ (دیکھیے "تغلق، بنو")

تغلق، غیاث الدین:۔ بنو تغلق کا بانی۔ (دیکھیے "تغلق بنو")

تغلق، فخر الدین محمد:۔ خاندان تغلق کا دوسرا فرمانروا۔ (دیکھیے "تغلق بنو")

تغلق، فیروز شاہ:۔ خاندان تغلق کا تیسرا بادشاہ (دیکھیے "تغلق بنو")

تفتازانی (صفر ۷۲۲ھ/مارچ ۱۳۲۲ء - ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء):۔ سعد الدین بن مسعود بن عمر بلاغت، منطق، کلام فقہ تفسیر، ماوراء الطبیعۃ کے ماہر اور مصنف تفتازان میں خراسان میں نسا کے قریب پیدا ہوئے۔ آپ نے عضد الدین ایجی اور قطب الدین رازی سے تعلیم حاصل کی۔ بقول ابن عرب شاہ تفتازانی، قطب الدین رازی کی طرح ان علما میں سے تھے جو مغربی قپچاق کے مغل بادشاہوں کے دربار میں چلے آئے تھے۔ چنانچہ آپ خوارزم میں آ بسے تھے ۱۳۸۰ء میں علامہ تفتازانی سمرقند چلے گئے۔ سمرقند ہی میں وفات پائی اور سرخس میں دفن ہوئے آپ کے سن وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء بعض نے ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء اور حبیب السیر، ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء بتایا ہے۔

آپ کی اولاد میں ایک لڑکے کا ذکر ملتا ہے جو شیخ الاسلام شمس الدین محمد کے نام سے مشہور تھے، آپ کے شاگردوں میں سے حسام الدین حسن بن علی بیوردی اور برہان الدین حیدر کے نام ملتے ہیں۔

تفتازانی نے شافعی اور حنفی فقہ پر کتابیں لکھیں۔ اسی وجہ سے بعض انہیں شافعی مسلک اور بعض حنفی مسلک کے حامل سمجھتے ہیں۔

تفتازانی نے کئی ایک اصناف علم پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ کی تصنیف مندرجہ ذیل ہیں۔

شرح التصریف العزی اور ارشاد الہادی صرف و نحو ہیں۔
المطوّل، مختصر المعانی اور شرح القسم الثالث من المفتاح بلاغت پر
شرح الرسالہ الشمسیہ، تہذیب المنطق والکلام منطق پر
المقاصد، شرح العقائد النسفیہ، ماوراء الطبیعات اور علم کلام پر
التلویح الی کشف حقائق التنقیح، شرح الشرح اصول فقہ پر:۔
المفتاح، اختصار شرح تلخیص الجامع الکبیر فقہ پر:۔
کشف الاسرار و عُدّة الابرار (تفسیر قرآن مجید بزبان فارسی) تفسیر پر
شرح الکشاف یا حاشیہ علی الکشاف ہیں۔

تفسیر کھولنا، بیان کرنا، کسی تحریر و قول کے مطالب کو سامعین کے ذہن کے قریب کرنا۔ اصطلاح میں اس سے مراد قرآن مجید کے معانی اور مفہوم کو واضح کرنا۔ بالفاظ دیگر تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت ادا اور الفاظ کے معنی، ان کے انفرادی و ترکیبی حالات اور ان کے تتمات کا بیان ہو۔

بقول امام ماتریدی "تفسیر اس یقین کا نام ہے کہ لفظ سے یہی مراد ہے اور اس قدر یقین ہو کہ خدا کو شاہد ٹھہرا کر کہا جائے۔ خدا نے یہی معنی مراد لیے ہیں"

امام ابو النصر قشیری کے نزدیک "تفسیر موقوف ہے۔ سماع اور اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، پر کتاب اللہ کا جو مفہوم سنت رسول اللہ اور احادیث صحیحہ و صریحہ کے ذریعہ متعین ہو گا وہ تفسیر ہو گا۔"

زرکشی نے کہا کہ "تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب سمجھی جاتی ہے جسے اس نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔"

بعض علما نے یہ بیان کیا ہے کہ تفسیر اصطلاح میں نزول آیات ان کے شان نزول اور ان کے اسباب نزول کے علم کو کہا جاتا ہے اور اس بات کے جاننے کو بھی تفسیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہ آیات قرآن کے مکی اور مدنی محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، خاص و عام، مطلق و مقید، حلال و حرام

Marfat.com

وعدہ و وعید، امر و نہی اور عبرت و امثال ہونے کی ترتیب معلوم ہو۔

ضرورت تفسیر:۔ یہ ایک امر واقعی ہے کہ تمام انسان یکساں عقل و قابلیت نہیں رکھتے۔ ان کی استعداد اور صلاحیتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کوئی کج ذہن ہوتا ہے تو کوئی کند ذہن کوئی ذکی ہوتا ہے تو کوئی بالکل غبی۔ اس لیے کسی کلام کو سمجھنے میں ہر شخص یکساں نہیں۔ پھر عام لوگوں کا کلام تو الگ رہا لیکن جہاں معاملہ اللہ تعالے کے کلام کا ہو۔ جس کی جامعیت، ہمہ گیری، بسط اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں جس میں بے شمار مطالب فصاحت و بلاغت، اوصاف کلام اور معنی و بدیع کی ایک دنیا آباد ہو۔

قرآن کی تفسیر و تشریح آنحضور ؐ کی ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ اس لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

"اور وہ قرآن کی تعلیم دیتے اور سکھاتے ہیں۔" (۳ : ۱۶۴)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ؐ نے تفسیر کے سیکھنے کا حکم بھی دیا تھا۔

چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "سورۃ حدید" کی تفسیر سیکھو۔ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس ؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "تو قرآن کا اچھا ترجمان ہے۔"

آپ کے بعد صحابہ ؓ کے دور میں بھی تفسیر و تشریح کلام خداوندی کا فریضہ صحابہ کرام ؓ انجام دیتے رہے۔ ان کے باقاعدہ مختلف مقامات پر حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور اس کے بعد پھر ہر دور میں تفسیر قرآن کا رواج برابر قائم رہا۔ بقول خواجہ عبدالحی فاروقی آج تک عربی میں جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان کی تعداد کئی ہزار ہے۔

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ تفسیر کا علم ایک مقدس اور متبرک علم ہے جو ہر شخص سے تمام احتیاطوں اور ذمہ داریوں کا مطالبہ کرتا ہے اور جس کا موضوع اللہ تعالے کی کتاب قرآن مجید ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالے کے احکام کا پورا علم حاصل کر سکے۔

تفسیر کا ارتقاء:۔ آنحضور ؐ کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے

"بلاشبہ یہ اللہ تعالے کا مومنین پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ان کے پاس خود انہی میں سے ایک رسول ؐ بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" (۳ : ۱۶۴)

مندرجہ بالا ارشاد الٰہی سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضور ؐ کی ذمہ داری محض یہ نہ تھی کہ جو لوگ اللہ تعالے کی بھیجی ہوئی کتاب پر ایمان لے آئیں آپ صرف ان تک قرآنی آیات پہنچا دیں بلکہ ان کا تزکیہ اور انہیں اس کتاب کی تعلیم دینا بھی آپ کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ نیز تعلیم دینا سے مراد صرف الفاظ کا دہرانا نہیں تھا۔ بلکہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے مطابق "ہم نے (اے رسول ؐ) تم پر قرآن نازل کیا تاکہ لوگوں کے سامنے اس چیز کی وضاحت کرو جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔" (۱۶ : ۴۴) اس کی تشریح و توضیح تھی۔

چنانچہ یہی تعلیم کتاب و حکمت ہے جو قرآن مجید کی تفسیر نبوی ہے۔ آپ ؐ کا ہر ارشاد اور آپ ؐ کا ہر عمل قرآن مجید کی تفسیر و تشریح تھا۔

عہد نبوی میں تفسیر کی نوعیت یہ تھی کہ اگر کسی آیت کے متعلق آنحضور ؐ نے ضرورت محسوس کی تو خدا کی منشا و مراد بتا دی۔ یا کسی کو کوئی مشکل پیش آئی تو اس نے آنحضور ؐ سے پوچھ کر اپنی تشفی کر لی۔ وہ آیات جن کا تعلق عمل سے ہے آنحضور ؐ نے عملاً ان کی تفسیر کر دی۔

آپ کے بعد صحابہ کرام ؓ قرآن کی تفسیر اور تشریح میں بڑی شدت سے احتیاط برتتے رہے۔ احادیث میں تفسیر بالرائے کے متعلق جو وعید آئی ہے اس کی وجہ سے انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا لیکن احساس فرض اور تمدنی ضروریات کی بنا پر صحابہ کرام ؓ کی ایک تعداد ایسی تھی جو قرآن کی تشریح و تفسیر کرتی تھی۔ ان کی تفسیروں کا تعلق صرف ان آیات سے تھا جو امر و نہی پر مشتمل ہیں۔ ان مفسر صحابہ کرام ؓ میں حضرت ابوبکر ؓ، حضرت عمر ؓ، حضرت عثمان ؓ، حضرت علی ؓ، ابن مسعود ؓ، ابن عباس ؓ، ابی بن کعب ؓ، زید بن ثابت ؓ، ابن زبیر ؓ اور ابو موسیٰ اشعری ؓ خاص طور پر مشہور ہیں۔ صحابہ کرام ؓ سے قرآن کی جو تفاسیر منقول ہیں ان میں سے دو قلم بند کی گئی تھیں۔ ایک تفسیر ابن عباس ؓ ہے دوسری تفسیر ابی بن کعب ؓ ہے۔ ان کا بیشتر حصہ قرآن کے مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ آیات احکام سے متعلق اگر کوئی حدیث انہیں معلوم ہوتی تو ان آیات کی تفسیر میں وہ احادیث بیان کر دیتے تھے اور اگر کوئی حدیث انہیں معلوم نہ ہوتی تو پھر خود ہی فقہی نقطۂ نظر سے اس آیت کی تشریح و توضیح کرتے۔ لیکن ایسا موقع بہت کم آیا ہے۔

صحابہ کرام ؓ کے بعد تابعین کا دور آتا ہے اس دور میں مختلف فرقے اپنے باطل نظریات کی اشاعت کے لیے قرآن کو آلۂ کار بنانے میں زیادہ سرگرم ہو گئے تھے دوسرے جب رومیوں اور ایرانیوں سے میل ملاپ بڑھا تو کچھ ایسے عجمی افکار کو دخل اندازی کے مواقع ملے جن سے ذہنی انتشار پیدا ہونا لازمی تھا۔ تیسرے یونانی فلسفہ کی وجہ سے معاشرتی معاشی اور سیاسی نوعیت کے بہت سے پیچیدہ مسائل ابھر رہے تھے چنانچہ تابعین کو ان گوناگوں مشکلات سے واسطہ تھا۔ اس لیے انہوں نے تفسیر کے معاملے میں صحابہ کرام ؓ کا ہی طریقہ اختیار کیا۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ انہیں جو کچھ صحابہ کرام ؓ سے پہنچا ہے اسے بیان کرنے ہی پر اکتفا کریں تابعین اس کے ساتھ وہ پیش آمدہ مسائل سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ایسے مسائل میں وہ خود اپنی علمی بصیرت سے کام لے کر قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح کرتے۔ تابعین کے درمیان تفسیر میں اختلاف کم ہے احکام میں زیادہ اختلاف ہے کیونکہ زمانے کے تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات کی بنا پر ابھرنے والے نئے مسائل میں اجتہاد کیا جائے گا۔ تو لازمی طور پر آراء کے درمیان اختلاف ہوگا۔ لیکن یہ اختلاف تنوع کا ہے تضاد کا نہیں ہے۔

اس دور کے مشہور مفسرین میں علقمہ، عمرو بن شرحبیل، مسروق، اسود بن یزید سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، شعبی، مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ اور اعمش ہیں۔

تبع تابعین کے دور میں علوم اسلامی کی فنی تقسیم عمل میں آئی۔ جب کہ اس کی حیثیت پہلے ایک جامع علم کی تھی جو تفسیر بھی تھا حدیث بھی فقہ بھی تھا اور اصول فقہ بھی تھا۔ لیکن اب ہر شعبہ بجائے خود ایک مستقل فن کی نوعیت اختیار کر گیا۔ نیز اس دور میں سارے غلط اور باطل نظریات کھل کر سامنے آ گئے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ایسی تفسیریں تالیف کی گئیں جن میں آنحضور ؐ سے مروی تفاسیر اور اصحابہ و تابعین کے اقوال کو جمع کیا گیا۔ لیکن فاسد اور باطل نظریات و افکار سے پوری طرح متاثر اور مرعوب ہو جانے والے اذہان کے لیے یہ کوشش کارآمد نہ ہو سکی۔ تاہم ان باطل نظریات کے رد کے لیے کوششیں جاری رہیں۔ اسی دور میں روشن خیالی اور ذہنی ترقی اس بات کا نام قرار پائی

Marfat.com

کہ یونانی فلسفہ اور عجمی افکار کی بساط پر قرآنی آیات کے مہرے جماتے جائیں اور قرآن کی زبان سے وہی کچھ کہلوایا جائے جو اس فلسفہ اور ان افکار کو مطلوب ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیت اور نصرانیت کی اسلام کے خلاف ملی بھگت نے مسلمانوں پر سے ایمانیات و عقائد کی گرفت ڈھیلی کرنے کے لئے نئی چالیں چلیں جن میں ایک خلق قرآن کا فتنہ بھی تھا۔ لیکن ان تمام فتنوں کا جواب دیا جاتا رہا۔

لسانی علوم (ادب و بلاغت) میں رسوخ رکھنے والے اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لئے قرآن کو استعمال کر رہے تھے۔ انہی علوم میں دستگاہ رکھنے والے اہل حق بھی تھے جو انہی علوم سے ان نظریات کا رد بھی پیش کر رہے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تفسیری ادب میں تفسیری تالیفات کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ اور یوں کتب تفسیر کا ایک عظیم الشان ذخیرہ امت مسلمہ کے پاس جمع ہو گیا۔ چونکہ علوم کی شعبہ وار تقسیم ہو چکی تھی۔ اس لیے ہر شعبے کے شہسواروں نے میدان میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ اور یوں مختلف علوم و فنون کے زاویہ نگاہ سے مرتب کی ہوئی تفسیروں کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم ہو گیا جو اپنی تعداد کے لحاظ سے شمار میں نہیں آسکتا اور اپنی مقدار کے لحاظ سے اس قدر حیرت انگیز ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

موجودہ دور تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں بنیادی طور پر تو انہی اسالیب اور جہات میں سے کسی کو اختیار کیا گیا ہے جو سابقہ تفاسیر کی رہی ہیں اور ان میں انھی قدیم علوم و فنون اور افکار و نظریات کی کار فرمائیاں نظر آتی ہیں جن کا سلسلہ پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ لیکن جب جدید علوم و فنون جدید فلسفہ جدید اسالیب بیان اور طرز استدلال کا غلغلہ بلند ہوا تو جدید ترین تفاسیر بھی جدید علوم و فنون کی روشنی میں جدید طرز بیان کے ساتھ تصنیف کی گئیں۔

۱۔ چند مشہور تفاسیر

۱۔ تفسیر ابن عباسؓ:۔ تفسیر کا نام "تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباسؓ" ہے۔ ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے اسے جمع کیا ہے۔ یہ تفسیر نہایت مختصر ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے ٹھوس ہے۔ یہ تمام تفسیری مباحث، فقہی اور کلامی مباحث اور اعتقادی مباحث میں مدار حجت ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ تمام صحابہ کرامؓ میں سے علوم قرآن کے موضوع پر حجت تسلیم کیے گئے ہیں۔ امت مسلمہ انہیں ترجمان القرآن کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ تفسیر بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ تفسیر طبری:۔ اس کا نام "جامع البیان عن تاویل آیۃ القرآن" ہے۔ ابوجعفر بن جریر طبری (۲۲۴ھ تا ۳۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ موجودہ تفسیری سرمائے کا ماخذ اول ہے۔ علماء نے تسلیم کیا ہے کہ اس تفسیر کی کوئی نظیر آج تک نہیں پائی گئی۔ اس تفسیر میں تمام قرون اولیٰ صحابہ کرام اور تابعین کے تمام تفسیری اقوال کو منضبط کیا ہے۔ آیات کی تفسیر میں جتنی احادیث ملی ہیں انھیں نقل کر دیا گیا ہے اگرچہ اس میں کچھ ضعیف احادیث بھی آگئی ہیں تاہم مصنف نے تمام اقوال روایات نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

۳۔ تفسیر ابن کثیر:۔ "تفسیر قرآن العظیم" حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن الخطیب (۷۰۵ھ تا ۷۷۴ھ) کی تصنیف ہے۔ تفسیر ماثور ہے۔ صحابہ کرام و تابعین کی تمام صحیح روایات اور آثار اس میں نقل کیے گئے ہیں۔ احادیث کی نقل میں صحت اور سند کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ فقہی اختلاف کے موقع پر مختلف مذاہب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ عبارت سادہ اور بیان دل نشین ہے۔ اہل سنت والجماعت کے ہاں یہ تفسیر متداول ہے۔ کئی بار چھپ چکی ہے نو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ تفسیر الکبیر:۔ "مفاتیح الغیب" ابوعبداللہ محمد بن عمر بن حسین الملقب فخر الرازی (م ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے۔ تیس جلدوں میں ہے علامہ فخر الدین رازی ایک زبردست متکلم اور علوم عقلیہ اور علوم ریاضی کے بڑے ماہر تھے اس تفسیر میں کلامی بحثیں، معتزلہ کی تردید، مضامین فلسفہ، مباحث ریاضی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے۔ یہ تفسیر درایت میں اعلیٰ درجے کی اور روایت میں کم پایہ کی تفسیر ہے۔

اس میں سوال و جواب اور مسائل کی شکل میں مباحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے معتزلہ اور ملحدین کے اعتراضات کو تو زوردار طریقے سے بیان کیا ہے لیکن اس کے جواب میں وہ زور نہیں جو ہونا چاہیئے تھا امام رازی اس تفسیر کو اپنی زندگی میں پوری نہیں کر سکے تھے۔ چنانچہ شیخ احمد بن محمد قمولی نے اسے مکمل کیا۔

۵۔ تفسیر کشاف:۔ "الکشاف عن الحقائق تنزیل وعیون عقاویل فی وجوہ التاویل" ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری (م ۵۳۸ھ) کی تصنیف اور ایک جامع تفسیر ہے جو معتزلہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ لغت، نحو اور بلاغت کے نقطۂ نظر سے اس میں نہایت عمدہ باتیں اور عجیب و غریب نقاط اور لطائف ہیں۔ یہ صرف قرآن کی تفسیر ہی نہیں بلکہ عربی زبان سیکھنے کے لئے بڑی مفید و ممد ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کا معیار بے حد بلند ہے۔

یہ تفسیر طوالت، اسرائیلیات اور ضعیف روایات سے پاک اور سہل ہے۔ اور اکثر مقامات پر سوال و جواب کی صورت میں مطالب کو پیش کیا گیا ہے۔

اسلوب بیان کے لیے جا بجا اسالیب عرب سے استدلال کیا گیا ہے اس تفسیر کے کئی حاشیے لکھے گئے ہیں۔ کمال پاشا زادہ پہلوان، شیخ حیدر اور زہادی کے حاشیے خاص طور پر مشہور ہیں۔

اہلسنت اور معتزلہ کے مشہور کلامی اختلافات میں بڑے پرزور انداز میں معتزلہ کی وکالت کی گئی ہے۔ بقول صاحب "کشف الظنون" کسی کتاب تفسیر کی ایسی خدمت نہیں کی گئی جیسی کہ اس کتاب کی گئی ہے۔

صاحب مناہل العرفان کے بقول تفسیر کشاف مندرجہ ذیل امور میں دوسری تفاسیر سے ممتاز ہے۔

۱۔ حشو و زوائد اور طوالت سے خالی ہے۔

۲۔ قصص اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔

۳۔ لغات عرب کے مطابق معانی کے بیان پر اور اس کے اسالیب پر اس میں اعتماد کیا گیا ہے۔

۴۔ معانی و بیان کے علوم پر خاص توجہ دی گئی ہے اور وجوہ اعجاز کی تفہیم کے لئے نکات بلاغت کی تحقیق کی گئی ہے۔

یہ تفسیر کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ صاحب کشف الظنون کے بقول چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ جو نسخہ ۱۳۶۷ھ میں شائع ہوا وہ تین ضخیم جلدوں پر

Marfat.com

مشتمل ہے۔

۶۔ تفسیر طبرسی :۔ "مجمع البیان فی تفسیر القرآن" ابو علی الفضل ابن الحسن الطبرسی (م ۵۴۸ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ شیعہ اثنا عشری فرقے کی بلند پایہ تفسیر ہے۔ ابتدائی دور کی بڑی تفسیروں میں اس کا شمار ہوتا ہے اہل تشیع کی نظر میں اس تفسیر کا مقام وہی ہے جو اہل سنت کے ہاں تفسیر طبری کا۔ اگرچہ یہ ایک شیعی تفسیر ہے لیکن بہت معتدل نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی روایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اور امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے فقہی احکام بھی درج کیے گئے ہیں۔ بلاغت و فصاحت کے لحاظ سے بھی ایک اچھی تفسیر ہے

۷۔ تفسیر احکام القرآن :۔ احمد بن علی رازی المشہور ابو بکر جصاص کی تصنیف ہے جو اپنے وقت کے امام تھے حنفی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر علماء آپ کو مجتہد تسلیم کرتے ہیں۔

یہ تفسیر فقہی آیات کی تفسیر ہے جو سورتوں کی ترتیب ہی سے لکھی گئی ہے علمی اور فقہی اختلافات پر مجتہدانہ بحث اور حنفی مسلک کی وضاحت و وکالت کی گئی ہے۔ یہ تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ جو ۱۸۰۵ صفحات پر مبنی ہے۔ ہر جلد کے آخر میں مضامین کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ اس کے حد درجہ اختصار کی وجہ سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

۸۔ تفسیر قرطبی :۔ "جامع احکام القرآن" ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی (م ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں تمام تفسیری مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ البتہ تاریخی واقعات کی تفصیلات کا ذکر کرنے کے بجائے انہوں نے احکام القرآن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہ مالکی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس قرأت، اعراب اور ناسخ و منسوخ کی بحثوں کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

تفسیر کے دوران آنے والی احادیث اور اقوال کا مکمل حوالہ دینے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ تفسیر بیس جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔

۹۔ تفسیر بیضاوی :۔ "انوار التنزیل و اسرار التاویل" قاضی امام ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی (م ۶۸۵ھ) اور بقول بعض ۶۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ یہ چار اہم تفاسیر طبری، رازی، کشاف، بیضاوی وغیرہ میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم الشان تفسیر ہے جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے مختلف امتیازات رکھنے والی تفاسیر کا نچوڑ ہے۔ یعنی اس میں اعراب اور معانی و بیان سے متعلق مباحث دراصل کشاف کے مندرجات کا مغز ہیں حکمت و کلام سے متعلق مواد تفسیر کبیر (الرازی) سے ماخوذ ہیں۔ اشتقاق اور دقیق حقائق اور لطیف اشارات و نکات تفسیر راغب اصفہانی سے ماخوذ ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ قاضی بیضاوی نے اس میں معقول دلائل اور مقبول تصرفات رکھنے والے ایسے امور بھی ثبت کیے ہیں جو ان کی فکر و بصیرت کے ثمرات و نتائج ہیں۔

درس نظامی میں عرصہ دراز سے متداول ہے۔ تفسیر کشاف کے بعد سب سے زیادہ حواشی اسی تفسیر کے لکھے گئے ہیں جو کم و بیش چالیس ہیں۔

مصنف نے لغوی تحقیق اور قرأت کے بیان کے بعد ان شبہات کا ازالہ کیا ہے جو اہل سنت کے خلاف معتزلہ اور دوسرے عقلیت پرستوں نے کیے تھے اس تفسیر کے بے شمار حاشیے لکھے گئے۔ مصنف نے ہر سورت کے آخر میں فضائل سورت کے بارے میں احادیث بیان کی ہیں۔ اگرچہ ان میں ضعیف اور موضوع کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔

۱۰۔ تفسیر جلالین :۔ اس تفسیر کے دو مؤلف ہیں دونوں کے نام کے ساتھ جلال الدین آتا ہے اس لئے اس تفسیر کا نام جلالین ہے۔

جلال الدین محلی (م ۸۶۴ھ) نے اس تفسیر کے پندرہ سولہ پارے لکھے تھے کہ وفات پا گئے۔ بعد میں علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے مولانا جلال الدین کے نقش قدم پر چل کر اسے مکمل کیا۔ اس میں گرامر، نحو اور لغت کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت آسان ہے۔ اس کے مختلف حاشیے اور خلاصے لکھے گئے۔ پرانی تفاسیر میں سب سے زیادہ چھپنے والی یہی تفسیر ہے۔ درس نظامی کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ تفسیر تمام عالم اسلام میں مشہور اور متداول ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔

۱۱۔ تفسیر روح المعانی :۔ "روح المعانی فی التفسیر القرآن العظیم و سبع المثانی" علامہ شہاب الدین محمود آلوسی البغدادی (م ۱۲۷۰ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ نو بڑی جلدوں پر مشتمل ہے، تیرہ صدیوں میں علم تفسیر پر جتنا کام ہوا ہے۔ اس کا احاطہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس تفسیر میں ہر قسم کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف صرف کتابوں کا حوالہ دیتا ہے۔ علم قرآن کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہ گیا جس پر بحث نہ کی گئی ہو۔ علم الکلام، فقہ، تصوف، گرامر، لغت یہ تمام کچھ اس میں ہے۔ یہ موجودہ زمانے کی تفاسیر میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ مصنف اہل سنت گروہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن فضیلت اہل بیت اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس سے اس کا میلان شیعت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

۱۲۔ تفسیر الجواہر :۔ "الجواہر فی تفسیر القرآن الحکیم" علامہ طنطاوی جوہری (بعض جگہوں پر طنطاوی بن جوہری درج ہے) کی تصنیف ہے۔

یہ عجیب و غریب تفسیر ہے علماء اسے ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں سب کچھ ہے لیکن تفسیر نہیں۔ عرب میں ایک مرتبہ اسے ضبط بھی کر لیا گیا۔ علامہ طنطاوی موجودہ علوم کا ماہر تھا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد سائنسی علوم کی طرف توجہ مبذول کرانا تھا۔ یہ تفسیر ۲ جلدوں میں ہے جس میں قرآن کی تفسیر صرف چھ جلدوں میں آتی ہے۔ علامہ طنطاوی اپنے نیک جذبے کے تحت ہر معاملے میں اسلام کی برتری ثابت کرتا ہے۔

۱۳۔ تفسیر المنار :۔ "المنار فی تفسیر القرآن الحکیم" علامہ رشید رضا (م ۱۳۵۴ھ) مشہور مصری عالم شیخ محمد عبدہ کے شاگرد کی تفسیر ہے۔ جو ۱۲ جلدوں میں ہے اور صرف ۱۲ پاروں کی تفسیر ہے۔ مصنف کے انتقال کی وجہ سے یہ تفسیر نامکمل رہ گئی۔ یہ تفسیر زیادہ تر ان کے استاد شیخ عبدہ کے اقوال پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس تفسیر میں صحیح روایات، عقلی دلائل، حکمت تشریع اور کائنات میں قانون قدرت جیسے موضوعات کو لیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن مجید ہر دور کے لئے ذریعہ رشد و ہدایت ہے۔ نیز مصنف نے بڑی دلسوزی کے ساتھ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا قرآنی تعلیمات کے ساتھ تقابل کیا ہے۔

یہ تفسیر تحریک احیائے اسلام کی طویل لڑیوں میں سے اہم کڑی ہے کہیں کہیں شرح و بسط سے بھی کام لیا گیا ہے۔ روایات کو کتابوں میں سے چھان بین کر کے لکھتے ہیں۔ گرامر کی مفید باتیں بھی ہیں دور حاضر کی بہت عمدہ اور جامع تفاسیر میں سے ہے۔ ہمارے زمانے تک اسلام کے ضمن میں جو پیچیدگیاں اور

Marfat.com

دوسری کتابیں پیدا کی گئی ہیں وہ بھی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں اور احسن طریقے ان کے جوابات دیئے ہیں۔

۱۴۔ تفسیر فی ظلال القرآن :۔ یہ سید قطب شہید (د، ۱۳۸۶ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں تفسیر کا علمی مواد کم ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم آپ بلند پایہ عالم دین نہیں تھے وہ پہلے صرف ایک سکول میں مدرس تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ تفسیر جیل میں لکھی جہاں کوئی کتاب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگرچہ اس تفسیر میں علم کم ہے لیکن جذبہ ایمانی بے انتہا ہے۔ ادبی لحاظ سے بہترین تفسیر ہے مصنف کا دلولہ اسلام کو دوبارہ غالب دیکھنا ہے پوری کتاب تین حصوں اور آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ سراسر دعوت عمل ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ اور جملے سے اسلام اور ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ پوری تفسیر میں تجدد پسندی، سقیم تاویلات اور معذرت خواہانہ انداز بیان کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مغرب کے مادی تصورحیات کے سخت دشمن ہیں اور دل نشین انداز میں دنیا کی بے ثباتی بیان فرماتے ہیں۔ اسلوب بیان اور طرز ترتیب بالکل نیا ہے۔

یہ مصر کی جدید ترین تفاسیر میں سے ہے۔

۱۵۔ تفسیر حقانی :۔ "فتح المنان" مولانا عبدالحق حقانی دہلوی (د، ۱۹۰۰ء) نے تصنیف کی ہے۔ یہ پہلی جامع اردو تفسیر ہے اپنے زمانے تالیف تک بالکل جدید تفسیر ہے اردو تفاسیر میں اس کا ایک بلند مقام ہے جس دور کی یہ تصنیف ہے وہ زمانہ چونکہ مناظروں کا تھا اس لئے اس میں مناظرانہ رنگ بھی ہے مصنف نے اس تفسیر میں عیسائیوں کے اس زہریلے پروپیگنڈے کا رد کیا ہے جو وہ اسلام اور قرآن کے بارے میں کرتے رہے ہیں نیز مغرب زدہ طبقے کے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ اسلام سائنس کے خلاف ہے۔ مصنف نے ابتدا میں ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں اسلام کے بنیادی افکار کی وضاحت کی ہے اور تجدد پسندوں کے خیالات کا رد کیا ہے

اس تفسیر میں تحقیق لغوی ترکیب نحوی، اسباب نزول، فقہی اختلافات کی تشریحات وغیرہ تمام باتیں موجود ہیں جو عام تفاسیر میں پائی جاتی ہیں۔

یہ تفسیر متوسط درجے کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے

۱۶۔ بیان القرآن :۔ یہ تفسیر مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھی ہے مولانا نے خود لکھا ہے کہ آج کل اردو میں ناشروں نے محض تجارت کی غرض سے بے شمار ترجمے اور تفسیریں شائع کرنا شروع کر دی ہیں جن میں رطب و یابس صحیح و سقیم سب کچھ درج ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آسان زبان میں مختصر تفسیر لکھی جائے جس میں صحیح مطالب بیان کئے گئے ہوں"

یہ تفسیر ایک جلد میں ہے جس میں مندرجہ بالا مقصد کے ساتھ ساتھ تشریح لغات، فصاحت و بلاغت کے نکات اور تصوف و سلوک کے اسرار و رموز بھی آگئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ تصنیف اور بھی مفید ہو گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا انداز مشکل پسندانہ ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

۱۷۔ ترجمان القرآن :۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صرف اٹھارہ پارہ کی تفسیر کی ہے۔ اس کی عبارت نہایت عمدہ اور مختصر ہے اس تفسیر کے چند حصوں پر علماء نے اعتراض کیا ہے ان حصوں کا تعلق "تحمد، ترمیت اور وحدت ادیان" سے ہے

۱۸۔ تفسیر ماجدی :۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تصنیف ہے۔ قرآن مجید کی آیات پر مختصر حواشی ہیں تقریباً ہر آیت پر مستند ترین کتب تفسیر سے تفسیری اختصار سلیقے سے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ گویا آیات کے بارے میں مختلف مفسرین کی بصیرت افروز آراء ان حاشیوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔ دو جلدوں میں ہے مغربی تہذیب اور مستشرقین کے معاندانہ اعتراضات کا نہایت عمدگی سے رد کیا ہے۔

۱۹۔ تفہیم القرآن :۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف ہے۔ جو ۱۹۷۲ء میں چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔

اگرچہ یہ عالمانہ تفسیر نہیں ہے جس کا خود مصنف نے بھی مقدمہ میں اظہار کیا ہے "کہ یہ تفسیر میں عوام کے لئے لکھ رہا ہوں" لیکن جدید دور میں جدید مسائل کے متعلق ان کا حل پیش کرنے میں تمام تفاسیر پر فوقیت حاصل کر چکی ہے۔

بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق "تفہیم القرآن بے پناہ محنت، تحقیق اور تلاش و طلب کا ایک حسین شاہکار ہے۔ آیات کے اردو ترجمے میں بلا کی سلاست و فصاحت ہے۔ ہر واقعہ کا تاریخی پس منظر دیا گیا ہے۔ غزوات کی ضرورت و اہمیت پر مکمل بحث کی گئی ہے۔ آیات کی شان نزول پر احادیث کی روشنی ڈالی گئی ہے اور آیات سے فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے۔"

اس تفسیر کی ہر سورت کے شروع میں ایک دیباچہ کی شکل میں اس سورت کے مضامین کا خلاصہ اور ساتھ ہی تاریخی پس منظر اور زمانہ نزول بھی بیان کر دیا گیا ہے جس سے پڑھنے والے کے سامنے پوری سورت کے مضامین کا ایک مرتب اور مربوط مجموعہ آجاتا ہے اور پھر سورت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی۔

"تفہیم القرآن" میں تفسیر بالرائے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ مغربی افکار اور جدید تہذیب نے اسلام کے بارے میں جس قدر شکوک و شبہات پھیلائے ہیں "تفہیم القرآن" میں ان کے نہایت اطمینان بخش جوابات موجود ہیں۔

ب۔ عربی اور فارسی کی دیگر اہم تفاسیر

۱۔ "مجمع البحرین" ۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے اتقان اس کا مقدمہ ہے

۲۔ "تفسیر ابی اللیث" (د، ۳۸۳ھ) روایت و درایت کے لحاظ سے عمدہ تفسیر ہے

۳۔ "تفسیر اسحاق بن راہویہ نیشاپوری" (د، ۲۳۸ھ) اس میں منقولات کو نہایت احتیاط سے نقل کیا ہے۔

۴۔ "تفسیر الخوارزمی" (د، ۵۳۹) اہل حدیث کی تفاسیر کے طرز پر لکھی گئی ہے۔

۵۔ "تفسیر الجوینی" (د، ۴۳۸ھ) اس میں ہر ایک آیت کی دس وجوہ پر تفسیر کی ہے۔

۶۔ "مدارک التنزیل" ۔ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی (د، ۷۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔ حنفی مذہب کی نہایت عمدہ تفسیر ہے۔

۷۔ "معالم التنزیل" ۔ ابومحمد حسین رکن الدین بن مسعود بغوی (د، ۵۱۹ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں کسی قدر غیر معتبر قصے بھی درج ہیں۔

۸۔ "تفسیر مظہری" قاضی ثناء اللہ پانی پتی (د، ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے۔ تصوف اور فقہ سے متعلق مضامین ہیں۔ منقولات کو نہایت تحقیق سے لاتے ہیں۔ بہت عمدہ تفسیر ہے۔

۹۔ "تفسیر دُرّ منثور" ۔ جلال الدین سیوطی کی تفسیر ہے منقولات کی کثرت ہے۔

۱۰۔ "سواطع الالہام" ۔ ابوالفیض فیضی (د، ۱۰۰۴ھ) کی بے نقط تفسیر ہے عبارت

Marfat.com

آرائی ہے۔ غیر معمولی تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ مقصدِ تفسیر سے بے بہرہ ہے۔

۱۱۔ "سراج المنیر"۔ شیخ خطیب شربینی کی تصنیف ہے۔ تفسیر رازی اس کا ماخذ ہے۔

۱۲۔ "فتح الرحمان" شاہ ولی اللہ کا ترجمہ اور حواشی بزبان فارسی۔

۱۳۔ "عرائس البیان" از ابو محمد بقلی شیرازی کی تصنیف ہے۔ تصوف کے نقطۂ نظر سے تفسیر کی گئی ہے۔

۱۴۔ "فتح البیان"۔ نواب صدیق حسین خان کی تصنیف ہے جو قاضی شوکانی کی تفسیر کا ملخص ہے۔

۱۵۔ "لباب التاویل فی معنی التنزیل" المشہور تفسیر خازن از علاء الدین علی بن محمد بغدادی المعروف صوفی خازن (م ۷۲۵ھ) اس میں قصص پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اکثر غلط روایات اور اسرائیلیات کی بھرمار ہے سب سے زیادہ غلط روایات اس تفسیر میں ہیں۔

۱۶۔ "تفسیر تنزیہ القرآن عن المطاعن" از قاضی عبدالجبار معتزلی (د، ۴۱۵ھ) معتزلہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے پوری تفسیر نہیں ہے

۱۷۔ احکام القرآن" از ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن عربی (د، ۴۶۸ھ) اس میں ان تمام اختلافات کو لیا گیا ہے جو احکام کے بارے میں ائمہ کے مسالک کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ چار جلدوں میں ۲۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۸۔ "احکام القرآن"۔ ابوالحسن علی بن محمد الکیا الہراسی (د ۵۰۴ھ) کی تصنیف ہے شافعی مسلک کے نقطۂ نظر سے فقہی مسائل قلم بند کئے گئے ہیں۔

۱۹۔ "کنز العرفان فی فقہ القرآن" مقداد ابن عبداللہ کی تصنیف ہے جنہوں نے آٹھویں صدی کے آخر یا نویں صدی ہجری کے شروع میں وفات پائی ہے اثنا عشری فرقے کی تفسیر ہے۔

۲۰۔ "تفسیر حسینی" ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ تصوف کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ فارسی زبان میں ہے۔

۲۱۔ "اتقان فی علوم القرآن" از شیخ جلال الدین سیوطی۔

۲۲۔ "ارشاد العقل السلیم" از ابو المسعود

۲۳۔ "ارشاد ابن برجان" از شیخ ابن برجان۔

۲۴۔ "بسیط واحدی" از شیخ واحدی۔

۲۵۔ "تاویلات ماتریدی"۔ از شیخ ماتریدی۔

۲۶۔ "تفسیر ابراہیم" از ابراہیم بن معقل حنفی (د، ۲۹۲)

۲۷۔ "تفسیر ابن ابی حاتم" از ابو حاتم عبدالرحمان بن محمد رازی (م، ۳۲۸ھ) علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کا خلاصہ لکھا۔

۲۸۔ "تفسیر ابن ابی جمرہ" از حافظ عبداللہ بن سعد اندلسی (د ۵۲۵)

۲۹۔ "تفسیر ابن ابی شیبہ"۔ حافظ ابوبکر عبداللہ بن محمد کوفی (د ۲۳۵ھ) کی تصنیف ہے

۳۰۔ "تفسیر ابن اثیر" از علامہ ابن اثیر۔

۳۱۔ "تفسیر ابن جماعہ" قاضی ابراہیم بن محمد کنانی کی تصنیف ہے آٹھ جلدوں میں ہے

۳۲۔ "زاد المسیر المشہور تفسیر ابن جوزی" ابوالمظفر یوسف بن قزاعلی حنفی (د، ۶۵۴ھ) کی تصنیف ہے، ۲۰ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۳۳۔ "تفسیر ابن حبان" از حافظ محمد بستی (د ۳۵۴ھ)

۳۴۔ "تفسیر ابن حکیم" از ابوالمظفر محمد بن اسعد (د، ۵۶۷ھ)

۳۵۔ "تفسیر ابن دہان" سعید بن مبارک نحوی کی تصنیف ہے جو چار جلدوں میں ہے

۳۶۔ "تفسیر ابن سدین" از تقی الدین محمد بن حسین شافعی (د، ۶۸۰ھ) شافعی مسلک کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔

۳۷۔ "تفسیر ابن العربی" از شیخ محی الدین محمد بن علی الطائی الاندلسی (د، ۶۳۸ھ) تصوف کے رنگ میں ہے اور ایک مختصر تفسیر ہے۔

۳۸۔ "تفسیر ابن عرفہ" امام ابو عبداللہ محمد بن عرفہ مالکی (د، ۸۰۳ھ) کی تصنیف ہے

۳۹۔ "تفسیر المحرر الوجیز" از ابو محمد عبدالحق۔ ابوحیان نے اس کی بڑی تعریف کی ہے

۴۰۔ "تفسیر ابن ماجہ" حافظ ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی (د، ۲۷۳ھ) کی تصنیف ہے

۴۱۔ "تفسیر ابن مردویہ" از حافظ ابوبکر احمد بن موسیٰ اصفہانی (د، ۴۱۰ھ)

۴۲۔ "تفسیر ابن المنذر" از امام ابوبکر محمد بن ابراہیم (د، ۳۰۳ھ) دس جلدوں میں ہے

۴۳۔ "تفسیر ابن النقاش" شمس الدین محمد بن علی (د، ۷۶۳ھ) کی تصنیف ہے کافی ضخیم ہے۔ اس تفسیر میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ کسی دوسری تفسیر سے ایک حرف تک نقل نہیں کیا گیا۔

۴۴۔ "التحریر والتحبیر" از شیخ ابن النقیب۔ یہ تفسیر پچاس سے زائد جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۵۔ "تفسیر ابن وہب" از عبداللہ بن وہب قرشی کی تصنیف ہے۔

۴۶۔ "تفسیر ابوالحسن" از ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (د، ۳۲۴ھ)

۴۷۔ "تفسیر ابوالعباس" از ابوالعباس سمعان۔ یہ تفسیر دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۸۔ "تفسیر ابو اللیث"۔ ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی حنفی (د، ۳۷۵ھ) کی تصنیف ہے۔ نہایت عمدہ تفسیر ہے اس کا ترکی میں ترجمہ شہاب احمد بن محمد نے کیا ہے۔

۴۹۔ "تفسیر ابوالقاسم" از ابوالقاسم عبداللہ بن احمد بلخی (د، ۳۱۹ھ) ۱۲ جلدوں میں مکمل ہوئی۔

۵۰۔ "الاستغنا فی علوم القرآن" از محمد بن علی مصری (د، ۳۸۸ھ) ۱۲۰ جلدوں میں ۱۲ سال میں ختم ہوئی۔

۵۱۔ "تفسیر الاسکندری" حسین بن ابوبکر نحوی (د، ۷۲۱ھ) کی تصنیف ہے۔ دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۵۲۔ "تفسیر اصفہانی" از شیخ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد تیمی (د، ۵۲۵ھ) اس مصنف کی دوسری تفاسیر ہیں تفسیر جامع تیس جلدوں میں تفسیر معتمد دس جلدوں میں تفسیر ایضاً چار جلدوں میں تفسیر توضیح تین جلدوں میں ہے۔

۵۳۔ "تفسیر اصفہانی" علامہ شمس الدین شافعی (د، ۷۴۹ھ) کی تصنیف ہے کئی جلدوں میں ہے۔

۵۴۔ "تفسیر بدر الدین" شیخ محمود بن اسرائیل (د، ۸۲۳ھ) کی تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۵۵۔ "تفسیر امام الحرمین" ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی (د، ۴۷۸ھ) کی تصنیف ہے۔

۵۶۔ "تفسیر البخاری" ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری کی وہ تفسیر ہے جو آپ نے

Marfat.com

صحیح بخاری میں ذکر کی ہے اس کے علاوہ ایک اور بہت بڑی تفسیر بھی آپ نے لکھی ہے۔

۵۷۔ "تفسیر البیہقی" از ابوالمحاسن مسعود بن علی بیہقی (د، ۵۴۴ھ) کی تصنیف ہے

۵۸۔ "تفسیر جامی" از شیخ نورالدین عبدالرحمان بن احمد جامی۔ "کشف التنزیل فی تحقیق التاویل" ابوبکر بن علی مصری۔ (د، ۸۰۰ھ) کی تصنیف ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔

۵۹۔ "تفسیر الخطیب التبریزی" ابوزکریا یحییٰ بن علی (د، ۵۰۲ھ) کی تصنیف ہے۔

۶۰۔ "تفسیر الزرکشی" از شیخ بدرالدین محمد بن عبداللہ مصلی (د، ۷۹۴ھ)

۶۱۔ "تفسیر سبط ابن الجوزی" از ابوالمظفر یوسف بن قزاوغلی (د، ۶۵۴ھ) دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۶۲۔ "تفسیر السخاوی" از ابوالحسن علی بن محمد مصری (د، ۶۴۳ھ)

۶۳۔ "تفسیر الشیرازی" شیخ عبدالوہاب بن محمد فامی کی تصنیف ہے جس میں شواہد کے طور پر ایک لاکھ اشعار درج ہیں۔

۶۴۔ "تفسیر الصالحی" از صالح بن محمد ترمذی، اس میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایات ہیں اور ان کے علاوہ چار ہزار حدیثیں بھی ہیں۔

۶۵۔ "مجمع البیان لعلوم القرآن" ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (د، ۴۶۰ھ) علامہ زمخشری نے اسے مختصر کیا ہے اور اس کا نام "جوامع الجامع" رکھا۔

۶۶۔ "تفسیر عبدالصمد" از عبدالصمد بن قاضی محمود۔ تین جلدوں میں ہے۔

۶۷۔ "تفسیر عطاء" از عطا ابن ابومسلم خراسانی۔

۶۸۔ "تفسیر عکرمہ" از حضرت عکرمہ۔ اس تفسیر کے مطالب عبداللہ بن عباس سے روایت کیے گئے ہیں۔

۶۹۔ "تفسیر القاری" ملا علی قاری کی تصنیف ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

۷۰۔ "تفسیر القزوینی" شیخ ابویوسف قزوینی کی تصنیف ہے۔ تین سو جلدوں پر مشتمل ہے

۷۱۔ "تفسیر قطب الدین" از قطب الدین محمد بن محمد اریقی (د، ۸۲۱ھ) کی تصنیف ہے۔ جو کئی جلدوں میں ہے

۷۲۔ "تفسیر الماوردی" از امام ابوالحسن علی بن حبیب (د، ۴۵۰ھ)

۷۳۔ "تفسیر مجاہد" ابوالحجاج مجاہد بن جبیر (د، ۱۰۴ھ) کی تصنیف ہے۔

۷۴۔ "تفسیر المرسی" ابوالفضل محمد بن عبداللہ (د، ۶۵۵ھ) کی تصنیف ہے۔ بیس جلدوں میں ہے۔ اس تفسیر میں آیات کا ربط بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۷۵۔ "تفسیر المحمدیہ" اسے تفسیر "مصنفک" بھی کہتے ہیں۔ علی بن محمد شاہرودی بسطامی (د، ۸۷۵ھ) کی تصنیف ہے بزبان فارسی کئی جلدوں میں ہے

۷۶۔ "تفسیر ناصر بن منصور" از ناصر بن منصور آٹھ جلدوں میں ہے۔

۷۷۔ "تفسیر نجم الدین" از احمد بن عمر خیوطی (د، ۶۱۸ھ) بارہ جلدوں میں ہے۔

۷۸۔ "الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن" ابوزید عبدالرحمان بن محمد الجزائری (د، ۸۷۶) کی تصنیف ہے۔ تصوف کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔

۷۹۔ "غرائب القرآن ورغائب الفرقان" حسن بن محمد نیشاپوری (د، ۹۰۰ھ) کی تصنیف ہے۔ اس میں قرأت، لغت اور تصوف پر باقاعدہ عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے۔ یہ جامع قسم کی تفسیر ہے۔

۸۰۔ "الجامع بین فنی الروایہ والدرایہ فی التفسیر المشہور فتح القدیر" قاضی محمد بن علی الشوکانی (د، ۱۲۵۰ھ) کی تصنیف ہے یمن کے رہنے والے تھے اور زیدی شیعہ تھے۔ یہ چار جلدوں میں ہے

ج۔ اردو تفاسیر

۱۔ "تفسیر الحسنات بآیات بینات خلاصہ تفسیر الآیات باقوال الحسنات" از ابوالحسنات قادری علامہ سید محمد احمد (م، ۱۳۸۰ھ) مفسر مرحوم نے اپنی وفات سے ایک روز پہلے ۲۸ ویں پارے کی تفسیر مکمل کرلی تھی۔

۲۔ "تفسیر خلیلی"۔ ابوابراہیم بن الحکیم الحاج عبدالعلی آروی کی تفسیر ہے۔ دو جلدوں میں ہے۔

۳۔ "تفسیر اکسیر اعظم" احتشام الدین محمد مرادآبادی کی تصنیف ہے نو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ "تفسیر نعیمی" مفتی احمد یار خان نے سات جلدوں میں لکھی۔

۵۔ "تفسیر نعیمی" مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی نے دو جلدوں میں مکمل کی۔

۶۔ "تفسیر قادری" مولانا فخرالدین قادری دو حصوں میں مکمل ہے۔

۷۔ "تفسیر فیوض القرآن" ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے تین حصوں لکھی ہے۔

۸۔ "تفسیر بیان للناس" خواجہ احمدالدین امرتسری کی تصنیف ہے سات جلدوں میں ہے

۹۔ "تفسیر عثمانی" از مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمود حسین۔

۱۰۔ "احسن التفاسیر" از احمد حسن محدث دہلوی (د، ۱۳۳۸ھ) کی تصنیف ہے اہل حدیث نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے

۱۱۔ "تنویر القرآن علی کنز الایمان" از مفتی اعجاز ولی خان۔

۱۲۔ "تفسیر مواہب الرحمان" سید امیر علی ملیح آبادی کی تصنیف ہے جو ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ "خلاصہ التفاسیر" از فتح محمد تائب (د، ۱۳۲۲ھ) چار جلدوں پر مشتمل ہے بقول مولانا عبدالماجد دریاآبادی اگرچہ ضخامت میں یہ تفسیر چھوٹی ہے۔ لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے افضل ہے۔

۱۴۔ "تشریح القرآن" محمد عثمان سلیم الدین تسلیم (د، ۱۳۰۱ھ) کی تصنیف ہے۔ چار جلدوں میں ہے۔

۱۵۔ "تفسیر ثنائی" از ثناءاللہ امرتسری (د، ۱۳۶۷ھ) سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایک تفسیر عربی زبان میں بھی لکھی ہے جو "تفسیر القرآن بکلام الرحمان" ہے۔

۱۶۔ "تفسیر صدیقی" از عبدالقدیر حسرت صدیقی۔

۱۷۔ "تفسیر مجددی" اس تفسیر کو تفسیر فاروقی بھی کہتے ہیں۔ رؤف احمد رافت کی تصنیف ہے۔ تین جلدوں میں ہے۔

۱۸۔ "ترجمان القرآن بلطائف البیان" از نواب صدیق حسن خان (د، ۱۳۰۷ھ) ۱۶ جلدوں پر مشتمل ہے امام شوکانی کی عربی تفسیر فتح القدیر کا خلاصہ ہے۔

Marfat.com

۱۹۔ "الطاف الرحمان بہ تفسیر القرآن" از عبدالباری محمد فرنگی محلی (د: ۱۳۰۲ھ)
۲۰۔ "تفسیر حقانی" مولانا عبدالحق حقانی دہلوی نے چار جلدوں میں تفسیر کی ہے۔
۲۱۔ "مطالب القرآن" از سید علی حسن بہاری۔ تین جلدوں میں ہے۔
۲۲۔ "تفسیر قادری" از فخر الدین احمد فرنگی محلی۔ دو جلدوں میں ہے
۲۳۔ "تفسیر جلالین" البذر سنبھلی نے عربی کی تفسیر جلالین کا اردو ترجمہ کیا ہے۔
۲۴۔ "تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف" از مولانا حسین بخش جاڑا گیارہ حصوں میں ہے۔
۲۵۔ "تفسیر بیان القرآن" از محمد علی لاہوری احمدی۔ تین جلدوں میں ہے۔
۲۶۔ "تدبر قرآن" مولانا امین احسن اصلاحی، چار جلدیں چھپ چکی ہیں۔
۲۷۔ "معارف قرآن" مفتی محمد شفیع کی تصنیف ہے آٹھ جلدوں میں ہے
۲۸۔ "برہان" تفسیر الفرقان فی المعارف القرآن خواجہ محمد عبدالحیٰ فاروقی کی تصنیف ہے
۲۹۔ "معارف القرآن" از مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔
۳۰۔ "تفسیر سراج البیان"۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے یہ تفسیر لکھی ہے۔

د۔ قرآن مجید کی نامکمل اور مختلف پاروں کی اردو تفاسیر

۱۔ "القول المتین فی تفسیر سورۂ والتین"۔ ابوالکلام آزاد کی تصنیف ہے۔
۲۔ "تفسیر سورۃ فاتحہ" از محمد عالم آسی امرتسری
۳۔ "تفسیر سورۃ الفیل، اخلاص و فضائل بسملہ" از ابراہیم رضا۔
۴۔ "آسان تفسیر" از مولانا محمد عبدالحی یہ تیسویں پارے کی تفسیر ہے۔
۵۔ "تفسیر تبیان القرآن" از احمد حسن۔ دو پاروں کی تفسیر ہے۔
۶۔ "تفسیر فاتحہ الکتاب" از احمد سعید خان۔ قرآن پاک کی وہ آیات جن میں سورہ فاتحہ کے الفاظ آئے ہیں جمع کرکے تفسیر کی گئی ہے۔
۷۔ "اسرار القرآن" از احمد علی خان پارہ اوّل کی تفسیر ہے۔
۸۔ "تفسیر سورۃ بقرہ" از ارشد خان بھٹی۔
۹۔ "الازھار النافعہ فی تفسیر سورۃ فاتحہ" از مولانا اشرف شمسی
۱۰۔ "تفسیر سورۃ آل عمران" از ڈاکٹر اشفاق علی۔
۱۱۔ "توضیح القرآن" از شیخ محمد اقبال۔ سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، انفعال، محمد، فتح، الحجرات کی تفسیر ہے۔
۱۲۔ "تفسیر فراہی"۔ از حمید الدین فراہی اسے اردو قالب میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ڈھالا ہے۔
۱۳۔ "تفسیر ابر رحمت" امیر الدین محمد پٹیالوی کی تصنیف ہے۔ سورۃ یوسف کی تفسیر ہے۔
۱۴۔ "الناموس المفصل فی تفسیر سورۂ مزمل" از انوار الحق علوی
۱۵۔ "نور الحق فی تفسیر الفلق" از انوار الحق علوی۔
۱۶۔ "تفسیر سورۂ کوثر" از انیس احمد
۱۷۔ "تفسیر سورۂ والتین والعصر" از مولانا محمد ایوب۔
۱۸۔ "تفسیر سورۃ فاتحہ" از مولانا تمنا عمادی۔
۱۹۔ تفسیر سورۃ یوسف۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔
۲۰۔ "میزان الادیان بتفسیر القرآن" از دیدار علی شاہ الوری۔
۲۱۔ "تفسیر القرآن" از ذوالفقار حمید۔ یہ سورۃ بقرہ کی تفسیر ہے۔
۲۲۔ "تفسیر رفیعی" از رفیع الدین محدث دہلوی۔ سورۃ البقرہ کی تفسیر ہے۔
۲۳۔ "معارف القرآن" از شاہد القادری یہ سورۃ العصر کی تفسیر ہے۔
۲۴۔ "لوامع البیان" از سعادت اللہ خان۔ یہ سورۃ النبا اور النازعات کی تفسیر ہے۔
۲۵۔ "رفیق المسلمین" تفسیر سورۃ یٰسین۔ از نواب شمس الدین و نواب قمر الدین
۲۶۔ "سلطان التفاسیر" از سلطان محمد خان پادری تفسیر سورۃ فاتحہ۔
۲۷۔ "الجمال والکمال" از محمد سلیمان سلمان منصور پوری۔
۲۸۔ "تفسیر سورۃ فاتحہ" از سید احمد شہید بریلوی۔
۲۹۔ "تفسیر قرآن" از شاہ الحق احمد عثمانی۔ یہ پارہ ۲۹ اور ۳۰ کی تفسیر ہے۔
۳۰۔ "نظم البیان فی مطالب القرآن" از شمس الدین
۳۱۔ "تفسیر القرآن" از قاضی شمس الدین۔ پہلی جلد سورۃ مائدہ تک چھپ چکی ہے
۳۲۔ تفسیر الجوہر الفرید فی سورۃ التوحید" از شمس اللہ قادری
۳۳۔ "تذکیر الکل بتفسیر الفاتحہ وار بع قل" از نواب صدیق حسن خان۔
۳۴۔ "سراج المبین" از محمود احمد حشی یہ سورۃ یٰسین کی تفسیر ہے۔
۳۵۔ "تفسیر سورۃ والعصر" از عبدالباری
۳۶۔ "اسرار التنزیل فی تفسیر سورہ فیل" از عبدالبصیر سیوہاروی
۳۷۔ "الفوز العظیم" از عبدالجلیل نعمانی۔
۳۸۔ "جواہر التفسیر فی السیر والتذکیر" از عبدالحی قادری۔
۳۹۔ "الخلافۃ الکبریٰ" از خواجہ محمد عبدالحی فاروقی سورۃ البقرہ کی تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بیان تفسیر (آل عمران) الصراط المستقیم (انفعال و توبہ) ہجرت (سورۂ یوسف) بصائر (بنی اسرائیل سے متعلق آیات کی تفسیر) برہان (سورۃ نور) سبیل الرشاد (سورت حجرات) سبیل السلام (سورۃ مجادلہ تا التحریم) ذکریٰ (پارہ عم کی تفسیر) بھی ان کی تصانیف ہیں۔
۴۰۔ "تفسیر پارہ عم" از محمد عبدالرحیم
۴۱۔ "الدر المکنون فی تفسیر الماعون" از عبدالصمد صارم
۴۲۔ "تفسیر سورۃ فاتحہ" از عبدالصمد فاروقی۔
۴۳۔ "تفسیر کلام علام الغیوب فی احوال یوسف ابن یعقوب" از عبدالعزیز ابی محمد ابن حاجی محمود۔
۴۴۔ "مشکوۃ الموحدین" از عبدالغفور سنجاری
۴۵۔ "تفسیر پارہ عم و آلم" از عبدالقادر
۴۶۔ "ذخیرۂ عقبیٰ معروف تفسیر سورۂ الانشرح" از عبدالقادر محمد سجادہ نشین محمد قطب الدین۔
۴۷۔ "تفریح الجنان فی تفسیر ام القرآن" از عبدالقادر ہزاروی۔
۴۸۔ "دستور الارتقا تفسیر سورۃ الاسریٰ" از عبداللطیف افغانی اکبرآبادی۔
۴۹۔ "تفسیر القرآن بآیات القرآن (ابتدائی پارے)" از عبداللہ چکڑالوی
۵۰۔ "تفسیر مقبول" از عبداللہ سید۔ یہ سورہ یٰسین۔ الرحمٰن، الواقعہ، تبارک الذی، نوح، الجن، المزمل کی تفسیر ہے۔
۵۱۔ "جنگ انقلاب" از عبیداللہ حضرمی
۵۲۔ "دستور انقلاب" " "
۵۳۔ "عنوان انقلاب" " "

Marfat.com

۵۴۔ "نور مبین تفسیر سورۃ الیٰسین" از محمد عسکری
۵۵۔ "نظم البیان" از غلام معین الدین
۵۶۔ "تفسیر سورہ لیٰسین و پارہ تبارک الذی" از غلام غوث حنفی اس کے علاوہ مطلع الیہ فی تفسیر سورۃ العصر۔ سلسلۃ المرجان۔ تفسیر سورۃ لنساء و ام القرآن۔ نثر المرجان۔ تفسیر سورۃ مائدہ تا سورہ توبہ بھی ان کی تفاسیر ہیں۔
۵۷۔ "تفسیر سورہ الرحمان" از فیض الرحمان۔
۵۸۔ "تفسیر معوذتین" از محمد قاسم نانوتوی
۵۹ "مظہر العجائب" از سلطان اللہ لکھنوی۔
۶۰۔ "نکات القرآن" محمد علی ایم اے واحدی۔ ابتدائی پانچ پاروں کی تفسیر ہے۔
۶۱۔ "نجم الہدیٰ فی تفسیر سورہ والنجم" از حافظ محمد ابراہیم سیالکوٹی
۶۲۔ "عرائس البیان تفسیر سورہ رحمٰن" از " " "
۶۳۔ "انوار الساطعہ تفسیر سورہ واقعہ" از " " "
۶۴۔ "واضح البیان تفسیر سورہ فاتحہ" از " " "
۶۵ "سورہ کہف" از " " "
۶۶ "تبصیر الرحمٰن فی تفسیر القرآن" از " " "
۶۷۔ "تفسیر سورہ کوثر فی فضائل خیر البشر" از نادر حسین خالص الدولہ
۶۸۔ "ناصر التفاسیر" از ناصر علی ۶۹۔ دستور حیات تفسیر سورۃ لنساء" از حافظ احمد یلو
ان کے علاوہ سینکڑوں ایسی بہت سی تفاسیر ہیں۔ جو نامکمل یا کسی پارے یا واقعے پر مبنی ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث انہیں درج نہیں کیا جا سکا۔ (زیر لکھنے قرآن)

تفلس

تفلس گرجستان اور کارتیل کا صدر مقام۔ جس کا محل وقوع البانیا کے شمال مشرق یعنی داغستان میں ہے۔

گرجی وقائع نامہ کے مطابق شاہ گرجستان کے خلاف جو آلِ ساسان کی خسروی شاخ میں سے تھا۔ ایک مہم بھیجی گئی جس کی سرکردگی ایرانی ستھاؤنے کی تھی اس نے الواب کوہ قاف کے درمیان تفلس کا شہر تعمیر کرایا۔ تاکہ وہ گرجستان کے پایۂ تخت متسخیتا کے خلاف ایک دیوار کا کام دے سکے۔

شاہ وختنگ گرگسال کی جنگوں میں، جو ایرانیوں کے خلاف لڑی گئی تھیں تفلس کا قلعہ اور گاؤں تباہ ہو گئے تھے۔ بعد میں وختنگ نے تفلس میں ایک شہر کی بنیاد ڈالی جس کی فصیلیں اس کے بیٹے ڈچی نے مکمل کرائیں۔ ۵۲۳ء میں ایرانیوں نے گرجستان کے حکمران خاندان کو ختم کر کے تفلس میں ایرانی اقتدار قائم کیا۔

مسلمانوں نے خلفائے راشدین کے عہد حکومت ہی میں ماورائے بحر خزر تک کا علاقہ زیر نگیں کر لیا تھا۔ بقول طبری ۲۲ھ/۶۴۳ء میں سراقہ نے حبیب بن مسلمہ کو تفلس فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جس کی اسی سال وہاں کے باشندوں سے صلح ہو گئی۔ بقول الیعقوبی یہ صلح ۲۵ھ/۶۴۵ء میں حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ہوئی۔ حبیب بن مسلمہ آرمینیا فتح کرنے کے بعد جب گرجستان کی طرف متوجہ ہوا تو ایک گرجستانی سفیر امان حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ حبیب نے لوگوں کو امان دے دی اور ایک عالم عبدالرحمان بن جزء السلمی کو تفلس کے لوگوں کو شریعت کے مسائل سمجھانے کے لئے بھیج دیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اہل تفلس نے اسلام قبول کر لیا۔ تفلس فتح کر لینے کے بعد حبیب نے دوسرے علاقے فتح کرنے یا ان علاقوں سے صلح نامے کرنے شروع کئے۔ حبیب کی مہم سے المتوکل کے عہد حکومت تک جرزان اور ابخاز تفلس کے فوجی کمانڈر کو خراج ادا کرتے رہے تفلس میں عہد بنوامیہ میں ایک ٹکسال بھی قائم کی گئی۔ ۱۴۷ھ/۷۶۴ء میں استرخان خوارزمی کے حملے کے دوران میں تفلس میں داخل ہو گئے۔ خزروں کا ایک حملہ ۱۸۳ھ/۷۹۹ء میں ہوا جس میں تفلس تباہ ہو گیا۔ المامون کے عہد میں ایک شخص محمد بن عتاب آرمینیا کا بادشاہ بن بیٹھا ۲۱۴ھ/۸۲۹ء میں اس نے گرجیوں کا علاقہ فتح کر لیا محمد بن عتاب کے بعد خالد نے تفلس اسحاق بن اسماعیل بن شعیب کو دے دیا جو مروان کا حوالی تھا، ۹۲۲ء تک تفلس میں عباسی ٹیکسالی موجود تھی جس میں درہم ڈھلتے تھے۔

۹۱۴ء میں تفلس جعفر بن علی کے قبضے میں تھا۔ جعفر کی وفات کے بعد تفلس کے امراء نے شہر کی چابیاں شاہ بگرات کے حوالے کر دیں۔ ۱۰۵۴ء میں سلجوقیوں نے گنجہ کے خلاف ایک مہم بھیجی لیکن بگرات رابع کے حلیف بزنطینیوں کی ایک جوابی کارروائی سے شہر بچ گیا۔ ۱۰۶۸ء میں الپ ارسلان نے شاہ آرمینیا، شاہ کاخیتھیا اور امیر تفلس کو ہمرکاب لے کر بگرات کے خلاف چڑھائی کی اور پورے خارتھلیا پر قبضہ کر لیا۔

اس نے تفلس فضلون گنجوی کو عطا کر دیا۔ ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں تفلس کے مسلمانوں کی شکایت پر محمود بن سلجوق نے گرجستان میں ایک مہم بھیجی۔ ان دنوں داؤد ثانی تفلس کا حاکم تھا جو مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم کرتا تھا۔ محمود بن سلجوق کے لشکر کو داؤد ثانی نے شکست دی اور اس نے مسلمانوں پر ظلم و ستم روا رکھا۔

۱۴۰۳ء میں تیمور تفلس سے گزرا تو اس نے تمام مسیحی دیروں اور کلیساؤں کو ویران کر دیا۔ تیمور کی لائی ہوئی تباہی کے بعد جو عام بد نظمی پھیلی اس کا ذکر "وقائع نامہ گرجستان" میں محفوظ ہے۔ ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء میں جہاں شاہ قرہ قوئینلو نے تفلس پر قبضہ کر لیا۔ اس دور میں گرجستان تین بڑی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جو یہ تھیں خارتھلیا منگریلیا جس کا صدر مقام تفلس تھا اور امیریتھیا۔

۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں اوزون حسن گرجستان میں آیا تو قسطنطین نے تفلس اوزون حسن کے حوالے کر دیا۔ ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں طہماسپ نے تفلس پر قبضہ کیا۔ حاکم شہر نے ایرانیوں کی اطاعت قبول کر لی اور اسلام بھی لے آیا۔

۱۵۷۸ء میں عثمانی ترک سمتسخہ کے راستے سے گرجستان میں گھس گئے اور تفلس پر قابض ہو گئے۔ ترکوں نے دو سو سپاہی اور ایک سو توپیں تفلس میں چھوڑیں اور تفلس کی سنجق محمد بن فرہاد پاشا کے حوالے کر دی۔ دو گرجوں کو مساجد میں تبدیل کیا

۱۶۰۳ء میں ایران کے شاہ عباس اول نے تفلس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۱۷۲۳ء میں عثمانیوں نے دوبارہ گرجستان کا علاقہ حاصل کر لیا۔ ۱۷۳۴ء تک یہ علاقہ ان کے قبضے میں رہا۔

۱۷۹۵ء میں آغا محمد قاچار نے تفلس کو فتح کیا اور نہایت بے دردی سے لوٹا۔ ایرانی حملے کے بعد داغستانیوں نے حملہ کیا۔ ۱۷۹۹ء میں تفلس کا روس سے الحاق ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء تک تفلس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انقلاب روس کے بعد تفلس جمہوریات متحدہ روسیہ میں سے ماورائے قفقاز کی جمہوریہ کا پایۂ تخت قرار پایا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ترکوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے سے انکار کر دیا تو ماورائے قفقاز کو تین جمہوری سلطنتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ تفلس دوبارہ گرجستان کا پایۂ تخت قرار پایا۔

Marfat.com

تفلس کا حال عرب جغرافیہ دانوں نے بہت کم بیان کیا ہے۔ بقول اصطخری یہ شہر بہت بڑا تھا۔ اس کے گرد مٹی کی فصیلیں تھیں۔ یہ عالم اسلام کا ایک سرحدی مقام تھا۔ جس کے پرے کوئی مسلم آبادی نہ تھی۔

۱۸۰۳ء میں تفلس میں چار ہزار مکان تھے اور کل آبادی ۱۶ ہزار تھی۔ ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۲۸۹۱۸ تھی۔ جن میں ارمنی، گرجستانی روسی، یہودی، ایرانی، جرمن، آذربائیجانی اور ترک شامل تھے۔

تقتمیش ترکی حکومت آلتون اردو کا خان۔ باپ کا نام تولی خوجہ تھا جو منگیشلاق کا حاکم تھا۔ اسے کو خان ارس کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا۔ تقتمیش کو باپ کے قتل کے بعد نابالغ ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا گیا۔ ۷۷۷ھ / ۱۳۷۶ء میں تقتمیش تیمور کے پاس چلا گیا۔ جس نے سمرقند میں اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اترار، صبران اور سیغناق کے علاقے عطا کیے۔ ارس خان کے بیٹے قتلغ بوغا نے اس پر حملہ کیا۔ اگرچہ قتلغ بوغا اس لڑائی میں قتل ہو گیا لیکن تقتمیش کو شکست نصیب ہوئی۔ وہ دوبارہ تیمور کے پاس گیا اور وہاں سے امداد حاصل کرنے کے بعد ارس خان کے دوسرے بیٹے کے ساتھ نبرد آزما ہوا لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست اٹھانا پڑی۔ اب تیمور کو بذات خود تقتمیش کے ساتھ ارس خان کے خلاف میدان جنگ میں آنا پڑا۔ چنانچہ تیمور نے ارس خان کے لشکر کو شکست فاش دی۔ اس جنگ میں ارس خان بھی مارا گیا۔ خان کے بعد اس کے بیٹے توختہ قیا اور تیمور ملک یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ تیمور ملک نے تقتمیش کو تیمور کے واپس لوٹتے ہی پھر شکست دی۔ لیکن بعد میں تیمور کی خواہش کے مطابق اسے سیغناق کا علاقہ دے دیا۔ تیمور ملک کو تخت نشین ہونے کے بعد شراب خوری کی عادت ہو گئی اور وہ سلطنت کے کاروبار سے غافل ہو گیا۔ چنانچہ تقتمیش نے تیمور کے کہنے پر اس کے علاقے پر یلغار کی اور اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد تقتمیش نے آلتون اردو کی سلطنت کے مغربی حصے پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا اور اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔ ۱۳۸۱ء میں اس نے روسیوں سے اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب روسیوں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے ۱۳۸۲ء میں ملک روس کو بری طرح پامال کیا۔ روس کے دارالحکومت ماسکو کو خود لوٹا اور اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح روس میں تاتاریوں نے اپنی حکومت ایک سو سال کے لیے دوبارہ قائم کر لی۔

تقتمیش اپنی ریاست قائم کرتے ہی تیمور کا دشمن ہو گیا۔ اور اس طرح سے اس نے تیمور کے احسانات کا بدلہ دیا۔ ۷۸۹ھ / ۱۳۸۷ء میں تقتمیش نے تیمور کے خلاف دربند کے راستے آذربائیجان پر حملہ کیا۔ تبریز کو بڑی بے دردی سے تباہ کر دیا۔ آٹھ روز تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ اس سارے عرصے میں تیمور نے بڑے تحمل اور صبر سے کام لیا۔ اس نے ایک لشکر اپنے بیٹے میران شاہ کی کمان میں بھیجا جس نے تقتمیش کو شکست دی۔ لیکن فتح حاصل کرنے کے بعد تیمور نے قیدیوں کو رہا کر دیا اور تقتمیش کو صرف ملامت و تنبیہ کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ لیکن تقتمیش نے اسی سال تیمور کے قلب سلطنت پر حملہ کر دیا۔ تیمور کو ایران سے جلد ہی واپس لوٹنا پڑا اور اس نے ۱۳۹۱ء میں آلتون اردو کے ممالک کے خلاف انتقامی مہم شروع کی۔ چنانچہ تقتمیش کو قندوزچہ کے میدان میں شکست فاش ہوئی۔ تیمور آلتون اردو کی سلطنت کو مطیع کیے بغیر واپس چلا گیا۔

اب تقتمیش اور تیمور کے درمیان کھلی عداوت پیدا ہو گئی۔ تقتمیش نے مصر کی آلتون اردو کی حکومت کو ساتھ ملا کر تیمور کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں تیمور مغرب کے خلاف اپنی پنج سالہ یورش میں مصروف تھا۔ ۱۳۹۴ء میں تیمور کو کوشکی کے مقام پر اطلاع ملی کہ آلتون اردو کے لشکروں نے ملک پر حملہ کر دیا۔ تیمور نے نہایت آسانی سے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ ۱۳۹۵ء میں تیمور نے تقتمیش کے خلاف اپنی مہم شروع کی۔ دریائے ترک کے کنارے فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں تقتمیش کچھ عرصے کے لیے غائب ہو گیا۔ تیمور نے اس کا تعاقب کیا تو راتور پہنچ کر اس نے قوریچی چاق اغلی ارس خان کے بیٹے کو الوس جوجی کی خانی عطا کی۔ ۱۳۹۶ء میں تیمور دربند کے راستے آذربائیجان واپس آ گیا تو تقتمیش کو ایک بار پھر تاج و تخت واپس لینے کا موقعہ ملا۔ ۱۳۹۶ء میں اس نے جنوہ کے فرنگیوں کے خلاف جنگ کی۔ تقتمیش بھاگ کر دیوٹ میں امیر لتھونیا کے پاس چلا گیا۔ امیر لتھونیا نے اس کی مدد کی لیکن تاتاریوں نے ۱۳۹۹ء میں اسے شکست دی۔ ۱۴۰۵ء میں تقتمیش نے اپنا ایک ایلچی تیمور کے پاس بھیجا جس کے ذریعے اس نے تیمور سے معافی مانگی۔ تیمور نے وعدہ کیا چین کی مہم کے بعد آلتون اردو کی مملکت میں آ کر وہ تقتمیش کو اس کا تخت واپس کرا دے گا۔ ۱۴۰۶ء میں تقتمیش تومن کی ایک فوج کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

تقدیر اندازہ ٹھہرانا۔ مقرر کرنا۔ یہ لفظ قدر سے نکلا ہے جس کے معنی اندازے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے "ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" (۵۴: ۴۹)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے ضمن میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہوا لیکن قرآن مجید میں اس کے بار بار اعادے سے اس کی اہمیت واضح ہو گئی ہے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اسے بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ بعض احادیث میں تقدیر کو ایمانیات کی آخری کڑی قرار دیا گیا ہے۔ (صحیح مسلم)

تقدیر کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اندازے اور فیصلہ ازلی کے مطابق بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کے تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی نقشہ تیار کر لیتا ہے اور اسی مجوزہ نقشے کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں۔ چنانچہ خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلے کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں۔ موت و حیات، فقر و غنا، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق ظہور پذیر ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنی میں کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

"اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے منزلیں مقدر کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر) لوٹتا ہے نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ وہ چاند کو پا لے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔" (۳۶: ۳۸ تا ۴۰)

"اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے (۶۵: ۳)

"ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا۔" (۵۶: ۶۰)

Marfat.com

چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لئے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عقیدۂ تقدیر کا منشا یہ ہے کہ ہمیں جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بے جا ہے اسی طرح ہمیں جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے۔ اس لئے ہمیں دل شکستہ اور مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں اسی جذبے اور جوش و خروش سے از سر نو جد و جہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے "جبر و قدر"، "قضا و قدر")

تقرت

تگرت، الجزائری صحرا کا ایک قصبہ۔ یہ بسکرہ سے ۱۳۵ میل جنوب میں واقع ہے اور سطح سمندر سے ۲۰۰ فٹ اونچا ہے۔

تقرت کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات نہایت قلیل ہیں۔ ابن خلدون کے مطابق بربر قبیلے ریغرہ کی ایک بڑی جماعت نے زاب اور ورقلہ کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں زناتہ کے دیگر قبائل کے ساتھ گھل مل گئے اور خود مختارانہ طور پر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں رہنے لگے۔ ان قصبات میں تقرت سب سے بڑا قصبہ تھا۔ ان لوگوں میں یہودیوں کی خاصی تعداد تھی جن میں سے اکثریت نے خوارج کا مذہب اختیار کر لیا۔ اور ایک مدت دراز تک اس مذہب پر قائم رہے۔

تقرت عربوں کے پہلے حملے سے تو بچا رہا لیکن آخرکار مغرب کے حکام کی برتری انہیں تسلیم کرنا پڑی۔ الموحدون کے دور حکومت میں ایک والی، جو بسکرہ میں رہتا تھا، اہل تقرت کا حاکم ہوتا تھا۔ اس کے بعد تونس کے حفصیوں کے ماتحت رہا۔ بعد ازاں بنو مزل کے زیر اقتدار آ گیا۔ تقرت پر دو خاندان بنو عبد اللہ اور تیماسین کے بنو ابراہیم اپنا اپنا حق ملکیت جتاتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان دونوں میں تنازعات ہوئے۔ ان فسادات کو دبانے کے لئے سلطان ابن الحکم حفصی نے تقرت پر حملہ کیا اور ۱۳۵۳ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوبارہ خانہ جنگی شروع ہوئی جو اس وقت تک جاری رہی جب تک سیدی محمد بن یحییٰ نے تقرت پر قبضہ نہیں کر لیا۔ وہ تقریباً چالیس برس یہاں پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے بعد فسادات پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ایک مراکشی شہزادہ سلیمان بن جلاب یہاں پر اقامت پذیر ہوا۔ اس نے یہاں پر ایک مسجد بنوائی اور اپنے آپ کو بادشاہ تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی شہزادہ بنی جلاب کا بانی ہے جو انیسویں صدی تک تقرت میں حکمرانی کرتے رہے سولہویں صدی میں بیگلربک صلاح رئیس نے بنی جلاب کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی اور تقرت کو لوٹنے کے بعد خراج کے معاہدے پر واپس چلا گیا۔ اٹھارویں صدی میں بنی جلاب نے قسطنطنیہ کے بیگوں کی فرمانروائی کو تسلیم کر لیا لیکن ٹیکس ادا نہ کیے۔ چنانچہ بیگوں نے انہیں بے دخل کر کے بنی خانہ کو ان کی جگہ بٹھانا چاہا۔ ۱۸۲۱ء میں جب احمد مملوک نے ان پر چڑھائی کی تو ابن تقرت نے کچھ دے دلا کر اس سے اپنی گلو خلاصی کرا لی۔ لیکن بنو جلاب کی دشمنی ترکوں سے اور زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۸۴۱ء میں جب فرانسیسیوں نے بسکرہ میں اپنے قدم جما لئے تو عبد الکریم کے جانشین عبد الرحمان نے فرانس کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔

لیکن ۱۸۵۲ء میں فرانسیسی فوج کے ایک دستے نے تقرت پر قبضہ کر لیا اور یہاں ایک محافظ فوج متعین کر دی۔ ۱۸۷۱ء میں پھر شورشیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور بو شوشہ نامی ایک شخص نے تقرت پر قبضہ کر لیا۔ محافظ فوج کو تہ تیغ کر دیا گیا اور تھوڑے عرصے بعد پھر امن قائم ہو گیا۔

تقرت وادی ریغ کا سب سے اہم مقام ہے۔ وادی ریغ ۱۳۰ میل شمالاً جنوباً ایک لمبی تنگ وادی ہے جس میں صحرا سے دو دریا آکر گرتے ہیں۔ تھوڑی سی گہرائی پر زیر زمین پانی موجود ہے۔ چنانچہ یہاں کھجور کے درخت خوب پھلتے پھولتے ہیں تقرت کے جھنڈ، جن میں دو لاکھ کے قریب درخت ہیں اور جن میں عمدہ قسم کی کھجوریں لگتی ہیں، تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ یہاں کا موسم صحت کے لحاظ سے مضر ہے کیونکہ سطح زمین پر جمع ہو جانے والے پانی کے نکاس کا کوئی راستہ نہیں۔ موسم گرما میں یہاں ایک خاص بخار کا دورہ رہتا ہے۔ تقرت دو حصوں میں تقسیم ہے ایک حصہ سواد قصبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس حصے میں متعدد محلے ہیں۔ دوسرا حصہ نواح قصبہ کے نام سے ہے جس میں قصبے کے گرداگرد دو یا تین میل کے دائرے کے اندر متعدد گاؤں آباد ہیں۔ اس حصے میں مکان کچی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں۔

تقرت کی قابل ذکر عمارت صرف ایک جامع مسجد ہے جسے تیونس کے کاریگروں نے تعمیر کیا تھا۔ تقرت کی آبادی زیادہ تر رواغہ پر مشتمل ہے جو وادی ریغ کے اصل باشندے ہیں اور بربر نسل سے ہیں۔ وہ یہودی جنہوں نے سترہویں صدی کے اختتام اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں اسلام قبول کیا۔ انہوں نے یہاں آکر ایک الگ محلہ بسا لیا ہے۔

آج کل تقرت ایک خطے کا صدر مقام ہے۔ جس کی آبادی اڑھائی لاکھ کے قریب ہے۔

تقلید

کسی ایسے قول کی پیروی کرنا جس کی دلیل و حجت سے مقلد کو واقفیت نہ ہو۔ گویا تقلید یہ ہے کہ انسان کسی غیر کے قول یا فعل کو صحیح مان کر اس کی دلیل پر غور و تامل کیے بغیر اس کا اتباع کرے۔ تقلید اجتہاد کی ضد ہے۔ اتباع اور تقلید میں ایک باریک سا فرق ہے کیونکہ اتباع میں کسی کی پیروی سوچ سمجھ کر اور مقاصد و اغراض سے کما حقہ واقفیت حاصل کر کے کی جاتی ہے جبکہ تقلید کی صورت محض حسن ظن ہے۔

تقلید کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جس زمانے میں مذاہب فقہ کی تدوین ہوئی۔ تقلید کے اسباب میں اہم ترین سبب علماء متاخرین میں مجتہدانہ صلاحیتوں کا فقدان ہے۔ تیسری صدی کے بعد جب اجتہاد مطلق ختم ہو گیا تو فقہائے متاخرین یا عوام کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اکابر متقدمین کی تقلید کے قائل ہو جائیں۔

شاہ ولی اللہ نے تقلید کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک تقلید واجب ہے۔ ایک تقلید حرام۔

چنانچہ جو شخص کتاب و سنت سے ناواقف ہو اور تتبع و استنباط کے ناقابل ہو وہ کسی متقی عالم سے پوچھے کہ فلاں مسئلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے۔ اور جب اسے بتایا جائے تو اس پر عمل کرے۔ یہ تقلید جائز اور واجب ہے نیز لکھتے ہیں کہ اس قسم کی تقلید کی علامت یہ ہے کہ کسی مجتہد کے قول پر گویا

Marfat.com

اس شرط پر عمل کیا جائے کہ وہ قول سنت کے مطابق ہو اور پھر تا مقدور سنت کی تلاش کرتا ہے۔ جب اسے یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کے مجتہد کا قول کسی نصِ حدیث سے مطابقت نہیں رکھتا تو اس قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرے جیسا کہ اس بات کی طرف ائمہ کرام کا اشارہ بھی ہے۔ مثلاً امام ابو حنیفہ کا قول کہ اگر میری بات کسی حدیث سے ٹکرائے ہو تو اسے پتھر پر دے مارو۔

اگر نصِ حجت کے مل جانے کے باوجود بھی مقلد محض تقلیداً کسی امام کے خلاف شریعت قول کو نہیں چھوڑتا۔ تو ایسی تقلید ممنوع ہے۔ اس کی شرع میں کوئی اصل نہیں اور نہ قرونِ سابقہ میں سے کسی نے اس پر عمل کیا۔

تقلید کی مخالفت کرنے والوں میں داؤد بن علی ابن حزم اور دیگر اصحاب ظاہریہ کا نام آتا ہے۔ ان کے نزدیک متاخر فقہا کے لئے بھی ضروری ہے کہ اجتہاد کریں۔

وجوبِ تقلید کی تائید میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فقط قرونِ اول کے فقہا میں وہ حقیقی نظر اور تیزیِ فہم وہ وسعتِ علم اور درایت پائی جاتی تھی جو اصل ماخوذ سے مسائلِ فقہ کے استنباط کے لئے ضروری ہے اور وہی لوگ ان مسائل کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے قائم کر سکتے تھے۔ یہ بات متاخرین کے حصے میں نہیں آئی۔

تقلید نے مختلف مذاہب میں اختلافات قائم رکھنے میں مدد دی۔ لیکن اس پر یہ الزام دینا مناسب نہیں ہے کہ زمانہ مابعد میں فقہ کی ترقی کے محرکات کو ٹھنڈا کرنے کی ذمہ داری بھی تقلید ہی پر ہے۔ (نیز دیکھیے "اجتہاد")

تقوی محفوظ کرنا، مصیبت سے بچانا۔ اصطلاح میں تقوے سے مراد ممنوعہ چیزوں سے بچ کر رہنا۔ پاکیزہ زندگی بسر کرنا۔ گویا اپنے آپ کو گناہ میں پڑنے سے بچانا تقوے ہے۔

حضرت عمرؓ نے کعب الاحبارؓ سے تقوی کی تعریف پوچھی تو انہوں نے پوچھا آپ کبھی خاردار راستہ پر چلے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا کہ آپ نے کیا طریقہ اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے بچاؤ کیا اور کپڑے سمیٹ کر چلا۔ حضرت کعب نے کہا یہی تقوے ہے (معالم التنزیل)

امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں تقوی کے مندرجہ ذیل تین مراتب بیان کئے ہیں

۱۔ جہنم سے ڈر کر اپنا دامن شرک سے پاک رکھنا۔ یہ توحید خالص ہے جسے قرآن مجید میں کلمۃ التقوی کہا ہے

۲۔ ہر اس فعل یا ترکِ فعل سے اجتناب کرنا جس میں گناہ ہو حتی کہ صغیرہ گناہ سے بھی بچنا۔ شرع میں اسی کو تقوی کہتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوی کرتے۔"

۳۔ ہر اس چیز سے جو حق سے غافل کرتا ہے قطعاً لاتعلق۔ رہنا اور حق کے ساتھ ظاہر و باطن میں دل بستگی رکھنا

یہ اعلیٰ ترین تقوے ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے

"اللہ سے تقوے رکھو جیسا کہ تقوی کا حق ہے"

تقوے انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں بتایا گیا ہے کہ تقوی کا مقام دل ہے۔ سب نیک اعمال اور عبادات کا دار و مدار تقوے ہی پر ہے۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

"اللہ تعالے تمہاری صورتوں اور تمہارے جسموں سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ کیونکہ دل ہی مخزن تقوی ہیں۔" (مسلم)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

"آگاہ رہو کہ سینے میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب یہ تندرست ہو تو تمام بدن تندرست رہتا ہے۔ اور اگر یہ بیمار ہو جائے تو سارا بدن بیمار پڑ جاتا ہے۔ جان لو یہ دل ہے۔" (بخاری)

اسلام میں عبادات کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے مگر اس بنیاد کی قرارگاہ بھی تقوی ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ تقوے کے بغیر عبادات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے

چنانچہ حج کے بارے میں یہ حکم دیا کہ

سفر کے لئے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ تقوی ہے (۲:۱۹۷)

قربانیوں کے بارے میں فرمایا۔

اللہ تعالے تک تمہارے ذبیحوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقوی پہنچتا ہے جس کا مقام دل ہے۔ (۲۲ : ۳۷)

روزوں کے بارے میں ارشاد ہے۔

"تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے تاکہ تم میں تقوے پیدا ہو۔" (۲ : ۱۸۳)

لباس، ستر اور عفتِ نگاہ کے لئے بہت ہی اہم اور ضروری چیز ہے۔ لیکن یہاں پر بھی اصل الاصول تقوے ہی بتایا گیا ہے۔

"بہترین پوشاک لباس تقوے ہے۔" (۷ : ۲۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ضرار کو جلوا دیا اس لئے کہ آپ کو وحی کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ اس کی بنیاد تقوے پر نہیں تھی۔

آنحضورؐ نے جمعہ کا پہلا خطبہ جو قبا کے مقام پر ارشاد فرمایا اس خطبے میں آپ نے فرمایا!

"میں تمہیں تقوے کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمانوں کو جو بہترین تلقین کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسے آخرت کے لئے آمادہ کرے اور تقوے کا حکم دے۔" (طبری)

حدیث قدسی ہے۔

اللہ تعالے فرماتا ہے کہ "میں اس بات کا سزاوار ہوں کہ مجھ سے تقوے رکھا جائے جس نے مجھ سے تقوے کیا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا۔ اس کے لئے میرے پاس مغفرت ہے۔" (شرح اربعین ابن حجر)

تقوے کے تقاضے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ تعالے کا خوف۔ ۲۔ حدود شناسی۔ ۳۔ صغیرہ گناہوں کو معمولی نہ سمجھنا۔ ۴۔ مشکوک چیزوں سے بچنا۔ ۵۔ دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرنا۔ ۶۔ عدل و انصاف۔ ۷۔ ایفائے عہد

تقوے کا اللہ تعالے کے ہاں بہت بڑا اجر ہے آنحضورؐ نے خطبۂ قبا میں فرمایا کہ تقوے آبرو دلاتا ہے۔ اللہ کی خوشنودی دلاتا ہے۔ درجات

Marfat.com

بلند کرتا ہے۔ (طبرانی)

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

"اللہ کے نزدیک تم میں سے مکرم وہ ہے جو تقوے میں تم سب سے بڑھ کر ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

تقویم جنتری، کیلنڈر۔ وقت کو گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں مرتب کرنا۔ گویا تقویم تاریخ اور ہفتے کے دنوں کی تعین کے جدول کا نام ہے۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ہفتہ کے سات دن، تیس دنوں کے مہینے اور بارہ مہینوں کا سال کب سے مقرر کیا گیا اور کس قوم کا یہ کارنامہ ہے لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ ابتداً لوگ چاند ہی کے مہینے جانتے تھے۔ اور بارہ مہینوں کا ایک سال شمار کرتے تھے۔ دن رات جو ہم روز دیکھتے ہیں اس میں شمار کرنے کی کوئی امتیازی بات حقیقتاً ایسی نظر نہیں آتی جس سے شمار کیا جا سکے۔ صرف ایک بات ہمارے دیکھنے میں آتی ہے کہ تیس یا انتیس دن کے بعد چاند بہت باریک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد ہر روز بڑھتا رہتا ہے اور پورا چاند ہو جاتا ہے اسی طرح روز بروز گھٹتا رہتا ہے اور نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ پھر دو تین راتوں کے بعد باریک سا نمودار ہوتا ہے۔

جب بارہ مرتبہ اسی طرح چاند کا عروج و زوال ہو جاتا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً وہی پچھلا موسم آجاتا ہے اس طرح مہینے کے تیس یا انتیس دن ہوئے اور سال کے بارہ مہینے۔ دنیا اسی قاعدے پر عمل کرتی رہی اور سال کے کسی بڑے واقعے کو ابتداء قرار دے کر حساب ہوتا رہا۔ کہیں پر کسی بڑے میلے کو ابتداء قرار دے دیا گیا اور کہیں کسی جنگ یا بادشاہ کی تخت نشینی کو۔

شمسی سال اس عرصے کے برابر ہوتا ہے جس میں زمین اپنے مدار کو پوری طرح طے کر لیتی ہے۔ یعنی پوری طرح سورج کے گرد چکر کاٹ لیتی ہے۔ یہ عرصہ ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے، ۴۸ منٹ، ۴۶ سیکنڈ ہے۔

قمری سال شمسی سال سے ۱۱ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو قمری مہینوں کے ساتھ ہی کچھ زائد دن لگا کر ایک مخلوط طریقہ حساب رائج ہوا۔ جس کے ذریعے بارہ قمری مہینوں کو شمسی سال کے برابر کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہندوستان چین اور مصر و شام کے قدیم کیلنڈروں میں نظر آتا ہے۔ بعد میں شمسی سال اور مہینوں کا حساب الگ الگ ہونے لگا لیکن مذہبی امور کے لئے قمری حساب کسی نہ کسی قدر باقی رکھا گیا۔

آج کی دنیا میں قمری اور شمسی دونوں قسم کے سال کا شمار موجود ہے قمری سال حقیقی ہے۔ اس میں موسم کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، کبھی یہ سال سردیوں میں شروع ہوتا ہے اور کبھی گرمیوں میں، کبھی بہار میں اور کبھی خزاں میں۔ زمین کے گرد چاند کے بارہ چکروں کی مجموعی مدت ۳۵۴ دن ۸ گھنٹے ۴۸ منٹ ۳۴ سیکنڈ ہوتی ہے۔ ہر قمری سال اتنی ہی مدت کا ہوتا ہے۔ یہی قمری سال مسلمانوں کے ہجری کیلنڈر میں شمار ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے قمری سال ہی کیوں اختیار کیا اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیات ہیں۔

"وہ خدا ہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا ہے اور اس کے لئے منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان سکو۔" (۱۰:۵)

"اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ ہی ہے۔ جو اللہ کی کتاب میں مقرر ہے۔" (۹:۳۶)

نصاریٰ کا ایسٹر، ہندوؤں کی دیپاولی اور یہودیوں کا صوم کپور اب بھی قمری سال کے حساب ہی سے ہوتے ہیں۔ باقی کاروباری ضرورتوں کے لئے شمسی سال رائج ہے۔

سنہ ہجری:۔ عرب میں قدیم زمانہ سے قمری سال رائج تھا اور مہینوں کے نام بھی یہی ہوا کرتے تھے۔ سال کے آخری مہینوں میں حج بھی ہوا کرتا تھا اور یہ طریقہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے زمانے سے رائج تھا۔

قمری مہینے چونکہ موسموں کا ساتھ نہیں دیتے عربوں نے جب دیکھا کہ حج کا وقت کبھی گرمی اور کبھی سردی میں آجاتا ہے اس وقت نہ ان کی فصلیں تیار ہوتی ہیں اور نہ جانوروں کے بچے خرید و فروخت کے لئے مہیا ہوتے ہیں تو انہوں نے غالباً یہودیوں سے سیکھ کر کبیسہ کا طریقہ رائج کیا۔ یعنی دو یا تین سال کے بعد سال میں ایک ماہ کا اضافہ کرنے لگے۔ اس عمل حساب کو ہندوستان میں لوند کہتے ہیں۔ یہ طریقہ قبیلہ کنانہ کے ایک شخص قلمس نے رائج کیا تھا۔ اس کے بعد یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ قبیلہ کنانہ کا سردار حج کے اجتماع میں اعلان کر دیتا تھا کہ آئندہ حج کس ماہ میں ہوگا اور اضافی تیرہواں مہینہ اس نے کس مہینے کے ساتھ بڑھایا ہے۔ لیکن عربوں نے اس عمل کو ہر کام کے لیے قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ وہ قمری مہینوں کو بھی یاد رکھتے تھے اور بغیر کبیسہ کے سال اور مہینے شمار کرتے تھے۔

چنانچہ عربوں میں دو قسم کے کیلنڈر رائج ہو گئے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں بھی یہ دونوں قسم کے کیلنڈر موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں تاریخوں اور مہینوں کے بعض اختلافات ملتے ہیں۔ یہ طریقہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع تک جاری رہا۔ اس سال آنحضورؐ نے حج کے موقع پر خدا کے حکم کے مطابق اعلان فرما دیا کہ اب زمانہ پھر صحیح وقت پر آگیا ہے آئندہ سے نہ کبیسہ ہوگا اور نہ نسئی ہوا کرے گی۔ اس کے بعد سے ایک ہی قسم کا قمری سال شمار ہونے لگا۔

دنیا میں ہر قوم میں کسی مشہور اور اہم واقعہ سے سال کا شمار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا ہجری سال آنحضورؐ کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی جس سال آپؐ نے ہجرت فرمائی تھی اس سال کی پہلی محرم سے ۱ھ شمار کیا جاتا ہے۔ جس روز آپ مقام قبا پر پہنچے تاریخ ۸ ربیع الاول ۱ھ تھی۔

سنہ عیسوی:۔ ہم آج کل جس شمسی کیلنڈر کو عیسوی سنہ کہتے ہیں وہ گریگوری کیلنڈر بھی کہلاتا ہے۔ یہ درحقیقت پرانا رومی کیلنڈر ہے۔ جسے آگسٹس نے ترمیم کر کے تیار کیا تھا۔ پھر جولین نے اس میں ترمیم کی اس کے بعد بھی کئی بار اس میں ترمیم ہوئی۔ آخری بار ۱۵۸۲ء میں پاپائے گریگوری کے حکم سے اس میں ترمیم کی گئی۔

جولین کے چھ سو سال بعد ایک عیسائی راہب ڈینس اگزیگوس نے اسے حضرت عیسیٰؑ کی طرف غلط حساب کر کے منسوب کر دیا۔ اس وقت سے اسے مسیحی کیلنڈر کہنے لگے۔ ورنہ اس کا حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حقیقت میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

Marfat.com

تقیہ عذر، خوف، بچاؤ، فقہ اہل تشیع کی اصطلاح میں نقصان کے خوف سے عقائد کو پوشیدہ رکھنا۔ شیعہ علما کہتے ہیں کہ تقیہ ایک پردہ ہے مومنین کے لیے اور اس کے جواز میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہیں۔

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔" (۱۰۶:۱۶)

"مومن، مومن کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ کریں۔ اور جو شخص ایسا کرے گا۔ اسے اللہ سے کوئی تعلق نہیں مگر اس صورت میں کہ ان کافروں سے بچاؤ مقصود ہو اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔" (۲۸:۳)

اس آیت میں "تُقٰتہ" کو "تقیۃ" بھی پڑھا گیا ہے۔

"آل فرعون کے ایک مومن نے کہا جو اپنا ایمان چھپاتا تھا۔" (۲۸:۴۰)

اس آیت میں واضح طور پر ایمان کے چھپانے کا ذکر تعریف کے انداز میں کیا گیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صحت اعتقاد و خوف خدا کے ساتھ خلاف ایمان کچھ کہہ دینا یا کرنا جائز ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمارؓ بن یاسر کی مثال دی جاتی ہے کہ جب کفار قریش نے انہیں بہت مجبور کیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اور پھر آنحضورؐ کے سامنے اپنی مجبوری کو بیان کر کے اسلام کا اقرار کیا۔

تقیے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ خوف ضرر و دفع مضرت مقصود ہو خواہ وہ مالی جان کا نقصان ہو یا آبرو کا لیکن کسی قسم کا نفع اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے قول و فعل کو تقیہ نہیں کہا جائے گا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ان اعمال و اقوال کا تعلق حقوق اللہ اور فرائض دین سے ہو۔ حقوق العباد میں تقیہ خونریزی سے بچنے کے لیے جائز ہے لیکن خون کرنے تک نوبت پہنچ جائے تو جائز نہیں ہے۔ تقیے کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ اس سے اصل دین کو نقصان نہ پہنچے۔

تاریخی رنگ میں تقیہ کی ضرورت اس واسطے پیش آئی کہ بعض غیر شیعی حکومتوں میں انہیں بعض صورتوں میں برا سمجھا جاتا رہا۔ چنانچہ اپنے مخالفین کے طعن و تشنیع اور سلاطین کے خوف سے بچنے کے لیے انہوں نے تقیہ کو اختیار کیا اور تعلیمات اہل تشیع میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔

اہل سنت حضرات کے ہاں تقیہ کوئی اصطلاح نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رخصت ہے جس پر عمل نہ کرنا بہتر اور افضل ہے۔

امام احمدؒ بن حنبل سے کسی نے پوچھا اگر آپ کے سر پر کوئی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو آپ اس کی بات مان لیں گے تو انہوں نے کہا "نہیں" اس کے بعد فرمایا اگر عالم نے تقیہ کر کے مان لیا اور جاہل تو جاہل ہے ہی تو پھر حق کے ظاہر ہونے کی کیا صورت رہ جاتی ہے۔

امام رازیؒ کے نزدیک "تقیہ انھی صورتوں میں جائز ہے جن میں اظہار حق اور دین کا سوال ہو۔"

تکاثر، سورۃ :۔ قرآن مجید کی ۱۰۲ ویں سورت (دیکھئے "التکاثر، سورۃ")

تکبر دوسرے کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھنا۔ آنحضورؐ نے تکبر کی تعریف ایک سوال کے جواب میں نہایت واضح طور پر فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا "جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں۔ اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ خود صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ آدمی حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

تکبر کا ظہور سب سے پہلے شیطان سے ہوا۔ اس نے آدم کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہتر اور بالاتر سمجھا اور پکارا۔

"میں اس (آدم) سے بہتر ہوں وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں۔" (۱۲:۷)

چنانچہ شیطان کو اسی تکبر کی بنا پر مردود قرار دیا گیا اور فرمایا "یہاں سے اتر جا۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔" (۱۳:۷)

تکبر کی اصل حقیقت حق کا انکار اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ہے۔ یعنی محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے ان کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ جس بات کو وہ جانتے اور مانتے ہیں حق اس کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ان کو عزت و نعمت حاصل ہوتی ہے اسے وہ اللہ کا فضل سمجھنے اور اس پر اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اسے یا تو اپنا پیدائشی اور خاندانی حق سمجھ بیٹھتے ہیں — یا اپنی کوشش اور قابلیت کا ثمرہ خیال کرتے ہیں اور پھر اس پر اتراتے اور فخر کرتے ہیں۔ اس چیز کو بعض احادیث میں آدمی کی خود فریبی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کے لیے تین مہلک چیزوں میں سے سب سے زیادہ مہلک شمار کیا گیا ہے آنحضورؐ کا ارشاد ہے۔

"رہیں تین مہلک چیزیں تو ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے دوسرے بخل کی اطاعت اور تیسرے آدمی کا خود اپنے اوپر فریفتہ ہونا اور یہ چیز ان تینوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔" (مسلم)

قرآن و حدیث میں تکبر کرنے والے شخص کے بارے میں کئی جگہوں پر وعید سنائی گئی ہے ارشاد الٰہی ہے۔

"اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔" (۱۸:۳۱)

"اللہ یقیناً ان سب کے کرتوت جانتا ہے چھپے ہوئے بھی اور کھلے بھی وہ ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو تکبر کرتے ہیں۔" (۲۳:۱۶)

آنحضورؐ نے فرمایا۔

"دوزخی بدگو، حرام خور اور متکبر کو کہتے ہیں۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں فرمایا۔

"وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو۔" (مسلم)

تکبر و غرور کے بہت سے اسباب ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر تکبر کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔ حسب و نسب۔ حسن و جمال۔ مال و دولت قوت اور اعوان و انصار کی کثرت اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں بلکہ تم میں سے اللہ کے نزدیک بڑا اور عزت والا وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔" (۱۳:۴۹)

Marfat.com

سکولوں میں پڑھنے والے پاکستانی بچوں کیلئے

مکتبہ شاہکار

کا قائم کردہ

شاہکار منصوبہ نمبر ۲

ہمارے بچوں سے بچوں کی قدرتی ذہانت کو زنگ لگا دینے والے مروجہ گھسے پٹے نظام تعلیم کے برعکس ایک فعال، بامقصد، موثر اور وقت کے تیز رفتار تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم

جنوں، بھوتوں، پریوں اور نازنینوں کی تصوراتی جاسوسی، رومانی، طلسماتی کہانیوں کے رنگین لبادوں میں چھپے ہوئے تباہ کن لٹریچر کے خلاف — ایک ٹھوس معلوماتی، جدید، سائنٹیفک اور منظم اشاعتی منصوبہ۔

تعلیمی نظام

فی الحال مندرجہ ذیل ۸ ضروری مضامین کیلئے سلسلے قائم کیے جا رہے ہیں۔ ہر سلسلے کے تحت ہر ماہ ایک تعلیمی باتصویر فیچر شائع ہوگا یعنی ایک مہینے میں آٹھ فیچر پیش کیے جائیں گے۔ چار فیچر ہر پہلی کو اور ۴ فیچر ہر پندرہ کو شائع ہوا کریں گے۔ پہلے سال میں شائع ہونے والے ۹۶ تعلیمی فیچروں کی مکمل فہرست یہ ہے

جس کا نفاذ یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء سے ہو رہا ہے

سلسلہ نمبر ۱

چند عجیب و غریب جانور، انسان سے ملتے جلتے جانور، چمگادڑ اور اسکے رشتہ دار، شیر چیتے اور بلیاں، دوست کتے، دشمن کتے، ریچھ اور اسکے رشتہ دار، سمندر کے بڑے بڑے جانور، کترنے والے جانور، کھودنے والے جانور۔ گائے، بیل اور بھینس۔ بھیڑ بکریاں، تیز دوڑنے والے جانور۔

سلسلہ نمبر ۲

روٹی اور ڈبل روٹی۔ ایک گلاس پانی۔ ایک کپ چائے۔ گھنٹے اور گھڑیاں۔ کاغذ اور گتے۔ ماچس اور دیا سلائی۔ چاقو چھریاں اور کانٹے۔ گڑ، شکر اور چینی۔ اونی، سوتی کپڑے۔ اینٹیں اور عمارتیں۔ نمک۔ کیمرہ اور فوٹو گرافی۔

سلسلہ نمبر ۳

کائنات کتنی وسیع ہے؟ سورج اور ہماری زمین۔ زمین کیوں اور کیسے گھومتی ہے؟ زمین کے گولے میں کیا ہے؟ آگ اور پانی زمین کا نقشہ بدلتے رہتے ہیں۔ دھوپ اور ہوا پہاڑوں کا حلیہ بگاڑتے رہتے ہیں۔ زمین کا چہرہ، پہاڑ اور برف کے دریا۔ جنگل اور صحرا۔ دریا اور سمندر۔ آب و ہوا۔ موسم

سلسلہ نمبر ۴

سب سے پہلے زبان بنی تھی، پھر خبر رسانی شروع ہوئی۔ دور دراز فاصلے سمٹنے لگے، نقل و حمل کی ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ پگڈنڈیوں اور سڑکوں سے پہلے کیا تھا؟ لکھنے کا فن ایجاد ہوتا ہے۔ پہیہ ایجاد ہوتا ہے۔ پیغام رساں گھوڑے۔ باربرداری کے دوسرے جانور۔ سڑکیں بنتی ہیں، آبی راستے کھل جاتے ہیں۔ ریل خانہ بدوش

سلسلہ نمبر ۵

قدرت کی طاقت۔ انسان کی طاقت، جانوروں کی طاقت، ہوا کی طاقت۔ کوئلے کی طاقت، بھاپ کی طاقت۔ بھاپ کی طاقت کے کرشمے۔ گیس کی طاقت، گیس کی طاقت کے کرشمے۔ تیل کی طاقت۔ تیل — کنویں سے کارخانے تک۔

سلسلہ نمبر ۶

سارا جہاں ہمارا — پاکستان۔ افغانستان۔ ایران۔ اردن، البانیہ۔ الجزائر۔ انڈونیشیا۔ ترکی۔ سعودی عرب۔ تیونس، سوڈان وغیرہ۔

سلسلہ نمبر ۷

زندگی ہی زندگی۔ پہلی پہلی زندہ چیزیں، زندگی سمندر سے نکل کر خشکی پر کیوں آئی؟ زندگی ہر تو جسم بناتا ہے۔ ننھی منی زندہ چیزیں۔ اچھے جراثیم، برے جراثیم۔ زندگی کہاں رہتی ہے؟ خون کے سرخ خلیے، خون کے سفید خلیے، دل، پھیپھڑے، جسم۔

سلسلہ نمبر ۸

ہر فیچر میں ہر موضوع سے متعلق، انتہائی دلچسپ سوالات اور ان کے جوابات مع تصاویر۔

دبیز آفسٹ پیپر پر چھپے ہوئے بڑے سائز کے ہر باتصویر تعلیمی فیچر کی قیمت صرف ۵۰ پیسے

Marfat.com

● شاہکار انسائیکلوپیڈیا معلومات ● شاہکار بے بی انسائیکلوپیڈیا ● شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا ● شاہکار جریدی کُتب

—— کے ساتھ ساتھ ہر ماہ بارہ شاہکاروں کا اضافہ ——

یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء سے

اُردو نشر و اشاعت کی تاریخ کے دو اہم سنگِ میل —— دو اور انقلاب آفریں شاہکار منصوبے

[redacted]

—— اور بھی ارزاں قیمت کے گراں قدر علمی و ادبی سلسلے ——

شاہکار جیبی کُتب

● اُردو کے عظیم افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کے مجموعے، دُنیا کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کے مجموعے، شاہکار ڈرامے، شاہکار ناولٹ، شاہکار چھوٹے ناول۔ اردو کے اور دنیا کی دوسری زبانوں کے طنزیہ، مزاحیہ ادب کا شاہکار انتخاب، شاہکار تنقیدی و تحقیقی مقالات کے مجموعے ● ہر موضوع پر چھوٹی ضخامت کے شاہکار، فلسفہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، نفسیات، فنونِ لطیفہ، شخصیات، سائنس، اسلامیات، پاکستانیات، غرض ہر موضوع کے عظیم تاریخ ساز مقالات۔ ایسی ضخیم علمی کتابوں اور ناولوں کی معیاری تلخیص جن کی مکمل اشاعت فی الحال یا تو ممکن نہیں یا موزوں نہیں۔ ایسے بیش بہا اور لازوال علمی جواہر جو گراں ڈیل جرائد اور گراں قیمت کتب کے اوراقِ گمشدہ میں مخفی پڑے ہیں۔ ایک خوشبو جو بند ہو جانے کے لیے نہیں پھیل جانے کے لیے ہے

—— بہترین دماغوں کا بہترین نچوڑ ——

● ہر مہینے چار شاہکار جیبی کتب دو کتب ہر پہلی تاریخ کو اور دو کتابیں ہر پندرہ کو "شاہکار" کی معروف باقاعدگی سے شائع ہوا کریں گی:

● دبیز آفسٹ پیپر کا رنگین سرورق ● سفید کاغذ

قیمت فی شاہکار جیبی کتاب:

صرف اور صرف ڈیڑھ روپیہ

شاہکار منصوبہ نمبر ۶

سرورق: ایشین آرٹ پرنٹیں، ۱۲- میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط (۱۲) وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیرِ اعلیٰ : سیّد قاسم محمود
• مدیر : عطش دُرّانی
• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

شاہ مدارؒ دُوسرا زاویۂ نظر

شاہ مدارؒ کے متعلق تحقیقات کے ضمن میں ہمیں چند مزید آرا موصول ہوئی ہیں۔ ان میں سے دوسرے زاویۂ نظر کی چند تحقیقات نذرِ قارئین ہیں۔ اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی واضح صورت سامنے آجائے گی۔

ساہیوال سے جناب جاوید کیلانی رقمطراز ہیں :

ساہیوال شہر کی وجہ تسمیہ وہاں بسنے والی ایک قوم "ساہی" ہے۔ اس کا شاہ مدارؒ سے کوئی تعلق نہیں۔ چک ۹۰/۱ آر میں موجود مزار شاہ مدارؒ کی بابت وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا کہ یہ سلسلۂ مداریہ کے کسی بزرگ کا مزار ہے۔

لاہور سے ڈاکٹر خوشی محمد کے مراسلے کا لب لباب یہ ہے :

(۱) ہندوستان میں آنے والے شاہ مدار ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء میں حلب میں پیدا ہوئے (بحوالہ مخطوطہ "مراۃ المداری" (فارسی) از عبدالرحمٰن عباسی، اردو ترجمہ عبدالرشید، مطبوعہ فرخ آباد، ۱۹۱۰ء) ——— (۲) ان کی تاریخ پیدائش اور نسب میں اختلاف ہے (امیر حسن مداری نے "تذکرۃ المتقین" مطبوعہ کانپور ۱۸۹۸ء میں یکم شوال ۲۴۲ھ/۱۶ فروری ۱۰۵۱ء درج کی ہے) ——— (۳) بعض کے نزدیک وہ یہودی النسل تھے (بحوالہ "مراۃ المداریؒ") اور بعض کے نزدیک حضرت امام باقر کی اولاد سے تھے۔ (بحوالہ "کتاب اعراس" از محمد نجیب ناگوری مطبوعہ آگرہ ۱۸۸۳ء)
(۴) ایکسچ اشرف جہانگیرؒ سمنانی کے ساتھ ثابت ہے (تقریباً ۸۰۰ھ میں) قرین قیاس ہے کہ ۷۱۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔

ایک اور قاری جناب سلیمان فاروقی (کراچی) کا ارشاد ہے :-

"اس جدید دَورِ سائنس میں آپ یہ کیا محاضرات و کرامات کی کہانی لے کر بیٹھ گئے؟ شاہ مدارؒ پچاس برس جئے یا پانچ سو برس؟ اُنھوں نے تمام عمر روزہ رکھا یا طعام اڑائے، ان کا لباس ایک ہی تھا یا کئی؟ ان تمام باتوں کی تحقیق سے آپ کو کیا حاصل؟ علم میں کتنی ترقی ہوگی اور عمل کو کیا فائدہ ہوگا؟ علوم و فنون کی تمام تر تحقیق اور ترقی آخر کس لیے ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ اعمال کو صالح تر بنانے کے لیے۔ پھر گڑے مُردے اکھاڑنے سے فائدہ؟ کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں شاہ مدارؒ کی تعلیمات کیا تھیں؟ اُنھوں نے کیا بتایا؟ کس راہ پر چلایا؟ کیا وہ راہ نیکی اور راستی کی تھی؟ اگر ایسا تھا تو ہم نے اُسے کیوں چھوڑ دیا؟ یہ سب کچھ ہیرو ازم ہے، عظمت پرستی ہے، شخصیتوں کے بُت بنا کر پُوجنے کی بجائے ان کی تعلیمات کو سمجھیں، اور عقل و استدلال سے کام لیں۔ یہی اسلام ہے اور یہی رضائے الٰہی۔"

آپ کا
عطش دُرّانی

تاریخ اشاعت : ۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء ★ ناشر : سیّد قاسم محمود ★ طابع : اے ریاض حسین الجدید پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

تکبیر خدا کی بڑائی بیان کرنا۔ اللہ اکبر کہنا۔ قرآن میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر" (۳:۷۴)

"اور اس کی بڑائی بیان کرو۔ کمال درجے کی بڑائی۔" (۱۱۱:۱۷)

اللہ اکبر کا نعرہ مسلمانوں کا مذہبی نعرہ ہے۔ اس کا استعمال نماز اور اذان میں ہوتا ہے نماز اسی کلمے سے شروع کی جاتی ہے اور نماز کا ہر نیا رکن ادا کرتے وقت تکبیر کہی جاتی ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیر کہتے ہیں تکبیر سے مسلمانوں میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلمان عیدین کی نماز پڑھنے کے لئے نکلتے ہیں تو راستے میں عید الفطر کے موقع پر آہستہ آواز سے اور عید الاضحیٰ کے موقع پر بلند آواز سے تکبیریں پڑھی جاتی ہیں۔ جانور ذبح کرتے وقت بھی بسم اللہ کے ساتھ اللہ اکبر ضرور کہا جاتا ہے۔

عیدین کی نماز میں چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں۔
نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہی جاتی ہیں جبکہ اہل تشیع کے ہاں پانچ تکبیریں ہیں۔

اذان چار تکبیروں سے شروع ہوتی ہے اور دو تکبیروں پر ختم ہوتی ہے
حج کے دوران میں کئی بار تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ مثلاً طواف کے شروع میں طواف کے درمیان میں طواف کے اختتام پر کعبہ نظر آنے پر۔ حجر اسود کے پاس، منیٰ اور عرفات کے درمیان اور صفا و مروہ پر۔

گویا تکبیر وہ کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لئے مختصر ترین کلمہ ہے اور اسلامی زندگی کے مختلف حالات میں جہاں اللہ اس کی عظمت، رحمت اور اس کی عنایت کا تصور مسلمانوں کے ذہن میں جلوہ گر ہوا استعمال کیا جاتا ہے۔

تکبیر تحریمہ نماز کی نیت کے بعد قیام کرتے وقت اللہ اکبر کہہ کر نماز کی ابتدا کرتے ہیں۔ اسی کو تکبیر تحریمہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد نمازی ہمہ تن نماز میں معروف ہو جاتا ہے۔ اکثر ائمہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کہنا فرض ہے اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کا اٹھانا سنت ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز ہر اس لفظ سے جو تعظیم والا ہو منعقد ہو جاتی ہے جیسے اللّٰہُ اَعْلَم، اور اللّٰہُ اَعْظَم، اور صرف اللّٰہ بھی کہہ دیا جائے تو کافی ہے۔

تکریت دریائے دجلہ کے کنارے ایک قصبہ جو سامرا کے شمال میں سلسلہ جبل حمرین کے دامن میں واقع ہے۔ تکریت کا پرانا قصبہ چند پہاڑیوں پر تعمیر ہوا تھا موجودہ قصبہ ان پہاڑیوں میں سے ایک پر واقع ہے اس کے دامن میں دریا بہتا ہے۔ شمال کی طرف سنگِ ریگی کی چٹان ہے جس پر اب تک پرانے قلعے کے آثار موجود ہیں۔ یہ دریا کی سطح سے دو سو فٹ بلند ہے۔ پرانے شہر کے آثار ایک بڑے دائرے کی شکل میں ان دونوں پہاڑیوں کے مغرب میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرانا تکریت کسی زمانے میں ایک بہت بڑا رقبہ گھیرے ہوئے تھا۔

اس شہر کا ذکر سب سے پہلے بطلیموس نے برثہ کے نام سے کیا ہے۔ امیانوس اور مارکلینوس نے اسے ورتہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قلعے کی پہاڑی کو اب تک برثہ کہا جاتا ہے۔ سریانی کتب میں اس کا نام تغریث آیا ہے۔ ۱۱۵۵ء میں اسے استقفیہ الموصل میں شامل کر دیا گیا۔

بقول عرب مصنفین اس کی بنیاد ساسانی بادشاہ سابور بن اردشیر نے رکھی تھی اس کے نام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نام ایک عیسائی بدوی تکریت بنت وائل کے نام پر رکھا گیا تھا۔

تکریت کو ۱۶ھ میں عبداللہ بن معتمؓ نے جنہیں سعد بن ابی وقاص نے بھیجا تھا فتح کیا۔ دوسری مرتبہ ۲۰ھ میں ایک صلح نامے کے تحت اس نے دوبارہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ مسعود بن حریث نے اس پر دوبارہ قبضہ کیا اور وہ یہاں کا پہلا فرمانروا تھا۔ اسی نے یہاں ایک جامع مسجد بنوائی۔

ساتویں صدی کے آخر میں اس شہر کے نواح میں قیس اور بنو تغلب میں جنگ ہوئی گیارہویں صدی میں یہاں پر خود مختار سرداروں کی حکومت تھی۔ بعد میں طغرل بیگ سلجوقی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۴۹ء سے تکریت بیگ تگین خاندان کے علاقے میں شامل کر دیا گیا اور ۱۱۹۰ء میں یہ شہر عباسی خاندان کے قبضے میں آ گیا۔

تکریت صلاح الدین ایوبی کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے بھی مشہور ہے عہد سلاجقہ میں صلاح الدین کا والد نجم الدین ایوب تکریت کا والی تھا۔

بعد کی صدیوں میں اس شہر کی رونق ختم ہو گئی اور یہ ایک معمولی سا مقام رہ گیا۔ بغداد کی مہم کے دوران میں ہلاکو نے دریائے دجلہ اسی مقام سے پار کیا تھا۔

خلافت عثمانیہ میں تکریت ایالت رقہ کی ایک سنجق تھا۔ انیسویں صدی کی اصلاحات کے بعد اس کی اس حیثیت کو کم کر کے ولایت بغداد کی قضا سامرا کا ایک ناحیہ بنا دیا گیا اس وقت اس کی آبادی چار پانچ ہزار سے زائد نہیں تھی۔ جو اب پچیس ہزار کے قریب ہو چکی ہے یہاں کی اکثریت حنفی العقیدہ مسلمانوں کی ہے اور یہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے۔

تکش (دور حکومت ۵۶۷ھ/۱۱۷۲ء تا ۵۹۶ھ/۱۲۰۰ء) ابن ایل ارسلان خوارزم شاہ سردار خورستان کا حکمران تخت نشینی سے پہلے جند کا والی تھا جو سیر دریا کے زیریں حصے پر واقع ہے۔ تخت کے لئے اسے اپنے چھوٹے بھائی سلطان شاہ سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ اس کش مکش میں شاہ قرہ ختائی نے اسے مدد دی۔ جب لڑائی کا فیصلہ تکش کے حق میں ہو گیا تو اس نے شاہ قرہ ختائی کی مدد سے مرو، سرخس اور طوس میں ایک خود مختار حکومت قائم کی اور اپنی وفات تک ان علاقوں پر حکومت کرتا رہا۔

تکش نے ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں خراسان کے پایۂ تخت نیشاپور پر قبضہ کر لیا اور اپنے بڑے بیٹے ملک شاہ کو وہاں کا والی مقرر کیا۔ بعد میں اسے مرو کا والی بنا دیا اور چھوٹے بیٹے کو اس کی جگہ مقرر کیا۔

۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں سلطان طغرل ثانی کے شکست کھا جانے کے بعد عراق سے سلاجقہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اس فتح کے بعد تکش کا مرتبہ ایک مقامی امیر سے بڑھ کر ایک بڑی سلطنت کے بادشاہ کا ہو گیا۔ اس نے اپنے سکوں پر سلطان ابن خوارزم شاہ کندہ کرنا شروع کر دیا۔ اب عراق ہمدان سمیت تکش کے قبضے میں آ گیا۔ ۵۹۲ھ/۱۱۹۶ء میں خلیفہ ناصر کے لشکر کو ہمدان میں شکست دی۔ خلیفہ کا مطالبہ تھا کہ وہ مفتوحہ علاقے خالی کر دے لیکن تکش نہ صرف اس مفتوحہ علاقے پر قابض رہنا چاہتا تھا بلکہ خلیفہ سے ولایت خورستان بھی ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ تکش اور شاہ قرہ ختائی کے درمیان بھی باہمی جنگ و جدال کا ذکر ملتا ہے۔ ان لڑائیوں کا سب سے بڑا واقعہ تکش کا بخارا کو تسخیر کرنا تھا۔

اگرچہ تکش ایک بڑا صاحب اقتدار بادشاہ تھا لیکن آخر تک قرہ ختائی کا باجگزار رہا۔

Marfat.com

تکفین:۔ کفن پہنانا۔ (دیکھیے "تجہیز و تکفین"، "کفن")

تکلیف کسی کی طاقت سے زیادہ کام۔ اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ، مصیبت، مشکل۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر مختلف مقامات پر اس طرح کیا گیا ہے۔

"کسی جان پر اس سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالا جائے۔" (۲:۲۳۳)

"اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔" (۲:۲۸۶)

"ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بوجھ رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے" (۶:۱۵۲)

"پس اے نبیؐ تم اللہ کی راہ میں لڑو۔ تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے مکلف نہیں ہو۔" (۴:۸۴)

"بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور اچھے کام کیے۔ اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ جنت والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (۷:۴۲)

"اور ہم کسی شخص پر کچھ بوجھ نہیں ڈالتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔" (۲۳:۶۲)

"اللہ کسی شخص پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر اس کے مطابق جو اسے دیا ہے" (۶۵:۷)

گویا تکلیف کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کسی کو اس بات کا حکم نہیں دیتا جو اس کی استطاعت سے بڑھ کر ہو۔ گویا مخلوق خدا پر جو کچھ اللہ تعالٰی نے وحی کے ذریعے پہنچایا ہے اس پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل واجب ہونا تکلیف ہے۔

مکلف کون شخص ہے۔ اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر عاقل اور بالغ انسان مکلف ہے۔ لیکن چونکہ آنحضورؐ جنات کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے اس لیے جنات بھی مکلف ہیں اس شریعت کے جو آپ لائے تھے۔ رہے فرشتے تو وہ بھی مکلف ہیں کیونکہ آنحضورؐ ان فرشتوں کی طرف بھی مرسل ہیں لیکن فرشتوں پر تکلیف کا اطلاق عمل طاعات میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں ایمان تو پہلے ہی موجود ہے۔ بعض کی رائے کے مطابق عمل طاعت تو ان میں فطری طور پر موجود ہے۔ اور ان کی طرف آنحضورؐ کی بعثت محض ان کی شان بڑھانے کے لیے تھی۔

چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان کی ذمہ داری اس کی مقدرت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ تعالٰی اس سے بازپرس کرے کہ تو نے فلاں کام کیوں نہ کیا، یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اس کی قدرت سے باہر ہو اور اللہ اس پر مواخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن ان تمام معاملات میں اپنی مقدرت کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا ہے اور کیا چیز اس کی استطاعت سے باہر ہے؟

تکویر، سورۃ:۔ قرآن مجید کی ۸۱ویں سورت (دیکھیے "التکویر، سورۃ")

تکہ ایک ترکمانی قبیلہ۔ جس کا تعلق نسل سالور سے بتایا جاتا ہے۔ ابوالغازی نے اس قبیلے کو دوادر قبیلوں سرق اور یَوت کے ساتھ بیرونی سالور کے ذیل میں شمار کیا ہے۔ اسی کی تصنیف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ قبیلہ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں کوہستان بلخان و کورین پر خانہ بدوشی کی حالت میں رہا کرتا تھا۔ اس قبیلے کے بعض لوگ تجارت کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں اس قبیلے نے مشرق کی جانب بڑھنا شروع کر دیا اور یہاں پر انہوں نے آہستہ آہستہ ایرلی قبیلے اور قردشلی قبیلے کی جگہ لے لی۔ اسی طرح سرق کو سرخس اور مرو سے نکال کر ان کی جگہ بھی خود آباد ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے قریب قریب تکہ کا مرو پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس وقت تکہ قبیلے کا سردار قوشت خان تھا۔ جب بلخان میں روسیوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے تکہ کو مغلوب کرنا ضروری سمجھا چنانچہ ۱۸۷۷ء میں لڑائی شروع ہو گئی جو ۱۸۸۴ء میں ختم ہوئی جبکہ مرو پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ روسی اعداد و شمار کے مطابق اس وقت تکہ قبیلے کی تعداد تین لاکھ تھی اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم تھے۔ ہر گروہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو خان کے لقب سے مشہور تھا۔

روسی حکومت کے قائم ہونے کے بعد اور خاص کر انقلاب روس کے بعد تکہ بھی دوسرے قبیلوں کی طرح اپنے خاص خاص قبائلی نام کھو چکے ہیں اور اب مجموعی طور پر ترکمان کے نام سے مشہور ہیں۔

تکہ اوغلی اناطولیہ کا ایک خاندان جو تکہ ایلی پر حکمران رہا۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ تکہ بک یا تکہ پاشا تھا جو سلجوقیوں کی طرف سے انطالیہ کا حکمران تھا اس کے بعد اس کا بیٹا یونس بیگ اس کا جانشین ہوا۔ لیکن اسکے دور حکومت کا حال تاریکی میں ہے۔ ۷۲۳ھ/۱۳۲۳ء میں بقول ابن بطوطہ یہاں خضر بیگ جو یونس بیگ کا بیٹا تھا حکمرانی کرتا تھا۔ جس کے بعد اس کا بھائی محمود بیگ تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کے دور حکومت کے حالات بھی کچھ واضح طور پر سامنے نہیں آ سکے۔ ۱۲۷۲ء/۱۳۷۴ء میں محمود بیگ کا بیٹا محمد بیگ یہاں کا حکمران بنا۔ ۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء میں سلطان بایزید اوّل یلدرم نے تکہ ایلی کی ریاست کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت عثمانی میں شامل کر لیا۔ ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء تک عثمانی خاندان حکمران رہا۔ اسی سنہ میں محمد بیگ کے بیٹے عثمان چلبی نے بادشاہت سنبھال لی۔ عثمان نے دوسرے حکمرانوں سے مل کر اپنی حکومت کو اور زیادہ مضبوط کر لیا۔

۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں قرہ حصار کے والی حمزہ بن فیروز بیگ نے انطالیہ کا محاصرہ کر لیا۔ عثمان چلبی نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس کی وفات کے بعد یہ خاندان بھی ختم ہو گیا۔

تکہ ایلی ایشیائے کوچک (ترکیہ) کا ایک ضلع جو جنوبی اناطولیہ میں واقع ہے۔ اس کی شمالی سرحد قرہ مان اور حمید ایلی کے اضلاع ہیں۔ مشرقی سرحد ایچ ایلی اور مغربی منتشا ایلی ہے جنوب میں سمندر جو قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے۔

ابتدا میں تکہ اوغلی کی سرزمین تھی لیکن جس طرح تکہ اوغلی کے حالات تاریکی میں ہیں اسی طرح تکہ ایلی کے حالات کے بارے میں بھی بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں تکہ ایلی کے ایران سے تعلقات تھے۔ ایران کے ایک بزرگ شیخ صدرالدین نے یہاں ایک جماعت بھی تیار کی تھی۔ اس وقت سے تکہ ایلی اور اس کے ملحقہ علاقے حمید ایلی کے لوگ ایرانی شیوخ سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علویوں کی کئی بغاوتیں تکہ ایلی میں ظہور پذیر ہوئیں جن میں سے ایک باباشاہ قلی کی بغاوت تھی۔ جس کا تعلق ایران کے صفویہ سے تھا۔

تکہ ایلی میں اہل تشیع آباد ہیں۔ اس علاقے کی دو بندرگاہیں انطالیہ اور علائیہ

Marfat.com

ایک اہم خصوصیت کی حامل ہیں۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے دوران میں ان ہی کے ذریعے ایشیائے کوچک کی پیداوار اسکندریہ اور دمیاط بھیجی جاتی تھی۔ انطالیہ اپنی خود مختاری ۱۴۵۰ء تک قائم رکھ سکا جب کہ علائیہ پر ۱۴۷۲ء میں عثمانیوں کا قبضہ ہوا۔

تکیہ دارا، دائرہ، سہارا، ٹیک۔ اصطلاح میں آرام کرنے کی جگہ۔ فقیر کے رہنے کی جگہ۔ زمانہ قدیم میں تکیوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی دستور تھا کہ شام کے بعد شہر پناہ کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ چنانچہ رات کے وقت آنے والے مسافر شہر کے اندر داخل نہ ہو سکتے تھے اور انہی تکیوں میں رات گذارتے۔ تکیہ کا فقیر ان مسافروں کی ہر طرح سے خدمت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ نووارد شخص بھی جس کا شہر میں کوئی رشتہ دار نہ ہوتا تھا، انہی تکیوں میں رہتا تھا۔ گویا پرانے زمانے میں یہ تکیے ایک طرح کے ریسٹ ہاؤس تھے۔

دن کے وقت ملحقہ علاقوں کے بوڑھے اور جوان اپنی فرصت کے اوقات بھی انہی تکیوں میں گذارتے۔

ہر تکیہ میں ایک کنواں اور اس کے ساتھ غسل خانے موجود تھے۔ یہیں لوگ نہا دھو کر چٹائیوں پر بیٹھ کر چوسر، شطرنج اور تاش کھیل کر اپنا دل بہلاتے۔ شادی اور غمی کی تقریبات بھی انہی تکیوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ برادریوں کے جھگڑے حل کرنے کے لیے پنچائیتیں بھی یہیں لگتیں۔ تکیہ کے اندر ہی ورزش کرنے کے لیے ایک اکھاڑہ ہوتا تھا۔

زمانے کے ساتھ ساتھ ان تکیوں کا نقشہ بھی بدل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تکیے بھنگیوں چرسیوں اور چنڈو بازوں کے قبضے میں آ گئے۔ اور پھر یہ محض ملنگوں اور نشہ بازوں کے تکیے بن کر رہ گئے۔ پاکستان میں اکثر بڑے شہروں کے باہر یہ تکیے موجود ہوتے تھے۔ لاہور کے مشہور مشہور تکیے مندرجہ ذیل ہیں۔

تکیہ صابر شاہ، تکیہ بھورے سائیں، تکیہ شیر علی، تکیہ بالمیکیاں، تکیہ پیر مکی، تکیہ ذیلداراں تکیہ سیدے شاہ، تکیہ گوندی پیر، تکیہ کھڑکی پیر، تکیہ قطب شاہ، تکیہ سردار شاہ، تکیہ پیر ازغائب تکیہ گھدو شاہ، تکیہ مسکین سائیں، تکیہ اہل دلا، تکیہ تاجے شاہ، تکیہ میراثیاں، تکیہ کھوتیاں والا تکیہ لالو سائیں، تکیہ کبوتر شاہ، تکیہ گڈی سائیں، تکیہ شیر شاہ ولی، تکیہ جھنگی، تکیہ نتھے شاہ تکیہ کھائی والا، تکیہ سرمہ سائیں، تکیہ سبز پیر، تکیہ چیت رام، تکیہ سادھواں۔

تلاوت قرآن مجید پڑھنا۔ قرآن مجید کے پڑھنے کے بارے میں قرآن و حدیث میں بہت فضیلت بتائی گئی ہے۔ "اور جب قرآن کی تلاوت کی جا رہی ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

آنحضور ؐ نے فرمایا کہ "جو آدمی قرآن پڑھتا اور پڑھاتا ہے وہ سب سے افضل شخص ہے۔" (بخاری)

ایک حدیث میں فرمایا "سوائے دو آدمیوں کے اور کسی سے حسد کرنا جائز نہیں ایک اس سے جو قرآن کا علم رکھتا ہے اور اس کو پڑھتا پڑھاتا ہے دوسرے اس سے جو مالدار ہے اور اپنا مال راہ خدا میں شب و روز لٹاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک جگہ فرمایا "خداوند عالم قرآن پڑھنے والے کو عزت بخشتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو ذلیل کرتا ہے۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

"اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ (یعنی تلاوت کلام پاک کرتے رہا کرو۔) اس لیے کہ جہاں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے وہاں سے شیطان بھاگتا ہے۔" (مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف بھی تلاوت کرے گا اسے ایک ایک حرف کے بدلے میں ایک نیکی عطا ہوتی ہے اور ہر نیکی کا دس گنا ثواب ملتا ہے۔" (مشکوٰۃ) (نیز دیکھیے "تجوید"، "ترتیل"، "قرأت")

تل ابیض شام کا ایک شہر۔ اس شہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سرزمین کنعان کی طرف کوچ کرنے سے قبل یہاں اقامت گزیں ہوئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خادم لیعازر کو حضرت اسحاق کے رشتے کے لیے یہاں بھیجا تھا۔

تل باشر خوشخبریوں کی پہاڑی۔ شمالی شام کا ایک قلعہ جو عینتاب کے قریب نہر ساجور پر حلب کے شمال میں دو دن کی مسافت پر واقع ہے۔

اس شہر کا ذکر قدیم آشوریوں کے زمانے سے چلا آتا ہے زمانہ قدیم میں اسے تل بسرے کہتے تھے۔

عرب مصنفین نے صلیبی جنگوں سے پہلے تل باشر کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۰۹۷ء میں قلعہ ہائے تل باشر و راوندان گوڈفرے کے بھائی کاؤنٹ بالڈون اول بورگ نے فتح کر کے الرہا کی ریاست میں شامل کر لئے۔ ۱۱۰۲ء میں تل باشر جوسلین کو بطور جاگیر دے دیا گیا ۱۱۰۴ء میں فرنگیوں نے تل باشر سے حلب کی طرف کوچ کیا اور بسرفوث پر قبضہ کر لیا۔ حران کی شکست کے بعد جب جوسلین کو اس کے دشمنوں نے گرفتار کر لیا اور زرفدیہ کی رقم مقرر ہو گئی اور اسے یہ رقم ادا کرنے کے لیے رہائی دی گئی تو اس کے ساتھیوں کو جو تل باشر میں موجود تھے یرغمال کے طور پر قید کر لیا گیا۔

فرنگی مصادر کے مطابق ۵۰۲ھ / ۱۱۰۹ء میں جوسلین اپنے چچا بغدوین اور حامیوں کے ساتھ تل باشر کو اپنا فوجی مرکز بنا کر انطاکیہ کے ٹنکری کے ساتھ برسر پیکار رہا۔

سلطان محمد نے ترکوں کا ایک لشکر امیر مودود والی موصل کی کمان میں بھیجا جو تل باشر کے سامنے آ موجود ہوا۔ اور ڈیڑھ ماہ تک اس لشکر نے تل باشر کا محاصرہ کیے رکھا لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۱۲۰ء میں ایل غازی، جوسلین سے شکست کھا کر تل باشر کی طرف بڑھا اس نے کئی روز محاصرہ جاری رکھا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں اہل حلب نے تل باشر پر کئی مرتبہ حملہ کیا لیکن نقصان اٹھاتے رہے۔ یہاں تک کہ جب جوسلین ۱۱۳۱ء میں مر گیا تو اس کا بیٹا جوسلین ثانی تخت نشین ہوا جو بہت زیادہ عیاش اور شراب نوشی کا دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس کے زمانہ میں تل باشر حلب کے حکمران سیف الدین سوار کے بار بار حملوں کی جولانگاہ بن گیا۔ ان حملوں کی وجہ سے نیز سلطان مسعود سلجوقی کی تاخت و تاراج اور نورالدین کے حملوں سے جوسلین کو اور بھی زیادہ ضعف پہنچا۔ ۱۱۵۰ء میں جوسلین کو گرفتار کر کے حلب میں قید کر دیا گیا اور مسعود نے کیسوم بہسنی اور رعبان کے قلعے فتح کر لیے لیکن تل باشر وہ اب بھی فتح نہ کر سکا۔ اس کے واپس ہو جانے کے بعد شاہ یروشلم نے تل باشر میں بزنطینی سپاہیوں کی فوجیں متعین کیں لیکن دوبارہ فرنگیوں کی حکومت قائم نہ کر سکا۔ دلوک کا قلعہ مسخر ہو جانے کے بعد ۵۴۶ھ / ۱۱۵۱ء میں تل باشر کی قلعہ گیر فوج نے مجبوراً قلعے کی چابیاں نورالدین کے حوالے کر دیں۔

نورالدین نے تل باشر کا قلعہ حسان کے حوالے کر دیا جس نے اس کے دفاعی مورچوں

Marfat.com

کو مضبوط کر کے اس میں کئی برسوں تک کا سامان رسد جمع کیا۔ ۱۱۷۶ء میں یہاں کے امراء نے صلاح الدین ایوبی کی اطاعت قبول کر لی۔ ۵۷۹ھ/۱۱۸۳ء میں صلاح الدین ایوبی نے تل باشر کے قلعے کا دفاع عماد الدین زنگی کے مقابلے میں نہایت کامیابی سے کیا۔ ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء میں الملک الظاہر نے تل باشر کو فتح کیا۔ ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں شاہ روم کیکاؤس نے یہ قلعہ فتح کیا۔ اسی سال الملک الاشرف نے اس قلعے کو سلطان سلجوق سے دوبارہ چھین لیا اور حلب کے نوجوان شہزادے شہاب الدین طغرل کے حوالے کر دیا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں العزیز والی حلب نے تل باشر کا قلعہ فتح کیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کیا۔

۶۳۸ھ/۱۲۴۱ء میں خوارزمیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ۶۴۶ھ/۱۲۴۹ء میں حلب کے والی الملک الناصر نے حمص کے خلاف ایک فوج بھیجی الملک الاشرف نے مجبوراً حمص شہر کے بدلے تل باشر اسے دے دیا۔

اس شہر میں کئی تجارتی منڈیاں تھیں اور ایک بستی ربض تھی آج کل غالباً تل باشر مزرعہ سی وہی قدیم ربض ہے۔ زمانہ قدیم میں اس کے اردگرد سرسبز و شاداب باغات بھی تھے

تلبیس کسی چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے کو تلبیس کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔ "اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ" (۲:۴۲) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: اور البتہ ہم ان پر مشتبہ کر دیں گے جو کچھ وہ حق کو باطل سے ملاتے ہیں۔ بقول علی ہجویری "یہ صفت اللہ تعالے کے سوا کسی اور کے لئے محال ہے کیونکہ وہ کافر کو مومن کی صفت میں ظاہر کرتا ہے اور مومن کو کافر کی صفت میں۔" جب ایک گروہ میں سے کوئی آدمی اچھی خصلتوں کو بری صفات سے پوشیدہ کرتا ہے تو اس کے اس عمل کو تلبیس کہتے ہیں۔

تَلبیہ لبیک کا کلمہ ادا کرنا جس کے معنی ہیں "میں تیری اطاعت پر مقیم ہوں۔" میں حاضر ہوں۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ کلمات ہیں جو احرام باندھنے کے بعد رمی جمار تک باآواز بلند بار بار کہنا ہوتے ہیں۔ یہ کلمات مندرجہ ذیل ہیں۔

لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ

"حاضر ہوں میں اے اللہ، حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ ہر قسم کی تعریف اور نعمت تیرے ہی لئے ہے اور بادشاہی بھی۔ تیرا کوئی شریک نہیں"

تلبیہ کی اس سے مختصر صورتیں بھی ہیں۔ مثلاً

لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ وغیرہ۔

تِلِمسان "چشموں کا شہر" الجزائر کا ایک شہر جو معمولی سی ڈھلوانی سطح مرتفع پر واقع ہے جو اس میدان سے یک دم بلند ہو جاتی ہے۔

قدیم شہر موجودہ شہر سے چند سو گز کے فاصلے پر اس کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ یہ قدیم شہر تلمسن اور آغادیر (اگادیر) دو ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔

تلمسان کو الجدار یا مدینۃ الجدار کا نام بھی دیا گیا ہے۔ عربوں کی روایت کی رو سے قرآن مجید کے مطابق حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات کا مقام یہیں پر تھا۔ تلمسان کے اور نام بھی ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ پوماریا (باغہائے میوہ) یہ اس چھوٹے سے شہر کا نام تھا جس کا ذکر بعض لاطینی کتبوں میں ملتا ہے۔

۲۔ تغرات یا تاگرارت۔ یہ نام اسے گیارہویں صدی میلادی میں فاتح مرابطین نے دیا تھا۔ جنہوں نے موجودہ تلمسان اور اس کی شاندار جامع مسجد کی بنیاد ڈالی تھی۔ انہوں نے اس کی بنیاد اس وقت ڈالی تھی جب وہ پرانے تلمسان کا محاصرہ کر رہے تھے۔

۳۔ منصورہ یا المحلۃ المنصورہ۔ (فتح مند یا فتح مندی والی لشکرگاہ) اس شہر کا رقبہ ۲۵۰ ایکڑ تھا۔ اسے فاس کے سلاطین نے تیرہویں صدی میں تلمسان کے محاصرے کے وقت ایک میل مغرب کی سمت بنایا تھا۔ انہوں نے ایک جامع مسجد ایک محل اور ایک فصیل دار قلعہ اس شہر میں بنوایا تھا۔ تلمسان ان تین شہروں سے جو یکے بعد دیگرے تعمیر ہوئے بنا۔ اگادیر مشرق میں تاگرارت وسط میں اور منصورہ مغرب میں تھا۔ موجودہ تلمسان شہر وسطی شہر ہے۔ دوسرے دونوں شہروں کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔

تلمسان میں اسلام کب پھیلا تاریخی طور پر یہ بات واضح طور پر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ آٹھویں صدی عیسوی کی بربری ریاست کے سردار ابو قرہ کے بارے میں بھی زیادہ مفصل حالات نہیں ملتے۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس امیر نے متعدد بار خوارج زناتہ کے سردار کی حیثیت سے مشرق کی جانب یلغاریں کیں اور افریقیہ تک جا پہنچا تھا

تلمسان میں اہل سنت والجماعت کا مذہب آٹھویں صدی میں اچھی طرح رائج ہو چکا تھا۔ ۷۹۰ء میں ادریس اول نے یہاں ایک عالیشان مسجد بنوائی تھی۔ اس وقت سے تلمسان اگادیر صوبائی حکومت کا مرکز بن گیا۔

موجودہ تلمسان جس کی بنیاد گیارہویں صدی عیسوی میں یوسف بن تاشفین نے رکھی تھی، بڑی ترقی کی۔ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں الموحدین نے اس کے گرد ایک فصیل بنوائی۔ مرابطین کے زمانے میں یہ شہر علم کلام اور فقہ کے درس و تدریس کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اس دور میں اس نے بڑے بڑے علماء اور فقہا پیدا کئے۔ شہر پر قبضہ کرنے کے تیس سال بعد الموحدین نے جامع مسجد کے ایک حصے کی زیب و زینت کو مکمل کیا۔ ساتویں صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں جب الموحدین کی سلطنت کمزور ہو گئی تو بنو عبد الواد نے مغرب وسطیٰ میں اپنی خود مختار ریاست قائم کی۔ اور تلمسان کو اپنا پایہ تخت بنا لیا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری/تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں تلمسان کے ہمسایہ حکمرانوں نے تلمسان پر متواتر حملے کئے اگرچہ یہ حملے بعض اوقات کامیاب بھی رہے لیکن شاہی خاندان نے اتنا وقت نکال ہی لیا تھا کہ انہوں نے چند یادگار عمارتیں تعمیر کر سکیں۔ بنو عبد الواد نے علوم و فنون کو خوب ترقی دی۔ اور طلباء کے لئے مدرسے قائم کئے۔ ان بادشاہوں کو تلمسان کی تجارتی اہمیت کا پورا احساس تھا چنانچہ انہوں نے اپنی بندرگاہ ھنین کے ذریعے ہسپانیہ کے ساتھ بھی ہمیشہ تعلق قائم رکھا۔

اس دور میں تلمسان نہ صرف ایک بڑا تجارتی مرکز اور گرد و نواح کے علاقے کی پیداوار کے لئے بڑی بھاری منڈی تھا بلکہ صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ ترقی کر گیا تھا۔ یہاں کی بنی ہوئی اشیاء کی مانگ عام تھی۔

نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی میں جب عربوں نے سپین سے ہجرت کی تو ان کی اکثریت تلمسان ہی میں آکر آباد ہوئی۔ ان کی وجہ سے زندگی کے مختلف شعبوں میں نئی سرگرمی پیدا ہو گئی۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں بنو عبد الواد کے آخری بادشاہوں نے وہران میں ہسپانیوں کی بادشاہی تسلیم کر لی۔ لیکن ۱۵۵۵ء میں الجزائر کے پاشا صالح رئیس نے ترکوں کے نام پر تلمسان پر قبضہ کر لیا۔

ترکوں کے قبضے کے بعد تلمسان کی تجارت اور خوشحالی آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ اب اسکے عروج و زوال کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ترک تین سو سال تک اس

Marfat.com

شہر پر قابض رہے لیکن اس سارے عرصے میں یہاں کوئی نئی عمارت تعمیر نہ ہوئی بلکہ متعدد عمارتیں اور محل گر کر کھنڈر بن گئے۔ ۱۸۳۰ء میں تلمسان نے ترکوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ترک اپنے پیچھے ایک اہم نسلی ورثہ قول اوغلی چھوڑ گئے۔ یعنی ترکوں کی اولاد جو مقامی عورتوں سے ہوئی۔ قول اوغلی ابھی تک موجود ہیں اور تلمسان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں۔

۱۸۳۰ء میں اہل تلمسان نے ترکوں سے چھٹکارہ پا کر سلطان مراکش کی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۸۳۶ء میں فرانسیسی پہلے پہل تلمسان میں داخل ہوئے لیکن ۱۸۳۷ء میں ایک عہدنامے کی رو سے وہ یہاں کا قبضہ امیر عبدالقادر کے نائب کے حوالے کر کے یہاں سے چلے گئے۔ ۳۱ جنوری ۱۸۴۲ء کو عہدنامے کی خلاف ورزی ہونے پر بوگو تلمسان آیا اور شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے آج تک تلمسان میں خوشحالی کا دور دورہ ہے جسے مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی نے تباہ کر رکھا تھا۔

۱۸۵۴ء میں تلمسان کو ایک خود مختار بلدیہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۵۸ء میں اسے ایک اقلیم عام کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ ایک قضا اور فوجی چھاونی کا صدر مقام تھا۔ یہاں ایک پیادہ پلٹن اور ایک رسالہ تعینات تھا۔ یہاں کئی مدرسے، بینک اور زمینداروں کو قرض دینے کے دفاتر موجود ہیں۔

اسلامی فن کی یادگار زمانہ عمارتیں جن کی وجہ سے تلمسان زینت کاری کے بہترین اندلسی المغربی دور کا عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دل فریب اور زیبائش میں اہم درجہ رکھتی ہیں۔

اس کے آثار قدیمہ میں تاگرارت اور منصورہ کی فصیلیں، اولیا اللہ کے مقابر، جامع مسجد اور اس کا مینار، مسجد اولاد الامام، خاندان عبدالواد کے پہلے حکمران کا بنوایا ہوا محل، مسجد و خانقاہ سیدی ابراہیم، مساجد سیدی سنوسی اور سیدی البنا، مسجد سیدی ابومدین جو ابوالحسن مرینی نے تعمیر کرائی تھی قابل دید ہیں۔

اہل تلمسان فنون صغری مثلاً بافندگی، چمڑے پر سبزی اور روپہلی گل دوزی، تانبے، اون، لکڑی اور دھاتوں کی چیزوں کی آرائش میں اب بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ساز اور زین پوشوں کی زیبائش میں جو سرکاری تقاریب میں استعمال ہوتی ہیں، خاص طور پر بڑا کمال دکھاتے ہیں۔

تلمسان کے باشندوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ عربی زبان غالباً ادریسی عہد میں اختیار کی تھی۔ یہ لوگ شروع سے اولیاء پرستی اور ٹونے ٹوٹکے کے معتقد ہیں۔ یہاں کی آبادی میں یہودی بھی ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں جو رسم و رواج میں مسلمانوں کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ ان یہودیوں کی زبان بھی ایک قسم کی عربی ہی ہے۔ جس پر مراکشی بولی کا بہت زیادہ اثر ہے۔

تلمسان کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بربروں کا ایک قدیم شہر تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ تیسری صدی ہجری میں یہاں پر عربی زبان بولی جانے لگی۔ یہاں کے باشندے مالکی المذہب کے پیروکار ہیں۔ قرون وسطیٰ میں اس کی حیثیت صوبائی صدر مقام کی تھی۔ بعد میں ایک مسلمان بربری شاہی خاندان کا پایۂ تخت رہا۔ ترکوں کی آمد سے ثقافتی لحاظ سے تو اس پر کوئی خاص اثر نہ پڑا اگرچہ نسلی اعتبار سے ایک خاص نسل قول اوغلی نے جنم لیا۔ مسلمان آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں دوسرے نمبر پر یہودی اور تیسرے نمبر پر فرانسیسی اور دوسرے یورپی باشندے آتے ہیں۔

تلمسانی، عفیف الدین سلیمان

(۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء — ۵ رجب ۶۹۰ھ/۴ جولائی ۱۲۹۱ء) ابن علی بن عبداللہ ابن علی ایک صوفی اور عالم جو کوفی الاصل خاندان سے تھا۔ بقول ذہبی کوفی الاصل۔ تلمسان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر ہی میں شام آ گئے تھے۔ جہاں وہ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بعد ازاں روم چلے گئے اور صدرالدین القونوی کی شاگردی اختیار کی۔ یہیں پر چالیس چالیس دن کی چالیس صوفیانہ خلوتیں مکمل کیں۔ عفیف الدین ایک متورع خوش اخلاق اور باوقار انسان تھے لیکن ان کی ذات ہمیشہ مشتبہ رہی۔ بقول ذہبی کوئی شیخ صحیح طور پر ان کے اعتقادات معلوم نہ کر سکا کہ ان کے اعتقادات کی حقیقت کیا تھی۔ ان پر نصیری العقیدہ ہونے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ ابن الفوطی نے اپنی کتاب "مجمع الآداب" میں انہیں علمائے عارفین میں شمار کیا ہے۔ عفیف الدین ایک خوش صحبت انسان تھے۔ ان کا دعوے تھا کہ انہیں عرفان حاصل ہے اور اس امر کا اظہار انہوں نے بستر مرگ پر کیا تھا۔ انہوں نے موت کے وقت یہ الفاظ کہے تھے "جسے معرفت الہیٰ حاصل ہے وہ اللہ سے کیونکر خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ مجھے یہ معرفت حاصل ہے اس لئے مجھے اس سے خوف نہیں بلکہ خوش ہوں اس کی خدمت میں شرف حضوری حاصل ہو گا۔

ان کا انتقال دمشق میں ہوا اور شہر کے صوفیوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

انہوں نے مختلف علوم پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں رسالہ فی علم العروض، دیوان، مقامات، شرح المواقف للنفری، کتاب المواقف، شرح قصیدہ النفسیہ لابن سینا، شرح اسماء الحسنیٰ، شرح فصوص الحکم مشہور ہیں۔

تلمسانی ابواسحٰق

(محرم رجب ۶۰۹ھ/نومبر ۱۲۱۲ء — ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء) ابراہیم بن ابی بکر بن عبداللہ انصاری ایک عالم دین اور مالکی فقیہہ۔ تلمسان میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ غرناطہ چلے گئے۔ تین سال بعد غرناطہ سے مالقہ چلے گئے۔ یہیں پر انہوں نے اکثر علوم کی تحصیل کی۔ بعد میں مالقہ سے سبتہ چلے گئے۔ یہاں پر انہوں نے شادی کی اور اسی شہر میں وفات پائی۔

وہ عالم، فاضل شخصیت کے مالک تھے۔ فقہ میں خاص درک رکھتے تھے۔ امام مالک کے مقلد تھے۔ اور مالکی فقہا میں خاص مقام حاصل تھا۔ اکیس سال کی عمر میں انہوں نے احکام وراثت پر ایک رسالہ لکھا تھا جس کی کئی ایک شرحیں کی گئیں۔ ان کی دوسری تصانیف میں نتیجہ الخبر و مزلیتہ الغیر فی نظم المغازی و السیر (آنحضورؐ کی منظوم سیرت)، مقالہ فی العروض، منظومہ المولد الکریم، العشرات وغیرہ ہیں۔

تلمود۔ یہودیوں کی ایک مقدس کتاب (دیکھئے "تالمود")

تمجید بزرگی بیان کرنا۔ خدا کی بزرگی کی تعریف کرنا۔ کلمہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ پڑھنا۔

احادیث میں اس کلمے کی بہت فضیلت آئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "کیا میں تمہیں وہ کلمہ جو زیر عرش جنت کے خزانے سے نازل فرمایا گیا ہے بتا دوں؟ وہ یہ ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ جب آدمی یہ پڑھتا ہے تو خداوند عالم فرماتا ہے۔ "میرا یہ بندہ میرا مطیع ہو گیا" (مشکوٰۃ المصابیح)

Marfat.com

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔
"لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہنے سے ننانوے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ ترین بیماری سنج و غم ہے۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے مجھے حکم دیا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد زیادہ سے زیادہ رکھا کرو۔ اس لئے کہ یہ جنت کے خزانوں کی ایک کنجی ہے۔ بقول مکحولؒ جو شخص یہ پڑھے گا اس کے واسطے نقصان کے ستر دروازے بند کر دیئے جائیں گے جن میں سب سے کم درجہ رکھنے والا دروازہ مفلسی ہے۔

تمدن:۔ شہریت، طرز معاشرت۔ (دیکھئے "تہذیب")

تمکن تصوف کی اصطلاح میں تمکین سے مراد محققین کا محل کمال اور درجہ اعلیٰ میں اقامت کرنا ہے۔ پس اہل مقامات کا مقامات سے گذرنا ممکن ہے لیکن تمکین کے درجے سے گذرنا محال ہے۔ کیونکہ مقام مبتدیوں کا درجہ ہے۔ اور تمکین منتہی لوگوں کی جائے قرار ہے۔ گویا مقامات رستے کی منزلیں ہیں اور تمکین درگاہِ حق میں قرار پانا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں شاعر لوگ اپنے ممدوح کی مدح عمل سے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی شاعر کسی ممدوح کی درگاہ میں پہنچ جاتا تو تلوار سونت لیتا اور گھوڑے کے پاؤں اڑا دیتا اور تلوار توڑ دیتا۔ اس کی مراد اس فعل سے یہ ہوتی تھی کہ مجھے سواری کے جانور کی اس لئے ضرورت تھی کہ اپنے حاسدوں کو جو مجھے آپ کی خدمت سے منع کرتے تھے اپنے سے ہٹا رکھوں۔ اب میں جناب کی خدمت میں پہنچ گیا ہوں اور سارے مقامات طے کر لئے ہیں تو اب سامان سفر کی ضرورت ہے۔ اس شاعر کا یہ عمل مقامات سے گذر کر تمکین اختیار کر لینا ہوتا تھا۔

اللہ تعالےٰ نے موسیٰؑ کو بھی یہی حکم دیا تھا جب آپ منزلوں کو طے کر کے اور مقامات سے گذر کر تمکین کے محل میں پہنچے تو حق تعالےٰ نے ان سے فرمایا اپنے دونوں نعلین اتار دو اور اپنی لاٹھی پھینک دو کیونکہ وہ مسافت طے کرنے کا آلہ ہے اور وصل کی درگاہ میں مسافت طے کرنے کے سامان کی پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس محبت کی ابتداء حق کو طلب کرنا اور انتہا حق کے ساتھ آرام پانا ہے۔ بقول حضرت علی ہجویریؒ صاحب تمکین یا متمکن وہ شخص ہے جو متردد نہ ہو اور اپنا سارا سامان راہ الٰہی میں لے گیا ہو اور غیر کا خیال دل سے نکال دیا ہو۔ نہ کوئی ایسا معاملہ گذرے کہ اس کے ظاہر کو بدل دے اور نہ کوئی ایسا حال ہو کہ اس کے باطن کو تبدیل کر دے جیسا کہ حضرت عیسیٰ متغیر تھے۔ حق تعالےٰ نے ایک نظر سے طور پر جلوہ ڈالا تو آپ کے ہوش اڑ گئے اور ہمارے نبی کریمؐ متمکن تھے کہ مکہ معظمہ سے قاب قوسین تک عین تجلی الٰہی میں گئے لیکن آپؐ کا حال متغیر نہ ہوا۔ یہ درجہ نہایت اونچا تھا۔

تمگروت وادی درعہ کا سب سے بڑا شہر جو مراکش کے جنوب میں واقع ہے اس شہر کے مکان لال مٹی سے بنے ہوئے ہیں جن کے گرد کھجور اور دوسرے پھلدار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ ہیں۔ وادی درعہ کے بائیں کنارے آباد ہے۔ شہر کے گرد ایک فصیل ہے جو زیادہ بلند نہیں ہے۔ اس فصیل میں چار دروازے ہیں جو چاروں سمتوں میں واقع ہیں۔

اس شہر کی اہمیت شیخ محمد ابن ناصر کی شخصیت کی وجہ سے ہے۔ اس کی بنیاد ۹۸۳ھ/ ء میں مرابطون خاندان کے ایک فرد ابوحفص عمر بن احمد انصاری نے ڈالی تھی۔ جس کا تعلق زاویہ سیدالناس سے تھا۔ یہاں پر دو اشخاص سیدی عبداللہ بن حسین اور سیدی احمد بن ابراہیم کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی تھی کہ صوفی ارادت مند محمد ابن ناصر بھی یہیں ان کے قدموں میں آکر آباد ہو گئے اور سیدی احمد بن ابراہیم کی وفات کے بعد شیخ الزاویہ بنے۔ آپ نے اپنا سلسلہ طریقت جاری کیا۔ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا اور اس کے بعد اس کا بیٹا موروثی طور پر تمگروت کے شیخ ہوتے چلے آئے۔ ان سب شیوخ کے مزار ایک مقبرے میں ہیں جو ۱۸۹۹ء کی آتش زدگی کے بعد دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

تمیم بن معز رجب ۴۲۲ھ/جولائی ۱۰۳۱ء - ۵۰۱ھ/۱۱۰۸ء) بلوزیری کے صنہاجہ خاندان کا پانچواں بادشاہ۔ قیروان کے قریب صبرہ (المنصورہ) میں پیدا ہوا۔ ۴۴۵ھ/۱۰۵۴ء میں ۲۳ سال کی عمر میں المہدیہ کا والی بنا۔ ۴۴۹ھ/۱۰۵۷ء میں اس کے والد المعز نے دارالسلطنت قیروان کو اس کی حفاظت نہ کر سکنے کی وجہ سے خیرباد کہہ دیا اور تمیم کے پاس پناہ گزین ہوا۔ المعز کی وفات کے بعد ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء میں تمیم کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے افریقہ کے ان تمام شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جنہیں سابقہ والیوں اور امراء نے خود مختار ریاستوں میں تبدیل کر لیا تھا۔ تمیم کو بنو حماد سے بھی لڑنا پڑا جو اس کے رشتہ دار ہی تھے لیکن تمیم نے المہدیہ کے خلاف بنو حماد کے حکمران الناصر بن حماد کی کوششوں کو بھی ناکام بنا دیا لیکن اس کی توجہ زیادہ تر ساحلی شہروں کی طرف رہی اور اس نے کچھ عارضی نوعیت کی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ سوسہ پر اس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

۱۰۸۴ء میں عربوں نے المہدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ تمیم کے بری مقبوضات اس کے قبضے سے نکلے جا رہے تھے اس نے اپنے والد کے نقش قدم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہ کوشش کی کہ نارمن صقلیہ پر قبضہ نہ کر سکیں، لیکن جب وہ اس میں ناکام ہوا تو بحری غارتگری کو زیادہ تیز کر دیا۔ اس کا ردعمل عیسائیوں میں یہ ہوا کہ اہل جنوہ اور اہل پیزا نے اتحاد کر کے ۶ اگست ۱۰۸۷ء کو المہدیہ پر قبضہ کر لیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا۔ ۴۹۸ھ/۱۱۰۴ء میں نارمن نے اس پر ایک اور حملہ کیا، جو ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کے چار سال بعد تمیم نے وفات پائی۔

تمیم بنو ایک عرب قبیلہ۔ اس کا نسب نامہ کچھ اس طرح ہے۔ تمیم بن مُرّ بن اُدّ بن طابخة بن الیاس بن مُضر۔ اس لحاظ سے اس قبیلے کا شمار مضری قبائل میں ہوتا ہے۔

اس خاندان کے بارے میں ابتدائی معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ بنو تمیم کا ذکر تاریخ میں پہلی بار چھٹی صدی میں آتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عظیم قبیلہ تھا جو عرب کے مشرقی ساحل پر ایک بڑے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ نجد کے تمام علاقے، بحرین کے ایک حصے اور یمامہ کے ایک حصے میں یہ لوگ آباد تھے۔

بنو تمیم چونکہ بدوی تھے، اس لئے انہوں نے کبھی شہر نہیں بسائے۔ ہجر، الاحساء اور الجرعا جیسے شہروں میں یہ لوگ میلوں اور منڈیوں کے موقعوں پر اکثر جایا کرتے تھے بعض روایات کے مطابق انہوں نے ان مقامات کو فتح بھی کیا تھا لیکن زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ یہ لوگ ان شہروں کی آبادی کو تنگ کرتے رہتے کبھی ان سے صلح کر لیتے اور کبھی جنگ چھیڑ دیتے۔ اور کبھی شہریوں کو فدیہ وصول کرنے کے لئے پکڑ کر لے جاتے بنو تمیم لات، منات اور عزیٰ کی پرستش کرتے تھے۔ علاقے کی وسعت کے

Marfat.com

لحاظ سے یہ لوگ زمانہ قدیم ہی سے بہت سے گروہوں اور شاخوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان میں ہر گروہ اپنی جگہ خود مختار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قبیلے کے مختلف گروہوں میں کبھی اتحاد قائم نہ ہو سکا۔

اس قبیلے کے بڑے بڑے گروہ اور بطون مندرجہ ذیل ہیں۔

زید مناۃ، عمرو، سعد، مالک، منقر، عطارد، حنظلہ، دارم، یربوع، ریاح، کلیب، نہشل، مجاشع وغیرہ۔

بنو تمیم میں بڑے بڑے مشہور و معروف شاعر گذرے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے تمیم اور ان کے ہمسایوں بکر بن وائل کی مسلسل رقابت رہی اور دوسری طرف شاہان ایران سے ان کے تعلقات۔ شاہان ایران نے بنو بکر اور بنو تغلب کو اپنے زیر اثر لانے کے بعد بنو تمیم پر بھی اپنا سکہ جمانا چاہا۔ کیونکہ تمیم کی موجودگی سے عرب کے مشرقی ساحل اور یمن کے ساتھ ایرانیوں کے بری راستے ہمیشہ خطرے میں رہتے تھے۔

آنحضورؐ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے آس پاس کے قبیلوں پر غلبہ حاصل کر لیا اور وسطی عرب پر بھی مدینے کی اسلامی حکومت کا رعب اور دبدبہ بیٹھ گیا تو بنو تمیم نے بھی مسلمانوں کے ساتھ اتحاد قائم رکھنے ہی میں فائدہ سمجھا۔ چنانچہ ۸ھ میں انہوں نے ایک وفد آنحضورؐ کی خدمت میں بھیجا اور باہمی دوستی کا معاہدہ طے کیا۔ لیکن اس وقت اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ کے انتقال کے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے والوں میں انہوں نے سب سے پہلے سبقت کی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے شدید حملوں کے باعث انہوں نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں اسلامی فتوحات کے دوران میں انہوں نے اپنے سپاہیانہ جوہر خوب دکھائے۔ اس کے بعد تمیمی مجاہدین کا ایک بڑا حصہ ایران کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ پہلے کوفے اور بصرے کے دو بڑے فوجی مقامات میں آباد ہوئے۔ اور بعد ازاں خراسان کا رخ کیا۔ یہاں پر عباسیوں کے دور حکومت میں عرب آبادی میں اکثریت انہی کی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ بدستور اپنی جنگجویانہ روح کی نمائش کرتے رہے۔ انہوں نے بنو امیہ کے دور کی تمام باغیانہ تحریکوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

بنو تمیم نے خوارج کی حیثیت سے کافی مستعدی دکھائی۔ اس تحریک کے آغاز کے غالی خارجی یہی لوگ تھے۔ ازارقہ کا سردار قطری بن الفجاء اور اس کے اکثر سرکار تمیمی ہی تھے۔ عباسیوں کی تحریک میں بھی یہ لوگ پیش پیش رہے اور آخر میں افریقہ میں خاندان بنو اغلب کی بنیاد ڈالنے والا ابراہیم بن اغلب بنو تمیم ہی سے تھا

تمیم داری رضؓ ابو رقیہ تمیم الداریؓ ایک صحابی، قبیلہ لخم بن عدی کی شاخ الدار بن ھانی بن حبیب بن غارۃ بن لخم سے تھے۔ آپ کا قبیلہ یمن سے نکل فلسطین میں آباد ہو گیا تھا۔ آپ کی ایک نسبت الدیری بھی ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ ۹ ہجری میں اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک دیر میں راہب تھے۔

آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔

"تمیم بن اوس بن خارجہ بن سود بن جزیمہ بن فداع بن عدی بن الدار"۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی آپ مذہبی زندگی بسر کرتے تھے۔ فلسطین میں آپ راہب اور عابد کی حیثیت سے رہے تھے۔ بعض نے آپ کو یہود اور نصاریٰ کے علماء میں شمار کیا ہے۔

۹ ہجری میں غزوہ تبوک سے پہلے آپ شام سے مدینے آئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے قبیلے کے اور بھی کئی افراد تھے۔ سب نے اکٹھے اسلام قبول کیا اور عہد نبوت میں مدینے ہی میں مقیم رہے۔ بقول ابن ہشام اس وفد کی تعداد دس تھی ان کے متعلق آنحضورؐ نے خیبر کی زمین کی وصیت فرمائی تھی۔ بقول ابن اسحاق آپ نے آنحضورؐ کے ساتھ غزوہ تبوک میں شرکت کی تھی کیونکہ قبول اسلام کے بعد یہی ایک غزوہ تھا جو رجب ۹ ہجری کو پیش آیا تھا۔

آپ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک مدینے ہی میں سکونت پذیر رہے ۳۵ھ کے بعد شام میں آ بسے۔ بقول صاحب "تہذیب" آپ بیت المقدس میں قیام پذیر ہوئے۔ اور صاحب "اسد الغابہ" کے نزدیک بیت المقدس کے قریب عینون نامی گاؤں میں آ کر آباد ہو گئے۔ جو آنحضورؐ نے آپ کو جاگیر میں عطا کیا تھا۔

آپ کی زندگی مدینے اور شام میں زاہدانہ اور عابدانہ طریق سے گذری۔ مدینے میں آنحضورؐ کی وصیت کے مطابق خیبر سے گذر بسر کے لئے کچھ مل جاتا تھا۔ شام پہنچ جانے کے بعد قریہ عینون کی آمدنی سے گذر بسر کرتے رہے۔ سارا وقت عبادت میں صرف کرتے۔ کبھی کبھی وعظ بھی کہتے تھے۔ آپ تہجد کثرت سے پڑھتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی رکعت میں سارا قرآن ختم کر دیتے۔

آپ اسلام میں پہلے قاص (واعظ) تھے۔ اس کے لئے آپ نے حضرت عمرؓ سے اجازت لے لی تھی۔

آپ نے مسجد نبوی میں قندیل لٹکا کر زیتون کے تیل کا چراغ جلایا۔ چنانچہ اس کے بعد قندیلوں کا عام رواج ہو گیا، جو آگے چل کر جھاڑ اور فانوس کی صورت اختیار کر گیا۔

مذہبی عالم ہونے اور اپنے ذوق علمی کے سبب اسلام کے اہل علم میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ سے بہت سی روایات مروی ہیں۔ آپ سے روایت کرنے والے صحابہ میں ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، انس بن مالکؓ، زرارۃؓ بن اوفیٰ، تابعین میں سے عبداللہ بن موہب، سلیم بن عامر، شرجیل بن مسلم قبیصہ بن ذویب، عطا بن یزید لیثی، روح بن زنباع، شہر ابن حوشب، عبدالرحمن بن غنم وغیرہ اہم ہیں۔

ان مرویات میں ایک روایت آنحضورؐ نے آپ سے نقل فرمائی ہے اور یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے۔ دجال کے بارے میں اس روایت سے علماء حدیث نے چند اصول وضع کئے ہیں۔

آپ کی بصیرت اور علم کی وسعت پر اس واقعے سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ جب آپ آنحضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے آنحضورؐ سے درخواست کی کہ حبرون الخلیل کو انہیں اور ان کی اولاد کو جاگیر کے طور پر عطا فرمایا جائے۔ آنحضورؐ نے آپ کی درخواست منظور کر لی اور اس عطیئے کی دستاویز لکھ دی حالانکہ فلسطین اس وقت تک بزنطینیوں کے قبضے میں تھا۔

آپ کی تاریخ وفات بعض کے اقوال کے مطابق ۴۰ھ ہے جو قبر پر لکھی ہوئی ملی ہے۔

آپ کی وفات بیت جبرین میں ہوئی جو فلسطین کا ایک شہر ہے۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام رقیہ تھا۔ اسی لئے آپ کی کنیت ابو رقیہ تھی۔ آپ کا شمار ان صحابہ میں تھا جو زہد و تقوے عبادت و ریاضت میں ضرب المثل تھے۔ آپ کی نماز تہجد مشکل ہی سے قضا ہوتی، تہجد میں بسا اوقات ایک آیت اتنی بار دہراتے کہ پوری رات ختم ہو جاتی۔

ریاکاری سے حد درجہ پرہیز رکھتے تھے۔ اپنی عبادت لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے

Marfat.com

دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ آپ رات میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں آپ اس سوال پر بہت ناراض ہوتے اور فرمایا کہ ایک رکعت نماز جسے میں رات کی تنہائی میں پڑھوں، مجھے اس بات سے زیادہ محبوب ہے کہ میں رات بھر نماز پڑھوں اور صبح کو سب سے بتاتا پھروں۔

تمیم داری خوش پوش، خوش وضع اور خوش صورت آدمی تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ آپ کو خیر اہل المدینہ (مدینہ کے سب سے اچھے اور نیک آدمی) فرمایا کرتے تھے۔

تمیمی، عبدالواحد (و۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) بغداد کے ایک صوفی بزرگ۔ کنیت ابوالفضل تھی والد کا نام عبدالعزیز بن حرث بن اسد تھا۔ عرب کے مشہور و معروف قبیلے بنو تمیم سے تھے۔

پہلے شیخ خراسان شیخ ابوالقاسم سے اکتساب فیض کیا۔ بعد ازاں شیخ ابوبکر شبلی سے منسلک ہو گئے۔ اور سرفراز خلافت ہو کر شبلی کی مسند ارشاد کی زینت بنے۔

آپ کا سلسلہ جنیدیہ تھا۔ آپ نے شریعت و طریقت کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بے شمار خلقت نے آپ کی وجہ سے راہ ہدایت پائی۔ آپ نے حرمین الشریفین کے کئی سفر کئے اور بیشتر بلاد عرب و عجم کی سیاحت کی۔ عمر کا زیادہ حصہ بغداد میں بسر کیا۔ عہد عباسی میں وفات پائی۔ قبر امام احمد بن حنبل کے مقبرہ میں واقع ہے۔

تناسخ اواگون۔ جون بدلنا۔ بقول مولانا اشرف علی تھانوی ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف نفس ناطقہ کا انتقال۔

ہندوستان میں اس اعتقاد کے لوگ عام ہیں۔ بقول البیرونی "جس طرح شہادت بہ کلمۂ اخلاص مسلمانوں کے ایمان کا شعار ہے۔ تثلیث علامت نصرانیت ہے اور سبت منانا علامت یہودیت اسی طرح تناسخ ہندو مذہب کی نمایاں علامت ہے"۔

البیرونی تناسخ کے بارے میں حکمائے ہند کی یہ رائے بھی لکھتا ہے۔

"ایک ہی زندگی کی مدت نفس کے لیے اتنی کم ہے کہ وہ اس میں ان کثیر چیزوں کا جن پر دنیا مشتمل ہے احاطہ نہیں کر سکتا۔"

بقول شہرستانی۔ "تناسخ سے مراد وہ عقیدہ ہے جس کی رُو سے دنیا کے پے در پے ادوار حیات اور یکے بعد دیگرے نئے وجود اختیار کرنا مانا جاتا ہے۔"

ہندومت تناسخ کا قائل ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک موجود زندگی میں انسان جس قسم کے اعمال کا مرتکب ہوتا ہے اسی کے مطابق اگلا جنم لے گا۔ موجودہ زندگی کی مصیبتیں اور راحتیں سب کی سب گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ان ہی اعمال کے نتیجے کے طور پر انسان ادنیٰ یا اعلیٰ ذات میں حیوانات اور نباتات کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ عمدہ اعمال کی وجہ سے انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اگر اعمال انتہائی خراب ہوں تو پھر اسے جہنم میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اس دنیا میں بار بار پیدا ہوتا رہتا ہے اس چکر کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کو کرم کے چکر سے آزاد کرے۔ اور یہ چیز برہما کے ساتھ اتحاد کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

عقیدۂ تناسخ روح کے ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہونے کے معنی میں متعدد شیعی فرقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

نصیریوں کا عقیدہ ہے کہ ان کی ملت کا گنہگار آدمی یہودی، سنی مسلمان یا عیسائی کی شکل میں اس دنیا میں واپس آئے گا اور وہ منکر جو حضرت علیؓ کو نہیں مانتے، گدھے، خچر، اونٹ، کتے اور اسی قسم کے دوسرے جانور بن جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تناسخ کے سات درجے ہیں۔

اسماعیلی یہ بات نہیں مانتے تھے کہ روح جانوروں کے اجسام میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ عقیدہ ضرور رکھتے ہیں کہ عالم حیات و ممات میں زندگی متعاقب اور پے بہ پے ہوتی ہے جن میں روحیں محو عمل رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں معرفت امام حاصل ہو اس کے بعد یہ روحیں عالم نور میں پہنچ جاتی ہیں۔

بقول شہرستانی معتزلہ میں سے احمد بن حائط کے مریدوں کی تعلیم یہ تھی کہ اوّل اوّل خدا نے ہر قسم کی مخلوق پیدا کر کے ایک قسم کو اس دنیا سے الگ کسی اور دنیا میں رکھا اس کے بعد جس کسی نے کچھ نافرمانی کی اسے اس کے گناہوں کے مطابق انسان یا جانوروں کی شکل میں اس دنیا میں بھیجا۔ اس کے بعد وہ ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کے گناہوں کے اثرات زائل ہو جائیں۔

تناسخ کا عقیدہ ہندومت اور مسلمانوں کے علاوہ بدھ مت، قدیم یونانیوں اور دنیا کے دیگر مذاہب و اقوام کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اسلام کی صحیح تعلیمات اس عقیدے کی مخالف ہیں اور واضح طور پر اس کی تردید کرتی ہیں۔ (نیز دیکھئے "روح" و مضامین متعلقہ مذاہب)

تناوتی اباضی فرقے کے بہت سے روحانی شیوخ کا اسم نسبتی۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں ان شیوخ میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے۔

۱۔ ابویعقوب یوسف بن محمد تناوتی ان کا بعد کی روایات میں بھی اکثر ذکر ملتا ہے۔ آپ کے بیٹے اسماعیل اور پوتے ابویعقوب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ نہایت متقی و پرہیزگار اور صاحب کرامات تھے۔

۲۔ ابوعمار عبدالکافی تناوتی۔ آپ ایک امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے تیونس میں تعلیم حاصل کی۔ حصول علم خاص طور پر فقہ اللغت عربی کی تحصیل کا بے حد شوق تھا۔ تعلیم میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ والدین روپے کے ساتھ جو خطوط بھیجتے تھے آپ انہیں بھی پڑھنے کی فرصت نہ پاتے تھے۔ جب تعلیم سے فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو ان خطوط کو کھولا جن میں سے ایک میں والد کے انتقال کی خبر تھی اور دوسرے میں والدہ کے انتقال کی۔

علم دین میں آپ کے استاد ابوزکریا یحییٰ بن ابی بکر تھے۔

آپ کی تصانیف میں "الموجز فی تحصیل السؤال"۔ "شرح الجہالات" — "سیرۃ" وغیرہ ہیں۔

۳۔ عمرو بن الموتناوتی۔ کچھ عرصہ جزیرہ جربہ میں مقیم رہے۔ یہ پہلے شخص تھے جن کو عرب حملہ آوروں نے وارجلہ میں قتل کیا۔ یہ بھی مذکورہ بالا حضرات کی طرح اصحاب تقویٰ میں سے تھے۔

تنزانیہ مشرقی افریقہ کا ایک ملک جو ٹانگانیکا اور زنجبار کے باہمی ادغام سے ۱۹۶۴ء میں متحدہ جمہوریہ تنزانیہ کے نام سے عمل میں آیا اس

Marfat.com

کا کل رقبہ ۳۶۲۸۲۰ مربع میل اور آبادی ۱۴۰۰۰۰۰۰ ہے ڈوڈوما تنزانیہ کا دارالحکومت ہے۔ ۱۰۰ ق۔م میں تنزانیہ کے ساتھ ہندوستان اور عرب ممالک کی ساحلی تجارت زوروں پر تھی۔ پہلی صدی عیسوی میں یونانی تاجروں نے بھی اس کے ساتھ تجارت شروع کی۔

۱۴۹۸ء میں دنیا کا مشہور سیاح واسکوڈے گاما کی سیاحت کے بعد پرتگالیوں نے عربوں کو اس ملک سے نکال باہر کیا۔ اور خود قابض ہو گئے لیکن تعداد کی کمی کے باعث وہ سلطنت کا انتظام چلانے میں ناکام رہے۔ چنانچہ جلد ہی عربوں کی حکومت دوبارہ بحال ہو گئی۔ ۱۸۵۶ء میں سید سعید والیٔ تنزانیہ کے انتقال کے بعد تنزانیہ کو تقسیم کر دیا گیا اور زنجبار ایک علیحدہ سلطنت کی حیثیت سے تنزانیہ سے علیحدہ ہو گیا۔

تقسیم کے بعد تنزانیہ میں جرمنوں کا اثر و نفوذ اس قدر تیزی سے بڑھا کہ ۱۸۸۴ء میں ڈاکٹر کارل پیٹرز نے یہاں کے سرداروں سے تھوڑے ہی عرصے میں بہت سے معاہدے کر لیے۔ ۱۸۸۵ء میں حاصل کردہ علاقے کو جرمنی کا زیر تحفظ علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں سلطان نے زنجبار اور پمبہ کا علاقہ برطانیہ کے حوالے کر دیا۔

جنگ عظیم اوّل کے دوران میں برطانوی اور بلجیمی فوجوں نے جرمنوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ اور ۱۹۱۹ء میں معاہدہ ورسیلز عمل میں آیا جس کی رُو سے ٹانگانیکا برطانیہ کا انتدابی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ٹانگانیکا میں پہلی لیجسلیٹو کونسل قائم کی گئی ۱۳ دسمبر ۱۹۴۶ء میں اس علاقے کو اقوام متحدہ کے تولیتی علاقے میں تبدیل کر دیا گیا۔

پہلے انتخابات کے بعد یہاں پر وزارتی نظام قائم کیا گیا۔ اگست ۱۹۶۰ء میں دوسرے عام انتخابات میں جولیس نائیریرے یہاں کا وزیر اعلیٰ منتخب ہوا۔ یکم مئی ۱۹۶۱ء کو نائیریرے کو یہاں کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو اسے مکمل خود اختیاری حاصل ہو گئی اور اسی تاریخ کو ٹانگانیکا بھی آزاد ہو گیا۔ ۱۸ جنوری ۱۹۶۱ء کو زنجبار میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اسے شدید آئینی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اسے خود مختار سلطنت قرار دیا گیا۔ لیکن ایک ماہ کے اندر ہی نئی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور ملک کو عوامی جمہوریہ زنجبار قرار دے دیا گیا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۶۴ء کو زنجبار اور ٹانگانیکا کو باہم مدغم کر کے ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو نئی حکومت کا نام تنزانیہ رکھ دیا گیا۔ اور ۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو یہاں ایک پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہاں کی زرعی پیداوار میں لونگ، کپاس، کافی، گنا اور لکڑی ہے۔ معدنیات میں ہیرے، سونا، ٹین وغیرہ ہیں۔ کوہ کلمنجارو کی چوٹی یہاں کا بلند ترین مقام ہے۔ ۱۹۳۴۰ فٹ بلند ہے۔ آبادی کا مذہب اسلام ہے۔ یہاں کی بولیوں میں سواحلی اور انگریزی ملک کی سرکاری زبانیں ہیں۔ زنجبار میں سواحلی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی، انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

تنزانیہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کا رکن ہے۔

تنزیل

تنزیل:۔ وحی کا اترنا۔ دیکھیے "وحی"

تنس

تنس (TENES) الجزائر کے ساحل پر ایک شہر جو وادی شلف میں الجزائر سے ۱۲۵ میل دور واقع ہے۔ یہ شہر ایک پتھریلی سطح مرتفع پر تعمیر ہوا ہے موجودہ شہر اسی جگہ پر آباد ہے جہاں کارتنا کا قدیم شہر اور فنیقیہ اور قرطاجنہ والوں کی بنائی کوٹھی واقع تھی جو رومیوں کے زمانے میں رومی نو آبادی بنا دی گئی۔ پہلے ونڈالوں نے اسے تباہ کیا پھر عربوں نے تاخت و تاراج کیا۔ اور نتیجۃً کارتنا بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔

تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں سپین کے مہم جو افراد نے یہاں آ کر سمندر سے دو میل کے فاصلے پر ایک نیا شہر بسایا۔ یہی شہر موجودہ تنس ہے۔

بقول البکری یہ شہر ہسپانوی ملاحوں نے ۲۶۲ھ/۸۷۵ء میں بسایا تھا۔ جو سردیوں کے موسم میں اس بندرگاہ سے گذرا کرتے تھے۔ بعد میں نو ابراہیم کے بربر بھی یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ اور ان مہاجروں کی سادہ سی بستی نے ایک شہر کی صورت اختیار کر لی۔ اس شہر کے گرد دیواریں تھیں اور اس کے اندر ایک مسجد بھی تھی۔ اس کے آثار اب تک تنس قدیمہ میں موجود ہیں۔ فصیل کا ایک حصہ ابھی تک باقی ہے۔ مسجد بھی موجود ہے۔

بقول ادریسی یہاں پر ایک علوی الاصل خاندان حکمران تھا۔ جس نے اندلس کے امویوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اموی حکمران ایسے آدمیوں کو جن کے متعلق انہیں شکایت ہوتی تھی، جلاوطن کر کے یہاں بھیج دیا کرتے تھے۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی میلادی کے بعد کئی خاندان یکے بعد دیگرے یہاں پر حکمران رہے۔ ان خاندانوں میں فاطمیہ، صنہاجہ، معزاوہ، المرابطون اور الموحدون مشہور ہیں۔ الموحدون کی سلطنت کے خاتمے کے بعد یہ علاقہ تلمسان کے بنو زیان کے قبضے میں آ گیا۔ پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ علاقہ ایک خود مختار ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ جس پر پہلے تو شاہی خاندان کے افراد اور پھر مقامی شیوخ حکمرانی کرتے رہے۔ آخری شیخ ہسپانیہ کا باجگزار بن گیا۔ ۱۵۱۷ء میں ترکی امیر البحر عروج باربروسا نے اسے فتح کیا اور چند سال بعد خیر الدین باربروسا نے یہاں ترکی اقتدار قائم کر دیا۔ اور اس میں ایک قائد اور کچھ قلعہ گیر فوج متعین کر دی۔ اس وقت سے اس شہر کی خوشحالی کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ اٹھارویں صدی میں غلّے کی تجارت، جو یورپ کے ساتھ سولہویں اور سترہویں صدی میں جاری تھی بالکل بند ہو گئی۔ مقامی لوگوں نے شہر کو کئی بار لوٹا۔ اور ترکوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔

۱۸۳۰ء کے بعد تنس کچھ مدت کے لیے خود مختار رہا۔ بعد میں عبد القادر نے اس شہر کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ اور یہاں کی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ۱۸۴۳ء میں یہاں کے لوگوں نے فرانسیسیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ بوگرو نے یہاں فوراً مکانات بنوانے شروع کر دیے۔ ان تعمیرات سے موجودہ شہر کی ابتدا ہوئی ۱۹۲۹ء سے پہلے ایک ریلوے لائن بنائی گئی جو شہر کو وادیٔ شلف سے ملاتی ہے اس سے بندرگاہ کی تجارت پر اچھا اثر پڑا ہے۔ یورپی آبادی جنوب کی طرف دو میل کے فاصلے پر مقامی باشندوں کا ایک گاؤں ہے جس کی آبادی بارہ سو کے قریب ہے اسے تنس القدیمہ کہتے ہیں۔ یہ بھی سطح مرتفع پر واقع ہے۔

شہر تنس اپنے اندرونی انتظامی معاملات میں بالکل خود مختار ہے۔ یہاں کی آبادی دس ہزار کے قریب ہے۔ یہ ایک مخلوط ناحیے کا صدر مقام بھی ہے۔ جس کی کل آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

تنظیمات

تنظیمات وہ اصلاحات جو مملکت عثمانیہ کی حکومت اور جمہوری ادارے کے سلسلے میں سلطان عبد المجید کے عہد حکومت میں جاری ہوئیں۔ تنظیمات خیریہ کی ترکیب پہلے پہل سلطان محمود ثانی کے دور حکومت کے آخری برسوں میں ملتی ہے دور تنظیمات کا خاتمہ ۱۸۸۰ء میں سمجھا جاتا ہے۔ جب عبد الحمید ثانی کا دور حکومت شروع ہوتا ہے تنظیمات نے ان اصلاحات کو جاری رکھا جنہیں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے اس غرض سے شروع کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کو جو اندرونی اور بیرونی لحاظ

Marfat.com

سے کمزور ہو چکی تھی بچایا جا سکے۔ محمود ثانی اندرون ملک میں نظام جاگیرداری کو منسوخ کرنے اور ینی چری فوج کے رجعی عنصر کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح داخلی معاملات میں اس نے اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا۔ لیکن وہ مصر اور یونان کے چھن جانے کو نہ روک سکا۔ تنظیمات کا کارنامہ اس کے جانشینوں اور سرکاری عہدیداروں کے حصے میں آیا۔

۱۸۳۹ء سے لے کر کریمیا کی جنگ کے خاتمے تک اصلاحات کی روحِ رواں مصطفیٰ پاشا تھا، جو چھ مرتبہ وزیرِ اعظم بنا۔ اصلاحات کے دوسرے دور میں جس کا آغاز فروری ۱۸۵۶ء میں ہوا، مصلحین کی سرگرمیوں کی رہبری علی پاشا اور فواد پاشا نے کی تیسرے دور کی شخصیت مدحت پاشا تھی۔

سلطان عبدالمجید نے اپنے والد سلطان محمود ثانی کی تیار کردہ سکیم کے مطابق نفاذ اصلاحات سے متعلق ان کے تیار کردہ فرمان کا اعلان کیا۔ جسے "خطِ شریف گلخانہ" کا نام دیا گیا۔ یہ فرمان اپنی نوعیت کے اعتبار سے دولتِ عثمانیہ کا اہم دستور خیال کیا جاتا ہے۔ اس فرمان میں سلطان نے اس بات کا اعلان کیا۔

"یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے ابتدائی دور میں قرآن عزیز کے احکام اور سلطنت کے قوانین کا احترام ہمیشہ کیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کی طاقت عظمت میں ترقی ہوتی گئی اور بلا استثناء اس کے تمام باشندوں میں بہت زیادہ خوشحالی اور فارغ البالی پھیل گئی۔

• ڈیڑھ سو سال سے پیہم حادثوں اور مختلف وجوہ کی بناء پر شریعت نبویؐ اور قوانین سلطنت پر عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ طاقت اور فارغ البالی کمزوری اور افلاس سے بدل گئی ہے۔ کیونکہ جو حکومت اپنے قوانین کی پابندی ترک کر دیتی ہے اس کا سارا استحکام بھی کافور ہو جاتا ہے۔"

"ہم شروع ہی سے ان معاملات پر غور کر رہے ہیں اور سریر آرائی کے دن سے آج تک بہبودِ عامہ صوبوں کی اصلاح اور قومی بار کی تخفیف ہماری توجہ کا مرکز ہے۔ اگر ہم عثمانی صوبوں کے جغرافیائی حالات، زمین کی زرخیزی، باشندوں کی موزونیٔ طبع اور ذکاوتِ فہم کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں یقین آ جائے گا کہ مؤثر طریقوں کی دریافت اور استعمال پُر امید ہے۔ خدا کی مدد سے خاطر خواہ نتیجہ چند ہی سال میں حاصل ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نصرت اور آنحضورؐ کی دعا پر پورا اعتماد کر کے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ جدید قوانین کے ذریعے سے دولتِ عثمانیہ کے صوبوں میں عمدہ نظم و نسق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ قوانین بالخصوص مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوں گے:۔

۱۔ رعایا کی جان، آبرو اور مال کے کامل تحفظ کی ضمانت۔

۲۔ محاصل کے وصول کرنے کا ایک باقاعدہ نظام۔

۳ فوج کی بھرتی اور اس کی مدت ملازمت کے تعین کے لئے بھی ایسا ہی باقاعدہ نظام۔

محاصل کی تشخیص کا انتظام نہایت ضروری ہے کیونکہ سلطنت کو اپنے علاقوں کی حفاظت کرنے میں مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں اور فوجوں نیز دوسری ملازمتوں کے لئے رقم کی ضرورت رہتی ہے جس کے حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رعایا پر چندے لگائے جائیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آئندہ ملتِ عثمانیہ کے ہر فرد پر اس کے حسبِ حیثیت محصول لگایا جائے۔ اور اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے۔ اور چونکہ پہلے نظام کے تحت صوبے کا ملکی اور مالی انتظام کسی ایک شخص ہی کو مطلق العنانی کے سپرد کر دیا جاتا تھا جو بعض اوقات نہایت سخت گیر اور حریص ثابت ہوتا تھا کیونکہ حاکم اگر نیک نہ ہو تو اپنے فائدے کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ اب وہ نظام ختم کیا جاتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ برّی اور بحری فوجوں کے مصارف کا تعین خاص قوانین کے ذریعے کر دیا جائے۔ اگرچہ ملک کی حفاظت کا خیال ہم سب پر مقدم ہے اور تمام باشندوں کا فرض ہے کہ اس مقصد کے لئے سپاہی فراہم کریں پھر بھی ضروری ہے کہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے فوجی دستوں کے لئے قوانین مقرر کر دیئے جائیں۔ نیز فوجی سپاہیوں کی مدت ملازمت کم کر کے چار یا پانچ سال کر دی جائے کیونکہ ضلع کی آبادی کا لحاظ کئے بغیر کسی ضلع سے زیادہ اور کسی سے کم سپاہیوں کا بھرتی کرنا بے انصافی کے علاوہ ملک کی زراعت اور صنعت و حرفت کو بھی ایک مہلک صدمہ پہنچاتا ہے۔ اسی طرح سپاہیوں کو عمر بھر فوجی خدمت میں رکھنے کے لئے ان کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی بھی کم ہونے لگتی ہے۔

غرض ان مختلف قوانین کے بغیر جن کی ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے سلطنت میں نہ قوت رہ سکتی ہے نہ دولت نہ خوشحالی نہ امن بخلاف اس کے ان جدید قوانین کی موجودگی سے یہ تمام باتیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

• ۔ آئندہ ہر ملزم کے مقدمے کی سماعت اعلانیہ شرعی قانون کے مطابق ہوا کرے گی اور جب تک باضابطہ فیصلہ نہ سنا دیا جائے، کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے کو خفیہ طور پر یا اعلانیہ زہر دے کر یا کسی اور طریقے سے مار ڈالے۔

• ۔ کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ دوسرے کی آبرو پر حملہ کرے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

• ۔ ہر شخص اپنے ہر قسم کے مال و متاع پر قابض رہے گا اور پوری آزادی سے اسے فروخت یا منتقل کر سکے گا کسی کو اس میں مزاحمت کا حق نہ ہوگا مثلاً کسی مجرم کے بیگناہ وارث اپنے قانونی حقوق سے محروم نہیں کئے جائیں گے اور نہ اس مجرم کا مال و متاع ضبط کیا جائے گا۔

• ۔ یہ مراعات ساری رعایا کے لئے بلا لحاظ مذہب و فرقہ پوری قوم کے لئے یکساں طور پر جاری ہوں گی۔

• ۔ جیسا کہ ہماری مقدس شریعت کا تقاضا ہے، سلطنت کے تمام باشندوں کو ان کی جان، آبرو اور مال کی نسبت ہماری طرف سے کامل ضمانت عطا کی جاتی ہے۔•

ان تنظیمات سے چونکہ قدیم دساتیر کی مکمل تجدید ہوتی تھی اور وہ بالکل بدل جاتے تھے اس لئے ان تنظیمات کا نفاذ بڑی پُر آشوب فضا میں ہوا۔ کوئی وزیرِ اعظم شاذ و نادر ہی کسی منصوبے کو مکمل طور پر امن کے ساتھ نباہ سکتا تھا۔ وزارت اچانک معزول ہو جاتی تھی۔ پھر اچانک ہی بحال بھی ہو جاتی تھی۔ باوجودیکہ سلطان عبدالمجید ان اصلاحات کی طرف نسبتاً زیادہ مائل تھا۔ رشید پاشا ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۸ء تک کے درمیانی عرصے میں کم از کم چھ مرتبہ وزیرِ اعظم بنا۔ ایسے وقت بھی آئے جب غیر ملکی دخل اندازی کی وجہ سے اچانک نئی جدوجہد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ صورت حال بالخصوص پیرس کی صلح کانفرنس سے پہلے کے مذاکرات کے وقت پیدا ہوئی۔ ترکیہ کے حلیف اس وقت سلطان کو بین الاقوامی قرارداد کے ذریعے پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان اصلاحات کا فوری نفاذ کرے جو ابھی تک معرضِ التوا میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ "خطِ ہمایوں" (۱۸۵۶ء) کی شکل میں نکلا۔ ۲۱ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطان عبدالمجید نے بابِ عالی کے دوسرے اہم دستور (تنظیمات) کا اعلان کیا جو مندرجہ ذیل ہے۔

"تمام رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت" "خطِ شریف گلخانہ" میں دی گئی ہے اس کی توثیق کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق رعایا کے مراتب و مذاہب

Marfat.com

میں کسی قسم کا امتیاز جائز نہ ہوگا۔

ان تمام حقوق و مراعات کی جو نصاریٰ اور سلطنت کے دوسرے فرقوں کو دیئے گئے ہیں، از سر نو توثیق کی جاتی ہے۔ ان حقوق و مراعات پر بے توقف نظر ثانی کرکے زمانے اور سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق انہیں ترقی دی جائے گی۔ اور اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی۔ جو مندرجہ بالا اصلاحات پر بحث کرکے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی۔ سلطان محمد فاتح اور اس کے جانشینوں نے جو حقوق بطریق کو عطا کئے تھے، ان میں اس جدید حق کا اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب عمر بھر کے لئے ہوا کرے گا۔

نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کے بطریقوں، اسقفوں اور مذہبی عہدہ داروں کو باب عالی کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق وفاداری کا حلف لینا پڑے گا۔

وہ تمام محصول اور چندے جو مختلف فرقوں کے پادری اپنی جماعتوں سے وصول کیا کرتے تھے ممنوع قرار دیئے جاتے ہیں۔ مقررہ تنخواہیں بطریقوں، اسقفوں اور تمام چھوٹے بڑے مذہبی عہدہ داروں کو ان کے مراتب اور خدمات کے لحاظ سے دی جائیں گی۔ پادریوں کی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔

موجودہ کلیساؤں، مدرسوں، ہسپتالوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت ہے لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی اور بطریق یا اس فرقے کا مذہبی پیشوا اسے منظور کرے گا تو ہر جدید تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا۔ اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوگی تو سلطان نقشہ ملاحظہ کرکے تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔

ہر فرقے کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

وہ تمام القابات و امتیازات جن سے رعایا کے بعض طبقے اعلیٰ اور بعض ادنیٰ شمار ہوتے ہیں، ہمیشہ کے لئے شاہی دفتر سے خارج کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح عہدہ داروں اور عام لوگوں کو بھی دل آزار اور اہانت آمیز کلمات کے استعمال سے سختی سے روکا جاتا ہے۔

چونکہ تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے اس لئے کوئی شخص اپنے مذہب کی وجہ سے ستایا نہ جائے گا۔ اور نہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائیگا

ملکی اور فوجی عہدے ساری رعایا کے لئے یکساں طور پر ہوں گے۔ تقرر صرف قواعد و ضوابط کے مطابق اور قابلیت کی بنا پر ہوگا۔

ہر فرقے کو علوم و فنون کے مدارس قائم کرنے کی اجازت ہے۔ البتہ نصاب تعلیم اور اساتذہ کا انتخاب ایک مخلوط مجلس کے زیر نگرانی ہوگا جو باب عالی کی طرف سے مقرر کی جائے گی۔

وہ تمام مقدمات جن کا تعلق تجارت یا فوجداری سے ہوگا اور جن میں فریقین مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے ہوں گے مخلوط عدالتوں میں پیش کئے جائیں گے اور ان کا اجلاس بر سر عام ہوا کرے گا۔

قید خانوں اور حوالاتوں کی اصلاح کی جائے گی اور معمولی جرائم کے مجرموں کے لئے نئے ضابطے مرتب کئے جائیں گے۔

چونکہ محصولوں کے عائد کرنے میں مساوات برتی جائے گی اس لئے انصاف تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقے کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں۔ انہیں فوجی خدمات کے معاوضے میں نقد رقم پیش کرنے کی اجازت بھی حاصل رہے گی۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کو بھی فوج میں بھرتی کرنے کے ضوابط مرتب کرکے جلد شائع کر دیئے جائیں گے۔

صوبوں کی مجلس میں اصلاح کی جائے گی تاکہ انتخابات بہتر طریق پر ہو سکیں اور باشندوں کی آزادانہ صحیح رائے معلوم ہو سکے۔

باب عالی مالی ساکھ قائم کرنے میں حتی الوسع پوری کوشش کرے گا اور جن چیزوں سے اس ساکھ کو تقویت ہوتی ہے مثلاً بنک وغیرہ انہیں فروغ دے گا۔ اور ان کے لئے ضروری سرمایہ فراہم کرے گا۔

ان کے علاوہ سلطان عبدالمجید نے تعلیم کے شعبے میں بھی اصلاحات نافذ کیں۔

فوجی اصلاحات کے سلسلے میں فوج کے دو حصے کر دیئے گئے۔ ۱۔ نظام۔ ۲۔ ردیف۔ پہلی فوج میدان کارزار میں رہتی تھی اور دوسری حرب گاہ کی مقررہ میعاد ختم کرنے کے بعد آئندہ ضروریات کے لئے تیار رکھی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا تنظیمات کے جاری کردہ اہم قوانین سن وار ذیل میں دیئے جاتے ہیں

۱۸۳۹ء کے فوراً بعد رشید پاشا نے فرانسیسی طرز پر صوبوں کے نظم و نسق کا ایک نیا طریق جاری کیا۔

۳۔ نومبر ۱۸۳۹ء خط شریعت گلخانہ۔

۸۔ مارچ ۱۸۴۰ء مجلس احکام عدلیہ کی ترتیب جدید۔

۱۸۴۰ء اجرائے مجموعہ قوانین تعزیرات

۱۸۴۰ء تخلیق عدالت تجارت (تجارت مجلسی)

۶۔ ستمبر ۱۸۴۳ء مختلف مقامات سے فوج بھرتی کرنے کا قانون

۱۸۴۵ء دارالخلافہ میں مجمع مندوبین ولایات۔

۱۸۴۵ء قیام یونیورسٹی و دیگر معاہد برائے تعلیم ثانوی۔

۱۸۴۶ء۔ نشر ضابطہ اداری۔

۱۸۴۷ء دیوانی اور فوجداری مخلوط عدالتوں کا قیام۔

۱۸۴۷ء نظارت معارف عمومیہ۔

۲۴۔ مئی ۱۸۵۰ء فرمان بحق مسلمانان۔

۲۸۔ جولائی ۱۸۵۰ء ضابطہ تجارت کا نفاذ۔

۲۸۔ نومبر ۱۸۵۲ء فرمان ادارہ ولایات۔

۱۸۵۴ء مجلس کبیر کی دو حصوں میں تقسیم۔

۱۔ مجلس اصلاحات۔ ۲۔ مجلس عالی احکام عدلیہ۔

۷۔ مئی ۱۸۵۵ء غیر مسلم رعایا سے وصولی خراج کی موقوفی اور انہیں فوج میں بھرتی کرنے کا فیصلہ

۱۸۔ فروری ۱۸۵۶ء خط ہمایوں کا اجراء۔

۳۰۔ مارچ ۱۸۵۶ء عہد نامہ صلح پیرس۔

۱۸۵۶ء عثمانی بنک کی تاسیس۔

۲۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء قانون اراضی کا نفاذ۔

۹۔ اگست ۱۸۵۸ء ضابطہ تعزیرات کا نفاذ۔

۳۰۔ اپریل ۱۸۶۰ء ملحق قانون تجارت ان عدالت ہائے تجارتی کی تنظیم کے متعلق جنہیں غیر مخلوط عدالتوں میں ضم کر دیا گیا۔

۲۴۔ مئی ۱۸۶۰ء قواعد و ضوابط متعلقہ جماعت ارمنیان گریگوری۔

۱۸۶۱ء دونوں مجالس عالیہ کو ایک کرکے اس کے تین شعبے اداری، تشریعی اور مالی قائم کئے گئے۔

Marfat.com

یکم مئی ۱۸۶۱ء جدید ضوابط برائے لبنان۔

۱۴ر نومبر ۱۸۶۱ء آئین دادرسی تجارتی۔

۱۸۶۲ء۔ ضوابط اساسی برائے بطریرکیہ عمومی۔

۴ر فروری ۱۸۶۳ء امتیاز تاسیس امپیریل۔

۲۰ر اگست ۱۸۶۳ء۔ ضابطہ قانون تجارت بحریہ۔

یکم اپریل ۱۸۶۴ء ضوابط خصوصی برائے جماعت یہود۔

۶ر ستمبر ۱۸۶۴ء۔ قواعد اساسی برائے لبنان۔

۸ر نومبر ۱۸۶۴ء۔ قانون ولایات۔

۱۶ر جون ۱۸۶۷ء۔ قانون جس کی رُو سے غیر ملکیوں کو حصول ملکیت کا حق حاصل ہوا۔

۱۱ر اپریل ۱۸۶۸ء۔ قیام شورای دولت و دلیان احکام عدلیہ۔

۱۸۶۸ء۔ افتتاح مدرسہ ثانوی غلطہ سرای۔

یکم ستمبر ۱۸۶۸ء۔ عثمانی قومیت کا قانون۔

۱۹ر جنوری ۱۸۶۹ء۔ قانون اختیارات عدالت ہائے نظامیہ۔

۴ر اپریل ۱۸۶۹ء۔ مجلہ۔ احکام عدلیہ یعنی ضابطہ دیوانی کی تنقیح اس قانون کے سولہ حصے جو ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۶ء میں نافذ ہوئے۔

۱۸۶۹ء۔ فرمان تخلیق اسقفیہ بلغاریا۔

۲۲ر جنوری ۱۸۷۱ء۔ ادارہ ولایات کا قانون۔

۲۱ر جنوری ۱۸۷۴ء۔ اوقاف دینیہ کے غیر دینی کاموں میں استعمال کرنے کا قانون (اس پر کبھی عملدرآمد نہیں ہوا۔)

۱۸۷۵ء۔ فرمان برائے اصلاح محکمہ عدالت۔ عدالت ہائے تجارتی وزارت عدل کو منتقل ہوئیں۔

۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء۔ سلطنت عثمانیہ کے قانون اساسی کا نفاذ۔

۲۰ر مئی ۱۸۷۹ء۔ وزارت عدل و عبادات کا نظام اساسی۔

۱۸ر جون ۱۸۷۹ء۔ نظام عدالت ہائے نظامیہ۔

۱۸ر جون ۱۸۷۹ء۔ قانون اجرائے فیصلہ جات۔

۲۱ر جون ۱۸۷۹ء۔ ضابطہ دادرسی دیوانی۔

تنوخ قدیم مختلف قبائل کا مجموعہ جن کے شجرۂ نسب کے مشترک ہونے کی وجہ سے عموماً انہیں ایک ہی قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ قبائل عربوں کے خلاف باہم متحد تھے۔ ان میں وہ قبیلے شامل تھے جو تہامہ سے بحرین کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ یعنی یمنی قبائل ان میں بنو اشعر اور بنو ازد وغیرہ اہم ہیں۔

ایک اور فہرست میں معدیوں کا بھی ذکر ہے اور مالک بن زبیر کے ساتھ ساتھ مالک اور عمرو (ابنا) فہم بن تیم اللہ اور ان کے رہط اور الحیقار بن قنص اور ایاد بن نزار ابن معد کے تین بطون کا ذکر بھی آتا ہے۔ ان قبائل کا ذکر طبری اور ابن خلدون نے کیا ہے۔

بحرین میں یہ سب قبیلے جمع ہوئے اور دفاع اور حملہ کرنے میں باہم شریک ہونے کی شرط پر حلیف بنے۔ یہیں انہوں نے اپنا نام تنوخ رکھا۔ بقول طبری بنانة بن لخم کے قبائل بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ بعد ازاں ازدی بھی اسی اتحاد میں شریک کر لیے گئے۔

یہاں سے تنوخ عراق میں طوائف الملوکی کے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ عراق میں داخل ہونے لگے۔ سب سے پہلے الحیقار، قنص اور کچھ دیگر قبیلے اکٹھے ہو کر وہاں پہنچے۔ ان کا ارمانیوں سے مقابلہ ہوا جن کی زمینوں پر ان قبائل نے جنگ کر کے قبضہ کر لیا اور اس کے بعد عرب الانبار اور عرب الحیرہ کا جزو بن گئے ان کے بعد تیم اللہ اور ایاد اپنے حلیفوں کے ساتھ الانبار پہنچے پھر نمارہ بن قیس بن نمارہ قبائل کندہ اور دوسرے قبیلے الحیرہ میں آ گئے۔

بقول یاقوت تنوخ کی کثیر تعداد الانبار اور الحیرہ کے درمیان ایک ایسے علاقے پر آباد ہوئی جس کے مشرق میں دریائے دجلہ اور مغرب میں صحرا ہے انہیں عرب الضاحیہ کہا جاتا تھا اور یہ لوگ جھونپڑیوں اور بکریوں کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔

ان کا سب سے پہلا بادشاہ مالک بن فہم تھا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمرو اور اس کے بعد جذیمۃ الابرش اس کے جانشین ہوئے۔ جذیمہ کی سلطنت حیرہ انبار، بقہ، ہیت، عین التمر، غمیر اور قطقطانہ تک کا علاقہ شامل تھا۔

خزیمہ کے بعد عمرو بن عدی اس سلطنت کا مالک بنا اور اس طرح بادشاہت بنی لخم میں منتقل ہو گئی۔

ابوالفداء نے تنوخ کی ان جنگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو لخمیوں سے ہوئیں تنوخ میں عیسائیت کی تبلیغ کب کی گئی اس بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بقول پاٹرول اور رینیٹ ۵۵۹ء اور ۵۰۷ء کے درمیان احوذمہ نے ان میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔

اسلام کے ابتدائی فتوحات کے دوران میں تنوخ عام طور پر سرحد کے قبیلوں بہرا، کلب، سلیح اور غسان وغیرہ کے حلیف دکھائی دیتے ہیں جن کے کچھ افراد عیسائی تھے۔

خالد بن ولید ۱۲ھ میں عین التمر کی فتح کے بعد دومۃ الجندل کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں تنوخ کی کثیر تعداد اپنے سرداروں کی سربراہی میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے عیاض بن غنم پر پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ عربوں نے قلعے سے نکل کر مسلمانوں کی دو فوجوں پر حملہ کیا۔ لیکن ناکام رہے اور صرف چند افراد ہی واپس قلعے میں جا سکے۔ تھوڑے عرصے میں قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور بچوں اور عورتوں کے سوا تمام مردوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔

دریائے یرموک کی لڑائی کے بعد ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے حمص اور قنسرین کا رُخ کیا اور انہیں فتح کر لینے کے بعد گرد و نواح کی مستقل آبادی کو جسے حاضر قنسرین کا نام دیا جاتا تھا اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ تنوخی یہاں پر مستقل طور پر آباد تھے ان میں سے بعض تو مسلمان ہو گئے اور اکثر عیسائی ہی رہے۔ ابوعبیدہؓ نے تنوخ اور دوسرے قبائل سے معاہدہ کیا اور ان لوگوں پر جزیہ عائد کیا جو اسلام نہ لائے۔

۱۷ھ میں جب ہرقل نے شام کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے ایک بڑی مہم تیار کی تو اہل قنسرین و حلب بشمول تنوخ و سلیح بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ چونکہ اہل جزیرہ کے تنوخ نے رومیوں کو اہل حمص کے خلاف برانگیختہ کیا تھا حضرت عمرؓ نے ان کی تنبیہ کے لیے جند عراق کو الجزیرہ پر چڑھائی کے لیے بھیجا اور تنوخ اور ربیعہ کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ یہ کارروائی عیسائی عربوں کو پسپا کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کے فوراً بعد بزنطینیوں کو … جو تنوخ اور سلیح کو مشکل میں پھنسا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے زبردست شکست ہوئی بزنطینیوں کے بقیہ السیف کو جن کے ساتھ غسان، ایاد اور تنوخ کے افراد بھی شامل تھے اور

Marfat.com

ہرقل سے جا ملنے کی کوشش کر رہے تھے میسرہ بن مسروق نے آ لیا اور ان سب کا کام تمام کر دیا۔

اس دور میں تنوخ الحضر سے روانہ ہو کر بہت دور مغرب کی طرف جا آباد ہوئے تھے۔ بقول ہمدانی ان کے بائیں طرف اس علاقے میں جو بحیرہ روم تک پھیلتا چلا گیا ہے تنوخ آباد تھے۔ القصیص تنوخ کا فوجی گروہ ہے۔ ساحل سمندر پر اذقیہ کا شہر انہی کا شہر ہے۔

دوسرے عیسائی قبیلوں مثلاً تغلب کی طرح جنگ صفین کے موقع پر تنوخ بھی امیر معاویہؓ کے اور مرج راھط میں مروان کے طرفدار ہو کر لڑے تھے۔

خلیفہ المہدی نے ان تنوخیوں کو جو حلب کے گردو نواح میں خیمہ زن تھے مسلمان ہونے پر مجبور کیا اور ان کے نو تعمیر گرجے مسمار کرا دیئے۔

ہارون الرشید کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے فتنوں کے دوران میں باغیوں نے حلب کے قریب تنوخ کی آبادی پر حملہ کر دیا۔ دس روز تک لڑائی جاری رہی اور آخر کار تنوخی رات کے وقت خفیہ طور پر قنسرین کی طرف روانہ ہو گئے لیکن قنسرین پر بھی قبضہ نہ کر سکے۔ اور منتشر ہو کر تکریت، آرمینیا اور دوسرے مقامات کی طرف چلے گئے۔ بقول فواد حمزہ ملک شام میں تنوخ کی اولاد اب بھی باقی ہے۔

تواب گنہ گاروں کی توبہ قبول کرنے والا۔ اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام۔ تواب تائب کا مبالغہ ہے اور تائب توبہ سے ماخوذ ہے توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے تو گناہ سے رجوع کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو رحمت کے ساتھ رجوع کرنا۔ یعنی بندہ توبہ کرے تو خدا اپنی عادت کے مطابق پھر مہربانی کرنے لگتا ہے۔

قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ "اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲ : ۳۷)

"یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے۔" اس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲ : ۵۴)

"اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (۲ : ۱۲۸)

"البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں۔ ان کو میں معاف کر دوں گا۔ اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔" (۲ : ۱۶۰)

"اور وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" (۹ : ۱۰۴)

"اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا۔ تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں یقیناً وہ توبہ کرنیوالا اور رحیم ہے۔" (۹ : ۱۱۷، ۱۱۸)

"تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا) (۲۴ : ۱۰) (نیز دیکھئے "اسماء الحسنیٰ"، "توبہ")

توبہ رجوع کرنا۔ پلٹنا۔ لوٹنا۔ گناہوں سے پچھتا کر صدق دل سے خدا کی طرف مائل ہونا۔ بندے کی طرف سے توبہ کے یہ معانی ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آ گیا۔ طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو گیا پھر سے نظر عنایت اس کی طرف مائل ہو گئی۔

قرآن مجید میں توبہ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

"وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔" (۹ : ۱۰۴)

"اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی خرابی نہ ہوگی سو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان پر رجوع برحمت کیا۔" (۵ : ۷۱)

"اور (اے مومنو) سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔" (۲۴ : ۳۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے آگے خالص توبہ کرو امید ہے کہ تمہارا رب تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے اور تمہیں باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔" (۶۶ : ۸)

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات میں توبہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

توبہ مومنین کے لئے اپنے رب سے تقرب کا ذریعہ بنتی ہے اور ان کا شمار شہداء اور صدیقین میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جو بندہ جتنا اللہ کے زیادہ قریب ہوگا اسے اتنا ہی اپنی بے بضاعتی اور اللہ کے جلال و کمال کا احساس ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ انبیا اور اولیا توبہ و استغفار کثرت سے کرتے تھے۔ لازمی نہیں کہ توبہ و استغفار کسی گناہ کی بنا پر ہو بلکہ وہ اس کے ذریعے گناہ کے تصور سے اللہ کی طرف بھاگتے تھے اور اس طرح اپنے رب کے قریب تر ہو جاتے تھے۔

توبہ گناہ کو اس طرح سے زائل کر دیتی ہے گویا گناہ سرزد ہوا ہی نہیں۔

احادیث میں آتا ہے۔

"لوگو، اللہ کی درگاہ میں توبہ کرو، میں دن بھر میں سو بار خدا کی درگاہ میں توبہ کرتا ہوں (مشکوٰۃ)۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا:۔

"جب کوئی بندہ اللہ سے توبہ کرتا ہے تو وہ اپنے بندے کی توبہ سے اتنا خوش ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنی سواری پر ایک چٹیل میدان میں جا رہا ہو۔ پھر وہ سواری گم ہو جائے اور اس پر اس کا کھانا پینا بھی ہو اور وہ ناامید ہو کر ایک درخت کے پاس آئے اور اس کے سائے میں لیٹ گیا ہو پس وہ اسی مایوسی کی حالت میں خاموش اداس پڑا ہو کہ اچانک اس کی سواری اس کے پاس آ کھڑی ہو۔ اس نے اس کی رسی پکڑ لی ہو

Marfat.com

اور خوشی کی زیادتی کے سبب اس کے منہ سے یہ غلط الفاظ نکل گئے ہوں اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا پروردگار ہوں۔" (مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

" اللہ تعالےٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا رہتا ہے جب تک کہ (نزع سے) اس کا نرخرہ نہ بولنے لگے۔" (مشکوٰۃ)

توبہ اس ندامت اور پشیمانی کا نام ہے جو گناہ پر اس کے گناہ ہونے کے لحاظ سے حاصل ہو اور ساتھ اس بات کا بھی پختہ ارادہ ہو کہ آئندہ وہ کام نہ کیا جائے۔

توبہ کی ایک قسم توبۃ النصوح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

" توبۃ النصوح یہ ہے کہ انسان دل سے نادم ہو۔ زبان سے استغفار کرے جسم کو گناہ سے قطعاً روکے اور نیت کرے کہ آئندہ پھر اس گناہ کا ارتکاب نہ کروں گا۔ بعض کہتے ہیں کہ توبہ کے معنی ہیں گناہ سے باز رہنا۔"

معتزلہ نے توبہ کے قبول ہونے کو تین شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ایک بندوں کے حقوق کو ادا کرنا۔ دوسرے پھر وہ کام کبھی نہ کرنا۔ تیسرے ہمیشہ اور ہر وقت پشیمان رہنا۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک، ان میں سے کوئی بات توبہ کے قبول ہونے کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک توبہ کی یہ تین شرائط ہیں۔ اوّل فی الفور گناہ کو چھوڑ دینا دوسرے آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا۔ تیسرے اس کے مرتکب ہونے پر پچھتانا۔

بقول سری سقطیؒ " توبہ نام ہے گناہ کو یاد رکھنے کا۔"

امام ثوری فرماتے ہیں" توبہ کے معنی ہیں خدا کے سوا سب چیزوں سے قطع تعلق کر لینا۔"

بقول امام غزالیؒ توبہ ہر مومن پر "علی الفور" تادم مرگ واجب ہے۔ کیونکہ کوئی بشر معصیت سے خالی نہیں اور معاصی نفس ایمان کے لیے مہلکات ہیں۔

کیا توبہ کا قبول کرنا اللہ تعالےٰ پر لازم و واجب ہے؟

معتزلہ کے نزدیک توبہ قبول کرنا اللہ تعالےٰ پر واجب ہے۔ لیکن اہل سنت کا مسلک اس سے مختلف ہے۔ امام غزالی معتزلہ سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے خود توبہ کو گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنایا ہے لہٰذا جو شخص توبہ کی شرائط کو پورا کرے گا اس سے اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ یہ وجوب اللہ تعالےٰ پر خارج سے عائد کیا گیا ہے۔

بعض نے توبہ کی یہ تین قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ توبہ عوام۔ گناہوں سے رجوع کرنا اور دل میں پچھتانا۔

۲۔ توبہ خواص۔ اپنی نیکیوں کو حقیر سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ میری کوئی نیکی خدا کی بارگاہ میں پیش ہونے کے لائق نہیں۔ یہ خیال کر کے اپنی نیکیوں سے اس طرح عذر خواہی کرے جیسے گنہگار اپنے گناہوں سے عذر خواہی کرتا ہے۔

۳۔ توبہ خاص الخاص۔ مخلوقات سے قطع تعلق کر کے خدا کی طرف جھک جانا اور اس سے نفع و نقصان کی امید نہ رکھنا۔

امام غزالیؒ نے تائبین کو چار گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ بندہ توبہ کرے اور اس پر آخر عمر تک قائم رہے۔ جو تقصیر ہو گئی اس کی تلافی کرے۔ اور بعد میں اس کے دل میں ارتکاب معاصی کا خیال تک نہ آئے۔ (سوائے ان معمولی لغزشوں کے جو تقاضائے بشریت ہیں۔) ایسا بندہ سابق بالخیرات ہے۔ اور ایسی توبہ، توبۃ النصوح کہلاتی ہے۔

۲۔ تائب اوامر پر عمل کرے اور کبائر سے اجتناب کرے لیکن کیفیت یہ ہو کہ وہ ایسے گناہوں سے اپنے آپ کو نہ بچا سکتا ہو جو اس کے ماحول کے سبب سے اس پر بلا قصد وارد ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اسے احساس ہو اور اپنے نفس کو ملامت کرے اور نادم ہو۔ پھر تجدید عزم کرے کہ وہ ان اسباب سے جن کی وجہ سے اس سے یہ گناہ سرزد ہوا، اپنے آپ کو بچائے گا۔ عام تائبین اسی زمرے میں آتے ہیں اور تائب کا یہ بھی اعلیٰ مرتبہ ہے۔

۳۔ تائب توبہ کرے اور خاصی مدت تک اس پر قائم بھی رہے پھر بعض معاصی اسے مغلوب کر لیں لیکن اس کے باوجود وہ اعمال صالحہ پر قائم رہے اور ہر وقت امید کرتا ہے کہ وہ ان معاصی سے اجتناب کرے گا۔ وہ بار بار توبہ کرتا ہے اور نادم ہوتا ہے۔

۴۔ یہ کہ مرتکب معاصی توبہ کرے لیکن بعد میں پھر معاصی میں منہمک ہو جائے حتیٰ کہ اسے پھر توبہ کا خیال تک نہ آئے اور نہ اس کے دل میں افسوس اور ندامت پیدا ہو بلکہ وہ شہوات نفسانی کا بندہ بن جائے۔ اگر ایسے بندے کا انجام نیکی پر ہو تو وہ عذاب دوزخ سے آخر کار نجات پا سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی مغفرت بہت وسیع ہے۔

بقول قشیریؒ توبہ سالکین طریقت کی پہلی منزل اور طالبانِ حقیقت کا پہلا مقام ہے ان کے نزدیک توبہ کے تین مدارج یہ ہیں۔

جو بندہ عذاب سے ڈر کر توبہ کرے وہ صاحب توبہ ہے۔

جو حصولِ ثواب کے لئے توبہ کرے وہ صاحبِ انابت ہے۔

جو اللہ کی اطاعت اور پابندیٔ احکام کی خاطر توبہ کرے وہ اوّاب ہے۔ نیز وہ توبہ کو عام مومنین کی صفت قرار دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔

" عوام کی توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور خاص لوگوں کی توبہ غفلت سے ہوتی ہے۔"

ابوالحسن بوشنجہؒ فرماتے ہیں۔ جب تو گناہ کو یاد کرے اور اس کے یاد کرنے سے لذت نہ پائے، پس یہی توبہ ہے۔"

بقول ذوالنون مصریؒ توبہ دو قسم کی ہوتی ہے۔

ایک توبہ انابت یعنی رجوع کرنے کی وجہ سے اور دوسری توبہ استحیا یعنی شرم کی وجہ سے۔ پس خدا کی طرف رجوع کرنے کی توبہ یہ ہے کہ بندہ عذاب کے خوف سے خدا کی طرف رجوع کرے اور حیا کی وجہ سے توبہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالےٰ کے کرم سے حیا کر کے گناہ سے خدا کی طرف رجوع کرے۔

توبہ، سورۃ۔ قرآن مجید کی نویں سورۃ (دیکھیے "التوبہ، سورۃ")۔

توحید یکتائی، وحدت واحد ہونا۔ علم الکلام کی اصطلاح میں خدا تعالےٰ کی ذات کا ہر طرح کے شرک اور دوئی سے پاک ہونا۔ اسلام کے بنیادی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ یعنی اللہ تعالےٰ ایک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرقہ معتزلہ کے نزدیک محض توحید ہی بنیادی عقیدہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا کے واحد ہونے کا بیان کئی مقامات پر آیا ہے۔ لیکن لفظ توحید کہیں نہیں آیا مثلاً۔

" اور لوگو! تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس بڑے مہربان، رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔۔۔ (۲ : ۱۶۴)

علمائے دین اس امر پر متفق ہیں کہ توحید کے معنی اللہ کو ایک ماننا اور اس پر ایمان

Marfat.com

لاتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ابن خلدون کے نزدیک توحید کے بارے میں فقط ایمان یا تصدیق کافی نہیں بلکہ دل میں ایک ایسی کیفیت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ جس سے انسان بے اختیار اللہ کو ذات، صفات اور افعال میں یکتا مان لے۔

توحید کے دلائل

مختلف اسلامی فرقوں نے علم توحید کی طرح طرح کے دلائل سے توضیح کی ہے۔

پہلی دلیل تو یہ ہے کہ کسی بھی نظام کار کے لئے حاکمیت اعلیٰ کا واحد اور غیر منقسم ہونا ضروری ہے۔ کسی ایسی تنظیم کا تصور بھی محال ہے۔ جہاں دو یا دو سے زیادہ صاحب اقتدار ہوں۔ اگرچہ جمہوریت حکومت کا حق بہت سے لوگوں کو تفویض کر دیتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ مرگز نہیں ہوتا کہ عامل بھی بہت سے ہوں۔ یقیناً انہیں ایک نہ ایک عامل منتخب کرنا پڑتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں: "ایک اور اہم پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اور باہمی سازگاری ہے۔ اسی طرح کی موافقت جیسی کہ زوجین میں نظر آتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلف کا ہے زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت سب زوجین کا سا اختلاف اور سب اسی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔"

"توافق کا یہ پہلو صرف زوجین ہی میں نہیں بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لئے سرگرم ہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آ کر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں۔ زمین اس کے لئے گہوارہ مہیا کرے۔ ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے۔ سورج اس کو گرم رکھے۔ شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے۔ ہوائیں اس کو لوریاں دیں اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہولے تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ یہی حال دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔"

جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لئے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے۔ پھر آسمان سے پانی برستا ہے۔ اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لئے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں۔ وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں۔ بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی لاتا ہے۔ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے، جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر قوت، حکمت و رحمت نے ساتھ ایک خاص مقصد کے لئے تصرف میں لائے۔

قرآن مجید میں اسی توافق اور ہمہ گیری کے اصول کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے ان تمام مناظر قدرت کو جو بھی دیکھے گا وہ یہ کیسے باور کرے گا کہ یہ تمام یونہی اتفاقی طور پر وجود میں آ گئے؟ یا مختلف دیوتاؤں نے باہم صلاح مشورہ کے ساتھ انہیں پیدا کیا

قدیم مذاہب میں توحید

ابتدائی تصورات:۔ خدا کے متعلق انسان کا قدیم ترین تصور توحید ہی کا ہے۔ یعنی صرف ایک ان دیکھی قوت نے انسان اور ان تمام اشیاء کو پیدا کیا۔ جنہیں وہ چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔ انیسویں صدی کے اکثر مغربی علماء کا یہ خیال ہے کہ انسان کے دینی عقائد کی ابتدا شرک اور کثرت پرستی سے ہوئی۔ یہ تصورات قانون ارتقاء کی مختلف کڑیوں سے گذرتے رہے۔ اور بالآخر انہوں نے اپنی ترقی یافتہ صورت میں ایک ہستی اور خالق واحد کی نوعیت پیدا کر لی۔ عام خیال یہی ہے کہ شروع میں فطرت پرستی نے جنم لیا۔ اور پھر ہر فطری مذہب کے لئے علیحدہ علیحدہ دیوتا مقرر ہو گیا۔ اسی صدی میں اجداد پرستی کے نظریہ نے جنم لیا۔ جس سے انسان کے ابتدائی تصورات مذہب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی اور تقریباً تمام تر علماء اسی ارتقائے مذہب کے نظریے کے حامی رہے۔ وائنا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈبلیو شمٹ نے اس موضوع پر قلم فرسائی کی اور بتایا کہ شواہد کی رو سے سب سے پہلا مذہبی تصور جو ذہن انسانی کے افق پر طلوع ہوا توحیدی اعتقاد ہی تھا۔

قدیم تہذیبیں:۔ قدیم ترین تہذیبوں اور ثقافتوں میں ہمیں ہستی الٰہی کے واحد ہونے کا تصور ملتا ہے مثلاً قدیم آسٹریلیا کے باشندے "بادلوں کے باپ" کی پوجا کرتے تھے۔ جس نے اس ساری دنیا کو بنایا تھا۔ چند قبائل اسے ایک بڑا اژدہا قرار دیتے ہیں۔ نیوزی لینڈ کے موری قبائل اس ماورائی ہستی کو "اتوا" کا نام دیتے ہیں۔ نیوگنی اور جزائر سلیمان کے قدیم لوگ اسے "ماتا" اور پولینیشیا کے لوگ اسے "تارو" کہتے تھے۔ افریقہ کے جن قبائل کے ہاں ہستی اعلیٰ کا تصور ملتا ہے۔ وہ اسے "انکائی" یا "ادماکورو" کہتے تھے۔ تاہم اس کے اختیارات محدود تھے۔ قدیم امریکا کے قبائل کے ہاں بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ ان کے خدائے واحد کا نام "نوتکا" تھا۔

لنکا کے ویدہ قبائل کے یہاں ہستی اعلیٰ ایک مخالف روح ہے، جس سے انسان ڈرتا رہتا ہے۔ قدیم موہنجو ڈارو میں بھی ہمیں دیوتائے واحد "ارن" کی جھلک ملتی ہے۔

گونڈ قبیلہ کے ہاں "بھگوان" سب سے بڑا دیوتا ہے۔ یہی دیوتا ہندوؤں کے ہاں سب پر حاوی ہے۔ قدیم سامیوں کے ہاں بھی ہستی مطلق کا نام "ایل" یا "آل لاہ" تھا۔ یہی نام آگے چل کر الوہ، الٰہی اور اللہ کی صورت اختیار کر گیا۔ ہندوستان میں یہی برہما کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ فلسفہ اپنشد نے برہما کو خالق مطلق قرار دیا ہے یہ اور بات ہے کہ عملاً ہندومت میں سینکڑوں ہزاروں دیوتا پیدا ہو گئے۔ بدھ مت میں اگرچہ خدا کی ہستی کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ مگر مہاتما بدھ کے پیروؤں نے خود اسی کو الوہیت کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ قدیم ایرانیوں کے ہاں بھی آہورمزدا ہی کو خالق کل قرار دیا گیا۔

یہودیوں کا تصور:۔ ابتدا میں یہودیوں کا خدا محض نسلی خدا کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی "یہوا" صرف اسرائیل کا خدا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تصور وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اشعیاء دوم کے صحیفہ میں "تمام قوموں کا خدا" اور "تمام قوموں کا ہیکل" نمایاں ہو گیا۔ تاہم اسلام کے ظہور تک عملی طور پر توجہ کا یہ تصور نسل اسرائیل ہی تک محدود رہا۔

مسیحی تصور:۔ عیسائیوں کے ہاں خدا واحد تو تھا لیکن اس کی تعلیم میں دو اور اقانیم بھی شریک تھے۔ روح القدس اور بیٹا۔ چنانچہ یہ تصور بھی ناقص ہی رہا۔

مصر اور بابل کا تصور:۔ قدیم مصر کے فرعونوں کے ہاں خدا کی مجسم صورت رکھتی تھی اگرچہ مصری ان فرعونوں کے آگے سر جھکاتے رہے لیکن علاوہ توحید بھی ۔۔۔ تھے

Marfat.com

ان کے تمام دیوی دیوتا ایک خالقِ مطلق کے ماتحت تھے، جسے آتن یا آمن کا نام دیا گیا ہے۔ البتہ ان کے ہاں توحید خالص نہیں تھی۔ اخناتون وہ واحد فرعون ہے۔ جس نے مصر میں توحید پرستی کو رواج دیا۔

قدیم یونانیوں کے ہاں تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح میں توحید کا تصور نشو و نما پانے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی معلم شخصیت سقراط کی حکمت میں نمایاں ہوئی جسے افلاطون نے آخری شکل دی۔ سقراط نے قدیم دیو مالائی اور اسطوری مذہب سے بغاوت کی اور توحید خالص کا علم بلند کیا۔ اسے اپنی اس حق گوئی کی سزا زہر کا پیالہ پینے کی صورت میں وصول کرنا پڑی۔

افلاطون نے اپنے استاد کے اس کام کو آگے بڑھایا اور باقاعدہ حیثیت دے دی اس کے تصور کے مطابق خدا مادے سے الگ اور واحد حیثیت رکھتا ہے۔ ارسطو نے اسے عقل اول اور عقلِ فعال کا نام دیا، جو ایک ابدی اور بسیط ہستی ہے۔ سکندریہ کے نوفلاطونی مکتبِ فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا واحد ہے لیکن وہ کیا ہے؛ اس کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قرآنی تصورِ توحید:۔ اسلام میں توحید خالص کا ذکر اس طرح سے کیا گیا ہے

"کہہ اللہ کی ذات واحد ہے۔ اللہ بے نیاز ہے (اسے کسی کی احتیاج نہیں) نہ تو اس سے کوئی پیدا ہوا۔ اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی ہستی اس کے درجہ اور برابر کی ہے۔" (۱۱۲: ۱ تا ۴)

قرآن کہتا ہے کہ خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکی ہیں متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے۔ رحمت والا ہے۔ دیکھنے والا، سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ لیکن یہ بھی صاف صاف بتا دیا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصور میں آسکتی ہو۔ وہ عدیم المثال ہے۔ تمہاری نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں۔ اسکے لیے تخیل سے بھی مثالیں نہیں گھڑی جاسکتیں۔ یہی توحید خالص ہے یعنی ہر تشبیہ تنزیہہ سے پاک ہے۔

بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ "قرآن کے تصور الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے اور ساری عمر کی سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ انسانی فکر جتنی بھی کاوشیں کرے گا۔ اس کے سوا اور کوئی حل پیدا نہیں کر سکے گا۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہو گئیں۔ دوسری طرف ہماری فطرت کا آغاز اضطراب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام آشنا بلند کہ نگاہ و تصور تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔

توحید اور شرک:۔ جہاں تک توحید اور شرک کا تعلق ہے۔ قرآن کا تصور اس حد تک کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی مثال دیگر تصورات میں نہیں مل سکتی۔ اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو بقول ابوالکلام آزاد اسے اپنی صفات میں بھی یگانہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اگر کوئی دوسری ہستی اس میں شریک نہ ہو۔ پہلی بات کو توحید فی الذات اور دوسری کو توحید فی الصفات قرار دیا گیا ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہو سکتی۔ اس لیے دیگر مذاہب نے زیادہ تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا اور کسی نہ کسی صورت میں شخصیت اور اصنام پرستی وغیرہ شامل مذہب رہی ہیں لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا۔ بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" جیسی آیت کی تفسیر قرآن مجید میں جا بجا ملتی ہے۔

علم توحید اور اس کا ارتقاء

اہل اسلام کے نزدیک توحید کا تصور بھی دو رجائی ہے۔ انہی میں سے ایک درجہ علمی ہے جو دلیل اور برہان پر موقوف ہے اور ایک عینی درجہ ہے، جو وجدان سے پیدا ہوتا ہے۔ بطور علم توحید عقائد دینیہ یعنی علم الکلام کی بنیاد ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک علم توحید کی یہ تعریف ہے کہ اس میں ایمان کے صحیح عقیدوں کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جاتا ہے۔

علم توحید کی حدود:۔ مختلف علما کی تعریفوں کے ملخص کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علم توحید وہ علم ہے، جس میں اللہ اور اس کی صفات سے بحث کی جاتی ہے۔ رسولوں کا اور ان کی ضروری خصوصیات کا پتا چلایا جاتا ہے۔ آخرت اور اس کے احوال کی تفتیش کی جاتی ہے اور اس میں ان امور سے بحث کی جاتی ہے جو ان مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بقول الخوارزمی اس علم کا تقاضا ہے کہ بہت سے مسائل میں اختلاف رائے پیدا ہو۔ ان تمام مسائل کو بارہ مبادیات کے تحت درج کیا گیا ہے مثلاً ۱۔ اجسام حادث ہیں۔ ۲۔ عالم کا موجد ہے اور وہ اللہ ہے (۳) اللہ ایک ہے ۴۔ اللہ کی مثل نہیں۔ ۵۔ اللہ کا دیدار۔ ۶۔ صفات الٰہی کی بحث۔ ۷۔ انسانی افعال کی بحث۔ ۸۔ برائی مشیت ایزدی ہے یا نہیں۔ ۹۔ کبیرہ گناہ۔ ۱۰۔ نبوت کے ثبوت۔ ۱۱۔ آنحضورؐ کی نبوت اور ختم نبوت۔ ۱۲۔ مسئلہ امامت

ان مسائل پر بحث مباحثے کی بنا پر مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا ہو گئے۔ مثلاً اہل سنت، معتزلہ، خوارج، شیعہ وغیرہ۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے اکثر علماء نے علم توحید کو سرے ہی سے رد کر دیا اور کہہ دیا علم توحید یا علم کلام پڑھنے والا زندیق ہے چونکہ علم توحید کو علم کلام، فقہ اکبر، اصول دین وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے ائمہ کرام نے عوام کو علم کلام اور اس کے شغل سے روکا۔ امام شافعی کا ایک قول ہے کہ "شرک کے سوا، اگر آدمی ان تمام باتوں میں جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔ مبتلا ہو جائے۔ تب بھی وہ اس سے بہتر ہے کہ علم کلام کو اپنا شغل بنائے۔" اسی طرح امام احمد بن حنبل کی رائے ہے۔ "علم کلام میں مشغول رہنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا"

ابتدائی نشو و نما:۔ علم توحید کا آغاز بنیادی طور پر تفسیر قرآن سے ہوتا ہے۔ پہلی صدی کے ابتدا میں اہل اسلام قرآن کو سمجھنے کے لیے اپنی عقل اور رائے سے کام لیتے اور اسی طرح سنت کو پرکھتے۔ آنحضورؐ کے فوراً بعد مسئلہ امامت پیدا ہوا جس نے علم کلام کی بنیادیں بہم پہنچائیں۔ شیعان علی اہل بیت کو امامت کا حق دار ٹھہراتے تھے اور خارجی معتزلہ سب سے زیادہ اہل شخص کی امامت کے قائل تھے۔ اعتدال پسند مسلمان قریش میں سے بہترین کے طرف دار تھے۔ یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ عائشہؓ و علیؓ، معاویہؓ و علیؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے طرف داروں نے آپس میں سر پھٹول اور جنگ و جدل سے کام لیا۔ ہر دو گروہ نے ایک دوسرے کو کافر ٹھہرایا۔ چنانچہ ایمان کے معنی تشریح اور توضیح کی تلاش شروع ہو گئی۔ اسی اختلاف کی بنا پر خوارج، مرجیٔ اور بعد ازاں معتزلہ جیسے فرقے پیدا ہوئے اور یوں یہ سیاسی اختلاف دینی اختلاف بن کر رہ گیا۔ ادھر امامت کا مسئلہ بھی علم کلام کا ایک جزو ہو گیا۔ جبکہ بقول شہرستانی مسئلہ امامت کی بحث کے لیے علم فقہ زیادہ موزوں تھا نہ کہ علم کلام۔ کیونکہ اس کا تعلق عمل سے زیادہ ہے، اعتقاد سے نہیں۔ مگر امامیوں، رافضیوں اور خارجیوں کے عقائد میں غلو کرنے کی وجہ سے مسلمین

Marfat.com

نے اسے بھی علم کلام میں شامل کر لیا تاکہ دین کے عقائد مجروح نہ ہو سکیں۔

بیرونی اثرات:۔ جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکلتے ہی اسلام پر دنیا بھر کے افکار و مذاہب کے فکری و نظری حملے ہونے لگے اور ہر مختلف ادیان اور نظریات کے حامل لوگ جب حلقۂ اسلام میں آتے ہیں اپنے مخصوص زاویہ نظر کی بناء پر عقائد اسلامی کی مختلف توجیہیں کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے علمائے دین سے باقاعدہ مناظرے اور مجادلے کرنا شروع کر دیئے۔ اسی موقع پر مفکرین نے قرآن کی آیاتِ متشابہات کا سوال اٹھایا اور اس کے حل میں لگ گئے۔ بعض نے ان کے معنی ظاہری لئے اور بعض نے تشبیہی۔ بعض نے سرے سے ان پر بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ان اختلافات کی بناء پر فرقہ بندی ہوئی اور مشبہہ، مجسمہ معتزلہ، معطلہ اور صفاتیہ وغیرہ فرقے پیدا ہوئے۔

اشعریہ یا اشاعرہ:۔ ان تمام فرقوں اور ملحدوں کے ردّ عمل کے طور پر ابوالحسن اشعری میدان میں آئے اور انہوں نے علم توحید میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انہوں نے ہر فرقے کی افراط و تفریط سے دامن بچانے کی کوشش کی اور یوں ایک درمیانی راہ نکالی۔ ان کے پیروکار اشعریہ یا اشاعرہ کہلائے اور ان کے مذاہب کو اہل حق یا اہل سنت والجماعت کا مذہب قرار دیا گیا۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے فلسفہ کی تحصیل کی تاکہ ملحدوں کا مقابلہ فلسفے ہی کے ہتھیاروں سے کیا جائے۔ اس بات سے علم کلام پر گہرا اثر پڑا اور بہت سے فلسفیانہ نکات سامنے آنے کی بناء پر اس علم کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ اشعری مذہب کو جس عالم نے سب سے پہلے فلسفیانہ دلائل پر منظم کیا اور اس کی خوب اشاعت کی وہ قاضی ابوبکر الباقلانی ہیں۔ ان کے بعد امام الحرمین جوینی اور پھر ان کے شاگرد امام غزالی پیدا ہوئے۔ جنہوں نے علم کلام میں اپنی مسلّم حیثیت پیدا کی۔ ان کا طریقہ اس بنیاد پر قائم ہوا تھا کہ اگر دلیل باطل ہے تو عقیدہ بھی باطل ٹھہرتا ہے۔ بعد ازاں امام غزالی نے استدلال کی تمام پابندیاں ہٹا دیں اور آج تک یہی قاعدہ رائج ہے۔

مختلف فرقوں کی آراء

قرآن مجید میں "اللہ کا چہرہ اور ہاتھ" کے الفاظ آئے ہیں۔ عرش اور دیگر تشبیہی باتیں نیز خدا کا علم، قدرت اور کلام وغیرہ ثابت ہے۔ مشبہہ مجسمہ گروہ نے ان آیات کے وہی معنی لئے جو ظاہر میں تھے یعنی اللہ کا ہاتھ، پاؤں چہرہ وغیرہ ہے۔ وہ کلام کرتا ہے، نیز وہ ظاہر بھی ہو سکتا ہے۔ ابن جوزی کے نزدیک ان میں سے غالی حنبلیوں نے افراط سے کام لیا اور صفات کو محسوسات میں شامل کر دیا۔ انہوں نے اللہ کے لئے انسان کا سا جسم گھڑ لیا۔ دوسری طرف معتزلہ نے اتنی مخالفت کی کہ صفات کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ معتزلہ کے افراطی گروہ کا نام واصلیہ بھی ہے۔ معتزلہ کے بہت سے فرقے ہوئے۔ تاہم وہ پانچ اصولوں پر متفق ہیں۔ ۱۔ توحید۔ ۲۔ عدل۔ ۳۔ وعد و وعید۔ ۴۔ ایمان و کفر کی درمیانی منزل۔ ۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ توحید میں انہوں نے اللہ کو مخلوق کی صفات سے منزہ ٹھہرایا اور اس میں اتنے غلو سے کام لیا کہ سرے سے صفات ہی کے منکر ہو گئے اس لئے ان کا نام معطلہ بھی پڑ گیا۔ ان کے برعکس، جو صفات کے قائل رہے۔ صفاتیہ کہلائے معتزلہ کے نزدیک توحید یہ ہے کہ "اللہ ایک ہے، اس کا کوئی مثل نہیں، چنانچہ وہ نہ جسم ہے۔ نہ صورت نہ جوہر ہے نہ عرض۔ اس کا نہ کوئی رنگ ہے، نہ بو، نہ موضع، لمس، اس کا طول، عرض اور عمق بھی نہیں۔ وہ نہ متحرک ہے نہ ساکن۔ اس کے اعضاء و جوارح کچھ نہیں۔ اس کے لئے جہتیں ہیں نہ کوئی مکان اسے محیط کئے ہوئے ہے۔ اسے چھونا ممکن نہیں۔ حواس اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ اسے انسانی قیاس نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وہ کسی مخلوق کے مشابہ ہے۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔"

تیسری صدی ہجری میں اشاعرہ کا ظہور ہوا۔ انہوں نے اس افراط و تفریط کے بین بین راہ نکالی اور عقل کو کسوٹی قرار دیا۔ انہوں نے تشبیہہ کو باطل ٹھہرایا اور صفات معنوی ثابت کیں۔ نیز اس بارے میں تمام بدعتوں کا ردّ کیا۔ اور بعض اقوال بھی تیار کئے۔ اشاعرہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے ایک خاص جہت اور مکان ہے۔ اور وہ صفات علم قدرت وغیرہ رکھتا ہے۔ لیکن اس کے لئے جسم یا اس سے تشبیہہ لازم نہیں۔ نیز خدا تعالیٰ کا دیدار اگرچہ دنیا میں ممکن ہے، لیکن یہ آخرت میں وقوع ہوگا۔ ان کے نزدیک کلام دو طرح کا ہے، کلام لفظی جسے ہم پڑھتے ہیں اور کلام نفسی، جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ کلام لفظی حادث ہے اور کلام نفسی قدیم۔ اس طرح وہ قرآن کو مخلوق کہنے سے بچ گئے

خوارج کے ہاں بیس فرقے ہوئے۔ یہ سب دو باتوں پر متفق تھے۔ ۱۔ علیؓ، عثمانؓ اصحاب جمل دونوں حکم (عمرو بن عاص اور ابوموسیٰ اشعری) اور ان کے متفقین سب کافر ہیں۔ ۲۔ گناہ کا مرتکب مسلمان، کافر ہے۔

شیعہ کے ہاں بھی بہت سے فرقے ہوئے مثلاً ۱۔ غالیہ، جو حضرت علیؓ کی شان میں غلو کرتے ہیں۔ ۲۔ کیسانیہ۔ ۳۔ زیدیہ۔ ۴۔ امامیہ۔ یہ تمام فرقے امامت کو ارکان دین میں سے ایک مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک آنحضورؐ پر یہ فرض تھا کہ وہ امّت کے لئے امام مقرر کر جاتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا ہے۔ اس کے لئے وہ نص غدیر قائم کرتے ہیں یعنی "جس کا میں مولا اس کا علیؓ"

عقیدہ توحید کے اثرات

توحید محض ایک مجرد علمی حقیقت نہیں، بلکہ یہ عملی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے اس عقیدے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بہت سے نمایاں اثرات پڑتے ہیں انہیں ہم بآسانی فکری اور عملی اثرات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

فکری اثرات:۔ مولانا محمد حنیف ندوی اپنی تصنیف "اساسیات اسلام" میں لکھتے ہیں کہ توحید کا پہلا اور عظیم اثر فکر و ذہن پر مرتب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یکتائی سے اس میں اپنی یکتائی کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان یہ سچ مچ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ بہتر اور احسن ہی نہیں اللہ کا بندہ بھی ہے یا کائنات میں اس کی حقیقت صرف حیاتیاتی عنصر ہی کی نہیں بلکہ اس سے سوا اور اس سے زیادہ یہ کسی بڑی حقیقت سے بھی تعبیر ہے۔

توحید کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کائنات، معاشرہ اور اس کی آسودوں اور تمناؤں میں جو ایک طرح کی دوئی، اجنبیت یا غیریت ہے۔ وہ دور ہو جاتی ہے اور انسان اپنے گرد و پیش اور حالات و ظروف کو اپنا مخالف سمجھنے کی بجائے اپنا دوست سمجھنے لگتا ہے۔ کیونکہ جس خدا نے اس کائنات کو بنایا ہے، وہی خدا تو ہے، جس کے دستِ ہنر پرور نے انسانی فکر و تعقل کی پرورش کی ہے۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ان دونوں میں حقیقی اختلاف رونما ہو۔

توحید کا تیسرا اثر یہ پڑتا ہے کہ انسان خدا کو ہر حال میں اپنے ساتھ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں توکل کا عقیدہ انسان کو مایوس ہونے سے بچا لیتا ہے۔ چنانچہ اس نیت کے ساتھ کام کرتا ہے کہ اگر کام صحیح ہے اور مقصد نیک ہے تو اللہ اسباب کی فراہمی میں میرے ساتھ ہے۔ اس کی کارسازی اور توفیق برابر شامل حال ہے۔

علاوہ ازیں توحید کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ انسانی تفکر و تدبر خالصتہً سائنسی اور علمی اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور ذہن توہمات اور بت پرستی کے تمام پردوں کو چاک کر کے اس روشنی کو پا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ کائنات نظم و قاعدہ کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے ... علل و اسباب کی ہم آہنگی اور استواری ہے اور ایک ہی قانون جاری و ساری ہے۔

Marfat.com

عملی اثرات :- عملی طور پر عقیدۂ توحید انسان پر کس طرح سے اثر انداز ہوتا ہے اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب "حقیقتِ توحید" میں دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک :-

انسانی زندگی پر اس کا سب سے نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ عقیدہ انسان کو آزادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے، جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق ہے یہ عقیدہ انسان میں حد درجہ خودداری اور عزتِ نفس پیدا کر دیتا ہے۔ اس پر اعتقاد رکھنے والا خدا کے سوا کسی کو طاقتور اور صاحب اختیار و اثر نہیں سمجھتا۔

یہ عقیدہ انسان میں تواضع و انکساری بھی پیدا کر دیتا ہے اس کا قائل کبھی اور متکبر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے، خدا کا دیا ہوا ہے اور خدا اسے واپس بھی لے سکتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی طرح کے کمال کو وہ اپنی قابلیت کا نتیجہ نہیں سمجھتا یہ عقیدہ رکھنے والا وسعتِ نظری کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ایسے خدا کا قائل ہوتا ہے جو زمین و آسمان اور کائنات کی ہر شئے کا مالک ہے۔ چنانچہ وہ کسی طرح بھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح عقیدہ توحید پر ایمان لانے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور نیک عمل کے سوا اس کے لیے نجات اور فلاح کا کوئی ذریعہ نہیں۔ کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جو بے نیاز ہے اور بے لاگ عدل کرنے والا ہے۔

اس عقیدے کا حامل ہمیشہ پُرامید رہتا ہے۔ وہ ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو زمین اور آسمان کے تمام خزانوں کا مالک ہے۔ جس کا فضل و کرم بے حد حساب ہے، جس کی قوتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایمان اس کے دل کو تسکین بخشتا ہے، اس کو اطمینان سے بھر دیتا ہے اور ہمیشہ امیدوں سے لبریز رکھتا ہے۔ چاہے وہ دنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے

یہی چیز انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ حرص و ہوس اور رشک و حسد کے رکیک جذبات اس کے دل سے نکل جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ عزت اور طاقت کا مالک ہے، جس کو جب چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے۔ دیتا ہے

یہ عقیدہ انسان میں صبر و توکل کی زبردست طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی انسان اپنی سعی کا نتیجہ خدا پر چھوڑ دیتا ہے اور ناکامی کی صورت میں مایوس نہیں ہوتا۔

اسی چیز سے انسان میں سعی و محنت کا حوصلہ، ارادہ اور عزم بیدار ہوتا ہے، جو انسان کو بہادر اور جری بنا دیتا ہے۔ اس عقیدے کا قائل اپنی جان و مال اور ہر چیز کا مالک خدا ہی کو سمجھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

توحید کا عقیدہ انسان کو خدا کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کا ماننے والا جانتا ہے کہ خدا ہر چھپی ہوئی اور کھلی چیز سے باخبر ہے۔ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اگر ہم رات کے اندھیرے اور تنہائی کے گوشے میں بھی کوئی گناہ کریں تو خدا کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ یہ عقیدہ جتنا مضبوط ہوگا۔ اتنا ہی انسان خود کو خدا کے احکام کا مطیع پائیگا

اجتماعی طور پر انسان ہر قسم کے تعصباتِ رنگ، نسل، قوم، وطن، علاقہ زبان وغیرہ کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور پوری بنی نوع انسان کو ایک وحدت سمجھنے لگتا ہے جس سے عالمی ریاست کے تصور کو جلا ملتی ہے۔ (نیز دیکھئے "اسلام"، "ایمان"، "اسمائے حسنیٰ" "اللہ"، "کلام")

توختہ، سید احمد ترمذی ایک صوفی بزرگ۔ والد کا نام سید احمد تختہ شال زیل تھا جو شہاب الدین غوری کے زمانے میں لاہور آئے تھے۔ توختہ ترمذ میں پیدا ہوئے۔ توختہ ترکی زبان میں کھڑے ہونے کو کہتے ہیں

آپ کے نام توختہ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ ایک دن آپ کے مرشد نے آپ کو یاد فرمایا۔ آپ جب حاضر ہوئے تو شام کا وقت تھا حجرے کا دروازہ بند تھا۔ آپ نے اپنے آنے کی اطلاع یا دستک دینے کو ادب کے منافی سمجھا اور ساری رات حجرہ کی دہلیز کے پاس کھڑے کھڑے گزار دی کہ شاید شیخ یاد فرمائیں۔ جب صبح ہوئی اور مرشد نے دروازہ کھولا اور آپ کو باہر کھڑے ہوئے پایا تو توختہ کہہ کر مخاطب کیا اس روز سے لوگ آپ کو سید احمد توختہ کے نام سے مخاطب کرنے لگے۔

ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شہاب الدین غوری کے عہد میں لاہور آئے تھے۔ یہ خیال صاحب "تاریخ جلیلہ" کا ہے۔ اکثر نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ ان مصنفین کے نزدیک سید احمد توختہ خود لاہور تشریف لائے۔ قدیم مصنفین نے ان کی اولاد کے بارے میں بھی کچھ نہیں لکھا۔ البتہ غلام دستگیر نامی نے تاریخ جلیلہ میں سردار اعظم مکران کے خط کو درج کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ سید احمد توختہ جب ترمذ سے کیچ (مکران) پہنچے تو ان کے ہمراہ ان کی دو صاحبزادیاں بی بی حاج اور بی بی تاج تھیں۔ بی بی حاج کا نکاح آپ نے شہزادہ مکران سلطان بہاء الدین بن سلطان قطب الدین سے کر دیا اور اس کام سے فارغ ہو کر آپ لاہور روانہ ہو گئے۔

آپ کی لاہور میں آمد کا سن کسی تاریخ نگار اور مصنف نے نہیں لکھا ہے اور نہ ہی کسی نے آپ کی عمر لکھی ہے صرف صاحب "حدیقۃ الاولیاء" نے آپ کا سن وفات ۶۰۲ھ لکھا ہے۔ بقول منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور سید احمد توختہ خسرو شاہ غزنوی کے عہدِ حکومت میں غالباً ۵۶۰ھ کے قریب لاہور تشریف لائے تھے۔

سید احمد توختہ نے لاہور ہی میں انتقال کیا۔ اور آپ کا مزار اکبری دروازے کے اندر محلہ چلہ بیبیاں میں واقع ہے۔ جس جگہ آپ مدفون ہیں وہاں یا تو آپ ہی کے زمانہ میں قبرستان تھا یا آپ کے دفن کیے جانے کے بعد وہاں قبرستان بن گیا۔ ۱۹۱۳ء سے قبل سید احمد توختہ کا مزار نہایت خستہ حالت میں تھا اندرونی اور بیرونی فرش مٹ چکے تھے۔ دیواروں کا پلستر بھی ختم ہو چکا تھا۔ پیر غلام دستگیر نامی نے اس کی مرمت کرائی۔ مزار کے حجرہ اور برآمدہ کو اچھی طرح مسقف کرایا اور ایک منزل بنا کر وہاں کتب خانہ رکھا۔ اور نیچے مہمانوں اور زائرین کے لیے آرام گاہ بنائی گئی۔

تورات یہودیوں کی الہامی کتاب جو عبرانی زبان میں حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی عام طور پر تورات سے مراد بائیبل کے عہد نامہ قدیم کی ابتدائی پانچ کتابیں لی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں تورات بائیبل کی پانچ کتابوں کا نام نہیں بلکہ وہ ان پانچ کتابوں میں شامل ہے۔

بقول مولانا مودودی تورات سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے لے کر ان کی وفات تک تقریباً چالیس سال کے دوران میں ان پر نازل ہوئے۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالےٰ نے پتھر کی لوحوں پر کندہ کر کے انہیں دیے تھے۔ باقیماندہ احکام کو حضرت موسیٰؑ نے لکھوا کر اس کی ۱۲ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دی تھیں اور ایک نقل بنی لاوی کے سپرد کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کتاب کا نام "تورات" تھا۔ یہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی پہلی تباہی کے وقت تک محفوظ تھی۔ اس کی ایک نقل جو بنی لاوی کے سپرد کی گئی تھی، پتھر کی لوحوں سمیت عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی اور بنی اسرائیل اس کو "تورات" ہی کے نام سے جانتے تھے۔"

Marfat.com

تورات جن پانچ صحیفوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں صحائف موسےؑ کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں :-

۱۔ کتابِ تکوین۔ اس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک کے حالات سے مجملاً بحث کی گئی ہے۔ اس میں آلِ یعقوب کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے اور مذہب میں اخلاق کو جو مقام حاصل ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

۲۔ کتابِ خروج۔ اس کی ابتدا ولادت موسیٰؑ سے ہوتی ہے نیز یہ کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر طور سینا تک لے گئے، اس کا احوال ہے۔

۳۔ کتاب احبار۔ اس میں بنی اسرائیل کے لئے وہ قوانین جن کا تعلق خاص طور پر عبادات سے ہے مثلاً قربانی، قصاص، جانوروں کی حلت و حرمت وغیرہ کے احکام درج ہیں۔

۴۔ کتاب گنتی۔ اس میں خروج کے بعد کا تاریخی تبصرہ ہے کہ کس طرح علاقہ فتح کیا۔ نیز جستہ جستہ احکام و قوانین درج ہیں۔

۵۔ کتاب استثناء۔ اس میں ملک فلسطین کی تقسیم وغیرہ کے امور مذکور ہیں یہ صحیفہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے ذکر پر ختم ہو جاتا ہے۔

تورات کے بارے میں قرآن شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمایا تھا۔ چنانچہ تورات وحی کے اس سلسلے کی ایک عظیم المرتبت کڑی ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے انبیا پر نازل کرتا رہا۔ اس کی بڑی اہمیت یہ کہ یہ ایک مکمل شریعت یا دستورِ حیات ہے جو حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے لئے دیا گیا تھا۔ اگرچہ تورات کے بعد دو اور صحیفے زبور اور انجیل نازل ہوئے لیکن شریعت موسوی برقرار رہی اور حضرت عیسیٰؑ نے بھی اسے قائم رکھا۔ جیسا کہ آپؑ نے فرمایا۔ "یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں" (متی ۵ : ۱۷)

قرآن مجید میں تورات کا کئی جگہوں پر ذکر آیا ہے اور کہیں اس کو "الفرقان وضیاء" اور کہیں "بصائر" کے القابات سے نوازا گیا ہے۔

"اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان اور روشنی اور متقیوں کے لئے نصیحت دی۔" (۲۱ : ۴۸)

"پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی۔ لوگوں کے لئے بصیرتوں کا سامان بنا کر ہدایت اور رحمت بنا کر تاکہ شاید لوگ سبق حاصل کریں۔" (۲۸ : ۴۳)

قرآن کریم کی رُو سے وہ تورات جو موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی اسی طرح منزل من اللہ تھی۔ جیسے قرآن مجید لہٰذا من جملہ اور صحائف انبیاؑ کے اس پر بھی کتاب اللہ کی حیثیت سے اعتقاد رکھنا اور ایمان لانا لازمی ہو جاتا ہے۔

موجودہ تورات کی تدوین و تالیف کا زمانہ متعین کرنا آج ممکن نہیں ہے۔ جو تورات عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی۔ یہودیوں کی اس سے غفلت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ یہودیہ کے بادشاہ یوسیاہ کے عہد میں جب ہیکل سلیمانی کی مرمت ہوئی تو اتفاق سے سردار کاہن (ہیکل کے سجادہ نشین اور قوم کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا) خلقیاہ کو ایک جگہ تورات رکھی ہوئی مل گئی۔ اس نے ایک عجوبے کی طرح اسے شاہی منشی کو دیا۔ اور شاہی منشی نے اسے لے جا کر بادشاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا جیسے ایک عجیب انکشاف ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا تو یہ کتابیں تلف ہو گئیں۔ ان کتابوں کے احکامات معناً یہودی ربانیوں کے حافظے میں موجود تھے۔ کیونکہ وہ مذہبی مجالس میں ان کتابوں کے مفہوم کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہتے تھے۔ زمانہ اسیری میں ان کتابوں کو دوبارہ جمع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ بابل کی اسیری کے بعد جب عزرا کاہن کے زمانے میں بچے کھچے لوگ بابل کی اسیری سے واپس یروشلم آئے اور دوبارہ بیت المقدس تعمیر ہوا۔ تو چند بزرگوں کے دل میں تورات کو جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ عزرا اور دوسرے چند بزرگوں نے اس اہم کام کی تکمیل کی۔ یہ کام ۴۴۵ ق۔م میں انجام پایا۔ لیکن ۱۶۸ ق۔م میں یونانی بادشاہ انٹیوکس نے ایک بار پھر بخت نصر کے تاخت و تاراج کی یاد تازہ کر دی۔ اس نے عزرا کی جمع کردہ تورات بھی جلوا دی۔ اس کے بعد یہوداہ نے تورات کی از سر نو تدوین کی۔ اور اس میں تیسرے سلسلے کا اضافہ کیا۔ جب رومی حملہ آور ہوئے تو یہ ایک بار پھر حملہ آوروں کی دست برد کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد یہ کئی بار ضائع ہوئی اور اس کو بار بار جمع کیا گیا۔

ہر بار جب تورات تدوین کی جاتی تھی تو اس کی زبان بھی بدل جاتی تھی۔ پہلے تورات عبرانی زبان میں تھی عزرا نے غالباً اسے جب دوبارہ جمع کیا تو ارامی زبان استعمال کی۔ کیونکہ نینوا میں اسیری کے دوران میں یہودی اپنی زبان بھلا بیٹھے تھے اور انہوں نے مقامی زبان آرامی کو اپنا لیا تھا۔ پھر جب یونانیوں نے انہیں گرفتار کر کے اسکندریہ میں قید کر دیا تو انہیں یونانی زبان اپنانے میں کسی قسم کا تردد نہ ہوا۔ اس کے بعد تورات یونانی زبان ہی میں جمع کی گئی۔ جسے شاہ مصر بطلیموس نے اسکندریہ کے کتب خانے کے لئے تیار کرایا تھا۔ یونانی نسخے سے ایک مرتبہ تورات کو عبرانی زبان میں منتقل کیا گیا۔ جب یہودی رومیوں کے غلام بنے تو پھر وہ رومی زبان اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور تورات کا ترجمہ رومی زبان میں ہوا۔

مذکورہ بالا تاریخی شہادتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہودیوں کی اصل کتاب حوادث زمانہ کی نذر ہو گئی۔ اور موجودہ تورات بعد میں مرتب ہوئی۔ چنانچہ ان حادثات سے گذرنے کی وجہ سے تورات اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھی۔ اور اس میں اکثر جگہوں پر تحریف ہو گئی اور اس میں بہت سی وہ باتیں بھی شامل کر لی گئیں جو من جانب اللہ نہیں تھیں بلکہ ان ترتیب دینے والوں کے ذہن کی اپنی اختراعیں تھیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جگہ جگہ تورات کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

"اے مسلمانو! اب کیا تم ان لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔" (۲ : ۷۵)

"اس سے پہلے ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔" (۴۱ : ۴۵)

"ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا۔ انہیں پوشیدہ نہیں رکھنا ہوگا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ دیا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔" (۳ : ۱۸۷)

تورات کے بارے میں یہ بات کہ وہ تحریف کا شکار ہوئی صرف قرآن ہی نہیں کہتا بلکہ خود علمائے یہود و نصاریٰ بھی اس بات کو مانتے ہیں۔

Marfat.com

عہد قدیم کے دیگر صحائف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحریف کا آغاز بہت ابتدائی زمانہ سے شروع ہوگیا تھا۔ بعض انبیائے بنی اسرائیل نے خود بھی اس فعل کو مذموم قرار دیا ہے۔

"سرزمین، ان کے نیچے جو اس پر بستے ہیں، نجس ہوئی کہ انہوں نے شریعتوں کو کو عدول کیا۔ قانونوں کو بدلا۔ عہد ابدی کو توڑا۔" (اشعیاء ۲۴: ۵)

"تم نے زندہ خدا رب الافواج، ہمارے خدا کی باتوں کو بگاڑ ڈالا۔" (ارمیاء ۲۳: ۳۶)

ہسپانوی یہودی عالم ابن عزرا نے تحقیق کی کہ صحائف خمسہ (تورات) حضرت موسیٰ کے بعد کی تالیف ہیں۔

فرانسیسی عالم کاپیلو نے ثابت کیا ہے کہ تورات کا اصل عبرانی متن بغیر ماثوری اعراب کے اور طریقوں پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ جو عبرانی متن موجود ہے وہ بھی حتمی طور پر صحیح نہیں ہے۔

ایک فاضل جرمن عالم رائمارس نے ۱۷۷۴ء میں اپنی ایک ضخیم تصنیف میں بائیبل کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کیا ہے۔

تورات کے بارے میں ان نظریات کے حامل کوئی ایک دو افراد نہیں بلکہ علماء و فضلاء کی اکثریت کا یہی نظریہ تھا۔ جدید تنقید و تحقیق نے بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ موجودہ تورات اور دیگر صحائف عہد قدیم اللہ کا کلام یا وحی منزل من اللہ نہیں ہیں بلکہ ان مختلف صحائف کو مختلف ادوار میں مختلف اشخاص نے تصنیف و تالیف کیا ہے۔

جب جدید تنقید و تحقیق نے یہ بات تسلیم کر لی کہ موجودہ تورات منزل من اللہ کتاب نہیں ہے تو مختلف صحائف اور ان کے حقیقی مصنفین کا پتا لگانے کی کوشش کی گئی۔ ان محققین کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ عہد قدیم کی ثلاثی تقسیم اور اس کی تدوین تین مختلف ادوار میں ہوئی۔ سب سے پہلے تورات مدون ہوئی، اس کے بعد صحائف انبیاء اور پھر صحائف مقدسہ۔

اگرچہ اس بارے میں کہ موجودہ تورات کس سن میں مرتب کی گئی، کوئی تحقیقی ثبوت نہیں ہے۔ اندرونی شہادت کی بنا پر اس کی تدوین کی تاریخ ۴۴۴ ق۔م ہو سکتی ہے صحائف انبیاء کے ترتیب دیئے جانے کا زمانہ ۲۰۰ ق۔م اور ۲۵۰ ق۔م کے درمیان کا ہے

جبکہ صحائف مقدسہ کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ ۱۰۰ ق۔م اور ۱۵۰ ق م کے درمیانی عرصے میں مرتب و مدون کیے گئے۔

قرآن تورات کے بارے میں جو موقف اختیار کرتا ہے، وہ ابتدائے مضمون میں درج ہو چکا ہے۔ قرآن نے جہاں مجملاً تورات کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی ہے آج سے چودہ سو سال پیشتر یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ اس میں یہود نے تحریف کر دی ہے اور اس کے بعض حصے خود بھی تصنیف کر لیے ہیں موجودہ دور میں محققین یہود و نصاریٰ قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں بلکہ وہ اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھے ہیں کہ اکثر نے اس کے وحی ہونے ہی سے انکار کر دیا۔

لیکن ان محققین کا یہ نظریہ بھی درست نہیں ان کی نظریں یہ دیکھنے سے قاصر رہی ہیں کہ جہاں تورات میں انسانی ہاتھوں کی لکھی تحریریں موجود ہیں، وہاں اس میں اب بھی وحی الٰہی کے جواہر ریزے موجود ہیں۔ اگرچہ ایک عام آدمی کے لیے تمیز کرنا بڑا مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تورات کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر۔ تاہم جو لوگ کتب آسمانی میں بصیرت رکھتے ہیں، وہ ایک حد تک صحت کے ساتھ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان اجزاء میں کہاں کہاں اضافے ملحق کر دیئے گئے ہیں۔

قرآن انہیں منتشر اجزاء کو تورات کہتا ہے اور انہیں کی وہ تصدیق کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزاء کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو بجز اس کے کہ بعض بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے۔ اصول تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان سر مو فرق نہیں پایا جاتا۔

توران

ایرانی اصطلاح میں اس سے مراد وہ ملک ہے جو ایران کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

اس علاقے کو توران کیوں کہا جاتا ہے نیز اس کا مفہوم بعد کے زمانے میں کیا تھا جس کی وجہ سے لفظ "توران" ترکوں کی سرزمین" کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کا جواب کچھ یوں ہے۔

اوستا کے ان اجزاء میں، جو اب تک محفوظ ہیں "تورہ" کا لفظ ملتا ہے۔ جو دو صالح آدمیوں کے باپ کا نام تھا۔ اوستا میں جو لوگ مذکور ہیں کہ جنہیں تورہ کہا جاتا تھا، غالباً خانہ بدوش تھے۔ ان لوگوں کو سچے مذہب کا دشمن بتایا گیا ہے۔ لیکن متعدد عبارات میں اس بات کا بھی ذکر موجود ہے کہ تورہ میں نیک اور متقی لوگ بھی تھے۔

تورہ کی نسلی خصوصیات کے متعلق جو نظریات پیش کیے گئے، ان کے مطابق اس نام کے ضمن میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو بحیرۂ خزر اور دریائے سیحون کے درمیانی میدانوں میں رہتے ہیں۔

تورہ کے متعلق زیادہ مفصل معلومات مشہور مستشرق مارکار نے بہم پہنچائی ہیں اس کے نزدیک ایرانیوں کا قدیم وطن ایریانم وایجو خوارزم میں تھا۔ ایران اور توران کی جنگیں جن کا ذکر اساطیر میں آیا ہے۔ اس کش مکش کا منظر ہیں جو شہری (حضری) ایرانیوں اور خانہ بدوش ماہی خوروں کے درمیان ہوئیں۔

تورہ کی اصطلاح بعد میں ایرانیوں کے نئے دشمنوں (سکر و کالٹے، طخاریوں، یولے۔ جی کوشانیوں، ختی ادنیوں، صاطلہ اور ترکوں) کے لئے استعمال ہونے لگی۔

توران کا ذکر شاہنامے میں فریدون کے ذکر کے ساتھ جو آخری شہریار تھا مذکور تھا قدیم اساطیری روایات کے مطابق فریدون کے بیٹوں کے درمیان دنیا کا تین حصوں میں تقسیم ہونا ایک تمثیل ہے۔ لیکن فردوسی کے دور تک یہ افسانوی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی۔ فردوسی نے شاہنامے میں لکھا ہے کہ فریدون کے تین بیٹے سلم، تور اور ایرج تھے۔ اس نے اپنی سلطنت کو ان تینوں میں ایسے تقسیم کیا کہ بڑے بیٹے سلم کو مغرب کے علاقے (روم و خاور) دیئے۔ دوسرے بیٹے تور کو توران عطا کیا۔ اسی وجہ سے اس کا لقب توران شاہ پڑا۔ تیسرے بیٹے کو "دشت گردان و ایران زمین" کا علاقہ دیا۔

توران ایک جغرافیائی اصطلاح کی حیثیت سے۔ یہ اصطلاح قبائل تورہ کے نام سے ماخوذ ہے بالآخر اس کا اطلاق ترکوں کے ملک پر ہونے لگا۔

بقول فردوسی یعنی چینیوں اور ترکوں کے علاقے کو دریائے جیحون ایران سے جدا کرتا ہے۔ عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک ترکوں کا علاقہ صرف سیر دریا کے مشرق میں شروع ہوتا تھا۔ اور ماوراء النہر کا علاقہ اس میں شامل نہیں اس لئے عام تاثر یہی ہے کہ توران اور ماوراء النہر کو ایک ہی ملک سمجھا جائے یعنی وہ علاقہ جو آمو دریا (جیحون) اور سیر دریا (سیحون) کے درمیان ہے۔

خوارزمی کے بقول ایرانی جانب جیحون کے علاقے کو "مرز توران" کہتے ہیں۔ یاقوت نے بھی ماوراء النہر کے ملک کو توران کہا ہے۔ دمشقی کے نزدیک فریدون کے ہاتھوں

Marfat.com

دنیا کے تین حصوں میں بٹ جانے کے بعد جو حصہ تور کو ملا ترکوں نے اس علاقے کا نام اپنے بادشاہ کے نام پر توران رکھا۔

ہربلیٹ کے نزدیک توران کی اصطلاح افراسیاب جو اپنی پیدائش کے لحاظ سے ترک لیکن نسل کے اعتبار سے فریدون کے بیٹے تور کی اولاد سے تھا، ماخوذ ہے، وہ اس تمام علاقے کا بادشاہ تھا، جو دریائے جیحون کے پار مشرق اور شمال میں واقع ہے۔ اس ملک کو توران کہتے تھے۔ اس کے بعد اسے ترکستان کہنے لگے ہیں۔

یورپ میں توران کی اصطلاح نے انیسویں صدی میں رواج پایا۔ جس زمانے میں ترکی قومیت کی مہم شروع ہوئی اور اس کو خوب ہوا دی گئی اس زمانے میں اس تحریک کا سب سے بڑا علمبردار ضیا گوک الپ تھا۔ اس نے اپنے قومی گیتوں میں کہا ہے "اوغور خان کی اولاد اس ملک کو کبھی نہیں بھولے گی جس کا نام توران ہے۔"

ترکوں کا آبائی وطن نہ ترکیہ ہے اور نہ ترکستان، ان کا اصل وطن تو توران کی عظیم الشان ازلی ابدی سرزمین ہے۔ ضیا گوک الپ کی تعلیمات کا خلاصہ اس کی کتاب "ترکیت کے بنیادی اصول" میں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں توران کے تخیل کو نسبتاً زیادہ عملی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نے قوم کا اطلاق افراد کی اس جماعت پر کیا ہے جو زبان مذہب اخلاقیات اور جمالیات کے واحد رشتے میں منسلک ہوں گویا توران ترکوں، منگولوں، تونغوزوں فنوں اور مجاروں سے مرکب نہیں بلکہ توران ایک نام ہے جس میں صرف ترکی قبائل شامل ہیں۔

توران شاہ

(دورِ حکومت ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء - ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء) یمن میں ایوبی بادشاہ یمن کے خاندان ایوبی کا بانی۔ اس سے دو سال پہلے فاطمی بادشاہ عاضد کی موت نے صلاح الدین ایوبیؒ کو آئین کے مطابق مصر کا حاکم بنا دیا تھا۔ حاکم بننے کے بعد صلاح الدین کے دل میں یمن کو فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

صلاح الدین ایوبیؒ نے اپنے بڑے بھائی توران شاہ کو نوبہ کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ لیکن توران شاہ نے نوبہ کو اس اہمیت کا حامل نہ سمجھا کہ اس کے لیے اتنی مشقت اور خرچ برداشت کیا جائے۔ اسی اثنا میں صلاح الدین کی توجہ جزیرہ نمائے عرب کی طرف مبذول ہو گئی جس کی شمالی سرحد پر بندرگاہ ایلہ واقع تھی۔ اس لیے اس نے توران شاہ کو یمن بھیج دیا۔ چنانچہ توران شاہ نے ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں زبید کو فتح کر لیا اور اسی سال عدن پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔

توران شاہ نے اس سے اگلے ہی سال صنعاء سے علی بن حاتم ہمدانی کو نکال باہر کیا۔ لیکن توران شاہ کی اس جگہ طبیعت نہ لگی۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی صلاح الدین کو کہہ سن کر ملک شام میں اپنی تبدیلی کرا لی۔ توران شاہ نے ملک شام کے والی کی حیثیت سے تین سال دمشق میں گذارے۔ یہاں سے اس کی تبدیلی اسکندریہ میں ہو گئی جہاں پر اس نے انتقال کیا۔ توران شاہ کو شام سے جو محبت و رغبت تھی اسی بنا پر اس کی بہن اس کی لاش کو مصر سے شام لے آئی تھی اور دمشق کے باہر اپنے تعمیر کردہ مدرسے میں اس کی تدفین کرائی۔

توران شاہ کی فتح یمن ایوبیوں کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی۔ انہوں نے وہاں کی تین تین چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے سلطنت ایوبی سے ملحق کر دیا۔ اور اس ملک پر اپنا پورا تسلط جما لیا۔

توران شاہ زندگی میں سلطنت اٹھانے والوں میں سے تھا۔ اس نے مصر کے زمانہ قیام میں ہی کافی دولت اکٹھی کر لی تھی۔ قیام یمن کے دوران میں بھی صلاح الدین ۵

ایوبی نے اسے بیش قیمت جاگیریں عطا کیں۔ لیکن باوجود اتنی جاگیروں کا مالک ہوتے ہوئے جب اس کا انتقال ہوا تو وہ دو لاکھ دینار کا قرض دار تھا۔ جو اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی نے ادا کیا۔

توفیق پاشا

——— خدیو مصر (۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۲ء) یہ خدیو اسماعیل پاشا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ مصر میں تعلیم پائی۔ انیس سال کی عمر میں مجلس خصوصی کے صدر کی حیثیت سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۰ر مارچ ۱۸۷۹ء میں جب نوبار پاشا مستعفی ہو گیا تو اس کے والد نے اسے وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن جلد ہی اس نئی وزارت کو ختم کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ شریف پاشا وزیر اعظم بنا۔ جب ۲۶ر جون ۱۸۷۹ء میں سلطان نے اسماعیل کو معزول کر دیا۔ تو قانون وراثت کے مطابق باپ کی جگہ توفیق پاشا تخت نشین ہوا۔

آغاز حکومت ہی میں توفیق پاشا کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شریف پاشا نے نئے خدیو کی خدمت میں آئین کا مسودہ پیش کیا۔ جسے خدیو توفیق پاشا نے مسترد کر دیا۔ چنانچہ ۱۸ر اگست کو شریف پاشا مستعفی ہو گیا اور کچھ عرصے تک مجلس وزراء کی صدارت توفیق پاشا خود ہی کرتا رہا۔ تھوڑے سے بعد ریاض پاشا کو اس عہدے پر فائز کیا گیا جس کی وزارت دو سال تک رہی۔ یہاں تک کہ عرابی پاشا کی قیادت میں فوج نے بغاوت کر دی۔ چنانچہ اس دوران میں ملک کے مالیات پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کی نگرانی دوبارہ قائم ہو گئی۔ ان حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کی خوشحالی کا جدید دور شروع ہو گیا ہے۔ لیکن جنوری ۱۸۸۰ء میں فوج میں بدامنی پیدا ہو گئی اور اس بدامنی کے نتیجے میں شریف پاشا کو دوبارہ اقتدار حاصل ہو گیا جس کی بنا پر عام قومی شورش رونما ہو گئی۔ خدیو توفیق پاشا کے ساتھ کوئی ایسی طاقت و جماعت نہ تھی جس کی طاقت کے بل پر وہ اپنا اختیار و اقتدار برقرار رکھ سکتا۔ اس کا حامی و محافظ سلطان روم جو مصر کا اختیار دار تھا، بھی کمزور ہی تھا اس لیے وہ بے بس اور ناچار دیکھتا ہی رہا اور قوم پرستوں نے جو اقدامات مناسب سمجھے کر ڈالے۔ قوم پرستوں نے ایک قدم یہ بھی اٹھایا کہ عمائدین کی ایک مجلس کا اجلاس بلایا۔ اگرچہ پہلے پہل تو قومی رہنماؤں نے نہایت ہی اعتدال پسندی کا ثبوت دیا لیکن بین الاقوامی مالی مشکلات کی وجہ سے غیر ملکیوں کے خلاف عام نفرت اور مخالفت کا زبردست جذبہ پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ جون ۱۸۸۲ء میں اسکندریہ میں قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۱ر جولائی کو انگریزی بیڑے نے شہر پر گولہ باری کی۔ خدیو توفیق پہلے ہی ارکان حکومت کے ساتھ دار الخلافہ سے بھاگ کر اسکندریہ کے قریب آ گیا تھا۔ اعرابی پاشا جواب خدیو کا مخالف تھا اور کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا تھا۔ خدیو کی قیام گاہ سے چند میل کے فاصلے پر مقیم ہو گیا۔ اب خدیو کے لیے دو راستے تھے یا تو قوم پرستوں کا ساتھ دے یا پھر غیر ملکی مداخلت قبول کرے۔ آخر کار قوم پرستوں کی بغاوت کو انگریزی فوجوں نے کچل ڈالا۔ خدیو قاہرہ میں واپس آ گیا اب اس کے لیے اپنا اقتدار بچانے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی تھی۔ کہ وہ غیر ملکیوں (انگریزوں) کی خواہش کے مطابق عمل پیرا ہو۔

خدیو توفیق پاشا کے زمانے ہی میں سوڈان کا صوبہ مصر سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے جلد ہی بعد توفیق پاشا کا حلوان کے خدیوی محل میں اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا عباس حلمی تخت نشین ہوا۔

توفیق پاشا کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ اتنی پریشانیوں اور سیاسی مشکلات

Marfat.com

کا، جو اسے پیش آئیں، مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ توفیق پاشا نرم مزاج آدمی تھا۔ جن لوگوں کو شخصی طور پر اس سے واسطہ پڑا، وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ان میں یورپی سیاست دان بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے اس کے بارے میں بہت سی اچھی باتیں بیان کی ہیں۔

توکل خدا پر بھروسہ رکھنا، اعتماد کرنا۔ توکل قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ عام طور پر لوگوں کے نزدیک توکل یہ ہے کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے اور بے کار بیٹھے ہوئے یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس کے لئے اسباب اور تدبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ صحیح معنوں میں توکل یہ ہے کہ کسی کام کو پورے ارادے اور عزم کے ساتھ انجام دے اور یہ یقین رکھے کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور کامیاب کرے گا۔ پس تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک کرنا توکل نہیں۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا ایک اہم راز ہے قرآن و حدیث میں توکل کے بارے میں جو تعلیم دی گئی ہے وہ ذیل میں درج ہے۔

ان آیات و احادیث میں توکل کا صحیح مفہوم بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے "اور معاملات میں ان سے مشورہ لے لو۔ پھر جب پکا ارادہ کر لو تو پھر اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور مومنوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔" (۳: ۱۵۹، ۱۶۰)

اے پیغمبر! پیروی کرو۔ اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی گئی ہے۔ بے شک اللہ خبردار ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ ہی کارساز ہے۔" (۳۳: ۲،۳)

"اے میری قوم! اگر میرا کھڑا ہونا اور میرا اللہ کی آیات سے نصیحت کرنا تم پر بھاری ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔" (۱۰: ۷۱)

"اے نبی تو ان منافقوں سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔" (۴: ۸۱)

"اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا اور اپنے بازو کو اس کے لیے جھکا جو مومنوں میں سے تیری پیروی کرتا ہے۔ سو اگر وہ تیری نافرمانی کریں تو کہہ دے میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے جب تو رات کو اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔"

(۲۶: ۲۱۴ تا ۲۱۹)

"اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی اس کی طرف جھک جا اور اللہ پر بھروسہ رکھ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو کچھ پروا نہ کر تجھے اللہ کافی ہے وہی ہے جس نے اپنی نصرت کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ تجھے قوت دی۔" (۸: ۶۱، ۶۲)

"یہ قرآن بنی اسرائیل پر بہت سی وہ باتیں بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور بے شک وہ مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے تیرا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ غالب علم والا ہے۔ سو اللہ پر بھروسہ رکھ۔ تو کھلے حق پر ہے۔" (۲۷: ۷۶ تا ۷۹)

"اور ہم نے تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دیجئے میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا (سوائے اس کے) کہ جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے اور اس زندہ رہنے والے (خدا) پر بھروسہ کر جسے موت نہیں۔"

(۲۵: ۵۶، ۵۷)

"اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں تو ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ کافی ہے۔ نہیں کوئی معبود لیکن وہی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔" (۹: ۱۲۹)

"میں نے تو جہاں تک ممکن ہے اصلاح کا ارادہ کیا ہے اور مجھے توفیق اللہ ہی سے ملی ہے۔ اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (۱۱: ۸۸)

"اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے۔ وہی اللہ ہے میرا پروردگار۔ اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (۴۲: ۱۰)

ان آیات اور اس قسم کی اور بہت سی آیات میں کہیں عزم کے بعد، کہیں عمل کے، کہیں دشمنوں کے مقابلے میں استقلال کے بعد، کہیں بقدر وسعت و طاقت، اصلاح قوم کے بعد، کہیں ضعف قلب کو زائل کر کے جرأت ظاہر کرنے کے بعد توکل کا اعلان کیا گیا ہے یا توکل کی تعلیم دی گئی ہے۔

ایک حدیث میں صحیح توکل کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

کہ ایک شخص آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کیا میں اپنی اونٹنی کو اللہ پر توکل کرتے ہوئے کھلا چھوڑ دوں؟ آپؐ نے فرمایا اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔" (ترمذی)

بعض روایات میں آیا ہے کہ کچھ لوگ زاد راہ لیے بغیر حج کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے اور کہا کرتے تھے "نحن المتوکلون" ہم متوکل ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے اس طرز عمل کو غلط بتاتے ہوئے ان کی اصلاح کی ہے اور فرمایا "زاد راہ لے کر چلو۔"

اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسباب سے کام نہ لینا اور اسے توکل قرار دینا بہت بڑی غلط فہمی ہے اور دین کو نا سمجھنے کی بات ہے اور ایسے توکل کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بقول امام قشیریؒ "توکل کا محل (مقام) قلب ہے اور ظاہری ہاتھ پاؤں ہلانا قلبی توکل کے منافی نہیں۔ آنحضورؐ متوکلانہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ لیکن کسب بھی آپؐ ہی کی سنت تھی۔

توکل کا طبعی نتیجہ صبر ہوتا ہے یا شکر۔ اگر متوکل آدمی کی منشا کے مطابق معاملات وقوع پذیر ہوتے ہیں تو اس سے تشکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اگر معاملات اس کے برخلاف وقوع پذیر ہوتے ہیں تو صبر کی قلبی عبادت ظاہر ہوتی ہے۔

ابو علی دقاق کے نزدیک متوکلانہ زندگی کے تین درجات ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ توکل ہے جو مومنین کی صفت ہے۔

پس کسی کام کو سرانجام دے کر اس کا نتیجہ خدا پر چھوڑ دینا توکل ہے۔ ایسے ہی توکل کے بارے میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

"میری امت کے ستر ہزار آدمی بے حساب جنت میں جائیں گے۔ اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں نہ تو منتر جنتر کراتے تھے نہ شگون لیتے تھے بلکہ ہر حال میں خدا پر بھروسہ کرتے تھے۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"اگر تم لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے جیسا کہ اس پر بھروسہ رکھنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اسی طرح روزی دیتا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے اور شام کو

Marfat.com

شکم سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔" (ابن ماجہ)

توکلی، نور بخش مولانا (۱۸۷۷ء/ ۲۲ مارچ ۱۹۴۸ء) ایک عالم دین اور مصنف موضع چک قاضیاں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بزرگان دین سے ارادت مندی اور عقیدت آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ اپنی ذہانت، محنت اور شریف النفسی کے باعث اساتذہ اور ہم عمر ساتھیوں میں مقبول تھے۔ مقامی مدرسین سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے عربی کی امتیازی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸۹۳ء میں محمڈن سکول چھاؤنی انبالہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ انبالہ ہی میں حضرت توکل شاہ سے بیعت ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں میونسپل بورڈ کالج امرتسر میں پروفیسر مقرر ہوئے علم دین کے حصول شوق نے اس دور میں بھی آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ مولانا غلام رسول قاسمی سے آپ نے فقہ، حدیث، تفسیر اور معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ سائیں توکل شاہ کی وفات کے بعد مولوی مشتاق احمد محدث انبیٹھوی سے بیعت ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد لاہور تشریف لے آئے اور ایک مدت تک انجمن عثمانیہ کے دارالعلوم کے اعزازی ناظم تعلیم رہے۔ اور ماہوار رسالہ انجمن نعمانیہ کے ایڈیٹر بھی۔ اس دوران میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ ایک عرصے تک انجمن نعمانیہ کی دینی درسگاہ کے ناظم امور تعلیمات رہے۔ آپ کی یہ ساری خدمت اعزازی تھی۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے چک قاضیاں میں ایک مدرسہ اسلامیہ توکلیہ کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے سے بہت سے طلبہ فیضیاب ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ نے لائلپور میں سکونت اختیار کر لی آپ نے آخری وقت تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

ایک روز مکان کی سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا۔ جس سے کافی زخم آئے آپ ان زخموں کی تاب نہ لا سکے اور اسی روز آپ کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق نور شاہ ولی کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں سیرت رسول عربی، عید میلاد النبی، معجزات النبی اعجاز القرآن، شرح قصیدہ بردہ (عربی و اردو) غزوات النبی، حلیۃ النبی، شرح ہدایہ، کتاب البرزخ، مقدمہ تفسیر القرآن، امام بخاری و شافعی، تفسیر سورۃ فاتحہ سورۃ البقرہ، تذکرہ غوث الاعظم وغیرہ ہیں۔

تونس ایک اسلامی ملک اور ایک شہر جو تونس ملک کا صدر مقام ہے۔ تونس ملک جو قرون وسطیٰ میں افریقیہ کہلاتا تھا۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۵۱۸۰ مربع کلومیٹر ہے اور ۶۳۳۷۹ مربع میل ہے۔ اس کے مغرب میں الجزائر۔ جنوب میں صحرائے اعظم جنوب مشرق میں دور جا کر لیبیا شمال مشرق میں بحیرہ روم کے ساحل ہیں۔ شمال مغرب میں خمیر اور مگود کے پہاڑ ہیں جو ساحل کے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں مشرق میں یہ پہاڑ گھٹتے گھٹتے ان پہاڑیوں سے آ ملتے ہیں جو بنزرت اور ماطر کے رسوبی میدانوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

تونس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس علاقے پر نو سو سال تک بربر حکومت کرتے رہے۔ اسے فتح کرنے کے لئے عرب حملہ آور جو جنوب مغرب سے آئے تھے۔ تقریباً نصف صدی تک یہاں کے بربر باشندوں اور بزنطی عمال کے خلاف شدید جنگیں لڑتے رہے۔

عربوں سے پہلے دو حملے جن کے درمیان اٹھارہ سال کا وقفہ تھا ان کی صورت صرف قتل و غارت کی تھی لیکن ان کی وجہ سے زیادہ منظم مہمات کے ذریعے ملک کو باقاعدہ فتح کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ ان دنوں بزنطی افریقیہ سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔ ۶۶۲ء تک المغرب کی ولایت کا الحاق مصر کے ساتھ ہو چکا تھا۔ یہ قبضہ ۶۶۹ء اور ۶۷۵ء کے درمیانی عرصے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں عقبہ بن نافع نے فتوحات سرانجام دیں اور قیروان کی بنیاد پڑی۔ اسی زمانے میں بزاسین پر عربوں کا مکمل طور پر قبضہ ہوا اور بربری قبیلوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ لیکن اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ایک نئے اسلامی شہر کی بنیاد پڑی۔ ۶۸۱ء میں عقبہ واپس آ گیا۔ لیکن دو سال بعد ہی وہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں تنگتانیا تک جا نکلا اور واپسی پر علاقہ زاب میں باغیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ یہ بغاوت اہل ملک نے کی تھی جس کا سرغنہ کسیلہ تھا اور اس کی امداد رومی کر رہے تھے۔ وہ کئی سال تک ایک وسیع بربری ریاست پر حکمران رہا اور عربوں کے نئے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔

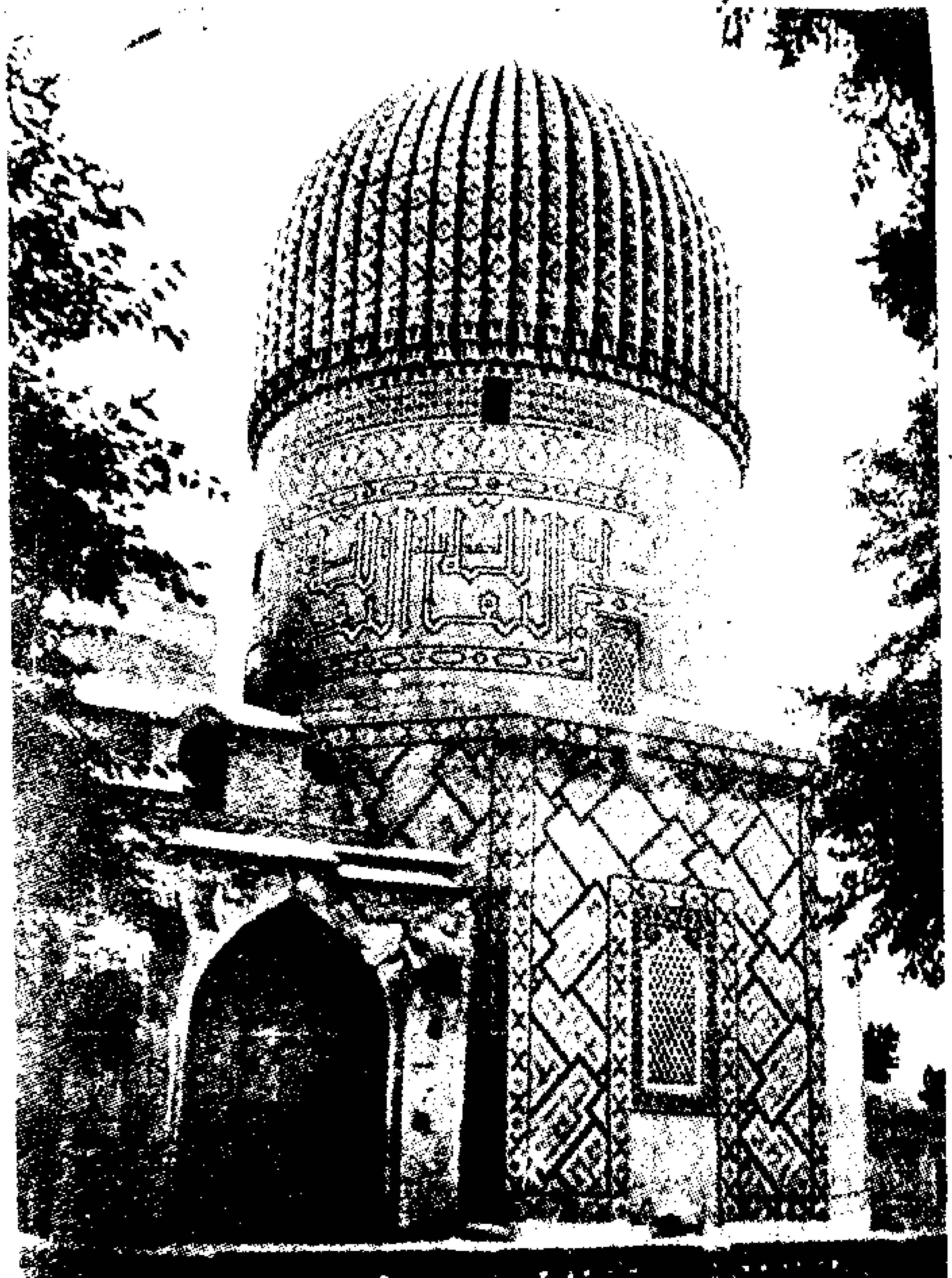

تلمسان کی جامع مسجد (تعمیر ۱۰۸۲ء) کا ایک منظر

Marfat.com

۶۸۸ء میں سیبہ کے علاقے میں ایک حملے کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ ۶۲ھ ۶۹۳ء میں بنو امیہ اپنے داخلی حالات درست کرکے اس قابل ہوسکے کہ توسیع سلطنت کی پالیسی پر دوبارہ عمل پیرا ہوسکیں۔ چنانچہ حسان بن نعمان چالیس ہزار فوج لے کر بزاسین پر حملہ کرنے کے لیے آیا۔ ۶۹۵ء میں اس نے قرطاجنہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن دو سال بعد یہ علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن اگلے ہی سال اس نے دوبارہ قرطاجنہ پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ اور حزب مضبوطی سے یہاں اپنے قدم جما لئے۔ ۶۹۸ء میں عرب وہ تمام علاقہ جو اب مملکت تونس میں شامل ہے۔ بربروں اور بزنطیوں سے چھین چکے تھے۔ حسان نے تونس کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشین موسیٰ بن نصیر نے زغوان فتح کیا۔ اور پھر افریقہ کے بربروں کو ساتھ لے کر فتح المغرب کی جانب بڑھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں شمالی افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح اس حصے میں بھی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ یہاں کے باشندوں نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح فساد عقیدہ کی آڑ لے کر دوبارہ خود مختار ہوجائیں آخری اموی خلفاء اس دور دراز صوبے کو جو ان کے ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا اپنے ماتحت رکھنے میں ناکام رہے۔ ادھر عباسی یہ چاہتے تھے کہ اگر اندلس ان کی اطاعت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکتا ہے تو کم سے کم افریقہ ہی ابوالخطاب اباضی سے چھین کر واپس لے لیں۔ چنانچہ عباسی جرنیل محمد بن الاشعث نے دوبارہ قیروان کو فتح کیا لیکن اس کی حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اور وہ ۶۵ء میں دوبارہ واپس جانے پر مجبور ہوگیا۔ اس کا جانشین الاغلب بن سالم بھی باغیوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ اور ۷۶۷ء کی بغاوت میں مارا گیا اور پانچ سال تک ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم رہا۔ ۷۷۲ء تا ۷۹۴ء افریقہ میں آل مہلب حکمران رہے یہ خاندان ایک مدت تک امن و امان قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ بنو مہلب کے آخری حکمران الفضل کی وفات کے بعد دوبارہ فتنہ و

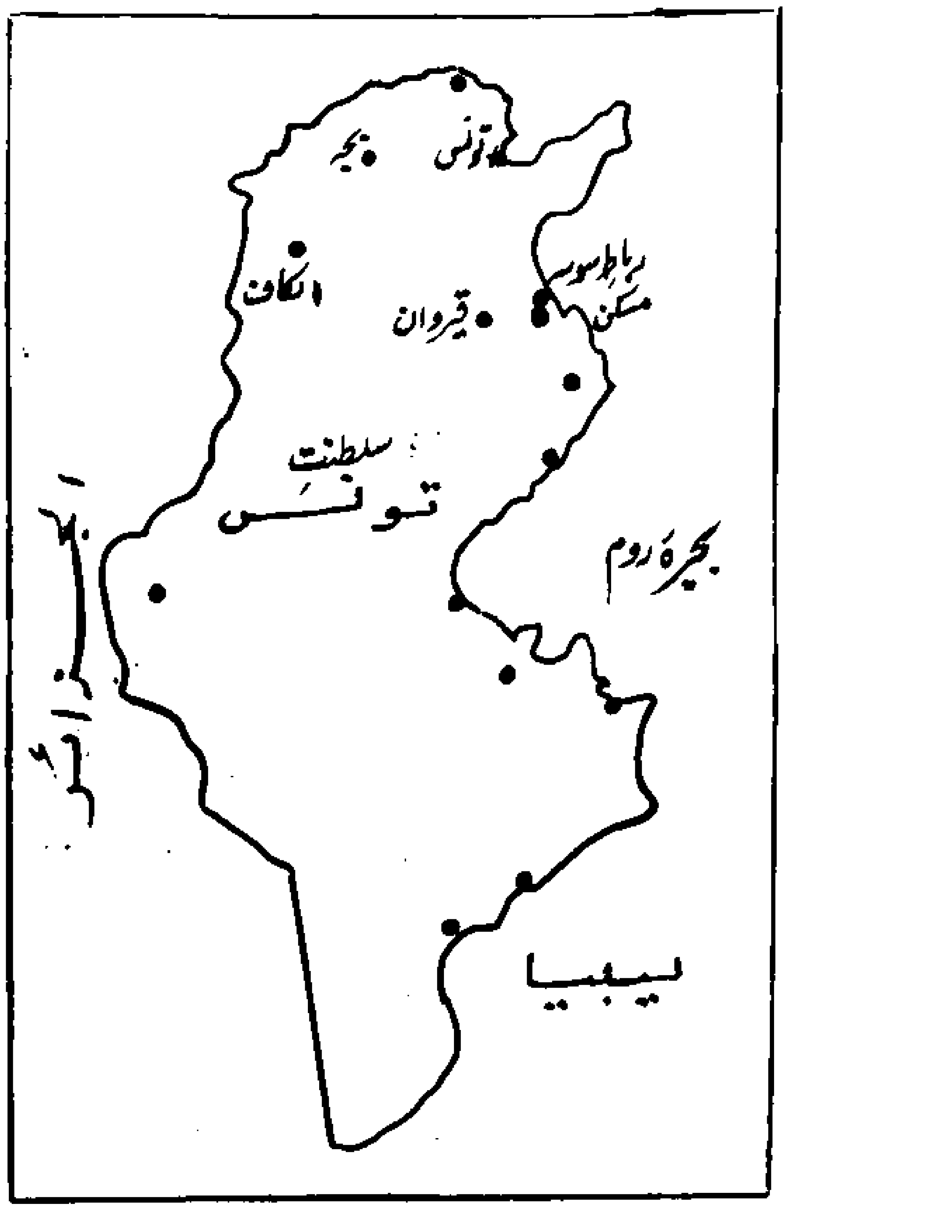

فساد کا بازار گرم ہوگیا ۸۰۰ء میں ابراہیم بن اغلب عباسیوں کے حامی کی حیثیت سے اپنے صوبے زاب میں جہاں اس کا باپ والی رہ چکا تھا اچانک آموجود ہوا۔ اور ابن مقاتل کو بھی قیروان میں واپس لے آیا جس کو تونس کی تمیمی سپاہ نے وہاں سے بھگا دیا تھا۔ ہارون الرشید نے ابراہیم کا ایک باجگزار امیر کی حیثیت سے تقرر کردیا۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے لے کر ۹۰۹ء تک بنو اغلب تونس پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس خاندان نے تونس میں بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں یہ امیر اگرچہ ظاہراً خلیفہ بغداد کے ماتحت تھے لیکن عملاً خود مختار تھے۔ حکومت ان کے خاندان میں موروثی تھی وہ ہمیشہ توسیع مملکت کی حکمت عملی پر کاربند رہے اگرچہ ابراہیم خود تمیمی تھا لیکن اس خاندان کو ہمیشہ بنو تمیم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا مسکن تونس تھا۔ چنانچہ بنو تمیم اکثر بغاوتیں اور شورشیں برپا کرتے رہے۔ ۸۰۲ء میں ملک تونس میں ایک بغاوت برپا ہوئی۔ جسے ابراہیم نے دبا دیا۔ ۸۰۵ء میں اسے طرابلس کی بغاوت سے واسطہ پڑا۔ ۸۱۰ء میں اس کے جرنیل عمران بن مخلد نے بغاوت کردی۔

ابراہیم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا زیادۃ اللہ (۸۱۷ء تا ۸۳۸ء) تخت نشین ہوا۔ اسے بھی ایک طاقتور حریف منصور الطنبذی سے واسطہ پڑا۔ کئی سال تک ملک تونس کا تمام شمالی علاقہ امیر کی دسترس سے باہر رہا۔ لیکن زیادۃ اللہ نے اپنی عقلمندی اور ذہانت سے اس علاقے کو دوبارہ واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے فسادی فوج کی توجہ سسلی کے جہاد کی طرف مبذول کردی اور اس طرح یہ فوج کی طرف سے مطمئن ہوکر تعمیرات کی طرف متوجہ ہوا۔ ۸۲۱ء میں اس نے رباط سوسہ تعمیر کرایا۔ قیروان میں ایک جامع مسجد بنوائی اور اسی طرح کی کئی اور تعمیرات کرائیں ۸۳۱ء میں پلرمو فتح ہوگیا اور اس کے ۱۲ سال بعد مینہ کی بھی تسخیر ہوگئی۔

تعمیرات کا کام زیادۃ اللہ کے جانشینوں نے بھی وسیع پیمانے پر جاری رکھا۔ ۸۵۰ء میں سوس اور سفاقس کی جامع مساجد تعمیر ہوئیں۔ امیر احمد اس معاملے میں ان سے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ۸۶۰ء کے لگ بھگ ان دونوں شہروں کے گرد فصیلیں بنوائیں اور مشہور تالاب جو اغلبیوں کے تالاب کے نام سے مشہور ہے بنوایا۔ اس تالاب سے قیروان کو پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ امیر ابراہیم ثانی جو اپنے بھائی محمد کے بعد ۸۷۴ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے قصر القدیم کو خیرباد کہہ کر ایک جدید مسکونی قصبہ رقادہ بسایا جو قیروان سے پانچ میل جنوب میں واقع تھا۔

سسلی کی فتح ۸۷۸ء میں سیراقوسہ اور ۹۰۲ء میں طبرمین کے فتح ہونے سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ۹۰۲ء میں ابراہیم ثانی اپنے بیٹے عبداللہ کے حق میں دستبردار ہوگیا اسی سال بنو اغلب نے کتامہ کے خلاف ایک مہم بھیجی جو بڑی مشکلات کے بعد کامیاب ہوسکی۔ ۹۰۳ء میں زیادۃ اللہ ثالث کے عہد میں جو اپنے باپ عبداللہ کو قتل کرنے کے بعد امیر بنا تھا شیعی خطرے کا دباؤ کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگا۔ اس کے زمانے میں ۹۰۷ء میں باغایہ اغلبیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۹۰۹ء میں الاربس کی فتح کے بعد امیر زیادۃ اللہ ثالث نے بغداد کی طرف راہ فرار اختیار کی اور شیعی داعی مہدی ملک رقادۃ میں داخل ہوگیا اور اس طرح تونس ملک میں فاطمی خلافت قائم ہوگئی۔

اغلبی دور فقہی مباحث کے لحاظ سے ایک سنہری زمانہ تھا۔ اس دور میں مختلف مذاہب فقہ ہوئے۔ اور احادیث کی امہات کتب تالیف ہوئیں۔

Marfat.com

خراسان کو ملک تونس میں یہ طاقت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ مذہب اہلسنت کے مقابلے میں ملک کے اکثر حصے میں غلبہ حاصل کر سکیں۔ اس دوران میں ملک تونس میں کئی بڑی شخصیات نے جنم لیا۔ ان میں قاضی عبدالرحمان بن زیاد جو ابن الاشعث کے رفیق کار تھے۔ اسد بن الفرات جو خراسانی تھے۔ اور مصر کے مالکی فقیہ امام عبدالرحمان کے شاگرد تھے۔ امام سحنون جو اسد بن الفرات کے شاگرد تھے اور قیروان کے قاضی تھے اور انہوں نے مالکی مذہب کو خوب ترقی دی۔ اس وقت سے تونس کا غالب مذہب مالکی ہی ہے۔

فاطمی خلفاء کی نظریں اوّل روز سے ہی مصر پر لگی ہوئی تھیں اور جب تک اسے زیر نہ کر لیا گیا وہ وہاں فوجی مہمات بھیجتے رہے۔ ۹۱۱ء میں عبیداللہ (مہدی) نے جو پہلا فرمانروا تھا۔ اپنے داعی ابو عبداللہ کو قتل کرا دیا جس کی کوششوں کی وجہ سے اسے تاج و تخت ملا تھا۔ ۹۱۴ء میں اس نے اپنے بڑے بیٹے کی سرکردگی میں الفیوم پر حملے کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی ایک دوسری فوج نے اسکندریہ پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کر لیا۔ عبیداللہ (مہدی) کو مغرب میں بہت زیادہ کامیابیاں حاصل ہوئیں اور اس نے ایک وسیع علاقے پر فاطمیوں کا اقتدار قائم کر دیا اس کے بعد ابوالقاسم نزار المتلقب القائم بامر اللہ اس وسیع سلطنت کو جو اسے ورثہ میں ملی بڑی مشکل سے ہی اس پر اپنا اقتدار قائم رکھ سکا۔ ابویزید بن کیداد جو "صاحب الحمار" کے نام سے مشہور تھا نے افریقہ کے شہروں پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ اس نے مشرقی اوراس کے آوارہ قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر ایک زبردست بغاوت برپا کر دی۔ دوسری طرف خارجی بربروں نے باجہ اربس، قیروان اور سوسہ کو تاخت و تاراج کر ڈالا اور تونس پر قبضہ کر لیا۔ اور خلیفہ کو اس کے پایۂ تخت مہدیہ میں محصور کر دیا جہاں اس نے ۹۴۶ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے اسماعیل (المنصور) نے ان لوگوں کی مدد سے جو ان حملہ آوروں سے تنگ آ چکے تھے۔ صورت حالات پر قابو پا لیا۔ اور اس طرح ایک پر آشوب دور کا خاتمہ ہونے کے بعد تونس میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ منصور نے امن و امان کے فوراً بعد صبرۃ (المنصوریہ) نامی ایک شاندار اور بارونق شہر کی بنیاد ڈالی۔ ۹۵۳ء میں المعز تخت نشین ہوا اس کے دور حکومت میں ۹۶۹ء میں فسطاط فتح ہوا۔ اور اگلے سال ہی دمشق پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ ۹۷۳ء میں خلیفہ المعز نے قاہرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور افریقہ کو اپنے ایک قابل معاون بربری امیر بولوگین بن زیری کے سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

چنانچہ ۹۷۳ء سے تونس پر بنو زیری حکومت کرنے لگے۔ ان کے عہد حکومت میں جن کا تقرر ہمیشہ قاہرہ سے فاطمی خلفاء کرتے تھے۔ افریقہ نے ترقی و خوش حالی کا دور دیکھا۔ اگرچہ کئی ایک واقعات ایسے ضرور وقوع پذیر ہوتے رہے جن کا اثر اس ترقی و خوش حالی پر بھی پڑا۔ لیکن ان تمام واقعات کے باوجود گیارہویں صدی کے نصف تک المعز بن بادیس کے عہد حکومت میں افریقہ کی خوشحالی اوج کمال پر پہنچ گئی۔ المعز بن بادیس جس کی مصر کے فاطمی خلفاء بڑی عزت کرتے تھے اور سارے مغرب میں جس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی ۱۰۵۰ء تک فاطمیوں کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا اور فاطمی اطاعت سے منحرف ہو کر عباسیوں کی بیعت کر لی۔ فاطمیوں نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے اس باغی حکمران کے خلاف خانہ بدوش ہلالی عربوں کے غارت گر دستے بھیجے۔ چنانچہ ۱۰۵۱ء جس میں بنو ریاح بنو ہلال میں سے سب سے پہلے افریقہ پہنچے تونس کی تاریخ میں ایک نقطہ انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے حملہ آوروں نے جو لاکھوں کی تعداد میں آ گئے تھے شمالی افریقہ کا حلیہ بگاڑ دیا۔ المعز مہدیہ چلا گیا۔ بربروں کو شمالی افریقہ میں اور پرے تک دھکیل دیا۔ مرکزی حکومت کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔ بڑے بڑے شہر عربوں کے قبضے میں آ گئے یا خود مختار بن بیٹھے۔ مقامی سرداروں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں

بنو زیری ان تمام مشکلات کے باوجود مہدیہ میں جمے رہے اور وہاں سے سوسہ اور قابس کے درمیانی ساحل پر حکمرانی کرتے رہے۔

یحییٰ بن تمیم (م ۱۱۱۶ء) اور اس کے بعد اس کے بیٹے علی (م ۱۱۲۱ء) نے فاطمی خلفاء کی دوبارہ اطاعت قبول کر لی اور عربی قبیلوں کی مدد سے خشکی اور تری کے علاقوں پر کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں لیکن اچانک ایک متوقع دشمن نے انہیں مغلوب کر لیا یہ دشمن نارمن تھے جو سسلی اور مالٹا فتح کر چکے تھے۔ اور اب افریقہ کے معاملات میں بھی دخل انداز ہونے لگے تھے۔ اور بالآخر حسن بن علی کو ۱۱۴۸ء میں مہدیہ سے نکال دیا اور سوسہ سے طرابلس تک کے تمام ساحلی شہروں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۱۵۹ء و ۱۱۶۰ء میں عبدالمومن الموحدی نے انہیں کفار سے نجات دلائی۔ عبدالمومن نے تمام مخالفین کا قلع قمع کر کے۔ شمالی افریقہ کی سیاسی وحدت ایک بار پھر بحال کر دی جو تقریباً پچاس سال تک قائم رہی۔ ۱۲۰۰ء میں بنو مرابطین کے یحییٰ ابن اسحاق بن محمد ابن غانیہ نے ملک تونس کے تمام حصے پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۲۰۵ء۔ ۱۲۰۶ء میں خلیفہ الناصر نے ایک مہم بھیجی جس نے المرابطین کے دور کو ختم کر دیا۔ اور زبردست صوبائی حکومت قائم کی اور اس کا انتظام شیخ عبدالواحد بن ابی حفص کے حوالے کیا۔ اور اس طرح بنو حفص کی افریقہ پر حکمرانی قائم ہو گئی۔ ابو زکریا (یحییٰ) اپنے بھائی عبداللہ کو اپنے راستے سے ہٹا کر رفتہ رفتہ خود مختار ہو رہا تھا۔ اس عظیم الشان خاندان بنو حفص کا اصل بانی ہے جو تقریباً ساڑھے تین سو سال حکومت کرتے رہے انہوں نے دوبارہ مالکی مذہب اختیار کیا۔ ۱۲۵۰ء میں ابو عبداللہ محمد بن ابو زکریا جو اس خاندان کا دوسرا خود مختار امیر تھا کی خلافت کا مکہ مکرمہ سے اعلان کیا گیا اور اس نے خلیفہ المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے دور میں سلطنت کی وسعت طرابلس سے لے کر الجزائر کے اندر تک تھی اور بڑے بڑے شہروں یعنی تونس (شہر) قسطنطنیہ اور بجایہ میں مضبوطی سے قائم تھی۔ اس سلطنت کا رعب و داب شمالی افریقہ کی حدود سے باہر بھی قائم تھا۔ اسی وجہ سے ہسپانیہ اور مسیحی یورپ کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ اس دور میں علم فقہ اور فن تعمیر کو ملک تونس میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ حفصیوں کے عظیم الشان بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ابو عمر عثمان کا نام جس نے ۱۴۳۵ء سے ۱۴۸۸ء تک حکومت کی اس صدی کے سارے حکمرانوں کے ناموں پر چھایا ہوا ہے۔ عثمان کی وفات کے بعد حالات بہت خراب ہوتے چلے گئے۔ چند سالوں کے اندر تین خلیفہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور اس طرح یہ عظیم الشان سلطنت آہستہ آہستہ ہسپانیوں کے حملے کے سامنے دم توڑنے لگی۔ جو ترک بحری قزاقوں کے تعاقب میں ان علاقوں میں آنے لگے تھے اور اور رفتہ رفتہ مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے لگے تھے۔ بالآخر ستمبر ۱۵۷۴ء میں عثمانی فوجوں نے جو قسطنطنیہ سے سنان پاشا کے بیڑے میں بھیجی گئی تھیں حلق الوادی اور تونس کو فتح کر لیا اور اس طرح ہسپانوی قبضے کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی حفصی خاندان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ سنان پاشا نے ملک تونس کو مستقل ترکی صوبہ قرار دیا اور اس کا ایک حاکم اور ایک پاشا مقرر کیا۔ ۱۵۸۷ء میں اس صوبے کو براہ راست باب عالی کے تحت لے لیا گیا۔ ۱۶۱۰ء تا ۱۶۳۷ء جبکہ تونس کی نیابت یوسف کے ہاتھ میں تھی تو تونس کی نیابت نے

Marfat.com

طرابلس کے پاشا سے جبراً واپس لے لیا۔ اس طرزِ عمل سے تونس اور الجزائر کی سرحد متعین ہوگئی۔

انیسویں صدی میں نیابت تونس کی سیاسی حیثیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ جب ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہوگیا تو اس کے اثرات تونس پر بھی پڑے۔ تونسیوں نے نصف صدی تک اپنے اندرونی نظام کی ترمیم و تجدید سے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے کی بے سود کوشش کی۔ اس کے لئے ایک طرف تو ڈھیلی ڈھالی عثمانی اختیارداری تھی اور دوسری طرف اس کے معاملات میں عیسائی حکومتوں کی دخل اندازی جو وہ اپنے قنصلوں کے ذریعے کرتی رہتی تھیں۔ تونس کی حکومت کو ان کے بین بین چلنا پڑتا تھا۔

خلافت عثمانی کا حق اختیارداری جس کی برطانیہ کی طرف سے تائید ہوتی تھی اور فرانس کی جانب سے مخالفت صرف چند شاہی فرمانوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا تھا جو بایٔ کے تقرر کے وقت جاری ہوتے تھے۔

۱۸۷۸ء میں برلن کانگرس کے بعد سے برطانیہ اور جرمنی فرانس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اس وقت فرانس نے تونس میں دخل اندازی کی۔ جب اہل خمیر نے الجزائر پر حملے کئے تو فرانس کے وزیر ژول فیری نے اپریل ۱۸۸۱ء میں تونس پر حملہ کرنے کے لئے تیس ہزار فوج بھیج دی۔ فرانسیسی جرنیل بریار نے ۱۲ مئی کو ترکی احتجاج کے باوجود محمد الصادق بای تونس سے معاہدہ باردو پر دستخط کرا لیے۔ جس کی رو سے نیابت تونس کے کل فوجی خارجی اور مالی معاملات پر فرانس کا عملاً تصرف ہوگیا۔ اور وہاں پر ایک فرانسیسی وزیر مقیم مقرر کیا گیا۔ اس طرح یہ نیابت تونس فرانس کے زیرِ حمایت آگئی اگرچہ اس وقت تو زیرِ حمایت کا لفظ استعمال نہ کیا گیا لیکن اس کے بہت جلد بعد جب وسطی تونس اور جنوب میں علی بن خلیفہ کے زیرِ حمایت ایک شورش برپا ہوئی تو اسے فرانسیسیوں ایک دوسری مہم کے ذریعے دبا دیا۔ تو یہ ملک قطعی طور پر فرانس کی حمایت میں آگیا۔

فرانس کے زیرِ حمایت آجانے سے تونس کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اب بای برائے نام اس نیابت کا اختیاردار امیر اور صاحبِ مملکت تھا۔ وزیر مقیم جو وزیر مفوض برائے نیابت تونس کہلاتا تھا عملی طور پر یہاں کا حقیقی حکمران تھا۔ یہ ایک امر واقع ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں دس ہزار تونسیوں نے فرانس کی خاطر جان دے دی۔ اس دور میں تونس میں دوہری حکومت قائم رہی یعنی ایک طرف تو بای کی حکومت جو روایتی تھی اور دوسری طرف فرانس کی حکومت تھی۔ فرانس نے تونس کے قرضے کی ادائیگی کی ضمانت بھی دی تھی اس لیے برطانیہ اور اطالیہ دونوں اس بات پر راضی ہو گئے کہ مالی کمیشن توڑ دیا جائے چنانچہ ۱۸۸۴ء میں اسے توڑ دیا گیا۔

فرانس کے عہدِ حمایت کے آغاز میں اور ۴ فروری ۱۸۸۳ء کے بموجب مقیم عام کا بلافصل معاون "دبیر عام حکومت تونس" تھا جو ہر قسم کے سرکاری مکاتیب کی نگرانی کرتا تھا۔ اور وزیر اعظم کے باب میں اس کا وہی مقام تھا جو بای کے باب میں مقیم عام کا تھا ۱۴ جولائی ۱۹۲۲ء سے یہ عہدہ اڑا دیا گیا۔ اور اس کی جگہ نائب مقیم عام نے لے لی۔ ۱۰ فروری ۱۹۲۳ء کو ایک صدارتی فرمان کی رو سے اس کے اختیارات کی تحدید کی گئی۔ ملک کا جنوبی حصہ فوجی علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس حصے کو چھوڑ کر باقی ملک پانچ کوروں میں منقسم کر دیا گیا۔ ہر کورہ متعدد داخلی نظارتوں میں منقسم تھا۔ جن کی تعداد ۱۹ تھی۔ ۲۷ مارچ ۱۹۲۸ء کے فرمان کے مطابق اقلیمی بلدیات کا قیام عمل میں آیا۔ ان کے ارکان کا انتخاب ہر چھ سال بعد ہوتا تھا۔

۱۹۳۰ء میں حزب "نو دستور" وجود میں آیا۔ اگرچہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی آزادی کے حصول کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس جنگ کے بعد اس تحریک نے بہت زور پکڑا۔ لیکن فرانس کب چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے یہ علاقہ نکلے۔ چنانچہ حزب نو دستور جن کا سب سے بڑا مقصد عوام تک پہنچنا اور انہیں منظم کرنا تھا، وجود میں آیا تو حکومت فرانس نے ان پر سختی کی اور بہت سی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ دستور و نو دستور دونوں کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے خطرے کے پیش نظر بعض صلح جویانہ اقدامات بھی کیے گئے۔ جونہی دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی تونس اور متصلہ علاقے جنگ کی لپیٹ میں آگئے۔ ۱۹۴۳ء میں قوم پرستوں نے دوبارہ سر اٹھایا تو انہیں پھر طاقت کے زور سے دبا دیا گیا۔ لیکن اس مرتبہ قوم پرستوں نے بڑے عوام و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد کے برسوں میں کچھ اصلاحات کی گئیں۔ مگر فرانسیسی حکومت کا ردعمل چونکہ بہت سست تھا اور قوم پرستوں کے مزاج کے مطابق نہ تھا اس لیے ان کا جوش آزادی بڑھتا گیا۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں فرانس تونس کو داخلی آزادی دینے پر آمادہ ہوگیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو تونس آزاد ہوگیا اور حبیب بورقیبہ نئی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ انہوں نے تونس کو آزاد کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو تونس میں عام انتخابات منعقد ہوئے اور ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء میں تونس کو جمہوریہ قرار دیا گیا اور حبیب بورقیبہ ملک کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں ملک کو نیا دستور دیا گیا۔ ۸ نومبر کو قومی اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے اب ملک ۱۴ ولایتوں میں تقسیم ہے۔ اور ہر ولایت کا حاکم والی کہلاتا ہے۔ اس کا معاون معتمد کہلاتا ہے۔

۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء کو لیبیا اور تونس کے انضمام کا اعلان کیا گیا اور اس مشترکہ ریاست کا نام "اسلامی عرب جمہوریہ" رکھا گیا۔ مگر اس اعلان پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

اقتصادی و دیگر معلومات: آئین کی رو سے ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ کل رقبہ ۱۶۴۱۵۰ کلو میٹر ہے (۶۳۳۶۲ مربع میل) ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ایک اندازے کے مطابق تونس کی آبادی ساٹھ لاکھ تھی۔ جس میں ۹۷ فیصد مسلمان ہیں۔ عربی سرکاری زبان ہے۔ البتہ فرانسیسی بھی بولی سمجھی جاتی ہے۔

تونس میں تعلیم پر سرکاری کنٹرول ہے۔ ۱۹۷۴ء میں وہاں ۹ لاکھ ۴ ہزار طلباء پرائمری میں، ایک لاکھ اسی ہزار طلباء ثانوی اور پیشہ ورانہ سکولوں میں اور ۱۵ ہزار طلباء اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے۔ تونس میں ایک یونیورسٹی ہے۔

تونس بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ جہاں مکئی، گندم، جو، جوار، باجرہ زیتون، کھجور، نارنگیاں، لیموں اور دیگر پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ایک خاص قسم کی گھاس بھی پیدا ہوتی ہے، جس سے کاغذ بنتا ہے۔ زیادہ تر تجارت برطانیہ سے ہوتی ہے ملک بھر میں ریل، سڑک، ہوائی راستوں، ٹیلیفون، تار، ڈاک وغیرہ کا جال بچھا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر تونس ایک ترقی پذیر ملک ہے۔

تونس جمہوریہ تونس کا دارالحکومت۔ آج کل تونس دو شہروں پر مشتمل ہے جو اگرچہ ایک دوسرے سے متصل ہیں لیکن تمدنی زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے بالکل مختلف ہیں۔ ایک شہر جس میں ملکی باشندوں کی آبادی ہے عہد قدیم کی یادگار ہے۔ جبکہ دوسرا شہر یورپی طرز کا ہے۔ جس کی بنیاد زمانہ قریب ہی میں ڈالی گئی اور مزید ترقی کر رہا ہے۔ پرانا شہر تونس جھیل کے کنارے سے تقریباً پون میل کے فاصلے پر ہے۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی تونس پر وہ تاریکی سے نکل کر ایک اسلامی شہر

Marfat.com

کی حیثیت میں اُبھرا۔ اس نے جلد ہی قرطاجنہ کا مقام حاصل کر لیا۔ ۶۹۸ء میں جب حسان بن النعمان نے قرطاجنہ کو فتح کر کے برباد کر دیا تو اسے سب سے پہلے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جھیل کے کنارے چھوٹے قصبے کو بحری مرکز میں تبدیل کر دے جہاں سے بحری بیڑے دور دراز مہموں پر روانہ ہو سکیں۔ اور وہ قصبہ بزنطی بڑے کے اچانک حملے سے بھی محفوظ رہ سکے۔ اس نے تونس میں ایک دارالصناعة بھی قائم کیا اور جہاز سازی کے اس دارالصناعة میں کام کرنے کے لئے مصر سے ایک ہزار قبطی خاندان یہاں لا کر آباد کئے۔ پہلے پہل یہاں عیسائی سوداگر وارد ہوئے لیکن جلد ہی نو مسلم باشندے کثیر تعداد میں یہاں آنے لگے جہاں عرب سپاہی بھی ان کے ساتھ آ ملے۔ ۱۱۴ھ/۷۳۲ء میں اموی والی ابن الحجاب نے یہاں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔ بقول یعقوبی شہر کے اردگرد گارے اور کچی اینٹوں سے فصیل تعمیر کی گئی تھی ——— ——— یہ فصیل کس نے تعمیر کرائی، اس بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ شہر اچانک ظہور میں آیا۔ قیروان کی طرح وہ کسی خاص منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آیا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں تونس نے خاص اہمیت حاصل کر لی اسکی شہرت فقہی اور مذہبی تعلیم کے لحاظ سے تھی۔ یہاں پر روزگار زمانہ علماء معلمین کی ایک کثیر تعداد موجود تھی، جنہوں نے اپنی تعلیمات سے پورے ملک میں اسلام کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا۔

تونس سیاسی لحاظ سے قیروان کی مرکزی حکومت کی مخالفت و مزاحمت کا مرکز و مرجع رہا۔ بنو تمیم کی فوج جو یہاں مقیم تھی، وہ شورشوں کا اہم عنصر تھی۔ اسی وجہ سے اس شہر نے اکثر بغاوتوں اور شورشوں میں حصہ لیا، جنہیں بنو امیہ، بنو عباس کے والی اور اغلبی امیر برابر دباتے رہے۔ جب زیادۃ اللہ اول کے دور میں منصور الطنبذی نے زبردست شورش برپا کی تو یہ شہر بھی اس شورش میں ملوث تھا۔ زیادۃ اللہ کی فوجوں نے اس شہر کو فتح کر لیا۔ اور ۲۱۸ھ/۸۳۳ء میں اس کی فصیلوں کو مسمار کرا دیا ۲۸۱ھ/۸۹۴ء میں بھی ابراہیم ثانی نے ایک بغاوت میں ملوث ہونے کی وجہ سے تونس پر چڑھائی کی اور اپنا صدر مقام بھی اسی میں تبدیل کر لیا تاکہ اس شہر پر اپنا نظم و ضبط قائم رکھ سکے۔ ابراہیم ثانی نے یہاں پر کئی عمارات تعمیر کرائیں۔ عبداللہ ثانی نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا اگرچہ وہ ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں اسی محل میں مارا گیا۔

فاطمیوں نے اس شہر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ۳۳۲ھ/۹۴۴ء میں ابویزید کا تونس پر عارضی سا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ اس کا حملہ تونس کے لئے بہت سخت تھا ابن حوقل نے دسویں صدی عیسوی کے تونس کے بارے میں لکھا ہے کہ اس وقت وہ ایک خوشحال شہر تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تونس کی پیداوار کی کثرت، اس کے محل وقوع کی موزونیت اور اس کے باشندوں کی دولت مندی کی تعریف ہے شہر کی فصیلوں اور خندق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق شہر کے پانچ دروازے تھے۔

تونس تقریباً سو سال تک خوشحالی اور امن و امان کے دور سے فیضیاب رہا۔ حتیٰ کہ گیارہویں صدی عیسوی میں اسے ایک خوفناک حادثے کا شکار ہونا پڑا۔ جس سے اس کی اقتصادی اور سیاسی حالت نہایت دگرگوں ہو گئی، جبکہ ہلالی عربوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں بنی ریاح کے سردار عابد بن ابی الغیث کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ ۴۵۱ھ/۱۰۶۰ء میں اس نے وہاں پر عبدالحق ابن خراسان کو اپنا والی مقرر کیا۔ جس نے جلد ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے صنہاجی خاندان کی بنیاد ڈالی جو ایک سو سال تک برابر حکومت کرتا رہا۔ سوائے بیس سال کے ایک وقفے کے۔ عبدالمومن کے دور حکومت ۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء میں تونس افریقیہ کا صدر مقام بنا اور جمہوریہ تونس بننے تک یہ شہر افریقیہ ہی کا صدر مقام رہا۔ ۵۹۵ھ/۱۱۹۹ء میں عبدالکریم الرغراغی نے اس پر ناکام حملے کئے۔ لیکن اس کے بعد یعنی تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں بنو حفص اس شہر پر قابض ہو گئے۔ بنو حفص کے پہلے خود مختار بادشاہ ابوزکریا کے دور سے تونس میں بھی خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس نے کئی عمارت تعمیر کرائیں۔ مدارس قائم کئے گئے اور مساجد تعمیر ہوئیں۔ چودہویں صدی عیسوی کو علمی لحاظ سے تونس کا سنہری دور قرار دینا چاہیئے۔ لیکن سیاسی لحاظ سے اس صدی میں فتنہ و فساد اور بدامنی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ بنی مرین نے دو مرتبہ تونس پر قبضہ کیا۔ پندرہویں صدی میں اگرچہ سیاسی حالات پرسکون ہو گئے۔ لیکن تونس پر ایک طرح کا جمود طاری رہا۔ اس صدی میں بھی مدارس اور مساجد کی تعمیر کے علاوہ دوسری عمارات کی تعمیر بھی جاری رہی۔ یہاں تک کہ سولہویں صدی میں تونس ترکوں اور ہسپانیوں کی طویل جنگوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ۱۵۳۴ء میں خیرالدین کی فوجوں نے تونس کو تاخت و تاراج کیا اور اگلے ہی سال چارلس پنجم کی فاتح فوجوں نے اس میں لوٹ مار مچا دی۔ ۱۵۷۰ء میں اگرچہ بنو حفص نے دوبارہ اقتدار بحال ہو جانے سے شہر کے استحکامات کی طرف پھر توجہ دی گئی لیکن یہ سب باتیں بے کار ثابت ہوئیں کیونکہ تونس کو ایک بار پھر غارت گری کے لئے ہسپانوی فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

۱۵۷۴ء میں ترکوں نے اس قلعے کو جو جھیل کے کنارے ستارے کی شکل میں بنایا گیا تھا بالکل تباہ کر دیا گیا۔ بعد میں سنان پاشا نے یہاں پر ایک مستحکم حکومت قائم کی اور تونس کی تعمیرات کا سلسلہ از سر نو شروع ہوا۔ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع کے سیاسی ہنگاموں کے دوران میں اہل الجزائر نے تونس پر دو دفعہ ۱۶۸۶ء اور ۱۶۹۴ء میں قبضہ کر لیا۔ اس بدامنی کے دور میں کافی اہل تونس کو کشت و خون کے دریا سے گذرنا پڑا۔ اس زمانے میں تونس اہل الجزائر کے رحم و کرم پر تھا۔ یہاں تک کہ حسینیوں کے زمانے میں بھی یہی حالت قائم رہی اگرچہ جنگوں کے درمیانی پرامن وقفوں میں اس خاندان نے بہت سی نئی عمارات تعمیر کرائیں جن سے شہر کی رونق بڑھتی گئی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں فرانسیسی قبضے کی وجہ سے تونس میں بڑے وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی۔ یہ ترقی ابھی تک جاری ہے۔

۱۹۷۶ء میں تونس کی کل آبادی دس لاکھ تھی جس میں ایک چوتھائی یورپین اور کوئی پچاس ہزار یہودی تھے۔

تونسوی، محمد سلیمان

(۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء - ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) برعظیم کے ایک بزرگ صوفی گرگوجی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام زکریا بن عبدالوہاب تھا۔ آپ کا خاندان افغان قوم کے جعفریہ قبیلہ سے متعلق تھا چونکہ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا، اس لئے تعلیم و تربیت کا انتظام والدہ نے کیا۔ چار سال کی عمر میں آپ کی والدہ نے ملا یوسف جعفر کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لئے بھیجا بعد میں میاں حسن علی سے قرآن پاک پورا کیا اور ابتدائی دینی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں مولوی ولی محمد، قاضی محمد عاقل سے تکمیل تعلیم کی۔ نوعمری کے زمانے ہی میں خواجہ نور محمد مہاروی سے بیعت کی۔ پیر کی عقیدت اور احکام کی بجا آوری میں دوسرے پیر بھائیوں سے سبقت لے گئے۔ پیر کے حکم پر دہلی کا سفر کیا۔ یہ سفر شاہ فخر کی ملاقات کے لئے کیا تھا جو آپ کے پیر کے مرشد تھے لیکن جب دہلی پہنچے تو شاہ فخر کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہاں سے واپس لوٹے۔ چھ سال مرشد کی خدمت میں رہے۔ خلافت ملنے پر مرشد کے

Marfat.com

حکم کے مطابق تونسہ میں قیام فرمایا۔ جہاں لوگ دُور دُور سے آپ کی طبیعت کے لئے حاضر ہوتے۔ آپ نے تونسہ کو دارالعلوم بنا دیا تھا۔ آپ نے تونسہ میں کئی مدرسے قائم کئے جن میں پچاس مدرسین تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کے اس درس و تدریس کے شوق نے تونسہ کو تعلیمی مرکز بنا دیا جہاں پر دور دور سے لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے۔ آپ کو خود درس دینے کا بہت شوق تھا اپنے خاص شاگردوں اور مریدین کو سلوک و احسان کی کتابوں کا درس خود دیتے تھے۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا قرآن، حدیث اور فقہ پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ تصوف کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی تھا آپ نے نہایت عسرت میں عمر بسر کی اور ساری زندگی فقر و فاقہ میں گذاری۔

آپ نے ایک طرف تو صوفیا کی اصلاح کی طرف توجہ دی، دوسری طرف علماء کو بھی ان کا صحیح مقام بتایا۔ آپ صوفیا کو دنیا داری سے دین داری کی طرف بلاتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ کل تم کیا تھے اور آج کیا ہو گئے ہو۔ تمہاری کوششوں اور عبادتوں کے مرکز کیوں تبدیل ہو گئے۔ تم نے دین کی بجائے دنیا سے کیوں دل لگا لیا۔ تم نے اپنے اعتقادات میں کیوں فساد پیدا کر لئے۔ صحیح مذہبی جذبہ پیدا کرو کہ وہی سعادتِ دارین کا باعث ہے۔ دوسری طرف وہ علماء کی گمراہی کو ساری قوم کی گمراہی کے مترادف سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ علماء کی گمراہی خود ان ہی تک محدود نہیں رہتی۔ عوام بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ایک صوفی کی گمراہی خود اسی تک رہتی ہے۔ لیکن عالم کی بے راہ روی سے عوام بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ تنہا جنت میں جاتے ہیں اور نہ دوزخ میں، دونوں جگہ کثیر جماعت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

آپ شریعت کے معاملے میں نہایت سخت گیر تھے فرماتے تھے کہ "جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالےٰ کا محبوب ہو جائے تو اسے چاہئے کہ ظاہر اور باطن میں شریعت کی متابعت کرے۔" آپ کا خیال تھا کہ انسانیت کا کمال بغیر متابعت شریعت دشوار ہے آپ فرماتے تھے۔ "ایک غیر شرعی فعل بندے کو مرتبۂ ولایت سے نیچے پھینک دیتا ہے۔" آپ تصوف و سلوک کی مستند کتابوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کرتے تھے کہ صراطِ مستقیم سے مراد راہ شریعت ہے۔ شیخ ابن عربی نے "فتوحاتِ مکیہ" میں اور شیخ سہروردی نے "عوارف المعارف" میں یہی بتایا ہے کہ شریعت کی مدد کے بغیر روحانیت کی دشوار گذار راہیں طے نہیں کی جا سکتیں۔ آپ نے تونسہ ہی میں وفات پائی۔ نواب بہاولپور نے ستر ہزار روپے سے سنگ مرمر کا عالیشان مزار تعمیر کرایا۔

آپ کی اولاد میں دو فرزند خواجہ گل محمد اور خواجہ درویش محمد تھے لیکن وہ دونوں آپ کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے پوتے خواجہ اللہ بخش آپ کے خلیفہ ہوئے۔

آپ کے ستر سے زائد خلفاء تھے، جنہیں آپ نے خرقۂ خلافت عطا فرمایا تھا ان میں مولوی محمد یاراں کلاچوی۔ مولوی محمد علی مکھڈی، مولوی محمد علی خیرآبادی، مولانا احمد تونسوی، مولوی نور جہانیاں صاحب بہاول پوری، شمس الدین سیالوی وغیرہ ہیں

پنجاب میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کا نام شاہ نور محمد مہاروی کے ذریعے پہنچا اور شاہ محمد سلیمان تونسوی کے ذریعے اس سلسلے کی تکمیل ہوئی۔ آپ سلسلۂ نظامیہ کے آخری عظیم بزرگ تھے۔ آپ کا تبحر، تقدس، اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لئے جدوجہد اپنی نظیر آپ تھی۔

تھانوی، اشرف علی:۔ ایک عالم دین اور صوفی بزرگ (دیکھئے "اشرف علی")

تہامہ ایک عرب صوبہ ساحل عرب کے متصل ایک نشیب اور تنگ قطعہ زمین جو جزیرہ نمائے سینا سے شروع ہو کر عرب کی مغربی اور جنوبی سمت کے ساتھ چلا گیا ہے۔

تہامہ کا مفصل حال ادریسی نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس میں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ گذرتا ہے جو خلیج قلزم سے شروع ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک پشتہ کوہ مشرق کی طرف چلا گیا ہے۔ اس کی مغربی سرحد پر خلیج قلزم مشرقی سرحد پر پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شمالاً جنوباً چلا گیا اور یہ صوبہ سرجہ سے عدن تک پھیلا ہوا ہے تہامہ کا عریض ترین حصہ جدہ کا عقبی علاقہ ہے اور اکثر تہامہ کو بھی مکے ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے اور مکہ کے مندرجہ ذیل حصے تہامہ ہی میں شامل تصور کئے جاتے ہیں جُرشَم، بیش، عَک ہیں۔ اگرچہ عرب مصنفین اس مخصوص سمت میں تہامہ کی وسعت کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ ان تمام آراء کو یاقوت نے معجم میں بیان کیا ہے۔

تہامہ کی چوڑائی مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ بعض مقامات پر تو وہ ساحل کا ایک تنگ سا ٹکڑا ہی ہے۔ جیسا کہ الطور اور سویز کے درمیان یا قنفذہ اور لحیہ کے مقامات پر ہے یمن کے علاقہ میں تہامہ سطح سمندر سے ۴۰۰ فٹ بلند ہو جاتا ہے۔

عرب جغرافیہ نویسوں نے تہامہ کو نہ صرف ساحل البحر، غور اور سافلہ کا مرادف بلکہ اسے یمن، الیمامہ اور العروض کے ساتھ ساتھ ایک مستقل جغرافیائی وحدت قرار دیا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یمن کی تاریخ کے مختلف ادوار میں تہامہ اداری لحاظ سے ایک علیحدہ کورہ یا صوبہ ہوتا رہا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب ایرانیوں نے یمن کو فتح کیا تو اس کی یہی صورت تھی۔ ۸۱۹ء تا ۱۰۱۸ء بنو زیادی کے دور حکومت میں بھی اس کی یہی حیثیت تھی۔ اس کے بعد تھوڑے عرصے کے لئے تہامہ نے خود مختاری بھی حاصل کی اور زبید اس کا پایۂ تخت تھا۔ بعد میں صنعاء کے امراء کے تحت یہ دوبارہ علیحدہ صوبہ بن گیا۔

یمنی کے حصے میں اس کی چوڑائی تیس میل سے لے کر پچاس میل تک ہے۔

تہامہ کی زمین گرم و خشک ہونے کی وجہ سے میدانی نباتات پیدا کرنے کی قدرتی اہلیت رکھتی ہے۔ باجرہ، جو، مکئی، گندم، گنا، کھجور، تل، نیل اور کپاس یہاں کی مشہور پیداوار ہیں۔

تہامہ کی آبادی کا اندازہ پچاس لاکھ کے قریب ہے۔ ساحل پر لوگ تجارت، جہاز رانی، ماہی گیری اور کشتیاں بنانے کا کام کرتے ہیں اور ملک کے اندرونی حصوں میں اکثر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کی زبان فصیح عربی سے بہت مختلف ہے۔

تھانیسری، مولانا احمد (وفات ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) ایک عالم دین اور صوفی زاہد کا نام محمد تھا، دہلی میں پیدا ہوئے اور تعلیم بھی دہلی ہی میں حاصل کی۔ قاضی رکن الدین عبدالمقتدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ طریقت میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید ہوئے اور تصوف میں کمال حاصل کیا آپ علم و فضل اور زہد و تقوے کے باعث بہت مشہور تھے۔ جب تیمور نے دہلی پر حملہ کرنے کا قصد کیا تو دہلی سے اکثر علماء نکل کھڑے ہوئے لیکن آپ دہلی ہی میں مقیم رہے۔ بعد میں تیمور نے آپ کے مریدوں سمیت آپ کو گرفتار کر لیا لیکن جب تیمور کو آپ کے علم و فضل کا علم ہوا تو اس نے آپ کو قید سے رہا کر کے اپنے دربار میں جگہ دی۔ جب تیمور ہندوستان سے واپس چلا گیا اور تیموری حملہ کی وجہ سے

Marfat.com

دہلی کی رونق ماند پڑ گئی تو مولانا احمد تھانیسری نے بھی دہلی کو خیرباد کہہ کر کالپی میں عزلت اختیار کر لی اور وفات تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ وفات کے بعد کالپی ہی میں دفن ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں سے "قصیدۂ دالیہ" جو نعت ہے۔ بہت زیادہ مشہور ہے۔

تہجّد کچھ دیر سونے کے بعد جاگنا بقول مولانا مودودی تہجد کے معنی نیند توڑ کر اٹھنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں قیام شب اور خصوصاً نصف رات اور فجر کے درمیان نماز (نوافل) پڑھنا تہجد ہے۔

قرآن مجید میں تہجد کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

اور رات کو تہجد پڑھو، یہ تمہارے لئے نفل ہے۔ بعید نہیں کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر فائز کر دے۔" (۱۷: ۷۹)

جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے نماز تہجد آنحضورؐ کے لئے فرض نمازوں سے بھی ماسوا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں صحابہ کرام کا قیام شب کا دستور عام تھا۔

"اے کملی لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔" (۷۳: ۱-۴)

ایک اور آیت میں قیام شب یا قیام لیل کے بارے میں فرمایا گیا۔

"رات کو اللہ کے آگے سجدہ ریز رہو اور رات کا طویل حصہ اس کی تسبیح کرتے ہوئے گزارو۔" (۷۶: ۲۶)

یہی وجہ ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپؐ نے اور صحابہ کرام نے قیام لیل کو فرض سمجھا اور وہ آپ کے ساتھ اتنا قیام فرماتے کہ ان کے پاؤں ورم کر جاتے (ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضورؐ رات کو تہجد کے لئے کھڑے ہوتے تو اور لوگ بھی شرکت کی غرض سے آجاتے تھے لیکن آپ اتنے شفیق و رحیم تھے کہ آپؐ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر وہ اس پر اس طرح کاربند رہے تو کہیں قیام لیل امت پر ہمیشہ کے لئے فرض نہ ہو جائے۔ پس آپؐ نے فرمایا کہ لوگ اپنے گھروں میں تہجد پڑھیں (ابوداؤد)

مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ سورۃ مزمل کی آخری آیات کے نزول کے بعد قیام لیل اگرچہ مسلمانوں کے لئے تطوع ہو گیا لیکن نبی کریم کے لئے خصوصیت کے ساتھ فرض رہا۔ احادیث میں قیام لیل کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اسے تمام اعمال سے افضل کہا گیا ہے۔

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔

"طول القیام" (ابوداؤد)

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔ "فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

آنحضورؐ جب کبھی بیمار یا تھکے ہوتے تو بیٹھ کر نماز تہجد ادا کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ نے آنحضورؐ کی نماز تہجد کی تفصیل اس طرح بتائی ہے۔

"آنحضورؐ نماز شب عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد سے قبل فجر تک گیارہ رکعتیں پڑھتے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے ایک رکعت وتر کی نماز پڑھتے۔ سجدہ اتنا طویل کرتے کہ آدمی پچاس آیتیں پڑھ سکتا، سر اٹھانے سے پہلے فجر کی اذان کے بعد پھر کھڑے ہو کر دو مختصر رکعتیں پڑھ کر داہنی کروٹ سے لیٹ جاتے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہؓ کی ایک اور روایت کہ آپ نے تیرہ رکعتیں پڑھیں ان میں وتر اور فجر کی دو سنتیں شامل ہیں۔" آپ نے تہجد کی بعض دفعہ آٹھ اور بعض دفعہ دس رکعتیں پڑھیں

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ وتر کو صلوٰۃ لیل کا آخری جزو بناؤ۔

احناف کے نزدیک وتروں کے علاوہ تہجد کے نوافل آٹھ یا چار رکعت ہیں دو رکعت بھی پڑھتے ہیں۔

ایک حدیث میں نماز تہجد کی ترغیب آپ نے اس طرح دلائی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آپ نے فرمایا "خداوند ہر رات کو تہائی حصہ رہ جانے پر آسمان دنیا پر آتا ہے اور آواز دیتا ہے کون ہے جو مجھ کو پکارے اور میں اس کی دعا سنوں۔ کون ہے جو مجھ سے کچھ مانگے اور میں عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے اور میں اسے بخش دوں۔" (بخاری و مسلم)

تہذیب آراستگی، اصلاح، آرائش، ترتیب، تزئین، آداب، ثقافت کا ظاہری و مادی پہلو۔ (دیکھئے۔ ثقافت۔)

تہران ایران کا صدر مقام۔ پہلے پہل "ط" سے طہران لکھا جاتا رہا۔ بعد میں "ط" کی جگہ "ت" نے لے لی۔ تہران کا ذکر سب سے پہلے "فارس نامہ" (۵۱۰ھ/۱۱۱۶ء) میں آتا ہے۔ اس کے مصنف نے تہران کے اناروں کی بہت تعریف کی ہے۔ تہران کے گاؤں اصطخری کا ذکر ۳۴۰ھ کے زمانے سے پہلے بھی موجود ہے۔ سمعانی نے اپنے ایک بزرگ ابوعبداللہ محمد بن حماد الطہرانی الرازی کا ذکر کیا ہے۔ جس نے عسقلان میں ۲۶۱ھ/۸۷۵ء میں انتقال کیا تھا۔

سلطان ارسلان بن طغرل نے کبھی کبھی دولاب کے قریب، جو تہران کے جنوب مشرق میں ایک جگہ کا نام ہے، قیام کیا ہے۔

ابن اسفندیار نے تاریخ طبرستان میں ایران کے حماسی دور کی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افراسیاب اس جگہ خیمہ زن ہوا تھا جہاں اب دولاب اور تہران آباد ہیں۔

یاقوت نے تہران کے بارے میں ایک مختصر سی یادداشت لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ ایک بڑا قریہ تھا جس کے بارہ محلے تھے۔ تہران میں مکان زیرزمین بنائے گئے تھے اور اطراف قریہ کے باغات بہت گھنے تھے۔ یہ مقام اچھی طرح سے محفوظ تھا۔"

۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں رے زوال پذیر ہونا شروع ہوا۔ جب مغلوں نے اس کو تباہ و برباد کر دیا تو تہران کو اہمیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ تہران کی آب و ہوا بھی رے سے بہتر تھی اور یہاں آبادی بھی زیادہ تھی۔

۸۰۶ھ/۱۴۰۴ء میں تیموری دور میں تہران رے کا ذکر آیا ہے کہ اس جگہ شہزادہ رستم نے تقریباً بیس روز تک قیام کیا تھا۔

تہران میں آنے والے پہلے یورپی سیاح کلاویخو نے تہران کے بارے میں لکھا ہے، کہ اس وقت تیمور کا داماد امیر سلیمان شاہ رے میں حکومت کرتا تھا وہ رامین میں رہتا تھا شہر رے بے آباد تھا۔ برج تہران میں اس کا ایک نمائندہ (گورنر) رہا کرتا تھا۔ یہ ایک خاص عمارت تھی جس میں بادشاہ اپنے قیام کے دوران میں ٹھہرا کرتا تھا۔ تہران کے گرد اس وقت کوئی فصیل نہ تھی۔

صفویوں کے عہد میں رے کی کچھ زیادہ اہمیت نہ رہی تھی۔ اس میں صرف دو شہر قابل ذکر رہ گئے تھے۔ ایک تہران اور دوسرا ورامین۔ تہران کی خوشحالی شاہ طہماسپ اول کے

Marfat.com

تہران کے ایک جامع مسجد کا منظر۔

دور میں سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ صفویوں کے دور میں تہران ایک درمیانے درجے کے شہر کی حیثیت سے ترقی کر گیا۔ شاہ طہماسپ اوّل نے ۹۶۱ھ/۱۵۵۶ء میں یہاں پر بازار بنوائے اور شہر کے اردگرد ایک فصیل بنوائی جس میں چار دروازے اور ۱۱۴ برج تھے اور جس کی لمبائی تقریباً ایک فرسخ تھی۔ ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء میں تہران افغانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں نادر شاہ نے تہران کا علاقہ اپنے بڑے لڑکے رضاقلی مرزا کو جاگیر میں دے دیا۔ خاندان نادری کے زوال کے بعد تہران پر قاچاریوں کا قبضہ ہو گیا ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۹ء میں کریم خان زند نے قاچاریوں کو شکست دی اور تہران پر قبضہ کر لیا۔ کریم خان تہران کو اپنا پایۂ تخت بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک ہی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء میں اس نے شیراز کو اس مقصد کے لیے چنا۔ جب آقا محمد قاچار کریم خان کے سامنے لایا گیا تو وہ اس سے بہت مہربانی سے پیش آیا اور معاف کر دیا۔

۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں کریم خان کے انتقال کے فوراً بعد آقا محمد قاچار نے تہران کے نواح میں قبضہ کر لیا۔ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں آقا محمد کی فوجوں نے تہران کا محاصرہ کر لیا۔ اور بالآخر تہران پر آقا محمد قاچار کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے تہران کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ بعد میں اس نے جب ایران مکمل طور پر فتح کر لیا تو تہران کو ایران کا دارالحکومت قرار دے دیا گیا اور آج تک تہران کی یہ حیثیت قائم ہے۔

۱۲۱۱ھ/۱۷۹۷ء میں آقا محمد قاچار کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد فتح علی شاہ تخت نشین ہوا۔ فتح علی شاہ کے بعد ۱۸۳۴ء میں اس کا بیٹا ، افضل سلطان عادل شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس نے صرف چھ ہفتے حکومت کی۔ اس کے بعد تین اور بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ان بادشاہوں کے دور حکومت میں تہران کے امن چین میں وبائی امراض خلل انداز ہوتے رہے۔ قحط اور بیماریوں کی وجہ سے اکثر لوگ یہاں سے نقل مکانی کرتے رہے۔

قاچاریوں کے عہد میں تہران نے بہت ترقی کی۔ کئی عمارات تعمیر ہوئیں جن میں قصر گلستان اور مسجد شاہ جیسی قابل دید عمارات ہیں۔ ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۴ء شہر میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ شہر کو ہر سمت میں وسعت دی گئی۔ پرانی خندق اور فصیل کا اکثر حصہ غائب ہو گیا۔ ۱۸۷۴ء میں شہر میں بارہ دروازے بنائے گئے۔ اسی طرح اور بہت سی نئی تعمیرات ہوئیں۔

انقلاب ایران کے بعد سے تہران جو اس سے قبل باقی صوبوں سے کچھ الگ تھلگ تھا بڑی تیزی کے ساتھ ملک کی سیاسی اور علمی کاوشوں کا مرکز بن گیا۔ موجودہ زمانے میں کئی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مثلاً بانک شہنشاہی، دانش گاہ، ریلوے سٹیشن، مسجد سپہ سالار جو شہر کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار ہے۔ وغیرہ تہران ایران کے نظام رسل و رسائل میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ ایک بین الاقوامی ہوائی اڈا ہے۔ یورپ مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، افغانستان اور پاکستان جیسے ممالک سے اس کا اتصال ہے۔ تہران میں برابر توسیع ہو رہی ہے۔ آج کل شمال کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اب یہ ایران کا سب سے بڑا شہر خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں تہران کا نقشہ بدل دیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں تہران کی آبادی تخمیناً چار لاکھ تھی۔

جدید تہران کے تاریخی مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

شہر کے درمیان میں میدان سپاہ (فوجی میدان)، شہرداری (ٹاؤن ہال) اور اس کے نزدیک بہت سی وزارتی عمارات ہیں۔ پولیس ہیڈکوارٹرز ایک جدید عمارت ہے۔ آثار قدیمہ کا ایک عجائب گھر ہے میدان سپاہ کے جنوب میں قصر گلستان ہے جو انیسویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جو اب ایک عجائب گھر بنا دیا گیا ہے اور جس میں بہت سے تاریخی نوادرات مثلاً تخت طاؤس جیسی چیزیں ہیں اس کے نزدیک ہی بازار میں مسجد شاہ ہے جو قاچار دور کی یادگار ہے۔ میدان سپاہ کے مشرق میں شمال مشرق کی طرف قصر بہارستان ہے جہاں قومی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس عمارت میں ایک بہت بڑی لائبریری ہے۔ قصر بہارستان کے بالکل نزدیک جنوب میں مسجد سپاہ سالار ہے۔ جس میں آج کل مقیاتیکل کالج اور لائبریری قائم ہے شہر کے مغرب میں خاک مرمر (قصر ماربل) ہے جو شاہ کی اقامت گاہوں میں سے ایک ہے۔ شہر کے شمال مغرب میں تہران یونیورسٹی ہے شہر کے جنوبی حصے میں خیابان پہلوی کے ساتھ ہی ریلوے سٹیشن ہے جو کہ ایک بڑی اور باوقار عمارت ہے۔ اس کے علاوہ دو باغ "باغ ملی" اور "باغ شاہ" ہیں۔ تہران سے پانچ میل دور مہرآباد میں ہوائی اڈا ہے۔ اس کے علاوہ کپڑے، سیمنٹ، سگریٹ، چینی، چمڑا اور اسلحہ بنانے کے کارخانے ہیں۔

تہلیل کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنا۔ یعنی اس بات کا اقرار کرنا "نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے"۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ تہلیل کا لفظ لا الٰہ الا اللہ سے اسی طرح ماخوذ ہے جیسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے کو بسملہ اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہنے کو تحولق (حوقلہ) کہتے ہیں۔

احادیث میں اس کلمے کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں اور ذکر الٰہی میں یہ کلمہ بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔

Marfat.com

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا: ایمان کے ستر سے اوپر دروازے ہیں۔ ان میں سب سے ارفع اور اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے" (مسند احمد)

" ایک اور جگہ لا الٰہ الا اللہ بکثرت کہنے کو تجدید ایمان کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔" (مسند احمد)

ایک اور حدیث میں اس کلمے کو ان چار کلموں میں شمار کیا گیا ہے جو اللہ تعالےٰ کو بہت زیادہ پسند ہیں۔" (مسند احمد)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ

آپؐ نے فرمایا بے شک میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر انسان مرتے دم اسے ادا کرے تو اس کی روح کو جسم سے جدا ہوتے وقت ایک نئی تازگی مل جائے اور قیامت کے دن وہ اس کے لئے نور کا کام دے گی۔" (مسند احمد)

آنحضورؐ نے ایک حدیث میں حکم دیا ہے۔

"تیمارداروں کو چاہیئے کہ مرنے والے کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کریں۔" (مسند احمد)

جب آپؐ کو نبوت ملی تو آپ اکثر اجتماع کے مقامات پر تشریف لے جاتے اور اس کلمے کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے؛

"لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو تمہاری فلاح و بہبود اسی کلمے سے وابستہ ہے۔" (مسند احمد)

حضرت عمرؓ نے اس کلمے کو کلمۂ اخلاص اور کلمۂ تقوےٰ قرار دیا ہے۔

اس کلمے کے پہلے حصے لا الٰہ میں تمام معبودوں اور الہٰوں کی نفی ہے اور دوسرے حصے الا اللہ میں خدائے واحد کی وحدانیت کا اثبات ہے۔ اور یہی تہلیل کا مفہوم بھی ہے۔

تیرانا مملکت البانیا کا صدر مقام، جو سطح سمندر سے ۴۰۰ فٹ بلندی پر کو ہلئی داجتت کے ۵۴۰۰ فٹ بلمبے چوڑے دامن میں واقع ہے۔ مشرق، جنوب اور مغرب میں پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔

تیرانا کی بنیاد ۱۶۰۰ء کے قریب بارقین زادہ سلیمان پاشا نے رکھی تھی۔ اور اس نے اپنی ایرانی فتوحات کی یادگاروں کے طور پر اس کا نام تہران رکھا تھا جو بگڑ کر تیران یا تیرانہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جدید تحقیق کی رو سے تیرانا کا ذکر ۲ ستمبر ۱۴۷۰ء میں بھی ملتا ہے جب تیرانا کے میدان میں وینس کا کمانڈر فرانسسکو کونٹارینی اڑھائی ہزار سواروں اور البانوی پیادہ فوج کے ساتھ ترکوں سے لڑا تھا اور بری طرح شکست سے دوچار ہوا تھا۔ تقریباً ۱۸۰۰ء کے بعد اس شہر پر کرویہ کے خاندان توپتان کا قبضہ ہوگیا۔ اس خاندان کے ایک رکن قپلان احمد پاشا کو جس نے ایک لڑائی میں جو والیٔ اشقودرہ البانیہ کے خلاف لڑی گئی تھی، کارہائے نمایاں انجام دینے پر سلطان نے تیرانا کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ ۱۸۲۰ء کی خانہ جنگی کے زمانے میں تیرانا کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۳۹ء تک احمد بیگ شاہ زوگ حکمران رہا۔ ۱۹۳۹ء میں اس شہر پر اٹلی کا قبضہ ہوگیا۔ اٹلی اور جرمنی کی فوجوں نے اس شہر کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ ۱۹۴۴ء میں اہل البانیہ نے جرمنوں سے یہ ملک واپس لے لیا اور ۱۹۴۶ء میں ایک جزوی اشتراکی عوامی جمہوریت قائم کی گئی۔ اس زمانے سے یہ شہر مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ نئے محلے آباد کئے گئے۔ کئی نئے کارخانے قائم ہوئے ۱۹۵۷ء میں ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کئی ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم ہیں۔ پانچ کالجوں میں زراعت، طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شہر میں پرانی یادگاریں بہت کم ہیں۔ ان یادگاروں میں زیادہ تر مشہور مسجد حاجی ادھم بک اور جامع مسجد اصناف ہیں۔ جامع مسجد سلیمان پاشا نے ۱۶۰۵ء میں تعمیر کرائی تھی۔ تیرانا کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ البانیا کے مفتی اعظم کی جائے قرار ہے۔ بے شمار مسلمان امراء کا وطن ہونے کی وجہ سے اسے البانیہ میں مسلمانوں کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ تجارتی لحاظ سے بھی تیرانا کو بہت اہم مقام حاصل ہے کیونکہ یہ شہر البانیا کے زیریں کی تجارتی منڈی ہے۔

تیط مراکش میں بحر اوقیانوس کے ساحل پر ایک مقام ــــــــ مقامی روایت کے مطابق تیط کے بانی ولی اسماعیل امغار (شیخ) تھے جو آسمانی روشنی کی رہنمائی میں مدینے سے یہاں آئے اور ایک چشمہ کے سامنے جو سمندر میں تھا، آپ جنگل میں قیام پذیر ہوئے۔ جب کبھی آپ کو روزہ افطار کرنا ہوتا تو آپ سمندر کی لہروں پر چل کر اس چشمے پر جایا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کا نام تیط - ان - فطر مشہور ہوگیا۔

اسماعیل شیخ نے اس علاقے کے سردار کی لڑکی سے شادی کی اور امغاریوں کے خاندان شریفی کے مورث اعلیٰ بن گئے۔ اسی خاندان کے ایک رکن مولائے عبداللہ نے تیط کا اہم رباط بارہویں صدی عیسوی میں قائم کیا۔

اس علاقے کے بارے زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ چودہویں صدی عیسوی میں العمری نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔ "تیط مراکش کے ۲۴ بڑے شہروں میں سے ہے۔ ۱۵۱۳ء میں جب پرتگیزوں کا ازمور پر قبضہ ہوگیا تو تیط نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی اور خراج ادا کرنے لگا۔ جلد ہی ۱۵۱۴ء سے میں وطاسی خاندان کے حکمران محمد ان صر نے اس خوف سے کہ کہیں رباط عیسائیوں کا فوجی مرکز نہ بن جائے۔ اس کی فصیلیں مسمار کرا دیں اور یہاں کے باشندوں کو فاس کے علاقے میں بھجوا دیا۔ اس سے تیط کی اہمیت بالکل ختم ہوگئی۔ موجودہ دور میں تیط ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کے اردگرد قدیم تیط کے برجوں اور دروازوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ لوگ اب اس کو مولای عبداللہ کے نام سے جانتے ہیں۔

تیمم قصد کرنا۔ ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک مٹی یا اس کی قائم مقام کسی چیز سے خاص طریقے کے ساتھ پاکیزگی حاصل کرنا۔

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کی اجازت غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر دی گئی تھی جو ۵ ھ میں ہوا تھا۔ جب حضرت عائشہؓ کا ہار تلاش کرنے میں لوگوں کو اتنی دیر لگ گئی کہ پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو یہ اجازت نازل ہوئی تھی۔

قرآن مجید میں تیمم کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے۔

"اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے لمس کیا ہو اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ بے شک اللہ نرمی سے کام لینے والا ہے اور بخشش فرمانے والا ہے۔" (۴: ۴۳)

"اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو۔ بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔ اللہ تم پر تنگی نہیں چاہتا مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے تاکہ تم شکر گزار بنو۔" (۵: ۶)

حضرت عمرانؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں آنحضورؐ کے ساتھ تھے آپؐ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب نماز پوری ہوگئی تو دیکھا کہ ایک شخص سب سے الگ بیٹھا ہے۔ اس نے سب کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تو فرمایا، اے فلاں تو نے جماعت کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی۔ اس نے کہا میں ناپاک تھا اور پانی نہیں ملا۔ آپؐ نے فرمایا تمہیں تو تیمم کر لینا ہی کافی تھا۔ (بخاری و مسلم)

Marfat.com

حضرت عمارؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ بن الخطابؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں جنبی ہوں اور پانی نہیں۔ حضرت عمارؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا۔ آپ کو وہ واقعہ یاد نہیں کہ میں اور آپ ایک سفر میں جنب ہو گئے تھے تو آپ نے نماز نہیں پڑھی اور میں نے خاک میں لوٹ کر تیمم کر لیا اور نماز پڑھ لی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ خاک پر لوٹنے کی بجائے اس طرح تیمم کر لینا کافی تھا۔ اور آپ نے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور پھونک مار کر چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔ (بخاری) مسلم سے بھی اسی کی مانند روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین پر ہاتھ مار کر پھر پھونک کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لینا ہی کافی ہے۔ (مسلم)

تیمم وضو کا کام بھی دے سکتا ہے اور غسل کی بجائے بھی کافی ہو سکتا ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر اور یہ نیت کر کے کہ میں پاک ہونے کے لئے وضو یا غسل کی بجائے تیمم کرتا ہوں۔ پاک مٹی پر یا ہر گرد آلود چیز پر دونوں ہاتھ مار کر دونوں کہنیوں تک ملے جائیں۔ انگوٹھی، ہاتھ کے زیور وغیرہ کو ہلا لینا چاہیئے۔ اکثر فقہاء کا یہی مسلک ہے۔

اہل حدیث حضرات اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک صرف ایک دفعہ ہی ہاتھ مارنا کافی ہے۔ وہی ہاتھ منہ پر پھیر لیا جائے اور اسی کو کلائی تک ہاتھوں پر بھی پھیر لیا جائے کہنیوں تک مسح کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ وضو اور غسل دونوں کے لئے تیمم کافی ہے مگر دونوں کے لئے جدا جدا نیت فرض ہے۔ وضو کی طرح تیمم میں بھی یہ شرط ہے کہ ہاتھ اور منہ کی کوئی ایسی جگہ نہ رہے جس پر ہاتھ نہ پھرے

فقہی نقطہ نظر سے تیمم کی اجازت ان صورتوں میں ہے:

۱۔ سفر میں یا شہر سے باہر ہو اور ایک کوس سے قریب پانی نہ ملتا ہو
۲۔ غسل کی حاجت ہو اور پانی صرف وضو کے لئے مل سکتا ہو۔
۳۔ پانی صرف پینے کے لئے اور اس کو وضو میں برتنے سے یہ اندیشہ ہو کہ اسے یا اس کے ساتھی یا ساتھ کے جانوروں کو پیاس سے تکلیف ہوگی۔
۴۔ پانی تک جانے میں دشمن یا درندے کا خوف ہو یا آگ لگ جانے یا مال چوری ہو جانے کا اندیشہ ہو۔
۵۔ کنواں موجود ہو مگر پانی نکالنے کے لئے ڈول وغیرہ نہ ہو۔
۶۔ ساتھی کے پاس پانی ہو مگر وہ قیمت پر دیتا ہو اور قیمت موجود نہ ہو یا وہ بہت گراں دیتا ہو۔
۷۔ بیماری کے باعث پانی استعمال کرنے سے معذور ہو۔
۸۔ پانی استعمال کرنے سے بیمار ہونے یا بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔
۹۔ عید کی نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو یا عید کی نماز میں وضو ٹوٹ جائے اور وضو کرتے کرتے نماز کے جاتے رہنے کا احتمال ہو۔
۱۰۔ نماز جنازہ کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔ لیکن جنازہ کے ولی کو تیمم کرنا جائز نہیں

پانی ملنے کی امید میں نماز کے آخر وقت تک توقف کرنا مستحب ہے۔ لیکن اگر اول وقت میں ہی تیمم کر کے نماز پڑھ لی جائے اور پھر وقت کے اندر اندر پانی مل جائے تو نماز دوہرانا واجب نہیں۔ جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تیمم بھی ان چیزوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تیمم پانی مل جانے پر اور عذر رفع ہو جانے پر بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تیمور (۲۵ شعبان ۷۳۶ھ/۹ اپریل ۱۳۳۶ء - ۱۷ شعبان ۸۰۷ھ/۱۸ فروری ۱۴۰۵ء) فاتح ایشیا۔ امیر تاراغای کا بیٹا۔ تکینہ خاتون کے بطن سے تھا اس کا باپ حاجی برلاس سے پہلے کش اور اس کے ملحقہ علاقے کا حاکم تھا۔ اس کے خاندان کا دعوٰے تھا کہ وہ چنگیز خان کی اولاد سے ہیں۔ خواجہ ایلغار نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ آج کل مولود خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ لنگ کا لقب تیمور کو ایک زخم کی وجہ سے ملا تھا۔

تیمور ابتدائے عمر ہی میں نہایت ذہین اور شجاع تھا۔ پہلے اس نے امیر قازغان کی ملازمت کر لی جو ایک مقامی حکمران تھا۔ جب توغلوق تیمور خان نے ماوراءالنہر پر حملہ کیا تو تیمور حاجی برلاس کے ہمراہ فرار ہوگیا۔ لیکن جلد ہی واپس آکر اپنے ہم وطنوں کی مظلومیت کا حال بیان کرنے کے لئے فاتحین کے سامنے پیش ہوا اور توغلوق تیمور خان کے پاس جاکر اپنے قبیلے کی طرف سے اطاعت کی قسم کھائی۔ اس اقدام کی بنا پر اور اس کی بہادری سے متاثر ہو کر توغلوق تیمور خان نے اسے اپنے بیٹے الیاس کا، جسے اس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کا انتظام کرنے کے لئے سمرقند کا والی بنایا تھا، وزیر مقرر کیا اور اس طرح تیمور پچیس سال کی عمر ہی میں سیاست کے میدان میں داخل ہوگیا۔ لیکن جلد ہی اپنے سالے امیر حسین سے جا ملا۔ جس نے چغتائی شہنشاہ توغلوق تیمور خان کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ امیر حسین نے ماوراءالنہر کے علاقے سے جو اب الیاس کے قبضے میں تھا، چغتائی فوجوں کو اس علاقے سے نکالنے کے لئے اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کردیں۔ اگرچہ اس معاملے میں پہلے پہلے تو انہیں (امیر حسین اور تیمور) کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بالکل آخر توغلوق تیمور خان اور اس کا بیٹا الیاس ایک جنگ میں مارے گئے لیکن امیر حسین انتہا درجے کا حاسد تھا۔ چنانچہ تیمور اس سے علیحدہ ہو گیا اور اس پر حملہ کر کے اس کو قتل کرا دیا۔ اس طرح تیمور ۷۷۱ھ/۱۳۷۰ء میں جانشین چغتائی اور ال تیمور کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس وقت سے اسے ترکوں کے ہاں الغ بیگ یا بک اور جن علاقوں میں فارسی بولی جاتی تھی وہاں پر امیر کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

تیمور نے ۷۷۱ھ تا ۷۸۲ھ/۱۳۷۰ء سے ۱۳۸۰ء کے درمیان اس نے چغتائی قوم کے مشرقی حصوں پر جو جیتہ کے نام سے مشہور تھے اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی اس مقصد کے لئے وہ دس سال سے زیادہ لڑتا بھڑتا رہا۔ اس نے نو بار لشکر کشی کی پانچ بار بار جیتہ پر اور چار مرتبہ بلاد خوارزم کے خلاف۔

اس نے ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء میں کاث وخیوہ پر چڑھائی کی اور علاقہ کاث کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۷۷۳ھ/۱۳۷۳ء میں تیمور نے ایک بار پھر خوارزم کا رخ کیا۔ اور اپنے تمام سابقہ علاقے واپس لے لئے۔ ۷۷۷ھ/۱۳۷۶ء میں تیمور نے قپچاق کی تقسیم کے وقت تقتمش خان کی حمایت کی جو کریمیا کا خان تھا ۷۸۲ھ/۱۳۸۰ء - ۱۳۸۱ء میں تیمور نے تقتمش کو روسیوں کے خلاف بھیجا۔ چنانچہ اس نے ماسکو فتح کر کے شہر کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن اس کے چار سال بعد ہی تقتمش تیمور کے خلاف ہوگیا جو اس کا محسن تھا۔ پہلے تو اس نے فتح پائی۔ لیکن بعد میں ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں تیمور نے اسے شکست دی۔

۱۳۸۰ء سے ۱۳۸۱ء میں تیمور نے ایران کی فتح کا عزم کیا۔ اور اس کی ابتدا خراسان کے حملے سے کی۔ خراسان فتح کرنے کے بعد ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء میں کفار مغول کے خلاف ایک مہم سے واپس آکر اس نے جرگان، مازندران اور سیستان کو فتح کیا ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں ہرات کی بغاوت کے خاتمے پر اس علاقے پر بھی اس کا مکمل قبضہ ہوگیا۔

Marfat.com

۷۸۸ھ تا ۷۹۵ھ/۱۳۸۶ء تا ۱۳۹۳ء تک تیمور فارس، عراق، لرستان اور آذربائیجان کی فتح میں مشغول ہوگیا اور جلد ہی ان علاقوں پر قابض ہوگیا۔ جب اصفہان کے لوگوں نے تیمور کے خلاف ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء میں بغاوت کی تو اس بغاوت کو جسے آذربائیجان اور عراق کے سابق فرمانروا کی حمایت حاصل تھی کچلتے وقت تیمور نے ستر ہزار باشندوں کو قتل کرا کر ان کی کھوپڑیوں سے مینار بنوالیے۔

چونکہ تقتمش ابھی تک برابر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور جس وقت تیمور ایران کی مہم میں مصروف تھا تو تقتمش نے سمرقند اور کش تک کے علاقے پر حملہ کر کے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ خوارزم تقتمش کا فوجی مستقر تھا۔ چنانچہ تیمور نے ایران کی مہم سے واپس لوٹ کر مصمم ارادہ کر لیا۔ ۱۳۸۸ء میں وہ خوارزم کی طرف بڑھا۔ اور ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء میں سیر دریا کے طاس میں داخل ہوا۔

۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء میں تیمور اپنی پنجسالہ مہم پر روانہ ہوا۔ آذربائیجان سے روانہ ہو کر وہ پورے قفقاز کو طے کر کے گرجستان اور آرمینیا پہنچا اور ان پر قابض ہوگیا ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں آل مظفر کا خاتمہ کر کے علاقہ فارس کو مکمل طور پر تسخیر کر لیا۔ اور اپنے بیٹے عمر شیخ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ بغداد پر فوج کشی کر کے اس نے بغداد کو بھی فتح کر لیا۔

سلطان احمد جلائر بغداد سے بھاگ کر شام پہنچا جہاں وہ سلطان مصر الملک الظاہر برقوق کا باجگزار بن گیا۔ جب ملک الظاہر نے اسے تیمور کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر تیمور نے ایشیائے کوچک پر حملہ کر کے الرہا فتح کر لیا اور اسے تاخت و تاراج کر ڈالا۔ تکریت ماردین اور آمد بھی تسخیر کر لیے۔ اس جنگ میں شیخ مارا گیا۔ ۷۹۷ھ/۱۳۹۵ء میں دربند کے مقام پر تقتمش کو شکست دی اور اس علاقے کے ان تمام فوجی استحکامات کو جو تقتمش کے لیے فوجی مستقر کی حیثیت رکھتے تھے، تباہ برباد کر ڈالے۔ تیمور کی فوجیں بڑھتے بڑھتے علاقہ قازان میں دریائے والگا اور دریائے کاما کے سنگم تک پہنچ گئیں۔ یہاں سے وہ کیف سے ہوتا ہوا اور روس کے اندرونی علاقے سے گذرتا ماسکو تک پہنچا۔ اس نے روس کے متعدد شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ ماسکو پر تیمور ایک سال تک قابض رہا۔

۷۹۸ھ/۱۳۹۶ء میں تیمور نے آذربائیجان کا رخ کیا۔ رمضان کے مہینے میں نہاوند پہنچا۔ نہاوند سے ہمدان پہنچا اور یہاں عید منانے کے بعد ایران کے مختلف حصوں پر حکومت کرنے کیلئے والی مقرر کیے۔ اس دوران میں یزد میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو اس نے اس بغاوت کو دبا دیا۔ اس دوران میں تقریباً فارس کے تیس ہزار باشندے قتل کیے گئے۔

تسخیر ایران کے بعد تیمور کا ارادہ تھا کہ وہ چین جائے اور ان چینی شہزادوں کو ان کا حق دوبارہ واپس دلائے جو اس کی کفالت میں تھے۔ اس کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان شہزادوں کو ان کا حق دلانے کے ضمن میں وہ مشرقی ترکستان اور منگولیا پر قابض ہو کر اس تمام علاقے کو مسلمان بنا سکتا ہے۔ لیکن اس مہم کا آغاز کرنے سے پہلے ہندوستان پر فوج کشی ضروری تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تیمور کی مملکت کی جو سرحد ملتان اور کابل کے مقامات پر ہندوستان سے ملتی تھی، وہ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔

چنانچہ مارچ ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء میں تیمور ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ۲۴ ستمبر کو اس نے دریائے سندھ پار کر کے ۱۸ دسمبر کو دہلی کو فتح کر لیا۔ اسی ہزار باشندوں کا قتل عام کیا اور شہر کو ویران کر دیا۔ چند روز دہلی میں گذارنے کے بعد تیمور ۸۰۲ھ/۸ جنوری ۱۳۹۹ء میں میرٹھ پہنچا اور قلعہ میرٹھ کی تسخیر کے بعد اس نے کوہ ہمالیہ کے دامن کے راجاؤں کو مغلوب کیا۔ کشمیر کی سرحد جان پر پہنچنے کے بعد تیمور نے واپس سمرقند لوٹنے کی تیاری کی۔ دہلی اور ملتان میں اس نے سابقہ تغلق حکام کا تقرر کیا۔ جنہوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اگرچہ دہلی میں اس کے بہت سے کام ناتمام رہ گئے تھے۔ لیکن ان کاموں کو ادھورا چھوڑ کر عجلت میں سمرقند لوٹنے کے بعض اسباب تھے۔ ایشیائے کوچک میں اس وقت جو ناسازگار حالات پیدا ہو گئے تھے، ان حالات سے مجبور ہو کر تیمور کو ایک بار پھر اس طرف کوچ کرنا پڑا۔ چنانچہ ۸۰۲ھ/۱۰ ستمبر ۱۳۹۹ء میں وہ دوبارہ اس طرف روانہ ہوا۔ آذربائیجان پہنچتے ہی فوراً اپنے بیٹے میران شاہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے خلاف ضروری کارروائی کر کے تیمور نے گرجستان کو تباہ و برباد کیا۔ ۸۰۳ھ/اگست ۱۴۰۰ء میں ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور سیواس میں آدھمکا یہاں اس نے اپنے مخالف تقریباً ۴ ہزار سواروں کو گڑھوں میں زندہ دفن کرا دیا۔ سیواس سے وہ ملطیہ، حلب، حماۃ، حمص اور بعلبک ہوتا ہوا شام پہنچا اور دمشق پر قابض ہوگیا۔ ۸۰۳ھ/۱۴۰۱ء میں دوبارہ بغداد پر قبضہ کر کے ان بیس ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا جنہوں نے سلطان احمد جلائر کی حمایت کی تھی۔ ابن عرب شاہ نے ان کی تعداد چالیس ہزار بیان کی ہے۔

جب تیمور گرجستان کی تازہ مہم سے واپس آیا تو بایزید جس نے مصر کے عباسیوں سے سند حکومت طلب کی تھی اور تیمور کے دوست بزنطی بادشاہ پر حملہ کیا تھا اور تیمور کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ انقرہ کے میدان میں ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء کو ایک بڑا معرکہ کارزار گرم ہوا جس میں بایزید کو شکست ہوئی۔ اور وہ قید کر لیا گیا بالآخر ۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تیمور نے ازمیر کو فتح کیا اور ۸۰۷ھ/۱۴۰۴ء میں سمرقند واپس آگیا۔ جہاں سے اس نے چین کے خلاف نئی مہم کا آغاز کیا۔ ۸۰۷ھ/۱۴۰۴ء میں اس نے یہ مہم شروع کر دی۔ اور جیحون دریا کو جس پر برف جمی ہوئی تھی عبور کر لیا۔ اترار کے مقام پر تقتمش کی درخواست پر اس کو معاف کر دیا۔ اس مہم کے دوران میں اس نے بہت سے علما کو اپنے ساتھ لیا تاکہ ان کی مدد سے بدھ مذہب کے پیروؤں اور چین کی راہ میں ملنے والے شامنی مذہب والوں کو مسلمان کیا جا سکے۔ تیمور نے فیصلہ کیا تھا کہ چین اور منگولیا کے علاقوں کو فتح کر کے اپنے پوتے محمد سلطان کے سپرد کر دے گا۔ لیکن اس کا آق شہر میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے یہاں کے عمل داری دوسرے پوتے الغ بیک کے حوالے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ۱۰ شعبان ۸۰۷ھ/۱۱ فروری ۱۴۰۵ء کو وہ بیمار پڑ گیا۔ بالآخر ۱۷ شعبان یعنی ۱۸ فروری کو ۷۱ سال کی عمر میں ۳۶ سال حکومت کرنے کے بعد تیمور کا انتقال ہوگیا۔ یہاں سے اس کی میت سمرقند لائی گئی اور گور میر کی شاندار عمارت میں اسے دفن کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ رخ اس کا جانشین بنا۔

تیمور کے دائیں ہاتھ میں عیب تھا اور دائیں ٹانگ میں لنگ تھا۔ ۱۹۴۱ء میں پروفیسر گریمی یازوف اور پروفیسر ارشانن نے تیمور کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیوں کا معائنہ کر کے ثابت کیا کہ اس کے دائیں ہاتھ اور ٹانگ میں واقعی خرابی تھی۔

تیمور سنجیدہ طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کے مزاج میں جدت تھی۔ منافقت کا دشمن تھا۔ صاف گوئی کو پسند کرتا تھا۔ بعض لوگوں نے اس کے انصاف کی بہت تعریف کی ہے۔ نہایت سخت مزاج تھا۔ مجرموں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرتا تھا۔ حافظہ خداداد تھا۔ ان پڑھ تھا۔ فارسی ترکی اور مغولی جانتا تھا عربی سے قطعاً ناآشنا تھا۔ فن تعمیر سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ اس نے کئی مساجد اور محل تعمیر کرائے کئی باغات لگوائے جو بہت مشہور تھے۔

Marfat.com

تیمور ایک طویل قامت انسان تھا اس کا سر بہت بڑا تھا۔ اس کی چار بیویاں تھیں ان میں سے پہلی بیوی اولجای ترکان ماوراء النہر کے حکمران قازغان کی پوتی تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ اور ایک بیٹی تھی ۱۔ غیاث الدین جہانگیر ۲۔ معزالدین عمر شیخ ۳۔ جلال الدین گورگان عرف میران شاہ ۴۔ شاہ رخ۔ بیٹی کا نام سلطان بخت تھا۔ جس کی شادی سلیمان شاہ سے ہوئی تھی۔

تاریخ میں تیمور کو خاندان تیموری (مغلیہ خاندان) کے بانی کے علاوہ مسلم فنون لطیفہ اور ثقافت کے مربی کی حیثیت سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ترکستان کے مغل آرٹ کی سرپرستی تیمور ہی نے کی تھی۔ اسے محلات اور باغات تعمیر کرانے کا بے حد شوق تھا۔ سمرقند کے محلات اور باغات اسی کے ذوق کی شہادت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں نکلوانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

تیمور کو علم تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ تاریخی شخصیتوں میں وہ آنحضورؐ کو سب سے زیادہ محبوب و محترم جانتا تھا۔ تصور حکومت میں وہ چنگیز خاں اور محمود غزنوی سے بے حد متاثر تھا۔ سادات اور علماً کا بے حد احترام کرتا تھا۔ شیخ احمد یسوی کو وہ اپنا مرشد مانتا تھا۔ اسے منافقت سے سخت نفرت تھی اور ہر حال میں راست گوئی کو پسند کرتا تھا۔ خود شراب کا رسیا تھا اور اسے علی الاعلان پیتا تھا۔ اس معاملے میں وہ شریعت کی بجائے چنگیزی یاسا کا پابند تھا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ معارف دینی کی تحقیق میں لگا رہتا تھا۔

تیمور، بنو اس سے مراد یوں تو تیمور کے تمام اخلاف ہیں لیکن خاص طور پر اس سے مراد تیموری خاندان کے وہ شہزادے مراد ہیں جو ایران اور وسط ایشیا میں حکمران رہے۔ اس خاندان کی تاریخ دو ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ دور اوّل میں تیمور کی سلطنت اس کے بیٹوں اور پوتوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ لیکن جلد اس کے دو حصے ہوگئے۔ مغرب میں میران شاہ اور اس کے بیٹوں ابوبکر اور محمد عمر کی حکومت قائم ہوگئی اور مشرق میں شاہ رخ کی جو پہلے پہل تو خراسان تک محدود تھی لیکن تھوڑے عرصے ہی میں ماوراء النہر کا علاقہ بھی اس کی سلطنت میں شامل ہوگیا اور اس طرح وہ تمام علاقے جو امیر تیمور کی حکمرانی میں تھے۔ شاہ رخ کے زیر اقتدار آگئے۔

دوسرا دور شاہ رخ کے انتقال سے جنگ سترونک ہے۔ جس سے تیموری سلطنت کو آخری ضرب لگی۔ اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

امیر تیمور کی وفات پر امراء کا یہ خیال تھا کہ جب تک چین کی تسخیر مکمل نہیں ہوجاتی اس وقت امیر تیمور کی وفات کو چھپائے رکھنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اس مہم کے دوران میں شہزادہ خلیل کو حاکم بنانے اور کاروبار مملکت کے چلانے کے لیے ایک مجلس قائم کرنے نیز مہم کے اختتام پر خلیل تیمور کی خواہش کے مطابق حکومت پیر محمد بن جہانگیر کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں دعویداران حکومت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ چنانچہ دو مرتبہ شکست کھانے کے بعد پیر محمد نے خلیل کی اطاعت قبول کرلی خلیل نے اس کا علاقہ اسی کے پاس رہنے دیا۔ لیکن اس کے چھ ماہ بعد پیر علی تاز وزیر نے اس کو قتل کرا دیا اور خود اس کے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اسی کوشش میں اسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ادھر امراء نے خلیل کا بھی ساتھ چھوڑ دیا اور اسے معزول کردیا۔ لیکن ۸۰۹ھ/۱۴۰۷ء میں اس کی اطاعت شعاری کے لیے عراق کی مملکت اس کے حوالے کردی گئی۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے باقی دن گذارے۔ میران شاہ اپنے بیٹے ابوبکر کے ساتھ امیر تیمور کی نصیحت کے مطابق اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمد عمر کی نگرانی میں اپنی سلطنت پر جو صوبہ جات عراق، آذربائیجان موغان، شیروان اور گرجستان پر مشتمل تھی حکومت کرتا رہا۔ ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء میں اس نے بھی شاہ رخ کی اطاعت قبول کرلی۔ وہ ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں قرا یوسف کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ غالباً اسی زمانے میں اس کے بیٹے بھی ہلاک ہوگئے۔

جب امیر تیمور نے وفات پائی تو شاہ رخ خراسان کا حاکم تھا۔ اس نے ۸۰۹ھ/۱۴۰۷ء میں مازندران فتح کیا۔ ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں ماوراء النہر پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ شاہ رخ نے ۸۱۷ھ/۱۴۱۴ء میں فارس ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں کرمان اور آذربائیجان کے علاقوں کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ آخر کار شام اور عربستان کے سوا وہ تمام علاقے جو امیر تیمور کی سلطنت میں شامل تھے شاہ رخ کے قبضے میں آگئے۔ اس کے عہد حکومت میں کئی بغاوتیں بھی ہوئیں جو دبا دی گئیں۔

۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں اس نے اپنے بیٹے بایسنغر کو دیوان اعلیٰ کی مسند پر بٹھایا اور خود لوگوں کے فیصلے اور انصاف کرنے لگا۔ شاہ رخ کے الغ بیگ کے سوا باقی تمام بیٹے اس کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ شاہ رخ کا انتقال رے کے مقام پر ۸۵۰ھ/۱۴۴۷ء میں ہوگیا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی سخاوت اور شجاعت کی وجہ سے بہت عزت تھی۔ اسے رفاہ عامہ کے کاموں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے ہرات میں ایک بڑا کتب خانہ بنوایا تھا۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔

الغ بیگ جو شاہ رخ کا بیٹا تھا، عالم و فاضل اور ادیب شخص تھا۔ اسے حکومت کے کاروبار کے بجائے علمی تحقیقات سے بہت زیادہ دلچسپی اس نے صرف دو سال حکومت کی۔ اپنے بھتیجے علاء الدولہ سے شکست کھا کر اس نے اس کے ہر مطالبہ کو منظور کرلیا تاکہ اپنے لڑکے عبداللطیف کو اس کے نیچے سے نکال لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

اس کے لڑکے نے بغاوت کرکے اسے کئی مرتبہ شکست دی بالآخر ۸۵۳ھ/۱۴۴۹ء میں اپنے بیٹے عبداللطیف کے ہاتھوں ہی قتل ہوا۔ اگرچہ وہ خود بھی چھ ماہ حکومت کرنے کے بعد قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد شاہ رخ کا پوتا سلطان عبداللہ میرزا، ابوسعید کی مخالفت کے باوجود تخت نشین ہوا۔ لیکن جلد ابوسعید کے ہاتھوں، جس نے ازبکوں سے مدد لی تھی، شکست کھا کر قتل ہوا۔ ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء میں عبداللہ کے بعد بابر میرزا تخت نشین ہوا جو نہایت عیاش اور شراب کا رسیا تھا۔ اس کے زمانے میں عراق اور کرمان کا علاقہ تیموریوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے علاء الدولہ کی آنکھیں نکلوا دیں مگر ابوسعید سے شکست کھائی اور اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء میں مرگیا۔

بابر میرزا کے بعد ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء میں ابوسعید تخت پر بیٹھا۔ اس کا عہد حکومت بالکل مختلف تھا وہ اپنے دور کا سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ تھا۔ سلطان عبداللہ کے بعد اس نے سمرقند پر قبضہ کرلیا تھا۔ بعد میں اس نے ماوراء النہر، بدخشاں، کابل، قندھار اور ثغور ہند کے اضلاع عراق اور خراسان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ مغلوں سے لڑنے کے بعد اس نے ان سے اتحاد کرلیا۔ اوزون حسن کی صلح کی درخواست کو ٹھکرا کر ابوسعید نے اس کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور قراباغ جا پہنچا جہاں اس کی فوجیں بھوک سے تنگ آ گئیں اور وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئیں اور خود دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اوزون حسن نے ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء میں اسے قتل کرا دیا۔

ابوسعید میں بہت سی عمدہ صفات تھیں۔ اس میں وقار، دوراندیشی، اصابت گوئی، سرگرمی اور حیرت انگیز سیاسی قابلیت تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان احمد اس کا

Marfat.com

جانشین مقرر ہوا۔ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس کا دورِ حکومت سوائے چار لڑائیوں کے جن میں سے ایک اُس کے چھوٹے بھائی عمر شیخ سے ہوئی تھی۔ سارا عہد امن و امان سے گزرا۔ اس سارے دورِ حکومت میں سارا اقتدار امرا اور علما کے پاس تھا اور یہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ اس کا دورِ حکومت ۸۷۲ھ/۱۴۶۷ء تا ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء تک کا ہے۔

سلطان احمد کے بعد سلطان محمود اپنے پیشروؤں کے چار بیٹوں کو قتل کرا کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس نے صرف چھ ماہ حکومت کی۔ اس کا یہ مختصر دور ظلم و استبداد کا دور تھا۔ وہ اس مختصر سے دور میں قابل نفرت و ملامت سمجھا جاتا رہا۔ یہ اپنے بعد کئی بیٹے چھوڑ کر مرا اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان مسعود ۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے بھائیوں بایسنغر اور علی سے لڑنا پڑا۔ سلطان مسعود نے ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء تک چار حکومت کی۔

عمر شیخ بن ابو سعید نے فرغانہ میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ اس نے کئی بار سمرقند پہ حملے کئے اور اسے فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس کی سخاوت، شیریں مزاجی اور انصاف پسندی کی بہت سی تعریف کی جاتی ہے۔ اگر اسے شراب نوشی اور جوئے کی لت نہ ہوتی تو وہ ایک دیندار آدمی تھا۔ وہ چغتائی فرمانروا یونس خان کا داماد تھا۔

۳۹ سال کی عمر میں ایک حادثے کی وجہ سے ۸۹۹ھ/۱۴۹۴ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا جانشین ظہیر الدین بابر ہوا۔ اس نے کئی مرتبہ سمرقند پہ کامیابی سے حملے کئے۔ ایک بار سمرقند پر قابض بھی ہو گیا لیکن ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں شیبانی نے اسے بے دخل کر دیا۔ یہاں سے وہ ہندوستان چلا آیا۔ اور ایک عظیم الشان مغلیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔

ہرات میں سلطان حسین بایقرا نے ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء تا ۹۱۱ھ/۱۵۰۶ء، ۳۷ سال حکومت کی۔ اس نے خراسان، طخارستان، قندھار، سیستان اور مازندران کے علاقوں کو اپنے زیر اقتدار کر لیا اور اپنے سب حریفوں پر فتح حاصل کی۔ اس کی سلطنت کو ایک طرف تو ازبکوں سے خطرہ رہتا تھا۔ دوسری طرف اس کے بیٹوں نے اس کے خلاف بغاوتیں کیں جنہیں اسے فرو کرنا پڑا۔ ایک بار وہ شیبانی کے خلاف جنگ کے لئے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بدیع الزماں جانشین ہوا جو ایران کے تیموری خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ شیبانی سے شکست کھا کر شاہ اسماعیل کا مہمان بنا اور آخر کار سلطان سلیم نے اسے قید کر ڈالا اسی قید میں اس نے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں قسطنطنیہ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد زمان قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان چلا آیا جہاں اس نے گجرات کا بادشاہ بننے کی ناکام کوشش کی ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء میں فوت ہوا۔

تیونس: ایک اسلامی ملک۔ (دیکھئے، تونس)

تین، سورۃ: قرآن مجید کی ۹۵ ویں سورت (دیکھئے، التین، سورۃ)

ٹمبکٹو: مغربی افریقہ میں جمہوریۂ مالی کا ایک شہر جو دریائے نائیجر کے قریب صحرائے اعظم افریقہ کی سرحد پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۸۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔
بقول صاحب "تاریخ بلاد سوڈان" اس شہر کی بنیاد خانہ بدوش قبیلہ توارگ مغشرن نے پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں رکھی۔ یہ لوگ ان علاقوں میں اپنے گلے چراتے پھرتے تھے۔ بالآخر مستقل طور پر اسی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اس طرح ٹمبکٹو ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ تاجروں کے ساتھ ساتھ علما و فضلا بھی مصر، توات، غدامس، تافیلالت، فاس اور سوس وغیرہ سے یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ شہر کے اندر خوب صورت عمارات تعمیر ہوئیں اور اس کے ارد گرد ایک فصیل بھی بنا دی گئی۔ ایک جامع مسجد وسط شہر میں تعمیر ہوئی۔ اور ایک مسجد شمال کی جانب بنائی گئی۔ ۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء میں مالی سے پہلا حکمران خاندان یہاں آیا جو ۸۳۷ھ/۱۴۳۳ء تک حکمرانی کرتا رہا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی اسی زمانے میں یہاں آیا۔ اس نے شہر کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں تحریر کی ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ شہر ایک خوشحال تجارتی مرکز تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں کی عورتیں برہنہ رہتی تھیں۔ قبیلہ مسوفہ کے لوگ ایک ایسی نقاب پہنتے تھے جو چہرے کے نیچے کے نصف حصے کو چھپا لیتی تھی۔

ٹمبکٹو پہ دوسرا حکمران قبیلہ مغشرن کے توارگ کا تھا جو تقریباً چالیس سال تک اس علاقے پر قابض رہا۔ اس خاندان کے بعد یہ شہر سنی علی کے قبضے میں چلا گیا اور ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء سے ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء تک اس کے زیر اقتدار رہا۔ شہر فتح کرنے کے بعد اس نے اسے خوب تاخت و تاراج کیا۔ انتہائی ظالم حکمران تھا۔ اس کے بعد ٹمبکٹو نے سنغائی خاندان کے عہد میں بہت ترقی کی۔ اس خاندان کے مشہور بادشاہ اسکیا الحاج محمد کے عہد میں یہ شہر ترقی کی اعلیٰ منازل پر تھا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ اسکیا داؤد تھا جس کا انتقال ۹۳۵ھ/۱۵۲۸ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس شہر پر حکومت مراکش کا تسلط قائم ہو گیا۔ ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں مراکش کے پاشا محمود نے مراکش کے سلطان مولائی احمد سے چھین لیا۔ چنانچہ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء سے ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء تک اس علاقے پر مراکش کی حکومت کا قبضہ رہا اور یہ شہر پاشاؤں کی جبر ستانی اور توارگ کے حملوں سے دوچار رہا۔ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں توارگ اس علاقے پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں پُل قوم کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ جن سے پھر تکروروں نے چھین لیا۔

ٹمبکٹو کا یورپ سے اتصال نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ اس کی تجارت اٹلی، فلورنس کے ساتھ تونس اور طرابلس کے راستے ہوتی تھی۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے بعد یورپ سے اس شہر کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اس شہر کی وضع دیکھنے میں اب بھی معمولی سی ہے۔ اگرچہ مقامی فن عمارت سے یہاں والوں کی خوش ذوقی کا پتا چلتا ہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں یہ شہر فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس شہر کو الجزائر کے ساتھ پہلے پہل موٹر کاروں کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ اب یہ شہر اتنا وسیع نہیں ہے۔ جتنا کہ سنغائی حکمرانوں کے دور میں تھا۔ قدیم شہر کے کھنڈر دریائے نائیجر سے دس میل جنوب کی طرف کو اور موجودہ شہر کے شمال اور مغرب میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۸ء تک یہ علاقہ فرانسیسی سوڈان میں شامل تھا۔ آج کل مالی میں شامل ہے۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت سنغائی لوگوں کی ہے جو حبشی ہیں۔ اس شہر کی پرانی رونق اگرچہ بحال نہیں ہو سکی، تاہم فرانسیسی اثر کے تحت نئے کوچے اور مدارس تعمیر ہو گئے ہیں۔

یہ شہر نہ صرف اس لئے دلچسپ ہے کہ یہ جنوب کی طرف اسلام کی عظیم توسیع کا شاہد ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ مسلمانوں کی سرگرم زندگی کا یہ خود ایک پُر رونق مرکز بھی رہا ہے۔ یہاں ایک مشہور و معروف دانش گاہ تھی جس نے بہت سے علما اور مورخ پیدا کئے۔ ٹمبکٹو میں انتہائی علم و ادب کا دور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی تک رہا ہے۔

موجودہ زمانے تک اس شہر کا باہر کی دنیا سے اتصال اونٹ کی سواری یا دریا کے راستے یا سڑک ہی سے ہے یہاں نہ ریلوے لائن ہے اور نہ ہوائی اڈا موجود ہے۔
ٹمبکٹو کی کل آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے۔ یہاں پر نمک کا ذخیرہ ہے۔ تاجران

Marfat.com

نمک کے دو قافلے سال میں دو مرتبہ یہاں آتے ہیں۔ ہر قافلے میں اونٹوں کی تعداد تین چار ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ یہاں نمک کی تجارت عروج پر ہے۔

ٹونک ہندوستان کی ایک قدیم ریاست اور شہر جو اب صوبہ راجستھان کے ایک ضلع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست ٹونک راجپوتانے اور وسط ہند کے درمیان واقع تھی۔ جس کا کل رقبہ ۲۵۵۳ مربع میل تھا یہ ریاست چھ اضلاع پر مشتمل تھی راجپوتانے کے تین اضلاع ٹونک، علی گڑھ اور نمبا ہیڑہ اور وسط ہند کے تین اضلاع چھپڑہ پڑاوہ اور سرونج اس میں شامل تھے۔ ریاست کا نام دارالحکومت ٹونک پر رکھا گیا تھا۔

ٹونک شہر کی بنیاد ۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ء میں رکھی گئی۔ جس کے گرد فصیل ہے۔ اس کے جنوب میں نیا شہر ہے جس کے محلوں کے نام مختلف نوابوں کے ناموں پر ہیں۔

ٹونک ہندی میں نوکدار پہاڑی کو کہتے ہیں۔ اس شہر کی ابتدائی آبادی ایک نوکدار پہاڑی کے دامن میں ہوئی تھی جسے ٹونکوار کہتے تھے جو رفتہ رفتہ ٹونک کے نام سے بدل گئی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس شہر کا نام محمد آباد رکھا گیا تھا۔ اس شہر پر مختلف راجپوت قبیلے اور رئیس قابض رہے۔ نواب امیر خان کے دور (انیسویں صدی) سے اس کی تاریخی حیثیت کا آغاز ہوا۔ ۱۸۱۷ء میں نواب نے انگریزوں سے سمجھوتہ کر کے ریاست ٹونک کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے میں ٹونک شہر میں مختلف محل، حویلیاں، تالاب، باغ اور گنج تعمیر ہوئے۔ جن کی وجہ سے وہ ایک قابل ذکر شہر بن گیا۔

۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں نواب امیر خان کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا محمد وزیر خان مسند حکومت پر بیٹھا۔ جو بڑا علم دوست اور دین دار حکمران تھا۔ اس کو ملک کی ترقی اور خوشحالی کا بہت زیادہ خیال تھا۔ وہ سید احمد شہید بریلوی کا مرید تھا۔

۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں وزیر خان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا امین الدولہ نواب محمد علی خان ریاست ٹونک کا والی بنا یہ فرمانروا بھی بہت بڑا عالم اور دیندار تھا اور اپنے والد کی طرح سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین سے دلچسپی رکھتا تھا جو انگریزوں کو کھٹکتی تھی

۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں انگریزوں نے اسے معزول کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حافظ محمد ابراہیم علی مسند نشین ہوا۔ اور نواب محمد علی خان نے حکومت برطانیہ کی خواہش کے مطابق بنارس میں بقیہ زندگی بسر کی جہاں اس نے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔

تقسیم ہند کے بعد دوسری ریاستوں کی طرح ریاست ٹونک بھی ہندوستان میں ضم ہو گئی اور آج کل بائیس ریاستوں کی یونین میں جو "راجستھان یونین" کے نام سے مشہور ہے شامل ہے۔

موجودہ ٹونک شہر کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔ اور یہ ایک اہم صنعتی و زرعی مرکز ہے۔

ٹھٹھہ پاکستان کا ایک قدیم شہر جو کوہ مکلی کے دامن میں قدیم شہر کے کھنڈروں پر آباد ہے۔ یہ کراچی سے ۶۱ میل دور واقع ہے۔ سومروں کے زوال کے بعد جب سندھ کی حکومت پر سمّوں کا قبضہ ہوا تو انہوں نے کوہ مکلی کے دامن میں ایک شہر بسایا جس کا نام "ساموئی" رکھا۔ ساموئی ان کا پہلا دارالحکومت تھا پھر اس سے چھ میل جنوب کی جانب انہوں نے کوہ مکلی کے ایک پشتے پر قلعہ تغلق آباد تعمیر کیا اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ آج کل اسے کلاکوٹ کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ساموئی اور قلعہ تغلق آباد کے درمیان ٹھٹھہ آباد کیا اور اس میں اپنا پایۂ تخت منتقل کیا۔

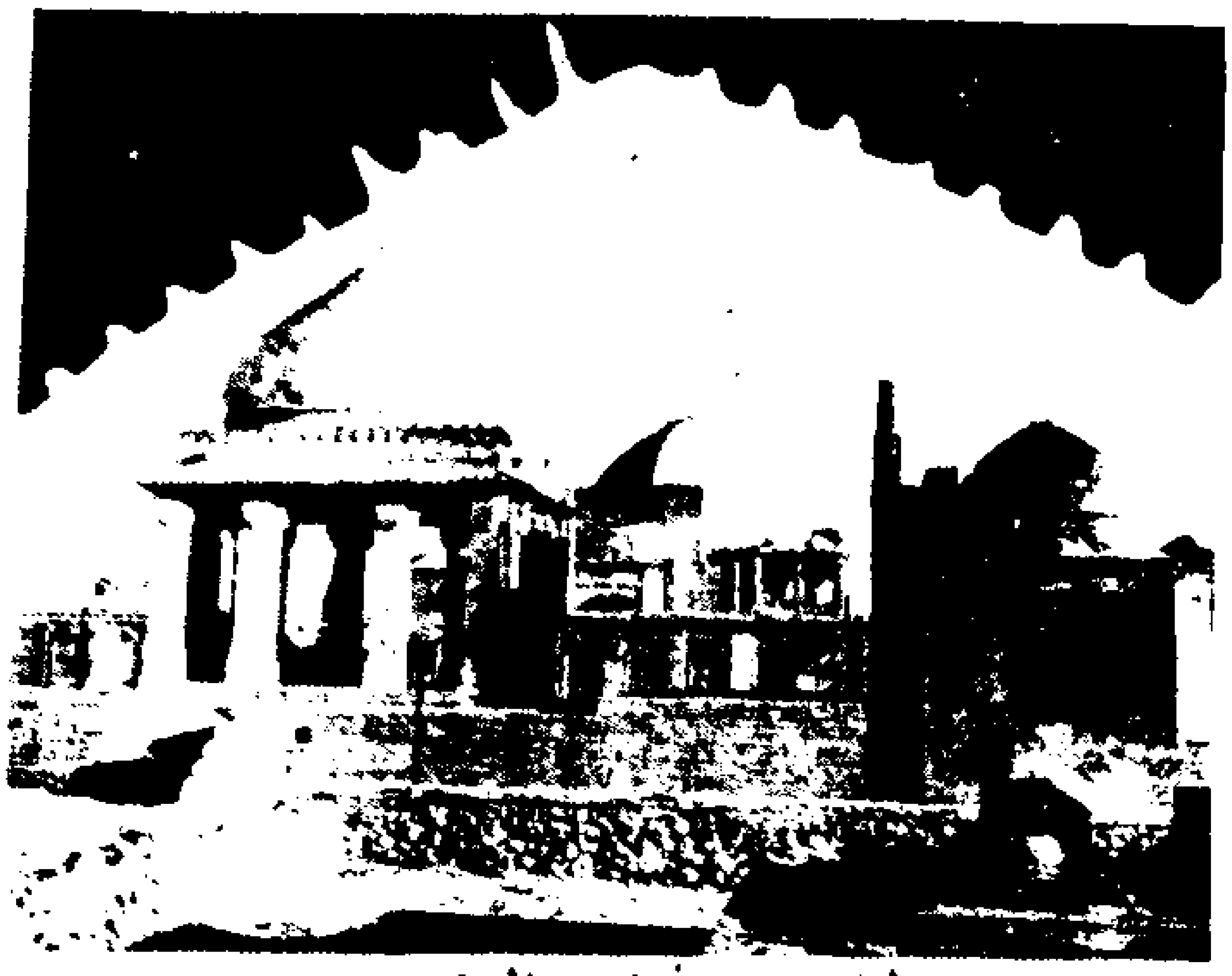

ٹھٹھہ میں شاہجہانی مسجد

ٹھٹھہ کا ذکر سب سے پہلے ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں ملتا ہے۔ آثاریات سندھ کے مشہور محقق ہیگ کے خیال کے مطابق "یہ غالباً ۱۳۴۰ء میں آباد ہوا ہو گا۔ مدت دراز تک یہ ایک اہم تجارتی مرکز رہا۔ مشہور مؤرخ وڈنگٹن کے بقول مغلیہ دور میں تجارت میں ٹھٹھے کی برابری ہندوستان کا کوئی شہر نہ کر سکتا تھا۔" اس زمانے میں ملتان بھکر سے سامان تجارت دریا کے راستے کشتیوں پر ٹھٹھہ میں لایا جاتا تھا۔ ۹۹۹ھ/۹۱-۱۵۹۰ء میں جب خانخاناں نے ٹھٹھے پر لشکر کشی کی تو لشکر کے لئے غلہ کشتیوں کے ذریعے لاہور سے وہاں تک پہنچایا گیا تھا

۱۶۱۴ء کی حدود میں پرتگیز لاہور سے کشتیوں کے ذریعے مال تجارت یہاں لاتے تھے اور پھر یہاں سے ایران بھیجتے تھے۔ وڈنگٹن نے لاہور سے ٹھٹھہ کی مسافت تیس دن لکھی ہے جبکہ فنچ نے یہ مسافت چالیس دن بتائی ہے۔

تاریخ میں ٹھٹھے کا ذکر بار بار آیا ہے۔ عرب فاتحین پہلی بار اموی خلیفہ عبدالملک کے دور میں وارد ہوئے اور محمد بن قاسم نے الور کی مہم کے لئے ٹھٹھے ہی کے قریب سے دریائے سندھ کو پار کیا۔ یہ علاقہ پہلے اموی خلفاء اور بعد میں عباسی خلفاء کے عاملوں کے ماتحت رہا۔

۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں محمود غزنوی نے قادر باللہ عباسی کے عاملوں کو اُچ اور ملتان سے نکال دیا۔ ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء میں محمود غزنوی کے وزیر عبدالرزاق نے سندھ پر حملہ کیا اور ٹھٹھے اور سیوستان کے لوگوں کو زیر کر کے عربوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ٹھٹھہ پر غزنویوں کا ۵۸۳ھ/۱۱۸۳ء تک قبضہ رہا۔ اس کے بعد یہاں بدامنی اور بے چینی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ خاندان تغلق کے زمانہ میں سندھ کی ہندو رعایا نے اپنے حقوق کا مطالبہ کر دیا۔ ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء میں جب سلطان غیاث الدین تغلق ملتان سے دہلی گیا تو یہاں کی سومرہ قوم نے بغاوت کر دی اور ٹھٹھے پر قبضہ کر لیا۔ ۷۵۱ھ میں سلطان محمد شاہ تغلق کی وفات پر جو ٹھٹھے کے قریب ہی ہوئی تھی طغی نے بغاوت کر دی۔ قوم سومرہ اور رجاریچہ سے ساز باز کر کے فیروز شاہ تغلق سے ٹھٹھے کے قریب جنگ لڑی۔ ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء میں ٹھٹھے کے حاکم جام خیرالدین نے بھی بغاوت

Marfat.com

کردی۔ جس کی وجہ سے فیروز شاہ تغلق کو ایک بار پھر ٹھٹھے کا رُخ کرنا پڑا۔ خیرالدین قلعہ بند ہوگیا۔ بعد میں اس نے سلطان سے معافی مانگ لی۔ چنانچہ سلطان نے اس کے بعد اس کے بیٹے جام جونہ کو ۷۷۷ھ/۱۳۷۵ء میں ٹھٹھے کا حاکم بنایا جو ۷۹۱ھ/۱۳۸۸ء تک یہاں کا حاکم رہا۔ اس کے بعد جام علی شیر کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا لیکن اسے اس کے بھائیوں نے قتل کر دیا۔ جام علی شیر ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء سے ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء تک یہاں کا حاکم رہا۔ اس کے بعد سلطان علی شاہ میران خان نے ٹھٹھہ فتح کر کے ۸۱۶ھ میں جام کرن کو یہاں کا حاکم بنایا لیکن عوام نے دوسرے روز ہی اسے قتل کر دیا۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں صلاح الدین نے سلطان مظفر کی مدد سے ٹھٹھے پر قبضہ کر لیا۔

سلاطین تغلق کے بعد سے ٹھٹھے کے خود مختار حکمرانوں کا دور شروع ہو جاتا ہے ان خود مختار حکمرانوں میں جو جام ہی کہلاتے تھے جام نندو یعنی جام نظام الدین ٹھٹھے کا پہلا حکمران تھا۔ اس کا دورِ حکومت ۸۶۶ھ/۱۴۶۱ء سے ۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء تک ہے اس کا عہدِ حکومت نہایت زرین عہد ہے۔ وہ بڑا نیک، علم دوست اور دیندار انسان تھا۔ اس نے چوروں اور ٹھگوں کا قلع قمع کیا۔ قاضی عبداللہ کی نمازِ جنازہ قاضی صاحب کی وصیت کے مطابق اسی جام نندو نے پڑھائی تھی۔ کیونکہ نیکی عفت کے لحاظ سے جام نندو ضرب المثل تھا۔

۹۱۴ھ/۱۵۰۸ء میں شاہ بیگ ارغون بھکر کے حکمران نے جام نندو کی وفات کے بعد ٹھٹھ پر پہلا حملہ کیا۔ ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء میں ایک اور حملے کے بعد اس نے ٹھٹھے پر قبضہ کر کے سموں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء میں شاہ بیگ ارغون کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسین مسند نشین ہوا جو بڑا با تدبیر اور صاحبِ استقلال انسان تھا۔ اس نے مغلوں کے سندھ میں پاؤں کا جمنے دیئے۔ اس کے بعد ٹھٹھ پر ترخانوں کی ۴۸ سال حکومت رہی۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں میرزا عیسیٰ ترخان کے عہدِ حکومت میں پرتگیزوں نے ٹھٹھے پر دھاوا بول دیا۔ لوگ نمازِ جمعہ ادا کر رہے تھے کہ فرنگیوں نے شہر میں لوٹ مچائی کر کے گھروں کو آگ لگا دی۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو عیسیٰ خاں بھکر میں تھا۔ چنانچہ وہ یہ خبر سن کر ٹھٹھ آیا۔ اس نے دریا کے ساتھ ساتھ شہر کے گرد ایک فصیل بنوائی۔ ایک نہر شہر تک کھدوائی۔ ایک نیا قلعہ "شاہ بندر" تعمیر کرایا۔

جب شیر شاہ سوری سے ہمایوں نے شکست کھائی تو وہ لاہور سے ہوتا ہوا بھکر پہنچا اور وہاں سے مایوس ہو کر ٹھٹھ آیا۔ شاہ حسین میرزا ارغون نے ہمایوں سے جنگ کی اور لشکر بادشاہی میں غلے کا پہنچنا بند کرا دیا جہاں سے وہ ناچار جودھپور کی طرف چلا گیا۔

۹۹۹ھ/۹۱-۱۵۹۰ء میں جب خانخاناں نے شہنشاہ اکبر کے عہد میں سندھ پر حملہ کیا تو ٹھٹھ ترخانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اور یہاں پر خاندانِ مغلیہ کے مقرر کردہ نواب حکومت کرنے لگے۔

جب ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء میں سندھ کا ایک الگ صوبہ بنایا گیا تو ٹھٹھ اس کا صدر مقام بنا۔

ٹھٹھے میں عہدِ مغلیہ کی دو مساجد بہت زیادہ خوب صورت اور دل کش ہیں ان میں سے ایک تو عہدِ جہانگیر میں نواب مظفر خاں کے دور ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۴ء میں مکمل ہوئی اور دوسری شاہجہان کی جامع مسجد ہے جو ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء میں تعمیر کی گئی تھی نواب سردار خان اس آفت ناگہانی سے تقریباً نصف شہر غیر آباد ہو گیا۔ نواب حفیظ اللہ خان نے یہاں ایک قلعہ کی تعمیر شروع کرائی جو نامکمل ہی رہ گئی ۱۰۹۹ھ

۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب نے داراشکوہ کے تعاقب میں فوجیں بھیجیں تو وہ ٹھٹھ میں آ گیا۔ جہاں سے بعد میں وہ گجرات کی طرف بھاگ گیا۔

میاں نور محمد کلہوڑہ نے شاہانِ مغلیہ سے لے لیا۔ ۱۱۱۰-۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں ہملٹن ٹھٹھے سے گذرا اس نے لکھا ہے "یہ شہر تین میل لمبا اور نصف میل چوڑا تھا اور اس کی آبادی ۸۰ ہزار تھی۔"

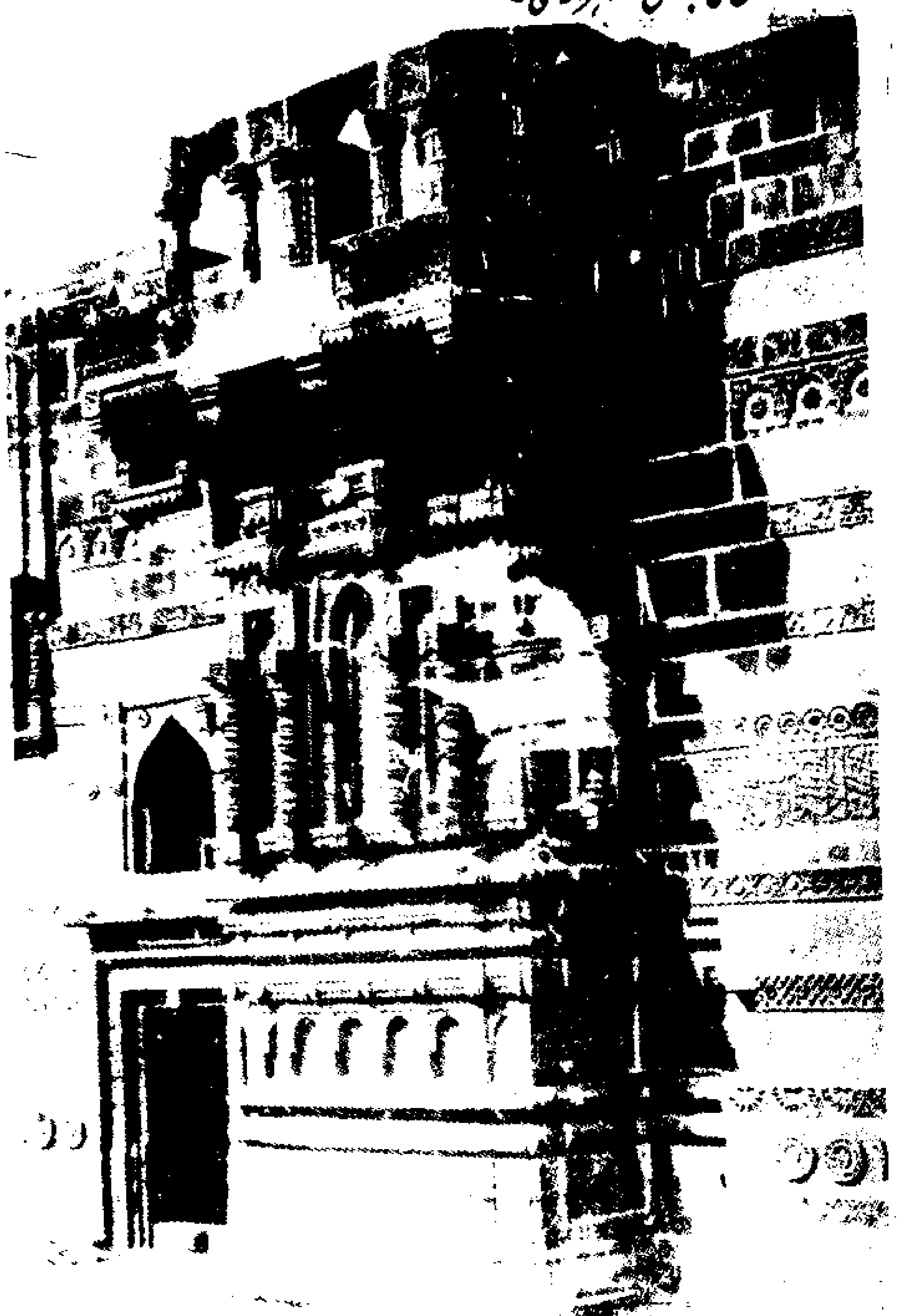

ٹھٹھہ میں جام نظام الدین کا مقبرہ

بارھویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی میں ٹھٹھ ایک مردم خیز شہر تصور ہوتا تھا۔ یہ بہت سے اولیاء، علماء و فضلاء اور دوسرے نامور اہلِ کمال کا مرکز تھا۔

۱۷۵۸ء میں یہاں پر ایک برطانوی فیکٹری (تجارتی کوٹھی) قائم کی گئی۔ ۱۸۳۹ء میں ایک برطانوی فوج کا دستہ اس کوٹھی میں متعین کیا گیا۔

عہدِ حاضر میں دریائے سندھ ٹھٹھ سے تقریباً چھ میل مشرق میں بہتا ہے اور چار پانچ میل نیچے جا کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء تک یہ دریا ٹھٹھے کے جنوب میں بہتا تھا۔ اس کی ایک شاخ اس شہر کے مغرب میں بہتی تھی۔ ٹھٹھ ایک بارونق شہر ہے۔ ببول اور کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ دور سے دیکھا جائے تو درختوں کے جھنڈ سے شہر کی اٹھتی ہوئی عمارات کا منظر بہت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ ٹھٹھ کی آبادی پچیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ آثارِ قدیمہ میں اولیاء اللہ کے مزار، مساجد وغیرہ ہیں۔ مساجد میں خصوصاً شاہجہان اور اورنگ زیب کی بنائی ہوئی اور مقابر میں حاکمِ سندھ عیسیٰ ترخان، جام نظام الدین اور مرزا جانی بیگ

Marfat.com

کے مزار قابل دید ہیں۔

ٹیپو سلطان (ب ۲۰ ذی الحج ۱۱۶۳ھ/۲۰ نومبر ۱۷۵۰ء — ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ/۴ مئی ۱۷۹۹ء) ہندوستان کی سلطنت میسور کا آخری فرمانروا شیر میسور نواب حیدر علی کا بیٹا۔ تحریک آزادی ہندوستان کا پہلا شہید۔ دیون ہلی کے مقام پر پیدا ہوا۔ والدہ کا نام فاطمہ فخر النساء تھا۔ حیدر علی نے نرینہ اولاد کی آرزو میں آرکاٹ کے مشہور بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر دعا مانگی تھی۔ اس لئے بیٹے کا نام اسی بزرگ کے نام پر رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیپو کا اصل نام فتح علی تھا، لیکن تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس کا نام فتح علی تھا یا اس کی کنیت ابوالفتح تھی۔ البتہ اس کے ایک بیٹے کا نام فتح حیدر ضرور تھا۔ "تاریخ حمید خانی" کے مصنف محب الحسن خان کی روایت کے مطابق ۱۷۶۹ء میں نظام دکن نے ٹیپو کو "فتح علی خان بہادر" کا خطاب دیا تھا۔ "نشان حیدری" کے مولف حسین کرمانی کے بقول حیدر علی نے ایک وفد ٹیپو کی سرکردگی میں دکن روانہ کیا تھا۔ جہاں ٹیپو کو "نصیب الدولہ" کا خطاب ملا۔

بچپن ہی سے ٹیپو جری، محنت کش اور صاحب لیاقت تھا۔ اسلامی علوم کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، تامل، کنٹری جیسی زبانوں پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔ نیز اس زمانے کے فنون سپہ گری شمشیر زنی، تیر افگنی، نیزہ بازی، تفنگ اندازی، تیراکی وغیرہ میں بھی کما حقہ مہارت حاصل کر لی تھی اور سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے ٹیپو سلطان حرب و ضرب کے آداب اور رزم و پیکار کے انگریزی طریقوں سے بھی واقف ہو چکا تھا۔

۱۷۶۵ء میں ٹیپو سلطان فوجی زندگی میں پہلی بار ہمارے سامنے آتا ہے، جب وہ حیدر علی خاں کے ساتھ مالابار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہاں اس نے صرف دو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے ایک بڑے لشکر کو حراست میں لے لیا جس پر حیدر علی نے خوش ہو کر اسے اپنی محافظ فوج میں شامل کر لیا اور جاگیر عطا کی۔

۱۹ر جون ۱۷۶۷ء کو ٹیپو سلطان مدراس اور اس کے مضافات پر چھاپے مار رہا تھا۔ اس وقت انگریز پہلی بار میسور میں حیدر علی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہاں سے وہ واپس لوٹتے ہوئے ترناپور اور وانم باڑی کی تسخیر میں والد کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ نیز آنبور کے محاصرے میں بھی شریک رہا۔

جب انگریزوں نے منگلور (بندر کوڑیال) پر قبضہ کر لیا۔ تو ٹیپو سلطان کو ان کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے حیدر علی بھی وہاں پہنچا۔ یہاں انہوں نے عجب چال چلی۔ بیگار میں پکڑے ہوئے بیس ہزار افراد کو لکڑی کی بندوقیں دے کر ہزار ہزار کی ٹکڑی میں انگریزی توپ خانے کے سامنے کھڑا کر دیا اور خود ٹیپو سلطان مورچوں پر حملہ آور رہا۔ اس محاذ پر فتح یابی کے بعد حیدر علی مدراس کی طرف روانہ ہو گیا اور ۴ر اپریل ۱۷۶۹ء کو حکومت مدراس کو صلح نامہ لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے دیسی ریاستوں میں کمپنی کا وقار گر گیا اور انہوں نے خود کو مضبوط اور مستحکم محسوس کیا

حیدر علی انگریزوں سے نمٹ کر واپس آیا کہ مرہٹہ فوجیں ترمبک راؤ کی قیادت میں میسور کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ ساونور اور کڑپہ کے سردار بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس مرحلے پر ٹیپو سلطان کو حکم ملا کہ وہ مرہٹوں کی رسد کو تباہ کرے۔ چنانچہ اس نے مرہٹوں کے عقب میں موجود تمام کنوؤں اور تالابوں میں زہر ڈلوا دیا اور کھیت روند ڈالے۔ اب حیدر علی نے بھی مرہٹوں کے عقب پر چھاپہ مارنا چاہا۔ مرہٹوں کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے پلٹ کر جنگ شروع کر دی۔ مشیروں کی رائے کے خلاف حیدر علی سرنگاپٹم کی طرف فرار ہو گیا۔ اس افراتفری میں ٹیپو اپنے باپ سے جدا ہو گیا۔ جس سے مرہٹوں نے فائدہ اٹھایا اور ٹیپو کی گرفتاری کا اعلان کر دیا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی ٹیپو دو دن جانثاروں کے ساتھ بھیس بدل کر سرنگاپٹم پہنچ گیا اور دونوں باپ بیٹا ایک ماہ تک وہاں محصور رہے۔ ترمبک راؤ تقریباً تین ماہ محاصرے سے تنگ آ گیا اور وہاں سے اٹھ کر تنجاور کی طرف چلا گیا۔

۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کی وفات کے بعد دربار پونا کی اندرونی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر علی نے دریائے تنگ بھدرا اور کرشنا کے درمیانی علاقے مرہٹوں سے چھین لئے۔ ان میں اکثر مہمات میں ٹیپو بھی شریک رہا۔

۱۷۸۰ء میں انگریزوں سے دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ حیدر علی اور سلطان ٹیپو نوے ہزار فوج کے ساتھ کرناٹک جا پہنچے۔ انگریز سپہ سالار سیکٹر منرو کانجی ورم پہنچ کر کرنل بیلی کا انتظار کر رہا تھا، جو سامان رسد و اسلحہ کے ساتھ گنتور سے آ رہا تھا ٹیپو سلطان کو بیلی پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ سلطان نے بیلی کو کانجی ورم سے پندرہ میل پرے بری طرح شکست دے کر قید کر لیا۔ بیلی کی شکست کے بعد اعتراف کیا گیا کہ یہ شدید ترین ضرب تھی، جو ہندوستان میں انگریزی قوت پر لگی۔

ادھر حیدر علی نے منرو پر حملہ کرنے کی بجائے آرکاٹ کا محاصرہ کر لیا۔ ٹیپو سلطان بھی مدد کو پہنچا اور شہر فتح ہو گیا۔ پھر ٹیپو سلطان آنبور اور بعض دوسرے قلعے مسخر کر کے اگست ۱۷۸۱ء میں واپس آرکاٹ پہنچا۔ جہاں سے ۱۷۸۲ء میں اسے تنجاور بھیج دیا گیا۔ یہاں اس نے کرنل بریتھویٹ کو شکست فاش دی۔

عقب سے خبر ملی کہ انگریزی فوجیں ساحل مالابار پہنچ رہی ہیں۔ چنانچہ سلطان فوراً پلٹا اور پال گھاٹ کا محاصرہ کر لیا۔ انگریز اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پال گھاٹ خالی کر کے پونانی پہنچ گئے۔ ٹیپو سلطان نے پونانی کا بھی محاصرہ کر لیا۔ مگر ابھی وہ حملہ نہ کر پایا تھا کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر ملی۔

حیدر علی نے ۷ر دسمبر ۱۷۸۲ء کو وفات پائی۔ سرداروں نے فوراً مرزا خاں کو ٹیپو سلطان کی طرف بھیج دیا اور میت کو غسل دے کر تابوت میں رکھا اور مناسب پہرے کے ساتھ کولار کی طرف بھیج دیا۔ نیز چھوٹے بیٹے عبدالکریم کو عارضی طور پر مسند نشین کر دیا۔

۱۱ر دسمبر ۱۷۸۲ء کو ٹیپو سلطانؒ کو خبر ملی اور وہ اسی وقت روانہ ہو گیا۔ ۲۵ر دسمبر ۱۷۸۲ء کو وہ چکور پہنچ گیا، جہاں اس کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے تمام ماتمی رسوم کی ممانعت کر دی اور ۲۰ر محرم ۱۱۹۷ھ/۲۶ر دسمبر ۱۷۸۲ء کو خاموشی کے ساتھ مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

تخت نشینی کے وقت ٹیپو سلطان کی سلطنت دکن میں شمالی طرف دریائے کرشنا، جنوبی سمت ریاست ٹراونکور، مشرق میں مشرقی گھاٹ اور مغرب میں ساحل سمندر تک پھیلی ہوئی تھی۔ آبادی، زرخیزی اور حسن انتظام کی بدولت یہ ایک شاندار سلطنت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے علاوہ مقامی ہمسائے مرہٹے اور نظام حیدرآباد اس علاقے کو ہتھیا لینے کی فکر میں تھے۔ مگر دوسری طرف اس علاقے کا فرمانروا ایک ایسا سلطان تھا۔ جو نہ صرف موروثی طور پر جری اور مجاہد تھا بلکہ دور شہزادگی میں بھی عزم و حوصلے اور تدبر کی داد لے چکا تھا۔

حکومت سنبھالتے ہی ٹیپو سلطان نے سب سے پہلا کام اپنی فوج کو منظم کرنے کا کیا۔ اس نے باقاعدہ رجمنٹیں مقرر کیں اور ماہور تنخواہ مقرر کر دی۔ اس سے

Marfat.com

پہلے ہندوستان میں ماہوار تنخواہ کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس نے فرانسیسی افسروں کی خدمات حاصل کیں تاکہ فوج کو یورپی نمونے پر منظم کیا جاسکے۔ عام روایت کے مطابق ٹیپو سلطان کی باقاعدہ فوج ایک لاکھ کے قریب تھی۔

انگریزوں نے جنرل میتھیوز کی سرکردگی میں از سرِ نو مالا بار پر حملہ کردیا اور بدنور کے حاکم ایاز خاں نے نہ صرف شہر و قلعہ بلکہ پورا صوبہ بدنور اس شرط پر انگریزوں کے حوالے کردیا کہ اس کی حکومت بدستور اسی کی تحویل میں رکھی جائے۔ سلطان کو خبر ہوئی تو اس نے لطف علی بیگ کو دفاع کی غرض سے بھیجا۔ اس وقت تک انگریز ایاز خاں سے سمجھوتے کے مطابق بڑے علاقے پر قابض ہوچکے تھے۔ لطف علی بیگ نے باقی علاقے کو بچانے کی کوشش کی لیکن انگریزوں کی قوت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ فتح کے بعد انگریزوں نے وہاں انتہائی دردناک مظالم روا رکھے۔

یہ خبریں سلطان تک پہنچیں تو وہ بگولے کی طرح اٹھا اور انگریزوں پر چھا گیا اس نے ایک ہی حملے میں بدنور پر قبضہ کرلیا۔ یہاں وہ بنگلور پہنچا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ انگریز جنرل کیمبل نے ۲ راگست ۱۷۸۳ء کو صلحنامہ پر دستخط کردیئے۔

ہر طرف سے شکست و ہزیمت اٹھا کر انگریزوں نے میسور میں سازشوں کا آغاز کردیا۔ سرنگا پٹم میں ہندو راجا کو گدی پر بٹھانے کی سازش کرائی گئی۔ لیکن ٹیپو سلطان کی تدبیروں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور نتیجۃً ۱۱ رمارچ ۱۷۸۴ء کو انگریزوں اور سلطان کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ جس کی رو سے فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کردیئے۔ اور اسیرانِ جنگ چھوڑ دیئے۔

انگریزوں سے فارغ ہو کر سلطان نے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ اتحاد کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ادھر نظام اور مرہٹوں کے درمیان اس امر پر اتفاق ہوگیا کہ میسور کی سابقہ ریاست چھوڑ کر باقی تمام سلطانی مقبوضات کو چھین کر باہم تقسیم کرلیا جائے۔ ایک جھڑپ کے بعد دونوں فروری ۱۷۸۷ء میں سلطان کے ساتھ صلح کرلینے پر مجبور ہوگئے۔ طے پایا کہ دونوں طاقتیں انگریزوں کے خلاف سلطان کو مدد دیں گی۔

اسی زمانے میں سلطان نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا، جسے دونوں ہمسایہ ممالک نے تسلیم کیا۔ خطبے میں مغل حکمران کی جگہ اپنا نام شامل کرایا۔ نیا روپیہ جاری کیا۔ انتظامی معاملات درست کیے۔ نیا آئینِ حکومت نافذ کیا۔ سرنگا پٹم میں مسجد اعلیٰ کی تعمیر اختتام کو پہنچی۔ سن ہجری کی جگہ سن محمدی جاری کیا جو آغاز نبوت سے شروع ہوتا تھا۔ مہینوں کے نئے نام رکھے اور ملک بھر میں مختلف صنعتیں جاری کروائیں

سلطان نے فرانس کے دستورِ جمہوریت سے متاثر ہوکر اس کا عملی نفاذ اپنے ہاں بھی کرنا چاہا اور دفاعی اور خارجی امور کے علاوہ دیگر تمام تر اختیارات مجلسِ وزراء کو سونپ دیئے۔ جس کا میر (وزیر اعلیٰ) یعنی صدر الصدور میر صادق کو بنایا۔

۱۷۸۴ء میں سلطان نے عثمان خاں کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا تھا۔ وہاں سے حوصلہ افزا جواب آیا تو غلام علی خان لنگڑے، شاہ نور اللہ، لطف علی بیگ اور محمد حنیف کو ایک سفارت پر روانہ کیا۔ جسے قسطنطنیہ کے بعد فرانس اور پھر انگلستان بھی جانا تھا، مگر یہ سفارت صرف ترکی ہی سے واپس لوٹ آئی۔ سلطان ترکی نے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے لیے پروانۂ سلطانی بھجوایا۔ اسی طرح سلطان نے کریم خان زند، حاکم ایران، زمان شاہ درانی حاکم افغانستان اور شاہ فرانس کے پاس بھی الگ الگ سفارتیں بھجوائیں

ٹیپو سلطان

اس وقت لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے آتے ہی تمام معاہدوں سے انحراف کرنا شروع کردیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ ٹیپو سلطان کو شکست دیئے بغیر انگریزی حکومت قائم کرنے کے خواب کی تعبیر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ مگر فوجی و عددی برتری کے باوجود ابھی تک وہ سلطان کو شکست سے آشنا نہ کرسکے تھے۔ یہ دیکھ کر کارنوالس نے سازشوں کا ایک جال بچھانا شروع کردیا۔

مرہٹوں اور نظام کے ساتھ انگریزوں کی گفت و شنید جاری تھی کہ ٹراونکور کے راجہ نے انگریزوں کی شہ پر سلطانی علاقے کوچین پر قبضہ کرلیا۔ اسی دوران میں ٹراونکور نے ولندیزیوں سے دو قلعے جیاکوٹہ اور کرنگانور خرید لیے جو دفاعی لحاظ سے میسور کی سرحد پر اہم حیثیت رکھتے تھے۔ کارنوالس نے اس سودے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اور ولندیزی گورنر نے بھی اس میں اپنی عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ ان حالات میں ۲۴ دسمبر ۱۷۸۹ء کو جب سلطان نے اپنی سرحدوں کا جائزہ لیا۔ تو اس نے ایک خط راجہ کو لکھا کہ دونوں قلعے اسے واپس دے دیئے جائیں۔ نیز کوچین کا علاقہ بھی واپس کر دیا جائے۔ راجہ کے غیر ذمہ دارانہ جواب پر سلطان نے اس کی گوشمالی کرنے کے لیے کچھ فوج بھیجی، جس کے ساتھ راجہ کی فوجوں کی چھوٹی سی جھڑپ ہوئی۔

جولائی ۱۷۹۰ء میں مدراس کے گورنر نے کارنوالس کی ہدایت کے مطابق سلطان کو لکھا کہ جھگڑے کے تصفیے کے لیے کمشنر مقرر کیے جائیں۔ سلطان نے اتفاق کیا اور اور کہا کہ بہتر ہے کمشنر اس کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ جب میڈوز گورنر بنا تو اس نے کمشنر سے انکار کردیا۔ سلطان نے اپنے سفیر بھیجنا چاہے تو اسے بھی نہ مانا اور کہلا بھیجا کہ

ٹیپو سلطان شہید - ایک ہندوستانی مصور کی نظر میں -

Marfat.com

صلح چاہتے ہو تو تاوان ادا کرو۔

بعد کے واقعات کچھ یوں ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں نے ٹراونکور کے واقعہ کو بہانہ بنا کر تیسری بار میسور پر حملہ کر دیا۔ ابتدا میں جنرل میڈوز فوج کی کمان سنبھال۔ اس نے جنوبی سمت سے میسور پر حملہ کر دیا۔ مئی سے دسمبر ۱۷۹۰ء تک اس کے حملے ناکام رہے۔ فروری ۱۷۹۱ء میں کارنوالس نے کمان سنبھالی اور سیدھا بنگلور کی طرف بڑھا سلطانی فوج مدافعت میں ناکام رہی اور کارنوالس نے بنگلور کو فتح کرنے کے بعد مئی ۱۷۹۱ء میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ مگر چیچک پھوٹ پڑنے کی وجہ سے محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا ابھی کارنوالس محاصرہ اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ مرہٹے اس کی مدد کو آ گئے۔ اور یوں فروری ۱۷۹۲ء میں اس نے دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ سامان رسد کی موجودگی میں اسے محاصرے کی طوالت کا کوئی خوف نہ تھا۔ ادھر سلطانی فوج ہر قسم کی کمک سے محروم ہو چکی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریز چاہتے تو سلطنتِ میسور کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر ٹیپو سلطان کا دبدبہ ان پر اس قدر طاری ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو مصالحت کا پابند بنانے ہی میں عافیت سمجھی۔

اس مصالحت میں طے پایا کہ:۔

۱۔ سلطان نصف سلطنت اتحادیوں (انگریز مرہٹے اور نظام) کے حوالے کر دے

۲۔ تین کروڑ تیس لاکھ پگوڈے کی رقم تاوان دے۔ اس میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ کی رقم فوراً ادا کی جائے اور باقی رقم فی الفور ادا کر دی جائے۔

۳۔ تمام اسیران جنگ رہا کر دیئے جائیں۔

۴۔ معاہدے کی شرطیں پوری ہونے تک سلطان کے دو بیٹے بطور یرغمال اتحادیوں کے پاس رہیں۔

اس معاہدے سے سلطان پر سیاسی، معاشی اور انتظامی طور پر سخت ضرب لگی۔ اندازہ لگانے کی بات ہے کہ جس ملک کا مالیہ اڑھائی کروڑ ہو، وہ نصف ملک بھی ہاتھ دے اور تین کروڑ سے زیادہ تاوان بھی دے۔ اس کی معاشی حالت کیسی ہو جائے گی۔ اس کے باوجود سلطان نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی اولالعزمی میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ جفاکشی کے ساتھ انتظام سلطنت میں لگ گیا سرکشوں کو سزا دی۔ وفاداروں سے حلف لیا۔ زراعت کی حوصلہ افزائی کی اور فوج کو از سر نو مستحکم کیا اور صرف پانچ ہی برس کی انتھک محنت سے ملکی معیشت کو سنبھالا دے دیا۔

اس دوران میں سلطان کی سیاسی اور فوجی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ تجارت اور صنعت کے علاوہ اس نے فرانس کے ساتھ کئی فوجی معاہدے بھی کئے اس وقت نپولین مصر فتح کر چکا تھا۔ اس نے جو خط ٹیپو سلطان کو لکھے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایران کے راستے ہندوستان آنا چاہتا تھا تاکہ یہاں انگریزوں سے نمٹ سکے۔ اس خط سے انگریز بھی آگاہ تھے۔ ابتدا میں تو وہ خاموش رہے مگر جب مرہٹوں اور نظام کی طرف سے انہیں مکمل معاونت کا یقین ہو گیا تو انگریز گورنر ولزلی نے سلطان کو تہدید آمیز خطوط لکھنے شروع کئے۔

سلطان کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے۔ مسلمان آپس کی سرپھٹول کے باعث کمزور ہو چکے تھے اور سات سمندر پار کی ایک قوم اپنے پنجے اس سرزمین میں گاڑ رہی ہے۔ اگر اس قوم کا مقابلہ نہ کیا گیا تو بہت جلد ہندوستان جیسا زرخیز علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا جائے گا جو یہاں سے دولت کو ہر روپ میں انگلستان پہنچا دیں گے۔

مگر افسوس کہ سلطان اپنے محل اور دربار میں ہونے والی سازشوں کو نہ سمجھ سکا۔ بزعم خود اس نے فرانسیسی طرز کی جمہوریت نیو ڈال دی۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ یہ زمین بھی موزوں ہے یا نہیں۔ میر صادق، پورنیا اور قمرالدین خاں جیسے وزرا اختیارات کو ناجائز طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہ فوری فوائد کے لالچ میں درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور حکومت کو مناصب کے بڑے بڑے عہدوں کی امید میں سلطان کا ہر راز ان تک پہنچا دیتے تھے۔

جب سلطان کے دل میں ان سازشوں کے متعلق شکوک کی جگہ گھیری تو اس نے تمام عہدیداروں کو مسجد اعلیٰ سرنگاپٹم میں بلا کر وفاداری اور ایمانداری کا حلف لیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ انگریزوں کی سازشیں عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ اور ولزلی سلطان کو جنگ کی دھمکی دے چکا تھا

جولائی ۱۷۹۸ء میں ولزلی نے جنرل ہیرس کو حکم دیا کہ سلطان سے گفت و شنید ختم کر دی جائے اور سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا جائے۔ سلطان کو علم ہوا تو اس نے سفیر کے ذریعے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی مگر اس کا جواب یہ ملا کہ اب جنرل ہیرس ہی سے بات چیت ہو سکتی ہے۔

فروری ۱۷۹۹ء میں جنرل ہارس نے پیشقدمی شروع کر دی۔ ۲۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو اس نے سرنگاپٹم پر گولہ باری سے پیشتر مصالحت کا ایک مسودہ سلطان کی خدمت میں دستخط کرنے کے لئے بھیج دیا۔ جس میں انتہائی ذلت آمیز شرائط درج تھیں۔ یعنی نصف سلطنت چھوڑ دی جائے۔ دو کروڑ تاوان دیا جائے۔ جن میں سے ایک کروڑ فوراً ادا کیا جائے۔ چار بیٹے اور چار جرنیل بطور یرغمال دیئے جائیں۔ یہ جواب چوبیس گھنٹے کے اندر مانگا گیا تھا۔

سلطان ایسی ذلت آمیز شرائط پر صلح نہ کر سکتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" امید افزا جواب نہ ملنے پر جنرل ہیرس نے قلعہ پر گولہ باری شروع کرا دی۔ سلطانی افواج نے اس گولہ باری کا پوری مستعدی سے جواب دیا۔ مگر سلطانی وزرا غداری کی قسم کھائے بیٹھے تھے انہوں نے گولہ بارود میں مٹی اور سن ملوا دیا۔

۴ مئی کی صبح انگریزی افواج سرنگاپٹم کے گرد موجود دریائے کاویری کا دو سو گز پاٹ پار کر کے فصیل کے ایک شگاف پر حملہ کیا۔ سلطان نے خود وہاں دفاعی فوج متعین کی تھی۔ مگر عین اس وقت پورنیا نے محافظ فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے بلا لیا۔ یوں انگریزی فوج بلا تکلف اندر داخل ہو گئی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ٹیپو سلطان مورچوں پر سے چکر لگا کر سائبان تلے آ کر بیٹھا تھا کھانا سامنے دھرا تھا۔ ابھی لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک جاں نثار سید غفار کے شہید ہونے کی اطلاع ملی۔ پتا چلا کہ انگریزی فوج قلعہ میں آ گئی ہے۔ سلطان نے یہ کہہ کر کھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ "ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں۔"

اس وقت انگریزی فوج اندر آ چکی تھی۔ سلطان ڈڈی دروازے کی طرف بڑھا چند جاں نثار ساتھ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ قلعہ سے باہر نکل کر کسی اور مقام پہ پناہ لی جائے۔ لیکن میر صادق نے باہر نکل کر دروازہ بند کرا دیا اور خود شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ایک جاں نثار اس کی غداری کو بھانپ لیا اور پیچھے دوڑ کر تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑا دی

اب سلطان ہر طرف سے انگریزی فوج میں گھر چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی تلوار اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ سلطان کے دو زخم لگ چکے تھے۔ تیسرے زخم نے

Marfat.com

نڈھال کر دیا۔ وفاداروں نے اٹھا کر پالکی میں ڈالنا چاہا۔ لیکن ایک ہجوم نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ سلطان زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑا ایک انگریز سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کی بیش قیمت پیٹی اتارنا چاہی۔ ابھی سلطان میں زندگی کی رمق اور غیرت کا جوش باقی تھا۔ فوراً تلوار کا وار کیا۔ اور سپاہی کو کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ ایک اور سپاہی یا شاید اسی سپاہی نے پستول کے وار سے سلطان کو شہید کر دیا۔

۵ مئی کو انگریزوں نے سلطان کی میت کو حیدر علی کے پہلو میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا۔ اس کی دو بیویاں تھیں اور بارہ بیٹے تھے، جو اس کے بعد حراست میں لے گئے۔

۶ مئی تک سرنگاپٹم میں لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ محل کے علاوہ عوام کے گھروں سے کروڑوں اربوں پونڈ مالیت کی اشیاء اٹھائی گئیں۔ ہزاروں لاکھوں افراد شہید ہوئے اور اس لوٹ مار کو روکنے کے لیے خود انگریز جرنیلوں نے اپنے کئی سپاہیوں کو پھانسی پر چڑھایا۔

اس وقت بڑا شہزادہ فتح حیدر سرنگاپٹم سے باہر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا، مگر انگریزوں کے ساتھ ساتھ پورنیا نے تخت دلانے کا یقین دلایا۔ چنانچہ اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ بعد میں لارڈ ولزلی اپنے عہد سے پھر گیا اور سلطان شہید کے شہزادوں کو دو لاکھ چالیس ہزار پگوڈا کا وظیفہ دے کر میسور کی گدی پر قدیم راجا کے بے پالک بیٹے کو بٹھا دیا۔ شہزادوں کو پہلے ویلور میں نظر بند کیا گیا اور بعد ازاں کلکتے منتقل کر دیا۔

ٹیپو سلطان ایک بہت بڑا مجاہد اور پکا مسلمان تھا۔ نماز صبح کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا اور سارا دن باوضو رہتا۔ خود عالم تھا اور اہل علم کی قدردانی کرتا تھا۔ اس کا کتب خانہ ہندوستان کے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔

اس کے اوضاع و اطوار پسندیدہ اور مثالی تھے۔ حیاداری کا یہ عالم تھا کہ حمام میں بھی کپڑ باندھ کر نہاتا۔ اس نے کبھی ایسا کپڑا نہ باندھا جس سے جسم شرعی حدود میں ننگا ہوتا یا جس میں نماز نا جائز ہوتی۔ آخری دور میں سبز رنگ کی دستار پہنتا تھا۔ مکروہات اور منہیات سے اس نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ تمام فرامین پر اپنے ہاتھ سے بسم اللہ لکھتا اور نیچے دستخط کرتا۔

شجاعت اور بہادری میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ شیر اس کا پسندیدہ جانور تھا۔ شاید اسی لیے انگریزوں نے اسے شیر میسور ہی کا لقب دیا تھا۔ اسلامی حمیت اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تعصب سے بھی پاک تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ پورنیا جیسے ہندو اس کے وزراء میں شامل تھے۔

ٹیپو سلطان بے حد اختراع پسند تھا۔ سن محمدی، نئے سکوں، نئی وضع کے اسلحے، قواعد و ضوابط، آئین وغیرہ کا اجراء اس کی اختراع پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اسے اپنی ریاست اور عوام سے بے حد محبت تھی اور ہمیشہ ان کی فلاح و بہبود میں لگا رہتا۔ اگرچہ اس کا زیادہ تر وقت میدان جنگ میں گذرا، اس کے باوجود اسے جتنا بھی وقت ملا، اسے اس نے عوام کی فلاح کے لیے صرف کیا۔ کسانوں کو مالیہ معاف کیا سرکاری زمین پٹے اور ملکیت پر کاشت کے لیے دی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے لیے بہتر اقدامات کیے۔ اس سے پہلے ہندو عورتیں عام طور پر سر و سینہ کھولے پھرتی تھیں۔ اس نے حکم دیا کہ کوئی عورت کرتے اور اوڑھنی کے بغیر باہر نہ نکلے۔

وہ مذہبی شعائر کا سختی سے پابند تھا۔ رمضان میں پورا ماہ روزوں کا احترام کرتا اس نے گدی نشینوں اور مجاوروں کو نذر و نیاز لینے سے منع کر دیا۔ نیز لوگوں کو اپنے سامنے احتراماً جھکنے سے بھی منع کر دیا۔

حکومت کے لیے اس نے مختلف محکمے قائم کیے، جو تعداد میں ننانوے تھے۔ ہر محکمے کا ایک میر مقرر کیا۔ توشے خانے کو دو حصوں جنس اور نقد میں تقسیم کیا۔ بحریہ کا مستقل محکمہ قائم کیا۔ فوجی قواعد کے لیے کتاب لکھوائی۔ فن جہاز سازی پر توجہ دی۔ مقناطیسی پہاڑوں سے جہازوں کو بچانے کے لیے لوہے کی جگہ تانبے کے پیندے کا استعمال ٹیپو سلطان ہی کی ایجاد ہے۔

تجارتی و صنعتی ترقی کے لیے ہندوستان میں پہلا قدم ٹیپو سلطان ہی نے اٹھایا ریشم کی صنعت اسی کی مرہون منت ہے۔ اسے گنے، گندم، جوار، پان کی کاشت سے خصوصی دلچسپی تھی۔ درختوں میں چیڑ، سال، ساگوان، سپاری، صندل اور ناریل لگانے پر زور دیتا۔ شہتوت کے درختوں پر ریشم کے کیڑے پالنے کے لیے بڑے بڑے باغات لگوائے۔

ان تمام امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان ایک ایسا مسلمان، غیور، مجاہد باہمت جری، قابل، منتظم اور حکمران تھا۔ جس کی مثال تاریخ بہت کم پیش کر سکے گی مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد وہ جنگ آزادی کا پہلا ہیرو اور پہلا شہید تھا۔ زندگی بھر وہ انگریزوں کا دشمن رہا اور اس نے ان کے غلبے سے ملک کو بچانے کے مقصد کی خاطر جان دے دی۔ دشمن پر اس کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ عرصہ دراز تک انگریز مائیں اپنے بچوں کو ٹیپو کا نام لے کر ڈراتی رہیں۔

ثابت رض بن ضحاک صحابی ابو زید کنیت تھی اور قبیلہ اشہل سے تھے۔ آپ بعثت نبوی کے تیسرے سال پیدا ہوئے۔ غزوہ حمراء الاسد اور خندق میں حصہ لیا۔ آپ سے چودہ احادیث کی روایت ہے۔ آنحضور ؐ کے وصال کے بعد آپ نے شام میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر شام سے بصرہ منتقل ہو گئے اور وہیں پر مستقل سکونت پذیر ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں وفات پائی۔

ثابت رض بن وحداح صحابی۔ ابو الدحداح کنیت قبیلہ بلی کے خاندان انیف سے تھے ہجرت کے بعد مشرف باسلام ہوئے اور بہت سے غزوات میں حصہ لیا۔ غزوہ احد میں جب مسلمان بدل ہو کر لڑائی سے کترانے لگے تو آپ نے انتہائی ثابت قدمی اور عزم و استقلال کا ثبوت دیا۔ قریش مکہ کے چند جانبازوں نے آپ کی شجاعت دیکھ کر آپ پر حملہ کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں کی ہمت افزائی کرنے والا کوئی شخص باقی نہ رہے خالدؓ بن ولید (جو ابھی تک اسلام نہیں لاتے تھے) کے نیزے سے زخمی ہو کر گر پڑے علاج کی بدولت عارضی طور پر تندرست ہو گئے۔ لیکن غزوہ حدیبیہ کے بعد زخم پھر سے ابھر آئے جو جان لیوا ثابت ہوئے۔

آپ صدقہ و سخاوت میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ کئی مرتبہ آپ نے مالی قربانی دی اور بے شمار دولت خرچ کی۔

ثابت بن قیس رض صحابی۔ ابو محمد کنیت اور خطیب رسول اللہ لقب تھا۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ کئی غزوات میں آنحضور ؐ کی معیت میں لڑے۔ حضرت جویریہؓ غزوہ مریسیع میں اسیر ہو کر ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں۔ جنہیں آنحضور ؐ نے رقم دے کر ثابت بن قیسؓ سے آزاد کرایا اور اپنے عقد میں لے لیا۔ ۹ ھ میں بنو تمیم کے وفد کے سامنے آپ نے آنحضور ؐ کے حکم سے جوابی خطبہ

Marfat.com

دیا اسے سن کر بنو تمیم دنگ رہ گئے اور آپ کی فصاحت کے معترف ہوئے۔ ۱۱ھ میں جب طلیحہ پر فوج کشی کی گئی تو انصار آپ ہی کی قیادت میں تھے۔ جب وہ آیت جس میں مسلمانوں کو رسول اللہؐ کے سامنے اونچی آواز میں بولنے سے منع کیا گیا نازل ہوئی تو حضرت ثابتؓ بن قیس کو فکر دامنگیر ہوئی اور اپنے گھر میں سر جھکا بیٹھے رہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا تو کہنے لگے۔ میں اکثر آنحضورؐ کے سامنے اونچی آواز سے بولتا رہا اس باعث مجھے ضرور جہنم میں جانا پڑے گا۔ جب آنحضورؐ کو اس بات کا علم ہوا تو فرمایا "خدا کی قسم ثابتؓ جہنمی نہیں۔ بلکہ میں اسے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔"

۱۲ھ میں مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کے دوران شہید ہوئے۔

ثابت بن قرہ (۲۱۹ھ/۸۳۴ء — ۲۶ صفر ۲۸۸ھ/۱۸ فروری ۹۰۱ء) ماہر ریاضیات طبیب اور فلسفی۔ حران میں پیدا ہوا۔ وہ ایک اونچے خاندان کا فرد تھا۔ ابتدائی عمر میں صراف تھا۔ قیام بغداد کے دوران میں اس نے فلسفہ اور ریاضی میں مہارت حاصل کر لی۔ محمد بن موسیٰ اسے اپنے ہمراہ بغداد لے گیا اور خلیفہ معتضد کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ نے اپنے درباری منجموں میں شامل کر لیا۔ بغداد میں ثابت کا بیشتر وقت یونانی علماء کی تصانیف کے ترجمے اور شرح نویسی میں گذرا۔ اس کے علاوہ اس نے خود بھی ریاضی میں کتابیں لکھیں۔ فلسفے کا مطالعہ اور مطب کا شغل بھی جاری رکھا۔ اور بغداد ہی میں انتقال کیا۔

خلیفہ کے دربار میں ثابت کی بارسوخ شخصیت سے صابیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ثابت کی سریانی تصانیف جو اس نے غالباً حران ہی میں اپنے ہم مذہبوں کے عقائد اور طرق عبادت کے متعلق لکھیں تھیں۔ آج کل یہ کتابیں ناپید ہیں۔ ابن العبری کو جس نے تیرہویں صدی میں انتقال کیا۔ ان کتب کے متعلق ایک حد تک معلومات تھیں

ثابت کی عربی تصانیف کی فہرستیں خوول زون، زوٹر، شتائن، شتائنڈر براکلمان اور وڈیمان نے اپنی کتب میں دی ہیں۔ بہت سا قیمتی اور قابل اشاعت مواد اب بھی مخطوطات کی صورت میں موجود ہے۔

ثانی شرقپوری رح (۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء — ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء) میاں غلام اللہ نام حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے بھائی اور خلیفہ۔ شرقپور میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ تربیت میاں شیر محمد نے کی۔ میٹرک تک تعلیم پائی اور طبیہ کالج سے حکیم حاذق کا امتحان پاس کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی تو طبابت چھوڑ کر میونسپل کمیٹی شرقپور میں سیکرٹری ہو گئے میاں صاحب نے اپنی زمین واقع جھوک گنڈ والی ان کے نام کر دی تو نمبرداری بھی مل گئی۔ ایک روز میاںؒ صاحب نے نظر توجہ کی تو تصوف کی راہ پر آ گئے اور ان کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں انہوں نے جامع حضرت میاں صاحبؒ کی بنیاد رکھی اور تبلیغ اسلام کے لیے ایک انجمن "حزب الرسول" قائم کی۔ تین حج کیے اور تقریباً تیس برس تک منصب خلافت ادا کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ پسماندگان میں دو صاحبزادے چھوڑے۔

حضرت ثانیؒ صحیح معنوں میں میاں صاحب کے ثانی تھے۔ انھی کی مانند وعظ فرمایا کرتے۔ خلاف شریعت کسی کو بات نہ کرنے دیتے۔ طبیعت میں انتہائی سادگی اور سخاوت تھی۔ سائل کو کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹایا کرتے۔ دین اسلام کی اشاعت کا شوق بے حد، جس کا مظہر تبلیغی انجمن ہے۔ ان کا عرس ۲۹ رسے ۳۱ رجولائی تک ہوتا ہے۔

ثعالبی تین مشہور عرب مصنفین جنکا اسم نسبتی ثعالب سے ماخوذ ہے یعنی لومڑیوں کی کھالیں سینے اور ان کا کاروبار کرنے والے

(۱) ۔ ثعالبی ابو منصور: — (۳۵۰ھ/۹۶۱ء — ۴۳۰ھ/۱۰۳۹ء) عبد الملک بن محمد اسماعیل پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کا ایک کاتب، شاعر اور مصنف جس کی پچاس سے زائد تالیفات ہیں۔ نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کے حالات زندگی جو اس کی تصانیف سے اخذ کئے گئے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔

بقول ابن خلکان "ثعالبی فراء تھا یعنی لومڑی کی کھال کی پوستینیں سیا اور بنایا کرتا تھا۔ لیکن بقول ذکی مبارک "یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کا ادبی کمال ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور اس کی شہرت ابھی دور دور تک نہیں پہنچی تھی۔ جب اس نے کاتب، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے کمال حاصل کر لیا تو ملوک و امرائے وقت کے ہاں اسے تقرب حاصل ہو گیا۔ جن امراء کے پاس اسے رسائی اور تقرب حاصل تھا ان میں امیر صاحب الجیش ابو المظفر نصر بن ناصر الدین سلطان مسعود ابن محمود، ابو العباس مامون بن مامون خوارزم شاہ خلف بن احمد سنجری الشیخ ابو الحسن محمد بن عیسے الکرجی، امیر ابو الفضل عبید اللہ بن احمد المیکالی، ابو الحسن مسافر بن الحسن، الوزیر ابو النصر احمد بن محمد، امیر ابو النصر سہل ابن المرزبان تھے۔

۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء میں ثعالبی نیشاپور چھوڑ کر جرجان پہنچا۔ وہ ایک طویل مدت تک غزنہ میں مقیم رہا۔ ۳۸۲ھ/۹۹۲ء میں وہ بخارا میں تھا۔ ۴۰۳ھ میں جرجان سے جرجانیہ گیا۔ تقریباً ایک سال بغداد میں بھی مقیم رہا۔

ثعالبی کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور تصنیف "یتیمۃ الدھر فی محاسن ابن العصر" ہے۔ یہ کتاب اس نے ہارون بن المنجم کی کتاب البارع کے ذیل کے طور پر لکھی۔ یہ کتاب ۳۸۴ھ میں لکھنا شروع کی اور تقریباً ۴۰۳ھ میں اسے جرجان میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں ثعالبی کے معاصر اور اس سے پہلی نسل کے شعراء کا تذکرہ ہے۔ جس کی ترتیب شعراء کے اوطان کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تذکرہ میں زیادہ تر منتخب اشعار مجموعہ ہے۔ جس میں شعراء کے سوانح حیات عام طور پر نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تعریفی کلمات مبالغہ آمیز بیان کئے ہیں اور ان کلمات کا استعمال مختلف شعراء اور ادبا کے لئے اس طرح کیا ہے کہ کسی کے بارے میں بھی تشخیص اور تمیز میں مدد نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اس کی ایک کتاب "اقتباس کلم النبیؐ والصحابہ والتابعین وملوک الجاہلیہ وملوک الاسلام والوزراء والکتاب والبلغا والحکماء" بھی بے حد اہم ہے۔

(۲) ثعالبی، ابو منصور: — (وفات ۔ ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) حسن بن محمد المرغنی۔ ایک عرب مورخ ۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں۔ اس نے ایک کتاب "الغرر فی سیر الملوک واخبارھم" لکھی اور اسے امیر نصر محمود غزنوی کے بھائی کے نام معنون کیا۔ اس کتاب میں نوع انسانی کی تاریخ حضرت آدمؑ سے لیکر محمود سبکتگین کے زمانے تک درج ہے۔ اس کتاب میں عرب تاریخ نویسی کی پرانی رسم یعنی واقعات کو خالصتاً سال وار لکھنے کی قیود سے آزاد ہو کر تاریخ کو نفسیاتی اصول کے مطابق قلمبند کرنے کی ایک قابل تعریف کوشش ہے۔ اس نے طبری، جوالیقی اور دوسرے عرب مورخین کی کتب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مگر کسی تنقید کے بغیر

Marfat.com

ان کا مواد شامل تصنیف کر دیا۔

(۱۱) ثعالبی، عبد الرحمٰن :۔ (۷۸۸ھ/۱۳۷۶ء – ۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء) بن محمد بن مخلوف الجزائری۔ شمالی افریقہ کے ایک عالم دین الجزائر میں پیدا ہوئے۔ بجایہ، تونس اور قاہرہ میں تعلیم پائی۔ قاہرہ سے بغرض حج بیت اللہ حجاز کا قصد کیا۔ زیارت خانہ کعبہ کے بعد تونس واپس آئے اور یہیں وفات پائی۔

آپ کی تصانیف میں سب سے اہم قرآن مجید کی تفسیر ہے جو آپ نے ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء میں مکمل کی۔ تفسیر کا نام "الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن" ہے۔ اس کے علاوہ "العلوم الفاخرہ فی النظر فی امور الاخرہ" جو مسائل معاد پر ہے۔ "جامع الامہات فی احکام العبادات" اور "رسالہ الالغاز المغنیہ الجامعہ بین الشریعۃ والحقیقۃ" بھی آپ کی بہترین تصانیف میں سے ہیں۔

ثعلبہ بنو

ایک عام اور قدیم اسم علم جس کا اطلاق قدیم عرب کے متعدد قبائل کبیرہ کی بڑی شاخوں کے ناموں پر ہوتا ہے۔ مثلاً "ثعالبہ بن عکابۃ" جو بکر بن وائل کے بڑے قبیلے کی اہم شاخ ہے اور یمامہ سے بحرین تک کے علاقے میں آباد ہے۔ "ثعلبہ بن ذبیان" جو غطفان کی شاخ ہے۔ اور علاقہ نفود میں آباد ہے۔ "ثعلبہ بن یربوع" تمیم کا ایک قبیلہ ہے۔

ثعلبہ نام کے دو اور قبائل بھی قابل ذکر ہیں ان میں یثرب بن اوس کا ایک قبیلہ ثعلبہ اور دوسرا "ثعلبہ بن الفطیون" جو یہود بنی قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا ایک رکن مخیریق بہت بڑا عالم تھا یہ آنحضورؐ کا مخالف تھا بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا اور جنگ احد میں شہید ہوا۔

ایک اور شخص ثعلبہ بن عمرو بن مجالد تھا جو خاندان غسان کا پہلا رئیس بتایا جاتا ہے۔

ثعلبی

(وفات ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) احمد بن محمد بن ابراہیم، ابو اسحاق نیشاپوری۔ ایک مشہور امام اور مفسر۔ آپ کی مشہور تصنیف تفسیر "الکشف والبیان عن تفسیر القرآن" ہے۔ اس تفسیر میں آپ نے طبری کے علاوہ تقریباً ایک سو ماخذوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تفسیر حجم کے لحاظ سے تفسیر بیضاوی سے دوگنا ہے۔ دوسری مشہور تصنیف "قصص انبیاء" جو تاج العرائس کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انبیاء کے بارے میں تمام واقعات تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔

ثقافت

تہذیب، تمدن، فلاحت، تربیت، ذہنی ترقی، ظہور انسانیت اختیار آداب، رکھ رکھاؤ۔ یہ ایک مجموعی لفظ ہے، جو معاشرت، تہذیب اور تمدن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاحی طور پر ثقافت، تہذیب اور تمدن کے معنوں میں فرق ہے۔

ثقافت کے اصطلاحی معنی انسانوں کے طریق زندگی کے ہیں۔ یعنی انسان کیونکر رہتے، ملتے جلتے، کھاتے پیتے، بستے گاتے اور سلیقے سکھاتے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر طرز معاشرت کو ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے کلچر (CULTURE) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی "ہل چلانا" یا "کھیتی باڑی کرنا" کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کے مفہوم میں ذہنی ترقی، اخلاق و آداب، تہذیب و تمدن اور قومی خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام کام اکتسابی ہوتے ہیں۔ یعنی انسان خود سیکھ کر کرتا ہے۔ ان میں جبلی اور فطری طور پر انجام پانے والے کام شامل نہیں۔ مثلاً بھوک جبلی شے ہے اس لئے یہ ثقافت میں شامل نہیں۔ مگر اسے مٹانے کے لئے جو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ انہیں ثقافت میں شامل کیا جاتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ ثقافت ماحول اور ضرورت کے تحت جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہے۔ ثقافت ہر شخص کی ضرورت ہے اور ہر شخص ثقافت میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

تہذیب ثقافت کی ایک شاخ ہے، جس میں تحریر کا استعمال، شہروں کا وجود سیاسی ردّ و بدل اور پیشہ وارانہ تخصص شامل ہے۔ جدید دور کے محققین نے ثقافت کی حدود میں مذہب، فلسفہ، آرٹ اور معاشرت کو شامل کیا ہے اور تہذیب میں ہر طرح کے تکنیکی علوم کو شامل کیا ہے۔ ثقافت کی طرح ہر شخص تہذیب میں اپنا کردار ادا نہیں کرتا اور یہ اس کے لئے ضروری بھی نہیں۔ ثقافت کی ترقی میں تہذیب ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ثقافت تہذیب یافتہ بھی ہو سکتی اور غیر تہذیب یافتہ بھی۔ مثلاً حجری دور کی ثقافت ۳۰۰۰ ق م میں تہذیب یافتہ ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس وقت تحریر اور شہر وجود میں آ چکے تھے۔

تمدن بھی تہذیب کی طرح ثقافت کی ایک شاخ ہے۔ یہ لفظ مدینہ سے نکلا ہے۔

قاہرہ کی جامع ازہر (۹۷۰ء) کا دالان

Marfat.com

جس کے معنی شہر کے ہیں۔ تمدن کو شہر کے حوالے سے پہچاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تمدن شہروں کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ گویا تمدن شہری طرز معاشرت و معیشت کا نام ہے۔ غلطی سے تمدن کے لفظ کو تہذیب کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جب ہم ہڑپا یا قدیم روما کی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل ہم اس کے تمدن کی بات کرتے ہیں۔ تمدن عارضی اور مقامی ہوتا ہے۔ ہر قوم اور علاقے کے ساتھ اس کا تمدن نشوونما پاتا اور زوال عمر اس کے ساتھ ہی مٹ جاتا ہے۔

ثقافت، تہذیب اور تمدن کی ان تعریفوں میں سے بھی ثقافت کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں آتا۔ اس سلسلہ میں اے ایل کروبر اور اس کے ایک دوست نے اہم علمی کوشش سر انجام دی ہے۔ ان کے نزدیک ثقافت :-

۱۔ کا حقیقی تعلق معیار سے ہے۔
۲۔ اس میں شعور و ادراک بھی ایک اہم فعل ہے۔
۳۔ ضروری ہے کہ یہ معیار کسی نوع یا معاشرہ کی عملی زندگی میں جاری و ساری ہو۔
۴۔ اس طرز زندگی کو اس نہج کا ہونا چاہیئے کہ اس پر صحت مند مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

اسلامی ثقافت

کیا مسلمانوں کی جداگانہ ثقافت، تہذیب یا تمدن ہے یا کبھی رہا؟ کیا اسلام نے کسی قسم کی ثقافت کا آغاز کیا؟ ۔ اس کا جواب صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ خود منکرین یورپ نے بھی دیا ہے۔ "تشکیل انسانیت" میں رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

"یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد و گوناگوں اثرات ہیں۔ جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔ پھر اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہلو نہیں جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتا نہ چلے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے ظہور سے ملتا ہے۔ جو عصر حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کارفرمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ ہمارا مطلب ہے علوم طبیعیہ اور روح علم کے ظہور سے ...."

بریفالٹ کی طرح دیگر مستشرقین کو بھی اس امر کا بخوبی یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب یا ثقافت مغربی تہذیب و تمدن کو پچھاڑ سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی تہذیب ہے۔ جو علم و اخلاق سے آراستہ اور عشق جیسی توانائی سے مسلح ہے۔ مصر و بابل کا تمدن ختم ہو گیا، ان کی تہذیب و تمدن اجڑ گئی اور ثقافت برباد ہو گئی۔ چین کی ثقافت عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی ہندو تہذیب و تمدن اوہام اور خرافات کا مجموعہ ہے اور یورپی تہذیب میکیاولی کی ابلیسی سیاست پر مبنی ہے۔

مولانا مودودی نے اسلامی تہذیب اور اس کے مبادیات پر بہ احسن طریق قلم فرسائی کی ہے۔ انہوں نے ثقافت اور تہذیب کو ہم معنی الفاظ قرار دیتے ہوئے تہذیب ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع بدائع، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست (جسے ہم نے ثقافت کا نام دیا ہے) تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ جبکہ تہذیب کے عناصر ترکیبی ۱۔ تصور زندگی۔ ۲۔ زندگی کا نصب العین ۳۔ بنیادی افکار و عقائد، ۴۔ اخلاقی تربیت، ۵۔ نظام اجتماعی ہیں۔ دنیا کی ہر تہذیب انہی عناصر سے بنی ہوئی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اسلامی ثقافت کو ان عناصر کی بنیاد پر دیکھیں، لازم ہے کہ ثقافت کے وسیع مفہوم کا جائزہ لیتے ہوئے اسلامی ثقافت کا کھوج لگائیں اس کا آغاز داعئ اسلام کی بعثت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ" وہ بنیادی کلمہ ہے، جس پر اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن کی عمارت استوار ہوتی ہے، جس کا سب سے پہلا اخلاقی مظہر "السلام علیکم" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ وحشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا اور ایشیا و افریقہ کی ثقافت و تمدن میں تہذیب کا شائبہ تک نہ تھا۔ یورپ کا تمدن بھی غیر مہذب اور ثقافت بھی غیر مہذب تھی۔ اس وقت اسلام کی روشنی عرب سے نکلی جس کی تہذیب نے پوری دنیا کو راہ ہدایت دکھائی۔ اسلام وہ پہلا دین ہے، جس نے مذہب کی صحیح حدود متعین کیں۔ اسے ذاتی ذوق سے نکال کر اجتماعی مقام عطا کیا فلسفے کو ایک نیا موڑ بخشا، تمام علوم و فنون کو یکجا کیا اور انسانی تہذیب و معاشرت کو یک لخت بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ تکنیکی علوم میں مسلمانوں نے جدید یورپ کی سی ترقی نہیں کی لیکن بغداد

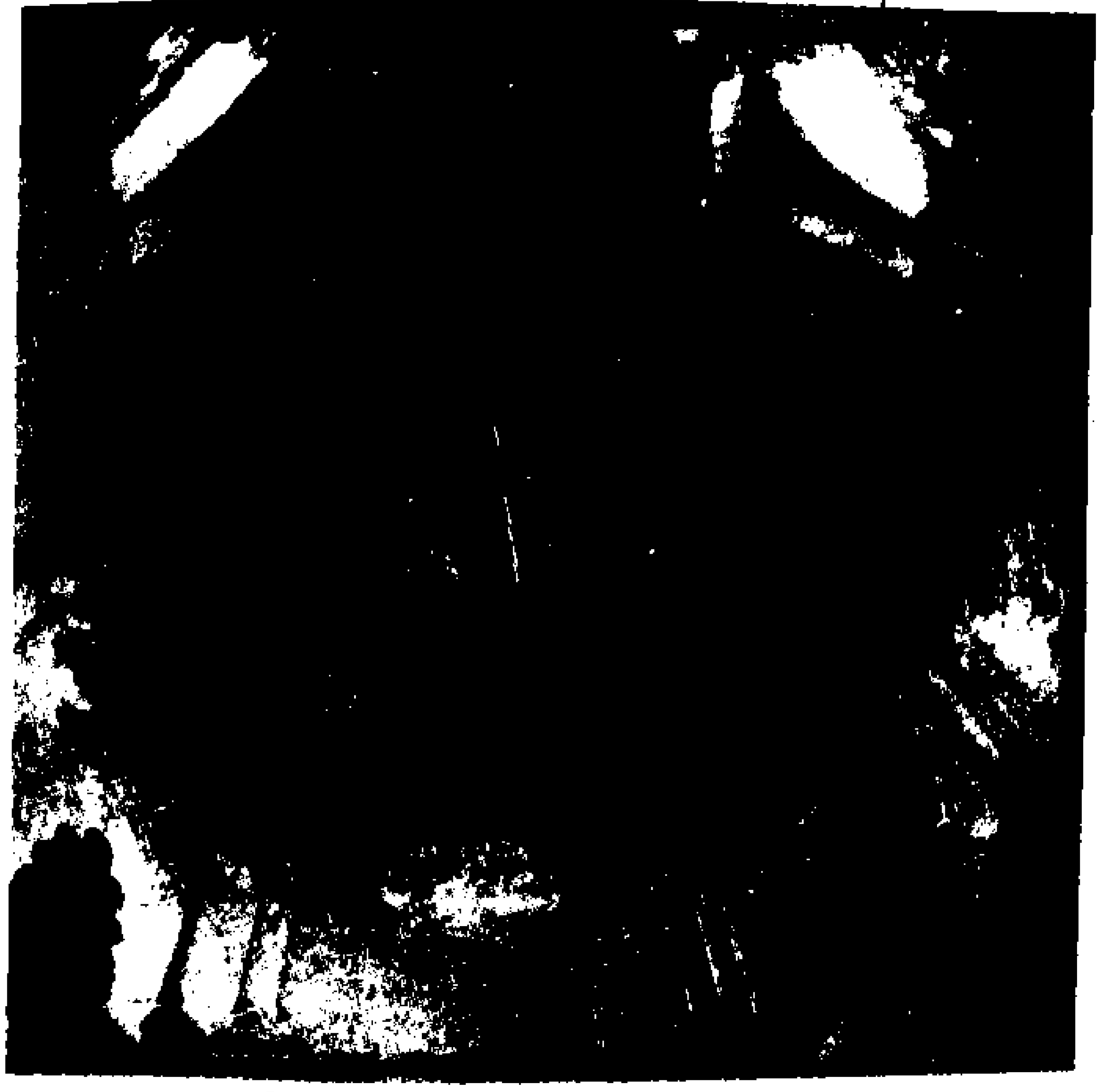

قرطبہ کی جامع مسجد کا اندرونی گنبد

برصہ میں عثمانی تعمیرات۔ (۱۳۹۰ء)

Marfat.com

کتاب "مجالس حریری" از واسط حریری کا ایک ورق (عباسی عہد ۱۲۲۲ء)

اور اندلس کے مراکز علوم وفنون کی بیشتر مثالیں تکنیکی علوم میں مسلمانوں کے ذوق وشوق کا اظہار کرتی ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے طرز زندگی میں اس حد تک تبدیلی پیدا کر دی کہ آج بھی مختلف مقامی ثقافتوں کے باوجود مجموعی طور پر اسلامی ثقافت ایک ہی ہے جس کا آغاز کلمہ طیبہ سے ہوتا ہے تو انجام صفائی (باطنی وجسمانی) پر۔

اسلامی ثقافت کی بنیادیں

اسلامی ثقافت کیونکر ایک جداگانہ حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور اس سے مسلمانوں کی مختلف تہذیبوں اور تمدنوں نے کیوں کر جنم لیا؟ اس کا جواب مولانا مودودی نے اپنی کتاب میں واضح طور پر دیا ہے۔ ان کی تشریحات کا لب لباب یہ ہے۔

۱ اسلام کا تصور زندگی:۔ اسلام کا تصور زندگی دیگر تمام اقوام و مذاہب سے جدا اور افراط وتفریط میں میانہ روی ہے۔ اسلام نے نہ تو انسان کو غیر ذمہ دار اور متکبر ہونے کی اجازت دی ہے اور نہ مجبور و بے کس مخلوق ٹھہرایا ہے۔ انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ نطفہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ بے بس بچہ ہوتا ہے۔ قدرت اس کی پرورش کا سامان کرتی ہے۔ وہ جوان ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو کر مر جاتا ہے۔ اس مختصر عرصہ حیات میں وہ ایک لمحہ بھی اپنی زندگی پر قادر نہیں ہوتا۔ یقیناً اس سے بالاتر ایک قوت موجود ہے جس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف کائنات کی تمام چیزیں انسان کے لئے کار آمد ہیں۔ وہ ان پر فضیلت رکھتا ہے اور انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ اس لحاظ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور نائب ہے کائنات اور اس کی تمام اشیاء کا مالک حقیقی اللہ ہے انسان کو اس کا تصرف حاصل ہے مگر اس تصرف کے سلسلے میں وہ اللہ کے آگے جوابدہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے انسان کائنات اور اس کی اشیاء کا استعمال اللہ کی بتائی ہوئی حدود میں رہتے ہوئے کرے۔ اس ذمہ داری میں ہر شخص فرداً فرداً اللہ کے آگے جواب دہ ہے۔ یہ دنیا صرف برتنے کے لئے ہے۔ حلال چیزیں خود حرام کرنے اور حرام کو حلال کرنے والے خدا کے باغی ہیں۔ جن کا حساب آخرت میں ہوگا۔ ایماندار اچھا اجر پائیں گے اور بے ایمان اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ ضرورت ہے کہ دنیا اور اس کے اموال کا استعمال اس طرح سے کیا جائے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ کیونکہ ایک وقت آنے والا ہے کہ جب ہر نفس کو اس کی سعی کے مطابق بدلہ ملے گا پس جو شخص ذرہ برابر بھی نیک عمل کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر برا عمل کرے گا وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ ہر نفس جو کچھ کماتا ہے، اس کا بوجھ اسی پر ہے اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

شاہنامہ فردوسی کا ایک ورق "سکندر اعظم کی محفل"

ایک گروہ انسان کو مجبور و بے کس ٹھہراتا ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک کائنات کی بنیاد تکلیف اور دکھ پر ہے۔ تیسرا گروہ اس زندگی کو حقیقی سمجھ کر تعیش کی راہ پر گامزن ہے اور چوتھا گروہ اس ساری دنیاوی زندگی کو سراسر گناہ سمجھ کر رہبانیت کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن اسلام ان سب کے بین بین رستہ اختیار کرتا ہے اور انسان کو طبعی قوانین قدرت کا پابند ٹھہرا کر نیابت الٰہی کا مکلف ٹھہراتا ہے۔

یہی چیز اسلامی ثقافت کی پہلی بنیاد ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھک سکتا۔

۲۔ زندگی کا نصب العین:۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر فرد، قوم اور تہذیب میں اس کا جواب مختلف طور سے ملے گا۔ تاہم ایک شئے ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے خوشی اور مسرت کا حصول۔ روحانی تہذیبوں میں اسے نجات کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام میں زندگی کا نصب العین صرف اللہ کی خوشنودی کو قرار دیا گیا ہے۔ انسان کا ہر خیال، ارادہ اور عمل صرف اللہ کے لیے ہونا فرض ہے یعنی جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، وہ دراصل اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ اخلاق وطبعی قوانین کے تحت کیا جاتا ہے۔ جب تمام کائنات ایک خدا کی مطیع وفرمانبردار ہے تو اخلاقی وعقلی طور پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان کے ہر ارادے اور فعل کا مقصد رضائے الٰہی قرار دیا جائے تاکہ فرض نیابت بہ احسن طور ادا ہو سکے۔

جب زندگی کا مقصد اللہ کی خوشنودی ٹھہرے تو یقیناً انسان کا ہر ثقافتی فعل، خیال، ارادہ، زندگی، موت، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، معاملات معاشرت، دوستی دشمنی، معیشت ومعاشرت وغیرہ محض اللہ کے لئے ہوتی ہے۔ گویا اسلامی ثقافت کی دوسری بنیاد خالص اللہ کے لیے ہونا ہے۔ یہ چیز اسلامی ثقافت کو دنیا کی دیگر ثقافتوں اور تہذیبوں کو جدا کر دیتی ہے۔

۳۔ بنیادی افکار وعقائد:۔ ہر انسانی تہذیب اور ثقافت کسی نہ

Marfat.com

کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایمان کی اصطلاح قائم کی گئی ہے اسلام کے علاوہ دیگر تہذیبوں میں اوہام باطلہ کی ایک کثیر تعداد ایمان میں شامل ہے۔ ایسے ایمان میں قوم پرستی، شخصیت پرستی، قانون پرستی، علم پرستی، نفس پرستی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اسلام میں ایمان صرف پانچ بنیادوں پر قائم ہے۔ اس میں کسی قسم کے وہم، تعصب یا نفس پرستی کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پانچ باتوں پر ایمان کو توشۂ آخرت قرار دیا گیا۔

۱۔ اللہ پر ایمان۔ کہ وہ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ چنانچہ جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ تنگ نظر نہیں ہو سکتا، خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ اس کے سامنے خشوع و خضوع اور انکسار کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ صبر و توکل سے کام لیتا اور کبھی بھی اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا۔ اس سے اس کے اندر بزدلی نہیں آتی اور وہ ہمت و شجاعت کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے دل سے حرص و ہوس اور رشک و حسد کے جذبات بھی دور ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنے اعمال کی تہذیب کرنے پر مجبور رہتا ہے۔

(۲) فرشتوں کے وجود پر ایمان:۔ یعنی ایسی قدرتی قوتیں موجود ہیں، جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو چلائے ہوئے ہیں۔ کوئی انہیں دیوتا کہتا ہے تو کوئی طبعی قوانین اور کوئی خدا کے بیٹے۔ مگر اسلام کے نزدیک فرشتے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ مخلوق خدا ہیں۔ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے احکام کے پابند ہیں انھی میں سے کچھ پیغام رسانی پر لگے ہوئے ہیں۔ جو اللہ کی وحی اس کے برگزیدہ بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ ان پر ایمان کا مطلب ہے کہ انسان یقین کرے کہ یہ ساری کائنات ایک نظام کی طرح مربوط ہے۔ جسے خدا کے مقرر کردہ فرشتے چلا رہے ہیں۔

(۳) رسولوں پر ایمان:۔ اس بات پر ایمان لانا کہ خدا اپنے بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اور ان کی رہبری کرتا ہے۔ وہ اس پیغامبری کے لیے چند لوگوں کو چن لیتا ہے۔ انہیں رسول کہتے ہیں۔ جنہیں وحی کے ذریعے فرشتے خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ایسے لوگ غیر معمولی علم اور بصیرت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا علم یا خبر یقینی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا دیا ہوا پیغام صحیح اور سچا ہے۔ تمام پیغمبر ایک ہی پیغام لے کر آئے تھے۔ ان کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور حضرت محمدؐ پر ختم ہوا۔ آنحضور صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ گویا آخری ہدایت ہے، جس میں کوئی رد و بدل نہیں۔ یہاں آکر تمام رسولوں کے پیغام کی تکمیل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب لازم ہو گیا ہے کہ اتباع و اطاعت رسول کی جائے۔

ایمان بالرسول کی بنیاد پر جو تہذیب قائم ہوتی ہے، وہ تمام خرابیوں سے پاک ہوتی ہے۔ کیونکہ اولاً اس میں طریق فکر ایک ہی شخص مقرر کرتا ہے۔ وہی اصول اخلاق بھی متعین کرتا ہے اور وہی قوانین وضع کرتا ہے۔ اس طرح سے وہ تہذیب و تمدن کا منبع و مصدر بن جاتا ہے۔ خدا کے رسولؐ کے مقرر کردہ اصول قومی یا زمانی نہیں بلکہ آفاقی اور مبنی بر صداقت ہوتے ہیں۔ جس چیز کو محمدؐ نے کفر اور باطل قرار دے دیا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے کفر اور باطل ہے اور جسے اسلام اور حق کہہ دیا وہ ہمیشہ کے لئے اسلام اور حق ہے یہی وہ ٹھوس بنیاد ہے جس پر اسلامی تہذیب کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

(۴)۔ الہامی کتابوں پر ایمان:۔ اس امر پر ایمان لانا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولوں پر کتابیں نازل کیں۔ کتابوں سے مراد اللہ کا کلام ہے، جو اس کے رسولوں پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے کی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ اگرچہ تمام الہامی کتابوں کے وجود پر ایمان ضروری ہے لیکن اتباع صرف قرآن مجید کا ضروری ہے۔ کیونکہ دیگر الہامی کتب میں تحریف کی گئی ہے اور یوں اس میں کلام انسانی شامل کر دیا گیا ہے۔ جبکہ قرآن مجید اس خامی سے پاک ہے۔ یوں یہ شریعت اسلامی کا منبع و مصدر ٹھہرتا ہے۔ جس پر اسلامی تہذیب کی بنیاد ہے۔

(۵) یوم آخرت پر ایمان:۔ اس امر پر ایمان کہ موت کے بعد ایک زندگی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کی ہے۔ یہ زندگی صرف اس دائمی زندگی کو حاصل کرنے کی تیاری کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ ایک دن آئے گا جب ساری مخلوق دوبارہ زندہ کی جائے گی اور ان کے اعمال کے مطابق جزا و سزا قائم کی جائے گی۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل برا ملنا لازم ہوگا۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی بس یہی کچھ ہے، جو ہمارے سامنے ہے۔ دوسری کے نزدیک زندگی شعور اور احساس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تیسرے کے نزدیک روح انسانی بار بار اس دنیا میں مختلف روپ میں آتی جاتی رہتی ہے اور یوں یہ کارخانۂ حیات مسلسل چلتا رہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ کائنات ایک روز پیدا ہوئی تھی تو ایک

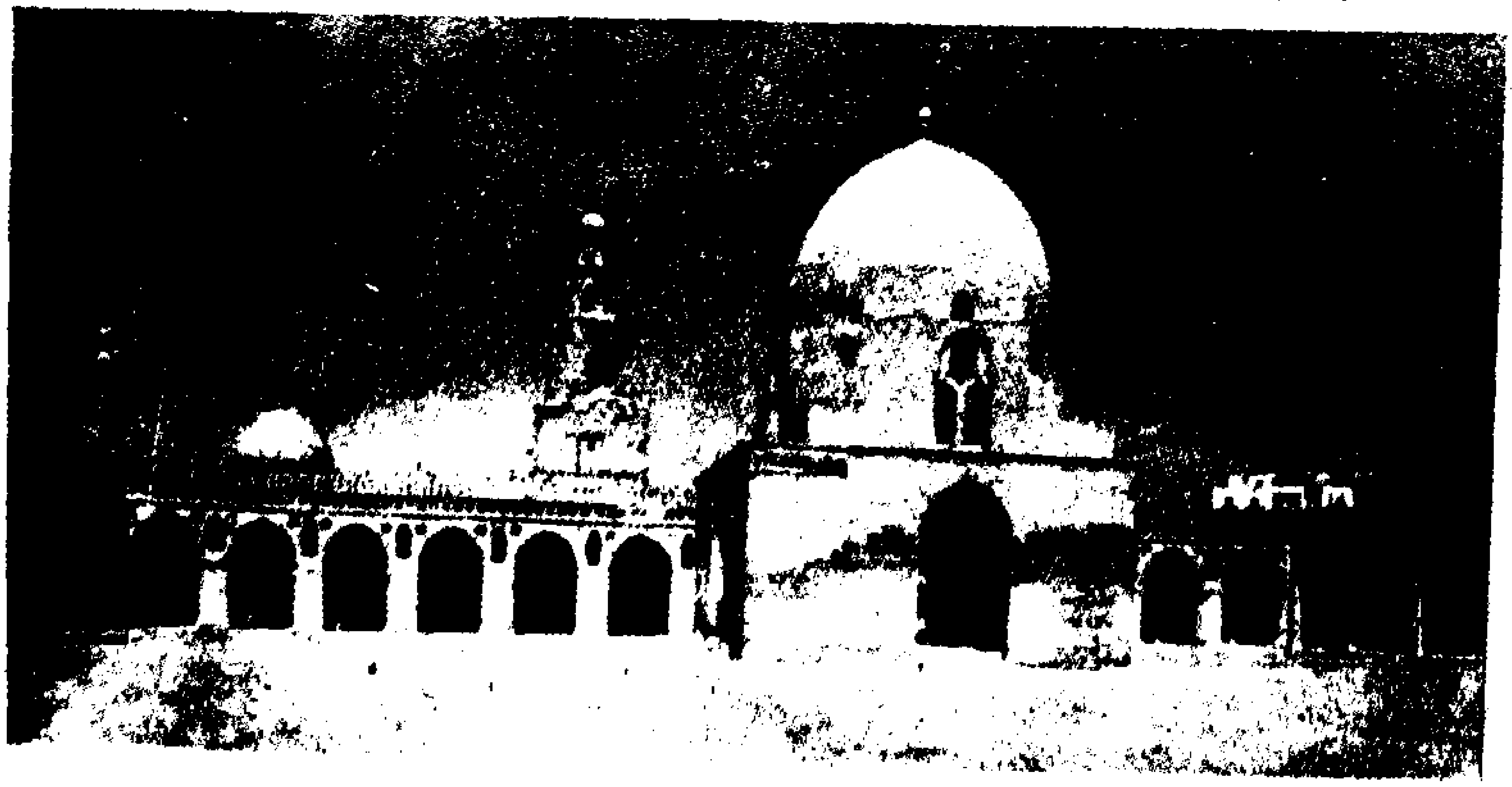

مسجد ابن طولون قاہرہ (۸۶۹ء) (عباسی دور)

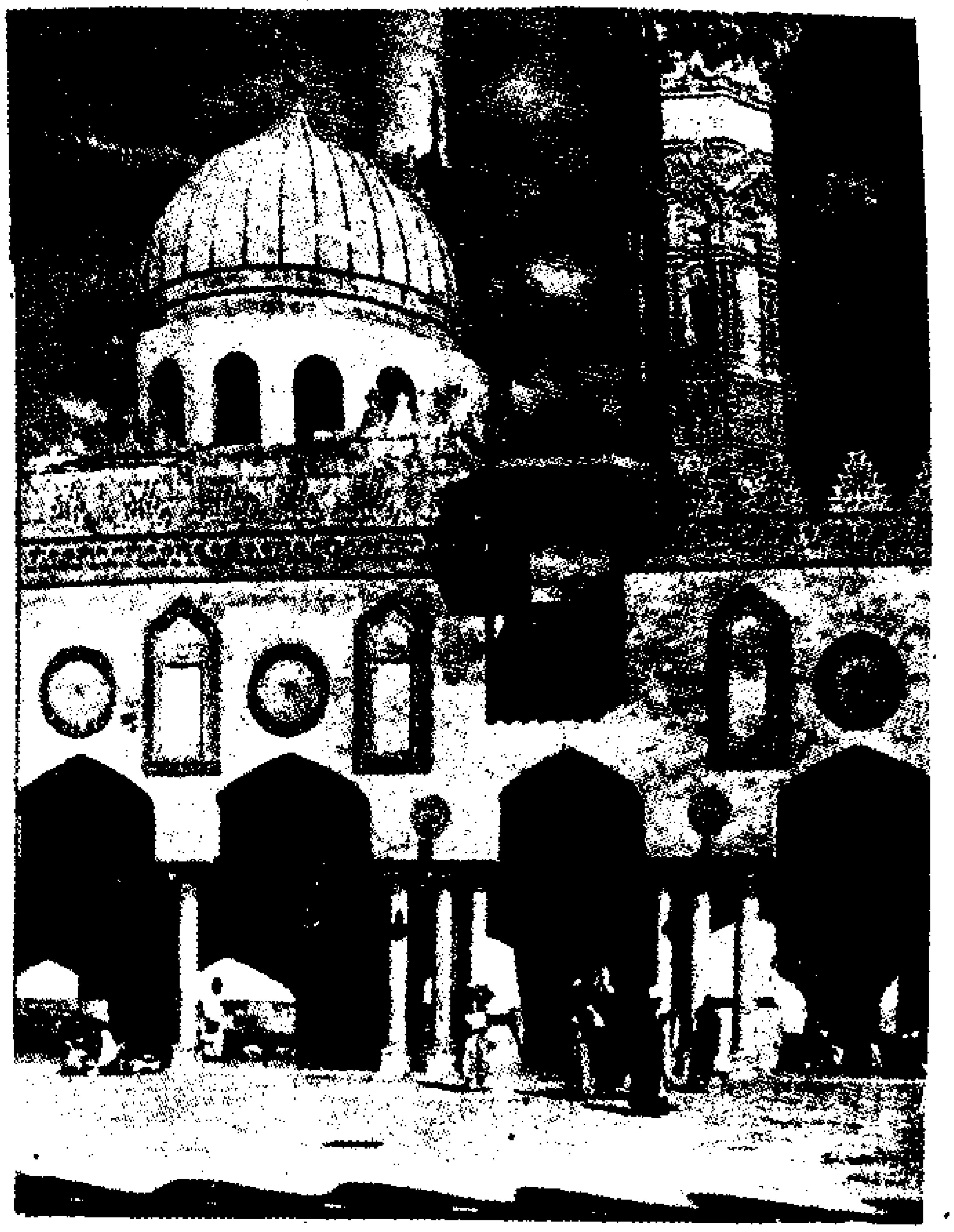

دمشق کی جامع مسجد (۷۱۵ء) کا دالان

الحمراء (غرناطہ ۱۳۵۴ء) کا دالان

روز ختم بھی ہو جائے گی۔ موت فنائے محض نہیں بلکہ انسان کو ایک زندگی سے دوسری کی طرف لے جانے والا ایک دروازہ ہے۔ جہاں رائی کے برابر عمل بھی سامنے آ جائے گا۔ وہاں افعال کے وہ حقیقی نتائج مرتب ہوں گے، جو عقل، حکمت اور عدل و انصاف کے مطابق ہیں موجودہ دنیا کے وہ مادی وسائل اور قوانین جو انصاف و عقل کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ وہاں بے اثر ہوں گے۔ مثلاً دولت، سفارش، حمایت چالاکی، طاقت وغیرہ۔

اس عقیدے کے ماننے سے لازم ہو جاتا ہے کہ انسان خود کو ایک ذمہ دار ہستی سمجھے اور اپنی ہر حرکت اور فعل کے لئے ذمہ دار بنے۔ چنانچہ وہ اپنی دنیاوی زندگی اس طرح سے مرتب کرے گا کہ اسے آگے چل کر جواب دہ ہونا ہے۔ نیز حیات دنیا ایک دھوکا ہے اور آخرت بہتر جگہ ہے۔

۴۔ تربیت افراد:۔ اسلام میں تربیتِ افراد کا طریقہ خارجی سے زیادہ داخلی ہے تہذیب و تزکیہ نفس کے بعد ہی انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ بہتر معاشرتی زندگی گزار سکے۔ اسلام نے اعمال کا دارومدار نیت کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ نیت درست ہونے ہی سے کردار و عمل کی درستگی ہو سکتی ہے اور جب ایسا ہو تو یقیناً ایک فلاحی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جس کی ثقافت دنیا کی بہترین ثقافت بن جاتی ہے۔ وضو، غسل اور دیگر ایسے کئی طریقوں سے جسمانی پاکیزگی اور طہارت کی عادت پڑ جاتی ہے، جو یقیناً ایک صاف ستھری ثقافت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

۵۔ اجتماعی نظام:۔ اگرچہ اسلام نے انفرادیت پر زور دیا ہے لیکن ہر فرد کو ذاتی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ملت یا معاشرے کا پابند بھی ٹھہرایا ہے۔ اطاعت امیر اور پابندی شریعت فرد میں ایسی خصوصیات پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ ملت کے ساتھ وابستہ رہ کر اس کے استحکام اور قوت کا باعث بنتا ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام خاندان سے شروع ہو کر مسجد، محلہ، گاؤں، شہر، علاقہ اور پھر درجہ بدرجہ ملت اسلامیہ کی طرف جاتا ہے۔ لیکن مسلمان کی وفاداری ترجیحی طور پر اولاً ملت کے ساتھ ہے اور پھر درجہ بدرجہ ہوتی ہوئی خاندان اور ذات تک آتی ہے۔ یوں نسبتہً ایک مضبوط معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔

اسلامی ثقافت کی روح:۔ وہ کونسی واحد بنیاد ہے، جس پر موجودہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی عمارت تعمیر ہوئی یعنی مسلمانوں کے کلچر کی واحد روح کیا تھی؟ اس کا جواب علامہ اقبال نے اپنے "خطبات" میں یوں دیا ہے "محسوسات اور متناہی پر اسلام کی وہ توجہ، جو اس نے علم و حکمت کی جستجو میں کی اس لئے اس غلط فہمی کا ازالہ ہونا چاہیے کہ یہ یونانی فلسفہ تھا۔ جس نے اسلامی ثقافت کی ہیئت اور وضع قطع متعین کی — افکار اسلامی نے جس سمت میں حرکت کی اس کا رخ فکر یونان سے سراسر مختلف تھا۔ اسپنگلر کے بقول یونانیوں کی نظر ہمیشہ تناسب پر رہی۔ لامتناہیت سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی ان کا ذہن ہمیشہ وجود متناہی کی قدرتی شکل و ہیئت اور اس کے قطعی اور معین حدود میں الجھا رہا۔ اسلامی ثقافت کے نزدیک فکر محض ہو یا نفسیات مذہب، دونوں کا نصب العین یہ رہا ہے کہ لامتناہی سے لطف اندوز ہوں بلکہ اس پر قابو بھی پائیں۔"

اسلامی تہذیب و ثقافت، ابتدائی عہد میں

تہذیب و تمدن ثقافت کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ اسلامی ثقافت میں بھی ان شاخوں نے اتنا بھرپور کردار ادا کیا ہے کہ آج تہذیب و ثقافت کو جدا جدا مفہوم میں دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ابتدائی عہد کی اسلامی ثقافت یقیناً عرب ثقافت سے ایک حد تک جداگانہ تھی۔

Marfat.com

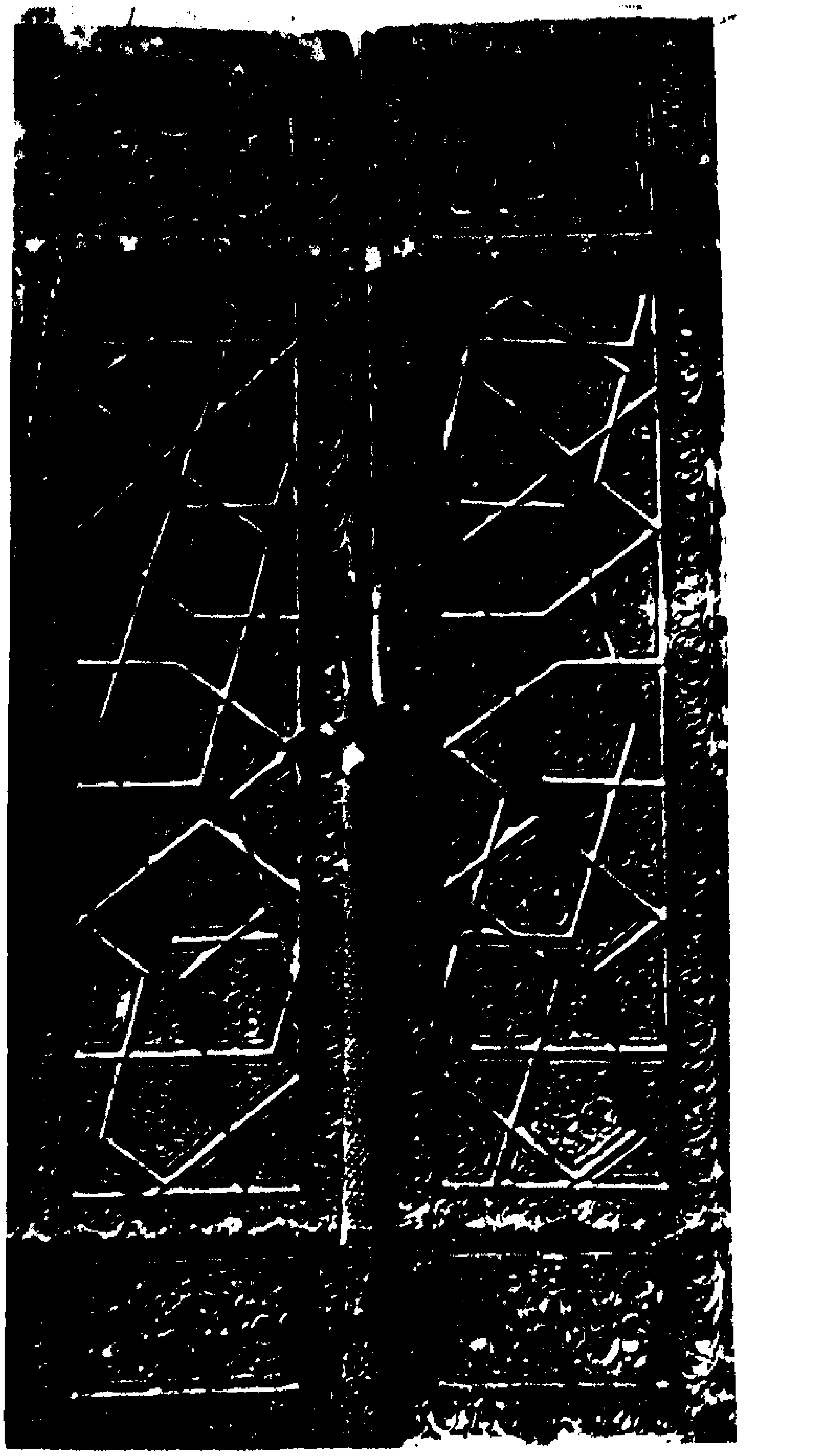

چوبی منقش دروازہ (بارھویں صدی عیسوی)

اس امر کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عرب بت پرست تھے۔ حضرت محمد صلعم کی برکتِ نبوت سے وہ چند برس میں توحید پرست ہو گئے اور خانہ کعبہ بتوں سے پاک ہو گیا۔ جگہ جگہ مساجد قائم ہو گئیں۔

۲۔ السلام علیکم تہذیب کا ایک اہم اور بنیادی جزو بن گیا۔

۳۔ بدلے اور ظلم کی جگہ اخوت اور بھائی چارے نے لے لی۔

۴۔ عورتوں اور بیٹیوں کو قتل کرنے اور مجبورِ محض سمجھنے کی جگہ انہیں بھی معاشرے میں قابل قدر مقام مل گیا۔

۵۔ نمائش، تزئین اور ریاکاری کی جگہ سادگی اور خلوص نے لے لی۔

۶۔ رُتبہ اور عزت نیک اور پرہیزگاروں کا حق سمجھا جانے لگا۔

۷۔ طاقتوروں کا کوئی مقام نہ رہا۔ مظلوموں اور بیواؤں کی دادرسی ہونے لگی

۸۔ جوا، قتل، شراب نوشی اور ایسی دیگر کئی برائیوں کا قلع قمع ہو کر ایک صالح معاشرہ بننے کے آثار پیدا ہو گئے۔

۹۔ پاکیزگی، صفائی اور پانچ وقت کی نماز جزوِ زندگی بن گئیں۔

۱۰۔ فضول شعر گوئی کی جگہ تلاش و تحقیقِ علم مسلمانوں کا ذوقِ طلب بن گیا۔

۱۱۔ عرب بدوی زندگی کو ترک کر کے مدنی زندگی اختیار کرنے لگے۔

۱۲۔ سپاہیانہ بہادری کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی حدود سے نکال کر اشاعتِ اسلام کے لئے صرف کیا جانے لگا۔

۱۳۔ حاکمیت اعلیٰ کا حق دار صرف خدا تعالےٰ کو سمجھا گیا۔ جس کی نیابت خلفاء، شریعت کی حدود میں رہ کر کرتے تھے۔

۱۴۔ خلفاء کا چناؤ اور عوام کے سامنے جوابدہی جمہوری اصولوں سے بھی کہیں بہتر جمہوری ہو گئی۔ ابوبکر صدیقؓ کا خطبہ اس امر کی گواہی دیتا ہے۔

۱۵۔ علم، ادب، فن کے ہر شعبے پر اسلام کی ایک مخصوص چھاپ لگتی چلی گئی۔

۱۶۔ دنیا میں پہلی بار باقاعدہ تعلیمی نظام اور درس گاہوں کا اجراء ہوا۔ اس سے پہلے مقامی اساتذہ اور ان کی درسگاہیں محدود تعداد میں ہوا کرتی تھیں۔

۱۷۔ مسلمان اپنا کام عموماً خدا کی خوشنودی کے لئے، خدا واسطے سے کرتے تھے۔

۱۸۔ عوام کی خبرگیری اور انتظامِ سلطنت کے لئے بیت المال کا قیام عمل میں آیا۔ نظامِ حصولِ زکوٰۃ جاری ہوا۔ اور لاوارثوں اور مستحق لوگوں کے روزینے مقرر ہوئے۔ خلفائے راشدین کے دور میں عموماً ان امور پر عمل ہوتا رہا۔

۱۹۔ شرم و حیا اسلامی تہذیب و ثقافت کا اہم جزو بن گئی، خصوصاً عورت کے لئے پردہ لازم ہو گیا۔

۲۰۔ عدل و انصاف کا دور دورہ ہوا اور دنیا میں پہلی بار عدالت کے کٹہرے میں حکمران اور رعیت مساوی حیثیت سے کھڑے ہونے لگے۔ عدلِ فاروقی آج بھی دنیا میں ضرب المثل ہے۔ یوں مساوات کا آغاز ہوا۔

۲۱۔ اطاعتِ امیر (جب تک امیر شریعت کا پابند رہے) عام مسلمانوں کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ خالد بن ولید کی معزولی ایک اہم مثال ہے۔ ان تمام امور کی ہزاروں مثالیں تاریخ اسلام میں بکھری ہوئی ہیں۔

اسلامی تہذیب، قرونِ وسطیٰ میں

قرونِ وسطیٰ میں سقوطِ بغداد (تیرہویں صدی عیسوی) میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھا، خصوصاً علمی و سائنسی میدانوں میں دور دور تک مسلمانوں کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ دنیا آنے والے ادوار پر مسلمانوں کی نظر تھی اور وہ ان ادوار کو بہتر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ وحشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ گارے اور گھاس کے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ ان کی گلیاں غلیظ اور جا بجا گندے جوہڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سیاست، حکومت، تمدن اور تہذیب کا کوئی تصور سرے سے وہاں موجود نہ تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدن تباہ ہو چکے تھے۔

اس وقت مسلمان اُٹھے اور انہوں نے صرف ایک صدی میں ہندوستان سے فرانس اور چین سے افریقہ تک کے علاقوں میں ایک ہی ثقافت وارد کر دی، جس کی ابتداء کلمہ طیبہ سے، اقتدار اللہ اکبر کے سائے میں اور انجام السلام علیکم تھا۔ مسلمانوں نے جا بجا مساجد بنائیں۔ جن کا طرزِ تعمیر دیگر معابد سے جدا مگر ہر مقام پر ایک جیسا تھا۔ انہوں نے علم و فن کے بڑے بڑے مراکز قائم کئے۔ یونانی، رومی ہندی اور چینی علوم کو جمع کر کے مرتب کیا۔

Marfat.com

جدّت کا امین انقلاب کا ضامن
مکتبہ شاہکار

ہر موضوع کی قدیم و جدید شاہکار جریدی کتب ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو انتہائی باقاعدگی سے پیش کرتا ہے۔

۱- حاجی مراد	۲/۵۰
۲- لوسٹوری	=/۲
۳- غبارِ خاطر	۳/۵۰
۴- نوٹرے ڈیم کا کبڑا	۲/۵۰
۵- داراشکوہ	=/۳
۶- رومیو جیولیٹ } ۷- میکبتھ	۳/۵۰
۸- سائنس سے بھی عجیب تر	=/۲
۹- مہمان بہار - آتش رفتہ	=/۳
۱۰- آوازِ دوست	=/۳
۱۱- بھوانی جنکشن	۲/۵۰
۱۲- پولیس افسر کی ڈائری	۲/۵۰
۱۳- شاہنامۂ اسلام (اوّل)	=/۳
۱۴- چلتے ہو تو چین کو چلیئے	۲/۵۰
۱۵- علی اور نینو	۲/۵۰
۱۶- تحریک پاکستان	=/۳
۱۷- صحرانورد کے خطوط (اوّل)	=/۳
۱۸- النبیؐ الخاتم	۲/۵۰
۱۹- شاہنامۂ اسلام (دوم)	=/۳
۲۰- فردوس بریں	۲/۷۵
۲۱- ایمانیات	۲/۲۵
۲۲- جین آئر	=/۴
۲۳- شکست	=/۳
۲۴- مجبور آوازیں	=/۴
۲۵- شاہنامۂ اسلام (سوم)	=/۳
۲۶- قائداعظمؒ میری نظر میں	=/۴
۲۷- مقدس نازنین	=/۴
۲۸- صحرانورد کے خطوط (دوم)	۳/۵۰
۲۹- خزینۂ معلومات	=/۴
۳۰- علی گڑھ کے تین نامور فرزند	=/۲
۳۱- شاہنامۂ اسلام (چہارم)	=/۳
۳۲- محبت عظیم ہے	۲/۵۰
۳۳- نقوشِ قائداعظمؒ	۲/۵۰
۳۴- اردو کی آخری کتاب	۲/۵۰
۳۵- رحمتِ عالمؐ	=/۲
۳۶- اسرائیل قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں	۳/۵۰
۳۷- اردو کے چار مزاحیہ شاعر	=/۲
۳۸- پولیس افسر کی ڈائری (حصہ دوم)	=/۳
۳۹- ذہن کی آزمائش	۲/۵۰
۴۰- قاسم کی مہندی	۳/۵۰
۴۱- پیغمبرِ صحرا	=/۴
۴۲- نوجوان دہقان کی داستانِ غم	۲/۵۰
۴۳- بیادِ قائداعظمؒ	۲/۵۰

دورِ جدید کا سب سے بڑا علمی منصوبہ

انسائیکلوپیڈیا معلومات قسطوار

(ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے)

فی قسط =/۳ روپے ——— سالانہ =/۳۰ روپے

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

اسلامی انسائیکلوپیڈیا قسطوار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

فی قسط =/۳ روپے ——— سالانہ ۳۰ روپے

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا رنگارنگ باتصویر

بے بی انسائیکلوپیڈیا قسطوار

(ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے)

فی قسط ۲/۵۰ روپے ——— سالانہ ۲۵ روپے

۱۹۷۶ء کی سب سے خوبصورت کتاب

محمد رسول اللہ

ڈاکٹر توفیق الحکیم کی عظیم تصنیف

عطیہ خلیل عرب کا بہترین ترجمہ

قیمت =/۲۵ روپے

۱۹۷۶ء کی سب سے کثیرالاشاعت کتاب

سبز کتاب

فرمودات قائداعظمؒ کا حسین مجموعہ

طالب علموں اور دوستوں کے لیے بہترین تحفہ

قیمت =/۲ روپے

Marfat.com

یکم اکتوبر کو آنے والے شاہکار

شاہکار جلیبی کتاب (نمبر ۱)

تاریخ حریت اسلام

منشی محمد دین فوق کی ایک نایاب تصنیف

جس میں زمانۂ رسالت سے کر انیسویں صدی تک مسلمان بادشاہوں اور حق پرست بزرگوں کے جرأت آفرین حالات اور سبق آموز واقعات درج ہیں — ۱/۵۰

شاہکار جلیبی کتاب (نمبر ۲)

شاہکار تعلیمی فیچر (نمبر ۱)

سلسلہ نمبر ۱: جانوروں کی دنیا

قدرت کے ہزاروں بچے

رنگین، باتصویر: — ۵۰/-

شاہکار جریدی کتاب (نمبر ۴۴)

افلاطون کی ری پبلک

سقراط کے شاگرد اور ارسطو کے استاد افلاطون کی وہ شہرۂ آفاق تصنیف جو گزشتہ ڈھائی ہزار سال سے مسلسل شاہکار چلی آ رہی ہے حسن، عدل، محبت ... کے بارے میں افلاطون کا مثالی خواب

شاہکار تعلیمی فیچر (۲)

سلسلہ نمبر ۲: جانی پہچانی چیزیں

روٹی اور ڈبل روٹی

رنگین، باتصویر: — ۵۰/-

شاہکار تعلیمی فیچر (۳)

سلسلہ نمبر ۳: زمین اور اس کے پڑوسی

کائنات کتنی وسیع ہے؟

رنگین، باتصویر: — ۵۰/-

شاہکار انسائیکلوپیڈیا معلومات

۶

شاہکار جے بی انسائیکلوپیڈیا

اکتوبر ۷۰ء سے اشاعت ...

قسط (۱۳) ...

بدروح سے برطانیہ تک ...

(۳)

سوالنامے کے صحیح جواب ...

باتصویر

شاہکار تعلیمی فیچر (۴)

سلسلہ نمبر ۴: انسانی میل جول

زبان کس طرح بنی؟

رنگین، باتصویر: — ۵۰/-

سرورق: ایشین آرٹ پریس، ۱۲۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

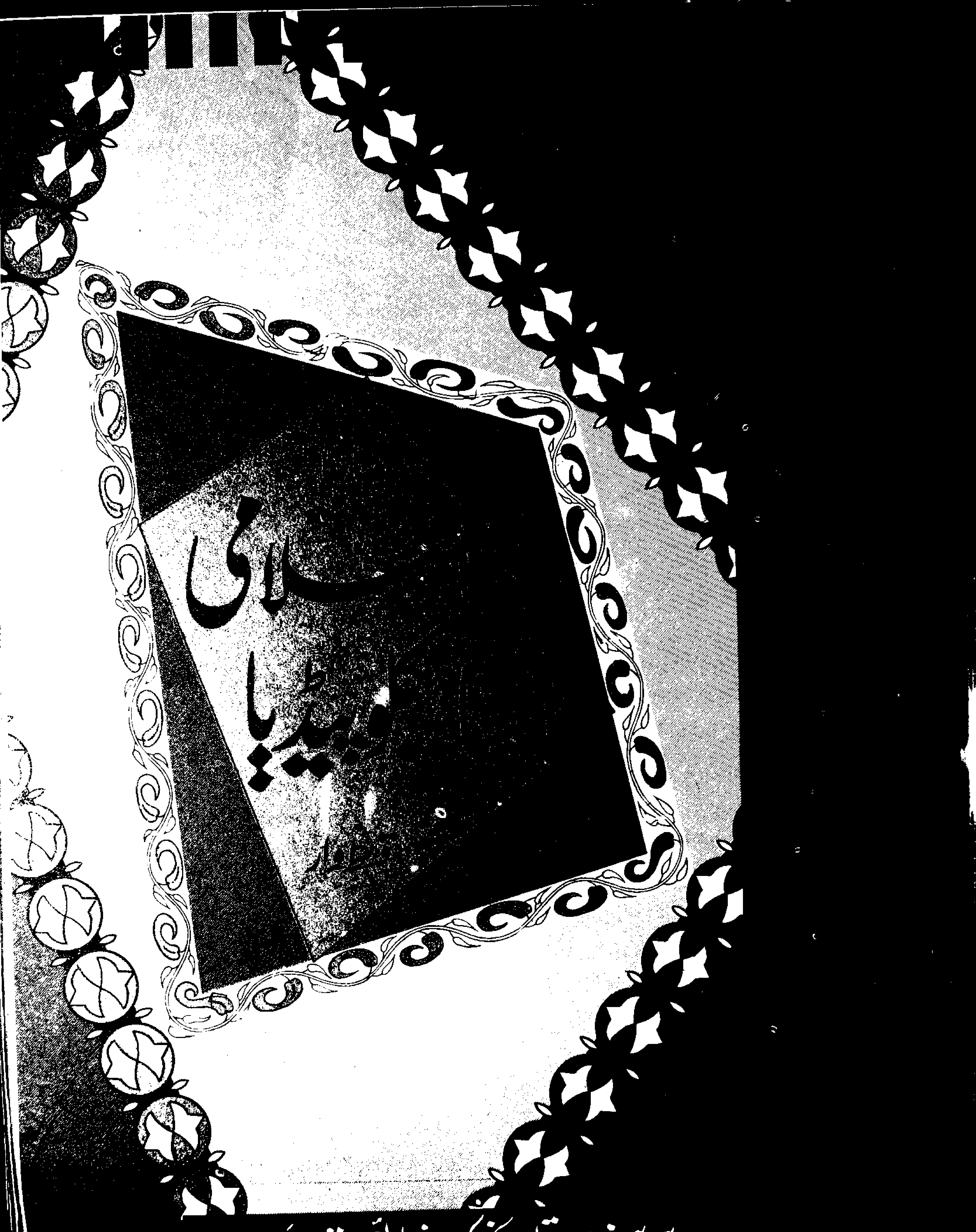

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط ۱۲ وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیر اعلیٰ : سیّد قاسم محمود

• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳

تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

مکتبہ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴- لاہور

شاہکاریہ

رفتہ رفتہ

قارئین کرام! گزشتہ عید مبارک!

"اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کی پہلی سالگرہ کی بھی مبارک قبول فرمائیے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ "اسلامی" اپنا پہلا سال مکمل کر کے آج اپنی منزل کی دوسری سیڑھی پر قدم رکھ رہا ہے۔ یہ سراسر اللہ رب العزّت کا احسان عظیم ہے کہ جس نے "شاہکار" جیسے بے بضاعت ادارے کو اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔ ہماری دُعا ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیا اسی طرح بخیر و خوبی اپنا سفر طے کرتا رہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ ایک دن ضرور آئے گا جبکہ یہ مکمل شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

اس سال کے دوران میں ہمیں بہت اچھے اور قابل قارئین میسر آئے۔ اگرچہ "شاہکار" اپنی ہر بہتر کوشش اس بات میں صرف کر رہا ہے کہ وہ اس خدمت کو بہتر سے بہتر انداز میں انجام دے اور زیادہ سے زیادہ قارئین تک اپنی مطبوعات پہنچائے۔ لیکن درحقیقت اس ساری کوشش میں پلہ ہمارے قارئین کا بھاری ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ کس کس طرح سے "شاہکار" کا تعارف اپنے دوستوں اور حلقۂ احباب میں کراتے ہیں، وہ اپنی جیب خاص سے "شاہکار" کی مطبوعات خرید کر اپنے دوستوں کو پیش کرتے ہیں اور اس طرح سے جہالت کے خلاف اس جہاد میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

دراصل ہمارے پیش نظر خدمت اسلام کا ایک بہت بڑا اور وسیع پروگرام ہے اور وہ ہے "تشکیل الٰہیات جدیدہ" کا، "اسلامیات کی تدوین نو" کا، "سائنس اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا۔ دورِ حاضر میں مختلف ادیان و مذاہب آج جس مشکل سے دوچار ہیں، وہ مذہب اور سائنس کا آپس میں تضاد ہے، لیکن ہمارے خیال میں اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد اور بُعد نہیں بلکہ ان میں آپس میں مکمل ہم آہنگی ہے۔

"اسلامی" ہمارے اس پروگرام کی اوّلین کڑی ہے، پہلی کوشش ہے اور ہم یہ بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہماری اس اوّلین کوشش کا جس محبت بھرے انداز سے خیر مقدم کیا گیا ہے انشاء اللہ ہم اپنے اس منصوبے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ لیکن یہ تمام کام آہستگی سے ہوگا۔ اس میں کچھ وقت لگے گا جس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ سرمائے کی کمی ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اصل میں ہم خود ہر کام آہستگی سے کرنے کے حق میں ہیں۔ عجلت بازی سے کام کرنا ہمیں پسند نہیں۔ لیکن وہ دن دُور نہیں کہ جب ہم اپنے اس سارے پروگرام کو اپنی قوم کے سامنے پیش کر سکیں گے۔

آپ کا نیازمند

شریف اصلاحی

تاریخ اشاعت: ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۶ء ناشر: سیّد قاسم محمود۔ طابع: ریاض حسین الجدّہ پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

انہوں نے اس بارے میں نئے نئے نظریات پیش کئے اور نئی نئی دریافتیں کیں۔ جابجا کتب خانے اور درسگاہیں قائم رکھیں۔ شفاخانے بنوائے، سڑکیں نکالیں، نہریں کھودیں، باغات لگوائے، گلیوں کو پختہ کیا، رات کو روشنی کا انتظام کیا۔ پل اور تالاب بنائے اور دنیا کو ایسی حسین تعمیرات سے بھر دیا، جن کے امتیازی اوصاف چمک، روشنی، صفائی، کشادگی، نقاشی، مصوری، سنگ مرمر کا کام، محراب و منبر و مینار، تالاب اور فوارے تھے۔

رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب "تشکیل انسانیت" میں لکھتا ہے کہ عربوں کے ہاں نفیس سوتی، اونی اور ریشمی لباس تھے۔ جنہوں نے نیم عریاں لوگوں کو لباس کا شوقین بنا دیا۔

پروفیسر براؤن "تاریخ ادبیات عربی" میں لکھتا ہے کہ سلاطین علماء اور فضلاء کی پیروی کیا کرتے تھے۔ محمود غزنوی تو اہل علم کو "اغوا" کیا کرتا تھا۔

دنیا کا سب سے پہلا باقاعدہ تعلیمی نظام "نظامیہ" کا تھا۔ جسے نظام الملک نے مرتب کیا تھا۔ بغداد میں نظامیہ سلسلے کے تحت تیس کالج تھے۔ یہی حال سپین کا تھا۔ ڈاکٹر ڈریپر "معرکہ مذہب و سائنس" میں لکھتے ہیں کہ جب یورپ جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا تو قرطبہ اور غرناطہ کی درسگاہوں میں حصول علم کے بڑے بڑے فانوس جگمگا رہے تھے۔

کتب اکٹھی کرنے کا جنون مسلمانوں میں عام تھا۔ سلاطین اور امراء تو کیا عام مسلمان بھی کتابوں کا ذخیرہ کرنا ثقافت و تہذیب کا جزو سمجھتا تھا۔ "الفہرست" میں ابن ندیم لکھتا ہے کہ بغداد میں محمد بن حسین ابی بعرہ کا کتب خانہ لاجواب تھا۔ یاقوت حموی "معجم البلدان" میں رقمطراز ہے کہ سلطان بہاء الدولہ کے وزیر ابو نصر سابور کے کتب خانے سے بہتر کوئی کتب خانہ نہ تھا۔ الفخری کے بقول آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے وزیر موید الدین کی ذاتی لائبریری دس ہزار کتب پر مبنی تھا۔ مقریزی کے بقول "خلفائے فاطمی کے ہاں چھ لاکھ کتابیں تھیں"۔ اور ڈاکٹر ڈریپر کے بقول جب نوح بن منصور سامانی نے صاحب بن عباد کو وزارت کی دعوت دی تو اس نے چار سو اونٹ کتابیں اٹھانے کے لئے طلب کئے۔ "تمدن عرب" کا مصنف لیبان لکھتا ہے کہ جب منگولوں نے اہل بغداد کی کتابیں دریائے دجلہ میں پھینکیں تو وہاں ایک پشتہ سا بن گیا، جس پر لوگ پیدل چل سکتے تھے۔ اور دریا کا پانی سیاہی گھلنے سے کالا پڑ گیا۔

ہمارے باہمت اسلاف نے خود بھی تصانیف کے انبار لگا دیئے تھے ہزاروں ایسے ادباء اور علماء گذرے ہیں۔ جن کی تصانیف کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ مثلاً امام غزالی دو سو، ابن عربی اڑھائی سو، ابن تیمیہ پانچ سو، جلال الدین سیوطی ساڑھے پانچ سو اور ابن طولون دمشقی ساڑھے سات سو کتابوں کے مصنف تھے۔ ہالینڈ کی ایک فرم ای جے برل نے کئی ہزار عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر، رابرٹ بریفالٹ، لیبان، فلپ ہٹی، گیتھال، نکلسن، براؤن، ول ڈیورانٹ، آرنلڈ، چارلس مورا اور سکاٹ وغیرہ ایسے کئی مستشرقین ہیں، جنہوں نے اس امر کے دستاویزی ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔

ایجاد و صنعت کے لحاظ مسلمانوں کا اہم کام کاغذ کا رواج ہے۔ اس کے اصل موجد تو چینی تھے مگر مسلمانوں نے بغداد، دمشق، نیشاپور، شیراز، خراسان مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لئے استعمال کیا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے کہ کاغذ پر پہلی تحریر عربوں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے افریقہ کے سردار یعقوب نے ۱۲۰۵ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابل ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔ مسلمانوں نے عجیب و غریب قسم کی گھڑیاں بنائیں۔ جن کے تذکروں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ ول ڈیورانٹ لکھتا ہے کہ سپین کے ایک مسلمان ابن فرناس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اوّل عینک کا شیشہ، دوم وقت بتانے والی گھڑی اور سوم

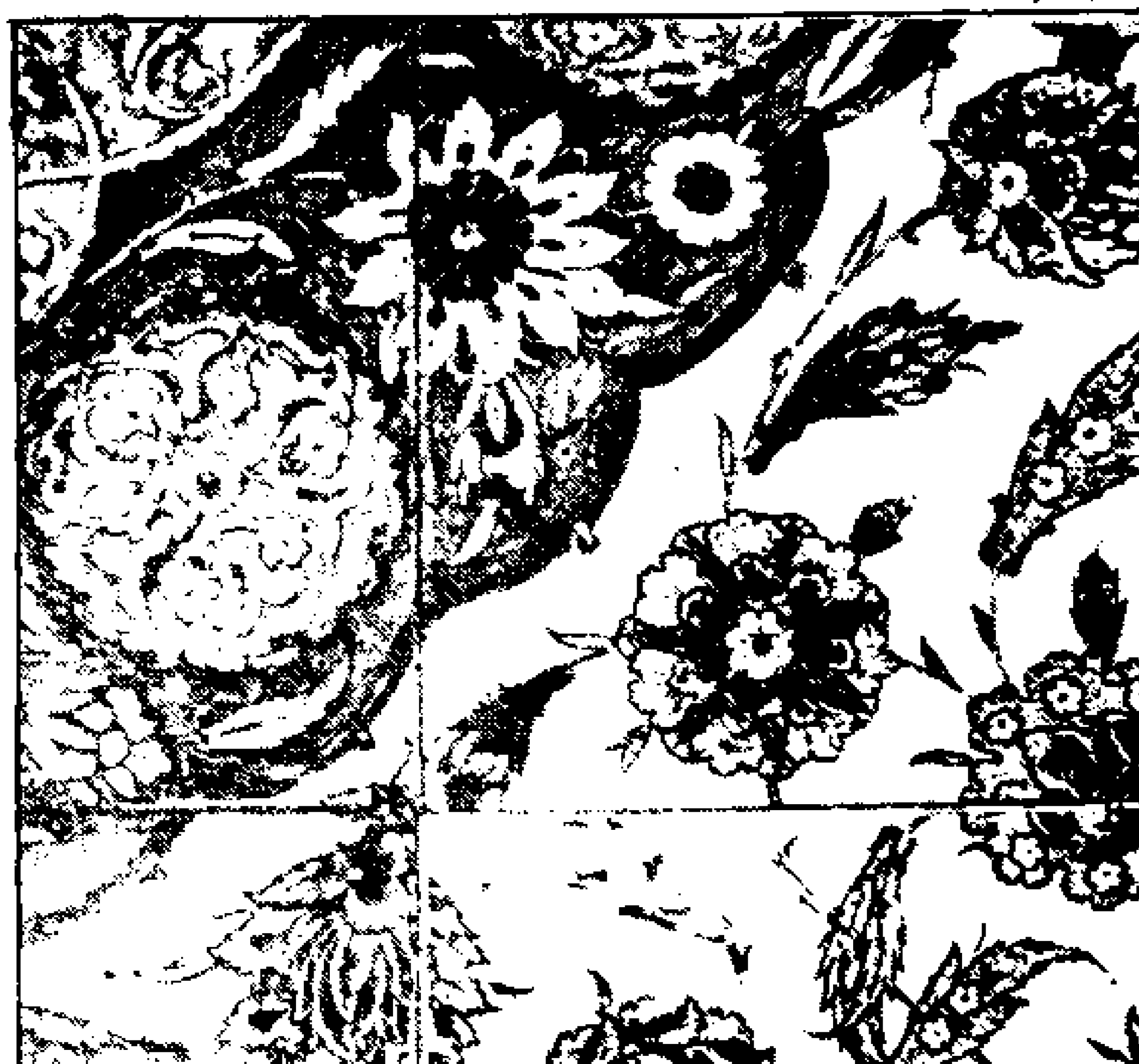

سلطان سلیمان عثمانی کے مقبرے میں منقش ٹائیل

سمرقند اور نیشاپور کے ظروف (عباسی دور)

Marfat.com

بیبرس ثانی کے لیے بنایا گیا سلور ریب فالزش رشام ۱۳۱۵ء

ہوا میں اڑنے والی مشین۔ اسی طرح پہلا چھاپہ خانہ بھی سپین میں لگا۔ جس پر عبدالرحمان اوّل (۷۸۸ء) کے احکام چھپتے تھے۔ تاریخ میں ماہ نخشب کا ذکر عموماً آتا ہے۔ یہ وہ مصنوعی چاند ہے، جسے ترکستان کے ایک عالم حکم بن ہاشم نے بنایا تھا۔ یہ چاند نخشب کے ایک کنوئیں سے نکلتا، اندازاً سو مربع میل کے رقبے کو منور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے۔ موصل کی ململ، دمشق اور طلیطلہ کی تلواریں، عدن کے اونی کپڑے، حلب کے شیشے، رے کے رنگین برتن۔ رقہ کے صابن، ایران کے قالین اور نیشاپور کا عطر مشہور تھے۔

مسلمان وہ پہلے لوگ تھے، جنہوں نے سائنس پر کما حقہٗ توجہ دی۔ بقول رابرٹ بریفالٹ "سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے، پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔ جن سے یونانی بے خبر تھے۔ یورپ میں اس روح اور اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔" یوں تو مسلمانوں کے طبعی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق مختصراً یہ کہ انہوں نے روشنی، نظر، کسوف خسوف، باد و باراں، حیوانیات، نباتات، خواص اشیاء وغیرہ پر لاتعداد کتب لکھیں گندھک اور شورے کا تیزاب بنایا۔ الکحل سے کام لیا۔ جرثقیل کے قوانین پر روشنی ڈالی مائعات معادن اور سیماب وغیرہ کا وزن معلوم کیا۔ نیز پہاڑوں اور سمندروں کے ذخائر پر بحث کی۔

طب میں اسلام نے ہزارہا علماء پیدا کئے۔ جبرئیل بن بختیشوع یوحنا بن ماسویہ، الکندی، رازی، ابن سینا، ابوالقاسم، ابن زہر، ابن خطیب اور ابن رشد جیسے سینکڑوں طبیبوں نے علم طب کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے کہ چیچک کا ٹیکہ اور آپریشن کے کئی طریقے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔

فلسفہ اور دیگر علوم مابعد الطبیعیات مسلمانوں نے بیش قیمت اضافے کئے۔ یورپ میں صدیوں تک الکندی، ابن رشد، جاحظ، ابن طفیل، امام غزالی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا۔ ریاضی میں عمر خیام، الخوارزمی، ابوالوفا، ابن الہیثم اور موسیٰ بن شاکر جیسے علماء کا کوئی جواب نہ تھا۔ الجبرا، مثلثات اور دیگر کئی علوم ریاضی مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے۔ علم ہیئت میں مسلمانوں کی اہم ایجاد اصطرلاب تھی، جس سے ستاروں کا فاصلہ ناپا جاتا تھا۔

علم تاریخ پہلی بار مسلمانوں ہی نے صحیح اور سائنسی بنیادوں پر مدوّن کیا۔ واقدی ابن سعد، بلاذری، ابن اثیر، طبری، ابن خلکان، ابن حجر، ابن عساکر اور ابن خلدون جیسے سینکڑوں مورخین نے وہ کام کئے جو آج بھی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم لغت، ادب، شاعری، تصوف، موسیقی، حدیث، فقہ، علم الکلام اور ایسے سینکڑوں علوم میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔

قرون وسطیٰ کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیل علم کو فرض اوّلین اور کسب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔ خصوصاً علم دین اور تصوف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب بست و کشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

مسلمانوں کی چند اہم تہذیبیں اور تمدن

اس امر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا پورا نمونہ، جس کا خاکہ جناب مولانا مودودی نے پیش کیا ہے۔ کبھی سامنے آیا۔ کیونکہ ایسا تبھی ممکن ہے جب پورا معاشرہ اسلامی ہو اور اس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمو ہو سکے۔ لیکن اس کی چند جھلکیاں مسلمانوں کی چند تہذیبوں میں ضرور ملتی ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب کا ایک مجموعی تاثر تو سابق میں دیا جا چکا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے چند اہم شہروں کی تہذیبوں کی ایک جھلک دینا ضروری ہے۔

بغداد، عہد عباسیہ میں: ۔ عباسی خلفاء نے عراق کے شہر بغداد کو اپنا پایہ تخت بنایا تو دنیا بھر سے اہل علم و ہنر یہاں اکٹھے ہو گئے۔ سلطنت عباسیہ کے عہد میں شہر بغداد آبادی، خوبصورتی، علوم و فنون، تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے دنیا میں اوّل درجے کا شہر تھا۔ شہر ایک خندق اور پختہ فصیل کی حدود میں تھا۔ فصیل کے دروازوں پر خوبصورت گنبد بنے ہوئے تھے، جن پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ شہر میں ہر طرف بے شمار صاف، سیدھی سڑکیں تھیں۔ جن پر دونوں طرف بازار ہوتے تھے، جہاں دنیا بھر کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں، ایک بڑی اور کئی چھوٹی چھوٹی نہریں شہر میں پہنچائی گئی تھیں۔ امرائے سلطنت کے محل سنگ مرمر کے بنے ہوئے منقش اور خوبصورت ہوتے تھے۔ رات کے وقت وہاں قندیلوں سے روشنی ہوتی تھی۔ دریائے دجلہ شہر کے درمیان سے گزرتا تھا، جس میں کئی جہاز ہر وقت لنگر انداز رہتے تھے۔ لوگوں کو پینے کے لئے صاف اور میٹھا پانی مہیا ہوتا تھا۔

بغداد میں بے شمار مساجد، مدارس اور جامعات تھیں۔ طلباء کو وظائف دیئے جاتے۔ تعلیمی اخراجات حکومت کی زیر نگرانی اوقاف سے پورے ہوتے۔ عدل و انصاف کا چرچا دور دور تک ہوتا تھا۔ علم و ادب کا دور دورہ تھا۔ الف لیلیٰ کی مشہور داستان یہیں لکھی گئی۔

Marfat.com

۲- قرطبہ (اموی دور میں) :- یہ سپین کا ایک شہر ہے۔ قرون وسطیٰ میں سپین کو اندلس کہا جاتا تھا۔ قرطبہ اندلس کا پایۂ تخت تھا۔ اموی خلفاء یہاں حکمران تھے یہاں کے شاہی محلات، باغات، مکانات، عمارتیں، مساجد، پل، حمام وغیرہ اتنے خوبصورت تھے کہ آج تک ان کا ذکر قابل فرحت ہے۔ شہر کے ۲۱ بڑے محلے تھے۔ ہر محلہ بجائے خود ایک شہر تھا۔ ان سب کو ایک فصیل نے احاطہ کیا ہوا تھا۔ شہر میں کشادہ سڑکیں اور صاف ستھرے گلی کوچے تھے۔ روشنی کا بہترین انتظام تھا، شہر کے سامنے وادی الکبیر کا پل انجنیئرنگ کا بے مثل نمونہ تھا۔ لاتعداد مدارس تھے، تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ کتب خانے بے شمار تھے۔ قرطبہ کی جامع مسجد آج بھی مسلمانوں کی اس تہذیب اور تمدن کی نشان دہی کر رہی ہے

ان دونوں بڑی تہذیبوں کے علاوہ بے شمار چھوٹی چھوٹی تہذیبیں بھی ہیں۔ جو مختلف علاقوں مثلاً مصر، شام، ترکستان، ہندوستان اور جزائر انڈونیشیا و ملائیشیا میں معرض وجود میں آئیں اگرچہ انہوں نے مقامی ثقافت سے بھی اثر لیا لیکن اس کے باوجود ان پر اسلامی ثقافت کی چھاپ ضرور رہی۔ چنانچہ قاہرہ، دمشق، بصرہ، سمرقند، بخارا، لاہور، ملتان، دہلی، لکھنؤ، مالدیپ اور سماٹرا وغیرہ میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت آج بھی قابل ذکر ہے۔

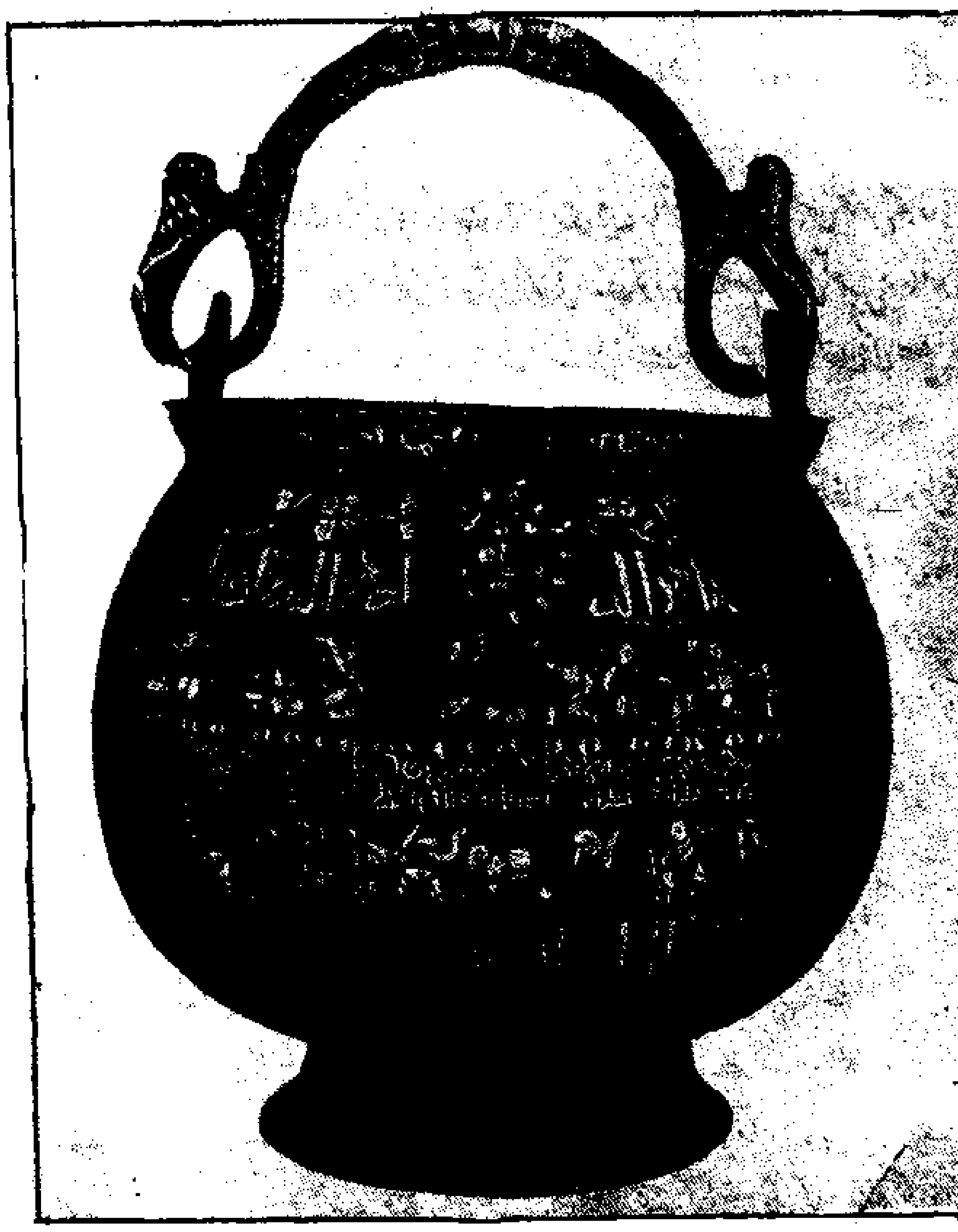

کانسی کا ڈول، جس پر محمد بن عبدالولید اور مسعود بن احمد کے دستخط ہیں (۶۶۳ء)

ثقیف، بنو عرب کا مشہور قبیلہ جو بہت جنگجو تھا اور طائف اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھا۔ آخر تک کفر کا ساتھ دیتا رہا۔ قبائل عدنان کی ایک شاخ جس کا نسب نامہ عرب مورخین نے اس طرح بیان کیا ہے۔ "ثقیف بن منبہ بن بکر بن ہوازن۔"

ثقیف کا زمانہ ظہور اسلام سے تقریباً تین سو سال پہلے کا ہے۔ کیونکہ عہد نبوی کے اواخر میں عروہ ابن مسعود بن معتب بن مالک بن کعب بن عمرو ابن سعد بن عوف بن ثقیف نے اپنے بڑھاپے میں اسلام قبول کیا تھا۔

عربی روایات کی رُو سے ثقیف نے اپنے بھائی یا ابن عم کو کسی بات پر قتل کر کے فرار اختیار کیا تھا اور طائف پہنچا تھا۔ جہاں سردار علاقہ عامر بن الظرب عدوانی نے اسے پناہ دے کر اپنی لڑکی بھی اس سے بیاہ دی تھی۔ اس مشہور عرب حکم کے نسب سے بھی ثقیف کا زمانہ اسی مذکورہ مدت پر متعین ہوتا ہے۔

ثقیف کے بارے میں کہ آیا اس کا تعلق قبیلہ ایاد سے تھا یا ہوازن سے یا خود ثمود سے، پرانے زمانے ہی سے اختلاف چلا آتا ہے۔ اس اختلاف کا پس منظر یہ ہے کہ ثقیف ایک مفرور پناہ گزیں تھا۔ جس نے مصلحتاً اپنا صحیح نسب پوشیدہ رکھا ہوگا بعد میں جب اس سوال نے علمی اہمیت اختیار کی تو ثقفیوں کے موافقوں اور مخالفوں دونوں نے خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ ابرہہ حبشی کے حملۂ مکہ میں ثقیف نے حبشیوں سے تعاون کیا تھا اور ابو رغال نے حملہ آور فوج کی رہبری کی تھی۔

بنو ثقیف کا علاقہ طائف تھا۔ وہ اسلام سے قبل ہی اچھی خاصی حضریت اختیار کر چکے تھے۔ وہ وادی وج میں لیۃ اور وحط وغیرہ میں باغبانی وغیرہ کو کافی ترقی دے چکے تھے اور آب رسانی میں بھی کافی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے شہر کی حفاظت کے لئے اس کے اردگرد ایک فصیل بھی بنالی تھی۔ اہل مکہ کے ساتھ بیاہ شادی کے تعلقات تھے۔ دیگر عربوں کی طرح بنو ثقیف بھی بُتوں کی پوجا کرتے تھے۔ عکاظ میں جہار نامی بُت ان کا خاص بت تھا۔ جس کی نگرانی وغیرہ انہیں کے سپرد تھی۔ طائف میں تو انہوں نے لات نامی بت کے لئے کعبۂ ثانی بھی تیار کر لیا تھا اور طائف شہر کو ایک حرم قرار دے دیا تھا۔ جہاں پر جانوروں کا شکار اور جنگلی درختوں کا کاٹنا حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ طائف کی زرخیزی اور تجارتی اہمیت کے باعث یہاں بہت سے یہودی بھی آکر آباد ہو گئے تھے۔ جو عہد اسلام کے آغاز تک موجود تھے بنو ثقیف ابتداء میں کچھ زیادہ تعداد میں نہیں تھے کہ قابل کاشت زمین سے تنہا استفادہ کر سکتے۔ اس لئے انہوں نے دوست قبائل کو وہاں پر آباد ہو جانے دیا پہلے تو ان کے تعلقات بہتر رہے لیکن جلد ہی ان قبائل میں باہمی رقابت پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ یہ قبائل جو بعد میں یہاں آکر آباد ہوئے احلاف کہلائے۔ معاہدۂ اسلام طائف میں اس بات کی خاص طور پر صراحت موجود ہے کہ بنی مالک (ثقیف) کا شرار الگ ہوگا اور احلاف کا الگ۔

ظہور اسلام سے کچھ عرصہ بعد آنحضورؐ تبلیغ کی خاطر طائف گئے لیکن وہاں پر کسی ایک شخص نے بھی آپؐ کی بات نہ سنی۔ ۵ ہجری میں جنگ خندق کے موقع پر جب کہ سارا عرب مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر چڑھ آیا تھا تو ان حملہ آوروں میں بلاذری کے بقول بنو ثقیف کا بھی ایک دستہ تھا۔

فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں جب مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ ہوازن مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا تدارک کرنے کے سلسلے میں اولاً حنین کا معرکہ پیش آیا اور بقیۃ السیف کا طائف میں محاصرہ کیا گیا اور چند دن ٹھہر کر بعض مؤثر سیاسی انتظامات کرنے کے بعد آنحضورؐ واپس مدینہ تشریف لے آئے لیکن ایک سال کی مدت کے اندر ہی بنو ثقیف وغیرہ اہل طائف کا ایک وفد مدینے آیا اور اسلام قبول کیا۔ آنحضورؐ نے ان کی دلداری کے لئے انھیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور بعض رعایتوں سے نوازا لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد خلافت میں مرتدین سے مقابلے کے لئے بنو ثقیف نے بخوشی فوجی رضاکار مدینے بھیجے تھے۔ حضرت عمرؓ فاروق کے دور میں بنو ثقیف گورنری اور دیگر

Marfat.com

ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا گیا۔ عمان کا گورنر جس نے مغربی ہند کے ساحلوں پر پہلی اسلامی مہم بھیجی تھی، وہ ثقفی ہی تھا۔ حجاج بن یوسف بھی بنو ثقیف ہی سے تھا جس کے بھتیجے نے سندھ و پنجاب تک اسلامی مقبوضات کو بڑھا دیا۔

تیسری صدی ہجری میں ثقفی مزارعین یمن وغیرہ کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ زیدیوں کے یمن پر قبضہ کرنے میں بنو ثقیف کا بھی ہاتھ تھا۔

مشہور سیاح برکھارٹ کے بقول" طائف کے نواح کا زرخیز علاقہ اور حجاز کی مشرقی گھاٹیوں کے عمدہ مقامات اسی قبیلے کی ملکیت ہیں۔ طائف کی حضری آبادی کا نصف حصہ اب بھی بنو ثقیف ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ خانہ بدوش بھی ہیں۔ ان کے پاس گھوڑے اور اونٹ تو بہت کم ہیں لیکن بھیڑ بکریاں خاصی تعداد میں ہیں۔ ضرورت پڑے تو وہ الغلو سے مسلح دو ہزار افراد میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۲ء میں طائف کے دفاع میں وہابی نجدیوں کا مقابلہ کیا تھا۔

ثمامہ بن آثال رضؓ

صحابی۔ ابوامامہ کنیت تھی۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: ثمامہ بن آثال بن نعمان بن سلمہ بن عتبہ ابن ثعلبہ بن یربوع بن ثعلبہ بن دؤل بن حنیفہ حنفی یمامی۔

آپ یمامہ کے سردار تھے۔ فتح مکہ کے چند روز بعد آنحضورؐ نے یمامہ کی طرف ایک مختصر سریہ بھیجا جو چند سواروں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے لوٹتے ہوئے ثمامہ کو گرفتار کر لیا اور مدینہ لاکر مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا۔ آنحضورؐ نے انکے پاس آکر پوچھا: "کیوں ثمامہ کیا ہوا"۔ تو آپ نے جواب دیا" محمدؐ بہت اچھا ہوا۔ اگر تم مجھ کو قتل کرو گے تو ایک جاندار کو قتل کرو گے اور اگر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو ایک احسان شناس پر احسان کرو گے۔ آنحضورؐ نے دوسرے دن پھر یہی سوال کیا اور تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ تیسری مرتبہ سوال کے جواب پر آنحضورؐ نے انہیں رہا کر دیا۔ آپ پر آنحضورؐ کے اس رحم و کرم کا اثر یہ ہوا کہ رہائی پاتے ہی اسلام قبول کر لیا اور عرض کی کہ میں عمرہ کا قصد کر رہا تھا کہ آپ کے سواروں نے مجھے پکڑ لیا۔ اب کیا حکم ہے۔ آنحضورؐ نے بشارت دی اور عمرہ پورا کرنے کا حکم فرمایا جب عمرہ کے لیے مکہ گئے تو کسی نے پوچھا کیا تم بے دین ہو گئے تو جواب میں کہا کہ نہیں بلکہ رسول اللہ کے ساتھ اسلام لایا ہوں۔ یاد رکھو اب بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے گیہوں کا ایک دانہ بھی یمامہ سے مکہ نہیں آسکتا۔

چنانچہ واپس یمامہ جا کر غلہ رکوا دیا۔ جس سے مکہ میں قحط پڑ گیا۔ بعد میں اہل مکہ کی درخواست پر آنحضورؐ نے ثمامہ کو لکھا کہ غلہ نہ روکا جائے۔ اس طرح غلہ دوبارہ یمامہ سے مکہ آنے لگا۔

مسیلمہ کذاب مشہور مدعی نبوت آپ کا ہموطن تھا۔ آنحضورؐ کی حیات مبارک میں تو آفتاب حقیقت پر اس کی تاریکی غالب نہ آسکی۔ لیکن وصال نبویؐ کے بعد مسیلمہ بڑے زور شور سے اٹھا۔ اہل یمن اس کے جال میں پھنس کر مرتد ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین کی سرکوبی کے لیے جب اسلامی لشکر بھیجا تو حضرت ثمامہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت ان میں شامل ہو گئے اور مرتدین کی سرکوبی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔

مرتدین کے استیصال کے بعد بنی قیس کے مرتد سردار حطیم کا حلہ (کرتا) اس کے قاتل سے خریدا اور اسے پہن کر نکلے بنو قیس نے آپ کے بدن پر حطیم کا حلہ دیکھ کر سمجھا کہ آپ ہی نے اسے قتل کیا ہے۔ چنانچہ اس شبہ میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

آپ ایک اچھے عربی شاعر تھے۔

ثمامہ بن اشرس

ایک متکلم جو معتزلہ شیوخ میں سے تھا اور مامون معتصم اور واثق کے عہد میں دربار سے وابستہ رہا۔

نہایت عالم و فاضل شخصیت کا مالک تھا۔ ہارون اور اس کے بعد مامون نے اس کی ذہنی قابلیت اور تبحر علمی کے باعث دربار میں حاضری کی دعوت دی۔ یہ قدامت پسندانہ نظریات پر کڑی تنقید کرتا تھا۔ اس سے قدامت پسندانہ نظریات کا حامل طبقہ اس کا دشمن ہو گیا۔ جب متوکل کے دور حکومت میں ان لوگوں کا دربار میں دوبارہ اثر و رسوخ ہو گیا تو انہوں نے اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں۔

ثمامہ نے اپنے زمانے کے اہم حل طلب مسائل پر نہایت مدلل طریق سے آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ اس کی یہ رائے بسا اوقات منفرد ہوتی ہے۔ ثمامہ کی رائے میں "علم انسانی وہ چیز ہے جس کی ابتدا وقت میں ہوتی ہے لیکن جس کی کوئی علت اولیٰ نہیں ہے جو وقت میں کام کر رہی ہو۔ نفس انسانی خود اسے پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ گویا ایک ایسا فعل سرانجام دے گا جو خدا کا فعل ہے۔"

"ہمارے پاس جو کچھ ہے اور ہمیں جس چیز پر اختیار حاصل ہے وہ صرف ہماری قوت ارادی کا باطنی فعل ہے۔ اس فعل کے نتائج اس میں شامل نہیں۔" "ہماری فطری عقل ہمارے افعال کی اخلاقی اقدار طے کرتی ہے اور ان اقدار کی تعیین اللہ کی طرف سے آمرانہ رنگ میں نہیں ہوتی۔"

"ہمارے تمام معارف (عقلی مدرکات) ضروری ہیں، اتفاقی نہیں۔ جس شخص کو خدا کی وہ معرفت حاصل نہیں۔ جس پر منطق اسے مجبور کرتی ہے تو وہ احکام الٰہی کی تعمیل پر مامور نہیں۔ لیکن عدم تعمیل کی صورت میں وہ شرف انسانی سے محروم ہو کر حیوانوں کی سطح پر آجائے گا۔"

ثمامہ کا مذہب یہ ہے کہ ہماری ساری معلومات ضروری ہیں ان میں اتفاق کا دخل نہیں نیز یہ کہ جس شخص نے اطمینان کے ساتھ منطق (استدلال) کے زور سے اللہ کو نہیں مانا۔ وہ اللہ کو پہچاننے کا مکلف نہیں ہے۔ نیز اس کے نزدیک جس نے ضروری طور پر اللہ کو نہیں پہچانا، اس کے لئے نہ کوئی امر ہے نہ کوئی نہی۔ یعنی اس پر تعمیل احکام کا حکم عائد نہیں ہوتا۔ وہ صرف خدمت اور دوسروں کی عبرت کے لئے پیدا ہوا ہے اور وہ اپنی جہالت کے بارے میں معذور ہے۔ اس کے لئے نہ ثواب ہے نہ عذاب"

ثمامہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہود اور نصاریٰ اور انہیں جیسے اور لوگ مثلاً کفار اور کمسن بچے جنہیں معرفت اشیا کی طاقت نہیں ہوتی یہ سب عنقریب مٹی ہو جائیں گے اور انہیں آگ کا عذاب نہ ہو گا لیکن خیاط معتزلی نے ان لوگوں کو جنہوں نے مندرجہ بالا رائے ثمامہ سے منسوب کی ہے۔ جھوٹا قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ثمامہ مانتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور تمام کفار کو آگ کا عذاب ہو گا۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ انہیں کیا کرنے کا حکم ملا ہے اور کس چیز سے روکا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ قصداً اللہ کا انکار کرتے ہیں البتہ جسے معرفت کا کوئی راستہ ہی نہیں مل سکا تو اس پر کوئی الزام نہیں۔ وہ نہ یہودی ہے نہ نصرانی اور نہ کافر۔

ثمامہ بن عدی رضؓ

صحابی۔ خاندان قریش سے تھے۔ ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ غزوۂ بدر اور بعد میں پیش آنے والے غزوات میں وقتاً فوقتاً شریک ہوتے رہے۔ حضرت عثمانؓ

Marfat.com

کے عہد خلافت میں عمان (یمن) کے حاکم مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر سن کر بے اختیار رو پڑے اور ایک نہایت ہی رقت انگیز اور دردناک خطبہ دیا۔ جس میں فرمایا آج خلافت سلطنت سے بدل گئی۔ جو شخص جس چیز پر قابض ہوگا اسی کو کھا جائے گا۔"

اس سے زیادہ حالات زندگی معلوم نہیں ہیں۔

ثمود حضرت صالحؑ کی قوم کا نام۔ یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ اس قوم کے قصے نزول قرآن کے وقت زبان زد عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بھی اس قوم کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نگاروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

بقول مولانا مودودی "مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔"

رومی مورخین کے مطابق "یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کیخلاف لڑے جن کے دشمن تھے۔"

قوم ثمود کا وطن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جو مدائن صالح کے نام سے موسوم ہے۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں الحجر کہلاتا تھا۔ اب بھی وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں۔ جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس علاقے کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ آنحضورؐ کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے آنحضورؐ جب غزوہ تبوک کے موقع پر اس علاقے سے گذرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشاندہی کی اور فرمایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا۔ دوسرے کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ آج کل یہ مقام "فج الناقہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ان کھنڈرات میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے آپؐ نے انہیں جمع کر کے فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔ لہذا یہاں سے جلدی گذر جاؤ یہ سیرگاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

جب حضرت صالحؑ نے قوم ثمود کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی تو آپ کے مخالفین نے جن کا سردار جندع بن عمرو تھا۔ آپؐ سے معجزے کے لیے سوال کیا اور جب اللہ تعالےٰ نے معجزے کے طور پر اونٹنی بھیجدی تو اس قوم نے اس کو قتل کر دیا۔ اس بنا پر اس قوم پر اللہ تعالےٰ نے ایک عذاب کے ذریعے انہیں ہلاک کر دیا۔

قرآن مجید میں قوم ثمود کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے:

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے، لہذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آلے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا۔ اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقے کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے۔؟" انہوں نے جواب دیا "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔" ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

"پھر انہوں نے اسی اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم

مدائن صالح کے ثمودی عمارات

Marfat.com

مدائنِ صالح میں ثمود کی عمارات

مدائنِ صالح میں وہ کنواں جس پر حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔

کی خلاف ورزی کر گذرے اور صالحؑ سے کہہ دیا کہ لے آؤ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔ آخرکار ایک ہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالحؑ یہ کہتا ہوا اُن کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم، میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔" (۷: ۷۳ تا ۷۹)

قرآن میں ایک اور مقام پر قوم ثمود کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

"ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان سے کہا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یونہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور ان بے لگام لوگوں کی عبادت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔" انہوں نے جواب دیا "تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے۔ لا کوئی نشانی اگر تو سچا ہے۔" صالح نے کہا "یہ اونٹنی ہے ایک دن اس کے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔ اس کو ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا۔" مگر انہوں نے اس کی کوچیں کاٹ دیں اور آخرکار پچھتاتے رہ گئے۔ عذاب نے انہیں آلیا۔"

(۲۶ : ۱۴۱ تا ۱۵۸)

ایک اور سورت میں اس قوم کی بدکرداری اور اس عذاب کا نقشہ جو انہیں دیا گیا، اس طرح کھینچا ہے:

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ تو یکایک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔ صالحؑ نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے۔"؟ انہوں نے کہا "ہم نے تو تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے" صالحؑ نے جواب دیا "تمہارے نیک و بدشگون کا سر رشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔"

اس شہر میں نو جتھہ دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا "خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔" یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انہیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا ان کو اور ان کی پوری قوم کو۔ وہ ان کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔" (۲۷: ۴۵ تا ۵۲)

قوم ثمود جس طریق سے ہلاک ہوئی، اس کی تفصیل جیسا کہ سورۃ ۷: ۷۶ میں بتائی گئی ہے کہ رجفۃ یعنی بھونچال نے انہیں آلیا اور سورہ ۴۱: ۱۲، ۱۶ آیت میں صاعقہ یعنی بجلی گرنے کا ذکر ہے۔

ان دونوں اقوال کو اس طرح سے جمع کیا جا سکتا ہے کہ زلزلے نے انہیں نیچے سے آلیا اور آواز بلند نے اوپر سے۔

قرآن میں قوم ثمود کا ذکر بعض ایسی ہی دوسری اقوام کے ساتھ انسانوں کو عبرت دلانے کے لئے کیا گیا ہے۔

ثناء اللہ امرتسری، مولانا (۱۲۸۷ھ/۱۸۶۸ء — ۱۳۶۸ھ/۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء) مفسر، مناظر اور عالم دین۔ ابوالوفا کنیت۔ والد کا نام خضر تھا۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب کشمیر کے نومسلم خاندان منٹو سے ملتا تھا۔ آپ نے مولانا غلام رسول قاسمی، مولانا احمد اللہ امرتسری، مولانا احمد حسن کانپوری، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث تھے چنانچہ اپنے مسلک کی ترویج کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اخبار اہل حدیث جاری کیا۔ فن مناظرہ میں مشاق تھے۔ زندگی بھر آریہ سماج اور قادیانیوں سے معرکۃ الآرا مباحثے کئے اور دین اسلام اور ختم نبوت کی حقانیت ثابت کرتے رہے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد سرگودھا میں مقیم ہوئے۔ آخر عمر میں فالج ہو گیا۔ اور اسی عارضے

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

سے وفات پائی ہے۔

آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن کی تفسیر کا نام تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے۔ اردو تفسیر کا نام تفسیر ثنائی" ہے۔

ثناء اللہ پانی پتی، قاضی (۱۱۴۳ھ/۳۱-۱۷۳۰ء — یکم رجب ۱۲۲۵ھ/۲ اگست ۱۸۱۰ء) مفسر اور جید عالم دین۔ شیخ جلال الدین پانی پتی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا شجرہ نسب حضرت عثمانؓ سے جا ملتا ہے۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور بعد میں دوسرے علوم کی تحصیل میں مشغول رہے۔ تحصیل علم کی خاطر دہلی گئے جہاں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے حدیث سنی۔ کم عمری ہی میں شاہ محمد عابد لاہوری سے نقشبندی سلسلے میں بیعت کی۔ ان کی وفات پر مرشد کے حکم کے مطابق مرزا مظہر جانجاناں دہلوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے بھی علم طریقت اخذ کیا۔ علم کی تحصیل کے بعد وطن واپس آئے اور بقیہ عمر افتاء، تصنیف و تالیف اور نشر علوم میں گزار دی۔ آپ نے پانی پت میں منصب قضا بھی اختیار کیا۔ اور اس بلند عہدے کا آپ نے نہایت احسن طریق سے حق ادا کیا۔ آپ نے پانی پت ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ایک بلند پایہ شخصیت تھے۔ آپ کے مرشد مرزا مظہر جانجاناں نے ایک مرتبہ آپ کے بارے میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالٰی نے مجھ سے بروز حشر پوچھا کہ ہماری درگاہ میں کیا تحفہ لائے ہو تو عرض کروں گا ثناء اللہ پانی پتی لایا ہوں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے آپ کو "بیہقئ وقت" کا خطاب دیا۔ فقہ و اصول میں آپ مرتبہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔ تفسیر و کلام و تصوف میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ صفائے ذہن، جودت طبع، قوت فکر اور سلامت عقل کے لئے مشہور تھے۔

آپ کی تیس سے زائد تصانیف و تالیفات ہیں۔ ان میں سے مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

تفسیر مظہری :- یہ عربی زبان میں سات جلدوں میں ہے جو قاضی صاحب کی معروف ترین تصنیف ہے۔ اس کو آپ نے اپنے مرشد مرزا مظہر جانجاناں کے نام سے منسوب کیا۔ دوسری مرتبہ حیدر آباد دکن سے دس جلدوں میں شائع ہوئی۔ تفسیر کا رنگ محدثانہ ہے اور حنفی مذاق کے مطابق لکھی گئی ہے۔ یہ تفسیر قدمائے مفسرین کے اقوال اور تاویلات جدیدہ کی جامع ہے۔ اس کے علاوہ مالا بدمنہ، وصیت نامہ ارشاد الطالبین، جواہر القرآن، حقوق الاسلام (فارسی) شہاب ثاقب، تذکرۃ الموتیٰ والقبور (فارسی) تذکرۃ المعاد (فارسی) رسالہ در اباحت و حرمت سود۔ السیف المسلول (فارسی)، رد مذہب شیعہ۔ رسالہ حرمت متعہ وغیرہ ہیں۔

ثناء اللہ قادری (۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء — ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) ایک صوفی اور عالم دین طلنگاہ ضلع جلندھر میں پیدا ہوئے۔ اپنے نانا شاہ عبدالغفور کے زیر سایہ تربیت پائی۔ اوائل عمر میں روزگری کا کام سیکھا اور پشمینہ کی تجارت کے سلسلہ میں ایران کابل اور ہندوستان کے دور دراز مقامات تک سفر کئے۔ پہلے اپنے نانا سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد شاہ محمد صادق کے دست مبارک پر بیعت کی اور تیس سال تک مرشد کی خدمت میں رہے پھر لاہور آئے اور حضرت میاں میرؒ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ کلکتہ میں حضرت عبدالوہاب کے حلقہ ارادت میں رہے۔ کشمیر میں حضرت حبیب سے فیض حاصل کیا۔ بعد میں کابل جا کر شاہ قلندر کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اس کے بعد حضرت غلام الدین خراسانی سے بھی کسب فیض کیا۔ الغرض آپ نے اپنی زندگی کے پچاس سال سیر و سیاحت اور بزرگان دین سے فیوض و برکات حاصل کرنے میں گزارے۔ آخر عمر میں جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں انتقال کیا۔ مزار مبارک گلا چور متصل جلالپور جٹاں کے کنوؤں کے پاس ہے۔ آپ اپنے وقت کے عارف باللہ، متبحر عالم اور پرگو شاعر تھے۔

آپ نے تقریباً ایک سو سے زائد کتب تصنیف کیں۔ جو نثر اور نظم دونوں میں ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ دیوان خراباتی۔ شمع العارفین، جنت العارفین، گلزار نور نامہ۔ مجمع البرکات، تذکرہ الواصلین، معراج السالکین، دلیل العارفین، حقیقت الابنیا، صراط مستقیم۔ حقیقت اولیاء، تذکرۃ الکاملین وغیرہ ہے۔

ثنویت دو خداؤں کی پوجا کرنا۔ ایک عقیدہ جس کی تعلیم یہ ہے کہ نور اور ظلمت دو مساوی اور دوامی الاصل خلق کنندہ ہیں۔ فلسفے کی یہ اصطلاح سب سے پہلے تھامس ہائیڈ نے اپنی کتاب تاریخ مذہب میں استعمال کی، جس سے اس نے مذہب کی خیر و شر کی ثنویت مراد لی تھی۔

زرتشت کی تعلیم میں ثنویت سب سے زیادہ اہم ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کا خالق ایک نہیں بلکہ دو ہیں، ایک وہ جس نے دنیا کی تمام مفید اور کارآمد چیزیں پیدا کیں جسے وہ اہورا مازدا یعنی بہت جاننے والا آقا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسرا خالق جس نے تمام مضر اور تکلیف دہ اشیاء کی تخلیق کی اس کا نام اینگرو مینو بتایا گیا ہے زرتشتی تعلیمات کے ماخذ اوستا میں اہورا مازدا کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔ اہورا خود کہتا ہے۔ "میں ہی محافظ، میں ہی خالق، میں ہی رازق اور میں ہی باری ہوں، سب سے زیادہ رحم کرنے والا میں ہی ہوں۔ میرا نام صحت عطا کرنے والا ہے۔ اہور یعنی آقا، مازدا یعنی بہت جاننے والا۔ مقدس، عظیم، دور اندیش محافظ، خیر خواہ، خالق، خوشحالی دینے والا، مطلق العنان اور خود مختار میں ہی ہوں"۔

خالق خیر کی چھ صفات بہت اہمیت رکھتی ہیں (۱) یعنی وہ عقل کل ہے (۲) غیر فانی ہے (۳) صحت مند اور توی ہے (۴) حقیقت اعلیٰ ہے (۵) دیندار اور متقی ہے (۶) ارضی نعمتوں کا مالک ہے۔

انگرومینو خدائے شر ہے۔ بعد میں اوستا میں اس کو ان تمام صفتوں کا حامل قرار دیا جانے لگا جو شیطان کے سلسلے میں انجیل اور قرآن میں موجود ہیں۔

ان دونوں خالقوں کے دائرہ اختیار واضح طور پر الگ الگ متعین ہیں اوپر خدائے خیر کی عملداری ہے اور نیچے پاتال میں اس کے طاقتور حریف کا عمل دخل ہے۔ ان دونوں خداؤں کی سلطنت کے درمیان یہ دنیا واقع ہے جو دونوں کا اکھاڑا ہے۔ یہ دونوں دنیا میں قوت آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے عمل کی حمایت حاصل ہوتی ہے

چنانچہ پارسیوں کا عقیدہ ہے کہ انگرومینو نے نہ صرف مضر اشیاء پیدا کی ہیں بلکہ وہ مازدا کی پیدا کردہ اچھائیوں کو ختم کرنے کے درپے بھی رہتا ہے۔ موت کا بازار بھی اسی نے گرم کر رکھا ہے۔ انسانوں کے پہلے جوڑے کو اینگرو ہی نے ورغلایا۔ اس لئے ہر پارسی کا فرض ہے کہ وہ شر کا مقابلہ کرے اور خیر کی سربلندی کے لئے کوشاں رہے اور خود کو گناہ اور معصیت میں ملوث نہ ہونے دے۔

اسلام میں کسی ایسے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی اسلام میں کوئی ثنوی فرقہ یا ثنوی عقیدہ ہے۔ اسلام نے چونکہ توحید پر زور دیا ہے۔ لہٰذا اس کے

Marfat.com

نزدیک ثنویت کا مطلب خدا کے تصور کی نفی ہے۔ اس طرح سے لفظ ثنویت الحاد و خواری کا کلمہ بنکر رہ گیا۔

ثواب بدلہ، صلہ، نتیجہ عمل۔ بقول امام راغب اصفہانیؒ "انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے۔"

لغوی اعتبار سے ثواب کا لفظ خیر و شر دونوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے۔

قرآن مجید یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔

"(یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے" (۳: ۱۹۵)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

"تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ (دیگا)" (۳: ۱۴۸)

"جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا۔" (۳: ۱۴۵)

یہاں ثواب دنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اسی سعی و عمل کے نتیجے میں آخرت کی پائیدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔

قرآن ہی میں ایک جگہ آتا ہے۔

"جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اس کو اس کی نیکی کا دس گنا ثواب ملے گا۔ اور جو شخص بدی لے کر آئے گا تو بس اتنی ہی سزا بھگتے گا اور لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (۶: ۱)

ثوبانؓ (وفات ۵۴ھ/۷۲-۶۷۳ء) صحابی۔ ابو عبداللہ کنیت۔ آپ یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ثوبان غلام تھے آنحضورؐ نے خرید کر آزاد کر دیا اور فرمایا "دل چاہے اپنے خاندان والوں میں چلے جاؤ اور دل چاہے میرے ساتھ رہو۔ میرے ساتھ رہو گے تو میرے اہل بیت میں تمہارا شمار ہوگا۔" حضرت ثوبانؓ نے اس شرف کو خاندان پر ترجیح دی اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد مدینہ میں طبیعت نہ لگی اور یہاں سے شام چلے گئے اور رملہ میں سکونت اختیار کرلی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد حکومت میں مصر کی فتوحات میں شریک ہوئے۔ بعد میں رملہ سے حمص منتقل ہو گئے اور یہیں وفات پائی۔

ثوبان آنحضورؐ کے خادم خاص تھے اور مسلسل آپؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہیں آنحضورؐ سے استفادہ کرنے کا زیادہ وقت ملا تھا۔ انہیں ۱۲۸ حدیثیں ازبر تھیں۔ بقول حافظ ابن عبدالبرؒ "ثوبان ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے حدیثیں محفوظ کیں اور ان کی اشاعت بھی کی۔"

ثوبانؓ کے تلامذہ میں معدان بن طلحہ، راشد بن سعد، جبیر بن نفیر، عبدالرحمان ابن غنم، ابوادریس خولانی قابل ذکر ہیں۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جو جماعت صاحب علم و افتا تھی ثوبان اس کے ایک رکن تھے۔ لوگ ان سے احادیث سنتے تھے۔ ان کے معاصرین دوسروں سے سنی ہوئی حدیثوں کی تصدیق ان سے کراتے تھے۔

آنحضورؐ کی حیات مبارکہ میں اور وفات کے بعد بھی دونوں زمانوں میں آپؐ کا فرمان مبارک ثوبانؓ کے پیش نظر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ زبان نبویؐ سے جو کچھ سن لیا وہ ہمیشہ جان کے ساتھ رہا۔ جس چیز میں بھی آنحضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی کا ذرا سا بھی پہلو نکلتا ہوتا وہ ہمیشہ اس سے محترز رہتے۔

ثوبیہؓ صحابیہؓ۔ ابولہب کی لونڈی تھیں۔ بعد میں اسلام قبول کیا۔ آنحضورؐ نے اپنی والدہ کے دودھ کے بعد پہلا دودھ جو پیا، وہ انہی کا تھا۔ حضرت ثوبیہؓ نے حمزہ بن عبدالمطلب، جعفر بن ابی طالب اور ابوسلمہ بن عبدالاسد المخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔

ثور، غار ایک غار جس میں مدینہ کو ہجرت کرتے ہوئے آنحضورؐ اور ابوبکر صدیقؓ نے پناہ لی تھی۔

بقول زرقانی "یہ غار مکہ سے تین میل دائیں سمت واقع ہے۔ پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے۔ سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔"

یہ غار جو جبل ثور میں واقع ہے آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔ اس غار سے چند معجزات وابستہ ہیں۔ مشہور ہے کہ جب کفار آپ کو تلاش کرتے ہوئے غار کے قریب آئے تو خدا نے حکم دیا تو دفعتہً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر غار کے منہ کو ڈھانک لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے اور مکڑی نے غار کے منہ پر جالا تن دیا۔ جب قریش کے نوجوانوں نے دیکھا کہ غار کے منہ پر ایک درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اتنی گھنی ہیں کہ انہیں کاٹے اور صاف کئے بغیر کوئی شخص بھی غار میں داخل نہیں ہو سکتا نیز مکڑی کا تنا ہوا جالا کہ اگر کوئی شخص غار میں داخل ہوتا تو وہ صحیح و سالم نہ رہتا اور کبوتروں کے گھونسلے اور انڈوں سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ مدت سے یہاں کوئی شخص نہیں آیا۔ چنانچہ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر واپس لوٹ گئے۔

آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں اس غار میں تین دن اور تین راتیں قیام فرمایا۔ بقول ابن ہشام اس عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ "اور آپؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ شب کو غار میں ساتھ سوتے صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتا لگاتے کہ قریش کیا مشورہ کر رہے ہیں جو خبر ملتی شام کو آنحضورؐ سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور ابوبکرؓ صدیق انکا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی چوتھے روز آپؐ اس غار سے نکلے اور مدینے کی راہ لی اور وہ راستہ اختیار کیا جہاں سے کم لوگ آتے جاتے تھے۔

ثوری، امام:- فقیہ و محدث (دیکھیے "سفیان ثوری")

جابر بن اَفلَح ابو محمد، ایک مشہور ہیئت دان۔ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔

قرون وسطیٰ میں تو اسے اکثر غلطی سے کیمیا دان جابر بن حیان سے خلط ملط کر دیا جاتا تھا۔ اس کا بیٹا یہودی فلسفی ابن میمون کو۔ (وفات ۱۲۰۴ء) ذاتی طور پر جانتا تھا۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جابر بن افلح نے بارہویں صدی عیسوی کے نصف کے قریب قرطبہ میں وفات پائی ہوگی۔

جابر نے فلکیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، جو آج بھی دو مختلف ناموں کتاب

Marfat.com

"العینۃ" اور "اصلاح المجسطی" سے محفوظ ہے۔ اس کتاب میں جابر نے بطلیموس کے بعض نظریوں پر سخت تنقید کی ہے۔ خاص طور پر بطلیموس کے اس دعوٰے پر نکتہ چینی کی ہے کہ سیارگان اسفل یعنی عطارد اور زہرہ کا کوئی مری اختلاف منظر موجود نہیں ہے۔ یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے فلکی حصے سے پہلے مثلثیات پر بھی ایک باب موجود ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں بھی کیا گیا ہے جو پطرس ایپالزس نے نزمبرگ سے ۱۵۳۴ء میں شائع کیا تھا۔

جابر بن حیان (۱۲۰ھ/۷۳۷ء - ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) ابن عبداللہ عرب کیمیاگر جو طوس میں اور بعض کے نزدیک خراسان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کوفہ کا مشہور دواساز تھا۔ جابر نے بھی ابتداً یہی پیشہ اختیار کیا اور کچھ عرصہ طبابت بھی کی۔ لیکن جلد ہی اپنی زندگی کیمیاوی تحقیقات کے لئے وقف کردی۔ اپنے مصری اور یونانی پیشروؤں کی طرح جابر بھی اس نظریے کا حامی تھا کہ بنیادی دھاتیں مثلاً ٹین، سکہ، تانبا وغیرہ ایک پوشیدہ عنصر کے ذریعے سونے چاندی میں منتقل ہوسکتی ہیں۔ اس عنصر کی تلاش میں اس نے بہت سے کیمیاوی تجربے کئے۔ وہ اس عنصر کو تو دریافت نہ کرسکا البتہ دوسرے کئی ایک مفید مرکب معلوم کرلئے۔ اس کا اہم کارنامہ تین تیزابوں شورے کا تیزاب، گندھک کا تیزاب اور ایکوا ریجیا کی دریافت ہے۔ جن کو اس نے اپنے ایجاد کردہ ایک آلہ کیمیا، قرع انبیق کی مدد سے تیار کیا تھا۔

مذہبی عقائد کے لحاظ سے جابر کا قرامطہ سے بڑا گہرا تعلق نظر آتا ہے اس کے ہاں وہی اصطلاحات ملتی ہیں جو قرامطیوں اور فاطمی اسماعیلیوں کے ہاں رائج تھیں۔ بعض عقائد کے لحاظ سے جابر کی تعلیم فرقہ نصیریہ سے ملتی ہے۔ کیونکہ اس کے یہاں بھی اقانیم ثلاثہ کا تصور موجود ہے۔

جابر کے اپنے قول کے مطابق اسے جملہ علوم اپنے استاد امام جعفر صادقؒ سے ملے تھے اور اس کی اپنی حیثیت محض ایک مرتب اور مؤلف کی ہے۔ اس کا ایک استاد حربی الحمیری تھا اور ایک راہب سے بھی اس نے بعض علوم حاصل کئے تھے لیکن شیعی تصنیفات سے امام جعفر صادقؒ کے شاگردوں میں کسی جابر بن حیان کا نام نہیں ملتا۔

محمد محسن شیخ آغا بزرگ طہرانی نے ابوالربیع بن سلیمان کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب جابر نے ۲۰۰ ہجری میں مقام طوس وفات پائی تو اس کی تصنیف "کتاب الرحمۃ" اس کے سر کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔

جابر کی تصانیف کی تعداد بائیس تا ستائیس تک بتائی جاتی ہے۔ جن میں کتاب الزہر کتاب التجمیع اور الزیاق الشرقی خاص طور پر مشہور ہیں۔ اس کی تصانیف کو متعدد مجموعوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں اہم ترین کتب المائۃ والاثنا عشر، کتاب السبعین، کتب الموازین، کتب الخمسمائۃ ہیں اس کی تصانیف میں سے تقریباً سب کی سب لاطینی کے علاوہ یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ کیمیا کے متعلق جابر کے بہت سے نظریات اٹھارویں صدی میں مروجہ کیمسٹری کے آغاز تک درست اور مستند سمجھے جاتے رہے ہیں۔

جابر نے اپنی کیمیا کی کتابوں میں دھات کا کشتہ بنانے، فولاد بنانے، چمڑا رنگنے، لوہے پر وارنش کرنے، خضاب بنانے وغیرہ کی بیسیوں ترکیبیں لکھی ہیں۔

جعفر برمکی جابر کا بہت مداح تھا۔ چنانچہ جابر نے اپنی کئی تصانیف خالد برمکی، یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی کے نام معنون کی ہیں۔

بعد میں آنے والے عرب کیمیاگروں نے جابر کی تحریروں سے خاصا اثر قبول کیا۔

متاخرین سب کے سب ان کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے اس کی تصانیف کی شرحیں بھی لکھیں۔

جابر بن زید (۲۱ھ/۶۴۲ء - ۹۳ھ/۷۱۱ء) ابوالشعثاء البصری فرقہ اباضیہ کا مشہور محدث اور فقیہ۔ عمان میں نزوی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ قبیلہ ازد سے تعلق تھا۔ تابعین میں سے تھے۔ حدیث اور فقہ میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ بیشمار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ان سے بہت سی روایات مروی ہیں۔ اگرچہ آپ سرکاری طور پر قاضی نہ تھے لیکن بصرے میں آپ ہی کو قاضی سمجھا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق انہیں عبداللہ بن اباض کی وفات پر بصرے کی اباضی جماعت کا (دیکھئے اباضیہ) سربراہ تسلیم کیا گیا۔

جابر کے امویوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ الحجاج سے بھی بہت اچھے مراسم تھے جب حجاج نے ازارقہ کو دبانے کے لئے انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا تو انھیں بھی پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب کئی دوسرے اباضی سرداروں کے ساتھ جزیرۃ العرب کے جنوبی علاقے میں جلاوطن کردیا گیا کیونکہ عامل بصرہ سے انہیں بعض سیاسی معاملات میں اختلاف تھا۔

آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۹۶ھ/۷۱۴ء بتائی ہے اور بعض کے نزدیک ۱۰۳ھ/۷۲۱ء ہے۔

بصرے میں آپ کے علم و فضل کی بہت زیادہ شہرت تھی۔ قرآن مجید کی تفسیر کے بارے میں بھی آپ کا قول سند مانا جاتا تھا۔ چنانچہ امام حسن بصری کی غیر حاضری میں جابر ہی سے فتوے طلب کیا جاتا تھا۔ جابر حضرت ابن عباسؓ کے گہرے دوست اور ان کے متبعین میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔

بعض کے نزدیک جابر اباضیوں میں سے نہیں تھے مثلاً ابونعیم نے "حلیہ" میں جہاں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے، لکھا ہے کہ ان پر اباضیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔

جابر بن سلیم المعروف فراج بن سلیم۔ سسلی کا ایک مشہور و معروف محقق اور عالم اس نے ۱۲۷۹ء میں امام رازی کی تصنیف "الحاوی" کا ترجمہ کیا اور ۱۲۸۰ء میں ابن جزلہ کی کتاب "تقویم الابدان" کا ترجمہ اور حواشی لکھے۔ اس کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔

جابر رضؓ بن عبداللہ ؓ (وفات ۷۴ھ/۶۹۴ء) صحابی، ابوعبداللہ کنیت۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر والد سمیت مسلمان ہوئے آپ کا شمار آنحضورؐ کے مشہور صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ خندق میں رسول اللہؐ کے ہمراہ خندق کھودنے میں شامل ہوئے۔ غزوۂ حنین اور غزوۂ تبوک میں بھی شرکت کی۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں بھی شامل تھے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں اختلاف ہوا تو حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور ۳۷ھ میں جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے۔

حضرت جابر کی زندگی کا مقصد اشاعت حدیث رہا۔ آپ نے بڑی محنت سے احادیث جمع کیں۔ آپ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ آنحضورؐ کو جب بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی تو آپ ہی سے قرض لیتے تھے۔ ایک بار ادائیگی کے وقت خوشنودی کے طور پر اصل

Marfat.com

رقم سے کچھ زیادہ دیا۔ آنحضورؐ کو آپ سے بہت محبت تھی۔ باوجود آسودہ حال اور فراخی کے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سادہ خوراک کھاتے جب کوئی مہمان آتا تو کوئی تکلف نہ کرتے اور جو کچھ اس وقت موجود ہوتا سامنے رکھ دیتے تھے۔

جب حجاج مدینہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے آپ کے ساتھ بھی سختی کی۔ آخر عمر میں بہت کمزور اور نابینا ہو گئے تھے۔ ۹۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ حجاج نہ پڑھائے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے فرزند نے پڑھائی۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپ کا مکان مسجد نبوی سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ جس کے قریب آپ نے ایک مسجد بنوا رکھی تھی۔

جابرؓ بن مسلم صحابی۔ آپ کی کنیت ابوجری تھی۔ بنو تمیم سے تھے۔ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شخص کی رائے کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہے۔"؟ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ہیں۔ میں نے آپ کے پاس جا کر کہا "علیکم السلام، یا رسول اللہ"۔ یہ سلام سنکر آنحضورؐ نے فرمایا کہ علیک السلام مُردوں کا سلام ہے۔ السلام علیک یا رسول اللہ کہا کرو۔ اس تعلیم کے بعد میں نے کہا "السلام علیک یا رسول اللہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں!" فرمایا "ہاں میں اللہ کا رسول ہوں، میری دعا قبول ہوتی ہے۔ اگر میں تمہارے لئے دعا قبول کردوں تو قبول ہو گی، اگر تمہارے قحط سالی ہو تو میری دعا سے تم سیراب ہو گے اور تمہارے لئے روئیدگی ہو گی۔ اگر تم بے آب و گیاہ میدان میں ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے تو میری دعا سے تمہارے پاس واپس آ جائے گی۔" یہ سنکر میں نے کہا "یا رسول اللہ خدا نے آپ کو جو کچھ سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھائیے" فرمایا "نیکی کو حقیر نہ سمجھو اگرچہ وہ اسی قدر ہو کہ اپنے بھائی سے خندہ روئی سے گفتگو کر یا اپنے ڈول سے پیاسے کے برتن میں پانی ڈال دو۔ اگر کوئی شخص تمہارے راز سے واقف ہو اور وہ تم کو کسی بات پر شرم دلائے تو تم اس کے راز کا حوالہ دے کر اس کو شرم نہ دلاؤ۔ تاکہ اس کا وبال تمہارے اوپر نہ ہو۔ لٹکتے ہوئے ازار (تہمد) سے پرہیز کرو کیونکہ یہ غرور کی نشانی ہے اور غرور خدا کو ناپسند ہے۔ کسی کو گالی نہ دو۔ چنانچہ آپ کے ارشاد کے بعد سے میں نے کسی انسان بلکہ اونٹ اور بکری تک کو گالی نہیں دی۔ آپ کے حالات زندگی کچھ زیادہ نہیں ملتے۔

جابہ ایک قدیم پہاڑی ریاست جس کا صدر مقام برہم پترہ تھا۔ جابہ کو کئی مختلف ناموں سے لکھا جاتا رہا ہے۔ مثلاً یعقوبی نے اسے نابہ، کنبایہ ادریسی نے جافہ اور جابہ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اسے عابہ، غابہ اور عانہ وغیرہ بھی لکھا گیا ہے۔ بقول ہیوان سانگ "یہ ریاست ۶۶۷ میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔" غالباً الکنندہ اور کرنالی دریاؤں کے درمیان کا پہاڑی علاقہ اس میں شامل تھا۔ بعد میں شہر چمبہ کو اس کا صدر مقام بنایا گیا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء میں اس ریاست کو ہماچل پردیش کے صوبے میں مدغم کر دیا گیا اور اس طرح اس ریاست کا نظم و نسق براہ راست مرکزی حکومت ہندوستان کے ہاتھ میں آ گیا۔

عرب مصنفین نے عام طور پر جابہ کو چمبہ کے حکمرانوں کا لقب قرار دیا ہے یہ حکمران غالباً سورج بنسی راجپوت تھے۔ ابن رستہ کے بقول "یہاں کا فرمانروا ہندوستان کے راجاؤں میں بڑی شان و شوکت کا مالک تھا۔ اس کا تعلق سلوقی (نسل) سے تھا اور سلوقین کی اصطلاح چمبہ کے شاہی خاندان کے لئے مخصوص تھی"۔ خاندان چمبہ کی بنیاد نویں صدی عیسوی کی ابتداء میں رکھی گئی۔ یہاں کے راجا اپنے ہی خاندان میں بیاہ شادی کرتے تھے۔ البتہ لہرا کے راجہ (راشٹر کوٹ) ان عورتوں سے شادی کر لیتے تھے۔ جابہ کی الجرز (گوجروں) سے ہمیشہ جنگ رہتی تھی راشٹر کوٹوں اور راجگان چمبہ کا آپس میں اتحاد تھا۔ ابن رستہ کے مطابق سرخ صندل کی لکڑی چمبہ سے وسادر بھیجی جاتی تھی۔

جابیہ غسانی حکمرانوں کی مرکزی قیام گاہ جو جولان میں دمشق سے تقریباً ۸۰ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ یہ قیام گاہ بہت سی پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی تھی جابیہ عرب بدوؤں کے حرثا کا مکمل ترین نمونہ تھا۔ حرثا اس وسیع میدان کو کہتے ہیں جہاں بدوی پڑاؤ ڈالتے تھے۔ اور جہاں مکان اور خیمے آپس میں خلط نظر آتے تھے۔

موجودہ دور میں یہ مقام ایک بہت بڑے چشمے اور چراگاہوں پر مشتمل ہے۔ عربوں نے جب اس شہر کو فتح کر لیا تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ ابتداء ہی سے یہاں ایک بڑی چھاؤنی قائم تھی جو پورے شام میں سب سے بڑی تھی۔ جابیہ عرصہ دراز تک جند دمشق کا صدر مقام رہا۔ جنگ یرموک سے بھی اس مقام کو وابستگی ہے۔ یہیں پر بزنطیوں سے ایک جھڑپ ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ ۱۷ھ ۶۳۸ء میں حضرت عمرؓ نئی فتوحات سے پیدا شدہ صورت حال کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے حجاز کے اکابر صحابہ کے ساتھ جابیہ تشریف لائے۔ فوج کے سالاروں اور اعلیٰ عہدے داروں کا جو وہاں اجتماع ہوا وہ آج بھی یوم جابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی مقام پر وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۃ الجابیہ کہلاتا ہے اور حدیث کی کتب میں اکثر اس خطبے کا ذکر آتا ہے۔ ابتداء عہد اسلام میں ہی یہاں ایک وسیع مسجد تیار کی گئی۔ جس میں منبر بھی نصب تھا۔ چنانچہ جابیہ نے جلد ہی ایک بڑے شہر اور چھاؤنی کا درجہ حاصل کر لیا۔

تمام اموی خلفاء امیر معاویہؓ کے زمانے ہی سے اس مقام پر کچھ دن ضرور قیام کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب اپنی خلافت کا اعلان کیا اور حجاز سے بنو امیہ نکال دیئے گئے تو اہل شام معاویہ ثانی کا جانشین مقرر کرنے کے لئے جابیہ ہی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ مروان بن الحکم کی خلافت کا اعلان یہیں کیا گیا تھا۔ عبدالملک کے دو بڑے بیٹوں کو اس کا جانشین اسی جگہ چنا گیا۔ سلیمان کے عہد میں جابیہ کے عظیم فوجی چھاؤنی یہاں سے حلب کے شمال میں دابق میں منتقل کر دی گئی۔ لیکن یہ شہر ایک صوبے کا صدر مقام ضرور رہا۔ عباسی عہد میں اس شہر کی اہمیت فروتر ہونے لگی اور آہستہ آہستہ جابیہ تباہی سے دوچار ہوتا چلا گیا۔ آج کل اگرچہ یہ شہر کالعدم ہو چکا ہے لیکن دمشق کے جنوب مغربی دروازے باب الجابیہ سے اس کی پرانی یاد اب بھی تازہ ہو جاتی ہے۔

جاٹ برعظیم پاک و ہند کا ایک قبیلہ جو پنجاب، سندھ، راجستھان اور مغربی اترپردیش میں آباد ہے۔ غیر منقسم پنجاب میں راوی کے مغربی جانب کے اضلاع میں بہت سے جاٹ مسلمان تھے۔ لیکن وسطی پنجاب میں اکثر جاٹ سکھ اور جنوب مشرقی علاقے میں ان کی اکثریت ہندو تھی۔ تقسیم کے بعد تمام غیر مسلم جاٹ پاکستانی علاقوں سے ہندوستان چلے گئے۔ اور آج کل اترپردیش کے شمال اور مغربی اضلاع میں ان کی آبادی کثرت سے ہے انہوں نے سلطنت مغلیہ پر زوال لانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اپنے آخری ایام میں یہ سلطنت اس قابل بھی نہ رہی کہ صدر مقام پر بھی جاٹوں کی لوٹ مار کا مقابلہ کر سکتی۔

Marfat.com

جب محمد بن قاسم سے پہلے عرب سپہ سالار بدیل بن طہفۃ البجلی نے دیبل کی بندرگاہ پر حملہ کیا تھا تو جاٹوں نے اس کا مقابلہ کر کے اسے ہلاک کر دیا تھا۔ بعد میں ان کی مڈبھیڑ محمد بن قاسم سے ۹۴ھ/۷۱۲ء میں حملہ دیبل کے موقع پر ہوئی۔ مسلمانوں نے ان کو کثیر تعداد میں گرفتار کر کے حجاج بن یوسف کے پاس بھجوا دیا۔ اس کے بعد سے یہ لوگ سندھ اور بیرون سندھ میں مستقل طور پر پُرامن زندگی بسر کرتے رہے۔ جب محمود غزنوی کا دورِ حکومت آیا تو اس سے ان کی دریائے سندھ پر ایک بحری لڑائی ہوئی۔ کیونکہ ان لوگوں نے سلطان کی فوج پر عقب سے چھاپے مارے تھے۔ اور کئی مرتبہ لشکر کا ساز و سامان لوٹ لیا تھا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد یہ لوگ پھر شاہجہان کے عہد حکومت میں سامنے آتے ہیں۔ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء میں انہوں نے شہنشاہ کے خلاف بغاوت کی اور متھرا کے فوجدار مرشد علی خان کو قتل کر دیا۔ اورنگ زیب کو دکن کی مہم میں مصروف پا کر شمالی ہند کے جاٹوں نے اپنے سرداروں راجارام اور رام چہرا کی سرکردگی میں عوام میں پھر بغاوت کی۔ انہوں نے اکبر کے مقبرے کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ میر ابوالفضل نے جو یہاں کا فوجدار تھا ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۰۹۷ھ/۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی کے لیے سردار خان جہان کوکلتاش کو بھیجا لیکن اس نے کئی معرکوں میں جاٹوں سے شکست کھائی۔ بعد میں شہنشاہ نے اپنے پوتے بیدار بخت کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھرت پور اور اس کے گرد و نواح کے جاٹوں نے اپنے سردار سورج مل کی قیادت میں آگرے اور دہلی کے درمیانی علاقے میں خوب لوٹ مار مچائی اور باشندوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھائے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو اس نے ان مظالم جاٹوں کا قلع قمع کرنے کا اپنی فوج کو خاص طور پر حکم دیا۔ ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء میں اپنے چوتھے حملے کے دوران میں اس نے ایک بار پھر جاٹوں پر چڑھائی کی۔ اگرچہ وہ ان پر مکمل طور پر قابو نہ پا سکا۔ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں جب مرہٹوں کو ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کی تیسری لڑائی میں ایک فیصلہ کن شکست ہوئی تو اس شکست سے جاٹوں کی بھی کمر ٹوٹ گئی۔

جب احمد شاہ واپس لوٹا تو اس نے پنجاب کے جاٹوں کے ایک معمولی سردار آلا سنگھ کو اس کی فوجی خدمات کے صلے میں کئی ایک گاؤں عطا کیے جو بعد میں ریاست پٹیالہ کی بنیاد بنے۔

تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں رنجیت سنگھ جو ایک جاٹ تھا پنجاب میں ایک طاقتور سکھ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران جاٹوں نے دہلی میں عام بدنظمی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے تو انہیں بھی مطیع ہونا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے الور، بھرت پور اور گرد و نواح کے علاقے میں دوبارہ سر اٹھایا اور تقسیم ہند کے بعد ہونے والی لوٹ مار اور قتل و غارت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ موجودہ دور میں وہ مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

ہندوستان میں کچھ جاٹوں نے مسلمانوں کی فتح سندھ کے تھوڑے عرصے بعد ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ پنجاب میں ان کے بہت سے قبیلوں نے جلال الدین حسین بخاری اور بابا فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بھی ان کی ایک بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔

جاٹ کی معرب شکل زُطّ ہے۔ جٹ اور جٹّا کے الفاظ بھی ان ہی کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔

جاثیہ ا۔ قرآن مجید کی ۴۵ ویں سورت (دیکھیے "الجاثیہ")

جاحظ، ابوعثمان عمرو بن بحر الفُقیمی۔ عربی نثر نگار اور کتب ادب کا مصنف (۱۶۰ھ/۷۷۶ء۔ محرم ۲۵۵ھ/دسمبر ۸۶۸ء یا جنوری ۸۶۹ء) بصرہ میں پیدا ہوا۔ حبشی الاصل تھا۔ آنکھوں کے ڈھیلے پیدائش ہی سے باہر کو نکلے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس کا لقب جاحظ پڑ گیا تھا۔ بچپن بصرہ ہی میں گذرا، تعلیم کا بچپن ہی سے بے حد شوق تھا۔ متجسس طبیعت لے کر پیدا ہوا تھا۔ مسجد میں ان لوگوں میں جا بیٹھتا تھا جو مختلف مسائل پر بحث کرنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ لسانی تحقیق کی جو مجالس مربد میں منعقد ہوتی تھیں ان میں بھی شریک ہوتا تھا۔ اس نے الاصمعی، ابوعبیدہ، ابوزید جیسے علمائے لسانیات اور شعر العرب کے فاضل ترین لوگوں کے حلقہ درس میں زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔ ذہانت اور شوق نے اسے بچپن ہی میں معتزلہ اور امراء کے حلقوں سے روشناس کرا دیا تھا۔ اس طرح سے اس نے رفتہ رفتہ عربی زبان میں حقیقی مہارت پیدا کر لی اور ساتھ ہی مروجہ روایتی ثقافت میں بھی ماہر ہو گیا۔ اپنے ذوقِ مطالعہ سے وہ بیرونی دنیا کے حالات اور معاملات سے بھی روشناس ہو گیا۔ بصرے کے علاوہ بغداد نے بھی جو تہذیب و تمدن کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھا۔ جاحظ کے ذہن کی نشوونما میں فیصلہ کن اثر ڈالا۔ اعتزال اور حقیقت پسندی کی واضح چھاپ تو اگرچہ بصرے ہی نے اس کے ذہن پر ثبت کر دی تھی اور وہ اپنے وطن کا صرف عالم ہی نہیں بلکہ ایک کامل نمائندے کی حیثیت حاصل کر گیا تھا۔

جاحظ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ تو اگرچہ پہلے ہی شروع کر دیا تھا لیکن اندازاً ۲۰۰ھ/۸۱۵، ۸۱۶ء میں تو واضح طور پر اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے اس زمانے میں اس نے "امامت" کے موضوع پر چند تصانیف لکھ کر مامون سے خراج تحسین حاصل کیا اور اسے خلیفہ کے دربار میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا۔ وہ چند دن ابراہیم بن صولی کا دفتر وزارت میں مددگار بھی رہا اور کچھ روز کاتب (منشی) کے فرائض بھی انجام دیے لیکن سیرت نگاروں کی تحریروں کی روشنی میں جاحظ کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی بھی کسی سرکاری عہدے پر فائز نہ ہوا اور نہ ہی اس نے کسی کی باقاعدہ نوکری کی۔ وہ اپنی تصانیف بڑے لوگوں کے ناموں سے منسوب کر کے معقول رقمیں وصول کرتا تھا۔ غالباً وہ ایک مدرس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متوکل اسے اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کرنے کا خواہشمند تھا لیکن وہ اس کی بدصورتی کی بنا پر یہ خدمت اس کے سپرد نہ کر سکا۔ جاحظ کو کچھ عرصہ حکومت سے وظیفہ بھی ملتا رہا۔ ان تمام بحثوں کو سمیٹتے ہوئے جو ہمیں اس کے بارے میں مختلف سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں کے ہاں ملتی ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ جاحظ کو ایک درباری کی حیثیت تو حاصل نہیں تھی لیکن وہ ایک غیر رسمی مشیر کی خدمت ضرور انجام دیتا رہا۔ جن تصانیف کی بنا پر اسے دربار میں شہرت حاصل ہوئی ان تصانیف میں مسئلہ خلافت سے بحث کی گئی تھی اور عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ خلفاء کے ساتھ تو اس کے بے تکلفانہ مراسم قائم نہ ہو سکے لیکن امراء اور دوسری سربرآوردہ شخصیتوں کے ساتھ اس کا برابر ربط ضبط رہا۔

جاحظ نے مختلف سیاحتیں بھی کیں۔ جن میں شام کی سیاحت بھی شامل ہے۔ قیام بغداد کے دوران میں اسے علم کے ایک بیش بہا خزینے سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور وہ یونانی کتب کے بہت سے تراجم تھے جو مامون کے عہد میں عربی میں کیے گئے۔ اسے قدیم فلاسفہ کو مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

زندگی کے آخری حصے میں فالج سے اس کا آدھا حصہ مفلوج ہو گیا تھا اور

Marfat.com

وہ بغداد سے بصرہ واپس لوٹ آیا تھا جہاں اس نے وفات پائی۔

جاحظ ایک کثیر التصنیف مصنف ہے۔ اس کی تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ اس کی تصانیف کو دو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ادب کے تحت آتی ہے۔ ان کتب میں جاحظ کا کام صرف اتنا ہے کہ اس نے مضامین کا انتخاب کر کے انہیں پیش کیا اور تحریری روایات پر رائے زنی کی دوسری قسم میں اس کے اپنے طبع زاد تصانیف اور مقالات ہیں جن سے وہ بحیثیت ایک انشا نگار اور مفکر کے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کی مشہور تصانیف۔

"کتاب الحیوان"، "کتاب البغال"، "کتاب البیان والتبیین"، "کتاب البخلاء"، "کتاب مفاخرۃ الجواری والغلمان"، "المعاد والمعاش"، "السر وحفظ اللسان"، "کتاب العثمانیہ"، "کتاب تصویب علی فی تحکیم الحکمین"، "رسالہ فی بنی امیہ"، "رسالہ فی نفی التشبیہ"، "کتاب الرد علی النصاری"، "رسالہ فی مناقب الترک" اور "کتاب التربیع والتدویر" ہیں۔

جاحظ معتزلی نظریات و افکار کا مالک تھا۔ سیاسیات کی طرح الٰہیات میں بھی وہ معتزلی تھا۔ بقول ابوحیان توحیدی وہ "فصاحت و بلاغت کا بڑا ماہر اور معتزلہ کے ایک دبستان کا بانی تھا۔"

جادو ایک نخلستان نیز ڈیپار کا وہ سلسلہ جو ۱۶ سے ۲۰ درجے تک طول بلد شمالی اور ۱۲ سے ۱۳ درجے عرض بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ یہ ٹیلے ٹوٹی عمارتوں کے کھنڈروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ جنہیں پہاڑی نالوں کی آبجو نے الگ الگ کر دیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صحرائی ہے۔ یہاں کا موسم انتہائی خشک ہوتا ہے اور دن رات کے درجہ حرارت میں بے حد فرق ہے۔

اس کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے مختلف راستے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مثلاً مرزوق اور تشاد کا قدیم تجارتی راستہ جس کے ساتھ اس مقام پر وہ راستہ بھی آملتا ہے جو لغزان سے ہوتا ہوا غات اور غدامس کو جاتا ہے یہ راستہ یہاں سے جنوب کی طرف علیحدہ ہو جاتا ہے اور پھر ایک طرف تو فاشی کی جانب بانا تیجریا کے گیاھستانوں تک اور دوسری طرف کوار اور تشاد کی طرف نکل جاتا ہے نخلستان کے کنارے پر چند باغات کے آثار ملتے ہیں جن میں سے تین ۱۹۵۰ء تک موجود تھے۔ اور ارد گرد صحرا میں چٹائیوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں ہیں۔ یہ گاؤں کنوری قوم کے حصہ دی گروہوں نے بسائے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں یہاں کے باشندوں کی معاشی حالت نہایت ابتر ہو گئی تھی اس دور میں صحرا پار کی تجارت تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ مرزوق کے باشندے غلاموں کی تجارت کو قطعاً بند کر دیا تو انہیں بے پایاں نقصان پہنچا۔ نیز قزاق بدوں کے حملوں کے سبب اجطوارق اور تدہ قوم کے لوگ اطراف و اکناف سے جادو کے قریب اس غرض سے جمع ہو گئے کہ یا تو لڑ بھگڑ کر روزی حاصل کریں یا قزاقوں کے گروہ بنا کر کاروانوں کو لوٹتے پھریں۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ ان حالات میں یہاں کے باشندے اپنی نمک کی کانیں اور کھجوروں کے باغ چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان کی جگہ تدہ کے باشندوں نے لے لی۔ جب یہ علاقہ فرانس کی عملداری میں آیا تو اس نے ان اجڑے ہوئے نخلستانوں کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء سے جادو کے راستے پر کاروانوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا اور کھجوروں کے باغات میں بھی کہیں کہیں کاشت ہونے لگی۔ چنانچہ جادو کے نخلستان میں اس کے سات ہزار درختوں سے ساٹھ ٹن کھجور حاصل ہوتی تھی۔

۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۴۰۵ افراد پر مشتمل تھی لیکن فصل کے موقع پر یہاں کی آبادی چند ہزار افراد تک بڑھ جاتی ہے کیونکہ نوجوان مرد باقی وقت میں کسب معاش کے لیے جنوب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور فصل کے موقع پر ہی واپس آتے ہیں۔ یہاں کی موجودہ آبادی سات ہزار کے لگ بھگ ہے۔

جادو طرابلس الغرب میں جبل نفوسہ کے مشرقی خطے کا قدیم صدر مقام جو آجکل ضلع فساطو میں ایک قصبے کی صورت میں تین ناہموار پہاڑیوں پر واقع ہے۔ جہاں تک قدیم شہر کا تعلق ہے اس کے بارے کچھ زیادہ تفصیل سے معلومات نہیں ملتی۔ تاریخ کے جو ذکروں سے جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو شہر کی بنیاد مسلمانوں کی فتح شمالی افریقہ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ چونکہ یہ شہر اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو طرابلس شہر کو فذان اور وسطی سوڈان سے ملاتی تھی۔ یہی بات اس شہر کی خوشحالی اور ترقی کا سبب بنی۔

جادو کے بارے میں معلومات صحیح طور پر پہلی بار دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملتی ہیں۔ یہ معلومات الدرجینی نے جو ایک اباضی سوانح نگار ہے شیخ ابوعثمان المزاتی کے متعلق ایک قصبے میں ایک تجارتی قافلے کا ذکر کیا ہے جو اہل جادو پر مشتمل تھا۔

اباضی مورخین کے بقول "جادو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں پورے جبل نفوسہ کا سیاسی اور انتظامی مرکز تھا۔" ابومنصور الیاس بھی یہیں اقامت گزیں تھا جسے تاہرت کے رستمیہ امام نے یہاں کا والی مقرر کیا ہوا تھا۔ بعد میں ابویحییٰ زکریا ارجانی نے بھی جادو ہی کو اپنا صدر مقام بنایا جو ایک خود مختار امام کی حیثیت سے جبل نفوسہ پر حکمرانی کرتا رہا۔

ان دنوں جادو نے ایک تجارتی شہر کی حیثیت سے بہت ترقی کی۔ بقول ابن حوقل (۳۶۷ھ/۹۷۷ء) "یہاں ایک مسجد تھی اور ایک منبر"۔ ابوعبید البکری (۴۶۱ھ/۱۰۶۸ء) نے لکھا ہے کہ جادو ایک بڑا شہر تھا۔ جس میں بازار تھے اور یہودیوں کی کافی آبادی تھی۔ طرابلس الغرب سے فذان کے شہر زویلہ کو جانے والے قافلے جادو ہی سے گزرتے تھے۔ جبل نفوسہ اور خاص طور پر جادو کے کانم کے ساتھ بڑے گہرے روابط قائم تھے۔ جبل نفوسہ کے دوسرے مقامات کے باشندے جادو میں جو تجارتی مرکز تھا آیا کرتے تھے۔ ان دنوں جادو ملک کے سارے مشرقی حصے کا معاشی مرکز تھا۔

جادو اپنی مخلوط آبادی کے باوجود اباضیوں کا ایک اہم مذہبی مرکز تھا۔ جہاں پر ملک بھر کے اباضی علما و فضلا کا اجتماع رہتا تھا۔

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کا نصف جادو کے لیے نہایت خوشحالی کا زمانہ تھا۔ جبل نفوسہ کے حاکموں کے علاوہ خود اس شہر کے حاکم بھی مقامی اباضی شیوخ ہوا کرتے تھے۔ اہل جادو میں سب سے پہلا حاکم ابومحمد الدرفی تھا۔ اس کی رہائش دار بنی عبداللہ میں تھی جو جادو کے بازار میں واقع تھا۔ بعد میں یہی مکان شیوخ شہر کی آماجگاہ بن گیا۔ ابومحمد کے بعد اس کا بیٹا ابویحییٰ یوسف جانشین ہوا جو ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء تک حکمرانی کرتا رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں یہاں پانچسو مکانات تھے اور آبادی زیادہ تر نفوسہ کے بربروں پر مشتمل تھی۔ موجودہ زمانے میں جادو کی آبادی چند ہزار ہے قدیم شہر کے آثار محض ٹوٹے پھوٹے پتھروں کے ایک ڈھیر اور غاروں کی صورت میں موجود ہیں۔

Marfat.com

جن کے وسط میں ایک مسجد ہے۔ مسجد کے قریب ہی زمانہ قدیم میں کاروباری منڈی اور بازار تھا۔ اس بارے میں کہ یہ قدیم شہر کس زمانے میں ویران ہوا۔ تاریخ سے ہمیں کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ جادو شہر کا آخری بار ذکر راضیوں کے تذکرے میں چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں آیا ہے۔

جادو واقعات کے غیر فطری طور پر ظہور میں لانے کا فن۔ یہ علم ہر زمانے میں ہر قوم کے افراد کے عقیدے میں داخل رہا ہے اور مختلف اشخاص ہر جگہ اس کا دعوےٰ کرتے چلے آئے ہیں۔ قدیم مصر کے پجاری اس دعوے پر اپنی عبادت اور مذہب کی بنیاد رکھتے تھے۔ قدیم مصری، بابلی، ویدک اور دیگر روایتوں میں دیوتاؤں کی طاقت کا ذریعہ بھی جادو ہی کو خیال کیا جاتا تھا۔ یورپ میں باوجود عیسائیت کی اشاعت کے جادو کا رواج برابر جاری رہا اور افریقہ میں اب تک ایسے ڈاکٹر موجود ہیں جو جادو کے علاج کا صرف دعوےٰ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے دعوؤں کو حبشی لوگ عملاً تسلیم کرتے اور ان سے خائف رہتے ہیں۔ جادو کئی شکلیں اختیار کرتا ہے۔

جادو کے متعلق یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر برا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواح خبیثہ یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے۔

"سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔" (۲: ۱۰۲)

لیکن اس میں کوئی کلمہ کفر یا کوئی فعل شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے۔ اور آنحضورؐ نے اسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سات غارتگر چیزوں سے پرہیز کرو۔" لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا: خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا اور بھولی بھالی عفیف مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ (بخاری و مسلم)

جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گذر کر جسم کو بھی اسی طرح سے متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گذر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً خوف ایک نفسیاتی چیز ہے۔ مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور بدن میں کپکپاہٹ سی ہو جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی طرف جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں۔ وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی تھیں لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انہیں سانپ ہی محسوس کیا۔ اور حضرت موسیٰؑ تک کے حواس جادو کی اس تاثیر سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اسی طرح قرآن میں سورۃ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "بابل میں ہاروت و ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ (۲: ۱۰۲)" یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا اور ظاہر ہے اگر تجربے سے لوگوں کو اس عمل کی کامیابی معلوم نہ ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ یہ بات بلاشبہ اپنی جگہ درست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا اثر انداز ہونا بھی اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے

جار:- پڑوسی۔ (دیکھئے "ہمسایہ")

جار اللہ زمخشری:- عالم دین اور مفسر۔ (دیکھئے زمخشری جار اللہ)

جارجیا:- ایک علاقہ جو اب روس کے زیر تسلط ہے (دیکھئے "گرجستان")

جارودؓ بن عمروؓ صحابیؓ، نام بشر، ابو منذر کنیت اور جارود لقب تھا۔ قبیلہ عبد قیس کے سردار تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں انہوں نے قبیلہ بکر بن وائل کو لوٹ کر بالکل صاف کر دیا تھا۔ عربی میں جرد کے معنی برگ و بار کے ہیں۔ یہی واقعہ ان کے لقب کا سبب بنا۔ مذہباً عیسائی تھے۔ ۱۰ھ میں قبیلہ عبد قیس کے ساتھ مدینہ آئے۔ آنحضورؐ نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے کہا اے محمدؐ میں ایک مذہب پر تھا۔ اب تمہارے مذہب کے لئے اپنا مذہب چھوڑ رہا ہوں۔ میرے تبدیل مذہب کے بعد تم میرے ضامن ہو گے؟ آنحضورؐ نے فرمایا ہاں میں تمہارا ضامن ہوں۔ خدا نے تم کو تمہارے مذہب سے بہتر مذہب کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ اس مختصر سی گفتگو کے بعد جارودؓ اپنے ساتھیوں سمیت حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ آنحضورؐ کو ان کے اسلام لانے کی بہت خوشی ہوئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے۔

فتنۂ ارتداد کے زمانے میں ان کے قبیلے کے بہت سے آدمی مرتد ہو گئے لیکن آپ استقامت کے ساتھ دین حق پر قائم رہے۔ چونکہ آپ سردار قبیلہ تھے اس لئے اپنے اسلام کا اعلان کر کے دوسروں کو ارتداد سے روکتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں آپ نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایران پر فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے اور فارس یا نہاوند کے معرکے میں شہید ہوئے۔

حضرت جارود سے عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابو مسلم الجذامی، زید بن علی اور محمد بن سیرین نے روایت کی ہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ میں بہت زیادہ جرأت تھی اظہار حق میں بے باکی حد درجہ پہنچی ہوئی تھی۔ جس بات کو حق سمجھ لیتے تھے اس کے اظہار میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ بحرین کے گورنر قدامہ بن مظعون کو بعض رومیوں نے شراب پیتے دیکھا۔ آپ کو اس کا علم ہوا تو حضرت عمرؓ کے پاس آ کر کہا کہ امیر المومنین قدامہ نے شراب پی ہے ان پر شرعی حد جاری کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے شہادت طلب کی تو آپ نے حضرت ابوہریرہ کو پیش کیا۔ انھوں نے شہادت دی کہ میں نے نشہ کی حالت میں قے کرتے ہوئے دیکھا ہے حضرت عمرؓ نے قدامہ کو طلب کیا، وہ آئے۔ ان کے آنے کے بعد حضرت جارودؓ نے پھر کہا۔ امیر المومنین کتاب اللہ کی رو سے حد جاری کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم کو اتنا اصرار کیوں ہے تم گواہ ہو مدعی نہیں ہو۔ تمہارا کام شہادت دینا تھا جسے تم پورا کر چکے۔ اس وقت آپ خاموش ہو گئے لیکن دوسرے روز پھر اصرار کیا۔ شہادت ناکافی ہونے کے سبب حضرت عمرؓ کو آپ کا اصرار ناگوار گذرا اور فرمایا "تم تو مدعی بنے جاتے ہو شہادت صرف ایک ہے۔ اس اعتراض پر حضرت جارودؓ نے کہا عمرؓ میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ حد میں تاخیر نہ کرو۔ آخرکار ان کی بے جا ضد پر حضرت عمرؓ کو تنبیہ کرنا پڑی اور فرمایا جارودؓ خاموش رہو ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔ اس تنبیہ پر جارود نے غصے سے کہا" عمرؓ حق اس کا نام نہیں ہے کہ تمہارا ابن عم شراب پیے اور تم الٹے مجھے برے سلوک کی دھمکی دو آخر میں جب قدامہ کی بیوی نے شہادت دی تو حضرت عمرؓ نے حد جاری کرائی۔

جارودؓ چونکہ آنحضورؐ کے آخری زمانہ میں اسلام لائے تھے اس لئے آپ کی روایتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آپ کی اولاد میں ایک صاحبزادے تھے جن کا نام منذر تھا۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا
Marfat.com

جارودیہ ابتدائی دور کے اہل تشیع کی ایک جماعت۔ ان کا ذکر اکثر زیدیہ کے ضمن میں آتا ہے۔ یہ لوگ ہر علوی کو جو حضرت فاطمہ کی اولاد میں سے ہو امام تسلیم کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو اور بزور شمشیر امامت کا دعوےٰ کرے۔

اس گروہ کا بانی ابوالجارود زیاد بن المنذر تھا جو نابینا تھا۔ اس نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے جنہوں نے اس کا نام سرحوب رکھا تھا۔ اسی وجہ سے یہ گروہ سرحوبیہ بھی کہلاتا ہے۔

یہ گروہ ابوبکرؓ صدیق اور عمر فاروقؓ کی خلافت کو اس لیے تسلیم نہیں کرتے کہ علویوں کی موجودگی میں غیر علویوں کی امامت تسلیم نہیں کی جا سکتی وہ کسی غیر علوی امام کی تائید کرنے والوں کو کافر سمجھتے تھے۔ ان کا امامت کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ ہر فاطمی امامت کا یکساں حقدار ہے۔ نیز ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ امام کو جس علم کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے فطرت ہی سے ودیعت ہوتا ہے۔ سیکھنے سے نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ کوئی نہ کوئی علوی خروج کرتے ہوئے بطور مہدی واپس آئے گا۔ بعض کے نزدیک یہ مہدی محمد بن عبداللہ بن حسینؓ بن علیؓ المعروف نفس الزکیہ اور بعض کی رائے میں محمد بن قاسم بن علی بن حسین یا یحییٰ بن عمر الکوفی ہوں گے۔

بعض شیعیوں کے لئے یہ نام تقریباً ڈیڑھ سو سال تک استعمال ہوتا رہا۔

جاریہؓ بن قدامہ صحابیؓ۔ ابوایوب کنیت اور المحرق لقب تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ "جاریہ بن قدامہ بن زہیر (یا) بن مالک بن زہیر (یا) بن الحصین بن رزاح بن ربیعہ۔

حضرت علیؓ کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور یہی ان کی شہرت کا سبب ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو شہید ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر کے لشکر بصرے میں داخل ہوئے تو جاریہ ان دنوں یہیں موجود تھے جنگ جمل میں انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا۔ جنگ صفین میں بصرے کے قبائل سعد اور رباب کی سرداری انہیں کو سونپی گئی تھی۔ انہوں نے اس معرکے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

بقول المبرد وہ تحکیم کی موافقت میں تھے اور سرداران تمیم کے اس وفد میں شامل تھے جس نے الاشعث اور خوارزد کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی۔

واقعہ تحکیم کے بعد بھی حضرت علیؓ کے وفادار رہے اور خوارج کے ساتھ لڑائیوں میں حضرت علی کے مددگار رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے جس لشکر کو خوارج سے جنگ کے لئے بصرہ بھیجا تھا۔ جاریہؓ اس لشکر کے سردار تھے۔ جب حضرت علی کے دوستوں تک نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو پھر بھی ان کی وفاداری میں کچھ فرق نہ آیا۔ پھر جب حضرت امیر معاویہؓ نے مصر فتح کر لیا تو بصرے کی اس صورت حال کے پیش نظر کہ وہاں حضرت علیؓ کے حمایتی قلیل تعداد میں تھے حضرت جاریہ نے اس شہر کو اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی۔

حضرت امیر معاویہ نے عبداللہ ابن عامر الحضرمی کو اپنا سفیر بنا کر بصرے بھیجا تاکہ بنو تمیم کی تالیف قلب کرے چنانچہ اسے ایک حد تک ان کی حمایت حاصل بھی ہو گئی۔ تو زیاد بن ابیہ نے جو بصرے کا نائب عامل تھا۔ حضرت علی کو لکھا کہ جاریہؓ بن قدامہ کو بصرے بھیجیں کیونکہ ان کی اپنے قبیلے میں بہت زیادہ عزت ہے۔ جاریہ جنگجوؤں کا ایک دستہ لے کر بصرے پہنچے۔ بنی تمیم کی تالیف قلب کر کے انہیں اپنے ساتھ ملایا اور پھر ابن الحضرمی کے لشکر پر حملہ کیا۔ ابن الحضرمی شکست کھا کر اپنے ستر رفقا کے ساتھ ایک مضبوط سا سانی قلعے میں بند ہو گیا۔ جاریہؓ نے اس قلعہ کا محاصرہ کر کے اس کے گرد لکڑیاں جمع کرائیں اور آگ لگوادی اس طرح ابن الحضرمی اور اس کے رفقا جل کر مر گئے اور بصرے میں حضرت علیؓ کی حکومت قائم ہو گئی۔

جاریہؓ ہی نے حضرت علیؓ سے ۳۹ ھ میں زیاد کو صوبہ فارس کا عامل مقرر کرنے کی سفارش کی تھی تاکہ وہ ان ایرانیوں کی بغاوت فرو کر سکے جنہوں نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔

جاریہؓ نے حضرت علیؓ کے عہد حکومت میں آخری لڑائی بسر بن ارطاۃ کے خلاف ۴۰ ھ میں لڑی تھی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے حضرت حسنؓ کے لئے مدینہ منورہ میں لوگوں سے زبردستی بیعت لی۔

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں جاریہؓ کی ان سے صلح ہو گئی۔ ایک روایت کے مطابق امیر معاویہؓ نے انہیں ۹۰۰ جریب پر مشتمل ایک جائداد بھی عطا کی تھی۔ انہوں نے بصرے میں وفات پائی۔

جاسوس خفیہ خبر رساں۔ ٹوہ لگانا۔ جاسوس خاص طور پر اس مخبر کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے سن گن لینے کے لئے دشمنوں میں بھیجا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ایمان والوں کو ایک دوسرے کی ٹوہ لگانے سے منع کیا گیا ہے (۴۹: ۱۲) الماوردی کے نزدیک محتسب کے لئے جاسوس سے کام لینا جائز ہے۔ جبکہ کسی ممنوعہ بات کا ارتکاب کیا گیا ہو۔ مگر امام غزالی کے نزدیک نا جائز ہے۔

جاسوسی کے دو پہلو ہیں ایک تو دوسروں کے راز ٹٹولنا، لوگوں کے حالات و معاملات کی ٹوہ لگاتے پھرنا۔ گویا اندرون ملک ایسے وجوہ کی بنا پر جن کا تعلق حکومت اور نظم و نسق سے ہو دوسرے بیرون ملک سیاسی اور جنگی اغراض کے تحت جاسوسی کرنا۔

جہاں تک پہلی قسم کی جاسوسی کا تعلق ہے بقول مولانا مودودی وہ ہر حال میں شرعاً ممنوع ہے۔ ایک مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسروں کے جن حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے ان کی کھوج کرید کرے۔ اور پردے کے پیچھے جھانک کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کس میں کیا عیب ہے۔ اور کس میں کون کونسی کمزوریاں چھپی ہوئی ہیں۔ لوگوں کے نجی خطوط پڑھنا، دو آدمیوں کی باتیں کان لگا کر سننا، ہمسایوں کے گھروں میں جھانکنا اور مختلف طریقوں سے دوسروں کی خانگی زندگی یا ان کے ذاتی معاملات کی ٹٹول کرنا ایک بڑی بداخلاقی ہے۔ جس سے طرح طرح کے فساد رونما ہوتے ہیں۔ اسی لئے آنحضورؐ نے تجسس کرنے والوں کے بارے میں فرمایا۔ "اے لوگو! جو زبان سے ایمان لائے ہو مگر ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں اترا ہے۔ مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی کھوج نہ لگایا کرو۔ کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیوب ڈھونڈنے کے درپے ہوگا اللہ اس کے عیوب کے درپے ہو جائے گا اور اللہ جس کے درپے ہو جائے اسے اس کے گھر میں رسوا کر کے چھوڑتا ہے۔" (ابوداؤد)

تجسس کی ممانعت کا یہ حکم صرف افراد کے لئے ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی حکومت کے لئے بھی شریعت نے نہی عن المنکر کا جو فریضہ حکومت کے سپرد کیا ہے۔ اس کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ جاسوسی کا ایک نظام قائم کرے۔ لوگوں کی چھپی ہوئی برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور ان پر سزا دے بلکہ اسے صرف ان برائیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنی چاہیئے جو ظاہر ہو جائیں۔ رہی مخفی خرابیاں تو ان کی اصلاح کا راستہ جاسوسی نہیں ہے بلکہ تعلیم، وعظ و تلقین، عوام کی اجتماعی تربیت اور ایک پاکیزہ معاشرتی ماحول پیدا

Marfat.com

کرنے کی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بہت سبق آموز ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت آپ نے ایک شخص کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا آپ کو شک گذرا اور دیوار پر چڑھ گئے دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی آپ نے پکار کر کہا "اے دشمن خدا، کیا تو نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا۔ اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟" اس نے جواب دیا "امیر المومنین جلدی نہ کیجئے اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ کیئے ہیں، اللہ نے تجسس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسس کیا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور آپ دیوار پر چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت لیے بغیر داخل نہ ہو اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں تشریف لے آئے۔"

یہ جواب سنکر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے۔ اور اس کے خلاف انہوں نے کوئی کارروائی نہ کی: البتہ اس سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ افراد کے لیئے ہی نہیں خود اسلامی حکومت کے لیئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کے راز ٹٹول ٹٹول کر ان کے گناہوں کا پتہ چلائے اور پھر انہیں پکڑے۔

اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ مخصوص حالات ہیں جن میں تجسس کی فی الحقیقت ضرورت ہو مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رویئے میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آ رہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کر سکتی ہے۔

جہاں تک جاسوسی کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے عہد نبوی میں بھی سیاسی اور جنگی مقاصد کے تحت خفیہ اطلاعات فراہم کرنے کے لیئے جاسوس سے کام لیا جاتا تھا چنانچہ مشرکین اور ابوسفیان وغیرہ کے حالات سے باخبر رہنے کے لیئے آپؐ نے خاص آدمی مقرر کر رکھے تھے۔ زمانہ جنگ میں اور خاص طور پر خانہ جنگی اور بغاوت کے دوران میں خفیہ خبر رسانوں سے کام لینے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

جسطرح عسکری قائدین کو یہ صلاح دی گئی ہے کہ وہ اپنے جاسوس دشمنوں میں بھیجیں اسی طرح انہیں یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ اپنے لشکر سے ایسے سب افراد کو نکال دیں جو دشمنوں کے لیئے جاسوسی کر سکتے ہیں۔ غیر مسلموں کو کاتب مقرر نہ کرنے کا مشورہ بھی اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ وہ دشمنوں کے جاسوسوں کا کام دے سکتے ہیں فقہائے دشمن کے لیئے کام کرنے والے جاسوسوں کے سلوک کے بارے میں اپنی اپنی آراء بیان کی ہیں۔

امام اوزاعی نے کہا ہے کہ اگر یہ جاسوس ذمی ہے تو اس نے وہ عہد توڑ دیا جس کی بناء پر اس نے مسلمانوں کے ساتھ رہنا اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ امام ابو یوسف کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اسے فقط عبرت آموز سزا ملنی چاہیئے کیونکہ وہ نقض عہد کا مرتکب نہیں ہوا۔ امام ابو حنیفہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے نزدیک وہ صرف جسمانی سزا اور قید کا مستوجب ہے۔ امام مالک کے نزدیک وہ نقض عہد کا مرتکب ہوا ہے اور اسے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک "اگر جاسوس غیر ملکی باشندہ ہو اور اسلامی علاقے میں پروانۂ سلامتی حاصل کیئے بغیر گھس آیا ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر پروانۂ سلامتی اس کے پاس ہے اور وہ کاروباری سلسلے میں نہیں آیا تو اسے محض حدود مملکت سے خارج کر دیا جائے گا اور اگر وہ تجارت کی غرض سے سفر کر رہا ہے تو اسے جسمانی سزا دے کر نکالا جا سکتا ہے۔" امام مالک کی رائے کے مطابق دشمن کے جاسوس کا قتل کر دینا جائز ہے خواہ وہ پروانۂ سلامتی لے کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ امام یوسف بھی یہی رائے رکھتے ہیں —

جاف جنوبی کردستان اور ایران کے ایک ضلع سنہ کا ایک بڑا اور مشہور کرد قبیلہ۔ اس قبیلے نے ایران کے صوبہ اردلان کے علاقہ جوان رود میں گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں بود و باش اختیار کی۔ مویشی پال کر گذر بسر کرتے ہیں۔ بعض موسموں میں یہ خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس قبیلے کا تاریخ میں ذکر پہلی بار سلطان مراد چہارم کی مہمات اور معاہدہ ترکی و ایران کے ضمن میں آتا ہے۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں اس قبیلے کی بڑی تعداد ترکی کے علاقے میں نقل مکانی کر گئی۔ یہ تعداد دس ہزار خیموں پر مشتمل تھی۔ ترکی کے علاقے میں آباد ہو جانے والے گروہ کا قیام موسم گرما میں پنجوین کے گردو نواح کے کوہستانی علاقے میں بہار و خزاں کے موسم میں شہر زور کے میدانی علاقے میں اور موسم سرما میں دریائے سیروان کے دائیں کنارے پر واقع ان اراضی پر جن کا انحصار کفری پر تھا ہوا کرتا تھا۔

زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس قبیلے کے کچھ عناصر گوران کچھ سنجابی کچھ شرف بیانی اور بعض باجلان کے ساتھ خلط ملط ہو گئے۔ اور اصل قبیلے سے کٹ گئے۔ یہ قبیلہ اپنی خانہ بدوش زندگی اور نظم و ضبط سے بے اعتنائی کے باعث اپنے پڑوسیوں اور حضری آبادی سے تنازعات برقرار رکھے رہا۔ بعض موسموں میں یہ لوگ ایران کے علاقوں میں داخل ہو جاتے تھے جہاں کے باشندوں سے ان کے گہرے روابط قائم ہو گئے تھے چونکہ ان کے دونوں ممالک (ایران، ترکی) سے تعلقات تھے اس لیئے تقریباً ایک صدی تک دونوں ملکوں کی سرحدی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل رہا۔ یہ ایک عنصر تھا جسے قابو میں رکھنا بڑا مشکل تھا۔ ایک تو ان کی تعداد زیادہ تھی دوسرے اقتدار کے حصول کے لیئے ان میں آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔ ان میں سے ہر فریق کبھی ایران سے اور کبھی ترکی سے امداد کا طالب رہتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء سے ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء تک متعدد وقفوں کے ساتھ ان کا شمار سلطنت بابان کے باجگزاروں میں ہوتا رہا۔ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں اگرچہ یہ لوگ برائے نام ترکی حکومت کے نظم و نسق کے ماتحت ہو گئے تھے لیکن پھر بھی جنگ عظیم اول تک انہیں قوانین حکومت کا مؤثر طور پر پابند بنایا جا سکا۔ وہ جس علاقے میں ڈیرہ ڈالتے وہاں مویشی چراتے اور اپنا تسلط برقرار رکھتے۔

۱۳۳۷ھ/۱۹۱۸ء میں سرحدوں کی واضح حدبندی کے بعد اور ایک مؤثر و مستحکم حکومت قائم ہو جانے کے بعد سے اس قبیلے کی اہمیت کافی حد تک ختم ہو چکی ہے

جاگیر زمین، اقطاع۔ وہ اراضی جو حکومت کی طرف سے افراد کو بطور انعام تفویض کی جائے۔ جاگیردار اس اراضی پر مالیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ سلطان لوگوں کو انہیں علاقوں کی جاگیریں دے سکتا ہے۔ جن کا اس کا تصرف اور احکام نافذ ہوں۔ جن جاگیروں کے مالک معین اور مستحقین معلوم ہوں وہ کسی کو بطور جاگیر نہیں دے سکتا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ اقطاع تملیک (مملوکہ جاگیرات) ۲۔ اقطاع استغلال (وظائف)

اقطاع تملیک کی تین قسمیں ہیں۔ غیر آباد زمین، آباد زمین اور معادن (کانیں) غیر آباد زمین کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ہمیشہ سے بے آباد پڑی ہوں دوسرے وہ

Marfat.com

جو کسی وجہ سے بے آباد ہوگئی ہوں ۔ وہ زمین جو ہمیشہ سے غیر آباد ہو ۔ اور کسی کی ملک نہ ہو سلطان کو حق ہے کہ کسی کو آباد کرنے کے لئے دے دے اس بارے میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ سلطان نے جاگیر دی ہو کیونکہ ان کے خیال کے مطابق بلا اجازت سلطان آباد کرنا جائز نہیں ۔ امام شافعی کے نزدیک جاگیر ملنے سے آباد کرنے کا حق زیادہ ہو جاتا ہے ۔

غیر آباد زمین کی دوسری قسم یہ ہے کہ پہلے آباد تھی پھر غیر آباد ہوگئی ۔ اس کی بھی دو اقسام ہیں ۔

۱ ۔ عہد جاہلیت کی یعنی عاد و ثمود کی زمینوں کی طرح ہو یہ قدیمی غیر آباد زمین کے حکم میں آتی ہے ۔ اس میں سے جاگیر دینا جائز ہے ۔ آنحضورؐ کا فرمان مبارک ہے کہ عاد کی زمینیں اللہ اور رسول کی ہیں پھر میری طرف سے تمہاری ہیں ۔

۲ ۔ اسلامی ۔ جو زمینیں مسلمانوں کی ملک رہ کر پھر بیکار اور برباد ہوئی ہوں اس بارے میں فقہا کی تین آراء ہیں ۔ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ آباد کرنے سے ملکیت حاصل نہ ہوگی ۔ خواہ اصل مالک ہوں یا نہ ہوں ۔ امام مالک کے نزدیک ہر دو صورت میں آباد کرنے سے آباد کرنے والے کو ملکیت حاصل ہو جائے گی ۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو آباد کرنے سے بھی وہ زمین آباد کار کی ملکیت نہیں ہو سکتی ۔ البتہ اگر مالک غیر معلوم ہیں تو آباد کرنے سے اس کی ملکیت ہوگی ۔ نیز ان کے نزدیک جاگیروں کے علاوہ اور زمین آباد کرنے سے کسی کی ملکیت نہیں بن سکتی ۔ مالکوں کے معلوم ہونے کی صورت میں سلطان کے لئے ایسی زمینوں کو جاگیر میں دینا جائز نہیں ہے ۔ اس کے اصل مالک ہی اس زمین کو بیچ کرنے یا آباد کرنے کے زیادہ مستحق ہیں ۔

جب سلطان کسی کو جاگیر دے تو دوسروں کی نسبت اس کا زیادہ حق ہو جائے گا ۔ مگر اس کی ملکیت آباد کرنے سے پہلے قائم نہ ہوگی وہ شخص مکمل آباد کرنے کے بعد مالک ہوگا ۔ اگر آباد کرنے میں توقف کیا تو مالک نہ ہوگا ۔ توقف کو دیکھا جائے گا ۔ اگر ظاہری عذر کی وجہ سے ہو تو قابل اعتراض نہیں اور جاگیر عذر کے ختم ہونے تک اس کے قبضے میں رہنے دی جائے گی ۔ اور اگر عذر نہ ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین سال سے پہلے کچھ تعرض نہ کیا جائے گا اگر اس عرصے کے اندر اندر آباد کرے تو فبہا ورنہ جاگیر واپس لے لی جائے گی ۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے جاگیروں کی مدت تین سال مقرر کی تھی ۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ مدت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں صرف آباد کرنے کی قدرت کا اعتبار کیا جائے گا ۔ اگر اتنا عرصہ گذر گیا جس میں آسانی سے وہ زمین آباد ہو سکتی تھی تو اب اس سے کہا جائے گا کہ یا تو اسے آباد کرو تو یہ تمہارے قبضے میں رہے گی ورنہ تمہارے سے لے لی جائے گی ۔

نیز اس قسم کی جاگیر اگر کوئی دوسرا آباد کرے تو اس کے بارے میں امام شافعی کی رائے کے مطابق اگر تین سال کے اندر آباد کرے تو جاگیر والے کی ملک ہے اس کے بعد آباد کرے تو آباد کرنے والے کی ملک ہے ۔ امام مالک کے نزدیک اگر جاگیر ہونے کا علم ہوتے ہوئے آباد کرے تو جاگیر والے کی ملک ہے ۔ اور اگر یہ علم نہ ہو تو جاگیر والے کو اختیار دیا جائے کہ یا تو اپنی جاگیر لے کر آباد کرنے کا خرچہ آباد کرنے والے کو دے یا زمین اسے دے کر غیر آباد ہونے کے وقت کی قیمت اس سے وصول کرے ۔

اقطاع تملیک کی دوسری قسم آباد زمین ہے اس کی بھی دو اقسام ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کا مالک معلوم ہو اس میں سلطان کو تصرف کرنے کا حق نہیں ۔ البتہ اگر وہ جاگیر دارالاسلام میں واقع ہو تو خواہ مسلم کی ملک ہو یا ذمی کی بیت المال کے حقوق وصول کر سکتا ہے اور مسلمانوں کے ہاتھ سے باہر دارالحرب میں ہو تو فتح کی شرط پر جاگیر دے سکتا ہے ، جس طرح حضرت تمیم داریؓ نے آنحضورؐ سے شام کی فتح سے پہلے یہ درخواست کی تھی کہ شام کے چشمے مجھے عنایت فرما دیجیے تو آپؐ نے انہیں ان کی ملکیت میں تحریری طور پر دے دیا تھا ۔ اسی طرح ابوثعلبہ خشنیؓ نے ایک جاگیر رومی سلطنت میں مانگی ۔ آپؐ کو تعجب ہوا صحابہ سے فرمایا ۔ "سنتے ہو یہ کیا کہتا ہے ۔" اس نے کہا ۔ "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو مبعوث فرمایا ہے ۔ یہ علاقے ضرور آپ کے لئے فتح ہوں گے ۔" چنانچہ آپؐ نے اس کو تحریری اجازت دے دیا ۔

دوسرے یہ کہ اس کے مالک مخصوص متعین نہ ہوں ۔ اس کی بھی تین اقسام ہیں ۔ ایک یہ کہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد اس کو امام بیت المال کے لئے انتخاب کرے یا تو اہل خمس کے استحقاق میں یا غانمین کی رضامندی سے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے سواد کی زمین سے کسریٰ اور اس کے خاندان کا مال اور جس کے مالک بھاگ گئے یا ہلاک ہوگئے تھے انتخاب کر لیا تھا ۔ آپ نے اس میں سے کسی کو جاگیر نہیں دی ۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے اس مصلحت سے کہ جاگیروں میں دینے سے اس کی آمدنی بڑھ جائے گی ۔ اس کو جاگیروں میں دے دیا ۔ اور شرط یہ لگائی کہ اس کا حق فے ادا کریں گویا یہ جاگیریں آپ نے بطور اجارے کے دی تھیں جس کی آمدنی رفاہ عامہ میں صرف کی تھی اور حضرت عثمانؓ اس سے انعامات و عطیات دیتے تھے اس کے انتظام میں سلطان کو اختیار ہے خواہ وہ اس کی آمدنی براہ راست بیت المال کے لئے رکھے ۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے کیا خواہ زمین کو ہوشیار زمینداروں کے حوالے کر کے ان سے کم و بیش پیداوار کے لحاظ سے معین خراج وصول کرے جیسا کہ حضرت عثمانؓ کے عمل سے ثابت ہے ۔ یہ خراج زمین کی اجرت ہوگا ۔ جو مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے ۔ البتہ اگر اہل خمس کا حق ہو تو ان پر خرچ کیا جائے گا ۔

دوسری قسم خراجی زمین ہے ۔ اس میں سے جاگیر دینا جائز نہیں کیونکہ اس کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں اول یہ کہ اصل زمین وقف ہو اور اس کا خراج اجرت ہو اس میں سے ملوکہ جاگیرات صحیح نہیں نہ اس کی بیع و ہبہ جائز ہے اور دوسری قسم یہ ہے کہ زمین ملک ہو اور اس کا خراج جزیہ ہو تو جس زمین کے مالک معین ہوں اس کو بھی جاگیر میں دینا صحیح نہیں اور اس کے خراج میں سے وظائف مقرر ہونے کے متعلق اقطاع استغلال میں ذکر آ رہا ہے ۔

تیسری قسم یہ ہے کہ اس کے مالک مر گئے ہوں اور نہ ہی کوئی اس کا وارث موجود ہو اس کو بیت المال کی ملکیت میں داخل کر کے عام مسلمانوں کی میراث بنا دینا چاہیئے اور آمدنی کو ان کی مصالح میں صرف کرنا چاہیئے ۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کی میراث صرف فقراء میں میت کی طرف سے بطور صدقہ کے خرچ کرنی چاہیئے اور امام شافعی کے نزدیک اس کا مصرف عامۃ المسلمین کے مصالح ہیں ۔ چنانچہ ایک رائے تو اس بارے میں یہ ہے کہ وہ وقف ہو جاتے ہیں اس لئے اس کا مصرف کسی طرح خاص نہیں عام ہے اور ان کی بیع ہبہ اور جاگیر کے طور پر دینا جائز نہیں ۔

دوسری رائے یہ ہے کہ جب تک امام وقف نہ کرے وقف نہیں ہوتے اس رائے کے مطابق ان کی بیع اگر بیت المال کے لئے مفید ہو تو درست ہے ۔ ان کی قیمت مصالح عامہ ، حاجت مندوں پر صرف کیا جائے گا اور جاگیر میں دینے کے متعلق دو قول ہیں ۔ ایک میں جواز کا پہلو ہے کہ جب بیع کرنا اور قیمت حاجت مندوں میں صرف کرنا جائز ہے تو جاگیر میں دینا بھی جائز ہے ۔ دوسرے قول میں عدم جواز کا کیونکہ بیع میں معاوضہ ہوتا ہے اور جاگیر عطیہ ہوتی ہے ۔

اقطاع معادن یعنی کانوں کی جاگیر سے مراد زمین کے وہ ٹکڑے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دھاتیں جواہرات اور دوسری اقسام کی اشیاء پیدا کی ہیں ۔ ان کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہرہ

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

اور دوسری باطنہ۔

ظاہرہ سے مراد وہ معادن ہیں جن کی چیز ظاہر اور کھلی ہوئی ہوں جیسے سرمہ، نمک وغیرہ ان کا حکم پانی کے مثل ہے جو کسی کو بطور جاگیر دینا درست نہیں۔

ثابت بن سعید اپنے دادا کی روایت بیان کرتے ہیں کہ ابیض بن حمال نے مارب کے نمک کو آنحضورؐ سے بطور جاگیر مانگا۔ آپؐ نے دے دیا۔ اقرع بن حابس تیمی نے عرض کیا "یا رسول اللہ میں نے اس نمک کو جاہلیت میں دیکھا ہے کہ وہاں اور کچھ نہیں ہے۔ لوگ آتے ہیں اور پانی کی طرح لے جاتے ہیں۔" آپ نے اس کو ابیض سے واپس کرنے کو فرمایا تو اس نے عرض کیا "یا رسول اللہ میں اس شرط پر واپس کرتا ہوں کہ آپؐ اس کو میری طرف سے صدقہ فرمادیں۔" آپؐ نے فرمایا "یہ تمہاری طرف سے صدقہ ہے اور مائے عد کی طرح ہر شخص کے لئے عام ہے۔" مائے عد سے مراد وہ پانی ہے جس میں انقطاع نہ ہو۔ جیسے کنویں، چشمے وغیرہ۔

چنانچہ اس قسم کی چیزوں کو جاگیر میں دینا جائز نہیں۔

معادن باطنہ سے مراد وہ کانیں ہیں۔ جن کی اشیا پوشیدہ ہیں۔ جیسے سونے چاندی پیتل اور لوہے وغیرہ کی کانیں جاگیر کے طور پر دینے کے بارے میں دو قول ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ انھیں جاگیر کے طور پر دینا ناجائز ہے اور معادن ظاہر کی طرح یہ بھی سب کے لئے عام ہیں۔

دوسرے قول کے مطابق جائز ہے۔ دلیل اس کی یہ دی جاتی ہے کہ ابن عوف اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو معادن قبلیہ کی جلسی اور غوری قدس کی ناقابل زراعت زمینیں جو اب تک کسی مسلمان کو نہیں دی گئی تھیں مرحمت فرمائیں۔

اس قول پر جاگیردار کو حق جاگیر حاصل ہے اور دوسرے کو منع کرنا صحیح ہوگا اس کے بارے میں دو رائے ہیں ایک یہ کہ جاگیرداران معادن کا اپنے دوسرے اموال کی طرح مالک ہوتا ہے اور اپنی زندگی میں بیع کرسکتا ہے اور مرنے کے بعد وراثت جاری ہوگی۔

دوسری رائے یہ ہے جاگیرداران معادن کا مالک نہیں ہوتا وہ جب تک قابض رہے مستفید ہوتا رہے گا۔ اور کوئی شخص تعرض نہیں کرسکتا۔ اور جب وہ جاگیر سے دستبردار ہو جائے تو وہ معادن جاگیر کے حکم سے خارج ہوکر حسب سابق سب کے لئے مباح ہو جائے گی۔

یہ تو تھیں اقطاع تملیک (مملوکہ جاگیرات) کی اقسام اب ہم اقطاع استغلال (وظائف) کے بارے میں بحث چھیڑتے ہیں۔

اقطاع استغلال (وظائف) کی دو اقسام ہیں۔ ۱۔ عشر۔ ۲۔ خراج۔ عشر میں سے وظائف مقرر کرنا جائز ہیں۔ کیونکہ وہ زکوٰۃ ہے۔ اور اس کے مستحقین بھی خاص لوگ ہیں خراج کے وظائف کا حکم وظیفہ خوار کی حالت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی تین حالتیں ہوسکتی ہیں۔

ایک یہ کہ وظیفہ خوار اہل صدقات سے ہو۔ اسے خراج سے دینا جائز نہیں۔ کیونکہ خراج مال فے ہے۔ جس کے اہل صدقات مستحق نہیں ہوتے جس طرح فوجی صدقہ کے مستحق نہیں ہوتے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک خراج سے وظیفہ دینا جائز ہے کیونکہ وہ فے کو اہل صدقہ کے لئے جائز سمجھتے ہیں۔ دوسرے اگر وظیفہ خوار اہل مصالح میں سے ہو کہ جنگی کوئی تنخواہ نہیں ہوتی ان کے لئے بھی علی الاعلان وظیفہ مقرر کرنا جائز نہیں بطور انعام دینا جائز ہے۔

تیسرے یہ کہ تنخواہ دار یعنی فوجی ہو۔ فوجیوں کو اقطاع دینا خصوصیت سے جائز ہے۔ ان کی معین تنخواہیں اس استحقاق پر دی جاتی ہیں کہ وہ قوم و مذہب کی حمایت میں اپنی جانیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے یہ وظیفہ دائمی اور برقرار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی مدت ایک سال تک ہے۔ چونکہ اقطاع خراج کو زیادہ تر اہل فوج ہی کے لئے موزوں سمجھا جاتا تھا اور اس طرح ہی فوجی جاگیرداری کی ابتداء ہوئی۔ یہاں تک کہ جاگیرداروں کی ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی۔ اقطاع خراج سے یا تو فوج کی تنخواہوں کا ایک حصہ ادا کرنا مقصود تھا یا اسے تنخواہوں کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اگر محاصل کی وصول میں بے قاعدگی ہوتی تو جاگیریں اہل فوج ہی کو دے دی جاتی تھیں۔

جالوت فلسطیوں کا ایک گراں ڈیل پہلوان، جس نے بنی اسرائیل کی فوج کو دعوت مبارزت دی اور جسے حضرت داؤدؑ نے قتل کیا تھا۔ یہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل پر عمالقہ کا غلبہ ہوگیا تھا اور انہوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ بنی اسرائیل پر اس وقت سموئیل نبی حکومت کرتے تھے جو بہت بوڑھے ہوچکے تھے۔ سرداران بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا بادشاہ ہونا چاہیئے جس کی قیادت میں وہ جنگ کرسکیں۔ چنانچہ سموئیل نبی نے حکم ربی کے مطابق طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کردیا۔ جب طالوت بنی اسرائیل کا لشکر لے کر دریا پار کرکے آگے بڑھا تو انہوں نے طالوت سے کہا کہ ہم جالوت کا مقابلہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

قرآن مجید میں جالوت کا ذکر اس طرح سے آیا ہے:

"پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کرکے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے۔ انہوں کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی "اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر ہمارے قدم جمادے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر آخر کار اللہ کے اذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کردیا۔" (۲: ۲۴۸ تا ۲۵۱)

جالوت سے جنگ کا مقام "غور" بتایا جاتا ہے۔ جاردن کی زیریں وادی میں ہے بعض نے جالوت کو امیر العمالقہ اور بقیۃ الجبارین کے القاب دیئے ہیں۔

جالوت کے بارے میں مختلف قصے اور کہانیاں گھڑی گئی ہیں۔ اور مختلف نصوص میں اسے ملوث کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت داؤد سے پہلے جن لوگوں نے بنی اسرائیل پر مظالم کئے تھے ان سب کو جالوت کا نام دے دیا گیا۔

جالور ہندوستان کی ریاست راجستھان کا ایک قصبہ، جو جودھ پور سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر جنوب کی سمت میں واقع ہے۔

مسلمانوں کا یہاں سے گذر سب سے پہلے ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء میں ہوا جب علاء الدین کی فوجیں جالور سے گذری تھیں لیکن انہوں نے اس علاقے پر قبضہ نہیں کیا۔

جمادی الاوّل ۷۵۰ھ/دسمبر ۱۳۵۰ء میں بادشاہ نے ملتان کے والی عین الملک کو جالور اجین اور چندیری پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ جب وہ مالوے میں داخل ہوا تو ڈیڑھ لاکھ ہندو فوج نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ جالور کا چوہان راجہ مسلمانوں کی اس فتح سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ والی ملتان کے ساتھ سلطان علاء الدین کی اطاعت کا

Marfat.com

حمت اٹھانے کے لیے دہلی آیا۔ دو سال بعد جب اس راجہ نے سرکشی اختیار کی تو علاءالدین نے جالور پر حملہ کر دیا۔ جسے کمال الدین گرگ نے فتح کر کے دہلی کے زیر نگیں کر دیا۔ بعد میں جب سلطان کی وفات کے بعد دہلی کی سلطنت کمزور پڑ گئی تو چوہان راجہ کا دوبارہ جالور پر قبضہ ہو گیا۔

۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء میں چوہان راجہ کے مر جانے کے بعد افغانوں کا سردار ملک خرم اس کی بیوہ کا امور حکومت میں ہاتھ بٹانے لگا۔ یہ افغان گروہ آٹھویں صدی ہجری چودہویں صدی عیسوی کے زمانے میں صوبہ بہار سے مارواڑ آ گیا تھا جہاں انہوں نے جالور کے راجہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جب افغانوں اور راجپوتوں میں اختلافات رونما ہوئے تو ملک خرم نے شہر اور اس کے قلعہ سوگیر پر قبضہ کر لیا اور دہلی کی سلطنت سے اپنی حکومت کی توثیق کا پروانہ حاصل کر لیا۔ ۸۰۱ھ/۱۳۹۹ء میں جب تیمور نے دہلی پر قبضہ کیا اور اسے تاخت و تاراج کیا تو جالور کے حاکم کچھ عرصے کے لئے خود مختار حاکم ہو گئے لیکن بعد میں وہ گجرات کی سلطنت کے باجگزار ہو گئے۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں جب پالن پور بھی جالور کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ تو حاکم جالور جواب نواب کہلانے لگے تھے ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء میں جالور سے اپنا پایہ تخت پالن پور میں تبدیل کر لیا۔ یہ ریاست ۱۹۵۶ء تک ایک خود مختار مسلم ریاست رہی جو بعد میں حکومت ہندوستان میں مدغم کر دی گئی۔

جالور کی یادگار عمارات میں قلعہ پرمار راجپوتوں نے تعمیر کرایا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں اس قلعے کے احاطے کی دیواروں میں توپیں نصب کرنے کے لیے کچھ تغیر و تبدل کیا تھا۔ قدیم ترین عمارت اندرون شہر کی ایک مسجد ہے جو سلطان علاءالدین خلجی کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ مسجد توپ خانہ مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اسے مدتوں اسلحہ خانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔

ایک مسجد قلعے کے اندر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے علاءالدین کی فوج نے بنایا تھا۔

موجودہ دور میں جالور ایک قصبہ ہے۔

جالینوس (۱۳۰ء - ۲۰۰ء) ایک مشہور و معروف طبیب، جراح، دوا ساز اور علم طب کی کتابوں کا مصنف۔ ایشیائے کوچک کے شہر پرگاموں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک معمار کا بیٹا تھا۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں طب کا مطالعہ شروع کیا۔ علم کی تحصیل کے لیے سمرنا، کورنتھ اور سکندریہ گیا۔ اسکندریہ سے واپس آ کر پرگیمم کے بادشاہ کا شاہی طبیب مقرر ہوا۔ بعد میں روم چلا گیا اور شہنشاہ مارکس آریلیس کا شاہی طبیب بن گیا۔ لیکن چار سال بعد پھر واپس پرگیمم آ گیا۔

اس نے تشریح عضویات، امراضیات، معالجات اور صیدلیات میں نئے نئے تجربے کر کے نئے حقائق کا انکشاف کیا۔ جالینوس بڑا پُر نویس، واضح اور زور دار مصنف تھا۔ اس کا شمار دنیا کے مشہور طبی فلاسفہ میں کیا جاتا ہے اس نے تقریباً ۱۲۰ کے قریب کتب تصنیف کیں جو طب، منطق، صرف و نحو، اخلاقیات فلسفہ اور ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ اس کے غیر معمولی فضل و تبحر، ذہانت و سہل بیانی اور ادعا و تحکم کا نتیجہ ہے کہ اس کے اقتدار میں سولہویں صدی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے یونان کی تشریحی و طبی معلومات اور ان کے عملی پہلو کو ایک واحد اور منظم شکل میں پیش کیا۔ اس کی شہرت ایک طبیب کی حیثیت سے برسوں تک بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ آخر کار بقراط کے برابر طب کا معلم اعظم تسلیم کر لیا گیا۔

جالینوس نے یونانی اطباء کے عظیم الشان کارناموں کو جس طرح منضبط کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچایا وہ اسی کا کارنامہ ہے۔

طب و فلسفہ میں جالینوس کی بہت سی تصانیف جن کے بارے میں خیال تھا کہ نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ عربی ترجموں کی شکل میں منظر عام پر آئیں۔ ۵۰۰ء میں جب فلسفے اور طب کو مسیحی نصاب تعلیم میں قطعی طور پر شامل کر لیا گیا تو نہ صرف جالینوس کی اکثر تصانیف کے محفوظ رہنے کی ضمانت مل گئی بلکہ آئندہ زمانے تک کے لئے اس کا تفوق بھی قائم ہو گیا۔

ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں جالینوس کی جو تصانیف یونانی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان سب تصانیف کے ترجمے آخر کار عربوں کے ہاتھوں میں آ گئے۔ اور اس طرح عربوں کو اس کی متعدد ایسی تصانیف کا سراغ مل گیا جو متاخر بزنطی دور میں ضائع ہو چکی تھیں۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ متاخر عرب اطباء نہ صرف جالینوس کی جملہ تصانیف بلکہ اس کے طریق کار اور قائم کردہ نتائج پر پوری طرح حاوی تھے اور ان کے ہاں طب کی تعلیم و تدریس میں ان سب کتابوں کا متن ان کی شرحیں اور خلاصے اور ان پر مبنی نئی تالیفات نصاب کے لازمی جزو کے طور پر شامل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ اور دور نشاۃ ثانیہ میں جالینوس پر جو کچھ علمی کام ہوا ہے وہ ایک حد تک عربوں کی تالیفات اور اس کی کتابوں کے عربی تراجم ہی کا مرہون منت ہے

جام افغانستان کا ایک گاؤں جو علاقہ غور میں چشت کے شمال میں واقع ہے اور خاص طور پر خوبانیوں کے باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں پر اسطوانی شکل کا متناسب منزلوں والا ایک مینار بھی واقع ہے۔ جس کی کرسی ہشت پہلو ہے۔ اس پر مخروطی شکل کی تین منزلیں اوپر نیچے بنی ہوئی ہیں۔ جن کے اندر ۱۸۰ سیڑھیوں والا ایک زینہ بنا ہوا ہے۔ مینار کی بلندی کی وجہ سے اسے قطب مینار دہلی اور مینار بخارا کے ساتھ شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مینار غوری خاندان کے پانچویں بادشاہ، ابوالفتح محمد بن سام (۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء - ۵۹۹ھ/۱۲۰۲ء) نے بنوایا تھا۔

بقول اے ماریکیو "یہ مینار، مینار فتح بھی تھا اور قطب مینار کی طرح ایک ایسا مینار بھی جو سلطنت غوریہ کے علاقوں کے مرکزی نقطے کی نشاندہی کرتا تھا۔ چنانچہ اس مینار کو جام میں غوریوں کے دارالسلطنت شہر فیروزکوہ کا واحد باقی ماندہ نشان قرار دیا جا سکتا ہے۔"

جامع وہ بڑی مسجد جس میں بہت سے لوگ جمع ہو کر نماز جمعہ ادا کریں۔ (دیکھئے "مسجد")

جامع اموی دمشق کی ایک مسجد جسے اسلام میں چوتھی مقدس ترین مسجد کا درجہ حاصل ہے۔ ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے مسجد اقصیٰ کے بعد دوسرا درجہ جامع اموی کا ہے۔ ۸۹ھ/۷۰۵ء میں ولید بن عبدالملک نے اس مسجد کو بنوایا تھا۔ یہ مسجد دنیا کی جمیل ترین عبادت گاہوں میں سے ہے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یروشلم کے حرمین کے بعد اسی جامع کا درجہ ہے۔ اس کا طول ساڑھے پانچ سو قدم ہے

Marfat.com

اور عرض ڈیڑھ سو قدم ہے۔ ولید بن عبدالملک نے سات سال تک اس مسجد کی تعمیر کے لیے شام کا پورا مالیہ وقف رکھا۔ مقامی کاریگر باعث تسلی ثابت نہ ہوئے تو ایران اور ہندوستان سے فنکار بلائے گئے اور ایک سو بازنطینی فنکاروں کے لیے بزنطی شہنشاہ کو لکھا گیا۔ رنگ رنگ کے پتھروں اور نہایت کم یاب سنگ مرمر سے اس مسجد کی دیواریں اور چھتیں آراستہ کی گئیں۔ دیواروں پر سنہری بیل بوٹے بنوائے گئے تھے اور جابجا جواہرات جڑے گئے تھے۔ اس کے ستون بہت بڑے بڑے تھے جو سنگ سماق اور سنگ رخام کے مختلف رنگوں کے ہیں۔ اس کے قبہ میں بارہ ہزار قندیلیں سونے اور چاندی کی زنجیروں میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ماہ رمضان میں ان بارہ ہزار قندیلوں کو روشن کیا جاتا۔ چار مصلوں یعنی حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کے لیے چار محراب علیحدہ علیحدہ بنے ہوئے ہیں۔ اس مسجد میں ۵۰ مؤذن مقرر ہیں جو اس کے تین میناروں پر چڑھ کر اذان کہتے ہیں۔ بقول مولوی محبوب عالم "میں نے ظہر کے وقت اس کے مشرقی مینار پر پندرہ بیس آدمی ایک وقت میں اذان دیتے ہوئے دیکھے جو بلند آواز سے ہم آہنگ ہو کر اذان کہتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی آواز دور دور تک پہنچتی ہے۔"

مسجد کی شمالی سمت میں ولید نے ایک مینارہ تعمیر کرایا تھا جس پر رات کے وقت روشنی ہوتی تھی۔ بعد میں تعمیر کے اس نمونے کی پیروی شام، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں ہوئی۔ یہ سب سے پرانا اور خالص اسلامی مینارہ ہے۔ جنوبی سمت کے دو مینار پہلے گرجے کے برج تھے۔ بقول امام غزالی وہ شمالی مینار میں عبادت اور مراقبے کے لیے معتکف رہے۔

اس مسجد کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ نماز کے لئے محراب سب سے پہلے اسی میں بنی۔ اسی مسجد میں نعل نما محرابیں بنائی گئیں۔

ایک اندازے کے مطابق اس کی تعمیر پر تین کروڑ اشرفیاں صرف کی گئیں۔ اس جامع کی تعمیر کے وقت علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے کاریگروں کے جو اس تعمیر کے لئے دستیاب ہو سکتے تھے، بارہ ہزار کاریگر اور معمار و سنگتراش بلاد روم سے بلائے گئے تھے۔ ابن عساکر نے "العیون" میں اس جامع کو تعمیر کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔

جامع اموی کی جگہ پہلے پہل یہاں دمشق کے جوپیٹر کے لئے ایک مندر بنا ہوا تھا۔ بعد میں رومی شہنشاہ آرکاڈیس نے پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کی جگہ ایک کلیسا تعمیر کیا۔ ولید نے اس گرجے پر قبضہ کر کے یہاں مسجد کی تعمیر کرائی۔ جس مقام پر حضرت یحییٰ کا سر مبارک کٹ جانے کے بعد رکھا گیا تھا وہ مقام اب بھی مسجد کے اندر محفوظ ہے اور اس پر ایک قبہ بنا دیا گیا ہے۔ ایک اور مسیحی اثر بھی مسجد میں محفوظ ہے۔ یعنی جنوبی سمت کے رواق کا کتبہ جس کی عبارت یہ ہے۔ "اے مسیح! تیری بادشاہت دائمی ہے اور تیری حکومت نسلاً بعد نسل قائم رہے گی۔"

۱۰۶۹ء میں یہ عظیم الشان مسجد پہلی مرتبہ آتشزدگی سے برباد ہو گئی۔ جب اسے تعمیر کیا گیا تو تیمور لنگ نے فتح دمشق کے وقت اسے آگ لگوا دی۔ اس مرتبہ پھر اس کو اسی شان و شوکت سے تیار کیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں اسے تیسری بار پھر آتشزدگی کا حادثہ پیش آیا۔ اس مرتبہ کی آتشزدگی سے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس مرتبہ اس میں وہ قرآن مجید بھی جل گیا جس پر حضرت عثمانؓ کا خون گرا ہوا تھا جسے وہ اپنی شہادت کے وقت پڑھ رہے تھے۔ لیکن اہل دمشق نے چندہ کر کے دوبارہ اس کی تعمیر اور مرمت شروع کر دی۔ بقول منشی محبوب عالم "۱۹۰۰ء میں جب میں نے اسے دیکھا تو آدھی سے زیادہ تیار ہو چکی تھی۔ اور اس وقت تک پچاس ساٹھ ہزار پونڈ خرچ ہو چکے تھے۔" اب یہ مسجد مکمل طور پر تیار ہو چکی ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر مبارک بھی اسی مسجد کے سامنے واقع ہے۔

جامع قرطبہ

قرطبہ کی ایک بڑی جامع مسجد۔ قرطبہ کی جامع مسجد اس شہر کے لیے مایہ ناز تھی۔ اس کا شمار وسیع ترین مساجد میں ہوتا تھا اور وہ مسجد مغربی دنیائے اسلام کی مقدس ترین عبادت گاہ تھی۔ دور دراز اور قرب جوار کے مسلم زائرین اس شاہراہ پر ہوتے ہوئے جو اندلسیہ (عرب حکمرانوں کی زبان میں الاندلس) کے سرسبز شاداب دیہات سے گذرتی تھی، قرطبہ پہنچتے تھے۔ ان تھکے ماندے زائرین کو جو دریا کے طویل رومی پل پر سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آتے تھے مسجد کا بلند مینار دراصل روشنی کا مینار معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹی سی ڈھلوان سڑک پل پر سے مسجد کی مغربی دیوار کے قریب تک جاتی تھی۔ زائرین ایک محرابی دیوار سے گذر کر جب ایوان عبادت کے صحن میں جاتے تھے تو سفر کی تمام تھکن بھول جاتے۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا کہ ایک نئی دنیا میں آ گئے ہیں۔ ہر طرف خاموشی اور سکون کا سماں ہوتا تھا۔ ایک شخص عمارت کے شمالی کنارے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بنی ہوئی کشادہ محرابوں میں سے ایوان عبادت کے اندر دور تک نظر ڈال سکتے تھے۔ نارنگی کے درختوں کی قطاریں صحن میں ٹھنڈا سایہ پھیلاتی تھیں اور درختوں کے پتلے تنوں کا سلسلہ ان مرمریں ستونوں سے جا کر مل جاتا ہے۔ جو عمارت کے اندر دور تک چلے گئے تھے اور محراب کے قریب پہنچ کر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے تھے۔

یہ عظیم مسجد اب ایک بڑا گرجا ہے۔ مگر آج بھی اس کے متعلق یہ خیال کرنا دشوار ہے کہ یہ عمارت کوئی مسیحی کلیسا ہے۔ قدیم ایوان عبادت اتنا وسیع ہے کہ سولھویں صدی میں گرجا کا جو سارا خانہ اور مقدس عبادت گاہ تعمیر کی گئی تھی وہ دھندلے ستونوں کے جنگل میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ عمارت اس زمانے کے مقابلے میں جب مسلم زائرین اس میں نماز پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے اب دھندلی ہو گئی ہے۔ صحن کے سامنے

جامع اموی

Marfat.com

کشادہ محرابی دروازے اب بند کر دیئے گئے ہیں اور بہت سے جھاڑ فانوس جو چھت میں لٹکے ہوئے تھے غائب ہیں۔

دروازوں کے اندر داخل ہوتے ہی ان ستونوں کے درمیانی راستوں سے گذرنا پڑتا ہے جو آٹھویں صدی میں عبدالرحمان اول نے اس وقت بنوائے تھے جب مسجد کی تعمیر شروع کی تھی۔ عرب معماروں نے اونچائی میں اضافے کے لیے دوہری محرابوں کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اور اپنے ذوق رنگ آمیزی کی مدد سے سرخ اینٹ اور ہلکے بادامی رنگ کے پتھر کی متبادل دھاریاں ڈال کر محرابیں تعمیر کیں۔ جنوب کی طرف جانے کے لیے ان درمیانی راستوں سے گذرنا پڑتا ہے جو عبدالرحمان ثانی نے نمازیوں کی بڑھتی ہوئی جماعتوں کے لیے گنجائش نکالنے کی غرض سے تعمیر کرائے تھے۔ اس کے بعد محرابوں کی تزئین زیادہ پر رونق ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان سے محراب نظر آنے لگتی ہے جو جنوبی دیوار کے اندر ایک گہرے طاق کی شکل میں ہے اور جس کے چاروں طرف طلائی پچیکاری کے نقوش تاباں و درخشاں ہیں۔ محراب مصلیٰ کے سامنے قوسی محرابیں کچھ عجیب طرح آپس میں گھتی ہوئی ہیں اور اوپر قوسی چھتوں نے جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ جانے والے راستے پر تین نہایت خوشنما چھوٹے چھوٹے برج بنا دیئے ہیں۔

عمارت کا یہ خوبصورت جنوبی حصہ ان کاریگروں کا مرہون منت تھا جن کی خدمات الحکم ثانی نے حاصل کی تھیں۔ ان فنکاروں نے محراب مصلیٰ، قوسی چھتیں اور محرابوں کی آرائش اس طرح کی تھی کہ پلاستر اور سفید سنگ مرمر کے چوکوں پر کندہ کاری کے ابھرے ہوئے نقوش ہیں۔ ایک دوسرے پر لپٹی ہوئی ڈنڈیوں، پھولوں اور پتیوں کے نمونے سجائے گئے تھے۔ محراب مصلیٰ کی قوس کے اردگرد پچیکاری میں نقوش عربیہ کے حسین دلربا پھول بوٹے اس کاریگر کا کارنامہ تھے جسے الحکم کی مخصوص درخواست پر بزنطی شہنشاہ نے قسطنطنیہ سے بھیجا تھا۔

محراب مصلےٰ کی دائیں جانب کی قوسی محراب بھی پچیکاری سے آراستہ تھی۔ یہیں وہ نجی دروازہ تھا جس سے خلیفہ مسجد میں آتا تھا۔ اس کا محل "القصر" دریا کے کنارے تھا۔ یہیں سے ایک مسقف راستہ نجی دروازے تک آتا تھا۔ بائیں جانب کی محراب سے ان کمروں میں داخل ہوتے تھے۔ جہاں بیش بہا چیزیں محفوظ تھیں۔ مسجد کی سب سے بیش بہا چیز وہ بڑی تقطیع کا قرآن مجید تھا جس کے چار صفحات آنحضورؐ کے صحابی اور خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمانؓ کے قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ نیز جب آپؓ کو شہید کیا گیا تھا تو آپ اسی نسخے کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کا خون اس کے صفحات پر گرا تھا۔ یہ قرآن صرف جمعہ کے وقت نکالا جاتا تھا اور قرطبہ پہنچنے والا ہر زائر اسے اپنی زیارت کے لیے طرہ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

جامع مسجد دہلی دہلی کی مشہور و معروف مسجد جسے شاہ جہاں نے بنوایا تھا شاہجہان کی خواہش تھی کہ اس کا نیا دارالحکومت جو شاہجہان آباد کہلاتا

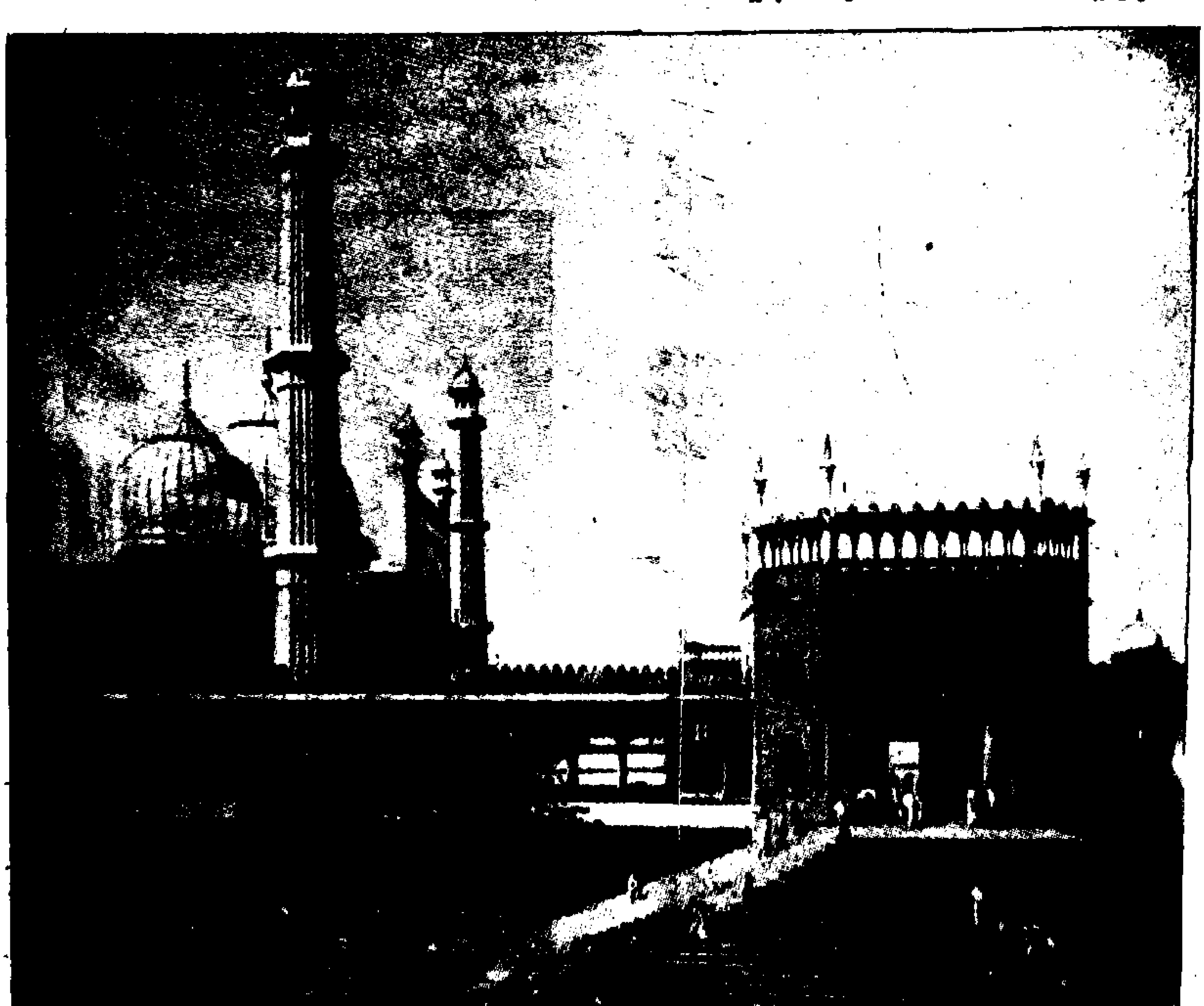

جامع مسجد دہلی (تعمیر شدہ ۱۶۴۴ء تا ۱۶۵۸ء)

Marfat.com

تھا۔ دنیا کے اعلیٰ ترین شہروں میں سے ایک ہو۔ اپنے محل کے قریب ہی اس نے جامع مسجد تیار کرائی۔ جس کے بارے میں یہ روایت کی جاتی ہے کہ اس مسجد کا نمونہ شاہجہان نے خواب میں دیکھا تھا اور اسی قسم کی مسجد جو بیتے آسمان پر ہے اسے مسجد جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ یہ مسجد ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء سے ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء کے درمیانی عرصے میں بنکر تیار ہوئی۔ اس مسجد کے بارے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے۔ جس کا کتب تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا کہ جب جامع مسجد بنکر تیار ہوگئی تو بادشاہ نے آکر معائنہ کیا۔ قطب نما رکھ کر جب قبلہ جانچا تو معلوم ہوا کہ کچھ فرق رہ گیا ہے۔ بادشاہ نہایت مایوس اور رنجیدہ ہوا۔ مگر ایک درویش ظاہر ہوئے اور انہوں نے پلنے والوں کی طرف جو مسجد کا کرنہ ہے اس سے پشت لگا کر مسجد کو سیدھا کر دیا اور اس کے بعد فوراً ہی انتقال کر گئے۔ بادشاہ نے اُس بزرگ کی قبر اسی مقام پر بنا دی۔ اتفاق سے چند قبریں آج بھی وہاں موجود ہیں۔ لہٰذا اس روایت میں اور بھی جان پڑ گئی۔

مسجد کو دیکھتے ہی پہلا اثر اس کی بلند کرسی کا ہوتا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے ایک پوری پہاڑی دبا دی گئی ہے۔ وہ چبوترہ جس پر مسجد کی عمارت بنائی گئی ہے تیس فٹ اونچا ہے اور چودہ سو مربع گز اس کا رقبہ ہے۔ مسجد کے جنوبی، مشرق اور شمالی سمت بڑی بڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں جن پر لمبی لمبی پتھر کی سلیں جڑی ہوئی ہیں۔ جہاں سیڑھیاں اوپر جا کر ختم ہوتی ہیں وہاں خاصی بڑی کشادہ جگہ ہے۔ اس جگہ پر سیڑھیاں تین طرف سے آکر ختم ہوتی ہیں۔ ہر دروازے کی سیڑھیوں کا یہی معاملہ ہے قبلہ کی جانب (مغربی سمت) کو چھوڑ کر باقی تین طرف خوشنما اور وسیع دروازے ہیں۔ جن کی شان اس سبب سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ وہ بلندی پر واقع ہیں اور ان تک پہنچنے کے لئے نہایت وسیع اور کشادہ سیڑھیاں ہیں۔ شاہی زمانہ میں لال قلعہ کے سامنے والا دروازہ جو مشرقی دروازہ کہلاتا ہے۔ بادشاہوں کے استعمال کے لئے کھولا جاتا تھا۔ اور شمال و جنوب کی سمت والے دروازے پبلک کے لئے تھے۔ مسجد کا صحن ۳۲۵ فٹ مربع ہے۔ اس کے عین وسط میں ایک بڑا حوض ہے اور تین اطراف میں مسقف دالان ہیں۔ اصل عمارت عرض میں دو سو فٹ اور گہرائی میں نوے فٹ ہے سامنے دیوار میں گیارہ محرابی در ہیں جن پر سفید اور سیاہ پتھر کا کام ہے۔ قبلے کی جانب دیوار میں نہایت خوشنما محرابیں بنائی گئی ہیں۔ پیش امام کے سامنے جہاں وہ کھڑے ہوتے تھے ایک سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ اس دودھیا پتھر میں یہ خوبی ہے کہ جب مشرق میں سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو یہ پتھر گلابی ہو جاتا ہے۔ سنا ہے کہ یہ پتھر اب وہاں سے اکھاڑ لیا گیا ہے۔ مسجد کی چھت پر تین بڑے گنبد ہیں جن پر سنگ موسیٰ اور سنگ سرخ کی پٹیاں ہیں۔ عمارت کے دونوں کناروں پر سنگ سرخ کے ایک سو تیس فٹ بلند مینار ہیں ان کے اندر چکر دار دروازے ہیں۔ جن سے اوپر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ خوبصورتی دیدہ زیبی غرض ہر نقطہ نظر سے یہ عمارت لاجواب کہی گئی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہوا تو جذبۂ انتقام کی آگ نے ان کو آپے سے باہر کر دیا تھا۔ ان کے بعض حکام چاہتے تھے کہ مسجد کو بارود سے اڑا دیا جائے۔ تاکہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائے۔ بعض کی خواہش تھی کہ اس کو گرجا میں منتقل کر دیا جائے۔ بہرحال آخر میں طے یہ پایا کہ اس کو مسلمانوں سے لے کر اپنے قبضے میں رکھا جائے۔ لیکن آخر کار ۱۸۶۲ء میں اس کو واگذاشت کر دیا گیا اور اس وقت سے مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں۔

جامع جمع کرنے والا۔ اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں سے ایک نام (دیکھئے۔ "اسماء الحسنیٰ")

جامعہ یونیورسٹی۔ اصطلاح میں اس کا اطلاق اعلیٰ مذہبی تعلیم کے قدیم اداروں مثلاً جامعۃ الازہر وغیرہ پر ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں سرکاری طور پر اس لفظ کا اطلاق جدید طرز کی ایسی یونیورسٹی تک محدود ہے جسے مغربی نمونے پر چلایا جا رہا ہو جامعہ کی اصطلاح پہلی بار انیسویں صدی کے وسط میں استعمال کی گئی۔ یونیورسٹی کے معنوں میں جامعہ کا لفظ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں استعمال ہوا جب جامعۃ المصریۃ کے قیام کے لئے مصر کے چند دانشوروں اور مصلحین نے ایک تحریک کی ابتدا کی۔ اسی زمانے سے اسلامی ملکوں میں جامعہ یونیورسٹی کا ہم معنی قرار پایا۔ بعض اسلامی ممالک میں جامعہ کے علاوہ چند اور اصطلاحات بھی استعمال کی جانے لگیں۔ اور یہ اصطلاحات یا تو قومی زبانوں سے ماخوذ تھیں یا پھر یورپ سے مستعار لی گئی تھیں۔ مثلاً ترکی میں (UNIVERSITE) برعظیم پاک و ہند میں "یونیورسٹی" ایران میں "دانش گاہ" اور انڈونیشیا میں "UNIVERSITAS"

موجودہ زمانے تک یونیورسٹی تعلیم نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ بہت سی یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں۔ ذیل میں ہم صرف چند بڑی اور مشہور یونیورسٹیوں کا ذکر کریں گے۔

برعظیم پاک و ہند میں سر چارلس ووڈ کی سفارشات پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور تقریباً پچیس سال تک پورے ہندوستان میں انہیں یونیورسٹیوں سے کام چلایا جاتا رہا۔

۱۸۸۲ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قائم کی گئی ۱۸۸۸ء میں الہ آباد میں ایک اور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سے پہلی جنگ عظیم تک کوئی اور یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن دو مختلف ادوار میں یعنی 1915ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان اور دوسرے تقسیم پاک و ہند کے بعد یونیورسٹی اداروں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان

پنجاب یونیورسٹی

Marfat.com

کی یونیورسٹیوں کی تعداد ۶۲ تھی اور ان میں سے ۸ یونیورسٹیاں وہ تھیں جو تقسیم ملک کے بعد قائم ہوئی تھیں۔

ہندوستان میں دو یونیورسٹیاں ایسی ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔ ان میں ایک تو علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ سر سید احمد خان ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جسے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ جس کا مقصد مسلمان نوجوانوں کو جدید سائنسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا۔

دوسری یونیورسٹی حیدر آباد دکن کی "جامعہ عثمانیہ" تھی جو ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی۔ اس یونیورسٹی میں اسلامی علوم کی طرف خاص توجہ دی تھی۔

پاکستان میں سب سے قدیم یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی ہے۔ جو ۱۸۸۲ء میں لاہور میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ حیدر آباد میں سندھ یونیورسٹی ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئی۔ پشاور یونیورسٹی ۱۹۵۰ء اور کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئیں۔ لاہور میں ایک انجینیئرنگ یونیورسٹی اور لائلپور میں زرعی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ حال ہی میں چند اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ جن میں ملتان یونیورسٹی۔ سکھر یونیورسٹی۔ اسلام آباد میں قائد اعظم یونیورسٹی، گومل یونیورسٹی، ہزارہ یونیورسٹی، کوئٹہ یونیورسٹی شامل ہیں۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو بھی اب باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ان تمام یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم کے شعبے موجود ہیں۔

ایران کی یونیورسٹیوں میں قدیم ترین یونیورسٹی تہران یونیورسٹی (دانشگاہ تہران) بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کی ابتدا ۱۸۵۱ء میں دارالفنون کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں ایک سرکاری یونیورسٹی بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء میں دانشگاہ تبریز کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد ازاں دانشگاہ مشہد، دانشگاہ شیراز، دانشگاہ اصفہان، دانشگاہ اہواز، دانشگاہ رضائیہ۔ ایران کی تمام یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم فارسی ہے۔

جامعہ استنبول

افغانستان میں یونیورسٹی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ایک شعبہ طب کے اجراء سے ہوا۔ بعد میں دوسرے شعبے بھی قائم ہو گئے۔ اور ان تمام شعبوں کا الحاق ۱۹۴۶ء میں کابل یونیورسٹی سے کر دیا گیا۔ کابل یونیورسٹی ۱۹۳۳ء میں قائم کی گئی تھی۔

ملایا اور سنگاپور۔ ملایا میں یونیورسٹی کا قیام ۱۹۴۹ء میں وفاق ملایا اور نوآبادی سنگاپور کی حکومتوں کے مشترکہ احکام سے عمل میں آیا۔ کوالالمپور میں یونیورسٹی کی مکمل تعلیم کا آغاز ۱۹۵۰ء سے اور سنگاپور میں ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں یہ یونیورسٹی دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے جو درجے کے اعتبار سے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ملایا یونیورسٹی سنگاپور میں اور دوسری ملایا یونیورسٹی کوالالمپور میں دو مساوی حصوں پر مشتمل ہے۔

انڈونیشیا میں یونیورسٹیوں کے قیام کی تحریک ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی ۱۹۴۹ء میں جوگ جکارتا میں گاجا مادہ یونیورسٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں جکارتا میں انڈونیشیا یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ ایرلنگا یونیورسٹی ۱۹۵۴ء میں، اندلاس یونیورسٹی ۱۹۵۶ء میں۔ ہوک ننگ اور حسن دین یونیورسٹی ۱۹۵۶ء میں قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ مکاسر، بندونگ، گاجہ میڈا، سوہابایا، حالانگ بالی، پاجاکمبوہ، پادانگ اور تونداتو میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔

مصر میں ۱۹۰۶ء میں ایک قومی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک اٹھائی گئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کو سرکاری یونیورسٹی سے ممتاز کرنے کے لئے الجامعۃ الاہلیہ کہا جاتا ہے۔ ایک سرکاری یونیورسٹی مارچ ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں اسکندریہ میں ایک مکمل یونیورسٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں قاہرہ میں ایک اور یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ انقلاب کے بعد ان تینوں یونیورسٹیوں کو جامعۃ القاہرہ، جامعۃ الاسکندریہ اور جامعۃ عین شمس کے نام دیئے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں ایک یونیورسٹی اسیوط میں قائم کی گئی لیکن مصر کی تمام یونیورسٹیوں میں قاہرہ یونیورسٹی سب سے قدیم ہے

شام میں الجمہوریۃ العربیہ المتحدہ کی تشکیل کے موقع پر جامعۃ الشام کا نام جامعۃ الدمشق رکھ دیا گیا۔ اس کے علاوہ حلب میں ۱۹۶۰ء میں ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

لبنان میں سب سے پہلے بیروت میں امریکن یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں اس کا نام شامی پروٹسٹنٹ کالج تھا۔ ۸ نومبر ۱۹۲۰ء میں اسے امریکن یونیورسٹی آف بیروت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک یونیورسٹی سینٹ جوزف ہے جو ۱۸۷۵ء میں قائم کی گئی تھی۔ ۱۸۸۱ء میں پوپ لیو سیزدہم نے اسے یونیورسٹی کا نام دیا۔ ۱۹۵۱ء میں الجامعۃ اللبنانیہ کا قیام عمل میں آیا۔

عراق میں پہلی جنگ عظیم سے قبل اعلیٰ تعلیم کا صرف ایک ادارہ تھا۔ ۱۹۲۳ء میں حکومت نے جامعۃ آل بیت کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بعد میں یہ منصوبہ ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ کئی ایک کالج قائم کئے گئے۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ بغداد کا قیام عمل میں آیا۔

سعودی عرب میں ۱۹۵۷ء میں ریاض میں جامعہ شاہ سعود قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک یونیورسٹی مدینہ میں قائم ہے۔

سوڈان میں ۱۹۵۶ء میں جامعہ خرطوم کا قیام عمل میں آیا۔ آج کل خرطوم یونیورسٹی میں زراعت، فنون، معاشی و عمرانی علوم، انجینیئری، قانون، طب، سائنس اور علاج حیوانات کے شعبے قائم ہیں۔

لیبیا میں جامعہ لیبیا کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں رکھی گئی۔ اس یونیورسٹی کی ابتدا بن غازی میں

Marfat.com

ادب اور تعلیمات کے لئے ایک شعبے سے ہوئی تھی۔ آج تک اس میں کئی اور شعبوں کا اجراء ہو چکا ہے۔

تونس میں الجامعۃ الاعظم ایک اعلیٰ مذہبی تعلیم کا قدیم مرکز ہے۔ آج کل اسے الجامعۃ الزیتونیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ایک اور تونس یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔

الجزائر میں جامعۃ الجزائر کی حیثیت ۱۹۶۲ء تک ایک فرانسیسی یونیورسٹی کی تھی ۱۸۰۹ء میں مدارس قانون، سائنس اور ادب کو ترقی دے کر باقاعدہ یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی تھی۔ ذریعۂ تعلیم فرانسیسی تھا۔

مراکش میں حصولِ آزادی کے بعد ایک قومی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک اٹھی اور ۱۹۵۷ء میں جامعۃ الرباط کا قیام عمل میں آیا۔ جو شعبہ ہائے شریعت، قانون، معاشی و عمرانی علوم، ادب اور طبیعات پر مشتمل ہے۔ طب اور دوا سازی کا بھی ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔

ترکی میں جدید طرز کی فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوا۔ اس سلسلے میں کئی ایک مدارس قائم کئے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں ایک مجلس نے سرکاری یونیورسٹی کے قیام کی سفارش کی۔ اگرچہ اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ آخر کار ۱۹۰۰ء میں جامعہ استنبول قائم ہوئی۔ پہلے اس کا نام دارالفنون تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مدرسہ طب اور مدرسہ قانون کا اس سے الحاق کر دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ایک استنبول ٹکنیکل یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ۱۹۴۶ء میں انقرہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں ایجین یونیورسٹی ازمیر میں قائم کی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں مشرقی ترکیہ میں اتاترک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

پچھلے چند برسوں میں یونیورسٹی تعلیم نے اسلامی ممالک میں نہایت تیزی کیساتھ ترقی کی ہے۔ قائم شدہ یونیورسٹیوں میں مختلف شعبوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور نئی نئی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔

جامعہ ازہر: قاہرہ کی عظیم اسلامی درسگاہ۔ (دیکھئے "ازہر، جامعہ")

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مسلمانوں کی ایک عظیم درسگاہ۔ جس کی بنیاد مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۲۰ء میں رکھی تھی۔ جس زمانے میں اس درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی ان دنوں انگریز حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ جس کے تحت ہر اس چیز، ہر اس ادارے اور ہر اس شخص سے تعلقات توڑ دیئے گئے۔ جس کا تعلق انگریزوں سے تھا۔ انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انگریزوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے سماجی و معاشرتی تعلقات منقطع کر لئے گئے، حتیٰ کہ ایسے لوگوں کو مرنے پر قبرستانوں میں دفن کرنے سے منع کر دیا گیا، تعلیمی اداروں کے لئے حکومت کی گرانٹ (امداد) لینے سے انکار کر دیا گیا۔ بہت سے طالب علموں نے ایسے تعلیمی اداروں سے اپنے نام خارج کروا لئے۔ جنہیں حکومت چلاتی تھی یا جو حکومت کی امداد سے چلتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت کے قائد اعلیٰ تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ علیگڑھ کالج بھی تحریکِ خلافت کے پروگرام پر عمل کرے۔

چنانچہ مولانا محمد علی جوہر علی گڑھ گئے اور بہت سے طلباء کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ کالج کے منتظمین کا خیال تھا کہ جب تک کالج کے طلباء سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں حکومت سے عدم تعاون حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگرچہ مولانا کالج کو انگریزی اثر سے آزاد کرانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علیحدہ بنیاد ڈال دی۔ جو ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ یہاں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری نے انہیں بہت مدد دی اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کے حسن تدبر اور انتظامی قابلیت سے جامعہ نے بہت زیادہ ترقی کی۔ آج بھی یہ ادارہ اپنی مخصوص عمارت میں اوکھلا (قرول باغ) کے مقام پر بدستور قائم ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ادب و اشاعت علم کا ایک مرکز ہے۔ یہاں فنون اور عمرانی علوم کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا امتحان حکومت کی نظر میں کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی بی اے کی سند سے کم تصور نہیں کیا جاتا۔

جامی، مولانا (۲۳ شعبان ۸۱۷ھ / ۷ نومبر ۱۴۱۴ء - ۱۸ محرم ۸۹۸ھ / ۹ نومبر ۱۴۹۲ء) نور الدین عبدالرحمان۔ ایک بہت بڑے عالم دین، صوفی اور بلند پایہ فارسی شاعر۔ خراسان کے ضلع جام کے قصبہ خرجرد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نظام الدین احمد دشتی تھا۔ ان کا خاندان پہلے دشت میں سکونت پذیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود مولانا جامی بھی پہلے دشتی تخلص کرتے تھے۔ بعد میں ان کے والد نے دشت کو چھوڑ کر علاقہ جام میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ہرات اور سمرقند گئے جو اسلامی علوم کے بہت بڑے مراکز تھے۔ جہاں پر آپ نے علوم اسلامی اور تاریخ و ادب کی تعلیم حاصل کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ ظاہری علوم حاصل کرنے کے بعد باطنی علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور سعد الدین محمد کاشغری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور بیعت کی۔ یہ بزرگ سلسلہ نقشبند کے بانی حضرت بہاء الدین نقشبندی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ان کی بدولت تصوف میں کمال حاصل کیا۔ مرشد کی وفات کے بعد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء میں حج بیت اللہ سے مشرف یاب ہوئے اور واپسی میں ہمدان کردستان، بغداد، کربلا، نجف شریف، دمشق، حلب اور تبریز کے علاقوں کا سفر کرتے ہوئے واپس وطن لوٹے۔ بقیہ زندگی ہرات ہی میں بسر کی جہاں آپ کا سارا وقت مطالعے، شعر و شاعری اور روحانی مجاہدات میں صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ بہت بلند مرتبہ شاعر تھے۔ لیکن تمام زندگی کسی دربار کا رُخ نہیں کیا اور نہ ہی کسی بادشاہ کی خوشامد کی۔ آپ کے زمانے کے بادشاہ آپ کی بہت عزت کرتے تھے بقول شہنشاہ ظہیر الدین بابر "علوم عقلی و نقلی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔" نیز یہ کہ جامی کو کسی مدح و ستائش کی ضرورت نہیں یہاں ان کا ذکر محض برکت و سعادت حاصل کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔"

نویں صدی ہجری میں جب آپ کی شہرت ترکی میں پہنچی تو محمد ثانی نے آپ کو استنبول آنے کی رغبت دلائی۔ بایزید ثانی نے بھی انہیں دو مکتوب ارسال کئے۔

بقول دولت شاہ جامی آخر عمر میں ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ لیکن علی شیرازی نے اس بات کی تردید کی ہے جو آخر عمر تک آپ کے پاس تھا۔ آپ نے ہرات میں وفات پائی اور حاکم ہرات نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کا مقبرہ ہرات میں آپ کے مرشد سعد الدین کے مقبرے کے قرب میں واقع ہے۔

مولانا جامی کی متعدد تصانیف ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کتنے مختلف علوم پر حاوی تھے۔ آپ کو زبان و اسلوب پر پوری دسترس حاصل تھی آپ کی زیادہ تصانیف نثر میں ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ کو شہرت شعری تخلیقات کی بناء پر ہوئی۔ نظم میں آپ کی تخلیقات ایک تو وہ سات مثنویاں ہیں جو

Marfat.com

مثنوی ہفت اورنگ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کے علاوہ غزل میں آپ کے تین مجموعے ہیں اس دیوان میں جوانی سے لے کر آخر عمر تک کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ تینوں مجموعے ان ناموں سے مشہور ہیں۔ ۱۔ فاتحۃ الشباب (م ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء) ۲۔ واسطۃ العقد (م ۸۹۴ھ/۸۹ ۱۴ء)۔ ۳۔ خاتمۃ الحیات (۸۹۵ھ/۱۴۹۰ء) اور مثنویاں ہیں جو ہفت اورنگ کے نام سے مشہور ہے یہ شامل ہیں۔ ۱۔ مثنوی سلسلۃ الذھب (۸۷۳ھ/۱۴۶۸ء) ۲۔ مثنوی سلامان وابسال (۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء) ۳۔ مثنوی تحفۃ الاحرار (۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء) ۴۔ مثنوی سبحۃ الابرار (۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء) ۵۔ مثنوی یوسف وزلیخا (۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء) ۶۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں (۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء) ۷۔ مثنوی خزنامہ سکندری (۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء) نثر میں آپ کی تصانیف ۱۔ تفسیر ۲۔ شرح فصوص الحکم ۳۔ رسالہ فی الوجود۔ ۴۔ رسالہ لاالٰہ الا اللہ۔ ۵۔ شواہد النبوۃ۔ ۶۔ اشعۃ اللمعات۔ ۷۔ شرح رباعیات۔ ۸۔ رسالہ تحقیق مذہب صوفی و متکلم و حکیم ۹۔ رسالہ مناسک حج۔ ۱۰۔ مناقب۔ ۱۱۔ نفحات الانس، خواجہ عبداللہ انصاری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

جانبلاط امراء کا ایک خاندان جو نسل کے اعتبار سے کُرد تھے اور ان کا مذہب دروزی تھا۔ یہ خاندان لبنان میں آکر آباد ہو گیا تھا لبنان میں ان لوگوں نے ایک جانبلاطی جماعت قائم کی۔ یہ لوگ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں علاقہ کلیس میں نمودار ہوئے۔ اس خاندان کے جو افراد خاص طور پر مشہور ہوئے وہ یہ ہیں۔

جانبلاط بن قاسم الکردی:۔ (م ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) ابن عربی کے نام سے مشہور تھا۔ عثمانی ترکوں نے اسے اپنی طرف سے کلیس کی سنجاق کا حاکم مقرر کیا اس نے وہاں پر قزاقی کا سدباب کیا اور قبرص جزیرے کی فتح میں حصہ لیا۔ اس کے بیٹے حسین (م ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء) نے حلب سے وہاں کے والی نصوح پاشا کو نکال باہر کیا۔ چونکہ حسین نے ایران کے خلاف مہم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس لئے اسے وان کے مقام پر پھانسی دے دی گئی۔ اس کا بیٹا علی عثمانی مورخین کا جانبلاط اوغلو تھا۔

علی بن حسین:۔ (م ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء) حسین کے بعد اس کا بیٹا علی کلیس کا حاکم بنا جس نے حلب میں بغاوت برپا کر دی۔ اور شام میں اپنی حکومت کی توسیع کا کام کیا۔ اس نے حماسے اونہ تک ایک آزاد امارت قائم کر لی اور سلطان کو خراج دینا بند کر دیا اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کر دیا۔ اس نے تیس ہزار سے زائد فوج بھرتی کی۔ لیکن ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء میں اروج کے مقام پر سلطان کی فوجوں نے اس پر غلبہ پالیا تو اس کے چچا کی سفارش پر سلطان نے اسے معاف کر دیا۔ اور تمسور کی فوجی قیادت اس کے سپرد کی۔ تو وہ ینی چریوں کے ساتھ لڑائی میں شریک ہو گیا اور بعد میں بغداد بھاگ گیا اور آخر کار ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن کلیس پر حکمرانی جانبلاط ہی کی رہی۔ علی بن حسین کے بعد جانبلاط خود بھی سلطان کے وفادار رہے۔ علی کا ایک بھتیجا مصطفےٰ اولایت روم ایلی کا "بے" مقرر کیا گیا۔

جانبلاط بن سعید:۔ (م ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء) یہ غالباً علی کا پوتا تھا اپنے دو بیٹوں سعید اور رباح کے ساتھ ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء میں لبنان میں آکر شوف میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء کو یہ امیر فخرالدین کی مہمات میں شریک ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رباح اس کا جانشین بنا۔ اس کے پوتے علی نے دروزیوں کے طاقتور رئیس قبلان القاضی التنوخی کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد اس کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس نے امیر حیدر شہاب کو یمنی جماعت کے خلاف جنگ عین دارہ میں کافی مدد بہم پہنچائی تھی بعد میں اس کے داماد علی نے مختارہ کا قلعہ تعمیر کرایا اور آخر کار مقامی طور پر وہاں اپنے خاندان کی حکومت قائم کر لی۔ اس نے جانبلاطی جماعت سے مل کر امیر لبنان کی حکومت کے خلاف ایک تحریک کو ترقی دی۔ اس نے خاندان شہاب کے تنازعات میں بھی مداخلت کی۔ ۱۱۷۳ھ/۱۷۶۰ء میں اس نے امیر منصور کو اس کے شریک نائب السلطنت احمد کے مقابلے میں حکومت دلانے کا یقین دلایا۔ لیکن اس سے فریب کھانے کے بعد امیر یوسف کو حکومت دلائی۔ بعد میں امیر یوسف کے بھی خلاف ہو گیا۔ اس نے ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

جانبلاط بشیر:۔ جو غالباً علی کا پوتا تھا۔ عکا کی مسجد کے نمونے کی مختارہ میں مسجد تعمیر کرائی۔ اس نے امیر بشیر ثانی شہاب کی تخت نشینی میں ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں مدد دی اور ایک عرصے تک اس کا مددگار رہا۔ جب امیر بشیر مصر گیا تو اس نے امیر کی غیر حاضری میں اس کے نائب عباس کو امیر کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ امیر بشیر نے واپسی پر مختارہ کے مقام پر اسے شکست دی۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ ۱۸۴۱ء میں خاندان شہاب کے سقوط کے بعد عثمانی ترکوں نے شوف کی حکومت کے لئے جانبلاط خاندان کی جگہ خاندان ارسلان کو ترجیح دی۔ سعید جانبلاط نے جس کو اس طرح سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۶۰ء کے خونچکاں واقعات میں سرگرمی سے حصہ لیا اسے موت کی سزا سنائی گئی۔ بالآخر اس نے ۱۸۶۱ء میں قید خانے میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نسیب نے ارسلان کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی اور انیسویں صدی میں ارسلان کو شوف کی حکومت سے نکال دیا۔

جانکنی عالم نزاع۔ جب انسان پر عالم نزاع کا وقت ہوتا ہے تو اس پر موت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً ناک کا ٹیڑھا ہو جانا، پاؤں کا سُت جانا کہ پھیل نہ سکیں یا اسی قسم کی اور چیزیں جو جانکنی کے وقت ظاہر ہوتی ہیں تو جو افراد اس وقت ایسے شخص کے پاس موجود ہوں ان کے لئے مستحب ہے کہ اس کا منہ قبلے کی طرف پھیر دیں اور سیدھی کروٹ لٹانا سنت ہے۔ جیسے زندگی میں سونا سنت ہے۔ اگر چت لٹانا مقصود ہو تو اس کے پاؤں قبلے کی طرف کر دیں اور سر کے نیچے ایک پاک تکیہ رکھ کر ذرا اوپر اٹھا دیں تاکہ اس کا منہ قبلے کی طرف ہو جائے۔ اس طرح لٹانا بھی جائز ہے اور اگر مرنے والے کو کچھ زیادہ تکلیف ہو تو اس کو اسی وضع پر چھوڑ دیں جس وضع پر وہ پڑا ہو۔ اس کے اقربا پر اور اگر اقربا موجود نہ ہوں تو جو کوئی مسلمان وہاں پر موجود ہو شہادتین کی تلقین کرنا غرغرہ کے وقت سے قبل یعنی اس سے پہلے کہ دم اس کے گلے میں آکر اٹکے واجب ہے کیونکہ یہ حالت سننے اور سمجھنے کی نہیں رہتی۔ بعض علماء کے نزدیک تلقین کرنا مستحب ہے اور اس سے مراد اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ہے اور بعض کے نزدیک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہے۔

لیکن تلقین اس طور سے کی جائے کہ حاضر خود پڑھ پڑھ کر سنائیں اور مرنے والا شخص سنے اور سمجھے۔ مرنے والے کو نہ کہیں کہ تو بھی کہہ اس لئے کہ یہ وقت اس پر کمال تکلیف کا ہوتا ہے۔ مبادا ان کا کہنا اس کو برا معلوم ہو یا وہ بسبب تکلیف کی زیادتی انکار کر دے جو اس کے حق میں بہتر نہیں۔ حاضرین اس وقت تک تلقین کرتے

Marfat.com

رہیں کہ مرنے والا ایک بار شہادتین صراحتاً یا اشارۃً کہہ ڈالے پھر اس کو تلقین کرنا موقوف کر دیں۔ اگر اس کے بعد کوئی دنیاوی بات اس کے منہ سے نکلے تو پھر اسی طور پر تلقین کریں یہاں تک کہ اس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو جائے۔ اگر کسی مسلمان سے کفر کا کلمہ جانکنی کی حالت میں منہ سے نکل جائے تو اس کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت مانگنی چاہیئے۔ اور اس کی تجہیز و تکفین بھی مسلمانوں ہی کی طرح کریں کیونکہ اس وقت کفر و اسلام کا اعتبار نہیں۔ مرنے والے کے پاس سورۃ یاسین اور سورۃ رعد پڑھنا مستحب ہے۔

جان محمد، مولانا

(وفات ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء) ایک عالم دین والد کا نام غوث محمد تھا۔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ سکھ دور حکومت میں تعلیم حاصل کی۔ اور علم دین میں خاص دسترس حاصل کی۔ آپ سے ہزاروں طلبہ نے علم دین کی تکمیل کی۔

مولانا جان محمد ایک قابل مدرس، خوش بیان واعظ اور مشہور فقیہہ تھے۔ بقول مولوی فقیر محمد جہلمی صاحب "حدائق الحنفیہ" آپ علوم مروجہ کی ہر شاخ پر بڑی دسترس رکھتے تھے درس میں تشنگانِ علوم دینیہ کے جمگھٹے رہتے۔ پنجاب کے دور افتادہ اضلاع سے لوگ آتے اور علم و فضل سے دامن بھر کر لے جاتے جو آپ کا وعظ سنتا گناہ سے تائب ہو جاتا۔ آپ کے شاگرد علم و عمل کے پیکر بنکر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ پنجاب کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہو جہاں آپ کا شاگرد علم دین کا نور نہ بکھیر تا رہا ہو۔

آپ کی تصانیف میں "زبدۃ التفاسیر"، "شرح قصیدہ بردہ"، "شرح قصیدہ امالی"، "رسالہ اثبات خلافت امیر معاویہؓ" وغیرہ مشہور ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی محمد عالم کھوڑی، مولوی کرامت اللہ، مولانا غلام محمد اور مولانا فخر الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جانیکلی، علی پاشا

(۱۱۳۳ھ/۲۱-۱۷۲۰-۱۱۹۹ھ/جولائی ۱۷۸۵ء) ایک صاحب سیف اور خاندان درہ بے کا بانی۔ والد کا نام احمد آغا تھا جو قصر شاہی کا قپوچی باشی تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ عہد جوانی میں اپنے بھائی سلیمان پاشا کے ہمراہ جانیک گیا۔ بعد میں اپنے بھائی کی جگہ وہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ اور محصل کے خطاب سے نوازا گیا۔ روس اور ترکی کی جنگ کے دوران میں اسے متعدد بار لشکر کی قیادت سونپی گئی۔ پہلے اس نے جارجیا میں خدمات سرانجام دیں بعد میں مولدویا میں اس کا تقرر کیا گیا جہاں اس نے روسیوں کے خلاف لڑائی میں خوب شہرت حاصل کی اور اسے انعام کے طور پر وزارت کا منصب سونپا گیا۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں اس نے کریمیا کی مہم کی قیادت کی۔ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں قارص کا سپہ سالار بنایا گیا۔ اسی دوران میں اس نے جانیک میں اپنی حکومت کو خوب مضبوط کر لیا۔ اور مشرق کی جانب اپنی سلطنت میں توسیع بھی کی۔ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں اسے طربزون کا والی تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے چند سالوں بعد ہی اس نے سیواس اور ارزروم کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔

اسے ایک بار پھر ۱۱۹۱ھ/جنوری ۱۷۷۸ء میں کریمیا کا سرعسکر اور ایک مہم کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اسے اپنے اناطولوی حریف چپان اوغلی کے مقابلے پر آنا پڑا۔ جس نے استنبول میں اس کے دشمنوں کے اکسانے پر اس پر فوج کشی کر دی تھی۔ ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء میں علی پاشا کریمیا کی طرف فرار ہو گیا۔ اور وہاں کے خان شاہین گرائی سے پناہ کا طالب ہوا۔ جس کے توسط سے اسے معافی مل گئی۔ اور دوبارہ بحال کر دیا گیا اسے وزیر کا منصب اور سابقہ مقبوضات بھی دوبارہ مل گئے۔ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں علی پاشا نے حکومت کو ایک یادداشت پیش کی۔ جس میں روس میں ترکوں کی شکست کے اسباب بیان کئے گئے تھے۔ اور ان اصلاحات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جنہیں اس وقت سلطنت میں نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

جاوا

انڈونیشیا کا معاشی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے ایک اہم مرکزی جزیرہ دنیا کا گنجان آباد جزیرہ جس کے مغرب اور شمال مغرب میں سماٹرا ہے شمال میں بحیرہ جاوا اسے کالیمنتان سے جدا کرتا ہے۔ مشرق میں جزائر سونڈا صغیر ہیں۔ اور جنوب میں بحر ہند واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۸۵۰۴ مربع میل ہے۔

جاوا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس نے اس جزیرے کو اپنی زبان میں جاباد یو لکھا تھا اور جاوا اسی سے ماخوذ ہے قدیم ہندوؤں نے سنسکرت میں اس کا نام "یا وادویپا" (سونے کا جزیرہ) لکھا ہے۔ چنانچہ جاوا "یادہ" سے نکلا ہے۔ سب سے قدیم ماخذ جس میں جاوا کا لفظ پہلی بار ملتا ہے وہ یاقوت کی معجم البلدان ہے۔

جاوا انسانی آبادی کے قدیم ترین اماکن میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ کا آغاز ہندوؤں کی آمد سے ہوتا ہے جو تجارت کے لئے اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں ان ہندو تاجروں نے یہاں پر اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں جو بعد میں باقاعدہ ریاستوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ چنانچہ جاوا میں ہندوؤں اور بدھوں کی بعض بڑی بڑی سلطنتیں بھی قائم ہوئیں۔

ایک روایت کے مطابق یہاں کی پہلی ہندو ریاست ترو ما تھی۔ جس کا پہلا ہندو راجہ آجی ساکا تھا۔ آٹھویں یا نویں صدی میں جاوا کے نصف جزیرے پر سماٹرا کی بدھ سلطنت سری وجایا کا قبضہ ہو گیا۔ جس کا خاتمہ خاندان سلیندرا کے ہاتھوں ہوا۔ اس خاندان کے بعد یہاں خاندان ماترم کی حکومت رہی جس کے بعد سلطنت کیدری قائم ہوئی۔ ۱۲۹۴ء میں جاوا کی ممتاز ترین ہندو سلطنت مجاپاہت کا آغاز ہوا جس کا ۱۴۷۸ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔

جاوا میں اسلام کی اشاعت کا کام چودھویں صدی کے اواخر اور پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ملاکا کے مسلمان تاجروں کے ذریعے ہوا۔ احمد آباد کے ایک تاجر اور صوفی بزرگ ملک ابراہیم (مولانا مغربی) جاوا میں پہلے مبلغ اسلام تھے۔ انہیں طب میں بھی حددرجہ کمال حاصل تھا۔ انہوں نے گریسک کے راجہ کا علاج کیا جو صحت یاب ہونے کے بعد مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام رادن رحمت رکھا گیا۔ اس طرح جاوا میں پہلی مسلمان حکومت قائم ہوئی۔ رادن رحمت کا شمار بھی مولانا مغربی کی طرح جاوا کے ان ولیوں میں ہوتا ہے جن کی کوششوں سے یہاں پر اشاعت اسلام ہوئی مبلغینِ اسلام عام طور پر اپنے معتقد مسلمان تاجروں کے ہمراہ یہاں آتے تھے اور علاقائی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد تبلیغ اسلام کا آغاز کر دیتے۔ یہ مبلغین نہایت اونچے اخلاق کے حامل تھے۔ انہوں نے بے انتہا ہمدرد، بے لوث، اچھے اور اچھے کردار کا جو نمونہ پیش کیا اس سے لوگ خود بخود ان کے پیغام کی طرف کھنچنے لگے اور بڑی کثیر تعداد میں اسلام قبول کرتے چلے گئے۔ اور اسلامی سلطنتیں قائم ہونے لگیں۔

دیماک کی سلطنت:۔ اگرچہ جاوا میں پہلی اسلامی سلطنت گریسک میں قائم ہوئی تھی۔ لیکن صحیح معنوں میں پہلی اسلامی سلطنت دیماک میں قائم ہوئی جو مجاپاہت کی آخری ہندو ریاست تھی۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی اشاعت سے برافروختہ ہو کر ہندو

Marfat.com

راجاؤں نے مسلمانوں پر سختی کرنی شروع کی تو مسلمان سوداگروں نے نومسلموں کی مدد سے ایک فوج تیار کی اور اس کا سپہ سالار ایک مقامی جرنیل رادن پاتح (فاتح) کو مقرر کیا۔ جس نے ہندو فوج کو شکست دی۔ بعد میں اس کو وہاں کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۵۲۰ء میں رادن پاتح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رادن یونس تخت نشین ہوا جس نے اپنے عہد حکومت میں نہ صرف جاپارا سے گریسک تک کا علاقہ بلکہ مادورا سے پالمبانگ کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس نے پرتگیزوں کو مشرق سے نکالنے کے لئے ان پر چڑھائی کی لیکن ناکام رہا اور جاپارا بھی اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ۱۵۲۳ء میں یونس کے انتقال کے بعد اس کا چچا رادن ترنگانو جو ایک بلند حوصلہ حکمران تھا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے سوپٹ یوربنگ اور اس کے نواحی علاقے اپنی مملکت میں شامل کئے۔ اس کے چھوٹے بیٹے تیمور نے ماترم فتح کیا۔ ۱۵۴۶ء میں ترنگانو نے پسوروان کی ہندو سلطنت پر حملہ کیا لیکن اسے دشمنوں نے ایک غلام کے ذریعے قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا مومن تخت پر بیٹھا وہ بڑا عالم دین تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اس کے دور حکومت میں اسلامی علوم اور اسلامی طرز زندگی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس مرد درویش کو اس کے بھتیجے آریہ پنان سانگ نے قتل کر دیا اور اس کے نوعمر بیٹے آریہ پنگیری کو برطرف کر کے حکومت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

بانتم کی سلطنت :۔ ۱۵۲۲ء میں مشہور عالم اور صوفی پاتح صلاۃ (فتح اللہ) نے جاوا کے مغربی حصے میں ایک ریاست قائم کی۔ بانتم اس کا صدر مقام تھا۔ ۱۵۵۲ء میں سلطنت اپنے بیٹے مولانا حسن الدین کے حوالے کرنے کے بعد پاتح صلاۃ تبلیغ اسلام کی خاطر چری بون چلے گئے۔ جہاں اٹھارہ سال تبلیغ کرنے کے بعد ۱۵۷۰ء میں وفات پائی۔

سلطان حسن الدین جس نے ۱۵۵۲ء تا ۱۵۷۰ء تک حکمرانی کی۔ ایک دیندار عالم اور عادل حکمران تھا۔ اس نے لمپونگ کا علاقہ اپنی مملکت میں شامل کیا۔ اس کے دور حکومت میں تجارت کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ اس نے کثرت سے مساجد، مدرسے اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ اس سلطان کی دینداری کی طرف رغبت کے باعث مکہ مکرمہ اور دوسرے بلاد اسلامیہ کی طرف بہت سے علماء اور صوفیا بانتم پہنچے۔ ۱۵۷۰ء میں سلطان حسن الدین بھی حکومت اپنے بیٹے یوسف کے سپرد کر کے تبلیغ اسلام میں مشغول ہو گیا۔ جو ۱۵۸۰ء تک حکمران رہا۔ اس سلطان نے بھی اپنے باپ دادا کی اسلامی روایات پر عمل کرتے ہوئے سلطنت کا نظم و نسق بڑی عمدگی کے ساتھ چلایا اور علم و حکمت و تجارت و حرفت کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بھائی شہزادہ جاپارا فوج لے کر چڑھ آیا اور حکومت کا دعوے دار بنا۔ لیکن امراء نے اس کو حکمران تسلیم نہ کیا اور سلطان یوسف کے ایک کمسن لڑکے مولانا محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ سلطان محمد کے دور حکومت میں بانتم کا بحری بیڑا بہت مضبوط تھا۔ جس کی مدد سے ۱۵۹۵ء میں سلطان نے ولندیزیوں کو شکست دے کر جاوا سے نکال باہر کیا تھا۔ ۱۶۰۵ء میں سلطان نے سماٹرا پر چڑھائی کی تاکہ ملایا میں اہل یورپ کو ان کے اڈوں سے بآسانی باہر نکالا جا سکے پالمبانگ کے مقام پر بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ لیکن عین فتح کے موقع پر دشمن نے دھوکے سے سلطان کو قتل کرا دیا۔ اس طرح سلطان کی فوج کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ سلطان محمد کے بعد یہ ریاست خانہ جنگی کا شکار ہو گئی۔ ۱۶۱۹ء میں ولندیزی دوبارہ آ پہنچے۔ اور انہوں نے بٹاویا میں اپنا تجارتی مرکز اور قلعہ تعمیر کر کے بانتم پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔

۳۔ پاجانگ کی سلطنت :۔ ترنگانو کے پوتے آریہ پنگیری کو اس کا پھوپھا آدی دیالیو جو پاجانگ کا گورنر تھا اپنے ساتھ پاجانگ لے گیا تھا۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دی۔ اور پاجانگ کو اس کا مرکز حکومت قرار دیا۔ اس طرح ترنگانو کی سلطنت کا مرکز دیماک سے منتقل ہو کر پاجانگ ہو گیا۔ چونکہ دیماک دارالحکومت سے کافی فاصلے پر تھا یہ بات دیکھتے ہوئے ترنگانو کا ایک داماد لنگر وہاں کا حاکم بن بیٹھا۔ لیکن وہاں کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور سلطان پاجانگ سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان نے اس مہم پر آدی دیالیو کے ایک متبنیٰ سوتا دیالیو کو روانہ کیا۔ سوتا دیالیو اس مہم میں کامیاب رہا۔ اور اسے سنوپاتی (جرنیل) کا اعزاز دیا گیا۔ سلطان کا جانشین پنگیران (شہزادہ) بونو بنا۔ لیکن وہ اتنا ہردلعزیز نہ تھا۔ سنوپاتی کو عوام اور فوج کی حمایت حاصل تھی۔ جب اسے ایک خاندانی نزاع کی بنا پر جلا وطن کر دیا گیا تو ملک میں بغاوت ہو گئی۔ اس بغاوت میں آدی دیالیو مارا گیا۔ نیز شہزادہ بونو نے ۱۵۷۸ء میں تخت سنوپاتی کے حوالے کر دیا۔

ماترم کی سلطنت :۔ سنوپاتی نے اپنا صدر مقام پاجانگ سے ماترم منتقل کر کے جاوا کی سب سے مشہور اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کا دور حکومت ۱۵۷۸ء تا ۱۶۱۳ء ہے۔ اس نے تمام مشرقی اضلاع فتح کئے۔ کیدیری، پسوروان، مادورا اور چری بون پر اس کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا مسبرلانگ تخت پر بیٹھا جس کو اس کے بڑے بھائی مسرنگ سنگ نے معزول کر کے خود سلطان اگنگ کا۔

جاوا میں اسلامی فن تعمیر کا کمال

Marfat.com

لقب اختیار کیا۔

سلطان اگنگ کا دورِ حکومت ۱۶۱۳ء تا ۱۶۴۵ء تک ہے۔ وہ جاوا کا سب سے بڑا مسلمان فرمانروا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت اسلامی اقتدار کا عہدِ عروج تھا۔ اس کے تخت نشین ہونے پر تمام ہندو ریاستوں نے متحد ہو کر ہندو مجاپاہیت کا اقتدار بحال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سلطان اگنگ نے ان تمام ریاستوں کو زیر نگیں کر لیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں یورپ کے تاجروں کی آمد الجزائر شرق الہند میں شروع ہو چکی تھی۔ ۱۵۹۵ء میں سلطان بانتن کی اجازت سے انہوں نے جاپارا میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ لیکن بڑھتے بڑھتے انہوں نے ۱۶۱۹ء میں جکارتا پر قبضہ کر لیا۔ اور ایک نیا شہر بٹاویا کے نام سے بسایا۔ اب یہ لوگ ماترم کی سلطنت کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ جب سلطان اگنگ نے ان کا یہ رخ دیکھا تو ان پر حملہ کر کے شکست فاش دی۔ اور انہیں اس جزیرے سے نکال باہر کیا۔ تقریباً پچیس سال تک یہ جزیرہ ان کے وجود سے پاک رہا۔

سلطان اگنگ ایک نڈر جرنیل اور مدبر حکمران تھا۔ علماء کا سرپرست تھا اور خود بھی ایک بڑا عالمِ دین تھا۔ اس نے جگہ جگہ مدارس قائم کیے۔ طلبہ کو غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجنے کا بندوبست کیا۔ ملک میں اسلامی قوانین نافذ کیے وہ چاہتا تھا کہ سارے انڈونیشیا کو متحد کر کے ایک ملک اور ایک قوم کی شکل دی جائے۔ جس کی بنیاد اسلام پر ہو۔ اس نے فلسفہ و حکمت پر ایک ضخیم کتاب "سستر و گندنگ" بھی تصنیف کی۔

سلطان اگنگ کے بعد اس کا بیٹا ہمنگ کورت اول تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۶۴۵ء تا ۱۶۷۷ء تک ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک نا اہل حکمران ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف ولندیزیوں کو واپس آنے کی اجازت دی بلکہ ہر قسم کی تجارتی اور تبلیغی مراعات سے بھی نوازا۔ اس طرح ولندیزی جاوا میں اپنے پنجے جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمنگ کورت کے وطن دشمن اور غیر اسلامی کردار سے کبیدہ خاطر ہو کر عوام نے ایک بہادر نوجوان تورونا جایا کے زیرِ قیادت ولندیزوں اور سلطان کے خلاف ایک طویل جنگ کا آغاز کیا۔ اور بالآخر ماترم پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمنگ کورت نے ولندیزوں کے پاس جانے کے لیے راہ فرار اختیار کی لیکن راستے ہی میں مر گیا

اس کے بعد اس کا بیٹا ہمنگ کورت دوم ۱۶۷۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۰۳ء تک ہے۔ ولندیزوں نے اسے اپنے باپ کا تخت واپس لانے کے لیے معاہدہ سیماسانگ طے کیا۔ اور ۱۶۷۸ء میں تورونا جایا پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ جب وہ ہمنگ کورت دوم کے سامنے لایا گیا تو اس نے اسے فوراً قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ ۲ جنوری ۱۶۸۰ء کا ہے۔ اب ولندیزوں کے لیے جاوا پر پوری طرح سے قابض ہونے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ اس کے آخری ایام میں ولندیزی سلطان کے خلاف ہو گئے۔ تو اس نے سراپاتی سے مدد چاہی جو وسطی جاوا میں ان کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ ۱۶۸۵ء میں جب ولندیزوں نے ایک فوج ماترم پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجی تو اس نے شب خون مار کر اس فوج کو ختم کر دیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا سونان ماس ہمنگ کورت سوم کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ یہ صرف ایک سال تخت پر بیٹھ سکا کہ اس کے چچا پاکوبوانو نے ولندیزوں کی مدد سے اسے معزول کر دیا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۰۳ء تا ۱۷۰۴ء ہے

ہمنگ کورت سوم کی معزولی کے بعد پاکوبوانو ۱۷۰۴ء تا ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا اس کے دورِ اقتدار میں جاوا پر ولندیزوں کا پورا پورا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا پاکوبوانو دوم کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۱۹ء تا ۱۷۲۷ء تک ہے۔ اس کو ولندیزوں نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہمنگ کورت چہارم ۱۷۲۷ء تا ۱۷۴۹ء تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد کا مشہور واقعہ جنگ مادورا ہے جس میں اہلِ جاوا پہلی مرتبہ کھلم کھلا خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے۔ ۱۷۴۶ء کے عہد نامہ سوراکارتا کی رو سے ولندیزوں کو مکمل اجارہ داری مل گئی۔ اس کے بعد پاکوبوانو سوم تخت نشین ہوا۔ اس کا دورِ حکومت ۱۷۴۹ء تا ۱۷۸۸ء تک ہے۔ اس کے ہی عہدِ حکومت میں وہ مشہور عہد نامہ ہوا جس کی رو سے آئندہ سے ماترم کے تمام حکمرانوں کو ولندیزوں کی نگرانی میں حکومت کرنا تھا۔ جب سلطان نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو جنگ چھڑ گئی جس کے نتیجے میں ولندیزوں کو چند روز کے لیے مشرقی جاوا خالی کرنا پڑا لیکن ۱۷۵۵ء میں انہوں نے بالآخر پاکوبوانو کے حلیف منگ کالوجی کو اپنے ساتھ ملا کر سلطنت ماترم کو دو ریاستوں یوگ یکارتا اور سوراکارتا میں تقسیم کر دیا۔ ایک ریاست کا سربراہ پاکوبوانو کو قرار دیا گیا اور دوسری کا منگ کالوجی کو اور اس کی ریاست کا صدر مقام جوگ جکارتا مقرر ہوا۔ اس طرح سلطنت ماترم ولندیزوں کے ماتحت آ گئی اور مجمع الجزائر پہان کے تین سو سالہ دور کا آغاز ہو گیا۔ (اس دور کی تفصیل کے لیے دیکھیے "انڈونیشیا")

۱۹۴۹ء میں آزادی کے بعد آزاد جمہوریہ متحدہ انڈونیشیا کا وجود عمل میں آیا۔ جس کے تحت جاوا نظم و نسق کے اعتبار سے تین حصوں مغربی جاوا (بندونگ)، وسطی جاوا (سیماسانگ) مشرقی جاوا (سورابایا) میں تقسیم کر دیا گیا۔ انڈونیشیا کا دارالحکومت جکارتا بھی جاوا ہی میں واقع ہے۔

جاوا میں ۱۰۹ آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ جن کا سلسلہ اس جزیرے کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل تک پھیلا ہوا ہے۔ جن میں سے تیرہ پہاڑ ابھی متحرک ہیں اور بعض اوقات بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا گرم ہے اور بارش خوب ہوتی ہے۔ گرم آب و ہوا اور بارش کی کثرت کے سبب زمین زرخیز ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں پر پانچ ہزار سے زیادہ خودرو بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔

پیداوار کے لحاظ سے جاوا انڈونیشیا کا سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب جزیرہ ہے۔ تقریباً تیس لاکھ ایکڑ زمین پر چاول اور ساڑھے چار لاکھ ایکڑ پر چائے کی کاشت ہوتی ہے۔ چاول اور چائے کے علاوہ یہاں کی پیداوار میں گنا، تمباکو، ربڑ، سنکونا، قہوہ اور گرم مصالحہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کی آبادی ۱۹۷۳ء کی مردم شماری کے مطابق ۷۸۶۶۰۰۰۰ ہے۔

جاوید (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء - ۱۳۴۱ھ/۱۶ اپریل ۱۹۲۳ء) ایک ترک معیشت دان اور سیاست دان۔ سالونیکا میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کا باپ ایک سوداگر تھا۔ سالونیکا اور استنبول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۱۸۹۶ء میں مدرسہ ملکیہ سے فارغ التحصیل ہوا۔ پہلے چند دن زرعی بنک میں ملازمت کی بعد میں وزارت تعلیم میں ملازم ہو گیا۔ ۱۹۰۲ء میں اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر سالونیکا واپس چلا گیا۔ جہاں وہ ایک نجی ابتدائی سکول کا مدیر ہو گیا۔ یہیں پر اس نے عثمانی انجمن اتحاد و ترقی میں شرکت کی۔ جو سلطان عبدالحمید ثانی کے ظلم و استبداد کے خلاف نوجوان ترکوں کی ایک تحریک تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جاوید مدرسہ ملکیہ میں معاشیات کا لیکچرر مقرر ہوا۔ یہیں پر اس نے چند کتب اقتصادیات پر تصنیف کیں۔ اور ایک رسالہ "علوم اقتصادیہ و اجتماعیہ مجموعہ سی" احمد شعیب اور رضا توفیق بولوق باشی کے ساتھ مل کر

Marfat.com

نکالا۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک پارلیمنٹ کا رکن رہا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک وزیر مالیات مقرر کیا گیا۔ وہ ایک بہترین مقرر اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت پر جاوید کابینہ سے مستعفی ہو گیا۔ جب انجمن اتحاد و ترقی کے قائدین کی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو جاوید روپوش ہو کر ملک سے باہر نکل گیا۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں استنبول کی عدالت نے اسے اس کی عدم موجودگی میں پندرہ سال قید با مشقت کی سزا سنائی۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے عبدالحمید ثانی کے لڑکے برہان الدین کی مطلقہ بیوی علیہ سے شادی کی۔ ۱۹۲۲ء میں جاوید واپس استنبول آگیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے لوازن صلح کانفرنس کے وفد کے مشیر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ۱۹۲۶ء میں مصطفیٰ کمال اتاترک پر قاتلانہ حملے کے بعد جاوید کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور بغاوت کے الزام میں اسے انجمن اتحاد و ترقی کے دوسرے تین اور رہنماؤں کے ساتھ ۲۶ اگست ۱۹۲۶ء کو انقرہ میں پھانسی دے دی گئی۔

جاہلیت اصطلاح میں اس سے مراد زمانہ قبل اسلام کے عربوں کی حالت۔ دعوتِ اسلام سے پہلے اور بالخصوص قبل از ہجرت نبوی کا زمانہ مراد ہے کیونکہ اس زمانے میں عرب میں مشرکین عرب کا اجتماعی اور سیاسی قانون جاری و ساری تھا جو کسی وحی الٰہی کے تابع نہ تھا۔

قرآن مجید میں یہ لفظ چار مختلف جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔

"اور ایک دوسرا گروہ جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے (۳: ۱۵۴)

"تو کیا پھر یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" (۵: ۵۰)

"اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔" (۳۳: ۳۳)

"جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی۔" (۴۸: ۲۶)

جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

آنحضور ؐ نے فرمایا "تین کام جاہلیت کے ہیں۔ دوسروں کے نسب پر طعن کرنا ستاروں کی گردش سے فال لینا اور مردوں پر نوحہ کرنا۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

بقول مولانا مودودی جاہلیت سے مراد اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ طرز عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔ جاہلیت اولیٰ کا مطلب وہ برائیاں ہیں جن میں اسلام سے پہلے عرب کے لوگ اور دنیا بھر کے دوسرے لوگ مبتلا تھے۔

مفسرین میں سے بعض کے نزدیک دور جاہلیت اس زمانے کا نام ہے جو آنحضور ؐ کی بعثت سے پہلے تھا اور بعض کے نزدیک ہجرت نبوی تک کا زمانہ ہے۔ بعض نے آنحضور ؐ سے ڈیڑھ سو سال پہلے تک کے زمانے کو عہد جاہلیت قرار دیا ہے۔

جائز اصطلاح فقہ میں اس سے مراد وہ افعال ہیں جن کے کرنے کی اجازت ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ افعال جو اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو

جائز کی اصطلاح واجب اور مندوب (جس کے کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے) سے اس طرح ممیز اور مختلف ہے جس طرح حرام اور مکروہ سے۔

جائز وہ ہے جسے قانون شریعت نے جاری و نافذ کیا ہے اور اس پر عمل بلا دغدغۂ قلب صحیح ہے۔

فقہائے اسلام نے جائز کی اصطلاح خاص معنوں میں استعمال کی ہے۔ ان کے نزدیک اس سے مراد ہر وہ قانونی فعل جو باطل یا فاسد نہیں۔ علمائے احناف کے نزدیک ایسے فعل کو (جو باطل یا فاسد نہ ہو) صحیح کہا جاتا ہے۔ یہ فعل قانون شریعت کے عین مطابق ہوتا ہے۔ بایں ہمہ حنفی علماء اس امر کو ترجیح دیتے ہیں کہ لفظ جائز کو ہر درست کام کے لئے استعمال کرنے کے بجائے اس فعل کے لئے استعمال کیا جائے جو از روئے شریعت درست و روا ہو۔ درحقیقت جائز کام کے صحیح معنی شرعی نقطہ نظر سے مشروع فعل ہے۔

بقول مولانا اشرف علی تھانوی جائز کا اطلاق بہت سے معانی پر ہوتا ہے۔ ۱۔ مباح۔ ۲۔ جو شرعاً ممتنع و ناممکن نہ ہو خواہ مباح ہو یا واجب یا مندوب یا مکروہ۔ ۳۔ جو عقلاً ممتنع و ناممکن نہ ہو۔ خواہ واجب ہو یا راجح۔ ۴۔ جس میں دونوں باتیں برابر ہوں۔ خواہ یہ مساوات و برابری شرعی نقطہ نظر سے ہو۔ جیسے مباح یا عقلی نقطہ نظر سے جیسے بچے کا فعل۔ ۵۔ جو مشکوک ہے اور جسے محتمل بھی کہتے ہیں اور یہ ایسا فعل ہے کہ جس کے بارے میں انسان کی عقل یہ کہے کہ اس میں دونوں باتیں برابر ہیں یا جو نفس الامر اور شریعت کے اعتبار سے ممتنع نہ ہو۔

جائے نماز: نماز پڑھنے کی جگہ۔ (دیکھئے "مصلا")

جبّار: زبردست، غالب۔ اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں میں سے ایک (دیکھئے اسماء الحسنیٰ)

جبّار بن صخر (ــــــ ۳۰ھ/۶۵۰ء) صحابی ؓ۔ ابو عبداللہ کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندان مسلمہ سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے۔ غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ آپ حساب میں بہت زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے محاسب اور خازن کا عہدہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ فتح خیبر کے بعد عبداللہ بن رواحہ کی جگہ آپ ہی کو خازن مقرر کیا گیا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ؓ کے عہد خلافت میں آپ اسی عہدے پر فائز رہے آپ سے چند احادیث مروی ہیں۔ حضرت عثمان ؓ کے عہد خلافت میں ۶۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

جُبّائی (۲۳۵ھ/۸۴۹ء۔ ۳۰۳ھ/۹۱۶ء) ابو علی محمد بن عبدالوہاب۔ ایک معتزلی عالم۔ خوزستان کے شہر جُبّا میں پیدا ہوا۔ تعلیم بصرے میں ابو یعقوب الشحام کے مدرسے میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر اپنے استاد کا جانشین بنا۔ اس نے اپنے اساتذہ کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی۔

جبائی کا شمار معتزلہ کے مشہور ترین افراد میں ہوتا ہے۔ عقیدے کے لحاظ سے اسے بغدادی معتزلہ سے اختلاف تھا۔ وہ بصرے میں بھی نظام اور جاحظ سے اختلاف رکھتا تھا۔ نہ ہی اصم اور عباد کے نظریات سے اسے اتفاق تھا۔ اس کا

Marfat.com

مقام معتزلہ بصرہ میں ہے۔ جنہیں خاص طور پر افعال انسانی کے مسئلے میں بغدادی معتزلہ سے اختلاف ہے۔

جبائی کے دو شاگرد ایسے تھے جنہوں نے اس کے بعد کافی شہرت حاصل کی۔ ایک تو اس کا بیٹا ابوہاشم تھا اور دوسرے ابوالحسن اشعری تھے جو ایک مسئلے کے بارے میں جبائی کے جوابات سے مطمئن نہ ہوکر ایک الگ جماعت کے بانی بنے اور معتزلی عقائد کے رد میں مشغول ہو گئے۔

ایک روایت کے مطابق جس مکالمے کی بنا پر امام اشعری اور ان کے استاد جبائی کے درمیان اختلاف ہوا وہ مکالمہ تین بھائیوں کے انجام سے متعلق تھا۔ جن میں سے ایک متقی تھا، دوسرا غیر متقی اور تیسرا ایسا تھا جو بچپن ہی میں انتقال کر گیا تھا اس مسئلے میں قضائے الٰہی کی عقلی تصدیق و تصویب کا معاملہ درپیش تھا۔ اور جب جبائی سے اشعری کے سوالات کا کوئی شافی جواب نہ بن پڑا تو اشعری اپنے استاد سے

علیحدہ ہو گئے۔

جبائی کی تصانیف میں سے آج کوئی تصنیف بھی باقی نہیں ہے۔ اس کی ایک تصنیف "کتاب الاصول" کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔ جس کے رد میں امام اشعری نے کئی رسائل لکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی کئی اور تصانیف بھی تھیں۔

جبائی ان معتزلہ میں سے تھا جنکی تردید کی اشعری نے بہت زیادہ کوشش کی اس نے بعض اشعری دلائل کو خود پیش کیا۔ اس کے بعض رجحانات معتزلی دبستان کی بہترین روایتوں سے مربوط ہیں لیکن بعض میں اشعریہ کے مسائل علم کلام کے حل پیش کرتا نظر آتا ہے۔

جبائی نے حقیقت صفات کی "تعطیل" پر اس حد تک زور دیا کہ ان کی حیثیت محض اسماء کی رہ گئی۔

جبائی کا بیٹا ابوہاشم جو اس کا شاگرد بھی تھا۔ اشعری کا ہم عصر تھا۔ اور ان متاخر معتزلہ میں سے تھا۔ جنہوں نے سنی فکر کو براہ راست متاثر کیا۔ وہ ایک دبستان کا بانی تھا۔ اس کے پیرو بہشمیہ کہلاتے تھے۔

جبت بے حقیقت، بے فائدہ اور بے اصل چیز۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا یہ حال ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔" (۴:۵۱)

اسلام کی زبان میں جادو، کہانت (جوتش)، فال گیری ٹونے ٹوٹکے، شگون اور دوسری تمام وہمی و خیالی باتوں کو جبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آنحضور کا ارشاد مبارک ہے:۔

"جانوروں کی آوازوں سے فال لینا، زمین پر جانوروں کے نشانات قدم سے شگون نکالنا اور فال گیری کے دوسرے طریقے سب "جبت" کے قبیل سے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الحکمت)

پس جبت کا مفہوم وہی ہے جسے اردو میں اوہام کہا جاتا ہے۔ (نیز دیکھئے "اوہام جاہلیہ")

جُبّ الحزن غم کا کنواں۔ غم والا گڑھا۔ جہنم کا ایک گڑھا۔ جس سے جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب الحزن سے اللہ کی پناہ مانگا کرو۔" صحابہ نے عرض کی۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب الحزن کیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا۔ "جہنم میں ایک نالہ ہے جس سے جہنم بھی دن میں چار سو بار پناہ مانگتی ہے۔" صحابہ نے عرض کی "اس میں کون داخل ہوگا۔" آپؐ نے فرمایا "جو محض دکھلاوے کے لیے قرآن شریف پڑھتے ہیں۔" (مشکوٰۃ المصابیح)

جبرائیلؑ ایک مقرب فرشتہ جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے پیغمبروں پر وحی لاتا رہا ہے۔ جبرائیل کے معنی عبرانی زبان میں عبداللہ کے ہیں۔ یعنی اللہ کا بندہ۔ اس فرشتے کے دوسرے نام روح الامین، روح الاعظم، روح القدس صفاتی نام ہیں۔

آنحضورؐ کی جبرائیلؑ سے سب سے پہلی ملاقات غار حرا میں ہوئی۔ جب آپؐ تفکر و عبادت میں تنہا مشغول تھے۔ تو جبرائیلؑ تشریف لائے اور اپنا تعارف کرا کے آپؐ کو رسول ہونے کی خوشخبری دی اور پھر سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات پڑھنے کی تلقین کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نہیں پڑھ سکتا۔ تو جبرائیلؑ نے آپؐ کو اپنے سینے سے چمٹایا اور کہا اب پڑھو۔ آپؐ نے پھر وہی عذر کیا چنانچہ پھر اپنے سینے سے چمٹایا اور تین بار یہی عمل دہرایا۔ اور تیسری بار بڑی طاقت سے بھینچا اور کہا پڑھو۔ یہ پہلی وحی تھی۔

روایت کے مطابق اس وحی کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہو گیا آنحضورؐ مضطرباً اس کے منتظر رہے۔ چنانچہ ایک روز آپؐ غار حرا سے اعتکاف کے بعد واپس تشریف لا رہے تھے کہ اوپر سے ایک آواز آئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو عظیم الشان فرشتہ جس سے پہلے حرا میں ملاقات ہو چکی تھی۔ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ ایک تخت پر متمکن اور زمین و آسمان کے مابین سارے افق پر چھایا ہوا تھا۔ آپؐ گھر آکر چادر لپیٹ کر پڑ گئے۔ اس اثنا میں سورۃ المدثر نازل ہوئی۔

بخاری کی ایک روایت کی رو سے اس وقت جبرائیلؑ اپنی طبعی صورت میں تھے آنحضورؐ نے انہیں اس صورت میں دو بار دیکھا تھا۔ ورنہ عموماً وہ انسانی شکل و صورت میں آپؐ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احزاب کے بعد جبرائیلؑ آدمی کی شکل میں غبار آلود ظاہر ہوئے اور یہ کہہ گئے کہ آپؐ تو جنگ سے فارغ ہو گئے لیکن ہم نہیں ہوئے چلئے بنی قریظہ کا محاصرہ کیجئے یہ حدیث صحاح ستہ کی کتب میں روایت ہے۔ اور کبھی اجنبی شکل میں اس طرح ظاہر ہوتے تھے کہ شریک مجلس بھی دیکھ لیتے تھے۔ چنانچہ مشہور حدیث جو حدیث جبرائیلؑ کے نام سے موسوم ہے۔ ایک اجنبی صورت میں نہایت سفید لباس میں ظاہر ہوئے اور آپؐ کے زانوئے مبارک سے زانو ملا کر بیٹھ گئے اور آنحضورؐ سے سوال کرنے لگے لیکن آنحضورؐ کے جواب کی تصدیق بھی کرتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس شخص کے اس طرح سوالات کرنے اور خود ہی ان کے جوابات کی تصدیق کرنے پر بڑا تعجب ہوا۔ اس شخص کے چلے جانے کے بعد آنحضورؐ نے فرمایا کہ یہ جبرائیلؑ تھے اور تمہیں اسلام کے معنی سکھانے آئے تھے۔

اسی طرح جبرائیلؑ آنحضورؐ اور صحابہؓ کے ساتھ ایک روز اول وقت میں نماز پڑھ کر اور دوسرے روز آخر وقت میں نماز پڑھ کر نمازوں کے اوقات بتا کر گئے یہود جبرائیلؑ سے خوش نہیں تھے۔ اور انہیں اپنا دشمن خیال کرتے تھے۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

اور عذاب کا فرشتہ کہتے تھے۔

قرآن میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"ان سے کہہ دو کہ جو کوئی جبرائیلؑ سے عداوت رکھتا ہو، اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ جبرائیلؑ نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیلؑ اور میکائیل کے دشمن ہیں۔ اللہ ان کافروں کا دشمن ہے (۲:۹۷، ۹۸)

قرآن میں تین مختلف جگہوں پر جبرائیل کا نام آیا ہے۔ دو مرتبہ سورۃ بقرہ کی آیت ۹۰ اور ۹۸ میں اور تیسری مرتبہ سورۃ التحریم کی آیت ۴ میں۔ "اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔) کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور اگر نبیؐ کے مقابلے میں تم نے باہم جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا مولیٰ ہے۔ اور اس کے بعد جبرائیل اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔ (۶۶:۴)

قرآن میں باقی جگہوں پر جہاں بھی جبرائیل کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے صفاتی ناموں کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً

"اور عیسیٰؑ ابن مریم کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔" (۲:۸۷)

"جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ یاد کر میری اس نعمت کو جو میں نے تجھے اور تیری ماں کو عطا کی تھی۔ میں نے روح پاک سے تیری مدد کی۔" (۵:۱۱۰)

"یہ تیرے رب کی نازل کردہ چیز ہے اسے لیکر تیرے دل پر امانت دار روح اتری ہے۔" (۲۶:۱۹۲، ۱۹۳)

ان آیات میں روح القدس، روح الامین سے مراد جبرائیلؑ ہی ہیں۔

جبرتی، عبدالرحمٰن

(۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء - ۱۲۴۱ھ/۲۶-۱۸۲۵ء) بن حسن ایک بلند پایہ مورخ۔ جبرت میں ایک حنفی المذہب خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ خاندان زہد و تقشف میں نہایت اونچا مقام رکھتا تھا جبرتی کے کردار اور تصور حیات کے بنانے، سنوارنے میں سب سے زیادہ حصہ اس کے والد کا ہے۔ اپنے والد کے علاوہ جبرتی جن دوسرے لوگوں سے متاثر ہوا ان میں مرتضیٰ الزبیدی حسن العطار اور اسماعیل الخشاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں مملوک کے عہد میں گوناگوں تفصیل اور صحیح تاریخی ماخذ کی وہ فراوانی ہے کہ عالم اسلام کا کوئی دوسرا خطہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے برعکس مصر کے عثمانی دور حکومت میں اس قسم کے ہم عصر ماخذ کی بڑی کمی ہے جو خود اہل مصر نے تصنیف و تالیف میں کئے ہیں۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں تاریخ نگاری کا مصر میں کچھ احیاء ہوا۔

جبرتی نے اپنی وقائع نگاری کی ابتداء ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء سے کی ہے۔ اگرچہ اس عہد تک اس کی اسلامی اور مصری تاریخ میں معلومات بہت کم تھیں لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس نے ایک ایسے صوبے کی مقامی تاریخ تصنیف کی جو وسیع و عریض سلطنت کا حصہ تھا۔

"عجائب الآثار فی التراجم والاخبار" جبرتی کی سب سے بڑی تاریخی تصنیف ہے اس میں اس نے ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء سے ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء تک کی معلومات درج کی ہیں۔ اس کتاب کی پہلی تین جلدوں کو جبرتی نے ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء سے لے کر ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء تک آخری شکل دی۔ چوتھی اور آخری جلد بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔ جس زمانے کا حال اس میں قلمبند ہے۔ یعنی ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۹ء تا ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں۔ جبرتی نے چونکہ محمد علی اور اس کی حکومت پر تنقید کی تھی۔ اس وجہ سے اس کتاب کی اشاعت ایک عرصے تک ممنوع رہی۔ اور کہیں ۱۸۷۰ء میں اس سے پابندی اٹھائی گئی۔ ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء میں یہ کتاب مکمل طور پر شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس پورے عہد کے لئے بے مثل ہے جس کا حال اس میں قلم بند کیا گیا ہے۔ جبرتی نے اس کے ابتدائی حصے میں جو عام تصویر پیش کی ہے۔ اس سے اس زمانے کی مصر کی نہایت واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ جس کا تعلق فرانسیسی قبضے اور محمد علی کی حکومت کے ابتدائی عہد سے ہے اس سے بہتر کوئی اور ماخذ نہیں ہے۔

جبرتی کی دوسری تصنیف "مظہر التقدیس بذھاب دولۃ الفرنسیس" کے نام سے ہے۔ اس میں اس دور کے حالات قلمبند ہیں۔ جب فرانسیسیوں کا مصر پر قبضہ تھا۔ یہ کتاب دو چھوٹی جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا دو بار ترکی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جبرتی کا تاریخ اسلام کے بارے میں علم اگرچہ بہت محدود تھا۔ نہ ہی اس کے کسی مسلم مورخ سے ذاتی روابط تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مصر اور خاص طور پر قاہرہ میں جو واقعات رونما ہوتے رہے ان کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کرنے میں اسے بہت سہولت حاصل تھی اس کے خاندان اور بالخصوص اس کے والد کے مملوک اور آل عثمان کے حکمران طبقے اور علماء سے مختلف نوعیتوں کے نہایت گہرے تعلقات قائم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر اور قاہرہ میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح معلومات جبرتی کی تصانیف میں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے جبرتی کو ایک بہت بڑا مورخ مانا جاتا ہے۔ جسے اسلامی تاریخ نگاری میں ایک یکتا حیثیت حاصل ہے۔

جبر مسیحی

حضرموت کے ایک عیسائی خاندان کا غلام۔ آنحضورؐ مروہ کے قریب جبر کے مکان کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی حلاوت اور اس کے علوم کی نورانیت جب قلوب کی تسخیر کرنے لگی اور کفار نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرویدہ ہوتے جا رہے ہیں اور کوئی تدبیر اسلام کی مخالفت میں کامیاب نہیں ہوتی تو انہوں نے طرح طرح کے افترا اٹھانے شروع کئے۔ کبھی اسے سحر بتایا۔ کبھی پہلوں کے قصے اور کہانیاں کہا۔ کبھی یہ کہا کہ آنحضورؐ نے یہ خود گھڑ لیا ہے اور ہر طرح کوشش کی کہ کسی طرح لوگ اس کتاب مقدس کی طرف سے بدگمان ہوں۔ انہیں فتنہ انگیزیوں اور مکاریوں میں سے ایک مکر یہ بھی تھا کہ انہوں نے جبر مسیحی جو ایک عجمی غلام تھا کے بارے میں کہا کہ وہ آنحضورؐ کو قرآن سکھاتا ہے۔ اور آپؐ اس غلام کی باتیں سنکر اپنے الفاظ میں دہرا دیتے ہیں۔ نیز وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہمیں اپنا مذہب تبدیل کرنا پڑا تو ہم مسیحی دین اختیار کر لیں گے۔

جب قریش نے اس بات کو عام کرنا شروع کیا تو اللہ تعالےٰ نے سورۃ نحل کی آیت ۱۰۳ میں ان کے اس الزام اور گمراہی کی تردید کی۔

"اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص آپ کو آیات قرآنی کی تعلیم دیتا ہے لیکن جس شخص کی جانب یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ قرآن واضح عربی زبان میں ہے۔" (۱۶:۱۰۳)

اللہ تعالےٰ کی قدرت ہے کہ جس غلام کی طرف کفار مکہ یہ نسبت کرتے تھے اس

Marfat.com

کے دل کو بھی اس کلام کے اعجاز نے تسخیر کر لیا اور وہ بھی مشرف باسلام ہوگیا۔ اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں رہنے لگا۔

جبروت:۔ عظمت، بزرگی، برتری۔ (دیکھئے "عالم ملکوت وجبروت")

جبر وقدر ابتدائے آفرینش سے جن مسائل نے عقل انسانی کو ورطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ جبر وقدر بھی ہے۔ یعنی یہ کہ انسان اپنے ارادے اور فعل میں مجبور ہے یا مختار اور اگر مختار ہے تو کس حد تک۔ اگر اسے مطلق العنان تصور کریں تو یہ بات اللہ کی قدرت حاکمیت ارادیت اور ایمان والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالےٰ کے منافی ہوگی۔ اور اگر انسان کو مجبور محض مانیں تو انبیاء کی بعثت اور جزا وسزا کا خیال اور انسان کا جوابدہ ہونا باطل قرار پائے گا۔ اور مشرکین وکفار اپنے مذہب باطل کفر وشرک کی تائید میں تقدیر ازلی کو بطور حجت پیش کر کے اپنی معذوری ثابت کریں گے جیسا کہ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات میں اس کا اشارہ ملتا ہے۔

یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" (۶ : ۱۴۸)

یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔" (۱۶ : ۳۵)

وہ بولا "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا۔" (۱۵ : ۳۹)

جبر وقدر کا مسئلہ ہمیشہ سے اہل مذہب اور اہل فلسفہ کے نزدیک معرکتہ الآرا رہا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف اقوام اور افراد نے اس بارے میں مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ عام طور پر انہوں نے اس مسئلے کی حل کی دو ہی صورتیں نکالی گئیں۔ یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی۔ اور دبے پاؤں اس راستے سے گذر گئے۔ یا اگر بحث چھیڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا۔ چنانچہ یہی جبر ہندو مذہب میں تناسخ، اواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں حضرت آدم ؑ کے گناہ اور خدا کی مرضی کے پیرایہ میں ہے۔ یہودیوں کے مجموعہ تورات میں حضرت ایوب ؑ کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے ــــــ

دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے انسانی اختیار وآزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا۔ خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔

قرآن حکیم میں اس مسئلہ کے متعلق اس قدر اہتمام ہے کہ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں اس کے متعلق پہلوؤں میں سے کسی نہ کسی پر روشنی ڈالی گئی ہو اور غالباً قرآن حکیم میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کو مشکل ترین تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ واقعات عالم کی شہادت اور قانون قدرت کے مطالعے سے جس قدر اس مسئلے کی صحت معلوم ہوتی ہے۔ شاید ہی کسی اور مسئلہ کی ہو۔

مسلمانوں میں جو لوگ انسان کے لیے اصلاً کسی اختیار کے قائل نہ ہوئے یا اسے مجبور محض سمجھتے تھے جبریہ کہلائے۔ اس کے برعکس جو انسان کو مختار کل اور اپنے افعال کا خالق سمجھتے تھے جیسے معتزلہ، امامیہ، زیدیہ وغیرہ قدریہ کہلائے۔

اہل جبر کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان بالکل مجبور ہے اور کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اس کی مثال بعینہٖ پتھر اور لکڑی کی سی ہے۔ اس خیال کے لوگوں کو اگر صحیح مان لیا جائے تو نتیجۃً شریعت کے تمام اوامر ونواہی کو باطل قرار دیا جائے اور ضرورت نبوت کو عبث تسلیم کیا جائے گا۔ اور افعال ذات باری کو حکمت ومصلحت سے عاری سمجھا جائے گا۔

اہل قدر کا مسلک یہ ہے کہ جس قدر افعال انسان سے سرزد ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ذات باری کو کسی قسم کا تعلق نہیں بلکہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے گویا اہل قدر نے قدر وارادت ذات باری کا انکار کر دیا اور اسے معطل قرار دیا۔

تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جبر وقدر کے ہر دو مذہب باطل ہیں اور صحیح مذہب جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے افراط وتفریط کے عین وسط میں واقع ہے۔ یعنی نہ تو مجبور محض ہے نہ قادر مطلق بلکہ انسان مشیت ازلی کے تابع ہو کر اپنی آزاد مرضی کا استعمال کرتا ہے اور اسی لیے وہ جوابدہ بھی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر ایک فعل کی جو انسان سے صادر ہوتا ہے دو جہت ہوا کرتی ہے۔ جہت اول کو تو ذات باری کی مشیت وقدرت سے تعلق دے سکتے ہیں۔ جس سے کمال صفات باری تعالیٰ کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ یعنی آیت وما تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

اور ہر ذرہ کائنات میں مشیت ازلی مؤثر دکھائی دیتی ہے اور اسی مقام پر یہ راز کھلتا ہے کہ کوئی امر اللہ کے دائرہ علم وارادت، حکمت وقدرت سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اس اعتقاد سے انسان کو اپنے عجز وضعف کا علم ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالےٰ سے توفیق وعصمت کی استدعا کرتا ہے۔ جہت ثانی کے اعتبار سے فعل کو ارادہ انسانی کے ساتھ تعلق دیا جاتا ہے۔ جس سے انسان کی اس حالت اختیاری کا پتہ چلتا ہے جس کی رو سے وہ جوابدہ قرار پاتا ہے یعنی انسان کسب فعل میں خیر کو شر پر ترجیح دینے میں مختار من اللہ ہے۔ اس مقام پر آیت قرآنی لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اس عقیدے سے وہ اپنے ملک کی بارگاہ میں اپنے تئیں مجرم قرار دیتا ہے۔ اور اللہ کی طرف شر کی نسبت کرنے سے باز رہتا ہے مذکورہ بالا ہر دو جہتوں کے ربط سے جو صحیح عقیدہ مسئلہ اختیار کے بارے میں حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خالق افعال ذات باری ہے اور اکتساب فعل انسان سے صادر ہوتا ہے۔

یہی وہ درست عقیدہ ہے جس سے توحید، شریعت، عدل وحکمت کا ابطال لازم نہیں آتا قرآن حکیم کی آیات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کسطرح آیات جبر کے ساتھ آیات قدر کو ربط دیا گیا ہے۔ اور ہر دو کے باہم ملانے سے مذکورہ بالا صحیح عقیدہ کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ وگرنہ اہل جبر نے آیات جبر کو اپنے دعوے میں پیش کر کے آیات قدر میں تاویل کرلی اور اہل قدر نے آیات قدر کو اثبات دعوے میں پیش کر کے آیات جبر میں تاویل کرلی اور بجائے خود دو مستحق بن بیٹھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اختیار اور عدم اختیار کے ضمن میں ہم ربوبیت اور عبودیت کے اس ضروری ربط اور تعلق کے بغیر نہ تو قادر مطلق کی توحید کا مسئلہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی انسانی ہستی کی عظمت اور اس کی غایت کا مفہوم ہمارے ذہن میں آسکتا ہے۔ اس مسلک اعتدال کی حقانیت قرآن حکیم کی آیت اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے پناہ مانگتے ہیں" سے ثابت ہوتی ہے جس میں نہایت وضاحت کے ساتھ ہر دو مذہب باطل یعنی جبریہ وقدریہ کا رد ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایاک نعبد میں انسان نسبت فعل اپنی ذات کی طرف کرتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی ہستی کو چند فرائض کی بجا آوری کے معرض میں لاتا ہے۔ گویا اس نسبت فعل سے وہ اپنے تئیں جواب دہ قرار دیتا ہے لیکن وہ مکلف ہونے کی قابلیت رکھتا ہے اور یہی ایک امر اس کو دیگر جمادی اشیاء کی ہستی سے امتیاز بخشتا ہے۔ پس ایاک نعبد میں خالص جبر کا رد نہایت شدت سے ثابت ہوتا ہے۔ ایاک نستعین کی حقیقت میں فرقہ قدریہ کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ استعانت کی حقیقت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسباب وذرائع خارجیہ کا مہیا ہونا اللہ کی طرف سے ہے اور اسی کا نام

Marfat.com

توفیق الٰہی ہے چونکہ انسان اپنے فرائض کے انصرام کو توفیق الٰہی پر موقوف رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کی خود مختاری کا مسئلہ باطل ہوا۔ پس ہر دو جملہ کے ملانے سے جو صریح مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے اور نہ ہی علی الاطلاق مختار کل۔ قرآن حکیم میں اس قسم کے سینکڑوں نظائر موجود ہیں جن سے مذکورہ بالا خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ بنیادی حقائق درج ذیل ہیں۔

۱۔ سب کچھ مشیت ربانی سے ہوتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اور کتب منزلہ اور فطرت انسانی اور عقول سلیم اور انسان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اس امر پر دال ہے کہ عالم کائنات میں کسی امر کے وجود اور عدم وجود کی حقیقی علت مشیت یا ارادہ الٰہی ہے تمام اہل اسلام اس اصل عظیم کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی کو اس میں انکار نہیں۔ نیز جب تک ارادہ الٰہی کو ہر امر کی علت نہ مانا جائے کسی شخص کو حقیقی توحید کی طرف راستہ نہیں مل سکتا۔ سورۃ التکویر کی آیت۔

"اور تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے (۸۱: ۲۹)"

سے ظاہر ہے۔ اسی نقطہ نظر کی طرف حضور کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے۔

لاتقولوا ماشاء اللّٰہ وشاء محمدؐ ولکن قولوا ماشاء اللّٰہ وحدہٗ

۲۔ اللہ تعالٰی نے نیک اور بد دونوں راستے سمجھائے ہیں۔ چنانچہ نیک راہ پر چلنے والا نیک نتائج تک پہنچتا ہے اور برائی اختیار کرنے والا بدانجام حاصل کرتا ہے۔

"اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔" (۹۱: ۸،۷)

"اور دونوں نمایاں راستے انہیں دکھا دیئے۔" (۹۰: ۱۰)

۳۔ حکمت کاملہ کے اسی طرح کے انتظام ہیں مثلاً اگر دنیا میں بالکل بدی نہ ہوتی تو نیک مخلوق انعام و صلہ کی مستحق نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر نیکی اور بدی دونوں ہوتیں مگر بدی کا نتیجہ برا نہ ہوتا تو پھر بھی نیکی اور بدی میں تفاوت نہ ہوتا اور کامل عدل کے بالکل منافی ہوتا کہ نیک اور بد کو یکساں صلہ دیا جائے۔

۴۔ اللہ تعالٰی نے ہر کیفیت میں ترقی کی قابلیت ودیعت کی ہے نیک اور بد دونوں کیفیتوں میں توفیق من جانب اللہ ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے (۱۳: ۱۱)"

"پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (۶۱: ۵)

۵۔ اللہ تعالٰی نے نیکی کا حکم دیا اور بدی سے منع فرمایا اور اسی مقصد کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔

"اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔" اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔" (۱۶: ۳۶)

۶۔ اللہ تعالٰی کامل العلم ہے۔ اسے کائنات اور موجودات کے ہر ذریعے کے متعلق مکمل علم ہے اور جو واقعہ پیش آنے والا ہے سب اس کی لوح علم پر منقوش ہے۔

"یہ بات تیرا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ اس کے راستے سے کون بھٹک گیا اور کون سیدھے راستے پر ہے۔" (۵۳: ۳۰)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو۔" (۵۷: ۲۲)

۷۔ اللہ تعالٰی نے انسان کو قوت فیصلہ عطا کی ہے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات کے افعال ان کی فطرت میں داخل ہیں لیکن انسان کی فطرت میں بجائے افعال کے قوت فیصلہ کو داخل کیا گیا ہے۔

جس کو کام میں لا کر وہ جداگانہ راستے انتخاب کرتا ہے۔ یہی وہ قوت فیصلہ خدا کی امانت ہے جو آسمان و زمین کی کسی مخلوق کو نہیں دی گئی اور اسی کے سبب وہ اپنے افعال کا فاعل سمجھا جاتا ہے۔

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو اسے اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے۔ مگر انسان نے اسے اٹھا لیا، بیشک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔" (۳۳: ۷۲)

نتیجۃً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ہر چیز اللہ کی قدرت مشیت اور علم و حکمت سے ہے لیکن ان تمام مجبوریوں کے باوجود انسان میں چونکہ قوت فیصلہ ودیعت کی گئی ہے اس لیے اس کو پتھر یا حیوان کی طرح مجبور ماننا بھی نا انصافی ہوگی۔ اور جو حکم اس کو نیکی کی طرف جانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس کو تکلیف مالا یطاق کہنا بھی غلط ہوگا۔ اور دوسری طرف انسان کو ہر امر میں مطلق العنان اور کامل آزاد قرار دینا بھی ان تمام قوانین قدرت سے چشم پوشی کرنا ہے۔ جو اسے چاروں طرف سے محیط ہیں۔ غرضیکہ جبر و اختیار کے بین بین حالت ہی وہ صداقت ہے جو واقعات عالم کی شہادت اور فطری مذہب کی تعلیم سے قابل یقین ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالٰی ہے۔

"ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو (ہر ایک کا حال) ٹھیک ٹھیک بتا دینے والی ہے۔ اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔" (۲۳: ۶۲)

"اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔" (۱۸: ۲۹)

لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا، اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔" (۳۹: ۷)

"یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرے اور یہ کوئی سبق حاصل نہیں کریں گے۔ الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقوے کیا جائے۔ اور وہ اس کا اہل ہے کہ تقوے کرنے والوں کو بخش دے (۷۴: ۵۴ تا ۵۶)

جیسا کہ قرون وسطیٰ اور عہد عتیق کے فلسفیوں کو اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جدید مفکرین کو بھی اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ (نیز دیکھئے "تقدیر"، "جبریہ")

جبریلؑ:۔ ایک مقرب فرشتہ (دیکھئے "جبرائیل")

جبریہ وہ فرقہ جو انسان کو مجبور محض مانتا ہے اور کہتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ انسان بذات خود کچھ نہیں کر سکتا۔ اس عقیدے کے مطابق چونکہ ہر شے امر الٰہی کے تابع ہے اس لیے کوئی شے انسانی ارادے سے بدل نہیں سکتی۔ چنانچہ اس مذہب کی رو سے بندوں کے افعال ان کے اپنے ارادوں کے تابع نہیں بلکہ وہ طوعاً و کرھاً ارادہ الٰہی سے وابستہ ہیں۔ گویا بندوں سے صادر ہونے والے افعال درحقیقت افعال الٰہی ہیں۔ جبریہ مذہب قدریہ مذہب کی عین ضد ہے۔

اس فرقے کی بنیاد جہم بن صفوان (م ۱۲۸ھ/۷۴۵ء) نے رکھی۔ ان کے مقابلے میں قدریہ یعنی معتزلہ انسان کو مختار مطلق مانتے ہیں۔ اشعریوں کے نزدیک انسان کچھ مختار ہے

Marfat.com

اور کچھ مجبور۔ معتزلہ اشاعرہ کو بھی جبریہ ہی کہتے ہیں۔

اہلِ سنت اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں کے اختیاری اور غیر اختیاری سارے افعال اللہ کی طرف سے معرضِ وجود میں آتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے بھی قائل ہیں کہ وہ اللہ کے بخشے ہوئے ارادہ جزئیہ کو ہر کام میں صرف کر سکتے ہیں۔ یہ بات جبریہ کے عقیدے کے خلاف ہے۔

جبریہ کا ایک فرقہ جو جبریہ خالصہ کے نام سے موسوم ہے بہتمام جبر کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک انسان اور جمادات کے مابین کوئی فرق نہیں۔ دوسرا فرقہ جبریہ متوسطہ کہلاتا ہے جو اس بات کے تو قائل ہیں کہ بندے میں قدرت ہے مگر یہ نہیں مانتے کہ یہ قدرت فعل پر کوئی تصرف کر سکتی ہے۔

بخاریہ، فراریہ اور کلابیہ بھی اسی فرقے میں شمار ہوتے ہیں۔ مغربی فلاسفروں کا ایک گروہ بھی جبر کا قائل ہے۔ چنانچہ یونانی مفکر کے خیال کے مطابق کائنات کی ہر چیز قانونِ قدرت کے ماتحت ہے اور اس سے انحراف نہیں کر سکتی۔ برطانوی فلسفی ہابس کا نظریہ تھا کہ کائنات اور انسان کی ہر حرکت قانونِ اسباب کے ماتحت ہے۔ نفسیات کے علماء کا خیال بھی یہی ہے کہ انسان اپنی مرضی کا مختار نہیں ہے بلکہ ذہنی اور جسمانی حالات اس کے ارادے اور عمل کو جس رُخ چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ (نیز دیکھیے "تقدیر" "جبر و قدر"، "قدریہ")

جَبَلُ الطارق جبرالٹر۔ ہسپانیہ کے صوبہ قادس کے جنوب مغرب میں ہسپانیہ کی انتہائی جنوبی حد پر ایک برطانوی نوآبادی جو سطحِ سمندر پر بڑھتی ہوئی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱½ مربع میل ہے۔ ہسپانیہ کے قطعہ ارضی سے ایک ایک ریگستانی ٹکڑے کے ذریعے منسلک ہے۔

جبل الطارق کو ہر دور میں بحیرہ روم کی کلید کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس وجہ سے ہر دور میں اس کے استحکام پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔

زمانہ قدیم میں اسے قادس ہرکیولیم (HERCULEUM) کہا جاتا تھا۔ عرب اسے خلیج الزقاق کہتے ہیں۔

اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ۹۲ھ/۷۱۱ء میں طارق بن زیاد اس کے ساحل پر اترا تھا۔ اور اس کو فتح کیا۔ اس کا دوسرا نام جبل الفتح ہے۔ جبرالٹر جبل الطارق ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

عربوں کے عہدِ حکومت میں جبل الطارق کی بندرگاہ شہر اور قلعہ جو مورُوں نے بنایا تھا۔ جہازوں کے لئے ایک محفوظ مستقر کا کام دیتا رہا۔

جب خلیفہ عبدالمومن الموحد اپنی افریقی مہم (۵۵۴ھ/۱۱۵۹ء تا ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) سے واپس آیا تو اس نے اپنے بیٹے یوسف عاملِ اشبیلیہ کو جبل الطارق میں ایک نیا شہر بسانے کا حکم دیا تاکہ وہ شہر قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ پر ہونے والے حملوں کا مقابلہ کر سکے اور زبردست لشکر کشی کے لئے ایک مستقر اور محلِ اجتماع کا کام دے تاکہ وہاں فوجیں ٹھہرائی جا سکیں۔ چنانچہ ایک خوبصورت شہر جس میں ایک جامع مسجد اور خلیفہ کے لئے ایک محل تعمیر کیا گیا۔ المومن نے ۵۵۵ھ/نومبر ۱۱۶۰ء میں نئے شہر کا معائنہ کیا اور اس کا نام مدینۃ الفتح رکھا۔ ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء میں فرڈیننڈ چہارم نے شاہ قشتلہ کے لئے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء میں مراکش کے بنو مرین نے اسے فتح کر لیا۔ بعد میں غرناطہ کے ناصری سلطان یوسف ثالث نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کا قبضہ ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء سے ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء تک رہا۔ بالآخر ۲۰ راگست ۱۴۶۲ء کو مدینہ شدونہ کے ڈیوک قزمان نے ہنری چہارم شاہ قشتلہ کے لئے اسے فتح کیا۔ ۱۴۶۲ء سے ۱۵۰۲ء تک جبل الطارق قزمانوں کی موروثی جاگیر رہا۔ اور بعد میں دوبارہ بادشاہ کی ملکیت میں آگیا۔ ۱۷۰۴ء میں ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی کے موقعہ پر امیر البحر سر جارج روک نے اس پر قبضہ کر کے اسے برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ بعد میں اسے کئی محاصروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں ۱۷۰۹ء تا ۱۷۸۳ء کا محاصرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس میں جبل الطارق نے جنرل الیئٹ کے ماتحت ہسپانیہ اور فرانس کے محاصرے کا مقابلہ کیا۔

۱۰ ستمبر ۱۹۶۷ء میں جبل الطارق کے باشندوں کو موقعہ دیا گیا کہ آیا وہ برطانیہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا سپین کے اقتدار کے تحت آنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے برطانیہ کے ساتھ الحاق کو ترجیح دی۔

جبل الطارق ایک اہم بحری اڈہ ہے۔ ۱۹۷۳ء میں اس کی کل آبادی ۲۹۹۲۷ تھی جو برطانوی، یہودی اور مراکشی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اس تعداد میں برطانوی حکومت کا حفاظتی دستہ بھی شامل ہے۔

جبلہ شام کے ساحل پر ایک بندرگاہ جو جزیرہ رواد کے مقابل واقع ہے فینیقیوں کے زمانے میں یہ شہر ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ڈورری نوآبادی کا قیام عمل میں آیا۔ رومیوں کے عہدِ حکومت میں یہ شہر بہت خوشحال تھا۔ زرعی پیداوار کی کثرت تھی۔ ۱۷ھ/۶۳۸ء میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے اس شہر کو فتح کر کے اس کی قلعہ بندیاں مسمار کر دیں۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اس کے دفاع کا نئے سرے سے انتظام کیا۔ اور ایک فصیل بھی تعمیر کرائی۔

جب چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں بزنطیوں کو دوبارہ طاقت حاصل ہوئی تو انہوں نے اس شہر پر دو مرتبہ قبضہ کیا۔ پہلی بار ۳۵۰ھ/۹۶۸ء میں دوسری بار ۳۶۴ھ/۹۷۵ء میں۔ ۳۷۵ھ/۹۸۵ء میں یہ شہر پھر سے جُندِ حمص کا حصہ بن گیا۔ ۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء میں ابن صُلیحہ نے بزنطیوں کو اس علاقے سے نکال باہر کیا اور یہ شہر ایک بار پھر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ ۴۹۴ھ/۱۱۰۱ء میں قاضی ابن صلیحہ نے اسے طغتگین کے جو دمشق کا اتابک تھا حوالے کر دیا لیکن تھوڑے سے دنوں بعد دمشقی دستے کو شہر سے نکلنا پڑا۔ اور اس مرتبہ اس پر طرابلس کے بنو عمار کا قبضہ ہوگیا۔

جبلہ ۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء میں صلیبیوں کے ہاتھ آگیا۔ جنہوں نے یہاں پر ایک رومی اسقفیت قائم کی اور یہاں کی تجارت اہلِ جنیوا کے سپرد کر دی۔ ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء میں اہلِ جبلہ کی دعوت پر صلاح الدین نے اس شہر کا رُخ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح جبلہ الناصر کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۲۸۵ء تک یہ شہر صلیبی جنگجوؤں اور فوجی طرز کے پادریوں کی جماعت کے درمیان وجہ نزاع بنا رہا۔ ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاؤن نے اسے فتح کر کے نیابت حماۃ میں شامل کر لیا۔ مملوک عہد میں یہ شہر خوشحال تھا۔ اور صوفی ابراہیم بن ادھم کی زیارت کے لئے آنے والوں کی وجہ سے اسے بہت رونق حاصل تھی۔ ۱۵۱۶ء سے چار سو سال تک جبلہ پر عثمانیوں کی حکمرانی رہی۔

موجودہ دور میں جبلہ کی حیثیت ایک قصبے کی ہے۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ اس کی سابقہ شان و شوکت کی داستان بیان کرتے ہیں۔

جبلہ، بن ایہم بنو غسان کا آخری بادشاہ۔ سلطنتِ غسان عرب اور شام کے درمیان عربوں کی ایک ریاست تھی جو قیصرِ روم کی باجگزار تھی۔ اس نے مسلمانوں سے بزنطی لشکر کے ساتھ مل کر دو لڑائیاں لڑیں۔ ایک دومۃ الجندل اور دوسری

Marfat.com

یرموک لیکن دونوں میں شکست کھائی۔ جنگ یرموک ١٥ھ/٦٣٦ء میں جبلہ بزنطی لشکر کے ساتھ مسلمان عربوں کے خلاف لڑا۔ شکست کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ بڑے شاہانہ کروفر کے ساتھ اسلامی دارالخلافہ میں آیا۔ جہاں اس کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ ایک روز کعبہ کا طواف کرتے ہوئے جبلہ کے شاہی چوغے پر ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا۔ جبلہ نے اس بدو کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ جس سے اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ بدو حضرت عمرؓ کی عدالت میں حاضر ہو کر انصاف کا طالب ہوا۔ حضرت عمرؓ نے جبلہ کو بلا کر پوچھا "تم نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو کیوں مارا۔؟" جبلہ نے جواب دیا۔ "اس نے میری توہین کی۔ اگر وہ متبرک جگہ پر نہ ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔" حضرت عمرؓ نے کہا۔ "یہ الفاظ تمہارے جرم کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا یا تم بدو سے معافی مانگو یا مقررہ سزا بھگتو۔" جبلہ نے کہا۔ "لیکن میں بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی آدمی" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "شاہ ہو یا گدا تم دونوں مسلمان ہو اور اسلام کی نظر میں سب برابر ہیں۔" جبلہ نے درخواست کی کہ سزا کل تک کے لئے موقوف رکھی جائے۔ بدو کی رضامندی سے یہ درخواست منظور ہوئی۔ مگر جبلہ نے رات کی تاریکی میں راہ فرار اختیار کی اور قسطنطنیہ پہنچ کر دوبارہ عیسائی ہو گیا۔

جبوتی ایک شہر اور بندرگاہ جو خلیج عدن کے افریقی ساحل پر خلیج تجرہ کے دہانے پر واقع ہے۔ یہ علاقہ فرانس کو مارچ ١٨٨٥ء میں عیسے کے مقامی مشائخ نے دیا تھا جو صومالی بولنے والا ایک قبیلہ تھا۔ یہ شہر اور بندرگاہ فرانس ہی کی تعمیر شدہ ہے۔ شہر کی بنیاد گورنر لے گارڈ نے ٢٠ مارچ ١٨٨٨ء میں رکھی۔ ١٨٩٦ء میں اس نے فرانس کی خلیج عدن کی بستی کے بڑے شہر اُبک کی جگہ لے لی۔ اور ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ تھوڑے سے عرصے بعد ہی اس بندرگاہ کے سامنے زیلع اور تجرہ کی بندرگاہیں ماند پڑ گئیں اور یہ جنوبی حبشہ کے مال کے برآمد کرنے کا مقام بن گیا۔ چونکہ اس میں گہرے پانی کی چند گودیاں موجود ہیں۔ اس لئے یہ افریقہ کے مشرقی ساحل کی اول درجے بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ جبوتی جمہوریہ فرانس کے زیر اقتدار ہے ٢٣ جون ١٩٥٦ء کے قانون کی رو سے ١٩٥٠ء سے یہ ایک گورنر کی نگرانی میں ہے۔ جو حکومتِ فرانس کا ایک نمائندہ ہوتا ہے۔ ١٨٩٧ء میں فرانسیسی۔ حبشہ ریلوے کا کام شروع کیا گیا۔ جو ١٩١٧ء میں مکمل ہو گیا۔ یہ ریلوے جبوتی کو حبشہ کے دارالحکومت ادیس ابابا سے ملاتی ہے۔

١٩٦٦ء میں اس شہر کی آبادی ستر ہزار کے قریب تھی۔ جن میں صومالی، گدبورسی ہبرادل، الیساق اور دارود تھے۔ ایک چوتھائی غیر ملکی ہیں۔ عربوں کی بھی ایک خاص تعداد موجود ہے۔ بیشتر تجارت عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ اکثریت کی زبان عربی ہے

جبوتی کا قاضی عربی الاصل ہوتا ہے جو اس علاقے کا مذہبی سربراہ ہے۔ یہاں کی آبادی کی اکثریت شافعی المذہب ہے۔ تصوف میں جبوتی اور قادریہ سلسلے مقبول ہیں عبدالقادر جیلانیؒ کے علاوہ بہت سے مقامی اور غیر مقامی اولیا کی تقریباً ہر جگہ تقدیس و تکریم کی جاتی ہے۔

جبوتی میں آٹھ جامع مساجد ہیں جو پختہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں اور یہ مساجد چھوٹے چھوٹے قبیلوں نے اپنے تاریخی بزرگوں کے نام سے موسوم کر رکھی ہیں۔

جبیرؓ بن مطعم ؟ — ٥٨ھ/٦٧٧ء) صحابیؓ، کنیت ابو محمد قریش سے تھے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف قرشی نوفلی۔

جبیر کے والد مطعم قریش کے نرم دل اور خدا ترس لوگوں میں سے تھے۔ آنحضورؐ کو ان کی وجہ سے ابتدائی زندگی میں بہت زیادہ مدد ملی۔ جب کہ آپ چاروں طرف سے مصائب و آلام سے گھرے ہوئے تھے۔ جب قریش مکہ کو آنحضورؐ کو تبلیغ سے روکنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو آپس میں معاہدہ کر کے بنو ہاشم کا مقاطعہ کر دیا اور اس عہدنامے کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے قریش کی دوسری شاخوں کا میل جول بنی ہاشم کے ساتھ ممنوع ہو گیا تھا۔ اس لئے بنی ہاشم شعب ابی طالب میں چلے گئے اور تین سال تک اس قید میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اس پوری مدت میں شعب ابی طالب پر برابر قریش کا پہرہ رہا۔ اور کھانے پینے کی کوئی چیز شعب ابی طالب میں نہ جانے پاتی تھی۔ لیکن انہی شقی القلب لوگوں میں کچھ نرم دل بھی تھے جو کھانے پینے کی چیزیں چوری چھپے اندر بھیج دیا کرتے تھے۔ بعد میں کچھ منصف مزاج لوگوں نے اس ظالمانہ معاہدے کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اس کو چاک کر ڈالا۔ ان صدائے احتجاج بلند کرنے والوں میں ایک مطعم بھی تھے۔

جبیر اسی منصف مزاج اور نرم دل باپ کے بیٹے تھے۔ لیکن قومی عصبیت قبول حق کے مانع آتی تھی۔ مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جب بدر کے مقام پر پہلا معرکہ ہوا تو جبیر اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ البتہ اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لئے آئے۔ جب جبیر مسجد میں داخل ہوئے تو آنحضورؐ نماز میں مصروف تھے اور سورۃ طور کی آیات تلاوت فرما رہے تھے۔ جبیر نے جب کلام اللہ کی آیات سنیں تو خود کہتے ہیں کہ میں اس قدر متاثر ہوا کہ معلوم ہوتا تھا میرا قلب پھٹ جائے گا۔

جب آنحضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں گفتگو کی۔ آپؐ نے جبیر کے والد کے احسانات کو یاد کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا باپ زندہ ہوتا اور وہ سفارش کرتا تو میں چھوڑ دیتا۔

غزوہ بدر کے مقتولین کا انتقام غزوہ احد کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں تمام مشرکین نے بقدر استطاعت حصہ لیا۔ جبیر نے بھی اپنی طرف سے اپنے غلام وحشی کو بھیجا اور کہا کہ اگر تم حمزہ کو قتل کر دو گے تو تم آزاد ہو جاؤ گے۔ چنانچہ حضرت حمزہ اسی وحشی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جبیر نے صحیح روایت کے مطابق صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی زمانے میں اسلام قبول کیا۔

قبول اسلام کے بعد غزوہ حنین میں شرکت کی۔ حنین کی واپسی کے وقت آپ آنحضورؐ کے ساتھ تھے۔

آنحضورؐ کی وفات کے بعد ایک عرصے تک زندہ رہے لیکن بہت کم نظر آتے تھے۔ اولاد میں دو لڑکے محمد اور نافع چھوڑے۔

اگرچہ حضرت جبیر کو آنحضورؐ کی صحبت میں رہنے کا موقع بہت کم نصیب ہوا لیکن کافی احادیث آپ کے حافظہ میں محفوظ تھیں۔ آپ سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد ساٹھ ہے جن میں سے چھ متفق علیہ ہیں۔

علم الانساب کے بہترین حافظ تھے اور اس کو اس فن کے سب سے بڑے ماہر حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حاصل کیا تھا۔ اس لئے ان کا شمار قریش کے ممتاز نسابوں میں تھا۔ حضرت عمرؓ کو جب نسب کی تحقیقات کی ضرورت پیش آتی تھی تو جبیرؓ ہی سے تحقیقات کراتے تھے۔

حضرت جبیرؓ میں علم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اگرچہ قریش کی ایک مقتدر شاخ کے رکن اور روسائے قریش میں سے تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کبر و نخوت ان میں نام کو نہ تھی۔ اور ان کا قریش کے حلیم ترین اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔

Marfat.com

جُبَیل خلیج فارس کے کنارے سعودی عرب کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ جو عینین کے نام سے بھی مشہور ہے۔ جبیل درب الکنھری کے شروع ہی میں واقع ہے جو ریاض کی طرف جانے والی ایک کاروانی گذرگاہ اور موٹر کا راستہ ہے۔

قبیلہ آل بو عینین کے افراد دعوے کرتے ہیں کہ اس مقام پر ان کے جد امجد خولید بن عبداللہ بن عارم آباد ہوئے تھے اور اس کا عینین نام وہاں کے دو بہتے ہوئے چشموں کی وجہ سے پڑا تھا۔ ایک روایت کے مطابق کسی وقت یہاں پر قبیلہ عبدالقیس بھی سکونت پذیر تھا۔

اوائل اسلامی عہد میں یہ علاقہ اپنے کھجور کے درختوں کی وجہ سے خوب مشہور تھا۔ موجودہ شہر ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء کے قریب آل بو عینین کے افراد سے آباد تھا۔ جو ایک مقامی جھگڑے کی بنا پر ترک حکام کی اجازت سے قطر سے ترک وطن کرکے آئے تھے۔ یہ لوگ مسلکاً مالکی تھے اور صدف گیری یا دوسرے پیشوں سے گذر بسر کرتے تھے۔ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں جب سلطان عبدالعزیز السعود نے الحسا فتح کیا تو جبیل سعودی حکومت میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء کے صلح نامے کی رو سے جب برطانیہ نے سلطان عبدالعزیز کا قبضہ تسلیم کر لیا تو یہ قصبہ باقاعدہ طور پر سعودی عرب کا علاقہ سمجھا جانے لگا۔ شروع شروع میں جبیل وسطی عرب میں بھیجے جانے والے سامان کے لئے ایک درآمدی بندرگاہ بن گئی۔

دمام میں بندرگاہ ریل اور سڑکوں کا مرکز بن جانے سے جدید رسل و رسائل میں ترقی ہوئی تو اس کی اہمیت کم ہو گئی۔

یہاں کی آبادی اندازاً آٹھ، نو ہزار کے قریب ہے۔

جُبَیلہ وادی حنفیہ کے مغربی کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں جو عینیہ اور درعیہ کے درمیان نجد میں واقع ہے۔

وادی حنفیہ کے دائیں کنارے جو ٹیلے موجود ہیں وہ مقامی روایات کے مطابق قبور صحابہ کہلاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آنحضورؐ کے ان صحابہ کی قبور ہیں جو عقرباء کی لڑائی میں شہید ہوئے تھے۔

ابن بشر کے بقول۔ جبیلہ ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں آل یزید کے قبضے میں تھا۔ جس پر موسیٰ بن ربیعہ بن مانع مریدی نے جو السعود کا ایک جد امجد تھا حملہ کر دیا اور جلد ہی اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ جبیلہ اور عقرباء کا ذکر بطور میدان کارزار بار بار کرتا ہے جہاں آل سعود کی ترقی پذیر طاقت اور الحسا کے بنو خالد کے بارسوخ امراء کے درمیان ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۱ء اور ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں معرکے ہوتے رہے۔

یہ علاقہ ریاض سے حجاز جانے والی دو شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہے۔ ان میں سے ایک سڑک اس پتھریلے ملک میں سے چکر کاٹتی ہوئی گذرتی ہے جو وادی حنفیہ کے مشرقی کنارے اور ریاض کے درمیان واقع ہے اور دوسری سڑک وادی حنفیہ کے ساتھ ساتھ جبیلہ تک چلی گئی ہے۔ انہی سڑکوں کے ذریعے اس قصبے کو ریاض تک عقرباء کے باغ کی پیداوار فروخت کرنے کے لئے رسائی ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ایک نئی سڑک تعمیر کی گئی ہے جو ریاض سے جنوب مشرق کو شعب لحا پر واقع بازو سے ترتیل کر جاتی ہے۔

جَدّہ بحر احمر پر سعودی عرب کا ایک شہر اور حجاز کی سب سے بڑی بندرگاہ اور مکہ آنے والے حجاج کے لئے سب سے بڑی اترنے کی جگہ جو مکہ سے تقریباً ۴۶ میل دور ۲۱ درجہ ۲۸ دقیقہ شمال میں اور ۳۹ درجے ۱۱ دقیقے مشرق میں واقع ہے اور پختہ سڑک کے ذریعے ۷۲ کلومیٹر اور مدینہ منورہ سے ۴۱۹ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔

اس شہر کو حقیقی شہرت اور اہمیت اس وقت نصیب ہوئی جب ۲۶ھ/۶۴۶ء میں حضرت عثمانؓ نے پرانی بندرگاہ شعیبہ کی جگہ جدے کو مکہ کی بندرگاہ قرار دیا۔ اسلامی دنیا کا مرکز اور قبلہ ہونے کی وجہ سے مکہ ایک بڑا تجارتی شہر بن گیا۔ جس کا سامان تجارت جدے کے راستے مصر اور ہندوستان سے آنے لگا۔

جدہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ایک خوشحال شہر تھا اور یہاں سے حاصل ہونے والا محصول حجاز کے حکمرانوں کی آمدنی کا اہم ذریعہ تھا۔ بقول ناصر خسرو پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں اس کی فصیل نہیں تھی۔ مردوں کی آبادی پانچ ہزار تھی اور شریف مکہ کا ایک غلام یہاں پر حکمران تھا۔ جس کا سب سے بڑا کام محاصل کی وصولی تھا۔ ابن جبیر نے چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے جدے کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں کہ اس میں گھاس پھونس کے جھونپڑے، پتھر کی بنی ہوئی سرائیں اور مسجدیں ہیں وہ صلاح الدین کی تعریف کرتا ہے کہ اس نے وہ محاصل ختم کر دیئے تھے جو شریف مکہ وصول کرتے تھے۔

خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد تجارت کا رخ بصرے سے جدے کی طرف مڑ گیا۔ مصر سے بحری جہاز سونا، معدنیات اور یورپ سے اونی کپڑا لے کر جدے میں ان جہازوں سے ملتے تھے جو ہندوستان سے چاول، شکر، چائے، غلہ، قیمتی پتھر اور عطریات وغیرہ لے کر آتے تھے۔ جدے کو اس سامان تجارت پر دس فیصد محصول حاصل ہوتا تھا

۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء کے بعد مصر کے مملوک سلاطین نے محاصل کی وصولی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح جدہ مصر کا ایک طرح سے دست نگر ہو گیا۔

۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں جب پرتگیزوں کی مشرقی سمندروں میں آمد شروع ہوئی اور مسلمان جہاز رانوں پر انہوں نے جو حملے کئے اس سے جدہ کو خطرہ سا لاحق ہو گیا۔ جس کا مقابلہ مملوک سلاطین نے اور پھر عثمانی خلفاء نے بڑی ہمت سے کیا۔ حسین الکردی نے جو مملوک سلطان قانصوہ الغوری کی طرف سے جدے کا گورنر تھا۔ ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تیار کرائی۔

۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں لوپو سوارس مملوک بحری بیڑے کا تعاقب کرتا ہوا جدے کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا لیکن مضبوط دفاعی انتظامات کی وجہ سے شدید حملہ نہ کر سکا۔ ۹۴۸ھ/۱۵۴۱ء میں پرتگیزوں نے جدے پر قبضہ کرنے کی آخری ناکام کوشش کی جس کا شریف البرکات نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سلطان سلیمان نے اس کامیاب دفاع کے صلے میں اسے جدے سے وصول شدہ رقم کا نصف دیا۔

جدے کی تاریخ میں گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی اور بارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی تک کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن تیرہویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں جدہ کئی انقلابات سے گذرا۔ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء میں وہابیوں نے شریف غالب کو جدے میں محصور کر دیا۔ لیکن وہ شہر پر قابض نہ ہو سکے بالآخر شریف غالب نے ہتھیار ڈال دیئے اور ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء تک جدہ پر وہابیوں کا قبضہ رہا۔ یہاں تک کہ محمد علی پاشا نے جدہ پر عثمانیوں کی سیادت قائم کر دی۔ بقول برکہارٹ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۵ء میں جدے کی آبادی ۱۲ ہزار تا ۱۵ ہزار تھی۔ جس میں اصل باشندے بہت کم تھے جبکہ یمن و حضرموت کے غیر ملکی لوگ زیادہ نظر آتے تھے۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں جدہ براہ راست باب عالی کے تحت آ گیا۔ ۳ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ/۱۵ جون ۱۸۵۸ء میں جدے میں ایک خونریز ہنگامہ ہوا۔ جس میں بہت سے آدمی مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں غیر ملکی بھی تھے۔ ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء میں جب شریف حسین نے عربوں کی خود مختاری کا اعلان کیا تو جدہ پہلا شہر تھا جس پر اس کا قبضہ ہوا۔ عربوں کی بغاوت کے دوران میں شریف کی فوجوں کے لئے جو ترک افواج سے برسر پیکار تھیں جدہ سب سے بڑا رسدگاہ تھا۔

Marfat.com

ربیع الاول ۱۳۴۳ھ/اکتوبر ۱۹۲۴ء میں سعودیوں کا مکے پر قبضے کے بعد جدہ علی بن الحسین کا دارالحکومت بن گیا۔ اس دوران میں جدہ شریفوں اور وہابیوں کے مابین اقتدار کے لیے رسہ کشی کا مرکز بنا رہا۔ جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ/جنوری ۱۹۲۵ء سے مسلسل ایک سال کے لیے وہابی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کیے رکھا۔ آخر کار جمادی الآخر ۱۳۴۴ھ/دسمبر ۱۹۲۵ء میں شہر پر وہابیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء میں عبدالعزیز بن سعود اور کلبرٹ کلیٹن نے جدے میں باہمی ملاقات کی جس کے مطابق برطانیہ نے سلطنت آل سعود کی مطلق اور مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا۔

انتظامی طور پر یہاں ایک قائم مقام حکومت کرتا ہے جو گورنر مکہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ شہر کی ایک منتخبہ میونسپل کمیٹی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جدے کی تجارت بڑے زوروں پر ہے۔ ۱۹۴۶ء-۱۹۴۷ء میں شہر کی فصیل گرا دی گئی اور شہر کو تین سمتوں میں پھیلا دیا گیا۔ مشرق میں مکے کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ شمال میں مدینے کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ اور جنوب میں بندوالی سڑک کے ساتھ ساتھ شہر کے پرانے حصے میں قدیم عمارات کو گرا کر سرکاری دفاتر کے لیے عمارات تعمیر کرائی گئی ہیں۔

جدہ اپنی بین الاقوامی نوعیت کی آبادی کے لیے مشہور ہے۔ جدے کی بڑی بڑی عمارات میں کسٹم ہاؤس، میونسپلٹی کے دفاتر، حکومت کے دفاتر وغیرہ ہیں شہر کے جنوبی کنارہ پر ایک جدید طرز کی بندرگاہ ہے۔ جس میں دو نشست والا ایک ہزار تین سو فٹ لمبا پشتہ ہے۔ اس بندرگاہ میں آٹھ لاکھ ٹن سالانہ کے حساب سے سامان تجارت اتارا اور چڑھایا جاتا ہے۔ شہر میں ایک مرکز صحت ایک ہسپتال ایک طبی امتحان گاہ اور دو دارالحجاج موجود ہیں۔ جن میں ایک پشتے سے ملحق ہے اور دوسرا ہوائی اڈے سے جدہ حاجیوں کے لیے سرکاری ہوائی اور بحری اڈا ہے۔ جہاں وہ مکہ جاتے ہوئے اترتے ہیں۔

یہاں پر کئی ایک ہلکی صنعتیں قائم ہیں۔ جن میں سیمنٹ کے کارخانے اور سنگ گر کلٹنے کے کئی ایک کارخانے قائم ہیں۔

جدیدہ مراکش کا ساحلی شہر جو بحراوقیانوس پر وادی ام الربیع کے دہانے سے ۱۱ کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہے۔

آج کل مازگان کی پرانی بستی کو اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ محض ایک بندرگاہ تھی جہاں جہاز اکثر آتے جاتے تھے۔ تمام قرون وسطیٰ میں بھی بظاہر یہی صورت رہی۔ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے البکری نے مازگان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی توثیق چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں کی ہے۔ اس جگہ کا یہی نام دوبارہ ایک مخطوطے میں وارد ہوا ہے جو مقام ازمور کے ایک نامور ولی مولائی ابوشعیب سے متعلق سبق آموز محاضرات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں مازیغان مچھلی والوں کی ایک بستی کا نام بتایا گیا ہے جو ازمور اور رباط تیط کے درمیان واقع تھا۔
اس بندرگاہ سے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی سے دکالہ کا غلہ بھر کر مازگان کی بندرگاہ سے اپنے صدر مقام کی رسد رسانی کے لیے لے جایا کرتے تھے۔
۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں جارج ڈی میلو نے پرتگال واپس آ کر مازگان میں اپنے خرچ سے ایک قلعہ بنانے کی شاہی اجازت حاصل کی۔ ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں جارج ڈی میلو کو اس قلعے کی سرداری عطا کی گئی۔ لیکن ۱۵۱۰ء میں یہ قلعہ بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ ۱۵۱۴ء میں دو معماروں کی زیر ہدایت ایک چوکور قلعہ وہاں پر تعمیر کیا گیا۔ اس کے بازوؤں پر چہار گوشہ برج بنائے گئے۔ ان میں سے ایک برج وہی قدیم تھا جو بریجہ کے نام سے مشہور تھا۔ موجودہ باشندے پرتگیزی قصبے کا ذکر اسی نام سے کرتے ہیں۔ ۱۵۴۱ء میں اسے مال خانہ بنا دیا گیا۔ ۱۲ مارچ ۱۵۴۱ء کو شاہ پرتگال سوم نے ناچار تہیہ کر لیا کہ سفی اور ازمور کو خالی کر کے مازگان میں اپنی ساری طاقت جمع کرے کیونکہ یہ مقام زیادہ کام کا اور زیادہ آسانی سے قابل دفاع اور جنوبی مراکش میں وہ جتنی پرتگیزی فوج رکھنا چاہتا تھا اس کے لیے موزوں تھا۔

مازگان کو اپنے قبضے میں رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پرتگیزی ساحل پر اپنا جہازی اڈا قائم رکھیں۔ تاکہ شرق الہند سے آمدورفت کا راستہ محفوظ رہے۔ نیز انہیں یہ بھی امید تھی کہ سازگار حالات میں یہ قلعہ مراکش کو فتح کرنے کے لیے ایک نہایت اچھا اڈا ثابت ہوگا۔

مازگان کے قلعے کو چند موقعوں پر سخت حملے برداشت کرنے پڑے۔ اپریل ۱۵۶۲ء میں سعدی سلطان محمد بن عبداللہ الغالب باللہ نے اس کا فوجی محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ وہ اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۶۳۹ء میں سیدی محمد عیاشی مجاہد نے پرتگیزوں پر حملہ کر کے ان کو کسی قدر نقصانات پہنچائے۔
مولائی اسماعیل کے پوتے سیدی محمد بن عبداللہ نے جنوری ۱۷۶۹ء کے اواخر میں اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پانچ ہفتے کے محاصرے کے بعد پرتگیزوں نے اس قلعے کو خالی کر دیا۔ پرتگیزوں نے جاتے ہوئے سرنگیں لگی چھوڑ دی تھیں۔ ان کے پھٹ جانے سے بڑا نقصان ہوا۔ سلطان کا ایک تباہ شدہ شہر پر قبضہ ہوا تھا۔ اس نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا۔ لیکن اس شہر کی حالت خراب و خستہ ہی رہی۔ اسی وجہ سے اس کا نام مہدومہ (شکستہ حال) پڑ گیا۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں سیدی محمد بن ہشام کے عہد حکومت میں سیدی محمد بن طیب نے جو دکالہ اور تامسنہ کا قائد تھا اس کی حالت درست کی اور اس کا نام "جدیدہ" رکھا۔ اس شہر کی موجودہ آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

جُذَام، بنو ایک عرب قبیلہ۔ جس کا نسب نامہ یہ ہے عمرو بن عدی بن حارث بن مرہ بن ادد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا۔
بنو جذام ان بدویوں میں شامل تھے جو زمانہ قبل از اسلام میں بزنطی شام اور فلسطین کی سرحدوں پر آباد ہو گئے تھے اور مدین، عمان، معان اور اذرح جیسے مقامات پر قابض تھے۔ جنوب میں تبوک اور وادی القریٰ تک ان کے اثرات قائم تھے۔ مدینے کے یہودی قبیلے بنو نضیر کو بھی بنو جذام کی ایک شاخ ہی سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ بنو جذام کے بزنطیوں سے روابط قائم تھے اسی وجہ سے سطحی طور پر عیسائی بن گئے تھے۔ اگرچہ ابن الکلبی کے نزدیک انکا شمار بھی اہل شام میں ہوتا ہے جو اقیصر نامی بت کو پوجتے تھے
جب اسلام شمال کی جانب پھیلنے لگا تو بنو جذام نے موتہ کے مقام پر اس کی راہ روکنے کے لیے کوشش کی۔ اگرچہ اس کی ایک شاخ بنو ضبیب مسلمان ہو چکی تھی لیکن ان کے خلاف حضرت زید بن حارثہ اور عمرو بن العاص کی مہمات کو ضروری خیال کیا گیا یہ قبیلہ شہنشاہ ہرقل کے عرب اتحادیوں میں سے تھا اور ۱۵ھ/۶۳۶ء میں جنگ یرموک میں انہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ بعد میں جب یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے شام کی فتح میں حصہ لیا۔
اموی دور میں جند فلسطین کا ایک بڑا حصہ بنو جذام پر مشتمل تھا۔ جب معاویہ بن یزید کی وفات پر مروان کا نام بحیثیت خلیفہ کے پیش کیا گیا تو یہ نام پیش کرنے والا بھی بنو جذام کا رئیس روح بن زنباع تھا۔ اور اموی دور کے زوال تک ان کے تعلقات

Marfat.com

بنو مروان سے بہت زیادہ قریبی رہے۔

بنو جذام نے اموی دور میں حکومت میں یہ دعوے کیا تھا کہ وہ کہلان بن سبا یمنی کی نسل سے ہیں اور لخم اور عاملہ سے بھی ان کا رشتہ ہے۔ لیکن شمالی عرب کے قبائل کا دعوٰے یہی رہا کہ جذام، قضاعہ اور لخم کی اصل میں نزار کی نسل سے تھے۔ بعد میں ان قبائل نے یمنی اصلیت اختیار کر لی تھی۔

جراجمہ جرجومہ شہر کے باشندے، جو عربوں اور بزنطیوں کے سرحدی علاقے میں آباد تھے۔ انہوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں عربوں اور بزنطیوں کی باہمی جنگوں میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بزنطی مورخ انہیں ماردیہ کا نام دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ مذہباً عیسائی تھے لیکن مذہب کے معاملے میں ان کا رویہ سرد مہرانہ تھا۔

عربوں نے جب انطاکیہ فتح کیا تو جراجمہ پر بھی چڑھائی کرنے کے لئے انہوں نے ایک دستہ زیر قیادت حبیب بن مسلمہ الفہری روانہ کیا۔ بقول البلاذری اور ابن الاثیر "جراجمہ عربوں کے لئے ہراول اور جاسوسی کی خدمات بجا لانے کے لئے رضامند ہو گئے نیز یہ کہ وہ جبل اللکام کے دروں کی پاسبانی کریں گے۔ اور عربوں کے ساتھ ان چھوٹے قلعوں کی محافظ فوجوں میں بھی بھرتی ہوں گے جو شام کو آنے والے اور شام سے باہر جانے والے راستوں کے محافظ تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جزیے سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور انہیں یہ بھی حق دیا گیا کہ اگر وہ جنگی معرکوں میں حصہ لیں گے تو انہیں مال غنیمت سے بھی حصہ دیا جائے گا۔ لیکن ان لوگوں کی وفاداری مسلسل نہ تھی وہ عربوں کو دغا دینے میں کبھی بھی نہیں چوکتے تھے۔

بقول تھیوفینیز امیر معاویہؓ کے عہد میں قیصر قسطنطین نے جراجمہ کو شام کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے فوجی دستوں نے بزنطی فوجی دستوں کی مدد سے یونانی افسروں کی زیر قیادت جبل اسود سے بیت المقدس تک کے درمیانی علاقے پر قبضہ جما لیا۔ نیز لبنان کے خطے کے سارے پہاڑوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا بہت سے بھاگے ہوئے یونانی الاصل غلام بھی جراجمہ کے ساتھ آملے۔ اور کچھ کوہستانی اضلاع کے باشندے بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ چنانچہ اس خطرناک صورت حال کو روکنے کے لئے امیر معاویہؓ نے قیصر سے گفت و شنید کی اور دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ طے پایا جس کے مطابق انہوںؓ نے سالانہ خراج ۳۰۰۰ سونے کے سکے ۸۰۰۰ قیدیوں کی رہائی اور ۵۰ اصیل گھوڑے دینے کی شرط قبول کر لی۔ قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ جراجمہ کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ اور انہیں آدمی، ہتھیار اور مال غرض کسی شکل میں مدد نہ پہنچائے گا۔ بعد میں اس گروہ کو امیر معاویہؓ کے ہاتھوں کچھ نقصان بھی پہنچا۔ اور ۴۹ھ/۶۶۹ء یا ۵۰ھ/۶۷۰ء میں انطاکیہ اور آگے شمال کی طرف خاص جراجمہ کے علاقے میں زط (جاٹ) بسا دیئے گئے۔

جب خلیفہ عبدالملک ۶۹ - ۷۰ھ/۶۸۸ - ۶۸۹ء میں عبداللہ ابن زبیرؓ سے برسر پیکار تھا نیز اس کے ساتھ ہی عمرو بن سعید اشدق کی بغاوت فرد کرنے میں بھی منہمک تھا۔ جس کو خود اس نے دمشق کا عامل بنایا تھا۔ قیصر جیسٹینین دوم نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے جراجمہ کو شام پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اس لشکر کے ساتھ جراجمہ کے علاوہ مقامی کسانوں اور بھاگے غلاموں کی بھی ایک بڑی تعداد آملی۔ چنانچہ اس مہم جو قوم کے حملے ختم کرنے کے لئے خلیفہ کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑے اور اس کا ذمہ لیا کہ انہیں ہر ہفتے ایک ہزار دینار ادا کئے جائیں گے۔ اس کے بعد خلیفہ نے قیصر سے انھی شرائط پر صلح کی جن پر امیر معاویہؓ نے قیصر سے اس وقت کی تھی جب وہ اہل عراق کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے۔ لیکن جلد ہی قیصر نے اپنے مطالبوں میں اضافہ کر دیا اور خلیفہ نے بامر مجبوری قبرص، ارمینیا اور آئبیریا کا آدھا خراج قیصر کو دینا منظور کیا۔ چنانچہ قیصر نے ۱۲ ہزار جراجمہ کو واپس بلا لیا جو بزنطی علاقے میں آباد ہو گئے۔

بقول البلاذری صلح نامہ پر دستخط کرنے کے بعد خلیفہ کو جراجمہ سے پیچھا چھڑانے کی چال چلنی پڑی۔ اس نے اپنے ایک معتمد علیہ شخص سُحیم بن المہاجر کو روانہ کیا کہ ان کے یونانی سردار سے ملاقات کرے۔ سحیم اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ اس نے ظاہری طور پر خلیفہ کی مخالفت کر کے یقین دلایا کہ وہ یونانی سردار کا ساتھ دے گا۔ اس کے بعد اپنے سپاہیوں کو لیکر جو کمین گاہ میں چھپے ہوئے تھے اچانک اس پر حملہ کر دیا اور اسے اور اس کے یونانی سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ سحیم نے جراجمہ کو امان دیدی ان میں سے کچھ تو حمص و دمشق کے قرب و جوار میں آباد ہو گئے۔ اور کچھ آمانوس کو چلے گئے۔ مقامی کسان جو جراجمہ کے ساتھ جا ملے تھے اپنے اپنے گاؤں واپس چلے گئے اور بھاگے ہوئے غلام اپنے آقاؤں کے پاس واپس پلٹ کر آ گئے۔ کچھ نے خلیفہ کی ملازمت اختیار کر لی اس طرح خلیفہ نے اس عنصر پر قابو پایا۔"

بہرحال جراجمہ اپنے آمانوس کے پہاڑی ماسکنوں میں نیز ان یونانیوں کی مدد سے جو اسکندرون کے قرب و جوار سے آئے ہوئے تھے۔ پریشانی کا باعث بنے رہے۔ ۹۹ھ/۷۰۸ء میں مسلمہ نے قلعہ جرجومہ پر حملہ کرنے کے لئے ایک مہم تیار کی اور اسے مسخر کر کے مسمار کر ڈالا۔ لیکن جراجمہ کے ساتھ بہرحال میں خاص سلوک روا رکھا گیا۔ انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ مسلمانوں کا لباس پہنتے ہوئے بھی اپنا عیسائی مذہب قائم رکھیں۔ انھیں جزیے سے معافی دی گئی۔ ان کے گھر والوں کے لئے تنخواہیں اور سامان رسد مقرر ہوا۔ وہ مسلمانوں کی مہمات میں حصہ لیتے تھے۔ اور انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ جنگ میں جس کو وہ قتل کریں اس کا مال وہ خود لے لیں۔ ان تمام رعایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکومت نے ان کے ساتھ بڑا فیاضانہ سلوک کیا اور بلا امتیاز مذہب انہیں بڑی بڑی رعایتیں دیں۔

ان کی کچھ تعداد شمالی شام میں تیزین اور بیلون کے علاقے میں اور کچھ حمص اور انطاکیہ میں آباد کی گئی تھی۔ لیکن ان تمام رعایتوں کے باوجود بہت سے جراجمہ سرحد پار چلے گئے اور بزنطیا میں جا کر آباد ہو گئے۔ اور ماردیہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ تصانیف میں ان ماردیہ کے حوالے بھی ملتے ہیں جو اسلامی مملکت میں مقیم رہے۔ یزید ثانی کے عہد میں عراق کی فوج میں شامل تھے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں آمانوس کی محافظ قلعہ فوج میں شامل تھے۔ عہد عباسی میں واثق باللہ نے بھی ان کے خصوصی حقوق کو بحال رکھا۔ لیکن المتوکل نے اپنے دور حکومت میں ان پر جزیہ لگا دیا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں جراجمہ کا آمانوس میں موجود ہونے کا ذکر ملتا ہے جہاں جبل اللکام میں حضرت مریمؑ کی ایک خانقاہ کا حال تحریر ہے۔ جو "دیر الجراجمہ" کے نام سے موسوم تھی۔

جربہ المغرب کا سب سے بڑا جزیرہ جو ترنس کے جنوب میں خلیج قابس میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۵۱۴ مربع کلومیٹر ہے۔ یہ جزیرہ بر اعظم سے کٹا ہوا ہے کیونکہ اس کے مغرب میں بحیرہ بوغزارہ اور دا بنائے قنطرہ اور مشرق میں آبنائے اجم ہے۔

جربہ کو مصنفین نے کئی نام دیئے ہیں۔ بعض نے اسے پایاب پانی کا جزیرہ اور بعض نے آرام طلبوں کا ملک لکھا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے وسط سے یہاں پر خوب کاشت کاری ہونے لگی۔ اس زمانے سے یہ علاقہ حکومت قرطاجنہ کے ماتحت تھا اور اس کی معیشت کا انحصار

Marfat.com

زیتون کے تیل پر تھا۔ رومیوں کے عہد میں اس جزیرے کی بحری سرگرمیوں کا کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہے۔ لیکن قدیم بستیوں کے کھنڈروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اس کی معاشی اہمیت کچھ زیادہ ہوگی۔

جربہ شہر جس سے اس جزیرے کا نام مشتق ہے۔ حومت سوق کے قریب واقع تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں جب یروشلم کو لوٹا گیا تو بہت سے یہودی وہاں سے بھاگ کر جربہ میں آ بسے آج کل جو یہودی یہاں آباد ہیں وہ انھی کی اولاد میں سے ہیں۔ جربہ پہلے ایک رومن نائب قنصل کے صوبے کا حصہ تھا۔ اس کے بعد حکومت طرابلس العرب کے زیر اقتدار آگیا۔ بعد میں اس پر وندال قوم کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد بزنطی حکومت کا تسلط اس پر قائم ہوگیا۔ بزنطی عہد میں جربہ کے اسقف کا تقرر طرابلس سے ہوتا تھا۔ ۴۵ھ/۶۶۵ء میں جب معاویہ بن حدیج نے (BYZACENE) میں لڑائیاں لڑیں تو جربہ کو رویفع بن ثابت نے فتح کر کے وہاں قبضہ جما لیا۔ بعد کی چند صدیوں کے جزیرے کے حالات کا پتہ نہیں کیا ہے۔ جب یہ قیروان اور مہدیہ کے زیر تسلط آیا تو یہاں کے باشندے خارجی عقائد کے دل سے حامی ہوگئے۔ بقول البکری یہاں کے باشندے بدمزاج اور ریاکار تھے۔ خشکی اور تری دونوں میں ڈاکے مارتے تھے۔" ادریسی نے ان کے بارے میں لکھا ہے "یہ سب بربر تھے۔ اور کوئی زبان نہیں بول سکتے تھے"

پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں اس جزیرے کی بابت بیان کیا گیا ہے کہ یہاں پر پھلوں اور زیتون کے گنجان باغ تھے اور جربہ کا شمار وہاں کے چھوٹے شہروں میں کیا گیا ہے۔ اس دور میں بنو ہلال کی یورشوں اور زیری خاندان کے زوال کے باعث اہل جربہ کے جذبہ حریت میں اضافہ ہوا۔ ان کے تونس کے ساحل پر اور عیسائی بیڑوں پر قزاقانہ حملے پہلے سے زیادہ ہوگئے۔

۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء تک علی بن یحییٰ زیری ان کا رئیس تھا۔ ۵۳۰ھ/۱۱۳۵ء میں جورج انطاکی نے جو صقلیہ کا امیر البحر تھا اس جزیرے کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء میں مہدیہ کی فتح سے نارمن اقتدار کو مزید تقویت ملی۔ یہ قبضہ ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد عبدالمومن الموحدون نے نارمنوں کو تونس کے ساحل اور جزائر سے نکال باہر کیا۔ لیکن ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء میں ابوحفص عمر کے دور حکومت کے آغاز میں عیسائیوں نے حملہ کر کے اسے دوبارہ حاصل کر لیا۔ ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں عیسائیوں نے آبنائے قنطرہ اور رومی سنگ بستہ راستے کی حفاظت کے لیے وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جس کے چاروں طرف ایک خندق تھی۔ چند بغاوتوں کے برپا ہونے اور ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں تونس والوں کے چھاپہ مارنے کے بعد اہل صقلیہ نے رامون مونتانیر کو روانہ کیا کہ جربہ پر دوبارہ قبضہ کرے۔ اس نے ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء سے ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء تک بڑی جابرانہ حکومت کی۔ بعد میں یہ جزیرہ براہ راست حکومت صقلیہ کے تحت آگیا۔ کچھ عرصہ بعد اہل جربہ نے پھر بغاوت کی۔ اس مرتبہ انہیں بنوحفص کے فرمانروا ابوبکر کی حمایت حاصل تھی چنانچہ بالآخر ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں جربہ چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوگئے۔ بعد میں انہیں ایک بار پھر ۷۸۵ھ/۱۳۸۳ء تا ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بعد کی صدی میں ارغون کے الفانسو پنجم کی اس جزیرہ کو فتح کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ جب ۸۳۵ھ/۱۴۳۲ء میں اس نے دوسرا حملہ کیا تو سلطان ابوالفارس جربہ والوں کی مدد کے لیے بہ نفس نفیس آیا۔ عربوں نے اس جزیرہ میں ایک اور قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ "ابرج الکبیر" کے نام سے جربہ کے کھنڈروں کے قریب شمال کی جانب بنایا گیا ہے۔ کچھ وقت گذرنے کے ساتھ اس فصیل کے چاروں طرف ایک نئی بستی بھی آباد ہوگئی۔ اس بستی کا نام حومت سوق رکھا گیا۔

اہل جربہ کی آزاد اور سرکش طبیعت کی وجہ سے ان کی حفصیوں اور عیسائیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ ۸۸۵ھ/۱۴۸۰ء میں ابوعمر عثمان نے اپنا تعلق اچانک ان لوگوں سے منقطع کر لیا اور جزیرے کو برعظم سے ملانے والی واحد سڑک یعنی رومی سنگ بستہ راستے کو ارادۃً توڑ ڈالا۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں جربہ ہسپانیوں اور ترکوں کے درمیان باہمی کشمکش کا مرکز بن گیا۔ حفصیوں نے جربہ ترکوں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے جنگی مرکز بنا لیں عیسائی انہیں یہاں سے ہٹانے میں ناکام رہے۔ ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں انہوں نے پیڈرو نوارو کی زیر قیادت ایک زبردست حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء میں یہ جزیرہ طورغود کے جنگی اقدامات کا مرکز بنا۔ آخر کار جربہ ترکوں کے قبضے میں آگیا۔ اس کا نظم و نسق یکے بعد دیگرے الجزائر طرابلس اور تونس سے متعلق رہا۔

۱۰۴۰ھ/۱۶۳۱ء تا ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء مرودہ بے کے دور اقتدار میں جربہ مستقل طور پر تونس کے زیر اقتدار آگیا۔ ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۸ء میں اس جزیرے کو حکومت طرابلس کے مطابق

زمانے پر ابراہیم پاشا نے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔

۱۱۱۷ھ/۱۷۰۵ء تک ترکی تونس کے حکمران دے اور بے آتے رہے۔ ان کے بعد حسینی خاندان کے حکمران آئے۔ انہوں نے جربہ کے دور دراز علاقوں میں اپنے نائب پہلے "شیخ" اور "قائد" مقرر کیے۔ یہ اعلیٰ عہدے دار بعض خاص گھرانوں سے موروثی طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔

بارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں ہی مالکی مذہب نے فرقہ اباضیہ کی جگہ لے لی اور عربی سب سے زیادہ مشترکہ زبان کی حیثیت اختیار کر گئی اٹھارویں صدی ہی میں خانہ بدوش ارغامہ اور اکارہ قبائل نے جبزہ کے میدان سے متعدد بار چھاپے مارے۔ ۱۷۹۴ء میں طرابلس کے ایک علی بوغل کے نامی شخص نے ۵۰ روز تک جزیرے پر قبضہ جمائے رکھا اور خوب لوٹ مار کی۔ ۱۸۶۴ء میں علاقہ ززیس کے قبائل نے جزیرے پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۰۵ء - ۱۷۰۶ء، ۱۸۰۹ء اور ۱۸۶۴ء میں جزیرے میں طاعون کی وبا پھیلی۔ ۱۸۴۶ء میں جب احمد بای نے غلاموں کی تجارت کی بندش کر دی۔ تو جزیرے کی معاشی حالت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ کیونکہ اس وقت جربہ اور قابس بردہ فروشی کی بڑی منڈیاں تھیں۔ انیسویں صدی میں جربہ ایک پُررونق اور خوشحال جزیرہ تھا۔

اس جزیرے کی آبادی ہمیشہ نسبتاً زیادہ ہی رہی۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی ۶۲۲۰۰ تھی۔ پچھلے چند سالوں میں برعظم افریقہ اور خاص طور پر جنوبی تونس کے بہت سے لوگ یہاں آ کر آباد ہوگئے ہیں آبادی میں یہاں کے اصلی باشندوں کی تعداد ۵۰ فیصد ہے۔ یہاں کے لوگ عربی بولتے ہیں۔

آدھی آبادی نے وہابیت کی مقامی صورت میں اپنے اباضی عقائد برقرار رکھے ہیں۔ مکران کی بڑی اکثریت جو مشرقی اور وسطی حصوں میں قیام پذیر ہے۔ اہلسنت الجماعت ہے۔ یہاں پانچ لاکھ ستر ہزار کھجور کے درخت ہیں۔ قدیم دستکاریاں اب کسی نہ کسی طور موجود ہیں۔ یہاں کی صنعت میں شوخ رنگ کا دھاری دار اونی کپڑا اور دوسرا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ یہاں کے باشندے اپنے مختلف پیشوں میں بڑی محنت سے کام کرتے ہیں اگرچہ وہ مدتوں باہر رہتے تھے پھر بھی اپنے جزیرے، اپنے معاشرتی اور خاندانی تعلقات کے ساتھ دل و جان سے وابستہ رہے ہیں۔

زراعت خاص طور پر مرکزی اور مشرقی حصوں میں ہوتی ہے جہاں میووں اور ترکاریوں کی فصلوں کی آبپاشی کے لئے پانی ٹنکوں کے ذریعے زمین سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ماہی گیری یہاں کی گیارہ فیصد آبادی کا پیشہ ہے۔ ۱۹۷۲ء میں یہاں کی آبادی ۶۵۵۳۲ تھی۔

Marfat.com

جرجان ایک قدیم صوبہ جس کی حدود وہی تھیں جو موجودہ ایرانی صوبے استرآباد کی ہیں۔ اس صوبے کی زرخیزی اور خوشحالی کا دارومدار اترک اور جرجان کے دریاؤں پر تھا۔

ساسانی عہد میں جرجان کو بہت اہمیت حاصل تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ شمال کی جانب سے دباؤ ڈالنے والے خانہ بدوشوں کے مقابلے میں اسے ایک سرحدی صوبے کی حیثیت حاصل تھی۔ شہرستان، یزدگرد اور شہر پیروز کے قلعے بیابان دہستان کے خانہ بدوشوں کے حملوں کا دفاع کرنے کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ علاقے کی حفاظت کے لیے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ ایک لمبی فصیل تیار کرائی گئی تھی۔

اگرچہ ۳۰ھ/ ۵۰-۶۵۱ء میں سعید بن العاص نے شاہ جرجان پر جزیہ عائد کیا تھا

لیکن جرجان پر مسلمانوں کا قبضہ حقیقی معنی میں ۹۸ھ/ ۷۱۶-۷۱۷ء میں یزید بن مہلب کے ہاتھوں ہوا۔ اس وقت اس علاقے پر ایک مرزبان کی حکومت تھی لیکن عملاً سارے اختیارات ایک ترک سردار صول کے ہاتھوں میں تھے۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ جب سوید بن مقرن نے ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں بسطام فتح کیا تو روزبان صول نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرلی۔

دریائے اندرہاز (موجودہ دریائے جرجان) کے کنارے سرکش آبادی کی گوشمالی کے بعد یزید بن مہلب نے شہر جرجان کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے میں اس شہر کو اسی نام کے صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی - چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر خوشحال تھا۔ اس کے اردگرد باغات تھے جن کی آبیاری دریا سے کی جاتی تھی۔ اس شہر کی صنعت میں ریشم سازی خاص طور پر اہم تھی۔ یہ شہر روس جانے والی کاروانی شاہراہ کی ایک منزل بھی تھا۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کے لیے ایک کشتیوں کا پل تھا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر اصل شہر تھا جو شہرستان کے نام سے مشہور تھا۔ بقول المقدسی اس کے نو دروازے تھے۔ مغربی کنارے پر ایک مضافاتی شہر بکر آباد کے نام سے مشہور تھا۔

بحر خزر کے ساتھ کا علاقہ علوی دعوت کے لیے بہت بہتر ثابت ہوا یہی وجہ ہے کہ طبرستان کے علویوں نے جرجان کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔ خاص جرجان میں حضرت محمد بن جعفر صادقؒ کی قبر ہے۔

۳۱۶ھ/ ۹۲۸ء میں مرداویج بن زیاد دیلمیوں کی مدد سے جرجان میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جو تقریباً ایک سو سال تک قائم رہی۔ امیر قابوس بن وشمگیر (۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء تا ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۲-۱۰۱۳ء) کی قبر کا قبہ گنبد قابوس کے نام سے آج بھی اس عہد کی یادگار ہے۔

جب مغول یلغار ہوئی تو جرجان کی آبادی کا خوب قتل عام کیا گیا۔ بقول المستوفی جس نے آٹھویں صدی ہجری/ چودہویں صدی عیسوی میں اپنی کتاب نزہتہ القلوب تحریر کی، رقم کیا ہے کہ جرجان شہر کھنڈروں کا ڈھیر تھا۔

ایک روایت کے مطابق تیمور نے ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء میں یہاں پر دریا کے کنارے ایک محل تعمیر کرایا تھا لیکن جرجان کی پہلی سی خوشحالی دوبارہ واپس نہ آسکی۔

حاجی خلیفہ نے جہان نما میں جو ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ عہد مغول کے بعد جب جرجان دوبارہ آباد ہوا تو اس وقت سے یہاں کی اکثریت غالی شیعوں پر مشتمل رہی ہے۔ دریائے جرجان اور خرم رود کے سنگم سے جوزادیہ بنتا ہے۔ وہاں کھنڈروں کے بڑے بڑے ڈھیروں سے قدیم جرجان کی جائے وقوع کا پتہ چلتا ہے۔

جرجانی، اسمٰعیل بن الحسین زین الدین، ابوالفضائل حسینی ایک طبیب و مصنف جو اسماعیل کے نام سے مشہور تھا۔ ۵۰۴ھ/ ۱۱۱۰ء میں وہ خوارزم چلا گیا۔ اور قطب الدین محمد خوارزم شاہ کے دربار سے منسلک ہوگیا۔ اس نے عربی اور فارسی زبان میں تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب "ذخیرہ خوارزمشاہی" قطب الدین محمد خوارزم شاہ ہی کے نام سے معنون کی ہے۔

اسماعیل نے بعد ازاں اتسز ابن محمد کے دربار سے وابستگی اختیار کرلی۔ جس کے حکم سے اس نے "الخفی العلائی" کی تصنیف کا کام شروع کیا۔ اس کے بعد میں وہ مرو میں جو اتسز کے حریف سلطان سنجر بن ملک شاہ کا دارالحکومت تھا، کے دربار سے منسلک ہوگیا۔

اسماعیل کی تصانیف میں "ذخیرۂ خوارزم شاہ" سب سے عمدہ تصنیف ہے اسے فارسی زبان کا غالباً پہلا دائرۃ المعارف کہنا بجا ہوگا۔ اس میں ساڑھے چار لاکھ کے قریب الفاظ ہیں۔ اس کتاب کا عربی اور ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے عبرانی میں اس کا خلاصہ ملتا ہے۔ اس تصنیف کے علاوہ اس کی تقریباً ایک درجن کے قریب اور تصانیف ہیں۔ عربی زبان میں دنیا کی بے ثباتی پر اس کا ایک رسالہ "المنبتہ" ہے۔

جرجانی علی بن محمد (۷۴۰ھ/ ۱۳۳۹ء - ۸۱۶ھ/ ۱۴۱۳ء) کنیت ابوالحسن المعروف سید شریف۔ ایک عالم دین و مصنف استرآباد کے قریب تاجو میں پیدا ہوئے۔ ۷۶۶ھ/ ۱۳۶۵ء میں وہ قطب الدین محمد الرازی التحتانی سے علم حاصل کرنے کی خاطر ہرات گئے۔ لیکن انہوں نے اپنے شاگرد مبارک شاہ سے جو مصر میں مقیم تھے، تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ ۷۷۰ھ/ ۱۳۶۸ء تک وہ ہرات ہی میں ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد قرمان گئے اور محمد الفناری کی شاگردی اختیار کی بعد میں ان کے ہمراہ مصر گئے اور مبارک شاہ اور اکمل الدین کے درس سے مستفیض ہوئے۔ ۷۷۶ھ/ ۱۳۷۴ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا اور پھر وہاں سے شیراز پہنچے جہاں پر ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء میں شاہ شجاع نے انہیں معلم مقرر کیا۔

جب تیمور نے شیراز فتح کیا تو سید شریف کو اپنے ساتھ ہی سمرقند لے گیا۔ یہاں پر ان کی سعد الدین تفتازانی سے بحثیں ہوئیں۔ تیمور کی وفات کے بعد سید شریف شیراز واپس آگئے۔

سید شریف نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ فارسی زبان میں منطق اور صرف و نحو کی کتابیں لکھیں۔ متکلم کی حیثیت سے انہوں نے فلسفے کو بہت بڑا مقام دیا۔ وہ زمانہ جس سے سید شریف کا تعلق ہے متقدمین کی کتب پر شرحیں لکھنے کا زمانہ تھا۔ انہوں نے ایجی کی "المواقف" پر شرح لکھی۔ فقہ میں سجاوندی کی تصنیف "الفرائض السراجیہ" کی شرح لکھی۔ تفتازانی کی شرح "المطول" پر تعلیقات و حواشی لکھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف "تعریفات" میں نہایت ہی سہل و سادہ زبان اختیار کی ہے۔

بقول بدرالدین العینی "سید جرجانی عالم الشرق اور علامہ دہر تھے۔ فصاحت و بلاغت اور حسن عبادت کے ساتھ ساتھ فن مناظرہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی علمی اور تدریسی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے متبعین اور تلامذہ کی ایک کثیر تعداد تھی۔

Marfat.com

جرجی، زیدان: ایک عیسائی مورخ اور ادیب (دیکھئے "زیدان جرجی")

جَرّاح، بنو: قبیلے طے کی ایک شاخ۔ بقول صاحب "تاج العروس" یہ شاخ جرط بن خالد بن معبد بن عدی افلت طائی کی نسل سے ہے جو فلسطین اور بلقاء کے علاقے میں آباد ہوئی۔ اس علاقے میں الشراۃ کے پہاڑ اور شمالی عرب کے صحرا، جہاں اَجا اور سلمیٰ کی دو پہاڑیاں واقع ہیں، ان کے علاقے میں شامل تھے۔

اس خاندان نے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی اور پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ لیکن اس دوران میں بھی وہ اپنے لیے کوئی ریاست ہی حاصل کرسکے اور نہ ہی کوئی علاقہ اپنا مرکز بنا سکے۔ بزنطیوں اور فاطمیوں کے درمیان ان کے تعلقات عجیب ہی رہے کبھی تو وہ فاطمیوں کے طرفدار ہوتے اور کبھی بزنطیوں کے۔ جب بھی انہیں کسی جانب سے خطرہ محسوس ہوتا تو وہ خوشامد سے کام لینے میں ہرگز ہرگز نہ ہچکچاتے تھے۔ وہ اپنی چال بازیوں سے صرف اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے کہ وہ حج کو جانے والے قافلوں کو لوٹتے رہیں۔

تاریخ کے اوراق میں اس خاندان کے جس فرد کا نام سب سے پہلے آتا ہے وہ دَغفَل بن الجراح ہے جو قرامطہ کا حلیف تھا۔ دغفل کے بعد اس کے بیٹے مفرج نے ۴۰۴ھ/۱۰۱۴ء تک خوب شہرت حاصل کی۔

خلیفہ عبدالعزیز کے زمانے میں جب ایک ترک الپتگین کے خلاف فوج کشی کی گئی اور محرم ۳۶۷ھ/ستمبر ۹۷۷ء میں رملہ کے باہر ایک لڑائی ہوئی۔ الپتگین بھاگ کھڑا ہوا لیکن اپنے دوست مفرج کے قابو آگیا، جس نے اسے خلیفہ کے حوالے کردیا۔ اس کے دو سال بعد وہ عارضی طور پر رملہ پر قابض ہوگیا۔ اس کی یہ حیثیت مصری لشکر کے سردار الفضل نے بھی تسلیم کرلی۔ فضل اور مفرج کے باہمی تعلقات زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے۔ لیکن مفرج نے خلیفہ العزیز کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنے سپہ سالار کو یہ حکم دے کہ مفرج کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اس طرح مفرج کو فلسطین کا مختار کل ہونے کا ایک بار پھر موقع مل گیا۔ اس نے فلسطین میں اپنی تاخت وتاراج کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگلے سال خلیفہ نے اس کی بیخ کنی کے لیے ایک لشکر بھیجا۔ مفرج وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس دوران میں اس نے حاجیوں کے ایک قافلے کو، جو مکہ معظمہ سے حج کے بعد واپس لوٹ رہا تھا لوٹ لیا۔ ۳۷۹ھ/۹۷۵ء میں مفرج نے شمالی عرب میں حجاج کے ایک قافلے کو لوٹا۔ اگرچہ کلیس جو وزیر مصر تھا، مفرج کو بہت خطرناک خیال کرتا تھا۔ اس نے بستر مرگ پر خلیفہ سے درخواست کی تھی کہ اگر مفرج اس کے ہاتھ لگ جائے تو اسے ہرگز معاف نہ کیا جائے۔ لیکن خلیفہ نے درگذر سے کام لیا اور حلب کے خلاف مہم میں حصہ لینے کے لیے بلا بھیجا۔

مفرج نے ۳۸۰ھ/۹۹۰ء میں رملہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس علاقے کو تاخت وتاراج کیا۔ دمشق کے نئے عامل جیش بن صمصامہ نے صور میں علاقہ کی بغاوت فرد کرنے کے بعد مفرج پر حملہ کر کے اسے مار بھگایا۔ مفرج نے بنو طے کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ ۳۹۹ھ/۱۰۰۹ء میں مفرج نے اپنے تینوں بیٹوں علی، حسن اور محمود کو بدولیوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ابورکوہ باغی کے خلاف الحاکم کی مدد کے لیے بھیجا۔

۴۰۲ھ/۱۰۱۲ء میں فاطمی وزیر ابوالقاسم المغربی نے بھاگ کر فلسطین میں مفرج کے بیٹے حسان کی لشکرگاہ میں پناہ لی۔ جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بعد میں بنو جراح نے المغربی کے اکسانے پر رملہ پر قبضہ کرلیا۔ فلسطین پر بنو جراح کا قبضہ صرف دو سال پانچ ماہ رہا۔ ۴۰۴ھ/۱۰۱۳ء کے آغاز میں الحاکم نے فیصلہ کیا کہ بنو جراح کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ان کے خلاف ایک فوج روانہ کی علی اور محمود نے اطاعت قبول کرلی مفرج کا عین اس موقع پر انتقال ہوگیا۔ حسان نے راہ فرار اختیار کی اور اپنی ماں کے ذریعے معافی کی درخواست کی جو منظور کرلی گئی۔ ۴۰۶ھ/۱۰۱۶ء میں اس نے حلب کی مہم میں شرکت بھی کی۔ حسان کے ولی عہد عبدالرحیم سے جو الحاکم کا بھائی اور دمشق کا عامل تھا نہایت خوشگوار تعلقات تھے جو اور بھی زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ حسان کی خواہش فلسطین پر حکومت کرنے کی تھی اس نے اپنے باپ کی طرح بزنطی سلطنت سے برابر رابطہ قائم رکھا۔ جب قیصر ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں حلب کے صالح بن مرداس کے بیٹوں کے خلاف لشکر کشی کی تیاری کر رہا تھا تو حسان نے اس سلسلے میں اپنے قبیلے کی طرف سے اسے مدد کی پیش کش کی۔ قیصر نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ حسان کے اقتدار کو اس ملک میں پھر بحال کردے گا۔ لیکن قیصر کی یہ مہم ناکام رہی۔ حسان نے پھر رافع بن ابی اللیل کے بنو کلب کی مدد سے حوران کے علاقے میں فاطمی لشکر کے خلاف مہم شروع کی۔ لیکن اسے صحرا کی طرف پسپا ہونا پڑا یہاں تدمر کے نواح میں وہ قیصر کے ایک ایلچی سے ملا۔ جس نے اسے بزنطی علاقے کے قریب آباد ہونے پر آمادہ کرلیا۔ چنانچہ بیس ہزار سے زائد افراد اپنے گلوں اور خیموں کے ساتھ انطاکیہ کے نواحی علاقے کی طرف ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں منتقل ہوگئے۔ حسان کو قیصر نے بہت سے تحفے تحائف عطا کئے۔ اور اس کے بیٹے علاف کو دربار میں شرف باریابی بخشا۔ بنو طے نے انطاکیہ کے جنوب مشرقی جانب اپنے خیمے ادج کے قریب نصب کیے۔ حسان نے بزنطیوں کی بڑی شدومد سے مدد کی۔ اس نے قلعہ افاقیہ پر کامیاب حملہ کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس کے علاوہ حاکم کی جبل الرواديث میں قلعہ منیقہ کو سر کرنے میں بھی ان کی مدد کی۔

۵۰۱ھ/۱۱۰۸ء میں ایک شخص ابوعمران فضل بن ربیعہ بن حازم بن الجراح کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے، جو بغداد سے سلجوقی تاجدار کی ملازمت اختیار کرنے آیا تھا۔ شام میں وہ کبھی تو مصریوں کا ساتھ دیتا اور کبھی فرنگیوں کا۔ اس کا یہ طرز عمل دیکھتے ہوئے، دمشق کے اتابک طغتگین نے اسے شام سے نکال دیا۔ بغداد میں اس نے حلہ کے صدقہ زیدی کے خلاف کرنے اور اس صحرا کا راستہ بند کردینے کی پیش کش کی۔ بعد میں وہ انبار چلا گیا۔

اس شورش پسند قبیلے کے متعلق تاریخ میں یہی کچھ واقعات محفوظ ہیں۔ بہرحال چوتھی پانچویں صدی ہجری/دسویں، گیارہویں صدی عیسوی میں شام کی سیاسیات میں اس قبیلے کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ان پر فاطمی کبھی حملہ کرتے اور کبھی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے۔ بزنطیوں نے بھی انھیں ہمیشہ اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے ہمیشہ منافقانہ طرز عمل، غداری اور لوٹ مار کو اپنا طرز عمل بنائے رکھا۔

جَرح وتعدیل: علم حدیث وفقہ کی ایک اصطلاح۔ جرح کے معنی ہیں تنقید کرنا عیب نکالنا اور تعدیل کے معنی ہیں صادق اور قابل اعتبار ثابت کرنا۔

علم حدیث کی اصطلاح میں اس کے معنی راویان حدیث کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی تحقیق کرنا فقہ کی اصطلاح میں اس کے معنی گواہوں کے قابل اعتبار یا ناقابل اعتبار ہونے

Marfat.com

کی چھان بین کرنا ہے۔

حدیث کے راویوں کی یہ چھان بین آنحضورؐ کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکی تھی لیکن فن کی صورت بعد میں لی۔

حدیث میں اس فن میں خدمات سرانجام دینے والوں میں حضرت ابن عباسؓ، انس بن مالکؓ، شعبی، ابن سرین الاعمش، شعبہ، امام مالک، ابن المبارک، ابن عینیہ عبدالرحمان بن المہدی اور یحییٰ ابن معین۔

امام احمد بن حنبل کے عہد میں جرح وتعدیل کا فن پورے کمال پر پہنچ چکا تھا۔

جب دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے دوران میں بہت سی احادیث گھڑی جانے لگیں تو راویوں کے حالات کی تحقیق وتفتیش کی طرف خاص طور پر توجہ دی جانے لگی۔ ان کے اوصاف کے بارے میں لکھا جانے لگا۔ تیسری صدی ہجری نویں صدی عیسوی میں تو اس فن پر کتابیں تصنیف کی جانے لگیں۔ ان تصانیف میں عام طور پر راویوں کے اسماء کی فہرست دی جاتی تھی اور ہر ایک کے نام اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کا ثقہ وغیر ثقہ ہونا بھی درج کیا جاتا تھا۔ سنن (مجموعہ احادیث) میں جن میں احکام کی احادیث ہیں راویوں کے حالات پر حواشی ملتے ہیں۔ جیسے کہ سنن دارمی وغیرہ میں ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں راویوں کی ثقاہت کی چھان بین کو مستحسن اور درست قرار دیا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ راویان حدیث پر جرح کرنے کو مستحسن خیال نہیں کرتے تھے۔ بعد میں جب علم حدیث پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں تو جرح وتعدیل اس علم کا ایک مستقل شعبہ قرار پایا۔

چونکہ آنحضورؐ کے تمام صحابہ معتبر تھے اس لیے ان سے متعلق جرح کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زمانہ مابعد کے راویوں کے بارے میں یہ بات ضروری سمجھی گئی چنانچہ ثقہ راویوں کی چند صفات مقرر کی گئیں۔

صبحی صالح نے اپنی کتاب "علوم الحدیث" میں یہ صفات درج کی ہیں۔

۱۔ وہ مسلمان ہو۔ ۲۔ حافظہ اچھا رکھتا ہو اور صائب العقل ہو۔ ۳۔ سچ (صادق القول) ہو۔ ۴۔ اپنی روایت کے نقص وعیب کو کسی صورت نہ چھپاتا ہو۔ ۵۔ ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہو۔

ابن ابی حاتم الرازی نے اپنی کتاب "الجرح والتعدیل" کے مقدمے میں راویوں کے مختلف طبقات سے بحث کی ہے۔ اس کے مقرر کیے ہوئے طبقات رواۃ اس موضوع پر بعد میں لکھنے والے کے لیے معیار کا کام دیتے رہے ہیں۔

ابن ابی حاتم الرازی نے راویوں کی چند اقسام بتائی ہیں۔ ان کے نزدیک جن راویوں کی احادیث قبول کی جا سکتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ ثقہ یا متقن یعنی بالکل صحیح ضبط کرنے والا۔ ۲۔ صدوق یعنی راست گو۔ ۳۔ شیخ ۔ ۴۔ صالح الحدیث یعنی حدیث میں کھرا۔

استناد کے لحاظ سے کمتر درجے کے راویوں کی چار اقسام ہیں۔

۱۔ لین الحدیث (حدیث میں نرم اور کم کوش) ۲۔ لیس بقوی (روایت میں قوی نہ ہو) ۳۔ ضعیف الحدیث (حدیث میں ضعیف) ۴۔ متروک الحدیث (جس کی احادیث ترک کر دی گئی ہیں) اور ذاہب الحدیث (جس کی حدیث رد کر دی گئی ہو) یا کذاب (جھوٹا)

علمائے حدیث کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں جرح اور تعدیل دونوں موجود ہوں تو جرح کو قوی تر مانا جائے گا۔ کیونکہ جنہوں نے جرح (نکتہ چینی) کی ہے ان کے پاس اس راوی کے بارے میں ایسی اطلاعات موجود ہوں گی جو دوسروں کو میسر نہ تھیں۔ لیکن جہاں تعدیل کرنے والوں پر لازم نہیں کہ اپنی رائے کی تائید میں دلیل پیش کریں وہاں جرح کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنی رائے کی معقول وجہ پیش کریں۔ کیونکہ ضعف کی وجوہ کے بارے میں علمائے حدیث میں اختلاف ہے اس لئے جراح کا فیصلہ اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب اس کے وجوہ بیان کیے جائیں۔

اس بارے میں بھی اختلاف رائے ہے کہ ایک عالم کی جرح وتعدیل کافی بھی ہے یا نہیں کیونکہ گواہوں کو قابل اعتماد قرار دینے کے لیے دو اشخاص کی تصدیق ضروری ہے لیکن بقول ابن صلاح " راوی حدیث کو قابل اعتماد یا ناقابل اعتماد قرار دینے کے لیے ایک شخص کی رائے بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی عدالت، امانت اور ثقاہت مشہور ہو۔

جُرم

جُرم عربی میں اس کے ایک معنی ذنب (گناہ) کے ہیں۔ قرآن مجید میں مجرمین اور مجرمون کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اسلامی شریعت میں جرم کی سزا کی دو اقسام ہیں۔ ۱۔ حد۔ ۲۔ تعزیر۔

حد کا پیمانہ اور اس کے قواعد وضوابط مقرر ہیں۔ جبکہ تعزیر میں حاکم وقت یا قاضی کی صوابدید کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اسے اختیار ہوتا ہے کہ مختلف جرائم کے لیے کس قسم کی سزا دی جائے۔ جرمانہ بھی تعزیر کے ضمن آتا ہے۔ (نیز دیکھیے "تعزیر" "حد")

فارسی میں جرم بمعنی جرمانہ (تاوان) بھی آتا ہے۔

جَرُندَہ

جَرُندَہ ایک شہر۔ ہسپانیہ کے اسی نام کے صوبے کا صدر مقام۔ ولایت قطلونیہ کے چار صدر مقامات میں سے ایک۔

ابتدا میں یہ ایبیریا کا ایک گاؤں تھا جسے بعد میں رومیوں نے ترقی دے کر ایک شہر کی حیثیت دی۔

یہ شہر سمندر سے ۲۵ کلومیٹر دور جبل البرانس کے بیرونی دامن میں ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع ہے۔ جو تیر اور اونا کی ندیوں سے گھرا ہوا ہے۔

یہ شہر چونکہ فرانس اور سپین کے مشرقی راستے پر واقع ہے۔ اس لئے اس کی جائے وقوع دفاعی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہم ہے۔ اس کو مختلف ادوار میں مسلسل حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام محاصروں کا شہر بن گیا۔ اس شہر پر باری باری قوطوں، عربوں، ہسپانیہ کے سرحدی فرانکوں اور قطلونی ارغونیوں کا قبضہ ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے ایک بڑے جنگی قلعے کی شکل اختیار کر لی۔

جب عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں مسلمانوں نے حملے شروع کیے تو انہوں نے جبل البرانس کے دامن کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جرندہ بھی ان مقبوضات میں شامل تھا۔

دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی میں اس مقام پر جو بعد میں ہسپانوی سرحدی علاقے کے نام سے موسوم ہوا کوئی معین سرحد نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جرندہ کے باشندوں نے قرطبہ کے امیر عبدالرحمان اول کی شکست کے بعد ۱۶۹ھ/ ۷۸۵ء میں اپنا شہر فرنگیوں کے حوالے کر دیا تھا جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اب فرنگی برشلونہ کے وسیع علاقے پر قبضہ میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو ۱۷۷ھ/ ۷۹۳ء میں خلیفہ ہشام اول کے سپہ سالار عبدالملک بن مغیث نے جرندہ کا محاصرہ کر لیا اور وہاں کی محافظ فوج کا صفایا کر دیا۔ اگرچہ وہ جرندہ شہر کو فتح نہ کر سکا۔ ۱۷۸ھ/ ۷۹۴ء میں فرنگیوں نے جرندہ اور تعزکی بالائی وادی کے درمیانی کوہستانی علاقے پر قبضہ

Marfat.com

جا پایا اور ایک طویل محاصرے کے بعد برشلونہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۱۲ھ/ ۸۲۸ء میں برشلونہ اور جرندہ پر مسلمانوں نے حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ہسپانیہ کا یہ سرحدی علاقہ اتنا مضبوط کر دیا گیا تھا کہ حاجب المنصور کے برشلونہ پر قبضے کے باوجود مسلمان جرندہ تک نہ پہنچ سکے۔

۴۰۰ھ/ ۱۰۱۰ء میں یہاں کے قطلونیوں کا ایک گروہ خلیفہ محمد المہدی کی معیت میں بربروں سے وادی آرد میں لڑا تھا۔ اس لڑائی میں قطلونیوں کو بری طرح ناکامی اٹھانی پڑی اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ مقتولین میں جرندہ کا اسقف بھی تھا۔

۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء میں فرانس کے فلپ اگسٹس نے جرندہ پر قبضہ کر لیا۔

بعد میں اس شہر کو امیر دی آنا کی بھڑکائی ہوئی خانہ جنگیوں اور فرانس کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کی بناء پر بہت سے محاصروں اور حملوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ہسپانیہ کی جنگ تخت نشینی کے دوران میں اہل جرندہ نے آرچ ڈیوک کی حمایت کا اعلان کیا تو اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی گئی۔ اس کے مصائب و آلام اس وقت انتہا کو پہنچے ہوئے تھے جب جنرل الرز کاسٹرو نے دلیرانہ مقاومت پر کمر باندھی اور یہ شہر پورے سات ماہ تک نپولین کے سپہ سالاروں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔

جرندہ کی آبادی تقریباً ۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

جُرہُم، بنو عرب کا ایک قبیلہ۔ اس کو جُرہَم پڑھنا بھی درست ہے۔ قدیم عرب مستند روایات کے مطابق یہ قحطان کی اولاد سے تھے۔ اس قبیلے نے یمن سے مکہ مکرمہ ہجرت کی۔ پہلے تو یہ لوگ قبیلہ قطورا (عمالیق) سے جنگ میں برسر پیکار رہے پھر اپنے سردار مضاض بن عمرو کے ماتحت بیت اللہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ بنو خزاعہ کے بکر بن عبد مناۃ نے انہیں بیت اللہ سے نکال باہر کیا۔

یہ روایت بھی بنو جرہم کے بارے میں روشنی ڈالتی ہے کہ حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کو بنو جرہم نے اپنی حمایت میں لیا اور حضرت اسماعیل نے اسی قبیلے کی ایک خاتون سے شادی کر لی۔ مختلف روایات سے اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے کہ جرہم ماضی بعید میں ایک خوشحال قبیلہ تھا جو آغاز اسلام سے پہلے معدوم ہو چکا تھا۔

بقول ابن خلدون "جرہم کے نام سے دو قومیں گذری ہیں ایک بنو جرہم تو عاد کے زمانے میں تھے۔ اور یہ قحطان سے بہت پہلے ہوئے ہیں۔ دوسرے بنو جرہم قحطانی نسل سے تھے۔ جنہوں نے حجاز میں حکومت قائم کی۔ جرہم کے بعد اس کا بیٹا یالیل مسند حکومت پر بیٹھا اور اس کے بعد یہ سلسلہ ثعلبہ بن عبد المدان، عبد المسیح، مضاض تک پہنچا۔ اسی قوم میں حضرت اسماعیل مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی شادی بھی اسی قبیلے میں ہوئی تھی۔

بقول ابن حزم اور القلقشندی "جرہم بالکل نیست و نابود ہو گئے تھے اور ان میں سے کوئی باقی نہیں بچا تھا۔"

جُریج ایک صالح اور عابد شخص جو بنو اسرائیل میں سے تھا۔ اس شخص کا قصہ خود آنحضورؐ نے بیان فرمایا ہے اسی وجہ سے اسے حدیث میں جگہ ملی۔

اس قصے کی روایات میں مختلف تفصیلات ملتی ہیں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ جریج ایک نیک آدمی تھا جس پر ایک عورت نے تہمت زنا لگائی اور ثبوت کے طور پر اپنے بچے کو پیش کیا کہ یہ اس کے نطفے سے ہے۔ حالانکہ اس بچے کا باپ کوئی اور تھا۔ جب اس بچے سے خود اس مرد صالح نے پوچھا کہ تیرا باپ کون ہے۔ تو اس نے اپنے اصلی باپ کا نام بتا دیا اور اس طرح وہ شخص تہمت سے بری ہو گیا۔

روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جریج کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ اور آنحضورؐ کے درمیان کا زمانہ تھا۔

جَرِید نخلستانوں کا علاقہ، صحرائے اعظم کا ایک علاقہ جو جنوب مغربی تونس میں واقع ہے۔ اس میں نفطہ، توزر، الودان اور الحمہ کے نخلستان شامل ہیں۔ وسطی زمانہ میں اس کو بالعموم قسطیلیہ کہا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں جرید میں قفصہ، نفزاوہ کو ہی نہیں بلکہ علاقہ قابس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

توزر، نفطہ اور الحمہ تینوں اس سڑک پر واقع تھے جو رومی اور بزنطی سرحد کی طرف جا نکلتی تھی۔

جرید کو عربوں نے دو مرتبہ فتح کیا۔ ۲۶ھ/ ۶۴۷ء میں اسے ابن زبیر نے فتح کیا اور ۴۹ھ/ ۶۶۹ء میں عقبہ بن نافع نے۔ جرید ہمیشہ علیحدگی پسند تحریکوں اور بغاوتوں کا مرکز رہا ہے۔ نویں صدی عیسوی میں جب قسطیلیہ اغالبہ کا ایک صوبہ تھا اور یہاں ان کی طرف سے ایک عمال حکومت کرتا تھا۔ باوجودیکہ اس کی زیادہ تر آبادی اباضی خارجیوں کی تھی۔ یہاں صرف ایک مرتبہ بغاوت ہوئی۔ عربوں کی آبادی اس وقت علاقے میں بہت تھوڑی تھی۔

پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ بڑا خوشحال تھا۔ اس وقت توزر کی حیثیت فی الواقع ایک شہر کی تھی اس کی فصیلوں کے چار دروازے تھے مسجد بہت بڑی تھی۔ اور ملحقہ بستیاں گنجان آباد تھیں۔ بلاد الحضر کی جامع مسجد ۱۰۲۷ء سے ۱۰۳۰ء کے درمیان قیروان کے روایتی طرز پر تعمیر ہوئی تھی۔

نفطہ شہر کی حفاظت کے لیے بھی ایک فصیل تھی۔ اس کی آبادی بہت کثیر تھی اور یہ چار شہروں پر مشتمل تھا جن کے گرداگرد بھی فصیلیں تھیں۔ نفطہ کی آبادی ۱۴۶۰۰ ہے مگر فضا بالکل دیہاتی ہے۔ یہ شہر اتنے قریب قریب تھے ایک شہر میں رہنے والے دوسرے شہر والوں سے گفتگو کر سکتے تھے۔

جرید کے قدرتی وسائل بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں کھجور اول نمبر پر تھی یہاں کے سنگترے اور نیشکر کی بہت زیادہ شہرت تھی بقول البکری "توزر سے ہر روز کھجوروں سے لدے ہوئے ایک ہزار سے زائد اونٹ باہر جاتے تھے۔"

۴۴۵ھ/ ۱۰۵۳ء میں بنو ہلال کے مقدمۃ الجیش نے عابد بن ابی الریث کی سرکردگی میں قسطیلیہ کو لوٹا لیکن تھوڑے ہی عرصے اسے اس ریاست میں شامل کر لیا جو قفصہ کے عامل عبد اللہ بن الرند نے جنوبی تونس میں قائم کی تھی اور جو اس وقت تک قائم رہی جب تک ۰۰۔ ۱۱۵۹ء میں الموحدین نے اسے فتح نہ کر لیا۔ کچھ عرصے بعد جرید ان کوششوں کا مرکز بن گیا جو علی اور اس کے بعد یحییٰ بن غانیہ نے دولت المرابطین کو پھر سے بحال کرنے کے لیے کیں۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری/ تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں بنو حفص کے ماتحت جرید کی حکمرانی ان خاندانوں کے ہاتھ میں تھی جو یہاں پر اپنی موروثی حکومت قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ترکوں نے اور ۱۷۰۵ء سے حسینی سلاطین نے بار بار لشکر کشی کی تا کہ جرید کو اپنے زیر نگیں رکھ سکیں۔ ۱۸۸۰ء میں یہاں فرانسیسی حکومت قائم ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد کئی ایک مقامات پر چاہ کنی سے نخلستانوں کے رقبے میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

جرید میں گیارہ لاکھ سے زائد کھجوروں کے پیڑ موجود ہیں۔ کھجوروں کے سب سے زیادہ بار آور باغ توزر میں ہیں۔ یہاں کی آبادی بارہ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جو

Marfat.com

جریدہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور تونسی صحرا کی سب سے بڑی منڈی ہے۔

جریرؓ بن عبد اللہؓ (ر ۔۔۔ ؟ ۔۔۔ ۵۴ھ/ ۶۷۳ء) صحابی، یمن کے شاہی خاندان کے رکن اور قبیلہ بجیلہ کے سردار ابو عمر کنیت تھی نسب نامہ اس طرح ہے جریر بن عبد اللہ بن جابر بن مالک بن نصر بن ثعلبہ بن جشم بن عوف بن خزیمہ بن حرب بن علی بن مالک بن سعد بن نذیر بن قسر بن عبقر ابن انمار بن اراش بن عمرو بن غوث بجلی۔

بعض روایات کے مطابق آنحضورؐ کے وصال سے ۴۰ روز پیشتر ایمان لائے لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ آپ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ ظاہر ہے آپ آنحضورؐ کے وصال سے چار پانچ ماہ پیشتر ایمان لاتے ہوں گے۔ بقول واقدی آپ رمضان میں مشرف باسلام ہوئے تھے۔

جب آپ آنحضورؐ کی خدمت میں قبول اسلام کے لئے حاضر ہوئے تو آنحضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کیسے آنا ہوا۔ عرض کیا اسلام قبول کرنے آیا ہوں۔ آنحضورؐ نے آپ کے لئے اپنی چادر بچھادی اور فرمایا مسلمانو جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کی عزت کیا کرو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر مجمع کو خاموش کرانے کی خدمت آپ ہی کے سپرد تھی۔

فتح مکہ کے بعد اگرچہ عرب کے تمام قبیلے تقریباً اسلام کے حلقہ اثر میں آچکے تھے لیکن صدیوں کے اعتقاد کی وجہ سے توہم پرستی باقی تھی۔ چنانچہ وہ صنم کدوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے اس وہم کو دور کرنے کے لئے آنحضورؐ نے کئی صنم کدے گرا دیئے۔ یمن کے صنم کدہ ذی الخلیفہ کو جو کعبہ یمانی کے نام سے مشہور تھا ڈھانے کی خدمت جریرؓ کی سپرد ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ایک سو پچاس سواروں کے دستہ کے ساتھ یمن پہنچ کر ذی الخلیفہ کے صنم کدہ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ابھی آپ یمن ہی میں تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن آپ کو اس بارے میں خبر نہ ہو سکی۔ ایک روز یمن کے دو آدمیوں کو حدیث نبوی سنا رہے تھے کہ انہوں نے کہا تم اپنے جس ساتھی کا حال سنا رہے ہو وہ تین روز ہوئے ختم ہو گیا۔ یہ دہشت ناک خبر سنکر آپ مدینہ کو روانہ ہو گئے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں غالباً آپ نے خاموشی کی زندگی بسر کی۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں آپ نے عراق کی فوج کشی میں شرکت کی۔ اگرچہ عراق پر حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت ہی میں فوج کشی ہو چکی تھی لیکن اس سلسلے کی مشہور جنگ واقعہ جسر میں جو حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہوئی۔ مسلمانوں کو نہایت سخت شکست ہوئی اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے اس لئے حضرت عمرؓ نے عراق میں برسرپیکار فوج کی امداد کے لئے تمام عرب قبائل کو جمع کیا اور ہر قبیلے کے سردار کو اس قبیلے کا افسر بنا کر عراق روانہ کیا۔ جریرؓ بجیلہ کے سردار بنے اور اپنے قبیلے کے ساتھ عراق پہنچے اور مقام ثعلبہ پر مثنیٰ بن حارثہ سے جو ایرانیوں کے مقابلہ میں تھے ملے، مقام حیرہ میں مسلمانوں اور ایرانیوں کا مقابلہ ہوا۔ جریرؓ اپنے قبیلے کو برابر جوش دلاتے رہے اور آخر کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

جنگ یرموک میں بھی جریرؓ نے بڑے کارنامے اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ یرموک کے بعد کسریٰ کا پایہ تخت فتح ہوا۔ بعد میں عمرو بن مالک نے جلولاء کی مہم سر کرکے جریرؓ کو چار ہزار مسلح فوج کے ساتھ جلولاء کی حفاظت کے لئے متعین کیا۔

جلولاء کے قریب ہی حلوان جو ایرانیوں کا اہم مرکز تھا بلا کسی خون ریزی کے، اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اہواز کی باری آئی۔ تو یہ مہم بھی جریرؓ کے ہی سپرد ہوئی۔ ایرانی پسپا ہو کر تستر میں قلعہ بند ہو گئے۔ بعد میں تستر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جریرؓ ہمدان کے گورنر تھے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کی بیعت کرلی اور اپنے رقبہ حکومت میں حضرت علیؓ کی بیعت لے کر خلیفہ کے پاس کوفہ چلے آئے۔ جنگ جمل کے بعد جب حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو اپنی بیعت کے لئے خط لکھا تو اس خط کو حضرت امیر معاویہؓ کے پاس لے جانے والے بھی جریرؓ ہی تھے۔ جب اہل شام نے حضرت علیؓ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تو واپس آکر مطلع کیا اور حضرت امیر معاویہؓ کے انتظامات سے بھی مطلع کیا۔ اس پر کچھ دوسرے لوگ آپ سے ناراض ہو گئے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں رکھنے لگے۔ چنانچہ ان باتوں سے بددل ہو کر آپ نے قرقیسیا میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔ پھر آپ نے کسی جنگ میں حصہ نہ لیا۔ نہ ہی آپ جنگ صفین میں شریک ہوئے بلکہ قرقیسیا میں خاموشی کی زندگی بسر کرنے لگے اور یہیں پر وفات پائی۔

آپ کی اولاد میں پانچ لڑکے عمر، منذر، عبید اللہ، ایوب اور ابراہیم تھے

اگرچہ آپ آخری زمانہ میں مشرف باسلام ہوئے اور اس وجہ سے آپ کو فیضان نبوی سے استفادے کا موقع بھی کم ملا۔ لیکن جتنا وقت آپ کو ملا اس سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ آپؓ سے ایک سو کے قریب احادیث مروی ہیں۔ جن میں سے آٹھ متفق علیہ ہیں۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں آپ کے لڑکوں میں منذر عبید اللہ، ایوب ابراہیم اور ان کے علاوہ ابو ذرعہ بن عمر، انس، ابو وائل، یزید بن وہب زیاد بن علاقہ شعبی، قیس بن ابی حازم، ہمام بن حارث وغیرہ ہیں

آپ اتنے حسین تھے کہ حضرت عمرؓ آپ کو امت مسلمہ کا یوسف کہا کرتے تھے

آنحضورؐ آپ کی بہت عزت و توقیر فرماتے تھے۔ جب آپ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے تو آنحضورؐ آپ کے بیٹھنے کے لئے چادر مبارک بچھا دیتے تھے۔ آپ کو دیکھ کر مسکرا دیتے تھے اور غائبانہ ذکر خیر فرماتے۔

جریرؓ کی خوبیوں اور آنحضورؐ کے ان کی توقیر کرنے کی وجہ سے خلفاء اربعہ بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے۔ "خدا تم پر رحمت نازل فرمائے، تم جاہلیت میں بھی اچھے سردار تھے اور اسلام میں بھی اچھے سردار ہو۔"

جزء ٹکڑا، حصہ۔ آسانی اور سہولت کے پیش نظر قرآن مجید کی تلاوت کی خاطر قرآن مجید کو تیس پاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر پارہ ایک جزء کہلاتا ہے۔

جزا بدلہ، صلہ، مکافات۔ یہ لفظ اچھے اور برے اجر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ثواب کے لئے بھی اور سزا کے لئے بھی۔

جزا کا ایک عظیم الشان وقت وہ ہے جو قیامت یا محشر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے جزا اس عالم میں بھی ہے۔ لیکن اخروی زندگی کے لئے خاص طور پر مستعمل ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی جزا و سزا ایک کھلا کھلا رنگ ان نتائج کا ہے جو فی الحقیقت ہر فعل کے ساتھ ساتھ ہر آن یہاں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر وہ نظر انسان سے بسا اوقات مخفی رہتے ہیں۔ بعض وقت بطور نمونہ ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔

آخرت کی زندگی جسے سورۃ بقرہ میں پانچواں اصول مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اس زندگی پر یقین رکھنا یہی ہے کہ انسان جزا و سزا پر کامل یقین رکھے۔ جب ایک انسان ایک فعل کے نتیجے کو برا جانتا ہے تو وہ عموماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اچھا جانتا ہے تو اسے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جزا و سزا پر یقین انسان کو گناہ سے بچاتا ہے اور جب تک اعمال کی جزا و سزا پر یقین کامل نہ ہو اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا مودودی رقمطراز ہیں کہ اس کے معنی ہیں روز جزا کا مالک۔ یعنی اس دن کا مالک جب کہ تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے ان کے کارنامۂ زندگی کا حساب لیا جائے گا اور ہر انسان کو اس کے عمل کا پورا صلہ یا بدلہ مل جائے گا۔ اللہ کی تعریف میں رحمان اور رحیم کہنے کے بعد

Marfat.com

مالک روز جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ نرا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ منصف بھی ہے اور منصف بھی ایسا بااختیار منصف کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہوگا نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔"

جزا و سزا کا ذکر قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے۔

"جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔" (۷: ۱۸۰)

"کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے وہ ان کے چہروں اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: لو اب جلنے کی سزا بھگتو، یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا (۸: ۵۰، ۵۱)

"پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزا چکھو، جو تم کماتے رہے ہو اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے۔" (۱۰: ۵۲)

"اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے گا۔" (۱۴: ۵۱)

"اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا۔" (۱۱: ۱۱۱)

"جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی۔ وہ جنت کے مستحق ہیں۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے۔" (۱۰: ۲۶، ۲۷)

"اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو۔ تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔" (۶۶: ۷)

"بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے .... درحقیقت جہنم ایک گھات ہے، سرکشوں کا ٹھکانا، جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کے دھوون ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ۔ وہ کسی حساب کی توقع نہ رکھتے تھے۔ اور ہماری آیات کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا تھا اور حال یہ تھا کہ ہم نے ہر چیز گن گن کر لکھ رکھی تھی۔ اب چکھو مزہ، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں ہرگز اضافہ نہ کریں گے۔

یقیناً متقیوں کے لیے کامرانی کا ایک مقام ہے، باغ اور انگور اور نوخیز ہم سن لڑکیاں اور چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں کوئی لغو اور جھوٹی بات وہ نہ سنیں گے۔ جزا اور کافی انعام تمہارے رب کی طرف سے۔" (۷۸: ۱۷ تا ۳۶)

"پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی۔ وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔" (۹۹: ۷، ۸)

قرآن و حدیث میں وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومن صالح، مومن خطاکار، مومن ظالم و فاسق، محض کافر اور کافر مفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔

اول یہ کہ کافر و مشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے۔) ضائع کر دیئے گئے۔ آخرت میں وہ ان کا وہاں کوئی اجر نہیں پا سکیں گے۔ ان کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں ان کو مل جائے گا۔

دوم یہ کہ بدی کی سزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہے۔ مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی۔ بلکہ کہیں تصریح ہے کہ ہر نیکی کا اجر اس سے دس گنا ہے اور کہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کر دے۔

سوم یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں تو ان کے چھوٹے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

چہارم یہ کہ مومن صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ اس کی برائیوں سے درگذر کیا جائے گا اور اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ دنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے وہ رزق دیتا ہے اور آخرت میں ان کی جزا دے گا۔ رہا کافر، تو دنیا میں اس کی بھلائیوں کا بدلہ چکا دیا جاتا ہے پھر جب قیامت ہوگی تو اس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی۔" (ابن ماجہ)

آیت "جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔" انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے۔ یوں ہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں۔

جزا کی حقیقت، اس کی مدت اور اس کے مستحقین کے بارے میں جو مسائل ہیں ان میں بکثرت اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ معتزلہ کے عقیدے کے مطابق خدا کی طرف سے خیر کا اجر اور برائی کی سزا لازمی ہے۔ عقلاً بھی یہی سمجھا جاتا ہے۔

معتزلہ بصرہ کی رائے یہ تھی کہ خدا نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ لیکن چاہے تو سارے گنہگاروں کو بخش دے۔

عام عقیدہ یہ ہے کہ مومن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ میں نہیں رہے گا۔ بالآخر خدا اسے نجات دے دے گا۔ جبکہ معتزلہ اور خوارج کی اکثریت اس خیال کی حامی تھی کہ کبیرہ گناہ انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگ میں پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن جاحظ کے نزدیک یہ صرف ضدی منکرین کا مقدر تھا۔

جُزُولی، ابوعبداللہ (م ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء) محمد بن سلیمان بن ابی بکر۔ ایک صوفی اور فقیہ۔ مراکشی سوس میں بربر قبیلہ جزولہ میں پیدا ہوئے۔ انہیں میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی بعد میں فاس چلے گئے اور وہاں مدرسہ صفارین میں داخل ہو کر مزید تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسہ میں ان کا سکونتی حجرہ آج تک محفوظ ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے قبیلے میں واپس گئے، ہی تھے کہ انہیں مجبوراً شمالی مراکش کی طرف چلے جانا پڑا کیونکہ انہوں نے لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لیے ایک ایسے جرم کا اعتراف کر لیا تھا جس کا ارتکاب انہوں نے نہیں کیا تھا وہاں سے سمندر کے راستے بلاد مشرق کی طرف چلے گئے۔ اور چالیس سال وہیں پر گذارے۔ اس عرصے میں وہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کچھ عرصہ بیت المقدس میں رہے۔ اس کے بعد فاس میں واپس لوٹ آئے۔ اپنے اس قیام فاس کے دوران میں انہوں نے اپنی کتاب دلائل الخیرات تالیف کی۔ اس کے بعد سلسلہ شاذلیہ میں بیعت کی اور چودہ سال تک دنیا سے کنارہ کش رہے اور عبادت الٰہی میں مشغول رہے۔ چودہ سال بعد خلوت خانہ سے نکل کر اسفی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں ان کے مریدین کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی حتیٰ کہ شہر کا حاکم انہیں وہاں سے نکال دینے پر مجبور ہو گیا۔

ایک روایت کے جزولی نے اس شہر کے لئے اللہ تعالیٰ سے بددعا کی، جس کے نتیجے میں وہ چالیس سال تک پرتگیزوں کے قبضہ میں رہا۔

ایک اور روایت کے مطابق شہر کے حاکم نے ان کے بارے میں یہ خیال کر کے کہ یہ مہدی ہی ہیں جن کا انتظار ہے۔ انہیں زہر دلا دیا۔ انہوں نے نماز کی حالت میں

Marfat.com

وفات پائی، جس مقام پر ان کی وفات ہوئی سوہ آفوغال تھا۔ ان کے ایک مرید عمر بن سلیمان السیاف نے اس واقعے سے متاثر ہو کر حزو نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اپنے مرشد کا انتقام لینے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے جزولی کی نعش ایک تابوت میں رکھی اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسلسل بیس سال تک وہ اپنے مرشد کی نعش کو ساتھ لئے ضلع سوس کو تاخت و تاراج کرتا پھرا۔ جب شام ہوتی تو وہ اسے ایک جگہ رکھ دیتا۔ اس جگہ کا نام اس نے رباط رکھا ہوا تھا۔ اس کے گرد پہرا لگوا دیتا اور ایک قدآدم وہاں بتی جلتی ہوئی تیل سے بھرے ہوئے پیپے ہی کھڑی رہتی۔ جب ۸۹۰ھ/۱۴۸۶ء میں عمر السیاف قتل کر دیا گیا تو جزولی کی نعش کو حاحتہ کے علاقہ میں دفن کر دیا گیا۔ ستر سال بعد جب سلطان ابوالعباس احمد اعرج مراکش میں داخل ہوا تو اس نے شیخ کی نعش کو قبر کھود کر نکلوایا اس کے ساتھ ہی سلطان کے والد کی نعش بھی نکالی گئی۔ جنہیں مراکش لے جایا گیا اور ریاض العروس کے مقبرے میں پہلو بہ پہلو دفن کیا گیا۔

عوام میں جزولی سیدی بن سلیمان کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا شمار مراکش کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔

جزولی تصوف کے جید عالم ہونے کے علاوہ فقیہہ بھی تھے۔ ابن الحاجب کی "مدونہ" اور "المختصر الفرعی" ازبر تھیں۔

اگرچہ تصوف میں انہوں نے کئی ایک کتب تصنیف کی تھیں لیکن آج کل مندرجہ ذیل کتابیں دستیاب ہیں۔

۱۔ "دلائل الخیرات و شوارق الانوار فی ذکر الصلوۃ علی النبی المختار"

۲۔ حزب الفلاح۔ ۳۔ حزب الجزولی موجودہ دور میں حزب الدائم لا یزول کے نام سے مشہور ہے۔

جزولی، ابوموسیٰ (۔۔۔؟ ۔۔۔ ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) عیسیٰ بن عبدالعزیز بن یللبخت بن عیسیٰ ابن یومریلی بربر قبیلے کا ایک فرد تھا جو جنوبی مراکش کے ایزوکتن میں شامل ہے۔ ابتدائی تعلیم مراکش میں حاصل کی۔ بعد میں مشرق کا رخ کیا اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے شرف یاب ہوا۔ قاہرہ میں مشہور نحوی ابومحمد بن عبداللہ بن بری کے درسوں میں شریک ہوا۔ قاہرہ ہی میں صحیح بخاری شیخ ابو محمد بن عبیداللہ سے پڑھی۔ اپنے قیام قاہرہ میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور فقر و فاقہ کی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔

واپسی میں وہ بجایہ میں کچھ دن کے لئے ٹھہر گیا۔ جہاں اس نے اپنا وقت قواعد عربیہ کے پڑھانے میں صرف کیا۔

۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں اپنے الجزائر کے قیام کے دوران میں اس نے آشیر کے ایک نحوی ابوعبداللہ بن محمد بن قاسم بن منداس کو اپنی کتاب القانون پڑھائی۔ اس کے بعد سمندر پار کر کے وہ اندلس پہنچا اور کچھ عرصہ مریہ میں نحو کی تعلیم دینے میں مصروف رہا۔ ابوالعباس المعزلی نے الموحدون کے سلطان سے سفارش کر کے اسے مراکش کی جامع مسجد میں خطیب کا عہدہ دلایا۔

ابوموسیٰ جزولی نے ازمور میں انتقال کیا۔ بقول ابن قنفذ ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء میں وفات پائی۔

اس کے شاگردوں میں ابن مطیع بن عبدالرحمان الزواوی اور ابوعلی عمر بن محمد الازدی الشلوبینی تھے۔

اس کی تصانیف میں شرح قصیدہ بانت سعاد۔ القانون جو مقدمۃ الجزولیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۔ القانون کی شرح۔ ۴۔ امالی فی النحو۔ ۵۔ شرح الاصول لابن السراج۔ ۶۔ شرح دیوان المتنبی و اختصار ہیں۔

جزیرۃ الخضرا ایک شہر جو سبز جزیرہ کے بالمقابل خلیج پر تنادل کارنیرو اور پونتا دی یورپا کے درمیان واقع ہے۔ اس کو جزیرہ ام حکیم بھی کہا جاتا ہے جو اس عورت کے نام پر ہے جسے موسیٰ بن نصیر سے آزادی پانے کے بعد طارق بن زیاد اپنے ساتھ لے کر اس جزیرے میں داخل ہوا اور بعد میں یہ علاقہ اسے ورثے میں دے دیا تھا۔ شامی سرداروں نے ان بربریوں کو بھی یہیں رکھا تھا۔ جنہیں بلج نے ۱۲۴ھ/ ۷۴۲ء میں اس وقت ان کے سپرد کیا تھا جب وہ بستے بربروں کی ایک بغاوت کو فرو کرنے کے لئے جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں وارد ہوا تھا۔

اس شہر کو جزیرہ جزرا کا نام بھی دیا جاتا رہا ہے۔ رومی عہد میں اس کا نام ایڈپورٹم ایلبم تھا۔

یہ جزیرہ ایک پہاڑی پر آباد ہے جو سمندر پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کی دیواریں ساحل بحر تک چلی گئی ہیں۔

اس علاقے کو مسلمانوں نے رمضان ۹۱ھ/ستمبر، اکتوبر ۷۱۰ء میں فتح کیا تھا اور یہ وہ پہلا مقام تھا جو مسلمانوں نے اندلس میں فتح کیا تھا۔ مسلمانوں نے یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی جو جزیرۃ الخضرا کے جنوب مشرقی سمت سمندر کے کنارے بنائی گئی تھی۔ اس مسجد کو مسجد الرایات (جھنڈوں والی مسجد) کہتے تھے کیونکہ یہاں ان جھنڈوں کے نیچے عرب اور بربر قبائل جو طارق کے زیر فرمان تھے، مشورے کرتے تھے۔ ۲۴۵ھ/۸۶۰ء میں نارمنوں (مجوسیوں) نے اسی مسجد کے بالمقابل صف آرائی کی اور بعد میں اس پر قابض ہو کر اسے جلا دیا تھا۔

عبدالرحمان ثالث نے یہاں پر اپنے فوجی دستوں کے لئے ایک اسلحہ خانہ تعمیر کرایا تھا۔ اس کے سپہ سالاروں نے یہیں سے مراکش کے ادریسیوں کے خلاف فوج کشی کی۔ خلافت اندلس کے موقعہ پر بربروں نے پہلے ۴۰۱ھ/۱۰۱۱ء میں اور پھر ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء سے ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء تک اس کو تاخت و تاراج کیا۔ یہیں اس کے اشبیلیہ سے الحاق سے قبل حمودی خاندان کے محمد اور قاسم نے اپنی خلافت قائم کی۔ ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں جزیرۃ الخضرہ کو معتمد نے یوسف بن تاشفین کے حوالے کر دیا۔ جس نے ہسپانیہ پر فوج کشی کی۔ زلاقہ کے مقام پر الفانسو ششم کو شکست فاش دی۔ یوسف نے فوراً شہر کی حصار بندی کی اور شہر کے گرداگرد ایک خندق کھدوائی اسلحہ اور خوراک ذخیرے قائم کئے اور سپاہیوں کا ایک منتخب دستہ تعینات کیا۔ جب دوسری بار اس نے سمندر پار کیا تو پھر یہیں پر اترا اور الیت کے محاصرے کے لئے یہیں سے روانہ ہوا۔ ۵۴۱ھ/۱۱۴۶ء میں الموحدون کا اس شہر پر قبضہ ہو گیا۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء اور ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں اہل قشتالیہ نے اس شہر کو اور رندہ کے علاقوں کو خوب لوٹا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۲ء میں یہ شہر ابن ہود کے زیر سیادت آ گیا۔ ۶۶۷ھ/۱۲۶۸ء میں الفانسو (فاضل) نے سمندر کے راستے اس شہر کی ناکہ بندی کر دی۔ ۱۲۷۹ء میں مسیحی فوجوں نے یہاں پر ڈیرے ڈال دیئے ۲۱ جولائی ۱۲۷۹ء کو قشتالوی لشکر نے بنومرین کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔ انہوں نے شہر پر دوبارہ دھاوا بول کر اسے سر کر لیا۔ اندلس کی چار مہموں کے دوران میں ابویوسف نے اسی شہر کو اپنی کارروائیوں کا مستقر بنایا۔ اس کے قریب ہی فاس میں قصر البنیہ تعمیر کرایا۔ ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء میں ابوالحسن علی نے جزیرۃ الخضرا کی خلیج میں امیر البحر جینویو کے لشکر کو شکست دی اور شہر میں داخل ہوا۔ اس کے دو سال بعد الفانسو یازدہم نے اس شہر کو فتح کیا۔ ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء میں غرناطہ

Marfat.com

کے سلطان نے اسے دوبارہ تسخیر کرایا اور اس کے استحکامات کو تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن اس کا یہ قبضہ زیادہ دیر نہ رہا۔ کیونکہ چند سال بعد عیسائیوں نے مستقل طور پر اپنی حکومت قائم کر لی انہوں نے مسلمانوں کا بنایا ہوا شہر گرا دیا۔ اس شہر کا الحاق جبل الطارق سے ہو گیا۔ اور ۱۷۵۵ء میں اسے انتظامی طور پر سان روکیو سے علیحدہ نہیں کیا گیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اس شہر نے بہت سرعت سے ترقی کی۔ ۱۹۰۵ء میں یہاں پر ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ جو مراکش کے مسئلے پر غور و خوض کے لیے تھی۔

جزیہ

جزیہ جزا سے مشتق ہے۔ بقول امام راغب اصفہانی اس کا نام جزیہ اس لیے ہے کہ یہ ذمیوں کی جانوں کی حفاظت کا بدل ہے۔

بقول صاحب روح المعانی "کیونکہ اہل ذمہ کو قتل و قتال سے بری الذمہ کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کام کی جزا اور بدلے کے طور پر ان سے جزیہ لیا جاتا ہے۔" پھر آخر میں خوارزمی کا قول نقل کیا ہے یہ "گزیت" کا معرب ہے جس کے معنی فارسی میں خراج کے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک حتیٰ یعطوا الجزیۃ سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ عقد معاہدہ پر قائم رہیں۔ جس طرح تمام حکومتوں کے خزانوں میں ٹیکس دیتے رہنا وفاداری و پابندی قانون کی دلیل ہے۔ اور نہ ادا کرنا بے وفائی و غداری کی۔ اسی طرح جزیہ دیتے رہنا بھی پابندی عہد کی دلیل ہے۔ اور اس کا ادا نہ کرنا نقض عہد کا ہم معنی۔

ابن اثیر نے جزیے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"جزیہ عبارت ہے اس مال سے جس پر اہل کتاب سے حفاظت جان کی ذمہ داری کا معاہدہ طے کیا جائے گویا یہ ذمی کی جان کا بدل ہے۔"

بقول ابن منظور "ذمی کا جزیہ وہ مال ہے جس پر وہ حفاظت اور ذمے داری میں کئے کا معاہدہ طے کرے۔"

مولانا اشرف علی تھانوی کے نزدیک "جزیہ وہ مال ہے جو ذمی پر عائد کیا جاتا ہے جسے خراج یا خراج الراس بھی کہتے ہیں۔"

اسلام کے عہد اولین میں خراج اور جزیہ ایک دوسرے کے مترادف رہے ہیں۔

جزیہ اس وقت واجب ہوتا ہے جب غیر مسلم دشمن ہتھیار ڈال دے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا معاہدہ مذکورہ اسلامی اصولوں کے مطابق طے پا جائے اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی حفاظت و ذمے داری میں آنا قبول کرے۔ جزیے کی وصولی پورا سال گذرنے کے بعد ہو گی۔ اس سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ نیز اگر کوئی ذمی مسلمان ہو جائے تو اس کا جزیہ معاف ہو جاتا ہے۔

ابن اثیر نے ایک حدیث نقل کی ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا مسلمانوں پر کوئی جزیہ نہیں" اس کی تشریح میں اس نے لکھا ہے کہ جب کوئی ذمی مسلمان ہو جائے اور سال کا کچھ حصہ گذر چکا ہو تو قبول اسلام سے سال کے اس حصے کا جزیہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ اسی طرح ذمی کے فوت ہو جانے پر بھی جزیہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

جزیے کی حکمت یہ ہے کہ ایک طرف تو ذمی لوگ کفر پر مصر ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی جان و مال کی حفاظت بھی چاہتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر دارالاسلام کے دفاع میں اور دارالحرب کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس لئے ان کے سامنے ایک آسان متبادل صورت رکھی گئی ہے اور وہ یہ کہ شہری حقوق کے بدلے ذمی لوگ مالی ذمے داری قبول کریں۔ چنانچہ ایک شہری کے طور پر جزیے کی مناسب مقدار انہیں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی ہے کہ چونکہ دارالاسلام کے باشندے اس کی حفاظت و دفاع کے لیے اپنی رغبت سے جان و مال کی قربانی دیتے ہیں اور ایک غیر مسلم سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دارالاسلام سے اسے قلبی وابستگی یا دلی لگاؤ ہو گا اور ظاہر ہے کہ قدرتاً اس کا اندرونی میلان دارالحرب ہی کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس سے سچی قربانی اور کامل امداد کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

جزیہ کی رقم ایسی قلیل مقرر کی گئی ہے کہ اس کا ادا کرنا ان لوگوں پر بار نہ ہو۔ اس کے وصول کرنے کے طریقوں میں بھی نرمی و رفق کی تاکید کی گئی ہے۔ قید اور سزا وغیرہ سے انہیں تکلیف دینا اور ان پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا جائز نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے متعلق کئی ایک تاکیدی احکام اور روایات موجود ہیں۔

حضرت عمرؓ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ کی ایک بڑی رقم لائی گئی۔ آپ نے اسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہوتا ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا۔" محصلین نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی سے وصول کیا ہے۔" آپ نے پھر پوچھا بغیر مارے باندھے؟ انہوں نے عرض کیا "بغیر مارے باندھے" تب آپ نے کہیں جا کر اس مال کو بیت المال میں داخل کرنے کی اجازت دی۔

حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو عکبری پر عامل مقرر کرتے ہوئے ہدایت فرمائی کہ خراج کی تحصیل میں ان پر ایسی سختی نہ کی جائے کہ وہ اپنے گدھے یا اپنی گائیں یا اپنے کپڑے یا دوسری چیزیں فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرنا۔"

حضرت حکیمؓ بن حزام نے فلسطین کے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ تحصیل جزیہ میں سختی کرتے ہیں۔ تو انہوں نے اس سے منع کیا اور کہا کہ میں نے آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو لوگ دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں انہیں اللہ تعالے قیامت کے دن تکلیف دے گا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اسلامی فوجیں حمص (شام) سے ہٹ آئیں تو حضرت ابوعبیدہؓ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر کئی لاکھ کی رقم جزیہ یہ کہہ کر لوٹا دی کہ چونکہ ہم اب تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے یہ جزیے کی رقم ہم بھی نہیں رکھ سکتے۔

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ ان شہری حقوق کے جواب میں ایک ٹیکس ہے جو جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری کی شکل میں انہیں حاصل ہوتے ہیں۔

مسلم آبادی حقوق کے لئے دوسری طرح کے فرائض بجا لاتی ہے۔ یعنی فوجی خدمات مگر غیر مسلم اس سے مستثنیٰ ہو کر صرف جزیے کے مکلف ہوتے ہیں۔ نیز ان باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں پر جو جزیہ عائد کیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ امن و آئین کے پابند ہوں۔ رضا و رغبت کے ساتھ قانون عدل کی اطاعت کریں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے مصارف ادا کریں جو انہیں پر امن زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے۔ ظلم و تعدی سے محفوظ رکھتی ہے انصاف کے ساتھ حقوق تقسیم کرتی ہے۔ قوت والوں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکتی ہے کمزوروں کو قوت والوں کا غلام بننے سے بچاتی ہے اور تمام سرکش عناصر کو اخلاق و انسانیت کا پابند بناتی

قرآن مجید کی آیت جزیہ "ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں۔ اور نہ وہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اور محکوم و مطیع ہونا قبول کریں۔" کی رو سے وجوب جزیہ کی تین شرائط نکلتی ہیں۔ اور اگر ان تینوں میں سے کسی ایک کا فقدان ہوگا تو جزیہ لینا جائز نہ ہوگا

۱۔ یہ کہ مسلمان جنگ کے ذریعے انہیں قوت سے مغلوب کر لیں۔ اس لئے جنہیں قوت سے مغلوب نہ کیا گیا یا وہ قتال کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں جیسے بچے، بوڑھے اور عورتیں، تو ان پر جزیہ عائد نہ ہوگا۔

۲ ۔ وہ اسلامی حکومت کے مطیع و محکوم ہونے پر راضی ہو کر معاہدہ طے کریں۔

Marfat.com

۳ - ذمی کو حفاظت کی ضمانت حاصل ہو لہٰذا اگر جان و مال کی حفاظت نہ ہو تو جزیے کی وصولی کا حق نہیں ہو گا۔

جزیہ عائد کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کافر مسلمانوں کی قوت سے ٹکرانے کی جرأت نہ پائیں اور برضا و رغبت غلبہ اہل اسلام قبول کر لیں۔ اس صورت میں جزیے کی مقدار وہی رہے گی جو طرفین باہمی گفت و شنید سے طے کر لیں گے۔ جیسا کہ آنحضورؐ نے بنی نجران سے ایک ہزار دو سو حلہ ادا کرنے پر معاہدہ کیا تھا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھا کر غلبہ اہل اسلام قبول کر لیں۔ اور امام وقت انہیں اپنے مذہب اور اپنی املاک پر برقرار رہنے کی اجازت دے دے اور ان پر جزیہ عائد کر دے۔

امام احمد کے نزدیک جزیے کی کوئی مقدار متعین نہیں بلکہ وہ امام وقت کی صواب دید پر ہے جب کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دولت مند پر ۴۸ درہم اور متوسط الحال پر ۲۴ درہم سالانہ ہے۔

امام مالک کے نزدیک یہ مقدار چار دینار یا چالیس درہم سالانہ ہے۔ جبکہ امام شافعی کے نزدیک ہر بالغ ذمی پر جزیہ ضروری ہے اور ہر امیر غریب، مرد، عورت، بوڑھے، پاگل اندھے اور راہب پر ایک دینار ہے۔

اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ مذہب کے لحاظ سے جزیہ ادا کر کے حفاظت میں آنے کے مستحق کون لوگ ہیں۔

اہل کتاب اور مجوس سے جزیہ لینے پر تو سب لوگ متفق ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مشرکین عرب کے سوا ہر کافر مشرک سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ مجوسی ہوں یا صابی یا بت پرست، امام شافعی کہتے ہیں جزیہ اہل کتاب و مجوس سے خاص ہے۔ امام مالک نزدیک مرتد کے سوا ہر کافر سے جزیہ لیا جا سکتا ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک جزیہ اہل عجم کے ساتھ خاص ہے خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک۔ اہل عرب خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ان سے صرف اسلام یا تلوار قبول ہے

آنحضورؐ نے یہود و نصاریٰ اور مجوس سے جزیہ قبول فرمایا۔ اور انہیں مذہبی آزادی عطا کی۔ البتہ بت پرست اور مشرک عربوں سے صرف اسلام ہی قابل قبول تھا۔ جزیے سے ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری کبھی قبول نہیں کی۔

حضرت معاذؓ کو جو آنحضورؐ کے عہد مبارک میں یمن کے گورنر تھے آپؐ نے انہیں ہدایت فرمائی۔ یہود و نصاریٰ کو اپنا دین چھوڑنے کی آزمائش میں نہ ڈالا جائے اور ان پر جزیہ عائد کیا جائے۔ ہر بالغ مرد، عورت، غلام اور لونڈی پر ایک دینار یا اس کا مساوی (یمنی کپڑا) واجب ہے۔ جو یہ رقم میرے کارندوں کو ادا کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت و ذمہ داری میں آ گیا۔ اور جو نہ دے گا وہ اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ (نیز دیکھیے "اہل ذمہ")

جسم بدن۔ اصطلاحِ فلسفہ میں جسم اور لاجسم، اللہ، روح اور نفس کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے افکار کے نوفلاطونیت سے متاثر ہونے کا تعلق ہے ان کے ہاں دو خصوصیات پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۔ لاجسم طبعی طور پر بسیط اور غیر منقسم ہے۔ ۲۔ لاجسم اپنی سلبی صفت کے باوجود ایک حقیقی اصول مسبب ہے۔ جبکہ جسم لاجسم کا ایک حاصل ہے۔

بقول امام اشعری ایک شیعی متکلم ہشام بن الحکم (تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی) اس نظریے کا بہت بڑا علمبردار تھا کہ اللہ ایک جسم ہے۔ بایں ہمہ وہ اللہ کا تقابل دنیوی اجسام سے نہیں کرتا تھا۔ بلکہ مجازی مفہوم میں ایک ہستی موجود قرار دیتا تھا جو بسبب خود اپنی ذات سے موجود ہے۔

علم الکلام کے دبستانوں کے درمیان طویل مباحث کے بعد مسلمانوں نے اللہ کی لاجسمیت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن نفس انسانی کی روحانیت کے عقیدے کو جسے بہت سے متکلمین بالخصوص امام غزالی کی تائید حاصل تھی، قبول عام نصیب نہ ہوا۔ ابن حزم نے اپنی کتاب "الفصل" میں نفس فردیہ کو جسم قرار دیا۔ اس لیے کہ یہ دیگر افراد کے نفوس سے ممیز ہے اور اس لیے بھی کہ اسے متعدد ایسی باتوں کا علم ہے جن سے کوئی اور واقف نہیں۔

فلسفیانہ اعتبار سے دیکھا جائے تو جوہریت پسندوں اور ان کے مخالفین میں کم از کم ایک مفروضہ مشترک ہے اور وہ یہ کہ جسم مرکب لاجسم ہے، لیکن کیسے؟ جوہریت پسند متکلمین کے نزدیک جسم نے ایسے چھوٹے چھوٹے ذروں (جواہر) سے ترکیب پائی ہے۔ جن کی مزید تقسیم ممکن نہیں اور جو بجائے خود لاجسم اور ناقابل ادراک ہیں۔ اس کے برعکس ارسطو اور اس کے ہمنوا فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ جسم مرکب ہے۔ ہیولیٰ (مادہ) اور صورت سے اور یہ دونوں بذات خود لاجسم اور ناقابل تقسیم اور ناقابل ادراک ہیں لیکن جسم قابل تقسیم ہے ارسطو کے نزدیک جسم وہ ہے جس کے تین ابعاد ہوں۔ اور جو متصل اور بطور غیر منقسم کمیت ہو۔

اس سوال کا کہ جسم کس طرح معرض وجود میں آتا ہے، جواب یوں دیا گیا ہے کہ جسم نے جسمیت کے ذریعے مادی وجود اختیار کیا ہے۔ جب جسم مطلق یا مادہ ثانیہ اس طرح معرض وجود میں آتا ہے تو محسوس اجسام کے ابعاد اور اس کی دیگر صفات بھی معرض وجود میں آ جاتی ہیں۔ اس طرح لاجسم اور جسم کے درمیان خلیج کو پاٹ دیا گیا ہے۔

بدن، جسد کو جسم کے مترادفات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بدن اور جسد کا اطلاق عموماً انسانی جسم پر ہوتا ہے۔ بدن کا اطلاق عموماً دھڑ پر ہوتا ہے۔

انسان کے اعضاء قدرت نے مقصداً پیدا کیے ہیں۔ ان کے صحیح استعمال اور حفاظت کا نام آداب ہے، جسم کی پاکیزگی اور صفائی واجب ہے اس سے صحت قائم اور طبیعت خوش رہتی ہے۔ روزانہ غسل کرنا تمام دن تر و تازہ رکھتا ہے۔ اس سے صحت قائم اور طبیعت خوش رہتی ہے۔ چہرہ چونکہ انسان کا آئینہ دل ہوتا ہے اس لیے چہرے پر وقار و سکون کی علامت موجود رہنی چاہیے۔ سر ہمیشہ سیدھا رکھنا چاہیے۔ سر کے بال یا تو تمام رکھنے چاہئیں یا پھر تمام منڈوا دینے چاہئیں۔ سفید بالوں کا اکھاڑنا مکروہ فعل ہے آنکھوں کو مٹی اور تیز روشنی سے بچانا اور ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے۔ ہلکی روشنی میں مطالعہ نہیں کرنا چاہیے۔ مطالعہ کرتے ہوئے روشنی بائیں طرف سے آنی چاہیے۔ آنکھوں کو سورج کی طرف دیکھنے سے روکنا چاہیے۔ سبز اور نیلا رنگ آنکھوں کے لیے مفید ہے کانوں میں کوئی چیز پھیرنے سے پردے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کان اچھی بات سننے کے لیے ہوتے ہیں ناک میں انگلی ڈالنا خلاف ادب ہے اس لیے رومال استعمال کرنا چاہیے۔ دانتوں کی حفاظت کے لیے مسواک کرنا لازم ہے۔ دانتوں سے ناخن کترنا، ہونٹوں میں دبانا اور زبان کو ہونٹوں پر پھیرنا بری بات ہے۔ زبان سے گندی بات کہنے سے غیبت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اسے نیک کلمات میں استعمال کرنا چاہیے ہاتھوں سے کھیلنا، منہ پر رکھنا اور بالوں میں پھیرنا خلاف تہذیب ہے انگلیاں چٹخانا اور لوگوں کے سامنے ناخن کاٹنا درست نہیں۔ ہاتھوں سے دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہیے۔ ہر کام دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ پاؤں دھو کر صاف رکھنے چاہئیں اور انہیں برے کاموں کی طرف لے جانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ آداب جسم انسان میں کمالِ حقیقی پیدا کرتے ہیں۔

Marfat.com

جصاص (۳۰۵ھ/۹۱۷ء — ۷ ذوالحجہ ۳۷۰ھ/۱۴ اگست ۹۸۱ء) احمد بن علی ابوبکر الرازی، ایک مشہور حنفی فقیہ۔

۳۲۴ھ/۹۳۵ء میں بغداد پہنچا۔ جہاں پر علی بن الحسن کرخی کے حلقۂ درس میں فقہ کا مطالعہ کیا۔ اپنے قیام بغداد کے دوران میں قرآن و حدیث پر بھی کام کیا اور عاصم، عبدالباقی قانع، عبداللہ بن جعفر الاصفہانی گجراتی اور دیگر اساتذہ سے احادیث کی روایت کی۔ بعد میں اپنے استاد کرخی کی ہدایت پر نیشاپور گئے اور وہاں پر حاکم نیشاپوری کی زیر نگرانی اصول حدیث کا مطالعہ کیا۔ کچھ عرصے بعد جب ان کے استاد کرخی وفات پا گئے تو وہ واپس بغداد چلے آئے اور یہ واقعہ تقریباً ۳۴۴ھ/۹۵۵ء کا ہے۔

بغداد واپس آکر جصاص حنفیوں کے سرگردہ بن گئے۔ انہیں دو مرتبہ قاضی کے عہدے پر نامزد کیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

جصاص نے محدثین اور فقہاء کے درمیان ثالثی کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے شاگردوں میں قدوری ابوبکر احمد بن موسیٰ خوارزمی اور کئی ایک علماء ہیں۔ انہوں نے نیشاپور میں انتقال کیا۔

ان کی تصانیف میں "کتاب الاصول" جو شیبانی کی جامع الکبیر کی شرح ہے۔ "شرح المختصر فی الفقہ" جو امام طحاوی کی المختصر فی الفقہ کی شرح ہے۔ "احکام القرآن" دستیاب ہیں۔

جعدہ (عامر) جنوبی عرب کا ایک قبیلہ۔ ابتدائے عہد اسلام میں جعدہ کے پاس یمن کے پہاڑی سلسلے یعنی سرو حمیر کے انتہائی جنوب کی وہ زمینیں تھیں جن کے شمال میں الضالع اور قعطبہ کے موجودہ شہر اور جنوب میں وادی ابین واقع ہے۔ عدن سے صنعاء جانے والی سڑک جعدہ کے علاقے سے گذرتی تھی۔ ان کے ہمسائے بنو مذحج اور بنو یافع تھے۔ جنوبی عرب کے جعدہ کو ہمدانی نے عین الاکبر کا ایک قبیلہ لکھا ہے ان میں اور شمالی عرب کے قبیلہ جعدہ بن کعب بن ربیعہ میں فرق ہے۔ ہمدانی نے مزید لکھا ہے کہ اس زمانے میں جنوبی عرب کے جعدہ دعوے کرتے تھے کہ وہ جعدہ بن کعب کے جو ان سے زیادہ طاقتور قبیلہ تھا، رشتہ دار ہیں

البکری کے بقول جعدہ بن کعب جنوب کی جانب نجران کے علاقے تک پائے جاتے ہیں۔ اور غالباً اس قبیلے کے مہاجر مغربی نجد سے یہاں آئے اور جعدہ سرو حمیر ان کی انتہائی جنوبی آبادی کے نمائندے ہیں جو مقامی لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

ہمدانی نے جعدہ کے علاقے کے جغرافیائی حالات بھی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

قبیلہ عامر جعدہ کی ایک شاخ ہے آج کل ان کا علاقہ تقریباً وہی ہے جو قدیم دور کے جعدہ کا تھا۔ یہ اس سطح مرتفع پر مشتمل ہے جو عدن سے ایک سو میل شمال میں واقع ہے اور جس کا مرکزی مقام الضالع ہے جو عامری امارت کا صدر مقام ہے۔ قبیلہ جعدہ کے لوگ وادی عد کے علاقے کے اندر بھی رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔ جعدہ اپنی اصل بنو طلال سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ زیادہ دور کے شمالی علاقے سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔

جعفر برمکی: خلیفہ ہارون الرشید کا وزیر۔ (دیکھیے "برامکہ")

جعفر بن ابی طالب (م ۸ھ — جمادی الاولیٰ ۸ھ/۶۲۹ء) ابوعبداللہ کنیت والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ والد کی طرف سے سلسلہ نسب یہ تھا۔ جعفر بن ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی اور والدہ کی طرف آنحضورؐ کے چچیرے بھائی اور حضرت علیؓ کے سگے بھائی تھے اور ان سے دس سال بڑے تھے۔ حضرت عباسؓ نے اپنے بھائی ابوطالب کی عیال داری کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ان کی کفالت اپنے ذمے لی۔ اور انہیں اپنے گھر لے گئے۔ تھوڑے دن بعد ہی حضرت جعفرؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں چوبیسویں، اکتیسویں یا بتیسویں فرد تھے۔

حضرت جعفرؓ مشرکین قریش کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر گئے۔ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس بھی ان کے بعد حبشہ ہجرت کر گئیں۔ جب مشرکین مکہ نے یہ دیکھا اور سنا کہ مسلمان حبشہ میں آرام اور امن و سکون سے زندگی گذار رہے ہیں تو انہوں نے عمرو بن العاص، ابو ربیعہ اور ابن المغیرہ مخزومی کو تحفے تحائف دے کر نجاشی کے دربار میں بھیجا تاکہ نجاشی سے کہہ سن کر مہاجرین کو حبشہ سے نکلوا باہر کریں۔

چنانچہ شاہ نجاشی کے طلب کرنے پر مسلمانوں نے حضرت جعفرؓ ہی کو اپنا امیر بنایا۔ اور انہوں نے عربوں کی جہالت اور آنحضورؐ کی تعلیمات کے بارے میں ایک بہترین تقریر کی۔ وہ تقریر یہ تھی۔

"بادشاہ ہم پر ایک تاریک دور گذرا ہے اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا۔ مردار خوری، زناکاری، قتل و غارت، قطع رحمی ہمارے آئے دن کا مشغلہ تھا۔ ہمسایوں کے حقوق سے ہم بے گانہ تھے۔ رحم و انصاف سے ہم ناآشنا تھے اور حق و باطل کے امتیاز پر ہماری نظر نہ تھی۔ غرض ہماری زندگی سرتاسر درندوں کی سی زندگی تھی۔ قوی، ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتوانوں کو ہضم کر لینے کو اپنے لئے باعث فخر و طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہم میں ایک عظیم الشان پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف ہیں جس کی صداقت، امانت، عصمت پر دوست و دشمن دونوں گواہ ہیں۔ جس کی قوم نے اسے "محمد الامین" کا لقب دیا۔ وہ آیا۔ اس نے ہمیں خدا کی وحدانیت کا درس دیا۔ خدائے واحد کی جانب بلایا۔ اس نے بتایا کہ خدا کا کوئی سہیم و عدیل نہیں ہے۔ وہ شرک سے پاک ہے۔ بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لئے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد کی عبادت، حق عبدیت ہے۔ اس نے ہمیں حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا۔ ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی۔ قتل و غارت کی رسم بد کا خاتمہ کیا۔ زناکاری کو حرام اور فاحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہمیں نجات دلائی۔ نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا۔ جھوٹ بولنے اور ناحق مال یتیم کھانے کو حرام قرار دیا، نماز اور خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہمیں حیوانیت کے قعر مذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مقام پر پہنچایا۔

بادشاہ ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے۔ یہ ہے ہمارا قصور، جس کی بدولت مشرکین کا یہ وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہمیں ان کے حوالے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم توحید سے منہ موڑ کر بت پرستی اختیار کر لیں اور برے کاموں کو اچھا جانیں مکہ میں جب ان لوگوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو ہم نے اے بادشاہ تیرے ملک کا رخ کیا اور یہاں پناہ لی"۔

Marfat.com

انسائیکلوپیڈیا معلومات

(ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے)

فی قسط -/۳ روپے ——— سالانہ -/۳۰ روپے

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

فی قسط -/۳ روپے ——— سالانہ -/۳۰ روپے

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا رنگا رنگ باتصویر

بے بی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

(ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے)

فی قسط ۲/۵۰ روپے ——— سالانہ -/۲۵ روپے

۱۹۷۱ء کی سب سے خوبصورت کتاب

محمد رسول اللہ

ڈاکٹر توفیق الحکیم کی عظیم تصنیف

عطیہ خلیل عرب کا بہترین ترجمہ

قیمت -/۲۵ روپے

۱۹۷۱ء کی سب سے کثیرالاشاعت کتاب

سبز کتاب

اقوال و ارشادات قائداعظم کا حسین مجموعہ

... کے لیے بہترین تحفہ

قیمت -/۲ روپے

جدّت کا امین انقلاب کا ضامن

مکتبہ شاہکار

ہر موضوع کی قدیم و جدید شاہکار جریدی کتب ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو انتہائی باقاعدگی سے پیش کرتا ہے۔

۱	حاجی مراد	۲/۵۰	۲۲	جین آئر	-/۴
۲	لوسٹوڑی	-/۲	۲۳	شکست	-/۳
۳	غبارِ خاطر	۳/۵۰	۲۴	مجبور آوازیں	-/۴
۴	نوٹرے ڈیم کا کبڑا	۲/۵۰	۲۵	شاہنامۂ اسلام (سوم)	-/۳
۵	داراشکوہ	-/۳	۲۶	قائداعظم میری نظر میں	-/۴
۶	رومیو جیولیٹ }	۳/۵۰	۲۷	مقدس نازنین	-/۴
۷	میکبتھ }		۲۸	صحرانورد کے خطوط (دوم)	۳/۵۰
۸	سائنس سے بھی عجیب تر	-/۲	۲۹	خزینۂ معلومات	-/۴
۹	مہمان بہار - آتش رفتہ	-/۳	۳۰	علی گڑھ کے تین نامور فرزند	-/۲
۱۰	آوازِ دوست	-/۳	۳۱	شاہنامۂ اسلام (چہارم)	-/۳
۱۱	بھوانی جنکشن	۲/۵۰	۳۲	محبت عظیم ہے	۲/۵۰
۱۲	پولیس افسر کی ڈائری	۲/۵۰	۳۳	نقوشِ قائداعظم	۲/۵۰
۱۳	شاہنامۂ اسلام (اوّل)	-/۳	۳۴	اردو کی آخری کتاب	۲/۵۰
۱۴	چلتے ہو تو چین کو چلیے	۲/۵۰	۳۵	رحمتِ عالم	-/۲
۱۵	علی اور نینو	۲/۵۰	۳۶	اسرائیل قرآنی پیشین گوئیوں کی زد میں	۳/۵۰
۱۶	تحریک پاکستان	-/۳	۳۷	اردو کے چار مزاحیہ شاعر	-/۲
۱۷	صحرانورد کے خطوط (اوّل)	-/۳	۳۸	پولیس افسر کی ڈائری (حصہ دوم)	-/۳
۱۸	النبی الخاتم	۲/۵۰	۳۹	ذہن کی آزمائش	۳/۵۰
۱۹	شاہنامۂ اسلام (دوم)	-/۳	۴۰	قاسم کی مہندی	۳ ۵۰
۲۰	فردوسِ بریں	۲/۷۵	۴۱	پیغمبرِ صحرا	-/۴
۲۲	ایمانیات	۲/۲۵	۴۲	نوجوان ورتھر کی داستانِ غم	۲/۵۰

۴۳ - بیادِ قائداعظم ۲/۵۰
۴۴ - افلاطون کی "ری پبلک" ۳/۵۰
۴۵ تھیلما -/۴

Marfat.com

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

• مدیرِ اعلیٰ : سید قاسم محمود
• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط (۶۱) وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

شاہکاریہ

موت العالِم موت العالَم

پوری دنیائے اسلام میں یہ خبر انتہائی حزن و ملال کے ساتھ سنی گئی کہ ۵-۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی درمیانی شب فقیہہ شہیر مفسرِ قرآن مفتیِ اعظم پاکستان، تحریکِ پاکستان کے رہنما مولانا مفتی محمد شفیع ۸۲ سال کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

مفتی محمد شفیع صاحب کیا گئے، گویا عالمِ اسلام کی ایک جلیل القدر ہستی ہم سے چھن گئی۔ ان کی ذات فتنوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں ہزارہا مسلمانوں کے لیے سہارا تھی۔ اب یہ سہارا ٹوٹ گیا۔

آپ کی ساری عمر دین کی خدمت میں گزری۔ قیامِ پاکستان سے قبل آپ تقریباً ۲۷ سال تک دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے۔ تدریس کے علاوہ شعبۂ تصنیف میں بھی آپ نے بہت اہم خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے بہت سی کتابیں اور پمفلٹ لکھے۔ آپ کا سب سے بڑا کام قرآن کی تفسیر ہے جو "معارف القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور علمی حلقوں میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ آپ کے فتاویٰ کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔ آپ علمائے کرام کی اس صفِ اوّل کے بزرگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں سے انتقالِ اقتدار کو تقسیمِ اقتدار کے ساتھ مشروط کرنے پر زور دیا تھا تاکہ مسلمان ایک آبرومندانہ زندگی بسر کر سکیں۔

پاکستان آ کر آپ نے کراچی میں دیوبند طرز کا دارالعلوم قائم کیا اور تادمِ آخر اس سے وابستہ رہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد آپ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے صدر بھی رہے۔ حکومتِ پاکستان نے تعلیماتِ اسلامی کے لیے جو بورڈ قائم کیا مولانا اس کے بھی رکن رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے چلے جانے سے پاکستانی قوم ایک بہت بڑی دینی شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔ آپ کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا اس کا پُر ہونا بڑا مشکل ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس رات پاکستان کے مغربی حصے میں علم و عرفان کی یہ شمع گل ہوئی۔ اسی رات اور شاید اسی وقت پاکستان کے سابقہ مشرقی حصے سے بھی ایک اور علم و عرفان کی شمع بجھ گئی اور وہ شمع تھی مولانا اطہر علی خان کی جو جامعہ امدادیہ کشور گنج سے علم کی روشنی پھیلا رہی تھی۔ —— تاریخ میں جب بھی مشرقی پاکستان میں دینِ اسلام کے خادموں کا ذکر آئے گا مولانا اطہر علی خان کا اسمِ گرامی احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ مرحوم انتہائی بلند پایہ، فراخدل، روشن خیال اور متبحر عالمِ دین تھے۔ وہ لادینی قوتوں اور علیحدگی پسند تحریکوں کے راستے کی ایک مضبوط چٹان تھے۔ ان کے انتقال سے بنگلہ دیش کے باشندے ایک عظیم اور بلند مرتبت شخصیت سے محروم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان مرحومین کو اپنے جوارِ خاص میں جگہ دے۔ (آمین)

آپ کا نیازمند : شریف اصلاحی

تاریخ اشاعت : ۱۵ / نومبر ۱۹۷۶ء ناشر

Marfat.com

نجاشی نے حضرت جعفرؓ کی تقریر سنکر درخواست کی کہ تمہارے پیغمبر پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی آیات تلاوت کیں۔

"پس مریمؑ نے بیٹے کی طرف اشارہ کیا، لوگوں نے کہا کہ ہم اس بچے سے جو ابھی گہوارے میں ہے کس طرح بات کریں؟ حضرت عیسٰیؑ نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں خدا نے مجھ پر کتاب نازل کی اور مجھے پیغمبر بنایا ہے۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے مبارک کیا ہے اور جب تک میں زندہ رہوں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ مجھے ظالم اور شقی نہیں ٹھہرایا۔ سلامتی ہے میرے لئے اس روز جب میں پیدا ہوا۔ اور اس روز جب میں مروں گا اور اس روز جب مجھے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔" (۱۹ : ۲۹ تا ۳۳)

نجاشی حضرت جعفرؓ کی تقریر سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان سفیران قریش کو کہا تم لوگ واپس جاؤ، خدا کی قسم میں ان مسلمانوں کو تمہارے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔

حضرت جعفرؓ ہجرت کے چھٹے سال کے بعد تک حبشہ ہی میں رہے اور ۷ھ/۶۲۸ء کو عین فتح خیبر کے روز مدینہ منورہ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضورؐ نے انہیں گلے سے لگایا اور پیشانی چوم کر فرمایا کہ میں نہیں جانتا مجھے جعفرؓ کے آنے سے زیادہ خوشی ہوئی یا خیبر کی فتح سے۔

آنحضورؐ نے جب قیصر روم، خسرو ایران، عزیز مصر اور دوسرے فرمانرواؤں اور رؤسا کے نام دعوت اسلام کے خطوط بھیجے ایک خط شرجیل بن عمرو کے نام بھی بھیجا لیکن شرجیل نے آپؐ کے قاصد حارثؓ ابن عمیر کو شہید کر دیا چنانچہ ان کے قصاص کے لئے آپؐ نے تین ہزار افواج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ اس کا سپہ سالار زیدؓ بن حارثہ کو مقرر کیا۔ اور فرمایا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو جعفرؓ ان کے جانشین ہوں اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ ان کی جگہ لے لیں۔ موتہ کے مقام پر پہنچ کر مسلمانوں کا مقابلہ شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے ہوا۔ یہ غزوہ، غزوۂ موتہ کے نام سے مشہور ہے جو جمادی الاوّل ۸ھ/۶۲۹ء میں پیش آیا۔ امیر لشکر حضرت زیدؓ شہید ہو گئے تو حضرت جعفرؓ نے علم سنبھالا اور دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دشمن کا ہر طرف سے زور تھا۔ چنانچہ ان کا بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ دونوں ہاتھ کٹ گئے۔ لیکن انہوں نے علم مبارک سرنگوں نہ ہونے دیا اور اسے کٹے ہوئے بازوؤں میں لے کر سینے سے چمٹائے رکھا۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی۔ حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ تینوں ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے۔

حضرت جعفرؓ انتہائی دلیر اور نڈر انسان تھے۔ ایک روایت کیمطابق لڑائی شروع ہونے سے قبل انہوں نے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں تاکہ لڑائی سے بھاگنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جو اس غزوہ میں شریک تھے، کہتے ہیں کہ میں نے جعفرؓ کی لاش کو تلاش کر کے دیکھا تو صرف سامنے کی طرف پچاس زخم تھے۔ تمام بدن کے زخموں کا شمار نوے سے زیادہ تھا، لیکن کوئی زخم پشت پر نہیں تھا۔

آنحضورؐ کی آنکھوں کے سامنے میدان جنگ کا پورا نقشہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت جعفرؓ کی خبر آنے سے پہلے ہی صحابہ کے سامنے ان کی شہادت کا حال بیان فرما دیا۔ آپؐ کو بے حد صدمہ ہوا۔ حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو بشارت دی کہ خدا نے جعفرؓ کو کٹے ہوئے بازوؤں کے بدلے دو نئے بازو عنایت فرمائے ہیں اور وہ ان بازوؤں سے ملائکہ جنت کے ساتھ مصروف پرواز رہتے ہیں۔ اسی لئے انہیں جعفرؓ طیار اور ذوالجناحین کہا جانے لگا۔

آنحضورؐ نے حضرت جعفرؓ کے بارے میں فرمایا کہ جعفرؓ تم میری صورت اور سیرت دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو۔ چونکہ بہت فیاض اور راہ خدا میں زیادہ خیرات کرنے والے تھے اس وجہ سے انہیں ابوالمساکین کا لقب بھی دیا گیا تھا۔

جعفرؓ نے دو بار ہجرت کی تھی اس وجہ سے انہیں ذوالہجرتین بھی کہا جاتا ہے ایک ہجرت حبشہ کی طرف اور دوسری مدینہ منورہ کو۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ کے بعد کوئی شخص جس نے جوتا پہنا اور سواریوں پر سوار ہوا اور عمامہ باندھا وہ جعفرؓ سے افضل نہ تھا۔

جَعفَر بن حرب (۔۔۔؟ ۔۔۔ ۲۳۶ھ/۸۵۰ء) کنیت ابوالفضل۔ ایک معتزلی عالم جس کا تعلق دبستان بغداد سے تھا۔ پہلے بصرے میں ابوالہذیل علاف کا شاگرد ہوا۔ بعد میں بغداد جا کر المردار کی شاگردی اختیار کی۔ اس نے زہد و تقویٰ اور تقشف میں اپنے استاد المردار کا اتباع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہوئی کثیر مال و دولت غریبوں میں تقسیم کر دی۔

جعفر معتزلہ کے اس عقیدے کا حامی تھا کہ قدیم ہی سے باری تعالےٰ اپنی ذات کی وساطت سے (بہ ہستہ کا) عالم ہے۔ اس کا علم اس کے وجود کا عین ہے اور جو چیز اس کے علم میں ہے وہ بھی قدیم ہی ہوگی۔ اس کے نزدیک اللہ تعالےٰ کی "حکمت" میں ہمارے لئے اس بات کی ضمانت موجود ہے کہ اس سے ظلم و کذب کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ درحقیقت ہم ایسے "اللہ" کا معقول طور پر تصور ہی نہیں کر سکتے جو واقعۃً "ظلم کا مرتکب ہوتا ہو۔ جو منکر اپنی سعی اور تحقیق سے اللہ کا اقرار کرے وہ اس سے افضل ہے جو عنایت الٰہی سے ایمان لائے

جعفر قرآن مجید کو بھی مخلوق مانتا تھا اور اس کے نزدیک قرآن حادث ہے اور اس کا محل وقوع آنحضورؐ ہیں۔

اس کی رائے میں روح اصلاً جسم سے مختلف ہے اور اس کے ساتھ اتفاقاً جمع کر لی گئی ہے اس کی رائے میں ہم اپنے آخری فیصلے یا ارادے کے مطابق عمل کرتے ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی اور فیصلہ مانع نہ ہو جائے۔

امامت کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ امامت اسے ملتی ہے جو سب سے بڑھ کر اس کا اہل ہو نہ کہ اسے جو نسب کی وجہ سے یہ حق رکھتا ہو۔ اس کے خیال میں آنحضورؐ کے بعد امامت کے زیادہ اہل حضرت علیؓ تھے۔

جعفر بن مُبَشِّر (۔۔۔؟ ۔۔۔ ۲۳۴ھ/۹–۸۴۸ء) الثقفی، القصبی۔ دبستان بغداد کا ایک مشہور و معروف معتزلی عالم ابوموسیٰ المردار کا شاگرد رشید تھا کسی قدر النظام البصری سے متاثر تھا۔ اس کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ اس کے بارے میں صرف یا تو ترک دنیا کے متعلق چند ایک حکایات ملتی ہیں یا یہ بات کہ اس نے عامۃ کو معتزلی عقائد سے روشناس کرایا اور بشر بن غیاث المریسی سے مناظرے کئے۔

جعفر کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ بعد کے زمانے کے ملاحدہ کے سیرت نگاروں نے اس کے شاگردوں اور جعفر بن حرب کے شاگردوں کو جعفریہ کے نام سے معتزلہ بغداد کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

بقول الخیاط فقہ میں اس کا اصول یہ تھا کہ قرآن کے ظاہری مفہوم سنت اور اجماع کی پیروی کی جائے اور رائے و قیاس سے اجتناب کیا جائے۔

جعفر فقہ اور کلام کی بہت سی کتابوں کا مصنف تھا۔ اگرچہ اس کی تصانیف گردش

Marfat.com

رہا لیکن عراق آپ کا وطن نہ بن سکا۔

آپ نے بعمر ۶۵ سال یا ۶۸ سال مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی اور جنت البقیع میں اس قبہ میں دفن ہوئے جس میں حضرت حسن، امام زین العابدین اور امام باقرؓ دفن تھے۔

آپ کی اولاد میں صاحبزادوں میں اسماعیل، عبداللہ، موسیٰ کاظم، اسحٰق، محمد اور عباس تھے اور لڑکیوں میں ام فروہ، اسماء اور فاطمہ الصغریٰ تھیں۔

آپ کا علم و عمل نوع انسانی کی ہدایت کا باعث تھا۔ آپ صبر و شکر، تسلیم و رضا، زہد و تقوے اور عبادت و ریاضت کا نمونہ تھے۔ ہر زمانے کے علماء نے آپ کی شخصیت اور پاکیزہ کردار کے بارے میں اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے

بقول امام نووی۔ لوگ آپ کی امامت و جلالت اور عظمت و سیادت تسلیم کرتے ہیں

ابن حجر مکی کے بقول تمام بلاد اسلامیہ میں آپ کے علم و حکمت کا شہرہ تھا۔

شہرستانی کے نزدیک امام جعفر صادق علم دین و ادب کا سرچشمہ، حکمت کا بحر ذخار، زہد و تقوے میں کامل تھے اور عبادت و ریاضت میں بلند مقام رکھتے تھے دنیا سے نفور، حب دنیا اور شہرت سے بے تعلق تھے۔ اپنے زہد و تقشف کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

بقول عمرو بن ابی المقدام آپ شجر نبوت کا ثمر شیریں ہیں۔

روایت حدیث اور علم حدیث اگرچہ آپ کے خاندان کا طرہ امتیاز تھا لیکن خود امام جعفر سے بکثرت احادیث مروی ہیں۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے سوال کیا گیا کہ جو احادیث آپ روایت کرتے ہیں ان کی سند کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد سے سنی ہیں اور بعض ان کی تحریرات سے مجھے ملی ہیں۔

امام مالک نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے آنحضورؐ کی کوئی حدیث بیان کی ہو اور آپ باوضو نہ ہوں۔

خود آپ کے قول کے مطابق " ابان بن تغلب نے مجھ سے ۳۰ ہزار احادیث نقل کی ہیں"۔

النجاشی نے "رجال" میں لکھا ہے کہ میں نے کوفے کی مسجد میں نو سو شیوخ کو حضرت امام جعفرؑ سے روایت کرتے سنا ہے۔

آئمۂ حدیث و سنن کی ایک جماعت نے امام جعفر سے روایت کی ہے اور ان میں مسلم، مالک، ابو داؤد سجستانی، ترمذی، نسائیؒ، ابن ماجہ، دارقطنی وغیرہ شامل ہیں

اہل تشیع کے یہاں اصول مذہب میں جو چار کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں ان سب جامعین نے امام جعفر سے حدیث روایت کی ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک ان کے رواۃ کی تعداد ۴ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روایات کی تعداد کتنی ہوگی جب کہ رواۃ کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔

فقہ میں بھی اہل تشیع کے نزدیک امام جعفر کا مقام بہت بلند ہے آپ سے بہت سے اقوال مشہور ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا۔ "پانچ قسم کے لوگوں سے پرہیز کرو۔

ایک جھوٹے آدمی سے کیونکہ ہمیشہ اس کے ساتھ دھوکے میں رہو گے۔

دوسرے بے وقوف سے کہ وہ ہر چند تیرا فائدہ چاہے گا لیکن تیرا نقصان کرے گا۔

تیسرے بخیل سے کیونکہ وہ تیرا نہایت قیمتی وقت ضائع کرے گا۔

چوتھے بزدل آدمی سے کہ وہ بوقت ضرورت تجھ سے علیحدہ ہو جائے گا۔

پانچویں فاسق سے کیونکہ وہ تجھ کو ایک [illegible] کے عوض [illegible] بیچ کرے گا۔

جعفرؓ طیار:- جعفرؓ بن ابی طالب کا لقب۔ (دیکھئے "جعفرؓ بن ابی طالب")

جعفر میر

نواب سراج الدولہ کی افواج کا سپہ سالار جو نواب سے غداری کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء تا ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء اور ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء تا ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء تک نواب آف بنگال رہا۔ وہ سید احمد النجفی کا بیٹا تھا۔ اس کی شادی بنگال کے صوبیدار علی وردی خان کی سوتیلی بہن شاہ خانم سے ہوئی تھی۔

علی وردی خان کی ملازمت میں وہ کٹک کا نائب ناظم اور مدناپور و ہگلی کا فوجدار تھا۔ جب علی وردی نے مسند سنبھالی تو اس نے جعفر کو بخشی افواج مقرر کیا۔ اس نے کئی ایک لڑائیوں میں کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء میں بھاگیرتی کے کنارے اس نے مرہٹہ سردار بھاسکر پنڈت کو شکست دی۔ ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء میں ہگلی کے جرمن تاجروں کی شوریدہ سری کو اس بہتر انداز سے کچلا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس علاقے سے چلے گئے۔

۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں جب اس کو مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کا حکم ملا تو اس نے اس حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بردوان پر حملہ کر دیا۔ اس حکم عدولی کی بنا پر اس کو تمام مناصب سے الگ کر دیا گیا لیکن اگلے ہی سال ان تمام مناصب پر دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ ۱۱۶۳ھ/۱۷۵۰ء میں اس نے میر حبیب اور اس کے مرہٹہ حلیفوں کے خلاف ایک معرکے میں کامیابی حاصل کی۔

میر جعفر ایک بے اصول اور جاہ طلب شخص تھا۔ اس کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ اس نے ایک بار اپنے محسن اور سرپرست علی وردی خان کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ علی وردی خان کی وفات کے بعد جب اس کا نواسہ سراج الدولہ تخت پر بیٹھا تو اس نے ایک بار پھر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اس نے سراج الدولہ کے خالہ زاد بھائی شوکت جنگ سے جو مدعی حکومت تھا خفیہ طور پر خط و کتابت کے ذریعے اسکو حکومت کے لئے اکساتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شوکت جنگ جیسے نااہل اور کمزور انسان کے برسر اقتدار آ جانے کی وجہ سے حکومت کا سارا نظم و نسق خود اس کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ لیکن میر جعفر کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور شوکت جنگ سراج الدولہ کے ہاتھوں جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد میر جعفر نے انگریزوں سے جوڑ توڑ شروع کی جو سراج الدولہ سے شکست کھانے کے بعد ہندو سیٹھوں اور غدار مسلمان امراء کو ساتھ ملا کر ایک ایسے شخص کو نواب آف بنگال بنانا چاہتے تھے جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کا کام دے سکے۔ چنانچہ ۴ جون ۱۷۵۷ء کو اس کے اور انگریزوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا جس کے مطابق یہ بات طے پائی کہ انگریزی افواج کی مدد سے سراج الدولہ کو معزول کر کے میر جعفر کو مسند حکومت پر بٹھایا جائے۔ اور اس کے معاوضے میں میر جعفر انگریزوں کے تمام فوجی اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ دو کروڑ روپے بطور ہرجانہ کلکتے کے سوداگران کو ادا کرے گا۔ نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کو مزید مراعات دے گا۔ جب سراج الدولہ کو اس معاہدے کا علم ہوا تو اس نے میر جعفر کو معزول کر دیا۔ لیکن جب جگت سیٹھ جیسے غداروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ جعفر کے بغیر انگریزوں سے مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے تو سراج الدولہ نے اسے دوبارہ بحال کر

Marfat.com

نے میر جعفر، دراصل اس کے ساتھیوں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ انگریزوں کے مقابلے میں نواب کا ساتھ نہ دیں گے اور دل و جان سے ان کا مقابلہ کریں گے۔

چنانچہ ۲۳ جون ۱۷۵۷ء میں جب پلاسی کے میدان میں کلائیو کے زیر قیادت انگریزی فوج نے سراج الدولہ کا مقابلہ ہوا تو عین اس موقع پر جب کہ میدان جنگ سراج الدولہ کے ہاتھ میں تھا میر جعفر کی غداری کے سبب انگریزوں کا پلہ بھاری ہوگیا اور اس طرح میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ سراج الدولہ مرشد آباد لوٹ گیا وہاں سے عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں میر جعفر کے داماد میر قاسم کے ہاتھوں گرفتار ہوکر مرشد آباد لایا گیا جہاں پر میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور میر جعفر کو نواب بنا دیا گیا۔

میر جعفر نہ تو ذہین تھا اور نہ مستعد حکمران۔ اس میں اصول جہانبانی کا فقدان تھا اپنے دور حکومت میں تمام عرصہ وہ برائے نام نواب رہا۔ اور اصل اقتدار کلائیو کے ہاتھوں میں تھا۔ اسے ابتدا ہی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خزانہ تقریباً خالی تھا۔ تخت نشینی کے وقت جعفر مالی لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ انگریزوں سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرسکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس سلسلے میں اسے یہ آسانی دینے میں رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ نصف رقم ۳۱ اکتوبر ۱۷۵۷ء تک اور بقیہ رقم تین سال کے عرصے میں ہر چھ ماہ بعد مساوی اقساط میں ادا کردے۔ چنانچہ مسند نشینی کے فوراً بعد اس نے روپوں اور اشرفیوں سے پوری کشتی بھر کر کلکتے کی طرف روانہ کی جس میں ۲۵ لاکھ روپیہ ثابت جنگ کرنل کلائیو کا حصہ تھا۔ اس نے کمپنی اور کمپنی کے اہلکاروں کی طمع پوری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں میں کلائیو کا گدھا کے نام سے مشہور ہوگیا۔

اس نے شروع شروع میں کمپنی کو ۲۲،۱،۹۶۰ روپے دیئے۔ ۹ اگست ۱۷۵۷ء کو مزید ۱۶،۵۵،۳۵۸ روپے دیئے۔ ۳۰ اگست ۱۷۵۷ء کو جو سونا اور جواہرات دیئے اس کی مالیت ۱۵،۹۹،۳۷ روپے تھی۔ کلکتہ کونسل کے ارکان نے ان نذرانوں کے علاوہ میر جعفر سے کثیر رقوم حاصل کیں۔ ان معاملات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میر جعفر اپنے مالی مسائل سے سخت پریشان ہوگیا۔ اس کے پاس سپاہیوں کی تنخواہ دینے کے لئے خزانے میں کچھ نہ تھا۔ اس پر اکثر سپاہیوں نے بغاوت کردی۔ دوسری طرف انگریزوں کو مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی اور شجاع الدولہ والی اودھ کے مقابلے کے لئے مزید رقم کی ضرورت محسوس ہوئی تو کمپنی نے بقیہ اقساط کی وصولی کے لئے میر جعفر پر زور ڈالا۔ اور جب وہ انگریزوں کی توقعات پوری نہ کرسکا تو انہوں نے اس کو معزول کردیا۔ اور اس کی جگہ اس کے داماد میر قاسم کو بٹھا دیا۔ لیکن ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں میر قاسم کو معزول کرکے دوبارہ میر جعفر کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن اس کے آخری ایام اطمینان و سکون سے نہ گذر سکے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی آخری عمر میں افیون و حشیش کا عادی ہوگیا تھا اور آخرکار جذام کے مرض میں مرگیا۔

اس نے اپنی قوم سے جو زبردست غداری کی تھی اس کی سزا اسے اس طرح بھگتنی پڑی کہ اس گناہ عظیم کے لئے تاریخ اور دنیائے انسانیت اسے غدار کے نام سے یاد کرتی ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اسی کے بارے میں یہ شعر کہا ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ دنیا ننگِ دین ننگِ وطن

جعلیون

جعلیون تا قبائل کا ایک گروہ۔ جس کا تعلق جمہوریہ سوڈان سے ہے۔ اس گروہ کے بڑے بڑے قبیلے زیادہ تر جعفری ہیں اور دریائے نیل کے کناروں پر علاقہ دنقلہ سے جنوب کی جانب سبلوقہ تک آباد ہیں۔ ان کے نسب نامے کے بارے میں یہ روایت کی جاتی ہے کہ ان کے اس نام کا بانی ایک شخص ابراہیم تھا جو جعل کے لقب سے مشہور تھا۔ اگرچہ کردفان اور دوسرے مقامات کے دیگر قبیلے اور برادریاں بھی اپنے آپ کو اسی گروہ سے وابستہ کرتی ہیں۔ اس گروہ کے شمالی قبیلے ابھی تک ایک نوبی بولی بولتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر اس گروہ میں مشترک عنصر غالباً نوبی خون کی آمیزش ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ان لوگوں نے وادی نیل سے بار بار نقل مکانی کی اور غالباً اسی وجہ سے سوڈان کے دیگر حصوں میں بھی متعدد قبائل نے جعلی نسل ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ بعض روایات میں ابراہیم جعل کو حضرت عباسؓ کی اولاد بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس روایت کا معاملہ صرف اس حد تک ہے جس طرح زمانہ مابعد کے افراد خود نمائی کی خاطر اکثر ایسی روایات وضع کرلیا کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں جعلیوں کا لقب عموماً ایک مخصوص قبیلے کو دیا جاتا ہے جو دریا کے قریب انتہائی جنوبی جانب رہنے والے قبائلی گروہ میں سے ہے اور جس کا علاقہ اتبرہ اور نیل کے سنگم اور آبشار سبلوقہ کے درمیان واقع ہے۔

فنج کے دور میں جعلیون اپنے جنوبی پڑوسیوں عبداللاب کے تابع تھے۔ جن کا موروثی سردار و دجیب سلطان سنار کے تحت عرب قبائل کا رئیس اعلیٰ تھا۔ دسویں صدی ہجری سولہویں صدی عیسوی کے اواخر سے ترکی و مصری فتح کے زمانے تک یہ قبیلہ خاندان سعداب کے سرداروں کے ماتحت رہا۔ جن کا صدر مقام شندی نیل کے دائیں کنارے پر واقع تھا۔

۱۷۷۲ء میں جب بروس یہاں پر آیا تھا تو اقتدار کی اصلی مالک عبداللابیہ شہزادی تھی۔ ان سرداروں کو مک کہا جاتا تھا۔ آخری مک نمر محمد کی حکومت جعلی قبیلے کے عبداللاب کی حکومت سے کہیں زیادہ باوقار تھی۔

بقول برکھارٹ جو یہاں پر ۱۸۱۴ء میں آیا تھا۔ "مشرقی جغرافیائی سوڈان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز شندی تھا۔ اور یہاں پر اندرون مصر اور بحر احمر سے آنے والی سڑکیں آ کر ملتی تھیں۔" ترکی اور مصری حملے کے وقت مک نمر محمد نے اسماعیل کامل پاشا کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ لیکن اگلے سال ہی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں جب اسماعیل سنار سے واپس آیا تو غلاموں کے بارے میں دونوں میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور اسماعیل اس جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کے نتیجے میں جعلیون اور ان کے جنوب کے قبائل میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ اس بغاوت کو کردفان سر عسکر محمد خسرو بے نے بڑی خونریزی کے بعد فرو کیا۔

جعلیون نے جو تیز فہم اور تجارت میں اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتے تھے۔ ترکی اور مصری حکومت کے تحت خوب دولت کمائی۔ انتشار کے دور میں بہت سے جعلیون کردفان اور دارفور میں آ بسے۔ خاص طور پر حبشی عربوں کی جنوبی پٹی میں جہاں چھوٹے چھوٹے سوداگروں کے لئے حالات بہت سازگار تھے اور چونکہ ان سوداگروں کا غلاموں کی تجارت میں بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ اس لئے گورنر جنرل گورڈن پاشا نے ۱۸۷۹ء میں ان کے خلاف سخت کارروائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ مہدی کے مددگار بہت سے دور انتشار کے جعلیون تھے۔ مہدی کے

Marfat.com

حکومت کے ابتدائی برسوں میں جعلیون اور دریا کے قریب کے دوسرے قبائل پیش پیش رہے۔ لیکن خلیفہ عبداللہ نے سیاسی اقتدار رفتہ رفتہ بقارہ کی طرف منتقل کر دیا۔ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں مصر و برطانیہ کی مشترکہ اور باقاعدہ حکومت کے زمانہ قیام میں جعلیون نے تعلیم و تجارت کے روزافزوں موقعوں سے فائدہ اٹھایا۔ آج کل یہ قبائل موجودہ جمہوریہ سوڈان کے علاقوں میں ہر جگہ آباد ہیں۔

جغرافیہ یونانی لفظ جیوگرینی کا معرب، زمین کی مساحت و پیمائش زمین کے بیان کا علم۔ وہ علم جس کے پڑھنے سے دنیا کی موجودات قدرتی اور مصنوعی کا حال معلوم ہو۔

جغرافیہ کی اصطلاح سب سے پہلے رسائل اخوان الصفا میں نقشۂ عالم کے معنی میں استعمال ہوئی تھی۔

علم جغرافیہ میں کرہ ارض کے خط و خال، زمین، پانی، آب و ہوا، نباتات، حیوانات اور انسان کے آپس کے تعلقات سے بحث ہوتی ہے اس علم کی خاص خاص شاخیں یہ ہیں طبعی، نباتاتی، حیواناتی، اقتصادی، تاریخی، ریاضیاتی، طبقاتی اور سیاسی یا ملکی۔

المقدسی نے "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" جغرافیے کے بیشتر پہلوؤں سے بحث کی ہے اور وہ اس کی جامعیت کے تصور کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔

اسلام سے قبل عربوں کی جغرافیائی معلومات بعض روایتی اور قدیم جغرافیائی تصورات یا جزیرۂ عرب کے مقامات اور آس پاس کے علاقوں کے مقامات کے ناموں تک محدود تھیں۔ یہ معلومات جن تین بنیادی ماخذوں میں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں ۱۔ قرآن مجید۔ ۲۔ احادیث نبوی۔ ۳۔ قدیم عربی شاعری۔ قدیم عربی شاعری میں جو جغرافیائی تصورات و معلومات موجود ہیں۔ ان سے اسلام سے قبل کے عربوں کے ان جغرافیائی مظاہر کے مفہوم اور ان کے علم کی حدود کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں جغرافیہ اور کائنات کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں۔ ان کے لیے صحابہ کرام سے منسوب ایسی روایات بھی موجود ہیں جنکا تعلق کائنات، جغرافیے اور دیگر متعلقہ مسائل سے ہے۔ یہ روایات بعض جغرافیہ دانوں نے اپنی کتابوں میں قابل اعتماد علمی ذخیرے کے طور پر پیش کیں۔ جب اسلام افریقہ اور ایشیا میں پھیلا تو عربوں کو معلومات جمع کرنے اور ان مختلف ممالک کے بارے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے اور اس طرح مسلمانوں کے علم جغرافیہ نے ترقی کی۔ اس ترقی میں قرآن مجید، فن حدیث و رجال اور عام تحقیقی و مشاہداتی ذوق نے بڑا حصہ لیا۔

مسلمانوں کے علم جغرافیہ میں زیادہ وسعت عباسی عہد کے آغاز اور بغداد کے دارالخلافہ بن جانے کے بعد ہی پیدا ہوئی۔ ایران، مصر اور سندھ کی فتوحات نے ایک طرف تو عربوں کو قدیم تمدن کے ان وارثوں کے علمی و ثقافتی سرمائے سے براہ راست مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اور دوسری طرف ان علاقوں کے علمی مراکز تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں ان کے قبضے یا علم میں آگئیں۔

اس دور میں مسلمانوں نے غیر ملکی زبانوں کے علمی ذخائر کو حاصل کر کے انہیں عربی زبان میں منتقل کیا۔ چنانچہ ہند کی جغرافیائی و فلکیاتی معلومات سنسکرت کی کتاب "سوریہ سدھانتا" کے عربی میں ترجمہ ہونے کی وجہ سے عربوں تک پہنچیں۔

ان متعدد تصورات میں جن سے عرب علماء متعارف ہوتے اکیا مبحث کا یہ نظریہ بھی شامل تھا۔

عربوں کے جغرافیائی ادب سے اس امر کی کافی شہادت ملتی ہے کہ عربی جغرافیہ و نقشہ نویسی پر ایران کے اثرات بھی ہیں۔ ایران کے بہت سے جغرافیائی تصورات و روایات کو عربوں نے اپنایا۔ ایرانی روایات سے عربوں کی جہاں رانی اور اس سے متعلق ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ عرب نقشہ سازی پر بھی فارسی اثرات ظاہر ہیں۔

یونانیوں کا علم جغرافیہ اور علم ہیئت کس طرح عربوں میں منتقل ہوا۔ اس کے متعلق ہمیں مقابلۃً زیادہ مواد دستیاب ہے۔ اس عہد میں جغرافیہ بطلیموس کا ترجمہ کئی بار ہوا۔

اگرچہ علاقائی اور بیانی جغرافیے نیز نقشہ سازی میں فارسی اثرات واضح تھے لیکن یونانی اثرات عملی طور پر عرب جغرافیے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہوگئے۔ عرب جغرافیے کی یونانی بنیاد سب سے زیادہ ریاضیات، طبیعیات اور انسانی و حیاتی جغرافیے کے میدان میں نمایاں رہی۔

دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی تک عرب ماہرین فلکیات و فلسفہ نے اپنے تجربات اور نظریاتی مباحث کے ذریعے ریاضیاتی و طبعی جغرافیے میں بھی نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ عرب جغرافیہ نگاروں نے جن ممتاز عرب فلاسفہ اور ماہرین فلکیات کی کتابوں سے استفادہ کیا یا ان کے نظریات سے بحث کی ان میں یعقوب بن اسحاق الکندی خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ جغرافیے کی دو کتابوں کا مصنف ہے۔ ۱۔ "رسم المعمور من الارض"۔ ۲۔ "رسالۃ فی البحار والمیاہ والجبال" ہے۔

ابن خرداذبہ نے جس کو بابائے جغرافیہ کہنا بجا ہے۔ عربی زبان میں جغرافیہ نگاری کے اسلوب اور نمونے کی بنیاد ڈالی۔ دبستان عراق کے ضمن میں ابن خرداذبہ، یعقوبی، اور مسعودی کی کتابیں اس دبستان کے دوسرے مصنفین سے بعض باتوں میں ممتاز ہیں

قدامہ بن جعفر الکاتب نے "کتاب الخراج و صنعۃ الکتابۃ" کا بارہواں باب عہد بنو عباس میں ڈاک کی منزلوں اور راستوں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اس کے نزدیک اس تصنیف کا اصل مقصد مملکت اسلام اور اس کی سرحدوں کا بیان تھا۔ اس کے جغرافیہ میں اسلامی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی رجحان بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً سرحدوں کا دفاع۔ وہ عمومی اور طبعی جغرافیے سے بحث کرتا ہے۔

"الاعلاق النفیسہ" جو ابن رستہ کی تصنیف ہے اس لحاظ سے ابن قدامہ کی کتاب کے مشابہ ہے کہ اس کے علاقائی جغرافیے کے آغاز ہی میں مکہ مدینہ کا بیان ملتا ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ممالک کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں جو عالم اسلام کی حدود سے باہر واقع تھے۔ اس نے ریاضیاتی جغرافیے سے باقاعدہ اور مفصل طور پر بحث کی ہے۔ بالکل اسی کے تتبع میں ابن الفقیہ نے بھی اپنی کتاب "البلدان" میں جغرافیائی مواد کو علاقائی بنیادوں پر پیش کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی ایک مشہور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار سیاح اور ممتاز جغرافیہ نگار بھی تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا لکھا ہوا سفرنامہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ لیکن اس کی دوسری تصانیف سے اس کی سیاحت کے بارے میں ایک سرسری سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے جغرافیے کو تاریخ کا ایک جزو قرار دیا ہے۔

عمومی جغرافیے پر لکھنے والوں کے دوسرے بڑے گروہ میں الاصطخری، ابن حوقل المقدسی اور ابوزید احمد بن سہل البلخی شامل ہیں۔

دبستان بلخ کے جغرافیہ نویسوں نے عربی جغرافیے کو صحیح معنوں میں اسلامی رنگ دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بلاد اسلامیہ تک محدود رکھا۔ انہوں نے جزیرہ عرب کو وسط عالم قرار دیا۔ الاصطخری، ابن حوقل اور المقدسی نے پہلی بار جغرافیائی اصطلاح میں ملک کا تصور پیش کیا ہے اور دنیا کی چار عظیم سلطنتوں کی سرحدیں متعین کرنے کے ساتھ ساتھ ہر

Marfat.com

ملک کی حدبندی کی ... چنانچہ دبستان بلخ کے تصورات کی اشاعت کا سب سے زیادہ ذمہ دار اصطخری ہی تھا۔ اس نے طویل سیاحتیں کیں اور اپنے تجربات سفر کو "المسالک والممالک" میں قلم بند کیا ہے۔ یہی کتاب بعد میں فارسی کتب جغرافیہ کی بنیاد ...

ابن حوقل کو بچپن ہی سے جغرافیے میں بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس نے طویل سیاحت کی۔ اس نے اپنی کتاب "صورۃ الارض" ۳۶۶ھ/۹۷۷ء میں مکمل کی۔ اس نے نئی معلومات کا اضافہ کیا جو کئی صدیوں تک جغرافیہ نگاروں کے لیے ایک مستند ماخذ بنی رہیں۔

صاحب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" المقدسی اپنے زمانے کا صحیح جغرافیہ دان تھا۔ اس نے عربی جغرافیہ کو ایک نئی بنیاد پر استوار کیا اور اسے ایک نیا مفہوم اور وسعت دی۔ اس نے اپنے سے پہلے جغرافیہ نگاروں سے نہایت ضروری باتیں اخذ و مستعار لیں۔

اسی دور کے جغرافیائی ادب اور سفرنامے وجود میں آئے۔ جن سے علاقائی و بیانی جغرافیے سے متعلق عربوں کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ عربوں نے دو خطے دریافت کیے۔ جن کے بارے میں انہیں علم ہی نہیں تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے ان علاقوں کے انکشاف کی بھی کوشش کی۔ جن کے بارے میں وہ نظریاتی معلومات رکھتے تھے۔

اس دور کی ایک امتیازی خاصیت یہ ہے کہ اس دور میں عربوں میں تحقیق و تجسس اور انکشافات کی روح بیدار تھی۔ لیکن ملاحی ادب، جس کا اکثر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ یونانی اور دیگر ماخذ سے حاصل شدہ نظریاتی معلومات کی تردید کے طور پر وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریے اور عمل تجربے میں بعض اوقات تضاد پیدا ہو جاتا تھا۔ اور اسی مسئلہ کا سامنا عرب جغرافیہ دانوں اور سیاحوں کو کرنا پڑا۔ نظریے اور تجربے کے مابین یہی تصادم تھا۔ جس کے باعث بعد کے دور میں عرب جغرافیے کے ارتقا کی راہ متعین ہوئی۔ جب عملی تجربہ کرنے والوں نے نظریاتی اصول رکھنے کے لئے میدان خالی کر دیا تو عرب جغرافیہ نویسی کا زوال یقینی ہو گیا۔

پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کا زمانہ عرب جغرافیے کی انتہائی ترقی کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں عربی ادب میں جغرافیائی ادب کو خاص مقام حاصل ہوا۔ جغرافیائی مواد کو پیش کرنے کے لیے اسالیب اور طریقے اختیار کیے گئے۔ اس دور میں البیرونی نے عرب جغرافیے میں جو اضافہ کیا اس کی اہمیت دو طرح سے ہے۔ ایک تو اس نے اپنے زمانے کے تمام جغرافیائی ادب کا تنقیدی، خلاصہ پیش کیا۔ چونکہ وہ یونانیوں، ہندیوں اور ایرانیوں کی تحقیقات سے بخوبی واقف تھا۔ اور اسے عربوں کی مساعی کا بھی جو انہوں نے اس میدان میں کی تھیں علم تھا اس لیے اس نے اس موضوع کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا۔ جہاں تک عمومی، طبعی اور انسانی جغرافیے کے اصول و نظریات کا تعلق ہے اس نے قابل قدر اضافے کیے۔

البیرونی کے معاصر جغرافیہ دانوں میں ابن یونس، ابوالحسن علی بن عبدالرحمٰن ناصر خسرو، ابوعبید اللہ بن عبدالعزیز البکری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی تک عرب جغرافیہ مسلسل تنزل کا شکار رہا۔ اس دور کی تصانیف کا معیار عام طور پر پست ہے۔ موضوع کے بارے میں علمی و تنقیدی رویہ اختیار کرنے اور معلومات کی صحت پر توجہ دینے کی بجائے اب پچھلے مصنفین کی تصانیف کے ملخصات پر ساری توجہ مبذول کر دی گئی۔ اس دور کو ہم جغرافیائی معلومات کی جمع و تدوین کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے جغرافیائی ادب کو آٹھ اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جغرافیہ عالم:۔ اس دور کی جغرافیہ عالم پر اہم تصانیف میں "منتہی الادراک فی تقسیم الافلاک" تصنیف محمد بن احمد الخرقی۔

"کتاب الجغرافیہ" از محمد بن ابوبکر زہری غرناطی۔

"نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" از شریف ادریسی۔

"کتاب الجغرافیہ فی الاقالیم السبعہ" از ابن سعید۔

"تقویم البلدان" از ابوالفداء ہیں۔

۲۔ کائناتی جغرافیہ:۔ اس صنف پر بھی کئی ایک تصانیف ہیں۔ جو اس دور میں تصنیف ہوئیں۔ ان میں سے مشہورترین ابوحامد غرناطی کی "تحفۃ الالباب و نخبۃ العجائب"

القزوینی کی "عجائب البلدان اور آثار البلاد"

الدمشقی کی "نخبۃ الدھر فی عجائب البر والبحر" اور

ابن الوردی کی "خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب" ہیں۔

۳۔ زیارتی ادب:۔ تیسری صنف زیارتی ادب کی ہے اور اس موضوع پر قابل ذکر کتب میں الھروی کی "اشارات الی معرفۃ الزیارات" عبدالقادر محمد نعیمی کی "الدارس فی تاریخ المدارس" ہیں۔

۴۔ جغرافیائی لغات:۔ اس موضوع پر یاقوت الحموی نے ایک بہت ہی مفید کتاب معجم البلدان کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ء کی تصنیف ہے اس میں اسمائے امکنہ کی ایک جغرافیائی لغت ہے۔ اس کی دوسری اہم تصنیف "کتاب المشترک وضعاً والمختلف صقعاً" ہے۔

۵۔ سیاحت نامے:۔ اس دور کے مشہور سیاحت ناموں میں "الرحلہ" تصنیف ابن جبیر، "تاریخ المستنصر" تصنیف ابن مجاور، نیز البلوی، العبدری، التیجانی وغیرہ کی الرحلات ہیں۔ لیکن قرون وسطیٰ میں عربی میں سب سے اہم سفرنامہ "تحفۃ النظار" ہے جو سفرنامہ ابن بطوطہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

۶۔ ملاحی ادب:۔ اس صنف پر مشہور تصانیف ابن ماجد کی "کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد"، سلیمان بن احمد المہری کی "العمدۃ المہریہ فی ضبط العلوم البحریہ" اور "شرح تحفۃ الفحول فی تمہید الاصول" ہیں۔

۷۔ فلکیاتی ادب:۔ اس دور میں فلکیات پر بھی چند اہم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ الغ بیگ اس دور کے ماہرین فلکیات میں سے تھا۔ اس کی موت سے ... فلکیات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے مشاہدات کے نتائج "زیج جدید سلطانی" شامل ہیں۔

۸۔ علاقائی جغرافیائی ادب:۔ اس دور میں عربی اور فارسی ... اور قومی اساس پر جغرافیائی ادب پر تصانیف کی ایک کثیر تعداد منظر عام پر آئی ... موضوع پر لکھنے والوں میں ابراہیم ابن واصف شاہ، النویری، المقریزی، ابن ... العمری، القلقشندی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شمالی افریقہ میں الحسن بن ... نے "جامع المبادی والغایات" تحریر کی۔ ایران، وسط ایشیا اور ہندوستان میں فارسی کی بعض تصانیف میں بھی کسی حد تک علاقائی اور بیانیہ جغرافیے سے بحث کی گئی ہے۔

جہاں تک ترک جغرافیہ نگاروں کا معاملہ ہے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی تک جغرافیے پر کتابیں لکھنی شروع نہیں کی تھیں۔ شروع شروع میں انہوں نے کتب ... کے ...

Marfat.com

احوال عالم کے بارے میں کتابچے لکھنے شروع کئے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور تصنیف "در مکنون" ہے۔ جو یازیجی اوغلی احمد بیجان کی تصنیف ہے۔

کچھ عرصے بعد سپاہی زادہ محمد بن علی نے "اوضح المسالک الی معرفۃ البلدان والممالک" کے نام سے ابوالفداء کی تصنیف تقویم البلدان کا ترجمہ کیا۔ وسیع ترمعنوں میں جغرافیائی ادب میں ہم علی قوشچی کی تصنیف "رسالہ ریاضیات وفلکیات" کا نام لے سکتے ہیں جو فارسی میں تھا۔

ترکوں کی طبع زاد تصانیف جغرافیہ بحری و جہازرانی میں ملتی ہیں۔ اس موضوع پر پیری محی الدین رئیس نے ایک کتابچہ لکھا جو ۱۲۹ ابواب پر مشتمل تھا اور ہر باب کے ساتھ ایک نقشہ تھا۔ اسی موضوع پر سیدی علی رئیس بن حسین نے ایک کتاب "المحیط" کے نام سے تصنیف کی۔ سید نوح کی تصنیف "کتاب بحر الاسود والابیض" بھی اس موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔

"جہاں نما" تصنیف مصطفیٰ بن عبداللہ المشہور کاتب چلپی ایک اہم ترین اور جامع جغرافیائی تصنیف ہے۔ اس کتاب کو اس نے ایک نئے انداز سے یورپی نمونے کے مطابق لکھا ہے۔

عثمانی ادب میں سیاحت ناموں میں علی اکبر کا "سفرنامہ چین" اور سیدی علی رئیس کا سفرنامہ ہند قابل ذکر ہے۔ لیکن ان سب میں اہم ترین تصنیف اولیا بن درویش محمد ظلی المعروف اولیا چلبی کی "تاریخ السیاح" یا "سیاحت نامہ" ہے۔ یہ کتاب مسلم اقوام کے پورے ادب میں منفرد حیثیت کی مالک ہے۔

جفر ایک عددی علم، اس میں احوال غیب کا علم معلوم کرنے کا دعوے کیا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں اس علم میں مخفی معانی کی مدد سے واقعات، خصوصاً آنے والے واقعات کی تعبیر یا ان کی اطلاع حاصل کی جاتی ہے۔ اس علم کی بنیاد نیومرولوجی یعنی یونانیوں کے قدیم علم الاعداد پر ہے۔ سب سے پہلے عبرانیوں نے اپنی ابجد کے بائیس حروف کو اعداد میں منتقل کر کے ان سے طرح طرح کی تاویلات اخذ کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ عربوں نے اس ابجد میں چھ حروف کا اضافہ کیا۔ اس طرح عربی ابجد کے کل اٹھائیس حروف وضع ہوئے جن کے مساوی اعداد مقرر کر کے عربوں نے ان اعداد کی گنتی کو ہزار تک پورا کر لیا۔ عربی ابجد کے حروف اور ان کے مساوی اعداد حسب ذیل ہیں۔

ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰

ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ان اٹھائیس حروف ابجد کو چاند کی اٹھائیس منازل پر منطبق کر کے ہر منزل کا ایک الگ حرف مقرر ہوا اور ہر حرف کی ایک خاص تاثیر متعین کی گئی۔

انہی تاثیرات کے علم پر جفر کی مشہور و معروف شاخ علم الآثار کو استوار کیا گیا۔ اوراد و نقوش علم الآثار کے اصول و قواعد کے مطابق ہی ترتیب پاتے ہیں۔

اوراد میں وہ وظائف بھی شامل ہیں جو کلام پاک کی آیات سے لے کر علم الآثار کے مطابق مختلف تاثیرات پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بعض آیات قرآنی کے حروف کی ابجدی قدریں مجمل کر کے نقوش ترتیب دیئے جاتے ہیں اور مختلف مطالب کے حصول اور اخذ کرنے کے کام آتے ہیں۔

علم الاعبار الجفر کی مشہور بڑی [illegible] قواعد کے مطابق جو حروف سوال سے حروف جواب پیدا کرتے [illegible] اس طرح ماضی حال مستقبل میں پیش ملنے والے واقعات کی خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔

علم جفر کے بارے میں جو تحقیق کی گئی ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی ابتدا عبرانیوں سے ہوئی ہے۔ وہی اس علم کے موجد تھے۔ لیکن جس ترتیب میں یہ موجودہ دور میں رائج ہے اس کے بانی عرب ہیں۔

بعض حضرات اسے آنحضورؐ، حضرت علیؓ اور حضرت جعفر صادقؒ جیسی شخصیات سے منسوب کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ علم عرب کاہنوں میں موجود تھا۔

اہل تشیع میں بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے دو رسائل "جفر" اور "جامع" نام سے تصنیف کئے تھے۔ جن میں ماضی حال اور مستقبل کے حالات مندرج تھے۔ یہ رسائل نسلاً بعد نسلاً آپؑ کی اولاد میں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ امام مہدی ان کو ساتھ لے کر سرداب سُر من رائے میں گم ہو گئے اور جب آپ دوبارہ ظاہر ہوں گے تو یہ رسائل بھی آپ کے پاس ہوں گے۔

جکارتا انڈونیشیا کا سب سے بڑا شہر اور صدر مقام جو جاوا کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ اس شہر کا قدیم نام سنڈا کلاپا تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی میں یہ بندرگاہ جب سلطان بانتن کے زیر اقتدار میں آئی تو اس نے اس بندرگاہ کو جکارتا (شاندار قلعہ) کا نام دیا۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک اور روایت یہ کی جاتی ہے کہ اس کا نام جیکارتا یعنی فاتح خوشحال تھا۔ جو ولندیزی ابتداء میں سیاحت کے لئے یہاں آئے، انہوں نے اس کو جکاترا کر دیا۔

دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب ولندیزی جاوا پہنچے تو انہوں نے وہاں کے مقامی سلاطین سے چاہا کہ بانتن اور جکارتا وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ لیکن جب انہوں نے مشورہ سری اختیار کی تو سلطان بانتن نے ان پر سختی کی اور وہ ان سختیوں کی وجہ سے جکارتا منتقل ہو گئے۔

اس دور میں جکارتا ایک قصبہ تھا۔ انہوں نے امیر جکارتا کی مرضی کے خلاف ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ امیر نے سلطان بانتن سے مدد چاہی۔ چنانچہ دونوں فریقوں میں جنگ چھڑ گئی جو جنگ جکارتا کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں ولندیزی شکست کھا کر جزیرہ امبون میں پسپا ہو گئے۔ لیکن بد قسمتی

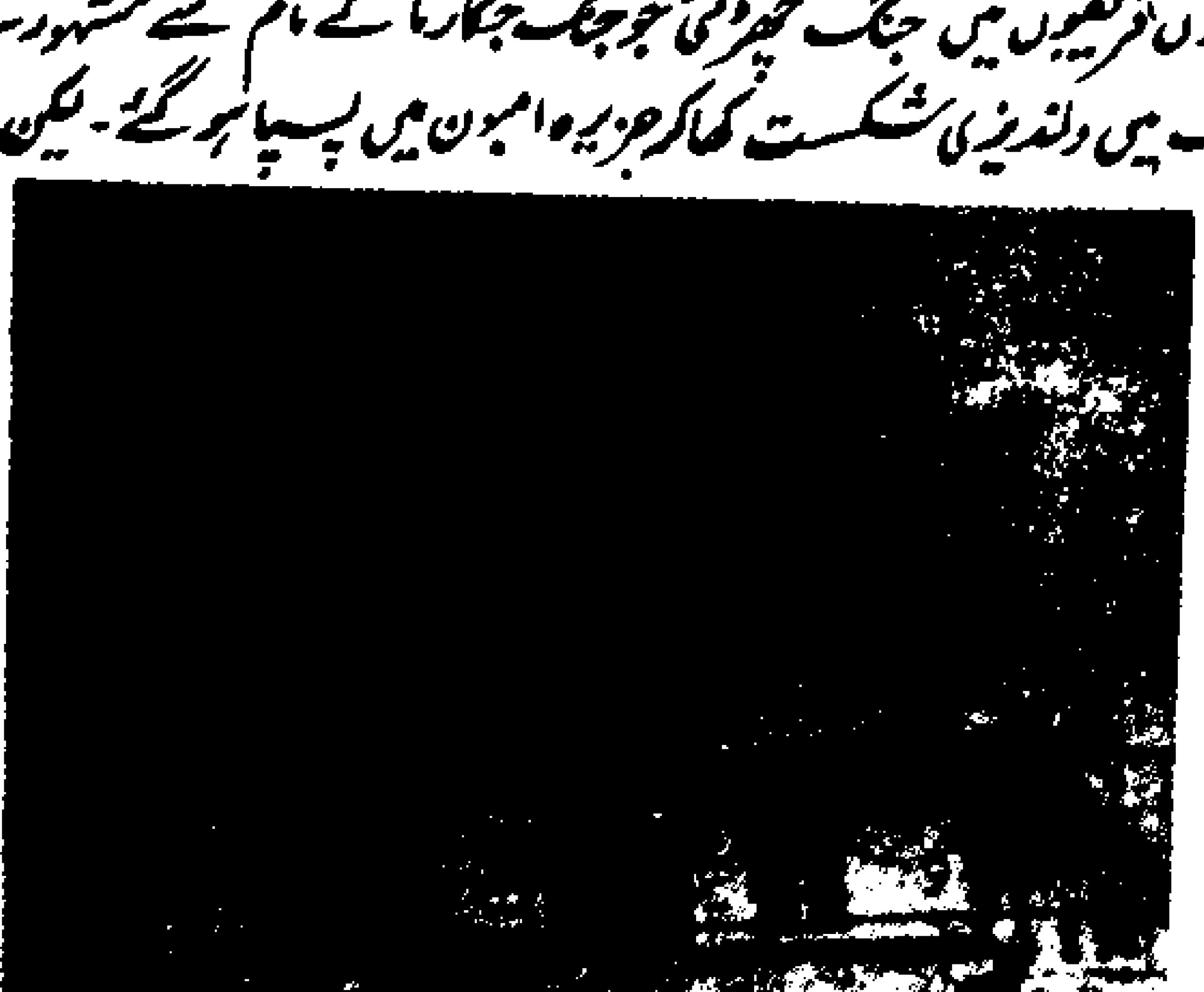

جکارتا میں سنہری مسجد

Marfat.com

جکارتا کے جنگل کا ایک خوبصورت منظر

سے مالِ غنیمت کی تقسیم پر بانٹن اور جکارتا کی فوجوں میں آپس میں لڑائی چھڑ گئی اور دونوں فوجیں آپس میں کٹ مریں۔ جب ولندیزیوں نے میدان صاف دیکھا تو دوبارہ جکارتا پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے تین روز تک قتل عام جاری رکھا۔ کھیت جلا دیئے گئے اور مساجد کو مسمار کر دیا۔ جب یہ قصبہ اہل ملک سے خالی ہو گیا تو ولندیزیوں نے اپنے اہل قوم کے لئے ایک جدید طرز کی بستی بسائی اور اس کا نام بٹاویا رکھا۔ ابھی اس شہر کو آباد ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ماترم کے سلطان اگنگ کی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تین چار ماہ سخت مقابلہ رہا اور بالآخر سلطان کی فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا بٹاویا کا قلعہ تباہ کر دیا گیا۔ اگرچہ سلطان کی زندگی میں ولندیزی یہاں اپنے قدم نہ جما سکے لیکن اس کی وفات کے بعد انھوں نے دوبارہ بٹاویا کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور یہاں پر یورپ کے شہری نمونوں پر عمارات تعمیر کرائیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ شہر یورپی ڈھانچے میں ڈھل گیا۔

۱۹۱۹ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا اولین ہیڈ کوارٹر یہیں بنایا تھا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۶ء تک ایک مختصر عرصے کے لئے یہاں پر برطانیہ کا قبضہ رہا لیکن ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک اس شہر پر دوبارہ ولندیزی قابض رہے۔ اور جکارتہ ولندیزی گورنر جنرل کا مستقر رہا۔ اس دور میں اس شہر نے خوب ترقی کی اور بین الاقوامی تجارت کا مرکز اور انڈونیشی مجمع الجزائر میں انتظامیہ کا صدر مقام رہا۔ انڈونیشیا کے دوسرے حصوں اور بیرونی ممالک کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے رہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اس شہر پر جاپانیوں کا قبضہ رہا۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد جب ولندیزیوں نے اتحادیوں کی مدد سے دوبارہ اس شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو انڈونیشی حریت پسندوں نے ہتھیار سنبھال لئے اور اس طرح ولندیزی اور ان کے ہمنواؤں کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ آزادی کے بعد جکارتا انڈونیشیا کا دارالحکومت بن گیا۔

اس نقطۂ نظر سے یہ بات قابل بیان ہے کہ ولندیزی دورِ حکومت میں یہاں کے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکوں کے مراکز زیادہ تر یہیں رہے۔ تاہم بٹاویا کو بھی اسلامی زندگی کے مطالعے اور علمی تحقیقات کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل رہی۔ بٹاوی شعبۂ قانون جو ۱۹۲۴ء میں قائم ہوا میں ابتدا ہی سے اسلامی قانون و اسلامیات کے پروفیسر کی آسامی مخصوص رکھی گئی۔

۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے انڈونیشیا فتح کرنے کے بعد بٹاویا کا نام ایک بار پھر جکارتا رکھ دیا گیا۔

جکارتا سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک مقام بوگور ہے۔ ۱۶۳۲ء میں جب بٹاویا (جکارتا) میں ایک خطرناک وبا پھیلی تو لوگ یہ شہر چھوڑ گئے اور بوگور میں جا بسے اس طرح ایک نئی بستی وجود میں آئی جس میں سرکاری دفاتر بھی منتقل کر دیئے گئے۔ سرکاری آبادی اب بھی یہیں پر آباد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جکارتا شہر دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس جدید حصے میں باغات کشادہ سڑکیں اور نئی وضع کی خوبصورت عمارات ہیں۔ پرانا شہر انڈونیشی تہذیب و تمدن کا مظہر ہے۔ اس حصے میں سے کئی نہریں گذرتی ہیں جو بڑا حسین منظر پیش کرتی ہیں۔ ان پر آمد و رفت کے لئے متعدد پل ہیں۔ جکارتا سے سورابایا اور دوسرے شہروں کو ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔

موجودہ شہر نہایت خوبصورت ہے سڑکیں بہت کشادہ اور صاف ہیں۔ خوبصورت عمارات ہیں۔ شہر سے متصل ایک جدید بندرگاہ ہے۔ جو چھ لاکھ مربع فٹ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ بندرگاہ اور شہر کے مابین کیموران کے مقام پر انڈونیشیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈا ہے۔

Marfat.com

جکارتا میں متعدد کارخانے ہیں جن میں سے ریلوے ورکشاپ، لوہے کی ڈھلائی، چمڑہ رنگنے اور ادویہ سازی کے کارخانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چونکہ یہ شہر انڈونیشیا کا سب سے بڑا اور اہم ترین شہر ہے۔ اسی لحاظ سے تعلیمی مرکز بھی ہے۔ تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ جمہوریہ انڈونیشیا یونیورسٹی یہیں قائم کی گئی ہے۔ یہاں کی قابل دید عمارات میں گرجاگھر، مسجدیں اور عجائب گھر ہیں۔ شہر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک عظیم الشان ریڈیو سٹیشن ہے۔ ملک کا مرکزی شفاخانہ بھی یہیں پر ہے۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۴٫۵۷۶٫۰۰۹ نفوس پر مشتمل تھی۔

جلال الدولہ (۳۸۳ھ/۹۹۳ء - ۴۳۵ھ/۹ مارچ ۱۰۴۴ء) ابو طاہر بن بہاء الدولہ، بویہی سلطنت کا تاجدار جب بہاء الدولہ کے بعد اس کے بیٹے سلطان الدولہ کو امیر الامراء چنا گیا تو اس نے اپنے بھائی جلال الدولہ کو بصرے کا والی مقرر کیا۔ چنانچہ وہ کئی سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء میں سلطان الدولہ کی وفات کے بعد اور اس کے اگلے سال مشرف الدولہ کی وفات کے بعد اس کو امیر الامراء بنایا گیا۔ لیکن وہ اس عہدے کو قبول کرنے کے لئے بغداد نہ گیا تو اس کے بھتیجے ابوکالیجار بن سلطان الدولہ کو یہ عہدہ پیش کیا گیا لیکن اس نے بھی اس عہدے کو قبول نہ کیا۔

جب جلال الدولہ نے یہ سنا کہ اب بغداد میں اس کے نام کا خطبہ نہیں پڑھا جاتا تو اس نے بغداد پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور وہ بصرہ لوٹ گیا۔ ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء میں ترکوں کی درخواست پر وہ دارالخلافہ میں داخل ہوا۔ اگلے برس ہی بغداد میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلال الدولہ نے بڑی مشکل سے امن بحال کیا۔ اس دوران میں اس کے بھتیجے نے بصرے پر قبضہ کر لیا۔ ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں اس نے واسط پر بھی قبضہ جما لیا۔

۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں ابوکالیجار نے جلال الدولہ کے خلاف لشکرکشی کی۔ لیکن تین دن جنگ لڑنے کے بعد اس نے فرار کی راہ اختیار کی۔ جلال الدولہ نے واسط پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر بغداد میں داخل ہوا۔ بصرہ بھی فتح ہو گیا لیکن ابوکالیجار کی فوجوں نے اس پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ اس زمانے میں دارالخلافہ میں ترک سپاہیوں کی خودسری روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس لئے امیر الامراء کو اپنے مزید اختیارات سے دستبردار ہونا پڑا۔

۴۲۳ھ/۱۰۳۲ء میں امیر الامراء کا محل لوٹ مار کا نشانہ بنا چنانچہ جلال الدولہ نے عکبرا کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ ترکوں نے ابوکالیجار کو امیر الامراء بنانے کا اعلان کر دیا لیکن چونکہ اسے امارت میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جلال الدولہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد دوبارہ اپنے دارالخلافہ میں آ گیا۔ اگلے سال اس کے محل پر دوبارہ حملہ ہوا۔ اب بویہی امیر کو جو قوت و اختیار سے بالکل محروم ہو چکا تھا۔ دوسری مرتبہ پھر راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اس نے کرخ میں شیعیوں کے ہاں پناہ لی۔ بعد میں باغیوں نے اسے بغداد واپس بلا لیا۔

اسی سال ابوالقاسم والی بصرہ نے ابوکالیجار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کیونکہ وہ اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔ ابوالقاسم نے جلال الدولہ کے لڑکے عبدالعزیز کو بصرے بلایا لیکن ۴۲۵ھ/۱۰۳۴ء میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا اور شہر کے لوگوں نے دوبارہ ابوکالیجار کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔

۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء میں جلال الدولہ کو ایک بار پھر بغداد سے نکال دیا گیا۔ لیکن قرواش بن المقلد الموصلی اور دبیس بن علی المزیدی کی حمایت حاصل ہو جانے پر وہ ایک بار پھر دارالخلافہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ابوکالیجار نے آخرکار جلال الدولہ سے صلح کر لی اور جب اس کے لڑکے ابو منصور کی شادی جلال الدولہ کی لڑکی سے ہو گئی تو اس [illegible] ہو گئی۔ اس موقع پر جلال الدولہ نے "شاہ شاہان" کا لقب اختیار کیا جو قدیم ایرانی لقب تھا۔

۴۳۱ھ/۱۰۴۰ء میں اسے ایک بار پھر دارالخلافہ میں ترکوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار بویہی سلطنت کو انتہائی مخدوش حالت میں چھوڑ کر جلال الدولہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

جلال الدین احسن (م ۷۴۰ھ/۱۳۳۹ - ۴۰ء) مدورا کا پہلا سلطان۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ پنجاب کے قصبہ کیتھل کا رہنے والا تھا۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء میں صوبہ معبر میں نائب اقطاع کے عہدے پر فائز تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے اسے صوبیدار مقرر کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے ۷۳۵ھ/۱۳۳۴ - ۳۵ء میں جلال الدین احسن شاہ کا لقب اختیار کر کے مدورا میں جو قدیم پانڈیا سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق نے اسے اس کی غداری کی سزا دینے کے لئے جنوب کی طرف چڑھائی کی۔ جو ہیضہ پھوٹ پڑنے کی وجہ سے رک گیا۔ اس وبا سے سلطان محمد تغلق کی فوج کا دسواں حصہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان دہلی کو ہاتھ سے نکلے ہوئے صوبے پر دوبارہ قبضہ نہ ہو سکا۔

تقریباً پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اس کے ایک عامل نے اسے قتل کر دیا۔ اگرچہ جلال الدین احسن مدورا کا پہلا خودمختار سلطان تھا۔ لیکن اس نے کسی حکمران خاندان کی بنیاد نہ رکھی۔

جلال الدین کی اولاد میں دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کی سلطان غیاث الدین سے اور دوسری کی شادی ابن بطوطہ سے ہوئی تھی۔

جلال الدین تبریزی بنگال کے ایک صوفی بزرگ (دیکھئے "تبریزی، جلال الدین")

جلال الدین حسین بخاری ہندوستان کے ایک بزرگ۔ (دیکھئے "مخدوم جہانیاں")

جلال الدین خلجی خلجی خاندان کا ایک سلطان — (دیکھئے "خلجی، جلال الدین")

جلال الدین خوارزم شاہ سلطان محمد خوارزم شاہ کا بڑا لڑکا اور اس خاندان کا آخری حکمران۔ (دیکھئے "خوارزم شاہ")

جلال الدین رومی ایک عالم دین اور بزرگ صوفی۔ (دیکھئے "رومی، مولانا")

جلال الدین سیوطی مصر کے ایک عالم دین — (دیکھئے "سیوطی، جلال الدین")

Marfat.com

جلال الدین مجرد سلہٹی (؟ ـــــ ۲۰ر ذیقعدہ ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء) بنگال کے بزرگ صوفی۔ والد کا نام محمد ابراہیم تھا جو بخارا کے قریب قونیا نامی گاؤں میں اقامت پذیر تھے۔ آپ کے آباء اجداد یمن کے رہنے والے تھے۔ جو قونیہ میں آبسے تھے۔ دادھیال کی طرف سے آپ قریشی الاصل تھے۔ اور ننھیال کی طرف سے آپ کا سلسلہ سادات سے جا ملتا ہے۔ ابھی آپ کا بچپن ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ آپ کے ماموں سید احمد کبیر نے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ وہ آپ کو مکہ معظمہ لے گئے اور وہاں پر مذہبی اور روحانی تعلیم دی۔ آپ نے انہی کے حلقہ طریقت میں رہ کر حقائق و معارف کے درس حاصل کئے۔ جب پوری طرح واقف اسرار و رموز ہو گئے تو آپ کے ماموں نے کہا کہ اب سرزمین ہند میں جا کر لوگوں کی اصلاح کرو اور دین حق کی تبلیغ کرو۔

آپ کی سلہٹ میں آمد کس سن میں ہوئی۔ اس بارے میں مورخین کی رائے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۱۳۴۸ء بتایا ہے اور بعض نے ۱۳۰۳ء۔ موخرالذکر تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

آپ کی سلہٹ میں آمد کے بارے میں بڑی دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے کہتے ہیں کہ جب آپ سلہٹ تشریف لائے۔ تو یہاں پر اسلام کا نام لینے والا صرف ایک شخص تھا۔ جس کا نام برہان الدین تھا جب اس کے گھر بچہ پیدا ہوا تو اس نے اس بچے کی خوشی میں ایک گائے ذبح کی۔ اس راجہ نے برہم ہو کر اسے بچے کو ذبح کرا دیا اور برہان الدین کا دایاں ہاتھ بھی کٹوا دیا۔ جب راجہ کے تشدد کی یہ خبر دہلی کے فرمانروا علاؤ الدین خلجی تک پہنچی تو اس نے اپنے بھانجے سکندر خان غازی کو اس راجہ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ سکندر نے دو مرتبہ حملہ کیا لیکن دونوں بار ناکام رہا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ فتح حضرت جلال الدین کے ہاتھ میں رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت جلال الدین مکہ معظمہ سے دریائے برہم پتر پہنچے۔ ان کے ساتھ ۳۶۰ اولیائے کرام تھے۔ آپ نے اللہ کا نام لے کر اپنے مصلے دریا میں ڈال دیئے۔ چنانچہ دریا کو عبور کر کے سلہٹ کی وادیوں میں پہنچے جہاں پر ان کا مقابلہ راجہ گور گوبند سے ہوا۔ راجہ جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے حکومت کی باگ ڈور سکندر غازی کو سونپ دی اور خود یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح آپ کے دم قدم سے نہ صرف سلہٹ بلکہ سارے بنگال میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک مشہور شعر ہے۔

کافرستان تھا سلہٹ در و دیوار سے پوچھ
کون آیا تھا یہاں کس کی اذانیں گونجیں

آپ نے سلہٹ میں ابتدائی دو سال سلطنت کے نظم و نسق میں صرف کئے اور باقی پینتیس سال خدمت خلق اور ریاضت و عبادت میں گذارے۔ آپ مجرد رہے۔ اسی سبب آپ کو مجرد سلہٹی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ جب بنگال کی سیر و سیاحت کے لئے آیا تھا تو اس نے آپ سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس نے اپنے سفرنامے میں آپ کے بارے میں لکھا ہے۔

"متواتر چالیس سال سے آپ صائم الدہر رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ صرف دسویں دن روزہ افطار کرتے تھے۔ آپ کے پاس ایک گائے تھی جس کے دودھ سے روزہ افطار کرتے۔ آپ قائم اللیل بھی تھے اس وقت آپ کا قد بلند و بالا تھا اور رخساروں پر بہت کم بال تھے۔ ان پہاڑوں کے باشندے آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے آپ انہی لوگوں کے درمیان رہنے سہنے لگے تھے۔"

آپ نہایت سادہ زندگی گذارتے تھے۔ شجاعت بہت زیادہ تھی۔ آپ کا مزار مبارک سلہٹ کی قابل دید عمارتوں میں سے ایک ہے، آپ کی درگاہ کو روحانیت اور مادیت دونوں اعتبار سے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس محلہ کا نام جہاں آپ کی درگاہ ہے اس کی نسبت سے محلہ درگاہ پڑ گیا ہے۔ درگاہ مبارک پر مسلمان، ہندو سکھ، عیسائی۔ سب زیارت کے لئے آتے ہیں۔ یہ عمارت پہاڑوں پر واقع ہے درگاہ کا خوب صورت قبہ آپ کے جاہ و جلال کا پتہ دیتا ہے۔ اس کے مشرق جانب خوبصورت مسجد ہے۔ آپ کے مزار کے آس پاس ان شیدائیان اسلام کے مقبرے ہیں جو آپ کے ہمراہ سلہٹ تشریف لائے۔

جلال الدین محلی :۔ ایک مفسر قرآن۔ (دیکھئے "محلی جلال الدین")

جلال زادہ صالح چلبی ایک عثمانی عالم، مورخ اور شاعر۔ جلال زادہ مصطفیٰ چلبی کا چھوٹا بھائی تھا۔ وچترن میں پیدا ہوا۔ جہاں پر اس کا والد جلال الدین قاضی تھا۔ اس نے کمال پاشا زادہ اور سلطان سلیمان کے اتالیق خیرالدین افندی سے علم حاصل کرنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں صحن اور ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں ادرنہ بایزیدیہ میں پہنچا۔ اس نے حلب، دمشق، اور قاہرہ میں عدالتی خدمات بھی انجام دیں۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء میں اسے اس عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ تو اس نے ایوب میں سکونت اختیار کر لی۔ اور یہیں پر ایک مقامی مدرسے میں معلمی اختیار کر لی۔ آخر عمر میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے اس نے معلمی کو خیرباد کہہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ اور مرتے دم تک اسی کام میں مشغول رہا۔ اس نے ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے بھائی کی بنائی ہوئی مسجد کے صحن میں دفن ہوا۔

صالح چلبی نے تقریباً سترہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں مشہور ترین کتاب "تاریخ مصر جدید" ہے۔

جلال زادہ مصطفیٰ چلبی (۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء ـــ ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء) عہد عثمانیہ کا مورخ۔ باپ کا نام قاضی جلال الدین تھا۔ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں دیوان ہمایوں میں محرر ہو گیا۔ بڑا باصلاحیت آدمی تھا۔ پیری پاشا نے اس کی صلاحیتیں دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مصطفیٰ چلبی پیری پاشا اور اس کے جانشین ابراہیم پاشا کا کاتب رہا۔ احمد پاشا کی بغاوت کے بعد مصر کے معاملات کو معمول پر لانے میں اس نے بڑی مدبری سے کام لیا۔ ان خدمات کے صلے میں اسے رئیس الکتاب کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ ۹۴۱ھ/۱۵۳۵ء میں اسے نشانجی بنایا گیا۔ اس عہدے پر اس نے تیئیس سال خدمات انجام دیں۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی سرکاری دستاویزات اور اس کے رائج کردہ القابات کئی سال تک نمونے کا کام دیتے رہے۔ ۹۶۴ھ/۱۵۵۷ء میں رستم پاشا نے اسے متفرقہ باشی کا عہدہ دے کر اس منصب سے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن ۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء میں سکولو نے اسے دوبارہ اس کے عہدے پر بحال کر دیا۔ لیکن اگلے ہی سال مصطفیٰ کا انتقال ہو گیا۔

اس نے سلطنت کے نظم و نسق کے حالات تیس جلدوں میں لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور اپنی اس تصنیف کا نام "طبقات الممالک و درجات المسالک" رکھا گیا تھا۔ اس کتاب کی صرف آخری جلد جو سلیمان کے عہد حکومت تک ہے۔ ہم تک

Marfat.com

پہنچی ہے۔ اس کتاب کے چند ایک قلمی نسخے جو علیحدہ علیحدہ اجزا پر مشتمل ہیں۔ آج بھی موجود ہیں۔ جو "فتح نامہ رودس" اور "مہاج نامہ" کے نام سے موسوم ہیں۔
اس کی دوسری تصانیف میں "مواہب الخلاق مراتب الاخلاق"، "دلائل نبوت محمدی"، "معارج النبوہ"، "ہدیۃ المومنین"، "جواہر الاخبار فی خصائل الاخیار"، "قانون نامہ" وغیرہ ہیں۔ یہ تمام تصانیف ترکی میں محفوظ ہیں۔

جلال شاہ :- بنگال کے ایک بزرگ صوفی۔ (دیکھئے "جلال الدین مجرد سلہٹی")

جلالین، تفسیر :- قرآن مجید کی تفسیر۔ (دیکھئے "تفسیر")

جلاریہ (جلائریہ) ایک مغل قبیلے کا نام۔ یہ قبیلہ ان خانوادوں میں سے ہے۔ جنہوں نے ایلخانیہ کے بعد ان کی معدوم سلطنت کے حصے بخرے کر لیے تھے۔ ان کے شجرہ نسب کا آغاز ایلخانیوں سے ہوتا ہے۔ جو ہولاکو کے متعلقین میں سے تھا۔ یہ شجرہ "حسن بزرگ" تک پہنچتا ہے۔ جو اس خاندان کا موسس اور ابوسعید کے دورِ حکومت میں روم کا والی تھا۔ جب ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں ابوسعید کا انتقال ہوا تو ہولاکو خاندان کے تین افراد یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے ان میں سے محمد حسن بزرگ کا متوسل تھا۔ جب محمد کو حسن کوچک نے قتل کیا اور خود ساتی بیگ کے نام پر حکومت کرنے لگا۔ اس کے بعد سلیمان پوری ایلخانی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکے۔ اور حسن بزرگ اور اس کے پیروکاروں نے بغداد میں اپنے قدم جما لیے اور ارتنا اور خراسان کے حکمران طغاتیمور کی طرح چوبانیوں کی حکومت کا مقابلہ کرتے رہے جلاریہ کو حسن کوچک نے اپنا مطیع کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ جو ناکام رہیں۔ ۷۴۳-۷۴۴ھ/۱۳۴۳-۱۳۴۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کے بھائی ملک اشرف نے حکومت پر قابض ہو کر سلیمان اور ساتی بیگ کو حسن بزرگ کے ہاں فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اشرف بھی جلاریہ سے بغداد خالی نہ کرا سکا۔ الٹا اصفہان، کرمان یزد اور شیراز کے صوبے جو حسن کوچک کے مطیع تھے۔ وہ بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔

یہ بات واضح ہے کہ سلطنت ایلخانیہ کو کمزور کرنے میں حسن بزرگ کا ہاتھ تھا لیکن وہ اس کے خاتمے کا خواہاں نہ تھا۔ ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء میں حسن بزرگ کا انتقال ہو گیا اور جلاریہ کی قیادت اس کے بیٹے اویس کو ملی۔
جب التون اردو کے سلطان جانی بیگ نے ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء میں اشرف کی حکومت کا تختہ الٹ تو بغداد کے جلاریہ نے جانی بیگ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا جانی بیگ کے بعد اس کا بیٹا بیردی بیگ نے آذربائیجان سے اشرف کے سابقہ معاونین کے حق میں دستبردار ہو گیا تو اویس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور آذربائیجان کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اور آخرکار ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں دوسرے حملے میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔

جلاریہ نے ۷۶۲ھ/۱۳۶۱ء سے ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء تک جلاریہ کو مزید کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ فارس میں خاندان مظفریہ کے شہزادے شاہ محمود نے جلاریہ کی سیادت تسلیم کر لی۔ لیکن ۷۶۵ھ/۱۳۶۴ء میں ان کی مخالفت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ان کے لیے مزید قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ ۷۷۵-۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء میں اویس نے انتقال کیا تو امراء نے اس کے بڑے لڑکے حسن کو قتل کر دیا۔ چنانچہ اس کا چھوٹا بیٹا حسین تخت نشین ہوا۔ جس کے دور میں سلطنت کے انحطاط کے کچھ آثار نمایاں ہوئے۔ ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء میں شیخ علی نے بغاوت کر دی اور بغداد پر قبضہ جما لیا۔ عادل جس پر حسین کامل اعتماد رکھتا تھا۔ جب ۷۸۲ھ/۱۳۸۰-۱۳۸۱ء میں تبریز پر حملہ آور ہوا تو حسین کے بھائی احمد نے اپنے بھائی کو بے یار و مددگار پا کر قتل کر دیا۔ اور خود حکمران بن بیٹھا ابھی وہ اپنی حکومت بھی اچھی طرح سے مستحکم نہ کرنے پایا تھا کہ التون اردو اور اس کے بعد تیمور کے حملے نے اسے یہاں سے باہر نکال دیا۔ احمد بغداد واپس چلا آیا اور بعد میں عثمانی ترکوں کے پاس اور پھر وہاں سے مصر چلا گیا۔ تیمور کی وفات پر احمد ایک بار پھر بغداد پر قابض ہو گیا۔ لیکن ۸۱۲-۸۱۳ھ/۱۴۰۹-۱۴۱۰ء میں اس نے دوبارہ تبریز کو فتح کرنے کی کوشش کی تو وہ قرہ قوینلو کے ہاتھوں گرفتار کر کے مروا دیا گیا۔

ویسے تو بغداد پر ۸۱۴-۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء میں قرہ قوینلو کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن عراق کے زیریں حصے میں جلایری چند سال تک حکومت کرتے رہے۔ اس خاندان کا آخری فرمانروا حسین ثانی ۸۳۵-۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں محاصرہ حلہ کے دوران میں جو قرہ قوینلو نے کیا تھا، مارا گیا۔
اس قبیلے کے بادشاہوں کے زیرِ سرپرستی جو یادگاریں تعمیر کی گئیں ان میں مرجان کی سرائے اور مسجد ہیں۔

جُلُف ایک سابقہ ریاست کا نام۔ یہ ریاست اس علاقے میں تیرہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک قائم جو اب سینیگال کا حصہ ہے۔ اس میں والو، کایور، باؤل، سین، سلوم، دمار اور ڈمبوک کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔
موجودہ دور میں یہ علاقہ جمہوریہ سینیگال کے ایک خطے کا نام ہے اس کے شمال میں والو، دمار اور فوٹہ تورو، مشرق میں فوتہ دمنغا اور فرلو، جنوب میں نیانی ولی اور باؤل مغرب میں کایور اور نیانی ڈیمبور واقع ہیں۔
ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ کے خاندان کے ایک نیک اور متقی انسان جن کا نام ابوبکر بن عمر تھا جو ابو دردای کے نام سے بھی مشہور تھے۔ مکہ معظمہ سے سینیگال میں جا کر آباد ہوئے اور اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کی۔
اسی طرح کی ایک اور روایت کے مطابق ایک اور شخص نے جو آنحضورؐ کی آل میں سے تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جُلُف کو تکرور کے تسلط سے آزاد کرایا اور مختلف علاقوں مثلاً والو، باؤل، سین اور سلوم کا باری باری الحاق کر لیا۔ ان حکمرانوں نے بوریہ جلف کا لقب اختیار کیا۔
یہ حکمران سولہویں صدی عیسوی تک حکمرانی کرتے رہے۔ اور غالباً یہ ان لوگوں کی حد درجہ جمہوریت پسندی ہی کی وجہ ہے کہ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی ایسا حکمران نہیں ہے جس کا نام ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔
چونکہ یہ علاقہ اندرون ملک واقع ہے۔ اس لیے یورپی استعماریت کا اس پر نسبتاً کچھ دیر سے ہی اثر ہوا۔ ویسے ہی سولہویں صدی میں اس علاقے میں اسلام کا اثر بھی کچھ زیادہ گہرا نہ تھا۔ الغوں میں مشرکانہ رسوم پائی جاتی تھیں جو متقی مسلمانوں کے لیے خاص طور پر پریشانی کا موجب تھیں۔ لیکن بقول کادموستو ۸۵۰ھ/۱۴۴۵ء میں اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کی رفتار بہت زیادہ ترقی پر تھی۔
فرانسیسیوں نے ۱۶۸۲ء میں الغوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ اس کے تین سال بعد جلف کے حاکم سے معاہدہ کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے ۱۶۸۹ء

Marfat.com

میں ایک فرانسیسی عالم طبیعات نے جلت کی سیاحت کی۔ اور تقریباً ایک صدی بعد کایور کے دامل لات دیور کے خلاف فوجی کارروائیوں کے دوران میں یہ باغیوں کی جائے پناہ بن گئی۔ ۱۸۷۱ء میں تیجانی سردار احمد شیخو نے جلت اور کایور کا محاصرہ کیا لیکن ناکام رہا اور شکست کھائی۔

اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں کرنل دودز نے جلت کے حاکم کو بھگا دیا۔ بالآخر حاکم جلت کے بھائی نے ۴ مئی ۱۸۹۰ء میں فرانسیسی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ اس وقت ہی سے جلت سینیگال کی ترقی سے بہرہ ور ہونے لگا۔ ۱۹۳۱ء میں ڈکر۔ سینٹ لوئی ریلوے کی ایک لائن جلت کے اندر تک بچھائی گئی۔ موجودہ زمانے میں یہ پورے کا پورا علاقہ اسلام قبول کر چکا ہے۔ ہر ایک گاؤں میں جامع مسجد اور ایک یا اس سے زائد اہلِ بزرگوں اور درویشوں کی خانقاہیں موجود ہیں۔ یہ لوگ صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند ہیں یہاں کے باشندے تصوف میں سلسلہ قادریہ کے متبعین میں سے ہیں۔

ان لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں گاؤں ان زمینوں پر بسائے گئے تھے جو حاکم جلت نے مختلف مہمات میں نمایاں کارنامے انجام دینے والے لشکریوں کو دی تھیں۔ یہاں کا معاشرہ بھی دو دو ازواجی گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور ان گروہوں میں نہ تو کوئی دوسرا شخص داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کو چھوڑ سکتا ہے۔ آزاد لوگ مرابطیہ یا بانی موضع کی اولاد ہیں۔ یہاں مختلف گھرانے علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔

جلت سینیگال کے سب سے بنجر علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باشندے عارضی طور پر شہروں میں نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ یہاں صرف مونگ پھلی کی کاشت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے جلت کی معیشت کو واضح طور پر ترقی حاصل ہوئی ہے —

جلوآنوی حضرت مولانا غلام محمدؒ

(پیدائش ۱۹۵۰ بکرمی - ۱۸۹۳ء — تاریخ وصال - ۹ر شوال المکرم ۱۳۷۵ھ ۱۵ر مئی ۱۹۵۶ء) سلسلہ قطبیہ قادریہ کے مشہور ترین ولی کامل، عالمِ باعمل، فارسی، عربی، اردو اور پنجابی کے قادر الکلام شاعر۔

ضلع لائلپور کے قصبہ کمالیہ کے قریب ایک گاؤں مخدوماں شریف میں حضرت میاں محمد فاضل مرحوم کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابھی بارہ تیرہ برس ہی کے تھے کہ سید شیر محمد گیلانیؒ فتح پور شریف گوگیرہ ضلع ساہیوال کے بیعت ہو گئے۔ اور پھر انہیں کی خدمت میں اٹھارہ سال کے طویل عرصہ میں علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور ہوئے۔ مرشد کامل کی نگاہِ خاص کے صدقے تصوف اور وحدت الوجود کے علم میں آفتاب درخشاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دقیق سے دقیق مسائل چند اشاروں میں حل کر دیا کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وحدت الوجود اور تصوف کے منکرین بھی سلسلہ غلامی میں شمولیت فرما کر جاتے۔

آپ شریعت غرا کے سخت متبع، سراپا عشق و محبت، مسئلہ رضا بالقضاء، توکل، عشق و توحید و شریعت مطہرہ کے عین مطابق قرآن و احادیث اور عارفین و کاملین کے اقوال کی روشنی میں ایسی پرتاثیر تقریر فرماتے کہ جاہل اور ان پڑھ بھی قلب و ذہن میں محسوس کر لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تمام مریدین صاحب حال ہیں۔

آپ تمام زندگی دن ہو یا رات ہر وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں سرشار و مستغرق رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور پرنور، تاجدارِ عرب و عجم کی ذاتِ والا صفات کے کمالِ حسی و خلقی اور شمائل و فضائل عام فہم زبان میں بیان کرنے کا خاص کمال حاصل تھا آپ وفات کے بعد تاندلیانوالہ، سمندری روڈ پر واقع موضع جلوانہ شریف میں ہی دفن کیے گئے۔

آپ کو نہ صرف علم لدنی اور علم تصوف میں امتیاز حاصل ہے بلکہ اپنے زمانے کے عربی، فارسی، اردو اور پنجابی میں مایہ ناز اور یکتائے زمانہ شاعر ہونے کا شرف بھی ہے نادر الوجود، نایاب عجائب روزگار اور عشق افروز کلام کہنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کی شاعری میں غزلیات، قصائد، کافیاں، ڈھولے، سی حرفیاں، رباعیات اور منظوم خطوط شامل ہیں۔

مولانا غلام محمد جلویؒ نے اپنی زندگی میں شاعری کے علاوہ متعدد کتب تصوف نثر میں لکھی ہیں جن کی تعداد سترہ کے لگ بھگ ہے۔

۱۔ اسرار المقطعات و رموز المتشابہات :۔
قرآن مجید کے حروفِ مقطعات کی تفسیر عربی زبان میں منظوم مع اردو ترجمہ —

۲۔ حقیقتِ محمدیہ المعروف تحقیق العارفین :۔
دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں اولیائے کاملین و اقطاب کے معارف و اذواق اور مکاشفات ہدیتاً حضور پرنور شافع یوم النشور کی خدمتِ عالیہ میں پیش کیے ہیں۔

۳۔ نور الایمان فی علم العرفان
اردو زبان میں ایک ملا کے تینتیس ۳۳ سوالات کے جوابات پر مشتمل ایک رسالہ۔

۴۔ نور ولایت۔
پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے جس میں مرشد کامل سائیں شیر پاکؒ کی تعریف و توصیف پر مشتمل قصائد اور سی حرفیاں ہیں۔

۵۔ دیوان عشق۔
غزلیات، رباعیات، مستزاد، قصائد اور دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ نیز اسی دیوان میں تلوک چند مرحوم کی استفہامیہ نظم کا جواب بھی ہے جو اس نے پاکستان کے خلاف دہلی پہنچ کر اپنے اخبار میں شائع کروائی تھی۔

۶۔ پیام جلویؒ۔
فارسی زبان کی کتاب ہے جس میں عارفِ جلویؒ نے بائیس منظوم خطوط اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیے۔ جس کے مطالعہ سے ایک عارف و کامل کے ذوقِ روحانی کا پتہ چلتا ہے۔

۷۔ مدینۃ النبیؐ
فارسی زبان میں حضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات نبی صلعم کی تعریف و توصیف میں بڑے دل کش انداز میں نثر کی کتاب ہے۔

۸۔ کمالِ جلویؒ۔
چھوٹے سے رسالے میں نہایت ہی مشکل اور دقیق مسائل وحدت الوجود عربی اور فارسی زبان میں نظم و نثر ہر دو صورت میں پیش کیے ہیں۔

۹۔ رمز الوحدت۔
مسئلہ وحدت الوجود پر پنجابی زبان میں قرآن کریم کی آیات، دلائل و تمثیلات کے سوالات جوابات پر مبنی علمائے ظواہر کے لیے مبسوط کتاب ہے۔

۱۰۔ اسرار المقطعات و رموز المتشابہات۔
قرآن شریف کے انیس حروفِ مقطعات کی تفسیر بزبانِ فارسی منظوم مع اردو ترجمہ یہ کتاب اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے۔ عربی کی تفسیر مقطعات اس سے علاوہ ہے۔

۱۱۔ الاسرار الالہیہ من الفتوحات المکیہ۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

حضرت شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی کی مشہور تصنیف فتوحات مکیہ کا فارسی ترجمہ حسین انتزاب جس سے مولانا موصوف کے علم و ادراک کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جلوتیہ ترکی کے ایک سلسلۂ تصوف کا نام۔ اس سلسلے کی بنیاد استنبول کے نزدیک سقوطری کے شیخ عزیز محمود ہدائی نے رکھی۔ یہ جلوہ سے مشتق ہے اس کا مفہوم اصطلاح تصوف میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان صفات خداوندی پر غور و فکر یعنی مراقبے کے ذریعے خلوت سے نکل کر ہستی باری تعالےٰ میں فنا ہو جائے۔ جلوتیہ ایک خاص سنی طریقہ ہے اور اس کی بنیاد سات اسمائے الٰہی کے ذکر پر ہے جو اصول اسماء کہلاتے ہیں ان اسماء میں پانچ اور فروعی اسماء الفتاح، الاحد، احد الصمد کا الذکر کیا جاتا ہے۔ شیخ اپنے ہر مرید کو یہ اسماء بتاتا ہے اور ان اسماء کا ورد ان پر لازم ہوتا ہے۔ اور وہ بعد میں ان خوابوں کی بنا پر جو وہ شیخ کے سامنے بیان کرتے ہیں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے کی دیگر عبادات میں مختلف نفل نمازیں اور روزے بھی شامل تھے۔ جلوتی سبز عمامہ باندھتے تھے۔ جن میں کپڑے کی تیرہ پٹیاں ہوتی تھیں۔

اس سلسلے کا مرکز سقوطری کے تکیے میں تھا۔ جہاں محمود ہدائی مدفون تھے دوسرا مشہور مرکز بروسہ میں اسماعیل حقی کا تکیہ تھا۔ بقول اسماعیل حقی مصنف تفسیر روح البیان و دیگر تصانیف سات اسماء کے ذکر کی ابتدا شیخ ابراہیم زاہد گیلانی سے شروع ہوئی اور ان کے شاگرد شیخ ابواسحٰق صفی اردبیلی کے توسط سے آگے پہنچا۔"

جلوتیہ سلسلہ بیرامیہ کی ہی ایک شاخ ہے۔ اگرچہ حاجی بیرام محمود ہدائی کا روحانی رشتہ بعض مقامات پر یقینی نہیں۔ ہدائی سفری حصار میں پیدا ہوئے اور بعض کے نزدیک سیوری حصار ان کا مولد بتاتے ہیں۔ سلطان سلیم نے ادرنہ کے مدرسہ میں مدرسی اختیار کرنے سے قبل انھوں نے استنبول میں تعلیم پائی۔ مصر میں جہاں وہ نائب قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ کریم الدین خلوتی سے وابستہ ہو کر خود بھی خلوتی ہو گئے۔

ہدائی بڑے خوش بیان اور نرم گفتار تھے۔ وہ سر پر لمبے بال رکھتے تھے ان کی تقلید میں ان کے مقلدین نے بھی اپنے سروں پر لمبے بال رکھنے شروع کر دیئے۔

جلوتیہ کی ایک اور شاخ تھی۔ جس کے بانی ہاشم بابا تھے۔ انھوں نے ۱۷۷۳ء میں وفات پائی۔ وہ جلوتیہ شیخ اور ملامتی بھی تھے اور قطب ہونے کے مدعی تھے۔

جلیل بزرگی والا۔ اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام۔ (دیکھیے "اسماء الحسنیٰ")

جلیلی موصل کا ایک شاہی خاندان۔ اس خاندان کے سترہ افراد اس ولایت میں والی کے منصب پر فائز ہوئے۔

روایت کی رو سے ان کا وطن مشرقی اناطولیہ بتایا گیا ہے۔ اس خاندان کا مؤسس عبدالجلیل ہے۔ جس نے گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں عمری خاندان کے عیسائی غلام کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔

اس کے بیٹے اسماعیل نے جو مسلمان تھا، اپنی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر موصل کی پاشالیق حاصل کر لی، اور ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء سے چند سال تک حکمرانی کرتا رہا۔

اسماعیل کے بعد اس کا بیٹا حسین پاشا ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں اس منصب پر فائز ہوا۔ وہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء تک آٹھ بار مختلف وقفوں کے بعد اس منصب پر فائز ہوا۔ حسین نے ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں نادر شاہ کے مقابلے میں موصل کے دفاع میں شریک ہو کر بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ وہ مختلف اوقات میں دوسری ولایتوں کا والی اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔

اس کی وفات کے بعد پچاس سال تک اس کے بیٹے اور دوسرے اقرباء کا بھی یہی حال رہا۔ اس کے اخلاف میں سے جلیلی پاشا جو موصل کا والی تھا۔ موصل میں قبائلیوں اور دیہاتیوں کو شورشوں اور اپنے خاندان کی حاسدانہ تفرقہ پردازیوں کے برخلاف برسرپیکار نظر آتا ہے۔

اس خاندان کو عراق کے اگلے اور پچھلے تمام خاندانوں میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔

جب اس خاندان کے آخری والی یحییٰ پاشا کو معزول کر کے ایک جدید قسم کی مرکزی حکومت قائم کی گئی تو ان والیوں میں اس خاندان کے ممتاز افراد میں امین پاشا بن حسین، محمد پاشا بن امین پاشا اور احمد پاشا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جلیلی خاندان کے افراد تقریباً نوے سال تک حکمرانی کرتے رہے۔ اور اتنی طویل مدت تک اس خاندان کا اپنے آپ کو بے بدل ثابت کرنا اور اس کا مردانہ وار استقلال اس کو تاریخ میں ایک خاص مقام دیتا ہے۔

موجودہ دور میں اس خاندان کی اولاد موصل میں بڑی کثیر تعداد میں آباد ہے اگرچہ انہیں اب حکومت میں کوئی اثر و رسوخ حاصل نہیں رہا۔

جم (۲۷ رصفر ۸۶۴ھ/۲۲ دسمبر ۱۴۵۹ء — ۲۹ رجمادی الاول ۹۰۰ھ/۲۵ فروری ۱۴۹۵ء) ابن سلطان محمد ثانی۔ سلطنت عثمانیہ کا ایک سلطان۔ ماں کا نام چیچک خاتون تھا۔ جو سلطان محمد ثانی کی ایک کنیز تھی جس کو سلطان نے اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔

جم کا تعلق غالباً سربیا کے شاہی خاندان سے بتایا جاتا ہے۔ ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء میں جم کو دوا تالیقوں کے ساتھ قسطمونی کے سنجاق کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء میں وہ اپنے متوفی بھائی مصطفیٰ کی جگہ قرہ مان قونیہ کا گورنر بنا۔

سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد قرہ مانی کے دشمنوں نے ینی چریوں کی مدد سے ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں جم کی جگہ اس کے بھائی بایزید کو تخت نشین کر دیا۔ بایزید ابھی استنبول ہی میں تھا کہ جم نے آ کر بروسا پر قبضہ کر لیا۔ یہاں اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ بھی جاری کیا۔

بایزید نے اس کی تجویز کہ مملکت کو آپس میں تقسیم کر لیا جائے رد کر دیا اور ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں ینی شہر کے مقام پر بایزید نے جم کو شکست دی۔ شکست کے بعد جم قونیہ کی طرف نکل گیا اور طرسوس میں پناہ گزین ہوا۔ یہ علاقہ اس وقت مملوکوں کے زیر حکومت تھا۔ جب مملوکوں کے دارالسلطنت میں پہنچا تو سلطان قایت بائی نے اس کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا۔

۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں قرہ مانی مدعی حکومت قاسم بیگ اور انقرہ کے سنجاق بیگ محمد نے اسے اناطولیہ واپس جانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ سلطان قایت بائی نے اسے اناطولیہ جانے کی اجازت دے دی۔ قاسم اور محمد بھی مملوکوں کے علاقے میں اس سے آملے اور قونیہ کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھے تو محمد بیگ کو جو انقرہ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شکست ہوئی اور اسے چبق اووہ کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔

قاسم اور محمد محاصرے کا خیال چھوڑ کر انقرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے

Marfat.com

لیکن جب انہوں نے یہ خبر سنی کہ بایزید ثانی کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بڑھی چلی آرہی ہے۔ تو وہ دونوں واپس لوٹ آئے۔ جم نے تاش ایلی میں پناہ لی۔ یہاں پہنچ کر جم نے بایزید سے صلح کی بات چیت کی۔ لیکن وہ تقریباً ناکام رہی۔ قاسم نے جو علاقہ دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جم کو سمندر کے راستے روم ایلی جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے رودس میں گرینڈ ماسٹر پی ڈی ابیوسن سے عہد پیما کرلیا۔ جم کے اس سے پہلے ہی سے تعلقات تھے۔ جب کہ وہ اپنے باپ کے زمانہ میں قرہ مان کا گورنر تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے جم کو رودس میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت مل گئی۔ پی ڈی ابیوسن نے پوپ کو لکھا کہ جم کو مملکت عثمانیہ کے تباہ کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ادھر جم کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے بھائی بایزید ثانی کو اس بات پر راضی کرے گا کہ مملکت عثمانیہ آپس میں تقسیم کرلی جائے۔ لیکن بایزید نے ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں نائٹوں سے معاہدہ صلح کرلیا۔ جس کے تحت یہ طے پایا کہ نائٹ جم کو پوری طرح قابو میں رکھیں گے اور وہ بایزید کو تنگ نہ کرسکے گا اور بایزید اس کام کے عوض انہیں پنتالیس ہزار سالانہ وینس کے طلائی سکے دیتا رہے گا۔ جب پی ڈی ابیوسن نے جم سے یہ وعدہ کرکے کہ اسے براہ فرانس ہنگری پہنچا دیا جائے گا تو جم کو فرانس میں سات سال نظربند رکھا۔ جم چونکہ ایک اہم سیاسی قیدی تھا۔ وہ جس کے پاس بھی رہتا تھا ایک تو اس کا سیاسی بھرم بڑھتا تھا۔ دوسرے اسے روپیہ بھی ملتا تھا۔ اس لئے ہر ایک اسے اپنے پاس رکھنے کا خواہش مند تھا۔ جب جم فرانس میں نظربند تھا تو بایزید نے اس کے تین سالہ بچے اوغوز خان اور اپنی سلطنت کے سب سے طاقتور فرد گدک احمد پاشا کو قتل کرا دیا۔

نائٹوں اور پوپ ہشتم نے عیسائی دنیا کی عام بہتری کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ جم کو روما بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں جب جم پوپ سے ملا تو اس نے پوپ سے نائٹوں کی شکایت کی کہ انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور انہوں نے اسے روم ایلی پہنچانے کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ نیز انہوں نے مجھ سے قیدیوں کا سا سلوک کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ ہنگریوں کے ساتھ مل کر اپنے ہم مذہبوں سے نہیں لڑے گا۔ چنانچہ اسے واپس مصر بھیج دیا جائے۔ لیکن پوپ نے اس کی ایک نہ سنی۔ جم کے یورپ پہنچنے سے پوپ کی وقعت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ ترکوں کے خلاف صلیبی لڑائی لڑی جائے۔ چنانچہ اس نے عیسائی بادشاہوں کے نام خطوط لکھے۔

بایزید جم کے روما بھیج دیئے جانے سے بڑا پریشان تھا۔ اس نے قبوجی باشی مصطفیٰ بیگ کو ایک خط دے کر روما بھیجا جس میں پوپ کو اپنی دوستی کا یقین دلایا گیا تھا نیز اس نے اپنے سفیر کو ایک لاکھ بیس ہزار ڈوکٹ بھی دے کر بھیجا تھا جو جم کی تین سال کی پنشن تھی۔ جو اس وقت ادا کرنی تھی جب کہ مصطفیٰ بیگ جم کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔

۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء میں شاہ فرانس جم کو بادشاہ نیپلز پر حملہ کرنے کے وقت اپنے ساتھ لے گیا۔ لیکن جم راستے میں بیمار ہوگیا اور نیپلز پہنچ کر اس کا انتقال ہوگیا۔

جم نے مرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھا تھا کہ اس کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔ تاکہ صلیبی جنگ کے منصوبوں کے سلسلے میں کوئی اس کا نام استعمال نہ کرسکیں۔ بایزید اس کی لاش کو سرزمین ترکی میں لے جائے۔ اس کے تمام قرضے ادا کر دیئے جائیں اور اس کی ماں، بیٹی اور دوسرے لواحقین اور خدام کی کفالت کا بایزید مناسب انتظام کرے۔

جم کے انتقال کی خبر بایزید کو ۲۴۔رجب ۹۰۰ھ/۲۱ اپریل ۱۴۹۵ء میں ملی۔ اس نے پوری مملکت عثمانیہ میں اس کی وفات کا اعلان کرا دیا اور اس کے لئے عام دعائے مغفرت کی گئی۔ ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء میں اس کی میت کو ترکی لایا گیا۔ اور بروسا میں اس کے بڑے بھائی مصطفیٰ کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

بایزید ثانی نے اس کی وصیت کے مطابق تمام باتیں پوری کیں مگر اس کا لڑکا مراد جس نے رودس میں پناہ لے رکھی تھی۔ جزیرے کی فتح کے موقع پر پکڑا گیا اسے اس کے بیٹے سمیت قتل کرا دیا گیا۔

جم ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا۔ اس کے دو دیوان ایک فارسی اور ایک ترکی زبان میں موجود ہے۔

جمادی الاوّل:۔ اسلامی مہینہ۔ ترتیب کے لحاظ سے پانچواں اسلامی مہینہ

جمادی الثانی:۔ چھٹا اسلامی مہینہ۔

جماعت پارٹی، گروہ، حدیث میں جماعت کا لفظ بہت سی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً بنیادی طور پر جماعت کا لفظ باجماعت نماز میں شریک ہونے والوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آنحضورؐ نے فرمایا۔

"باجماعت نماز دو یا دو سے زیادہ افراد کے شریک ہونے سے ہوتی ہے (مسند)"

"باجماعت نماز کا ثواب اکیلے پڑھنے سے زیادہ ہے۔ (بخاری)

جماعت کا لفظ احادیث میں اس جماعت کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جو کسی امام کی اطاعت پر جمع ہوں۔

آنحضورؐ نے فرمایا۔

"ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کی نہ جماعت ہو اور نہ ان کا کوئی امام۔ کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے۔" (بخاری و مسلم)

جماعت کا لفظ آنحضورؐ نے ان سیاسی وثیقوں میں بھی استعمال کیا ہے جو ابن سعد نے نقل کئے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا:۔

"تو ہماری جماعت میں داخل ہوجا۔ یہ تیرے لئے بہتر ہے۔ (الوثائق ص۹)

"جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔" (ترمذی)

"جس نے سنت ترک کی وہ جماعت سے نکل گیا۔ (مسند احمد)

احادیث میں جماعت کا لفظ عامۃ المسلمین کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جنہیں قوم، نسل، رنگ، زبان اور ملک کے اختلاف سے قطع نظر محض دینی اور اسلامی رشتے نے مسلمانوں کی ایک قوم بنا دیا۔

فقہا جماعت کا لفظ باجماعت نماز ادا کرنے والوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے نزدیک جماعت کا اصولی مفہوم وہ جماعت صحابہ ہے جو نماز میں آنحضورؐ کے ساتھ شریک ہوتی تھی۔ بعد میں نماز سے قطع نظر صحابہ کی پوری جماعت مراد لیا جانے لگا۔

Marfat.com

حنبلی عقائد میں یہ خیال برابر کام کرتا رہا کہ حقیقی مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ آنحضورؐ کے اسوہ کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور جماعت صحابہ کے تعامل پر نظر رکھی جائے۔

جماعت کے تصور کے بارے میں مختلف مکاتب فکر میں اختلاف ہے۔ مثلاً طبری کے خیال میں جماعت کا مفہوم صرف صحابہ تک محدود نہ رکھا جائے۔ شاہ ولی نے جماعت المسلمین کا لفظ جماعت کفار کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ علامہ رشید رضا کے نزدیک بھی جماعت کے مفہوم میں وسعت ہے اور حنبلیوں کی طرح محدود نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جماعت سے مراد ہر عہد کے "ارباب حل وعقد" مراد ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو برملا کہتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں جماعت سے مسلمانوں کا سواد اعظم مراد لی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "اس بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیات جاہلی سے تعبیر کیا ہے۔ ...... افراد تباہ ہو سکتے ہیں لیکن ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"

ان کے نزدیک "جماعت سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو...... اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ قائم رہ سکتے ہیں۔ جب تک کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد اور مؤتلف و ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔"

اسلام مسلمانوں کی جماعت کی بنیاد باہمی مواخات و مساوات پر رکھتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کی تشکیل کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کی بہتری اور فلاح کے لئے قائم کیا گیا ہے (۳ : ۱۱۰)

جماعت اسلامی پاکستان کی ایک مشہور و معروف جماعت۔ یہ جماعت ۲ ر شعبان ۱۳۶۰ھ / ۲۶ ر اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں مولانا مودودی کی دعوت پر قائم ہوئی۔ اس کی بنیاد ۷۵ ارکان نے رکھی تھی۔ برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے بعد جماعت اسلامی بھی تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۱۔ جماعت اسلامی پاکستان ۲۔ جماعت اسلامی ہند۔ ۳۔ جماعت اسلامی جموں و کشمیر۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد جماعت اسلامی بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ یہ جماعت جزائر انڈیمان اور سری لنکا میں بھی سرگرم عمل ہے۔

جماعت اسلامی محض ایک "سیاسی" یا "مذہبی" یا "اصلاحی" جماعت نہیں ہے بلکہ یہ وسیع معنی میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے اسلام کے جامع اور عالمگیر نظریہ حیات پر یقین رکھتی ہے۔ اور اس کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک دنیا کے بگاڑ کا حقیقی سبب خدا اور آخرت سے بے نیازی اور رسالت کی رہنمائی سے روگردانی ہے۔ دنیا میں جہاں اور جس شعبہ زندگی میں بھی خرابی پیدا ہوئی ہے اس کی تہہ میں یہی بنیادی سبب کارفرما رہا ہے اور کوئی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ خدا کی اطاعت، آخرت کی جوابدہی کے احساس اور رسالت کی رہنمائی کو نظام زندگی کی بنیاد بنایا جائے۔

عقیدہ جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہوگا۔ یعنی یہ کہ صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس کی تشریح دستور جماعت میں اس طرح کی گئی ہے۔

اس عقیدے کے پہلے جزو یعنی اللہ کے واحد الٰہ ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ ہے۔ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریادرس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقوے اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہے، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں۔ خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرے۔ کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے۔ کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ جو ایک اللہ کی اطاعت کے تحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ

۶۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دستبردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اس اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے بلکہ ہر چیز، حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔

۱۱۔ اپنے لئے اخلاق میں، برتاؤ میں معاشرت اور تمدن میں معیشت اور سیاست میں غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے، اور ہر اس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس عقیدے کے دوسرے جزو یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب

Marfat.com

یہ ہے کہ مسلمانوں کا ثبات حق کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعے سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے۔

۱۔ انسان ہر اس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لئے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول خدا سے ثابت ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔

۳۔ رسول خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے تحت ہو نہ کہ ان سے آزاد

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لئے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے۔ خواہ وہ شخصی ہوں، یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت و عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی مدمقابل بن جائے۔

۶۔ رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے۔

۷۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی دوسرے انسان کا یہ منصب تسلیم نہ کرے کہ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ ہو۔

جماعت اسلامی کا مقصد جس کے لئے وہ قائم ہوئی ہے یہ ہے۔

"انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر و نظر، عقیدہ و خیال مذہب و اخلاق، سیرت و کردار، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت معیشت و سیاست، قانون و عدالت، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر قائم کیا جائے۔

جماعت اسلامی کے سربراہ کو "امیر" کہتے ہیں۔ اس جماعت کے پہلے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ موجودہ امیر میاں طفیل محمد ہیں۔ امیر کا انتخاب پانچ سال کے لئے ارکان جماعت براہ راست خفیہ رائے دہی کے ذریعے کرتے ہیں

امیر جماعت جماعتی پالیسی اور پروگرام اور تمام اہم امور پچاس ارکان پر مشتمل، مجلس شوریٰ کے مشورے سے طے کرتا ہے اور اس مجلس شوریٰ کے ارکان کا تقرر بھی ارکان جماعت کے براہ راست خفیہ ووٹوں سے کیا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی اپنے ممبروں کی تنظیم کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے

۱۔ متفق۔ ۲۔ رکن۔

احیائے اسلام کی تحریک اور عوام پاکستان کی بہبود کے لئے جماعت اسلامی کے تاریخی پارٹ کا جائزہ لینے کے لئے حسب ذیل شواہد قابل توجہ ہیں۔

۱۔ جماعت اسلامی کا لٹریچر اور اس کی دعوت کے اثرات گذشتہ ۳۲ سالوں میں کرۂ ارض کے ہر گوشے میں جہاں مسلمان پائے جاتے ہیں پہنچ گئے ہیں۔ اس کا لٹریچر اردو سے عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، سواحلی، تامل، بنگلہ گجراتی وغیرہ ستائیس مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل رہا ہے اور یہ جماعت کا اہم ترین کام ہے کہ اس نے ایک وسیع لٹریچر فراہم کیا ہے جو ہر پہلو میں اسلام کی صداقت اور اس کے قابل عمل ہونے کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کو مطمئن کر سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد اس بات پر پوری طرح مطمئن ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ ایک جدید ترین ریاست کو اسلام کے اصولوں پر چلایا جا سکتا ہے۔

۲۔ جماعت کا دوسرا کام یہ ہے کہ اس نے مخلص اور بھروسے کے قابل سیرت و کردار رکھنے والے کارکنوں کی ایک ایسی منظم ٹیم تیار کی ہے۔ جس نے انتھک محنت سے لاکھوں آدمیوں کو اپنا ہم خیال بنایا ہے۔ قوم میں اپنی دیانت و امانت کا اعتماد قائم کیا ہے۔

۳۔ پاکستان بننے کے بعد سے سیلابوں اور طوفانوں کے متاثرہ افراد، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے مصیبت زدگان، جہاد کشمیر، دفاع پاکستان، جہاد فلسطین اور اریٹیریا کے مجاہدین کی امداد کے سلسلے میں پاکستان کے عوام نے مجموعی طور پر ۸۰ لاکھ روپے نقد و سامان کی صورت میں جماعت کو دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں جماعت کے شعبہ خدمت خلق کے تحت ملک میں مفت اور سستے علاج اور غریب طبقوں اور طلبہ کی امداد کا کام وسیع پیمانے پر جاری ہے۔

۴۔ اس ملک میں جو تحریکیں لادینی اور ملحدانہ نظام لانا چاہتی ہیں یا جو تحریکیں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں جماعت اسلامی نے ہر میدان میں ان تحریکوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور کر رہی ہے۔ خواتین میں بھی اس جماعت کا کام جاری ہے۔

۵۔ دستور میں پہلے قرارداد مقاصد کا پاس کرانا اور اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرانے میں جماعت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

جماعت اسلامی کو ۱۹۵۳ء میں بھاری ابتلا سے گذرنا پڑا جو قادیانیت کی تحریک کی مخالفت کرنے کی وجہ سے تھا۔ جماعت کے امیر مولانا مودودی کو پھانسی تک کی سزا بھی سنائی گئی جو اس تحریک کے خلاف ایک پمفلٹ لکھنے کے جرم میں سنائی گئی تھی۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ محلاتی سازشوں اور آمریت اور مارشل لا جیسے سخت ادوار میں بھی جماعت اسلامی نے مختلف فتنوں کے خلاف پرزور آواز بلند کی۔ الغرض اس جماعت نے ہر میدان میں وقت کے ہر چیلنج کا جواب دیا اور اس کا سامنا کیا۔

جماعت، تبلیغی ایک خالص مذہبی جماعت۔ جس کا مرکز رائے ونڈ ہے۔ تبلیغی جماعت کے بانی اور داعی مولانا محمد الیاس ہیں۔ آپ نے ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ/۲۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو مدینہ منورہ سے کاندھلہ واپس آنے کے بعد اس جماعت کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ آپ نے تبلیغی گشت شروع کر کے لوگوں کو دعوت دی کہ وہ بھی عوام میں نکل کر دین کے اولین ارکان و اصول (کلمہ توحید و نماز) کی تبلیغ کریں۔ دین کی تبلیغ کے لئے عام آدمیوں کا زبان کھولنا بڑا پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ چند آدمیوں نے بڑی

Marfat.com

شرم و حیا اور رکاوٹ کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔ چنانچہ عرصے تک میوات میں اسی طرز پر کام ہوتا رہا اور دینی و علمی مرکزوں کے لوگوں کو میوات کے جلسوں میں تبلیغی جماعت کے اجتماع کے موقع پر دعوت دی جاتی رہی اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا نے اپنے طویل تجربے اور بالغ نظری سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اپنے ماحول اور مشاغل میں گھرے رہ کر ان غریب میواتی کاشت کاروں کا دین سیکھنے کے لئے وقت نکالنا اور اس تھوڑے سے وقت میں جس میں ان کو کامل یکسوئی بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ دین کے ایسے اثرات کو قبول کر لینا جن سے ان کی زندگی میں انقلابی اصلاح اور تغیر پیدا ہو جائے ممکن نہیں۔ ان سے یہ مطالبہ کرنا بھی صحیح نہیں کہ سب کے سب اس عمر میں مکاتب اور مدارس کے طالب علم بن جائیں اور یہ توقع بھی غلط ہے کہ وعظ و پند ہی سے ان کی زندگی میں انقلاب آجائے گا۔ اور وہ اس جاہلی زندگی سے نکل کر اسلامی زندگی میں قدم رکھیں گے۔ ان کے عادات و اخلاق مزاج و طبائع شوق و رغبت اور جذبات بدل جائیں گے۔

مولانا کے نزدیک اس کی تدبیر صرف یہی کہ ان کو کچھ مدت کے لئے جماعتوں کی شکل میں دین اور علم کے مرکزوں کی طرف نکلنے پر آمادہ کیا جائے۔ وہ وہاں کے عوام اور جہلا میں کلمہ اور نماز کی تبلیغ کریں اور اس طرح اپنا پڑھا ہوا سبق پختہ کریں اور وہاں کے اہل علم و دین کی مجلسوں میں بیٹھ کر ان کی باتوں کو غور سے سنیں اور ان کی زندگی نشست و برخاست اور عمل کو لغور دیکھیں اور اس طرح بالکل فطری طریقہ پر جسطرح بچہ زبان سیکھتا ہے اور آدمی تہذیب و شائستگی حاصل کرتا ہے وہ دین اور علم دین حاصل کریں۔

جب تبلیغی جماعت کے افراد تبلیغ کے لئے نکلتے ہیں تو ان کو حسب ذیل ہدایات ہیں۔ جن کو ہم تبلیغی جماعت کے اصول کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ ہر کلمہ گو اور علم والے کا دل سے احترام و اکرام کریں اور اس کی مشق کریں۔

۲۔ دوسرے کے عیوب سے اپنی آنکھیں بند کریں۔ اور اپنے عیوب تلاش کرتے رہیں

۳۔ بیان اور تعلیمی حلقوں اور مجلسوں میں کسی طبقہ یا جماعت یا فرد پر نکیر یا طنز نہ کرنا۔ جو لوگ جماعت میں وقت نہ لگا سکیں ان کی بھی تنقیص نہ کرنا۔

۴۔ ہر علاقہ کے بزرگان دین علماء اور مشائخ سے استفادہ کی اور دعاء کی نیت سے ملیں اور ہر ایک کے تعلق والوں سے اکرام و محبت کے ساتھ مل کر کام کریں۔ کسی پر تنقید نہ کریں۔

۵۔ تبلیغ اور جماعت میں نکلنے کو دنیوی فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اپنے حاصل کئے ہوئے مفادوں کو قربان کرنے کی مشق کی جائے۔

۶۔ بیان میں اپنے کارنامے نہ بیان کئے جائیں۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ و السلام صحابہ کرامؓ اور اسلاف کے واقعات کے ذریعے ترغیب دی جائے اور ان ہی کی مددوں کا تذکرہ کیا جائے۔

۷۔ کرنے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ دن میں اس کے دین کی انتھک کوشش کر کے راتوں کو تضرع و زاری و الحاح کے ساتھ خدا ہی سے اس کی نصرت اور مدد مانگی جائے اور جو کچھ وجود میں آئے اس کا کرم سمجھا جائے۔

تبلیغی جماعت کے نظام کار کے بارے میں کہ جب جماعتیں وجود میں آجائیں تو ان کے کام کا نظام کیا ہوگا اور ترکیب کیا ہوگی۔ کس چیز کی اور کتنی چیزوں کی دعوت دی جائے گی۔ مولانا الیاسؒ کے الفاظ میں یہ ہے۔

۱۔ نکلنے کے وقت حضورؐ کی لائی ہوئی چیزوں میں جو چیز جتنی اہم ہے اس میں اسی کی حیثیت سے کوشش کرنا، اس وقت ہم بدقسمتی سے کلمہ تک سے ناآشنا ہو رہے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلا اسی کلمہ طیبہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدا کی خدائی کا اقرار اور اسی اللہ کے حکم پر جان دینے کے علاوہ در حقیقت ہمارا اصل میں مشغلہ ہوگا۔

۲۔ کلمہ کے لفظوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے اور نمازوں کو حضورؐ کی نماز جیسی بنانے کی کوشش میں لگے رہنا۔

۳۔ تین وقتوں کو (صبح و شام اور کچھ حصہ شب کا) اپنی حیثیت کے مناسب تحصیل علم و ذکر میں مشغول رکھنا۔

۴۔ ان چیزوں کو پھیلانے کے لئے اصل فریضہ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بہ ملک رواج دینا۔

۵۔ اس پھرنے میں خلق کی مشق کرنے کی نیت رکھنا۔ اپنے فرائض (خواہ خالق کے ساتھ متعلق ہو یا خلق کے ساتھ) کی ادائیگی کی سرگرمی، کیونکہ ہر شخص سے اپنے ہی متعلق سوال ہوگا۔

۶۔ (تصحیح نیت) یعنی ہر عمل کے بارے میں اللہ نے جو وعدے وعید فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعے اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا۔

یہ جماعت ہند و پاکستان کے علاوہ حجاز، عراق، لندن، امریکہ، افریقہ، برما وغیرہ تقریباً سارے ہی ملکوں میں موجود ہے۔

پاکستان میں اس جماعت کا مرکز رائے ونڈ میں ہے جو لاہور کا ضلع ہے۔ اسی مرکز میں اس کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے اور اس اجتماع میں ہزاروں کی تعداد میں ساری دنیا کے مسلمان جو جماعت سے وابستگی رکھتے ہیں شریک ہوتے ہیں۔ یہیں سے مختلف جماعتیں بن کر پورے ملک میں اور بیرون ملک تبلیغ کے لئے نکلتی ہیں۔

جماعت علی شاہ، پیر

(۱۲۵۶ھ یا ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۰ء یا ۱۸۴۵ء – ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ / ۳۱ اگست ۱۹۵۱ء) ایک عالم دین اور محدث۔ والد کا نام سید کریم شاہ تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد میں سے سید محمد حنیف نامی ایک بزرگ شہنشاہ اکبر کے عہد میں شیراز سے ہندوستان تشریف لائے اور علی پور سیداں میں سکونت پذیر ہو گئے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں عبدالرشید سے پڑھیں اور مولانا عبدالوہاب امرتسری سے تکمیل کی پھر لاہور آکر مولانا غلام قادر بھیروی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے مولوی عالم اور مولوی فاضل کا کورس پڑھا۔ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی سے جو اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر تھے مزید استفادہ کیا۔ بعد میں مولانا محمد مظہر سہارنپوری، مولوی محمد علی اور مولانا احمد حسن کانپوری، شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی سے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔

روحانی تربیت کے لئے آپ بابا فقیر محمد چوراہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند روز ان کی صحبت میں رہے۔ حضرت بابا نے آپ کو خلافت اور اجازت عطا فرمائی اور دعاؤں کے ساتھ آپ کو رخصت کیا۔ یہ اسی بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ پشاور سے راس کماری اور کشمیر سے مدراس تک آپ کے عقیدت مندوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے برعظیم پاک و ہند ہی میں نہیں بلکہ کابل، برما، سعودی عرب اور دیگر ممالک میں بھی آپ کے عقیدت مند موجود ہیں۔

Marfat.com

خلافت ملنے کے بعد آپ نے علی پور سیداں کی مسجد کو وعظ و تبلیغ کا مرکز بنایا اور ملک کے دور دراز علاقوں میں تبلیغی دورے کئے۔ آپ کے ہاتھ پر سینکڑوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ آپ نے کئی جگہ مدارس و مساجد اور کنوئیں بنوائے۔ آپ ساری عمر تبلیغ اسلام میں پوری تندہی کوشاں رہے۔

۱۹۲۳ء میں جب شدھی کی تحریک اٹھی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا تو آپ نے اس تحریک کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور اس فتنے کی سرکوبی کے لئے مہم شروع کی۔

آپ نے ہر قومی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب عثمانی سلطان عبدالحمید نے حجاز ریلوے لائن کی تعمیر کے سلسلے میں مسلمانان عالم سے چندہ مانگا تو آپ نے چھ لاکھ روپے کی رقم اپنی اور اپنے متوسلین کی جانب سے بھجوائی۔ سلطان نے آپ کو "عمدہ الاماثل والا فاضل" کے خطاب سے نوازا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی گئی تو آپ نے تین لاکھ روپے کی رقم اس فنڈ میں جمع کرائی۔ اور بعد میں بھی تعاون فرماتے رہے۔

تحریک خلافت میں بھی آپ نے ہر طرح کی خدمات انجام دیں۔ خلافت فنڈ میں لاکھوں روپیہ چندہ دیا۔

تحریک پاکستان میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کی حمایت کی۔ قائداعظم کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اسلامی آئین کے نفاذ کے لئے کوشش کرتے رہے۔ آپ جگہ جگہ جلسوں اور یادداشتوں کے ذریعے حکومت کو اسلامی آئین کے نفاذ کا وعدہ یاد دلاتے رہے۔

علی پور سیداں میں آپ نے چھ لاکھ روپے کے صرف کثیر سے ایک خوبصورت مسجد بنوائی جو قابل دید ہے۔

پیر جماعت علی شاہ کا انتقال ایک سو سال سے زائد کی عمر میں ہوا۔ آپ کا عرس علی پور سیداں میں ہر سال ۲۸، ۲۹ ربیساکھ کو نہایت عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔ آپ سچے عاشق رسولؐ تھے اور عشق نبی آپ کے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ آنحضورؐ کا نام مبارک سنتے ہی آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ آپ ہر سال حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جاتے اور زیادہ وقت مدینہ طیبہ ہی میں گزارتے آپ کو وہاں کی ہر چیز سے عقیدت تھی۔ وہاں کے چرند پرند اور حیوان اور جانوروں تک سے پیار تھا۔ مولانا داؤد غزنوی نے آپ کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے جو انھوں نے بچشم خود دیکھا تھا۔

"ایک مرتبہ مدینہ شریف میں باب السلام کے نزدیک چند کتے لیٹے ہوئے تھے ایک ناسمجھ نے جاتے جاتے ایک کتے کو لاٹھی ماری۔ کتا لنگڑاتا اور چیختا چلاتا جا رہا تھا کہ اچانک آپ وہاں تشریف لے آئے۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو کتے کو پاس بٹھایا اور اس شخص سے کہا ظالم تو نے یہ نہ دیکھا کہ مدینہ منورہ شریف کا کتا ہے۔ پھر اپنا عمامہ پھاڑ کر کتے کی زخمی ٹانگ پر پٹی باندھی اور بازار سے کھانا منگوا کر اسے کھلایا۔

آپ کی مجلس میں اکثر و بیشتر نعت خوانی ہوتی رہتی تھی۔ آپ امیر ملت اور محدث علی پور کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

جمال الدین آق سرای (ـــ ؟ ـــ ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء) ایک ترکی فلسفہ دان اور متکلم۔ آق سرای کے مقام پر پیدا ہوا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ امام فخرالدین رازی کا پوتا تھا اور جمالی کے نام سے مشہور تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آق سرای گئے مدرسہ زنجرلی میں مدرس مقرر ہوا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو جو ایک کثیر تعداد میں تھے۔ تین گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی جماعت اور گروہ کو "مشائیون" کہا جاتا تھا۔ یہ شاگرد اس کے گھر کے دروازے پر جمع ہو جاتے اور اس کے ساتھ مدرسے تک جاتے اور جمال الدین انہیں چلتے چلتے درس دیتا تھا۔ دوسری جماعت "رواقون" کی تھی جو مدرسے کے ستونوں کے نیچے اس کا انتظار کرتے تھے۔ جہاں ان کا استاد انہیں کھڑے کھڑے سبق دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیسرے گروہ کے پاس جاتا تھا جو مدرسے کے بڑے کمرے میں موجود ہوتے تھے۔

حسام الدین نے اپنی کتاب "اماسہ تاریخی" میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حاجی شادگلدی کے ہاں قاضی عسکر کے عہدے پر فائز تھا۔ جب مؤخرالذکر کو میواس کے امیر قاضی برھان الدین کے ہاتھوں شکست ہوئی تو ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء میں جمال الدین آق سرای چلا گیا۔

جمال الدین کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ براکلمان نے ۷۷۰ھ ۱۳۷۷ء طاہر بروسلی نے ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء اور عدنان ادوار نے ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء بیان کی ہے۔

اس کے شاگردوں میں علامہ ملا فناری جیسے صاحب علم لوگ تھے۔

جمال الدین کی تصانیف اخلاق جمالی، شرح الغایۃ القصویٰ، شرح الایضاح شرح مشکلات القرآن الکریم، حال، الموجز، حاشیہ، الملتقی، شرح اللباب المسمیٰ بکشف الاعراب وغیرہ ہیں۔

جمال الدین افغانی:۔ اتحاد عالم اسلامی کا علمبردار (دیکھئے افغانی، جمال الدین)

جمال الدین محمود، استادار (ـــ ؟ ـــ ۷۹۹ھ/۱۳۹۵ء) مصر میں عہد مملوک میں شاہی محل اور شاہی مطبخ کا نگران استادار کے فرائض میں شاہی محل اور شاہی مطبخ کی دیکھ بھال، محل کے غلام، لونڈیاں اور ملازمین کی تنخواہ کی تقسیم ان کے لئے غذا، پوشاک اور دوسری ضروریات کی فراہمی کا کام تھا۔ یہ ایک نہایت اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا اور ایک وقت میں کئی کئی افراد استادار ہوتے تھے۔

اس کا شمار آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مصری عمائدین میں ہوتا ہے اس کے ابتدائی حالات زندگی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے بارے میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ نہایت ہی غریب شخص تھا، خوش قسمتی سے اس کی رسائی ایک مشہور ترکی غلام سودون باق السیفی المزبای الظاہری تک ہو گئی اور اس کی حالت بہتر ہو گئی چونکہ جمال الدین سودون کا پروردہ تھا اسی نسبت سے اسے السودونی بھی کہا جانے لگا۔ وہ الملک الظاہر سیف الدین ابوسعید کے عہد حکومت میں حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز ہوا۔ وہ قاہرہ کا "شادالدواوین" بھی مقرر کیا گیا جو ایک ذمہ عہدہ تھا۔ محمود نے اس عہدے کو نہایت ہی احسن طریقے سے نبھایا۔ اس کی خوش سلیقگی سے متأثر ہو کر الملک نے اسے جلد ہی "استاداریہ" جیسے نہایت ہی اہم منصب پر تقرر کر دیا۔ کچھ عرصے بعد ہی اسے سلطان کا مشیر خاص ہونے کا اعزاز

Marfat.com

بھی حاصل ہوا۔

جب یلبغا الناصری نے خروج کیا تو اسے بھی دوسرے ظاہری امراء کے ساتھ قید میں ڈال دیا گیا۔ جب الملک الناصر دوبارہ مصر آکر تخت نشین ہوا تو جمال الدین محمود کو اس کے سابقہ عہدے پر دوبارہ فائز کر دیا گیا۔

آخر عمر میں محمود کو بہت زیادہ تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا سارا مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور اسے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ وہ سلطان کے زیر عتاب آگیا۔ اس سے پانچ لاکھ دینار طلب کیے گئے اور حکم دیا گیا کہ انکار کی صورت میں اس کی جاگیر فروخت کر کے یہ رقم حاصل کی جائے۔ بالآخر یہ معاملہ ڈیڑھ لاکھ دینار پر طے ہو گیا۔ اس کے بیٹے امیر ناصر الدین محمد نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر دس گھوڑے اسکندریہ کے بنے ہوئے سوتی کپڑوں کے دو سو تھان اور دس ہزار دینار پیش کیے۔ لیکن سلطان کا غصہ محمود و آل محمود کے بارے میں پھر بھی ٹھنڈا نہ ہو سکا ابن بطلاری والی قاہرہ نے ان کے ملازمین اور اقربا کو ایسی سخت سخت سزائیں دیں کہ وہ لوگ خزانوں اور دفن شدہ مال و دولت کو زیادہ دیر راز میں نہ رکھ سکے۔ ان لوگوں کی اطلاعات پر جب تفتیش شروع ہوئی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے چاندی اور سونا اگلنا شروع کر دیا ہے۔ محمود کی جو دولت سلطان کو حاصل ہوئی بقول ابن تغری بردی چودہ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم بتائی ہے۔ لیکن پھر بھی محمود نے جو دولت لوگوں کے پاس چھپا رکھی تھی وہ ان ہی کے پاس رہ گئی۔

جب محمود نے قید خانے میں انتقال کیا تو اس کی حالت نہایت ہی کس مپرسی کی تھی اور اس کے کفن کے لیے دام تک میسر نہ تھے۔ آخر اس کے ایک غلام نے اپنی جیب خاص سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا۔

جمال بابا ۔ برعظیم پاک و ہند کے ایک بزرگ (دیکھیے "شاہ جمال بابا")

جمال پاشا، احمد (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۲ء — ۱۳۴۰ھ/۲۱ جولائی ۱۹۲۲ء) ایک ترک سپاہی اور سیاستدان۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں "مکتب حربیہ" میں تعلیم مکمل کی۔ اور بحیثیت کپتان عام اساکین حربیہ میں ملازم ہوا۔ اس کا تقرر سالونیکا کی تیسری فوج میں کیا گیا۔ یہاں پر وہ مقدونیہ کی "نوجوان ترک سازش" کے بنیادی ارکین میں شامل ہو گیا۔ اس کو مجلس اتحاد و ترقی کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں انقلاب کے بعد وہ مجلس اتحاد و ترقی کی مجلس عاملہ کا رکن بنا۔ اس ۱۹۰۹ء کی تحریک مخالف انقلاب" کے دبانے میں بڑی ہمت سے کام کیا اور سکوتری کا فوجی عامل بنایا گیا۔ اسی سال اسے اڈنہ کا اور ۱۹۱۱ء میں بغداد کا والی بنایا۔ ۱۹۱۲ء میں اس نے قونیہ کی فوج محافظ کی قیادت سنبھالی۔ بلقان کی پہلی جنگ میں اس نے ویزہ کی لڑائی میں شرکت کی۔ ادرنہ پر حصار پر شکست کھائی۔

اتحاد و ترقی کے انقلاب کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء میں وہ استنبول کا فوجی قائد اور والی مقرر کیا گیا۔ بلقان کے حملے کے وقت اس نے اتحادیوں کی ادرنہ پر دوبارہ قبضے کی تجویز کی پرزور تائید کی۔ اور اپنی تدابیر سے دارالسلطنت کی حزب مخالف کے سرغنوں کو گرفتار کر کے ملک بدر کر کے جدید نظام کو قطعی اور مضبوط تر کر دیا۔

جون ۱۹۱۳ء سے جب صدر اعظم محمود پاشا کو قتل کیا گیا۔ جنگ عالمگیر کے اختتام تک سلطنت عثمانیہ کی باگ ڈور عملی طور پر جمال پاشا، انور پاشا اور طلعت پاشا ہی کے ہاتھ میں رہی۔ جمال پاشا کو لیفٹیننٹ جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں وزیر تعمیرات عامہ مقرر کیا گیا۔ فروری ۱۹۱۴ء میں ... بحریہ ... کے سپرد کی گئی جولائی ۱۹۱۴ء میں وہ فرانس کے دورے پر گیا تاکہ حکومت عثمانیہ اور فرانس میں باہمی تعاون قائم ہو سکے۔ اگست ۱۹۱۴ء میں اسے دوسری فوج کی قیادت سونپ گئی۔ نومبر ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک جمال پاشا چوتھی فوج کے سپہ سالار رہے۔ نیز صوبہ شام کا جس میں فلسطین اور حجاز شامل تھے۔ فوجی عامل بھی رہا۔ اس ساری مدت میں ۱۹۱۸ء تک اس کے پاس وزارت بحریہ کا عہدہ رہا۔ وہ بیک وقت انور پاشا کا ہم پلہ بھی تھا۔ اس کا ماتحت بھی۔

جب طلعت پاشا کی مجلس وزراء سے مستعفی ہونے تو جمال پاشا نے بھی بحریہ کی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو طلعت اور انور کے ساتھ فرار ہو کر برلن چلا گیا۔ جہاں سے بعد میں سوئٹزر لینڈ چلا گیا۔ اس کی غیر حاضری میں عدالت نے اسے موت کی سزا کا فیصلہ سنایا۔ اس نے قیام یورپ کے دوران میں افغانستان کے امیر امان اللہ خان کی ملازمت قبول کر لی۔ یہاں سے اس نے روس کا سفر کیا اور وہاں سوویٹ حکومت کے مہتم امور خارجہ چشیرن کو اس بات پر راضی کر لیا کہ افغانستان کی فوج جدید طریق پر تیار کرے۔ اپنے قیام ماسکو کے دوران میں اس نے کمال اتاترک کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۹۲۰ء میں تاشقند میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ جہاں اس نے نظر بند ترکی افسران میں سے چند افراد کو بھرتی کر کے اپنے منصوبے کے لیے ایک جماعت تیار کی۔ اور پھر اپنا "فوجی ناظر عام" کا عہدہ سنبھالنے کے لیے افغانستان روانہ ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ایک بار پھر ماسکو گیا۔ تاکہ بالشویک حکومت، مصطفیٰ کمال اور انور پاشا کے ساتھ مزید بات چیت کرے۔ اس کے بعد جب وہ افغانستان آ رہا تھا تو تفلس کے مقام پر دو ارمنوں سرگو ترتیان اور کرکن لالیان نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسے پہلے تفلس میں اور پھر کچھ عرصہ بعد ارزروم میں دفن کیا گیا۔

جمال تلوی، ملا ایک عالم دین۔ آپ نے اوچ شریف میں مولانا اسماعیل سے علم دین حاصل کیا۔ لاہور کے محلہ تلہ میں فروکش تھے۔ آپ کی درسگاہ میں بہت سے طالب علم علم تفسیر و حدیث اور دوسرے اسلامی علوم کی تحصیل کرتے تھے۔ آپ کو علی ہجویری" المعروف داتا گنج بخش سے حد درجہ عقیدت تھی۔ پورے بارہ سال تک آپ مزار مبارک پر حاضری دیتے رہے۔

آپ میں صبر و تحمل اور برداشت حد درجہ موجود تھی۔ ایک مرتبہ آپ کو کھانے کے لیے کئی روز تک کچھ نہ مل سکا۔ لیکن آپ نے اس فاقہ کشی کا کسی دوسرے کے سامنے ذکر نہ کیا۔

ملا بدایونی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ اس وقت کے اعلم العلماء میں سے ہیں۔ آپ کا درس بے مثال ہے بڑے خوش بیان اور زود خطابت کے مالک تھے۔ معقولات اور منقولات کے نہایت دقیق مسائل شاگردوں کو اس انداز میں سمجھاتے تھے۔ جیسا کہ یہ چیز ان کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ فیضی اپنی بے نقط تفسیر میں آپ سے ہی اصلاح لیتا تھا۔

جمال حسینی (ت ؟ — غالباً ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء) ایک عالم دین اور مورخ امیر جمال الدین عطاء اللہ حسینی الدشتکی الشیرازی ان کا اعزازی لقب تھا۔ انہوں نے ہرات میں سلطان حسین تیموری کے عہد حکومت میں شہرت پائی۔ ان کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں "روضۃ الاحباب"

Marfat.com

لا سیرالنبی والآل والاصحاب" جو آنحضرت اصاحب کے خاندان اور صحابہؓ کی تاریخ ہے یہ کتاب انھوں نے جنرل شیر لال کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں ہوا۔

دوسری تصنیف "تحفۃ الاحبار فی مناقب آل العبار" جو آنحضورؐ، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کے فضائل پر مشتمل ہے۔

تیسری کتاب کا نام "ریاض السیر" ہے۔

جمال، عبدالناصر (۱۳۳۶ھ/۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء — ۱۳۹۰ھ/۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء) مصر کے سابق صدر۔ شمالی مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں بنی مور میں پیدا ہوئے۔ جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہ ایک متوسط الحال مصری گھرانہ تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم کے لیے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ نہضۃ المصر ثانوی سکول میں داخل ہوئے۔ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹ سال کی عمر میں ۱۹۳۷ء میں ملٹری اکیڈمی میں داخل ہوئے ایک سال تکمیل علم سے فارغ ہونے کے بعد جولائی ۱۹۳۸ء میں انفنٹری میں انھیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے کمیشن مل گیا۔ اس کے بعد تھرڈ کیولری بٹالین کے ساتھ منسلک ہو گئے اور ان کا ملک آباد میں تقرر کیا گیا۔ یہیں پر ان کی انور السادات زکریا محی الدین اور احمد انور سے ملاقات ہوئی۔

جمال عبدالناصر اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے ملک و ملت کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے تھے۔ خود ان کے قول کے مطابق "میری زندگی میں وہ دن ۱۹۳۵ء کے اس پرآشوب دور سے بھی پہلے آ چکا تھا۔ جب میں طالب علم تھا اور میرے شب و روز فلک شگاف نعروں اور جلوسوں میں بسر ہو رہے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا جو بالآخر بحال کر دیا گیا۔ میں ان دنوں طلبائے کے وفود کے ساتھ قوم کے زعماء کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا تھا کہ خدا کے لیے مصر کی خاطر متحد ہو جائیے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں جو نیشنل فرنٹ کا قیام عمل میں آیا وہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔"

جمال عبدالناصر ایک انقلابی جذبہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھی ان میں یہ جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو لکھا ہوا خط جو انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ ان کے اس انقلابی ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"آج صورت حال بڑی نازک ہے اور مصر نازک ترین پوزیشن میں ہے ...... شاید ہمیں زندگی کو خیرباد کہنا پڑے، موت سے ہمکنار ہونا پڑے، یا اس کی دیواریں بڑی مستحکم ہیں، کون ان کو ڈھائے گا۔ کون ان کو گرائے گا۔"

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر انہیں سکندریہ بھیجا گیا۔ یہاں ان کی ملاقات عبدالحکیم عامر سے ہوئی۔ بعد میں انہیں العالمین اور سکندریہ کے درمیان ایک فوجی کیمپ میں متعین کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ دو برس کے لیے سوڈان بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں انہیں ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر مقرر کیا گیا اور کچھ عرصہ بعد انھوں نے جنرل سٹاف کالج میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد لیکچرر کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین شروع ہوئی تو ناصر نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تاکہ وہ رضاکار کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو سکیں۔ لیکن ان کا استعفیٰ منظور نہ ہوا۔ جب مصر نے جنگ فلسطین میں شامل ہونے

مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر

کا فیصلہ کیا تو جمال عبدالناصر کو محاذ پر بھیجا گیا۔ دوران جنگ وہ شدید زخمی ہوئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک غزہ کے ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ اس جنگ میں انھوں نے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں انہیں دو مرتبہ فوجی اعزاز "فواد سٹار" ملا۔ وہیں انھوں نے آزاد خیال افسروں کی تنظیم کا خاکہ تیار کیا۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ فاروق کے نامزد امیدوار کے خلاف جنرل نجیب کو آفیسرز کلب کا صدر منتخب ہونے میں مدد دی۔ آزاد خیال افسروں کی تنظیم نے جس کی قیادت جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء میں مصر میں انقلاب برپا کیا۔ اور نائب صدر منتخب ہوئے۔ جب جون ۱۹۵۳ء میں جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو نجیب صدر اور وزیراعظم ہوئے اور جمال عبدالناصر نائب وزیراعظم اور وزیر داخلہ بنے۔ جب خارجہ پالیسی اور ملکی اصلاحات کے سلسلے میں نجیب اور ناصر کے درمیان اختلافات رونما ہوئے تو فوجی کونسل کی اکثریت نے ناصر کا ساتھ دیا۔ ایک سال تک جنرل نجیب کو سیاست سے الگ ہونا پڑا۔ اس پر امریکہ نے اسوان بند کے لیے مالی امداد کا وعدہ واپس لے لیا۔ اور بین الاقوامی بینک نے بھی قرض دینے سے انکار کر دیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو زرعی اصلاحات کا قانون پاس ہوا۔ جس کے تحت حد ملکیت دو سو ایکڑ تک مقرر کی گئی۔ اس طرح مصر میں پہلی مرتبہ فلاحین (مزارعوں) کو جو صدیوں سے جاگیرداری نظام کے تحت پستے چلے آ رہے تھے۔ اس عرصے میں نئی حکومت نے معاشرتی اصلاحات اور قومی ترقی کے مسائل پر بھی توجہ دی اور ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کیا۔ ۱۹ اکتوبر کو مصر سے برطانوی افواج انخلاء سے غیر ملکی تسلط سے نجات مل گئی۔

۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو ناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے اور قرار پایا کہ بیس ماہ کے اندر تمام افواج نہر کے علاقے سے نکل جائیں۔ اس طرح مصر کو تین ربع صدی بعد

Marfat.com

کو برطانیہ، فرانس اور اسرائیلی افواج نے مصر پر حملہ کر دیا۔ مگر اقوام متحدہ کے دباؤ پر برطانیہ فرانس اور اسرائیل کو اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔

جون ۱۹۵۶ء میں مصر میں نیا آئین نافذ کیا گیا اور جنرل ناصر پہلے صدر منتخب ہوئے فروری ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کا اتحاد ہوا اور متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آئی۔ صدر ناصر کا دور اقتدار مسلسل آزمائش میں گذرا۔ نہر سویز ۱۹۵۶ء میں اینگلو فرانسیسی اور اسرائیلی حملے نے مصر کو نہایت ہی نازک صورت حال سے دوچار کر دیا۔ لیکن صدر ناصر کے پائے استقلال میں ذرا لغزش نہ آئی۔ انہوں نے کمال جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔

دوسری بار ایک اور بڑی آزمائش کا سامنا جون ۱۹۶۷ء میں اس وقت کرنا پڑا۔ جب اسرائیل نے عربوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اور صحرائے سینائی سمیت کئی عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ نہر سویز بند ہو گئی۔ جس سے مصر کے لیے چند در چند مشکلات پیدا ہو گئیں۔ صدر ناصر نے اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اور صدارت کے منصب سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ جو بعد میں عوام اور دوست عرب ممالک کے اصرار پر واپس لے لیا۔

انہوں نے اسرائیل کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مصر کی طاقت میں نمایاں اضافہ کیا۔ اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ آئندہ اسرائیل کی جارحیت کا مؤثر انداز میں سدباب کر سکے۔ وہ تادم مرگ مقبوضہ عرب علاقوں کو اسرائیل سے واگذار کرانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ شبانہ روز محنت نامساعد حالات اسرائیلی جارحیت اور اردن میں فدائین اور حکومت کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کے باعث ان کی صحت بری طرح متاثر ہوئی اور جلد ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

جمال عبدالناصر کے کارہائے نمایاں میں مصر کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانا۔ زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیرداری نظام کا خاتمہ۔ اقتصادی استحکام کے لیے دوررس اقدامات ہیں۔

فروری ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کا اتحاد ہوا اور متحدہ عرب جمہوریہ وجود میں آیا۔ ۱۹۶۰ء میں روس سے اسوان ڈیم بنانے کا معاہدہ ہوا۔ اسوان ڈیم کی تعمیر ان کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ ان کے ان تمام کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کا ایک ایسا کام بھی ہے جو ان کے خلاف جا پڑتا ہے اور وہ ہے اخوان المسلمین پر ان کی زیادتیاں اور مظالم۔

●

جمالی، حامد بن فضل اللہ دہلوی (ر۔ ؟ ۔۔۔ ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء) ایک صوفی شاعر اور صوفیاء کا تذکرہ نگار۔ اس نے وسط ایشیا سے المغرب تک اور اناطولی سے یمن تک پورے دار الاسلام میں سیاحت کی اور بہت سے صوفیاء کرام سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان صوفیاء میں مولانا جامی بھی ہیں۔ اس کی سیاحت کو ہندی سلسلہ ہائے تصوف اور بقیہ دنیائے اسلام کے صوفیاء کے درمیان ایک واسطے کی حیثیت حاصل ہے۔

جمالی اگرچہ صوفی تھا۔ اور اس کے زہد و تقوے کی شہرت اگرچہ عام تھی۔ لیکن وہ بھی پچھلے سہروردی صوفیاء کی طرح سلاطین دہلی کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس کے سکندر لودھی سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ جب مغل لودھیوں کا تختہ الٹ کر خود حکمران ہوئے تو اس نے بابر اور ہمایوں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے۔

اکبر کے عہد حکومت میں اس کا بیٹا عبدالرحمان گدائی صدر کے عہدے پر فائز تھا جمالی نے ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ لیکن اس کی شہرت کا دار و مدار "سیر العارفین" پر ہے۔ یہ ہندوستان کے سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ کے حالات زندگی پر مبنی ہے۔

جمالی، مولانا علاؤالدین علی مولانا (ر۔ ؟ ۔۔۔ ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء) علی بن احمد بن محمد جمالی سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام صرف علی چلپی اور زنبلی علی افندی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

جمالی کرمان کے شیوخ اور علماء کے اس خاندان سے ہیں جس نے اماسیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اماسیہ میں پیدا ہوئے۔ استنبول اور برسہ میں ملا خسرو اور حسام زادہ مصلح الدین جیسے علماء سے علم کی تحصیل کرنے کے بعد ادرنہ میں مدرس مقرر ہوئے۔

۸۸۰ھ/۱۴۷۶ء میں انہیں مدرسی سے سبکدوش کر دیا گیا۔ لیکن ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں بطور مدرس آپ کا دوبارہ تقرر ہوا۔ ۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء میں اماسیہ کے مفتی بنے ۹۰۰ھ/۱۴۹۵ء میں استنبول کے مدرسہ ثمانیہ میں انکا بطور مدرس ان کا تقرر کیا گیا اور اس طرح آپ پیشہ تدریس کے بلند ترین منصب پر پہنچ گئے۔ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء میں ان کا تقرر بطور شیخ الاسلام کیا گیا۔ چنانچہ جمالی اس عہدے پر بایزید ثانی، سلیم اول اور سلیمان اول کے ادوار حکومت میں تقریباً ۲۴ سال تک فائز رہے۔ حکومت کے بعض اہم مسائل میں بیباکانہ مداخلت اور ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر شیخ الاسلام کا عہدہ سلطنت عثمانیہ میں ایک اہم ترین منصب بن گیا۔ چنانچہ جب سلیم اول نے یہ سوال اٹھایا کہ امور حکومت میں شیخ الاسلام کی مداخلت سلطان کے انتظامی اختیارات پر دست اندازی کے مترادف ہے۔ تو انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ بحیثیت شیخ الاسلام اس پر اگلی دنیا میں سلطان کی نجات کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔

سلیم اول ان کا بہت زیادہ مداح تھا۔ وہ انہیں روم ایلی اور اناطولی کا قاضی عسکر مقرر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جمالی نے اس کی اس پیش کش کو قبول کرنے انکار کر دیا۔

جمالی کو تصوف سے بھی دلچسپی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا ذکر صوفی علی جمالی کے نام سے بھی کیا جاتا ہے۔ انہوں نے تصوف میں ایک رسالہ "فی حق الدوران" بھی تصنیف کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد انہیں ایک ولی کامل کا درجہ دیا گیا استنبول میں کوچہ زیرک کی ایک چھوٹی سی مسجد جو انہوں نے خود بنوائی تھی میں دفن ہیں۔ جمالی کی تصانیف میں "مختصر الہدایہ" اور "مختار الفتاوی" بھی ہیں۔

جمائی آنحضورؐ نے فرمایا "جمائی لینا شیطانی فعل ہے۔ لہٰذا جمائی روکنے کی کوشش کرو۔ اس لیے کہ شیطان اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔" (بخاری)

ایک اور حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

"جب کوئی شخص جمائی لیتے ہوئے "ہا" کرتا ہے۔ تو شیطان ہنستا ہے۔" (مسلم)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا "جب جمائی آئے تو ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لو۔ کیونکہ شیطان منہ میں داخل ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

Marfat.com

... کنکر۔ اصطلاح میں جمرہ سے مراد دوران حج میں کنکریاں پھینکنا ہے۔ نیز جمرہ کا نام جمرہ منیٰ کی وادی میں ان تین مقامات کو دیا گیا ہے۔ جس جگہ پر حاجی لوگ عرفات سے واپس لوٹتے ہوئے ٹھہرتے ہیں اور حکم شرعی کے مطابق کنکریاں پھینکتے ہیں۔ ان تینوں مقامات کو جمرہ اولیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ عقبہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس جگہ کا نام جمرہ یا تو اس بنا پر پڑا کہ وہاں کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔ اور یا پھر کنکریوں کے ڈھیر کی وجہ جو حاجیوں کی کثیر تعداد میں پھینکی جانے کی وجہ سے بن جاتا ہے۔

یہ تینوں مقامات مکہ سے چند میل کے فاصلے پر منیٰ کے میدان میں ہیں عرفات سے چل کر حاجی لوگ جمرہ اولیٰ پر پہنچتے ہیں۔ پھر وہاں سے ۱۵۰ میٹر کے فاصلے پر جمرہ وسطیٰ ہے۔ یہ دونوں مقام منیٰ کے بڑے بازار کے درمیان واقع ہیں۔ یہاں سے ۱۱۵ میٹر آگے کی طرف دائیں ہاتھ کو جہاں سڑک منیٰ سے نکل کر پہاڑوں پر چڑھتی ہوئی مکہ کی طرف جاتی ہے۔ جمرہ عقبہ واقع ہے۔ اس میں ایک دیوار واقع ہے اور ایک حوض زمین میں کھدا ہوا ہے۔ پہلے دو ستونوں اور تیسری دیوار کو حاجی لوگ شیطان کہتے ہیں۔

ذوالحجہ کی دس تاریخ کو قربانی سے پہلے ہر حاجی کو سات کنکریاں جمرۃ العقبہ پر پھینکنی ضروری ہیں۔ ۱۱ تاریخ کو زوال اور غروب شمس کے درمیانی وقت میں ہر حاجی ہر جمرہ پر باری باری جاتا اور جمرہ اولیٰ سے شروع کر کے تینوں پر سات سات کنکریاں پھینکتا ہے۔ ۱۲ تاریخ کو بھی یہی عمل دہرانا پڑتا ہے۔ نیز اگر کوئی گروہ منیٰ ہی میں ٹھہرا ہے تو تیرہ تاریخ کو بھی یہی عمل کرتا ہے۔ یہ کنکریاں حاجی لوگ مزدلفہ سے لے کر آتے ہیں۔

کنکری پھینکتے بسم اللہ، اللہ اکبر کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ بعض فقہا نے کہا ہے کہ اس رسم کا اصل ماحصل یہی ہے۔ اس سارے عمل کو اصطلاح میں رمی جمار کہتے ہیں۔ چاروں فقہا کے نزدیک یہ عمل واجب ہے۔

ہر ایک مذہب فقہ میں رمی کے طریقے کی جزوی ہدایات دی گئی ہیں۔ ذرا سی کوتاہی کرنے پر کفارہ دینا واجب ہو جاتا ہے۔ جو ایک محتاج کو کھانا کھلانے سے لے کر ایک جانور کی قربانی تک ہے۔

یہ سنت ابراہیمی ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو اپنی عزیز ترین چیز کی قربانی دینے کے لئے خواب میں کہا گیا تو آپؑ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لئے لے کر چلے تو راستے میں شیطان کا سامنا ہوا۔ یہ تین مقام جن پر کنکریاں پھینکی جاتی ہیں وہ مقام ہیں کہ جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کو شیطان دکھائی دیا اور اس نے آپؑ کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن آپؑ نے اس کی بات پر کچھ توجہ نہ دی۔ بلکہ اس کی طرف ناراضگی سے کنکریاں پھینکیں۔ شیطان ان تینوں مقامات پر مختلف بھیس میں حضرت ابراہیمؑ کے سامنے آیا تھا۔ چنانچہ حاجی لوگ اسی سنت ابراہیمیؑ کا اتباع کرتے ہیں۔ جس سے شیطان کی ذلت ہوتی ہے۔

جمشید (جم) کئی تاریخی شخصیتوں کا نام۔ قدیم ایرانی نوشتوں میں ایک بطل جو ویواہونت کا بیٹا تھا، کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شخصیت اس ہزار سالہ عہد کی شخصیت ہے۔ جس میں انسانوں نے مذہب اور اخلاق کی بدولت دیوؤں کے اثر و نفوذ سے نجات حاصل کی۔ اس نے ہزاروں شہر اور قریے آباد کئے ذات پات کی تنظیم کی۔ جب سردی کے ایک خوفناک موسم کے بعد سیلاب آنے لگے جو کسی جادوگر یا دیو نے شروع کئے تھے تو اس نے بنی نوع انسان کو تباہی سے بچانے کے لئے ایک وسیع زمین دوز پناہ گاہ تیار کی۔ نوشتوں ہی کی رو سے اس نے ان لوگوں کو جو صرف سبزی ہی کھاتے تھے جانوروں کا گوشت کھانا سکھایا اوستا میں جو خونی قربانیوں سے روکتی ہے اس کی مذمت کی ہے۔ نیز اس کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کسی دیو کے زیر اثر یہ بھی سمجھنے لگا تھا کہ وہ خود ہی خدا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کی پاکیزگی جاتی رہی۔ نیز نوع انسانی کو اس سے بجز آلام و مصائب کے اور کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ ایک صدی تک گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بعد میں دیوؤں نے اپنے سردار اژی دھاکہ کے حکم پر اسے تلاش کرنے کے بعد ایک کھوکھلے درخت میں جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی آرے سے چیر دیا گیا۔

اس روایتی کہانی کی تین بڑی خصوصیات ہیں جو ایرانی ابطال کی کہانیوں میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شدید گناہ کی پاداش میں رحمت خداوندی سے محروم ہو جانا دوسری کسی شاندار محل کی تعمیر، تیسری حیات ابدی سے محرومی۔

جادو کا پیالہ جس میں جمشید کو تمام جہان نظر آتا تھا یہ بھی بہت قدیم قصوں کا موضوع ہے۔

اکثر مصنفین نے جمشید اور حضرت سلیمانؑ کو ایک ہی شخصیت قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عرب مصنفین نے اس نظریے کے رد میں کافی کچھ لکھا ہے۔

جمشید یا جم کئی تاریخی شخصیات کا بھی نام ہے۔ ان میں ایک ساسانی بادشاہ قباذ کا بیٹا ہے۔ ایک عثمانی سلطان محمد ثانی کا بیٹا ہے۔ (دیکھئے "جم") اسی نام سے ایک شخصیت غیاث الدین جمشید کی ہے۔ جس نے الغ بیگ کا اس کی فلکی زیجات میں ہاتھ بٹایا تھا۔

فارسی اور ہندی ادب میں بہت سے قصے اور کہانیاں لکھی گئیں جن کا موضوع جمشید ہے۔ ان بعض شاعروں نے دخترِ جمشید کی ترکیب استعمال کی ہے۔ کیونکہ شراب جمشید کی ایجاد ہے۔ اس لئے اسے دخترِ جمشید کہا گیا ہے۔ جامِ جم اور تختِ جم کی تراکیب اکثر ملتی ہیں۔

جمع بین الصلاتین دو وقتوں کی نماز ملا کر ایک وقت میں پڑھنا۔ مثلاً ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت ہی میں پڑھ لی جائے۔ حج کے دوران میں حاجی لوگ عرفات میں ۹ ذوالحجہ کے وقت ہی میں ظہر اور عصر کی نماز ملا کر پڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر مزدلفہ میں پہنچ کر عشاء کے وقت میں مغرب اور عشا کی نماز ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔

بعض حضرات کے نزدیک جمع بین الصلاتین حج کے علاوہ ہر سفر میں جائز ہے اس کی ایک شکل جمع صوری بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کو موخر کر کے اس وقت پڑھا جائے۔ جب اس کا وقت ختم ہونے کے قریب ہو اور دوسرے وقت کی نماز کو وقت شروع ہوتے ہی پڑھ لیا جائے۔ اس طرح بظاہر تو یہ معلوم ہو گا کہ دونوں نمازیں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں پڑھی گئی ہیں لیکن حقیقت میں دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھی گئیں۔ فقہائے احناف کے نزدیک سفر حج کے علاوہ دوسرے سفروں میں صرف صوری ہی جائز ہے۔ جمع بین الصلاتین یا جمع حقیقی جائز نہیں۔

Marfat.com

جمعۃ الوداع ماہ رمضان کا آخری جمعہ، رمضان کا مہینہ اہل اسلام کے نزدیک چونکہ بہت خیر و برکت کا مہینہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمان اس مہینے کو اس اہتمام سے رخصت کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے عزیز مہمان کو الوداع کہتا ہے۔ ماہ رمضان کے اس آخری جمعہ کو زیادہ سے زیادہ افراد نماز جمعہ ادا کرتے ہیں اور اس روز عید کا سا سماں ہوتا ہے۔

جُمُعَہ یوم، دن، مسلمانوں کا ایک خاص یوم۔ اسلامی تقویم کے لحاظ سے ہفتے کا ساتواں اور آخری دن۔ عہد اسلام سے قبل اس کو "یوم عروبہ" کہا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کا نام یوم جمعہ رکھا۔ کیونکہ اس روز مسلمان مسجد میں جمع ہوتے اور نماز پڑھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس کی وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ اس روز اللہ تعالےٰ نے آدمؑ کی تخلیق کی یا اس لیے کہ اس دن حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کا ملاپ اور اجتماع ہوا۔

بقول محمد بن سیرین کہ ہجرت نبوی اور سورہ جمعہ میں نماز جمعہ کی فرضیت کے نزول سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہؓ نے انصار کے بعض لوگوں کو جمع کیا اور وہ یاد الہٰی میں مصروف ہو گئے اور دو رکعت نماز باجماعت پڑھی۔ پھر ایک بکری ذبح کی اور مسلمانوں کی دعوت کی۔ یہ یوم العروبہ تھا۔ جس کو بعد میں یوم الجمعہ کا نام دیا گیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ کعب بن لوی یا قصی بن کلاب نے بھی اس دن کے لیے یہی نام استعمال کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس روز قریش کے لوگوں کا اجتماع کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے اس فعل سے اس دن کا نام تبدیل نہیں ہوا تھا اور عام اہل عرب اس کو یوم عروبہ ہی کہتے تھے۔

کیونکہ اسلام سے قبل ہفتہ کا ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کر لینے اور اس کو اپنی ملت کا شعار بنانے کا طریقہ اہل کتاب میں موجود تھا۔ اور یہودیوں کے ہاں اس مقصد کے لیے سبت (ہفتہ) کا دن خاص تھا۔ کیونکہ اس روز اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دی تھی۔ عیسائیوں نے اپنے لئے اتوار کا دن شعار ملت قرار دے رکھا تھا۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو یہودیوں سے مخصوص کرتے تھے۔ کیونکہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ صلیب پر جان دینے کے بعد حضرت عیسےٰ اتوار کے روز قبر سے نکل کر آسمان کی طرف گئے تھے۔

چنانچہ ان دونوں ملتوں سے اپنی ملت کو مخصوص اور ممیز کرنے کے لئے اسلام نے ان دونوں ایام کو چھوڑ کر جمعہ کا روز اپنی اجتماعی عبادات کے لئے اختیار کیا۔

جمعہ کی فضیلت کے بارے میں کثرت سے احادیث مروی ہیں۔

آنحضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا۔ "سب سے افضل دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اس دن اللہ تعالےٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اسی دن وہ جنت سے اتارے گئے۔ اسی دن ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اور اسی دن قیامت آئے گی۔ اور اسی دن میں ایک وقت ایسا ہے جسے بندہ مومن پائے تو وہ اللہ سے جو دعا مانگے گا قبول ہوگی۔ (مسلم)

ایک اور حدیث میں جمعہ کے روز کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"اللہ کے نزدیک جمعہ سید الایام ہے۔ جس کا مرتبہ یوم الفطر اور یوم النحر سے بھی بڑا ہے اور اس میں پانچ باتیں ہیں۔ اسی دن آدمؑ پیدا کیے گئے۔ اسی دن وہ جنت سے اتارے گئے اسی دن وہ فوت ہوئے اسی دن میں ایک گھڑی ایسی ہے جس میں بندہ مومن اللہ سے جو مانگتا ہے پاتا ہے بشرطیکہ وہ کوئی حرام چیز طلب نہ کرے اور اسی دن قیامت آئے گی۔ (الدر المنثور ۶، ۲۱۸)

ایک اور موقع پر آپ کا ارشاد ہے۔

"میرے پاس جبرئیل آئے ان کے پاس سفید آئینہ تھا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ جمعہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے اور آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے لیے عید بنا کر پیش کی ہے یہ دن ہمارے نزدیک سید الایام ہے اور اسے ہم آخرت کے دن "یوم المزید" یعنی اضافے والا دن کہیں گے۔ (الکشاف ۴، ۵۲۲)

جمعہ، سورۃ:۔ قرآن مجید کی ۶۲ ویں سورت (دیکھئے "الجمعہ سورۃ")

جمعہ، نماز ایک فرض نماز۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو مسعودؓ انصاری کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی فرضیت کا حکم ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے مکہ معظمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ مکہ میں کوئی اجتماعی عبادت کرنا ممکن نہ تھا اس وجہ سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ لیکن آپؐ نے ان لوگوں سے جو مکہ سے ہجرت کر چکے تھے یہ حکم بھجوا دیا کہ وہاں جمعہ قائم کریں۔ چنانچہ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے بارہ آدمیوں کے ساتھ مدینے میں پہلا جمعہ پڑھا۔

بقول حضرت کعب بن مالک اور ابن سیرینؒ "اس سے بھی پہلے مدینے کے انصار نے بطور خود قبل اس کے کہ آنحضورؐ کا حکم انہیں پہنچتا آپس میں یہ طے کیا تھا کہ ہفتہ میں ایک دن مل کر اجتماعی عبادات کریں گے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے یہودیوں کے سبت اور عیسائیوں کے اتوار کو چھوڑ کر جمعہ کا دن منتخب کیا اور پہلا جمعہ حضرت اسعد بن زرارہ نے بنی بیاضہ کے علاقہ میں ۴۰ افراد کے ساتھ پڑھا۔ (مسند احمد)

بقول مولانا مودودی "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ذوق خود اس وقت یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ایسا ایک دن ہونا چاہیے جس میں زیادہ سے زیادہ مسلمان جمع ہو کر اجتماعی عبادت کریں اور یہ بھی اسلامی ذوق ہی کا تقاضا تھا کہ وہ دن ہفتے اور اتوار سے الگ ہو تا کہ مسلمانوں کا شعار ملت یہود و نصاریٰ کے شعار ملت سے الگ رہے۔ یہ صحابہؓ کی اسلامی ذہنیت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ بسا اوقات ایک حکم کے آنے سے پہلے ہی ان کا ذوق کہہ دیتا تھا کہ اسلام کی روح فلاں چیز کا تقاضا کر رہی ہے۔"

آنحضورؐ نے ہجرت کے بعد جو کام کئے ان اولین کاموں میں سے ایک جمعہ کی اقامت تھی۔

بقول ابن ہشام۔ "مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آپ پیر کے روز قبا پہنچے چار دن وہاں قیام فرمایا پانچویں روز جمعہ کے دن وہاں سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں بنی سالم بن عوف کے مقام پر تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آ گیا۔ اسی جگہ آپؐ نے پہلا جمعہ ادا فرمایا۔"

جمعہ کی نماز کے لیے آپؐ نے وہی وقت مقرر فرمایا جو ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ آپؐ نے ہجرت سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو جو حکم بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ جب جمعہ کے روز سورج نصف النہار سے ڈھل جائے تو دو رکعت نماز کے ذریعے سے اللہ کے حضور تقرب حاصل کرو۔" (مسند احمد)

یہ بات بھی آپؐ کے عمل سے ثابت ہے کہ اس روز آپؐ ظہر کی نماز کے بجائے جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے۔ اس نماز کی صرف دو رکعتیں ہوتی تھیں۔

Marfat.com

نماز جمعہ کے بارے میں حدیث میں بہت تاکید فرمائی گئی ہے۔
قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔ اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔" (۶۲ : ۱۰)

اس آیت میں پکارنے سے مراد وہ اذان ہے جو خطبہ سے پہلے کہی جاتی ہے نہ کہ وہ اذان جو خطبہ شروع ہونے سے بہت پہلے جو لوگوں کو یہ اطلاع دینے کے لئے دی جاتی ہے کہ جمعہ کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں صرف ایک ہی اذان کہی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی ایک ہی اذان کہی جاتی رہی۔ حضرت عثمانؓ کے دور میں جب آبادی بڑھ گئی تو انہوں نے پہلے ایک اور اذان دلوانی شروع کر دی جو مدینے کے بازار میں ان کے مکان زورا پر دی جاتی تھی۔ (بخاری)

مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

"یہ حکم واضح طور پر نماز جمعہ کے فرض ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اول تو اذان سنتے ہی اس کے لئے دوڑنے کی تاکید بجائے خود اس کی دلیل ہے۔ پھر بیع جیسی حلال چیز کا اس کی خاطر حرام ہو جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فرض ہے۔ مزید براں ظہر کی فرض نماز کا جمعہ کے روز ساقط ہو جانا اور نماز جمعہ کا اس کی جگہ لے لینا بھی اس کی فرضیت کا صریح ثبوت ہے کیونکہ ایک فرض اسی وقت ساقط ہوتا ہے جب کہ اس کی جگہ لینے والا فرض اس سے زیادہ اہم ہو۔" اسی کی تائید بکثرت احادیث کرتی ہیں۔ جن میں آنحضورؐ نے جمعہ کی سخت ترین تاکید کی ہے اور اسے صاف الفاظ میں فرض قرار دیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ کسی اور شخص کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑا کر دوں اور جا کر ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں آتے۔ (بخاری)

ایک جگہ فرمایا۔

"لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے گا اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں جمعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا "آج سے لے کر قیامت تک جمعہ تم لوگوں پر فرض ہے جو شخص اسے ایک معمولی چیز سمجھ کر یا اس کا حق نہ مان کر اسے چھوڑ دے، خدا اس کا حال درست نہ کرے، نہ اسے برکت دے، خوب سن رکھو اس کی نماز نماز نہیں، اس کی زکوٰۃ زکوٰۃ نہیں، اس کا حج حج نہیں، اس کا روزہ روزہ نہیں اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ پھر جو توبہ کرے اللہ اسے معاف فرمانے والا ہے۔" (ابن ماجہ)

ایک جگہ آپؐ نے فرمایا۔

"جمعہ ہر اس شخص پر فرض ہے جو اس کی اذان سنے۔" (ابوداؤد)

امام بیہقی نے بھی اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث روایت کی ہے کہ آپؐ نے خطبہ میں فرمایا۔ "جان لو کہ اللہ نے تم پر نماز جمعہ فرض کی ہے۔"

بعض علمائے اہل حدیث کے نزدیک جمعہ کے لئے دو اذانیں درست نہیں۔ کیونکہ امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ آنحضورؐ اور ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ کے عہد میں پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر حضرت عثمانؓ کے عہد میں آبادی کی کثرت کے باعث ایک اذان کا اضافہ کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ کے عہد میں بھی سنت رسول اور سنت شیخین پر عمل رہا۔

بقول ابن العربی "اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ نماز جمعہ کی اذان کے بعد خرید و فروخت بالکل حرام ہے۔"

حنفیوں کے نزدیک جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا وقت ہے نہ اس سے پہلے وقت میں جمعہ ہو سکتا ہے اور نہ بعد میں۔ بیع کی حرمت پہلی اذان ہی سے شروع ہو جاتی ہے نہ کہ دوسری اذان سے جو امام کے منبر پر بیٹھنے کے بعد دی جاتی ہے لیکن بیع فاسد نہیں ہو جاتی جمعہ ہر بستی میں نہیں بلکہ مصر جامع میں ہو سکتا ہے اور مصر جامع کی تعریف یہ ہے کہ وہ شہر جس میں بازار ہوں قیام امن کا انتظام موجود ہو اور آبادی اتنی ہو کہ اگر اس کی بڑی مسجد سے بڑی مسجد میں بھی نماز جمعہ کے مکلف سب جمع ہو جائیں اس میں سما نہ سکیں جو لوگ شہر سے باہر رہتے ہوں ان پر جمعہ اس صورت میں شہر آکر پڑھنا فرض ہے۔ جب کہ ان تک اذان کی آواز پہنچتی ہو یا وہ زیادہ سے زیادہ شہر سے چھ میل دور کے فاصلے پر ہوں نماز جمعہ کھلے میدان میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ نیز یہ کہ اس جگہ جہاں ہر شخص کو شریک ہونے کا اذن عام ہو نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن جہاں دوسرے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو خواہ وہاں کتنے ہی افراد جمع ہوں نماز جمعہ نہیں ہوتی۔

جمعہ کی نماز میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک کم از کم امام کے سوا تین آدمی یا بقول امام یوسف و محمد امام سمیت دو آدمی ایسے موجود ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ مسافر، بیمار، ٹانگوں سے معذور اور قیدی پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ نیز اندھے یا کسی ظالم سے اس کو جان جانے کا یا ناقابل برداشت مالی نقصان کا خطرہ ہو یا سخت بارش اور کیچڑ وغیرہ ہو تو بھی جمعہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن جن لوگوں سے جمعہ چھوٹ گیا ہو یا قیدیوں اور معذوروں کے لئے نماز ظہر باجماعت پڑھنا مکروہ ہے۔

خطبہ بھی نماز جمعہ کی شرائط میں سے ایک شرط ہے۔ خطبہ لازماً نماز سے پہلے ہونا چاہیے اور دو خطبے ہونے چاہئیں خطبے کے لئے جب امام منبر کی طرف جائے اس وقت سے اختتام خطبہ تک ہر قسم کی بات چیت ممنوع ہے۔

شوافع کے نزدیک بھی جمعہ کا وقت وہی ہے جو ظہر کا ہے۔ بیع کی حرمت اور سعی کا وجوب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب دوسری اذان ہو جائے لیکن بیع فسخ نہیں ہوتی۔ جمعہ ہر اس بستی میں ہو سکتا ہے۔ جس کے مستقل باشندوں میں چالیس ایسے آدمی موجود ہوں جن پر نماز جمعہ فرض ہے۔ بستی سے باہر کے ان لوگوں پر جمعہ کے لئے حاضر ہونا لازم ہے۔ جن تک اذان کی آواز پہنچ سکتی ہو۔ جمعہ لازماً بستی کے حدود میں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مسجد ہی میں پڑھا جائے۔ صحت جمعہ کے لئے ضروری ہے کہ جماعت میں امام سمیت کم از کم ۴۰ آدمی ایسے شریک ہوں جن پر جمعہ فرض ہے۔ شوافع کے نزدیک جن عذرات سے کسی شخص سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ سفر کی حالت میں ہو یا کسی مقام پر چار روز یا اس سے کم قیام کا ارادہ رکھتا ہو بشرطیکہ سفر جائز نوعیت کا ہو ایسا بوڑھا یا مریض ہو کہ سواری پر بھی جمعہ کے لئے نہ جا سکتا ہو۔ اندھا اور کوئی آدمی ایسا نہ پاتا ہو جو اسے نماز کے لئے لے جائے۔ جان یا مال اور آبرو کا خوف لاحق ہو۔ قید کی حالت میں بشرطیکہ قید اس کے اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہ ہو۔ نماز سے پہلے دو خطبے ضروری ہیں۔ خطبے کے دوران میں خاموش رہنا مسنون ہے مگر بات کرنا حرام نہیں۔ مکروہ ہے سلام کا جواب دیا جا سکتا ہے اور آنحضورؐ کا نام سن کر بآواز بلند درود پڑھ سکتا ہے۔

مالکیہ کے نزدیک جمعہ کا وقت زوال سے شروع ہو کر مغرب سے اتنے پہلے تک ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے خطبہ اور نماز ختم ہو جائے۔ بیع کی حرمت اور سعی کا وجوب دوسری اذان سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی بیع فاسد ہے

Marfat.com

اور فسخ ہو جائے گی۔

جمعہ ان بستیوں میں ہو سکتا ہے جن کے باشندے وہاں مستقل طور پر گھر بنا کر رہتے ہوں اور جاڑے و گرمی میں منتقل نہ ہوتے ہوں۔ ان کی ضروریات اسی بستی میں فراہم ہوتی ہوں اور اپنی تعداد کی بنا پر وہ اپنی حفاظت کر سکتے ہوں۔ عارضی قیام گاہوں میں خواہ کتنے ہی لوگ ہوں اور خواہ وہ کتنی ہی مدت ٹھہریں جمعہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جس بستی میں جمعہ قائم کیا جاتا ہو۔ اس سے تین میل کے فاصلے تک رہنے والے لوگوں پر جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔ نماز جمعہ صرف ایسی مسجد میں ہو سکتی ہے جو بستی کے اندر یا اس سے متصل ہو اور جس کی عمارت بستی کے عام باشندوں کے گھروں سے کم تر درجے کی نہ ہو۔ بعض مالکیوں نے ایک شرط یہ بھی لگائی کہ مسجد مسقف ہو اور اس میں پانچ وقت کی نماز کا اہتمام بھی کیا جاتا ہو۔ لیکن مالکیہ کا راجح مسلک یہ ہے کہ ایسی مسجد میں بھی جمعہ ہو سکتا ہے جو صرف نماز جمعہ کے لئے بنائی گئی ہو اور پانچ وقت کی نماز کا اس میں اہتمام نہ ہو۔ نیز مسجد کا مسقف ہونا بھی شرط نہیں۔

نماز جمعہ کی صحت کے لئے جماعت میں امام کے سوا کم سے کم ١٢۔ آدمی موجود ہونے ضروری ہیں جن پر نماز جمعہ فرض ہے۔ جن عذرات کی بنا پر کسی شخص سے جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ تقریباً وہی ہیں جو دوسروں کے نزدیک ہیں۔

خطیب لازماً وہی شخص ہونا چاہیئے جو نماز پڑھائے اگر خطیب کے سوا کسی اور نے پڑھائی ہو تو وہ باطل اور فاسد ہوگی۔

حنبلیوں کے نزدیک نماز جمعہ کا وقت صبح کو سورج کے بقدر یک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے عصر کا وقت شروع ہونے تک ہے۔ لیکن زوال سے پہلے جمعہ صرف جائز ہے۔ اور زوال کے بعد واجب اور افضل ہے۔ بیع کی حرمت اور سعی کے وجوب کا وقت دوسری اذان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو بیع ہو وہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتی۔ جمعہ صرف اس جگہ ہو سکتا ہے۔ جہاں سے ۴۰ ایسے آدمی ہوں جن پر جمعہ فرض ہو۔ مستقل طور پر گھروں میں آباد ہوں۔ اگر متفرق گھر اور محلے ہوں اور جو ساتھ ساتھ نہ ہوں لیکن ان سب کے مجموعے کا نام ایک ہو تو وہ ایک ہی بستی ہے خواہ اس کے ٹکڑوں کے درمیان کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو بستی سے باہر جو لوگ تین میل کے اندر رہتے ہوں ان پر جمعہ میں حاضر ہونا فرض ہے۔ جماعت میں امام سمیت ۴۰۔ آدمیوں کا شریک ہونا لازمی ہے۔ نماز جمعہ مسجد کے علاوہ کھلے میدان میں بھی ہو سکتی ہے۔ جن صورتوں میں جمعہ کا فرض ساقط ہو جاتا ہے وہ تقریباً دوسرے آئمہ والی ہی ہیں۔ نماز سے پہلے دو خطبوں کا ہونا ضروری ہے۔ جو شخص خطیب کے اتنے قریب بیٹھا ہو کہ اس کی آواز سن سکتا ہو اس شخص کے لئے بولنا حرام ہے۔

اگر جمعہ کے روز عید ہو جائے تو جو لوگ عید پڑھ چکے ہوں ان پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہے۔ لیکن مسلک آئمہ ثلاثہ کے نزدیک۔ عید سے جمعہ کی نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔

وہ شخص جس پر جمعہ فرض نہیں ہے اگر وہ نماز جمعہ میں شریک ہو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اس کے لئے پھر ظہر پڑھنا فرض نہیں رہتا۔

نماز جمعہ کی فرضیت کے لئے شرائط سات ہیں۔

١۔ عقل۔ ٢۔ مرد ہونا۔ ٣۔ حریت (آزاد ہو) ٤۔ بلوغ۔ ٥۔ قدرت ٦۔ اقامت۔ ٧۔ قریہ۔

جب یہ شرائط پوری ہو جائیں گی تو نماز جمعہ فرض ہو جائے گی۔

اہل حدیث حضرات کے نزدیک جمعہ کے لئے کوئی شرط نہیں۔ ان کے نزدیک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی نماز جمعہ درست ہے۔ ان کے نزدیک جب نمازی مسجد میں آئے۔ خواہ اذان ہو رہی ہو یا خطبہ ہو رہا ہو تو اس کو دو رکعت نماز پڑھ کر بیٹھنا چاہیئے۔

اہل تشیع حضرات کے نزدیک امام یا اس کے نائب کی موجودگی اور جماعت اور وقت اور خطبہ مشروط ہے اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر جمعہ کی نماز ایک وقت میں ایک سے زائد مقامات پر پڑھی جائے تو ان میں کم از کم ایک فرسنگ کا فاصلہ ہونا لازمی ہے ورنہ نماز باطل ہو جائے گی۔

جمعیت جدید عربی زبان میں یہ اصطلاح جماعت یا انجمن کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال موجودہ دور ہی میں شروع ہوا اور پہلی بار یہ اصطلاح غالباً ان منظم خانقاہی فرقوں یا اجتماعات کے لئے جو سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں شام اور لبنان کے مشرقی یونانی کلیساؤں میں منظر عام پر آئے۔ مثلاً جمعیت المخلص یعنی ایک یونانی کیتھولک فرقہ جس کی بنیاد ١٧٠٨ء کے قریب رکھی گئی۔

وسط انیسویں صدی میں لبنان اور ازاں بعد عربی بولنے والے دوسرے ممالک میں بھی اس اصطلاح کا استعمال عام ہو گیا اور علمی، ادبی، فلاحی اور سیاسی مقاصد کے لئے رضا کارانہ طور پر قائم ہونے والی جماعتوں پر بھی اس نام کا اطلاق ہونے لگا۔

سب سے پہلی جماعت جو الجمعیۃ السوریہ کے نام سے ١٨٤٧ء میں قائم ہوئی اس کی بنیاد ان امریکی پروٹسٹنٹ مبلغین نے جو علمی مذاق رکھتے اور تہذیب و ثقافت کے معیار کو بلند کرنا چاہتے تھے بیروت میں قائم کی۔ ١٨٥٧ء میں اس کی جگہ الجمعیۃ العلمیہ السوریہ نے لی جو ایک بڑی جماعت تھی۔ ١٨٦٨ء میں عثمانی حکومت نے اس کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کر لیا۔ اسی قسم کی ایک تنظیم ١٨٥٠ء میں الجمعیۃ الشرقیہ قائم کی گئی۔

پہلی انجمن خواتین جو بیروت میں ١٨٨١ء میں جمعیت باکورۃ سوریہ تھی۔ اس کے علاوہ فلاح عامہ کی متعدد انجمنیں جن میں جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ غالباً سب سے پہلی تھی اس کی بنیاد ١٨٧٨ء میں سکندریہ میں رکھی گئی۔ اس کے اغراض و مقاصد میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے قومی مدارس کا قیام تھا لیکن اعرابی تحریک اور برطانوی قبضہ کی وجہ سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد میں ١٨٩٢ء میں ایک اور جماعت الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ مصر کے مشہور عالم شیخ محمد عبدہٗ اس جمعیت کے سرگرم رکن تھے۔ اس جمعیت کے ماتحت کئی مدارس قائم کئے گئے۔

بیروت میں جمعیۃ المقاصد الخیریہ ١٨٨٠ء میں قائم کی گئی۔ جس کے تحت لبنان کے سنی مسلمانوں کے لئے کئی ایک مدرسے کھولے گئے۔ ان جمعیتوں میں ایک اور مشہور اور ذی اثر جماعت جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ تھی جو مسلمانوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی اور جس کے ارکان نے ایک حقیقی اسلامی حکومت قائم کرنے کا حلف اٹھا رکھا تھا۔ اس جماعت کے روح رواں مشہور و معروف شخصیت جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہٗ تھے۔ یہ اس زمانے میں قائم ہوئی جب مصر پر برطانیہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کی جمعیت کی شاخیں مختلف ممالک میں قائم تھیں۔

جمعیت کی اصطلاح بطور ایک سیاسی انجمن کے اور کچھ عرصہ تک مستعمل ہوتی رہی مثلاً جمعیۃ العربیۃ الفتاۃ جو ١٩١١ء میں سلطنت عثمانیہ کے آخری ایام میں جو سات عرب طالب علموں نے قائم کی تھی۔ عرب قوم پرستوں کی

Marfat.com

مشہور انجمن بھی پیرس میں قائم کی گئی بعد میں دمشق اس کا مرکز بنا اس نے خفیہ بات چیت میں بڑا حصہ لیا۔ جو مصر میں شریف حسین اور برطانوی حکام کے درمیان ہوئی۔ جس کا نتیجہ ترکی حکومت کے خلاف عرب بغاوت کی صورت میں نکلا۔ اس بغاوت کا رہنما فیصل بن حسین اسی جمعیت کا ایک رکن تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مصر میں ایک اور جمعیت اخوان المسلمین کے نام سے قائم ہوئی۔ جس کا آغاز ۱۹۲۸ء میں حسن البنا شہید کے ہاتھوں ہوا۔ اس نے سیاست میں بڑا اہم کردار سرانجام دیا۔

اب عام طور پر سیاسی تحریکوں کے لئے جمعیۃ کی اصطلاح کی بجائے حزب کی اصطلاح استعمال ہونے لگی اور جمعیۃ صرف فلاحی اور ثقافتی اور ایسی ہی دوسری رضاکارانہ تنظیموں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

جمعیت طلبہ: طلبہ کی تنظیمیں، طلبہ کے گروہ، طلبہ کی جماعتیں۔ (دیکھئے "طلبہ کی جمعیتیں")

جمعیت اتحاد العلماء: پاکستان میں علماء کی ایک تنظیم جس میں تقریباً تمام مسلکوں کے علما شامل ہیں۔ یہ ۱۹۶۳ء کے آخری ایام تھے موسم سرما اپنے جوبن پر تھا۔ جب ملک کے ۲۷ منتخب علماء کرام سٹلائیٹ ٹاؤن، سرگودھا کے ایک مکان میں جمع ہوئے۔ ان سب حضرات کو مولانا گلزار احمد مظاہری نے اپنے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ دور تھا۔ جب سابق صدر پاکستان محمد ایوب خان مرحوم نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ عوام ان کی حکومت سے مطمئن نہیں اور اپنے اقتدار کو مضبوط اور طویل بنانے کے لئے انہیں کچھ دوسرے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جو ذرائع اختیار کئے ان میں سے ایک ذریعہ یہ تھا کہ قوم کو آپس میں مذہبی بنیادوں پر لڑا دیا جائے اور ملکی نظم و نسق اور سیاسی مسائل پر ان کی توجہ کم سے کم ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ کچھ مذہبی راہنماؤں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور کچھ مخلص علماء جو حقائق کے اس پس منظر سے ناواقف تھے۔ میدان میں اس لئے کود پڑے تھے کہ اگر مخالف گروہ کے سرکردہ لوگ ہمارے مسلک کے خلاف اس طرح کھل کر پراپیگنڈہ کرتے ہیں تو ہمیں بھی اپنا موقف اسی آن بان اور اسی انداز میں عوام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ صورت حال جب یہ ہو گئی اور مختلف اطراف سے ایک دوسرے پر الزام تراشی کے طومار باندھے جانے لگے تو درد دل رکھنے والے علماء کرام سے قوم کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اور کڑاکڑاتی سردی کے دنوں میں وہ سرگودھا شہر میں جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ امت کے اس انتشار کو ختم کرنے کے لئے باقاعدہ تنظیم کے تحت کام کیا جائے۔ انفرادی کوششیں کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ اس تنظیم کا نام جمعیت اتحاد العلماء رکھا گیا۔ اور یہ نام اپنے مقاصد کی پوری پوری نشاندہی کر رہا تھا۔ امام المحدثین مولانا سید انور شاہ صاحب کاشمیری کے شاگرد رشید اور جامعہ عربیہ گوجرانوالہ کے بانی مولانا محمد چراغ صاحب اس تنظیم کے صدر، اشاعت العلوم لائلپور کے شیخ الحدیث مولانا مفتی سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل نائب صدر اور مولانا گلزار احمد مظاہری اس تنظیم کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ کارکنوں کے اعتماد کی بنا پر تنظیم کا یہ ڈھانچہ آج تک جوں کا توں کام کر رہا ہے۔ تنظیم کی سرپرستی کے لئے برصغیر کی عظیم اور اسم بامسمیٰ علمی شخصیت حضرت مولانا ولی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں درخواست کی گئی جو انہوں نے بخوشی قبول فرمائی۔

اپنی زندگی کے اس تقریباً تیرہ سالہ دور میں اس تنظیم کی سرگرمیاں ملکی حالات کے ساتھ ساتھ تیز اور سست ہوتی رہی ہیں۔ تنظیم کے ناظم اعلیٰ مولانا گلزار احمد صاحب مظاہری آج کل مشرق وسطیٰ کے دورے پر ہیں اور اتحاد امت کی خاطر سعودی کی نمایاں شخصیتوں کے ساتھ ملاقاتیں کر رہے ہیں۔

پاکستان میں تحریک ختم نبوت جب اپنے عروج پر تھی تو مولانا گلزار احمد مظاہری اس وقت بھی بیرون ملک تھے۔ اس دوران میں وہ جہاں جہاں گئے۔ انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کو اس مسئلہ سے اچھی طرح روشناس کرایا اور پاکستانی عوام کے اس ضمن میں مطالبات کے لئے زبردست تائید حاصل کی۔

۱۹۷۵ء میں جمعیۃ اتحاد العلماء نے نفاذ شریعت کیلئے ایک ملک گیر مہم کا آغاز کیا۔

جمعیت اتحاد العلماء کے قابل ذکر کاموں میں سے ایک کام جو بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ علما اکیڈمی کا قیام ہے۔ علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے اس لحاظ سے فریضہ اقامت دین کو بنیادی ذمہ داری ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے طبقہ علماء کی اکثریت اس فریضے کی اہمیت اور اس کے عملی تقاضوں سے بے تعلق ہے۔ اس وجہ سے آج ہمارے ہاں دینی رہنمائی کے سرچشمے خشک ہو چکے ہیں۔ اور طبقہ علماء اپنے اندرونی اختلافات اور فروعی مسائل میں الجھ رہا ہے اور امت کی رہنمائی کے منصب سے یکسر بے خبر ہے۔ جمعہ کے اجتماعات ایک رسم بن گئے ہیں۔ اور لوگ وہاں سے فکر، پیش آمدہ حالات پر تبصرہ اور کوئی رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے پرانے قصے اور دور دراز کار داستانیں سن کے اٹھ آتے ہیں۔ ان حالات میں ضرورت ہے کہ علماء و آئمہ کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے جو دین کی حقیقی روح سے آشنا ہو۔ اپنی ذمہ داریاں سمجھتا ہو۔ امت کے حالات و معاملات پر اس کی نظر ہو اور وہ اپنے سامعین اور مقتدی حضرات کو کوئی فکر اور جذبہ دے سکے۔ ایسے گروہ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ آج دنیا بھر میں مساجد کی تعداد لاکھوں ہے، لیکن ان میں سے بہت کم ایسی مساجد ہیں جن کو مرکز اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ حال ہی میں مکہ کی "پیغام مسجد کانفرنس" میں بھی اس ضرورت کا احساس کیا گیا اور مساجد کو مراکز اسلام میں تبدیل کرنے کی عملی تدابیر طے کی گئی ہیں۔ انہی مقاصد کے حصول کے لئے ایک عرصے اہل فکر و نظر کے حلقہ میں تجاویز و مشورے ہو رہے تھے۔ چنانچہ جمعیت اتحاد العلماء کے اصحاب علم و فضل نے اسے عملی شکل دے دی ہے اور علما اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس میں باقاعدہ کلاسز کا آغاز ہو چکا ہے۔

علما اکیڈمی نہ صرف علماء حق کا گروہ تیار کرے گی بلکہ مساجد کے ذریعے اسلامی انقلاب لانے کی ایک تجربگاہ بھی ثابت ہو گی۔

علما اکیڈمی ان مقاصد کو بروئے کار لائے گی جو درج ذیل ہیں۔

- ایسے علماء اور ائمہ حضرات تیار کرنا جو فریضہ اقامت دین کا مکمل شعور رکھتے ہوں۔
- معاشرے میں حکیمانہ انداز میں اصلاح کا کام کر سکیں۔
- دور حاضر کے مسائل میں اسلام کو بحیثیت ایک رہنما قوت کے پیش کر سکیں۔
- اتنا علم رکھتے ہو کہ عالمی تحریکات (عیسائیت، یہودیت، سرمایہ داری سوشلزم، قادیانیت) کا مقابلہ علمی استدلال سے کر سکیں۔
- قیام پاکستان کے محرکات سے بخوبی آگاہ ہوں۔
- اختلافی مسائل میں امت کو الجھانے کی بجائے اسے قرآن و سنت

Marfat.com

کی روشنی فراہم کریں۔

- ۔ اپنی مساجد یا دینی مراکز میں تحریک اسلامی کے بھرپور کارکن ہوں۔
- ۔ قرأت و تجوید کے اعلیٰ معیار پر پورا اتر سکیں۔

چنانچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اکیڈمی میں تین شعبے قائم کئے گئے ہیں ــــ

۱۔ شعبہ تربیت آئمہ و خطباء
۲۔ شعبہ حفظ و قرأت
۳۔ شعبہ تحقیق

یہ علماء اکیڈمی لاہور سے تقریباً چھ میل دور ملتان روڈ پر مرکزی جماعت اسلامی "منصورہ" کے سامنے ایک قطعہ اراضی اور ایک عمارت خرید کر اس میں قائم کی گئی ہے۔ (مولانا محمد حنیف)

جمعیت علماء اسلام

پاکستان کی ایک دینی اور سیاسی تنظیم۔ جمعیت علماء اسلام سب سے پہلے قیام پاکستان سے قبل تحریک پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے علماء نے قائم کی اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ العزیز کی راہنمائی میں جمعیت علماء اسلام نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔

قیام پاکستان کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی زندگی نے زیادہ دیر وفا نہ کی اور ان کے بعد جمعیت کو فعال اور سرگرم قیادت میسر نہ آسکی۔ تاہم حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی راہنمائی میں تھوڑا بہت کام جاری رہا اسی دوران جمعیت علماء اسلام کی مساعی سے علامہ سلیمان ندویؒ کی صدارت میں تمام مکاتب فکر کے ۳۱ جید علماء نے اسلامی دستور کے ۲۲ نکات کا اعلان کیا۔

۵۶ء میں پہلے آئین کے نفاذ کے بعد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی تحریک پر ملتان میں مغربی پاکستان کے علماء کرام کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جس میں جمعیت علماء اسلام کو از سر نو سرگرم اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت مولانا احمد علیؒ نئی جمعیت کے امیر منتخب ہوئے۔ جمعیت نے عام انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا اور انتخابی منشور بھی جاری کیا۔ نیز جمعیت کی طرف سے ۵۶ء کے دستور کے خلاف اسلام دفعات کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے دستور میں اہم ترامیم کا مطالبہ کیا اور مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد جمعیت کا نصب العین قرار پائے۔

۱۔ علمائے دین کی راہنمائی میں مسلمانوں کی منتشرانہ قوتوں کو جمع کرنا اور عالم اسلام سے دین کی خاطر برادرانہ تعلقات قائم کرنا۔

۲۔ قرآن و سنت کی روشنی میں سیاسی، مذہبی اور ملکی معاملات میں مسلمانوں کی راہنمائی اور اس کے موافق عملی جدوجہد کرنا۔

۳۔ پاکستان میں صحیح جمہوریت اسلامیہ برپا کرنے اور اسلامی عادلانہ نظام کے نفاذ کے لئے ایسی کوشش کرنا جس سے باشندگان پاکستان ایک طرف انسانیت کش سرمایہ داری اور دوسری طرف اتحاد آفریں اشتراکیت کے مضر اثرات سے محفوظ رہ کر فطری معاشرتی نظام کی برکتوں سے مستفید ہو سکیں۔

۴۔ پاکستان میں ایسے جامع نظام تعلیم کی ترویج و ترقی کے لئے سعی کرنا جس سے مسلمانوں میں خشیت الٰہی، خوف آخرت اور پابندی ارکان اسلام کے علاوہ فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

۵۔ مسلمانان پاکستان کے دلوں میں جذبہ جہاد فی سبیل اللہ [illegible] استحکام اور سالمیت کے لئے جذبہ ایثار و قربانی پیدا کرنا۔

۶۔ مسلمانوں میں وحدت فکر اور اخوت اسلامیہ کو اس طرح عملی دنیا کرانا کہ صوبائی لسانی اور نسلی تعصبات دور ہوں۔

۷۔ تمام محکوم مسلم ممالک کی حریت و استقلال اور غیر مسلم ممالک کی مسلم اقلیتوں کی باعزت اسلامی زندگی کے مواقع پیدا کرنے کے لیے کوشش کرنا۔

۸۔ مختلف اسلامی اداروں مثلاً مساجد، مدارس، کتب خانوں اور دارالیتامیٰ کی اصلاح و ترقی اور ان کی آزادی و خود مختاری کے تحفظ کی کوشش کرنا۔

۹۔ تمام آئینی ذرائع سے باطل فرقوں کی فتنہ انگیز نیز مخرب اخلاق اور خلاف اسلام کارروائیوں کی روک تھام کرنا۔

نوٹ:۔ جمعیت علماء اسلام میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے اور جمعیت کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھنے والے ہر مسلمان (مرد اور عورت) جمعیت کا رکن بن سکتا ہے

۵۸ء کے مارشل لاء میں دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ جمعیت علماء اسلام بھی خلاف قانون قرار دے دی گئی تو جمعیت سے وابستہ علماء نے مذہبی امور میں ملت اسلامیہ کی راہنمائی کے لئے غیر سیاسی تنظیم "نظام العلماء" قائم کر لی۔ جس کے سربراہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ منتخب ہوئے۔ مارشل لاء کے دوران فوجی حکومت نے عائلی قوانین نافذ کئے تو نظام العلماء نے اس کی پرجوش مخالفت کی اور دہلی گیٹ کے باہر ایک بہت بڑے جلسہ عام میں مولانا احمد علیؒ نے عائلی قوانین کو سراسر خلاف اسلام قرار دے کر انہیں منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح ایوب خان مرحوم نے دستور کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں آراء و سفارشات طلب کیں تو نظام العلماء نے اسلامی دستور کا خاکہ اور ضروری تجاویز پیش کیں۔

کالعدم جمعیت علماء اسلام کے سربراہ مولانا احمد علیؒ مارشل لاء کے دوران ہی وفات پا گئے اس لیے مارشل لاء اٹھنے کے بعد جمعیت کے نائب امیر مولانا مفتی محمود نے قائم مقام امیر کی حیثیت سے جمعیت علماء اسلام کی بحالی کا اعلان کیا۔ اور بعد ازاں حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی کو جمعیت علماء اسلام کا مرکزی امیر منتخب کر لیا گیا جو اب تک امارت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

جب ایوب حکومت نے ملک میں اسمبلیوں کے پہلے انتخابات کرائے تو مولانا مفتی محمود قومی اسمبلی کے اور مولانا غلام غوث ہزاروی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور دونوں راہنماؤں جمعیت علماء اسلام کے اغراض و مقاصد کی روشنی میں اسلامی اقدار اور قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔

۶۸ء میں مشرقی پاکستان میں جمعیت علماء اسلام کے باقاعدہ قیام کے بعد مرکزی سطح پر جمعیت کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ مولانا محمد عبداللہ درخواستی امیر اور مولانا مفتی محمود جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ اس دوران لاہور میں جمعیت کی آل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں ہزاروں علماء نے شرکت کی اور ایوب آمریت کے خلاف علماء نے لاہور کی سڑکوں پر تاریخی مظاہرہ کیا۔ جس پر ملک بھر کے اخبارات نے جمعیت کو خراج تحسین پیش کیا۔

اسی دوران حزب اختلاف کی جماعتوں نے جمہوری مجلس عمل قائم کی اور جمعیت علماء اسلام اس میں شامل ہو گئی۔ ایوب خان مرحوم کی گول میز کانفرنس میں جمعیت کے جنرل سیکرٹری مولانا مفتی محمود اور مشرقی پاکستان شاخ کے امیر [illegible] اس میں شریک ہوئے اور کانفرنس میں مولانا مفتی محمود نے تمام مکاتب [illegible]

Marfat.com

علماء کے مرتب کردہ ۲۲ دستوری نکات کو شامل کرنے اور مسلمانوں کی تعریف متعین کرنے کا مطالبہ کیا۔

ایوب خان کی آمریت کے خلاف اپوزیشن کی جدوجہد میں جمعیۃ علماء اسلام نے بھرپور حصہ لیا۔ جمعیۃ کے صوبائی امیر مولانا عبیداللہ انور کی قیادت میں جمعیۃ نے لاہور میں احتجاجی مظاہرہ کیا اور پولیس کے وحشیانہ تشدد کی وجہ سے مولانا انور شدید زخمی ہو کر کافی عرصہ تک میو ہسپتال میں زیر علاج رہے مولانا عبیداللہ انور اور ان کے رفقاء کی اس قربانی سے ملک بھر میں تحریک جمہوریت کو تقویت ملی۔

۱۹۷۰ء میں یحییٰ خان نے ملک میں عام انتخابات کرائے اور تمام صوبوں میں جمعیۃ علماء اسلام نے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں اسے قومی اسمبلی میں سات سرحد اسمبلی میں چار بلوچستان اسمبلی میں تین اور پنجاب اسمبلی میں دو نشستیں حاصل ہوئیں انتخابات کے بعد جمعیۃ علماء اسلام نے دستور سازی میں اپنا کردار انجام دینے کی طرف توجہ دی اور یحییٰ خان، مجیب الرحمان اور بھٹو کے درمیان اختلافات کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اور جب بھٹو صاحب اور ان کی تحریک پر مغربی پاکستان کی دوسری سیاسی پارٹیوں نے دستور ساز اسمبلی کے ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا تو جمعیۃ علماء اسلام نے اسے ملکی سالمیت کے لیے تباہ کن قرار دیتے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت کرنے کا تاریخی اعلان کیا اور مولانا مفتی محمود نے اقلیتی سیاسی جماعتوں کا لاہور میں اجلاس طلب کر کے حکومت سے معقول اور متوازن رویہ اختیار کرنے کا مطالبہ کیا اور دستور سازی کے سلسلہ میں تجاویز پیش کیں اور اس کے بعد بھی دوسرے سیاسی لیڈروں کے ساتھ مل کر یحییٰ خان، مجیب الرحمان اور بھٹو کے درمیان اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کی مسلسل سعی کی۔

سقوط ڈھاکہ کے المناک سانحہ کے بعد بھٹو صاحب نے مغربی پاکستان میں عنان اقتدار سنبھالی تو جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مارشل لاء کے خاتمہ کی بھرپور جدوجہد کی۔ جس کے نتیجے میں بھٹو صاحب کو مارشل لاء ہٹا کر عبوری آئین کے تحت صوبائی حکومتیں بحال کرنا پڑیں۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مشترکہ حکومتیں قائم کیں۔ سرحد میں جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود نے وزارت اعلیٰ کا قلمدان سنبھالا اور بلوچستان میں نیپ کے راہنما سردار عطاء اللہ خان مینگل وزیر اعلیٰ بنے۔

مولانا مفتی محمود نے وزارت سنبھالتے ہی صوبہ بھر میں شراب پر مکمل پابندی لگانے کا اعلان کیا۔ جس کا ملک میں اور بیرون ملک پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ انھوں نے اردو کو صوبہ کی سرکاری زبان قرار دیا۔ احترام رمضان کا آرڈی ننس نافذ کیا۔ جہیز پر پابندی لگائی۔ سرکاری لباس شلوار قمیض قرار دے دیا۔ خواتین کے لیے پردہ لازمی قرار دیا۔ جوئے پر مکمل پابندی لگائی، تقاوی قرضوں پر سود معاف کر دیا۔ تمام قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لیے علماء اور وکلاء پر مشتمل کمیشن قائم کیا اور ان جیسی دیگر اسلامی اصلاحات مرکزی حکومت کی مسلسل مداخلت کے باوجود کیں۔

صوبائی حکومتوں کے قیام کے ساڑھے نو ماہ بعد جب مرکزی حکومت نے بلوچستان کی آئینی واکثریتی حکومت کو جسے ۲۱ کے ایوان میں سے ۱۴ ارکان کی حمایت حاصل تھی برطرف کر دیا تو مولانا مفتی محمود کی کابینہ بھی احتجاجاً مستعفی ہو گئی اور مرکزی حکومت کے مسلسل اصرار کے باوجود انھوں نے استعفیٰ واپس نہ لیا۔

اس کے بعد اپوزیشن پارٹیوں نے متحدہ جمہوری محاذ قائم کیا تو جمعیۃ علماء اسلام اس میں شامل ہو گئی۔ اور مولانا مفتی محمود اس کے اول نائب صدر منتخب ہوئے۔ متحدہ محاذ کے ساتھ ملک کے دستور کو زیادہ سے زیادہ اسلامی اور جمہوری بنانے کے لیے مولانا مفتی محمود نے فیصلہ کن کردار ادا کیا اور بالآخر مسلسل جدوجہد کے بعد دستور میں بہت سی اسلامی اور جمہوری دفعات شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

بھٹو حکومت کی طرف سے دفعہ ۱۴۴ کے مسلسل نفاذ کے خلاف لاہور اور ملتان میں متحدہ جمہوری محاذ نے ۱۹۷۳ء میں تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا تو جمعیۃ کے متعدد کارکنوں نے جبر و تشدد کے باوجود دوسری جماعتوں کے شانہ بشانہ گرفتاریاں پیش کیں اور جمعیۃ کے صوبائی سربراہ مولانا عبیداللہ انور بھی اس موقع پر گرفتار ہوئے۔

تحریک ختم نبوت میں بھی جمعیۃ علماء اسلام نے بھرپور کردار ادا کیا۔ قومی اسمبلی میں ملت اسلامیہ کے جذبات کی ترجمانی کرنے والے ارکان اسمبلی کی مولانا مفتی محمود نے قیادت کی اور ملک بھر میں جمعیۃ کے کارکنوں نے تحریک میں پرخلوص اور بھرپور حصہ لیا۔

جمعیۃ علماء اسلام نے لوگوں کے ایسے تنازعات و مقدمات کے تصفیہ کے لیے جن میں سرکار فریق نہیں ہوتی۔ "عدالت شرعیہ" کے نام سے ایک پرائیویٹ عدالتی نظام بھی قائم کر رکھا ہے۔ جس کے قاضی القضاۃ مولانا مفتی محمود ہیں اور ان کے معاون قاضی مولانا محمد سرفراز خان گوجرانوالہ اور مولانا عبدالکریم لاڑکانہ ہیں۔ مرکزی عدالت کے تحت صوبوں میں باقاعدہ شرعی عدالتیں قائم ہیں اور اپنے تنازعات کے شرعی تصفیہ کے خواہشمند حضرات ان عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے جنرل سیکرٹری مولانا مفتی محمود قومی اسمبلی میں متحدہ اپوزیشن پارٹی کے قائد کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیتے ہیں اور ان دنوں آئندہ انتخابات کے لیے تمام اپوزیشن جماعتوں اور جمہوری قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر منظم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

زاہد الراشدی، ناظم جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

جمعیت علمائے اہلحدیث

اہل حدیث حضرات کی تنظیم۔ برعظیم پاک و ہند میں اہلحدیث حضرات آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس، مؤتمر اہلحدیث ہند، جماعت غرباء اہل حدیث سابقہ پنجاب اور بنگال میں جمعیۃ تبلیغ اہلحدیث نام کی تنظیموں کی صورت میں منظم تھی۔ اہلحدیث کے دینی مدارس اور دینی ادارے بھی کثرت سے مشرقی پنجاب اور وسطی ہند میں تھے۔ ۱۹۴۷ء قیام پاکستان کے ہنگامہ دار و گیر میں بہت سے اکابر علماء اہل حدیث جام شہادت نوش کر گئے۔ ان کی مساجد و مدارس اجڑ گئے۔ ان کے قیمتی اور نادر و نایاب کتب خانے ہندوستان میں رہ گئے یا تباہ ہو گئے الغرض پاکستان کے سلسلہ میں جماعت اہلحدیث کو شدید صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔

ڈیڑھ دو سال اسی افراتفری میں گذر گئے۔ پھر جماعت اہل حدیث کے اصحاب رشد نے جن میں سرفہرست مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ)، مولانا عبدالواحد، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف وغیرہ تھے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی کی زیر قیادت جمعیت کی تنظیم کی طرح ڈالنے کے لیے غور و فکر کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کو جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے لاہور مدرسہ تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں جمعیت قائم کی گئی اور مولانا داؤد غزنوی کو صدر اور پروفیسر عبدالقیوم کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

پہلی اہلحدیث کانفرنس مئی ۱۹۴۹ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس کے صدر حافظ محمد ابراہیم میر محدث سیالکوٹی اور صدر استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی قرار پائے۔

جمعیت اہل حدیث کا ابتدائی قافلہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل

Marfat.com

جمعیت علمائے اہلحدیث

سلفیؒ، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، حاجی محمد اسحاق حنیف ارشدی، پروفیسر عبدالقیوم، مولانا محمد علی قصوری مرحوم، مولانا محی الدین قصوری، مولانا محمد حنیف ندوی، میاں عبدالمجید پر مشتمل تھا۔

"الاعتصام" کا اجراء:- اسلام کی تبلیغ کتاب و سنت کی اشاعت مسلک اہل حدیث کے فروغ۔ جمعیت اہل حدیث کے استحکام اور جماعت کے علمی و تبلیغی ذوق کو مزید پختہ کرنے کی غرض سے گوجرانوالہ سے "الاعتصام" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا گیا۔ یہ ہفت روزہ جماعت اہل حدیث گوجرانوالہ کی سرپرستی میں جاری ہوا جو بعد میں مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی تحویل میں دے دیا گیا۔

جمعیت المحدیث کو منظم کرنے کے لیے مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف اور مولانا حافظ محمد اسماعیل ذبیحی نے اس سلسلے میں پورے مغربی پاکستان کے دورے کیے اسی اثناء میں ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی۔ مجلس عمل جس میں تمام دینی جماعتیں شامل تھیں۔ جمعیت المحدیث کی طرف سے اس میں تین اکابر نامزد کیے گئے ان اکابرین میں مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور محمد عطاء اللہ حنیف تھے اس تحریک میں دوسرے علماء کے ساتھ جمعیت المحدیث کے بھی بہت سے علماء گرفتار ہوئے۔

جمعیت المحدیث کی دوسری المحدیث کانفرنس اپریل ۱۹۵۴ء میں ملتان میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی قصوری اور صدر استقبالیہ مولانا محمد اسحاق تھے اس کانفرنس میں تبلیغ دین کے لیے جامع منصوبہ تیار کرنے، جمعیت کی تنظیم کو مزید مستحکم کرنے اور المحدیث افراد کو جو دوسری جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں ان کو دوبارہ جماعت میں واپس لانے کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں تیسری اہل حدیث کانفرنس بلائی گئی جو دھوبی گھاٹ لائلپور میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر مولانا سید محمد اسماعیل غزنوی اور صدر استقبالیہ مولانا محمد صدیق لائلپوری تھے۔ اس کانفرنس کے موقعہ پر مجلس شوریٰ جمعیت المحدیث نے انتہائی دوررس فیصلے کیے۔

اولاً جماعتی دستور پاس کیا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا ثانیاً مرکزی معیاری درسگاہ کا قیام عمل میں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ثالثاً ادارہ اشاعت السنۃ کے نام سے اشاعتی ادارے کا قیام کے متعلق تھا۔

رابعاً دینی و سیاسی جماعتوں کو پانچ نکاتی قرارداد پاس کر کے دعوت اتحاد کی طرح ڈالی۔

جامعہ سلفیہ کا قیام:- جماعت کی علمی دینی اور تحقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے لائلپور میں ایک معیاری دینی و علمی درسگاہ بنام جامعہ سلفیہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ کانفرنس کے موقعہ اپریل ۱۹۵۵ء کو لائلپور میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم اور حضرت میاں صوفی محمد باقر مدظلہ کے ہاتھوں ایک سادہ و باوقار تقریب میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ اور بہت سے دیگر علماء و اعیان جماعت موجود تھے۔ جامعہ سلفیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ایک اجلاس میں مولانا عبیداللہ احرار ناظم تعمیرات مقرر کیے گئے۔ جنہوں نے شب و روز ایک کر کے دو تین سالوں میں حسب ضرورت ایک شاندار عمارت تعمیر کرادی۔ مئی ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں ایک منتخب اور سپیشل جماعت کا انتخاب کر کے جامعہ سلفیہ کا اجراء کر دیا گیا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم اس کے ناظم تعلیمات منتخب ہوئے تھے۔ اس اسپیشل کلاس کے اساتذہ میں مولانا سید احمد داؤد غزنوی مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف اور

مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔

چوتھی اہل حدیث کانفرنس:- اکتوبر ۱۹۵۶ء کے آخر میں گوجرانوالہ شیرانوالہ باغ میں چوتھی اہلحدیث کانفرنس پوری شان و شوکت سے منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر علامہ خلیل عرب مرحوم۔ صدر استقبالیہ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم تھے۔ کانفرنس کے موقعہ پر مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاس ہوئے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی صدارت میں مجلس شوریٰ نے آئندہ کے لیے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو صدر مولانا حافظ محمد گوندلوی کو نائب صدر مولانا محمد اسماعیل سلفی کو ناظم اعلیٰ حاجی محمد اسحاق حنیف کو ناظم نشر و اشاعت، مولانا محی الدین احمد قصوری کو ناظم تعلیمات میاں عبدالمجید کو ناظم مالیات منتخب کیا۔

ادارہ اشاعت السنہ کا قیام:- مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے بموجب جمعیۃ المحدیث اشاعت السنہ کے نام سے اشاعتی ادارہ قائم کر لیا۔ جس نے تھوڑے سے وقت میں نہایت قیمتی کتابیں مثلاً ۱۔ بنیات ۲۔ تقویۃ الایمان ۳۔ عدالت نبوی کے فیصلے ۴۔ اسلامی دستور کا مختصر خاکہ ۵۔ تحفۃ الموحدین ۶۔ مکالمات نبوی وغیرہ شائع کر کے ملک بھر کے اہل علم سے داد و تحسین وصول کیا۔

۱۹۵۷ء کے نصف اول میں جامعہ سلفیہ لاہور سے لائلپور منتقل ہو گیا۔ اس کے صدر المدرسین و رئیس الجامعہ استاذ العلماء حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ مقرر ہوئے۔ "الاعتصام" کی ادارت مستقلاً مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ نے سنبھالی۔

جمعیۃ اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس اپنے ہر جواب و نتائج کے اعتبار سے ملک گیر شہرت اور اثرات کی حامل رہی تھیں۔ چنانچہ پانچویں کانفرنس ۱۹۵۷ء کو سرگودھا میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدر استقبالیہ مولانا محمد اسحاق رحمانی تھے ۵۸ء، ۵۹ء، ۱۹۶۰ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہونے کی وجہ سے کانفرنس کی اجازت نہ مل سکی۔ ۱۹۶۱ء اکتوبر کو لائلپور میں جامعہ سلفیہ کی حدود کانفرنس منعقد ہوئی البتہ ۱۹۶۲ء نومبر کو ساتویں المحدیث کانفرنس مولانا عبدالعزیز کی صدارت میں باغ موچی دروازہ میں اپنے تزک و احتشام سے منعقد ہوئی اس کے صدر استقبالیہ حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم تھے۔ اس کانفرنس میں مشرقی پاکستان کے اجلہ علماء کرام نے بھی شمولیت فرمائی تھی۔ علماء اہلحدیث کے علاوہ اس میں آغا عبدالکریم شورش کاشمیری مرحوم شیخ خورشید احمد مرحوم (اس وقت وزیر قانون تھے) علامہ علاء الدین صدیقی، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری نے بھی خطاب فرمایا تھا۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو مولانا محمد داؤد غزنوی وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مجلس شوریٰ نے مولانا محمد اسماعیل سلفی کو ان کی جگہ امیر، مولانا غزنوی کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر غزنوی کو ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا۔ آج کل جمعیت اہل حدیث پاکستان امیر مولانا معین الدین لکھنوی آف اوکاڑہ ناظم اعلیٰ الحاج مولوی فضل الحق ہیں اور جامعہ سلفیہ نہایت خوش اسلوبی سے لائل پور میں اپنے سفر کو رواں دواں کیے ہوئے ہے۔ ہفت روزہ الاعتصام کے مدیر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف ہیں۔ ہفت روزہ "المحدیث" لاہور حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری کی ادارت میں نکلتا ہے۔ جمعیت المحدیث کا دوسرا مجلہ ہفت روزہ "الاسلام" گوجرانوالہ سے جناب بشیر احمد انصاری ایم اے کی ادارت میں نکلتا ہے

جمعیت اہل حدیث کا دائرہ کار:- جمعیت المحدیث پاکستان اپنے دائرہ کار اور وسعت کے اعتبار سے ایک ممتاز اور دینی جماعت ہے۔ پاکستان کے تمام صوبہ جات صوبہ سرحد آزاد کشمیر پنجاب بلوچستان اور سندھ میں پانچ صد سے زائد ابتدائی شہری اور ضلعی جمعیتیں اس سے ملحق ہیں۔ مرکزی جمعیت المحدیث پاکستان و

Marfat.com

مرکزی دفتر ایبٹ آباد (پاکستان) میں واقع ہے۔

جمعیت اہل حدیث کا انتظام :- مرکزی جمعیت اہلحدیث کا نظام جمہوری شورائی ہے۔ پاکستان بھر کے مختلف صوبہ جات بلکہ ضلع جات کے الگ الگ بنیادی اعتبار سے مجلس شوریٰ کے لیے ارکان مقرر ہیں۔ ابتدائی جمعیتوں کے انتخابات ہوتے ہیں۔ ضلعی یا شہری جمعیتوں کے نمائندگان مجلس شوریٰ مجلس شوریٰ ایک جگہ اکٹھے ہو کر مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کا انتخاب کرتے ہیں اور یہی جمعیت اہلحدیث کا سب سے بڑا اور مؤثر و طاقتور ایوان ہوتا ہے۔ اسے مرکزی مجلس شوریٰ کہا جاتا ہے مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کا امیر منتخب ہونے کے بعد چالیس ایام کے اندر اندر عہدیداران کے علاوہ مزید پچیس ارکان پر مشتمل مجلس عاملہ نامزد کرتا ہے جو صرف ارکان مجلس شوریٰ سے ہی لی جا سکتی ہے اور یہی جمعیت اہلحدیث کی پالیسی ساز اور نگران مجلس ہوتی ہے اور مجلس عاملہ بھی مجلس شوریٰ کے ہاں جواب دہ ہوتی ہے۔

(مولانا محمد اسلم سیف فیروز پوری)

جمعیت علمائے پاکستان پاکستان میں اہل سنت جماعت (بریلوی مکتبہ فکر) کی سب سے بڑی تنظیم جس کا قیام ۱۹۴۸ء میں ملتان میں عمل میں آیا اور سب سے پہلے امیر علامہ سید احمد قادری ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔

اس جمعیت کا مقصد اور نصب العین اس مملکت پاکستان میں اس کے نظریہ کے مطابق مکمل اسلامی آئین کا نفاذ۔ نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری قوت سے نافذ کرنا اور مقام و ناموس مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور تحفظ ہے۔

• ۔ صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی عزت و تکریم۔

• ۔ اولیاء کرام، صوفیائے عظام کا احترام اور انکی تعلیمات کا فروغ۔

• ۔ آئمہ مجتہدین، خاص طور پر امام اعظم ابو حنیفہ کا احترام اور علماء کی کتاب و سنت کی روشنی میں پیروی۔

• ۔ اس نظام حکومت کا قیام، جس میں کتاب و سنت کی عملداری ہو جس میں پارلیمنٹ حدود اللہ سے باہر جا کر کوئی اختیار استعمال نہیں کر سکتی۔

• ۔ اسلام کے مکمل اقتصادی اور معاشی نظام کو بروئے کار لانا۔

• ۔ کسانوں، مزدوروں اور محنت کش طبقہ کے حقوق کا تحفظ اور وسائل مہیا کرنا۔ اس کے پروگرام میں شامل ہے۔

جمعیت علمائے پاکستان کا واحد مقصد جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔

پاکستان میں نظام اسلام کا نفاذ۔

اسلامی اقدار کی حفاظت۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسوہ حسنہ کا بقاء

خلفائے راشدین کے دور سعید سے راہنمائی حاصل کرنا، عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کے قیام کی کوشش کرنا اور حقوق اہل سنت کا تحفظ ہے۔

جمعیت کی جد و جہد :- جمعیت العلماء پاکستان ملکی و ملی معاملات میں دلچسپی لیتی رہی۔ بحالی مہاجرین اور تحریک آزادی کشمیر میں بھرپور حصہ لیا مگر اس کی اس اصل جد و جہد آئین اسلامی کی تدوین تھی۔ اسلامی فقہ کی رو سے اصول فقہ سے مراد آئین اور احکام فقہ سے مراد "قانون" ہے۔ پھر بھی عہد حاضر کی زبان میں مستقل آئین ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ اس لیے جمعیت کی تمام سرگرمیاں اسی جانب مرکوز رہیں چنانچہ ہم نے ۱۹۴۹ء کی قرارداد مقاصد ۱۹۵۲ء کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ (بی بی سی رپورٹ) ۱۹۵۴ء کے عبوری مسودہ آئین ۱۹۵۶ء کے آئین ۱۹۶۲ء کے ایوبی آئین سب کو نامکمل قرار دیتے ہوئے مثالی آئین کے لیے کوشش جاری رکھی۔ مذکورہ تمام مسودات آئین میں کوتاہی کی وجہ یہ تھی کہ قرآن و سنت کو پاکستان میں اساس حجت تسلیم کر لینے کے باوجود فقہ کو اساس حجت میں شامل نہ کیا گیا اور اس طرح نص کو تفسیر بالرائے سے مسخ کرنے اور تحریف و مطالبہ کے راستے کھلے رکھے گئے۔

۱۹۶۹ء میں جب یحییٰ خان نے مستقل آئین سازی کے لیے مجلس آئین ساز منتخب کرانے کے لیے عمومی انتخابات کا اعلان کیا تو سواد اعظم اہلسنت نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جون ۱۹۷۰ء میں اہلسنت کا ایک آل پاکستان کنونشن دار السلام ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقد کیا۔ اس کنونشن میں تقریباً دس ہزار علماء مشائخ، خطباء، وفقہا اور آئمہ و قانون دان حضرات جمع ہوئے جہاں آئین اسلامی کی خاطر عمومی انتخابات میں حصہ لینے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔ تقریباً اڑھائی لاکھ سنی عوام کے اجتماع میں اس قرارداد کی توثیق ہوئی خواجہ حافظ محمد قمر الدین صاحب سجادہ نشین آستانہ سیال شریف کو آل پاکستان جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا۔

پانچ چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں خواجہ صاحب نے ملک بھر جمعیت کے پبلک جلسوں سے خطاب کیا۔ اگست میں عمومی انتخابات کے سرکاری اعلان کے بعد خواجہ صاحب نے بے سر و سامانی کی حالت میں آئین اسلامی کی تدوین کی خاطر الیکشن کی تیاری شروع کی۔ تین چار ماہ کی جد و جہد میں جمعیت العلمائے پاکستان نے آئین ساز اسمبلی کی سات نشستیں حاصل کر لیں۔

۱۹۷۱ء کے پر آشوب دور میں جمعیت ملکی دفاع کے لیے سرگرم عمل رہی۔

مئی ۱۹۷۲ء میں بمقام خانیوال جمعیت کا کل پاکستان کنونشن منعقد ہوا جس میں صوبائی مجالس شوریٰ، صوبائی مجالس منتظمہ مرکزی مجلس شوریٰ اور مرکزی مجلس عاملہ کے علاوہ خصوصی دعوت پر مندوبین شامل ہوئے جن کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے متجاوز تھی۔ اس کنونشن میں جمعیت کا نیا آئین منظور ہوا۔ جس سے پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے مرکزی عہدیداروں نے خطاب کیا۔ اسی خانیوال کنونشن میں مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کو صدر اور مولانا عبدالستار خان نیازی کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

پاکستان کے مستقل آئین کی تدوین کے سلسلہ میں جمعیت نے قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ مولانا نورانی صاحب کی خدمات زبان زد خاص و عام ہیں۔ اسمبلی کے اندر اور باہر آئین کی تدوین کے علاوہ بنگلہ دیش کے فتنہ سے قوم کو نجات دلانے کے لئے اکابرین جمعیت نے ملک میں سینکڑوں جلسے کیے صرف مولانا نیازی صاحب نے اس سلسلہ میں بنگلہ دیش کے خلاف اسی جلسوں سے خطاب کیا۔ مولانا کے خلاف مقدمات کھڑے کیے گئے اور جیل میں ڈال دیا گیا۔ مولانا کے علاوہ جمعیت کے دیگر اکابرین صوبائی ناظم اعلیٰ، نائب ناظم، ناظم اطلاعات، صوبہ سندھ کے اکابرین پر مقدمات چلائے گئے۔

۱۹۷۳ء میں مہنگائی، گرانی اور حکومت کی ناقص خارجہ پالیسی کے خلاف متحدہ جمہوری محاذ کے فیصلے کے مطابق بطور احتجاج تحریک جمہوریت شروع کی گئی تو جمعیت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۷۴ء میں جب قادیانیت کے خلاف مہم شروع کی گئی تو جمعیت بھی ملک کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں پر مشتمل مجلس عمل تحفظ ختم نبوت میں شریک رہی جمعیت کے رہنما علامہ سید محمود احمد رضوی مجلس عمل کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء میں بھی جب ملک میں تحریک ختم نبوت چلی تو تمام مکاتب فکر کے علماء نے اپنے اجلاس میں جمعیت کے سربراہ مولانا سید ابو الحسنات قادری کو مجلس عمل کا صدر منتخب

Marfat.com

کیا۔ اس زمانے میں جو تمام مذہبی جماعتوں کے لیے ابتلا کا دور تھا۔ جمعیت کے موجودہ سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خان نیازی کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا تھا۔
جمعیت علمائے پاکستان کی تنظیم کے ممبروں کے دو درجے ہیں۔ ۱۔ رکن۔ ۲۔ خادم

جمعیۃ علمائے ہند غیر منقسم ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ و تجدید و احیائے دین کا کام شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی ؒ کی ذات گرامی سے شروع ہوتا ہے۔ آپ وہ خرابیاں دور کرنے میں کامیاب ہوئے جو اس وقت اکبری الحاد سے پیدا ہو چکی تھیں آپ کی اصلاحی خدمات کا سلسلہ ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء تک رہا۔ یعنی جہانگیر کی وفات سے تین سال تک اس کے بعد شاہجہان کے دور سلطنت میں آپ کی اصلاحات کا نمایاں اثر سامنے آیا۔ اورنگ زیب عالمگیر جو سلطنت مغلیہ کے آخری مضبوط اور دیندار بادشاہ تھے۔ وہ خواجہ محمد معصوم صاحب ابن حضرت مجدد سے بیعت بھی تھے اور خواجہ سیف الدین ابن خواجہ محمد معصوم سے روحانی تربیت حاصل کی تھی۔ عالمگیر کے دور حکومت ہی میں پہلی بار ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا تھا کہ کابل اور قندھار سے آسام تک، تبت اور نیپال سے بندرگاہ سورت کھمبات اور بالا بار تک سیاسی اور اسلامی مرکز ایک ہو گیا۔ یہ انھی بزرگوں کی طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

جمعیۃ علماء کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں فقط علماء ہوں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی وہ جماعت جنہوں نے علماء کی قیادت کو منظور کیا اور ان کی زیر سرکردگی خدمات انجام دیں۔ اس لیے جمعیۃ کے لیے عام ممبر سازی اور عہدہ داران میں غیر علماء کو ہمیشہ لیا جاتا رہا۔

اس طبقہ جماعت علمائے ہند کو طبقہ اول سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ زوالِ سلطنت مغلیہ کا دور وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ بھی اسی گروہ علماء سے تعلق رکھتے تھے آپ نے ہر ممکن سعی کی کہ سلطنت اسلامی صحیح راہ پر گامزن ہو جائے۔ جس کی دلیل آپ کی گرانقدر تصانیف ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول، انسان کے بنیادی حقوق، بین الاقوامی تحفظات اور مذہبیات جیسے سب ہی عنوانات دے کر مسائل حل فرمائے ہیں۔

یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد کے حضرات کا یہ مسلک رہا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی اصلاح کی پوری قوت سے کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں چاہے کوئی ملامت اور چاہے مصائب و آلام سے بھی دوچار ہونا پڑے۔ کیونکہ خیر خواہی جس کی آنحضورؐ نے تعلیم فرمائی۔ "النصیحۃ لائمۃ المسلمین وعامتھم" دراصل یہی ہے۔

ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے بعد یہاں کی حکومت کو گھن لگنا شروع ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے نہ صرف یہ کہ اس کو محسوس کیا بلکہ اس کے اسباب و علل پر بڑی دیدہ وری سے اور جامعیت کے ساتھ بحث کی اور ان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اس کی طرف حکومت کو امراء اور وزراء کو اور سوسائٹی کے دوسرے طبقات کو درجہ بدرجہ نہایت پرزور و پرشکوہ الفاظ میں توجہ دلائی۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی حیات میں دہلی کے حالات اور زیادہ بگڑے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے دہلی کے دارالحرب ہونے کا فتوےٰ دیا۔ نیز جب آپ نے یہ حالات دیکھے تو اپنے حلقہ اثر سے کایا اور اپنے بعد جانشین ہونے والوں کا تعارف کرایا۔ ان کی جماعت نے ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں سید احمد شہید کی سرکردگی میں ان کی ایک باقاعدہ ترتیب دے دی۔ پہلے پہل یہ۔ پنجاب اور سرحد میں اسلامی حکومت کے غلبہ کی کمی کی وجہ سے انگریزی تسلط کے باوجود انجام کی پروا نہ کرتے ہوئے ان حضرات نے وعدہ کر کے رضاکارانہ تربیت کا آغاز کیا۔ روح جہاد پھونکی اور سرفروش مجاہدین تیار کرنے شروع کر دیئے۔ ہر قدم کا آخری مقام سہارنپور تھا جو یوپی کی آخری سرحد ہے جو پنجاب سے ملحق ہے آپ کی اس تحریک کے اثرات پورے بنگال آسام اور برما تک پہنچ گئے۔

۹ شوال ۱۲۳۹ھ/۶ مئی ۱۸۲۴ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے نواسے حضرت شاہ اسحاق صاحب آپ کی جگہ مسند نشین ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ان کو تمام کام سونپ دیئے تھے۔ جب سید احمد شہید کا قافلہ دہلی پہنچا، تو انہوں نے بھی شاہ اسحاق کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس زمانے میں اگر جمعیۃ کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحاق اس کی صدارت کرتے اور جب اجلاس مدرسہ سے باہر ہوتا تو سید احمد شہید اس اجلاس کی صدارت کرتے۔

شاہ عبدالعزیز کے معروف ترین تربیت یافتہ علماء حضرات یہ تھے۔
مولانا شاہ رفیع الدین، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا شاہ عبدالغنی، مولانا محمد اسحٰق، مولانا محمد یعقوب، مولانا شاہ عبدالحی، شاہ محمد اسماعیل، حضرت سید احمد شہید، مولانا رشید الدین، مولانا مفتی صدر الدین، مولانا الٰہی بخش، شاہ غلام علی، مولانا مخصوص اللہ، مولانا کریم اللہ، مولانا میر محبوب علی، مولانا عبدالخالق، مولانا میر محبوب علی، مولانا حسن علی، مولانا حسین احمد وغیرہ۔ یہ حضرات وہ عظیم المرتبت شخصیات تھیں جنہوں نے دین اسلام کی بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ انہی افراد میں سے وہ طبقہ بھی تھا جس نے بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔ تاریخ حریت کا دردناک حادثہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ/۶ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا۔

علماء کا یہ طبقہ جماعت علماء کا پہلا طبقہ تھا۔ اس طبقے میں اور اس کے بعد تمام طبقات میں قیادت علماء ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ ورنہ مجاہدین میں عوام ہی تھے۔

دوسرا طبقہ:۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کا وحشت و بربریت کا دور آیا۔ اس میں بھی سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ان کے پیر بھائی حافظ محمد ضامن شہید مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سردھڑ کی بازی لگائی۔ معرکہ شاملی میں جہاد بالسیف بھی کیا یہ جماعت علماء کا دوسرا طبقہ تھا۔

انگریزی غلبہ کے بعد ان حضرات میں سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا رحمت اللہ مکہ معظمہ ہجرت فرما گئے۔ دوسرے حضرات نے دینی درسگاہ پر زور دیا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ غرض ان آفتابہائے رشد و ہدایت نے اسلامی نظریات و علوم اور عمل کی حفاظت میں پوری توجہ دی اور بدیشی حکومت کا تسلط ختم کرنے میں پوری قوت صرف کرتے رہے۔ ان اکابرین کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں درج ہیں۔

تیسرا طبقہ:۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے بعد صحیح طور پر اس مسند پر متمکن ہونے والی عظیم ترین مفکر شخصیت حضرت مولانا محمود الحسنؒ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف تو ایسے رفقائے کار عطا فرمائے جو آسمان رشد و ہدایت کے آفتاب تھے۔ مثلاً شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا سید تاج محمود امروٹی، مولانا غلام محمد دینپوری وغیرہم اور دوسری طرف مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا حسین احمد مدنی مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم جیسے اہم حضرات کہ جنہیں آسمان علم کے درخشندہ ستارے

Marfat.com

کہا جاتا ہے بجا ہوگا یہ حضرات قدرت نے آپ کے حلقہ تلامذہ میں داخل فرمائے۔

حضرت شیخ الہند نے دو طریقے اختیار فرمائے۔ ایک طرف گوریلا جنگ کا انتظام کیا اور دوسری طرف حکومت ترکیہ اور دیگر اسلامی حکومتوں سے انگریز کے پنجہ استبداد سے استخلاص کے لئے امداد چاہی۔ انگریز کی حکومت میں رہتے ہوئے اس طرح کا نظام چلانا بہت ہی مشکل تھا۔ آپ نے ہر علاقہ کے اولیاء کرام کو اس علاقہ کی گوریلا تحریک کا انچارج بنا کر پورے ہندوستان کو مختلف یونٹوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس لئے انگریز سی آئی ڈی تحریک کے تمام شرکاء کو دریافت نہ کر سکی۔

مولانا محمود الحسن کی روش ہمیشہ سب کو یکجا کرنے کی رہی۔ انگریزی دور میں کارکن حضرات اشاروں سے کام لیتے تھے۔ ریکارڈ کے بارے میں ہدایت ہوتی تھی کہ ہرگز نہ رکھا جائے۔ ۱۹۴۶ء تک یہی حالت رہی۔ اس لئے حضرت شیخ الہند کے کارکنوں کی تصویر کشی ناممکن ہے۔

چوتھا طبقہ:۔ جمعیۃ علماء کا چوتھا طبقہ ان حضرات کا ہے جو حضرت شیخ الہند کے رنگ میں رنگے گئے۔ کچھ عرصہ اس طبقہ کے سرگروہ حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رہے۔ آپ کے بعد ۳۴ سال مولانا حسین احمد مدنی اس طبقہ کے سرگروہ رہے۔ ۱۹۴۲ء تک اس طبقہ (جمعیۃ علماء) کی ایک ہی رائے ہوتی تھی لیکن اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی بعض اختلافات کی بناء پر دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے اور پھر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار فرمائی۔ اور مسلم لیگ کی مناسبت سے جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے لئے قانون اسلام پر عمل کرنے کے لئے ایک جدا وطن چاہتے تھے جو مسلم لیگ لے کر اٹھی تھی۔ ان کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے تاکید کی تھی کہ اگر ان کا پاکستان بننے سے پہلے انتقال ہو جائے تو انہیں اس جگہ دفن کیا جائے جہاں پاکستان بننا یقینی ہو۔

انہوں نے اور ان کے سب عظیم ساتھیوں نے اس ملک کے لئے پوری جدوجہد سے کام لیا۔ آپ شارح مسلم شریف مفسر قرآن اور جامع العلوم شخصیت رکھتے تھے اس پر مستزاد یہ کہ حسن تقریر و تحریر انتہا درجہ کا تھا۔ جب پاکستان بنا تو کراچی تشریف لے آئے۔ آپ میں دنیا طلبی قطعاً نہ تھی۔ بے حس قوم نے ان کے مرتبہ کو پہچانا اسلامی حکومت کے لئے قرارداد مقاصد پاس کرائی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کی وفات ہو گئی۔ اور کراچی میں مدفون ہوئے۔

دوسری طرف مولانا حسین احمد مدنی اور باقی سب علماء تھے۔ ان کا اس وقت یہ نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے نقل آبادی اور جدا وطن مناسب نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے قرارداد پاس کر کے یہ فارمولا پیش کیا کہ

۱۔ صوبے خود مختار ہوں۔

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لئے کر دی گئی ہو باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵۔ مسلمان ۴۵۔ دوسری اقلیتیں ۱۰۔

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہوں گے۔

اس فارمولے کے فائدے یہ ہوں گے کہ (ا) اہم پورٹ فولیو (قلمدان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوگی۔ (ب) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جائے تو صوبہ کشمیر، پورا صوبہ پنجاب، کیمبلپور سے سہارنپور کی سرحد تک۔ پورا صوبہ بنگال، مسلم اکثریت کے زیر اقتدار ہوں گے۔ ہر طرح ہندوستان کے کل چودہ صوبوں میں سے پانچ صوبے ایسے ہوں گے۔ جہاں مسلم اکثریت کا اقتدار ہوگا۔ اور کشمیر سمیت پندرہ میں سے چھ صوبے ایسے ہوں گے (ج) صوبہ دہلی اور صوبہ آسام میں مسلمان ۴۴ فیصد ہیں۔ حکومت میں مسلمانوں کا حصہ مساوی کے قریب ہوگا۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ ۳۰ یا ۳۳ فیصد ہوگا۔ وزارتوں میں مؤثر شمولیت ہوگی۔ (د) مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں مسلمانوں کو حق استرداد حاصل ہوگا۔ (ماخوذ از مجاہد ملت نمبر الجمعیۃ دہلی ص۵۸ کالم ۲ و ص۵۹ کالم ۱)

جمعیۃ علمائے ہند کے اکابر اپنی جگہ کامل اخلاص کے حامل تھے۔ انہوں نے اپنے اسلاف کے طرز پر زندگی گذاری تھی۔ استبداد انگریز کے مقابلہ میں ساری عمر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ مولانا آزاد ذہین ترین انسان تھے۔ تاحیات جمعیۃ سے تعلق رہا۔ حضرت شیخ الہند کے پروردہ تھے۔ ان پر ان کی نظر شفقت رہی تھی انہوں نے اپنے نظریہ کے ناکام ہونے کے بعد نواب ممدوٹ کے ذریعے قائداعظم سے کہلایا کہ وہ بنگال چھوڑ دیں اور پنجاب پورا لے لیں لیکن قائداعظم نے فرمایا وہ کیا جانیں اور وہ کانگریس کو اس پر کیسے راضی کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر لیاقت علی خان کی زبانی کہلایا کہ میں کانگریس سے منوالوں گا۔ کیونکہ اس علاقہ میں سکھوں کی اکثریت ہے اسے پاکستان میں داخل کر دیں۔ لیکن انہوں نے آکر جواب دیا کہ قائداعظم منظوری کے دستخط کر آئے ہیں۔ اس کے بعد قائداعظم جو آہنی عزائم والے انسان تھے کتنے پریشان ہوئے اور مولانا آزاد نے ان سے ایک بار کہا تھا کہ آپ جلدی نہ کریں دس سال مل کر کوشش کریں گے تو نقشہ ہی بدل جائے گا۔ جس پر قائداعظم نے فرمایا کہ دس سال بہت ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد نے کہا کہ قوموں کی قسمت کے فیصلوں کے لئے دس سال کا عرصہ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کے بارے میں کچھ روشنی راجہ صاحب محمود آباد کے انٹرویو سے پڑتی ہے۔ جو جناب مختار مسعود کے مجموعہ مضامین میں جس کا نام "آواز دوست" ہے۔ غالباً جولائی ۷۵ء میں چھپا ہے۔

فارمولے کی مذکورہ دستاویز سے اور اس کے ماسبق و مابعد عبارتوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان حضرات کا۔ یعنی جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ مع جمعیت علماء اسلام کا اختلاف دراصل اس بارے میں تھا کہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے کونسی صورت زیادہ نفع بخش ہے۔ صوبائی خود مختاریاں دلائی جائیں تو بہتر رہے گا جس میں کلکتہ جیسا بڑا شہر مع قرب و جوار کے فولادی کارخانوں کے مسلم اکثریت کے تحت آجاتا ہے یا مسلمانوں کے لئے جدا حدود اور جدا وطن کا مطالبہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے زیادہ مفید ہے۔ لیکن جمعیۃ علماء ہند انتخابات میں ناکام ہو گئی۔ اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت قرار پائی اور مملکت پاکستان معرض وجود میں آئی۔

لیکن جیسے کہ ایک مثال مولانا آزاد کے اخلاص کی دی گئی ہے اسی طرح جمعیۃ کے سب اکابر کا حال رہا۔ انہوں نے کبھی پاکستان کی مخالفت تو کیا کمزوری بھی نہیں چاہی۔ پاکستان کی مضبوطی سے ہندوستان کے مسلمانوں کی کمر مضبوط ہوتی ہے اور اس کی کمزوری سے وہاں کا مسلمان نڈھال ہو جاتا ہے کیونکہ اسلام کا رشتہ سب رشتوں پر غالب ہے۔

چنانچہ شیخ العرب والعجم صدر جمعیۃ علماء ہند و صدر مدرس و شیخ الحدیث دارالعلوم

Marfat.com

دیوبند کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ "جب کسی نے ایک مجلس میں پوچھا کہ حضرت پاکستان کے لئے اب آپ کا کیا خیال ہے! تو حسب معمول سنجیدگی و بشاشت سے فرمایا کہ "مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے" (شیخ الاسلام نمبر روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء صدا، کالم ۱، سطر ۸)

جمعیۃ علماء کے اس طبقہ نے طبقہ اول کی طرح اسلامی اقتصادیات بھی تحریر کیں۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمان صاحب سیکرٹری جمعیۃ علماء ہند نے اس عنوان پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کی مختصر فہرست ابواب یہ ہے (۱) اقتصاد و علم الاقتصاد (۲) معاشیات کے جدید نظریئے (۳) اصول معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں (۴) انفرادی معیشت (۵) اجتماعی نظام معیشت (۶) بیت المال اور اس کے مصارف (۷) زراعت تجارت اور صنعت و حرفت (۸) مال گذاری خراج اور (۹) زمینداری (۱۰) ربا اور اس کے اقسام و احکام (۱۱) بینک کواپریٹو سوسائٹیاں اور مضاربت (۱۲) کارنیں اجارہ داری کی کمپنیاں ملیں اور کارخانے (۱۳) زکوٰۃ صدقات وراثت اور اوقاف (۱۴) اسلامی نظام کا دیگر اقتصادی نظاموں سے موازنہ۔ (۱۵) ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل۔ یہ کتاب ۵ ۱۹۴ سے طبع ہوتی آرہی ہے۔

اس کے بعد ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی جو دسمبر ۶۰ء میں دہلی سے طبع ہوئی اس کا نام ہے "دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" یہ کتاب ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

سید صاحب کے مکاتیب میں جو انہوں نے سلاطین کے نام تحریر فرمائے یہ مضمون ملتا ہے کہ میں امام جہاد ہوں اور منصب امامت اور منصب سلطنت میں بہت فرق ہے۔ امام کا تقرر جہاد و بغاوت و فساد فرو کرنے کے لئے ہوتا ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ ممالک پر قابض ہو جائے۔ مکاتیب سید احمد شہید مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لاہور صہ۱۸ اس سے آگے دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

لہٰذا اس وقت کہ بلاد ہندوستان اہل کفر و طغیان کے تسلط سے بھر گئے ہیں میں نے اپنے وطن مالوف سے چل کر بہ نیت ہجرت و جہاد خراسان کی طرف رخ کیا ہے

اس سے آگے صہ۱۹ کی پشت پر ایک مکتوب میں ہے۔

میرا مقصود اصلی یہ ہے کہ ہندوستان میں جہاد کروں نہ یہ کہ دیار خراسان کو وطن بنا لوں۔

صہ۶۹ پر قاضی مقرر کر کے اس کے فرائض بتلائے ہیں وہ یہ ہیں جھگڑے ختم کرنا۔ ان کے بارے میں فیصلے دینا۔ حدود شرعیہ اور تعزیرات کا نفاذ اقامت جمعہ و عیدین۔

بہرحال آپ نے جو کچھ کیا وہ اسلام کے لئے کیا اور اپنے آپ کو امیر المومنین لکھا جو خاص اسلامی لقب ہے۔ اور خود کو اسی درجہ میں رکھا کہ دراصل آپ امام جہاد ہیں۔ اس صفحہ کی دوسری طرف متعدد قاضیوں کا اسلامی طریقہ پر تقرر کے فرامین دیئے گئے ہیں۔

سید صاحب کا مکتوب امامت کے متعلق سیرت سید احمد شہید میں صہ۱۸۴، ۱۸۳ مطبوعہ خواجہ بک ڈپو لاہور پر دیا گیا ہے جو قابل دید ہے۔

اب تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب کے بقیہ مسلمانوں کو نمایاں کیا گیا ان کے لئے شبینہ مکاتب قائم کئے گئے۔ ہندی رائج ہونے پر مذہبی کتابیں ہندی میں رائج کر دی گئیں

اس دور میں جمعیۃ کی خدمات کا تذکرہ مولانا شیخ محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند شیخ الحدیث و صدر مفتی مدرسہ امینیہ دہلی و رئیس ادارہ مباحث فقہیہ و مہتمم جامعہ قاسمیہ مراد آباد و ممبر عاملہ و شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے جمعیۃ علماء ہند کیا ہے ۹ اور تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند کے نام سے چار حصے تحریر فرمائے ہیں۔ ان کی فہرست بھی اس انسائیکلوپیڈیا کے مختصر مضمون میں لانی ممکن نہیں رحمہم اللہ اجمعین۔

جمل، جنگ

ایک لڑائی جو جمادی الآخر ۳۶ھ / دسمبر ۶۵۶ء میں بصرے کے قریب ہوئی۔

اس جنگ کے فریقین میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ تھے۔ اس جنگ کو جنگ جمل کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں حضرت عائشہؓ میدان جنگ میں ایک اونٹ پر سوار تھیں۔ جس کا نام عسکر تھا۔ بعد میں یہی اونٹ لڑائی کا مرکز بن گیا۔

حضرت عائشہؓ فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ معظمہ گئی ہوئی تھیں لیکن محرم میں عمرہ کرنے کے لئے وہیں قیام پذیر تھیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ملی جب عمرہ کی ادائیگی کے بعد مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں تو راستے میں مقام سرف پر عبید بن ابی سلمہ نے اطلاع دی کہ حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اور مدینہ منورہ میں ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ چنانچہ آپ راستے ہی سے مکہ واپس ہو گئیں اور لوگوں کو حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے اور اصلاح فتنہ و فساد کی دعوت دی۔ چنانچہ مکہ میں حضرت عثمانؓ کا مقرر کردہ عامل عبداللہ بن عامر حضرمی اور بنو امیہ کے تمام افراد جو جا بجا مکہ پہنچے تھے آپؓ کی آواز پر لبیک کہی۔ عامل بصرہ عبداللہ بن عامر اور عامل یمن یعلی بن منبہ نے لشکر کے سامان سفر کی تیاری اور فراہمی میں حصہ لیا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چار ماہ بعد مکے پہنچ گئے۔

اس مہم کے جواز کے سلسلہ میں ان لوگوں نے جو دلائل دیئے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اصلاح احوال کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک طرف تو شہادت عثمان کا واقعہ تھا اور لوگ قاتلین قصاص لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف بعض حلقوں کی طرف سے یہ بات بھی کہی گئی کہ حضرت علیؓ قاتلوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں اور وہ انہیں سزا نہیں دیں گے۔ اس سے ایک خلفشار پیدا ہو گیا۔ بعض جگہوں مثلاً مصر میں محمد بن ابی حذیفہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس تمام صورت حال کو ختم کرنے کے لئے حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ تاکہ اصلاح احوال کے لئے کوئی قدم اٹھایا جا سکے۔ نیز قاتلین عثمانؓ سے قصاص لیا جا سکے۔ اگر ایسا نہ کیا جا سکا تو ہر آنے والے خلیفہ کو قتل کرنے کی رسم چل نکلے گی۔

چنانچہ بعض مورخین کے نزدیک ایک ہزار اور بعض کے خیال کے مطابق تین ہزار افراد پر مشتمل یہ قافلہ بصرے کی طرف روانہ ہوا۔ جب حضرت علیؓ کو اس بارے میں معلوم ہوا تو آپؓ نے حالات کے تدارک کے لئے ربیع الاول کی آخری تاریخوں میں بصرے کا رخ کیا۔ آپؓ پہلے شام کی طرف چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور مکے سے آنے والوں کو راستہ ہی میں روک لینا چاہتے تھے۔ لیکن الربذہ کے مقام پر پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ وہ تینوں حضرات اپنے ساتھیوں سمیت آگے نکل چکے ہیں

Marfat.com

بصرے پہنچ کر حضرت عائشہؓ کے لشکر نے اہل شہر کو اپنے مقصد میں شرکت کے لئے دعوت دی چنانچہ اہل شہر دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جماعت نے حضرت علیؓ کے عامل بصرہ عثمان بن حنیف کے ہاتھ پر بیعت کی اس دوران میں دونوں جماعتوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئیں۔

آخر کار جمادی الآخر کے وسط میں حضرت علیؓ بصرہ کے مضافات میں پہنچ گئے اور فریقین میں گفت و شنید کا آغاز ہوا۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سب کے سب یہ چاہتے تھے کہ صلح کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اور ہر شخص کو یقین تھا کہ اب سمجھوتا ہوا ہی چاہتا ہے کہ منافقین اور قاتلین عثمانؓ کی شرارت سے جنگ شروع ہو گئی۔

حضرت عائشہؓ کی فوج میں تیس ہزار اور حضرت علیؓ کی فوج میں بیس ہزار سپاہی تھے۔ لڑائی صبح سے شام تک جاری رہی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں گروہوں میں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے ایک ہی قبیلے کے اور بعض اوقات ایک ہی خاندان کے لوگ باہم لڑ رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ محمل میں اونٹ پر سوار تھیں۔ جس کے سرپوش کو لوہے کی چادروں اور دوسرے سامان سے مضبوط بنا دیا گیا تھا۔ اونٹ کی حفاظت ایک قسم کے زرہ بکتر سے کی گئی تھی۔ لڑائی کے اختتام پر محمل میں اس قدر تیر لگ چکے تھے کہ وہ خارپشت دکھائی دیتا تھا حضرت عائشہؓ کو کوئی تیر نہ لگا۔ صرف بازو پر ایک خراش آئی۔ لڑائی اونٹ کے اردگرد خاص طور پر بہت زیادہ شدید تھی۔ محمل کے محافظین آیات قرآنی پڑھتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا آتا رہا جو زخمی ہو کر گر جاتا وہ اونٹ کی مہار دوسرے محافظین کے ہاتھ میں دے دیتا۔ ناقہ کی مہار پکڑنا گویا دار و رسن سے کھیلنا تھا۔ چنانچہ جان نثار یکے بعد دیگرے اونٹ کی مہار پکڑتے جاتے اور شہید ہوتے جاتے تھے۔ ان محافظین کی تعداد میں اختلاف ہے۔ ان کی تعداد چالیس سے دو ہزار سات سو تک بتائی جاتی ہے۔

بالآخر حضرت علیؓ نے جنگجوؤں کو حکم دیا کہ اس ناقے کو کسی نہ کسی طرح مار گراؤ۔ کیونکہ جنگ کا خاتمہ اس کے گرنے پر منحصر ہے اس پر امین بن ضبیعہ نے اونٹ کے پاؤں میں تلوار ماری اور وہ بلبلا کر بیٹھ گیا۔ بس پھر کیا تھا اہل جمل منتشر ہو گئے اور حضرت علیؓ کی فوج نے اونٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے اعلان کرا دیا کہ ہتھیار ڈالنے یا گھر کا دروازہ بند کرنے والا امن و امان میں ہے۔ کسی کا تعاقب نہ کیا جائے۔ کسی کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر اس پر دست درازی نہ کی جائے۔ حضرت علیؓ کی فوج نے اس حکم کی تعمیل کی۔

حضرت علیؓ نے محمد بن ابوبکر کو حکم دیا کہ جا کر اپنی بہن کی حفاظت کرو۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ پھر وہ خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مزاج پرسی کے بعد کہا۔ اللہ تعالے آپ کی ہر غلطی پر خط عفو کھینچ دے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا "غفور الرحیم تمہاری بھی ہر غلطی کو معاف کرے"۔

اس جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کے تیس ہزار لشکریوں میں سے نو ہزار اور حضرت علیؓ کے بیس ہزار کی فوج میں سے ایک ہزار ستر آدمی کام آئے۔ یہ لڑائی مصالحت اور صاف دلی کی گفتگو پر ختم ہوئی۔

یکم رجب ٣٦ھ/٦٥٦ء کو حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو محمد بن ابوبکر اور امرائے بصرہ کی چالیس خواتین کے ہمراہ بصرے سے روانہ کیا۔ اور چند کوس تک خود بھی رخصت کرنے آئے۔ پھر دونوں صاحبزادوں حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو بھیجا اور حضرت عائشہ مکہ معظمہ تشریف لے گئیں۔ اور وہاں سے فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد محرم ٣٧ھ/٦٥٧ء میں عازم مدینہ ہوئیں۔

اس جنگ میں حضرت علیؓ کے مخالف فریق کی شکست کی چند وجوہات یہ تھیں۔

بقول حضرت علیؓ جو انہوں نے ایک سائل کے جواب میں کہا تھا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کی رضا کے لئے خروج کیا ہے۔ تو ان کے پاس اس موقف کی تائید میں دلیل موجود ہے اور ہمارے پاس کی اپنے موقف کی تائید میں دلیل موجود ہے۔ اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو دونوں طرف کے مقتولین جنت میں ہوں گے۔

جنگ سے پہلے ایک ایسا موقع پیدا ہو گیا تھا کہ فریقین میں صلح ہو جاتے حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ کی بالمشافہ گفتگو ہو چکی تھی اور جنگ نہ کرنے کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ کا بھی یہی خیال تھا۔ جس کی وجہ سے طرفین کے سرداروں نے جنگ و پیکار کے خیالات اور ارادے بتدریج اپنے دلوں سے نکال دیئے۔

حضرت طلحہؓ کو تیر لگا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ایک مکان میں چلے گئے اور جہاں پر جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

ایک موقع پر حضرت زبیرؓ کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے ان سے کہا۔ اے ابو عبداللہؓ کیا تمہیں یاد ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے فرمایا تھا۔ "تم علیؓ سے ناحق لڑو گے" چنانچہ یہ گفتگو کرنے کے بعد زبیرؓ میدان جنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ بنو تمیم کے ایک فرد نے ان کا تعاقب کیا اور ایک سنسان جگہ پر انہیں شہید کر دیا۔

لڑائی کے دوران میں حضرت علیؓ نے اس بات کو تاڑ لیا تھا کہ جب تک لوگوں کو حضرت عائشہؓ کا ہودج میدان جنگ میں نظر آتا رہے گا یہ جنگ کسی طرح نہ تھمے گی۔ چنانچہ آپؓ کے کہنے پر ایک شخص نے اونٹ کے پاؤں پر تلوار ماری اور اونٹ بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ جنگ ختم ہو گئی۔

جمہوریت ایک طرز حکومت، یہ اصطلاح ترکی میں اٹھارویں صدی میں عربی لفظ جمہور سے وضع کی گئی ہے۔ جس کے معنی آدمیوں کا مجموعہ۔ مجمع عام یا عام طور پر سارے لوگ مراد لئے جاتے ہیں۔

جمہوریت کی اصطلاح پہلی مرتبہ فرانسیسی جمہوریہ کے بارے میں استعمال ہوئی۔ جمہور کے مفہوم میں لوگوں کی اکثریت مراد ہے فقہ میں یہ لفظ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جمہور علماء سے مراد علما کی اکثریت ہے۔

الماوردی کے قول کے مطابق اسلامی ریاست کے رئیس کے لئے اہل حل و عقد کا اتفاق ضروری ہے مگر اسلامی ریاست کو قدیم ادب میں جمہوریت کبھی نے نہیں کہا۔

جمہوریت کی اصطلاح مغربی افکار و علوم کی اشاعت کے بعد عام ہوئی۔ اور مسلمانوں کے ادب میں جمہوریت کا جدید مغربی تصور اس سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں اسلامی ریاست کے جمہوری اور غیر جمہوری ہونے کی بحث بھی پیدا ہوئی۔

چنانچہ یہ بحثیں بھی پیدا ہوئیں کہ اسلامی ریاست کو مغربی طرز کی جمہوریت کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ نیز خلفائے راشدین کی حکومت جمہوریت کے جدید مفہوم کے مطابق

Marfat.com

کس حد تک جمہوری حق یا نہیں۔

بہت سے علماء نے اسے جمہوریت کہنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں مغربی جمہوریت کے وہ اصول بھی شامل ہو سکتے ہیں جنہیں اسلامی تصورات سے مطابقت نہیں ——

تحقیق کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی تصور ریاست بعض امور میں جدید جمہوری نظریے سے مماثلت رکھتا ہے اور بعض میں اس سے مختلف ہے۔ —

اسلام کو جمہوریت کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلا سے کچھ زیادہ ہی شدومد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہیئے اور قانون کی حکمرانی کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جاننے اور اس کو مؤثر بنانے کے لئے جو نظام اور ڈھانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں۔ اسلام تو مغربی جمہوریت کی مندرجہ ذیل باتوں سے اختلاف کرتا ہے۔

اسلام حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے۔ اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے۔ بنیادی قانون قرآن و سنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر سو فیصد افراد بھی قانون خداوندی کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اس کا اختیار نہیں۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے۔ یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے ان میں عوام اور ان کے نمائندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی و عمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے۔ ان میں تفصیلات طے کریں۔ اس طرح جمہور کی قانون سازی کے اختیار مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے حدود و اختیار کا تعین پیش کرتا ہے۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے۔ جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں جب کہ اسلام کے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور مسلمان اپنے معاملات اس کے مطابق طے کرتے ہیں۔

جمہوریت میں ہر لحظہ مخاصمت اور پارٹی بازی کی جو فضا برقرار رہتی ہے۔ اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے۔

"نیکی اور تقوے کے معاملات میں تعاون کرو اور برائی اور گناہ کے امور میں ہرگز تعاون نہ کرو۔" (۲:۵)

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

اسلام اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لئے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیئے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں آنحضورؐ کا ارشاد مبارک ہے۔

"بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔" (بخاری و مسلم)

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود حکومت کے کسی عہدہ منصب کا طالب ہو۔" (ابوداؤد)

اسی طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب اختیار کے لیے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی۔

جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ جبکہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالمگیر ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ہمارے سامنے اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یعنی اس کا شورائی کردار اور جمہوری کردار آ جاتا ہے اور یہیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی ریاست اور مغربی طرز کی جمہوریت سے کن باتوں میں مختلف ہے۔

دراصل مغربی جمہوریت صرف شورائیت ہی نہیں اس کے جدید تصورات ایک سے زیادہ اور پیچ در پیچ ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مقالہ نگار کے مطابق ڈیموکریسی جس کا جدید اردو، عربی اور ترکی ادب میں ترجمہ "جمہوریت" کیا گیا ہے "ایک ایسی طرز حکومت ہے جسے اپنے ہی لوگ چلا رہے ہوں اور جدید ترعمل کی رو سے آزاد انتخابی اور نمائندہ اداروں کے انتظام میں ہو اور اس کی ہیئت حاکمہ قوم کے سامنے جواب دہ ہو۔" مقالہ نگار مزید لکھتا ہے۔ "یہ ایک اسلوب حیات بھی ہے۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام افراد برابر ہیں اور ہر فرد کو زندہ رہنے کا برابر حق حاصل ہے اسی طرح ہر فرد کی آزادی مسلم ہو۔ اپنی زندگی خوشگوار بنانے میں ہر شخص آزاد ہو لیکن ان عقیدوں کے پس منظر میں اور ان کے نتیجے میں صدہا تصورات ایسے بھی ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف پائے جاتے ہیں۔

اسلامی ریاست جہاں مغربی جمہوریت کے بعض پہلوؤں سے مماثلت رکھتی ہے وہاں وہ جمہوریت سے کئی لحاظ سے مختلف بھی ہے۔ اور اپنا مخصوص مزاج اور اپنی مخصوص شعوریات کی حامل ہے جس میں اسلام کے باقی احکامات کی طرح اعتدال وسط پسندی اور امتزاج عناصر کی صفات موجود ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تمدنی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ تصور افراط و تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے بنی نوع انسانی کے مصالح کی بہتر کفالت کر سکتا ہے۔

جو علماء اسلامی ریاست کو جمہوریت کہنا مناسب خیال نہیں کرتے وہ اپنے نظریے کے حق میں مندرجہ ذیل دلائل دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی ریاست نیابت الٰہی ہے وہ ایک طرف زمین پر خدا کی نیابت کرتی ہے تو دوسری طرف خدا کے بندوں کی۔

۲۔ اسلامی ریاست کا دستور اساسی وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ چنانچہ بنیادی قوانین قرآن و سنت نے مہیا کر دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے بنیادی قوانین کی حد تک یہ حکومت قانون سازی نہیں کر سکتی۔ البتہ جن معاملات میں قرآن و سنت خاموش ہیں اور معاملہ محض کاروباری اور تمدنی ہے۔ ہیئت حاکمہ (امیر یا امام) یا شوریٰ قیاس و اجماع کے ذریعے قانون بنا سکتی ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست میں شوریٰ کے طریقے حالات کے تحت مختلف ہو سکتے ہیں جیسا کہ خلافت راشدہ کے تجربوں سے معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ اسلامی ریاست میں امیر یا امام مستقل ہوتا ہے لیکن اصولاً مستقل اس لئے نہیں کہ اسے شرعی اسباب کی بنا پر عدم اعتماد کی وجہ سے معزول بھی کیا جا سکتا ہے

۵۔ اسلامی ریاست میں امام اہل العقد والحل کی رائے پر عمل کرتا ہے۔ لیکن

Marfat.com

امام ان کی رائے کو مسترد کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔

٦۔ امام اکثریت کے فیصلے کا پابند نہیں لیکن اکثریت کے فیصلے کو شرعی جواز کے بغیر مسترد نہیں کر سکتا اسے اپنے مؤقف کے بارے میں دلائل دینا پڑتے ہیں۔

٧۔ اسلامی ریاست مساوات کے سلسلے کا کامل نمونہ ہے۔ مغربی تصور مساوات کے مقابلے میں ارفع، اکمل اور معقول تر ہے۔

٨۔ اسلامی ریاست میں شریعت کے تابع آزادی رائے اور آزادی عمل کا اصول موجود ہے۔ لیکن یہ آزادی بنیادی عقائد اسلامی کے خلاف استعمال نہیں کی جا سکتی۔

٩۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلامی ریاست کے بنیادی تقاضوں سے متفق ہو کر شہری حد تک ان کی تکمیل میں متفق و متحد ہوں۔

جمیل بن نخلۃ المدوّر (١٢٧٩ھ/١٨٦٢ء - ١٣٢٥ھ/٢٦ جنوری ١٩٠٧ء) ایک عرب صحافی اور ادیب۔ المدور تخلص تھا بیروت میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک علمی گھرانے میں پرورش پائی۔ یہی وجہ اس کے ادیبانہ رجحانات کو ترقی دینے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی۔

اس نے نہ صرف عربی علوم کی تحصیل کی بلکہ بیروت یونیورسٹی میں فرانسیسی زبان و ادب کی تعلیم بھی پائی۔ لیکن جلد ہی اس کا میلان تاریخ میں مشرق قدیم کی اقوام کے مطالعے کی طرف ہو گیا۔ وہ بہت سے رسالوں کا مدیر رہا۔ ان رسائل میں "الجنان" اور "المقتطف" اور ایک بین الاقوامی اخبار "المؤید" شامل ہیں۔

اس کا انتقال قاہرہ میں ہوا۔ اس کی تصانیف میں "حضارۃ الاسلام فی دار السلام" بہت مشہور و معروف ہے۔ اس کتاب کا شمار جدید عربی فکر کی ایک دستاویز کی حیثیت سے موجودہ دور کی اہم ترین تصانیف میں کیا جا سکتا ہے "حضارۃ الاسلام" میں بنو عباس کے خلیفہ المنصور سے لے کر ہارون الرشید تک کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں قدیم اسلامی تاریخ اور ثقافت کے حوالے بھی آ گئے ہیں۔

اس کی ایک اور تصنیف "تاریخ بابل و آشور" ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور تصنیف "کتاب التاریخ القدیم" ہے۔

جن چھپے ہوئے، پوشیدہ۔ جس لفظ میں جیم اور نون کا مادہ ہوگا اس میں پوشیدگی و استتار ملحوظ ہوگا۔ مثلاً جنت (کیونکہ وہ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے) اس لیے جنت کہلاتی ہے۔ جنون کیونکہ عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

جنین پیٹ والے بچے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ماں کی رحم میں پوشیدہ ہوتا ہے جنان کا اطلاق دل پر اس لیے کرتے ہیں کہ وہ پوشیدہ اور اس کے خیالات چھپے ہوتے ہیں۔ جُنّۃ، ڈھال کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی آڑ میں چھپا لیتی ہے۔ چنانچہ جن اللہ کی اس مخلوق پر بولا جاتا ہے جو لطافت مادہ کے سبب حس بصر (دیکھنے کی قوت) سے پوشیدہ رہتی ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں جن ایک غیر مرئی مخلوق ہے۔ بعض کے نزدیک ملائکہ بھی جنوں میں شامل ہیں۔ بعض کے نزدیک تمام ملائکہ جن ہیں۔ لیکن تمام جن ملائکہ نہیں ہیں جنوں کی تخلیق کس طرح ہوئی؟ ان کی کیا حقیقت ہے۔ اس بارے میں مفسرین نے قرآن مجید کی ان آیات کی بناء پر جن میں یہ لفظ آیا ہے۔ اس مخلوق کے بارے میں بہت سے تصورات قائم کیے ہیں۔

امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: "یہ بخار یا آگ سے بنے ہوئے ذوی العقول ہمارے حواس سے غیر محسوس، مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے والے اور عظیم و دشوار کاموں کے انجام دینے کے قابل اجسام ہیں۔" اور ان کے ساتھ کی دوسری ذوی العقول ہستیوں کو نور اور مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ جن نجات ابدی حاصل کر سکتے ہیں، وہ مزید لکھتے ہیں۔ "آنحضورؐ ان کے لیے بھی اسی طرح مبعوث ہوئے ہیں جیسے بنی نوع انسان کے لیے ان میں سے کچھ جنت میں داخل ہوں گے اور کچھ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔"

اسلامی عقائد میں جن کا وجود متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ آج بھی قائم ہے۔ حتیٰ کہ معتزلہ میں سے بھی صرف چند ہی نے ان کے وجود میں شک کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے بھی ان کے متعلق مختلف نظریات قائم کیے ہیں۔

مولانا مودودی اپنی تفسیر میں "وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ" کے ضمن میں رقمطراز ہیں۔

"نار سے مراد ایک خاص نوعیت کی آگ ہے نہ کہ وہ آگ جو لکڑی یا کوئلہ جلانے سے پیدا ہوتی ہے اور مارج کے معنی ہیں خالص شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔ جس طرح پہلا انسان مٹی سے بنایا گیا پھر تخلیق کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے اس کا بُت خاکی نے گوشت۔ کے زندہ بشر کی شکل اختیار کی اور آگے اس کی نسل نطفہ سے چلی اسی طرح پہلا جن خالص آگ کے شعلے، یا آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا گیا اور بعد میں اس کی ذریت سے جنوں کی نسل پیدا ہوئی۔ ان کا وجود بھی اصلاً ایک آتشیں وجود ہی ہے لیکن جس طرح ہم محض تودہ خاک نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ بھی محض شعلہ آتش نہیں ہیں۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جن مجرد روح نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خاص نوعیت کے مادی جسم ہی ہیں۔ اسی چیز کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔ "شیطان اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے جہاں تم اس کو نہیں دیکھتے۔" (٧، ٢٧) اسی طرح جنوں کا سریع الحرکت ہونا ان کا بہ آسانی مختلف شکلیں اختیار کر لینا اور ان مقامات پر غیر محسوس طریقے سے نفوذ کر جانا جہاں خاکی اجزاء سے بنی ہوئی چیزیں نفوذ نہیں کرتی ہیں ان کا نفوذ محسوس ہو جاتا ہے۔ یہ سب امور بھی اسی وجہ سے ممکن اور ناقابل فہم ہیں کہ وہ فی الاصل آتشیں مخلوق ہیں۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جن نہ صرف انسان سے بالکل الگ نوعیت کی مخلوق ہیں بلکہ ان کا مادہ تخلیق ہی انسان، حیوان، نباتات اور جمادات سے قطعی مختلف ہے۔"

جن بھی انسانوں کی طرح ایک فنا ہو جانے والی مخلوق ہیں۔ نیز انسانوں کی طرح جنات بھی ایک ذی اختیار مخلوق ہیں۔ یعنی انہیں بھی انسانوں کی طرح خیر و شر میں انتخاب کی آزادی ہے۔ اور جزا و سزا کے مکلف ہیں۔

جن اگرچہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں۔ مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں اور ملاء اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے سن گن لیں تو شہاب ثاقب ان کو مار بھگاتے ہیں۔

مشرکین عرب کا خیال تھا کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں یا خدائی اسرار تک انہیں کوئی رسائی حاصل ہے۔ اسی طرح وہ انہیں خدا کا شریک ٹھہراتے تھے۔ ان کی عبادت کرتے تھے اور ان کا نسب خدا سے ملاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے ان عقائد

Marfat.com

کی تردید کی ہے۔

"پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔" (۳۴ : ۱۴)

عربوں میں جنات کے لئے ان کے اوصاف کی بنا پر چند نام دیئے جاتے تھے

۱۔ عامر (ہمزاد) جو جن آدمیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

۲۔ ارواح :۔ جو لڑکے بالوں کو ستاتے ہیں۔ (اہل ہند انہیں بھوت یا آسیب کہتے ہیں۔)

۳۔ شیطان :۔ جو خبیث اور سخت تکلیف دینے والے ہوتے ہیں۔

۴۔ مارد :۔ جو شیطانوں سے بھی زیادہ سرکش ہوتے ہیں۔

۵۔ عفریت :۔ یہ مارد سے زیادہ قوی ہوتے تھے۔

۶۔ ہاتف :۔ جنگلوں میں چیخنے چلانے اور آواز دینے والوں کو کہتے ہیں۔

۷۔ رجال الغیب :۔ یہ مسافروں کو راہ بھلا دیتے ہیں۔

۸۔ شہابہ :۔ یہ بیابانوں میں کبھی ایک لشکر اور مشعل وغیرہ سے چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔

۹۔ چھلاوہ :۔ رات میں اور بعض اوقات دن میں اجاڑ جنگلوں میں کبھی چھوٹے چھوٹے لڑکوں کی صورت میں دکھلائی دیتے ہیں اور پھر دفعتاً کسی اور شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ جنوں کا ایک گروہ آنحضورؐ سے قرآن سن کر ایمان لایا تھا اور اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ کرتا تھا۔

"(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے۔) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے انہوں نے جا کر کہا "اے ہماری قوم کے لوگو ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی۔ رہنمائی کرتی ہے حق ہے اور راہ راست کی طرف اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو۔ اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔ اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا۔" (۴۶ : ۲۹ تا ۳۱)

معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے کہ معظمہ میں کم از کم چھ وفود آئے تھے۔

جن مسلم اور کافر دونوں قسم کے ہیں۔ کافر جن زیادہ شریر اور مشکل سے قابو میں آنے والے سمجھے جاتے ہیں۔

جنات میں نر اور مادہ دونوں صفتیں موجود ہیں اور یہ اکٹھے مل کر رہتے ہیں۔ جیسا کہ امام مالک کے فتوے سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اہل یمن نے ان سے ایک فتویٰ معلوم کیا تھا کہ ایک جن مرد ایک انسان عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے امام مالک نے اس کے جواب میں کہا کہ اس میں کوئی برائی تو نہیں لیکن مجھے یہ ناپسند ہے کہ ایک عورت حاملہ پائی جائے تو وہ کہہ دے کہ یہ حمل جن کی طرف سے ہے۔ اور اسلام میں فتنہ بڑھے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جنات کی سرگرمیاں رات کے وقت ہوتی ہیں اور صبح جیسے ہی مرغ پہلی بار بانگ دیتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

کیا جن جنت میں جائیں گے اور کیا جنوں کو ثواب ملے گا۔ اس سوال کے جواب میں امام ابو حنیفہ سے تین قول ثابت ہیں۔

پہلا قول تو یہ ہے کہ ان کے لئے کوئی ثواب نہیں سوائے اس کے کہ وہ آگ سے نجات پائیں گے اور پھر انہیں حکم ہوگا کہ دوسرے حیوانات کی طرح مٹی ہو جائیں اور وہ نیست ہو جائیں گے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جن بھی اہل جنت میں سے ہوں گے۔ مگر دخول جنت سے بڑھ کر انہیں کوئی ثواب نہ ملے گا۔

تیسرا قول توقف کا ہے کہ گو جنوں کے عذاب اور آگ میں جانے کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مگر ان کے بہشت میں جانے کا کوئی ذکر نہیں نہ ان نعما کے حاصل کرنے میں ان کا ذکر ہے جو اہل جنت کے لئے ہیں۔

امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے کہ جنوں کو طاعت پر ثواب ملے گا اور وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

جن، سورۃ :۔ قرآن مجید کی ۷۲ ویں سورۃ (دیکھئے۔ "الجن، سورۃ")

جنابت

جنابت حدث کبیر دوری بے گانگی، شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ نجاست ہے جو قضاء شہوت سے یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو جنب کہتے ہیں۔ ایسا شخص صرف غسل سے یا بامر مجبوری تیمم ہی کے ذریعے پاک ہو سکتا ہے۔

جنبی شخص کے لئے نہ تو نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور نہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر سکتا ہے۔ نہ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے۔ (مگر مجبوری کی حالت میں جائز ہے) اور نہ قرآن پاک کو چھو سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

"اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک کہ غسل نہ کر لو۔ الا یہ کہ راستہ سے گذرتے ہو۔" (۴ : ۴۳)

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سے فقہا اور مفسرین میں سے ایک گروہ نے یہ مراد لی ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیئے۔ الا یہ کہ کسی کام کے لئے مسجد میں سے گذرنا ہو۔

بعض دوسرے حضرات نے اس سے مراد سفر لیا ہے یعنی اگر آدمی حالت سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے تو تیمم کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک جنبی وضو کر کے مسجد میں بیٹھ سکتا ہے۔ اس رائے کو حضرت علیؓ، ابن عباس، سعید بن جبیر نے اختیار کیا ہے۔ اس بارے میں تقریباً تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالت سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔

جنابت سے متعلق قرآن میں ایک اور مقام پر آیا ہے۔

"اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو۔" (۵ : ۶)

Marfat.com

جنابی، ابوسعید (؟ — ۳۰۱ھ/۹۱۳ء) مشرقی عرب میں قرامطہ کے اقتدار کا بانی۔ حسن بن بہرام۔ جنابہ میں پیدا ہوا جو فارس کا ساحلی قصبہ تھا۔ بائیں پاؤں سے لنگڑا تھا۔ بصرے میں آٹے کی سوداگری کرتا تھا۔ اس نے قرامطی ہونے کی وجہ سے جنوبی ایران میں داعی کے فرائض انجام دیئے۔ یہاں پر اسے حکومت کے خوف سے چھپ کر رہنا پڑتا تھا۔ بعد میں اسے بحرین خاص میں بھیجا گیا۔ جہاں اس نے ایک بڑے گھرانے میں شادی کرلی۔ یہاں پر اس کے مریدین میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

اس نے ۲۸۶ھ/۸۹۹ء میں بحرین کے ایک بڑے حصے کو اپنے زیر تسلط کرلیا۔ قطیف پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔

۲۸۷ھ/۹۰۰ء اس کے مددگار بحرین کے صدر مقام ہجر کے قریب بڑی تعداد میں جمع ہوکر بصرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خلیفہ المعتضد نے اس کے مقابلے کے لیے دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بھیجا۔ ابوسعید کے لوگوں نے اس لشکر کو بری طرح شکست دی اور تقریباً ۲۹۰ھ/۹۰۳ء میں ابوسعید نے طویل محاصرے اور شہر کا پانی بند کر دینے کے بعد ہجر پر قبضہ کرلیا۔ بعد میں یمامہ پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے عمان پر حملہ کر دیا۔ ۳۰۰ھ/۹۱۳ء میں اس کی فوجوں نے ایک بار پھر بصرے کے ضلع پر حملہ کر دیا۔ لیکن ایک غلام نے اسے کئی دوسرے سرداروں سمیت قتل کر دیا۔

اس کے مرنے کے بعد اس کے سات بیٹوں میں سے سعید تخت نشین ہوا پھر چند سال بعد ابوطاہر جو اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا تخت پر بیٹھا۔

ابوسعید کے مرنے کے بعد اس کی عزت و تکریم بہت زیادہ کی جانے لگی۔ اس کے بارے میں اس کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آئے گا۔ اور اسی خیال کے سبب اس کے مقبرے کے دروازے پر ایک گھوڑا جس پر زین کسا ہوتا تھا ہر وقت تیار کھڑا رہتا تھا۔

بحرین کے قرامطہ نے اسی کے نام پر اپنا نام ابوسعیدی رکھا۔ اور بعد میں یہاں کی جمہوریہ کا جو دستور بنا اس کو بھی ابوسعید کے نام ہی سے موسوم کیا گیا۔

جنابی، ابوطاہر (رمضان ۲۹۴ھ/جون ۹۰۷ء) بحرین کا حکمران — سلیمان ابن ابوسعید۔ بحرین کی ریاست کے مشہور ترین حکمرانوں میں سے تھا۔ یہ کچھ عرصے تک حجاج اور زیریں عراق کے باشندگان کے لیے خطرہ بنا رہا۔ ابوطاہر ان قرامطہ کا جو ۳۱۱ھ/۹۲۳ء شبخون مار کر بصرے میں گھس گئے تھے سردار تھا۔

۳۰۵ھ/۹۱۷ء میں اس کے بڑے بھائی سعید کو معزول کر کے بقول ابن خلدون عبیداللہ فاطمی کے فرمان کے مطابق اسے حاکم بنا دیا گیا تھا۔

۳۱۱ھ/۹۲۳ء میں بصرے پر حملہ ہوا اسی سال کے آخر میں ابوطاہر نے حجاج کے قافلے پر جو مکہ معظمہ سے الہبیر واپس آرہا تھا حملہ کر دیا۔ امیر قافلہ گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اسے اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا۔

اسی موقع پر ابوطاہر نے اپنے ایک قاصد کو بغداد بھیج کر اس کے ذریعے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ بصرہ، اھواز اور کچھ اور علاقے قرامطہ کو دیئے جائیں۔ جب اس کا یہ مطالبہ رد کر دیا گیا تو اس نے ۳۱۲ھ/۹۲۴-۹۲۵ء میں حجاج پر دوبارہ حملہ کر دیا اور کوفے کو لوٹا۔ خلیفہ نے اس کے خلاف یوسف ابی الساج کو ایک بڑی فوج دے کر بھیجا لیکن یوسف گرفتار ہوگیا۔

ابوطاہر دریائے فرات کے کنارے بڑھتے ہوئے انبار جا پہنچا اور وہاں سے دریا پار کر کے بغداد پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔ یہاں سے ناکام ہو کر ابوطاہر نے شمال کی طرف رُخ کیا اور راحبہ، قرقیسیا اور رقہ پہنچ کر وہاں کے باشندوں سے زر فدیہ وصول کیا۔ ۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں واپس بحرین پہنچا اور یہاں پر الاحساء کے قریب جو اس کا دار الحکومت تھا ایک "المومنیہ" نام سے ایک دار الہجرۃ تعمیر کرایا۔

۷ ذوالحجہ ۳۱۷ھ/۱۱ جنوری ۹۳۰ء کو ابوطاہر نے اس وقت جب حجاج جمع تھے۔ مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ اس نے مسجد حرام میں حجاج کا قتل عام کرایا اور خانہ کعبہ کی تمام قیمتی اشیاء لوٹ لیں۔ اور مسلسل سات روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ واپسی میں حجر اسود نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔

۳۱۸ھ/۹۳۰ء میں اس کا عمان پر قبضہ ہوگیا۔ ۳۱۹ھ/۹۳۱ء میں اس نے عراق کو فتح کرنے کی دوبارہ کوشش کی لیکن کوفے سے آگے اس کی رسائی نہ ہوسکی اور قرامطہ تقریباً پچیس روز تک کوفے میں لوٹ مچائی کرتے رہے۔

ان حالات میں حج کرنا چونکہ ناممکن ہوگیا تھا۔ اس لیے خلیفہ الراضی کے رئیس الحجاب محمد بن یاقوت نے ۳۲۲ھ/۹۳۴ء میں ابوطاہر سے گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ خلیفہ کا اقتدار تسلیم کرے اور حجاج سے تعرض کرنا چھوڑ دے نیز حجر اسود کو اس کے مقام پر واپس کر دے۔ اور اس کے بدلے میں ان علاقوں کی حکومت جو اس نے فتح کر لئے ہیں باضابطہ طور پر سند دے دی جائے گی۔ اگرچہ ابوطاہر نے سوائے حجر اسود کی واپسی کے تمام باتیں منظور کرلیں لیکن ۳۲۳ھ/۹۳۵ء میں اس نے دوبارہ حجاج پر حملہ کیا خلیفہ نے فوجی دستوں کو کوفے اور قادسیہ کے درمیان شکست دی اور بحرین واپس آنے سے پہلے کچھ عرصہ کے لیے کوفے پر قابض رہا۔

۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں بالآخر کوفے کے ایک علوی کے ذریعے ابوطاہر اور خلیفہ کے درمیان یہ بات طے پائی کہ حج دوبارہ جاری ہوسکتا ہے لیکن ۲۵ ہزار یا ایک لاکھ بیس ہزار دینار بطور خراج اور راستے کی حفاظت کے لیے محصول ادا ہوتا رہے چنانچہ یہ رقم قرامطہ حجاج سے باقاعدہ وصول کرتے رہے لیکن عراق کے جنوبی حصے میں ان کے حملے ختم نہیں ہوئے۔

ابوطاہر نے اڑتیس سال کی عمر میں چیچک کے عارضہ سے انتقال کیا۔

جنابی، ابومحمد ایک مورخ مصطفےٰ ابن حسن بن سنان الحسینی الہاشمی، امیہ (اماسیہ) کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا کئی ایک شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کئی ایک شہروں میں معلم کے فرائض انجام دیتا رہا۔ کچھ عرصے کے لیے حلب میں قاضی کے عہدے پر بھی فائز رہا۔

اس کی شہرت ایک تاریخی کتاب کے لکھنے سے ہوئی۔ جو اس نے دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں عربی زبان میں تاریخ کے موضوع پر لکھی تھی۔ اس

Marfat.com

کتاب کا نام "العلیم الزاخر فی احوال الاوائل والاواخر" یہ کتاب عام طور پر تاریخ الجنابی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کتاب کے بیاسی باب ہیں اور ہر باب میں ایک مسلمان حکمران خاندان کا بیان ہے۔

جنابی نے خود ہی اس کا عربی سے ترکی زبان میں ترجمہ اور خلاصہ تیار کیا تھا۔

جناح، محمد علی :- بانی پاکستان۔ (دیکھیے "قائد اعظم")

جَناحیہ ایک گروہ جنہیں الطیاریہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حضرت جعفر بن ابوطالب کے پرپوتے عبداللہ بن معاویہ کے خاص طرفدار تھے۔ اگرچہ یہ خاندان اہل تشیع حضرات کی نظروں میں حضرت جعفر ان کے بیٹے اور ان کے پوتے بہت محترم اور قابل عزت ہیں۔ لیکن اس خاندان سے کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت وابستہ نہیں ہوئی تھی۔ ۱۲۷ھ/۷۴۴ء میں عبداللہ بن معاویہ بنو امیہ کے خلاف شیعوں کی ایک عام بغاوت میں ان کی قیادت سنبھالی۔

اگرچہ عبداللہ بن معاویہ کی وسیع جماعت میں کچھ عرصہ تک شیعہ حضرات بھی شریک رہے۔ اور وہ سیاسی طور پر بڑے سرگرم عمل تھے۔ اور کچھ خوارج بھی تھے لیکن جناحیہ اور الطیاریہ کے لفظ کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے۔ جن کی امامت کے واحد حقدار عبداللہ بن معاویہ تھے۔ اس جماعت کے لوگوں کے دعوے کے مطابق ابو ہاشم بن محمد بن الحنفیہ نے امامت بنو عباس کی بجائے عبداللہ بن معاویہ کے حوالے کی تھی جو اس موقع پر نہایت کم سن تھے۔ اور ان کی دیکھ بھال صالح بن مدرک کے سپرد تھی۔

ان لوگوں کے نزدیک امام علم غیب رکھتا ہے۔ نیز جو امام کو پہچانتا ہے وہ باقی فرائض سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن معاویہ کے انتقال کے بعد بعض جناحیہ کا یہ دعوے تھا کہ وہ اصفہان کے پہاڑوں میں چلے گئے ہیں اور کسی علوی کو حکومت دلانے کے لیے واپس آئیں گے۔ بعض جناحیہ نے اسحاق بن الحارث کو اپنا امام مان لیا تھا

جنازہ جنز کے معنی چھپایا، ڈھانپا، چارپائی پر ڈالی ہوئی نعش، میت تابوت یا میت مع تابوت۔

مردے کو کفنانے کے بعد چارپائی پر یا جو چیز چارپائی کے مثل ہو اس پر ڈال کر اس طرح سے کھینا کہ اس کے چاروں کونے چار مرد کاندھوں پر رکھ کر لے چلیں سنت ہے لیکن اگر اٹھانے والوں کی تعداد کم ہو تو جتنے بھی جنازہ اٹھا کر چلیں جائز ہے

جس وقت جنازہ لے کر چلیں تو مستحب ہے کہ پہلے دس دس قدم چاروں طرف سے لیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب جنازہ اٹھالیں تو ایک شخص اٹھانے والوں میں سے اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلے پھر اسی سمت سرہانے سے پاؤں کی طرف دائیں کندھے پر ہی رکھ کر دس قدم چلے۔ اس کے بعد بائیں کندھے پر جنازے کی دوسری طرف سرہانے کی طرف دس قدم لے کر چلے۔ اور پھر اسی طرف میت کے پاؤں والی سمت بائیں کندھے پر دس قدم لے کر چلے۔ یہ کل چالیس قدم بنتے ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان چالیس قدموں کے عوض چالیس گناہ کبیرہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ جنازے کو باری باری ایک دوسرا اپنے کندھے پر لیتا ہوا چلے جنازہ لے کر چلتے ہوئے جلد چلنا چاہیے لیکن اس قدر تیز نہیں چلنا چاہیے کہ دوڑنے کا گمان ہو اور جنازے کو حرکت اور تکلیف پہنچے۔

جنازے کے پیچھے چلنا بہتر ہے آگے چلنا بھی جائز ہے۔ بہت آگے پیچھے نہیں چلنا چاہیے بلکہ قریب قریب چلنا چاہیئے۔ جنازے کے ساتھ ساتھ چلنے والے اپنے دلوں میں خدا کا خوف کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں اور موت کو یاد کرتے غمناک صورتیں بنا کر دل میں گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے چلیں اور دنیا کی باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے چلیں جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کلمہ، درود یا قرآن مجید یا کوئی اور ذکر الٰہی اونچی آواز سے پکار کر پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

جنازے کے ساتھ چلتے وقت سواری پر سوار ہو کر چلنا خلاف حرمت ہے۔ اگر کوئی شخص بمجبوری اور سوار ہو کر چلے تو اسے جنازے کے پیچھے چلنا چاہیئے۔ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور ایک جنازے کی مشائعت میں نکلے آپ نے کچھ لوگوں کو سوار دیکھ کر فرمایا "کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ خدا کے فرشتے تو پاپیادہ چلتے جاتے ہیں اور تم چوپاؤں کی پیٹھ پر چڑھے جا رہے ہو۔ (ترمذی)

جنازہ، نماز میت کی نماز، اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ جنازے کی نماز فرض کفایہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے انکار کرے تو کافر ہو جائے گا۔ اور ایک مسلمان نے بھی نماز پڑھ لی تو سب چھوٹ جائیں گے

ابن مسعود سے روایت ہے کہ نماز جنازہ کا نہ کوئی وقت معین ہے نہ اس کی تکبیرات کی خاص تعداد مقرر ہے۔ "اوسط" میں ہے کہ آپ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات تکبیریں بھی کہی ہیں اور پانچ بھی اور چار بھی۔ لہٰذا جب تم کسی کو امام جنازہ بناؤ تو جتنی تکبیریں وہ کہے تم بھی کہو۔ (انتخاب حدیث از جعفر شاہ)

نماز جنازہ کی صحت کی نو شرطیں ہیں۔

۱۔ مسلمان ہونا میت کا اور نماز پڑھنے والے کا۔ ۲۔ میت اور مصلی (نمازی) کا پاک ہونا جنابت اور بے وضو ہونے سے اور تمام ناپاک چیزوں سے اگر جنازہ کی نماز با جماعت پڑھیں تو فقط امام اور میت کی طہارت شرط ہے۔

۳۔ میت اور مصلی کا لباس پاک ہونا چاہیئے۔ ۴۔ میت اور نمازی کا پاک ہونا۔ ۵۔ میت اور مصلی کا ستر عورت چھپانا۔ ۶۔ میت کا زمین یا اس چیز پر رکھنا جو شرع میں زمین کے مثل ہو۔ نمازی کے روبرو۔ ۷۔ امام کا بالغ ہونا۔ ۸۔ کھڑا ہونا نماز پڑھنے والے کا قبلہ کے رخ۔ ۹۔ نیت کرنا مصلی کی نماز کے خاص واسطے اللہ تعالیٰ کے دعا واسطے اس میت کے۔

مصلی اس طرح کہے نیت کرتا ہوں چار تکبیر نماز جنازہ واسطے اللہ کے درود واسطے رسول اللہ ہے۔ دعا واسطے اس میت کے منہ طرف قبلہ شریف کے اور اگر مقتدی ہو تو یہ بھی کہے پیچھے اس امام کے اللہ اکبر۔ جنازے کی نماز کے دو ارکان ہیں ۱۔ چار تکبیریں کہنا۔ ۲۔ نماز میں کھڑا ہونا ترکیب نماز یہ ہے۔

نیت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ثنا پڑھے۔

سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ ط

پاک ہے تو اے اللہ اور ساتھ تعریف اپنی کے اور برکت والا ہے تیرا نام اور بلند ہے۔ شان تیری اور تیری تعریف بڑی ہے اور نہیں ہے معبود سوائے تیرے۔

پھر دوسری تکبیر پڑھے اور آنحضور پر درود شریف پڑھے جو درود بھی یاد ہو پڑھ لے مثلاً اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ وَسَلَّمْتَ وَبَارَكْتَ وَرَحِمْتَ وَتَرَحَّمْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ

حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ؕ

الٰہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آل پر رحمت بھیج۔ جس طرح تو نے رحمت بھیجی اور سلام بھیجا اور برکت دی اور مہربانی کی اور رحم کیا، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی آل پر، بے شک تو تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔

پھر تیسری تکبیر کہے اور دعا پڑھے اس نماز میں کوئی دعا مقرر نہیں۔ جو دعا یاد ہو پڑھ لے لیکن جو دعا حدیث شریف میں آئی ہے اس کا پڑھنا افضل ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثَانَا، اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ ؕ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ ؕ

اے اللہ بخش ہمارے زندہ کو اور ہمارے مردہ کو اور ہمارے حاضر کو، اور ہمارے غائب کو اور ہمارے چھوٹے کو اور ہمارے بڑے کو اور ہمارے مرد اور عورت کو، اے اللہ جس کو زندہ رکھے تو ہم میں سے پس زندہ رکھ اس کو اوپر اسلام کے، اور جس کو فوت کرے تو ہم میں سے پس فوت کر اس کو اوپر ایمان کے۔

اگر میت نابالغ اور مجنون کی ہو جو عبادت کے مکلف نہیں تو نابالغ لڑکے کے لیے اور مجنون مرد کے لیے یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا فَرَطًا وَّاجْعَلْہُ لَنَا اَجْرًا وَّذُخْرًا وَّاجْعَلْہُ لَنَا شَافِعًا وَّمُشَفَّعًا ؕ

اے اللہ بنا اس کو واسطے ہمارے پیش رو اور بنا اس کو واسطے ہمارے اجر اور ذخیرہ اور اس کو واسطے ہمارے سفارش کرنے والا اور اس کی سفارش قبول فرما۔

نابالغ لڑکی اور مجنون عورت کے لیے یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا لَنَا فَرَطًا وَّاجْعَلْھَا لَنَا اَجْرًا وَّذُخْرًا وَّاجْعَلْھَا لَنَا شَافِعَۃً وَّمُشَفَّعَۃً ؕ

اے اللہ بنا اس کو واسطے ہمارے پیش رو اور بنا اس کو واسطے ہمارے اجر اور ذخیرہ اور بنا اس کو واسطے ہمارے سفارش کرنے والی اور اس کی سفارش قبول فرما۔

پھر دعا پڑھنے کے بعد چوتھی تکبیر کہہ کر دائیں طرف منہ پھیر کر السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہے اور پھر بائیں طرف منہ پھیر کر یہی کلمہ کہے۔

پہلی تکبیر میں کانوں تک ہاتھ اٹھانا ضروری ہے باقی تکبیروں کے دوران میں ہاتھ اٹھانا موافق مذہب مختار کے درست نہیں۔

نماز میں میت کے سینے کے برابر امام کا کھڑا ہونا مستحب ہے۔ نیز نماز میں تین صفیں بنانا مستحب ہیں اگر سات آدمی ہوں تب بھی تین صفیں بنانی چاہئیں۔ کیونکہ آنحضور کا فرمان ہے۔ "جس شخص پر تین صف آدمیوں نے نماز پڑھی تو اللہ تعالےٰ اس کو بخش دے گا۔"

نماز جنازہ میں برخلاف دوسری نمازوں کے سب سے پچھلی صف میں کھڑا ہونے کا ثواب بہت زیادہ ہے۔

اگر بہت سے جنازے اکٹھے ہوں تو ہر جنازے کی علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ اگر اکٹھی نماز پڑھ لیں تو بھی جائز ہے۔

اگر جنازوں میں مرد عورتیں اور نابالغ سب جمع ہوں تو مردوں کو سب سے پہلے رکھیں خواہ آزاد ہوں یا غلام۔ اس کے بعد نابالغوں کو رکھیں اور ان کے بعد عورتوں کو رکھیں۔

جناونی، ابو عبیدہ جبل نفوسہ کا حکمران۔ عبدالحمید، جو تاہرت کے اباضی اماموں کی طرف سے جبل نفوسہ کا والی تھا۔ اجناون کے گاؤں کا باشندہ تھا۔ یہ علاقہ شہر جادو کے جنوب میں واقع تھا۔ جناونی کو ۱۹۶ھ / ۸۱۱ء میں امام عبدالوہاب بن عبدالرحمان بن رستم کے جبل نفوسہ کے قیام کے دوران ہی میں بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اسی شہرت کے سبب ابوالحسن ایوب کے انتقال کے بعد یہاں کے باشندوں نے جناونی کو اپنا والی اور حکمران چن لیا۔ عبدالوہاب کی وفات (۲۰۸ھ / ۸۲۳ء) سے ذرا پہلے اسے باقاعدہ تقرری بھی حاصل ہو گئی تھی۔

اس کے زمانہ ولایت میں مسلسل جنگ کی وجہ سے بڑا خلل پیدا ہوا۔ جناونی کو یہ جنگ شمالی افریقہ کے ایک سابق اباضی امام ابوالخطاب عبدالاعلیٰ کے پوتے خلف بن اسمح کے خلاف لڑنا پڑی۔ بالآخر جناونی اس جنگ میں کامیاب ہوا۔

جناونی ایک عالم و فاضل شخص تھا وہ بربری زبان کے علاوہ عربی اور کانم کی زبان سے بھی واقف تھا۔ اس کا شمار ان بارہ شخصیات میں ہوتا ہے جن کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ان شخصیات کو "مستجاب الدعوات" کہا جاتا ہے۔ یہ شخصیات دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر اور تیسری صدی ہجری اور نویں صدی عیسوی کے اوائل میں جبل نفوسہ میں آباد تھیں۔ ان شخصیات کا مستقر اجناون ہی تھا جو جبل نفوسہ کا کچھ عرصے کے لیے سیاسی اور مذہبی مرکز بن گیا تھا۔

جَنْبٌ پہلو جمع جنوبٌ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ۔ کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں کے بل لیٹے ہوئے۔ (۳ : ۱۹۱)

جنب سے فعل دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک سمت مخالف کو جانا۔ دوسرے سمت موافق کو آنا۔ صاحبِ بالجَنْب کے معنی قریبی دوست کے ہیں۔

جارِ الجُنُب اس پڑوسی کو کہتے ہیں جو اجنبی شخص پڑوس میں رہتا ہو۔ قرآن میں یہ انھی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (نیز دیکھیے "پڑوسی")

وہ شخص جس پر غسل واجب ہو۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وان کنتم جنباً فاطھروا

"جب تم حالت جنابت میں ہو تو غسل کر لو۔" (۵ : ۶) (نیز دیکھیے "جنابت")

جَنَبَہ عمان کے سرآوردہ قبائل میں سے ایک قبیلہ۔ ایک زمانے میں اس قبیلے کو عمان کے بدوی قبائل میں سب سے زیادہ فوقیت اور قوت حاصل تھی۔

موجودہ دور میں بھی اس قبیلے کی تعداد اتنی ضرور ہے کہ صحرا میں ان کا درجہ امرائے دروع اور آل وہیبہ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

اس قبیلے کے بڑے بڑے حصے ہیں جو یہ ہیں۔

مجاعلہ، فوارس، آل ذبیان اور آل ابو غالب ان میں مجاعلہ کو دوسرے تمام گروہوں پر برتری حاصل ہے۔ اس گروہ کا سردار جاسر بن حمود ہے۔

جنبہ ایک وسیع و عریض علاقے پر قابض ہیں۔ یہ عام طور پر دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔

مشرق میں یہ لوگ خلیج عمان میں صور کے مقام پر ساحلوں کے ساتھ ساتھ بستے چلے گئے ہیں۔ یہاں بو علی ان کے شریک ہیں۔ ساحل بحیرہ عرب کی چھوٹی بندرگاہوں میں جازر کی حد تک کی آبادی بحری امور سے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ یہاں کے

Marfat.com

بعض باشندوں نے تاجروں کی حیثیت سے دوسرے ممالک میں بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

اس گروہ کے خانہ بدوش اونٹوں اور بکریوں کے بڑے بڑے گلوں کے مالک ہیں سردیوں میں یہ لوگ ساحلوں پر ڈیرے جا ڈالتے ہیں اور گرمیوں میں اندرون ملک ماہی گیری بھی بہت سے افراد کا پیشہ ہے۔ جو شارک پکڑنے میں بڑے ماہر ہیں۔

جنبہ کا دوسرا گروہ جو مغربی گروہ کہلاتا ہے بنیادی طور پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض لوگوں کی کچھ نہ کچھ املاک بھی ہیں۔ قبیلے کا سردار جاسر محمود عز میں جو قبیلے کا دارالحکومت سمجھا جاتا ہے۔ کچھ اراضی کا مالک ہے۔

اس گروہ کا دل پسند سلسلہ کوہ، اور شہر ادم کی نواحی وادیاں کوہستان درورع کے مشرق میں واقع ہیں۔

جنبہ کا تعلق غافری فریق سے ہے یہ لوگ دہیبہ کے خلاف ہیں۔ درورع کے حلیف ہیں اگرچہ اب ان قبائل کی باہمی عداوت پہلے جیسی شدید نہیں رہی۔

جعلان جنبہ بنی بو علی کے حلیف ہیں۔ جنبہ عقیدے کے لحاظ سے سنی ہیں اباضی عقائد ان کے ہاں فروغ نہ پا سکے۔ اگرچہ اباضی امام کی یہ لوگ عزت و تکریم ضرور کرتے ہیں

جنت باغ۔ نیک انسانوں کا مرنے کے بعد دائمی گھر۔ جنت ہر اس باغ کو کہتے ہیں جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ بعض کے نزدیک ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوتے ہوں اور بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے اور یا اس لئے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کے اس ارشاد سے ظاہر ہے۔

"کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے" (۳۲ : ۱۷)

جنت کی جمع جنات ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنات لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہے۔

۱۔ جنت الفردوس ۲۔ جنت عدن ۳۔ جنت النعیم ۴۔ دارالخلد ۵۔ جنت الماوٰی ۶۔ دارالسلام ۷۔ علیین۔

بعض اہل تحقیق نے بہشت کے آٹھ درجات قائم کئے ہیں۔ جو یہ ہیں

۱۔ عدن ۲۔ جنت الماوٰی ۳۔ فردوس ۴۔ نعیم ۵۔ دارالقرار ۶۔ دارالخلد ۷۔ دارالسلام ۸۔ دارالجلال۔

محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہ کے لئے ہیں لیکن آٹھواں دیدار حق تعالیٰ کے لئے لیکن دیدار حق کے لئے کونسا درجہ ہے اس بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس کے نزدیک یہ مقام علیین ہے جب کہ بعض کے نزدیک مقعد صدق ہے۔

علامہ زمخشری صاحب "کشاف" نے جنت کے نام اس ترتیب سے بیان کئے ہیں۔

"دارالخلد، دارالمقام، دارالسلام، جنت عدن، دارالقرار، جنت نعیم جنت الماوٰی، جنت فردوس۔"

علامہ موصوف نے سورۃ الذاریات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عدن کو زمرد سبز سے بنایا گیا ہے۔ اس میں سخی و عادل و نمازی و زاہد اور آئمہ مساجد رہیں گے۔

جنت الماوٰی کو نور سے تیار کیا گیا ہے اور یہ مقام ہے شہید حقیقی، خیرات کرنے والوں، غصہ کھانے والوں اور تقصیروں کے معاف کرنے والوں کا۔

فردوس کو جلال کبریائی کے نور سے بنایا ہے۔ اس میں انبیاء علیہم السلام رہیں گے۔ اس کے درمیان ایک عرفہ نور رضا کا بنایا ہے۔ اسے مقام محمود کہتے ہیں۔ آنحضورؐ اس میں تشریف رکھیں گے۔

نعیم کو زبرجد سبز سے بنایا ہے۔ اس میں شہید حکمی اور موذن رہیں گے۔

دارالقرار کو مروارید روشن سے بنایا ہے۔ اس میں عام مومنین رہیں گے۔

دارالسلام کو یاقوت سرخ سے بنایا ہے۔ اس میں فقیر، صابر امت کے رہیں گے۔

دارالجلال زر سرخ سے بنا ہے۔ اس کو دارالمقام بھی کہتے ہیں۔ اس میں اس امت کے اغنیاء شاکر رہیں گے۔

قرآن مجید میں صیغہ واحد تثنیہ جمع میں یہ لفظ ایک سو انچاس مرتبہ آیا ہے۔ بعض جگہوں پر اضافتوں کے ساتھ بھی آیا ہے۔ مثلاً جنۃ النعیم، جنۃ الخلد جنت عدن، جنۃ الماوٰی۔

قرآن مجید میں اس لفظ کے لئے اور دوسرے الفاظ جو استعمال کئے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

فردوس، روضہ، دارالخلد، دارالمقامہ، دارالسلام

قرآن پاک میں آنے والی زندگی کے اس دائمی اور غیر فانی گھر کو جو ہر قسم کے آزار اور پریشانی سے پاک ہوگا، باغ (جنت) کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ان لوازم کا بھی ذکر موجود ہے جن سے ہم اس مادی زندگی میں مانوس ہیں۔ مثلاً باغ، مرغزار، آب رواں، گل و ثمر، عمدہ مشروبات و ملبوسات وغیرہ۔

مفسرین کے ایک گروہ نے ان کی لفظی تعبیر کی ہے لیکن ایک اور گروہ اسے مجاز و استعارہ سمجھتا ہے۔

بقول مولانا سید سلیمان ندوی "ان کی حقیقت بالکل وہی نہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں۔ بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی۔

بعض حضرات کے نزدیک قرآنی آیات سے جنت کے بارے میں جو تصور قائم ہوتا ہے، وہ مثالی ہے۔ یعنی جنت نکوکاروں کے اس گھر سے عبارت ہے جس میں انسانوں کی اعلیٰ تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہوں گی۔ جنت کی ایک صفت خلود بھی ہے یعنی اس گھر میں پہنچ کر لوگ ایسی مسرتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔ جنہیں زوال نہیں آئے گا۔ یہاں کی مسرتیں غم و حزن کی آلائشوں سے پاک ہوں گی یہ ایسی پاکیزہ جگہ ہوگی جس میں کینہ، بغض، حسد، رشک اور لغویات کا گذر تک نہ ہوگا۔ وہ امن و سلامتی کا گھر ہوگا۔ مقام رحمت ہوگا۔ مقام نور اور مقام رضوان مقام طیب و طاہر، مقام تسبیح و تہلیل، مقام قرب خداوندی اور مقام نعمت دیدار ایزدی۔

قرآن مجید میں جنت کے بارے میں جو آیات ہیں ہم ذیل میں ان کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جن سے جنت کے تصور کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

"مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنستر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے۔ جسے پی کر نہ ان کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا اور

Marfat.com

وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں۔ اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ہوگی ...... وہ بے خار بیریوں اور تہ بہ تہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی، اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن۔" (۵٦ : ۱۵ تا ۳۷)

"اور ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطا کرے گا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں دھوپ کی گرمی ستائے گی نہ جاڑے کی ٹھر۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی۔ اور اس کے پھل ہر وقت ان کے بس میں ہوں گے (کہ جس طرح چاہیں انہیں توڑ لیں) ان کے آگے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش کرائے جا رہے ہوں گے۔ شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے اور ان کو (منتظمین جنت نے) ٹھیک اندازے کے مطابق بھرا ہوگا۔ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں بکھیر دیئے گئے ہیں۔ وہاں جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک بڑی سلطنت کا سر و سامان نظر آئے گا۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔" (٧٦ : ۱۲ تا ۲۱)

قرآن مجید کی طرح احادیث میں بھی جنت کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ ذیل میں احادیث اور مفسرین کے بعض نکات جو جنت کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں درج کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ پوری تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ نکات زیادہ تر طبرانی اور شعرانی نے بیان کئے ہیں

جنت عام طور پر بلند ترین آسمان کے اوپر اور عرش الٰہی کے نیچے بتائی جاتی ہے۔ جنت کے مختلف طبقات یا مقامات تک پہنچنے کے لئے آٹھ بڑے دروازے ہیں ہر طبقہ اپنی جگہ عموماً درجوں میں منقسم ہے۔ بلند ترین درجے کو جو ساتویں آسمان پر یا اس سے بھی ماورا ہے عدن اور فردوس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ان دروازوں کے کھولنے کی چابی کے تین دندانے ہیں۔ جو ایک حدیث میں بیان ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں ۱۔ توحید کا اقرار ۲۔ اطاعت خداوندی ۳۔ تمام غیر شرعی کاموں سے احتراز۔

آنحضورؐ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ فرشتے نہایت عمدہ اور سریلے نغموں کے ساتھ ان نیک بندوں کا استقبال کریں گے۔ عربی یہاں کی زبان ہو گی۔ پھر یہاں پر ان لوگوں کی ضیافت ہوگی۔ نیز احادیث میں ایک ایک کھانے کا حال بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بعد میں انہیں مکانوں کی طرف لے جایا جائے گا جو ان سے پہلے ہی تیار کئے گئے ہیں۔ جنت پہلے ہی سے موجود ہے۔ جنت میں مومنین کو رویت باری تعالیٰ نصیب ہوگی۔

ایک حدیث میں جو عبادہؓ بن صامت سے مروی ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ بہشت کے سو درجے ہیں اور ہر درجے کی مسافت مقدار مسافت ارض و سما ہے اور اعلیٰ درجہ فردوس ہے اور اسی پر عرش ہے اور وہ بہشت میں درمیان کی چیز ہے اور اسی سے چار نہریں جاری ہیں۔ سو تم جب اللہ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو۔ اس لئے کہ بہشت اعلیٰ درجہ ہے۔

معتزلہ ان افعال خداوندی کو جنہیں شرعی اصطلاحوں میں پیش کیا گیا ہے استعاً سمجھتے ہیں لیکن جنت کی حسی لذات کا مفہوم لفظی لے کر اس میں تمثیل کے انداز پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک جنت کے پھل اس دنیا کے پھلوں کی طرح ہیں۔ نیز معتزلہ لقا۔ رؤیت الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جنت اس وقت موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ قیامت کے وقت تخلیق کی جائے گی۔

ان کے مقابلے میں دوسرے متکلمین یعنی اشاعرہ کے نزدیک جنت ابدی ہے۔ ان کے نزدیک جنت کی لذتوں کا دنیوی خوشیوں کے ساتھ کوئی مشترکہ معیار نہیں بلکہ وہ ان کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں اور وہ ایک مختلف نوعیت کی ہیں۔

جنت البقیع مدینہ منورہ کا قبرستان۔ یہ قبرستان مسجد نبوی سے مشرق کی سمت واقع ہے۔ معمولی رفتار سے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا راستہ ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں تک پہنچنے کے لئے بہت سے گلیوں سے گذرنا پڑتا تھا لیکن اب حکومت نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی، تکمیل پختہ سڑک بنا دی ہے۔ اس راستے کی وجہ سے بقیع میں آنا جانا بہت زیادہ آسان ہو گیا ہے

جنت البقیع کا قبرستان زمانہ جاہلیت سے اہل مدینہ کا قبرستان چلا آ رہا ہے عثمانیوں کے دور میں یہاں بھی بہت سی پختہ قبریں اور ان پر خوب صورت قبے بنے ہوئے تھے لیکن نجدی حضرات نے شریف حسین کو شکست دے کر جب مدینہ منورہ پر قبضہ کیا تو یہاں کے اکثر قبے گرا دیئے اور قبریں توڑ دیں لیکن پھر بھی پختہ قبروں کی کچھ تعداد اب بھی موجود ہے۔

اس قبرستان کی فضیلت میں کئی ایک احادیث مروی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص مدینہ میں مرے اور بقیع میں دفن کیا جائے۔ وہ میری شفاعت سے ممتاز ہوگا۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے آنحضورؐ زمین سے اٹھیں گے پھر آپ کے بعد ابوبکر صدیقؓ، ان کے بعد عمر فاروقؓ اور ان کے بعد اہل بقیع اور پھر اہل مکہ اٹھیں گے۔

حدیث میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ دو مقبرے ایسے ہیں جن کی روشنی آسمان پر ایسی ہے جیسی کہ زمین پر چاند سورج کی۔ ایک تو مقبرہ بقیع ہے اور دوسرا مقبرہ عسقلان۔

اس قبرستان میں بے شمار صحابی مدفون ہیں۔ مسلمانوں میں سے جنت البقیع میں سب سے پہلے دفن ہونے والوں میں حضرت عثمان بن مظعون ہیں ان کے بعد سیدنا ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی قبرستان میں دفن کئے گئے۔

جب جنت البقیع میں زیارت کے لئے جائے تو سنت یہ ہے کہ بقیع کے دروازے پر پہنچ کر السلام علیکم یا اہل القبور کہے اور یہ دعا پڑھے۔

اللھم اغفر لاھل بقیع الغرقد اللھم لا تحرمنا اجرھم ولا تفتنا بعدھم واغفرلنا ولھم نیز اس دعا سے پہلے یا اس کے بعد گیارہ مرتبہ سورۃ

Marfat.com

اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب اہل مقبرہ کی ارواح کو ہدیہ کرے۔ سلام کی نیت اور مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ جمیع آل و اصحاب اور مومنین جو اس قبرستان میں آرام فرما ہیں انہیں ثواب پہنچے۔

پھر اپنا منہ آنحضورؐ کی پھوپھی کی جانب کرے جو بقیع کے دروازے کے متصل بائیں جانب مدفون ہیں اور زیارت ختم بھی انہیں پر کرنی چاہیئے۔ اس بارے میں بعض علماء کا اختلاف ہے کہ کس قبر سے زیارت کی ابتدا کرے۔ اہل گروہ کے نزدیک حضرت عباسؓ اور ائمہ اہل بیت سے جو لوگ آپ کے قبہ میں مدفون ہیں ان سے ابتدا کرے کیونکہ یہ قبہ قریب ہے اور یہاں سے گذر کر دوسروں کی زیارت کی طرف متوجہ ہونا ایک قسم کی بے ادبی ہے، نیز وہ گروہ اپنی دلیل میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اہل مدینہ کا یہی عمل تھا۔

دوسرا گروہ کے نزدیک زیارت کی ابتدا حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کرے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی بہنیں مدفون ہیں اور چونکہ یہ آپؐ کے جزو شریف اور آپ کے ٹکڑے ہیں اس لیے دوسری کو ان پر مقدم کرنا مناسب نہیں۔

بعض علماء کے نزدیک حضرت عثمانؓ بن عفان سے زیارت کی ابتدا کرے اس لیے کہ آپ اہل بقیع میں افضل ہیں۔

اسی طرح بعض علماء نے اس سے مختلف آراء کا اظہار بھی کیا ہے۔

جندبؓ بن جنادہ صحابی رسول جن کی کنیت ابوذر غفاری ہے۔ (دیکھیے۔ ابوذر غفاریؓ)

جَنَدرلی عثمانی ترکوں میں علماء اور سیاست دانوں کا ایک خاندان۔ یہ خاندان ۷۵۰ھ/۱۳۵۰ء تا ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء تک ممتاز اور نمایاں رہا۔ اس خاندان سے پانچ افراد وزیر اعظم بنے۔ پرانے ماخذوں میں اس خاندان کا نام چندرلی اور جندری ہے۔ اس خاندان کے مشہور افراد مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ خیر الدین خلیل بن علی، جو کرہ خلیل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ یکے بعد دیگرے بلجک، ازنک اور برسہ کا قاضی رہا۔ مراد اول نے مسند نشینی کے بعد جلد ہی اسے قاضی عسکر کے عہدے پر مقرر کیا۔ غالباً ۷۸۲ھ/۱۳۸۱ء میں اسے وزیر بنا دیا گیا۔ وہ پہلا وزیر تھا جسے ملکی نظم و نسق کی نگرانی کے ساتھ فوج کی قیادت بھی دی گئی تھی وہ معزلہ، تھریس، مقدونیہ اور تھسلی کی فتوحات میں بھی برابر شریک رہا۔ کرمان کی جنگ کے دوران میں اسے سلطان مراد نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے روم ایلی میں تعینات کر دیا۔ جہاں وہ ۷۸۹ھ/۱۳۸۶ء میں وفات پا گیا۔ اس کا بیٹا ایاس۔ بیگلربیگی ہوا۔ جس نے بایزید اول کے عہد میں انتقال ہوا۔

۲۔ علی پاشا۔ اس نے بھی وزیر اعظم کے طور پر مراد اول، بایزید اول اور امیر سلطان کی خدمات انجام دیں۔ اس نے ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء میں انتقال کیا۔

۳۔ ابراہیم پاشا۔ ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء میں برسہ کا قاضی تھا۔ ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں قاضی عسکر بنا۔ ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء کی ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ وزیر دوم تھا۔ مراد ثانی جب خلیفہ بنا تو بایزید پاشا (وزیر اعظم) تخت کے مدعی مصطفےٰ کے ہاتھوں مارا گیا۔ تو ابراہیم اس کی جگہ وزیر اعظم بنا اور مرتے دم تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس نے بعارضہ طاعون ۲۲ ذیلقعدہ ۸۳۲ھ/۲۵ اگست ۱۴۲۹ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنے دور میں ایک محتاط اور دانشمندانہ خارجی حکمت عملی اختیار کی۔

۴۔ خلیل پاشا۔ ابراہیم پاشا کا بڑا لڑکا تھا۔ [illegible] ۸۴۶ھ/۱۴۴۳ء تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں اس نے محمد ثانی [illegible] تخت نشین کرانے میں جو کردار ادا کیا نیز بوزنطی شہنشاہ کے ساتھ سازباز رکھنے کے نتیجے میں محمد ثانی نے ناراض ہو کر فتح قسطنطنیہ کے بعد ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں اسے قتل کرا دیا۔

۵۔ ابراہیم پاشا۔ خلیل پاشا کا لڑکا تھا۔ ۸۳۳ھ/۱۴۳۰ء میں پیدا ہوا جب خلیل سلطان کی نظروں میں معتوب ہوا تو اس وقت ابراہیم ادرنہ کا قاضی تھا۔ ۸۶۹ھ/۱۴۶۵ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ بعد میں قاضی عسکر بنا یا گیا ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء تک وہ سلطان بایزید کا لالہ (وزیر) کے منصب کے ساتھ تھا۔ بایزید ثانی نے اپنی تخت نشینی کے بعد ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء میں روم ایلی کا قاضی عسکر بنایا۔ لیکن اگلے سال ۸۹۱ھ/۱۴۸۶ء میں اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء میں وزیر اعظم بنا۔ لیکن اس کے دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

ابراہیم پاشا کے بعد جندرلی خاندان میں پھر کوئی اس منصب پر فائز نہ ہو سکا اور یہ خاندان معرض گمنامی میں پڑ گیا۔

جندی، ابوعبداللہ (؟ — ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء) یمن کے شافعی فقیہ اور مورخ۔ بہاؤ الدین محمد بن یعقوب بن یوسف اس کا تعلق یمن کے شہر ظفار سے تھا۔ ابوعبداللہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ زبید میں گذارا اور یہیں پر اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی تصانیف میں سے جو محفوظ رہ گئی ہیں ان میں "کتاب السلوک فی طبقات العلماء والملوک" ہے۔ یہ کتاب یمن کے علماء اور خصوصاً فقہا کی سوانحی قاموس ہے اس میں شہروں کے لحاظ سے شخصیات کو ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مقدمے میں جو بڑا طویل ہے آنحضورؐ سے لے کر ۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء تک ملک کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس مقدمے کو یمن کے مورخین نے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بلکہ کئی ایک مورخین نے تو اسے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ابوعبداللہ کی دوسری تصنیف "سلوک" ابھی تک مکمل طور پر طبع نہیں ہو سکی اس کے تاریخی مقدمے کے ایک حصے کی جس کا تعلق یمن میں فاطمی داعیوں سے ہے۔ ایچ۔ سی۔ کای نے اپنی کتاب Yaman its early Mediaeval History میں ترتیب دی ہے اور ترجمہ کیا ہے۔

جندیشاپور خوزستان کا ایک شہر۔ جندیشاپور کی بنیاد ساسانی بادشاہ شاپور اول نے رکھی تھی۔ اس شہنشاہ نے اس شہر میں یونانی قیدیوں کو بسایا تھا۔ اس شہر کو یونانی زبان میں Beth Lapat کا نام دیا گیا ہے جو گر کر بیل آباد ہو گیا ہے۔

اس شہر کے محل وقوع کی نشاندہی شاہ آباد کے کھنڈرات کرتے ہیں مسلمانوں نے اس شہر پر ۱۷ھ/۶۳۸ء بلکہ زیادہ ترجیح ۶۳۸ء میں تستر پر فتح حاصل کرنے کے بعد کیا تھا۔ اس شہر کی فتح کا سہرا ابوموسیٰ اشعریؓ کے سر ہے۔ یہاں کے باشندوں نے شرائط طے کرنے کے بعد بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

یہ شہر یعقوب بن لیث الصفار (۲۶۲ھ/۸۷۵ء تا ۲۶۳ھ/۸۷۷ء) کا دارالحکومت تھا۔ یعقوب کے دور کے چند آثار اس شہر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

[redacted]

Marfat.com

اس شہر کی شہرت زیادہ تر اس کے ثقافتی مرکز بنے رہنے کی وجہ سے ہے۔ جس نے اسلام میں علمی و عقلی سرگرمیوں کو متاثر کیا۔ اس کی شہرت میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ اضافہ ہوا کہ اس سے طب کا گہرا تعلق تھا اور یہ شہر طب یونانی کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔

جندیشاپور میں ایک ہسپتال تھا جس میں یونانی طریق علاج اور بزنطی ہسپتالی طریق علاج کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاج کی بنیاد تنہا علمی طب پر رکھی ہوئی تھی ہارون الرشید نے جس جو تھے ہسپتال کی بنیاد رکھی تھی اسے جندیشاپور کے اطباء نے تعمیر کیا تھا اور وہی اس کو چلاتے تھے

اس شہر میں ایک طبی مدرسہ بھی تھا۔ مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی طب پر جندیشاپور کا اثر ہارون الرشید کے عہد حکومت میں اس وقت باقاعدہ طور پر پڑنا شروع ہوگیا تھا جب جندیشاپوری اطباء نے بغداد میں سکونت اختیار کرنی شروع کردی تھی۔

روایات میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ عرب کے طبیب حارث بن کلدہ نے جو آنحضورؐ کے زمانہ مبارک میں تھا۔ اس نے اسی شہر میں طب پڑھی تھی۔

جندیشاپور کو بلاشبہ نسطوریوں نے ایک اہم طبی مرکز کی شکل میں بدل دیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ جندیشاپور کی طبی تعلیم کو اسکندریہ اور انطاکیہ کی طبی تعلیم کے نمونے پر ڈھالا گیا ہو۔

اس شہر کا مطالعہ اس نظر سے بھی کیا گیا ہے کہ وہ ایک ایسا مقام ہے جس کے ذریعے الرھا اور نسی بس کے یونانی علم کی میراث بغداد میں پہنچی۔

جنگی اصول

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ "ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرنے آمادہ ہوں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام مدافعانہ جنگ کی ہدایت دیتا ہے۔ لیکن سورۃ نساء میں ارشاد ہے۔

"تم کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جن بستیوں کے لوگ ظالم ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام صرف مدافعانہ جنگ کی تعلیم ہی نہیں دیتا بلکہ مظلوم کی حمایت میں لڑنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ وہ دنیا میں صلح و امن کا خواہشمند ہے۔ جنگ و جدل کا نہیں لیکن جہاں انسانوں پر ظلم وستم ہو ان کو نجات دلاکر امن وسکون کی زندگی سے بہرہ ور کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہے وہ صرف اس صورت میں جارحیت کی اجازت دیتا ہے۔ جب کہ ظلم کا ازالہ پرامن طریقوں سے نہ ہوسکے۔

بلاشبہ جنگ ایک فتنہ ہے لیکن ظالموں کو ان کے مظالم سے نہ روکنا بہت بڑا فتنہ ہے۔ ان حالات میں جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں جنگ کی حیثیت ایک قومی پیشہ کی سی تھی۔ ذرائع معاش کی قلت، ضروریات زندگی کی کمیابی اور اجتماعی نظم وضبط کے فقدان سے عربوں میں جنگجوئی کی عادت اس قدر پختہ اور راسخ ہوگئی تھی کہ وہ قتل وخون ریزی اور لوٹ مار کو اپنی خصوصیات، بلکہ مفاخر میں شمار کرنے لگے تھے۔

جب سلام کا جھنڈا اس دنیا میں بلند ہوا تو اس نے اور دوسرے معاملات کی طرح جنگ کے معاملے میں بھی اصلاح کا علم بلند کیا۔ اس نے حقیقت جنگ کو بدل کر بالکل ایک نیا نظریہ پیش کیا جس سے اس وقت کی دنیا ناآشنا تھی۔

اس نے اپنی تعلیمات کے ذریعے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرائی کہ جنگ و قتال فی الاصل ایک معصیت ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہیئے لیکن جب دنیا میں اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم وفساد پھیل جائے اور سرکش وگمراہ لوگ اللہ کی مخلوق کے امن وسکون کو خطرے میں ڈال دیں تو محض دفع شر کے لیے جنگ کرنا ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہوجاتا ہے۔

لیکن چونکہ اس کے نزدیک جنگ کا اصل مقصد اپنے حریف کو ہلاک کرنا یا نقصان پہنچانا نہیں بلکہ محض فساد اور فتنے کو دفع کرنا ہے اس لیے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جنگ میں صرف اتنی ہی طاقت استعمال کرنی چاہیئے جتنی دفع شر کے لئے ناگزیر ہو۔ نیز اس کا استعمال صرف انھی افراد کے خلاف ہونا چاہیئے جو عملاً برسرپیکار ہوں یا زیادہ سے زیادہ جن سے شر کا اندیشہ ہو۔

چنانچہ اسلام نے اپنے اس پاکیزہ تصور کے تحت جنگ کے بارے میں ایک مکمل ضابطہ اور لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ جنھیں ہم اسلامی اصول جنگ یا اسلامی قوانین جنگ کا نام دے سکتے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

اہل قتال اور غیر اہل قتال کی تقسیم:۔ اسلام اس سلسلے میں سب سے پہلے جو اصول پیش کرتا ہے وہ مسلمانوں سے برسرپیکار گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک طبقے کو وہ اہل قتال کا نام دیتا ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔

دوسرا طبقہ جسے اسلام غیر اہل قتال کا نام دیتا ہے۔ اس میں وہ انسان شامل ہیں جو عقلاً و عرفاً اور عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی اندھے، لنگڑے لولے مجنون، خانقاہ نشین اور معبدوں کے مجاور وغیرہ اسلام نے پہلے طبقے کو تو جنگ میں قتل کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن دوسرے طبقے کو قتل کرنے اور ان سے تعرض کرنے سے منع کیا ہے

آنحضورؐ نے فرمایا۔

"نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو اموال غنیمت میں چوری نہ کرو۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو نیکی و احسان کرو۔ کیونکہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آنحضورؐ جب کہیں فوج بھیجتے تھے تو ہدایت کردیتے تھے کہ معاہدے کے لیے بے ضرر خادموں اور خانقاہ نشین زاہدوں کو قتل نہ کرنا۔

فقہاء نے اس حکم سے یہ استنباط کیا ہے کہ وہ تمام لوگ جو لڑنے سے معذور ہیں یا عادتاً معذور کے حکم میں آتے ہیں قتال سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن یہ استثناء اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ عملاً جنگ میں حصہ نہ لیں۔ اگر ان میں سے کوئی عملاً جنگ میں شرکت کرے۔ مثلاً بیمار، پلنگ پر لیٹے لیٹے فوجوں کو جنگی چالیں بتارہا ہو، یا عورت غنیم کی جاسوسی کا کام کررہی ہو یا بچہ خفیہ خبریں حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہو یا مذہبی طبقہ کا کوئی فرد دشمن کو جنگ کا جوش دلا رہا ہو تو اس کا قتل جائز ہے

اس کے ساتھ ہی اسلام اہل قتال کے بارے میں بھی چند ایک اصول بتاتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

بے خبری اور غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز یعنی رات کے آخری حصے میں جبکہ لوگ بے خبر سو رہے ہوں۔ آنحضورؐ نے اس فعل قبیح کی ممانعت فرمائی اور یہ قاعدہ مقرر

Marfat.com

کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔

حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ آنحضورؐ جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے۔

آگ میں جلانے سے ممانعت :۔ اکثر جنگوں میں فریقین غصہ اور شدت انتقام سے پاگل ہو کر اپنے دشمنوں کو زندہ جلا دیتے تھے۔ آنحضورؐ نے فرمایا: "آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے اور کسی کو سزاوار نہیں۔"

باندھ کر قتل کرنے کی ممانعت :۔ اسلام نے دشمنوں کو باندھ کر قتل کرنے اور تکالیف پہنچا پہنچا کر جان لینے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے قتل صبر (باندھ کر مارنے) سے منع فرمایا۔

لوٹ مار کی ممانعت :۔ اسلام اس بات سے بھی منع کرتا ہے۔

فتح خیبر کے موقع پر آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم میں جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہوں اور جوانمردی کے احکام دیتا ہوں وہ بھی قرآن کی طرح یا اس سے زیادہ ہیں۔ اللہ نے تمہارے لئے یہ جائز نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھس جاؤ ان کی عورتوں کو مارو پیٹو اور ان کے پھل کھا جاؤ۔ حالانکہ ان پر جو کچھ واجب تھا وہ نہیں دے چکے۔

اسی طرح ایک مرتبہ جہاد میں اہل لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا رہے تھے۔ جب آنحضورؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے ہنڈیاں الٹ دیں اور فرمایا "لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔"

دشمن کے علاقے کی بربادی و تباہ کاری کی ممانعت :۔ اگرچہ افواج کی پیشقدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی جنگ کے معمولات میں سے ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں یہ پسندیدہ بات نہیں۔ اسلام اس چیز کو فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ اور سختی کے ساتھ اس بات کی ممانعت کرتا ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ نے شام اور عراق کی طرف فوجیں بھیجتے ہوئے انہیں جو ہدایات جاری کیں ان میں سے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا اور فصلوں کو خراب نہ کرنا۔

مثلہ اور نعشوں کی بے حرمتی کی ممانعت :۔ اسلام نے جنگ کے اصولوں میں یہ بھی ایک اصول قرار دیا ہے کہ دشمن کی نعشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے۔ نہ ان کے اعضاء کو کاٹا جائے۔

حضرت عبداللہ بن یزید انصاری سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ کے مال اور مثلہ سے منع فرمایا۔

قیدیوں کے قتل کی ممانعت :۔ جیسا کہ آنحضورؐ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا تھا۔ "کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے۔ کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے۔"

لیکن اسلام کا یہ اصول اسیران جنگ کے بارے میں عام طور پر ہے۔ اسلامی حکومت کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ اگر کوئی ایسا آدمی جو اسلام کا شدید دشمن ہو یا جس نے مسلمانوں پر انتہائی مظالم ڈھائے ہوں یا وہ ائمہ شر و فساد ہوں کبھی جنگ میں ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان کے قتل کا حکم دے سکتی ہے جیسا کہ غزوہ بدر کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط کو قتل کیا گیا تھا۔

قاصد اور سفیر کے قتل کی ممانعت :۔ اسلام قاصدوں اور سفیروں کے قتل سے بھی منع کرتا ہے۔ جب آنحضورؐ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کا قاصد اس کا گستاخانہ پیغام لے کر آیا تو آپ نے فرمایا: "اگر قاصدوں کا قتل کرنا ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔"

ایفائے عہد کا حکم :۔ نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی ممانعت میں بے شمار احادیث ہیں۔ اسلام نے اس فعل کو بدترین فعل قرار دیا ہے۔

آنحضورؐ نے فرمایا: "ہر غدار و عہد شکن کی بے ایمانی کا اعلان کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہو گا۔ جو اس کے غدر کا ہم قد ہو گا۔" ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

آپ نے فرمایا: "جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اس میں کوئی تغیر و تبدیل نہ کرے تاوقتیکہ اس کی مدت گذر نہ جائے۔ یا پھر اگر خیانت کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھ کر اس کو ختم معاہدہ کی اطلاع دے دے۔"

اس کے علاوہ اسلام نے بدنظمی اور انتشار سے بھی منع کیا ہے جو کہ جاہلیت کے دور کی روش تھی کہ جب عرب جنگ کے لئے نکلتے تو راستے میں جو کوئی ملتا اس کو تنگ کرتے اور جب کسی منزل پر اترتے تو سارا راستہ روک لیتے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر آپ نے منادی کرائی۔

"جو کوئی منزل کو تنگ کرے گا یا راہ کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں ہو گا۔"

اسی طرح آپ نے شور و ہنگامے سے بھی باز رہنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ

ایک موقع پر ہم آنحضورؐ کی معیت میں تھے اور جب کسی وادی پر پہنچتے تھے تو زور شور سے تکبیر و تہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے۔

اس پر آنحضورؐ نے فرمایا "لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے۔"

چنانچہ اسلام نے یہ جنگی اصول بیان کر کے جنگ کو ان تمام وحشیانہ افعال سے پاک کر دیا جو اس عہد میں جنگ کا ایک غیر منفک جز بنے ہوئے تھے اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جس میں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم ممکن نقصان پہنچا کر اس کے سر کو دفع کرنے کی کوشش کریں۔

جنگلی ایران کی ایک قومی اور اصلاحی تحریک۔ یہ تحریک میرزا کوچک خان، احسان اللہ خان اور کئی دوسرے آزاد خیال اور آئین پرست افراد کی زیر قیادت ۱۹۱۵ء میں گیلان کے جنگلوں میں وجود میں آئی۔ جن لوگوں نے اس تحریک میں حصہ لیا انہیں جنگلی کہتے ہیں۔

ان کا نعرہ خارجی اثر و نفوذ سے آزادی اور اسلام کے جھنڈے تلے ایران کی آزادی تھا۔ ان لوگوں نے اتحاد اسلام کے نام سے ایک خاص انقلابی جماعت قائم کی۔

انہوں نے "جنگل" نام کا ایک اخبار بھی جاری کیا تھا اور فوجی تربیت کے لیے جرمنی، آسٹریا اور ترکی کے متعدد افسروں کو فوجی استادوں کے طور پر بلایا۔ اس تحریک کے اخراجات گیلان کے زمینداروں سے جبراً وصول کئے ہوئے روپے سے پورے کئے جاتے تھے۔ اس تحریک کو ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب سے بہت زیادہ تقویت حاصل ہوئی۔ اور یہ ۱۹۱۸ء میں بحر خزر کے دوسرے علاقوں تک پہنچ گئی۔ مارچ

Marfat.com

۱۹۱۸ میں انہیں قزوین پر قبضہ کرنے سے بمشکل ہی باز رکھا گیا۔ جرمنوں اور ترکوں کو کاکیشیا میں داخل ہونے اور باکو میں تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لئے جو برطانوی فوج بھیجی گئی تھی جنگلیوں کا علاقہ اس فوج کے راستے کے آرپار پڑتا تھا اور برطانوی فوجوں کے درمیان منجیل اور رشت والی سڑک پر معمولی سی لڑائی بھی ہوئی لیکن ۱۲ راگست ۱۹۱۸ء میں برطانیہ اور میرزا کوچک خان نے انگریزوں کے خلاف جنگ و جدال ترک کرنا پڑی۔ لیکن اس معاہدے کے بعد جنگلیوں میں اعتدال پسند عناصر اور انتہا پسندوں کے خلاف تفریق پڑ گئی۔ اس باہمی تفرقہ بازی نے ایرانی حکومت کی قازق فوجوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ جنگلی فوجوں کو منتشر کر دیں خواہ عارضی طور پر ہی سہی۔

اس تحریک کے دوسرے مرحلے کی خصوصیت بالشویکی مدد ہے۔ ۱۸ رمئی ۱۹۲۰ء کو روس بالشویکی بیڑے نے انزلی پر بمباری کی اور سوویٹ فوجوں نے گیلان کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ کوتوایک نئی جماعت تشکیل کی گئی اور میرزا کوچک خان نے اپنے آپ کو ایرانی اشتراکی جمہوریہ کا نمائندہ ظاہر کر کے گیلان کی سوویٹ جمہوریہ قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ گیلان کی اس اشتراکی جمہوریہ نے جو ۱۹۲۱ء تک برسر اقتدار رہی بڑے بڑے زمینداروں کی جاگیروں کو ضبط کر کے کسانوں میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ ایرانی کسانوں کو آزاد مقامی اشتراکی گروہوں میں منظم کرنے میں ناکام رہی۔

جب ۲۹ رفروری ۱۹۲۱ء سوویٹ ایرانی معاہدہ طے پایا تو اس کی رو سے ۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو سوویٹ فوجیں ایران سے واپس چلی گئیں۔ چنانچہ سوویٹ امداد سے محروم ہونے کے بعد جب ان کا مقابلہ رضا شاہ کے زیر قیادت بڑی ایرانی فوجوں سے ہوا تو اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء تک ان کی بغاوت فرو ہو گئی۔ میرزا کوچک خان کو قید کر لیا گیا۔ جسے بعد میں پھانسی دے دی گئی۔ اور اس طرح یہ تحریک اپنے خاتمے تک پہنچی۔

جنید آیدین اوغلو خاندان کے امراء میں سے آخری امیر عثمانی ماخذ میں اس کا لقب ازمیر اوغلو لکھا ہے۔ بدبیہ کے امیر ابراہیم بہادر کا بیٹا اور محمد بیگ کا پوتا تھا۔ جس نے آیدین میں اس خاندان کی امارت کی بنیاد ڈالی تھی۔

تاریخ میں جنید سب سے پہلے ۸۰۴ھ/۱۴۰۲ء میں ظاہر ہوتا ہے جب کہ تیمور نے امارت آیدین کو جسے بایزید اول نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا، دوبارہ آزاد کیا تو جنید اور اس کے بھائی حسن آغا نے جو حکومت عثمانیہ کے زمانے میں ازمیر کے بالائی حصار کے قرہ باشی رہ چکے تھے سلطان بایزید اول کے بیٹوں کی خاندانی جنگوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ازمیر کو جنید نے اور آیا سولوک کو حسن آغا نے اپنے قبضے میں لے لیا ۸۰۵ھ/۱۴۰۳ء میں موسیٰ کی وفات کے بعد اس کے بھائی امور ثانی نے آیا سولوک کو دوبارہ فتح کر لیا۔ اور حسن آغا کو قید کر دیا۔ جنید اپنے بھائی حسن آغا کو رہا کرانے میں کامیاب رہا اور اسے ازمیر لے آیا۔ اس نے صوبہ آیدین کے سابق والی سلیمان چلپی کے ذریعے آیا سولوک دوبارہ حاصل کر لیا۔ نیز امور ثانی سے صلح کر کے اس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ امور ثانی کی وفات کے بعد ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء میں وہ تنہا امارت کا حاکم بن بیٹھا۔ اس نے آیدین کی امارت میں آلاشہر، صالح لی اور نیف بھی شامل کر لیے۔ اسی سال عیسیٰ چلپی ازمیر آیا تاکہ اپنے بھائی محمد کے خلاف جنید کی مدد حاصل کر سکے۔ لیکن محمد نے انہیں شکست دی جنید نے معافی مانگ لی اور فاتح کی اطاعت کا اقرار کر کے اپنی حکومت بچا لی۔

۸۰۹ھ/۱۴۰۷ء میں سلیمان جنید کو روم ایلی لے گیا۔ اور اوچریدہ کا حاکم بنا دیا۔ ۸۱۴ھ/۱۴۱۱ء میں جب سلیمان اپنے بھائی موسیٰ سے لڑتا ہوا مارا گیا تو جنید ازمیر واپس آ گیا اور آیا سولوک کے حاکم کو نکال کر اپنی پہلی ریاست واپس لے لی۔ محمد اول نے موسیٰ پر غالب آنے کے بعد ازمیر کے علاقے پر قبضہ کر لیا لیکن جنید کے معافی مانگنے پر ازمیر اسے بخش دیا۔

۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں جنید کو روم ایلی بھیجا گیا اور نیقوپولیس کا حاکم مقرر کیا گیا۔ صوبہ آیدین الگزنڈر ولد شِشمن کو دے دیا گیا لیکن وہ مصطفیٰ کی بغاوت کے دوران ۸۱۹ھ/۱۴۱۶ء میں مارا گیا۔

مصطفیٰ نے جنید کو اپنا وزیر بنا لیا۔ لیکن سلطان محمد اول نے وینس سے صلح کا معاہدہ کر لیا جس کے بل پر مصطفیٰ نے تخت کے حقدار ہونے کا دعوے کیا تھا۔ بعد میں سلطان محمد اول کے حکم سے مصطفیٰ جزیرہ لیمنوس اور جنید کو قسطنطنیہ کی خانقاہ میں نظر بند کر دیا گیا کیونکہ بزنطی حاکم کو محمد اول نے قید کے مصارف ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں محمد اول کی وفات کے بعد قیصر نے دونوں قیدیوں کو رہا کر دیا مراد ثانی نے جنید سے وعدہ کیا کہ اگر وہ مدعی تخت مصطفیٰ کا ساتھ چھوڑ دے تو اسے ازمیر کا علاقہ دوبارہ واپس مل سکتا ہے۔ چنانچہ جنید راتوں رات ازمیر پہنچ گیا۔ جہاں کے باشندوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے امور ثانی کے بیٹے مصطفیٰ اکرم کو آیا سولوک سے نکال دیا۔ تو مراد ثانی نے ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء میں جنید کے خلاف قدم اٹھایا تاکہ اسے ازمیر کے علاقے تک محدود کر دے لیکن جنید ترکی علاقوں پر چھاپے مارنے سے باز نہ رہ سکا۔ چنانچہ مراد ثانی نے ... فوج قرطاش کے بیٹے کی زیر قیادت بھیج کر ازمیر کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور جنید کو قلعہ اپسیلی میں پناہ لینی پڑی اور اس نے بخشی کی بہن کو مار ڈالا جو اس کے پاس تھی۔ چونکہ مراد ثانی نے آیدین صوبہ کی حکومت ایک نومسلم خلیل بخشی کو دی تھی جس کی بہن کو جنید نے گرفتار کر لیا تھا۔ جب جنید نے ۸۲۸ھ/۱۴۲۵ء میں اپسیلی میں ہتھیار ڈال دیئے تو بخشی نے اپنی بہن کا قصاص لینے کے لئے اس کو مار ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بیٹے قرت حسن اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کو مار ڈالا۔

جنید، ابوالقاسم (؟ — ۲۹۸ھ/۹۱۰ء) ایک بہت بڑے صوفی بن محمد بن جنید خزاز۔ آپ سری سقطی کے بھتیجے بھانجے اور انہی کے مرید تھے۔ آپ کی سکونت بغداد میں تھی۔ آپ نے فقہ ابوثور سے پڑھی تصوف کی تعلیم حارث محاسبی سے حاصل کی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اپنے استاد محاسبی کے ساتھ چلتے پھرتے تصوف کے مسائل پر بحث کرتے رہتے تھے اور وہ آپ کے سوالات کے برجستہ جوابات دیتے رہتے تھے۔ ان جوابات کو بعد میں آپ نے کتابوں میں قلمبند کر دیا۔

محاسبی کے ساتھ آپ کو بھی راسخ العقیدہ صوفیاء کا سب سے بڑا امام تسلیم کیا گیا ہے اور آپ "سید الطائفہ" (صوفیوں کے سردار) "طاؤس الفقراء" (شیخ المشائخ) کے القابات سے نوازا گیا ہے۔ لوگ آپ کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔

ابن ندیم نے اپنی "الفہرست" میں آپ کے "رسائل" کا ذکر ہے جو خاص خاص اشخاص کے نام مرسلہ خطوط اور تصوف کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔

حلاج پر آپ کا اثر بہت نمایاں تھا۔ جنید نے اپنے عقیدے کو جسے آپ نے دلائل عقلیہ سے واضح کیا تھا۔ اس طرح بیان کیا ہے۔ "چونکہ سب چیزوں کو اصل ذات خدا ہے۔ اس لئے علیحدگی (تفرق) کے بعد آخر کار وہ پھر اسی ذات کی طرف عود کریں گے تاکہ پھر اس سے مل جائیں۔ نیز صوفی مقام فنا میں یہی درجہ حاصل کرتا ہے۔

حالت وصل کے بارے میں آپ نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

Marfat.com

"کیونکہ اس وقت تجھ سے خطاب کیا جائے گا اور مخاطب بھی تو خود ہی ہوگا۔ تجھ سے تیرے حالات دریافت کئے جائیں گے۔ اور دریافت کرنے والا تو خود ہوگا۔ برکات کا کثرت سے فیضان ہوگا اور دونوں جانب سے اقرار و اعتراف ہوں گے ایمان کی قوت پیہم بڑھتی چلی جائے گی اور رحمتوں کا لگاتار نزول ہوگا۔"

آپ زبان کی ان جسارتوں سے بچتے۔ جنہوں نے بسطامیؒ اور حلاجؒ جیسے اصحاب سکر کی زبان پر جاری ہو کر راسخ الاعتقاد لوگوں کو ان کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا۔ الغرض جنید نے اپنے واضح تصورات اور مکمل ضبط نفس کی بدولت ایک ایسی بنیاد قائم کر دی۔ جس کے اوپر بعد کے سلسلہ ہائے صوفیہ کی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔

جنید ہمہ تن درد و عشق تھے۔ تصوف کے بارے میں آپ فرماتے ہیں: "جب تک ایک ہاتھ سے قرآن اور دوسرے سے سنت رسول نہ پکڑلو۔ اس راستے پر نہ چلو تاکہ شبہات کے گڑھوں میں گر اور نہ بدعت کی تاریکی میں مبتلا ہو سکو۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"قیل و قال اور جنگ و پیکار سے یہ درجہ مجھ کو نہیں ملا۔ بلکہ بھوک، پیاس نیند اور ترک دنیا سے ملا۔"

آپ کا قول ہے۔

"جو آنکھ حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کو نہ دیکھے اس کا اندھا ہونا بہتر ہے اور جو زبان ذکر حق میں مصروف نہ ہو اس کا گونگا ہونا اچھا ہے۔ اور جو کان حق بات نہ سنے اس کا بہرہ ہونا اچھا ہے اور جو بدن اس کی خدمت نہ کرے اس کا مرجانا بہتر ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ عبودیت کی دو خصلتیں ہیں۔

۱۔ ظاہر و باطن میں ہر طرح خدا کی رضا پر راضی رہنا۔ ۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری محبت کے ساتھ اقتدا کرنا۔

آپ کا قول ہے کہ خلق چار چیزوں کا نام ہے۔ ۱۔ سخاوت ۲۔ الفت ۳۔ نصیحت ۴۔ شفقت

جنید بغدادی:۔ ایک بہت بڑے صوفی اور بزرگ۔ (دیکھئے جنید ابوالقاسم)

جنید بن عبدالرحمان (۔۔۔۔ ۱۱۲ھ/۷۳۲ء) اموی خلیفہ ہشام کے دور میں ایک نامور سپہ سالار اور والی۔ جنید کو ہشام نے ۱۰۵ھ/۷۲۴ء میں برعظیم پاک و ہند کے ان مسلم مقبوضات کا جنہیں محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا۔ والی مقرر کیا۔ یہ مقبوضات ۹۲ھ/۷۱۱ء سے ۹۴ھ/۷۱۳ء میں فتح کئے تھے۔ جنید ۱۱۱ھ/۷۲۹ء تک سندھ کا گورنر رہا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں کئی مرتبہ فوج کشی کی۔ جنید نے کیراج کے راجہ کے خلاف فوج کشی کی جو مجبور ہو کر فرار ہوگیا اور اس طرح کئی شہر جنید کے ہاتھ آئے۔ ۱۱۰ھ/۷۲۹ء میں جنید کو گورنری کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ اس وقت میں جنوبی ہند کی سمت مسلمان گجرات کے اندر تک اور مشرق کی جانب مالوہ کی سرزمین تک یعنی وسطی ہند تک پہنچ چکے تھے۔ جنید شمال میں غزوں کے علاقے تک پہنچا۔ نیز چین کی ایک باجگزار ریاست کا ایک شہر اور ایک قلعہ پر بھی قابض ہوگیا۔ ۱۱۱ھ/۷۳۰ء میں جنید خراساں کا والی مقرر کیا گیا۔ بعد میں اسے ماوراء النہر کی طرف بھیجا گیا تاکہ اس کی حالت کو درست کر سکے۔ جو ترکوں کے حملوں کی وجہ سے ناقابل اطمینان ہوگئی تھی۔ نیز اشرس بن عبداللہ سلمی سابق والی خراساں کی مدد کرنا بھی مقصود تھی جو شکل [illegible] بخارا میں اشرس کی فوج سے جا ملا [illegible] فوج کے ساتھ بخارا میں اشرس کی فوج سے جا ملا اور ترکوں کے [illegible] زرمان کے مقام پر انہیں شکست دی۔

خراسان واپس آکر جنید نے طخارستان پر حملہ کیا لیکن اسے جلد ہی وہاں سے ماوراء النہر کے لئے واپس آنا پڑا جہاں اسے سمرقند کے حاکم سورۃ بن حر التمیمی کی مدد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ جنید نے دریائے جیحون عبور کر کے کش سے سمرقند جانے کے لئے پہاڑی راستہ منتخب کیا۔ لیکن جب وہ الشعب نامی گھاٹی میں پہنچا تو صغد، شاش اور فرغانہ کے لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ماری گئی۔ جنید نے یہاں سے سورۃ کو پیغام بھیجا کہ وہ سمرقند چھوڑ کر اس کی مدد کے لئے آجائے۔ چنانچہ سورۃ جنید کی مدد کے لئے روانہ ہوگیا لیکن جیسا کہ وہ اس بات کا نتیجہ جانتا تھا۔ ترکوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ سورۃ خود اس لڑائی میں مارا گیا۔ اور اس کی فوج بھی اس لڑائی میں ختم ہوگئی۔ جنید الشعب سے نکل کر سمرقند پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے چار ماہ تک صغد میں قیام کیا اور یہیں سے اس نے بخارا کو جس کا ترکوں نے محاصرہ کر رکھا تھا، بچانے کے لئے قطن بن قتیبہ کی مدد کے لئے ایک فوج تیار کی اور بالآخر طواویس کے قریب ترکوں کو شکست دے کر بخارا میں داخل ہوا۔ ۱۱۶ھ/۷۳۴ء کے آغاز میں خلیفہ نے اسے واپس بلا لیا۔ کیونکہ وہ جنید سے اس بنا پر ناراض ہوگیا تھا کہ اس نے خلیفہ کے باغی یزید بن مہلب کی بیٹی فاضلہ سے شادی کر لی تھی۔ خلیفہ نے اس کی جگہ عاصم بن عبداللہ کو خراسان کا والی مقرر کیا۔ لیکن ابھی عاصم راستے ہی میں تھا کہ جنید مرو میں ایک بیماری سے انتقال کر گیا۔

جنید میں ایک بہترین سپہ سالار کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ماوراء النہر میں ترکوں کی سخت مخالفانہ تحریک کے باوجود اپنا اقتدار قائم رکھ سکا۔ اس کے علاوہ اس میں انتظامی صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جب اسے سندھ سے واپس بلایا گیا تو اس نے بیت المال میں ایک کروڑ اسی لاکھ طاطری درہم چھوڑے تھے۔

جنید کے بارے میں جو عام روایات مشہور ہیں ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جنید نے سندھ کی حکومت سے برطرف کئے جانے کے بعد بنو امیہ کی مخالفت میں بکیر بن ہامان کی برپا کردہ باغیانہ تحریک میں اس کا ساتھ دیا تھا لیکن یہ روایت بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جنید کو سندھ کی گورنری سے معزول کئے جانے کے فوراً بعد خراسان کا حاکم بنا دیا گیا تھا جہاں جنید نے اس باغیانہ تحریک کے سرکردہ آدمیوں کو گرفتار بھی کیا تھا۔ اس ضمن میں الدینوری کی فراہم کردہ اطلاع بھی صحیح نہیں ہے۔ نیز اسد بن عبداللہ کی معزولی کی خبر بھی جو الدینوری نے بیان کی ہے صحیح نہیں ہے۔

جنیدیہ صوفیا کا ایک گروہ اور فرقہ۔ یہ لوگ حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد سے محبت کرتے ہیں۔ جو صوفیا کے ایک گروہ کے سردار اور ان کے اماموں کے امام تھے۔ آپ کا طریقہ طیفوریوں کے برعکس صحو پر مبنی ہے۔ جن کا اختلاف پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔ صوفیا کے تمام مذاہب میں مشہور و معروف آپ ہی کا مذہب ہے۔

بقول حضرت علی ہجویری جتنے مشائخ بھی ہوئے ہیں سب جنیدی مذہب کے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

جدّت کا امین انقلاب کا ضامن

مکتبہ شاہکار

[illegible] جدید شاہکار [illegible] کتب ہر [illegible] باقاعدگی سے پیش کرتا ہے۔

۱۔ حاجی مراد	۲/۵۰
۲۔ نوسٹوٹری	۲/=
۳۔ غبارِ خاطر	۳/۵۰
۴۔ نوٹرے ڈیم کا کبڑا	۲/۵۰
۵۔ داراشکوہ	۳/=
۶۔ رومیو جولیٹ ۷۔ میکبتھ	۳/۵۰
۸۔ سائنس سے بھی عجیب تر	۲/=
۹۔ مہمان بہار۔ آتش رفتہ	۳/=
۱۰۔ آوازِ دوست	۳/=
۱۱۔ بھوانی جنکشن	۲/۵۰
۱۲۔ پولیس افسر کی ڈائری	۲/۵۰
۱۳۔ شاہنامۂ اسلام (اوّل)	۳/=
۱۴۔ چلتے ہو تو چین کو چلئے	۲/۵۰
۱۵۔ علی اور نیتو	۲/۵۰
۱۶۔ تحریک پاکستان	۳/=
۱۷۔ صحرانورد کے خطوط (اوّل)	۳/=
۱۸۔ النبی الخاتم	۲/۵۰
۱۹۔ شاہنامۂ اسلام (دوم)	۳/=
۲۰۔ فردوس بریں	۲/۷۵
۲۱۔ ویمانیات	۲/۲۵
۲۲۔ چین آئنز	۴/=
۲۳۔ شکست	۳/=
۲۴۔ مجبور آوازیں	۴/=
۲۵۔ شاہنامۂ اسلام (سوم)	۳/=
۲۶۔ قائداعظم میری نظر میں	۴/=
۲۷۔ مقدس نازنین	۴/=
۲۸۔ صحرانورد کے خطوط (دوم)	۳/۵۰
۲۹۔ خزینۂ معلومات	۴/=
۳۰۔ علی گڑھ کے تین نامور فرزند	۲/=
۳۱۔ شاہنامۂ اسلام (چہارم)	۳/=
۳۲۔ محبت عظیم ہے	۲/۵۰
۳۳۔ نقوشِ قائداعظمؒ	۲/۵۰
۳۴۔ اردو کی آخری کتاب	۲/۵۰
۳۵۔ رحمتِ عالمؐ	۲/=
۳۶۔ اسرائیل قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں	۳/۵۰
۳۷۔ اردو کے چار مزاحیہ شاعر	۲/=
۳۸۔ پولیس افسر کی ڈائری (حصہ دوم)	۳/=
۳۹۔ ذہن کی آزمائش	۳/۵۰
۴۰۔ قاسم کی مہندی	۳/۵۰
۴۱۔ پیغمبر صحرا	۴/=
۴۲۔ نوجوان در مصر کی داستانِ غم	۲/۵۰
۴۳۔ بیاد قائداعظم	۲/۵۰
۴۴۔ افلاطون کی "ری پبلک"	۳/۵۰
۴۵۔ بھٹیلا	۴/-
۴۶۔ ذہن کی آزمائش (حصہ دوم)	۲/-
۴۷۔ قابوس نامہ	۳/۵۰

Marfat.com

سالِ قائدِ اعظم کا انمول تحفہ

قائدِ اعظمؒ
ڈائری
۱۹۷۷ء

یکم دسمبر کو آنے والے شاہکار

شاہکار جریدی کتاب **دفاعِ پاکستان** (نمبر ۴۸)

ہماری فوج ایشیا کی بہترین فوج بنا دی جائے گی۔ وزیرِ اعظم
پاکستان کے اس عزم کی تائید میں، سرحد کے محافظوں
کے نام ایک کتاب۔ ہماری افواج کی عسکری
قوت پر ایک شاہکار تحریر۔
مصنف: منوّر مرزا
قیمت: -/۳

شاہکار
جیبی کتاب (۹)
تاریخ حرب اسلام
دنیائے اسلام کی

بی بی انسائیکلوپیڈیا
معصوم ذہنوں تک سہل انداز میں علم کی ترسیل
کا خوبصورت انداز۔ ردیف دار ترتیب میں، پوری دنیا
کے بارے میں رنگا رنگ معلومات۔ قسط ۱۵۔ قیمت: ۲/۵۰

جہالت کے خلاف جنگ میں ناقابلِ شکست ہتھیار، زندگی کے ہر شعبے سے
انسائیکلوپیڈیا معلومات سے متعلق تفصیلات: قسط نمبر ۸ —— قیمت: -/۳

احیائے فکر و فن کی تحریک شاہکار

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط (۱۶) وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیر اعلیٰ : سیّد قاسم محمود
• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

خواجہ ظفر نظامی لائل پور سے تحریر کرتے ہیں کہ آپ نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی چودھویں قسط، صفحہ ۶۲۷ پر جلوی امام حضرت پیر غلام محمد صاحب قدس سرہ الاطہر کے متعلق جو اشاعت فرمائی ہے اس میں چند امور کی وضاحت اشد ضروری ہے۔

(۱) آں سرکار حضرت امام جلوئی کی تاریخ وصال باکمال ۴ شوال المکرم ۱۳۷۵ھ ہے۔

۲۔ آں سرکار حضرت امام جلویؒ مشہور ہیں۔ آپ فقر و فنا کے سرتاج اور قطب زماں ہیں خواجہ نظام الدّین صاحب تونسوی نے فرمایا تھا کہ آپ حضرت امام جلویؒ ہزار سالہ مجدد ہیں۔ ۱۰ جولائی ۱۹۷۰ء سے آپ کا جسدِ مبارک آپ کی وصیت مبارک کے مطابق لاہور جڑانوالہ روڈ پر ڈھڈیوالہ شریف لائلپور شہر منتقل ہو چکا ہے۔ لہذا اب جناب موضع جلو آنہ میں دفن نہیں ہیں۔ یہاں ڈھڈیوالہ شریف میں آپ کا عالیشان روضہ منورہ زیرِ تعمیر ہے اور اس روضہ اقدس کی پیشگوئی ساٹھ سال قبل خواجہ نور محمد صاحب خلیفہ اعظم حضرت خواجہ خدا بخش صاحب خیر پوری نے فرمائی تھی کہ یہ خاص جگہ ایک فنافی الرسولؐ کی ہے۔ نیز جناب امام جلویؒ نے اپنے معزز مریدین میں سے سات افراد کی ایک کمیٹی تشکیل فرمائی تھی جن کے سپرد دربارِ عالیہ کے کلی انتظامات ہیں۔ امام جلویؒ کا سالانہ عرس مبارک ۲۰-۲۱ اسوج ڈھڈیوالہ میں بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے۔

۳۔ وحدت الوجود اور حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت شیخ الاکبرؒ کے بعد یہ واحد ہستی ہیں۔

۴۔ مذکورہ کتب کے علاوہ جناب امام جلویؒ کی پانچ کتب اور بھی چھپ چکی ہیں جو درج ذیل ہیں:۔ (۱) "مکتوبات طیبات" لیقون من رحیق مختوم المعروف تعلیم توحید و دقیق علوم۔ (۲) "مرآت العاشقین" ملفوظات شریف حضرت سید شیر محمد صاحب گیلانیؒ فتح پوری (۳) وصال باکمال حضرت سید شیر محمد شاہ صاحب گیلانیؒ فتح پوری۔ (۴) خلاصۃ المنام المعروف گلدستہ انعام۔ (۵) اسرار التوحید یعنی ملفوظات حضرت امام جلویؒ جلد اوّل۔ دوم اور جلد اوّل دفتر سوم ——— ان کے علاوہ جناب امام جلویؒ کے خلفاء اور مریدین میں بھی صاحب تصنیف ہیں جن کی بعض کتب شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً ۱۔ تحقیق الاولیا فی شان سلطان الاصفیاءؓ ۲۔ اسرار القدم من خصوص الحکم۔ ۳۔ تفسیر جلویؒ۔ ۴۔ تفسیر رومیؒ ۵۔ تفسیر برزخ جامع۔ (۶) رسالہ برزخ جامع۔ ۷۔ بتنوع الغیب من فتوح الغیب ۔ ۸ گلدستہ عقیدت منظوم جلد اوّل و دوم ——— مندرجہ تمام کتب میاں محمد یار وٹو چک ۲۱۴ ڈھڈیوالہ شریف (لاہور جڑانوالہ روڈ) لائلپور سے دستیاب ہیں۔

شریف اصلاحی

تاریخ اشاعت ۱۵ رجنوری ۱۹۷۷ء ناشر: سیّد قاسم محمود طابع: ریاض حسین الجدہ پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

چنگیز خان مغل سلطنت کا بانی۔

(… ۱۱۶۷ء — … ۶۲۵ھ/۱۸ اگست ۱۲۲۷ء)۔

اس کے باپ کا نام یسوکائی تھا کا بھتیجا تھا جو اصل منگولوں کا آخری خان یا حاکم تھا۔ چنگیز خان کا اصل نام تموجین تھا وہ دریائے اونان کے دائیں کنارے دیلون بولدق کے مقام پر پیدا ہوا جو مشرقی سائبیریا کے موجودہ علاقے چیتہ میں واقع ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں تفصیلی حالات دو مغل کتابوں میں درج ہیں۔ چنگیز خان کا سلسلہ نسب کئی پشتوں سے ہوتا ہوا مجبوراً بھیڑیئے اور سفید ہرن کے باہمی اختلاط تک پہنچتا ہے۔

مغل بارہویں صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے میں مشرقی منگولیا میں غالب رہے لیکن بعد میں انہیں علاقہ بوئرنور کے تاتار نامی ایک قبیلے کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس قبیلے نے شمالی چین کے حکمرانوں کے ساتھ مل کر ۱۱۶۱ء میں مغلوں کو شکست دی۔ اگرچہ اب مغلوں کا کوئی سردار نہیں رہا تھا اور وہ غیر منظم ہو چکے تھے تاہم انہوں نے تاتاریوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ تاریخ میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ چنگیز کی پیدائش کے وقت اس کا باپ دو تاتار سرداروں کو جنگی قیدی بنا کر لایا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام تموجین۔ اوکہ تھا اسی سے چنگیز خان کو اس کا اصل نام تموجین ملا تھا۔

مغلوں میں اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ اپنے قبیلے سے باہر شادی کرتے تھے چنانچہ جب تموجین کی عمر نو سال ہوئی تو اس کا باپ اسے لے کر منگولیا کے انتہائی مشرقی حصے میں گیا۔ تاکہ اس کی ماں کے قبیلے قنقرات میں اس کے لیے کوئی لڑکی تلاش کرے مغلوں کے رواج کے مطابق یسوکائی اپنے بیٹے کو وہیں پر چھوڑ آیا تاکہ وہ اپنے ہونے والے سسر کے خیمے ہی میں پرورش پائے۔ جس کی دس سالہ بیٹی بورتہ سے اس کی شادی ہونا طے پائی تھی۔ اور جس کی قسمت میں شہنشاہوں کی ماں اور دادی بننا لکھا تھا۔ جب یسوکائی وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ تو اس کے دیرینہ دشمنوں نے اس کو پہچان کر ایک دعوت میں زہر دے دیا۔ اس کی بیوی نے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کی کوشش کی جس میں شروع شروع میں تو اسے کامیابی ہوئی لیکن انہوں نے بعد میں اسے اور اس کے کم سن بچوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا تاکہ وہ فاقہ کشی سے خود بخود ہلاک ہو جائیں۔ انہوں نے درختوں کی جڑیں، بیر اور وہ مچھلیاں جو تموجین اور اس کے بھائی دریائے اونان سے پکڑ کر لاتے تھے اور چھوٹا موٹا شکار کر کے گذر بسر کرتے تھے۔

تموجین تقریباً جوان ہو چکا تھا۔ اس کے قبیلے کی ایک شاخ تائیجیوت کو جب یہ پتا چلا کہ وہ زندہ ہے انہوں نے اس مقصد سے ان کے چھوٹے سے خیمے پر حملہ کر دیا تاکہ وہ اپنے باپ کی جگہ نہ لے سکے۔ اگرچہ تموجین بچ کر جنگلوں میں نکل کھڑا ہوا لیکن کئی دن بعد ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے دشمنوں نے اسے مارا نہیں لیکن انہوں نے اسے مستقل طور پر قیدی بنا لیا۔ اس کے گلے میں لکڑی کا ایک طوق ڈال دیا وہ جہاں کہیں بھی جاتے اس کو برابر اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک موقع پر جب کہ وہ لوگ جشن منا رہے تھے تو تموجین کو بھاگ نکلنے کا موقع ملا اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور اس طرح وہ ان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ان لوگوں سے رہائی پانے کے بعد تموجین اپنی ہونے والی بیوی بورتہ کے لیے مشرقی منگولیا کا رخ گیا۔ بورتہ اپنے جہیز میں صرف ایک سیاہ سمور کی کھال لائی۔ یہ کھال اس کے لیے آگے چل کر ترقی کا ذریعہ بنی۔ تموجین نے کھال طغرل کو تحفتہً پیش کی۔ جس کی سلطنت … کے کنارے موجودہ اُرخن بتود کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ طغرل تاریخ میں اونگ خان کے نام سے معروف ہے جو تموجین کے باپ کا اندہ یا خونی بھائی رہ چکا تھا۔ وہ اس تحفے سے بہت خوش ہوا اور اس نے تموجین کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ اس بات کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایک جنگی قبیلے مرکیت کے لوگوں نے تموجین کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور اس کی زیبا بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ تموجین نے طغرل اور اپنے دوست جاموقہ کی مدد سے مرکیت کو شکست دے کر اپنی بیوی کو واپس لے لیا۔ جاموقہ اور تموجین بہت زیادہ گہرے دوست تھے۔ وہ ساتھ ساتھ ہی اپنے خیمے لگاتے تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد دونوں میں رنجش پیدا ہو گئی جاموقہ سے کنارہ کش ہو جانے کے فوراً بعد مغل حکمرانوں نے تموجین کو اپنا خان تسلیم کر لیا اور اسے چنگیز خان کا لقب دیا۔ بعد میں وہ اسی لقب سے تاریخ میں مشہور ہوا۔

قبیلے کا سردار بننے کے بعد چنگیز خان مغلوں کی خانہ جنگیوں میں ایک اہم قوت بن گیا ۱۱۹۶ء میں جب لوگوں نے اس کے سرپرست طغرل کو تخت سے اتار دیا تو اسے کچھ وقت قراختائی کے دربار میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑی بالآخر ۱۱۹۸ء میں چنگیز خان کی مداخلت سے اسے دوبارہ اپنا تاج و تخت واپس مل گیا۔ اسی سال ان دونوں نے تاتار کے خلاف ایک مہم میں چین کے حلیف کے طور پر حصہ لیا۔ ۱۱۹۹ء میں چنگیز خان اور طغرل جسے اب اونگ خان کا لقب مل چکا تھا۔ دونوں نے مل کر مغربی منگولیا میں نایمان قبیلے پر حملہ کیا یہ قبیلہ بظاہر ترکی النسل تھا اور اس کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ۱۲۰۱ء اور ۱۲۰۲ء میں ان دونوں نے کئی موقعوں پر چنگیز خان کے سابق دوست جاموقہ کے دفاقی قبیلوں کو شکست دی۔ ۱۲۰۲ء میں چنگیز خان نے ایک اور لڑائی میں اپنے قدیم دشمنوں تاتاریوں سے آخری انتقام […] لیا۔ اور بحیثیت قوم کے تاتاری نیست و نابود ہو گئے۔ اس اثنا میں طغرل اور اس کے درمیان بھی تعلقات خراب ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ ایک روز ان دونوں کے درمیان کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی۔ پہلی جنگ میں چنگیز خان کو شکست ہوئی لیکن دوسری لڑائی میں چنگیز خان نے طغرل کو شکست فاش دی۔ اور وہ مغرب کی جانب بھاگ نکلا جہاں ایک نایمانی سرحدی سنتری نے اس کا کام تمام کر دیا اور اس طرح مشرقی اور وسطی منگولیا مکمل طور پر چنگیز خان کے زیر اقتدار آ گئے۔ صرف مغرب کی طرف جہاں نایمان کے ساتھ جاموقہ اور مرکیت سردار اور ان کے ساتھ توقتائی بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس علاقے میں چنگیز خان کا اقتدار قائم نہیں ہو سکا لیکن قبل اس کے کہ اس کے دشمن اس پر حملہ کرتے چنگیز خان نے پیش قدمی کر کے ایک معرکے میں انہیں شکست دی۔ اس موقعہ پر نایمان حکمران مارا گیا اس کا بیٹا کوچلوگ مرکیت کے توقتائی کے ساتھ مغرب کی طرف بھاگ گیا تاکہ دریائے ارتش کے بالائی حصوں میں جا کر آخری مرتبہ دشمن کے مقابلے کی تیاری کرے اچانک ایک تیر لگنے سے توقتائی مر گیا اور کوچلوگ کو آگے مغرب کی طرف بھاگنا پڑا۔ جہاں قراختائی کے علاقے میں اس کو پناہ مل گئی لیکن اس اثنا میں جاموقہ کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور دھوکے سے اسے چنگیز خان کے حوالے کر دیا جس نے اسے مروا دیا اور اس طرح چنگیز خان بلا شرکت غیرے منگولیا کا مالک بن بیٹھا۔ ۱۲۰۶ء میں مغل حکمرانوں کے ایک اجتماع میں چنگیز خان کے حاکم اعلیٰ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

۱۲۰۵ء میں چنگیز خان نے تنگوت پر حملہ کیا۔ یہاں کے باشندے تبتی نسل کے تھے اور اس علاقے میں آباد تھے جہاں دریائے زرد کا بڑا موڑ واقع ہے۔ آجکل یہ علاقہ صوبہ کانسو اور علاقہ اوردوس پر مشتمل ہے۔ مزید مہموں کے بعد تنگوت کی حیثیت باجگزاروں کی ہو گئی اور اس طرح شمالی چین پر حملے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ ۱۲۱۱ء میں چنگیز خان نے دیوار چین کے سارے علاقے پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ لیکن دیوار کی وجہ سے ان کی پیشقدمی رک گئی۔ ۱۲۱۳ء میں وہ دیوار چین کو سر کر کے دوسری طرف پہنچ گیا اور مغل

شمال چین کے میدان میں پھیل گئے۔ ۱۲۱۵ء بشمول دریائے زرد کے شمال کا سارا علاقہ منگولوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب وہ تین اطراف سے پیکن (موجودہ بیجنگ) کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چینی شہنشاہ نے شرائط صلح منظور کر لیں اور خراج ادا کر کے منگول فوجوں کو اپنے علاقے پر حملہ کرنے سے باز رکھا۔ یہ خراج وہ بیش بہا جہیز تھا جو چینی شہزادی کو دیا گیا جس کی شادی چنگیز خان سے کر دی گئی لیکن حالات نے منگول کو فوراً بعد ہی چین واپس آنے پر مجبور کر دیا پیکن پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے اسے بالکل تباہ و برباد کر ڈالا۔ شہنشاہ دریائے زرد کے جنوبی کنارے پر واقع کائی فنگ کی طرف بھاگ نکلا۔ لیکن لڑائی اس کے بعد بھی جاری رہی اور بالآخر چنگیز خان کی وفات کے سات سال بعد یعنی ۱۲۳۴ء میں جا کر چین کی تسخیر مکمل ہوئی۔ جو چنگیز خان نے اپنے ایک جرنیل مقلی کے سپرد کی تھی۔

سمرچائی اور سنکیانگ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کے بعد چنگیز خان کی سلطنت کی سرحدیں، سلطان محمد خوارزم شاہ کی مملکت سے جا ملیں۔ ۱۲۱۶ء میں اور مزید احتیاط کے ساتھ ۱۲۱۹ء میں بحیرہ ارال کے شمال اور مشرق میں سلطان محمد کے زیر کمان فوج اور چنگیز خان کے سب سے بڑے بیٹے جوجی کے زیر کمان منگول فوج کے درمیان لڑائی ہوئی منگول فوج اس وقت مرکیت کے باقی ماندہ لوگوں کو مغلوب کر کے واپس آ رہی تھی۔ یہ لڑائی فیصلہ کن ثابت نہیں ہوئی اور آخر میں پیدا ہونے والی آویزشوں پر بظاہر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ یہ آویزش دراصل اس وقت شروع ہوئی۔ جب اترار کے حاکم نے چنگیز خان کے ایک سفیر اور اس کے ساتھ جانے والے مسلمان تاجروں کے کارواں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ چنگیز خان نے خون بہا کی خاطر دوسرا سفیر بھیجا اسے بھی قتل کر دیا گیا اب جنگ ناگزیر ہو گئی۔ ۱۲۱۹ء کے موسم بہار میں چنگیز خان نے دریائے ارتش کے کنارے اپنی فوجیں اکٹھی کیں اور موسم خزاں تک وہ اترار کی دیواروں کے سامنے جا پہنچا اور اس نے شہر کا محاصرہ کرنے کے لیے اپنے بیٹوں چغتائی اور اوکتائی کے ماتحت ایک دستہ یہاں چھوڑا اور ساتھ ہی جوجی کو سیر دریا کے نشیبی جانب ایک مہم پر روانہ کیا۔ اور فوج کا بڑا حصہ ساتھ لے کر خود بخارا کی طرف بڑھا۔ شہر کا محاصرہ ہوا تو محافظ فوجیں اسے چھوڑ کر بھاگ گئیں اور شہر صرف تین دن کے محاصرے کے بعد فروری ۱۲۲۰ء میں تسخیر ہو گیا۔ سمرقند نے بھی بخارا کی طرح بہت کم مزاحمت کی اور مارچ میں اپنی شکست تسلیم کر لی اترار پہلے ہی فتح ہو چکا تھا۔ اور اس کے محاصرین بھی سمرقند کی فتح میں شامل ہو گئے۔ سمرقند سے چنگیز خان نے اپنے دو بہترین جرنیلوں یعنی جبہ اور سبتائی کو سلطان محمد کے تعاقب میں بھیجا۔ سلطان محمد منگول کی تیز پیش قدمی کی خبر سن کر پریشانی کے عالم میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مغربی جرنیلوں نے مغرب کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور آذربائیجان سے گذرنے اور کوہ قاف عبور کرنے کے بعد وہ موجودہ جنوبی روس کے چٹیل میدانوں میں اترے۔ جہاں انہوں نے روسیوں اور قپچاق کی ایک فوج کو کریمیا میں دریائے کلکہ کے کنارے شکست دی۔ اس کے بعد وہ بحیرہ خزر کے شمالی ساحل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وسطی ایشیا میں چنگیز خان سے جا ملے۔

۱۲۲۰ء میں چنگیز خان نے اپنے آدمیوں اور مویشیوں کو آرام دینے کے لیے موسم گرما نخشب کے علاقے میں گذارا۔ موسم خزاں میں اس نے ترمذ پر قبضہ کیا اور پھر دریائے جیحون کے بالائی حصے کا رخ کیا اور ۱۲۲۰ء۔ ۱۲۲۱ء کے موسم سرما میں موجودہ سٹالن آباد کے علاقے میں فوجی سرگرمیوں میں مصروف رہا اور کچھ دن بدخشاں میں بسر کیے۔ سمرقند فتح کرنے کے بعد وہ چغتائی اور اوکتائی کو سلطان محمد کے صدر مقام گرگنج کا محاصرہ کرنے کے لیے پہلے ہی روانہ کر چکا تھا۔ اب اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو خراسان کی تسخیر [illegible] کبھی اپنی سابقہ حالت پید آ سکا۔

بقول ابن الاثیر مرو کے مقام پر سات لاکھ مرد و زن [illegible] موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ جبکہ الجوینی نے قتل ہونے والوں کی تعداد ۱۳ لاکھ [illegible] نیشاپور کے متعلق بھی جوینی نے لکھا ہے کہ "یہ حکم دیا گیا تھا کہ شہر کو اس طرح ہموار کیا جائے کہ اس کی زمین پر ہل چل سکے اور ایک منگول حکمران کی موت کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ بلی اور کتے تک زندہ نہ چھوڑے جائیں"۔ ہرات فتح کرنے کے بعد تولی اپنے باپ سے جا ملا۔ جس نے شہر طالقان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ جو بلخ اور مرو الرود کے درمیان واقع تھا۔ ۱۲۲۱ء کا موسم گرما چنگیز خان نے بلخ کے جنوب کے پہاڑوں میں گذارا۔ اسی اثنا میں سلطان محمد کا بیٹا جلال الدین غزنہ تک آ پہنچا اور چاریکار کے شمال مشرق میں پروان کے مقام پر ایک منگول فوج کو، جو اس کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی تھی شکست فاش دے چکا تھا۔ پوری مہم میں یہ واحد موقع تھا کہ منگولوں کو شکست ہوئی۔

چنگیز خان کو جونہی یہ المناک خبر پہنچی تو وہ بڑی تیزی سے جلال الدین کے تعاقب میں جنوب کی طرف بڑھا اور آخرکار اسے دریائے سندھ کے کنارے آ لیا۔ جلال الدین کو منگول فوجوں نے تین طرف سے گھیر رکھا تھا اور چوتھی طرف یعنی اس کے پیچھے دریا تھا۔ اس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور بعد میں دریا میں کود پڑا اور دوسرے کنارے پر جا پہنچا اور چنگیز کے مرنے کے تین سال بعد تک منگول سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتا رہا۔

بقول نسوی سندھ کی جنگ جو شوال ۶۱۸ھ/۲۴ نومبر ۱۲۲۱ء میں ہوئی چنگیز خان کی مغرب کی مہم کی آخری جنگ تھی۔ اس نے واپسی کی تیاریاں شروع کیں اور آسام اور تبت سے ہوتا ہوا ہندوستان کے راستے واپسی کے امکانات کا جائزہ لینے کے بعد بالآخر اسی راستے واپس چلا گیا۔ جس راستے سے آیا تھا۔ یہ سفر اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑاؤ ڈال کر طے کیا۔ ۱۲۲۲ء کی گرمیاں اس نے ہندوکش کی پہاڑی چراگاہوں میں اور سردیاں سمرقند کے قرب و جوار میں بسر کیں۔ ۱۲۲۳ء میں موسم بہار اور موسم گرما موجودہ تاشکنت (تاشقند) میں بسر کیا۔ ۱۲۲۴ء کی گرمیاں اس نے دریائے ارتش کے بالائی حصے میں بسر کیں اور ۱۲۲۵ء میں موسم بہار میں وہ منگولیا میں جو اس کا صدر مقام تھا پہنچا۔

۱۲۲۶ء میں وہ پھر ایک بار تنگوت سے برسرپیکار ہوا لیکن اس مہم کی کامیابی دیکھنے کے لیے موت نے اسے مہلت نہ دی۔ ۱۲۲۷ء میں جب وہ کانسو میں دریائے حسی پر واقع ضلع چنگ شوئی میں اپنے گرمائی مقام میں آرام کر رہا تھا اس کا انتقال ہو گیا۔

جوزجانی کے بقول جب چنگیز خان نے خراسان پر چڑھائی کی تو اس وقت وہ ایک بلند قامت قوی الجثہ اور تنومند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھدرے بال تھے جو سفید ہو چکے تھے۔ چنگیز خان کی زندگی کے اپنے والد کی وفات کے بعد کے ستائیس سال جب کہ وہ چالیس سال کا ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا دور قسمت آزمائی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس نے اسے ایک حکمران بننے کی تربیت دی۔ چنگیز خان کی فوج کے اعداد و شمار کے متعلق ماخذوں سے جو معلوم ہو سکا ہے وہ اس کی فوج کی تعداد چھ یا سات لاکھ بتاتے ہیں۔

چنگیز کی کامیابی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مغربی اور مشرقی ترکستان کے مسلمان باشندے بادشاہ نایمان کوچلک خان اور خود خوارزم شاہ کے ہاتھوں بہت مظالم برداشت کر چکے تھے۔ اور وہاں کے بہت سے شہر چنگیز خان کا استقبال ایک نجات دہندہ [illegible] کر رہے تھے۔ چنگیز خان ان مسلمان حکمرانوں کے [illegible] بجائے حسن سلوک سے پیش آیا [illegible]

Marfat.com

[illegible]

چنگیز خان جب بخارا پر قبضہ کر چکا تو وہ اپنے بیٹے تولی خان کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کی جامع مسجد میں جو قراخانیوں کے زمانے میں جامع کبیر کہلاتی تھی داخل ہوا اور اس کے ایک حصے میں گھوڑوں کے لئے اصطبل بنوادیا اور وہاں کے علماء اور مشائخ کو ان گھوڑوں کو دانہ کھلانے پر مامور کیا اور خود اپنے امراء کے ساتھ مسجد کے ایک دوسرے حصے میں اپنی فتح و کامیابی کا جشن منانے اور عیش و عشرت کی محفل منعقد کرنے میں مشغول ہوگیا۔ تیسرے روز شہر کے باہر مصلیٰ میں شہر کے اشراف اور دولتمند لوگوں کو جمع کر کے منبر پر کھڑا ہوا اور ان سے اس طرح مخاطب ہوا: "تمہارا گناہ بڑا ہے اور میں اس کے محاسبے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ میں عذاب الٰہی ہوں، اگر تم نے کوئی بڑا گناہ نہ کیا ہوتا تو خدا مجھے عذاب بنا کر نہ بھیجتا۔"

مسلمان علماء میں جس عالم کا ذکر تاریخی مصادر میں چنگیز کے مصاحب کے طور پر آیا ہے وہ قاضی وحیدالدین فشنگی ہے۔ اس سے چنگیز خان نے متعدد بار پیغمبروں اور سابقہ مسلمان حکمرانوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہ آنحضورؐ کو "محمد یلواج" (محمد رسول) کہا کرتا تھا۔ ایک بار فشنگی سے دریافت کیا کہ محمد یلواجؐ نے اس کے بارے میں دنیا میں آنے اور دنیا کو فتح کرنے کے بارے میں کوئی خبر دی تھی یا نہیں۔ اس پر قاضی فشنگی نے اسے وہ احادیث سنائیں جو ترکوں کے خروج کے متعلق ہیں۔ انہیں غور سے سننے کے بعد چنگیز نے کہا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تو سچ کہہ رہا ہے۔"

چنگیز خانوادہ چنگیز کے چار بیٹوں سے جو لورتہ کے بطن سے پیدا ہوئے ان سے جو اولاد ہوئی خانوادہ چنگیز کے نام سے موسوم ہوئی۔

چنگیز کی وصیت کے مطابق اس کی سلطنت اس کے مندرجہ ذیل چار بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔ ۱۔ جوچی ۔ ۲۔ چغتائی ۔ ۳۔ اوکتائی ۔ ۴۔ تولوی ۔

۱۔ جوچی چونکہ اپنے والد کی وفات سے پہلے ہی مرگیا تھا اس کا ورثہ جو میدان قپچاق اور مغربی سائبریا بشمول خوارزم پر مشتمل تھا۔ اس کی اولاد کے حصے میں آیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تیرہویں صدی ہی میں اور یقینی طور پر چودہویں صدی کے اوائل تک اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ عقیدے کے اعتبار سے سنی تھے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

جوچی کے دوسرے بیٹے باتو (م ۱۲۵۵ء) کے حصے میں قپچاق کا میدان آیا۔ اس نے التون اردو کی سلطنت کی بنیاد رکھی اس کے جانشینوں نے ۱۳۶۰ء تک وہاں حکومت کی۔

سولہ برس بعد ۱۳۷۶ء میں التون اردو کی سلطنت باتو کے بڑے بھائی کے جانشینوں کے ہاتھ آئی۔ ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء کے بعد التون اردو کا علاقہ کئی ریاستوں میں منقسم ہوگیا جن پر چنگیز خان کی اولاد کی حکومت تھی۔ اور وہ ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء تک اس پر قابض رہے۔

۲۔ قلمرو استراخان جہاں کوچک محمد کے جانشین ۹۶۵ھ/۱۵۵۷ء تک حکومت کرتے رہے۔ اس دوران میں باتو اور اردہ کے بھائی توغہ تیمور (توقا تیمور) کے جانشین قپچاق کی تقسیم میں اپنا حصہ لینے میں کامیاب ہوگئے ان کا تعلق اس خاندان کی تیسری شاخ سے تھا۔ ان میں حکمرانی کے سلسلے کی تفصیل یہ ہے۔

۳۔ الغ محمد اور بوریک اردو سے نکالے جانے کے بعد قازان کا خان بنا۔ یہ ریاست اس کے جانشینوں سے روسیوں نے ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء میں چھین لی۔

۴۔ الغ محمد کا بھتیجا حاجی گرای کریمیا کا حکمران بنا۔ اس کے جانشینوں نے خاندان گرای کے نام سے یورپ میں چنگیز خان کے آخری جانشینوں کی حیثیت سے اس علاقے میں حکومت کی۔ یہاں تک کہ روسیوں نے ۱۷۸۳ء میں اس پر قبضہ کرلیا۔

۵۔ قاسموف ۔ علاقہ ایازان کی چھوٹی سی تاتاری ریاست میں الغ محمد، کوچک محمد گرای اور شیبانیوں کی شاخوں کے کئی حکمرانوں نے حکومت کی۔ ان میں سے بعض نے عیسائیت قبول کرلی۔ یہ لوگ روسی امراء کے خاندانوں کے مورث اعلیٰ ہے۔

۶۔ استراخان (دیکھئے "۲") میں حکمران شاخ کے جانشین روسی قبضے کے بعد بھاگ کر شیبانیوں کے پاس بخارا میں چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک شہزادے جان محمد بن یار محمد نے شیبانی خان اسکندر کی بیٹی سے شادی کرلی۔ ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۸ء میں خاندان بخارا کی اولاد نرینہ کے ختم ہو جانے کے بعد جان محمد کے بیٹے باقی محمد نے ملک کا انتظام سنبھال لیا اور اس نئے خاندان کا نام استرخانی یا جانیہ پڑ گیا۔ یہ خاندان ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء تک بخارا میں حکمران رہا۔

جوچی کے ایک اور بیٹے مغول کے جانشینوں میں اس کے پوتے نوغائی نے التون اردو کے کئی حکمرانوں کے دور میں ایک مقتدر شخص کی حیثیت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء میں وہ ایک خانہ جنگی کے دوران میں مارا گیا۔ اس کے بعد دو پشتوں تک اس کے جانشینوں کا پتہ چلتا ہے۔

جوچی کے سب سے چھوٹے بیٹے شیبان کے جانشین ابتدائی دور میں کوہ یورال کے جنوب مشرقی علاقے میں دریائے تو بول کے منبع اور مشرق میں بالائی ارتش کے درمیان کہیں رہتے تھے جہاں انہوں نے اپنی خانہ بدوشی کی زندگی کو قائم رکھا۔ جب وہ نقل مکانی کر کے اوردہ کے "آق اردو" کے باشندے تقمیش کی ماتحتی میں قپچاق کے میدان میں چلے گئے تو شیبانیوں نے ان کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ شیبانیوں کی حکومت ماوراء النہر کے مندرجہ ذیل علاقوں میں قائم رہی۔

بخارا پر یہ لوگ ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء تک قابض رہے ان کا آخری حکمران عبداللہ ثانی تھا

خوارزم ۔ اس پران کا اقتدار ۹۱۱ھ ۔ ۹۱۲ھ/۱۵۰۵ ۔ ۱۵۰۶ء میں قائم ہوا۔ اور یہاں پران کا اقتدار ۱۱۰۶ھ ۔ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۴ ۔ ۱۶۹۵ء تک قائم رہا۔

فرغانہ ۔ جس پر شیبانیوں کی ایک شاخ نے ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء میں قبضہ کیا اور ۱۸۷۶ء تک یہاں پران کا اقتدار قائم رہا۔ یہاں تک کہ روس نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

تومن ۔ اس کے نواحی علاقے کو شیبانی حکمران ابک نے ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں ایک غیر چنگیزی سے چھین لیا۔ اور تقریباً ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء تک اس علاقے پر قابض رہے

چنگیز خان کے دوسرے بیٹے چغتائی کے جانشینوں نے بھی تقریباً اتنے ہی عرصے تک حکومت کی۔ انہوں نے اوکتائی کے جانشینوں کا تیرہویں صدی عیسوی میں نہایت جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ ۷۰۰ھ/۱۳۰۰ء کے بعد اندرونی ایشیا ان کے قبضے میں آگیا۔

چغتائی کا پڑپوتا برق اور اس کا بیٹا دوا (۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء تا ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء) چینیوں کی مدد سے قایدو سے جنگ کرتے رہے اور بالآخر اس کی سلطنت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بھائی ترمہ شیرین نے اسلام قبول کرلیا اور اپنے ساتھ اپنے خاندان کو اور رفتہ رفتہ سارے علاقے کو حلقۂ اسلام میں داخل کرلیا۔ اس کی موت کے بعد اس خاندان کی عارضی طور پر دو شاخیں ہوگئیں

۱۔ خاندان کی وہ شاخ جو ماوراء النہر میں حکمران تھی مسلمان ہوگئی۔

Marfat.com

چنگیز (خانوادہ)

چنگیز خان، م ۱۲۲۷ء

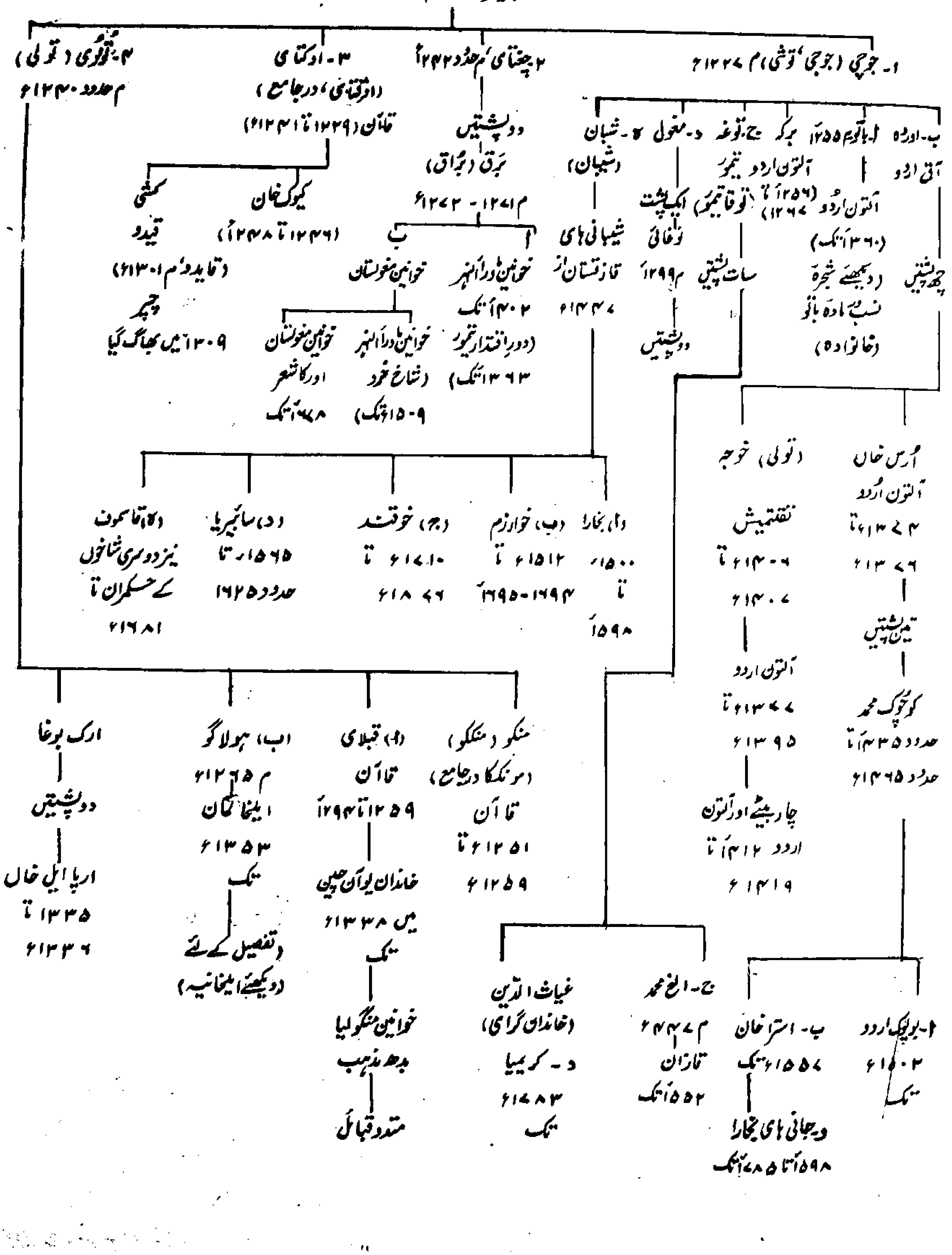

Marfat.com

[illegible] حصہ جو اس وقت مغولستان کہلاتا یا [illegible] خاندان کی دوسری شاخ کے [illegible] آیا۔ اس کے دورِ حکومت میں اسلام بہت آہستہ آہستہ پھیلا۔ ماوراالنہر کے شیبانیوں نے چغتائیوں کو ۹۱۴ - ۹۱۵ھ/۱۵۰۸ - ۱۵۰۹ء میں قطعی طور پر ختم کر دیا۔ صرف تین شن کے مشرق کا مغولستان اس خاندان کے قبضے میں رہا۔ لیکن اسے قبیلہ دوغلات کو بھی اپنے اقتدار میں ایک حصہ دار بنانا پڑا۔ جن کا مرکز کاشغر تھا۔ سولہویں صدی تک چغتائی قوت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی بالآخر ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء میں جب خان اسماعیل کاشغری نے خوجہ کے اقتدار سے نکلنے کی کوشش کی تو چغتائی قوت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔

چنگیز خان کا تیسرا بیٹا قاآن کی حیثیت سے اپنے باپ کا جانشین بنا اور ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء تا ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء تک حکمران رہا۔ اس کے بیٹے کیوک کو بھی ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء تا ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء تک یہ شرف حاصل رہا۔ ان کی وفات کے بعد الگوولوں کی بیواؤں نے اتالیق کی حیثیت سے سلطنت کا کاروبار چلایا لیکن ہاتو کے اثر و رسوخ کے تحت خانیت عظمیٰ اس شاخ میں نہ رہ سکی۔ اور تولوی کی شاخ میں منتقل ہو گئی۔

چنگیز خاں کے سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو خاص منگولیا کا علاقہ بطور اولوس ملا تھا۔ چونکہ اس کے بیٹوں منگو قاآن اور قبلائی کی حیثیت خانان بزرگ کی تھی، ۱۲۸۰ء تک وہ تمام چین پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس لئے منگولیا اور اس کے صدر مقام قراقرم اور وسطی سلطنت کے درمیان خاندانی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ ایک تیسرے بھائی ارق بورگ نے منگولیا میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا لیکن ۱۲۶۴ء میں اسے مغلوب ہونا پڑا۔ ۱۲۹۴ء میں قبلائی کی موت کے بعد پوری مغول سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اس خاندان کی دوسری شاخوں نے آہستہ آہستہ اسلام قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ ایران کے ایلخان بھی جن کے تعلقات خاص طور پر خان بالیغ کے ساتھ بہت زیادہ مسلمان ہو گئے۔

سولہویں صدی کے آخر میں مغول قوم میں بدھ مت اپنے کلیسائے زرد کی لاماتیت والی تبتی شکل میں قدم جما چکا تھا۔ ۱۶۴۹ء کے بعد اور روس کے علاقے میں مغول پھر چینی تسلط میں آ گئے۔

قبلائی کے چوتھے بھائی ہولاگو نے ایران، عراق اور عارضی طور پر شام فتح کیا۔ اس نے عباسی خلافت ختم کر کے ایلخانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی وہ اور اس کے جانشین شروع میں بدھ مت کی طرف مائل تھے لیکن ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء میں وہ غازان کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء کے بعد خانہ جنگیوں کی وجہ سے ایلخانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس شاخ کا آخری فرمانروا انوشیروان تھا۔

چنیوٹ

پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ایک شہر جس کا ضلع جھنگ ہے۔ دریائے چناب کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور شہر سے صرف دو میل کے فاصلے پر بہتا ہے۔ غالباً یہ شہر از منہ قدیم میں چینیوں کی ایک بستی تھی۔ شہر کے بارے میں چند ایک اور روایات ہیں مثلاً یہ کہ قدیم زمانے میں کسی حکمران کی بیٹی جس کا نام "چنیاں" تھا وہ شکار کھیلنے کی بڑی شوقین تھی۔ اسے شکار کے لئے یہ جگہ بہت زیادہ پسند آئی اور اس نے اس جگہ ایک شہر بسانے کا حکم دیا۔ اس شہر کا نام اس کے نام کی رعایت سے "چندنیوٹ" رکھا گیا۔ قدیم تحریروں میں اس کا یہی نام ملتا ہے۔

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے چنیوٹ اور سفید ہنوں کی سلطنت کے صدر مقام ساکلہ کو ایک ہی شہر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۸۰۰ھ/۱۳۹۸ء کی ہندوستانی مہم کے دوران میں تیمور نے اسے فتح کیا۔ اس کے بعد اس شہر پر اسی خاندان کا قبضہ رہا۔ ۸۷۶ھ/۱۴۷۱ء میں والیِ ملتان سلطان حسین بن قطب الدین لنگاہ نے بہلول لودھی کے صوبیدار سید علی خان ملک تاجی کھوکھر کو چنیوٹ کی حکومت سے بے دخل کر دیا۔ اسی اثناء میں بہلول لودھی نے جب اپنے بیٹے باربک شاہ کو پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا سلطان حسین کو یہ تقرر پسند نہ آیا چنانچہ اس نے ملتان کے قریب گھمسان کی ایک لڑائی میں باربک شاہ کو شکست دی۔ لیکن باربک کی فوجیں چنیوٹ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

بابر اس ارادے سے کہ چنیوٹ پر کبھی تیمور خاندان کا قبضہ تھا اس شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء میں چنیوٹ فتح کر لیا۔ اس طرح یہ شہر مغلوں کے زیرِ حکومت آ گیا۔ اکبر کے دورِ حکومت میں یہاں پر ایک خشتی قلعہ تھا۔ اس قلعہ میں پانچ ہزار فوجی رہتے تھے۔

بارھویں صدی ہجری / اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں درانیوں کے حملوں اور سکھوں کی لوٹ مار نے اس شہر کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں چنیوٹ کو ایک بار پھر سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ جب ایک سکھ سپہ سالار نرائن سنگھ نے اس پر حملہ کیا۔ لیکن اگلے ہی سال انگریزوں نے پنجاب کو اپنے علاقے میں شامل کیا تو اس شہر پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

موجودہ چنیوٹ میں اب خاص شہر اور دو نواحی بستیاں شامل ہیں۔ شہر ڑاگنجان آباد ہے۔ شاہ جہانی عہدِ حکومت کے وزیرِ اعلیٰ سعد اللہ خاں علامی نے یہاں ایک خوبصورت جامع مسجد بنوائی تھی۔ اس مسجد میں قرب و جوار کی پہاڑیوں کا پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ چنیوٹ کی موجودہ آبادی اندازاً ۵۰ ہزار ہے۔

چوپان (خانوادہ)

مغل امراء کا ایک خاندان۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ قبیلہ سلاوز کے ایک شخص سیدو خان شیرہ کی نسل سے ہیں جس نے ایک موقع پر چنگیز خان کی جان بچائی تھی۔ اس خاندان کے ممتاز ترین افراد مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ امیر چوپان: ایک قابل اور آزمودہ کار فوجی سپہ سالار تھا۔ اس نے اپنی پہلی لڑائی ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء میں لڑی۔ اس کے بعد اس نے ایلخانی، ارغون، گیخاتو، غازان اور الجایتو کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء میں ابوسعید نے اسے امیر الامراء کے منصب سے نوازا اور اپنی بہن دولندی سے اس کی شادی ہوئی۔ ابوسعید کے عہدِ حکومت میں جو الجایتو کا جانشین بنا، امیر چوپان کو ملکی امور میں بہت اثر و رسوخ حاصل ہو گیا۔ علاوہ ازیں ایلخانی سلطنت کے سب اہم صوبوں پر اس کے بیٹوں کی حکومت تھی۔ ۷۱۹ھ/ستمبر ۱۳۱۹ء میں امراء کی ایک جماعت نے امیر چوپان کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن امیر چوپان نے ابوسعید کی اعانت سے اس بغاوت کو کچل ڈالا۔ دولندی کی وفات کے بعد امیر چوپان نے ابوسعید کی دوسری بہن ساتی بیگ سے شادی کر لی۔ یہ واقعہ ۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء کا ہے۔ ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں اس نے اپنی بیٹی بغداد خاتون سے جو شیخ حسن جلائری کی بیوی تھی سے ابوسعید کو شادی کرنے سے روک دیا۔ دو سال بعد جب امیر چوپان پایۂ تخت سے دور خراسان میں تھا تو اس نے امیر چوپان کو اور پوری ایلخانی سلطنت میں اس کے خاندان والوں کو قتل کرنے کے احکام جاری کئے۔ امیر چوپان کو ان احکامات کی پہلے ہی خبر مل گئی تھی۔ چنانچہ وہ رے تک آیا اور ابوسعید سے گفت و شنید کی لیکن ناکام رہا۔ یہاں

Marfat.com

سے وہ ہرات کی جانب بھاگ کھڑا ہوا اور کرت قبیلے کے رئیس ملک غیاث کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔ جس نے چند ماہ بعد انعام کے لالچ میں ۷۲۸ھ/۱۳۲۷ء میں امیر چوبان اور اس کے بیٹے جلو خان کو قتل کر دیا۔ ان کی لاشیں دفن کے لئے مدینہ منورہ لے جائی گئیں۔

۲۔ دمشق خواجہ: امیر چوبان کا تیسرا بیٹا۔

جب امیر چوبان ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں چغتائی خاندان کے مغلوں کے خلاف خراسان کی حفاظت کے لئے روانہ ہوا تھا تو دمشق خواجہ شاہی دربار میں رہا اور عملاً ایلخانی سلطنت کا حکمران بن گیا۔ اس کی آوارہ مزاجی نے ابو سعید کو جو چوبانیوں کا قلع قمع کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا ایک عذر مہیا کر دیا۔ دمشق خواجہ پر حرم شاہی کی ایک عورت سے ناجائز تعلق کا جرم ثابت ہوا اور اسے ۵ شوال ۷۲۷ھ/۲۴ اگست ۱۳۲۷ء میں موت کی سزا دے دی گئی۔ اس کی بیٹی دلشاد خاتون کی اس کے باپ کی موت کے بعد پہلے ابو سعید سے شادی ہوئی اور بعد میں جلائیری شیخ حسن بزرگ سے۔

۳۔ تیمور تاش: امیر چوبان کا دوسرا بیٹا جو الجائیتو کا وزیر رہا تھا۔

۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء میں ولایت روم کا حاکم بنا۔ وہ پہلی مرتبہ مغول فوجوں کو بحیرہ روم کے ساحلوں تک لے گیا۔ ۷۲۱ھ/۱۳۲۱-۱۳۲۲ء میں اس نے بغاوت کی۔ اس نے مہدی کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کے سکے ڈھالے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ امیر چوبان اپنے اس بیٹے کو گرفتار کر کے ابو سعید کے پاس لایا جس نے اس کے باپ کی خاطر اسے معاف کر دیا۔ اپنے بھائی خواجہ دمشق کے قتل کے بعد تیمور تاش بھاگ کر مصر چلا گیا۔ جہاں پر سلطان الناصر نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ لیکن بعد میں ابو سعید کے تیمور تاش کے لئے مطالبات سے گھبرا کر اسے قتل کرا دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۲ شوال ۷۲۸ھ/۲۱ اگست ۱۳۲۸ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

۴۔ حسن بن تیمور تاش:

اس کو حسن کوچک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں ابو سعید کی وفات کے بعد ایک حیلے سے روم میں اپنے والد کے امیر ڈول کی مدد حاصل کر لی۔ اس نے ذوالحجہ ۷۳۸ھ/جولائی ۱۳۳۸ء میں حسن بزرگ کو نخجوان کے قریب شکست دی۔ پھر اس نے امیر چوبان کی بیوہ ساتی بیگ اور اریہ خان کی تبریز میں اطاعت قبول کر لی۔ ۷۳۹ھ/۱۳۳۸-۱۳۳۹ء میں حسن بزرگ سے شرائط صلح طے کر لیں۔ اگلے سال اس نے اپنی اطاعت ہلاگو خان کی اولاد میں سے سلیمان خان کی طرف منتقل کر کے اس سے ساتی بیگ کی شادی کر دی۔ اسے ۲۷ رجب ۷۴۴ھ/۱۵ دسمبر ۱۳۴۳ء میں اس کی بیوی عزت ملک نے تبریز میں قتل کرا دیا۔

چورم وسطی اناطولیہ کے شمالی حصے کا ایک شہر جو دریائے یمی تورز کے معاون چورم چای سے تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔

چورم ایک وسیع زرخیز وادی میں واقع ہے اور چورم نام کی ولایت کا صدر مقام ہے۔ یہ ولایت انقرہ میں شامل تھی۔ آخری مردم شماری کے مطابق جو ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ اس شہر کی آبادی ۲۲۸۳۵ تھی۔

جدید چورم میں اگرچہ تاریخی دلچسپی کی کوئی خاص بات نہیں ہے اس کی بڑی مسجد "اولو جامع" موجودہ دور کی بنی ہوئی ہے جو ۱۹۰۹ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ لیکن اس کی بنیاد غالباً اٹھارھویں صدی کی عمارت پر رکھی گئی ہے۔ اس مسجد میں سلجوقیوں کے آخری عہد کی ایک [illegible] مشہور ہے کہ یہ مجسمہ و حصار ہے [illegible]

چورم کی ولایت کی بعض فضاؤں میں حتی کی مشہور کہانیاں [illegible]

چوش وسطی والگا کی ایک ترکی بولنے والی قوم۔

چوش کی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ اسی قوم کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ آس پاس کے علاقوں میں بھی آباد ہیں یعنی تاتارستان اور باشقرت کی خود مختار جمہوریتوں الیا نووسک، کوئی بیشو اور سارٹوف کے خطے اور مغربی سائبیریا میں بھی یہ لوگ آباد ہیں۔

ایک خیال کے مطابق چوش قبائل خزر کے اخلاف تھے۔ اگرچہ یہ خیال آج کل ترک کر دیا گیا ہے اور زیادہ قرین قیاس خیال یہ ہے کہ چوش بلغاری الاصل ہیں۔ اس امر کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ آج کل کی چوش زبان اور بلغار شہر کے شکستہ آثار اور دریائے ڈینیوب کے کنارے پر مقابر کے کتبوں کی زبان میں موجود ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں حسین فیض خانوف اور کئی ایک دوسرے محققین چوش کو بلغاری قبیلہ سوک یا سوز کی نسل سے بتاتے ہیں جنہوں نے دیگر بلغاریوں کے برخلاف اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور مظاہر پرستی پر قائم رہے۔

چوش کے بارے میں ایک نیا نظریہ یہ ہے کہ چوش کے اجداد ایسے فن اگری قبائل سے تھے جو ترکی کی تمدن سے مختلف ترکی قبائل کے ذریعے متاثر ہوتے۔ یہ ترکی قبائل جنوب یا جنوب مشرق سے آ کر ساتویں صدی عیسوی میں بلغاریوں کے وسطی والگا تک پہنچنے سے پہلے ہی وہاں وارد ہو گئے تھے۔ ترکی تمدن کا اثر و نفوذ فن اگری لوگوں میں بلغاری عہد میں تیرھویں صدی تک یا اس کے بعد تک جاری رہا۔

ان کی اصل و نسل جو کچھ بھی ہو، چوش ترکی بولتے تھے لیکن مظاہر پرست تھے۔ اٹھارھویں یا انیسویں صدی میں انہیں عیسائی بنا لیا گیا۔ لیکن مسلمانوں یعنی بلغاریوں اور بعد میں تاتاریوں کے رابطے کی وجہ سے اسلامی اثرات سے متاثر ہوتے رہے۔ بعض چوش جو قازان کے تاتاریوں سے بہت زیادہ قریب تھے مسلمان ہو گئے یہ عمل قازان کی خانی حکومت کے دور سے شروع ہوا اور موجودہ زمانے تک جاری ہے۔

ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے انہوں نے تاتاریوں کی زبان اور مذہب دونوں بیک وقت اختیار کر لئے اور وہ تاتاری بن گئے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں قازان کی حکومت میں چوش تاتاریوں سے تین گنا تھے۔

وہ چوش جو مظاہر پرست یا عیسائی ہیں ان میں بیسویں صدی کے آغاز تک بھی ایسے گروہ موجود تھے جو راسخ العقیدہ مسلمان نہ تھے جیسے تاتارستان کی خود مختار سوویٹ جمہوریت کے ضلع KAYBITZK کے کریش چینی کرباشی جو مظاہر پرست ہیں یا اولیانووسک کے علاقے کے چوش جنہیں ۱۹۱۷ء سے پہلے کلیسائے قدیم کا عیسائی تصور کیا جاتا تھا۔

۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد تیرہ لاکھ اناسی ہزار کے لگ بھگ تھی جبکہ ۱۹۵۹ء میں چوش کی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ میں ان کی تعداد دس لاکھ چھیانوے ہزار تھی۔

چوری سرقہ، خفیہ طور پر اس چیز کو لے لینا جس کو لینے کا حق نہ ہو۔

شرعی اصطلاح میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے [illegible]

Marfat.com

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لینے کی حرکت حد درجہ کمینی حرکت ہے اسی لئے اس کی سزا بھی بہت سخت رکھی گئی ہے۔

قرآن مجید میں چوری کی سزا یہ بیان ہوئی ہے

"اور چور خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی۔
(۵ : ۳۸، ۳۹)

بقول مولانا شبلی نعمانی "چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اور اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی اور برائیاں شامل ہیں۔"

اہل عرب میں غالباً عام افلاس کی وجہ سے یہ بیماری اس حد تک تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس بات کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی۔

حضرت عبادہ بن صامت رضؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضورؐ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔" پھر یہ آیت پڑھی۔ "جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری اللہ تعالےٰ کے ذمے ہے۔ اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کو اس کی سزا دے دی گئی تو اس کے گناہ کا کفارہ ہو گیا اور اگر کسی نے ان میں سے ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کرے، چاہے سزا دے۔" (بخاری، کتاب الحدود)

ایک اور حدیث میں آنحضورؐ نے چور پر لعنت بھیجی۔ "فرمایا اللہ تعالےٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ آنحضور نے یہ بھی فرمایا کہ جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔" (بخاری)

نبی کریمؐ نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اور ایک ڈھال کی قیمت آنحضورؐ کے زمانہ میں بروایت عبداللہ بن عباسؓ دس درہم، بروایت ابن عمرؓ تین درہم اور بروایت انس بن مالکؓ پانچ درہم اور بروایت حضرت عائشہؓ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔

اس اختلاف کی بنا پر فقہا کے درمیان کم سے کم نصاب سرقہ میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سرقہ کا نصاب دس درہم ہے اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک چوتھائی دینار۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ مثلاً آنحضورؐ نے ہدایت فرمائی ہے کہ پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ کاٹا نہ جائے گا۔ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ کے زمانہ میں حقیر چیزوں کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔ نیز حضرت عمرؓ نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کے قائل نہیں۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی امام اعظمؒ قطع ید کے قائل نہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

اگر چور خود ایک بار اقرار کرے یا مردوں کی گواہی سے چوری ثابت ہو جائے تو اس کا ہاتھ کاٹنا ضروری ہے۔ اگر ایک جماعت چوری کرے تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اگر جماعت میں سے ایک شخص نے چوری کی اور باقی ہمراہیوں نے اس مال کو آپس میں تقسیم کیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر ہر ایک کے حصہ میں نصاب کی مقدار یعنی دس درہم مال آیا ہے تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے پہلی بار چوری کی تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور اگر وہ دوسری بار پھر چوری کرے تو بالاتفاق اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ پھر تیسری بار چوری کرنے کے جرم میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسے قید کیا جائے گا لیکن امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک تیسری مرتبہ اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور چوتھی بار چوری کرنے پر اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ (نور الہدایہ)

چھینک

جب بخارات دماغ کی طرف چڑھتے ہیں تو دماغ متاذی ہو کر اضطراراً ان کو دفع کرتا ہے اس طرح جو حرکت عمل میں آتی ہے چھینک کہلاتی ہے۔

چھینک سے ایک طرح کی راحت پہنچتی ہے اس لئے چھینک لینے والے کو الحمد للہ کہنے کا حکم ملا ہے۔ یہ کلمہ شکر ہے۔

حضرت عامر بن ربیعہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضورؐ کے پیچھے نماز میں چھینک لی تو کہا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا حَتّٰی یَرْضٰی رَبُّنَا وَبَعْدَ مَا یَرْضٰی مِنْ اَمْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ٥

"سب تعریف خدا کے لئے ہے۔ بہت تعریف، پاک تعریف۔ یہاں تک کہ ہمارا پروردگار راضی ہو جائے اور اس کے بعد ہمارے دنیاوی اور اخروی امور سے راضی ہو۔"

آنحضورؐ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ کلمات کس نے کہے ہیں۔ وہ شخص خاموش ہو گیا۔ آنحضورؐ نے پھر فرمایا کہ یہ کلمات کس نے کہے ہیں اس مرتبہ بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار فرمایا کہ یہ کلمے جس نے کہے ہیں اُسے فوراً بول اٹھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس نے کوئی بری بات نہیں کہی ہے وہ شخص بول اٹھا کہ حضورؐ میں نے کہے ہیں اور میں نے بجز بھلائی کے ان سے اور کچھ ارادہ نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ کلمات سیدھے عرش تک پہنچ گئے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب کسی کو چھینک آئے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ (ہر حال میں خدا کا شکر ہے) کہے اور سننے والا یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہے اور جب سننے والا یَرْحَمُکَ اللّٰہُ (خدا تجھ پر رحم کرے) کہے تو یہ اس کے جواب میں یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ (خدا تمہیں ہدایت دے اور تمہارے دل سنوار دے) کہے (مشکوٰۃ)

ایک حدیث میں جو حضرت انسؓ سے مروی ہے "ایک بار دو آدمیوں کو آنحضورؐ کے سامنے چھینک آئی پس ایک کا تو آپؐ نے جواب دیا اور دوسرے کا جواب نہ دیا۔

اس نے عرض کی یا حضرتؐ آپؐ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا تو آپؐ نے فرمایا اس نے الحمد للہ کہا تھا اور تم نے نہیں کہا تھا" (مشکوٰۃ)

آنحضورؐ کا فرمان مبارک ہے "جب کسی کو چھینک آئی اور اس نے الحمد للہ کہا تو تم جواب دو اور جو نہ کہے تو تم بھی جواب نہ دو" (مسلم)

ایک اور حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آپؐ نے فرمایا کہ جب آنحضورؐ کو چھینک آتی تو آپؐ روئے مبارک ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور آواز مدھم کر لیا کرتے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

حضرت مسلم بن اکوعؓ سے مروی ہے ایک بار آنحضورؐ کے سامنے ایک شخص کو چھینک آئی تو آپ نے یَرْحَمُکَ اللہ فرمایا۔ مگر دوسری مرتبہ فرمایا اس کو زکام ہے۔ (مسلم)

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے تیسری بار یہ فرمایا تھا۔

چیچن

روسیوں کا دیا ہوا ان مسلمانوں کا نام جو وسطی قفقاز میں دریائے سنجہ اور دریائے تیرک کے جنوبی معاون دریاؤں کی وادیوں میں رہتے ہیں۔

یہ لوگ "آئبیرو۔قفقازی" اقوام کے لسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان انگش، بتسزبی اور کستن زبانوں کے ساتھ مل کر ایک خاص گروہ کی تشکیل کرتی ہے جو داغستانی زبانوں سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔

چیچن قدیم "آئبیرو قفقازی" قبائل کی اولاد ہیں جنہیں الائن نے درہ دریال اور وادی تیرو ارغون کے درمیان بلند پہاڑیوں کی طرف بھگا دیا تھا۔ اٹھارھویں صدی تک ان کی تاریخ کا قطعی پتہ نہیں چلتا۔ ان کے بارے میں صرف اس حد تک معلومات ملتی ہیں کہ سولھویں صدی میں ان کے غلہ بان قبیلوں نے اس علاقے میں آنا شروع کیا جو آج کل چیچنوں کے ملک کا شمالی حصہ ہے۔ شروع میں وہ کبرد حکمرانوں کے محکوم تھے لیکن اٹھارھویں صدی میں وہ روسیوں کے آنے سے ذرا پہلے انہوں نے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا تھا۔

یہ لوگ حنفی مسلک تھے جو سترھویں صدی سے داغستان اور کبردیا کی راہ سے اس ملک میں داخل ہونا شروع ہوا۔

جب روسی فوج کے دستے اس علاقے میں داخل ہوئے تو چیچن خیلوں میں منقسم تھے۔ ان میں سے بعض قبیلوں کی صورت میں متحد تھے۔ روسیوں نے چیچن کا نام اٹھارھویں صدی کے وسط میں روسیوں کی جنوب کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی تو اس پیش قدمی میں قلعے تعمیر ہوئے۔ قازقوں کی نوآبادیاں قائم کی گئیں اور مقامی باشندوں کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر کے انہیں بلند کہساروں کی طرف بھگا دیا گیا۔

چیچنوں نے روسی پیش قدمی کا جم کر مقابلہ کیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں بلاد چیچن شمیل کی امامت کا سب سے بڑا گڑھ بن گئے۔ اور روسی ۱۸۵۹ء تک بمشکل ان پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ۱۸۶۵ء میں چیچنوں کا ایک گروہ جو چالیس ہزار افراد پر مشتمل تھا ترکیہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب سے ذرا پہلے بلاد چیچن میں امن و امان قائم ہو گیا تھا۔

انقلاب سے پہلے چیچنی معاشرے میں قدیم اور اصلی جاگیردارانہ نظام قائم رہا تقریباً ہر جگہ چالیس سے پچاس افراد تک کا ایک بڑا سا قبیلی خاندان نظر آتا تھا۔ بعد ازاں چیچنی معاشرے نے معاشرتی طبقات میں کسی قسم کی تفریق کو تسلیم کرنا چھوڑ دیا۔ اور تمام چیچن اپنے آپ کو اندرونی اختیارات [illegible] اکتوبر کے انقلاب کے بعد ملک چیچن [illegible] کا آخری گڑھ رہ گیا تھا، ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء میں اسے جمہوریہ کوہسار میں شامل کر لیا گیا اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو بالائی چیچنیا کو خود مختار خطہ چیچن بنا دیا گیا۔ ۷ جولائی ۱۹۲۴ء کو بلاد انگش کو خود مختار خطہ انگش کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۹ء کو گروزنی سے ملحقہ نشیبی علاقے کو چیچن کے خود مختار خطے میں شامل کر دیا گیا۔ لیکن جنوری ۱۹۳۴ء میں ان دو مختار علاقوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ اور اسے چیچن۔ انگش خود مختار علاقے کا نام دے کر ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو چیچن انگش آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریہ کی صورت دے دی گئی۔ ۲۵ جون ۱۹۴۶ء کو یو ایس ایس آر کی سپریم کورٹ کے حکم سے اس جمہوریہ کو ختم کر دیا گیا اور چیچن اور انگش اقوام کو ملک بدر کر کے وسطی ایشیا میں بھیج دیا گیا۔ ۹ جنوری ۱۹۵۷ء میں سپریم سوویٹ کے ایک نئے حکم نے مہاجرین کو بحال کر دیا۔ اور چیچن انگش آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریہ پھر قائم ہو گئی۔

موجودہ زمانے میں چیچن۔ انگش کی آزاد سوویٹ اشتراکی جمہوریہ کا کل رقبہ انیس ہزار تین سو مربع کلومیٹر ہے اور ۱۹۵۸ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی سات لاکھ تھی۔ جس میں چیچنوں کی حیثیت اقلیت کی ہے۔

چین

آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک جو براعظم ایشیا کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے اس کا نمبر روس اور کینیڈا کے بعد آتا ہے۔

چین کے مغرب میں روس، پاکستان اور ہندوستان کا علاقہ ہے شمال میں روس اور منگولیا، شمال مشرق میں شمالی کوریا اور روس اور جنوب مشرق میں بحرالکاہل سے ملحقہ سمندر بحیرہ مشرقی چین، جنوبی بحیرہ چین واقع ہیں۔ جنوب میں ہندوستان، نیپال، بھوٹان، برما، لاؤس اور شمالی ویت نام جیسے ممالک ہیں۔ تائیوان (فارموسا) مشرقی اور جنوبی بحیرہ چین کے درمیان واقع ہے۔ چین کی مشرقی سمت میں ہانگ کانگ ہے۔

چین کی آبادی پچاسی کروڑ اور رقبہ ۳۶,۹۱,۵۰۱ مربع میل ۹۵,۶۰,۹۸۸ مربع کلومیٹر ہے۔ پیکنگ دارالحکومت ہے۔ چین کے اکیس صوبے اور وفاقی لحاظ سے پانچ خود مختار یونٹ ہیں جغرافیائی اعتبار سے یہ ملک کئی صوبوں میں بٹا ہوا ہے۔

چین کی سرزمین کی طرح یہاں کے باشندے بھی کئی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہن، جنہیں چین کے اصل باشندے سمجھا جاتا ہے اصل چین اور منچوریا میں آباد ہیں یہ لوگ ملک کی کل آبادی کا نوے فی صد ہیں۔ چین کے باقی باشندوں کی تعداد ملک کے مغربی اور شمالی حصوں میں آباد ہیں ان کی اکثریت منگول، تبتی اور یوگرز لوگوں پر مشتمل ہے یہ مختلف زبانیں بولتے ہیں، ترکی، منگولی اور تبتی زیادہ بولی جانے والی زبانیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ بدھ اور کنفیوشزم کے پیرو ہیں مسلمان بھی تھوڑی تعداد میں آباد ہیں۔

چین کے اسی فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں ۱۹۶۵ء تک زراعت سے کل قومی آمدنی کا پچاس فی صد حاصل ہوتا تھا۔ چین میں صنعتی ترقی کا آغاز ۱۹۴۹ء میں ہوا ۱۹۶۵ء میں چینی کارخانوں نے قومی پیداوار کا ۲۶% فی صد حصہ فراہم کیا۔ چین کی قدیم ترین صنعت پارچہ بافی نے صنعتی ترقی اور قومی آمدنی [illegible] کردار ادا کیا۔

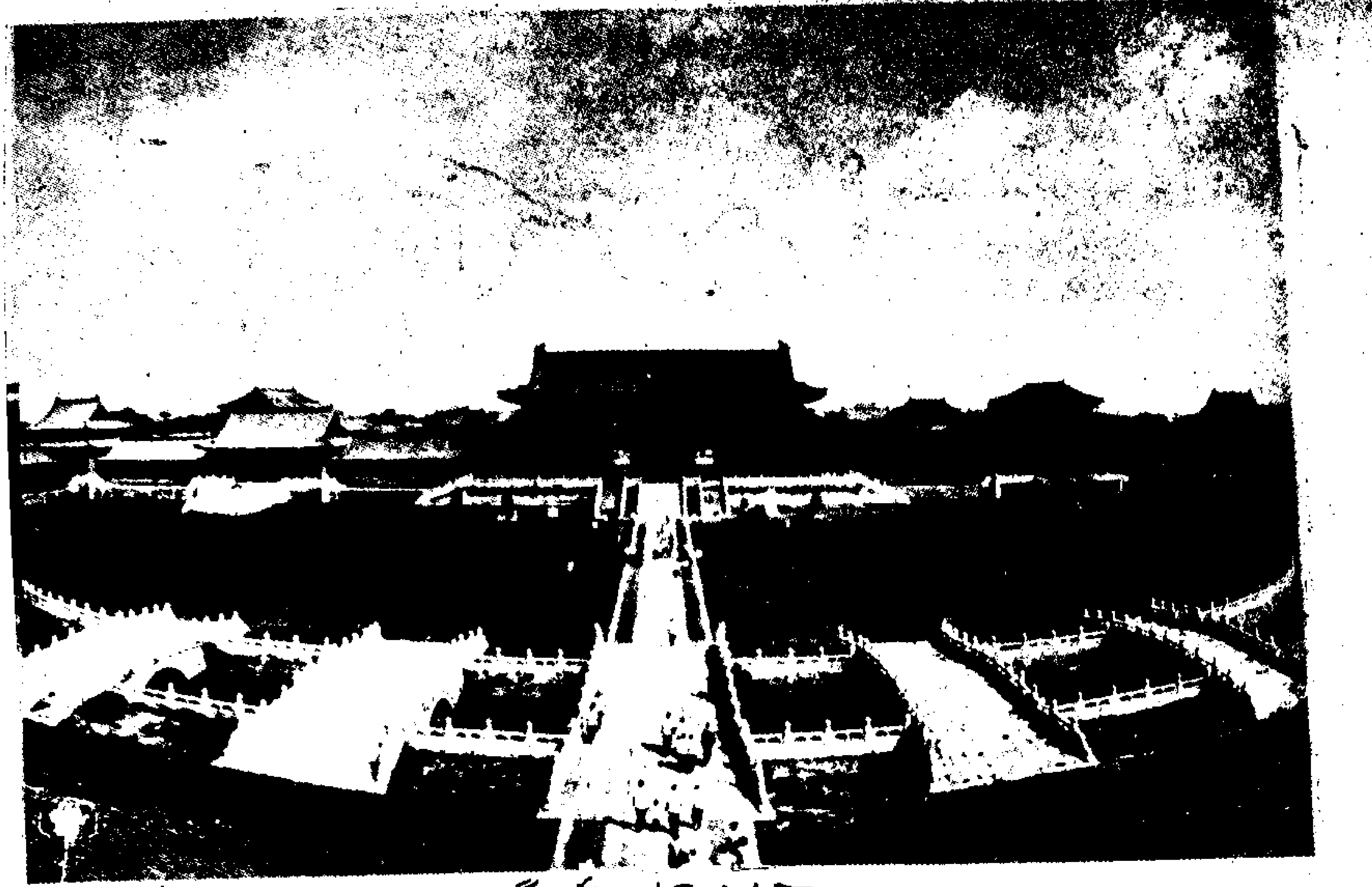

چین کا عجائب گھر

چین کی تاریخ بڑی پُرانی اور متنوع ہے۔ یہاں سے ایسے انسانی ڈھانچے ملے ہیں جو دس لاکھ سے بھی زیادہ پُرانے ہیں جس سے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کرہ ارض کے ابتدائی عہد کے انسان چین میں آباد تھے شمالی چین کے میدانوں میں دریائے زرد کی وادی قدیم انسانی تہذیب کا گہوارہ تھی جس نے اپنے انوکھے منفرد اور عالیشان تہذیبی اثرات چھوڑے۔

ولادت مسیح سے تین ہزار سال پہلے چین دنیا کا متمدن ترین ملک سمجھا جاتا تھا۔ تاریخ میں چین کے جس پہلے بادشاہ کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے اس کا نام فوہی تھا جو ۲۸۵۲ ق-م سے ۲۷۳۸ ق م تک حکمرانی کرتا رہا۔ چینیوں نے اسے دیوتا کا درجہ دے دیا تھا اس کے بعد تین شہنشاہوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کی حکومت ۲۴ویں صدی قبل مسیح تک رہی ان کے بعد یاؤ اور رسں آتے ہیں جن کو چینیوں نے پہلے صحیح حکمران قرار دیا ہے۔

۲۲۰۵ ق-م میں ہسیا خاندان کی حکمرانی تھی اگرچہ اس بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ واقعی یہ خاندان کبھی چین پر حکمران رہا ہے۔ البتہ اس بات پر تمام تاریخ دان متفق ہیں کہ چین میں سب سے پہلے شنگ یا ین خاندان نے حکومت کا آغاز کیا۔ اس خاندان نے ۱۷۶۶ تا ۱۵۲۲ قبل مسیح تک حکمرانی کی ۱۱۲۲ قبل مسیح میں ریاست "چو" کے حکمران ود نے اس خاندان کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ پہلا حکمران خاندان ہے جس کے بارے میں تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ یہ خاندان تین سو سال تک حکمران رہا۔

۶۰۰ سے ۳۰۰ قبل مسیح کے عرصے میں چین میں تین مشہور فلاسفر پیدا ہوئے جنہوں نے چینی زندگی کو بے حد متاثر کیا یہ لاوزو، کنفوشس اور ہسانزو تھے۔ ان میں سے کنفوشس کے فلسفے نے چینیوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا اس کی تعلیمات میں سے اہم یہ ہے کہ لیڈر صرف اچھی مثالیں قائم کر کے تعلیم کی مدد سے نرم روی اور انصاف اختیار کر کے لوگوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے اس خیال کو دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی کہ آدمی سکونِ قلب صرف دنیا کے لوگوں کے لیئے برادرانہ محبت کے جذبے اور ذاتی ڈسپلن کے ذریعے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ مثالی ڈھانچے، منظم، تعلیم یافتہ اور باہمی اتحاد کی بنیاد پر قائم ہونے والی جس سوسائٹی کا خواب کنفیوشس نے دیکھا وہ کئی سو برس تک چین کے لوگوں کا ایڈیل بنی رہی۔

۲۵۶ ق-م میں چاؤ خاندان ختم ہوا اور ۲۴۹ ق-م میں چی ان خاندان اقتدار پر براجمان ہوا۔ ۱۴۱ قبل مسیح میں ودتی حکمران کے عہد میں چین اس قدر مضبوط تھا کہ اس کی قدیم سرحدیں وسیع کرنے کا کام آسانی سے ہونے لگا۔

ہن حکمرانوں کے عہد میں چین معاشی لحاظ سے خوشحال ہوگیا۔ ۸ء میں حکومت کے ایک عہدے دار وانگ پینگ نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد ہن خاندان نے حکومت واپس لے لی۔ ۲۲۰ء میں آخری ہن حکمران کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پونے چار سو سال تک چھ مختلف خاندان چین پر حکومت کرتے رہے۔ ۵۵۰ء میں سوئی خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ لیکن سوئی خاندان ہی کے ایک افسر اعلیٰ نے اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد تین سو سال تک تیانگ خاندان حکومت کرتا رہا۔

۸۰۰ء میں اندرونی انتشار کے باعث ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ۹۰۰ء میں خریفوں نے چین سے منگولیا، منچوریا اور کوریا کے علاقے چھین لیئے اس کے بعد سنگ خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ خاندان ۹۶۰ء سے ۱۲۷۹ء تک حکمران رہا۔ ۱۲۶۰ء میں قبلائی خان نے یوان خاندان کی بنیاد رکھی اور یہ خاندان ۱۳۶۸ء تک برسر اقتدار

Marfat.com

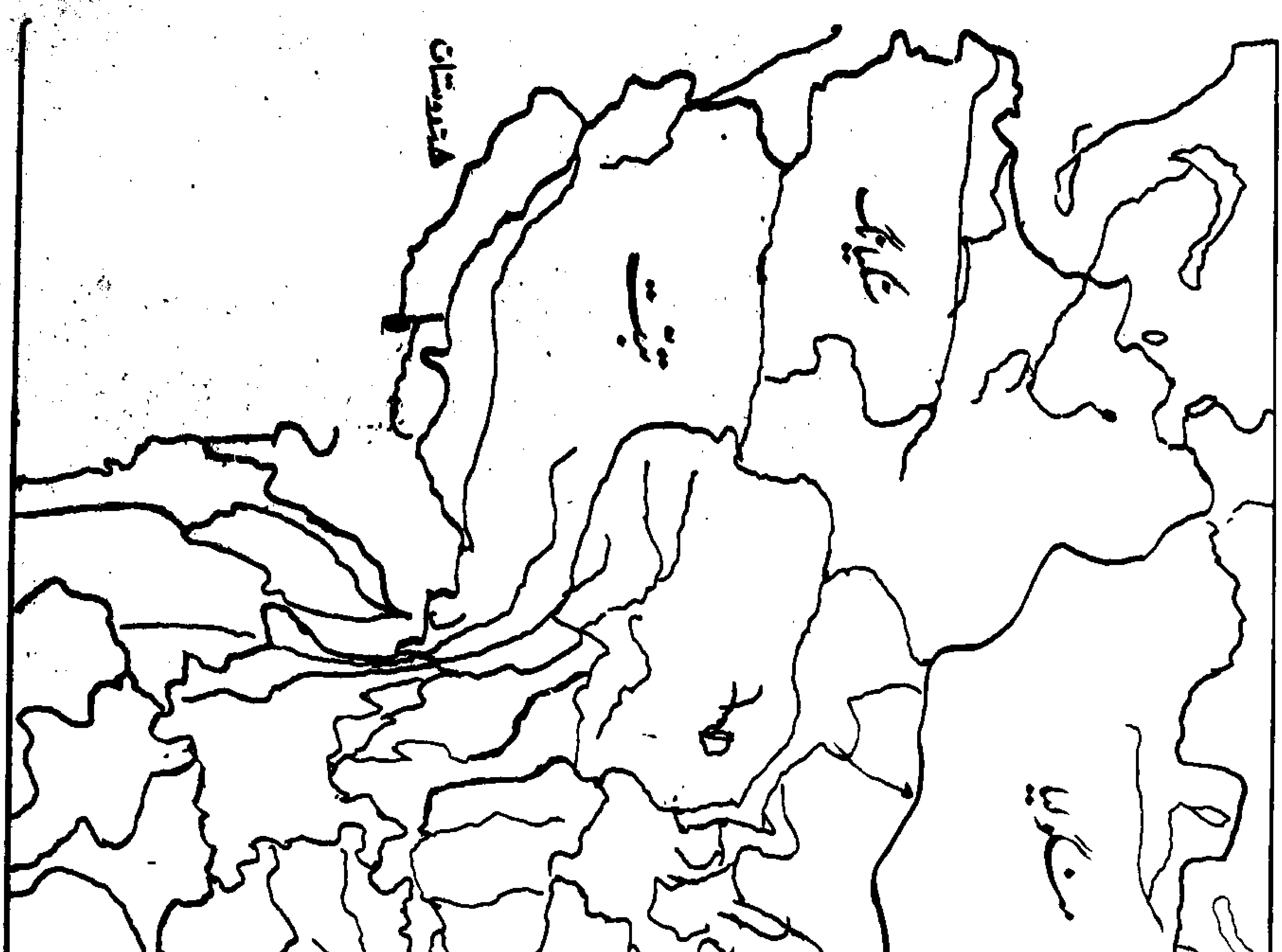
ہندوستان
تبت
منگولیا
بحیرہ جنوبی چین
بحیرہ مشرقی چین
بحیرہ زرد

Marfat.com

اس کے بعد منگ خاندان نے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ انھوں نے اہلِ چین یا چین کے باشندوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۴۰۰ء میں منگولوں کے پاس اس ملک کا صرف مغربی اور کچھ شمالی علاقہ رہ گیا۔ ۱۴۲۱ء میں منگ خاندان کے بادشاہ نیگ وہم نے پیکنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ آخری خاندان جس نے چین پر بادشاہت کی مانچو خاندان تھا۔ اس خاندان کا دورِ حکومت ۱۶۴۴ء سے ۱۹۱۲ء تک ہے۔ ۱۹۱۴ء کو چین میں پہلی مرتبہ جمہوری تحریک کو کامیابی نصیب ہوئی۔ ڈاکٹر سن یات سن جمہوریہ چین کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے انتقال کے بعد چیانگ کائی شیک برسرِ اقتدار آئے۔ انھوں نے ملک کی انقلابی تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی ۱۹۳۵ء میں انقلابی تحریک کی قیادت ماؤزے تنگ کے ہاتھ میں آ گئی۔ چیانگ کائی شیک اقتدار سے محروم ہو کر فارموسا بھاگ گیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عوامی جمہوریہ چین کا پرچم سارے ملک پر لہرانے لگا۔

اس ملک کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے۔ جس میں آنحضورؐ نے فرمایا۔ "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔ بقول علمائے کرام یہاں چین سے مراد دور دراز کا علاقہ ہے۔

حاتم بن ہرثمہ ایک شخص جو خلفائے عباس کی ملازمت میں متعدد عہدوں پر فائز رہا۔

اس کے لئے الامین کی طرف سے صالح کی طرف ایک خط شوال ۱۹۲ھ/ اگست ۸۰۸ء میں لکھا گیا تھا۔ جس میں ولی عہد نے اپنے بھائی کو ہدایت کی تھی کہ حاتم بن ہرثمہ کی اس کے عہد میں توثیق کر دے۔ نیز خلیفہ کے محلات کی حفاظت کا کام اس کے سپرد کر دے۔ بعد میں الامین نے حاتم کو مذہبی اور مالی اختیارات کے ساتھ مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس سے قبل وہ ۱۷۸ھ/ ۷۹۴ء میں اپنے باپ کی گورنری کے دوران میں مصر میں پولیس کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہ چکا تھا ۱۹۴ھ/ ۸۱۰ء میں مصر میں ایک ہزار خراسانی ابناء کی فوج کے ساتھ گورنر کی حیثیت سے پہنچا۔ اس نے پہلے بلبیس میں قیام کیا۔ اس دوران میں اس نے حوف یا مشرقی ڈیلٹا کے سرکش عربوں کو خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ بعد میں اس نے ان میں سے ایک سو کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ ۴ شوال ۱۹۴ھ/ ۱۱ جولائی ۸۱۰ء کو وہ فسطاط پہنچا جب الامین اور المامون کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی چونکہ حاتم کو المامون کا طرفدار خیال کیا جاتا تھا اس لئے الامین نے اس کو برطرف کر دیا۔ حاتم نے جمادی الآخرہ ۱۹۵ھ/ مارچ ۸۱۱ء میں مصر کو خیرباد کہا۔ ۲۰۰ھ/ ۸۱۶ء میں جب اس کے والد نے وفات پائی تو وہ آرمینیہ کا گورنر تھا اس کے بعد کے حالات بہت کم دستیاب ہیں۔

حاتم طائی بن عبداللہ بن سعد۔ دورِ جاہلیت کا ایک شہسوار اور شاعر، زمانہ زیست چھٹی صدی عیسوی کے نصف ثانی سے لیکر ساتویں صدی کے اوائل تک ہے۔ وہ بشر بن ابی خازم اور عبید بن الابرص جیسے شعراء کا ہم عصر تھا۔

حاتم میں ایک صاحبِ مروت شخص کے اوصاف، خاص طور پر مہمان نوازی اور سخاوت بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس نے مہمان نوازی اور سخاوت کرنے میں اپنی ضروریات کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس کے اندر جود و سخا کا یہ میلان اس کے بچپن ہی میں ظاہر ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دادا نے اس کے بچپن ہی میں ساتھ چھوڑ دیا تھا جس کی سرپرستی میں اس نے پرورش پائی تھی۔ کیونکہ اس کا والد عین جوانی میں وفات پا گیا تھا۔

عام روایت کے مطابق جو اس کے بارے میں کی جاتی تھی وہ قبل از اسلام کے عربوں کا ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس کی فیاضی ضرب المثل تھی۔ اسی وجہ سے اسے جوادیا اجود کہتے تھے۔ بعض روایات میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ اپنی وفات کے بعد بھی جو غالباً آنحضورؐ کی پیدائش کے قریب سال واقع ہوئی تھی، وہ ان لوگوں کی حاجت برآری کیا کرتا تھا جو اس کے مزار پر جا کر اس کی مہمان نوازی کے طلبگار ہوتے تھے۔

اس کا مزار غالباً بلاد طئی کے ایک پہاڑ کے اوپر تھا جو تنغر میں وادی حائل کے کنارے واقع تھا۔ اس کے مزار کے دائیں اور بائیں جانب پتھر کی چار مورتیاں تھیں جن کی شکل لڑکیوں کی سی تھی اور جو بال بکھیرے ہوئے اس کے مدفن پر نوحہ کر رہی تھیں اس کے مزار کے قریب اس بڑی دیگ کے باقی ماندہ ٹکڑوں کی بھی نمائش کی گئی تھی جس میں سے وہ اپنے مہمانوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔

بقول پال گریو "حاتم کا مزار اس علاقے میں اب تک مشہور و معروف ہے"۔ حاتم کے اشعار زیادہ تر سخاوت اور ایثار کی تعریف میں ہیں۔ عربی ادب میں حاتم کی شخصیت بہت ہر دلعزیز ہے۔

حاجب اصطلاح میں حاجب کا لفظ مسلم ممالک میں ایسے شخص کے لئے ہوتا تھا جو بادشاہ تک رسائی والے دروازے کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح بہت جلد دربار میں ایک حیثیت اور عہدے کا نام بن گئی۔ اس عہدے کی نوعیت مختلف خطوں اور مختلف ادوار میں خاصی بدلتی رہتی تھی۔

اموی دور کی ابتدا ہی میں حاجب کا عہدہ نظر آتا ہے حاجب نہ صرف حکمران کے حضور میں احباب اور ملاقات کرنے والوں کو پیش کرتا، بلکہ وہ سنجیدہ اور شریف سامعین کی تنظیم کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس دور میں حاجب کتاب سیکرٹریوں کی ہم مرتبہ حیثیت میں خلیفہ کے مصاحبوں میں شامل تھا۔

عباسی دور میں دربار کے دو عہدے سب سے زیادہ اہم تھے۔ ایک عہدہ وزیر کا تھا اور دوسرا عہدہ حاجب کا۔ یہ دونوں عہدے موالی کو عطا کئے جاتے تھے حاجب کا مرتبہ وزیر کے مرتبے سے کم تھا۔ حاجب جو محل کے خدام میں سے مقرر ہوتا تھا، محل کے خدم و حشم کا سربراہ بھی ہوتا اور رسوم کا نگران بھی۔ اسے بعض اوقات یہ حکم بھی ملتا تھا کہ ایسے اشخاص کو تشدد آمیز طریقوں سے برطرف کر دے جنہوں نے خلیفہ کو ناخوش کیا ہے۔

عباسی دورِ حکومت کی پہلی دو صدیوں میں وزیر اور حاجب کے درمیان مسلسل رقابت چلتی رہتی۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ رقابت برقرار تھی لیکن اس صدی کے آخر میں حاجب کی حیثیت وزیر کی حیثیت کے مقابلے میں کسی قدر کم ہو گئی۔ حاجب کی امیر کے ساتھ بھی رقابت تھی جو اس دور میں فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ ۳۱۷ھ/ ۹۲۹ء سے حاجب کا عہدہ زیادہ تر فوجی نوعیت کا ہو گیا تھا اور حاجب فوجی سپہ سالاروں (امراء) کے رقیب بن گئے تھے۔ بقول الصابی اس دور میں حاجب کے سرکاری فرائض اب بھی خلیفہ کی خدمت یا حفاظت سے متعلق تمام اشخاص کی نگرانی کرنا، محل کے اندر کے تمام امور کا نظم و

Marfat.com

نسق اور مختلف معززین اور درباریوں کے مراتب کی صحیح تعین کرتے ہوئے درباروں کا انتظام کرنا تھا۔

اندلس میں حاجب کی حیثیت مشرق کے حاجب سے مختلف تھی۔ یہاں پر حاجب کا لقب وزیر کے لقب سے ہمیشہ اعلیٰ تر ہوتا تھا اور وزراء کی حیثیت مختلف النسل کے مشیروں سے زیادہ نہ تھی۔ حاجب انتظامی اور سرکاری امور میں حکمران کی اعانت کرتا اور بطور وزیر اعلیٰ کام کرتا تھا۔ وہ شہری انتظامیہ کے تین محکموں یعنی قصر شاہی، دیوان وزارت اور شعبۂ مالیات کا نظم و نسق اس کے ہاتھ میں تھا۔

جب اندلس میں اموی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ملوک الطوائف نے ملک کے بجائے اپنے لئے حاجب کا لقب اختیار کر لیا۔

سامانیوں کے دور میں محلاتی نظام اور دفتری نظام عباسی خلفاء کے طرز پر تھا۔ چنانچہ سامانی حاجب امیر کے اپنے نجی عملے سے ابھرتا تھا۔ اگرچہ چوتھی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں اور غالباً اس سے بھی کچھ پہلے سے حاجب محل کا ایک خالص نجی عہدے دار نہ رہا تھا بلکہ وہ بنیادی طور پر ایک اعلیٰ فوجی سالار ہو گیا تھا۔ چونکہ سامانی فوج مرکزی اور اہم حصہ ترکی غلاموں کا محافظ دستہ تھا۔ اس لئے حاجب اعلیٰ محل کے عملے کا سربراہ بھی ہوتا تھا اور فوج کا سپہ سالار اعلیٰ بھی۔

یہ عہدہ سامانیوں سے خراسان میں ان کے جانشین غزنویوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ سلطان کے ماتحت فوج کے سالار اعلیٰ کا لقب حاجب بزرگ ہوتا تھا اور حاجب اور جرنیل براہ راست اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ غزنوی حاجب بزرگ سامانی حاجب بزرگ کے مقابلے میں محل کے انصرام پر بلاواسطہ اختیار رکھنے میں ایک قدم پیچھے ہوتا تھا۔

سلجوقی عہد میں غزنوی دور کے مقابلے میں امیر حاجب کے عہدے کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ اس وقت حاجب خاص طور پر سالار فوج نہیں رہا۔ بلکہ ایک درباری عہدیدار بن گیا۔ تمام امیروں کی طرح امیر حاجب بھی فطری طور پر فوجی مہموں میں حصہ لیتا تھا اور بسا اوقات ملک کی افواج کے ایک حصے کی قیادت بھی کرتا تھا۔ اس دور میں حاجب کے فرائض بقول نظام الملک درباری عہدیدار کے تھے۔ نیز امیر حاجب عملی طور پر بالعموم ایک ترک امیر ہوتا تھا۔ اور اس کے ماتحت عموماً غلام ہوتے تھے۔ اس کا تعلق فوجی نظم و ضبط اور درباری اداب سے ہوتا تھا وہ دربار کا اہم ترین عہدیدار ہوتا تھا جس کا منصب امیر حرس سے بلند سمجھا جاتا تھا۔

بقول ابن الاثیر بڑے بڑے امیروں اور صوبائی گورنروں کے اپنے دربار ہوتے تھے اور ان کے بھی حاجب ہوتے تھے۔

ایلخانیوں کے دور حکومت میں حاجب قصر شاہی کا منصرم ہوتا تھا وہ شاہی دربار یا صوبائی درباروں میں اکثر فوجی طبقے کا رکن ہوتا تھا

تیموریوں کے عہد میں حجاب دربار کے عہدیداروں میں سے ہوتا تھا اور اس کا رتبہ نواب حضرت سے کچھ کم ہوتا تھا۔

صفویوں کے دور میں حاجب کی اصطلاح میں تبدیلی ہو گئی۔ اب حاجب اعلیٰ کو ایشک آقاشی باشی کہا جانے لگا۔ اس کے فرائض بھی بالکل وہی ہوتے تھے جو حاجب دربار کے ہوتے تھے۔

فاطمیوں کے دربار کا حاجب ایک بلند درجے کا اہل کار ہوتا تھا۔ جو صاحب الباب کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ لیکن اس کے ماتحت حاجب کہلاتے تھے۔ نیز بسا اوقات اسے بھی اس کے معروف لقب صاحب الباب کی بجائے حاجب الباب کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ابن الطویر نے [illegible] کا ذکر کیا ہے اس کا فرض یہ تھا کہ سرکاری ملاقاتوں کا انتظام کرے اور وہ غیر مجاز ملاقاتیوں کو دور رکھے۔

شام کے سلجوقی حکمرانوں نے پہلی بار حاجب کا عہدہ قائم کیا جو مشرق میں معروف تھا۔ اس دور میں اس عہدے پر ایک فوجی عہدیدار کا تقرر ہونے لگا جس کے فرائض فوجی نوعیت کے تھے۔ مثلاً وہ قلعے کی کمان کرتا اور شحنہ کی حیثیت سے کام کرتا۔ یا بعض اوقات سفیر کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا۔

الغرض مصر میں ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں حاجب کی اصطلاح کا استعمال بھی قصر شاہی کے منصرم کے معنی میں ہوتا تھا۔

ملوک عہد میں بھی حاجب منصرم محلات کے کچھ فرائض انجام دیتا تھا بڑا حاجب یعنی حاجب الحجاب سلطان کے دربار میں سفیروں، مہمانوں، فریادیوں اور دوسرے زائرین کو پیش کرتا تھا۔ تاہم مملوکوں کے عہد میں حاجب کے بنیادی فرائض شرطہ کے بجائے عدلیہ سے متعلق تھے وقت کے ساتھ ساتھ حاجب الحجاب کا عدالتی دائرہ کار خاصا وسیع ہوتا چلا گیا۔ پہلے پہل وہ مصر میں نائب السلطنت کے ماتحت تھا لیکن یہ عہدہ خالی چھوڑ دیا جاتا یا بعد میں جب اسے ختم کر دیا گیا تو حاجب نے بہت زیادہ قوت حاصل کر لی سلطان شعبان نے عدالتی اختیارات جنہیں نائب السلطنت استعمال کرتا تھا۔ حاجب الحجاب کو منتقل کر دیئے جو ایک خود مختار اور آزاد عدالت کا سربراہ بن گیا۔ پہلے پہل مرکز میں تین اعلیٰ افسر ہوتے تھے:

۱۔ حاجب الحجاب۔

۲۔ حاجب اور

۳۔ حاجب ثانی۔

بعد میں برقوق نے ان کی تعداد کو پانچ کر دیا تھا۔

حاجب کا عہدہ شمالی افریقہ میں فاطمی عہد میں موجود تھا۔ لیکن اس کے بعد فوراً ختم ہو گیا۔ لیکن حفصیوں کے عہد میں اس نے دوبارہ اہمیت حاصل کر لی۔ غالباً یہ عہدہ افریقہ میں اندلس سے آیا تھا۔ پہلے پہل حاجب محض ایک قسم کا منتظم محلات تھا اور ساتھ ہی حکمران اور ہر طبقے کے لوگوں کے درمیان واسطے کا کام دیتا تھا۔ ابو حفص کے عہد کے بعد حاجب نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ اس سے وزیر اعلیٰ کا کام لیا جانے لگا۔ قسطنطنیہ اور بجایا کے امراء کی اس رسم کو تونس میں بھی شروع کیا گیا کہ سعت می حاجب کو اپنا دستِ راست بنایا جائے۔

آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں حفصیوں کی بحالی کے بعد حاجب کا لقب تو برقرار رہا لیکن اس کے اختیارات کم ہو گئے اور وہ ایک بار پھر ایک قسم کا رئیس محکمہ استقبالیہ بن کر رہ گیا

حاجت کی نماز:

وہ نماز جو حاجت براری کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ جب بندے کو کوئی مشکل کام آپڑے تو حاجت کی نماز جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا جس آدمی کو اللہ یا کسی آدمی سے کوئی حاجت ہو تو چاہیئے کہ باقاعدہ وضو کر کے دو رکعتیں پڑھے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے۔ درود بھیجے اور پھر یہ دعا پڑھے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ [illegible]

Marfat.com

...موجبات رحمتک وعزائم مغفرتک والغنیمۃ من کل بر والسلامۃ من کل اثم لا تدع لی ذنبا الا غفرتہ ولا ھما الا فرجتہ ولا حاجۃ ھی لک رضی الا قضیتھا برحمتک یا ارحم الراحمین۔

ترجمہ: "نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ بردبار اور بخشش کرنے والا۔ پاک ہے پروردگار بڑے عرش کا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پرورش کرنے والا ہے تمام جہانوں کا۔ میں تجھ سے ان اعمال کی توفیق مانگتا ہوں جو تیری رحمت نازل ہونے کا سبب ہوں اور ایسے عمل جن کے سبب تیری بخشش ضروری ہو جائے۔ ہر گناہ سے محفوظ رکھ اور معاف کر دے، میری ہر فکر کو دور کر دے، تمام حاجات کو بر لا، پورا کر اس کو اے تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے۔"

حاج عمر

دورِ حکومت (۱۷۹۰ء تا ۱۸۶۴ء)

سوڈان کا ایک جوشیلا مذہبی رہنما، فاتح اور مملکت تکرور کا بانی سینیگال کے ضلع فوتا میں الور کے مقام پہ پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام عمر سید وائل تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی اور جربہ میں تعلیم کی تکمیل کی۔

۱۸۲۰ء میں حج کے لئے سفر کیا اور مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران میں اس نے اپنے آپ کو شیخ محمد الغالی سے وابستہ کر لیا اور اس طرح تجانیہ سلسلے میں داخل ہو گیا افریقہ میں واپس آکر اس نے کچھ عرصہ بورنو اور سکوتو میں گزارا۔ یہیں پہ اپنے دورانِ قیام اس نے مجدد ہونے کا دعوی کیا اس نے خاص طور پہ قادری سلسلہ کی مخالفت کی اور ان پہ تساہل پسندی کا الزام لگایا۔ بورنو اور سکوتو سلطنتوں کے حکمران اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ لیکن یہاں سے اپنے سفر کے دوران میں جب وہ سیگو پہنچا تو بمبارہ کے سلطان نے اسے قید کر لیا اور کافی عرصے تک اسے قید میں رکھا۔ بعد میں رہائی حاصل کرنے کے بعد وہ فوتا جالون چلا گیا۔ جہاں اس نے اہل جالون کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ اس نے دیگنکو میں ایک زاویہ قائم کیا جو جلد ہی مرجع خلائق بن گیا۔ اسے جلد ہی ملک بھر میں اس علاقے کا مذہبی پیشوا تسلیم کر لیا گیا ۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۸ء تک اس نے فوتا کے قریبی علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لئے سفر جاری کیا۔ بہت سے قبائل اس کے مقلد بن گئے۔ اس کے روز افزوں رسوخ سے خائف ہو کر المامی الفایا نے اسے فوتا کے علاقے میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی تو اس نے دینجرای میں قیام کر لیا جہاں پر اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اور ہتھیار اور گولہ بارود جمع کر کے اپنے پیروکاروں کو کفار کے خلاف جہاد کا حکم دیا۔ چنانچہ پندرہ سال کی مدت میں حاج عمر کا ایک وسیع علاقے پر قبضہ ہو گیا اور وہ وہاں کا حکمران بن گیا۔ ۱۸۴۹ء میں اس نے بورہ، بمبوک اور بودوگو کے اضلاع فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ بعد میں اس نے کارتہ کو بھی اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ وہ اس کے لئے پانچ سال تک برسرپیکار رہا۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں اس کے دارالحکومت پر قبضہ کر کے اس نے اس علاقے کے باشندوں کو اسلام قبول کرنے پر مائل کیا۔

حاج عمر کو کئی ایک بغاوتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اسے المغاربہ کے علاوہ سیگو کے سلطان احمدو کے حملوں سے بھی اپنا بچاؤ کرنا پڑا۔ اس عرصے میں بالائی سینیگال کے فرانسیسیوں سے تصادم شروع ہو گیا۔ جب وہ کارتہ کا مکمل طور پہ مالک بن گیا تو اس نے سیگو کے بمبارہ اور مسینا کے قلعہ کے خلاف کارروائی شروع کی۔ اس نے سنسنڈنگ پر قبضہ کر لیا اور دشمن کی فوجوں کو تیو کے مقام پر شکست دی وہ ۱۸۶۱ء میں سیگو کے شہر میں داخل ہوا اور اپنے بیٹے احمد شیخو کو سیگو کا حاکم بنایا۔

سیگو فتح کرنے کے بعد اس نے ٹمبکٹو کے خلاف فوج کشی کی اور اس علاقے کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ اس شہر پر اس کا دوسرا حملہ ناکام رہا۔ کیونکہ مسینا میں ایک عام بغاوت پھیل گئی جو قلبہ کے کئی سرداروں کی انگیخت سے جنہیں کونتہ کے سرداروں کی حمایت حاصل تھی، عمل میں آئی تھی۔ باغیوں نے حاج عمر کو حمداللہ میں محصور کر لیا۔ لیکن وہ آٹھ ماہ کے محاصرے کے بعد شہر کو آگ لگا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس کے دشمنوں نے اس کا تعاقب کیا تو اس نے ایک غار میں چھپ کر پناہ لی۔ جہاں اس نے خودکشی کر لی تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ زندہ نہ آسکے۔

حاج عمر کی موت کے بارے میں ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس کا تعاقب کرنے والوں نے غار میں دھواں کر کے اس کا دم گھونٹ دیا۔

حاج عمر نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اس کے انتقال کے بعد کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے لڑکے نے بعد میں اپنے والد کی پوری سلطنت حاصل کرنے کے لئے کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ اس کوشش میں نیوروا اور مسینا پر قابض ہو سکا۔

حاجی

حج کرنے والا۔

حاجی کا لفظ اصل میں حج کی عبادت بجا لانے کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جیسے کسی کو نماز پڑھنے کے لحاظ سے نمازی کہا جائے یا روزہ رکھنے کے لحاظ سے روزہ دار کہیں۔ لیکن حج نماز اور روزہ کی طرح ایک ایسی عام عبادت نہیں جو ہر شخص بجا لا سکے بلکہ وہ اپنی شرائط کی سختی کے باعث بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ اس لئے حاجی کا لفظ دوسرے لوگوں کے درمیان ایک امتیاز خاص پیدا کر دیتا ہے۔ اور ناموں کے ساتھ بطور خطاب استعمال ہوتا ہے

(نیز دیکھئے "حج")

حاجی بہادر

(۱۶ رجب ۹۸۹ھ / ۱۵۸۱ء - رجب ۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۷ء)

پاکستان میں صوبہ سرحد کے ایک بزرگ صوفی۔ آپ کا نام عبداللہ والد کا نام سید سلطان محمد شاہ تھا۔ آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

"سید عبداللہ بن سید سلطان محمد میر سرور بن سید سلطان میر اکبر بن سید سلطان میر انشا بن سید سلطان سحان شاہ بن سید سلطان محمد زبیر بن سید میر کمال بن سید سلطان میر جمال بن سید سلطان ابی مفضل بن سید سلطان سراج الدین بن سید سلطان بہاؤالدین بن سید سلطان عبدالرحمان بن سید سلطان محمد عمران بن سید سلطان شعبان بن سید سلطان محمد ناہد بن سید سلطان امیر احمد بن عبدالعزیز بن سید محمد ابراہیم بن سید امام حسن عسکری بن سید امام علی تقی بن سید امام علی موسی رضا بن سید امام موسی کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید امام باقر بن سید محمد زین العابدین بن سید امام حسینؓ بن علیؓ۔

آپ ہندوستان کے مشہور شہر آگرے میں پیدا ہوئے علوم رسمیہ کی تکمیل کے بعد سترہ سال کی عمر میں سید آدم بنوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہوں نے آپ کو بہادر کے لقب سے نوازا۔ آپ نے سید آدم بنوری کے دست حق پرست پر بیعت

Marfat.com

کی اور پورے گیارہ سال تک آپ اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ مرشد نے آپ کی تربیت باطنی پر خصوصی توجہ دی۔ یہاں تک کہ آپ منزل کمال پر پہنچ کر مظہر تجلیات ذوالجلال ہو سکے اور خلافت سے نوازے گئے۔

اسی زمانے میں آپ نے مرشد کے ہمراہ فریضہ حج و زیارت روضہ نبوی کی سعادت حاصل کی۔ پھر آپ نے کوہاٹ آکر رشد و ہدایت کی شمع روشن کی تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی شہرت کا چرچا دُور دُور تک پھیل گیا۔

آپ کو خدا بینی کا دعویٰ تھا۔ اس بنا پر لوگ آپ کو خدا بین کہنے لگے۔ جب آپ کے اس دعوے کا چرچا عام ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچا تو اس نے آپ کو حسن ابدال میں طلب کیا جہاں وہ خوشحال خاں خٹک کی بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھا۔

چنانچہ آپ حسن ابدال کے دربار میں پہنچے جہاں پر علمائے ہندوستان جمع تھے تو فرمایا "میں اس زمانے کا قطب و غوث ہوں، حق سبحانہ تعالیٰ جو بے چوں و بے جہت ہے اس ظاہری آنکھ سے دیکھتا ہوں نہ باطنی آنکھ سے"۔

چنانچہ اس موضوع پر پانچ چھ روز مناظرہ ہوتا رہا۔ علماء کی طرف سے اس مناظرے میں جنہوں نے حصہ لیا ان میں اخوند شاہ مراد دہلوی اور مولانا نور محمد مدحق لاہوری تھے لیکن آپ نے اپنے دعوے کی حقیقت کو علماء پر واضح کر دیا۔

اورنگ زیب عالمگیر نے خواہش ظاہر کی کہ میراجی چاہتا ہے کہ آپ کوہاٹ چھوڑ کر دارالسلطنت لاہور میں آبسیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ کوہاٹ میرے آباؤ اجداد کا وطن ہے اور میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔

آپ کی وفات حالت سفر میں بڈاخیل میں ہوئی۔ آپ کا جنازہ کوہاٹ لایا گیا اور شہر کی جنوبی سمت میں آپ کو دفن کیا ہے۔ آج بھی آپ کا مزار کوہاٹ میں مرجع خلائق ہے۔

آپ کے مریدین کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب ہے جبکہ مولوی شاہ مراد دہلوی نے آپ کے مریدین کی تعداد دو لاکھ ساٹھ ہزار نو سو کے قریب بتائی ہے۔

حاجی بیرام ولی

(۷۵۳ھ/۱۳۲۵ء - ۸۳۳ھ/۱۴۲۹ء - ۱۴۳۰ء) انقرہ کے مشہور ولی اور سلسلہ بیرامیہ کے بانی۔

نعمان نام والد کا نام قویون لوجہ احمد تھا انقرہ کے گاؤں صول فضل میں پیدا ہوئے۔ بروسہ اور انقرہ میں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے مدرسہ قرہ انقرہ میں پڑھایا۔ بعد میں شیخ حامد نے انہیں قیصریہ میں آنے کی دعوت دی۔ تو انہوں نے معلمی کی زندگی ترک کر دی۔ شیخ حامد کے مرید کی حیثیت میں ان کے ساتھ اور پھر وہاں سے حج کے لیے گئے جہاں سے وہ آق سرای میں آگئے۔ ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء میں اپنے مرشد شیخ حامد کی وفات کے بعد بقول مستقیم زادہ اپنے وطن انقرہ واپس لوٹ آئے۔ انقرہ میں بہت سے افراد ان کے مرید ہو گئے۔

حاجی بیرام ولی کے مریدین میں آق شمس الدین، دوزہ عمر سکینی، یازیجی اوغلو محمد اور احمد بیجان نیز حاجی بیرام کے داماد وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے بعض مریدین کے انتہا پسند رجحانات کے باوجود ان کی اپنی تعلیمات ان حدود سے آگے نہیں بڑھیں جن کی اجازت شریعت نے دی ہے۔ وہ سادہ اور غریب زندگی بسر کرتے اور [illegible] وہ ہمیشہ دوسروں کو جود و سخا کی تلقین کرتے [illegible] اس کی جامع میں تبلیغ کرتے تھے۔ وہ اسی مسجد [illegible] مزار میں دفن کئے گئے اس مسجد کی بنیاد بھی خود انہوں نے رکھی تھی حاجی بیرام ولی سے پانچ نظمیں منسوب ہیں۔

حاجی بیرام ولی کے حالات زندگی پر کوئی مفصل تصنیف نہیں ہے اس وجہ سے ان کے حالات زندگی اتنی وضاحت سے معلوم نہیں۔

حاجی پاشا

(۔۔۔ ۔۔۔ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء) نام خضر بن علی بن خطاب۔ ایک عثمانی دور کا فقیہ اور طبیب۔

وہ سلطان بایزید یلدرم کا ہم عصر تھا۔ تعلیم قاہرہ میں حاصل کی۔ اس نے شیخ مبارک شاہ سے دینیات اور فقہ کا نصاب مکمل کیا۔ شیخ اکمل الدین اور شیخ بدرالدین بہادی اس کے ہم سبق تھے۔ ایک بار جب وہ بیمار ہوا تو اس نے طب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور جلد ہی اس نے علم میں بہت شہرت حاصل کر لی۔ آخر کار وہ قاہرہ کے شفا خانے مارستان مصر کا رئیس الاطباء مقرر ہو گیا۔ آیدین واپس آنے پر اس نے آیدین اوغلو محمد بے کی دعوت پر برگی میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں پر وفات پائی۔

حاجی پاشا نے اپنی خدمات تیمور کے سامنے بھی پیش کی تھیں اور اس نے تیمور کے طبیبوں کو تعلیم دی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ شہزادہ سلیمان کی ملازمت میں اس کے دربار میں گزرا۔

اس نے اپنی اوائل عمر میں دینیات اور فقہ پر کتابیں لکھی تھیں جن میں تفسیر مجمع الانوار فی جمع الاسرار (دو جلدوں میں) ۲۔ شرح بیضاوی شریف طب میں ایک کتاب "الشفار" ہے۔

حاجی خلیفہ

(ذوالقعدہ ۱۰۱۷ھ/ فروری مارچ ۱۶۰۸ء - ۱۷ ذوالحجہ ۱۰۶۷ھ/ ۲۶ ستمبر ۱۶۵۷ء)

مصطفیٰ بن عبداللہ المعروف بہ کاتب چلبی، ایک مشہور ترکی مصنف۔

قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ سلحداروں کے برگزیدہ فوجی دستے میں بھرتی ہو گیا۔ تقریباً اسی دور میں اسے اناطولی کے دفتر محاسبہ میں ایک ادنیٰ منشی کی جگہ مل گئی۔

وہ بارہ عساکر سلطانی کے ہمراہ ایشیائے کوچک کی مشرقی سرحد پر ۱۰۲۳ھ سے ۱۰۴۵ھ تک سوائے دو مختصر وقفوں کے مقیم رہا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ سوار فوج کے انتظامی دفتر میں منشی مقرر ہوا۔ لیکن شوال ۱۰۳۸ھ/ مئی ۱۶۲۹ء کے آخر میں اسے پھر اس مہم میں شریک ہونا پڑا۔ جو وزیراعظم خسرو پاشا کی قیادت میں ایران کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ اس نے ایران کے خلاف ۱۰۴۳ھ/ ۱۶۳۳ء تا ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء کی اس بڑی مہم میں حصہ لیا۔ جو خود سلطان مراد رابع کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی ۲۲ صفر ۱۰۴۵ھ/ ۷ اگست ۱۶۳۵ء میں جب فوج حلب میں موسم سرما بسر کر رہی تھی۔ حاجی خلیفہ نے حج بیت اللہ کیا۔ رجب ۱۰۴۵ھ/ دسمبر ۱۶۳۵ء میں [illegible] ملی۔ ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۴۵ء میں اس نے "دوسرا باش مقابلہ قلیمی" کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء میں اس کے دوستوں نے [illegible]

Marfat.com

[illegible] کی ... پرورش پائی ۔ چنانچہ اسی وقت سے لوگ اسے حاجی خلیفہ کے نام سے پکارنے لگے۔

ابھی وہ ۵۰ سال ہی کا تھا کہ قسطنطنیہ میں اسے اجل کا پیغام آپہنچا۔

اس کی تصانیف میں "فذلکہ" جو تقریباً ڈیڑھ سو فرمانروا خاندانوں کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے اور عربی زبان میں ہے۔ فقہ سے متعلق علی تو شجی کے رسالہ "المحمدیہ" کی شرح، تقویم التواریخ "سلم الوصول الی طبقات الفحول" جو مشاہیر کے سوانح کی قاموس ہے اور عربی زبان میں ہے "تحفۃ الاخیار فی الحکم والامثال والاشعار"، "کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون" جو عربی زبان میں ایک مشہور و معروف دائرۃ المعارف اور مصنف کی سب سے اہم تصنیف ہے "رونق السلطنۃ" جو تاریخ قسطنطنیہ ہے "تحفۃ الکبار فی اسفار البحار" جو عثمانی بحریہ کی تاریخ ہے "میزان الحق فی اختیار الاحق" جو مصنف کی آخری تصنیف ہے خاص طور پر مشہور ہیں۔

حاجی گرای (۔۔۔ ۔ ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء)

خوانین کریمیا کے خاندان گرای کا بانی۔

اس نے سکوں پر اپنا نام السلطان حاجی کری بن غیاث الدین خان کندہ کرایا تھا۔ وہ ۸۲۲ھ/اگست ۱۴۲۹ء میں اس کی قریم پر بطور خان حکومت کر رہا تھا۔ پولینڈ کے ماخذ کی رو سے وہ لتھوانیا میں ٹروکی کے نزدیک پیدا ہوا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لتھوانیا کے گرینڈ ڈیوکوں نے تقتمش اور حاجی گرای کے آباؤ اجداد کو پناہ دی۔ اور سرای کے خوانین سے انہیں بچایا۔ جن کی حمایت طاقتور امیرادیگو کرتا تھا۔

حاجی گرای کے تحت قریم میں ایک خود مختار خانیہ کی تشکیل میں جو عوامل کارفرما رہے۔ ان میں اہم ترین بات یہ تھی کہ شیرین، قونغورت اور برین جیسے بڑے بڑے قبائل نے مغرب کی جانب بحیرہ اسود کے شمالی سواحل اور جزیرہ نمائے قریم میں نقل مکانی کی۔

۸۳۶ھ/۱۴۳۳ء اور ۸۲۷ھ/۱۴۳۴ء میں حاجی گرای بحیثیت خان، کفہ کے جنویوں سے جنگ کر رہا تھا تاکہ کفہ اور قریم کی دوسری بندرگاہوں سے وصول ہونے والے اہم محاصل پر متصرف ہوسکے۔ وہ بھی اپنے پیش رو خوانین آلتون اُردو کی طرح ہمیشہ ان بندرگاہوں کو اپنے زیر اقتدار سمجھتا رہا۔

۸۳۶ھ/۱۴۳۶ء کے موسم گرما میں جب اس کے باجگذار منگوپ کے والی آلکسیس نے بلقلاوہ پر قبضہ کر لیا۔ تو اس نے کفہ کے جنویوں کے خلاف خود ہی عداوت کا راستہ کھول دیا۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے جنوا سے کارلو لو میلینو کو چھ ہزار سپاہ دے کر بھیجا گیا۔ اس نے بلقلاوہ کو واپس لے لیا۔ جب وہ حاجی گرای کے مستقر اسکی قریم کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو اچانک حملہ ہوا جس میں اسے شکست ہوگئی اور حاجی گرای کی فوجوں نے کفہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن چونکہ ان کے پاس نہ جہاز تھے اور نہ توپ خانہ لہذا وہ آتشیں ہتھیاروں سے مسلح محصورین کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ کفہ کی تسخیر میں ناکامی کے بعد حاجی گرای نے کوشش کی کہ تجارت کا رُخ اسکی قریم کرچ اور اکرمن بندرگاہوں کی طرف پھیر دیا جائے جو اس کے زیر اقتدار تھیں۔

۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء میں سرای کے خان سید احمد نے قریم پر قبضہ کر لیا۔ اور حاجی گرای کہیں رجب ۸۵۳ھ/اگست ۱۴۴۹ء میں جا کر کاسی میر چہارم کی مدد سے یہاں پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

۸۴۹ھ/۱۴۴۵ء میں اس نے پولینڈ کے کاسی میر چہارم کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ لتھوانیا اور پولینڈ کے ساتھ گہرا تعاون ہمیشہ اس کی حکمت عملی کا حصہ رہا۔ ۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء میں جب سید احمد نے کاسی میر کے علاقوں پر چڑھائی کی تو حاجی گرای نے عقب سے حملہ کر کے اسے شکست دی۔

۸۵۸ھ/جون ۱۴۵۴ء میں اس نے عثمانی سلطان محمد ثانی سے ایک معاہدہ کیا جس کا مقصد یہ تھا جنویوں سے کفہ چھین لیا جائے لیکن یہ فتح نہ ہوسکا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد جنوبی قریم کے قبائلی سرداروں کو حاجی گرای کے خلاف صف آرا کرانے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے اسے معزول کر کے اس کے بیٹے حیدر خان کو اس کی جگہ خان بنا دیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی حیدر خان کو بھاگنا پڑا۔ اور حاجی گرای کو دوبارہ اقتدار حاصل ہوگیا۔ اس کے بعد سے جنویوں سے اس کے تعلقات خوشگوار رہے۔

حاجی گرای نے لتھوانیا اور پولینڈ سے قدیم اتحاد برقرار رکھا اس نے التون اردو کا شیرازہ منتشر کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ پاپائے روم نے اسے سلاطین عثمانیہ کے خلاف استعمال کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں اس کا شمار مشرقی یورپ کی نہایت طاقتور شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وفات کے بعد وہ بغچہ سرای کے نزدیک سلجیق میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوا۔ اس کے آٹھ بیٹے تھے۔

حاحا

بربر قبائل کا مراکشی وفاق۔ یہ لوگ مصمودہ میں سے ہیں جو حضری ہیں اور مغربی اطلس اعلیٰ کی سطح مرتفع میں سمندر تک آباد ہیں۔

۱۹۳۹ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد چوراسی ہزار تھی۔ ان میں سے بیس یہودی تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قدیم دستور کے مطابق اس علاقے میں کسی یہودی کو سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ علاقہ ایک قدیم شاہراہ پر واقع ہے جو شمالی اور جنوبی علاقوں یعنی مراکش کے میدانوں اور تارودانت کے درمیان پہاڑی دوروں میں سے ہوتی ہوئی ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔

حاحا نے غالباً عقبہ بن نافع کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ یہ لوگ تشلحت بولی بولتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر مقامی طور پر بولی جانے والی عربی کو سمجھتے ہیں۔ ان کا پیشہ کاشت کاری اور بھیڑ بکریاں پالنا ہے۔ دیہات میں ان کے مکانات ساتھ ساتھ بنے ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے ہٹ کر بنے ہوئے ہیں ان کا ہر گروہ دوسرے گروہ سے علیحدہ رہتا ہے۔

تاریخ میں اس وفاق کا ذکر سب سے پہلے پانچویں/گیارھویں صدی میں مرابطی تحریک کے حامیوں کی حیثیت سے آتا ہے۔ بعد میں ان کا ذکر سلطنت الموحدون کے معاونین کے طور پر آتا ہے۔

ابن خلدون نے ان کی دانشوری کی تعریف کی ہے اور انہیں غیور اور دلیر بتایا ہے۔ اس کے ایک صدی بعد الحسن بن محمد الوزان الزیاتی اور بعد ازاں مارمول نے قانون و فقہ میں ان لوگوں کے امتیاز کی توثیق کی ہے۔ جو علاقہ ان

Marfat.com

سے منسوب کیا جاتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے جو آج کل کے تصرف میں ہے۔

جب مراکش میں پرتگیزوں نے پیش قدمی کی تو ان میں ایک مذہبی اور اجنبی دشمن کے طور پر پرتگیزوں کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور انہوں نے فوراً ان کے خلاف جہاد کی قیادت سنبھال لی اور مرابطون بنو سعد سے مدد کی درخواست کی۔ ان کی عیسائیوں کے خلاف ایک طویل عرصے تک جدوجہد جاری رہی۔

۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں سلطان احمد المنصور نے حاحا کے چھ سو آدمیوں کو بھرتی کر کے اس وعدے پر ٹمبکٹو بھیجا کہ وہ تمام محاصل اور لگانوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء میں جب الصویرہ کا شہر بسایا گیا تو شمالی حاحا مزید خوشحال زندگی گذارنے لگے۔

جنوب کے حاحاحین کا مرکز تمنر ہے مراکشی مخزن کے لئے مستقل پریشانی کا باعث بنے رہے اور ان کے علاقے میں پوری طرح عمل دخل فرانسیسی انتداب کے زمانے میں ہو سکا۔

حارثؓ بن ابی ہالہ صحابی۔

آپ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے فرزند تھے جو پہلے شوہر سے تھے۔ جب مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ گئی اور آنحضورؐ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا تھا تو کفار آنحضورؐ پر ٹوٹ پڑے۔ حارث یہ خبر سن کر دوڑے آئے کافروں نے اُن کو شہید کر دیا اسلام کی راہ میں وہ پہلے شہید ہیں۔

حارثؓ بن اوس (— ؟ — شوال ۳ھ/ ۶۲۴ء)

ایک صحابی۔

ابن معاذ بن نعمان بن امرئ القیس بن زید بن عبدالاشہل۔ ابوالاوس کنیت تھی۔ والدہ ہند بنت عتیک بن امرئ القیس بن زید بن عبدالاشہل تھیں۔

آنحضورؐ نے حارث بن اوس اور عامر بن ضمیرہ کے درمیان عقد مواخاۃ کیا۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے کعب بن الاشرف (یہودی) کو قتل کیا۔

حارث غزوہ اُحد میں بھی شریک ہوئے اور اسی روز شہید ہو گئے۔ اپنی شہادت کے دن ان کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ اُن کی کوئی اولاد نہ تھی

حارث بن سریج (— ؟ —— ۱۲۸ھ/۷۴۶ء)

ابو حاتم، خراسان میں اموی انتظامیہ کے خلاف ایک باغیانہ تحریک کا قائد۔

حارث کا ذکر ۱۱۱ھ/۷۲۹ء میں پیکند کے مقام پر خاقان کی فوجوں کے خلاف لڑائی میں جرات مند جنگجوؤں کے ضمن میں آتا ہے۔ اسے والی خراسان جنید بن عبدالرحمان المری کے حکم پر کوڑے لگوائے گئے۔ کیونکہ حارث نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

حارث نے ۱۱۶ھ/۷۳۴ء میں بغاوت کی۔ اور جوزجان، فاریاب اور طالقان کی مقامی فوجوں کی مدد سے حارث نے بلخ پر قبضہ کر لیا اور ایک فوج کی قیادت کرتے ہوئے مرو پر چڑھائی کر دی [illegible] اس کے پیروؤں کی تعداد گھٹ کر تین ہزار رہ گئی۔

جب خلیفہ ہاشم نے عاصم کو گورنری سے برطرف کر دیا اور اس کی جگہ اسد بن عبداللہ قسری نیا گورنر مقرر ہوا تو اسد نے بلخ پر دوبارہ قبضہ کر کے حارث کو دریائے جیحون عبور کرنے پر مجبور کر دیا۔ حارث نے مقامی قائدین کی فوجوں کی مدد سے ترمذ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن وہ اس شہر کو فتح کرنے میں ناکام رہا اور اسے طخارستان میں واقع تبوشکان کے قلعے میں پسپا ہونا پڑا اور جب اسد کی بھیجی ہوئی ایک فوج نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا تو حارث کے پیروؤں نے قلعہ چھوڑ دینے پر اصرار کیا اور مخالف فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جن میں سے بعض کو قتل کر دیا گیا اور عورتوں کو لونڈیاں بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ حارث اپنی فوج سمیت ترغش کے خاقان کے ساتھ شامل ہو گیا وہ خریستان کی لڑائی میں خاقان کی طرف سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑا۔ جب اس کی فوج نے شکست کھائی تو ایک اور نئی مہم کی تیاریوں میں حارث نے خاقان کی معاونت کی اور خاقان سے ۵ ہزار گھوڑے وصول کئے۔

اسد کی وفات کے بعد نصر بن سیار نے ۱۲۲ھ/۷۴۰ء میں ایک فوج کے ساتھ شاش پر چڑھائی کر دی۔ نصر اور حارث کے دستوں کے درمیان ایک جھڑپ ہوئی لیکن بعد میں شاش اور نصر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت یہ طے ہوا کہ شاش کا حکمران حارث کو فاراب میں جلاوطن کر دے گا۔ لیکن بعض حالات کی بنا پر نصر کو خلیفہ یزید بن الولید سے حارث کو معاف کر دینے کی درخواست کرنی پڑی۔

جب حارث ۱۲۷ھ/۷۴۵ء میں مرو آیا تو اس نے اس مطالبے پر زور دیا کہ کتاب و سنت کے احکام کے مطابق عمل کیا جائے۔ نصر اور مرو کے لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ نیز اس کا بیٹا محمد اور بیٹی الالوف کو بھی رہا کر دیا گیا اور نصر نے اسے ایک ضلعے کا حاکم مقرر کرنے کی پیش کش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ نصر نے اسے جو تحائف دیئے وہ اس نے اپنے پیروکاروں میں تقسیم کر دیئے۔ حارث نے نصر سے مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرے جو شریف الطبع اور حق پرست ہوں۔

حارث کی مرو میں آمد کے تھوڑے عرصے بعد تین ہزار تمیمی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے اس سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ حارث نے مرو کے باہر پڑاؤ ڈالا اور نصر کی مخالفت اختیار کرتے ہوئے جہم بن صفوان کو اپنی سیرت پڑھنے کی ہدایت کی۔ تھوڑے عرصے کے لئے جدیع الکرمانی بھی حارث کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن ان کی فوجوں میں تصادم ہو گیا اور حارث اس اثناء میں قتل کر دیا گیا۔

حارث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مرجئی تھا اس کا معتمد جہم بن صفوان تھا اس نے سیاسی سرگرمیوں میں ابوالصیدار کی پیروی کی جو موالی کے حقوق کے لئے لڑا۔ حارث اور اس کے پیرو اسلام کے ابتدائی دور میں صرف ایک ہی ایسا گروہ ہے جس نے قوم سے علیحدگی اختیار کی اور اپنے بھائیوں کے خلاف غیر مسلموں کی حمایت اس مقصد کے لئے کی کہ ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو قرآن و سنت کے احکام کے مطابق عمل کرے۔

حارث میں تبلیغ کا ایک احساس تھا اس نے بظاہر زہد کی زندگی بسر کی۔ وہ چاہتا تھا کہ آنحضورؐ اور خلفائے راشدین کی حکومت جیسی ایک صحیح حکومت قائم کی جائے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ شوریٰ سے انتخاب کے اصول کو [illegible] جائے۔

Marfat.com

حارث بن عمیر ازدی: (صحابی) آپ قبیلہ ازد سے تھے۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔

آنحضورؐ نے جب سلاطین اور امراء کے پاس دعوتِ اسلام کے خط بھیجے تو ایک خط شرجیل بن عمر فرمانروائے بصریٰ کے نام بھی لکھا۔ حضرت حارثؓ کو اس کے پہنچانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ یہ خط لے کر آپ موتہ کے مقام تک ہی پہنچے تھے کہ شرجیل سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟۔ حارثؓ نے کہا شام، شرجیل نے کہا، تم کسی کے قاصد معلوم ہوتے ہو؟۔ آپؓ نے کہا ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں۔ یہ سن کر اس نے حارثؓ کی مشکیں کسوا کے قتل کر دیا۔

حارثؓ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے قاصد ہیں جس نے خدا کی راہ میں جام شہادت پیا۔ آنحضورؐ کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپؐ کو بہت زیادہ رنج ہوا۔ اور حارثؓ کے خون کے لئے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک سریہ موتہ روانہ کیا۔ اسی سریہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفر طیارؓ وغیرہم شہید ہوئے۔

حارث بن کعب (بنو)

یمن کا ایک عرب قبیلہ بنو حارث کا نسب یہ ہے:۔

"حارث بن کعب بن عمرو بن علۃ بن جلد بن مذحج (مالک)"

بنو حارث نجران کے علاقے میں رہتے تھے اور بنو ہمدان کے پڑوسی تھے نجران کے علاقے کے علاوہ اور مقامات پہ یہ علاقے ان کے قبضے میں تھے۔ العرش، العاذ، بطن الذہاب، ذو المروت، الفرط، عدورہ، عبابہ، الخصاصہ، قری بجل، صمصر، سوحان، میثان، شط زیاد۔ وادیوں میں العوھل الاعلیٰ اور العوھل الاسفل، النضارات، شجر

چشموں میں عینا ذنب، البثرار، الجفر، الھلار، الحمی، الکوکب، خطمہ خلیقی، الملحات، مارہ، شسعیٰ، الشلیلہ، یدمات اور پہاڑیوں میں تخم کی پہاڑیاں ان کے قبضے میں تھیں۔

اس قبیلے کے کچھ خاندان حضرموت کے مقام ریدا الصیعر اور شہر رداع میں صمع اور حدقان کی بستیوں میں اور دمشق کے قریب الغنجہ میں رہتے تھے۔

زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ یغوث نام بت کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سے بعض عیسائی تھے۔ عبدالمدان بن دیان نے جو بنو حارث کا ایک ممتاز خاندان تھا۔ ایک بڑا گرجا "دیر نجران" بنایا تھا جو کعبہ نجران بھی کہلاتا تھا۔

یہ بات تاریخی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ یغوث نامی بت کی وجہ سے بنو حارث اور بنو مراد کے مابین جو اس بت کی ملکیت کے دعویدار تھے الرزم کے مقام پر عین اسی روز ایک معرکہ ہوا جس دن جنگ بدر ہوئی۔ بنو حارث نے بنو ہمدان سے اتحاد کر کے بنو مراد کو شکست دی اور یغوث انہی کے قبضے میں رہا۔

کلاب کی دوسری لڑائی میں جو دھنا میں لڑی گئی، بنو حارث جو بلحارث کے نام سے معروف تھے تیمی قبیلوں رباب اور سعد ابن زید مناۃ کے خلاف لڑے جن کا قائد قیس بن عاصم تھا بلحارث کے ساتھ ہمدان، کندہ، قضاعہ اور دوسرے قبیلے تھے اور فوج کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ اس جنگ میں بلحارث کو شکست ہوئی۔

ایک اور جنگ میں جو حدوہ کے نام سے معروف ہے اور تہامہ کے مقام پر مدس کے خلاف لڑی گئی تھی بلحارث کو دوبارہ شکست ہوئی۔

جب آنحضورؐ کی دعوت تمام دیارِ عرب میں پہنچی تو بنو حارث میں سے جو لوگ عیسائی تھے انہوں نے آنحضورؐ کی خدمت میں غالباً ۸ھ/۶۲۹-۶۳۰ء میں ایک وفد بھیجا جو زیادہ تر مذہبی پیشواؤں پر مشتمل تھا۔ یہ وہی وفد ہے جس کا تفاسیر میں وفد نجران کے نام سے ذکر آتا ہے۔

اس وفد نے مدینے کے قریب ایک مقام پر آنحضورؐ سے ملاقات کا انتظام کیا اور طے کیا کہ اس مقام پر آپؐ کے ساتھ مباہلہ کریں گے۔ لیکن جب ان کو آپؐ کی صداقت کا یقین ہو گیا اور اپنی شکست کا خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے آنحضورؐ سے مباہلہ منسوخ کرنے کی درخواست کی جسے آپؐ نے اس شرط پہ منظور کر لیا کہ وہ پہلے سے زیادہ جزیہ دیں۔

ربیع الاوّل ۱۰ھ/۶۳۱ء میں آنحضورؐ نے خالد بن ولیدؓ کو چار سو اسی افراد کے ساتھ بلحارث کے پاس انہیں اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا۔ ان میں سے بعض مشرکوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت خالدؓ نے وہاں قیام فرما کر انہیں قرآن حکیم اور ارکان اسلام کی تعلیم دی۔

کچھ عرصہ بعد وہ ایک وفد کے ہمراہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے وفد کے ہر رکن کو چار سو درہم دیئے۔ ان میں سے قیس بن الحصین کو بلحارث کا امیر مقرر کیا۔ جب ۱۱ھ/۶۳۲ء میں اسود عنسی نے پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کیا تو بلحارث نے اس کی پیروی اختیار کر لی اور انہوں نے نجران کے عامل عمرو بن حزم کو نکال دیا، اور اسود عنسی ایک فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں بلحارث کے مسلمان اسلام پر قائم رہے۔ اور عیسائیوں نے معاہدے کی تجدید کی۔

حارثؓ بن نوفلؓ: (صحابی) آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے: "حارث بن نوفل بن حارث ابن عبدالمطلب بن ہاشم قرشی ہاشمی۔ آپ کے والد آنحضورؐ کے چچیرے بھتیجے تھے۔ اس رشتہ سے حارثؓ آنحضورؐ کے پوتے ہوئے۔

حارثؓ کے والد نے غزوۂ خندق سے قبل اسلام قبول کیا تھا! اور آپؓ بھی اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ اگرچہ آپؓ کے والد شرفِ ہجرت سے بھی سرفراز ہوئے لیکن حارثؓ اس شرف سے محروم رہے۔

آنحضورؐ نے حارثؓ کو جدّہ کی امارت سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس لیے وہ جنگِ حنین میں شریک نہ ہو سکے۔ بقول واقدی حضرت ابوبکرؓ نے آپؓ کو مکہ کی امارت پر فائز کیا تھا لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق مکہ کی امارت پر عتاب بن اسید مامور تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حارثؓ کو جدّہ کی امارت سے معزول کر دیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں آپؓ کو اسی سابقہ عہدے پر دوبارہ بحال کر دیا تھا۔

حارثؓ نے بصرہ میں گھر بنا لیا تھا اور یہیں پر وفات پائی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ستر برس تھی۔

ایک اور روایت کے مطابق آپؓ نے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کے آخر میں وفات پائی۔ لیکن ابن سعدؒ نے "طبقات" میں آپؓ کی وفات حضرت عثمانؓ کے عہد میں بتائی ہے۔

آپؓ کی چار بیویاں تھیں جن کے نام یہ ہیں:۔ دہلہ، ام زبیر، ربطہ اور ام حارث اور لڑکوں میں سعید، محمد الاکبر، ربیعہ، عبدالرحمٰن، عیینہ، محمد الاصغر،

Marfat.com

حارث ابن حارث تھے۔

حارثؓ بن ہشام

صحابی اور مشہور دشمن اسلام ابوجہل کے بھائی۔ کنیت ابو عبدالرحمٰن، نسب نامہ یہ ہے:۔
حارثؓ بن ہشام ابن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم، قرشی، مخزومی۔

حارثؓ مکہ کے رئیس اور بڑے مخیر اور فیاض آدمی تھے۔ سینکڑوں غریبوں کے کھانے کا بندوبست ان کے دستر خوان پر ہوتا تھا۔ آنحضورؐ کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح حارثؓ اسلام قبول کر لے۔ ایک مرتبہ آپؐ کی مجلس میں ان کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کیوں نہ ہو ان کے باپ بھی سردار تھے کاش خدا انہیں اسلام کی ہدایت دیتا۔

غزوہ بدر میں ابوجہل کے ساتھ تھے لیکن میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے اور ابوجہل مارا گیا۔ چنانچہ ان کی اس بزدلی پر حسانؓ بن ثابت نے اشعار میں انہیں غیرت دلائی۔ انہوں نے اشعار ہی میں اس کی توجیہہ آمیز معذرت کی۔ اُحد میں بھی مشرکین کے ہمراہ تھے۔

حارثؓ فتح مکہ میں دوسرے سردارانِ قریش کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلام کے بعد سب سے پہلے غزوہ حنین میں شریک ہوئے۔ آنحضورؐ نے مال غنیمت میں سے سو اونٹ مرحمت فرمائے۔

حنین کے بعد مکہ لوٹ گئے۔ لیکن آنحضورؐ کی وفات کے وقت مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے۔ چنانچہ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجرین و انصار میں خلافت کے بارے میں اختلاف ہوا تو حارثؓ نے یہ صائب رائے ظاہر کی کہ خدا کی قسم اگر رسول اللہ نے "الائمۃ من قریش" نہ فرمایا ہوتا تو ہم انصار کو بے تعلق نہ کرتے۔ کیونکہ وہ اس کے اہل ہیں لیکن رسول اللہ کے فرمان میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اگر قریش میں صرف ایک شخص بھی باقی ہوتا تو بھی خدا اس کو خلیفہ بناتا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب شام پر فوج کشی کا عزم کیا اور تمام بڑے بڑے رؤسا کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو حارثؓ کو بھی ایک خط لکھا۔ حارث حصول سعادت کے بہت سے مواقع کھو چکے تھے اس لئے تلافی مافات کے لئے فوراً آمادہ ہو گئے۔ لیکن ان کی ذات تنہا نہ تھی۔ وہ صدہا غریبوں کا سہارا تھے۔ اس لئے مکہ ماتم کدہ بن گیا سب با دیدہ پرنم الوداع کہنے کو نکلے۔ جب بطحا کے بلند حصے پر پہنچے تو رونے والوں کی گریہ وزاری پر ان کا دل بھر آیا اور ان الفاظ میں ان کو تشفی دینے کی کوشش کی۔

"لوگو! خدا کی قسم میں اس لئے تم لوگوں سے جدا نہیں ہو رہا ہوں کہ مجھے تمہارے مقابلے میں کوئی ذاتی منفعت مقصود ہے یا تمہارے مقابلے میں دوسرا شہر پسند ہے بلکہ ایک اہم معاملہ پیش آ گیا ہے۔ اس میں قریش کے بہت سے اشخاص شریک ہو چکے ہیں جو تجربہ اور خاندانی اعزاز کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے۔ اگر ہم نے اس زریں موقع کو چھوڑ دیا تو اگر مکہ کے تمام پہاڑ سونے کے ہو جائیں اور ان سب کو ہم خدا کی راہ میں لٹا دیں تب بھی اس کے ایک دن کے برابر اجر نہیں پا سکتے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں اگر ہم کو دنیا نہ ملی تو کم از کم آخرت کے اجر میں شریک ہو جائیں ہمارا یہ نقل مکانی خدا کے لئے اور شام کی طرف ہے۔"

چنانچہ اس ولولہ اور جوش کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلے اور فحل اور اجنادین کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔ اس سلسلہ کی مشہور جنگ یرموک میں ابتداء میں مسلمانوں [illegible] پر سخت دم واپسیں پیاس کا غلبہ تھا۔ پانی [illegible] زخمی مجاہد نے بھی پانی مانگا۔ فطری فیاضی نے گوارا نہ کیا کہ ان کو پیاسا چھوڑ کر خود سیراب ہوں۔ چنانچہ پانی ان کی طرف بڑھا دیا۔ اس زخمی مجاہد کے پاس ایک تیسرا زخمی اسی حالت میں تھا چنانچہ اس نے ان کی طرف بڑھا دیا۔ ان کے پاس پانی پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ دم توڑ دیا۔ غرض تینوں تشنہ کامانِ حق تشنہ حوض کوثر پر پہنچ گئے۔

شہادت کے وقت ایک لڑکا عبدالرحمٰن چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسل میں بڑی ترقی دی اور خوب پھلی پھولی۔

حضرت حارثؓ کی فیاضی، سیر چشمی اور غربا پروری کے مناظر کی ایک جھلک تو مندرجہ بالا سطور میں سامنے آ چکی۔ ان کے دوسرے فضائل بقول ابن عبدالبر یہ تھے حارثؓ فضلاء اور خیار صحابہ میں تھے۔ عموماً مؤلفۃ القلوب مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اتنا زیادہ راسخ نہ ہوا تھا لیکن حضرت حارثؓ اس سے مستثنیٰ تھے۔ وہ ان مؤلفۃ القلوب میں تھے جو سچے مسلمان تھے اور قبول اسلام کے بعد ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہ دیکھی گئی۔

حارث کذاب:

(ب — ٥ — ٦٩ھ/٦٨٨ء) ایک جھوٹا نبی حارث بن عبدالرحمٰن بن سعید متنبی دمشقی۔ پہلے ابوجلاس عبدی قریشی کا مملوک تھا۔ آزاد ہونے کے بعد اس کے دل میں یاد الٰہی کا شوق پیدا ہوا۔ اہل اللہ کی دیکھا دیکھی دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہنے لگا۔ سدِ رمق سے زیادہ غذا نہ کھاتا۔ کم سوتا کم بولتا اور اس قدر کپڑا پہنتا جو ستر عورت کے لئے ضروری ہے۔ یہ زہد و ورع، ریاضتیں اور مجاہدے کسی مرشد کامل کے ارشاد و افادہ کے تحت عمل میں لائے جاتے تو اسے قال سے حال تک پہنچا دیتے اور معرفت الٰہی کا نور اس کے کشور دل کو جگمگا دیتا۔ لیکن اس غریب کو معلوم نہ تھا کہ جو لوگ کسی رہبر کامل کی صحبت میں رہ کر منازل سلوک طے کرنے کے بجائے از خود ریاضت و انزوا کا طریقہ اختیار کرتے ہیں شیطان ان کا رہنما بن جاتا ہے اور اس وقت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک انہیں ضلالت و ہلاکت ابدی میں نہیں ڈال دیتا۔

چنانچہ جب جنود ابلیس نے حارث کو اپنی نگاہِ التفات سے مخصوص کر کے اس پر القاء و الہام کے دروازے کھولے تو اس کو عجیب قسم کی چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ جو پہلے کبھی مشاہدے سے نہیں گزری تھیں۔ لیکن اس کے سر پر کسی شیخ طریقت کا سایہ نہیں تھا جس کی طرف یہ رجوع کرتا کہ وہ اسے شیطانی اغواکوشیوں سے متنبہ کر کے ضلالت سے بچاتا۔ اس نے اپنے باپ کو جو موضع حولہ میں رہتا تھا لکھ بھیجا کہ جلد میری خبر لو۔ مجھے بعض ایسی چیزیں دکھائی دے رہی ہیں جن کے متعلق خوف ہے کہ مبادا شیطان کی طرف سے ہوں۔ یہ پڑھ کر گم کردہ راہ باپ نے اس کو ورطۂ ہلاکت سے نکالنے کی بجائے الٹا گمراہی کے جال میں پھنسا دیا اور لکھ بھیجا "بیٹا! تو اس کام کو بے خطر کر گزر جس کے لئے تجھے حکم ہوا ہے۔"

چونکہ حارث نے سخت زاہدانہ اور متقشفانہ زندگی اختیار کر رکھی تھی، اور دائم العبادات، معمور الاوقات تھا اس سے بھی ماورائے عقل افعال صادر ہوتے تھے۔ چنانچہ مسجد میں ایک پتھر پر انگلی مارتا تو وہ تسبیح پڑھنے لگتا۔ موسم گرما میں لوگوں کو سرما کے پھل اور میوہ جات کھلاتا۔ جب حارث کے استدراج کا [illegible] دور دور شہرت اختیار کی تو ایک دمشقی رئیس قاسم بن [illegible]

Marfat.com

کیا تم نبی ہونے کے مدعی ہو؟ حارث نے کہا میں نبی اللہ ہوں۔ قاسم نے کہا اے عدو اللہ تو جھوٹا ہے۔ آنحضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ بالکل بند ہو چکا ہے۔ قاسم نے جا کر خلیفہ عبدالملک بن مروان سے ملاقات کی اور حارث کی فتنہ انگیزی کا حال بتایا۔ عبدالملک نے حکم دیا کہ حارث کو گرفتار کرکے میرے سامنے لایا جائے۔

جب پولیس گرفتاری کے لئے مکان پر پہنچی تو اس کا وہاں کوئی کھوج نہ مل سکا۔ حارث دمشق سے بھاگ کر بیت المقدس پہنچا اور نہایت رازداری کے ساتھ اپنی نشر انگیزی میں مصروف رہا۔ اس کے مرید ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو خدا سے ملاقات کے شائق ہوں۔ انہیں جہاں کہیں اس ذہنیت کا آدمی نظر آتا اس کو ساتھ لے جاتے اور حارث سے ملاقات کرا کے اپنی جماعت میں داخل کرانے کی کوشش کرتے ایک مرتبہ ایک بصری کو اپنے ساتھ لے گئے جو بیت المقدس میں نووارد تھا اس نے توحید الٰہی کے متعلق حارث کی نکتہ آفرینیاں سنیں تو اس کے حقائق و معارف پر عش عش کر اٹھا لیکن جب حارث نے بتایا کہ میں نبی مبعوث ہوا ہوں تو کہنے لگا تمہاری ہر بات پسندیدہ ہے لیکن دعوائے نبوت کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔ حارث نے کہا نہیں نہیں تم سوچو اور غور کرو اس وقت تو بصری بلاتسلیم دعوائے نبوت مجلس سے اٹھ کر چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر آیا اور ظاہری طور پر حارث کے دین پر ایمان لاکر اس کی جماعت میں داخل ہو گیا اور شب و روز وہیں رہنا شروع کر دیا یہاں تک کہ حارث کے مخصوص مریدین میں شمار کیا جانے لگا۔

جب بصری نے حارث کے تمام جزئی اور کلی حالات معلوم کر لئے تو ایک دن کہنے لگا۔ یا نبی اللہ میں بصرہ کا رہنے والا ہوں، اب میں اپنے وطن جا کر لوگوں کو آپ کی نبوت کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ حارث نے اجازت دے کر رخصت کیا۔ بصری سیدھا خلیفہ عبدالملک کے پاس گیا اور اس سے حارث کے بارے میں ذکر کیا۔ عبدالملک نے کہا کہ وہ اس وقت کہاں ہے بصری نے بتایا کہ بیت المقدس میں فلاں جگہ چھپا بیٹھا ہے اس نے مزید کہا کہ اگر میرے ساتھ کچھ آدمی کر دیئے جائیں تو میں اسے گرفتار کرکے آپ کی بارگاہ میں پیش کر سکتا ہوں۔ خلیفہ نے چالیس فرغانی سپاہی بصری کی تحویل میں دے دیئے اور ان کو حکم دیا کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں۔

بصری ان پیادوں کو لے کر بیت المقدس آیا اور رات کے وقت حارث کی قیام گاہ پر پہنچا۔ یہ شخص سپاہیوں کو ایک آڑ میں کھڑا کر کے پہلے خود گیا۔ لیکن دربان نے دروازہ کھولنے سے انکار کیا اور بولا گو تم حضرت کے خدام میں داخل ہو تاہم اتنی رات گئے کسی کے لئے داخلہ کی اجازت نہیں۔ بالآخر بصری نے دربان کو دروازہ کھولنے پر رضامند کر لیا۔ دروازہ کھلا تو بصری نے سپاہیوں کو بھی بلا لیا۔ یہ دیکھ کر دربان اور دوسرے پیروانِ حارث کے ہوش اڑ گئے۔ بصری نے اپنے رفقاء کی مدد سے حارث کو زنجیروں میں جکڑا اور عبدالملک کے دربار میں لے کر چلے۔ جب وہ بیت المقدس میں پہنچے تو حارث نے ایک قرآنی آیت (۵ : ۱۳۴) پڑھی، جس کے پڑھتے ہی گلے اور ہاتھ کی زنجیر ٹوٹ کر زمین پر جا پڑی۔ پیادوں نے زنجیر اٹھا کر پھر ہاتھ گلے سے باندھی۔ اور لے کر چلے۔ جب دوسرے درے پر پہنچے تو حارث نے پھر وہی آیت "اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں راہ راست کو چھوڑ دوں تو یہ حق فراموشی مجھی پر وبال ہو گی اور اگر راہ راست پر ہوں تو یہ اس کلام کی بدولت ہے جس کو میرا رب مجھ پر نازل فرما رہا ہے۔" چنانچہ پیادے پھر سلاسل کو اٹھا اور حارث کو سہ بارہ اس میں جکڑ کر چلے۔ آخر دمشق پہنچے اور حارث کو عبدالملک کے دربار میں پیش کیا۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ واقعی تم مدعی نبوت ہو؟ حارث نے کہا ہاں، خلیفہ نے ایک قوی ہیکل محافظ کو حکم دیا کہ اس کو نیزہ مار کر ہلاک کر دو۔ نیزہ مارا گیا لیکن حارث پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر حارث کے مریدوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ انبیاء اللہ کے جسم پر ہتھیار اثر نہیں کرتے۔ خلیفہ نے محافظ سے کہا کہ شاید تم نے بسم اللہ پڑھ کر نیزہ نہیں مارا۔ اس مرتبہ محافظ نے بسم اللہ پڑھ کر وار کیا تو حارث بری طرح زخم کھا کر گرا اور جان دے دی۔

علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان" میں لکھا ہے کہ حارث کی ہتھکڑیاں اتارنے والا اس کا کوئی شیطان دوست تھا۔

حارثہ: بن بدر بن تمیم۔ قبیلہ تمیم کی ایک شاخ غدانہ کا ایک فرد جو زیاد بن ابیہ کا سپہ سالار اور دوست تھا۔

ہجرت نبوی سے کچھ عرصہ قبل پیدا ہوا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابتدائی عمر میں وہ سجاح کے پیروؤں میں شریک رہا جس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا تھا جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے مخالفین میں سے تھا۔ لیکن بعد ازاں اس نے حضرت علیؓ سے وابستگی اختیار کر لی۔

اوائل عمر میں ہی وہ زیاد سے جو بعد میں عراق کا گورنر ہوا، وابستہ ہو گیا وہ خطیب ہونے کے علاوہ شعر بھی کہتا تھا اور عربوں کی قدیم تاریخ میں اسے خاص طور پر دسترس حاصل تھی اور اس کی شجاعت بھی مسلمہ اور آزمودہ تھی۔

اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت کی بناء پر وہ معاشرے کا ایک نمایاں فرد تھا اور مختلف قابلیتوں کے جمع ہونے سے اس نے داھیہ کا لقب پایا۔ اگرچہ وہ تمیمی تھا لیکن زیاد کی دوستی کی بدولت اس کا نام قریش کی فہرست میں درج کر لیا گیا تھا۔

زیاد کے جانشین اور بیٹے عبیداللہ نے حارثہ سے دوستی رکھنے میں ایسی زیادہ گرمجوشی نہیں دکھائی۔ یزید اوّل کے انتقال پر جو سیاسی بحران پیدا ہوا اس دوران میں حارثہ کئی بار کم و بیش کامیابی کے ساتھ خارجیوں سے برسر پیکار رہا۔

حارثہ کی ناکامی کی وجہ اکثر اوقات بصرے کے سپاہیوں کی حکم عدولی تھی۔ ایک ایسی ہی مہم کے دوران میں وہ ۶۶ھ میں بیمار ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہ ولید اوّل کے عہد حکومت تک زندہ رہا۔ اگرچہ یہ روایت زیادہ صحیح نہیں ہے۔

حارثہ بن سراقہ: رضی (صحابیؓ) (۔۔۔؟۔۔۔ - ۲ھ/۶۲۳ء)

آپ قبیلہ خزرج کے نجار خاندان سے تھے والد ہجرت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ ہجرت سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سلسلہ نسب یہ ہے حارثہ بن سراقہ بن حارث بن عدی بن مالک بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار۔ ان کی والدہ اُم حارثہ تھیں نام ربیع بنت النضر بن ضمضم بن زید بن حرام ابن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار تھا۔ آنحضور کے خادم انس بن مالک کی پھوپھی تھیں آنحضورؐ نے حارثہ بن سراقہ اور السائب بن عثمان ابن مظعون کے درمیان عقد مؤاخات قائم کیا۔ غزوہ بدر کے روز سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ کو روانہ ہوتے ایک حوض پر پانی پینے گئے حبان بن العرقہ نے تیر مارا۔ آپؓ وہیں شہید ہو گئے۔ حضرت حارثؓ کو انصار میں سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی۔ والدہ کے بہت فرمانبردار اور اطاعت گزار تھے والدہ بھی آپ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ جب آپ شہید ہوئے تو آپؓ کی والدہ نے آنحضورؐ سے عرض کی یا رسول اللہ صلعم آپ کو حارثہ سے میرا تعلق

Marfat.com

معلوم ہے اگر وہ جنت میں ہوں تو صبر کروں ورنہ آپؐ کی جو خواہش ہو وہ کھول۔ آپؐ نے فرمایا اے والدۂ حارثہ جنت ایک نہیں ہے بلکہ بہت سی جنتیں ہیں اور حارثہؓ اس کے افضل یا اعلیٰ درجے فردوس میں ہیں۔ حارثہ بن سراقہ عبادت اور ریاضت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔

حارثہؓ بن نعمان: (صحابی) ابن نفع زید بن ثعلبہ بن غنم ان کی والدہ جعدہ بنت عبید بن ثعلبہ بن عبید بن ثعلبہ بن غنم عتیق یا ابو عبداللہ کنیت تھی۔

حضرت حارثہ بدر و احد و خندق تمام غزوات میں حضور کے ہمرکاب رہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے زندگی بھر میں دو مرتبہ جبرئیلؑ کو دیکھا۔ ایک دفعہ تو یوم الصورین میں، جس وقت آنحضورؐ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہوئے اور جبرئیل دحیہ بن خلیفۃ الکلبی کی شکل میں ہمارے پاس سے گزرے اور انہوں نے ہمیں مسلح ہونے کا حکم دیا۔

دوسرے موضع الجنائز کے دن، جس وقت ہم لوگ حنین سے واپس آئے میں اس حالت میں گزرا کہ وہ آنحضورؐ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سلام نہیں کیا۔ جبرئیل نے پوچھا کہ اے محمدؐ یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "حارثہ بن نعمانؓ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا یہ یوم حنین میں ان سو صابروں میں سے نہیں ہیں جن کے جنت میں رزق کا اللہ کفیل ہے؟ اگر یہ سلام کرتے تو ہم انہیں ضرور جواب دیتے۔

آخر عمر میں حارثہ بن نعمان کی نظر جاتی رہی تھی۔ انہوں نے اپنی جانماز سے حجرے کے دروازے تک ایک ڈوری باندھ رکھی تھی۔ پاس ہی ایک ڈوکری رکھ لی تھی جس میں کھجوریں وغیرہ تھیں۔ جب کوئی مسکین سلام کرتا تو وہ ان کا سلام کھجوریں سے لیتے۔ ڈوری پکڑ کر دروازے تک آتے اور مسکین کو دیتے۔ گھر والے کہتے کہ ہم آپ کے لیے کافی ہیں۔ جواب دیتے کہ میں نے آنحضورؐ کو فرماتے سنا ہے کہ مسکین کو دینا بُری موت سے بچاتا ہے۔

حضرت حارثہ بن نعمان کے مکانات مدینے میں آنحضورؐ کے مکانات کے قریب تھے۔ انہوں نے حضرت امیر معاویہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

حازم: نومبر ۱۲۱۱ء / ۶۰۸ھ ــــ ۲۴ رمضان ۶۸۴ھ / نومبر ۱۲۸۵ء) حازم بن محمد بن خلف بن حازم انصاری مشہور نحوی، شاعر اور ماہرِ بلاغت۔

قرطاجنہ میں قبیلہ اوس کے ایک خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ قرطاجنہ کا قاضی تھا۔ حازم نے اپنے والد ہی سے نحو، عربی زبان، حدیث اور مالکی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے مرسیہ میں اور پھر اشبیلیہ اور غرناطہ میں اپنی تعلیم جاری رکھی الشلوبینی نے اس کو عربی زبان میں فلسفہ اور سب سے بڑھ کر ابن سینا کی تصانیف سے یونانی فلسفے کا مطالعہ کرنے پر اکسایا۔

والد کی وفات کے بعد وہ مراکش چلا گیا جہاں پر اس نے الموحد خلیفۃ الراشد کے حلقے میں ادبی مشاغل میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ المغرب چلا گیا اور وہاں پر ابو زکریا اوّل حفصی کے دیوان میں سیکرٹری ہو گیا۔ نحو اور بلاغت میں اپنی اعلےٰ درجے کی علمیت اور اپنی روایت کی بدولت اسے اپنے معاصرین میں بلند مقام حاصل ہو گیا۔

حازم نے تونس میں وفات پائی۔ اس کی تصانیف تین بڑے شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی منظوم تصانیف جو مخطوطات اور معاصر یا متاخر تصانیف میں محفوظ ہیں، جنہیں [illegible]

نحو کے میدان میں حازم [illegible] کی "المقرب" پر تنقید کا ایک مصنف بھی ہے۔ جس کا نام "شد الزنار علی جحفلۃ الحمار" تھا۔ ایک ماہرِ بلاغت کے طور پر اس کی تصانیف "کتاب التجنیس"، عروض پر ایک رسالہ "کتاب القوافی" اور ایک اہم تصنیف "منہاج البلغاء و سراج الادباء" ہیں۔

حازمیہ: خارجیوں کا ایک فرقہ جو حازم بن عاصم کا متبع ہے۔ ان کا مذہب اہل تشیع کے موافق ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں وہ توقف کرتے ہیں اور انہیں بَری نہیں جانتے اور نہ ان کے سوا کسی اور کو بری سمجھتے ہیں۔

حاشد و بکیل: جنوبی عرب کے قبائل کا ایک بڑا مجموعہ جن کے مابین ایک وفاق قائم تھا۔

موجودہ زمانے میں جنوبی عرب کے باشندے حاشد کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کرتے ہیں۔ حاشد الاصغر بن جشم بن نوف بن حاشد الاکبر بن جشم بن ہمدان بکیل کو وہ حاشد الاکبر کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔

ان کا علاقہ صنعا کے قریب واقع ہے اور مغرب کی سمت میں مارب اور نجران تک پھیلا ہوا ہے اور مشرق میں صحرا کے عین کنارے تک پہنچ جاتا ہے۔ فی لوزنے اسی علاقے کو "بلد القبائل" یعنی قبائلیوں کا علاقہ کہا ہے۔ بنو حاشد تین بڑے گروہوں میں منقسم ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ الحارف۔

۲۔ بنو صریم۔

۳۔ العصیمات۔

بنو حاشد میں مسلح آدمیوں کی تعداد بائیس ہزار ہے۔ حاشد کے علاقوں میں مندرجہ ذیل مقامات شامل ہیں:۔

قاعتہ شمس، قاعتہ حبیس، قاعتہ البون، جبل ذی بین اور حبس کے ساتھ اسی نام کی ایک وادی ہے جو وادی شرابہ کی معاون ہے۔ حوث اور ورقت کے گاؤں، خمر، تعار کے کھنڈرات، جبل تنلن۔

بنو حاشد تمام عرب قبائل میں بدنام ہیں۔ لیکن گلازر نے مہربان خصلت اور بالطبع صاف دل لکھا ہے۔

بنو بکیل بنو حاشد کے علاقوں سے مشرق کی جانب رہتے ہیں اور مندرجہ ذیل قبائل پر مشتمل ہیں:۔

بحارث، بلاد البستان، خولان، جبر، ارحب، نہم، عیال صریح، نوف، ذو محمد، ذو حسین، سفیان، مرہبہ، مرھبہ، وادعہ، ہمدان عیال، سالم، وائلہ، عمائسہ اور اہل امار نیز خود صنعا کا شہر بھی ایک وقت میں بنو بکیل کے علاقے میں شمار ہوتا رہا۔ بکیل کے مسلح آدمیوں کی تعداد اسّی ہزار بتائی جاتی ہے۔

حاشد اور بکیل زیدی ہیں اور سیاسی حیثیت سے زیادہ تر آزاد ہیں۔ زمین کی پیداوار روز بروز کم ہوتے جانے کی وجہ سے حاشد اور بکیل کے بہت سے افراد اپنے علاقے کو ترک کر دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حاشد اپنے علاقے [illegible]

Marfat.com

[illegible] ابن [illegible] سے [illegible] اپنی قوت [illegible] جب [illegible] تک پہنچے
[illegible] ذکر قدیم [illegible] آثار [illegible] کا کوئی نہ کوئی تعلق [illegible] رہے تھے۔

۵ہ/ ۶۲۸ء میں بکیل اور حاشد کے درمیان ایک شدید جنگ لڑی گئی تھی۔ [illegible] کا سبب یہ تھا کہ بکیل [illegible] ذو حوزان کو [illegible] کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب حاشد نے [illegible] سے [illegible] وائع [illegible] میں قتل عام شروع کر دیا۔ حاکم [illegible] پاشا [illegible] نے [illegible] کو ختم کرایا اور اس طرح یہ دونوں قبیلے اس کے زیر حکومت آ گئے۔

الہمدانی نے اپنی تصنیف صفۃ جزیرۃ العرب میں ان دونوں قبیلوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

بکیل کے علاقوں میں یہ مقامات شامل تھے۔ الصمع، حدقان، مطرۃ عذر، متعدد بدیاں جو خارد میں آ کر مل جاتی ہیں، جبل زیبان، حریب اقرط الحق، وادی عصم، بالائی جوف، مصولان، جبل ورود، الصیلح، خیوان اور صعدہ کے درمیانی گاؤں بلد شاکر بن بکیل، حیدہ اور طلاح ہیں۔ بکیل کی منڈیوں میں ورود، عرق اور ریدہ تھیں۔

حاطبؓ بن ابی بلتعہ :

(۔۔۔؟ ۔۔۔ ۳۰ھ/ ۶۵۰ء) صحابی اور ایام جاہلیت کے مشہور شاعر۔ ابو محمد اور ابو عبد اللہ کنیت۔ سکونت یمن میں تھی شہسواری میں کمال شہرت رکھتے تھے۔ ہجرت سے پہلے مسلمان ہوئے اور تمام جنگوں میں نمایاں حصہ لیا۔

آپ ۶ھ میں مقوقس شاہ مصر کے پاس آنحضورؐ کا خط لے کر گئے تھے شاہ مصر نے خط پڑھ کر اسے بڑی تکریم کے ساتھ ہاتھی دانت کے ایک ڈبے میں بحفاظت رکھ دیا اور حاطب کو بیش قیمت تحائف اور ماریہ اور سیرین دو لونڈیاں دلدل نامی ایک خچر اور بہت سے قیمتی ملبوسات دے کر روانہ کیا۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ خود فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس شاہ اسکندریہ کے پاس نامۂ گرامی دے کر بھیجا۔ مقوقس نے مجھے اپنے محل میں اپنے پاس ٹھہرایا۔ اس نے اپنے تمام پادریوں کو جمع کیا اور مجھے بلا کر کہا "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا تم ذرا سمجھ کر جواب دینا" میں نے کہا "پوچھئے"۔ اس نے کہا "تم اپنے حضرت سے مجھے مطلع کرو کیا وہ نبی نہیں ہیں؟"۔۔۔۔۔ میں نے کہا "وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں"۔ اس نے کہا "جب وہ اس اونچے پایے کے تھے تو انہیں یہ کیسے سوجھی کہ جب قوم نے انہیں وطن سے نکال باہر کیا، قوم کے لئے بددعا کیوں نہ کی؟" میں نے کہا "کیا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تم لوگ اللہ کے رسول ہونے کی شہادت نہیں دیتے ہو؟" اس نے کہا "بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں"۔ میں نے کہا "جب قوم نے ان کو پکڑا اور ان کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو انہیں کیا سوجھی کہ قوم پر بددعا کیوں نہیں کی؟ کہ اللہ ان سب کو تباہ و برباد کر دیتا اور ان کو اللہ نے آسمان دنیا پر اٹھا لیا"۔ یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا تم نہایت ہی دانا اور عقلمند ہو اور دانا و عقلمند کے پاس آئے ہو۔ یہ ہدیے میں تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں آنحضورؐ کے لئے اور تمہارے ساتھ پہرے دار بھیج دوں گا۔ چنانچہ اس نے بہت سی نایاب چیزیں اور تین باندیاں آنحضورؐ کی خدمت میں بھیجیں جن میں سے ایک ابراہیم بن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ ہوئیں جن کا نام حضرت ماریہؓ تھا۔ ایک باندی آپ نے حسانؓ بن ثابت کو اور تیسری محمد بن قیس عبدی کو ہبہ [illegible]

جب آنحضورؐ نے مکے پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا تو آپؓ نے مکہ والوں کو اس بات کی خبر دار کرنے کے لئے ایک خط لکھا۔ آنحضورؐ کو اس خط کی اطلاع ہو گئی۔ آپؐ نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور عرض کی کہ میں نے مرتد ہو کر خط نہیں لکھا بلکہ صرف اس لئے کہ ایام جاہلیت میں قریش سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے اور میرے بہت سے قریبی رشتہ دار مکے میں مقیم ہیں چنانچہ آنحضورؐ نے معمولی سرزنش کے بعد ان کا قصور معاف کر دیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں آپؓ کو دوبارہ سفیر بنا کر مصر بھیجا گیا۔ آپؓ نے ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ بڑے سخت مزاج اوصاف کے تھے۔ تجارت آپؓ کا ذریعہ معاش تھا۔

حافظ :

اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں میں سے ایک نام (دیکھئے "اسماء الحسنیٰ")

حافظ :

جب اس کلمے کا اطلاق انسان پر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے قرآن مجید زبانی یاد ہو یعنی جس نے قرآن مجید کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رکھا ہو۔

حافظ :

(۴۶۷ھ/ ۱۰۷۴ء ۔۔۔ جمادی الآخرہ ۵۴۴ھ/ اکتوبر ۱۱۴۹ء) گیارھواں فاطمی خلیفہ۔ عبدالمجید نام اور ابو المیمون کنیت تھی عسقلان میں پیدا ہوا جہاں اس کا والد ابو القاسم محمد مصر میں قحط سالی کی وجہ سے چلا گیا تھا۔ حافظ نے خاصی لمبی عمر میں سیاسیات میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کیا ۵۲۴ھ/ ۱۱۳۰ء میں جب خلیفہ الامر بغیر اولاد نرینہ چھوڑے قتل ہوا تو اس وقت حافظ کافی معمر ہو چکا تھا۔ چونکہ شہزادوں میں وہ قریب ترین وارث تھا۔ اسی وجہ سے اسے الحافظ لدین اللہ کا لقب دے کر نائب السلطنت چنا گیا۔ اسے خلیفہ اس لئے نہیں بنایا گیا کہ اس زمانے کے عام شیعہ عقیدے کے مطابق امامت صرف باپ سے بیٹے کو پہنچ سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ الامر کی بیوہ کے ہاں جلد ہی ولادت کی توقع تھی۔ حافظ نے ابھی عنان حکومت سنبھالی ہی تھی کہ ابو علی احمد بن افضل معروف بہ الخلیفہ نے فوج کی مدد سے اس کے خلاف بغاوت اور حافظ کے مقرر کردہ وزیر کو برطرف کر کے خود وزارت کے عہدے پر قابض ہو گیا۔ حافظ کو قصر شاہی میں قید کر دیا اور فاطمی خاندان کے جائز حقوق پامال کر کے امام منتظر کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اسی کے نام کا سکہ جاری کر دیا ایک سال تک وہ پورے اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ بالآخر حافظ تخت پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور بلا شرکت غیرے حکومت کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے بیٹوں حسن اور حیدرہ کے باہمی جھگڑوں نے اس کے اقتدار کی بنیاد متزلزل کر دی۔ ایک سخت معرکے کے بعد جس میں حیدرہ نے شکست کھائی اور حسن سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ حسن نے اپنے والد حافظ کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا۔ حافظ نے مجبور ہو کر اس کے عیسائی طبیب سے زہر دلا کر اسے ہلاک کروا دیا۔ فوج نے بہرام نامی ایک ارمنی وزیر کا تقرر کروایا جو عیسائی تھا۔ دو سال بعد حافظ نے اسے معزول کر دیا اس کے بعد رضوان وزیر مقرر کیا گیا لیکن اس کا بھی حافظ سے جلد ہی بگاڑ پیدا ہو گیا۔ انہی نامساعد حالات میں بوڑھے خلیفہ حافظ کا درد قولنج سے ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

Marfat.com

حافظ ابراہیم : مصری شاعر اور مصنف :

اصل نام محمد حافظ اور والد کا نام ابراہیم تھا۔ حافظ ابراہیم کے نام سے معروف ہوئے۔ ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۲ء کے درمیان دہانشی کشتی میں پیدا ہوا جو دیروط کے نزدیک نیل کے ساحل پر لنگر انداز تھی۔ ابھی چار سال کا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ اس کی پرورش ماموں نے کی۔ یہ کچھ عرصہ قاہرہ میں رہا بعد میں طنطا چلا گیا جہاں اس کے ماموں نے ایک مکان دے دیا تھا۔ اسی جگہ وہ عربی شاعری سے مانوس ہوا پھر بیروزگاری سے تنگ آکر اس نے قاہرہ فوجی کالج میں داخلہ لے لیا۔

تعلیم سے فارغ ہوکر وہ وزارت جنگ میں اور پھر وزارت داخلہ میں ملازم رہا۔ اس نے ایک عہدیدار کی حیثیت سے مشرقی سوڈان میں لارڈ کچنر کی مہم کے زمانے میں کافی عرصہ ملازمت کی۔ ۱۹۰۶ء میں قاہرہ واپس آگیا اور استاد مفتی عبدہ سے وابستہ ہوگیا۔ یہاں پر اس نے خود کو شاعری کے لئے وقف کر دیا۔ اس دور میں اس نے سعد زغلول، مصطفیٰ کامل اور قاسم امین جیسے سیاسی قائدین سے رابطہ قائم رکھا۔ ۱۹۱۱ء میں وہ سول سروس کا رکن بنا اور اسے قاہرہ میں کتاب خانہ خدیو کے ادبی حصے کا صدر بنا دیا گیا۔ اپنی وفات تک (۲۱ جولائی ۱۹۳۲ء) اس نے یہ عہدہ سنبھالے رکھا۔

حافظ ابراہیم عربی شاعری کے جدید مکتب فکر کے ان نمائندوں سے ہے جن کا قائد سامی البارودی تھا۔ اس کے دیوان کے قطعات میں بہت سی تفصیلات اور براہ راست مشاہدات ملتے ہیں جو اس زمانے کے مصر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کی شاعری الازہر کے علمی حلقوں میں بہت جلد معروف ہوگئی اور اس نے مصر کے اعلیٰ مہذب طبقے اور سیاسی قائدین سے بڑی داد حاصل کی اس نے وکٹر ہیوگو کی MISERABLES میں سے کئی ضمنی قصوں کا ترجمہ کیا۔ اس نے خلیل مطران سے مل کر PAUL-LEROY-BEAULIEU کی ایک تصنیف کا ترجمہ بھی کیا جو "الموجز فی علم الاقتصاد" کے نام سے شائع ہوا۔

حافظ ابرو : ایک ایرانی جغرافیہ نویس اور مورخ

(—؟— ۳ شوال ۸۳۳ھ/۱۵ جون ۱۴۳۰ء)

شہاب الدین عبداللہ بن الرشید الخوافی، المعروف حافظ ابرو۔ ہرات میں پیدا ہوا۔ ہمدان میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی تصانیف سے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیمور کے دربار سے وابستہ تھا اور بادشاہ کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے وہ شطرنج کا ماہر تھا۔ تیمور کے بعد وہ اس کے جانشین شاہرخ اور شاہزادہ بایسنغر کے دربار سے منسلک ہوگیا۔

حافظ ابرو نے تیمور کی آخری مہمات، ہرات اور شاہرخ کی مہمات کے حالات ایک عینی شاہد کی حیثیت سے لکھے ہیں۔ ۸۱۷ھ/۱۴۱۵ء میں شاہرخ نے اس سے جغرافیہ پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ حافظ ابرو کی یہ تصنیف جس کا نام کہیں بھی درج نہیں، دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں المغرب سے کرمان تک مختلف ملکوں کا بیان ہے۔ آخری ابواب میں جو فارس اور کرمان سے متعلق ہیں۔ جغرافیائی حالات اور مختلف اضلاع کی سیاسی تاریخ مصنف کے زمانے تک مندرج ہے۔ دوسری جلد میں خراسان اور ماوراءالنہر کا جغرافیہ اور تاریخ زیادہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

پہلی جلد ۸۲۲ھ/۱۴۱۹ء میں لکھی گئی اور دوسری جلد اس سے ایک سال بعد۔ شاہرخ کے فرمان کے مطابق حافظ ابرو نے ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء میں تاریخ عالم کی اہم ایران کا ایک [illegible] ہے جس نے جامع التواریخ کا ذیل [illegible] تک لکھا۔

۸۲۶ھ/۱۴۲۳ء میں حافظ ابرو نے شہزادہ بایسنغر کے لئے چار جلدوں میں "زبدۃ التواریخ" کے نام سے تاریخ عالم لکھی جو ۸۳۰ھ/۱۴۲۶ء میں مکمل ہوئی۔ یہ تاریخ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد میں زمانۂ قبل اسلام کے پیغمبروں اور ایران کے شاہان قدیم کے بارے میں حالات درج ہیں۔ دوسری جلد میں آنحضورؐ سے المستعصم تک، تیسری جلد میں بعد از خلافت بغداد سلجوقیوں اور مغلوں کے حالات ابوسعید ایلخانی کی وفات تک اور چوتھی جلد میں سوانح تیمور اور شاہرخ کے گیارہ سالہ حالات قلم بند ہیں۔

حافظ ابرو نے اپنی کتابوں میں بہت سی معلومات ایسی تحریروں سے اخذ کی ہیں جو اب معدوم ہیں۔ جہاں تک اس کے اپنے عہد کے واقعات اور حالات کا تعلق ہے اس کی کتاب کے متعلقہ حصے بہت مستند سمجھے جاتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی : محدث، مؤرخ اور فقیہہ (دیکھئے "ابن حجر عسقلانی")

حافظ احمد پاشا : (—؟— ۱۹ رجب ۱۰۴۱ھ/۱۰ فروری ۱۶۳۲ء) سلطنت عثمانیہ کا صدر اعظم۔

اس کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن ایک روداد کے مطابق جو اس نے وینس کی حکومت کو بھیجی تھی ۱۶۱۲ء میں اس کی عمر چالیس سال کی تھی۔

اس نے اندرون ہمایوں (محل سلطانی) میں مصاحب (بادشاہ کا خاص ندیم) کے منصب تک ترقی کی۔ وہ طوغانجی باشی (میر شکار) بھی رہا۔ بعد میں وہ وزیر اور قپودان پاشا یعنی عثمانی بحریہ کا امیر البحر اعظم بن گیا۔ اور اس عہدے پر ۲۲ شوال ۱۰۱۶ھ/۹ فروری ۱۶۰۸ء تا ۱۶ فروری ۱۶۰۹ء فائز رہا۔ اس عہدیدار کی حیثیت سے اس نے کوئی ناموری حاصل نہ کی ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں وہ ان جہازوں کی حفاظت نہ کر سکا جو مصر کا خراج لے کر اسکندریہ سے استانبول جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کو قپودان پاشا کے عہدے سے معزول کر کے شام کا بیگلر بیگی بنا دیا گیا۔ اپریل ۱۶۰۹ء تا جنوری ۱۶۱۵ء وہ لبنان کے دروزی سردار فخرالدین ثانی کے خلاف فوجی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ بعد میں جب وہ دیار بکر کا بیگلر بیگی تھا اسے بغداد پر ترک حکومت بحال کرنے کا حکم ملا۔ جہاں سوباشی بکر نے بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ اس مہم میں وہ ناکام رہا۔ ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳-۱۶۲۴ء میں شاہ عباس اوّل صفوی کی فوجوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ ربیع الآخر ۱۰۳۴ھ/ فروری ۱۶۲۵ء میں حافظ احمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا۔ اس کے عہد کا سب سے اہم واقعہ بغداد کا ناکام محاصرہ ہے جو صفر ۱۰۳۵ھ/ نومبر ۱۶۲۵ء تا شوال ۱۰۳۶ھ/ دسمبر ۱۶۲۶ء جاری رہا۔

حافظ احمد پاشا کو ربیع الاول ۱۰۳۶ھ/ دسمبر ۱۶۲۶ء میں صدر اعظم کے عہدے سے معزول کر کے وزیر ثانی بنا یا گیا۔ سلطان مراد رابع کی ایک بہن سے اس کی شادی ہوگئی۔ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۰۴۱ھ/۲۵ اکتوبر ۱۶۳۱ء کو دوسری بار صدر اعظم بنا۔ لیکن ایشیائے کوچک کے فوجی [illegible]

Marfat.com

[illegible] عربی فارسی کی دیوان کا ایک اچھا شاعر تھا۔ بغداد کا محاصرہ کر کے اس نے سلطان سے کمک بھیجنے کی درخواست ایک منظوم خط میں کی تھی۔ سلطان مراد رابع نے جو خود بھی شاعر تھا اس خط کا جواب منظوم خط میں ہی دیا تھا

حافظ برخوردار: (غالباً ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء — ۹) پنجابی زبان کا ایک ممتاز شاعر اور مصنف۔

تخت ہزارے کے نواحی گاؤں شلمانی ضلع سرگودھا میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے لئے لاہور آیا۔ بعد میں سیالکوٹ چلا گیا بقیہ عمر وہیں گزاری۔ وہ قرآن مجید کا حافظ تھا ساری عمر وعظ و نصیحت کرنے اور شعر و شاعری میں گزاری۔

حافظ برخوردار کی تصانیف کی تعداد چالیس کے قریب ہے جو تمام کی تمام پنجابی میں ہیں۔ اس کی تصانیف کو موضوع کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مذہبی اور شرعی مسائل سے متعلق کتب ہیں "نہر العلوم، بحر العلوم، شمس العلوم، مفتاح العلوم، فقہ اجمال، نجات المسلمین، تنبیہ المفسدین، فرائض ہندوی، یوسف زلیخا" اور "قواعد برخوردار" ہیں۔ رومانی داستانوں میں "مرزا صاحباں" اور "ہیر رانجھا" قابل ذکر ہیں۔

حافظ برخوردار نے ان تصانیف میں مقامی بولی کی بجائے ٹکسالی اور معیاری پنجابی زبان استعمال کی ہے۔ مذہبی تصانیف میں عربی اور فارسی کی بڑی پیاری آمیزش ہے۔ رومانی داستانوں کی زبان بہت دل آویز اور خوب صورت ہے وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنی زبان کے لئے "پنجابی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

پنجابی ادب کے بعض نقادوں نے یہ بات لکھی ہے کہ حافظ برخوردار کے نام کا ایک نہیں بلکہ دو شخص تھے۔ بقول میاں محمد بخش، احمدیار، مولوی دلپذیر، "ایک حافظ برخوردار تو وہ ہے جس نے فرائض ہندوی میں اپنا مسکن جیبہ چٹھہ پرگنہ صوبہ لاہور بتایا ہے اور دوسرا وہ ہے جس نے "تنبیہ المفسدین"۔ "مفتاح السعادت" وغیرہ میں اپنا وطن تخت ہزارہ بتایا ہے۔"

اس بات کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ "بحر العلوم" کے مصنف حافظ برخوردار نے رومانی داستانیں لکھنے والوں کو سخت الفاظ میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور انہیں بدعت کا مرتکب قرار دیا ہے۔

حافظ جمال اللہ سید: (۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء — ۱۲ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء) ایک صوفی بزرگ۔

آپ حافظ محمد برخوردار کے صاحبزادے تھے۔ پیدائش ساہن پال شریف ضلع گجرات میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر مولانا مفتی محمد صدیق اور حافظ مفتی شکر اللہ سے علوم عقلی و نقلی حاصل کئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر درگاہ نوشاہیہ میں مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کو حدیث و فقہ میں بڑا کمال حاصل تھا۔ آپ علم تصوف و اشارات فقر میں استاد کامل تھے۔ مجاہدہ و ریاضت سے کبھی فارغ نہ ہوتے۔ اکثر لاہور تشریف لے جایا کرتے اور اکابر مشائخ لاہور سے ملاقاتیں کیا کرتے۔ مولانا سید [illegible] نے آپ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"[illegible] جمال اللہ بن سید برخوردار بن محمد بن العلا لاہوری۔"

آپ نے چوہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار ساہن پال شریف ضلع گجرات میں ہے۔ آپ کی اولاد میں دو بیٹے تھے جن کے نام سید ابو سعید ترامض، سید حافظ محمد حیات ربانی ہیں۔ "حقائق الآثار" آپ کی تصنیف ہے۔

حافظ دراز (۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء — غالباً ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء) ایک عالم دین۔

نام محمد احسن واعظ ابن حافظ محمد صادق واعظ۔ پشاور میں پیدا ہوئے۔ اکثر علوم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کئے۔ آپ فقہ و حدیث اور اصول میں یگانۂ روزگار تھے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تمام عمر تدریس و تالیف میں صرف کی۔ آپ نے ۸۱ برس کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے 'فیض الباری شرح صحیح بخاری' (فارسی)، 'تفسیر سورۂ یوسف'، 'تفسیر سورۃ والضحیٰ'، 'معراج نامہ'، 'حاشیہ مسلم'، 'شرح قاضی مبارک' وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

حافظ رحمت خان: (۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء — ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء) روہیل کھنڈ کے ایک اہم حکمران خاندان

کا سردار۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

"رحمت خان بن شاہ عالم خان بن محمود خان بن شہاب الدین بن دولت خان بن بدل خان بن داؤد خان بن جبر تیج خان بن قیس عبدالرشید"

وہ شہامت پور میں پیدا ہوا جو روہ کا ایک چھوٹا سا غیر معروف گاؤں ہے۔ اس کی پیدائش اس کے والد کی ہندوستان سے پہلی بار واپسی کے بعد ہوئی۔ یہاں ان دنوں علاقہ کیٹھیر میں ایک غلام داؤد خان نے، جو مقامی راجاؤں اور زمینداروں کے ہاں فوجی خدمات انجام دیتا رہا تھا، بہت اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ داؤد خان نے اپنی ریاست علیحدہ قائم کر لی۔ اس کے عروج کی خبر سن کر اس کے بہت سے ہم وطنوں نے بھی ہندوستان کا رخ کیا۔ انہیں میں رحمت خان کا والد عالم خان بھی تھا۔ داؤد خان نے ایک آقا کی حیثیت میں ان کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ لیکن جلد ہی دونوں میں رنجش پیدا ہو گئی۔ اور داؤد خان نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد داؤد خان خود بھی مارا گیا اور متبنیٰ علی محمد خان اس کا جانشین ہوا۔ جو سخت جان اور دلیر سپاہی تھا۔ اس کے دور میں روہیلے اتنے نڈر ہو گئے کہ انہوں نے علی محمد خان کی سرکردگی میں پرگنہ، بریلی اور اس کے گرد و نواح میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان میں مزید علاقے فتح کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔ اودھ کے نواب وزیر صفدر جنگ نے بادشاہ کو علی محمد خان کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ چنانچہ خود بادشاہ کی قیادت میں روہیلہ سردار کے خلاف ایک مہم روانہ ہوئی۔ علی محمد خان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگرچہ وزیر الممالک قمر الدین خان کی سفارش سے اسے معافی مل گئی لیکن بادشاہ اسے قیدی کی حیثیت سے دہلی لے گیا۔ مگر علی محمد خان کے دست راست حافظ رحمت خان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ رحمت خان نے اپنی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑی فوج تیار کر لی۔ اور دار السلطنت کی طرف روانہ ہوا، تاکہ بادشاہ پر دباؤ ڈال کے اپنے سرپرست علی محمد خان کو رہا کرا سکے۔ چنانچہ حافظ رحمت خان وزیر الممالک اور دوسرے امرا سے اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ یوں علی محمد خان کو رہا کر کے اسے سرہند کی صوبیداری دے دی گئی جہاں

Marfat.com

ان [illegible] بن گئے جو [illegible] ایک [illegible] تھی رحمت خان نے ایک دفعہ [illegible] کو جلد آور [illegible] کو کرا امتیاز حاصل کیا [illegible]

محمد شاہ اور وزیر الممالک قمر الدین خان کے انتقال پر ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں وزارت کے اہم منصب کے لئے کشمکش شروع ہوئی تو رحمت خان ایک ہزار چیدہ سپاہیوں کو لے کر دہلی روانہ ہوا اور کامیاب حملہ کر کے بادشاہ احمد شاہ کو وزارت کا عہدہ صفدر جنگ کے سپرد کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۳ شوال ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں علی محمد خان کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنی وفات سے دو دن پہلے حافظ رحمت خان کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ لیکن رحمت خان اس کے ایک کمسن لڑکے سعد اللہ خان کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو گیا اور اس کی خورد سالی کے زمانے میں رحمت خان عملاً نائب حکومت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے نواب صفدر جنگ کے دل میں روہیلوں کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی اس نے پہلے تو قطب الدین خاں سابق گورنر مراد آباد کے نام روہیل کھنڈ کی حکومت کی سند دربار شاہی سے جاری کرا دی لیکن وہ حافظ رحمت خان سے لڑتا ہوا مارا گیا تو فرخ آباد کے بنگش نواب قائم خان کو روہیلوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ بدایوں سے تین میل کے فاصلے پر زبردست جنگ ہوئی جس میں قائم خاں مارا گیا اور اس کے ساٹھ ہزار فوج تتر بتر ہو گئی۔ رحمت خان نے نواب بنگش نواب کے پرگنوں کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ ادھر صفدر جنگ نے اپنے آلۂ کار کی شکست سے فائدہ اٹھا کر فرخ آباد پر قبضہ کر لیا۔ لیکن قائم خان کے چھوٹے بھائی احمد خان نے جلد ہی صفدر جنگ کے نائب نول رائے کو شکست دے کر قتل کر دیا اور اپنا غصب شدہ علاقہ واپس لے لیا۔ اس پر صفدر جنگ برافروختہ ہوا اور اس نے ایک بڑی فوج جمع کر کے افغانوں کے خلاف چڑھائی کر دی۔ رحمت خاں نے احمد خان کی درخواست پر اس کا ساتھ دیا۔ اور اس طرح دونوں کی فوجوں نے مل کر اودھ کی افواج کو بھاری شکست دی۔ چنانچہ اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے صفدر جنگ نے ملہار راؤ ہلکر اور آپا جی سندھیا کی سرکردگی میں مرہٹوں کو بلا لیا اور فرخ آباد کی طرف کوچ کر دیا۔

ابھی رحمت خان انولہ میں افغان سرداروں سے بات چیت ہی کر رہا تھا کہ سعد اللہ خاں اس سے مشورہ کئے بغیر یلغار کرتا ہوا میدان جنگ میں آ گیا۔ ۲۸ اپریل ۱۷۵۱ء کو فتح گڑھ کے نزدیک ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں نے سعد اللہ خاں کی بارہ ہزار فوج کو مکمل شکست دی۔ اس فتح سے سرشار ہو کر مرہٹوں اور ان کے حلیف صفدر جنگ کو اب کٹھیر (روہیل کھنڈ) پر حملہ کرنے اور قبضہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے ارادوں کو بھانپ کر رحمت خان اور دوسرے روہیلہ سردار ترائی کے دشوار گزار علاقے میں ہٹ گئے۔ صفدر جنگ اور اس کے مرہٹہ حلیفوں نے ان کی خیمہ گاہ کا محاصرہ کر لیا لیکن اس علاقے کی دشوار گزاری اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے باعث ان کی ہمت پست ہو گئی اور انہوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ واپس چلے جائیں لہٰذا بعد میں وہ احمد شاہ کے اشارے پر روہیلوں سے صلح کی گفت و شنید کرنے پر راضی ہو گیا جس کے نتیجے میں ۱۷۵۲ء میں لکھنؤ میں ایک صلح نامے پر دستخط ہو گئے اس طرح حافظ رحمت خان اور صفدر جنگ کے درمیان تجدید تعلقات ہو گئی۔ مرہٹوں کی تاخت سے روہیل کھنڈ میں بڑی تباہی پھیلی تھی۔ لہٰذا حکومت کا خرچ چلانے کے لئے حافظ رحمت خاں نے بڑے بڑے سرداروں میں علاقہ تقسیم کر دیا تا کہ ہر سردار اس کی آمدنی سے اپنی سپاہ کا خرچ پورا کر سکے۔

۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء [illegible]
یہ خیال کے [illegible]
ان کا [illegible] استقلال [illegible]
تقسیم کر دیا۔ عبداللہ [illegible]
خان کو بریلی اور اہرات کا علاقہ اور سعد اللہ خان کو مراد آباد کا علاقہ ملا۔ ریاست کی تقسیم ہو جانے کے باوجود جلد ہی نواب عبداللہ خان کی سخت طبیعت کی وجہ سے فساد ہونے لگے۔

معاملہ یہاں تک بڑھا کہ ایک روز اس نے اپنے بھائی فیض اللہ خان کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ جب فیض اللہ نے حافظ رحمت خان کے ہاں پناہ لی تو عبداللہ خان نے رحمت خان کو زہر دلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ رحمت خان نے اسے وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ لیکن پانچ ماہ تک مارا مارا پھرنے کے بعد نواب احمد خان بنگش کی سفارش پر دوبارہ حافظ رحمت خان کے پاس آ گیا اور ریاست کی نئے سرے سے تقسیم ہوئی۔ لیکن اس تقسیم سے سلطنت کی آمدنی بہت کم ہو گئی اور رحمت خاں اپنی سلطنت کی حدود بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی حکومت پیلی بھیت تک بڑھا لی۔ اس کا نام اس نے حافظ آباد رکھا اور اسے اپنی عملداری کا صدر مقام بنا لیا۔ اس سے پہلے بریلی اس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس نے بریلی میں ایک بڑا محل، ایک دیوان خاص اور ایک دیوان عام تعمیر کرایا تھا۔ اسی دوران احمد شاہ نے صفدر جنگ کی جگہ غازی الدین عماد الملک کو وزارت دے دی۔ اس بات سے برہم ہو کر صفدر جنگ لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔

اس نے حافظ رحمت خان کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا۔ رحمت خان چالیس ہزار سپاہی لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا لیکن راستے ہی سے واپس لوٹ آیا۔ حافظ رحمت خاں کا ایک رفیق نجیب خان بادشاہ کے ساتھ جا ملا اور اس نے صفدر جنگ کے مقابلے میں کئی مورچے سر کئے۔ بعد میں صفدر جنگ نے بادشاہ سے معافی مانگ لی۔ ۱۷۵۶ء میں صفدر جنگ کا انتقال ہوا۔ اسی سال غازی الدین نے احمد شاہ بادشاہ کو نابینا کر کے قید میں ڈال دیا اور اس کی جگہ بہادر شاہ اوّل کے پوتے عزیز الدین کو عالمگیر کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر تیسری بار حملہ کیا۔ اس نے میر منو کی بیوی کی سفارش پر غازی الدین کو معاف کر دیا۔ اور رحمت خان کو حکم دیا کہ غازی الدین کو شجاع الدولہ سے، جو صفدر جنگ کا جانشین ہوا۔ زر پیشکش وصول کرنے میں مدد دے۔ حافظ رحمت خاں کی کوشش سے دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا اور جنگ کی نوبت نہ آئی۔ احمد شاہ ابدالی عماد الملک کی جگہ نواب نجیب الدولہ کا تقرر کر کے قندھار واپس چلا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد غازی الدین نے مرہٹوں اور جاٹوں کی مدد سے نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال دیا۔ جس نے حافظ رحمت خان اور شجاع الدولہ کی مدد سے ان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ ابھی [illegible] شاہ ابدالی کے حملے کی خبر پھر مشہور ہوئی تو غازی الدین نے عالمگیر ثانی کو قتل کرا کے اورنگ زیب عالمگیر کے ایک پوتے کو شاہجہان ثانی کے خطاب سے بادشاہ بنا دیا۔ ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کی حکومت [illegible] رحمت خان [illegible] کے بیٹے عنایت خان [illegible]
تھا، عملی حصہ لیا اور اپنی فوجوں [illegible]
نے اسے [illegible]

Marfat.com

[illegible] جب [illegible] تو نواب
[illegible]
احمد بنگش کے جواب وزیر اور وزیرالامرا ہو گیا تھا اس نے فرخ آباد کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ حافظ رحمت خان نے کمزور فریق کا ساتھ دیا اور فرخ آباد کی اس چھوٹی سی ریاست کو تباہی سے بچالیا۔

۱۷۶۳ء میں نواب سعد اللہ خان کا انتقال ہوا تو روہیل کھنڈ کے سردار نواب علی محمد خان کے کسی لڑکے کو اپنا حکمران ماننے پر رضامند نہ ہوتے بلکہ حافظ رحمت خان کی سرداری میں رہنا قبول کیا۔

۱۷۶۴ء تک روہیل کھنڈ میں امن وامان رہا۔ اس کے بعد رحمت خان نے جس بڑے واقعہ میں حصہ لیا وہ پٹنے پر حملہ تھا' جو اس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ ۱۱۷۸ھ/ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں جو انگریزوں اور بنگال کے معزول ناظم میر قاسم اور رحمت خان کے حلیف شجاع الدولہ کے درمیان لڑی گئی شجاع الدولہ کو شکست ہوئی۔ اس نے رحمت خان کے پاس پناہ لی جو ان دنوں حسن پور میں خیمہ زن تھا۔ جب شجاع الدولہ نے دیکھا کہ رحمت خان کوئی عملی مدد دینے کے لئے تیار نہیں تو اس نے مرہٹوں سے رجوع کیا۔ اور دونوں کی فوجوں نے مل کر ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء میں کوڑہ جہاں آباد کے مقام پر انگریزوں پر دھاوا بول دیا تاہم ان کے سپاہی انگریزی توپوں کی گولہ باری کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور انہیں مکمل شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شجاع الدولہ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن اس کے دل میں حافظ رحمت خان کی طرف سے برابر یہ خلش رہی کہ وہ ایک نازک وقت میں اس کے کام نہیں آیا۔ چونکہ انگریزوں کو حافظ رحمت خان کی جانبداری کا یقین تھا لہٰذا اسے چند سال اور اطمینان اور راحت میں بسر کرنے کا موقع مل گیا۔

انگریزوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ ہندوستان کے افق پر نمایاں ہو رہا تھا اور یہ بات حافظ رحمت خان جیسے ہوشیار اور باصلاحیت شخص سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی۔ ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰ء میں نجیب الدولہ اور ۱۱۸۵ھ/ ۱۷۷۱ء میں رحمت خان کا چچا زاد بھائی دوندے خان انتقال کر گیا جس سے ہندوستان میں افغان حکومت کو بہت نقصان پہنچا۔ نجیب الدولہ کا بیٹا اور جانشین مرہٹوں کا حلیف بن گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنے مقبوضات کی شجاع الدولہ سے حفاظت کر سکتا تھا۔ حافظ رحمت خان نے نواب اودھ کا ساتھ دیا۔ جسے انگریز اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے اور جس کا علاقہ ان کے اور مرہٹوں کے مابین ایک درمیانی ریاست کا کام دے سکتا تھا۔

مرہٹوں کے خلاف حفاظت کی قیمت میں اپنے حصے کے طور پر رحمت خان نے شجاع الدولہ کو روہیلوں کی جانب سے چالیس لاکھ روپے دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ دس لاکھ روپے تو فوراً ادا کر دیئے جائیں گے اور باقی رقم تین سال کے عرصے میں تین قسطوں میں پوری کر دی جائے گی۔ کچھ مدت بعد حافظ رحمت خان کو محسوس ہوا کہ وہ شرائط پوری نہیں کی گئیں جن کی رو سے وہ چالیس لاکھ روپے دینے کا پابند ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے اس رقم کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔

شجاع الدولہ نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی تصور کیا۔ اس نے [illegible] لاکھ روپے نقد اور [illegible] لاکھ روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ [illegible] کی طرف سے مدد کا یقین دلایا گیا۔ اس نے اٹاوہ اور فرخ آباد [illegible] نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خان سے امداد کا وعدہ لے لیا۔

بلکہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کو بھی یہ لالچ دے کر کہ فتح کے بعد آدھا روہیل کھنڈ بادشاہ کی ملکیت میں دے دیا جائے گا' روہیل کھنڈ کے فتح کرنے کی حمایت لے لی۔ بعض روہیلہ سرداروں نے اس جنگ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ انگریزوں نے اس جنگ میں عملی طور پر اودھ کی فوجوں کی مدد کی۔ ان سرداروں میں علی محمد خان کا دوسرا بیٹا فیض اللہ خان بھی شامل تھا۔ جو بعد میں ریاست رامپور کا بانی ہوا۔ حافظ رحمت نے مصالحت کی خاطر وارن ہیسٹنگز سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن اس نے حافظ رحمت سے ملنے کی بجائے شجاع الدولہ کی اعانت کے لئے انگریزی فوج روانہ کر دی جس کے سپہ سالار کرنل چیمپئن نے حافظ رحمت خان کو لکھا کہ شجاع الدولہ کو دو کروڑ روپے ادا کئے جائیں ورنہ جنگ ہوگی۔ اس نامعقول مطالبے کے بعد صلح کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء میں فریقین کا کٹرہ میراں پور میں تصادم ہوا۔ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ادھر بخشی احمد خان کی قیادت میں روہیلوں کی فوج کی ایک بڑی تعداد نے حافظ محمد خان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حافظ رحمت خان کو ایک گولہ آکر لگا اور وہ فوراً ہلاک ہو گیا۔ اس کے ایک سابق ملازم نے اس کا سرتن سے جدا کر دیا اور اسے لے کر شجاع الدولہ کے پاس گیا جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ بعد میں اس کی نعش بھی میدان جنگ میں مل گئی اس طرح ہندوستان میں روہیلوں کی قلیل المدت لیکن شاندار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء میں راؤ پہاڑ سنگھ نے جس کو رحمت خان نے کئی جاگیریں دی تھیں اس کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کر دیا جسے ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء میں رحمت خان کے ایک بیٹے دلاور خان نے مکمل کیا۔ حافظ رحمت خان کی موت کے بعد مفتوح فوجوں نے بے یارومددگار آبادی کو خوب لوٹا۔ ہزاروں گاؤں جنہوں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا' نذر آتش کر دیئے گئے اور باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ سینکڑوں عمارتیں جو روہیلہ سرداروں نے بنوائی تھیں۔ پیوند زمین کر دی گئیں۔ حافظ رحمت کے رشتہ داروں اور گھرانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے ان کی حالت انتہائی خراب وخستہ کر دی گئی اور عورتوں تک کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پیدل چلنے پر مجبور کیا گیا

حافظ رحمت خان ایک نیک' عادل اور رحم دل حکمران تھا۔ اس کے عہد حکومت میں چاروں طرف امن وامان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ وہ علم وادب کا سرپرست تھا۔ تقریباً پانچ ہزار علماء کو خزانۂ عامہ سے وظائف دے کر کفالت کرتا تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ فارسی زبان کا شاعر بھی تھا۔ اس نے "خلاصۃ الانساب" جیسی کتاب لکھی جس میں افغانوں کے نسب کا حال بیان کیا گیا ہے اور آخری باب میں شیعہ مذہب کی تردید کی گئی ہے۔ اس کے عہد میں کسانوں کی حفاظت کی جاتی تھی کاریگروں اور صناعوں کو اپنے اپنے کام میں بلا روک ٹوک مشغول رہنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کے دور میں کاروبار ترقی پر تھا۔

حافظ روح اللہ (۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء — ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء)

ایک عالم دین۔ آپ نے لاہور میں زندگی بسر کی۔ صرف ونحو' منطق' فلسفہ اور علوم دینیہ میں کمال حاصل کیا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد سلیم لاہوری بھی تھے جن سے آپ کو حد درجہ عقیدت تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر معلمی کا پیشہ

Marfat.com

اپنایا اور ساری عمر درس وتدریس میں گزاری۔ یہ زمانہ پنجاب پر بڑا پر آشوب تھا۔ سکھوں کی حکومت نے علمی مراکز کو تہس نہس کر دیا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں سکھوں کی چیرہ دستیوں نے زندگی اجیرن کر دی تھی۔ مگر حافظ روح اللہ حالات سے بے نیاز اہلِ ذوق کو علمِ دین کی دولت سے مالا مال کرتے رہے۔ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں امن وامان قائم ہوا تو اس نے آپ کے استقلال اور علمی خدمات کی شہرت سن کر طلب کیا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء کو حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ جہاز میں رمضان کی راتوں میں تراویح پڑھانے کے لیے لوگ آپ کو امام بناتے۔ آپ حافظِ قرآن نہ تھے مگر سارا دن ایک پارہ زبانی یاد کر کے تراویح میں سناتے اس طرح آپ نے دورانِ سفر قرآن حفظ کیا۔ مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد یمن تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی۔

حافظ شیرازی : (غالباً ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء–۷۹۱–۷۹۲ھ/ ۱۳۸۹ء) فارسی غزل گو شاعر۔

نام اور لقب شمس الدین محمد ہے۔ شیراز میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور علمِ دین و دیگر متعلقہ علوم کی تحصیل میں مشغول رہے۔ اسی دور میں عربی زبان و ادب سے خوب واقفیت پیدا کر لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد معلمی کا پیشہ اپنایا۔ وہ ایک مدرسے میں تفسیرِ قرآن کے معلم تھے ان کا مدرسے میں تقرر یا تو قوام الدین حسن نے یا خواجہ قوام الدین وزیر نے کیا تھا۔

حافظ کو غزل گوئی میں حد درجہ کمال حاصل تھا۔ آخر میں انہوں نے اپنی غزلیات کو دیوان کی صورت میں مرتب کیا اور اس میں قصائد اور دوسری چھوٹی نظموں کا اضافہ کر کے ۷۷۰ھ/۱۳۶۸–۱۳۶۹ء میں اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس دیوان کے ساتھ ہی حافظ کا نام شیراز سے باہر بھی مشہور ہو گیا۔ چنانچہ ہرمز کے والی توران شاہ نے بہت فیاضی کے ساتھ حافظ کی قدر دانی کی۔ اگرچہ یزد کے مظفری خاندان کے فرمانروا نصرت الدین یحییٰ نے جو اپنی زندگی ہی میں اپنے بخل کے لئے بدنام تھا۔ حافظ کی طرف نظرِ التفات نہ کی۔ دکن کے بہمنی خاندان کے حکمران محمود شاہ اوّل کے عہد میں حافظ کو بادشاہ کے وزیرِ عدالت کی طرف سے دعوت پہنچی تھی۔ ایلخان احمد جو خود بھی شاعر تھا حافظ کو بغداد آنے کی دعوت دی تھی۔ ان کی دعوت کو حافظ نے قبول نہ کیا۔

حافظ کی شاعرانہ سرگرمیاں شاہ شجاع کے عہد میں اپنے عروج پر تھیں۔ شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ/۱۳۹۴ء میں وفات پائی۔ حافظ نے اکثر قصائد میں اس کی مدح سرائی کی ہے۔ ان کی باہمی دوستی کے متعلق بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ آخری عمر میں حافظ کو دوبارہ مظفری خاندان کا ایک مربی منصور مل گیا جس نے تیمور کے جانے کے بعد فارس کے صوبے پر قبضہ کر لیا تھا۔

حافظ کو اپنے وطن شیراز سے ایسی دلی محبت تھی جو آج بھی دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کبھی شیراز سے باہر جانا گوارا نہ کیا۔

حافظ، ایران کے غزل گو شعراء میں بلند ترین مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ وارداتِ عشق کے بیان میں بہت محتاط ہیں۔ عریانی سے پرہیز کرتے ہیں۔ سرورِ بادہ اور نشاط و طرب کی نغمہ سرائی میں مشرق میں ان کی نظیر کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دنیا کے عظیم ترین شعراء میں شمار کیا جاتا ہے جس کا ثبوت ان کے دیوان کی شرحوں سے ملتا ہے جو کافی تعداد میں موجود ہیں۔

حافظ [illegible] فال نکال کر معاملات میں رہنمائی حاصل کرتے [illegible] سے یاد کرتے تھے۔

حافظ نور اللہ شاہ : (جمادی الآخر ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء– ۶ صفر ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)

ایک عالمِ دین اور بزرگ صوفی۔

آپ کا لقب فرشتہ صفات اور قاضی القضاۃ تھا۔ والد کا نام حافظ محمد حیات ربانی تھا۔ ساہنپال ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والدِ محترم سے حاصل کی آپ علمِ تفسیر، حدیث و فقہ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ نے بیعت اپنے والدِ بزرگوار سے کی اور مقاماتِ سلوک طے کرنے کے بعد خلافت و اجازت حاصل کی نیز اپنے عم بزرگ سید ابو سعید مرتاض سے خرقۂ تبرک حاصل کیا۔ ۱۱۸۸ء میں رئیس اعظم منچر چٹھہ ضلع گوجرانوالہ نے جو زمانۂ طوائف الملوکی میں حدودِ ملتان تک کا خود مختار حاکم تھا، اپنے علاقے کے ستر علماء میں سے آپ کو منتخب کر کے قاضی القضاۃ کا منصب دیا تھا۔

آپ نے بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی، آپ کا مقبرہ نوشاہیہ میں ہے۔ آپ کی تصانیف میں "نور الفتاوی المعروف فتاوی نوشاہیہ"، "مصطلحات الصوفیہ"، "انشائے نور اللہ"، "رقعات نور اللہ" اور "مکتوبات نور اللہ" ہیں۔

حافظ ولی اللہ (؟–جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء)

برِعظیم پاک و ہند کے ایک نابینا عالمِ دین اور مناظر۔

جموں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ سال کے تھے کہ والدین مہاراجہ کے مظالم سے تنگ آکر لاہور چلے آئے۔ چیچک کی بیماری میں بینائی جاتی رہی۔ آپ حافظِ قرآن و انجیل تھے۔ میدانِ مناظرہ میں اپنے مدِ مقابل اور حریف کو اسی کی کتابوں کے حوالے سے لاجواب کر دیتے۔

ایک وقت تھا کہ انگریز بہادر کی مضبوط حکومت کے زیرِ سایہ سینکڑوں عیسائی پادری یورپ سے نکل کر برِعظیم کے ہر شہر میں علمائے اسلام کو مناظرہ کے لیے کہا کرتے اور عیسائیت کے محاسن و کمالات سے عوام کو متاثر کرتے۔ اگرچہ اس وقت کے علمائے کرام نے ان فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے مسکت جواب دیتے۔ مگر حافظ ولی اللہ ان کی جو درگت بناتے وہ انہی کے حصے کی بات تھی۔ پنجاب کے تمام شہروں میں جہاں کوئی عیسائی پادری سر اٹھاتا حافظ ولی اللہ بنفسِ نفیس وہاں پہنچتے اور اسے للکار کر میدانِ مناظرہ میں لے آتے۔ پھر بھرے مجمع میں اس کو لاجواب کر کے تائب کرا دیتے یا بھاگ جانے پر مجبور کر دیتے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر عیسائی مبلغ شہر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

قدرت نے آپ کو بے پناہ حافظہ بخشا تھا۔ جس کتاب کو ایک بار سن لیتے وہ ان کے ذہن پر نقش ہو جاتی تھی۔ کسی شخص کا ہاتھ ایک بار ہاتھ میں لیتے تو پندرہ بیس سال بعد اگر ملاقات ہوتی تو پہچان لیتے کہ یہ فلاں شخص کا ہاتھ ہے۔

۱۸۴۹ء میں جب پنجاب میں بھی انگریزوں کا عمل دخل ہو گیا تو لارڈ ڈلہوزی نے ایک منصوبے کے تحت یورپ کے عیسائی پادریوں [illegible] ملک پہنچ کر مشنری مراکز قائم کریں [illegible]

Marfat.com

[illegible] پادری [illegible] بانی ایف سی کالج لاہور یعنی انہی لوگوں [illegible] تھا۔ یہ لوگ نہ صرف عیسائیت کے محاسن پیش کرتے بلکہ اسلام پر بھی مختلف قسم کے اعتراضات کرتے چنانچہ اس زمانے میں حافظ ولی اللہ گوجرانوالہ سے لاہور پہنچے اور شاہی مسجد کے نائب خطیب مقرر ہوئے آپ مولانا غلام قادر بھیروی، مولوی غلام محمد بگوی، مولوی محمد الدین وغیرہ کے ہم عصر تھے یہ تمام علماء آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ فنِ مناظرہ کے علاوہ آپ عربی زبان پر اس قدر حاوی تھے کہ عرب سیاح لاہور آتے تو آپ سے بلاتکلف عربی میں گفتگو کرتے یہاں کے حالات پر تبصرہ کرتے اور علمی مسائل پر بحث کرتے۔ مولوی فقیر محمد جہلمی آپ کے معاونِ تحریر تھے۔

حافظ ولی اللہ کے ایک مناظرے کا ذکر درج کیا جاتا ہے۔ لاہور میں پادری فونڈر نے چیلنج کیا کہ وہ مسلمانوں کے علماء سے مناظرہ کرنا چاہتا ہے۔ سرائے سلطان لاہور میں عظیم اجتماع ہوا۔ تین روز تک مناظرہ ہوتا رہا۔ حافظ ولی اللہ ان دنوں لاہور سے باہر تھے۔ واپس آئے تو آتے ہی کہنے لگے کہ مجھے مناظرے کے میدان میں لے چلو۔ آپ وہاں پہنچے تو مجمع میں ایک شور برپا ہو گیا۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ آپ نے سارے علماء کرام سے اجازت لی اور پادری کے مقابلہ میں تنِ تنہا کھڑے ہوئے۔ آپ نے کہا کہ میں نابینا ہوں اپنے مدِمقابل کو پاس جا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ آپ کو پادری فونڈر کے قریب لے جایا گیا۔ وہ ایک پُررعب شخصیت کا مالک تھا۔ حافظ صاحب نے اس کے چہرے کو ٹٹولا اور پھر منہ پر ایک ایسا زوردار تھپڑ مارا کہ پادری کے دانتوں سے خون بہہ نکلا۔ پس پھر کیا تھا مجمع میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مناظرہ درہم برہم ہو گیا حافظ ولی اللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کو ڈر تھا کہ یہ معاملہ کوئی تحریک نہ بن جائے اگلے ہی روز لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو جو انگریز تھا مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر کیا گیا عدالت کے اردگرد بڑا ہجوم تھا۔ حافظ ولی اللہ کو بیان دینے کے لیے بلایا گیا۔ آپ نے انگریز مجسٹریٹ کے سامنے بتایا کہ استغاثہ کا مجھ پر یہ الزام کہ میں نے ارادہ قتل سے تھپڑ مارا ہے۔ بالکل غلط ہے میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ پادری صاحب انجیل مقدس پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں۔ میں نے تھپڑ مارا۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ اگر تمہیں ایک تھپڑ مارا جائے تو دوسرا گال پیش کر دو مگر پادری صاحب نے انجیل پر عمل کرنے کی بجائے مقدمہ کر دیا۔ یہ بیان دیتے ہی حافظ ولی اللہ نے انجیل کے ایڈیشن کا حوالہ دے دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ فلاں ایڈیشن فلاں لائبریری میں ہے۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پادری فونڈر کو جواب دینے کے لیے کہا تو اس نے اٹھ کر اعتراف کیا کہ واقعی انجیل مقدس میں یونہی لکھا ہے، میں مقدمہ واپس لیتا ہوں۔

آپ ایک عرصہ تک شاہی مسجد کے خطیب رہے پھر مسجد وزیر خاں میں خطابت کے فرائض انجام [illegible]۔ آپ نے جو کتابیں املا کرائیں ان میں 'ردلفری' 'مباحثہ دینی' 'صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیطان' اور 'ابحاث ضروری' وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حاقہ، سورۃ

قرآن مجید کی ۶۹ ویں سورت (دیکھئے "الحاقۃ سورۃ")

حاکم

وہ شخص جو فیصلہ کرے، افسر، حکومت کرنے والا۔ مسلمانوں کا حاکم خلیفہ ہوتا ہے جو دین پر رسول اللہؐ کا نائب ہوتا ہے۔ صوبوں [illegible] کے لیے جو خلیفہ کے ماتحت ہوتے ہیں وہ امراء کہلاتے ہیں۔ اسلام میں مشرقی خطابات سلطان اور بادشاہ وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ قرآن میں بادشاہ کے لیے ملک کا لفظ آیا ہے۔ "اور ان کے نبی نے انھیں کہا کہ اس کی بادشاہی کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس تابوت آئے جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون اور اسکا بقیہ ہے۔" (۲:۲۴۸)

قرآن مجید اور احادیث میں حاکم کی اطاعت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ بس بشرطیکہ اس کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔" (۴:۵۹) حضرت ام حصینؓ سے مروی ہے آنحضورؐ نے فرمایا اگر ہر کسی نکٹے غلام کو حاکم بنایا جائے اور وہ تم پر کتاب اللہ کے موافق حکمرانی کرے تو تم اس کی اطاعت کرو اور اس کا حکم مانو (مشکوٰۃ)

حاکم کو اپنی رعیت کی خبرگیری کرنی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس طرف خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ حضرت معقل بن یسارؓ سے مروی ہے کہ میں نے آنحضورؐ کو فرماتے سنا کہ جس بندے کو خدا اپنے بندوں کا حافظ و نگہبان ٹھہرائے اور وہ رعیت کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کے ساتھ حفاظت و نگرانی نہ کرے تو وہ بہشت کی خوشبو تک نہ سونگھنے پائے گا (مسلم شریف، بخاری شریف)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا: سنو! تم سب اپنی رعیت کے محافظ ہو اور تم سب سے رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ حاکم جو لوگوں کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ رعیت کا نگہبان ہے اور وہ اپنی رعیت کے احوال سے پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے اہل خانہ کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت یعنی اہل خانہ کی بابت پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی محافظ ہے اور اس سے ان کی بابت سوال ہو گا۔ آدمی کا غلام اپنے مالک کے مال کا نگران ہے اور اس سے اس کی بابت دریافت کیا جائے گا۔ سنو تم سب راعی ہو اور سب اپنی رعیت کی بابت جوابدہ ہو (بخاری و مسلم)

حاکم کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کرے حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز بلحاظ قدر و منزلت تمام بندگانِ خدا میں بزرگ ترین بندہ منصف اور نرم دل امام (حاکم) ہے اور قیامت کے دن بلحاظ قدر و منزلت تمام لوگوں میں بدترین شخص ظالم اور احمق امام (حاکم) ہے۔ (بیہقی) ایک اور حدیث میں جو معقل بن یسارؓ سے مروی ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمان رعیت کا حاکم ہوا اور پھر وہ اس حالت میں مرا کہ رعیت کا بدخواہ تھا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم) آپؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا "بدترین امراء وہ ہیں جو رعیت پر ظلم کریں اور رحم و مہربانی سے پیش نہ آئیں" (مشکوٰۃ المصابیح)

ایک اور مقام پر آنحضورؐ نے فرمایا "عادل و منصف حاکم خدا کے ہاں نور کے منبروں پر اور خدا کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور خدا کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ ہاں وہ عادل حاکم جو اپنے احکام میں اپنے اہل میں اور اپنی ولایت و حکومت میں عدل کرتے ہیں"

حاکم بامر اللہ

(۲۳ ربیع الاول ۳۷۵ھ/۱۳ اگست ۹۸۵ء ۔۔۔ ؟ ء) ابو علی منصور بن عبدالعزیز باللہ نزار۔ چھٹا فاطمی خلیفہ جو اپنے جور و ستم اور ظلم و تشدد کی وجہ سے اور اپنے دعوائے الوہیت کی وجہ سے مشہور

Marfat.com

ہے۔ قاہرہ میں پیدا ہوا تھا۔ جب اس کے باپ نے انتقال کیا تو اس کی عمر گیارہ سال تھی ۳۸۳ھ/۹۹۳ء میں اس کے ولی عہد ہونے کا سرکاری اعلان ہو چکا تھا۔ اس کے والد نے بستر مرگ پر قاضی القضاۃ محمد بن نعمان اور بنو کتامہ کے سردار الحسن بن عمار کو ہدایت کی کہ اس کے بیٹے کی خلافت کا اعلان کر دیں۔ چنانچہ باپ کی وفات کے بعد اس کی بیعت کی گئی اور امام کے خطاب اور حاکم بامر اللہ کے لقب سے خلیفہ بنایا گیا۔ اور برجوان اس کا ولی مقرر ہوا۔

کتامی بربروں نے اس کے عہد حکومت کے آغاز ہی میں اس بات پر اصرار کیا کہ حکومت کی قیادت ان کے سردار الحسن بن عمار کے ہاتھ میں دے دی جائے چنانچہ اس نے اپنی فوج میں شامل دیگر عناصر کو نظر انداز کر کے بربروں کو نوازنا شروع کر دیا۔ اس نے برجوان سے بھی جھگڑا کیا جس کو ابن عمار کے حامیوں کے اس منصوبے سے خاصی تشویش ہوئی تھی کہ حاکم کو دبا دیا جائے۔ نہایت طاقتور بربروں میں سے ایک بربر جیش بن طمصامہ جسے طرابلس کی گورنری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا تھا برجوان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ابن عمار کے خلاف ایک بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے شکست ہوئی۔ چنانچہ برجوان دوبارہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں نوجوان خلیفہ حاکم کے حق میں دوبارہ بیعت کرائی اور ابن عمار کو قتل کر دیا گیا۔ ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء کے بعد برجوان کے پاس اقتدار نہ رہا۔ حاکم جس کی شخصیت اب ظاہر ہونے لگی تھی برجوان کی اتالیقی کو بوجھ محسوس کرنے لگا چنانچہ اس نے اپنے غلام ریدان کے ہاتھوں اسے اس وقت قتل کرا دیا جب وہ اس کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہنگامے شروع ہوئے کیونکہ ترکوں نے یہ خدشہ محسوس کیا کہ یہ بربر جماعت کا لایا ہوا انقلاب تھا۔ نوجوان خلیفہ حاکم کو محل کے دروازے پر ان اسباب کی وضاحت کرنے کے لیے آنا پڑا جن کی وجہ سے وہ برجوان کو قتل کرانے اور جلد رعایا سے اطاعت سعادت کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

برجوان کو قتل کرا دینے کے بعد مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ وہ صرف اپنے نفس اور میلان کی اطاعت کرتا تھا۔ نہایت غیر معمولی اور غیر مقبول اقدامات کے احکام صادر کرتا۔ پھر ان میں تخفیف کر دیتا یا انھیں منسوخ کر دیتا۔

اس کے عہد حکومت کی بعض خصوصیات یہ تھیں۔

۱۔ مذہبی اقدامات اور اخلاقی و معاشی نوعیت کے فرامین۔

۲۔ پھانسی کے بہت سے واقعات اور مظالم۔

۳۔ غیر مطمئن لوگوں کی بغاوتیں۔

۴۔ حاکم کی عجیب و غریب عادات جو جنون کے قریب تھیں اور اس کا دعویٰ الوہیت۔

دوسری جانب ایسے مواقع بھی تھے جہاں حاکم نے نہایت سادگی انکسار الصاف اور زاہد و رواداری کی حس ظاہر کی۔ حاکم نے جو اقدامات کیے ان کی کچھ تفصیل یہ ہے ۳۹۲ھ/۱۰۰۲ء میں شراب کی ممانعت کر دی اور شراب کے مٹکے توڑنے کے احکام صادر کیے۔ مصر کے غالب اکثریت رکھنے والی سنی آبادی نے سنیوں کے خلاف اقدامات کی شدید مخالفت کی۔ چنانچہ یہ اقدامات بعض اوقات منسوخ بھی کیے گئے۔ ۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء میں تیرہ اشخاص کو گرفتار کر کے ان کی عام نمائش کی گئی کیونکہ انھوں نے ضحیٰ کی نماز ادا کی تھی۔

حاکم نے حکمت عملی میں متلون مزاجی کے باعث چند ایسے اقدامات بھی کیے جن کی وجہ سے اکثر ہنگامے ہوتے رہتے تھے اور فرقہ وارانہ رجحانات کو ہوا ملتی تھی۔ انجام کار شیعہ سنی کشیدگی نے فسادات کی شکل اختیار کر لی۔

[illegible] اس کی الوہیت [illegible] کے لیے عملی اقدامات کیے [illegible]

اخلاقی اور معاشرتی نوعیت کے فرامین حاکم کے نہایت عجیب [illegible] سے ہیں۔ اگر وہ اس کی متلون مزاجی اور ترنگ کا نتیجہ نہیں تھے تو انھیں [illegible] دینے اور خامی کو ختم کرنے کی شدید خواہش سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

انتہا پسند اسماعیلیوں نے اس کے ان نظریات کو قبول کر لیا [illegible] کی جن کی رو سے وہ خدائی شخص تھا۔ اس سلسلے میں اسماعیلی مبلغوں حسن بن حیدرہ الفرغانی الاخرم، حمزہ بن علی احمد الزوزنی اور محمد بن اسمٰعیل النشتکین الدرزی نے انفرادی طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ سن ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں خلیفہ کی منظوری سے اس نظریے کا پرچار شروع ہوا۔

حاکم کا انجام بھی اس کی زندگی کی طرح غیر معمولی ہوا۔ ۲۷ شوال ۴۱۱ھ/۱۳ فروری ۱۰۲۱ء کو مقطم پہاڑی کی اس سطح مرتفع پر جو اس علاقے سے حلوان کو جاتی ہے رات کو سیر کرتے ہوئے غائب ہو گیا۔ وہ سیر کرتا ہوا اپنے دو ساربانوں سے دور نکل گیا جو اس کے ساتھ تھے اور جنھیں اس نے انتظار کرنے کا حکم دیا تھا۔ انھوں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا۔ اگلی صبح محل واپس چلے گئے۔ تلاش کی گئی اور پانچ روز بعد اس کے کپڑے پائے گئے جو خنجر کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ حاکم کے بارے میں ایک روایت ہے اکثر مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے یہ ہے کہ اسے اس کی بہن ست الملک نے قتل کرا دیا تھا جس کے ساتھ اس کی چپقلش تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مجموعی طور پر حاکم کا عہد حکومت مصر کے لیے خاص طور پر برا تھا۔ اگرچہ اس کے عہد حکومت کے کچھ اچھے پہلو بھی تھے۔ حاکم کے عہد حکومت میں وسیع فاطمی سلطنت کا کوئی علاقہ خارج نہیں ہوا۔ حلب کے منصور بن لولو نے اس کے عہد میں فاطمی خلافت کی اطاعت قبول کی اور اس کے غائب ہونے کے بعد حلب میں کئی فاطمی گورنر آئے۔

جامع الراشدہ اور جامع المقس کی تعمیر اور جامع الحاکم کی تکمیل بھی حاکم کے کارناموں میں شامل ہے۔ حاکم علوم و ادبیات کی سرپرستی کرتا تھا۔ اپنے عہد حکومت کے آغاز میں اس کا ارادہ تھا کہ وہ قاہرہ کے اہم اشخاص کے باقاعدہ مشورے سے حکومت کرے گا لیکن جلد ہی وہ اس سے اکتا گیا۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ فیاض تھا اور اس نے عطیات دے کر اور اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں استحکام پیدا کر کے قحط کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ حاکم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ابوہاشم علی کی خلافت کا اعلان کیا گیا اور ابن دواس کو اس کمسن خلیفہ کا ولی مقرر کیا۔ عوام نے اسے الظاہر لاعزاز دین اللہ کا لقب دے کر اس کی بیعت کی۔

حاکم نیشاپوری

(۳ ربیع الاول ۳۲۱ھ/۹۳۳ء - ۳ صفر ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء)

محمد بن عبداللہ بن محمد۔ کنیت ابوعبداللہ۔ ایک ممتاز محدث ابن البیع کے نام سے مشہور تھے۔ علم حدیث کی تحصیل کے لیے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ آپ نے تقریباً دو ہزار شیوخ سے احادیث سنیں۔ آپ [illegible] قاضی رہے تھے اس لیے حاکم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد ذھبی نے ایک ہزار بیان کی ہے۔ ان تصانیف میں "معرفۃ علوم الحدیث" علم حدیث پر ایک اہم کتاب ہے۔ جس نے اس موضوع کا ایک معیار قائم کیا ہے۔ [illegible] حاکم نیشاپوری کی علمیت کی [illegible] حاضری دیتے رہتے۔ [illegible]

[illegible] کی جگہ سے [illegible] ترویج کی ہے۔ [illegible] نے اپنی تصنیف [illegible] "الامام" اور "اہلِ بات" کا حافظ بتایا ہے۔ ابنِ حجر نے "لسان المیزان" میں آپ کے بارے میں لکھا ہے "ان کا شمار ضعیف محدثین میں نہیں کیا جا سکتا"۔ آپ کی تصانیف میں "المستدرک علی الصحیحین" "المدخل فی اصول الحدیث" "معرفۃ علوم الحدیث" "تاریخ نیشاپور" اور "کتاب مزکی الاخبار" خاص طور پر مشہور ہیں۔

حال

زمانے کی موجودہ گھڑی جو وقت کو ماضی اور مستقبل سے جدا کرتی ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں "حال وہ کیفیت ہے جو دل میں بغیر تصنع و اجتناب و اکتساب پیدا ہوتی ہے کبھی طرب، کبھی حزن یا قبض یا بسط اور کبھی ہیبت و خوف کی صورت میں اور نفس کی دوسری صفات زائل ہو کر یہ کیفیت چھا جاتی ہے لیکن عارضی ہوتی ہے۔ یہی کیفیت اگر دائمی ہو جائے اور ہر وقت رہے تو اسے مقام کی کیفیت کا نام دیا جاتا ہے۔

بقول علی ہجویریؒ "حال وہ کیفیت ہے کہ بندہ اس کی وجہ سے زمانۂ ماضی و مستقبل سے فارغ ہو جائے اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل میں جلوۂ الٰہی یا الہام کی قسم کا کوئی فیضان ہو جو اس کے باطن کو ہمہ تن اس میں اس طرح مجتمع کر دے کہ حال کے مکاشفہ میں نہ اس کو وقتِ گذشتہ یاد ہو نہ آئندہ۔ پس جن لوگوں کو یہ کیفیت حاصل ہے وہ کہتے ہیں ہمارا علم انجام اور تقدیرِ سابقہ کا ادراک نہیں کر سکتا۔ ہمارے لئے حال یعنی حالتِ مشاہدہ بہت اچھی چیز ہے کیونکہ اگر ہم آئندہ کل میں مشغول ہوں یا گذشتہ کل کا اندیشہ دل میں لائیں تو موجودہ وقتِ مشاہدہ سے ہم حجاب میں چلے جائیں گے۔ چنانچہ ابو سعید خرازؒ فرماتے ہیں کہ اپنے عزیز وقت کو سب سے عزیز ترین چیز کے سوا کسی اور چیز میں مشغول نہ کر اور بندہ کی عزیز ترین چیز ماضی اور مستقبل کے دوران موجودہ وقت میں حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ہے۔ حال کی یہ تعریف بھی کی گئی ہے کہ یہ ایک روحانی کیفیت کا نام ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ الوہی کیفیت جس سے روحانی توازن پیدا ہو کر ایک کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ ذوالنون مصریؒ نے سب سے پہلے حال اور مقام کا فرق بیان کیا ہے بعض مشائخ حال کو تغیر پذیر صفت نہیں مانتے ان کا خیال ہے کہ اس صفت میں بقا و دوام ہوتا ہے۔ لیکن بعض دوسرے مشائخ کا خیال یہ ہے کہ حال کا حصول یا تو اعمالِ صالحہ اور تزکیہ نفس پر منحصر ہے یا ذاتِ حق سے محض بطورِ امتحان یا انعام حاصل ہوتا ہے۔ حال اور وقت میں فرق یہ ہے کہ حال وہ فیضانِ الٰہی ہے جو مشاہدۂ حق کے وقت دل پر وارد ہو کر اسے ایسا آراستہ کر دیتا ہے جیسا کہ روح جسم کو آراستہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا وقت حال کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ وقت کی صفائی اور آراستگی حال کے سبب سے ہوتی ہے اور کا قیام اسی پر موقوف ہوتا ہے۔ پس جب صاحبِ وقت صاحبِ حال ہو جاتا ہے تو تغیر اس سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اور اپنے حال میں وہ مستقیم ہو جاتا ہے کیونکہ حال کے بغیر وقت پر زوال روا ہے اور جوں ہی اس کے ساتھ حال پیوستہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا زمانہ وقت ہی ہو جاتا ہے اور پھر اس پر زوال روا نہیں۔ مشائخ نے بیان کیا ہے کہ حال یہ ہے کہ زبان کسی اندازِ بیان میں بھی اس کو بیان نہ کر سکے بلکہ عمل اس کے حال کی حقیقت کو بیان کرے۔

ابو علی دقاق کا قول ہے کہ دنیا اور عقبیٰ میں خوشی اور ہلاکت میں تیرا وقت وہی ہے جس میں تو موجود ہے اور حال ایسا نہیں ہوتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر فیضان ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ صاحبِ وقت تھے کہ ایک وقت فراق سے آپ کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں اور دوسرے وقت وصال سے بینا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ چونکہ صاحبِ حال تھے وہ نہ فراق کا کچھ خیال کرتے کہ اس سے غمگین ہوں اور نہ وصال کا خیال کرتے کہ اس سے مسرور ہوں ستارہ چاند اور سورج سب ان کے حال کی مدد کرتے تھے لیکن آپ مشاہدۂ حق کی وجہ سے سب سے فارغ تھے حتیٰ کہ جس چیز کو دیکھتے اس میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے اور فرماتے "میں زوال پانے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ پس صاحبِ وقت کے لئے عالم کبھی تو دوزخ بن جاتا ہے کیونکہ وہ غیبت کے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور حبیب کے گم ہو جانے سے اس کا دل وحشت کا محل بن جاتا ہے اور کبھی اس کا دل مشاہدۂ حق کی دولت پا کر جو ہر آن اس کو تحفہ کے طور پر ملتی رہتی ہے بہشت کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن صاحبِ حال خواہ بلائے حجاب میں ہو یا نعمت کے مشاہدہ میں سب حالتیں اس پر یکساں ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ مشاہدہ کے محل میں ہوتا ہے۔ اس مثال سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ حال ایسے شخص کی صفت ہے جو خدا تعالیٰ کو مطلوب ہوتا ہے اور وقت اس شخص کا درجہ ہے جو طالبِ حق ہو ایک تو وقت کی راحت میں اپنے ساتھ باہوش ہوتا ہے اور دوسرا حال کی خوشی میں حق تعالیٰ کے ساتھ مجذوب اور مدہوش ہوتا ہے۔ پس ان دونوں مقاموں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حالت افندی

(۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء ــــ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء)

محمد سعید، سلطان محمود ثانی کے عہد کا ایک ترک مدبر۔ والد کا نام قاضی حسین افندی تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ شیخ الاسلام شریف افندی کے ہاں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ شیخ الاسلام کی وفات کے بعد رئیس تشریفات راشد افندی کے مہردار کا یاماق پھر یینی شہر فنار کے نائب کا کتخدا مقرر ہوا۔ استانبول واپس لوٹنے پر اس کو تعلیم مکمل کرنے کا موقع مل گیا۔ اسے زود فہمی اور ذہانت کی بنا پر مختلف عمائد کے ہاں کاتب کی حیثیت سے ملازمت ملتی رہی۔ اسی دوران میں اس کا تقرر رئیس دفتر محاسبہ کے عہدے پر ہو گیا۔ فرانس سے شرائط صلح طے ہوتے ہی اسے پیرس میں سفیر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۰۶ء کے اواخر میں اسے دیوان ہمایونی میں مہردار کی حیثیت سے اس کا تقرر ہو گیا۔ لیکن مئی ۱۸۰۷ء میں اسے رئیس الکتاب بنا دیا گیا۔ ۵ مارچ ۱۸۰۸ء کو اسے برطانیہ سے ساز باز کرنے کے الزام میں برطرف کر کے جلا وطن کر کے کوتاہیہ بھیج دیا گیا لیکن اگلے ہی سال ۱۸۰۹ء میں اسے استانبول واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ نئے سلطان محمود ثانی نے اسے بغداد بھیجا تاکہ وہاں کے خود مختار والی کوچک سلیمان پاشا کو واجب الادا رقم کی ادائیگی پر آمادہ کر سکے۔ چنانچہ اس نے اس سرکش والی کے خلاف ایک فوجی مہم تیار کی اور اس مہم میں کامیاب رہا۔ ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں حالت افندی کا تقرر کتخدای رکاب ہمایوں کے عہدے پر ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں وہ نشانجی ہو گیا۔ حالت افندی سلطان محمود ثانی کا معتمد تھا اور سلطان اکثر امور سلطنت میں اس کے مشورے لیتا تھا۔ ایک دور میں اس کی طاقت کا یہ حال تھا کہ صدر اعظم اور شیخ الاسلام کے مناصب پر نامزدگیاں بھی اس کے اختیار میں تھیں۔

حالت افندی کے زوال کا سبب اس کی وہ سرگرمیاں تھیں جو ۱۸۲۰ء میں یانیہ کے تپہ دلنلی علی پاشا کی برطرفی پر منتج ہوئیں۔ علی پاشا کے خلاف مہم سے برانگیختہ ہو کر موره میں یونانیوں نے بغاوت کر دی۔ یہ واقعہ مارچ ۱۸۲۱ء کا ہے۔ چنانچہ اس کا ذمے دار حالت افندی کو ٹھہراتے ہوئے ۱۲۳۸ھ/نومبر ۱۸۲۲ء میں قونیہ میں جلا وطن کر دیا گیا۔ جہاں چند روز بعد اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا اس کی لاش وہیں دفن کر دی گئی لیکن سر قسطنطنیہ میں لایا گیا جسے اس کی بنائی ہوئی سبیل اور کتاب خانے کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

Marfat.com

حالی (۱۵ شعبان ۹۷۷ھ/۲۳ جنوری ۱۵۷۰ء اور ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۱ء)

حالی مصطفیٰ افندی، عثمانی دور کا مشہور عالم اور شاعر۔ وہ عزمی زادہ کے نام سے بھی معروف تھا۔ قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد پیر محمد عزمی شہزادہ محمد جو بعد میں سلطان محمد ثالث بنا کا اتالیق تھا۔ اس نے سعدالدین جیسے نامور مؤرخ اور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے بعد مدرس ہو گیا۔ فن تدریس میں اُس نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی اور ایوب و سلطان سلیم کے مدارس میں اور سلیمانیہ اور وفا میں مدرس رہا۔ حالی کو ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں دمشق کا قاضی مقرر کیا گیا۔ ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں وہ قاہرہ چلا گیا جہاں کچھ عرصہ کے لیے وہ بیگلر بیگی کے عہدے پر فائز رہا۔ کچھ عرصے کے لیے معتوب رہنے کے بعد اُسے بروسہ کا قاضی بنا دیا گیا۔ ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں ادرنہ کا قاضی مقرر ہوا۔ اسی سال وہ دمشق آ گیا اور ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء تک دمشق ہی میں مقیم رہا۔ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۸ء میں عثمان ثانی تخت نشین ہوا تو حالی کو پھر قاہرہ کا قاضی مقرر کیا گیا۔ بعد میں سلطان مراد رابع نے اسے اناطولو اور پھر روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدے پر فائز کیا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے اسے سلیمانیہ کے دار الحدیث کا مدرس مقرر کیا گیا۔

وفات کے بعد اسے قسطنطنیہ میں سوندر جاوشی سی کے صحن میں دفن کیا گیا۔ حالی اپنی زندگی میں بڑے نشیب و فراز سے گزرا۔ وہ بڑے بڑے مناصب پر فائز رہا۔ اُس سے تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ حالی اپنے زمانے کے فاضل ترین علماء میں سے تھا اس نے فقہ کی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس کا کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے بیشتر کتابوں پر اس کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے حواشی تھے۔

نثر میں اس کی تصانیف ہیں "شرح المنار" اور "درر و غرر" پر حواشی "مغنی اللبیب کی شرح" "شرح ہدایہ" وغیرہ اور نظم میں ایک دیوان ہے جو اکیس قصائد، سات سو اکیس غزلیات، تین سو رباعیات اور ساقی نامہ پر مشتمل ہے۔

حالی الطاف حسین (۱۲۵۰ھ/۱۸۳۷ء — ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء) برِعظیم پاک و ہند کے ایک نامور شاعر اور ادیب۔ والد کا نام ایزد بخش تھا۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ نسب کے اعتبار سے انصار قوم کی اس شاخ سے تھے جو غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت سے پانی پت میں آباد تھی۔ نو سال کی عمر میں والد وفات پا گئے اور ان کی پرورش بڑے بھائی نے کی۔ مولانا حالی کو مسلسل تعلیم کا موقع نہ مل سکا لیکن انھوں نے فارسی اور عربی کی بعض متداول کتابیں پڑھیں۔ فلسفہ، منطق اور حدیث و تفسیر کا بھی مطالعہ کیا۔

مولانا حالی کو قیام دہلی کے دوران میں مرزا غالب کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا اور ان سے شعر و سخن میں اصلاح لینے لگے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مولانا حالی کو نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے تعلق پیدا ہو گیا اور وہ ۱۸۶۹ء تک ان کی خدمت میں رہے۔ شیفتہ اُردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا ذوق شعر اعلیٰ درجے کا تھا۔

۱۸۷۲ء میں مولانا حالی نے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کر لی۔ جہاں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ شدہ عبارتوں کی تصحیح کا کام ان کے سپرد ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں جب کرنل ہالرائڈ کے ایما پر مولانا محمد حسین آزاد نے ایک ایسے مشاعرے کی طرح ڈالی جس میں مصرع طرح کی بجائے موضوع دیا جاتا تھا چنانچہ مولانا حالی نے چار مثنویاں حُبِ وطن، برکھا رُت، نشاطِ امید اور مناظرہ رحم و انصاف انھی مشاعروں کے لیے لکھیں۔

بعد میں لاہور کی ملازمت سے قطع تعلق کر لیا اور اینگلو عربک سکول میں مدرسی

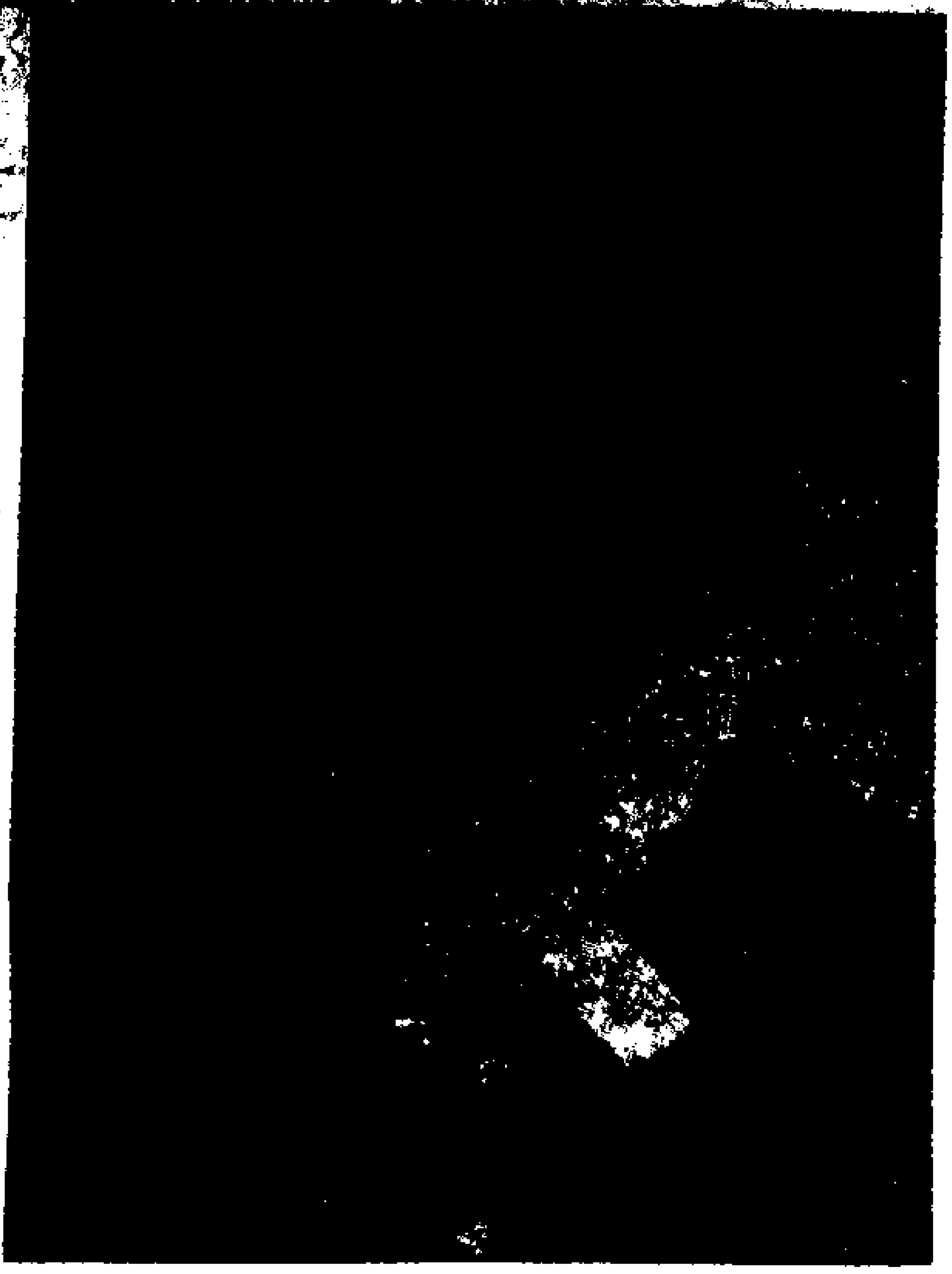

مولانا الطاف حسین حالی

اختیار کر لی۔ ۱۸۷۹ء میں سرسید کے ترغیب دلانے پر مسدس مدوجزر اسلام لکھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے متعلق سرسید احمد خان نے کہا تھا کہ "جب روز قیامت خدا مجھ سے پوچھے گا تو کیا لایا؟ تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔

آپ نے پانی پت میں وفات پائی۔

مولانا حالی کی تصانیف میں "مجالس النساء"، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید، تریاق، شواہد الالہام وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا حالی میں شیخی تعلی اور تکبر نام کو نہ تھا۔ ان کی خاموشی، متین سنجیدہ طبیعت اور گفتگو سے ایک ناواقف شخص اس بات کا پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ مصنف، شاعر یا عالم ہیں۔

جدید اُردو نثر میں حالی کا بڑا مقام ہے۔ حالی نے سب سے پہلے متین اور حقیقت کی ترجمان نثر کی بنیاد ڈالی جو ہر قسم کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین ادا کرنے کیلئے موزوں ہے۔ اُن کی نثر میں سادگی اور مدعا نگاری کا اجتماع ہے۔ بقول نواب عماد الملک "سرسید کی جماعت میں بہ حیثیت انسان حالی کا درجہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انھیں نہ پہنچتے تھے" حقیقت یہ ہے کہ وہ ہماری تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے مزاج میں ضبط، اعتدال، رواداری اور بلند نظری تھی۔ اور یہی خوبیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

بقول خواجہ غلام الثقلین مرحوم "مولانا حالی یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیا خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ ان کے والدین شیعہ تھے لیکن [illegible] الجماعت میں تعلیم پائی۔ مولانا مسلماً سنی تھے [illegible]

Marfat.com

[illegible] اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔

حام حضرت نوح کا بیٹا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں آیا۔ طوفان کے وقت اپنے بھائیوں سام اور یافث کے ساتھ کشتی نوح میں موجود تھا۔ اس کے بارے میں ایک روایت موجود ہے جس کی رو سے حضرت عیسیٰؑ نے اس کی قبر پر قم باذن اللہ پکار کر اسے کچھ عرصہ کے لیے زندہ کیا اور اس سے طوفان نوح کا حال سُنا۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حام عالم شباب ہی میں فوت ہو گیا تھا (البطری' ۱: ۱۸۷)

مسلم مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بددعا سے اولاد حام کا رنگ سیاہ اور بال گھنگھریالے ہو گئے۔ نیز حضرت نوحؑ نے یہ دُعا بھی کی تھی کہ سب پیغمبر سام کی اولاد سے اور سب بادشاہ یافث کی اولاد سے ہوں اور حام کی اولاد ان دونوں کی خدمت گذار ہوں۔

یہ بات بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ نے ساری زمین اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔ حام کو دریائے نیل سے مغرب کا علاقہ (افریقہ) دیا گیا اور وہ ابوالحبش کہلایا۔

تورات کی رو سے حام کے چار بیٹے تھے کوش، مصرایم، فوط اور کنعان۔ کوش کا بیٹا نمرود بابل کا بادشاہ ہوا اور اس کی باقی اولاد مشرق و مغرب کے ساحلی علاقے نوبہ، حبشہ اور فزان وغیرہ میں آباد ہو گئی۔

حام زمانہ جاہلیت میں اہل عرب مختلف طریقوں سے جانوروں کو بتوں وغیرہ کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اور ان سے کام لینا یا ذبح کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس طریق پر چھوڑے ہوئے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے، چنانچہ حام اس بوڑھے اونٹ کو کہتے تھے جس کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا۔ تب اس بوڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نیز اگر کسی اونٹ کے نطفے سے دس بچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزاد کر دیا جاتا تھا۔

نیز وہ زبانیں جن کا رشتہ السنہ سامیہ سے ہے ان کے لیے حامی۔ سامی گروہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ گروہ حامی زبانوں پر مشتمل ہے۔

حامد بدایونی برعظیم پاک و ہند کے ایک عالم دین (دیکھئے "بدایونی، عبدالحامد مولانا")

حامد رضا خان قادری: (۱۲۹۲ھ/۱۸۸۷ء-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۵ء) ایک عالم دین۔ حامد رضا خان، مولانا احمد رضا خان بریلوی کے بڑے فرزند تھے۔ تعلیم و تربیت آپ کے والد نے فرمائی۔ ۱۹ برس کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔ مولانا حامد رضا خان عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ علوم ادبیہ کے علاوہ دیگر علوم و فنون تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ میں یکتائے روزگار تھے۔ نہایت فصاحت و بلاغت سے عربی میں برجستہ اشعار و مضامین و خطبات تحریر فرماتے۔ آپ نے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا اور اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی کے جوار میں دفن ہوئے۔ آپ کی اولاد میں دو صاحبزادے اور چار لڑکیاں تھیں۔

مولانا حامد رضا خان نہایت متواضع، منکسر المزاج اور عمدہ اخلاق کے مالک تھے۔ علم دین حاصل کرنے والے طلباء، حاجت مندوں، درویشوں اور فقراء پر بہت شفقت فرماتے۔ آپ نے سالہا سال دارالعلوم منظر الاسلام میں درس حدیث دیا۔ آپ کے خلفاء میں شیخ الحدیث مولانا سردار احمد قادری، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا ابراہیم رضا خان، مفتی اعجاز ولی خان اور ابوالحسنات محمد احمد قادری جیسی شخصیات ہیں۔

حامد میاں، مولانا: (۱۳۴۵ھ/دسمبر ۱۹۲۶ء تا حال) پاکستان کے ایک جید عالم دین۔

تاریخی نام سعید اختر۔ والد کا نام محمد میاں، خاندان سادات سے ہیں۔ والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب عثمانی ہے جس کا تذکرہ سید محبوب رضوی نے تاریخ دیوبند میں کیا ہے۔ اور اس خاندان کے افراد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

والد کی طرف سے سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

سید حامد میاں بن سید محمد میاں بن سید منظور محمد بن سید یوسف علی بن سید محمد علی بن سید ظہور ولی بن سید محمد فردوس بن سید شاہ شبلی بن سید بندگی محمد اسماعیل بن سید محمد علاؤ الدین بن سید احمد کبیر بن شہاب الدین بن حسین علی بن عبدالباسط بن ابوالعباس بن اسحاق عندلیب الملکی بن قاری حسین علی ہادی بن لطف اللہ بن تاج الدین احمد بن حسین بن علاء الدین بن ابی طالب بن ناصر الدین احمد بن نظام الدین حسین بن موسیٰ بن محمد الاعرج بن ابی عبداللہ احمد بن موسیٰ المبرقع بن امام محمد تقی بن امام موسیٰ علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام ابی عبداللہ الحسین بن سیدہ فاطمہ زہرہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان کے آباؤ اجداد ساتویں صدی ہجری میں سید محمد ابراہیم کے اجداد میں سید حسین حمص سے ترک وطن کر کے اوش میں وارد ہوئے اور وہاں سے ہندوستان تشریف لائے اور شیخ بہاء الدین زکریا سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

مولانا حامد میاں دیوبند میں پیدا ہوئے اور تعلیم کا آغاز دیوبند ہی سے ہوا۔ قاری اصغر علی استاد اوّل تھے۔ چونکہ ان کے والد جامعہ قاسمیہ المعروف مدرسہ شاہی مرادآباد میں تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی حاصل کرنے کے بعد بقیہ تعلیم اس مدرسہ میں حاصل کی اور اپنے والد محترم، مولانا عبدالحق مدنی، مولانا عبدالماجد، مولانا عجیب نوربتوی، مولانا اسماعیل سنبھلی وغیرہم سے تحصیل علم کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر دیوبند میں داخلہ لیا اور حدیث و تفسیر اور فقہ کا علم یہاں سے حاصل کیا۔ دیوبند میں مولانا اعزاز علی، مولانا ابراہیم بلیاوی اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہم سے تعلیم پائی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگرچہ مولانا حسین احمد مدنی سے طبعی مناسبت اور عقیدت پہلے کبھی نہیں رہی تھی لیکن ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر بیعت کی یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا ہے۔ چنانچہ حضرت مدنی کی معیت میں سلوک کی منازل طے کیں اور حج کے لئے بیت اللہ شریف گئے اور زیارت بیت اللہ اور روضہ اطہر سے مشرف ہوئے۔

ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کے بعد مراد آباد میں مدرسہ شاہی میں جس کی بنیاد مولانا نانوتوی نے رکھی تھی، میں معلمی کے فرائض کے ساتھ ساتھ افتاء کے فرائض بھی زیر سرپرستی مولانا سید فخر الدین صاحب جو بعد میں دیوبند کے شیخ الحدیث بنے، انجام

Marfat.com

دینے لگے۔

۱۹۵۲ء میں پاکستان تشریف لائے۔ چند ماہ جامعہ اشرفیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ بعد میں احمدیہ بلڈنگ کے قریب مدرسہ احیاء العلوم کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۵ء میں مسلم مسجد لوہاری میں جامعہ مدنیہ شروع کیا جو بعد میں کریم پارک میں مستقل جگہ مل جانے کے بعد ایک بڑی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ آج کل مولانا امیر انجمن جامعہ مدنیہ کے عہدے پر فائز ہیں اور تدریسی فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ آج کل بخاری شریف پڑھا رہے ہیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ایک ماہوار رسالہ "انوار مدینہ" کے نام سے نکال رہے ہیں جو ۱۹۷۰ء سے مسلسل نکل رہا ہے۔

آپ کی تصانیف میں تصوف پر "ذکر جمیل"۔ نحو پر "تسہیل الصرف" اور "تسہیل النحو" ہیں۔ کچھ کتابیں ابھی مسودات کی شکل میں موجود ہیں۔ جو جلد ہی منظر عام پر آ جائیں گی۔

حامدی، ابراہیم (۔۔۔؟ ۔ شعبان ۵۵۷ھ / جولائی ۱۱۶۲ء) بن حسین بن ابی السعود ہمدانی۔ یمن میں طیبی اسمٰعیلیوں کا دوسرا داعی مطلق۔ ایک روایت کے مطابق اسے صلیحی ملکہ السیدہ نے ۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء میں داعی اعظم مقرر کر دیا لیکن بعد میں یہ عہدہ عدن کے امیر سبا بن ابی السعود بن زریع کو منتقل کر دیا۔ ۵۳۲ھ / ۱۱۳۸ء میں داعی خطاب بن الحسن کی وفات کے بعد پہلے طیبی داعی مطلق ذویب بن موسیٰ نے اسے اپنا نائب بنا لیا۔ ۵۴۶ھ / ۱۱۵۱ء میں اس کی وفات کے بعد حامدی اس کا جانشین ہوا اور اس طرح امام کی عدم موجودگی وہ بلند ترین منصب تک پہنچ گیا۔ حامدی ابراہیم صنعا میں رہتا تھا۔ جس کے ہمنی حکمران جماعت کو چھوڑ چکے تھے لیکن وہ تبلیغی کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے حامدی بظاہر مخصوص طیبی نظام حقائق کا بانی تھا۔ اس کی اہم ترین کتاب "کنز الولد" ہے۔

حامدی کا بیٹا حاتم تھا جو تیسرے داعی مطلق کی حیثیت سے اپنے باپ کا جانشین بنا۔

حامیم قرآن مجید کی مندرجہ ذیل سورتوں کے شروع میں آنے والے حروفِ مقطعات۔ ان سورتوں کی تعداد سات ہے۔

۱۔ سورۃ المومن ۲۔ سورۃ فصلت ۳۔ سورۃ الشوریٰ ۴۔ سورۃ الزخرف ۵ سورۃ الدخان ۶۔ سورۃ الجاثیہ ۷۔ سورۃ الاحقاف۔

ان سورتوں کو الحوامیم، آل حٰم یا ذوات حٰم کہلاتی ہیں۔

اس لفظ کے معنی الازہری کے قول کے مطابق "جو کچھ ہونا تھا اس کا فیصلہ ہو چکا ہے" ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے حامیم کے معنی کے سلسلے میں تین اقوال ہیں۔ ۱۔ یہ اللہ کا اسم اعظم ہے ۲۔ یہ قسم ہے ۳۔ یہ اللہ کے اسم مبارک کے حروف ہیں۔

علامہ الآلوسی کا قول ہے کہ حوامیم میں تین باتیں مشترک ہیں۔

۱۔ لفظ حامیم سے آغاز ۲۔ نزول کتاب اور وحی کے ذکر سے شروع ہوتی ہیں ۳۔ تمام کی تمام مکی سورتیں ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ یہ سورتیں قرآن مجید کا لب لباب ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے حوامیم کو قرآن کا دیباچہ یا جمال و رونق کہا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حوامیم جنت کے باغات ہیں۔ نیز حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ مجھے سبع طوال (سات لمبی سورتیں) تورات کی جگہ۔ راآت اور طواسین انجیل کی جگہ اور طواسین و حوامیم [illegible] کی جگہ [illegible] مفصلات سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی نوازا ہے [illegible] کی۔

حامیم بن من اللہ ابو محمد کنیت۔ سلسلۂ نسب یہ ہے حامیم بن من اللہ بن حریز بن عمرو، المعروف بہ المفتری۔ ایک جھوٹا مدعی نبوت جو ریف کے بربر قبیلے غمارہ سے تھا۔ ریف نے سرزمین ریف، واقع ملک مغرب میں دعوائے نبوت کیا اور اپنی فریب کاریوں کا جال پھیلا کر ہزارہا زود اعتقاد بربری عوام کو اپنا پیرو بنایا۔ اس نے غمارہ بربروں میں اور زیادہ صحیح الفاظ میں قبیلہ مجکاسہ میں ایک نیا مذہب رائج کرنے کی کوشش کی یہ قبیلہ تطوان کے نواح میں آباد تھا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کے لیے ایک نیا آئین جاری کیا جو اسلامی شریعت سے بہت مختلف تھا۔ اس نے صرف دو نمازوں کا حکم جاری کیا۔ پہلی طلوع آفتاب کے وقت اور دوسری غروب کے وقت۔ اس نے ماہ رمضان کے تیس روزے بھی ختم کر دیئے اور ان کی جگہ صرف رمضان کے آخری عشرے کے تین، شوال کے دو اور ہر بدھ اور جمعرات کو دوپہر تک کا روزہ متعین کیا۔ اس نے اپنی امت سے حج زکوٰۃ اور وضو کو بھی ساقط کر دیا۔ جو شخص اس آئین کی خلاف ورزی کرتا اس سے چھ راس مویشی کفارہ یا تاوان وصول کر کے بیت المال میں داخل کیا جاتا۔ اس نے خنزیر کو حلال کر دیا۔ اس نے اس مچھلی کو حلال قرار دیا جو اس کے خانہ ساز شرعی طریقہ سے ذبح کی گئی ہو۔ تمام حلال جانوروں کے سر اور انڈے کھانے کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ اس علاقے کے بربر قبائل آج تک انڈوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے قرآن مجید کی نقل میں ایک کتاب بنانے کی بھی مذموم کوشش کی۔

اس کی پھوپھی جس کا نام تنجیت یا تابعیت تھا کاہنہ اور ساحرہ تھی۔ وہ بھی نبیہ مشہور ہوتی تھی اور اس کا نام بھی نمازوں میں لیا جاتا تھا۔ اسی طرح اس کی بہن جس کا نام دجو تھا اور وہ بھی کاہنہ اور ساحرہ تھی اس کو بھی پیغمبر کا درجہ دیا جاتا تھا۔

اس نے اپنے پیروؤں کی رہنمائی کے لیے بربری زبان میں کتاب بھی لکھی جسے کلام الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا کرتا تھا اور جس کے الفاظ نماز میں پڑھے جاتے تھے۔ نمونے کے طور پر اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"اے وہ جو آنکھوں سے پنہاں ہے مجھے گناہوں سے پاک کر دے۔ اے وہ جس نے موسیٰؑ کو دریا سے صحیح و سلامت پار کر دیا میں حامیم پر اس کے باپ ابو خلف من اللہ پر ایمان لایا ہوں۔ میرا سر اور میری عقل میرا سینہ اور میرا خون اور میرا گوشت و پوست سب پر ایمان لائے ہیں۔ میں حامیم کی پھوپھی تابعیت پر بھی جو ابو خلف من اللہ کی بہن ہے ایمان لایا ہوں"

حامیم کے پیرو امساک باراں کے وقت اور ایام قحط میں حامیم کی پھوپھی اور اس کی بہن کے توسل سے دعا مانگتے تھے۔ حامیم ایک لڑائی میں مارا گیا جو ۳۱۹ھ / ۹۳۱ء یا ۳۲۹ھ / ۹۴۰ء میں تنجیر کے پاس احواز میں قبیلہ مصمودہ سے ہوئی۔ لیکن جو مذہب اس نے جاری کیا تھا وہ ایک طویل عرصے تک موجود رہا۔ اس خاندان میں ایک اور جھوٹا نبی عاصم بن جمیل بھی گزرا ہے۔

حائضہ: وہ عورت جو حالت حیض میں ہو (دیکھئے "حیض")

Marfat.com

حائطیہ : ایک فرقے کا نام۔ اس فرقے کا بانی میانی احمد بن حائط ہے۔ اس فرقے کا عقیدہ ہے کہ خدا دو ہیں۔ ایک قدیم خدا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور دوسرا بعد میں پیدا ہوا ہے وہ مسیح ہے اور اس نے وقت کی تخلیق کی ہے۔ قیامت کے روز دوسرا خدا ہی فیصلے کرے گا۔

حائر : ایک اصطلاح جس کے معنی عرب مصنفین کے مطابق ایسی تفریح گاہیں یا باغات تھے جن میں بعض اوقات کوئی مکلف عمارت بھی ہوتی تھی۔ زیادہ صحیح طور پر اس سے مراد اس قسم کے باغ حیوانات تھے جیسے سامرا اور مدینۃ الزھرا میں موجود تھے۔ عراق میں بغداد اور سامرا جیوں کی متعدد فصیلوں کے اندر نادر اقسام کے درخت لگائے جاتے تھے اور یہاں شکار کی غرض سے جانور رکھے جاتے تھے۔ اگرچہ آجکل یہ فصیلیں نیست و نابود ہو چکی ہیں تاہم امویوں کے زمانے کے بعض آثار ایسے ملتے ہیں جن میں مختلف قسم کی چار دیواریاں اس حد تک محفوظ رہ گئی ہیں کہ ان کے اندر واقع باغات کی شکل و صورت اور وسعت سے متعلق خاصی معلومات مل جاتی ہیں۔

حائر یا حیر کسی خاص جگہ یا مقام کا نام بھی ہے مثلاً حیرون یا حبرا کا وہ مقدس خطہ جہاں انبیائے بنی اسرائیل کے مقابر ہیں۔ کربلا کے اس علاقے کو بھی جو شہادت امام حسینؑ کی وجہ سے مقدس سمجھا جاتا ہے، حیر کہتے ہیں۔ سامرا کا ایک بڑا محلہ حیر کہلاتا تھا۔ اس میں وسطی شہر کا وہ سارا عقبی علاقہ شامل تھا جو ابتدا میں خلیفہ المعتصم کے وسیع باغ حیوانات کا ایک حصہ تھا۔

محمد بن شاکر کی تصنیف "عیون التواریخ" سے معلوم ہوتا ہے کہ حائر نامی ایک باغ بھی تھا جو امیر معاویہ کے دبیر سرجون بن منصور الرومی کی ملکیت تھا۔ المقدسی نے صور کی بندرگاہ کا نام حیر لکھا ہے اور طبری کے بقول بخت نصر نے وہاں ایک حیر عرب تاجروں کے لئے تعمیر کرایا تھا جو منڈی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

حائل : مغربی نجد میں جبل شمر کے علاقے کا دارالحکومت جو سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک سا حلیۃ الحمشیۃ کے عین وسط میں واقع ہے۔ یہ شہر ایران سے مکہ جانے والے زائرین کے راستے کی بڑی منازل میں سے ہے۔ اور تقریباً بیس فٹ اونچی دیواروں اور گول اور مربع برجوں سے محصور ہے یہ گیارہ محلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک بڑی مسجد اور ایک قلعہ بند محل ہے۔ یہاں ایک اہم منڈی ہے۔ اس کے علاوہ وسیع سیرگاہیں اور باغات ہیں۔ آبادی تیس ہزار کے قریب ہے۔ ۱۸۶۷ء میں یہاں قحط کے بعد وبا پھیل گئی جس میں کافی جانی نقصان ہوا۔

حائل کی حکومت گزشتہ صدی میں بیت علی خاندان کے ہاتھ میں تھی ۱۸۲۰ء میں سردار عبداللہ بن رشید نے اپنے کثیر التعداد اور بارسوخ رشتے داروں کی مدد سے تاج و تخت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی۔ عبداللہ ناکام رہا اپنے وطن کو خیر باد کہہ گیا۔ لیکن دس سال بعد وہابی سردار فیصل کی مدد سے دوبارہ حائل واپس آیا۔ جس کے لئے عبداللہ نے الاحسار کا صوبہ فتح کیا۔ اس وہابی امیر نے اس کی خدمات کے صلے میں اسے جبل شمر کا موروثی امیر بنا دیا۔

عبداللہ کے بڑے بھائی عبید نے بیت علی کو شہر سے نکال دیا۔ عبداللہ نے یہاں ایک بڑا محل بنوایا۔ اس کے بیٹے اور جانشین طلال کے عہد میں حائل میں خوشحال تھے۔ اس بادشاہ نے جامع مسجد اور منڈی بنوائی اور خوبصورت باغات لگوائے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے اس نے بصرے، واسط اور دوسرے شہروں سے تاجروں کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس نے مدینہ منورہ اور یمن سے کاریگر بھی بلوائے۔

الہمدانی نے ایک وادی حائل کا بھی ذکر کیا ہے غالباً وہ یہی شہر ہے یاقوت نے بھی حائل کا ذکر ایک وادی کے طور پر کیا ہے جو قبیلہ طے کے دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان واقع ہے اس نے اس کا ذکر ایک ضلع کے طور پر کیا ہے۔ حائل پر عبدالعزیز ابن سعود نے یکم ربیع الاول ۱۳۴۰ھ / ۲ نومبر ۱۹۲۱ء میں قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے یہ شہر تجارتی اور زرعی ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے۔

حب پیار، محبت

قرآن مجید میں یہ لفظ پیار کے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اس کے لئے مودۃ، ود کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

"وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں رحمٰن ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا (۱۹ : ۹۶)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے (۵ : ۵۴)

"اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم پیدا کیا"۔ (۳۰ : ۲۱) ۔ ان اقتباسات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لفظ مودۃ صرف دوستی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جبکہ دوسرے الفاظ انسان کے ملکوتی پیار کے معنی میں ہی استعمال ہوئے ہیں روایات کے مطابق حب ہر طرح کے پیار اور دوستی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس حدیث مبارک سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے "آپس میں بھائیوں جیسا پیار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے"۔

ایک حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ "روحیں ابتدا میں اکٹھی تھیں جیسے کسی فوج کو ترتیب دیا گیا ہو، بعد میں انہیں الگ الگ جسموں میں حلول کر دیا گیا۔ لہٰذا وہ جو دنیائے ارواح میں ایک دوسرے کو جانتی تھیں وہ اب بھی اسی طرح ہیں اور جو وہاں اجنبی تھیں وہ یہاں بھی اجنبی ہیں۔" (مشکوٰۃ)

اخلاق جلالی کے مصنف نے حیوانی پیار اور روحانی پیار میں فرق بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حیوانی پیار خواہشات کی زیادتی کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ لیکن روحانی پیار دو روحوں کی آپس میں ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے اس سے ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

عشق یا پیار حب کے مفہوم میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ عشق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ العشاقہ سے نکلا ہے۔ العشاقہ ایک بیل ہوتی ہے جو مختلف درختوں پر لپٹی رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لفظ ایرانی زبان سے آیا ہو۔ ابن سینا جیسے عظیم فلسفی بھی لفظ العشق کے بارے میں (اس جذبے کو قدرتی رجحان تصور کرتے ہوئے) لکھتے ہیں کہ "یہ جذبہ بطور خاص صرف آدمی کی مختلف اصناف تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تمام موجودات تک پھیلا ہوا ہے، خواہ وہ جنت میں ہوں یا زمین پر جانور ہوں یا نباتات اور یہاں تک کہ زمین میں موجود مختلف اشیاء کی کانوں تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔

Marfat.com

میرا بوالبقا مراپنی کلیات میں حب کے مختلف مدارج بیان کرتے ہیں جو مرد اور عورت کے درمیان شدتِ جذبات کے مفروضوں پر مبنی ہیں۔

حبِ دنیا دنیا کی محبت

مسلمانوں کو دنیا کی محبت میں پڑنے اور یادِ الٰہی سے غفلت برتنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں حبِ دنیا کی چیزیں یہ گنوائی گئی ہیں۔

"لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ اس دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے" (۳:۱۴)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ کا گزر ایک مردہ بکری پر سے ہوا۔ آپ نے فرمایا بھلا تم میں سے کوئی شخص اس کو ایک درہم میں لینا پسند کرے گا۔ صحابہ نے عرض کی کہ ہم تو اسے کسی چیز کے عوض میں بھی خریدنا پسند نہیں کرتے، فرمایا خدا کی قسم جتنا یہ مردہ بکری تمہارے نزدیک حقیر ہے۔ دنیا خدا کے نزدیک اس سے بہت زیادہ حقیر ہے۔" (مشکوٰۃ)

حباب بن منذر (صحابیؓ) کنیت ابوعمر، قبیلہ خزرج سے تھے۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے

اور تمام غزوات میں شمولیت کی۔ غزوۂ بدر میں قبیلہ خزرج کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ غزوہ بدر کے موقع پر جنگ سے متعلق جتنی تجاویز آپ نے پیش کیں، آنحضورؐ نے ان سب کو قبول فرمایا۔ آپ غزوۂ اُحد کے وقت آنحضورؐ کے حکم کے مطابق دشمن کے لشکر میں گھوم پھر کر وہاں کے حالات معلوم کر کے آپؐ تک پہنچاتے تھے۔

حبابؓ شاعر بھی تھے اور عموماً رزمیہ اشعار کہتے تھے۔ آپؓ اس قدر فصاحت و بلاغت سے خطبہ دیتے تھے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔ علم حدیث کے ماہر تھے اور متعدد احادیث آپؓ کے سینے میں محفوظ تھیں۔ پچاس سال کی عمر میں آپؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں وفات پائی۔

جبری: (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳-۱۶۰۴ء — ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء)

عبدالرحمٰن بن حسن، ادرنہ کا مؤرخ۔ ادرنہ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد معلّم تھا۔ جبری نے ادرنہ اور استانبول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس نے بطور مدرس عمر کا زیادہ حصہ ادرنہ میں گزارا۔ ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء کے بعد وہ مختلف شہروں میں قاضی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ آخری وقت میں وہ سیروز میں قاضی تھا اسی سنہ میں وفات پائی۔

جبری کی تصانیف میں "ریاض العارفین"، "حدائق الجنان"، "دفتر اخبار" وغیرہ مشہور ہیں۔ "انیس المسامرین" جبری کی سب سے مشہور تصنیف ہے جو اس کے آبائی شہر کی تاریخ اور حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں جبری نے مساجد اور رفاہ عامہ کی دوسری عمارتوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اس میں شہر کے مشاہیر کا بھی ذکر ہے۔

حبس: قفس (دیکھئے "قید")

حُبس: شرعی اصطلاح [illegible] میں آیا ہے [illegible]

ہر وہ چیز حبس کہلاتی ہے جو خدا کے نام سے مخصوص کر دی جائے۔ ایام جاہلیت میں مشرک لوگ جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے ان کو بھی حبس کہتے تھے۔ غرض حبس کے معنی ہیں جو چیز خدا کے لئے مخصوص کر دی جائے۔

حبش: ایک صوبے کا عثمانی نام جو مصر کے جنوب میں خلیج عدن تک بحر احمر کے افریقی ساحلی علاقوں پر مشتمل ہے اس میں جدہ کی سنجاق بھی شامل ہے۔ دیگر اہم سنجاقیں جو اس علاقے میں شامل ہیں یہ ہیں:-

ابریم، سواکن، ارکیکو، مصوع، زیلع اور جدہ۔ اس صوبے کی بنیاد پرتگیزیوں کو نکال باہر کرنے کے ارادے سے رکھی گئی۔ پرتگیزی مملوک سلطان کے آخری برسوں میں بحر احمر کے ساحل کے ساتھ واقع اپنے اڈوں سے سفر حج اور گرم مصالحہ کی تجارت میں خلل ڈال رہے تھے۔ ان کے حملوں سے جدہ سویز اور طور جیسی بندرگاہوں کے محاصل میں کافی کمی واقع ہو گئی۔ چنانچہ خادم الحرمین کی حیثیت سے عثمانی سلطان کو ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ لیکن پانچ مختلف مہموں میں ناکامی کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان علاقوں پر مشتمل ایک صوبہ قائم کر دیا جائے۔

۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء میں اوزدہ میر پاشا کو اس صوبے کا بیگلر بیگی مقرر کیا گیا۔ اس نے مصر میں فوج جمع کر کے دریائے نیل کے پار حملہ کیا جو ناکام رہا۔ دوسری مہم میں وہ اپنی فوجیں لے کر سویز کے راستے میں سواکن کے ساحل پر اترا اور اس نے مصوع سے زیلع تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ ترک اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لئے اوزدہ میر پاشا کے انتقال تک اس علاقے میں توسیع کرتے رہے لیکن اس کے انتقال کے بعد ترکوں کا اقتدار زوال پذیر ہونے لگا۔ چنانچہ دور دراز کے اضلاع کو یا تو چھوڑ دیا گیا یا ان کا نظم و نسق علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۷۸۹ء میں مصوع عثمانی حکومت کے بجائے ایک قبائلی سردار کے ماتحت تھا جس کا لقب نائب تھا۔ یمن اور حرمین شریفین میں امن قائم رکھنا چونکہ بیگلر بیگی کا فرض تھا اس لئے دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں اس صوبے کا صدر مقام جدہ بنایا گیا بعد میں اس علاقے کی شورشوں کی وجہ سے مدینہ منورہ کو عارضی طور پر صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں عثمانی سلطان نے صوبے کے افریقی حصوں پر اپنے اختیارات مصر کے پاشا کو منتقل کر دیئے۔

حبش الحاسب المروزی: احمد بن عبداللہ اسلامی فلکیات میں ایک اہم شخصیت۔ مرو میں پیدا ہوا۔

بعد میں بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ اس نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ ابن القفطی نے اس کا زمانہ حیات المامون اور المعتصم کا عہد حکومت قرار دیا ہے۔ ابن الندیم نے اس کی تصانیف کی فہرست اس طرح دی ہے۔

۱۔ کتاب الزیج الدمشقی ۲۔ کتاب الزیج المامونی ۳۔ کتاب الابعاد والاجرام ۴۔ کتاب عمل الاسطرلاب ۵۔ کتاب الرخائم ۶۔ کتاب الدوائر الثلثۃ المماسۃ وکیفیۃ الاوصال۔ ۷۔ کتاب عمل السطوح المبسوطۃ [illegible]

Marfat.com

بیت ... علمِ مثلثات کے اعمال، جیبِ مستوی، جیبِ معکوس، مماس، مماس التمام اور فلکیاتی مسائل میں ان کے اطلاق میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا۔ تمام مت اخر مورخین کی متفقہ رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حبش عباسی عہد کے ابتدائی حصے کے چند بڑے ماہرینِ فلکیات میں ایک تھا۔

ابوجعفر بن احمد بن عبداللہ حبش کا بیٹا تھا جو علمِ ہیئت اور صناعتِ آلات میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بھی "الاصطرلاب المسطح" کے نام سے لکھی تھی۔

حبشہ : عربی میں اس کا اطلاق حبشہ کے باشندوں اور ملک دونوں پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات براعظم افریقہ کے مشرقی خاکنائے پر بھی اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ حبشہ میں اگرچہ ہمیشہ عیسائیوں کی اکثریت رہی لیکن اس میں مسلم آبادی بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ حبشہ کے آنحضورؐ کے دور سے کر ہمیشہ عالمِ اسلام سے تعلقات رہے ہیں۔

تاریخ میں آنحضورؐ اور نجاشی کے درمیان دوستانہ مراسم کا ذکر موجود ہے۔ اس علاقے میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر اس وقت ہوئی جب اکسومی ریاست اپنے دورِ زوال میں تھی۔ ایرانی بحیرۂ قلزم اور اس کے تجارتی راستوں کو درہم برہم کر چکے تھے مسلمانوں کی سلطنت میں پورا عرب اور شمالی افریقہ شامل ہو چکے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام عیسائی سلطنت کے دروازوں پر دستک دے چکا تھا۔ جزائر دہلک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اسلام کی زبردست اشاعت کے مقابلے میں یہاں کے لوگوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے ناقابلِ تسخیر پہاڑی قلعوں میں پڑے رہیں۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر مسلمان حبشہ کی سرحدوں پر چھاتے چلے جا رہے تھے لیکن مسلمانوں نے اس حسنِ سلوک کے پیشِ نظر جو یہاں کے لوگوں نے ابتدا میں صحابۂ کرامؓ کے ساتھ کیا تھا، اس علاقہ کو اپنے دائرۂ فتوحات میں شامل نہ کیا۔ لیکن سرحدوں پر جو یورشیں شروع ہو چکی تھیں ان کے اثرات کو مٹایا نہ جا سکا۔ زیریں علاقوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا اور مسلم طاقتیں یکے بعد دیگرے بحیرۂ قلزم کے افریقی ساحلوں پر اپنا اقتدار قائم کرتی رہیں۔

اسلام کا نفوذ نہ صرف ان ساحلی علاقوں میں ہو رہا تھا جہاں سے حکومتِ حبشہ کا اقتدار مٹ چکا تھا بلکہ وہ خانہ بدوش بھی اسلام قبول کر رہے تھے جو سمندر اور مشرقی ڈھلانوں کے درمیانی علاقوں میں آباد ہوتے اور آتے جاتے رہتے تھے۔ آخرکار اسلام مشرقی سواحل اور مملکت سدامہ تک پہنچ گیا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی اور چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانے میں اسلام کی اشاعت بڑے منظم طور سے ایک وسیع علاقے میں ہوئی۔ چنانچہ جزیرہ نمائے دہلک، دنقلی، صومالی سواحل، شمال میں بجایہ جنوب میں سدامہ، مشرقی شوا کی ریاست افات میں، مشرق میں ہرار اور مغرب میں جبیل زوای کے قریب اسلام پہنچ چکا تھا۔

ساحلی میدانوں میں اسلام مسلمان تاجروں کے ذریعے پھیلا۔ ان علاقوں میں اسلام کی اشاعت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام غلامی کا مخالف ہے۔ اور لوگوں کو اسلام ... میں غلامی ... سے یہ بہتر نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر کے آزاد شہری قرار پائیں۔

وسطی پہاڑی علاقے کی عیسائی ریاستوں اور مسلم سلطنتوں کے درمیان ایک طویل اور مہلک جنگ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی تک کے دور میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ہرار ایک مسلم شہری ریاست اور اسلامی تجارت اور تہذیب و ثقافت پھیلانے کا بڑا مرکز بن گیا۔ سطح مرتفع شوا کا جنوب مشرقی حصہ اور وادی اوش کی ڈھلانیں افات کے قبضے میں رہیں۔ یہ سب سے اہم سلطنت تھی۔ جنوبی حبشہ کے بڑے حصوں پر دوارو کا سلطنت کا قبضہ تھا۔ شرقہ اور راربنی کی چھوٹی چھوٹی ماتحت ریاستیں دوارو اور انتہائی مغربی مسلم ریاست ہدیہ کے درمیان واقع تھیں۔ ہدیہ کی مسلم ریاست سدامہ اور گراجہ کے علاقوں پر مشتمل تھی۔

یہ مسلم ریاستیں شہنشاہ آمدہ سیون (۱۳۱۴ء تا ۱۳۴۴ء) کے خلاف صف آرا تھیں۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے زیرِ نگین علاقے منتشر تھے اور ان علاقوں کے درمیان کوئی مناسب رابطہ اتصالی انتظام نہ تھا چنانچہ آمدہ سیون نے افات اور ہدیہ پر حملہ کر دیا۔ اور دونوں کو شکست دی اس لئے دریائے اوش تک پوری سطح مرتفع پر آمدہ کا قبضہ ہو گیا۔

اس فتح سے بہت سے لوگ عیسائی ہو گئے۔ اس زمانے میں بہت سی خانقاہیں اور گرجے قائم کئے گئے۔

آمدہ سیون کا جانشین اور بیٹا سیفہ ارعد زیادہ تر حبشہ میں مصری تاجروں کے خلاف اپنی انتقامی کارروائیوں کی وجہ سے مشہور رہے۔

ارعد کے بیٹے ودیت نے مصری حکمران سے عارضی صلح کر لی۔ اس اثنا میں حبشیوں نے محسوس کیا کہ اپنے قریبی پڑوسیوں یعنی بحیرۂ قلزم کے ساحل پر مضبوط قلعے رکھنے والے مسلمانوں سے بیک وقت آویزش اور پُرامن طور پر رہنے کی حکمتِ عملی کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے انہوں نے پرتگیزی بحریہ کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ مسلمانوں کو بحیرۂ قلزم کے علاقے سے نکال باہر کیا جائے۔ لیکن پرتگیزی مشن کے نہ پہنچنے کی وجہ سے انہیں اس مقصد میں ناکامی ہوئی۔

اسی دوران میں اندرونی شورشوں کی وجہ سے سلطنتِ ادل میں بحران پیدا ہو چکا تھا۔ خاندان ولسمہ کے وقار کو ایک شکست کی وجہ سے شدید ٹھیس پہنچی جس کے وقار کو اب امیر اور فوجی للکار رہے تھے۔ سلطنت ابوبکر نے اپنا دارالحکومت ہرار میں منتقل کر لیا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان جرنیلوں کے دباؤ سے آزاد رکھنا چاہتا تھا جنہیں دنقلی اور صومالی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ فوجی قائدین کا سردار احمد بن ابراہیم جلد ہی حبشہ میں مسلم مقبوضات کا مالک بن گیا اور امیر کا لقب اختیار کر لیا۔ سردار احمد بن ابراہیم نے پہلے ادل میں اپنی طاقت کو مستحکم کیا پھر دنافلہ اور صومالیوں کو ایک زبردست اور طاقتور فوج میں منظم کیا۔ اس نے ۱۵۲۹ء میں حبشی شہنشاہ لبنہ ڈنگل پر حملہ کیا اور اسے شکستِ فاش دی۔ اگرچہ وہ اس فتح سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ دو سال بعد اس نے وہ حملہ شروع کیا جس سے وہ تقریباً سارے حبشہ پر قابض ہو گیا۔ لیکن سردار احمد بن ابراہیم کی وفات کے بعد حبشہ کے لئے مسلمانوں کی طرف سے عملاً کوئی خاص خطرہ نہ رہا۔ یورپ کی ایک عیسائی مملکت

Marfat.com

کے سپاہیوں کی مدد سے حبشیوں نے آخرکار اپنی قدیم عیسائی سلطنت کو بچا لیا۔ لیکن اس وقت حبشہ بہت تباہ حال ہو چکا تھا۔ اس کے بہت سے کلیسا اور خانقاہیں معدوم اور اس کے پادری طاقت سے محروم ہو چکے تھے۔

جب مصر میں خدیو اسماعیل کی حکومت تھی تو اس نے حبشہ کی فتح کے منصوبے بنائے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں مصر نے اس پر تین سمت سے حملہ کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ اس شکست سے مصریوں کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر انہوں نے فوراً ایک اور مہم تیار کی جس کی قیادت خدیو کے بیٹے نے کی۔ جس میں تقریباً بیس ہزار افراد شامل تھے۔ اس مرتبہ شہنشاہ نے حبشیوں کی فوج منظم کی۔ ۱۸۷۶ء میں گرا کے قریب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ مصریوں نے انہیں شکست فاش دی۔ اہل حبشہ اور مسلمانوں کی آخری لڑائی ۱۸۸۸ء میں ہوئی جبکہ مہدی کی ریاست کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد سوڈان اور حبشہ میں عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔

مہدویوں کا ایک جلادستہ مغربی حبشہ میں داخل ہو گیا جس نے گوندار کے کچھ حصے جلا دیئے اور سرحد پر پڑاؤ ڈال دیا۔ جنگ میں مہدویوں نے شہنشاہ جون کو شکست دی۔

موجودہ دور میں افریقی مشرقی خاکنائے کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان ہے لیکن حبشہ کی سیاست اور معاشرت پر ان کا اثر بہت ہی معمولی ہے۔ حبشہ کی سیاسی اور ثقافتی زندگی عیسائیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ شمال مشرقی افریقہ کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سوائے جنوبی افریقہ کے، جہاں غیر مسلم حکومت ہے۔ حبشہ ہر سمت سے مسلم علاقوں میں گھرا ہوا ہے۔ جبرت، حبشہ میں مسلمانوں کا سب سے قابل ذکر گروہ ہے۔ زیریں علاقوں میں کشتی اور سیلوتی عوام میں اسلام اب بھی آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے۔

حبشہ کی جدید ریاست میں بحیرہ قلزم کے ساحلوں پر واقع تجارتی مقامات میں مسلمانوں کے آباد ہو جانے سے ساحلی میدانوں میں رہنے والے خانہ بدوشوں میں اسلام پھیلا۔ انتہائی شمال میں رہنے والے خانہ بدوش یعنی بجایہ اور سیلوتی خطے اور ساحلی آبادیاں دونوں سے متاثر ہوئے۔ زیلع اشاعت اسلام کا اہم مرکز بن گیا۔ تجارتی تعلقات کے سبب مغرب میں دریائے گبے کے دونوں جانب بدیہ تک سدامہ کی ترقی یافتہ جنوبی سلطنتوں کے حکمران طبقوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مشرقی پہاڑی علاقوں کے ساتھ ساتھ مسلم ریاستوں میں مشہور ترین اوفات اور ادل تھیں۔ بلی اور دوارو کی مسکم سدامہ ریاستوں کا بہت سا خطہ گلا کے بڑے حملے سے مغلوب ہو گیا۔ چنانچہ ایک شہر ہرار کے سوا تمام علاقے سے اسلام غائب ہو گیا۔ یہاں اسلام صرف صومالی قبائل میں پھیلا۔

عرب مصنف اکثر لفظ حبشہ اتنا ہی مبہم طور پر استعمال کرتے ہیں جتنا بہم ازمنۂ قدیم و متوسط کے یورپ میں لفظ ابیقوپیا استعمال ہوتا تھا۔ یعنی تقریباً نیم صحرائی افریقہ کے قابل زراعت حصے کے لئے۔

حبشی: برعظیم پاک و ہند میں حبشی کی اصطلاح ان افریقی قوموں کے لئے استعمال ہوتی ہے جن کے آباؤ اجداد شروع میں اس ملک میں غلاموں کی حیثیت سے آئے۔ ان میں سے بعض ہمسایہ مسلم ممالک کے غلاموں کے لئے گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس نام کا اطلاق بلا کسی تمیز کے تمام افریقیوں پر ہوتا ہے۔

ابتدائے عہد اسلام میں حبشیوں کی تعداد و حیثیت کے متعلق [illegible] بہت کم ملتی ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان کی ملکہ رضیہ کے حبشی غلام یاقوت کے اقتدار سے یہ بات واضح ہے کہ اس دور میں بھی حبشی اختیار و شہرت کے بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ تغلق عہد تک حبشی برعظیم میں ہر طرف پھیل چکے تھے۔

ابن بطوطہ نے اپنی سیاحت کے دوران میں (۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء) حبشیوں کو ہندوستان سے لے کر سیلون تک ملازمت کرتے ہوئے دیکھا جن کی اکثریت چوکیداروں اور بری و بحری سپاہیوں کی حیثیت سے ملازم تھی۔

غلام ملک سرور نے جو غالباً ایک حبشی خواجہ سرا تھا آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطان محمد بن فیروز تغلق اور بعد کے تغلق بادشاہوں کے دور میں اہم حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں "خواجۂ جہاں" کے لقب سے وزیر مقرر ہوا۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں اسے سلطنت کے مشرقی صوبوں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کے متبنیٰ قرنفل نے ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں مبارک شاہ کے نام سے ملک سرور کا جانشین بننے کے بعد اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کیا اور سکے ڈھلوائے۔ اس کے بعد اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم شاہ نے، جونپور پر تقریباً چالیس برس تک حکومت کی۔

حبشی بنگال میں سمندر کے ذریعے سے پہنچے تھے۔ ایک روایت کے ذریعے الیاس شاہی سلطان رکن الدین باربک شاہ کے پاس آٹھ ہزار کے قریب غلام تھے۔ یہ غلام فوجی مقاصد کے لئے رکھے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ جلال الدین فتح شاہ کے دور حکومت میں وہ خطرناک طور پر طاقتور ہو گئے۔ حبشیوں کے سب سے پہلے شخص نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء سے لے کر ۸۹۹ھ/۱۴۹۳ء تک بنگال پر حکومت کی۔ ۹۰۰ھ/۱۴۹۳ء میں ایک عرب وزیر علاء الدین حسین کو بادشاہ چن لیا گیا تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد تمام افریقیوں کو بنگال سے نکال باہر کیا گیا۔ ان میں سے اکثر گجرات اور دکن چلے گئے۔

حبشی غالباً دکن ہی میں ایک طویل عرصے تک زیادہ نمایاں حیثیت کے حامل رہے بقول رفیع الدین شیرازی صاحب تذکرۃ الملوک "بہمنی سلطان فیروز (۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء تا ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) کے حرم میں اس کے ذاتی خدام کے طور پر بہت سے حبشی موجود تھے۔ جب ایرانیوں اور ترکوں کی تعداد میں احمد کے تخت نشین ہونے کے بعد اضافہ کر دیا گیا تو حبشی دربار کی عنایات سے محروم ہو گئے اور وہ دکن کے مقامی مسلمانوں کی حمایت کرنے لگے۔ احمد شاہ ولی کے عہد حکومت کے آخری برسوں میں دو بہمنی صوبوں "ماہور" اور "گلبرگہ" پر حبشی حکمرانی کرتے تھے۔ قصبہ بیدر کے باہر جس پہاڑی پر حبشی جماعت کا قلعہ تھا وہ اب بھی حبشی کوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ حبشیوں نے بری افواج میں اہم عہدے حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ گجرات اور دکن کی بحری فوجوں میں بھی اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات میں حبشیوں کو سمندر کے راستے سے بھڑوچ، سورت، رندیر اور کھمبایت کی بندرگاہوں کے راستے مسلسل درآمد کیا جاتا رہا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق صرف احمد آباد میں پانچ ہزار حبشی تھے۔ اس طرح پرتگیزی فاتح کے وقت سیف الملک جو حفتارج قلعہ دامان کا گورنر تھا کے پاس چار سو حبشیوں کی فوج تھی۔ گجرات کی بحریہ میں تاجر اور سپاہی دونوں حیثیتوں [illegible] غلام پڑے مغل دور میں جو ترقی و ترویج ہندوستان [illegible]

Marfat.com

[illegible] میں بکثرت ملتے ہیں۔

حبل اللہ :

اللہ کی رسی۔ دین اسلام۔

حبل اللہ سے مراد اللہ تعالےٰ کا دین ہے۔ قرآن مجید میں دین کو اللہ کی رسّی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالےٰ ہے :-

"سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو"۔

(۳ : ۱۰۳)

بقول مولانا مودودی :- اس رسّی کو "مضبوط پکڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت "دین" کی ہو۔ اس سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لئے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں۔ پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔"

حبیب اللہ خان :

(دورِ حکومت ۱۸۷۲ء تا ۱۹۱۹ء)
(افغانستان کا حکمران)

امیر عبدالرحمٰن کا بیٹا، باپ کے بعد افغانستان کا حکمران بنا۔ اس نے مملکت کے خارجی معاملات میں برطانیہ کے ثالثی کی درخواست کی۔ جہاں تک سرحد کے تعین کا تعلق تھا، دونوں ملکوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ اس کے عہد میں برطانیہ نے افغانستان کو ان شرائط پر آزادی دینے کا وعدہ کیا۔

۱- امیر دوسرے ملکوں سے تعلقات کے سلسلے میں برطانوی حکومت کے مشورے کے مطابق قدم اٹھائے گا۔

۲- ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ سٹرلنگ سالانہ فوجی تعاون کے سلسلے میں امداد کے طور پر وصول کرے گا۔

۳- افغانستان کے جنگی سامان کی درآمد پر کوئی پابندی نہیں لگائی جائے گی۔

۴- غیر معینہ عرصے کے لئے وائسرائے ہند کے دربار میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ اور ہندوستان اور برطانیہ میں افغان تجارتی ایجنٹوں کا تقرر تسلیم کیا جائے گا۔

امیر نے یہ وعدہ بھی کیا برطانیہ سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے گا اور کسی تیسری حکومت کوئی معاملہ طے کرنے سے پہلے برطانیہ سے مشورہ کرے گا تاہم اس نے برطانیہ کی یہ درخواست کہ وہ لنڈی کوتل پر قلعہ تعمیر کرے مسترد کر دی۔ اس کے عہد میں تمام سیاسی روابط کو برطانوی ایجنٹ کے اختیار میں دے دیا گیا۔

حبیب اللہ اپنے باپ کی طرح مستعد و سرگرم تو نہ تھا لیکن داخلی حکمت عملی کے تحت اس نے بحالیٔ امن کے لئے ایک پروگرام شروع کیا۔ جو نیا فضانہ اقدامات [illegible]

[illegible] ملک کی تشویشناک معاشی صورت حال کے پیش نظر مالی حکمت عملی کے تحت بعض اقدامات کئے جن کی رو سے ہندوستان سے تجارت میں اضافے کی اجازت دی گئی۔ ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو اس نے وادی النگار میں قلعہ السراج کے قریب گوش جی پڑاؤ ڈال رکھا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے قتل سے امن و سکون اور برطانیہ سے دوستی کا یہ عبوری دور اچانک ختم ہو گیا۔ لیکن ملک کے جدید قومی تقاضوں کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔

حبیب اللہ قندھاری :

(۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء - رمضان ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء) بن فیض اللہ افغانستان کے ایک بڑے عالم دین اور صوفی، قندھار میں پیدا ہوئے۔ چھبیس سال تحصیل علم میں مصروف رہے۔ اس دوران میں علم کے حصول کے لئے ایران اور بلاد عرب بھی گئے۔ بعد ازاں قندھار میں تدریس و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

میاں فرح الدین کی وساطت سے میاں فقیر اللہ شکارپوری نقشبندی کی بیعت کی۔ آپ نے "استاد الکل" اور "محقق قندھاری" کے القاب سے شہرت پائی جب ۱۲۴۱ھ میں مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی قیادت میں ہندوستان کے مجاہدین کا قافلہ قندھار پہنچا تو آپ کابل تک کے سفر میں ان کے ہمرکاب رہے۔

آپ کے علم و فضل کی شہرت ان کے شاگردوں اور ان کی تالیفات کے ذریعے ہندوستان تک پہنچی۔ ان کے شاگردوں میں ایک مولوی عبداللہ غزنوی تھے جنہوں نے امرتسر میں بالخصوص اور پنجاب میں بالعموم مشعل ہدایت روشن کی۔ انہوں نے پنجاب میں علم حدیث پھیلانے میں نمایاں خدمت سرانجام دی۔

آپ نے باون سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کا مزار قندھار میں ہے۔ آپ کی تصانیف عربی، فارسی اور پشتو تینوں زبانوں میں ہیں۔ جن کی تعداد چالیس سے اوپر ہے۔ ان تصانیف میں "مغتنم الحصول فی علم الاصول" جو اصول فقہ پر ہے "نقد الثقات فی ترتیب الموضوعات" فارسی زبان میں حدیث کے موضوع پر ہے "ترجمہ مقامات حریری (فارسی)" منتخب تحریر اقلیدس (عربی)"۔ "لسان المیزان فی تقویم الاذھان" عربی زبان میں علم منطق پر لکھی گئی ہے۔ "احکام الملتہ فی احکام اہل القبلہ" (عربی) خاص طور پر مشہور ہیں۔

حبیب النّجّار :

انطاکیہ کے ایک ولی اللہ۔

بائیبل میں ان کا ذکر آغابوس کے نام سے کیا گیا ہے بعض مفسرین کے نزدیک ان کا قصہ نام لئے بغیر قرآن مجید میں بھی یوں مذکور ہے۔

"انہیں مثال کے طور پر اس بستی والوں کا قصہ سناؤ جب کہ اس میں رسول آئے تھے۔ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انہوں نے دونوں کو جھٹلایا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لئے بھیجا اور ان سب نے کہا ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں"

بستی والوں نے کہا :

"تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے۔ تم محض جھوٹ بولتے ہو"

رسولوں نے کہا :

"ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے"

Marfat.com

بستی والے کہنے لگے:
"ہم تو تمہیں اپنے لئے فال بد سمجھتے ہیں، اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے۔"
رسولوں نے جواب دیا:
"تمہاری فال بد اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ باتیں تم اس لئے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔"
اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے "ایک شخص" دوڑتا ہوا آیا اور بولا: "اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی اختیار کر لو، پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔ آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے۔ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود بنا لوں؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو۔"
آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ: "داخل ہو جا جنت میں۔" اس نے کہا: "کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی۔ اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔" (۳۶: ۱۳ تا ۲۷)
مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ شخص حبیب نجار تھا جو بُت بنایا کرتا تھا۔ بعد میں اس نے رسولوں کے معجزے دیکھے تو اس نے دین حق قبول کر لیا۔ دمشقی نے تو اس کے بارے میں عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے کہ حبیب نے اپنا کٹا ہوا سر پہلے اپنے بائیں ہاتھ میں لیا۔ اور پھر داہنے ہاتھ پر رکھ لیا اور اس انداز سے تین دن اور تین رات شہر میں گشت کرتا رہا۔ اس کا مقبرہ ابھی تک انطاکیہ میں موجود ہے اور بہت سے لوگ اس کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ بعض مفسرین نے ان تینوں کے نام بھی دیئے ہیں جو یحییٰؑ، یونسؑ اور شمعونؑ ہیں اور بعض کے نزدیک یہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری تھے لیکن نہ تو قرآن میں کسی بستی کا تعین کیا گیا ہے نہ کسی صحیح حدیث میں بلکہ بائبل کی کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسول کون تھے اور کس زمانے میں بھیجے گئے تھے۔

حبیب بن عبدالملک: دمشق کے اموی خلیفہ ولید اول کا پوتا۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد وہ شام سے راہ فرار اختیار کر کے اندلس چلا گیا تھا۔ جب اس کا چچا عبدالرحمٰن وہاں پہنچا اور اس نے وہاں اموی خلافت کا دعویٰ کیا تو حبیب نے اس کی حمایت کی۔ المصارہ کی لڑائی میں قرطبہ کے تخت کا فیصلہ عبدالرحمٰن کے حق میں ہوا۔ حبیب اس جنگ میں رسالے کا سپہ سالار تھا۔ فتح حاصل کرنے کے بعد عبدالرحمٰن نے اسے مستقلاً اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ بعد میں اسے طلیطلہ کی حکومت سونپی گئی۔ جب تک وہ طلیطلہ میں رہا اس شہر میں بغاوت کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ حبیب نے طلیطلہ کو ان دنوں اپنے گرد و نواح میں ہونے والی شورش کے خلاف کارروائیوں کے لئے ایک مستقر کے طور پر استعمال کیا۔ ۷۶۲ء/

...۷۰ھ میں اسے ایک بار پھر [illegible] کرنی پڑی۔ یہ بغاوت تامسلمی سنہ پر پاکی تھی [illegible] عبدالرحمٰن الداخل نے ان خدمات کے صلے میں بڑے انعامات سے نوازا۔ [illegible] جاگیریں عطا کیں۔ اس کی وفات پر عبدالرحمٰن نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔
وہ بنو حبیب کا بانی تھا۔ اس خاندان میں اندلس کے بعض شاہسوار پیدا ہوئے۔ خود وہ اس خاندان کی ممتاز ترین شاخ تھے۔

حبیب بن عمرو رضؓ: (صحابی) آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:- حبیب بن عمرو بن محصن الانصاری بن عمرو بن مبذول بن غنم بن مازن بن النجار۔
آپ ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے یمامہ کی جنگ میں شہادت پائی۔ آپ راستے میں پیدل چلے جا رہے تھے کہ دشمن نے وار کر کے شہید کر دیا۔

حبیب بن مسلمہ: (؟ — ۴۲ھ/۶۶۲ء) بن مالک القرشی الفہری۔ کنیت ابو عبدالرحمٰن
اسلام کے اولین فاتحین اور قائدین میں سے تھے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ امام بخاریؒ نے انہیں صحابہؓ میں شمار کیا ہے کیونکہ ان کے بارے میں ایک روایت ہے کہ وہ نوجوانی کی عمر میں آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حبیب ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں شام کی فتح میں شریک تھے اور غزوہ یرموک میں لشکر کے ایک حصے کے سپہ سالار تھے۔ بعد میں دمشق جا کر سکونت اختیار کر لی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عیاض بن غنم کو معزول کر دینے کے بعد انہیں جزیرے کے علاقے کا والی بنایا تھا۔ پھر ان کی ولایت میں آذربائیجان اور آرمینیہ بھی شامل کر دیئے گئے۔ بعد میں انہیں معزول کر دیا گیا۔
جنگ صفین میں حبیب، حضرت معاویہؓ کے طرفداروں میں شامل تھے اور لشکر کے بائیں بازو کے سرعسکر تھے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں انہوں نے بزنطینیوں کے خلاف کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ ان جنگوں میں انہیں اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا۔ شعراء نے ان کی بہادری اور جرأت کی تعریف کی۔ جنگوں میں بہادری دکھانے کی وجہ سے ان کا لقب "حبیب الروم" مشہور ہو گیا تھا۔
ان کے مقام وفات کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے آرمینیہ اور بعض نے دمشق کو ان کا مقام وفات بتایا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے دمشق میں انتقال کیا۔

حبیب بورقیبہ: تونس کے صدر۔ ان کے والد ایک فوجی افسر تھے۔ ۱۹۲۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس گئے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک فرانسیسی عورت سے شادی کر لی۔ ۱۹۲۷ء میں واپس آ کر وکالت شروع کی اور ۱۹۳۰ء میں "صوت التیونس" اخبار کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ جو دستور پارٹی کا ترجمان تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل ہیں۔
۱۹۳۴ء میں انہوں نے نیو دستور پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اسی [illegible] سرگرمیوں کی بناء پر نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء رہا ہونے پر [illegible] کی۔ ۱۹۳۸ء میں انہیں ملک [illegible]

Marfat.com

[illegible] پر قبضہ کر لیا تو انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء
[illegible] تونس کی آزادی کے لیے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں آئینی اصلاحات کے لیے بات چیت کرنے پیرس گئے مگر گفتگو ناکام رہی۔ چنانچہ تونس واپس آنے پر ۱۸ جنوری ۱۹۵۲ء کو گرفتار کر لیے گئے اور دوبارہ ملک بند کر دیا گیا عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا اور تشدد شروع کر دیا چنانچہ یکم جون ۱۹۵۵ء کو وہ فاتحانہ شان سے وطن واپس آ گئے کیونکہ فرانس اور تونس کے درمیان بات چیت کے بعد تونس کو خود مختاری دینے کا معاہدہ ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے دوبارہ "دستور پارٹی" کو منظم کیا اور اس کے صدر منتخب ہوئے اپریل ۱۹۵۶ء میں انھیں تونس کی نئی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ اسمبلی کے سپیکر تھے چنانچہ انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ اور انھوں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے فرائض سنبھالے ۲۱ جولائی کو انھوں نے ملک میں بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کیا اور جمہوریہ تونس وجود میں آئی تو حبیب بورقیبہ نئی جمہوریہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے تونس کی حکمران جماعت۔ دستور سوشلسٹ پارٹی نے صدر حبیب بورقیبہ کو تاحیات تونس کا صدر منتخب کیا۔ وہ حکمران جماعت کے صدر بھی ہیں۔

حبیب بورقیبہ اعتدال پسند ہیں تونس کی آزادی میں اگرچہ وہ فرانس کے بد ترین دشمن تھے لیکن آزادی کے بعد انھوں نے خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں کسی قسم کی تاخیر نہ کی۔

۱۹۵۹ء کے انتخابات نے ان کے اس عہدے کی تصدیق کر دی۔ ۱۹۶۹ء میں وہ تیسری بار ملک کے سربراہ منتخب ہوئے۔

(—ء —— ۱۵۶ھ/ ۷۷۳ء)

حبیب عجمی :

ابو محمد کنیت، ایک بزرگ اور مشائخ کبار میں سے ہیں۔ شروع میں آپ بہت زیادہ دولت مند تھے۔ ساہوکار تھے اور مال پر سود لیا کرتے تھے۔ ہر روز قرضداروں کے ہاں تقاضا کرنے جاتے اور جس سے جو لینا ہوتا جب تک مل نہ جاتا اسے نہ چھوڑتے۔ اپنی آمد و رفت کا خرچ بھی قرضداروں ہی سے وصول کرتے لیکن ایک واقعہ نے پوری زندگی بدل کے رکھ دی۔ یہ واقعہ مندرجہ ذیل ہے :۔

ایک روز آپ کسی مقروض کے ہاں تقاضا کرنے گئے۔ مقروض گھر پہ نہ تھا۔ اس کی بیوی موجود تھی۔ اس نے کہا "میرا خاوند گھر پہ نہیں ہے نہ ہی گھر میں کوئی روپیہ ہے جو ادا کر سکوں۔ ہاں ایک بکری ذبح کی تھی اس کی گردن موجود ہے۔ آپ چاہیں تو وہی لے جائیں"

آپ نے کہا "وہی دے دو" چنانچہ گردن لے کر گھر آئے اور بیوی سے کہا یہ سود میں ملی ہے اسے پکا لو۔ بیوی بولی "آٹا اور لکڑی بھی ختم ہے"۔ کہنے لگے "اچھا میں ابھی جا کر دونوں چیزیں بھی سود میں لے آتا ہوں" یہ کہہ کر دوسرے قرضداروں کے ہاں گئے اور ان سے لکڑی اور آٹا بھی سود میں لے آئے۔ بیوی نے گردن پکائی جب کھانا تیار ہو گیا اور کھانے کے لئے بیٹھے تو باہر سے کسی سوالی نے آواز دی۔ "میں بھوکا ہوں کچھ کھانے کے لئے دیا جائے" آپ نے اندر ہی سے اسے جھڑک دیا۔ سائل چلا گیا۔

جب آپ کی بیوی نے سالن میں چمچہ ڈال کر نکالا تو معلوم ہوا کہ وہ خون ہی خون ہے وہ بھی سے حیران ہو کر شوہر کی طرف دیکھا اور کہا کہ اپنی خود غرضی اور کنجوسی کا نتیجہ دیکھو۔ خواجہ عجمی نے ہنڈیا میں خون دیکھا تو حیران رہ گئے۔ دل میں جو چنگاری دبی تھی بھڑک اٹھی۔ اسی وقت اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کر لی۔ اگلے روز جمعہ تھا آپ باہر نکلے تاکہ باری باری سب قرضداروں کے پاس جا کر انہیں سود معاف کر دیں۔ راستے میں بچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو دیکھ کر چلانا شروع کیا۔ ہٹو حبیب سود خور آ رہا ہے۔ ہم پر اس کی گرد پڑ گئی تو ہم بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔ یہ سن کر آپ کے دل پر اور چوٹ پڑی۔ اور اپنا ارادہ ترک کر کے سیدھے خواجہ حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ حسن بصری نے آپ کو نصیحتیں کیں اور توبہ کرائی۔ پھر آپ باہر تشریف لے گئے اور اعلان کر دیا جس کسی کے ذمے میرا کچھ نکلتا ہے وہ آئے اور مجھ سے دستاویز لے جائے۔ چنانچہ قرضدار آتے اور آپ سے اپنی دستاویز لے گئے۔ سب مال و اسباب جو آپ کے پاس جمع تھا راہ خدا میں لٹا دیا۔ اب یہ عالم تھا کہ دن میں خواجہ حسن بصری کی مجلس میں تشریف لے جاتے۔ ان سے علم سیکھتے اور معرفت الہی کے رموز سے آگہی حاصل کرتے۔ رات کو علیحدگی میں بیٹھ کر عبادت الہی کرتے صاحب اخبار الصالحین نے آپ کے انقلابی واقعے کو اس طرح درج کیا ہے۔

امام ذہبی فرماتے ہیں :۔

حبیب بن محمد سوداگر تھے اور دراہم کا بیوپار کیا کرتے تھے۔ ایک دن چند لڑکوں کے پاس سے گزرے جو کھیل کود میں مصروف تھے۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے کہا کہ دیکھو سود خور آ گیا۔ یہ سن کر آپ نے سر جھکا لیا اور کہا کہ اب بچوں ایک پر تو نے میرا حال ظاہر کر دیا ہے۔ جب گھر پہنچے تو ایک صوف کا کرتہ پہن لیا اور تمام مال و اسباب سامنے رکھ کر دعا کی کہ اے پروردگار میں اس مال کے عوض تجھ سے اپنا نفس خریدنا چاہتا ہوں مجھے آزاد فرما دے۔ جب دوسرا دن ہوا تو اپنا تمام مال راہ خدا میں خیرات کر دیا اور عبادت الہی میں مصروف ہو گئے۔ اور صائم الدھر اور قائم اللیل رہنے لگے اور ہر وقت ذکر الہی میں مشغول رہتے۔

ایک روز پھر لڑکوں کے پاس سے گزرے تو لڑکوں نے آپس میں کہا خاموش ہو حبیب العابد آتے ہیں یہ سن کر رونے لگے اور کہا اے اللہ یہ سب تیری طرف سے ہے۔

صاحب مراۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ "آپ سب کچھ راہ خدا میں لٹا دینے کے بعد دریائے فرات کے کنارے ایک مکان بنا کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ دن کو خواجہ حسن بصری سے علم حاصل کرتے اور رات کو عبادت کرتے رہتے۔"

روایت ہے جب اس طرح عبادت کرتے ایک مدت گزر گئی تو ایک دن بیوی نے شکایت کی کہ خرچ نہیں ہے۔ ضروریات کیسے پوری کی جائیں۔ آپ نے فرمایا کام پہ جاتا ہوں، مزدوری سے جو ملے گا لے آؤں گا۔ چنانچہ آپ دن بھر گھر سے باہر رہ کر عبادت کرتے شام کو واپس گھر آ جاتے۔ جب بیوی انہیں خالی ہاتھ دیکھتی تو کہتی یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ فرماتے میں کام کر رہا ہوں اور جس کا کام کر رہا ہوں وہ بڑا سخی ہے کہتا ہے کہ وقت آنے پر خود ہی اجرت دے دیا کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ لہذا مجھے اس سے مانگتے شرم آتی ہے۔ وہ کہتا ہے دس روز میں مزدوری دیا کروں گا چنانچہ بیوی نے صبر کیا۔ اور جب دسویں روز بھی شام کو خالی ہاتھ واپس آئے تو راستے میں سوچ رہے تھے، اب بیوی کو کیا جواب دوں گا۔ بہرحال جب گھر پہنچے تو دیکھا عمدہ کھانا تیار ہے۔ بیوی آپ کو دیکھتے ہی بول اٹھیں۔ یہ کس نیک بخت کا کام کرتے ہو۔ جس نے دس دن کی اجرت اس قسم کی بھیجی اور تین ہزار درہم نقد بھی بھیجے ہیں۔ یہ بھی کہلا بھیجا ہے کہ کام زیادہ محنت سے کرو گے تو اجرت زیادہ دوں گا۔

Marfat.com

یہ ماجرا دیکھ کر آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ خیال آیا کہ خدائے پاک نے ایک گنہگار بندے کی دس روز کی عبادت کا صلہ دیا۔ اگر زیادہ حضورِ قلب سے عبادت کروں گا تو نہ جانے کیا کچھ دے گا۔ یہ سوچ کر علائق دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے اور ایسی ایسی عبادتیں اور ریاضتیں کیں کہ اسرارِ الٰہی بے نقاب ہو گئے عنایاتِ الٰہی کا نزول شروع ہو گیا۔ اور مستجاب الدعوات کا درجہ مل گیا۔

جب آپ کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تھا تو آپ بہت زیادہ روتے تھے کسی نے کہا کہ تم سمجھتے تو ہو نہیں، روتے کیوں ہو؟ فرمایا "میری زبان تو عجمی ہے مگر دل عربی ہے۔"

ایک روز امام احمد حنبل اور امام شافعی بیٹھے تھے۔ آپ کا وہاں سے گزر ہوا۔ امام احمد بن حنبل نے کہا ہم آج ان سے ایک سوال کریں گے۔ چنانچہ جب آپ قریب آئے تو انہوں نے سوال کیا کہ آپ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کی پانچ نمازوں میں سے ایک نماز قضا ہو گئی ہو اور اسے یہ یاد نہ ہو کہ وہ کونسی نماز تھی۔ اسے کیا کرنا چاہیئے؟

آپ نے فرمایا ایسے شخص کا دل خدا سے غافل ہے اسے ادب کرنا چاہیئے۔ اور پانچوں وقت کی نمازیں قضا سمجھ کر ادا کرنی چاہئیں۔ امام احمد بن حنبل جواب سن کر حیران رہ گئے۔

تذکرۃ الاولیاء میں آپ کی وفات ۹ رمضان ۱۳۰ھ/۷۴۷ء بعہد ہشام بن عبدالملک ہوئی۔ آپ کا مزار بصرہ میں ہے۔ آپ اکابرین طائفہ و عرفائے اولیاء و کبرائے فقہا میں سے تھے۔ جب کبھی دوسرے بزرگانِ کرام کو کسی مسئلہ میں باہم اختلاف ہوتا تو وہ آپ ہی کو منصف مقرر کرتے تھے۔ آپ کے مشہور اقوال یہ ہیں:

۱۔ علم کے ساتھ یقین بھی ضروری ہے۔
۲۔ جس دل میں نفاق کا غبار نہ ہو رضا اسی دل میں ہے۔
۳۔ مرید کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے اسے کوئی لگاؤ نہ ہو۔

(۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء ـــ ؟)

ایک مستشرق

حتی: پورا نام ڈاکٹر فلپ کے حتی ہے۔ شملان کے مقام پر لبنان میں پیدا ہوئے۔ بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۸ء میں فارغ ہو کر امریکہ چلے گئے اور کولمبیا یونیورسٹی میں ریسرچ کرتے رہے۔ وہاں سے مشرقی ادبیات والسنہ میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی اور وہیں پروفیسر مقرر ہو گئے پہلی جنگ یورپ ۱۹۱۹ء میں ختم ہوئی تو انہیں بیروت کی یونیورسٹی میں طلب کر لیا گیا۔ اور وہ تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۶ء تک وہیں رہے۔ پھر امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں تاریخ عرب کے پروفیسر مقرر ہو گئے بعد ازاں انہیں مشرقی درسیات کے ایک شعبے کا رئیس بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ تمام مناصب سے سبکدوش ہوئے۔ اب بھی مختلف اداروں اور انجمنوں میں انہیں منفرد حیثیت حاصل ہے۔

ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت "تاریخ عرب" کو حاصل ہوئی۔ اس کتاب کا مختصر ایڈیشن بھی انہوں نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ "تاریخ شام" اور "تاریخ لبنان" "اسلامی ریاست کی ابتداء" ان کی مشہور تصانیف میں ہیں۔

[illegible]

حج: میں [illegible] متعدد کرنے اور طواف وغیرہ مناسک حج ادا کرنے [illegible] کا نام حج بیت اللہ ہے۔

حج اسلام کے پانچ ارکانِ بنیادی میں سے آخری رکن ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔" (۳:۹۷)

حج کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو مرکز اجتماع قرار دیا۔ یہ خدا کا پہلا گھر تھا جو نوع انسانی کے لئے قبلہ مقرر کیا گیا۔ قرآن مجید کی رو سے اس کا محل وقوع مکہ مکرمہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ تجویز کی تھی..... اور لوگوں کو حج کے لئے اذن عام دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں۔" (۲۲:۲۷)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لئے حج کرے پس اس میں نہ شہوت کی بات کرے نہ گناہ کرے تو وہ (گناہوں سے) اس دن کی طرح (پاک صاف) ہو جاتا ہے جبکہ اس کی ماں نے جنا تھا۔ (مشکوٰۃ)

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا عورتوں کا جہاد حج ہے (مشکوٰۃ)

حج کی حقیقت

حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے۔ یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اس معاہدہ اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجا لائے اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اس ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ خود اپنے کو حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں۔ اس لئے اتنے دنوں تک (یعنی احرام کے زمانے میں) ہر قسم کے بال نہ منڈواتے ہیں نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں یعنی نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ سلے کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں نہ شکار کرتے ہیں نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں نہ بیوی سے ہم بستر ہو سکتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اپنے دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے، دوڑتے ہوئے، خدا کے گھر میں پہنچے تھے، آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کے لبوں پر ہوتا ہے۔

"میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں [illegible]
شریک نہیں، [illegible]

Marfat.com

[illegible] کا بھی برابر کوئی شریک نہیں۔

یہ خصوصیت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا و مروہ تک) حضرت ابراہیم دوڑے گئے تھے کہ مردہ پہ پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے، وہاں سب دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشائیش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، قصور معاف کراتے، روتے اور آئندہ زندگی کے لئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے۔

یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر، دُور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل و صورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور جلے بُھنے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا مغفرت کی پکار، گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی۔ پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی عبودیت، اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اس میدان میں، اس موقع پر اور اسی حالت میں، اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے کی تھی اور یہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم ؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

"میں ہر طرف سے منہ موڑ کر اس طرف منہ کیا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔"
"میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے سے پہلے فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہوں۔" (۲۰:۱۶)

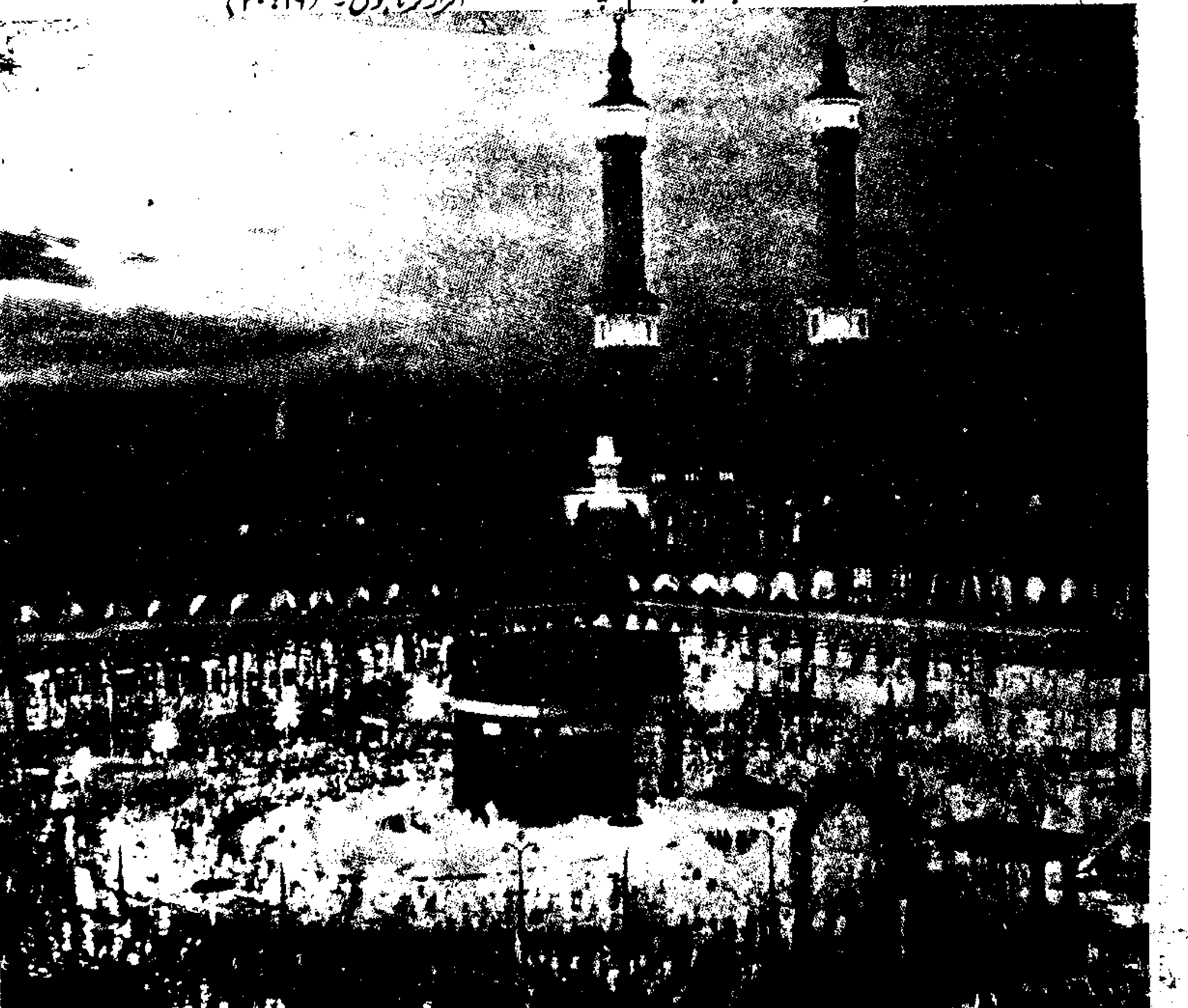

حج کا ایک روح پرور منظر

Marfat.com

حج زمانہ جاہلیت میں

زمانہ جاہلیت میں حج ایک میلہ تھا جو سال کے سال لگتا تھا۔ بڑے بڑے قبیلے اپنے جھتوں کے ساتھ یہاں آتے اور اپنے پڑاؤ الگ الگ ڈالتے۔ پھر ہر قبیلے کا شاعر یا بھاٹ اور اپنے قبیلے والوں کی بہادری، ناموری، عزت، طاقت اور سخاوت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا اور ہر ایک ڈینگیں مارنے میں دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ دوسرے کی ہجو تک نوبت پہنچ جاتی۔ پھر فیاضی کا مقابلہ ہوتا۔ ہر قبیلے کے سردار اپنی بڑائی جتانے کے لئے دیگیں چڑھاتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اونٹ پر اونٹ کاٹتے چلے جاتے۔ اس فضول خرچی سے ان لوگوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس میلے کے موقع پر ان کا نام سارے عرب میں اونچا ہو جائے۔ اور یہ چرچے ہوں کہ فلاں صاحب نے اتنے اونٹ کاٹے اور فلاں صاحب نے اتنے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ ان مجلسوں میں راگ رنگ، شراب خوری، زنا اور ہر قسم کی فحش کاری خوب دھڑلے سے ہوتی تھی اور خدا کا خیال مشکل ہی سے کسی کو آتا تھا۔ کعبے کے گرد طواف ہوتا تھا مگر اس طرح کہ عورت مرد سب ننگے ہو کر گھومتے اور کہتے کہ ہم اسی حالت میں خدا کے سامنے جائیں گے جس میں ہماری ماؤں نے ہمیں جنا ہے۔ ابراہیم کی مسجد میں جو عبادت ہوتی تھی، وہ ایسی ہوتی تھی کہ تالیاں پیٹی جاتیں، سیٹیاں بجائی جاتیں اور سنکھ پھونکے جاتے۔ خدا کا نام بھی پکارا جاتا تھا۔ مگر کس شان سے؟ کہتے تھے "میں حاضر ہوں۔ میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ مگر وہ جو تیرا ہونے کی وجہ سے تیرا شریک ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور اس کی ملکیت کا بھی مالک ہے۔ خدا کے نام پر قربانیاں کرتے تھے، مگر کس بد تمیزی کے ساتھ؟ قربانی کا خون کعبہ کی دیواروں سے لتھیڑا جاتا اور گوشت دروازے پر لٹکایا جاتا اس خیال سے کہ نعوذ باللہ یہ خون اور گوشت خدا کو مطلوب ہے۔

اسلام نے جاہلیت کے ان تمام طریقوں کی اصطلاح کی اور صحیح انبیاء کے طریقے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو:

۱۔ عاقل ہو، مجنوں مکلف نہیں
۲۔ بالغ ہو، بچوں کے لئے ضروری نہیں۔
۳۔ اس کے پاس اتنا مال ہو جو نہ صرف اس کے مصارف حج کے لئے کافی ہو بلکہ ان تمام افراد کے لئے کافی ہو جن کے معاش کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہے۔
۴۔ تندرست اور صحت مند ہو اور اس کے بدن میں اتنی طاقت ہو کہ حج کا سفر کر سکے۔ اور احکام بجا لا سکے۔
۵۔ اس کے لئے راستہ پر امن ہو۔
۶۔ ذریعہ سفر میسر ہو، خواہ بحری، خواہ ہوائی۔
۷۔ کوئی عملی روک ٹوک اور بندش نہ ہو مثلاً حکومت وقت نے حج کو جانے والوں کی تعداد مقرر کر رکھی ہو اور اس میں اس کا نام نہیں آ سکا یا روپیہ تو موجود ہے۔ زر مبادلہ میسر نہیں۔ چنانچہ جو شخص یہ تمام شرائط پورا کرتا ہو تو امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس شخص پر اسی وقت حج ہو جاتا ہے اور امام شافعی نے تاخیر کرنے والے کو گنہگار قرار دیا ہے۔ چونکہ حج کے لئے کافی روپیہ، مشقت اور وقت درکار ہے اور اگر تمام احکام

محفوظ رکھ کر صحیح طور پر حج کر لیا جائے تو [illegible] اسی لئے شریعت نے عمر بھر میں ایک ہی دفعہ حج فرض قرار دیا [illegible] شخص ایک سے زائد حج کرتا ہے تو یہ اس کے لئے نفل حج ہو گا۔

حج کے معین ایام صرف چھ ہیں یعنی اسلامی قمری تقویم کے مطابق آٹھ ذوالحجہ سے کر تیرہ ذوالحجہ تک بلکہ ضرورت اور مجبوری ہو تو گیارہ ذوالحجہ تک بھی۔ لیکن اس کا احرام یکم شوال سے آٹھ ذوالحجہ تک جب چاہیں باندھا جا سکتا ہے۔

مواقیتِ حج

شریعت نے اطراف عالم کے لئے چند مقامات متعین کر دیئے ہیں کہ جو شخص حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جانا چاہے وہ ان مقامات سے بغیر احرام باندھے نہ گزرے گویا یہ مقامات ہی وہ حدود ہیں کہ جہاں سے ظاہری طور پر بھی تذلل انکسار اور تواضع کی حالت ضروری ہے۔ ان مقامات کو اصطلاح میں مواقیت کہتے ہیں۔ ان کی تعداد پانچ ہے۔

۱۔ **یلملم**: ایک پہاڑی کا نام ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہے۔ یہ پاکستان ہندوستان اور یمن وغیرہ کی طرف سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا حج سے پہلے مدینہ جانے کا ارادہ ہو تو اسے چاہیے کہ یلملم سے احرام نہ باندھے بلکہ جدہ اتر کر مدینہ منورہ احرام کے بغیر چلا جائے پھر وہاں سے واپسی پر مدینہ منورہ کے میقات یعنی ذوالحلیفہ سے احرام باندھے۔

۲۔ **جحفہ**: یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک بستی تھی۔ جو اب موجود نہیں اس وقت اس کے قریب ایک اور بستی ہے جسے رابغ کہتے ہیں۔ یہ جگہ مکہ مکرمہ سے جانب شمال تقریباً ایک سو چالیس کے فاصلے پر ہے اور مصر شام طرابلس اور یورپ وغیرہ سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔

۳۔ **ذات عرق**: یہ عراق والوں کا میقات ہے۔

۴۔ **قرن المنازل**: یہ بھی ایک پہاڑ کا نام ہے جو عرفات کی طرف واقع ہے۔ یہ نجد والوں کا میقات ہے اسے مخفف کر کے صرف "قرن" بولتے ہیں۔

۵۔ **ذوالحلیفہ**: اس جگہ کو آج کل بئر علی کہتے ہیں۔ یہ مدینے سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے یہ مدینے والوں کا میقات ہے۔ مکہ سے بعید ترین میقات یہی ہے۔

آنحضورؐ نے یہ میقات ان اطراف کے لئے مقرر کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ میقات ان ملکوں کے لئے اور جو شخص یہاں سے یا ان ملکوں سے گزرے جو ان کے آس پاس یا آمنے سامنے میں پڑتے ہیں اور اس کی نیت حج کرنے کی ہو تو اس پر فرض ہے کہ یہاں سے بغیر احرام باندھے نہ گزرے۔ جو ان مواقیت کے اندر رہتے ہیں وہ اپنے گھروں سے احرام باندھیں حتیٰ کہ جو لوگ مکے میں رہتے ہیں وہ اپنے گھروں ہی سے احرام باندھیں۔

ارکان حج

احرام: جس طرح نماز کے لئے تکبیر اس کی نیت کا اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے بعد [illegible] زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے [illegible] میں جو جدوجہد کی مشغل [illegible] دیکھئے "احرام"

طواف کرنا

... کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعا مانگنا۔ اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھر کر ادا کی جاتی ہے۔ چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے ..... اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں اللہ تعالےٰ سے اپنی مغفرت کی دعائیں کرتا ہے

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے اس لئے آنحضورؐ نے فرمایا کہ "خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو۔" (ترمذی و نسائی) (نیز دیکھئے "طواف")

حجر اسود کا استلام

یہ ایک کالا پتھر ہے جو کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہوا ہے۔ جس کی طرف رخ کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشے کا نام "رکن شامی" ہے۔ اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان کا کام دے۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں سینے سے بھی لگا سکتے ہیں ہاتھ یا کسی لکڑی یا کسی اور چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں۔ (نیز دیکھئے "الاسود، حجر")

سعی

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں جواب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور بیٹے کی جگہ مینڈھا قربانی کیا بعض روایات میں ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئیں تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا یہ صفا و مروہ کی سعی ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔ بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اور دعا مانگتے ہیں۔ پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہ کو نظر آئے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا طواف کرنا گناہ نہیں (۲: ۱۵۸)

وقوف عرفہ

عرفات میں نویں ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں معروف رہنا پڑتا ہے۔ اور اصل حج اسی کا نام ہے اگر اس دن کوئی شخص عرفات میں نہ پہنچ سکے تو اس کا حج نہیں ہوتا۔ یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا سے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے۔ اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے۔ ہر شخص کو داہنے بائیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے اس لئے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا۔ اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے۔

"تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام

شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک میدان کو اس لئے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں۔ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"خدا کو گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔" (۲: ۲۰۳)

کیونکہ جاہلیت کے دور میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخر کیا کرتے تھے جو اکثر لڑائی جھگڑا کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس بے ہودہ رسم کے رد کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کے مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف محبت، مساوات، یک جہتی کا مقام قرار دیا جائے۔

قربانی

یہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائیں۔

یہ قربانی ان لوگوں کے لئے ہے جو حج اور عمرہ بصورت قرآن یا بصورت تمتع ادا کریں اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہے

حلق راس

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا ارشاد چھپا ہے۔ تمدن کے ابتدائی

Marfat.com

عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیئے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لئے یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

رمی جمار

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں حاجی خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں آنحضور ؐ نے ایک حدیث میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ کنکریاں پھینکنے سے مقصود اس بہانے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں (مشکوٰۃ) (نیز دیکھئے "جمرہ")

ذوالحجہ کی گیارہویں تاریخ کو جسے یوم التشریق الاول کہتے ہیں۔ اس دن سورج ڈھلنے کے بعد جمرہ اولیٰ کے پاس آکر، جسے جمرہ دنیا بھی کہتے ہیں، سات کنکریاں ماری جائیں اور پھر کچھ پیچھے ہٹ کر منہ اٹھا کر دعا مانگی جائے آنحضور ؐ نے اس جگہ پون گھنٹے تک مانگی تھی۔ اس کے بعد جمرہ وسطیٰ میں آجائے وہاں بھی اسی طرح سات کنکریاں مارے اور اسی طرح تقریباً اتنی وقت دعا میں صرف کیا جائے۔ اس کے بعد جمرہ عقبیٰ میں آجائے اور یہاں بھی اسی طرح کنکریاں مارے یہ رمی جمار سورج ڈھلنے سے لے کر شام تک کسی وقت کی جا سکتی ہے

ذوالحجہ کی بارہویں تاریخ کو یوم التشریق الثالث کہتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام یوم النفر الاول بھی ہے کیونکہ اس دن حاجت مند حج کے مناسک ختم کر کے مکہ واپس جا سکتے ہیں۔ اس روز بھی سورج ڈھلنے کے بعد سے لے کر شام تک پہلے روز کی طرح تینوں جمروں پر کنکریاں پھینکی جائیں۔

ذوالحجہ کی تیرھویں تاریخ کو یوم التشریق الثالث کہتے ہیں اس کا دوسرا نام یوم النفر الثانی ہے پہلے دو دنوں کی طرح اس دن بھی تینوں جمروں پر رمی جمار کی جائے اور پھر مکہ مکرمہ کو واپسی ہو۔ یہ حج کے مناسک کا اختتام ہے۔

حج کے آداب

شریعت کے ہر حکم اور اسلام کے ہر رکن کے ساتھ کچھ آداب بھی وابستہ ہیں چنانچہ حج کے آداب یہ ہیں۔

حج کا ارادہ کرنے سے پہلے استخارہ کر لینا چاہیئے حج کے لئے نیت خالص ہونی چاہیئے۔ ریا کا دخل، حاجی اور الحاج کہلانے کا شوق اور دیگر فاسد ارادے نہ ہوں۔ راستے کا خرچ ساتھ ہو پیچھے اہل و عیال کے اخراجات کا پورا بندوبست ہو محض توکل پر چل دینا ہر شخص کا کام نہیں مال حلال ہونا چاہیئے۔ رشوت، چور بازاری اور ظلم سے حاصل کیا ہوا مال نہ ہو۔ روانگی سے قبل دو رکعت نماز نفل ادا کرنا چاہیئے اور کچھ صدقہ وخیرات دینا چاہیئے دو یا دو سے زیادہ ہم سفر ہوں تو کسی دیندار، تجربہ کار اور متحمل مزاج آدمی کو اپنا امیر بنا لینا چاہیئے۔ حج کا تمام سفر ذکر الٰہی، تہلیل، تحمید، تسبیح، استغفار، دعا، تلاوت قرآن اور انابت الی اللہ میں صرف ہونا چاہیئے۔

حج کے لئے ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو۔ وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے کسی کو تکلیف نہ دے یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے۔ شکار تک اس کے لئے جائز نہیں، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے۔ مناسک حج ادا کرتے وقت کسی کو دھکیلا نہ جائے، گرایا نہ جائے اور کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور وہ وقت سامنے رکھا جائے جب حضرت ابراہیم ؑ، حضرت ہاجرہ

اور حضرت اسمٰعیل ؑ نے تسلیم و رضا [illegible] سرزمین سے بلند ہوئی حتیٰ اللہ علیہ [illegible]

حج ابتدائے آفرینش [illegible]

حج کی ابتداء: کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم ؑ کے زمانے سے لے کر

آں حضور ؐ تک کسی نہ کسی شکل میں مختلف اقوام میں موجود تھیں۔ [illegible] اپنے حقیقی معنوں میں حج کی اصلیت ہر قوم میں موجود ہے۔ ہر ایک قوم اور اہل ملک کے ہاں ایک جگہ ہوتی ہے جسے وہ متبرک خیال کرتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر وہ مناسک اور آداب زیارت بجا لاتے اور قربانیاں کرتے ہیں جو ان کے اسلاف سے منقول ہیں۔

حج میں بیت اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "یہ دنیا میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔" (۳: ۹۶)

چنانچہ بیت اللہ کے ساتھ زمانہ قدیم سے روحانی عقیدتیں وابستہ رہی ہیں۔ بقول ابن اسحاق اور المسعودی ایک مرتبہ جب قوم عاد پر قحط مسلط ہوا تو وہ ایک وفد کی صورت میں بیت اللہ آئے اور یہاں انہوں نے دعائیں کیں۔

طبرانی کی روایت کے مطابق آں حضور ؐ نے فرمایا۔ مسجد خیف میں ستر انبیاء نے نماز پڑھی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ آنحضور ؐ نے فرمایا کہ بیت اللہ کا حج ستر انبیاء نے کیا۔ اسی قسم کی اور دوسری روایات جن کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ سے روحانی وابستگی تاریخ کا ایک قدیم واقعہ ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں: آں حضور ؐ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے

بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اس کا ایک ایک مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے۔ چنانچہ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی اسی قرآن مجید میں یہ بتائے گئے ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں۔

۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہو۔

۲۔ حضرت ابراہیم نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر بے نشان نہ ہو جائے۔ اور آخر ان میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

۳۔ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں۔ اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو اس بے ثمر اور شور زمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۴۔ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کرنا ہر قریب اور دور کے راستے سے لوگ لبیک کہیں گے۔ تاکہ یہاں آکر دین و دنیا کا کوئی فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں داخل ہوتے ہیں۔ جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں۔ اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس میں ایک وضع میں وضع بہ روش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں۔ اور ایک ہی بولی میں خدا کی عبادت کرتی ہیں۔ یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات [illegible]

Marfat.com

... کے اسباب ہیں اس لئے یہ حرم روانی نہ صرف اس ... ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں، اے خداوند! تو ان کے گناہ معاف کر تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶۔ خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب اور مظہر اور میرے راستے پر چلے اس لئے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

اس حج کے مناسک احکام اور ہدایات، طبیعتوں میں حوصلہ، صبر، تواضع تعاون، شفقت اور سادگی پیدا کرنے کے لئے ایک روحانی و جسمانی تربیت اور اصلاحی مشق ہے۔

حج کی قسمیں

حج قران : حج قران یہ ہے کہ انسان احرام باندھتے وقت حج و عمرہ دونوں کی اکٹھی نیت کرے اور کہے اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ بِالْحَجِّ وَالْعُمْرَۃِ

"اے اللہ! میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے حاضر ہوں۔"

نیز یہ کہ اختتام عمرہ و حج احرام نہ کھولے۔ جیسا بھی موقع ہو۔ خواہ عمرہ پہلے کرے خواہ حج۔

آں حضورؐ نے حج قران کی نیت کی تھی لیکن امت کے لئے آپ کو حج تمتع پسند تھا۔

حج تمتع : حج تمتع یہ ہے کہ انسان احرام باندھتے وقت حج اور عمرہ دونوں کی نیت کرے لیکن یا تو پہلے مرحلے پر صرف یہ کہے اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ بِالْعُمْرَۃِ (اے اللہ میں عمرے کے لئے حاضر ہوا ہوں) پھر عمرہ کر کے سر منڈوانے کے بعد احرام کھول دے اور پھر اس کے بعد یوم عرفہ یعنی حج سے ایک دن پہلے حج کا احرام یوم الترویہ ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو باندھے اور اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ بِالْحَجِّ۔ (یا اللہ میں حج کے لئے حاضر ہوا ہوں) کہہ کر حج کے مناسک ادا کرے یا اسی طرح پہلے حج کرے اور پھر عمرہ کرے۔ حج تمتع کا یہ طریقہ ہے کہ میقات سے حج تمتع کا احرام باندھ کر روانہ ہو جائے اور راستے بھر کثرت سے دعائے استغفار اور ذکر الٰہی کرتا رہے اور مکہ مکرمہ پہنچنے کے ساتھ ہی وضو کرے اور عمرہ کر کے احرام کھول دے۔ احرام کھول دینے کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن ذکر الٰہی میں ہر وقت مصروف رہنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ساتویں ذوالحجہ سے مناسک حج شروع ہوتے ہیں جو ایک ہفتے میں ختم ہوتے ہیں۔

حج منفرد : حج قران یا حج تمتع کی نیت کر لینے کے بعد اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صورت کے سوا کہ آدمی نے حج تمتع کی نیت کی ہو۔ اور پھر اس کا خیال ہو کہ میں حج قران کروں تو وہ طواف عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج قران کی نیت کر سکتا ہے۔ اس میں فقہا میں سے کسی کو اختلاف نہیں۔

حج، سورۃ : قرآن مجید کی ۲۲ ویں سورت۔ (دیکھئے "الحج، سورۃ")

حجاب : چھپنا، چھپانا، نظر سے پوشیدہ ہونا، رکاوٹ، اوٹ قرآن مجید میں یہ لفظ سات بار آیا ہے۔ بعض آیات میں اس کا مفہوم آڑ یا کوئی ایسی شے ہے جو نظروں سے ایک دوسرے کو پوشیدہ رکھے۔ یا طرفین کو کسی حائل شے کے ذریعے علیحدہ علیحدہ کر دے مثلاً

"مریم نے اپنے آپ کو گھر والوں سے الگ کر لیا۔ (۱۹ : ۱۷)

قیامت کے دن ناجیوں اور مستحقین عذاب کے مابین حجاب۔

"جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ جس میں سے ایک دروازہ ہوگا۔" (۵۷ : ۱۳)

"یہ کسی انسان کو نصیب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بات کرے وحی کے ذریعے کے سوا یا ایک حجاب کے پیچھے سے۔" (۴۲ : ۵۱)

"میں نے دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے، یہاں تک کہ سورج چھپ گیا اوٹ میں۔" (۳۸ : ۳۲)

ایک حدیث میں موت کو بھی حجاب قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں حجاب پردے کے دستور یا حکم کی بنیاد قرآن کی آیات پر ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے "پردہ")

حجاب سے مراد وہ پردہ بھی ہے جس کے پیچھے بیٹھ کر خلفاء اور حکمران اپنے آپ کو دوسروں کی نظر سے وقار کی خاطر پوشیدہ کر لیتے تھے۔ یہ دستور اسلام میں بنو امیہ نے ساسانی تمدن کے زیر اثر داخل کیا۔ جس نے بعد میں ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی چنانچہ حاجب کا منصب وضع کیا گیا۔

(نیز دیکھئے "حاجب")

حجاب تصوف کی اصطلاح میں صوفیوں کے نزدیک ہر وہ چیز ہے جو مقصود حقیقی پر پردہ ڈال دے۔ یعنی ہر وہ چیز جس کی وجہ سے انسان حقیقت ربانی محسوس کرنے کے قابل نہ رہے۔

حجاب ایک پردہ ہے جو سالک اور اس کی خواہش کے مابین یا جیسے تشانچی اور اس کے نشانے کے درمیان حائل کر دیا جائے۔ جو دل پر مادی دنیا کی صورتوں کے نقش سے پیدا ہوتا ہے جو حق کے حضور میں مانع ہوتی ہیں چنانچہ محجوب وہ شخص ہے جس کا قلب اللہ کے نور کے لئے بند ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آگاہی پر حسی یا ذہنی جذبات کا غلبہ ہے۔

بقول حلاج :- "تمہارا حجاب تمہاری حرص و ہوا ہے۔"

محجوب ہو جانے کے بہت سے اسباب ہیں۔ بقول علی ہجویریؒ انسان کی طبعی خواہشات کو جتنی بھی غذا دی جائے اس کی جبلت اتنی ہی طاقت ور ہو جاتی ہے اور حرص و ہوا اس کے اعضا میں بے روک ٹوک پھیل جاتی ہے اور ہر رگ میں ایک مختلف پردہ وجود میں آ جاتا ہے۔

حجاب کی ضد کشف ہے۔ علائق دنیا سے صوفیا کا قطع تعلق بھی حجاب کہلاتا ہے۔ اس کے معنی تعویذ بھی ہے جو اپنے پہننے والے کو ہر قسم کی تکلیف اور گزند سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اس کے کاموں میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

Marfat.com

حجاج بن یوسف : بنوامیہ کا ایک جرنیل اور لائق ترین گورنر

(۴۱ھ/۶۶۱ء — رمضان ۹۵ھ/۷۱۴ء)

اموی دور کا ایک بڑا سیاست دان۔ قبیلہ بنو ثقیف کی شاخ احلاف سے تھا۔ طائف میں پیدا ہوا۔ حجاج ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ جن کا ذریعہ معاش سنگ بزداری اور معماری تھا۔ اس کی والدہ قبیلہ بنو ثقیف سے تھی اور مغیرہ بن شعبہ کی مطلقہ بیوی تھی جسے حضرت امیر معاویہ نے کوفے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ جوانی کے زمانے میں وہ طائف میں ایک مدرس تھا۔ اس نے مدینہ کے الحرہ اور الربذہ کی لڑائیوں میں جو ۶۵ھ/۶۸۴ء میں ہوئیں۔ یا تہامہ میں تبالہ کے گورنر کی حیثیت سے قابل ذکر خدمات سرانجام دیں۔

حجاج خلیفہ عبدالملک کے ابتدائی عہد میں طائف سے دمشق آیا، جہاں خلیفہ کے وزیر ابوزرعہ روح بن زنباع الجذامی نے اس کی ذہانت دیکھ کر اسے اپنی پولیس میں ملازم رکھ لیا۔ اس نے جلد ہی خلیفہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اور خلیفہ نے اسے سپہ سالار افواج مقرر کر دیا۔

حجاج کی قیادت میں سب سے پہلی لشکر کشی عبداللہ ابن زبیر کے خلاف ہوئی جو حجاز میں خلافت کے دعویدار تھے۔ چنانچہ ۷۲ھ/۶۹۱ء میں دجیل پر مسکن کے مقام پر مصعب کے خلاف فتح کے بعد اسی مہینے میں وہ دو ہزار شامیوں کو لے کر عبداللہ ابن زبیر کے مقابلے کے لئے کوفے سے مکہ روانہ ہوا۔ اس نے طائف پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا اور بعد میں اسے اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ خلیفہ نے حکم دیا تھا کہ سب سے پہلے وہ عبداللہ بن زبیر سے گفت و شنید کرے لیکن اگر مخالفت جاری رہے تو محاصرہ کر کے اس کی رسد بند کر دے لیکن اس مقدس شہر میں کسی صورت میں بھی خونریزی نہ کی جائے۔ جب گفت و شنید نا کام ہو گئی تو حجاج نے خلیفہ سے مکہ مکرمہ کو بزور شمشیر فتح کرنے کی اجازت مانگی اور کمک بھی طلب کی۔ جب اسے ان دونوں باتوں کی اجازت مل گئی تو اس نے جبل ابوقبیس پر پتھر برسائے چونکہ عبداللہ ابن زبیر نے اسے طواف اور سعی کی اجازت نہ دی تھی اس لئے اس نے ناراض ہو کر خانہ کعبہ اور حاجیوں پر بھی پتھر برسانے سے دریغ نہ کیا۔ چنانچہ محاصرے کے سات مہینے گذر جانے کے بعد جب ابن زبیر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ کے قریب لڑائی میں شہید ہو گئے اور مکہ پر بھی حجاج کا قبضہ ہو گیا تو عبدالملک نے اس کو حجاز، یمن اور یمامہ کی گورنری عطا کر دی۔

۷۳ اور ۷۴ھ/۶۹۳ء میں گورنر حجاج نے خود فوج کی قیادت کی اور خانہ کعبہ کو اس کی اصل بنیادوں پر تعمیر کے لئے اخراجات مہیا کئے۔ اس نے حجاز میں بڑی سختی کے ساتھ امن و امان بحال کیا لیکن وہ بڑا سخت طبیعت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ کو اکثر مداخلت کرنی پڑتی تھی۔

۷۵ھ/۶۹۴ء میں حجاج کو عراق کا گورنر مقرر کیا گیا کیونکہ خارجیوں کی مسلسل سازشوں کے باعث عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم اور ذمے دار انتظامی عہدہ تھا۔ حجاج نے ۳۳ سال کی عمر میں یہ گورنری سنبھالی۔ سب سے زیادہ اہم کام کوفہ اور بصرے کے دستوں میں نظم و ضبط بحال کرنا تھا۔ چنانچہ حجاج نے دھمکی دی کہ جو سپاہی تین دن کے اندر اندر واپس نہ آیا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کی جائداد اور مال و متاع لوٹ لیا جائے گا۔ یہ تدبیر بڑی کارگر ہوئی اور سپاہی اپنے خیموں میں آگئے۔ ان میں تنخواہیں تقسیم کرنے کا کام حجاج نے خود سنبھالا تاکہ ایک خطرناک بغاوت کو دبا سکے جس کی قیادت ابن الجارود کر رہا تھا۔

[illegible]
خلیفہ کی مداخلت سے حضرت الشریح کی [illegible]
کے ختم ہو جانے کے بعد حجاج کو ۸۰ھ/۶۹۹ء [illegible]
اور سجستان کی طرف جسے از سر نو مطیع کرنا تھا عبدالرحمن بن الاشعث کو ایک [illegible]
الطواویس کا قائد بنا کر بھیجا۔ ابن الاشعث نے یہ مہم بڑی احتیاط سے اور احکام کے مطابق چلائی لیکن حجاج نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور اس نے کئی ایک خطوط میں ابن الاشعث کو حکم دیا کہ وہ بلا تاخیر پیش قدمی کرے اور دھمکی دی کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو قیادت اس کے بھائی اسحاق کو دے دی جائے گی۔ چنانچہ ابن الاشعث نے اپنے بڑے افسروں سے مشورہ کیا اور اس نے ایک فوج لے کر جس کی تعداد جلد ہی ایک لاکھ ہو گئی۔ حجاج کے خلاف چڑھائی کر کے کوفے اور بصرے پر قبضہ کر لیا اور بصرے کے نواح میں گورنر حجاج کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ۸۲ھ/۷۰۱ء میں ابن الاشعث دیر الجماجم اور مسکن میں دجیل پر فیصلہ کن شکست اٹھانی پڑی۔

چنانچہ حجاج کے خلاف عراق کے عربوں کی یہ آخری بغاوت تھی۔ حجاج نے اس بغاوت کو دبانے اور کردی و دیلمی زمینداروں کو کچل دینے کے بعد امن و امان قائم کر لیا تو اس نے ملک پر شامی فوج کی حکومت کو مضبوط کر لیا۔

۸۳ھ/۷۰۲ء میں اس نے کوفے اور بصرے کے درمیان قلعہ بند شہر واسط تعمیر کرایا۔ یہاں خود سکونت اختیار کی اور بیشتر شامی فوج کو یہیں منتقل کر دیا۔ تاکہ لوگوں کو شامیوں کی لوٹ مار سے محفوظ کر سکے۔ چنانچہ اب حجاج خراسان کے سوا تمام اسلامی مشرق کا حکمران تھا۔

عبدالملک کے بعد جب ولید تخت نشین ہوا تو اس نے ہر معاملے میں حجاج کو کھلی چھٹی دے دی۔ وہ اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ کیونکہ حجاج نے عبدالعزیز بن مروان کے دعوے کے خلاف عبدالملک کو اس کی جانشینی کے لئے آمادہ کیا تھا۔ نیز مشرق میں ولید کی شاندار فتوحات بھی حجاج ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ حجاج نے قتیبہ بن مسلم مجاعہ بن سعر اور محمد بن قاسم کی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ان ممتاز سپہ سالاروں کو مختلف مقامات پر متعین کیا۔ چنانچہ قتیبہ بن مسلم نے ماوراء النہر کو مجاعہ بن سعر نے عمان کو اور محمد بن قاسم نے ہندوستان کو فتح کیا۔ اگرچہ حجاج نے ان مہمات میں خود حصہ نہ لیا لیکن وہ ان کے لئے بڑی احتیاط سے تیاری کرتا تھا۔ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے بھاری سے بھاری اخراجات کو بھی بطیب خاطر برداشت کرتا۔

حجاج ملک کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کے لئے بڑا فکر مند تھا جو بیس سال جنگ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ زراعت کو ترقی دینے میں بھی حجاج نے بہت کوششیں کیں۔ اس نے بشار بن مسلم جیسے ممتاز عربوں کو جاگیروں کے طور پر غیر مزروعہ اراضی عطا کیں دیہاتی لوگوں کے شہروں میں انتقال کے خلاف جن کی وجہ سے خراج میں تباہ کن کمی واقع ہو گئی تھی۔ اس نے مزید اقدامات کئے اور نو مسلموں کو مجبور کیا کہ وہ ان کھیتوں میں واپس جائیں جنہیں وہ چھوڑ کر آئے تھے۔

قرآن مجید کے نسخوں میں یکسانیت پیدا کرنا بھی اس کا منتہائے مقصود تھا اس کی خواہش تھی کہ ایک طرف تو قرآن حکیم کی مختلف قراءتوں کے بارے میں متکلمین کے جھگڑوں کو ختم کیا جائے اور ایک ہی متن مقرر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کی علیحدہ علیحدہ اجزاء یا پاروں میں تقسیم اس کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ نیز قرآن [illegible] اعراب بھی اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اس نے عبدالملک کی مالی اصلاحات کے سلسلے میں خالص عربی سکے [illegible]

Marfat.com

[illegible] پہنچا [illegible] آگئے۔ حجاج نے ۵۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ [illegible] انبار [illegible] کی دعا سے [illegible] کہ اسے سامنا پڑا وقت سے پہلے ہی [illegible] ضعیف ہو گیا تھا۔ یہ واسط میں دفن ہوا۔

المسعودی کے بقول اس کی موت کا سبب معدے کا سرطان تھا۔ اس کی قبر کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے اس کی قبر کے آثار مٹا دیئے گئے تھے۔ اس کی موت پر صرف چند لوگوں نے آنسو بہائے۔ حجاج نہایت ظالم گورنر تھا۔ اگرچہ اس کا دامن سیرت ظلم و تشدد کے داغوں سے آلودہ ہے لیکن اس کے مابہ الامتیاز محاسن کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ وہ ایک بے بدل سپہ سالار تھا۔ مشرقی فتوحات میں اس کا کمال سیاست دانی کارفرما تھا۔ وہ ایک فصیح البیان قرآن کریم کا حافظ اور بلند پایہ قاری تھا۔ کلام اللہ پر اعراب لگوانے کی اولیت کا سہرا اس کے سر ہے۔ غیر عرب علاقوں میں عربی زبان کو دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کرنا حجاج کی ایک سیاسی دوراندیشی تھی۔ حجاج بنو امیہ کا سب سے زیادہ وفادار خادم تھا۔ اس کی اطاعت شعاری اور جذبہ خدمت گذاری کی کوئی انتہا نہ تھی اور اموی خلفاء نے بھی اس کا صلہ بے دریغ عنایات کے ساتھ دیا۔

حجاز جزیرہ العرب کا شمالی مغربی حصہ سعودی عرب کا مغربی صوبہ جو بحر قلزم کے ساتھ مغربی ساحل پر واقع ہے۔ آں حضورؐ کا وطن مالوف مسلمانوں کا روحانی مرکز، لفظی معنی وہ چیز جو دو چیزوں کو جدا کرے چونکہ یہ حصہ بھی نجد اور تہامہ کے درمیان حائل اور حاجز ہے اس لئے اسے بھی حجاز کہتے ہیں۔ حجاز کا علاقہ شمال میں فلسطین تک چلا جاتا ہے۔ جنوب میں کسی وقت حجاز کی سرحد یمن سے ملتی تھی لیکن زمانہ حال میں دونوں کے درمیان عسیر کو حائل کر دیا گیا۔ عام طور پر حجاز کو ان تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شمالی حصہ

۲۔ وسطی حصہ

۳۔ جنوبی حصہ

شمالی حصہ سعودی عرب اور اردن کی درمیانی سرحد تک چلا گیا ہے۔ جو العقبہ کے جنوب میں ایک نقطے سے شروع ہو کر الطبیق کے پہاڑی سلسلے کے اوپر تک چلی گئی ہے چونکہ اسرائیل نے خلیج عقبہ کے ایک مقام پر قبضہ کر لیا ہے اس لئے حاجیوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ قدیم خشکی کے راستے سے جو سینا سے عقبہ ہوتا ہوا جاتا تھا آ جا سکیں۔ حجاز کی چھوٹی بندرگاہوں میں خلیج عقبہ پر واقع حقل اور مقنا ہیں اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر المویلح، ضبا، الوجہ اور املج ہیں۔ چھوٹے چھوٹے راستے الوجہ سے گذرتے ہوئے اندرونی بڑی سڑک سے العلا پر یا اس کے قریب مل جاتے ہیں۔ شمالی حصے میں زیادہ تر آمدورفت ان راستوں پر رہی ہے جو اسرات کے مشرق میں واقع ہیں۔

وسطی حصہ تاریخ اسلام کے نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس حصے کے حدود یہ ہیں۔ جنوب میں وہ علاقے جو طائف، مکہ اور جدہ کے [illegible] ہیں۔ اور شمال میں وہ علاقے جو مدینہ اور ینبوع کے نزدیک ہیں۔ قدیم سڑک طائف سے شروع ہو کر شمال کی سمت النخلہ الیمانیہ کی وادی تک جاتی [illegible] یہاں [illegible] نیچے اتر کر مکے کی جانب چلی جاتی تھی۔ اس وادی میں قرن [illegible] تھا۔ جو نجد یا نجد [illegible] سے آنے والے حاجیوں کے لئے میقات کا کام دیتا تھا۔ موجودہ میقات اسی وادی میں السیل الکبیر کہلاتی ہے۔ النخلہ الشامیہ میں ذات العرق تھا۔ جو ان حاجیوں کے لئے جو شمال نجد اور عراق سے درب زبیدہ کے ساتھ ساتھ آتے تھے اس سمت میں ذات العرق کا ذکر حجاز کی حد کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اب پہاڑوں میں سے ایک پختہ راستہ بل کھاتا ہوا براہ راست طائف سے مکے جاتا ہے۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان سفر کرنے والے دو راستوں میں سے ایک راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ الدرب السلطان ساحل کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ اور دوسرا الدرب الشرقی بڑے حرے کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ مکے کے باہر تین گھنٹے کی مسافت پر بمقام سرف ام المومنین حضرت میمونہ کا مقبرہ اور مسجد تھی۔ وادی فاطمہ کے شمال میں یہ سڑک عسفان میں سے گذرتی ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آنحضورؐ نے بنو لحیان پر حملہ کیا تھا۔ قدیمہ کے تھوڑے ہی فاصلے پر سمندر نظر آتا ہے۔ رابغ اگرچہ ساحل سمندر پر واقع تھا لیکن باقاعدہ بندرگاہ نہ تھی۔ رابغ ان حاجیوں کے میقات کی حیثیت سے جو خشکی کے راستے شام، مصر اور مغرب سے آتے تھے۔ الجحفہ کی جگہ لے لی۔ جو اب ایک ویران گاؤں اور ایک وادی میں واقع ہے۔ حاجی بحیرہ قلزم میں سے ہو کر آتے ہیں۔ وہ اس وقت احرام باندھ لیتے ہیں۔ جب جہاز رابغ کے پاس سے گذرتا ہے۔ رابغ کے شمال میں الابواء کے مقام پر آنحضورؐ کی والدہ ماجدہ کا معروف مدفن ہے۔

آج کل ایک تارکول کی پختہ سڑک جدے، رابغ اور بدر سے ہوتی ہوئی مکے اور مدینے کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ اس لئے یہ راستہ زیادہ آسان ہو گیا ہے۔

حجاز کے جنوبی حصے میں باقی دو حصوں سے زیادہ اونچے پہاڑ ہیں۔ وہاں بارش اور زراعت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جدے سے چل کر ایک سڑک اللیث القنفدہ اور حلی سے گذرتی ہوئی ساحل کے متوازی القحمہ تک جاتی ہے۔ طائف سے ایک شاہراہ الحزم نخلستان کو جاتی ہے۔ بلند علاقے میں واقع ایک اور سڑک طائف کو تربہ سے ملاتی ہے۔

حجاز کی تاریخ کا تعلق مکے مدینے اور ان جیسے مقامات کی تاریخ سے بہت قریب کا ہے۔ لہٰذا ان علاقوں کی تاریخ میں اس کا ذکر بھی ہو جائے گا۔ تاریخ میں حجاز کی خود مختار سلطنت کا سرکاری نام صرف دس برس سے کم عرصہ کے لئے رہا۔ یہ زمانہ شاہ حسین بن علی کا عہد حکومت ہے جو ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء تا ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ہے۔ ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء سے پورا حجاز سعودی خاندان مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ حجاز کا اکثر حصہ بنجر اور پہاڑی ہے اس لئے اشیائے خوردنی اکثر دوسرے ملکوں سے آتی ہیں۔ اس کے زرخیز قطعات میں سے ایک تو وادی فاطمہ ہے۔ جو ایک اچھی شاداب جگہ ہے اور جہاں اناج اور ترکاریاں اچھی پیدا ہوتی ہیں۔ اور دوسری طائف جو ایک چھوٹا سا شہر ہے مکہ سے مشرقی سمت میں ۷۲ میل کے فاصلے پر جبل غزوان پہ آیا ہے۔ تمام حجاز میں اس سے زیادہ شاداب اور بہار افزاء مقام ہیں۔ یہاں میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ حجاز کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔

حجامت بال کٹوانا۔ اسلام چونکہ صفائی اور طہارت کا دین ہے چنانچہ اس نے اپنے پیروکاروں

Marfat.com

کی صفائی اور طہارت کی طرف خاص توجہ دلائی ہے۔ حجامت کرانی مسنون ہے حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ نے فرمایا انسانی طبیعت کے پانچ تقاضے ہیں۔

۱۔ ختنہ کرانا۔ ۲۔ استرہ لینا۔ ۳۔ ناخن تراشنا۔ ۴۔ لبیں لینا۔ ۵۔ بغل کے بال اکھیڑنا۔ (بخاری و مسلم)

آدھا سر منڈوانا اور آدھا چھوڑنا منع ہے۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے ایک بچے کو دیکھا جسکا کچھ سر منڈا ہوا تھا اور کچھ (اس کے حال پر) چھوڑ دیا گیا تھا تو آپؐ نے اس سے منع کیا اور فرمایا سارا سر منڈو یا سب کو (اس کے حال پر) چھوڑ دو۔ (مشکوٰۃ)

حج بدل : اگر کسی شخص پر حج فرض ہو چکا ہے اور وہ کسی وجہ سے حج نہ کر سکے مثلاً اس کے لئے راستہ پر امن نہیں یا اسے سواری میسر نہیں یا اس کی صحت اس قابل نہیں تو وہ اپنی طرف سے کسی دوسرے شخص کو حج کروا سکتا ہے۔ اگر حج فرض ہونے کے بعد کوئی شخص فوت ہو جائے۔ تو اس کے ورثہ کو چاہیئے کہ وہ اس کی طرف سے حج بدل کروائیں۔ بعض فقہا نے لکھا ہے کہ اس غرض کے لئے تقسیم وراثت سے پہلے اس کے مال میں سے رقم علیٰحدہ کی جاسکتی ہے بہتر یہ ہے کہ حج بدل اس شخص سے کروایا جائے۔ جو خود حج کر چکا ہے لیکن یہ ضروری نہیں۔

حجت ثبوت، برہان، دلیل
قرآن مجید میں حجت کا لفظ ایسی دلیل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس سے حق کا اثبات اور باطل کا ابطال ہوتا ہو۔

بقول امام راغب "حجت اس دلیل کو کہتے ہیں جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے نقیضین میں سے کسی ایک کی صحت کی مقتضی ہو"

مثلاً۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"پھر کہو (تمہاری اس حجت کے مقابلہ میں) حقیقت اس حجت تو اللہ کے پاس ہے" (۶: ۱۴۹) اور لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں؛ (۴۲: ۱۵) چنانچہ حجت کے معنی بحث و تکرار اور جھگڑے کے بھی ہیں۔

قرآن مجید میں حجت کے مادے سے دیگر الفاظ پندرہ بار استعمال ہوئے ہیں۔

بقول الازہری "حجت ہر اس طریق کو کہتے ہیں جس کے ذریعے بحث و مباحثہ کے وقت مخالف فریق پر فتح پائی جائے۔

عام طور پر حجت کا لفظ دلیل کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے کبھی کبھی حجت قاطعہ کی ترکیب آتی ہے جس کے معنی فیصلہ کن دلیل یا ثبوت کے ہیں۔

متکلمین اور فلاسفہ کے ہاں اس کا استعمال ان کے فکری سلک پر موقوف ہے۔

ابن سینا نے حجت کو وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔

علم کلام میں حجت کے اصطلاح کا استعمال دلیل کے ساتھ بار بار ملتا ہے۔

باقلانی نے حجت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ دلیل جو دلالت بھی کہلاتی ہے اور جس سے کوئی چیز ثابت بھی کی جاتی ہے حجت ہے۔

امام غزالی کے ہاں حجت کا لفظ "قائل کرنے والی دلیل" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جو قبولیت اور اذعان کا تقاضا کرتی ہے۔

فلسفہ اور علم کلام کی اصطلاحوں میں حجت کے مختلف معنی آتے ہیں کبھی یہ لفظ دلیل کے مشترک معنوں میں استعمال ہوتا ہے [illegible]

حدیث کی اصطلاح میں حجت اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے [illegible] تین لاکھ احادیث یاد ہوں اور اسے ان کے راویوں کے متعلق پوری واقفیت رکھتا ہو۔

اہل تشیع کے فرقہ سبعیہ کے ہاں حجت وہ شخص ہے جو "امام" اور "[illegible]" کے درمیان ہوتا ہے۔

اہل تشیع حضرات کے ہاں حجت کی اصطلاح تین معنی میں استعمال ہوتی ہے وہ عام طور پر اس شخص کو حجت کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک رسائی ہوتی ہے۔ یا جو کسی مقررہ زمانے میں بنی نوع انسان میں اللہ یا اس کی مشیت کا مظہر بن کر دین کا کام کرتا ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ بھی اللہ تعالیٰ کی حجت تھے۔

حضرت سلمانؓ کی اس شہادت کو کہ حضرت علیؓ امامت کے درجے پر فائز ہیں حجت کہا گیا ہے۔

کبھی یہ اصطلاح خلافت میں اس ہستی پر دلالت کرتی ہے جس کے واسطے سے کروڑ لوگ اس ہستی تک رسائی حاصل کرتے ہیں جس تک عام طور پر رسائی نہیں ہوتی۔

اسمٰعیلیوں کے ہاں یہ اصطلاح خلافت کی اس خاص شخصیت کے بارے میں استعمال ہوتی ہے جس کی نسبت یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ وحی کے منصب کی بجا آوری کا کام کر رہی ہے فاطمی عہد میں یہ اصطلاح ان بڑے داعیوں کے لیئے استعمال ہوتی تھی جو عام داعیوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ تعداد میں بارہ حجت تھے۔

اہل تشیع کی حدیث کی مشہور کتاب الکافی کو بھی حجت کہا جاتا ہے۔

حجۃ الوداع آنحضورؐ کا آخری حج۔
آنحضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری سال ۱۰ھ میں حج کا ارادہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مجھ سے حج کے احکام سیکھ لو۔ شاید میں اگلے سال حج نہ کر سکوں اور تم میں نہ ہوں۔"

آپؐ کو اپنے وصال کے بارے میں معلوم تھا چنانچہ آپؐ چاہتے تھے حج کے احکام بیان کر کے شریعت کی تکمیل کر دینی چاہتے اس لیئے اس حج کا نام حجۃ الوداع قرار پایا۔

چنانچہ ذوالقعدہ کے آخری ایام میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپ حج کرنے کی غرض سے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ کو صبح کے وقت مکہ مکرمہ آپ کے قدم مبارک سے مشرف ہوا اور نویں تاریخ کو جمعہ کے روز عرفات کا میدان اسلام کی شان و عظمت کا بہترین نمونہ بن گیا۔

عرفات میں ہی یہ آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

" آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیئے مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور اسلام کو بحیثیت دین کے تمہارے لیئے پسند کر لیا۔ تکمیل دین کی بشارت سے سب کو خوشی تھی اور اس آیت کے نزول سے سب خوش تھے۔

دوپہر کے بعد آنحضورؐ نے ایک لمبا اور پُر تاثیر خطبہ دیا۔ جس میں لوگوں کو جامع طور پر دینی اور دنیوی امور کے متعلق شرعی احکام سنائے خطبے کے بعد فرمایا لوگو! قیامت کے دن تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم سے کیا معاملہ کیا اور تم میں کیونکر زندگی بسر کی، تم اس کا کیا جواب دوگے۔ اس پر چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئی کہ یا رسول اللہ آپ نے خدا کے سب احکام ہمیں پہنچا دیئے اور رسالت کا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ سن کر آپؐ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا الٰہی تو گواہ ہے یا الٰہی تو گواہ ہے، الٰہی تو گواہ رہ [illegible] رسالت [illegible] ادا کر دیا۔

Marfat.com

حاضر سٹاک " شاہکار کتب "

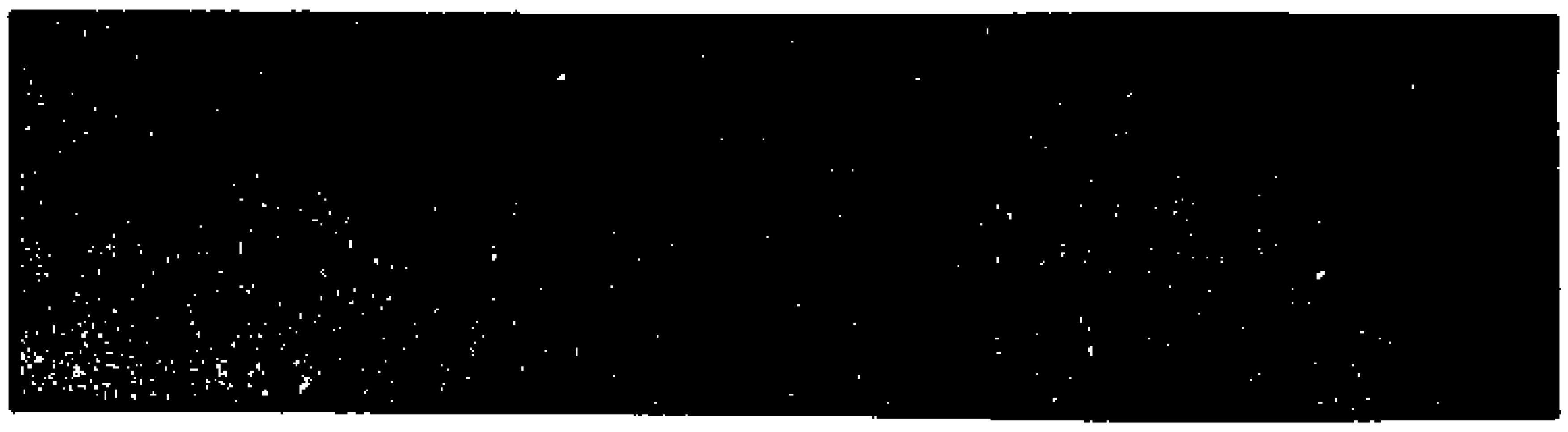

صحرانورد کے خطوط (اول)	میرزا ادیب	۳/۰۰
صحرانورد کے خطوط (دوم)	میرزا ادیب	۳/۵۰
مقدس نازنین (ناول)	مولانا عبدالحلیم شرر	۴/۰۰
علی گڑھ کے تین نامور فرزند	ڈاکٹر نسیم سوہدروی	۲/۰۰
محبت عظیم ہے (ناول)	گیرزیا ڈیلیڈا	۲/۵۰
اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں	علی اکبر	۳/۵۰
نقوش قائد اعظم	پروفیسر رحیم بخش شاہین	۲/۵۰
بیاد قائد اعظم	خواجہ ظفر نظامی	۲/۵۰
قاسم کی مہندی (افسانے)	سید قاسم محمود	۳/۵۰
پیغمبر صحرا	کے ایل گابا	۴/۰۰
نوجوان ورتھر کی داستان غم	گوئٹے	۲/۵۰
ری پبلک	افلاطون	۳/۵۰
تھیلما	میری کوریلی	۴/۰۰
قابوس نامہ	امیر کیکاؤس	۳/۵۰
دفاع پاکستان	منور مرزا	۳/۵۰
اقبال کا فلسفہ خودی	پروفیسر عثمان	۳/۵۰

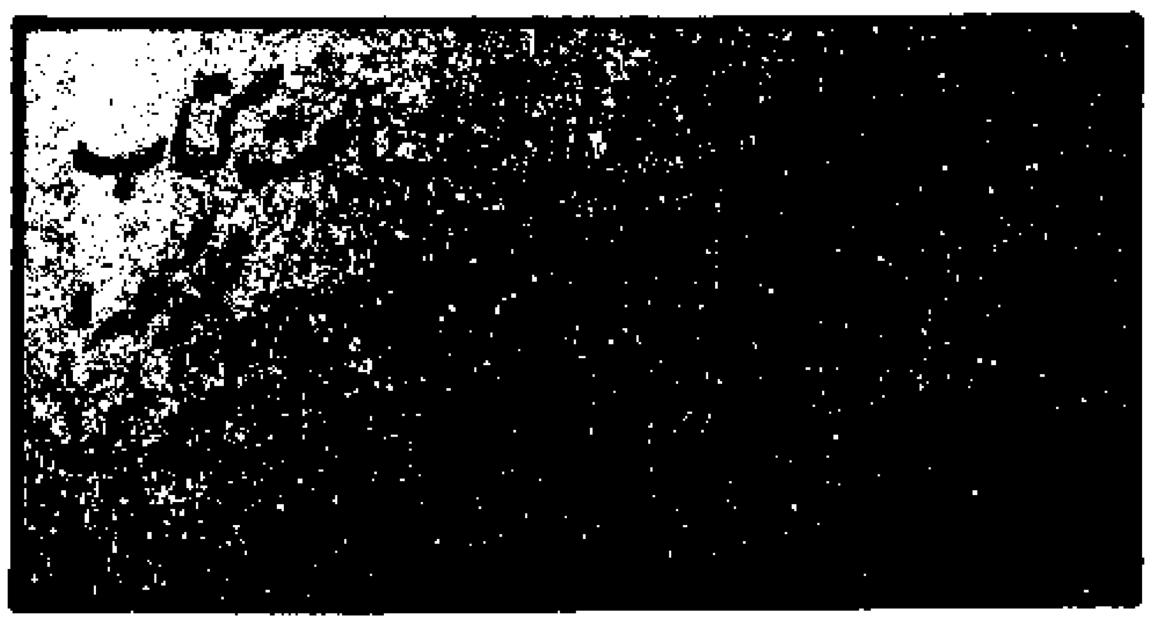

مکتبہ شاہکار کے تین انسائیکلوپیڈیا
ملک میں علمی ماحول کے خالق ہیں۔

شاہکار انسائیکلوپیڈیا معلومات
ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۳۰/۰۰ فی قسط ۳/۰۰

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۳۰/۰۰ فی قسط ۳/۰۰

شاہکار بچوں کا انسائیکلوپیڈیا
ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۲۵/۰۰ فی قسط ۲/۵۰

ایجنسی کی کتابیں

محمد رسول اللہ
ڈرامائی انداز میں سیرت نبوی پر عظیم کتاب
ڈاکٹر توفیق الحکیم کی شاندار تصنیف عطیہ خلیل عرب کا بہترین ترجمہ ۲۵/=

مؤرخین اسلام
ڈاکٹر غلام جیلانی برق
مجلد آفسٹ کاغذ ۲۵/۰۰، غیر مجلد نیوز کاغذ ۲۰/۰۰

دورِ جدید کے افسانہ نگار
مظفر محمد علی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ
قسطوں میں موت
۸/۰۰

Marfat.com

یکم فروری کے پانچ شاہکار

شاہکار جریدی کتاب (۵۲)

عرب دُنیا کے ایک ممتاز عالِم

اُستاذ محمد فتحی عثمان کی تصنیف

دینِ عمل

دورِ جدید کی مشہور عربی کتاب کا

براہِ راست اُردو ترجمہ

از

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

۳/۰۰

شاہکار جیبی کتاب (۱۳)

شاہکار تقویم عالم

فروری

اِس ماہ میں رونما ہونیوالے اہم تاریخی واقعات، عظیم شخصیات، ایجادات۔

چار ہزار سالہ انسانی تاریخ کا روزنامچہ، ہر دن کا ریکارڈ الگ درج ہے۔ بالتصویر

۱/۵۰

شاہکار جیبی کتاب

امیر علی ٹھگ

کرنل میڈوز ٹیلر کی مشہور تصنیف

شاہکار

قسط نمبر (۱۰)

انسائیکلوپیڈیا معلومات

ردیف وار ترتیب میں اردو زبان کا سب سے بڑا انسائیکلوپیڈیا

بالتصویر صفحات نمبر ۴۳۷ تا ۴۸۰،

پچاس سے زائد عنوانات پر معلوماتی مضامین

سالانہ: ۳۰/- روپے فی قسط ۳/-

شاہکار

قسط نمبر (۱۷)

بے بی انسائیکلوپیڈیا

پاکستانی بچوں کیلئے اُردو کا پہلا

رنگین، مفصل، معلوماتی انسائیکلوپیڈیا۔ قسط وار،

صفحات نمبر ۵۱۳ تا ۵۴۴

سالانہ: ۲۵/- — فی قسط ۲/۵۰،

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط (۱۵) وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

• مدیرِ اعلیٰ : سیّد قاسم محمود

• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳

تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

مکتبہ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

اس مرتبہ بھی ہم آپ کے لئے کوئی خوشی کی خبر لے کر حاضر نہیں ہو رہے۔

پہلی خبر تو یہ ہے کہ ممتاز عالمِ دین جامعہ محمدی شریف، جھنگ کے بانی مولانا محمد ذاکر وفات پا گئے۔ مولانا مرحوم کی ملّی اور دینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی حیات ناپائیدار میں مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی اور طلبِ حقوق کی کئی ایک تحریکیں اُبھریں، پروان چڑھیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچیں۔ مولانا نے ان تحریکوں میں نہ صرف حصّہ لیا بلکہ ہمیشہ اگلی صفوں میں رہے۔ ان کی زندگی بزرگانِ سلف کا ایک نمونہ تھی۔ ان کے اندر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے حد درجہ تڑپ موجود تھی اور یہی درد انہیں کسی طور چین نہیں لینے دیتا تھا۔ یہی درد تھا جس نے جھنگ جیسے پس ماندہ علاقے میں انہیں ایک جامعہ کی بنیاد رکھنے پر مجبور کیا۔ پھر اس کے لئے اتنی محنت اور تگ و دو کی کہ اپنی صحت کی بھی پروا تک نہ کی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح "جامعہ محمدی شریف" کو ایک یونیورسٹی کا درجہ مل جائے۔ اگرچہ ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی اور وُہ اپنی اس حسرت کو دل ہی دل میں لئے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مولانا محمد ذاکر کے دل میں مسلمانوں کی ہمہ گیر صلاح و فلاح کا خیال تھا۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی نہ تھے لیکن قوم کی خدمت کی خاطر انہوں نے پہلے صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصّہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں وہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اگرچہ چلنے پھرنے سے معذور تھے لیکن پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر اسمبلی میں آتے اور اپنا حقِ نمائندگی احسن طریقے سے ادا کرتے تھے۔ ختمِ نبوّت کی تحریک میں بھی انہوں نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ان کی گرانقدر خدمات کی بنا پر قوم ہمیشہ انہیں یاد رکھے گی۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کی ان خدمات کو شرفِ قبولیت عطا کرے اور مولانا کو بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین۔

ایک اور دردناک، المناک، غم ناک خبر یہ ہے کہ ہمارے پڑوسی ملک ترکی میں ۲۵ نومبر کو ایک خوفناک زلزلے نے مشرقی ترکی کے سرحدی علاقوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس زلزلے میں چھ ہزار سے زائد افراد ہلاک اور سینکڑوں گاؤں تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے اس مصیبت کے وقت کام آئیں اور جو امداد بھی ان سے بن پڑے اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔

اس موقع پر ایک حدیث جو حضرت علیؓ سے مروی ہے یاد آ رہی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب میری اُمّت میں یہ برائیاں پیدا ہو جائیں تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے • جب سرکاری مال ذاتی ملکیت بنا لیا جائے • امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جانے لگے • زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھا جانے لگے • خاوند بیوی کا فرمانبردار ہو جائے اور ماں کا نافرمان • آدمی دوستوں سے بھلائی کرے لیکن والدین پر ظلم و ستم • مساجد میں شور و غل برپا کیا جانے لگے • نااہل رہنما بن جائیں • آدمی کی عزت اس کی شرارت کی وجہ سے کی جاتے • نشہ آور چیزوں کا استعمال عام ہو جائے • مرد ریشمی لباس پہننے لگیں • گانے والی عورتوں اور آلاتِ موسیقی کا دور دورہ ہو جائے۔ مُردوں پر لعن طعن اور زبان درازی کی جائے • جب یہ سب کچھ ہونے لگے تو لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت قہرِ الٰہی کے منتظر رہیں خواہ وہ سُرخ آندھی کی شکل میں ہو یا زلزلے کی صورت میں یا شکلیں مسخ ہو جانے کی صورت میں۔" (ترمذی شریف)

آپ کا نیاز مند، شریف اصلاحی

تاریخ اشاعت : ۱۵ دسمبر ۱۹۷۶ء ــــ ناشر : سیّد قاسم محمود ــــ طابع : ریاض حسین الجدید پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

جواد ۔ ایک مصاحب اور شاعرانی ۔ (دیکھیے "قمار بازی")

جواد اصفہانی زنگی حکمرانوں کا وزیر ۔ ابو جعفر محمد بن علی ۔ اس کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اس کے والد نے بہت کچھ اہتمام کیا تھا ۔ ابھی اس کی عمر بہت کم تھی کہ سلطان محمود سلجوقی کے دیوان العرض میں اسے ملازمت مل گئی بعد میں وہ زنگی کے مصاحبین و مقربین میں شامل ہو گیا ۔ جواد نصیبین اور الرقہ کا والی بھی رہا ۔ تمام زنگی ریاست کی نگرانی بھی اس کے سپرد تھی ۔ جب زنگی کو قتل کیا گیا تو جواد کی جان بھی مشکل ہی سے بچی ۔ اور وہ اپنی فوج موصل لے جانے میں کامیاب ہو گیا ۔

جواد سیف الدین غازی کے عہد میں بھی اپنے عہدے پر قائم رہا ۔ اس دور میں وہ اپنی داد و دہش کی شہرت کی بناء پر الجواد یعنی صاحب کرم کے نام سے یاد کیا جانے لگا ۔ مسلمان اس بنا پر بھی اس کے احسان مند ہیں کہ اس نے ذاتی خرچ سے مکے اور مدینے کے مقدس شہروں میں بہت سی مفید اصلاحات کیں ۔ ۵۵۰ھ / ۱۱۶۳ء میں قطب الدین مودود نے جو اپنے بھائی کا جانشین ہو چکا تھا ۔ جواد کو موصل میں قید کر دیا ۔ ایک سال بعد وہ اس قید خانے میں انتقال کر گیا ۔

جواد کی میت کو پہلے مکہ معظمہ لے گئے جہاں مقدس مقامات پر اسے پھرایا گیا پھر وہاں سے مدینہ منورہ لے جا کر اسے دفن کیا گیا ۔

جواد پاشا ۱۸۵۱ء/۱۲۶۹ھ ـــــ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ / ۱۱ اگست ۱۹۰۰ء) ترکی کا وزیر اعظم ۔

احمد جواد پاشا میر آلای مصطفیٰ عاصم کا بیٹا تھا ۔ شام میں پیدا ہوا ۔ تعلیم و تربیت فوجی کالج میں پائی ۔ ۱۸۷۱ء میں اس نے سٹاف کالج کے نصاب کی تکمیل کر لینے کے بعد روسی ، ترکی جنگ میں سپہ سالار اعظم سلیمان پاشا کے ایڈ ڈی کانگ اور نجیب پاشا کے لشکر میں سٹاف افسر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیں ۔

جواد پاشا نے تھوڑے سے عرصہ میں بڑی ترقی کی ۔ اور وہ مختلف عہدوں پر فائز ہوا مثلاً ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء میں وہ میرلوا کے ساتھ ساتھ مانٹی نیگرو کا سفیر مقرر کیا گیا ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء میں فریق کے منصب کے ساتھ اقریطش کا فوجی سالار مقرر ہوا ۔ لیکن اس کے جلد ہی بعد اقریطش کا نائب والی اور خصوصی متصرف (کمشنر) کے عہدے پر نامزد کیا گیا ۔

سلطان عبدالحمید نے اس کی خدمات اقریطش سے خوش ہو کر ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں جواد پاشا کو وزیر اعظم کے منصب سے سرفراز کیا ۔ وہ اس منصب پر تین سال سے کچھ زائد عرصے تک فائز رہا ۔ بعد میں جواد پاشا سلطان کی نظروں سے گر گیا ۔ کیونکہ اس نے متفرق بغاوتوں اور شورشوں کے بارے میں جو عرض داشتیں سلطان کی خدمت میں ارسال کی تھیں ۔ ان میں ان تمام شورشوں کا سبب نظام حکومت کی خامی کو بتایا تھا ۔ نیز اس نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ حکومت میں شاہی محل کی مداخلت کو کم کر کے باب عالی کے اختیارات بڑھائے جائیں ۔ چنانچہ جواد پاشا کو ان عرض داشتوں اور تجاویز کا صلا یہ ملا کہ اسے ۹ جون ۱۸۹۵ء کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا گیا ۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی اسے دوبارہ اقریطش کا سالار عسکر مقرر کر دیا گیا ۔ ۱۸۹۷ء میں جواد پاشا کو شام کی پانچویں فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ۔ لیکن عرصے میں جب اس کی صحت بہت خراب رہنے لگی تو اسے استانبول واپس بلا لیا گیا جہاں پر کچھ عرصہ بعد اس نے وفات پائی ۔

وہ ایک صاحب علم آدمی تھا ۔ اسے بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا وہ عربی فارسی ، اطالوی ، فرانسیسی اور یونانی زبانوں کا عالم تھا ۔ اس کے ساتھ ہی وہ کئی ایک کتب کا مصنف بھی تھا ۔ جن میں مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ مشہور ہیں ۔

"معلومات کافیہ فی ممالک عثمانیہ" ، "تاریخ عسکری عثمانی" ۔ اس کے علاوہ ترکی زبان میں "ریاضی مباحث دقیقہ سی" ، "کیمیا ، نکتہ ، ضالۃ تطبیق" ، "رسالہ ملفوظ" ہیں ۔ جواد پاشا کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا وہ ایک بہت قیمتی کتب خانے کا مؤسس تھا ۔

جوتا اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر چھوٹے بڑے معاملات کے بارے میں انسانوں کو تعلیم دی ہے ۔ جوتا پہننے سے چونکہ پاؤں پر ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رہتا ہے نیز ہر قسم کی گندگی وغیرہ سے بھی بچا رہتا ہے اسی لئے کتب احادیث میں جوتے کا ایک علیحدہ باب باندھا گیا ہے ۔

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے کسی غزوے میں آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا ، بہت سی جوتیاں لے لو اس لئے کہ مرد جب تک جوتیاں پہنے رہتا ہے سوار کی مانند رہتا ہے ۔" (مسلم)

احادیث میں جوتا پہننے کے چند آداب بھی بتائے گئے ہیں ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا جب کوئی شخص پہنے تو پہلے سیدھے پاؤں میں پہنے اور جب جوتا اتارے تو الٹا جوتا اتارے یعنی پہننے میں پہلا جوتا داہنے پاؤں کا ہونا چاہیے ۔ اور اتارنے میں پہلا جوتا بائیں پاؤں کا ۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور جگہ پر آپ نے فرمایا ۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا ۔" جب کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو ایک پاؤں میں جوتی پہن کر نہ چلے جب تک اس کی دوسری جوتی کا تسمہ درست نہ ہو جائے اور نہ ایک پاؤں میں موزہ پہن کر چلے ۔" (مسلم)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ آدمی کھڑا ہو کر جوتا پہنے (ترمذی و ابوداؤد)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے ۔" یہ طریقہ سنت ہے کہ جب آدمی کہیں بیٹھے تو اپنی جوتیاں اتار لے اور اپنے پہلو میں یعنی اپنے پاس رکھ لے ۔" (ابوداؤد)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضورؐ اپنے صحابہ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے ۔ اچانک آپؐ نے اپنے جوتے پاؤں سے اتار کر اپنی بائیں طرف رکھ دیئے ۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے ۔ جب نماز ختم ہو گئی تو آنحضورؐ نے پوچھا کہ تم نے اپنے جوتے کیوں اتارے ؟ صحابہ نے عرض کی ہم نے آپ کی تقلید میں ایسا کیا ۔ پھر آنحضورؐ نے فرمایا میرے پاس جبرئیلؑ آئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے جوتے پر تھوڑی سی غلاظت لگی ہوئی تھی ۔ پس تم سے جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو جوتے کو اچھی طرح دیکھ لیا کرے اور اگر تم ان پر غلاظت لگی ہوئی پاؤ تو اسے صاف کر لو اور پھر ان کے ساتھ نماز پڑھ لو ۔"

حضرت امر بن شعیب سے مروی ہے کہ میں نے آنحضور کو جوتوں سمیت اور بغیر جوتوں کے نماز پڑھتے دیکھا ہے ۔

ہدایہ میں جو فقہ حنفی کی کتاب ہے درج ہے کہ جب جوتوں پر کوئی غلاظت لگ جائے مثلاً خون یا گوبر تو اس زمین پر رگڑ کر ضرور صاف کر لیا جائے ۔

Marfat.com

جُوچی (۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء ــــ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء) چنگیز خاں کا سب سے بڑا لڑکا اور آلتون اردو، قریم، تیومن، بخارا اور خیوہ کے خوانین کا جدِ امجد۔

اس کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں اور یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ ایک ایسا شخص جو اس قدر بہت سے شاہی خانوادوں کا بانی تھا۔ لیکن اس کے حالات زندگی اتنے کم دستیاب ہیں کہ اس کی ولدیت تک غیر یقینی ہے۔

جوچی کا ذکر سب سے پہلے ۱۲۰۷ء میں ملتا ہے۔ جب وہ اویرت نیز جھیل بیکل کے مغربی سواحل پر جنگلوں میں رہنے والے دوسرے قبائل کے خلاف ایک مہم کے ساتھ بھیجا گیا۔ چنانچہ ان لوگوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد وہ مغرب کی جانب بڑھا۔ یہاں پر نسبیدہ قیرغیز نے جو بالائی ینیسی کے علاقے میں آباد تھا اس کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ ۱۲۱۸ء/۱۲۱۹ء میں اس نے اس قبیلے کی ایک بغاوت کو بھی فرو کیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ان حملوں میں بھی شریک تھا جو اس نے شمالی چین پر کئے تھے۔ اس نے اپنے بھائیوں چغتائی اور اوکتائی کے ساتھ مل کر نان شان ہیسی، چیہ لی، نان اور ہو کی لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔

جوچی نے ۱۲۱۶ء/۱۲۱۷ء میں مرکیت کے بچے کھچے لوگوں پر کی جانے والی توجہ کشی میں بھی حصہ لیا اور انہیں شکست دے کر بالکل نیست و نابود کر دیا۔ جب چنگیز خاں کی افواج کا خوارزم شاہ سے ٹکراؤ ہوا جو ان جنگوں کا پیش خیمہ تھا جو ۱۲۱۹ء میں ہوئیں اور جب چنگیز خاں کی فوجیں اترار کے بالمقابل پہنچیں تو جوچی کو سیر دریا کے زیریں علاقے میں ایک مہم پر بھیجا گیا۔ چنانچہ سیر دریا کے زیریں علاقے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سغناق، اوزکند، برچین اور اشناس فتح کئے۔ پھر اس نے جند پر حملہ کیا۔ اگرچہ وہ جند پر حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن جب اسے یہاں کی صورت حال کے بارے میں معلومات بہم پہنچیں تو اس نے جند کا محاصرہ کر لیا جو ۱۲۲۰ء میں فتح ہو گیا۔ یہاں سے جوچی نے گیا ہستان قرہ قوم کی طرف پیش قدمی کی۔ یہاں سے چنگیز خاں نے اسے گرگانج کے محاصرے میں اپنے بھائی اوکتائی کے ساتھ شریک ہونے کا حکم دیا۔ آخر کار یہ شہر بھی ۶۱۸ھ/۱۲۲۰ء میں فتح ہو گیا اور جوچی کے مفتوحہ علاقے میں شامل ہو گیا۔ ۱۲۲۳ء کے بعد جوچی قلان باشی سے گیا ہستان اپنے باپ اور بھائیوں سے جا ملا۔ بعد میں اس اجتماع سے فارغ ہو کر جوچی دوبارہ اپنے مفتوحہ علاقے میں آ گیا اور اپنی بقیہ زندگی یہیں پر گزار دی۔ اس کے آخری ایام میں اپنے باپ چنگیز خاں سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے

جوچی نے قلان باشی میں چنگیز خان سے کئی ماہ قبل وفات پائی۔ اس کی ریاست اس کے دو بیٹوں اردہ اور باتو نے آپس میں تقسیم کر لی۔ اور یہ دونوں علی الترتیب اردوئے معلا کے بانی ہوئے۔

جودت پاشا ترکی کا ایک مشہور ادیب اور سیاستدان۔ (دیکھئے "احمد جودت پاشا")

جود و سخا بخشش، سخاوت۔ بعض لوگوں نے جود و سخا کے درمیان فرق کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ سخی وہ ہے جو سخاوت میں اپنے پرائے کی تمیز کرے اور جو کچھ وہ کرے کسی دنیاوی غرض اور سبب سے وابستہ ہو۔ اور سخاوت میں یہ ابتدا کا مقام ہے۔

جواد وہ ہوتا ہے جو بخشش کرتے وقت اپنے اور بیگانے کی تمیز نہ کرے اور اس کی سخاوت بے غرض اور بلا سبب ہو۔

علی ہجویری نے جواد اور سخی کی دو مثالیں بیان کی ہیں جن سے جود و سخا کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب تک کوئی مہمان نہ آ جائے کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک دفعہ تین دن تک کوئی شخص نہ آیا۔ آخر ایک آتش پرست آپ کے گھر کے دروازے پر آ گیا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا تم کون ہے اس نے کہا میں آتش پرست ہوں آپؑ نے فرمایا چلا جا تو مہمانی اور مہربانی کے لائق نہیں۔ اس پر اللہ تعالے کی طرف سے عتاب ہوا کہ جس شخص کی ستر سال تک میں نے پرورش کی ہے تجھے اتنا بھی گوارا نہ ہوا کہ اسے ایک روٹی دے دے

پس حضرت ابراہیمؑ نے بخشش میں اپنے پرائے کی تمیز کی اور ایک روٹی تک غیر مذہب والے کو دینی گوارا نہ کی

لیکن اس کے برعکس جب حاتم کا بیٹا آنحضورؐ کی خدمت میں آیا تو آپؐ نے اپنی چادر اٹھا کر اس کے نیچے بچھا دی اور فرمایا۔ جب تمہارے پاس کسی بھی قوم کا کوئی شریف آدمی آ جائے تو اس کی تکریم کرو۔

آنحضورؐ نے اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہ کی۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ کا مقام سخاوت تھا اور آنحضورؐ کا مقام جود تھا۔

آنحضورؐ نے فرمایا سخی آدمی بہشت سے قریب اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل آدمی دوزخ کے نزدیک اور بہشت سے دور ہے۔ نیز فرمایا کافر سخی اللہ کے نزدیک بخیل مومن سے اچھا ہے۔" (کشف المحجوب)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضورؐ کل کے لئے کوئی چیز نہیں رکھتے تھے (ترمذی)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ آنحضورؐ سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ نے (کہتے ہوئے) فرمایا ہو (میں) نہیں دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ سب لوگوں سے زیادہ حسین زیادہ سخی اور زیادہ بہادر تھے۔ (بخاری) ...... ایک اور حدیث ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضورؐ کے پاس آیا۔ اور آپؐ سے اس قدر بکریاں مانگیں کہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی جو بھیڑ بکریوں سے پُر تھی بخش دی۔ جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ کر گیا تو کہنے لگا اے قوم! مسلمان ہو جاؤ۔ خدا کی قسم محمدؐ وہ بخشش کرتے ہیں کہ اپنی مفلسی سے بھی نہیں ڈرتے۔" (بخاری)

نیز حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ آنحضورؐ کے پاس ایک مرتبہ ستر ہزار درہم آئے آپؐ نے ان کو ایک گدڑی پر ڈال دیا۔ اور جب تک ان سب کو راہ خدا میں نہ دے دیا۔ آپؐ اس جگہ سے نہ اٹھے۔ (مشکوٰۃ)

جواز حلت۔ کسی چیز کا جائز، حلال، مجاز ہونا۔ شریعت کی اصطلاح میں نص قرآنی اور احکام شریعت کے ماتحت کسی عمل اور استعمال کی اجازت۔ اسلامی فقہ کے دائرے میں جواز کا مفہوم وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی ضد حرمت یا عدم جواز وغیرہ ہیں۔

جوالیقی، ابو منصور (۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء ــ ۱۵ محرم ۵۳۹ھ/۱۹ جولائی ۱۱۴۴ء) ایک ادیب اور معلم۔ موہوب بن احمد بن محمد بن خضر۔ بغداد میں پیدا ہوا۔ بقول بروکلمان وہ ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔
اس کی "جوالیقی" نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ادنےٰ خاندان کا فرد تھا۔

Marfat.com

کیونکہ جوالیقی کے معنی جوالیاں بنانے والا یا بیچنے والا کے ہیں۔

جوالیقی مدرسہ نظامیہ میں اپنے استاد تبریزی کی صدر شعبہ علم الالسنہ کا دوسرا جانشین ہوا۔ مسلک کے اعتبار سے وہ پکا سنی تھا۔ اسے علی بن زید کی جگہ جو کہ شیعہ تھا زبردستی استعفیٰ دلوا کر مقرر کیا گیا تھا۔

وہ ایک فرض شناس معلم تھا۔ اور سوالات کے جواب نہایت احتیاط سے دیا کرتا تھا۔ وہ بہترین خوش نویس بھی تھا۔ اس کی خوش نویسی کی بہت تعریف کی جاتی ہے جوالیقی کی تصانیف کو تبریزی کی تصانیف کا ہم پلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے عربی زبان کا ثقافتی درجہ اس پستی سے جس میں وہ سلجوقیوں کے زمانے میں جا پڑی تھی۔ نکال کر بلند کیا۔

اس نے اپنی کتاب "المعرب من الکلام الاعجمی علی حروف المعجم" میں فصیح عربی کی حفاظت اس طرح کی کہ بیرونی اصل کے سارے الفاظ ایک جگہ اکٹھے کر کے ان کی حقیقت کی صراحت کر دی گئی ہے۔ یہ شرح لغت کی کتاب جو اس کی زندگی میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اور بہت مفید ثابت ہوئی۔ جوالیقی نے بغداد میں وفات پائی ہے۔

اس کی شہرت بڑی حد تک مندرجہ بالا تصنیف کی مرہون منت ہے۔ جیسا کہ اس کے ایک شاگرد ابو البرکات ابن الانباری نے کہا ہے: "شیخ نحو سے بڑھ کر لغت نویسی کا ماہر تھا۔"

یہ کتاب اس کے پیشروؤں کی تحقیقات کی ایک قابل قدر تطبیق ہے۔

اس کی دوسری کتاب "التکملہ فی مایلحن فیہ العامہ" ہے۔ اس کتاب کا واضح مقصد غلط الفاظ کی تصحیح کرنا ہے۔

جوالیقی کی تیسری تصنیف ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" کی شرح ہے جو ایک اوسط درجے کی کتاب ہے۔

ابن الانباری اس کی طرف ایک اور تصنیف "کتاب العروض" بھی منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح بروکلمان نے اس کی تصانیف کی فہرست میں "شرح مقصورہ ابن درید" کو بھی شامل کیا ہے۔ تنوخی نے ایک اور تصنیف "کتاب غلط الضعفا من الفقہاء" اسی کی تصنیف بتاتا ہے۔

جوانی، ابو علی (۵۲۵ھ/۱۱۳۱ء — ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء) ایک عرب نساب اور مورخ۔ محمد بن اسعد۔ جوانی خاندان کا دعوے تھا کہ وہ عبیداللہ بن حسینؑ کے ایک بیٹے کے واسطے سے حضرت علیؓ کی اولاد سے ہیں۔ مصر میں پیدا ہوا اور وہیں پر تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مصر، دمشق اور حلب میں حدیث پڑھائی۔ ایک بار وہ مصر میں علوی سردار بھی مقرر ہوا اس کا شوق و مشغلہ انساب اور تاریخ کا مطالعہ کرنا تھا۔

ابو علی جوانی ہمیشہ ایوبیوں کا منظور نظر رہا۔ ان کے ناموں سے اس اپنی کئی تصانیف بھی معنون کی ہیں۔ صلاح الدین نے اسے مدینہ منورہ کے قریب موضع جوانیہ جاگیر کے طور پر عطا کیا تھا۔ اور اسی نام کی نسبت کی وجہ سے اس کا خاندان موسوم ہوا۔

مقریزی نے المقفیٰ میں جوانی کی اٹھارہ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بعض کتابیں ضخیم تھیں۔ ان کتابوں میں حضرت علیؓ کے شجرہ نسب سے بحث کی گئی ہے اور جوانی خاندان کی تاریخ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اپنے والد کے شجرہ نسب کی تحقیق اور

بنو طالب کی سوانح عمریاں، طالبی ماہرین الانساب، بنو الارقط اور بنو ادریس پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے زیادہ عام نوعیت کی تاریخی اور نسابی تصانیف بھی مرتب کی ہیں۔

اس کی تصانیف میں "الجواہر المکنون فی ذکر القبائل والبطون"، "النقط علی الخطط"، "التحفۃ الشریفیۃ"، "التحفۃ الظریفیۃ" یا "اصول الحساب وفصول الانساب" ہیں۔

جودھپور ایک سابق ریاست اور شہر۔ انڈیا میں مارواڑ راجپوتانہ ایجنسی کی تمام قدیم ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست۔ اس ریاست کا رقبہ ۳۶۱۰۰ مربع میل تھا اور ۱۹۴۱ء میں اس کی کل آبادی ۲۵۵۵۹۰۴ تھی۔

اس ریاست کی بنیاد قدیم روایات کے مطابق جنکا تاریخی طور پر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ قنوج کے راجپوتوں نے محمد غوری کے ہاتھوں ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء میں شکست کھانے کے بعد رکھی تھی۔

گوالہ دودھ فروخت کر رہا ہے

جودھپور شہر کی تاریخ کا آغاز ۸۶۴ھ/۱۴۵۹ء سے ہوتا ہے۔ یہاں کے راجا راو مالدیو نے جس نے ہمایوں کو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا، شیر شاہ اور اکبر کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اور ان کا باجگزار بن گیا۔ اس وقت سے حاکمان جودھپور کے دہلی کے شاہان مغل سے گہرے تعلقات قائم رہے۔ یہاں کے حکمران اپنی بیٹیوں کی شادیاں مغلیہ خاندان میں کرتے تھے۔ اور مغل افواج میں بھرتی ہوتے تھے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ جو ان راجپوتوں میں سے مشہور ترین مہاراجہ تھا۔ مغل شہنشاہوں کے ملازموں میں مشہور تھا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں جب ان کی مغلیہ سلطنت سے جنگ چھڑی تو جودھپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اگرچہ گوریلا اور چھاپہ مار لڑائی کئی سال تک جاری رہی۔

سادات بارھہ نے جودھپور کے حکمران کو مجبور کیا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر سے کرے۔ جونہی مغلیہ سلطنت کمزور پڑی تو مرہٹوں اور امیر خاں کی فوجوں نے جودھپور

Marfat.com

کو بری طرح روندا۔ ۱۸۱۸ء میں جودھپور انگریزوں کے زیر تسلط آگیا اور یہاں پیمان کی علداری قائم ہوگئی۔ مہاراجہ تخت سنگھ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا وفادار اور حامی تھا ۱۸۶۲ء میں متبنیٰ بنانے کے حق کی ضمانت دی گئی۔ اس تمام عرصے میں جب تک یہ ریاست انگریزوں کی علداری میں رہی کوئی خاص واقعہ یا اہم بات قابل ذکر نہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۹ء میں جودھپور کو راجستھان کے نئے صوبے میں ملا دیا گیا۔ اور اس طرح یہ قدیم ریاست ختم ہوگئی۔

جودی، کوہ ایک پہاڑ کردستان کے علاقے ضلع بہتان میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق میں تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر ایک بلند کوہ جو ۳۷ درجے ۳۰ دقیقہ شمال میں واقع ہے۔ اس کا دوسرا نام کوہ آراراط اور جبل الحارث بھی کہتے ہیں۔ اس کا قدیم نام اغری تاغ تھا۔ جودی پہاڑ کی شہرت کا منبع عراق و عرب کی وہ روایت ہے جس کے مطابق اس پہاڑ پر کشتی نوح جا کر ٹھہری تھی۔

یہ پہاڑ اس مقام پر واقع ہے جہاں ترکی، ایران، روس اور آرمینیا کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس کی شمالی اور مشرقی ڈھلان کی طرف آرس بہتا ہے جو سطح سمندر سے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں بایزید کا میدان واقع ہے جو سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ مغرب کی طرف چھوٹی چھوٹی آتش فشاں پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ ان میں سے ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹا سا درہ گذرتا ہے۔ یہ پہاڑ دو چوٹیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا درمیانی پالان ۸۸۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ دونوں چوٹیوں کے درمیان سات میل کا فاصلہ ہے۔ بڑی چوٹی کی انتہائی بلندی ۱۲۸۴۷ فٹ ہے ان دونوں چوٹیوں کے قریب دور دور تک کوئی اور چوٹی اتنی بلند نہیں۔ دونوں چوٹیاں لاوے اور آتشی چٹانوں سے بنی ہیں۔ آج کل اس پر ہمہ وقت برف جمی رہتی ہے۔ اس کے ارد گرد میدانوں میں عمدہ گھاس کے وسیع قطعات ہیں یہاں کرد قبائل اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے دامن میں کہیں کہیں درخت بھی ملتے ہیں۔ لیکن پہاڑ سبزے سے خالی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں آبادی تھی بقول المقدسی "اس پہاڑ پر ایک ہزار گاؤں آباد تھے۔"

اس پہاڑ کا ذکر سب سے پہلے بائیبل میں آراراط کے نام سے ملتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نوح کی کشتی "آرک" اسی پہاڑ کی بڑی چوٹی پر آ کر ٹھہری تھی۔ نیز یہ کشتی ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کو آراراط کی پہاڑیوں پر ٹک گئی (پیدائش ۸:۴)

قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

"حکم ہوا۔ اے زمین، اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا۔" چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جودی پر ٹک گئی، اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم۔" (۱۱:۴۴)

قدیم ارمنی روایات اس بارے میں بالکل خاموش ہیں کہ کشتی نوح کہاں رکی تھی۔ بعد کے ارمنی ادب میں جو کچھ روایات اس بارے میں ملتی ہیں وہ تورات کے بڑھتے ہوئے اثرات کا نتیجہ ہے۔ ابن قتیبہ نے آراراط ہی کو، کوہ جودی قرار دیا ہے۔ سکندر اعظم کے عہد کا مورخ بروسس لکھتا ہے کہ اسے کوہ جودی کی چوٹی پر سے کشتی کے آثار بھی ملے ہیں۔ ابن بطوطہ نے ۱۳۲۵ء میں اس پہاڑ کی زیارت کی تھی۔

موجودہ دور میں بھی اکثر لوگوں کو یقین ہے کہ آراراط کی چوٹیوں پر جمی ہوئی ہزاروں

کوہ آراراط۔ اور اس کے دامن میں ارمینیا کے شہر جیروان

برس پرانی برف کے نیچے نوح کی کشتی موجود ہے۔

آرمینہ کے لوگ اس روایت پر یقین رکھتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد دنیا میں بسنے والی پہلی قوم آرمینہ کے لوگ تھے۔

قدیم تفسیروں میں اس پہاڑ کو حضرت نوح کے خشکی پر اترنے کی جگہ بتایا گیا ہے کشتی نوح کے ٹھہرنے کی جگہ کی اس تعین کی جس کا پتا عہد نامہ قدیم کی ارامی زبان میں تفاسیر و تراجم میں بھی چلتا ہے۔ اس کی بنیاد اگرچہ بابلی روایت ہے۔ اس کا ماخذ بیروس ہے اس کے علاوہ کوہ نصر جس کا ذکر داستان طوفان نوح کے سلسلے میں قدیم آشوری و فارس کے میخی خط میں لکھے ہوئے کتبات میں ملتا ہے۔ ممکن ہے وہ گورڈینے ہی میں واقع ہو۔ کیونکہ مسیحی ماخذ کی رو سے گورڈینے کے پہاڑوں کو حضرت نوح کی خشکی پر اترنے کی جگہ بتایا گیا ہے یہ قدیم یہودی، بابلی روایت عیسائیوں نے اختیار کی۔ بعد میں جب ۲۰ھ/۶۴۰ء میں عربوں نے بہتان فتح کر لیا تو انہوں نے اسے کوہ جودی کا نام دے دیا۔ قرآن حکیم میں جودی سے وہ پہاڑی مراد لی جاتی ہے جو عرب میں واقع ہے۔ چنانچہ بائبل میں جو کشتی ٹھہرنے کی جگہ آراراط بتائی گئی ہے وہ آرمینہ کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلہ کوہستان کا نام بھی۔ اور یہ سلسلہ کوہستان آرمینہ کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل جودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیراسس نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتی نوح کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے زمانے کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔

آراراط کے آس پاس کے تمام علاقوں کی طرح جبل جودی کا گرد و پیش آج تک ایسی یادگاروں اور داستانوں سے پر ہے جن کا تعلق طوفان نوح اور کشتی کے نکلنے کے بعد حضرت نوح کے حالات زندگی سے ہے۔

مثال کے طور پر پہاڑی کے دامن میں اب تک ایک گاؤں ہے جسے قریۃ الثمانین کہتے ہیں۔ کیونکہ داستان کی رو سے کشتی میں بچ نکلنے والے ۸۰ آدمی پہلے یہیں...

آباد ہوتے تھے۔

اسی طرح عرب جغرافیہ نویس اپنے زمانے میں ایک خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو جودی پر موجود تھی اور جسے دیرالجودی کہتے تھے۔

ایک برباد شدہ درگاہ کا مسلمان عیسائی اور یہودی سب احترام کرتے ہیں آج کل اس کو "سفینہ بنی نوح" کہا جاتا ہے۔

جوزجان (گوزگان) ایک قدیم ضلع جو افغانستان ترکستان میں مرغاب اور آمو دریا کے درمیان واقع ہے۔ اس ضلع کی حدود واضح طور پر متعین نہیں کی گئی تھیں۔ خاص طور پر مغرب میں تو کوئی واضح حدبندی نہیں تھی۔ اس ضلع میں وہ خطہ جس میں آج کل میمنہ، اندخوی، شبرگان اور سرپل واقع ہیں، ضرور شامل تھا۔ یہ علاقہ ہمیشہ خانہ بدوش قبائل کی جائے سکونت رہا کیونکہ یہ علاقہ ایرانی سطوح مرتفع کے دامنوں اور شمالی بے برگ و گیاہ میدانوں میں واقع تھا۔

موجودہ زمانے میں بھی یہاں پر خانہ بدوش قبائل سکونت پذیر ہیں اگرچہ یہاں کی بعض زرخیز وادیوں میں مستقل آبادیاں بھی موجود ہیں۔ یہاں کی اصل دولت مویشیوں کے ریوڑ ہیں۔ جن پر لوگوں کی گذر بسر ہے۔

ایرانی سطوح مرتفع سے ماوراءالنہر کا راستہ اس ضلع کے اندر سے ہو کر گذرتا تھا لیکن اسے زیادہ تر جنگی راستے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

جوزجان کا ضلع پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں طخارستان سے ملحق تھا۔ ۳۲ھ/۶۵۲ء میں جب احنف بن قیس نے فوج کشی کی تو اس کے نائب الاقرع نامی شخص نے جوزجان کو فتح کیا۔ اس علاقے کو صرف ترکوں ہی کی جنگ سے نقصان نہیں پہنچا بلکہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے بھی جوزجان کو بہت کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۱۹ھ/۷۳۷ء میں جوزجان کے صدر مقام کے قریب اسد بن عبداللہ قسری نے خاقان کو شکست دی۔ ۱۲۵ھ/۷۴۳ء میں یحییٰ ابن زید علوی نے جن کے مزار کا بعد ازاں ایک مدت دراز تک احترام کیا جاتا رہا۔ امویوں سے جنگ کرتے ہوئے اسی جگہ شکست کھائی۔ عہد عباسی میں یہاں کا حاکم انبار میں سکونت رکھتا تھا۔ تاہم گوزگان۔ خدا کا مقامی حکمران گھرانہ یعنی خاندان افریغون باقی رہا۔ اس خاندان نے کندرم کو اپنا دارالسلطنت بنائے رکھا۔ اگرچہ کبھی کبھی جوزجان کا سیاسی مرکز شبورقان نظر آتا ہے۔ المقدسی اور الیعقوبی نے یہودیہ (میمنہ) کو دارالسلطنت بتایا ہے۔

اس ضلع کا "جوزجان" جو قدیم نام تھا۔ آہستہ آہستہ متروک ہو گیا۔ اس کے متعدد شہروں کا ذکر اس ضمن میں آتا ہے کہ وہ مخالفانہ حملوں کا شکار ہوتے رہے اور یہ بات اس ضلع کی اہمیت کے لیے سب سے بڑھ کر ہے کہ اس کے متعدد شہر اگرچہ بہت سے حوادث کے شکار ہوتے رہے لیکن ان تمام حوادث کے باوجود آج تک باقی ہیں۔

موجودہ دور میں ازبک خانوں کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستیں (آقچہ، اندخوی، شبرگان، سرپل، میمنہ) قدیم جوزجان میں قائم ہو گئی ہیں لیکن اپنے طاقتور ہمسایوں کی یورشوں کا شکار رہتی ہیں۔ دوست محمد خان کے عہد میں ان تمام ریاستوں کو رفتہ رفتہ باہم ملا دیا گیا ہے اور ایک افغان ترکستان بنا دیا گیا ہے۔ صرف میمنہ میں خودمختاری کا کچھ شائبہ باقی ہے۔

جوزجانی، مولانا (۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء - غالباً ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء، ۱۲۶۰ء) ایک عالم دین، مصنف اور مورخ۔

ابو عمرو منہاج الدین عثمان المعروف "مولانا منہاج سراج" والد کا نام سراج الدین محمد تھا۔ جنہیں افصح العجم اور اعجوبۃ الزمان کہا جاتا تھا۔ ان کے بزرگوں میں امام عبدالخالق (۴۵۱ھ/۴۹۲ھ) جوزجان میں وارد ہوئے۔ انہوں نے سلطان ابراہیم غزنوی کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ امام عبدالخالق کے یہاں ابراہیم ہوئے۔ ابراہیم کے یہاں منہاج الدین عثمان پیدا ہوئے۔ جن کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا نصف اول ہے۔ منہاج الدین عثمان کے فرزند سراج الدین محمد تھے۔ یہ خاندان دربار غزنی میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

بقول محمد عوفی ان کی ولادت لاہور میں ہوئی۔ منہاج الدین عثمان کی والدہ ہرات کے مشہور علمی خاندان کی خاتون تھی۔ جس کا نام تولک تھا۔ وہ سلطان غیاث الدین غوری کی شہزادی کی رضاعی بہن تھی۔ سن بلوغ کے پہنچنے تک منہاج الدین عثمان کی تربیت فرزند ملوک غور کے دربار میں ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے قرآن پاک حفظ کیا۔ اور ۶۱۱ھ/۱۲۱۴ء تک اسی دربار میں زندگی گذاری۔

۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں سلاطین غور کی طرف سے دربار سیستان میں پہلی بار سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں جب چنگیزی افواج نے ہرات پر حملہ کیا تو منہاج عثمان وہیں پر موجود تھا۔ ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں اس نے گزلو اور تمران کا سفر کیا اور وہیں پر شادی کے بعد سکونت اختیار کر لی۔

بعد میں اس کی درباری اور سیاسی شہرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اس نے سلاطین غور کے قاصد اور سفیر کی حیثیت سے ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء تک متعدد بار فراہ، سیستان اور قہستان ملاحدہ کی طرف سفر کیا۔ اسی سال اس نے ہندوستان کا قصد کیا۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء کے آغاز میں وہ غزنہ اور درہ گومل سے ہوتے ہوئے بنوں (بنیان) پہنچا۔ یہاں سے اُچ میں وارد ہوا۔ جہاں سلطان ناصرالدین قباچہ کی طرف سے اسے مدرسہ فیروزی کا اہتمام اور لشکر میں عہدہ قضا تفویض کیا گیا۔

۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء میں جب سلطان شمس الدین التمش نے اُچ فتح کر لیا تو منہاج الدین اس کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ دہلی پہنچا۔ ۶۲۹ھ/۱۲۳۱ء میں سلطان نے اسے خطیب دربار مقرر کیا۔ اگلے سال صفر ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء میں منہاج الدین کا تقرر حصار گوالیور میں قاضی و خطیب و امام اور محتسب جمیع امور شرعیہ کی حیثیت سے حاصل ہوا۔ اس عہدے پر وہ چھ سال تک رہا۔

۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء میں رضیہ سلطانہ کے عہد حکومت میں منہاج الدین دہلی واپس ہوا جہاں اسے گالیور (گوالیار) کے عہدہ قضا کے علاوہ مدرسہ ناصریہ کا صدر مدرس اور مہتمم بھی بنا دیا گیا۔

بہرام شاہ کے عہد حکومت میں ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں منہاج الدین کو قاضی پایہ تخت (قاضی القضاۃ) کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ بہرام شاہ کے قتل ہو جانے کے بعد اس نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس دور میں اس پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔ جس میں وہ بال بال بچا۔ اس کے بعد وہ دو سال تک یعنی ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء تک لکھنوتی (مشرقی بنگال) میں گوشہ نشین رہا۔ سلطان علاءالدین مسعود نے اسے دوبارہ دہلی طلب کیا اور مدرسہ ناصریہ کا انتظام اوقاف دہلی کی تولیت، گالیور کی قضا اور خطیب جامع مسجد دہلی کی حیثیت سے اس کا تقرر کیا گیا۔

جب سلطان ناصرالدین ۶۴۴ھ/۱۲۴۶ء میں دہلی میں تخت نشین ہوا تو اس نے منہاج الدین پر گوناگوں نوازشات کیں۔ ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء میں اسے کل ہند کا قاضی القضاۃ اور حاکم حضرت دہلی مقرر کیا گیا۔ اور ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۲۰ ربیع الاول ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں اسے "صدر جہاں" کا خطاب دیا گیا۔ ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء میں تیسری

Marfat.com

مرتبہ ہندوستان کا قاضی القضاۃ اور قاضی حضرت دہلی بنا دیا گیا۔ بلبن جو بعد میں غیاث الدین بلبن کے نام سے ہندوستان کا بادشاہ بنا منہاج الدین کا مربی خاص تھا۔

اس کے بعد کے حالات زندگی، اس کی وفات اور اس کے مدفن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً اس نے ٦٥٨ھ/١٢٥٩ء، ١٢٦٠ء میں وفات پائی ہو گی کیونکہ اس کی آخری تصنیف جو "طبقات ناصری" کے نام سے ہے۔ ٦٥٨ھ/١٢٥٩ء کے آخر میں مکمل ہوئی تھی۔

منہاج الدین ایک ہمہ گیر شخصیت کا حامل تھا۔ وہ ایک عالم، درباردار، فقیہہ شاعر، ادیب اور مورخ تھا۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے اسے اہل تصوف اور صاحب وجد و سماع لکھا ہے۔

سلطان ناصر الدین کی اس پر گوناگوں نوازشات تھیں۔ چنانچہ اس نے اس سلطان کے نام پر پہلے "ناصری نامہ" اور پھر "طبقات ناصری" تصنیف کیں۔

منہاج الدین کی تصانیف میں "طبقات ناصری" بہت زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں اس نے قدیم تاریخی کتب کے حوالے سے نیز اپنے مشاہدات اور سنی روایات کی بنیاد پر جو اس تک پہنچیں فارس و یمن اور عرب کے قدیم بادشاہوں کے حالات نیز انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور پھر ظہور اسلام سے اپنے عہد تک کے احوال رقم کئے ہیں۔ یہ کتاب تیئیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

جولان جنوبی شام کا ایک ضلع۔ اس کے مغرب میں اردن شمال میں جبل الشیخ کی شاخیں مشرق میں دریائے رقاد اور دریائے علان اور جنوب میں دریائے علان اور جنوب میں دریائے یرموک واقع ہے۔ جولان کا شمالی حصہ قدرے بلندی پر واقع ہے جو ایک غیر آباد کوہستانی علاقے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ بر کانی چٹانوں والی زمین پر بلوط کے جنگلات موجود ہیں۔ جولان کا جنوبی حصہ خاصا نشیب میں ہے۔ اس حصے کی زمین میں بر کانی کنکر پائے جاتے ہیں یہ نسبتاً ہموار ہے۔

موجودہ جولان کا یہ علاقہ ہیلینکی عہد کے قدیم جولانیتس سے ملتا جلتا ہے جو غالباً قصبہ جولان کے نام پر جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں آتا ہے۔ موسوم ہوا لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے

جولان کے پہاڑیوں پر برف باری کا ایک منظر

Marfat.com

کے یہ علاقہ وقت کے ساتھ ساتھ سکڑتا گیا۔

ایک وقت تھا کہ اس صوبے میں دریائے علان کے مشرق کا علاقہ بھی اس صوبے میں شامل تھا۔ چنانچہ سرحد کے اس پار جابیۃ الجولان اور نیم الجولان جیسے مقامات کی موجودگی اس کا واضح ثبوت ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور تک یہ علاقہ جولان کے صوبے میں شامل تھا۔

بزنطی عہد میں جولان ولایت فلسطین الثانیہ میں شامل تھا۔ اور اس زمانے میں بنو غسان کی ریاست کا ایک مرکز تھا۔ شرجیل نے جب اردن کو فتح کیا تو اسی دوران میں اس نے اس علاقے پر بھی قبضہ کیا۔ بعد میں اسے دمشق کے صوبے سے ملا دیا گیا تھا۔ بقول المقدسی جولان دمشق کے چھ اضلاع میں سے ایک تھا۔ اس کا صدر مقام بانیاس تھا اور مملوک کے عہد تک اس کی یہی حیثیت برقرار رہی۔ جدید عہد میں یہ حیثیت قنیطرہ نے لے لی۔ جو دمشق اور طبریہ کے درمیان ایک اہم سڑک پر آباد ہے۔ اس کی پرانی آبادی کا بیشتر حصہ بنو مرہ پر مشتمل تھا۔ لیکن اب یہاں مختلف النسل اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آباد ہیں۔ ان لوگوں میں دروز اور متاولہ شیعہ بھی شامل ہیں۔ جو کوہ حرمون کے دامن میں چرکسوں اور ترکمانوں کی آبادیوں اور دوسرے بدوی قبائل کے ساتھ ساتھ جو اب شہری زندگی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ آباد ہو گئے ہیں۔

اس شہر کی شہرت خاص طور پر یہاں کی زرعی پیداوار کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ دمشق کو یہیں سے غلہ فراہم کیا جاتا تھا۔ موجودہ دور میں بھی اس پورے علاقے میں غلہ مہیا کرنے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

جوناگڑھ

جوناگڑھ پاک و ہند کا ایک متنازعہ شہر اور عہد برطانوی میں ہندوستان کی ایک ریاست جو ۲۲ درجے ۴۴ دقیقے اور ۲۱ درجے ۵۳ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۰ درجے اور ۷۲ درجے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳۳۳۷ مربع میل ہے تقسیم پاک و ہند کے وقت یہاں کی آبادی تقریباً ساڑھے سات لاکھ تھی اور سالانہ آمدنی ڈیڑھ کروڑ روپیہ تھی۔ یہ شہر مغرب اور جنوب مغرب میں بحیرہ عرب سے گھرا ہوا ہے اس کی ایک بارونق بندرگاہ جو ویراول (ویراول) کے نام سے مشہور ہے۔ کراچی (پاکستان) سے تین سو بحری میل کے فاصلے پر ہے۔

ریاست میں گرنار کی پہاڑیوں پر کئی ایک جینیوں اور ہندوؤں کے مندر ہوتے ہیں ہندو ان پہاڑیوں کو بہت مقدس خیال کرتے ہیں۔ یہ مندر جو ان پہاڑیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ قدیم زمانے کے ہیں۔ جوناگڑھ اور گرنار پہاڑیوں کے درمیان ایک کھڈ کی چٹان پر مہاراج اشوک کے فرمان کھدے ہوئے ملے ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ علاقہ بدھ مت کا ایک خوشحال مرکز اور سلطنت موریا کا ایک حصہ تھا

خاندان موریا کے بعد اس علاقے میں باختریوں اور یونانیوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ ان سلطنتوں کا صدر مقام جوناگڑھ تھا۔ جب ان بیرونی حکمرانوں کا زوال شروع ہوا تو یہاں کے مقامی راجپوت سرداروں نے انہیں مغلوب کر کے ملک بدر کر دیا۔ جب محمود غزنوی نے ۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء میں حملہ کر کے یہ سارا علاقہ فتح کیا تو یہ علاقہ انہی راجپوتوں کے قبضے میں تھا۔ سومناتھ کا مندر بھی جسے محمود غزنوی نے مسمار کیا تھا جس میں وہ مشہور بت جس کو محمود غزنوی نے توڑا تھا اسی علاقے میں تھا۔

محمود غزنوی اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد ایک مسلم فوجدار کے ہاتھ میں دے کر خود واپس چلا گیا۔ جسے بعد میں یہاں کے راجپوتوں نے اس علاقے سے نکال باہر کیا۔ ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء میں قطب الدین ایبک نے انہلواڑہ کی فتح کے بعد سورٹھ (کاٹھیاواڑ) (بشمول جوناگڑھ) پر چڑھائی کی لیکن خراج وصول کر کے واپس چلا گیا۔

اس کے بعد تقریباً سو سال تک کسی مسلمان حملہ آور نے اس علاقے پر حملہ نہیں کیا۔ اگرچہ شمال کی طرف سے مسلمان سیاحت کے لئے برابر یہاں آتے رہے۔ بعض مسلمانوں نے یہاں سکونت بھی اختیار کر لی۔

۶۹۷ھ/۱۲۹۷ء میں علاء الدین خلجی کے بھائی الماس بیگ الغ خاں نے سورٹھ پر حملہ کیا اور سومناتھ کو راجپوتوں سے چھین کر اس مندر کو زمین بوس کر دیا۔ لیکن اس نے چوڑاسما راجپوتوں سے جو جوناگڑھ پر قابض تھے کوئی تعرض نہ کیا۔ ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء میں سلطان محمد بن تغلق نے اس علاقے پر حملہ کر کے جوناگڑھ کا قلعہ فتح کر لیا۔ چنانچہ اسی وقت سے جوناگڑھ صوبہ گجرات کی عملداری میں آ گیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں ناظم گجرات نے جوناگڑھ میں ایک تھانہ قائم کیا۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے اس تبدیلی حالات سے پورے طور پر مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ ناظم گجرات ظفر خان نے ۷۹۷ھ/۱۳۹۴ء اور ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں سومناتھ پر سرکش راجپوتوں کو سزا دینے کے لئے حملہ کیا تھا۔ یہ راجپوت ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء تک اس بیرونی حکومت کے خلاف کوششیں کرتے رہے۔ چنانچہ ۸۷۱ھ/۱۴۶۷ء میں محمود بیگڑا نے راجپوتوں کے آخری فرمانروا کو شکست دے کر جوناگڑھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

محمود کو معزول کردہ راجہ کے خلاف جس نے اپنا کافی علاقہ دوبارہ واپس لے لیا تھا ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء اور ۸۷۴ھ/۱۴۷۰ء میں مزید دو حملے کرنے پڑے۔ ایک سال تک بڑی سخت لڑائی کے بعد آخر کار سلطان محمود جوناگڑھ پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی کے بعد ہندوؤں کی حکومت جوناگڑھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور شہر کا نام مصطفٰی آباد رکھا گیا۔ سادات، علماء و قضاۃ اور دیگر مشاہیر کو احمد آباد سے اس شہر میں آکر بس جانے کی دعوت دی گئی۔ قدیم قلعے کی مرمت کی گئی۔ نیز دولت مندوں کو بڑے بڑے مکانات، مسجدیں اور رفاہ عامہ کی عمارات بنانے کی ترغیب دلائی گئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں شہر کی عظمت و شان کو چار چاند لگ گئے۔ قلعہ اوپرکوٹ کی بستی جوناگڑھ ہی کہلاتی رہی لیکن نیچے کے نئے شہر کا نام مصطفٰی آباد کہلانے لگا۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء تک جوناگڑھ سلاطین گجرات کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد میں اس کو عبدالرحیم خانخاناں نے فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔

صوبہ گجرات کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے جوناگڑھ کا انتظام فوجداروں کے سپرد تھا۔ جنہیں ناظم مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک فوجدار شیر خان بابی نے جو نسلاً افغان تھا، ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء، ۱۷۳۸ء میں اپنے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایک دانشمند فوجی سردار تھا۔ اس نے اپنے بیس سالہ دور حکومت اپنی حکومت استحکام اور مضبوطی سے قائم کر لی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں محمد مہابت خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے بارہ سال حکومت کی ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۰ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا کمسن بیٹا محمد حامد خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ستائیس سال تک حکومت کر کے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں وفات پائی۔

جوناگڑھ کے اسی فرمانروا سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلی مرتبہ معاہدہ ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں ہوا۔ اس سے قبل جوناگڑھ اور اس کی باجگزار ریاستوں مانا ودر، مانگرول اور دیگر تعلقوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو چکا تھا۔ جس کی رو سے انہوں نے جوناگڑھ کی سیادت اور ان سے خراج وصول کرنے کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ یہ معاہدہ تسلیم کروانے میں انگریز ریذیڈنٹ مقیم بڑودہ کا بھی عمل دخل تھا۔ چنانچہ انگریزوں کا ملک کے اندرونی معاملات میں عمل دخل بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۱ء میں جوناگڑھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا تفوق پوری طرح تسلیم کر لیا۔ اور کمپنی نے خراج کی وصولی کا کام ریاست کی طرف سے اپنے ذمے لے لیا جوناگڑھ

Marfat.com

کا یہ فرمانروا ۱۸۴۰ء میں وفات پاگیا۔ اس کے بعد اس کا کم سن لڑکا اس کا جانشین ہوا۔ بعد کے فرمانرواؤں میں محمد رسول خان جو ۱۸۹۲ء تا ۱۹۱۱ء تک برسراقتدار رہا۔ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے دور حکومت میں جوناگڑھ میں ایک کالج، ایک کتب خانہ، عجائب گھر اور ایک جدید طرز کا ہسپتال، آب رسانی کا کارخانہ اور ایک یتیم خانہ قائم کیا۔ سومناتھ کے مندر کی مرمت کے لئے ایک معقول رقم مختص کی۔ اس کی وفات کے بعد ۱۹۱۱ء میں اس کا لڑکا محمد مہابت خاں چونکہ کم سن تھا۔ اس لئے ریاست کا نظم و نسق حکومت ہند نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب مہابت خان سن بلوغ کو پہنچا تو اس نوزیں گدی نشین کو ۱۹۲۰ء میں پورے اختیارات سونپ دیئے گئے۔ ۱۹۴۳ء سے ریاست جوناگڑھ کے ساتھ سردار گڑھ اور بانٹوہ کی باجگزار ریاستیں اور بہت سے دیگر تعلقے جوناگڑھ سے ملحق ہو گئے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب برطانوی اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہوگیا تو اس ریاست نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور اس کا اعلان کر دیا۔ ہندوستانی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی چنانچہ جب ریاست نے اپنا فیصلہ واپس لینے سے انکار کر دیا تو اسی سال نومبر میں ہندوستانی فوجوں نے ریاست پر ناجائز طور پر جبراً قبضہ کر لیا۔ نواب نے مع اہل و عیال پاکستان (کراچی) میں پناہ لی۔ اور اس نے ۱۹۶۰ء میں یہیں پر وفات پائی۔ جوناگڑھ کے الحاق اور قبضے کا جھگڑا ہندوستان اور پاکستان میں اب تک چل رہا ہے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ایجنڈے میں چلا آتا ہے۔

ریاست جوناگڑھ کا سب سے بڑا شہر جوناگڑھ ہندوستان کے سب سے خوشنما اور خوبصورت شہروں میں سے ہے۔ اس کا قدیم قلعہ، اوپر کوٹ برعظیم ہند و پاک کے مضبوط ترین پہاڑی قلعوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس شہر میں متعدد شاندار اور اعلیٰ درجے کی عمارات پائی جاتی ہیں۔ ان عمارات میں پہلے حکمرانوں کے اور ان کی بیگمات اور وزیر شیخ بہاء الدین کے مقبرے شامل ہیں۔ جو دکنی طرز تعمیر پر بنائے گئے تھے۔ ان مقبروں کی خصوصیت ان کے ان کے پہلوؤں کے دو دو مینارے ہیں جن پر چڑھنے کیلئے گھومتے ہوئے زینے باہر کی طرف بنے ہوئے ہیں۔ پورے برعظیم پاک و ہند میں اس طرح کے زینوں کا نمونہ اور کہیں نہیں ملتا۔

جوناگڑھ شہر میں دو بڑی لمبی چوڑی توپیں موجود ہیں۔ جنہیں بیرونی ترک جو یہاں کے حکمران کے ملازم تھے جوناگڑھ لائے تھے۔ یہاں پر ایک وسیع جنگل ہے جو بہت گھنا ہے اور گر جنگل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ امراء اور مقامی رئیسوں کی پسندیدہ شکارگاہ ہے۔ اسی ریاست کی حدود کے اندر سومناتھ کا مندر بھی ہے۔

جونپور ہندوستان کے صوبہ اترپردیش (شمال ہندوستان) میں دریائے گمتی کے کنارے ایک شہر جو ۲۵ درجے ۴۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۸۲ درجے ۴۲ دقیقے طول بلد مشرقی میں واقع ہے۔

جونپور کی بنیاد ۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں فیروز شاہ تغلق نے منیاچ کے قریب رکھی تھی۔ ہیکل کے مشابہ ہے۔ اس مسجد کا سب سے بڑا دروازہ ۲۴ر۹ میٹر اونچا ہے۔ ہر باب مسجد کے اندر ایک وسیع محراب دار حجرہ ہے جس میں روایتی طور پر بنی ہوئی تیزروں کی انیوں جیسی جھالریں ہیں۔ اس مسجد میں مینار نہیں ہیں۔ ایک اور مسجد خالص مخلص، جو ابراہیم

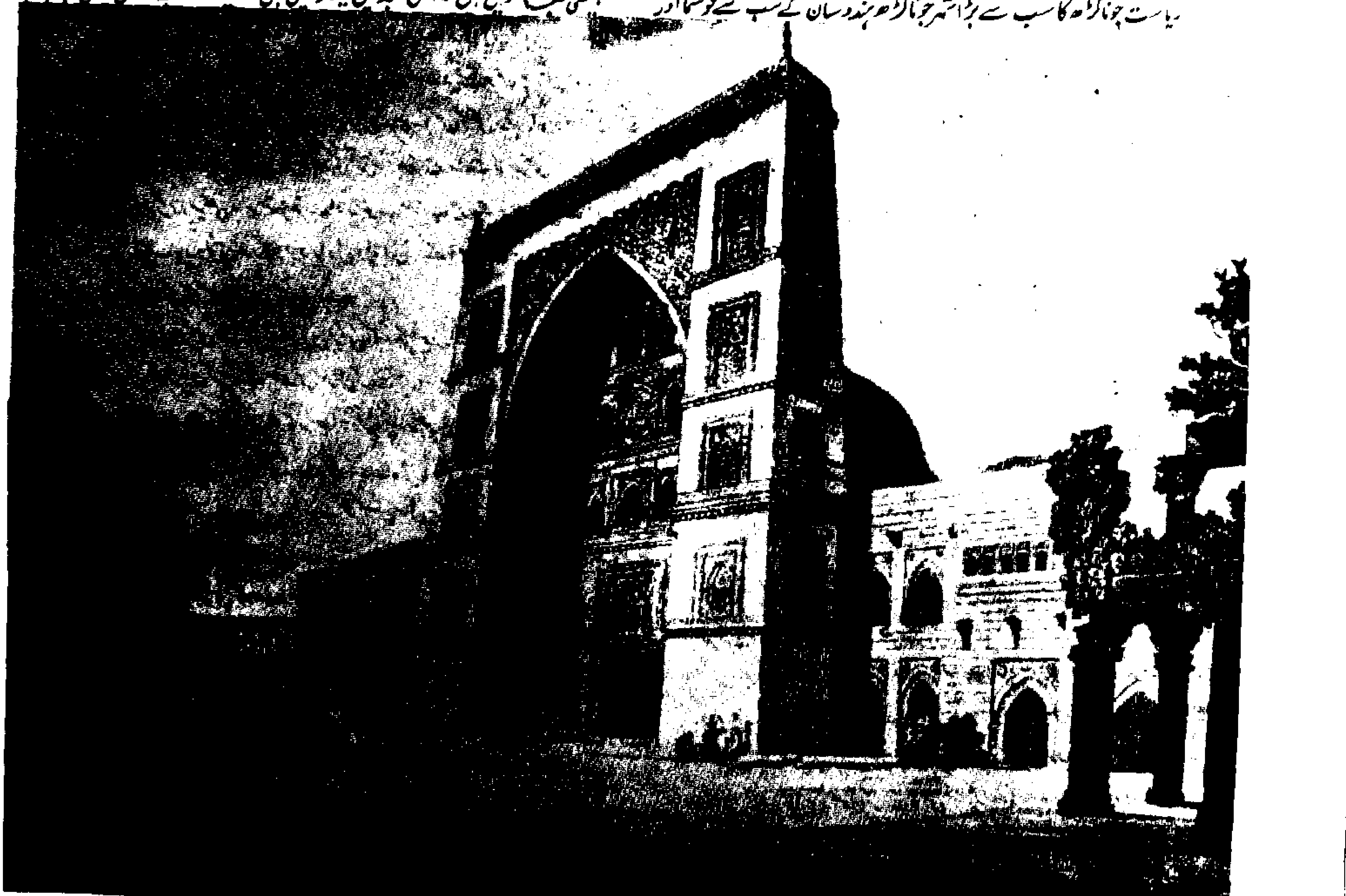

جامع مسجد جونپور

Marfat.com

کے قدیم الیوان نے تعمیر کی تھی۔ اسی عہد کی ہے۔ اس مسجد کے صرف مرکزی باب مسجد میرڈ اسیمبزل ایوان باقی رہ گئے ہیں۔ جو تمام دلیریکل اور تعمیری تزئین کے ہیں۔

اسی عہد کی ایک اور مسجد جو مسجد جھنجری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے وسطی دروازے میں سے صرف اس کی منقش دیوار باقی بچی ہے۔ جو جونپور کی سنگ تراشی کے نہایت نفیس کام سے بھری پڑی ہے۔

مسجد لال دروازہ جو شہر کے شمال جنوب میں واقع ہے۔ جونپور کی سب سے چھوٹی مسجد ہے۔ یہ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں تعمیر کی گئی تھی۔

جسے ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے برباد کیا تھا۔ مسلم مورخین کے نزدیک جونپور کا نام جونہ شاہ سے مشتق ہے جو تخت نشینی سے پہلے محمد بن تغلق کا لقب تھا۔

ناصرالدین محمود تغلق کے دور حکومت میں جب ملک پرآشوب حالات سے دوچار تھا تو مشرقی اضلاع کے ہندوؤں نے سلطنت دہلی کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں خواجہ سرا ملک سرور خواجہ جہاں نے محمود کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اسے بھیجے۔ چنانچہ خواجہ جہاں نے کویل (علی گڑھ)، اٹاوہ اور قنوج کو مطیع کر لینے کے بعد جونپور پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں وہ اودھ کی سلطنت کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔

۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں دہلی کے سلطان بہلول لودھی نے آخری شرقی سلطان حسین کو شکست دی اور اپنے لڑکے باربک کو جونپور کا حکمران بنایا نیز اسے شاہی لقب اور سکہ ضرب کرنے کی اجازت بھی دی۔ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں سکندر لودھی جب دہلی کا سلطان بنا تو جونپور کو بھی اس نے دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء، ۱۵۲۷ء میں ہمایوں نے اپنے باپ بابر کے لیے جونپور کو فتح کیا اور وہاں پر گورنر کا تقرر کیا گیا لیکن شیر شاہ سوری کی قوت بڑھ جانے اور گورنر جنید برلاس کی وفات کے بعد جونپور افغان گروہ کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ چنانچہ ۹۴۳ھ/۱۵۳۶ء میں ہمایوں نے ایک بار پھر مجبوراً جونپور پر چڑھائی کی اور اس پر قبضہ کیا۔

ہمایوں کی دہلی سے طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد مشرقی صوبوں پر سے اس کا قبضہ ختم ہو گیا تو ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کی فتح عظیم کے بعد اسے اور اس کے بیٹے عادل خان کو جونپور کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔

جب چنار نے ترقی کی تو جونپور کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ علی قلی خان کی جو ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء میں وہاں کا گورنر تھا، بغاوت (۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء) کے پہلے اسے اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ جب ۹۷۴ھ/۱۵۶۷ء میں علی قلی خان نے شکست کھائی۔ تو اکبر نے عارضی طور پر وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اور خانخاناں محمد منعم خان کو وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔

الہ آباد کی تاسیس کے بعد جونپور کی ساری اہمیت ختم ہو کر رہ گئی اور بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جونپور نوابان اودھ کے اور ۱۷۷۵ء میں انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

جونپور اپنی تاسیس کے زمانے سے لے کر شیر شاہ کے عہد تک اپنے علم و فضل کی وجہ سے "شیراز ہند" کہلاتا تھا۔ یہاں کے بعض حکمران روایتی انداز کے عالم و فاضل سے بڑھ کر شائستہ، نکتہ سنج اور صاحب ذوق تھے۔ اس کی مساجد میں آج بھی دینی مدارس موجود ہیں۔

جونپور کی یادگار عمارات میں فیروز شاہ کا قلعہ ہے۔ جو دریائے گومتی کے شمالی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی دیواریں پتھر کی ہیں جو کافی بلند ہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے مخروطی اور کروی برج تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان برجوں کو ۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے مسمار کر دیا تھا۔ انہی مسمار شدہ عمارات میں فیروز شاہ کے گورنر کا تعمیر کرایا ہوا محل چہل ستون بھی تھا۔

اسی گورنر کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد ابھی تک موجود ہے۔ جو اس نے اپنے قلعے میں تعمیر کرائی تھی مسجد کے صحن میں ایک منفصل مینار ہے جو تقریباً بارہ میٹر اونچا ہے۔

ان ہی قابل دید عمارات میں اٹلا مسجد بھی ہے۔ جس کی بنیادیں فیروز شاہ تغلق نے ہندوؤں کے مندر اٹلا دیوی کی جگہ رکھی تھی۔ اسے ابراہیم شرقی نے ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں تعمیر کرایا۔ یہ مسجد سب سے بڑی (۷،۸۰۰ مربع میٹر) اور سب سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کے لیوان کا مرکزی کھانچا جو ایک بہت بڑے برج سے ڈھکا ہوا ہے اور اسے صحن کی طرف سے ایک بلند مخروطی پھاٹک نے ڈھانپ رکھا ہے جو مصر کے باب

جونپوری، سید محمد (جمادی الاولیٰ ۸۴۷ھ/۱۰ ستمبر ۱۴۴۳ء - ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء) مہدی ہونے کا مدعی۔ والد کا نام سید خان تھا۔ وہ بڈھ اویسی اور بی بی آغا ملک کے نام سے بھی مشہور تھا۔ جونپور میں پیدا ہوا۔

سید محمد بچپن ہی میں بہت زیادہ ذہین اور غیر معمولی قوت حافظہ کا مالک تھا۔ اس نے سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس کے استاد شیخ دانیال چشتی نے اسے اسد العلماء کے خطاب سے نوازا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ جونپور سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوا۔ قیام مکہ معظمہ کے دوران میں طواف کرتے ہوئے اس نے اچانک اعلان کر دیا کہ وہی مہدی موعود ہے۔ مکہ کے علماء نے اس کے دعوے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اگلے سال وہ گجرات واپس آیا۔ احمد آباد میں اس کا ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء میں پہلی بار راسخ العقیدہ علماء کے ساتھ تصادم ہوا۔ جنہوں نے اس کے اس دعوے کو چیلنج کیا کہ خدا ان طبعی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ماحول کو اپنے خلاف پا کر وہ احمد آباد چلا گیا۔ لیکن ۹۰۵ھ/۱۴۹۹ء میں اس نے پٹن نے قریب ایک چھوٹی سی جگہ بڑھلی میں ایک بار پھر اپنے مہدی ہونے کے دعوے کو دہرایا اور بعض خود مختار حکمرانوں کو جن میں غیاث الدین خلجی (مالوہ) محمود بیگڑا (گجرات) احمد نظام شاہ (احمد نگر) شاہ بیگ (قندھار) اور میر ذوالنون (فراہ) کے حکمرانوں کو اس نے تبلیغی خط لکھے اور لکھا کہ یا تو اسے مہدی مان لیں یا اگر وہ جھوٹا ہو تو اسے مروا دیں۔ چنانچہ ان حکمرانوں نے اس کے دعوے مہدویت کو تسلیم کر لیا۔ لیکن یہ بات بھی علماء کو متاثر نہ کر سکی۔ جب علماء نے دیکھا کہ عوام میں اس کا اثر بڑھتا جا رہا ہے تو اس کی جلاوطنی کا مطالبہ کیا۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا پھرا۔ جب یہاں اسے اپنے دعوے میں ناکامی ہوئی تو وہ خراسان میں فراہ کے مقام پر آیا جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے پیرو زیادہ تر جنوبی ہند کے بعض علاقوں میں آباد ہیں جو ابھی اس کے مقبرے کی زیارت کرنے کے لیے فراہ میں جاتے ہیں۔

اس کے مرنے کے بعد اس کے پیروکاروں میں متعدد روحانی جانشین اور خلفاء ہوئے سب سے پہلا خلیفہ اس کا لڑکا سید محمود تھا۔ اس عرصے میں اس کے پیروکاروں نے اپنے کئی ایک مرکز قائم کیے۔ جنہیں وہ اپنی اصطلاح میں "دائرے" کہتے ہیں یہ دائرے زیادہ تر گجرات میں تھے۔ جہاں وہ مل کر مشترک زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ صرف آپس میں ہی لین دین کرتے تھے۔ ان کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت کو حکومت نے اپنے لیے خطرہ سمجھا تو حکومت نے ان پر سختی کرنی شروع کی۔ انہیں مرتد قرار دیا گیا اور ان کے خلیفہ کو قید میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ قید کی مشقتوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے ۹۱۸ھ/۱۵۱۲ء میں انتقال کر گیا۔ نیز جب گجرات کے علماء نے ان کے قتل کا فتوے دیا تو انہیں اور زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء میں سدراسن کے مقام پر گجرات کی فوج اور مہدویوں کے درمیان بڑے زور کا رن پڑا۔ جس میں ان کا خلیفہ خوندمیر اپنے بہت سے پیروکاروں

Marfat.com

کے ساتھ ٹھنڈا مار آگیا۔ اگرچہ علما کی مخالفت اور حکومت کی مزاحمت کے باوجود یہ تحریک بالکل ختم نہ ہو سکی۔

سید محمد جونپوری بہت نیک سیرت انسان تھا۔ عبدالقادر بدایونی جیسا انسان بھی جو اس کا سخت معترض تھا، اس کے تقوے، علم و فضل اور اخلاص کا قائل تھا اور اسے عظیم علما میں شمار کرتا تھا۔

دوسرے صوفیا کی طرح سید محمد نے بھی اپنے پیروکاروں کو دنیا سے کنارہ کش رہنے اور ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنے کا حکم دیا۔ وہ توکل، صحبت صالحین پر اور دنیا سے کنارہ کشی پر زور دیتا ہے۔

اس کے پیروکار ہجرت کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ سیاست سے کنارہ کش رہتے تھے۔ تاہم ان کی سرگرمیوں نے حکومت کو کارروائی کرنے پر مجبور کیا۔

سید محمد سرمایہ پرستی، ذخیرہ اندوزی اور جمع مال کو بھی ایک غیر اسلامی اور لائق مذمت فعل قرار دیتا ہے۔

اس کی تحریک کی ناکامی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس کے پیروکاروں کی ملت کے سواد اعظم سے علیحدگی۔

۲۔ بانی تحریک سید محمد کو مہدی موعود تسلیم کرانے پر ان لوگوں کا اصرار

۳۔ علما اور حکومت کی مخالفت

۴۔ شمالی ہند میں قابل قیادت کی کمی۔

۵۔ دکن میں ان لوگوں کا سیاست میں الجھ کر رہ جانا۔

سید محمد کے پیروؤں کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں موجودہ دور میں سابق ریاست حیدرآباد (دکن)، میسور، جے پور اور گجرات میں موجود ہیں۔ جو لوگ پاکستان ہجرت کر کے آ گئے ہیں انہوں نے شہداد پور کے مقام پر ایک "دائرہ" قائم کیا ہے۔

مادہ، اصل ہر شے، فارسی اور عربی زبانوں میں اس کے معنی قیمتی پتھر کے بھی ہیں۔ یہ جوہر بلفظ فلسفۂ ارسطالیس کی ایک بنیادی اصطلاح ہے۔ مادے کو اس کے عام مفہوم کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حقیقی معنی میں آتا ہے یعنی وہ چیز جو حقیقت میں موجود ہو۔ افلاطون کے نظریے کے مطابق جزئی یا چند روزہ اشیاء جو عالم محسوسات میں نظر آتی ہیں۔ محض نمود ہیں۔ اس کی حقیقت اس عالم میں ہے جو ماورا ہے اور وہ غیر متغیر اور قدیم تصورات کا عالم ہے۔

ارسطالیس اور اس کے مسلمان متبعین کا نظریہ افلاطون کے نظریے کے خلاف ہے ان کے نزدیک عالم محسوسات حقیقت رکھتا ہے اور افراد پر مشتمل ہے۔ اسی لئے مادہ (جوہر) اپنے سب سے وسیع اور گہرے مفہوم کے لحاظ سے ارسطالیس کی فہرست مقولات میں سب سے پہلا اور سب سے اہم مقولہ ہے جس سے مراد ایک محسوس اور ٹھوس جسم ہوتا ہے۔ اس مفہوم کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ عالم محسوس کی تمام اشیاء، تمام اجسام، اجزائے اجسام نباتات اور حیوان سب جوہر ہیں۔ منفرد جوہر بعض اوقات اول کہلاتے ہیں تاکہ انہیں دوسرے جواہر یعنی انواع و اجناس سے ممتاز کیا جائے۔ لیکن ارسطالیس اور اس کے مکتبۂ فکر کے مطابق ہر ایک ٹھوس اور معین جسم دو چیزوں مادہ اور صورت سے مرکب ہے۔ اور اگرچہ مادہ بغیر صورت کے موجود بذاتہ نہیں ہو سکتا اور نہ صورت ہی، کم سے کم عالم تحت القمر یعنی عالم ارضی میں تاہم دونوں کی حقیقت خارجی ہے۔ مادہ اپنے معقول مفہوم کے لحاظ سے مادہ اولیٰ اور صور کی تہ میں پنہاں شے ہے اور بذاتہ کوئی معین صورت نہیں رکھتا۔ تاہم چونکہ یہ صورتوں کا حامل ہے جو کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی حقیقتیں ہیں اس لحاظ سے بڑا بنیادی مقام رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں جوہر محض ایک استعداد یا قوت ہے لیکن اس لئے وہ بالفعل اصل نہیں ہے اس لئے صورتیں وجود کی اصل نہیں ہو سکتا، بلکہ قدیم اور ازلی ہے۔ صورت، کائنات کا ماہیت اور حقیقت ہے اور وہ ہر فرد جزئی کی ایک عمومی خصوصیت ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہر فرد انسان ایک انسان ہے۔ اور انسان ہونا اس کی ماہیت ہے جو اسے دیگر حیوانات سے جدا کرتی ہے اور یہی اس کے انسان ہونے کی ایک علت ہے۔ اسی کو ارسطالیس اور اس کے دبستان کے لوگ "علت صوری" کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ ذوات ارسطالیس کے نظریے کے مطابق بذاتہ موجود نہیں کیونکہ وجود تو فقط جزئیات یا افراد کا ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ انہیں ایسی حقیقتیں مانتا ہے جو حادث چیزوں کی حقیقت سے اعلیٰ ہیں۔ کیونکہ وہ علتیں ہیں اور علت اس کے نزدیک اپنے معلول سے زیادہ بلند مرتبہ ہوتی ہے پھر یہ قدیم ہیں اور اس لحاظ سے بھی یہ افراد کہلانے کی بہ نسبت جوہر کہلانے کی زیادہ مستحق ہیں۔ لیکن ان ذوات کو جو خود موجود نہیں مگر قدیم ہیں حادث موجودات کی علت صوری کیسے مانا جا سکتا ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے نو افلاطونی فلسفے کے نقیب مسلم فلاسفہ ارسطالیس کو چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان ذوات کا حقیقی اور قدیم سرچشمہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یا اس کے خیال کرنے میں قائم ہے یہ اللہ ہی کا خیال ہے جو تمام اشیاء کی علت صوری اور علت العلل ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی وحدت کامل اس کے اپنے خیال سے متاثر نہیں ہوتی۔ اللہ کا شعور ذاتی ان ذوات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اللہ جو عالم ہے اس کی ذات میں علم اور معلوم سب ایک ہیں۔

نیز یہ کہ اس عالم میں وہ خفیہ جوہر ہے جسے العقل الفعال کہتے ہیں۔ یہ غیر مولود اور غیر فانی ہیں۔ یہ ایک غیر مادی صورت ہے جو عقل انفعال سے مل کر انسانی ہستیوں میں افکار کو حرکت میں لاتی ہے۔ اس عالم سے اوپر اور بھی عقول ہیں جو جواہر ہیں اور یہی کرہ ہائے افلاک کو متحرک کرنے والی ہیں۔ پھر سب سے اوپر چوٹی پر اللہ تعالیٰ ہے جو الحق اور صحیح ترین معنی میں جوہر ہے۔ تاہم ارسطالیس کے نزدیک اللہ تعالیٰ تو ایک قدیم کائنات کا قدیم حرکت دینے والا ہے۔ مگر وہ اس کا پیدا کرنے والا نہیں۔ نہ کرہ ہائے افلاک حرکت میں لانے والے عقول اپنی ذات یا وجود میں اس کے محتاج اور تابع ہیں لیکن مسلم فلاسفہ کے نزدیک نو افلاطونی نظریہ تنزلات کے زیر اثر، واجب الوجود ایک قدیم اور مستقل خالق عالم ہے اور عالم اس کے ساتھ موجود ہے۔ اور قدیم ہے۔ ان کے نزدیک وحدت الٰہی سے کثرت عالم پیدا ہوتی ہے اور اس کا ذریعہ ہے وسائط عقول اور نفوس کے سلسلۂ تنزلات کا قدیم و لازمانی ظہور۔ یہی مجرد ہستیاں کرہ ہائے افلاک کو حرکت میں لاتی ہیں اور اس سلسلۂ عقول کی آخری کڑی عقل فعال یعنی واہب الصور ہے۔

امام غزالی نے اس کی بنیادی کمزوریوں پر نظر ڈالی ہے۔ اگر عالم کثرت وسائط سے حاصل ہوا ہے تو اللہ کے علاوہ علل العلل اور بھی ثابت ہوتی ہیں اور اگر خود اللہ سے حاصل ہوا ہے تو درمیانی وسائط بے کار ہیں۔ اگر اللہ سب سے برتر قدیم اور وجود عالم کی علت اولین ہے تو عالم کے تمام تغیرات اسی سے صادر ہوں گے۔ ان کا ماخذ مادہ نہیں ہو سکتا جو پہلے سے موجود ہو۔ کیونکہ اللہ سے پہلے کوئی ایسی ہستی ہے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ مادہ بلا صورت موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ نیز یہ کہ قدیم فلاسفہ کی ساری الجھنیں مادے کو قدیم ماننے کا نتیجہ ہیں۔ حالانکہ وہ حادث ہے۔

اشاعرہ کے نزدیک جوہر محض چند اعراض کی اساس عنصر ہے۔ جس کا جی چاہے اسے مادہ کہہ لے مگر یہ وہ مادہ نہیں جسے ارسطالیسی فلسفہ ایک صاحب استعداد و قوت ذات مانتا ہے، بلکہ فقط ایک ایسی شے جو اعراض بردار یا حامل اعراض ہے اسے جسم بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اساس عنصرہ جواہر سے مرکب ہے جو باہم اکٹھے ہو کر جسم بن جاتے۔ پھر بھی یہ

Marfat.com

اصطلاح کسی قدر مبہم ہی رہتی ہے۔ کیونکہ وہ جوہر کا اطلاق جزو لاتیجزی پر کرتا ہے۔ جب کہ اجزاء لاتیجزی جن سے مل کر عالم بنا ہے۔ ان کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے ان کا دارومدار صرف اللہ تعالےٰ کی قدرت پر ہے۔ جو کہ ہر وقتی جوہر یا اپنی جوہر دنیا کی دم بدم تخلیق کرتا رہتا ہے۔ نیز چونکہ علم کلام میں جوہر کے معنی خالص مادی شے ہے ہیں اس لئے اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالےٰ پر نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمان فلاسفہ اس بات میں بھی ارسطاطالیس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ارسطاطالیس روح یا نفس کو بھی جوہر کہتا ہے کیونکہ وہ ہر زندہ شے کی علت صوری ہے تاہم وہ اسے بدن سے الگ کوئی علیحدہ شے تسلیم نہیں کرتا۔ یعنی ایسی شے جو بدن سے آزاد ہو اور اس کی فنا کے بعد باقی رہے۔ اس کے مقابلے میں مسلم فلاسفہ روح یا نفس کو جوہر قائم بنفسہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی ایسا جوہر جو اپنا وجود رکھتا ہے اور اس کا جسم پر انحصار نہیں۔

جوہر صقلی (ـــ؟ ـــ ۲۰ ذوالقعدہ ۳۸۱ھ/ ۲۸ اپریل ۹۹۱ء) ایک سپہ سالار اور منتظم جو شمالی افریقہ اور مصر میں فاطمی سلطنت کے بانیان میں سے تھا

جوہر کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ جوہر فاطمی خاندان کا ایک آزاد شدہ غلام تھا اور سلاوی نسل سے تھا۔ اس کا باپ عبداللہ غالباً غلام تھا ۳۴۷ھ/ ۹۵۸ء میں جب المعز نے فیصلہ کیا کہ اپنی پوری طاقت ایک فوجی مہم میں لگا دے۔ جس سے سارا شمالی افریقہ اس کے زیرنگیں آجائے تو اس نے اس مہم کی قیادت اپنے کاتب جوہر کو دی تاکہ وہ جوہر کو دوسرے لوگوں کی نظر میں یہ ثابت کر سکے کہ وہ فاطمی سپاہیوں میں ماہر ترین اور قابل شخصیت ہے۔

جوہر نے اس مہم میں جو مغرب اوسط اور مغرب اقصیٰ میں عقبہ بن نافع کی مہم کے تقریباً ۲۸۰ سال بعد عمل میں آئی تھی۔ مسلم افواج کی کامیاب مہموں میں سب سے زیادہ کامیاب تھی۔ اگرچہ جوہر نے جو فتوحات حاصل کیں ان کے اثرات دیرپا نہ تھے۔ جس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

ایک تو اس علاقے کی نوعیت بڑی دشوار گذار تھی اور دوسرے دشمن کی طاقت بہت زیادہ تھی۔

تاہرت کے قریب اس کا زناطیوں کی ایک بڑی فوج سے مقابلہ ہوا۔ جوہر نے اس لڑائی میں کامیابی حاصل کی اور زناطیوں کا قائد یعلیٰ بن محمد جو افکن کا گورنر تھا اور بنی امیہ کا طرفدار تھا اس لڑائی میں مارا گیا۔

اس لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد جوہر نے فاس پر چڑھائی کرنے کے بجائے یا اس علاقے میں بنو امیہ کے دوسرے قلعوں کو فتح کرنے کے بجائے آسان مہموں پر لگایا۔ چنانچہ اس نے اپنا رخ جنوب مشرق کی طرف کیا اور سجلماسہ کی چھوٹی سی ریاست پر حملہ کر دیا۔ اور وہاں کے حاکم محمد بن الفتح بن میمون جو مدرارکہ مار بھگایا اور بعد میں اسے قتل کر دیا۔ جوہر نے اس علاقے میں سال بھر سے زیادہ قیام کیا۔

۳۴۹ھ/ اکتوبر ۹۶۰ء میں اس نے فاس کا رُخ اختیار کیا۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ایک ماہ بعد ایک زبردست حملہ کر کے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح سے سارا مغرب اقصیٰ کچھ دنوں کے لئے فاطمیوں کے زیر اقتدار آگیا۔ جوہر چند ماہ کے بعد قیروان سے ایک فاتح کی حیثیت سے لوٹا۔ اور اپنے ساتھ کچھ قیدی اور بیش قیمت مال غنیمت لایا۔

المعز جوہر کی ان فتوحات سے بہت خوش ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ جوہر کی مدد سے وہ مصر فتح کر سکتا ہے۔ جس کی فتح کا خواب فاطمی شروع دن سے دیکھ رہے تھے۔

۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء سے ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء تک جوہر کے بارے میں تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ ۳۵۸ھ/ ۹۶۹ء میں وہ ایک بار پھر میدان جنگ میں نظر آتا ہے۔ اس مرتبہ المعز نے مصر پر فوجی چڑھائی کے لیے قائد عسکر منتخب کیا۔ بقول اس کے "واللہ اگر یہ جوہر اکیلا ہی اٹھ کھڑا ہو تو مصر فتح کرے گا۔ اور ہم اپنے معمولی سادہ لباس ہی میں اس سرزمین کے اندر بغیر لڑے بھڑے داخل ہو جائیں گے۔ اور اس قابل ہو جائیں گے کہ ابن طولون کی ویران شدہ قیام گاہوں میں جا بسیں اور ایک ایسا شہر تعمیر کریں جو ساری دنیا پر غالب آجائے۔"

چنانچہ چار ماہ کے اندر جوہر مصر کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ شعبان ۳۵۸ھ یکم جولائی ۹۶۹ء میں فسطاط کا حاکم بن گیا۔ اسے ذرا جیزہ پر معمولی سی لڑائی لڑنا پڑی جوہر اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ مصری عوام کی ہمدردیاں کس طرح حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس نے عوام کو بڑے اچھے شاندار اعلانات پڑھ کر سنائے نیز جعفر بن الفرات کو اپنا وزیر بنا لیا۔ دوسرے دن اس نے نئے دارالسلطنت قاہرہ کی بنیاد رکھی جو بغداد کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا شہر بنا۔ اس کے ایک سال بعد جوہر نے جامع الازہر کی بنیاد ڈالی۔

جوہر مصر میں فاطمی سلطنت قائم کرنے کے بعد چار سال سے زائد مصر کا تنہا گورنر رہا۔ اپنی چار سالہ گورنری کے دوران میں جوہر نے بحیثیت ایک منتظم اپنی قابلیت اور بیش بینی کا ثبوت دیا۔ اس کو مصر کے عوام کی مکمل طور پر ہمدردیاں حاصل تھیں۔ اس نے ملک کی مالی حالت کو جو اخشیدیوں کے آخری عہد میں بری طرح ابتر ہو چکی تھی درست کیا جوہر کو اس نئے صوبے کے انتظامی کام کے علاوہ قرامطہ کے خطرے کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔

قرامطہ اور ان کے مددگاروں سے جنگ کے دوران میں جوہر کو حجاز بھی فاطمی حکومت میں شامل کرنے کا موقع مل گیا۔

۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں فاطمیوں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا چار سالہ گورنری کے بعد جب المعز ۱۷ محرم ۳۶۲ھ/ ۷ اکتوبر ۹۷۲ء میں قاہرہ میں داخل ہوا تو کچھ عرصے بعد اس نے جوہر کو برطرف کر دیا۔

۳۶۸ھ/ ۹۷۸ء کے بعد سے جوہر کا نام سننے میں نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ۳۸۱ھ ۹۹۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ برطرفی سے اپنی موت تک کا زمانہ اس نے عبادت الٰہی میں بسر کیا۔ اس کا ایک لڑکا حسین خلیفہ الحاکم کا سپہ سالار تھا جو بعد میں خلیفہ کے خلاف سازشوں کے نتیجے میں مارا گیا

جوہر، مولانا محمد علی (۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء ـــ ۱۳۵۰ھ/ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء) ایک عالم دین۔ مسلمانوں کے لیڈر۔ جرنلسٹ۔ مولانا کے والد کا نام ریاست رام پور میں پیدا ہوئے۔

محمد علی دو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے کی۔ پہلے بریلی کے اسکول میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ وہاں سے انگلستان گئے اور آکسفورڈ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

ولایت سے آنے کے بعد کچھ دن تک رام پور کے محکمہ تعلیم میں ملازم رہے۔ وہاں سے بڑودہ چلے گئے اور پھر نوساری میں کمشنر مقرر ہو گئے۔ بڑودہ میں تقریباً چھ سات سال ملازمت کی۔ مضامین لکھنے کا شوق یہیں سے پیدا ہوا۔

بعض باتوں کی وجہ سے وہ بڑودہ کی ملازمت سے دل برداشتہ سے ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے دو سال کی چھٹی لے لی اور کلکتہ چلے گئے۔ اور وہاں سے ایک ہفتہ وار

Marfat.com

اخبار "کامریڈ" کے نام سے جاری کیا۔ چنانچہ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء میں "کامریڈ" کا پہلا پرچہ نکلا۔ اگر دیکھا جائے تو مولانا محمد علی جوہر کی پبلک لائف صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ ۲۰ سال تک ان کی ہنگامہ پرور شخصیت دنیا کے سامنے رہی۔ بالآخر لندن میں جہاں وہ برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبہ آزادی پیش کرنے کے لیے گئے تھے کو وہیں انتقال کر گئے۔ تدفین کی غرض سے آپ کی میت بیت المقدس لے جائی گئی اور وہیں آپ دفن ہوئے۔

مولانا محمد علی جوہر

ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے بے انتہا مظالم سہے۔ جیلیں کاٹیں۔ تحریک عدم تعاون کی پاداش میں کئی سال جیل میں رہے۔ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت کے بانی مولانا محمد علی جوہر ہی تھے۔ ترک موالات کی تحریک میں بھی وہ مسٹر گاندھی کے برابر کے شریک تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی جس نے قابل تعریف قومی خدمات انجام دیں مولانا ہی کی تخلیق ہے۔ مولانا انڈین نیشنل کانگرس میں بھی رہے۔

اس کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا۔ پھر ولولہ اور آخر میں جنون یہی جنون تھا جو کامریڈ کے مضمون پر اور جامع مسجد کے ممبر پر قلم اور زبان سے اہل احتساب کو دعوت گیر و دار دیا تھا۔

مولانا جوہر شروع شروع میں یعنی کامریڈ کی ابتدائی زندگی میں انگریزوں کے بالکل مخالف نہ تھے۔ ان کے بہت سے دوست جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان سب سے مولانا کے تعلقات دوستانہ رہے۔ مگر نظر بندی کے زمانہ میں ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا۔ اور انھیں انگریزوں سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی۔ اور انھوں نے طے کر لیا کہ اب اپنے مادر وطن کو انگریزوں سے آزاد کرا کر ہی دم لیں گے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ میرے خیال میں وہ سب سے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے کانفرنس میں بیٹھ کر انگریزوں سے للکار کر کہا کہ یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہندوستان سے برطانوی تسلط نابود ہو کر رہے۔

یہ ان کی اسلام اور اپنے وطن سے محبت ہی تھی کہ گول میز کانفرنس میں انگریز دشمنی کے باوجود شرکت کی۔ ان کی شرکت ان کی حب الوطنی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ وہ اس وقت سخت بیمار تھے اور جہاز میں اسٹریچر پر لٹا کر لے جائے گئے تھے۔ روانگی سے پیشتر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ مرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ لیکن ایک بیان میں انھوں نے کہا تھا کہ حکومت نے صلح و آشتی کا جو دروازہ کھولا ہے میں اسے بند کرنا نہیں چاہتا۔

مولانا کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان کا ہر کام (دوستی و دشمنی) اللہ کے لیے تھا۔ نظر بندی کے زمانے میں جب سپرنٹنڈنٹ پولیس، سی آئی ڈی کے افسر اعلیٰ کھایار پر آپ سے ایک عہدنامے پر دستخط کرانے کے لیے آیا جس میں یہ وعدہ درج ہو کہ مولانا غیر آئینی طریقوں اور تشدد سے ہمیشہ محترز رہیں گے۔ تو مولانا جوہر نے اس عبارت میں یہ اضافہ کیا کہ سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں گے تو اس صورت میں میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا۔ حکومت وقت نے اس عہدنامے کو قبول نہیں کیا اور دونوں بھائیوں کو مزید دو سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ بیک وقت لیڈر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، مقرر، مورخ اور زبردست انشا پرداز تھے۔

انشا پردازی کے میدان میں انھوں نے انگریزوں تک کو شکست دے دی۔ ان کے اردو کے مضامین بھی بڑے روح پرور ہیں۔ بقول سید محفوظ علی بدایونی: "مولانا محمد علی خوش نصیب شخص تھے جنھیں جینا بھی خوب آتا تھا اور مرنا بھی خوب آیا۔ جو عملاً دکھلا گئے کہ زندگی چاہے شروع اپنے ذاتی عیش کے خیال سے کی جائے مگر ختم دوسروں کے آرام کی خاطر ہونی چاہیے۔ چونکہ قسمت میں اس کے خدا پرست مسلمان کی زندگی لکھی تھی اور ایک مجاہد کی موت وہ اللہ کے عاشق تھے۔ اللہ کے رسول کے عاشق تھے رسول کی امت کے عاشق تھے۔"

جوہری، ابونصر (۔۔۔ ؟ ۔۔۔ ۳۹۸ھ/۱۰۰۸ء یا ۴۰۰ھ/۱۰۱۰ء) اسماعیل بن حماد ایک مشہور لغت نویس۔ فاراب کے صوبے میں پیدا ہوئے جو سیر دریا کے مشرق میں واقع تھا۔ ترکی الاصل تھا۔ اپنے ماموں ابوابراہیم اسحاق فارابی سے گھر میں تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بغداد چلے گئے۔ جہاں پر ابوسعید حسن بن عبداللہ سیرافی اور ابوعلی حسن بن احمد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ انھوں نے عربی میں تبحر پیدا کرنے کے لیے عراق و شام کی سیاحت کی اور حجاز تک گئے۔ اس تمام سفر میں ان کی تمام توجہ ربیعہ اور مضر قبائل کے مخصوص محاورے کی جستجو میں مرکوز تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مشرق کا رخ کیا اور کچھ عرصہ دامغان میں جو البرس سے نیشاپور کو جانے والی سڑک کے کنارے ایک قصبہ ہے ابوعلی حسن بن علی کے پاس گزارا۔ خراسان کے دارالحکومت میں جا کر انھوں نے عربی زبان، نحو اور خطاطی کی تعلیم دی۔ انھوں نے خطاطی میں بہت شہرت حاصل کی۔ یہاں تک کہ ان کے خط اور مشہور ابن مقلہ کے خط میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ انھوں نے نیشاپور میں وفات پائی۔ انھوں نے جنونی حالت میں اپنے مکان کی چھت سے گر کر وفات پائی۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔

جوہری کے شاگردوں میں اسماعیل بن محمد بن عبدوس الرہان نیشاپوری، ابوسہل محمد بن علی بن محمد ہروی کے نام شامل ہیں۔

Marfat.com

جوہری کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ ثعالبی اور یاقوت نے ان کے بعض اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

جوہری کی تصانیف یہ ہیں۔ "المقدمہ فی النحو"۔ "عروض الورقہ"، "تاج اللغۃ و صحاح العربیہ"، "دیوان الادب فی اللغۃ"، "لغت اعزدن"، "صحاح"

جویریہ (م ۵۰ھ — ۵۶ھ/۶۷۵ء) ام المومنین ان کے والد کا نام حارث بن ابی ضرار الخزاعی تھا جو قبیلہ بنو مصطلق کے سردار تھے۔ غزوہ بنو مصطلق میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے پاس آئیں۔ یہ غزوہ ۵ھ/۶۲۶ء میں واقع ہوا تھا۔

مسلمانوں نے یک دم حملہ کیا تو بنو مصطلق کے دس آدمی مارے گئے۔ باقی تمام لشکر جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ انھی جنگی قیدیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں جو حضرت ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں۔ لیکن آنحضورؐ نے حضرت جویریہ کی درخواست پر ان کے مالک قیس بن ثابت سے خرید کر آزاد کر دیا۔ پھر آپؐ نے بنو مصطلق کی تالیف قلب اور تکریم کے لئے اپنی زوجیت کے شرف سے نوازا۔ اس معزز رشتے کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ آنحضورؐ آپؓ کا نکاح آپؓ کی ساری قوم کے لئے بڑا بابرکت ثابت ہوا۔

آپؓ کا اصل نام برہ تھا۔ آنحضورؐ نے اسے بدل کر جویریہ رکھا۔ حضرت جویریہؓ کے پہلے خاوند کا نام سافع بن صفوان تھا جو اسی جنگ میں کام آیا تھا۔ بعض نے آپ کے پہلے خاوند کا نام صفوان بن مالک اور ابن حزم نے عبداللہ بن جحش الاسدی بتایا ہے۔

جب آنحضورؐ کے عقد میں آئیں تو اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ آنحضورؐ نے حضرت جویریہ سے نکاح کر کے دشمنوں کے ساتھ فراخدلی، حسن سلوک اور بردبارانہ رویہ اختیار کرنے کی بے نظیر مثال قائم کی۔ اس سلوک کی بنا پر آپؓ کے والد حارث بھی آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔

حضرت جویریہؓ سے صرف سات احادیث مروی ہیں۔ جن میں سے ایک صحیح بخاری اور دو صحیح مسلم میں ہیں۔ آپؓ سے حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت جابرؓ نے احادیث روایت کی ہیں۔

آپؓ نے پینسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور بعض روایات کے مطابق ستر سال کی عمر میں۔ آپؓ کی نماز جنازہ والی مدینہ مروان بن الحکم نے پڑھائی تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور حکومت میں حضرت جویریہؓ کے لئے چھ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا تھا۔

جوین ایران کے کئی ایک مقامات کا نام۔ (۱) اردشیر خرہ کا ایک گاؤں۔ یہ شیراز سے پانچ فرسنگ پر ارجان جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اسے عام طور پر جویم اور موجودہ زمانے میں گویم کہا جاتا ہے۔ نیز یہ جویم ابی احمد سے ایک علیحدہ مقام ہے جسے موجودہ دور میں جُم کہتے ہیں۔

(۲) نیشاپور کے علاقے کا ایک ضلع جسے آج کل گویان بھی کہتے ہیں۔
یہ بسطام سے جانے والی ایک کاروانی شاہراہ پر جاجرم اور بیہق کے درمیان واقع ہے۔ اس ضلع کا صدر مقام آزادوار تھا۔ بعد میں فریومد اس کا صدر مقام بنا۔ یہ سب گاؤں تھے جو تمام کے تمام شمالی نصف حصے میں تھے۔ جنوبی نصف حصہ بالکل غیر آباد تھا۔

جوین کا میدان شمال اور جنوب میں پہاڑیوں کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے جو آج بھی سبزوار کے ضلع کا ایک حصہ ہے۔ اس میں تقریباً ۶۵ چھوٹے چھوٹے شہر ہیں یہ شہر دریائے جوین کے کنارے دور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اس وادی کے درمیان آزادوار کے گاؤں کے قریب قدیم دارالسلطنت کے کھنڈر ملتے ہیں۔ آج کل مرکزی شہر جغتے ہے جو اس کے جنوب مشرق میں جنوبی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے

(۳) جوین یا گوین سجستان میں ایک قلعہ بند مقام
یہ لاش سے تین سے پانچ کلومیٹر شمال کی جانب فراہ رود کے کنارے واقع ہے۔ یہ مقام اپنے موجودہ نام سے قدیم اور قرون وسطیٰ کے سیاحت ناموں میں ملتا ہے۔

لاش اور جوین کی اہمیت کا دار و مدار اب بھی اس بات پر ہے کہ افغانستان کی جانب سے قندھار اور ہرات کی سڑکیں ایران کی طرف سے مشہد، یزد اور ناصر آباد کی سڑکیں یہاں آکر ملتی ہیں۔

بقول عرب جغرافیہ نویس ہرات سے زرنج جانے والے سڑک پر جوین خارجیوں کا ایک نہایت مضبوط و مستحکم قلعہ تھا۔

یہ ایک اونچے مقام پر ایک زرخیز میدان کے بیچ میں جو کھنڈروں سے ڈھکا پڑا ہے واقع ہے۔ جس کے ارد گرد مٹی کی ایک چوکور دیوار کھینچی ہوئی ہے۔ جوین لاش کے مستحکم مقام سے جو ایک چٹان پر واقع ہے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی میں جوین کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ اور روبہ تنزل دکھائی دیتا تھا۔ موجودہ دور میں بھی اس علاقے میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔

جوینی، ابوالمعالی (۱۸ محرم ۴۱۹ھ/۱۷ فروری ۱۰۲۸ء — ۲۵ ربیع الآخر ۴۷۸ھ/۲۰ اگست ۱۰۸۵ء) ایک مشہور عالم دین جن کا تعلق اشاعرہ سے تھا۔

عبدالملک نام اور امام الحرمین لقب تھا۔ مشہور شافعی عالم دین۔ ابو محمد عبداللہ جوینی کے فرزند تھے۔ بشتنکان نامی گاؤں میں نیشاپور کے نواح میں پیدا ہوئے

انیس سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات کے بعد ان کا سلسلۂ درس و تدریس سنبھالا۔ جب طغرل بیگ سلجوقی کے وزیر عمید الملک کندری نے اشاعرہ کی مخالفت کی اور منبروں سے بھی ان کی مخالفت شروع ہوئی تو ابوالقاسم قشیری کی طرح جوینی بھی ترک وطن کر کے بغداد چلے گئے۔ اس کے بعد ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں وہ حجاز چلے گئے اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں چار سال تک درس دیتے رہے۔ اسی وجہ سے انہیں امام الحرمین کہا جانے لگا۔ پھر جب سلجوقیوں کے ہاں وزیر نظام الملک کو اقتدار حاصل ہوا تو وہ اشاعرہ کا طرفدار تھا۔ اس نے تمام تارکین وطن کو واپس بلایا چنانچہ جوینی بھی نیشاپور واپس آگئے۔ نظام الملک نے ان کے لئے نیشاپور میں ایک خاص مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسہ نظامیہ رکھا۔

امام غزالی اپنی عمر کے آخری حصے میں کچھ مدت کے لئے اس مدرسے میں معلم رہے۔

جوینی آخر عمر میں بیمار ہو کر اپنے پیدائشی گاؤں میں چلے گئے۔ چنانچہ وہیں پر ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کے شاگردوں میں امام غزالی جیسے عالم ہیں۔

جوینی نے اس دور میں قلم اٹھایا جو قدیم اشعری دبستان اور اس دبستان کے درمیان کا زمانہ تھا۔ جس کو ابن خلدون نے دبستان جدید قرار دیا ہے۔ جوینی کی

Marfat.com

تحقیقات اصول فقہ اور علم الکلام کے درمیان بٹی ہوئی تھیں۔ ان کی تصانیف میں "کتاب الورقات فی اصول الفقہ" جس کی شرحیں گیارہ صدی ہجری/ سترہ صدی عیسوی تک برابر لکھی جاتی رہیں۔ "کتاب البرھان فی اصول الفقہ" علم کلام پر "الشامل" جو عظیم تصنیف ہے۔ "کتاب الارشاد الیٰ قواطع الادلۃ فی اصول الاعتقاد" ہیں۔

جوینی، ابومحمد (۔۔۔ ۔ ۴۳۸ھ/۱۰۴۷ء) ایک شافعی عالم عبداللہ بن یوسف بن محمد امام الحرمین آپ کا لقب تھا۔ اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ نیشاپور میں گذارا اور نیشاپور ہی میں وفات پائی۔

آپ تفسیر، فقہ اور لغت کے جید عالم تھے۔ ابوالمعالی عبدالملک مشہور عالم آپ کا بیٹا تھا۔ آپ کو فروق المسائل سے زیادہ دلچسپی تھی۔ آپ کی تصانیف "الوسائل فی فروق المسائل" اور "الجمع والفروق" شافعی فقہ کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

جوینی، شمس الدین محمد (۔۔۔ ۔ ۴ شعبان ۶۸۳ھ/۱۶ اکتوبر ۱۲۸۴ء) محمد بن محمد، ایک ایرانی ماہر سیاست اور علاءالدین جوینی کا بھائی اس کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہیں۔ ۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء-۱۲۶۳ء میں ایلخان ہولاگو نے اسے وزیر اعظم بنایا۔ وہ صاحب دیوان ہو گیا اور بعد میں اباقا کے عہد حکومت میں بھی وہ اسی منصب پر فائز رہا۔ اس نے اپنا اثر اپنے ماتحت وفادار عمال کی مدد سے ساری ایلخانی مملکت پر پھیلا دیا۔ اس کی شہرت بھی بہت زیادہ ہو گئی۔ وہ خاص کر اپنے ان مسلم ساتھیوں میں جنہیں اس نے ان کے دشمن حاکموں کے بہت سے جابرانہ اقدامات سے بچایا تھا، بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

شہرت کے ساتھ ساتھ اس کی ثروت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی آمدنی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک تومان روزانہ تھی۔

جوینی ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء میں اناطولیہ میں منگولوں کی کمزور حالت کو مضبوط کرنے کے لیے ایک مستعد شخصیت ثابت ہوا۔ وہ قرامان اور مملوکوں سے بھی عمدہ تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے شرف الدین ہارون کو وہاں کا حاکم بنایا جو بعد میں ۶۸۲ھ/۱۲۸۳ء میں بغداد کا حاکم ہو گیا۔ اس کے بعد جوینی ایران واپس آ گیا۔ اس دوران میں اس کا ایک مخالف مجد الملک یزدی ترقی کر کے مملکت کا مہتمم بن گیا۔ چنانچہ اباقا نے اپنی نظریں جوینی سے ہٹا کر یزدی کی طرف پھیر لیں۔ اباقا کی موت کے بعد جوینی ایک بار پھر واحد سرکردہ وزیر رہ گیا۔ سلطان احمد جو ایلخانیوں میں پہلا مسلمان فرمانروا تھا جوینی کی طرف بہت زیادہ مائل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جوینی نے اس کی جعلی مدعی سلطنت ارغون کے خلاف مدد بھی کی تھی۔

۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء میں جب ارغون تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جوینی نے پہلے تو ہندوستان کی طرف فرار ہونے کا فیصلہ کیا لیکن پھر اس نے ایلخان سے معافی مانگنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اور اپنے گھرانے کے بچاؤ کے لئے اس نے فدیہ پیش کیا۔ اگرچہ وہ مطالبے کے دو ہزار تومان میں سے صرف چار لاکھ درہم فراہم کر سکا۔

جوینی اہر نامی گاؤں کے قریب جو قزوین اور زنجان کے درمیان تھا بے رحمی کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ اس کے کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی اسی طرح مار دیئے گئے۔

جوینی اپنے بھائی کی طرح ایک علم دوست شخص تھا اس نے علم الکلام اور دیگر علوم و فنون کی حتی الامکان سرپرستی کی۔ اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس غرض کے لیے صرف کیا۔ خود وہ عربی فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا۔

جوینی، علاءالدین (بہاءالدین) (۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء - ۶۸۱ھ/۱۲۸۳ء) بن محمد، ایک ایرانی حاکم اور مورخ اس کا خاندان جوین کے ایک خاص شہر آزادوار سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خاندان اپنا رشتہ ہارون الرشید کے وزیر فضل بن ربیع کی اولاد سے جوڑتا ہے۔

علاءالدین نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف "دیوان" میں ملازمت اختیار کر لی۔ جوینی دو مرتبہ، ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء تا ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء اور ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء تا ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء منگولیا میں اپنے آقا ارغون کے ہمرکاب رہا۔ جب ہولاگو خراسان پہنچا تو علاءالدین اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ چنانچہ جب اس نے الموت کے اسماعیلیوں پر اور بعد میں بغداد پر حملہ کیا تو علاءالدین اس کے ساتھ تھا۔ اسی نے اسماعیلیوں کے سردار رکن الدین خورشاہ کے ہتھیار ڈالنے کی شرائط تحریر کیں اور اسی کی کوشش سے الموت کا مشہور کتب خانہ تباہی سے بچ گیا۔

۶۵۷ھ/۱۲۵۹ء میں علاءالدین عراق عرب اور خوزستان کا حاکم مقرر ہوا جہاں وہ بیس سال تک اسی منصب پر فائز رہا۔ اس نے اپنے دور میں مزارعوں کی حالت سدھارنے کے لیے بہت زیادہ کام کیا۔ اس نے ان صوبوں کی خوشحالی میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔ اس نے انبار سے کوفہ اور نجف تک دس ہزار طلائی دینار خرچ کر کے ایک نہر کھدوائی۔ اور اس نہر کے کناروں پر تقریباً ڈیڑھ سو گاؤں آباد کیے۔

ہولاگو کے بیٹے اباقا کا دور حکومت علاءالدین اور اس کے بھائی شمس الدین جو صاحب دیوان تھا کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ جوینی اس دور میں مصائب کا خاص نشانہ بنا رہا۔

۶۸۰ھ/۱۲۸۱ء میں علاءالدین کو اس الزام کے تحت کہ اس نے سرکاری خزانے سے ۲۵ لاکھ دینار غبن کر لئے، قید میں ڈالا گیا لیکن چند ماہ بعد ایلخانی گھرانے کے بعض افراد کی سفارش پر اسے قید سے رہا کر دیا گیا۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد اس الزام میں کہ اس کی مصر کے مملوک بادشاہ سے خط و کتابت ہے۔ دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اس الزام کی جوابدہی کے لئے ہمدان پہنچا لیکن اس وقت ایلخان کا انتقال ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ قید ہی میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ تگودار جس نے اسلام قبول کر لیا اور اب سلطان احمد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اباقا کا جانشین ہوتے ہی علاءالدین کو رہا کر کے اس کے سابق عہدے پر بحال کر دیا۔ چنانچہ علاءالدین دوبارہ اپنے پرانے علاقوں کا گورنر بن گیا۔ لیکن وہ اس کے بعد کچھ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ سلطان احمد کا بھتیجا جو بعد میں ایلخان ارغون کے نام سے ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء میں تخت نشین ہوا۔

۶۸۱ھ/۱۲۸۲ء-۱۲۸۳ء میں بغداد پہنچا اور اس نے علاءالدین کے نائبوں پر دوبارہ غبن کا الزام عائد کر کے انہیں تکالیف دینی شروع کیں۔ علاءالدین نے جو اس وقت اران میں تھا، جب یہ خبر سنی تو اس پر سکتے کا دورہ پڑا اور وفات پا گیا۔

علاءالدین جوینی بڑا عالم و فاضل شخص تھا۔ وہ شعرا اور علما کا بہت زیادہ قدردان تھا۔ اس کی تاریخ کی تصنیف کو اسلوب کے لحاظ سے انشاء کا بے مثال نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

اس کی کتاب "تاریخ جہانگشائی" صرف واحد ایسی تصنیف ہے جس سے ہمیں اس کی زندگی کے تفصیلی حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں پہلے حصے میں مغول کی تاریخ اور ان کی فتوحات کا بیان ہے۔ اس حصے میں جوچی اور چغتائی کے اخلاف کی تاریخ بھی شامل ہے۔ یہ حصہ اس زمانے کے واقعات تک محدود ہے جو گیوک قاآن کی وفات کے بعد رونما ہوئے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں خوارزم شاہوں کے خاندان کی تاریخ ہے۔ جس کی بنیاد سابقہ تصانیف پر رکھی گئی ہے۔

تیسرا حصہ مغول کی تاریخ کا تتمہ ہے جو اسماعیلیوں کے مغلوب ہونے تک ہے اس کتاب کا مشرق کی تاریخی روایات پر بڑا اثر پڑا۔ اور درجہ اول کی مستند تواریخ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ علاء الدین وہ تنہا فارسی مورخ ہے جس نے منگولیا تک سفر کیا اور مشرقی ایشیا کے ممالک کا بیان بلاواسطہ اپنے ذاتی علم سے کیا ہے چنگیز خان کی فتوحات کے بارے میں بھی اتنی تفصیلات اور کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔ بہت سے اہم واقعات بھی فقط اسی کتاب میں ملتے ہیں۔

جوینی نے یہ تاریخ اس وقت لکھنی شروع کی تھی جب وہ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں منگولیا میں تھا۔

اس نے اپنی آخری عمر میں دو اور رسالے تصنیف کئے جن میں سے ایک کا نام "تسلیۃ الاخوان" ہے۔

جہاد

کوشش، مشقت۔ وہ کوشش اور محنت جو کسی معین مقصد کے لئے کی جائے۔ اصطلاح میں اس کے معنی اس محنت اور کوشش کے ہیں جو اللہ کے لئے، اللہ کی راہ میں، اسلام کے لئے، نظام ملت کے لئے یا اس کے استحکام کے لئے کی جائے۔ خواہ وہ مال سے ہو، جان سے ہو یا کسی اور طریقے سے ہو۔ بعض احادیث میں اپنے نفس سے جہاد کرنے کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

جہاد اسلام کا ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے انجام دینے میں ہر وہ کوشش اور محنت بطور عبادت شامل ہے جو ملت کے استحکام میں، جملہ اجتماعی امور میں، عام مجاہدہ سے لے کر ملت کے معین مصالح، مثلاً حق کی سربلندی، اعلائے کلمۃ اللہ، مظلوموں کی حمایت، حملہ آوروں کا مقابلہ اور اس میں آگے بڑھ کر ان کی کمین گاہوں، رسد گاہوں، چھاؤنیوں سلسلہ رسل و رسائل اور ان کی مرکزی قوت کو ختم کرنے تک۔ سب امور شامل ہیں۔ سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنا بھی جہاد ہے۔

قتال جہاد میں شامل ہے اور یہ جہاد کی آخری اور انتہائی صورت ہے جو دعوت دینے والی اقوام کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو عالمگیر ہونے اور دنیا کے موجودہ نظاموں کی تنسیخ کا دعویدار ہو۔ وہ قدرتاً باطل کی تمام قوتوں کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ باطل قوتوں کی طرف سے مقابلے کی توقع رکھتے ہوئے جہاد کی ہر صورت کے لئے اپنے پیروکاروں کو تیار رکھنا لازمی ہے۔

اسلام چونکہ رہبانیت میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ اور زندگی کے حقائق کو نظر انداز نہیں کرتا اس لئے قتال کی مجبوری سے غفلت نہیں برتتا اور وہ اپنے ماننے والوں کو ہر وقت اس کے لئے تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

اگرچہ جہاد میں قتال بھی شامل ہے لیکن ہر قتال جہاد نہیں ہوتا۔ جہاد اپنے مقصد، طریق کار اور نصب العین کے اعتبار سے محض اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ غایات اسلامی کے لئے ہوتا ہے۔ یہ اندھا دھند جنگ و جدال نہیں بلکہ مقاصد ملت کی خاطر ایک بااصول جنگ ہے جو معین اصولوں، پابندیوں اور احتیاطوں کے ساتھ لڑی جاتی ہے۔ اور ان احتیاطوں کا ذکر قرآن مجید میں بصراحت کیا گیا ہے۔

اسلام میں جہاد کا حکم اس وقت نازل ہوا جب آنحضورؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور چونکہ اس وقت کفار قریش نے جنگی یورشوں کے ساتھ مسلمانوں کو ستانا شروع کیا۔ چنانچہ ان لوگوں کے مقابلے اور ان کے شر کے دفعیہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے جہاد کا حکم دیا۔

قرآن مجید میں اور احادیث میں جہاد کا کئی مقامات پر حکم دیا گیا ہے۔

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔" (حج: ۷۸)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا۔

"اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے۔ اگر تم جانو۔" (۱۰: ۱۱)

"تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے۔ جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جفاکار ہیں۔ اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔" (۴: ۷۵)

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اس لئے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی برا ہے۔" (۲: ۱۹۰ - ۱۹۱)

"تم ان سے لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز نہ آئیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔" (۲: ۱۹۲)

"کیا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی راہ میں جہاد کیا" (۹: ۱۶)

"مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔" (۴: ۹۵)

جہاد کا حکم چونکہ مدینہ منورہ کے زمانے میں دیا گیا ہے۔ اس لئے جہاد کے بارے میں مدنی سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا آیات کے علاوہ اور بہت سی آیات میں جہاد کے بارے میں حکم دیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی جہاد کے بارے میں کئی مقامات پر ترغیب دلائی گئی ہے۔

"حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو اللہ کو رب ماننے پر اسلام کو دین اور محمدؐ کو رسول ماننے پر راضی ہو گیا اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ میں یہ سن کر متعجب ہوا۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ان کلمات کا اعادہ فرمائیں۔ آپ نے ان کا اعادہ فرمایا اور پھر ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ایک اور کام ہے جس کی بدولت اللہ تعالےٰ ایک بندے کو جنت کے اندر کے سو درجے زیادہ بلندی عطا فرمائے گا۔ ایک درجے سے دوسرے درجے تک کا فاصلہ اتنا ہو گا جتنا آسمان و زمین کا۔ عرض کیا وہ کونسا کام ہے یا رسول اللہ۔ ارشاد ہوا "اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔" (تین مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا۔)" (مسلم، نسائی)

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص

Marfat.com

نے اللہ کی راہ میں اتنا عرصہ تک بھی قتال کیا جتنا ایک اونٹنی کے دو دوہنے پر لگتا ہے، اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔ بشرطیکہ یہ قتال اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی نیت سے کیا ہو۔" (ترمذی)

ایک اور حدیث میں جہاد کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے۔

"حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل ایسا عمل ہے جو راہ خدا میں جہاد کے ہم پلہ ہو۔؟ آپ نے فرمایا۔ اس عمل کی تمہارے اندر استطاعت نہیں ہے دریافت کرنے والوں نے یہی سوال پھر دو یا تین بار دوہرایا۔ آپؐ ہر مرتبہ یہی فرماتے رہے کہ اس عمل کی تمہارے اندر استطاعت نہیں ہے۔ پھر آپ نے فرمایا" مجاہد فی سبیل اللہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص برابر روزے رکھ رہا ہو، برابر نماز پڑھ رہا ہو۔ برابر آیات الٰہی کی تلاوت کر رہا۔ اپنے روزوں اور نمازوں میں کوئی توقف نہ کر رہا ہو یہاں تک کہ مجاہد گھر لوٹ آئے۔" (بخاری، مسلم)

جہاد ناگوار ہونے کے باوجود فرض ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"تم پر قتال فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔" (۲: ۲۱۶)

"نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کیساتھ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔" (۹: ۴۱)

"اے ایمان والو! مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔" (۴: ۷۱)

چنانچہ تمام محدثین اور ائمہ فقہ نے جہاد کی فرضیت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک فرض عین اور دوسری فرض کفایہ۔ اگر دشمن دارالاسلام کے کسی علاقہ پر، خواہ وہ آباد ہو یا غیر آباد، صحرا ہو یا پہاڑ حملہ کر دے تو اس علاقے کے مسلمانوں پر دشمن کے خلاف جہاد کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔ اگر وہ دشمن کے دفاع کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو متصل کے علاقوں کے مسلمانوں پر اس کی مدافعت فرض عین ہے اور اگر وہ بھی ناکافی ثابت ہو رہے ہوں تو مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں پر دارالسلام کے اس حصے کا دفاع لازم ہے اور دشمن کے تسلط سے اس کا آزاد کرنا فرض عین ہے۔

جو شخص بلا عذر اس فرض کے قیام سے جی چرائے گا وہ سخت گنہگار ہو گا۔ اور اس کے تمام اچھے اعمال غارت ہو جائیں گے۔ آنحضورؐ کے زمانے میں جن لوگوں نے جہاد کی نفیر عام کے بعد شرکت میں پس و پیش کیا یا عدم شرکت کے مرتکب ہوئے وہ منافقین کہلاتے۔ ان کے لیے اللہ تعالےٰ نے سخت وعید بھیجی اور آنحضورؐ کی دعائے مغفرت سے محروم ہوئے۔

فرض کفایہ کی شکل یہ ہے کہ اگر کوئی گروہ دشمن کی مؤثر مدافعت کر رہا ہو۔ تو دوسروں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس ذمہ داری کو سب نے ترک کر رکھا ہو تو سب تارک فرض ہوں گے اور گنہگار رہوں گے۔ فرض کفایہ کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت و فضیلت کا موجب ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مجاہدین کو قاعدین (جہاد کے لیے نہ نکلنے والوں) پر فضل و انعام اور رحمت و مغفرت کے لحاظ سے کئی درجے فائق تر رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

فرض عین کی شکل میں تمام قوم کو اپنی خدمات حکومت اسلامی کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ حکومت کا یہ کام ہے کہ وہ جن لوگوں کو چاہے قتال کے لیے منتخب کرے اور جن لوگوں کو چاہے کوئی اور ذمہ داری سونپ دے۔ اور جن لوگوں کو حکومت کی طرف سے کوئی معین ذمہ داری نہ سونپی گئی ہو تو وہ بجائے خود جس شکل میں بھی جہاد میں حصہ لے سکتے ہوں لیتے رہیں۔

جہاد کی یہ شکل دائمی اور ابدی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تین چیزیں ایمان کی جڑ ہیں۔ پہلی چیز اس آدمی سے ہاتھ اٹھا لینا جو لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے اور کسی گناہ کی وجہ سے اس کی تکفیر نہ کی جائے اور کسی عمل کی پاداش میں اسلام سے خارج نہ کیا جائے دوسری چیز جہاد ہے۔ یہ جاری ہے جب سے اللہ تعالےٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اور جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑے گا۔ اس جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل منسوخ نہیں کر سکتا۔ تیسری چیز تقدیر پر ایمان لانا ہے (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا جو شخص اس حالت میں مر گیا اس نے نہ جہاد کیا اور نہ جہاد کا ارادہ دل میں رکھا۔ وہ نفاق کی ایک حالت میں مرا۔" (مسلم، مسند احمد)

عمران بن حصین سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت کا ایک گروہ برابر حق پر لڑتا رہے گا۔ اور حق کے دشمنوں پر غلبہ پائے گا۔ حتیٰ کہ میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑے گا۔" (ابوداؤد)

جہاد سے جی چرانے اور جہاد نہ کرنے والوں کے لیے بڑی وعید سنائی گئی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

"اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اٹھائے گا۔ اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (۹: ۳۹)

ایک حدیث میں آنحضورؐ نے فرمایا۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جب لوگ درہم و دینار کے حریص ہو جائیں اور جنس بازار میں آنے سے پہلے ہی اس پر بیع کرنے لگیں اور بیلوں کی دُمیں پکڑ لیں۔ (کھیتی باڑی میں منہمک ہو جائیں) اور جہاد چھوڑ دیں تو اللہ ان پر سخت آزمائش مسلط کرے گا۔ اور وہ اس سے وقت تک نہ نکل سکیں گے جب تک اپنے دین کی طرف نہ لوٹ کر آئیں گے۔ (اور جہاد کو قائم نہ کریں گے) (مسند احمد)

ایک حدیث میں جہاد کی اقسام کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا" مشرکین سے جہاد کرو اپنے مالوں سے، اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے (مسند احمد، نسائی)

اس حدیث میں جہاد کی تین قسموں پر زور دیا گیا ہے۔ مالی جہاد، جسمانی جہاد، اور لسانی جہاد۔ ان تینوں قسموں کی فضیلت قرآن و حدیث میں بتائی گئی ہے۔ نیز دیکھیے" جنگی اصول")

جہاں آرا بیگم

(۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ/۲۳ مارچ ۱۶۱۴ء — ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء) ایک مغل شہزادی جو شاہجہاں اور ممتاز محل کی پہلوٹھی کی لڑکی تھی اعزازی لقب "فاطمۃ الزمان" تھا۔ بیگم صاحب یا بادشاہ بیگم درباری خطاب تھا۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء میں اپنی والدہ ممتاز محل کے انتقال کے بعد اسے سلطنت کی خاتون اول کا اعزاز ملا۔

جہاں آرا بیگم اپنے والد کی فرمانبردار اور خدمت گذار تھی۔ جب شاہجہاں کو اورنگ زیب نے معزول کرنے کے بعد قید میں ڈال دیا تو بھی اس نے اپنے والد کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسے دارا شکوہ سے خاص انس تھا۔

جہاں آرا بیگم کئی ایک اچھی صفات کی مالک تھی وہ ایک باکمال خاتون تھی شاہجہاں کے عہد حکومت میں وہ بڑی با اثر تھی۔ بادشاہ نے سورت کی بندرگاہ کی آمدنی جو تقریباً چھ لاکھ روپے سالانہ بنتی تھی اپنی اس بیٹی کے نام کر رکھی تھی۔ اورنگ زیب نے

Marfat.com

اپنے عہد میں اس رونق کو دوگنا کر دی تھی ۔ جن دنوں شاہجہان نظربند تھا ۔ تو جہاں آرا کی حیثیت باپ اور بھائی اورنگ زیب بادشاہ وقت کے درمیان ایک واسطے کی تھی ۔ اور ساری اہم سیاسی خط و کتابت اسی کے ذریعے ہوتی تھی ۔

تمام عمر اس نے شادی نہیں کرائی ۔ اس کو تصوف سے بھی خاص لگاؤ تھا اور سلسلہ چشتیہ میں بیعت تھی ۔

جہاں آرا بیگم دو کتابوں کی مصنفہ بھی تھی ۔ اس کی یہ تصانیف "مونس الارواح" اور "صاحبیہ" کے عنوان سے ہیں ۔ "مونس الارواح" حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح حیات ہے ۔ جبکہ دوسری کتاب میں اس نے اپنے پیر و مرشد ملا شاہ قادری کی سوانح حیات قلم بند کی ہے جو نامکمل ہے ۔

وفات کے بعد اسے دہلی میں حضرت نظام الدین درگاہ کے صحن میں ایک سادے سے مقبرے میں جو خود اس نے بنوایا تھا ۔ دفن کیا گیا ۔

شاہجہاں کی طرح فن تعمیر سے اسے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی ۔ چنانچہ آگرے کی جامع مسجد جس سے ملحق ایک مدرسہ بھی تھا ۔ اسی کی یادگار ہے جو اکبر کی تعمیر کرائی ہوئی فتح پور سیکری کی مسجد کے بعد مغل دور کی سب سے پہلی اور وسیع ترین مسجد ہے ۔ یہ مسجد جہاں آرا نے اپنے ذاتی خرچ سے بنوائی تھی ۔

جہاندار شاہ (۱۰ رمضان ۱۰۷۱ھ/۱۰ مئی ۱۶۶۱ء — ۱۶ محرم ۱۱۲۵ھ/۱۱ فروری ۱۷۱۳ء) ایک مغل شہنشاہ جس کا دور حکومت ۲۱ صفر ۱۱۲۴ھ/۲۹ مارچ ۱۷۱۲ء تا ۱۶ محرم ۱۱۲۵ھ/۱۱ فروری ۱۷۱۳ء ہے ۔

معزالدین اپنے والد بہادر شاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا ۔ جو بہادر شاہ کی وفات کے وقت ملتان کا صوبیدار تھا ۔ جہاندار شاہ عیش پسند اور آرام طلب انسان تھا ۔ جب بہادر شاہ کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ چھڑی تو جہاندار شاہ نے دکن کے صوبیدار اور میر بخشی ذوالفقار خان کے بل بوتے پر اس جنگ میں عملی حصہ لیا ۔ کیونکہ میر بخشی عظیم الشان کو تخت سے محروم کر کے وزارت خود حاصل کرنا چاہتا تھا ۔

چنانچہ مغلوں کے دستور کے مطابق بہادر شاہ کے بیٹوں میں بھی تخت نشینی کی جنگ شروع ہوگئی لاہور کے قریب تین روز کی جنگ کے بعد عظیم الشان کو شکست ہوئی اور وہ ہلاک ہوگیا ۔ جہاندار شاہ نے ذوالفقار کی مدد سے اپنے دوسرے بھائیوں جہان شاہ اور رفیع الشان کو بھی قتل کرا دیا ۔ اور ۵۲ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۔

جہاندار شاہ اپنے باپ بہادر شاہ سے بھی نکما ثابت ہوا ۔ اس نے دہلی کی ایک خوب صورت کنجرن سے شادی کر لی ۔ جو رقاصہ لال کنور کے نام سے مشہور تھی ۔ چنانچہ وہ اور کنجرن ہاتھی پر سوار ہو کر شہر میں نکلتے تھے ۔ اور کنجروں پر سیم و زر کی بارش کرتے تھے ۔ کنجرے اس داد و دہش سے بہت خوش ہوئے اور کنجرن پر پھبتیاں کستے تھے ۔

ایک دفعہ جہاندار شاہ قطب صاحب کی سیر سے واپس آیا وہ شراب کے نشے میں شاہی رتھ میں مدہوش پڑا تھا ۔ رتھبان بھی بے خبر تھا ۔ اس نے رتھ بہل خانے میں کھڑی کی اور پھاٹک کو قفل لگا کر گھر چلا گیا ۔ بادشاہ محل میں نہ پہنچا تو سب کو تشویش ہوئی ۔ ساری رات تلاش کی لیکن پتہ نہ چلا ۔ صبح ہوئی تو رتھبان اپنی نوکری پر آیا بہل خانے کا دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت ابھی رتھ میں پڑے اونگھ رہے ہیں وہ ساری رات بہل خانے میں پڑے سوتے رہے ۔

ایسے حالات میں ملکی معاملات کیا ترقی کر سکتے تھے ۔ اس کے ہم عصر مورخوں نے اس کے انجام کا باعث اس کے ذوق عیش پرستی اور رقاصہ لال کنور سے اس کی شیفتگی کو ٹھہرایا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مرکزی حکومت کی مالی حالت سدھارنے کی کوئی کوشش نہ کی اور اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار خاں وزیر کے خلاف لال کنور بے مصاحبین کی سازشوں سے نظم و نسق سلطنت میں کوئی مضبوطی یا استواری پیدا نہ ہو سکی ۔ اس نے خاندانی آدمیوں کی بجائے بازاری لوگوں کو اعلیٰ عہدے دینے شروع کیے اور انہیں اپنا مشیر بنایا ۔ یہ بادشاہ سلطنت کے کاموں سے بالکل بے خبر رہا ۔

چنانچہ تقریباً ایک سال بعد اورنگ زیب کا پوتا اور عظیم الشان کا دوسرا بیٹا فرخ سیر سادات بارہہ یعنی عبداللہ خان اور حسین علی خان کی مدد سے جن کو ساتھ ملانے میں جہاندار شاہ ناکام رہا تھا ۔ پٹنے سے آگرے کی طرف بڑھا اس نے راستے میں کھجوا (خواجہ) کے مقام پر جہاندار شاہ کے بیٹے عزالدین کو شکست دی ، جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں نے عجلت میں لشکر جمع کیا اور آگرے کی طرف روانہ ہوئے لیکن ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء میں شکست کھائی ۔ اس کے بعد جہاندار شاہ ذوالفقار خاں کے والد ملتق اسد خان کے پاس پناہ لینے کے لیے دہلی کی طرف بھاگ نکلا ۔ جہاں باپ اور بیٹے نے اس توقع پر کہ شاید فرخ سیر کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے جہاندار شاہ کو دہلی کے قلعے میں بند کر دیا ۔ فرخ سیر نے دہلی پر چڑھائی کی اور اس کے دہلی میں فاتحانہ داخل ہونے سے ایک روز پیشتر جہاندار شاہ اور اس کے وزیر ذوالفقار خان کو اس کے حکم سے قتل کر دیا گیا ۔ فرخ سیر نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان دونوں کی بے سر لاشوں کو ہاتھی کے ہودے سے الٹا لٹکا کر شہر میں پھرایا ۔

جہاں سوز (ر ۔ ۱ ۔ ۵۵۶ھ/۱۱۶۱ء) علاء الدین حسین بن الحسین غوری خاندان کا ایک شاعر فرمانروا ۔ جو اس واقعے کی بناء پر بدنام ہے کہ اس نے ۵۴۶ھ/۱۱۵۱ء میں غزنہ کو نذر آتش کر دیا تھا ۔

غوریوں اور بہرام شاہ غزنوی کے درمیان چپقلش کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ قطب الدین محمود (علاء الدین کے بڑے بھائی) نے غزنہ کے بعض باشندوں سے ساز باز کر کے غزنہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو بہرام شاہ نے اسے زہر دلوا دیا ۔ علاء الدین کے ایک اور بھائی سیف الدین نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کی کوشش کی ۔ چنانچہ غزنہ پر غوری افواج کا عارضی طور قبضہ ہو جانے کے بعد سیف الدین کو بہرام شاہ کے ہاتھوں بڑے شرمناک طریقے سے موت کا شکار ہونا پڑا ۔ علاء الدین کے ایک اور بھائی بہاء الدین سام کو اس کی موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے بھائیوں کا بدلہ لے سکے ۔ چنانچہ علاء الدین نے بہرام شاہ پر چڑھائی کر دی ۔ اور تین لڑائیوں میں بہرام شاہ کو پے در پے شکست دے کر غزنہ پر قبضہ کرنے کے بعد شہر کو نذر آتش کر دیا ۔

اگلے سال ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں جب کہ بہرام شاہ پنجاب میں پناہ گزین ہو چکا تھا علاء الدین نے مقطع ہرات سے اتحاد کر کے سلطان سنجر کی طرف پیشقدمی کی لیکن ہرات کے قریب اوبہ کے مقام پر شکست کھا کر گرفتار ہوا ۔ ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں رہائی پائی ۔ اور اپنی وفات تک فیروزکوہ میں خاموشی سے حکومت کرتا رہا ۔

جہانگیر (۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ/۳۱ اگست ۱۵۶۹ء — ۲۷ صفر ۱۰۳۷ھ/۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء) خاندان مغلیہ کا چوتھا بادشاہ ، نورالدین اور جہانگیر لقب تھا ۔

شہنشاہ اکبر کا زندہ رہنے والوں میں سب سے پہلا بچہ کیونکہ اس سے پہلے سب بچے زمانہ شیرخوارگی ہی میں وفات پا جاتے تھے ۔

جہانگیر کی والدہ مشہور و معروف راجپوت مہارانی مریم الزمانی تھی ۔ اس کی پیدائش

Marfat.com

ہندوستان کے مشہور و معروف بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ہوئی۔ یہ خانقاہ آگرے کے قریب فتح پور سیکری میں واقع تھی۔ اس بزرگ ہستی کے نام پر شہزادے کا نام بھی سلیم ہی رکھا گیا۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ شہزادہ سلیم اسی بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ نیز اکبر شہزادے کو ہمیشہ شیخو بابا کے نام سے پکارتا تھا۔ کیونکہ وہ احتراماً بزرگ شیخ کا نام اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

اگرچہ شہزادے کی تعلیم و تربیت ایک خاص ماحول میں کی گئی تھی لیکن سلیم اس وقت کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور محلاتی سازشیں اس پر بھی اثر انداز ہو کر رہیں یہاں تک کہ باپ اور بیٹے کے تعلقات میں حد درجہ کشیدگی پیدا ہو گئی اور یہی کشیدگی ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں بغاوت کا سبب بنی۔ سلیم نے علم بغاوت بلند کر کے الٰہ آباد، اودھ اور بہار پر قبضہ کر لیا اور اپنے باپ کی اطاعت سے منحرف ہو کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں جہانگیر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھا لیکن اکبر کی دفاعی کارروائیوں کی وجہ سے الٰہ آباد کی طرف واپس لوٹ آیا۔ یہیں پر اس نے شاہی لقب اختیار کیا۔ اور باقاعدہ دربار بھی قائم کر لیا۔ اس دوران میں جہانگیر کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اس کے اور اکبر کے درمیان تعلقات کشیدہ کرنے والی شخصیت اکبر کا وزیر ابوالفضل ہے۔ جو اس کے خلاف شہنشاہ اکبر کے کان بھرتا رہتا ہے چنانچہ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں جب ابوالفضل دکن سے واپس آ رہا تھا تو جہانگیر کے بنائے گئے منصوبے کے مطابق بندیلا سردار بیر سنگھ دیو کے ملازمین نے اس پر حملہ کیا اس کا سر قلم کر کے جہانگیر کے دربار میں الٰہ آباد بھیج دیا۔ ان چند صدمات نے اکبر کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اس کی صحت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ آخر کار ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا اکبر کے انتقال کے بعد اس کی وصیت کے مطابق جہانگیر ابوالمظفر نورالدین محمد بادشاہ غازی کے لقب سے خاندان مغلیہ کا چوتھا شہنشاہ بنا۔

ابھی جہانگیر کو تخت پر بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ اسے اپنے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ خسرو راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس بغاوت میں راجپوت اس کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ وہ فوج جمع کرنے کے ارادے سے آگرے سے بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد جہانگیر بھی اس کے تعاقب میں لاہور پہنچ گیا۔ دریائے راوی کے کنارے باپ بیٹے میں ایک خونریز لڑائی ہوئی جس میں خسرو کو شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ لیکن شاہدرہ کے قریب پکڑا گیا۔

اگرچہ باہمی مصالحت ہو گئی لیکن شہنشاہ جہانگیر نے اپنے بیٹے کی اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ بالآخر اس نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء میں برہان پور کے مقام پر انتقال کیا۔ اس کے انتقال سے جہانگیر کی ایک بڑی پریشانی دور ہو گئی۔

۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں احمد نگر کے ایک حبشی سردار ملک عنبر نے بہت سی فوج جمع کر کے شاہی فوج پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ اس پر جہانگیر نے بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم خانخاناں کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ لیکن عبدالرحیم کو اس مہم میں کامیابی نہ ہوئی۔ بعد ازاں یہ مہم خان لودھی اور شہزادہ خرم (شاہجہان) کے سپرد ہوئی۔ ان دونوں کے احمد نگر والوں سے کئی معرکے ہوئے آخر شہزادہ خرم نے ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء کو احمد نگر کو دوبارہ سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ملک عنبر کا انتقال ہو گیا اور احمد نگر کی شورش ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کر لی جو مرزا غیاث کی بیٹی تھی۔ اسی کے ساتھ ہی ایک فرمانروا کی حیثیت سے جہانگیر کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ نورجہاں نے آہستہ آہستہ تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ امور سلطنت پر دن بدن اثر انداز ہونے لگی۔ اس کا نام شہنشاہ جہانگیر کے نام کے ساتھ طلائی سکوں پر کندہ ہونے لگا۔ آخر کار وہ عملی طور پر پوری طرح فرمانروا بن گئی۔

۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں جہانگیر کے دوسرے بیٹے شہزادہ خرم (شاہجہان) نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں شہزادہ خرم اور نورجہاں کی باہمی رنجش کا بڑا دخل تھا۔ شہزادہ خرم کی شادی نورجہاں کے بھائی آصف خان کی لڑکی سے ہوئی اور شہریار جو جہانگیر کا چھوٹا بیٹا تھا نورجہاں کی بیٹی سے بیاہا گیا تھا جو اس کے پہلے خاوند شیر افگن سے تھی۔ اس لئے نورجہاں یہ چاہتی تھی کہ جہانگیر کے بعد اس کا داماد شہریار دہلی کے تخت پر بیٹھے لیکن آصف خان خفیہ طور پر اپنے داماد خرم کی مدد کرتا تھا۔ دربار میں نورجہاں کا زور تھا۔ اس لئے مغل شہزادوں کے عام دستور کے مطابق اس نے بھی تخت پر قبضہ کرنے کے لئے دکن میں اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس پر نورجہاں نے مہابت خان کو جو ایک افغان سردار تھا، شہزادہ خرم کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ مہابت خان نے شکست دے کر خرم کا ناک میں دم کر دیا۔ وہ جان بچانے کے لئے کبھی دکن سے بنگال کی طرف بھاگتا تھا اور کبھی بنگال سے دکن کی طرف آخر تنگ آ کر اس نے ۱۰۳۵ھ/مارچ ۱۶۲۶ء میں مہابت خان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور باپ سے معافی مانگ لی۔ اس طرح خرم کی بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس فتح سے مہابت خان کا اقتدار بہت بڑھ گیا نورجہاں اسے اپنے ساتھ ملانا چاہتی تھی تاکہ شہریار جہانگیر کی وفات کے بعد آسانی سے تخت پر بیٹھ سکے۔ لیکن مہابت خان نے انکار کر دیا۔ اس لئے نورجہاں نے اس پر خیانت کا الزام لگا کر دربار میں طلب کیا۔ جہانگیر اس وقت کابل جا رہا تھا اور دریائے جہلم کے اس طرف ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ نورجہاں اور شاہی فوج دریا کے پار پہنچ چکی تھی کہ مہابت خان پانچ ہزار

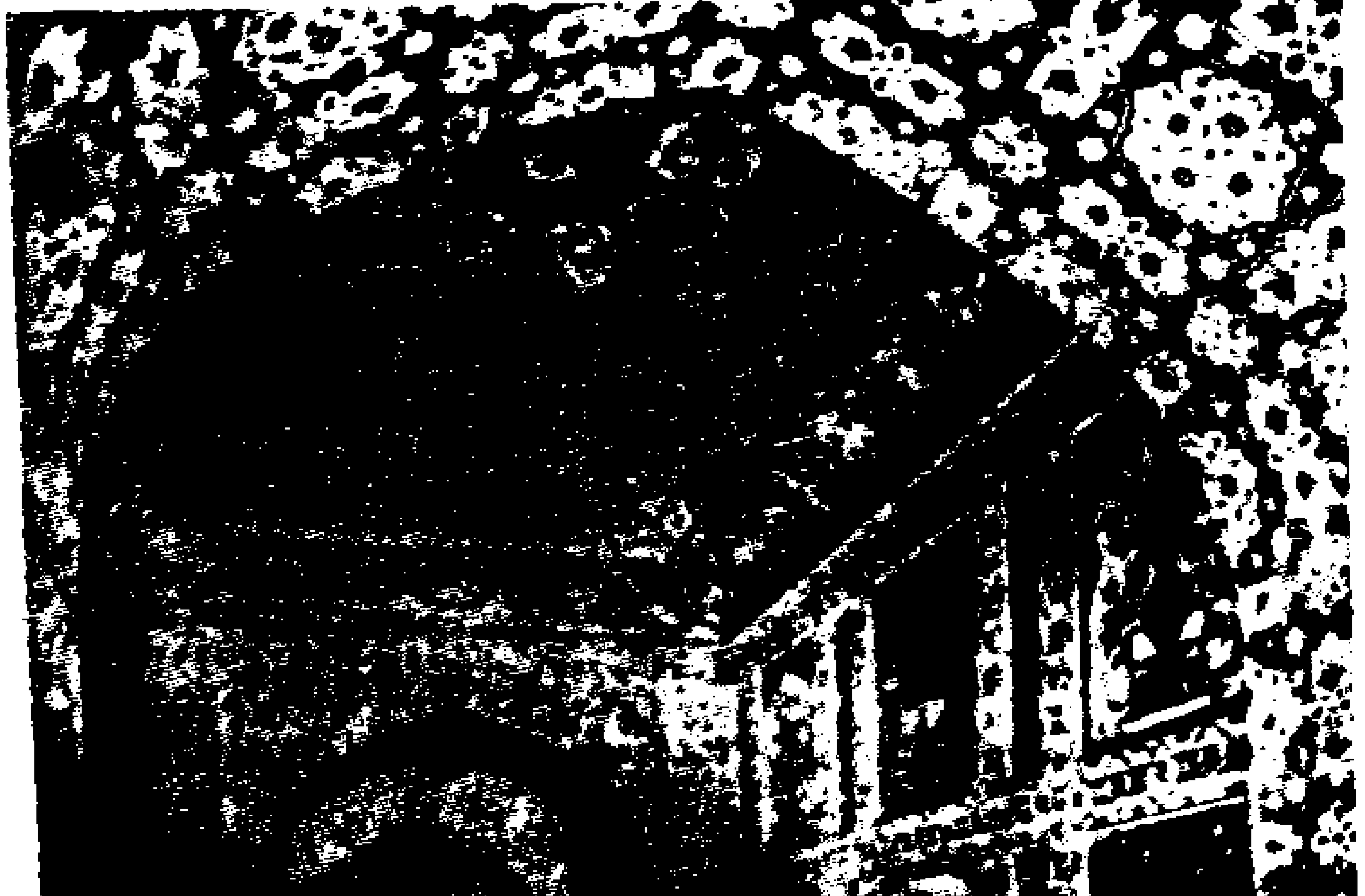

مقبرہ جہانگیر

Marfat.com

سپاہیوں کو لے کر جہانگیر کے خیمے کے سامنے پہنچ گیا اور جہانگیر کو اکیلے میں پاکر اپنی حراست میں لے لیا۔ یہ واقعہ ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کا ہے جب نورجہان کو بادشاہ کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو بادشاہ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر وہ بھی جہانگیر کے پاس چلی آئی اور مہابت خان نے اسے بھی نظربند کر لیا۔ یہاں سے یہ قافلہ کابل پہنچا آصف خان پہلے تو فرار ہو گیا مگر پھر نورجہاں کے اشارے پر کابل میں مہابت خان سے جا ملا اور شاہی افواج میں پھوٹ ڈلوادی۔ وہاں نورجہاں نے خفیہ طور پر بہت سی فوج جمع کر لی اور بادشاہ کو مہابت خان کی قید سے نکال لے گئی۔ مہابت خان بھاگ کر دکن میں شہزادہ خرم سے جا ملا۔ جو تخت پر قبضہ کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ نورجہاں نے اس کے بعد خان جہاں لودھی کو شاہی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور حکم دیا کہ باغیوں کو کچل دیا جائے۔ لیکن مہابت خان کے خلاف کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے ہی جہانگیر راجوڑی سے کشمیر آتے ہوئے راستے ہی میں انتقال کر گیا۔

جہانگیر نے ۵۸ سال (شمسی) کی عمر میں ۲۲ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ اس کی میت لاہور میں لائی گئی۔ جہانگیر کی میت کو نامساعد حالات کی بنا پر موزوں رسوم تعزیت کے بغیر ہی دفن کر دیا گیا۔ جہانگیر کو جس مقبرہ میں دفن کیا گیا اس کا انتخاب نورجہاں نے کیا تھا اور اپنے خرچ سے ایک شاندار مقبرہ بھی اسی نے تعمیر کرایا تھا۔

جہانگیر کے دور حکومت کے دو مشہور واقعات قاضی نوراللہ شوشتری کا قتل اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اسیری ہے۔ جنہیں جہانگیر کے حکم سے گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا تھا۔ لیکن کم و بیش ایک سال بعد بادشاہ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے انہیں رہا کر دیا۔ ان دو واقعات پر معاصر اور بعد میں آنے والے مورخین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اس کے عہد حکومت کا ایک اور مشہور واقعہ سر طامس رو کا ہندوستان میں بطور سفیر آنا ہے جس کو انگلستان کے بادشاہ جیمز اول نے بھیجا تھا۔ وہ کئی سال تک جہانگیر کے دربار میں رہا۔ اس نے سورت، کھمبایت، گوا اور احمد آباد میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس طرح انگریزوں کو محصول ادا کئے بغیر ہندوستان میں تجارت کرنے کا موقع مل گیا اور اسی تجارت کی بدولت انہوں نے اس ملک میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

جہانگیر ایک عالم فاضل شخص تھا۔ وہ انسان شناس اور مسائل میں گہری نظر رکھنے والا تھا۔ تخت پر بیٹھنے سے پہلے اس کی طبیعت میں لاپرواہی بہت تھی۔ اور وہ چنداں مستقل مزاج معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن تخت پر قدم رکھتے ہی اس کے طور طریقے بدل گئے۔ وہ نہایت متانت اور دانشمندی سے امور سلطنت سرانجام دینے لگا۔ چنگی کے محصول میں کئی نقائص تھے اس نے وہ سب نقائص دور کئے بہت سے محصول بالکل ختم کر دیئے۔

اس سے پہلے بعض جرموں میں مجرموں کے کان ناک وغیرہ کاٹ دیئے جاتے تھے اس نے اس وحشیانہ سزا کو منسوخ کر دیا۔ اگرچہ وہ خود شراب پیتا تھا لیکن اس نے شراب، تمباکو اور ایسی دوسری نشہ آور اشیاء کی امتناعی کا حکم دے رکھا تھا۔ وہ ایک نہایت ہی زیرک حکمران تھا۔ فارسی کے علاوہ ترکی زبان بھی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ بابر کی طرح اس نے بھی اپنی سوانح حیات خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کی اور اس کا نام "تزک جہانگیری" رکھا۔ اس نے اس کتاب میں اپنی سلطنت کے اور اپنے حالات بالکل صحیح صحیح لکھے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مے نوشی اور افیون خوری کی عادت پر بھی پردہ نہیں ڈالتا جو اس کی صحت کو گھن کی طرح کھا گئی تھی۔

جہانگیر نرم دل اور کریم النفس بھی تھا۔ وہ بڑا انصاف پسند اور عادل بادشاہ تھا۔ وہ ملک کی خوش حالی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ عدل و انصاف میں اس قدر مشہور تھا کہ اس کے عدل کے سبب اردو ادب میں عدل جہانگیری کی صنعت استعمال کی جانے لگی۔ اس نے اپنے محل کی دیوار کے ساتھ سونے کی ایک زنجیر لٹکا رکھی تھی اور حکم دے رکھا تھا کہ جس شخص کو کوئی شکایت ہو اور ہم سے ملنا چاہتا ہو وہ رات کے وقت بھی اس زنجیر کو ہلا کر ہمارے کانوں تک اپنی فریاد پہنچا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔

اسے تشدد سے نفرت تھی اگرچہ بعض اوقات وہ تشدد پہ اتر آتا تھا لیکن ایسے واقعات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

اس کا دور حکومت رعایا کے لئے امن و خوشحالی کا دور تھا۔ اس دور میں صنعت اور تجارت کو بھی بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کے دور میں سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال و استحکام پیدا ہوا۔ جس کو صرف میواڑ اور دکن کی چند لڑائیوں اور بنگال کی معمولی شورشوں نے متاثر کیا۔

اسے مناظر قدرت سے بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ جس کا ثبوت اس کی تصنیف تزک جہانگیری میں ملتا ہے۔ جس میں اس نے مناظر قدرت سے کشمیر اور دوسرے مقامات کے حسن کی تعریف خوب مزے لے لے کر کی ہے۔ اس نے بہت سے شفاخانے، سرائیں مکتب اور مدرسے تعمیر کرائے۔ ان سب کے اخراجات حکومت خود ادا کرتی تھی۔ اس کے دربار میں کئی ایک مشہور مصور موجود رہتے تھے۔ اسے شاعری کا بھی ذوق تھا۔

جہانگیر جوگیوں اور سنیاسیوں کی بھی بہت سرپرستی کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو پہلے سے بھی زیادہ ترقی کے میدان میں گامزن ہو کر تمام سلطنت پر چھا گئے۔

جہانگیر لاہور میں شاہدرہ کے مقام پر جس مقبرے میں دفن ہے وہ مغلوں کے فن تعمیر کا ایک نہایت اعلیٰ اور عمدہ نمونہ ہے۔

جہانیاں جہاں گشت ۔ ایک بہت بڑے صوفی (دیکھئے "مخدوم جہانیاں")

جہشیاری، ابوعبداللہ (د ۳۳۱ھ/۹۴۲ء-۹۴۳ء) محمد بن عبدوس۔ ایک ادیب اور سیاست دان۔ کوفے میں پیدا ہوا چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی سے سیاست میں حصہ لیتا کیونکہ اس کے وزیروں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کا باپ وزیر علی بن عیسےٰ کا حاجب تھا۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد جہشیاری اس عہدے پر فائز ہوا۔ ۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں وہ علی بن عیسیٰ کی فوج رکاب کا سردار تھا۔ کچھ عرصے بعد جہشیاری ابن مقلہ کے حامیوں میں شامل ہو گیا۔ جس کی وزارت کے اعلان میں اس نے مدد کی تھی۔ نیز جب وہ معزول و معتوب ہوا تو جہشیاری ہی نے اسے چھپایا۔ خود اسے کئی بار وزیروں اور امیروں نے قید اور جرمانے کی سزائیں دیں۔

جہشیاری کی تصنیف "کتاب الوزراء والکتاب" بہت زیادہ مشہور ہے بلکہ خود اس کی شہرت اسی تصنیف کے سر ہے۔ اس کتاب میں اس نے حکومت کے ان وزیروں اور دبیروں کا ذکر کیا ہے جو ۲۹۶ھ/۹۰۸ء تک برسر اقتدار آئے۔ اس میں اس نے لوگوں کے کردار اور فکری و ذہنی صلاحیتوں پر بھی اسی قدر توجہ دی ہے جتنی کہ ان کی انتظامی اور سیاسی سرگرمیوں پر

Marfat.com

جہشیاری نے المقتدر کی خلافت کے حالات و واقعات پر بھی (ایک) کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کی ایک اور تصنیف جو حکایات کا مجموعہ تھی بعض لوگ "الحکایات العجیبہ" کو جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے جہشیاری ہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

جھنڈا۔ امتیازی نشان، (دیکھیے "علم")

جھنگ پاکستان میں صوبہ پنجاب کا ایک شہر اور ضلع۔ جو ۳۰ درجے طول بلد اور ۳۵ درجے عرض بلد پر واقع ہے قدیم مورخین نے جھنگ نام کے کسی شہر کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم اس علاقے کو وسیع اور گھنے جنگل کی وجہ سے جھنگی، جھانگ، جہانگ، جھنگڑ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ قدیم زمانے میں اس قصبہ کا نام برہمن گڑھ اور علاقے کا نام جھنگی تھا۔

جھنگ کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے۔ وہ گذشتہ ہزاروں برس سے مختلف حملہ آوروں کی دست برد کا نشانہ بنتا رہا جس کی وجہ سے اس علاقے میں مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ قدرتی بات ہے۔ گوجل، دراوڑ، قاحل، آریا، یونانی، ایرانی، بدھ اور مسلم تہذیبوں نے یہاں اپنے اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔

جب اشوک ۲۷۲ قبل مسیح میں تخت پر بیٹھا تو اس نے بدھ مذہب کو فروغ دینے کے لیے جگہ جگہ مندر تعمیر کرائے۔ چنانچہ اس علاقے میں بھی ان مندروں کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ ان کے ملبے سے اب بھی بدھ کی مورتیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ شورکوٹ میں (بدھ کونہ) مندر سے بدھ کی مٹی کی مورتیاں تانبے کے سکے جن پر ایک طرف مہاتما بدھ اور دوسری طرف اشوک کی شبیہیں کندہ ہیں اب بھی بعض لوگوں کے پاس موجود ہیں۔

وچ نامہ میں لکھا ہے کہ وچ کے بعد ساہسی حکمران بنا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے ہرلش نے حکومت سنبھالی تو اس نے اپنی سلطنت کو انتظامی اعتبار سے چار مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبوں میں ایک صوبہ برہمن گڑھ تھا۔ اس نام کا ایک قلعہ اور شہر موجودہ جھنگ صدر کے قریب موجود تھا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ جھنگ کو ایک صوبہ کا درجہ دیا گیا۔ اس صوبے میں پنڈی بھٹیاں، کمارہ، چاچ، چنیوٹ، شورکوٹ، لیہ، اعوانی اور دیپال پور کے علاقے شامل تھے۔ جب محمد بن قاسم نے ۹۳ھ/۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا اور اس کے بعد ملتان فتح کر لیا۔ تو مسلمان فوجیں شورکوٹ کا قلعہ فتح کرنے میں بھی کامیاب ہو گئیں۔ ان دنوں جھنگ کا حاکم بجے راؤ کا لواسہ تھا۔ محمد بن قاسم کے حملے کے دوران اسے سخت نقصان پہنچا۔ اور مسلمانوں کی فتح کے بعد یہ علاقہ ہندوؤں کی سلطنت کا حصہ نہ بن سکا۔

نظام حکومت سنبھالنے کے بعد محمد بن قاسم نے سندھ سے چنیوٹ تک ریاست کو پانچ صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ ان صوبوں میں ایک صوبہ شورکوٹ اور ایک صوبہ چنیوٹ بھی تھا۔ چنیوٹ کے گورنر حریم بن عبدالملک تمیمی اور شورکوٹ کے گورنر جلال الدین محمود غازی بنے۔

خلافت عباسیہ کے دور میں جھنگ کے جن گورنروں کے نام ملتے ہیں ان میں موسےٰ بن کعب، تمیمی، عیینیہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں مشہور عمر بن حفص ہے۔ جو در پردہ فاطمی تحریک کا ہمنوا تھا۔

جب محمود غزنوی نے ملک ایاز کو اپنا نائب بنا کر لاہور میں متعین کیا تو شورکوٹ جھنگ، چنیوٹ، بھیرہ وغیرہ کے علاقے ملک ایاز کی نگرانی میں رہے۔

محمود غزنوی کے بعد کھوکھروں نے بھیرہ سے شورکوٹ تک کا علاقہ سنبھال لیا۔

پھر جب التمش حکمران ہوا جسے خلافت عباسیہ بغداد سے باقاعدہ طور پر ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کیا تو اس نے اپنی حدود سلطنت دہلی تک وسیع کر لیں اور جو علاقے ناصر الدین قباچہ نے ایبک کے زمانے میں اپنی ریاست میں شامل کر لیے تھے وہ بھی اس سے واپس لے لیے۔ اس طرح شورکوٹ تا بھیرہ اور علاقہ کوہستان بھی التمش کی حکومت میں چلا گیا۔ اس نے جھنگ کے نول سردار ٹوڈر کو باقاعدہ مقامی اختیارات سونپے۔

جس جگہ آج کل جھنگ شہر آباد ہے۔ یہاں گھنا اور وسیع جنگل تھا۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہاں سے دو میل جنوب مشرق کی طرف برہمن گڑھ کا قلعہ اور شہر تھا۔ اس برباد شدہ قلعہ پر مہر سیال کا مزار موجود ہے۔ کیونکہ رائے سیال اور اس کی اولاد حضرت شیر شاہ جلال بخاری سے بیعت ہو چکے تھے اور وہ عموماً بھیرہ، خوشاب، چنیوٹ، ساہیوال، شاہ پور کے علاقوں میں عموماً جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اس وسیع جنگل میں شہر بسانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جھنگی یا جھانگ کے نام سے یہ علاقہ پہلے ہی مشہور تھا۔ حضرت شاہ جلال نے رائے سیال کو بشارت دی کہ آئندہ اس علاقے پر تمہاری حکومت ہوگی چنانچہ ۱۲۸۸ء میں اس بشارت کے تحت نئے شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ اور اس کا نام جھنگ سیالاں رکھا۔

۱۴۶۰ء میں جھنگ پر لنگاہوں کا حملہ ہوا اس جنگ میں جھنگ تباہ و برباد ہو گیا لیکن ۱۴۶۲ء میں جھنگ شہر جو اس لڑائی میں تباہ ہو گیا تھا مل خاں نے دوبارہ بسایا۔

اکبر کے عہد میں جھنگ صوبہ ملتان سے منسلک ہو گیا۔ ۱۸۱۶ء میں سردار کھڑک سنگھ کی قیادت میں سکھوں کی فوج نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ ۱۸۱۸ء میں ملتان شہر پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا تو جھنگ اور اس کی ذیلی و ملحقہ ریاستوں پر سکھ افسران متعین ہو گئے تھے اور اس طرح جھنگ سکھوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۸۴۸ء میں ضلع جھنگ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور سکھ حکومت کے تمام کارندوں کو فارغ کر کے جملہ اختیارات خود سنبھال لیے۔

۱۸۹۰ء میں ضلع جھنگ کی از سر نو حد بندی کی گئی۔ لیہ کا علاقہ جھنگ سے نکال کر ضلع مظفر گڑھ میں شامل کر دیا۔ حیدرآباد کو ضلع میانوالی میں پنڈی بھٹیاں کو ضلع گوجرانوالہ میں کمالیہ اور ساہیوال کو علیحدہ کر کے ضلع ساہیوال بنایا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ساندل بار کا علاقہ جو سب تحصیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ کاٹ کر لائل پور کے نام سے نیا ضلع بنا دیا گیا۔ باقیماندہ ضلع کو بھی انتظامی اعتبار سے تحصیلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جھنگ تحصیل کا صدر مقام جھنگ صدر (مگھیانہ) مقرر ہوا۔

۱۴ اگست کو پاکستان کے قیام کے بعد سے جھنگ پاکستان کا ایک شہر ہے۔

انگریزوں کی عملداری کے ابتدائی دنوں میں یعنی ۱۸۸۱ء جھنگ کا مجموعی رقبہ ۶۰۰۷ میل پر مشتمل تھا۔ اور اس کی آبادی ۳۹۵۲۹۶ تھی ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع جھنگ کا کل رقبہ ۳۴۰۱ مربع میل رہ گیا ہے۔ اس کی کل آبادی ۱۵۵۳۶۵۷ تک پہنچ گئی ہے۔ جھنگ شہر کی آبادی ۱۹۷۲ء میں چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس وقت زنانہ مردانہ دو ہائی سکول اور تیرہ پرائمری سکول جاری ہیں۔ سات مذہبی مدارس ہیں۔

جھنگ صدر:۔ موجودہ شہر ان دنوں ضلع جھنگ کا صدر مقام ہے۔ جو جھنگ صدر کے نام سے موسوم ہے۔ تمام ضلعی دفاتر اسی جگہ واقع ہیں۔ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ پندرہ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ موجودہ شہر سے ڈیڑھ میل مشرق کی جانب جہاں مائی ہیر کا مزار ہے۔ قدیم شہر اور قلعہ اسی جگہ پر تھے۔ ۱۹۴۹ میں محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ کے مطابق یہ شہر سکندر اور چندر گپت کے عہد میں

تعمیر و انتقامات

تاریخ میں دوسری مرتبہ یہ شہر مغل تاجدار جہانگیر کے عہد میں ایک چھوٹی سی بستی کی شکل میں میگھا نامی ایک سیال نے آباد کیا تھا۔ یہ جگہ نسبتاً بلند تھی کیونکہ قدیم زمانے میں یہاں ایک قلعہ تھا۔ جو تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اسی قلعے کے کھنڈروں پر مگھیانہ شہر آباد ہوا۔ شہر کے گرد پختہ فصیل تعمیر کی گئی۔ اس کے چاروں طرف پختہ دروازے بنائے گئے۔ قدیم شہران چار دروازوں کے اندر تھا۔ دونوں شہروں کا انتظام چلانے کے لئے ایک میونسپل کمیٹی جس میں جھنگ شہر اور جھنگ صدر (مگھیانہ) ۱۸۸۰ء سے آج تک شامل ہیں۔

۱۹۵۰ء میں سیلاب سے شہر کو سخت نقصان پہنچا۔ حکومت نے تین میل مشرق کی جانب سیٹلائٹ ٹاؤن بسایا۔

جھنگ صدر میں دو مردانہ ایک زنانہ ڈگری کالج۔ ایک زنانہ انٹر کالج ایک کمرشل انسٹی ٹیوٹ۔ دو ٹیکنیکل سکول، پانچ مردانہ اور ایک زنانہ ہائی سکول چار مڈل سکول اور چالیس پرائمری سکول ہیں۔ اس وقت ۵۳ جامع مساجد ۹۶ دیگر مساجد اور دو عید گاہیں ہیں۔ پانچ فلور ملیں اور ایک شوگر مل ہے۔

جھوٹ کذب۔ دروغ، خلاف واقعہ، غلط، انسان کے سارے اخلاق ذمیمہ میں سب سے زیادہ بری اور مذموم عادت خواہ وہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے۔

جھوٹ تمام قسم کی قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے۔ انسان کے دل کے اندر کی بات سوائے اللہ تعالےٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا شخص کسی فرد کے بارے میں اگر کچھ جان سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اگر وہ اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کرتا ہے۔ تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے۔ ایسے انسان میں دنیا کی جو برائیاں بھی ہیں وہ اس سے کم ہیں۔

شریعت میں جھوٹ کی بہت زیادہ مذمت آئی ہے۔ جھوٹ کبیرہ گناہوں میں داخل ہے۔

نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو جھوٹا ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر نبی سچا نہیں تو اس کے دعوے اور پیام پر کسی کو بھروسا نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے صدق نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی گئی ہے اور بتایا گئی ہے کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہو سکتا۔

"اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور آہی جائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گذرنے والا کذاب ہو۔" (۴۰ : ۲۸)

اس آیت سے واضح ہے کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

"اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو۔" (۳۹ : ۳)

آنحضورؐ نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔" (بخاری)

ایک اور حدیث آپ نے فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے۔" آپ نے فرمایا "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو نیکی کا کام کرتا ہے وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا۔" اس شخص نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا " جھوٹ بولنا۔ جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا۔ اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔" (مسند احمد)

اس حدیث سے واضح ہے کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں۔ اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

ایک اور جگہ پر آپ نے فرمایا۔

"جھوٹ رزق کو گھٹاتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

اسلام کی لغت کا سب سے سخت ترین لفظ لعنت ہے۔ جس کے معنی اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کا مستحق شیطان کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہودیوں کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بناء پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالےٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے۔ مباہلہ کے موقع پر فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدا تعالےٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

"پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں" (۳ : ۶۱)

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

"اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔" (۲۴ : ۷)

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر انجان بن جائے۔ حق کا علم رکھتے ہوئے بھی اس کے اظہار سے باز رہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ یہ گویا ایک طرح نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ جو دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

"اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی طور پر جھوٹے ہیں۔" (۶۳ : ۱)

اسی بنا پر آنحضورؐ نے جھوٹ کو نفاق کی ایک علامت بتایا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ منافق کی پہچان تین باتیں ہیں۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔" (بخاری)

جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جس کی وجہ سے بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں یا جو اس

Marfat.com

کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو۔ لیکن یہ قولی ہے یعنی زبان کا جھوٹ۔ کذب عملی یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

اسلام اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ بچوں کو بہلانے کے لئے ان سے جھوٹے وعدے کر لئے جائیں جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔

ایک صحابی عبداللہ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا جب کہ آنحضورؐ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ "یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی۔" آنحضورؐ نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو۔ میری ماں نے کہا اس کو کھجور دے دوں گی۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ بھی تمہارا جھوٹ لکھا جاتا۔ (ابوداؤد)

اس تعلیم کا منشا ایک طرف تو یہ ہے کہ مسلمان کی زبان کسی حالت میں بھی جھوٹ سے آلودہ نہ ہونی چاہیئے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید کرنا اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویے سے بچے کی تعلیم و تربیت پر اثر پڑے گا۔

بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی موجود ہوتی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید نے آنحضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہر جھوٹے سے جھوٹا جھوٹ بھی لکھا جاتا ہے۔ (مسند احمد)

اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی جو خوش گپی کے موقع پر محض لطف صحبت کے لئے بولا جاتا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس، اس پر افسوس" (ابوداؤد) کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے۔ اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے۔ اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ کے برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کئے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابل اعتماد سمجھتا ہے۔ اس لئے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کرتا ہے۔ اسلام نے اس کو خیانت قرار دیا ہے۔

آنحضورؐ نے فرمایا کہ یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآں حالانکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو۔" (ادب المفرد)

اس سے زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زور اور افک وغیرہ کے ناموں سے تعبیر کیا ہے۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالےٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے۔ "بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔" (۲۲: ۳۰)

- جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ایک انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے۔ ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں سماعون للکذب (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے۔ (۵: ۴۱)

جہلم: پاکستان کا ایک شہر اور ضلع۔ جو لاہور سے ۱۰۵ میل کے فاصلے پر شمال مغرب میں دریائے جہلم کنارے واقع ہے۔ یہ ضلع ۳۲ درجے ۲۷ دقیقے اور ۳۳ درجے ۱۵ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۲ درجے ۳۲ دقیقے اور ۷۳ درجے ۴۸ دقیقے طول بلد مشرق کے درمیان واقع ہے۔

تاریخی لحاظ سے جہلم نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ جہلم کا ذکر اس زمانے سے چلا آتا ہے جب آریا وسط ایشیا سے اس ملک میں آئے تھے اور قافلوں کی شکل میں اس جگہ مقیم ہوئے تھے۔ جہاں آج کل دریا کے کنارے شہر جہلم واقع ہے۔

جہلم کا ذکر تاریخ میں اس وقت نمایاں طور پر آتا ہے جب سکندر اعظم نے اس ضلع کی تحصیل پنڈدادن خان میں دریائے جہلم کے دائیں کنارے پورس سے جنگ کے موقع پر اپنا فوجی کیمپ لگایا تھا جو کئی میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت راجہ پورس جہلم پر حکمرانی کرتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ راجا بکرماجیت کا بھائی جو جوگی ہو گیا تھا۔ ٹلہ کی خانقاہ پر پہنچا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں بال ناتھ جوگی کی اس خانقاہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ خانقاہ گورکھ ناتھ کے نام سے منسوب تھی۔ مہابھارت کی جنگ کے بعد پانچ پانڈو بھائی جلاوطنی کے بعد اس جگہ آئے تھے۔

۲۷۲ تا ۲۳۱ قبل مسیح میں جہلم کا علاقہ اشوک کی سلطنت میں شامل تھا اور اس کا ایک حصہ تھا۔

تاریخ میں جہلم کا دوبارہ ذکر اس وقت آتا ہے۔ جب یہ حکومت کشمیر کے زیر اثر رہا۔ چینی سیاح ہیون سانگ جب ۶۳۱ء میں یہاں پہنچا تو اس وقت سے لے کر نویں صدی عیسوی تک یہ علاقہ کشمیر کے ہندو راجاؤں کے زیر نگین رہا۔ بعد میں یہ علاقہ یکے بعد دیگرے کابل کے برہمن راجاؤں، محمود غزنوی، محمد غوری، بلبن، فیروز شاہ تغلق اور تیمور کے ہاتھوں سے ہوتا ہوا ۱۵۱۹ء میں بابر کے قبضے میں آیا۔ اس زمانے میں کئی عمارات اور مندر بنے جو جہلم کے نزدیک کے علاقہ میں کھنڈرات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس علاقے نے محمود غزنوی جیسے فاتح اور شہاب الدین محمد غوری جیسے عظیم شہنشاہوں کو بھی یہاں سے گذرتے دیکھا جب کہ ان کی منزل مقصود دہلی تھی۔ اس علاقے کی مغل شہنشاہوں نے بھی تعریف کی ہے۔ جب یہ علاقہ شیر شاہ سوری کے زیر نگیں آیا تو اس نے ہمایوں کے مقابلے کے لئے رہتاس کا مشہور قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ رہتاس ۲۶۰ ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے جو ۱۵۴۰ء میں تیار کرایا تھا۔

بابر نے وادیٔ جہلم کی حسین ترین جھیل کلرکہار کا ذکر نہایت دلچسپ پیرائے میں کیا ہے ضلع جہلم ہی میں مہابت خان نے جو شاہجہان کا جرنیل تھا جہانگیر اور نورجہاں کو گرفتار کیا تھا۔ دریائے کے اس پار قصبہ "سرائے عالمگیر" مغلوں ہی کی یادگار ہے۔

۱۷۹۳ء میں زمان شاہ کابل کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد جب دہلی پر حملے کے لئے بڑھا تو اس کی توپوں میں سے بارہ توپیں دریائے جہلم میں ڈوب گئیں۔

۱۸۱۰ء میں اس علاقے پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ پنڈدادن خان میں سکھوں نے اپنا دارالضرب بھی قائم کیا تھا۔ بعد میں یہ علاقہ انگریزوں کے ماتحت آگیا۔ انگریزوں نے ۲۳ مارچ ۱۸۴۹ء پنڈدادن خان، چکوال، تلہ گنگ اور جہلم کی چار تحصیلیں اس ضلع میں شامل کیں اور پنڈدادن خان کو اس ضلع کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں جہلم تحصیل کو تلہ گنگ کی تحصیل میں شامل کر دیا گیا اور جہلم کی نئی تحصیل قائم ہوئی۔ بعد میں پنڈدادن خان کی جگہ جہلم شہر کو ضلع جہلم کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ موجودہ دور میں ضلع جہلم تین تحصیلوں پر مشتمل ہے

[redacted]

Marfat.com

مسجد افغاناں جو دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔

۱۔ تحصیل جہلم۔ اس کا رقبہ ۸۹۶ مربع میل اور آبادی

۲۔ تحصیل چکوال۔ اس تحصیل کا رقبہ ۱۰۱۲ مربع میل اور آبادی

۳۔ تحصیل پنڈدادن خان۔ اس کا کل رقبہ ۴۸۶ مربع میل اور آبادی۔

دریائے جہلم اس ضلع کو مشرق میں کشمیر سے اور جنوب میں گجرات اور ضلع سرگودھا سے جدا کرتا ہے۔ یہ دریا ضلع کی حدود کے ساتھ ساتھ ایک سو بیس میل تک بہتا ہے۔ ضلع میں تلہ اور نیلی کے سلسلہ ہائے کوہ پائے جاتے ہیں۔ اس علاقے کو بابر "بچہ کشمیر" کہا کرتا تھا اس علاقے کی معدنیات میں سے نمک کی برآمد سب سے زیادہ ہے۔ کھیوڑے کی کان جو دنیا کی بڑی بڑی کانوں میں سے دوسرے درجے پر ہے۔

جہلم کے قابل دید مقامات میں قلعہ رہتاس ہے جو جہلم سے شمال مغرب کی جانب دس میل کے فاصلے پر ہے جو شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ اس کی تعمیر پر اس زمانے میں ۰۰۰ر۲۵ر۳۴ روپیہ صرف ہوا تھا۔ قلعے کے لئے اس جگہ اور نام کا انتخاب خود شیر شاہ نے کیا تھا۔ قلعے کا محیط ڈھائی میل ہے۔

کھیوڑہ:۔ یہ دنیا کی نمک کی بڑی بڑی کانوں میں سے دوسرے نمبر پر ہے۔ دنیا کا بہترین نمک یہاں سے نکالا جاتا ہے۔ کان کا اندرونی حصہ قابل دید ہے۔ آج کل سوڈا ایش ... نمک نکالا جاتا ہے۔

کلر کہار کی جھیل:۔ اس کی بابر نے اپنی "تزک" میں بڑی تعریف کی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں پر بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ منگلا ڈیم جہلم سے ۱۹ میل کے فاصلے پر بنایا گیا ہے۔ یہ ڈیم بن جانے سے پاکستان بجلی کے معاملے میں خود کفیل ہو گیا ہے۔

پہاڑوں میں گھری ہوئی ۲۰ میل لمبی جھیل اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان کی ہمت کے سامنے دریا، پہاڑ کوئی شے نہیں۔ دریا کے کنارے مسجد افغاناں ہے جو جہلم میں داخل ہوتے ہوئے ایک حسین منظر پیش کرتی ہے۔

جہلم ضلع اور اس کے صدر مقام کا نام ہی نہیں بلکہ اس دریا کا نام بھی جہلم ہے جس کے دائیں کنارے پر اس نام کا شہر آباد ہے۔

جہلمی فقیر محمد:۔ رو دیکھیے۔ "فقیر محمد جہلمی"۔

جہم بن صفوان ابو محرز۔ الہٰیات کا ایک عالم۔ جہم کو بعض اوقات ترمذی اور سمرقندی بھی کہا گیا ہے۔ یہ خوارزم کے ایک قبیلہ راسب کے مولیٰ تھے۔ ان کا ذکر حارث بن سریج کے کاتب کی حیثیت سے آتا ہے۔ جو تاریخ میں "صاحب الرایۃ السوداء" (کالے جھنڈے والے) کے نام سے مشہور ہے۔ جس نے بنو امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔

جہم ۱۱۶ھ/۷۳۴ء سے ۱۲۸ھ/۷۴۶ء تک مشرقی خراسان کے ایک حصے کا فرمانروا بھی رہے۔ ۱۲۸ھ/۷۴۶ء میں انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس تحریک بغاوت کا جس کی ذہنی قیادت جہم نے کی تھی۔ بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ حکومت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اسی وجہ سے اس تحریک کو مرجئہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

جہم نے ایک ہندی فرقہ سمنیہ کے رد میں اللہ کی ہستی پر دلائل عقلیہ پیش کئے تھے۔

دیگر آراء جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وہ فرقہ جہمیہ کی ہیں۔ جس کا ذکر ان کی وفات کے ستر سال بعد سننے میں آیا۔ ان آراء کا تعلق جہم کے ساتھ واضح نہیں ہے۔

جہمیہ قدیم زمانے کا ایک فرقہ۔ اس فرقے کے بارے میں سب سے دلچسپ یہ ہے کہ اس کے افراد میں سے کسی کا نام معلوم نہیں۔ سوائے جہم بن صفوان کے جس کو اس فرقے کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں جب یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تو بشر بن غیاث المریسی اور اس دور کے بعض دوسرے لوگوں نے فرقہ جہمیہ کے عقیدے کی اشاعت کی۔

بشر جو ابو یوسف کا شاگرد تھا ابراہیم بن المہدی کے زمانے (۲۰۲ھ/۸۱۷ء) میں اس کے ان عجیب خیالات کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔

جہمیہ کے بارے میں ابتدائی سوائے اس کے مخالفوں کی تحریروں میں ملتے ہیں اور خاص طور پر امام احمد بن حنبل کی تصنیف "الرد علی الزنادقۃ والجہمیہ" اور ان

Marfat.com

کے ہم خیال لوگوں مثلاً [illegible] و المشبہہ"، الاشعری کی "الابانہ" خشیش کی " [illegible] اور ابن رجب البغدادی کی " ذیل طبقات الحنابلہ" میں موجود ہیں۔

جہمیوں کے نزدیک جو قرآن کے الفاظ کو مخلوق یا اللہ کی صفت علم کا انکار کرتا تھا، کافر تھا۔

نعیم بن حماد نے جو غالباً ۲۳۱ھ/۸۴۶ء میں قید خانے میں فوت ہوا اور جب اس نے قرآن کے مخلوق ہونے کا انکار کیا تو بتایا کہ وہ پہلے جہمی تھا۔

جہمیہ نے عقیدہ "جبر" کی انتہائی شکل کو اختیار کیا تھا۔ جس کی رو سے انسانوں کی طرف فعل کی نسبت محض مجازی ہے۔ جیسے کہ غروب ہونے میں سورج کا فعل مجازی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق قرآن مخلوق تھا۔ نیز وہ اس بات کا انکار کرتے تھے کہ اللہ تعالے کے لئے کوئی مستقل ازلی صفت علم ثابت ہے۔ ان کے عقیدے کے لحاظ سے حوادث دینوی کا علم اللہ تعالے کو ان کے ظہور کے بعد ہوتا ہے بالعموم وہ تمام صفات الہیہ کے علیحدہ وجود کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی لئے ان پر تعطیل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ (یعنی وہ اللہ تعالے کو محض ایک مجرد ہستی ٹھہراتے ہیں)

قرآن میں جو صفات جیسے ید، وجہہ وغیرہ اللہ تعالے کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ جہمیہ ان کی عقلی تاویل کرتے تھے۔ ایمان کے بارے میں ان کے عقائد مرجئہ کے عقائد سے مماثلت رکھتے تھے۔

نعیم بن حماد اور ابن عساکر نے اس فرقے کی نشوونما کا باعث متبعین ابوحنیفہ کو اور بصرے میں عمرو بن عبید کو قرار دیا ہے۔ جب کہ حنابلہ کے خیال میں وہ لوگ تھے جو عام طور پر معتزلہ شمار ہوتے تھے۔ حقیقت میں جہمیہ کے خیالات اور ابوالہذیل جیسے معتزلہ کے عقائد میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ بعد میں معتزلہ نے اپنے حلقے سے ان لوگوں کو خارج کر دیا جو ان سے مسئلہ قدر یا اختیار کے باب میں اختلاف کرتے تھے۔ اگرچہ وہ بہت سے دیگر مسائل میں ان سے متفق تھے۔ متبعین ابوحنیفہ کی طرف سے بھی جہمیہ پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔

جہنم دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام۔ جہنام کے معنی بہت زیادہ گہرائی کے ہیں۔ جہنم کا لفظ اسی سے نکلا ہے۔

لوگوں کے مرنے کے بعد ان کی روحوں کے محشر میں جمع ہونے کا عقیدہ بہت پرانا ہے۔ یہ عقیدہ تقریباً بیسویں قبل مسیح کے بعد سے اکاریوں، سومیریوں، قدیم مصریوں، یونانیوں، اشوریوں اور حطیوں میں راسخ ہو چکا تھا۔ نیز ہندومت، بدھ مت اور زرتشتیت میں بھی اس عقیدے کے بارے میں کچھ نہ کچھ ملتا تھا۔ لیکن موجودہ اہم مقدس کتابوں میں اس عقیدے کے بارے میں جو تعلیمات ملتی ہیں وہ مبہم اور مختصر ہیں۔

اسلام واحد مذہب ہے جس نے نہایت واضح الفاظ میں آخرت اور آخرت میں مکافات و عقوبت کے عقیدے کو بیان کیا ہے۔

قرآن مجید میں آنحضور ؐ کے بارے میں بشیر (خوشخبری دینے والا) اور نذیر (ڈرانے والا) بنا کر بھیجنے کا ذکر بار بار آیا ہے۔

قرآن مجید میں جہنم کا ذکر بھی واضح طور پر موجود ہے۔

قرآن کے مطابق جہنم بے ایمان مرنے والوں اور ایسے گناہ گاروں کا ٹھکانہ ہے جن کے جرم ناقابل معافی ہیں۔ اس کا سب سے نمایاں وصف آگ ہے۔ قرآن میں بعض جگہوں پر آگ کے معنی میں آنے والا کلمہ "نار" ہی جہنم کے لفظ کی جگہ پر استعمال ہوا ہے [illegible] کہ جہنم سات طبقوں یا [illegible] مکان ہے۔

۱۔ جہنم [illegible]

۲۔ سعیر۔ جو [illegible]

۳۔ حطمہ۔ جو یہودیوں کا ٹھکانہ ہے۔

۴۔ لظیٰ۔ جس میں دیو اور ابلیس کا ٹھکانہ ہے۔

۵۔ سقر۔ جو جباروں اور متکبروں کی سزا کی جگہ ہے۔

۶۔ جحیم۔ جو مشرکوں اور بت پرستوں کی جگہ ہے۔

۷۔ ھاویہ۔ جو سب سے نیچے ہے۔ اور یہ فرعونوں اور منافقوں کا ٹھکانہ ہے۔

قرآن مجید میں جہنم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے۔ سرکشوں کا ٹھکانہ۔ جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ چکھیں گے۔ کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون۔ (ان کے کرتوتوں) کا بھرپور بدلہ (۷۸: ۲۱ تا ۲۶)

قرآن مجید میں جہنم کے ایک درخت کا ذکر بھی آیا ہے۔ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالے فرماتا ہے۔

"بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لئے فتنہ بنا دیا ہے وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے۔ اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لئے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی۔" (۳۷: ۶۲ تا ۶۸)

جہنم کا کئی ایک احادیث میں بھی ذکر آیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے آنحضور ؐ نے فرمایا کہ دوزخ میں ہزار برس تک آگ پھونکی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگیا پھر ہزار برس زیادہ تیز کی گئی پر وہ سفید ہوگیا۔ پھر ہزار برس زیادہ تیز کی گئی حتیٰ کہ سیاہ ہوگیا۔ سو دوزخ کی آگ سیاہ تاریک ہے اس میں روشنی ہرگز نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ)

جہنم کی گہرائی کے بارے میں ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اگر اس میں کنکر پھینکا جائے تو ستر برس میں بھی اس کی تھاہ کو نہیں پہنچے گا۔ (مسلم)

معتزلہ کے نزدیک جہنم میں داخل ہونے والے پھر باہر نہیں نکلیں گے۔ مگر ان کے علاوہ اشاعرہ اور دیگر فرقوں اور مذاہب (مسلکوں) اور اکابرین سلف کے نزدیک صاحب ایمان لوگ جہنم میں تا ابد ہرگز نہیں رہیں گے بلکہ یہ بھی کہ جنہیں اللہ چاہے وہ وہاں رہے بغیر ہی نجات پا جائیں گے

جہنم کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ وہ قید خانہ نہیں بلکہ شفاخانہ ہے اور بقول سید سلیمان ندوی اس کا منشا یہ ہے کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کو نتائج بد کو دور کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہوگی۔ اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موعودہ بہشت میں داخل ہوگی۔

اس خیال کی تصدیق بخاری شریف کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ یہاں تک کہ جب دوزخیوں کو گناہوں سے خالص کر لیا جائے گا۔ اور وہ پاک و صاف ہو جائیں گے تب انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت

دالے جب ا... کی ...

نیز عبداللہؓ بن عمرو اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا جب اس میں کوئی متنفس نہ ہوگا اور اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے۔ (مسلم و مسند احمد)

جمہوریہ جب ہسپانیہ میں سقوط خلافت بنو امیہ پر جو ہولناک تصادم رونما ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل قرطبہ نے بارسوخ اور معزز مدبر ابوحزم جہور بن محمد بن جہور کے مشورے سے اول تو شاہی خاندان کے جملہ افراد کو نالائق قرار دیا اور پھر انہیں شہر بدر کر دیا۔ اور ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء میں ایک جمہوریہ کا اعلان کر کے اس کی صدارت وزیر ابوحزم کے سپرد کر دی۔ ابوحزم اس سے پہلے بھی ہشام ثانی کے دور میں اپنی عظیم سیاسی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کر چکا تھا۔ اس نے صدر منتخب ہونے کے بعد تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے ایک جمہوری طرز کی حکومت قائم کر دی۔ اور مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے ایک مجلس قائم کی۔ وہ مجلس جو فیصلے کرتی تھی ابوحزم ان کی طرف سے ان فیصلوں کو نافذ کر دیتا تھا۔

اس طرح قرطبہ میں پھر امن و امان بحال ہو گیا۔ تجارت میں بھی از سر نو زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ابوحزم کی یہ حکومت ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء تک تقریباً بارہ سال تک قائم رہی۔

ابوحزم کے بعد اس کا بیٹا ابوالولید محمد اس کا جانشین بنا اور الرشید کا لقب اختیار کیا۔ اس نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر حکومت کا انتظام چلانا چاہا۔ اس میں ابوحزم جیسی قوت نہ تھی کہ حکومت کر سکتا۔ لہٰذا اس نے اپنی چھوٹی سی ریاست کا انتظام اپنے وزیر ابن السقا کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ قرطبہ پر اصل حکومت ابن السقا ہی کی تھی۔ اور الرشید برائے نام تھا۔ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں اس کے بیٹے عبدالملک نے المعتضد کے کہنے میں آکر ابن السقا کو دھوکے سے قتل کر دیا تو الرشید نے اپنا ولی عہد بنا دیا اور اجازت دے دی کہ جس طرح وہ چاہے امور سلطنت انجام دے۔ لیکن قرطبہ کے باشندے اس کی خلاف قانون کارروائیوں کے باعث بہت جلد اس سے نفرت کرنے لگے۔ ۴۶۱ھ/۱۰۶۹ء میں جب المعتضد (حاکم اشبیلیہ) وفات پا گیا تو ابن الافطس نے قرطبہ پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ عبدالملک نے المعتمد سے مدد طلب کی۔ اس نے تیرہ سو سواروں کا ایک دستہ اس کی مدد کے لیے بھیجا۔ اس لشکر نے ابن الافطس کو محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا۔ المعتمد کے قائدین عسکر نے اس کے سن رسیدہ باپ الرشید کو جو گذشتہ پچیس سال سے حکمران تھے، گرفتار کر لیا تو اہل قرطبہ نے ذرا مزاحمت نہ کی۔ چنانچہ ان دونوں کو جزیرہ سالٹیز میں جلا وطن کر دیا گیا۔

جہیر، بنو ایک خاندان جس نے سلاجقہ اعظم کے دور اقتدار میں خلیفہ کی وزارت کی تقریباً مکمل اجارہ داری سنبھال رکھی تھی۔

اس خاندان کو جو سیاسی اقتدار حاصل تھا اس کا بانی فخر الدولہ ابونصر محمد بن محمد بن جہیر تھا جو ۳۹۸ھ/۱۰۰۸ء میں موصل میں دولت مند تاجروں کے ایک خاندان میں پیدا ہوا۔ اس نے اس شہر کے عقیلی فرمانرواؤں کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ فرمانروا مذہباً شیعہ تھے ۴۴۲ھ/۱۰۵۰ء میں فخر الدولہ حلب چلا گیا جہاں پر اس نے خاندان مرداسیہ کے شیعہ حکمران معز الدولہ ثمال کا وزیر مقرر ہو گیا۔ ۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء میں اس نے دیار بکر کے مروانی فرمانروا نصر الدولہ کے ہاں سکونت اختیار کر لی اور جلد ہی اس کا وزیر بن گیا۔ نصر الدولہ سنی العقیدہ تھا۔ جب نصر الدولہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بیٹوں میں جھگڑے شروع ہوئے تو فخر الدولہ نے خلیفہ القائم کی ان دشواریوں سے فائدہ اٹھایا جو اسے ایک ایسے وزیر کے انتخاب کے سلسلے میں پیش آ رہی تھیں جو ایک طرف تو سلطان کا مقرب ہو اور دوسری طرف خلیفہ کے مخصوص حقوق کا تحفظ بھی کر سکے۔ چنانچہ ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء میں فخر الدولہ کو اس منصب کی پیش کش کی گئی۔ بنو عباس کی وزارت پر یہ خاندان تقریباً نصف صدی تک فائز رہا۔ فخر الدولہ ۴۶۰ھ/۱۰۶۹ء سے صرف چار ماہ کی مدت کے سوا ۴۷۱ھ/۱۰۷۸ء تک وزیر رہا۔ جب اس پر عتاب نازل ہوا تو اس کے چند ماہ ہی اس کے بیٹے عمید الدولہ نے اس کی جگہ لے لی۔ ۴۶۰ھ - ۴۶۱ھ/۱۰۶۸ء - ۱۰۶۹ء میں نظام الملک کی ایک بیٹی کے ساتھ عمید الدولہ کی شادی کے واقعے کے بعد نظام الملک اور ابن جہیر کے درمیان باہمی روابط اور بھی زیادہ مضبوط ہو گئے۔ کیونکہ ابن جہیر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کی حیثیت اس صورت میں مستحکم رہ سکتی ہے کہ وہ ایک طرف تو حقوق خلافت کا دفاع کرے اور یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ اسے خلیفہ کے احکام کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی خواہش ہے اور دوسری طرف سلطنت اور اس کے ممتاز اور مقتدر وزیر نظام الملک کے ساتھ گہرے ذاتی تعلقات قائم رکھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا قدم اس کی اس سوچ کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ جب نظام الملک کی بیٹی وفات پا گئی تو اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی ابن جہیر کی معزولی بھی عمل میں آئی۔ بعد میں عمید الدولہ کی شادی متوفیہ کی بھتیجی یا بھانجی سے ہو گئی۔

ملک شاہ کے دور حکومت (۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء تا ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) کے نصف آخر میں بغداد پر سلاجقہ کی گرفت کے باوصف جو روز بروز کڑی ہوتی جا رہی تھی خلیفہ المقتدی نے بنو جہیر کی جگہ مسکویہ کے جانشین ابوشجاع زودراوری کو مقرر کر دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بنو جہیر نے ایک اور خطرناک مہم کا بیڑا اٹھایا۔ فخر الدولہ نے کچھ ایسا منصوبہ بنایا کہ ملک شاہ جس نے اسے لشکر مہیا کیا تھا اسے اس ریاست کی فتح کا کام تفویض کر دے جہاں اس نے حقیقتاً اپنے مفادات محفوظ اور روابط استوار کر رکھے تھے۔ لیکن اس نے ملک شاہ یا اس کے پیش رووں کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا تھا۔ چنانچہ یہ جنگ ۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء کے آغاز میں جا کر ختم ہوئی۔ فخر الدولہ نے آل مروان کا خزانہ ڈھونڈ نکالا اور بظاہر اسراف کی نذر کر ڈالا۔ اسی سال کے آخر میں اس کی غیر ہر دلعزیزی کے باعث ملک شاہ نے اس کی جگہ صوبے کا حاکم اپنے کسی اور نمائندے کو مقرر کرنا چاہا لیکن عمید الدولہ نے اس صوبے کے محاصل کا اجارہ لے لیا اور تین سال میں ایک کروڑ دینار ادا کیے۔ دوسری طرف اس کے باپ فخر الدولہ کو موصل کی نظامت مل گئی۔ یہاں اس نے محاصل معاف کر کے ہر شخص کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ فخر الدولہ کی وفات سے قبل جو موصل میں ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں واقع ہوئی۔ بنو جہیر کا کھویا ہوا اقتدار بحال ہو گیا۔

اگلے سال نظام الملک نے خلیفہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ عمید الدولہ کو وزارت سونپ دے۔ چنانچہ وہ ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔

دیار بکر کی حکومت عمید الدولہ نے اپنے بھائی الکافی کو اپنا نمائندہ بنا کر سپرد کر دی تھی جس کی وفات پر اس کا بیٹا جانشین ہوا۔

بنو جہیر پر ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء میں پہلے سے بھی زیادہ سخت وقت آیا۔ ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں ملک شاہ کے مرنے کے بعد دیار بکر پر اس کے بھائی تتش نے قبضہ کر لیا۔ غالباً ایک مختصر عرصے کے لیے الکافی کو وزارت کے منصب پر بدستور فائز رکھنے کے بعد واپس بلا لیا گیا۔

بغداد میں نئے سلطان برکیاروق کے زمانے میں جب ان جنگوں کے دوران میں کمی واقع ہوئی جو اسے اپنے بھائیوں سے لڑنا پڑی تھیں۔ تو اس نے غالباً اس بنا پر کہ اسے اپنی حکومت کے ساتھ عمید الدولہ کی وفاداری پر شبہہ تھا اسے گرفتار کر لیا۔ اور اس پر الزام لگایا

Marfat.com

کہ اس نے دیار بکر اور موصل سے ملنے والے خزائن کو غصب کیا ہے۔ چنانچہ عمید الدولہ پر اس الزام میں ایک کثیر رقم کا جرمانہ بھی کیا گیا۔ تھوڑے عرصے بعد عمید الدولہ قید خانے ہی میں انتقال کر گیا۔

عمید الدولہ کے بعد اس کا بھائی الکافی ۴۹۳ھ/۱۱۰۳ء سے ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء تک خلیفہ المستظہر کا وزیر رہا اور پھر سلطان محمد کی سفارش پر ۵۰۲ھ/۱۱۰۹ء سے ۵۰۷ھ/۱۱۱۴ء تک اسی عہدے پر فائز رہا۔

اس کے بعد بنو جہیر کے ایک اور فرد نظام الدین ابو نصر المظفر بن محمد بن جہیر کا نام ملتا ہے جو استاد دار اور پھر ۵۳۵ھ/۱۱۴۱ء تا ۵۴۲ھ/۱۱۴۷ء تک خلیفہ کا وزیر رہا۔

جہیز اسباب، سامان۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ سر و سامان ہے جو لڑکی کو نکاح میں اس کے ماں باپ کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ جہیز دینے کی رسم بہت قدیم ہے۔ ہر ملک اور علاقے میں اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام طور پر جہیز زیورات، کپڑوں، نقدی اور روزانہ استعمال کی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں جہیز کی رسم بہت عجیب و غریب صورت اختیار کر گئی ہے بہت سے غریب والدین کی بیٹیاں اس بنا پر رشتوں سے محروم رہ جاتی ہیں کہ ان کے والدین اپنی بیٹی کو جہیز میں بہت سا ساز و سامان نہیں دے سکتے۔

اسلام میں اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے

جے پور بھارت کی ایک سابق ریاست جو ۲۵ درجے ۴۱ ثانیے اور ۲۸ درجے ۳۴ ثانیے عرض بلد شمالی اور ۷۴ درجے ۴۱ ثانیے طول بلد کے درمیان واقع ہے۔ کل رقبہ ۱۵۵۷۹ مربع میل ہے۔

اس علاقے کا پہلا حکمران جسے اس وقت ڈھونڈھار کہتے تھے۔ گوالیار کے کچھواہہ رئیس کی اولاد میں سے ہے جسے ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء کے قریب دوسہ کا ضلع اپنے خسر سے تحفے میں ملا تھا۔ چنانچہ دوسہ اس علاقے کا پہلا دارالحکومت بن گیا۔

موجودہ شہر جے پور کی بنیاد جس کے نام پر تمام ریاست موسوم ہے راجہ جے سنگھ دوم نے ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۸ء میں رکھی تھی۔ یہ راجہ جے سنگھ سوائی کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے امبر کو چھوڑ کر جو سابق دارالحکومت تھا نئے شہر کو اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ جے پور کو احمد آباد کے نقشے کے مطابق تیار کیا گیا۔ جس میں سایہ دار چوڑی سڑکیں اور کشادہ بازار تھے۔ اس نے احمد آباد ہی سے مختلف پیشوں کے ماہر دستکاروں کو بھی بلوایا تھا۔

جے پور کو مولانا عبدالحی لکھنوی نے اپنی کتاب یاد ایام میں جین نگر لکھا ہے۔ اس راجہ کو مغل شہنشاہ نے جے سنگھ سوائی کا خطاب تھا۔ یہ حکمران ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں امبر کی گدی پر بیٹھا اور ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں وفات پائی۔ اس نے جے پور، دہلی، بنارس، متھرا اور اجین میں رصدگاہیں بنوانے میں اپنے سائنسی علوم و ہنر سے خوب کام لیا وہ دھوپ گھڑی جو دہلی کی رصدگاہ کے مثلث برج کے اوپر نصب ہے آج تک درست وقت دیتی ہے۔

۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں جے سنگھ کے انتقال کے فوراً بعد ہی بھرت پور کے جاٹوں نے کئی شدید حملوں کے بعد جے پور ریاست کا ایک حصہ چھین لیا ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کے قریب ماچیری (الور) کے سردار کا ساتھ چھوڑ دینے سے ریاست کا رقبہ مزید کم ہوگیا۔ اس صدی کے اواخر میں جے پور کی ریاست انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور کئی ایک ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔

۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک معاہدہ ہوا لیکن تھوڑے سال بعد ہی ختم ہوگیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں ایک اور معاہدہ کیا گیا جس سے مرہٹوں کے حملوں کا سدباب ہوگیا۔

۱۲۴۹ھ/۱۸۳۰ء میں جے سنگھ سوم کے بچپن ہی میں جب ایک شورش برپا ہوئی تو ریاست میں ایک انگریز عہدے دار کا تقرر کیا گیا۔

۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں ایک اور بغاوت ہوئی جس میں ایک گورنر جنرل کا ایجنٹ زخمی اور ایک برطانوی پولیٹیکل افسر مارا گیا۔

چنانچہ انگریزوں نے جبر و تشدد سے کام لیا اور ریاستی اخراجات میں بھی کمی کر دی گئی اگست ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد یہ ریاست حکومت متحدہ بھارت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔

جیجل الجزائر کا ایک ساحلی شہر جو بجایہ کے مغرب میں ستر کلومیٹر اور کولو (COLLO) کے مشرق میں پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جیجل کا قدیم شہر ایک بلند جگہ پر واقع تھا جہاں آج بھی اس کا قلعہ موجود ہے۔ یہ دو خلیجوں کے درمیان واقع ہے۔ موجودہ شہر ۱۸۵۶ء میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے ترکوں کے قدیم شہر کے تباہ و برباد ہو جانے کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ یہ شہر سمندر کے کنارے بڑی مشرقی خلیج کے نزدیک واقع ہے۔

جیجل ایک بہت ہی قدیم شہر ہے۔ فینیقیوں نے اپنے عہد میں یہاں ادگل نامی ایک تجارتی منڈی بھی قائم کی تھی۔ فینیقیوں کے بعد یہ اہل قرطاجنہ کے ہاتھوں میں آیا رومیوں کے زمانے میں ادگل کی نوآبادی MAURETANIA CAESARIENSIS میں شامل تھی۔ یہاں ایک اسقف رہتا تھا۔ بعد میں یہ نوآبادی ونڈلوں کے قبضے میں آ گئی اور پھر ونڈلوں سے بزنطیوں کا اس پر قبضہ ہوگیا۔

جب المغرب پر عربوں نے قبضہ کیا تو جیجل آزاد رہا۔ اور بقول ابن خلدون ابتدائی ہجری صدیوں میں اس شہر پر بربری قبیلہ کتامہ کا قبضہ تھا۔ جو قریبی پہاڑیوں میں آباد تھے۔ اس کے بعد یہ شہر تاراج کیا گیا اور ویران ہوگیا۔ بعد میں البکری کے دور میں یہ شہر پھر آباد ہوگیا۔ اس نے لکھا ہے کہ یہاں اس وقت پرانی عمارتوں کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔

بعد میں اس شہر کو بنو حماد نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور انہوں نے یہاں پر ایک قلعہ کی بھی تعمیر کی۔

چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں عیسائیوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور عیسائی اس وقت تک اس شہر پر قابض رہے جب تک عبدالمومن نے بنو حماد کا خاتمہ کر کے ان کا علاقہ اپنی حکومت میں شامل نہ کر لیا۔ چنانچہ عبدالمومن نے عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس شہر کو خالی کر دیں۔

الموحدون کے اقتدار کے خاتمے پر اس شہر پر بنو حفص نے غلبہ پا لیا۔ یہ شہر کئی ایک مواقع پر بجایہ اور تونس کے حکمرانوں کے درمیان باعث نزاع رہا۔ ان دونوں حکومتوں کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے باشندے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی میں جیجل کی تجارتی اہمیت کم ہو گئی جس

[redacted]

Marfat.com

کا سبب بحری ڈاکہ زنی یعنی اختلاف کا ہوجانا تھا۔ دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں اس شہر پر اہل جنوا کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن اس قبضے کے ایک سال بعد ہی اہل جیجل نے عروج کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ جس نے احمد بن القاضی کی مدد سے جو ایک قبائلی سردار تھا اہل جنوا کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ٩١٨ھ/١٥١٢ء میں اسنے بجایہ کا محاصرہ کیا۔ ٩٢٢ھ/١٥١٦ء میں عروج نے الجزائر کو فتح کیا۔

خیرالدین باربروسہ نے قبائلیوں سے شکست کھا کر اس شہر میں پناہ لی۔ اور ٩٢٦ھ/١٥٢٠ء سے ٩٣٣ھ/١٥٢٧ء تک اس شہر میں سکونت پذیر رہا۔ خیرالدین نے جیجل کو اپنے بیڑے کا مرکز بنایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس شہر کو اپنا صدر مقام بنائے لیکن بعد میں اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے اس شہر کے لوگوں کی وفاداری کے صلے میں ان کو اور ان کے بعد آنے والوں کو ہمیشہ کے لئے تمام لگانوں سے مستثنیٰ کر دیا۔

١٠٢٠ھ/١٦١١ء میں عیسائی طاقتوں نے مشتعل ہوکر (SANTA CRUZ) کے مارکوئیس کی سالاری میں ہسپانوی بیڑے نے اس شہر کو نذر آتش کر دیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ پوری سولھویں صدی اور سترہویں صدی کے نصف اول تک جیجل کے جہاز ران بحری یلغاریں کرتے رہے تھے۔

١٠٧٤ھ/١٦٦٣ء میں حکومت فرانس نے جیجل میں اس فوجی بیڑے کے لیے جو بربری حملہ آوروں کا سدباب کرنے میں مشغول تھا۔ ایک مستقل بندرگاہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اگلے سال تقریباً آٹھ ہزار حملہ آور فوج جیجل میں اتار دی گئی۔ اور ٢٣ جولائی ١٦٦٤ء میں فرانسیسیوں کا اس شہر پر قبضہ ہوگیا۔ دوسری طرف الجزائری اپنی فوج لے آئے انھوں نے زبردست توپیں نصب کرلیں۔ چنانچہ الجزائری توپوں سے مار کھا کر فرانسیسی ٣١ اکتوبر ١٦٦٤ء کو اپنے دو ہزار آدمیوں کا نقصان اٹھا کر یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔

آئندہ کے حملوں کا سدباب کرنے کے لیے ترکوں نے اس شہر میں مستقل قلعہ نشین فوج مقرر کر دی۔ لیکن یہ فوج تعداد میں کم تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ قلعے میں بند اور مسلسل محاصرے کی حالت میں رہتی تھی۔

١١٩٨ھ/١٧٨٥ء میں جیجل کی تجارت کو پھر فروغ حاصل ہوا اور خوشحالی کی یہ کیفیت ١٨٠٣ء تک قائم رہی یہاں تک کہ قبائلی بغاوت نے اسے خطرے میں ڈال دیا۔ الحاج محمد بن الحرش نے شہر پر حملہ کیا۔ اور ترکی محافظ فوج فرار ہوگئی۔ الحاج محمد نے اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا۔ جیجل کی حکومت آغا کا خطاب دے کر حامی کے سپرد کر دی ١٨٠٥ء میں رئیس حمیدو کو باغیوں کی سرکوبی کے لئے جہازوں کے ایک دستے کے ساتھ بھیجا گیا۔ اس نے شہر پر گولہ باری کی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد قبائلیوں کی بدسلوکی سے تنگ آکر جیجل کے باشندوں نے دائی کی اطاعت قبول کرلی اور اس نے شہر میں نئی محافظ فوج بھیج دی۔

١٨٣٠ء میں ترکی حکومت کے خاتمے پر اس شہر کے باشندے آزاد ہوگئے۔ ان کی یہ آزادی و خودمختاری ١٨٣٩ء تک قائم رہی۔ ١٣ مئی ١٨٣٩ء کو الجزائر کے گورنر جنرل نے اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ١٨٥١ء میں جنرل سینٹ ارمنڈ کی سرکردگی میں ایک مہم نے قبائلیہ صغیر کے قبائل کو اپنا مطیع فرمان کرلیا اور اس طرح اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس بندرگاہ کو کارک کی برآمد کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو قبائلیہ صغیر کے جنگلات میں پیدا ہوتا ہے۔

جیحان ایک قدیم ندی، ان دو ندیوں میں سے ایک ہے جو سلیشیا میں سے ہوکر گذرتی ہے اور بحیرہ روم جا پڑتی ہے۔ دوسری جو زیادہ مغرب میں ہے۔ عرب جیحان سے مراد قدیم عصری پرمیس لیتے ہیں۔ مندرجہ بالا دونوں ندیوں کو عربوں نے جیحون اور سیحون کے ناموں پر جیحان اور سیحان کے نام دیئے ہیں یہ دونوں ندیاں عربوں اور بزنطیوں کے علاقوں میں حد فاصل تھیں۔

یہ دریا البستان کے ذرا شمال مشرق میں ان پہاڑوں سے نکلتا ہے جو اسے توخمہ صویو کی وادی سے جدا کرتے ہیں۔ اور توخمہ دریائے فرات کا ایک معاون ہے۔ البستان کے نزدیک چھوٹی چھوٹی بہت سی ندیوں کے ملنے سے جیحان کے پانی میں اضافہ ہوجاتا ہے فرمان صویان تمام ندیوں میں ممتاز ہے۔ جو جیحان میں آکر ملتی ہیں۔ آگے چل کر جب گوکسون چای اس میں آملتی ہے تو یہ جنوب کی سمت مرعش کا رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس شہر کے مضافات میں آق صو جو سہراب کی نہر حوریث کے نام سے مشہور ہے۔ آملتا ہے۔ یہ شمال مشرق سے آتا ہے۔

جیحان یہاں سے جبل لبنان کے مغرب کو جاتے ہوئے جنوب مغرب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اور سیس کے خطے سے گزرتا ہے۔ جہاں سے یہ اپنے معاونوں کو ساتھ لیتا ہوا کلیکیا کے میدان کے کنارے پہنچتا ہے۔ یہ اپنا راستہ مسس (المصیصہ) کی جانب بنالیتا ہے اور یہاں آطنہ کی شاہراہ اسے ایک قدیم پتھر کے پل کے ذریعے سے عبور کرتی ہے۔

دریائے جیحان کا دہانہ بحرہ روم میں ہے اور سیلابی مٹی سے بنے ہوئے ڈیلٹا کے باعث چند بار سرکتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ مشرق کی سمت مڑ کر فوراً سمندر کی ایک خلیج میں جا گرتا ہے۔ جو قدیم آیاس کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا زیریں اور وسطی حصہ علاقہ ثغور (سرحدی اضلاع) میں تھا۔ اس دریا کا ذکر حمدانی عہد کے شاعروں کے ہاں ایک سے زائد بار آیا ہے۔

مملوکوں کے عہد میں ملک ناصر محمد نے اس علاقے کو فتح کیا۔ اور وہ جیحان کی بگڑی ہوئی شکل جہان کی مطابقت سے "الفتوحات الجہانیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

جیحان کا لفظ کبھی کبھی دریا کے علاوہ اس خطے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یحییٰ ابن سعید الانطاکی نے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

جیرفت کرمان کا ایک زرخیز ضلع اور ایک شہر۔ یہ شہر بام کے جنوب مغرب میں واقع ہے جسے بارجان کے پہاڑ بام سے جدا کرتے ہیں۔

اس شہر کا ذکر سب سے پہلے اس وقت آتا ہے۔ جب ٣٥ھ/٦٥٥ء میں مجاشع بن مسعود نے اسے فتح کیا۔ اس کے بارے میں اس سے پہلے کے حالات معلوم نہیں ٣٥ھ/٦٥٥ء کے بعد سے اس کا نام عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں کثرت سے ملتا ہے اس شہر میں خوارج بھی سرگرم عمل رہے ہے۔ المقدسی مشہور جغرافیہ نویس نے اس شہر کی اراضی کی زرخیزی اور اس کی خوب صورتی کے بیان میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔ یعقوب صفاری اور اس کے بھائی عمرو نے اس شہر کو عمارتوں سے مزین کیا لیکن اسے منگول اور ایلخانی دور کے بعد کی طوائف الملوکی سے بہت زیادہ نقصان پہنچا۔

جیرفت کا ذکر تیموری عہد تک بدستور سننے میں آتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس شہر کا ذکر ماخذوں میں نہیں ملتا۔

اگرچہ ضلع کا نام موجودہ دور میں بھی یہی ہے۔ پرانے شہر کی جائے وقوع اگرچہ معلوم نہیں لیکن اس کے بارے میں قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور سبزاداراں کے موجودہ قصبے کے قریب ہوگی۔ کیونکہ وہاں پر بعض پرانے کھنڈرات بھی ملتے ہیں جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ضرور اس قدیم شہر کے ہوں گے۔

Marfat.com

بحیرہ قلزم کے ساحل پر جنوب مغربی سعودی عرب میں ایک وادی، ایک بندرگاہ **جیزان** اور ضلع یا صوبہ اس نام سے موسوم ہیں۔ اس کا قدیم نام جاذان اب بھی اس صوبے کے رہنے والے اپنی نگارشات میں استعمال کرتے ہیں۔

ابتدا میں یہ ایک ندی کا نام تھا جو جبل رازح اور یمن کے علاقہ خولان سے نکلتی ہے۔ جبل العر کے جنوب میں بہتی اور پھر جنوب مغرب کی طرف مڑ کر جدید بندرگاہ کے قریب بحیرہ قلزم میں جا گرتی ہے۔ اس کے باعث ندی کے سب سے نشیبی علاقے عرب کے زرخیز ترین زراعتی قطعے بن گئے ہیں۔ یہاں کی خاص فصلوں میں جوار، باجرا اور تل ہیں۔ بعض دوسرے اناج، کپاس اور نیل بھی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں کی زمین بہت زیادہ زرخیز ہے۔

سعودی عرب کی حکومت نے اس ندی پر ایک بہت بڑا بند باندھا ہے۔

دو نہریں جن میں ایک PEARLY GATES کے نام سے مشہور ہے۔ کھلے سمندر سے نکل کر فرسان کے ساحل سے گذرتی ہوئی بندرگاہ جیزان تک جاتی ہے، بندرگاہ کے قریب سمندر زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس وجہ سے جہاز اس سے تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ چھوٹی کشتیوں کے لئے پتھریلے ساحلی پہاڑوں کے درمیان ایک بندرگاہ بنا دی گئی ہے۔ شہر پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ یہاں کی سب سے اونچی پہاڑی ساٹھ میٹر بلند ہے۔ بستی کا خشکی کی طرف کا رخ ایک شور میدان سے گھرا ہوا ہے۔ آج کل یہاں پر نئی طرز کے پختہ مکان، ہسپتال، ایک ہوٹل اور سکول بھی موجود ہے۔ قصبے کے باہر ایک نمک کی کان ہے جس سے تجارتی پیمانے پر نمک نکالا جاتا ہے۔ جیزان کے لوگوں کا خاص پیشہ ایک زمانے میں موتی نکالنا تھا۔

جیزان کا صوبہ جو تہامہ عسیر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ نشیبی علاقوں کے علاوہ ان پہاڑیوں پر بھی مشتمل ہے جو براعظم کی حد فاصل کے مغرب میں واقع ہیں اور ان کی چوٹی پر ابہی واقع ہے۔ یہ پہاڑ جو جیزان کی اندرونی حدود میں واقع ہیں۔ القمر، حروب الریث، بنو مالک اور نیفا شامل ہیں۔ جو ساحل سمندر سے کم و بیش پچاس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہیں۔

القمر کی بندرگاہ کو لاوے کا ایک میدان باقی صوبے سے جدا کرتا ہے۔ سارے صوبے میں الشقیق اور جزائر فرسان صرف ایسے مقام ہیں جہاں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔ مواشی کی کثرت ہے۔

ابتدائے عہد اسلامی میں اس علاقے کا سب سے اہم قبیلہ حکم بن سعد العشیرہ تھا جو جنوبی عرب کے قبیلے کہلان کی ایک شاخ تھی۔ اس قبیلے کا صدر مقام شہر المخوف تھا اور بندرگاہ الشرجہ تھی۔ نشیبی علاقے میں کئی ایک اور قبائل سکونت پذیر تھے عقیلی کے بقول بارہ قبائل وادی کے نشیبی حصوں میں آباد ہیں۔ جن کا صدر مقام جیزان کی بندرگاہ ہے اور سترہ قبائل بالائی حصوں میں آباد ہیں۔ جن کا مرکز ابو عریش ہے۔

جیزان کا لفظ ایک حدیث میں بھی آیا ہے جہاں اسے ضمد کے ساتھ ملا کر لایا گیا ہے جو شمال کی ایک متصل وادی کا نام ہے۔ قدیم جغرافیہ نویسوں کے ہاں جیزان سے مراد یہی وادی ہوتی ہے۔

۳۷۲ھ/۹۸۳ء تا ۳۹۳ھ/۱۰۰۳ء تک یہاں پر عثر کا رئیس سلیمان بن طرف یہاں پر حکمرانی کرتا تھا۔ یہ خیال عقیلی کے مطابق ہے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ حسین بن سلامہ (م ۴۰۲ھ/۱۰۱۲ء) نے جو خانوادہ زیادیہ کا وزیر تھا۔ سلیمان کے اقتدار کا خاتمہ کیا ہو اور مخلاف السلیمانی کا علاقہ واپس زیادی حکومت کے ماتحت دے دیا ہو۔

سلیمانی شریفوں کے مخلاف میں متمکن ہونے کا زمانہ متعین نہیں ہو سکا۔ ایک روایت کے مطابق داؤد بن سلیمان جو اس خاندان کا پہلا شخص تھا حماد سے ہجرت کر کے مخلاف میں وارد ہوا۔ ابدیہ بااللہ ۲۹۰ھ/۹۱۰ء کا ہے۔ تاہم سلیمانیوں کی قوت کا مرکز تخمیناً ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء تک مخلاف میں منتقل نہیں ہوا تھا۔

۵۲۹ھ/۱۱۳۵ء تا ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں مخلاف کو بھر وہ نے ہوز یک حیثیت سے سنجاہدہ کے اقتدار کا اصل مالک تھا۔ اپنے لئے بطور جاگیر حاصل کر لیا تھا۔ زیدی امام بھی جو جیزان کے قریب قریب ٹھیک مشرق میں صعدہ کے پہاڑی اقطاع میں اکثر حکمران رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً مخلاف کے معاملات میں دخل اندازی کرتے رہے ہیں۔

مخلاف کے غوام کرایوبیوں کے عہد میں شلوط کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا۔ قاسم بن غانم کے دو بیٹوں نے یکے بعد دیگرے ایوبیوں کے خلاف بغاوتیں بھی کیں، جو ناکام رہیں الملک الاشرف عمر بن یوسف کے بقول ہاشم بن وہاس کو جو غانم بن یحیٰ کا پرپوتا تھا اس کے زمانے میں جیزان کا حاکم تھا۔ غانمی خاندان کے دوسرے افراد بیش اور باختہ میں حکمران تھے۔ اور اس قبیلے کی دوسری شاخوں کے افراد ضمد، صبیا اور نولو میں حکمران تھے

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں غوانم کی ایک اور شاخ قطبی نے درب النجا کو اپنا صدر مقام مقرر کیا۔ اس شہر کے کھنڈر آج بھی ابو عریش کے نزدیک پائے جاتے ہیں۔

۸۸۲ھ/۱۴۷۷ء یا ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں شریف مکہ محمد بن برکات اول نے مخلاف پر حملہ کیا اور بہت سا مال غنیمت جس میں قیمتی کتابیں بھی تھیں لوٹ کر لے گیا۔

جب ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء میں ورتھیما نے جیزان کی سیاحت کی تو اس نے بندرگاہ پر مختلف ملکوں کے ۴۵ جہاز کھڑے دیکھے تھے۔ اس نے مخلاف اور الشرجہ کی بندرگاہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

قیس بن محمد الحرامی نے دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جیزان پر تین مختلف مواقع پر حملہ کیا۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۹ء میں ایک ترکی مدیر مخلاف کا حاکم بنا کر بھیجا گیا اور اس کا صدر مقام ابو عریش بنایا۔ انھی دنوں میں ایک قلیل عرصے کے لئے شریف محمد ابونمی نے اس ضلع پر قبضہ کر لیا۔

۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء میں صنعاء کے زیدی امام نے احمد بن غالب کو مخلاف کا حاکم مقرر کیا۔ زیدیوں ہی کی طرف سے مخلاف کے خیراتیہ خاندان کے پہلے حاکم احمد بن محمد نے بھی ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء میں یہاں پر اپنی حکومت کا آغاز ایک زیدی حاکم کی حیثیت سے کیا۔ احمد کا دادا خیرات جب مکے سے ابو عریش میں آیا تو اس کے لئے بندرگاہ جیزان کی آمدنی سے زیدی امام المتوکل اسماعیل بن القاسم نے وظیفہ مقرر کیا۔

بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں نجران کے جنگجو قبیلے یام نے اپنے نئے سرداروں کے ماتحت مخلاف پر پیشقدمی کی۔

۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء میں خیراتیہ خاندان کا دوسرا حاکم محمد ابن احمد ابو عریش کے وسیع ضلع پر جس میں جیزان کی بندرگاہ بھی شامل تھی خود مختار حاکم تھا۔

۱۸۰۹ء میں وہابیوں کے جہاز جیزان کی بندرگاہ میں داخل ہوئے اور قہوہ کی دوسری اشیاء پر قبضہ کر لیا۔

۱۸۲۵ء میں جیزان کی بندرگاہ کی تجارت محمد علی پاشا کی اجارہ داری کے طریق کے باعث بہت مدھم پڑ چکی تھی۔

خیراتیہ رئیسوں میں سب سے زیادہ وجیہ حکمران الحسین بن علی حیدر [illegible] تا ۱۸۴۸ء تک حکومت کی تہامہ پر جنوب میں مخنہ تک اور کچھ عرصہ کے لئے تعز

Marfat.com

اور الیمن الاسفل کے دوسرے پہاڑی مقامات پر بھی قابض ہوگیا تھا۔ زیدی المتوکل محمد بن یحیٰ سے شکست کھانے کے بعد حکومت سے دستبردار ہوگیا۔ عثمان ترکوں کے عہد میں اس کے دو بیٹے ابو عریش میں قائم مقام رہے۔

۱۹۱۹ء میں مخلاف میں ترکوں کی جگہ لینے کے بعد علی الادریسی نے دو سال بعد جیزان کی بندرگاہ کے قریب الحفائر کے مقام پر شکست دی۔

آج کل سعودی عرب کی حکومت نے بندرگاہ جیزان کو اس ضلع کا صدر مقام قرار دیا ہے۔ نیز اس کی خوشحالی کے لیے بہت سے اقدامات کئے گئے ہیں۔

جیزی، ابو محمد (م ۲۵۶ھ/۸۷۰ء یا ۲۵۷ھ/۸۷۱ء) الرابیع بن سلیمان بن داؤد الازدی الاعرج، ایک عالم دین۔ جیزی امام شافعی کے پیرو تھے۔ اور غالباً ان کے بلاواسطہ شاگرد تھے۔ وہ بہت سے قدیم شوافع کی طرح مالکی اور عبداللہ بن عبدالحکم کے شاگرد تھے۔ شافعی مسلک اختیار کرنے کے بعد جیزی "کتاب الام" کو کامل صحت سے جمع و تالیف کرنے میں مشغول ہو گئے۔ جو شافعی مسلک کا ایک شاہکار ہے۔ نیز شافعی مسلک کی یہ کتاب جو جیزی کی تالیف ہے۔ اور البویطی کا تالیف شدہ نسخہ بہت معتبر خیال کئے جاتے ہیں۔

جیزی کا تالیف شدہ نسخہ شافعی فقہ کے اس دوسرے دور کا ترجمان خیال کرنا چاہیئے جسے مصری دور کہتے ہیں۔

جیزی نے مصر میں وفات پائی۔ اس کے شاگردوں میں ابو داؤد اور النسائی ہیں۔

بقول ابن خلکان جیزی نہایت صالح اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے

جیسور بنگلہ دیش کا ایک بڑا شہر۔ اس کے نام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ سنسکرت کے لفظ "یاشوہرہ" سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی معتوب کے ہیں۔ اس کا تعلق راجا پرتاب آدتیہ کی کہانی سے ہے جو ایک زمیندار تھا اور مغل بادشاہ جہانگیر نے اس کے باغیانہ رویے کی بنا پر اس کی سرکوبی کی تھی۔

یہ علاقہ مسلمانوں کی حکومت میں خلیفہ آباد کی سرکار کا ایک حصہ تھا۔

آج کل خلیفہ آباد کی جگہ کھلنا کے ضلع کا باگرھاٹ ہے

جہاں خان جہاں (م ۸۶۳ھ/۱۴۵۹ء) مدفون ہے جس نے اس علاقے کو سلطان ناصر الدین محمود ثانی کے عہد حکومت میں فتح کیا تھا۔ اس زمانے کی بہت سی عمارات آج بھی باگرھاٹ یا اس کے قرب وجوار میں موجود ہیں۔

ان عمارات میں زیادہ اہم خان جہاں کا مقبرہ، سات گنبد، مسجد کر، مسجد قصبہ اور مسجد سیل کپا ہیں۔ یہ مساجد مسلمانوں کے فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہیں اور بنگال کے مسلمانوں کے فن تعمیر کا ایک نیا اسلوب پیش کرتی ہیں۔

خان جہاں نے جسے عوام خانجا علی کہتے ہیں۔ محمد طاہر المعروف پیر علی کیساتھ مل کر اس علاقے میں اشاعت اسلام کا کام سرانجام دیا۔ آج کل یہاں کے عوام خان جہاں کو ایک بہت بڑا ولی اللہ مانتے ہیں۔

جیش فوج کے لیے ایک عربی اصطلاح۔ جند، لشکر۔ زمانہ جاہلیت میں اگرچہ عربوں میں باہمی جنگیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ ان باہمی قبائلی لڑائیوں تمام صحت مند اور توانا افراد کو حصہ لینا پڑتا تھا لیکن ان میں کوئی فوجی یا عسکری تنظیم نہ تھی۔ ان لڑائیوں کا فیصلہ افراد کی قوت بازو پر ہوا کرتا تھا۔

فوج کا تخیل اسلام کے ظہور کے ساتھ ان ... سے پیدا ہوا جن کی قیادت آنحضور نے فرمائی تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی اصولاً جنگ کے قابل تمام مسلمان افراد کو جہاد کے لیے بلایا جا سکتا تھا۔ لیکن عملاً قبائل اپنے مردوں میں سے ایک مقررہ حساب ... آدمی جہاد کے لیے مہیا کرتے تھے۔ عام طور پر یہ تعداد رضاکاروں سے پوری کی جاتی تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں متعین ہو جانے کے بعد وہ لوگ اپنے اہل وعیال سے منقطع نہیں ہوتے تھے وہ صحیح معنوں میں فوج کی شکل میں مرتب نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑائیوں کے درمیانی وقفوں میں اگر وہ چاہتے تو دیگر مشاغل بھی اختیار کر سکتے تھے۔ دوسرے بجز چند مستثنیات کے اہل وعیال سے الگ چھاؤنیوں میں رہنے کے پابند نہیں تھے۔ لیکن وہ قوم کا ایک ایسا گروہ تھے جو مستقل طور پر جہاد کے حکم پر لبیک کہنے پر تیار اور مجبور تھے۔ ان فوجی سپاہیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ غالباً حضرت عمرؓ کے ماتحت ان کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اور بنو امیہ کی انتہائی وسیع وعریض مملکت کے وقت یہ تعداد اس سے دوگنا ہو گئی تھی۔

شام کے سوا دیگر ولایات میں عرب افواج کو ملکی باشندوں کی بستیوں کی بجائے چھاؤنیوں میں رکھا جاتا تھا جو بعد میں نئے شہر بن گئے۔ تمام فوج مختلف قبائل کے افراد سے مرکب ہوتی تھی۔ لیکن فوج کے زیریں درجوں میں ایک ہی قبائل اصل کے سپاہی ہوتے تھے۔ ان کی آمدنی غنیمت سے متعلق قوانین کے ذریعے معین کی جاتی تھی۔ جنگی فتوحات سے اموال غنیمت میں وسیع علاقوں کا اضافہ ہو گیا تو فوج کا ایک گروہ یہ بات منوانے میں کامیاب ہو گیا کہ مفتوحہ علاقے اجتماعی طور پر موجودہ اور آئندہ امت اسلامیہ کی مشترکہ ملکیت رہیں گے۔ اور پھر انہیں محاصل سے باقاعدہ فوج کے لیے روپیہ فراہم ہونے لگا۔ بعد ازاں شام میں اور پھر المغرب میں ایک مربوط عسکری تنظیم صوبوں کے حساب سے قائم کر دی گئی۔ جس کی نظیر اس سے پہلے ایران وعراق میں کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

یہ بات کہ پہلی ابتدائی نوعیت کی فوج کلیتہً مسلمان عربوں پر مشتمل تھی۔ تاریخ میں واضح ہے تاہم جلد ہی عرب سردار اپنے موالی اپنے ہمراہ لانے لگے تھے۔ اس کے برعکس بعض جنگجو سرحدی قوموں کو اسلام قبول کئے بغیر ہی مسلمانوں کی فوجی مہمات میں محصولات سے مستثنیٰ کر کے امدادی سپاہیوں کی حیثیت سے ملازمت میں لے لیا گیا تھا۔ ان میں وسطی ایشیا، شمالی ایران اور ارمینیا نیز شامی امانوس کے سپاہیوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد بربر جو ابھی سطحی طور پر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اس لشکر کا ایک بڑا جزو بن گئے۔ جو ہسپانیہ کی فتح کے لیے روانہ ہوا تھا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک فوجی دستہ تشکیل دیا گیا جس کا نام شرطہ تھا۔ یہ فوجی دستہ خلیفہ یا والی کے بہت ہی قریب ہوتا تھا۔ لیکن یہ بنیادی طور پر جنگ سے کم اور داخلی امن وامان کے قیام سے زیادہ متعلق تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے پولیس کی ایک جمعیت کی شکل اختیار کر لی۔

اموی دور کے بعد فوجی تنظیم کی صورتوں میں کافی تبدیلی ہوئی۔ ایک طرف تو بڑھتی ہوئی مزاحمت اور ذرائع رسل ورسائل کے طویل ہوتے چلے جانے کے وجہ سے فتوحات کی آمد کم ہو گئی تو تنخواہ ہی جو کہ بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی ان فوجی سپاہیوں کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ رہ گئی۔ اب ان کے مطالبات بڑھ گئے ہیں دوسری

اسلامی انسائیکلوپیڈیا
Marfat.com

طرف بصرے اور کوفے جیسے شہروں میں متعین محفوظ افواج روز بروز شہری زندگی کے زیادہ رنگ ڈھنگ اختیار کرتی چلی گئیں۔ چنانچہ اس کے سرحدی جیوش کے درمیان ایک نئی تفریق پیدا ہوگئی۔ کیونکہ سرحدوں کے یہ فوجی بدستور جنگی زندگی گذار رہے تھے۔ وہ لوٹ کر وطن نہیں آتے تھے۔ اگرچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جنگی تدابیر میں اصلاح کا سہرا اموی خاندان کے آخری خلیفہ مروان ثانی کے سر ہے جو ایک تجربہ کار شخصیت ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اموی دور کے اختتام تک فوج میں کوئی نئی تنظیم قائم نہیں ہوئی۔

عباسیوں کے دور میں ایک نئی فوج جسے ابومسلم خراسانی نے مرتب کیا تھا جو خراسان کے لوگوں پر مشتمل تھی اور عباسی اپنی فتح کے لئے اسی نئی فوج کے مرہون منت تھے۔ تقریباً ایک سو سال تک اس نئی حکومت کی پشت پناہی کرتی رہی۔ ابتدا میں یہی خراسانی لشکر خلیفہ قریب اور بڑے بڑے ملکی مرکزوں میں مقیم رہتے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصے تک دو فوجیں پہلو بہ پہلو رہیں۔ خراسانی فوج جو فوجی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھی اس فوج کو تیراندازی میں، محاصرے کی لڑائی میں اور نفط (آتش یونانی) کے استعمال میں اتنی زیادہ مہارت حاصل تھی کہ اموی فوج اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ اس فوجی عنصر سے عباسیوں کو فنی مہارت کا ایک ایسا عنصر مل گیا تھا جس سے اموی فوج محروم تھی۔

اب عربوں کی دو جداگانہ حیثیتیں ہوگئیں ایک وہ عرب جو فوجی کارروائیوں سے منقطع سے بہت دور رہتے تھے۔ پھر دوسری قسم کے عرب وہ سرحدی لوگ تھے جنہیں اس طریقے سے غیر عسکری نہیں بنایا جاسکا۔ لیکن انہوں نے غازیوں اور مرابطون کی نئی خود مختارانہ طرز کے مطابق اپنے آپ کو منظم کرکے سرکاری فوج سے باقاعدہ طور پر اپنے آپ کو منقطع کرلیا۔

عباسیوں کے دور میں باقاعدہ سرکاری فوج کے سپاہی خواہ کوئی بھی ہوں دوسری جنگی جماعتوں سے جن کی تنظیم مقابلۃً محض ہنگامی ہوتی تھی۔ بہرحال امتیاز رکھتے تھے دیگر رضاکاروں کے فوجی دستوں کو نہ صرف تنخواہ کم ملتی تھی بلکہ انہیں یہ تنخواہ دوران جنگ ملتی تھی۔ وہ پیشہ ور سپاہی شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں تک غازیوں کا تعلق ہے۔ تو ان کا گذارا لڑائیوں کے درمیانی وقفے میں اپنے غیر فوجی کاروبار کے منافع پر دوران جنگ میں مال غنیمت پر اور ان مذہبی اوقاف پر ہوتا تھا جو اندرون ملک کے مسلمان جہاد کے بدل کے طور پر اپنی طرف سے ایک کثیر تعداد میں قائم کر رہے تھے۔ ان غازیوں کے نام بھی جیش کے عام دفاتر میں درج نہیں ہوتے تھے۔

المعتصم نے جس نے کہ مصر میں عربوں کی باقاعدہ فوج کو مغلوب کیا تھا خراسانیوں کی جگہ ترکوں کو دینے میں پیش قدمی کی۔ چنانچہ شروع میں ترک سے مراد زیادہ تر وہ لوگ تھے جو اسلامی حدود میں مقیم تھے۔ خاص کر فرغانہ کے لوگ جن کے معاشرتی حالات خراسانیوں سے ملتے جلتے تھے لیکن اس کے کچھ عرصے بعد ہی وہ نوجوان جو مسلم سلطنت سے باہر پیدا ہوئے تھے اور جنہیں مجاہدین یا سوداگر وسطی ایشیا سے یا ان علاقوں سے جواب روسی نیم صحرائی علاقے میں لائے تھے۔ انہیں بھی ترکوں کے طور پر فوج میں بھرتی کیا جانے لگا۔ یہ ترک دیگر سپاہیانہ اوصاف کے علاوہ خصوصیت سے اعلیٰ درجے کے شہسوار ہوتے تھے۔ یہ اتنی چھوٹی عمر میں غلام بنائے جاتے تھے کہ اپنے آقا کی ذات سے وابستگی ان کی سرشت کا جزو بن جاتی تھی۔ مشرقی مسلم ریاستوں کے لئے ترکی فوج کے بغیر گذارہ کرنا گویا ناممکن ہوگیا تھا اور سبھی ملک یکے بعد دیگرے ترکوں کی ایسی فوج رکھتے رہے۔ پھر بعد میں مشرق میں یہ بھی کیا گیا کہ ان ترکوں کے توڑ کے لئے ایسے لوگ بھی فوج میں بھرتی کئے گئے جو اکھڑ دیہاتی اور کوہستانی تھے اور پہاڑی پیادہ جنگ لڑنے میں ماہر تھے۔ مثال کے طور پر دیلمی یا شہرزوری جیسے کرد یا مقامی حبشی اور غزنویوں کی فوج میں ہندو وغیرہ۔

ولایت افریقیہ میں جہاں زنگیوں، سلاویوں اور سوڈانیوں سے جیش کی تعداد بڑھائی گئی تھی ترکوں کو لاکر ان کا توازن درست کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں ترکوں کی جگہ ارمنوں کو لانے کی کوشش کی۔

بعد میں جب سلجوقیوں نے جو خود ترک تھے۔ سابق اسلامی ممالک پر قبضہ کیا تو اس وقت بھی فوج کی ساخت مستقل طور پر متاثر نہیں ہوئی۔ ایشیائے کوچک کے سلجوقیوں نے اپنے طریقے پر اپنی فوج کے شعبوں میں بزنطی ارمنی اجیر سپاہیوں، فرنگیوں وغیرہ کا اضافہ کیا جب کہ مغل فاتحین اپنی فوج میں گرجستانیوں کو لے آئے۔ چنانچہ سابق رومی سلطنت کا اتباع کرتے ہوئے خصوصاً بزنطی سلطنت کے حدود میں اسلامی عہد میں بھی جنگیں لڑنے کا کام روز افزوں طور پر اجیر سپاہیوں کے حوالے ہوتا رہا۔ ان میں زیادہ تعداد ترکوں کی تھی اجیر سپاہیوں کے لئے اپنے آبائی وطن کو لوٹنا خلاف معمول بات تھی۔ کسی سلطان کی فوج کے مملوک بھی ذاتی یا خانگی غلاموں کی طرح نہ ہوتے تھے۔ بلکہ وہ دراصل شاہی اقتدار کے سرگرم کارکن ہوتے تھے۔ انہیں بھی تنخواہ دار سپاہیوں کی طرح تنخواہ ملتی تھی۔ انھیں اپنے فوجی فرائض کی ادائیگی کے بعد خاص آزادی حاصل ہوتی تھی۔

ان نوجوان سپاہیوں (غلاموں) کے بارے میں جو عباسی فوج میں ہوتے تھے کی تربیت کا کیا انتظام تھا واضح طور پر ہمارے سامنے نہیں آتا۔ ان معاملات کے بارے میں صحیح معلومات ہمیں مملوکوں کے دور میں ملتی ہیں۔ ان کے قیام کا انتظام کبھی کبھی لوگوں کے گھروں میں بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ سپاہی زیادہ تر بارکوں میں رہتے تھے۔ ایک گروہ "حجریہ" کہلاتا تھا جو حاکم وقت کے محل کے نزدیک رہتا تھا۔ ان کے اور آبادی کے درمیان بار بار لڑائی جھگڑے رہتے تھے۔ المعتصم کے دور میں سامرہ کو دارالخلافہ بنانے کا باعث بھی یہی ہوا تھا۔ لیکن سلجوقی فتح کے بدولت یک جہتی پیدا ہوگئی۔ اس دور میں فوج عسکری تربیت شہروں کے مضافات میں کھلی جگہوں میں حاصل کرتی تھی۔ بڑی ریاست کی فوج کئی جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس گروہ بندی میں عام طور پر نسل اور فنی ضروریات کا خیال رکھا جاتا تھا اس زمانے میں فوج کی کوئی خاص وردی نہ ہوتی تھی۔ لیکن ہر دستے کا اپنا ضابطہ لباس ضرور تھا۔ اس کے علاوہ مختلف لشکروں کے اپنے اپنے جھنڈے (رایۃ) اور سپہ سالار یا حکمران کا اپنا "لوا" ہوتا تھا۔ جو اس کے خیمے کے نزدیک ہوا میں لہراتا رہتا تھا جہاں سے وہ لڑائی کی قیادت کرتا اور جو پوری فوج کے مرجع اور مقام اجتماع کا کام دیتا تھا

الجزائر اور مراکش میں جیش کے معنی ایک مسلح دستے فوج کے ہیں جو کسی کاروان یا فوجی جمعیت کے خلاف "غزوہ" کے لئے جائے اور جب جیش کئی سو آدمیوں پر مشتمل ہو تو "حرکہ" کہتے ہیں۔ یہ جیوش شمالی سوڈان یا وادی نائجر سے لے کر صحرا میں سے گذرتے ہوئے الجزائر اور مراکش کے جنوب تک ترکتازیاں کرتے تھے۔ یہ جیوش کبھی کبھی قبیلہ طوارق کے افراد پر مشتمل ہوتے تھے لیکن اکثر اوقات بلند جبال اطلس کی جنوبی ڈھلانوں کے بربروں پر مشتمل ہوتے۔

مراکشی فوج میں جیش سے مراد ایک قسم کی جاگیرداری تنظیم مراد ہے۔ یہاں جیش کے وجود میں آنے کی تاریخ مراکش کے موجودہ حکمران خاندان کے آغاز سے وابستہ ہے یہاں کے سلاطین کو اس اندیشے سے کہ وہ بربروں کے دست نگر نہ بن جائیں اور جن پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غیر ملکی اجیر سپاہیوں کو اپنے گرد رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ پہلے زمانے میں شمالی افریقہ کے بادشاہ عیسائیوں، کردوں، ایرانیوں اور حبشیوں کو فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ بنو وطاس کے دور میں کرد، عیسائی اور حبشی عرف رکاب کے

Marfat.com

سپاہیوں کو برطرف کر دیا گیا اور ان کی جگہ عربوں کے محافظوں نے لے لی۔
بنو سعد تخت نشین ہوئے تو انہوں نے اپنے جیش کے عربوں کو اہل سوس کا نام دے کر فاس کی محافظ فوج سے ساتھ متعین کیا۔ اس طرح بنو سعد کی فوج بھی جیش معرض وجود میں آئی۔ جیسا کہ بنو وطاس کے عہد میں ہوتا تھا کہ جیش "مخزن" کے ارکان کے لشکروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور ارکان مخزن عمر بھر اپنے سلطان کے بلاوے کے منتظر رہتے تھے۔ ان کی گذر اوقات اراضی پر ہوتی تھی جو ایک قسم کی جاگیری شکل تھی۔ نیز انہیں مال گذاری معاف ہوتی تھی۔

پھر جب ترکوں کا ہمسایہ ملکوں پر قبضہ ہوا تو بنو سعد کے دربار میں بھی ان کا اثر بڑھا اور جیش کے علاوہ یہاں کے شریفوں نے بھی ایک ایسا لشکر رکھنا چاہا جو ترکوں کے تربیت یافتہ تھے۔ جب بنو سعد کا شیرازہ بکھرا تو سلطان عبداللہ بن شیخ نے وفادار فوجیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہی جس پر وہ کامل اعتماد کر سکتا ہو چنانچہ اس نے سراقہ کو ان بیشتر اراضی کی ملکیت عطا کر دی جو ان کے پاس پہلے فقط عارضی جاگیر کی شکل میں تھی۔

۱۶۶۵ء میں جب مولای الرشید نے تخت پر قبضہ کیا تو اس کے جانشین مولای اسماعیل نے جیش کو اس کی امتیازی صورت عطا کی۔ اس جیش میں سراقہ کے گروہ نیز شراذہ قبیلے، اودایہ اور بواخر بھی شامل تھے۔ فرانسیسیوں کے زیر حمایت حکومت میں جیش انھی چار مخزن قبائل پر مشتمل تھا۔ جیش میں عہدے اکثر باپ سے بیٹے کو ملتے تھے۔

دور جدید میں اسلامی افواج کی تاریخ کا سب سے نمایاں پہلو ان کی اصلاح اور مغربی طرز اختیار کرنے کی تاریخ ہے۔ ۱۶۴۴ء تا ۱۶۶۹ء جنگ اقریطش میں عثمانی خلافت نے اپنے سرنگ انداز سپاہیوں کی تربیت کے لیے انگریز اور ولندیزی معلموں کی خدمات حاصل کیں۔ سترہویں صدی کے اختتام پر توپ بنانے کے کارخانوں کی نگرانی وینس کے توپ خانے کا ایک سابق فوجی سردار کیا کرتا تھا۔ جس نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا کے ذمے گولہ اندازوں کے فوجی دستے کی تربیت کا کام سپرد ہوا۔ ۱۷۸۴ء میں جب روسیوں نے کریمیا کا الحاق کر لیا تو ترک فوج کی مغربی طرز پر تنظیم نے زور پکڑا۔

سلیم سوم کے عہد حکومت (۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء تا ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) میں پرانی طرز کی فوج کی ہیئت کو بالکل بدل کر جدید حالات کے مطابق و مناسب بنا دینے کی کوشش کی۔ اس نے توپ خانے میں اصلاحات نافذ کیں۔ نظم و ضبط کو کسا اور لشکریوں کی تنخواہ میں بیس سے چالیس اسپر روزانہ کا اضافہ کیا۔ ۱۷۹۶ء میں جمہوریہ فرانس سے ایک سفیر آکر دربار میں اپنے ساتھ استنبول میں متعدد افسر لایا جنھیں "نظام جدید" کی تربیت کا کام تفویض کیا گیا۔ یہ نیا جیش جو رضاکاروں سے بنا تھا توپچیوں، سپاہیوں اور پیادوں پر مشتمل تھا۔ سلطان اس نئی فوج کا ینی چریوں سے بلا ضرورت میل ملاپ ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے "نظام" کو استنبول کے باہر فوجی بارکوں میں مقیم کرایا۔ جب ۱۷۹۸ء میں فرانسیسی فوج نے فلسطین پر فوج کشی کی تو اس "نظام" کو جس کی تعداد اس وقت تین چار ہزار پر مشتمل تھی۔ شہر عکہ کی مدافعت پر لگایا گیا۔ اور اس نے اپنے جوہر دکھائے۔ چنانچہ سلطان نے اب "نظام" کے سپاہی ینی چریوں اور عام آبادی دونوں میں سے جبریہ بھرتی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن ینی چریوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا اور اس نے "نظام" کی تنسیخ سے اپنے تخت کو بچانے کی کوشش کی۔ ینی چریوں نے "نظام" کی بارکوں کو جلا کر خاک کر دیا۔ سلیم کی تخت سے معزولی کے بعد مصطفیٰ رابع اس کا جانشین بنا لیکن تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ بیرق دار مصطفیٰ پاشا نے اسے معزول کر کے محمود ثانی کو تخت نشین کرایا اس نے ۱۸۰۸ء میں ایک نئے نمونے کی فوج کے لیے بھرتی کی اس کے ارکان کو اس نے "سگبان" کا لقب دیا اور ان جوانوں کو بھرتی کر کے اس نے سلیم کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن ینی چریوں کے ہاتھوں اس کی تباہی نے ان اصلاحات کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

لیکن اس کے اٹھارہ سال بعد سلطان محمود ثانی نے ایک بروقت ضرب لگا کر ینی چریوں کی قوت کو ختم کر دیا اور سلطنت کو ایک نئی فوج دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نئی فوج کا نام جو ۱۷ رجون ۱۸۲۶ء کو ینی چریوں کی پوری جمعیت کا خاتمہ کر دینے کے بعد وجود میں آئی "عساکر منصورۂ محمدیہ" رکھا۔ فوج کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ سر عسکر اس کا سربراہ بنایا گیا جو سلطان کے ماتحت سب کا نگران اور حاکم تھا۔ یہ نئی فوج بارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ جو بارہ سال تک فوجی خدمات انجام دیتی تھی۔ بعض اوقات یہ میعاد ملازمت بڑھا بھی دی جاتی تھی۔ ۱۸۴۳ء کے قانون کے ذریعے فوجی ملازمت کی میعاد پانچ سال مقرر کی گئی۔ اور ۱۸۶۹ء میں یہ میعاد چار سال کر دی گئی۔ ۱۸۴۳ء کے قانون میں پانچ فوجی جیوش کی گنجائش رکھی گئی۔ یہ جیوش مندرجہ ذیل تھے۔
۱۔ شاہی محافظ جیش ۲۔ استنبول جیش ۳۔ ایلی جیش ۴۔ اناطولی جیش ۵۔ عربستان کا جیش۔

۱۸۴۸ء میں ایک چھٹا جیش وجود میں لایا گیا جس کا صدر مقام بغداد تھا اور جو بغداد کے جیش کے نام سے موسوم تھا۔

فوجی عہدوں کی درجہ بندی۔ یورپی طرز پر کی گئی تھی۔ سلطان محمود نے بارہ ہزار فوج میں اضافہ بھی کیا گیا۔ ۱۸۴۰ء کے بعد کے دس برسوں میں تو یہ اضافہ بہت زیادہ کیا گیا یہاں تک کہ فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔

۱۸۵۶ء کے "خط ہمایوں" کے نفاذ سے قبل فوج کی بھرتی کلیتہً سلطنت کی مسلم آبادی میں سے کی جاتی تھی۔ اس خط میں آئندہ سب کی سب رعایا سے فوجی خدمت لیے جانے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس ارادے پر عمل نہ ہو سکا۔

ان ہی دنوں میں جب ترکی میں فوجی اصلاحات ہو رہی تھیں مصر میں محمد علی نے اصلاحات نافذ کیں۔ اس نے مصر میں اپنی حکومت مستحکم اور مضبوط کرنے کے تھوڑے ہی دن بعد ایک جدید کارگر فوج کی تشکیل کا ارادہ کیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے نپولین فوج کے ایک سابق سربراہ کو جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اور سلیمان پاشا کے نام سے معروف تھا۔ ایک نئے مدرسہ حربیہ میں تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ یہ مدرسہ قاہرہ سے دور اسوان میں قائم تھا۔ جہاں سوڈانی غلام اور محمد علی کے تین سو مملوک تربیت پاتے تھے۔ ۱۸۲۴ء تک تقریباً ۲۴ ہزار سوڈانی غلام اس مقصد کے لیے بھرتی کیے گئے لیکن ان کی شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک تین ہزار غلام زندہ تھے۔ بعد میں محمد علی نے مصری کسانوں میں سے فوجی بھرتی شروع کی۔ چنانچہ ۱۸۴۱ء میں ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ فوج جس میں باقاعدہ فوج بھی شامل تھی۔ ولی عہد مصر کے زیر فرمان موجود تھی۔

ایران میں انیسویں صدی کے دوران میں فوجی اداروں کی اصلاح کی کوششیں نہ تو اتنی صبر آزما تھیں نہ اتنی باقاعدہ جتنی کہ مصر اور عثمانی سلطنت میں تھیں۔ ۱۸۱۷ء۔ ۱۸۰۸ء میں فرانسیسیوں نے ایرانی فوجوں کی تربیت کے لیے ایک جماعت بھیجی اسی طرح ۱۸۱۰ء میں برطانیہ نے بھی ایک جماعت اس مقصد کے لیے بھیجی۔ لیکن ان کا نقش نہ تو زیادہ گہرا تھا نہ پائیدار بالآخر ۱۹۲۱ء میں کہیں جا کر رضا شاہ جو حکومت کا تختہ الٹ دینے کے بعد سپہ سالار بنا تھا نے

Marfat.com

ایرانی فوج کی یورپی طرز پر تنظیم کرنے کے قابل ہو سکے۔

۱۹۲۵ء میں جبری بھرتی کا قانون منظور ہوا۔ اس میں دو برس کے لیے فوجی ملازمت کو تمام افراد کیلئے لازمی قرار دیا گیا۔ تہران میں ایک فوجی کالج بھی قائم کیا گیا۔

پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد جو عرب حکومتیں قائم ہوئیں ان کے پاس یورپی حکم بردار حکومتوں کے ماتحت مختصر رضا کار افواج تھیں۔ جن کی تربیت اور تنظیم انہیں حکم بردار حکومتوں نے کی تھی۔ ان عرب حکومتوں نے مکمل آزادی حاصل کرنے کے بعد تیزی کے ساتھ عام جبری بھرتی کا آغاز کیا۔

(ـــ ۷۵۰ھ/ ۱۳۵۰ء یا ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء) اسماعیل بن موسیٰ

جَیطالی، ابو طاہر ایک ممتاز اباضی عالم۔

وہ اجیطال یا جعال کا باشندہ تھا۔ یہ گاؤں جبل نفوسہ کا ایک قدیم گاؤں ہے جو اب تک موجود ہے۔ اور اجیطل یا جیطل کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے بارے میں تاریخ سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ شیخ عیسیٰ بن موسیٰ الطرمیسی کا شاگرد تھا جو ساتویں صدی ہجری، تیرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہو گذرا ہے۔ جیطالی نے کچھ عرصہ مزغورہ میں تعلیم پائی۔ نیز اس نے اپنی زندگی کے نو سال فرسطا کے گاؤں میں گذارے جو جبل نفوسہ کے مغربی حصے میں واقع ہے۔

جیطال کے بارے میں ایک روایت یہ بھی کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کچھ غلاموں کو فروخت کرنے کیلئے طرابلس لے گیا اس شہر کے امیر نے اسے قید کر لیا۔ لیکن ابن مکی والی قابس کی مداخلت کی وجہ سے اسے وہاں سے رہائی حاصل ہوئی۔ جس کے بعد وہ جربہ چلا گیا۔ یہ علاقہ اس وقت والی قابس کے زیر حکومت تھا۔ اس نے جربہ میں ہی وفات پائی۔ اور اسے جزیرے کی اباضی وعدانی جامع مسجد کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اس نے کئی رسائل تصنیف کئے۔ جن کا موضوع خاص طور پر عقائد اور شریعت ہے اور بقول بعض متاخر اباضی علماء ان رسائل سے اس (اباضی) فرقے کا احیاء ہوا۔

ان رسائل میں "قواعد الاسلام"، "القناطر" جو کئی جلدوں میں ہے۔ "شرح النونیہ"، "کتاب الفرائض"، "اجوبۃ الائمہ"، "کتاب الحج والمناسک"، "قصائد"، "کتاب المرضا" خاص طور پر مشہور ہیں۔

جیفر عمان کے بادشاہ کا نام۔ جیفر اور اس کے بھائی عبد کے نام آنحضورؐ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے ہاتھ خط بھیجا تھا۔

اس خط کا مضمون یہ تھا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدا کے رسول محمدؐ بن عبداللہ کی جانب سے جیفر اور عبد پسران جلندر کے نام۔

اس شخص کو سلامتی ہو جو راہ راست پر چلے۔

امابعد۔ میں تمہیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لے آؤ۔ تاکہ سلامت رہو۔ میں تمام لوگوں کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ ان لوگوں کو نصیحت کروں جو باطنی زندگی سے زندہ ہیں۔

میں نے کافروں پر حجت پوری کر دی ہے۔ اگر تم اسلام لائے تو میں تمہیں تمہارے ملک پر بحال رکھوں گا۔ اگر اسلام سے اعراض کرو گے تو تم سے تمہارا ملک چھین لیا جائے گا۔ میرے گھوڑے تمہارے ملک میں گشت لگائیں گے۔ میری نبوت تمہارے ملک پر غالب ہو جائے گی۔

آنحضورؐ کے اس خط کی کتابت ابی بن کعبؓ نے کی تھی۔

جیلانی، عبد القادر ایک بہت بڑے عالم دین اور صوفی (دیکھئے: عبد القادر جیلانی)

جین مت ایک قدیم مذہب جو اپنشد کے نظریات کے رد عمل کی بناء پر وجود میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنشد کی تعلیمات اس قدر فلسفیانہ تھیں کہ عوام ان کے سمجھنے سے قاصر تھے۔ دوسرے آتما اور برہمن کا اتحاد جس کی بنیاد اپنشد نے رکھی تھی اس کو لوگوں نے کچھ اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ اس نظریہ کی بڑی مخالفت کی گئی۔ اسی لئے ایک نیا مذہب وجود میں آیا۔

اس مذہب کا نام ان صوفیوں (جینا) پر رکھا گیا جنہوں نے اپنی تمام خواہشات پر قابو پایا تھا۔ جین کے لفظی معنی فاتح کے ہیں۔

جینی اپنے مذہب کو قدیم ترین بتلاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جین مت کروڑہا برس سے موجود ہے۔ ان کے نزدیک چوبیس تیرتھنکر (پیغمبر) گذرے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے پہلا انسان ناتھ تھا۔ اور سب سے آخری مہابیر ہے جس کا زمانہ ۵۴۰ ق م تا ۴۶۸ ق م ہے ناتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سو کروڑ پیٹ پیدا ہوا تھا۔ پیٹ سے مراد ان کے نزدیک اتنی مدت ہے جتنا کہ کوئی پرندہ ایک مربع میل کنوئیں کو باریک بالوں سے فی بال سو سال کے حساب سے ڈال کر بھر دے۔

بانیٔ مذہب:۔ جین مت کا بانی مہابیر ہے جو گوتم بدھ کا ہمعصر تھا۔ مہاویر گدھ کے راجہ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اس کا اصل نام وردھمان تھا۔ وہ بچپن ہی میں اپنی شجاعت اور معمولی بہادری کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا تھا۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی اور دس سال تک نہایت خوشگوار زندگی بسر کرتا رہا۔ اس زمانے میں لوگ روحانی زندگی کے حصول کے لیے فقر و فاقہ کرتے حتیٰ کہ اس میں مر جاتے تھے۔ مہابیر کے والدین نے بھی اسی طریقے سے وفات پائی۔ ان کی موت نے مہابیر پر بہت زیادہ اثر کیا اور اس نے تارک الدنیا ہو جانے کا تہیہ کیا۔ وہ فقیروں کا لباس پہن کر محل سے نکل کھڑا ہوا اور بارہ سال تک خاموش رہنے کا عہد کیا۔ وہ اس عرصے میں جنگلوں میں گھومتا پھرا اس مدت کے گذر جانے کے بعد وہ اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے دور دراز ملکوں میں گیا۔ مہابیر نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

تعلیمات:۔ جینیوں کے نزدیک تمام مصائب کا سرچشمہ انسانی خواہشات کو قرار دیا گیا ہے۔ جو لامتناہی اور غیر محدود ہیں۔ چنانچہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ان خواہشات سے دور رکھے اپنے دل سے ہر قسم کی تمنا اور خواہش کو نکال پھینکے اور جب خواہشات نکل جائیں تو روح مسرت اور شادمانی سے ہم آغوش ہو جائے گی۔ یہی مسرت نروان کہلاتا ہے یہ نروان حاصل کرنے کا سبھی ذریعہ تھا۔ مہابیر نے نروان حاصل کرنے کے لیے پانچ فرائض کی بھی نشاندہی کی ہے۔

پانچ ورت (عہد) پر عمل پیرا ہونے سے نروان حاصل ہوتا ہے۔

۱۔ کسی ذی روح کو قتل نہ کیا جائے۔ کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

۲۔ چوری سے پرہیز کیا جائے۔

۳۔ جھوٹ بولنے سے باز رہا جائے۔

۴۔ پاک دامنی کی زندگی بسر کی جائے۔ اور نشہ آور اشیاء کے استعمال سے باز رہنا چاہیے۔

۵۔ کسی چیز کا لالچ یا تمنا نہ کی جائے۔

جینی خدا کے قائل نہیں نہ ذات پات کی تفریق اور ویدوں کو مانتے ہیں۔ نروان حاصل

Marfat.com

کرنا ان کا اور شی ہے۔

جین مت میں عبادت میں صرف تپسیا پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس تپسیا میں فقر و فاقہ کو بہت اہمیت دی گئی۔ تعذیب نفس، ترک خواہشات اور ترک دنیا ہی ان کے نزدیک بہتر عبادت ہے۔ اور اس کے لئے کسی مندر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں جین مت میں معابد کے نشانات نہیں ملتے۔ بعد میں عبادت خانے تعمیر ہوئے۔

اس مذہب میں اہنسا پر بھی بہت زور دیا گیا ہے اور قربانی کی مخالفت کی گئی ہے جینیوں نے اہنسا کے معاملے میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ وہ اپنے منہ اور ناک کے نتھنوں پر کپڑا باندھ رکھتے ہیں تاکہ کوئی جاندار چیز اندر نہ جا کر مر جائے۔ وہ گوشت کھاتے ہیں۔ پانی چھان کر پیتے ہیں۔ نیز چلتے وقت کپڑے کی دھجیوں کی ایک جھاڑو سے راستہ صاف کرتے جاتے ہیں کہ کہیں جیو ہتیا نہ ہو جائے۔

جین مت میں واضح طور پر جنت اور دوزخ کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوزخ زیر زمین ہے اور اس کی تعداد سات ہے۔ جنت کو چھبیس بتاتے ہیں جو اوپر تلے ہیں۔ ان کے خیال میں روح میں وزن ہوتا ہے۔ جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو روح بھاری ہو جاتی ہے اور جہنم میں جا گرتی ہے۔

آج کل جینیوں کی تعداد سولہ لاکھ کے قریب ہے ان کے بعض مندر ہندوستان کے فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ ہندوستان کے صوبہ گجرات میں کوہ ابو میں ایک عظیم الشان مندر ہے جس کا شمار ہندوستان کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ان مندروں کی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہے۔

آج بھی جینی خدمت خلق کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایسے اداروں کا قیام جن کے ذریعے انسان و حیوان کی خدمت ہو سکے ان کا محبوب مشغلہ ہے

اس مذہب کے حقیقی عروج کا زمانہ موریا خاندان کا عہد ہے۔ چندر گپت موریا نے جین مت قبول کر لیا تھا۔ اس کے عہد ہی میں جین مت کے پیروکاروں کے دو فرقے ہو گئے تھے ایک فرقہ سوتیا مبر کے نام سے موسوم ہوا جو سفید کپڑے پہنتا تھا۔ دوسرا فرقہ دگمبر یعنی آسمانی لباس والا مشہور ہوا جو بالکل برہنہ رہتے تھے۔ جینیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ مذہب دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے اور یہ صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ کائنات کی تمام چیزوں کا مذہب ہے لیکن اس کے باوجود یہ مذہب عالمگیر نہ بن سکا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اصول بہت سخت تھے۔ اس کے پانچ اصولوں میں سے پہلے اصول پر بہت زور دیا گیا تھا۔ یعنی کسی جاندار کا قتل نہ کیا جائے۔ اس کے باعث اس کے پیروکار دنیا کا کوئی پیشہ اختیار کرنے کے قابل نہیں رہے وہ زراعت سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ زمین پر ہل چلانے سے حشرات الارض کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بھٹی کے کام سے اس لئے دور رہتے تھے کہ اس سے بھی غیر مرئی جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں وہ اسی خیال سے پانی تک نہیں ابالتے تھے۔ شکار کے قریب نہیں بھٹکتے تھے۔ چنانچہ اگر ان تعلیمات پر عمل کیا جائے تو تمام کاروبار حیات معطل ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ اسی خامی کی وجہ سے یہ مذہب دوسرے ملکوں میں مقبول نہیں ہوا۔ البتہ اس کے ماننے والے ہندوستان میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں اہنسا پر اتنی سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔

جیون، ملا احمد (۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء — ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء — ۱۷۱۸ء) بن ابی سعید بن عبید اللہ بن عبدالرزاق بن مخدوم۔ ایک عالم دین و مفسر قرآن لکھنؤ کے قریب امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے سات برس کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں عقلی اور نقلی علوم کی تکمیل کر لی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں محمد صادق السرکھی اور لطف اللہ کوڑا جہان آبادی ہیں۔

آپ نے اکیس برس کی عمر میں اپنی تفسیر مکمل کر لی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کو اپنے "اساتذہ" میں شامل کر لیا تھا اور آپ کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول بھی اپنے باپ اورنگ زیب کی طرح آپ کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ آپ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فقہ میں خاص مہارت حاصل تھی۔ یہ ایسے احکام شرعیہ سے بحث کرتی ہے جنہیں فقط قرآن حکیم ہی سے مستخرج کیا گیا ہے۔

علم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے آبائی شہر میں پڑھانا شروع کیا۔ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ء میں آپ اجمیر اور دہلی کو روانہ ہوئے۔ اور یہاں پر آپ نے کافی عرصہ قیام کیا۔ اس قیام کے دوران میں آپ وعظ و نصیحت اور تعلیم و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۰ء میں پہلی مرتبہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور پانچ سال تک وہاں پر قیام کیا۔ ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء میں ہندوستان واپس آنے پر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ آپ تقریباً چھ سال تک اورنگ زیب کے افسروں کے ساتھ رہے۔ جو اس زمانے میں دکن کی ریاستوں سے برسر پیکار تھا۔ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دوبارہ حج بیت اللہ تشریف لے گئے۔ اور ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء میں واپس امیٹھی پہنچے۔ یہاں پر دو سال قیام کیا اس قیام کے دوران میں آپ کو اپنے شیخ یاسین بن عبدالرزاق قادری سے خرقہ تصوف عطا ہوا۔ اس کے بعد آپ اپنے بہت سے شاگردوں کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ اجمیر میں شاہ عالم اول سے ملاقات ہوئی جو آپ کو اپنے ہمراہ لاہور لے آیا۔ شاہ عالم کی وفات کے بعد آپ دوبارہ دہلی لوٹے اور پھر تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے اپنے آبائی شہر امیٹھی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔

آپ کا انتقال دہلی کی جامع مسجد میں اپنے زاویے میں ہوا لیکن ان کی لاش کو بعد میں نکال کر امیٹھی میں دفن کیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں "التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیہ"، "نور الانوار" شرح "منار الانوار"، "السوانح"، "مناقب الاولیاء" خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک اور کتاب آداب احمدی جو تصوف اور صوفیہ کے مقامات پر ہے۔ آپ کی اوائل عمر کی تصنیف ہے۔

چاٹگام:۔ بنگلہ دیش کا ایک شہر (دیکھیے "چٹاگانگ")۔

چار قُل قرآن مجید کی آخری سورتوں میں سے چار سورتیں جو "قل" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی "قل یا ایھا الکافرون"، "قل ھو اللہ احد"، "قل اعوذ برب الفلق" اور "قل اعوذ برب الناس"

فاتحہ اور ایصال ثواب کے لیے انہیں پڑھا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد دوسرے تیسرے دن فاتحہ کی تقریب کو بھی قل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چار یار (رمز) چار دوست۔ اس ترکیب کے لغوی معنی چار دوستوں کے ہیں۔ یہ لفظ آنحضور کے چار اصحاب خلفائے راشدین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

Marfat.com

چار یار

جن کے اسمائے گرامی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ حضرت علی مرتضیٰؓ۔ یہ چاروں یار عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

چاشت، نماز

وہ نفل نماز جو سورج کے بہت بلند ہونے پر پڑھی جاتی ہے یہ نماز مستحب ہے دو یا چار یا بارہ رکعت پڑھی جاتی ہیں۔

اس نفل نماز کا احادیث میں بہت درجہ بتایا گیا ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ صبح ہوتے ہی لازم ہوتا ہے تمہاری ہر ہڈی پر صدقہ۔ پھر تمہاری ہر تسبیح۔ یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے اور لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے اور اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔ نیک کام کا حکم کرنا صدقہ ہے اور بری بات سے روکنا صدقہ ہے۔ اور ان سب کے مقابلے میں دو رکعت چاشت کی کافی ہوتی ہیں۔" (مسلم)

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک قوم کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا تو کہا کہ یہ لوگ جانتے نہیں کہ اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں نماز اس سے بہتر ہے (یعنی چاشت کی نماز جو یہ لوگ اول وقت میں پڑھ رہے ہیں اس سے وہ چاشت کی نماز بہتر ہے جو گرم وقت میں پڑھی جائے) چنانچہ آنحضورؐ نے فرمایا ہے کہ خدا کی طرف کامل توجہ رکھنے والوں کی نماز کا وقت، وہ ہے جب کہ اونٹوں کے بچے گرم ہو جائیں یعنی آفتاب خوب بلند ہو جائے۔" (مسلم)

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص چاشت کے وقت بارہ رکعتیں پڑھے خداوند تعالےٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بناتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے آنحضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص چاشت کی دو رکعتوں کی حفاظت کرے تو اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں اگرچہ وہ دریا کے جھاگ کے برابر ہوں۔ (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

چاند

چاند دیکھنے کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ جب چاند دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل دعا پڑھنی چاہیئے۔

آنحضورؐ جب چاند دیکھتے تھے تو مندرجہ ذیل دعائیں پڑھتے تھے۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے مروی ہے کہ آنحضورؐ چاند دیکھ کر یہ دعا پڑھتے تھے

اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْیُمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ۔

اے خدا اس (چاند) کو ہم پر امن و برکت و سلامتی اور اسلام کے ساتھ نکال میرا پروردگار اور تیرا پروردگار خدا ہے۔"

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ آنحضور جب نیا چاند دیکھتے تو اول تین مرتبہ فرماتے ھِلَالُ خَیْرٍ وَّ رُشْدٍ۔ "یہ خیر و بھلائی کا چاند ہے۔" پھر تین مرتبہ فرماتے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَکَ میں اس خدا پر ایمان لایا جس نے تجھے پیدا کیا اور بعد میں فرماتے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ذَھَبَ بِشَھْرِ کَذَا وَجَآءَ بِشَھْرِ کَذَا۔

سب تعریف خدا کے لئے ہے جو فلاں مہینہ لے گیا اور فلاں مہینہ لایا۔"

چاند بی بی

چاند بی بی (۱۵۵۳ء تا ۱۵۹۵ء) احمد نگر کے بادشاہ حسین نظام شاہ (۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء۔ ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء) احمد نگر خوزندہ سلطان کی بیٹی تھی۔ ۱۵۶۴ء میں چودہ سال کی عمر میں اس کی شادی سلطان بیجاپور علی عادل شاہ سے ہوئی۔ اس شادی سے ان دو کستانی ریاستوں کی باہمی چپقلش ختم ہو گئی۔ اور دکن کی پانچوں سلطنتوں میں باہمی اتحاد کی صورت پیدا ہوگئی شکل آئی۔ کیونکہ علی عادل شاہ کی بہن کی شادی چاند بی بی کے بھائی مرتضیٰ نظام سے ہوئی

جب چاند بی بی اپنے خاوند کے گھر آئی۔ تو اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے خاوند کا تخت کانٹوں کی سیج ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے خاوند کی ہر معاملے میں مدد کرنے کو اپنا شعار بنا لیا۔

چاند بی بی کئی ایک مہموں میں اپنے خاوند کے ہمراہ رہی۔ اس نے میدان جنگ کی سختیاں اور مصائب جھیلے۔ وہ اس کے ساتھ شکار کھیلتی اس کو بروقت ضرورت بہت قیمتی مشورے دیتی۔ اور اس کی ہمت بندھاتی۔

جب اس کے خاوند علی عادل شاہ نے (۱۵۸۰ء) میں وفات پائی تو اس کی عمر اٹھائیس برس کی تھی لیکن وہ رزم و بزم کے تمام قواعد سے واقف تھی۔

علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ چنانچہ اس کے بعد اس کا نو سالہ بھتیجا ابراہیم تخت پر بیٹھا اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کا لقب اختیار کیا۔ لیکن حکومت کا نظم و نسق چاند بی بی کے ہاتھ میں ہی تھا۔ کیونکہ بادشاہ کی عمر ابھی بہت کم تھی۔

چاند بی بی کی شجاعت و بہادری ایک بار اس موقع پر دیکھنے میں آئی جب برار بیدر اور گولکنڈہ کی متحدہ فوجوں نے بیجاپور کے دارالحکومت پر حملہ کیا۔ چاند بی بی دشمنوں کی اس صف آرائی سے ذرہ برابر خوفزدہ نہ ہوئی۔ اور جتنے دن تک محاصرہ رہا۔ برابر ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک جاتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب کہ بارش بہت تیزی سے ہو رہی تھی اور ایک جگہ فصیل میں شگاف بھی پڑ گیا تھا لیکن چاند بی بی وہاں اس کی حفاظت کے لیے خود کھڑی رہی۔ اور اپنے سامنے اس شگاف کو بند کروایا۔ یہ محاصرہ پورا ایک سال تک رہا بالآخر دشمن کو ناچار پسپا ہونا پڑا۔

جب ابراہیم عادل شاہ کی ہمشیرہ کا نکاح احمد نگر کے شاہزادے میراں حسین سے ہوا تو اس وقت ہی چاند بی بی کو اپنے وطن دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ کیونکہ رخصتی کے بعد سے سلطنت کے حالات اور انتظامات نے اس کو اتنی فرصت ہی نہ دی تھی کہ وہ کہیں باہر قدم رکھتی۔ ان دنوں احمد نگر کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ اب احمد نگر اور بیجاپور کے مابین اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے احمد نگر کے اندرونی حالات بھی بہت حد تک دگرگوں تھے۔ چنانچہ چاند بی بی بیجاپور واپس آگئی۔ بعد میں دوبارہ جب وہ احمد نگر گئی تو حالات پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئے تھے۔

ابراہیم نظام شاہ کے انتقال کے بعد احمد نگر کے تخت کے دو دعویدار تھے۔ ایک ابراہیم کا لڑکا بہادر تھا۔ دوسرا احمد تھا جو نظام شاہ کے ایک بھائی کا پوتا تھا۔

چاند بی بی بہادر کی طرف دار تھی۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ اس کی حمایت کی۔ لیکن میاں منجو احمد کا طرف دار تھا۔ اس نے ایک غیر معمولی نقصان دہ قدم اٹھایا۔ اس نے شہنشاہ اکبر کے لڑکے مراد کو جو اس وقت گجرات کا حاکم تھا احمد نگر پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

مراد نے فوراً دارالحکومت پر چڑھائی کر دی۔ ادھر چاند بی بی نے بہادر کے جائز وارث تاج و تخت ہونے کا اعلان کر دیا اور گولکنڈہ اور بیجاپور والوں سے مدد طلب کی۔ مغلوں نے احمد نگر کا دو مرتبہ محاصرہ کیا جو دکن کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ ہیجان انگیز واقعات میں سے ہے۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

مغل حکمران تمام خوبیوں کے باوجود کہ اسے فراوانیٔ رسل و رسائل کی فراوانی حاصل تھی احمد نگر کے حکمران جیتنے میں انتشار تھا۔ کامیابی نہ ہو سکی۔ چاند بی بی نے اس محاصرے کے دوران میں وہ بہادرانہ کام سرانجام دیئے کہ کوئی مرد بھی مشکل سے ایسے نازک وقت میں ان حالات سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مراد نے چاند بی بی کی بہادری کو دیکھتے ہوئے اسے سلطان تسلیم کر لیا۔ دکن کی پانچ سلطنتوں میں صرف اسی حکمران کے شاہی لقب کو مغلوں نے تسلیم کیا چنانچہ ایک عہدنامے کے مطابق برار کا علاقہ مغلوں کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اور احمد نگر کی مکمل آزادی خود مختاری تسلیم کر لی گئی۔

اس معاہدے کے بعد کچھ عرصے کے لئے حالات پرسکون رہے لیکن داخلی امن کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ جو لوگ چاند بی بی کے مخالف تھے انہوں نے اب مغل شہزادے دانیال کو مدد کے لئے بلایا۔ چاند بی بی سلطان نے بھی دوبارہ گولکنڈہ اور بیجاپور سے مدد طلب کی۔ لیکن اس دفعہ یہ اتحاد کامیاب نہ ہو سکا اور ۱۵۹۷ء میں سونی پت کے میدان میں چاند بی بی اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ چاند بی بی کو اس کے مخالف گروہ نے جس کی قیادت حمید خان کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے شہر کے اوباشوں کو ساتھ لے کر محل کے اس حصے پر حملہ کر دیا جہاں قیام گاہ تھی اور ملکہ کو نہایت سفاکی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

ایک انگریز مصنف میڈوز ٹیلر نے چاند بی بی کے بارے میں لکھا ہے۔

"ملکہ الزبتھ کی ہمعصر . . . . ایک ملکہ، قابلیت میں اس کی ہم پلہ سیاسی فہم و ذکا میں اس کے برابر اور اس کی طرح تعلیم یافتہ اور کمالات سے آراستہ تھی مگر اس کی تعلیم کی نوعیت یک گونہ مختلف تھی، وہ اتنے ہی بڑے اور زرخیز خطے پر حکمران تھی جتنا انگلستان ہے۔ حاسدوں اور دشمنوں میں گھری ہوئی ایک خاتون جس نے محض اپنی شجاعت و عزیمت سے اپنی مملکت کو تباہ اور ٹکڑے ہو جانے سے بچا لیا . . . . . . وہ سادہ مزاج، فیاض، راست باز اور رحم دل، پاکباز، متقی اور مخیر، ہندوستان کی تمام خواتین میں وہ اس طرح ممتاز تھی جس طرح ایک گوہر بے داغ و بے بہا۔"

چاہ بابل بغداد سے جنوب کی طرف تقریباً ۵۵ میل کے فاصلے پر ایک چوکور کنواں جس کا قطر تین فٹ کے قریب ہے۔ کنکر پھینکنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں پانی موجود ہے۔ اس کنویں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ہاروت و ماروت الٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ اور قیامت تک لٹکے رہیں گے۔ (نیز دیکھیے "ہاروت و ماروت")

چاہ نخشب ایک کنواں جس کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ اس کنویں میں سے حکیم عطا ابن مقنع نے شعبدے کے طور پر سیمابی اجزا کی ترکیب سے ایک چاند نکالا تھا۔ نخشب ترکستان کے ایک شہر کا نام ہے۔ اسی شہر کی نسبت سے ماہ مقنع کو ماہ نخشب کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ حکیم مذکور نے شہر کے باہر ایک کنواں بنوایا جس میں سے اندھیری راتوں میں ایک چاند نکل کر ہوا میں معلق ہو جاتا اور چار کوس تک اس کی روشنی سے ہر چیز منور ہو جاتی۔

چاہ یوسف نواح شام میں طبریہ کے نزدیک ایک کنواں۔ وہ کنواں جس میں حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے ڈال دیا تھا۔ حضرت یوسفؑ چونکہ حضرت یعقوبؑ کے بہت زیادہ لاڈلے بیٹے تھے۔ اور حضرت یعقوبؑ آپؑ سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ چنانچہ آپؑ کے بھائی آپؑ سے حسد کرنے لگے۔ وہ آپؑ کو سیر کے بہانے سے جنگل میں لے گئے۔ اور باہم مشورہ کر کے آپؑ کو ایک ایسے کنویں میں ڈال دیا جو عرصے سے خشک پڑا تھا۔ حجازی اسماعیلیوں کا ایک قافلہ سامان تجارت لے کر شام سے مصر کی طرف جا رہا تھا۔ کنواں دیکھ کر اہل قافلہ نے پانی کے لیے اس میں ڈول ڈالا جسے پکڑ کر حضرت یوسفؑ کنویں سے باہر آ گئے۔ قافلے والوں نے انہیں غلام کے طور پر اپنے ساتھ لے لیا اور مصر لے گئے۔

اس کنویں پر آج کل ایک گنبد بنا ہوا ہے۔

چترال عہد برطانوی کی ہندوستان کی ایک ریاست جو ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں شامل ہو گئی ۱۹۶۹ء میں پاکستان کی حکومت کے ایک حکم کے تحت ریاست دیر، سوات اور چترال کو ختم کر کے ان علاقوں پر مشتمل مالاکنڈ ڈویژن کی تشکیل کی گئی جو صوبہ سرحد کا ایک حصہ ہے۔

سابق ریاست چترال کا علاقہ ۳۵ درجے ۱۵ دقیقے اور ۳ درجے ۸ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۱۷ درجے ۲۲ دقیقے اور ۷۴ درجے ۹ دقیقے طول بلد مشرق میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۰۰۵ مربع میل ہے۔ یہ علاقہ سوویت روس، افغانستان اور عوامی جمہوریہ چین سے ملا ہوا ہے۔ اس ریاست کا نام اس کے دارالحکومت کے نام پر چترال ہے۔

چینیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں اس علاقے کو فتح کرنے کے بعد چترر کے نام سے موسوم کیا۔ جس کے معنی سبزہ زار بیان کئے گئے ہیں۔ بابر نے اپنی تزک بابری میں یہی لفظ چھت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس ریاست کی سالانہ آمدنی تقریباً ۱۳۰۰۰۰ روپے تھی۔

چترال کا علاقہ ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ جس کی برفانی چوٹیاں اور برفانی تودے کوہ ہندوکش کی سرسبز و شاداب وادیوں کے لیے آب پاشی کا ایک دائمی منبع ہیں۔ کوہ ہندوکش کی شاخیں چترال کو کئی کوہستانی علاقوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ چترال میں جو دیر اور سوات کے بے نام کوہستانوں ہمالیہ اور سلسلہ قراقرم سے چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے بہت سے مشہور درے اور چوٹیاں ہیں۔

درہ دوارہ سے جو ۱۴۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے بدخشاں کو راستہ جاتا ہے جو سال میں صرف تین مہینے کھلا رہتا ہے زمانہ قدیم سے یہ درہ چترال اور وسطی ایشیا کے درمیان کاروانوں کا اہم راستہ رہا ہے۔ درہ بارو غل جو وادی یارخون کے اس پار ہے چین اور سوویٹ روس کو چترال سے ملاتا ہے اور یہاں کاشغر اور ختن سے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔ دیگر اہم دروں میں درہ شندور اور درہ لواری ہیں۔ جن سے بالترتیب، گلگت اور دیر کو راستہ جاتا ہے جبکہ درہ لواری چترال اور باقی پاکستان کے درمیان آمدورفت کا واحد ذریعہ یہاں کے لوگوں کا ذریعہ گذر بسر زراعت و پرورش حیوانات ہے۔ اگرچہ اس علاقے میں معدنیات اور جنگلات بکثرت ہیں۔ جن سے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ یہاں پر سرمہ، کچے لوہے گندھک، ابرق بلور اور ہڑتال کے اچھے خاصے ذخیرے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد چترال نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔

چترال کی قدیم تاریخ کی بابت بہت کم معلومات ہیں۔ قدیم باشندے "پشاچ" کہلاتے ہیں۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مردم خور ہیں انہیں پہلی صدی قبل مسیح میں مغلوب کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے چترال کے بارے میں معلومات تاریکی میں ہیں۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں جا کر ہمیں آثار قدیمہ کی یہ شہادت ملتی ہے کہ چترال ۲۸۷ھ / ۹۰۰ء میں کابل کے راجہ جے پال کے زیر فرمان تھا۔ اور یہاں کے باشندے بدھ مت کے پیرو تھے۔ چنگیز خان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی چترال پر حملے کئے۔ اگرچہ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔

Marfat.com

چترال کے آخری حکمران خاندان کا بانی ایوب بابا نامی ایک شخص تھا۔ اسے بابر کا پوتا بتایا جاتا ہے۔ جو اپنے باپ ہمایوں کے ایران کی طرف روانہ ہونے کے بعد چترال آ

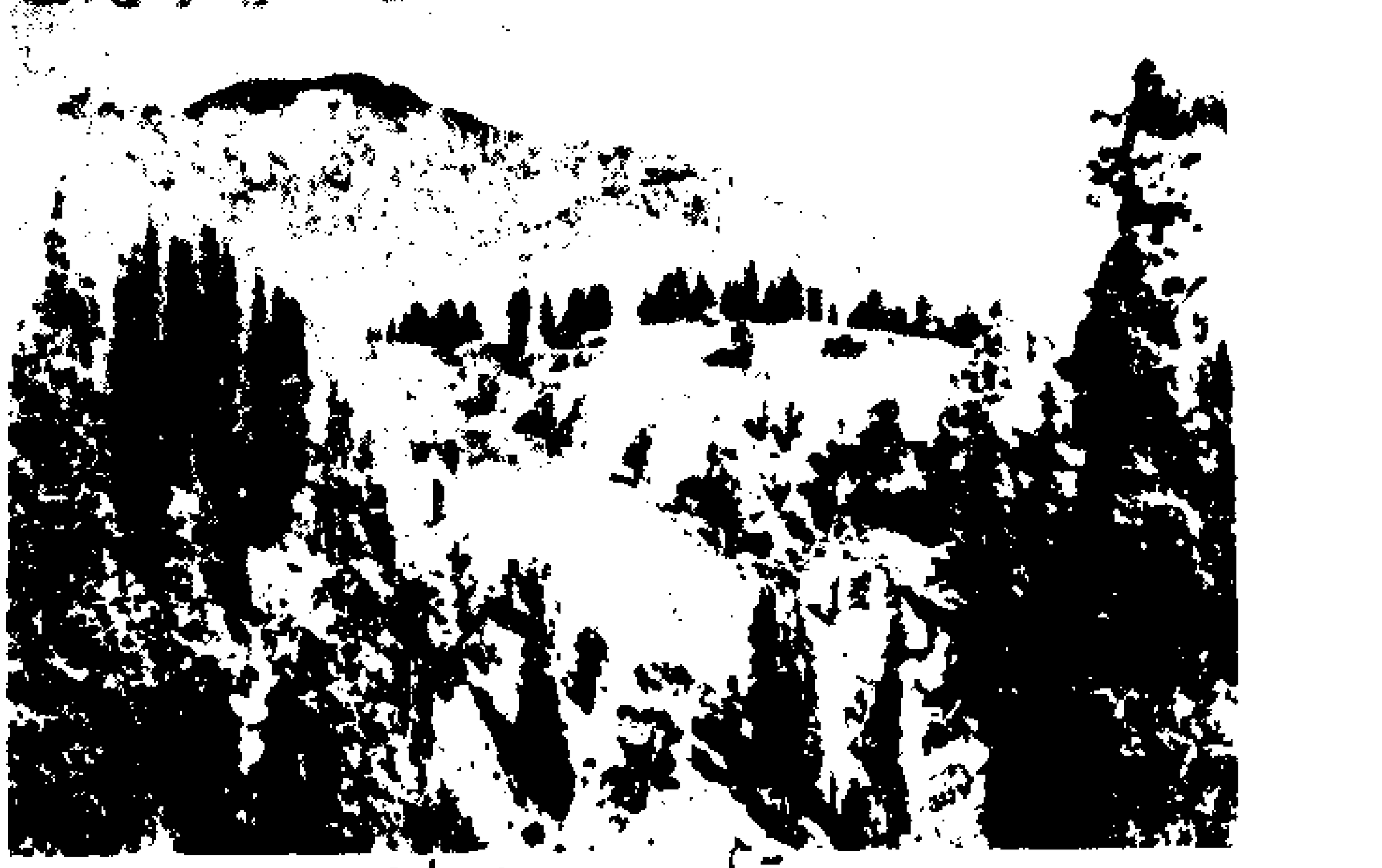

وادی چترال میں برف باری

نکلا تھا۔ اور اس نے یہاں کے فرمانروا کے ہاں ملازمت کر لی تھی۔ جو خاندان رئیسہ کا شہزادہ تھا بعد میں ایوب کا پوتا سنگین علی اول حکمران کا منظور نظر بن گیا۔ جس نے اسے امیر الامراء مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے بڑی قوت حاصل کر لی۔ ۹۷۸ھ/۱۵۷۰ء میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے دو بیٹوں محمد رضا اور محمد بیگ نے اس کی جگہ سنبھالی۔ بعد میں رئیسہ شہزادے کے انتقال کے بعد محمد رضا فی الواقع حکمران بن گیا۔ لیکن جلد ہی اس کے بھتیجوں نے اس کو قتل کر دیا کیونکہ اس نے ان کے والد محمد بیگ کے ساتھ زیادتیاں کی تھیں۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں محمد بیگ کے بیٹے محرم شاہ اول نے چترال کے آخری رئیسہ حکمران کو پرامن طور پر تخت سے اتار کر بدخشاں بھیج دیا اور خود حکمران بن بیٹھا۔ ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں محمود بن ناصر رئیسہ نے ایک بہت بڑی بدخشانی فوج کے ساتھ چترال پر چڑھائی کر دی۔ اس نے محرم شاہ اول کو شکست دی اور چترال سے جلاوطن کر دیا۔ ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں محرم شاہ اول محمود رئیسہ کو قتل کرنے کے بعد دوبارہ چترال واپس آ گیا۔ ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء میں اس پر دوبارہ حملہ کیا گیا۔ بعد میں محرم شاہ اول کو اپنی فوج کی غداری کے سبب ملک چھوڑنا پڑا۔ اس کے بیٹے سنگین علی دوم نے اپنی کھوئی ہوئی ریاست دوبارہ حاصل کرنے سے مایوس ہو کر افغانستان چلا گیا۔ جو اس وقت ہندوستان کی مغل حکومت کا ایک حصہ تھا۔

بہادر شاہ اول (شاہ عالم) کے دور حکومت میں سنگین علی دوم دہلی آ گیا۔ ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں شاہ عالم کی ملازمت میں آ گیا۔ بادشاہ کی مالی امداد سے وہ اس قابل ہو گیا کہ وہ سوات کے رنگروٹوں کو فوج میں بھرتی کر سکے۔ اور اس طرح اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کے قابل ہو گیا۔ ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں اس کو خاندان رئیسہ کے چند افراد نے قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد متعدد کمزور اور ناکارہ حکمران آتے رہے۔ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں فرامرز جو محرم شاہ اول کا بھتیجا تھا تخت نشین ہوا۔ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں اسے اس کے چچا شاہ افضل نے قتل کر ڈالا اور تخت پر قبضہ جما لیا۔ ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بھائی شاہ فاضل تخت پر بیٹھا۔ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں شاہ نواز خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں خیر اللہ خان بن عصمت اللہ خان کے چترال پر حملے کو بھاری نقصانات اٹھا کر پسپا کیا۔ ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں وہ تیسری بار تخت پر بیٹھا۔ اس وقت چترال چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک وحدت ایک مقامی سردار کے ماتحت تھی۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں شاہ نواز کا بھائی محرم شاہ ثانی کٹور کا خطاب اختیار کر کے حکمران بن بیٹھا اور ملک امان کے کسی بیٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا کر بادشاہت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۸ء میں اس کے انتقال کے وقت اس کا چچا شاہ افضل ثانی تخت نشین ہوا۔ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں مہتر چترال نے مہاراجہ کشمیر سے سمجھوتہ کر لیا جس کی رو سے مہاراجہ نے بارہ ہزار روپے سالانہ خراج کے عوض مہتر چترال کی سرداری کو تسلیم کر لیا ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں بالائی چترال کے حکمران بہادر پہلوان کی شکست کے بعد سارا علاقہ پہلی دفعہ ایک سردار مہتر امان ملک کے تحت متحد ہو گیا۔ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں لاک ہارٹ مشن چترال آیا۔ اس کے بعد ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں ایک اور مشن کیپٹن ڈیورنڈ کی سرکردگی میں وہاں آیا۔ جس کے توسل سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں سالانہ خراج کی رقم جو کشمیر دربار ادا کرتا تھا بڑھا کر بارہ ہزار روپے کر دی گئی۔ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں افضل الملک اپنے باپ امان الملک کا جانشین ہوا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی اس کے چچا شیر افضل نے اسے قتل کرا دیا۔ ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں نظام الملک کو اس کے سوتیلے بھائی امیر الملک نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد امرا خاں نے جو جندول کا والی اور اس وقت دیر کا مالک تھا چترال پر حملہ کیا۔ شیر افضل جو افغانستان میں ایک جلاوطن تھا۔ اس کے ساتھ مل گیا۔ امرا خان اور شیر افضل دونوں برطانوی ہندوستانی مختصر سی فوج کے خلاف متحد ہو گئے جو ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء کے معاہدے کی رو سے چترال میں متعین تھی۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ امیر الملک امرا خان اس کے حلیف سے خفیہ ساز باز کر رہا ہے تو برطانوی ایجنٹ نے اسے حراست میں لے لیا اور شجاع الملک کو عارضی طور پر مہتر تسلیم کر لیا۔

برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ شاہ شجاع کو تخت پر بٹھانے سے پہلے ملکی اور برطانوی چار سو مسلح فوجی سپاہیوں کے ساتھ قلعے پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس حفاظتی فوج نے امرا خان اور شیر افضل کی فوجوں پر حملہ کیا۔ لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

اب امرا خان اور اس کے حلیفوں کا تاریخی محاصرہ چترال شروع ہوا۔ جو ۳ مارچ ۱۸۹۵ء سے ۱۹ اپریل ۱۸۹۵ء تک رہا۔ بعد میں شیر افضل ۲۶ اپریل ۱۸۹۵ء کو بھیجی جانے والی انگریزی فوج کے ہاتھوں قید ہو گیا۔ تو محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ اور امرا خان بچ کر افغانستان چلا گیا۔ شجاع الملک کو بحیثیت مہتر کے مستقل کر دیا گیا۔ اور اس وقت سے چترال میں امن و امان کا مسلسل دور دورہ رہا۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء کی جنگ افغانستان کے دوران میں چترال سکاؤٹوں نے پورے طور پر انگریزوں سے تعاون کیا۔ مصارف جنگ کے لیے مہتر نے جو چندہ دیا تھا اس کے عوض میں اسے ایک لاکھ روپے کی رقم دی گئی اور اسی سال سے اسے گیارہ توپوں کی سلامی کے ساتھ ہز ہائی نس کا خطاب بھی دیا گیا۔

شجاع الملک نے جو ایک روشن دماغ حکمران تھا، چترال میں بجلی مواصلات لاسلکی اور موٹروں جیسی جدید سہولتوں کو ریاست میں مروج کیا۔ اور سڑکیں، قلعے، اناج کے گودام آب پاشی کی نہریں اور سکول تعمیر کرائے۔ ایک جامع مسجد بھی بنوائی۔ اس کو جدید چترال کا معمار کہا جاتا ہے۔

شجاع الملک کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ناصر الملک ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں اس کا چھوٹا بھائی مظفر الملک اس کا جانشین ہوا۔ یہ وہی حکمران تھا۔ جس نے ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۷ء میں پاکستان سے چترال کے الحاق کی پیش کش کی۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں سیف الرحمان اس کا جانشین ہوا جو ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء میں ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو گیا اور اس کا تین سالہ لڑکا سیف الملک ناصر تخت نشین ہوا۔

۱۹۶۹ء میں حکومت پاکستان کے [illegible] چترال۔

Marfat.com

دیر، سوات کی ریاستوں کو ختم کر کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مدغم کر دیا۔

چٹاگانگ

بنگلہ دیش کی ایک اہم بندرگاہ، ضلع اور ڈویژن۔ چٹاگانگ صدیوں پرانی بندرگاہ ہے۔ جہاں عیسائی جہاز ران اپنے جہاز اور مال لے کر آتے تھے۔ مسلمان پہلی بار دسویں صدی عیسوی میں اس بندرگاہ سے متعارف ہوئے ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء میں چٹاگانگ بنگال کا ایک خوشحال علاقہ تھا۔ مسلمانوں نے آٹھویں صدی ہجری/ چودہویں صدی عیسوی میں چٹاگانگ پر قبضہ کیا۔ ۱۰۷۷ھ ۱۶۶۶ء میں بنگال کے نواب شائستہ خاں نے چٹاگانگ کو فتح کر کے اپنے علاقے میں شامل کر لیا اور اس کا نام اسلام آباد رکھا۔ غداری سے میر قاسم نے ۱۱۷۴ھ ۱۷۶۰ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیا۔ چٹاگانگ دریائے کرنافلی کے کنارے واقع ہے۔ دریا کے دہانے سے بندرگاہ کا فاصلہ لگ بھگ بارہ میل ہے۔ سرسبز پہاڑیوں، دریا، سمندر اور ہرے بھرے میدانوں نے اس علاقے کو بے پناہ حسن و دلکشی عطا کر رکھی ہے۔ اونچی، نیچی پہاڑیوں پر سینکڑوں مکانات تعمیر کیے گئے ہیں۔ چٹاگانگ کی آب و ہوا صحت افزا ہے۔ فروری اور جون کے درمیان درجۂ حرارت عموماً ۸۰ فارن ہیٹ سے کم ہی رہتا ہے۔ سردی کا موسم گرما چار ماہ کا ہوتا ہے۔ سال کے باقی حصے میں برسات رہتی ہے سلہٹ کے بعد اس علاقے میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ ہوائی راستے اسے ڈھاکہ، کاکس بازار، رنگون اور کلکتہ کے ساتھ ملائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عمدہ بندرگاہ ہے۔ جس کے آس پاس کے علاقوں میں پٹ سن کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں چائے کے باغات بھی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کلکتہ سے کافی مسلمان تاجر یہاں آباد ہوئے۔ جس سے یہاں کی بندرگاہ کو ترقی ملی اور نئے نئے کارخانے قائم ہونے لگے۔ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء کے بعد چٹاگانگ بندرگاہ میں جہازوں کی مرمت اور مال رکھنے کی سہولت میں چار گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

۹ھ/۶۳۰ء میں ایک چینی سیاح ہیون سانگ یہاں آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ "چاٹگام کا وہ علاقہ جو خوب صورت جھیلوں اور حسین پہاڑوں کی دنیا ہے، دو سو مربع میل پر محیط ہے۔ یہ انسان کی سچی خوشیوں اور روحانی لذتوں کی آماجگاہ ہے۔" عرب کے نامور سیاح ادریس نے اپنی ڈائری میں کرنافلی کے عنوان سے لکھا ہے کہ اس علاقے کی سیر و سیاحت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہاں ایک بڑا شہر ہے جو خوب صورت پہاڑیوں، دریاؤں اور جزیروں کی آغوش میں ہر ذی روح کو پیغام حیات دیتا ہے۔ دنیا کے سیاحوں کے لئے یہاں قدرت کی طرف سے دلچسپی کے کافی سامان مہیا ہیں۔ ۶۹۴ھ/۱۲۹۴ء میں مشہور سیاح مارکوپولو نے چٹاگانگ بندرگاہ کی خوب صورتی اور ترقی کی تعریف کی۔ ابن بطوطہ نے سن ۷۴۶–۷۴۸ھ/۱۳۴۵–۴۷ء میں جاوا کے راستے چٹاگانگ سے چین تک سفر کیا۔ وہ بنگال کے قدرتی حسن سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے "چیزیں یہاں دنیا بھر سے سستی ہیں۔ لوگ خوش حال اور حکمران مسلمان ہیں۔ ہندو مذہب کا بھی اثر ہے۔ دیہاتی زندگی ملاحوں اور کشتیوں کے گرد گھومتی ہے۔ ملاح بڑے شریف اور دیندار ہیں۔" دسویں صدی عیسوی میں عرب یہاں آئے تو اس علاقے کی دلفریبی سے متاثر ہو کر ان میں سے کچھ لوگ یہیں آباد ہو گئے۔ یہ بنگال سے مختلف چیزیں اپنے ملکوں کو بھیجتے تھے ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں پرتگالی یہاں آئے۔ انہوں نے یہاں تجارتی کوٹھیاں بنائیں اور چاٹگانگ کی موجودہ بندرگاہ کا نام "بڑی بندرگاہ" رکھا۔ عربوں کی آمد سے پیشتر چاٹگانگ ایک معمولی بندرگاہ تھا جسے "تام لوک" کہتے تھے۔ عرب اس علاقے کو "زدہم" کہتے تھے۔

چٹاگانگ کی بڑی بڑی عمارتیں سرکاری دفاتر اور کچہریاں پہاڑیوں پر واقع ہیں اونچے، نیچے ٹیلوں کے درمیان رینگتی ہوئی سڑکیں اور سرسبز درخت بڑا پرکیف منظر پیش کرتے ہیں۔ شہر سے کچھ فاصلے پر حضرت بایزید بسطامی کی بیٹھک، حضرت شیخ فرید شکر گنج کا چشمہ اور حضرت بدرالدین شاہ اور حضرت امانت شاہ کے مزارات ہیں شہر کی پہاڑیوں پر ریلوے ہیڈکوارٹر، جنرل ہسپتال، پہاڑطی میں واقع ریلوے ورکشاپ اور فوجی تربیت گاہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چٹاگانگ بنگلہ دیش کا اہم تجارتی مرکز ہے۔ یہاں پٹ سن سے مختلف چیزیں تیار کرنے کے کئی کارخانوں کے علاوہ ٹیکسٹائل ملز، آئل ملز، ماچس اور چمڑا رنگنے کے کئی کارخانے ہیں۔ دریائے کرنافلی پر بند باندھ کر بجلی پیدا کی گئی ہے جو گھریلو استعمال اور کارخانے چلانے میں مدد دیتی ہے۔ چٹاگانگ میں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کئی مسلمان بزرگوں نے قیام کیا اور لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں پر اسلامی طرز معاشرت اور اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر ہے۔

چٹاگانگ ڈویژن بنگلہ دیش کے پانچ مشرقی ضلعوں پر مشتمل ہے۔ ان اضلاع کے نام چٹاگانگ، چٹاگانگ ہل ٹریکٹ، نواکھلی، کومِلا اور سلہٹ ہیں۔ پورے ڈویژن میں چودہ سب ڈویژن اور تقریباً سترہ سو دیہات ہیں۔ پٹ سن، چائے اور چاول اس علاقے کی مشہور فصلیں ہیں۔ کچھ علاقے میں تیل کے بیج اور کپاس بھی

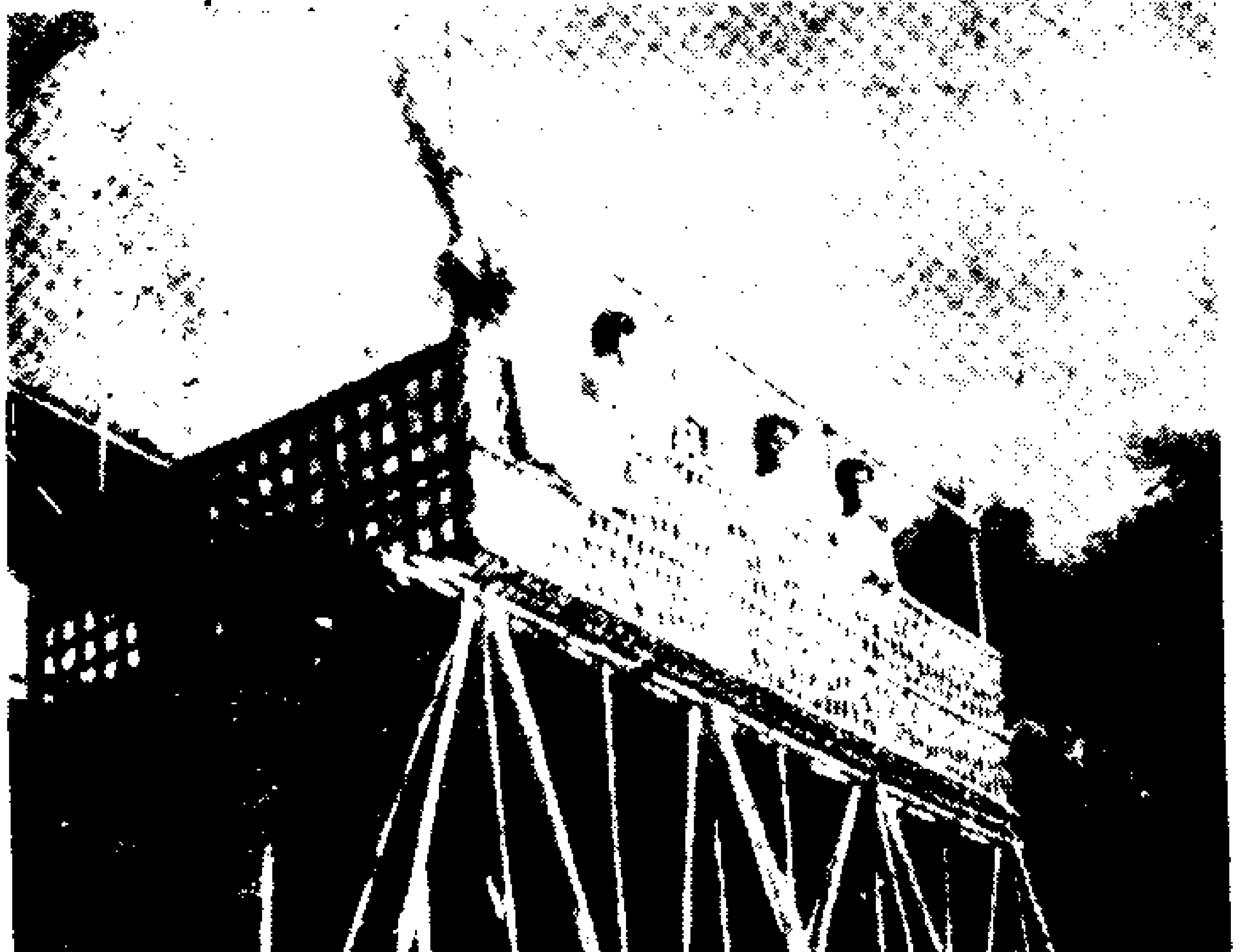

چٹاگانگ کے ایک مخصوص قبیلے کا مکان

Marfat.com

پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ تر آمدورفت دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے ہوتی ہے چٹاگانگ کے جنگلات میں کئی طرح کی قیمتی لکڑی ہوتی ہے۔ جس میں بید اور بانس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کپڑا بننا، بانس اور پٹ سن سے مختلف چیزیں تیار کرنا اس علاقے کی گھریلو صنعتیں ہیں۔ چٹاگانگ ڈویژن میں مسلمان، ہندو، بدھ اور قبائلی لوگ آباد ہیں ضلع چٹاگانگ کی آبادی میں غیر ملکی کثرت سے ملے ہوئے ہیں۔ ان میں عرب النسل لوگوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ چٹاگانگ کی بولی میں عربی کا اثر بھی زیادہ ہے
(اشرف تنویر)

چراغاں ایک محل کا نام جو خلیج باسفورس کی یورپی جانب بشکطاش اور بیکوی کے درمیان واقع ہے۔ یہ محل سلطان مراد رابع نے اپنی بیٹی کیا سلطان کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ بعد میں سلطان احمد کے وزیر اعظم اور ابراہیم پاشا کے داماد نے اپنی بیوی فاطمہ سلطان کے لئے اسے دوبارہ تعمیر کرایا بعد میں سلطان احمد کے وزیر اعظم اور ابراہیم پاشا کے داماد نے اپنی بیوی فاطمہ سلطان کے لئے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ سلطان اکثر یہاں آتا تھا اور اس موقع پر اس محل میں چراغاں کیا جاتا تھا۔

یہ محل تیسری بار سلطان مصطفیٰ ثالث نے اپنی دختر بیہمن سلطان کے لئے تیار کرایا۔ اس مرتبہ یہ تمام کا تمام لکڑی سے تیار کرایا گیا تھا۔ اس میں ۱۸۰ قدم لمبا ایک شاندار ایوان تھا۔ اس کے علاوہ مختلف تقاریب کے لئے اور بھی ایوان تھے ۱۸۶۳ء میں سلطان عبدالمجید نے اس محل کو گروا دیا۔ لیکن سلطان عبدالعزیز کے عہد میں اس کی تعمیر پھر نئے سرے سے شروع کی گئی۔ جو ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس بار یہ پتھروں سے بنایا گیا۔

۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالعزیز کا معزولی کے بعد سے خودکشی کے زمانے تک اسی محل میں فروکش رہا۔ معزول سلطان مراد خامس کو اس محل میں ستائیس سال تک رکھا گیا۔ بعد میں یہ محل کچھ تبدیلی کے بعد مجلس ملی کی عمارت کے طور پر بھی استعمال ہوتا رہا۔ جہاں پر سینیٹ اور مجلس نمائندگان کے اجلاس ہوتے تھے ۔۱۹ جنوری ۱۹۱۰ء میں آگ لگ جانے کی وجہ سے یہ محل ضائع ہو گیا۔ آج کل اس کی دیواریں اور شاہی دروازے باقی ہیں۔

چراغ دہلی (۔۔۔؟۔۔۔ ۷۵۸ھ / ۱۳۵۶ء) ایک بہت بڑے بزرگ، صوفی اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے کبار خلفاء میں سے تھے۔ شیخ نصیر الدین محمود بن یحیٰ۔ آپ کے والد لاہور میں پیدا ہوئے لیکن بعد میں اودھ میں جا کر سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ آپ کی پیدائش اودھ ہی میں ہوئی۔ آپ صحیح النسب سادات میں سے تھے۔ نو سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی پرورش آپ کی والدہ نے کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالکریم شیروانی، مولانا افتخار الدین محمد گیلانی ہیں۔

آپ کے بچپن ہی میں آثار ترک و تجرید نفس کشی آپ کی پیشانی سے ظاہر تھے پچیس سال کی عمر ہوئی تو ترک و تجرید کا طریقہ اختیار کیا۔ اور محاسبہ نفس اور مجاہدہ اور ریاضت و عبادت میں سات سال تک مشغول رہے۔ پورے سات سال تک ایک درویش کامل کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی۔ چالیس یا تینتالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور شیخ المشائخ نظام الدین محمد بدایونی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ آپ کا دستور تھا کہ شب و روز کمربستہ خدمت پیر و مرشد میں حاضر رہتے تھے۔ اس وقت حضرت نظام الدین کیلوکھڑی میں تشریف فرما تھے۔ جو جمنا کے کنارے ایک بالا خانہ تھا۔ چنانچہ آپ بھی پیر کی خدمت میں وہاں رہنے لگے۔ اس کے بعد وطن جانے کا کچھ زیادہ اتفاق نہیں ہوا۔ سوائے ایک مرتبہ والدہ محترمہ کی زیارت کے لئے گئے اور ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے یا بھائی بہن کی دلجوئی کی خاطر گاہے گاہے شیخ کی اجازت سے وہاں گئے۔

آپ کا دہلی میں قیام اپنے دوست شیخ برہان الدین غریب کے مکان پر تھا۔ شیخ المشائخ حضرت نظام الدین نے ۲۰ ذوالحجہ ۷۲۴ھ / ۹ نومبر ۱۳۲۴ء کو اپنے چند خلفا مقرر کئے۔ اس واقعے کے تقریباً ۴ ماہ بعد وفات پا گئے۔

آپ کو آپ کے مرشد نے اپنے پیر شیخ فریدالدین کا عطا کردہ خرقہ، مصلیٰ، تسبیح اور کاسہ چوبیں عنایت فرما کر دہلی میں اپنا جانشین مقرر کیا اور وصیت کی کہ اغیار کے آزار اور سرزنش پر صبر کیا کریں۔

آپ اپنے مرشد کے بعد تقریباً بتیس سال تک زندہ رہے۔ اس ساری مدت میں آپ اپنے پیر کا پورے طور پر اتباع کرتے رہے۔

ایک بار کوئی آپ کی پوشاک چوری کر کے لے گیا۔ آپ نے دم نہ مارا۔ اور بہ وصیت مرشد پابند رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن بعد نماز ظہر آپ حجرہ میں عبادت میں مشغول تھے۔ اور مراقبہ میں سر جھکائے ہوئے تھے کہ تراب نامی ایک قلندر بے باک کہ برسوں سے آپ کا دشمن تھا خالی موقع پا کر حجرہ میں گھس آیا۔ اور گیارہ زخم چھری سے آپ کے جسم پر لگائے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مریدوں نے دیکھ کر اسے گرفتار کر لیا اور حضرت کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا اس سے کوئی مزاحمت نہ کرے نیز اس قلندر کو نزدیک بلا کر بہت کچھ دے کر رخصت کیا اور دوستوں سے کہا کہ اگر اس کو ایذا دی جاتی تو خلاف وصیت شیخ ہوتا۔ اس واقعے کے بعد آپ تین سال تک زندہ رہے۔ اور بعد میں مختصر سی علالت کے بعد انتقال فرمایا اور اپنے ہی گھر میں دفن ہوئے۔ آپ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ اور اپنے پیر سے خرقہ و قدح وغیرہ جو کچھ ملا تھا آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا۔ آپ کا مزار سلطان فیروز شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔

آپ نے ساری عمر فقر، صبر اور تسلیم و رضا کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔ آپ سماع میں مزامیر سے اجتناب کرتے رہے۔ ایک واقعہ آپ کے بارے میں نقل ہے کہ ایک روز آپ کے کسی پیر بھائی کے گھر میں مجلس تھی۔ آپ بھی اسی مجلس میں موجود تھے کہ باجے کے ساتھ سماع شروع ہوا۔ آپ وہاں سے اٹھ کر چلے۔ دوستوں نے کہا بیٹھو۔ آپ نے فرمایا میں نہ ٹھہروں گا۔ یہ امر خلاف سنت ہے۔ لوگوں نے کہا کیا سماع سے منکر ہو۔ اور مشرب پیراں سے پھر گئے ہو۔ آپ نے فرمایا یہ کوئی حجت نہیں۔ دلیل تو کتاب و سنت سے چاہیے جب اس بات کا ذکر آپ کے مرشد سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کا اتقا بڑھا ہوا ہے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی اور ان کے اکثر خلفاء کا طریق یہ تھا کہ شریعت کا اتباع پوری طرح کیا جائے اور علوم دینیہ کی تدریس میں مشغول رہا جائے۔

آپ بڑے عابد و زاہد تھے حالات عالیہ اور مکاشفات جلیلہ رکھتے تھے۔ طریقہ آپ کا صبر و شکر، فقر و رضا و تسلیم تھا۔

آپ نے کوئی اپنی تصنیف نہیں چھوڑی البتہ حمید شاعر قلندر نے جو آپ کے خدمت گاروں میں سے تھا آپ کے ملفوظات جمع کئے۔ اور اس کتاب کا نام خیر المجالس رکھا۔

آپ کے مریدین میں سید محمد جعفر، قاضی عبدالمقتدر، سید محمد بن یوسف المعروف بہ گیسو دراز، سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں، مولانا احمد تھانیسری، اخی سراج پروانہ مولانا حسام الدین ملتانی اور محمد وجیہ الدین ادیب وغیرہ ہیں۔

Marfat.com

آپ کے چند ایک ارشادات درج ذیل ہیں۔

جو شخص ذکر الٰہی کرتا ہے خدا اس کا جلیس ہوتا ہے۔

راتوں کو بیدار رہو، اس لئے کہ نزول انوار اکثر راتوں ہی میں ہوا کرتا ہے۔

جو اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے اسے طاعت میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

سالک کو عبادت میں ذوق و شوق حاصل ہو تو یہی اس کی غذا بن جاتا ہے اگر یہ حاصل نہ ہو تو پھر عبادت اس کے لئے اشتہا کا باعث ہوتی ہے۔

اگر طلب دنیا میں خیر کی نیت ہو تو وہ فی الحقیقت طلب آخرت ہے

چراگاہ زمین کے وہ قطعات جو اس غرض سے آباد نہ کرنے دیئے جائیں کہ ان میں گھاس اور چارہ اُگے اور جانوروں کے چرنے کے لئے مباح ہو۔

آنحضورؐ نے اپنی حیات طیبہ میں مدینہ منورہ میں ایسا کیا تھا۔ آپ بقیع میں ایک پہاڑی پر چڑھے۔ آپؐ نے میدان کی طرف جس کی مقدار ۶×۱ میل تھی اشارہ کرکے فرمایا یہ میری حمیٰ (چراگاہ) ہے۔ اس چراگاہ کو آپؐ نے مہاجرین و انصار کے گھوڑوں کے چرنے کے لئے روک دیا تھا۔

آپؐ کے بعد آپ کے خلفاء کے بارے میں یہ بات ہے کہ اگر وہ تمام بنجر یا اکثر کو خاص لوگوں یا مالداروں کے لئے چراگاہ بنائیں تو جائز نہیں۔ اور اگر عام مسلمان یا فقراء و مساکین کے لئے بنائیں تو اس بارے میں دو قول ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے کیونکہ چراگاہ بنانے کا حق آنحضورؐ کو تھا۔ صعب بن جثامہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے بقیع کو چراگاہ بناتے وقت یہ فرمایا تھا کہ چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ آپؐ کے بعد آئمہ (خلفاء) کا چراگاہ بنانا جائز ہے کیونکہ آپؐ کو مسلمانوں کی مصلحت مدنظر تھی نہ کہ ذاتی منفعت یہی آپؐ کے خلفاء نے کیا۔ مثلاً ابوبکر صدیقؓ نے ربذہ میں اہل صدقہ کے لئے چراگاہ تجویز کی اور اس پر اپنے مولیٰ ابوسلامہ کو عامل مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ نے سرف میں چراگاہ مقرر کرکے اس پر اپنے مولیٰ ہنی نامی کو عامل بنایا تھا اور نصیحت کی تھی کہ اے ہنی لوگوں پر دست درازی نہ کر، مظلوم کی بددعا سے ڈر اس کی بددعا قبول ہوتی ہے اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے چرواہوں کو داخل ہونے دے۔ ابن عفان اور ابن عوف کے چوپایوں کو نہ چھیڑ اگر ان کے جانور ہلاک ہونے لگے تو کھجوروں اور کھیتوں کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور اونٹ اور بھیڑ بکری کے چرواہے میرے پاس آکر یہ شکایت کریں گے اے امیرالمومنین! آپ نے یہ کیا کیا! کیا میں ان کو یونہی پریشان چھوڑ دوں گا۔ مجھے درہم و دینار سے گھاس دینا سہل ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں جان ہے کہ اگر میں ان سے فی سبیل اللہ مال نہ لیتا تو ان کی بالشت بھر زمین بھی چراگاہ نہ بناتا اور آپ کے ارشاد کا کہ حمیٰ (چراگاہ) صرف اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔ یہ مطلب ہے کہ چراگاہ صرف اسی طرح ہے۔ جس طرح اللہ اور رسول نے فقراء اور مساکین اور عام مسلمانوں کی ضروریات کے لئے بنائی۔ نہ زمانہ جاہلیت کی طرح جب کہ لوگ زور قوت سے اپنے لئے مخصوص کر لیتے تھے۔ جیسے کلیب بن وائل کا طریقہ تھا کہ کسی جگہ کتے کو باندھ دیتا اور جہاں تک اس کے بھونکنے کی آواز جاتی اس کو چاروں طرف سے اپنی چراگاہ مخصوص قرار دیتا اور دوسری چراگاہوں میں لوگوں کا شریک رہتا۔

جب زمین کو چراگاہ بنا دیا جائے اور اسے آباد کرنے کی ممانعت کر دی جائے تو پھر اس پر چراگاہ کا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ اگر سب کے لئے ہو تو امیر غریب مسلم ذمی سب کو اپنے جانور چرانے کا حق ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے لئے خاص ہو تو اس میں سب امیر و غریب کو حق ہے ذمیوں کو ممانعت ہے۔

کسی قطعہ زمین کو حمیٰ قرار دینے کے بعد اگر کوئی شخص اس میں سے کچھ آباد کرے جس سے چراگاہ کا رقبہ کم ہو جائے تو اگر وہ آنحضورؐ کی تجویز کردہ ہو تو وہ چراگاہ ہی رہے گی اس کا آباد کرنا باطل ہے آباد کنندہ کو سزا دی جائے۔ اور اگر آپ کے بعد ائمہ میں سے کسی کی تجویز کردہ ہو تو کھیتی باقی رکھنے کے متعلق دو قول ہیں۔

ایک تو یہ کہ آباد نہ رکھی جائے آنحضورؐ کی چراگاہ کے مثل اس کا بھی حکم ہے۔ کیونکہ صحیح نافذ شدہ حکم سے چراگاہ قرار دی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ آباد رہنے دی جائے۔ کیونکہ آپ کا بالتصریح ارشاد ہے کہ جو شخص بیکار زمین کو آباد کرے وہ اس کی ملک ہے۔

کسی حاکم کو یہ جائز نہیں کہ چراگاہ یا بے کار زمینوں میں جانور چرانے پر لوگوں سے معاوضہ لے۔ آنحضورؐ کا فرمان ہے کہ تین چیزوں میں سب مسلمان شریک ہیں۔ پانی، آگ، چارا۔

چرچ :۔ عیسائیوں کی عبادت گاہ (دیکھئے "کنیسا")

چرکس اس لفظ کا اطلاق چند گروہوں پر ہوتا ہے جو بنو انجاز، بنوابزہ اور بنو ابخ سے مل کر "آبزد قفقازی" قوم کی شمال مغربی یا ابسگو۔ ادغہ شاخ بن گئے ہیں۔

چرکس قوم کے آباؤ اجداد بحر ازوف اور بحر اسود کے ساحلوں پر اور دریائے قوبان کے جنوب اور شمال کے میدانوں میں رہتے تھے۔ اور شاید دریائے ڈان تک پھیلے ہوئے تھے۔

دسویں صدی عیسوی میں روسی لوگ جزیرہ نمائے تمان ریاست تمترکن میں آباد ہوئے تو ان کا رابطہ چرکس سے شروع ہوا۔ جنہیں روسی تاریخ نگار "کسگ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک شمال مغربی کاکیشیا التون اردو کے زیر نگین تھا جب مؤخر الذکر کو زوال آ گیا تو مشرقی چرکس قبائل نے تاریخ قفقاز میں حصہ لینا شروع کیا۔

سولہویں صدی عیسوی میں ملوک قبارداي نے ماسکو کے حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے ایوان چہارم کی دوسری بیوی چرکس شہزادی تھی۔

سترہویں صدی میں قبار دای قبائل نے اہل قفقاز کے متحدہ گروہ کی قیادت کی۔ اس عہد سے چرکس کو یہاں بالادستی حاصل ہو گئی۔

انیسویں صدی کے وسط میں روسی فتح سے پہلے چرکس قبائل جو تعداد میں دس لاکھ سے زائد تھے۔ شمال مغربی کاکیشیا اور بحیرہ اسود کے مشرقی ساحل کے ایک حصے اور جزیرہ نمائے تمان میں انجازیہ کے نواح تک میں آباد تھے۔ ان کے بڑے بڑے قبائل یہ تھے۔

(مغربی قبائل)، ناتخواج، شاپشگ، ادغہ، موخوش، قمرگوے، بجدخ، خاتوقای، بسلنی۔

(مشرقی قبائل)، یا قبارد جو دو گروہوں قبارداي الکبریٰ اور قبارداي الصغریٰ میں منقسم تھے۔ تزداج اور آبازہ کو بھی ان قبائل میں شمار کر لینا چاہیئے۔

Marfat.com

اس ملک پر جب روسیوں نے فتح پائی تو مغربی چرکسوں کا بیشتر حصہ ۱۸۶۴ء / ۱۸۶۵ء میں ترکی میں نقل مکانی کر گیا اور بہت قلیل تعداد روس میں رہ گئی۔

۱۸۶۵ء کی نقل مکانی کے بعد قبائلی اختلافات تیزی سے کم ہوتے گئے اور روس میں رہ جانے والے قبائل منتشر عناصر نے ادیغہ قوم کی چھوٹی سی وحدت کی صورت میں اپنے آپ کو متحد کر لیا۔ موجودہ دور میں صرف مندرجہ ذیل قبائل اپنی بولی اور رسم و رواج کی بعض خصوصیات اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔

ابادزخ (ابزاخ)، بجدوخ شاپسگ۔

چرکسی حنفی المذہب سنی مسلمان ہیں۔ اسلام سولہویں صدی میں پہلے قباردوں میں پھر سترہویں صدی میں ادیغہ میں کریمیا کے تاتاریوں کے ذریعے پھیلا۔ لیکن اس کے نفوذ کی رفتار سست تھی اور پہلے وہ جاگیردار طبقہ امرا میں پھیلا۔ اٹھارہویں صدی میں کہیں جا کر کریمیا کے خانوں اور آناپہ کے ترکی پاشاؤں کی بدولت تمام قوم نے اسلام قبول کر لیا اور اس نے عیسائیت اور قدیم بت پرستی کی جگہ لے لی۔ اسلام قبول کرنے سے قبل چرکس زرعی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔

روس میں خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد ہی یہ نوبت آئی کہ روسی حکومت چرکس سے آباد علاقوں میں قائم ہوئی۔ چرکس تین علاقائی وحدتوں میں تقسیم کیے گئے۔

۱۔ ادیغہ کا خود اختیار خطہ:۔ دریائے قوبان اور اس کے معاونوں کے طاس میں جو کہ سنور کے خطے سے متعلق ہیں۔ ۲۷ جولائی ۱۹۲۲ء کو اسے ادیغہ چرکس کے خود اختیار خطے کا نام دیا گیا۔ اس خطے کا رقبہ ۴۴۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ اس خطے کا دارالحکومت میکوپ ایک روسی شہر ہے

۲۔ قرہ چای چرکس کا خود اختیار خطہ:۔ زلن چک کلاں اور خرد کی مرتفع وادیوں کا علاقہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو معرض وجود میں آیا۔ اس کا رقبہ ۱۴۲۰۰ مربع کلومیٹر ہے

۳۔ قبارد بلکر خود اختیار سوویت اشتراکی جمہوریہ۔ وسطی قفقاز کے کوہستانی حصے میں ہے یکم ستمبر ۱۹۲۱ء میں اس کی تشکیل دی گئی۔ اور خود اختیار خطہ قبارد کا نام دیا گیا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو بلکر کے قومی شہری ضلع کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا رقبہ ۱۲۴۰۰ کلومیٹر ہے۔ دارالحکومت نلچک ہے۔

چرکس مختلف زمانوں میں۔

چرکس عہد ممالیک میں:۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے آخری عشروں سے لے کر مملوک سلطنت کے خاتمے تک ممالیک کے عسکری معاشرے میں چرکس ایک غالب عنصر تھے۔ وہ اس سلطنت کے ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں قیام ہی کے وقت سے بجزولی نمایاں تھے۔ وہ برجیہ کی فوجی جمعیت میں جس کی بنیاد سلطان قلاوون نے رکھی تھی۔ ایک بہت ہی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ قپچاق ترک جو ایک سو تیس سال تک حکمران رہے چرکسوں سے ان کی جاہ طلبی خودسری اور انتشار و فساد پھیلانے کے رجحان کے سبب سخت خوفزدہ رہتے تھے۔

سلطان برقوق نے جو بذات خود چرکس اور برجیہ سپاہ کا رکن تھا، چرکس مملوکوں کو روز افزوں تعداد میں باقاعدہ طریقے سے خرید کر اور اس کے ساتھ ہر دوسری قوموں کے مملوکوں کی خرید کو سختی سے کم کر کے اپنی قوم کو حتمی فتح دلائی۔ اسے بجا طور پر چرکس حکومت کا بانی کہا جاتا ہے بقول قلقشندی (جو ایک قدیم مصنف ہے) "ہمارے زمانے میں بیشتر امیر اور فوجی چرکس ہیں۔ مصر کے ترکی مملوک تعداد میں اتنے کم ہو گئے ہیں کہ ان کے صرف چند باقی ماندہ لوگ اور ان کے بچے رہ گئے ہیں۔"

مملوک ماخذ قپچاق ترکوں کے انحطاط کی بنا پر چرکسوں کے عروج کا ذمہ دار زیادہ تر ان عوامل کو ٹھہراتے ہیں جو خود مملوک سلطنت کے اندر موجود تھے۔ اگرچہ وہ عوامل بھی جو (مصر کے باہر) مملوکوں کے اصل وطنوں میں کارفرما تھے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ہو سکتا ہے کہ چرکسوں نے اس سلطنت کے زوال کا عمل تیز کر دیا ہو۔

بعد کے عہد مملوکی میں چرکس نسل کا غلبہ ابتدائی عہد کے قپچاق ترکوں کے غلبے سے زیادہ قوی اور ہمہ گیر تھا۔ قپچاق ترکوں کے برعکس چرکس دوسرے مملوک گروہوں کے سخت دشمن تھے جن کی سیاسی اہمیت کو انھوں نے ختم کر دیا۔ مملوکوں کی کوئی دوسری جماعت نسلی وحدت اور نسلی فوقیت کے جذبات سے ان سے زیادہ سرشار نہ تھی۔ ان کے عہد میں القوم کا اطلاق صرف چرکسوں پر ہوتا تھا جو ساری کی ساری مملوک اقوام میں سے چرکسی ہی ایک ایسی قوم تھی جسے یہ دعوے تھا کہ ان کا سلسلہ نسب عرب قبیلے بنو غسان سے ملتا ہے۔ یہ قبیلہ ہرقل کے شام سے پسپائی کے وقت جبلہ بن الایہم کے ساتھ بلاد الروم میں داخل ہوا تھا۔

چرکس عثمانی عہد میں:۔ عثمانی ترکوں نے بحر اسود کے ساحلوں کا اہل جنیوا کو ہٹا کر آناپہ اور کبہ پر ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں قبضہ کر لیا۔ لیکن اندرونی علاقوں میں چرکس قبائل بدستور کریمیا کے خانوں کے ماتحت رہے۔ جو اپنے بیٹوں کو چرکسوں کے ہاں تربیت دلانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ چنانچہ اس رسم اور سلاطین کریمیا کی چرکسی امیرزادیوں کے ساتھ شادیوں کی وجہ سے ان کے چرکسوں کے ساتھ تعلقات استوار ہو گئے۔ کریمیا کے خوانین اپنے آپ کو فرمانروائے "طائع آرا چرکس" یا چرکاچ کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔

چرکسوں کا ملک "دشت" سے آنے والے تاتاری نوغائی قبیلوں کی پناہ گاہ کا کام بھی دیتا تھا۔ جو ان سے گھل مل جانے کی غرض سے عموماً یہاں خصوصاً دریائے قوبان کے طاس اور جزیرہ نمائے تامان میں آ بستے تھے۔ تاتاری چرکسی تعلقات کی استواری کے نتیجے میں اسلام چرکسوں میں پھیل گیا لیکن بقول اولیا چلبی ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۵ء میں بھی بہت سے قبائل ہنوز غیر مسلم تھے۔

عثمانی سلاطین چرکسوں پر کریمیا کی بادشاہی تسلیم کرتے تھے۔ لیکن وہ چرکسی سرداروں کو اپنے متوسل بیگ سمجھ کر انھیں احکام بھیجتے اور خطابات دیتے رہتے تھے۔ ۹۰۸ھ/ [illegible] میں سلیم ثانی نے زار روس کو لکھا کہ وہ چرکسوں کے معاملے میں جو اس کی رعایا ہیں، کوئی مداخلت نہ کرے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل سے چرکستان کو روسی سلطنت کی روز افزوں توسیع کی وجہ سے سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ تو چرکس عثمانی ترکوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے لگے۔

[illegible]ھ/۱۷۳۵ء میں چرکسوں نے دریائے قوبان کے دوسرے کنارے پر روسی فوجوں کو پسپا کر دیا لیکن ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء کے عہد نامہ قینارجہ کی رو سے عثمانی ترکوں نے کریمیا کی خانی ریاست کی آزادی کو اس کے مقبوضات سمیت جو دریائے قوبان کے شمال میں تھے اور جنہیں ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء میں روس نے اپنے ساتھ ملحق کر لیا تھا تسلیم کر لیا۔ قبارطائی ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں پہلے ہی سے روسیوں کے تحت آ چکے تھے۔

فرح علی پاشا نے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء تا ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء جو غیر معمولی قابلیت کا ناظم تھا۔ عثمانی سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اس غرض سے کی کہ وہ چرکسوں سے ازدواجی رشتے قائم کریں جس سے عثمانی اثر و نفوذ بڑھے اور چرکسوں میں اشاعت اسلام کو تقویت حاصل ہو۔ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء کے ادرنہ کے صلح نامہ کی رو سے عثمانی ترکوں کو روس کے حق میں چرکستان پر اپنے حقوق سے دستبردار ہونا پڑا۔ پھر بھی چرکسوں نے حملہ آوروں کے خلاف ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء تک شدید جدوجہد جاری رکھی۔ اور عثمانی اطلاع کے مطابق ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء اور ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء کے درمیان ۵۹۵۰۰۰ چرکسی اپنے ملک سے ہجرت کر کے ترکی چلے گئے۔ انہیں اناطولی اور روم ایلی میں بسایا گیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے بعد تک چرکسی غلام عثمانی نظام "قول" میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور بہت سے چرکسی حکومت کے

Marfat.com

چشتی، ابو یوسف، خواجہ (۳۷۵ھ/۹۸۵ء – ۴۵۹ھ/۱۰۶۶ء) ایک صوفی بزرگ۔ آپ کا لقب ناصر الدین تھا۔ والد بزرگوار کا نام محمد سمعان تھا اور والدہ کا نام عصمت خاتون تھا۔ جو خواجہ ابو محمد کی ہمشیرہ تھیں اور بڑی نیک اور زاہدہ تھی۔ خواجہ ابو محمد کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے خواجہ ابو یوسف کی پرورش اور تربیت آپ نے کی اور اپنے بعد انہیں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔

خواجہ ابو یوسف علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہو کر تھوڑے ہی عرصہ میں علم و فضل اور معرفت و حقیقت کے بلند درجہ کو پہنچ گئے۔ علم کی تحصیل سے فراغت پا کر آپ نے حضرت خواجہ ابو محمد ہی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ خواجہ نے فرمایا اے فرزند سات بار میرا نام لے کر آسمان کی طرف دیکھو۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو تحت الثریٰ تک نظر آ گیا۔ حضرت خواجہ کی نظر فیض کے اثر سے آپ پر علوم ربانی منکشف ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو خرقہ خلافت عطا کر کے جانشین مقرر کیا۔ مرشد کی وفات کے بعد آپ نے رشد و ہدایت کا فرض سنبھالا اور بہت سے لوگوں کو مقصود حقیقی تک پہنچایا۔

آپ ہمیشہ فقر و فاقہ میں رہتے تھے۔ لباس پھٹا پرانا ہوتا تھا۔ ہمیشہ فقراء کے ساتھ رہتے اور انہیں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اگر کوئی اہل دنیا آپ کی مجلس میں آ جاتا، تو چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ اس لئے کہ اہل دنیا سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ آپ روتے تھے اور فرمایا کرتے تھے اے اللہ میں فقیر اور مسکین ہوں پچاس سال کی عمر میں ایک تہہ خانے میں جو خود تیار کرایا تھا گوشہ نشین ہو گئے اور بارہ سال تک ریاضت کرتے رہے۔ یہ عبادت گاہ اب بھی موجود ہے اور لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔

آپ کا مزار چشت میں ہے۔ قطب اقطاب مودود چشتی آپ ہی کے صاحبزادے تھے اور آپ ہی کے مرید و خلیفہ تھے۔

چشتی، خواجہ معین الدین حسن (۵۳۶ھ/۱۱۴۱ء – ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) نامور اولیاء میں سے ایک ہندوستان میں سلسلہ چشت کے بانی۔ سیستان کے قصبہ سنجر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ غیاث الدین حسن بہت دولت مند تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے عابد و زاہد تھے نسب کے لحاظ سے آپ نجیب الطرفین سید تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

"خواجہ معین الدین بن غیاث الدین بن سید کمال الدین بن سید احمد حسین بن سید طاہر بن سید عبدالعزیز بن سید ابراہیم بن امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی بن امام زین العابدین بن امام حسینؓ بن علیؓ۔"

بیس سال کی عمر میں ان کے والد سید غیاث الدین انتقال کر گئے۔ غز ترکوں کے ہاتھوں سیستان کی تاخت و تاراج کے بعد وہ احوال باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلک صوفیہ کی جانب بہت قوی رجحان پیدا ہو گیا۔

والد نے ترکے میں ایک باغ اور ایک چکی چھوڑی۔ چنانچہ آپ نے باغبانی کو ذریعہ معیشت بنایا۔ آپ سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ درختوں کو پانی دیتے، زمین ہموار کرتے۔ پودوں کی کانٹ چھانٹ عمل میں لاتے اور خود ہی پھلوں کو فروخت کرتے۔ ایک روز آپ اپنے باغ میں آرام فرما رہے تھے کہ ابراہیم قندوزی ایک مشہور بزرگ جو مجذوب بھی تھے باغ میں تشریف لائے۔ اور نظروں ہی نظروں میں خواجہ صاحب کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اب آپ احوال باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلک صوفیہ کی جانب بہت قوی رجحان پیدا ہو گیا۔ سارا مال و اسباب راہ خدا میں دے دیا اور خدا پر توکل کر کے تن تنہا نکل کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے سمرقند و بخارا پہنچے جو ان دنوں اسلامی علوم و فنون کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ وہاں کی درسگاہوں میں اس زمانے کے ممتاز علماء سے مذہبی علوم کی تحصیل کی۔ عراق جاتے ہوئے قصبہ ہارون سے گذر ہوا جو ضلع نیشاپور میں واقع ہے۔ یہاں پر خواجہ عثمان سے ملاقات ہوئی اور ان کے مریدوں کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ تعلیم و تربیت کی غرض سے بیس سال تک اپنے مرشد کے ہمراہ سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اس کے بعد خود سیاحت کے لئے نکلے۔ دوران سفر مشاہیر مشائخ و علماء سے ملاقات کی۔ ان بزرگوں میں شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ نجیب الدین، عبدالقاہر سہروردی، شیخ ابو سعید تبریزی، شیخ عبدالواحد غزنوی جیسی مشہور و معروف شخصیات تھیں۔ آپ نے مملکتِ اسلامیہ کے تقریباً تمام بڑے مرکزوں کی جو اس عہد میں موجود تھے۔ سیاحت کی اور وہاں کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے تقریباً تمام رجحانات سے واقفیت حاصل کی۔ اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ کچھ عرصہ لاہور میں رہے اور کچھ وقت حضرت علی ہجویری کے مزار پر مراقبے میں صرف کیا۔ یہاں سے اجمیر پہنچے۔ آپ نے اجمیر ہی میں شادی کی۔ بقول عبدالحق دہلوی آپ نے دو شادیاں کیں ان میں سے ایک زوجہ ہندو راجہ کی لڑکی تھی۔ آپ نے اجمیر میں وفات پائی۔ اور یہیں پر آپ کا مزار ہے۔ جس کا ہندو مسلم دونوں احترام کرتے ہیں۔ عرس کے موقع پر پاک و ہند سے لاکھوں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ آپ کی اولاد میں تین لڑکے ابو سعید فخر الدین ابوالخیر ضیاء الدین، شیخ حسام اور ایک بیٹی بی بی جمال تھیں۔

آپ کی درگاہ کے احاطے میں بہت سی عمارتیں شامل ہیں۔ دروازے، مسجدیں، مسافر خانے، لنگر وغیرہ مالوے کے فرمانرواؤں، مغل شہنشاہوں، رئیسوں، سوداگروں اور صوفیوں نے گذشتہ صدیوں میں وہاں پر تعمیر کرائے۔

محمد بن تغلق جو دہلی کا پہلا فرمانروا تھا جس نے خواجہ صاحب کے مزار پر حاضری دی۔ مالوے کے خلجی سلاطین نے اسی ولی اللہ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ان کا مزار ملک کی سب سے بڑی زیارت گاہ کے طور پر شہرت پا چکا تھا۔

خواجہ صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے جو کام انجام دیا وہ معمولی نوعیت کا نہیں اور نہ ہی کسی معمولی انسان کا کام ہے۔

آپ ہی نے ہندوستان میں سلسلہ چشت کی بنیاد رکھی۔ آپ دو مرتبہ دہلی آئے۔ لیکن آپ نے سیاسی قوت کے اس مرکز سے اپنے آپ کو دور ہی رکھا اور خاموشی سے اس ملک میں ایک فکری انقلاب کی بنیاد رکھی۔

آپ کی تصانیف کے ضمن میں کئی ایک کتابوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن ایک کتاب کے بارے میں تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ "انیس الارواح" آپ ہی کی تصنیف ہے۔ دوسری کتابوں کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

آپ کے خلفاء میں خواجہ برہان الدین، شیخ حمید الدین ناگوری، بی بی حافظ

Marfat.com

جمال، شیخ وجیہہ الدین، سلطان مسعود غازی، شیخ وحید الدین خراسانی وغیرہ ہیں
آپ کے بعض ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بڑے صاحب دل، وسیع المشرب اور نہایت دردمند انسان تھے۔ آپ عمیق جذبۂ انسانیت کے علمبردار تھے۔ آپ کے نزدیک مذہب کے معنی خدمت خلق کے تھے۔ اپنے مریدین کو تعلیم دیتے تھے کہ وہ اپنے اندر دریا کی سی فیاضی، سورج جیسی گرم جوشی، زمین جیسی مہمان نوازی پیدا کریں۔"

تصوف کے چار بڑے سلسلوں میں سے ایک۔

چشتیہ اس سلسلے کے نام کی نسبت چشت سے ہے جو ہرات کے قریب ایک گاؤں (چشت) ہے۔ جہاں پر اس سلسلے کے حقیقی بانی خواجہ ابواسحاق شامی اپنے مرشد خواجہ ممشاد علو دینوری کے حکم کے مطابق آکر آباد ہوئے۔ اس سلسلے کا شجرہ اس طرح ہے۔

ابواسحاق ممشاد علو دینوری، امین الدین ابی ھبیرہ البصری، سدید الدین حذیفۃ المرعشی، ابراہیم ادھم بلخی، ابوالفیض فضیل بن عیاض، ابوالفضل عبدالواحد بن زید، حسن البصری، علی ابن ابی طالب، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

خواجہ معین الدین چشتی اس سلسلے کو چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں لائے۔ اور اجمیر میں چشتی صوفیہ کا مرکز قائم کیا۔ یہاں سے یہ سلسلہ ہندوستان کے اطراف واکناف میں پھیلا۔

خواجہ معین الدین اس سلسلے کے بانی تک مندرجہ ذیل روحانی پیشواؤں کے سلسلے سے پہنچتے ہیں۔

معین الدین حسن، عثمان ہارونی، حاجی شریف زندانی، مودود چشتی، ابی یوسف ابی محمد، ابن احمد، ابی احمد بن ذسعفد، ابواسحاق شامی۔

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کی سرگرمیوں کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ مشائخ کا دور جو تقریباً ۵۹۷ھ / ۱۲۰۰ء سے ۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء تک ہے۔

۲۔ صوبائی خانقاہیں۔ آٹھویں صدی ہجری / چودہویں صدی عیسوی سے نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی تک ہے۔

۳۔ سلسلہ صابریہ کا عروج۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی سے آگے تک۔

۴۔ سلسلہ نظامیہ کا احیاء۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی سے آگے تک۔

پہلے دور کے صوفیا نے اپنی خانقاہیں زیادہ تر راجپوتانہ، یوپی اور پنجاب میں قائم کیں۔ اس عہد میں یہ سلسلہ ایک بہت ہی زیادہ مربوط مرکزی نظام پر قائم تھا۔ محمد بن تغلق نے جب صوفیا کو ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہونے پر مجبور کیا تو اس کی اس حکمت عملی نے چشتیوں کے مرکزی نظام کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اور اس سلسلہ چشتیہ کی مرکزی تنظیم کا شیرازہ بکھر گیا اور صوبائی خانقاہیں جو کسی مرکزی نظام کے تحت نہ ہوتی تھیں معرض وجود میں آگئیں۔

اس دوسرے دور میں پہلے صوفیا کی روایات ترک کر دی گئیں۔ اور یہ آسان نظریہ اپنا لیا گیا کہ صوفیاء کو بادشاہوں اور اعلیٰ منصب داروں کا ہم نشین ہونا چاہیے۔ تاکہ ان پر اچھا اثر ڈال سکیں۔ جب کہ پہلے دور کے صوفیاء بادشاہوں سے دور رہتے تھے۔

اس دور میں شیخ سراج الدین المعروف بہ اخی سراج نے بنگال میں اس سلسلے کی بنیاد رکھی۔ جب کہ شیخ برہان الدین غریب نے اس سلسلے کو دکن میں روشناس کرایا۔ گجرات میں اس سلسلے کی نیو ڈالنے والے خواجہ قطب الدین کے دو مرید شیخ محمود اور شیخ حمید الدین ہیں۔ مالوہ میں شیخ نظام الدین اولیا کے مریدین شیخ وجیہ الدین یوسف شیخ کمال الدین اور مولانا مغیث الدین نے اس سلسلے کو منظم کیا۔

اس سلسلے کی صابریہ شاخ کے بانی کے متعلق بہت کم معلومات ہیں۔ اس شاخ کے اہم مراکز کلیر، پانی پت، ردولی، گنگوہ، تھانیسر، جھنجھانہ، الٰہ آباد، امروہہ، دیوبند، تھانہ بھون اور نانوتہ تھے۔ شیخ عبدالقدوس اس شاخ کے مشہور و معروف

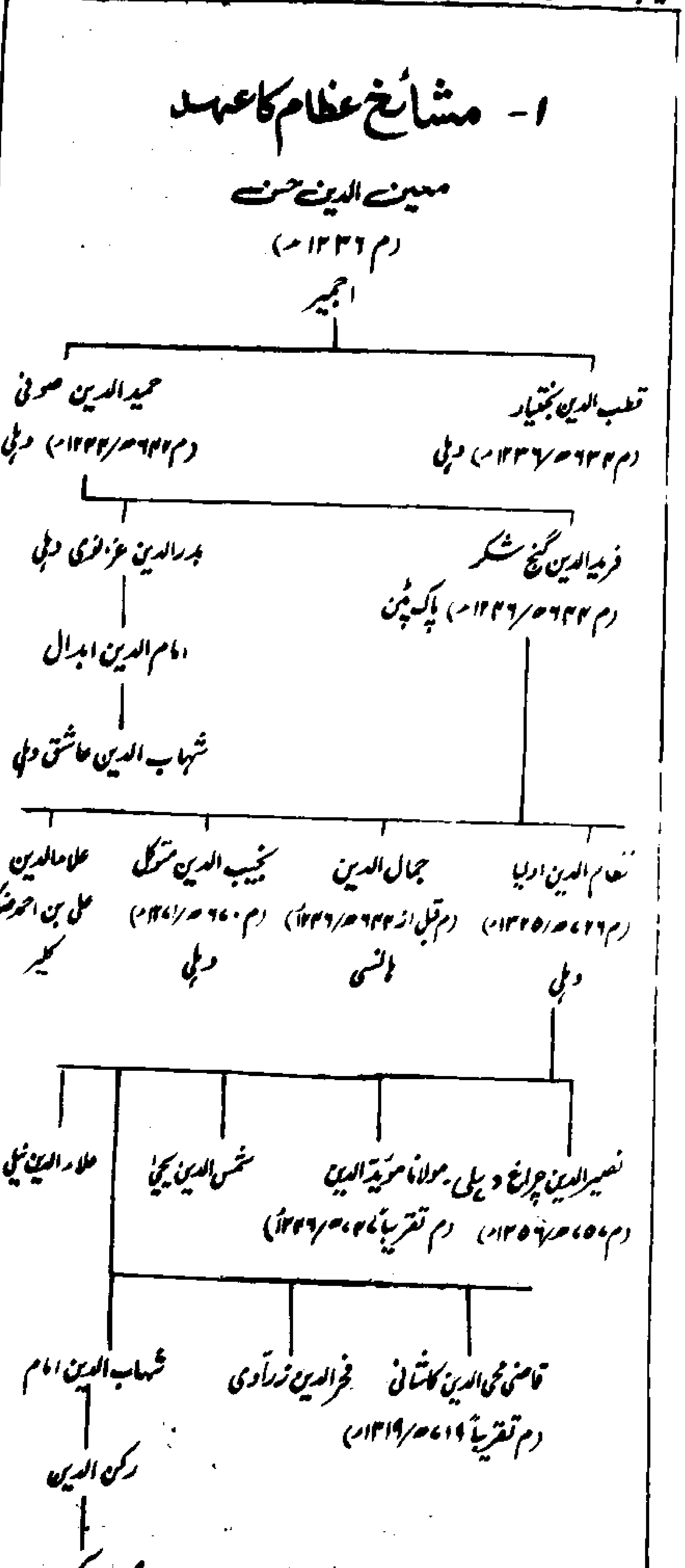

Marfat.com

چشتیہ عظمیٰ کی نظامیہ شاخ کا احیاء شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی نے کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی تصوف کے لیے وقف کر دی اور سلسلہ چشتیہ کو جو تقریباً مردہ ہو چکا تھا، نئے سرے سے زندہ کیا۔

ملفوظات :۔ قدیم چشتی صوفیائے ہند شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب "عوارف المعارف" کو سب سے اہم تصنیف سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے کا بنیادی تصور "وحدت الوجود" تھا۔ ذاتی جائداد پر قبضہ رکھنے کو چشتیہ توکل علی اللہ کے منافی سمجھتے ہوئے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ تمام دنیاوی ساز و سامان اور مادی شہوات کو ترک کرتے تھے۔ امن و صلح اور عدم تشدد پر اعتقاد رکھتے تھے اور انتقام اور بدلہ کو حیوانی دنیا کا طریقہ خیال کرتے تھے۔ حکومت سے راہ و رسم رکھنے کی کسی صورت میں بھی اجازت نہ تھی۔ ان کے نزدیک صوفیانہ زندگی کو غایت فقط اللہ تعالیٰ کے لیے جینا ہے۔ صوفی کو نہ تو جنت کی تمنا کرنی چاہیے اور نہ دوزخ سے ڈرنا چاہیے۔ چشتی صوفیانہ ریاضت کی ابتدا کرنے کے لیے رسمی طور پر اسلام قبول کرنے کا مطالبہ ضروری شرط کے طور پر نہیں کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ رسمی طور پر اسلام قبول کرنے سے پہلے جذباتی زندگی میں انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ صوبائی خانقاہوں کا دور

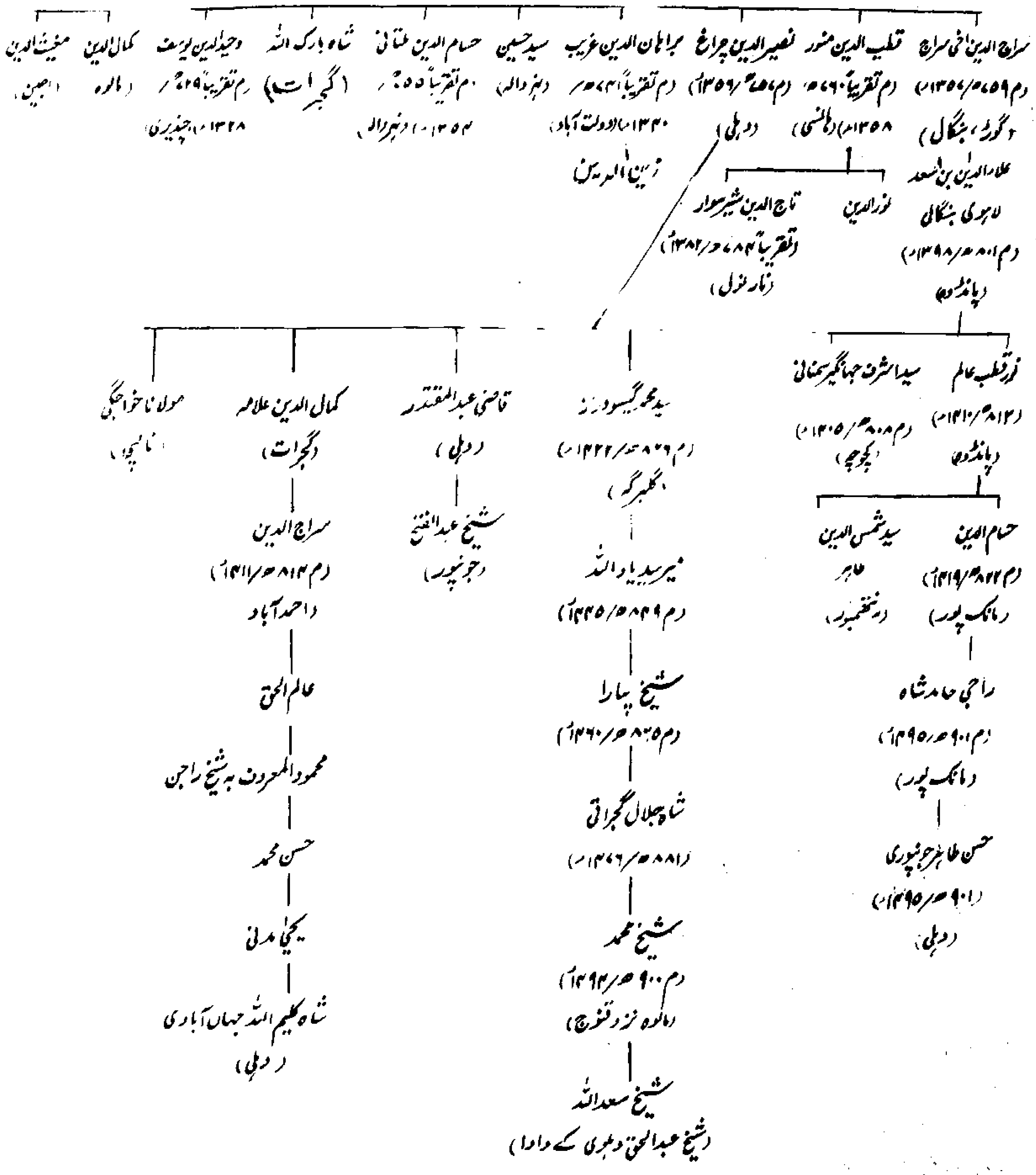

Marfat.com

۳۔ سلسلۂ صابریہ کا عروج

شیخ علاء الدین علی بن احمد صابر
(م ۶۹۱ھ/۱۲۹۱ء) (کلیر)

شمس الدین ترک (پانی پت)

جلال الدین محمود (پانی پت)

احمد عبدالحق
(م ۸۳۶ھ/۱۴۳۳ء) (ردولی)

شیخ عارف (ردولی)

شیخ محمد

شیخ بدھ

شیخ منصور — شیخ عالم

شیخ پیر — قطب الدین — شیخ حامد
(م ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء)

عبدالرحمان
(مصنف مرآۃ الاسرار)

عبدالقدوس
(م ۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء) (گنگوہ)

عبدالاحد
(والد شیخ احمد سرہندی)

جلال الدین فاروقی
(تھانیسر)
(م ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء)

نظام الدین فاروقی (بلخ)
(م تقریباً ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء)

ابو سعید (گنگوہ)

محب اللہ صدر پوری
(م ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء) (الٰہ آباد)

شاہ محمدی فیاض
(م ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء) (آگرہ)

شاہ عضد الدین
(م ۱۱۶۲ھ/۱۷۵۸ء)

شاہ عبدالہادی
(م ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) امروہہ

شاہ عبدالباری
(م ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء)

سید عبدالرحیم فاطمی
(م ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء) (بالاکوٹ)

میاں جی نور محمد
(م ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) (جھنجھانہ)

محمد صادق

محمد داؤد

شیخ سوندھا
(م ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء)

محمد اکرام
(مصنف اقتباس الانوار)

شاہ ابو المعالی
(م ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء)

محمد سعید

سید محمد سالم
(م ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء)

سید محمد اعظم
(م ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء)

حافظ موسیٰ مانک پوری
(م ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء)

سید امانت علی (م ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء)

حافظ محمد حسین (مصنف انوار العارفین)

حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء)

محمد قاسم نانوتوی
(بانی مدرسہ دیوبند)
(م ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء)

اشرف علی تھانوی
سید سلیمان ندوی
(م ۱۹۵۳ء) کراچی

رشید احمد
(م ۱۹۰۵ء)
(گنگوہ)

احمد حسن محدث
(م ۱۹۱۱ء) (امروہہ)

محمود حسن شیخ الہند
(م ۱۹۲۰ء) (دیوبند)

حسین احمد مدنی
(م ۱۹۵۷ء) دیوبند

خلیل احمد انبیٹھوی
(م ۱۹۲۷ء) (مدینہ منورہ)

عبدالرحمٰن محدث
(امروہہ)

محمد الیاس کاندھلوی (م ۱۹۴۴ء) (دہلی)

۴۔ سلسلۂ نظامیہ کا احیاء

شاہ کلیم اللہ جہان آبادی
(م ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء) (دہلی)

شاہ نظام الدین
(م ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء) (اورنگ آباد)

شاہ فخر الدین
(م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) (دہلی)

نور محمد
(م ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء)
(مہاران در بہاولپور)

محمد عاقل
(م ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء)
(چاچڑاں، پنجاب)

گل احمد پوری
(م ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء)
(مصنف تکملۂ سیر الاولیاء)

حافظ جمال
(م ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء)
(ملتان)

خدا بخش
(ملتان)

شاہ محمد سلیمان
(م ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء)
(تونسہ، نزد ڈیرہ غازی خان)

اللہ بخش
(م ۱۹۰۱ء)

حافظ موسیٰ
(م ۱۹۰۶ء) (تونسہ)

شمس الدین
(م ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء)
(سیال، پنجاب)

مہر علی شاہ
(گولڑہ، پنجاب)
(نیز دیکھیے "تصوف")

غلام حیدر علی شاہ
(م ۱۹۰۸ء) (جلال پور، پنجاب)

محمد علی
(م ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء)
(خیر آباد، یوپی)

حاجی نجم الدین
(م ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء)
(فتحپور، نزد جھنجھنو، راجپوتانہ)

حکیم محمد حسن
(م ۱۹۰۴ء) (امروہہ)

شاہ نیاز احمد
(م ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) (دہلی)

سید نظام الدین (بریلی)

شاہ محی الدین (بریلی)

چغتائی خان چغتائی سلطنت کا بانی۔ چنگیز خان اور اس کی دوسری بیگم بورتہ فوجین کا دوسرا بیٹا۔ اپنے بھائیوں کی طرح اس نے چین کے خلاف باپ کی مہموں میں حصہ لیا۔ تینوں شہزادوں جوجی، چغتائی اور اوکتائی نے خوارزم شاہ کی سلطنت اورگانج کا محاصرہ کرلیا۔ اور اسے صفر ۶۱۸ھ/۲۴ اپریل ۱۲۲۱ء میں فتح کرلیا۔ اسی سال چغتائی کا سب سے بڑا لڑکا موآتوکان، بامیان کے سامنے قتل ہوا۔ دریائے سندھ کی لڑائی کے بعد غالباً، شوال ۶۱۸ھ/۲۴ نومبر ۱۲۲۱ء چغتائی کو جلال الدین خوارزم شاہ کے خلاف جنگ کا انتظام سونپا گیا۔ اس نے اس سال موسم سرما ہندوستان میں گذارا۔ تنگت پر چنگیز خان کی آخری مہم کے دوران میں وہ منگولیا میں ان افواج کا امیر لشکر رہا۔ جو وہاں پیچھے چھوڑ دی گئی تھیں۔

چنگیز خان کے انتقال کے بعد چغتائی نے پھر کسی بھی مہم میں عملاً حصہ نہیں لیا۔ اس کی چنگیز خان کا سب سے بڑا زندہ بیٹا ہونے کی وجہ سے بہت عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ اس کو مشرق میں اویغور کے علاقے سے لے کر مغرب میں بخارا و سمرقند تک سارا ملک اپنے باپ سے ملا تھا۔

چغتائی اسلام کی طرف میلان نہیں رکھتا تھا۔ مغول قانون کی جن خلاف ورزیوں کی وہ سخت سزا دیتا تھا، ان میں بعض اسلامی احکام بھی تھے۔ ان ظالمانہ سزاؤں کی وجہ سے جو وہ ایسی خلاف ورزیوں پر صادر کرتا تھا مسلمانوں کو اس کے نام سے نفرت ہوگئی تھی۔

جوینی کے قول کے مطابق، چغتائی اپنے بھائی اوکتائی کے کچھ عرصہ بعد تک زندہ رہا۔

چغتائی خانیہ وسطی ایشیا کی ایک ریاست جسے چغتائی نے اپنے نام سے موسوم کیا۔ اگرچہ یہ اس مغول شہزادے کی وفات کے بعد قائم ہوئی۔ چغتائی کے بعد اس کا پوتا قرا ہولاکو اس کا جانشین بنا۔ اس کو چنگیز خان اور اوکتائی نے چغتائی کا وارث نامزد کیا تھا۔ ۱۲۴۱ء خان اعظم گویوک نے اسے چغتائی کے پانچویں بیٹے کے حق میں تخت سے معزول کردیا۔ لیکن ۱۲۵۱ء میں گویوک دوبارہ قرا ہولاکو کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ وطن واپس آتے ہوئے راستے ہی میں انتقال کرگیا اس کے بعد اس کی بیوی اس کی جگہ حکومت کرنے لگی۔ جس کا حلقۂ اقتدار وادی ایلی سے آگے پھیلا ہوا دکھائی نہ دیتا۔

۱۲۵۹ء میں خان اعظم مونگکا کے انتقال کے ساتھ ہی معاملات نے ایک بالکل ہی مختلف صورت اختیار کرلی۔ جب خان کے بھائیوں قوبیلائی اور اریغ بوکا میں غلبہ حاصل کرنے کی کشمکش ہوئی تو الغو جو چغتائی کا ایک پوتا تھا اریغ بوکا کے لیے وسطی ایشیا پر قبضہ رکھنے اور اس کے دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کرنے پر رضامند ہوگیا۔ وہ سارے وسطی ایشیا پر بشمول خوارزم اپنے زیر نگیں کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے پہلے یہ تمام علاقہ کبھی خانوادہ چغتائی کے تسلط میں نہیں آیا تھا۔

الغو کو وسط ایشیا کی ایک آزاد مغول ریاست کا بانی شمار کیا جا سکتا ہے تھوڑے ہی عرصے بعد ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ - ۱۲۶۶ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مبارک شاہ نے ۶۶۴ھ/مارچ ۱۲۶۶ء میں جو قرا ہولاکو اور شہزادی اور قینہ کا بیٹا تھا اور جس نے اس خانوادے میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اگرچہ تھوڑے ہی دن بعد اس کے چچا زاد بھائی براق خان نے اسے تخت سے اتار دیا۔ ۱۲۷۱ء میں جب براق کا انتقال ہوگیا تو قیدو نے چغتائی کے پوتے نیک پائی کو اس کا جانشین بنا دیا۔ نیک پائی کا جانشین چغتائی کا ایک اور پوتا بوقا تیمور بنا۔ قیدو نے ۱۲۸۲ء میں براق کے بیٹے دوا کو منتخب کرلیا۔ خان اعظم کے خلاف قیدو کی تمام جنگوں میں دوا اس کا حلیف اور وفادار رہا۔ اس نے ۱۳۰۶ھ میں اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے اپنے بیٹے چپر کو شکست دی اور اسے معزول کردیا۔ اس وقت سے چغتائی حکومت دوا ہی کے خاندان میں رہی اور دوا کے چھ بیٹے یکے بعد دیگرے حکمرانی کرتے رہے۔

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیو مونگکا کی مختصر سی حکومت بھی ان لوگوں سے اچھا سلوک کرتی تھی۔ جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

چغتائی کی ملکہ اور قینہ اپنے شوہر کے برعکس مسلمانوں پر بہت زیادہ مہربان تھی بقول وصاف وہ مسلمانوں کی محافظ و مددگار تھی۔ جمال قرشی کے بقول تو اس نے اسلام بھی قبول کرلیا تھا۔ اس کے بیٹے مبارک شاہ نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ ور مبارک شاہ کا حریف براق خان بھی کچھ عرصے بعد مسلمان ہوگیا تھا۔ الغو کی حکومت مسلمانوں سے کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ قیدو، چپر اور دوا نیز دوسرے مغول بادشاہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ اور ان کی سکونت مشرقی صوبوں میں رہی۔ ایسن بوکا کے عہد حکومت میں خان اعظم کی فوجیں مشرقی وسطی ایشیا میں دور تک اندر گھس گئیں اور انہوں نے بوکا کی سرمائی اور گرمائی اقامت گاہوں کو تہس نہس کردیا۔

کبک جو ایسن بوکا کا جانشین تھا اگرچہ مسلمان تو نہیں ہوا تھا لیکن مسلمان اسے عادل سلطان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس نے کئی شہر بسائے۔ اس نے نقرئی سکے بھی چلائے جو بعد میں بکی سکوں کے نام سے موسوم ہوئے۔ یہ سکے چغتائی مملکت کا پہلا سکہ تھا۔ اس نے کئی شہر بھی بسائے نیز اس نے نخشب کے نواح میں اپنے لیے ایک محل بنوایا۔ کبک کے کچھ عرصہ بعد اس کا بھائی ترماشیرین تخت پر بیٹھا۔ اس نے اسلام قبول کیا۔ اور اپنا نام علاء الدین رکھا اس نے مشرقی صوبوں کی طرف تغافل برتا۔ کچھ عرصے بعد اس کے بھتیجے بزن نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔ لیکن اس نے بھی چند ماہ ہی حکومت کی کہ ترماشیرین کا ایک اور بھتیجا جنگشی اس سے تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دور میں چغتائی سلطنت کا مرکز پھر کچھ عرصے کے لیے وادی ایلی میں منتقل ہوگیا۔ اور عیسائی کسی مداخلت کے بغیر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے۔ بعد میں خان قازان جو اوپری نسل سے تھا۔ اور موآتوکان کا دوسرا بیٹا تھا۔ حکمران ہوا اس نے ترک امرا کے خلاف جدوجہد کے دوران میں ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء، ۱۳۴۷ء میں ایک لڑائی میں انتقال کیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی ماوراءالنہر میں اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اگرچہ ترک امیر، ۱۳۷۰ء تک چغتائی کی اولاد کو برائے نام حکمرانوں کے طور پر تخت پر بٹھاتے رہے

چغری بیگ (غالباً ۳۸۰ھ - ۳۸۵ھ/۹۹۰ء - ۹۹۵ء - ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء) داؤد بن میخائل بن سلجوق طغرل بیگ کا بھائی اور خاندان سلجوق کی بنیاد رکھنے میں طغرل بیگ کا شریک۔

اس کے خاندان کے بارے میں اس بارے میں کوئی واضح شہادت نہیں ملتی کہ ان کا خاندان پہلے ہی مسلمان ہوگیا تھا یا بعد میں مسلمان ہوا۔

ان دونوں بھائیوں کے ابتدائی حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ابھی یہ دونوں بھائی چھوٹی عمر ہی میں تھے ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی پرورش ان کے دادا سلجوق نے خطہ جند میں کی۔ اس دوران میں ان کے چچا ارسلان اسرائیل سابائیو کی ملازمت میں تھا۔ اور جنگی مہمات میں خدمات انجام دیتا تھا۔ دادا کی وفات کے بعد انہیں بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر انہیں اپنے قبیلے کے ایک حصے کے ساتھ اس علاقے

Marfat.com

میں منتقل ہونا پڑا۔ جو ایک قرہ خان کی ملکیت تھا یہ حاکم کچھ عرصہ تک بغرا خان کے لقب سے معروف رہا۔ بعد میں ان دونوں بھائیوں کا اس سے جھگڑا ہو گیا تو یہ دونوں اپنے چچا سے جا ملے جو اس وقت بغرا کے حریف اور بخارا کے قرہ خانی حاکم علی تگین کی ملازمت اختیار کیے ہوئے تھا۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی بھی علی تگین ہی کی ملازمت میں آ گئے۔ بعد میں جب ان کی قبیلہ کی سرداری کے سوال پر اس سے ناچاقی ہو گئی تو یہ دونوں بھائی خوارزم میں منتقل ہو گئے۔ قوم اغز کا امیر شاہ ملک جوان کے خاندان کا دیرینہ دشمن تھا اور اس وقت رفتہ رفتہ جند کا مالک بن بیٹھا تھا، کی دھمکیوں نے انہیں ایک بار پھر ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ یہاں سے نقل مکانی کر کے انہوں نے خطہ غزنہ میں محمود غزنوی کے جانشین مسعود سے زبردستی اپنی سکونت کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ انہیں مغربی خراسان میں شمال کے سرحدی میدانوں میں انہیں سرکاری مراعات حاصل ہو گئیں لیکن وہ اپنے آپ کو نیک سیرت مہمان ثابت نہ کر سکے۔ ۴۲۸ھ/۱۰۳۶ء میں اہل مرو نے چغری بیگ کے لیے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اور اس نے وہاں ایک خود مختار امیر کی حیثیت سے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس کے بھائی طغرل نے نیشاپور میں بالکل یہی رویہ اختیار کیا۔ مرو سے چغری نے ہرات کا رخ کیا اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنی برادری والوں کو خطہ سیستان کی طرف بھیجا۔ ۴۳۱ھ/۱۰۴۰ء میں سلجوقی لشکر نے مسعود کو دندانقان پر ایسی شکست دی کہ اس کے بعد وہ سنبھل نہ سکا۔ بعد میں ان فاتحین نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ طغرل نے ایک طرف ایران میں نئی فتوحات کے لیے قسمت آزمائی شروع کی لیکن چغری نے نوخیز سلجوقی قوت کا مرکز خراسان ہی میں قائم رکھا۔ چغری نے ایک طرف بلخ اور پھر ترمذ کو اور دوسری طرف خوارزم کو اپنی سلطنت میں ملحق کر کے خراسان کی تسخیر مکمل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی چغری کے ایک بیٹے قاورت نے ایک حد تک خود مختار حاکم کی حیثیت سے کرمان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد سے چغری کی افواج کا سب سے بڑا عسکری کام غزنویوں کے خلاف ایک دشوار جدوجہد رہ گیا۔ جنہوں نے اپنے ایک کوہستانی حصار میں اور ان وسائل سے قوی ہو کر جو انہیں وادی سندھ کے صوبوں سے دستیاب ہوئے پھر جنگ چھیڑ دی اور گاہے گاہے انہیں کامیابی بھی ہوتی رہی۔ سلجوقی غزنوین کے اندرونی جھگڑوں میں مداخلت کرتے رہے۔ سلطان مودود نے چغری کی ایک لڑکی سے شادی بھی کی تھی مگر مودود کے ایک جانشین کے خلاف سلجوقیوں نے غاصب فرخ زاد کو شہ دی لیکن جلد ہی ان کی اس سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ بلخ اور سیستان کے ضلعوں میں برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چغری اب بوڑھا ہو چکا تھا اور جنگ کی باگ ڈور فی الحقیقت اس کے بیٹے الپ ارسلان کے ہاتھوں میں آ گئی۔

۴۵۱ھ/۱۰۶۰ء میں چغری اور سلطان ابراہیم غزنوی نے صلح کر لی۔ اگلے ہی سال چغری کا انتقال ہو گیا۔

چغری اور طغرل دونوں بھائیوں کے تعلقات کے درست رہنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ طغرل کے کوئی اولاد نہ تھی یہی وجہ ہے کہ جب ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء اور ۱۰۵۹ء میں ابراہیم اینال کی بغاوت سے طغرل کی سلطنت کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا تو اس وقت طغرل ایک حد تک اپنی سلامتی کے لیے اس مدد کا مرہون منت ہوا۔ جو اسے الپ ارسلان اور یاقوتی نے بہم پہنچائی۔

چغری نے خوارزم کی ایک شہزادی سے شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا الپ ارسلان اپنے باپ اور چچا دونوں کا وارث بنا۔

چغل خوری:۔ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔ (دیکھیے "غیبت")

چقمق الملک الظاہر سیف الدین۔ مصر کا سلطان جوانی میں سلطان برقوق کا مملوک تھا آہستہ آہستہ ترقی کر کے سلطان برسبائی کے تحت صدر "صاحب"، میر آخور اور آخر میں اتابک (سپہ سالار اعلیٰ) بن گیا۔

۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں جب سلطان برسبائی بستر مرگ پر تھا تو اس نے چقمق کو اپنے شیر خوار بچے الملک العزیز یوسف کا نائب السلطنت مقرر کیا۔ مملوکوں کے کئی لشکر جو ابتداً سلطان برقوق، ناصر فرج، مؤید شیخ اور برسبائی کی فوج رکاب کے طور پر بنائے گئے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھتے تھے۔ نیز ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ جس قدر ممکن ہو دولت اور اثر و رسوخ حاصل کر لیں۔ اس حالت سے جو انتشار پھیلا اس انتشار میں چقمق کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا جو یہ تھا کہ وہ خود فوج پر قبضہ کرے۔ چنانچہ سلطان یوسف کو معزول کر کے ایک حصار میں قید کر دیا گیا۔ بعد میں اسے اسکندریہ میں حراست میں رکھا گیا۔ چنانچہ ان اقدامات سے دمشق اور حلب کے والیوں کی مزاحمت بھی ختم ہو گئی۔ شامی باغیوں نے بھی شکست کھائی۔ ان کے قائدین کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ آخر کار ۸۴۲ھ/۱۴۳۹ء میں چقمق کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا۔ وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح عیسائیوں کے حملوں کو روکنے اور ان بحری قزاقی کے انسداد کے لئے شمالی ساحل کی مدافعت اور استحکام کا خواہشمند تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے قبرص کے راستے رودس کو جہاز بھیجے لیکن مصریوں کو ناکام واپس آنا پڑا۔ ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء اور ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء میں مصریوں نے پھر رودس کو فتح کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔

چقمق کی خارجہ حکمت عملی کامیاب تھی۔ اس کے تمام مسلمان حکمرانوں سے خوشگوار تعلقات تھے۔ اس کے عثمانی سلطان اور ترک ایشیائے کوچک کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات رکھے۔ چقمق اپنی داخلی حکمت عملی میں مصر میں سرکاری اجارہ داریوں کی بدنظمی کے سدباب میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ بذات خود کفایت شعار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ علماء کا قدردان تھا۔ ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء میں چقمق نے اپنے بیٹے عثمان کے ہاتھ پر لوگوں سے بیعت لی۔ اور اسی اثناء میں وفات پائی۔

اس کی رعایا کو اس کی وفات کا بہت زیادہ رنج ہوا۔ ارکان دربار اور لوگوں کے ہجوم کثیر نے اس کے جنازے میں شرکت کی۔

چکڑالوی، عبداللہ منکرین حدیث کا بانی۔ غلام نبی المعروف عبداللہ چکڑالوی۔ موضع چکڑالہ ضلع کیمبلپور کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں علم حدیث کی تکمیل کی۔ اور فارغ ہو جانے کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور اعتقادی کشمکش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انگریز کے پھیلائے ہوئے فکری اور نظریاتی فرقے آزادی سے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عبداللہ چکڑالوی نے بھی اس شہر کی فضا کو اپنے مشن کے موافق پاکر عوام الناس کو معمولی کوتاہیوں پر کافر قرار دینا شروع کر دیا۔ جس سے ان کے خلاف مخالفت کی زبانیں دراز ہونے لگیں۔ لاہور میں مسجد چینیاں میں جب مولوی رحیم بخش نے وفات پائی تو ان کے بعد اس کی امامت انہیں مل گئی۔ کچھ عرصہ درس حدیث دیتے رہے۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی اپنے درس میں صحیح بخاری کے لئے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ الباری کی دلیل دے کر بخاری شریف کے علاوہ حدیث کی دوسری تمام کتابوں کو مشکوک قرار دے دیا۔ ایک عرصے تک بخاری شریف کا درس جاری رکھا مگر طبعی اضطراب نے بخاری اور قرآن کا توازن شروع کر دیا۔ بعض احادیث خلاف آیات اللہ قرار دے کر اعلان کر دیا کہ جب قرآن ایک مکمل ہدایت ہے تو

حدیث کی کیا ضرورت ہے۔ چینیاں والی مسجد کے مقتدی کچھ عرصے تک تو برداشت کرتے رہے۔ پھر ایک روز مسجد سے نکال دیا۔ اسی عرصے میں ایک تفسیر بھی لکھی۔ جب مسجد سے نکال دیا گیا تو ان کا ایک متشدد مقتدی محمد بخش عرف چٹو بٹولی آپ کو سر بازار اپنے مکان میں لے گئے جہاں ایک احاطے میں اپنی مسجد بنا کر "اہل قرآن" کے مسائل کی تشہیر شروع کر دی۔ کچھ عرصے بعد چٹو بٹولی بھی چکڑالوی کا ساتھ چھوڑ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ملتان میں ایک نواب صاحب کے ہاں رہنا شروع کر دیا۔ ایک موقع پر لوگوں نے کسی خاص واقعہ پر عبداللہ چکڑالوی کو سنگسار کر دیا اور وہ نیم مردہ اپنے آبائی وطن چکڑالے چلے گئے۔ جہاں ایک طویل عرصے کے بعد انتقال کیا۔

"اہل قرآن" نے مختلف عنوانات سے صوبے بھر میں اپنے مراکز قائم کئے گوجرانوالہ میں اچھی خاصی تعداد اہل قرآن بن گئی۔ گجرات میں "دتے شاہی" فرقہ صرف تین نمازیں ادا کرتا اور دو نمازوں کو حدیثی نمازیں کہہ کر چھوڑ دیتا۔ امرتسر میں بھی ایک جماعت اہل قرآن کے مسلک اور عقائد کی اشاعت کرتی رہی۔ موجودہ دور میں غلام احمد پرویز اس مکتب فکر کے ترجمان ہیں۔

چلبی زادہ (غالباً ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء۔ ۲۸ جمادی الآخرہ ۱۱۷۳ھ/۱۶ فروری ۱۷۶۰ء) اسماعیل عاصم افندی۔ اٹھارویں صدی کا ایک عثمانی مورخ، شاعر اور شیخ الاسلام استنبول میں پیدا ہوا۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ بقول سالم افندی اسے ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں اسے فیض اللہ افندی نے ملازم کا درجہ دیا تھا۔ اس کی معلمانہ زندگی کا آغاز جو تمام کی تمام استنبول میں بسر ہوئی ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں کنعان پاشا کے مدرسے سے ہوا۔ جہاں سے وہ ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء میں قزداریہ چلا گیا اور پھر باری باری دمرقچی میں، ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء میں مدرسہ احمد پاشا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء میں مدرسہ عارفیہ اور ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء میں ملاگورانی میں اپنے خسر قاضی عمر افندی کے قائم کردہ مدرسے میں رہے۔ ۲۰ رمضان ۱۱۳۵ھ/۱۵ اپریل ۱۷۲۳ء میں اس کا تقرر رشید افندی کے بعد وقائع نویس کے طور پر ہوا۔ اور وہ اس عہدے پر تقریباً ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء تک متمکن رہا۔ جب اس کے سرپرست صدر اعظم ابراہیم پاشا کو باغیوں نے قتل کر دیا تو اس کے مقربوں کو بھی عہدوں سے معزول کر دیا۔

اس کو ۱۱۴۵ھ۔ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۲ء۔ ۱۷۳۳ء میں روینی شہر کا ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳ھ/۱۷۳۸ء۔ ۱۷۳۹ء میں برسہ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۴ء۔ ۱۷۴۵ء میں استنبول کا قاضی رہا۔ اس کے بعد وہ ایک عرصے تک بے کار رہا بالآخر ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۷ء میں ایک سال کے لیے اسے اناطولی کا قاضی عسکر بنا دیا گیا ۵ ذوالقعدہ ۱۱۷۲ھ/۳۰ رجب ۱۷۵۹ء میں اس کو "شیخ الاسلام" کا بلند منصب ملا اور آٹھ ماہ تک اس منصب پر فائز رہنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی تاریخ جو تاریخ راشد کے تکملے کے طور پر دو بار طبع ہوئی ہے استنبول کے ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء تا ۱۱۴۱ھ/۱۷۲۹ء عہد تک محیط ہے۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے جو حسن بیان اور لطافت و نزاکت خیال کے لحاظ سے ہمیشہ اس عہد کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

ملائی۔ پولی نیشی نسل کے لوگ وہ حضرت مسیح کی پیدائش سے پہلے جزیرہ نمائے **چم** ہند چینی کے جنوبی ساحلوں پر آباد ہو گئے تھے۔ تاریخ میں ان کا ذکر اس وقت آتا ہے جب ۱۹۲ء میں چمپا کی شاہی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ ریاست موجودہ ویت نام کے ساحلی صوبوں پر مشتمل تھی اور شمال میں کوانگ بند سے جنوب میں بند تھوان تک پھیلی ہوئی تھی۔

دسویں صدی تک چمپا کی ریاست ترقی کی اعلیٰ منازل پر تھی۔ اس عرصے میں چم خاندانوں نے اپنی حدود سلطنت میں کسی قدر توسیع کی۔ لیکن بعد کی صدیوں میں اس ریاست کا ویت نام اور خمر کے ہمسایہ ممالک سے کھلم کھلا تصادم ہوا بعد میں اسے مغلوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نیز اندرونی شورشوں اور بیرونی حملوں نے اس سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ بادشاہ چی یونگ نگا کے دور حکومت (۱۳۶۰ء تا ۱۳۹۰ء) میں فاتحانہ جنگ کے ایک مختصر وقفے اور حکمران کی حمایت میں چینی مداخلت کے باوجود یہ ریاست زوال پذیر ہو چکی تھی۔ ۱۴۷۱ء میں ویت نام کے شہنشاہ لی تھانہ تون نے ریاست چمپا کو مکمل طور پر زیر کر لیا۔ اور یہ ریاست ویت نام کے مقبوضات میں شامل ہو گئی۔ اس کے کچھ باشندوں نے سرزمین کمبوڈیا میں پناہ لے لی۔ آہستہ آہستہ اس ریاست کا نام مشرق بعید کی تاریخ سے غائب ہو گیا۔

چم قوم ہندوستان کی تہذیب سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ اور اس قوم نے دوسری صدی عیسوی میں ہندو مذہب اور ادب کو مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی تک یہ لوگ ہندومت کے پیرو رہے۔

اگرچہ مسلمان چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں اس علاقے میں سکونت اختیار کر چکے تھے لیکن ان لوگوں نے اپنی سلطنت کے خاتمے تک اسلام کو سنجیدگی سے قبول نہیں کیا۔

آج بھی ویت نام میں رہنے والے چم لوگوں کا تہائی حصہ برہمنی مذہب اختیار کئے ہوئے ہے۔ اور باقی ایک تہائی حصہ جو کمبوڈیا ہجرت کر کے گئے ہیں مسلمان ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ویت نام کے جنوب میں ان کی تعداد ۱۵۰۰۰ اور کمبوڈیا میں ۹۰۰۰۰ ہے۔

چم ابتدا میں مادر شاہی اور مختلف کنبوں میں منقسم تھے لیکن بعد میں انہوں نے ہندوستان کے زیر اثر ذات پات اور ہندوانہ طور طریقے اختیار کر لیے۔ یہ لوگ بحری قزاقوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہمسایہ صوبوں پر چھاپے مارتے اور غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ موجودہ دور میں چم نسلی اعتبار سے ایسی اقلیتیں ہیں جو اکثریت میں جذب ہوتی جا رہی ہیں۔

چمپانیر (محمود آباد) مغربی ہندوستان میں گجرات کا ایک شہر۔ یہ شہر احمد آباد کے جنوب مشرق کی جانب تقریباً ۷۸ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ گجرات کے سلطان محمود شاہ اول بیگڑہ نے ۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء میں اس کے قریبی قلعے پاواگڑھ کو فتح کر لینے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ پاوہ گڑھ پر اس سے پہلے ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں احمد شاہ اول نے حملہ کیا تھا لیکن فتح کرنے میں ناکام رہا تھا۔ محمود شاہ بیگڑہ قلعے کو فتح کرتے ہی شہر میں داخل ہوا۔ اور اس نے شہر کے اردگرد ایک فصیل بنوائی جس میں برج اور پھاٹک تھے۔ اس نے ایک قلعہ (بہادر) بھی تعمیر کرایا۔ نیز اس کا نام چمپانیر کی بجائے محمود آباد رکھا اور ۹۱۷ھ/۱۵۱۱ء میں اس کی

Marfat.com

وفات تک یہ اس کی محبوب سکونت گاہ رہا۔ ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء تک جب بہادر شاہ کا انتقال ہوا یہ شہر گجرات کا سیاسی مرکز رہا۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں جب گجرات مغلوں کے قبضے میں آیا تو چمپانیر اس وقت نو محلات کی ایک سرکار کا صدر مقام تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ شہر مرہٹوں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۸۵۳ء میں اس کو انگریزوں نے فتح کر لیا۔ لیکن اس وقت یہ شہر چونکہ ویران ہو چکا تھا اس لئے اسے دوبارہ آباد نہیں کیا گیا۔

اس شہر کی یادگار عمارتوں میں سات منزلہ محل جس کی اب صرف نچلی منزل باقی رہ گئی ہے۔ اس محل کو محمود نے پاواگڑھ کے بالمقابل چٹان کے سرے تعمیر کرایا تھا۔ شہر پناہ کے علاوہ باقی سب مسجدیں اور مقبرے ہیں۔ جن کا طرز تعمیر مقامی ہے جامع مسجد جو ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء کی تعمیر ہے کا خاکہ اس سے سو سال پہلے کی بنی ہوئی احمد آباد کی جامع مسجد سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دس اور مسجدیں جن میں نگینہ مسجد اور سدی سید کی مساجد بھی ہیں اور کئی ایک گمنام مقبرے ہیں۔

آج کل یہ شہر بالکل کھنڈر بن چکا ہے۔

چمکنی، میاں عمر صاحب

(۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء - ۱۶/شعبان ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء)

صوبہ سرحد کے ایک علمی اور روحانی بزرگ جو اپنی کرامات اور ہدایت خلق کے باعث بہت مشہور ہیں۔

والد کا نام محمد ابراہیم تھا۔ آپ کی پیدائش فرید آباد کے گاؤں میں ہوئی جو شاہجہان نے آپ کے دادا کو بطور جاگیر دیا تھا۔ آپ نے یوسف زئی کے علاقے خدو خیل میں تربیت پائی۔ آپ کے استاد دریا بابا حاجی تھے۔ جو شیخ عبدالوہاب اخوند پنجو کے مریدین میں سے تھے۔ تصوف اور سلوک میں آپ نے قلعہ اٹک کے شیخ یحییٰ سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ نے پشاور سے چھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں چمکنی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے علم و زہد کے کمالات اور ان کی کرامات کی شہرت صوبہ سرحد، افغانستان اور پنجاب میں دور دور تک پھیل گئی۔ آپ کی خدمت میں کیا خاص اور کیا عام سب کے سب حاضری دینا اپنے لئے باعث برکت سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی جب بھی اپنی جنگی مہمات کے سلسلے میں ہندوستان کی طرف آتا تو چمکنی میاں عمر صاحب کی خدمت میں حضور حاضری دیتا۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ احمد شاہ ابدالی کو عدل و انصاف خدمت خلق اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہدایت کرتے تھے۔

احمد شاہ ابدالی نے چمکنی کی خانقاہ اور لنگر کے لئے ہزاروں جریب زمین وقف کر دی تھی۔

آپ نے جا بجا مسجدیں تعمیر کرائیں اور دینی مدارس قائم کئے۔ مسافروں کے آرام کے لئے کنوئیں کھدوائے۔ آپ کا قائم کیا ہوا ایک مدرسہ جو چمکنی میں آپ کی خانقاہ سے ملحق تھا۔ اب سے چالیس سال پہلے تک بہت زیادہ شہرت رکھتا اور سرحد و افغانستان سے طلباء علم دین حاصل کرنے کے لئے یہاں آتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں "معانی شرح قصیدہ امالی"، ۲- "توضیح المعانی"، ۳- "شجرہ نسب افغاناں" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ نے تقریباً سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پشاور میں ہے۔ جو بہت زیادہ مشہور اور مرجع خاص و عام ہے۔

آپ کی اولاد میں ایک لڑکے کا ذکر ملتا ہے جس کا نام صاحبزادہ محمدی تھا

اور جو پشتو زبان کا ... شاعر تھا۔

چندیری

شمالی وسطی ہندوستان کا ایک شہر اور پرانا قلعہ۔ اس کے مشرق کی رخ سات ... بیتوا کی وادی نظر آتی ہے یہاں ہندو اور مسلمانوں کے آثار قدیمہ کے درمیان مسلمانوں کے قلعوں کے کھنڈر موجود ہیں جو غالباً آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے کے ہیں کیونکہ غیاث الدین بلبن نے اگرچہ ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء میں اس شہر کو فتح کر لیا تھا لیکن اس وقت اس کے پیش نظر اس پر مستقل قبضہ رکھنا مقصود نہ تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کا اس پر باقاعدہ قبضہ اس وقت ہوا جب ۷۰۵ھ/۱۳۰۵ء میں عین الملک نے راجہ ہر آنند کو شکست دی۔

نیا چندیری غالباً مالوہ کے غوری بادشاہوں نے نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں بسایا۔ مالوہ کی جنگوں کے دوران میں سلطان علاء الدین خلجی نے ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں اسے غوریوں سے چھین لیا۔ اس کے بعد یہ مقام خلجی صوبے داروں کے ماتحت رہا۔

چندیری چونکہ بندیل کھنڈ اور مالوہ کی سرحد پر واقع تھا اس لئے اس پر یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں کا قبضہ رہا۔ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء تک اس پر سکندر لودھی کی فوجوں کا قبضہ رہا۔ جب وہ یہاں سے ہٹیں تو چتوڑ کے رانا کا اس پر قبضہ ہو گیا اس نے محمود ثانی کے معزول کردہ وزیر مدنی رائے کو یہاں کا صوبے دار مقرر کیا۔ ۹۳۴ھ/۱۵۲۸ء بابر نے چندیری اس سے چھین لی۔ اور صاحب خان کے بیٹے احمد خان کو واپس دے دیا۔ بعد میں اس پر پوربیا راجپوت پورن مل کا قبضہ ہو گیا۔ اور ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء کے قریب شیر شاہ نے اسے فتح کر لیا۔ لیکن پورن مل اس پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ اس نے چندیری کے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ شیر شاہ نے ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں اس سے مسلمانوں کا انتقام لیا۔ جب اکبر نے مالوے کا صوبہ فتح کیا تو چندیری اس کی ایک سرکار کا صدر مقام ہوا۔ اس دور میں یہ ایک بڑا شہر تھا۔ جس میں چودہ ہزار پتھر کے مکان تھے۔ اور ۱۲ سو مساجد تھیں۔ اس کے بعد یہ کئی مرتبہ بندیلیوں کے قبضے میں آیا۔ بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے اس پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔

یہاں کی یادگار عمارتوں میں جامع مسجد، مدرسہ، شہزادی کا روضہ ہیں۔ شہر فصیل سے گھرا ہوا ہے۔ جس میں پانچ دروازے ہیں۔ ایک دروازہ کاٹی گھاٹی ہے جو سطح زمین پر ابھری ہوئی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

چنگانہ

ایک نام جو خانہ بدوش قوموں کے لئے مشرق میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ چنگر یا زنگر سے نکلا ہے۔ یہ نام اس قوم کا تھا جو زمانہ قدیم میں دریائے سندھ کے کناروں پر آباد تھی۔ غالباً بہرام گور (۴۲۰ء تا ۴۳۸ء) انہیں سب سے پہلے ہندوستان سے ایران لایا۔ اس کے بعد یہ لوگ ساری دنیا میں پھیل گئے۔

ان میں سے کچھ ایک جگہ آباد ہو گئے ہیں اور باقی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پرانے طور طریقوں پر چلنے والے خانہ بدوش ایک جگہ بس جانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایران اور ترکی میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کا اپنا علیحدہ مذہب اور سیاسی نظام ہے۔

Marfat.com

جدت کا امین انقلاب کا ضامن
مکتبہ شاہکار

ہر موضوع کی قدیم وجدید شاہکار جریدی کتب ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو انتہائی باقاعدگی سے پیش کرتا ہے۔

۱- حاجی مراد ۲/۵۰
۲- نوسٹوڑی ۲/=
۳- غبارِ خاطر ۳/۵۰
۴- تورڑے ڈیم کا کبڑا ۲/۵۰
۵- داراشکوہ ۳/=
۶- رومیو جیولیٹ }
۷- میکبتھ } ۳/۵۰
۸- سائنس سے بھی عجیب تر ۲/=
۹- مہمان بہار - آتشِ رفتہ ۳/=
۱۰- آوازِ دوست ۳/=
۱۱- بھوانی جنکشن ۲/۵۰
۱۲- پولیس افسر کی ڈائری ۲/۵۰
۱۳- شاہنامہ اسلام (اوّل) ۳/=
۱۴- چلتے ہو تو چین کو چلیے ۲/۵۰
۱۵- علی اور نیلو ۲/۵۰
۱۶- تحریک پاکستان ۳/=
۱۷- صحرانورد کے خطوط (اوّل) ۳/=
۱۸- النبیؐ الخاتم ۳/۵۰
۱۹- شاہنامہ اسلام (دوم) ۳/=
۲۰- فردوسِ بریں ۲/۵۰
۲۲- ایمانیات ۲/۲۵
۲۲- جین آئر ۴/=
۲۳- شکست ۳/=
۲۴- مجبور آوازیں ۴/=

۲۵- شاہنامہ اسلام (سوم) ۳/=
۲۶- قائداعظم میری نظر میں ۴/=
۲۷- مقدس نادین ۴/=
۲۸- صحرانورد کے خطوط (دوم) ۳/۵۰
۲۹- خزینۂ معلومات ۴/=
۳۰- علی گڑھ کے تین نامور فرزند ۲/=
۳۱- شاہنامہ اسلام (چہارم) ۳/=
۳۲- محبت عظیم ہے ۲/۵۰
۳۳- نقوشِ قائداعظمؒ ۲/۵۰
۳۴- اردو کی آخری کتاب ۲/۵۰
۳۵- رحمتِ عالمؐ ۲/=
۳۶- اسرائیل قزاقی [illegible] ۲/۵۰
۳۷- اردو کے چار مزاحیہ شاعر ۲/=
۳۸- پولیس افسر کی ڈائری (حصہ دوم) ۳/=
۳۹- ذہن کی آزمائش ۳/۵۰
۴۰- قاسم کی مہندی ۳/۵۰
۴۱- پیغمبرِ صحرا ۴/=
۴۲- نوجوان ورتھر کی داستانِ غم ۲/۵۰
۴۳- بیادِ قائداعظم ۲/۵۰
۴۴- افلاطون کی "ری پبلک" ۳/۵۰
۴۵- رقیبیا ۴/-
۴۶- ذہن کی آزمائش (حصہ دوم) ۲/-
۴۷- قابوس نامہ ۲/۵۰
۴۸- دفاع پاکستان ۳/۵۰

انسائیکلوپیڈیا معلومات قسط وار
(ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے)
فی قسط ۳/۰ روپے ـــــ سالانہ ۳۰/۰ روپے

خدمت اسلام کی ما بہترانہ مگر منظم کاوش
اسلامی انسائیکلوپیڈیا قسط وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
فی قسط ۳/۰ روپے ـــــ سالانہ ۳۰/۰ روپے

بچوں کے لیے اردو کا پہلا انسائیکلوپیڈیا رنگا رنگ باتصویر
بی بی انسائیکلوپیڈیا قسط وار
(ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے)
فی قسط ۲/۵۰ روپے ـــــ سالانہ ۲۵/۰ روپے

۱۹۶۸ء کی سب سے خوبصورت کتاب
محمد رسول اللہ
ڈاکٹر توفیق الحکیم کی عظیم تصنیف
[illegible]
قیمت ۷/۲۵ روپے

۱۹۶۸ء کی سب سے کثیر الاشاعت کتاب
[illegible]

Marfat.com

یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو آنے والے

اقبالؒ کا فلسفۂ خودی

(کتاب نمبر ۵۰)

علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے عظیم موقع پر اُن کے فلسفۂ خودی پر ایک بے نظیر و منفرد تصنیف ماہر اقبالیات پروفیسر محمد عثمان کی مشہور کتاب شاہکار ایڈیشن میں۔

قیمت ۳/۵۰ روپے

افرو ڈائٹ،

(کتاب نمبر ۵۱)

از بیگم عابد علی عابد، ایم اے

ڈائجسٹ سائز میں "شاہکار" کی اولین پیشکش پیئرلوئی کا شہرۂ آفاق ناول حسن کی دیوی زہرہ یا افروڈائٹ کے پردے میں صنف نازک کے فطری حسن اور زندگی کی مسرتوں پر ایک دلچسپ تحریر،

قیمت ۳/۵۰

شاہکار تقویم عالم

(جیبی کتاب نمبر ۱۱)

قارئین شاہکار کی خدمت میں ۱۹۷۷ء کا بہترین تحفہ، انسانی تاریخ کا روزنامچہ شخصیات ایجادات اور واقعات عالم کی ڈائری،

قیمت ۱/۵۰ روپیہ

سرورق: الشیخ آرٹ پریس،

Marfat.com

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط ○ وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

۱۷

• مدیرِ اعلیٰ : سید قاسم محمود
• نائب مدیر : شریف اصلاحی
اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے
ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"
خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

کبھی کبھی زندگی میں واقعات ایسی یکسانیت اختیار کر لیتے ہیں کہ جی خواہ مخواہ کسی تبدیلی کی خواہش کرنے لگتا ہے آدمی ایسا کیوں چاہتا ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب تو شائد کوئی بھی نہ دے سکے لیکن اتنا ضرور ہے کہ یکسانیت سے گھبرا جانا عین انسانی فطرت ہے۔ واقعات خواہ کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں، معمولات خواہ کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں، تھوڑے ہی عرصے میں اپنی کشش کھونے لگتے ہیں۔ گردشِ مدام ہو یا سکونِ کامل دونوں زیادہ عرصے تک اپنی دلفریبی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ تغیر کو ثبات کا قانون دنیا بھر میں لاگو ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ، کہیں آہستہ کہیں تیز رفتاری کے ساتھ۔ کہیں محسوس، کہیں غیر محسوس انداز میں ——— یہ نہ صرف موجود ہے بلکہ مصروفِ عمل بھی ہے۔

کچھ عرصے سے کارکنانِ شاہکار کی خواہش تھی کہ یکسانیت کا طلسم ٹوٹے اور معمولات میں ذرا تبدیلی آئے کہ اس سے کام کرنے کی امنگ ترنگ بڑھتی ہے۔ چنانچہ یکم مارچ ۱۹۷۷ء سے ترلیف جاوید اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے اور کفیل احمد صدیقی انسائیکلوپیڈیا معلومات کے نائب مدیر ہوں گے۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے نائب مدیر شریف اصلاحی اسلامیات کے موضوع پر تحقیقی کام کریں گے۔ ان کی تحریریں جدید کتب کے ذریعے قارئین تک پہنچا کریں گی۔

ان تبدیلیوں کو بنیادی تو نہیں کہا جا سکتا البتہ یکسانیت سے بچنے اور اسپ ذوق و شوق کو مہمیز دینے کا یہ ایک عمدہ طریقہ ہے۔ جس کے ذریعے ادارتی شعبے کے ارکان کے لئے نئی نئی علمی دلچسپیاں پیدا ہوں گی، اور قارئین تک بہتر معلومات زیادہ بہتر انداز میں پہنچیں گی۔

مخلص
اشرف تنویر
(مدیر انتظامی)

تاریخِ اشاعت ۱۵ فروری ۱۹۷۷ء ناشر: سید قاسم محمود طابع: رشید احمد چودھری مکتبہ جدید پریس لاہور

Marfat.com

حجر

منع کرنا، روکنا، کسی کو تصرفات سے روکنے کو حجر کہتے ہیں۔

۔ اسباب موجبہ حجر بالاتفاق تین ہیں۔ صغر سنی، غلامی، جنون یعنی ان تینوں صفات میں سے جس میں ایک پائی جائے گی اسے مال میں تصرف کرنے سے روکا جائے گا حتیٰ کہ وہ صفت اس سے زائل ہو جائے۔ اگر لڑکا بالغ ہو جائے مگر صاحب تمیز نہ ہو تو اسے مال سپرد نہ کیا جائے گا۔ صاحب مال جب تمیز دار ہو جائے تو بالاتفاق اسے اس کا مال سپرد کر دیا جائے گا

تمیز کی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل نے تمیز کی تعریف یوں کی ہے۔ کہ تمیز اس ہوشیاری اور دانائی کا نام ہے جس کے باعث لڑکا اپنے مال کی اصلاح کرے اور اپنے مال کو بڑھائے اور بے اندازہ خرچ نہ کرے۔

امام شافعی کے نزدیک تمیز وہ ہے جس سے صلاح مال اور دین ہو۔

حجر جن پر عائد ہو سکتا ہے وہ یہ ہیں ۱۔ نابالغ ۲۔ غیر عاقل ۳۔ غیر ذمہ دار اور بالخصوص فضول خرچ ۴۔ دیوالیہ ۵۔ غلام۔

حجر کا نفاذ خود بخود ہو جاتا ہے یا قاضی کی طرف سے عائد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

حجر، سورۃ

قرآن مجید کی پندرھویں سورۃ (دیکھئے "الحجر، سورۃ")

حجر

جنوبی عرب کا ایک شہر۔ جو تیما کے جنوب میں وادی القریٰ سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ شہر اب موجود ہیں۔ آج کل بدوی لوگ اس نام کا اطلاق اس سپاٹ وادی پر کرتے ہیں جو مبرک الناقہ اور بیر الغنم کے درمیان کئی میل تک پھیلی ہوئی ہے اس کی زرخیز زمین میں بہت سے کنویں ہیں جہاں بدوی بڑی تعداد میں اپنے گلوں سمیت آکر خیمہ زن ہوتے ہیں۔

حجر سے دو سڑکیں مکہ کی طرف جاتی ہیں ان میں سے ایک نجد کی سڑک ہے جس سے آجکل حاجی گزرتے ہیں دوسری شاہراہ مرو ہے جس سے قدیم زمانے کے زائرین مکے جایا کرتے تھے۔ اس کے مغرب میں ایک پہاڑ ہے جو ریت کے پتھر کی پانچ منفرد چٹانوں پر مشتمل ہے اور جن پر بہت ہی خوشنما یادگاریں تراش کر بنائی گئی ہیں۔ ان عمارات میں قصر البنت، بیت الشیخ، بیت اخریمات، محل المجلس اور دیوان شامل ہیں مکے جانے والے زائرین ایک دن کے لیے جبل اثالث پر قیام کرتے اور نماز ادا کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہاں پر لبدین اور متکبر الناس آباد تھے۔ قرآن نے انھیں قوم ثمود کہا ہے۔ جن کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ چٹانوں کو کاٹ کر وہاں اپنے مسکن بناتے تھے۔ ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنا کر بھیجا اور معجزے کے طور پر ایک اونٹنی بھیجی لیکن جب ان لوگوں نے اس اونٹنی کو مار کر اللہ تعالیٰ کی نشانی کی بے حرمتی کی تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عذاب نازل ہوا۔ اس شہر کا نام مدائن صالح بھی ہے۔

عربوں کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو الحجر میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ یہاں اپنی والدہ کے پہلو میں دفن ہیں۔

سیرت نبوی میں بھی حجر کا ذکر آیا ہے ۹ھ/۶۳۱ء میں جب آنحضورؐ تبوک کی طرف جہاد کی طرف جا رہے تھے تو اس علاقے سے آپ کا گزر ہوا۔ صحابہ کرام نے اپنے آپ کو تازہ دم کرنے کے لیے یہاں کے کنوؤں سے پانی حاصل کرنا چاہا لیکن آپؐ نے منع فرمایا کہ وہ ایسی جگہ نہ ٹھہریں جہاں عذاب الہٰی نازل ہو چکا تھا۔

امیر سعود نے یہاں پر ایک شہر بسانا چاہا تھا لیکن علماء نے ایسے علاقے پر جو مورد عذاب ہو چکا تھا از سر نو ایک شہر آباد کرنے پر شدید اعتراضات کیے جس وجہ سے یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

حجرات سورۃ

قرآن مجید کی ۴۹ ویں سورت (دیکھئے "الحجرات، سورۃ")

حجر بن عدی

بعض حجر کو صحابی کا درجہ دیتے ہیں لیکن قدیم ترین مصادر سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔ حجر ابتدا ہی سے حضرت علیؓ کی نصرت و حمایت میں دل و جان سے کوشاں رہے۔ انھوں نے جنگ جمل جنگ صفین میں شرکت کی۔ وہ اپنے زمانہ قیام کوفہ میں بنو امیہ کے خلاف نیز علویوں کے حق میں سرگرم عمل رہا۔

حضرت امام حسنؓ کے انتقال کے بعد حجر نے امام حسینؓ کو کوفے آکر فوج کی سرداری قبول کرنے کی دعوت دی، جب زیاد بصرے میں تھا تو گفت و شنید ناکام رہی تو زیاد نے حجر کو اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے شام میں حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا جہاں شام کے لوگوں کے مشورے سے انھیں موت کی سزا دی گئی چنانچہ دمشق کے قریب مرج عذرا کے مقام پر انھیں قتل کر دیا گیا۔

حجرہ

کمرہ، کوٹھری، وہ مکان جس میں آنحضورؐ نے وفات پائی تھی اور وہیں مدفون ہوئے۔ یہ حجرہ حضرت عائشہؓ کا تھا۔ اس کا رقبہ ۵۵ مربع فٹ ہے اور مسجد نبوی سے پیچھے واقع ہے۔ مسجد نبوی اور اس کے درمیان تقریباً ۲۶ فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تین قبریں ہیں ایک میں آنحضورؐ موجود ہیں دوسری حضرت ابو بکرؓ اور تیسری حضرت عمرؓ کی ہے۔

حجریہ

یمن کا ایک مجموعۂ قبائل۔ نیز یہ ایک انتظامی قضا کا نام بھی ہے جو الصلیحی کی سرزمین کے شمال میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے جس کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے اس علاقے کے پہاڑوں میں جبل صبر خاص طور پر مشہور ہے وادی ورزان اور وادی مقہ بھی اس علاقے میں ہیں۔ دبحان اس علاقے کا قابل ذکر شہر ہے ایک اور شہر ہروہ ہے جس کی آبادی پانچسو کے قریب ہے۔

حجریہ اپنے آپ کو خالص حمیری بتلاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی زمانے میں وہ اور صبیحی ایک ہی قبیلے میں شامل تھے۔ کچھ عرصہ قبل وہ صنعاء کے امام کے زیر اثر تھے۔ جب اس کا اقتدار کمزور پڑ گیا تو وہ آزاد ہو گئے۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں سے حجریہ قبیلہ ذو محمد کے زیر اثر آگئے ہیں۔ قبیلہ ذو محمد کے لوگ باقل کی اولاد سے

Marfat.com

ہیں جو پہلے صنعاء کے اماموں کی ملازمت کرتے تھے۔ لیکن جب انہیں زوال آگیا تو وہ خود یمن کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگئے۔
ذو محمد زیدیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے بہت سے مجبوراً ان سے بچنے کے لئے عدن کی طرف جا کر آباد ہوگئے ہیں جہاں وہ محنت مزدوری کرکے اپنی گذر بسر کرتے ہیں۔

حج مبرور

مقبول حج۔ احادیث میں یہ لفظ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ آنحضورؐ کی حدیث مبارک ہے :۔

"ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ تک کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان کے درمیان کے گناہوں کا ——— اور "حج مبرور" (پاک اور مخلصانہ حج) کا بدلہ تو بس جنت ہے۔" (بخاری و مسلم)

آپؐ نے فرمایا:

"حج اور عمرہ پے در پے کیا کرو، کیونکہ حج اور عمرہ دونوں فقر و محتاجی اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح لوہار اور سنار کی بھٹی لوہے اور سونے چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے اور "حج مبرور" کا صلہ اور ثواب تو بس جنت ہی ہے۔" (ترمذی، سنن نسائی)

ان احادیث سے واضح ہے کہ "حج مبرور" کا صلہ جنت، اللہ تعالےٰ کا قطعی فیصلہ ہے۔

حد

دو چیزوں کے درمیان کی روک، کسی شے کی انتہا۔ دو چیزوں کے درمیان فصل۔ اصطلاح میں حد کے معنی سزا کے ہیں۔ کیونکہ اس کے ذریعے مجرم کو جرم کے دوبارہ ارتکاب سے روکا جاتا ہے۔ حدود جمع ہے حد کی، حدود اللہ کی ترکیب قرآن مجید میں کئی جگہوں پر آئی ہے جس سے مراد اللہ کے احکام ہیں۔ فقہا کے نزدیک حد کے معنی وہ سزا ہے جو حقوق اللہ میں تجاوز کرنے کی وجہ سے (اللہ تعالےٰ کی طرف سے یا آنحضورؐ کی طرف سے) متعین کی گئی ہے۔ حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ حد میں سزا مقرر شدہ ہے اور اس میں رد و بدل کرنے کا کسی کو حق نہیں جبکہ تعزیر وہ سزا ہے جس کا تعین قاضی یا حاکم حالات کے مطابق خود کرتا ہے۔ بقول شاہ ولی اللہ دہلوی صاحبِ 'حجۃ اللہ البالغہ' :

"بعض معصیتیں ایسی ہیں جن پر عذاب آخرت کی وعید و تہدید ہے مگر بعض ایسی ہیں جو نظام تمدن میں خلل انداز ہونے کی وجہ سے انسان کے اطمینان و سکون اور معاشرے کے امن و امان پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کے لئے شرع نے حد مقرر کر دی ہے۔ یعنی (ٹھوس) سزا تجویز کی ہے۔ تاکہ اس دنیا میں ان افعال کے ارتکاب کی حوصلہ شکنی ہو اور نظام تمدن یا انفرادی انسانی امن و سکون قائم رہ سکے۔"

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے جرم و سزا کے مسئلے پر کسی انتقامی نظریئے پر عمل نہیں کیا بلکہ اس کے نزدیک سزا نفس انسانی کے تزکیہ و تصفیہ اور معاشرے کی تطہیر کا ایک ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سنگین جرائم کے سوا دوسری معصیتوں میں توبہ اور پشیمانی کو بھی اہمیت دی گئی ہے تاکہ داخلی انقلاب کی وجہ سے نفس رضاکارانہ طور پر جرائم [illegible] میں ہر جرم [illegible] ہے اور اس میں خدا کی طرف [illegible] نزدیک حد کی تعریف یہ ہے:

"شریعت کی رو سے مقررہ سزائیں حد ہیں۔ اس کے تحت بقول بعض فقہا قصاص حد ہے لیکن اکثریت کے نزدیک حدود یہ ہیں :۔

۱۔ زنا	۲۔ قذف
۳۔ سرقہ	۴۔ قطع الطریق

قصاص حد نہیں کیونکہ اس کا تعلق حق العبد سے ہے قصاص کی ایک تخفیفی صورت دیت ہے۔ فتح الباری میں مندرج ہے کہ حد سترہ وجوہ سے لازم آتی ہے۔ ان وجوہ میں زنا، خمر اور سرقے کے علاوہ ردۃ، حرابہ اور قذف شامل ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ سزاؤں کے بارے میں ممکن حد تک شفقت اور تخفیف کی طرف میلان رکھتے تھے۔ چنانچہ زنا، قذف وغیرہ کے ثبوت کے بارے میں بڑی احتیاطیں ملحوظ رکھی جاتی تھیں تاکہ جرم پوری طرح ثابت ہو جائے اور کسی شخص کو ناکردہ گناہ کی سزا نہ ملنے پاتے۔

اسلام میں سزاؤں کا مقصد اور حدود کا نفاذ انتقام یا بے رحمی کی بنا پر نہیں ہے چونکہ حد مانع اور زاجر کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ کافۂ انام کی مصلحت کے لئے مقرر کی گئی ہے اس لئے وہ حقوق اللہ میں داخل ہے۔ گویا اس کا مقصد ان باتوں سے منع کرنا ہے جو بندوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مثلاً ان باتوں سے سلطنتِ اسلامیہ کو محفوظ رکھنا جو تباہی لاتی اور فساد پیدا کرتی ہیں۔ زنا کی حد سے نسب محفوظ رہتے ہیں۔ چوری کی حد سے مال محفوظ رہتا ہے۔ شراب کی حد سے عقل کی حفاظت مقصود ہے اور تہمت کی حد سے آبرو کا بچاؤ ہوتا ہے۔ پس اگر تعزیری نظام قائم نہ کیا جاتا تو معاشرے میں بعض ناقابل تلافی رخنے پیدا ہو جاتے۔

جرائم کا معاشرے کے روحانی، اخلاقی اور اقتصادی حالات سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے اسلام نے جرائم کی روک تھام کے لئے سزاؤں کے نفاذ کے مناسب طریقے اختیار کئے ہیں۔ شریعت اسلامی میں جو حدود رکھی گئی ہیں ان کا مقصد گناہگار سے انتقام لینا نہیں۔ بلکہ اس بات کا شعور پیدا کرنا ہے کہ ان کی آگاہی کے بعد آدمی گناہ کے ارتکاب سے باز رہے ان کے ذریعے ذاتی کردار میں صالحیت پیدا کرنے کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور کی بیخ کنی ہو اور لوگوں کے جان و مال اور عزت کا تحفظ کیا جائے۔

اسلام میں حد کی سزا سب کے لئے یکساں ہے جو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہوتی ہے۔ کسی کے لئے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں۔ حدود کا نفاذ قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہے۔ آنحضورؐ کا واضح ارشاد موجود ہے۔

"پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں کہ وہ معاشرے کے پست طبقے پر حدود کا نفاذ کرتی تھیں لیکن اکابر کو چھوڑ دیتی تھیں۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا۔"

مختلف علوم میں 'حد' کا مفہوم مختلف ہے۔ مثلاً مہندسین کے ہاں 'حد' کے معنی خط اور سطح کے ہیں۔ علوم نجوم میں حد الکواکب سے مراد کواکب کا جرم (جسم) اور آسمان میں ان کے نور کے پھیلاؤ کی حد ہے۔ ایسے کواکب کو 'صاحب الحد' کہا جاتا ہے۔ علم کلام اور فلسفے میں 'حد' کی اصطلاح تعین کے معنوں میں استعمال

Marfat.com

ہوتی ہے منطق میں حد قیاس کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔

نحویوں اور صرفیوں کے نزدیک "حد" سے مراد ہے المعرف الجامع المانع۔

جبکہ صوفیوں کے ہاں 'حد' سے مراد خدا اور بندے کے درمیان وہ فصل ہے جو زمان و مکان کی قید کی بنا پر قائم ہے۔ چنانچہ انسان مکان اور زمان دونوں کے اعتبار سے محدود ہے۔ (نیز دیکھئے "تعزیر")

حدِ قذف

زنا کی تہمت لگانے والے کی سزا۔ قرآن مجید میں قذف کی حد یہ بیان ہوئی ہے:

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔" (۲۴ : ۴)

تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حکم عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے بلکہ پاک دامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح اگرچہ الزام لگانے والوں کے لئے اس آیت میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے مگر یہ صرف مردوں ہی کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی جرم قذف کی مرتکب ہوں تو وہ بھی اسی حکم کی سزاوار ہوں گی۔

قاذف (الزام لگانے والے) کا درج ذیل شرائط پر پورا اترنا ضروری ہے۔

۱۔ بالغ ہو۔ بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اسے تعزیر دی جا سکتی ہے مگر اس پر حد جاری نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ عاقل ہو۔ مجنوں پر حد قذف جاری نہیں ہو سکتی۔

۳۔ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (طائعاً) یہ حرکت کی ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ قاذف، مقذوف (جس پر الزام لگایا گیا ہو) کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو، کیونکہ ان پر قذف جاری نہیں کی جا سکتی۔ ان کے علاوہ حنیفہ کے نزدیک ایک شرط یہ بھی ہے کہ ناطق ہو، گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حد قذف کا مستوجب نہ ہو گا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تو وہ قاذف ہے۔

حدِ قذف کے بارے میں فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی نسبت ہلکی مار ماری جائے یعنی کوڑے تو اسی ہی ہوں مگر ضرب اتنی سخت نہ ہو جتنی زانی پر لگائی جاتی ہے۔ نیز اگر قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو اس پر ایک ہی حد جاری کی جائے گی لیکن امام شافعی کے نزدیک اس پر الگ الگ ہر شخص کے لئے پوری حد جاری ہو گی۔

حدث

ناپاکی۔ شریعت میں حدث کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ حدث اکبر ۲۔ حدث اصغر۔ حدث اکبر کی صورت میں غسل سے اور حدث اصغر سے وضو کے ذریعے آدمی طہارت حاصل کر سکتا ہے۔

جو شخص حدث اصغر کی حالت میں ہو اس کے لئے نہ صرف نماز پڑھنے کی ممانعت ہے بلکہ اسے کعبے کے گرد طواف کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ نیز وہ اس حالت میں قرآن کو بھی نہیں چھو سکتا۔ ان احکامات کا استنباط قرآن مجید کی ان آیات سے کیا گیا ہے:۔

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو! جب نماز کے لئے اٹھو تو چاہیئے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سر پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔" (۵ : ۶)

"یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا۔" (۵۶ : ۷۷ تا ۷۹ نیز دیکھئے جنابت)

حدوث عالم

آغاز عالم۔ حدوث، حدث سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونا، اٹھنا، زمانہ حال میں وقوع پذیر ہونا ہیں۔ مسلم حکمار کے نزدیک اس اصطلاح کے دو معنی ہیں:

۱۔ کسی چیز کا عارضی طور پر عدم سے وجود میں آنا۔ اس کو حدوث زمانی کہا گیا ہے۔ اس کے مقابل کی اصطلاح قدم زمانی ہے۔ متکلمین کے ہاں حدوث العالم کے معنی آغاز وقت کے لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہستی باری کے اثبات کے لئے آغاز عالم کو مانتے ہیں۔ امام غزالی اپنے قیاس منطقی کو اس طرح ثابت کرتے ہیں "ہر حادث وجود کو عدم سے وجود میں لانے کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے چونکہ یہ عالم بھی وجود رکھتا ہے جس کی پیدائش کا آغاز ہے۔ لہذا ضروری طور پر وہ کوئی نہ کوئی سبب رکھتا ہے۔"

۲۔ اس اصطلاح کے دوسرے معنی یونانی فلسفے کے پرستاروں کے نزدیک یہ ہیں۔ "حدوث سے حادثے کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی کسی چیز کا عدم سے وجود میں آنا۔ لیکن علم الوجود کے اعتبار سے یہ ضروری نہیں کہ اس میں زمان کی بھی آمیزش ہو۔ اس کا نام حدوث ذاتی ہے۔"

حدیبیہ

حرم مکہ کی مغربی حد۔ جو مکے سے کوئی دس میل اور جدے سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہ پہاڑ جو مکہ کو گھیرے ہوئے ہیں یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ شہری مملکت کی موزوں حد ہے۔

ابتدائے اسلام میں یہاں ایک کنواں موجود تھا جو مسافروں اور حاجیوں کے کام آتا تھا۔ لیکن یہاں کسی آبادی کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہاں کے ایک درخت کا تقدس اسلامی دور سے شروع ہوا۔ کیونکہ اس کے نیچے آنحضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے جاں نثاری کا عہد لیا تھا۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

"اے نبیؐ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہو گا اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔" (۴۸ : ۱۰)

جب اس درخت کے سائے میں مریضوں کی صحت وغیرہ کے غیر اسلامی معتقدات توہم کی شکل اختیار کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے اس درخت کو اکھڑوا دیا۔ بعد میں اس جگہ مسجد تعمیر کی گئی جو آج بھی موجود ہے۔ کچھ عرصے

Marfat.com

بعد یہ جگہ حاجیوں کی ضرورتوں کے تحت آباد ہونے لگی۔ آج کل یہ مقام پولیس کی اہم چوکی ہے۔ حدیبیہ کی شہرت اس بنا پر بھی ہے کہ ۶ھ میں آنحضورؐ نے یہاں قریش سے ایک معاہدہ کیا تھا۔

حدیبیہ صلح

ایک معاہدہ جو آنحضورؐ نے ۶ھ میں قریش کے ساتھ کیا۔ ذوالقعدہ ۶ھ میں آنحضورؐ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرے کیلئے مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے عمرے کا احرام باندھا ہوا تھا اور قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ مصالحانہ نیت تھی اس لئے ہتھیار ساتھ نہیں لائے گئے تھے۔ حالات معلوم کرنے کے لئے جاسوس بھیجا گیا۔ جس نے آکر بتایا کہ قریش کو مسلمانوں کی آمد کا پتہ ہے اور وہ جنگ کے لئے اپنے حلیفوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حدیبیہ کے مقام پر قریش نے مسلمانوں کا راستہ روک لیا۔ گفت وشنید شروع ہوئی۔ آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ کو سفیر اور معاہدہ صلح کے لئے مختار بنا کر مکہ بھیجا۔ قریش نے انہیں نظر بند کر دیا۔ بعد میں افواہ اڑی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ اس موقع پر آنحضورؐ نے مسلمانوں سے بیعت لی جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں مسلمانوں نے عہد کیا کہ وہ آخری دم تک قریش کا مقابلہ کریں گے۔ (دیکھئے بیعت رضوان)

مسلمانوں کے اس عزم پر قریش گھبرائے اور سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ تھوڑی سی ردوقدح کے بعد ایک صلح نامہ پر اتفاق ہو گیا۔ قریش کے بیشتر مطالبات مان لئے گئے جو یہ تھے:

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر حدیبیہ سے ہی واپس ہو جائیں اور عمرے کے لئے اگلے سال آئیں۔

۲۔ اگر مکہ سے کوئی شخص بھاگ کر آنحضورؐ کے پاس آئے تو اس کے سرپرست کے مطالبے پر اس کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ چلا جائے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے گی۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں دونوں فریق مکمل طور پر غیر طرفدار رہیں گے۔ تجارت یا حج وعمرے کے لئے ایک دوسرے کے علاقے میں آنے اور گزرنے کی اجازت ہو گی۔

۴۔ ان مفادات میں فریقین کے علاوہ ان کے وابستہ قبائل کو بھی برابر شریک سمجھا جائے گا۔ ان بنیادی شرائط کے علاوہ عہدنامہ متن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ زمانہ جاہلیت کی طرح باسمک اللّٰھم اور محمد رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھنا بھی قبول کر لیا گیا۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ مسلمان دب گئے اور قریش کی فتح ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو اس معاہدے کی دفعات کا پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوئے لیکن جب آنحضورؐ نے فرمایا کہ میں ان شرائط کو پسند کرتا ہوں تو پھر خاموشی اور اطاعت کے سوا کسی کو چون وچرا کی مجال نہ تھی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لئے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔

صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ باسمک اللّٰھم لکھنے میں کوئی شرک نہیں تھا۔ محمد بن عبداللہ لکھنے سے صورت حال بدل نہیں جاتی۔ عمرے میں عارضی رکاوٹ معمولی بات تھی اور "من استطاع الیہ سبیلا" کے باعث وہ مسلمانوں پر واجب نہ رہا تھا۔ تحویل ملزمین میں مدینے سے بھاگنے والا منافق یا مرتد ہی ہو سکتا تھا۔ مکی پناہ گزین نومسلم ہی ہو سکتا تھا اور نومسلم مظلوموں کا مکہ اور اس کے اطراف میں روز افزوں ہوتے جانا خود اہل مکہ ہی کے لئے خطرے کا باعث اور کسی اسلامی اقدام کے وقت مسلمان لشکر کے لئے قیمتی امداد ہو سکتا تھا۔

معاہدے کی نقلیں تیار ہونے کے بعد قریش کے وفد کو اسی وقت تک روکے رکھا گیا جب تک حضرت عثمانؓ بخیریت واپس نہیں آ گئے۔ پھر جانوروں کی قربانی مکے کی بجائے حدیبیہ ہی میں انجام دے کر آنحضورؐ واپس مدینہ تشریف لائے۔

یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ حدیبیہ میں دو عورتوں نے اسلامی پڑاؤ میں پناہ لی۔ جب قریش نے ان کی واپسی پر اصرار کیا تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ تحویل کی شرط صرف مردوں سے متعلق ہے۔ قریش نے اس تعبیر کو منظور کر لیا۔ دو نومسلم نوجوان جو مکہ سے بھاگ کر آئے تھے آنحضورؐ نے انہیں واپس کر دیا۔ بعد میں جب یہ دونوں اور دوسرے نومسلم ذوالمروہ کے دشوار گزار قطعے میں جمع ہو کر قریش کی تجارت کے لئے خطرہ بن گئے تو قریش ہی نے تحویل ملزمین کی یک طرفہ شرط منسوخ کرائی اور مکہ سے فرار ہونے والے مسلمان مدینہ پہنچ گئے۔

حدیث

خبر۔ بات، نئی چیز۔ اصطلاح میں اس خبر کو حدیث کہتے ہیں۔ جس میں آنحضورؐ کا قول، فعل یا تقریر بیان ہو۔ بعض اوقات کسی صحابی کے اقوال وافعال کو بھی حدیث کہہ لیا جاتا ہے۔ آنحضورؐ نے حدیث کا لفظ اپنے کلام کے لئے خود پسند فرمایا۔ تاکہ آپؐ کے اور دوسرے لوگوں کے کلام میں فرق ہو سکے۔ حدیث کے لئے خبر، اثر اور سُنّت کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ حدیث اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے۔ سُنّت اور حدیث میں معمولی فرق ہے۔ سُنّت کے بیان کو حدیث کہتے ہیں۔

آنحضورؐ کو خود حدیث کی حفاظت وروایت منظور ومطلوب تھی۔ جب آپؐ گفتگو فرماتے تو آہستہ آہستہ اور خوب وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے تاکہ سننے والے کو پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔ ضروری باتوں کو آپ تین تین بار دہراتے تاکہ حاضرین مجلس اچھی طرح یاد کر لیں۔ آپ نے حدیث کی ترغیب دلاتے ہوئے مختلف مواقع پر ارشاد فرمایا:

"جو موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک پہنچا دیں۔ تم مجھ سے سنتے ہو، دوسرے لوگ تم سے سنیں گے، پھر ان سے اور لوگ سنیں گے۔ اللہ تعالےٰ اس شخص کے چہرے کو رونق وتازگی بخشے جس نے میری بات سنی اور یاد رکھی یہاں تک کہ وہ بات اس شخص تک پہنچا دی جس نے نہیں سنا۔"

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ آپ نے حدیث کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے فرمایا کہ:

"جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

"میری حدیث جیسی سنو ویسی بیان کرو۔" آپؐ نے اپنی سنت وحدیث کی اہمیت، حفاظت اور اشاعت کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد

Marfat.com

ہے "جس نے میری سنّت سے منہ موڑا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔

حدیث کے بغیر قرآن کی تصحیح درست نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر کوئی شخص قرآن میں محض اپنی رائے سے کام لے کر ٹھیک نتیجے پر پہنچ بھی جائے تو وہ غلطی پر ہوگا"۔

ضرورت حدیث

فہم قرآن کے لئے حدیث کی ضرورت ہے۔ ہم اس زبان کے محتاج ہیں جس میں قرآن نازل ہوا۔ اسی طرح قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کے محتاج ہیں۔ مثلاً قرآن "اقامت الصلوٰۃ" کا حکم دے کر خاموش ہوجاتا ہے اور یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنّت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا کیا مطلب ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا "صلو کما رایتمونی" (نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) لوگوں نے جب تک آپؐ کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھ نہ لیا اس وقت تک اقامت صلوٰۃ کا مطلب سمجھ میں نہ آسکا۔ سنّت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنجوقتہ اذان و نماز با جماعت کا طریقہ، نماز کے اوقات، نماز ہیئت اس کی رکعتیں اور جمعہ و عیدین کی مخصوص نمازیں اور ان کی عملی صورت اور بہت سی تفاصیل بتائی ہیں۔ حدیث رسول قرآنی احکام کی عملی تفصیل اور قولی تفسیر ہے اگر سنت رسول سامنے نہ ہو تو کوئی شخص ایک رکعت نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اسی طرح دوسرے احکام کا معاملہ ہے۔

تدوینِ حدیث

اسلام میں چونکہ اطاعت رسول ابتدا ہی سے ایک لازمی امر تھا اس لئے صحابہ کرامؓ نے آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے حفظ و اشاعت کی طرف خاص توجہ دی۔ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے عہد میں سنّت رسول کا واحد اور مستند ذریعہ حدیث نبوی ہی تھا لہذا تدوین حدیث کے سلسلہ میں محدثین نے مقدور بھر کوششیں کیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حدیث کی کتابت عہد نبوی میں شروع ہوچکی تھی۔ عہد صحابہؓ اور عہد تابعینؒ میں مسلسل جاری رہی۔ مختلف علماء نے حدیث کے متعدد مجموعے مرتب کئے۔

بعد میں احادیث تشریح اور وضاحت نیز استنباط مسائل و احکام کے پیش نظر کئی علماء نے حدیث کے مجموعوں کی شرحیں تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حدیث کی معروف اقسام :۔

حدیث متواتر

وہ حدیث جس میں مندرجہ ذیل صفات ہوں :

۱۔ کثرت رواۃ۔
۲۔ ان راویوں کا جھوٹ پر اتفاق عادتاً محال اور ناممکن ہو۔
۳۔ یہ کثرت ابتدائے سند سے لے کر انتہائے سند تک بدستور قائم رہے
۴۔ وہ بات جو بیان کی جا رہی ہے جو اس حسنہ سے تعلق رکھتی ہو۔
۵۔ وہ خبر مفید علم یقینی ہو یعنی علم یقین کا فائدہ دینے والی۔

حدیث مرسل

اگر انتہائے سند میں یعنی تابعی کے بعد سکوت واقع ہو تو ایسی حدیث مرسل کہلاتی ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ مرسل کو مردود کی قسم اس لئے کہا جاتا ہے کہ محذوف راوی کا حال مجہول ہوتا ہے۔ وہ تابعی بھی ہوسکتا ہے اور صحابیؓ بھی اور تابعی ہونے کی صورت میں ضعیف بھی ہوسکتا ہے۔

حدیث مرفوع

اگر سلسلہ اسناد آنحضورؐ تک پہنچے تو یہ حدیث مرفوع کہلائے گی۔ حدیث کا مرفوع ہونا یا تو صریحاً ہوگا یا حکماً۔ اس کی آگے چھ اقسام ہیں :۔

۱۔ مرفوع قولی صریحی۔
۲۔ مرفوع فعلی صریحی۔
۳۔ مرفوع تقریری صریحی۔
۴۔ مرفوع قولی حکمی۔
۵۔ مرفوع فعلی حکمی۔
۶۔ مرفوع تقریری حکمی۔

حدیث موقوف

اگر سلسلہ اسناد صحابی تک پہنچے تو وہ روایت موقوف کہلائے گی۔ جیسے کہا جائے قال او فعل ابن عمر۔ یا عن ابن عمر موقوفاً

حدیث مقلوب المتن

وہ حدیث جس کے متن میں تقدیم و تاخیر ہوجائے۔

حدیث مقطوع

اگر سلسلہ اسناد تابعی یا تبع تابعی تک پہنچ کر ختم ہوجائے تو وہ حدیث مقطوع کہلاتی ہے۔

حدیث متروک

وہ حدیث جس کے راوی پر کذب کی تہمت ہو یعنی حدیث نبویؐ میں اس کا کذب ثابت نہ ہو لیکن عام گفتگو میں دروغ گو مشہور ہو۔

حدیث مرسل خفی

ہم عصر غیر ملاقی کی روایت کو مرسل خفی کہا جاتا ہے۔

حدیث احاد

اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی روایت میں اس قدر کثرت نہ ہو جیسی کہ متواتر میں۔

حدیث حسن

احاد مقبول کی ایک قسم ہے یعنی وہ حدیث جو صحیح کی طرح ہو لیکن راویوں کا درجہ حفظ و یاد وغیرہ میں صحیح کے راویوں سے کم ہو۔ مگر عمل کرنے میں دونوں برابر ہیں اور دونوں حجت ہیں۔ البتہ یہ صحیح سے رتبہ میں کم ہے۔

حدیث شاذ

شاذ کے لغوی معنی تنہا کے ہیں اور اصطلاحاً شذوذ سے مراد راوی کا اپنے سے زیادہ ثقہ اور راجح کی مخالفت کرنا ہے۔

حدیث صحیح

احاد مقبول کی ایک قسم ہے یعنی وہ حدیث کہ جس کو پرہیزگار، دیندار، خوب یاد رکھنے والوں نے ہر زمانے میں برابر روایت کیا ہے۔ اس میں کوئی عیب پوشیدہ نہ ہو اور معتبر لوگوں کی مخالفت بھی نہ ہو۔

حدیث ضعیف

وہ حدیث جو صحیح اور حسن کے مخالف ہو یا اس کے راوی میں ضعف کی کوئی وجہ مثلاً نقصانِ حفظ یا فسق یا جہالت یا بدعت وغیرہ پائی جاتی ہو یا اس کا راوی درمیان سے ساقط ہوگیا ہو یا اس کے راوی پر لوگ طعن کرتے ہوں

Marfat.com

حدیث عزیز

وہ حدیث جس کو ہر زمانے میں دو راویوں نے روایت کیا ہو۔ یہ حدیث احاد کی ایک قسم ہے۔

حدیث غریب

وہ حدیث ہے جس کی روایت کسی زمانے میں ایک ہی راوی سے ہو۔ یہ بھی احاد کی قسم ہے۔

حدیث متروک

وہ موضوع حدیث ہے جس کے راوی پر جھوٹ کی تہمت لگی ہو۔

حدیث مدلس

جس کے راوی نے اپنے شیخ کو کسی مصلحت سے حذف کر دیا ہو اور اس کا نام نہ لیا ہو۔

حدیث مشہور

جسے ہر زمانے میں تین یا تین سے زیادہ راویوں نے روایت کیا ہو۔ یہ حدیث احاد کی ایک قسم ہے۔

حدیث منکر

وہ حدیث ضعیف ہے جس کا راوی بہت غلطی کرتا ہو، غافل ہو یا اس کو وہم ہو یا اس کی روایت سچے لوگوں کی روایت کے مخالف ہو یا وہ فاسق ہو یا بدعتی۔

کتب حدیث

وضع و ترتیب مسائل کے لحاظ سے محدثین نے کتب حدیث کی نو، دس اقسام بیان کی ہیں:۔

۱۔ **جامع**: وہ کتاب حدیث جس میں ہر قسم کے مسائل کی احادیث جیسے عقائد، احکام، آداب، تفسیر، تاریخ، سیر، شمائل، فتن، علامات قیامت مناقب و مثالب مندرج ہوں۔ جیسے جامع البخاری، جامع الترمذی۔

۲۔ **سنن**: وہ کتاب حدیث جس میں احکام کی روایات فقہی ترتیب کے موافق بیان کی ہوں جیسے سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ۔

۳۔ **مسند**: جس میں صحابہ کرام کی ترتیب رتبی یا ترتیب حروف ہجار یا تقدم و تاخیر اسلامی کے لحاظ سے احادیث مذکور ہوں جیسے مسند امام احمد بن حنبل، مسند دارمی، مسند موسیٰ کاظم وغیرہ۔

۴۔ **معجم**: وہ کتاب حدیث جس میں وضع احادیث میں ترتیب اساتذہ کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ جیسے معجم الطبرانی، الکبیر المتوسط الصغیر۔

۵۔ **مستدرک**: جس کتاب حدیث میں کسی دوسری کتاب کی شرائط صحت کے موافق اس کی رہی ہوئی حدیثوں کو پورا کر دیا گیا ہو۔ جیسے مستدرک حاکم علی الصحیحین۔

۶۔ **مستخرج**: مستخرج وہ کتاب حدیث جس میں کسی دوسری کتاب کی احادیث کی زائد اسناد کا استخراج کیا گیا ہو۔ جیسے مستخرج ابوبکر اسماعیلی البخاری، مستخرج ابوعوانہ علی صحیح مسلم وغیرہ۔

۷۔ **جزء**: وہ کتاب حدیث جس میں فقط ایک مسئلہ کی احادیث یکجا کر دی گئی ہوں۔ جیسے جزء القراۃ بلبیہقی۔ جزء رفع یدین بلبخاری۔

۸۔ **مفرد**: جس میں صرف ایک شخص کی کل مرویات کا ذکر ہو مثلاً مفرد ابی بکرؓ

۹۔ **اربعین**: وہ کتاب حدیث جس میں جا بجا سے منقول چالیس احادیث کو منتخب کر کے درج کیا گیا ہو۔ جیسے اربعین نووی۔

صحابہ کرامؓ شب و روز آنحضورؐ کی خدمت میں رہتے تھے اور براہ راست آپؐ سے احادیث سنتے تھے۔ تمام صحابہ ثقہ اور قابل اعتماد تھے۔ بعد میں جب دوسرے لوگوں نے ان کی جگہ لی تو ان کے بارے میں ان احتیاط کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے محدثین نے حدیث کی چھان پھٹک کے لئے کچھ اصول روایت و درایت قائم کئے۔ چنانچہ وہ ہر حدیث کو ان اصولوں پر جانچتے اور پرکھتے تھے۔ مندرجہ بالا اقسام احادیث انہی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ محدثین نے اصول درایت قائم کر کے بتایا کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت مجروح ہو جاتی ہے۔ اور قابل اعتبار و اعتماد نہیں رہتی۔

۱۔ جب کوئی حدیث عقل و فہم کے منافی و معارض ہو۔
۲۔ کسی اصول مسلمہ سے معارض ہو۔
۳۔ محسوسات و مشاہدات سے معارض ہو۔
۴۔ قرآن مجید سے معارض ہو۔
۵۔ سنت نبوی سے معارض ہو۔
۶۔ حدیث متواتر سے معارض ہو۔
۷۔ اجماع قطعی و یقینی سے معارض ہو۔
۸۔ معمولی فروگذاشت پر ابدی اور سخت عذاب کی دھمکی پر مشتمل ہو۔
۹۔ رکیک المعنی ہو اور اس شائبہ لغویت پایا جاتا ہو۔
۱۰۔ اسے صرف ایک راوی روایت کرے۔ حالانکہ اس میں کوئی قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آیا ہوتا تو بہت سے لوگوں کو اس سے واقف و آگاہ ہونا چاہیئے تھا۔
۱۱۔ اس میں ایسی فضول باتیں ہوں جو آنحضورؐ کی زبان مبارک سے نہیں نکل سکتیں۔
۱۲۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو۔
۱۳۔ اس میں آئندہ واقعات کی بقید تاریخ و وقت کھلی کھلی پیشگوئی بیان کی گئی ہو۔
۱۴۔ حضرت خضر کے متعلق باتیں۔

حدیث قدسی

مقدس حدیث۔ اس کو حدیث الٰہی بھی کہتے ہیں۔ اصطلاح میں ایسی حدیث جس میں الفاظ اللہ تعالےٰ کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ آنحضورؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوتے ہیں۔ حدیث قدسی قرآن حکیم سے مختلف ہے۔

حدیث قدسی کے لئے ضروری نہیں کہ جبرائیل کی وساطت سے آئی ہو وہ بذریعہ الہام بھی آسکتی ہے اور حالت خواب میں بھی۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حدیث قدسی کے الفاظ اللہ تعالےٰ کے ہوتے ہیں جبکہ علماء کی اکثریت کی رائے ہے کہ یہ بعینہٖ اللہ تعالےٰ کے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالےٰ کے معنی و مفہوم کو آنحضورؐ الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ حدیث قدسی کو نماز میں تلاوت نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی حدیث قدسی کا حوالہ دیتے وقت یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا حدیث قدسی کو کتب حدیث میں کوئی جداگانہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ بعض مجموعے صحاح ستہ سے مرتب کئے گئے ہیں۔

حدید، سورۃ

قرآن مجید کی ۵۷ ویں سورۃ۔ (دیکھئے "الحدید، سورۃ")

Marfat.com

حدیدہ

عرب کی ایک بندرگاہ اور حدیدہ نامی صوبے کا دارالحکومت جو بحیرۂ احمر میں صنعا کے شمال اور شمال مغرب میں تقریباً ایک سو دس میل کے فاصلے پر واقع ہے حدیدہ یمن کی سب سے اہم بندرگاہ ہے وسطی افریقہ سے آنے والے حاجیوں کے جہاز یہیں لنگر انداز ہوتے ہیں۔

پہلے حدیدہ صنعا کے امام کے زیر نگین تھا۔ ۱۸۳۷ء میں ابراہیم پاشا اس شہر کا کمانڈر تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ شہر یمن کی ولایت کا ایک حصہ تھا۔ لیکن بعد میں اس نے ایک الگ ولایت کی حیثیت اختیار کر لی۔

یہ قلعہ بند شہر ہے جس کے چاروں طرف نخلستان اور پھلوں کے باغات ہیں یہاں کے بازار چھوٹے مگر گنجان آباد ہیں۔ امیر تاجروں کے مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ بڑے بازار میں تمام ضروریات زندگی کا وافر ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ مضافات میں عربوں کے علاوہ بہت سے ہندوستانی، پاکستانی، سومالی، ایرانی، یہودی اور حبشی آباد ہیں حدیدہ کی آب و ہوا صحت افزا ہے۔ حدیدہ کی بندرگاہ سے قہوہ، کھالیں، باجرہ، خشک میوہ جات، کھجور، لوبان، بیروزہ، کپڑا اور موتی دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ حدیدہ صوبے کی آبادی تقریباً ۶ لاکھ ۶۰ ہزار اور شہر کی آبادی ۵۰ ہزار ہے۔

حذقیل

ایک پیغمبر کا نام (دیکھئے "حزقی ایل")

حذیفہ بن یمان

ایک جلیل القدر صحابی۔

(ـــــ ؟ ـــــ ۳۵ھ / ۶۵۵ء یا ۳۶ھ / ۶۵۶ء)

ابوعبداللہ کنیت۔ آپؓ آنحضرتؐ کے ہمراز تھے۔ آپؓ سے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابودرداءؓ وغیرہ صحابہؓ اور تابعینؒ نے روایت کی ہے۔ آپؓ کی وفات مدائن میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے چالیس روز بعد ہوئی۔ آپؓ بڑے نیک اور زہد و ورع میں بہت آگے تھے۔

حذیفہ مرعشی

ایک بزرگ اور ولی اللہ۔ آپ نواح شام میں مرعش نامی مقام کے رہنے والے تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ قرأت بہت عمدہ کرتے تھے۔ آپ نے باطنی علوم خواجہ ابراہیم ادھم سے حاصل کیا۔ جب آپ نے مرشد کی خدمت میں حاضری دی تو انہوں نے آپ کو گلے سے لگا کر فرمایا، اطمینان رکھو۔ تم عنقریب اپنے مقصد میں اونچے درجے کو پہنچو گے۔ چنانچہ آپ نے حضرت خواجہ ادھم کی بیعت کی اور تقریباً ملازمت حاصل کیا۔ آپ تقریباً چھ ماہ تک پیر و مرشد کی خدمت میں گوشہ نشین ہو کر عبادت الٰہی میں مصروف رہے۔ خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سلوک کے راستے کے لئے جس بات کی ضرورت ہے وہ تم میں موجود ہے چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں آپ کمال کے درجے تک پہنچ گئے۔ جب مرشد کا وقت وصال آیا تو انہوں نے آپ کو بلا کر اپنی جانشینی کا شرف بخشا اور ہدایت فرمائی کہ خلق خدا کی رہنمائی کرو۔ نیز فرمایا:

"اے حذیفہ! دنیا کی طرف ہرگز توجہ نہ دینا اور ہمیشہ اپنے پیران طریقت کے راستے پر چلنا۔ یاد رکھو دنیا درویشوں کی رہزن ہے۔"

آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے واقف اسرار اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ زہد و ورع و تجرید میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کے زمانے کے بڑے بڑے بزرگ اور صاحب کمال شخصیتیں آپ کی مجلس میں کسب فیض کے لئے حاضر رہتی تھیں۔ آپ کو تنہائی پسند تھی۔ فقراء کی دوستی بھی عزیز تھی۔ اہل دنیا اور ان کی محبت سے اجتناب کرتے تھے آپ فرمایا کرتے تھے صحبت اپنا اثر ضرور رکھتی ہے خواہ ایک ساعت کی ہی کیوں نہ ہو۔

آپ ٹاٹ کا لباس پہنتے تھے اور ہر وقت آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ روتے کیوں رہتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ تو فرمایا اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک دوزخ میں مجھے معلوم نہیں کہ میں کس گروہ میں ہوں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ آپ فرماتے تھے کہ اچھے اعمال میں سے مجھے کوئی چیز گھر میں بیٹھنے سے افضل معلوم نہیں ہوتی اور اگر میرے پاس کوئی ایسی تدبیر ہوتی کہ فرد نفس کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہوتی تو میں ضرور اس پر عمل کرتا۔

حر

آزاد۔ سندھ (پاکستان) میں پیر پگاڑو کے مریدین کا لقب۔ یہ لوگ اپنے پیر و مرشد کے حکم پر اپنی زندگیاں قربان کر دینا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ حر بہت بہادر اور جیالے لوگ ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنے پیر صبغت اللہ کے حکم پر اسلام کی سربلندی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے انگریزوں نے انہیں کچلنے کے لئے فضائی، بری اور انتظامی طاقتوں سے پورا پورا کام لیا حروں کی اکثریت نے اس جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔ حر سالہا سال اس جنگ میں مصروف رہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان نے پاکستان پر اچانک حملہ کیا تو حروں نے ایک بار پھر اپنے پیر و مرشد کے حکم پر پاکستانی فوج کے دوش بدوش محاذ جنگ پر نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ حروں کا ایک مشہور نعرہ "بھیج پگارہ" ہے

حر العاملی

(۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۴ء ـــــ ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء - ۱۷۰۹ء) ایک شیعہ عالم۔ محمد بن الحسن بن علی بن حسین عاملی لقب تھا۔ جبل عامل کے علاقے مشغر میں پیدا ہوا۔ مشغر ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر شیخ حسین طاہر اور زین الدین سے جبع میں علم حاصل کیا۔ جبل عامل میں چالیس سال تک رہائش اختیار کئے رکھی۔ دو بار حج بیت اللہ کیا۔ دوسری بار حج کے سفر میں اصفہان سے گزرے جہاں محمد باقر مجلسی نے ان کا استقبال کیا عمر کا آخری حصہ مشہد میں امام علی رضا کے روضۂ مبارک میں شیخ الاسلام کی حیثیت سے گزارا۔

شیخ محمد نے مشہد ہی میں وفات پائی اور مرزا جعفر کے مدرسے سے متصل دفن ہوئے۔ ان میں حد درجہ سادگی تھی یہی وجہ ہے کہ جب شاہ سلیمان نے انہیں دیکھا تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ ان میں شیخ والی کوئی خو بو نہ تھی۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "تفصیل وسائل الشیعہ الی احکام الشریعہ" ہے جو احادیث کا وسیع

Marfat.com

مجموعہ ہے۔ ان کے مخالف بھی اس مجموعے کی وسعت اور فضیلت تسلیم کرتے ہیں۔ علم حدیث میں ان کی دوسری تصنیف "جواہر السنۃ فی الاحادیث القدسیہ" ہے جو احادیث قدسی کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے اپنی تیسری تصنیف "اثنا عشریہ فی رد الصوفیہ" میں تصوف سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ ان کی ایک اور مشہور تصنیف "وسائل امل الامل فی علماء جبل عامل" ہے جو انہوں نے اپنے وطن کے علماء کے بارے میں لکھی۔

حرا، غار

مکہ معظمہ سے شمال مشرق کی سمت تین میل کے فاصلے پر واقع غار۔ اس کے بالمقابل جبل ثبیر نامی مشہور پہاڑ ہے۔ ان پہاڑوں پر خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اگتا۔ حرا، جبل ثبیر سے زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ اس کے اوپر ایک سیدھی ڈھلوان اور پھسلوان چوٹی ہے۔ اس چوٹی پر آنحضورؐ اپنے صحابہ کے ساتھ ایک مرتبہ چڑھے تھے۔ بعثت سے پہلے آنحضورؐ اسی غار میں کئی کئی دن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بسر کرتے تھے۔ جب سامانِ خورد و نوش ختم ہو جاتا تو آپؐ گھر تشریف لے آتے۔ پھر کھانے کا سامان لے کر واپس اسی غار میں آجاتے۔ اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ غارِ حرا ہی میں آنحضورؐ پر پہلی وحی مبارک نازل ہوئی۔

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کو۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔" (۹۶ : ۱ تا ۵)

جب وحی نازل ہوئی تو آپ کی عمر چالیس سال تھی اور رمضان المبارک کی ۲۷ ویں تاریخ تھی۔ بقول ابن حزم "آنحضورؐ ارادۂ الٰہی کے تحت غارِ حرا میں تشریف لے جاتے۔ نہ تو آپؐ نے کسی کو وہاں جاتے دیکھا کہ آپ اس کی تقلید کرتے۔"

آج کل حاجی لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جاتے ہیں

حرارزم

(؟ —— شعبان ۵۵۹ھ / جولائی ۱۰۶۳ء) ابوالحسن علی بن اسماعیل بن محمد بن عبداللہ امام غزالی کے مکتبِ فکر کا ایک فقیہہ اور صوفی۔ فاس کا رہنے والا تھا۔ اوائل عمر ہی میں اس کے تعلقات شیخ ابوالفضل ابن النحوی سے قائم ہو گئے تھے۔ ابوالفضل امام غزالی کے افکار کا پیرو تھا۔ بعد میں اس نے اپنے چچا ابوصالح محمد بن حرزہم سے امام غزالی کے تصوف سے واقفیت حاصل کی اسے فاس میں نہایت ذہین لوگوں سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

حرارزم مرابطی عہدِ حکومت کے کٹھن ایام میں جب کہ عدالتِ احتساب کی سختی اور طاقت بڑھتی جا رہی تھی اپنے نظریات پر سختی سے ڈٹا رہا۔ ان حالات میں اسے خوف و ہراس کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے اربابِ اقتدار کی دھمکیوں اور مطالبات کے پیشِ نظر اپنے گھر میں رکھی ہوئی امام غزالی کی کتاب "احیاء علوم الدین" کو جلانے کا تہیہ کر لیا لیکن وہ ایک غیبی تنبیہ کی وجہ سے ایسا کرنے سے باز رہا۔ بعض اوقات اسے اپنے افکار کی حفاظت کے لئے اپنی جان تک خطرے میں ڈالنا پڑی اسے فاس میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں جہاں ابویعزا نامی ایک ولی کی مداخلت سے اس کی جان بخشی ہوئی۔

اس نے مرابطیوں [illegible] نجات پائی۔ حرارزم کا مزار سیدی حرارزم میں ہے جو فاس [illegible] واقع ہے۔ قصبے کے لوگ بکثرت اس کے مزار پر آتے جاتے رہتے ہیں۔

حرارزم نہایت دلیر اور علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھا۔ اس نے جرأت سے کام لے کر خاص طور پر اندلس اور کسی حد تک مغرب اقصیٰ میں مرابطیوں کی عدالتِ احتساب کی سختیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف پر زور احتجاج کیا۔

حرام

حلال کی ضد، وہ چیز جو از روئے شریعت ممنوع ہو۔ (دیکھئے حلال و حرام)

حرّان

ایک شہر جہاں کے باشندوں کا مذہب بت پرستی تھا۔ شمالی عراق میں چھوٹے سے دریا جلاب پر واقع ہے جہاں ایشیائے کوچک شام اور عراق کو جانے والے اہم کاروانی راستے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔

آج کل یہ ترکی مقبوضات میں شامل ہے۔ بقول یاقوت "حران اقلیم چہارم میں واقع ہے اور ارفہ سے صرف ایک دن کی اور رقہ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ حران ایک قدیم شہر ہے اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی جائے پیدائش خیال کیا جاتا ہے یہ چاند دیوتا سین کا گھر تھا۔" البیرونی نے اسے سین ہی سے منسوب کیا ہے اس شہر کی شکل چاند سے مشابہ ہے۔

حران شہر پر عربوں نے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ۱۹ھ/ ۶۴۰ء میں بغیر لڑائی کے قبضہ کیا تھا۔ اس دور میں یہ شہر دیار مضر کے اہم ترین شہروں میں سے تھا البلاذری نے لکھا ہے کہ اس شہر نے عیاض بن غنمؓ کے آگے ہتھیار ڈالے تھے۔ ابن ابی اصیبعہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے طب کے ایک مدرسے کو اسکندریہ سے حران میں منتقل کر دیا تھا۔ مروان ثانی نے یہاں سکونت اختیار کر کے اسے اموی سلطنت کا دارالحکومت بنایا۔ حران کی پہلی مسجد اس کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ یعقوبی کے بقول مروان نے اپنا محل اس مقام پر بنایا تھا جو دابالبین کہلاتا تھا اور اس کی تعمیر پر ایک کروڑ درہم خرچ کئے تھے۔ جب بنو عباس نے ایران اور عراق کے بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا تو مروان ثانی عباسی فوج سے جنگ کرنے کے لئے حران ہی سے بارہ ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوا تھا۔ ہارون الرشید نے دریائے جلاب سے حران تک ایک نہر بنوائی تھی۔

عباسی عہد کے آغاز میں یہ شہر مترجمین کے ایک اہم مکتب کا گھر تھا۔ مشہور مترجم البتانی بھی حران ہی کا باشندہ تھا یہ شہر حنبلیوں کا بھی اہم مرکز تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے اس شہر پر ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء میں قبضہ کیا۔ سلطان صلاح الدین نے اپنے عہدِ حکومت میں شہر کی جامع مسجد کی توسیع کی۔ کیونکہ اس کے عہد میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ ۵۸۷ھ/ ۱۱۹۱ء میں صلاح الدین نے حران اپنے بھائی ملک عادل کو پیش کر دیا جس نے قلعے کو از سرِ نو تعمیر کیا۔

مشہور عالمِ دین امام ابن تیمیہ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۱ء میں حران پر ناکام مہم کے بعد مغول نے یہاں کے باشندوں کو موصل اور ماردین میں منتقل کر کے اس شہر کی مسجدوں اور دیگر عمارتوں کو تباہ کر ڈالا۔ اور دروازوں کو اینٹوں سے چنوا دیا۔

Marfat.com

آجکل پورا شہر نہایت خراب و خستہ حالت میں ہے اور یہاں صرف خانہ بدوش بدو آباد ہیں۔ شہر کی یادگار عمارتوں اور کھنڈروں میں بڑی مسجد یا جامع الفردوس قلعہ، ایک باسیلکی کلیسا، مسجد کے جنوب میں ایک بڑا ٹیلا مقبرہ شیخ حیات وغیرہ ہیں۔

حرب

قتال، دو یا دو سے زائد فریقوں میں حالت جنگ۔ عہد جاہلیت میں کسی منظم حکومت کی عدم موجودگی کی وجہ سے قبائل اکثر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں ہونے والی جنگوں کا مقصد عام طور پر انتقام لینا ہوتا تھا۔ اسلام نے اس غایت جنگ کو ممنوع قرار دیا۔ اور صرف اسی جنگ کو جائز قرار دیا جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ یا دفاع ہو۔ (دیکھئے "جہاد")

حرب لعاث

زمانہ جاہلیت کی ایک مشہور و معروف لڑائی جو قبیلہ بنی اوس اور بنی خزرج کے مابین مسلسل بیس سال تک لڑی جاتی رہی۔ آخر اسلام نے ان دونوں قبیلوں کی باہمی رنجش اور دشمنی کو ختم کر کے انہیں باہم گلے ملا دیا۔ اس لڑائی کے چھ سال بعد آنحضورؐ نے مدینہ ہجرت کی۔

حرب بن امیہ

بن شمس، ابوسفیان کا باپ اور ابولہب کا خسر۔ حرب مکے کی اہم شخصیتوں میں سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے عربی تحریر استعمال کی۔ وہ ان پہلے اشخاص میں سے ہے جنہوں نے شراب ترک کی۔ حرب آنحضورؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا ساتھی تھا۔ وہ فوجی قائد کے طور پر ان کا جانشین ہوا۔ اس نے حرب فجار میں قبیلہ عبد شمس اور بعض راویوں کے مطابق قریش کی قیادت کی۔ حرب کے بعد قیادت بنو ہاشم میں آئی۔

حرب بنو

ایک طاقت ور یمنی الاصل عربی قبیلہ جو مکہ اور مدینے کے درمیان دو بڑی جماعتوں یعنی بنو سالم اور بنو مسروح میں منقسم ہے۔ بنو سالم میں مندرجہ ذیل اہم خاندان شامل ہیں:

الاحامدہ، الصبح، عمرو، معرہ، ولد سلیم، تمیم، مزینہ، الحوازم اور السعادین۔

بنو مسروح میں یہ اور بعض دوسرے خاندان شامل ہیں:

سعدی، لحبہ، البشر، الحمران، علی، الجہم اور بنو عمرو۔

بنو سالم کے حسب ذیل گاؤں مدینے اور ینبع کے مابین اور وادی فرا کے کنارے آباد ہیں:

الجدیدہ، ام شیان، الکیف، دار الحمرہ، الکسہ، الحزمتہ، الواسطہ، المسانیہ الصفرا، جہاں وسیع نخلستان اور ایک بڑی منڈی ہے۔ یہاں پر مکے کا اصلی بلسم بھی فروخت ہوتا ہے۔ بنو حرب کے کچھ لوگ وادی الخمض لیث کی چھوٹی بندرگاہ اور جبل مجزہ میں بھی رہتے ہیں۔

حرب فجار

زمانہ جاہلیت کی ایک لڑائی۔ یہ لڑائی ۱۵ عام الفیل میں قریش اور بنی قیس کے درمیان لڑی گئی۔ حرب فجار لڑنے کے ممنوعہ دنوں میں لڑی گئی اس لئے اسے حرب فجار کا نام دیا گیا ہے۔ اس لڑائی میں آنحضورؐ بھی شریک ہوئے۔ اگرچہ قریش حق پر تھے لیکن آپ نے کشت و خون میں حصہ نہ لیا۔ آپ صرف دشمن کے پھینکے ہوئے تیر اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے رہے۔ یہ لڑائی صلح پر منتج ہوئی۔ چنانچہ اس میں معاہدہ کیا گیا کہ ملک میں ہر طرح سے امن و امان قائم رکھا جائے اور مسافروں، غریبوں اور مظلوموں کی، خواہ وہ کسی قبیلے سے ہو مدد کی جائے۔

آنحضورؐ عہد رسالت میں بھی اس معاہدے پر فخر فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اس معاہدے کے لئے میں اب بھی حاضر ہوں۔ اس معاہدے کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ کیونکہ اس معاہدہ پر آمادہ کرنے والے تین سرداروں کے نام میں لفظ "فضل" شریک تھا۔

حربن عبدالرحمٰن الثقفی

(دور حکومت ۹۸ھ/ ۷۱۷ء — ۱۰۰ھ/ ۷۱۹ء) اندلس کا ایک والی۔ اس نے اپنے دور حکومت میں اندلس کے بہت سے اضلاع کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ اپنے تین سالہ دور حکومت میں اس نے جبل البرانس کی دوسری جانب حملے شروع کئے۔ عرب تواریخ میں اس بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ عیسائی مصنفین نے اسے "الاھر" لکھا ہے۔ ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی اس سے ڈرتے تھے۔ بعض لوگ اس کے مطالبات کی وجہ سے اس کے خلاف تھے۔ اسی وجہ سے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اسے برطرف کر دیا۔

حربن یزید

(— ؟ — ۱۰ محرم ۶۱ھ/ ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء) عبیداللہ بن زیادہ کی فوج کا امیر لشکر بن ناجیہ بن قعسب بن عتاب بن الحارث بن عمرو بن ہمام الریاحی۔

حر ایک ہزار سواروں کا لشکر قادسیہ سے لا کر ان فوجوں کے ہراول دستے میں شامل ہو گیا جو عراق کے والی عبیداللہ بن زیاد نے حضرت امام حسینؓ کے مقابلے کے لئے بھیجی تھیں۔ اس وقت حضرت امام حسینؓ اپنے عزیزوں اور ہمراہیوں کے ساتھ کوفے کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ چنانچہ حر کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت امام حسینؓ کی جماعت کا بالکل نزدیک سے تعاقب کرے اور انہیں کوفے میں عبیداللہ بن زیاد کے پاس لے آئے۔ حر کو جنگ کرنے اور قتل و غارت سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ حضرت امام حسینؓ کے کیمپ کے بالکل قریب رہا اور انہیں مدینے واپس نہ جانے دیا۔ آخر کار حر اس بات پر راضی ہو گیا کہ آپؓ کوفے جانے کا ارادہ ترک کر کے کسی دوسری طرف نکل جائیں۔ ابتدا میں حضرت امام حسینؓ سے حر کے تعلقات مخالفانہ نہیں تھے۔ چنانچہ وہ کبھی کبھی آپؓ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتا تھا۔

بعد میں عبیداللہ بن زیاد نے حر کو حکم دیا کہ حضرت امام حسینؓ کو کسی آباد جگہ نہ جانے دیا جائے تو اس نے آپؓ کو کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ جب عمر بن سعد بن ابی وقاص کو عبیداللہ بن زیاد نے امیر لشکر بنایا اور اس نے امام حسینؓ کی تجاویز کو رد کرتے ہوئے ان سے جنگ کرنے کا فیصلہ

Marfat.com

کربلا تو حُر نے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جا ملنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ آپ کی حالت مخالف فریق کے مقابلے میں کمزور ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے اس کے لئے دعائے مغفرت کی دعا کی۔ حُرؓ نے میدان کربلا میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ مگر بالآخر اُسے شہید کر دیا گیا۔

حربہ

نیزہ۔ حربہ قائد جیش اور شیخ قبیلہ وغیرہ کا نشان خاص ہوتا تھا۔ روایت ہے کہ فرعون کے لشکر کے سردار ہامان کے ہاتھ میں حربہ تھا۔ ایک اور روایت میں آنحضورؐ کو حبشہ سے ایک حربہ یا عنزہ بطور تحفہ آیا تھا۔ موجودہ دور میں بھی ایسے عصا اہل حبشہ کی مذہبی رسوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسلامی رسم و رواج میں حربہ کا وہی مصرف ہے جو عنزہ کا ہے۔

حربیہ

ترکوں کا عسکری تربیت دینے والا ادارہ۔ اٹھارھویں صدی میں عثمانی سلطنت میں فوجی تربیت سے متعلق نئی اصلاحات ہوئیں۔ اس دور میں سلطان محمد ثانی کی نئی فوج کے لئے کئی تربیتی مرکز استانبول میں قائم کئے گئے۔ ان میں "اکلای مکتب حربیہ سی"، توپخانہ، عامرہ مکتبی اور مکتب حربیہ شاہانہ شامل تھے۔ ۱۸۴۶ء میں ان سب کو استانبول کے محلے پانگ آلتی میں واقع ایک مرکزی مکتب حربیہ میں اکٹھا کر دیا گیا۔ اس میں ان ثانوی مکتبوں کے طالب علموں کو داخل کیا جاتا تھا، جو استانبول اور بعض دوسرے شہروں میں قائم کئے گئے تھے۔ حربیہ کے نصاب تعلیم میں مخصوص فوجی مضامین کے علاوہ حساب اور غیر ملکی زبانوں پر زور دیا جاتا تھا ۱۸۴۸ء میں دو سالہ نصاب کے بعد مزید دو سال کا نصاب جاری کیا گیا۔ یہ نصاب جنرل سٹاف کے افسروں کے لئے تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کا عرصہ دو سے بڑھا کر تین برس کر دیا گیا۔

۱۹۰۹ء میں مکتب حربیہ میں نو جرمن، آٹھ ترک اور دو ارمنی اساتذہ شامل تھے۔ پہلی عالمی جنگ کی ابتداء پر اس مکتب کے اساتذہ اور طالب علموں کو فوجی ملازمت میں لے لیا گیا۔ اس طرح یہ مکتب معطل ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں مصطفےٰ کمال پاشا کے زیر نگرانی انقرہ کے قریب جبہ جی میں ایک عارضی مکتب حرب کھولا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں پانگ آلتی کا مکتب حربیہ دوبارہ کھولا گیا اور اس کا نام حرب اوکولو رکھا گیا اسے انقرہ کی ایک نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان حربیہ سے ۲۷۹۹ لفٹیننٹوں نے سند حاصل کی۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان سند حاصل کرنے والوں کی سالانہ اوسط ۲۵ سے ۱۰۰ تک ہو گئی۔ انیسویں صدی کے اختتام پر یہ تعداد پانچسو سے بڑھ گئی۔

تعلیم و تعلّم کو مغربی رنگ میں رنگنے کی عثمانی اصلاحات میں حربیہ کا قیام اولین دیرپا اقدامات میں سے ایک تھا۔ اس کے طلباء اور سند یافتگان شروع ہی سے سیاسی انقلاب میں پیش پیش رہے۔ اتحاد و ترقی جمعیتی کے نام سے ایک انجمن ۱۸۳۹ء میں علیحدہ فوجی طبی کالج میں خفیہ طور پر قائم کی گئی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک فوجی عدالت میں حربیہ کے طلباء پر تخریبی سرگرمیوں کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور ان میں سے اٹھارہ کو لیبیا میں جلاوطن کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں حربیہ کے اساتذہ اور طلباء کا ان دو ناکام انقلابی تحریکوں میں بھی نمایاں حصہ تھا جو کرنل طلعت یدیمیر کی قیادت میں ابھری تھیں

حرس

ہوس۔ (دیکھئے "لالچ")

حرکت وسکون

۱۔ یہ اصطلاح فلسفۂ الٰہیات اور نحو میں استعمال ہوتی ہے۔ فلسفہ الٰہیات میں فلاسفہ اپنے تصور کی بنیاد یونانی نظریات پر قائم کرتے ہیں۔ چنانچہ کندی ارسطو کی طرح زمان اور حرکت کے مابین تعلق قائم کرتے ہوئے جب یہ کہتا ہے کہ زمان ایک مدت ہے جس کا شمار حرکت سے کیا جاتا ہے تو اصل میں وہ ارسطو ہی کے خیال کو نقل کرتا ہے۔ زمان سے مراد تعداد حرکت ہے اور وہ اسے حرکت ما قبل سے مطابقت دیتا ہے۔ حرکت کے لئے کسی حرکت پذیر شے، یعنی ایک جسم کا وجود لازم ہے جہاں تک اعداد کا تعلق ہے سریع حرکت اور دھیمی حرکت میں تمیز کی جاتی ہے۔ چنانچہ حرکت سریعہ وہ ہے جو کسی اور فاصلے کے برابر فاصلہ اس وقت سے کم وقت میں طے کرتی ہے جس میں دوسرا فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔ اگر طے شدہ فاصلے کی نسبت سے دو حرکتوں کی مساوات کا خیال کیا جائے تو حرکت سریعہ کا وقت کم تر ہوتا ہے اور اگر وقت کی نسبت سے اس مساوات کو لیا جائے تو حرکت سریعہ کا طے کیا ہوا فاصلہ زیادہ ہوتا ہے۔ سکون کی ایک ایسی قسم بھی ہے جو مادے کے جمود سے قریب تر ہے جس سے حرکت صادر ہوتی ہے۔ ہر فاعل جس سے فعل صادر ہوتا ہے ایک ایسی علت کی طرف رجوع کرتا ہے جو ثبات اور سکون کی کیفیت کے بعد آنے والے ایک تغیر کا مدار ہے اسی کو حرکت کہتے ہیں۔

حرکت سے قبل سکون کے خیال کو اخوان الصفا نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ مثلاً جسم اپنی جسمیت کی وجہ سے قابل حرکت نہیں۔ جسم کو حرکت دینے والا ایک اور جوہر روح ہے۔ روح حیّ بالذات ہے۔ اس طرح حرکت زندگی ہے۔ بعض اجسام میں یہ ذاتی ہے جیسے آگ میں۔ جب اس کی حرکت بند ہوتی ہے اور یہ سکون کی حالت میں ہوتی ہے تو یہ بجھ جاتی ہے اور کہیں یہ عادت ہوتی ہے۔ جیسا کہ پانی ہوا اور زمین میں کہ اگر ان کی حرکت رک بھی جائے تو ان کا وجود برقرار رہتا ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت:

"اللہ ہی نے تمہارے لئے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو"

(۴۰ : ۶۱)

کی تشریح اور تفسیر میں امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ حرکات تھکن پیدا کرتی ہیں کیونکہ وہ لازمی طور پر حرارت اور خشکی پیدا کرتی ہیں جو اذیت ہیجان کا باعث بنتی ہیں۔ مزید براں حرکات کی بڑی تعداد حیوانی جذبات کو منتشر کر دیتی ہے جو احساس میں حصہ لیتے ہیں اور حواس کی تیزی کند ہو جاتی ہے۔ اسی سے نیند آتی ہے۔

۲۔ عرب نحویوں کے نزدیک حرف متحرک ہوتا ہے یا ساکن۔ متحرک ہونے کی صورت میں صرف تین حرکات زیر، زبر، پیش میں سے کوئی ایک حرکت ہوتی ہے اور جب ساکن ہو تو اس پر حرکت کی بجائے سکون کی علامت (ـْ) ہوتی ہے۔ سکون کی ایک مخصوص صورت جزم (ـْ)، یعنی مضارع کے آخری حرف کا سکون

حرقوص بن زہیر سعدی

ایک سپہ سالار جس نے سوق الاھواز کو فتح کیا تھا۔ حرقوص کا نام پہلی مرتبہ عرب مورخین نے ۱۷ھ / ۶۳۸ء میں لیا ہے۔ جب ایرانی سپہ سالار ہرمزان کا دفاع کر رہا تھا اور مسلمانوں کو باوجود معاہدۂ صلح کے دھمکیاں دے رہا تھا۔ عتبہ بن غزوان، عامل بصرہ نے اس بات سے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کو مطلع کیا تو آپ نے حرقوص کی زیر قیادت فوجی دستے بھیجے انہوں نے فوج کے ساتھ ہرمزان کے خلاف پیش قدمی کی اور سوق الاہواز کے پُل کے اوپر اسے شکست دی۔ یہ حرقوص ہی تھا جس نے اس علاقے کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا۔ جب دربار خلافت میں فتح کی خبر اور مال غنیمت پہنچا تو حضرت عمرؓ نے حرقوص کو امیر القتال کا خطاب دیا اور اسے علاقے کا گورنر بھی مقرر کیا۔ لیکن جب ہرمزان کے خلاف دوبارہ فوج کشی کی گئی اور اس سے علاقہ واپس لیا گیا تو حرقوص نے اس معرکے میں ثانوی حیثیت سے شرکت کی۔ حرقوص بصرے میں دوبارہ ۳۵ھ / ۶۵۶ء میں نمودار ہوا جبکہ کوفے اور مصر سے مخالفین حضرت عثمانؓ کا ایک گروہ احتجاج کے لئے مدینے آیا تھا۔ چنانچہ حرقوص اس گروہ کا قائد تھا۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ کے گھر کے محاصرے، شہادت اور انتخاب حضرت علی میں حرقوص نے کوئی اہم حصہ نہیں لیا۔ جب حضرت عائشہؓ طلحہؓ اور ابن زبیرؓ حضرت علیؓ کے خلاف بصرے میں جمع ہوئے تو حرقوص ایک بار پھر بصرے میں تھا اور اس نے بصرے کے رئیس پولیس حکم بن جبلہ کی معیت میں اور شہادت عثمانؓ میں ملوث دوسرے لوگوں کے ساتھ اس معرکے میں شرکت کی۔

جنگ صفین میں حرقوص حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھا۔ لیکن بعد میں اس نے خوارج کی حمایت کر کے بالکل متضاد رویہ اختیار کر لیا۔ تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس نے جنگ حروراء میں بھی شرکت کی۔ جب حضرت علیؓ نے معاہدۂ صفین پر کاربند ہونے کا عوام میں اعلان کیا تو اس نے کوفے میں مخالفین علیؓ کے خفیہ اجتماع میں شرکت کی۔ جس میں خوارج نے حضرت علیؓ کے خلاف نہروان میں جمع ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

حرم

قابل عزت۔ قرآن مجید میں آیا ہے:

"اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لئے بہتر ہے۔" (۲۲ : ۳۰)

بخاری شریف کی ایک حدیث ہے:

"میں تجھے بیت اللہ کی عزت کی قسم دیتا ہوں۔"

قرآن و حدیث میں جہاں یہ لفظ آیا ہے ان سب جگہوں پر حرمت سے عزت و تعظیم ہی مراد ہے۔ حرم کے ایک اور معنی ممنوع کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں مکے مدینے اور ان کے گرداگرد کے چند میل کے علاقے کو حرم کہتے ہیں۔ اسے حرم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عزت قائم کی ہے اور ان مقامات پر بعض افعال اور اقدامات ممنوع ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں جنگ نہیں ہو سکتی۔ درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا۔ نیز اس میں داخل ہونے والا ہر گزند سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مکے اور اس کے ماحول کی حرمت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے قائم فرمائی تھی۔ ابن ماجہ کی حدیث ہے:

"الٰہی تو نے مکے کی حرمت حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے نافذ کی تھی اب میں تیرے ہی حکم سے مدینے کی حرمت کا اعلان کرتا ہوں۔ آئندہ سے مدینہ اپنے گرداگرد حرہ تک حرم ہے۔"

حرم کا لفظ زنان خانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جہاں غیر مرد نہ جا سکیں۔ نیز یہ لفظ اس کے مکینوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

حرمت رضاع

جب کوئی بچہ ماں کے سوا کسی اور عورت کا دودھ پیتا ہے تو وہ عورت اس کی ماں بن جاتی ہے۔ اس عورت کے ساتھ اور اس کی بیٹیوں، بہنوں وغیرہ کے ساتھ نکاح اس لڑکے کے لئے حرام ہو جاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اس کو حرمت رضاع کہتے ہیں۔

حرمین الشریفین

دو مقدس مقامات۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو حرمین شریفین یعنی دو مقدس اور قابل عزت مقامات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں مقامات کے خادم کے لقب کے لئے خادم الحرمین شریفین کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ (نیز دیکھئے "حرم")

حروراء

کوفے کے قریب ایک گاؤں، یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے پہلی بار خروج کیا تھا۔ یہ لوگ صفین کی جنگ میں حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے پیش کردہ تحکیم کے خلاف تھے۔ اگرچہ مقام صفین پر صرف چند لوگوں نے اپنی مخالفت کا اظہار کیا تھا لیکن بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ حروراء کے مقام پر ۳۷ھ / ۶۵۸ء میں جو لوگ جمع ہوئے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ حروریوں کے خروج سے فکر مند ہو کر حضرت علیؓ نے اپنے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کو ان کی طرف گفت و شنید کے لئے بھیجا۔ بعد ازاں خود بھی تشریف لائے۔ حروراء میں دو جنگیں ہوئیں۔ ایک ۶۷ھ / ۶۸۶ء میں اور دوسری ۳۱۵ھ / ۹۲۷ء میں۔

حروف مقطعات

حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ یہ سورۃ الشوریٰ کے ابتدا میں آئے ہیں۔

حروف مقطعات کے معنی کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سورتوں کے نام ہیں اور اسی غرض سے ان کے شروع میں آتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حروف دراصل کلمات محذوفہ کا اختصار ہیں۔ مثلاً الف سے مراد اللہ۔ میم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور لام سے مراد جبرائیلؑ ہیں۔ ابن عباسؓ نے اسی قول کا اظہار کیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک ان حروف کے اعداد سے اقوام عالم کی مدت اور زندگی مقصود ہے جبکہ دوسرے علماء کا خیال یہ ہے کہ حروف مقطعات اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہیں جو کسی کو معلوم نہیں۔ امام بیضاوی کے نزدیک ان کا مقصد اعجاز قرآن ثابت کرنا ہے۔ گویا ان کے ذکر سے عرب کے فصحا و عقلا کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب بھی انہیں حروف سے مرتب ہے جن سے وہ اپنا کلام ترتیب دیتے ہیں۔ حضرت

Marfat.com

عباسؓ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ان حروف میں اللہ کا اسمِ اعظم مخفی ہے۔

بقول مولانا مودودیؒ "جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیبِ بیان میں اس طرح کے حروفِ مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے نمونے ہیں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں جو تم بعض صورتوں کی ابتداء میں بولتے ہو اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے آنحضورؐ سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معنی متعین کرنا مشکل ہوگا۔

علیحدہ شکل میں، الگ کئے ہوئے۔ کٹے ہوئے حروف۔ اسلامی علوم کی اصطلاح میں مقطعات سے مراد وہ حروف ہیں جو قرآن کریم کی بعض سورتوں کے شروع میں الگ الگ واقع ہوئے ہیں۔ یہ حروفِ قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ ان میں سے دو مدنی سورتیں ہیں اور باقی سب مکی ہیں۔ یہ حروف قرآنی سورتوں کے شروع میں پانچ شکلوں میں موجود ہیں۔

۱۔ مفرد شکل میں یہ صرف تین جگہ آتے ہیں۔ ص، ق اور ن۔ یہ سورتیں بھی ان ہی حروف کے نام سے موسوم ہیں۔

۲۔ دو، دو کی شکل میں یہ نو مقامات پر آئے ہیں۔ طٰہٰ، طٰسٓ (النمل)، یٰسٓ اور حٰمٓ جو ان چھ سورتوں کے شروع میں واقع ہیں۔ المومن، حٰمٓ السجدہ، الزخرف، الدخان، الجاثیہ اور الاحقاف۔

۳۔ تین تین کی شکل میں یہ تیرہ سورتوں کے شروع میں آتے ہیں الٓمٓ جو ان چھ سورتوں کے شروع میں واقع ہیں۔

البقرہ، آل عمران، العنکبوت، الروم، لقمان اور السجدہ۔

الٓرٰ یہ ان پانچ سورتوں کے شروع میں آتے ہیں:

یونس، ہود، یوسف، ابراہیم، الحجر۔

طٰسٓمٓ یہ ان دو سورتوں کے شروع میں آتے ہیں:

الشعراء اور القصص۔

۴۔ چار چار کی شکل میں یہ صرف دو جگہ پر آئے ہیں:

الٓمٓصٓ سورۃ الاعراف کے شروع میں اور الٓمٓرٰ سورۃ الرعد کے شروع میں۔

۵۔ پانچ پانچ کی شکل میں یہ دو مقامات پر واقع ہوئے ہیں:

کٓھٰیٰعٓصٓ۔ یہ سورۃ مریم کے شروع میں واقع ہیں۔

حروفیہ

ایک بدعتی فرقہ جس کی ابتداء آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں ایران میں ہوئی۔ اس فرقے کا بانی فضل اللہ استرابادی تھا۔ فضل اللہ ۷۴۰ھ / ۱۳۴۰ء میں استراباد میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک صوفی کی حیثیت سے کیا اور وہ حرام غذا کھانے سے حد درجہ احتیاط و اجتناب کرتا تھا۔ اس معاملے میں وہ اتنا محتاط تھا کہ لوگ اسے [illegible] اس کا میلان شروع ہی سے تصوف اور زاہدانہ اعمال کی طرف تھا۔ نوجوانی میں اسے الہامی خواب دکھائی دینے لگے۔

ابتداء میں اس کے مریدین کی تعداد چند نفوس پر مشتمل تھا۔ لیکن جب اس نے اصفہان میں سکونت اختیار کی تو اس کے مریدین کی تعداد بڑھنے لگی۔ کئی دوسرے ملکوں کے لوگ بھی فضل اللہ کی تعبیر رؤیا میں قابلیت اور اس کے مریدین کی سادگی اور دیانتدارانہ زندگی سے متاثر ہو کر اس کے حلقۂ ارادت میں کشاں کشاں آنے لگے۔

چالیس سال کی عمر میں فضل اللہ تبریز میں اقامت گزیں تھا تو اسے ایک نیا تجربہ ہوا۔ اسے حروف کے خفیہ معنی اور نبوت کی اہمیت کا علم حاصل ہو گیا۔ تین دن اور رات اس پر وجدانی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد وہ ایک نئی مذہبی تحریک کا بانی بن گیا۔

اس نے اپنی تصنیف جاویدان نامہ کبیر میں حکمرانوں اور بادشاہوں کو اپنے عقیدے کا پیرو بننے کی دعوت دی۔ اس نے تیمور لنگ کو بھی اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دی۔ بعد میں اس نے تیمور لنگ کے عتاب سے بچنے کے لئے اس کے بیٹے میران شاہ کے پاس پناہ لی۔ لیکن میران شاہ نے اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے گرفتار کرا کے نخجوان کے قریب قلعہ جنق میں قید کر دیا۔ اور یہیں پر ۷۹۶ھ / ۱۳۹۴ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

جس جگہ فضل قتل ہوا کچھ عرصہ تک یہ مقام اس کے پیروؤں کا قبلہ (مکہ) بن گیا اور میران شاہ اس نئے مذہب کا دجال کہلانے لگا۔

فضل اللہ کا پہلا خلیفہ اس کا مرید علی الاعلیٰ بنا جو حروفی مذہب سے متعلق کئی کتابوں کا مصنف ہے ۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء میں اس نے ملک روم (اناطولی) میں حروفی عقیدے کی اشاعت کی۔ اناطولی میں حروفی عقائد دیگر عقائد کے پہلو بہ پہلو بکتاشیوں کی عجیب و غریب برادری میں باقی رہے۔ یہ فرقہ قلیل مدت تک ایک منظم تحریک کی شکل میں قائم رہا۔ بعد میں اس فرقے کو کئی مذہبی افتراقات کا سامنا کرنا پڑا۔

معتقدات: اس فرقے میں مذہب کی باطنی خصوصیت پر زور دیا گیا ہے۔ نبوت کے بارے میں حروفیوں کا نظریہ یہ ہے کہ آنحضورؐ کو واقعی خاتم النبیین کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ پر نبوت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ایک نیا دور جو دورِ نبوت سے برتر ہے۔ شروع ہوتا ہے یعنی دورِ ولایت اور یہ بھی فضل اللہ میں خدا کے ظہور والے دور سے مرتبے میں پیچھے رہ گیا۔

حروفیوں کے نزدیک کائنات قدیم ہے کیونکہ تخلیق کا عمل دائمی ہے۔ خدا کی صفات ذاتِ خداوندی کی مترادف ہیں جو خود ایک ناقابلِ رسائی پوشیدہ خزانہ ہے۔ ظہورِ خداوندی ادوار میں حرکت کرتا ہے اور ہر دور میں گزشتہ ادوار کے واقعات اور اشخاص دوبارہ ظاہر ہوتے ہیں۔

ان کے نزدیک انسان سے مراد قدرتی طور پر کوئی بالخصوص پاک اور مقدس انسان "فضل اللہ" ہے۔ "تمام دنیا تو خدا ہے آدم روح ہے اور سورج چہرہ" حروفیوں نے قرآن مجید کی اپنی باطنی تفسیر کی۔ نیز ہر ذرہ ایک "زبان" ہے جو بولتی ہے۔

ابتداء میں حروفیوں کی ایک الگ تنظیم تھی اور ان کی اپنی رسوم اور نمازیں تھیں۔ جنہیں علی الاعلیٰ کے ایک اہم باب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اذان میں ایسے کلمات شامل تھے:

Marfat.com

"اشہد ان لا الٰہ الا ت ـ ع ـ ہ"
میں گواہی دیتا ہوں کہ ت ـ ع ـ ہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔
"اشہد ان آدم خلیفۃ اللہ"
میں گواہی دیتا ہوں کہ آدم اللہ کا نائب ہے۔

فضل اللہ کے قتل کی جگہ کا حج ذوالقعدہ کے مہینے میں کیا جاتا تھا۔ مقتل کے دروازے کا اٹھائیس مرتبہ طواف کرنے کے بعد حروفی دنیا کے مشرق و مغرب کے چالیس عارفان حق کے نام لیتے ہیں۔ دریا کے مجری میں اتر کر تین بار اکیس اکیس یعنی ۶۳ سنگریزے چنتے ہیں۔ اکیس مٹی کے لئے، اکیس ہوا کے لئے اور اکیس پانی کے لئے۔ اور پھر انہیں آگ میں ڈال دیتے ہیں جو شیطان کا منبع ہے۔ یہ عمل کرتے وقت ان کا منہ میران شاہ کے قلعے کی طرف ہوتا ہے اور زبان سے "ملعون و بدکار" کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔

حرہ

حرہ واقیم یہ مدینہ منورہ کے باغات میں سے ہوتا ہوا اس شہر کی شمال مشرقی جانب میں پھیلا ہوتا ہے جسے حرہ واقم کہتے ہیں۔ اس کو ۶۳ھ/ ۶۸۳ء میں ہونے والی ایک لڑائی کی بدولت اس حرہ کو مزید اہمیت ملی۔ یزید بن معاویہؓ کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد مدینہ منورہ میں صورت حال خراب ہوگئی۔ یزید کی حکومت کو بنظر استحسان نہ دیکھا گیا۔ دینی حلقوں نے اس کی امامت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مدینہ منورہ کا گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان جسے یزید نے مقرر کیا تھا۔ ایک نوجوان اور ناتجربہ کار شخص تھا اس لئے صورت حال پر قابو نہ پا سکا۔ پھر یزید نے اہل مدینہ کے ایک وفد کو دعوت دی تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکالی جائے۔ اور ان سے فیاضی کا سلوک کر کے ان کی دلجوئی کی جائے۔ لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔

اس نے دوسری بار مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ چنانچہ یزید نے حجاز کی طرف ایک فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کا اصل مقصد ابن زبیر کو زیر کرنا تھا اس کا خیال تھا کہ ایک فوجی مظاہرہ اہل مدینہ کو مطیع کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ المری کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا اس لشکر کی تعداد ۴ ہزار سے ۱۲ ہزار تک بتائی گئی۔ مدینہ کے نخلستان میں پہنچ کر مسلم حرہ میں اپنا خیمہ نصب کرنے کے لئے چلا گیا۔ اہل مدینہ کو شہر کی غیر محفوظ جانب میں ایک خندق کھودنے اور اسے محفوظ بنانے کا وقت مل گیا۔ تین روز بعد اس مقام پر خونریز لڑائی ہوئی جس میں اہل مدینہ کو شکست ہوئی۔ شہر میں پناہ گزینوں کا تعاقب کرتے ہوئے شامی خوفناک لوٹ مار میں مصروف ہو گئے جو تین دن تک جاری رہی حبشیوں کا فساد برپا کرنے کا موقع مل گیا۔ حرہ میں بے دریغ قتل و غارت کی وجہ سے مسلم بن عقبہ کو مسرف کا خطاب دیا گیا، جس کے معنی ہیں "انسانی خون کو ارزاں کرنے والا۔"

حریت

آزادی، شرافت۔ بقول امام راغب "حریت" کی دو قسمیں ہیں:
۔ کسی کا غلام نہ ہونا۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔
"اے ایمان والو، تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔" (۲: ۱۷۸)

۲۔ صفات ذمیمہ یعنی حرص اور دنیوی مال و متاع کے لالچ سے آزاد ہونا اور اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دینا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:
"اے میرے رب میں نے تیری نذر کیا، جو کچھ میرے پیٹ میں ہے سب سے آزاد رکھ کر۔" (۳: ۳۵)

احادیث میں حر، حرۃ اور احرار وغیرہ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً "دیت الحر" یعنی آزاد شریف کے خون بہا کے ذکر میں یا غلاموں کو آزاد کرنے کے سلسلے میں کوئی آقا اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے تو اعلان کرتا ہے "میں اسے اللہ کی رضا جوئی کے لئے آزاد کرتا ہوں۔" (بخاری)

زمانہ جاہلیت میں عرب میں یہ اصطلاح عبد کی ضد کے معنی میں استعمال ہوتی تھی جس کے مصداق صفات حمیدہ اور اعلیٰ اخلاق کے حامل افراد ہوتے تھے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کے اکثر ممالک میں غلامی موجود تھی اور غلاموں کا درجہ آزاد انسانوں کے مقابلے میں نہ صرف کمتر تھا بلکہ ان کی حالت حیوانوں سے بھی بدتر تھی۔ اسلام نے غلامی کو اس وقت کی ایک عالمگیر، ناگزیر عادت سمجھ کر اس کا انسداد تدریجی طور پر، قانونی، اخلاقی، ترغیبی اور نفسیاتی انداز میں کیا ہے تاکہ اس قبیح رسم کا انسداد معاشرے کی روحانی امنگ بن جائے۔ لوگ خود بخود اس سے نفرت کرنے لگیں اور رفتہ رفتہ یہ رسم خود بخود مٹ جائے۔

اسلام نے مذہبی آزادی کا اتنا اعلیٰ تصور عام کیا۔ جس کی مثال آج کی نام نہاد مہذب دنیا میں بھی کہیں نہیں ملتی۔ حریت تصوف کی ایک اصطلاح بھی ہے صوفیوں کے نزدیک حریت نام ہے خدا اور اس کی بندگی کے سوا ہر چیز سے چھٹکارا پانے کا۔ یہ اس رشتے کے اقرار کا نام ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہے کہ وہ کامل طور پر اس کے محتاج ہیں۔

اس لفظ کا جدید سیاسی معنوں میں واضح استعمال انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کی حکومت ترکیہ کی یادگار ہے۔

حریر

ریشمی کپڑا۔ قرآن مجید میں حریر کا لفظ تین مقامات پر آیا ہے:
"بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان کو وہاں سونے کے کنگنوں اور موتیوں کا گہنا پہنایا جائے گا اور وہاں ان کی پوشاک ریشم کی ہوگی۔" (۲۲: ۲۳)
"اور انہیں ان کے صبر پر جنت اور ریشمی پوشاک کا بدلہ دیا جائے گا۔" (۷۶: ۱۲)
"اور انہیں ان کے صبر پر جنت اور ریشمی پوشاک کا بدلہ دیا جائے گا۔" (۷۶: ۱۲)
"ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے۔ وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا۔ وہاں ان کا لباس ریشم ہوگا۔" (۳۵: ۳۳)

Marfat.com

اسی طرح قرآن مجید میں استبرق کا لفظ بھی کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔ وہ بھی اسی مفہوم میں کہ جنت میں لوگوں کا لباس اور تکیے وغیرہ استبرق کے ہوں گے۔

حریر کے لباس اور دوسرے ساز و سامان کو اسلام میں مردوں کے لئے ناپسندیدہ اور مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ فقہا کے ایک بڑے گروہ نے اسے حرام قرار دیا گیا ہے بعض فقہا نے بعض شرائط کے ساتھ اس کے استعمال کو مردوں کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ عورتوں کے لئے حریر کا استعمال جائز ہے۔ اگرچہ بعض فقہا نے بعض خاص حالات میں عورتوں کے لئے بھی اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

کتب حدیث میں اس بارے میں آنحضورؐ کے اقوال اور عمل کے واقعات اور اس کے متعلق ہدایات ملتی ہیں۔

ان کتب میں ولیمہ اور شادی اور دوسرے موقعوں کے بارے میں بھی احکام موجود ہیں جو کم و بیش فرق کے ساتھ مردوں کے لئے حریر کے لباس کو ناپسندیدہ اور ممنوع اور عورتوں کے لئے جائز قرار دیتے ہیں۔

حریر کی ممانعت کی حکمت بالکل واضح ہے اور یہ احکام اسلام کے معاشی اور معاشرتی تصورات سے مربوط ہیں۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے جس کے لئے جد و جہد اور جہاد ناگزیر ہے۔ جہاد کی یہ ضرورت سخت کوشی خشن پوشی اور سادہ خوراک کی متقاضی ہے

اسلام ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں سب افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں اس لئے ایسے لباس اور ساز و سامان اور خوراک و پوشاک پر زور دیتا ہے جو عادلانہ معاشی تنظیم کے لئے ہر کسی کو میسر آ سکیں۔

اسلام کے اصول مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ خوراک و پوشاک کے ان لوازم کی حمایت کی جائے جو خواہ مخواہ برتری کا تاثر پیدا کرتے ہوں یا ان میں تکلف اور اسراف کا شائبہ ہو۔

عورتوں کے لئے حریر کے استعمال کی اجازت نسوانی نفسیات کے عین مطابق ہے زیب و زینت کا ذوق عورتوں کی فطرت کا حصہ ہے اور ان کا لباس نرم و نازک سے آراستہ و پیراستہ ہونے کا شوق قوانین فطرت کے عین مطابق ہے۔

حریری

(۴۴۶ھ/۱۰۵۴ء ـــــ ۶ رجب ۵۱۶ھ/۱۰ ستمبر ۱۱۲۲ء) ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بن عثمان۔ عربی زبان کا مشہور شاعر اور ماہر لسانیات بصرے کے قریب مشان میں پیدا ہوا۔ تعلیم بصرے میں حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر صاحب الخبر یعنی رئیس محکمہ خفیہ اطلاعات کے فرائض انجام دیتا رہا۔ فرائض منصبی کی بجا آوری کے بعد بھی اسے اتنی فرصت مل جاتی تھی کہ وہ اپنے دور کے بے کیف اور روبہ انحطاط بصرے کے درمیانہ طبقے کی سنجیدہ گفتگو میں حصہ لے سکے۔

اس کی شاہکار تصنیف "مقامات" ایک کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے جو ہمدانی کے مقامات کے نمونے پر ہے۔ اس کا قصہ گو حارث بن ہمام ہے اور ہیرو ابو زید سروجی ہے جو ایک چرب زبان، بدمعاش، رند مشرب آدمی ہے۔ یہ کتاب اس حد تک مقبول ہوئی کہ اس کی عربی، فارسی، عبرانی اور شامی زبان میں لاتعداد نقلیں ہوئیں

حریری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے عربی زبان پر بے نظیر قدرت حاصل ہے اور اس کا ذخیرہ الفاظ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ لفاظی کے ایسے کرتب دکھاتا ہے کہ اس کے مداح حریری کو اس اسلوب کا مکمل نمائندہ تسلیم کرتے ہیں اس کتاب کے علاوہ حریری کی دوسری تصانیف میں "درۃ الغواص فی اوھام الخواص" "فریدۃ الفقر" اور "درۃ ملحۃ الاعراب" اور ایک دیوان شامل ہے۔

حریم

عربی زبان میں اس کے کئی مفہوم ہیں مثلاً

۱۔ جسے چھونا منع ہو اور جس کے قریب جانے کی اجازت نہ ہو۔

۲۔ حریم ان کپڑوں کو کہتے ہیں جنہیں محرم (حرم والے) جب اتار دیتے تھے تو پھر پہنتے نہیں تھے۔ (جب تک حرم میں رہتے تھے)

۳۔ محرم (حرم والے) کے کپڑوں کو بھی حریم کہتے ہیں جنہیں ایام جاہلیت میں رب طواف کرتے وقت اتار دیتے تھے۔

۴۔ شاہی محل کے گرد کی اس جگہ کو بھی حریم کہتے ہیں جہاں داخلہ ممنوع ہے اور اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔

۵۔ بیوی کو بھی حریم کہتے ہیں کیونکہ خاوند اس کی مدافعت و حفاظت کرتا ہے

۶۔ خانہ کعبہ کے ارد گرد چار دیواری کے اندر کے حصے، نیز ہر مقدس مقام کو بھی حریم کہتے ہیں۔

۷۔ حریم کا لفظ کسی مکان کے اس حصے کے لئے بھی مستعمل ہے جہاں نامحرموں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس سے ان سب مستورات کو بھی حرم کہتے ہیں جو حرم کے اندر مقیم ہوں۔

فارسی میں حریم عام مکان، احاطے اور مکان کی چار دیواری کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

حریریہ

دمشق کے ضلع میں رفاعیہ درویشوں کا ایک فرقہ۔ اس فرقے کا بانی علی بن حسن حریری تھا جو ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء میں حوران کے شہر بصریٰ میں فوت ہوا وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ اس کے غالی عقیدے کو شاعر نجم الدین ابن اسرائیل نے حسین انداز میں بیان کیا ہے اسے ابن تیمیہ نے ایک اہم فتوے کے ذریعے ناجائز قرار دیا تھا۔

حزب

طائفہ جماعت، ہم خیال اور ہم رائے لوگ خواہ وہ ایک جگہ اکٹھے بھی نہ رہتے ہوں۔ حزب کا لفظ نیک اور بد، اچھی اور بری دونوں قسم کی جماعتوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اچھے لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے" (۵:۵۶)

اور برے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

"پس انہوں نے اللہ کا ذکر بھلا دیا۔ یہی لوگ ہیں شیطان کی جماعت" (۵۸:۱۹)

جنگ خندق کے موقع پر قریش، غطفان اور بنو قریظہ وغیرہم کے جو لشکر صحابہ کرامؓ کی جماعت کے خلاف مدینے پر حملہ آور ہوئے تھے انہیں بھی قرآن مجید میں احزاب کہا گیا ہے۔ (۳۳:۲۲)

علامہ راغب اصفہانی نے حزب کے معنی یہ بتائے ہیں: "وہ جماعت جس

Marfat.com

میں سختی اور شدت پائی جائے"۔

حزب کے معنی ہتھیار کے بھی ہیں۔ نیز حزب کے معنی ورد کے بھی ہیں قرآن کا وہ حصہ جس کی انسان تلاوت کرتا ہے۔

قرآن مجید کے جزو کے لئے بھی حزب کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ مصر میں ہر طریقہ تصوف ایک حزب ہے۔

حزب

گروہ۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مذہبی گروہوں کے لئے استعمال ہوا ہے:

"اللہ ہی کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے" (۵:۵۶)

ابتدائی زمانے میں یہ لفظ ٹکڑے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے خاص طور پر قرآن حکیم کیلئے کیونکہ مصریوں نے قرآن کو ساٹھ احزاب (حصوں) میں تقسیم کر رکھا تھا۔ موجودہ دور میں قرآن کا وہ نسخہ نہیں ملتا۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیا میں قرآن مجید کے حصوں کے لئے حزب کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔

حزب اللہ

اللہ کی جماعت، مومن۔ قرآن مجید میں یہ ترکیب انہی الفاظ میں استعمال ہوئی ہے:

"اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے
اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے" (۵:۵۶)

حزب اللہ کے افراد کی صفات یہ ہیں، جو مومنین پر نرم اور کفار پر سخت ہوں۔ جو اللہ کی راہ میں جدو جہد کریں، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہوتے ہیں۔

حزقی ایل

ایک نبی۔ بن بوری۔ جب آپ کی والدہ کی عمر زیادہ ہو گئی تو انہوں نے اللہ تعالےٰ سے اولاد کے لئے دعا مانگی جو قبول ہوئی۔

حزقی ایل، کالب کے جانشین تھے۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں نام کے ساتھ نہیں آیا۔ لیکن عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سورہ بقرہ میں جو یہ کہا گیا ہے:

"اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو اپنے گھروں
سے موت کے ڈر سے نکل کھڑے ہوئے اور وہ ہزاروں ہی تھے
پھر خدا نے ان کو حکم دیا کہ مر جاؤ (اور وہ مر گئے) پھر اللہ نے
انہیں جلا اٹھایا" (۲:۲۴۳)

اس آیت میں حزقی ایل ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی اس آیت:

"اور یہی نعمت اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ کو دی کہ یہ
سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے اپنی رحمت میں
داخل کیا کہ وہ صالحین میں سے تھے" (۲۱:۸۵)

میں ذوالکفل کا ذکر آیا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود کے نزدیک ذوالکفل سے مراد حزقی ایل ہی ہیں۔

بقول ثعلبی فرعون مصر کی مجلس مشاورت کے ایک رکن کا نام بھی حزقیل تھا جو بقول الکسائی ابتداء میں ایک بڑھئی تھا اور حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اسے ایک صندوق بنانے کے لئے کہا تھا تاکہ اس میں نوزائیدہ بچے کو محفوظ کر سکیں اس نے یہ راز شاہی پولیس کو بتانا چاہا لیکن جونہی اس نے یہ ارادہ کیا اس کی زبان بند ہو گئی اور یہ معاملہ اس کے ساتھ اس وقت تک رہا جب تک اس نے یہ قسم نہ کھائی کہ اب وہ یہ بات کسی سے نہیں کہے گا۔

چنانچہ اس واقعے کے بعد سے وہ حضرت موسیٰؑ کی عزت کرنے لگا

حزن

رنج، (دیکھئے "غم")

حسا

مشرقی سعودی عرب میں ایک نخلستان۔ یہ نخلستانوں کا ایک مجموعہ ہے گرمیوں میں اس علاقے کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہوتی ہے۔ آبادی دو لاکھ سے زائد ہے۔ یہاں کے باشندے سنی اور اثنا عشری شیعہ ہیں۔

یہ علاقہ مالکی علماء کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ یہ سعودی عرب کا سب سے بڑا اور زرخیز نخلستان ہے۔ حسا کی مشہور پیداوار کھجوریں ہیں۔ یہاں کھجوروں کی ستر سے زائد قسمیں ہیں۔ یہ علاقہ آنحضورؐ کے زمانے میں الحسا یا الاحسا کہلاتا تھا یہاں کے باشندوں نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ عباسیوں کے عہد میں جب عباسیوں کا زوال شروع ہوا تو اس علاقے کے لوگوں نے کئی بار بغاوت کی۔ ان بغاوتوں میں سب سے مشہور قرامطہ کی بغاوت ہے۔

از منۂ وسطیٰ کے عرب ماخذوں میں الحسا کو بحرین میں واقع ایک قلعہ بتایا گیا ہے اس قلعے کی بنیاد ۳۱۴ھ/۹۲۶ء میں قرمطی رہنما ابوطاہر جنابی نے رکھی تھی اس نے قلعے کا نام المومنیہ رکھا تھا لیکن اس کے اردگرد کی بستی اپنے پرانے نام الحسا ہی کے نام سے معروف رہی۔ قرامطی اقتدار کا خاتمہ الحسا کے مقامی حکمران خاندان بنو عیون کے ہاتھوں ہوا۔

یہ علاقہ ابتدائے عہد اسلام ہی میں گنجان آباد ہو چکا تھا۔ اس کے جغرافیائی محل وقوع اور وسائل کی وجہ سے نجدی وہابی اور ترک اسے اپنے قبضے میں لینے کے ہمیشہ خواہشمند رہے۔ ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں اسے وہابیوں نے قبضے میں لے لیا۔ ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء سے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۵ء تک اس پر محمد علی پاشا کی مصری فوجوں کا قبضہ رہا۔ ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۰ء میں اس پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۵۲ء تک الحسا مشرقی سعودی عرب کے پورے علاقے کا مرکز حکومت رہا اور اس زمانے میں صوبہ الحسا کہلاتا تھا۔

۱۹۵۲ء میں صوبے کا دارالحکومت الحسا سے الدمام میں منتقل کر دیا گیا۔ اور خود صوبے کا نام الحسا کے بدلے مشرقی صوبہ ہو گیا سعودی حکومت نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک اس نخلستان میں بڑے اہتمام سے زراعتی کام کی توسیع شروع کی۔

حساب

گنتی، شمار، حساب کتاب وغیرہ۔ قرآنی اصطلاح میں یہ لفظ اس حساب کتاب کے مفہوم میں آتا ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے بندوں سے لے گا۔ یوم الحساب کا لفظ قرآن مجید میں کئی مقام پر آیا ہے۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔

Marfat.com

اور موسیٰ نے کہا " میں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے۔" (۴۰ : ۲۶)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے :

" پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو، جب کہ حساب قائم ہوگا۔" (۱۴ : ۴۱)

" جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی ان کے لئے بھلائی ہے اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا۔" (۱۳ : ۱۸)

" اور جو لوگ ان روابط کو جن کا اللہ نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔" (۱۳ : ۱۲)

اسی طرح ایک مقام پر فرمایا گیا ہے :

" اللہ جلد ہی حساب لینے والا ہے۔" (۲ : ۲۰۲)

" اور اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔" (۲۴ : ۱۹)

قیامت میں ہر بندے کو ایک نامۂ اعمال دیا جائے گا جو بندے کے حساب کا گوشوارہ ہوگا۔ گویا یہ ایک فرد ہوگی جس پر اس کے اعمال لکھے ہوں گے۔ اگر نیکیاں برائیوں سے زیادہ ہوں گی تو یہ اعمال نامہ بندے کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ (۸۴ : ۷ تا ۱۰، ۱۹، ۲۰، ۲۹)

سخت حساب کی صورت میں یہ اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی۔ (۶۹ : ۲۵ تا ۲۶)

حسام الدین چلبی

(؟ ــــ ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء) حسن بن محمد بن حسن بن اخی ترک۔ جلال الدین رومی کے شاگرد رشید۔ ان کا خاندان ارمیہ سے آ کر قونیہ میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ نو عمری میں ہی مولانا جلال الدین رومی کے مرید ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ مولانا رومی اور ان کے حلقے کی نذر کر دیا۔ اس عقیدت اور خاطر داری سے مولانا رومی کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے حسام الدین کو اوقاف کی آمدنی اور لوگوں سے ملنے والے عطیات کا نگران مقرر کر دیا۔ یہ رقوم حسام الدین کو بھیج دی جاتی تھیں اور وہ انہیں سب سے پہلے مولانا رومی کے گھر والوں اور پھر ان کے حلقے کے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ حسام الدین اپنے زہد و تقویٰ اور مولانا رومی سے عقیدت مندی کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔

وہ شمس الدین تبریزی کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کی اس بات سے مولانا رومی بہت خوش تھے۔ مولانا رومی نے سرکاری حکام سے سفارش کر کے حسام الدین کو قونیہ میں خانقاہ ضیا اور خانقاہ لالا کا شیخ بنوا دیا۔ شیخ صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا جلال الدین رومی نے حسام الدین کو اپنا خلیفہ بنا لیا۔ مولانا کی وفات تک وہ ان کے خلیفہ اور کاتب کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ حسام الدین نے قونیہ میں انتقال کیا اور مولانا جلال الدین رومی کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

ان کی شہرت اس اعانت کی وجہ سے ہے جو انہوں نے مثنوی مولانا روم کے لکھنے میں کی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنی تصنیف کو حسام نامہ بھی کہا ہے۔ مولانا کو جب اور جہاں کہیں مثنوی لکھوانے کا موقع ملتا حسام الدین اشعار لکھنے اور پھر ان کو پڑھ کر سنانے کے لئے تیار رہتے تھے۔

حسان بن ثابت

(؟ ــــ ۴۰ھ / ۶۶۰ء) ایک بلند پایہ صحابی شاعر قبیلہ خزرج سے تھے۔ کنیت ابو الولید انصاری تھی۔ بقول ابو عبیدہ "تمام اہل عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ حسان بن ثابت تمام گاؤں کے بہترین شعراء میں سے تھے۔ آپؓ آنحضورؐ کے مداح خواں تھے۔ آپؐ نے ان کے حق میں فرمایا :

" مشرکین کی ہجو کرو۔ کیونکہ جبرئیلؑ تمہاری مدد کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ ہیں۔"

آپؓ ۱۲۰ برس زندہ رہے ۶۰ سال بت پرستی میں اور ۶۰ سال اسلام کے دامن میں زندگی بسر کی۔

آپؓ سے حضرت عمرؓ۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ نے احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔ آپؓ کے لئے مسجد نبوی میں منبر بچھایا جاتا تھا اور آپؓ سرورِ عالمؐ کے میلاد شریف اور مناقب و محامد فرمایا کرتے تھے۔

حسان بن مالک

(؟ ــــ ۶۵ھ / ۶۸۵ء یا ۶۹ھ / ۶۸۸ء)

خلیفہ یزید اوّل کا قرابت دار۔ اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے حسان بن مالک بن بحدل بن [illegible] جو ایک کلبی سردار تھا۔ چونکہ اس کا والد مالک یزید کی ماں میسون بنت بحدل کا بھائی تھا چنانچہ ان تعلقات کی وجہ سے اور اپنے قبیلے جو ایک صاحبِ اقتدار قبیلہ تھا، کی بنا پر اس نے حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کے عہدِ حکومت میں فلسطین اور اردن کے علاقے کے والی کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔ اس سے قبل اس نے جنگ صفین میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا۔ جب یزید مسند نشین ہونے کے لئے دمشق گیا تو حسان اس کے ساتھ تھا۔ چنانچہ یزید کے دربار میں اسے ایک اہم حیثیت حاصل رہی۔ یزید کے انتقال کے بعد معاویہ ثانی کے تخت نشین ہونے پر وہ جند اردن کا والی ہو گیا۔ چنانچہ یہی ایک واحد ضلع تھا جو حسان کے اثر سے امویوں کا وفادار رہا۔ بعد میں اس نے دمشق پر چڑھائی کی تاکہ وہ یزید کے کم سن بیٹوں کے مفادات کی نگہداشت کر سکے۔ حسان نے ان کے ساتھ جابیہ میں سکونت اختیار کی۔ اس قیام کے دوران میں وہ اپنی چالوں کی وجہ سے ضحاک ابن قیس کی پردہ دری کرنے میں کامیاب ہوا۔ جو دراصل امویوں کے مفاد سے غداری کر رہا تھا۔

جب حسان نے خالد بن یزید کے دعوے کی حمایت شروع کی تو اموی خاندان کے ارکان اور ان کے مددگاروں کو مجبوراً جابیہ آنا پڑا اور یہاں پر اس کی

Marfat.com

صدارت میں ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ چالیس روز کی گفت و شنید کے بعد مروان کو خلیفہ چنا گیا لیکن حسان نے اسے خلیفہ تسلیم کر لینے سے پہلے اسے اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ اس کے بعد خالد اس کا جانشین ہوگا۔ نیز اس کو اور اس کے خاندان کو وہ تمام مراعات حاصل ہوں گی جو انھیں بنو سفیان کے عہد میں حاصل تھے۔ اس کے بعد حسان کا اثر و رسوخ کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مروان نے اپنی وفات سے پہلے اپنے بیٹے عبدالملک کی جانشینی حسان سے تسلیم کرالی تھی۔ عمرو الاشدق کی بغاوت کے دوران میں حسان عبدالملک کا حامی تھا۔ اس کے بعد اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

یہ بات واضح ہے کہ ایک عرصے تک اس کے ہاتھ میں اموی خاندان کی حکومت کی باگ دوڑ رہی۔

حسان بن نعمان

(———؟———۸۶ھ/۷۰۵ء)

ایک نامور مسلمان جرنیل، مدبّر، سیاستدان اور فاتح۔

حسان بن نعمان شاہانِ غسان کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں افریقہ کا والی رہا۔ اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں مصر کا عامل مقرر ہوا۔

۷۶ھ/۶۹۵ء میں جب افریقہ میں شورش برپا ہوئی تو خلیفہ عبدالملک نے حسان کو اس شورش کو فرو کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حسان ۷۸ھ/۶۹۷ء میں ایک لشکرِ جرار لے کر وہاں پہنچے اور سب سے پہلے قرطاجنہ کو فتح کیا جو ابھی تک بزنطیوں کے قبضے میں تھا۔ قیروان میں کچھ روز سستانے کے بعد حسان ملکہ کاہنہ پر حملہ کرنے کی غرض سے جبل اور اس کی طرف پیشقدمی کرتے ہوئے وادی مسکیانہ میں فروکش ہوا۔

ملکہ کاہنہ کی بربر فوجوں سے اس کا نہایت سخت مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو بہت سا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ چنانچہ حسان پسپا ہو کر برقہ میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ جہاں پر اس نے خلیفہ کی طرف سے مزید کمک پہنچنے کا انتظار کیا۔ ۷۹ھ/۶۹۸ء میں مسلمانوں نے دوبارہ قرطاجنہ کا خشکی اور سمندر کی جانب سے محاصرہ کر لیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ حسان نے ان سب قلعوں کو جو افریقہ میں رومیوں کے قبضے میں تھے، فتح کر لیا۔ اس کے بعد حسان نے جبل اور اس کی جانب پیش قدمی کر کے ملکہ کاہنہ کے خلاف مہم کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ ملکہ کاہنہ کی بربر فوج مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا سکی اور میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی حسان نے تعاقب کر کے ملکہ کاہنہ کو قتل کر دیا۔ اور بربر قبائل نے حسان کو بارہ ہزار مجاہد مہیا کر کے امان حاصل کی۔ جب بربر قبائل نے اسلام قبول کر کے اطاعت کا اظہار کیا تو حسان بن نعمان اطمینان کر کے قیروان واپس لوٹ آیا۔ کیونکہ اب سارا علاقہ اس کے زیرنگین آ چکا تھا۔ اس کے بعد حسان اس علاقے کے نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا۔ عین اسی زمانے میں کہ جب اس نے انتظام کی طرف توجہ دی تھی مصر کے والی عبدالعزیز بن مروان نے اسے اچانک معزول کر دیا اور اس کی تمام املاک ضبط کر لی۔

حسان نے افریقہ کو فتح کر کے اسلامی حکومت کو وہاں مضبوط و مستحکم بنایا۔ اس نے تونس میں ایک دارالصناعۃ قائم کر کے بحری بیڑے کو مضبوط کیا۔ قیروان میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔

حسان نے اپنی آخری عمر میں کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ البتہ وہ رومیوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

اس کی وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے اس کا سال انتقال ۸۰ھ/۶۹۹ء بتایا ہے۔

حسان، بنو

ایک عربی قبیلے کی شاخ جو کندہ کے جنوب میں آباد ہے۔ یہ لوگ پہلے حضر موت میں رہتے تھے اور حسان بن معاویہ بن حارث بن معاویہ بن ثور بن مرتع بن کندہ کی اولاد ہیں۔

اس قبیلے کا ایک فرد عبدالرحمٰن بن علی بن باحسان الحضرمی (۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء تا ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء) مقاجس کی تاریخ کو عبداللہ بن احمد ابو ادہ اس کے بیٹے طیب نے تذکروں کی لغت قلادۃ النحر کے لئے استعمال کیا۔

قلقشندی کے نزدیک حسان کا ایک اور بطن کلب کی ایک شاخ عذرہ بن زید اللات سے تعلق رکھتا ہے۔

حسب نسب

حسب کے معنی کرم، شرف اور وہ فضیلت ہے جو اچھے اعمال کی وجہ سے حاصل ہو۔ اور نسب وہ قرابت ہے جو آباد اجداد کی طرف سے ہو۔

بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے آباؤ اجداد تو نیک ہوتے ہیں لیکن ان کے اپنے اعمال اچھے نہیں ہوتے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حسیب وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جو خود بلند مرتبہ ہو جس کے آباؤ اجداد گو اعلیٰ درجے کے نہ ہوں۔ مہر مثل کی تعیین میں فقہا حسب کو بھی دیکھتے ہیں اور نسب کو بھی۔

بقول صاحبِ غریب القرآن "حسب ان اعلیٰ اعمال کو کہا جاتا ہے جو کسی خاندان میں باپ کے بعد بیٹے میں منتقل ہوتے چلے جائیں"

حسب کے معنی رشتے دار کے بھی ہیں۔

کسی فرد یا قبیلے کا نسب نامہ زمانہ جاہلیت میں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اور نسب کے ماہرین کو نسابہ کہا جاتا تھا۔

نسب عزت و تکریم کا ایک عنصر تھا۔ یہ نہ صرف پدری بلکہ مادری نسل پر بھی مبنی تھا۔ عام طور پر قبیلے کے تمام افراد کا ایک اجتماعی نسب ہوتا تھا۔ جو اس کے جدِ اعلیٰ تک جاتا تھا۔ مگر اس کے علاوہ ایک قریب تر نسب بھی ہوتا تھا۔

عربوں میں کسی شخص یا قبیلے کا مقام اعزاز و اکرام متعین کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ اس کے اعمال دیکھے جائیں نیز یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اس کی قرابت داری معزز لوگوں سے ہے یا معمولی درجہ کے لوگوں سے یہ رشتہ داری ننھیال اور دادھیال دونوں طرف سے دیکھی جاتی تھی یعنی اس کے آباؤ اجداد کون ہیں اور اس کے شادی بیاہ کے تعلقات کن لوگوں سے قائم ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں حسب اور نسب بڑی حد تک لازم و ملزوم تھے۔ نسب کے ساتھ ساتھ، کسی فرد یا قبیلے کی عزت و تکریم اس پر بھی منحصر تھی کہ اس کے آباؤ اجداد نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اور ان میں سخاوت و شجاعت وغیرہ کے اعلیٰ اوصاف کہاں تک پائے جاتے ہیں۔

Marfat.com

چنانچہ اس قسم کا شخص بہرحال افضل تھا جس کا نسب بھی اعلیٰ ہو اور حسب بھی۔ اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعے حسب نسب کے معیار سے ہٹ کر ایک اور معیار قائم کیا ہے اور وہ ہے تقویٰ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

" لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے" (۴۹:۱۳)

حدیث میں آیا ہے۔

" اپنے باپ دادوں پر فخر نہ کرو" (احمد)

اسلام نے طعن فی النسب سے منع فرمایا ہے۔

عرب اپنے رواج کے مطابق اپنے اباؤ اجداد کی قسمیں کھاتے تھے۔

آنحضور ؐ نے فرمایا۔

" خبردار اللہ تمہیں اس سے منع فرماتا ہے کہ تم اپنے آباؤ کی قسمیں کھاؤ" (بخاری)

لیکن اپنے بزرگوں کے اچھے اوصاف کی یاد منع نہیں ہے۔

ایک اور جگہ پر آنحضور ؐ نے فرمایا۔

" کسی شخص کا حسب اس کے اخلاقی اوصاف ہیں"

دوسری جگہ فرمایا۔

" دامن کی پاکیزگی ہی انسان کا اصل حسب (شرف) ہے"۔

اسلام نے قبائل و شعوب کی بناء پر ترجیح کے تصور کے مقابلے میں تقویٰ کو معیار اکرمیت قرار دیا ہے۔ اس نے قبائل و شعوب کی بناء پر فخریہ جذبات کی بڑی حوصلہ شکنی کی ہے۔

حسبہ

اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ دوسری طرف یہ لفظ اس شخص کے فرائض کے معنوں میں آتا ہے جو کسی شہر میں عوام کے اخلاق کی نگرانی کے لئے سرکاری طور پر مقرر کیا جائے۔ اس شخص کو محتسب کا نام دیا جاتا ہے۔

حسبہ کے چونکہ دو مفہوم نکلتے ہیں اس لئے اس کے بارے میں معلومات مختلف قسم کے ماخذوں میں ملتی ہیں۔ اس کے ایک مفہوم کے بارے میں معلومات ان تمام کتب میں ملتی ہیں جو اخلاق عامہ، مذہب اور تجارت اور اس کے قانون کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔

بعض تصانیف میں حسبہ کے فضائل، محتسب کی ذمہ داریوں اور اس کے منصب کے مذہبی اور قانونی پہلوؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ اور بعض تصانیف میں محتسب کے فرائض منصبی کی انجام دہی کے لئے عملی اور فنی ہدایات و معلومات درج ہیں۔

ایسی تصانیف جن میں حسبہ کے بارے میں عام بحث بھی پائی جاتی ہے بے شمار ہیں۔ ان میں دو کتابیں الماوردی کی "الاحکام السلطانیہ" اور امام غزالی کی "احیاء العلوم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں ایک مصری عالم ابن الاخوۃ کی تصنیف "معالم القربۃ فی احکام الحسبہ" ہے اس کے علاوہ اس موضوع پر اور کئی ایک رسائل موجود ہیں اور یہی وہ ماخذ ہیں جنہیں بنیاد مان کر حسبہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ حسبہ کے وسیع معنوں کے پیش نظر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نیکی کو فروغ دے اور بدی سے نبرد آزما ہو اس لئے عام حالات میں سمجھانے بجھانے کا کام لے سکتا ہے بلکہ قانونی اجازت کا کام بھی لے سکتا ہے بلکہ غیر معمولی حالات میں حکومت کی نگرانی مہیا نہ ہونے کی صورت میں ان کے نفاذ کے لئے اپنے بل بوتے پر بھی کام کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ طاقتور ہو۔ دراصل یہ فریضہ نظری ہے اور موقع و محل کے مطابق نیکی کی ترویج اور بدی کی روک تھام کے لئے وہ جو کچھ کر سکتا ہو اسے کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اسلامی حکومت موجود ہو تو اسے اس امر کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور جائز حکومت کی موجودگی میں اس کے فرائض انجام دینے لگے۔ البتہ وہ حکومت کی توجہ دلا سکتا ہے۔

حسبہ کا ادارہ اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن اس کا آغاز زیادہ واضح نہیں ہے ابتداء میں حسبہ اور محتسب کے الفاظ استعمال نہیں ہوتے تھے۔ المامون کے دور حکومت میں صاحب السوق کی بجائے محتسب کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ اس سے پہلے یہ لفظ اس شخص کے لئے بولا جاتا تھا جو انفرادی حیثیت سے حسبہ کا فریضہ انجام دیتا تھا قدیم محتسب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے بنیادی مذہبی فریضے یعنی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کے علاوہ منڈی کے کاروبار کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ محتسب ان اعمال سے سروکار رکھتا تھا جو کھلے بندوں ہوتے تھے اس لئے اسے کسی قسم کی تفتیش کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ کسی کی شکایت کے بغیر دخل اندازی کر سکتا تھا۔ بازار کی نگرانی کے علاوہ محتسب کے وظائف کی تین قسمیں تھیں۔ وہ مذہبی فرائض کی انجام دہی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ مثلاً نماز باجماعت کا اہتمام اور مساجد کی خبر گیری وغیرہ گلیوں اور حماموں میں مردوں اور عورتوں کے درمیان شائستگی اخلاق کی پڑتال اور آخر میں ذمیوں کے بارے میں قانون کا نفاذ کرتا تھا۔

محتسب کو بعض اوقات حکومت براہ راست مقرر کر دیتی تھی لیکن اوقات ان کا تقرر گورنر اور قاضی کیا کرتے تھے جنہیں حسبہ کا منصب تفویض ہوتا تھا یعنی وہ خود کام کرنے کی بجائے دوسروں سے کرا سکیں۔ محتسب عام طور پر فقیہہ ہوتا تھا۔

عہد ممالیک میں دیگر مناصب کی طرح بعض اوقات حسبہ کی ملازمت رشوت دے کر حاصل کر لی جاتی تھی۔

موجودہ زمانے کی اصلاحات کے رائج ہونے سے قبل عام مسلم ممالک میں محتسب ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے آغاز تک مراکش اور بخارا میں محتسب موجود تھے۔ سلجوقی عہد میں ایران و ترکیہ میں اس منصب کو احتساب کے نام سے پکارتے تھے اور حسبہ کا لفظ اس صلاحیت کے لئے مخصوص تھا جس کا اہل محتسب کو ہونا چاہیئے۔

حسد

کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے اگر ایک شخص پر اللہ تعالےٰ اپنا کوئی احسان کرے مثلاً اس کے علم و فضل، مال و دولت عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے اور ان چیزوں کو دیکھ کر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو تو اسے رشک کہتے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسروں کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کا نام حسد ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

" پھر کیا یہ دوسروں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا" (۴:۵۴)

Marfat.com

"اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان لے پھر کر کفر کی طرف پلٹائے جائیں! اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔"

(۲ : ۱۰۹)

ایک حدیث میں آیا ہے:

"مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے۔" (النہایۃ)

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

۱۔ یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے۔ گو وہ اس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے یہ حسد کی مذموم ترین قسم ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی انہی کی طرح کافر ہو جائیں۔

۲۔ کسی کی یہ خواہش ہو کہ وہ نعمت اسے حاصل ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو نہیں مل سکتی اس لئے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

۳۔ کوئی شخص خود اس قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے۔ دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو حقیقی معنی میں حسد نہیں کہا جا سکتا قرآن مجید میں ارشاد باری تعالےٰ ہے:

"اور خدا نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے۔ اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔" (۴ : ۳۲)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ بھی مذموم ہے۔ لیکن تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اس کو مسابقت کہتے ہیں۔

حسد کے سات اسباب ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ **بغض وعداوت:** یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کے لئے دشمن کی برائی اور بھلائی یکساں ہوتی ہے اس لئے ہر ایک کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اس کی بجائے جب خدا اس پر احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ اور اسی کا نام حسد ہے۔

۲۔ **ذاتی فخر کا غلط خیال:** جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گزرتا ہے اور وہ اس کے اس ترفع (بلندی) کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

۳۔ حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنا مطیع بنانا چاہتا ہے۔ مگر جب دوسرا کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع ہو سکے۔ کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے:

"کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام) کی توفیق دے کر اپنا فضل کیا ہے۔"

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

۴۔ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے شرف کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔

۵۔ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے۔

۶۔ جاہ پرستی اور ریاست طلبی بھی حسد کی ایک وجہ ہے اس لئے جو لوگ اقتدار چاہتے ہیں جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک ہو گیا ہے تو انہیں یہ چیز گراں گزرتی ہے اور وہ خواہش کرتے ہیں کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

۷۔ خبث نفس اور بدطینتی حسد کا ایک سبب ہے۔ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو انہیں مسرت ہوتی ہے۔

حسد ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کہا گیا ان سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو آپؐ نے فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔

آنحضورؐ نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے "تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔" (ابوداؤد)

حسدای بن شپروط

(۲۹۴ھ/۹۰۵ء ——— ۳۶۵ھ/۹۷۵ء)

قرطبہ میں عبدالرحمٰن الثالث اور الحکم ثانی کے دربار کا ایک معزز یہودی عہدے دار۔

حسدائی عربی، عبرانی اور لاطینی زبانوں اور ملکی عشقیہ داستانوں پر عبور رکھتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اسے طب میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ ابتدا میں وہ ایک درباری طبیب تھا۔ لیکن جلد ہی وہ محاصل کا نگران اور پھر بزنطی اور جرمنی سفارتوں سے متعلق معاملات کا ذمے دار بنا دیا گیا۔

حسدائی ایک اہم مقصد کے لئے لیونش گیا، نبرہ کی ملکہ اور اس کے پوتے کو جو لیونش کا شہزادہ تھا قرطبہ لایا۔ اس نے ایک یونانی راہب کی مدد سے دیسقوریدس کی تصنیف کا مطالعہ کیا اور اس کے پرانے عربی ترجمے کی اصلاح کی۔

حسدائی یہودی علاقے کا سربراہ تھا۔ اس کے دربار میں عبرانی علماء اور شعراء حاضر رہتے تھے۔ اس کی کوششوں سے یہودی علوم کے ایک مقامی مدرسے کو بہت ترقی ملی۔ اس نے اندلس، المشرق، بزنطی اطالیہ طلوشہ اور خزر سلطنت کے یہودیوں کے لئے بہت سی خدمات انجام دیں۔

Marfat.com

حسرت موہانی، مولانا

(۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء — ۱۳۷۱ھ/۱۳ مئی ۱۹۵۱ء) اردو کے بلند پایہ شاعر، سیاست دان و قومی لیڈر۔ سید فضل الحسن نام حسرت تخلص تھا۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ اودھ میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب امام علی موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے۔ پہلے قرآن شریف، اردو و فارسی کی متداول کتابیں میاں جی غلام علی موہانی سے پڑھیں۔ ۱۸۹۴ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان خاص امتیاز سے حاصل کیا۔ فتح پور ہسوہ کی آب و ہوا حسرت کی ادبی و ذہنی تعلیم کے لئے بہت راس آئی۔ یہاں مولانا سید ظہور الاسلام، مولانا نور محمد، مولانا حبیب الدین جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اردوئے معلیٰ نامی رسالہ نکالا جس میں ادبی مضامین کے ساتھ سیاسی مضامین بھی ہوتے تھے۔ مئی ۱۹۰۴ء میں مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں ایک ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا کانفرنس میں حصہ لیا اور اسی وقت سے سودیشی تحریک کے مبلغ بن گئے۔

۱۹۰۷ء میں کانگرس کو چھوڑ دیا۔ ۱۹۰۸ء میں اپنے رسالے میں ایک مضمون شائع کرنے کی پاداش میں قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ اس قید کے زمانے میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں قید سے رہا ہونے کے بعد پرچہ دوبارہ جاری کیا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ نے پرچہ دوبارہ بند کر دیا تو مولانا نے وطنی مال کا ایک اسٹور شروع کیا۔

اسی زمانے میں جب مسلمانوں میں احرار نے جنم لیا، اس جماعت کے رہنماؤں اور رہبروں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہیں سے مولانا حسرت موہانی رئیس الاحرار کہلائے۔ حکومت مولانا کو تحریک آزادی کے اوّل صف اوّل کے قائدین میں شمار کرتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں للت پور جیل میں قید کر دیئے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کا جلسہ بھی اس کے ساتھ ہوا۔ مولانا نے اس میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ مولانا نے ترک موالات کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں تیسری اور آخری مرتبہ پھر دو سال کے لئے قید ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں اردوئے معلیٰ پھر سے جاری کیا۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا مسلم لیگ کی تنظیم جدید سے وابستہ ہوئے۔ اور یوپی پارلیمنٹ بورڈ کے سرگرم ممبر بنے۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کو عوام میں مقبول بنانے میں مولانا شوکت علی۔ مولانا ظفر علی۔ اور مولانا حسرت موہانی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ہندی مسلمانوں کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے مولانا قاہرہ کی فلسطین کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

تقسیم پاکستان کے بعد مولانا ہندوستان ہی میں رہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان کا وجود بہت بڑا سہارا تھا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب مولانا حسرت موہانی کے علاوہ کوئی ایسا ممبر نہ تھا جو مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے۔ مولانا نے ۷۵ برس کی عمر میں لکھنؤ میں

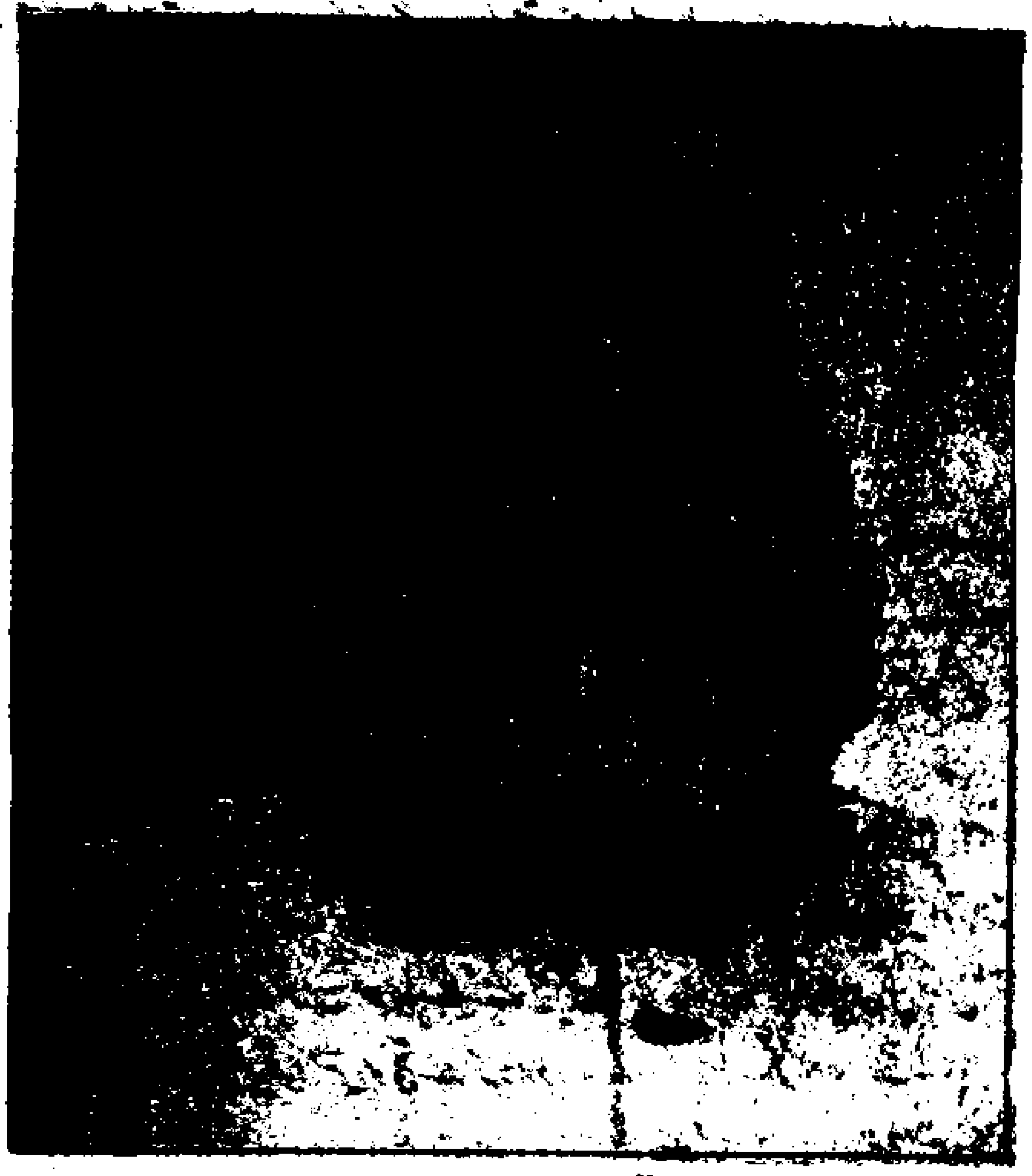

حسرت موہانی مولانا

وفات پائی اور وہیں باغ مولانا انوار میں دفن ہوئے۔ اولاد میں ۵ لڑکے اور دو لڑکیاں پہلی بیوی سے اور ایک لڑکی دوسری بیوی سے ہے۔

مولانا کی زندگی صحیح معنوں میں ایک مرد مسلمان کی زندگی تھی۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ مولانا جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتے تھے اس کو بغیر کسی تامل کے بغیر گھٹائے بڑھائے، بغیر ہموار کئے اور کسی مصلحت اور موقع کا انتظار کئے بغیر کہہ دیتے تھے۔ مولانا نے مالی عسرت کے باوجود گیارہ حج کئے اور بارہ مرتبہ مدینہ طیبہ میں حاضری دی۔ مولانا کی تصانیف میں شرح دیوان غالب، متروکات سخن، مشاہدات زنداں، انتخاب سخن اور دیوان شامل ہے۔

حسن

خوبصورت، اچھا۔ حسن مذکر ہے اور حسنہ مونث ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلا"۔

(۱۶ - ۱۲۵)

علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے۔ جو تین اہم اقسام حدیث میں سے ایک قسم ہے۔ حسن وہ حدیث ہے جس کے راویوں کے ثقہ ہونے پر پورا اتفاق ہو خواہ اس میں کسی دوسری معمولی وجہ سے کچھ کمزوری بھی پائی جاتی ہو۔

حسن آغا

(؟ — ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء)

الجزائر میں خیر الدین کا نائب۔

سردانیہ میں پیدا ہوا۔ خیر الدین نے ایک حملے کے دوران میں اسے قید کر کے اپنے خواجہ سراؤں میں شامل کر لیا تھا۔ حسن آغا نے جلد ہی اپنے آقا کا اعتماد

Marfat.com

حاصل کرلیا۔ چنانچہ اس نے حسن آغا کو کہیا (داروغہ) بنا دیا۔ جب اس نے تونس پر چڑھائی کی تو الجزائر کی حکومت حسن آغا کے سپرد کردی۔ جب ۱۵۳۶ء میں خیرالدین کو ترکی واپس بلایا گیا تو وہاں کی حکومت اس نے حسن آغا کو تفویض کی۔ حسن نے اپنے فرائض نہایت عمدگی سے سرانجام دیئے اس کے دور میں تمام رعایا اس سے خوش تھی۔ بقول ہامیڈو "اس سے زیادہ منصف مزاج پاشا اور کوئی نہیں گزرا"

جب ۱۵۴۱ء میں چارلس پنجم نے الجزائر پر حملہ کیا تو اس نے اس موقع پر حد درجہ شجاعت و بہادری دکھائی۔ اور شہنشاہ کی فوج کو شکست دینے میں بذات خود حصہ لیا۔ ہسپانوی فوج کی ناکامی کے بعد حسن نے ۱۵۴۲ء میں کوکو کے بادشاہ کے خلاف فوج کشی کی اور اسے خراج ادا کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس نے تلمسان کے بادشاہ کو وہران کے ہسپانویوں سے بچانے کے لئے المغرب میں فوج کشی کی۔ اس کے بعد اسے معزول کردیا گیا۔

حسن نے اٹھاون سال کی عمر میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں وفات پائی۔ وفات کے بعد اسے اس قبے میں دفن کیا گیا جو اس کے کہیا نے باب الوید کے قریب بنوایا تھا۔

حسن البنا شہید

(۱۳۲۴ھ/اکتوبر ۱۹۰۶ء — ۱۳۶۹ھ/فروری ۱۹۴۹ء) اخوان المسلمون (مصر) کے بانی۔ والد کا نام احمد بن عبدالرحمٰن تھا۔ محمودیہ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ والد کا پیشہ گھڑی سازی تھا لیکن وہ ازہر کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن کا ایک حصہ روزی کمانے کے لئے گھڑی سازی میں صرف کرتے اور بقیہ اوقات فقہ وحدیث کے مطالعے اور قرآن کی تدریس میں گذارتے۔ بعد میں اعزازی طور پر اپنے گاؤں کی ایک مسجد میں خطیب ہوگئے۔ چنانچہ حسن البنا نے ایسے گھر میں پرورش پائی جو دیہاتی ماحول میں علم وفضل اور اعلیٰ اسلامی ماحول سے آراستہ تھا۔

آپ کی ابتدائی تعلیم میں آپ کے والد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ نے بچپن میں اپنے والد سے قرآن حفظ کیا۔ بعد میں محمودیہ ہی کی ایک ابتدائی درس گاہ میں داخلہ لیا۔ جہاں اپنے استاد محمد زہران سے اخلاقی تربیت پائی۔ پھر مدرسہ اعدادیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دمنہور کے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ تین سالہ کورس پاس کرنے کے بعد آپ کو ضلعی بورڈ کی طرف سے معلمی کے فرائض سونپے گئے لیکن آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے قاہرہ کے دارالعلوم (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لے لیا۔ جو اس زمانے میں چھوٹا ازہر کہلاتا تھا۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں آپ نے دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی اور اسمٰعیلیہ میں مدرس ہوگئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ آپ ۱۹۳۲ء تک یہیں مقیم رہے اس دوران میں آپ نے اسمٰعیلیہ کے معاشرتی حالات کا مطالعہ کیا تاکہ دعوت وتبلیغ کے لئے ایسا اسلوب اور طریق کار اختیار کریں جو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوسکے۔ چنانچہ ابتدائی مطالعہ وتفکر کے بعد آپ نے مسجدوں کے بجائے قہوہ خانوں میں اشاعت دعوت اور اصلاح فکر کا کام شروع کردیا۔ اجتماعات کے لئے تکیوں اور زاویوں کو منتخب کیا گیا۔

۱۹۲۸ء میں اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۳۲ء تک جماعت کا کام اس حد تک بڑھا کہ تھوڑے عرصے کے بعد آپ کو معلمی کا منصب ترک کرکے ہمہ تن تحریک کے لئے وقف ہونا پڑا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں حسن البنا کے ساتھ حکومت کا رویہ خاصا سخت ہوگیا۔ سری پاشا اور پھر نقراشی پاشا کی وزارت کے زمانوں میں تھوڑی تھوڑی مدت قید بھی رہے۔ اس زمانے میں اخوان کی سرگرمیوں کو سختی سے دبا دیا گیا۔ لڑائی کے بعد اخوان اور حکومت کی باہمی کشمکش بڑھ گئی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں نقراشی قتل ہوا تو اس تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اس کے چند ماہ بعد آپ کو شہید کردیا گیا۔

آپ کی تصانیف میں "مذاکرات الدعوۃ والداعیہ"۔ "رسالۃ الجہاد" — "دعوتنا فی طور جدید"۔ "الرسائل الثلاث"۔ "بین الامس والیوم"۔ "الاخوان المسلمون تحت رایۃ القرآن"۔ "مشکلاتنا فی ضوء النظام الاسلامی" وغیرہ ہیں۔

حسن البنا بے پناہ ذہین، محنتی، وتاب اور توانا شخصیت کے مالک انسان نظر آتے ہیں۔ آپ کے دن اسلام کی دعوت اور انسانیت کی خدمت میں گزرتے اور راتیں خدا کے سامنے حاضری اور آہ وزاری کے لئے وقف رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ روحانیت، بے کراں جذبۂ شوق اور اخلاص وعزیمت کی عظیم دولت عطا فرمائی تھی۔ آپ نے پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا اپنے پسماندگان میں چھوڑا۔

حسن ابدال

پاکستان کے ضلع کیمبل پور کا قصبہ جو اٹک سے چالیس کلومیٹر مشرق میں واقع ہے یہ قدیم ٹیکسلا کے گرد ونواح میں پھیلے ہوئے آثار کا ایک حصہ ہے۔ یہ سطح سمندر سے اوسطاً ۱۵۰۴ فٹ بلند ہے چشموں اور باغات کی کثرت کی وجہ سے مغل مؤرخین نے اسے لاہور سے کابل جانے والی شاہراہ پر حسین ترین منزل لکھا ہے۔ یہاں پرانی خاندان ایسا نہیں ہے جو ۲۰۰ سال سے پہلے کا آباد ہو۔ ۱۸۶۶ء میں یہاں پر ریلوے سٹیشن بنایا گیا۔ ٹیکسلا اور حسن ابدال کا درمیانی فاصلہ بارہ میل ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں یہاں پر چھ سو سے زائد کنویں کھودے گئے ہیں لیکن کسی میں سے ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ موجودہ قصبہ مسلم عہد سے پیشتر آباد تھا۔

موجودہ قصبہ پندرھویں صدی کے نصف اول میں سبزوار کے ایک مجذوب بزرگ حضرت باباحسن ابدال نے جو بابا ولی قندھاری کے نام سے مشہور تھے۔ کے نام پر آباد ہوا۔ یہ بزرگ تیمور کے لشکر کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ یہ قصبہ جس پہاڑی کے دامن میں آباد ہے اسے بابا ولی قندھاری کی پہاڑی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ ۱۵۸۱ء میں قلعہ اٹک کی تعمیر اور اس کے پانچ سال بعد کشمیر کا راستہ محفوظ ہوجانے سے حسن ابدال ایک اہم مقام بن گیا۔

یہاں کئی ایک مقبرے ہیں جو خستہ حالت میں ہیں ان میں سے ایک کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کی دختر کا ہے۔ جو آجکل "لالہ رخ" کے نام سے موسوم ہے۔ مغل عہد کی سرائے جس کا کننگھم نے ذکر کیا ہے۔ اسے ۱۹۰۷ء میں مسمار کرکے کمپنی باغ بنا دیا گیا۔ یہ باغ ۱۹۶۲ء میں کیڈٹ کالج میں شامل کرلیا گیا۔

شاہان مغلیہ حسن ابدال میں اکثر آتے رہتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے یہاں پر تقریباً اٹھارہ ماہ قیام کیا۔ ۱۷۵۲ء سے ۱۸۱۳ء تک یہ علاقہ درانی کے قبضے میں رہا۔ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۴۹ء تک اس قصبے پر سکھوں کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔

آجکل اس کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار سے زائد ہے۔ یہاں پر فوجیوں کی ٹریننگ کے لئے ایک کالج بنایا گیا ہے۔

حسن الاعصم

(۲۷۸ھ/۸۹۱ء — ۳۶۶ھ/۹۷۷ء) بحرین کا ایک مشہور قرمطی رہنما۔

Marfat.com

حسن الاحسار میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ احمد بن ابی سعید ابوطاہر سلیمان کا بھائی تھا حسن ابوطاہر کی وفات کے بعد اکیلا کبھی اقتدار کا مالک رہا۔ بلکہ ابوطاہر کے بھائی مجموعی حیثیت سے اقتدار کے مالک تھے۔ وہ متعدد مواقع پر قرمطی افواج کا سپہ سالار رہا۔

۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں اس نے دمشق پر قبضہ کر لیا اور اخشیدی گورنر کو شکست دی۔ لیکن کچھ مال غنیمت کے غلط استعمال کی وجہ سے اس کی تذلیل ہوئی۔ شام کی فاطمی فتح اور قرامطہ کے رویئے میں تبدیلی کے بعد جو عباسی خلیفہ کے حلیف بن گئے تھے، اس نے کمان دوبارہ حاصل کر لی۔ بختیار البویہی اور ابوتغلب کی مدد سے حسن نے ۳۶۰ھ/۹۷۱ء میں دمشق کے باہر فاطمی سپہ سالار جعفر بن فلاح کے قتل ہو جانے کے بعد مکمل فتح حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس نے رملہ پر قبضہ کر لیا اور مصر میں جا کر قاہرہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اپنے حلیفوں عقیل اور طی کے دھوکہ دینے کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑا اور الاحسار واپس لوٹ آیا۔ لیکن دمشق قرامطہ کے قبضے ہی میں رہا۔

۳۶۳ھ/۹۷۴ء میں اس نے ایک بار پھر مصر پر چڑھائی کی لیکن اس مرتبہ بھی اس کے حلیف حسن بن الجراح نے غداری کی۔ چنانچہ فاطمی دستوں نے اسے شکست دی جو قرامطہ شام میں رہے وہ ترک الپتگین کی فوج میں شامل ہو گئے جوہر کی کمان میں ایک فاطمی فوج دمشق کے باہر آ پہنچی۔ الپتگین اور دمشق کے باشندوں نے حسن سے مدد مانگی جس نے جوہر کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ حسن اور الپتگین نے جوہر کا تعاقب کیا۔ جوہر کو رملہ اور پھر عسقلان میں ذلت آمیز شرائط پر چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد العزیز خلیفہ ۳۶۵ھ/۹۷۵ء میں خود میدان جنگ میں نکلا۔ اس نے الپتگین اور حسن کو شکست فاش دی۔ بعد میں حسن نے خلیفہ سے اس شرط پر کہ خلیفہ اسے تیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرے گا صلح کر لی۔

حسن رملہ میں بیمار ہو کر فوت ہوا۔ اسے فاطمیوں کے متعلق قرامطہ کے رویئے میں بڑی تبدیلی کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔

حسن الملک الناصر

(۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء ——— ۷۶۳ھ/۱۳۶۲ء)

ناصر الدین ابوالمعالی۔ دولت الترک خاندان کا انیسواں مملوک سلطان۔

حسن قلاوون کے آٹھ بیٹوں میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ خاندانی جانشینی کے لئے مسلسل کوشش کی وجہ سے پہلی بار سلطنت حاصل کرنے کے وقت ۱۴ رمضان ۷۴۸ھ/۱۸ دسمبر ۱۳۴۷ء میں اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ اس نے پہلے دور حکومت میں جس کی میعاد چار سال تھی دراصل حکومت نہیں کی اور جیسا کہ ممالیک کے عہد میں اکثر ہوتا تھا عملاً اقتدار سابق سلطان کے دور کے باقی ماندہ امراء کے باہم حریف گروہوں میں بٹا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بلوغ کو پہنچنے کے نو ماہ بعد امیر طاز اور امیر منکلی کے دباؤ کی وجہ سے حسن تخت سے دستبردار ہو گیا۔ اور اس کی جگہ اس کا بڑا بھائی صالح تخت نشین ہوا جو تین سال تک حکومت کرتا رہا۔

حسن کی دوبارہ بحالی میں صر غتمش اور شیخون جیسے امراء نے خاص طور پر حصہ لیا۔ دوسری بار تخت نشینی کے فوراً ہی بعد شیخون ایک مملوک کے ساتھ جھگڑے کے دوران میں مارا گیا اس کے بعد حسن کی حیثیت کمزور ہو گئی۔ آخر کار حسن کا دوسرا اور آخری دور حکومت اس کے اپنے ہی ایک جاہ طلب مملوک یلبغا نے ختم کر دیا۔ جب سلطان سازش کی اطلاع پا کر بدوی لباس میں شام کی طرف بھاگ جانے کا انتظام کر رہا تھا تو اسے قلعے میں قتل کر ڈالا گیا۔

حسن کا دور حکومت نہ تو طوالت ہی کی وجہ سے اہم ہے اور نہ اس کے عہد حکومت میں کوئی ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس نے تاریخ پر کچھ اثرات مرتب کئے ہیں۔

حسن بابا

الجزائر کا دے (Dey)

ابتدا میں حسن بابا بحری قزاقوں کا سردار تھا۔ اس نے ۱۶۷۱ء کے انقلاب میں حصہ لیا جس سے آغاؤں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی جگہ دایات کی حکومت قائم ہو گئی۔ حاج محمد جو پہلا دای تھا حسن کا خسر تھا اس وجہ سے حقیقی اقتدار اس کے ہی ہاتھ میں تھا۔ اس کی نخوت بے اعتمادی اور بے رحمی کی بنا پر اس کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اس نے بغاوت کی تمام کوششوں کو سختی سے دبائے رکھا۔ جب مراد بک کے بیٹوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے تونس میں انتشار پیدا ہوا تو اس نے امن و امان بحال کرنے کے بہانے ۱۶۸۰ء میں تونس پر حملہ کر دیا۔ اس نے ۱۶۸۱ء میں المغرب میں مولوی اسمعیل کی فوج سے جنگ لڑی۔ ۱۶۸۲ء میں حاج محمد یہ اطلاع پا کر کہ فرانسیسیوں نے ایک بیڑا اس کے خلاف روانہ کیا ہے طرابلس بھاگ گیا۔ چنانچہ اب عنان حکومت حسن نے سنبھال لی جب الجزائر پر پہلی گولہ باری (۱۶۸۲ء) ہوئی تو حسن اس دوران میں نہایت سختی سے حکومت کرتا رہا۔ دوسرے سال ڈیوک سن دوبارہ شہر کے بالمقابل آ دھمکا اور کئی دن کی گولہ باری کے بعد دامی فرانسیسی امیر البحر سے گفت و شنید کرنے پر مجبور ہو گیا۔ حسن رئیسوں کے سردار حاج حسین مزو مرتو کو بطور یرغمال اس کے حوالے کر دیا اور عیسائی قیدی رہا کر دیئے۔ چونکہ فرانسیسیوں کو تاوان ادا کئے جانے کے بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکا تھا اس لئے حاج حسین کا یہ کہنا تھا کہ وہ گفت و شنید کو جلد ہی کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ لیکن جہاز سے ساحل پر اترتے ہی اس نے رئیسوں کو جمع کیا اور جنینہ میں زبردستی داخل ہو کر حسن بابا کو قتل کرا دیا اور خود نے دائی کا عہدہ سنبھال لیا۔

حسن بادشاہ قادری

(۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء ——— ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء) ایک بزرگ صوفی والد کا نام سید عبداللہ، سلسلہ نسب پندرہ واسطوں سے سید عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ ٹھٹھہ کے مقام پر سندھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کی زیر نگرانی حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں علوم درسیہ کی تمام کتب کی تکمیل کر لی۔ سترہ سال کی عمر میں تدریس شروع کی۔ تصوف میں والد محترم سے آگاہی حاصل کی اور انہی کے بیعت ہوئے۔ مجاہدہ ریاضت کے لئے آپ دریائے شور تشریف لے گئے اور تقریباً سات سال تک مشقت اٹھاتے رہے تبلیغ و ارشاد کے لئے ہندوستان کا رخ کیا۔ گجرات کاٹھیاواڑ میں کئی مساجد تعمیر کیں، یہاں اپنے پانچ خلفاء مقرر کئے۔ پھر شاہجہان آباد سے ہوتے ہوئے دہلی اور وہاں سے لاہور پہنچے۔ لاہور سے پشاور کا قصد کیا۔ بعد میں کشمیر گئے اور چھ ماہ تک قیام کیا۔ قیام کے دوران میں یہاں پر لنگر جاری فرمایا۔ جس میں سو آدمی روزانہ کھانا کھاتے تھے۔ آپ نے تین مرتبہ کابل کا سفر کیا۔ کابل میں بھی آپ نے لنگر جاری کیا۔ پھر لاہور تشریف لائے اور حضرت میاں میر قادریؒ سے ملاقات کی۔

آپ نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پشاور میں وفات پائی۔ مزار مبارک

Marfat.com

پیشانی [illegible] ٹوٹ پڑی ہے۔

حسن بزرگ

(؟ ـــــــ ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء)

بغداد میں جلائری خاندان کا بانی۔ حسن بن حسین گورگان بن آق بوقا بن ایلخان المعروف بہ شیخ حسن۔

ابوسعید کی زندگی ہی میں اس نے ایک بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں ایلخان ارغون کی بیٹی تھی اسی وجہ سے جب ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء میں اس پر ایلخان ابوسعید کے قتل کا منصوبہ بنانے کا غالباً جھوٹا الزام عائد کیا گیا تو اس کی جان بخشی تو ہوگئی لیکن سزائے موت کے بدلے اسے کماخ میں جلا وطن کر دیا گیا۔ اگلے سال اسے ایشیائے کوچک کا والی بنایا گیا۔ ابوسعید کی وفات کے بعد جب تخت کے لئے کشمکش شروع ہوگئی خان آرپا جسے بادشاہت کے لئے چنا گیا تھا وہ بغداد کے والی علی بادشاہ کے ساتھ جنگ میں مارا گیا۔ علی نے ہلاگو کی نسل سے ایک اور حاکم موسیٰ کی بادشاہت تسلیم کر لی۔ اس پر شیخ حسن نے اس کی مخالفت میں بادشاہت کے ایک اور دعویدار محمد کو موسیٰ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ جنگ میں شیخ حسن نے فتح پائی اور اس نے تبریز کو اپنا صدر مقام بنایا۔ موسیٰ نے بغداد کی طرف مراجعت کی۔ یہ نزاع چونکہ دو مغول قبیلوں کے درمیان تھی۔ اس لئے خراسان کے امراء نے طغا تیمور کو خان منتخب کر لیا۔ اور موسیٰ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن ان امراء نے ۷۳۷ھ/۱۳۳۷ء میں شیخ حسن کے ہاتھوں مراغہ کے قریب ایک لڑائی میں شکست کھائی۔ موسیٰ گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ اسی اثناء میں شیخ حسن کا ایک اور حریف حسن کوچک پیدا ہو گیا۔ اس نے جنگ میں شیخ حسن کے تسلیم کردہ خان محمد کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اور شیخ حسن پر فتح بھی حاصل کی۔ شیخ حسن نے تبریز بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ بعد ازاں وہ بغداد چلا گیا اور وہاں اپنے قدم مضبوط کر کے اس نے شاہ جہان تیمور کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ء کا ہے اس کے بعد سے اپنی وفات تک شیخ حسن بغداد پر خود مختار طور پر حکومت کرتا رہا۔

حسن بصری خواجہ

(۲۱ھ / ـــــ ۱۱۰ھ /) تابعی، بزرگ صوفی اور صاحب کرامات ولی۔ کنیت ابوسعید، ابومحمد اور ابی النصر ہے۔ والد کا نام موسیٰ راعی تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد زید بن ثابت انصاریؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے ۱۲ھ میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ آپ کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھیں۔ جب آپ پیدا ہوئے تو حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں لائے گئے۔ آپ بڑے خوش رو تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کو دیکھ کر فرمایا "اس کا نام حسن رکھو کیونکہ اس کا چہرہ حسین ہے۔"

ابتداء میں آپ جواہرات بیچا کرتے تھے۔ چنانچہ لوگ آپ کو حسن لولوٰ کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کاروبار میں آپ نے بہت سا روپیہ کمایا۔ جب عشق الٰہی کا غلبہ ہوا تو آپ نے سارا مال و اسباب راہ خدا میں لٹا دیا اور دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو کر عبادت، ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ آپ سنت نبوی اور مطابعت مصطفویؐ کے بڑے پابند تھے۔ خوف الٰہی سے ہر وقت روتے رہتے تھے۔ کثرت گریہ کے باعث آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ کمزور اتنے ہو گئے تھے کہ بدن پر گوشت نظر نہیں آتا تھا۔ بقول صاحب تذکرۃ اولیاء حضرت علیؓ بصرہ تشریف لائے تو تمام واعظین اور ذاکرین کو منع کر دیا۔ مگر حسن بصری کا منبر باقی رہنے دیا۔ آپ حضرت علیؓ کے خلیفہ اور حضرت امام حسنؓ اور خواجہ کمیل بن زیاد کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ نے ہشام بن عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں نواسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار مبارک بصرہ میں ہے۔

آپ کا معمول تھا کہ ہفتے میں ایک بار مجمع عام میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ معروفتیں اٹھ گئیں اور برائیاں رہ گئیں۔ اور مسلمانوں میں جو باقی رہ گیا وہ مغموم و متفکر ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مالک بن دینارؓ نے پوچھا "لوگوں کی خرابی کس بات میں ہے؟" فرمایا "دل کے مرنے میں۔" پوچھا "دل کا مرنا کیا ہوتا ہے؟" فرمایا "دنیا کی محبت۔" حضرت جبیرؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

۱۔ بادشاہوں کی بساط پر قدم نہ رکھنا اگرچہ وہ شفقت کریں۔

۲۔ کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا خواہ وہ رابعہؒ وقت ہو اور تو اسے کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہو۔

۳۔ مزامیر نہ سننا اگرچہ تو مردانِ مرد کا درجہ رکھتا ہو۔

آپ بڑے مستجاب الدعوات، صاحب کرامات، عالی مقامات اور ظاہری و باطنی علوم میں یگانۂ روزگار تھے۔ آپ نے ایک سو بیس صحابۂ کرام کو دیکھا جن میں ستر اصحاب بدر تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ آپ کو بہت اچھا جانتی تھیں۔ آپ کے کلام میں بے حد تاثیر و قبولیت تھی۔ چنانچہ ہزارہا افراد نے آپ کی مجلس سے ہدایت پائی۔

بقول ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی، آپ خوف الٰہی کے حلیف تھے۔ حسن بصری حزن و الم کو دوست رکھتے تھے۔ راتوں کو جاگتے اور عبادت کرتے تھے۔ دن ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کرتے وہ فقیہہ بھی تھے اور زاہد بھی اور عابد بھی تھے۔ اور دنیا سے بیزار تھے۔ وہ دنیا اور اس کی زینت کو ہیچ اور ناکارہ سمجھتے تھے۔ نفس کی خواہشات سے عبادت کے خوگر تھے۔

حسن بن استاد ہرمز

(؟ ـــــــ ۴۰۱ھ/ ۱۰۱۰ء، ۱۰۱۱ء)

ابوعلی کنیت۔ دیلمی فوج کا ایک سردار۔

۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء میں صمصام الدولہ کے قتل کے بعد حسن نے بویہی خاندان کے حکمران بہاءالدولہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے حسن کو (۳۹۰ھ/ ۱۰۰۰ء) میں خوزستان کا والی مقرر کر دیا۔ اور اسے عمید الجیوش کا خطاب بھی عطا کیا۔ بعد میں اس نے حسن کو اسی حیثیت سے العراق روانہ کیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے پیشرو ابوجعفر حجاج اور ابوالعباس بن واصل اور دوسرے لوگوں سے کئی ایک جنگیں لڑیں۔

حسن نے اپنے والد کی ہی زندگی میں انچاس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس نے بغداد میں وفات پائی اور اہل قریش کے قبرستان میں دفن ہوا۔

حسن بن بہرام

(؟ ـــــــ ۳۰۱ھ / ۹۱۳ء)

ابوسعید کنیت۔ شیعان قطیف کا سرگروہ جو عمال خلافت کے خلاف خروج کیلئے کوشش کر رہا تھا۔

۲۸۱ھ/ ۸۹۴ء میں ایک شخص یحییٰ بن مہدی قطیف (مضافات بحرین) میں وارد ہوا اس کا دعویٰ تھا کہ مجھے مہدی آخر زمان نے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا ہے اور

Marfat.com

وہ عنقریب خروج چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس شخص کے بارے میں تاریخ میں کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اسے کس مہدی نے اپنا ایلچی بنایا تھا۔ اس شخص کا میزبان علی بن معلی نہایت غالی شیعہ تھا اس نے شیعان قطیف کو جمع کرکے مہدی آخر الزمان کا خط سنایا۔ شیعان قطیف نے خانہ ساز مہدی کے خط کو نہایت غور سے سنا اور سب نے حلف اٹھایا کہ جب اس مہدی کا ظہور ہوگا تو وہ سب ان کے ہمراہ ان کے دشمن سے لڑیں گے۔ ایک مرتبہ یحییٰ بن مہدی حسن بن بہرام کے گھر آیا اور سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جب حاکم کو حسن بن بہرام کے ایک شرمناک واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے حسن کو گرفتار کرکے سزا دی۔ چنانچہ اس کے بعد حسن اپنے اصل وطن موضع جنابا کی طرف بھاگ گیا۔ اور یحییٰ بن مہدی قبائل بنی کلاب عقیل و خریس کے پاس چلا گیا۔ چنانچہ یہ لوگ حسن بن بہرام کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح حسن کے کافی لوگ طرفدار ہوگئے۔ جب حسن کو ایک جمعیت حاصل ہوگئی تو وہ خود بھی دعوائے مہدویت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے قرب و جوار کے قصبات و دیہات کو تاراج کیا پھر بصرہ کو تسخیر کرنے کا عزم کیا۔ جب خلیفہ معتضد باللہ کو اس کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو اس نے بصرہ کی محافظت کے خیال سے ایک فصیل شہر کے گرد بنانے کا حکم دیا جس پر چودہ ہزار دینار صرف ہوئے۔

۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں حسن بصرہ کے قریب پہنچا۔ ادھر سے عباس بن عمر عامل فارس دو ہزار سواروں کے ساتھ بصرہ کی مدافعت کے لئے آگیا۔ بصرے سے کچھ فاصلے پر دونوں میں تصادم ہوا لڑائی میں حسن کو فتح ہوئی۔ حسن کے لشکر نے شاہی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر اس کے حکم سے بہت سی لکڑیاں جمع کی گئیں اور آگ کا الاؤ تیار کیا گیا بعد میں مسلمان قیدیوں کو اس آگ میں ایک ایک کرکے جھونکا۔ اس جنگ سے فارغ ہونے کے بعد حسن نے ہجر پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کرلیا۔

حسن اپنے خادم عقلبی کے ہاتھوں حمام میں مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سعید اس کا جانشین ہوا لیکن اس کا چھوٹا بھائی ابوطاہر سلیمان اپنے بڑے بھائی کو مغلوب کرکے تخت پر قابض ہوگیا۔

حسن کے مرنے کے بعد اس کے پیروؤں نے اس کی قبر پر بڑا گنبد تعمیر کرکے اس پر ایک پرندہ بنایا اور مشہور کیا کہ جب یہ پرندہ اڑے گا تو ابوسعید اپنی قبر سے اٹھ کھڑا ہوگا۔ نیز اس کی قبر کے پاس ایک گھوڑا باندھا اور خلعت شاہی اور تلوار رکھی تاکہ جب وہ اٹھے تو گھوڑے پر سوار ہوکر گنبد سے باہر نکلے۔

حسن اپنے بڑے بڑے دعوؤں کے باوجود بڑا زندیق تھا۔ اگرچہ وہ قرمطی مشہور تھا لیکن قرامطہ کے مسلک کے خلاف باطنی طریقہ کا دلدادہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حشر نشر کے سارے قصے من گھڑت اور فضول ہیں اور جو شخص کسی کو صوم و صلوٰۃ جیسے ظاہری اعمال کی ترغیب دے وہ واجب القتل ہے۔ وہ انتہا درجے کا سفاک تھا۔ اس نے بے شمار مسلمانوں کو نہایت سفاکی کے ساتھ شہید کیا۔ بہت سی مساجد منہدم کرادیں اور بے شمار عازمین حج کے قافلے لوٹے۔

حسن بن جابر

حضورؐ کے صحابی۔ آپ ابن ابی جابر السلمی کے نام سے بھی موسوم ہیں۔ طائف میں حضورؐ کے ہمراہ آپ بھی موجود تھے۔ انھوں نے [illegible] فرمائی ہیں۔

[illegible]

(ـــــــ ؟ ـــــــ ۱۶۷ھ/۷۸۳ء)

حضرت علیؓ کے پرپوتے

آپ کو اپنے باپ دادا کی طرح حکومت و اقتدار کی کوئی ہوس نہ تھی۔ آپ عباسی حکومت پر رضامند تھے۔ آپ کی بیٹی خلیفہ ابوالعباس سے بیاہی ہوئی تھی۔ آپ خود بھی خلیفہ کے دربار میں رہتے تھے۔ ۱۵۰ھ/۷۶۷ء میں آپ کو مدینے کا والی مقرر کیا گیا۔ لیکن اس کے پانچ سال ہی بعد خلیفہ کسی بات پر آپ سے ناراض ہوگیا۔ چنانچہ ۱۵۵ھ/۷۷۲ء میں آپ کو اس عہدے سے برطرف ہونا پڑا۔ برطرفی کے ساتھ ہی آپ کو قید میں ڈال دیا گیا اور آپ کی جائداد بھی ضبط کرلی گئی۔ اگرچہ منصور کی وفات کے بعد اس کے جانشین مہدی نے اس کی تلافی کی اور جو کچھ آپ سے چھین لیا گیا تھا وہ آپ کو واپس کردیا گیا۔ آپ حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے جارہے تھے کہ الحاجر کے مقام پر آپ کا انتقال ہوگیا اور آپ وہیں پر دفن ہوئے۔ آپ بڑے متقی اور متدین تھے۔

حسن بن زید بن محمد

(ـــــــ ؟ ـــــــ ۲۷۰ھ/۸۸۳ء، ۸۸۴ء)

طبرستان میں ایک علوی حکمران خاندان کے بانی۔

آپ حسن بن زید بن حسنؓ کے پرپوتے تھے۔ طبرستان میں طاہری خاندان کی جابرانہ حکومت کی وجہ سے حد درجہ بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ بعض لوگوں نے اس عقیدت کی وجہ سے جو انھیں علویوں سے تھی حضرت علیؓ کی اولاد میں سے کسی ایسے شخص کی تلاش کی جس کو وہ حکومت کا کاروبار سونپ سکیں۔ ان کی نظر حسن پر پڑی جو اس وقت رے میں سکونت پذیر تھے۔ ان کا یہ انتخاب موزوں ترین رہا کیونکہ حسن میں مستعدی اور ارادے کی پختگی دوسرے تمام لوگوں سے بڑھ کر پائی جاتی ہے۔ حسن طاہری فوجوں کو شکست دینے اور آمل اور ساریہ کے شہروں اور رے پر بھی قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن انھیں چاروں طرف سے حملوں کی مدافعت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا۔

حسن کو کئی بار اپنی مملکت کو چھوڑنا پڑا۔ لیکن تھوڑے سے وقت کے بعد جب بھی وہ واپس آنے تو قسمت ان کا ساتھ دیتی۔ ۲۵۷ھ/۸۷۱ء میں حسن کا جرجان پر قبضہ ہوگیا۔ اسی سال ان کا ایک اور دشمن یعقوب الصفار ان کے مقابل آیا۔ اس وقت حسن میں اپنے اس طاقتور دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی چنانچہ وہ دیلم چلے جانے پر مجبور ہوگئے لیکن سخت بارشوں کی وجہ سے یعقوب کو ہزیمت اٹھانی پڑی حسن واپس آگئے۔ ۲۶۶ھ/۸۸۰ء میں ایک سجستانی نے جس کا نام احمد بن عبداللہ تھا، جرجان پر چڑھائی کردی اور اس ملک کا ایک حصہ فتح کرلیا۔ جب حسن اس سے برسرپیکار تھے تو ایک اور علوی نے اپنے حق میں اعلان حکومت کرانے کے لئے یہ خبر مشہور کردی کہ حسن قتل ہوگئے۔ لیکن جب حسن واپس آئے تو اس کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور مارا گیا۔

حسن نے جب انتقال کیا تو اس وقت اپنے علاقے پر حکمران تھے بعد میں ان کا خاندان ۳۱۶ھ/۹۲۸ء تک طبرستان پر حکومت کرتا رہا۔

Marfat.com

حسن بن سہل

(؟ ——— ۲۳۵ھ / ۸۵۰ء)

بن عبداللہ سرخسی۔ خلیفہ المامون کا ایک والی۔

شروع میں یہ آتش پرست تھا لیکن بعد میں اپنے بھائی فضل کے ساتھ مسلمان ہوگیا۔ ۱۹۶ھ/۸۱۲ء میں مشرقی صوبوں کی حکومت جب المامون نے فضل کے سپرد کردی تو حسن کو اس کا وزیر خزانہ بنادیا۔ ۱۹۸ھ/۸۱۳ء میں حسن اپنے بھائی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے عرب اور عراق کا والی بن گیا۔ لیکن چونکہ حسن ایرانی النسل تھا اس لئے عربوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کرسکا۔ چنانچہ اس علاقے میں جلد ہی فتنہ و فساد برپا ہوگیا۔ اگرچہ حسن نے اس فتنہ و فساد اور غنڈہ گردی کا خاتمہ کردیا لیکن یہ امن و امان دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔

۲۰۱ھ/۸۱۷ء میں المامون نے علی بن موسیٰ کو اپنا جانشین مقرر کیا تو بغداد میں بغاوت برپا ہوگئی اور مہدی کے ایک بیٹے ابراہیم کی خلافت کا اعلان کردیا گیا ۲۰۲ھ/۸۱۸ء میں باغیوں نے واسط پر حملہ کردیا لیکن انھیں پسپا ہونا پڑا۔ جب حسن کا بھائی فضل قتل کر دیا گیا تو وہ دماغی توازن کھو بیٹھا۔ لیکن اسے دوبارہ صحت حاصل ہوگئی۔ ۲۱۰ھ/۸۲۶ء میں اس نے اپنی لڑکی بوران کی شادی المامون سے کردی۔

حسن علماء اور شعراء سے فیاضی کا سلوک روا رکھتا تھا۔ خاص کر علماء کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔

حسن بن صالح

(غالباً ۱۰۰ھ/۷۱۸، ۷۱۹ء ——— ۱۶۸ھ/۷۸۵ء)

ابوعبداللہ کنیت۔ محدث اور ایک زیدی متکلم۔

اس کے بارے میں بہت کم حالات معلوم ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی امام زین العابدین کے بیٹے عیسیٰ بن زید کے ساتھ کرنے کے بعد اپنے داماد کے ساتھ روپوش ہوگیا تھا تاکہ المہدی کی تلاش سے بچ سکے۔ وہ ساری عمر روپوش رہا۔ اس نے کوفے میں وفات پائی۔ اسے صالحیہ کے زیدی فرقے کا بانی قرار دیا گیا ہے۔

ابن قتیبہ نے اسے اصحاب الحدیث کے زمرے میں جگہ دی ہے۔ ابن ندیم کے بقول محدثین کی ایک بڑی تعداد زیدی ہے۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ امامت کے مسئلے پر حسن بن صالح کی رائے بھی وہی ہے جو معتزلہ کی ہے یعنی خلیفہ کسی بھی خاندان سے ہوسکتا ہے۔

حسن کے نزدیک امامت انتخابی ہے اور مفضول کو بھی تفویض کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ افضل معلوم و معروف بھی ہو۔ اس کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت برحق ہے کیونکہ حضرت علیؓ جو آنحضورؐ کے بعد تمام مسلمانوں سے افضل تھے خلافت چھوڑنے پر رضامند ہوگئے تھے۔ چنانچہ دوسرے شیعہ کے برعکس صالحیہ کا خیال تھا کہ صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کو ترجیح دینے میں قصوروار نہیں ہیں۔ جہاں تک حضرت عثمانؓ کا تعلق ہے صالحیہ انھیں اسلام سے خارج نہیں کرتے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک طرف تو وہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اس لئے مومن ہیں اور دوسری طرف انھوں نے ایسے اعمال کئے جن کی وجہ سے وہ (نعوذ باللہ) کافر ہوجاتے ہیں چنانچہ یہ لوگ کوئی ایک پہلو اپنانے سے انکار کردیتے ہیں۔

ان کے نزدیک امام حسنؓ یا امام حسینؓ کی کسی ایسی اولاد کے لئے جو امامت کی اہل ہو امامت تسلیم کرانے کے لئے قوت (سیف) کے استعمال کے حق میں ہے ان کے نزدیک دو امام دو مختلف ملکوں میں حکومت کرسکتے ہیں۔

حسن کی تصانیف میں سے "کتاب التوحید" "کتاب امامۃ ولد علی من فاطمہ" "الجامع فی الفقہ" وغیرہ مشہور ہیں

حسن بن صباح

(؟ ——— ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء)

صباحیہ فرقے کا بانی۔ جسے مہبط وحی ہونے اور اللہ تعالیٰ سے احکام پانے کا دعویٰ تھا۔ خراسان کے شہر طوس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ علی اسمٰعیلی مذہب کا پیرو تھا۔ اس کا سلسلہ نسب یہ ہے "حسن بن علی بن احمد بن جعفر بن حسن بن صباح حمیری"۔

اس کا باپ بڑا شریر و عیار قسم کا آدمی تھا اور اپنے خبث باطن اور رفض و زندقہ میں بدنام تھا وہ ابومسلم رازی کو جو ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھا جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ میں بھی صحیح العقیدہ مسلمان ہوں۔ اسی وجہ سے کہ کسی طرح اس سے رفض و الحاد کا الزام دور ہو جب اہل سنت و جماعت کے ایک بڑے عالم دین امام موفق نے نیشاپور میں مسند درس سنبھالی اور مختلف شہروں اور ممالک کے لوگ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے لئے آئے تو علی نے بھی اپنے بیٹے حسن کو نیشاپور لے جاکر امام موفق کے درس میں داخل کرایا۔ وہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس اپنے والد کے پاس آگیا جو رے میں بود و باش رکھتا تھا۔ ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء میں اپنے ہم مکتب اور دوست نظام الملک کے پاس نیشاپور پہنچا۔ نظام الملک نے اس کی سلطان ملک شاہ سے ملاقات کرائی اور اسے سلطان کا معتمد خاص مقرر کرادیا۔ لیکن چونکہ حسن بہت ہی بدسرشت تھا اب وہ ہر وقت اس فکر میں رہنے لگا کہ کسی طرح نظام الملک کو بادشاہ کی نظروں سے گرا دے اور خود اس کے عہدے پر پہنچ جائے۔ چنانچہ حسن کو اپنی ان حرکتوں کے سبب سلجوقیوں کے دربار سے نکلنا پڑا۔ یہاں سے نکل کر وہ اصفہان پہنچا۔ کچھ عرصے کے بعد اسے اصفہان کو بھی خیرباد کہنا پڑا اور ایک بار پھر عازم رے ہونا پڑا۔

رے پہنچ کر حسن کو معلوم ہوا کہ اسمٰعیلی مذاہب کا داعی الکبیر یہیں رہتا ہے۔ جو اسمٰعیلی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مبلغ ملازم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے داعی الکبیر سے مل کر درخواست دی کہ اسے بھی کوئی خدمت مفوض کی جائے۔ داعی الکبیر نے اسے ملازم رکھ لیا اور کچھ عرصے بعد اسے مصر بھیجا جہاں پر اس وقت عبیدیوں کی سلطنت تھی جو بظاہر اسمٰعیلی تھے اور در پردہ باطنی تھے۔ حسن کی مصر میں بہت قدر و منزلت کی گئی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ مصر میں ایک سازش میں ملوث پایا گیا جس کی بناء پر اسے قلعہ دمیاط میں قید کردیا گیا۔ اتفاق سے اسی روز قلعہ کا ایک نہایت مضبوط برج گر پڑا۔ لوگوں نے اس واقعے کو حسن کے باطنی تصرف پر محمول کیا۔ امیرالجیوش نے برافروختہ ہوکر اسے اس قلعہ سے نکال کر چند عیسائیوں کے ہمراہ ایک جہاز پر بٹھا دیا اور افریقہ کی طرف بھیج دیا۔ جہاز سے اتر کر وہ حلب بغداد، خوزستان سے ہوتا ہوا اصفہان پہنچا اور ان تمام علاقوں میں اسمٰعیلی مذہب کی دعوت دیتا رہا۔

اسی اثناء میں حسن کا استاد زادہ اور بعض دوسرے باطنی چند مضبوط قلعوں پر قابض ہوگئے۔ سب سے پہلے وہ جس قلعے پر قابض ہوئے وہ فارس کے قریب تھا جب

Marfat.com

یہاں پر ان کی جمعیت بڑھنے لگی تو انھوں نے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ چند ہی دنوں میں ان کی چیرہ دستیاں ان اطراف میں عام ہو گئیں تھوڑے ہی عرصے بعد باطنیوں نے قلعہ اصفہان پر قبضہ کر لیا۔

حسن بن صباح نے اصفہان آنے کے بعد اپنے چند لوگ اس غرض سے قلعہ الموت کی طرف بھیج دیئے تھے کہ اس کے گرد و نواح میں اسمٰعیلی مذہب کو پھیلائیں چنانچہ اسمٰعیلی مناد قلعہ الموت کے چاروں طرف نہایت زبردست طریق سے اپنے مذہب کا پرچار کر رہے تھے اور خود حسن الموت کے قریب قیام کر کے لوگوں کے دلوں پر اپنے ریا کارانہ زہد و اتقاء کا سکّہ جما رہا تھا۔ چنانچہ ہزارہا آدمیوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب اس کے مریدین کی تعداد زیادہ ہو گئی تو حاکم علاقہ اس سے بہت متردد ہوا اس نے سپاہیوں کے ایک دستے کو رات کی تاریکی میں حسن کو گرفتار کر کے قلعے میں بند کرنے کا حکم دیا۔ لیکن قلعہ میں داخل ہونے کے بعد حسن ایک ایسی چال چلا کہ حاکم علاقہ اس قلعے سے بالکل بے دخل ہو گیا۔ حسن نے یہ زمین تین ہزار دینار کے بدلے خرید لی۔ اگرچہ اس نے نماز پڑھنے کے لئے ایک چرسہ زمین مانگی تھی جب بیعنامہ تیار ہو گیا تو اس نے ایک بیل کی کھال منگوا کر اس کے باریک باریک ٹکڑے کرا کے اس سارے علاقے پر اپنے قبضے کا دعوےٰ کر دیا۔ جب حسن کو الموت جیسا مستحکم اور محفوظ قلعہ مل گیا تو اس نے صوبہ رودبار اور قزوین میں بڑے استقلال کے ساتھ اپنے مذہبی خیالات کی تبلیغ شروع کی۔ اس صوبے کے بہت سے لوگ بطیب خاطر اور بہت سے جبراً و قہراً اس کے داخل مذہب ہو گئے۔ اور مذہب کی آڑ ہی آڑ میں تمام صوبہ رودبار و کوہستان میں حسن کی حکومت قائم ہو گئی اس نے قلعہ الموت کو بحیثیت مستقر حکومت خوب مستحکم کیا اور اس کے چاروں طرف عالیشان محل تعمیر کرائے اور باغات لگوائے۔

اب حسن پر ہر وقت یہ دھن سوار تھی کہ کسی طرح سلطان ملک شاہ اور اپنے دوست نظام الملک طوسی کا قلع قمع کر دے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اتنے بڑے اور زبردست حریفوں کا مقابلہ اس کے لئے آسان نہیں۔ چنانچہ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب سوچی۔ اس نے جانبازوں کی ایک جماعت تیار کی اور ان کے لوح دل پر یہ بات مرتسم کرا دی کہ شیخ الجبل یعنی حسن بن صباح تمام دنیا کا مالک اور ورائے دنیا میں بڑا قادر و متصرف اور فعّال لّما یرید ہے اس تعلیم و تلقین کے علاوہ اس نے ایک ایسی تدبیر کی جس کی وجہ سے اس جماعت کو جاں سپاری پر آمادہ کرنا بالکل آسان تھا۔ اس نے قلعہ الموت کے ارد گرد خوبصورت مرغزاروں اور جاں بخش نزہت گاہوں میں نہایت خوبصورت محل، برج اور کوشکیں تعمیر کرائیں عالیشان محلات کی پاکیزگی اور خوشنمائی۔ باغوں اور مرغزاروں کی نزہت و تر و تازگی دیکھنے والے کے دل پر جادو کا اثر کرتی تھی۔ ان کے بیچوں بیچ جنت کے نام سے ایک خوش سواد باغ بنوایا جس میں وہ تمام سامان مہیا کئے جو انسان کے لئے موجب تفریح ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اشیائے بدیع، ہر قسم کے میوہ دار درخت، پھول، چینی کے خوبصورت ظروف، بلوری، طلائی اور نقری سامان، بیش قیمت فرش و فروش، یونان کے اسباب تعیشات، پرتکلف سامان خورد و نوش، چنگ و چغانہ، نغمہ و سرود، جنت کی دیواروں پر نقش و نگار کا نہایت نازک کام بنوایا۔ نلوں کے ذریعے محلات میں پانی، دودھ، شراب اور شہد جاتا تھا۔ ان تمام تکلفات کے علاوہ دل بہلانے کے لئے پری تمثال کم سن نازنینیں سو جو تھیں ان ماہ وش اچھوتیوں کی سادگی وضع اور ان کے حسن و جمال کی دلربائی معاً دیکھنے والے کو یہ یقین دلاتی تھی کہ یہ عالم سفلی کے سوا کسی اور ہی عالم کے اہالی پیکر ہیں۔ اس بارے میں کو [redacted] بعد زائرین کے دل پر فرحت و انبساط کا ایک ایسا شدید اثر پیدا کیا جاتا کہ وہ اس فرحت و مسرت کو دنیاوی نہیں بلکہ اخروی یقین کرے۔

حسن نے اپنے مریدین کو تین جماعتوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک تو داعی و مناد تھے جو دور دراز ممالک میں خفیہ لوگوں کو اس مذہب کی دعوت دیتے تھے۔ دوسرے رفیق جن کو حسن کا معتمد علیہ ہونے کی عزت حاصل تھی۔ تیسرا گروہ فدائیوں کا تھا جس کے لئے یہ جنت بنائی گئی تھی۔ ابن صباح علاقہ طالقان اور رود بار وغیرہ سے خوبصورت تندرست اور قوی ہیکل نوجوان جو سادہ لوح ہوتے اور ان میں ہر بیان کے باور کرنے اور جلد ایمان لانے کی صلاحیت نظر آتی فدائیوں کی جماعت میں بھرتی کرتا۔ وہ حسن کے ہر حکم کی بلا عذر آنکھیں بند کر کے تعمیل کرتے تھے۔ بھنگ جسے حشیش کہتے ہیں شاید ان ایام میں غیر معمولی چیز تھی۔ اور غالباً حسن بن صباح ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی دانشمندی سے بھنگ سے وہ کام لیا تو اس سے پہلے شاید کسی نے لیا ہو گا۔ جب فلاں سپاہی امیدواری کا دور ختم کر لیتا تو حسن اسے بھنگ کے اثر سے بے ہوش کر کے جنت میں بھجوا دیتا۔ جہاں وہ جاں پرور حوروں کی گود میں آنکھ کھولتا اور اپنے آپ کو ایسے عالم میں پاتا جہاں کی خوشیاں اور مسرتیں شاید بڑے بڑے شاہان عالم کو بھی نصیب نہیں۔ یہاں وہ انواع و اقسام کی نزہت گاہوں کی سیر کرتا۔ حوروں کے حسن سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا۔ ان مہ وشوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر مئے ارغوانی کے جام اڑاتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں بعد بہترین قسم کے میوے کھاتا اور ہر طرح کے تعیشات میں محو رہتا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد جب ان محبت شعار حوروں کی الفت کا نقش ان کے دل پر اتنا گہرا پڑ لیتا کہ پھر مدت العمر کبھی مٹ نہ سکے، تب وہی حوریں بھنگ کا ایک جام پلا کر اسے شیخ الجبل کے پاس بھجوا دیتیں جہاں وہ شیخ کے قدموں میں آنکھ کھولتا اور جنت کے چند روزہ قیام کی خوشگوار یاد اس کو سخت بے چین کر دیتی۔ حسن بن صباح اس کو جنت میں بھیجنے کی پھر امید دلاتا اور کہتا کہ جنت کے دائمی قیام کی لازمی شرط جاں سپاری و جاں سپاری ہے۔ چنانچہ وہ حسن کے احکام کی تعمیل میں کس طرح کوتاہی کر سکتا تھا۔ جب حسن کو کسی دشمن کا قتل کرانا مقصود ہوتا تو ایک فدائی نوجوان کو حکم دیتا کہ جا فلاں شخص کو قتل کر کے قتل ہو جا مرنے کے بعد فرشتے تجھے جنت میں پہنچا دیں گے یہی وہ خطرناک لوگ تھے جن سے خون آشامی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کو جس کے قتل کا اشارہ ہوتا وہ وہاں روپ بھر کر جا کے رسائی اور آشنائی پیدا کرتے، اس کے معتمد علیہ بنتے اور موقع پاتے ہی اس کا کام تمام کر دیتے۔ یہی وہ فدائی تھے جن کی وجہ سے دنیا بھر کے امراء و سلاطین حسن بن صباح کے نام سے کانپتے تھے۔ ان فدائین کو بلی کا گوشت کھلایا جاتا تھا کیونکہ بلی غضب کے وقت آپے میں نہیں رہتی اور مخالف پر سخت بے جگری کے ساتھ حملہ کرتی ہے۔ جب خواجہ نظام الملک نے قلعہ الموت پر لشکر کشی کی تو اسے بھی ایک ایسے ہی فدائی نے درخواست دینے کے بہانے سے شہید کر ڈالا۔ جب یہ حملہ کامیاب رہا تو حسن نے یہ بات طے کر لی کہ فوجوں کے لڑنے کی نسبت یہ بات کہیں زیادہ بہتر ہے کہ جو بادشاہ بھی اس پر حملہ کرنے کے لئے آگے اس بادشاہ کو کسی فدائی کے ہاتھوں مروا دیا جائے۔

حسن بن صباح نے ۹۰ سال کی عمر میں انتیس سال تک قلعہ الموت پر نہایت کامیابی سے حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا۔

Marfat.com

حسن بن صباح کا فرقہ حسنی سب سے آخری مسلم آزار فرقہ ہے جس سے عالم اسلام کو سابقہ پڑا۔ ان اسمٰعیلی فرقوں کی تعداد بعضوں نے مختلف ناموں سے خروج کیا کم از کم اکیس تک پہنچتی ہے۔ پہلا فرقہ اسمٰعیلی تو اصل ہے باقی اس کی شاخیں ہیں جو اپنے دعاۃ کی طرف منسوب ہو کر یا کسی خاص عقیدہ کے ماتحت کسی نام سے شہرت پذیر ہوئیں۔ حسن بن صباح کے فرقے کو حسنی کے علاوہ تعلیمیہ، فدائیہ، حشاشین، باطنیہ، صباحیہ، ملاحدہ وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

حسنؓ بن علیؓ

(رمضان المبارک ۳ھ / ۶۲۴ء - ۴۹ یا ۵۰ھ/ ۶۶۹ء، ۶۷۰ء) صحابی اور آنحضورؐ کے نواسے۔ ابو محمد کنیت، سید اور ریحانۃ النبی خطاب، شبیہ رسول لقب والد کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے:

ابو محمد حسن بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب اور والدہ کی طرف سے فاطمہ بنت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب۔

مدینے میں پیدا ہوئے۔ آنحضورؐ کو آپ کی پیدائش کی اطلاع ہوئی تو آپؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا میرے بچے کو دکھانا، کیا نام رکھا گیا۔ عرض کیا حرب، آپؐ نے فرمایا نہیں اس کا نام حسن ہے۔ پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا آپؐ کو حسنؓ سے غیر معمولی محبت تھی۔ آپ ہر روز نواسے کو دیکھنے کے لئے تشریف لے جاتے۔ آپؐ نے بڑے ناز و نعم کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ آٹھ سال کے تھے کہ آنحضورؐ کا وصال ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں سب سے پہلے طبرستان کی فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ یہ فوج کشی سعید ابن العاص کی ماتحتی میں ہوئی تھی۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں بھی شامل رہے۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد اس علاقے کے سوا جس پر حضرت امیر معاویہؓ کا قبضہ تھا، باقی سارے ملک کی نظریں حضرت حسنؓ پر لگی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں نے آپ کی بیعت کر لی۔

حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ میں قدیم اختلاف چلا آرہا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کی حیات ہی میں عالم اسلامی پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جناب علیؓ کی زندگی میں ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ لیکن حضرت علیؓ کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے فوراً فوجی پیش قدمی شروع کر دی اور عبداللہ بن عامر کو مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بھیجا۔ حضرت حسنؓ اس وقت کوفہ میں تھے۔ آپؓ کو عبداللہ بن عامر کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو آپؓ بھی مقابلہ کے لئے کوفہ سے مدائن کی طرف بڑھے۔ ساباط پہنچ کر اپنی فوج میں کمزوری اور جنگ سے پہلو تہی کے آثار دیکھے۔ اس لئے اسی مقام پر رُک کر یہ تقریر فرمائی:

"میں کسی مسلمان کے لئے اپنے دل میں کینہ نہیں رکھتا اور تمہارے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ تمہارے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ اسے مسترد نہیں کرو گے۔ جس اتحاد و یک جہتی کو تم پسند کرتے ہو وہ اس تفرقہ و اختلاف سے کہیں افضل و بہتر ہے جسے تم چاہتے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر اشخاص جنگ سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ اور لڑنے سے بزدلی دکھا رہے ہیں۔ میں تم لوگوں کو تمہاری مرضی کے خلاف مجبور کرنا نہیں چاہتا۔"

یہ تقریر سن کر خارجی عقائد کے لوگ جو آپؓ کے ساتھ تھے اور حضرت معاویہؓ سے لڑنا فرض عین سمجھتے تھے انہوں نے حضرت علیؓ کی طرح حضرت حسنؓ کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت حسنؓ نے یہ برہمی دیکھی تو گھوڑے پر سوار ہو گئے اور ربیعہ و ہمدان کو آواز دی انہوں نے بڑھ کر خارجیوں کے نرغہ سے چھڑایا۔ آپؓ سیدھے مدائن روانہ ہو گئے۔ راستے میں جراح بن قبیصہ خارجی حملے کی تاک میں چھپا بیٹھا تھا۔ آپؓ جیسے ہی اس کے قریب سے گزرے اس نے حملہ کر کے زانوئے مبارک زخمی کر دیا۔ حضرت حسنؓ مدائن پہنچ کر قصر ابیض میں قیام پذیر ہو گئے اور زخم بھرنے تک یہیں ٹھہرے رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد عبداللہ بن عامر کے مقابلے کے لئے تیار ہوئے۔

آپؓ کے مدائن چلے آنے کے بعد عبداللہ بن عامر کو موقع مل گیا اس نے بڑھ کر مدائن کو گھیر لیا۔ آپؓ اپنی فوج کی بددلی دیکھتے ہوئے پہلے ہی لڑائی کا ارادہ ترک کر چکے تھے۔ چنانچہ آپؓ نے چند شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت حسنؓ اور امیر معاویہؓ کی مصالحت کے بعد عمرو بن العاص نے جو امیر معاویہؓ کے ہمراہ تھے ان سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ مجمع عام میں حسنؓ سے دستبرداری کا اعلان کرا دو تاکہ لوگ خود ان کی زبان سے اس صلح نامے کو سن لیں۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کی فرمائش پر مجمع عام میں آپؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

"لوگو! خدا نے ہمارے اگلوں سے تمہاری ہدایت اور پچھلوں سے تمہاری خونریزی کرائی۔ دانائیوں میں بہترین دانائی تقویٰ اور کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری بداعمالیاں ہیں یہ امر (خلافت)، جو ہمارے اور امیر معاویہؓ کے درمیان متنازعہ فیہ ہے وہ اس کے حقدار ہیں یا میں، دونوں صورتوں میں امتِ محمدیہؐ کی اصلاح اور تم لوگوں کی خونریزی سے بچنے کے لئے میں اس سے دستبردار ہوتا ہوں۔"

پھر معاویہؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"یہ خلافت تمہارے لئے فتنہ اور چند روزہ سرمایہ ہے۔"

اس خاتم الفتن دستبرداری کے بعد حضرت حسنؓ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینۃ الرسول چلے گئے اس طرح آنحضورؐ کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی کہ "میرا یہ بیٹا سید ہے خدا اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے گا۔"

آپؓ کی مدتِ خلافت میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک پانچ مہینہ ہے اور بعض کے نزدیک چھ ماہ سے کچھ زیادہ۔ بعض نے اسے سات ماہ سے کچھ زیادہ بتایا ہے۔

دستبرداری کے بعد حضرت حسنؓ آخری لمحہ حیات تک مدینے میں خاموشی اور سکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ۵۰ھ میں آپؓ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے کسی وجہ سے زہر دے دیا، سم قاتل تھا قلب و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ جب حالت زیادہ نازک ہوئی اور زندگی سے مایوس ہو گئے تو حضرت امام حسینؓ کو بلا کر ان سے واقعہ بیان کیا۔ آپ کو اپنے نانا کے پہلو میں دفن ہونے کی تمنا تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ سے حجرہ نبوی میں دفن ہونے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے خوشی کے ساتھ اجازت دے دی۔ لیکن اجازت ملنے کے بعد بھی احتیاطاً فرمایا کہ میرے مرنے کے بعد دوبارہ اجازت لینا ممکن ہے میری زندگی میں مروت سے اجازت دے دی ہو۔ اگر دوبارہ اجازت مل

Marfat.com

جائے تو روضۂ نبوی میں دفن کرنا۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس میں بنی امیہ مزاحم ہوں گے۔ اگر مزاحم کی صورت پیش آئے تو زیادہ اصرار نہ کرنا۔

آپ نے ۴۷ یا ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مروان کو جب حضرت حسنؓ کو حجرہ نبوی میں دفن کرنے کا معلوم ہوا تو اس نے مزاحمت کی۔ چنانچہ آپؓ کو جنت البقیع میں حضرت فاطمہؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آپؓ کے جنازہ میں انسانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اس سے پہلے مدینہ میں کم دیکھنے میں آیا تھا۔

آپؓ صورت و سیرت دونوں میں آنحضورؐ کے مشابہ تھے۔ روایات میں ہے کہ آپ نے نہایت کثرت سے شادیاں کیں۔ اور اسی کثرت کے ساتھ طلاقیں دیں۔ بعض روایات میں آپؓ کی ازدواج کی تعداد نوّے تک پہنچتی ہے۔ اگرچہ یہ روایتیں مبالغہ آمیز ہیں۔ آپ کی کثرت ازدواج و طلاق کو دیکھ کر حضرت علیؓ نے کوفہ میں اعلان کر دیا تھا کہ انہیں کوئی اپنی لڑکی نہ دے۔ لیکن مسلمانوں میں خانوادۂ نبوی سے رشتہ پیدا کرنے کا شوق اتنا غالب تھا کہ حضرت علیؓ کی مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ کی اولاد میں آٹھ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

آپؓ کی کل مرویات کی تعداد تیرہ ہے۔ آپ عرب کے اخطب الخطباء کے فرزند تھے۔ اس لئے خطابت آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کی ذات باطنی اور معنوی لحاظ سے بھی اسوۂ حسنہ نبوی کا نمونہ تھی۔ آپ تمام مکارم اخلاق کا پیکر مجسم تھے لیکن زہد و ورع، دنیا وی جاہ و حشم سے بے نیازی اور بے تعلقی آپؓ کا ایسا خاص اور امتیازی وصف تھا جس میں کوئی آپؓ کا حریف نہیں

آپ نے ایک عظیم الشان سلطنت کو محض چند انسانوں کے خون خرابے سے بچنے کے لئے چھوڑ دیا۔ عبادت الٰہی آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور وقت کا بڑا حصہ آپ اس میں صرف کرتے تھے۔ آپ نہ صرف خود فیاض بلکہ دوسروں کی فیاضی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آپ میں ضبط و تحمل بھی بہت زیادہ تھا۔ آنحضورؐ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ حسن کو میرا علم اور میری صورت ملی ہے۔

حسن بن علی

دورِ حکومت ۵۱۵ھ/۲۲-۱۱۲۱ء - ۵۴۳ھ/۴۹-۱۱۴۸ء) مہدیہ کے زیری خاندان کا آخری حکمران۔ جس کا والد بچپن ہی میں وفات پا گیا۔ انتقال کے وقت وہ ملک کا انتظام اپنے آزاد کردہ غلاموں کو تفویض کر گیا۔ ۱۱۲۲ء میں امیر البحر جارج انطاکی نے قوصرہ کے جزیرے اور راس دیمس کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس نے المہدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۱۳۵ء میں عیسائی بیڑہ دوبارہ زیری دارالسلطنت کے سامنے نمودار ہوا اس بار وہ حسن کو بچانے کے لئے آیا تھا۔ کیونکہ حسن نے روجر ثانی سے مدد کی درخواست کی تھی جس پر حمادی خاندان کے بادشاہوں نے خشکی اور سمندر دونوں راستوں سے حملہ کر رکھا تھا مسلم حکمران نے عیسائی بادشاہ کو اس کی اعانت کے صلے میں ساحلی علاقوں کے شہزادوں پر اپنا اقتدار جمانے کی اجازت دے دی۔

۱۱۴۲ء میں مہدیہ کے سامنے امیر البحر جارج انطاکی کے ایک نئے بحری مظاہرے نے حسن کو روجر ثانی کی پیش کردہ شرائط منظور کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب حسن ایک حد تک اس کا باجگزار بن گیا تھا لیکن یہ ساری ذلت اٹھانے کے باوجود زیری سلطنت قائم نہ رہ سکی۔ روجر ثانی نے قابس کے سردار یوسف بن حماد کے بیٹوں کے حقوق کی حمایت کے بہانے سے جنہیں خود وہاں کے باشندوں کی درخواست پر بے دخل کر دیا گیا تھا، جارج انطاکی کو ایک بار پھر مہدیہ کی طرف روانہ کیا اور ۵۴۳ھ/۴۹-۱۱۴۸ء میں عیسائیوں نے بغیر کسی جنگ کے قبضہ کر لیا کیونکہ حسن اور مہدیہ کے باشندے قبضے سے پہلے ہی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ حسن نے قبیلہ الریاح کے ہاں اور بعد میں بونہ اور بجایہ میں پناہ لی۔ بجایہ کے بادشاہ نے حسن کو الجزائر میں نظر بند کر دیا۔ ابھی یہ یہاں نظر بندی کے ایام گزار رہا تھا کہ شہر الموحدین کے ہاتھ آ گیا۔ عبدالمومن نے حسن کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا اور جب ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء میں مہدیہ کو عیسائیوں سے واپس لیا گیا تو حسن ایک والی کی حیثیت سے دوبارہ وہاں آیا۔ اس کے بعد عبدالمومن نے مراکش واپس بلا لیا۔

حسن نے ۵۶۳ھ/۱۱۶۸ء میں تمسنا کے صوبے البروز کے مقام پر انتقال کیا۔

حسن بن محمد الوزان

(۹۰۱ھ/۱۴۹۵ء — ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء) غرناطہ میں پیدا ہوا اور فاس میں پرورش پائی۔ بنو وطاس نے اسے تین مرتبہ سیاسی مہمات پر جنوبی مراکش بھیجا ۹۲۱ھ/۱۵۱۶ء دمشق اور پھر استانبول گیا۔ ۹۲۶ھ/۱۵۲۰ء میں واپسی پر اسے بحری ڈاکو گرفتار کر کے پہلے نیپلز اور پھر روم لے گئے اور پاپائے روم لیو دہم کی خدمت میں غلام کی حیثیت سے پیش کیا۔ پاپائے روم نے اسے عیسائیت میں داخل کیا۔ اور اس کا نام یوحنا الاسد الغرناطی رکھا۔ لیکن اس کا یہ ارتداد بحالت مجبوری اور عارضی تھا۔ اس نے روم میں چند کتابیں لکھیں جن میں عربی، عبرانی، لاطینی لغت، "فہرست مخطوطات عربی در اسکوریال" اور "Libellus de viris illustribus apud Arabes" ہیں۔ ان تصانیف سے اہل مغرب کو تاریخ اسلام کی بابت پہلی بار مواد مہیا ہوا۔ ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء سے پہلے حسن تونس آیا اور اس نے وہاں پر عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور اسلام پر ہی اس کا خاتمہ ہوا۔

حسن بے زادہ

ایک ترک مورخ۔

وہ حسن بے کوچک کا بیٹا تھا۔ جو سلیمان پاشا کی وزارت عظمیٰ کے دوران میں رئیس الکتاب رہا تھا۔ حسن نے بھی اپنے والد کا پیشہ اختیار کر کے دیوان ہمایوں میں بطور منشی شامل ہو گیا۔

۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں اور ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء میں حسن سردار ساطورجی محمد پاشا کے دبیر کی حیثیت سے اس کی ہنگری کی مہمات میں شریک رہا اس کے بعد وہ پاشی تذکرہ جی کی حیثیت سے اور ۱۶۰۱ء کے بعد بادشاہی موصوف کے جانشین وزیر اعظم ابراہیم پاشا اور یمشجی حسن پاشا کے رئیس الکتاب کے طور پر مختلف خدمات سر انجام دیتا رہا۔ وہ اناطولی کے دفتر مال کا ناظر بھی رہا۔

اس کی تصانیف میں اصول الحکم فی نظام العالم بھی قابل ذکر ہے۔ اس کی سب سے اہم تصنیف تاریخ آل عثمان ہے جس میں سلیمان اول کی تخت نشینی سے سلطان مصطفیٰ کی مکرر تخت نشینی تک کے زمانے کے حالات و واقعات درج ہیں۔

حسن پاشا

(۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء ——— ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء)

Marfat.com

ولایت بغداد کا گورنر احمد پاشا کا والد۔ حسن پاشا مراد چہارم کے ایک افسر کا بیٹا تھا۔ عراق میں پیدا ہوا۔ سرائے مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے بڑی تیزی سے قونیہ، حلب، ارفہ اور دیار بکر کی گورنری کی طرف منزلیں طے کیں۔ اس نے عراق کے مملوک حکمرانوں کے سلسلے کی بنیاد رکھی جو ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء تک چلتا رہا۔

عراق میں حسن پاشا نے اپنے تقوے، استقلال، انصاف، سالانہ مہموں میں اجڈ عرب اور کردی قبائل کو کامیابی کے ساتھ نظم و ضبط کا پابند بنانے میں غیر معمولی کردار کا مظاہر کیا۔ اس نے امن و قانون کا ایک اعلیٰ معیار حاصل کیا اور اپنے ماتحتوں سے بھی انصاف اور دیانت داری کا تقاضہ کیا۔

۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء میں ایران کے خلاف عثمانی اعلانِ جنگ میں اہم فوجی کاروائیوں اور دشمن کے علاقے پر وسیع پیمانے پر حملہ کرنے میں اس کا ہاتھ تھا۔

حسن پاشا نے کرمان شاہ میں انتقال کیا۔ اس کی وفات کے بعد اسے فاتح ہمدان کا خطاب دیا گیا۔

حسن پاشا

(۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء ـــــ ۹۸۰ھ/۱۵۷۰ء)

الجزائر کا بیگلر بیگ۔

حسن پاشا خیر الدین کا بیٹا تھا جو ایک مراکشی عورت کے بطن سے تھا۔ اسے ۱۵۴۴ء میں الجزائر کا پاشا بنایا گیا۔ اور مغربی الجزائر میں ترکی اقتدار بحال کرنے کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ کیونکہ وہاں پر ترکوں کی حکومت کمزور ہو چکی تھی ۹۵۲ھ/۱۵۴۶ء میں اس نے تلمسان کے ضلع میں اہل ہسپانیہ کے خلاف فوج کشی کی۔ لیکن اسے جلدی الجزائر واپس جانا پڑا کیونکہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہاں وہ بیگلر بیگ کی حیثیت سے اپنے والد کا جانشین ہوا۔ یہ عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد اس نے ایک نئی مہم کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ فوج کشی اہل مراکش کے خلاف تھی۔ جنھوں نے ۱۵۵۱ء میں تلمسان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے اہل مراکش کو شکست دی۔ اور تلمسان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حسن الجزائر میں اہم تعمیری کاموں میں مشغول رہا۔ اس نے قلعہ بندیوں کی توسیع کی۔ عوام کے لئے بنوائے اور ایک شفاخانہ ینی چری سپاہیوں کیلئے قائم کیا۔ چونکہ حسن پاشا فرانسیسی حکمتِ عملی کے مخالف تھا اس لئے باب عالی نے اسے قسطنطنیہ واپس بلا لیا۔

۱۵۵۷ء میں حسن پاشا افریقہ واپس چلا آیا۔ لیکن ان فسادات نے جو صلاح رئیس کی وفات پر رونما ہوئے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے دوبارہ بیگلر بیگ کی حیثیت سے الجزائر روانہ کرے۔ چنانچہ الجزائر میں امن بحال کرنے کے بعد حسن نے اہل مراکش کے خلاف فوج کشی کی۔ انھوں نے اس کی آمد پر تلمسان کو خالی کر دیا۔ ترکوں نے فاس کی دیواروں تک ان کا تعاقب کیا اور وہاں انھیں تباہ کن شکست دی۔

دوسرے سال جب ہسپانویوں نے مستغانم کا محاصرہ کیا تو حسن اس شہر کی امداد کو آپہنچا اور اس نے انھیں مار بھگایا۔ اس شکست سے عیسائیوں کو وہران تک محدود رہنا پڑا اور ترکوں کے لئے خطرہ جاتا رہا۔

حسن نے اس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کے بعد یہاں کے قبائل کو زیر کرنے کی تدبیر کی اس نے ینی چری سپاہیوں کی کسی آئندہ سرکشی سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کیلئے ہسپانوی نو مسلموں کی ایک فوج تیار کی۔ اس نے کوکو کے سلطان کی بیٹی سے شادی کر کے کئی قبیلوں کی اعانت حاصل کر لی۔ اس نے بنی عباس کے سردار احمد بن قاضی کے خلاف جنگ کی طرح ڈالی جس میں احمد نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

اگرچہ حسن اشراف کی ریشہ دوانیوں اور ہسپانیوں کی بحری تیاریوں کی وجہ سے حسن بربری قبائل کو پورے طور پر مطیع و منقاد نہ بنا سکا۔ اس نے وقتی طور پر اپنے مخالفین سے کوئی تعرض نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۵۶۱ء میں اسے اپنی قوتیں اہل مراکش کے خلاف صرف کرنے کا موقع ملا ابھی وہ ان سے جنگ شروع کرنے ہی والا تھا کہ ینی چریوں نے جو اس سے ناخوش تھے اسے گرفتار کر لیا اور قسطنطنیہ بھیج دیا۔

حسن نے تمام الزامات کو جو اس کے خلاف لگائے گئے تھے باب عالی کے سامنے غلط ثابت کر دیا۔ چنانچہ وہ تیسری بار الجزائر آیا۔ سلطان کے ایک ایلچی نے اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی از سر نو امن و امان قائم کر دیا تھا۔ اس مرتبہ حسن نے ہسپانویوں کو ملک سے نکال دینے اور وہران اور المرسی الکبیر پر قبضہ کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ اس نے تیس ہزار سپاہیوں کی معیت میں دونوں شہروں کا محاصرہ کر لیا۔ اور ساتھ ہی اس کے بیڑے نے سمندر کی طرف سے اس کی ناکہ بندی کر دی۔ دو ماہ کی بے سود کوشش اور پے در پے حملوں کے بعد ہسپانویوں کے ایک امدادی بیڑے کی آمد نے ترکوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد حسن کو اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد اسے الجزائر کے جہازوں کو اپنی قیادت میں مالٹا لے جانا پڑا جس کا ترک محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر حسن نے شجاعت کے خوب جوہر دکھائے۔ اسے قپودان پاشا (امیر البحر) کا منصب دیا گیا۔ وفات کے بعد حسن کو اس کے والد خیر الدین کے پہلو میں بویوک درہ میں دفن کیا گیا۔

حسن پاشا بن حسین

(؟ ـــــ ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء)

یمن کا والی۔

وہ البانیا کا باشندہ تھا۔ اور قسطنطنیہ میں بوستان جی باشی کے عہدے پر مامور تھا۔ ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں ترکی اقتدار کو قائم کرنے کیلئے یمن روانہ کیا جہاں پانچ سال کے عرصے میں کچھ تو زور بازو سے اور کچھ حیلہ سازی سے وہ سرکش اشراف کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مزید بغاوتوں کی روک تھام کے لئے ۱۵۸۴ء کے آخر میں اس نے آلِ مطہر کو قسطنطنیہ میں جلا وطن کر دیا۔ آنے والے چند سالوں کے دوران میں اس نے متعدد چھوٹے قلعوں کو مسخر کیا اس نے یافع اور دیگر اضلاع کو فتح کر لیا۔

۱۵۹۷ء میں زیدیوں نے ایک نئی اور خطرناک بغاوت برپا کر دی۔ اس بغاوت کا سربراہ مہدی القاسم بن محمد تھا۔ اس نے کوکبان کے ضلع اور ثلد کے قلعے پر قبضہ حاصل کر لیا۔ ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۶ء کے شروع میں حسن پاشا کو اس کی اپنی درخواست پر واپسی کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ وہ قسطنطنیہ واپس آگیا۔

۱۰۱۴ھ/۱۶۰۶ء میں حسن پاشا مصر کا والی بنایا گیا اور وہ اس عہدے پر ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء کے اختتام تک براجمان رہا۔ اس نے وہاں سے واپس قسطنطنیہ آنے کے بعد وفات پائی۔

حسن پاشا شریف

(؟ ـــــ ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۱ء) الحاج سلیمان آغا کا بیٹا۔

اس کا ذکر ۱۱۸۳ھ/۱۷۷۰ء میں روس کے خلاف جنگ کے دوران میں روپچق،

Marfat.com

سلسلہ اور میر گوگی کی افواج کے قائد کے طور پر آتا ہے۔ اس نے ۱۷۶۹ء میں یوکرین میں کریم خان گیرائی کی سرکردگی میں بحیثیت سالار رضاکاران نمایاں حصہ لیا۔ اس مہم کے دوران میں اس نے صدر اعظم محسن زادہ محمد پاشا کو جو مالی امداد دی تھی اس کے صلے میں اسے قپوجی باشی کا منصب عطا کیا گیا۔

۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں حسن پاشا منصب وزارت کے ساتھ روسچق کا فوجی حاکم بھی مقرر کیا گیا۔ جہاں اس نے بڑی کامیابی سے روسی حملے کی مدافعت کی صلحنامہ ہونے کے بعد حسن پاشا معتوب ہو گیا۔ چنانچہ اسے وزارت کے عہدے سے الگ ہونا پڑا۔ اس نے جلاوطنی کی حالت میں کئی سال فلیپو پولس اور سالونیکا میں گزارے لیکن ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۷ء پر روس سے جنگ چھڑ جانے کے بعد اسے دوبارہ ڈینیوب کے محاذ پر مختلف حیثیتوں میں فوج کی کمان دے دی گئی۔ ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء کو جزائرلی حسن پاشا کی وفات کے بعد اس کی جگہ "صدر اعظم" اور سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء کے آخر میں بڑی سرعت کے ساتھ یکے بعد دیگرے کبکیا طوجی الیساقچی اور اسمٰعیل کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

اس کے علاوہ شریف حسن پاشا نے اپنے آپ کو ہر قسم کی من مانی کارروائی اور مہان گوگی سے مورد شک و شبہہ بنا لیا تھا چنانچہ ایک رات اس کی قیام گاہ واقع شمنی میں اچانک گھیر لیا گیا اور گولی مار دی گئی۔

حسن پشاوری

(؟ ——— ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء)

ایک بزرگ سونی۔

والد کا نام سید عبداللہ گیلانی۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ سید حسین بن سید عبداللہ بن سید محمد بن سید عبدالقادر بن سید عبدالباسط بن سید حسین بن سید قطب عالم بن سید احمد بن سید شرف الدین قاسم بن سید شرف بن سید بدرالدین حسن بن سید علاؤالدین علی بن شمس الدین محمد بن شرف الدین یحییٰ بن سید شہاب الدین احمد بن سید قطب عالم بن سید صالح النصر بن قطب الادائرہ سید عبدالرزاق بن عبدالقادر جیلانی الحسنی والحسینی۔

آپ کے دادا سید محمود بغداد سے ٹھٹھہ آئے اور یہیں سادات میں شادی کر لی۔ آپ کی پیدائش ٹھٹھہ میں ہوئی۔ آپ کا قلب شروع ہی سے زہد و انفقار کی طرف مائل تھا۔ آپ نے اپنے والد اور دوسرے بزرگوں سے روحانی فیض حاصل کیا اور اپنی عمر کا بڑا حصہ ریاضتوں، مجاہدوں، صفائی قلب اور عزلت و تنہائی میں بسر کیا۔ والد کی وفات کے بعد پاک و ہند اور حجاز کا سفر کرتے ہوئے اور مختلف بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوتے ہوئے پشاور آئے اور یہیں پر سکونت پذیر ہوئے۔ سلسلہ قادریہ میں آپ اپنے والد سے بیعت تھے اور ان ہی سے خرقہ خلافت حاصل کی۔

آپ اکثر ذکر و شغل اور عبادت میں مشغول رہتے راتوں جاگتے اور عبادت و مراقبے میں مشغول رہتے۔ خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی آدمی خدا کا نام زبان پر لاتا تو آپ کے آنسو جاری ہو جاتے۔ آپ اکثر روتے رہتے تھے اور جس پر توجہ دیتے اس پر بھی ورد اور شغل کی حالت طاری ہو جاتی۔

آپ نے پشاور میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پشاور میں مرجع خاص و عام ہے۔

آپ کے سیرت و اخلاق میں خدمت خلق اور استغناء کا جوہر سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ فقراء اور مساکین کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے اور ان کی بہت خدمت کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا سب لوگ آپ کے عیال ہیں۔ آپ کے صاحبزادوں میں شاہ محمد غوث لاہوری ہیں جنہوں نے عرفان و تصوف میں غیر معمولی شہرت و عظمت حاصل کی اور اپنے والد کی وفات کے بعد خلیفہ ہوئے۔

حسن پاشا داماد

(؟ ——— ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء)

عثمانی وزیر اعظم۔

پہلے وہ چوک دار ہو گیا اور پھر ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء میں سلاح دار کے رتبے کو پہنچا۔ محرم ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء میں سلیمان ثانی کی تخت نشینی کے بعد اسے مصر کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء ۱۶۹۰ء تک فائز رہا۔ اسی سال وہ برسہ اور ازمد کا متصرف ہو گیا۔

حسن پاشا نے ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء میں محمد چہارم کی بیٹی خدیجہ سلطان کے ساتھ شادی کر لی۔ کچھ عرصہ بغاز محافظی کی حیثیت سے خدمت سرانجام دینے کے بعد اسے ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۴ء میں جزیرہ ساقیز کا گورنر بنا دیا گیا۔

۱۱۰۶ھ/۱۶۹۴ء میں اسے ساقیز کے مقام پر وینس کی ایک بحری فوج کے حملے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ موثر مزاحمت ممکن نہ تھی اس لئے حسن پاشا نے مختصر محاصرے کے بعد جزیرہ اہل وینس کے حوالے کر دیا۔ اس پسپائی کی پاداش میں حسن پاشا کو تھوڑی سی مدت کی قید کی سزا ملی۔ اس کے بعد اسے کریمیا میں کفہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء میں اسے ترقی دے کر پانچویں اور پھر دوسرے وزیر کا رتبہ دے دیا گیا۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے اورنگ محافظ، اناطولی کے بیگلربیگی اور حلب کے بیگلربیگی کے عہدوں پر فائز رہا۔

۱۱۱۰ھ/۱۶۹۸ء میں استانبول میں "قائم مقام" مقرر ہو جانے کے بعد حسن پاشا مختلف حیثیتوں میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔ تا آنکہ احمد ثالث کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصے بعد ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں سے وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہا۔

۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں دوسری مرتبہ مصر کا گورنر پھر ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء شام میں طرابلس کا گورنر ہو گیا۔ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں ایک بار پھر اناطولی کے بیگلربیگی کی حیثیت سے خدمت کے بعد میں اسی سال اس کا شام رقہ میں اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ اس عہدے پر اپنی وفات تک فائز رہا۔

حسن پاشا سید

(؟ ——— ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء)

ضلع قرہ حصار شرقی کے ایک گاؤں کا باشندہ تھا۔ وہ ینی چری فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء میں اس نے قول کا ولیسی یعنی لفٹیننٹ جنرل کا عہدہ حاصل کر لیا۔ وہ برابر ایرانی مہمات میں شریک رہا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں آسٹریا سے جنگ کے دوران میں وہ ترقی کر کے ینی چری فوج کا آغا (سردار) بن گیا۔ اس جنگ میں اس کی شجاعت اور بہادری کے صلے میں اسے وزیر کا لقب مل گیا۔ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء کے

Marfat.com

معاہدے کی رو سے انہیں پاسے سرحدی جنگ کا خاتمہ جو بلغراد کے صلحنامے کے وقت سے غیر مسلسل طور پر جاری تھی اور متفرق سیاسی اقدامات، جن کا محرک مشہور و معروف احمد پاشا بونیوال تھا۔ اور جن کا مقصد یہ تھا کہ باب عالی کو یورپی اتحاد میں شامل کرلیا جائے۔ یہ تمام واقعات اس عہد وزارت میں ہوئے۔ محل سرائے کی ریشہ دوانیوں کے باعث اسے ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء میں معزول کرنے کے بعد رھوڈس میں جلاوطن کردیا گیا۔ لیکن اگلے ہی سال اسے ایچ۔ ایل اور کچھ عرصہ بعد دیاربکر کا والی بنا دیا گیا۔ اس نے دیاربکر میں وفات پائی۔

حسن پاشا ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑا دانا اور تجربہ کار تھا اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔ اس نے استانبول میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا۔

حسن چلبی قنالی زادہ

(۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء ——— ۱۲ شوال ۱۰۱۲ھ/۱۴ مارچ ۱۶۰۴ء)

ایک مشہور ترکی عالم۔

بروسہ میں پیدا ہوا۔ والد کا نام علی چلبی بن امراللہ کا بیٹا تھا۔ حسن کا والد عالم اور شاعر کی حیثیت میں مشہور تھا چنانچہ حسن نے بھی فقہ اور دینیات کی تعلیم پائی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ بروسہ، ادرنہ، حلب، قاہرہ، گیلی پولی، ایوب اور زکرہ جدیدہ میں مدرس رہا۔

حسن نے مصر میں وفات پائی۔ اس وقت وہ رشید کا قاضی تھا۔ اسے شاعری میں بھی درک تھا۔ اس نے دینیات کی بعض اہم کتابوں پر ضمیمے اور تعلیمات لکھیں۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف جس نے اس کی شہرت کو چار چاند لگائے "تذکرۃ الشعراء" ہے۔ اس کتاب میں تقریباً سات سو شعراء کے حالات درج ہیں۔

حسن دہلوی

(۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء)

امیر نجم الدین المعروف حسن دہلوی۔ والد کا نام علاءالدین سیستانی تھا۔

انھوں نے اپنے دوست امیر خسرو کے ساتھ ملتان میں غیاث الدین بلبن کے سب سے بڑے بیٹے سلطان محمد کی ملازمت میں پانچ سال بسر کئے اور بعد کے زمانے میں علاءالدین خلجی کے درباری شعراء میں شامل ہوگئے۔ جب انھوں نے خواجہ نظام الدین اولیا کی بیعت کی تو اس وقت ان کی عمر ۵۳ برس تھی۔

حسن دہلوی نے خواجہ نظام اولیاء کے ملفوظات ایک کتاب میں جمع کئے۔ اس کتاب کا نام "فوائدالفواد" ہے اس کتاب میں ایک سو اٹھاسی مجالس کے ملفوظات جمع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو ادبی محاسن، شگفتہ اندازِ بیان اور عارفانہ موضوعات کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں کے صوفیانہ ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں امیر خسرو کہا کرتے تھے "کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام سے ہوتیں اور یہ کتاب میرے نام سے ہوتی۔

حسن دہلوی نے ایک فارسی دیوان بھی چھوڑا ہے جو تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں عارفانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے نثر میں بھی چند کتابیں تصنیف کی ہیں۔

حسن ذکی محمد

ایک مورخ اور پروفیسر۔ آپ ۱۹۰۸ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں پر حاصل کی۔ پھر پیرس چلے گئے اور وہاں تعلیم حاصل کی ۱۹۳۴ء میں آپ مسلم آرٹ کے عجائب خانہ جو قاہرہ میں واقع ہے کیوریٹر (CURATOR) بن گئے ۱۹۳۹ء میں آپ فواد اول کی یونیورسٹی میں شعبہ جات آرٹس کے لیکچرار مقرر ہوئے ۱۹۴۶ء میں مسلم آثارِ قدیمہ کے پروفیسر بن گئے اور پھر دو سال بعد ہی فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین مقرر ہوگئے۔ لیکن بعد میں انہیں مسلم آرٹ کے عجائب خانہ میں ڈائریکٹر کا عہدہ مل گیا۔ آپ اب تک اسی عہدے پر فائز ہیں محمد حسن ذکی نے مسلم آرٹ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اسی لئے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں ان میں "اسلام میں مصوری" "فاطمیوں کے خزانے" "قرون وسطیٰ میں عرب ملکوں کا دستور نشکارہ" "اسلامی عہد میں ایرانی آرٹ" "اسلام کے فنون" "فواد اول یونیورسٹی عجائب خانہ میں آرٹ" وغیرہ شامل ہیں۔

حسن روملو

(۹۳۷ھ/۱۵۳۱ء - ۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء) ساوج بلاغ کا گورنر وہ قزلباش امیراعلیٰ سلطان روملو کا پوتا تھا۔ قم میں پیدا ہوا اس نے صفوی فوج میں بحیثیت توپچی تربیت حاصل کی اس کی ناموری اور شہرت کا دارومدار زیادہ تر احسن التواریخ کی وجہ سے ہے۔ وہ ایک قزلباش افسر کی حیثیت سے فوجی معاملات پر خاص توجہ دیتا تھا۔ سیاسی احتیاط کی وجہ سے اس نے قزلباش کے افعال کو اچھے رنگ میں پیش کیا ہے۔

حسن کی یہ کتاب شاہ طہماسپ کے دورِ حکومت کے لئے بڑی مستند کتاب ہے اس کی "احسن التواریخ" سلطان محمد شاہ کی تخت نشینی کے حالات تک ہے کیونکہ حسن ۹۴۸ھ/۱۵۴۲ء سے طہماسپ کی بیشتر مہمات میں شاہ کا مصاحب رہا۔ چنانچہ ۹۸۵ھ/۱۵۷۸ء تک کے واقعات کے لئے وہ ایک عینی شاہد ہے۔

حسن سلیم

مصری مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ۔ آپ ایک پرائمری سکول میں استاد تھے۔ انھوں نے نہایت محنت اور لگن کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر پیرس اور وی آنا گئے ۱۹۲۸ء میں آپ قاہرہ یونیورسٹی میں "مصریات" کے پروفیسر بن گئے۔ جب قاہرہ یونیورسٹی نے غزا میں کھدائی شروع کرائی تو آپ کو اس کا انچارج بھی بنا دیا گیا پھر جب حکومت نے غزا کی کھدائی اپنے ہاتھ میں لی تو ایک الگ محکمہ کھول کر انھیں اس کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ آپ نے انگریزی اور عربی میں کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے "تاریخ مصر و ترکی" "تاریخ یورپ" "تاریخ مملوکین" "تاریخ محمد علی کا ایک ورق" "مصری مذہب کی تاریخ" "غزا کے آثارِ قدیمہ انگریزی میں اور "قدیم مصر کی جغرافیائی تقسیم" "قدیم مصری ادب" عربی میں لکھی گئی ہیں۔

حسن صغانی

(۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء - ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) رضی الدین لقب اور کنیت

Marfat.com

ابوالفضل۔ آپ حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد سے تھے۔ حسن کے والد نے صغانیاں کو خیر باد کہہ کر لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حسن لاہور میں پیدا ہوئے لیکن ان کی پرورش غزنین میں ہوئی۔ بقول مولانا عبدالحئی لکھنوی ان کی پرورش بھی لاہور میں ہوئی تھی انہوں نے تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کا شمار بہت جلد ارباب علم و فضل میں ہونے لگا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے انہیں لاہور کا قاضی بنانا چاہا۔ لیکن انہوں نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے غزنین چلے گئے جہاں پر کچھ عرصہ تک تحصیل علم میں مصروف رہے بعد میں وہ غزنین سے عراق چلے گئے اور وہاں کے علماء سے بھی فیض حاصل کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ بغرض حج بیت اللہ گئے اور وہاں پر بھی محدثین سے حدیث پڑھی۔

حسن ۶۱۰ھ/۱۲۱۳ء میں عدن پہنچے اور وہاں سے پھر مکہ مکرمہ گئے اور اس کے بغداد گئے۔ اس وقت عباسی خلیفہ الناصر باللہ کی حکومت تھی۔ اس نے ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں حسن صغانی کو سلطان التمش کے دربار میں خیر سگالی کے مشن پر بھیجا۔ ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں وہ دوبارہ بغداد واپس گئے اس وقت المستنصر باللہ کا عہد حکومت تھا جس نے انہیں دوبارہ ہندوستان اسی مشن پر بھیجا۔ یہ زمانہ سلطانہ رضیہ کا تھا اس طرح حسن دو سلطانوں کے عہد میں ہندوستان میں اقامت گزیں رہے۔

بقول صاحب فوائد الفوائد رضی الدین بداؤں سے علی گڑھ کے مشرف کے نائب مقرر ہوئے۔ بعد میں ملازمت ترک کرکے والی علی گڑھ کے بیٹے کو پڑھانے لگے لیکن بعد میں اس سے بھی دل برداشتہ ہو کر بغداد چلے گئے۔ حسن کو یمن جانے کا اکثر اتفاق ہوا۔ یہاں ان کا قیام عدن میں ہوتا تھا۔ وہاں پر وہ طلبہ کو خطابی کی معالم السنن کا درس دیتے تھے۔

حسن صغانی کا انتقال بغداد میں معتصم باللہ کے عہد حکومت میں ہوا۔ ابتداء میں انہیں بغداد میں دفن کیا گیا۔ لیکن بعد میں ان کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ مکرمہ میں دفن کیا گیا۔ انہوں نے مکہ مکرمہ، عدن اور ہندوستان میں بہت سے شیوخ سے حدیث سماعت کی تھی۔

انہیں تمام علوم متداولہ میں اور خاص طور پر لغت، حدیث اور فقہ میں خاص مہارت حاصل تھی۔ بقول الذہبی علم اللغۃ میں وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ الزبیدی نے انہیں الامام الحافظ فی علم اللغۃ ' الفقیہ المحدث الرحال کہا ہے۔ اور سیوطی نے انہیں علم لغت کا علمبردار کہا ہے۔ بقول الدمیاطی وہ لغت، حدیث اور فقہ تینوں علوم کے امام تھے۔

حسن صغانی کی تصانیف میں ۱۔ مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ" ۲۔ "الرسالۃ فی الاحادیث الموضوعہ" جس کا پورا نام "الدار الملتقط فی تبیین الغلط ونفی اللغط فی الاحادیث الموضوعہ" ۳۔ "دراسحابۃ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ" ۴۔ "الشمس المنیرۃ" ۵۔ "اسمار شیوخ البخاری" ۶۔ "کتاب الاضداد" ۷۔ "کتاب اسماء الذئب" ۸۔ "کتاب یفعول" ۹۔ "العباب الزاخر واللباب الفاخر" جو بیس جلدوں میں ہے۔ ۱۰۔ "التکملہ والذیل والصلۃ" ۱۱۔ "مجمع البحرین فی اللغۃ" ۱۲۔ "کتاب خلق الانسان" وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

حسن عسکری امام

(ربیع الاوّل ۲۳۰ھ/نومبر ۸۴۴ء - ۲۶۰ھ/۸۷۳ء) ابو محمد حسن بن علی اثنا عشری شیعہ کے گیارھویں امام۔ الصامت، الزکی، الخالص، التقی، الرفیق اور الہادی آپ کے القابات۔ تھے سلسلہ نسب یہ ہے: حسن بن علی بن محمد الجواد بن علی الرضا بن موسیٰ الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن علی زین العابدین ابن الحسین بن علی بن ابی طالب۔ آپ کی نسبت آپ کے والد ماجد ابوالحسن علی العسکری کی طرح العسکری ہے۔ یہ نسبت سامراء (سر من رائی) کی طرف ہے اس کو مدینۃ العسکر کہتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ۲۳۱ھ اور بعض کے نزدیک ربیع الآخر ۲۳۲ھ/اپریل ۸۴۷ء ہے آپ کی والدہ ماجدہ کا نام حُدیث تھا۔ بعض جگہوں پر ان کا نام سوسن اور سلیل بھی بتایا گیا ہے۔ آپ اپنے والد کے ساتھ سامرا آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آپ نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ آپ اپنی امامت کے تقریباً ۶ برسوں کے دوران میں مسلسل حکومت کے زیر نگرانی رہے۔ المعتمد نے تو آپ کو کچھ عرصہ کے لئے قید میں ڈالا تھا۔

اثنا عشری روایات کے مطابق آپ کے والد نے پہلے اپنے بیٹے محمد ابو جعفر کو امام مقرر کیا تھا۔ لیکن ان کی وفات ہو جانے کی وجہ سے ۲۵۴ھ/۸۶۸ء آپ کو امام نامزد کیا۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک کا خیال تھا کہ محمد ابو جعفر ہی امام ہیں۔ کیونکہ امام علی العسکری نے انہیں امام نامزد کیا تھا اور امام کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا لہٰذا امام محمد ابو جعفر ہی ہیں اور وہ القائم المہدی اور غائب ہیں۔

امام حسن العسکری جو دوسرے گروہ کی نظر میں گیارھویں امام ہیں۔ ۲۶۰ھ/۸۷۳ء میں بیمار ہوئے اور ایک ہفتے بعد وفات پا گئے اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کے مسئلے پر اہل تشیع میں مزید اختلاف ہوا۔ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ نے محمد جو آپ کے صاحبزادے تھے چھوڑے۔ لیکن دوسروں نے اس کا انکار کیا ہے۔ بعض کے خیال کے مطابق آپ القائم تھے اور واپس آئیں گے۔ دوسروں نے آپ کے لاولد فوت ہونے کو آپ کی امامت کے خلاف ایک حجت مانا ہے اور وہ آپ کے بھائی جعفر کی طرف پلٹ گئے۔ آپ کی وفات کے بعد اہل تشیع کے چودہ فرقے ہوئے۔ المسعودی نے ۲۰ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ امام شہرستانی نے آپ کی وفات کے بعد بارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے۔

حسن فہمی

ایک ترک صحافی۔ اس نے ۱۹۰۹ء میں اخبار سربستی کے مدیر کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی۔ اس نے اپنے اخبار میں مجلس اتحاد و ترقی پر شدید حملے کئے تھے۔ اسے اپریل ۱۹۰۹ء میں گلاٹا پل پر کسی نامعلوم شخص نے قتل کر دیا۔ آزاد خیال طبقے اور اتحاد محمدی والوں نے مجلس اتحاد و ترقی کو حسن کے قتل کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس کے قتل کے بعد مخالفانہ مظاہرے اور ہنگامے ہوئے۔

حسن فہمی

(؟ —— ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء) ایک عثمانی سیاست دان والد کا نام حاجی اوغلو شریف تھا۔ باطوم کے نزدیک پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد استنبول چلا گیا۔ یہاں پر اس نے عربی فارسی، فرانسیسی زبانیں اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

Marfat.com

۱۸۵۷ء میں اس نے سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ بعدازاں مختلف تجارتی ایوانوں میں وہ ایک عہدے پر رہا۔ اسی ملازمت کے دوران میں اس نے اخبارات کے لئے تقویم تجارت اور جریدہ حوادث قلم بند کئے۔

۱۸۶۹ء میں وہ ایوان تجارت کی پہلی مجلس کا صدر بن گیا۔ بعدازاں جب مدحت پاشا اور عبدالحمید ثانی کی دستوری حکومت قائم ہوئی تو اس وقت حسن شعبہ ترجمہ کا کاتب تھا۔

مارچ ۱۸۷۷ء میں حسن انتخابات میں نائب چنا گیا۔ نومبر میں اسے تیسرے انتخاب کے نتیجے میں ایوان کا صدر چنا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں وہ امور تعمیرات عامہ کا وزیر مقرر ہوا۔ وہ استانبول میں قانون تجارت اور بین الاقوامی قانون بھی پڑھاتا رہا۔ ۱۸۸۱ء میں حسن وزیر انصاف بنایا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں ایک خاص سفارتی مقصد کے لیے اسے لندن بھیجا گیا۔ ۱۸۸۹ء میں اسے جامع المحاصل اور ۱۸۹۲ء میں آیدین کا والی بنایا گیا وہ دوسرا ترکی نمائندہ تھا جس نے ۱۸۹۷ء میں جنگ یونان ترکی کے بعد عہدنامہ پر دستخط کئے۔

اگرچہ وہ بہت سے عہدوں پر فائز رہا لیکن اس نے کبھی بھی حکومت کی خوشامد نہ کی۔ انقلاب کے بعد نوجوان ترکوں نے اسے "بوڑھا جواں ہمت ترک" کا خطاب دیا اس کا اورنہ پتی میں انتقال ہوا۔

حسن فہمی افندی

(۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء — ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) ایک عثمانی شیخ الاسلام، جو افتہرلی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا والد عثمان افندی تھا۔ ابلغین میں پیدا ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر محکمہ علمیہ کے شعبہ تدریس میں مختلف حیثیتوں میں ملازم رہا۔ ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں درس وکیلی کے عہدے پر فائز ہوا اس کے ذمے شیخ الاسلام کی طرف سے تدریس اور تبلیغ کا فریضہ بھی تھا۔ سلطان عبدالعزیز کی تخت نشینی کے بعد اس کی حیثیت بہت مضبوط ہو گئی کیونکہ وہ سلطان کا استاد تھا۔ ۱۸۶۳ء میں وہ سلطان کے ساتھ مصر گیا۔

وہ ۱۸۶۷ء میں اناطولی کا اور پھر روم ایلی کا قاضی عسکر بن گیا۔ ۱۸۶۸ء میں وہ پہلی مرتبہ شیخ الاسلام بنایا گیا۔ ستمبر ۱۸۷۱ء میں اس کو شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ جولائی ۱۸۷۴ء میں وہ دوسری بار اس عہدے پر فائز ہوا۔ وہ مئی ۱۸۷۶ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس تمام عرصے میں اس کی اور جودت پاشا کی آپس میں چپقلش رہی۔ جب محمود ندیم کی وزارت ختم ہوئی تو حسن کو بھی اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔

حسنک

(؟ — ۲۸ صفر ۴۲۳ھ/۱۴ فروری ۱۰۳۲ء) ابوعلی حسن بن محمد عباس، محمود غزنوی کا وزیر۔ وہ کم عمری ہی میں خراسان کا گورنر بننے کے بعد ۴۱۴ھ/۱۰۲۳ء میں حج کے لئے گیا۔ وہ براستہ قاہرہ واپس آیا تو مصر کے فاطمی خلیفہ الظاہر نے اسے خلعت دی جس کو اس نے قبول کر لیا۔ اس بنا پر عباسی خلیفہ القادر کو شک گزرا کہ حسنک کہیں فاطمیہ کی خلافت کا حامی نہ بن گیا ہو۔ اسی بنا پر اس نے غزنہ میں اس کی واپسی پر سلطان محمود کو لکھا کہ وہ اسے قرمطی ہونے کی وجہ سے موت کی سزا دے۔ محمود غزنوی نے خلیفہ کے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے حسنک کو وزیر مقرر کر دیا۔

سلطان محمود کے دور حکومت کے آخری چھ سالوں میں اس نے سلطان کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس نے اس کے بیٹے مسعود کی مخالفت اور مسعود کے بھائی محمد کی حمایت کی۔ چنانچہ محمود کے انتقال کے بعد اس کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے ہرات کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ بعد میں اس پر قرمطی ہونے کے پرانے الزام کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا اور آخر کار اسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔

حسن مولائی

دور حکومت ۱۲ ستمبر ۱۸۷۳ء تا ۹ جون ۱۸۹۴ء) ابوعلی مراکش کا سلطان اس کے والد کا نام سیدی محمد بن عبدالرحمٰن تھا۔ ۲۷ برس کی عمر میں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد بغاوتیں برپا ہو گئیں۔ لیکن اس نے تیزی سے بغاوتوں کو دبا دیا۔

حسن نے اپنے عہد حکومت کا بڑا حصہ مہموں میں گزارا ان مہموں کا مقصد بربر قبائل کو مطیع رکھنا تھا۔ ایک ایسی ہی مہم کے دوران میں وہ تافیلات تک جا پہنچا۔ وہ اس مہم کے دوران میں تادلا میں وفات پا گیا۔ اس کی موت کو صیغہ راز میں رکھا گیا اور جب فوج رباط پہنچ گئی تو اس کے بیٹے عبدالعزیز نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

حسنویہ بن حسین

(؟ — ۳۶۹ھ/۹۷۹ء) ایک کرد سردار جس نے دسویں صدی عیسوی کے دوران میں مغربی ایران اور بالائی الجزیرہ میں خود مختار اور مستقل ریاستیں قائم کیں اور نہایت کامیابی کے ساتھ انہیں برقرار رکھا۔

وہ برزکانی کرد قبیلے کی ایک شاخ سے تھا۔ اپنے دو چچاؤں کے انتقال کی وجہ سے وہ وسطی جبال میں متعدد قلعوں اور محفوظ مقامات پر قبضہ کرنے کے قابل ہو گیا۔

حسنی

حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بیٹے امام حسنؓ کی اولاد میں سے علوی شریفوں کا نام۔ حسنی کا لقب خاص طور پر ان شریفوں کے لئے وقف ہے جو عبداللہ الکامل کے صاحبزادے محمد النفس الزکیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ اس خاندان نے المغرب اور مغربی صحرا کی تاریخ میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے دو عظیم شریفی خانوادوں نے یعنی خانوادہ سعدیہ نے دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں خانوادہ علویہ نے مراکش میں گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں موجودہ زمانے تک حکومت کی۔

حسیب

قیامت کے روز حساب کرنے والا۔ اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے ایک نام۔
(دیکھیے "اسماء الحسنیٰ")

حسین احمد مدنی مولانا

(۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ/۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء — ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) دیوبند

Marfat.com

حسنی شرفاء کا شجرۂ نسب

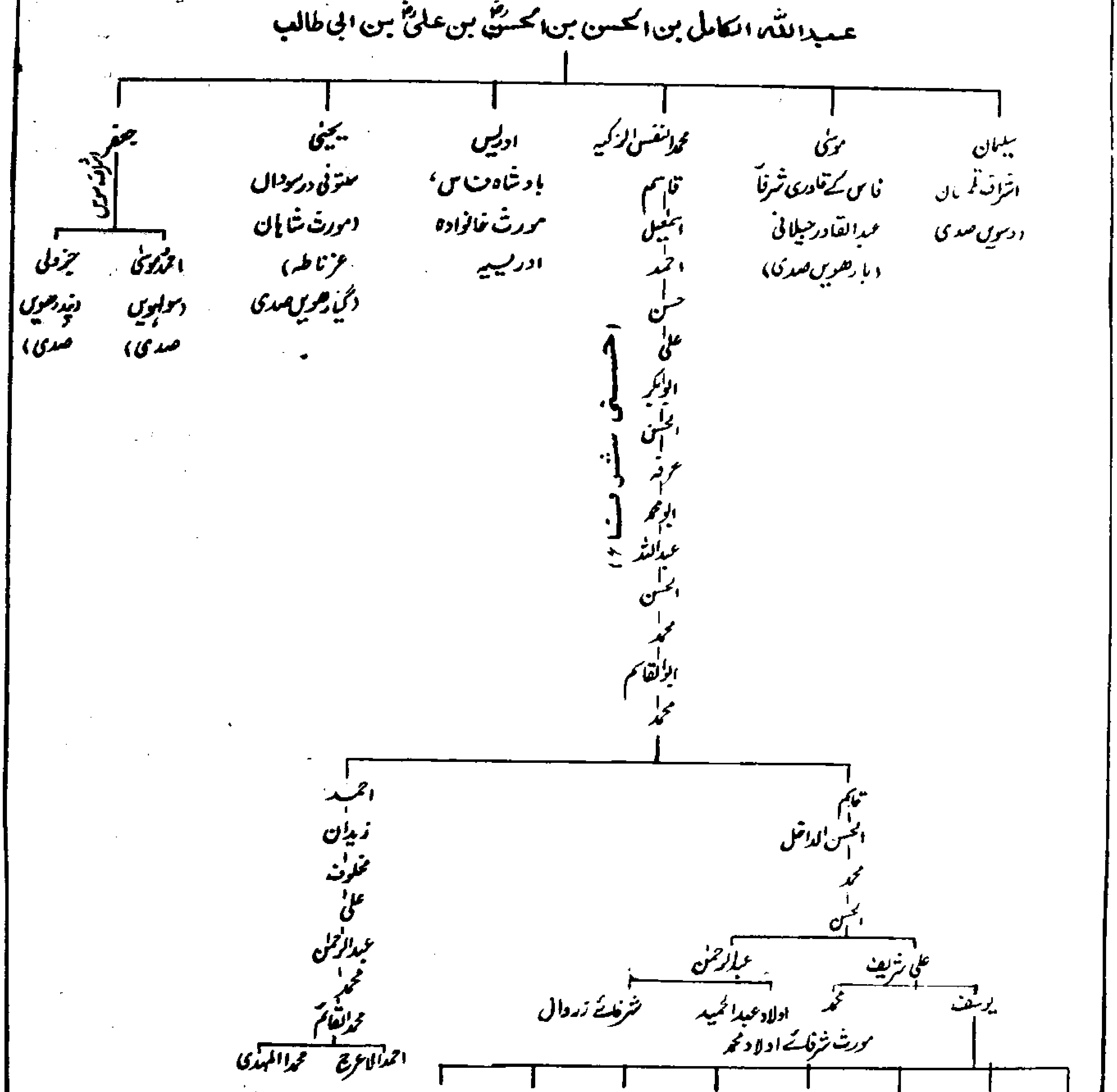

Marfat.com

کے ایک جید عالم۔ والد کا نام حبیب اللہ تھا جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ حسینی سید ہیں آپ کے مورث اعلیٰ کا نام شاہ نورالحسن تھا ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جو ایک بلند پایہ بزرگ اور عالم دین تھے۔ تیرہ سال میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ دیوبند میں جن اساتذہ سے آپ نے علم حاصل کیا۔ ان میں مولانا محمود الحسن، مولانا ذوالفقار علی مولانا عبدالعلی محدث دہلوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تھے۔

١٣١٦ھ/١٨٩٨ء میں آپ کے والد نے مع اہل و عیال مدینہ منورہ کو ہجرت کی۔ اس وقت مدینہ منورہ میں دو کتب خانے بہت مشہور تھے۔ آپ نے ان کتب خانوں سے پورا پورا استفادہ کیا۔ ادبیات کی تکمیل آپ نے مدینہ منورہ کے معمر ادیب مولانا شیخ آفندی عبدالجلیل سے کی جو علمائے حجاز میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

تحصیل علم کے ساتھ ہی آپ نے مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ١٣١٨ھ/١٩٠٠ء میں آپ ہندوستان تشریف لائے۔ دو سال یہاں قیام پذیر رہے۔ ١٣٢٠ھ/١٩٠٢ء میں واپس مدینہ منورہ چلے گئے۔ اس مرتبہ آپ کا حلقہ درس بہت وسیع ہوا اور طلبار کا ایک جم غفیر آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ دور دراز کے ممالک سے تشنگان علم آپ کے حلقہ درس میں شرکت کے لئے آنے لگے۔ آپ کے درس کی شہرت عرب کے علاوہ دیگر ممالک تک جا پہنچی اور چوبیس سال کی عمر میں آپ کو شیخ العرب والعجم کے لقب سے نوازا گیا۔

آپ تصوف میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہیں ١٨٩٨ء میں حضرت نے آپ کو چاروں سلسلوں میں بیعت فرما لیا۔ اسی عرصے میں آپ کے والد مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اس لئے شیخ نے حکم دیا تھا کہ مکہ معظمہ میں چونکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تشریف فرما ہیں اس لئے ان ہی سے ذکر و شغل کی تلقین حاصل کر لینا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے آپ پر نہایت شفقت فرمائی۔

مولانا حسین احمد مدنی تقریباً سولہ سترہ برس تک مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ جب شریف مکہ نے انگریزوں کی شاطرانہ اور پرفریب سازش میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

١٩١٤ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب بھی حجاز تشریف لے گئے۔ انگریز ہر قیمت پر شیخ الہند کو گرفتار کرنا چاہتا تھا اور چونکہ وہ حدود حرم میں داخل ہو چکے تھے اس لئے انہیں صرف شریف حسین کی حکومت ہی گرفتار کر سکتی تھی مگر شریف مکہ انگریزوں کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا یوں ان لوگوں کو مع ان کے رفقار مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل اور دیگر ساتھیوں کے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں بھیج دیا گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے استاد کی معیت میں ساڑھے چار سال کا عرصہ قید میں گزارا۔ آپ نے اسی عرصہ میں قرآن پاک حفظ کیا۔ مالٹا سے رہائی پانے کے بعد آپ اپنے استاد محترم کے ساتھ ہندوستان آئے۔ چونکہ اس وقت حجاز، عراق شرق اردن، شکڑوں کی صورت میں برطانوی تولیت میں دیئے جا چکے تھے اور آپ کے نزدیک آزادیٔ ہند ملت اسلامیہ کے نقطہ نظر سے ممالک اسلامی کی آزادی کا واحد ذریعہ تھی اس لئے آپ نے مدینہ منورہ جانا مفید خیال نہ کیا۔ اور ہندوستان ہی میں قیام فرمایا۔

شیخ الہند محمود الحسن نے آپ کو دارالعلوم کی صدر مدرسی کے لئے نامزد کیا۔ ١٩٢٧ء میں مولانا حسین احمد مدنی دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت پر مستقل طور پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے دارالعلوم میں درس حدیث دیا اور ٣١ سال تک دارالعلوم میں علوم نبوہ کی خدمت کرتے رہے۔

مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھ کر مولانا حسین احمد مدنی نے جو کام کیا وہ اتنا زیادہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ایک شیخ الحدیث، سیاسی لیڈر اور مدبر و مفکر اپنی بے پناہ مصروفیات سے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ مسترشدین پر بھی توجہ دے سکے اور اپنے لاکھوں مریدوں کے حالات دکوائف معلوم کر کے ان کی تربیت کر سکے۔

خودداری، ذوق عبادت، اتباع شریعت، عزم و استقلال، سادگی و بے تکلفی، احساس فرض منصبی، تواضع و انکساری، فیاضی و مہمان نوازی، ایثار و قربانی، قناعت و استغنا آپ کی وہ صفات ہیں جنہوں نے آپ کی شخصیت کو بہت بلند مقام عطا کیا ہے۔ اولاد میں آپ نے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں چھوڑیں۔

ایک جادوگر، عامل جنات۔ عثمانی سلطنت کے سلطان ابراہیم کا استاد۔ اس کے والد کا نام شیخ ابراہیم تھا حسین آفندی اپنے آپ کو صدرالدین القونوی کی اولاد میں سے کہا کرتا تھا۔ استنبول میں وہ سلیمانیہ کے ایک مدرسے میں داخل ہو گیا اور جادوگری کے ذریعے زندگی بسر کرنے لگا۔ یہ علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ اسی لئے اسے جنجی (جادوگر) کا لقب مل گیا۔ ... کی ماں نے دعویٰ کیا تھا کہ حسین آفندی سلطان ابراہیم کے جنوں کو دور کر سکتا ہے اسی لئے سلطان کی ماں نے فوراً اپنے پاس بلا بیا اور اسے ابراہیم کا اتالیق بنا لیا اس وقت دراصل ابراہیم کی والدہ ہی صحیح معنی میں حکمرانی کر رہی تھی۔ بعد میں شیخ الاسلام یحییٰ آفندی کی مخالفت کے باوجود ٢٠ ذیقعدہ کو ١٠٥٤ھ ١٩ جنوری ١٦٤٥ء کو غلطہ کا قاضی بنا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی استنبول کے قاضی کا درجہ بھی مل گیا۔ اس نے عہدے سے فائدہ اٹھایا اور رشوت لے کر لوگوں کو مختلف عہدوں پر مامور کرنے لگا۔ اس طرح اس نے کافی دولت جمع کر لی۔ اسی جرم میں اسے تھوڑے تھوڑے دنوں کے لئے منصف سے برطرف بھی کیا گیا آخری مرتبہ تو اسے جلاوطن کر کے گیلی پولی بھیج دیا۔ پھر سلطان محمد رابع تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اس کے تمام مال و اسباب کو ضبط کر لیا۔ اسے گیلی پولی سے لا کر جیل میں ڈال دیا۔ ایک ماہ تک جیل میں رکھنے کے بعد دوبارہ جلاوطن کر کے مخالیچ (MIKHALIC) بھیج دیا۔ پھر جب اسے موت کی سزا دی گئی تو اس کی جائیداد کا آخری مشہور محل بھی شہزادی کو دے دیا گیا۔ اور پھر اسے شوال ١٠٥٨ھ/ستمبر ١٦٤٨ء میں سزائے موت دے دی گئی۔

حسین بن دلدار علی

سید، نامور شیعہ مجتہد۔ آپ کے والد کا نام سید دلدار علی تھا ربیع الآخر ١٢١١ھ/اکتوبر ١٧٩٦ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ آپ کے استادوں میں آپ کے بڑے بھائی سید محمد اور سید محمد مہدی نام مشہور ہیں۔ سترہ سال کی عمر میں آپ نے دو کتابیں "رسالۂ تجزی فی الاجتہاد" اور "رسالۂ حکم ظن در رکعتیں اولیین" لکھیں۔ ان کتابوں کو دیکھ کر ہی آپ کے والد نے آپ کو اجتہاد کی اجازت دی۔

Marfat.com

آپ ذہانت و ذکاوت، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور اخلاق و سخاوت میں بہت مشہور تھے۔ والد کی وفات کے بعد لوگ آپ کی جانب زیادہ مائل ہونے لگے بشاہ اودھ کو ان سے بہت لگاؤ اور عقیدت تھی۔ اس لئے آپ کو خطاب سے سرفراز فرمایا اور ایک مُہر عنایت کی اس مُہر پر یہ عبارت کندہ تھی "ماوی علوم دین، حامی سادات و مومنین، حافظ احکام اللہ، مجتہد العصر سید العلماء"۔ اس نے حسین بن دلدار کے کہنے پر ایک عالی شان دینی مدرسہ بھی قائم کیا۔ اس مدرسے کے استاد اور نگران کی حیثیت میں آپ نے ہی کام کیا۔ عراق اور ایران کے علماء ان کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اردو اور فارسی کے مشہور شاعر مرزا غالب کو جو شاہ اودھ سے تعلق پیدا ہوا تھا وہ سید حسین بن دلدار کی وجہ سے ہی تھا۔

آپ کا انتقال ۱۷ رمضان ۱۲۷۳ھ/ اکتوبر ۱۸۵۶ء میں ہوا۔ اور آپ کو امام باڑہ لکھنؤ میں دفن کیا گیا۔

آپ کے تین بیٹے تھے ان میں سے سید محمد تقی نے بڑی شہرت اور عظمت حاصل کی۔ حسین بن دلدار نے بیس سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک "حدیقۂ سلطانیہ" جو فارسی زبان میں ہے شیعہ عقائد پر مبنی ہے۔ اور اسی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئی۔

حسن بن ذکرویہ

مہدویت کا مدعی۔

اس نے اپنے آپ کو احمد کے نام سے موسوم کرکے اپنی کنیت ابو عباس رکھی۔ بادیہ نشینوں کے اکثر قبائل نے اس کو مہدی موعود سمجھتے ہوئے اس کی پیروی اختیار کی۔ اس کے چہرے پر ایک تل تھا جس کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی کہتا تھا۔ اسی وجہ سے صاحب الشامہ کے لقب سے مشہور تھا۔

اس نے عیسیٰ کو جو اس کا چچا زاد بھائی تھا مدثر کا لقب دیا۔ اور اسے اپنا ولی عہد بنایا۔ وہ کچھ عرصہ تک اپنے پیروؤں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہا۔ اس کے بعد اس نے دمشق پر چڑھائی کردی۔ چنانچہ دمشق عرصہ تک محصور رہا۔ آخر کار اہل دمشق نے محاصرے سے تنگ آکر نقد زر پیش کرکے اس سے مصالحت کرلی۔

اس کے بعد اس نے حمص پر حملہ آور ہوکر اسے تسخیر کرکے وہاں کے منبروں پر اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ یہاں سے اس نے حماۃ اور معرۃ النعمان پر فوج کشی کی اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس نے عورتوں اور بچوں تک کو بھی معاف نہ کیا۔ پھر بعلبک کی طرف متوجہ ہوا۔ اور یہاں کی آبادی کے قتل و غارت کا حکم دیا چنانچہ اس کی یہ قتل و غارت گری اس وقت تک جاری رہی جب تک بعلبک میں سوائے چند آدمیوں کے تمام آبادی کا خاتمہ نہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے سلمیہ کی طرف رخ کیا اور وہاں بھی قتل و خونریزی کی انتہا کردی۔ یہاں تک کہ مدرسوں اور مکتبوں میں پڑھنے والے کم سن بچوں کی جان لینے سے بھی گریز نہ کیا۔

حسین بن سعید

ایک ممتاز شیعہ عالم دین۔ آپ کے والد سعید بن حماد بن سعید بن مہران تھے انہوں نے اپنے دو بیٹوں کے نام حسن اور حسین رکھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حسین بن سعید کی پیدائش مدینے میں یا کوفے میں ۱۸۵ھ میں ہوئی۔ علمائے رجال کے بقول آپ کو امام رضاؑ، امام محمد تقیؑ اور امام علی نقیؑ کی صحبت نصیب ہوئی۔ آپ کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا۔

آپ کے بارے میں ابن ندیم اپنی الکتاب الفہرست میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ و آثار و مناقب میں سب سے زیادہ وسیع علم رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ اپنے بھائی حسن کے ساتھ مل کر تمام کام کیا کرتے تھے اور دونوں نے مل کر فقہ، تفسیر اور اپنے عقائد پر مبنی کتابیں لکھیں۔ شیعہ حضرات میں بہت مقبول ہوئیں۔

حسین بن سلیمان

ایک ایرانی بادشاہ۔ تخت نشینی سے پہلے وہ سلطان حسین مرزا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کا باپ شاہ سلیمان صفوی ایران کا حکمران تھا۔ ابتدائی عمر میں وہ خاموش طبع محنتی اور زہد و تقویٰ کی جانب مائل تھا۔ جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ حسین بن سلیمان سلطنت کے معاملات سے قطعی ناآشنا تھا۔ اسی لئے حرم میں موجود خواجہ سراؤں نے اس بات کا خوب فائدہ اٹھایا اور تمام کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر کچھ مذہبی پیشواؤں اور حرم کے خواجہ سراؤں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑکنے لگی۔ چنانچہ حسین شاہ کو سازش کے تحت شراب نوشی کا عادی بنا دیا۔ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی چند سالوں تک تو کسی خاص فتنے نے سر نہ ابھارا لیکن بعد میں بلوچستان کے علاقے میں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوگیا اور کچھ باغیوں نے سر اٹھایا۔ لیکن اسے بعض لوگوں نے خوب محنت اور عزم کے ساتھ کام کرکے دفع کردیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد قندھار میں شورش رونما ہوئی۔ چنانچہ حسین نے گرگین کو ایک لشکر جرار دے کر ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ جس نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اس مہم کو انجام دیا۔

یہ بغاوت ایک غلزئی سردار میرویس کے اشارے پر ہوئی تھی۔ چنانچہ گرگین خان نے میرویس کو اصفہان جانے پر مجبور کردیا۔ وہ بھی بہت چالاک آدمی تھا اس لئے جلد ہی حسین شاہ کا منظور نظر بن گیا۔ اور دربار میں گرگین خان کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی۔ کہ میرویس کو قندھار جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد سب سے پہلا کام میرویس نے یہی کیا کہ گرگین خان کو قتل کرا دیا۔ میرویس کا انتقال ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء کو ہوا۔ غلزئیوں کی کامیابی کے بعد ابدالی قبیلہ کو جوش آیا اور اس نے بھی ہرات میں بغاوت کردی۔ ایرانیوں کو مطیع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

عین اسی وقت محمود نے بھی قندھار میں بغاوت ختم کرنے کے بعد ایران پر حملہ کردیا۔ اور اصفہان کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ حسین شاہ کی فوج تعداد میں کم تھی پھر بھی اس نے محمود کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اس موقع پر محمود کی فوجوں نے اصفہان کا محاصرہ کرلیا۔ جس کی طوالت کے باعث دار الحکومت میں بھوک اور بیماری کا دیو آن وارد ہوا۔ بے شمار شہریوں نے اجل کو لبیک کہا۔ چنانچہ حسین شاہ کی فوجوں نے نشانات شاہی محمود کو عطا کرائے۔

اسی دوران میں پیٹر اعظم نے بھی ایران پر حملہ کردیا۔ ترکی نے بھی اس ملک پر چڑھائی کردی۔ روس نے ترکی پر چڑھائی کردی۔ اس طرح یہ جنگ پھیل گئی۔ لیکن ترکی میں موجود فرانسیسی سفیر نے روس اور ترکی میں بیچ بچاؤ کرادیا اور ان کے درمیان ایک معاہدہ طے پاگیا جس میں یہ لکھا تھا کہ وہ مفتوحہ علاقے آپس میں بانٹ لیں گے۔

Marfat.com

حسین شاہ کو معزولی کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن محمود جلد ہی اپنی موت مرگیا۔ اس کے بعد علنریوں اور عثمانی ترکوں میں ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ ترکی کے سپہ سالار اعظم احمد پاشا نے حسین شاہ کو دوبارہ تخت نشین کرنا چاہا لیکن بات نہ بن سکی اور حسین شاہ کو قتل کر دیا گیا۔

حسینؓ بن علیؓ امام

(۴ شعبان ۴ھ/جنوری ۶۲۶ء - ۱۰ محرم ۶۱ھ/اکتوبر ۶۸۰ء)

آنحضورؐ کے چھوٹے نواسے، اہل تشیع اثنا عشریہ کے تیسرے امام۔ ابو عبداللہ کنیت، سید شباب اہل الجنۃ، ریحانۃ النبی اور سید الشہداء لقب۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے فرزند۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ولادت کی خبر سن کر آنحضورؐ تشریف لائے۔ بچے کو منگا کر دائیں کان میں آذان کہی اور بائیں کان میں اقامت۔ والدین نے آپؓ کا نام حرب رکھا تھا۔ آنحضورؐ کو یہ نام پسند نہ آیا۔ آپؐ نے بدل کر حسینؓ رکھا۔ آپؓ نے آنحضورؐ کی گود مبارک میں پرورش پائی۔ آپؓ کے بچپن کے حالات میں آپؓ کے ساتھ آنحضورؐ کے پیار اور محبت کے کئی واقعات ملتے ہیں۔ آپؐ حضرت حسینؓ کے ساتھ غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ آپ روزانہ اپنے دونوں نواسوں کو دیکھنے جاتے تھے۔ ابھی آپؓ کی عمر سات سال ہی کی تھی کہ نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں آپؓ کی عمر سات آٹھ سال کی تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے آخری ایام میں آپ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ آپ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور قرابت رسولؐ کا خاص لحاظ رکھتے۔ حضرت عثمان کے دور خلافت میں آپ جوان ہو چکے تھے۔ ان کے عہد خلافت ہی میں سب سے پہلے میدان جہاد میں قدم رکھا۔ ۳۰ھ/۶۵۰ء میں طبرستان کی فوج کشی میں مجاہدانہ شریک ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کے دوران میں جب باغیوں نے قصر خلافت کا محاصرہ کر لیا تو آپؓ بھی حضرت حسنؓ کے ساتھ قصر خلافت کے دروازے پر حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لئے مامور ہوئے۔

جب حضرت علیؓ نے کوفہ کو دارالخلافہ بنا لیا تو آپؓ مدینے سے کوفہ تشریف لے آئے۔ جنگ جمل میں اپنے والد کے ساتھ تھے۔ جنگ کے اختتام پر کئی میل تک حضرت عائشہ کو مدینہ پہنچانے کے لئے گئے۔ جنگ صفین میں بھی آپ نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ جنگ صفین کے بعد خوارج کی سرکوبی میں بھی بڑے انہماک سے حصہ لیا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت آپ کوفے میں موجود تھے۔ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا فیصلہ کیا تو آپؓ نے اس بات کی سخت مخالفت کی۔

آپؓ نے امیر معاویہؓ کے عہد کی لڑائیوں میں بھی شرکت کی قسطنطنیہ کی مشہور مہم میں آپؓ مجاہدانہ شریک تھے۔ آپؓ ابتدائی عمر ہی سے اصلاح و تعلیم کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ چنانچہ حجر بن عدی کا قتل ہوا تو آپؓ نے حضرت معاویہؓ سے ملاقات کے وقت سخت احتجاج کیا اور حالات و معاملات کی بگڑی ہوئی صورت حال پر گفتگو کی۔

آپؓ قرآن مجید کے مطالب اور احادیث بیان فرماتے تھے۔ عبادت و ریاضت بکثرت نوافل پڑھنا اور قیام اللیل آپ کا عام دستور تھا۔ اکثر روزہ رکھتے تھے۔ آپ نے پچیس حج کئے۔ میدان کربلا میں آپ کی شہادت کا کارنامہ جس نے پوری تاریخ میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، محدثین و مؤرخین نے اس واقعہ پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

امام حسینؓ نے اسلام کا ارتقا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسلامی تاریخ کے جملہ واقعات ان کے سامنے ہوئے۔ آپؓ نے تمام مراحل تبلیغ و دعوت کو آزمایا اور ان کا جائزہ لیتے رہے۔ ۵۶ھ/۶۷۲ء میں جب صورت حال زیادہ بگڑ گئی۔ یزید کو ولی عہد نامزد کیا گیا تو آپؓ نے اس بات کی سخت مخالفت کی۔ اس پر شام سے جواب طلبی ہوئی۔ جس کے جواب میں آپؓ نے حکومت پر سخت تنقید کی۔ اور اپنے خیالات واضح کرتے ہوئے یزید کی ولی عہدی کے ناجائز ہونے کا اعلان کر دیا۔ معاملات نازک صورت اختیار کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کربلا کا سانحہ پیش آیا۔ جس میں آپ نے شہادت پائی۔

آپ کی شہادت کا واقعہ بھی منجملہ ان واقعات کے ہے جن میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں نے بڑی افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ بقول مولانا معین الدین ندوی "آپ کی تقریر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت امام حسینؓ کا یزید کے مقابلے میں آنا محض حصول خلافت کے لیے نہ تھا بلکہ اس کا مقصد اسلامی خلافت کا احیا تھا۔ یعنی موروثی حکومت کے اثر سے اس کے نظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کر کے پھر خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی جائے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نے خود اس کی خواہش نہیں کی بلکہ جب اہل عراق نے پیہم خطوط سے آپ کو اس کا یقین دلا دیا کہ ان کے لئے یزید کی حکومت ناقابل برداشت ہے۔ اس وقت آپؓ نے کوفہ کا قصد فرمایا۔ آپؓ کے تشریف لے جانے کے بعد جب عراقیوں نے دھوکہ دیا تو آپؓ واپس جانے پر آمادہ ہو گئے اور فرمایا کہ تم نے اپنی شکایات کی بنا پر مجھے بلایا تھا۔ اب جبکہ تم اسے پسند نہیں کرتے تو مجھے بھی آپ کی خواہش نہیں ہے میں جہاں سے آیا ہوں واپس چلا جاؤں گا۔"

آپ کی شہادت کے بارے میں افراط و تفریط سے پاک اور صحیح مسلک یہ ہے کہ آپ کوفیوں کی دعوت پر ایک نیک مقصد تجدید خلافت کے لئے اٹھے تھے اور اس کی راہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

آپؓ سے جو احادیث مروی ہیں ان کی تعداد آٹھ ہے۔ کیونکہ آپؓ آنحضورؐ کے زمانے میں نہایت کم سن تھے البتہ بالواسطہ روایات کی تعداد بہت ہے۔ آپؓ نے جن بزرگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں ان میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، ہند بن ابی ہالہؓ، حضرت عمر بن خطاب وغیرہ ہیں۔

آپؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں۔ آپ کی ازدواج میں لیلےٰ، شہربانو، حباب، حرار، سکینہ اور عزالہ تھیں۔ آپ کی اولاد میں صرف امام زین العابدین زندہ بچے تھے، باقی سب لڑکے میدان کربلا میں شہید ہو گئے تھے۔ صاحبزادیوں میں سکینہ، فاطمہ اور زینب تھیں۔

حسین بن علی

(--- ؟ --- ۸ ذوالحجہ ۱۶۹ھ/۱۱ جون ۷۸۶ء) ایک علوی جس نے خلیفہ الہادی کے عہد خلافت میں مدینے میں ایک خروج کی قیادت کی۔ والد کا نام علی العابد تھا جو اپنے زہد و تقا کی وجہ سے مشہور رہے تھے۔ ان کی والدہ زینب بھی متقی و پرہیزگار خاتون تھیں۔ جس کی پرورش انتہائی زہد و تقویٰ اور بنو عباس سے خفیہ طور پر سخت نفرت کے ماحول میں ہوئی۔

Marfat.com

خلیفہ المہدی سے ان کے اچھے خاصے تعلقات تھے۔خلیفہ انہیں مالی عطیات دیتا رہتا تھا لیکن جس خروج کی انہوں نے مدینے میں قیادت کی اس کا فوری محرک وہ اہانت آمیز سلوک تھا جو حاکم مدینہ کے ایک نائب عبدالعزیز بن عبداللہ نے اس شہر کے بنوطالب کے ساتھ ۱۶۹ھ / ۷۸۶ء میں کیا تھا۔

عبدالعزیز بن عبداللہ کو جب یہ خبر ملی کہ بعض شیعی حاجیوں نے اپنے قیام مدینہ کے دوران میں حسین اور دوسرے علویوں سے ملاقاتیں کی ہیں تو اس نے شہر میں طالبیوں کے آنے جانے پر پابندیاں لگانے کی کوشش کی۔اسی طرح کے بعض دوسروں واقعات سے صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی۔

۱۳ ذوالقعدہ کی ایک صبح پو پھٹتے ہی ۲۶ علویوں، ان کے بہت سے موالی اور دس حاجیوں نے مسجد نبوی پر قبضہ کر لیا۔اور مؤذن کو مجبور کیا کہ اذان اہل تشیع کے مطابق کہے۔ یہ اذان سن کر عبدالعزیز روپوش ہو گیا۔حسین نے نماز پڑھوانے کے بعد ایک تقریر کی اور لوگوں سے بیعت لی۔دو علویوں نے حسین کی تائید سے انکار کیا۔ان میں سے ایک موسیٰ بن جعفر الکاظم تھے جنہیں اثنا عشری اپنا ساتواں امام مانتے ہیں۔

حسین کا یہ خروج عام نہ تھا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے آئے اور جب انہوں نے حسین کو منبر پر سفید چغہ اور عمامہ پہنے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ ان کے کیا ارادے ہیں اس لئے واپس چلے گئے۔بہت سے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور حاکم شہر کے دو سو سپاہیوں اور متعدد رضاکاروں نے مسجد پر فوراً دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔پورا شہر ابھی باغیوں کے قبضے میں نہیں آیا تھا۔اس لئے ان کی حالت نازک ہو گئی۔وہ مسجد ہی میں مقیم ہو گئے اور روز تک بند رہے۔بعد میں حسین نے اپنے آپ کو اس صورت حال سے نجات دلانے کا فیصلہ کیا۔چنانچہ وہ اپنے تین سو مسلح آدمیوں کی قیادت کرتا ہوا مسجد سے باہر نکلا

عباسیوں اور حسین کے حامیوں کے درمیان مکے سے چھ میل دور فخ کے مقام پر جنگ ہوئی۔دوران جنگ حسین اور اس کے ساتھیوں کو امان کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے اسے رد کر دیا۔اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ان کے کم وبیش سو آدمی قتل ہوئے۔جب حسین کی شکست کی خبر مدینے پہنچی تو عبدالعزیز اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اپنے عہدے پر واپس آ گیا۔اس نے علویوں اور حسین کے بعض حامیوں کے گھر جلوا دیئے۔اور ان کا مال واسباب بطور مال غنیمت ضبط کر لیا۔یوں اس خروج کا خاتمہ ہو گیا۔

حسین بن محمد تقی

ایک شیعہ عالم اور محدث۔

آپ علامہ نوری کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔آپ ۱۸ شوال ۱۲۵۴ھ جنوری ۱۸۳۹ء کو قریہ نور طبرستان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم طہران میں حاصل کی۔۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں آپ عراق آ گئے۔یہاں آپ نے عبدالحسین طہرانی اور شیخ مرتضیٰ انصاری سے فیض حاصل کیا۔حسین بن محمد تقی نے تین بار حج کیا اور کتنی ہی مرتبہ مشہد کی زیارت کو بھی گئے۔آپ سامرے میں کافی عرصہ تک مقیم رہے۔یہیں جمادی الآخر ۱۳۲۰ھ/ ستمبر ۱۹۰۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔آپ کو نجف میں دفن کیا گیا۔

حسین بن محمد تقی نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں "جامع کبیر" "مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل" شامل ہیں۔

حسینی بنو

ایک شاہی خاندان۔جس نے ۱۷۰۵ء سے ۱۹۵۷ء تک تونس پر حکومت کی۔اس خاندان کا بانی حسین بن علی تھا جو ۱۷۰۵ء میں ابراہیم الشریف کی الجزائریوں کے ہاتھوں شکست اور گرفتاری کے بعد صاحب اقتدار بن گیا تھا۔ترک سلطان احمد ثالث نے اسے صوبہ تونس کا بے بنا دیا تو بیر بے (حاکم اعلیٰ) کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس نے فوجی رہنماؤں کی مجلس مشاورت کو اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ اس کے خاندان میں اولاد نرینہ میں سب سے بڑے لڑکے کے موروثی حق جانشینی کا اصول اختیار کر لیا جائے۔اس کے دور حکومت کا بیشتر حصہ کسی الجھن کے بغیر گزرا۔لیکن آخر میں اس کے بھتیجے علی نے الجزائریوں کی مدد سے اسے معزول کر دیا اور خود بے بنا علی پاشا بیس سال تک (۱۷۳۵ء تا ۱۷۵۶ء) حکومت کرتا رہا۔بعد میں اسے اپنے بیٹے یونس اور پھر اپنے عم زاد محمد بن حسین کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔

محمد نے (۱۷۵۶ تا ۱۷۵۹ء) الجزائری فوجوں کی مدد سے تونس پر قبضہ کر لیا۔ ان افواج نے شہر کو تاراج کیا۔پھر اس کا بھائی علی بے (۱۷۵۹ء تا ۱۷۸۲ء) اس کا جانشین بنا۔اگرچہ حکومت ترکیہ اسے محض والیٔ تونس تسلیم کرتی تھی۔تاہم اسے عملاً خود مختاری حاصل رہی۔کیونکہ حکومت ترکیہ تونس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔تونس اور فرانس کے درمیان پہلی مرتبہ اختلاف رائے اسی کے عہد میں ہوا۔

علی بے کے بعد حمودہ پاشا (۱۷۸۳ء تا ۱۸۱۴ء) نیا بے بنا۔جس کا اہل وینس سے سخت تصادم ہوا۔اس نے سوسہ اور غلطہ پر گولہ باری کی۔حمودہ پاشا کے بعد عثمان بے بنا جس کا عہد حکومت صرف دو تین ماہ رہا۔اس کے بعد محمود (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۴ء) بے بنا جس نے ینی چریوں کو دوبارہ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔تاکہ الجزائری حملوں کو روکا جا سکے۔اس سے پہلے حمودہ بے نے ینی چری فوج کو ختم کر دیا تھا۔اس نے الجزائر کے اوجاق سے صلح کر لی۔اس کے بعد حسین ۲۴ء تا ۱۸۳۵ء اس کا جانشین بنا۔جس نے مسئلہ مشرق کے ضمن میں مختلف مدارج پر سلطنت عثمانیہ کی تائید وحمایت کی۔حسین کے بعد مصطفیٰ (۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۷ء) نیا بے بنا اس کے بعد احمد (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۵ء) اس کا جانشین ہوا۔تونس میں سب سے پہلے اصلاحات اسی نے نافذ کیں۔اس نے رفاہِ عامہ کے بڑے بڑے کام شروع کئے۔

محمد بے (۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۹ء) اور اس کا بھائی محمد الصادق (۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۲ء) دونوں باعزم مصلح تھے۔علی بے (۱۸۸۲ء تا ۱۹۰۲ء) ان کا جانشین بنا اس کے دور میں فرانس کی استبدادی حکومت مکمل طور پر قائم ہوئی اس اثنا میں فرانس کی جانب سے برابر دست درازیاں ہوتی رہیں۔جن کی بنا پر تین حکمرانوں محمد الہادی (۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۶ء) محمد الناصر (۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۲ء) اور محمد الحبیب (۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۹ء) کی حیثیت محض برائے نام رہ گئی۔احمد بے (۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۲ء) فرانسیسی ریذیڈنٹوں کی ہدایت پر کاربند رہا۔حالانکہ ۱۹۳۴ء میں حبیب بورقیبہ کی سرکردگی میں نئی دستور پارٹی نے ملک کے قومی سیاسی احساسات کو مزید تقویت دی۔

احمد کے بعد منصف بے (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء) نے قوم پرست تحریک قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔اس نے اپنے مختصر عہد حکومت میں اپنے آپ کو ایک مستعد حکمران ثابت

Marfat.com

کیا اس کی جگہ الامین (۱۹۴۳ء/۱۳۶۲ھ) کو بنا دیا گیا۔ لیکن اس میں احمد جیسی مستعدی اور قوت کی (...) تھی اس لئے تونس کی حریت و خود مختاری کا سرچشمہ عمل پھر بورقیبہ اور نئی دستور پارٹی کے ہاتھ آ گیا۔

کچھ عرصہ بعد بنو حسین کو خاص حقوق حاصل نہ رہے اور ۱۹۵۶ء کے قانون کی رو سے حکومت بے سے لے کر وزیر اعظم کو تفویض کر دی گئی۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء کو مجلس آئین ساز نے خانوادہ بنو حسین کے خاتمے اور جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔

حسین پاشا

امیر البحر۔ الجزائر کا بحری مہم جو۔ یہ مزہ مورتہ کے نام سے زیادہ مشہور تھا یہ اس کا اطالوی لقب تھا۔ اسکا مطلب ہے "نیم مردہ" یہ لقب اس لئے پڑا تھا کہ ہسپانوی فوجوں کے ساتھ ایک جنگ میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ جب سے ہی اس کا یہ لقب پڑ گیا تھا۔ وہ مالورقہ میں پیدا ہوا۔ ۱۶۴۷ء میں ایک بحری مہم جو کے طور پر اس کی سپورٹ کا آغاز ہوا بعد میں الجزائر کی ایک مشہور و معروف شخصیت بن گیا۔ جب فرانسیسی بحری بیڑے نے الجزائر پر بمباری کی تو دای بابا حسن نے اسے یرغمالی بنا کر فرانسیسیوں کے سپرد کر دیا۔ لیکن حسین پاشا نے اپنی کوششوں اور جدوجہد سے رہائی پائی۔ اور الجزائر آکر حسن بابا حسن کے خلاف سازش تیار کر کے اُسے مروا دیا اور خود دای بن گیا۔ اور فرانسیسی بیڑے پر آگ کے گولے برسا کر اُسے الجزائری ساحل کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ۱۶۸۴ء میں اس نے لوئیس ۱۴ سے صلح کر لی۔ لیکن ۱۶۸۶ء میں حکومت عثمانیہ نے الجزائر سے واپس بلا بھیجی۔ اسی اثنا میں فرانسیسیوں نے صلح نامہ توڑ دیا اور پھر الجزائری ساحلوں پر بمباری شروع کر دی۔ حسین پاشا نے انتقال کے طور پر فرانسیسی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ ۱۶۸۹ء میں باب عالی نے حسین پاشا کو عثمانی بیڑے کا امیر البحر بنانے کا فیصلہ کیا لیکن الجزائر میں سلطانی فرمان آنے سے پہلے ہی اندرونی اختلافات کے باعث حسین نے راہ فرار اختیار کی اور استنبول چلا گیا۔ وہاں ۱۱۰۱ھ/۱۶۹۰ء میں ترکی بحریہ کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ حسین پاشا نے دو جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ حسین پاشا کا انتقال ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء میں ہوا۔

حسین پاشا نے حکومت عثمانیہ کی بہت خدمت کی۔ اس نے عثمانی بیڑے کی اصلاح کر کے اُسے مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اور بحری ملازمت اور نظم و ضبط کے لئے قانون بنائے۔

حسین پاشا

ایک غلام۔ قد چھوٹا ہونے کے باعث کوچک کے لقب سے مشہور ہوا۔ اسے اس کے آقا سلاحدار ابراہیم پاشا نے ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۷ء میں سلطان مصطفیٰ ثالث کو دے دیا تھا۔ اس نے اپنے رضاعی بھائی جو سلیم ثالث کے نام سے تخت پر بیٹھا تھا کے ساتھ پرورش پائی۔ سلیم نے ۱۱ رجب ۱۲۰۳ھ/۷ اپریل ۱۷۸۹ء کو تخت پر بیٹھتے ہی اسے اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔ پھر چند سال بعد ہی ۱۶ رجب ۱۲۰۶ھ/۱۰ مارچ ۱۷۹۲ء کو اسے وزیر کا درجہ دے دیا سلطان کی طرف سے اسے لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ اس نے بڑی محنت اور ہوشیاری سے بحری فوج اور اسلحہ خانے کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ اور تمام عثمانی فوجوں کو فرانسیسی فوجوں کے انداز میں منظم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کام میں اس نے غیر ملکی ماہروں سے بھی مدد لی۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ مل کر فرانسیسیوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اور مصر کا فاتح ثانی مانا جانے لگا کیونکہ اس کی تدبیروں کے باعث فرانسیسیوں کو مصر سے نکلنا پڑا تھا۔ سلطان نے اسے بے شمار اعزازات سے بھی نوازا۔ ۲۲ شعبان ۱۲۱۸ھ/۷ دسمبر ۱۸۰۳ء کو انتقال ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چھیالیس سال سے بھی کم تھی۔ جامع ایوب میں اسکا مقبرہ بنا ہوا ہے۔

حسین پاشا

ایک ترکی وزیر۔ آغا حسین پاشا کے نام سے زیادہ مشہور رہے۔ اس کے والد کا نام حاجی مصطفیٰ تھا۔ اس کی پیدائش ادرنہ میں ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں ہوئی۔ حسین پاشا ینی چری کے نویں دستے بلوک میں بھرتی ہو کر ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء میں قسطنطنیہ آ گیا۔ اس نے ۱۸۰۷ تا ۱۸۱۲ء تک روسی جنگ میں حصہ بھی لیا۔ جلد ہی اسے ینی چری کا سارجنٹ بنا دیا گیا۔ اس نے اپنی خدمات اور ذہانت کی بنا پر بہت سے امتیازات حاصل کر لئے۔ وزیر اعظم سلحدار علی پاشا نے سلطان کی توجہ حسین پاشا کی قابلیت اور محنت کی لگن کی جانب مبذول کرائی۔ چنانچہ سلطان نے اسے ینی چری کے اہم ترین عہدے "قول کیا یا" پر ترقی دے دی۔ حسین پاشا نے ۲۴ جمادی الآخر ۱۲۲۸ھ/۲۶ فروری ۱۸۲۳ء میں اس عہدے کا حلف اٹھایا اور پھر چند ماہ بعد ہی ینی چری کے بعض اہم عہدوں پر فائز آدمیوں کو ہٹایا اور انھیں مختلف صوبوں میں بھیج دیا۔ بعد میں اس نے زیادہ سخت تدبیریں کر کے ینی چری کے دستے کو اختتام کے قریب کر دیا۔ سلطان بھی یہی چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے فوراً حسین پاشا کو اپنا وزیر بنا لیا اور اُسے آغا پاشا کا لقب دے دیا۔ لیکن ینی چری نے اسے اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیا۔ اس لئے ۲۶ اکتوبر کو سلطان نے اسے وزارت سے الگ کر دیا اور اسے ازمید اور بروسہ کا گورنر مقرر کیا۔ ساتھ ہی باسفورس کے قلعوں اور وہاں کی فوج کا افسر اعلیٰ بھی بنا دیا۔ تین سال بعد ہی ینی چری میں بغاوت ہو گئی جسے حسین پاشا نے بڑی بہادری کے ساتھ فرو کر دیا۔

۱۸۲۸ تا ۱۸۲۹ء میں ہونے والی روسی جنگ میں اسے سپہ سالار کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن روسیوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نہ کر سکا۔ بالآخر ۲ جمادی الآخر ۱۲۶۵ھ/۲۵ اپریل ۱۸۴۹ء کو انتقال ہو گیا۔

حسین پاشا

حسین پاشا نام تھا۔ اس کے چچا زاد بھائی نے اُسے عموجہ زادہ کا نام دیا۔ جسکے معنی ہیں چچا کا بیٹا۔ حسین پاشا نے اُس زمانے میں پرورش پائی جب کوپرولو خاندان اپنے عروج پر تھا۔ تیس سال کی عمر تک حسین پاشا نے کوئی خطاب حاصل نہ کیا۔ کیونکہ وہ پُر آسائش اور تن آسان زندگی کو پسند کرتا تھا۔ ۱۶۸۲ء میں وی آنا کی جنگ میں صدر اعظم قرا مصطفیٰ پاشا نے شکست کے بعد حسین پاشا کو دارالسلطنت سے ذلیل کر کے نکال باہر کیا۔ بعد میں اسے شہر زور کا گورنر بنا دیا پھر ایک سال بعد ہی درۂ دانیال میں چار طاق کا فوجی گورنر مقرر کر دیا۔ پانچ سال تک اس عہدے پر رہنے کے بعد ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء میں اسے وزیر کا عہدہ عطا کیا گیا۔ اسلاح ذوالحجہ شعبان ۱۱۰۲ھ/مئی ۱۶۹۱ء میں قسطنطنیہ واپس آ گیا۔ یہاں آکر اس نے صدر اعظم کے قائم مقام کی حیثیت میں بھی کام کیا۔ کیونکہ وہ خود میدان جنگ میں مصروف عمل تھا۔ حسین پاشا شوال ۱۱۰۵ھ/جون ۱۶۹۴ء تک قائم مقام صدر رہا۔ بعد میں دوبارہ

Marfat.com

اپنے سابق عہدے پر درہ دانیال واپس چلا گیا۔ ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۴ء میں اسے قپودان پاشا کا عہدہ دے دیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد اس نے ساقز کو دوبارہ فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس علاقے پر اہل وینس نے قبضہ کر لیا تھا۔ حسین پاشا نے وینس کے بحری بیڑے کو فروری ۱۶۹۵ء میں شکست دی تو اہل وینس خود ہی ساقز کو چھوڑ کے چلے گئے۔ پھر حسین پاشا نے مئی ۱۶۹۵ء میں فوج کی سپہ سالاری چھوڑ دی اور ساقز میں صرف ایک محافظ کی حیثیت سے رہنے لگا۔

۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء میں اسے وہاں سے تبدیل کر کے بلغراد کا محافظ بنا دیا گیا۔ انہی دنوں وزیراعظم الماس پاشا زنطہ کی جنگ میں مارا گیا تو حسین پاشا اس کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ شکست خوردہ فوج کو لے کر ادرنہ آ گیا اور ایک معاہدے کے ذریعے اس جنگ کو ختم کر دیا۔ یہ جنگ پندرہ سال تک جاری رہی۔ حسین پاشا پانچ سال تک وزارت عظمیٰ پر فائز رہا۔ اور ۱۱ ربیع الآخر ۱۱۱۴ھ/۴ ستمبر ۱۷۰۲ء کو ایک لاعلاج مرض کے باعث استعفا دے دیا۔ اور گوشہ نشین ہو گیا۔

اس کا اسی سال ۲۲ ستمبر کو انتقال ہو گیا۔

حسین پاشا اپنی زندگی میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ اور ملک و ملت کی خدمات انجام دیتا رہا۔ تدبر، دیانت، محنت اور لگن اس کے کردار کی اہم خوبیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

حسین جاہد

ایک ترک ادیب۔ اخبار نویس اور سیاست دان۔ ان کے والد استنبول کے رہنے والے تھے۔ آپ کی پیدائش بلیکسیر میں ہوئی۔ ان کے والد علی رضا صوبے میں سرکاری ملازم تھے۔ حسین جاہد نے ابتدائی تعلیم مقدونیہ کے شہر سرس میں پائی۔ بعد میں استنبول آ گئے اور یہاں باقی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں نظام تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ اس دوران فرانسیسی زبان سیکھ کر ترکی کے مدرسوں میں فرانسیسی اور ترکی کے استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے صحافتی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور ایک نیا جریدہ کا آغاز کیا۔ اسی سال پارلیمنٹ کے رکن بن گئے۔ لیکن ۳۱ مارچ تا ۲ اپریل کے دوران میں قدامت پسند عناصر نے انقلاب برپا کر دیا۔ اس دوران میں باغیوں نے آپ کے پریس اور اخبار کے دفتر پر حملہ کر کے تباہ کر دیا اور آپ کی شکل کے ایک اور شخص کو قتل کر دیا۔ ۱۹۱۸ء میں ترکی کی شکست اور اتحادیوں میں جب خانہ جنگی شروع ہوئی تو انگریزوں نے حسین جاہد کو دیگر سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں اور سیاست دانوں کو جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا۔ آپ نے مالٹا سے رہائی پانے کے بعد ترکی آ کر مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت پر تنقید کرنا شروع کر دی اور اپنے اخبار طنین کا دوبارہ اجرا کیا۔ حکومت نے آپ کو گرفتار کر لیا اور آپ کے طرز عمل کو شکست خوردہ ذہنیت کا مظہر قرار دے کر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا۔ ۱۹۲۶ء میں رہا ہوئے تو پھر آپ نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اتاترک کے انتقال کے بعد آپ نے دوبارہ سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور ۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۰ء تک پارلیمنٹ کے رکن رہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۵۷ء میں استنبول میں ہوا۔

آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ جو سیاسی، تاریخی، عمرانی اور ادبی ہیں۔ آپ نے بعض انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی کتابوں کا تراجم بھی کئے۔

حسین حلمی پاشا

۱۸۵۵ء میں متیلین میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان ایک متوسط طبقے کا نمائندہ تھا۔ آپ کے والد ایک معمولی تاجر تھے۔ ابتدائی تعلیم ایک مدرسے میں اور پھر جامع رشدیہ میں باقی تعلیم حاصل کی۔ فقہ کی تعلیم اور فرانسیسی زبان پرائیویٹ استاد سے پڑھی۔ آپ ۱۸۷۴ء میں مقامی سرکاری ادارے میں ملازم ہو گئے۔ اور نو سال تک متیلین میں ہی رہے۔ بعد میں ۱۸۸۳ء میں ایجین کا انتظامیہ بنا دیا گیا۔ یہاں سے آپ کو شام اور پھر لبنان اور یمن بھیجا گیا۔ دولت عثمانیہ کی جانب سے ۱۸۹۸ء میں آپ کو یمن کی گورنری سونپ دی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں دستوری انقلاب برپا ہوا تو آپ کامل پاشا کی کابینہ میں بطور وزیر داخلہ شامل ہو گئے۔ لیکن جب کامل پاشا نے دو وزیروں کو برطرف کر کے ان کی جگہ نئے وزیر مقرر کئے تو آپ نے بھی احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ اس کے صرف دو دن بعد ہی کامل پاشا کو بھی اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ اور اس طرح حلمی پاشا مملکت عثمانیہ کا پہلی مرتبہ وزیراعظم بنا۔ تقریباً دو ماہ بعد ہی ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء میں حلمی پاشا وزارت عظمیٰ سے بھی مستعفی ہو گئے۔ مئی ۱۹۰۹ء کو دوبارہ وزیراعظم بنے۔ اس مرتبہ بھی انجمن اتحاد و ترقی اور فوج نے حکومت کے معاملات میں دخل اندازی ترک نہ کی تو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۹ء کو دوبارہ استعفیٰ دے دیا۔

حسین حلمی پاشا کا انتقال ۷ اپریل ۱۹۲۲ء کو ویانا میں ہوا۔

حسین شاہ

آپ بنگال کے حسین شاہی خاندان کے بانی تھے۔ اور اشراف مکہ کی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ آپ کے والد نے ترمذ سے آ کر ضلع چاند پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں رادھا میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہاں آپ نے بچپن میں قاضی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر حبشی سلطان شمس الدین مظفر شاہ کی ملازمت اختیار کر لی اور اپنی ذاتی قابلیت اور کردار کے باعث بہت جلد وزیر کا منصب جلیل حاصل کر لیا۔ حسین شاہ نے اپنے ظالم آقا کے خلاف بغاوت کی اور قلعہ گوڑ کا چار ماہ تک محاصرہ کئے رکھا۔ بالآخر مظفر شاہ نے قلعے سے باہر نکل کر حملہ کرنا چاہا اور قتل ہو گیا۔ اس وقت حسین شاہ بنگال کے تخت پر بیٹھ گئے۔ حبشی گذشتہ دور حکومت میں سرکش اور باغی ہو گئے تھے۔ ان کی طرف توجہ دی اور انہیں زیر کر لیا۔

آپ کی وفات سنہ ۹۲۵ھ ۱۵۱۹ء میں ہوئی اور آپ کا بیٹا نصرت شاہ تخت نشین ہو گیا۔ آپ نے اپنے دور حکومت میں بے شمار مساجد، خیرات خانے، سکول، مدرسے، رفاہ عام کے دوسرے کام کئے۔

پنجابی بجھارتوں کا جامع مجموعہ
بُجھ میری بُجھکا
مرتبہ
ارشد میر
یکم مارچ کو شائع ہو رہا ہے
مکتبہ شاہکار ـــــــ چوک اردو بازار لاہور

Marfat.com

حاضر سٹاک شاہکار کتب

مندرجہ ذیل شاہکار جریدی کتب محدود تعداد میں موجود ہیں
جلد از جلد منگوا لیجئے، ورنہ یہ بھی ختم ہوجائیں گی
تو آپ کا پچھتاوا اور بھی بڑھ جائیگا۔

صحرانورد کے خطوط (اوّل)	میرزا ادیب	۳/۰۰
صحرانورد کے خطوط (دوم)	میرزا ادیب	۳/۵۰
مقدس نازنین (ناول)	مولانا عبدالحلیم شرر	۴/۰۰
علی گڑھ کے تین نامور فرزند	ڈاکٹر نسیم سوہدروی	۲/۰۰
محبت عظیم ہے (ناول)	گیرزیا ڈیلیڈا	۲/۵۰
اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں	علی اکبر	۳/۵۰
نقوش قائداعظم	پروفیسر رحیم بخش شاہین	۲/۵۰
بیاد قائداعظم	خواجہ ظفر نظامی	۲/۵۰
قاسم کی مہندی (افسانے)	سید قاسم محمود	۳/۵۰
پیغمبر صحرا	کے ایل گابا	۴/۰۰
نوجوان ورتھر کی داستان غم	گوئٹے	۲/۵۰
ری پبلک	افلاطون	۳/۵۰
تھیلما	میری کوریلی	۴/۰۰
قابوس نامہ	امیر کیکاؤس	۳/۵۰
دفاع پاکستان	منور مرزا	۳/۵۰
اقبال کا فلسفہ خودی	پروفیسر عثمان	۳/۵۰

ذہن کی آزمائش
تین حصوں کے نئے
ایڈیشن زیر طبع ہیں

پاکستان میں سب سے کثیرالاشاعت کتاب
فرمودات قائداعظم کا حسین مجموعہ
سبز کتاب
طالبعلموں اور دوستوں کے لیے
بہترین تحفہ
دو روپے

مکتبہ شاہکار تین انسائیکلوپیڈیا
ملک میں علمی ماحول کے خالق ہیں۔

شاہکار انسائیکلوپیڈیا معلومات
ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۳۰/۰۰ فی قسط ۳/۰۰

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۳۰/۰۰ فی قسط ۳/۰۰

شاہکار بے بی انسائیکلوپیڈیا
ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے
سالانہ ۲۵/۰۰ فی قسط ۲/۵۰

ایجنسی کی کتابیں

ڈرامائی انداز میں سیرت نبوی پر عظیم کتاب
محمد رسول اللہ
ڈاکٹر توفیق الحکیم کی شاندار تصنیف 'عطیہ خلیل عرب کا بہترین ترجمہ ۲۵/

مورخین اسلام
ڈاکٹر غلام جیلانی برق
مجلد آفسٹ کاغذ، غیر مجلد نیوز کاغذ
۲۰/۰۰ ۲۵/۰۰

دور جدید کے افسانہ نگار
مظفر محمد علی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ
قسطوں میں موت
۸/۰۰

Marfat.com

جریدی نمبر ۵۴

ذہن کی آزمائش حصہ چہارم

سیرت النبیؐ کے موضوع پر بطرز سوال و جواب اردو میں یا دنیا کی کسی بھی زبان میں پہلی کتاب جو ربیع الاوّل کے مبارک مہینے میں شائع ہو رہی ہے۔ اس میں ۱۱۴۰ سوالات مع جوابات شامل ہیں جن میں حیاتِ طیبہ کے ہر پہلو اور ہر گوشے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں جناب کرم الٰہی دلشاد نے عقیدت کے ساتھ ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ -/۳

ڈائجسٹ نمبر ۵۰۵

ڈاکٹر کے آنے تک

ابتدائی طبی امداد پر گھریلو کتاب جس کا ہر وقت ہر گھر میں ہونا ضروری ہے۔ یہ کتاب آپ کو ہنگامی حالات (بجلی کا شاک، ڈوبنا، جل جانا، ہسٹریا، ہڈی ٹوٹنا، زخم آنا اور عام بیماریوں کے حملوں) سے نمٹنے کے لیے تیار کرتی ہے۔ آپ خود اعتمادی سے ڈرامائی انداز میں ہر بیماری کے اچانک حملے کا رخ پھیر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کے آنے تک یا مریض کو ہسپتال لے جانے تک آپ کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ کتاب چھوٹی موٹی گھریلو چیزوں سے آپ کو ہر بیماری کا فوری علاج سکھاتی ہے۔ خواجہ عبد الحمید لون اور ریاض حسین خدا بخش کی مشترکہ کاوش۔ ۲/۵۰

جیبی نمبر ۱۵

تقویمِ مارچ

مارچ سے متعلق اہم شخصیات، ایجادات اور واقعاتِ عالم کی یومیہ ڈائری ذہانت بڑھانے والے معلوماتی مقابلوں کے لیے ایک خصوصی باتصویر پیشکش۔ "شاہکار تقویم عالم" کے مسلسل سلسلے کا تیسرا حصہ۔ ۱/۵۰

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار ۱۸

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط ○ وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

(۱۸)

• مدیرِ اعلیٰ : سیّد قاسم محمود
• نائب مدیر : شریف اصلاحی

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۲
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

کم تعداد ــــــ بہتر معیار

"شاہکار اب ہر ماہ آپ کی خدمت میں نو کی بجائے پانچ مطبوعات پیش کرے گا۔ مطبوعات کی تعداد یکایک تقریباً نصف کر دینے سے بہت سے قارئین کو شاید دھچکا لگے۔ عین ممکن ہے کہ ہمارے خلوص یا ہماری نیّت پر شبہ کا اظہار کیا جائے یا "بنی جمالو" قسم کے کردار ہمارے اس اقدام کے بارے میں بے سر و پا باتیں کرتے ہوئے نظر آئیں۔ ممکن ہے اس فیصلے کو ہماری کم ہمتی یا پسپائی کا نام دیا جائے لیکن ہر ماہ نو کی بجائے پانچ شاہکار شائع کرنے کی وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ شاہکار نے کتب کے میدان میں ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ عریاں، گھٹیا، غیر معیاری اور سستی لچر تحریروں کی بھرمار میں سنجیدگی، وقار اور معیار کی نہ صرف بات کی ہے، بلکہ ان خصوصیات کی حامل تحریریں عاشقانِ مطالعہ تک پہنچانے کا سلسلہ سوا دو برس سے جاری ہے۔

ایک ماہ میں نو مطبوعات کی تکمیل کس قدر خونِ جگر مانگتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہ عین خوش قسمتی کی بات ہے کہ شاہکار کو اعلیٰ ذوق و نظر کے حامل قارئین کے ساتھ ساتھ سخت جان اور باصلاحیت کارکن میسر آئے ہیں۔ قارئین کی تنقید صحیح سمت میں کارکنوں کی رہنمائی کرتی ہے اور یہ لوگ خوب سے خوب تر کی جستجو میں مشغول رہتے ہیں لیکن ایسے حالات میں جبکہ پورے جوش و جذبہ کے ساتھ علم و ادب کے فروغ کے لیے کام ہو رہا ہو، میر کارواں، کی صحت جواب دینے لگے تو ہوشمندی کا تقاضا کیا ہونا چاہیئے؟

یقیناً یہی کہ کام گھٹایا جائے۔ ہم ایسا ہی کر رہے ہیں، لیکن صرف تعداد کی حد تک۔ معیار نہ صرف برقرار رکھا جائے گا، بلکہ اس کا رُخ بلندیوں کی جانب مائل رہے گا۔

ہم اس کا عہد کرتے ہیں۔

بشرطیکہ آپ سے ہمیں بے لاگ تبصروں اور تنقید پر مشتمل خطوط ملتے رہیں۔ امید ہے آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے

مخلص
اشرف تنویر

---

* حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب
* ختم نبوتؐ * حقوق العباد
* حیات بعد الموت * حفظ الرحمٰن سیوہاروی
* خالد بن ولیدؓ * حیدر آباد دکن
* حنین غزوہ * امیر خسروؒ دہلوی

تاریخ اشاعت : ۱۵ مارچ ۱۹۷۷ء ناشر: سیّد قاسم محمود۔ طابع : ریاض حسین، الجدّہ پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

حسین شاہ ارغون

ٹھٹھہ کا ارغون خاندان کا بانی۔ ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش خیال کیا جاتا ہے کہ قندھار میں ہوئی۔ یہ علاقہ اس کے باپ کے زیر نگیں تھا۔ ۹۱۳ھ ۱۵۰۷ء میں بابر نے قندھار پر قبضہ کرلیا تو اس کا والد شال اور سیوی میں جاکر آباد ہوگیا۔ جو آجکل سبی کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اس نے ان علاقوں کو اپنا مقبوضہ تصور کرنا شروع کردیا۔ ۹۲۱ھ/۱۵۱۰ء میں حسین شاہ نے اپنے باپ سے لڑکر بابر کی ملازمت اختیار کرلی۔ اور دو سال تک ملازمت میں رہا۔ پھر جب گھریلو تنازعہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا تو وہ واپس اپنے باپ کے پاس آگیا۔ اس کے باپ نے ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ء میں اسے ٹھٹھے کے حکمران کی مدد کے لئے روانہ کردیا۔ اس علاقے پر اس کے حریف جام صلاح الدین نے چڑھائی کردی تھی۔ اس جنگ میں جام صلاح الدین مارا گیا۔ اور اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ جب ۹۲۸ھ/۱۵۲۱ء میں اس کے والد کا انتقال ہوگیا تو بالائی سندھ پر اس کی حکمرانی کا اعلان ہوا۔ چنانچہ اس نے موقع ملتے ہی ٹھٹھہ پر چڑھائی کردی اور جام فیروز کو شکست دے کر شہر پر قابض ہوگیا۔ جام فیروز بھاگ کر گجرات چلا گیا اور جلاوطنی میں وفات پائی۔

۹۳۱ھ/۱۵۲۴ء میں حسین شاہ نے ملتان پر حملہ کیا۔ حاکم ملتان محمود خان لنگاہ نے بھی اسّی ہزار فوج کے ساتھ اسکا مقابلہ کیا لیکن بہت جلد بیمار ہوکر مرگیا۔ اس کے جانشین سلطان محمود خاں لنگاہ دوم نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے حسین شاہ ارغون سے صلح کرلی۔ اس کے بعد اس نے دراوڑ اور ملتان پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ لیکن جب وہ فاتحانہ بھکر کی میں داخل ہورہا تھا تو اُسے اطلاع ملی کہ ٹھٹھہ پر کچھ لوگ حملہ کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ لشکر لے کر اُدھر متوجہ ہوا اور انہے شکست دی۔

حسین شاہ ۱۲ ربیع الاول ۹۶۲ھ/۴ فروری ۱۵۵۵ء کو ۳۴ سال تک حکمران رہنے کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ بہت بہادر حکمران تھا۔ علماء اور ماہرین فقہ کا بہت قدردان تھا۔ خود بھی فارسی زبان میں شعر بھی کہتا تھا۔

حسین شاہ شرقی

ریاست جونپور کا آخری بادشاہ۔ اپنے بڑے بھائی محمد شاہ کے انتقال کے بعد ۸۶۳ھ/۱۴۵۸ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس وقت دہلی پر بہلول لودھی کی حکومت تھی۔ حسین شاہ شرقی نے حکومت سنبھالتے ہی بہلول لودھی سے صلح کا معاہدہ کرلیا۔ جو چار سال کے لئے تھا۔ اس مہلت سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ترہت اور اڑیسہ پر حملہ کرکے فتح کرلیا۔ اڑیسہ کے ہندو راجا نے بھاری تاوان دینا منظور کرلیا۔ پھر ۸۷۱ھ/۱۴۶۶ء میں انھوں نے گوالیار کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت یہاں راجہ مان سنگھ کا قبضہ تھا اس نے بھی تاوان دینا منظور کرلیا۔ ملکہ جہاں نے حسین شاہ کو اس بات پر اُکسایا کہ وہ خاندانِ سادات کے علاء الدین شاہ کو اس کی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ دلانے کی کوشش کرے۔ اس لئے آپ نے دہلی پر چڑھائی کردی۔ اس وقت بہلول لودھی پنجاب کے دورہ پر تھا۔ چنانچہ بہلول نے حسین شاہ شرقی سے صلح کی درخواست کی کیونکہ اس کی فوجیں بہت کم تھیں اور حسین کی فوجوں سے جنگ کرنے کے ناقابل تھیں حسین شاہ نے اس درخواست کو رد کردیا۔ لیکن جب جنگ ہوئی تو نتیجہ اس کے خلاف نکلا اور بڑی مشکل سے حسین شاہ نے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء میں حسین شاہ نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اٹاوہ پر حملہ کردیا۔ یہاں قطب خاں لودھی کی حکومت تھی لیکن یہاں بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا اور ایک بار پھر شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی لیکن کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں بالآخر حسین شاہ شرقی نے اپنی فوجی چالوں کے ذریعے لودھیوں کو شکست سے دوچار کردیا۔ اس مرتبہ جب آپ کی فتح مند فوج واپس جارہی تھی تو بہلول لودھی نے پیچھے سے اس پر حملہ کردیا اور حسین شاہ کو مجبوراً کانپی پٹیالی اور دوآب کے کئی شہروں پر بہلول لودھی کا قبضہ ماننا پڑا۔ اس شکست کے بعد آپ نے ایک مرتبہ پھر ۸۹۲ھ/۱۴۸۶ء میں اٹاوہ پر حملہ کردیا۔ لیکن اس میں بھی شکست مقدر رہی اور ریاست جونپور پر بہلول لودھی کا قبضہ ہوگیا۔ چنانچہ آپ اپنی جان بچاکر بہار کی طرف بھاگ گئے۔ حسین شاہ شرقی کو اپنی ریاست جونپور کی بازیابی کی جب کوئی اُمید نظر نہ آئی تو بنگال کے ایک گاؤں کہل چلے گئے اور یہیں پر ۹۰۵ھ/۱۵۰۰ء میں وفات پائی۔ آپ کی وصیت کے مطابق جسد خاکی جونپور لاکر جامع مسجد کے قریب شیخ عیسیٰ تاج۔ بن احمد عیسیٰ کی خانقاہ کے قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ یہ مسجد ان کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئی تھی۔ اور شرقی فن کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔

آپ کی وفات کے ساتھ ہی ریاست جونپور کے شرقی بادشاہوں کا خاندان ختم ہوگیا حسین شاہ شرقی موسیقی نواز تھے اور خود بھی موسیقی کا شوق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک راگ جسے "خیال" کہا جاتا ہے ایجاد بھی کیا تھا۔

حسین قادری

(۱۷۴۷ء/۱۷۹۷ء) سلسلۂ قادریہ کے بزرگ، عالم دین۔ آپ نے ظاہری علوم و فنون کی تعلیم اپنے والد ماجد قطب الاقطاب شیخ کمال قادری سے حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف مقامات سے بے شمار لوگوں سے اکتساب فیض کیا۔ لاہور میں حضرت شیخ عبداللہ بوج قادری سے شرف بیعت حاصل کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۲ء میں جب کلانور کو مستقل ہیڈکوارٹر بناکر سکھوں کے خلاف کارروائی کی تو خواجہ حسین نے بھرپور طریقے سے اس کارروائی میں حصہ لیا۔ بلاقی چک کے معرکے میں آپ خصوصی طور پر شریک رہے۔ اس معرکے میں ہزاروں سکھ ہلاک ہوئے۔ جہاد کے علاوہ ریاضت و عبادت میں بھی آپ نے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ عام طور پر آپ جامع مسجد میاں کوٹ میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ ریاضت کے لئے آپ نے خانقاہ حضرت حاجی حسین میں، مقبرہ حضرت صاحب کے مغرب میں، ایک حجرہ مخصوص کر رکھا تھا۔ مرقد منور خاندانی قبرستان میاں کوٹ میں تالاب کے کنارے واقع ہے۔ (ش۔ ج)

حسین نظام شاہ

احمد نگر کے نظام شاہی سلاطین کا تیسرا فرمانروا اور برہان نظام شاہ اوّل کا سب سے بڑا بیٹا۔ برہان نظام شاہ کے بعد ۱۵۵۴ء میں المؤید من عنداللہ کا لقب اختیار کرکے مسند نشین ہوا۔ احمد نگر سے تخت کے کئی دعویدار بھی پیدا ہوگئے تھے۔ جن میں عبدالقادر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حسین نظام شاہ شیعی عقائد اختیار کئے ہوئے تھا۔ عبدالقادر نے شیعی عقائد قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اسے شاہی دربار کے دکنی گروہ کی حمایت حاصل تھی۔ حسین نظام شاہ کے چھوٹے بھائی نے اپنے خسر خواجہ جہان پرندکی مدد سے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر دونوں حسین شاہ سے شکست کھاکر بیجاپور میں عادل شاہی سلطان کے پاس گئے اور اسے احمد نگر پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ

Marfat.com

نے تخت کے دعویدار میران شاہ علی کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی عادل شاہی اور نظام شاہی سلاطین کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کا اہم واقعہ وجیانگر کے حکمران رام رائے کی شمولیت ہے۔ رام رائے نے عادل شاہی سلطان کا ساتھ دیا۔ ہندو راجہ کے مسلمانوں پر ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمانوں نے اپنی رقابتیں ترک کر کے آپس میں مفاہمت اور اتحاد کا راستہ اختیار کر لیا اور رام رائے کو ۱۵۶۵ء میں تلی کوٹہ کی جنگ میں شکست فاش دی۔ وجیانگر سلطنت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس جنگ میں قلب پر حسین نظام شاہ مامور تھا۔ جنگ کے چھ ماہ بعد حسین نظام شاہ انتقال کر گیا۔

حسین ہمدانی

ایک بابی مصنف جس نے مرزا علی باب کی تاریخ لکھی۔ شاہ ایران کے ہمراہ یورپ کے سفر پر گیا۔ کچھ وقت استنبول میں گزارا۔ ۱۸۷۴ء میں ایران واپس آیا تو کچھ مدت کے لئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد ایک زرتشتی مانک جی کی ملازمت اختیار کر لی۔ مانک نے حسین ہمدانی کو باب کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ تاریخ باب کی تکمیل کے بعد اس کی خواہش تھی کہ وہ باب کی پوری طرح وضاحت کرے لیکن اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور ۱۸۸۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ (ش - ع)

حسینی سادات، امیر

ایک ممتاز صوفی، مصنف اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ممتاز شاگرد۔ پورا نام حسین بن عالم بن الحسن الحسینی۔ غور کے گاؤں گوزیو میں پیدا ہوئے۔ والد کے ہمراہ ملتان آ کر سلسلہ سہروردیہ سے منسلک ہو گئے۔ امیر حسینی کی شادی شیخ زکریا ملتانی کی بیٹی سے ہوئی۔ انہوں نے بلبن اور فیروز شاہ خلجی (۱۲۹۰ء-۱۲۹۶ء) کے عہد حکومت میں ملتان میں قیام کیا۔ امیر حسینی ہرات میں ۱۳۲۸ء کے بعد فوت ہوئے اور عبداللہ بن جعفر طیار کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

حسینی ایک نامور صوفی مفکر تھے۔ دولت شاہ نے انہیں علمیت اور شہرت میں جنید ثانی کہا ہے۔ تاریخ اور ادبیات فارسی در راہ نمائے کتاب کے مصنف نے آپ کا مقام سعدی اور رومی کے بعد بتایا ہے۔ صوفیانہ خیالات کو قصے کہانیوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کا انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کی اہم تصانیف یہ ہیں: نزہۃ الارواح، بہاء الدین بدھ کی شرح، طرب المجالس، زاد المسافرین اور کنز الرموز۔ آپ کی تصانیف میں معاشرتی اور اخلاقی انتشار کے خلاف نمایاں صوفیانہ ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ (ش - ع)

حشر، سورہ

قرآن مجید کی ۵۹ ویں سورت۔ (دیکھئے الحشر)

حشویہ

ایک اصطلاح، جسے ظواہر پر انحصار کر کے تجسیم کے قائل ہو جانے والے لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ ظاہری کلمات کو قابل ترجیح سمجھتے تھے۔ سالمیہ بھی انہی لوگوں میں شامل ہیں۔ معتزلہ اصحاب الحدیث کی پوری جماعت کو حشویہ کہتے تھے کیونکہ وہ ایسے کلمات کا استعمال جائز سمجھتے تھے۔ جن میں خدا کی طرف اعضائے انسانی منسوب کئے گئے ہیں۔ (ش - ع)

حصن کیفا

الجزیرہ کا ایک شہر جو دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہ دیار بکر اور جزیرہ ابن عمر کے درمیان [illegible] ہوتا ہے کہ یہاں ۸۰۰ ق م [illegible] کے درمیان ایرانی شہنشاہیت کے زمانے میں جو سرحدی جنگیں ہوئیں ان میں شہر کا [illegible] بلند اور مستحکم قلعے کی وجہ سے اہم حصہ لیا۔ جنگی اہمیت کی وجہ سے یہاں کا شہر بطور قلعہ تھا اور یہ جگہ دیار بکر اور جزیرہ ابن عمر کے درمیان تجارتی مرکز تھی۔ یہ شہر ۱۱۰۱ء سے ۱۲۳۲ء تک ارتقی خاندان کا دارالسلطنت رہا۔ ۱۲۳۲ء میں ایوبیوں نے حصن کیفا کی ارتقی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ۱۲۶۰ء میں مغول نے اس شہر پر قبضہ کر کے اسے برباد کر دیا۔ اس کے بعد اس کی حالت برابر گرتی چلی گئی۔

قرون وسطیٰ کے اسلامی دور میں حصن کیفا کو جو مسلسل خوشحالی نصیب ہوئی۔ اس کا بین ثبوت وہاں کی شاندار عمارتوں سے ملتا ہے۔ ان یادگاروں میں حسب ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ قلعہ اپنے شاندار دروازوں کے ساتھ شہر کے اوپر واقع ہے۔
۲۔ شہر کے وسط میں جامع الملوک مسجد ہے۔
۳۔ ایک مسجد دریائے دجلہ کے کنارے کے قریب واقع ہے۔
۴۔ ایک قدیم مدرسے کے کھنڈرات جو زیریں شہر کی مشرقی دیوار کے پاس ہیں یہ سب کی سب باقیات دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہیں۔ مغربی کنارے پر ایرانی طرز کا ایک قبرستان ہے جس میں زینب بیگ بن اوزون حسن کا مقبرہ ہے۔ (ش - ع)

حصید، جنگ

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ۱۲ ہجری میں حصید کے مقام پر لڑی گئی۔ حضرت خالد بن ولید جنگ حیرہ میں کامیابی کے بعد انبار، عین التمر اور دومۃ الجندل کے معرکوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ ایرانیوں نے جب یہ دیکھا تو حیرہ پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ حیرہ کے عیسائی بھی جوشِ انتقام میں ایرانیوں کے ساتھ مل گئے۔ ایرانی سردار زرمہر اور روزبہ اپنی فوج کے ساتھ حصید کی طرف بڑھے۔ اسلامی سپاہ کے قعقاعؓ اور ابولیلیٰؓ بھی اسلامی فوج کے دستوں کی کمان سنبھال کر حصید پہنچ گئے۔ خونریز جنگ میں دونوں ایرانی سردار ہلاک ہو گئے۔ نصف سے زیادہ فوج قتل ہوئی، باقی نے راہِ فرار اختیار کی۔ (ش - ع)

حصین بن نمیر

بنو امیہ کا ایک سپہ سالار، جو جنگ صفین میں امویوں کی طرف سے لڑا۔ یزید اوّل کی تخت نشینی کے وقت وہ حمص کا حاکم تھا۔ حجاز کے خلاف فوج کشی میں وہ سپہ سالار مسلم بن عقبہ المری کا نائب مقرر ہوا۔ مکے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے مسلم نے بستر مرگ پر فوج کی کمان حصین کے سپرد کر دی۔ مسلم مشلل کے مقام پر فوت ہوا۔ مشلل کے باشندوں نے مسلم کی لاش کو قبر سے نکال کر سنگسار کر دیا تھا۔ حصین بن نمیر نے مشلل کے سب باشندوں کو قتل کر دیا۔ اس نے دو مہینے تک مکے کا محاصرہ جاری رکھا۔ فتح کرنے سے قبل ہی یزید کا انتقال ہو گیا اور حصین نے محاصرہ اٹھا لیا۔ حصین نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو خلیفہ بنانے کے سلسلے میں ناکام کوشش کی۔ مروان بن الحکم کی تخت نشینی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ اور اپنے قبیلہ کے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ خالد بن یزید کی بجائے مروان کو خلیفہ تسلیم کر لیں۔ حصین جنگ خازر میں [illegible] ابراہیم بن اشتر کے ہاتھوں مارا گیا۔ (ش - ع)

Marfat.com

حضانت

فقہا کی اصطلاحی زبان میں بچے کی سرپرستی کا حق۔ سرپرستی کا یہ حق بچے کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے علیحدہ نہ ہونے کی صورت میں صرف دو حالتوں میں حق سرپرستی کے معاملے میں بیوی پر خاوند کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اوّل جبکہ بیوی کی سکونت خاوند کی سکونت سے الگ ہے یا تو اس لئے کہ خاوند نے سرپرستی کی اجازت دیتا ہے (حنفی مسلک) یا اس لئے کہ بیوی نے نکاح کی شرائط میں سے ایک شرط کے ذریعے یہ حق اپنے لئے تسلیم کرا رکھا ہے (مالکی اور حنبلی مسلک) دوسری صورت یہ کہ خاوند اپنے بچے کو ایک سفر پر ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے اور بیوی کو اپنے ہمراہ نہیں لے جاتا۔ حنفیوں کے نزدیک اصولاً حضانت ماں کا حق ہے۔ باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ ماں کی سرپرستی کے بغیر اور اس کی مرضی کے خلاف بچے کو سفر پر ساتھ لے جائے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حق حضانت اس عمر تک کے لئے ہوتا ہے جب لڑکا خود کھانے پینے لباس پہننے اور استنجا کرنے لگے۔ لڑکی کی صورت میں اس کے بالغ ہونے تک ہے یہی قول امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک جب لڑکی میں جنسی خواہش ظاہر ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک حق حضانت اس وقت تک رہتا ہے جب تک لڑکا واضح طور پر بات چیت کر سکے اور لڑکی کی بلوغت تک۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی دونوں کے لئے سات سال کی عمر تک حق حضانت ہوتا ہے شیعی فقہ کی رو سے لڑکے کے متعلق دو سال اور لڑکیوں کے متعلق سات سال تک حق حضانت حاصل رہتا ہے۔

حنفی، شافعی اور حنبلی فقہ میں (جن کے نزدیک حق حضانت جلد ختم ہو جاتا ہے) یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس چھوٹے بچے کا کیا ہو گا جو اب ماں کی سرپرستی میں نہیں رہا۔ حنفی فقہ میں اس عمر میں بچے کو واجبی طور پر باپ کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور باپ کے انتقال کی صورت میں یا سرپرستی کے قابل نہ ہونے کی صورت میں، اس مرد رشتے دار کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ جس پر بچے کی ولایت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ لڑکی کی صورت میں یہ شرط ہے کہ ولی لازمی طور پر "محرمات" میں شامل ہو۔ سات سال کے لڑکے یا نو سال کی لڑکی سے مشورہ نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اس عمر میں اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی عقلمندانہ فیصلہ کر سکیں۔ شافعیؒ سات سال کے لڑکے کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں کہ وہ چاہے تو اپنی ماں کے ساتھ رہے اور چاہے تو اپنے باپ کے گھر چلا جائے۔ شافعیؒ یہی حق نو سال کی لڑکی کو بھی دیتے ہیں۔

حنفی پندرہ سال کے لڑکے کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے باپ سے الگ ہو کر یا اپنی ماں سے علیحدہ ہو کر رہنا چاہے بشرطیکہ اس نے سات برس کی عمر میں ماں کو اپنا سرپرست منتخب کیا ہو۔ سن بلوغت کو پہنچنے والی لڑکی کی صورت میں شافعی مذہب سب سے زیادہ نرمی سے کام لیتا ہے۔ کیونکہ اس مکتب کے فقہا بالغ لڑکی کو علیحدہ مسکن رکھنے سے منع نہیں کرتے۔ مالکی فقہ کی رو سے ایک دوشیزہ بالغ ہو کر بھی اپنے باپ سے الگ نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف ایک لڑکی جو بیوہ یا مطلقہ ہو تو اُسے نقل و حرکت کی پوری آزادی حاصل ہے۔ حنفی فقہا کے نزدیک ایسی لڑکی اب بھی اپنے باپ کے ساتھ رہے گی۔

حضانت کی تفویض مختلف مذاہب میں مختلف ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مختلف مذاہب کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حنفی اور مالکی حق حضانت کو ایسی شکل دیتے ہیں جس میں ہمیشہ عورتیں ہی فوقیت حاصل کرتی ہیں۔ ننھیال کی عورتوں کو ددھیال کی عورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ شافعی اور حنبلی مذاہب کچھ عورتوں (ماں، نانی، پرنانی) کو اوّلیت دیتے ہیں۔ مگر خاص حالات میں مردوں کو عورتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ بچے کی بہت ہی قریبی رشتہ دار عورتیں بھی موجود ہوں۔ حنفی اور مالکی فقہا کے نزدیک حضانت ماں کا حق ہے۔ ماں کی وفات پا جانے یا اس کے قابل سرپرستی ہونے یا اس صورت میں کہ وہ اپنے حق کو کسی وجہ سے ضائع کر دے۔ یہ حق ماں کی قریبی رشتہ دار عورتوں کو اور پھر باپ کی قریبی عورتوں کو حاصل ہوتا ہے ان کے بعد سگی بہن اور ننھیال میں سے بہن، ددھیال سے پہلے پھر بھتیجیاں (سوائے ہم جد کے) خالہ کو پھوپھی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مالکی فقہ میں خالہ کو باپ کی قریبی رشتہ دار عورتوں پر ترجیح دی گئی ہے۔ حنفی اور مالکی مذاہب میں مردوں کو حضانت کا حق صرف اس وقت دیا جاتا ہے جب تمام رشتہ دار عورتیں مفقود ہوں جن سے شادی نہ ہو سکے۔ حق حضانت کے لحاظ سے مردوں میں سب سے پہلے عصبات (مرد جو مردوں کے واسطے سے رشتہ دار ہیں) آتے ہیں۔ سب سے پہلے باپ، پھر کسی عصبہ کے نہ ہونے کی صورت میں (حنفی فقہ کی رو سے) عورتوں کے واسطے سے رشتہ دار مرد لڑکی کی صورت میں صرف مرد جن کے ساتھ شادی حرام ہے۔ آخر میں ان مردوں اور عورتوں کا حق ہے جن سے شادی کرنا حرام نہیں۔ تمام رشتے داروں کی عدم موجودگی میں قاضی کسی اور قابل اعتبار شخص کو حضانت کے لئے مقرر کر سکتا ہے۔ شافعی اور حنبلی مذاہب میں قریبی رشتے دار عورتوں کے موجود ہونے کے باوجود مرد حق حضانت استعمال کر سکتے ہیں۔ ان دو مذاہب میں باپ کی طرف سے بہن کو (ماں کی طرف سے بہن پر) اور پھوپھی کو خالہ پر ترجیح دی جاتی ہے۔

استحقاق کے سلسلے میں اہم مسئلہ اکثر مختلف المذاہب والدین کے بچے سے متعلق پیش آتا ہے۔ شافعی مذہب کے نزدیک بچے کا باپ مسلمان ہو اور بیوہ یا مطلقہ مسلمان نہ ہو تو حضانت کا حق عورت کو نہیں دیا جائے گا۔ مالکیوں کا اس بارے میں قدرے تامل ہے اور حنفیوں کا فیصلہ ہے کہ ذمیہ (عیسائی یا یہودی عورت) حضانت کا حق رکھتی ہے۔ حنفیوں کے نزدیک ایک غیر مسلم عورت اس وقت حق حضانت سے محروم ہو جاتی ہے جب وہ بچے کو اس کے باپ کے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کر چکی ہو۔ ہر مسلک فقہ کے مطابق مرتدہ حضانت سے خارج ہے۔ (اشریف جاوید)

حضرموت

بلاد عرب میں یمن کے مشرق میں ایک مملکت۔ زمانۂ قبل از اسلام میں حضرموت میں قبیلۂ صدفؔ آباد تھا۔ بنو کندہ نے جو تیس ہزار کی تعداد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ ولادت کے قریب بحرین سے ترک وطن کر کے حضرموت چلے آئے

حضرموت کا مشہور شہر المکلا

Marfat.com

تھے۔ اپنے آپ کو انہی سے وابستہ کر لیا تھا۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں کلاوہ کے سردار قیس بن اشعث نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

حضر موت ایک پہاڑی سرزمین ہے جس کے آر پار ایک مدی ہے۔ ساتھ ہی کئی بڑی بڑی ندیاں نکلتی ہیں۔ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ پہاڑیاں ہیں اور ان کے پیچھے پہاڑوں کا ایک بلند کوہستانی سلسلہ ہے جس میں سب سے اونچا جبل العرشہ ہے۔ پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ شمالی سمت میں بڑی وادی سے ملتی ہے اور صحرائے الفظم تک پھیلا ہوا ہے۔ قدیم دارالحکومت تریم، عینات اور القسم تھے۔

آج کل حضر موت جمہوریہ جنوبی یمن کا حصہ ہے۔ ۱۹۶۱ء میں اس کی آبادی تقریباً تین لاکھ تھی۔ اہم ترین شہر اور بندرگاہ المکلا ہے۔ (ش۔ ج)

حضور

جنوبی عرب کا ایک پہاڑ جو صنعا کے مغرب میں وادی سام اور وادی شردؤ کے درمیان حراز کے پہاڑی سلسلے کے قریب واقع ہے۔ حضور کا نام حضور بن عدی بن مالک کے نام سے ماخوذ ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام بن مہدم کے اجداد میں سے تھے۔ یہ پہاڑ ۰۰۰ ۴ فٹ بلند ہے۔ عربوں کی روایت کے مطابق ان تین پہاڑوں میں یہ سب سے اونچا ہے جہاں طوفان نوحؑ میں سمندر کی لہریں نہیں پہنچ سکی تھیں۔ اس کی بلند ترین چوٹی جبل قاہر ہے جس کے اوپر حضرت شعیبؑ کا مقبرہ اور مسجد ہے۔ زائرین یہاں بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ حضور شعیب میں کئی کئی فٹ برفباری بھی ہوتی ہے۔ (ش۔ ج)

حضین

بن منذر بن حارث، بصرے کے شاعر۔ آپ کا شمار سربرآوردہ تابعین میں ہوتا ہے۔ آپ نے چھوٹی عمر ہی میں جنگ صفین میں داد شجاعت پائی۔ آپ حضرت علیؓ کے لشکر میں بنو ربیعہ کے علمبردار تھے۔ بعد میں آپ کا ذکر صرف شاعر کی حیثیت سے ملتا ہے۔ آپ نے چند حدیثیں روایت کی ہیں۔ جن میں بعض احادیث شاہان فارس کے بارے میں ہیں۔ آپ کی کنیت ابوساسان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا خاندان ایران سے متاثر رہا ہے۔ (ش۔ ج)

حطیم

خانہ کعبہ کے شمالی جانب ایک دیوار (دیکھئے کعبہ)۔

حفص، بنو

شمالی افریقہ کا ایک خاندان (۱۲۲۹ء / ۱۵۷۴ء) جس کا نام اس کے مورث اعلیٰ شیخ ابوحفص عمر بن یحییٰ الہنتاتی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ابوحفص موحدین کی سلطنت کا بانی تھا۔ اس کے فرزند شیخ ابو محمد عبدالواحد نے ۱۲۰۷ء سے ۱۲۲۱ء تک افریقیہ پر حکومت کی۔ اس کا پوتا ابو محمد عبداللہ بن عبدالواحد ۱۲۲۶ء میں افریقیہ کا حاکم بنا۔ اس کی معزولی کے بعد ۱۲۲۸ء میں اس کے بھائی ابوزکریا یحییٰ کو افریقیہ کا والی بنایا گیا۔ اس نے ۱۲۳۰ء میں قسطنطنیہ اور بجایہ پر قبضہ کر کے طرابلس الغرب اور قسطنطنیہ کے جنوبی علاقے کو بانی ابن غانیہ سے چھڑا کر سارے افریقی مقبوضات کو سیاسی وحدت کی لڑی میں پرو دیا۔ ۱۲۳۱ء میں الجزائر کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ جولائی ۱۲۴۲ء میں تلمسان کا شہر فتح کیا۔ ۱۲۴۹ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو شمالی مراکش کا سارا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔ بنو نصر اور بنو مرین اس کی ماتحتی کا دم بھرتے تھے۔ اس

خاندان کے دیگر حکمران [redacted]

۱۔ خلیفہ المستنصر باللہ [redacted]

تا ۱۲۷۷ء [illegible]

۲۔ الواثق بن مستنصر [illegible]

۳۔ ابواسحاق ۱۲۷۹ء تا ۱۲۸۳ء [illegible]

۴۔ ابن ابی عمارہ ۱۲۸۳ء تا ۱۲۸۴ء [illegible]

۵۔ ابوحفص ۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۵ء

۶۔ ابوعصیدہ بن الواثق ۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۹ء

۷۔ ابویحییٰ ابوبکر الشہید ۱۳۰۹ء

۸۔ ابوالبقاء ۱۳۰۹ء تا ۱۳۱۱ء

۹۔ ابن اللحیانی ۱۳۱۱ء تا ۱۳۱۷ء

۱۰۔ ابوبدیر بن اللحیانی ۱۳۱۷ء تا ۱۳۱۸ء

۱۱۔ ابویحییٰ ابوبکر ۱۳۱۸ء تا ۱۳۴۶ء

۱۲۔ ابوالعباس احمد ۱۳۴۶ء تا ۱۳۴۹ء

۱۳۔ ابوالفضل بن ابویحییٰ ابوبکر ۱۳۵۰ء

۱۴۔ ابواسحاق بن ابویحییٰ ابوبکر ۱۳۵۰ء تا ۱۳۶۹ء

۱۵۔ ابوالبقا خالد ۱۳۶۹ء تا ۱۳۷۰ء

۱۶۔ ابوالعباس ۱۳۷۰ء تا ۱۳۹۴ء

۱۷۔ ابوفارس بن ابوالعباس ۱۳۹۴ء تا ۱۴۳۴ء

۱۸۔ المستنصر (ابوفارس کا پوتا) ۱۴۳۴ء تا ۱۴۳۵ء

۱۹۔ عثمان (المستنصر کا بھائی) ۱۴۳۵ء تا ۱۴۸۸ء

۲۰۔ ابوزکریا یحییٰ (عثمان کا پوتا) ۱۴۸۸ء تا ۱۴۸۹ء

۲۱۔ عبدالمؤمن بن ابراہیم ۱۴۸۹ء تا ۱۴۹۰ء

۲۲۔ ابویحییٰ زکریا بن یحییٰ ۱۴۹۰ء تا ۱۴۹۴ء

۲۳۔ ابویحییٰ (سابق حکمران کا بھانجا) ۱۴۹۴ء تا ۱۵۲۶ء

۲۴۔ الحسن بن ابویحییٰ ۱۵۲۶ء تا ۱۵۴۳ء

۲۵۔ احمد بن الحسن ۱۵۴۳ء تا ۱۵۶۹ء

۱۵۶۹ء میں الجزائر کے پاشا نے تونس پر قبضہ کر لیا اور احمد اپنے بھائی کے ہاں حلق الوادی چلا گیا۔ ۱۵۷۴ء میں تونس مملکت عثمانیہ کے ماتحت صوبے کا صدر مقام بن کر رہ گیا۔ (شریف جاوید)

حفصہ

ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمر بن الخطاب۔ آنحضرت صلعم کی چوتھی زوجہ مطہرہ جو حضرت عائشہؓ کے بعد آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ آپ ہجرت نبوی سے اٹھارہ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ ہجرت سے قبل آپ حضرت خنیس بن حذافہ کے نکاح میں تھیں۔ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ اسلام لائے اور مدینہ کو ہجرت کی۔ آپ کے شوہر حضرت خنیس غزوۂ بدر میں زخمی ہوئے۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ [illegible] کہ آپ کے شوہر غزوۂ بدر میں زخمی ہو کر فوت ہوئے۔ [illegible] کا قول ہے کہ آپ کے شوہر ۳ ہجری میں غزوۂ احد میں [illegible] سال آپ رسول اللہؐ کے نکاح میں آئیں۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہؓ کو ایک طلاق دی اور پھر [illegible]

حضرت حفصہؓ رسول کریم صلعم کے وصال کے بعد مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہیں جافظ ابن الیر کے قول کے مطابق حضرت حفصہؓ کا انتقال جمادی الاوّل ۴۱ھ میں ہوا۔ نماز جنازہ مروان بن الحکم والئ مدینہ نے پڑھائی۔ ابن حجر اور ابن سعد کی روایت کے مطابق مروان نے بنو حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک ان کے جنازے کو کندھا دیا اور وہاں سے جنت البقیع تک حضرت ابو ہریرہؓ نے کندھا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عاصم بن عمرؓ نے انہیں قبر میں اتارا۔ مسلمؒ اور بخاریؒ نے ان سے دس احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت حفصہؓ اکثر روزہ سے رہتی تھیں اور نماز و یاد خدا میں مشغول رہتی تھیں۔ (ش ع)

حفص بن سلیمان

دیکھیے "ابو سلمہ"۔

حفظ الرحمن سیوہاروی

(۱۹۰۱ء / ۲ر اگست ۱۹۶۲ء) برعظیم کے مشہور عالم دین۔ سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولوی شمس الدین صدیقی اپنے قصبے کے معزز، متدین اور عالم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت فضل الرحمن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔ ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے مدرسہ "فیض عام" میں حاصل کی۔ اس کے بعد مشہور علمی درس گاہ دارالعلوم دیو بند میں داخل ہوئے۔ جہاں آپ کو علامہ انور شاہ محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب اور میاں اصغر حسین صاحب جیسے نادرہ روزگار اساتذہ سے استفادہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مدراس سے ایک فرمائش پر علامہ انور کشمیریؒ نے آپ کو وہاں بھیج دیا۔ پیرامیٹ میں کم و بیش سال بھر تدریس و تبلیغ میں مصروف رہے۔ یہیں آپ نے دو مختصر رسالے "حفظ الرحمن لمذہب النعمان" اور "مالابار میں اسلام" تحریر کیے۔ ۱۹۲۴ء میں حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر کلکتہ تشریف لے گئے۔ انجمن کے سرپرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے یہاں مفتی عتیق الرحمن صاحب کے ساتھ مل کر درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا آزاد کی رفاقت نے آپ کے ساتھ سیاسی ذوق ولگن کو دو آتشہ کر دیا۔

مولانا حفظ الرحمن اور مفتی عتیق الرحمان صاحب کی ابتدا ہی سے خواہش تھی کہ ایک ایسے تالیفی و تصنیفی ادارے کی بنیاد رکھی جائے جس میں کتاب و سنت، فقہ و تاریخ اسلامی کی مستند اور معیاری کتب شائع کی جائیں۔ کلکتہ میں رہائش کے دوران مفتی صاحب کو خاصی رقم مہیا ہو گئی چنانچہ دونوں حضرات دہلی آ گئے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی کو شریک مجلس ادارت کر کے ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی۔ مولانا کی مشہور کتابیں قصص القرآن (چار جلد) اخلاق اور فلسفۂ اخلاق اور اسلام کا اقتصادی نظام اسی ادارے سے شائع ہوئیں۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی جمعیت علمائے ہند کے رکن اور آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ نے تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور کئی بار گرفتار ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ انڈیا کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے۔ آپ کا شمار سیکولرزم کے صف اول کے حامیوں میں ہوتا تھا۔ سیکولرازم کو بھارت کے دستور کی بنیاد قرار دیئے جانے میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ آپ کانگرسی حلقوں میں کافی مقبول تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹو اور کورٹ کے رکن تھے۔ آپ کی ذات مسلم یونیورسٹی اور اس کے وقار کو باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔

آپ کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ آپ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی۔ پرجوش خطیب بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی ماہر و تجربہ کار معلم مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف بھی تھے۔ "بلاغ المبین" آپ کی اہم تصنیف ہے۔ اس کے تین حصے ہیں پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں تبلیغ اسلام کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں تیسرے حصے میں تبلیغ کے اثرات و نتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ آپ کا انتقال کینسر کے موذی مرض کے باعث ہوا۔ جنازے میں دو لاکھ افراد نے شرکت کی نماز جنازہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند نے پڑھائی۔ (شریف جاوید)

حفیظؒ

دیکھیے "اسماء الحسنیٰ"۔

حفیظ

(۱۸۸۰ء / ۴ر اپریل ۱۹۳۷ء) عبدالحفیظ بن سلطان مولائی حسن۔ مراکش کا علوی سلطان۔ ۱۶ر اگست ۱۹۰۷ء کو مراکش میں اور جنوری ۱۹۰۸ء میں فاس میں اس کے سلطان ہونے کا اعلان کیا گیا۔ مولائی حفیظ فقیہ اور عالم دین تھا۔ اس کے عہد حکومت میں فرانس اور جرمنی کے مابین ۱۹۰۹ء کا وہ معاہدہ ہوا جس کی رو سے مراکش کے معاملات میں فرانس کے "خاص حقوق" تسلیم کر لیے گئے۔ ۴ر مارچ ۱۹۱۰ء کو فرانسیسی مراکشی عہد نامے پر دستخط ہو گئے۔ اس مدبرانہ عمل سے دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت پیدا ہو گئی۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں ملیلہ کی شورش فرو کرنے کے نتیجے میں مراکش اور اندلس کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء کے آغاز میں مراکش میں بعض شورشیں رونما ہوئیں۔ جنہیں مولائی حفیظ نے فرانسیسی فوج کی مدد سے فرو کیا۔ ہسپانیہ نے فرانسیسی کارروائیوں کے مقابلے میں العرائش، القصر الکبیر اور اصیلیہ پر قبضہ کر لیا۔ اس مداخلت سے جرمنی افروختہ ہو گیا۔ لیکن جلد ہی نومبر ۱۹۱۱ء میں فرانس اور جرمنی نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ جس کی رو سے فرانس کو مراکش میں مداخلت کی کھلی آزادی مل گئی اور جرمنی کو استوائی افریقہ کے وسیع و عریض علاقے مل گئے۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کے معاہدے کے تحت مراکش اور فرانس کا زیر حمایت ملک بن گیا۔ اپریل میں فاس میں زبردست ہنگامے ہوئے۔ جس کے نتیجے میں سلطان حفیظ نے ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سلطان فرانس اور وہاں سے طنجہ آ گیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک وہ ہسپانیہ میں مقیم رہا۔ فرانس میں وفات پائی۔ اس کی لاش کو فاس میں لا کر شایان شان طریقے سے دفن کیا گیا۔ (ش ع)

حق

علم دینیات میں حق سچائی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی حق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک ہے اور ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

دین اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہر انسان کے دوسرے انسانوں پر بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں پر بھی کچھ حقوق ہیں جنہیں ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "خدا نے تمہارے (کام کے) لیے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں" (بقرہ۔ آیت ۲۹) اس سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ انسا

کو دنیا کی ہر اُس چیز سے نفع اٹھانا چاہیئے جو اس کے لیے خدا نے پیدا کی ہیں ۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں ضائع ہونے سے یا غلط استعمال سے بچایا جائے ۔ اسی چیز کا نام حق ہے ۔ قرآن میں آیا ہے " اور اُن کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو " (ذاریات ۔ ۱۰)

خدا کے رسولؐ نے کہا ہے کہ " بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے " (بخاری)
" تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے " (بخاری) ۔

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہر انسان کا دوسرے انسان پر حق ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے ۔ اس کے ایک ایک عضو کا اس پر حق ہے ۔ لفظ حق عموماً اپنے وسیع ترین معانی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا ۔ عربی میں یہ لفظ عام طور پر سچائی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ۔

حق

دیکھیئے اسمائے حسنیٰ

حقوق العباد

انسانوں کے حقوق انسانوں پر ۔ اسلامی تعلیمات میں حقوق العباد پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ۔ میدان حشر میں بھی حقوق العباد کے متعلق ہی زیادہ پوچھ گچھ کی جائے گی اور اس بارے میں ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی بھی قابلِ گرفت ٹھہرے گی ۔ ہر انسان اپنے عزیز و اقارب ، مساکین و یتامٰے مہمان و مسافر اور ملک و ملت کے متعلق اپنے فرائض انجام دیتا ہے ۔ ماں باپ سے ، محلہ داروں سے ، ہمسایوں سے ، ہموطنوں سے اور رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتا ہے ۔ اُن کا ہر آن خیال رکھتا ہے ۔ حقوق العباد میں آداب مجلس ، گفتگو کے آداب اور آداب ملاقات بھی شامل ہوتے ہیں ۔

قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : " مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں ، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو ، اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا ۔ "
(سورۃ حجرات ۔ آیت ۱۰)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک عالمگیر برادری بنا دیا ہے ۔ مسلمانوں کے درمیان بے انتہا اخوت اور رواداری پیدا کر دی ہے جو دوسری قوموں میں نہیں پائی جاتی ۔ اس آیت میں دیئے گئے حکم کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث سے بھی ہوتی ہے ۔

حضرت جریرؓ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی ۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا ۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا ۔ تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا ۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا " مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ۔ " (بخاری)

ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا " ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان و مال اور عزت حرام ہے ۔ "

قرآن میں آیا ہے ۔ " آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو ۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا

[illegible]
بھبتیاں کسنا ، الزام لگانا ، احترام کو [illegible]
زیرِ لب یا اشاروں کے ذریعے کسی کو رسوا کرنا ، ملامت بنانا [illegible]
کے زمرے میں آتا ہے ۔ چونکہ ان افعال سے آپس کے تعلقات بگڑتے ہیں اور معاشرے میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے ۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے ان سب افعال سے منع فرما دیا ہے ۔

نعمانؓ بن بشیر کہتے ہیں کہ میرے والد نے مجھے ایک عطیہ دیا ۔ میری والدہ عمرہؓ بنت رواحہ نے کہا " جب تک آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنا لیں گے میں راضی نہ ہوں [illegible] والد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے عرض کی کہ : یا رسول اللہؐ میں نے اپنے بیٹے کو جو عمرہ کے بطن سے ہے ایک عطیہ دیا ہے ۔ عمرہ نے مجھے تاکید کی ہے کہ (اس پر) آپ کو گواہ بنا لوں ۔ [illegible] کی بچوں کو بھی اسی طرح عطیہ دیا ہے ؟ " نعمان کے والد نے کہا نہیں ۔ حضورؐ نے جواب دیا ۔ " اللہ سے ڈرو اور اولاد کے درمیان انصاف کرو ۔ " نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ ان کے والد فوراً گھر آئے اور اپنا عطیہ مجھ سے واپس لے لیا ۔ "

اس حدیث سے علم ہوتا ہے کہ اولاد کا والدین پر یہ حق ہے کہ لین دین میں اولاد کے درمیان انصاف ہو ۔ لیکن ساتھ ہی اولاد پر بھی والدین کے کچھ حقوق ہیں ۔ ایک حدیث ہے کہ " اللہ تعالےٰ جس گناہ کو چاہتا ہے (سزا کے واسطے) قیامت تک کے لیے مؤخر کر دیتا ہے ۔ ہاں تین قسم کے گناہ ایسے ہیں جن کی سزا انسان کو موت سے قبل ہی بھگتنی پڑتی ہے ۔ (۱) بغاوت ، سرکشی ۔ (۲) والدین کی نافرمانی ۔ (۳) قطع رحم ۔

کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا ۔ پڑوسی کے آرام کا خیال رکھنا ۔ مہمان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ، یتامیٰ کی امداد کرنا اور اُن سے حسن سلوک سے پیش آنا ، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرنا اور ان کا مذاق اڑانے سے باز رہنا ۔ عام لوگوں پر رحم کرنا سب حقوق العباد کا حصہ ہے جسے پورا کرنے والا خدا کا نیک بندہ کہلاتا ہے ۔

حقوق اللہ

ارکان اسلام کی پابندی کرنا ۔ کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے ، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی و نفسانی قوتوں سے ، اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین ، رزق اور ذرائع سے فائدہ اٹھانا خود بخود خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے ۔ حقوق اللہ کا لازمی اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتلائے ہوئے راستے پر چلے ۔ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسے مقتدرِ اعلیٰ مانیں ، اسی کے آگے اعتراف بندگی میں سر جھکائیں ، اپنی حاجتوں میں اسی کی طرف رجوع کریں ، اسی کو مدد کے لیے پکاریں ، اسی پر بھروسا کریں ، اسی سے امیدیں وابستہ کریں اور اسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں ۔ یہ منصب بھی اللہ ہی کا ہے کہ اپنی رعیت کے لیے حلال و حرام کی حدود مقرر کرے ، ان کے حقوق و فرائض معین کرے ، ان کو امر و نہی کے احکام دے اور انھیں یہ بتلائے کہ اس کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے [illegible] وسائل کو وہ کس طرح کن کاموں میں کن مقاصد کے لیے استعمال کریں [illegible]

[illegible] کے حکم کو منبع قانون
[illegible] کی طرف رجوع کریں۔

... قرآن مجید کی سورہ آل عمران کی ۹۷ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر (بیت اللہ) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے"۔ اسی طرح سورۂ المدثر کی ۵۶ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وہ (اللہ) اس کا حقدار ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے"۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا ذکر و اظہار کیا جائے (سورہ الضحیٰ: ۱۱)۔ لوگوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بالکل یک سو ہو کر دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کریں۔ (البینۃ: ۵) حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے پانچوں نمازوں کے پڑھنے، رمضان کے روزے رکھنے، زکوٰۃ دینے، صاحب امر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا ایسا آدمی جنت میں داخل ہوگا۔ (شریف جاوید)

حقیقت

وہ چیز جس کی حمایت لوگوں پر واجب ہو، سچائی۔ حقیقت سے استعارہ کے طور پر سچائی بھی مراد لی جاتی ہے۔ جس کا مترادف مجاز ہے۔ اہل شریعت نے اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ حقیقت فی المفرد۔ جسے ہم حقیقتِ لغوی کہہ سکتے ہیں اور دوسری حقیقت فی الجملہ ہے، جسے عام طور پر عقلی حقیقت کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ حقیقت سے اللہ کی صفات مراد لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک حقیقت سے مراد توحید ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ حقیقت و شریعت دونوں لازم و ملزوم ہیں حقیقت کے بغیر شریعت کا وجود نہیں ہے، کیونکہ شریعت بذات خود حقیقت ہے۔ ایک سے ظاہری حال کی صحت مراد لی جاتی ہے اور دوسری سے باطنی حالت کی درستی! اس مسئلے پر علماء دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں ایک گروہ کہتا ہے کہ شریعت خود حقیقت ہے اور حقیقت شریعت جبکہ دوسرا گروہ ان دونوں کو لازم و ملزوم نہیں گردانتا۔

حقیقت سے مراد وہ معنی ہیں جن میں نسخ جائز نہیں اور عہدِ عالم سے لے کر عالم کے فنا ہونے تک اس کا حکم ایک ہی ہے۔ جبکہ شریعت سے مراد وہ معنی ہیں جس میں تغیر و تبدل جائز ہے جیسا کہ اوامر الٰہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت تو خالصتاً بندے کا کام ہے اور حقیقت خداوند تعالیٰ کی نگہبانی اور اس کی حفاظت اور عصمت کا نام ہے اس لئے شریعت صرف حقیقت کے وجود ہی سے قائم ہو سکتی ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ حقیقت سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔

صوفیاء نے حقیقت اللہ اور حق اللہ میں بھی امتیاز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت سے صفاتِ الٰہیہ کا اظہار ہوتا ہے اور حق سے صرف اس کی ذات کا۔ حقیقت تقریباً تمام صوفیانہ طریقوں کی آخری منزل مانی جاتی ہے۔ خدا کو بھی حقیقت الحقائق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں اور وہ تمام حقائق پر حاوی ہے دوسرے لفظوں میں وہ حضرۃ الوجود ہے۔

حکم

منصف، قاضی، ثالث جو تنازعہ کا فیصلہ کرتا ہے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عرب میں باقاعدہ قاضی یا منصف کوئی نہیں ہوتا تھا بلکہ لوگ باہمی افہام و تفہیم ہی سے اپنے تنازعات کا حل نکال لیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات کسی تنازعے کے حل کے لئے مختلف فریق اپنی رضامندی سے کسی بھی شخص کو حکم بنا لیتے تھے۔ فیصلہ کرنے والا آزادانہ طور پر مناسب فیصلہ دیتا تھا لیکن اس کے فیصلے پر عمل کرانے کے لئے فریقین کی اخلاقی قوت کے علاوہ اور کوئی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ حصولِ انصاف کی حد تک اس طرح کی ثالثی نے باقاعدہ ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ عرب میں میلوں وغیرہ کے موقع پر ایک حکم نامزد کیا جاتا تھا۔ بعد میں اسی حکم سے لوگ اپنے جھگڑوں کے فیصلے کرانے لگے اس طرح عربوں میں اس کا رواج ہوا۔

اسلام کے ظہور کے بعد بھی عرب معاشرے میں یہ رسم باقی رہی۔ کیونکہ قرآن مجید نے اصولی طور پر تحکیم کو موجود رکھا۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ

"ایک حکم مرد کے خاندان میں سے اور ایک حکم عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو"۔ (۴ (النساء) ۳۵)

ایک مشہور تحکیم سے اس کی مثال بھی لی جاتی ہے جس کے ذریعے امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ آپس میں کسی بات پر راضی ہو گئے تھے۔ اسلام میں تحکیم کی ابتدا۔ چیہ فریقین کی مرضی سے ہوتی ہے جو بعد میں ایک عدالتی کارروائی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تحکیم صرف شخصی حقوق کے متعلق تنازعات میں جائز ہے۔ بعض ایسے تنازعات جو جرائم کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں جیسے زنا، قتل، اتہام وغیرہ کے متعلق حکم بنانا جائز نہیں۔

ایک یا ایک سے زائد حکم بھی بنائے جا سکتے ہیں اس صورت میں صرف متفقہ فیصلہ ہی قابل قبول ہوتا ہے۔ حکم کے فیصلے کو تقریباً تمام فرقے تسلیم کرتے ہیں صرف شافعی فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اسے مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ اسلام میں حکم کے فیصلے کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اس فیصلے کی کسی قاضی یا عدالت سے توثیق کرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حکم کا فیصلہ کسی عدالت کے فیصلے کی طرح قوت اور اختیار نہیں رکھتا

حکم ۲

دیکھیے 'اسماء الحسنیٰ'

حکم اول

بن ہشام قرطبہ کا تیسرا اموی امیر۔ ۳ صفر ۱۸۰ھ/ ۱۴ اپریل ۷۹۶ء کو اس کی بیعت کی گئی۔ اس وقت الحکم کی عمر چھبیس برس تھی۔ اس کے چچا سلیمان اور عبداللہ اس کے خلاف ہو گئے۔ لیکن ان دونوں کی برپا کردہ کوئی شورش کامیاب نہ ہو سکی سلیمان کو قتل کر دیا گیا اور عبداللہ کو معافی دے دی گئی۔ الحکم کا پورا عہدِ حکومت بغاوتوں کو فرو کرنے میں گزرا جو طلیطلہ سرقسہ اور ماردہ کی سرحدوں پر متواتر ہوتی رہیں۔ الحکم بیرونی بغاوتیں فرو کرنے میں مصروف تھا۔ ہسپانوی ثغور کے عیسائی حکمرانوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۵ھ/ ۸۰۱ء میں برشلونہ پر قبضہ کر لیا۔ الحکم نے اپنے بھائی معاویہ بن ہشام کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا جس نے وادی ارعون میں شکست کھائی۔ ۱۹۲ھ/ ۸۰۸ء میں الحکم نے اپنے بیٹے ہشام کی قیادت میں لشکر بھیجا جس نے جلیقیہ میں فتح حاصل کی۔

الحکم اول کا عہدِ حکومت مسلسل لڑائیوں اور بغاوتوں کے باوجود اندلس کی ترقی کا دور رہا۔ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن الثانی کے جانشین قرار دیئے جانے کے دو ہی ہفتوں کے اندر ۲۵ ذوالحجہ ۲۰۶ھ/ ۲۱ مئی ۸۲۲ء کو الحکم نے وفات پائی۔ وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے اندلس میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج رکھی۔ اور اسے سامان حرب سے لیس کیا۔ اس نے اپنے محل کے دروازے پر ایک ہزار گھڑ سوار رکھے ہوئے تھے

Marfat.com

جو ہر وقت لڑائی کے لئے تیار رہتے تھے۔ الحکم اندلس کا بڑا صاحب [illegible]
پرشکوہ اور مدبر فرمانروا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ فصیح و بلیغ شاعر بھی تھا۔ (ش۔ ع)

حکم بن عمرو غفاری

حضورؐ کے مشہور صحابیوں میں سے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ بصرہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ جنگِ صفین میں حضرت علیؓ نے اپنے لشکر میں شامل ہونے کی دعوت دی جسے حکم بن عمرو غفاری نے رد کر دیا۔ ۴۴ھ میں آپ نے امیر معاویہؓ کے عہد میں غور میں ہونے والی بغاوت کچلنے کے لئے کام کیا۔ آپ نے نہایت ہوشیاری سے فوراً آناً فاناً علاقہ غور کے چپہ چپہ میں امن قائم کر دیا۔ بعد میں حضرت امیر معاویہؓ نے آپ کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ آپ کئی سال تک اس عہدے پہ فائز رہے۔ ۵۰ھ میں خراسان ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔

حکمت

اس کلام کو کہتے ہیں جو جہالت سے روکے اور انسان کو اس سے بچنے میں مدد دے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے مثلاً (البقرہ: ۱۲۹) (آل عمران: ۸۱) (نساء: ۵۴) قرآن میں آیا ہے حضرت داؤد علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکمت عطا کی گئی۔ اس کا ذکر ان سورتوں میں آیا ہے۔ البقرہ آیت ۲۵۱، المائدہ آیت ۱۱۰، الزخرف آیت ۶۳ اور لقمان ۱۲۔

حکمت دراصل ایک عظیم اثاثہ ہے جس کا تصور تقویٰ سے وابستہ ہے۔ حکمت کی تشریح میں کئی مفہوم ملتے ہیں۔ سورۂ لقمان کی آیت ۱۲ میں ہے:

"ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے لئے ہی مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے۔"

اس آیت میں حکمت کے معنی علم و عقل کے ذریعے سچی بات معلوم کرنے کے ہیں حکمت الٰہی کا مطلب اشیاء کی معرفت اور ماہیت کا علم ہوتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد قرآن کی تفسیر یا قرآن کی حقیقتوں کا سمجھنا ہے۔ ایک حدیث میں بھی حکمت کا لفظ آیا ہے اس میں اس لفظ کے معنی تقریباً یہی ہیں۔

بعض علماء نے حکمت اور علم میں فرق کو واضح کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ حکمت علم کی ایک شاخ ہے اور حکمت اور علم میں ماہیت کا نہیں بلکہ غایت و نوعیت کا فرق نظر آتا ہے۔ الجرجانی کہتے ہیں کہ لفظ حکمت سے حقیقت مراد لی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے۔ ہدایت الحکمت میں حکمت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"ان اعمال و افعال کا علم جو ہماری قدرت و اختیار میں ہیں حکمت عملی کہلاتا ہے۔"

حکمت کی اس تعریف پر عام علماء متفق نہیں ہیں۔ ابن سینا نے حکمت کی تعریف یوں کی ہے:

"علم اور عمل کی حدود کے اندر رہ کر روح کے ادراک کمال کا نام حکمت ہے۔"

اس تعریف میں ایک جانب تو عدل کی صفت کا کمال اور دوسری جانب نفس عاقلہ کی تکمیل کو شامل کیا گیا ہے۔

[illegible]

اس مسلک فکر کا بانی [illegible] ۱۱۵۵ء کے قریب [illegible] زنجان کے قریب ایک گاؤں [illegible] عمر بھر میں پچاس کتابیں لکھیں، جن میں الحلاق، [illegible] قدیم حکماء میں فیثاغورث، افلاطون اور ہرمز کے افکار سے متاثر [illegible] کا دعویٰ ہے کہ وہ الحکمت اللدنیہ اور الحکمت العتیقہ کا ہم [illegible] نے اشراقیوں کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ حکما ہیں جن کا [illegible] تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سہروردی سے پہلے بھی حکمائے اسلام نے اشراق کے اساس حکمت ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ ابن سینا اشراق اور تصوف میں فرق کرتا ہے کیونکہ تصوف محض طلب، ذوق اور وجد ہے جبکہ اشراق میں ذوق و عقل دونوں شامل ہیں۔ لیکن سہروردی کے نزدیک معرفت حقیقت ذوق پر منحصر ہے۔ بحث پر یہ وہی خیال ہے جس میں اللہ تعالیٰ پر [illegible] اعتقاد (تاله) کو حکمت کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے۔

حکمت الاشراق کا اساسی خیال یہ ہے کہ خدا کا نور سرچشمہ اور کائنات کا مصدر ہے۔ سہروردی کے نزدیک اشراق فیض علوی تک پہنچنے کی ایک سبیل ہے اور یہ فیض اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کسی کا قلب حکمت کے ذوق سے سرشار نہ ہو جائے۔ دوسرے عارف و مفکر تو حقیقت کو جمال یا ارادہ میں دیکھتے ہیں لیکن سہروردی حقیقت میں نور کا مشاہدہ کرتا ہے۔ سہروردی کے نزدیک حکیم وہ ہے جسے مشاہدۂ امور علویہ حاصل ہو۔ اور اس کا ذوق بھی ہو اور وہ تاله بھی رکھتا ہو۔ حکمت کی ابتدا دنیا سے کامل انقطاع اور مشاہدۂ انوار الٰہیہ ہے۔ سہروردی نے قدیم و جدید حکمت و فلسفہ و تصوف کے مابین امتزاج پیدا کیا ہے اسی لئے اسے الحکیم المتاله کہا جاتا ہے۔ اور وہ بقائے روح کے مسئلے پر ارسطو سے مختلف رائے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک روح ایک جوہر نورانی ہے۔ اسی طرح مشاہدہ کے نظریئے میں بھی وہ مشائین سے مختلف ہے۔ اس کے نزدیک رویت یا شہود اشراق کے نتیجے میں ہے اور ایک اشراق یافتہ روح کا عمل ہے حقیقت کی عبارت ہے۔ نور سے جس کے انعکاس کے کئی درجے ہیں۔ نور الانوار خدا تعالیٰ کی ذات ہے جسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اس حکمت کے معتقد علماء و حکماء، خصوصاً شیعی فکر سے تعلق رکھنے والے خاصی تعداد میں ہیں۔ ایران میں اس مکتب کو خاصی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ملا صدرا کی کتابوں کے ذریعے اس مسلک کا پرچار ہوا۔

حکم ثانی

المستنصر باللہ بن عبد الرحمٰن ثالث اندلس کا اموی خلیفہ۔ اس نے چھیالیس برس کی عمر میں رمضان المبارک ۳۵۰ھ / اکتوبر ۹۶۱ء میں حکومت سنبھالی۔ قرطبہ کے حکمران خاندان میں سے الحکم ثانی کا عہدِ حکومت بہت خوشحال تھا۔ اس کے زمانے میں قرطبہ ایک علمی مرکز کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ اس کا پندرہ سالہ عہدِ حکومت پرامن تھا۔ صرف ایک خطرے نے امن میں خلل ڈالا اور وہ نارمنوں کا حملہ تھا جسے ۳۶۰ھ / ۹۷۱ء میں ان کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس نے قرطبہ کی عظیم الشان مسجد کی توسیع و تزئین میں بڑے انہماک اور خوش ذوقی کا ثبوت [illegible] نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ [illegible]

Marfat.com

کا انتقال ہوا۔ مرحوم شہنشاہ بڑے علم دوست تھے، فقہا، علماء، ادبا اور ماہرین علوم کی صحبت کا متلاشی رہتا تھا۔ انہوں نے کتابیں لکھنے کے لئے بڑے بڑے عطیات دیئے۔ اسلامی ملکوں سے کثیر تعداد میں کتابیں خرید کر اپنے ملک کے کتب خانوں میں جمع کیں اور سنی ادبا، شعراء اور علماء کو وزارت کے منصب سے سرفراز کیا۔ (ش۔ ۵)

حکمران

دیکھئے "حاکم"

حکیم

دیکھئے "اسماء الحسنیٰ"

حکیم بن حزام

حضرت خدیجہ بنت خویلد ام المومنین کے بھائی تھے۔ آپ کی کنیت ابو خالد تھی ولادت کعبہ میں ہوئی۔ آپ قریش کے اشراف میں سے تھے۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اسلام قبول کرنے کے تقریباً ساٹھ سال بعد آپ کا انتقال ہوا۔ آپ نے اپنی بقیہ زندگی اسلام کی تبلیغ میں صرف کی۔ روایت ہے کہ آپ اسلام لانے سے پہلے بھی بہت فیاض واقع ہوئے تھے اور تقریباً ایک سو غلام آزاد کرنے کے بعد انہیں ایک ایک اونٹ دے کر رخصت کر چکے تھے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد بھی آپ نے اسی مروّت، فیاضی اور خدا ترسی کو برقرار رکھا حضرت ابو حازم کہتے ہیں کہ ہم نے مدینہ میں کسی آدمی کے متعلق نہیں سنا کہ اس نے اللہ کے راستے پر حکیم بن حزام سے زیادہ سواریاں دی ہوں۔ ابو حازم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ میں دو عربی آئے جن کا سوال یہ تھا کہ وہ کون شخص ہے جو اللہ کے راستے پر ہمیں سواریاں دے۔ کسی نے انہیں حکیم بن حزام کا پتا دیا۔ وہ دونوں اُن کے پاس چلے گئے عرض کیا کہ ہمیں اللہ کے راستے پر دو سواریاں چاہئیں آپ دونوں کو ٹھہرا کر بازار گئے اور دو بہترین اونٹنیاں جو گابھن تھیں خرید کر دونوں اعرابیوں کو دیدیں۔

حکیم بن حزام کے بارے میں حضرت سعید بن مسیبؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیم بن حزام کو یوم حنین میں کچھ عطیہ دیا۔ آپ نے اسے کم سمجھا۔ حضور نے اور زیادہ کر دیا۔ اس پر حکیم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کا کونسا عطیہ بہتر ہے۔ حضورؐ نے اس کا جواب دیا کہ پہلا۔ بعد میں کہنے لگے کہ یہ مال سبز و شیریں ہے جس نے اس کو سخاوت نفس اور اچھے کھانے کے لئے لیا اس کے لئے اس میں برکت ہے اور جس نے اپنی طمع نفس کے لئے لیا تو اس میں برکت نہ ہوگی اور اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔) اس دن کے بعد سے حکیم بن حزام کسی قسم کا عطیہ لینے کے لئے نہیں آئے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ کو کچھ دینے کے لئے بلایا۔ آپ ان کے پاس پہنچے مگر عطیہ لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی جماعت کے سامنے فرمایا کہ "تم حکیم پر گواہ ہو جاؤ میں ان کے سامنے ان کا حق پیش کرتا ہوں۔ اور یہ اس کے لینے سے انکار کرتے ہیں۔"

حکیم بن حزام کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی بات پر مکمل طور پر ثابت قدم رہے اور مرتے دم تک کسی سے کوئی عطیہ وصول نہ کیا البتہ خود نہایت فیاضی اور

سخاوت سے لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے رہے۔

حکیمیہ

ایک فرقہ۔ حضرت ابی عبداللہ محمد بن علی الحکیم ترمذیؒ کے پیروکار حکیمیہ کہلاتے ہیں۔ ابی عبداللہ محمد ظاہری اور باطنی علوم میں اپنے وقت کے اماموں میں سے ایک تھے انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جنہیں حکیمیہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے افراد قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کے زیادہ تر کلام اور طریقت کی بنیاد ولایت پر ہے۔ آپ ولایت اولیا کے درجات اور ان کی ترتیب کی رعایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایک بالکل الگ تھلگ سمندر کا ناپید کنارہ ہے۔ جس میں بہت سے عجائبات پوشیدہ ہیں۔

حکیمیہ فرقہ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بہت سے اولیا ہیں جن کو اس نے اپنی مخلوق میں سے چن رکھا ہے۔ خدا نے ان کے ارادہ کو دنیا کے تمام تعلقات سے الگ اور نفس کے تقاضوں سے آزاد کیا ہے ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ درجوں پر فائز کر کے ان پر اپنے اسرار و معارف کا دروازہ کھول دیا ہے۔

حلاج، حسین بن منصور

حسین بن منصور الحلاج شہر بیضا (فارس) ۲۴۴ھ/ ۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کا ابتدائی حصہ عراق کے شہر واسط میں گزرا۔ آپ کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اس لئے سولہ سال کی عمر میں مختلف شہروں کی سیاحت کی آپ نے بصرہ میں عمرو مکی کی صحبت سے استفادہ کیا۔ ۲۶۴ھ میں بغداد آتے اور جنید بغدادی کے حلقہ تلمذ میں شریک ہو گئے۔

آپ تین مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور ہر بار حج کی سعادت حاصل کی۔ آپ کی طبیعت میں انتہا کی بے باکی تھی جو بات ایک مرتبہ آپ کے دل میں آجاتی اُسے برملا کہنے سے نہ کتراتے تھے۔ اپنے عقیدے کے پکے اور سخت تھے۔ رواداری اور مصلحت کے بالکل قائل نہیں تھے۔ اگر آپ کے عقائد اور مذہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نظم و نثر میں مندرجہ ذیل تین چیزوں پر مشتمل عقائد کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ آدمی کی ذات میں اللہ تعالےٰ کا حلول۔
۲۔ حقیقت محمدیہ کا قدم۔
۳۔ توحید ادیان۔

آپ کے نظریۂ حلول کے بارے میں صفوان کے شخص اصطخری نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ "حسین بن منصور ہمیشہ کے اعتبار سے حلاج تھے ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اطاعت میں اپنے نفس کو پختہ کرے اپنے دل کو عمل صالح کا عادی بنالے، دنیاوی لذتوں کو چھوڑ دے، اپنی خواہشات اور شہوانیت پر غلبہ حاصل کرلے، وہ مقام مقربین تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب اس کا تزکیہ اور تنقیہ زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ بشریت کی حدود پھلانگ جاتا ہے اور جب اس میں بشریت ختم ہو جاتی ہے تو وہ خدا کی روح میں تحلیل ہو جاتا ہے جیسے حضرت عیسیٰ بن مریم پھر وہ خود کسی کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ دوسرے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں اور وہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے وہ وہی ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی فعل اپنا نہیں رہتا بلکہ خدا کا فعل بن جاتا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ حسین بن منصور حلاج انسان میں اللہ تعالےٰ کے حلول قائل تھے لیکن اس عقیدہ میں تنہا نہیں تھے بلکہ شیعہ حضرات کے عقائد میں بھی

Marfat.com

ایک اہم عقیدہ ہے اس لئے ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ منصور حلاج نے یہ عقیدہ یہیں سے لیا ہو۔ اپنے اشعار میں وہ کہتے ہیں کہ "ہم دو روحیں ہیں جنہوں نے ایک صورت بنائی ہے۔ جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو میں بھی اسے دیکھتا ہوں اور جب میں اسے دیکھتا ہوں تو وہ مجھے دیکھتا ہے"۔

اسی طرح وہ اپنے ایک اور شعر میں کہتے کہ "تو میری رگ و پے میں دل و دماغ میں اس طرح جاری و ساری ہے جس طرح میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ میرے ضمیر، دل و دماغ میں اس طرح حل ہو گیا جیسے روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے"۔
آپ "انا الحق" یعنی میں خدا ہوں کا نعرہ اکثر لگایا کرتے تھے اسی جرم کی پاداش میں ابن داؤد الاصفہانی الظاہری نے آپ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ اور ۲۹۷ھ میں آپ پہلی مرتبہ گرفتار کر لئے گئے لیکن آپ جیل سے ٹھیک ایک سال بعد فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور اہواز کے ایک مقام سوس میں چھپ چھپ کر رہنے لگے ۳۰۱ھ میں آپ کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور آٹھ سال تک مختلف قید خانوں میں اسیر رہے ۳۰۹ھ میں ان کے مقدمے کا آخری فیصلہ ہوا۔ جس کی رو سے انہیں ۱۸ ذیقعدہ کو سزائے موت دی گئی۔

اس فیصلہ میں لکھا تھا "آپ کو کوڑے مارے جائیں، پھر ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور بعد میں سر تن سے جدا کر کے ان کے اعضاء کو آگ میں جھلسا کر دجلہ کے پانیوں میں بہا دیا جائے"۔

آپ کی ہلاکت کے بعد آپ کے عقیدے کے بارے میں مختلف لوگوں نے طرح طرح کی آراء ظاہر کیں۔ ایک فریق نے کہنا شروع کیا کہ وہ کافر تھے اور کتاب و سنت کی رو سے انہیں صحیح سزا دی گئی ہے۔ لیکن دوسرا گروہ انہیں ولی اور برگزیدہ شخصیت گردانتا ہے وہ کہتے ہیں کہ منصور حلاج اللہ تعالیٰ کے مقربوں کی فہرست میں شامل تھے۔ ان سے جو اقوال منسوب ہیں ان کے ظاہری مفہوم و معنی سے لوگ مغالطہ میں پڑ گئے۔ ورنہ ان کے اصل مطالب پر غور کرتے تو انہیں کافر نہ کہتے۔ حضرت جلال الدین رومی جو فارسی کے عظیم المرتبت شاعر تھے۔ منصور حلاج کی تعریف اعلانیہ کرتے نظر آتے ہیں اور حضرت فریدالدین عطار تو آپ سے بے حد عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور آپ نے انہیں "شہید حق" کا خطاب تک دے ڈالا تھا۔

حسین بن منصور حلاج نے تصوف، طریق تصوف اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی تشریح کرنے کے لئے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں ۴۷ کتابوں کی تفصیل دی ہے جس میں سے چند یہ ہیں کتاب الاحرف المحدثۃ والازلیۃ والاسماء الکلیۃ، کتاب الاصول والفروع، کتاب العالم والمبعوث، کتاب العدل والتوحید، کتاب علم البقا والفناء، کتاب مدح النبی والمثل الاعلیٰ۔

حلال

مباح - جائز - روا یا غیر ممنوع - وہ کام جس کا کرنا غیر ممنوع ہو۔ اسلامی شریعت کے مطابق وہ چیز حلال ہے جس کا جائز ہونا قرآن مجید یا حدیث یا سنت سے واضح ہو جائے۔ اس کے علاوہ حلال کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ جس سے غیر کا حق منقطع ہو چکا ہو اور جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ پائی جاتی ہو۔ حدیث نبویؐ ہے "جس نے چالیس دن تک رزق حلال کھایا اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو منور کر دے گا اور اس سے حکمت کے سرچشمے پھوٹیں گے"۔

ہم مختلف جانوروں کو کھانے سے پہلے یہ جائزہ لیتے ہیں کہ یہ حلال ہیں یا نہیں، اور صرف انہی جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جن کی حلت ثابت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر حلال شے کو ہم ترک کر دیں بلکہ استعمال میں مسلمانوں کا اپنا اختیار ہے کہ وہ حلال چیزوں میں سے جنہیں چاہیں استعمال کریں اور جنہیں چاہیں ترک کر دیں۔

بعض فقہاء نے مشتبہ اشیاء کی طرف بھی دھیان دیا ہے۔ کچھ جائز چیزیں ایسی ہیں جن کی حلت آسانی سے واضح نہیں ہوتی انہیں مشتبہ کے زمرے میں رکھتے ہیں اور ان کے لئے حلال کی بجائے ایک اور لفظ "مباح" استعمال کرتے ہیں۔ مباح کا مطلب ہے جائز یا روا قرار دیا گیا۔ مباح کے بارے میں امام شوکانی کا قول ہے کہ مباح وہ ہے جس کا کرنے والا یا نہ کرنے والا کسی مدح یا مذمت کا مستحق نہ ہو یا صاحب شریعت نے انسان کو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دے دیا ہو۔ اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اسے کرے یا نہ کرے۔

اس بات کی تصدیق امام ابوبکر الجصاص کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے کہ "تمام پاکیزہ اور مزیدار چیزیں مباح ہیں تاوقتیکہ حرام یا ممنوع ہونے کے بارے میں ثبوت نہ مل جائے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حلال تو وہ چیزیں ہیں جن کے حلال ہونے کے بارے میں کتاب و سنت سے قطعی طور پر یا اجماع امت سے ثبوت مل جائیں لیکن جس چیز کا حلال ہونا یا نہ ہونا اجماع امت یا قرآن و سنت سے واضح نہ ہو وہ مشتبہ میں شامل ہوگی۔ حدیث نبویؐ ہے "حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کر دیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جس کے بارے میں اللہ نے اپنی کتاب میں سکوت اختیار کیا وہ تمہارے لئے معاف اور مباح ہے"۔

حلالہ

کسی چیز کو شرعاً جائز بنا لینا۔ عرب میں اسلام سے پہلے یہ دستور تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس کے ساتھ دوبارہ شادی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے طلاق حاصل نہ کر لے۔ اسلام میں بھی اس طریقے کو کچھ ردوبدل کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔

حلالہ طلاق کی ایک قسم بھی ہے جو تین طلاقوں کے بعد واقع ہو جاتی ہے۔ اس طلاق کے بعد عورت کے ساتھ پہلے شوہر کا نکاح کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب کہ وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد اس سے ہم بستری کرے اور پھر اگر اس سے طلاق حاصل کرے یا بیوہ ہو جائے۔

احادیث کی اکثر کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شخص نے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور دوسرے شوہر کے ساتھ اس کی خلوت بھی ہوئی، مگر مباشرت نہ ہوئی۔ پھر اس نے اسے طلاق دے دی۔ اب کیا اس عورت کا سابقہ شوہر اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ حضورؐ نے جواب دیا نہیں "جب تک دوسرا شوہر اس سے اسی طرح لطف اندوز نہ ہو چکا ہو جس طرح کہ پہلا شوہر ہوا تھا"۔

بعض لوگ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینے کے بعد بہت پچھتاتے ہیں اور دوبارہ اس سے نکاح کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ عورت کو حلالہ بنانے کے لئے دوسرے مرد کے ساتھ اس کا نکاح اس شرط پر کر دیتے ہیں کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد اسے طلاق دے دے گا۔ ایسا کرنا خلاف شریعت ہے۔ حضورؐ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگوں پر لعنت ہے حضورؐ کی حدیث مبارکہ ہے کہ:

Marfat.com

"اللہ نے تحلیل کرنے والے اور تحلیل کرانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔" حضرت [redacted] صحابہ سے فرمایا کہ "کیا میں تمہیں یہ نہ بتاؤں کہ کرائے کا سانڈ کیا ہوتا ہے۔" صحابہ نے عرض کی کہ ارشاد فرمائیں۔ اس پر آپ نے کہا کہ "وہ تحلیل کرنے والا ہے۔ خدا کی لعنت ہے تحلیل کرنے والے پر بھی اور اس شخص پر بھی جس کے لئے تحلیل کی جائے۔"

حلب

شمال مغربی شام کا ایک پرانا شہر۔ جو کسی زمانے میں بڑا تجارتی مرکز ہونے کے باعث خاصی شہرت رکھتا تھا۔ بغداد جانے والے بیشتر قافلے اس شہر سے گزرا کرتے تھے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں بھی اس شہر کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ بازنطینی عہد میں اس شہر کو کافی ترقی ملی۔ ساتویں صدی میں عربوں نے پہلی بار اس شہر پر قبضہ کیا۔ تین سو سال بعد بازنطینی حکومت نے ایک مرتبہ پھر سے عربوں سے واپس لے لیا۔ گیارھویں صدی کے اواخر میں اس پر سلجوقیوں (ترکوں) نے قبضہ کر لیا۔ ۱۱۲۴ء میں صلیبیوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء میں اس شہر کو

شہر حلب

فتح کیا۔ ہلاکو خاں نے ۱۲۶۰ء میں حلب پر قبضہ کیا۔ ۱۴۰۱ء میں تیمور نے یہ شہر فتح کیا۔ عثمانی ترکوں نے ۱۵۱۶ء میں حلب کو اپنی حکومت میں شامل کیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ خاصی تاریخی اہمیت کا شہر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ریشمی اور سوتی کپڑا تیار کرنے کے کارخانے موجود ہیں۔ اون چمڑے اور پھلوں کی تجارت بھی ہوتی ہے پرانے زمانے میں اس شہر کے بنے ہوئے آئینے اور تلواریں بہت مشہور تھیں۔

حلبی، برہان الدین

ایک مشہور حنفی مصنف۔ برہان الدین ابراہیم بن محمد بن ابراہیم، حلب میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حلب میں حاصل کی بعد میں قاہرہ چلے گئے جہاں آپ نے جلال الدین السیوطی جیسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد وہ قاہرہ سے استنبول (ترکی) چلے گئے۔ یہاں آپ پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک رہائش پذیر رہے۔ پھر آپ سلطان محمد فاتح ثانی کی مسجد میں امام اور خطیب بن گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ مفتی اعظم سعدی چلپی کے قائم کردہ دارالقراۃ میں استاد بن گئے۔ آپ عربی زبان، قرآن کی تفسیر، قرآت، حدیث اور خاص طور پر علم فقہ میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی تمام تر زندگی دنیاوی ضرورتوں اور آلائشوں سے پاک رہ کر گزاری اور اپنی زندگی کو صرف مطالعے اور تعلیم و تدریس کے لئے وقف رکھا۔

آپ کا انتقال ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء میں ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک اہم تصنیف "ملتقی الابحر" ہے۔ یہ کتاب آپ نے فقہ حنفی کے بارے میں لکھی ہے اس کی چار جلدیں ہیں۔

یہ کتاب آپ نے ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء میں مکمل کی۔ کئی علماء نے اس کتاب کی شرحیں لکھی ہیں۔ ترکی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سلطنت عثمانیہ میں اس کتاب کو حنفی مسلک کی مستند کتاب کا درجہ حاصل تھا۔

حلبی، نورالدین

نورالدین حلبی بن برہان الدین حلبی ایک مصنف تھے۔ ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ صلاحیہ میں پروفیسر رہے۔ آپ کا انتقال ہیں ۳۰ شعبان المعظم ۱۰۴۴ھ/۱۷ فروری ۱۶۳۴ء کو ہوا۔

ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک ہے اس کا نام "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" ہے جو سیرت الحلبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے اس میں شمس الدین صالحی کی کتاب "السیرۃ الشامیہ" کی تلخیص کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے بھی کئے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی اور بھی کتابیں ہیں جن میں "عقدالمرجان فیما یتعلق بالجان" اور "النصیحۃ العلویۃ" شامل ہیں۔

حلف الفضول

قبل از اسلام مکہ میں ہونے والے دو معاہدے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اپنے شہر میں کسی پر ظلم نہ ہونے دیں گے۔ چاہے وہ مکے کا شہری ہو یا اجنبی۔ پہلا معاہدہ قبیلہ جرہم کے تین سرداروں کے درمیان ہوا۔ جن میں سے ایک الفضل بن وداعہ تھا یہ حلف لگ بھگ چار ہزار برس پہلے ہوا تھا۔

دوسرا معاہدہ سن ہجری سے پینتیس برس قبل ۵۸۹ء کا ہے۔ اس میں بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو زہرہ، بنو تیم اور بنو حارث بن فہر شامل تھے۔ بنو ہاشم میں اصل داعی زبیر بن عبدالمطلب کے علاوہ آنحضرت ﷺ بھی پوری گرمجوشی سے اس معاہدے میں شریک ہوئے۔ اس معاہدے کا ماحصل یہ تھا:

۱۔ خدا کی قسم شہر مکہ میں کسی پر ظلم ہوا تو ہم سب ظالم کے خلاف مظلوم کی تائید میں ایک ہاتھ بن کر اٹھیں گے چاہے وہ شریف ہو یا وضیع، ہم میں سے ہو یا اجنبیوں میں سے تاکہ مظلوم کو اس کا حق مل جائے۔
۲۔ ہم حلف کی خلاف ورزی نہ کریں گے جب تک سمندر اسفنج کو بھگوتا ہے اور جب تک حرا اور شبیر کے پہاڑ اپنی جگہ قائم رہیں اور
۳۔ روزمرہ زندگی میں سب باہم مالی اعانت کریں گے۔

اس پر سب ماخذ کا اتفاق ہے کہ بعثت کے بعد آنحضرت نے فرمایا کہ اسلام اس حلف کو منسوخ تو کیا مضبوط تر ہی کرتا ہے اور یہ کہ خود آپ اس کی دہائی پر

[redacted]

Marfat.com

اب بھی دوڑیں گے۔ (ش ج)

حلم

اسلامی اخلاقیات کی رُو سے ایک صفت حسنہ، قرآن مجید اور احادیث کی رُو سے صفت رحمانی رسول پاک صلعم کا اسوۂ حسنہ، ایک عقلی رویہ اور ایک عملی تدبیر۔ "لسان العرب" میں حلم کے معنی عقلی توازن اور حلیم کے معنی صابر بتائے گئے ہیں۔ "محیط" میں حلم سے مراد نفس کی ایسی حالت ہے جو اس کے سکون کو قائم رکھتی ہے اور اسے غصے میں آسانی سے آپے سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ قرآن حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک صفت حلم بھی بتائی ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم [illegible] خود حلیم تھے بلکہ حلم کو خلقِ عظیم سمجھتے تھے۔ روایت ہے کہ کسی شخص نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو (البخاری) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا اصل میں زبردست اور طاقتور شخص وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو گرا دے۔ بلکہ غصے پر قابو پانے والا انسان طاقتور ہوتا ہے (البخاری)۔ احادیث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جس طرح [illegible] کیلئے حلم ضروری ہے اسی طرح عدل کے لئے بھی حلم ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول ہے کہ قاضی میں ان پانچ صفات میں سے اگر ایک بھی کم ہو تو اس کی شخصیت داغدار ہو جاتی ہے۔ (۱) فقاہت (۲)، حلم (۳) [illegible] (۴) محکمئ کردار (۵)، علم کا شغف۔

حضور اکرم صلعم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: "اللہ تعالےٰ مجھے اور تمہیں وہ زمانہ نہ دکھلائے جس میں لوگ عالم کی مطابعت نہ کریں اور حلیم سے حیا نہ کریں۔ ان کے دل عجمیوں جیسے (سخت) اور ان کی زبانیں عربوں جیسی (فصیح) ہوں گی۔ (مسند احمد بن حنبل) حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے کبھی کسی شخص سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ لیکن احکام الٰہی کی بے حرمتی کی گئی۔ تو آپ نے اللہ کے واسطے انتقام لیا (البخاری)، قریش نے آپ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی۔ راستوں میں کانٹے بچھائے۔ جسم اطہر پہ نجاستیں ڈالیں۔ گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا۔ آپؐ کی شان میں گستاخیاں کیں، کبھی جادوگر، کبھی مجنوں، کبھی شاعر کہا، لیکن آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی نہیں فرمائی (مسند احمد بن حنبل)،

قرآن مجید نے متقی لوگوں کی ایک صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ غصہ پی جاتے ہیں غصہ پی جانے کو نیکی اور غصہ پی جانے والے کو "محسن" کہا گیا ہے۔ یہ بھی حلم ہی کا ایک انداز ہے۔ رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے کہ علم سیکھنے سے آتا ہے اور حلم مزاولت سے حاصل ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو حلم کے باعث شب بیدار اور روزہ دار کے برابر درجہ ملتا ہے۔ امام حسنؓ کا قول ہے کہ علم حاصل کرو اور اسے وقار اور حلم سے حسین بناؤ۔ اکثم بن صیفی کے نزدیک حلم عقل کا ستون ہے۔ ملا دوانی کے نزدیک حلم ایک اخلاقی فضیلت ہے۔ حلم طمانیت قلب ہے کیونکہ حلم کے باعث انسان مغلوب الجذبات نہیں ہوتا۔ ابن مسکویہ بھی حلم کو اخلاقی فضائل میں شمار کرتے ہیں۔ ایک غیر مسلم مستشرق (Goldziher T. [illegible]) نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم نے جاہلیت کی رُوح کے خلاف آخری حد تک جہاد کرنے، اسے مکمل طور پر نیست و نابود کرنے اور اُسے حلم کی روح سے بدلنے کی بھرپور کوشش کی۔

(شریف جاوید)

[illegible]

صوفیوں کا ایک سلسلہ جس کے بانی ابوحلمان الفارسی المغلبی کو کلاباذی کی تصنیف "التعرف" میں صوفی شیوخ میں سے تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر اشاعرہ نے اسے بعض عقائد کی بنیاد پر اسلام سے خارج کر دیا۔ ابوحلمان کے عقیدے یہ تھے:

۱۔ خدا جسمانی طور پر خوب صورت اشخاص کے اندر موجود ہے۔

۲۔ [illegible] اس شخص [illegible] اس چیز میں ذات باری تعالےٰ کی پرستش کس طرح کی جائے۔

حلوائی [illegible]

عالم دین، صوفی اور پنجابی زبان کے ایک مفسر قرآن۔ آپ ۱۸۷۰ء میں لاہور کے دہلی دروازہ کے اندرونی محلے میں رہائش پذیر میاں محمد وارث کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ارائیں تھا اور پیشہ کھیتی باڑی۔ موجودہ فیض باغ (نولکھا گاؤں) میں آپکے خاندان کی زمین تھی۔ آپ کے خاندان نے مولانا کو دس سال کی عمر میں ایک حلوائی کی شاگردی میں دے دیا۔ جس کے پاس ابتداء میں آپ صبح سے شام تک کام کیا کرتے۔ بعد میں استاد نے قرآنی تعلیمات کے حصول کے لئے آپ کو کچھ وقت صرف کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ نے اپنی ذہانت اور محنت سے بہت جلد قرآن پاک کے معانی ازبر کر لئے۔ مختلف اساتذہ سے علم حاصل کرنے کے بعد آپ حضرت مولانا دستگیر قصوریؒ سے بیعت ہوئے اور ان سے دینی علوم کی مزید تعلیم حاصل کی۔ آپ نے قرآن پاک کی پنجابی میں تفسیر کی جو پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

آپ کی زندگی کا ایک پہلو دوسرے علماء سے ممتاز ہے آپ صبح صبح حلوا تیار کر کے دہلی دروازہ کے باہر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ریلوے شیڈ میں جانے والے مزدور آپ سے حلوا خریدتے اور کھاتے اور آپ حلوا فروشی کے ساتھ ساتھ دین کی باتیں بھی نہایت شگفتگی کے ساتھ بیان کیا کرتے۔ آپ نے پنجابی زبان میں سیرت نبویؐ لکھی جو لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں شفاء القلوب، رسالہ جمعہ، رسالہ اربعہ، اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ الحبیبؐ، الاعتیاف فی الحقیقت، الاقرار الحامیہ لمن ذم المعاویہؓ، الوارع نبوی، جامع الشواہد اور قصص المحسنین بہت مشہور ہوئیں۔

غلام دستگیر قصوریؒ کی وفات کے بعد پیر جماعت علی لاثانی علی پوری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ آپ کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ جامع مسجد کوتوالی میں دفن ہوئے۔

حلول

ایک فلسفیانہ اصطلاح۔ اس کے لغوی معنی ڈھیلا کرنا، کھولنا، نازل ہونا ہیں لیکن اسلامی علوم اور فلسفہ میں اس کے معنی ذرا مختلف ہیں۔ فلسفے میں اس سے مراد روح اور بدن کا حقیقی اتحاد یعنی حلول الروح فی البدن ہے۔ تصوف میں خدا کا اپنی کسی مخلوق میں سما جانے کو حلول کہتے ہیں۔

مختلف علماء نے اس کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں۔ علماء کے ایک گروہ کے نزدیک حلول ایک چیز کا کسی دوسری چیز سے اس انداز میں گھل مل جانا کہ اگر ہم ایک شے کی جانب اشارہ کریں تو دوسری شے کی طرف خود بخود اشارہ ہو جائے۔ یہ عمل ایک تو حقیقی ہو سکتا ہے جیسے پودوں میں پانی سرایت کر جاتا ہے اس کے علاوہ استعارۃً

[illegible]

Marfat.com

بھی یہ عمل ہو سکتا ہے کہ علمائے اسلام کی تعریف [illegible] طرح کرتے ہیں کہ ایک چیز دوسری چیز میں ایسے [illegible] اس کا اپنا وجود بالکل ختم ہو جائے اور پہلی چیز دوسری چیز کا لازمی حصہ بن جائے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ خداوند کریم کی ذات و صفات میں سے کسی ایک کا بھی مخلوق میں حلول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس سے اس کی ذاتِ واحدہٗ کی نفی ہو جاتی ہے۔ علماء نے حلول کی چار قسمیں بیان کی ہیں:۔

۱۔ حلول الوصفی۔ جیسے کسی جسم میں سفیدی یا سیاہی کا حلول۔

۲۔ حلول الجواری۔ یعنی ایک جسم کا دوسرے کے لئے برتن کی حیثیت رکھنا۔ جیسے پیالے میں پانی کا حلول۔

۳۔ حلول السریانی۔ جیسے کسی خیالی ہیولا میں کسی صورت کا حلول اور

۴۔ حلول الحیزی۔ یعنی اجسام کا مکانات میں حلول۔

ارسطو نے بھی عیسائیوں کے عقیدۂ حلول کی طرح یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کوئی روحانی جوہر ایک خاص شکل میں کسی مادے سے متحد ہو جاتا ہے۔

علماء اور مشائخ اسلام نے اس عقیدے کی عام طور پر نفی کی ہے۔ لیکن بعض ایسے علماء جو ایٹمی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں اسے درست خیال کرتے ہیں حلول کے عقیدے سے اتفاق کرتے ہیں۔ وہ الاشعری سے اتفاق کرتے ہوئے حلول کو جسم اور روح کے اتحاد کی صورت میں تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کیونکہ روح ایک جسم لطیف ہے خواہ وہ جنوں، فرشتوں یا کسی بھی مخلوق میں کیوں نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی بھی مخلوق میں حلول روح کے عقیدے کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر خدا کے اصلی جوہر یعنی جوہر الہیہ کا تجزیہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے جبکہ خداوند کریم کی ذات کا ہم تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم تجزیہ کریں تو دو ہستیوں کو ابدی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ایک خدا کی ہستی اور دوسری حلول کرنے والی۔ جس سے خدا کی وحدانیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ حلول کا عقیدہ رکھنے والوں کو مسلمان نہیں گردانا جا سکتا۔ اسی لئے علمائے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع نے حلولیہ فرقے کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔

حلولیہ

متصوفہ سبطلہ کا ایک فرقہ۔ اس فرقہ کے لوگ عورتوں اور بغیر داڑھی کے لڑکوں کو دیکھنا جائز خیال کرتے ہیں۔ یہ سماع اور رقص کے شوقین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی صفت ہے جو ہم پر نازل ہوتی ہے۔ اسی لئے جائز و حلال ہے۔ بعض لوگ درویشانہ لباس پہن کر آہیں بھرتے ہیں۔ شور و شغب مچاتے ہیں اکثر اوقات گریبان اور آستینیں تک پھاڑ دیتے ہیں۔

حلولیہ فرقے لوگ ابی حلمان دمشقی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ علماء اور مشائخ اس فرقے کو دین سے خارج قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے نظریات و خیالات و اعتقادات بدعت اور کفر کے قریب تر ہیں۔ وہ حلولیہ فرقے کے لوگوں کے بارے میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ روح کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں حلول کرنے کے نظریہ کو درست خیال کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ "حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا چیز ہے" بقول علماء اور مشائخ حلولیہ فرقے کے افراد بھی دراصل حق چھوڑ کر گمراہی کے راستوں پر چل پڑے ہیں۔

حلّی

(رمضان ۶۴۸ھ/ ۱۲۵۰ء۔ محرم ۷۲۶ھ/ ۱۳۲۵ء) علامہ جمال الدین ابو منصور حسن بن یوسف۔ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے شیعہ امامیہ کے نامور عالم۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سدید الدین، خالو نجم الدین جعفر محقق حلّی (مصنف "شرائع" وفات ۶۷۶ھ) اور یحییٰ الدین یحییٰ (مصنف جامع) سے حاصل کی۔ خاندان طاؤس سے حدیث کی تعلیم پائی۔

نقد الرجال کے مصنف لکھتے ہیں کہ حلّی نے ستر سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ مؤلف "روضات الجنات" کا بیان ہے کہ حلّی نے نوّے سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ خود حلّی نے مرنے سے چند سال قبل مہنّا ابن سنان کے نام اجازہ میں لکھی ہوئی اپنی ستر کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ مدرسی خیابانی نے "ریحانۃ الادب" میں حلّی کی ایک سو بیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے پندرہ فقہ پر اور دس اصول فقہ سے متعلق ہیں۔ "ایضاح المقاصد" کے مقدمے میں حلّی کی فلسفے، کلام اور منطق پر چالیس کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ حلّی نے اپنی کتاب "منتہی الوصول" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں اپنی فلسفیانہ تالیفات کو ختم کر دیا۔ اور فقہ و اصول پر لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

آپ نے دریائے فرات کے کنارے واقع شہر حلّہ میں وفات پائی اور نجف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔ (ش۔ ج)

حلیمؒ

دیکھئے 'اسماء الحسنیٰ'

حلیمہ سعدیہؓ

دیکھئے 'سعدیہ'

حمات

شام کا ایک شہر، جو حمص سے ۴۵ کلومیٹر شمال میں اور حلب سے ۲۰۱ کلومیٹر جنوب میں واقع ہے۔ حمات کی تاریخ عہد عتیق سے وابستہ ہے۔ اس شہر پر حتیوں کا قبضہ تھا گیارھویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ یہ شہر آرامی بادشاہوں کے قبضے میں آ گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں آرامی بادشاہوں نے مجبوراً یہودیوں کی بالادستی تسلیم کر لی۔ لیکن بعد ازاں وہ خود مختار بن گئے۔ ۷۲۰ ق م میں یہاں ایک بغاوت ہوئی جس کے نتیجے میں حمات کی آرامی بادشاہت کو سلطنت آشوریہ میں شامل کر لیا گیا۔ ۶۳۷ء میں ایک معاہدے کے تحت اس شہر نے عربوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ ۱۱۱۴ء میں آخری سلجوق فرمانروا رضوان کی وفات کے بعد دمشق کے اتابک طغتگین نے حماۃ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱۱۷ء میں حمات حمص کے والی خیر خان کی ماتحتی میں آگیا اس کے بعد مختلف فرمانروا حمات پر حکمران رہے۔ ۱۱۷۵ء میں یہ شہر سلطان صلاح الدین ایوبی کے زیر تسلط آ گیا۔ ۱۲۹۹ء میں یہ شہر شام کی مملوک نیابت کا صدر مقام قرار پایا۔ عثمانی عہد حکومت میں حمات طرابلس کا صدر مقام بنا۔ انیسویں صدی عیسوی میں حمات کو دمشق کی ولایت کے ماتحت کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں حمات کی آبادی ساٹھ ہزار تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے زائد تھی۔

حمات میں بہت سی قابل ذکر عمارتیں موجود ہیں۔ اہم ترین بانگ ناموی جامع

Marfat.com

مسجد ہے۔ مسجد کا ایوان آج بھی اپنی اصل صورت بتاتا ہے۔ ہذا العاصی کے دائیں کنارے جامع النوری ہے جس کی بنیاد سلطان نورالدین نے رکھی تھی۔

حماد الراویہ

انہیں حماد الروایہ بھی کہا جاتا ہے۔ کوفہ میں ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ والد دیلمی (ایرانی) جنگی قیدی تھے۔ عربی روانی سے نہیں بول سکتے تھے۔ لیکن عرب روایات کے بارے میں ان کی یادداشت اور حافظہ بہت تیز تھا۔ آپ نے بنو امیہ کے دور میں اسلام سے پہلے کی جانے والی شاعری کی تدوین و تجدید کی سب سے پہلی کوشش کی۔ اسبعات المعلقہ (المعلقات) کی تدوین و تجمیع کا سہرا انہی کے سر ہے۔ آپ نے خلیفہ وقت ولید ثانی کے ایک سوال کے جواب میں صرف جاہلیت کی نظمیں اور قصائد ہر ردیف ہجی کی ذیل میں کم از کم ایک سو اور دوسرے بے شمار قصائد اور نظمیں پڑھنے کی پیشکش کی۔ چنانچہ خلیفہ ولید ثانی نے اصالتاً اور وکالتاً تقریباً انتیس سو سے زائد قصیدے سنے اور اس کے صلے میں حماد کو ایک لاکھ درہم بطور انعام عطا کئے۔

حماد بن بلکین الزیری

حمادی خاندان کا بانی، ایک بربر حکمران۔ حماد فاطمی خلیفہ المعزؒ کے عہد میں المغرب کا والی رہا۔ ۳۷۷ھ/۹۸۸ء میں اس کے بھائی المنصور نے اسے اشیر کی ولایت دے دی۔ حماد نے تمام وسطی المغرب میں خاندان صنہاجہ کی برتری قائم کر دی۔ حماد اور بادیس کے بیٹے المعزؒ کے درمیان لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں زیری سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ حماد کو مسیلہ، طبنہ، الزاب، اشیر اور المغرب کے علاقے مل گئے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ دونوں حریفوں نے سلطنت کو آپس میں تقسیم کر کے شادی بیاہ کے ذریعے یگانگت پیدا کر لی۔ اس طرح خاندان صنہاجہ دو شاخوں میں تقسیم ہو گیا۔ یعنی قیروان میں المنصور کا خاندان اور القلعہ میں حماد کا۔ حماد نے ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء میں وفات پائی۔ اس خانوادے کا شجرہ نسب ذیل میں دیا جاتا ہے۔

(۱) حماد بن بلکین بن زیری

(۱۰۱۵ء — ۱۰۲۸ء)

۲۔ القائد (۱۰۲۸ء۔ ۱۰۵۴ء) | علناس | محمد

۳۔ محسن (۱۰۵۴ - ۱۰۵۵) | ۵۔ الناصر (۱۰۶۲ء۔ ۱۰۸۹ء) | ۴۔ بلکین (۱۰۵۵ء۔ ۱۰۶۲ء)

۶۔ المنصور (۱۰۸۹ء۔ ۱۱۰۵ء)

۷۔ بادیس | ۸۔ العزیز (۱۱۰۵ء۔ ۱۱۲۵ء)

۹۔ یحییٰ (۱۱۲۵ء۔ ۱۱۵۲ء)

[redacted]

وہ شے جو گلے میں لٹکائی جائے۔ عام طور پر چھوٹی جلد یا چھوٹے سائز کا قرآن پاک جو بطور تعویذ استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات بیاں کا زبر کے ساتھ یا بازو پر باندھے جاتے ہیں۔ مثال فرنگی میں اسے حرز کہا جاتا ہے۔ عرب لوگ اسے حمایہ، نسخہ یا حمائل کہتے ہیں۔ اسے عام طور پر چمڑے کے ٹکڑے یا موم جامہ میں لپیٹ کر، سونے یا چاندی سے بنے ہوئے خول میں رکھ دیا جاتا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں چھوٹے سائز کے قرآن پاک کو حمائل کہتے ہیں جنہیں لوگ عام طور پر دوران سفر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ تعویذ کے طور پر اکثر اوقات مختلف فرشتوں کے نام بھی لکھے جاتے ہیں۔ یوں تو بے شمار فرشتے ہیں لیکن چار اہم فرشتوں کے نام اکثر تعویزوں میں لکھے جاتے ہیں وہ حضرت جبرائیل، میکائیل، حضرت عزرائیل اور حضرت اسرافیل شامل ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جو ملائکہ سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔ تعویزوں میں شامل دعائیں، علامتیں اور اعداد وغیرہ مختلف جگہوں سے لئے جاتے ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر تعویزوں میں اللہ تعالےٰ کے نام نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ آیات قرآنی کی علامات زیچ، یہود کے علم الاسرار کے حروف بھی تعویزوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض تعویزوں میں جانوروں اور انسانوں کی تصاویر بھی نظر آتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر حافظ کا ایک تعویز ملاحظہ ہو۔

ح	ا	ف	ظ
ا	ف	ظ	ح
ف	ظ	ح	ا
ظ	ح	ا	ف

حمد

تعریف، ستائش۔ خاص طور پر اللہ کی تعریف۔ قرآن پاک میں سب سے پہلی سورۃ کا نام بھی حمد ہے۔ اس سورۃ کے آغاز میں حمد آیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ خدا کی تعریف تین طرح کی جا سکتی ہے، زبان سے جسے حمد قولی کہتے ہیں، اعضاء سے جیسے نماز۔ روزہ اور حج وغیرہ اسے حمد فعلی کہتے ہیں۔ اور دل سے خدا کی تعریف کرنے کو حمد حالی کہا جاتا ہے۔

اسلام میں جو تہذیب و اخلاق سکھاتا ہے اس کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے ہر کام کی ابتدا اللہ کی تعریف سے کرے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان برے کاموں سے بچا رہتا ہے کیونکہ خدا کا نام لے کر یا اس کی تعریف کے کلمات پڑھنے کے بعد وہ اپنے کام کے بارے میں ضرور سوچے گا کہ آیا وہ کوئی اچھا کام کر رہا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی تعریف کرنے اور اس کا نام لینے سے یہ بھی مراد ہوتی ہے کہ اس کے کام میں اللہ کی تائید شامل ہو جائے گی۔ وہ اسے شیطان کی فساد انگیزیوں سے بچائے گا۔

تعریف کرنے کی عام طور پر دو وجوہات ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ جس کی تعریف کی جائے وہ اپنے اندر حسن و خوبی اور کمال بزرگی رکھتا ہو دوسرے یہ کہ وہ محسن ہو اور لوگ اعتراف نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔

ہم اللہ تعالےٰ کی تعریف انہی دو حیثیتوں میں کرتے ہیں کیونکہ وہی ایسا حقیقت ہے جس کے پہلے دائرے مخلوق پرستی کی جو شماری جاتی ہے دنیا میں جس جگہ بھی اور جس شکل

[redacted]

[illegible] الحمد للہ [illegible] ہے ان کا عقیدہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے ... تعریف صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ اس حقیقت کی موجودگی میں کسی انسان، فرشتے، مخلوق یا کسی اور شے کی تعریف کریں۔

حمدان بن اشعث قرمط

حمدان بن اشعث قرمط کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ اس کا باپ کوفہ میں کنوئیں کھودنے کا کام کرتا تھا۔ حمدان عام طور پر بیل کی پیٹھ پر سوار ہو کر گھوما کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے قرمیط کہا جانے لگا۔ لفظ کرمیطا کا معرب قرمط ہے۔ ابتدا میں زہد و تقشف کی جانب مائل تھا۔ بعد میں ایک باطنی کے ذریعہ ایمان کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ وہ ایک دن گاؤں کا ریوڑ دوسرے گاؤں کی طرف لے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک باطنی فرقہ کا داعی ملا۔ حمدان نے اس سے معلوم کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ باطنی نے اس کا نام لیا جہاں حمدان جا رہا تھا۔ چنانچہ حمدان نے اسے اپنے سفر کا ساتھی بنا لیا۔ دوران سفر اس شخص نے حمدان کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ اسی دن سے حمدان نے الحاد کے سرغنہ اور باطنی فرقہ کے مبلغ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر اس کے باطنی پیرو اس کی نسبت سے قرمطی کہلانے لگے۔

حمدان بن اشعث نے دوسرے فرقوں کے خلاف تاویل کاری کے باطنی اصول کے ساتھ ساتھ بعض ظاہری اصولوں کو بھی اپنے مذہب میں شامل کر لیا تھا۔ وہ امام محمد بن حنیفہ کے لڑکے احمد کو رسول کہتا تھا اور خود مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ وہ زہد و تقویٰ کا پرچار کرتا تھا۔ اس لئے بہت سے دیہاتی لوگ اس کے دعویٰ پر یقین کر کے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اس نے اپنے پیروکاروں پر پچاس نمازیں فرض کیں لیکن لوگوں نے شکوہ کیا کہ اس طرح تو ہم اپنے دنیاوی کام بالکل نہیں کر سکیں گے۔

کچھ عرصہ بعد اس نے کہنا شروع کر دیا کہ میں نے ذات باری کی طرف رجوع کیا تھا اور لوگوں کو ایک تحریر دکھائی جس میں حمدان کو خطاب کر کے لکھا تھا کہ "تم ہی مسیح ہو، تم ہی کلمہ ہو، تم ہی مہدی ہو، تم ہی محمد بن حنیفہ ہو اور تم ہی جبریل ہو" اس کے بعد کہنے لگا کہ جناب مسیح بن مریم میرے پاس انسانی صورت میں آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ تم ہی داعی ہو، تم ہی حجۃ ہو، تم ہی ناقہ ہو، تم ہی دابہ ہو، تم ہی روح القدس ہو اور تم ہی یحییٰ بن زکریا ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ نماز صرف چار رکعتیں فرض ہیں دو رکعت فجر سے پہلے، دو رکعت غروب آفتاب سے پہلے۔ حمدان نے اذان دینے کا بھی نیا طریقہ بتایا کہ پہلے چار مرتبہ اللہ اکبر، پھر دو مرتبہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اور پھر ایک مرتبہ یہ کلمات کہیں۔ اشہد ان آدم رسول اللہ۔ اشہد ان نوحاً رسول اللہ اشہد ان ابراہیم رسول اللہ۔ اشہد ان موسیٰ رسول اللہ۔ اشہد ان عیسیٰ رسول اللہ اشہد ان محمداً رسول اللہ، اشہد ان احمد بن محمد بن حنیفہ رسول اللہ۔ اس نے سال بھر میں دو روزے رکھنے کا حکم بھی دیا۔ اور کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح حمدان نے بھی قرآن کی آیات اور بعض حصوں کو تبدیل کر کے اپنا کلام بنا لیا اور ظاہر کیا کہ یہ اس پر وحی کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ ان نے قرآن کی بعض احادیث میں تبدیلیاں کر کے انہیں اپنی وحی میں شامل کر لیا اور قرآن کی سورتوں کی بجائے وہ صرف اس کی بنائی ہوئی سورتوں ہی کو نماز میں پڑھا کرتے۔ حمدان نے نماز پڑھنے کے لئے بھی اپنا الگ طریقہ اختیار کیا۔

جب حمدان کی پیروؤں کی تعداد بڑھنے لگی تو اس نے بارہ آدمیوں کو اپنا نقیب بنا لیا اور انہیں کہا کہ وہ اردگرد کے علاقوں میں پھیل کر اس کے مذہب کی تبلیغ کریں۔ اس نے انہیں مسیح علیہ السلام کے حواریوں سے تشبیہ دی۔ جب ہیضم عامل کوفہ نے حمدان کے جھوٹے مذہب کے بارے میں سنا تو فوراً اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے حمدان کو اپنے پاس ہی قصر امارت کی ایک کوٹھری میں منتقل کر دیا۔ اور اس کی چابی اپنے تکیہ کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ حمدان کو ضرور قتل کرا دے گا۔ لیکن ہیضم کے گھر ایک لونڈی تھی جس نے ہمدردی کے طور پر حمدان کو آزاد کرنے کے بعد چابی دوبارہ اس کے تکیہ کے نیچے رکھ دی۔

حمدان نے اپنی اس آزادی سے فائدہ اٹھایا اور کہنے لگا کہ مجھے کوئی شخص بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس واقعے کے بعد اس کے پیروؤں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ انہوں نے اتنی تباہی مچائی کہ خراسان سے شام تک تمام علاقہ اس کے دست ستم سے چیخ اٹھا۔ اس کے پیروکار اتنے کٹر باطنی اور معاندین اسلام تھے کہ بیت اللہ کو مسمار کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے وہ حجر اسود کو اکھاڑ کر عمان لے گئے۔

برصغیر میں قرمطی فرقے کے لوگ مختلف اوقات میں آتے رہے۔ یہاں انہوں نے ملتان میں ایک نیم خود مختار حکومت بھی بنائی جسے سلطان محمود غزنوی کی فوجوں نے ۴۰۰ھ میں قرمطی لشکر سے لڑائی کے بعد فتح کر لیا۔ اور اس طرح ہندوستان میں ان کا زور ٹوٹ گیا۔

حمدان، بنو

ایک عرب خانوادہ، جس کے دو چھوٹے خاندان دسویں صدی عیسوی میں خلافت بنو عباس کے زوال کے بعد موصل اور حلب میں برسراقتدار آئے۔ بنو حمدان عادی بن اسامہ بن تغلب کی اولاد ہیں۔ عبداللہ ابوالہیجا ابن حمدون کے دونوں فرزند بنو حمدان کے نامور ارکان میں سے تھے۔ ابوالہیجا موصل کی امارت اور حمدانی خاندان کا بانی تھا۔ ابوالہیجا ۹۰۶ء میں موصل کی ولایت پر فائز ہوا اور ۹۲۹ء میں وفات پائی۔ حسن بن ابوالہیجا موصل کا امیر بنا۔ ۹۳۵ء میں خلیفہ الراضی نے اسے موصل کے علاوہ الجزیرہ کے تین صوبوں (دیار ربیعہ، دیار مضر اور دیار بکر) کا والی بنا دیا ۹۳۶ء میں سارے الجزیرہ کا حاکم بنا ۹۶۴ء میں اسے اردمشت کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ جہاں ۹۶۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو تغلب فضل اللہ الغضنفر والی بنا۔ اسے خلیفہ کی طرف سے عدۃ الدولہ کا لقب دیا گیا۔ ۹۷۹ء میں دملہ کے امیر مفرج نے ایک جنگ کے بعد اسے قید کر لیا بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔

حلب میں بنو حمدان کی امارت کا قیام علی بن عبداللہ ابوالہیجا کی کاوشوں کا مرہون منت ہے ۹۴۷ء میں علی (جو سیف الدولہ کے نام سے مشہور ہوا) ایک ایسی ریاست کا مالک بن گیا جس میں حمص، قنسرین، عواصم کی جنود، دیار مضر اور دیار بکر کا بیشتر حصہ شامل تھا۔ شام کے سرحدی علاقے بھی اس کی قلمرو میں شامل تھے۔ سیف الدولہ نے ۹۴۷ سے ۹۶۷ء تک حلب پر حکومت کی۔ فروری ۹۶۷ء میں اکاون سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ سیف الدولہ کے بعد اس کا فرزند سعد الدولہ ابوالمعالی جانشین ہوا۔ مسند نشینی کے وقت اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ دسمبر ۹۶۹ء میں حلب پر بوزنطینی سیادت قائم ہو گئی۔ ۹۷۷ء میں وہ دوبارہ حلب پر قابض ہو گیا۔ دسمبر ۹۹۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔ سعد الدولہ کے بعد اس کا بیٹا سعید الدولہ مسند نشین ہوا۔ اس کے عہد میں مصر کے فاطمیوں نے حلب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جسے سعید الدولہ نے بوزنطینی شہنشاہ کی مدد سے ناکام بنا دیا۔ سعید الدولہ نے اپنی لڑکی کی شادی اپنے لؤلؤ سے کر دی۔ اس وزیر نے سعید الدولہ کو ۱۰۰۲ء میں قتل

Marfat.com

کر دیا۔ اس کے بعد بنو حمدان کے ارکان نے حلب کی امارت کے لئے بہت کاوشیں کیں لیکن ناکام رہے۔ (ش ع)

حمدون القصار

حمدون بن احمد بن عمارہ ابو صالح القصار، ایک مشہور صوفی اور بزرگ عالم جو سفیان ثوری کے مرید اور فرقۂ ملامتیہ کے شیخ تھے۔ آپ نیشاپور میں رہتے اور تعلیم دیتے تھے۔ آپ کا قول ہے "قناعت تمہیں بغیر کسی غم و فکر کے سکون دے گی۔ تم زیادہ کی جستجو میں اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالتے ہو۔ صوفیا کی صحبت تحمل سکھاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کی قباحتوں سے درگزر کرتے ہیں، اور محاسن کی تعریف نہیں کرتے تاکہ تعریف تکبر کا موجب نہ بن جائے۔"

فرقۂ ملامتیہ کے پیرو خود پسندی اور تکبر سے بچنے کے لئے اپنے محاسن چھپاتے اور اپنے آپ کو قابل ملامت ظاہر کرتے تھے۔ ایک شخص نے آپ کو برا بھلا کہا تو آپ نے فرمایا "میرے بھائی! اگر تم تمام برائیاں مجھ سے منسوب کر دو تو بھی تم مجھے اتنا برا نہیں کہہ سکتے۔ جتنا برا میں خود اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔"

حمدون القصار نے ۲۷۱ھ/۸۸۴ء میں وفات پائی اور حیرہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کے رفقاء میں ابو تراب بخشی، علی نصیر آبادی اور ابو علی ثقفی قابل ذکر ہیں۔ (ش ع)

حمراء الاسد، غزوہ

مدینہ منورہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں یا قصبہ۔ یہاں غزوہ اُحد کے بعد ۳ھ میں جنگ ہوئی تھی۔ جنگ اُحد ختم ہونے کے بعد قریش کا لشکر واپس مکہ روانہ ہو گیا۔ لیکن ابو سفیان کو اچانک خیال آیا کہ مسلمان اس وقت کمزور ہو گئے ہیں لہٰذا ایسے وقت میں اگر ان پر حملہ کریں تو انہیں نیچا دکھا سکیں گے۔ عین اسی وقت حضورؐ بھی اسی مسئلہ پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ آپ نے کفار مکہ کی ممکنہ چڑھائی کے پیش نظر جنگ کے دوسرے روز ہی اعلان فرمایا کہ تمام مسلمان جو جنگ میں شریک تھے دوبارہ میدان میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ حضورؐ کے ارشاد پر تمام جاں نثار آکر جمع ہو گئے بیشتر جاں نثاروں کے بدن زخموں سے چور تھے۔ حضورؐ اس چھوٹے سے لشکر کو لے کر حمراء الاسد پہنچے۔ اُدھر کفار مکہ بھی وہاں پہلے سے موجود تھے مسلمانوں کی پیش قدمی کو دیکھ کر بوکھلا گئے، اور فوراً راہِ فرار اختیار کی۔ یہاں اسلامی لشکر نے تین روز تک قیام کیا اس غزوہ میں دو افراد کو قیدی بھی بنا لیا گیا۔ ان میں سے ایک عبدالعزیٰ شاعر تھا اس نے مسلمانوں سے وعدہ خلافی کی تھی اور عرب قبیلوں کو جنگ کے لئے آمادہ کیا تھا حضورؐ نے اسے دیکھا تو فرمایا "مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔" چنانچہ عبدالعزیٰ کو قتل کر دیا گیا، دوسرا قیدی معاویہ بن مغیرہ تھا یہ حضرت عثمانؓ کا عزیز تھا اس نے بھی مسلمانوں کو بہت ایذائیں پہنچائی تھیں۔ حضورؐ نے اسے مدینہ سے تین روز کے اندر اندر نکل جانے کا حکم دے کر رہا کر دیا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ تین دن گزرنے کے بعد بھی مدینہ میں گھومتا رہا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ اس غزوہ میں قتال کی نوبت نہیں آئی تھی۔

حمزہ بن حبیب

(۸۰ھ/۶۹۹ء - ۱۵۶ھ/۷۷۲ء) بن عمارہ بن اسماعیل۔ قرآن مجید کے سات قاریوں میں سے ایک۔ آپ عکرمہ بن ربیع التیمی کے خاندان کے ایک مولیٰ تھے

آپ کے لقب "الزیات" [illegible] تھے علم قرأت میں آپ الاعمش، حمران بن اعین [illegible] آپ کے شاگردوں میں قابل ذکر سفیان ثوری اور الکسائی تھے۔ (ش ع)

حمزہ بن عبدالمطلب

حضرت عبدالمطلب [illegible] تھا اور کنیت ابو عمارہ۔ عمر میں حضورؐ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ آپ کی والدہ ہالہ بنت وہب تھیں جو حضورؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ کی چچازاد بہن تھیں۔ حضرت حمزہؓ رسول اکرمؐ کے رضاعی بھائی تھے۔

آپ کی طبیعت مہم جو اور خطر آزما تھی۔ آپ کے والد حضرت عبدالمطلبؓ کا انتقال ہوا تو آپ کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت ننھیال میں ہوئی۔ عرب میں اس وقت شاعری اور انساب کا علم ہی تعلیم کے زمرے میں آتا تھا۔ جنگی مہارت، گھڑ سواری اور شکار وغیرہ معزز فنون میں شامل تھے مثلاً اسی لئے حضرت حمزہؓ کو شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ آپ بہت دلیر اور جنگجو تھے۔ اکثر جنگلوں میں جا کر گھڑ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شکار سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک عورت ملی جس نے بتایا کہ ابوجہل نے حضورؐ کو گالیاں دی ہیں۔ آپ یہ سن کر جوش میں آگئے۔ سیدھے ابوجہل کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کیا تو سمجھتا ہے کہ محمد بن عبداللہ بے سہارا ہے؟ کیا تو نے سمجھ لیا ہے کہ بنو ہاشم سارے کے سارے مر گئے ہیں؟

ابوجہل کے ساتھی یہ سنتے ہی جوش میں آگئے لیکن انہیں ابوجہل نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ "اسے کچھ نہ کہو۔ کیونکہ میں نے بھی آج اس کے بھتیجے کو گالیاں دی تھیں۔"

حضرت حمزہؓ اس کے بعد سیدھے حضورؐ کے پاس پہنچے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ حضورؐ نے آپ سے تمام واقعہ سن کر کہا کہ "چچا جان میں اس وقت زیادہ خوش ہوں گا جب آپ اس دین میں داخل ہو جائیں گے، جس کو لے کر میں آیا ہوں۔"

آپ کے ان الفاظ میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ حضرت حمزہؓ مسلمان ہو گئے ہجرت کے وقت آپ بھی مکہ سے مدینہ آگئے تھے۔ حضورؐ نے مدینہ میں حضرت حمزہؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ میں بھائی چارہ کرا دیا۔ ہجرت کے نو ماہ بعد حضور اکرمؐ نے صحابہؓ کی ایک جماعت کو کفار کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ میدان جنگ میں کفار اور مسلمان باقاعدہ صف بندی کر چکے تھے کہ اسی دوران میں قبیلہ بنو جہینہ کے سردار ابن عمرو نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس مہم میں اسلامی تاریخ میں پہلی بار جسے علم دیا گیا وہ آپ ہی تھے۔

۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے آغاز میں جب قریش کا سردار عتبہ اس کا بھائی شیبہ اور بیٹا ولید میدان میں نکلے تو حضورؐ نے ان کے مقابلے کے لئے چند انصاری صحابہؓ کو بھیجا لیکن عتبہ کہنے لگا کہ ہم صرف قریش لوگوں ہی سے مقابلہ کریں گے۔ اس پر آپؐ نے حضرت حمزہؓ، ابو عبیدہؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کو مقابلہ پر بھیجا۔ حضرت حمزہؓ نے پہلے ہی وار میں عتبہ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ آپ غزوۂ بدر میں بے جگری سے لڑے ۳ھ میں غزوۂ اُحد میں بھی آپ نے کفار کے کتنے ہی لوگوں کو تہ و تیغ کر دیا۔ آپ کی شمشیر بے نیام دشمنوں کا صفایا کر رہی تھی کہ ایک نیزہ آپ کے آکر لگا اور جگر کے پار ہو گیا۔ جس نیزے سے آپ شہید ہوئے وہ ایک حبشی غلام نے آپ پر پھینکا تھا جسے قریش کے سرداروں نے آزادی کا لالچ دے کر کسی جگہ تاک میں بٹھا رکھا تھا۔ جب آپ شہید ہو گئے تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے آپؓ کے جگر کے ٹکڑے کئے اور انہیں چبا کر تھوک دیا۔ بعد میں ناک کان کاٹ کر ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لیا۔ جب حضورؐ نے اپنے محبوب چچا کی لاش دیکھی تو [illegible]

رعیت پر تم پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے حقوق کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خود تمام نیک کاموں میں سب سے آگے بڑھتے تھے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں اسی طرح چھوڑ دیتا کہ درندے اور پرندے تمہیں کھا جاتے اور قیامت کے دن تم ان کے پیٹ سے اٹھائے جاتے۔ خدا کی قسم مجھ پر تمہارا انتقام واجب ہے میں تمہارے عوض ستر کافروں کا مثلہ کروں گا۔" بعد میں وحی کے ذریعے اللہ نے آپ کو اس بدلے سے ممانعت کر دی اور آپ نے کفارہ ادا کر کے قسم توڑ دی۔

حبشی غلام نے آپ کو شہید کرنے کے بعد آزادی تو حاصل کر لی تھی لیکن بعد میں اسے ندامت ہوئی اور اس نے کچھ عرصہ بعد اسلام قبول کر لیا۔ جب وہ حضور کے پاس آ کر اسلام قبول کر چکا تو آپ نے اسے اپنے سامنے آنے سے منع فرما دیا تھا۔

حمزہ بن علی درزی

دروز قوم کا بانی جس نے ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں اور بقول خود اس کے ۴۰۸ھ/۱۰۱۷ء میں پہلی بار اپنے عقائد کا اعلان کیا تھا۔ وہ ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء کے لگ بھگ مصر آیا۔ جب اس نے قاہرہ کی مسجد میں اپنے عقائد کا اعلان کیا تو لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ عوام میں ایک فساد برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ خلیفہ کی پناہ گاہ میں گزارنا پڑا۔ ۴۴۵ھ/۱۰۲۰ء میں خلیفہ کے لاپتہ ہو جانے کے بعد اس کے انجام کا علم نہ ہو سکا۔ پھر بھی دروزیوں کے مذہبی نظام میں اُسے امتیازی درجہ حاصل ہے۔ وہ اسے ہادیٔ اعظم کے لقب سے پکارتے ہیں ایک تاریخ دان النویری لکھتے ہیں "وہ علاقہ زوزان (فارس) کا رہنے والا تھا اور شروع میں مختلف قسم کے لباس تیار کرتا تھا اور کپڑوں کی تجارت بھی کرتا تھا۔

حمزہ بن دروزی نے اپنے مذہبی عقائد اور نظام کے بارے میں کئی کتابیں لکھیں جنہیں اس کے پیروکار مقدس کتابوں کا درجہ دیتے ہیں۔

حمزہ بیگ

داغستان کے دوسرے امام اور سیاسی و مذہبی تحریک مریدیہ کے قائد۔ داغستان کے امام اول غازی محمد اکتوبر ۱۸۳۲ء میں ایک روسی دستے کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اور حمزہ بیگ (GAMZAT BEK) داغستان کے امام بنے۔ تحریک مریدیہ کے باعث ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۹ء تک شمالی قفقاز بدامنی کا شکار رہا۔ یہ تحریک اسلامی تصوف کے ان اثرات پر مبنی تھی جو بخارا پیدا ہوئے اور جن کی تبلیغ نقشبندوں نے کی۔ جہاد کے عملی تصور سے اس تحریک کا بہت قریبی تعلق تھا۔ یہ تحریک نہ صرف روسیوں کے خلاف تھی بلکہ اُن' اور خانیوں کے بھی خلاف تھی جنہوں نے روسی تسلط کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

۱۳؍ اگست ۱۸۳۴ء کو حمزہ بیگ نے اور خانی دار الحکومت خونزاق کے قریب دریائے تیود پر اور خانیوں کو شکست دی اور ان کا قتلِ عام کرنے کے بعد روسیوں کو دار الحکومت سے نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹؍ ستمبر ۱۸۳۴ء کو امام شامل کے نائب اور گوریلا لیڈر حاجی مراد کے بھائی نے حمزہ بیگ کو قتل کر دیا۔ امام شامل تیسرے امام بنے اور انھی کے ہاتھوں مریدیت کی تحریک نے ایک قطعی صورت اختیار کی اور ۲۵؍ اگست ۱۸۵۹ء کو امام شامل کے ہتھیار ڈالنے تک جاری رہی۔ ش۔ ج

حمس

وہ تمام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت حرم مکہ کے رہنے والوں کو دیا جاتا تھا۔ حج اور حرم مکہ کے مراسم و لوازم کے نقطۂ نظر سے زمانۂ جاہلیت میں عرب قبائل تین طبقوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ حُمس، حلّہ اور طلس۔ "المحبّر" کے مصنف ابن حبیب نے لکھا ہے کہ قریش سارے کے سارے 'خزاعہ' مکہ میں رہنے والے اجنبی' قریش کی لڑکیوں کی اولاد بیرون مکہ میں 'حمس میں شامل تھے۔ ابن حبیب نے اپنی ایک دوسری تالیف "المنمق" میں حمس کے بارے میں لکھا ہے کہ قریش نے ایک دن سوچا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں اور حدود حرم میں رہتے ہیں' اس لئے اجنبیوں سے خود کو ممتاز کرنے اور ان سے اپنی عظمت منوانے کیلئے کچھ کرنا چاہیئے۔ اس لئے انھوں نے حج میں عرفات جانا ترک کر دیا اور کہا کہ اہلِ حرم کو حدودِ حرم سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔ بعد ازاں بعض اور قبائل کو بھی پاس رہنے یا رشتے دار ہونے کے باعث یہی امتیاز عطا کیا۔ اس کے بعد کچھ اور امور اضافہ کیے' جو پہلے نہ تھے۔ مثلاً گھی' دہی' پنیر اور اونی خیموں کو ... اور بیرون حرم سے حج یا عمرے کے لئے آنے والوں کے ساتھ آئی ہوئی غذا کو بھی اپنے لئے حرام قرار دیا۔ اجنبیوں پر یہ پابندی عائد کی کہ طواف قدوم کیلئے اہلِ حرم سے حاصل کئے ہوئے لباس میں ہوں' ورنہ برہنہ رہیں۔ اگر کوئی اجنبی کسی وجہ سے اپنے لباس میں طواف کرتا تو طواف کے بعد لباس کو مطاف ہی میں پھینک دینا پڑتا تھا۔ باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیرونی قبائل نے فوراً یہ پابندیاں گوارا کر لیں۔ بیرونی عورتیں اپنا سارا لباس اتارنے پر مجبور نہ تھیں۔ کسی حمسی کا لباس نہ ملتا تو وہ اپنے جسم پر اپنی کرتی (قمیض) باقی رکھتی تھیں۔ قرآن مجید نے مقامی اور اجنبی کا فرق منسوخ کر دیا۔ عرفات جانا سب کیلئے ضروری قرار دیا۔ برہنگی کی ممانعت ہوئی اور ہر عبادت کے وقت اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کا حکم ہُوا۔ بیرونی غذاؤں کی ممانعت کو منسوخ کیا گیا۔ دروازوں سے نہ آنے کی پابندی بھی منسوخ ہوئی۔ پرانی باتوں میں جو برقرار رکھی گئیں ان میں احرام کی حالت میں شکار نہ کرنا اور ناخن نہ تراشنا اور ہم بستر نہ ہونا قابلِ ذکر ہیں۔

حمص

شام کا ایک شہر جو دریائے عاصی کے مشرقی کنارے پر سطح سمندر سے پانچ سو میٹر بلند' کوہ لبنان اور جبل النصاریہ کے درمیان ایک نشیب کے دہانے پر واقع ہے۔ خلیج فارس سے پامیرا ہو کر بحیرۂ روم جانے کا آسان ترین راستہ یہیں سے گزرتا ہے کرکوک سے پٹرول کی پائپ لائین حمص سے گزرتی ہوئی طرابلس الشام اور بانیاس تک جاتی ہے۔ اس شہر کی پچھلے پانچ ہزار سال کی تاریخ اہم واقعات سے پُر ہے۔ دو ہزار سال قبل از مسیح حمص غیر معروف مقام تھا۔ شہر کی بنیاد قدیم یونانیوں کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس شہر پر رومی نقشۂ تعمیر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ۸۱ ق م سے ۹۶ء تک حمص پر عربوں کا ایک مقامی خاندان حکمران تھا۔ پانچویں صدی عیسوی تک عیسائیت یہاں جڑ پکڑ چکی تھی۔ جنگ یرموک کے بعد شہنشاہ ہرقل حمص چھوڑ کر چل دیا۔ اسلامی فوجیں حضرت ابوعبیدہؓ ابن الجراح کی زیر کمان حضرت خالدؓ بن ولید کی ہمراہی میں شہر کی دیواروں کے سامنے نمودار ہوئیں تو باشندوں نے امان طلب کر لیا۔ مسلمان ۱۶ھ/۶۳۷ء میں حمص میں داخل ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے پانچسو صحابی مفتوحہ شہر حمص میں سکونت کے لئے چلے آئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں حمص کا گورنر سعید بن عامر تھا۔ ۲۶ھ/۶۴۷ء میں حضرت امیر معاویہؓ نے حمص اور قنسرین پر قبضہ کر کے ان کا الحاق صوبہ شام سے کر دیا۔ جب ۲۷ھ/۶۵۷ء

Marfat.com

میں جنگ صفین ہوئی تو حمص کے باشندے حضرت علیؓ کے طرفدار تھے اور شیعیت کو اس علاقے میں عرصۂ دراز تک اقتدار حاصل رہا۔

آجکل حمص زراعتی اعتبار سے اہم مرکز ہے۔ یہاں صنعت کو فروغ حاصل ہے۔ ۱۹۶۰ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ تیئس ہزار تھی۔ آبادی کا پانچواں حصہ عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ حمص اہم راستوں کے چوراہے پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ زرعی اور صنعتی مرکز رہا ہے اور شام کی معیشت میں اب بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ تہذیب قدیم کے آثار سے معمور ہے۔ پرانی مسجدیں، حمام، مزارات خانقاہیں اب بھی محفوظ ہیں۔ (ش-ج)

حملۃ العرش

وہ آٹھ فرشتے جنہوں نے عرش معلی کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے "جو فرشتے (عرش الہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گردا گرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کے لئے (اس طرح) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تیری رحمت (عامہ) اور ہر چیز جو شامل ہے سوان لوگوں کو بخش دیجئے (جنہوں نے شرک و کفر سے) توبہ کر لی ہے اور تیرے رستہ پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔" (سورۃ ۴۰۔ آیت ۷)

بیضاوی کہتے ہیں کہ حملۃ العرش، وہ آٹھ فرشتے ہیں جو اپنے مرتبے کے لحاظ سے تمام فرشتوں میں افضل ہیں وہ اتنے لمبے ہیں کہ ان کے پاؤں زمین کی آخری تہہ تک اور سر اونچی ترین جنتوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ تمام کائنات ان کی ناف تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اگر ہم ان کے کانوں سے لے کر کندھوں تک کا فاصلہ طے کرنا چاہیں تو ہمیں سات سو سال لگ جائیں۔

حمنہ بنت جحش

جحش کی بیٹی، حضرت زینبؓ کی رضاعی بہن۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کے ہمراہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں اور انہی سے نکاح ہوا۔ حضورؐ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے لگے تو آپ بھی مدینہ ہجرت کر گئیں۔ آپ نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔

غزوۂ احد میں آپ شریک تھیں۔ آپ کے شوہر مصعبؓ بن عمیر نے اس غزوہ میں شہادت پائی۔ بعد میں حضرت حمنہ نے طلحہؓ سے نکاح کر لیا۔ آپ کی درست تاریخ وفات کا علم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ آپ حضرت زینبؓ کی وفات تک زندہ تھیں اور حضرت زینبؓ نے ۲۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کے حضرت طلحہؓ سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام محمد تھا جو محمد سجاد کے لقب سے مشہور ہوئے دوسرے کا نام عمران تھا۔

حمید

دیکھئے اسماء الحسنیٰ

حمید الدین ناگوری

خواجہ بختیار کاکیؒ کے دوست اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مریدوں میں سے تھے۔ آپ کا اسم گرامی محمد تھا لیکن حمید الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عطاء اللہ محمود تھا جو شہاب الدین غوری کے زمانہ میں بخارا سے ہندوستان آکر دہلی [illegible] شیخ حمید الدین ناگوری [illegible] قرآن و حدیث [illegible] ناگور کا قاضی مقرر کر دیا۔ تین سال تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ بعد میں دست بردار ہو کر بغداد چلے گئے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضری دی ان سے بیعت ہوئے اور ایک سال تک ان کی خدمت کر کے [illegible] کیں۔ اسی دوران میں آپ کے خواجہ بختیار کاکیؒ سے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے جو بھی بغداد میں مقیم تھے۔ یہاں سے آپ مدینہ تشریف لے گئے اور ایک سال تک حضورؐ کے روضۂ مبارک کے مجاور بنے رہے۔ پھر آپ مکہ چلے گئے۔ [illegible] سال تک وہاں کے مختلف بزرگوں سے [illegible] کے زمانہ میں دہلی تشریف لائے۔ دہلی آنے پر قطب الدین بختیار [illegible]۔ چنانچہ آپ کے ان کے ساتھ گہرے مراسم قائم ہو گئے۔ اور آپ نے انہی کے ساتھ [illegible] اختیار کی۔

آپ کو سماع کا بہت شوق تھا اور اکثر محفل سماع منعقد کیا کرتے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ بھی ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے لیکن آپ کے زمانے کے بیشتر علماء سماع کو جائز خیال نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سلطان التمش کے محل کے قریب محفل سماع منعقد تھی جس میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور خواجہ بختیار کاکیؒ موجود تھے۔ رکن الدین سمرقندی (جو سماع کو جائز نہیں سمجھتے تھے) کو علم ہوا تو آپ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس محفل کو روک دینے کے لئے آئے۔ لیکن حمید الدین ناگوری صاحب کو علم ہو گیا۔ آپ نے صاحب خانہ کو اندر کمرے میں بھیج دیا تاکہ انہیں اندر آنے کے لئے اجازت طلب کرنی پڑے۔ چنانچہ رکن الدین سمرقندی نے محفل میں آنے کی اجازت طلب کی تو یہ معلوم ہونے پر واپس چلے گئے کہ صاحب خانہ غیر حاضر ہے۔

آپ کو بابا فریدؒ سے [illegible] نے آپ کی دو کتابوں "تواریخ" اور "راحۃ الارواح" [illegible] دیا ہے۔ "سیر العارفین" میں ایک اور کتاب "لوائح" کا ذکر بھی ملتا ہے۔

آپ کی وفات دہلی میں ۶۴۱ھ میں ہوئی اور آپ کا مزار قطب الدین بختیار کاکیؒ کے قریب ہی واقع ہے۔

حمید اللہ، ڈاکٹر

پورا نام محمد حمید اللہ۔ آپ حیدر آباد دکن میں ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے دارالعلوم حیدر آباد دکن میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایم اے جامعہ عثمانیہ سے کیا ایل ایل بی کرنے کے لئے علیاس چلے گئے۔ جرمنی کے شہر بون کی یونیورسٹی سے ڈی فل اور پیرس (فرانس) سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں جامعہ عثمانیہ واپس آگئے اور وہاں تاریخ اور قانون پڑھانے لگے۔ آپ نے یورپ کی کئی درسگاہوں میں تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ آج کل آپ استنبول میں تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں اس کے ساتھ ساتھ آپ تحقیق کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ [illegible] کے خطبات کا جو ترجمہ انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے اس پر نظر ثانی آپ ہی نے کی تھی۔ آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں سیاسی وثیقہ جات (ترجمہ مجلس ترقی ادب لاہور) رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، قانون بین الممالک [illegible] اور قرآن پاک کا فرانسیسی [illegible]

آپ نے ایک زمانہ میں پاکستان کا دستور بنانے کے سلسلے میں [illegible]

Marfat.com

[illegible]

حمید احمد سنبھلی

آپ سنبھل میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر کی تعلیم حاصل کی اور اس میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ آپ عقائد اہل سنت کے پابند تھے۔ ہمایوں بادشاہ آپ کے عظیم مفسر قرآن ہونے کے باعث آپ کا معترف تھا اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جب ہمایوں کو جنگ میں شکست ہوئی تو آپ بھی ہمایوں کے ساتھ کابل چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہی ہمایوں لشکر جرار لے کر دوبارہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو آپ لشکر کے ہمراہ دوبارہ ہندوستان آ گئے۔ کابل سے واپسی پر آپ نے کچھ عرصے تک لاہور میں قیام کیا۔ یہاں مختلف لوگوں کی محفلوں میں آپ قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے رہے۔ آپ کے گرد اگرد بے شمار اہل ذوق جمع ہو گئے۔ اس وجہ سے بادشاہ آپ سے ناراض ہو گیا اور انہیں اپنے دربار میں بلایا۔ آپ نے آتے ہی کہا کہ "اے بادشاہ، میں نے تمہارے تمام لشکر کو شیعہ پایا"۔

اس پر بادشاہ نے سوال کیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے فوراً جواب دیا کہ "میں نے تمہارے سپاہیوں کے نام یار علی، کفش علی اور حیدر علی پائے ہیں۔ کیا تمہارے لشکر میں کسی اور کا کوئی یار دوست نہیں (یعنی کوئی سنی مسلمان نہیں ؟)

بادشاہ اس جواب پر کچھ پریشان ہوا اور غصہ میں آ کر کہنے لگا کہ "میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا اور دوسروں کے ناموں سے مجھے کوئی غرض نہیں اور نہ ہی میں ان کے ناموں کا ذمہ دار ہوں"۔

اس واقعے سے علم ہوتا ہے کہ علمائے اہل سنت کی نگرانی اور راسخ الاعتقادی کی دولت کو محفوظ و مامور رکھنے میں پیش پیش تھے۔

حنا

مہندی کو عربی میں حنا کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "یہود و نصاریٰ خضاب نہیں کرتے تو تم ان کی مخالفت کرو" (صحیح بخاری)

اس حدیث میں ہمیں خضاب کئے جانے کے بارے میں حکم ملتا ہے لیکن صرف مہندی سے ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے بہتر چیز جس سے بڑھاپا بدلا جائے مہندی اور وسمہ ہے"

حضورؐ خود بھی ریش مبارک کو مہندی لگایا کرتے تھے۔ آپ نے عورتوں کو بھی تلقین کی ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر مہندی لگائیں۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ سے ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے کہا کہ "یا نبیؐ مجھ سے بیعت لے لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا جب تک تو اپنے دونوں ہاتھ متغیر نہ کرے گی (یعنی مہندی نہ لگا لے گی) میں تجھ سے بیعت نہیں لوں گا۔ تیری دونوں ہتھیلیاں گویا درندے کی ہتھیلیاں ہیں۔ (کیونکہ درندوں کی ہتھیلیاں بے رنگ اور سفید ہوتی ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا ہاتھوں پر مہندی لگانا مستحب ہے۔

حناد

جنت میں داخل ہونے والا آخری انسان۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آخری جنتی کے داخلے کا واقعہ مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے آخری شخص جو جنت میں جائے گا وہ دوزخ سے نکلنے کی ہمت کر کے پاؤں چلے گا کبھی گر پڑے گا اور کبھی اس کو آگ کی لپیٹ جھلسے گی۔ جب دوزخ سے نکل کر آگے بڑھ جائے گا تو اس کی طرف دیکھ کر کہے گا کہ بابرکت ہے جس نے مجھے تجھ سے نجات بخشی۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ نعمت دی ہے۔ جو اولین و آخرین میں سے کسی کو بھی نہ دی۔ اس کے بعد ایک درخت اس کی نظر کے سامنے کیا جائے گا۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب مجھے اس درخت کے قریب کر دیجئے تاکہ اس کا سایہ حاصل کروں اور پانی نوش کروں جو اس کے نیچے بہہ رہا ہے حق تعالیٰ فرمائے گا عجب نہیں اگر میں تجھے یہ نعمت دے دوں تو اس کے بعد تو کچھ اور درخواست کرنے لگے؟ وہ عرض کرے گا کہ اے رب نہیں ایسا نہ کروں گا اور عہد کرے گا کہ اس کے بعد اور کچھ نہ مانگوں گا۔ اور رب العالمین اس کو معذور قرار دے گا۔ کیونکہ اس کو وہ چیز نظر آئے گی جس سے بغیر صبر نہی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ اس کو درخت کے قریب کر دیا جائے گا۔ وہ اس کے سایہ میں بیٹھے گا اور پانی پئے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر کے سامنے دوسرا درخت بلند کر دیا جائے گا جو پہلے سے بہت اچھا ہو گا۔ پس وہ عرض کرے گا کہ اے رب مجھے اس کے نزدیک پہنچا دے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ مانگوں گا۔ دوسرے درخت سے مستفید ہو چکے گا تو جنت کے دروازے کے قریب ایک درخت اس کے سامنے کر دیا جائے گا۔ پس وہ عرض کرے گا کہ اے رب مجھے اس کے قریب پہنچا دے۔ اس کے سوا آپ سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ارشاد ہو گا۔ کہ اے ابن آدم کیا تو نے مجھ سے پختہ عہد نہیں کیا تھا کہ اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ عرض کرے گا بے شک اے رب عہد کیا تھا۔ حق تعالیٰ اُسے معذور قرار دے گا چنانچہ اسے درخت کے قریب کر دیا جائے گا۔ جب وہ اس درخت کے قریب ہو جائے گا تو اسے جنتیوں کی آوازیں سنائی دیں گی اور کہے گا کہ اے رب مجھے اس کے اندر پہنچا دیجئے۔ ارشاد ہو گا کہ اے ابن آدم آخر تیرا سوال کرنا کسی طرح ختم بھی ہو گا؟ کیا تو اس سے راضی ہو گا کہ تجھے دنیا کی بقدر جگہ دے دوں اور اس کے ساتھ اسی قدر اور دے دوں۔ وہ عرض کرے گا آپ مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں حالانکہ آپ رب العالمین ہیں۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا۔ میں جو کچھ چاہوں اس پر قادر ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے آخر میں ہے کہ جب وہ شخص جنت میں داخل ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جو تیری آرزو ہو لے لے۔ وہ آرزوئیں کرتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ تمنا کر لے، فلاں نعمت آرزو کر لے۔ فلاں چیز کی تمنا کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کو آرزوئیں یاد دلاتے جائیں گے یہاں تک کہ اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جو کچھ تو نے تمنائیں کی ہیں وہ سب تجھے دیا اور اسی قدر اور دیا۔ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے جو تمنائیں کی ہیں وہ سب تجھے دیا اور اس کا دس گنا اور دیا۔ نبی کریم صلعم نے فرمایا ادنیٰ جنتی وہ ہو گا جس کے لیے اسی ہزار خادم اور بہتر بیویاں ہوں گی۔ (ش۔ ح)

حنظلہ بن ابی عامر

آپ کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ آپ کا باپ قبیلے کا با اثر غیر مسلمان شخص تھا۔ حضرت حنظلہؓ بن ابی عامر مسلمان ہو گئے۔ مگر کسی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ جب آپ نے غزوۂ احد کے لئے نفیر عام سنی تو فوراً شمشیر بدست میدان جہاد میں پہنچ گئے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ جس وقت آپ نے غزوۂ احد کا اعلان نامہ سنا تو آپ اپنی زوجہ سے ہم بستر تھے اسی وقت اٹھے اور نہائے بغیر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ ابوسفیان بن حرب رئیس کفار سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ آپ اسے اٹھا کر زمین پر دے مارنا چاہتے تھے کہ شداد بن اسود لیثی نے دیکھ لیا اس نے پیچھے سے ایسا وار کیا کہ حضرت حنظلہؓ کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ حضرت حنظلہؓ چونکہ حالت جنابت میں شہید ہوئے تھے اس لئے فرشتوں نے آپ کو غسل دیا۔ حضورؐ نے جب یہ حالت دیکھی تو فوراً فرمایا "ان کی زوجہ سے دریافت کرو کیا بات تھی"؟ حضرت

حنظلہؓ کی بیوی نے پورا واقعہ بیان کیا۔ جس پر حضورؐ نے ارشاد کیا "اسی وجہ سے ملائکہ غسل دے رہے تھے" اسی دن سے آپ کا لقب "غسیل الملائکہ" پڑ گیا۔

حنظلہ بن ربیع

رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب۔ آپ کی کنیت ابو ربعی تھی حضورؐ نے آپ کو غزوۂ طائف سے پہلے بنی ثقیف کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جنگ قادسیہ میں شرکت کی۔ کچھ عرصہ کوفہ میں رہائش پذیر رہنے کے بعد قرقیسیا چلے گئے اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں وفات پائی۔ حنظلہ بن ربیعؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

حنظلہ بن صفوان کلبی

بنو امیہ کا ایک سپہ سالار اور والی۔ شوال ۱۰۲ھ / اپریل ۷۲۱ء میں یزید ثانی نے اس کے بھائی بشر بن صفوان کی جگہ مصر کا والی مقرر کیا۔ اس نے مصر میں تین سال تک حکومت کی۔ اپنے دورِ حکومت میں اس نے مجسموں کو مسمار اور تصویروں کو مٹوا دیا۔ ہشام نے اسے والیٔ مصر کے عہدے سے برطرف کر دیا لیکن اس کے جانشین عبدالرحمٰن بن خالد کی نااہلی کے باعث دوبارہ حنظلہ بن صفوان بن زہیر الکلبی کو والیٔ مصر بنایا گیا۔ کیونکہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ صوبہ مصر پر بوزنطی ملیغار کر کے قبضہ کر لیں گے۔ اس کے دوبارہ یہ عہدہ سنبھالنے پر صوبے کے مغرب میں خارجی بربروں نے بغاوت کر دی۔ یہ حکومت کے لئے ایک سنگین خطرہ تھا۔ باغیوں نے عرب فوج کو کافی نقصان پہنچایا۔ افریقہ کے ایک گورنر کلثوم بن عیاض کو قتل کر دیا۔ ہشام کے حکم پر حنظلہ بن صفوان نے ایک بہت بڑی فوج کی مدد سے باغیوں کو شکست فاش دی۔

بنو امیہ کے زوال کے بعد ہونے والے ہنگاموں کے اثرات مغرب میں بھی محسوس کئے جانے لگے۔ اسی زمانے میں ایک غاصب عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری نے تونس میں بغاوت کر دی اور حنظلہ سے کہا کہ قیروان کا علاقہ اس کے حوالے کر دے۔ حنظلہ بن صفوان نے مذہبی رواداری کے پیش نظر کسی مزاحمت کے بغیر تمام علاقہ اسے دیدیا اور خود دمشق کی طرف چلا گیا۔

حنفی

مسلمانوں کا ایک فرقہ۔ حنفی کی جمع احناف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت نے اس کی ابتدا کی اور یہی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ سے پہلے بہت سے صحابہ نے استنباط اور اجتہاد سے کام کیا اور مجتہد اور فقیہہ کہلائے۔

فقہ حنفی کے ابتدائی ماخذوں میں مندرجہ ذیل تین چیزیں ہیں :۔

۱۔ امام صاحب کی اپنی کتابیں اور فتوے۔

۲۔ مجلس فقہہ کے فیصلے (یہ مجلس فقہ، امام ابو حنیفہؒ نے غیر سرکاری طور پر شریعت کی تدوین کے لئے قائم کی تھی)

۳۔ ان کے علاوہ آپ کے نامور شاگردوں مثلاً قاضی ابو یوسفؒ، امام محمد بن الحسن اور امام زُفرؒ کی تمام تصانیف اور آراء

آپ کے شاگردوں میں سے امام ابو یوسفؒ نے حنفی فقہ کے استحکام اور تدوین کے لئے بہت کام کیا۔ ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں کچھ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں ایک کتاب "الخراج" بھی شامل ہے۔ یہ کتاب بہت بہترین ہے۔ خود امام ابو حنیفہؒ بھی سمجھتے ہیں کہ فقہ حنفی کو اس [illegible]

قوانین کا مجموعہ ہے۔ امام [illegible] بہترین منتظم تھے۔ اسی لئے انہوں نے قاضی [illegible] میں بھی نافذ کر دیا۔

حنیفہؒ کا قول ہے "میرے شاگردوں میں سے جس نے سب سے زیادہ علم حاصل کیا وہ ابو یوسفؒ ہے"۔

فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب فتاویٰ عالمگیریہ ہے۔ یہ کتاب [illegible] فتاویٰ کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں حنفی مذہب کے بارے میں لکھی گئی تمام کتابوں سے انتخابات شامل ہیں۔

فقہ حنفی کے لوگوں کو اہل الرائے بھی کہا جاتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب سیرۃ النعمان میں لکھا ہے کہ "امام صاحب نے فقہ کی تدوین کی تو اس میں ہزاروں مسئلے پیش آئے۔ جس میں کوئی صحیح حدیث یا صحابہ کا قول بھی موجود نہ تھا۔ اس لئے انہیں قیاس سے کام لینا پڑا۔ ان سے پہلے بھی قیاس کیا جاتا تھا لیکن اس وقت مسائل اتنی کثرت کے ساتھ موجود نہیں تھے۔

امام مالکؒ بھی رائے میں اعتقاد رکھتے تھے اور اہل الرائے میں شامل خیال کئے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے پیروؤں کو قیاس کی زیادتی کے باعث اہل الرائے کا لقب دیا گیا۔ ویسے بھی قرآن اور حدیث کے بعد قیاس کا عمل بذات خود کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ صحابہ کرامؓ بھی اکثر قرآن و حدیث میں کوئی تصریح نہ پا کر مجبوراً قیاس کرتے تھے جسے عام زبان میں رائے کہا جاتا ہے۔

فقہ حنفی میں ایک اور متنازعہ بات مسئلہ تقلید ہے۔ سقوط بغداد کے بعد سیاسی مرکزیت کے زوال کے ساتھ ساتھ فقہ کی روح بھی کمزور ہو گئی تو بعض علماء تقلید شخصی پسند کرنے لگے اور اس طرح انہوں نے اجتہاد کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے۔ تقلید پر اصرار کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس وقت بے شمار فرقے وجود میں آ چکے تھے جس کے باعث خیالات میں [illegible] علاوہ اجتہاد کے لئے جس بلند معیار اور علم و تقویٰ کی ضرورت تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا تھا اسی لئے احناف اجتہاد کے خلاف ہیں۔

حنفی فقہ کے قبول عام کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ امام ابو حنیفہؒ کا طریقہ فقہ، انسانی ضرورتوں کی موجودگی میں نہایت موزوں اور مناسب لگتا تھا اور خاص طور پر اس وقت کی تہذیب سے بھی اس طریقہ فقہ کو بہت مناسبت تھی۔

حنفی، امام

دیکھئے ابو حنیفہ، امام

حنیف

دین حق کا حامی اور ماننے والا۔ وہ شخص جو باطل سے حق کی جانب مائل ہو اور اس پر قائم رہے۔ خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دین کے بارے میں یہ لفظ قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ اس کے مقابلے میں بت پرستوں کا تذکرہ ہے۔ حنفاء الہی [illegible] صعوبتیں اور تکلیف برداشت کرنے کے باوجود [illegible] ابن ہشام کی ایک روایت ہے کہ حنیف کے معنی مسلمان کے ہیں اس لئے اسلام کو حنیفیۃ السمحۃ اور حنیفیۃ الفطرۃ کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر کچھ اس طرح آیا ہے [illegible]

"(اے پیغمبر) تم لوگوں سے کہہ دو کہ تم ابراہیم [illegible] (خدا) کے ہو رہے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے [illegible]"

Marfat.com

...آپ ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ ایک یکسو فرمانبردار تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" (سورۂ آل عمران - ع ۷)

"بلاشبہ ابراہیمؑ لوگوں کے پیشوا ہوگزرے ہیں۔ خدا کے فرمانبردار بندے جو یکسو خدا کے ہو رہے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔" (سورۂ نحل - ع ۱۶)

حنین بن اسحاق

ایک حکیم اور مترجم۔ آپ کا تعلق مسیحی عرب قبیلہ عباد کے ایک گھرانے سے تھا۔ حیرہ میں ۱۹۴ھ/ ۸۰۹ء، ۸۱۰ء یا ۱۹۲ھ/ ۸۰۸ء میں پیدا ہوئے ان کے والد عطار تھے آپ ایک طبیب اور یونانی و بعض دوسری زبانوں سے عربی میں تراجم کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں۔ عمر کے ابتدائی ایام میں آپ بغداد آگئے اور یہاں مشہور طبیب یوحنا ماسویہ کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ اور علم طب میں مہارت حاصل کی۔ آپ کے تراجم بہت مقبول ہوئے۔ چنانچہ المامون نے آپ کو دیوان الترجمہ کا انچارج بنا دیا۔ اور ان کی ہر ترجمہ شدہ کتاب کے وزن کے برابر سونا تول کر انہیں دیا جانے لگا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ آپ نے بعد میں زیادہ سونا حاصل کرنے کے لئے موٹا کاغذ اور جلی قلم کا استعمال شروع کر دیا۔ بعد میں خلیفہ المتوکل نے انہیں اپنا طبیب بنا لیا۔

حنین طبعاًبت پرستی کے خلاف تھے اس لئے اسقف تھیوڈوسس (THEDOSIUS) نے کفر کے شبہ میں انہیں دائرہ عیسائیت سے خارج کر دیا۔ اس رنج کے باعث حنین نے زہر کھا کر صفر ۲۶۰ھ/ دسمبر ۸۷۳ء میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

آپ کی لکھی ہوئی جو کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان میں سے ایک 'المسائل الطب للمتعلمین' ہے جس کا لاطینی اور عبرانی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب 'اجتماعات الفلاسفیہ فی بیوت الحکمۃ فی الاعیاد و تفاوض الحکمۃ بینہم' ہے انہوں نے امراض چشم اور ان کے علاج پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں اس کے علاوہ دانتوں، معدے اور بلغم سے متعلق لکھی گئی کتابوں کے بارے میں بھی ذکر ملتا ہے لیکن یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ترجموں میں زیادہ تر افلاطون ارسطاطالیس اور بقراط کی کتابیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ دیسقوریدوس (DIOCSORIDES) کی لکھی ہوئی کتاب مخزن الادویہ کا ترجمہ بھی انہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حکیم جالینوس کی کتابوں کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جس کی حنین بن اسحاق نے اصلاح یا ترجمہ نہ کیا ہو۔ ان کے تراجم بھی انہی سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

حنین، غزوہ

مکہ سے کوئی بیس پچیس میل دور ایک وادی تھی جس کا نام حنین تھا۔ یہاں پر ہوازن اور ثقیف دو قبیلے آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے اپنے آپ کو بہت جنگجو اور بہادر سمجھتے تھے۔ اسی لئے جب حضورؐ نے مکہ فتح کیا تو یہ دونوں قبیلے بجائے قبول اسلام کے مکہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ ہوازن کے رئیس اعظم مالک بن عوف النضری نے جو تیس سال کا پر جوش جوان تھا سب سے پہلے جنگ کا فیصلہ کیا اور تمام قبائلی لڑنے والوں کو اس جنگ میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ بنو جشم اور بنو نضر قبیلے بالکل مطیع ہو کر اس میں شامل ہوگئے۔ بنو سعد بن بکر اور بنو ہلال میں سے بھی چند لوگ لڑائی کے لئے آگئے۔ ثقیف قبیلہ کے بھی تمام سردار اور رئیس افراد قبائل لشکر تھے۔

جب رسول اللہ کو ان کی تیاریوں کا علم ہوا تو آپ نے عبداللہ بن ابی حدرد کو حالات کی آگاہی کے لئے بھیجا وہ سب قبیلوں کے پاس گئے اور تمام حالات حضورؐ کے سامنے بیان کر دیئے جس کے بعد حضورؐ نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲ شوال ۸ ہجری مطابق ۶ جنوری ۶۳۰ء کو آپ ۱۲ ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے وادی حنین پہنچ گئے۔ یہاں کفار نے اپنی کمین گاہوں سے اسلامی لشکر پر حملہ کر دیا جس سے لشکر ہراساں ہو گیا اور دو ہزار نو مسلم افراد گھبرا کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جنہیں دیکھ کر لشکر میں شامل کچھ غیر مسلم اور دوسرے مسلمان بھی منتشر ہونے لگے حضورؐ کے گرد چند جاں نثار صحابہؓ میدان میں بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔ اس موقع پر رسولؐ خدا خود بھی ہاتھ میں تلوار لئے رجز پڑھ رہے تھے۔ انا النبی لاکذب، انا ابن المطلب،

حضرت انسؓ کی والدہ اُم سلیمؓ بھی ثابت قدم اصحاب میں شامل تھیں۔ وہ اپنے شوہر ابو طلحہؓ کے ہمراہ آئی تھیں۔ آپ نے کمر کو چادر سے کس کر باندھ رکھا تھا اور اونٹ کی نکیل کو کھینچ کر اس کے نتھنوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں تاکہ وہ بے قابو نہ ہو اور ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی طرف سے سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور کافروں کی یہی جزا ہے۔" (سورۃ التوبہ: ۲۶)

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا "زور سے پکارو اے گروہ انصار اے حدیبیہ میں درخت کے زیر سایہ بیعت کرنے والو!"

ابن ہشام سے روایت ہے کہ جونہی حضرت عباسؓ نے پکارا تو جس جس نے بھی اُن کی آواز سنی وہ لبیک لبیک کہتا ہوا واپس مڑا۔ جس کا اونٹ نہ مڑ سکا وہ ڈھال اور تلوار لے کر اونٹ سے اتر گیا۔ اس طرح پلک جھپکتے ہی میں ایک بہت بڑا گروہ حضورؐ کے گرد جمع ہو گیا۔ اور اپنے مخالفوں پر اس زور سے حملہ در ہوا کہ دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور تمام کفار سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں میدان خالی ہو گیا اور جگہ جگہ مال واسباب اور دشمنوں کے اہل و عیال بیٹھے رہ گئے۔ دشمنوں نے بھاگتے وقت اپنے تمام مال واسباب اور اہل و عیال تک کی پرواہ نہ کی۔ چنانچہ یہ تمام مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ حضورؐ نے بھاگنے والوں کے تعاقب کا انتظام فرمایا اور ابو عامر اشعریؓ کو اوطاس کی طرف مامور فرمایا انہوں نے بہت سے کافروں کو جہنم واصل کیا۔ لیکن آخر میں سلمہ بن دُرید کے تیر سے مہلک زخم لگا جس کے باعث آپ نے شہادت پائی۔ ابو عامر نے اپنی شہادت سے پہلے ہی اس کام پر ابو موسیٰ کو مقرر کر دیا تھا۔ بالآخر ابو عامر اشعریؓ کو نیزہ مارنے والے سلمہ بن درید کو بھی قتل کر دیا گیا۔ یہاں سے مسلمان یہ تمام علاقہ فتح کرتے ہوئے طائف پہنچ گئے۔ اس غزوہ میں جو مال غنیمت ہاتھ لگا اسے جعرانہ بھیج دیا گیا۔ ہوزان قبیلہ کے کچھ لوگ اوطاس میں جا کر جمع ہو گئے تھے مسلمانوں نے وہاں جا کر انہیں شکست دی۔

اس غزوہ میں جو صحابہؓ شہید ہوئے وہ ایمنؓ بن عبید اسامہؓ کے سگے بھائی، یزیدؓ بن زمعہ، سراقہ بن حارثؓ انصاری اور ابو عامر اشعریؓ ہیں۔

اس غزوہ میں چھ ہزار عورتیں اور بچے قیدی بنا لئے گئے۔ بے شمار اونٹ، بھیڑ بکریاں، تقریباً چالیس ہزار اوقیہ چاندی اور دوسرا سامان حرب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

Marfat.com

حوّا

حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ۔ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کے سوتے وقت ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن ان کی پیدائش کے اس عمل کے دوران میں آدمؑ کو کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ علماء کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حوّا کو پیدا کرنے کا یہ طریقہ اس وجہ سے اختیار کیا کہ اس کے ذریعے میاں بیوی کی زندگی میں خوشگواری اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ آپ کا نام حوّا اس لئے رکھا گیا کیونکہ وہ ایک زندہ ہستی سے پیدا کی گئی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ انہیں حوّا اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر آدمی کی ماں ہے۔ خداوند کریم نے حضرت آدمؑ اور حوّا کو جنت میں رہنے کا حکم دیا اور انہیں ایک خاص درخت کے پاس جانے اور اس کا پھل کھانے سے منع فرما دیا۔ لیکن ابلیس نے ان دونوں کو شجر ممنوعہ کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر انہیں اس بات پر کہ اس درخت کا پھل کھانے پر بھی آمادہ کر لیا۔ بالآخر دونوں نے وہ پھل کھا لیا جس کے نتیجے میں انہیں اپنی عریانیت کا احساس ہونے لگا اور انہوں نے جنت میں موجود مختلف درختوں کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپنے کی کوشش شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کے بعد حضرت آدمؑ اور حوّا کو جنت سے زمین پر اتار دیا۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت آدمؑ ہندوستان کی سرزمین پر اترے اور حضرت حوّا جدہ میں۔ بعد میں دونوں کی ملاقات مزدلفہ میں ہوئی۔

جنت سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا نے جا کر حج کیا اور بہت سی دوسری دینی رسمیں ادا کیں۔ حضرت آدمؑ نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ تمام بنی نوع انسان انہی دونوں کی اولاد ہیں حضرت حوّا اور آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا قصہ قرآن مجید کی سورت المائدہ میں موجود ہے حضرت آدمؑ کی وفات کے دو سو سال بعد حوّا کا بھی انتقال ہو گیا۔ آپ حضرت آدمؑ کے پہلو میں دفن ہوئیں۔

حواری

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی۔ قرآن پاک کی سورت آل عمران میں لفظ حواریّون آیا ہے جو انہی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر سورۃ نسا میں یوں آیا ہے "جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان (یہودیوں) سے انکار محسوس کیا تو کہا کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کریں گے۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کی راہ میں مدد دینے والے ہیں"

لفظ حواری حور سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں خالص سفیدی۔ اسی وجہ سے خالص اور صاف دل دوستوں کو بھی حواری کہا جا سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے ساتھ چونکہ صاف دل تھے اسی وجہ سے حواری کہلائے۔

اکثر ماہرین لغت کا خیال ہے کہ حواری کا مطلب دھوبی ہوتا ہے جو کپڑوں کو میل کچیل سے پاک کرتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بھی ایک طرح کے دھوبی تھے جو لوگوں کو گناہوں کے میل سے پاک صاف کیا کرتے تھے۔

لسان نے نبی کی بڑھ چڑھ کر مدد کرنے والے کو حواری گردانا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں کے نام کچھ یوں ہیں۔ (۱) شمعون یعنی پطرس (۲) اندریس جو شمعون کا بھائی تھا (۳) یعقوب بن زبدی (۴) یوحنا (۵) فلپس (۶) برتھلمائی (۷) توما (۸) متی [illegible] (۹) [illegible] (۱۰) [illegible] (۱۱) شمعون قنائی (۱۲) یہودا اسکریوطی [illegible]

بقول متی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے [illegible] کی طرف نہ جانا بلکہ صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کر دینا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے"

آج کل انجیل کے جو مختلف نسخے ملتے ہیں ان میں بارہ حواریوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں لکھی [redacted] نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ متی سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بارہ حواریوں کے بارے میں فرمایا کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو، بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے"

انجیلوں میں ان حواریوں کی ذاتی کمزوریوں کے بارے میں بھی مختلف بیانات ملتے ہیں مثلاً یہودا اسکریوطی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو تھوڑی سے رقم کے عوض یہودیوں کے ہاتھ پکڑوا دیا تھا۔ لیکن قرآن میں ان کے بارے میں ایسی باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا البتہ ان کی خوبیوں کا تذکرہ کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔

حوالہ

علم فقہ کی ایک اصطلاح۔ اگر کوئی شخص اپنا قرض کسی تحریر یا ضمانت کے ذریعے سے دوسرے شخص کو منتقل کر دے تو اس تحریر یا ضمانت کو حوالہ کہا جاتا ہے اہل سنت والجماعت کے علماء کہتے ہیں کہ کسی کا قرض دوسرے پر ہو اور دوسرا فرد اپنے قرض کا حوالہ کسی تیسرے پر کرنا چاہے تو یہ بالکل درست ہو گا لیکن جس کے لئے حوالہ کیا جا رہا ہو اسے اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو اسے قبول کرے یا انکار کر دے لیکن جس پر حوالہ کیا جا رہا ہو تو اسے سوائے قبول کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ امام مالک حوالے کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر محال (جس کے لئے حوالہ کیا جائے) محال علیہ (جس پر حوالہ کیا جا رہا ہے) کا دشمن ہو تو پھر یہ لازم نہیں کہ وہ حوالے کو قبول کرے۔

حور

بہت زیادہ گوری چٹی عورت جس کی آنکھوں کی پتلیاں چمکدار سیاہ ہوں۔ قرآن مجید کی بہت سی سورتوں اور آیات میں حوران بہشت کا ذکر آیا ہے۔ جن سے پتہ چلتا [redacted] گی، جو بے انتہا خوبصورت ہوں گی اور بد اخلاقی [redacted] کدورت جیسی آلودگیوں سے یکسر پاک ہوں گی۔ ان کی دوشیزگی کا یہ عالم ہو گا کہ انہیں کسی جن و بشر نے اس سے پہلے چھوا تک نہ ہو گا۔ ان کی آنکھیں موتی کی طرح چمکدار اور یاقوت و مرجان سے ملتی جلتی ہوں گی۔ قرآن مجید کی سورۃ الدخان میں آیا ہے "اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں ان سے بیاہ دیں گے"

علماء نے حوروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں [illegible] حوران جنّ۔ اس کے علاوہ [illegible]

Marfat.com

[illegible] اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن پاک میں حوران جنت کے بارے میں جو الفاظ آئے ہیں حقیقت میں ان سے مراد جنت کی لذتیں اور خوشیاں مراد ہیں جن کے اظہار کے لیے یہ مادی اور جسمانی استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔

قرآن مجید کی مختلف آیات میں حوروں کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان کی تفسیر حسن بصری نے اس طرح کی ہے کہ حوریں دراصل اولاد آدم کی نیک عورتیں ہیں۔"

قرآن مجید کی ایک آیت "زَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ"

ترجمہ: "خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے" میں لفظ زَوَّجْنَا کے لفظ سے ہمارا ذہن شادی یا نکاح کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ لیکن یونس کہتے ہیں کہ جنت میں نکاح نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ اہل جنت کو حوروں سے ملا دیا گیا۔ اور انسانوں کو ان کا ساتھی بنا دیا گیا ہے۔

[illegible]

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آیا ہے جن میں حوروں کی بے شمار صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام صفات ہمارے تصور سے بلند ہیں۔

حوریں درحقیقت جنت کی نعمتوں میں شامل ہیں۔ جس طرح ہم جنت کے پھلوں کو دنیاوی پھلوں پر، جنت کے پانی، دودھ، نہروں اور چشموں کو دنیا کے پانی، دودھ، نہروں اور چشموں پر فوقیت دیتے ہیں اور ان کی لذت یا مٹھاس کا درست اندازہ لگانے سے قاصر ہیں بالکل اسی طرح جنت کی حوروں کے بارے میں دنیا کی عورتوں کو سامنے رکھ کر کوئی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ جس طرح جنت کے پھل، دودھ، شہد اور دوسری نعمتیں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہیں اسی طرح حوریں بھی مردوں اور عورتوں کے لیے ہیں، لفظ حور صرف حسن، خوبصورتی، لذت اور سرور کے لئے بطور تمثیل استعمال ہوا ہے۔

حوض کوثر

جنت میں موجود ایک حوض۔ حوض کوثر کے بارے میں بہت سی احادیث بھی ملتی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نے شب معراج کا ذکر کرتے ہوئے بتایا "میں ایک حوض کے پاس سے گزرا۔ اس کے کنارے موتیوں کی طرح خوبصورت تھے۔ میں نے جبرائیل سے کہا! یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ حوض کوثر جو آپ کے اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ اس کی مٹی مشک کی طرح خوشبودار تھی۔"

ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے۔ حضور نے فرمایا: "میرا حوض ایک مہینے کے سفر کی مسافت جتنا لمبا ہو گا۔ اور اس کے سب کنارے برابر ہوں گے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، مشک و عنبر سے زیادہ خوشبودار، اور اس کے کنارے پر پینے کے برتن آسمان پر موجود ستاروں سے زیادہ ہوں گے۔ حوض کوثر کا پانی جو بھی پیئے گا وہ کبھی پیاسا نہ رہے گا۔" حضور نے ایک روز فرمایا کہ قیامت کے روز تمام مومنین کو ایک جگہ پر جمع کیا جائے گا وہ سب لوگ نجات کے خواستگار ہوں گے اور خواہش کریں گے کہ کاش کوئی شخص ان کی اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کرے اور انہیں یہاں سے نجات دلائے۔ پھر وہ حضرت آدمؑ کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ ابوالبشر ہیں آپ کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اور تمام ملائکہ نے آپ کو سجدہ بھی کیا تھا۔ پھر آپ کو ہر شے کے نام سکھائے اس لیے آپ ہماری شفاعت کریں۔ تاکہ ہمیں یہاں سے نجات ملے۔ وہ جواب دیں گے مگر میں اب تو کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ پھر آپ اس غلطی کا ذکر کریں گے جو شجر ممنوعہ کے پاس جانے کے باعث آپ سے سرزد ہو چکی تھی۔ اور کہیں گے کہ نوحؑ کے پاس جاؤ۔ خدا نے انھیں اپنا برگزیدہ پیغمبر بنایا تھا۔ پھر وہ تمام لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے لیکن حضرت نوحؑ بھی سفارش کرنے سے مجبوری کا اظہار کر دیں گے اور حضرت موسیٰؑ کے پاس بھیجیں گے۔ حضرت موسیٰؑ بھی ان سب لوگوں کی سفارش کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کے پاس بھیجیں گے۔ جب یہ تمام لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پاس جائیں گے تو وہ لوگوں سے کہیں گے کہ تم لوگ حضرت محمد رسول اللہؐ کے پاس جاؤ وہی تمہاری شفاعت کر سکتے ہیں، وہ مقرب الٰہی ہیں۔ چنانچہ پھر سب کے سب میرے پاس آئیں گے اور میں ان کی شفاعت کے لیے خدا کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کروں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے حاضر ہونے کی اجازت دیں گے تو میں خدا کو دیکھتے ہی سجدے میں گر جاؤں گا اور اس وقت تک سجدے ہی میں رہوں گا جب تک وہ مجھ سے یہ نہ کہے گا کہ اے محمدؐ اپنا سر اٹھاؤ جو چاہتے ہو کہو۔ میں سب سنوں گا اور آپ کی شفاعت قبول کروں گا۔ میں خدا کی حمد و ثنا کے بعد لوگوں کی سفارش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ میری سفارش قبول کریں گے اور ایک حد مقرر کر دی جائے گی میں باہر آ کر ان لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو جنت میں داخل کروں گا۔ اسی طرح تین مرتبہ میں خدا کے پاس ان لوگوں کی شفاعت کے لیے جاؤں گا، یہاں تک کہ وہ تمام لوگ جنت میں چلے جائیں گے جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ایک آیت تلاوت کی۔

"یہی وہ مقام محمود ہے جس کا تمہارے نبیؐ سے وعدہ ہو چکا ہے۔"

ہر جنتی اس حوض کوثر سے پانی پی سکے گا جو اتنا لذیذ و شیریں ہے کہ دنیا کی کوئی شئے اتنی لذیذ اور شیریں نہیں ہے۔ حضرت سہل بن سعدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں حوض کوثر کی نگرانی کروں گا اور جو میرے قریب سے گزرے گا وہ سیراب ہو گا اور جس نے اس کا پانی پی لیا وہ پھر کبھی پیاسا نہ ہو گا۔ اس وقت میرے پاس کئی گروہ آئیں گے جن کو میں جانتا ہوں گا۔ وہ بھی مجھے پہچان لیں گے۔ مگر پھر میرے اور ان لوگوں کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا۔ اس وقت میں کہوں گا۔ یہ تو میرے امتی ہیں تب خدا کہے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ انہوں نے بدعتیں کیں۔ ان کی تباہی ہو۔ پھر میں بھی کہوں گا کہ ایسے لوگوں کی تباہی ہو جنہوں نے میرے بعد بدعتیں کیں۔
(متفق علیہ)

حیّ

دیکھئے اسماء الحسنیٰ

حیا

شرم کرنا۔ حیاء کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم نفسانی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں پیدا کیا ہے۔ جیسے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں برہنہ ہونے سے حیا

Marfat.com

کرنا یا لوگوں کی موجودگی میں جماع کرنے سے پرہیز کرنا وغیرہ۔ حیا کی دوسری قسم ایمان سے تعلق رکھتی ہے جس کی وجہ سے مسلمان اللہ تعالیٰ کے خوف سے گناہ کرنے سے بچا رہتا ہے۔

حیا کی فضیلت کے بارے میں حضور اکرمؐ کی کئی احادیث ملتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "حیا ایمان کی شاخ ہے"۔ ایک اور حدیث ہے "حیا بھلائی ہی بھلائی ہے"۔ ایک اور موقع پر آپ نے اسلام کی صفات گناتے ہوئے کہا کہ "اسلام کی صفت حیا ہے"۔

ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی صفت ہوتی ہے۔ حیا کو اسلام میں اتنا دخل ہے کہ حضورؐ نے اسے اسلام کی ایک صفت قرار دیا۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ کا گذر ایک انصاری شخص کے قریب سے ہوا۔ وہ شخص اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا (کہ زیادہ حیا نہ کیا کر) حضورؐ نے فوراً اس سے کہا "اسے چھوڑ دے کیونکہ حیا ایمان کی شاخ ہے جس قدر زیادہ ہو بہتر ہے (صحیح بخاری)

ابن مسعود کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "سابق انبیاء کی باتوں میں جو بات بغیر کسی ترمیم اور تبدیلی کے باقی ہے وہ یہ ہے کہ جب تو شرم نہیں رکھتا تو جو چاہے کر۔ ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کنواری لڑکی سے زیادہ شرمیلے تھے جو ہر وقت پردے میں رہتی ہے۔ رسولِ اکرم جب کسی ایسی چیز کو دیکھتے جو آپ کو ناگوار معلوم ہوتی تو (اگرچہ آپ شرم کی وجہ سے ناگواری کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر) ہم لوگ اسے آپ کے چہرہ مبارک ہی سے معلوم کر لیتے تھے۔ (صحیح بخاری)

حیا کرنے کے بارے میں جہاں ہمیں احکامات یا احادیث ملتی ہیں وہاں بعض جگہ حیا نہ کرنے کے بارے میں احکامات ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ حق کہنے میں حیا نہیں کرتا"۔ پس حق بات کہنے میں حیا یا شرم کو آڑے نہیں آنا چاہیئے۔

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور اہلِ ایمان بہشت میں جائیں گے جبکہ بے حیائی اکھڑپن ہے اور اکھڑ لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے"۔

حیات المیر قادری

پورا نام جمال حیات امیر قادری تھا۔ حضرت سید نصر آپ کے بھائی اور حضرت غوث الاعظم آپ کے دادا ہیں۔ آپ کے بارے میں خزینۃ الاصفیاء کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری نے حضرت شاہ ابوالمعالی قادری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ حیات المیرؒ قادری شکل و صورت میں حضرت غوث الاعظمؒ سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ بہت خوبصورت تھے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ابھی تک زندہ ہیں کیونکہ حضرت غوث الاعظمؒ نے اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کی حیات جاوداں کے لئے دعا کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ مخازن صفات الاولیاء کے مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ حیات المیر سے جب بھی عمر کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے کہا کہ مجھے حضرت غوث الاعظمؒ کبھی کبھار گود میں بٹھا لیتے اور محبت بھرے جذبات کے ساتھ سینے سے چمٹا لیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کی ملاقات حضرت امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوگی اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو میرا بھی سلام کہنا۔

آپ لاہور تشریف لائے تو قبرستان میانی صاحب کے احاطہ ہی میں ٹھہرے۔ آپ نے

فیض حاصل کیا ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ کہتے ہیں وہ ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ فیض حاصل کیا یہاں تک کہ لاہور میں آپ تب تک فیض عام ہوگیا۔

بہت سے لوگوں نے آپ کی پیدائش کے بارے میں تحقیق کی جو تحقیقات چشتی کے مطابق آپ کی ولادت ۳ رمضان ۵۲۸ھ (۱۱۳۳ء) کو ہوئی۔ سکینۃ الاولیاء کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے اپنی وفات سے پہلے حیات المیر کو اپنے پاس بلایا اور کہا آپ کی عمر بہت لمبی ہوگی۔ یہاں تک کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور جب یہ موقع آئے تو انہیں ہمارا سلام کہنا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بری امام قادریؒ آپ کے خلیفہ تھے۔ مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنی کتاب "حدیقۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ آپ نے حضرت حیات المیر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

حیات بعد موت

پرانے زمانے میں قومیں زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ لوگ موت کو ایک لمبی نیند سے تعبیر کرتے تھے اور مردے کے ساتھ اس کی روزمرہ ضروریات کی تمام اشیاء دفن کر دیتے تھے تاکہ نیند سے جاگنے کے بعد اسے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ پرانے زمانے کے مصر میں اس کے آثار اہرامِ مصر کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ جن میں اس وقت کے بادشاہوں کو دفن کیا گیا تھا۔ وادیٔ سندھ، سومیری اور اشوری قوموں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد انسان کو ظلمات کی ملکہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ لوحِ محفوظ کی مدد سے انسان کے عملوں کا محاسبہ کرتی ہے اور اگر اعمال نیک ہوں تو اسے جنت میں بھیج دیتی ہے لیکن اگر اعمال بد ہوں تو اس کے لئے جہنم کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ہندو بھی آواگون (تناسخ) کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آتما (روح) امر ہوتی ہے اور انسان کے اعمال کے مطابق جون بدلتی رہتی ہے۔ اور آخر کار دیوتا بن جاتی ہے۔ بدھ مذہب کے ماننے والے افراد حیات بعد الممات کو نہیں مانتے۔

اسلام کے بنیادی ارکان میں حیات بعد الممات بھی شامل ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ:

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا۔ وہی تمہیں زندگی عطا کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے"۔ (البقرہ۔ آیت ۲۸)

قرآن مجید میں حیاۃ الدنیا کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ جو دنیاوی زندگی اور آخرت کے بعد کی زندگی میں واضح فرق بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق زندگی کے حسن و جمال سے بھرپور ہے لیکن اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے آئندہ کی زندگی کے لئے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ قرآن میں آیا ہے کہ:

"دنیاوی زندگی اُخروی زندگی کے مقابلے میں صرف کھیل کود کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ حقیقی زندگی کو دوام حاصل ہے"۔

قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کو بار بار ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ بناتی ہے اور انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ تمام ۔۔۔ [illegible]

Marfat.com

[illegible] ہے۔ [illegible] فیصلہ سامنے آتا ہے وہ ان عملوں کو جو اس نے کئے ہوتے ہیں دیکھتا ہے۔ اوران کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے وہ کبھی موجود ہی نہ تھی۔ [illegible] دنیاوی زندگی ہی [illegible] لیتے اور جزا و سزا اور آخرت کی زندگی سے بے نیاز ہو جانے [illegible] ہے۔ لیکن اسلام دنیاوی زندگی کی مذمت نہیں کرتا۔ کیونکہ اس زندگی کے اعمال پر آئندہ زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ بقر میں آیا ہے کہ " اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک بستی میں ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا۔ یہ آبادی ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا ؟ اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی۔ اور وہ سو سال تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا۔ " بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو ؟ " اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔" فرمایا۔ " تم پر سو سال اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں "۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا۔ " میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے "۔ (سورۂ بقر آیت ۲۸۵)

اس سے ہمیں علم ہو جاتا ہے کہ خدا نے حیات بعدالموت کے عقیدے کو انسانوں کے لئے ماننا ضروری بنا دیا ہے۔ اس واقعے میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی نبی ہو لیکن ان کا نام کہیں نہیں آیا۔

اللہ تعالٰے نے اسی لئے شہید کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے قرآن مجید میں آیا ہے :

" جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو وہ حقیقت میں زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم اور مطمئن ہیں۔ (آل عمران۔ آیت ۱۶۹)

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ موت کا لفظ اور اس کا تصور انسان کے ذہن پر ایک ہمت شکن اثر ڈالتا ہے اسی لئے اللہ تعالٰے نے لوگوں کو اس اثر سے بچانے کے لئے بھی شہدا کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اور ان کے ذہنوں میں یہ تصور اجاگر کر دیا ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے وہ حقیقت میں حیات جاوداں پاتا ہے۔

حیدر

حضرت علیؓ ابن ابی طالب کا ایک نام جو آپ کی والدہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد نے رکھا تھا۔ ۷ھ میں خیبر کی لڑائی میں حضرت علیؓ نے مرحب یہودی کے جوابی رجز میں اپنا یہ نام استعمال فرمایا تھا۔ حیدر کرار آپ کا نام شجاعت اور فتح خیبر کی وجہ سے زبان زد ہے۔ آنحضرت صلعم نے اسی موقع پر فرمایا تھا کہ کل انشاء اللہ جھنڈا اس مرد کو دوں گا جو کرار (بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا) اور نہ بھاگنے والا ہوگا۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوگا۔ اللہ اور اس کا رسولؐ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔ وہ میدان سے اس وقت تک واپس نہ آئے گا جب (خیبر) تک اللہ اس کے ہاتھوں فتح نہ کر دے۔ (ش۔ ج)

حیدر آباد دکن

غیر منقسم ہندوستان کی ایک ریاست۔ تقسیم کے بعد یہ ریاست انگریزوں کے اثر سے آزاد ہو گئی۔ بعد میں ہندوستان نے اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسے ہندوستان میں شمول سے پہلے آصفیہ سلطنت بھی کہتے تھے۔ اس سلطنت کی بنیاد مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت آصف جاہ صوبیدار نے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں رکھی۔ اس وقت یہ سلطنت دریائے نربدا سے ترچنا پلی اور کوکن سے مدراس تک پھیلی ہوئی تھی۔ انگریزوں نے آصف جاہ سے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیئے تھے اور یہاں تک کہ جب فرانسیسیوں نے مدراس کو چھیننا چاہا تو انہوں نے آصف جاہ سے امداد طلب کی۔

آصف جاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا مظفر جنگ حکمران بنا لیکن فسادیوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد آصف جاہ کا بیٹا صلابت جنگ ۱۷۵۱ء میں حکمران بن گیا۔ اس کے دور میں فرانسیسی کافی عروج حاصل کر چکے تھے۔ اسی دور میں مرہٹوں نے اس ریاست میں سر اٹھایا۔ اور ریاست کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اسی زمانے میں یورپ کی سیاست نے کروٹ بدلی اور فرانس کا اثر و رسوخ زائل ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی انگریزوں نے عروج حاصل کرنا شروع کر دیا۔ ۱۷۶۱ء میں صلابت جنگ کے وزیروں نے اسے قید کر لیا اور آصف جاہ کے چوتھے بیٹے نظام علی خاں کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے آصف جاہ ثانی کے نام سے حکومت کرنا شروع کر دی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کا قلع قمع کیا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آصف جاہ ثانی نے مرہٹوں کے مقبوضہ علاقوں کو پھر سے اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ اس کے انتقال کے بعد آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ تخت نشین ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں انگریزوں نے ریاست حیدر آباد کی داخلی سیاست میں اپنے قدم جما لیے تھے۔ چنانچہ جب وزیر ارسطو کا انتقال ہوا تو انہوں نے میر عالم کو وزیر مقرر کرا دیا۔ اس زمانے میں ریاست کا مالی نظام بگڑ گیا اور اس کا انتظام و انصرام چلانے کے لیے آصف جاہ ثالث کو قرض کی ضرورت پڑی۔ حیدر آباد میں ایک انگریز ساہوکار نے ۲۴٪ سود کی شرح پر قرض دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۳ء تک ریاست کے ذمہ ایک کروڑ سولہ لاکھ کا قرض واجب الادا ہو چکا تھا۔

آصف جاہ ثالث کے بعد آصف جاہ رابع نواب ناصر الدولہ اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں تخت پر بیٹھے۔ انہوں نے چندر لعل کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا۔ کیونکہ ریاست اس وقت تک دو کروڑ روپیہ کی مقروض ہو چکی تھی۔ انہوں نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ انگریزوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اور انہوں نے اس کی حکومت کو طرح طرح کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ پھر قرض کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ چنانچہ ۳۶ لاکھ سالانہ کی قسط مقرر کی گئی۔ ناصر الدولہ نے اسے اپنی تذلیل گردانا۔ اور تمام قرض کی ادائیگی کے لیے چار ماہ کی مہلت مانگی۔ انگریزوں نے اسے مہلت نہ دی بلکہ حیدر آباد پر چڑھائی کی دھمکی دی۔ اس کے بعد ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رو سے مئی ۱۸۵۳ء میں برار کا علاقہ انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں ناصر الدولہ کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ افضل الدولہ آصف جاہ خامس تخت نشین ہو گئے۔ جنگِ آزادی کے بعد حیدر آباد دکن انگریزوں کے دباؤ میں آ گیا اور مجبوراً انگریزوں

کی امداد و اعانت کرنا پڑی۔ اس کے بعد انگریزوں کا ریاست حیدر آباد میں اثر و رسوخ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۷ [illegible] ۱۹۲۷ کو انگریزوں نے ریاست حیدر آباد کو اپنا زیر دست علاقہ بنا لیا۔

حیدر آباد ریاست تعلیم کے میدان میں بہت پیش پیش نظر آتی ہے۔ یہاں ۱۲۲۷ھ/۱۸۰۸ء میں اعلیٰ مغربی تعلیم کا ایک کالج کھولا گیا جس میں ۱۹۰۷ء میں پہلی مرتبہ اعلیٰ مغربی تعلیم کا آغاز ہوا اور اسی دن سے مشرقی تعلیمی نظام رو بہ زوال ہونا شروع ہوا۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۶ء تک دارالعلوم کی ترقی

۱۸۶ فٹ بلند فن تعمیر کا شاہکار "چار مینار"

قرطبہ اور بغداد کا منظر پیش کرتی رہی۔ لیکن جب ۱۹۰۷ء میں اس کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع کر دیا۔ تو اس کی تمام تر ساکھ ختم ہو گئی۔ دو سال بعد حیدر آباد میں ایک جامعہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جو بالآخر آصف جاہ رابع میر عثمان علی کے عہد میں قائم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ ۱۳۲۶ھ/۱۹۱۸ء میں تقریباً قائم ہو چکی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کی تشکیل میں بارہ سال کا عرصہ لگا۔ جامعہ میں درس و تدریس کا ذریعہ اردو زبان کو بنایا گیا تھا اس لیے سب سے پہلے شعبہ دارالتصنیف و ترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور یورپی زبانوں کے اردو میں ترجمے کا کام شروع ہو گیا۔ ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ نے پہلا میٹرک کا امتحان اور ۱۹۲۲ء میں بی اے کا پہلا امتحان منعقد کیا اور ۱۹۲۵ء تک اس جامعہ سے ایم اے تک کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سلطنتِ آصفیہ کے زمانے میں یہاں کے فرمانرواؤں نے شعر و ادب کی سرپرستی کی۔ مشہور شعرا جو اس دور میں حیدر آباد دکن میں آئے ان میں مرزا داغ دہلوی، نواب [illegible] نے بھی اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اسی علاقے میں [illegible]

حیدر آباد

کراچی سے ۱۲۶ میل کے فاصلے پر واقع پاکستان کا چوتھا بڑا شہر مشہور ہے کہ حیدر آباد ایک قدیم شہر نیرون (یا نراں) کوٹ کی جگہ پر آباد ہے۔ اس شہر کو محمد بن قاسم الثقفی نے دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں فتح کیا تھا۔ لیکن موجودہ شہر حیدر آباد کی بنیاد زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس شہر کو ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑا نے بسایا تھا۔ اس نے ایک ٹیلے پر جو آج بھی حیدر آباد میں موجود ہے، ایک قلعہ بنوایا اور اس شہر کا نام حضرت علیؓ کے لقب پر حیدر آباد رکھا۔ آجکل یہ ٹیلہ گنجو ٹکر کے نام سے مشہور ہے۔ غلام شاہ کلہوڑا کا ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد حیدر آباد شہر پر تالپوروں کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے اسے اپنا دارالحکومت بنا لیا۔ نئے حاکم فتح علی خان نے اس شہر کو اپنی مرضی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرایا۔ حیدر آباد سندھ پر تالپوروں کا خاندان ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء تک حکمران رہا۔ میانی کی جنگ کے بعد تمام سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے اس علاقے کا دارالحکومت حیدر آباد سے کراچی منتقل کر دیا۔

حیدر آباد کی مشہور عمارتوں میں سندھ کے سابق حکمرانوں کے مقبرے ہیں جو میروں کے مقبرے کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ مقبرے ٹیلے کے شمالی جانب واقع ہیں اور کلہوڑوں کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے یہ شہر پاکستان کا حصہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں سندھ یونیورسٹی کو حیدر آباد منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۲ء سے سندھی زبان اور ادب کے فروغ اور قدیم سندھی مصنفین کی عربی اور فارسی تصانیف کی طباعت اور اشاعت کا ایک بورڈ بھی حیدر آباد ہی میں قائم ہوا۔ حیدر آباد کے مشرقی جانب پاکستان کا عظیم الشان غلام محمد بیراج ہے۔ اس کا افتتاح ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔

حیدر آباد پاکستان کے بڑے بڑے صنعتی مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس شہر میں کپڑا بننے کے بے شمار کارخانے ہیں۔ اس کے علاوہ شیشے کا سامان مٹی کے برتن، صندوق اور فرنیچر کی صنعتوں میں اس شہر کا ایک منفرد مقام ہے۔

یہاں کی زیادہ تر آبادی بلوچوں، سیدوں، راجپوتوں، جاٹوں، ہر نسل کے سندھیوں، میواتیوں اور مہاجروں پر مشتمل ہے۔ سندھی اور اردو عام بول چال کی زبانیں ہیں۔

حیدر بن علی

(ولادت ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء) حسینی رازی، ایرانی مؤرخ۔ ایک بڑی تاریخ عالم "تاریخ حیدری" کا مصنف۔ اس تصنیف کو جغرافیائی تقسیم کے مطابق پانچ حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ (۱) عالم عرب (۲) ایران (۳) وسطی ایشیا اور مشرق بعید (۴)، المغرب (۵) ہندوستان۔ یہ سیاسی تاریخ پر بحث کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی قدر و قیمت خاص طور پر ان معلومات کے لحاظ سے ہے جو وسطی ایشیا کے متعلق بہم پہنچاتی ہے۔ (م ع)

حیدر علی

حیدر علی سلطان (پیدائش ۱۷۲۲ء) جنوبی ہند کی سلطنتِ خداداد میسور کے بانی۔ آپ قریشی النسب تھے۔ آپ کا خاندان سولہویں صدی عیسوی میں مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے ہندوستان آیا۔ آپ کے والد شیخ فتح محمد جنوبی ہند کے مغل صوبیدار کے منصب دار تھے۔ آپ کی والدہ مجیدہ بیگم وہاں کے زمیندار اکبر علی خان کی دختر تھی۔ حیدر علی کی عمر پانچ برس کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی پرورش آپ کے چچا زاد بھائی حیدر صاحب نے کی جو میسور کی فوج میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے آپ کو فن سپاہ گری میں طاق کر دیا۔ حیدر علی نے سب سے پہلے کرناٹک کے نواب محمد علی والاجاہ کے بھائی عبدالوہاب کی ملازمت اختیار کی۔ بعد میں میسور کے راجہ نے آپ کو سرنگا پٹم میں ریاستی فوج کے ایک دستے کی کمان دے دی۔ کرناٹک کی جنگوں میں آپ کی جانبازی اور فوجی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ۱۷۵۲ء میں آپ کو ڈنڈیگل کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جس زمانے میں میسور کی فوجیں کرناٹک کی لڑائی میں مصروف تھیں، مرہٹہ پیشوا بالاجی باجی راؤ نے میسور پر حملہ کر دیا۔ راجا نے ایک کروڑ روپیہ دینے کا وعدہ کیا اور بطور ضمانت ریاست کا بیشتر حصہ مرہٹوں کی کفالت میں دے دیا۔ جب رقم ادا کی گئی تو مرہٹے ۱۷۵۵ء میں دوبارہ حملے کی سوچنے لگے۔ حیدر علی نے مطلوبہ رقم راجا کو فراہم کرکے دی جس پر راجا نے آپ کو فتح حیدر بہادر کا خطاب دیا اور میسور کی افواج کا سپہ سالار مقرر کرکے مرہٹوں سے معاملات طے کرنے کے کل اختیارات دے دیئے۔ حیدر علی نے صلح کی بجائے جنگ کا راستہ اختیار کیا۔ مرہٹہ فوج بھاگ نکلی۔ ۱۷۶۰ء میں حیدر علی نے مرہٹوں کے خلاف نظام دکن کے بھائی بسالت جنگ کو فوجی مدد دی اور قلعہ ہوسکوٹہ فتح کیا۔ اس کے عوض بسالت جنگ کی سفارش پر شہنشاہ دہلی نے سوبہ سرا کی صوبیداری کا فرمان حیدر علی کے نام جاری کر دیا۔ اگست ۱۷۶۰ء میں میسور کے وزیر کھنڈے راجا نے راجا کے ساتھ مل کر حیدر علی کو بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ حیدر علی نے اسے شکست دی اور سرنگا پٹم پر قبضہ کر لیا۔ کھنڈے راؤ کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا اور راجا کے مصارف کا انتظام کرکے حکومت کے اختیارات خود سنبھال لیے۔

اب حیدر علی نے نندی، بدنور اور منگلور کو فتح کرکے گوا پر چڑھائی کر دی۔ پرتگیزیوں نے کاروار کا علاقہ دے کر جان بچائی۔ اسی زمانے میں حیدر علی نے ایک بحری بیڑا تیار کرکے علی راجا کو امیر البحر مقرر کر دیا۔ علی راجا نے جزیرہ مالدیپ پر قبضہ کرکے راجا کی آنکھیں نکلوا دیں۔ حیدر علی نے اسے معزول کر دیا۔ اس پر نائروں نے بغاوت کر دی۔ حیدر علی انھیں شکست دیتا ہوا کالی کٹ تک پہنچ گیا۔ کالی کٹ کی تسخیر کے بعد کوچین کے راجا نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۷۶۳ء میں مرہٹوں نے پھر میسور کا رخ کیا اور بدنور پر قبضہ کر لیا لیکن حیدر علی کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گئے۔ حیدر علی کی فتوحات سے خوفزدہ ہو کر انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں سے اتحاد کر لیا۔ کرناٹک کا نواب بھی انگریزوں کی سرپرستی قبول کر چکا تھا۔ ان سب کی متحدہ فوجوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ یہ میسور کی پہلی جنگ (۱۷۶۷ء۔۱۷۶۹ء) کے نام سے معروف ہے۔ اس جنگ میں حیدر علی کو فتح ہوئی۔ انگریزی فوج سراسیمگی کی حالت میں سارا سامان چھوڑ کر بمبئی واپس ہو گئی۔ مرہٹے اور پھر نظام دونوں حیدر علی سے سمجھوتا کرکے جنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ نیا انگریز کمانڈر کرنل اوڈ منگلور کی طرف بڑھا تو حیدر علی نے اسے شکست دے کر اس کے اسلحہ اور تمام ضروری سامان پر قبضہ کر لیا۔ پھر کپتان نکسن کو ہزیمت دے کر ایروڈ بھی فتح کر لیا۔ ۱۷۶۹ء میں حیدر علی کی پیش کردہ شرائط پر انگریز صلح پر مجبور ہو گئے۔ طے پایا کہ فریقین آئندہ ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے۔ مقبوضہ علاقے اور قیدی واپس کر دیئے جائیں گے اور علاقہ کروڑ، جو پہلے نواب کرناٹک محمد علی کی ملکیت تھا، حیدر علی کے قبضے میں رہے گا۔

مزار حیدر علی

۱۷۷۰ء میں پیشوا مادھو راؤ نے میسور پر حملہ کر دیا۔ معاہدے کے مطابق انگریزوں نے حیدر علی کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی کو تنہا مرہٹوں کی کثیر فوج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مرہٹوں نے تمام مشرقی اور شمالی اضلاع فتح کر لیے۔ ۱۷۷۲ء میں پیشوا مر گیا۔ تو مرہٹہ سپہ سالار نے حیدر علی سے صلح کر لی۔ مرہٹوں کی واپسی کے بعد ۱۷۷۲ء میں حیدر علی نے کورگ، ۱۷۷۳ء میں ملیبار، کوچین اور نیلگری، ۱۷۷۴ء میں بلاری اور گتی، ۱۷۷۵ء میں بادامی، دھاڑواڑ اور چندرگ، ۱۷۷۹ء میں کڑپہ فتح کرکے ایک وسیع اور مستحکم ریاست قائم کر لی۔

۱۷۸۰ء میں میسور کی دوسری جنگ شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے معاہدہ مدراس کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس لیے حیدر علی فرانسیسیوں کے قریب ہو گئے۔ انگریزوں نے پانڈیچری فتح کرکے فرانسیسیوں کی دوسری بندرگاہ ماہی پر قبضہ کر لیا۔ یہ بندرگاہ حیدر علی کے مقبوضہ علاقے ملیبار میں واقع تھی۔ حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کر دیا اور آرکی، ترونور، کاویری پٹن، محمود بندر فتح کر لیا۔ ۱۷۸۱ء میں پولی پور کی مشہور لڑائی میں انگریزوں کی فوج کو شکست فاش دی اور سپہ سالار کرنل بیلی کے علاوہ دو ہزار سپاہی گرفتار کر لیے۔ پھر پیش قدمی کرتے ہوئے ویلور اور ارکاٹ کے مستحکم قلعے فتح کیے۔ انگریزوں کا ایک وفد صلح کی درخواست لے کر آیا لیکن حیدر علی نے وفد کو ناکام لوٹا دیا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے یہ دیکھ کر کہ کرناٹک پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا ہے اور رفتہ رفتہ مدراس کا علاقہ بھی ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، جنرل آئر کو سپہ سالار بنا کر مدراس روانہ کیا۔ لیکن چند روز میں ۱۷۸۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ کڈلور کے مقام پر شدید جنگ کے بعد انگریزوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور قلعہ آرنی پر بھی حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔ اس وقت جب انگریزوں کی حالت بہت کمزور تھی حیدر علی کا ارکاٹ کے قریب انتقال ہو گیا۔ حیدر علی کی میت کو سرنگا پٹم لا کر لال باغ میں دفن کیا گیا۔ جس پر ٹیپو سلطان نے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا۔ حیدر علی طویل قامت، گرانڈیل اور بارعب شخص تھا۔ ان پڑھ مگر ادب شناس تھے۔ آپ کی سلطنت اسی ہزار مربع میل علاقے پر پھیلی ہوئی تھی اور کئی نواب اور راجا ان کے خراج گزار تھے۔ (شریف جاوید)

Marfat.com

حیدر مرزا

(۱۵۰۰ء — ۱۵۵۱ء) ایک فارسی مؤرخ "تاریخ رشیدی" کا مصنف وہ چغتائی خاں یونس کا نواسہ اور بابر کا خالہ زاد بھائی تھا۔ ۱۵۰۸ء میں اپنے باپ کے قتل کے بعد ۱۵۰۹ء میں کابل پہنچا۔ بابر نے بیٹے کے طور پر اس کا استقبال کیا۔ اس نے ازبکوں کے خلاف فاتحانہ مہموں میں اور بخارا و سمرقند کی دوبارہ فتح میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ بابر کو چھوڑ کر فرغانہ میں منگول حکمران سعید خان کے پاس چلا گیا۔ سعید خاں نے اسے گرگان کا خطاب دیا۔ خان کے حکم پر اس نے بدخشاں، کافرستان، لداخ اور تبت میں کئی مہمیں سر کیں۔ ۱۵۳۳ء میں خاں کی وفات پر حیدر مرزا کو ملک چھوڑ کر تیموریوں کے پاس جانا پڑا۔ ۱۵۴۱ء میں وہ کشمیر فتح کرنے اور وہاں اپنی آزاد سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کشمیر کی حکمرانی کے زمانے میں اس نے اپنی کتاب تالیف کی جو کشمیر کے سابق حکمران عبدالرشید کے نام کی مناسبت سے "تاریخ رشیدی" مشہور ہوئی۔ یہ کتاب نہ صرف حیدر کے ہم وطنوں میں مقبول ہوئی بلکہ برصغیر، ترکستان اور ایران میں بھی مشہور ہوئی۔ بعد کے تمام جغرافیہ نویسوں اور مورخین نے اسے بطور سند استعمال کیا ہے۔ (ش۔ ج)

حیرہ

لخمی بادشاہوں کا دارالسلطنت، جو کوفے سے مغرب "مشہدِ علیؓ" سے جنوب مغرب کی جانب، نجف کی جھیل کے کنارے واقع تھا۔ یہ شہر تمدن کے ایک خاص معیار کو پہنچ گیا تھا اور بادشاہوں کے دربار میں شعرا جمع رہتے تھے۔ حیرہ کے لوگ فنِ کتابت بخوبی جانتے تھے اور وہیں سے یہ فن عرب میں پھیلا۔ ۱۶۰۲ء میں نعمان سوم کی موت کے بعد ایرانی بادشاہوں نے لخمی باجگزار سرداروں کا نظام ختم کر کے وہاں ایرانی گورنروں کو مقرر کیا اور عرب سرداروں کو ان کا ماتحت بنا دیا۔ ۶۳۳ء تک یہی نظام قائم تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے مسلم افواج کے ساتھ حیرہ پر حملہ کیا تو اس شہر نے بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کے بعد اس شہر کی اہمیت ختم ہو گئی۔ کوفے کی روز افزوں ترقی نے اس شہر کو رفتہ رفتہ اور بھی پس پشت ڈال دیا۔ خلیفہ ہارون الرشید کچھ دنوں حیرہ میں مقیم رہے تھے اور کچھ عمارتیں بھی تعمیر کرائیں مگر اس سے کوفے میں ناراضی پھیل گئی اس لیئے شہر کی اقامت چھوڑ گئے۔ دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں یہ شہر بہت وسیع مگر بہت کم آباد تھا۔ پورے ضلع کے زوال و انحطاط کی وجہ سے بعد میں حیرہ پہ اتنا سخت اثر پڑا کہ آخر میں وہ روئے زمین سے معدوم ہو گیا۔ اس کی جائے وقوع پر اب ایک چراگاہ ہے جہاں پست ٹیلے اور ٹھیکروں کے ڈھیر اس کے ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ (ش۔ ج)

حیض

ماہواری۔ ایام حیض طبی حیثیت سے ایک ایسی حالت ہے جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے قریب تر ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں یہودی اور دوسری غیر مسلم قومیں حائضہ عورت سے بے انتہا پرہیز کرتی تھیں۔ اور انہیں ایام ماہواری میں اچھوت بنا دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس غلط روش کا خاتمہ کیا۔
"وہ پوچھتے ہیں: حیض کا حکم کیا ہے؟ قرآن میں آیا ہے کہ:

کہو: "وہ ایک گ[redacted] سے الگ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ، جب [redacted] پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ۔ اس طرح جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں۔ اور پاکیزگی اختیار کریں۔" (سورۃ بقر)

یہاں حکم سے مراد حکم شرعی نہیں ہے بلکہ وہ فطری حکم ہے جو انسان اور حیوان سب کی جبلت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر نفس طبعاً واقف ہے۔ حضورؐ نے اس ارشاد کی جو مزید توضیح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے باقی تمام تعلقات بدستور برقرار رکھے جائیں۔

ایک حدیث حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں اور آنحضرت صلعم حالتِ جنابت میں ایک ہی برتن سے غسل کر لیتے۔ مجھے حالتِ حیض میں تہ بند باندھنے کا حکم دیتے اور پھر آپ اپنا بدن مجھ سے مس کرتے۔ نیز اعتکاف کی حالت میں سر مبارک باہر نکالتے اور میں آپ کا سر دھو دیتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ سے اور بھی بہت سی احادیث اسی موضوع پر بیان کی گئی ہیں۔ وہؓ کہتی ہیں کہ "میں حائضہ ہونے کے باوجود پانی پی کر اپنا بچا ہوا حضور صلعم کو دے دیتی۔ اور آپ میرے پینے کی جگہ منہ لگا کر پیتے۔ اسی حالت میں میں ہڈی چوس کر آپ کو دیتی اور آپؐ اسی جگہ سے منہ لگا کر چوستے۔" (امام مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ "مجھے مسجد سے چھوٹا بوریا لا دو۔ میں نے کہا: میں تو حائضہ ہوں۔" آپ نے فرمایا کہ "حیض تمہارے ہاتھ کو تو لگا ہوا نہیں ہے۔" (مسلم)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حائضہ عورت کے ساتھ وہ سلوک روا نہیں رکھا جا سکتا جو غیر مسلم قومیں رکھتی ہیں۔

حیوان

جانوروں کی دنیا جس میں انسان بھی شامل ہیں۔ انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے قرآن مجید میں یہ لفظ صرف ایک بار سورۂ عنکبوت کی ۶۴ ویں آیت میں آیا ہے اور "زندگی" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جنت کا ایک چشمہ بھی اسی نام سے موسوم ہے قدیم عرب کے متعدد قبیلوں کے نام جانوروں کے ناموں پر ہیں جیسے اسد (شیر) قریش (آدم خور مچھلی) وغیرہ قدیم عرب مرنے والوں کی روحوں کو کسی پرندے کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ یہ الو ہوتا تھا جو کچھ عرصے تک قبر کے ارد گرد اڑتا رہتا تھا۔ رسول کریم صلعم نے اس عقیدے کو مردود قرار دیا۔ قرآن مجید کی سورہ مائدہ اور انعام میں جاہلیت کی ان رسوم کی مذمت کی گئی ہے جن کی رو سے بعض جانوروں کو خاص خاص دیوتاؤں سے منسوب کر دیا جاتا تھا یا بعض اونٹوں بھیڑوں اور دوسرے جانوروں کو حرام قرار دے دیا جاتا تھا۔

پالتو جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسلام میں بعض جانوروں کا کھانا حلال ہے اور بعض کا حرام۔ ایک حدیث (ابو داؤد) کی رو سے تمام گوشت خور جانور حرام ہیں خواہ وہ دودھ پلانے والے جانور ہوں جن کے تیز دانت ہوتے ہیں یا وہ پرندے جن کے پنجے ہوں۔ لیکن اس حکم کو سب فقہا نے تسلیم نہیں کیا۔ مالکیوں کے ہاں شکاری پرندوں کا گوشت کھانا جائز ہے۔ تمام فقہا بلی، کتے، بھیڑیئے، مگرمچھ وغیرہ کو حرام سمجھتے ہیں۔ بعض جانور اس لیے حرام ہیں کہ رسول اللہ نے انہیں ان کے فاسقانہ طرز عمل کی بنا پر مارنے کا حکم دیا ہے۔ ان میں چیل، سیاہ و سفید کوا، بچھو، چوہا اور دیوانہ کتا شامل ہیں۔ پالتو جانوروں میں سے اونٹ، بیل، بھیڑ، بکری کے بارے میں کوئی تنازع نہیں بلکہ گوشت کی طرح کے

جانوروں کے معاملے میں اختلافات ہیں۔ شافعیوں اور حنبلیوں کے نزدیک گھوڑا حلال ہے لیکن دوسرے مذاہب اسے مکروہ سمجھتے ہیں گھریلو گدھا حرام ہے لیکن حنابلہ اُسے مکروہ مانتے ہیں۔ جنگلی گدھا حنفیوں کے سوا اور سب مذاہب میں حلال ہے خچر حرام ہے۔ ظاہریہ اور ابن حزم ان ممانعتوں کو رد کرتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں۔

مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ جانوروں بالخصوص سواری کے جانوروں سے اچھا سلوک کریں کیونکہ آخرت کی زندگی میں ظلم کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ انسانوں کی مانند دیگر حیوانات بھی قیامت کے روز دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور دُنیا میں جو جو ظلم ان پر بندوں کی طرف سے کئے گئے ہیں ان کا بدلہ ان سے دلایا جائے گا۔ (ش۔ ج)

خاتم النبیین

اللہ کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دیکھئے ختم نبوت)

خارجہ پالیسی

تمام ممالک دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات اور رابطہ قائم کرنے کے لئے کچھ اصول بناتے ہیں ان اصولوں کو خارجہ پالیسی کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں طاقتور قومیں اپنے سے کمزور ملکوں کو اپنا غلام بنا لینے کے فکر میں لگی رہتی تھیں اور کمزور ملک بھی اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے تھے۔ اس لئے تمام ممالک کی خارجہ پالیسی یا خارجہ سیاست سوائے جنگ و جدل اور قتل و غارت گری کے اور کچھ نہیں ہوتی تھی لیکن موجودہ زمانے میں خارجہ پالیسی کا یہ انداز کافی حد تک ختم ہو گیا ہے اور اب زیادہ تر ممالک ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں تمام ممالک اپنی ضرورت کی ہر ایک شے خود پیدا نہیں کرتے اس لئے انہیں بہت سی چیزیں دوسرے ممالک سے خریدنا پڑتی ہیں۔ یہ حاجات مبادلہ انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے خارجہ تعلقات کو مستحکم بنیادوں پر قائم کریں۔ ان کے لئے کچھ قوانین بنائے گئے ہیں جن کے ذریعے ہر حکومت کے حقوق ایک دوسرے سے رابطہ وغیرہ، ایک دوسرے کے فرائض، واجبات، جنگ اور صلح کے زمانہ میں، وضع ہو گئے ہیں۔

اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے جنگ و صلح اور امن و پیکار میں اسلامی ممالک کے لئے مختلف قواعد کی تشکیل کر دی تھی۔ علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ دولت اسلامیہ کا قیام وحدت دینیہ پر مبنی ہے اس وحدت کے اجزاء کا مجموعہ ہی امت واحدہ ہے، بے شک ان کی زبان مختلف ہو، بادشاہت مختلف ہو یا قومیتیں مختلف ہوں۔ اس لئے کہ دین کی وحدت ان تمام چیزوں پر غالب ہے لہذا ان تمام اختلافات کے باوجود "اُمّتِ واحدہ" اپنی جگہ قائم رہے گی۔

کسی اسلامی اور غیر اسلامی ملک کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے اس بات پر علمائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ اسلام اپنے مخالف کو قبولِ اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت دو طرح سے دی جا سکتی ہے:

۱۔ زبان سے اور

۲۔ تلوار سے۔

علماء کہتے ہیں کہ پہلے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔ اگر وہ اس دعوت کو ٹھکرا دیں تو ان سے جنگ کریں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں یا جزیہ یا خراج دینے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ اگر مسلمان کمزور ہو گئے ہوں تو وقتی طور پر مصالحت جائز تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر جیسے ہی یہ ضرورت ختم ہو گی دوبارہ جنگ کرنا واجب ہو جائے گا۔

اس نظریہ کے حامل علماء بے شمار دلائل پیش کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "یعنی تم پر قتال واجب کر دیا گیا ہے خواہ وہ تمہیں گراں ہی کیوں نہ گزرے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کو تم بُرا سمجھتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے بھلی ہوتی ہیں۔"

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے:

"آپ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ان لوگوں سے قتال کیجئے جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خرید لی ہے۔"

اس موضوع پر حضورؐ نے بھی فرمایا ہے۔ بخاری اور مسلم کی ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ:

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک مقاتلہ کروں جب تک وہ کلمۂ توحید اور رسالت محمدیؐ پر ایمان نہ لے آئیں۔ نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ کرنے لگیں تو جان و مال کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے۔ سوا اس کے کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ان سے مواخذہ کی نوبت آئے اور ان کا حساب کتاب اللہ کے ذمہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی جگہ مسلمانوں کو کافروں سے دوستی کرنے کی ممانعت کی ہے۔ اور مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ ربط و محبت کے تعلقات قائم کر کے انہیں اپنا حلیف بنانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

سورۃ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

"مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں۔"

اسی طرح سورہ مائدہ میں آیا ہے کہ:

"مسلمانو یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا، اس کا شمار انہی میں ہوگا۔"

مختلف علماء نے مسلمان ملکوں کے لئے خارجہ پالیسی کے جو اصول بنائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

اسلام کی طرف سے غیر مسلموں کو دعوتِ اسلام دینا اُمّتِ اسلامیہ پر فرضِ کفایہ ہے لیکن اگر کوئی جماعت یا گروہ اسلام کا پیغام اور دعوت اسلام دینا شروع کر دے تو یہ فرض باقی اُمت پر سے ساقط ہو جائے گا۔ لیکن اگر تمام امت میں سے کوئی بھی دعوت اسلام کو عام کرنے کے لئے آگے نہ بڑھے گا تو پھر پوری اُمّتِ اسلامیہ کو اس کا گناہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا تھا کہ جو کچھ ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اس کی تبلیغ فرمائیں۔ اسی لئے آپ زندگی بھر دعوت و تبلیغ پر قائم رہے۔ اور زبانِ مبارک خطوط اور پیغامبروں کے ذریعے دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھا۔

خارجہ بن حذافہ سہمی

عرب کے بہترین شہسواروں میں سے ایک۔ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فتح مصر کے موقع پر جنگی خدمات انجام دیں حضرت عمرؓ نے جن چار افسروں کے ماتحت چار ہزار کی کمک باہر بھیجی تھی ان میں سے ایک آپ تھے۔ مصر فتح ہونے کے بعد عمروؓ بن العاص نے آپ کو مصر کا حاکم مقرر کیا۔ جنگ صفین کے بعد خارجیوں نے حضرت علیؓ، معاویہؓ اور عمرو بن العاص کے

Marfat.com

خلافت سازش قتل کے سلسلے میں عمرو بن العاص کی بجائے رمضان ۴۰ھ میں آپ کو شہید کردیا۔ آپ چند احادیث کے راوی ہیں۔

خارجہ بن زید

ایک صحابی جو قبیلہ خزرج کے مشہور خاندان اغر سے تعلق رکھتے تھے۔ بیعت عقبہ میں اسلام قبول کیا۔ ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مدینہ آکر آپ کے ہاں قیام کیا تھا۔ آپ نے اپنی ایک بیٹی حبیبہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں دی تھی۔ ام کلثوم بنت ابی بکرؓ ان ہی کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ اسی وجہ سے حضرت خارجہؓ حضرت ابوبکرؓ کے اسلامی بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ خسر بھی تھے آپ غزوۂ بدر میں شریک رہے۔ اس غزوہ میں اُمیہ بن خلف کو آپ نے کئی آدمیوں کے ساتھ قتل کرمارا۔ آپ غزوۂ اُحد میں بھی شریک ہوئے۔ اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ اسی غزوہ میں آپ نے نیزوں کے دس سے زیادہ زخم کھائے اور شہید ہوئے۔ آپ کے بیٹے سعد بن ربیع بھی اسی غزوہ میں شہید ہوئے۔ دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔

خارجی

اسلام کے قدیم ترین فرقے کے پیرو۔ اسلام کی سیاسی تاریخ میں ان کا کردار یہ تھا کہ انھوں نے متواتر بغاوتیں کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر پورے کے پورے صوبے عارضی طور پر ان کے قبضے میں آگئے۔ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے سامنے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے متعلق جو تجویز جنگ صفین میں پیش کی تھی اس سے خوارج کا ایک علیحدہ فرقہ پیدا ہوا۔ باغیوں کا پڑاؤ نہروان کی نہر کے کنارے تھا۔ ان کے کوفے سے باہر نکلنے کی وجہ سے اس فرقے کا نام "خوارج" ہو گیا۔ خوارج نے جلد ہی اپنے انتہائی تعصب اور تنگ نظری کا اظہار پے بہ پے انتہا پسند اعلانات اور دہشتناک افعال کی صورت میں کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ حضرت علیؓ کا دعویٰ خلافت باطل ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے حضرت عثمانؓ کے مسلک کی بھی مذمت کی اور ان کی شہادت کا انتقام لینے کے ارادے سے بھی اپنی بریت کا اظہار کیا۔ جو شخص ان کے نظریے کو تسلیم نہ کرتا اسے کافر اور دین سے خارج قرار دینے لگے انھوں نے بہت سے لوگ قتل کیے۔ رفتہ رفتہ ان کی قوت بڑھتی گئی۔ بہت سے غیر عرب بھی ان میں شامل ہو گئے۔ جب خوارج سے حضرت علیؓ کی ابتدائی گفت و شنید ناکام رہی تو مجبوراً اس بڑھتے ہوئے خطرے کو دور کرنے کیلئے کارروائی کرنی پڑی۔ ۹ صفر ۳۸ھ/ ۱۷ جولائی ۶۵۸ء کو جنگ نہروان لڑی گئی۔ خارجیوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ آئندہ دو برسوں میں بھی مقامی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ خود حضرت علیؓ ایک خارجی عبدالرحمان ابن ملجم المرادی کے خنجر سے شہید ہوئے۔ ابن ملجم کے سسرال میں بہت سے لوگ جنگ نہروان میں قتل ہو چکے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ خارجیوں کی سازش کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کو بیک وقت قتل کر دیا جائے حملے کیلئے ایک ہی تاریخ کا۔ ایک ہی وقت مقرر ہوا۔ امیر معاویہؓ پر حملہ ہوا وہ زخمی ہو گئے۔ عمروؓ بن العاص اس رات بیمار تھے ان کی جگہ خارجہؓ بن حذافہ امامت کیلئے مسجد قاہرہ میں آئے اور شہید کر دیئے گئے۔

امیر معاویہؓ کے بیس سالہ دور میں کوفے اور بصرے میں خارجیوں نے کئی بغاوتیں کیں لیکن امیر معاویہؓ کے حسن تدبر اور سیاسی بصیرت کے باعث ان کو پنپنے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن وہ بھی خوارج کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خارجیوں کی ہلاکت میں اضافہ ہوتا گیا جن کے قتل کا بدلہ لینا خارجی تحریک کی ایک نمایاں علامت قرار پائی۔ خوارج نے جنگ میں چھاپہ مار طرز جنگ اختیار کر رکھے تھے۔ یزید اول کے مرنے کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی اس کے خلفشار میں خارجی تحریک نے بہت زور پکڑا اور ملک کی صورت حال نازک ہو گئی۔ خارجیوں کی سب تحریکوں میں اسلامی سلطنت کے استحکام کے لئے جو تحریک سب سے زیادہ خطرناک اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے شدید اور غیر مصالحانہ تھی وہ نافع بن ازرق کی سرکردگی میں ابھری۔ جس کی وجہ سے خوارج کو کچھ عرصے کے لئے کرمان، فارس اور دوسرے مشرقی صوبوں پر تسلط ہو گیا۔ اس بغاوت پر پہلے مہلب بن ابی صفرہ اور پھر حجاج بن یوسف کی کئی سال کی جدوجہد کے بعد قابو پایا جا سکا۔ حجاج کی سرگرمی اور ہمت نے بظاہر خارجی تحریک کا قطعی طور پر خاتمہ کر دیا۔ جب اموی عہد کے اواخر میں مرکزی حکومت میں ناقابل تدارک انحطاط آیا تو خوارج نے پھر سر اٹھایا اور دوبارہ غارت گری شروع کر دی۔ اس دور کی دو بڑی بغاوتیں یعنی ضحاک بن قیس شیبانی کی بغاوت الجزیرہ اور عراق میں، اور عبداللہ بن یحییٰ کی بغاوت عرب میں تقریباً ناکام رہیں۔ ان بغاوتوں نے جو فتنہ و فساد برپا کیا اس سے اموی حکومت کی مشرقی فصیلیں برباد ہو گئیں اور عباسیوں کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ آسانی سے سلطنت کے قلب تک پہنچ سکیں عباسیوں کے عہد میں چند مقامی بغاوتیں ہوئیں لیکن انھیں فوراً ہی دبا دیا گیا۔ خارجی تحریک عملی طور پر ختم ہو گئی اور اس کی حیثیت محض ایک مذہبی فرقے کی سی رہ گئی۔

خوارج کے مذہبی عقائد میں کوئی یکسانی نہ تھی۔ ان کے متعدد اور مستقل فرقوں کے اپنے اپنے خاص عقائد تھے۔ ان فرقوں کی مجموعی تعداد بیس تھی۔ مسئلہ خلافت کے بارے میں خوارج کے تمام فرقوں میں اتفاق ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مومنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے امام کے خلاف خروج ہونے کا اعلان کریں جو صحیح راستے سے بھٹک گیا ہو اور اس کو اسی بنا پر معزول کر دیں۔ دوسری طرف وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر مرد مومن جس کا کردار اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے ناقابل ملامت ہو اس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ وہ جماعت کی منعقدہ رائے سے امامت کے بزرگ ترین عہدے کیلئے منتخب کر لیا جائے۔ اپنے خلفاء کے علاوہ وہ جن خلفا کو برحق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔ حضرت عثمانؓ کو وہ ان کے عہد خلافت کے ابتدائی چھ سال تک خلیفہ مانتے ہیں اور حضرت علیؓ کو جنگ صفین تک۔ خوارج کا ایک بڑا عقیدہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے بغیر صرف ایمان حصول نجات کیلئے کافی نہیں۔ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے تو اس کے مومن ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اسے مرتد تصور کرتے ہیں۔ خوارج کے ایک انتہا پسند فرقے ازارقہ کا کہنا ہے کہ جو کوئی اس طرح کافر ہو جائے وہ اسلام کے دائرے میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا اور اسے ارتداد کے جرم میں بیوی بچوں سمیت قتل کر دینا چاہیے۔ وہ ان مسلمانوں کو جو خارجی نہیں مرتد سمجھتے ہیں۔ خوارج کے بعض فرقے یہودیوں یا عیسائیوں کو ہر طرح کا امن دے کر ان کے گھروں تک بحفاظت تمام پہنچانے کا ذمہ لیتے ہیں۔ (شریف جاوید)

خازن

(وفات ۳۴۹ھ/ ۹۶۰ء) پورا نام ابوجعفر خازن خراسانی، علم ہیئت کا عظیم ترین ماہر۔ وہ اپنی کنیت ابوجعفر کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ علم الحساب میں اس نے عددی مسائل پر بحث کی اور ارشمیدس کے ایک مسئلے کو حل کیا جو آخر میں ایک مکعب مساوات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس نے اقلیدس کی دسویں کتاب

Marfat.com

کے پہلے حصے کی شرح بھی لکھی جو تقسیم سے متعلق ہے۔ خازن کی علمی تحقیقات کا ایک بڑا میدان علم الہیئت تھا۔ کتاب "الالات العجیبۃ الرصدیۃ" میں اس نے فلکی مشاہدے کے بعض آلات کی کیفیت بیان کی ہے۔ ابن خلدون کے مقدمے میں بھی اس کتاب کا ذکر آیا ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسے آلے کا بھی بیان ہے جو سورج کے ارتفاع کی پیمائش کے کام آتا تھا۔ خازن کی دوسری کتاب "زیج الصفائح" کئی مقالات اور ایک طویل مقدمے پر مشتمل ہے۔ البیرونی کے بیان کے مطابق اس تصنیف میں اجرام فلکی کی حرکات کی تشریح کی گئی ہے۔ اپنی تیسری کتاب "المدخل الکبیر فی علم النجوم" میں اس نے علم التواریخ کے مسائل پر بحث کی ہے۔ "سر العالمین" میں خازن نے ابن الہیثم کے نظریۂ تکوین عالم سے بحث کی ہے۔ ابوجعفر نے دنیا کی ایک ایسی صورت بھی اختراع کی تھی، جو ایک خارج از مرکز کرۂ ارض اور ایک دائرے کے محیط پر مرکوز گردش کے نظریے سے مختلف ہے۔ اس نظریے کی رو سے سورج اور زمین کی گردش کے فرق کے باوجود، ان کا باہمی فاصلہ یکساں رہتا ہے۔ اسی طرح وہ دنیا کے دو طبقے مستنبط کرتا ہے، ایک شمالی اور ایک جنوبی جن میں گرمی اور سردی کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ (ش - ج)

خاطر

ایک صوفیانہ اصطلاح۔ جس سے مراد کسی ایسی بات کا خیال دل میں آنا جسے خود ہی کسی دوسرے خیال کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن تیسرا خیال اگر پہلے خیال کو اجاگر کر دے۔ صاحب خیال میں اس خیال کو دل سے دور کر دینے کی صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔

حضرت خیر نساج کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ حضرت جنید دروازے پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے اس خیال کو ہٹانا چاہا لیکن تیسرے خیال نے آکر دوسرے خیال کی تردید کر دی۔ چنانچہ حضرت موصوف تیسرا خیال آنے کے بعد باہر نکلے تو دروازے پر حضرت جنید کو کھڑے پایا۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ اگر تم پہلے خیال کی پیروی کرتے تو مجھے اتنی دیر تک باہر انتظار نہ کرنا پڑتا۔

اس واقع سے مشائخ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر خیال وہی تھا جو حضرت خیر نساج کے دل پہ گزرا تو پھر حضرت جنید کا خیال کیا تھا؟ حضرت جنید حضرت خیر نساج کے پیر تھے اور پیر چونکہ لامحالہ اپنے مرید کے احوال پہ واقف ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ واقع رونما ہوا ہے

حافظ

دیکھئے اسماء الحسنیٰ

خافی خان

(۱۶۶۴ء — ۱۷۳۲ء) ہندوستان کا ایک مؤرخ۔ اس کا باپ خواجہ میر شاہجہاں کے بیٹے مراد بخش کا ایک راز دار ملازم تھا۔ اورنگ زیب، بہادر شاہ اور محمد شاہ کے عہد میں خافی خاں دکن اور گجرات میں ملازم رہا۔ زندگی کے آخری ایام آصف جاہ نظام الملک کی ملازمت میں بسر کیے۔ اس نے "منتخب اللباب" کے نام سے ہندوستان کے تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کی۔ یہ ایک معیاری کتاب تصور کی جاتی ہے۔ یہ تاریخ دو سو سال کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا اختتام محمد شاہ کے چودھویں سالِ جلوس (۱۷۳۲ء) پر ہوتا ہے۔ اس تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قصہ در قصہ روایتیں پائی جاتی ہیں۔ مصنف نے جگہ جگہ اپنے مشاہدے بیان کیے ہیں۔ (ش - ج)

خاقانی

(۱۱۲۶ء — ۱۱۹۸ء) حسان العجم افضل الدین بدیل خاقانی شروانی، ایران کا جلیل القدر قصیدہ گو۔ اس کا لقب "افضل الدین" تھا۔ قصیدہ گوئی میں بلند مرتبہ حاصل ہونے کی بنا پر "حسان العجم" کا لقب پایا۔ خاقانی آذربائیجان کے قریب ایک مشہور شہر شروان میں پیدا ہوا۔ اس کا والد علی بڑھئی کا کام کرتا تھا اور والدہ نسطوری عیسائی تھی لیکن بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئی۔ والد کی وفات کے بعد خاقانی کی پرورش اس کے چچا طبیب مرزا کافی بن عثمان نے کی۔ طب، ہیئت، الٰہیات ایسے علوم کی تحصیل اسی سے ہوئی۔ ذوق شعر کی تربیت ابوالعلا گنجوی نے کی جو خاقانی اکبر ابوالہیجا فخر الدین منوچہر بن فریدون شروانشاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ خاقانی کی شادی ابوالعلا کی بیٹی سے ہوئی۔ ابوالعلا ہی کے توسط سے خاقانی نے دربار شروانشاہ میں رسائی پائی اور پہلا تخلص "حقائقی" ترک کر کے "خاقانی" اختیار کر لیا۔ شروانشاہ کے دربار میں اسے خاص قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ قصائد پر گراں بہا انعامات بھی پائے۔ شروانشاہ سے اجازت پا کر وہ ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء میں حج کیلئے روانہ ہوا۔ موصل کے وزیر جمال الدین محمد بن علی اصفہانی کی وساطت سے عباسی خلیفہ المقتفی بن مستظہر تک رسائی ہوئی۔ حج کے دوران میں اس نے کمال ارادت سے مکہ معظمہ کی توصیف پر پُرتاثیر قصیدے کہے۔ واپس شروان آنے پر پھر دربار شروانشاہ سے وابستہ رہا۔ دربار سے کنارہ کشی کی کوشش میں قید ہوا اور اسیری کے دوران اس نے وہ نظمیں لکھیں، جن سے فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں اس نے دوبارہ حج کیا۔ آخر میں وہ تبریز میں زاویہ نشین ہو گیا۔ وہیں وفات پائی اور مقبرۃ الشعرا میں مدفون ہوا۔

خاقانی نے قوت فکر، فنی مہارت، تراکیب الفاظ، تحقیق معانی اور مضامین نو کی بدولت ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی جو عراق عجم کی نسبت سے "سبک عراقی" کہلایا۔ خاقانی کا دیوان قصائد، غزلیات، مقطعات، متفرقات، مرثیوں، ترجیع بندوں، ترکیب بندوں، رباعیوں، صوفیانہ نظموں اور عربی قصیدوں پر مشتمل ہے۔ (ش - ج)

خالد بن سعید العاص

آپ مسلمان ہوئے تو اعقبین نے آپ کو بُری طرح زدوکوب کیا اور بے شمار اذیتیں دیں۔ بالآخر آپ مکہ میں روپوش ہو گئے اور کافی عرصہ ایسے ہی گزارا۔ حبشہ کی ہجرت کے وقت آپ اپنی زوجہ اُمیّہ اور بھائی عمر کو ہمراہ لے کر حبشہ چلے گئے۔ غزوۂ خیبر کے دنوں میں آپ حبشہ سے مدینہ آگئے اور تمام غزوات میں حضور اکرمؐ کے ساتھ شریک ہوئے۔ آپ کو پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ اس لئے حضورؐ کے خطوط بھی اکثر آپ ہی پڑھا کرتے تھے۔ ۹ ہجری میں بنو ثقیف کے وفد سے آپ ہی نے رسولؐ خدا کی طرف سے گفتگو کی۔ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا وہ بھی آپ نے ہی تحریر کیا۔ بعد میں حضورؐ نے آپ کو یمن کا گورنر بنا دیا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ گورنری سے سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ حضرت ابوبکرؓ آپ سے اصرار کرتے رہے کہ آپ سبکدوش نہ ہوں پھر آپ مدینے چلے گئے کیونکہ آپ کو ان کی خلافت پر اعتراض تھا۔ لیکن چند ماہ کے بعد ہی آپ نے ابوبکرؓ کے ہاتھ پہ بیعت کر لی۔ شام کی فتوحات میں آپ شامل ہوئے اور ان فتوحات کے دوران ہی میں آپ نے جام شہادت نوش کیا۔ آپ کی ایک بیٹی

Marfat.com

ام خالد حضورؐ کے مشہور صحابی زبیرؓ بن العوام کے نکاح میں تھیں۔

خالد بن عرفطہ

خالدؓ حضورؐ کی زندگی ہی میں مسلمان ہوگئے تھے لیکن کسی غزوہ میں شریک نہ ہو سکے۔ آپ نے رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد فتوحات ایران میں شمولیت کی۔ جنگ قادسیہ کے وقت سعد بن ابی وقاص نے انہیں فوج کے ایک دستے کا امیر بنا کر بھیجا۔ جنگ قادسیہ کے بعد انہوں نے ساباط کو فتح کرنے کے لئے جنگ لڑی جس میں انہیں فتح ہوئی۔ ۴۱ ھ میں آپ امیر معاویہؓ کی طرف سے اُن کے مخالفوں سے لڑے۔ اور ابی حوسا کو قتل کیا۔ اس کے قتل سے امیر معاویہؓ کے خلاف اٹھنے والی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔ آپ نے حضورؐ کی کچھ احادیث بھی بیان فرمائیں۔ ۶۰ ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس وقت آپ کوفہ میں رہائش پذیر تھے۔

خالد بن ولید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خالو تھے۔ جب آنحضورؐ نے اہلِ قریش کو بتوں کی پوجا کرنے سے منع فرمایا تو وہ سب آپ کے خلاف ہوگئے۔ اس وقت خالد بن ولیدؓ کی عمر تقریباً ۱۷ سال تھی۔ آپ بھی اپنے والد کے ساتھ حضورؐ کے دشمن تھے۔ بعد میں خالدؓ بن ولید نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن آپ کے والد نے اسلام قبول نہ کیا۔ اور اسلام دشمنی پر قائم رہے۔

خالدؓ بن ولید نے تلوار کے سائے میں پرورش پائی تھی اس لئے وہ بہت پھرتیلے اور نڈر تھے۔ گھڑ سواری اور نیزہ بازی کے ماہر تھے۔ ان کے بچپن کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کشتی لڑی۔ کشتی آپ نے جیت لی۔ رسہ کشی میں حضرت عمرؓ کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

حضرت خالدؓ بن ولید ابتدا میں مسلمانوں کے خلاف اہل قریش کے لشکر میں شریک رہے خاص طور پر جنگ اُحد میں شرکت کے بعد کافروں میں آپ کا نام بہت چمکا کیونکہ آپ نے جنگ اُحد میں مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کرکے انہیں بہت نقصان پہنچایا تھا۔ آپ کے مسلمان ہونے کا واقعہ کچھ یوں ہے۔ ایک مرتبہ آنحضورؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ خالدؓ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آپؐ پر وار کردوں۔ لیکن پھر قریب آتے ہی رُک گئے۔ اور دل میں کہنے لگے کہ جس پر میں حملہ کرنے لگا ہوں ان کی حفاظت تو خدا کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اُن کے دل میں آنحضورؐ سے محبت پیدا ہوگئی۔

دوسری طرف حضورؐ نے خالدؓ بن ولید کے بھائی جو مسلمان ہو چکے تھے سے فرمایا کہ خالدؓ سے کہو کہ جب تمہارا دل سچائی کو مان گیا ہے تو پھر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے میں کیا رکاوٹ ہے" خالدؓ کے بھائی نے فوراً آپ کو خط لکھا کہ " بھائی! تمہارا دل تو اسلام کی سچائی مان چکا ہے۔ اب دیر کس بات کی ہے۔ ایمان لے آؤ"

خالدؓ بن ولید نے اپنے بھائی کا خط پڑھا تو ان کی آتش اور بھڑک اٹھی فوراً مکہ پہنچے۔ لیکن رسول اللہ صلعم کو وہاں نہ پایا۔ پھر آپ مدینے آئے اور رسول کریم صلعم کی خدمت میں پہنچے اور اونچی آواز میں کلمہ کا ورد کرنے لگے۔ حضورؐ کو آپ کے اسلام لانے کی بہت خوشی ہوئی۔ یہ خبر ابوسفیان تک پہنچی تو وہ بہت سیخ پا ہوا۔ جونہی اس نے خالد بن ولید کو دیکھا تو پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ تم اسلام لے آئے ہو۔ خالدؓ نے مثبت جواب دیا اور کہا کہ "ہاں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حامی ہوں۔ میں دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا ہوں۔ اس پر ابوسفیان نے خالدؓ بن ولید پر تلوار تان لی۔ لیکن عکرمہ نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

ایک بار حضورؐ نے خالدؓ کو بنی حارث قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس قبیلے کے لوگ نجران میں آباد تھے۔ آپ نے حضرت خالدؓ کو حکم دیا تھا کہ پہلے تین دن تک لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اور ان کے سامنے اسلام پیش کرنا لیکن اگر وہ اسلام نہ لائیں یا اسلام لانے پر تیار نہ ہوں تو ان سے جنگ کرنا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ اپنے چند ساتھیوں سمیت نجران پہنچ گئے اور تمام لوگوں کو دعوت اسلام دی۔ آپ کے ساتھی بھی اسلام کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ بیشتر لوگ اسلام لے آئے اور انہوں نے حضرت خالدؓ اور ان کے ساتھیوں کی دعوت قبول کرلی۔

حضرت خالدؓ بن ولید کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد حاکم شام کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے لئے تین ہزار صحابہؓ کی فوج تیار ہوئی اس میں آپ بھی شامل تھے۔ اس جنگ میں مخالفین کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ خونریز معرکہ ہوا۔ ابتدا میں مسلمانوں کا کافی جانی نقصان ہوا۔ دوسرے دن اس لشکر کی کمان حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنے ہاتھوں میں لی۔ اعلیٰ جنگی اصولوں پر اپنی فوج کی تنظیم کی اور چھوٹی سی فوج نے حاکم شام کی ٹڈی دل فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور فتح پائی۔

رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد عرب کے کچھ قبائل اسلام سے پھر گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں آپ اسلامی لشکروں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ معرکہ یمامہ میں آپ نے صرف تیرہ ہزار فوجیوں کے ساتھ مسیلمہ بن کذاب کی فوج کو بری طرح شکست دی جبکہ مسیلمہ بن کذاب کے لشکر کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ صدیق کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے انہوں نے خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ۲۱ ھ میں وفات پائی آپ کی قبر حمص میں ہے۔ لوگ اب بھی ہزاروں کی تعداد میں فاتحہ پڑھنے کے لئے ان کی قبر پر جاتے ہیں۔ خالدؓ بن ولید جب بستر علالت پر تھے تو اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"میں نے ان گنت جنگوں میں حصہ لیا۔ کئی بار اپنے آپ کو ایسے خطروں میں ڈالا کہ جان بچانا مشکل نظر آتا تھا لیکن شہادت کی تمنا پوری نہ ہوئی میرے جسم پر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں تلوار، تیر یا نیزے کے زخم کا نشان نہ ہو۔ لیکن افسوس! موت نے مجھے بستر پر آ دبوچا۔ میدانِ کارزار میں شہادت نصیب نہ ہوئی!" (شریف جاوید)

خالد ہذلی

مسلمانوں کا دشمن۔ ایک کافر۔

ایک مرتبہ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ خالد ہذلی مسلمانوں سے جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو حالات جاننے کے لیے بھیجا حضرت عبداللہؓ جلد ہی میلوں کا سفر طے کرکے خالد ہذلی کے پاس جا پہنچے۔ اس وقت خالد ہذلی کے ساتھ کئی عورتیں تھیں اور وہ مکان کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ آپ نے اُسے روک لیا۔ خالد ہذلی نے دیکھتے ہی حضرت عبداللہؓ سے پوچھا کہ "آپ کون ہیں"۔ آپ نے فوراً جواب دیا۔ "میں ایک عرب ہوں، میں نے سنا ہے کہ آپ نبی کریم حضرت محمد رسول اللہؐ سے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں"۔ اس پر خالد نے کہا کہ "میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑی فوج ترتیب دے رہا ہوں"۔

Marfat.com

یہ جواب سنتے ہی حضرت عبداللہؓ نے خالد ہذلی کو قتل کر دیا اور عورتوں کو اس کی لاش پر روتا ہوا چھوڑ کر واپس حضورؐ کے پاس آ گئے۔ آپ نے انہیں تمام واقعہ بیان کیا۔ خالد ہذلی کے قبیلہ کے افراد کافی عرصہ تک خاموش رہے پھر ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ان کے چند افراد جمع ہو کر حضورؐ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ آپ ہماری تعلیم و تربیت کے لیے کچھ صحابہ کرام کو ہمارے ساتھ بھیجیں تاکہ وہ ہمیں قرآن اور دینی مسائل کی تعلیم دیں۔ لیکن یہ سب ان کی چال تھی۔ اس طرح وہ حضرت عبداللہ بن انیس اور کئی دوسرے صحابہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور راستے میں جا کر ان میں سے چند کو شہید کر دیا اور کچھ کو قید کر لیا۔

خالق

دیکھئے اسماء الحسنیٰ

خاوند

دیکھئے زوج

خباب بن ارث

آپ تمیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور لوہار کا کام کرتے تھے اسلام کے ابتدائی زمانے میں آپ کو غلام بنا کر مکہ میں فروخت کر دیا گیا تھا۔ آپ اس وقت مسلمان ہوئے تھے جب حضور اکرمؐ ارقم کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے اس وقت تک چند افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ انہیں قریش مکہ نے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ ایک مرتبہ آپ کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر ایک کافر آپ کے سینے پر بیٹھ گیا جس سے آپ کی پیٹھ جل کر سفید ہو گئی۔ ان کا جرم صرف اسلام قبول کرنا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں آپ مرتبہ آپ حضرت عمرؓ کو ان اذیتوں کے نشانات دکھانے لگے جو آپ کو پچیس تیس سال پہلے کفارِ مکہ نے پہنچائی تھیں حضرت عمرؓ نے آپ کو فوراً اپنی مسند پر بٹھایا اور کہنے لگے کہ "ایک شخص اور ہے جس نے آپ سے بھی زیادہ اذیتیں برداشت کی ہیں اور وہ ہیں بلال حبشیؓ"۔

"جناب فوراً بول اٹھے وہ کس طرح ان کے تو کئی دوست تھے جو انہیں مختلف اذیتوں سے نجات دلانے کی کوششیں کرتے تھے لیکن میری مدد کے لئے تو کوئی بھی نہیں تھا۔"

خبر

بیان اور اطلاع۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کسی خاص سیاق و سباق کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ حدیث میں اس کا استعمال علاوہ اور مقامات کے اس روایت میں ہوا ہے جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح جن چوری چھپے آسمان سے اطلاع حاصل کرتے ہیں اور کس طرح اُن پر دہکتے ہوئے شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں کہ ان کو سننے سے باز رکھا جاسکے۔ امام الغزالی نے اخبار کی اصطلاح ایسی احادیث کے لئے استعمال کی ہے جن کا سلسلہ رسول اکرم صلعم تک پہنچتا ہے۔ (ش۔ ع)

خبیب بن عدی

اسلام کے ابتدائی شہداء میں سے ایک۔ آپ مدینہ کے رہنے والے تھے اور حضورؐ کے صحابی تھے۔ آپ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد میں شریک ہوئے۔ جنگِ اُحد میں آپ کو ہذیل کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا اور اپنے ساتھ مکہ لے گئے۔ وہاں آپ کو غلام بنا کر بنو حارث کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بنو حارث نے آپ کو رسیوں سے باندھ کر نیزوں سے زخمی کیا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔

مسلمان تاریخ دانوں نے اس واقعہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ کس طرح آپ نے راہِ حق میں صبر و شکر کے ساتھ جان دی۔ اس واقعہ کا مکہ کے کافروں پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ابوسفیان جیسے سخت مزاج انسان کا دل بھی اس واقعہ سے پگھل گیا۔

بنو حارث آپ کو نیزوں سے بری طرح زخمی کر چکا تھا تو آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اگر آپ اسلام سے منحرف ہو جائیں تو میں آپ کو زندہ چھوڑ دوں گا"۔ لیکن آپ نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ اور کہنے لگے کہ میں دنیا تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن اسلام نہیں"۔

آپ کے بارے میں ایک واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کو شہید کر دیا گیا تو زمین اسی وقت شق ہو گئی اور آپ کی لاش اس میں سما گئی۔

خبیر

دیکھیے اسماء الحسنیٰ

ختان

احادیث میں جہاں دین فطرت کے خصائل کا بیان آیا ہے وہاں ناخن تراشنے مسواک، مونچھیں کترنے، داڑھی بڑھانے کے ساتھ ختنہ کا بھی ذکر موجود ہے۔ النووی کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ اور بہت سے دوسرے علماء کے نزدیک ختنہ واجب ہے امام مالک اور اکثر علماء کے نزدیک سنت ہے۔ صحیح صورت جس سے اصحاب کی اکثریت کو اتفاق ہے یہ ہے کہ ختنہ بچپن میں جائز ہے مگر واجب نہیں۔ بعض کے نزدیک ولادت کے بعد ساتویں دن ختنہ کرنا مستحب ہے۔ ابن سعد نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کا ختنہ تیرہ سال کی عمر میں ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلعم مختون پیدا ہوئے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں ختنہ کو مسلمانی کی علامت سمجھا جاتا ہے رکھے میں جہاں رسم ختنہ کو طہار کہا جاتا ہے بچوں کا ختنہ تین سے سات سال کی عمر میں ہو جاتا ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں ختنہ پیدائش کے بعد سات دن سے لے کر تیرہ سال تک مختلف عمروں میں حجام کرتا ہے۔ عموماً حجام عمل جراحی انجام دیتا ہے۔ حشفے کے آگے کی کھال کو ایک آلے سے سمیٹ کر اُسترے سے کاٹ ڈالتا ہے اور زخم پر لیپ کر کے پٹی باندھ دیتا ہے۔ زخم عموماً ایک ہفتے میں مندمل ہو جاتا ہے۔ (ش۔ ج)

ختم نبوت

مسلمانوں کا عقیدہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ پہ نازل شدہ کتاب قرآن مجید پرانی تمام آسمانی کتابوں کے احکام کو منسوخ کرنے والی اور تمام معاملات کے احکام و قوانین میں جامع ومانع ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی کتاب اللہ کی جانب سے نازل ہوگی نہ ہی کوئی اور نبی آئے گا۔ بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں، یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں۔

Marfat.com

مطلب یہ تھا کہ ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی حائل نہیں۔ اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی نبی رہنے والا ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (سورۃ الاعراف: ۱۵۸) اے نبی کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ (سورۃ الاعراف: ۱۵۸) بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے متنبہ کرنے والا ہو (الفرقان ۱:) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے (احزاب: ۴۰)

ایک گروہ لفظ "خاتم النبیین" کے معنی نبیوں کی مہر کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلعم کے بعد جو انبیا بھی آئیں گے وہ آپ کی مُہر لگنے سے نبی بنیں گے۔ ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ خاتم النبیین کے معنی افضل النبیین کے ہیں۔ یعنی نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے البتہ کمالات نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں۔ عربی لغت اور محاورے کی رُو سے "ختم" کے معنی مُہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔ قرآن کے سیاق و سباق اور لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی کریم صلعم کی ان احادیث سے ہوتی ہے:

(۱) آنحضرت نے فرمایا بنی اسرائیل کی قیادت انبیا کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے۔ (بخاری شریف کتاب المناقب)

(۲) نبی صلعم نے فرمایا میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ (بخاری شریف، کتاب المناقب)۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے چھ باتوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور چھٹی فضیلت آپ نے یہ بیان فرمائی کہ میرے اوپر انبیا کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)۔

(۴) رسول اللہ صلعم نے فرمایا، رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔ (ترمذی، مسند احمد)

(۵) رسول کریم صلعم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو۔ اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ لامحالہ اس کو تمہارے اندر ہی نکلنا ہے (ابن ماجہ، کتاب الفتن)

(۶) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ بن الخطاب ہوتے۔ (ترمذی، کتاب المناقب)

(۷) رسول کریم صلعم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم)

(۸) رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعوےٰ کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (ابوداؤد، کتاب [illegible])

منکرین ختم نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں اگر کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو وہ یہ حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، "یہ تو کہو کہ حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں، یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔" حضرت عائشہؓ کی طرف جس روایت میں یہ قول منسوب کیا گیا ہے وہ بجائے خود غیر مستند ہے۔ اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابل ذکر محدث نے نقل نہیں کیا۔ تفسیر کی کتاب دُرِّ منثور اور لغت حدیث کی ایک کتاب تکملہ مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی سند کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ایسی ایک ضعیف ترین روایت کو نبی کریم صلعم کے اُن ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابہؓ کرام کے اجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلعم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعوےٰ کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، ان سب کے خلاف صحابہؓ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔ اس سلسلے میں مسیلمہ کذاب کا معاملہ قابل ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلعم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعوےٰ یہ تھا کہ اسے حضور صلعم کے ساتھ شریک نبوت کیا گیا ہے۔ بنو حنیفہ نیک نیتی کے ساتھ اس پر ایمان لائے تھے اور انھیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم نے اس کو خود شریک رسالت کیا ہے۔ مگر صحابہ کرام نے بنو حنیفہ کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ مسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور جب وہ لوگ اسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنا لیا گیا۔ یہ کارروائی حضور صلعم کی وفات کے فوراً بعد ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں اور صحابہؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی۔ اجماع صحابہ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

اجماع صحابہ کے بعد جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دور صحابہ کے بعد کے علمائے امت کا اجماع ہے۔ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علماء اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو بھی آپؐ کے بعد نبوت کا دعوےٰ کرے یا اس کو مانے، وہ کافر اور خارج از ملت اسلام ہے۔ اس سلسلے کے چند شواہد درج ذیل ہیں:

(۱) امام ابو حنیفہؒ (۸۰ھ - ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا اور کہا "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امام اعظمؒ نے فرمایا: "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم فرما چکے ہیں 'لا نبی بعدی'۔" (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ)

(۲) علامہ ابن جریر طبری (۲۲۴ھ - ۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں سورۂ احزاب کی آیت ۴۰، کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مہر لگا دی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا۔"

(۳) امام طحاوی (۲۳۹ھ - ۳۲۱ھ) سلف صالحین اور خصوصاً امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ [illegible]

Marfat.com

[illegible] کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: " اور یہ کہ محمد صلی اللہ [illegible] اللہ کے برگزیدہ بندے، چنیدہ نبی، اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیاء، امام الاتقیا، سید المرسلین اور حبیب رب العالمین ہیں۔ ان کے بعد نبوت کا ہر دعوے گمراہی اور خواہش نفس کی بندگی ہے۔" (شرح الطحاویہ فی العقیدۃ السلفیہ)۔

(۴) علامہ ابن حزم اندلسی (۳۸۴ھ - ۴۵۶ء) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی کریم صلعم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزّ و جلّ فرما چکا ہے کہ محمدؐ نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔" (المحلّی)۔

(۵) امام غزالی (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں کہ امّت نے بالاتفاق لفظ 'لا نبی بعدی' سے اور نبی کریم صلعم کے قرائن احوال سے یہ سمجھا ہے کہ حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ آپ کے بعد کبھی نہ کوئی نبی آئے گا نہ رسول۔ نیز امّت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں کسی تاویل اور تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو منکرِ اجماع کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا" (الاقتصاد فی الاعتقاد)۔

(۶) علامہ زمخشری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں "اگر تم کہو کہ نبی کریم صلعم آخری نبی کیسے ہوئے جبکہ حضرت عیسیٰؑ آخری زمانے میں نازل ہوں گے، تو میں کہوں گا کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدیہ کے پیرو اور آپؐ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ گویا کہ وہ آپ ہی کی امّت کے ایک فرد ہیں۔"

(۷) علامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر 'انوار التنزیل' میں لکھتے ہیں آپؐ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا یا جس سے انبیاء کے سلسلے پر مہر کر دی گئی اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا ختم نبوت میں قادح نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپؐ ہی کے دین پر ہوں گے۔"

(۸) علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں "پس یہ آیت (احزاب: ۴۰) اس باب میں نصّ صریح ہے کہ نبی کریم صلعم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعوے کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجّال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے خواہ وہ کیسے ہی فرق عادت، شعبدے، جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے۔"

(۹) فتاویٰ عالمگیری جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے مرتب کیا تھا، اس میں لکھا ہے "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔"

قرآن مجید کی رُو سے ختم نبوت اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے نازک معاملے میں اللہ تعالےٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدرجہ اولیٰ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالےٰ خود قرآن میں صاف صاف اس کی تصریح فرماتا۔ رسول اللہ صلعم کے ذریعے اس کا کھلم کھلا اعلان کراتا اور حضورؐ دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امّت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمہیں ان کو ماننا ہوگا۔

قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاءؑ مبعوث ہوئے ہیں۔ اوّل یہ کہ کسی قوم میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا ہو اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ دوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو یا اس میں تحریف ہو گئی ہو اور اس کے نقش قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔ سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔ چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی کریم صلعم کے بعد باقی نہیں رہی۔ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپؐ کی دعوت سب قوموں تک پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ قرآن مجید اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر پر شہادت دے رہا ہے کہ حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ آنحضورؐ کے ذریعے سے دین کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ لہٰذا تکمیل دین کے لیے کوئی نبی درکار نہیں۔ چوتھی ضرورت کے لیے اگر کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔ (شریف جاوید)

ختنہ

دیکھئے ختان

خجندی

(وفات ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء) ابو محمود حامد بن خضر خجندی، ماہر فلکیات۔ بویہی خاندان کے حکمران فخر الدولہ کے عہد حکومت (۹۷۶ء - ۹۹۷ء) میں شہر رے میں مقیم تھا اس نے ایک سُدس (مقیاس ارتفاع) ایجاد کیا۔ یہ دو متوازی اور مستقیم دیواروں پر مشتمل تھا جن کا درمیانی فاصلہ بارہ فٹ تھا۔ سطح زمین سے تیس فٹ اوپر اور تیس فٹ نیچے تک جاتی تھیں اور اس پر دس دس انچ کے فاصلے پر نشان لگائے گئے تھے۔ شمالی سرے پر موجود سوراخ میں سے گزرنے والی شعاعیں ایک سفید سطح پر منعکس ہوتی تھیں جو محیط دائرے کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی تھیں چنانچہ اس طرح سے سورج کا انتہائی ارتفاع دریافت کر لیا گیا۔ خجندی نے ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں سُدس کی مدد سے منطقۃ البروج کی سطح کا اندازہ کیا۔ منطقۃ البروج کی سطح کا یہ اندازہ پہلے اندازوں سے قدرے مختلف ثابت ہوا یعنی ۲۳ درجے ۳۲ دقیقے ۲۱ ثانیے۔ جو مروجہ اندازے سے ۱/۴ ۳ دقیقے مختلف ہے۔

Marfat.com

خجندی نے بہت شرح بسط سے یہ عذر پیش کیا ہے کہ علم ہیئت سے متعلق مقداریں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے سطح منطقۃ البروج کے مائل بہ تبدیل ہونے کے خلاف اصولاً کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ خجندی نے ایک اور آلہ بھی ایجاد کیا تھا جو شاملہ کہلاتا تھا یا اصطرلاب اور مقیاس الارتفاع دونوں کی جگہ کام آتا تھا ابتدا میں یہ ایک عرض بلد کے لیے ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بعد میں ابن حنین اصطرلابی نے اُسے سب اعراض بلدی کے لیے قابلِ استعمال بنا دیا۔ (ش۔ ع)

خدیجہ رضؓ

ام المؤمنین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجۂ محترمہ قریش کے ممتاز خاندان اسد بن عبد العزیٰ سے تھیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔ خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ اسد بن عبد العزیٰ قریش کے ان نو ممتاز خاندانوں میں سے تھا جن میں دس قومی اور ملکی اعزازات منقسم تھے۔ جب قریش کو قومی اور ملکی مسائل درپیش ہوتے تو وہ صلاح مشورے کے لیے اس قبیلے کے پاس آتے تھے۔ آبائی سلسلۂ نسب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ آنحضرت صلعم کی پھوپھی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ عام الفیل سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ کا پہلا نکاح ابوہالہ تمیمی سے ہوا۔ بنو تمیم قریش کے ہم حلیف تھے۔ اس شوہر سے آپ کی تین اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے ہند اور حارث اور ایک لڑکی زینب۔ پہلے شوہر کی وفات کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ سے ہوا۔

دوسرے شوہر سے آپ کی ایک لڑکی ہوئی جو ام محمد کی کنیت سے مشہور ہوئی۔ عتیق بن عائذ رشتے میں حضرت خالدؓ بن ولید کے چچا تھے آپ بنو مخزوم سے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۳۵ برس تھی کہ آپ کے والد خویلد کا انتقال ہوگیا قریش کی طرح حضرت خدیجہؓ کا ذریعۂ آمدنی بھی تجارتی کاروبار تھا۔ حضرت خدیجہؓ ایک متمول خاتون تھیں۔ ان کا مال شام جایا کرتا تھا اور تنہا ان کا سامان تمام قریش کے سامان کے برابر ہوتا تھا۔ وہ معاوضے پر دوسرے لوگوں سے تجارت کا کام لیتی تھیں۔ آنحضرتؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ حضرت خدیجہؓ کی بھاوج تھیں۔ آپؐ اپنے چچا ابو طالبؓ کے ساتھ بعض تجارتی سفر کرنے کے بعد تجارت اور کاروبار میں ماہر ہو چکے تھے۔ آپؐ کی راست بازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق کا چرچا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے صدق و دیانت کا حال سُن کر آپؐ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرا مال تجارت لے کر شام جائیے۔ میرا غلام میسرہ آپؐ کے ہمراہ ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ جو معاوضہ میں آپ کے ہم قوموں کو دیتی ہوں، آپؐ کو اس کا دگنا دوں گی۔ آپؐ جو سامان ساتھ لے کر گئے اُسے فروخت کر کے دوسرا سامان خرید لیا۔ جہاں سامان بکتے ہیں فروخت ہونے سے اور بھی منافع ہوا۔ حضرت خدیجہؓ نے خوش ہو کر طے شدہ معاوضے کا دگنا ادا کیا۔ تجارتی سفر کے تین ماہ بعد حضرت خدیجہؓ نے نفیسہ بنت منیہ کے ذریعے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ آنحضرت صلعم ابو طالب اور تمام رؤسائے خاندان حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے۔ ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانسو درہم طلائی مہر قرار پایا۔ شادی کے وقت آنحضرت صلعم کا سن مبارک ۲۵ برس اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی تھیں۔

غارِ حرا میں آنحضرت صلعم پر پہلی بار وحی نازل ہوئی تو آپ نے گھر آکر حضرت خدیجہؓ سے فرمایا "مجھے اپنی جان [illegible]" حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا: "ہرگز نہیں، خدا کی قسم [illegible] آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ بیکسوں اور [illegible] کی [illegible] اور مصائب میں حق کی حمایت کرتے ہیں"۔ مسلمانوں کا [illegible] سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ آپؐ پر ایمان لائیں۔ قبول اسلام کے وقت [illegible] سال تھی۔ قبول اسلام کے بعد حضرت خدیجہؓ کی دولت و ثروت [illegible] اشاعت اسلام کے لیے وقف ہوگئی۔ آنحضرت صلعم کو مشرکین کی تردید یا تکذیب سے [illegible] پہنچا، حضرت خدیجہؓ کے پاس آکر دور ہوجاتا۔ وہ آپ کو تسلی دیتیں، آپؐ کی ہمت افزائی کرتیں۔ آپ کی باتوں کی تصدیق کرتیں اور مشرکین کی بدسلوکیوں کو آپ کے سامنے ہلکا کر کے بیان کرتی تھیں۔ محرم ۷ نبوت میں آپ کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ یہاں آنحضرت صلعم کے ساتھ حضرت خدیجہؓ بھی تین سال تک محصور رہیں۔ آنحضرت صلعم کے نکاح میں آنے کے بعد آپ کے چھ اولادیں ہوئیں۔ دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں۔ یعنی قاسمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ، عبد اللہؓ۔ دونوں صاحبزادے صغر سنی میں فوت ہوگئے۔ حضرت خدیجہؓ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ حضرت ابراہیمؓ کے علاوہ آنحضرت صلعم کی تمام اولاد انہی سے پیدا ہوئی۔ جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں آنحضرت صلعم نے دوسری شادی نہیں کی۔

شعب ابی طالب سے نکلنے کے چند روز بعد اور واقعہ معراج سے قبل، رمضان ۱۰ سنِ نبوت کو ۶۵ برس کی عمر میں حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ آنحضرت صلعم نے آپ کو حجون میں دفن کیا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات ابو طالب کی وفات سے تین دن بعد ہوئی۔ ان دونوں عزیزوں کی وفات سے آنحضرت صلعم کو بے حد صدمہ ہوا۔ اس نسبت سے وہ سال عام الحزن کہلایا۔ آنحضرت صلعم فرمایا کرتے تھے۔ خدیجہؓ نے اس وقت میری تصدیق کی اور مجھ پر ایمان لائی جب لوگوں نے میری تکذیب کی۔ حضرت جبریلؑ حضرت خدیجہؓ کے لیے اللہ تعالیٰ کا سلام لے کر آتے تھے۔ (ش۔ ج)

خذلان

ایک اصطلاح۔ یہ صرف اس وقت استعمال ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اپنے فضل اور مدد سے محروم کر دے۔ بحث سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۰ سے شروع ہوئی۔ "اگر وہ تمہیں چھوڑ دے (یخذلکم) تو کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے۔ لہٰذہ اہل ایمان کو چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں"۔ امام رازیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اسی آیت سے صحابہ کرامؓ نے یہ استنباط کیا کہ ایمان کا حصول صرف اللہ کی مدد پر منحصر ہے اور ایمان سے محرومی کا سبب اللہ کی طرف سے خذلان ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کیونکہ آیت بالا صاف بتا رہی ہے کہ معاملہ بالکل اللہ کے ہاتھوں میں ہے"۔ ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ صحیح ہدایت و تائید اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کی طرف سے (تیسیر) ہوتی ہے اور مومن کو ان اچھے کاموں کی توفیق ہوتی ہے جن کے لیے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ ابن حزم کا استدلال یہ بھی ہے کہ "اللہ نے آدمی کو دو صلاحیتیں دی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک تمیز اور دوسری ہوا (یعنی خواہش اور ہوس)۔ جب اللہ کسی نفس کی حفاظت کرتا ہے تو اس وقت اللہ کی تائید و توفیق سے اس کی قوت تمیز غالب آجاتی ہے لیکن جب وہ نفس کو خود اسی پر چھوڑ دیتا ہے (خذل) تو پھر "ہوا" کو قوت دے کر اتنا غالب کر دیتا ہے کہ آدمی گمراہ ہوجاتا ہے۔ یہی اضلال ہے"۔ معتزلہ اس تصور کو اللہ کے عدل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اللہ کسی انسان کو صحیح کام کی [illegible]

[illegible] اصطلاح میں خذلان کا مطلب ہے اللہ کا اپنے فضل سے محروم کر دینا۔ اشعریوں کے نزدیک خذلان کا مطلب نافرمانی کرنے کا میلان عطا کرنا ہے۔

خراج

زرعی ٹیکس جو غیر مسلم مالکوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ ہر اس زمین کا خراج وصول کیا جا سکتا ہے جسے مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد غیر مسلم مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا ہو۔ زرعی ٹیکس کے بارے میں حضورؐ کی ایک حدیث مبارک ہے جس زمین کو بارش نے سیراب کیا ہو اس پر عشر ہے اور جسے ڈول یا چھال سے سینچا گیا ہو اس پر نصف عشر ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر زمین مسلمان کی ملکیت ہو گی تو اس پر دسواں حصہ یا پانچواں حصہ زرعی ٹیکس کی صورت میں دیا جانا ضروری ہے چونکہ غیر مسلم اس حدیث کا مخاطب نہیں ہو سکتا اس لیے وہ اپنی زمین کا ٹیکس خراج کی صورت میں ادا کرے گا۔ جو آپس میں باہم طے کیا جاتا ہے۔ خراج وصول کرنے والے کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے خراج مقرر کرے۔

خراج وصول کرنے کی ابتدا حضرت عمرؓ فاروق کے زمانے سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے غیر مسلم علاقہ فتح کرنے کے بعد صحابہ کبارؓ کے مشورے سے خراج کی ابتدا کی تھی اور ارضِ سواد پر پہلی مرتبہ خراج عائد کیا تھا اس کے بعد یہ سنت جاریہ بن گئی اور آپ کے بعد بھی مسلمانوں نے غیر مسلموں کے علاقے فتح کرنے کے بعد زمین دوبارہ ان کے سپرد کی تو ان پر خراج عائد کیا۔

مختلف فقہا نے خراجی زمین کی تین قسمیں بتائی ہیں جو خراج مقرر کرتے اس کی کمی یا زیادتی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ زمین زرخیز ہے یا بنجر جس سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کھیتی اچھی ہو گی یا خراب۔ اس کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ کھیتی کیسی ہے۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ آمدنی کتنی ہو گی۔ سب سے آخر میں آلات کشاورزی کو پرکھا جاتا ہے یہ تینوں باتیں کسی زمین پر خراج کی شرح عائد کرتے وقت ذہن میں رکھی جاتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کے بعد خراج ان حکومتوں سے بھی وصول کیا جانے لگا جو طاقت و قوت میں کمزور ہوں یا ان کا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو اور لڑائی کے بغیر ہی صلح کر لیں۔ ایسی صورت میں صلح کے معاہدے میں خراج کے طور پر ایک رقم جو سالانہ وصول کی جاتی تھی مقرر کر لیتے تھے۔ عباسی دور کے فقہا نے جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں ان میں خراج کے بارے میں ضرور لکھا ہے۔ کیونکہ اس وقت خراج حکومت کا ایک اہم ذریعۂ آمدنی بن چکا تھا۔

کوئی زمین ابتدا میں مسلمان کے پاس ہو تو اس پر خراج نہیں لگایا جا سکتا بلکہ عشر لگایا جائے گا۔ اور اگر وہ زمین کسی وجہ سے غیر مسلم کی ملکیت بن جائے تو بھی وہ عشری رہے گی۔ اسی طرح اگر کوئی زمین پہلے کسی غیر مسلم کی ہو اور اس پر خراج عائد کیا جا چکا ہو اور وہ مسلمان کے پاس آ جائے تو وہ زمین خراجی ہی رہے گی۔ حضورؐ اپنے زمانے میں جزیہ وصول کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ان لوگوں سے مقابلہ کرو جنھوں نے اللہ کا دین قبول نہیں کیا، نہ وہ یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں نہ دین کی پیروی کرتے ہیں یہاں تک کہ فروتنی کے ساتھ جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔"

خراج مقرر کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ خراج دینے والے کو غیر ضروری تکلیف نہ پہنچے۔ علمائے فقہ کا قول ہے کہ عشر میں جو تکلیف ہے وہ مسلمان کو عبادت کا ثواب پہنچاتی ہے۔ اور خراج میں جو تکلیف ہے اس کا مطلب عقوبت ہوتا ہے۔

خراسان

ایران کے مشرق میں ایک وسیع صوبہ۔ عرب جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ اس کی سرحدیں مشرق میں سجستان اور ہند، مغرب میں صحرائے غُز اور جرجان، شمال میں بلاد ماوراء النہر، جنوب میں صحرائے ایران اور ضلع قومس (عراق عجم)۔ اس صوبے کے بڑے شہر نیشاپور، مرو، شاہجہان، ہرات اور بلخ تھے۔ موجودہ صوبہ خراسان میں قدیم صوبے کا نصف حصہ بھی شامل نہیں۔ سرخس سے شروع ہو کر جنوب کی طرف مشہد اور ہرات کے درمیان کا علاقہ افغانستان میں شامل ہو گیا ہے۔ مرو سے دریائے جیحوں تک پھیلا ہوا علاقہ روسی قلمرو میں ہے۔

۳۱ھ/۶۵۲ء میں عبداللہ بن عامر نے ضحاک بن قیس کی کمان میں جو لشکر فارس اور خوزستان سے روانہ کیا تھا، وہ خراسان پر حملہ آور ہوا۔ ابن قتیبہ کے مطابق یہاں کے باشندوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں مناقشت ہوئی تو عربوں کو نیشاپور سے نکلنا پڑا۔ حضرت امیر معاویہؓ حکمران ہوئے تو انھوں نے خراسان کو پھر سے زیر نگین کر لیا۔ خراسان ہی وہ صوبہ ہے جہاں ابو مسلم نے عباسیوں کے حق میں پراپیگنڈا کیا اور ان کی حمایت کے لیے فوجی بھرتی شروع کی اور بالآخر خلافت بنو امیہ کے زوال کا باعث بنا۔ خراسان حقیقی طور پر طاہری عہد میں آزاد ہوا جس کا مؤسس طاہر بن حسین تھا۔ اسے ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں خلیفہ مامون الرشید نے مشرقی علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔ ۹۰۰ء میں اسمٰعیل سامانی نے خراسان کو بلاد ماوراء النہر میں شامل کر لیا۔ ۹۹۴ء میں سلطان محمود بن سبکتگین اس پر قابض ہوا۔ ۱۰۳۸ء میں سلطان مسعود غزنوی نے خراسان فتح کیا۔ اگلے سال طغرل بیگ خراسان پر قابض ہوا۔ اس کے بعد خراسان خوارزم شاہیوں کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۲۲۰ء میں چنگیز خاں کے حملوں نے خراسان کی آزادی کلیتہً ختم کر دی۔ ۱۲۲۰ء کے بعد خراسان میں آل کرت اور سربداروں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ۱۳۸۱ء میں یہاں تیمور کا ورود ہوا۔ شیبک خاں ازبک نے شاہ اسمٰعیل اول کو شکست دے کر ۱۵۰۷ء میں خراسان فتح کر لیا۔ نادر شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نیشاپور اور مشہد کے سوا باقی علاقہ افغانستان میں شامل کر لیا۔ (ش۔ ج)

خرقہ

کپڑے کا پھٹا ہوا ٹکڑا کسی صوفی کا موٹا جھوٹا اونی لبادہ۔ صوفی کے فقر و قناعت کی ظاہری علامت۔ علی ہجویریؒ کا مقولہ ہے۔ "صوفی وہ ہے جو دل میں حرقہ (سوزِ دروں) رکھتا ہو نہ کہ وہ جو تن پر خرقہ (ظاہری لباسِ درویشی)۔ ابتدا میں بالعموم خرقہ نیلے رنگ کا ہوتا تھا۔ بعض اہلِ تصوف کوئی خاص لباس پہننا پسند نہیں کرتے تھے ان کی نظر میں یہ محض دکھاوا اور ریاکاری تھی۔ کسی مرید کو اپنے استاد (شیخ یا پیر) کی جانب سے خرقہ عطا کیا جانا ایک رسمی تقریب ہوتی تھی۔ خرقہ اس بات کا پتا دیتا ہے کہ اس کے پہننے والے نے سچائی کا راستہ یعنی صوفیا کا طریقہ اختیار کر لیا ہے اور اپنی خودی کو ترک کر کے مکمل طور پر اپنے آپ کو شیخ کے حوالے کر دیا ہے۔

خرقے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک "خرقۃ الارادہ" جس کا کوئی شخص اپنے شیخ سے خواستگار ہوتا ہے اور اس کے قبول کرنے سے وہ بے چون و چرا فرمانبرداری

Marfat.com

کا پابند رہتا ہے۔ دوسرا خرقۂ تبرک ہے جسے شیخ اپنی منصبی حیثیت سے ایسے آدمیوں کو عطا کرتا ہے جن کے متعلق اسے خیال ہو کہ ان کو طریقہ تصوف پر ڈالنا کارآمد ہوگا۔ (ش - ج)

خرقہ شریف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرہن کا نام جو قسطنطنیہ میں محفوظ ہے اور جس کی تبرک کے طور پر تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ ہر سال پندرھویں رمضان کو اس کی زیارت کا دن تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ یہ پہلے محل سلطانی کے ایک خاص کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ خرقہ شریف ایک چوڑی آستینوں والی عبا ہے جو اونٹ کی سفید اون کی بنی ہوتی ہے۔ ۱۸۴۹ء میں خرقہ شریف کو ایک مسجد میں منتقل کر دیا گیا جو سلطان عبد الحمید کی والدہ نے خاص طور پر اس کے لئے بنوائی تھی۔ یہ یادگار عمارت خرقہ شریف جامعی کہلاتی ہے اور استنبول یعنی باغچہ محلے میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک وسیع باغ ہے۔ مسجد ایک خوش قطع ہشت پہلو عمارت ہے جس کے اوپر ایک گنبد ہے اور پہلوؤں میں ایوان ہیں جن سے یہ عمارت شیشے دار رواقوں کے ذریعے ملی ہوئی ہے۔ چھت کے کنارے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف لوہے کا خوبصورت جنگلا ہے۔ (ش - ج)

خرگوشی

(وفات ۴۰۷ھ/۱۰۱۶ء) ابو سعید عبد الملک ابن محمد خرگوشی ایک مشہور واعظ اور زاہد۔ نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پہلی کتاب "شرف النبی" آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ پر ہے۔ اس میں وہ تمام احادیث جمع کی گئی ہیں جو سیرت پاک سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کی آٹھ جلدیں ہیں۔ دوسری کتاب "البشارۃ والنذارۃ فی تعبیر الرؤیا" یہ ایک زاہدانہ تالیف ہے جو خوابوں کی تعبیر پر لکھی گئی ہے۔ ان کی تیسری اور سب سے اہم کتاب "تہذیب الاسرار" ہے۔ اس کتاب میں تصوف کی تاریخ کے متعلق کافی مواد ملتا ہے۔ اس میں تصوف کے اقوال باقاعدہ مرتب کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت ابو نصر السراج کی تالیف "کتاب اللمع" کا سرقہ ہے۔ (ش - ج)

خرمیہ

ایک فرقہ جس نے ۱۳۶ھ میں ابو مسلم خراسانی کے قتل کے بعد شہرت پائی۔ ان میں سے ایک شخص سنبذ نے ابو مسلم کے انتقال کا معاوضہ کرتے ہوئے خراسان میں بغاوت کا آغاز کیا۔ اس بغاوت کو تین ماہ کے اندر دبا دیا گیا۔ اس کے بعد ان کا ذکر المامون کے عہد میں آتا ہے جب اس فرقے کے ایک شخص بابک خرمی نے اسلامی حکومت کے خلاف سرکشی اختیار کی۔ ۲۲۳ھ میں اسے ہلاک کر دیا گیا۔ المسعودی کے زمانے (۳۳۲ھ/۹۴۳ء) میں اس فرقے کے لوگ رے، اصفہان، آذربائیجان، کرج، برج، اور مسبذان میں پائے جاتے تھے۔

خرمیہ کے عقائد کے بارے میں مطہر بن طاہر نے "کتاب بدء الخلق والتاریخ" میں بیان کیا ہے کہ یہ لوگ مختلف فرقوں اور جماعتوں میں منقسم ہیں لیکن یہ سب کسی برگزیدہ ہستی کی دنیا میں واپسی کے عقیدے پر متفق ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ سب کے سب پیغمبر خواہ ان کی شریعت اور مذہبی طریقے ایک دوسرے سے مختلف ہوں، ایک ہی جذبے سے متاثر ہوتے ہیں۔ الہام اور وحی کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ تمام [illegible] میں جزا کی امید اور سزا کا خوف نہیں۔ [illegible] کی جائے یا اسے کوئی فرضی [illegible] ان کی جماعت کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرے [illegible] کا خواہاں نہ ہو۔ وہ ابو مسلم کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔ ان کے اپنے امام ہوتے ہیں جن سے وہ شرعی معاملات میں مشورہ لیتے ہیں اور ان میں ایسے مبلغین بھی ہیں جو ان کے دیہات کا دورہ کرتے رہتے ہیں انھیں وہ "فرشتوں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خمر اور دوسری شرابیں دیگر سب چیزوں سے بڑھ کر خوشی اور برکت کا موجب ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ اشتراک ازواج کو ممنوع تصور نہیں کرتے، بشرطیکہ عورتیں اس پر راضی ہوں۔ (ش - ج)

خزاعہ بن عمرو

جنوبی عرب کا ایک قبیلہ، جو عمر بن لحی بن ربیعہ بن حارثہ کی اولاد سے تھا۔ یہ لوگ قبیلہ آزد کی دوسری شاخوں کے ہمراہ عہد قدیم میں جنوبی عرب کو چھوڑ کر مکہ پہنچے اور بنو جرہم کے ساتھ ایک شدید جنگ کے بعد شہر مکہ اور حرم مکہ پر پورا تسلط جما لیا۔ ربیعہ بن حارثہ بن عمرو نے مکے کے آخری حکمران عامر بن عمرو بن حارث کی بیٹی فہیرہ سے شادی کر لی تاکہ بیت الحرام کی تولیت پر اپنا دعویٰ قانونی طور پر قائم کر لے۔ ربیعہ نے حج کی رسوم کا دوبارہ اجرا کیا اور زائرین کے آرام و آسائش کا انتظام کیا۔ اس نے سب سے پہلے کعبے کے گرد بت لا کر رکھے۔ خاص طور پر عراق عرب میں مقام ہیئت سے ہبل نامی بت وہاں لایا گیا جو رسول اللہ کے زمانے تک کعبے اور بتوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ بعض عرب مورخین کے بیان کے مطابق اس قبیلے کے لوگ تین سو اور پانچ سو سال تک کعبے کے متولی رہے۔ آخری حکمران خلیل بن حبشیہ بن سلول بن کعب بن عمرو تھا جس نے اپنی بیٹی حُبّیٰ کی شادی قبیلہ قریش کے سردار قصیّ بن کلاب سے کر دی۔ بالآخر قبیلہ قریش اور خزاعہ کے درمیان جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں کعبے کی تولیت اور شہر مکہ کی حکمرانی اہل قریش کو مل گئی۔ (ش - ج)

خزرج، بنو

عرب کا ایک قبیلہ جو اپنے ساتھی قبیلے اوس کے ہمراہ آغاز اسلام کے وقت مدینہ، خیبر اور تیما میں آباد تھا۔ چونکہ ان دونوں قبیلوں نے اسلام کی اشاعت و ترقی میں نمایاں حصہ لیا اس لئے انھیں "انصار" کے باعزت لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب رسول اللہ صلعم نے ۱۲ ربیع الاول ۱۳ نبوی (۲۴ ستمبر ۶۲۲ء) کو شہر یثرب (مدینہ) کے باہر کی بستی قبا میں نزول فرمایا تو یہ دونوں متحارب قبائل باہم شیر و شکر ہو گئے۔ غزوہ بدر میں خزرج کے ۱۷۵ افراد شریک جہاد ہوئے۔ انصار کو بھی مہاجرین ہی کی طرح معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ رسول اللہ کی مدح سرائی کرنے والے شاعر خزرجی تھے یعنی حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبد اللہ بن رواحہ۔ (ش - ج)

خزیمہ بن ثابت انصاری

صحابی رسول، راوی احادیث نبوی، کنیت ابو عمارہ تھی۔ خاندان [illegible] خزرج میں سے تھے۔ ہجرت مدینہ منورہ سے قبل [illegible]

Marfat.com

[illegible] آپ نے گھوڑے کی قیمت ابھی
[illegible] فروخت کر دیا۔ آنحضرت صلعم نے بدو
[illegible] میں تم سے گھوڑا خرید چکا ہوں۔ بدو نے کہا کر گواہ لائیے۔ گواہ کے مطالبے
پر سب مسلمان خاموش رہے لیکن حضرت خزیمہؓ نے کہا کہ میں گواہ ہوں کہ تم نے رسولؐ
اللہ کے ہاتھ گھوڑا فروخت کیا۔ رسولؐ اللہ نے پوچھا کہ سودا کرتے وقت تم موجود نہ تھے
۔ تم کس طرح گواہی دیتے ہو ؟ خزیمہؓ نے کہا میں آپ کی بات کی تصدیق کرتا ہوں
آنحضورؐ نے خوش ہو کر "ذو الشہادتین" کا لقب دیا۔ جنگ جمل میں حضرت عمارؓ بن یاسر
کو شامی افواج نے شہید کیا تو حضرت خزیمہؓ تلوار اٹھا کر شامی افواج کے خلاف برسر
پیکار ہوئے اور شہادت پائی۔ حضرت خزیمہؓ فرماتے تھے میں نے رسولؐ اللہ سے
سنا تھا کہ عمارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ آپ نے رسولؐ اللہ سے ۳۸ احادیث بیان
کی ہیں آپ انصار میں بڑی عزت اور وقار کے مالک تھے۔ (ش۔ ج)

خسرو

دیکھئے کسریٰ

خسرو دہلوی، امیر

(۱۲۵۳ء ـــــــ ۱۳۲۵ء) برِ عظیم پاک و ہند کے عظیم المرتبت فارسی شاعر۔ اتر پردیش کے ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے ان کے والد سیف الدین محمود سلطان التمش کے عہد حکومت میں فوجی ملازم تھے۔ خسرو آٹھ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا اور وہ نانا کی نگہداشت میں آ گئے۔ نانا کی وفات کے بعد خسرو نے پہلے سامانہ کے حاکم اور سلطان بلبن کے بھتیجے علاؤ الدین کشلو خان کی ملازمت اختیار کی بعد میں سلطان کے بڑے بیٹے محمد قاآن کی ملازمت اختیار کی اور اس کے ساتھ ملتان چلے گئے ۱۲۸۴ء میں شہزادہ محمد مغلوں سے جنگ میں مارا گیا اور خسرو قید ہو گئے۔ تھوڑی مدت بعد رہائی پا کر دہلی پہنچے۔ ۱۲۸۷ء میں سلطان معز الدین کیقباد اپنے والد بغرا خاں سے ملنے کے لیے بنگال گیا تو خسرو بھی ساتھ گئے۔ واپسی پر حاتم خان حاکم اودھ کے پاس دو سال گزارے۔ بعد ازاں حاتم خان کی اجازت سے دہلی آئے اور کیقباد کی سرپرستی سے بہرہ اندوز ہوئے۔ سلطان جلال الدین خلجی کے دور حکومت (۱۲۹۰ - ۱۲۹۵) میں خسرو کو خلعت امارت عطا ہوا اور بارہ سو تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد سلطان علاؤ الدین خلجی نے خسرو کا وظیفہ برقرار رکھا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ (۱۳۱۶ء - ۱۳۲۰ء) اور سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء) کے دور حکومت میں بھی امیر خسرو کو بادشاہ کا قرب اور سرپرستی حاصل رہی۔ آخر عمر میں امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے۔ سلطان محمد بن تغلق کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد امیر خسرو کا انتقال ہوا اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کی پائنتی دفن ہوئے۔

امیر خسرو کی حسب ذیل تصانیف دستیاب ہیں۔ ۱۔ پانچ دیوان، تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ، نہایۃ الکمال (۲) خمسہ یعنی مطلع الانوار، شیریں وخسرو، آئینہ سکندری، ہشت بہشت، مجنوں و لیلیٰ (۳) غزلیات، مختلف مجموعے (۴) منثور تصانیف یعنی خزائن الفتوح، افضل الفوائد (حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات) اعجاز خسروی (۵) تاریخی مثنویاں یعنی قران السعدین، مفتاح الفتوح، دول رانی خضر خان، نہ سپہر، تغلق نامہ۔ امیر خسرو کی تصانیف قرونِ وسطیٰ کے ہندی اسلامی تمدن کا مفصل مرقع پیش کرتی ہیں امیر خسرو احساسات و واردات کے اظہار کے لیے نئی نئی تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں۔ گہرا مشاہدہ اور شدت احساس امیر خسرو کے کلام میں بدرجہ کمال نظر آتی ہے امیر خسرو کو الفاظ کے انتخاب کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ امیر خسرو کے واردات سالک و عارف کے واردات ہیں جو

انہوں نے مجازی رنگ میں پیش کئے ہیں فلسفۂ حیات ان کا خاص موضوع ہے جس کے اہم عناصر آرزو، جستجو اور امن پسندی ہیں۔ وہ عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ماہر موسیقی بھی تھے وہ فن موسیقی کے استادوں میں شمار ہوتے تھے انہوں نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کی باہمی آمیزش سے کئی راگ اور راگنیاں تخلیق کیں۔ ستار کے موجد بھی وہی کہے جاتے ہیں۔ (ش۔ ج)

خسرو، مُلّا

(وفات ۱۴۶۹ء) محمد بن فرامرز بن علی محمد خسرو، دولت عثمانیہ کا مشہور فقیہ۔ خسرو نے تفتازانی کے مشہور و معروف شاگرد برہان الدین حیدر ہروی کی شاگردی اختیار کی اور ادرنہ کے "شاہ ملک" مدرسے میں مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۴۴۴ء میں ادرنہ کے قاضی اور اس کے بعد رومیلیا کے قاضیٔ عسکر متعین ہوئے قسطنطنیہ کے سب سے پہلے قاضی خضر بیگ کی وفات پر اس کے جانشین بنے۔ اسی دوران میں ایا صوفیہ میں مدرس بھی رہے ۱۴۶۲ء میں بروسہ چلے گئے جہاں ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ ۱۴۶۹ء میں سلطان کے حکم سے استنبول آئے اور شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ استنبول ہی میں وفات پائی۔ ملا خسرو ایک مشہور و معروف فقیہ تھے مصنف کی حیثیت سے بھی انہوں نے بڑی شہرت پائی۔ ان کی دو اہم تصانیف دُرر الحُکام فی شرح غُرر الاحکام، میں فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں۔ اور مرقات الوصول فی علم الاصول، اصول فقہ پر مشتمل ہے۔ (ش۔ ج)

خسوف وکسوف

چاند گرہن اور سورج گرہن۔ زمین اپنی گردش کے دوران میں جب سورج اور چاند کے درمیان آ جاتی ہے تو چاند پر اس کا سایہ پڑنے لگتا ہے جسے عرف عام میں چاند گرہن کہتے ہیں۔ چاند گرہن کبھی مکمل لگتا ہے اور کبھی جزوی۔ زمین اور چاند دونوں دراصل تاریک سیارے ہیں جو سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد اپنے مدار پر گردش کر رہی ہے اور چاند زمین کے گرد۔ یہ دونوں سیارے سال میں تقریباً دو مرتبہ ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے ہیں۔ سورج گرہن اس وقت ہوتا ہے جب چاند زمین کے گرد اپنے مدار پہ گردش کرتا ہوا زمین اور سورج کے

Marfat.com

درمیان آجاتا ہے تو اس کا سایہ سورج پر پڑنے لگتا ہے۔ یہ سایہ کبھی تاریک ہوتا اور کبھی نیم تاریک۔ جب سورج کو گرہن لگتا ہے تو اس وقت سورج، چاند اور زمین ایک دوسرے کی سیدھ میں ہوتے ہیں۔ سورج کو عام طور پر جزوی گرہن لگتا ہے لیکن جب کبھی سورج مکمل گرہن ہوتا ہے تو دن کے وقت بھی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ستارے نظر آنے لگتے ہیں۔ سورج ایک سیاہ گیند کی طرح نظر آنے لگتا ہے جس کے گرد ایک زرد ہالہ بنا ہوتا ہے۔ مکمل سورج گرہن زیادہ سے زیادہ سات منٹ تک رہتا ہے اور اس کے بعد گرہن اترنا شروع ہو جاتا ہے۔ سورج گرہن کو ننگی آنکھ سے یا عام رنگ دار شیشوں کی مدد سے نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ اس وقت سورج سے ایسی شعاعیں خارج ہو رہی ہوتی ہیں جن سے آنکھوں کی بینائی کو نقصان پہنچتا ہے۔ ۲۰/۲۱ جون ۱۹۵۵ء کو دنیا کے بیشتر ملکوں میں مکمل سورج گرہن ہوا تھا۔ بہت سی قومیں سورج گرہن، چاند گرہن کو برا خیال کرتی ہیں اور ان سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ ہندو ان دنوں دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ مسلمان بھی سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت نمازِ خسوف وکسوف ادا کرتے ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ نمازِ خسوف کے بارے میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ "ایک بار سورج گرہن ہوا، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم گھبرائے اور ڈرے کہ قیامت نہ آجائے۔ چنانچہ مسجد میں آئے اور نماز پڑھی۔ اس میں رکوع و سجود اتنا طویل کیا کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر فرمایا "یہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔ کسی کے مرنے اور پیدا ہونے کے سبب گرہن نہیں لگتا۔ بلکہ خدا نشانیوں کے ذریعے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ لہٰذا جب گرہن دیکھو تو اللہ سے ڈرو، ذکر، دعا اور استغفار کرو۔" (متفق علیہ)

ایک اور حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ "جس دن حضرت ابراہیمؓ (آنحضرتؐ کے بیٹے) کی وفات ہوئی تو سورج کو گرہن لگا۔ چنانچہ آپؐ نے لوگوں کو چھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھائی۔" (مسلم)

خضاب

مہندی کو کہتے ہیں۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ خضاب نہیں کرتے تو تم ان کی مخالفت کرو۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ سب سے بہتر چیز جس سے بڑھاپا بدل جائے مہندی اور وسمہ ہے۔ ہمام کی بیٹی کریمہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ سے مہندی کے خضاب کے بارے میں دریافت کیا۔ اُمّ المومنین نے فرمایا کہ خضاب میں کچھ حرج نہیں لیکن اپنے لیے اس کو اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی بُو ناپسند تھی۔ خضاب کی ممانعت کہیں سے ثابت نہیں۔ (ش۔ ح)

خضرؑ

اللہ کے نبی اور برگزیدہ بندے۔ آپ کی حیات و وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض صوفیا اور اہلِ معرفت ان کی حیات کے قائل و معتقد ہیں۔ وفات کے قائل کہتے کا کہنا ہے کہ اگر حضرت خضرؑ عہدِ نبویؐ میں زندہ ہوتے تو ضرور آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ پر ایمان لاتے اور آپؐ کی رفاقت میں جہاد کرتے۔ مستند روایات سے ثابت ہے کہ حضرت خضرؑ نہ کسی صحابی کو ملے اور نہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت خضرؑ کے متعلق جو روایتیں اور حکایتیں مشہور ہیں ان کا تعلق قرآن مجید کے اس

بیان سے [illegible] ایک دن بنو اسرائیل کے اجتماع [illegible] سب سے بڑا عالم کون ہے؟ [illegible] موسیٰؑ سے ناراض ہو گئے اور انہیں حکم [illegible] ملیں جہاں سے زیادہ عالم ہے۔ ساتھ ہی حکم [illegible] جہاں پہنچ کر مچھلی گم ہو جائے وہاں حضرت خضرؑ سے ملاقات [illegible] اپنے خادم کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے جس کی منزل مجمع البحرین تھی وہاں ان کو خدا کا برگزیدہ بندہ ملا۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی تاکہ وہ حضرت خضرؑ کے علومِ باطن سے بہرہ ور ہو سکیں۔ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے تاکید کی کہ وہ ان سے کسی بات کی تشریح طلب نہ کریں۔ اور یہ بھی کہا کہ انجام کار موسیٰؑ ان کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ سفر کے دوران میں حضرت خضرؑ نے چند ایسی باتیں کیں (غریبوں کی کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک لڑکے کو قتل کر دیا، ایک گرنے والی دیوار تعمیر کر دی) جن سے حضرت موسیٰؑ کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ حضرت خضرؑ [illegible] میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ بالآخر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کا ساتھ چھوڑ دیا اور چلتے وقت اپنے افعال کی تشریح و توجیہہ بتائی۔

"مجمع البحرین" کے بارے میں بھی علماء میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں باب المندب کے پاس بحرِ ہند اور بحیرۂ احمر ملتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ مقام طنجہ کے قریب تھا جہاں بحیرۂ روم اور بحرِ اوقیانوس ملتے ہیں۔ بعض کے نزدیک جہاں بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ اردن ملتے ہیں۔ (ش۔ ح)

خضر بیگ

(۲۶ اگست ۱۴۰۷ء - ۱۴۵۹ء) عثمانی عالم اور شاعر۔ ان کا باپ جلال الدین ایک نامور خاندان سے تھا اور سیوری حصار کا قاضی تھا۔ خضر بیگ تحصیلِ علم کے بعد اپنے آبائی شہر میں پہلے قاضی اور پھر مدرس مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بروسہ میں پروفیسر، انیغول میں قاضی اور ازنق میں مدرس اور بالآخر قسطنطنیہ کی فتح پر وہاں کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ خضر بیگ علومِ اسلامیہ کے ماہر اور عربی، فارسی اور ترکی ادبیات کے متعلق وسیع علم کے مالک تھے۔ خضر نے بحرِ بسیط میں ایک واعظانہ نظم بعنوان "النونیہ فی العقائد" لکھی۔ ان کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں جو بیشتر منظوم ہیں۔ خضر بیگ کا انتقال استنبول میں ہوا۔ استنبول کے بالمقابل ایشیائی ساحل پر ان کی بڑی جاگیریں تھیں۔ یہاں ایک گاؤں اب تک ان کے نام پر "قاضی کوی" یعنی قاضی کا گاؤں کہلاتا ہے۔ (ش۔ ح)

تامل ادب کا اخلاقی شاہکار
کرل
• مصنف: ـــــ ترووَلوور
• مترجم: ـــــ حیرت سہروردی

Marfat.com

شاہکار ڈائجسٹ کتاب (۵۰۶)

کُرل

تامل زبان کا ایک
قدیم صحیفہ جس میں اس عہد کی تمام تر
اخلاقی تعلیمات اور نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی
ہے۔ کُرل میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو نیکی کی تلاش کے ساتھ ساتھ
سچائیوں کو سمجھنے کی راہ بتائی گئی ہے۔ دنیا میں رہنے اور
دنیا ترک کرنے کے آداب سکھائے
گئے ہیں

تامل علماء کے ایک گروہ کے نزدیک کُرل کی
اہمیت سنسکرت ویدوں سے بھی زیادہ ہے

مترجم: حسرت سہروردی

۲/۵۰

کُرل نے تامل ادب میں اپنی صدیوں پرانی اہمیت
اور وقار کو قائم رکھا ہے

مصنف: ترووّلور

سی راجگوپال آچاریہ کے پیش لفظ کے ساتھ

Marfat.com

شاہکار جریدی کتاب نمبر (۵۶)

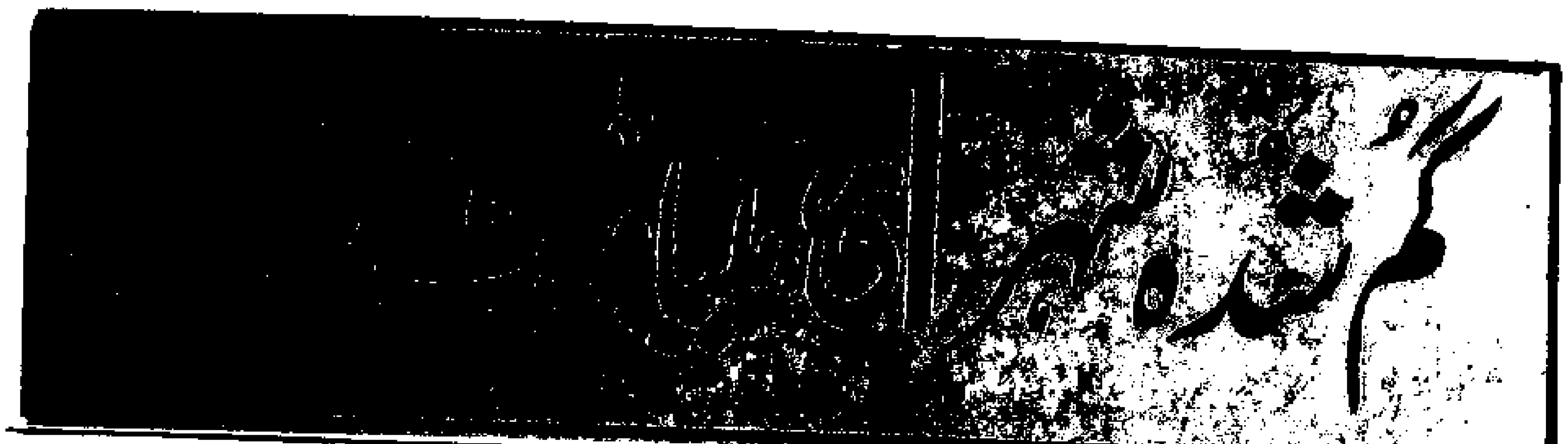

انسانی تہذیب کے قدیم گہواروں پر وقت کے ہاتھوں کیا گزری؟

- **پومپیائی** ، خوش و خرم لوگوں کا مصروف شہر تھا۔ اچانک آگ اور راکھ کی خوفناک بارش ہوئی اور شہر کو موت نے دبوچ لیا۔ ہنستا بستا شہر صرف ایک دن میں نیست و نابود ہوگیا۔
- **ہومر کا ٹرائے** ۔ جس کے متعلق ایک عرصہ تک کہا جاتا رہا کہ ٹرائے نام کا کوئی شہر دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن ۱۸۷۰ء میں ایک دیوانہ اس شہر کے کھنڈرات دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔
- **نوساس** ۔ کریٹ کے عظیم بادشاہ منہاس کا دار السلطنت ۔ منہاس پہلا حکمران بتایا جاتا ہے جس کے پاس بحری بیڑہ تھا اور بیشتر یونانی سمندر اس کی عملداری میں تھے۔ ۱۴۰۰ قبل مسیح میں ایک رات تباہی آئی اور کریٹ کی طاقت دھواں بن کر اڑ گئی۔
- **بابل** ۔ انسانی تمدن کی قدیم ترین سرزمینوں میں سے ایک ۔ جہاں بڑی بڑی سلطنتیں عروج و زوال کے مرحلوں سے گزریں ۔ بابل کے جابر بادشاہ، عقل مند پروہت، خوبصورت باغ اور سر بفلک مینار وقت کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے۔
- **مایاؤں کا چیچن اٹزا** ۔ گوئٹے مالا اور میکسیکو میں آباد مایا نسل کے لوگوں نے مضبوط شہر تعمیر کئے پھر جنگل پھیلتے پھیلتے شہروں پر غالب آ گئے ۔ جھاڑیاں اور بیلیں عمارتوں کو جکڑنے لگیں اور آئندہ تین سو برس کے لیے یہ شہر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

قیمت: ۳/۵۰

مصنف : رابرٹ سلور برگ

سرورق : ایشین آرٹ پریس، ۱۲، میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

۱۹

• مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود
• نائب مدیر : شریف جاوید

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبۂ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴- لاہور

شاہکاریہ

اور اب نفسیات —

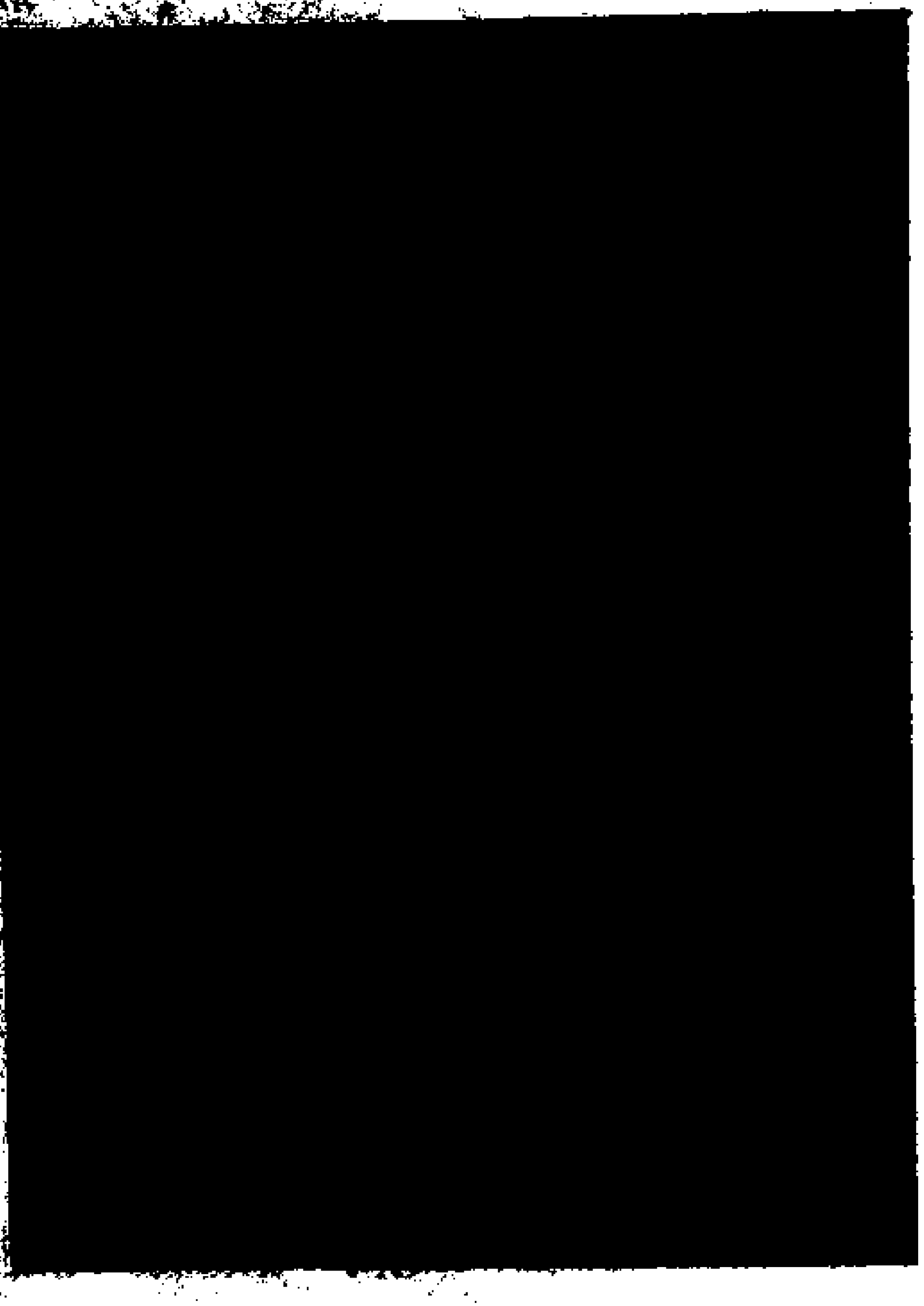

گذشتہ دو برس میں شاہکار واقفیت عامہ، اسلامیات، شخصیات پاکستانیات، تاریخ، فلسفہ، آثار قدیمہ، دفاع اور طب و صحت کے بارے میں کتب شائع کر چکا ہے۔ ادبیات میں ناول، افسانے ڈرامے، طنز و مزاح، ناولٹ اور شاعری پر مشتمل کتابیں پیش کی گئیں — جرم و سزا اور آپ بیتی ایسے موضوعات پر بھی شاہکار کتابیں قارئین تک پہنچانے کا آغاز کیا جا چکا ہے، لیکن ابھی بہت سے موضوعات شاہکار کے حلقۂ اشاعت میں لانے کا کام باقی ہے۔ یکم مئی کی جریدی کتاب نفسیات جیسے اہم موضوع پر پہلی شاہکار کتاب کی حیثیت سے شائع کی جا رہی ہے۔ تین بڑے نفسیات داں، سگمنڈ فرائڈ، الفریڈ ایڈلر اور ڈاکٹر ژنگ کے افکار و سوانح پر مشتمل ہے۔ شعور و لاشعور کی کشمکش، شعور، قبل شعور، انا، ما فوق الانا، جنس، جنس کی اہمیت، ایڈی پس الجھاؤ، آبائی الجھاؤ، نظریۂ خواب، خوابوں کی اقسام، خوابوں کی تشریح و تحلیل اور تحلیل نفسی کے بارے میں فرائڈ کے نظریات، جن کی وضاحت جیتی جاگتی زندگی سے مثالیں دے کر کی گئی ہے۔ الفریڈ ایڈلر کا نظریۂ احساس کمتری، نظریۂ جنس، جنسی کردار، شادی، جنسی کجروی اور خوابوں کی توضیح و توجیہہ، ڈاکٹر ژنگ کا نظریۂ لاشعور، خواب، خوابوں کی اقسام اور نظریۂ نفس اس کتاب کے اہم موضوعات ہیں۔

بادی النظر میں یہ موضوعات روکھے پھیکے محسوس ہوسکتے ہیں لیکن تینوں نفسیات دانوں کے سوانح اور ان کے مختلف نظریات سے متعلق عام زندگی سے مثالیں انہیں دلچسپ، قابلِ فہم اور توجہ طلب بناتی ہیں۔

یقین ہے کہ یہ کتاب بھی حسب سابق شاہکار قارئین کی گھریلو لائبریری کی زینت بنے گی۔

مخلص

تاریخ اشاعت: ۱۵ اپریل ۷۷ء - ناشر: سید قاسم محمود۔ طابع: ریاض حسین، الجدہ پرنٹرز، راوی روڈ - لاہور

Marfat.com

خضر خاں، سید

(وفات ۲۰ مئی ۱۴۲۱ء) فرمانروائے دہلی۔ خضر خان، ملک سلیمان کا بیٹا تھا جو فیروز تغلق کے امیر مردان دولت کا متبنیٰ تھا۔ خضر خان کو ملتان کی جاگیر ورثے میں ملی تھی۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو خضر خان بھاگ کر میوات چلا گیا۔ دہلی فتح ہونے کے بعد وہ تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملتان و دیپالپور کی جاگیریں حاصل کیں۔ سلطان محمود کے وزیر تو نے ملتان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جسے خضر خان نے ستلج کے کنارے ۱۲ نومبر ۱۴۰۵ء کو ہلاک کر دیا۔ محمود تغلق کی وفات کے بعد امرائے دہلی نے دولت خان کو اپنا فرمانروا تسلیم کر لیا۔ خضر خان نے دولت خان کا محاصرہ کر لیا۔ دولت خان نے ناچار شہر دولت خان کے سپرد کر دیا۔ ۴ جون ۱۴۱۴ء کو دولت خان کو حصار فیروزہ میں قید کر دیا گیا ہے۔ بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔

دہلی کی فرمانروائی حاصل کرنے کے بعد خضر خان نے روہیل کھنڈ اور دوآبہ گنگا جمنا کے باغی صوبوں کو دوبارہ مطیع بنا لیا اور ۱۴۱۶ء میں گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ سرہند میں ترکوں کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۱۴۲۱ء میں خضر خان نے میوات پر فوج کشی کی جہاں سے وہ اٹاوہ کے راستے واپس ہوا۔ دہلی واپس آنے پر علالت کے باعث اس کا انتقال ہوا۔

خط

دیکھیے، رسم الخط

خطا

صحیح سمت یا راستے سے منحرف ہو جانا۔ خطا وہ عمل ہے جو بلا ارادہ نہ کیا گیا ہو۔ لغت نویسوں میں یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ خطا کو غیر ارادی سمجھنا چاہیے یا ارادی۔ ایک علمی اصطلاح کے طور پر خطا کا استعمال صواب کی ضد کے معنوں میں ہوتا ہے۔ اس کی دو بڑی صورتیں یہ ہیں (۱) کوئی منطقی غلطی، ناقابل قبول۔ اول الذکر کا استعمال مسائل اجتہاد میں اور مؤخر الذکر کا استعمال اعتقاد میں ہوتا ہے۔ (۲) فعل غیر ارادی۔ یعنی وہ فعل جو خلاف قانون تو ہے لیکن جو اس نیت سے نہیں کیا گیا کہ قانون کی خلاف ورزی کی جائے خواہ یہ فعل عمداً ہی کیوں نہ سرزد ہو۔ معتزلہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس قسم کے افعال پر بارگاہ الٰہی سے کوئی سزا نہیں مل سکتی کیونکہ سزا صرف اس فعل پر ملتی ہے جس میں عمداً قانون کی خلاف ورزی کی جائے۔ اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ اگرچہ خطا کو اثم (گناہ) نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ (غفلت بہرحال ایک فعل ارادی ہے) مگر جو سزا اس طرح سرزد ہوگی۔ اس کی سزا مل سکتی ہے۔

خطابیہ

ایک فرقہ جس کا شمار انتہا پسند شیعوں میں ہوتا ہے۔ یہ فرقہ ابوالخطاب محمد بن ابی زینب اسدی اجدع سے منسوب ہے۔ ۳۰۰ھ کے قریب اس فرقے کے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تھی اور سواد کوفہ اور یمن میں آباد تھے۔ ابوالخطاب اپنے مخالفین سے قطعی بے رحمی کا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتا تھا (مردوں، عورتوں، بچوں سبھی کو) اس کے خیال میں قتل کر دینا ضروری تھا اور اپنے مخالفین کے مقابلے میں جھوٹی گواہی دینا بھی جائز قرار دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالخطاب کی وفات کے بعد اس کے معتقدین نے محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق کو امام تسلیم کر لیا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ خم غدیر کے روز رسول اللہ نے اپنا منصب نبوت حضرت علیؓ کو منتقل کر دیا تھا۔ اس فرقے پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ تمام قوانین اخلاق اور شریعت اسلام سے منکر ہو گیا تھا اس کے پیرو تناسخ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ چونکہ بظاہر اس فرقے کی کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا دشوار ہے کہ یہ بیانات کہاں تک صحیح ہیں۔

خطبہ

وہ خطاب یا تقریریں جو عبادت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ رسول اللہ کے خطبات کلمۂ "اما بعد" سے شروع ہوتے۔ حمد باری تعالےٰ کے ساتھ شہادت (تشہد) کا بھی ذکر ہوتا۔ بہت سی حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ خطبے میں قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تھے۔ اذان کے دوران میں رسول اللہ منبر پر تشریف فرما رہتے تھے۔ اقامت اس وقت پڑھی جاتی جب آپؐ خطبہ ختم کر کے منبر سے نیچے اتر آتے تھے۔ عیدین کے موقع پر آپؐ صلواۃ کا اختتام تسلیمؑ سے کرنے کے بعد کھڑے ہو جاتے اور حاضرین کی جانب متوجہ ہوتے۔

جمعہ کی نماز میں دو خطبے نماز سے پہلے پڑھے جاتے ہیں۔ باقی نمازوں میں صلواۃ پہلے اور خطبہ بعد میں ہوتا ہے ان خطبوں کے متعلق یہ شرائط مقرر ہیں۔ خطیب کو طہارت شرعیہ کی حالت میں ہونا چاہیے۔ اس کا لباس مقررہ طرز کا ہونا چاہیے۔ اُسے دونوں خطبے کھڑے ہو کر پڑھنے چاہئیں اور ان کے درمیانی وقفے میں بیٹھ جانا چاہیے۔ جمعہ کے اجتماع میں سامعین کی جو تعداد شرعاً ضروری ہے وہ موجود ہونی چاہیے۔ خطبے کے واجبات یہ ہیں۔ حمد باری تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام۔ دونوں خطبوں میں دینداری کی تلقین۔ جمہور کے لیے دعائے خیر۔ پہلے خطبے میں قرآن کے ایک جزو کی تلاوت (بعض فقہا کے نزدیک دونوں خطبوں میں) خطیب کے لیے یہ بات مستحسن ہے کہ وہ منبر پر یا اونچی جگہ پر کھڑا ہو۔ منبر پر قدم رکھنے کے بعد حاضرین کو السلام وعلیکم کہے۔ مؤذن کے اذان ختم کرنے تک بیٹھ جائے۔ کسی کمان تلوار یا عصا کے سہارے کھڑا ہو۔ سامعین کی طرف فوراً متوجہ ہو جائے۔ اہل اسلام کی طرف سے دُعا مانگے اور اپنے خطبے کو مختصر کرے۔

عیدین کے خطبے مندرجہ ذیل باتوں کے سوا خطبہ جمعہ کی طرح ہوتے ہیں۔ خطیب اپنے خطبے کا آغاز تکبیروں سے کرتا ہے۔ عید الفطر کے موقع پر سامعین کو صدقہ فطر کے فوائد و قواعد سے آگاہ کرتا ہے۔ عید الاضحیٰ کے دن قربانی کی اہمیت اور شرائط سے آگاہ کرتا ہے۔

خطیب

وعظ کہنے والا، جمعہ و عیدین کا خطبہ پڑھنے والا اور فصیح البیان مقرر۔ خطیب اور وعظ میں یہ فرق ہے کہ خطیب بعض خاص مواقع پر زور خطابت دکھاتا ہے اور وعظ وقت یا محل کا پابند نہیں ہوتا۔ مکہ معظمہ کی فتح کے بعد خود رسول اللہ بطور خطیب لوگوں کے سامنے آئے اور آپؐ نے مجمع عام میں تقریر فرمائی۔ یہ صورت حال پہلے چار خلفا اور بنو امیہ کے عہد میں قائم رہی اور ان کے مقرر کئے ہوئے حکام بھی خطبا کے فرائض انجام دیتے تھے وہ عصا یا نیزہ جو مسلم خطیب خطبہ پڑھتے وقت اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑے رہتا ہے، قدیم عرب کی ایک موروثی یادگار ہے۔ خطبے اور نماز کی دینی اہمیت نے خطیب کو ایک خصوصی اہمیت دی ہے۔ ہارون الرشید کے عہد سے خلیفہ نے نماز کے موقع پر خطبہ پڑھنے کا کام قضاۃ پر چھوڑ دیا اور خود سامعین میں شامل ہو گیا۔ مملوک سلاطین کے عہد میں ہر مسجد کا اپنا خطیب ہوتا تھا۔ صرف بڑی مساجد کے معاملات سے سلطان واسطہ رکھتا تھا۔

ماوردی کے بقول خطیب کے لیے بہتر یہ ہے کہ سیاہ لباس پہنے۔ امام غزالیؒ کے نزدیک سیاہ لباس کا پہننا بدعت میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں سفید لباس پہننا چاہیے خطیب کے نشان عودان (دو لکڑی کی چیزیں) ہیں یعنی منبر اور عصا یا لکڑی کی تلوار خاص

Marfat.com

جسے وعظ کے دوران میں اپنے ہاتھ میں رکھنا، کتب فقہ کی رُو سے خطیب کے لیے ضروری ہے۔ مسجد نبوی میں ۱۹۰۹ء میں ۴۶ خطیب اور مکہ معظمہ میں ۱۲۲ خطیب تھے۔

خطیب بغدادی

(۱۰ مئی ۱۰۰۲ء۔ ۵ ستمبر ۱۰۷۱ء) ابوبکر احمد بن علی بن ثابت، مشہور محدث اور خطیب۔ بغداد کے جنوب میں درزجان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لڑکپن کا زمانہ حدیث کی جستجو میں سفر کرنے میں گزارا۔ اس جستجو میں وہ بصرے، نیشاپور، اصفہان، ہمدان اور دمشق گئے۔ بالآخر انہوں نے بغداد میں سکونت اختیار کرلی اور خطیب کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی بنا پر خطیب بغدادی کے نام سے معروف ہوئے۔ علم حدیث میں متبحرانہ دسترس رکھنے کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ شروع میں حنبلی رہنے کے بعد ان کا شافعی مذہب کو ترجیح دینا ان کے فقیہانہ نظریئے (جن پر اشعریت کا اثر غالب تھا) ان سب باتوں نے امام احمدؒ کے شاگردوں کو ان سے متنفر کر دیا تھا لیکن حنبلیوں کی مخالفت کے باوجود خلیفہ القائم اور وزیر ابن مسلمہ کی تائید اور حمایت سے خطیب بغدادی، المنصور کی مسجد میں حدیث سے متعلق ایک سلسلہ درس جاری کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب البساسیری کی کامیاب بغاوت ابن مسلمہ کی تباہی کا باعث ہوئی تو خطیب بغدادی نے دمشق میں پناہ لی۔ دمشق کے فاطمی حکمران نے انہیں گرفتار کرلیا۔ لیکن آپ نے فرار ہوکر صور اور حلب کا رخ اختیار کیا سلجوقیوں نے بغداد میں امن و امان بحال کیا تو خطیب بغدادی واپس بغداد آگئے۔ اس کے ایک سال بعد وہیں وفات پائی۔ ان کے سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔ ان میں سب سے مشہور "تاریخ بغداد" ہے

خفاجی

(۱۵۷۱ء - ۳ جون ۱۶۵۹) شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر الخفاجی مصری حنفی۔ مصنف، عالم دین اور قاضی عسکر۔ اپنے ماموں ابو بکر شنوانی سے فقہ حنفی اور فقہ شافعی پڑھی۔ طب داؤد بصیر سے پڑھی۔ حج کے دوران میں مکہ اور مدینہ کے علماء سے استفادہ کیا۔ واپسی پر قسطنطنیہ گئے جہاں انہوں نے ریاضیات اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں۔ اپنے استاد سعد الدین بن حسن کی وفات کے بعد انہیں قسطنطنیہ میں مقبولیت حاصل ہوئی اور انہیں روم ایلی کا قاضی بنا دیا گیا۔ بعد میں مصر میں قاضی عسکر بنا کر بھیجے گئے۔ جلد ہی معزول ہوگئے۔ ان کی قابلیت کے اعتراف میں انہیں قاہرہ میں قاضی بنا دیا گیا۔ قاہرہ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی سب سے بڑی کتاب تفسیر بیضاوی کی شرح ہے جس کا نام "عنایۃ القاضی" ہے یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے دوسری بڑی تصنیف قاضی عیاض کی کتاب الشفاء کی شرح "نسیم الریاض" ہے۔ خفاجی نے "مقامات الرومیہ" قسطنطنیہ کے عالموں کی تنقیص میں لکھی۔ اور بھی کئی تصانیف آپ سے منسوب ہیں۔ (ش۔ ج)

خفیفیہ

ایک فرقہ جس کے لوگ حضرت ابی عبد اللہ محمد بن خفیف شیرازیؒ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ حضرت ابی عبد اللہ علوم ظاہر و باطن کے بہترین عالم تھے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے چار سو نکاح کئے لیکن شہوت نفسانی کی متابعت سے منہ موڑے رکھا۔ آپ کی تمام منکوحہ بیویوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے شیخ کو خلوت میں اسباب شہوت کے تابع کبھی نہیں پایا۔

آپ نے علم طریقت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو آپ کے پیروکاروں میں بہت مقبول ہیں۔ حضرت [illegible] مذہب کا اصل غیبت اور حضور ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں [illegible] اسی کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

غیبت و حضور دو ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی اس طرح واضح کیے جا سکتے ہیں جیسے کسی آنکھ میں اصل چیز کا عکس پڑتا ہے۔ پھر وہ عکس اصل سے متضاد دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح حضور سے مراد یقینی دلالت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے دل کا حاضر ہونا ہے۔ تاکہ غیبی حکم اس کے لیے عینی حکم بن جائے۔

غیبت سے مراد ہے کہ کسی بھی شخص کا دل اپنے آپ سے اس طرح غائب ہو جائے جیسے اس کا وجود ہی نہ ہوا اور وہ اس غیبت میں اپنے آپ کو دیکھ بھی نہ سکے۔

وہ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی کششوں کے باعث اس کا دل غائب ہوتا ہے تو دل سے کسی اور کی کشش ختم ہو جاتی ہے اور وہ کسی دوسری شے کو اس سے نسبت نہیں دیتا۔

حضرت جنیدؒ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا "ایک وقت میری حالت یہ تھی کہ اہلِ آسمان و زمین میری حیرانی پر روتے تھے اور پھر ایسا ہوا کہ میں ان کی غیبت پر رونے لگا۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ نہ اُن کی مجھے خبر ہے اور نہ اپنی۔ اور یہی حضور کی طرف بہت اچھا اشارہ ہے۔

خلافت

اس کے ایک معنی خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا، دوسرے معنی خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امر شرعی کے تحت اختیارات خلافت کو استعمال کرنا اور تیسرے معنی ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے انسان کو خلافت الٰہی یعنی زمین پر خدا کی نیابت بخشی گئی۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق کے وقت فرشتوں کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔ (بقرہ: ۳۰) انبیاء میں حضرت داؤدؑ کے بارے میں صریحاً حکم ہوا، "اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ اس لیے لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔" (ص: ۲۶)۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خلافت ارضی کی بشارت دی، "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں خلافت ارضی ضرور عطا کرے گا جس طرح اس نے تم سے پہلے لوگوں کو خلافت عنایت کی تھی" (النور: ۵۵)۔ قرآن میں خلافت کے ساتھ ساتھ اس کے فرائض بھی بتائے گئے ہیں "خلافت کے مستحق وہ لوگ ہیں کہ اگر انھیں ہم زمین میں غلبہ واقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے سب چیزوں کا انجام کار اللہ کے اختیار میں ہے": (حج: ۴۱)۔ اللہ کے رسول نے فرمایا: تمہیں میری اور خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا چاہیے" (ابن ماجہ) صاحب شریعت کی نیابت خلافت اور امامت کہلاتی ہے اور اس منصب کا حامل خلیفہ یا امام کہلاتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "سیاست شرعیہ" میں امیر (امام یا خلیفہ) کا سب سے بڑا منصب یہ بتایا ہے کہ وہ امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کریں اور خدا اور رسول کے احکامات کے مطابق [illegible]

Marfat.com

شیعہ فقیہوں نے امامت کے اصول کو اپنے عقیدے کا ایک بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ انھوں نے نص پر زور دیا ہے اور خلیفہ کے عہدے کو نہ صرف قریش کے خاندان بلکہ صرف حضرت علیؓ کے خاندان تک محدود کر دیا ہے اور یہ عقیدہ رکھا کہ حضرت علیؓ کو رسول اللہ نے براہ راست اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور حضرت علیؓ کی صفات کو ان کی اولاد نے وراثتاً پایا۔ اور یہ لوگ ابتدا ئے آفرینش ہی سے اس اعلیٰ عہدے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ رسول اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو کچھ پُر اسرار علوم سکھائے تھے جو حضرت علیؓ نے بعد میں اپنے فرزندوں کو بتائے اور اس طرح سے وہ نسلاً بعد نسل ایک دوسرے کو منتقل ہوتے رہے۔ ابن خلدون نے شیعی نقطۂ نظر بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"امامت عوامی مسائل میں سے نہیں کہ اسے امت کے سپرد کر دیا جائے اور امت کا نگران خود امت کے مقرر کرنے سے متعین ہوا کرے بلکہ یہ تو دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے کسی نبی کے لیے اس مسئلے سے غفلت کرنا یا امت کو تفویض کرنا جائز نہیں بلکہ نبی کے لیے واجب ہے کہ وہ امت کا امام خود متعین کر کے جائے۔ یہ امام کبیرہ و صغیرہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کو رسول اللہؐ نے نصوص کے ذریعے متعین کیا تھا۔"

خلافت تحریک

پہلی عالمگیر جنگ میں ترکوں نے انگریزوں کے خلاف جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ دیا تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کو فتح ہوئی۔ ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے پارلیمنٹ میں تقریباً تقریر کرتے ہوئے زور دے کر واضح کیا تھا کہ ہم ترکی کی سلطنت اور اس کے دارالحکومت قسطنطنیہ کے لیے قطعاً کسی خطرے کا سبب نہیں بنیں گے اور ہماری طرف سے ترکی کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ لیکن ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس میں سلطنت ترکی کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خلافت بھی عملاً ختم کر دی گئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ تحریک خلافت کا آغاز احتجاجی جلسوں سے ہوا۔ مسلم کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو ملک بھر میں یوم خلافت منایا گیا۔ تمام کاروبار بند رہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے ہفتہ تقریبات امن منانے کا اعلان کیا لیکن مسلمانوں نے ان تقریبات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں مسٹر فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مسٹر گاندھی، موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالوی بھی شریک ہوئے۔ مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اور فیصلہ ہوا کہ خلافت کے مسئلے پر لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک وفد یورپ روانہ کیا جائے۔ دوسری طرف برطانیہ دنیا بھر میں یہ جھوٹا پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھا کہ ترکی کی حرکتیں اسے سخت ترین سزا کا حقدار بناتی ہیں۔ ترکی اسی سلوک کا مستحق ہے کہ اسے کچل دیا جائے۔" وفد عدن اور پورٹ سعید کے شہروں سے ہوتا ہوا لندن پہنچا۔ اس وفد میں مولانا محمد علی، مولانا سید سلیمان ندوی اور سید حسن امام بیرسٹر پٹنہ شامل تھے۔ وفد نے برطانوی وزیراعظم سے ملاقات کی لیکن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ مفتوحہ قوم خواہ مسلمان ہو یا عیسائی، ایک جیسے سلوک کی مستحق ہے۔ ترکی نے برطانیہ سے شکست کھائی ہے لہٰذا اب اسے شکست کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ مولانا محمد علی نے اس گفتگو کا جواب دینا چاہا تو برطانوی وزیراعظم نے کہا کہ میں رات بھر بیٹھ کر آپ کی بحث نہیں سننا چاہتا۔ ملاقات کے خاتمے پر مولانا سید سلیمان ندوی نے خلافت کی اہمیت کے بارے میں ایک کتابچہ دینا چاہا تو برطانوی وزیراعظم نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وفد خلافت نے فرانس اور اٹلی کے متعدد شہروں کا دورہ کیا اور اپنے مشن سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں وفد واپس ہندوستان پہنچا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی اور علی برادران کے مشورے سے طے پایا کہ عدم تعاون کی ملک گیر تحریک چلائی جائے۔ عدم تعاون کے پروگرام کی کانگرس، جمعیت علمائے ہند اور خلافت کمیٹی نے حمایت کر دی۔ عدم تعاون کی اپیل کا ہندوؤں اور مسلمانوں نے کھلے دل سے خیر مقدم کیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء سے جنوری ۱۹۲۲ء کے درمیانی عرصے میں تین ہزار سے زائد ہندو مسلم تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین اور پیر غلام مجدد و نثار احمد کو دو دو سال کے لیے قید کر دیا گیا۔ عدم تعاون کی تحریک کو گرفتاریوں سے زبردست دھچکا لگا، لیکن اس کے مکمل خاتمے میں تشدد آمیز واقعات نے حصہ لیا۔ تحریک خلافت سے کانگرس کو دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو مسلمان دھڑا دھڑ کانگرس میں شامل ہونے لگے۔ دوسرے کانگرس کو وہ طاقت حاصل ہو گئی جو پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی، لیکن جس طریق سے گاندھی نے اس تحریک کو ختم کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے بارے میں اس قسم کے شکوک و شبہات پیدا کیے جن کا ... دور نہ کیا جا سکا۔ تحریک خلافت بے نتیجہ ثابت ہوئی، کیونکہ ترکی میں مسلمانوں نے ... طاقت پکڑ کر ... حکومت قائم کی اس کی اسمبلی کے سربراہ کمال اتاترک نے خلافت کے باقاعدہ خاتمے کا اعلان ...

خلافت راشدہ

صالحین کا وہ عہد حکومت جسے امت محمدیہؐ کی اجتماعی تائید و حمایت حاصل تھی ... جس نے عدل اور حق کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دین اسلام کے تمام ظاہری و باطنی دینوی اور اخروی تقاضے پورے کیے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک خلفائے راشدین سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ مراد ہیں جو رشد و ہدایت سے بہرہ مند اور راہ حق و عدل پر گامزن تھے۔ انھوں نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے اسلام کی اشاعت اور امت اسلامیہ کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ خلافت راشدہ کے بارے میں رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ خلافت علی منہاج النبوت طریقۂ نبوی پر عمل پیرا ہونے والی خلافت) تیس سال تک ہوگی (ابو داؤد: السنن) رسول کریم صلعم کی وفات کے وقت صحابہ کرامؓ میں دو قسم کے مکتب فکر ظاہر ہوئے ایک نظریہ یہ تھا کہ آپؐ کی نیابت کا منصب عام ہے اور ہر مسلمان جو لازمی اوصاف سے متصف ہو، بلا امتیاز، رنگ و نسل خلیفہ بن سکتا ہے۔ یہ مؤخر الذکر نظریہ انصار کا تھا جو آپؐ کی رحلت کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور حضرت سعد بن عبادہ انصاریؓ نے انصار کی اسلامی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انصار کا استحقاق خلافت ثابت کیا۔ مہاجرین کی ایک بہت بڑی جماعت خلافت کو قریش میں منحصر سمجھتی

Marfat.com

تھی اور بعض مہاجرین کا خیال تھا کہ یہ منصب قرابت رسول کی اساس پر حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ یا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کو بحیثیت وارث (العاصب) ملنا چاہیئے۔ لیکن اس موقع پر اکثریت نے مہاجرین کی عظیم جماعت کے اس موقف کی تائید کی جو یہ کہتا تھا کہ نیابت رسول خاندانی موروثی ہونے کی بجائے شوریٰ اور بیعت عام کی بنیاد پر ہونی چاہیئے۔ اس موقع پر ایک صحابی الحبابؓ ابن منذر انصاری نے کہا کہ ایک امیر انصار سے اور ایک امیر مہاجرین سے ہو لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح سما سکتی ہیں۔ بنو خزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ کو امیر بنانا چاہتے تھے مگر قبیلہ اوس نے اس کی مخالفت کی۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے نہایت نرمی اور آشتی سے انصار کو سمجھایا۔ آپ نے فرمایا، "مجھے تم لوگوں کے فضائل مناقب اور تمہاری خدماتِ اسلامی سے انکار نہیں لیکن عرب، قریش کے علاوہ اور کسی خاندان کی سیادت تسلیم نہیں کر سکتے پھر مہاجرین اپنے تقدم فی الاسلام اور آنحضرت صلعم کے ساتھ خاندانی تعلق کی بنا پر آپؐ کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں یہ ابوعبیدہؓ اور عمر بن الخطابؓ موجود ہیں ان میں سے جس کے ہاتھ چاہو بیعت کر لو"۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ آپ ہم سب میں بزرگ ہم سب میں بہتر اور رسول اللہؐ کے سب سے مقرب ہیں، اس لئے ہم آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہیں (بخاری شریف) دوسرے دن مسجد نبویؐ میں عام بیعت ہوئی اور ربیع الاول ۱۲ھ میں حضرت ابوبکر صدیق مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کا آغاز بڑی مشکلات اور بڑے اہم حوادث کے ساتھ ہوا۔ لیکن آپ نے اپنے تدبر، عاقبت اندیشی اور مذہبی بصیرت سے ان سب پر قابو پا لیا۔ سب سے اہم انقلاب عرب کا ارتداد تھا بہت سے قبائل نے آنحضرت صلعم کی زندگی میں اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن ان کے دلوں میں وہ راسخ نہ ہوا تھا اس لئے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد وہ مرتد ہو گئے۔ دوسری جانب جھوٹے مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا غرض حضرت ابوبکرؓ کے مسند خلافت پر قدم رکھتے ہی ہر طرف انقلاب کے آثار نمودار ہو گئے۔

ان مشکلات کے ساتھ ساتھ موتہ کی مہم درپیش تھی جس کو آنحضرت صلعم نے اپنے مرض الموت میں رومیوں سے حضرت زیدؓ بن حارثہ کے خون کا انتقام لینے کے لئے ان کے لڑکے اسامہؓ بن زید کی ماتحتی میں شام بھیجنے کے لئے حکم دیا تھا ابھی یہ مہم روانہ نہ ہوئی تھی کہ آپؐ کا انتقال ہو گیا۔ بعض صحابہؓ نے مخالفت کی کہ ایسی حالت میں فوج کو مرکزِ خلافت سے دور بھیجنا مناسب نہیں ہے اس مہم سے پہلے ان انقلابات کا تدارک ضروری ہے مگر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر مدینہ میں اتنا سناٹا ہو جائے کہ درندے اگر میری ٹانگیں نوچیں تب بھی میں اس مہم کو جس کی روانگی کا رسول اللہؐ نے حکم دیا، نہیں روک سکتا (تاریخ الخلفا سیوطی)۔ چنانچہ آپؓ نے فوج کو روانہ کیا۔ چالیس دن کے بعد یہ مہم اپنا کام پورا کر کے فاتحانہ مدینہ واپس آئی۔

آنحضرت صلعم کی زندگی ہی میں مسیلمہ کذاب نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد اور قبیلہ تمیم کی عورت سجاح بنت خویلد بھی نبوت کی دعویدار بن گئی اور اس نے مسیلمہ کذاب سے شادی کر لی۔ موتہ کی مہم کے بعد آپؓ نے مسیلمہ کی مہم حضرت شرجیلؓ کے سپرد کی۔ حضرت خالدؓ بن ولید طلیحہ بن خویلد کی طرف بڑھے۔ طلیحہ شام بھاگ گیا وہاں جا کر مسلمان ہو گیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ جنگ میں وحشیؓ بن حرب کے ہاتھوں مقتول ہوا اس کی بیوی سجاح بھاگ گئی۔ تیسرے مدعیٔ نبوت اسود عنسی کو اس کے اپنے ساتھی قیس بن مکشوح نے قتل کر دیا۔

مدعیانِ نبوت کے بعد آپ مرتدین کی طرف متوجہ ہوئے۔ عمان اور بحرین میں لقیط بن مالک نے عمان میں اور حطم بن ضبیعہ نے بحرین کے علاقے میں مرتد ہو کر خودسری کا اعلان کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے علاءؓ بن حضرمی، حذیفہ بن محصن اور زیادؓ بن لبید کو ان سرداروں کے مقابلہ پر بھیجا۔ حذیفہؓ نے لقیط کو قتل کیا، علاءؓ نے نعمان کی سرکوبی کی، اور زیادؓ نے کندہ کے سرداروں کو قید کر کے دوبارہ اسلام پر قائم کیا (طبری، ابن اثیر)۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو زکوٰۃ کے منکر تھے۔ آپ نے منکرین زکوٰۃ کے مقابلہ پر فوجیں روانہ کیں بنی عبس اور بنی ذبیان کے مقابلہ میں خود گئے اور انھیں زیر کیا۔ چند دنوں میں تمام منکرین نے زکوٰۃ ادا کر دی۔

اندرونی انقلاب فرو کرنے کے بعد آپ نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی درخواست پر حضرت خالدؓ بن ولید کو عراق روانہ کیا۔ جنگ میں عراق کے ایرانی حاکم ہرمز کو شکست فاش ہوئی۔ ہرمز جنگ میں مارا گیا۔ ایران کے فرمانروا اردشیر نے قارن کی ماتحتی میں ایک فوج گراں روانہ کی۔ مذار کے مقام پر جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے شکست کھائی۔ ان کی تیس ہزار سپاہ کام آئی۔ قارن سمیت تمام بڑے بڑے افسر مارے گئے۔ اردشیر نے ایران کے ممتاز بہادر اندرزغر اور بہمن جاذویہ کو ایک لشکر عظیم کے ساتھ روانہ کیا۔ ولجہ کے مقام پر حضرت خالدؓ بن ولید نے انھیں پھر شکست سے دوچار کیا۔ اندرزغر جان بچا کر بھاگ نکلا لیکن کچھ دور آگے جا کر پیاس کی شدت سے مر گیا (طبری)۔ اس جنگ میں بہت سے عیسائی عرب بھی مارے گئے ان عیسائیوں نے ایرانیوں کا ساتھ دیا تھا۔ انتقام کی خاطر عیسائی قبائل الیس کے مقام پر بہمن جاذویہ سے جا ملے۔ حضرت خالدؓ بن ولید الیس پہنچے اور انھیں شکست دی۔ الیس کے بعد امغیشیا پہنچے۔ وہاں کے باشندے حضرت خالدؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی شہر خالی کر گئے۔ حضرت خالد حیرہ کی طرف بڑھے۔ ایرانیوں نے ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔ حیرہ کے قرب و جوار کے باشندوں نے بھی بیس ہزار درہم پر صلح کر لی اور جنوبی عراق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت خالدؓ اب انبار کی طرف بڑھے، جہاں ایرانی فوجیں قلعہ بند تھیں جنگ ہوئی اور بالآخر ایرانیوں نے سپر ڈال کر صلح کر لی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ عین التمر پہنچے اور قلعہ بند ایرانیوں کو شکست دی۔ عراق و شام کی سرحد دومۃ الجندل میں عہد نبوی سے عربی عیسائی قبائل مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ حضرت خالدؓ اور عیاضؓ بن غنم نے انھیں شکست دی۔ بنی کلب کو ایک مسلمان عاصم نے امان دے دی باقی قبائل قتل کر دیئے گئے۔ حضرت خالدؓ دومۃ الجندل کی مہم سے فراغت حاصل کر کے حیرہ پہنچ گئے اور عین التمر میں قعقاع اور ابولیلیٰ سے جا ملے۔ یہ دونوں سردار ایرانیوں سے مقابلے کے لئے خنافس جا رہے تھے۔ قعقاع نے حصید پہنچ کر زرمہر اور روزبہ کو شکست دے کر قتل کیا عین اس وقت ابولیلیٰ بھی پہنچ گئے ایرانی مصیخ کی طرف ہٹ گئے حضرت خالدؓ ابولیلیٰ اور قعقاع کو لیتے ہوئے مصیخ پہنچے اور ایرانیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ فراض کی طرف بڑھے۔ یہاں شام عراق اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔ رومی اپنی حفاظت کے لیے ایرانیوں سے مل گئے۔ فرات کے لب ساحل جنگ ہوئی۔ ایرانیوں اور رومیوں نے شکست کھائی۔ قریب قریب کل فوجیں برباد ہو گئیں۔ اس جنگ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو شام کی مہم پر بھیج دیا۔ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ نے کبار صحابہؓ کے مشورہ سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا تھا۔ شام کے بڑھنے کے لئے علیحدہ علیحدہ فوجیں روانہ کی گئیں۔ ان فوجوں کی مجموعی تعداد ستائیس ہزار تھی۔ مسلمانوں کے مقابلے کے وقت ہرقل شام کا حاکم تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید عراق سے شام روانہ ہوئے۔ سرزمین شام

Marfat.com

میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلے بصرہ فتح کیا اس کے بعد عمرو بن العاص کی مدد کو پہنچے اور رومیوں کو شکست دے کر اجنادین پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ مل کر دمشق کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳ھ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہوگیا۔ آپؓ کی مدت خلافت دو سال تین ماہ اور دس دن تھی۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ کسی کام میں عہد نبوی سے سرمو تجاوز کرنا پسند نہ کرتے تھے اس لئے آپ کے زمانہ میں جملہ امور عہد رسالت کے نظام پر قائم رہے۔ کام امور اکابر صحابہ کے مشورے سے انجام پاتے تھے۔ آپ نے انتظامی سہولت کے خیال سے جزیرہ العرب کو مدینہ، مکہ، طائف، صنعا، نجران، حضرموت، بحرین اور دومۃ الجندل مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ عہد صدیقی میں زکوٰۃ، عشر، جزیہ اور غنیمت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگیا تھا لیکن آپؓ نے کوئی خزانہ قائم نہ کیا جو آمدنی ہوتی، اسلامی ضروریات پر صرف کرنے کے بعد جو کچھ بچتا اسے بلا تفریق عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے۔ عہد صدیقی میں فوج کا باقاعدہ نظام نہ تھا۔ عہد رسالت کی طرح مسلمان ضرورت کے وقت خود ہی جہاد کیلئے جمع ہو جاتے تھے۔ بیت المال کی آمدنی سے فوجی اخراجات کے لئے ایک رقم الگ نکال لیتے تھے جس سے اسلحہ اور بار برداری کے جانور خریدتے تھے اور جہاد کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں کی پرورش کیلئے بعض چراگاہیں مخصوص کر دی تھیں۔ عہد صدیقی کا ایک کارنامہ کتابی شکل میں قرآن مجید کی تدوین ہے۔ جنگ یمامہ میں حافظ قرآن کی بڑی تعداد شہید ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے پیہم اصرار کیا کہ قرآن کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عہد نبوی کے کاتب وحی حضرت زیدؓ بن ثابت کو اس کام پر مامور کیا۔ حضرت زیدؓ نے مختلف لکھے ہوئے اجزاء اور حفاظ قرآن کے سینوں سے قرآن کی سورتوں کو جمع کرکے کتابی صورت میں مدون کر دیا۔ حیات نبوی میں قرآن کی پوری ترتیب ہو چکی تھی موجودہ قرآن اسی ترتیب کے مطابق ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ:۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرض الموت میں اکابر صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت نامہ لکھوایا۔ اور حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ وصیت نامہ مکمل کروانے کے بعد اپنے غلام کو حکم دیا کہ اسے لے جا کر صحابہ کے عام مجمع میں سناؤ اور خود بالاخانہ پر جا کر حاضرین سے فرمایا کہ میں نے اپنے کسی عزیز کو خلیفہ نہیں بنایا۔ میں نے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو میرے نزدیک تم سب میں بہتر ہے"۔ سب نے بالاتفاق اس حسن انتخاب کی تائید کی اس کے بعد آپؓ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر ضروری وصیتیں کیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جمادی الثانی ۱۳ھ میں حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہوئے۔ آپ کی جانشینی کے وقت شام و عراق میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ آپ نے ابوعبیدہ ثقفی کو چند ہزار سپاہ کے ساتھ ایران کی مہم پر روانہ کیا۔ ایران کی فوجوں کا سپہ سالار خراسان کا نامور مدبر اور مشہور بہادر رستم تھا۔ ایران کے دو نامور بہادر نرسی اور جاپان بھی اس کی امداد پر مامور تھے۔ مقام نمارق میں جاپان کے ساتھ مقابلہ ہوا اور مسلمان سپاہ فتح یاب ہوئی۔ رستم نے ایرانیوں کا مقدس علم "درفش کاویانی" دے کر مردان شاہ کو تازہ دم فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ دریائے فرات کے کنارے جنگ ہوئی ابوعبید ثقفی کو ایک ہاتھی نے سونڈ میں لپیٹ کر پیروں کے نیچے مسل ڈالا ابوعبیدہ کی شہادت کے بعد مثنیٰ بن حارثہ بڑی مشکل سے تین ہزار جانیں بچا کر پسپا ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بجلی کی کمان میں تازہ دم فوج روانہ کی۔ ایرانیوں کی جانب سے مہران بن جاذویہ بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ دریائے فرات کے قریب بویہ کے مقام پر جنگ ہوئی مہران قتل اور اس کی فوجیں شکست سے دوچار ہوئیں۔ ایرانیوں نے جوش انتقام میں بوران دخت کو تخت سے اتار کر سترہ سالہ یزدگرد کو تخت نشین کیا اور زبردست جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی تمام مفتوحہ علاقوں میں بغاوت پھیلا دی حضرت عمرؓ کو خبر ہوئی تو آپ نے سعد بن ابی وقاص کو سپہ سالار اعظم مقرر کرکے بیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ پونے دو لاکھ ایرانی لشکر رستم کی کمان میں جنگ کے لیے آگے بڑھا۔ محرم ۱۶ھ میں جنگ قادسیہ کا واقعہ پیش آیا۔ تین روز تک جنگ ہوتی رہی بالآخر ایرانی شکست سے دوچار ہوئے، رستم میدان جنگ میں قتل ہوا۔ قادسیہ کی شکست کے بعد سعد بن ابی وقاص بابل کوثی اور بہرہ شیر کو فتح کرتے ہوئے ایران کے پایہ تخت مدائن کے قریب پہنچ گئے۔ مدائن باقاعدہ جنگ کے بغیر ہی فتح ہوگیا۔ یزدگرد پایہ تخت چھوڑ کر بھاگ گیا اور حضرت سعد بن ابی وقاص صفر ۱۶ھ میں مدائن میں داخل ہوگئے۔ مدائن سے نکلنے کے بعد ایرانیوں نے جلولا کو مرکز بنایا۔ مسلم سپاہ نے کئی مہینوں کی لڑائیوں کے بعد جلولا فتح کیا۔ جلولا عراق کا آخری مقام تھا اس کے بعد عراق کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ یزدگرد حلوان میں تھا اسے خبر ہوئی تو حلوان چھوڑ کر رے بھاگ گیا۔ قعقاع نے حلوان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن غنم کو جزیرہ کی مہم پر روانہ کیا۔ ۱۶ھ اور ۱۷ھ میں اسلامی لشکر نے جزیرہ کا پورا علاقہ فتح کر لیا۔ عراق کا سرحدی علاقہ خوزستان ایرانیوں کے قبضے میں تھا ۱۶ھ میں ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمار بن یاسر نے خوزستان فتح کیا خوزستان کی فتح کی خبر سن کر یزدگرد کو خطرہ محسوس ہوا کہ مسلمان پورے ایران پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس نے کافی تگ و دو کے بعد ڈیڑھ لاکھ فوج مسلمانوں کے مقابلے کے لئے نہاوند روانہ کی۔ حضرت عمرؓ نے نعمان بن مقرن کو سپہ سالار بنا کر نہاوند روانہ کیا۔ جنگ قادسیہ کے بعد یہ سب سے بڑا معرکہ تھا۔ اس جنگ میں بھی ایرانیوں کو شکست ہوئی تیس ہزار ایرانی سپاہ کام آئی۔ میدان جنگ میں سپہ سالار نعمان بن مقرن زخمی ہو کر شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ کے بعد مختلف مہمیں ایران کی فتح کے لئے روانہ کیں اسلامی لشکر نے اصفہان، ہمدان، رے، طبرستان، آذربائیجان، آرمینیا، فارس، کرمان، اور سیستان فتح کر لیے۔ یزدگرد خراسان میں تھا۔ جب خراسان فتح ہوا تو یزدگرد ملک چھوڑ کر ترکستان چلا گیا ایرانیوں نے سارا خزانہ مسلمانوں کے حوالے کرکے صلح کر لی۔ دمشق، حمص اور اردن بھی عہد فاروقی میں فتح ہوئے۔ جنگ یرموک میں مسلمانوں نے رومیوں کی قوت پاش پاش کر دی۔ ۱۸ھ میں بیت المقدس فتح ہوا۔ ۱۹ھ میں معاویہؓ نے قیساریہ فتح کیا۔ ۲۱ھ میں عمرو بن عاص نے مصر فتح کیا۔ عمرو بن العاص نے طرابلس الغرب پر بھی فوج کشی کی۔ ایک معمولی سی جنگ کے بعد فتح کر لیا گیا۔ ۲۳ھ کے اواخر میں فیروز پارسی نے حضرت عمرؓ پر مسجد میں خنجر سے حملہ کیا۔ آپؓ یکم محرم الحرام ۲۴ھ کو انتقال فرما گئے۔

فتوحات کی کثرت، محاصل کی فراوانی، انتظامات کی خوبی، جور و ظلم کے انسداد، عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام، ملک کی خوشحالی اور رعایا کی فارغ البالی وغیرہ تمام اوصاف و کمالات کے لحاظ سے دنیا کا کوئی حکمران فاروق اعظمؓ کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے دس سالہ دور خلافت میں ایران و روم کی عظیم الشان سلطنتوں کے پرخچے اڑ گئے اور ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ فتوحات سے بڑھ کر حضرت عمرؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی بنیادوں پر ایسا آئین حکومت مرتب کیا اور ایسا عادلانہ نظام قائم کر دیا جو مسلمانوں کی جملہ سعادتوں اور ترقیوں کا ضامن تھا۔ آپؓ نے شوریٰ کی بنیاد پر خلافت اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس نظام میں کوئی اہم کام اہل الرائے صحابہؓ کے مشورہ کے بغیر انجام نہ پاتا تھا (طبری) خاص خاص حالات میں عامہ مسلمین کا مشورہ بھی ضروری ہوتا تھا آپ فرمایا کرتے تھے لاخلافۃ الا عن مشورۃ (کنز العمال)۔ مجلس شوریٰ کے ممتاز ارکان یہ تھے، حضرت علیؓ، حضرت

Marfat.com

عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت زیدؓ بن ثابت (کنز العمال)۔ حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ علاقوں کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا۔ مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر اور فلسطین۔ مشرق میں خراسان، آذربائیجان اور فارس کے تین صوبے علیحدہ تھے۔ ہر صوبے میں عامل اعلیٰ، میر منشی، دفتر فوج کا منشی، کلکٹر، افسر پولیس، خزانچی اور قاضی ہوتے تھے۔ عموماً فوج کی سپہ سالاری حاکم عام سے متعلق ہوتی تھی۔ بعض حالات میں سپہ سالار بھی الگ ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا اصول یہ تھا کہ ہر عامل کے تقرر کے وقت اس کو ایک پروانہ دیتے تھے جس میں اس کے اختیارات کی تصریح ہوتی تھی۔ جائے تقرر پر یہ پروانہ مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا (طبری)، تاکہ عامل اپنی حدود سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ تمام عمال کو حج کے موقع پر حاضری کا حکم تھا۔ ان کی موجودگی میں اعلانِ عام کیا جاتا تاکہ کسی شخص کو کسی عامل سے شکایات ہو تو پیش کرے (طبری)۔ ارکانِ حکومت کو علی الاعلان سزا دیتے۔ آپ کے ایوانِ عدالت میں ادنیٰ و اعلیٰ اور خویش و بیگانہ سب برابر تھے۔ عہدِ فاروقی سے پہلے عرب میں جیل خانوں کا رواج نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے جیل خانے قائم کئے۔ زمین کی آبادی اور زراعت کی ترقی کے لئے یہ قانون بنایا کہ جو شخص غیر آباد زمین آباد کرے گا وہ اسکی ملک ہو جائیگی لیکن زمین لے کر تین برس کے اندر اسے آباد کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اس قانون سے افتادہ زمینیں کاشت کی جانے لگیں۔ زمین کی سیرابی کے لئے نہریں جاری کی گئیں بند باندھے گئے تالاب بنائے گئے اور پانی کی تقسیم کے لئے دہانے بنائے گئے۔ مقریزی کا بیان ہے کہ صرف مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور حکومت کی جانب سے اس کام پر لگے رہتے تھے۔

خراج کے علاوہ آمدنی کے ذرائع حسبِ ذیل تھے۔

زکوٰۃ، جزیہ اور مالِ غنیمت۔ عشور تجارتی ٹیکس تھا جسے اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے جاری کیا۔ آپؓ نے تمام صوبوں اور مرکزی مقامات میں بیت المال قائم کئے اور ان کے لئے وسیع عمارتیں بنوائیں اور ان پر لائق اور دیانت دار افسر مقرر کئے۔ (طبری) بیت المال کے مداخل و مخارج کا انتظام یہ تھا کہ ہر صوبے کی آمدنی وہاں کے بیت المال میں آتی تھی۔ صوبائی حکومت کے مصارف سے جو رقم بچتی تھی وہ صدر خزانہ مدینہ منورہ میں بھیج دی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں فوج کا کوئی باقاعدہ محکمہ نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نے ۱۵ھ میں ولید بن ہشام کے مشورہ سے نہایت وسیع اور منظم صیغۂ فوج قائم کیا۔ تنخواہ داروں کے بیوی بچوں کو وظائف ملتے تھے۔ جن لوگوں کی جتنی تنخواہ مقرر ہوتی تھی ان کے غلاموں کو بھی اتنی ہی ملتی تھی۔ فوجی تنخواہ داروں میں دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو ہر وقت جنگی مہمات میں مشغول رہتے تھے یہ باقاعدہ فوج تھی۔ دوسرے وہ جو اپنے گھروں پر رہتے تھے اور ضرورت کے وقت طلب کئے جاتے تھے یہ ریزرو فوج تھی۔ سارے ممالک محروسہ میں فوجی مرکز تھے۔ مدینہ، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، مصر، دمشق، حمص، اردن وغیرہ بڑے بڑے فوجی مرکز تھے۔ ان مرکزی مقامات کے علاوہ تمام ممالک محروسہ میں حسبِ ضرورت بکثرت چھاؤنیاں قائم تھیں۔ سرحدی علاقوں اور ساحلی مقامات کی حفاظت کا انتظام مستقل اور جداگانہ تھا۔ فوجی بھرتی کو اتنی وسعت دی گئی کہ جب جرین و انصار سے بڑھتے بڑھتے سارے عرب لوگوں کو اس میں شامل کیا جانے لگا۔ تقریباً دس لاکھ ہتھیار بند فوج ہر وقت تیار رہتی تھی اور اس میں ہر سال تیس ہزار فوج کا اضافہ ہوتا تھا (کنز العمال)۔ عہدِ صدیقی میں آپ ہی کے اصرار سے کلام اللہ کی تدوین ہوئی تھی۔ اپنے زمانے میں حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ملکوں میں قرآن کی تعلیم کے مکتب قائم کئے اور ان کے لئے تنخواہ دار معلم مقرر کئے (سیرۃ العمر ابن جوزی)۔ سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، حج اور نور (جن میں احکام ہیں) کا ذکر کرنا ضروری قرار دیا گیا (اصابہ تذکرہ اوس بن خالد)۔ قرآن پاک کے ساتھ بدو اعراب کے لیے ادب و عربیت کی تعلیم کی تاکید کی۔ جو لوگ لغت کے عالم نہ ہوں انہیں قرآن کی تعلیم دینے کی ممانعت کر دی گئی۔ قرآن کے معلمین کے لئے وظائف مقرر کئے (کنز العمال) ان تدبیروں سے ہزاروں حفاظِ قرآن پیدا ہو گئے۔ کلام اللہ کے بعد حدیث نبوی کا درجہ ہے چنانچہ اس کی تلاش، حفاظت اور اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ مسائل اور احکام کی حدیثوں کو بالفاظہا نقل کر کے اضلاع کے حکام کے پاس بھیجے۔ آپ روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیتے تھے۔ لوگوں کو کثرتِ روایت سے روکتے تھے۔ عہدِ فاروقی میں اسلامی تمدن کی ترقی سے سینکڑوں مسائل پیدا ہوئے۔ اس لیے اس زمانہ میں علم فقہ کی بڑی ترقی و اشاعت ہوئی۔ آپ خود لوگوں کو فقہی مسائل بتاتے تھے۔ مسائل کو صحابہ کے مجمع میں پیش کر کے طے کراتے تھے۔ اضلاع کے احکام اور افسروں کو فقہی احکام لکھ کر بھیجتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عمال و حکام کے علاوہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیے تمام ممالک محروسہ میں مستقل فقہا اور معلم مقرر کیے (اسد الغابہ) روضۃ الاحباب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے چار ہزار مسجدیں تعمیر کرائیں اور تنخواہ دار امام اور موذن مقرر کئے۔ ۱۷ھ میں حرم کی عمارت کو وسیع کیا اور اس کے گرد دیوار کھنچوا کر عام آبادی سے ممتاز کیا (بخاری شریف)۔ مسجدِ نبوی کی توسیع کی۔ ازواجِ مطہرات کے گھروں کو چھوڑ کر مسجدِ نبوی سے متصل جتنے مکانات تھے سب کو خرید کر مسجد کی عمارت میں شامل کر دیا۔ مسجد کا طول سو گز کی بجائے ایک سو بیس گز ہو گیا۔ مسجد کے گوشہ میں ایک چبوترہ بنوا دیا تاکہ جن لوگوں کو بات چیت کرنا ہو یا شعر پڑھنا ہو وہ اس گوشہ میں آجائیں (خلاصۃ الوفاء)

حضرت عمرؓ نے ہر صیغہ میں جو نئی باتیں ایجاد کیں۔ مورخین انھیں اوّلیات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اولیات کی فہرست یہ ہے۔ یہ اولیات طبری، تاریخ الخلفاء اور سیرۃ عمر ابن جوزی میں مذکور ہیں: (۱) بیت المال کا قیام (۲) عدالتوں کا قیام اور قاضیوں کا تقرر (۳) تاریخ اور سن کا قیام جو آج تک جاری ہے (۴) امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔ (۵) فوجی دفتر ترتیب دیا (۶) رضاکاروں کی تنخواہ مقرر کی (۷) دفتر مال کا قیام (۸) پیمائش کا طریقہ جاری کیا (۹) مردم شماری کرائی (۱۰) عشور تجارتی ٹیکس مقرر کیا (۱۱) نہریں کھدوائیں (۱۲) شہر آباد کرائے (۱۳) ممالک محروسہ کو صوبوں میں تقسیم کیا (۱۴) دریا کی پیداوار پر محصول لگایا (۱۵) حربی تاجروں کو ملک میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی۔ (۱۶) جیل خانہ قائم کیا (۱۷) درہ کا استعمال کیا (۱۸) راتوں کو گشت کر کے رعایا کا حال دریافت کرنے کا طریقہ نکالا (۱۹) پولیس کا محکمہ قائم کیا (۲۰) فوجی چھاؤنیاں قائم کیں (۲۱) گھوڑوں کی نسل میں اصیل اور مجنس کی تمیز قائم کی جو عرب میں نہ تھی (۲۲) پرچہ نویس مقرر کیے (۲۳) مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے آرام کے لئے چوکیاں اور سرائیں بنوائیں (۲۴) بے سہارا بچوں کی پرورش اور پرداخت کے لئے روزینے مقرر کیے (۲۵) قاعدہ بنایا کہ اہل عرب غلام نہیں بنائے جاسکتے (۲۶) مفلوک الحال عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے (۲۷) مکاتب قائم کیے (۲۸) معلموں اور مدرسوں کے مشاہرے مقرر کیے (۲۹) حضرت ابوبکرؓ سے باصرار کلام اللہ کی تدوین کروائی (۳۰) قیاس کا اصول قائم کیا (۳۱) فرائض میں عول کا مسئلہ ایجاد کیا (۳۲) فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کیا (۳۳) نماز تراویح جماعت سے قائم کی (۳۴) تین طلاقوں کو جو ایک ساتھ دی جائیں، بائن قرار دیا (۳۵) شراب کی حد اسی کوڑے مقرر کی (۳۶) تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی (۳۷) بنی تغلب کے عیسائیوں پر جزیہ کی بجائے زکوٰۃ مقرر کی (۳۸) وقف کا طریقہ ایجاد کیا (۳۹) نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں پر اجماع کرایا (۴۰) مساجد میں وعظ کا طریقہ جاری

Marfat.com

خلافتِ راشدہ

(۴۱) مؤذنوں اور معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں (۴۲) مسجدوں میں روشنی کا انتظام کیا (۴۳) ہجو کہنے والے کے لئے تعزیر مقرر کی (۴۴) غزلیہ اشعار میں عورتوں کے نام لینے سے منع کیا۔

خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ:۔ حضرت عمرؓ کی وفات سے قبل صحابۂ کرام نے ان سے جانشین نامزد کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ اور عبدالرحمٰن بن عوف چھ آدمیوں کو نامزد کرکے فرمایا کہ ان میں سے جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے امیر بنانا اور تاکید کردی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے کردیا جائے۔ میری وفات کے بعد ان چھ نامزد صحابہ کو ایک مکان میں بند کردیا جائے اور جب تک ان میں سے کسی کا انتخاب نہ ہو جائے اس وقت تک انھیں مکان سے باہر نہ آنے دینا۔ کثرت رائے کے بعد بھی اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی رہے تو اسے قتل کردینا (ابن سعد، تاریخ الخلفاء سیوطی)۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مقدادؓ نے مذکورہ چھ افراد کو مسور بن مخرمہ کے گھر میں یکجا کیا۔ دو دن میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا کہ انتخاب کی صورت یہ ہے کہ چھ کی تعداد کو اور کم کردیا جائے۔ اس تجویز پر حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کا نام پیش کیا۔ لیکن انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کا اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا کہ اگر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیں تو زیادہ مناسب ہے۔ دونوں راضی ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کو جمع کرکے مؤثر تقریر کی اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ آپ کی بیعت کے بعد حضرت علیؓ نے ہاتھ بڑھایا۔ بیعت عام کے بعد محرم ۲۴ھ میں حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے (ابن سعد، طبقات وغیرہ)

عہدِ عثمانی میں ۲۵ھ میں اسکندریہ میں رومیوں نے بغاوت کی جسے عمروؓ بن العاص کے ذریعے دبایا گیا۔ اسی سال آذربائیجان اور آرمینیا کے علاقے صلح توڑ کر باغی ہوگئے۔ ولید بن عقبہ اور سلمان بن ربیعہ باہلی کے ذریعے ان دونوں بغاوتوں کو فرو کردیا گیا۔ ایشیائے کوچک کے بطریق اعظم نے اسی ہزار فوجیں حبیب بن مسلمہ کے مقابلہ کے لیے بھیجیں۔ حبیب نے انھیں شکست دی۔ بہت سے علاقوں کو مطیع بنایا۔ اران اور گرجستان کے بعض علاقوں کو فتح کیا۔ اسی سال امیر معاویہؓ نے ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی اور بروسہ تک بڑھتے چلے گئے۔ انطاکیہ اور طرطوس کے درمیان جس قدر قلعے تھے سب میں اسلامی نوآبادیاں قائم کردیں (ابن اثیر)۔ ۲۷ھ میں عبداللہ بن سرح نے شمالی افریقہ پر فوج کشی کی۔ بعد میں عبداللہ بن زبیر بھی تازہ دم فوج کے ساتھ ان سے آملے۔ چنانچہ طرابلس، تونس، مراکش اور الجزائر وغیرہ تمام علاقے فتح کرلیے گئے۔ شام کے والی امیر معاویہ نے طرابلس الشام، عمودیہ اور ملطیہ فتح کیے۔ حضرت عثمانؓ سے باقاعدہ اجازت حاصل کرکے امیر معاویہؓ نے قبرص پر چڑھائی کی اور اسے فتح کرلیا۔ ۳۲ھ میں اہل قبرص نے مسلمانوں کے خلاف رومیوں کو مدد دی اس سے امیر معاویہؓ نے دوبارہ فوج کشی کرکے قبرص کو اسلامی مقبوضات میں شامل کرلیا اور یہاں مسلمانوں کی نوآبادی قائم کردی (فتوح البلدان)۔ ۲۹ھ میں یزدگرد نے فارس اور کرمان سے لے کر خراسان تک سارے عجم میں بغاوت کردی۔ ابن عامر والی بصرہ نے اس مہم کو سر کیا اور فارس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ ۳۰ھ میں سعید بن العاص نے طبرستان کی بغاوت کو فرو کیا اور پورے طبرستان پر قبضہ کرلیا۔ عبداللہ بن عامر نے خراسان کی بغاوت فرو کی۔ یزدگرد خراسان میں ایک دہقانی کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کے ساتھ ہی ساسانی خاندان اور اس کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ طبرستان کرمان اور سجستان کے علاقے بھی عہدِ فاروقی میں فتح ہوئے۔ عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ نے غزنہ سے کابل تک کا علاقہ فتح کیا۔ ۳۱ھ میں قیصرِ روم نے پانچ سو جہازوں کے ساتھ سواحل شام پر ہجوم کیا۔ امیر معاویہؓ اور عبداللہ بن ابی سرح نے اسے شکست فاش دی۔ ۳۲ھ میں امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ اور ۳۳ھ میں اناطولیہ کے قلعہ حصن المراۃ پر قبضہ کرلیا۔ دس سال کے عرصے میں اسلامی حکومت کے حدود ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحل اور یورپ کے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔

دورِ عثمانی کے ابتدائی پانچ چھ سال نہایت امن وسکون سے گزرے۔ فتوحات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، محاصل وخراج کی زیادتی، وظائف کی کثرت اور زراعت و تجارت کی ترقی نے ملک کو فارغ البالی اور عیش ونعم کے سامانوں سے معمور کردیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے لوازم ونتائج کے طور پر بغض وحسد اور شک ورقابت کا قدم بھی آیا۔ اندرونی تغیرات اور بیرونی اسباب نے مل کر حضرت عثمانؓ کے خلاف ایسا انقلاب برپا کیا جس نے نظام خلافت کو درہم برہم کردیا۔ مخالفین میں سب سے بڑا فتنہ انگیز بظاہر نومسلم لیکن منافق یہودی عبداللہ بن سبا تھا۔ اس نے زبانی وتحریری پروپیگنڈہ کے علاوہ خود عراق اور مصر جاکر خفیہ جماعتیں قائم کیں۔ بالآخر اس کی باغیانہ سرگرمیاں حضرت عثمانؓ کی شہادت پر منتج ہوئیں۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو کنانہ بن بشر، عمرو بن الحمق اور سودان بن حمران نے مل کر آپ کو شہید کردیا۔ مدینہ پر باغیوں کا قبضہ تھا۔ بدامنی کی وجہ سے کسی کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دو دن تک لاش مبارک بے گور وکفن پڑی رہی ۱۹ ذی الحجہ کی شام چند آدمیوں نے جان پر کھیل کر تجہیز وتکفین کی ہمت کی کابل سے مراکش تک کے فرمانروا کو سترہ آدمیوں کی مختصر جماعت نے خفیہ طور پر جنت البقیع سے متصل حش کوکب میں سپرد خاک کیا اور باغیوں کے خوف سے قبر کا نشان چھپا دیا (ابن سعد، طبری، ابن اثیر)۔

حضرت عثمانؓ کو اگرچہ اطمینان وسکون کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع صرف پانچ سال ملا لیکن اس قلیل مدت میں آپ نے امت اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ گو عثمانی دور میں عہد فاروقی کی طرح شوریٰ کا نظام نہ رہ گیا لیکن مہمات کے امور میں حضرت عثمانؓ اکابر صحابہ اور عمال حکومت سے مشورہ فرماتے تھے۔ صوبوں کی تقسیم قریب قریب وہی رہی جو عہد فاروقی میں تھی البتہ شام کے ملک کو، جو کئی صوبوں میں منقسم تھا، ایک صوبہ بنا دیا گیا اور امیر معاویہؓ پورے صوبے کے والی مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ فطرتاً نہایت حلیم الطبع، نرم خو اور خطا پوش تھے۔ آپ میں عفو ودرگزر کا پہلو غالب تھا اس لئے آپ میں احتساب کی وہ سختی نہ تھی جو حضرت عمرؓ کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ بعض ایسے امور سے چشم پوشی فرما جاتے تھے جن پر حضرت عمرؓ بڑے سے بڑے عہدہ دار کو بھی سزا دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ اس فطری افتاد طبع کے باوجود کسی ایسی بے عنوانی کو نظر انداز نہ کرتے تھے جس سے اصول اسلام، اخلاق عامہ یا حکومت کے نظام پر کوئی اثر پڑتا ہو۔ چنانچہ سعدؓ بن ابی وقاص کو بیت المال کا قرض نہ ادا کرنے کے الزام میں معزول کردیا گیا۔ سعدؓ بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو رعایا کی شکایت پر برطرف کیا۔ عہد عثمانی میں سپاہیوں کی تنخواہ میں سو سو روپے کا اضافہ ہوا (طبری) نئے مفتوحہ علاقوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم ہوئیں۔ شام میں بحرِروم کے ساحل پر انطاکیہ سے لے کر طرطوس تک فوجی نوآبادیاں بسائی گئیں (ابن اثیر) عہد فاروقی میں جہاد کے گھوڑوں اور دیگر مویشیوں کیلئے متعدد چراگاہیں بنائی گئی تھیں۔ حضرت عثمان نے ان میں اور اضافہ کیا۔ یہ چراگاہیں اتنی وسیع تھیں کہ صرف ضربہ کی ایک چراگاہ میں چالیس ہزار اونٹ پرورش پاتے (وفاء الوفاء)۔ سب سے نمایاں اور اہم ترقی بحری فوج کا قیام ہے۔ عہدِ عثمانی میں اسلامی بیڑے کو اتنی

Marfat.com

رفی دی گئی کروہ اس عہد کے طاقتور رومی بیڑے سے بھی بڑھ گیا۔ بحری بیڑے کے قیام کے بعد بحرِ روم مسلمانوں کی آماجگاہ بن گیا۔ رفاہِ عام کے بہت سے کام انجام پائے۔ دفاتر کے لیے وسیع عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ سڑکیں، پل اور مسافر خانے بنوائے گئے۔ کوفہ میں عقیل اور ابن ہبار کے مکانات خرید کر ایک وسیع مہمان خانہ بنوایا گیا۔ مدینہ اور نجد کی راہ میں ایک سرائے تعمیر ہوئی۔ کئی کنوئیں کھدوائے گئے۔ سیلاب کی روک تھام کیلئے مدینہ سے تھوڑے فاصلے پر بندھ بندھوایا اور نہر کھدوا کر سیلاب کا رخ دوسری طرف پھیر دیا گیا۔ ۲۹ھ میں مسجد نبوی کی دوبارہ تعمیر و توسیع ہوئی۔ مسجد کے طول میں بیس گز اور عرض میں تیس گز کا اضافہ ہوا (ابن اثیر)۔ کلام اللہ کی تدوین حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں ہو چکی تھی حضرت عثمانؓ نے مدون شدہ نسخے کی نقلیں کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ (بخاری شریف)

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ:۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تین دن تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ مدینہ میں ہر طرف باغی چھائے ہوئے تھے۔ خلافت کا انتظام بہ حال ضروری تھا۔ مہاجرین و انصار (حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سمیت حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خلیفہ کا انتخاب ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے اشارہ سمجھ کر جواب دیا کہ مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں جسے تم منتخب کرو گے میں بھی اسے قبول کر لونگا حاضرین نے پھر اصرار کیا۔ حضرت علیؓ نے پھر عذر کیا کہ امیر ہونے کے مقابلہ میں مجھے وزیر ہونا زیادہ پسند ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے غرض مسلمانوں کے اصرار پر آپ نے قبول فرمایا۔ مجمع عام میں مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی (طبری)۔ بیعت کے بعد ذی الحجہ ۳۵ھ میں آپ نے مسندِ خلافت پر قدم رکھا۔ حضرت علیؓ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ ایک دن کے لئے بھی آپ کو ملکی نظم و نسق کے قیام اور بیرونی فتوحات کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی۔ حضرت علیؓ عہد عثمانی کے اکثر عمال خصوصاً امیر معاویہؓ والی شام کے سخت خلاف تھے۔ اس لئے تخت پر بیٹھتے ہی آپ نے سب عمال کو معزول کر دیا۔ آپ کے بہی خواہوں نے اس فیصلہ کی مخالفت کی۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے عرض کیا کہ ابھی آپ معاویہؓ اور دوسرے عثمانی عمال کو ان کے عہدوں سے نہ ہٹائیے جب وہ بیعت کر کے آپ کی خلافت تسلیم کرلیں تو اس وقت جو دل میں آئے کیجیے۔ لیکن حضرت علیؓ نے سختی سے انکار کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے مشورہ دیا کہ ابھی معاویہؓ کو معزول نہ کیجیے۔ اگر وہ اپنے عہدہ پر قائم رہیں گے تو پھر انھیں اس بات کی پرواہ نہ ہوگی کہ خلیفہ کون ہے۔ لیکن اگر وہ معزول کر دیئے گئے تو حضرت عثمانؓ کے قصاص کی دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور سارے عراق و شام کو آپ کے خلاف کر دیں گے لیکن حضرت علیؓ نے ان کا مشورہ قبول نہ فرمایا (ابن اثیر) ۳۶ھ میں تمام عثمانی عمال کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے عمال مقرر کیے۔ شام پر سہیل بن حنیف کا تقرر ہوا۔ امیر معاویہؓ بیس بائیس سال سے شام کے والی چلے آ رہے تھے انھیں معزول کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے سہیل بن حنیف کو شام کی سرحد تبوک ہی سے واپس کر دیا (طبری)۔ امیر معاویہؓ کو معزول کرنے کے ساتھ ہی حضرت علیؓ نے ان کے پاس بیعت کے لئے علیحدہ ایک خط لکھا۔ اس وقت بڑے بڑے صحابہ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور ان کے قاتلوں کا پتہ نہ چلنے سے سخت متاثر تھے۔ امیر معاویہؓ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور مدینہ سے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیراہن اور ان کی اہلیہ نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں منگا کر دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر آویزاں کرادیں اس سے شام کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے لوگ اس منظر کو دیکھ کر زار زار روتے تھے۔ امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے قاصد کو روانہ کیا۔ حضرت علیؓ نے خالی لفافہ دیکھنے کے بعد قاصد سے پوچھا کہ شام میں کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں ساٹھ ہزار شیوخ حضرت عثمانؓ کے پیراہن پر رو رہے ہیں اور قصاص لینے کا عہد کر چکے ہیں حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا خدایا میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں (طبری)۔

حضرت علیؓ کو واقعات کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ آپ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن امیر معاویہؓ کے خلاف کسی کارروائی سے قبل ہی ایک اور نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دنوں میں حضرت عائشہؓ حج کے سلسلہ میں مکہ میں تھیں۔ مکہ سے واپسی میں راستہ میں آپ کو اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور مدینہ میں بدامنی بپا ہے (طبری)۔ یہ سن کر آپ مکہ تشریف لے گئیں۔ اس کے بعد حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ بھی مکہ پہنچ گئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ مدینہ میں لوگ حیران و سرگرداں ہیں ان کا حال یہ ہے کہ حق کو پہچان سکتے ہیں نہ باطل سے گریز کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں اپنی حفاظت کی طاقت ہے (طبری)۔ حضرت عائشہؓ کے واپس آنے کی خبر سن کر بہت سے مسلمان جمع ہو گئے تھے آپ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "کہ مختلف ملکوں کے عوام، اجنبیوں اور اہل مدینہ کے غلاموں نے چند معمولی باتوں پر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا .... میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لے کر اسلام کو معزز کرو (طبری) قصاص کی اس دعوت پر تین ہزار مسلمان سرفروشی کے لیئے تیار ہو گئے۔ غرض صفر ۳۵ھ میں حضرت عائشہؓ مدینہ سے بصرہ کے لئے روانہ ہوئیں۔ طبری کے الفاظ ہیں کہ "اس دن مسلمان اسلام پر اتنا روئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ روئے تھے۔" بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف نے ان لوگوں کو بصرہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور فوج لے کر مقابلہ پر نکل آیا۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ بھی مقابلے کے لئے بڑھے۔ بصرہ کے والی کو شکست ہوئی۔ حضرت علیؓ ۳۶ھ میں مدینہ سے بصرہ کے لیئے روانہ ہوئے۔ ذی قار پہنچ کر آپ نے منزل کی اور کوفہ اور بصرہ سے مدد کے لیے دعاۃ بھیجے۔ حضرت امام حسنؓ، عمارؓ بن یاسر اور ہاشم بن عتبہ کوفہ پہنچے۔ ابو موسیٰ اشعری نے لوگوں کو غیر جانبداری کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت حسنؓ نے تقریر کی اور دس ہزار آدمیوں نے ساتھ دیا (اخبار الطوال)۔ حضرت علیؓ نے قعقاعؓ بن عمرو کو حضرت عائشہؓ سے مفاہمت کی گفتگو کے لیے بھیجا قعقاع وہاں پہنچے تو انھوں نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی حضرت عائشہؓ کے پاس بلوالیا۔ قعقاعؓ نے پوچھا آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ نے جواب دیا: "قاتلین عثمانؓ کا قصاص، اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو قرآن کو چھوڑ دیا گیا اور اسے لیا گیا تو قرآن کو زندہ کیا گیا۔" قعقاعؓ نے کہا کہ میرے نزدیک تو بہتر طریقہ امن و سکون ہے جب حالات سکون پذیر ہو جائیں گے تو قاتلین عثمانؓ کو بھی پریشانی ہوگی اور ان سے قصاص بھی لیا جا سکے گا۔ آپ بیعت کر لیجیے اگر اپنی ضد پر قائم رہے تو نہ امن و امان قائم ہوگا اور نہ قصاص لیا جا سکے گا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ تم بالکل بجا کہتے ہو علیؓ کے پاس جا کر ان کی بھی رائے لو اگر وہ بھی تمہارے ہم خیال ہوں تو معاملات اصلاح پذیر ہو جائیں گے۔ قعقاعؓ واپس آ کر حضرت علیؓ کو یہ مژدہ سنایا۔ آپ بہت مسرور ہوئے اور مخلص مسلمانوں کی بڑی جماعت مصالحت کے لیے تیار ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ کے قاتلین سبائی جماعت کے افراد کو صلح کی گفتگو کا علم ہوا تو انھیں فکر ہوئی کہ ایسی صورت میں قصاص ضرور لیا جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مصالحت کی تکمیل سے پہلے جنگ چھیڑ دو جب ایک مرتبہ شعلہ بھڑک جائے گا تو پھر علیؓ اپنے بچاؤ کے لیے جنگ پر مجبور ہو جائیں گے (طبری)۔ حضرت علیؓ بصرہ پہنچے تو ان کے اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان صلح کی آخری کامیاب گفتگو ہوئی۔ مصالحت کی تکمیل کے بعد فریقین اپنے لشکروں

Marfat.com

واپس ہونے کے لیے تیار ہو گئے (طبری)۔ صبح ہونے سے قبل ہی سبائیوں نے دونوں فوجوں پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ نے جنگ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سبائیوں کی سازش کامیاب ثابت ہوئی اور جنگ روکنے کی پرخلوص کاوشیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جنگ میں شریک نہ ہوئے اور واپس جاتے ہوئے سبائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ فوج کے درمیان اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ محمل پر ہر طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی چار ہزار جاں نثاروں نے حضرت عائشہؓ اور اونٹ کی حفاظت میں جانیں فدا کیں (یعقوبی)۔ بالآخر حضرت عائشہؓ کا اونٹ زخمی ہو کر بیٹھ گیا اور حضرت علیؓ نے جنگ روک دی۔ چند روز بعد حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو انکے بھائی محمدؓ بن ابی بکرؓ امام حسن و حسین اور بصرہ کی چالیس معزز خواتین کے ہمراہ روانہ کیا حضرت عائشہؓ مکہ سے ہوتی ہوئی مدینہ تشریف لے گئیں جنگ جمل کے بعد رجب ۳۶ھ میں حضرت علیؓ نے کوفہ کو مرکز خلافت قرار دیا۔

جنگ جمل سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کے خلاف کارروائی کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ قاصدوں کے ذریعے گفت و شنید ہوتی رہی اور امیر معاویہؓ قصاص کی ضد پر اڑے رہے ان کا مطالبہ تھا کہ قاتلین عثمانؓ کو ہمارے حوالے کر دیں ہم سب سے پہلے بیعت کے لیے تیار ہیں۔ ذی الحجہ ۳۶ھ میں اسی ہزار فوج کے ساتھ حضرت علیؓ شام کی طرف بڑھے۔ فرات کے ساحل پر صفین کے میدان میں طرفین کی فوجیں خیمہ زن ہو گئیں۔ صلح کی ناکام کوشش دوبارہ ہوئی اور جمادی الاول ۳۷ھ میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ کئی مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی کام آئے۔ بالآخر شامی ہزاروں قرآن نیزوں پر بلند کر کے نکلے اور کہا کہ اگر شامی ختم ہو گئے تو رومیوں سے شام کی حفاظت کون کرے گا اور عراقی فنا ہو گئے تو اہل عجم سے عراق کو کون بچائے گا۔ آؤ ہم تم قرآن کو حکم مان لیں اس کا فیصلہ ہم دونوں کے لیے واجب التسلیم ہو گا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی جنگ بند ہو گئی اور طے پایا کہ دونوں فریق ایک ایک حکم (ثالث) مقرر کریں یہ دونوں کتاب اللہ کی رو سے جو فیصلہ کر دیں وہ فریقین کے لیے واجب التسلیم ہو۔ شامیوں نے عمرو بن عاص کو حضرت علیؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم مقرر کیا۔ ثالثین نے طے کیا کہ امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کو معزول کر کے مسلمانوں کو نئے سرے سے خلیفہ کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ دومۃ الجندل کی جامع مسجد میں ابو موسیٰ اشعریؓ نے متفقہ فیصلے کا اعلان کیا۔ اس کے فوراً بعد عمروؓ بن عاص کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اشعری نے حضرت علیؓ کو معزول کر دیا میں امیر معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں۔ یہ فیصلہ سن کر ابو موسیٰ چلائے کہ یہ غداری ہے لیکن اب تلافی ممکن نہ تھی۔ اس فیصلہ کے بعد امیر معاویہؓ کے حامیوں نے انھیں باضابطہ خلیفہ تسلیم کر لیا (طبری و اخبار الطوال)

اس نامنصفانہ فیصلے کے بعد حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہی دنوں خارجیوں نے عراق میں شورش اور بدامنی پھیلا دی۔ تحکیم کی تجویز طے ہو جانے کے بعد آپ کے حامیوں کی ایک جماعت اس کے خلاف ہو گئی تھی اور تحکیم کو کفر قرار دیا تھا یہی جماعت بعد میں خوارج کہلائی۔ حضرت علیؓ بھی تحکیم کی تجویز کے مخالف تھے لیکن اپنی ہی فوج کے اصرار پر انھیں مجبوراً تحکیم کی تجویز قبول کرنا پڑی تھی خوارجیوں کا عقیدہ تھا کہ معاملاتِ دین میں انسان کو حکم بنانا کفر ہے۔ اور اس کا فیصلہ ماننے والے سب کافر ہیں اور ان سے جہاد فرض ہے حضرت علیؓ نے خوارجیوں سے صلح کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ خوارجیوں نے قتل و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ حضرت علیؓ ... ہزار فوجوں کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلے۔ خونریز جنگ کے بعد خوارج کو شکست ہوئی۔

عرب کے نامور مدبر قیس بن سعد مصر کے گورنر تھے۔ امیر معاویہؓ نے انھیں اپنے ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ امیر معاویہؓ نے مشہور کر دیا کہ قیس ہمارے آدمی ہیں ان کے خطوط خفیہ طور پر ہمارے پاس آتے رہتے ہیں۔ حضرت علیؓ کو ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو آپ نے محمد بن ابی بکرؓ کو مصر روانہ کیا۔ قیسؓ بن سعد مستعفی ہو کر مدینہ چلے گئے (ابن اثیر)۔ محمد بن ابی بکر بالکل ناتجربہ کار تھے ان کی ناتجربہ کاری کے باعث مصر کے لوگ بھی حضرت علیؓ کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے بھی شامیوں کی طرح قصاص کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر امیر معاویہؓ نے ۳۸ھ میں مصر پر فوج کشی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ محمد بن ابی بکرؓ اسی جنگ میں مارے گئے۔ امیر معاویہؓ نے عمرو بن العاص کو مصر کا والی مقرر کر دیا۔ ۴۰ھ میں امیر معاویہؓ نے مشہور جفاکار بسر بن ابی ارطات کو تین ہزار سپاہ کے ساتھ حجاز اور یمن روانہ کیا حجاز کے علوی حاکم ابو ایوب انصاریؓ نے حرمِ نبوی کے احترام میں مزاحمت مناسب نہ سمجھی اور مدینہ چھوڑ کر کوفہ چلے گئے۔ بسر نے بزور اہل مکہ، اہل مدینہ اور اہل یمن سے بیعت لی۔ حضرت علیؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود کو چار ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا بسر اس وقت نجران میں تھا وہ علوی فوج کی خبر سن کر بھاگ نکلا۔ جاریہ اہل مکہ سے حضرت علیؓ کی اور اہل مدینہ سے حضرت حسنؓ کی بیعت لے کر واپس آ گئے (طبری)۔ ۴۰ھ میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان صلح ہو گئی۔ اس صلح کی رو سے حجاز و عراق اور مشرق کا پورا علاقہ حضرت علیؓ کے پاس رہا۔ شام، مصر اور مغرب کا علاقہ امیر معاویہؓ کے حصہ میں آیا۔ اسی سال حضرت علیؓ کی شہادت کا حادثۂ عظمیٰ پیش آیا۔ خارجیوں نے باہم مشورہ کے بعد طے کیا کہ معاویہؓ اور علیؓ دونوں میں سے کوئی بھی حکومت کا اہل نہیں۔ ان کی خانہ جنگی کی وجہ سے خلق اللہ مصیبت میں ہے۔ ان دونوں کو ختم کیے بغیر امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو، برک بن عبداللہ نے امیر معاویہؓ کو، اور عمرو بن بکر نے عمرو بن عاص کو شہید کرنے کا بیڑہ اٹھایا تینوں نے ایک ہی دن رمضان ۴۰ھ میں نمازِ فجر کے وقت تینوں بزرگوں پر حملہ کیا۔ عمرو بن عاص کی جگہ ایک اور شخص نماز پڑھا رہا تھا وہ دھوکے میں مارا گیا۔ امیر معاویہؓ پر اوچھا وار لگا اور وہ علاج معالجہ سے بچ گئے۔ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو شدید زخمی کر دیا۔ آپ نے لوگوں کو ہدایت کی کہ اگر میں جانبر نہ ہو سکوں تو خدا کے حکم کے مطابق گرفتار شدہ قاتل ابن ملجم کو قتل کر دینا اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میرے بعد میرے ایک خون کے بدلے میں مسلمانوں کا خون نہ بہانا صرف میرا قاتل قتل کیا جائے۔ زخمی ہونے کے تیسرے روز ۲۰ رمضان ۴۰ھ کو حضرت علیؓ نے انتقال فرمایا۔

حضرت علیؓ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں گزرا۔ آپ جس تقویٰ، دینداری اور عدل کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے، حالات کے تغیر سے لوگوں میں اس کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہ گئی تھی۔ آپ بیت المال کا ایک حبہ بھی بیجا صرف نہ ہونے دیتے تھے دوسری طرف امیر معاویہؓ اپنی کامیابی کے لیے ہر جائز و ناجائز وسیلہ اختیار کرتے تھے اور اپنے حامیوں کے لیے خزانہ کا منہ کھول دیا تھا۔ آپ بیت المال کی کوڑی کوڑی کا حساب لیتے تھے اور امیر معاویہؓ کی داد و دہش مخالفین تک کا منہ بند کر دیتی تھی۔ حضرت علیؓ کے عہد میں صیغۂ مال میں کئی مفید اصلاحات ہوئیں آپ نے جنگلات کو قابلِ محصول قرار دیا چنانچہ صرف صحرائے برس سے چار ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ عہدِ رسالت میں گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان کی باقاعدہ تجارت ہونے لگی تو ان پر زکوٰۃ مقرر کر دی گئی۔ حضرت علیؓ نے اسے منسوخ کر دیا عمال سے محاصل و خراج کی آمدنی کا نہایت سختی کے ساتھ احتساب کرتے۔ بازار کی نگرانی، نرخ اور

Marfat.com

ناپ تول کی نگرانی خود کرتے۔ درّہ لیکر بازار نکل جاتے اور بیچنے والوں کو حسنِ معاملت اور ناپ تول میں ایمانداری کی ہدایت فرماتے۔

خلجی (دہلی)

دہلی کا شاہی خاندان، جس نے ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک حکومت کی۔ غوری خاندان کے آخری فرمانروا سلطان معزالدین کیقباد کے قتل کے بعد خلجی خاندان کا پہلا حکمران جلال الدین فیروز شاہ خلجی ۱۳ر جون ۱۲۹۰ء کو کیلوکھری کے مقام پر تخت نشین ہوا۔ ابتدا میں شہر دہلی کے عمائد اس کے حامی نہ تھے۔ لیکن بالآخر تمام چھوٹے بڑوں نے بیعت کرکے فیروز خاں کو دہلی میں رہنے کی درخواست کی۔ سلطان بڑے جاہ جلال کے ساتھ دہلی پہنچا۔ جشن کے بعد ملک کے نظم ونسق کی طرف متوجہ ہوا۔ حسب مراتب جاگیریں اور تنخواہیں مقرر کیں۔ امیر خسرو دہلوی کو مصحف داری کی خدمت سپرد ہوئی۔ کڑہ مانک پور کے صوبیدار اور سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے بغاوت کی اور لشکر جرّار لے کر دہلی پہ حملہ آور ہوا۔ جنگ میں ملک چھجو کو شکست ہوئی اور وہ بلبنی امراء سمیت گرفتار ہوا۔ بعد میں سلطان فیروز شاہ نے سب کو معاف کر دیا۔ چنگیز خاں کے مغلوں نے پنجاب میں یورش کی۔ سلطان فیروز شاہ بے شمار فوج اور توپ خانے کے ساتھ مقابلے پہ آیا۔ مغلوں نے شکست کے آثار دیکھ کر صلح کر لی۔ مغل سپہ سالار سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور چند مغل امراء سمیت مسلمان ہو گیا۔ سلطان نے اسے بیٹا بنا لیا سلطان فیروز شاہ نے اپنے بھتیجے اور داماد ملک علاؤالدین کو کڑہ مانک پور کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس نے آس پاس کے علاقے فتح کرکے اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔ سلطان فیروز شاہ بغاوت کا خطرہ محسوس کرکے کڑہ مانک پور کی جانب روانہ ہوا۔ ملک علاؤالدین نے پاؤں پڑ کر معافی مانگ لی۔ اسی لمحے علاؤالدین کے ایک آدمی نے سلطان فیروز شاہ پر تلوار سے وار کیا، اور ۱۷ر رمضان المبارک / ۱۹ر جولائی ۱۲۹۶ء کو سلطان فیروز شاہ خلجی کا انتقال ہو گیا۔

سلطان فیروز شاہ کے قتل کے بعد علاؤالدین خلجی سکندر ثانی ۳ر اکتوبر ۱۲۹۶ء کو تخت نشین ہوا۔ اس نے فیروز شاہ کے دونوں بیٹوں رکن الدین حاکم ملتان اور ابراہیم کو اندھا کرانے کے بعد انہیں ہلاک کرا دیا۔ یہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے دکن فتح کرنے کی کوشش کی۔ وارنگل اور دوار وتی پورہ کی حکومتوں کو سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ گجرات، رنتھنبور اور چتوڑ پہ قبضہ کیا۔ مغلوں کی فوج نے ماوراءالنہر سے آ کر دہلی کا محاصرہ کیا۔ تھوڑے سے مقابلے کے بعد مغل شکست کھا کر فرار ہو گئے۔

ہندوستان کے طول وعرض میں جتنی فتوحات علاؤالدین کو حاصل ہوئیں اور جیسی شاندار عمارتیں اس نے بنوائیں، ان کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس کے دور کے مشہور احکام وہ ہیں جن کی رو سے ضروریات زندگی کی تمام اشیاء کی قیمتیں مقرر کر دی گئی تھیں۔ سلطان العارفین شیخ قطب الدین قدوۃ الاصفیا حضرت نظام الدین اولیا، زبدۃ العارفین شیخ صدرالدین عارف اور رکن الدین ملتانی اسی کے عہد میں تھے۔ امیر خسرو دہلوی جنھوں نے خمسۂ نظامی کے جواب میں سلطان کے نام پہ خمسہ لکھا، وہ ہزار تنکے (ٹکے) تنخواہ پاتے تھے۔ آخر عمر میں یہ سلطان صوم وصلوٰۃ کا پابند اور ریاضت وعبادت کا اتنا شائق ہو گیا تھا کہ لوگ اسے فرشتہ سمجھتے تھے۔ ۱۳۱۶ء کو ملک نائب وزیر مدارالمہام نے سلطان علاؤالدین کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

علاؤالدین کی وفات کے بعد ملک نائب نے خضر خاں ولی عہد کی بجائے تخت سلطنت پہ علاؤالدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو بٹھا دیا۔ تخت نشینی کے وقت شہاب الدین کی عمر سات برس تھی۔ ملک نائب نے شہاب الدین کے غیر مادری بھائی خضر خاں اور شادی خاں کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔ شہاب الدین کے حقیقی بھائی قطب الدین مبارک شاہ کو اندھا کرانا چاہا۔ لیکن شہزادے نے ملک نائب کے کارندوں کو انعام دے کر آمادہ کر لیا کہ وہ ملک نائب کو ہلاک کر دیں۔ ملک نائب کی ہلاکت کے بعد مبارک شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو اندھا کرا کے قید میں ڈال دیا۔ کم عمر شہاب الدین کی نام نہاد سلطنت صرف تین ماہ تک قائم رہی۔

اپریل ۱۳۱۶ء میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ عرف مبارک خاں تخت نشین ہوا۔ مبارک خاں نے خسرو خاں کو مدارالمہام بنا لیا۔ خسرو خاں کے مشورے پر اس نے اپنے تینوں اندھے اور قیدی بھائیوں کو قتل کروا دیا۔ مبارک خاں کے عہد میں ظفر خاں صوبے دار گجرات نے بغاوت کی۔ بغاوت فرو کر دی گئی اور ظفر خاں کو ہلاک کر دیا گیا۔ مبارک خاں نے خسرو خاں کو گجرات کا صوبیدار مقرر کر دیا گجرات خسرو خاں کا وطن تھا۔ اس نے گجرات میں قدم جما کر بغاوت کا ارادہ کیا لیکن امراء نے ساتھ نہ دیا۔ خسرو خاں دہلی آیا اور دوبارہ سلطان کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ خسرو خاں نے ۱۴ر اپریل ۱۳۲۰ء کو مبارک خاں کو قتل کروا دیا۔ علاؤالدین کے کم سن شہزادوں فرید خاں اور منگو خاں کو بھی قتل کر دیا۔

قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کرکے خسرو خاں نے اپنے نام کا خطبہ اور سکّہ جاری کیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ہندی رسمیں اور بت پرستی خوب پھیلی۔ دہلی میں ہندو مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ پانچ ماہ کے بعد پنجاب کے حاکم غازی خاں نے دہلی پر چڑھائی کی۔ خسرو خاں اندرپت کے مقام پر شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ ۶ر ستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی خاں، غیاث الدین تغلق کے لقب سے دہلی میں تخت نشین ہوا اور اس کے ساتھ خلجی خاندان کا عہدِ حکومت اختتام کو پہنچا۔

خلجی (مالوہ)

مالوے کا شاہی خاندان، جس نے ۱۴۳۶ء سے ۱۵۳۱ء تک حکومت کی۔ محمود شاہ خلجی اوّل نے اس کی بنیاد ڈالی۔ محمود شاہ، مالوے کے فرمانروا ہوشنگ شاہ کے وزیراعظم خان جہاں ملک مغیث کا بیٹا تھا۔ دونوں باپ بیٹے نے ہوشنگ شاہ کے بیٹے اور جانشین غزنین خاں (محمد شاہ) کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ ملک مغیث اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔ ۲۹ر شوال ۸۳۹ھ / ۱۵ر مئی ۱۴۳۶ء کو محمود شاہ مالوے کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں گجرات، چتوڑ، خاندیش کھیرلا اور جونپور فتح ہوئے۔ دکن فتح کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ۶۸ برس کی عمر میں ۱۹ر ذیقعدہ ۸۷۳ھ / ۲۷ر مئی ۱۴۶۹ء کو محمود شاہ اول کا انتقال ہو گیا۔

محمود کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا غیاث الدین خلجی تخت نشین ہوا۔

Marfat.com

غیاث الدین نے اپنے بڑے بیٹے ناصرالدین کو اپنا وزیراعظم بنالیا۔ سلطان غیاث اپنا زیادہ تر وقت حرم کے انتظام میں صرف کرتا اور سلطنت کا کام ناصرالدین اور اپنے مشیروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ ۲۲؍اکتوبر ۱۵۰۰ء کو ناصرالدین نے اپنے چھوٹے بھائی شجاعت خاں کو ہلاک کر دیا۔ ۲۷؍ربیع الثانی ۹۰۶ھ/۲۵؍اکتوبر ۱۵۰۰ء کو غیاث الدین کا انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ناصرالدین کے ایما سے سلطان غیاث کو زہر دیا گیا تھا۔

غیاث الدین خلجی کے انتقال کے بعد اکتوبر ۱۵۰۰ء میں ناصرالدین خلجی مسند نشین ہوا۔ سلطان ناصر نے اپنے دوسرے بیٹے شہاب الدین کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ مگر شہاب الدین نے بغاوت کی اور بالآخر راہ فرار اختیار کر لی۔ ۲؍مئی ۱۵۱۱ء کو ناصرالدین کی وفات پر اس کا تیسرا بیٹا محمود شاہ خلجی دوم تخت پر بیٹھا۔ محمود تدبر اور انتظامی قابلیت سے عاری تھا۔ اس نے نالائق خوشامدیوں کو بڑے بڑے عہدے دے کر اپنے امرا کی وفاداری سے ہاتھ دھو لیے۔ مخالف امرا نے کچھ عرصے تک محمود کے بڑے بھائی صاحب خاں کو محمد شاہ کے لقب سے بادشاہ بنا دیا۔ مدعیان سلطنت کے ہٹ جانے کے بعد محمود ثانی، اپنے وزیراعظم مدنی رائے کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ ۹؍شعبان ۹۳۷ھ/۲۶؍فروری ۱۵۳۱ء کو گجرات کے فرمانروا سلطان بہادر شاہ نے مالوے کو فتح کر کے گجرات میں شامل کر لیا۔ محمود ثانی اپنے سات بیٹوں سمیت گرفتار ہوا اور ۱۲؍اپریل ۱۵۳۱ء کو اسے ہلاک کر دیا گیا۔ محمود ثانی کے بعد خلجی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

خلع

ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے کر اس سے طلاق حاصل کرنا۔ اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر ہی میں معاملہ طے ہو جائے تو جو طے ہو وہی نافذ ہو گا۔ اگر عدالت میں معاملہ جائے تو عدالت صرف اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اس مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس مرد کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے پر عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے جو فدیہ چاہے تجویز کرے۔ اس فدیہ کو قبول کر کے شوہر کو اسے طلاق دینا ہو گا۔ بالعموم فقہاء نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ جو مال شوہر نے اس عورت کو دیا ہو اس کی واپسی سے بڑھ کر کوئی فدیہ دلوایا جائے۔ خلع کی صورت میں جو طلاق دی جاتی ہے وہ رجعی نہیں بلکہ بائنہ ہے چونکہ عورت نے معاوضہ دے کر اس طلاق کو گویا خریدا ہے۔ اس لیے شوہر کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ اس طلاق سے رجوع کر سکے البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر بھی ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو ایسا کرنا بالکل جائز ہے (سید ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن)۔ جمہور کے نزدیک خلع کی عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے مگر ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں متعدد روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلعم نے اس کی عدت ایک ہی حیض قرار دی تھی اور اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کیا (ابن اثیر)۔

خلق

دیکھیے، تخلیق

خُلق

دیکھیے، اخلاق

خلیفہ

دیکھیے، خلافت

خلیل اللہ

دیکھیے ابراہیمؑ

خلیل بن احمد

(۷۱۹ء - ۷۹۱ء ؟) ابوعبدالرحمٰن خلیل بن احمد بن عمرو بن تمام، ایک نحوی اور لغوی۔ خلیل متدین اور پرہیزگار شخص تھا۔ لغت اور نحو میں وہ بصرے کے دبستان کا مسلمہ رئیس الاساتذہ ہے۔ اس نے ریاضی، موسیقی اور عروض پر بھی کتابیں لکھیں۔ خلیل کو عروض کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے شعر کے اوزان، بحور اور اصطلاحاتِ عروض کو معین اور مدون کیا۔ اسی کا طریقہ آج تک رائج چلا آتا ہے۔ فارسی، ترکی اور اردو کے شعر و سخن میں بھی اسی کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ خلیل ہی نے سب سے پہلے عربی کی لغات "کتاب العین" تالیف کی۔ گو عربی نحو میں خلیل کی کوئی تصنیف باقی نہیں رہی مگر اس کے اثر کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سیبویہ کی "الکتاب" میں دوسرے نحویوں میں سے کل ۵۸۵ شواہد لیے گئے ہیں جن میں ۵۲۲ خلیل کے ہیں۔

خلیل بن اسحاق

(وفات ۱۳؍ربیع الاول ۷۷۶ھ/۲۲؍اگست ۱۳۷۴ء) بن موسیٰ بن شعیب، مصر کے ایک مالکی فقیہہ۔ انہوں نے ابن عبدالہادی، رشیدی اور عبداللہ منوفی سے تعلیم پائی۔ آپ حنفی مسلک کے تھے۔ منوفی کے کہنے سے مالکی طریقہ اختیار کیا۔ فقہی نقطۂ نظر سے وہ اپنے راہنما ابن حاجب کی طرح فقہہ کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو مالکی مسلک میں مصر اور المغرب کے شافعی رجحانات سے متاثر ہے۔ ان کی کتاب "المختصر" فقہ کا ایک ایسا دستور العمل ہے جس کا الجزائر میں سب سے زیادہ مطالعہ ہوتا رہا ہے۔ ان کی دوسری تصانیف یہ ہیں: (۱) التوضیح ابن حاجب کی المختصر کی شرح (۲) کتاب المناسک (۳) مناقب الشیخ عبداللہ منوفی، منوفی کے سوانح حیات (۴) ضبط الموجہات و تعریفہا۔

خلیل پاشا

اس نام کے دو ترکی وزرائے اعظم گزرے ہیں۔ (۱) قیصریلی خلیل پاشا احمد اول اور مراد رابع کے زمانے میں وزیراعظم تھا۔ محرم ۱۰۲۶ھ/جنوری ۱۶۱۷ء میں اوکوز پاشا کی جگہ وزیراعظم مقرر ہوا۔ اسی سال فروری میں عیسائی سفیروں کی حمایت کر کے اپنی آزاد خیالی کا ثبوت دیا۔ وہ وینس، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان سے اچھے تعلقات قائم کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ۱۶۱۸ء میں ترک فوج خلیل کی کمان میں ایران بھیجی گئی۔ ترک فوج کو سراو کے میدان میں شکست ہوئی۔ وہ واپس دارالسلطنت پہنچا تو اسے برطرف کر دیا گیا۔ ۴؍ذی قعدہ ۱۰۳۲ھ/۳۰؍اگست ۱۶۲۳ء کو مصطفیٰ اول کو تخت سے اتار کر مراد رابع تخت

Marfat.com

نشین ہوا۔ ۱۶۲۶ء میں خلیل کو دوبارہ وزیراعظم بنایا گیا۔ جولائی ۱۶۲۷ء میں ترک فوج دیاربکر گئی۔ پہلے اُخسخہ کے خلاف مہم روانہ کی گئی جہاں ایرانیوں سے خطرہ تھا۔ اسی دوران خلیل نے اباز اپاشا کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اباز اپاشا نے عثمان ثانی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بغاوت کر رکھی تھی۔ عثمان کو مئی ۱۶۲۲ء میں ینی چریوں نے قتل کر دیا تھا۔ ابازا نے شروع میں تو مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں فریب کا شبہ محسوس کرتے ہوئے ارزروم میں ینی چری کا قتل عام کر دیا۔ خلیل نے مجبوراً ارزروم کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن ستر دن کے محاصر کے بعد فوج کو سخت سردی کے باعث لوٹنا پڑا۔ برف کی وجہ سے فوج کو سخت نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ یہ مہم خلیل کی برخاستگی کا سبب بن گئی۔ ۱۶۲۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔ یورپین اور ترک مصنفین کے نزدیک خلیل پاشا اعتدال پسند اور انصاف پسند شخصیت کا حامل تھا۔ وہ مذہبی آدمی تھا اس نے قسطنطنیہ میں محمد فاتح کی مسجد کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔

(۲) ارناند خلیل پاشا، احمد سوم کے زمانے کا وزیر اعظم۔ ۵ر اگست ۱۷۱۶ء کو پیٹروڈائن کی جنگ میں وزیراعظم علی پاشا کی شہادت کے بعد خلیل ۱۷۱۶ء کو پیٹروڈائن کی جنگ میں آسٹریوں کے ہاتھوں وزیر اعظم علی پاشا کی شہادت کے بعد خلیل کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ دوسرے سال جنگ پھر سے شروع کی گئی اور خلیل بلغراد تک بڑھ گیا۔ ۱۶ر اگست ۱۷۱۷ء کو بلغراد کی جنگ میں خلیل کو مکمل شکست ہوئی۔ بلغراد پر آسٹریا کا قبضہ ہوگیا اور ترک نیش کو لوٹ گئے۔ اکتوبر ۱۷۱۷ء میں خلیل کو برخاست کر دیا گیا۔ ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ نرم مزاج، پرہیزگار اور نیک آدمی تھا۔

خلیل سلطان

(۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء - ۱۶ر رجب ۸۱۴ھ/۱۴۱۱ء) امیر تیمور کا پوتا جس نے سمرقند میں ۱۴۰۵ء سے ۱۴۰۹ء تک حکومت کی۔ خلیل جب پندرہ برس کا تھا تو اس نے ۱۳۹۹ء میں تیمور کی ہندوستان کی مہم میں بہت نام پیدا کیا۔ ۱۸ر فروری ۱۴۰۵ء کو تیمور کی وفات پر فوج نے خلیل کو تسلیم کر لیا۔ وہ پانچ برس تک سمرقند میں جما رہا لیکن اس کی حکومت ماوراء النہر سے باہر کہیں بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ آلتون اردو (GOLDEN HORDE) کے تاتاری پہلے خوارزم پر قابض تھے، اب انھوں نے بخارا تک قدم بڑھا لیے۔ ۱۴۰۹ء کے موسم بہار میں جب تاتار حملہ آور شاہرخ کی فوج بادغیس میں اور خلیل سلطان کی فوج شہر سبز میں جنگ کے لیے تیار تھی تو شمال میں امیر خدائے داد نے بغاوت کر دی۔ خلیل سلطان صرف چار ہزار سپاہی لے کر بغاوت فرو کرنے کے لیے بڑھا۔ ۱۳ر ذی قعدہ ۸۱۱ھ/۳۰ر مارچ ۱۴۰۹ء کو اسے سمرقند کے شمال میں خدائے داد نے گرفتار کر لیا۔ پہلے سمرقند اور بعد ازاں اسے فرغانہ لے جایا گیا۔ بالآخر امیر شیخ نورالدین کی مداخلت پر اس نے شاہرخ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے خلیل سلطان نے ماوراء النہر پر اپنی بادشاہت کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کے بدلے میں اُسے رَے ملا جہاں وہ مرتے دم تک مقیم رہا۔

خمارویہ

(پیدائش ۲۵۰ھ/۸۶۴ء) بن احمد بن طولون، مصر کا حکمران۔ طولون خاندان کے بانی احمد بن طولون نے ۲۶۹ھ/۸۸۲ء میں خمارویہ کو مصر میں اپنا قائم مقام مقرر کر دیا تھا۔ دمشق کی بغاوت فرو کرنے کے لیے [illegible] صرف بغاوت فرو کی بلکہ نہر العاصی کے کنارے [illegible] پیش قدمی کی۔ خلیفہ المعتمد کے بھائی الموفق کا بیٹا احمد خلیفہ کی فوج کی قیادت کرتے شام آیا۔ احمد نے دمشق کے والی ابن کنداج کے ساتھ مل کر مصری افواج پر حملہ کیا۔ مصری فوجیں دمشق اور پھر رملہ تک پسپا ہو گئیں۔ اسی اثنا میں خمارویہ سات ہزار سپاہیوں کو لے کر رملہ پہنچا۔ ۱۶ر شوال ۲۷۱ھ/۶ر اپریل ۸۸۵ء کو طواحین کی مشہور جنگ ہوئی خمارویہ اپنی بیشتر فوج کے ساتھ واپس مصر بھاگ گیا۔ ۲۷۳ھ/۸۸۶ء میں اسے برائے نام خراج کے عوض تیس سال کے لیے مصر و شام کے علاوہ سرحدات ایشیائے کوچک و آرمینیا کا والی تسلیم کر لیا گیا۔ ۸۸۶ء اور ۸۹۰ء میں صوبوں کے باغی والیوں اور خمارویہ میں جنگ ہوئی نتیجتاً خمارویہ کو عراق عرب کا بھی حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ رجب ۲۷۹ھ/اکتوبر ۸۹۲ء میں خلیفہ المعتمد نے وفات پائی اور الموفق کا بیٹا احمد المعتضد کے لقب سے مسند نشین ہوا۔ المعتضد نے لقب سے مسند نشین خمارویہ کے عہدے کی توثیق کر دی۔ خمارویہ عالم جوانی میں اپنے خادم کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ اس کی فضول خرچیوں سے ملک کو ایسا نقصان پہنچا کہ طولون خاندان کے حکمران مسلسل کمزور ہوتے گئے۔ ۲۹۲ھ/۹۰۵ء تک آل طولون کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔

خمر

نشہ آور چیز۔ خمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا ہے مجازاً گیہوں، جو، کشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی خمر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ خمر (شراب) کی حرمت کے بارے میں پہلا حکم قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ میں نازل ہوا۔ "پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ دوسرا حکم سورۂ نساء آیت ۴۳ میں نازل ہوا۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔" آخری حکم سورۂ المائدہ کی آیت ۹۰ میں نازل ہوا۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔" اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی اکرم صلعم نے ایک خطبہ میں لوگوں کو متنبہ فرما دیا تھا کہ اللہ تعالےٰ کو شراب سخت ناپسند ہے، بعید نہیں کہ اس کی قطعی حرمت کا حکم آجائے۔ لہٰذا جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کر دیں۔ جب سورہ المائدہ کی آیت ۹۰ نازل ہوئی تو آپؐ نے اعلان کرایا کہ اب جن کے پاس شراب ہے وہ نہ اسے پی سکتے ہیں نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ لوگوں نے پوچھا ہم یہودیوں کو تحفتاً کیوں نہ دے دیں؟ آپؐ نے فرمایا جس نے یہ چیز حرام کی ہے اس نے اسے تحفتاً دینے سے منع کر دیا ہے۔ بعض نے پوچھا ہم شراب کو سرکے میں کیوں نہ تبدیل کر دیں۔ آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ نہیں اسے بہا دو۔ ایک صاحب نے عرض کیا یارسول اللہؐ ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے پوچھا جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی ہے۔ عرض کیا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، تو اس سے پرہیز کرو۔ عرض کیا ہمارے علاقے کے لوگ تو نہ مانیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔"

Marfat.com

ابن عمرؓ کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، "اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے والے پر اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔" نبی صلعم نے یہ اصول بھی بیان فرمایا کہ جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ اور جس چیز کا ایک پورا فرابہ نشہ پیدا کرتا ہو۔ اس کا ایک چلو پینا بھی حرام ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی صلعم نے اس دستر خوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ ابتداءً آپ نے ان برتنوں تک کے استعمال کو منع فرمایا تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہو گیا تب آپ نے برتنوں پر سے یہ قید اٹھا دی۔ حضرت عمرؓ نے جمعہ کے خطبہ میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔

نبی صلعم کے زمانے میں شراب پینے والے کے لیئے کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی۔ جو شخص اس جرم میں گرفتار ہو کر آتا اسے جوتے، لات، مکے، بل دی ہوئی چادروں کے سونٹے اور کھجور کے سانٹے مارے جاتے تھے۔ آپؐ کے زمانے میں اس جرم پر زیادہ سے زیادہ چالیس ضربیں لگائی گئی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں چالیس کوڑوں کی سزا رہی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس جرم سے باز نہیں آتے تو انہوں نے صحابۂ کرام کے مشورے سے اسّی کوڑے سزا مقرر کی۔ اسی سزا کو امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ شراب کی حد قرار دیتے ہیں۔ ایک اور روایت کے بموجب امام شافعیؒ بھی اسی سزا کو حد قرار دیتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ چالیس کوڑوں کے قائل ہیں ایک روایت کے مطابق امام شافعیؒ بھی چالیس کوڑوں کے قائل ہیں۔ حضرت علیؓ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔

شریعت کی رو سے یہ بات حکومت اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزور قوت نافذ کرے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنی ثقیف کے ایک شخص رویشد کی دکان اس بنا پر جلوا دی گئی کہ وہ خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت عمرؓ کے حکم سے ایک گاؤں پورا جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقے سے شراب کشید اور فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔

خمس

پانچواں حصہ۔ مخالفین اسلام سے لڑ کر جو مال حاصل کیا جائے وہ "غنیمت" ہے اور جو مال بغیر لڑائی کے حاصل ہو اسے فَی کہتے ہیں۔ حنفیہ کی رائے کے مطابق فَی سب کا سب عام مسلمانوں کا ہے۔ یہ بیت المال میں جائے گا اور اس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا۔ بعض فقہا کی رائے ہے کہ خمس فَی میں سے بھی نکالا جائے گا۔ خمس کی پھر پانچ حصوں میں تقسیم ہوگی، جن میں سے پہلا حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ دوسرا رسولؐ کے قرابت داروں کا۔ تیسرا حصہ یتیموں کا ہے۔ چوتھا مساکین کا اور پانچواں مسافروں کا۔ بعض فقہا کی رائے ہے کہ رسولؐ کی وفات کے بعد آپؐ کا حصہ آپ کے ورثاء کو ملے گا۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ امام منتظر کا حق ہے جو آپؐ کا خلیفہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد یہ حصہ ساقط ہو گیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اس کو عامۂ مسلمین کے مفاد میں خرچ کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ذوی القربیٰ کا حق بھی آپؐ کے بعد ساقط ہو گیا۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ان کا حق خمس میں باقی ہے لیکن یہ حق صرف بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کا ہے۔ باقی ماندہ قریش کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

اثنا عشریہ کے معتبر عالم محقق اوّل نجم الدین جعفر بن یحییٰ نے بیان کیا ہے کہ خمس مفصلہ ذیل اموال سے لیا جاتا ہے۔ (۱) مال غنیمت سے (۲) معادن کے حاصلات سے (۳) ان خزائن مدفونہ سے، جن کے مالک کا پتہ نہ چلے کہ مسلم ہے یا ذمی (۴) سمندر کی پیداوار سے جو کسی مسلم نے ذمی کے ہاتھ فروخت کر دی ہو۔ (۷) ان اموال سے جن میں حلال اور حرام کی آپس میں اس قدر آمیزش ہو جائے کہ ان کا جدا کرنا دشوار ہو۔ اس کے بعد اس خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ (۱) اللہ (۲) اس کے رسولؐ (۳) ذوالقربیٰ۔ حصہ اوّل اور دوم کے حقدار رسولؐ کے وارث ہیں جن سے مراد عبدالمطلب کی صلبی اولاد ہے یعنی اولاد ابوطالب، عباس، حارث اور ابو لہب۔ بشرطیکہ وہ اثنا عشری ہوں (۳) ان کو دیا جائے گا جو قانوناً آپؐ کے جانشین یعنی امام الاصل ہیں بعض شیعہ فقہا نے فقط بارہ اماموں کو اس کا صحیح حقدار تسلیم کیا ہے۔

خندق، غزوہ

تاریخ اسلام کا ایک مشہور غزوہ جو مسلمانوں اور کفار عرب کے درمیان ذیقعدہ ۵ ھ (بعض کے نزدیک شوال ۵ ھ) میں ہوا۔ ۳ ھ غزوۂ احد میں قریش یہ دعویٰ کر کے گئے تھے کہ شوال ۴ ھ میں پھر لڑنے آئیں گے۔ مگر نہیں آئے۔ محرم ۵ ھ میں بنو نضیر مدینہ سے نکالے گئے تو ان کا بڑا حصہ خیبر میں جا بسا۔ بنو نضیر میں حیی بن اخطب بڑا مفسد اور شرارت پیشہ شخص تھا۔ حیی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، سلام بن مشکم، کنانہ بن الربیع وغیرہ اور سرداران بنو وائل ہود بن قیس اور ابو عمارہ وغیرہ متحد ہو کر پہلے مکہ گئے۔ قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف حملے کے لیئے تیار کیا اور مصارف جنگ کیلیئے مال و زر اکٹھا ہوا۔ اس کے بعد یہ سردار قبائل بنو غطفان اور بنو کنانہ میں گئے اور انھیں جنگ کے لیئے برانگیختہ کیا۔ قبائل قریش، بنو سلیم، بنو اشجع، بنو سعد، بنو مارہ، بنو نضیر، بنو غطفان اور بنو کنانہ کے قریباً پچاس سرداروں نے خانہ کعبہ میں جا کر قسمیں کھائیں کہ جب تک زندہ ہیں مسلمانوں کی مخالفت سے منہ نہ موڑیں گے اور اسلام دشمنی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑیں گے چنانچہ اسلام دشمن قبائل پر مشتمل دس ہزار سے چوبیس ہزار کی تعداد میں لشکر ابو سفیان کی کمان میں مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ اس لشکر میں ساڑھے چار ہزار اونٹ اور تین سو گھوڑے تھے۔

آنحضرت صلعم کو جب اس لشکر کے کوچ کی خبر ملی تو آپ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ طے پایا کہ مدینہ کے اندر رہ کر مدافعت کی جائے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ حملہ آور فوج سے محفوظ رہنے کے لیئے خندق کھود دی جائے۔ نبی کریم صلعم نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔ ایک طرف مدینہ منوّرہ کے مکانات کی دیواریں فصیل کا کام دے رہی تھیں۔ ایک طرف پہاڑیاں تھیں۔ جو سمت کھلی ہوئی تھی اور جہاں سے دشمن حملہ آور ہو سکتا تھا، اس طرف خندق کی کھدائی شروع کی گئی۔ دس دس رضا کاروں پر مشتمل تین سو ٹولیوں نے بیس بیس گز خندق کھود دی۔ خندق پانچ گز چوڑی پانچ گز گہری اور ساڑھے تین میل لمبی تھی۔ کھدائی کے دوران میں ایک جگہ بڑا سخت پتھر آ گیا۔ سب زور آزمائی کر چکے لیکن پتھر نہ ٹوٹا۔ بالآخر رسولؐ اللہ نے اس پر ضرب لگائی تو پتھر میں شگاف پڑ گیا ساتھ ہی روشنی نکلی۔ آپؐ نے اللہ اکبر کہا سب صحابہؓ نے تقلید کی۔ آپؐ نے فرمایا مجھ کو ملک شام کی کنجیاں دی

Marfat.com

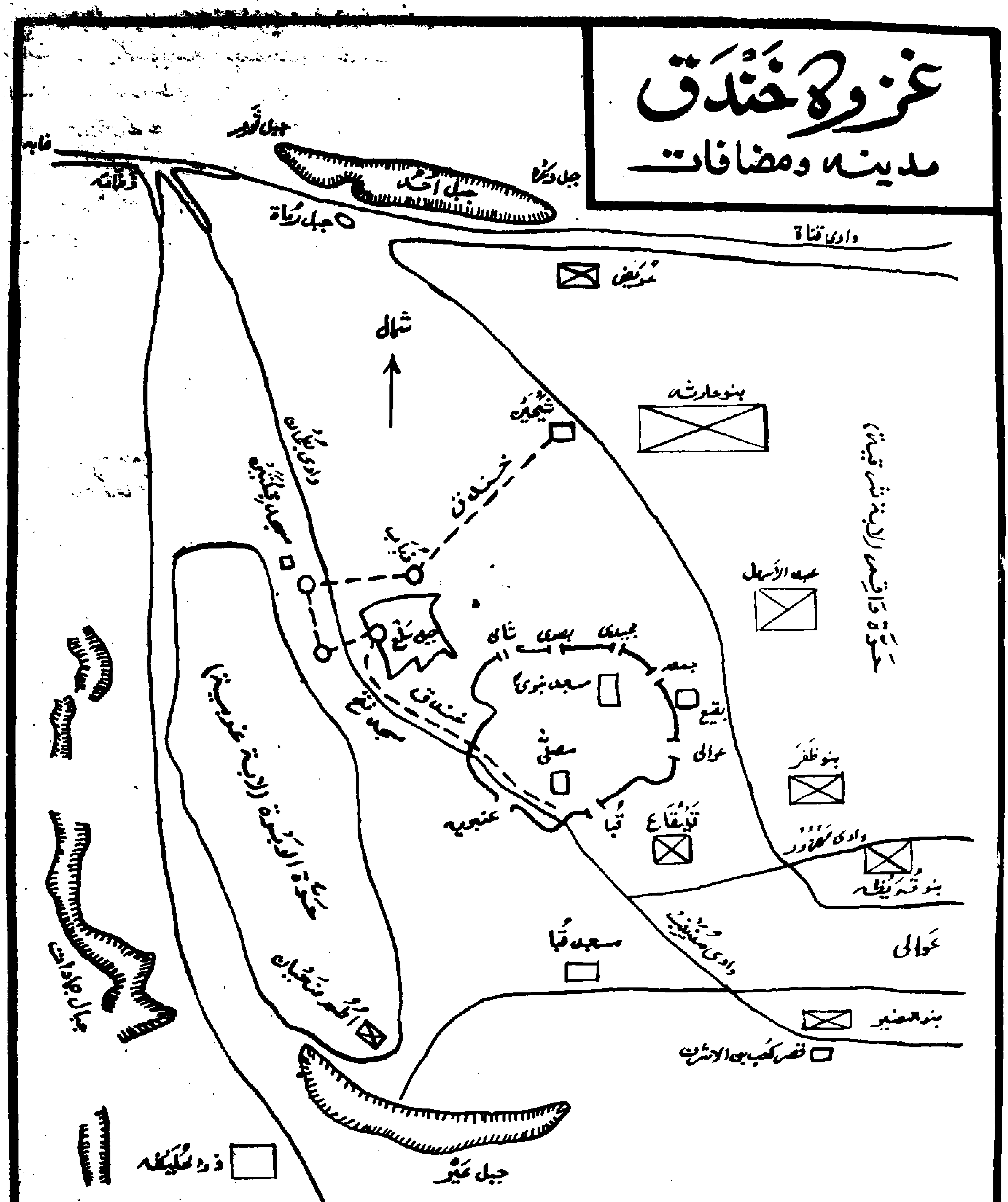

گئیں۔ پھر آپ نے دوسری ضرب لگائی۔ اس ضرب سے بھی روشنی نکلی آپ نے فرمایا مجھے ملک فارس کی کنجیاں دی گئیں۔ تیسری ضرب پر روشنی نکلنے پر آپ نے فرمایا مجھے یمن کی کنجیاں دی گئیں۔ تیسری ضرب سے پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ آپؐ نے صحابہؓ کو خبر دی کہ مجھے جبریلؑ نے خبر دی ہے کہ یہ تینوں ملک آپؐ کی امت کے قبضے میں آجائیں گے۔

مدینہ کے یہودی قبائل بنو قریظہ ایک معاہدہ کے تحت مسلمانوں کے حلیف تھے۔ بنو نضیر کے حیی بن اخطب نے انھیں بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ مسلمانوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو مدینہ کی ایک گڑھی میں جمع کر دیا تھا۔ بنو قریظہ اور منافقین کی طرف سے سخت خطرہ تھا۔ اس صورتِ حال میں لشکرِ کفار خندق کے سامنے آگیا۔ اس نے کئی مرتبہ خندق عبور کرنے کی کوشش کی لیکن [illegible]

Marfat.com

ایک کونے خندق بھی پار کرلی تیر اور پتھر برساتے رہے جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو عرب کے نامور بہادر ضرار، جبیرہ، نوفل اور عمرو بن عبدار ایک تنگ مقام سے خندق پار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عمرو بن عبدار کو حضرت علیؓ نے قتل کر دیا۔ وہ ہزار سوار کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ باقی تین کفار عمرو کے قتل کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ نوفل خندق میں گر گیا اسے بھی حضرت علیؓ نے بڑھ کر ہلاک کر دیا۔ باقی دو فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ آنحضرت صلعم کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ سامان رسد کہیں سے میسر نہ آسکتا تھا۔ ایک صحابی نے بھوک کی شکایت کی اور کرتا اٹھا کر دکھایا جس کے نیچے پتھر باندھ رکھا تھا۔ آپؐ نے اپنا کرتا اٹھا کر دکھایا تو دو پتھر پیٹ پر باندھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے انصار کے دو سرداروں سعدؓ بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے مشورہ کیا کہ کفار سے اس شرط پر صلح کر لی جائے کہ مدینے کی پیداوار کا ایک تہائی حصہ انکو دے دیا جائے۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب ہم مشرک اور بت پرست تھے تو اس زمانے میں یہ لوگ ایک کھجور بھی ہم سے نہیں لے سکتے تھے اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت عطا کی ہے کیا اس حالت میں ہم ان کو اپنا مال دیں۔ بخدا ان کے لئے ہمارے پاس تلوار کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

بنو قریظہ کے ایک نومسلم نعیمؓ بن مسعود نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں بنو قریظہ اور لشکرِ کفار میں پھوٹ ڈلوائے دیتا ہوں۔ چنانچہ نعیمؓ بن مسعود پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب رہے۔ بنو قریظہ و قریش کے تعاون کے امکانات ختم ہوگئے جب محاصرے کو ستائیس روز گزر گئے تو ایک رات تیز و تند آندھی چلی جس سے خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں اور چولہوں پر سے دیگچیاں گر گئیں۔ سردی بڑھ گئی۔ کفار مایوسی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر واپس چل دیئے۔ کفار کے فرار ہونے کی خبر آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی۔ مسلم لشکر کے مخبر حذیفہؓ بن یمان نے اطلاع دی کہ کفار بھاگ گئے ہیں اور ان کی لشکرگاہ خالی پڑی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب کفارِ قریش ہم پر کبھی حملہ آور نہ ہونگے۔

خوات بن جبیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے صحابی۔ آپ کا تعلق قبیلۂ اوس سے تھا۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں تمام غزوات میں حصہ لیا۔ بہادر اور شجاع تھے اسی وجہ سے رسول اللہ صلعم نے انھیں اپنا سوار مقرر کیا تھا۔ شاعر مزاج اور زندہ دل صحابی تھے۔ آخری عمر میں بصارت جاتی رہی۔

خواجو کرمانی

(۱۵ شوال ۶۷۹ھ / ۷ فروری ۱۲۸۱ء ــــ ۷۴۴ھ/ ۱۳۴۳ء)
کمال الدین ابوالعطا محمود بن علی بن محمود، ایران کا نامور شاعر۔ وہ کرمان کے ایک سربرآوردہ خاندان کا فرد تھا۔ کرمان ہی میں تعلیم پائی۔ فارسی، عربی اور دیگر علوم میں دسترس حاصل کی۔ وطن کی سیر و سیاحت کے بعد بغداد کا رُخ کیا۔ بغداد سے واپس ہوا تو اس نے مظفری خاندان کے حکمران یزد مبارز الدین محمد (۱۳۱۴ء ــــ ۱۳۵۸ء) کے قصیدے کہے۔ اس کے بعد شیخ ابواسحٰق اینجو کے دربار سے وابستہ رہا۔ اس کی شان میں متعدد قصیدے کہے۔ دربار ابواسحٰق میں خواجوؒ کی حافظ شیرازی سے بھی صحبت رہی۔ اس نے سلطان ابوسعید ایلخانی کی شان میں بھی قصیدے کہے۔ خواجوؒ نے نظامی گنجوی کے خمسے کے طرز پر خمسہ لکھا خواجوؒ کا دیوان قصائد، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد بیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس کی مشہور عشقیہ مثنوی "نوروز و گل" روانی اور جذبات نگاری کے اعتبار سے شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۲۶۱۵ ہے۔ یہ مثنوی خراسان کے حکمران فیروز کے بیٹے نوروز اور قیصر روم کی شہزادی گل کے معاشقے کی داستان ہے جو نظامی کی مثنوی "خسرو شیریں" کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ شبلی نعمانی نے خواجو اور حافظ کی غزلیات کا موازنہ کیا ہے جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ حافظ نے خواجو کا اسلوب اختیار کیا۔ یہاں تک کہ جذبات میں بھی اس کی پیروی کی۔ خواجو نے عشق و عاشقی کے جذبات کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اکثر پوری کی پوری غزلیں دنیا کی بے ثباتی پر کہی ہیں۔ خواجو کی غزل گوئی کی یہی خصوصیت ہے جس پر حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی اور اسی کے اسلوب میں غزل سرائی کی۔ حافظ نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز دو روش خواجو

خواجہ اجمیری

دیکھئے، چشتی، خواجہ معین الدین

خواجہ خضرؑ

دیکھئے، خضرؑ

خوارجیہ

دیکھئے، خارجی

خوارزمی، ابوعبداللہ محمد

(وفات ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء) مسلمانوں کے قدیم ترین دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) "مفاتیح العلوم" کا مصنف۔ یہ کتاب اس نے سامانی بادشاہ نوح ثانی (۹۷۶ء ــــ ۹۹۷ء) کے وزیر ابوالحسن عبیداللہ بن احمد ابی العتبی کے نام سے معنون کی گئی۔ یہ تصنیف دو مقالوں میں منقسم ہے۔ مقالۂ اول میں شریعت اور اس سے متعلق علوم، فقہ، کلام، عروض، تاریخ اور دوسرے مقالے میں فلسفہ، منطق، طب، فلسفہ، ہندسہ، فلکیات، موسیقی، حیل اور کیمیا سے بحث کی گئی ہے۔ مختلف مباحث کے متعلق معلومات کے لیئے یہ کتاب بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے

خوارزمی، محمد بن موسیٰ

(وفات ۸۳۵ء ــــ ۸۴۷ء ؟) ماہر فلکیات، ریاضی دان اور مؤرخ۔
خوارزمی نے المامون کے عہد میں شہرت پائی۔ وہ مطالعہ کا بیشتر وقت المامون کے کتب خانے میں گزارتا تھا۔ مامون نے اسے یونانی کتابیں جمع کرنے اور ان کے تراجم کروانے کا کام سپرد کیا تھا۔ تاریخ پر اس کی تصنیف "کتاب التاریخ" اور ریاضیات

Marfat.com

میں اس کی اہم ترین کتاب "حساب الجبر" ہے۔ حساب میں خوارزمی کی ایک اور تصنیف "کتاب الجمع والتفریق" بھی قابلِ ذکر ہے۔ فلکیات میں اس نے "فی زیج" لکھی۔ خوارزمی نے نجوم کے بعض مسائل پر قلم اٹھایا۔ اس نے اس امر کی تحقیق کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت مبارک کے وقت کواکب کے قرانات سے آپ کی آئندہ نبوت کے متعلق کہاں تک پتہ چل سکتا تھا۔ المامون کے ایما پر اس نے افلاک اور کرۂ ارض کے نقشوں کا اٹلس تیار کی۔ خوارزمی نے اسطرلاب کے بارے میں دو کتابیں "کتاب العمل بالاسطرلاب" اور "کتاب عمل الاصطرلاب" بھی مدون کیں مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی مخطوطہ نہیں۔

خواندامیر

(۱۴۷۵ء ـــــ ۱۵۳۵ء) غیاث الدین بن خواجہ ہمام الدین بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ برہان الدین محمد شیرازی' ایرانی مورخ۔ اس کا باپ برسوں سمرقند کے سلطان محمود کا وزیر رہا۔ خواندامیر نے سلطان حسین اور اس کی وفات کے بعد بدیع الزماں کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۵۱۴ء میں وہ گرجستان کے ایک گاؤں بشت میں تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہوگیا۔ مارچ ۱۵۲۸ء میں اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ پہلے بابر اور بعد میں ہمایوں کی ملازمت اختیار کی۔ ہمایوں کی مہم گجرات کے دوران انتقال ہوا اور اپنی وصیت کے مطابق دہلی میں نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کی قبروں کے قریب دفن ہوا۔ خواندامیر کی پہلی تصنیف 'خلاصۃ الاخبار' ہے۔ اس کی گراں قدر تصنیف 'حبیب السیر' ہے۔ یہ عمومی تاریخ ہے اس میں ابتدائے آفرینش سے اسمٰعیل صفوی اول کی وفات (۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء) تک کے حالات درج ہیں۔ کتاب کے سب سے مفید حصے وہ ہیں جو ہرات سلطان حسین بایقرا اور اسمٰعیل اول کی زندگی کے حالات پر لکھے گئے ہیں۔ ضمنی طور پر اس نے شیبانی اور بابر کے بارے میں بھی اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ خواندامیر غیر جانب دار اور صاحبِ اصول مصنف ہے۔

خوجہ آفندی

(۹۴۳ھ ۱۵۳۶ء ـــــ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء) سعد الدین بن حسن جان بن حافظ محمد بن حافظ جمال الدین اصفہانی' مشہور ترکی مورخ اور شیخ الاسلام۔ ان کے والد حسن جان نے سلطان سلیم اول کے عہد کے آخری سات سال میں حاجب کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ خوجہ آفندی نے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور جلد ہی ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے۔ ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء میں مشہور فقیہہ ابوالسعود کے ہاں ملازم ہوئے۔ ۹۸۱ھ/۱۵۷۴ء میں ولی عہد مراد کے اتالیق مقرر ہوئے۔ دسمبر ۱۵۷۴ء میں مراد سوم کی تخت نشینی پر اس کے معتمد مشیر مقرر ہوئے۔ آپ ترکی کی مشہور تاریخ "تاج التواریخ" کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں آل عثمان کی تاریخ اس کی ابتداء سے لے کر سلیم اول کی وفات (ستمبر ۱۵۲۰ء) تک بیان کی گئی ہے۔

خوشحال خاں خٹک

(۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء ـــــ ۲۸ ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ/۱۹ فروری ۱۶۸۹ء) بن شہباز خاں بن یحیٰی خاں بن ملک اکوڑی' پشتو کا عظیم شاعر' سپہ سالار اور پٹھانوں کے مشہور قبیلہ خٹک کا سردار۔ شہنشاہ اکبر نے ملک اکوڑی کو جاگیر دے کر اور منصب دے کر اٹک اور پشاور کے درمیان شاہی سڑک کا محصول وصول کرنے کا اختیار دے رکھا تھا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں یحیٰی خاں اور بعد میں شہباز خاں منصب دار مقرر ہوئے۔ یکم شوال ۱۰۵۰ھ/۴ جنوری ۱۶۴۱ء کو شہباز خاں قبائل کی باہمی جنگ میں مارا گیا۔ خوشحال خاں اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ مارچ ۱۶۴۴ء میں اس نے تارا گڑھ کا قلعہ فتح کیا جس پر اسے چار لاکھ روپیہ نقد اور ڈھائی لاکھ روپے کی جاگیر لاہور میں عطا ہوئی۔ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں اس نے اندراب اور ہندوکش کی حفاظت کی اور ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء میں بلخ و بدخشاں کی فوجی مہم میں شہنشاہ کا ہم رکاب رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شہنشاہ سے خوشحال خاں کے تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ خوشحال خاں مغلوں کا وفادار رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی تمنا یہ بھی تھی کہ پٹھانوں کی خود مختاری پر آنچ نہ آنے پائے۔ وہ پٹھانوں اور مغلوں کے درمیان ثالث کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا تھا یہ بات شہنشاہ اور کابل و پشاور کے حاکموں کے لئے قابلِ قبول نہ تھی۔

۱۶۶۱ء میں سید امیر خاں کابل کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے دربار شاہی سے خوشحال خاں کا منصب اور تمام مراعات منسوخ کرائیں پھر اسے گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ اپریل ۱۶۶۴ء تک وہ دہلی اور قلعہ رنتھنبور میں قید رہا۔ قید سے رہائی پانے کے بعد بھی اس پر بلا ناغہ دربار میں حاضر رہنے کی پابندی تھی۔ ۱۶۶۸ء میں اس کی جلاوطنی ختم ہوئی۔ ۱۶۷۲ء میں درۂ خیبر کے قبائل نے بغاوت کر دی۔ آفریدی سردار اکمل خاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے مغلوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ خوشحال خاں بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ ۲ مارچ ۱۶۷۴ء کو کڑپہ کی لڑائی میں شاہی لشکر کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷ جولائی ۱۶۷۴ء کو خود عالمگیر حسن ابدال پہنچا اور ایک سال تک وہاں مقیم رہا۔ ۱۶۷۵ء میں خوشحال خاں نے نابکش اور بعد ازاں گنبت میں مغل فوج کو شکست دی۔ شاہی دربار کی طرف سے مامور لوگوں نے خوشحال خاں کے خاندان میں نفاق کا بیج بویا اور اس کا بیٹا اشرف خاں اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ دوسرے بیٹے بہرام خاں نے بھی اس کے خلاف جنگ کی۔ آخر پیرانہ سالی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۷۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔ اکوڑہ سے چار میل مغرب میں اسوڑی کے مقام پر پہاڑ کے دامن میں دفن ہوا۔ لوحِ مزار پر اس کا ایک شعر کندہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے: "میں نے افغان قوم کی عزت و ناموس کے لئے تلوار کمر سے باندھ لی ہے میں ہوں زمانے کا غیور و جسور اور کلاہ حیثیت خوشحال خاں خٹک"

خوشحال خاں حنفی المذہب تھا۔ اس نے رجب ۱۰۹۳ھ میں کاکا صاحب سے بیعت کی تھی۔ اس نے پشتو اور فارسی میں پینتالیس ہزار اشعار کہے جن میں غزلیں' قصیدے' رباعیاں' قطعے' مسدس' مخمس' معشر' اور ترکیب بند وغیرہ عروضِ پشتو کے مطابق شامل ہیں۔ اسے بابائے پشتو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اس کے اشعار میں عشق' اخلاق' تصوف اور اجتماعی مسائل کے مضامین ہیں۔ بعض مورخوں نے اس کی کتابوں کی تعداد دو سو بتائی ہے۔ مشہور اور موجود تصانیف حسب ذیل ہیں: (۱) دیوان' اس میں سولہ ہزار اشعار ہیں۔ (۲) بازنامہ۔ پشتو زبان کی اس نثری کتاب میں شکار کا طریقہ اور شہباز کے امراض کا بیان ہے (۳) صحت الابدان' ایک مشہور پشتو نظم جس میں طب اور اصول صحت بیان

Marfat.com

کیے گئے ہیں [illegible] نثر کی ایک کتاب فقہ حنفی پر ہے۔ (۵) آئینۂ فقہ کی ایک عربی [illegible] کا پشتو نثر میں ترجمہ (۶) فضل نامہ، فقہی مسائل پر ایک پشتو مثنوی (۷) سوات نامہ، پشتو کے چار سو اشعار پر مشتمل ایک نظم جس میں سوات کے سفر کے حالات ہیں (۸) فرخ نامہ، پشتو میں شمشیر و قلم کا مناظرہ (۹) فراقنامہ، پشتو نظم میں قید و بند کے حالات (۱۰) دستار نامہ، پشتو نثر میں اخلاق، سیاست اور اجتماعیات پر ایک تالیف (۱۱) بیاض، پشتو نثر میں تاریخی یادداشتیں۔ (۱۲) زنجیری، پشتو نثر میں مختصر نویسی کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ (۱۳) ریاض المحبت۔

خوف، نماز

وہ نماز جو خوف، پریشانی یا مصیبت کے وقت پڑھی جائے۔ حضرت ابوداؤدؓ فرماتے ہیں کہ جب آندھی چلتی تو حضورؐ فوراً مسجد میں تشریف لے جاتے۔ جب سورج یا چاند گرہن ہو جاتا تو آنحضرتؐ فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ حضرت صہیبؓ حضور اقدس صلعم سے نقل کرتے ہیں کہ پہلے انبیاء کا بھی یہی معمول تھا کہ ہر پریشانی کے وقت نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ حضرت نضرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دن میں سخت اندھیرا ہو گیا۔ میں دوڑا ہوا حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ حضورؐ کے زمانے میں کبھی ایسی نوبت آئی ہے؟ انھوں نے فرمایا یا خدا کی پناہ، حضورؐ کے زمانے میں تو ذرا بھی تیز ہوا چلتی تو ہم سب مسجدوں کو دوڑ جاتے تھے کہ کہیں قیامت تو نہیں آگئی۔ عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلعم کے گھر والوں پر کسی قسم کی تنگی پیش آتی تو ان کو نماز پڑھنے کا حکم فرماتے۔ حضرت ابن عباسؓ ایک مرتبہ سفر میں تھے راستہ میں اطلاع ملی کہ بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے۔ اونٹ سے اترے، دو رکعت نماز پڑھی پھر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور پھر فرمایا کہ میں نے وہ کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا۔

آنحضرتؐ نے بحالت خوف یوں نماز پڑھی کہ ایک گروہ کو دو رکعت پڑھائی اور پیچھے چلا گیا پھر دوسرے گروہ کو دو رکعت پڑھائی اس طرح حضور صلعم کی چار اور دیگر لوگوں کی دو رکعتیں ہوئیں (نسائی)۔ سہل بن ابی حثمہ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے بحالت خوف سب کو اپنے پشت پر دو صفوں میں بانٹ دیا۔ پھر قریب تر صف نے آپ کے پیچھے ایک رکعت ادا کی اور حضور صلعم کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے کہ اس صف نے ایک رکعت اور ادا کر لی۔ اس کے بعد یہ لوگ جو اگلی صف میں تھے پیچھے چلے گئے اور پچھلی صف آگے چلی آئی۔ انھیں بھی حضورؐ نے ایک رکعت پڑھائی اور قعدے میں اتنی دیر رہے کہ انھوں نے ایک رکعت اور ادا کر لی۔ اس کے بعد حضورؐ نے سلام پھیرا (مالک، ترمذی، ابو داؤد)۔

خولان

جنوبی عرب کا ایک قبیلہ، جو ایک ہزار سال قبل مسیح میں اس علاقے میں آباد ہوا۔ عرب ماہرین انساب خولان بن عمرو بن مالک بن حارث بن مرہ بن اُدَد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا کو اس قبیلے کا جد امجد قرار دیتے ہیں۔ شعبان ۱۰ھ/ نومبر ۶۳۱ء میں خولان کا وفد رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے قبیلے کے مشرف بہ اسلام ہونے کا اعلان کیا۔ رسول اللہؐ نے انھیں اسلام کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے بت "عم انس" کو توڑ دیں گے۔ ان کی عزت افزائی کے طور پر آپؐ نے ۱۲½ اوقیہ چاندی کا تحفہ دیا۔ نبی کریم صلعم کی رحلت کے بعد ابتدا میں وہ بھی ارتداد کی تحریک میں شریک ہوئے۔ ۱۱ھ/ ۶۳۲ء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یعلیٰ بن منبہ کو کچھ تعزیری فوج دے کر بھیجا اور بنو خولان دوبارہ دائرہ اسلام میں آگئے۔ ۱۴ھ میں یمن کی فتح کے بعد جب اسلام خولان کے علاقوں میں پوری طرح پھیل گیا تو جنوبی عرب کے جن باشندوں نے مصر کی فتح میں حصہ لیا تھا وہ وہیں آباد ہو گئے۔ قبیلۂ خولان اب قبیلۂ بکیل کبریٰ کا ایک جزو ہے۔

خولہ بنت ازور

قرون اولیٰ کی ممتاز سرفروش اور بہادر خاتون، حضرت ضرارؓ کی بہن۔ ۱۹ھ میں جب جنگ اجنادین میں حضرت ضرار رومیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو حضرت خالدؓ بن ولید ان کی رہائی کے لیے ایک فوجی دستہ لے کر روانہ ہوئے۔ خولہ بنت ازور بھائی کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی اتنی سرعت سے روانہ ہوئیں کہ سب سے پہلے رومیوں پر جا حملہ آور ہوئیں۔ بہادری کے کئی حیرت انگیز واقعات آپ سے منسوب ہیں۔

خولہ بنت حکیم

آنحضرت صلعم کی صحابیہ۔ آپ سے کم و بیش پندرہ حدیثیں مروی ہیں۔ آپ کا نکاح حضرت عثمان بن مظعون سے ہوا۔ مدینہ میں ہجرت کی۔ ۲ھ میں حضرت عثمانؓ نے وفات پائی تو خولہؓ نے دوسرا نکاح کیا۔

خون بہا

دیکھیے، دیت

خونجی

(۵۹۰ھ/ ۱۱۹۴ء ـــــ رمضان ۶۴۶ھ/ دسمبر ۱۲۴۹ء) افضل الدین محمد بن ناماور بن عبدالملک۔ شافعی مصری، مشہور عالم دین اور حکیم۔ وہ مدرسۂ صلاحیہ قاہرہ اور دیگر مدرسوں میں درس دیتے رہے۔ عمر کے آخری حصے میں مصر اور اعمال مصر کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ خونجی نے طب اور منطق پر حسب ذیل کتابیں لکھیں، (۱) شرح ما قالہ الرئیس ابن سینا فی النبض (۲) شرح الجمل فی علم المنطق (۶) کتاب کشف الاسرار عن غوامض الافکار فی المنطق (۷) کتاب الموجز فی المنطق۔

خیبر، درہ

پاکستان اور افغانستان کے درمیان شمالی راستہ جو پشاور سے کابل کو جاتا ہے یہ ایک پیچ در پیچ خم کھاتی ہوئی تنگ سی گھاٹی ہے جس کے دونوں جانب ۶۰۰ فٹ سے ۱۰۰۰ فٹ بلند پہاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پشاور سے دس میل کے فاصلے سے شروع ہو کر یہ درہ ۳۳ میل تک مسلسل چلا گیا ہے اور افغانستان میں لوئی ڈکہ کی وادی میں ختم ہو جاتا ہے۔ پشاور سے سات میل مغرب میں قلعۂ جمرود سے تین میل آگے چڑھائی شروع ہو جاتی ہے اور قلعہ علی مسجد تک سطح بتدریج بلند ہوتی گئی ہے۔ ۳۱۷۴ فٹ بلند علی مسجد سے پانچ میل تک پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک تنگ گھاٹی ہے جس کی چوڑائی کہیں بھی دو سو گز سے زیادہ نہیں۔

Marfat.com

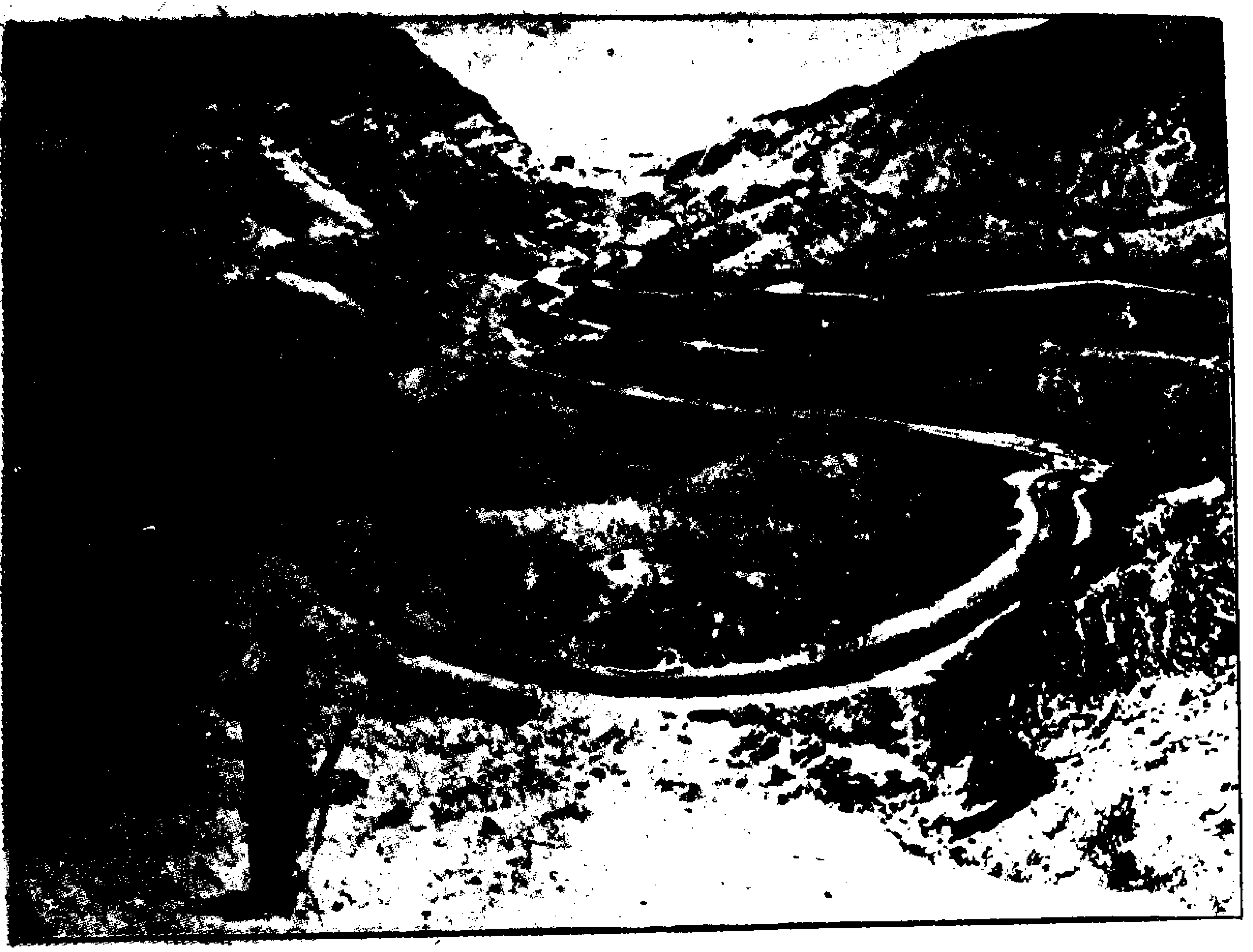

تاریخی درۂ خیبر

موضع زِنتارہ کے قریب واقع قلعہ کی دیواریں کچی اور برج بند ہیں۔ یہاں سے قریباً ایک میل تک وادی چوڑی ہوتی چلی گئی ہے۔ دونوں طرف قلعے، دیہات اور زیرِ کاشت اراضی کے قطعات نظر آتے ہیں۔ علی مسجد سے دس میل کے فاصلے پر ۳۵۱۸ فٹ بلند لنڈی کوتل کا قلعہ اور چھاؤنی ہے۔ یہ درّے کا بلند ترین مقام اور اہم ترین منڈی ہے۔ لنڈی کوتل سے شنواریوں کے علاقے سے گزر کر لنڈی خانہ پہنچتے ہیں جہاں سے ایک اور گھاٹی شروع ہوتی ہے لنڈی کوتل سے چھ میل دور طورخم کے مقام پر یہ درہ افغانستان کو جاتا ہے۔

تاریخی اور عسکری اعتبار سے یہ دنیا کا اہم درّہ ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد اقوام یہاں سے گزر کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایران کے شہنشاہ داریوش اعظم نے کابل فتح کرنے کے بعد درۂ خیبر کے راستے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ دو صدی بعد سکندر اعظم حملہ آور ہوا۔ اسلامی عہد میں ہندوستان پر حملے کے لیئے یہ راستہ کئی بار استعمال ہوا۔ محمود غزنوی اسی درّے سے گزر کر جے پال سے مقابلے کے لئے وادی پشاور میں آیا تھا۔ امیر تیمور ۱۳۹۸ء میں اسی راستے سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ۱۳۹۹ء میں واپسی کے لیئے یہی راستہ استعمال کیا۔ ۱۵۲۵ء میں بابر نے اسی راستے سے ہندوستان پر یلغار کی۔ ہمایوں کابل پر قبضہ کرنے کے بعد اسی درّے سے واپس آیا تھا۔ اکبر اور اس کے جانشین پنجاب سے کابل جانے کیلئے درہ خیبر استعمال کرتے رہے۔ اکبر کے چھوٹے بھائی اور کابل کے حاکم مرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد ۱۵۸۶ء میں راجا مان سنگھ شہنشاہ کی طرف سے کابل پر قبضہ کرنے کے لیئے اسی درّے سے گزرا۔ اس درّے پر عہد مغلیہ ہی سے آفریدیوں کا قبضہ رہا ہے۔ ۱۶۷۲ء میں قبائل نے کابل کے صوبیدار محمد امین خان پر درۂ خیبر میں حملہ کرکے چالیس ہزار فوج تباہ کر دی۔ عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کے علاوہ شاہی خزانے اور ہاتھیوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ نے کابل کے مغل صوبیدار ناصر خاں پر حملہ کرنے کے لیئے درۂ خیبر سے گزرنا چاہا لیکن قبائلیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ مگر نادر خاں نے ناصر خاں پر حملہ کرکے اسے جمرود کے قریب شکست دی۔ پنجاب پر حملہ کرتے وقت احمد شاہ درّانی اور اس کے پوتے شاہ زمان نے بھی کئی بار درۂ خیبر کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا۔ برطانوی حکومت نے پہلی بار درۂ خیبر کو ۱۸۳۹ء میں استعمال کیا جب کرنل کلاڈ ویڈ شہزادہ تیمور کو پشاور کے راستے کابل لے کر گیا۔ ۱۸۷۸ء میں سر نیول چیمبرلین کے سفارتی وفد کو علی مسجد کے قریب روک لیا گیا جس کے نتیجے میں دوسری جنگِ افغانستان چھڑ گئی اور ۱۸۷۹ء میں صلح نامہ گندمک کی رو سے درے کی دیکھ بھال اور قبائلی علاقے کا نظم و نسق برطانوی حکومت کے سپرد ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں آفریدیوں نے دوبارہ درّے پر قبضہ کر لیا۔ انگریزی فوج کئی ماہ کی جدوجہد کے بعد دوبارہ قدم جما سکی۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد درۂ خیبر اور اسکے نواحی علاقے میں بڑی خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ حکومتِ پاکستان نے انگریزی دور کی تمام فوجوں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔ قانون ساز اسمبلیوں میں قبائلیوں کو نمائندگی دی گئی۔

Marfat.com

خیبر، غزوہ

عرب میں یہودیوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز خیبر تھا۔ بنو نضیر مدینہ منورہ سے جلا وطن ہو کر خیبر میں آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہودی قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ قریب ہی بنو غطفان آباد تھے۔ بنو نضیر نے بنو غطفان کو اس شرط پر اپنا شریک بنایا کہ مدینہ کی نصف پیداوار انھیں دی جائیگی۔ یہودیوں کا سردار اسلام بن ابی الحقیق بڑا با اثر تھا۔ اس نے آس پاس کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کر لیا۔ جنگی تیاریوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ انھوں نے مدینہ کے منافقین کو بھی اپنا شریک کار بنا لیا۔ آنحضرت صلعم نے یہودیوں کی جنگی تیاریوں کا حال سن کر محرم ۷ھ میں مدینہ سے خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ مجاہدین کی تعداد بارہ سو سے سولہ سو تک بیان کی جاتی ہے۔ آپؐ نے خیبر اور بنی غطفان کے درمیانی مقام رجیع کو لشکر گاہ کیلئے تجویز فرمایا۔ بنو غطفان نے جب اپنی بستیوں کو خطرے میں دیکھا تو انھیں خیبر کے یہودیوں کی مدد کیلئے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خیبر متعدد چھوٹے چھوٹے قبائلی محلوں پر مشتمل تھا۔ ہر محلہ دوسرے محلے سے کچھ فاصلے پر تھا یہود خیبر سات بڑے اور متعدد چھوٹے قلعوں میں محفوظ تھے جن میں سے بعض میں منجنیقیں نصب تھیں۔ ہر قلعے کو تین تین فصیلوں سے اس طرح گھیرا گیا تھا کہ سوار و پیدل سپاہ ان کے سامنے بے بس تھی۔ یہودی جنگجو سپاہیوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ لشکرِ اسلام نے سب سے پہلے قلعہ ناعم فتح کیا۔ اندرونِ شہر سب سے اہم قلعہ قموص تھا۔ آنحضور نے یکے بعد دیگرے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مامور فرمایا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ آخر میں آپؐ نے حضرت علیؓ کو علم مرحمت فرمایا۔ بیس دن کے محاصرہ کے بعد قلعہ قموص فتح ہوا۔ اسی قلعے میں سے صفیہؓ بنت حیی بن اخطب قید ہوئی جو بعد میں آنحضرت صلعم کی زوجیت میں آئیں۔ فتح قموص کے بعد قلعہ شق، نطارہ اور کتیبہ فتح ہوئے۔ آخر میں دو قلعے وطیح اور سالم دس روز کے محاصرے کے بعد فتح ہوئے۔ اگر یہودیوں کے ساتھ انھی کی توریت کے احکام کے مطابق برتاؤ کیا جاتا تو سارے بالغ مرد قتل اور عورتیں و بچے غلام بنائے جا سکتے تھے مگر نبی کریم صلعم نے رحمدلی اور درگزر سے کام لیا۔ سب کی جان بخشی کی اور فرمایا کہ مال چھوڑ کر جسم کے کپڑوں کے ساتھ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ جب قبضہ مکمل ہو گیا تو آپؐ نے شرائط صلح میں مزید رعایت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہود خیبر ہی میں رہیں اور بٹائی پر کاشت کر کے نصف پیداوار لگان میں دیا کریں۔ آنحضرت صلعم نے نصف علاقہ بحق حکومت محفوظ کر دیا اور باقی فاتحوں میں بانٹ دیا۔ غزوۂ خیبر میں پندرہ مسلمان شہید ہوئے اور ۹۲ یہودی مارے گئے۔

(وفات ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) ترک مؤرخ۔ اس کا باپ عبدالحق آفندی عالم دین اور طبیب تھا۔ عبدالحق تین بار رئیس الاطباء مقرر ہوا۔ ۱۲۶۹ھ میں اسے رئیس العلماء کا خطاب ملا۔ خیراللہ نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ایک فقیہہ کی زندگی اختیار کی۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں وہ سمرنا میں "ملّا" مقرر ہوا۔ ۱۲۶۵ھ میں وہ انجمنِ دانش کا دوسرا صدر مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ بہت سے علمی اداروں اور طب کے مدرسے کا صدر رہا۔ پھر وزارت تعلیم میں اہم عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں اسے سفیر بنا کر ایران بھیجا گیا۔ ایران ہی میں اس کا انتقال ہوا۔ خیراللہ نے تاریخ، جغرافیہ، طب، سائنس اور زراعت سے متعلق متعدد کتب تصنیف کیں۔ اس کی شہرت تاریخ نویسی کی وجہ سے ہے۔ "وقائع مصریہ" کے علاوہ اس نے "دولت عالیۂ عثمانیہ تاریخی" لکھی۔ اس کتاب میں ہر ایک سلطان کے لئے ایک جلد مختص کی گئی ہے ہم عصر مسلمان اور عیسائی حکمرانوں کے حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی کل پندرہ جلدیں شائع ہوئیں جو عثمان اول کے عہد سے احمد اول کے زمانے کے حالات سے متعلق ہیں۔

خیرالدین

سلطان ولی بایزید ثانی کے زمانے (۱۴۸۱ء — ۱۵۱۲ء) کا اہم ترک ماہر فن تعمیر۔ اس کا شاہکار قسطنطنیہ کی مسجد بایزید ہے جو اعلیٰ فنِ تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ خیرالدین کو ترکی فن تعمیر کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ خیرالدین کی بنوائی ہوئی ایک مسجد بھی ہے جس کا نام اس کے نام پر ہے۔ یہ مسجد پارمق قپسو میں واقع وزیر اعظم سنان پاشا کے مقبرے سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ خیرالدین کی قبرستان کے مقبرے کے سامنے ہے۔

خیر الدین باربروسہ

دیکھئے۔ باربروسہ

دابۃ الارض

جانور جو علامات قُرب قیامت میں سے ہے۔ دابہ ایک خاص قسم کا جانور ہے یہ اس وقت ظاہر ہوگا جب انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکل چھوڑ دیں گے اور دنیا کی حالت اس قدر بگڑ چکی ہوگی کہ اس کے بعد اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ حدیث میں دابہ کو قیامت کی دس علامات میں سے ایک کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ اس جانور کو اپنی حجت کے طور پر لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا۔ اس کے خروج کے بعد توبہ کا موقع کسی کو نہیں دیا جائے گا۔ امام ابن کثیر نے اس جانور کے خروج کو اللہ تعالیٰ کی آخری حجت اور قیامت کی علامات میں سے ایک قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب دابۃ الارض ظاہر ہوگا تو وہ لوگوں سے کلام کرے گا جسے سب سنیں گے۔ اس جانور کے خروج کی جگہ کے بارے میں مختلف روایات ہیں کہ وہ تہامہ سے نکلے گا یا طائف میں یا مکے میں صفا و مروہ کے درمیان سے خروج کرے گا۔ ابو داؤد کی روایت کے مطابق یہ جانور تین بار ظاہر ہوگا۔ دو بار تو دور دراز کے علاقوں میں ظاہر ہوگا۔ پہلی بار کے خروج سے اس کا ذکر شہر مکہ تک نہ پہنچ پائے گا۔ دوسری بار اس کا قصہ شہرت پائے گا اور اس کا ذکر مکہ میں بھی پہنچ جائے گا۔ جب لوگ مسجدِ حرام میں ہوں گے تو تیسری بار اچانک دابۃ الارض لوگوں کو دکھائی دے گا۔

داتا گنج بخش

(۴۰۰ھ — ۱۹ صفر ۴۶۵ھ) بلند پایہ صوفی بزرگ۔ نام علی، کنیت ابوالحسن اور عرفیت داتا گنج بخش ہے۔ داتا گنج بخش کی وجہ تسمیہ کے بارے میں عام لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو دربار رسالت سے ہندوستان کی ولایت عطا ہوئی تو حکم ہوا کہ پہلے جا کے سید علی ہجویری کے روضۂ مبارک پر اعتکاف

Marfat.com

کرنا اور ان سے فیض حاصل کر کے راجپوتانہ کے صحرا میں جا کر اسلامی جھنڈا نصب کرنا چنانچہ خواجہ چشتیؒ نے آپ کے روضہ مبارک کے سامنے ایک کوٹھری میں چالیس دن تک اعتکاف کیا۔ چلہ کشی فرمانے کے بعد بوقت رخصت یہ شعر کہا۔

؎ گنج بخش فیض عالم مظہر نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

اسی وقت سے آپ گنج بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔ حقیقت عام لوگوں کے خیال سے کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ حضرت گنج بخش خود اپنی تصنیف "کشف الاسرار" میں فرماتے ہیں کہ "اے علی تجھے خلقت گنج بخش کہتی ہے اور تو ایک دانہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اس بات کا خیال ہرگز دل میں نہ لانا ورنہ محض دعویٰ اور غرور ہو گا۔ گنج بخش تو وہی ذات پاک (اللہ تعالیٰ) ہے اس کے ساتھ شرک نہ کرنا ورنہ تیری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ بے شک وہ اکیلا خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں" اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ کی زندگی میں بھی یہ لقب مشہور تھا۔ خواجہ غریب نوازؒ نے بھی اپنے شعر میں آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہی لقب استعمال کیا ہے۔

آپ کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ سید علی ہجویری بن سید عثمان غزنوی بن سید علی بن عبدالرحمٰن بن سید عبداللہ بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید بن امام حسن بن حضرت علیؓ۔ آپ فقہی اعتبار سے حنفی المذہب تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کا سلسلہ طریقت نو واسطوں سے حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے مخدوم حضرت سید علی ہجویریؒ حضرت شیخ ابوالفضل غزنویؒ کے خلیفہ تھے۔ شیخ ابوالفضلؒ حضرت علی حصریؒ کے مرید تھے۔ حضرت علیؒ حضرت ابوبکر شبلیؒ سے بیعت تھے۔ وہ حضرت جنید بغدادیؒ سے بیعت تھے۔ حضرت بغدادیؒ، خواجہ سری سقطیؒ کے مرید تھے اور خواجہ سقطیؒ خواجہ معروف کرخیؒ سے بیعت تھے۔ خواجہ کرخیؒ نے حضرت داؤد طائیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔ حضرت طائیؒ کے مرشد حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ تھے۔ خواجہ عجمیؒ خواجہ حسن بصریؒ کے مرید تھے اور خواجہ حسن بصریؒ کے مرشد سید علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ تھے۔

دارا شکوہ مؤلف "سفینۃ الاولیا" نے حضرت گنج بخش کا آبائی وطن غزنی بتایا ہے آپ کا خاندان ہجویر میں رہتا تھا۔ ہجویر غزنی سے بہت قریب ہونے کی وجہ سے غزنی کا ایک محلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ کا خاندان جلاب آ گیا۔ جلاب قصبہ غزنی سے ہجویر کی نسبت زیادہ قریب تھا۔ حضرت گنج بخش کے والد ماجد کا نام عثمان جلابیؒ مشہور ہے۔ حضرت ہجویریؒ نے دینی تعلیم اپنے آبائی وطن میں ابوالعلا عبدالرحیم اور ابوالعباس بن احمد سے حاصل کی۔ حضرت شیخ ابوجعفر محمد سے حسین بن منصور حلاج کی تصانیف پڑھیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ روحانی تجربات اور تزکیہ نفس کی خاطر سیر و سیاحت میں گزارا۔ دوران سیاحت بغداد، طبرستان، خراسان، کرمان، ماوراءالنہر، شام، عراق اور ترکی تشریف لے گئے۔ دوران سیاحت آپ نے اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے فیض حاصل کیا۔ ایک روز حضرت داتاؒ کے مرشد ابوالفضل غزنویؒ نے آپ کو حکم دیا کہ رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کرنے کی خاطر لاہور چلے جائیں۔ آپ نے تعمیل فرمائی اور اپنے دو پیر بھائیوں حضرت ابوسعیدؒ اور سید لطفیؒ کے ہمراہ لاہور شہر کے شمالی جانب دریائے راوی کے نزدیک شب بسری کے لیے ٹھہرے اگلے روز شہر میں داخل ہوئے اور اسی طرف چل دیئے جہاں آپ کا روضہ مبارک ہے۔ دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیا" میں لکھا ہے کہ آپ نے اپنی خانقاہ میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی۔ بعض علمائے لاہور کو مسجد کی سمتِ کعبہ پر اعتراض ہوا۔ آپ نے ایک شام معترضین کو دعوت پر بلایا۔ نماز کی امامت کے فرائض انجام دینے کے بعد آپ نے ان سے فرمایا کہ آپ کو اس مسجد کی سمت کعبہ پر اعتراض ہے ذرا نظر اٹھا کر [illegible] ہے کہ نہیں۔ چنانچہ سب نے بچشم خود کعبہ کو سامنے پایا اور حضرت ہجویری کے کمالات کے قائل ہو گئے۔

کشف المحجوب میں آپ لکھتے ہیں کہ ایک بار میں عراق میں دنیا کو حاصل کرنے اور اسے لٹا دینے میں بری طرح مشغول تھا اور بہت قرضدار ہو گیا تھا۔ جس کسی کو بھی کسی چیز کی آرزو ہوتی میری طرف رجوع کرتا اور میں اس فکر میں رہتا کہ سب کی آرزو کیسے پوری کروں اندریں حالات ایک بزرگ نے مجھے لکھا کہ اے فرزند اگر ممکن ہو تو دوسروں کی حاجت ضرور پوری کرو مگر سب کے لیے اپنا دل پریشان بھی نہ کیا کرو۔ کیونکہ رب العالمین ہی حقیقی حاجت روا ہے اور اپنے بندوں کے لیے کافی ہے حضرت شیخ ابوالعباسؒ سے شرفِ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ وہ ضرب اللہ پڑھ رہے ہیں اور ان پر رقت طاری ہے پھر انھوں نے اس زور سے نعرہ لگایا جس سے مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ وہ وفات پا جائیں گے۔ میں نے پوچھا یا شیخ یہ کیا کیفیت ہے؟ شیخ نے فرمایا آج گیارہ سال ہو گئے ہیں اور اسی مقام پر ہوں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ کشف المحجوب سے ماخوذ ہے کہ آپ نے تین ماہ تک حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزار مبارک پر اعتکاف کیا۔

آپ نے کشف المحجوب، کشف الاسرار، منہاج الدین اور دیوان علی تصنیف فرمائے جن میں سے کشف المحجوب اور کشف الاسرار دستیاب ہیں۔

دارا شکوہ

(۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء — ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء) شاہجہان اور ممتاز محل کا سب سے بڑا بیٹا۔ ۱۶۳۳ء میں اس کی ولی عہدی کا اعلان ہوا۔ حصار کی سرکار تفویض ہوئی اور فیروزہ کی جاگیر بھی ملی جسے ولی عہد کا تعلقہ تصور کیا جاتا تھا۔ ۱۶۴۵ء میں اسے الٰہ آباد کی صوبیداری عطا ہوئی۔ ۱۶۴۷ء میں پنجاب کا، ۱۶۴۹ء میں گجرات کا اور ۱۶۵۲ء میں ملتان اور بہار کا صوبیدار مقرر ہوا۔ صوبوں کی حکومت اس کے نائبوں کے سپرد تھی اور خود وہ دربار سے وابستہ تھا۔ ۱۶۴۸ء تک دارا شکوہ کو "تیس ہزار" ذات" اور "دس ہزار سوار" کا منصب مل چکا تھا۔ یہ وہی بلند ترین منصب تھا جو تخت نشینی سے پہلے شاہجہان کو ملا تھا۔ ایرانیوں نے ۱۶۴۹ء میں قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسے واپس لینے کی دو کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ ۱۶۵۳ء میں دارا نے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ قندھار فتح نہ ہو سکا اور دارا کو اس ناکامی سے بحیثیت ایک سیاسی اور فوجی رہنما کے نقصان پہنچا۔ ۱۶۵۷ء میں دارا کو ساٹھ ہزاری اور چالیس ہزاری کا اعلیٰ منصب عطا ہوا۔ اسی زمانے میں شاہجہان بیمار ہوا۔ شہزادوں میں تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ آگرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ساموگڑھ میں ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء کو دارا اور اورنگ زیب میں فیصلہ کن جنگ ہوئی جو دارا کے لیے تخت و تاج سے محرومی کا پیغام لائی۔ ۲۳ مارچ ۱۶۵۹ء کو اجمیر کے قریب دیورائی کے مقام پر آخری مرتبہ دارا نے قسمت آزمائی کرنا چاہی لیکن یہاں بھی اسے شکست ہوئی۔ دارا نے شاہ عباس دوم سے ایران آنے کی اجازت مانگی۔ شاہ ایران نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ حکام اور والیوں کے نام فرمان جاری کیا کہ جہاں جہاں شہزادہ پہنچے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا جائے۔ دارا نے ایران جانے کے لیے قندھار کا رخ کیا۔ راستے میں ڈھاڈر (سبی سے سترہ میل اور کوئٹہ سے ۸۵ میل) کے افغان سردار ملک جیون کے ہاں ٹھہرا۔ ملک جیون نے حکومت

Marfat.com

وقت سے وفاداری کرتے ہوئے دارا کو گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ دارا پر الحاد و بے دینی کے الزام میں مقدمہ چلا اور علماء کے فتوے سے اسے قتل کر دیا گیا۔ مقبرہ ہمایوں کے احاطے میں دفن ہوا۔ دارا ہندو فلسفے کے زیر اثر تھا۔ اس کے مسلمان صوفیا اور ہندو سنیاسیوں سے گہرے تعلقات تھے۔ دارا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف باہم مخالف نہیں۔ اس کے ذریعے حق کا ادراک کرنا چاہیئے۔ اپنشدوں کے ترجمے میں (جسے وہ وحدت کا سرچشمہ بیان کرتا ہے) دارا نے اسلام اور ہندومت کے پیروؤں کے مشترکہ نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ہندو فلسفے اور صنمیات سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ متعدد ملحدانہ نظریات کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ ذیل کی تصانیف دارا شکوہ کی یادگار ہیں۔ (۱) سفینۃ الاولیاء (۲) سکینۃ الاولیاء (۳) رسالہ حق نما (۴) حسنات العارفین' اس میں مختلف سلسلوں کے اولیاء کے اقوال درج ہیں (۵) مکالمہ بابالال و دارا شکوہ (۶) مجمع البحرین' ویدانت اور تصوف کی مصطلحات کا تقابلی مطالعہ (۷) سرِ اکبر' پچاس اپنشدوں کا ترجمہ۔

دار الاسلام

اسلام کا گھر۔ فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام سے مراد ایک ایسی ریاست یا ملک ہے جس کا سربراہ مسلمان ہو' جہاں اسلامی شریعت کے احکام عمل طور پر نافذ ہوں اور جہاں کی رعایا مسلمانوں اور اہل کتاب غیر مسلموں پر مشتمل ہو۔ لوگ بت پرست اور مشرک نہ ہوں۔ دارالاسلام کی غیر مسلم رعایا نے اگر برضا و رغبت اسلامی ریاست کی تشکیل میں حصہ لیا ہو اور دارالاسلام کے دفاع کے لئے اپنے مسلمان ہم وطنوں کے ساتھ بقائے باہمی کے اصول پر زندگی بسر کرنے کا عہد و پیمان کیا ہو تو شہریت میں ان کے حقوق و فرائض مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو اور غیر مسلم شوکت اسلام اور مسلمانوں کی عدل گستری سے متاثر ہو کر یا مفتوح قوم کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی رعایا ہونا قبول کریں تو انھیں ذمّی کہا جائے گا' ذمیوں اور عامۃ المسلمین کے حقوق و فرائض میں بجز اس کے کچھ فرق نہ ہوگا کہ ذمی شہریوں کے جان و مال کی حفاظت اسلامی ریاست کا فرض ہوگا۔ ذمّی اسلامی ریاست کے دفاع کے فریضے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ذمیوں کا فرض ہوگا کہ وہ جزیہ کے ذریعے دارالاسلام کی معاونت کریں۔ بنیادی شہری حقوق میں ذمیوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

دارالاسلام کے برحق قانونی سربراہ کے خلاف اگر کوئی فرد یا گروہ خروج کرے یا بغاوت کرے تو اسے اطاعت کی دعوت دی جائے گی اور انکار کی صورت میں ان سے قتال واجب ہے جس میں شریک ہونا جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض ہے۔ دارالاسلام کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انجام دے۔ اگر مسلمانوں پر ظلم ہو یا دارالاسلام پر مشرکین اور کفار حملہ آور ہوں تو امام وقت (سربراہ ریاست) جہاد کا اعلان کرے گا۔ اگر صلح پر آمادہ ہوں تو صلح کا حکمت اگر صلح پر آمادہ نہ ہوں تو سرکوبی کرنا ضروری ہے۔ اگر داخلی طور پر دارالاسلام کو کوئی خطرہ ہو تو اس وقت بھی جہاد فرض ہے مثلاً کوئی گروہ مرکزی حکومت کو چیلنج کرتے ہوئے فرائض اسلام یا بیت المال کے واجبات ادا کرنے سے انکار کرے۔

دار الحدیث

حدیث شریف پڑھانے کے مخصوص ادارے۔ جب تک حدیث کی تعلیم کیلئے مخصوص ادارے وجود میں نہ آئے تھے' حدیث کی تعلیم مسجدوں میں ہوا کرتی تھی۔ امام مالکؒ مسجد نبوی میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں بصرہ آئے اور ایک مسجد میں درس حدیث دینا شروع کیا۔ قاہرہ میں امام شافعی کا ایک شاگرد تیسری صدی ہجری میں مسجد ابن طولون میں حدیث کا درس دیا کرتا تھا۔ جب مخصوص اداروں کی بنیاد پڑ گئی تو لوگ مسجدوں اور استادوں کے ذاتی مکانات کی بجائے دار الحدیث کی طرف کھنچنے لگے۔ پہلا ادارہ جو خاص طور پر دار الحدیث کہلایا' اس کی بنیاد اتابک نور الدین (وفات ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۴ء) نے رکھی وہ خود حنفی تھا لیکن اس نے اس مدرسے کو شافعیوں کے لیئے مخصوص کر دیا۔ مورخ و محدث عبداللہ بن عساکر (وفات ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۶ء) دار الحدیث کے صدر مقرر ہوئے۔ اس پہلے دار الحدیث کے کھل جانے سے اسی قسم کے متعدد ادارے قائم ہوگئے جن کے ساتھ مشہور مورخین اور محدثین وابستہ تھے۔ پہلے پہل یہ زیادہ تر دمشق اور اس کے نواح میں کھلے اور بہت جلد تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئے۔

دار الحرب

فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں دشمنانِ اسلام کا وہ علاقہ یا ملک جس کے باشندے دعوتِ اسلام کو مسترد کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرکشی اور عداوت کا اظہار کریں اور جہاں مسلمانوں اور ذمیوں کی عبادت گاہیں محفوظ نہ ہوں دارالاسلام کا کوئی علاقہ کفار کے قبضے میں چلا جائے تو وہ بھی دار الحرب بن جاتا ہے بشرطیکہ وہاں اسلامی شریعت کے بجائے کافرانہ قوانین نافذ ہو جائیں۔ بعض علماء اسلام کی عملداری سے نکل جانے والے علاقے کو اس وقت تک دار الحرب کہنے میں احتیاط برتتے ہیں جب تک اس میں اسلام کا ایک حکم بھی نافذ رہے۔ شرک و عناد کی سرزمین دار الحرب قرار پاتی ہے۔ کفار کی سرزمین اس وقت تک دار الحرب نہیں بنتی جب تک لوگ دعوتِ اسلام کو مسترد کر کے دارالاسلام کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہوں۔ امام ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ دار الحرب پر بلا وجہ حملہ جائز نہیں۔ پہلے دعوت اسلام واجب ہے اور مسترد ہو جانے پر جہاد فرض ہوگا۔ اگر دار الحرب' دارالاسلام پر حملہ آور ہو تو اس وقت دعوت اسلام کی شرط کے بغیر جہاد فرض ہوگا۔ بلاد اہل حرب پر اگر لشکر اسلام بزورِ شمشیر قبضہ کر لے تو ان پر جزیہ عاید کیا جائے گا۔ ذمیوں میں سے کوئی شخص بھاگ کر دار الحرب چلا جائے تو وہ حربی قرار پائے گا اور گرفتاری کی صورت میں اسے قتل یا غلامی کی سزا دی جاسکے گی۔ اگر دار الحرب کا کوئی باشندہ مسلمان ہو جائے تو دار الحرب کے فتح ہونے پر اس کی جائداد مالِ غنیمت میں شامل نہیں ہو گی۔ دار الحرب کے کسی باشندے کو عموماً تین ماہ سے زائد دارالاسلام میں قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی اگر وہ اس سے زائد عرصہ دارالاسلام میں قیام کرنا چاہے تو ذمّی کی حیثیت سے رہے گا اور جزیہ ادا کرے گا۔ دار الحرب کے خلاف میدانِ قتال میں مسلمان پر شرعی حد قائم نہیں کی جاسکتی۔

دار الصلح

فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں وہ علاقہ یا ملک جس کے باشندے

Marfat.com

دارالاسلام کے امام (سربراہ ریاست) یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر صلح کر لیں۔ جب تک دارالصلح کے باشندے مقررہ شرائط کی پابندی کرتے رہیں ان سے کسی قسم کا تعرض جائز نہیں۔ اگر وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کریں یا دارالاسلام کے خلاف دارالحرب سے تعاون کریں تو اس صورت میں وہ ملک دارالصلح نہیں رہے گا بلکہ دارالحرب بن جائے گا اور اس کے ساتھ ہی معاہدۂ صلح ختم ہو جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ اور بعد کے حنفی فقہا دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان دارالصلح کو مستقل طور پر تسلیم نہیں کرتے لیکن امام شافعیؒ اسے تسلیم کرتے ہیں۔

دارقطنی

(۳۰۶ھ/ ۹۱۸ء ــــ ۸ ذیقعدہ ۳۸۵ھ/ ۴ دسمبر ۹۹۵ء) ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی، ایک نامور محدث جنہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کا لقب دیا گیا۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ مشاہیر محدثین سے تعلیم حدیث کی تحصیل کے لیے بصرہ، کوفہ، واسط، مصر اور شام کا سفر کیا۔ دارقطنی نے ادبیات کا بھی مطالعہ کیا۔ دیوان حمیری انھیں ازبر تھا اسی وجہ سے ان پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ وہ شیعیت کی طرف مائل تھے۔ دارقطنی نے احادیث کے تنقیدی مطالعے کو آگے بڑھانے میں بہت حصہ لیا۔ ان کی بیشتر تصانیف علم الحدیث سے متعلق ہیں: (۱) السنن اس کتاب میں مختلف اسناد اور اختلاف روایات کے ساتھ احادیث ابواب کی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں اور دوسری صحاح یا "جوامع" کے خلاف اس میں فقط وہ حدیثیں دی گئی ہیں جن کا تعلق فقہ سے ہے۔ (۲) کتاب علل الحدیث (۳) الالزامات علی الصحیحین قابل وثوق احادیث کا مجموعہ جو بخاری و مسلم کے شروط کے مطابق ہیں لیکن ان کتابوں میں درج نہیں۔ (۴) الاستدراکات والتتبع، بخاری اور مسلم کی ایسی دو سو حدیثوں کی فہرست جو دارقطنی کے نزدیک ضعیف ہیں۔ (۵) کتاب الاربعین (۶) کتاب الافراد (۷) کتاب الامالی (۸) کتاب المستجاد (۹) کتاب التردیا۔ (۱۰) کتاب التصحیف، اغلاط کتب حدیث پر (۱۱) کتاب المدبج، ان احادیث پر جو ہمعصر محدثوں نے ایک دوسرے سے لیں (۱۲) غریب الحدیث (۱۳) کتاب المختلف والموتلف فی اسماء الرجال (۱۴) کتاب الضعفاء (۱۵) کتاب القراءات، اس میں قراءت قرآن کے اصول بیان کیے گئے ہیں (۱۶) کتاب الاسخیاء والاجواد۔ ایک ادبی کتاب

دارمی

(۱۸۱ھ/ ۷۹۷ء ــــ ۲۵۵ھ/ ۸۶۹ء) ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد تمیمی سمرقندی، ایک نامور محدث۔ انھوں نے احادیث کی تلاش میں عراق، شام اور مصر کے مستند علماء سے ملاقاتیں کیں۔ مسلم بن حجاج اور ابوعیسیٰ ترمذی نے دارمی کی سند پر احادیث روایت کیں۔ وہ علم حدیث، ثقاہت، صداقت اور اصابت رائے کی وجہ سے مشہور تھے۔ دارمی کا مجموعہ احادیث "المسند" یا "سنن الدارمی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تالیف کو صحاح ستہ کے برابر مقام نہیں دیا گیا۔ ابن حجر عسقلانی اسے ابن ماجہ کی سنن سے افضل قرار دیتے ہیں۔ دارمی کو تفسیر قرآن لکھنے کا امتیاز بھی حاصل ہوا۔

داغ، نواب میرزا خاں

(۲۵ مئی ۱۸۳۱ء ــــ ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء) عہد جدید کے ممتاز اردو شاعر۔ ان کے والد نواب شمس الدین خان والی فیروز پور جھرکا کو مسٹر ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کے قتل میں شرکت کے الزام میں ۱۸۳۵ء میں پھانسی دے دی گئی تو داغ کی پرورش کی ذمہ داری انکی خالہ عمدہ خانم نے سنبھالی۔ ۱۸۴۰ء میں وہ اپنی خالہ کے ہمراہ رام پور چلے گئے۔ رام پور میں مولوی غیاث الدین، مؤلف "غیاث اللغات" سے فارسی پڑھی۔ ۱۸۴۴ء میں داغ کی والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے اور ولیعہد میرزا محمد سلطان فخر الملک (میرزا فخرو) سے نکاح کر لیا۔ داغ قلعۂ دہلی میں چلے گئے اور وہیں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ سید محمد میر پنجہ کش اور مرزا اعباداللہ بیگ سے خوشنویسی سیکھی۔ شہسواری مختلف ہتھیاروں کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کی۔ اوائل عمر ہی میں غزلیں کہنے لگے۔ ذوق سے تلمذ کا سلسلہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۴ء تک جاری رہا۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کی وفات کے بعد قلعۂ دہلی چھوڑنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد رام پور آگئے۔ نواب یوسف علی خاں کے مہمان ہوئے۔ نواب یوسف کی وفات کے بعد کلب علی خاں والی رام پور ہوئے تو ان کی ملازمت اختیار کر لی۔ مارچ ۱۸۸۷ء میں کلب علی خاں فوت ہوئے تو داغ ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ دسمبر ۱۸۸۷ء میں رام پور سے دہلی چلے آئے۔ اپریل ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد دکن پہنچے۔ ۷ فروری ۱۸۹۱ء کو نظام محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے اور ۴۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ ۱۸۹۴ء میں بڑھا کر ایک ہزار روپے کر دی گئی۔ ۱۸۹۴ء میں نظام کی طرف سے انھیں بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ کے خطابات ملے۔ بعارضۂ فالج وفات پائی اور عید کے دن حیدر آباد میں دفن ہوئے۔

داغ نے پانچ دیوان مرتب کیے۔ پہلا دیوان ضائع ہو گیا۔ دوسرے دیوانوں میں گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ شامل ہیں۔ داغ نے ایک دیوان محاورات (ایک ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل) بھی مرتب کیا تھا جسے ان کے اعزہ نے آصف جاہ ششم کی نذر کر دیا۔ نثری تصنیفات میں انشائے داغ (مکتوبات)، فرمان داغ (ذاتی خطوط)، بزم داغ (روزنامچہ) شامل ہیں۔ داغ کلام کی روانی و بے ساختگی اور اسلوب کی سادگی و نفاست کے لئے مشہور ہیں۔ زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ داغ نے غزل کو بنیادی طور پر اظہار جذبات کا ذریعہ بنا دیا۔ عشقیہ شاعری میں ان کا نصب العین عامیانہ اور مبتذل تھا۔ ان کی شاعری زیادہ تر ان کے زمانے کے فرسودہ معاشرے کے عام رجحانات کی آئینہ دار ہے۔

دانی، ابوعمرو عثمان

(۳۷۱ھ/ ۹۸۲ء ــــ ۴۴۴ھ/ ۱۰۵۳ء) بن سعید بن عمر الاموی، مالکی فقیہہ اور قاری قرآن۔ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ۳۹۷ھ سے ۳۹۹ھ تک کا زمانہ قاہرہ میں گزارا اس کے بعد قرطبہ، المریہ اور بعد میں دانیہ گئے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ ان کی ۱۲۰ تصانیف میں سے صرف دس دستیاب ہیں۔ ان میں دو مسائل نحویہ سے بحث کرتی ہیں اور باقی قراءت کے فن سے تعلق رکھتی ہیں۔ زیادہ مشہور تصانیف یہ ہیں (۱) کتاب المقنع فی معرفۃ رسم مصاحف الامصار (۲) التیسیر فی القراءات السبع، ابن خلدون کے بیان کے مطابق اس کتاب کا کثرت سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ (۳) المحکم فی نقط المصاحف۔

دانیال[ع]

... کی روایت کے مطابق حضرت دانیالؑ اسلہ چار کبار انبیاء میں شمار

Marfat.com

رہتے ہیں۔ صحیفہ دانیال "عہدنامہ قدیم" کے بعد صحیفوں میں شامل ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں ان کا بالصراحت ذکر نہیں آیا۔ بقول بلاذری (فتوح البلدان) حضرت ابوموسیٰ اشعری کو فتح سوس کے بعد قلعے سے دانیال نبی کی نعش ملی۔ انھوں نے حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے حکم سے دریا کا پانی بند کر کے وسط دریا میں نئے کفن میں دفن کر دیا اور پھر پانی جاری کر دیا۔ بلاذری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بخت نصر حضرت دانیالؑ کو قید کر کے بابل لے آیا تھا اور وہ وہیں فوت ہوئے۔ اہل سوس کے ہاں قحط پڑا تو انھوں نے اہل بابل سے حضرت دانیالؑ کی نعش عاریتاً مانگ لی تاکہ ان کے ذریعے بارش حاصل کر سکیں۔ اس طرح ان کی نعش سوس والوں کے پاس پہنچ گئی۔

دانیال مرزا سلطان

(۲۲ ستمبر ۱۵۷۲ء — ۲۸ اپریل ۱۶۰۵ء) مغل شہزادہ شہنشاہ اکبر کا تیسرا بیٹا۔ شہزادہ سلطان مراد کی وفات کے بعد اسے ۱۵۹۹ء میں دکن کا فوجی صوبیدار مقرر کیا گیا۔ ۱۶۰۰ء میں اس نے احمد نگر فتح کیا۔ فتح کی خوشی میں اکبر نے اسے خاندیش کا صوبہ عطا کیا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسے ہفت ہزاری دکھایا ہے۔ دانیال نے کثرت شراب نوشی کے باعث برہان پور میں وفات پائی۔

داؤد ۲

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر، جو بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے۔ آپؑ کا سلسلۂ نسب گیارہ پشتوں سے حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے۔ آپؑ کا ذکر قرآن مجید کی نو سورتوں میں سولہ مقامات پر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو ان کا مسخر بنا دیا تھا جو صبح شام ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے تھے (سبا: ۱۰؛ ص: ۱۷—۱۹)۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولیوں کی تعلیم اور فہم عطا کیا (النمل: ۱۷)۔ اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے لیے موم کی طرح نرم کر دیا تھا اور وہ اسے جس طرح چاہتے موڑ لیتے تھے (سبا: ۱۰)۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں زرہ سازی کا فن عطا کیا جس سے وہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے۔ (الانبیاء: ۸۰، سبا: ۱۰)، ہم نے انھیں ایسا لباس تیار کرنے کا فن سکھایا جو تمھیں شدتِ جنگ کے وقت محفوظ رکھتا ہے (الانبیاء: ۸۰، الکشاف ۱۲۸)۔ ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور انھیں خلافتِ ارضی عطا کر کے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا (ص: ۲۵)۔ خدا نے انھیں منصب نبوت، خطابت کی فصاحت اور صحیح فیصلے کی قوت بخشی تھی (ص: ۱۹)۔ اللہ تعالیٰ نے "زبور" حضرت داؤدؑ پر نازل فرمائی تھی (النساء: ۱۶۳، بنی اسرائیل ۵۴)۔ زہد و عبادت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں انہماک بخشا تھا۔ چنانچہ وہ نصف شب تک آرام کرتے اور تہائی شب عبادت میں گزارتے۔ ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے تھے۔

قرآن مجید میں حضرت داؤدؑ کی زندگی کا ایک واقعہ یوں مذکور کیا ہے کہ ایک روز حضرت داؤدؑ فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں تشریف فرما تھے۔ آپؑ کے فرزند حضرت سلیمانؑ بھی آپؑ کے پاس موجود تھے۔ مقدمہ درپیش تھا کہ کسی ریوڑ والے کی بھیڑوں نے رات کو کسی کی پکی ہوئی فصل کھا لی۔ حضرت داؤدؑ نے فیصلہ دیا کہ کھیت والے کو بھیڑیں بطور تاوان دے دی جائیں۔ گیارہ سالہ حضرت سلیمانؑ نے مشورہ دیا کہ فیصلے میں دونوں فریقوں کا خیال رکھیے۔ حضرت داؤدؑ نے فرمایا کہ تم فیصلہ دو۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ بھیڑیں کھیت والے کو دے دی جائیں وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور کھیت بھیڑوں والے کو دیا جائے جو اس پر محنت کر کے اس حالت پر لے آئے جو کھیت برباد ہونے کے وقت تھی۔ حضرت داؤدؑ نے اس فیصلے سے اتفاق فرمایا۔

داؤد بن علی

(۸۱۸ء؟ — ۸۸۴ء) بن خلف اصفہانی، فرقۂ ظاہریہ (داؤدیہ) کے امام فقہ۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ قرآن حکیم اور حدیث کے صرف ظاہری یا لغوی معنی لینے چاہئیں۔ داؤد نے اجماع کے تصور کو بھی صحابہؓ تک محدود کر دیا۔ صرف ایک امام کی تقلید کو رد کر دیا۔ آپ کوفے میں پیدا ہوئے۔ بصرہ، بغداد اور نیشاپور کے مشہور اساتذہ سے حدیث پڑھی اور اس کے بعد بغداد میں سکونت اختیار کر لی۔ بغداد میں مفتی اور معلم کی حیثیت سے ان کی بڑی قدر کی جانے لگی۔ آپ کے والد حنفی تھے لیکن داؤد کو امام شافعیؒ کا "متعصب" مقلد بیان کیا جاتا ہے۔

داؤد پاشا

ترکی کی تاریخ میں اس نام کی تین نامور شخصیتیں گزری ہیں جن میں سے ایک مملوک حکمران اور دو عثمانی وزرائے اعظم تھے۔

(۱) ترکی کا آخری مملوک حکمران (۱۷۶۷ء — ۱۸۵۱ء)۔ داؤد پاشا نے ۱۸۱۷ء سے ۱۸۳۱ء تک حکومت کی۔ اس نے مضبوط قبائلی حکمت عملی اختیار کی۔ فتنہ پرور یزیدیوں کی گوشمالی کی۔ ۱۸۲۳ء میں خطرناک ایرانی حملے کو روکنے کی تدبیر کی۔ تجارت میں یورپ کے طریقوں کو نمایاں طور پر ابھرنے دیا۔ اس کا زوال حکام استنبول کی پیہم حکم عدولی کی بنا پر ہوا۔ ۱۸۴۵ء میں اسے مدینہ منورہ میں روضۃ المبارک کا محافظ مقرر کیا گیا۔

(۲) عثمانی وزیر اعظم (وفات ۹۰۴ھ/۱۴۹۸ء) بایزید دوم کی تخت نشینی کے بعد وزیر مقرر ہوا۔ ۱۴۸۲ء میں صدر اعظم اسحٰق پاشا کا جانشین ہوا۔ پندرہ برس تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۱۴۸۷ء میں اس نے مملوکوں کے خلاف فوجی کارروائیوں میں ادانہ اور ترسوس پر قبضہ کیا۔ ۱۴۹۲ء میں البانیہ کی فوجوں کو شکست دی۔ ۸ مارچ ۱۴۹۷ء کو اسے برطرف کر دیا گیا۔ معزولی کی وجہ یہ تھی کہ محمد دوم کے پوتے آق قویونلو گودہ احمد بے کے تبریز کی طرف فرار کو پاشا کی غفلت پر محمول کیا گیا۔ وہ ایک قابل، راست باز مدبر اور علم کا مربی تھا۔ وہ اپنے وقت کے متمول ترین مدبروں میں سے تھا۔

(۳) عثمانی وزیر اعظم (وفات ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳ء)۔ اس کی شادی سلطان مصطفیٰ کی سگی بہن سے ہوئی۔ مصطفیٰ اول کی والدہ کی کوششوں سے ۲۰ مئی ۱۶۲۲ء کو وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اس نے معزول شدہ سلطان عثمان دوم کو فوراً قتل کرا دیا۔ ۱۳ جون ۱۶۲۲ء کو داؤد پاشا کو وزارت سے برطرف کر دیا گیا۔ باب عالی میں سیاسی دھڑوں کی مناقشت کی وجہ سے داؤد پاشا کو موت کی سزا دی گئی اور وہ استنبول کی مسجد مراد پاشا میں دفن ہوا۔

Marfat.com

داؤد پوترے

ریاست بہاولپور کا حکمران خانوادہ۔ داؤد پوترے اور کلہوڑے دونوں اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ ابوالفضل العباس بن عبدالمطلب کی نسل سے ہیں۔ کلہوڑوں اور داؤد پوتروں کا مشترک جدِ امجد محمد چنے خاں خیال کیا جاتا ہے۔ چنے کے بعد اس کے بیٹے محمد مہدی اور داؤد خاں قبیلے کے سردار بنے۔ محمد مہدی کی اولاد، اس کے بیٹے ابراہیم عرف کلہوڑے خاں کے نام پر کلہوڑا کہلانے لگی۔ داؤد خاں کے بعد محمود خاں اور پوتا محمد خاں سردار بنے۔ محمد خاں کے بیٹے داؤد خاں ثانی کی سرداری کے زمانے میں ان کی اولاد اور متعلقین داؤد پوترے کہلانے لگے۔ داؤد خاں ثانی کے جانشین آٹھ سردار ہوئے جن میں سے بہادر خاں ثانی قابلِ ذکر ہے۔ اس نے ۱۶۱۷ء میں شکارپور شہر کی بنیاد رکھی۔ داؤد پوترا سردار مبارک خاں اول ۱۷۲۳ء میں اپنے بیٹے صادق محمد خاں عباسی اول کے حق میں تخت سے دستبردار ہوگیا۔ ۱۷۲۶ء میں مبارک خاں اول کا انتقال ہوا۔ صادق محمد خاں نے اُچ، مغل صوبہ ملتان کا ایک حصہ اور قلعہ ڈیراور کا الحاق کیا۔ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر حملہ کیا تو صادق محمد خاں اول ڈیرہ غازی خاں جاکر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور نواب کا خطاب حاصل کیا۔ مفتوحہ علاقوں کے علاوہ اسے سیوستان اور لاڑکانہ کے پرگنے عطا کیے گئے۔ ۱۷۴۶ء میں کلہوڑا سردار خدا یار خاں نے شکارپور پر حملہ کیا۔ صادق محمد خاں جنگ میں مارا گیا۔ محمد بہاول خاں اول اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۱۷۴۸ء میں بہاولپور سمیت کئی شہروں کی بنیاد رکھی۔ بالآخر اس نام سے پوری ریاست موسوم ہوئی۔

۱۷۴۹ء میں بہاول خاں اول کی وفات پر محمد مبارک خاں ثانی تخت نشین ہوا۔ ۱۷۵۱ء میں درانی افواج نے اُچ اور بہاولپور پر حملہ کیا جس میں اسے شکست ہوئی۔ ۱۷۶۱ء میں سندھ کے حکمران شاہ کلہوڑا نے بہاولپور پر حملہ کر دیا۔ غلام شاہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے باغی بھائی عطر خاں کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۷۷۲ء میں محمد مبارک خاں ثانی کے انتقال پر اس کا بھتیجا محمد جعفر خاں اس کا جانشین ہوا اور بہاول خاں ثانی کا لقب اختیار کیا۔ ۱۷۷۷ء میں ملتان سکھوں نے چھین لیا۔ ۱۷۸۰ء میں بہاول خاں ثانی کو شہنشاہ دہلی شاہ عالم ثانی نے رکن الدولہ، نصرت جنگ اور حافظ الملک کے خطابات عطا کیے۔ ۱۷۸۶ء میں تیمور شاہ درانی نے شہر بہاولپور پر قبضہ کرکے اسے جلا دیا۔ درانی والیٔ ریاست کے بیٹے شہزادہ مبارک خاں عباسی کو یرغمال کے طور پر ساتھ لے گیا۔ بعد میں بہاول خاں ثانی کو عملاً معزول کرکے مبارک خاں کو حکمران بنا دیا۔ ۱۷۸۸ء تک بہاول خاں درانیوں کا صفایا کرنے میں مصروف رہا۔ ۱۸۰۵ء میں بہاول کی وفات پر اس کا بیٹا عبداللہ خاں جانشین ہوا اور صادق محمد خاں ثانی کا لقب اختیار کیا۔ اسی کا عہدِ حکومت ایران سندھ کے حملوں کو پسپا کرنے اور اپنے امراء کی بغاوتیں فرو کرنے میں گزرا۔ ۱۸۲۵ء میں اس کی وفات کے بعد رحیم یار خاں ملقب بہ محمد بہاول خاں ثالث جانشین ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ اور ملتان ہمیشہ کے لیے بہاولپور کے تسلط سے نکل گئے۔ یہ علاقے فرانسیسی جرنیل وانتورا نے ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ کے لیے فتح کیے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں ریاست بہاولپور نے برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرلیا۔ ۱۸۵۲ء میں محمد بہاول خاں ثالث کی وفات کے بعد صادق محمد خاں ثالث جانشین ہوا۔ اس کے بڑے بھائی شہزادہ حاجی خان نے اسے محل کے تہ خانے میں قید کر دیا۔ بعد میں ایک قلیل رقم بطور وظیفہ مقرر کرکے لاہور جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۸۵۳ء میں حاجی خاں، فتح خاں کے لقب سے جانشین ہوا۔ داؤد پوترے اس کے خلاف مسلسل ناکام سازشوں میں مصروف رہے۔ ۱۸۵۸ء میں اس کے انتقال کے بعد محمد بہاول خاں چہارم اس کا جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی اندرونی خلفشار جاری رہا۔ ۱۸۶۶ء میں اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر اس کا نابالغ بیٹا صادق محمد خاں چہارم تخت نشین ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں وہ بالغ ہوا تو برطانوی ہند کی حکومت نے اسے حکمرانی کے باضابطہ اختیارات تفویض کر دیئے۔ اس نے متعدد خوبصورت محل تعمیر کرائے جن میں صادق گڑھ محل اور نور محل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۸۹۹ء میں مبارک خاں، محمد بہاول خاں پنجم کے لقب سے جانشین ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ وہ حج کے بعد واپس آ رہا تھا کہ عدن میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کا تین سالہ چھوٹا بھائی صادق محمد خاں پنجم تخت نشین ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں بہاولپور پاکستان میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۵۶ء میں ریاست بہاولپور وحدتِ مغربی پاکستان میں مدغم ہوگئی۔

داؤد خاں کررانی

(وفات ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء) بنگال کا مطلق العنان حکمران۔ ۱۵۷۲ء میں افغان امراء نے اسے تخت پر بٹھایا۔ ۱۵۷۴ء میں داؤد نے شہنشاہ اکبر سے سرتابی کرکے غازی پور کی شاہی چوکی پر قبضہ کرلیا۔ منعم خاں کو اس کے مقابلے پر بھیجا گیا۔ جس نے دارالحکومت ٹانڈا پر قبضہ کرکے داؤد کو اڑیسہ میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ داؤد نے جوابی حملہ کیا۔ بالآخر صلح کرکے اکبر کو خراج ادا کرنے پر راضی ہوا۔ اڑیسہ کا صوبہ داؤد خاں کے پاس رہنے دیا گیا۔ ۱۵۷۵ء میں منعم خاں فرمانروائے بنگال کا انتقال ہوا تو داؤد خاں نے پھر بنگال پر قبضہ کرلیا۔ ۱۵۷۶ء میں خاں جہاں اور ٹوڈرمل نے مغلوں کی طرف سے دوبارہ حملہ کیا۔ نتیجتاً داؤد خاں مارا گیا اور بنگال پر مغلوں نے قبضہ کرلیا۔

داؤد طائیؒ

(وفات ۱۶۲ھ) امام الفقہ امام اعظمؒ کے شاگرد۔ آپ کا شمار حضرت حبیب عجمی کے جلیل القدر خلفاء میں ہوتا ہے۔ علوم ظاہری و باطنی میں باکمال تھے۔ حضرت کرخیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوسلیمان داؤد بن نصر طائی سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کا انتقال بغداد میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

داؤد، شیخ

(وفات ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء) صوفی اور عالم دین۔ آپ کی نسبت ستائیس واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم تک پہنچتی ہے۔ آپ کے بزرگ عرب سے ملتان آئے تھے آپ کے والد سید فتح اللہ ملتان کے قریب سیت پور میں مقیم تھے وہاں سے چونی والی میں منتقل ہوئے۔ شیخ داؤد نے ابتدائی تعلیم اسی قصبے میں حاصل کی۔ لاہور میں مولانا جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل سے علوم ظاہری میں تکمیل کی۔ اس کے بعد آپ نے سلسلہ قادریہ میں شیخ عبدالقادر ثانی اوچی کے پوتے سید حامد گنج بخش قادری اوچی سے بیعت کی۔ بیعت کے بعد آپ نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ چند برس جنگلوں اور ویرانوں میں بھی

Marfat.com

گزارے۔ ان مجاہدات کی بدولت اویسی نسبت آپ نے حضرت غوث الاعظم سے حاصل کی۔ مجاہدات کی تکمیل کے بعد آپ [redacted] ضلع ساہیوال میں اقامت اختیار کی۔ آپ قرآن وحدیث کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ آپ کی روحانیت اور تقدس کی شہرت اطراف میں پھیل چکی تھی۔ آپ کے خلفا میں مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ دہلوی شاہ ابوالمعالی لاہوری اور شاہ ابو اسحاق قادری لاہوری مشہور ہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی (مؤلف منتخب التواریخ) لکھتے ہیں کہ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جس میں سو سو پچاس پچاس غیر مسلم بمعہ اہل وعیال آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔

داہومی

جنوبی افریقہ میں واقع چند قدیم ترین تہذیبوں والے ممالک میں سے ایک۔ یکم اگست ۱۹۶۰ء کو فرانس سے آزادی حاصل کی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو اقوام متحدہ کا رکن بنا۔ داہومی کی آبادی (۱۹۶۵ء) چوبیس لاکھ ہے جس میں سے تین لاکھ مسلمان ہیں۔ کوٹونو یہاں کا سب سے بڑا شہر، بندرگاہ اور تجارتی مرکز ہے۔ کوٹونو کی آبادی ایک لاکھ گیارہ ہزار ہے۔ دوسرے بڑے شہر اور دارالحکومت پورٹونوو کی آبادی ستر ہزار ہے۔ داہومی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ زیادہ تر آبادی زراعت پیشہ ہے۔ ارواح پرستی (Animism) داہومی کا سرکاری مذہب ہے مسلمانوں کے نفوذ کا آغاز شمال مشرق سے ہوا۔ تیرھویں صدی میں مالی سلطنت کی ایک چھوٹی سی تجارتی نوآبادی قائم کی گئی۔ جلد ہی چھوٹی چھوٹی مسلم نوآبادیاں قائم ہو گئیں اور اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنیں۔ سترھویں صدی میں مراکش نے سونگھائی فتح کیا تو وہاں کے مسلمان داہومی کے شمالی حصے میں جاکر آباد ہوگئے۔ اٹھارہویں صدی میں مسلمان فلانی چرواہوں نے شمالی علاقوں میں اسلامی مرکز قائم کر لیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری برسوں میں اسلام نے جنوب مشرق کے لوگوں کو متاثر کیا۔ کچھ مسلمان تاجر دارالحکومت پورٹونوو میں آباد ہوگئے۔ ان کی تعداد بسرعت بڑھتی گئی۔ ان تاجروں نے داہومی کے یوروبہ خاندان کو مشرف بہ اسلام کیا۔ پورٹونوو اور پراکو اسلام کے بڑے مرکز بن گئے۔

دبیر، مرزا سلامت علی

(۲۹ اگست ۱۸۰۳ء ــــ ۸ مارچ ۱۸۷۵ء) مرثیہ گو اردو شاعر۔ دبیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کے ساتھ لکھنؤ آئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ شعر کہنے کا آغاز ابتدائی عمر میں کیا۔ کم وبیش ساٹھ برس مرثیہ گوئی کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں سیتاپور منتقل ہوگئے۔ ۱۸۵۸ء میں کانپور اور ۱۸۵۹ء میں عظیم آباد گئے۔ انجام کار لکھنؤ واپس چلے آئے اور یہیں انتقال ہوا۔ اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

دبیر ایک پرہیزگار، متقی، کریم النفس، مہمان نواز اور سنجیدہ ومتین بزرگ تھے۔ اچھے اشعار بڑی تیزی سے کہہ لیتے تھے۔ ان کا بیشتر کلام مراثی، سلام اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ عربی وفارسی کے عالم ہونے کی وجہ سے دبیر نے ان زبانوں کے ادب سے خوب فائدہ اٹھایا۔ شاعری کے میدان میں ان کے ہم عصر حریف میر انیس تھے۔ لکھنؤ میں انیس کا نام چمکنے سے بہت عرصہ پیشتر دبیر شہرت کے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔

دجال

اسلامی اصطلاح میں دجال سے مراد جھوٹا مسیح ہے اور اس کا دجل اس کی جادوگری اور کذب وفریب ہے (لسان العرب) دجال وہ ہے جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا اور الوہیت کا دعویٰ کرے گا۔ (ابن الاثیر) دجال کا خروج وظہور علامات قیامت میں سے ہے (بخاری ومسلم) دجال کا ظہور اولاً عراق وشام کے درمیان ہوگا اور وہ نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ پھر وہ اصفہان کی طرف جائے گا، جہاں وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور ستر ہزار یہودی اس کی پیروی کریں گے (شاہ رفیع الدین، صحیح مسلم) اس کے ظہور سے پہلے بڑی قحط سالی ہوگی اور لوگوں کو سختی کا سامنا ہوگا۔ (مسند احمد) دجال کی شکل و صورت بھی احادیث میں بیان ہوئی ہے کہ وہ کانا ہوگا، اس کی آنکھ میں پھلی ہوگی جو سبز رنگ کے شیشے کی بنی ہوئی معلوم ہوگی۔ اس کے بال حبشیوں کی طرح گھنگریالے ہوں گے گلا چوڑا چکلا ہوگا۔ اس کی پیشانی پر کافر لکھا ہوگا اور اس کا رنگ سرخی مائل اور جسم بھدا ہوگا۔ (بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد)

دجال کے پاس ایک باغ ہوگا جسے وہ جنت کہے گا، آگ ہوگی، جسے وہ دوزخ کا نام دیا جائے گا اور اس کے ہاتھ میں خرق عادات ظاہر ہوں گی۔ جیسے آسمان سے بارش برسانا درختوں کو پھل لگانا، شیاطین کو لوگوں کے مردہ ماں باپ کی شکل میں زمین کے اندر سے نکالنا اور بڑی تیزی سے ادھر سے ادھر جانا جس طرح ہوا پر بادل تیرتے جاتے ہیں (صحیح مسلم، شاہ رفیع الدین) وہ تمام دنیا فتح کرے گا مگر مکہ و مدینہ پر قبضہ نہ کر سکے گا۔ دجال کی فتنہ پردازی کی مدت چالیس دن، چالیس ماہ یا چالیس سال ہوگی (ابوداؤد، ابن ماجہ، شاہ رفیع الدین) اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی منارے پر نازل ہوں گے اور لد (بیت المقدس کے قریب) کے مقام پر دجال کو قتل کریں گے۔

دحلان

(وفات ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) سید احمد بن زینی شافعی مفتی، شیخ العلماء اور مورخ۔ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی شہر میں شافعی جماعت کے مفتی اور مجلس علماء کے صدر رہے۔ جب شریف اعظم عون الرفیق، عثمان پاشا (ترکی نائب) سے مخالفت کے باعث مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے تو سید دحلان نے بھی ان کی تقلید کی۔ زندگی کے آخری برسوں میں دحلان تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف رہے۔ انھوں نے نہ صرف روایتی اسلامی علوم کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا بلکہ مکہ میں تاریخ نویسی کے واحد نمائندہ بن گئے۔ شرح الآجرومیہ، السیرۃ النبویہ اور السیرۃ الزینیہ آپ کی مقبول عام تصانیف میں تاریخ پر ان کی تصانیف میں الفتوحات الاسلامیہ، درخلاصۃ الکلام فی بیان امراء البلد الحرام (تاریخ مکہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دحیہؓ

بن خلیفہ بن فروہ کلبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی اور مالدار تاجر۔ مدینہ منورہ میں آپ کے حسن کے بڑے چرچے تھے۔ حضرت جبریلؑ ان کی صورت اختیار کر کے نبی کریم صلعم کے پاس آیا کرتے تھے۔ غزوۂ یرموک میں ایک دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ ۵ھ میں رسول اللہ کا مکتوب شاہ روم ہرقل کو پہنچانے کا کام انھی کے سپرد کیا گیا تھا۔ حضرت دحیہؓ نے جب یہ خط ہرقل کو پہنچایا تو اس نے حسب دستور پادری کو طلب کر کے اسے خط سنایا۔ پادری خط سن کر کہنے لگا کہ بخدا یہ اللہ کا وہی رسول ہے جس کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ نے پیش گوئی کی تھی۔ شاہ روم نے آپ کی رسالت کو تسلیم کرنے

Marfat.com

سے انکار کر دیا۔ یہ مکتوب نبوی بعض دوسرے خطوں کے ساتھ اب تک موجود ہے اور اس کی نقول بصورت فوٹو دستیاب ہیں۔

دخّان

دیکھیے۔ الدّخان، سورہ

درجینی

ابو العباس احمد بن سعید بن سلیمان بن علی بن ایخلف' اباضی فقیہہ، شاعر اور مورّخ۔ ان کا تعلق علمار کے بربر اباضی خاندان سے تھا۔ ان کے جد ایخلف اور دادا سلیمان دونوں مشہور فقیہہ تھے۔ ان کے والد سعید بن سلیمان ممتاز محدث تھے۔ درجینی نے اباضی علمار کی درخواست پر اباضیوں کے متعلق تاریخی اور سوانحی کتاب" طبقات المشائخ" تحریر کی۔ بحیثیت ایک فقیہہ انھوں نے فقہ وراثت کے متعدد مسائل کا تصفیہ کیا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں مرتب ہوئے۔ بحیثیت شاعر ان کا ایک' دیوان' اور منظوم خطوط یادگار ہیں۔

درد، خواجہ میر

(۱۱۳۳ھ ــــ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ ۳ جنوری ۱۷۸۵ء) سید خواجہ میر بن خواجہ محمد ناصر عندلیب' اردو کے مشہور صوفی شاعر۔ ۲۸ برس کی عمر میں درد نے لباس فقر پہن لیا۔ والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔ سلطنت دہلی کی تباہی کے زمانے میں دہلی میں موجود رہے۔ درد تفسیر، حدیث، تصوف اور دوسرے علوم دینی کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ہر ماہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی جس میں علمار، مشائخ اور امرا شرکت کرتے۔ تصانیف میں اردو اور فارسی دواوین کے علاوہ تصوف کی یہ کتب شامل ہیں (۱) اسرار الصلوٰۃ (۲) واردات' اس میں ایک سو گیارہ عنوانوں میں تصوف کے رموز و معاملات بیان ہوئے ہیں۔ آزاد' آب حیات میں لکھتے ہیں کہ" درد کی شاعری کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ تصوف جیسا انھوں نے لکھا' اردو میں آج تک کسی سے نہ ہوا۔" درد کا دیوان اعلیٰ وارداتِ قلب اور روحانی ارتقا کا ایک سچا پرتو ہے۔ ان کی غزل میں صوفیانہ خیالات کے علاوہ مجازی عشق کے مضامین بھی موجود ہیں مگر درد نے پیرایۂ بیان ایسا رکھا ہے کہ اکثر غزلوں میں مجاز اور حقیقت دونوں طرح کے مفہوم شعر میں قائم رہتے ہیں۔ درد کی فارسی شاعری اردو شاعری سے کم تر ہے البتہ فارسی میں ان کی رباعیات پُر تاثیر ہیں۔

درزی

(وفات ۴۱۰ھ ۱۰۲۰ء) ابو عبداللہ محمد بن اسمعیل اسمٰعیلی داعی، فرقہ دُروز کے بانیوں میں سے ایک۔ وہ خلیفہ حاکم کا بہت ہی منظور نظر تھا۔ اس نے الحاکم کی الوہیت کا اعلان کیا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ کی روح' جو حضرت آدمؑ میں حلول کر گئی تھی، حضرت علیؓ میں اور پھر الحاکم میں منتقل ہوتی ہے۔ اس نے قاہرہ کی جامع مسجد میں الحاکم کی الوہیت پر ایمان لانے کا علی الاعلان مطالبہ کیا۔ اس سے متعدد بلوے ہوئے جو بالآخر درزی کی موت کا باعث بنے۔

[illegible]

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :" اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں' اے لوگو جو لوگ ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔" (الاحزاب: ۵۶)۔ یہ حکم نازل ہوا تو متعدد صحابہ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ آپؐ پر درود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے افراد کو مختلف اوقات میں درود سکھائے۔ چند درود حسب ذیل ہیں :-

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما صلّیت علیٰ ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم انک حمیدٌ مجید و بارک علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم انک حمید مجید۔

یہ درود کعب بن عجرہؓ سے بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' امام احمد' ابن ابی شیبہ' عبدالرزاق' ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔ ابن عباسؓ سے بھی خفیف فرق کے ساتھ یہی درود مروی ہے (ابن جریر)

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمد و ازواجہ و ذرّیتہ کما صلّیت علیٰ ابراہیم و بارک علیٰ محمد و ازواجہ و ذرّیتہ کما بارکت علیٰ آل ابراہیم انک حمید مجید۔

یہ درود ابو حمید ساعدیؓ سے امام مالک' احمد' بخاری' مسلم' ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اللّٰھمّ صلّ علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما صلّیت علیٰ ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم و بارک علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراہیم فی العالمین انک حمید مجید

یہ درود ابو مسعود بدریؓ سے امام مالک' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' احمد' ابن جریر' ابن حبّان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضورؐ پر درود بھیجنا سنت اسلام ہے' جب آپؐ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے اور خصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضورؐ پر درود بھیجنا فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب تشہد پڑھا جاتا ہے اس میں درود پڑھنا فرض ہے اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔ صحابہ میں سے ابن مسعودؓ' ابو مسعود انصاریؓ' ابن عمرؓ اور جابرؓ بن عبداللہ' تابعین میں سے شعبیؒ' امام محمد باقرؒ' محمد بن کعب قرظی اور مقاتل بن حیان اور فقہا میں اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک تھا۔ آخر میں امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ اور جمہور علمار کا مسلک یہ ہے کہ درود عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمہ شہادت کی طرح ہے جس نے ایک مرتبہ پر اقرار کر لیا اس نے فرض ادا کر دیا۔ اختلافات صرف وجوب کے معاملہ میں ہیں۔ درود کی فضیلت اور اس کا موجب اجر و ثواب ہونا اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا' اس پر ساری امت متفق ہے۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہوگی۔ اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلعم کے احسانات کی بھی ہوگی اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حضورؐ پر درود بھیجے گا۔ درحقیقت کثرت درود ایک پیمانہ ہے جو بتا دیتا ہے کہ دین محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمتِ ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے ملائکہ اس پر درود بھیجتے رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہتا ہے (احمد' ابن ماجہ)۔

Marfat.com

پھر فرمایا: "جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے (مسلم)۔ قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا (ترمذی) حضرت ابوہریرہؓ آنحضور صلعم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص میرے اوپر میری قبر کے قریب درود بھیجتا ہے وہ میں اس کو خود سنتا ہوں اور جو دور سے مجھ پر درود بھیجتا ہے وہ مجھ کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان کذا فی المشکوٰۃ و بسط السخاوی فی تخریجہ)۔ علامہ سخاویؒ نے قول بدیع میں متعدد روایات سے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ جو شخص دور سے درود بھیجے فرشتہ اس پر متعین ہے کہ حضورؐ تک پہنچا دے اور جو شخص قریب سے پڑھتا ہے حضورؐ اس کو خود سنتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب نے ایک مرتبہ آنحضور صلعم سے عرض کیا کہ میں آپ پر درود کثرت سے بھیجنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی مقدار اپنے اوقات دعا میں سے کتنی مقرر کروں، آنحضرت صلعم نے فرمایا جتنا تیرا جی چاہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ایک چوتھائی، آنحضورؐ نے فرمایا تجھے اختیار ہے اور اگر اس پر بڑھا دے تو تیرے لیے بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا نصف کر دوں۔ آپؐ نے فرمایا تجھے اختیار ہے اور اگر اس سے بڑھا دے تو تیرے لیے زیادہ بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ پھر میں اپنے سارے وقت کو آپ کے درود کے لیے مقرر کرتا ہوں۔ حضور اقدس صلعم نے فرمایا تو اس صورت میں تیرے سارے فکروں کی کفایت کی جائے اور تیرے گناہ بھی معاف کر دیئے جائیں گے۔ (ترمذی، سخاوی) ؛

درویش

حضرت داتا گنج بخشؒ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ: "فقیر (درویش) وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ کسی چیز سے اس کا نقصان ہو۔ نہ تو اسباب دنیاوی کے موجود ہونے سے وہ غنی ہوتا ہے اور نہ ان کی عدم موجودگی سے اس کا محتاج ہوتا ہے۔ اسباب کا ہونا' نہ ہونا اس کے نزدیک برابر ہے اور اگر ان اسباب کے نہ ہونے پر وہ خوش ہو تو جائز ہے۔ اس لئے کہ مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ درویش جتنا تنگ دست ہوتا ہے اتنا ہی وہ خوش ہوتا ہے کیونکہ اسباب کا ہونا درویش کے لیے بہت برا ہے" یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح فقیر کی علامت یہ ہے کہ بندہ کمال ولایت و قیام مشاہدہ کی صفت جاتے رہنے اور حق سے دور ہو جانے سے ڈرتا رہے۔ رویم بن محمد فرماتے ہیں کہ فقیر کی تعریف یہ ہے کہ فقیر کا باطن اغراض نفسانی سے اور اس کا بدن آفت سے محفوظ ہو اور جو احکام اس پر فرض ہیں' برابر ادا ہوتے رہیں۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز سے غنی نہیں ہوتا۔ ابوالحسن نوریؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کی صفت یہ ہے کہ چیز کے نہ ہونے کی صورت میں خاموش رہے اور ہونے کی صورت میں اس کو خرچ کرے ——
درویشوں کے چار بنیادی سلسلے ہیں' نقشبندی' سہروردی' قادری اور چشتی۔

درویش محمد پاشا

ترکی کے چار وزرائے اعظم اس نام سے گزرے ہیں۔ (۱) (وفات ۱۰۱۵ھ/دسمبر ۱۶۰۶ء) جنوری ۱۶۰۲ء میں اسے وزیر کا درجہ دے کر قپودان پاشا بنایا گیا۔ جون ۱۶۰۶ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ لیکن اس کے دشمنوں نے بہت جلد سلطان کو اس کے خلاف کر دیا۔ سلطان کی بدگمانی بالآخر درویش محمد پاشا کے قتل پر منتج ہوئی۔ ترکی وقائع نگار اسے تند مزاج' بے انصاف اور نا اہل شخص بتاتے ہیں۔

(۲) (وفات ۵ ربیع الاول ۱۰۶۵ھ/۱۲ جنوری ۱۶۵۵ء) وہ شام' دیار بکر' بغداد' حلب' اندلو' سلسٹریا اور بوسنہ کا بیگلر بیگ رہا۔ مارچ ۱۶۵۳ء میں وزیر اعظم بنا۔ اکتوبر ۱۶۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ وہ اپنے زمانے کے تمام اکابر میں سب سے دولت مند تھا۔

(۳) (۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء — ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء) وہ ۶ جولائی ۱۷۷۵ء کو وزیر اعظم بنا۔ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہوتے ہی ذاتی عیش اور آسائش کے حصول میں مصروف ہو گیا۔ مملکت کے معاملات کی طرف بے توجہی نے افواہوں کو جنم دیا۔ بالآخر ۱۹ دسمبر ۱۷۷۶ء کو اسے عہدے سے معزول کر کے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۰ فروری ۱۷۷۷ء کو اسے خانیہ کا والی مقرر کیا گیا۔ مگر وہ بحری سفر کے دوران میں بیمار ہو گیا اور اس نے ساقز میں وفات پائی۔

(۴) (۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء — ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) یا اثر عہد بیدار حالت آفندی کے مشورے پر سلطان محمود ثانی نے اسے ۶ جنوری ۱۸۱۸ء کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ دو سال تک وہ اس منصب پر فائز رہا لیکن اس مدت میں وہ امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ۵ جنوری ۱۸۲۰ء کو اسے معزول کر کے گیلی پولی میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۶ جنوری ۱۸۲۱ء کو دمشق کا والی مقرر ہوا۔ بعد میں بدل کر اناطولی میں بھیج دیا گیا۔ جہاں اس کے داماد حمدی بے کے ظالمانہ طرز عمل کی وجہ سے اسے معزول ہونا پڑا۔ جون ۱۸۲۷ء میں مدینہ منورہ کا والی مقرر کیا گیا۔ اسی سال اس کا انتقال ہوا۔ ترکی کے وزرائے اعظم میں اسے سب سے بے اثر وزیر اعظم بتایا جاتا ہے۔

درہ بیگی

ایشیائے کوچک کا حکمران خاندان جنہیں ترک مؤرخ عموماً متغلبہ (غاصبین) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ درہ بیوں کے زیادہ مشہور گھرانے حسب ذیل تھے۔
(۱) آیدین' منسا اور برغمہ کے قرہ عثمان اوغلو۔ یہ صارو خان اور آیدین کی سنجاقوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا اقتدار دریائے مندرس بیوک سے لے کر بحیرہ مرمرہ کے ساحل تک پھیلا ہوا تھا (۲) یوزوق کے چپان اوغلو۔ یہ نسلاً ترکمانی تھے اور عملاً قرہ عثمان اوغلو کے ہمعصر تھے ان کی حکومت بوزوق یوزغاد' قیصری' اماسیہ' انقرہ' اور نیگدہ کی سنجاقوں پر تھی۔ عروج اقتدار کے زمانے میں طرطوس پر حکمران رہے۔ اس خاندان کا پہلا شخص احمد پاشا ۱۷۶۵ء میں مرکزی حکومت کے حکم سے معزول ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مصطفیٰ جانشین ہوا۔ ۱۷۸۱ء میں وہ اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کا بھائی سلیمان جانشین ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا علاقہ مرکزی حکومت کے قبضے میں آگیا۔
(۳) طربزون اور جانیک کے علی پاشا کا خاندان۔ بطال بن علی پاشا والی حلب اور والی دمشق کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء میں طربزون کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۷۹۰ء میں روسیوں کے ساتھ جنگ میں گرفتار ہوا۔ ۱۷۹۹ء میں اسے روس کی سفارش پر دوبارہ سرکاری ملازمت مل گئی اس کے بیٹے جبرالدین راغب پاشا گورنر افیون قرہ حصار کو ۱۷۹۲ء میں معزول کر کے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس خاندان کا خود مختارانہ سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔

درہ خیبر

دیکھئے۔ خیبر، درہ

Marfat.com

دساسی، سلوستر

(۱۷۵۸ء — ۲۱ فروری ۱۸۳۸ء) فرانس کا ممتاز مستشرق، جس نے فرانس میں عربی دبستان کی بنیاد ڈالی۔ دساسی پیرس میں پیدا ہوا۔ مشرقی زبانوں میں غیر معمولی تبحر حاصل کیا اور ہمعصروں میں امام المستشرقین تسلیم کیا گیا۔ ۱۷۷۸ء میں فرانس کے شاہ لوئی ہژدہم نے مشرقی زبانوں کے مخطوطات کی اشاعت کے لیے آٹھ علماء کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی کا ایک رکن دساسی بھی تھا۔ ۱۷۹۵ء میں پیرس میں مشرقی زبانوں کی تدریس کے مدرسہ عربی کا پہلا استاد مقرر ہوا۔ اس نے طلبہ کے لیے عربی زبانوں کی مستند کتابوں کے اقتباسات کا ایک مجموعہ "التحفۃ السنیۃ فی علم العربیۃ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے لیے اس نے اسی قسم کا ایک مجموعہ "انیس المفید لطالب المستفید" کے نام سے مرتب کیا۔ ۱۸۱۳ء میں فرانس کی حکومت نے اسے بیرون کا خطاب دیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے شیخ فریدالدین عطار کا "پندنامہ" فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ ۱۸۲۲ء میں دساسی نے اپنے احباب کی شرکت سے ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ دساسی اس سوسائٹی کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ اس سوسائٹی نے علمی مجلہ "جرنل ایشیاٹک" جاری کیا۔ دساسی کے بہت سے مضامین اسی رسالے میں طبع ہوئے۔ علم و فضل کی بنا پر دساسی کو ملک بھر میں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جرمنی و روس کے شہنشاہ بھی مشرقی علوم کی تنظیم و ترویج کے لیے دساسی سے مشورے لیتے تھے۔ دساسی کے ایماء پر یورپ کے متعدد ملکوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم اور مشرقی علوم کی تحقیق کے لیے ادارے قائم ہوئے اور اس کے مشورے سے اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔

دسوقی

(۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء — ۶۷۶ھ / ۱۲۷۸ء ؟) برہان الدین ابراہیم بن عبدالعزیز بن قریش بن محمد، سلسلۂ دسوقیہ کے بانی۔ قریۂ مرقس بنی زیریں مصر کے ضلع غربیہ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا زیادہ حصہ قریب کے گاؤں دسوق کے گرد و نواح میں گزارا۔ ان کے والد مشہور مقامی ولی اور نانا ابوالفتح واسطی ضلع غربیہ میں رفاعی فرقے کے خلیفہ اور امام تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں (۱) الجواہر: یہ زیادہ تر مبتدیوں کے لیے ہدایات اور عملی احکام کا مجموعہ ہے۔ (۲) الجوہرہ: اس میں دسوقی کی کرامات کا ذکر ہے (۳) الحقائق: اس میں وہ مناجاتیں درج ہیں جو انھوں نے اللہ سے کیں۔ کتاب الجواہر یہ ان کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ جس میں حقیقت اور شریعت کے درمیان دلائل سے تطبیق دی گئی ہے۔ دسوقی کہتے ہیں کہ صرف غلبۂ حال کے وقت شریعت کی پیروی ساقط ہو جاتی ہے۔ سنوسی نے اپنی کتاب سلسبیل المعین میں برہانیہ (دسوقیہ) سلسلے کی یہ خصوصیات گنوائی ہیں۔ الذکر الجہری، مجاہدات نفس کشی اور "یا دائم" کا ورد۔

دعا

انسان کا اپنی طلب اور خواہش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔ اس سے مدد طلب کرنا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اور اے نبی، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں (البقرہ: ۱۸۶)۔ "اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے زیادہ دیا ہے، اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے (النساء: ۳۲)

غیر اللہ کو سجدہ کرنا ہی شرک نہیں ہے، بلکہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے دعا مانگنا یا اس کو مدد کے لیے پکارنا بھی شرک ہے۔ دعا اور استمداد و استعانت اپنی حقیقت کے اعتبار سے عبادت میں ہیں اور غیر اللہ سے مناجات کرنے والا ویسا ہی مجرم ہے جیسا ایک بت پرست مجرم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ان سے کہو، پکار دیکھو ان معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو۔ وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں، جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں۔ وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں (بنی اسرائیل: ۵۶-۵۷)

حاجت روائی اور مشکل کشائی کے سارے اختیارات اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے صرف اسی سے دعائیں مانگنا برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اسی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے، جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا۔ حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں مگر ایک تیر بے ہدف (الرعد: ۱۴) اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو، جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔ (الاعراف: ۵۶)

دنیا کی تدبیر و انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار کوئی اتنا بھی اختیار نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کر کے اس کا فیصلہ بدلوا دے یا کسی کی قسمت بنوا دے یا بگڑوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ خدا سے دعا کرے، مگر اس کی دعا کا قبول ہونا یا نہ ہونا بالکل خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ بعض اوقات تو نبی تک کی دعا رد کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں الا یہ کہ اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے" (یونس: ۳) نوح نے اپنے رب کو پکارا، کہا اے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا: اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تم اس کی بات کی مجھ سے درخواست نہ کرو جس کی حقیقت تو نہیں جانتا۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے۔ نوح نے فوراً عرض کیا۔ اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ (ہود: ۴۶-۴۷)

دعوی

قانونی چارہ جوئی۔ فقہاء کی اصطلاح میں دعوی سے مراد قاضی یا حکم

Marfat.com

(ثالث) کے سامنے کسی شخص کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنے حق کی اطلاع کرنا یعنی قاضی کے سامنے کسی شخص کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنے حق کا مطالبہ کرنا۔ دعویٰ ذیل کی صورتوں میں متحقق ہوتا ہے۔ (۱) اس مقدمہ میں جس میں کوئی فرد رنج یا نقصان پہنچانے والے فرد کے خلاف استغاثہ دائر کرے۔ جس میں قصاص کا اجرا یا دیت (خون بہا) دلوانے کا مطالبہ ہو (۲) ان مقدمات میں جہاں مختلف حدود شرعیہ کے ماتحت کسی مظلوم کے کلّی یا جزوی نقصان کی تلافی کے لئے ظالم کو عدالت میں طلب کیا جائے، جیسے سرقہ یا زنا کی صورت میں (۳) فرائض منصبی کے تحت فوجداری مقدموں میں جہاں ضرر رسیدہ کو واسطہ بنا کر یا "حسبہ" کے اختیارات کے بموجب کاروائی کی جائے۔ یہ کارروائی اس اصول پر مبنی ہوتی ہے کہ شخصی شکایات کے علاوہ ہر مسلمان قانون شکنی کرنے والے کے خلاف چارہ جوئی کا مجاز ہے (۴) ان مقدمات میں جو ظالم کی غیر معمولی کارروائی کے مطابق دائر کیے جائیں۔ فریقین کا حاضر ہونا مقدمہ کی کارروائی کے لئے اصولاً ضروری ہے۔ اسلامی قانون کے تحت کوئی فیصلہ غیر حاضری کی حالت میں نہیں ہو سکتا۔ حاضری سے گریز کرنے والے مدعیٰ علیہ کو حاضر ہونے پر مجبور کرنے کے لئے مختلف طریقے مقرر ہیں۔ انتہائی اقدام کے طور پر قاضی مدعیٰ علیہ کی بجائے ایک سرکاری نمائندہ مقرر کرے گا۔ مالکی، شافعی اور شیعہ مسلک میں جب دعویٰ میں مدعیٰ علیہ کا نام اور دیگر کوائف موجود ہوں تو پھر صحتِ دعویٰ کے لئے اس کی حاضری ضروری نہیں اور جو فیصلہ صادر کیا جائے گا وہ ویسا ہی جائز اور صحیح ہوگا جیسا کہ مدعیٰ علیہ کی حاضری کی صورت میں ہوتا۔

مقدمے کی کارروائی زبانی ہوتی ہے ہر چند کہ فریقین کو اپنے دلائل تحریری طور پر پیش کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن جب تک فریق مقدمہ حاکم کے سامنے اس کے صحیح ہونے کا اقرار نہ کرے، اس کے تحریری بیان کو سند نہ مانا جائے گا۔ دعویٰ کا بارِ ثبوت مدعی پر ہوتا ہے۔ اقبال، گواہی، حلف، تحریر اور قانونی قرائن یہ سب قانونی اثبات میں شامل ہیں۔ اثبات دعویٰ کے لئے سب سے زیادہ قوی دلیل مدعیٰ علیہ کا اقرار ہے لیکن صحت اقرار کے لئے ضروری ہے کہ مُقِر بالغ اور عاقل ہو اور اس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔ اثبات دعویٰ کی دوسری دلیل قسم ہے۔ اگر مدعی شہادت پیش نہ کر سکے تو وہ مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کا مجاز ہے لیکن قسم فوجداری مقدمات میں جائز نہیں۔ اس مسئلے میں فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مدعیٰ علیہ سے قسم لینے کے بعد مدعی گواہ پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک شہادت قابلِ قبول ہوگی۔ امام مالکؒ کے نزدیک گواہی اس شرط کے ساتھ قابلِ قبول ہوگی کہ قسم لینے سے قبل یہ علم نہ ہو کہ اس کے پاس گواہ موجود ہے اگر مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے انکار کردے تو اس صورت میں احناف اور امام احمدؒ بن حنبل کے مطابق فیصلہ اس کے خلاف صادر کیا جائے گا اور مدعی سے قسم نہیں لی جائے گی۔ اثباتِ دعویٰ کا یہ شرعی اصول ہے کہ جب دعویٰ کا ایسا ثبوت بہم پہنچا دیا جائے جو قانونی تقاضوں کو پورا کرتا ہو تو قاضی کو مقدمے کا فیصلہ اس ثبوت کے مطابق کرنا ہوگا چاہے اس کا یقین کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

دفن

دیکھیے: تدفین

دلاور پاشا

(وفات ۸ رجب ۱۰۳۱ھ/ ۱۹ مئی ۱۶۲۲ء) عثمانی وزیرِاعظم۔ جنوری ۱۶۱۴ء میں بغداد کا اور ۱۶۱۵ء میں دیار بکر کا بیگلر بیگی مقرر ہوا۔ جولائی ۱۶۲۰ء میں اسے برطرف کردیا گیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۶۲۱ء کو سلطان عثمانی نے اسے وزارت عظمیٰ پر فائز کیا۔ لیکن اس کے عہدے کی مدت ایک سال سے بھی کم تھی۔ دلاور پاشا ینی چریوں کی بغاوت میں مارا گیا یہی بغاوت عثمان ثانی کی معزولی اور موت پر منتج ہوئی۔

دلاور خاں

(وفات ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) سلطنت مالوہ کا بانی جس کا اصل نام حسن تھا۔ دھار میں شیخ کمال الدین مالوی کے مزار کے احاطے سے سنگِ مزار کا جو کتبہ دستیاب ہوا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں دلاور خاں مالوے کا والی تھا۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دلاور خاں نے ناصر الدین محمود شاہ تغلق کو پناہ دی۔ محمود تغلق ۱۴۰۱ء میں دہلی روانہ ہوا تو دلاور خاں نے اپنے بیٹے الپ خاں (بعد ازاں ہوشنگ غوری) کے اکسانے پر اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ دلاور خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان ہوشنگ شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

دُلدُل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاکستری رنگ کے خچر کا نام دُلدُل نے آپ کے غزوات میں آپ کی سواری کا کام دیا۔ دلدل نبی اکرم صلعم کی رحلت کے بعد تک زندہ رہا۔ وہ اس قدر سن رسیدہ اور بے دندان ہو کر مرا کہ اسے کھلانے کے لئے جَو اس کے منہ میں ڈالنے پڑتے تھے۔ شیعی روایت کی رو سے جنگ جمل میں حضرت علیؓ اسی دُلدُل پر سوار تھے اور جنگ صفین میں بھی حضرت علیؓ نے اسی پر سواری کی۔ یہ خچر رسول کریم صلعم کو مقوقس نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔ دُلدُل کے ساتھ اس نے ایک گدھا بھی بھیجا تھا جو عُفیر کہلاتا تھا۔

دمرداشی، احمد

بارھویں صدی ہجری/ اٹھارہویں صدی عیسوی کا مصری مؤرخ۔ اس کی تاریخی تصنیف "الدرۃ المصانۃ فی اخبار الکنانۃ" ۱۶۸۸ء سے ۱۷۵۵ء تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں قاہرہ کے حالات کا مفصل بیان موجود ہے۔ ترکی عہد کے مصر کے حالات پر یہ واحد کتاب ہے جو ایک اعلیٰ فوجی افسر نے لکھی ہے۔

دمشق

شام کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً سات سو میٹر بلند، صحرا کی حد پر اور لبنان شرقیہ کے سلسلۂ کوہ کی شرقی پہاڑی جبل قاسیون کے دامن میں واقع ہے۔ دمشق کے جنوب مشرق میں تل الصالحیۃ کے مقام جو کھدائیاں ہوئیں، ان سے یہاں چار ہزار سال قبل مسیح تک ایک شہری مرکز ہونے کا انکشاف ہوا ہے۔ یہ شہر حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں فتح ہوا لیکن حضرت سلیمانؑ کے عہد میں دمشق کے بادشاہ نے شمال کے شاہانِ آشور اور جنوب

Marfat.com

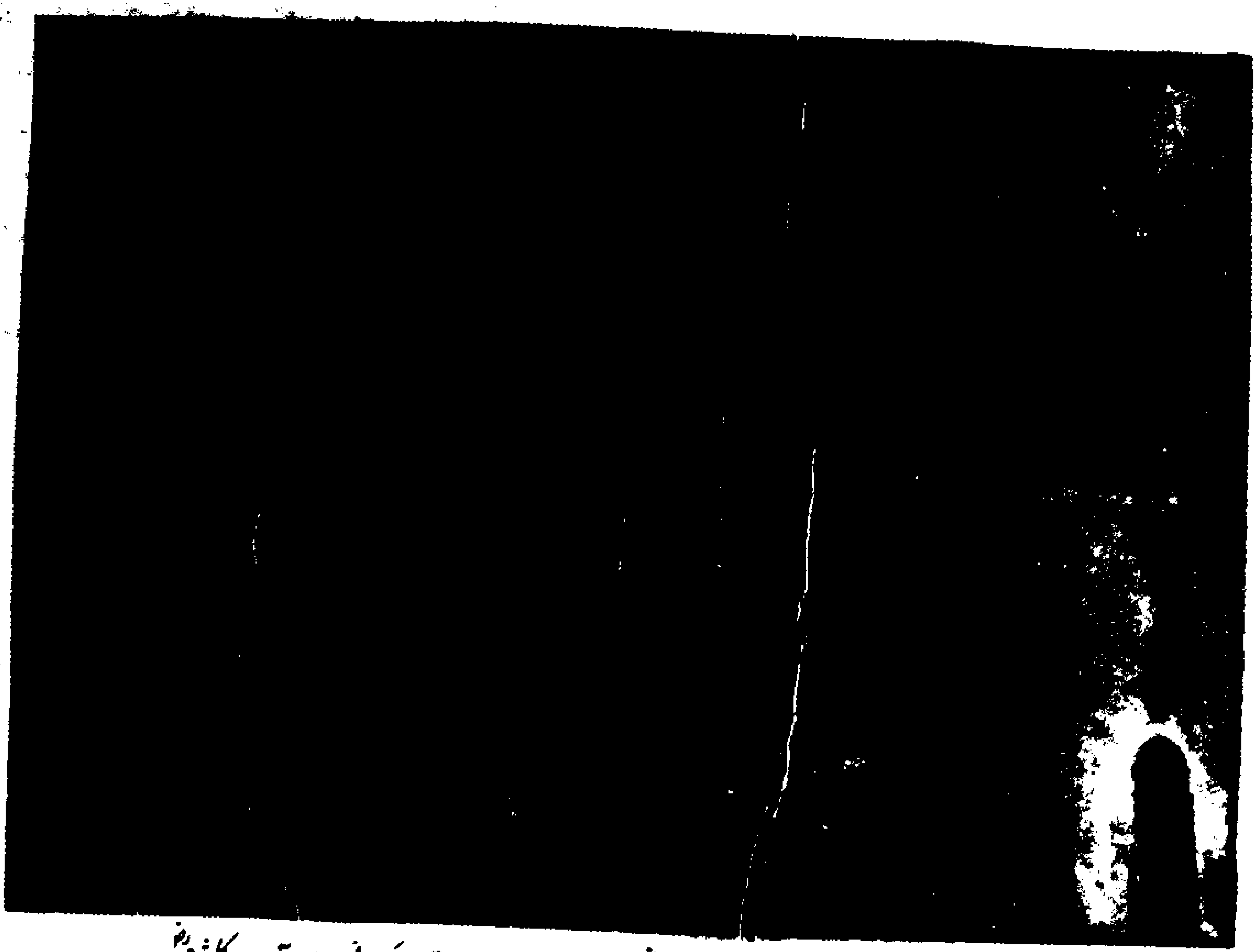

دمشق کے قبرستان باب الصغیر میں حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادیوں حضرت سیدہ سکینہؓ اور سیدہ ام کلثومؓ

نے مملوک اسرائیل کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ ۷۳۲ ق م میں تگ لت پیلیسر سوم نے دمشق کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوریوں، ساتویں صدی میں بابلیوں، چھٹی صدی میں ہخا منشیوں، چوتھی صدی میں یونانیوں اور پہلی صدی ق م میں بوزنطیوں کا دمشق پر یکے بعد دیگرے قبضہ رہا۔ ۶۴ ق م میں دمشق رومی سلطنت کا ایک صوبہ بنا۔ رومیوں کی جگہ بوزنطیوں نے سنبھالی۔ ۳۹۵ء میں یہ سلطنت شرقیہ کا ایک حصہ بن گیا۔ ۶۱۲ء میں خسرو ثانی نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ ۶۲۷ء میں ایرانی شہنشاہ کی وفات پر دمشق خالی کر دیا گیا اور ۶۲۶ء میں ہرقل شام میں واپس آگیا۔

رجب ۱۴ھ/ستمبر ۶۳۵ء میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابو عبیدہؓ نے دمشق فتح کیا۔ دمشق کی فتح نے مغرب کی ہزار سالہ سیادت کا خاتمہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے یزید بن ابی سفیان کو دمشق کا والی نامزد کیا۔ بہت جلد دمشق کو ایک مقدس شہر کا درجہ حاصل ہوگیا۔ روایات کی روشنی میں ان مقامات کا سراغ لگ گیا جنہیں انبیائے سابقین نے شہرت عطا کی تھی۔ چنانچہ زائرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ زیادہ تر لوگ جبل قاسیون میں کہف آدم (جہاں ہابیل کا قتل ہوا) یا کہف جبرئیلؑ میں جایا کرتے۔ برزہ میں حضرت ابراہیمؑ کے مقام ولادت کی تعظیم و تکریم کی جاتی۔ ۱۸ھ/۶۳۹ء میں یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کے انتقال کے بعد دمشق کی قیادت حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں آئی۔ ۳۶ھ/۶۵۶ء میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ حاکم بنے تو انھوں نے دمشق میں اقامت اختیار کر لی۔ ایک صدی تک یہ خلافت کے مرکزی صوبے کا ملی مرکز رہا۔ خلیفہ ابوالعباس سفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے خاندان بنوامیہ کا خاتمہ کرنے کے بعد رمضان ۱۳۲ھ/اپریل ۷۵۰ء میں دمشق فتح کیا اور وہ دمشق کا پہلا عباسی والی مقرر ہوا۔ اموی عمارتیں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ اس کی حیثیت ایک صوبائی شہر کی رہ گئی اور خلافت عباسیہ نے اپنا صدر مقام عراق میں قائم کر لیا۔ خلیفہ المتوکل نے اپنا دارالخلافہ دمشق میں تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف اڑتیس یوم قیام کرنے کے بعد سامرا واپس چلا گیا۔ ۲۵۴ھ/۸۶۸ء میں بخارا کے ترک احمد بن طولون کو خلیفہ نے دمشق کا والی مقرر کیا۔ اس نے خلافت کی کمزوریوں کے مدنظر ۲۶۴ھ/۸۷۸ء میں دمشق پر قبضہ کر لیا۔ بنو طولون کے زوال اور قرامطہ کی روز افزوں سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے خلیفۂ وقت نے اپنی فوجیں دمشق روانہ کر دیں۔ ۲۸۹ھ/۹۰۲ء میں قرامطہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۳۳۴ھ/۹۴۵ء میں ایک معاہدہ کی رو سے اخشیدی دمشق پر قابض ہوگئے اور اس کے عوض انھوں نے فرمانروایان حلب کو خراج دینا منظور کیا۔ ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں بنو فاطمہ خاندانِ اخشیدیہ کے قاہرہ میں جانشین ہوئے۔

۴۶۸ھ/۱۰۷۶ء میں بنو فاطمہ کا ملازم ترکمان سردار اتسز بن اوک دمشق پر قابض ہوگیا اور مصریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ سلجوقی سلطان نے اس کے جواب میں دمشق اپنے بھائی تتش کو جاگیر میں دے دیا۔ تتش نے ۴۷۱ھ/۱۰۷۹ء میں اتسز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء میں تتش اپنے بھتیجے برکیارق کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ دمشق اس کے بیٹے دقاق کے قبضے میں آگیا۔ رمضان ۴۹۷ھ/جون ۱۱۰۴ء میں دقاق کی وفات کے بعد تتش ثانی حکمران ہوا لیکن وہ جلد ہی وفات پا گیا۔ اب اتابک ظہیرالدین تغتکین دمشق کا واحد مالک تھا۔ صفر ۵۲۲ھ/فروری ۱۱۲۸ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا تاج الملوک بوری جانشین ہوا۔ ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء میں نورالدین نے خاندان بوریہ کا خاتمہ کر دیا۔ نورالدین حلب پر پہلے ہی قابض ہوچکا تھا۔ اس نے دمشق میں اقامت اختیار کر لی۔ بنو امیہ کے دور کے بعد پہلی بار دمشق پھر ایک وسیع، متحد اور خود مختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت بنا۔ دمشق اہل

Marfat.com

...مسلمانوں کا مرکز بن گیا۔ کثیر تعداد میں مذہبی عمارات، مساجد اور مدارس کی تعمیر ہوئی۔ شافعی المذہب ابن عساکر اور حنبلی المذہب ابن قدامہ بہت ممتاز ہوئے۔ نورالدین نے حدیث کی تعلیم کے لئے پہلا مدرسہ دارالحدیث کے نام سے قائم کیا۔ اس کا پہلا معلم شافعی مؤرخ ابن عساکر تھا۔ ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۴ء میں نورالدین کی وفات پر اس کا بیٹا الملک الصالح اسمٰعیل تخت نشین ہوا۔ ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۶ء میں صلاح الدین ایوبی نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ ۲۷ صفر ۵۸۹ھ/ ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین ایوبی نے دمشق میں وفات پائی۔ ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء تک یہاں ایوبیہ خاندان کی حکومت رہی۔ عام خوشحالی کی بدولت آل ایوب نے علماء اور مصنفین کی دریا دلی سے سرپرستی کی۔ ربیع الاول ۶۵۸ھ/ مارچ ۱۲۶۰ء میں ہلاکو خاں نے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ پہلا مملوک سلطان بیبرس اپنے عہدِ حکومت (۱۲۶۰ء ـــــ ۱۲۷۷ء) میں اکثر دمشق جاتا رہا۔ ۹۲۲ھ/ ۱۵۱۶ء تک ممالیک سلاطین دمشق پر قابض رہے۔ رمضان ۹۲۲ھ/ اکتوبر ۱۵۱۶ء میں آخری مملوک سلطان "قانصوہ الغوری" آلِ عثمان کے مقابلے میں مارا گیا اور سلطان سلیم اول کی فوجیں دمشق میں داخل ہو گئیں۔ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء تک دمشق آلِ عثمان کے زیرِ سیادت رہا۔ ۱۸۳۲ء میں محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا نے فلسطین کا علاقہ عبور کر کے دمشق پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۰ء کے دوران میں مصری تسلط کے باعث فارغ البالی پیدا ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں دمشق ایک بار پھر آلِ عثمان کے قبضے میں آ گیا۔

اگست ۱۸۶۰ء میں نپولین سوم کی فوجیں دمشق کے ساحل پر اتریں۔ ۷ مارچ ۱۹۲۰ء میں مجلسِ ملی نے شام کی آزادی کا اعلان کر کے فیصل کو بادشاہ منتخب کر لیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سان ریمو کی رو سے فرانس کو جمعیت اقوام کے نمائندے کی حیثیت سے شام پر انتداب کا حق مل گیا۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کو شام کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اگست ۱۹۴۵ء میں شکری القوتلی صدر جمہوریہ شام منتخب ہوئے۔ ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو شام اقوام متحدہ کا رکن بنا۔

دمشقی

(وفات ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۷ء) شمس الدین، ابو عبداللہ محمد بن ابی طالب الصوفی المعروف بہ ابن شیخ حطین، جغرافیہ دان جو دمشق کے قریب واقع الربوہ کا شیخ اور امام تھا۔ اس کی مشہور تصنیف "نخبۃ الدھر فی عجائب البر والبحر" جغرافیے سے متعلق ہے۔ اس کی ایک اور کتاب "المقامات الفلسفیۃ والترجمات الصوفیہ" ہے۔ یہ کتاب طبیعات، ریاضیات اور الٰہیات کی دائرۃ المعارف ہے۔

دمیاطی البنّاء

(وفات محرم ۱۱۱۷ھ/ مئی ۱۷۰۵ء) احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن عبدالغنی دمیاطی، مصر کا مشہور مصنف سلسلۂ نقشبندیہ کے رکن رکین کی حیثیت سے مشہور تھا۔ دمیاطی نے قاہرہ سے المزاحی اور شبرا ملسی سے علم القراءت، حدیث اور شافعی فقہ پڑھی۔ مکہ معظمہ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد الکورانی سے علم حدیث حاصل کیا۔ دمیاط واپس آ کر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "اتحاف فضلاء البشر" شائع کی۔ اس کتاب میں ابن محیصن المکی، الیزیدی البصری اور اعمش کوفی کی قراءتیں جمع ہیں۔ اس میں علم قراءت پر ایک فاضلانہ مقالہ بطور مقدمہ شامل ہے۔ دمیاطی نے مشہور کتاب "السیرۃ الحلبیۃ" کا ایک جلد میں ملخص بھی تیار کیا اور روزِ قیامت کی نشانیوں سے متعلق رسالہ "الذخائر المہمات" تالیف کیا۔ دمیاطی نے تین بار حج کیا۔ مدینہ منورہ میں وفات پائی اور بقیع میں دفن ہوئے۔

دمیاطی، عبدالمؤمن

(۶۱۳ھ/ ۱۲۱۷ء ـــــ ۷۰۵ھ/ ۱۳۰۶ء) بن خلف شرف الدین التونی الدمیاطی الشافعی، تیرھویں صدی عیسوی کی آخری تہائی میں حدیث کا اہم ترین راوی۔ انھوں نے "معجم شیوخ" کے نام سے لغت اسناد تصنیف کی۔ زمانہ مابعد کے مؤرخوں اور سوانح نگاروں نے اکثر اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں۔ اس تصنیف میں وہ احادیث اور متون شامل ہیں جو دمیاطی نے مصر، حرمین شریفین، شام، الجزیرہ اور عراق کے متعدد سفروں کے دوران میں اکٹھے کیے تھے۔

دمیری، محمد

(۷۴۲ھ/ ۱۳۴۱ء ـــــ ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) بن موسیٰ بن عیسیٰ کمال الدین علم الحیوانات کے دائرۃ المعارف "حیات الحیوان" کا مصنف۔ دمیری نے تحصیل علم کے لئے مشہور شافعی عالم بہاءالدین السبکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جمال الدین الاسنوی، ابن عقیل، برہان الدین قیراطی اور دیگر کئی علماء سے بھی درس لیا۔ جب دمیری کو متداول علوم اسلامیہ کی تدریس اور فتوے دینے کی اجازت مل گئی تو وہ بعض دینی درس گاہوں اور خانقاہوں سے وابستہ رہا۔ دمیری اپنی زاہدانہ زندگی کی وجہ سے مشہور تھا اور لوگ اسے صاحب کرامات سمجھتے تھے وہ اپنی وفات تک قاہرہ میں مقیم رہا۔ "حیات الحیوان" کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں اس کی شہرت ہوئی۔ اس کتاب کے مقالات حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے گئے ہیں اور ترتیب میں حیوانات کے ناموں کے پہلے حروف کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر مقالے میں مندرجہ ذیل امور پر بحث کی گئی ہے (۱) حیوانی نام کے لسانی پہلو (۲) حیوان اور اس کی عادات کی تفصیل (۳) حدیث کی کتابوں میں حیوانات کا ذکر (۴) بحیثیت غذا مختلف حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کے متعلق مختلف مذاہب کی رائے (۵) حیوانات کے نام سے تعلق رکھنے والی ضرب الامثال (۶) ہر حیوان کے اعضا اور اجزا کے طبی اور دیگر خواص (۷) مختلف حیوانات کے خواب میں دکھائی دینے کی تعبیر۔ کتاب میں ۱۰۶۹ مقالات ہیں جن کی بنیاد سینکڑوں ماخذ پر رکھی گئی ہے۔

دندان، ابوجعفر احمد

بن حسین، تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کا شیعی محدث۔ ان کا باپ ایک معتبر راوی تھے جس نے امام علی رضاؑ، امام محمد جوادؑ اور امام علی نقیؑ سے احادیث روایات کی ہیں۔ دندان نے بھی اپنے والد کے شیوخ کی سند پر احادیث روایت کی ہیں لیکن چونکہ وہ غلاۃ میں سے متصور ہوتے تھے اس لئے بطور راوی حدیث ان کی ذات قابلِ گرفت سمجھی جاتی رہی ہے۔ دندان قم میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔

دوارد

جنوبی حبشہ (ایتھوپیا) کی مسلم ریاست۔ اس کا ذکر حبشہ کے وقائع ناموں میں پہلے پہل عامدہ صیون اول کے عہد (۱۳۱۲ء ـــــ ۱۳۴۲ء) میں آیا ہے۔ حبشہ

Marfat.com

کی دیگر مسلم ریاستوں کی طرح دوارو بھی الگ بادشاہ کے زیرِ حکومت تھا۔ یہ بادشاہ، شاہِ حبشہ کا باجگزار ہوتا تھا۔ العمری کے بیان کے مطابق گو اس کا طول فقط پانچ دن اور عرض دو دن کی مسافت کے برابر تھا پھر بھی اس ریاست کی فوج بڑی طاقتور تھی۔ یہاں کے باشندے حنفی مسلمان تھے۔

دوبئی

دیکھئے متحدہ عرب امارات

دوزخ

دیکھئے جہنم

دوست محمد امیر

(وفات ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ / ۹ جون ۱۸۶۳ء) افغانستان میں بارک زئی حکومت کا بانی اور پائندہ خاں کا بیسواں فرزند۔ محمود شاہ کی دوسری بار حکومت کے زمانے میں دوست محمد ممتاز عہدوں پر فائز رہا۔ دوست کا بھائی فتح خاں محمود شاہ کا وزیر تھا۔ محمود نے فتح خاں کی طاقت پر حسد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نکلوا کر اسے قتل کرا دیا۔ دوست محمد نے کشمیر میں فوج اکٹھی کر کے کشمیر اور کابل پر قبضہ کر لیا اور شہزادہ سلطان علی کو وہاں کا حکمران بنا دیا۔ محمود نے اسے بے دخل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا تاہم سلطان علی نے کابل اپنے بھائی محمد اعظم خاں کے حوالے کر دیا۔ محمد اعظم خاں اس سے قبل کشمیر کا گورنر رہ چکا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں اعظم کی وفات کے بعد دوست محمد نے اعظم کے بیٹے اور وارثِ تخت حبیب اللہ خاں کو شکست دی۔ لیکن کابل اس کے ایک اور بھائی سلطان محمد خاں پشاوری کو ملا۔ ۱۸۲۶ء میں دوست محمد کابل میں تخت نشین ہوا۔ ۱۸۳۴ء میں اس نے امیر کا لقب اختیار کیا۔ ۱۸۳۹ء میں شاہ شجاع اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریز فوجوں نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے ۵ مئی ۱۸۳۹ء کو شجاع کو کابل کا فرمانروا بنا دیا۔ ۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو دوست محمد نے انگریز فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مئی ۱۸۴۱ء میں اسے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ دوست محمد کے بیٹے اکبر خاں نے شاہ شجاع کو قتل کر کے کابل پر قبضہ کر لیا۔ نومبر ۱۸۴۲ء میں دوست محمد خاں کو رہائی ملی اور وہ کابل پہنچا۔ دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد اس نے ۱۸۵۰ء میں بلخ اور خلم، ۱۸۵۴ء میں شبرغان، ۱۸۵۵ء میں میمنہ اور اندخوئی اور ۱۸۵۹ء میں کندز فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ ۱۸۵۵ء میں قندھار اور ۱۸۶۳ء میں ہرات فتح کیا۔ اس نے غلزئیوں کی طاقت کو ختم کر دیا۔ ممتاز قبائلی سرداروں کو قتل، قید اور بعض کو جلاوطن کر دیا دوست محمد کا تمام تر انحصار اپنے بیٹوں پر تھا جنہیں اس نے اہم علاقوں میں گورنر مقرر کر رکھا تھا۔ اس نے افغانستان جدید کی جغرافیائی حدود کو مضبوط بنایا اور داخلی استحکام کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بیٹوں میں محمد افضل خاں، محمد اعظم خاں، ولی محمد خاں، محمد اکبر خاں، شیر علی خاں محمد امین خان اور محمد شریف خاں قابلِ ذکر ہیں۔ دوست محمد کی وفات کے بعد شیر علی خاں تخت نشین ہوا۔

دولت آبادی

(وفات ۸۴۸ھ / ۱۴۴۵ء) شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر زاولی الہندی، ممتاز ہندوستانی عالم۔ دکن کے شہر دولت آباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں شیخ نصیر الدین چراغ کے مستند شاگردوں قاضی عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی سے تعلیم حاصل کی۔ امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو شہاب الدین دہلی چھوڑ کر جونپور آ گئے۔ جہاں سلطان ابراہیم شرقی نے انہیں اپنی سلطنت کا قاضی القضاۃ مقرر کیا اور "ملک العلماء" کا خطاب عطا کیا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان شرقی نے دربار میں شہاب الدین کے لئے چاندی کی ایک خاص کرسی مہیا کی گئی تھی۔ وہ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ان کی درج ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) شرح الہندی "کافیہ" کی شرح (۲) شرح اصول البزدوی (۳) العقائد الاسلامیہ، علم کلام پر ہے (۴) الارشاد، عربی نحو پر (۵) مصدق الفضل مشہور قصیدہ "بانت سعاد" کی شرح (۶) بحر المواج، قرآن مجید کی فارسی تفسیر (۷) تاریخ المدینہ (۸) فتاویٰ ابراہیم شاہی (۹) بدائع البیان (۱۰) مناقب السادات، آلِ رسول کے فضائل و حقوق پر۔

دولت سامیہ ملتان

قبیلہ مضر کی شاخ کنانہ میں فہر بن مالک پیدا ہوئے جن کا لقب قریش تھا اسی کی مناسبت سے پورا قبیلہ قریش مشہور رہا۔ فہر کے پوتا لوئی بن غالب بن فہر سے کئی قریش خاندانوں کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ لوئی بن غالب کے سات بیٹے تھے کعب، عامر، سامہ، خزیمہ، حارث اور عوف۔ کعب بن لوئی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسبی تعلق ہے اور سامہ بن لوئی سے ملتان کے سامی حکمران ہیں۔ سامہ بن لوئی نے مکہ سے نکل کر عمان میں سکونت اختیار کی، وہیں فوت ہوا اور اس کی اولاد وہیں آباد ہوئی اور بنو ناجیہ کے نام سے موسوم ہوئی سامہ کی اہلیہ کا نام ناجیہ بنت جرم بن ربان ہے۔ اسی ناجیہ کی طرف اس کے شوہر کی اولاد منسوب ہو کر بنو ناجیہ کہلائی۔ عمان میں بنو سامہ کا اقتدار ۲۷۹ھ اور ۲۸۶ھ کے درمیان شروع ہو کر ۳۰۵ھ میں ختم ہو گیا۔

بنو سامہ کے ایک غلام فضل بن ماہان نے ۱۹۸ھ اور ۲۱۸ھ کے درمیان عہد مامونی میں ہندوستان کے علاقہ سندان میں حکومت قائم کر لی تھی۔ محمد بن قاسم سامی (یہی محمد بن قاسم بن منبہ ہے) نے ۲۸۰ھ سے قبل متغلب حاکم سے مقابلہ کر کے ملتان فتح کیا اس نے ملتان میں سامی حکومت قائم کر کے اسے مرکزِ خلافت سے وابستہ رکھا اور عباسی خلفا کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ ملک سے تمام خرابیوں کو دور کیا۔ قرب و جوار کے ہندو مہاراجوں سے جنگ کر کے ان کی طاقت توڑی اور اپنی ساکھ قائم کی۔ ملتان میں سامی حکومت کا تذکرہ سب سے پہلے ابن رستہ نے "الاعلاق النفیسہ" میں کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے "ملتان میں ایک قوم ہے جو اپنے کو سامہ بن لوئی کی اولاد بتاتی ہے اور ان کو وہاں بنو منبہ کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ ہندوستان میں ملتان پر حکمران ہیں۔ یہ امیر المؤمنین کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ملتان منصورہ سے ملا ہوا ہے۔ ملتان میں ایک بت خانہ ہے جس کی آمدنی بہت زیادہ ہے۔ بنو منبہ کی دولت اسی بت خانہ کی آمدنی سے ہے۔ اس کی آمدنی بے حساب ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے راجے بنو منبہ سے جنگ کے لئے ملتان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور بنو منبہ اپنی خوش حالی، طاقت اور مالداری کی وجہ سے ان پر غالب آ جاتے ہیں"۔

ملتان میں بنو سامہ کی حکومت کا ذکر ابن رستہ کے بعد مسعودی نے اپنی کتاب "مروج الذہب" میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "ملتان میں میرا جانا ... کے بعد ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کا بادشاہ ابو اللہاب منبہ بن اسد قرشی تھا جو بنو سامہ بن لوئی

بن غالب کی اولاد سے ہیں۔ مسعودی کے تقریباً چالیس سال بعد ۳۴۰ھ کے حدود میں ابو اسحاق ابراہیم فارسی اصطخری نے "مسالک والممالک" میں ملتان اور اس کے سامی حکمرانوں کا تذکرہ یوں لیا ہے "شہر ملتان کے باہر آدھے فرسخ کی دوری پر بہت سی عمارتیں ہیں۔ اس بستی کو جندراور کہتے ہیں۔ یہ امیر ملتان کا فوجی کیمپ ہے۔ وہ اسی جگہ مستقل سکونت پذیر ہے۔ صرف جمعہ کے دن ملتان جاتا ہے۔ ہاتھی پر سوار ہو کر نماز جمعہ کے لئے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ ملتان کا امیر ایک قرشی ہے جو سامہ بن لوئی کی اولاد سے ہے۔ اس نے ملتان پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ امیر منصورہ کا مطیع نہیں ہے بلکہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے"۔ اسی کتاب میں اصطخری نے ملتان کے مشہور بت اور بت خانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "جو مال بھی اس بت کی نذر کیا جاتا ہے اسے امیر ملتان بت خانہ کے پجاریوں اور محافظوں پر خرچ کرتا ہے جب ہندو راجے ملتان پر چڑھائی کرتے ہیں اور اس بت کو بنوسامہ سے چھینا چاہتے ہیں تو امیر ملتان بت کو توڑنے اور جلانے کی دھمکی دیتے ہیں جس کی وجہ سے حملہ آور واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہندو راجے ملتان کو یقیناً ویران اور تباہ کر دیتے۔ ملتان میں کئی مضبوط قلعے ہیں اس کی سرسبزی اور آبادی منصورہ کے مقابلہ میں کم ہے"۔

اصطخری کے پندرہ بیس سال بعد ابن حوقل تاجر بغدادی (موجود ۳۵۸ھ) نے اپنی کتاب "صورالارض" میں ملتان کے سامی امیر کا یوں ذکر کیا ہے "ملتان کے باہر نصف فرسخ پر امیر کی لشکر گاہ ہے یہ امیر سامہ بن لوئی بن غالب کی اولاد سے ہے اور وہ کسی کی اطاعت و ماتحتی میں نہیں بلکہ بنی عباس کا خطبہ پڑھتا ہے"۔ یہ تحریر ملتان میں بنوسامہ کی حکومت کی آخری شہادت ہے۔ ۳۶۰ھ تا ۳۷۵ھ کا زمانہ بنوسامہ کے خاتمہ اور باطنیوں کے قبضے کا ہے۔ بنوسامہ کے بعد ملتان کے اسمٰعیلی شیعی حکمرانوں میں سب سے پہلا نام جلیم بن شیبان کا ملتا ہے جس نے سب سے پہلے ملتان کی سنی حکومت کو ختم کر کے یہاں اسمٰعیلی حکومت قائم کی۔ ملتان کے بنوسامہ کے بارے میں اگرچہ ایسی کوئی تصریح نہیں ملتی لیکن قرائن سے ان کا سنی ہونا یقینی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ عمان کے سنی بنوسامہ کے خاندان سے تھے دوسرے یہ کہ وہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے۔ تیسرے یہ کہ جمعہ کی نماز بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے۔ سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسمٰعیلی شیعوں نے ان کی حکومت ختم اگر وہ بھی اسمٰعیلی شیعہ ہوتے تو افریقہ کے عبیدیوں کا پروانہ ان کے پاس آتا اور بنوسامہ کو ختم کر کے شیعی حکومت قائم کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

وزیر مہلبی نے "احسن التقاسیم" میں لکھا ہے کہ ملتان کی عملداری لمبی چوڑی ہے۔ مغرب کی طرف حد ودمکران تک اور جنوب کی طرف منصورہ تک ہے۔ مسعودی نے "مروج الذہب" میں ملتان کی حدود میں ایک لاکھ بیس گاؤں بتاتے ہیں اور لکھا ہے کہ ملتان مسلمانوں کی بڑی سرحدوں میں سے ہے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ۳۰۳ھ سے پہلے اور اس کے بعد قنوج، ملتان کی حدود میں تھا۔ قنوج کے واسطے سے لاہور بھی مملکت ملتان میں شامل تھا۔

مملکت ملتان کے عوام کی پوشش اور لباس پر ہندوانہ طرز غالب تھا مسلمان اور ہندو دونوں کے سر پر بڑے بڑے بال اور جسم پر تہبند اور چادر ہوتی تھی۔ اہل ملتان کا عام لباس تہبند اور چادر تھا۔ باشندوں کا رنگ گندمی اور سیاہ دونوں قسم کا تھا۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ ملتان اور اس کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی تھی۔ مقدسی نے لکھا ہے کہ ملتان شہر میں فارسی بھی سمجھی جاتی ہے۔ شہر ملتان تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ عوام میں بڑی خوشحالی اور مرفہ الحالی تھی۔ ایک درہم میں تیس سیر روٹی دستیاب تھی اس سے اشیاء کی ارزانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں منصورہ کے بعد ملتان دوسرا بڑا مرکز تھا۔ جہاں اسلامی علوم و فنون اور مسلم تہذیب و ثقافت کی بہاریں صدیوں تک قائم رہیں۔ ابو دلف نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ ملتان میں اسلام کو ظہور و غلبہ حاصل ہے اور یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عام ہے۔ مملکت ملتان کی غالب آبادی غیر مسلموں کی تھی۔ مسلمان زیادہ تر مرکزی شہروں میں رہتے تھے۔ پورے سامی دور حکومت میں غیر مسلموں پر ظلم و ستم کا پتہ نہیں چلتا۔ ملتان کے علاوہ قنوج اور لاہور بھی مسلمانوں کے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے ملتان میں سامی دور میں جو علماء پیدا ہوئے ان کے نام سامی حکمرانوں کی طرح ناپید ہیں لاہور کے چند قدیم علماء کے حالات ملتے ہیں جنہوں نے اپنے دور میں عالمی شہرت پائی۔ ان کا شمار سامی دور حکومت کے حسنات و برکات میں ہوتا ہے۔ ان علماء میں شیخ اسمٰعیل لاہوری ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن لاہوری، ابوحسن علی بن عمرو بن حکم لاہوری اور عمرو بن سعید لاہوری شامل ہیں۔

دولت شاہ، امیر

(وفات ۸۹۲ھ/ ۱۴۸۷ء؟) بن علاءالدولہ بختی شاہ، ایک ایرانی مصنف یہ خراسان کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ اس کی کتاب "تذکرۃ الشعراء سات حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصے میں بیس یا کچھ کم شاعروں کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان ملوک اور سلاطین کا بھی حال لکھا ہے جو اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ آخری حصہ ان سات شاعروں کے لئے وقف ہے جو مصنف کے ہمعصر تھے۔ شاعروں کے کلام کا نہایت عمدہ انتخاب دیا گیا ہے۔

دولت ماہانیہ سنجان

ہندوستان کی خود مختار مسلم ریاست سنجان (سندان) ۱۹۸ھ سے ۲۲۷ھ تک قائم رہی۔ سندان موجودہ مہاراشٹر اور گجرات کے درمیان بمبئی سنٹرل ریلوے سٹیشن سے شمال کی طرف ۱۴۵ کلومیٹر پر اور سورت سے جنوب کی طرف ۱۱۸ کلومیٹر پر ایک معمولی سٹیشن ہے۔ قدیم عرب جغرافیہ نویس اور مؤرخ اسے سندان لکھتے ہیں۔ موجودہ مقامی زبان میں اسے سنجان کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ بلاد ہند کا مشہور شہر اور بندرگاہ تھی اور یہاں بحری تجارت کی عالمی منڈی تھی۔ اصطخری نے مسالک الممالک میں لکھا ہے کہ سندان سمندر سے نصف فرسخ پر واقع ہے۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر میں سندھ میں خود مختاری، اقتدار و غلبہ، قبائلی عصبیت اور مذہبی چپقلش سے ہر طرف بے اطمینانی برپا تھی۔ سندھ کا علاقہ چونکہ مرکز خلافت بغداد سے بہت دوری پر تھا اس لئے خلافت کے مخالفین قرامطہ، خوارج، روافض، اسمٰعیلی ملاحدہ وغیرہ ان اطراف کو اپنی معاندانہ سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ ان ناگوار حالات میں بنو سامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے سندھ کی الجھنوں سے ہٹ کر ہندوستان کے ایک مشہور شہر سندان پر قبضہ کر لیا۔ یہ گجرات کے مہاراجگان بلہرا کا مقبوضہ علاقہ تھا۔ فضل بن ماہان نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر کے دوراندیشی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر براہ راست خلافت عباسیہ سے تعلق قائم کر لیا۔ جس سے سندان خلافت کی قلمرو میں شامل ہو گیا اور یہ چھوٹی سی مسلم حکومت محفوظ و مامون ہو گئی۔ دولت ماہانیہ سندان کی داستان بلاذری کی اس تصریح کی رہین منت ہے: "منصور بن حاتم کا بیان ہے کہ فضل بن ماہان مولیٰ بنی سامہ نے سندان فتح کر کے اس پر غلبہ حاصل کر

Marfat.com

لیا اور خلیفہ مامون کی خدمت میں ہاتھی کا تحفہ بھیجا اور اس سے خط و کتابت جاری رکھی اور اس کے لئے سندان کی جامع مسجد میں دعا کی۔ جب فضل بن ماہان کا انتقال ہوا تو اس کا لڑکا محمد بن فضل بن ماہان جانشین ہوا اور ستر جہازوں کا بحری بیڑا لے کر ہندوستان کے مید یعنی سمندری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے نکلا اور ان کی بہت بڑی تعداد کو ختم کیا اور پالی (پالی تھانہ سوراشٹر) کو فتح کیا مگر جب سندان واپس آیا تو اس کا بھائی ماہان بن فضل بن ماہان حکومت پر قبضہ کر چکا تھا اور اس نے امیر المؤمنین معتصم باللہ سے تعلق پیدا کر کے مراسلت جاری کر لی اور اس کی خدمت میں ساگوان کا تحفہ بھیجا جو اتنی بڑی اور لمبی تھی کہ اس کی مثال دیکھنے میں نہیں آئی مگر ہندوستان کے لوگ اس کے بھائی محمد بن فضل کے طرفدار تھے اس لئے انھوں نے ماہان بن فضل کو قتل کر کے سولی دے دی۔ اس کے بعد اہل ہند سندان پر قابض ہو گئے اور وہاں کی جامع مسجد کو مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا تاکہ اس میں وہ نماز باجماعت اور جمعہ پڑھیں اور خلیفہ کے لئے دعا کریں"۔

سندان کی دولت ماہانیہ میں تین حکمران گزرے ہیں، (۱) بانی دولت فضل بن ماہان (۲) محمد بن فضل بن ماہان (۳) ماہان بن فضل بن ماہان۔ دولت ماہانیہ کے بانی فضل بن ماہان نے سندان میں ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی جس میں مقامی مسلمان جمعہ اور پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرتے۔ اس سے پہلے ابوجعفر منصور کے دور میں سندان کے قریب گندھارا میں عمرو بن جمل نے فتح کے بعد ایک مسجد تعمیر کی تھی لیکن سندان کی جامع مسجد اپنی شان و شوکت اور پائداری کے اعتبار سے بلاد بھرا میں اسلام کا پہلا قلعہ تھی اور مدتوں اسی شان سے قائم رہی۔ سندان کی یہ حکومت چونکہ شخصی تھی اس لئے فضل بن ماہان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا محمد بن فضل جانشین ہوا۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی اس کی حدود بڑھانے اور مزید امن و امان قائم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ سندان اہم ترین بندرگاہ تھی جہاں سے سیراف، بصرہ، عدن، حبشہ، سرندیپ اور چین تک تجارتی جہاز آتے جاتے تھے اس لئے محمد بن فضل نے اپنے دور میں بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کیا۔ وہ بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے ستر جہاز لے کر نکلا۔ بحری قزاقوں کی آبادیاں گجرات سے سندھ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ قزاق مالابار، گجرات، سندھ بلکہ سقوطرہ تک کی بحری راہ مسافروں اور تاجروں پر تنگ کیے ہوئے تھے۔ اسی گروہ نے راجہ داہر کے زمانے میں سندھ میں ایک جہاز کو لوٹا جس کے نتیجے میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔

بحری قزاقوں کو شکست دینے کے بعد محمد بن فضل نے پالی کو فتح کر کے مسلم ریاست کا حلقہ وسیع کیا۔ پالی سوراشٹر میں گھوگھ بندرگاہ کے قریب واقع ہے۔ جب وہ اس مہم سے کامیاب واپس آیا تو سندان کا نقشہ ہی اور بن گیا تھا۔ اس کے بھائی ماہان بن فضل نے اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سندان پر قبضہ کر لیا تھا اور امیر المؤمنین معتصم باللہ سے سرکاری طور پر مراسلت جاری کر لی تھی۔ ماہان کی یہ بغاوت سندان کی خود مختار حکومت کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ ہندوؤں نے محمد بن فضل کا ساتھ دے کر ماہان کو سولی پر لٹکا دیا اس کے بعد ہندوؤں نے خود سندان پر قبضہ کر لیا اس طرح سندان کی اٹھائیس سالہ دولت ماہانیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

سندان کے امرائے بنو ماہان اپنے آقا بنو سامہ کی طرح اہل سنت والجماعت میں سے تھے اور جس طرح بنو سامہ، عمان اور ملتان میں اپنی حکومتیں قائم کر کے خلفائے عباسیہ کے نام کا خطبہ پڑھ کر خلافت کے طرفداروں میں تھے اسی طرح ان کے موالی بنو ماہان سندان کے متعینہ علاقہ میں خلفائے اسلام کا خطبہ پڑھ کر ان کے حق میں منبروں پر دعائے خیر کرتے تھے۔ سندان کی شاندار حکومت اور مسلمانوں کے بلند کیا ہوئے مملکت بلہرا کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور یہاں عوام اور راجگان اسلام اور مسلمانوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ سندان کی مسلم حکومت کے ختم ہونے پر بھی یہاں کی مسجدوں اور میناروں سے اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا۔ سندان اور اس کے اطراف و جوانب کے ساحلی علاقہ کی زبان بحر لاروی کی نسبت سے لاریہ تھی جسے اب کوکنی یا مرہٹی کہتے ہیں۔ ماہانیوں کا اٹھائیس سالہ دور حکومت عالم اسلام میں وہ مقام و شہرت نہ پا سکا جو اسے اسلامی علوم و فنون اور مسلم تہذیب و ثقافت کا ایک مرکز بنا سکے۔ اس وقت مسلمانوں کا مرکز سندھ تھا۔ البتہ تیسری اور چوتھی صدی کے بعد سندان اپنی گزشتہ روایت و عظمت کی وجہ سے پرکشش ہو گیا۔

سندان عرب اور چین کے درمیان بحری تجارت کا چوراہا تھا۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ سندان قسط، بانس اور بید کا دیس ہے۔ یہاں پر چاول، شہد، ناریل، کیلے، آم، مرچ، ساگوان بکثرت ہوتے تھے اور بھاری تعداد میں عرب ممالک کو بھیجے جاتے تھے۔ سندان صنعتی مقام بھی تھا یہاں کی کئی صنعتیں عرب ممالک میں مشہور تھیں۔ خاص طور پر یہاں کے بنے ہوئے جوتے اور کپڑے بڑی شہرت رکھتے تھے۔

دولت متغلبہ طوران

ایک مسلم ریاست جو ۳۴۰ھ سے ۱۷۰ھ تک قائم رہی۔ طوران کسی زمانے میں سندھ کا ایک صوبہ تھا۔ طوران کے مغرب میں کرمان کا ملک اور سجستان کا ریگستانی علاقہ تھا۔ مشرق میں بحر فارس، شمال میں بلاد ہند اور جنوب میں مکران واقع تھا۔ طوران میں حسب ذیل شہر اور مقامات تھے: محالی، کیز، کانان، سوسہ، قصدار، قندابیل، بجشرد، کشرد، خوزی، رست کہن، رستاق روذ، موردان، رستاق ماسکان اور کیرکوہ۔ قصدار، طوران کا قدیم دارالسلطنت اور مرکزی شہر تھا۔ اس کا موجودہ نام خضدار ہے اور آجکل یہ قلات ڈویژن کا جدید صدر مقام ہے۔ قندابیل بہت بڑا شہر تھا۔ ابوالفدا نے تقویم البلدان میں اسے طوران کا دارالسلطنت بتلایا ہے۔ اس کا موجودہ نام گندھاوا (گنداوہ) ہے۔ درہ بولان اسی میں واقع ہے۔

۳۴۰ھ کے حدود میں مغیرہ بن احمد نے اس مملکت کی بنیاد رکھی۔ اس نے طوران پر قبضہ کر کے خلیفہ کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اس نے خود اقتدار و غلبہ حاصل کیا تھا۔ اس کی حکومت موروثی اور خاندانی نہیں تھی۔ اپنی حکومت میں وہ بالکل خود مختار اور آزاد تھا۔ اس نے طوران کے مرکزی شہر قندابیل اور قصدار سے الگ ایک تیسرے مقام کیزکان کو اپنا مستقر بنایا۔ جیسے منصورہ، ملتان اور مکران کے اکثر متغلب حکمرانوں نے مرکزی شہر سے ہٹ کر کسی چھوٹے سے مقام کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ مغیرہ بن احمد کے بعد بصرہ کا ابوالقاسم حکمران ملتا ہے جس کے بارے میں ابن حوقل کا بیان ہے کہ "طوران پر اہل بصرہ میں سے ایک شخص ابوالقاسم حکومت کرتا ہے۔ وہی حاکم ہے قاضی بھی اور فوج کا امیر بھی۔ اس کے باوجود اس کی جہالت کا یہ حال تھا کہ تین اور دس میں تمیز تک نہیں کر سکتا۔" اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالقاسم کا مغیرہ بن احمد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مغیرہ خارجی نہیں تھا بلکہ اہل سنت والجماعت میں سے تھا۔ مقدسی بشاری نے اپنی کتاب "احسن التقاسیم" (تالیف ۳۷۵ھ) میں لکھا ہے کہ دارالسلطنت قصدار کے دو حصے ہیں اور درمیان میں خشک وادی ہے ایک حصہ میں قلعہ ہے اور یہیں بادشاہ بھی رہتا ہے جو عادل و متقی ہے

Marfat.com

[illegible] کے بعد ہوئے۔ یاقوت حموی کی "معجم البلدان" کے مطابق چوتھی صدی کے آخر میں قصدار پر کسی [illegible] کی حکومت تھی جو خوارج کا مذہبی پیشوا بھی تھا۔ اس لیے دور میں خوارج کو یہاں بڑی شان و شوکت حاصل تھی۔ ۳۸۰ھ کے حدود میں سبکتگین نے قصدار پر قبضہ کر کے یہاں کے بادشاہ کو سامانی بادشاہ کا مطیع و باجگذار بنا دیا۔ ۴۰۲ھ میں سلطان محمود غزنوی نے قصدار پر فوج کشی کر کے فتح پائی اور وہاں کے سلطان کو اپنا مطیع و باجگذار بنایا۔ ۵۷۱ھ میں غوری سلطنت کے پرشکوہ حکمران ابوالفتح غیاث الدین غوری نے طوران کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

طوران کے امراء و سلاطین کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ شروع سے آخر تک ان کے یہاں نہ کوئی ذمہ دار حکومت تھی اور نہ کوئی باقاعدہ حکمران تھا۔ بلکہ اس دشوار گزار علاقہ میں جس کا بس چلتا وہی اپنی حکومت قائم کر لیتا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ نہایت متمدن اور یہاں کے باشندے عموماً خوارج تھے اس لئے وہ کسی حکمران اور متغلب سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ طوران کے متغلبین کے دو دور ہیں ایک وہ جس میں روسائے عرب قندابیل پر قابض ہوئے جن کو عمران بن موسیٰ برمکی نے ختم کیا اور ان کے بعد محمد بن خلیل نے قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کی۔ اس دور کے بعد سینکڑوں سال تک علاقہ طوران میں کوئی فتنہ برپا نہیں ہوا۔ یہ علاقہ براہ راست خلافت عباسیہ سے مربوط و متعلق رہا۔ اس کے بعد دوسرا دور معزہ بن احمد کے اقتدار سے ۳۴۰ھ میں شروع ہوا جو ۵۷۱ھ میں ختم ہوا۔ ان حالات میں مملکت طوران کے اندر کسی قابل ذکر ترقی کا پتا نہیں چلتا۔ دینی اور علمی میدان میں بھی کوئی خاص سرگرمی نظر نہیں آتی حالانکہ یہ دور اسلامی علوم و فنون کا دور بہار تھا اور مسلمانوں کی بستیاں علم اور اہل علم کے وجود سے معمور تھیں۔ پورے علاقہ طوران میں خوارج کا غلبہ تھا اور عام طور پر حکمران خارجی ہوا کرتے تھے۔ ان خاص معتقدات کی بنا پر عوام اور حکمران طبقوں میں مذہبی تشتت و تعصب پایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہاں امن و امان تھا اور دینی و اخلاقی قدریں پورے علاقے میں موجود تھیں۔ ذیل کے واقعہ سے طوران کے امن و امان، اخلاق و عادات اور عوام کے دینی حالات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

قاضی ابو علی تنوخی (متوفی ۳۸۴ھ) نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ فرقہ ہاشمیہ کے معتزلی متکلم و فلسفی ابوالحسن بن لطیف نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ قصدار کے علاقہ سے گزر رہا تھا جہاں خوارج کا خلیفہ مقیم تھا۔ میں نے ایک گاؤں میں ایک بوڑھے درزی کو دیکھا جو ایک مسجد میں تھا۔ میں اسے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی دے کر باہر تربوز کے ایک کھیت میں چلا گیا۔ میں نے کھیت سے ایک تربوز خرید کر کھایا جس سے فوراً بخار میں مبتلا ہو گیا۔ رات بھر اسی کھیت میں پڑا رہا۔ جب طبیعت سنبھلی اور دوسرے دن مسجد میں آیا تو دیکھا کہ درزی غائب ہے اور کپڑوں کی گٹھڑی اسی طرح محراب میں پڑی ہے۔ ابھی میں اپنے سامان کی جانچ پڑتال کر ہی رہا تھا کہ درزی آگیا میں نے کہا تم میرے کپڑے یہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ درزی نے کہا کہ میں ان کپڑوں کو رات یہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس پر میں اس سے الجھتا رہا اور وہ ہنسی میں ٹالتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ تم لوگوں نے گندی باتوں اور برے اخلاق کی عادت ڈال رکھی ہے تم لوگوں کی نشوونما بلاد کفر میں ہوئی ہے جہاں چوری اور خیانت کی وبا عام ہے۔ ہم لوگ یہاں ان باتوں کو جانتے تک نہیں۔ اگر تمہارا کپڑا یہاں پڑا پڑا پرانا ہو جاتا تب بھی اسے کوئی نہ پوچھتا۔ اگر تم مشرق و مغرب کا چکر کاٹ کر آؤ تب بھی یہ کپڑا اسی محراب میں ملے گا۔ ہم لوگ چوری اور فتنہ فساد نہیں جانتے۔ کئی کئی سال کے بعد جب اس قسم کی کوئی بات ہو جاتی ہے تو ہم اسے کسی اجنبی اور پردیسی کی حرکت سمجھتے ہیں۔ ہم یا اسے پکڑ کر قتل کر دیتے ہیں یا اس کا ہاتھ کہنی سے کاٹ دیتے ہیں۔ ابوالحسن بن لطیف کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد میں نے مختلف طریقوں سے قصدار کے لوگوں کے حالات معلوم کیے تو واقعی درزی کی بات صحیح نکلی۔ یہاں تک کہ لوگ راتوں کو گھر کے دروازے تک بند نہیں کرتے۔ بہت سے مکانات میں تو دروازے ہی نہیں ہیں۔

سو یہ طوران مجموعی اعتبار سے خشک و گرم تھا۔ زمین پہاڑی اور ریگستانی تھی مکانات زیادہ کچے تھے پانی کی کمی تھی۔ دریا اور ندیاں بہت کم تھیں۔ طوران کا علاقہ اگرچہ پہاڑی اور صحرائی تھا لیکن تجارت کا مرکز تھا۔ تاجروں کے مستقل مکانات، مال گودام اور سامان تجارت تھے۔ خراسان، ایران، کرمان اور ہندوستان کے تاجر یہاں آتے جاتے اور قیام کرتے تھے۔ اس علاقہ میں پیداوار کی کمی کے باوجود جنسوں کی فراوانی اور ارزانی کا حال یہ تھا کہ چالیس سیر گیہوں چار درہم سے آٹھ درہم میں ملتا تھا۔ طوران کی حکومت نے درآمدی برآمدی سامان پر محصول عائد کر رکھا تھا۔ محصول سے دس لاکھ درہم سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اصطخری نے اپنی کتاب "المسالک والممالک" میں لکھا ہے کہ طوران کے مسلمانوں اور کافروں کا لباس اور سر کے بال بڑھانے اور لٹکانے کا طریقہ ایک ہی قسم کا تھا۔ ان کا لباس چادر اور تہبند تھا۔

دولت معدانیہ مکران

حدود ۳۴۰ھ میں عیسیٰ بن معدان مہراج نے مکران پر غلبہ و اقتدار حاصل کر کے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کیا۔ یہی دولت معدانیہ مکران کا بانی تھا۔ اس کا تذکرہ سب سے پہلے اصطخری نے اپنی کتاب "مسالک والممالک" میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"عیسیٰ بن معدان نامی ایک شخص مکران پر قابض و دخیل ہے جسے لوگ اپنی زبان میں مہراج کہتے ہیں اس کی جائے قیام شہر کیز ہے۔" یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکران پر ایک شخص ۳۴۰ھ کے حدود میں قابض ہو گیا۔ ان دونوں بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن معدان پہلا شخص حکمران تھا جس نے مکران میں حکومت قائم کی۔ وہ خلفائے عباسیہ کا خطبہ نہیں پڑھتا تھا اور نہ ہی کسی کی اطاعت و امان میں تھا۔

پانچویں صدی کے ربع اول میں مکران کے دوسرے حاکم معدان بن عیسیٰ بن معدان کا پتا چلتا ہے جو مکران کے دارالسلطنت تیز میں رہتا تھا۔ اس کا انتقال ۴۲۲ھ میں یا اس سے کچھ پہلے ہوا۔ ابن اثیر نے اپنی کتاب "کامل ابن اثیر" میں لکھا ہے کہ: "۴۲۲ھ میں سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود نے تیز کی طرف فوج روانہ کی۔ اس پر اور اس کے اطراف پر قبضہ کیا۔ اس کی طرف فوج کشی کی وجہ یہ ہوئی کہ مکران کے بادشاہ معدان نے انتقال کیا اور اس نے دو لڑکے چھوڑے"۔

دولت معدانیہ مکران کا تیسرا حکمران عیسیٰ بن معدان تھا۔ ۴۲۲ھ میں جب معدان بن عیسیٰ کا انتقال ہوا تو اس نے دو بیٹے ابوالعساکر اور عیسیٰ چھوڑے۔ عیسیٰ نے خزانے پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ابوالعساکر نے خراسان جا کر اپنے بھائی کے مقابلے کے لیے سلطان مسعود سے مدد طلب کی۔ سلطانی فوج نے مکران پہنچ کر عیسیٰ کو اطاعت اور اپنے بھائی سے صلح کی دعوت دی لیکن وہ اٹھارہ ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کے لئے آگے بڑھا۔ جنگ میں عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پھر سنبھلا اور دوبارہ اپنے آدمیوں کو لے کر مقابلہ پر آیا اور عین معرکہ میں مارا گیا۔ ابوالعساکر نے مکران پر قبضہ کر کے تین دن تک لوٹ مار کی اور باشندوں کو زیر کیا۔ عیسیٰ کے بعد اس کا بھائی ابوالعساکر حسین بن معدان مکران کا حکمران بنا۔ وہ علم طب میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔ اس کی علم دوستی اور غیر ممالک کے اہل علم سے علمی مباحث و مسائل میں خط و کتابت

Marfat.com

دولت معدانیہ مکران

کا پتا چلتا ہے۔ اس نے سلطان مسعود کے نام کا خطبہ پڑھا اور اس کی اطاعت واذان میں اپنی حکومت قائم کی۔ ۵۷۱ھ میں سلطان غیاث الدین غوری کے ہاتھوں دولت معدانیہ مکران ختم ہوگئی۔ اس کی مدتِ حکومت ۱۲۱ سال ہے۔

معدانی حکمرانوں میں سے کسی کے بارے میں کسی سیاح یا مورخ نے یہ تصریح نہیں کی کہ وہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا یا خلافت عباسیہ سے تعلق رکھتا تھا یہ لوگ بالکل آزاد حکمران تھے۔ وہ نہ سُنّی تھے نہ شیعہ بلکہ وہ خارجی تھے۔ مسعودی نے "مروج الذہب" میں لکھا ہے کہ بلادِ مکران خارجیوں کا مسکن ہے۔ بنو معدان انھی خوارج میں سے تھے۔ دولتِ معدانیہ کے عام حکمران عادل و منصف اور شریف تھے۔ ان کے یہاں کبائر گناہ کا ارتکاب کفر تھا مقدسی نے "احسن التقاسیم" میں لکھا ہے کہ "مکران کا الگ بادشاہ ہے وہ متواضع، منکسر المزاج اور عادل و منصف ہے تم کو یہاں کے بادشاہوں کی مثال نہیں ملے گی" مقدسی نے ۳۷۵ھ سے پہلے کے حکمران کے بارے میں یہ بات بیان کی ہے۔

عرب جغرافیہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مکران ایک وسیع و عریض ولایت ہے جو ساحلِ سمندر پر واقع ہے اس میں بہت سے شہر و قریات ہیں۔ اس کے مغرب میں کرمان شمال میں سجستان جنوب میں سمندر اور مشرق میں ہندوستان ہے۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ مکران کا نام حضرت نوح علیہ اسلام کی اولاد میں مکران بن نازک بن سام بن نوح کے نام پر ہے جو بابل سے نکل کر اس علاقے میں آباد ہوگیا تھا۔ اصطخری نے ۳۴۰ھ کے حدود میں مکران کے شہروں میں یہ نام لکھے ہیں: کیز، تیز، فنز بود (پنجگور)، بہ، بند، قصر قند، درک، فاہ فزہ، ارمائیل اور قنبلی۔ مقدسی نے ۳۷۵ھ سے پہلے مکران کی وسعت بیان کرتے ہوئے بنجبور (پنجگور) کو یہاں کا دارالسلطنت بتایا ہے۔ اور شہروں میں مشکہ، کیبج، سرائے شہر، میر بور، خواش، دمندان، جالک، دزک، دشت علی اور تیز کے نام لکھے ہیں۔

مکران کے باشندے عموماً گندمی رنگ کے غیر مہذب اور جاہل تھے۔ مسلمانوں میں قابلِ ذکر علمی اور دینی زندگی کا ذوق نہیں تھا۔ عام لوگ خارجی عقیدہ کے تھے۔ ان کی زبان فارسی اور مکرانی تھی۔ بعض علاقوں میں بلوچی بھی رائج تھی۔ طرزِ زندگی عام طور سے ہندوانہ تھا اصطخری نے لکھا ہے کہ مکران کے لوگوں کا عام لباس کرتہ ہے۔ تاجر لوگ قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں۔ مقدسی نے مکران کا حال یوں بیان کیا ہے کہ اہل مکران میں کند ذہنی ہے ان کا رنگ گندمی ہے ان کی زبان وحشی ہے وہ کرتے پہنتے ہیں اور بالوں کو بڑھا کر لٹکاتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح کان چھدواتے ہیں۔ مکران میں جاٹوں کی آبادیاں زیادہ تھیں جو پھوس کے چھپروں میں رہتے تھے ان کا ذریعہ معاش مچھلیوں اور مرغابیوں کا شکار تھا۔ یہاں نہ کوئی قابلِ ذکر پیداوار ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی خاص صنعت و حرفت تھی۔ البتہ فانید (مٹھائی) مکران میں پورے عالم اسلام میں ہر جگہ سے اچھی اور زیادہ ہوتی تھی اور دنیا بھر میں بھیجی جاتی تھی۔

دولت ہباریہ منصورہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی حضرت ہبار بن اسود اسدی قرشیؓ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے۔ وہ بہت جری اور بہادر تھے۔ ان کی اولاد بھی اولوالعزمی سے متصف تھی۔ شام، بصرہ، سیراف، سندھ، بلخ اور مصر جہاں جہاں ان کی اولاد رہی غلبہ واقتدار اور شان و شوکت کی مالک بن کر رہی۔ انھی میں سے ایک شخص منذر بن زبیر ہباری قرشی ۱۰۵ھ میں سندھ آیا۔ سندھ میں اس کا خاندان وقت اور حالات کا منتظر رہا۔ یہاں تک کہ اس کے پوتے عمر بن عبدالعزیز بن منذر ہباری نے سندھ پر قبضہ کر کے منصورہ میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ ابن حزم کی صراحت ہے ۲۴۰ھ میں خلیفہ متوکل کے قتل کے فوراً بعد وہ سندھ کا حاکم بن گیا تھا۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے کہ جب سندھ کے عامل ہارون بن خالد نے ۲۴۰ھ میں انتقال کیا تو عمر بن عبدالعزیز نے جو سندھ پر قابض تھا دربار خلافت کو لکھ کر سندھ کی ولایت حاصل کی۔

دولت ہباریہ منصورہ کے بانی عمر بن عبدالعزیز بن منذر ہباری قرشی کے علاوہ دیگر حکمرانوں کا پتا نہیں ملتا صرف مسعودی نے اپنے ایک معاصر ہباری حکمران عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ابن حزم متوفی ۴۵۶ھ نے جمہرۃ الانساب میں عمر بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ سندھ کی حکومت اس کی اولاد میں چلی یہاں تک کہ اس خاندان کی حکومت ہمارے زمانہ میں سلطان محمود بن سبکتگین کے دور میں ختم ہوئی۔ زبیر بن بکار متوفی ۲۵۶ھ نے لکھا ہے کہ سندھ کا حاکم آج کل عمر بن منذر کی اولاد میں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۵۶ھ میں عمر کے بجائے اس کی اولاد سندھ پر حکمران تھی۔ ابن حوقل بغدادی (۳۵۸ھ) نے لکھا ہے کہ سندھ کے باشندے مسلمان ہیں۔ یہاں کا بادشاہ ہبار بن اسود کی اولاد سے ہے۔ اصطخری (۳۴۰ھ) نے مسالک والممالک میں لکھا ہے کہ سندھ کے باشندے مسلمان ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کا بادشاہ ہبار بن اسود کی اولاد سے ہے۔ مقدسی بشاری نے لکھا ہے کہ شاہان منصورہ خلیفہ عباسی کا خطبہ پڑھتے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز کے مرنے پر اس کا بیٹا عبداللہ بن عمر جانشین ہوا۔ یہ ۲۷۰ھ میں حکمران تھا اس نے بھی باپ کی طرح پورے سندھ پر نہایت کامیاب حکومت کی دین داری و دینی خدمات میں دور تک اس کا شہرہ تھا۔ اس کے دربار میں علماء، فضلاء، ادباء، شعرا اور ارباب علم دفن رہا کرتے تھے۔ اس نے آبائی وطن بانیہ چھوڑ کر منصورہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کشمیر کے اطراف میں الور کا راجہ مہروق بن رائق ہندوستان کے نامی گرامی بادشاہوں میں سے تھا وہ ۲۷۰ھ میں عبداللہ بن عمر کی کوششوں سے مسلمان ہوا۔ ۲۷۱ھ میں عبداللہ کے بھائی موسیٰ بن عمر بن عبدالعزیز ہباری قرشی کے حکمران ہونے کا پتا چلتا ہے۔ دولت ہباریہ کا پوتا حکمران ابو المنذر عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز ہباری قرشی تھا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ "میں ۳۰۰ھ کے بعد بلاد منصورہ میں داخل ہوا تو یہاں کا حاکم ابوالمنذر عمر بن عبداللہ تھا۔ بادشاہ کے دو لڑکے ہیں ایک کا نام محمد اور دوسرے کا علی ہے۔ ان کا پایۂ تخت منصورہ ہے جو ملتان سے ۷۵ فرسخ کی دوری پر ہے ایک فرسخ آٹھ میل کا ہوتا ہے۔ منصورہ سے متعلق جو علاقہ ہے اس میں تین لاکھ دیہات اور بستیاں ہیں۔ پوری مملکت میں گھنے درخت اور قریب قریب آبادیاں ہیں۔ اس میں مید (سمندری ڈاکو) نامی ایک قوم ہے جس سے اکثر جنگ رہا کرتی ہے۔ منصورہ کے بادشاہ کے پاس اسی جنگی ہاتھی ہیں اور یہاں کے جنگی اصول کے مطابق ہر ہاتھی کے اردگرد پانچسو پیدل فوج ہوتی ہے"۔

سندھ اور ملتان کی دوسری خود مختار حکومتوں کی طرح منصورہ کی ہباری حکومت بھی سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ۴۱۶ھ میں ختم ہوئی۔

ملوک منصورہ انتہائی دیندار اور اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔ امام داؤد ظاہری کے طریقے پر شدت سے عامل تھے۔ منصورہ میں بڑے بڑے ظاہری علماء، فقہا اور قضاۃ تھے۔ دولت ہباریہ کا سرکاری مذہب ظاہری تھا۔ اول سے آخر تک عباسی خلفاء سے متعلق رہے۔ آس پاس کے ہندو راجوں مہاراجوں سے ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ "ہباری حکمرانوں نے ملکی انتظام میں وہ قابلیت دکھائی جس نے رعایا کے دلوں کو ان کی طرف کھینچ لیا اور وہ دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں ہباریوں کو چاہنے لگے البتہ خطبہ

Marfat.com

[illegible] ہباری حکمرانوں کی دینداری کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے یہاں باقاعدہ عہدۂ قضا قائم تھا جہاں خالص دینی قوانین کی رو سے فیصلے ہوتے تھے حدود و تعزیرات جاری ہوتی تھیں اور پوری مملکت میں اسلامی احکام نافذ تھے

قدیم جغرافیہ نویسوں کے بیان کے مطابق اقلیم سندھ (منصورہ) کے مشرق میں بحرِ فارس مغرب میں کرمان اور سجستان کا صحرا شمال میں ہندوستان اور جنوب میں مکران اور بلوچستان کا درمیانی صحرا واقع تھا۔ مقدسی بشاری نے اقلیم سندھ کے بڑے بڑے شہر یہ بتائے ہیں منصورہ، دیبل، زندریج، کدار، مایل، قنبلی، نیرون، قالری، اتری، بلری، اسواہی، البرنج، بانیہ، منجابری، سدوسان، الرور، سوپارہ، کیناس، چیمور۔ منصورہ اس مملکت کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت تھا۔ یہاں سے ملتان بارہ مرحلہ پر اور طوران پندرہ مرحلہ پر واقع تھا۔ اس کے چاروں طرف چار دروازے تھے: باب البحر، باب طوران، باب سندان، باب ملتان۔ منصورہ کے بعد دولت ہباریہ کا دوسرا بڑا شہر دیبل ساحلِ سمندر پر واقع تھا۔ ہباری دورِ حکومت میں دیبل تباہ کن زلزلے سے دوچار ہوا۔ یہ زلزلہ ۲۸۰ھ میں پیش آیا جس سے پورا شہر نیست و نابود ہو گیا صرف سو مکانات بچ سکے۔ پوری آبادی زندہ دفن ہو گئی۔ اس تباہی کے بعد پانچ مرتبہ زلزلہ آیا اور ڈیڑھ لاکھ لاشیں ملبے سے نکالی گئیں۔ علامہ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں اس زلزلے کا ذکر کیا ہے۔

اقلیم سندھ کا ہباری علاقہ سرسبز و شاداب تھا کہیں کہیں ریگستانی اور پہاڑی علاقے بھی تھے۔ چاول، ہر قسم کی کھجور، گنا، آم، لیموں، ناریل، کیلا، شہد، السی وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ منصورہ کی بھینس اور سندھ کا پالہ اونٹ بہت مشہور تھا اس علاقے میں بڑی بڑی چراگاہیں اور مویشیوں کی کثرت تھی۔ سندھ کی مخصوص اور مشہور چیزوں میں آم، لیموں، کھمبائت کے جوتے اور پالہ اونٹ تھے جو پورے عالم اسلام میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ سندھ کا ملک ہباری حکومت میں بڑا خوشحال اور فارغ البال تھا۔ ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز بافراط اور سستی ملتی تھی۔ دیبل اور منصورہ کے تاجر دور دور تک شہرت رکھتے تھے اور عالم اسلام کے بڑے تاجروں اور مالداروں میں شمار ہوتے تھے۔ ہباری دورِ حکومت میں سندھ کی بری اور بحری تجارت بہت ترقی پر تھی اور پورے عالم اسلام سے اس کا تجارتی تعلق قائم تھا۔ دیبل اور الور بحری تجارت کے مراکز تھے۔ الور کی آبادی ملتان کے برابر تھی۔

دومۃ الجندل

عرب میں ایک واحہ (نخلستان)۔ وادی سرحان اس کے جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ایک سرے پر وسطی عرب اور دوسرے سرے پر حوران اور شام کا کوہستان ہے۔ مدینہ سے پندرہ دن اور دمشق سے سات دن کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔ اس کا طول تین میل اور عرض آدھ میل ہے۔ دومہ حضرت اسمٰعیلؑ کے لڑکے کا نام تھا۔ جو ہجرت کر کے یہاں چلے آئے تھے۔ انہی کے نام پر اس علاقے کا نام دومہ پڑ گیا۔ دُومۃ الجندل کو عہدِ نبوت میں خاص شہرت حاصل رہی۔ آنحضرت صلعم نے اسے فتح کرنے کے لئے تین بار کوشش کی۔ ۵ھ/۶۲۶ء کے غزوہ میں نبی کریم صلعم خود قائد الجیش تھے۔ اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا کیونکہ یہاں کے باشندے اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی تتر بتر ہو گئے تھے۔ دوسری بار ۶ھ میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف قائد الجیش تھے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار اصبغ بن عمرو کلبی اسلام لے آیا۔ تیسری بار ۹ھ میں خالدؓ بن ولید نے دومۃ الجندل پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ صفین میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکمین ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ جب حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی باہمی نزاع کے بارے میں اپنی تحقیقات مکمل کر چکیں تو دومۃ الجندل میں اکٹھے ہوں اور اپنا فیصلہ سنائیں حضرت علیؓ کو پریشان کرنے والی کارروائیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ امیر معاویہ نے ۳۹ھ/۶۶۰ء میں ایک فوج دومۃ الجندل روانہ کی تھی۔ حضرت علیؓ اس فوج کو پسپا کر دینے میں کامیاب ہو گئے لیکن نخلستان کے باشندوں نے حضرت علیؓ اور معاویہؓ ہر دو کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جب ممالک اسلامیہ کا مرکز بنو امیہ کے زمانے میں شام اور بنو عباس کے زمانے میں عراق مقرر ہوا تو دومۃ الجندل کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔

سلطنتِ عثمانیہ کی آخری صدیوں میں جب وہابیوں نے اس ملک پر قبضہ کر لیا تو دومۃ الجندل بھی ان کے قبضے میں آگیا اور یہ قبضہ آل رشید کے امیر شمر طلال کے حکومت سنبھالنے تک رہا۔ ۱۹۰۹ء میں قبائل روالہ کے سردار نوری ابن شعلان نے اس پر قبضہ جمایا۔ ۱۹۲۰ء میں امیر شمر نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں عبدالعزیز بن سعود نے حکومت شمر کا قلع قمع کرنے کے بعد اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

دہر

دیکھئے الدہر، سورہ

دہریہ

وہ گروہ جو دنیا کو ماضی اور حال دونوں میں قدیم اور دائمی جانتا ہے اور اس عقیدے کی رو سے قیامت اور آخرت کی زندگی سے انکار کرتا ہے۔ دہری وہ شخص ہے جو رب، خلق، ثواب و عذاب، دین اور قانون سب سے انکار کرتا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اور سمجھتا ہے کہ بدی صرف اس چیز میں ہے جو اس کی خواہشات کی تکمیل میں حائل ہو۔ اس کے نزدیک انسان، پالتو جانوروں اور وحشی درندوں میں کوئی فرق نہیں۔ خیر، اس کے نزدیک صرف وہ چیز ہے جو اس کے مفاد کے حصول میں مدد دے۔ اس کے خیال میں عالم کی ابتدا ذرات جوہری کے اتفاقی تصادم سے ہوتی ہے جو اس سے پہلے فضا میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔ جمال الدین افغانی دہری کے معنی "نیچری مادہ پرست" کرتے ہیں۔

دہلی

دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر واقع ہندوستانی شہر۔ دہلی ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ء سے ۱۸۵۸ء تک شمالی ہندوستان کے شاہی خانوادوں کا پایۂ تخت رہا (کچھ مدت کے لیے دولت آباد، آگرہ اور لاہور کو بعض حکمرانوں نے اپنا مرکز بنانا پسند کیا) ۱۹۱۱ء میں برطانوی حکومت کا دارالسلطنت قرار پایا اور اگست ۱۹۴۷ء سے بھارت کا دارالحکومت ہے۔

تاریخ کی کتب سے ثابت ہے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان کے فرمانرواؤں کا دارالسلطنت ہستناپور تھا۔ یہ شہر دریائے گنگا کے ساحل پر آباد تھا۔ جب کورو پانڈو کی مشترکہ فرمانروائی میں نفاق و اختلاف پیدا ہوا تو پانڈوؤں نے دریائے جمنا کے کنارے شہر اندرپت (اندر پرستھ) کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ قرنوں بعد ۴۴۰ بکرمی میں راجا اننگ پال ترلور نے اندرپت کے نزدیک ڈلی شہر آباد کیا۔ اس کے بعد رائے پتھورا نے بارسو کچھ بکرمی میں ایک قلعہ اور شہر اپنے نام پر تعمیر کیا۔ قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کا مسکن یہی شہر رہا۔ سلطان غیاث الدین

Marfat.com

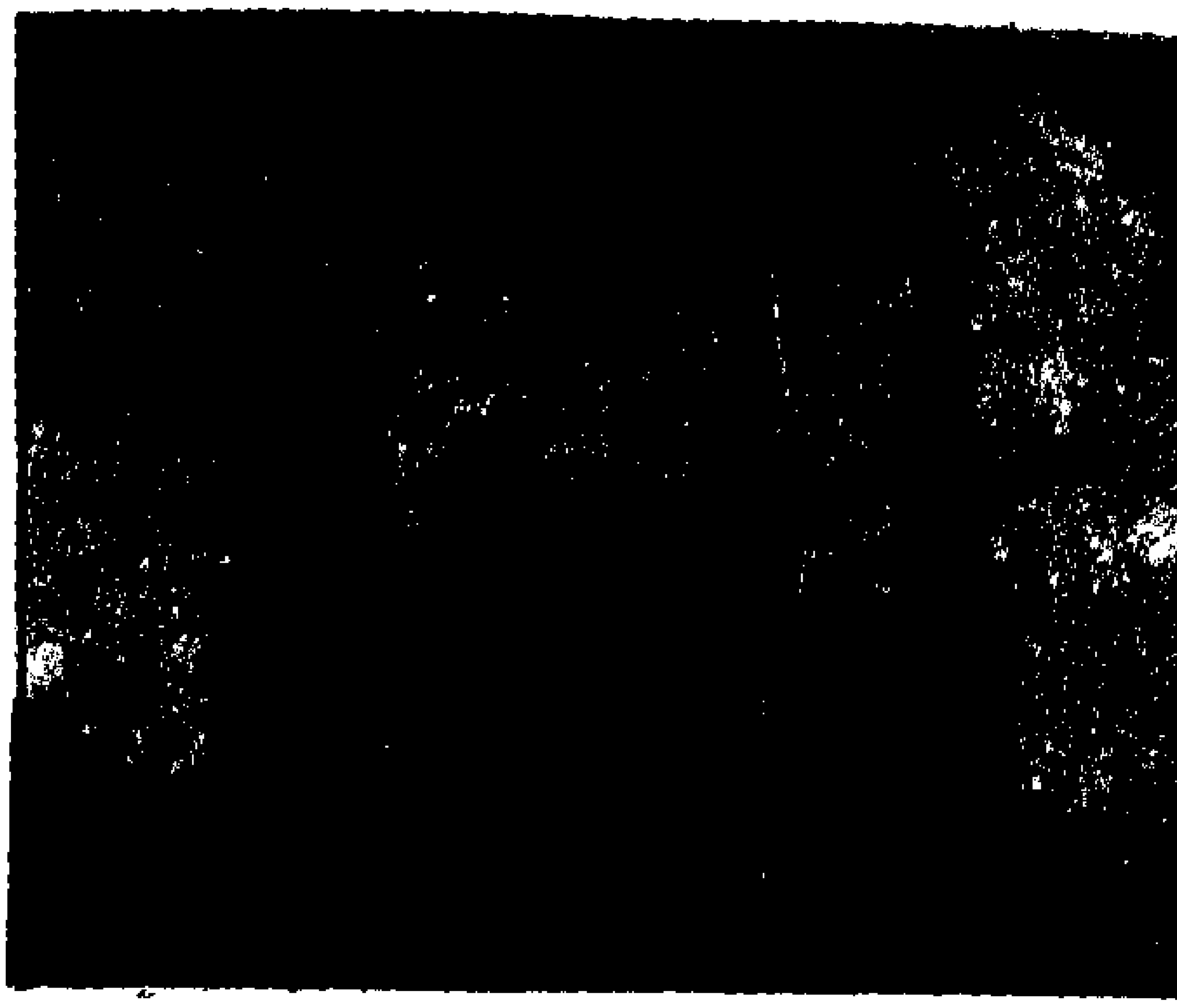

مغل شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ (دہلی) کبھی جس کے گرد وسیع باغ تھا مگر اب اجڑ گیا

بلبن نے دوسرا قلعہ بنایا جو ۶۶۶ھ میں مرزغن کے نام سے مشہور ہوا۔ ۶۸۶ھ میں معز الدین کیقباد نے دریائے جمنا کے کنارے کیلو کھری نام کا ایک نفیس شہر آباد کیا۔ جلال الدین خلجی نے شہر کوشک لعل اور علاؤ الدین خلجی نے کوشک سیری آباد کرکے انھیں اپنے دارالحکومت قرار دیا۔ ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں غیاث الدین تغلق نے ایک اور شہر کی بنا ر ڈالی فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۵ھ میں فیروز آباد کی بنیاد رکھی جسے دریائے جمنا سے نکالی ہوئی نہر شاداب کرتی تھی۔ مبارک شاہ نے مبارک آباد بسایا۔ ہمایوں نے ۹۳۸ھ میں قلعہ اندرپت کی مرمت کروا کے "دین پناہ" نام رکھا اور تخت گاہ قرار دیا۔ شیر شاہ افغان نے شہر کوشک سیری کو ویران کر کے ایک اور شہر آباد کیا۔ اُس کے بیٹے سلیم شاہ نے ۹۵۳ھ میں قلعہ سلیم گڑھ تعمیر کیا۔ اگرچہ ان فرمانرواؤں نے الگ الگ بستیاں بسا کر تخت گاہ قرار دیں لیکن بیرونی ممالک میں دہلی ہی کو ہندوستان کا دارالسلطنت سمجھا جاتا تھا۔ شاہجہاں نے ۱۰۴۸ھ میں دہلی کے نزدیک شاہجہاں آباد نام کا شہر آباد کیا۔ اس شہر کی آبادی اور رونق اتنی بڑھی کہ یہ تمام پرانے شہر اس میں شامل ہو گئے۔ شاہجہاں نے ۹ محرم ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء کو ایک نئے قلعے کی بنیاد رکھی جسے لال قلعہ کہتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں خاندانِ مغلیہ کے خاتمے کے ساتھ انگریزوں نے جنگ آزادی کے دوران میں یادگار عمارات کو شدید نقصان پہنچایا اور دارالحکومت کلکتہ منتقل کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں برطانوی ہندوستان کا دارالحکومت دہلی منتقل ہوا اور نئے شہر کی تعمیر شروع ہوئی جسے ابتدا میں رائے سینا اور بعد میں نئی دہلی کہنے لگے۔

دہلی کی یادگار عمارتیں درج ذیل ہیں۔ جامع مسجد، موتی مسجد، کلاں مسجد، کھڑکی کی مسجد، کوٹلا کی مسجد، مسجد قطب الدین ایبک، لال قلعہ، قطب مینار، مقبرہ کبیر الدین اولیا، مقبرہ نظام الدین اولیا، مقبرہ امیر خسرو دہلوی، مقبرہ نصیر الدین چراغ دہلی، مقبرہ قطب الدین بختیار کاکی، مقبرہ التمش، مقبرہ ناصر الدین محمود، مقبرہ علاؤ الدین خلجی، مقبرہ غیاث الدین خلجی، مقبرہ فیروز، ادہم خاں، مقبرہ عبدالرحیم خانخاناں اور مقبرہ ہمایوں۔

دیار بکری

(۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء؟) حسین بن محمد بن حسن، مشہور مورخ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ لکھی ان تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس کی۔ یہ تاریخ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی مصنف نے خانہ کعبہ کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ تاریخ اسلام کا مختصر خاکہ بھی مدرج ہے۔ اختتام پر عثمانی حکمرانوں کے نام گنوائے گئے ہیں۔ مصنف مکہ معظمہ میں رہتا تھا۔ اس نے اس تاریخی کتاب کا خاتمہ مراد سوم (۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء) پر کیا ہے۔

دیبل

سندھ کی قدیم بندرگاہ اور شہر۔ یہ دریائے سندھ کے مغربی جانب ایک کھاڑی کے دہانے پر واقع تھا۔ محمد بن قاسم نے ۹۲ھ/ ۷۱۲ء میں دیبل تسخیر کیا تھا۔ راجا داہر حاکم سندھ پر یہ الزام تھا کہ دیبل کے مقام پر بحری قزاقوں نے بعض ایسی کشتیوں کو لوٹ لیا جو مسلمان مرد اور عورتوں کو لنکا سے عراق اور مکہ لے جا رہی تھیں، راجا داہر نے اغماض سے کام لیا۔ محمد بن قاسم سے قبل دیبل کو فتح کرنے کے لیے عربوں کے دو بحری حملے ناکام ہو چکے تھے۔ ان کے قائد عبید اللہ بن نبہان اور بدیل بن طہفہ بجلی تھے۔ تیسری بار محمد بن قاسم خشکی کی طرف سے حملہ آور ہوا۔ عربوں نے ہندوستان میں پہلی بار منجنیق استعمال کرکے دیبل کے ۴۰ گز اونچے برج کو زمین بوس کر دیا گیا۔ شہر پہ قابض ہو جانے کے بعد محمد بن قاسم نے مغلوب غیر مسلموں کے سامنے نرم شرائط پیش کیں اور ذمیوں کی حیثیت سے انھیں پورے حفظ و امان کا یقین دلایا۔ محمد بن قاسم نے دیبل میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ اس نے ایک نیا محلہ بھی تعمیر کرایا اور اس میں چار ہزار عرب خاندان آباد کئے۔ دیبل ایک بارونق شہر تھا جو بحری تجارت اور کاروبار کا مرکز تھا۔ اس کے باشندوں کی بڑی تعداد تاجروں اور کاریگروں کی تھی۔

دیت

خوں بہا۔ مال کی وہ معین مقدار جو کسی کو قتل کرنے یا ظالمانہ طور پر کسی کو جسمانی ضرب پہنچانے کی صورت میں واجب الادا ہو۔ قانون کی زبان میں دیت وہ معاوضہ ہے جو قتل کے عوض واجب الادا ہو۔ جسمانی ضرر پہنچانے کے عوضانے کو "ارش" کہتے۔ دیت کہیں اختیاری ہے کہیں واجب۔ اختیاری دیت وہاں ہوتی جہاں ضرر رسانی کا عمداً ارتکاب کیا گیا ہو۔ قتل عمد کی صورت میں نمایاں قید یہ ہے کہ قتل کا ارتکاب مہلک آلے سے کیا گیا ہو۔ اگر یہ آلہ جان سے مارنے کے لیے استعمال نہیں ہوتا تو اس قتل کو قتل شبہ عمد قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں دیت اختیاری نہیں رہتی۔ مالکی مذہب میں جب قتل کا ارادہ ثابت ہو جائے تو خواہ مارنے کے لیے کوئی سا آلہ استعمال کیا جائے، دیت اختیاری ہو گی۔ قتل عمد کی اس صورت کے سوا جہاں قصاص ثابت ہو جاتا ہے تا دیگر صورتوں میں دیت واجب ہو گی۔ دیت کی مقداریں پوری پوری اس صورت میں واجب ہوتی ہیں جب ضرر رسیدہ شخص مسلم مرد اور رتبے میں آزاد ہو۔ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہوتی ہے۔ مالکیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ آدھی دیت انھی صورتوں میں ہو گی جہاں دیت، پوری دیت کے تیسرے حصے سے بڑھی ہوئی ہو۔ جہاں جرم کی نوعیت پوری دیت کے فقط چوتھائی حصے کی متقاضی ہو تو عورت کے لیے بھی چوتھائی دیت دینا ہو گی جو مرد کے لیے مقرر ہے۔ ذمی اور مستامن (وہ غیر مسلم اجنبی جو اسلامی علاقے میں عارضی طور پہ اجازت لے کر آیا ہو) کے لیے اکثر فقہا کے نزدیک دیت ایک تہائی یا نصف

Marfat.com

سے ظلم و جارحیت کے قائل ہیں۔ دیت صرف اس صورت میں واجب الادا ہو گی جب ارتکاب جرم مسلم علاقے میں ہوا ہو۔ غلام اگر جرم کا شکار ہوا ہو تو وہ نظام دیت میں شامل نہیں آتا۔ غلام کے مالک کو جتنا نقصان پہنچا ہو وہ اسی لحاظ سے معاوضہ کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ پوری دیت کے ادائے مؤجل کے بارے میں شافعی، مالکی اور حنبلی قتل عمد اور بلا عمد میں فرق کرتے ہیں۔ قتل عمد کی صورت میں دیت کی ادائیگی کا مطالبہ اس سال کے اندر اندر کیا جا سکتا ہے جس میں ارتکاب جرم ہوا ہو۔ بلا عمد کی صورت میں دیت کو تین سال کے اندر ایک تہائی فی سال کی قسط میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک دیت ہر حال میں تین سال کے اندر ادا کی جا سکتی ہے۔ جب دیت پوری دیت کی ایک تہائی ہو تو ہر مذہب میں پہلے سال کے اندر بالجبر وصول کی جا سکتی ہے۔

اگر فریقین میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو جائے تو دیت کی مقدار کا ایک معین اور محدود پیمانہ مقرر ہے۔ قتل نفس کی صورت میں اونٹوں کی تعداد سو مقرر ہے جو برابر تعداد کے پانچوں گروہوں میں منقسم ہے: ۴ ۲ سالہ، ۲۳ سالہ، ۲۲ سالہ مادہ اونٹ اور ۱۲ سالہ نر اونٹ۔ جہاں کسی پورے عضو کے کاٹ دینے یا جسمانی یا ذہنی وظیفے کے مختل کر دینے کا نتیجہ اتفاقی موت نہ واقع ہو تو دیت ہر ضائع شدہ عضو کے مناسب ہو گی۔ ایک بازو، ٹانگ، آنکھ یا اس کے ڈیلے کے بدلے کامل دیت کا نصف واجب الادا ہو گا۔ پلکوں کے ضائع کر دینے کے عوض چوتھائی دیت دینا ہو گا۔ ہاتھ یا پاؤں کی ایک انگلی کاٹ ڈالنے کے بدلے دیت کا دسواں حصہ دینا ہو گا۔ ایک دانت کے بدلے دیت کا بیسواں حصہ واجب ادا ہو گا۔ اگرچہ اصل قاعدے کی رو سے دیت میں اونٹ دینا چاہئیں۔ لیکن سونے کے سکوں (ایک ہزار دینار) یا چاندی کے سکوں (دس یا بارہ ہزار درہم) ادا کرنا بھی بالکل اسی کے برابر ہے۔ بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ دیت مویشی (دو سو)، بھیڑ (ایک ہزار) یا لباس (دو سو حُلّے) کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے۔

دیتریسی، فریڈرش

(۱۸۲۱ء۔ اگست ۱۹۰۳ء) ممتاز جرمن مستشرق، جس نے عربی ادب اور مسلمانوں کے فلسفے کو اپنا خاص موضوع بنایا۔ اس نے برلن یونیورسٹی، لائپزگ اور ہالہ کی دانش گاہوں سے تحصیل علم کی۔ مصر، شام اور فلسطین کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ وہ ۱۸۵۰ء میں برلن یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور عمر بھر اسی دانش گاہ سے وابستہ رہا۔ اس نے عربوں کے مشہور شاعر المتنبی کے دیوان کو واحدی کی شرح کے ساتھ دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ اس نے رسائل "اخوان الصفا" کے مندرجات سے بحث کی اور ان میں سے بعض کو جرمن زبان میں منتقل کیا۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں فارابی کی کتاب "السیاست المدنیہ" کا جرمن زبان میں ترجمہ کر رہا تھا، لیکن ترجمے کی تکمیل سے قبل ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

دیر

ایک نوابی ریاست جس کا الحاق ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے ہوا۔ ریاست دیر کم و بیش اس علاقے پر مشتمل ہے جسے پنج کوڑا اور اس کی معاون ندیاں سیراب کرتی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں سوات، دیر اور چترال کی ریاستیں پاکستان میں مدغم کر کے مالاکنڈ ڈویژن کی تشکیل کی گئی۔ یہ ڈویژن شمال مغربی سرحدی صوبے کا حصہ ہے۔ دیر کا آخری نواب سلطان محمد شاہ خسرو تھا۔ دیر کے حکمران خاندان کے بانی ملا الیاس ملقب بہ اخوند بابا نے گیارھویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی میں فروغ پایا۔ اس کا پوتا غزن خاں بن قاسم خاں بن ظفر خاں ۱۸۶۳ء میں دس ہزار فوج کے ساتھ امبیلا کی مہم میں قبائلی لشکروں کے ساتھ شریک ہوا۔ یہ مہم برطانوی ہندوستانی فوج نے سید احمد بریلویؒ کے مجاہدین کے خلاف شروع کی تھی۔ جب غزن خاں نے دیکھا کہ لڑائی کا پلہ انگریزوں کے حق میں جھک رہا ہے تو وہ اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔ غزن خاں کے بعد اس کا لڑکا رحمت اللہ خاں جانشین ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں رحمت اللہ خاں کے انتقال پر اس کا لڑکا۔۔۔ محمد شریف خاں مسند نشین ہوا۔ اس کے عہد میں چترال اور دیر کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ نواب دیر کو شکست ہوئی اور وہ سوات میں پناہ گزیں ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں محمد شریف برطانوی فوجوں کی مدد سے دیر کو واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۸۹۷ء میں اسے انگریزوں کی طرف سے نواب کا خطاب ملا۔ وہ انگریزوں کا پکا حلیف رہا۔ اسے ۲۶ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا اورنگ زیب خاں تخت نشین ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں سوات کی ستائی ہوئی رعایا نے میاں گل شہزادہ کے تحت اورنگ زیب کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے مفتوحہ علاقہ اسے واپس دلا دیا۔ ۱۹۲۵ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا تو اس کا بڑا بیٹا محمد شاہ جہان خاں اس کا جانشین ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں پورا شمال مغربی سرحدی صوبہ انگریزی حکومت کے خلاف اٹھا تو اس نے اپنے تمام وسائل برطانوی حکومت کو پیش کر دیئے۔ ۱۹۳۰ء ہی میں دیر اور سوات کی موجودہ سرحدوں کی توثیق ہوئی اور صدیوں پرانی عداوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت پاکستان نے محمد شاہ جہاں کو سنگین الزامات کی بنا پر معزول کر کے نظر بند کر دیا اور اس کے بڑے بیٹے محمد شاہ خسرو کو ۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو باضابطہ دیر کا نواب بنایا۔

دلیسلان، میک گوکن

(۱۸۰۱ء - ۴ اگست ۱۸۷۸ء) ممتاز فرانسیسی مستشرق۔ اس نے تاریخ ابن خلدون کے اقوام بربر سے متعلق حصّے کو فرانسیسی ترجمے کے ساتھ الجزائر سے متعدد جلدوں میں شائع کیا۔ البکری کی کتاب "المسالک و الممالک" کا وہ حصہ طبع کیا جو شمالی افریقہ کے جغرافیہ سے متعلق ہے۔ دلیسلان نے قاضی ابن خلکان کی کتاب "وفیات الاعیان" کو انگلستان کے اورنٹیل ٹرانسلیشن فنڈ کی فرمائش پر انگریزی کا جامہ پہنایا جو لندن سے چار جلدوں میں شائع ہوا۔ اس نے مقدمہ ابن خلدون کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ جو فرانس کے سرکاری مطبع سے ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۸ء کے درمیان تین جلدوں میں شائع ہوا۔

دین

وہ نظام زندگی یا طریق زندگی، جس کے قائم کرنے والے کو سند اور مُطاع تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے۔ عربی زبان میں دین کا ایک مفہوم ہے غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف، سیاست و فرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ دوسرا مفہوم ہے اطاعت

Marfat.com

فرمانبرداری اور غلامی تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے اور ان کو حکم نہیں دیا گیا، مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی راست رو ملت کا دین ہے (البیّنہ : ۵)

تمہارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سُؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور جو گلا گھونٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے۔ لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا۔ (المائدہ : ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکام شریعت بھی دین ہی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے "جنگ کرو، ان لوگوں سے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے اُسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (التوبہ:۲۹) یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام کے ان احکام کو ماننا اور ان کی پابندی کرنا بھی دین ہے، جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "زانیہ عورت اور مرد دونوں میں ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامنگیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو (النور : ۲)" یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔ (یوسف : ۷۶) اس سے معلوم ہوا کہ فوجداری قانون بھی دین ہے۔

اللہ تعالےٰ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظام زندگی اور ایک ہی طریقہ حیات صحیح و درست ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے، بلکہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت بھیجی ہے، کمی بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرز فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے اور اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے۔ اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی اُس نے اسلام ہی کی تعلیم دی۔ اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوع انسانی میں رائج کیے گئے ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیازات حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق دین کے عقائد اصول اور احکام میں ردّ و بدل کر ڈالا۔ ارشاد ربانی ہے :-

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے۔ اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی (آل عمران : ۱۹)

دین الٰہی

ہندوستان کے مغل شہنشاہ اکبر کا جاری کردہ دین۔ دین الٰہی کا اجرا ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں ہوا۔ اس میں نفس پرستی، غبن، فریب، غیبت، جبر، تعدّی، تحریف اور تجبّر کی ممانعت تھی۔ [illegible] عیسائیوں کی تجرد پسندی کا اضافہ کیا گیا۔ دین الٰہی [illegible] دین [illegible] جاتی ہے، کشادہ نظری، اعمال بد سے اجتناب، [illegible] دبانا، [illegible] مشاغل سے پرہیز، پرہیزگاری، تقویٰ، زہد، احتیاط، [illegible] شفقت اور صوفیہ کے طریق پر آرزوئے الٰہی کے ذریعہ تزکیۂ نفس۔ اس میں [illegible] شمس اور [illegible] کی حد تک زور دیا جاتا تھا۔ اس سے زرتشتی، ہندو مذہب اور صوفیانہ اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ شہنشاہ کو بالواسطہ طور پر ہی بلکہ خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے تمام مرید آپس میں ملتے وقت اللہ اکبر اور جل جلالہ کہہ کر سلام کرتے تھے۔ دین الٰہی میں نہ تو کسی الہامی کتاب کے نازل ہونے کا دعویٰ کیا گیا، نہ اس سے مذہبی پیشواؤں کے کسی سلسلے کا آغاز ہوا۔ ابوالفضل نے اکبر کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ اکبر نے کم از کم مجازاً اور کنایتہً ترک اسلام کا اقرار کیا تھا۔ بہر حال اکبر کے حق میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس نے علی الاعلان خدا یا نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ کسی کو اپنا نیا مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ہندوؤں کے دل جیتنے کے لیے اکبر تمام حدود سے تجاوز کر گیا تھا اور اس نے ایسی رسوم اختیار اور رائج کیں جو سراسر ہندوانہ تھیں۔ مثلاً ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت، جھروکہ درشن، داڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگانا اور ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر ان کی مذہبی رسموں میں حصہ لینا۔ دربار کی اس روش سے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔ ملا محمد یزدی نے فتویٰ دیا کہ بادشاہ بدمذہب ہو گیا ہے اور اس کے خلاف جہاد واجب ہے۔ قطب الدین کوکہ اور شہباز خاں کنبوہ جیسے امراء نے جرأت سے کام لیکر اکبر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بادشاہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے تمام مخالفین ترغیب و تخویف یا تشدد کا نشانہ بن گئے۔ حاشیہ نشینوں نے یہ بات اڑا دی کہ بعثت نبوی پر ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد اسلامی شریعت کی عمر پوری ہو چکی ہے لہٰذا ایک نئے دین اور نئے شارع کی ضرورت ہے اور اس منصب کے لیے اکبر ہی سزاوار ہے۔ اس کی تصدیق میں طرح طرح کی جھوٹی سچی پیش گوئیاں، اقوال اور اشعار پیش کیے گئے۔ بالآخر دین الٰہی اکبر شاہی کا اعلان کر دیا گیا۔

جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے انھیں بیعت کرتے وقت کلمہ "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" کے ساتھ دین اسلام سے علیحدگی اور اخلاص چہارگانہ (ترک مال، ترک جان، ترک ناموس، ترک دین) کا اقرار کرنا پڑتا۔ ان مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں چیلا کہا جاتا۔ بادشاہ کی طرف سے زنار یا انگشتری اور بطور شجرہ بادشاہ کی تصویر عطا ہوتی۔ جسے وہ مرصع غلاف میں رکھ کر دستار میں لگاتے۔ بادشاہ قرآن، وحی، حیات بعد الموت اور یوم جزا کا منکر ہو گیا۔ آفتاب پرستی اور مسئلہ تناسخ کا قائل ہو گیا۔ سجدۂ تعظیمی پر زور دیا گیا۔ شراب حلال کی گئی۔ سور کا گوشت خوراک کا جزو بن گیا۔ جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ جوئے کی حلت کا اعلان ہوا۔ صوم و صلوٰۃ اور حج منسوخ کر دیئے گئے۔ دیوان حکومت میں اذان اور نماز باجماعت موقوف ہو گئی۔ عربی کے مطالعے کو بنظر تحقیر دیکھا جانے لگا۔ فقہ، تفسیر اور حدیث کی بجائے نجوم و طب اور حساب و فلسفہ کی تعلیم رائج کی گئی۔ تقویم اسلامی کا استعمال ترک کر دیا گیا۔ ہندوؤں کو اجازت مل گئی کہ وہ [illegible] اعلان کریں۔ [illegible] مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ جب ہندو برت رکھیں تو مسلمان [illegible] کھانے پینے سے [illegible]

Marfat.com

[redacted]

مکتبۂ شاہکار

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو باقاعدگی سے کتب شائع کرنے والا واحد ادارہ

- ★ [illegible] ۲/۵۰
- ★ [illegible] رفتہ ۳/-
- ★ [illegible] ۲/۵۰
- ★ [illegible] ۲/۵۰
- ★ صحرا نورد کے خطوط (اوّل) ۳/-
- ★ شاہنامۂ اسلام (دوم) ۳/-
- ★ فردوس بریں ۲/۷۵
- ★ [illegible] ۴/-
- ★ مجبور آوازیں ۴/-
- ★ شاہنامۂ اسلام (سوم) ۳/-
- ★ قائد اعظم میری نظر میں ۴/-
- ★ مقدس نازنین ۴/-
- ★ صحرا نورد کے خطوط (دوم) ۳/۵۰
- ★ خزینۂ معلومات ۴/-
- ★ علی گڑھ کے تین نامور فرزند ۲/-
- ★ شاہنامۂ اسلام (چہارم) ۳/-
- ★ محبت عظیم ہے ۲/۵۰
- ★ نقوش قائد اعظم ۲/۵۰
- ★ رحمتِ عالم ۲/-
- ★ اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ۳/۵۰
- ★ اردو کے چار مزاحیہ شاعر ۲/-
- ★ پولیس افسر کی ڈائری (دوم) ۳/-
- ★ قاسم کی مہندی ۳/۵۰
- ★ پیغمبر صحرا ۴/-
- ★ نوجوان ورکر کی داستانِ غم ۲/۵۰

- ★ بیادِ قائد اعظم ۲/۵۰
- ★ افلاطون کی ری پبلک ۳/۵۰
- ★ بھیلما ۴/-
- ★ ذہن کی آزمائش (دوم) ۲/-
- ★ دفاعِ پاکستان ۳/۵۰
- ★ الحسینؓ ۲/۵۰
- ★ اقبال کا فلسفۂ خودی ۳/۵۰
- ★ ذہن کی آزمائش (سوم) ۳/-
- ★ دینِ عمل ۳/-
- ★ تذکرۂ غوثیہ ۲/-
- ★ ذہن کی آزمائش (چہارم) ۳/-
- ★ داستانِ ہٹلر ۲/۵۰
- ★ گمشدہ شہر اور طلیا میٹ تہذیبیں ۳/۵۰
- ★ یادِ اقبال ۴/-

[illegible]

- ✳ افروڈائٹ (ناول) ۳/۵۰
- ✳ شہزاد (ڈرامے) ۲/۵۰
- ✳ امیر علی ٹھگ (جرم و سزا) ۳/-
- ✳ گڈ ارتھ (ناول) ۲/۵۰
- ✳ ڈاکٹر کے آنے تک (طب و صحت) ۲/۵۰
- ✳ اسرار در بار حرام پور / پیار کے رشتے
- ✳ اے عشق کہیں لے چل ۲/-

شاہکار
اسلامی
انسائیکلوپیڈیا
کے اب مکمل
[illegible]

بے بی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

شاہکار ڈائجسٹ کتاب (۵۰۷)

ایک جلد میں تین شاہکار کتابیں

معلومات کی دوسری جلد کا آغاز

تین بڑے نفسیات داں

تاریخ اشاعت : ——— یکم مئی ۱۹۷۷ء

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار ۲۰

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط ○ وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

۲۰

• مدیرِ اعلیٰ : سید قاسم محمود
• نائب مدیر : کفیل احمد صدیقی
اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے
ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"
خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

تازہ مسوّدے کی خوشبو

آپ چاہتے ہیں کہ "شاہکار" سے جو بھی کتاب پیش کی جائے، وہ حقیقی معنی میں شاہکار ہو۔ لیکن [illegible]
مسوّدے کا پالینا جوئے شیر سے کم نہیں۔ پرانی کتابیں جو بار بار چھپتی رہتی ہیں، ان کے پیش کرنے میں وہ لذت [illegible]
اور بالخصوص تخلیقی مسوّدے کو شائع کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مسوّدے ہمارے پاس بہت آتے رہتے ہیں [illegible]
مطلب کے مسوّدے بہت کم ہوتے ہیں اور جب کبھی کوئی اچھا مسوّدہ ہاتھ آجاتا ہے تو فوراً دل میں اور ماحول میں [illegible]
رچ بس جاتی ہے اور جی چاہنے لگتا ہے کہ دوڑ کر سب سے پہلے آپ کو سناؤں کہ ایک پیاری چیز جنم لے رہی ہے [illegible]

کل دوپہر کی ڈاک سے ایک رجسٹری وصول ہوئی۔ یہ ایک دولت ہے جو خدا نے چھپّر پھاڑ کر ہمیں دی ہے [illegible]
عطا ہے جس سے ہمیں محبت نے سرفراز کیا ہے۔ یہ ایک تحفہ ہے جو آپ کے لیے ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ارسال [illegible]

ڈاکٹر صاحب سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اس سے پہلے آپ ان کی ۳۶ علمی و ادبی تصانیف، تالیفات [illegible]
مطالعہ کر چکے ہیں۔ یہ ان کی ایسی تصنیف ہے جس کا نام انھوں نے عجیب اور انوکھا رکھا ہے۔ یعنی "میری آخری [illegible]
موضوع اچھوتا اور شاندار ہے یعنی قرآن مجید کے منجانب اللہ ہونے پر چالیس، سائنسی، تاریخی اور عقلی [illegible]
کرنے میں جہاں فاضل مصنف نے اپنے عمر بھر کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا ہے، وہاں کم از کم [illegible]
مغربی علماء و فضلاء کی تصانیف سے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔

سطر سطر میں ڈاکٹر صاحب کا شوقِ تحقیق، جذبۂ تجسس اور زورِ استدلال [illegible]
اچھا مسوّدہ اچھی کتاب بننے تک کئی پیچیدہ اور نازک مرحلوں سے گزرتا ہے [illegible]
ڈاکٹر صاحب کی "آخری کتاب" کو جلد از جلد خوبصورتی سے شائع کرکے زیادہ سے [illegible]
دعا کیجیے کہ یہ ڈاکٹر برق کی آخری کتاب ثابت نہ ہو بلکہ وہ اس کے بعد [illegible]

تاریخ اشاعت: یکم جولائی ۱۹۷۷ء - ناشر: سید قاسم محمود - طابع: ریاض حسین، المجدد پرنٹرز، راوی روڈ لاہور

Marfat.com

دین الٰہی کی تشکیل میں ملکی مصالح کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اکبر ہندوستان میں ایک عظیم الشان اور مستحکم سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا لیکن علماء بالخصوص مخدوم الملک اور صدر الصدور اس قدر باثر اور مقتدر ہو چکے تھے کہ ملک کے فوجداری اور دیوانی معاملات ان کی رائے کے مطابق طے پاتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ بادشاہ مختار بالذات ہے یا علماء کے فتووں کا پابند ہے؟ ابتدا میں اکبر ایک سیدھا سادہ خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ وہ علماء مشائخ اور صوفیہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور علمی و مذہبی حقائق کا جویا رہتا تھا اس نے شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ کے قریب ایک عبادت خانہ تعمیر کرایا جس میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے علماء اور پیشوا بھی جمع ہوتے اور بادشاہ کے سامنے مختلف مسائل پر آزادانہ بحث و تمحیص کرتے۔ ان مجالس میں اسے محسوس ہوا کہ علماء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کج بحثی اور بہتان طرازی پر اتر آتے ہیں۔ ایک عالم کسی بات کو حرام قرار دیتا ہے تو دوسرا اسے حلال ٹھیراتا ہے۔ اسی زمانے میں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کا تقرب حاصل ہوا۔ یہ دونوں اپنی آزاد خیالی کے باعث علماء کے ہاتھوں تکلیفیں جھیل چکے تھے علماء کا زور توڑنے کے لیے انھوں نے ایک محضر تیار کیا جس کی رو سے اکبر کو سلطان عادل قرار دیتے ہوئے اسے مختلف فیہ دینی مسائل میں اجتہاد کے وسیع اختیارات دے دیئے اور اس پر بعض علماء کے دستخط بھی ثبت کرا لیے۔ ۱۰۰۱ھ میں شیخ مبارک اور ۱۰۰۴ھ میں فیضی کے انتقال کے بعد دین الٰہی کے دو بڑے ستون گر پڑے۔ ۱۰۰۷ھ میں ابوالفضل دکن کی مہمات پر بھیج دیا گیا تو دربار میں دین الٰہی کی سرگرمیاں مدھم پڑ گئیں۔ ۱۰۱۱ھ میں ابوالفضل کے خاتمے کے بعد اکبر کی بداعتمادی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہوا اور اس کے ساتھ ہی دین الٰہی کا سورج بھی غروب ہو گیا۔

دینوری

(وفات ۲۶ جمادی الاول ۲۸۲ھ) ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن ونند شہرۂ آفاق ماہر نباتیات۔ ادبیات اور عربیت کی حد تک تعلیم بصرہ اور کوفہ کے دبستانوں میں حاصل کی۔ اگرچہ وہ ماہر نباتات کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا لیکن نحو، لغت، ہندسہ، نجوم، ریاضی اور تاریخ میں قابل وثوق سمجھا جاتا ہے۔ فقہ اور تفسیر میں بھی اس نے گراں قدر آثار چھوڑے ہیں۔ اس کا شاہکار "کتاب النبات" ہے جو نباتاتی دائرۃ المعارف ہے۔ یہ چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس میں پودوں کی خاصیتوں میں طبی خواص و اثرات کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ دینوری پودوں کے ناموں اور اصطلاحوں کو کثرت سے عربی اور فارسی دونوں میں لکھتا ہے اس طرح یہ کتاب تیسری صدی ہجری کی فارسی کا گراں قدر ماخذ معلومات بھی ہے۔ پودوں کے ناموں کی تفصیل میں جب بھی موقع ملتا ہے وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ اس کے مترادفات دیگر عرب علاقوں میں کیا ہیں۔ پودوں کی ساخت، ان کے غذائی و طبی اور دیگر خواص کا بہت دقیقہ رس اور جامع ذکر کرتا ہے۔ پودوں کی جنس وار تقسیم بھی اس نے ایک مستقل باب میں کی تھی۔ زمین، بارش، نہروں اور پودا پھوٹنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک مفصل حال بھی اس نے دیا تھا۔ کتاب النبات" سہ گانہ ماخذوں سے مرتب ہوئی ہے۔ اپنے پیشروؤں کے بیانات کا اعادہ اپنے ذاتی مشاہدات اور اپنے ہمعصروں کے بیانات کی نقل۔ ذاتی مشاہدات کے سلسلے میں وہ ایران عراق، بوزنطی سرحد، شام عرب، افغانستان، بلوچستان اور خراسان کے پودوں کا ذکر کرتا ہے۔ جرمن محقق زیلبربرگ کا کہنا ہے کہ یونانیوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ اور اپنے علم و فضل کی انتہا کے زمانے میں نباتات پر جو کتابیں لکھیں، ابو حنیفہ دینوری ان کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

دینوری کی بیس کتابوں کا پتا چلتا ہے جس میں "کتاب النبات" (کچھ حصے) اور "الاخبار الطوال" دستیاب ہیں۔ اس کی دیگر کتب یہ ہیں: (۱) تفسیر، تیرہ جلدوں میں (۲) کتاب الوصایا، فقہ میں (۳) کتاب فی حساب الدور، فقہ میں (۴) کتاب القبلۃ والزوال، نیم فقہی فلکیاتی (۵) مایلحن فیہ العامۃ، کتاب اصلاح المنطق، کتاب الفصاحۃ، کتاب الجمع والتفریق، کتاب الشعر والشعراء، ادبیات اور لغت میں (۶) کتاب الباہ، طب میں (۷) البحث فی حساب الہند، کتاب الجبر والمقابلہ، کتاب نوادر الجبر، کتاب الکسوف ریاضی اور فلکیات میں (۸) کتاب البلدان، جغرافیہ میں (۹) الاخبار الطوال، خلافت راشدہ میں ایران کی فتح کے متعلق ایک قابل قدر ماخذ۔

دیوبندی

اترپردیش (بھارت) کے ایک مشہور اور دو ہزار سال قدیم قصبے دیوبند سے نسبت رکھنے والا۔ اکثر و بیشتر دیوبند میں واقع اسلامی دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء اور ان کے تلامذہ دیوبندی کہلاتے ہیں۔ دارالعلوم کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء کو دیوبند کی ایک قدیم مسجد چھتا میں مشہور عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء ——— ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) نے چند اہل فضل و تقویٰ بزرگوں کے تعاون اور مشورے سے رکھی تھی۔ جن میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حاجی عابد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس درس گاہ کے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی، پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن، پہلے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی مقرر ہوئے۔ دارالعلوم کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں رکھا۔ یہ درسگاہ درج ذیل مقاصد کے پیش نظر قائم کی گئی تھی۔ (۱) آزادیٔ ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق (۲) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جد و جہد کرنا (۳) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک کی حفاظت و اشاعت (۴) مسلم معاشرے سے خود غرضی اور استبداد کا خاتمہ (۵) علوم دینی کا احیاء (۶) علوم عقلیہ کی صحیح ترتیب (۷) دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علما تیار کرنا۔ درس گاہ کی مالی ضروریات کے سلسلے میں مولانا نانوتوی نے آٹھ اصول مقرر کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت وقت اور امراء اغنیاء کے تسلط سے درس گاہ آزاد رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے نظم و نسق کے لیے ایک مجلس شوریٰ ہے۔ مجلس انتظامیہ ہے۔ ایک مہتمم (رئیس الجامعہ) ہے۔ شیخ الحدیث یا صدر المدرسین کا منصب ممتاز اہل علم و تقویٰ کو ملتا ہے۔ یہاں علم صرف و نحو، ادب، علم المعانی، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، علم الفرائض، علم العقائد، علم الکلام، علم الطب، علم المناظرہ، علم ہیئت اور علم قرارت و تجوید کے علاوہ فارسی زبان و ادب اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے آٹھ سال کا نصاب ہے۔ اس درس گاہ میں دورۂ حدیث کی بڑی شان ہے۔ اس میں دور دراز کے طالب علم مبادیات کی تکمیل کے بعد شریک ہوتے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں دہلی، لکھنؤ اور خیرآباد میں تین مختلف النوع دینی ادارے موجود تھے۔ دہلی کے ادارے تفسیر اور حدیث کی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ لکھنؤ فقہ پر اور خیرآباد علم الکلام اور فلسفے کے لیے مخصوص تھا۔ دیوبند ان تینوں کے امتزاج کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دیوبند میں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں سے طلبہ آتے

Marfat.com

موتی مسجد ڈھاکہ

رہتے ہیں۔ درس گاہ میں پندرہ سَو طلبا کے قیام کا بندوبست ہے۔ دارالعلوم کی عمارت ایک ایک مسجد، ایک کتاب خانے اور حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کے متعدد درسی کمروں پر مشتمل ہے۔ دیوبند کے کتاب خانے کا شمار ہندوستان میں مخطوطات کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں ستر ہزار کتابیں موجود ہیں

مولانا محمد قاسم نانوتوی تین واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد تھے دیوبندی فقہی مذاہب میں سے امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ قرآن و سنّت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اکثر علمائے دیوبند روحانی مسلک کے لحاظ سے حاجی امداد اللہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں جو نقشبندی، چشتی، قادری اور سہروردی چاروں سلسلوں سے منسلک تھے۔ عقائد و علم الکلام میں امام ابوالحسن اشعریؒ کے مقلد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و عظمت پہ ایمان رکھتے ہیں۔ کثرت درود کو عین ثواب سمجھتے ہیں۔ دین میں غلو اور انتہا پسندی کے بجائے وہ اعتدال کے قائل اور عامتہ المسلمین کی تکفیر سے اجتناب و احتیاط لازم سمجھتے ہیں۔

دیوبندی علمائے کرام نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ آزادی ہند کے لئے ریشمی رومال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے منظم کی تھی۔ تحریک خلافت میں بھی دیوبندیوں نے بڑا حصہ لیا۔ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں دیوبندی دو حصوں میں منقسم تھے ایک حصے نے قیام پاکستان کی مخالفت کی اور دوسرے حصے نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع وغیرہ نے مسلم لیگ کے مؤقف کی حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد دیوبندی علماء کا علمی و روحانی مرکز بھارت میں رہ گیا اس لئے پاکستان کے مختلف مقامات پر علمی مرکز قائم کئے گئے۔ جامعۂ اشرفیہ لاہور، جامعۂ مدینہ لاہور، مدرسۂ عربی خیر المدارس ملتان، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار خاں، دارالعلوم کھڈہ کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور کی درس گاہیں دیوبندی مکتب فکر کی علمی یادگاروں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ڈوزی، رائن ہارٹ

(۱۸۲۰ء — ۱۸۸۳ء) ہالینڈ کا نامور مؤرخ اور مستشرق۔ علمی حلقوں میں پروفیسر ڈوزی کی شہرت "تاریخ مسلمانان اندلس" پر موقوف ہے جو اس نے فرانسیسی زبان میں چار جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے۔ مولوی محمد عنایت اللہ دہلوی نے "کارنامۂ اندلس" کے نام سے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ڈوزی نے عربی کی ایک لغت بھی مرتب کی ہے جو نہایت مفید کتب مراجع میں شمار ہوتی ہے۔ اس نے جن عربی تواریخ کے متن تحقیق و تصحیح کے بعد شائع کئے ان میں سے ذیل کے قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) تاریخ بنی زیان ملوک تلمسان (۲) شرح قصیدہ ابن عبدون (۳) عبدالواحد المراکشی، المعجب فی تلخیص اخبار المغرب (۴) ابن عذاری، البیان المغرب فی اخبار المغرب (۵) کلام کتاب العرب فی دولتہ العبادین (۶) المقری، نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب۔

ڈھاکہ

بنگلہ دیش کا دارالحکومت۔ یہ سمندر سے تقریباً ایک سو میل دور آبی شاہراہوں کے سرے پر واقع ہے۔ مشہور دریائی بندرگاہ نرائن گنج یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ڈھاکہ کا رقبہ ۲۸ مربع میل اور آبادی (۱۹۶۱ء) ۵,۶۰,۰۰۰ ہے۔ ۱۶۰۸ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت یہ مغلوں کا عارضی فوجی مستقر تھا۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے صوبۂ بنگالہ کا نیا دارالحکومت بن گیا۔ شہنشاہ جہانگیر کے نام پر اس کا نام جہانگیر آباد رکھا گیا۔ سترھویں صدی عیسوی میں اسے اراکانی مگھوں اور پرتگالی بحری قزاقوں کی یلغاروں کا سدِباب کرنے کے لیے دریائی قلعہ بندیوں سے محفوظ کیا گیا۔ یہ قلعہ بندیاں منشی گنج، نرائن گنج اور سونا کنڈا میں اب بھی موجود ہیں۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا بھائی شاہ شجاع اور شہنشاہ کا بیٹا محمد اعظم یہاں کے صوبیداروں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ دوسرے صوبیداروں میں سے میر جملہ کی شہرت تو فتح آسام کی بدولت ہوئی البتہ شائستہ خاں کی شہرت کے اسباب میں اس کی پچیس سالہ خدمات اور چاٹگام کی تسخیر (۱۶۶۶ء) شامل ہیں۔ ۱۷۰۶ء میں دارالحکومت مرشد آباد منتقل ہو گیا۔ اس کے باوجود ڈھاکہ کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ ململ سازی کی صنعت کا بدستور مرکز بنا رہا۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں یہاں پرتگیزیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے کئی کارخانے قائم کئے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر ایک نیا صوبہ بنایا گیا تو ڈھاکہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ ۱۹۱۲ء میں یہ انتظامی اقدام ہندوؤں کی مخالفت کی بنا پر کالعدم ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ مشرقی بنگال (بعد ازاں مشرقی پاکستان) کا دارالحکومت قرار پایا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ بنگلہ دیش کا دارالحکومت بنا۔

ڈھاکہ گھریلو صنعتوں کے لیے مشہور ہے۔ نفیس ململ کے لیے ڈھاکہ کی شہرت ہمیشہ مسلّمہ رہی ہے۔ یہ سُوتی ساڑھیوں اور پٹ سن کے قالینوں کی صنعت کا مرکز ہے۔ ڈھاکہ وسائل نقل و حمل کا بھی مرکز ہے یہاں کی بندرگاہ سے سٹیمر ملک کے مختلف حصوں کو جاتے ہیں۔ ڈھاکہ کی قدیم عمارتوں میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں، بڑا کٹرا، چھوٹا کٹرا، حسینی دالان، قلعہ اورنگ آباد اور بی بی پری کا مقبرہ۔ یہاں سات سو سے زائد مسجدیں ہیں جن میں سے سات گنبد مسجد اور ستارہ مسجد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جدید عمارتوں میں ہائی کورٹ، ڈھاکہ یونیورسٹی، سکرٹریٹ، کرزن ہال، گورنمنٹ ہاؤس، زراعتی انسٹیٹیوٹ، پبلک لائبریری، ڈھاکہ سٹیڈیم اور عجائب گھر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں کا عجائب گھر عہد مغلیہ کے اسلحہ اور زیورات، بت تراشی اور مصوّری کے نادر نمونوں، قدیم سکوں، مخطوطات، پارچات اور دیگر فنی نوادر کے لیے خاص شہرت کا حامل ہے۔

Marfat.com

ذات الرقاع غزوہ

غزوہ بنو نضیر (ربیع الاول ۴ھ) کے بعد آنحضرت صلعم مدینہ میں مقیم تھے کہ اوائل جمادی الاوّل میں یہ خبر ملی کہ بنی غطفان کے قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ نبی کریم صلعم چار سو (یا سات سو) صحابہؓ کے ہمراہ نجد کی طرف روانہ ہوئے۔ نجد پہنچے تو بنی غطفان کی ایک بڑی جمعیت مقابلہ پر آئی مگر جنگ نہ ہوئی۔ واپسی پر آنحضرت صلعم اپنی تلوار ایک درخت کے ساتھ لٹکا کر خود سایہ میں استراحت فرمانے لگے۔ ایک مشرک آیا اور تلوار اتار کر اسے حرکت دینے لگا۔ اس نے آنحضور صلعم سے پوچھا کہ بتلایئے اب میرے ہاتھ سے آپ کو کون بچائے گا۔؟ آپؐ نے فرمایا "خدا بچانے والا ہے"۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت جبریلؑ نے اس مشرک کے سینہ پر ایک گھونسہ رسید کیا جس کی وجہ سے تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ آنحضرت صلعم نے تلوار اٹھا کر فرمایا: اب بتا میرے ہاتھ سے تجھے کون بچا سکتا ہے۔ اس نے عرض کیا کوئی نہیں۔ رسول اللہؐ نے اس مشرک کو معاف کر دیا۔ وہ شخص اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ یہاں سے چل کر آنحضرت صلعم ایک گھاٹی میں ٹھہرے حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت عبادؓ بن بشر کو درّہ کی پاسبانی پر مقرر فرمایا دونوں صحابہ نے طے کیا کہ پہلی نصف شب حضرت عبادؓ اور نصف آخر میں عمارؓ بن یاسر پاسبان ہوں گے۔ پاسبانی کے دوران میں حضرت عبادؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک مشرک نے انھیں تیر مارا۔ آپ نے جسم سے تیر نکال کر پھینک دیا اور نماز پڑھتے رہے۔ کافر نے یکے بعد دیگرے تین تیر مارے۔ آپ نے تیر نکال کر نماز جاری رکھی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت یاسرؓ کو جگایا۔ آپ کے جسم کو خون میں لت پت دیکھ کر حضرت عمارؓ نے کہا کہ آپ نے مجھے پہلے ہی تیر۔ پر کیوں نہ بیدار کیا حضرت عبادؓ نے فرمایا کہ میں ایک سورت پڑھ رہا تھا۔ یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کو پورا نہ کروں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ اس غزوہ کو ذات الرقاع اس لیے کہتے ہیں کہ چلتے چلتے ہمارے پیر پھٹ گئے تھے اور ہم نے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لیے تھے اس لیے اسے غزوہ ذات الرقاع یعنی چیتھڑوں والا غزوہ کہنے لگے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ذات الرقاع ایک پہاڑ کا نام ہے۔

ذات السلاسل جنگ

یہ جنگ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں (محرم ۱۲ھ) لڑی گئی مسلمان پہلی مرتبہ عجم کی عظیم الشان سلطنت کے خلاف صف آرا ہوئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید جنگ یمامہ سے فارغ ہوئے تو ان کے پاس دو ہزار سپاہی رہ گئے تھے۔ دربار خلافت سے حکم ملا کہ خسرو عجم، ہرمز سے مقابلہ کرو۔ ہرمز نے عراق عرب میں مسلمانوں کی زندگی تنگ کر رکھی تھی۔ حضرت خالدؓ نے جواب بھیجا کہ میرے پاس فوج کم ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے قعقاعؓ بن عمرو تمیمی کو روانگی کا حکم دیا اور فرمایا جس لشکر میں ان جیسا ایک جانباز بھی ہو اسے اور کیا چاہیئے۔ ادھر حضرت خالدؓ نے قبائل مضر اور ربیعہ سے کچھ فوج اکٹھی کی۔ مثنیٰ بن حارثہ بھی کچھ سپاہیوں کے ساتھ آن ملے۔ اس طرح اسلامی لشکر کی تعداد دس ہزار سے زائد ہو گئی۔ جنگ شروع ہوئی مسلمانوں نے دیکھا کہ ہاتھی گھوڑے اور سپاہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح سامنے ہیں۔ ہاتھیوں کا رسالہ پہاڑ بن کر کھڑا تھا۔ مسلمانوں کو جنگ میں ہاتھیوں سے سابقہ پیش نہ آیا تھا۔ ہرمز نے سب سے پہلے حضرت خالدؓ کو مقابلے کے لئے للکارا اور نتیجتاً حضرت خالدؓ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ تھوڑی دیر مقابلے کے بعد ہرمز کی ایرانی فوج میدان سے بھاگ نکلی۔ اس لڑائی میں ایرانی فوج کے ایک حصے نے اپنے پاؤں میں زنجیریں باندھ لی تھیں تاکہ مقابلہ میں میدان سے بھاگ نہ سکیں۔ اس لئے اسے جنگ ذات السلاسل کہتے ہیں۔

ذات عرق

دیکھئے، "حج"

ذبیح اللہ

دیکھئے، "اسماعیل"

ذبیحہ

کوئی جانور یا جاندار جسے اسلامی شریعت کے مطابق ذبح کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا ہو۔ شریعت کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق ذبح کرنے کو ذکات (ذکاۃ تذکیہ) کہتے ہیں۔ ذکات کی متعدد صورتیں ہیں: (۱) ذبح (۲) نحر (۳) عقر (۴) کوئی اور جائز طریقہ۔ احناف کے نزدیک ذکات شرعی کی دو قسمیں ہیں: (۱) ذکات الاختیار (۲) ذکات الضرورت۔ قسم اول سے مراد ذبیحہ کو تیز آلے سے ذبح کرنا ہے۔ اس کے بارے میں پوری احتیاط بروئے کار لائی جاتی ہے۔ پہلی احتیاط یہ کہ مذبوح کو کم سے کم تکلیف ہو۔ دوسری یہ کہ خون کا بہاؤ پورا ہو۔ گلے کو بالکل کاٹ دینے کی بھی ممانعت ہے۔ تیسری احتیاط یہ ہے کہ ذبح کرنے والے کے ارادے میں ظالمانہ رجحان پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لئے حکم دیا گیا ہے کہ وہ ذبح کرنے کے دوران میں خدا کا نام لے اور اسے یاد کرے۔ بسم اللہ یا اللہ اکبر کہنا مستحب ہے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ذبح کرنے والا مسلم یا اہل کتاب میں سے ہو۔ مرجح یہ ہے کہ جانور کو بائیں پہلو پر اس طرح لٹایا جائے کہ جانور کا رُخ قبلہ کی طرف ہو۔ سب مذاہب نے ضروری قرار دیا ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے لیئے آلہ تیز ہونا چاہیئے تاکہ وہ غیر ضروری اذیت سے محفوظ رہے۔ بہت سے جانوروں کو ایک ہی دفعہ اکٹھا ذبح کرنا مکروہ ہے۔ یہ بھی مکروہ ہے کہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے جانور کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔

ذریٰت (سورہ)

قرآن مجید کی مکی سورت۔ دیکھئے الذّریٰت۔

ذکر

اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: "اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو (احزاب: ۴۱) اس کے علاوہ بھی بہت سی آیات میں ذکر کا حکم آیا ہے۔ حضرت ابی ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں بندے کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا کہ وہ میرے ساتھ گمان کرتا ہے اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میرا مجمع میں ذکر کرتا ہے تو میں اس مجمع سے بہتر یعنی فرشتوں کے مجمع میں تذکرہ کرتا ہوں اور اگر بندہ میری طرف ایک بالشت متوجہ ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اگر وہ

Marfat.com

میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر چلتا ہوں (بخاری، مسلم، ترمذی)۔ رسول اکرم صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس فرشتوں کی ایک جماعت ایسی ہے جو مجالس ذکر کی تلاش میں گھومتی پھرتی رہتی ہے اور جب کبھی وہ فرشتے مجلس ذکر کو پاتے ہیں تو اصحاب مجلس کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں حتیٰ کہ زمین اور پہلے آسمان کے درمیان کی تمام کائنات ان سے بھر جاتی ہے اور جب وہ منتشر ہوتے ہیں تو فرشتے آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اللہ عزوجل اپنے علم کے باوجود ان سے پوچھتا ہے تم کہاں سے آئے؟ تو وہ کہتے ہیں ہم روئے زمین میں تیرے ایسے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو تیری تسبیح، تکبیر، تہلیل اور حمد بیان کر رہے تھے (مسلم)۔ نبی اکرم صلعم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا۔ ان دونوں کی مثال زندہ اور مُردہ کی سی ہے کہ ذکر کرنے والا زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ (مسلم، بخاری، مشکوٰۃ)

مشہور محدث حافظ ابن قیمؒ نے اپنے رسالہ "الوابل الصیّب" میں ذکر کے فضائل یہ بیان کیے ہیں: (۱) ذکر شیطان کو دفع کرتا ہے اور اس کی قوت کو توڑتا ہے (۲) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے (۳) دل سے فکر و غم کو دور کرتا ہے (۴) دل میں فرحت، سرور اور انبساط پیدا کرتا ہے (۵) بدن کو اور خاص طور پر دل کو قوت بخشتا ہے۔ (۶) چہرے اور دل کو منور کرتا ہے (۷) رزق کو بڑھاتا ہے (۸) ذکر کرنے والے کو ہیبت اور حلاوت کا لباس پہناتا ہے (۹) اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے (۱۰) ذکر سے مراقبہ نصیب ہوتا ہے (۱۱) اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع پیدا کرتا ہے (۱۲) اللہ کا قرب پیدا کرتا ہے (۱۳) معرفت کا دروازہ کھولتا ہے (۱۴) اللہ کی ہیبت اور بڑائی دل میں پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری پیدا کرتا ہے (۱۵) اللہ کی بارگاہ میں ذکر کا سبب بنتا ہے (۱۶) دل کو زندہ کرتا ہے (۱۷) دل اور روح کی روزی ہے (۱۸) دل کو صاف کرتا ہے (۱۹) لغزشوں اور خطاؤں کو دور کرتا ہے (۲۰) اللہ کے عذاب سے نجات کا ذریعہ ہے (۲۱) سکینہ اور رحمت کے اترنے کا سبب ہے (۲۲) اس کی برکت سے زبان غیبت، چغل خوری، جھوٹ، بدگوئی اور لغوگوئی سے محفوظ رہتی ہے۔ (۲۳) ذکر کی وجہ سے ذکر کرنے والا بھی سعید (نیک بخت) ہوتا ہے اور اس کے آس پاس بیٹھنے والا بھی (۲۴) قیامت کے دن حسرت سے محفوظ رکھتا ہے (۲۵) دوام ذکر سے اپنے نفس کو بھلا دینے کا سبب ہوتا ہے (۲۶) ذکر آدمی کی ترقی کرتا رہتا ہے (۲۷) ذکر کا نور دنیا میں بھی ساتھ رہتا ہے اور آخرت میں بھی (۲۸) اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا دروازہ کھل جاتا ہے (۲۹) ذکر کرنے والا بغیر مال کے غنی ہو جاتا ہے۔ (۳۰) دل کو نیند سے جگاتا ہے (۳۱) ذکر غلاموں کے آزاد کرنے، مالوں کے خرچ کرنے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے برابر ہے۔ (۳۲) دل کی سختی دور ہوتی ہے۔ (۳۳) ذکر نعمتوں کو کھینچنے والا اور عذاب کو ہٹانے والا ہے (۳۴) ذکر کرنے والے پر اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعا ہوتی ہے (۳۵) ذکر پر مداومت (پابندی) کرنے والا جنت میں ہنستا ہوا داخل ہوگا (۳۶) ذکر نفل عبادات کا قائم مقام ہے۔ (۳۷) ذکر دوسری عبادات کے لیے معین و مددگار ہے (۳۸) دل سے خوف و ہراس دور ہو جاتا ہے (۳۹) ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ سچا بتاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں (۴۰) ذکر جہنم کے بیچ آڑ ہے (۴۱) ذکر کرنے والے کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں (۴۲) ذکر کی کثرت نفاق سے بری ہونے کی سند ہے (۴۳) ذکر کرنے والے کسی چیز میں بھی ذکر کے برابر لذت نہیں پاتے (۴۴) ذکر کرنے والوں کا چہرہ دنیا میں پر رونق اور آخرت میں پُر نور ہوگا۔ (۴۵) کثرت سے ذکر کرنے والے کے گواہ بھی کثرت سے ہوں گے۔

[illegible]

رسول اللہ کے صحابی۔ سب سے پہلے انصاری جو اسلام لائے۔ آپ اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ اکٹھے مکہ جا رہے تھے کہ نبی کریم صلعم کے متعلق سنا۔ آستانۂ نبوت پر حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور مدینہ واپس آ گئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ دونوں عقبہ میں حاضر ہوئے تھے اور دیگر صحابہ کے ساتھ ہی مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ آپ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ ابو الحکم بن اخنس ثقفی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر ابو الحکم پر حملہ کیا۔ اور اس کی آدھی ران کاٹ دی۔ پھر گھوڑے سے گرا ہلاک کر دیا۔

ذمہ

وہ ذمہ داری جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال، عزت اور حرمت کے تحفظ کے سلسلے میں قبول کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا ہے۔ اسلامی قانون میں غیر مسلم رعایا کی دو اقسام تجویز ہوئی ہیں اول وہ لوگ جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعے اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں۔ ایسے ذمیوں کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ انھیں وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو صلح نامے میں درج ہیں۔ رسول اللہ صلعم کا فرمان ہے "اگر تمہیں کسی قوم سے جنگ پیش آ جائے اور تم ان پر غالب آ جاؤ اور وہ تم سے صلح نامہ طے کرے تو تم پر ان شرائط کا بجا لانا فرض ہے اور اس سے بڑھ کر ان پر کوئی حق نہیں رکھتے (ابو داؤد)۔ ابو داؤد ہی کی حدیث ہے کہ "جو شخص کسی معاہدہ پر ظلم کرے گا یا اس کے پورے حقوق نہیں دے گا یا اس کی استطاعت سے بڑھ کر اس پر بار ڈالے گا یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی چیز وصول کرے گا تو میں اس کے خلاف آخرت میں خود مستغیث بنوں گا"۔ دوسرے وہ لوگ جنھیں بزور شمشیر فتح کیا گیا ہو۔ ان لوگوں کی طرف سے بیگانگی، شورش، بغاوت کے امکانات کو ختم کرنے کے لیئے قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور یہ حکومت کا فرض ہے کہ اپنی مملکت میں امن و سلامتی کی فضا قائم رکھنے کے لیئے حسب ضرورت قوانین بنا سکے۔

عمومی رنگ میں جو کم سے کم حقوق اسلام نے ذمیوں کو دیئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) ذمیوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ جو مذہب چاہیں اختیار کریں ان کے مذہب سے کچھ بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ وہ اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے میں آزاد ہونگے۔ ان کے عبادت خانے منہدم نہیں کیے جائیں گے اور مذہبی ضرورت کے لیے وہ نئی عبادت گاہیں بھی بنا سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "دین کے معاملے میں کسی بھی شخص کے ساتھ جبر و اکراہ کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ ہدایت گمراہی کے مقابلے میں بالکل واضح اور عیاں ہے (بقرہ، ۲۵۶)۔ ارشاد ربانی ہے "اگر اللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ذریعے دفاع کا بندوبست نہ کرتا رہتا تو یقیناً نصاریٰ کے صوامع گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت ذکر کیا جاتا ہے منہدم کر دی جاتیں (الحج ۴۰)۔ چنانچہ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ پرانے معبد قائم رکھے اور ذمیوں کو نئے معبدوں کی اجازت دی بلکہ معبدوں کے متعلق تمام عہدے اور تمام جائدادیں بحال رکھیں جو ان معبدوں کے لیے وقف تھیں۔ پجاریوں اور مجاوروں کے روزینے بھی اسی طرح جاری رکھے گئے (۲) ذمیوں کے سلسلے میں اسلامی حکومت دوسری ذمہ داری یہ لیتی ہے کہ جب کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو حملہ آور کی مزاحمت کی جائے گی اور ذمیوں کی حفاظت کی جائے گی۔ (۳) ذمی کی جان محفوظ رہے گی اور اس بارے میں اس کی حیثیت قانونی دوسرے شہریوں

Marfat.com

کے برابر ہوگی۔ حقوق میں سے سب سے مقدم قصاص کا حق ہے۔ (۴) ذمی کا مال محفوظ رہے گا اور اس کے مال و جائداد کے حقوق مسلمان شہریوں کے برابر ہونگے۔ آغاز اسلام ہی میں یہ مسئلہ طے پا گیا تھا کہ مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعایا کی مقبوضہ زمینیں انہی کے قبضہ میں رہیں گی (امام ابویوسف: کتاب الخراج) امام ابویوسف لکھتے ہیں کہ حکومت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ذمیوں سے ان کی زمین چھین لے۔ وہ زمین ان کی ملک ہے۔ انھیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی اور وہ اس کی خرید و فروخت کے مجاز ہیں (۵) ذمیوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے گی۔ اسلامی ریاست میں مسلمان اور ذمی شہری حقوق کے مسئلے میں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذمیوں کے متعلق کسی قسم کا تحقیر کا لفظ استعمال کرنا ناپسند خیال کیا جاتا ہے۔

آنحضور صلعم نے ایک ارشاد میں نجران کے ذمیوں کو جو حقوق دیئے اس کے الفاظ تاریخوں میں اس طرح درج ہیں (ترجمہ) "نجرانیوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ داری دی جاتی ہے کہ ان کی جان، مذہب، زمین اور اموال محفوظ رکھے جائیں گے یہ معاہدہ ان لوگوں پر بھی اطلاق پائے گا جو اس وقت اس موقع پر موجود نہیں۔ ان کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ ان کے تجارتی قافلوں اور وفود وغیرہ کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کے کسی حق کو تلف نہیں ہونے دیا جائے گا۔ کسی اسقف کو اس کے عہدے سے برطرف، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے بے دخل اور گرجا کے متولی و ناظم کو اس کے فرائض سے منع نہیں کیا جائے گا۔ انھیں زمانۂ جاہلیت کے جرائم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ان پر عشر (ٹیکس) عائد نہیں ہوگا اور نہ فوج ان کے علاقے میں داخل ہوگی" (امام ابویوسف، کتاب الخراج، فتوح البلدان)

اسلام کا اصولِ حکمرانی یہ ہے کہ ہر شخص کو بوقتِ ضرورت فوجی خدمت کے لئے بلایا جا سکتا لیکن ذمیوں کے ساتھ یہ رعایت ہے کہ فوجی خدمت ان کے لئے لازمی نہیں۔ اس کے بدلے ان سے جزیہ کی معمولی رقم لی جاتی ہے۔ کمزور، بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار اور بے روزگار لوگوں کو جزیہ سے مستثنیٰ ٹھہرایا گیا ہے۔ جزیہ ذمیوں کے جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں ہوتا ہے۔

ذنب

دیکھئے۔ نجوم

ذوالحجہ

عربی، اسلامی، قمری تقویم کے بارھویں مہینے کا نام۔ اسلامی عبادات میں سے حج اسی ماہ کی نو تاریخ کو ادا کیا جاتا ہے اور اس کی دسویں تاریخ کو عیدالاضحیٰ (عید قربان) ہوتی ہے۔

ذوالحلیفہ

دیکھئے، "حج"

ذوالخلصہ

وہ بت، جس کی زمانۂ جاہلیت میں قبائل دوس، خثعم، بجیلہ، ازد السرات اور تبالہ کے عرب پوجا کرتے تھے۔ علاماتِ قیامت کی ایک حدیث میں اس بت کا ذکر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک قبیلہ دوس کی عورتیں ذوالخلصہ کے گرد پھر جمع ہو جائیں گی اور اس کی اسی طرح پوجا نہ کریں گی جیسی پہلے زمانے میں کی جاتی تھی" یہ بت ایک سفید پتھر تھا جس پر تاج ایسی ایک شکل منقوش تھی۔ یہ تبالہ میں العبلاء کے مقام پر تھا۔ یہ مقام مکہ اور یمن کے درمیان مکہ سے تقریباً ۱۱۹ میل کے فاصلے پر تھا (ابن الکلبی: کتاب الاصنام)۔ بت پرست اسے بیت اللہ کے مقابلے میں کعبۃ الیمانیہ کہتے تھے (ابن سعد) جب اسلام پھیلا تو حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ نے اس بت کو اکھاڑ پھینکا۔ (کتاب الاصنام)

ذوالجلال والاکرام

دیکھئے، "اسماء الحسنیٰ"

ذوالجناح

سید الشہداء حضرت امام حسینؓ بن علیؓ سے منسوب گھوڑا۔ اہل تشیع ہر سال دس محرم کو یوم عاشورہ سوگ کے طور پہ مناتے ہیں۔ اس روز ذوالجناح نکالا جاتا ہے خوبصورت اور سجائے ہوئے گھوڑے پہ جگہ جگہ تیر باندھ دیئے جاتے ہیں۔ ذوالجناح کو امام حسینؓ کی سواری کا مظہر قرار دیا جاتا ہے:

ذوالفقار

ایک مشہور تلوار جو آنحضرت صلعم کو غزوۂ بدر میں مال غنیمت میں ملی تھی۔ اس سے پہلے ذوالفقار کا مالک ایک مشرک عاص بن منبہ تھا جو غزوۂ بدر میں مارا گیا۔ اس کا ذکر کئی احادیث میں آیا ہے۔ ذوالفقار کی وجہ تسمیہ میں کہا گیا ہے کہ اس تلوار میں دندانے یا کھدی ہوئی لکیریں تھیں۔ آنحضرت صلعم نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپ کی تلوار ذوالفقار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو اس کی تعبیر آپ نے یہ فرمائی کہ آپ کی ذات پر کوئی تکلیف آنے والی ہے اور اس سے مراد وہ تکلیف لی گئی جو غزوۂ احد میں آپ کو پیش آئی (البلاذری: انساب الاشراف)۔ تلوار اگرچہ نبی کریم صلعم کی تھی لیکن حضرت علیؓ کے پاس رہنے کے بعد خلفائے عباسیہ کے ہاتھ لگ گئی۔ تاہم "ذوالفقار" حضرت علیؓ کی طرف منسوب رہی ہے اور ایک علوی نشان سمجھی جاتی ہے۔

ذوالقدر

ایک ترکمان خاندان جس نے دو صدیوں تک (۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء — ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء) البستان سے مرعش و ملطیہ تک کے علاقے پر حکومت کی۔ یہ حکمران پہلے مصر کے ممالیک اور بعد میں عثمانی سلاطین کے باجگزار رہے۔ اس خاندان کا بانی زین الدین قرہ جہ بن ذوالقدر تھا۔ ایلخان ابوسعید کی وفات کے بعد جو ابتری پھیلی، اس سے فائدہ اٹھا کر قرہ جہ نے البستان پر قبضہ کر کے مملوک سلطان سے مسند حکومت حاصل کرلی۔ اس کی باقی عمر اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کشمکش میں اور مصر کی سیادت کے خلاف بغاوتوں میں گزری۔ اس نے حلب کے والی سے شکست کھائی اور اس کے حریف محمد بن ارتنہ نے اسے مصریوں کے حوالے کر دیا۔ مصریوں نے ۱۳۵۴ء میں اسے سزائے موت دی۔ قرہ جہ کے فرزند اور جانشین خلیل نے اپنے والد کے ساتھ غداری کا انتقام لینے کے لیے ارتنہ اوغلو سے خرپوت چھین لیا۔ ۱۳۸۱ء میں مصری افواج نے خلیل کو البستان سے نکال دیا۔ انجام کار ۱۳۸۶ء میں سلطان برقوق نے اسے قتل کروا دیا۔ ترکمانوں نے

Marfat.com

خلیل کے چھوٹے بھائی سولی کو جانشین تسلیم کر لیا۔ اس نے مصری فوج کو گوکسون کے قریب شکست دی۔ شام کے والیوں نے برقوق کے خلاف بغاوت کی تو سولی نے ان کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیجیں۔ ۱۳۹۱ء میں اس نے سلطان برقوق کی اطاعت قبول کر لی۔ ۱۳۹۸ء میں سلطان برقوق نے سولی کو قتل کروا دیا۔ عین اس موقع پر عثمانی سلطان بایزید اول نمودار ہوا اس نے ۱۳۹۹ء میں خلیل کے لڑکے ناصر الدین محمد کو حاکم بنا دیا۔ اپنے طویل عہدِ حکومت میں محمد نے نہ صرف مصر سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات قائم رکھے بلکہ عثمانی سلطنت سے بھی دوستانہ تعلقات استوار کر لیے۔ ۱۴۱۹ء میں محمد نے قرہ مان اوغلو کے خلاف مصر کی تادیبی مہم میں حصہ لیا اور اسے شکست دی۔ قرہ مان اوغلو کو گرفتار کر کے قاہرہ بھیج دیا۔ ان خدمات کے صلہ میں سلطان مصر المؤید نے قیصریہ اس کے حوالے کر دیا۔ ۱۴۴۲ء/۸۴۶ھ میں اس نے وفات پائی۔ محمد کے فرزند سلیمان کا عہدِ حکومت (۸۴۶ھ تا ۸۵۸ھ) سکون سے گزرا۔ ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء میں سلیمان کی بیٹی کی شادی آئندہ سلطان محمد ثانی سے کر دی گئی۔ سلیمان کے فرزند ملک ارسلان کے عہدِ حکومت (۸۵۸ھ/۱۴۵۴ء تا ۸۷۰ھ/۱۴۶۵ء) میں ریاست کو اوزون حسن کی طرف سے خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے خرپوت پر قبضہ کر لیا۔ عثمانیوں اور مصریوں کی سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں۔ ارسلان کے بھائی شاہ بداق نے مملوک سلطان خوشقدم کے ایما پر سازش کر کے ملک ارسلان کو قتل کر دیا۔ اس کی جگہ شاہ بداق تخت نشین ہوا۔ محمد ثانی نے ملک ارسلان کے دوسرے بھائی شاہ سوار کو اس کے سارے آبائی علاقے پر والی بنا دیا۔ شاہ سوار نے شاہ بداق کو نکال دیا اور اتنی قوت پکڑی کہ محمد ثانی کی حمایت سے بھی آزاد ہو گیا۔ مصری اسے گرفتار کر کے قاہرہ لے گئے اور ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں اسے قتل کر دیا۔ شاہ بداق پھر سے حاکم بنا۔ اس کے ایک اور بھائی علاء الدولہ کی بیٹی کی شادی شاہزادہ بایزید سے ہو چکی تھی (اسی کے بطن سے سلطان سلیم اوّل پیدا ہوا)۔ علاء الدولہ نے محمد ثانی سے حمایت کی درخواست کی۔ ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں شاہ بداق کو نکال دیا گیا۔ جب سلطان سلیم اول نے شاہ اسمٰعیل پر حملہ کیا تو علاء الدولہ نے عثمانی فوج کو کمک دینے سے انکار کر دیا۔ ۹۲۱ھ/۱۵۱۵ء میں عثمانی فوجوں نے حملہ کر کے علاء الدولہ کو قتل کر دیا۔ علاء الدولہ کی جگہ علی بیگ جانشین ہوا۔ اس نے سلیم اول کے حملہ مصر کے وقت خوب نام پیدا کیا۔ فرہاد پاشا نے سلیم اول سے ملی بھگت کر کے علی کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے ساتھ خاندانِ ذوالقدر کا دو صد سالہ عہدِ حکومت اختتام کو پہنچا۔

ذوالقرنین

عظیم فرمانروا، زبردست فاتح اور عظیم الشان ذرائع کا مالک۔ ذوالقرنین کا ذکر قرآن مجید میں سورہ کہف میں آیا۔ اس سے پانچ مختلف شخصیتوں کی طرف اشارہ سمجھا گیا ہے۔ (۱) یمن کے ملوک حمیر کے سلسلے کا ایک طاقتور بادشاہ جس کا نام الصعب بن قرین بن الہمال بیان کیا جاتا ہے (۲) ملوک حیرہ کے خاندان لخم کا فرمانروا منذر بن امری القیس المعروف بہ منذر الاکبر (۳) مشہور یونانی فاتح سکندر بن فیلقوس۔ اسے اکثر مؤرخین اور مفسرین نے قرآنی ذوالقرنین کا مصداق بتایا ہے۔ امام رازیؒ نے جزم و یقین کے ساتھ سکندر یونانی ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ مؤرخوں میں طبری اور ابن ہشام نے بھی سکندر یونانی ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ (۴) خورس بانی سلطنت ایران۔ اس کے نام مختلف زبانوں میں سائرس، کوروش اور کیخسرو آئے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے اسے قرآنی ذوالقرنین کا مصداق ٹھیرایا ہے۔ ابن کثیر نے ایک اور سکندر کا نام لیا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا معاصر، موحد اور صاحبِ ایمان تھا اور اس مشہور سکندر یونانی سے دو ہزار سال قبل گزرا ہے۔ تاریخ میں اس سکندر کا ذکر نہیں ملتا۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے "اور اے نبی یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہو میں اس کا کچھ حال تم کو سناتا ہوں۔ ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا اور اسے ہر قسم کے اسباب و وسائل بخشے تھے اس نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سروسامان کیا۔ حتیٰ کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا تو اس نے سورج کو کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا (ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل) وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین، تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔ اس نے کہا جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔ اور جو ان میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کے لیے اچھی جزا ہے اور ہم اس کو نرم احکام دیں گے۔ پھر اس نے (ایک دوسری مہم کی) تیاری کی یہاں تک کہ طلوعِ آفتاب کی حد تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لیے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔ یہ حال تھا ان کا اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اسے ہم جانتے ہیں، پھر اس نے (ایک اور مہم کا) سامان کیا یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا (کاکیشیا کے پہاڑی سلسلے) تو اسے ان کے پاس ایک قوم ملی جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔ ان لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین، یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم تجھے کوئی ٹیکس اس کام کے لیے دیں کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دے؟ اس نے کہا جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے تم بس محنت سے میری مدد کرو۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔ مجھے لوہے کی چادریں لا دو۔ آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اس نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ۔ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سرخ ہو گئی تو اس نے کہا لاؤ اب میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں گا۔ (یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آ سکتے تھے اور اس میں نقب لگانا ان کے لئے اور بھی مشکل تھا۔ ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوندِ خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (الکہف آیت ۸۳ تا ۹۸)

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ نزول قرآن سے پہلے جتنے مشہور فاتحین گزرے ہیں ان میں سے خورس ہی کے اندر "ذوالقرنین" کی علامات زیادہ پائی جاتی ہیں لیکن تعیین کے ساتھ اسی کو ذوالقرنین قرار دینے کے لیے ابھی مزید شہادتوں کی ضرورت ہے تاہم دوسرا کوئی فاتح قرآن کی بتائی ہوئی علامات کا اتنا بھی مصداق نہیں ہے جتنا خورس ہے۔ خورس ایک ایرانی فرمانروا تھا جس کا عروج ۵۴۹ ق م کے زمانے میں شروع ہوا۔ اس نے چند سال کے عرصے میں میڈیا (الجبال) اور لیڈیا (ایشیائے کوچک) کی سلطنتوں کو مسخر کرنے کے بعد ۵۳۹ ق م میں بابل کو بھی فتح کر لیا جس کے بعد کوئی طاقت اس کے راستے میں مزاحم نہ رہی اس کی فتوحات کا سلسلہ سندھ اور صُغد (موجودہ ترکستان) سے لے کر ایک طرف مصر اور لیبیا تک اور دوسری طرف تھریس اور مقدونیہ تک وسیع ہو گیا اور شمال میں اس کی سلطنت قفقاز (کاکیشیا) اور خوارزم تک پھیل گئی۔ عملاً اس وقت کی پوری مہذب دنیا اس کی تابع فرمان تھی۔

ذوالقرنین کی آہنی دیوار قفقاز کے علاقہ داغستان میں دربند اور داریال کے درمیان بنائی گئی تھی۔ قفقاز اس ملک کو کہتے ہیں جو بحیرۂ اسود اور بحیرۂ خزر کے درمیان واقع ہے۔ اس ملک میں بحیرۂ اسود سے داریال تک تو نہایت بلند پہاڑ ہیں اور ان کے

Marfat.com

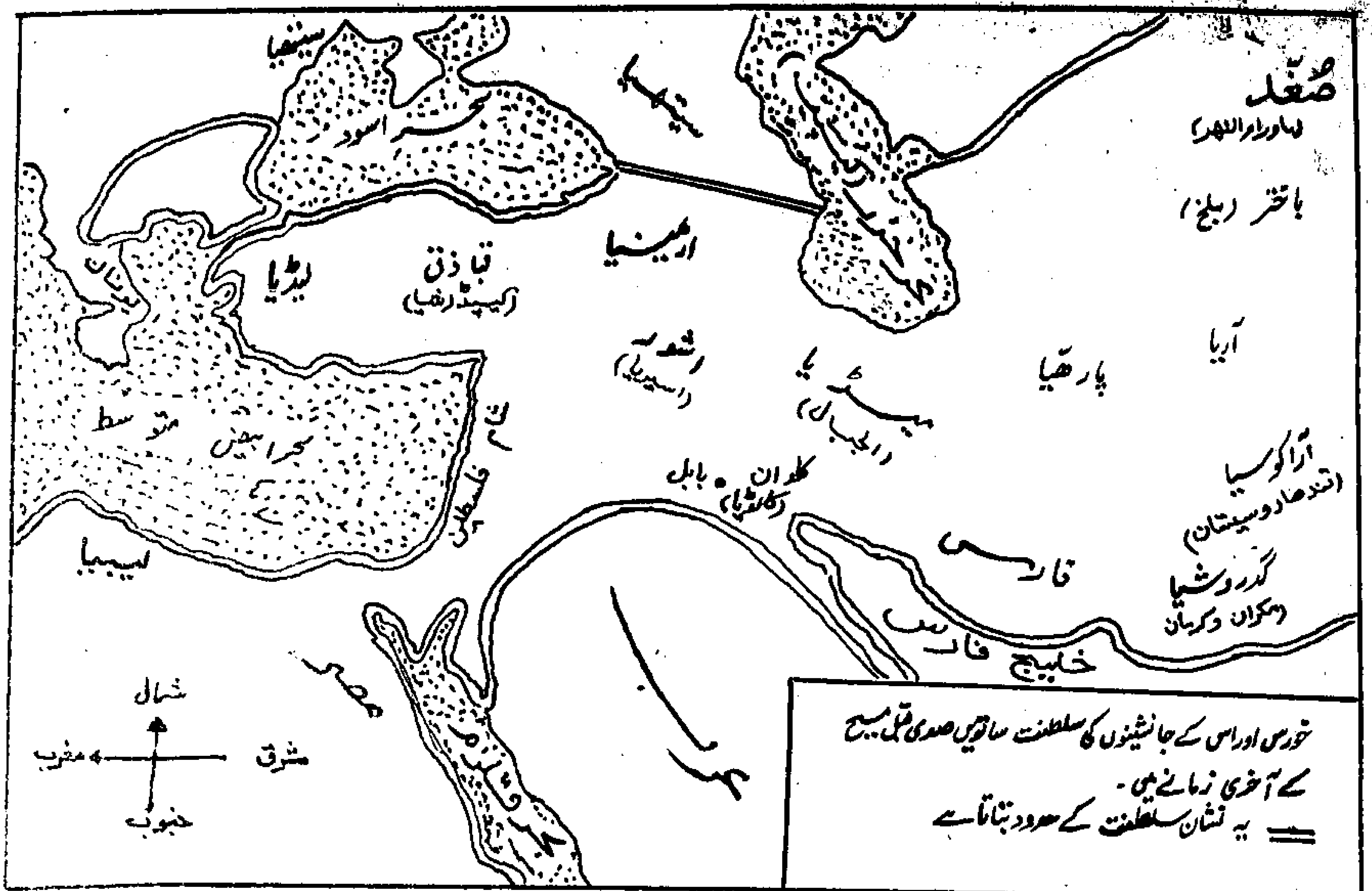

درمیان اتنے تنگ درے ہیں کہ ان سے کوئی بڑی حملہ آور فوج نہیں گزر سکتی۔ البتہ دربند اور داریال کے درمیان جو علاقہ ہے اس میں پہاڑ زیادہ بلند نہیں ہیں اور کوہستانی راستے خاصے وسیع ہیں۔ قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی طرف سے جنوب کی طرف غارت گرانہ حملے کرتی تھیں اور ایرانی فرمانرواؤں کو اسی طرف سے اپنی مملکت پر حملوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ انہی حملوں کو روکنے کے لیے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی جو ۵۰ میل لمبی، ۲۹ فٹ بلند اور دس فٹ چوڑی تھی۔ ابھی تک تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ دیوار ابتداءً کب اور کس نے بنائی تھی مگر مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدِ ذوالقرنین قرار دیتے ہیں اور اسی کی تعمیر کی جو کیفیت قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔ ابن جریر طبری اور ابن کثیر نے اپنی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہے اور یاقوت نے بھی معجم البلدان میں اس کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے آذربائیجان کی فتح کے بعد ۲۲ھ میں سراقہ بن عمرو کو باب الابواب (دربند) کی مہم پر روانہ کیا اور سراقہ نے عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو اپنے مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر آگے بھیجا۔ عبدالرحمٰن جب آرمینیا کے علاقے میں داخل ہوئے تو وہاں کے فرمانروا شہر براز نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے باب الابواب کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر شہر براز نے ان سے کہا کہ میں نے ایک آدمی کو سدِ ذوالقرنین کا مشاہدہ اور اس علاقے کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا تھا وہ آپ کو تفصیلات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے عبدالرحمٰن کے سامنے اس شخص کو پیش کیا۔

اس واقعہ کے دو سو برس بعد عباسی خلیفہ واثق (۲۲۷ھ — ۲۳۳ھ) نے سدِ ذوالقرنین کا مشاہدہ کرنے کے لئے سلام الترجمان کی قیادت میں پچاس آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی جس کے حالات یاقوت نے معجم البلدان میں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ یہ وفد سامرہ سے تفلیس، وہاں سے السریر، وہاں سے اللان ہوتا ہوا فیلان شاہ کے علاقے میں پہنچا، پھر خزر کے ملک میں داخل ہوا اور اس کے بعد دربند پہنچ کر اس نے سد کا مشاہدہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مسلمان عام طور پر قفقاز کی اسی دیوار ہی کو سدِ ذوالقرنین سمجھتے تھے۔

ذوالقعدہ

اسلامی ہجری تقویم کا گیارھواں مہینہ جو حرمت والے چار مہینوں اور حج کے مہینوں میں شمار ہوتا ہے۔

ذوالکفلؑ

ایک بزرگ کا لقب جن کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ حضرت زکریا کا دوسرا نام ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ حضرت الیاسؑ ہیں۔ کوئی یوشع بن نون کا نام لیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ الیسعؑ ہیں۔ کوئی انھیں الیسعؑ کا خلیفہ بتاتا ہے اور کسی کا قول یہ ہے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوتے اور ان کا اصلی نام بشیر تھا۔ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقی ایلؑ نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری (۵۹۷ ق م) کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہر خابور کے کنارے ایک بستی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے۔"

سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ "یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایلؑ نبی کی طرف ظاہر کیا ہے۔ لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی

Marfat.com

بنا پر یہ رائے قائم کی جاسکے تاہم اگر اس کے لئے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابلِ ترجیح ہوسکتی ہے کیونکہ بائیبل کے صحیفہ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں یعنی صابر و صالح - وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بخت نصر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بخت نصر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نو آبادی دریائے خابور کے کنارے قائم کردی تھی جس کا نام تل ابیب تھا۔

اسی مقام پر ۵۹۲ ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے جبکہ ان کی عمر تیس سال تھی اور مسلسل بائیس سال ایک طرف گرفتارِ بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کی بیداری کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس کارِ عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا اُس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال اُن کی بیوی (جنہیں وہ خود منظورِ نظر کہتے تھے) انتقال کر جاتی ہیں لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں اور حزقی ایل اپنا دکھڑا چھوڑ کر اپنی ملت کو خدا کے اُس عذاب سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں جو اس کے سر پر تلا کھڑا تھا۔

ذوالنون ؑ

دیکھئے یونس علیہ السلام۔

ذوالنون

(۱۹۰ھ/۷۹۶ء — ۲۴۶ھ/۸۶۱ء) ابو الفیض ثوبان بن ابراہیم مصر کے ایک صوفی بزرگ۔ ان کے والد نوبیہ کے رہنے والے تھے۔ ذوالنون نے طب اور کیمیا کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے استاد اور مرشد سعدون مصری تھے ذوالنون نے مکہ مکرمہ اور دمشق کی سیاحت کی۔ آخری عمر میں انھیں گرفتار کر کے بغداد میں قید کیا گیا لیکن بالآخر خلیفہ المتوکل کے حکم سے رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد مصر واپس آگئے۔ ذوالنون "رئیس الصوفیاء" کہلاتے ہیں سحر اور کیمیا کی چند کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ ان کی بہت سی دعائیں اور بعض اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ روحانی ترقی کے راستے میں نفس امارہ اصل رکاوٹ ہے جسے قابو میں لانے کا طریقہ ریاضت اور نفس کشی ہے۔ سب سے پہلے ذوالنون ہی نے صوفیاء کے عقائد بیان کیے اور معرفت کے حقیقی معنی سمجھائے۔ انھوں نے بتایا کہ معرفت توحید حقیقی کی صفات کے پہچاننے کا نام ہے اور یہ پہچان اولیاء اللہ کا خاصہ ہے جو اپنے دل کے اندر "وجہ اللہ" کا مراقبہ کرتے ہیں اس لئے اللہ انھیں اپنی بابت وہ کشف عطا فرماتا ہے جو دنیا میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔ ذوالنون ایک باعمل صوفی تھے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ روح کو منزلِ مقصود کی طرف بلند پروازی میں کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں۔ انھوں نے فنافی اللہ ہوکر زندگی بسر کرنے کے صوفیانہ تصور کی صراحت بھی کی ہے۔

ذہب

دیکھئے، سونا

ذہبی

(۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء — ۷۴۸ھ/۱۳۴۸ء) شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان بن قایماز بن عبداللہ الترکمانی الفارقی الدمشقی الشافعی عرب مؤرخ اور عالمِ دین۔ انھوں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ قاہرہ کے مستند علماء کے پاس سب سے زیادہ مدت گزاری ان کے اساتذہ کی تعداد تیرہ سو سے زیادہ ہے۔ تحصیلِ علم کے بعد دمشق میں حدیث کے استاد مقرر ہوئے۔ انھیں حدیث، الفقہ اور تاریخ میں ممتاز حیثیت حاصل تھی وہ دن رات مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ ۷۴۱ھ اور ۷۴۳ھ کے درمیان ان کی بینائی جاتی رہی۔ سیرت نگاروں نے انھیں محدث العصر اور خاتم الحفاظ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان کی تصانیف حدیث میں اور علم الرجال میں بہت مقبول ہوگئیں۔ "تاریخ الاسلام" ان کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ تاریخ رسول کریم صلعم کے نسب نامے سے شروع ہوکر ۷۰۰ھ پر ختم ہوتی ہے۔ حدیث کے شعبے میں ان کی تصانیف یہ ہیں: (۱) تذہیب الکمال فی اسماء الرجال (۲) المشتبہ فی اسماء الرجال۔

ذی النورین رضؓ

دیکھئے عثمان رضؓ بن عفان۔

رابعہ بصری رحؒ

(۹۵ھ/۷۱۴ء — ۱۸۵ھ/۸۰۱ء) بصرہ کی مشہور عارفہ جن کا شمار اولیاء میں ہوتا ہے۔ غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ بچپن میں کسی شخص نے انھیں پکڑ کر فروخت کر دیا۔ ان کی پاک طینت نے انھیں رہائی دلوائی۔ انھوں نے گوشہ نشینی اور تجرد کی زندگی بسر کرنے کے لیے صحرا میں عزلت اختیار کرلی۔ بصرہ میں آئیں تو ان کے گرد معتقدین اور رفقاء جمع ہوگئے جو ان سے دعائے خیر اور ان کی تعلیم سے مستفید ہونے کیلئے ان کے پاس آتے تھے۔ ان میں مشہور صوفی مالک بن دینار رحؒ، درویش صفت رباح القیسیؒ، محدث سفیان ثوری رحؒ اور صوفی شقیق بلخی شامل تھے۔ رابعہ بصری رحؒ نے انتہائی زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی۔ دیگر اولیاء کی طرح ان سے بھی بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔

ان کی جو دعائیں منقول ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے جو وہ معمولات کے وقت اپنے مکان کی چھت پر جاکر مانگا کرتی تھیں: "اے میرے مالک ستارے چمک رہے ہیں اور آدمیوں کی آنکھیں نیند میں بند ہیں اور ہر کوئی اپنی اپنی خلوت میں ہے اور میں ہوں کہ یہاں اکیلی ہوں تیرے ساتھ۔ اے میرے مالک! اگر میں دوزخ کے خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں تو تو مجھے دوزخ میں جھونک دے اور اگر میں جنت کی توقع میں تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے جنت سے محروم کردے لیکن اگر میں محض تیری ہی خاطر تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھ سے اپنے لازوال حسن کو پوشیدہ نہ رکھیو۔" ایک بار جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ انھوں نے ولایت کا مرتبہ کیسے حاصل کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا: "ان چیزوں کو ترک کر دینے سے جن کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں اور اس کی قربت سے جو ابدی ہے"۔

دوسرے اہل تصوف کی طرح رابعہ بصری رحؒ بھی خدا سے وصل کی متمنی تھیں۔ وہ معرفتِ حقیقی رکھتے ہوئے والہانہ محبت سے سرشار تھیں وہ ان اولین اہل تصوف میں سے تھیں جنھوں نے خالص محبت (بے غرض محبت) کی تلقین کی اور اس تعلیم کو نظریۂ کشف کے امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کا وقتِ آخر تھا تو انھوں نے اپنے رفقاء سے کہا کہ وہ ان کے پاس سے ہٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ کے قاصدوں کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ جونہی رفقاء باہر نکلے انھوں نے رابعہ بصری رحؒ کو کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے سنا۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

رادھن پور

برطانوی ہند میں ایک مسلم ریاست جو ریاست ہائے مغربی ہند کاٹھیاواڑ اور بمبئی میں شامل تھی اور اب بھارت کے صوبہ گجرات میں مدغم ہوچکی ہے۔ یہ ریاست گجرات

Marfat.com

کے شمالی مغرب کرنے میں رن کچھ کے قریب واقع تھی۔ اس کا رقبہ ۱۱۵۰ مربع میل اور آبادی (۱۹۲۱ء) ۶۸۰۰۰ تھی۔ اس ریاست کا بانی بہادر خان اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایران سے آیا تھا۔ ۱۷۳۲ء میں اس خاندان کے سربراہ جوانمرد خاں کو رادھن پور اور چند دوسرے اضلاع جاگیر میں ملے۔ ۱۷۳۹ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اسے نواب کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ ۱۷۵۶ء میں مرہٹہ پیشوا رگھوناتھ راؤ نے احمد آباد میں اس کا محاصرہ کر کے اسے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کیا اور اس شرط پر اس کی جاگیر واگزار کی گئی کہ وہ بوقتِ ضرورت پانچسو سپاہی اور تین سو گھوڑے پیشوا کو مہیا کرے گا۔ جوانمرد خاں کے بعد اس کے بیٹے نظام الدین اور غازی الدین ریاست کے مالک بنے۔ ۱۸۱۳ء میں غازی الدین کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شیر خاں کو رادھن پور اور کمال الدین کو سامی اور منج پور کے اضلاع ملے۔ ۱۸۲۴ء میں کمال الدین کی وفات کے بعد شیر خاں کے تحت ریاست پھر متحد ہو گئی۔ ۱۸۱۳ء میں ریاست کا حکومت برطانیہ سے رابطہ قائم ہوا اور بڑودہ کے مہاراجہ گائیکوار کو رادھن پور اور دیگر ریاستوں کا نگران مقرر کیا گیا۔ ۱۸۲۰ء میں نواب رادھن پور انگریزوں کا باج گزار قرار دیا گیا۔ شیر خاں کے بعد ندر آور خاں (۱۸۲۰ء — ۱۸۷۴ء) اور بسم اللہ خاں (۱۸۷۴ء — ۱۸۹۰ء) حکمران ہوئے۔ بسم اللہ کا جانشین اس کا نابالغ بیٹا محمد شیر خاں بنا۔ اس کی بلوغت تک ریاست کا انتظام انگریزی حکومت کے ہاتھ میں رہا۔ ۱۹۰۰ء میں ریاست میں انگریزی سکہ رائج ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت نواب مرتضیٰ خاں ریاست کے حکمران تھے۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کو یہ ریاست سوراشٹر کی یونین کا حصہ بن گئی۔ ۱۹۵۶ء میں رادھن پور کو بمبئی میں شامل کر دیا گیا۔ یکم مئی ۱۹۶۰ء کو صوبہ بمبئی، مہاراشٹر اور گجرات کے صوبوں میں منقسم ہوا تو سوراشٹر گجرات کا حصہ بنا۔

رازی

اسلامی اندلس کے تین ممتاز مؤرخین اس نام سے مشہور ہوئے۔ (۱) محمد بن موسیٰ بن بشیر بن جناد بن نفیط الکنانی الرازی۔ وہ ایران کے شہر رے میں پیدا ہوا۔ بلادِ مشرق سے تیسری صدی ہجری کے وسط میں تجارت کرنے کے لئے قرطبہ آیا۔ عربی میں تبحر کی بدولت اموی دار الخلافہ کے علمی حلقوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ امیر محمد بن عبد الرحمٰن نے کئی مواقع پر بلادِ مشرق اور اندلس میں سفارتی خدمات اس کے سپرد کیں۔ امیر موصوف کے بیٹے اور جانشین نے بھی رازی پر اسی اعتماد کا اظہار کیا۔ رازی منذر کی سفارت کے سلسلے میں البیرہ سے واپس ہو رہا تھا کہ ۲۷۳ھ/۸۸۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی تصنیف "کتاب الرایات" ہے جو مسلمانوں کی فتوحات اندلس سے متعلق ہے۔ اس میں عربوں کی ان امدادی افواج کی تفصیل درج ہے جو اپنے اپنے پرچموں کے ساتھ جزیرہ نما میں موسیٰ بن نصیر کے ساتھ داخل ہوئی تھیں۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

(۲) احمد بن محمد (۱۰ ذوالحجہ ۲۷۴ھ/۲۶ اپریل ۸۸۸ء — ۱۲ رجب ۳۴۴ھ/یکم نومبر ۹۵۵ء) مقدم الذکر مؤرخ کا بیٹا جو اندلس میں پیدا ہوا۔ تاریخی تقدم کے لحاظ سے اندلس کے مؤرخین میں یہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخ اندلس پر کئی کتب اور رسالے لکھے: (۱) تاریخ ملوک الاندلس (۲) کتاب فی صفت قرطبہ، (۳) کتاب الاستیعاب، اندلسی عربوں کے انساب پر ضخیم تالیف۔ اس مؤرخ کی کوئی کتاب اب دستیاب نہیں ہے۔

(۳) عیسیٰ بن احمد بن محمد۔ محمد بن موسیٰ رازی کا پوتا اور احمد بن محمد رازی کا بیٹا۔ اس نے اپنے باپ کے لکھے ہوئے وقائع کا سلسلہ اپنے زمانے تک جاری رکھا اور ایسے مآخذ استعمال کئے، جو احمد رازی کو نہیں ملے تھے، ان حصوں میں اضافہ کیا جن میں ابتدائی زمانوں کا بیان ہے۔

رازی۔ ابوبکر محمد

(۲۵۰ھ/۸۶۴ء — ۳۱۳ھ/۹۲۵ء) ابوبکر محمد بن زکریا مشہور طبیب کیمیادان اور فلسفی۔ رے میں پیدا ہوا حاکم رے کی ملازمت میں داخل ہونے کے بعد جلد ہی شہر کے نئے ہسپتال کا نگران اعلیٰ بن گیا۔ بغداد میں بھی اسی منصب پر فائز رہا۔ اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیب ہونے کی شہرت اسے ایک دربار سے دوسرے دربار میں پہنچاتی رہی۔ فلسفی یحییٰ بن عدی (ارسطاطالیس کا پیرو، یعقوبی فرقے کا معتقد اور فارابی کا شاگرد) کے متعلق المسعودی کہتے ہیں کہ اس نے فلسفے کی تحصیل کا آغاز رازی سے کیا تھا۔ داتا گنج بخشؒ کی کشف المحجوب میں مشہور صوفی حسین بن منصور حلاج اور رازی کے درمیان تعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ رازی کا اہم ترین کمال ان کی طبابت ہے۔ اسے اسلامی دنیا کا سب سے بڑا طبیب مانا جاتا ہے۔ اس نے مختلف امراض پر متعدد رسائل لکھے جن میں چیچک اور خسرہ پر رسالہ "کتاب الجدری والحصبہ" سب سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ طب پر دستور العمل کی کئی بڑی کتابیں لکھیں اس کتاب "طب المنصوری" والیٔ رے منصور بن اسحاق کے نام اور طب الملوکی والیٔ طبرستان علی بن دیمسوذان کے نام معنون ہیں۔ کتاب الحاوی عربی زبان میں سب سے بڑا طبی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔ اس کتاب میں طب کے ہر مسئلے پر تمام یونانی اور عرب اطبا کی آرا نقل کی گئی ہے۔ طبیعات، ریاضیات، فلکیات اور بصریات پر کتابیات نویسوں نے اس کی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں ہے۔ البیرونی نے رازی کے سوانح حیات اور تالیفات کے لئے ایک پورا رسالہ وقف کیا ہے۔ ما بعد الطبیعیات پر رازی نے جو کتابیں لکھیں وہ بھی دستیاب نہیں ہیں۔ رازی سائنس اور فلسفیانہ علم کے ارتقا پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بہت قدیم فلسفہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ارسطاطالیس اور افلاطون سے فائق سمجھتا ہے۔ فلسفے میں وہ اپنے آپ کو سقراط کے قریب اور طب میں بقراط کے درجے کا سمجھتا ہے۔

رازی، امین احمد

ایرانی تذکرہ نویس۔ اس کی شہرت کا باعث "تذکرۂ ہفت اقلیم" ہے جو ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ سات اقلیموں کی جغرافیائی ترتیب کے مطابق لکھا گیا ہے۔ ہر اقلیم میں مختصر جغرافیائی و تاریخی تعارف ہے اور اس کے بعد شعرا، علما اور مشہور شیوخ کے حالات تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ شعرا کے حالات لکھتے ہوئے ان کے کلام کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ تذکرہ حسب ذیل فصول پر مشتمل ہے: (۱) اقلیم اول: یمن، الزنج، نوبیہ اور چین (۲) اقلیم دوم: مکہ، مدینہ، یمامہ، ہرمز، دکن، احمد نگر، دولت آباد، گولکنڈہ، احمد آباد، سورت، بنگال، اوڑیسہ اور کوش (کوچ) (۳) اقلیم سوم: عراق، بغداد، کوفہ، نجف، بصرہ، یزد، فارس، سیستان، قندھار، غزنین، لاہور، دہلی، ہندوستان، شام اور مصر (۴) اقلیم چہارم: خراسان، بلخ، ہرات، جام، مشہد، نیشاپور، سبزوار، اسفرائن، اصفہان، کاشان، قم، ساوہ، ہمدان، طہران، دماوند، استر آباد، طبرستان، مازندران، گیلان، قزوین، آذربائیجان، تبریز، اردبیل، مراغہ (۵) اقلیم پنجم: شیروان، گنجہ، خوارزم، ماوراء النہر، سمرقند، بخارا، فرغانہ (۶) اقلیم ششم: ترکستان، فاراب، یارقند، روس، قسطنطنیہ، روم (۷) اقلیم ہفتم: بلغار، صقلب، یاجوج ماجوج۔

رازی، فخر الدین

دیکھئے۔ فخر الدین رازی

Marfat.com

راس، سرایڈورڈ

(۱۸۷۱ء — ۱۹۴۰ء) برطانیہ کا مشہور مستشرق۔ لندن میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ اعلیٰ تعلیم سٹراسبرگ اور پیرس کی یونیورسٹیوں سے حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں یونیورسٹی کالج لندن میں فارسی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل اور ۱۹۱۴ء تک بنگال گورنمنٹ کی ملازمت میں رہا۔ اس دوران میں اس نے لارڈ کرزن کے ایما پر پٹنہ کی خدابخش اورینٹل لائبریری کے عربی فارسی مخطوطات کی فہرست نگاری کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ اس نے بابر بادشاہ کا ترکی دیوان شائع کیا۔ عربی کی کتاب "تاریخ گجرات" کو ہندوستانی فضلا کی مدد سے تین جلدوں میں طبع کیا۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں وہ سکول آف اورینٹل سٹڈیز لندن کا پہلا ڈائرکٹر مقرر ہوا۔ اور بیس بائیس سال تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ نے اسے سر کا خطاب دیا۔ سبکدوش ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے اسے ۱۹۳۹ء میں استنبول بھیجا تاکہ وہ ترکوں سے برطانیہ کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات استوار کرے۔ استنبول میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوا۔

راسم احمد

(۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء — ؟) سوسے زائد کتب کا ترک مصنف۔ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں استنبول کے مشہور مدرسے دارالشفقہ سے فارغ التحصیل ہوا۔ بہت سے دوسرے اہل قلم کی طرح راسم نے بھی ادبی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا۔ ترکی کے تقریباً تمام اہم اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ جو بعد میں دو جلدوں میں (مقالات و مصاحبات) شائع ہوئے۔ ان کی کتاب "عمرِ ادبی" چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف کے روحانی ارتقا اور ان احساسات و جذبات کا عکس نظر آتا ہے جو مختلف رسالوں کی مطبوعات میں منعکس ہوتے رہے۔ اس کا طرزِ بیان اسلوبِ نگارش کے تمام مروجہ دبستانوں اور حلقوں سے یکسر الگ اور آزاد تھا۔ وہ نئے دبستان نگاری کا موجد تھا اس کے ادبی کارنامے ناولوں طویل افسانوں اور داستانوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں ناول سیلِ دل، تجارتِ حیات، مشاقِ حیات اور عسکر او غلو قابلِ ذکر ہیں۔ افسانے تجرابہ سنر عشق، مکتب ارفاد اشم اور ناکام قابلِ ذکر ہیں۔

راشدالدین، سنان

(وفات ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء) ابوالحسن سنان بن سلیمان بن محمد، اسمٰعیلیہ شام کا مشہور پیشوا جو شیخ الجبل کے نام سے بھی معروف ہوا۔ راشد نواح بصرہ میں پیدا ہوئے۔ ایران میں تعلیم پائی۔ ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء میں الموت کے امام حسن کی جانب سے شام کے اسمٰعیلی فرقے کے سردار ہوئے۔ اپنی موت تک اسی منصب پر فائز رہے۔ راشد نے اپنے زمانے کی مصری و شامی سیاست میں نمایاں حصہ لیا۔ سنان کے بارے میں جو قصے ملتے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر اس کی فدائیوں کی تنظیم سے ہے اس تنظیم کے ذریعے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو بذریعہ قتل ختم کرنے کا کام لیا کرتے تھے۔ بہت سے مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ سنان اس فرقے کا سب سے اعلیٰ اور فوق البشر سردار سمجھا جاتا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ وہ امام کے بعد بلند ترین منصب "حجۃ" پر فائز تھے۔

راشد باللہ

(۵۰۰ھ — رمضان ۵۳۲ھ) ابوجعفر منصور بن مسترشد، عباسی خلیفہ۔ ۲ ربیع الآخر ۵۱۳ھ/۱۳ جولائی ۱۱۱۹ء کو خلیفہ مسترشد نے لوگوں سے اپنے بیٹے ابوجعفر منصور کے لئے ولیعہدی کی بیعت لی۔ ذوالقعدہ ۵۲۹ھ میں راشد باللہ کے نام سے اس کی خلافت کی توثیق کی گئی۔ اس نے تخت نشین ہونے کے بعد لوگوں سے مال و دولت لینے میں کسی قدر ظلم و زیادتی سے کام لیا۔ سلطان مسعود کو لوگوں نے شکایات لکھ کر بھیجیں۔ سلجوقی سلطان مسعود بن محمود نے اس سے چار لاکھ دینار طلب کیے۔ راشد نے انکار کر دیا کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ سلطان کے بھتیجے داؤد بن محمود نے آذربائیجان سے بغداد پر فوج کشی کی اور صفر ۵۳۰ھ/نومبر ۱۱۳۵ء میں وہاں پہنچ گیا۔ عمادالدین زنگی اتابک موصل بھی اس سے آملا اور بغداد میں داؤد کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ خبر سن کر سلطان مسعود نے چڑھ کر بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ پچاس دن کے محاصرے کے بعد وہ نہروان کی طرف پسپا ہو گیا اور پھر ہمدان چلا گیا۔ طرنطائی والیٔ واسط نے کشتیوں کی کافی تعداد سلطان مسعود کو فراہم کی۔ اس طرح مسعود نے دجلہ کو عبور کر کے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا۔ داؤد آذربائیجان واپس ہوا۔ زنگی خلیفہ کے ساتھ موصل چلا گیا اور مسعود ذوالقعدہ ۵۳۰ھ/اگست ۱۱۳۶ء میں بغداد میں داخل ہوا۔ مسعود نے لوٹ مار اور دوسری بدعنوانیوں کی ممانعت کر دی اور انتظام سنبھال کر دیا۔ اس نے قاضیوں کی ایک مجلس طلب کی جنہوں نے معزول خلیفہ کے تخت و تاج کے لئے نااہل ہونے کا اعلان کیا۔ سلطان مسعود نے راشد باللہ کے چچا محمد بن مستظہر کو ۱۶ ذوالقعدہ ۵۳۰ھ کو امیرالمؤمنین مقرر کر دیا۔ راشد باللہ کو اپنی معزولی کا حال معلوم ہوا تو وہ موصل سے چل کر آذربائیجان کی طرف چلا گیا۔ اپنے لشکر کو مال و دولت تقسیم کیا۔ آذربائیجان کے شہروں کو لوٹ مار سے برباد کیا وہاں سے ہمدان آیا۔ یہاں بھی خوب فتنہ و فساد برپا کیا۔ پھر اصفہان پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں بیمار ہوا بیماری کے دوران ہی عجمیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

راشد محمد

(وفات ۱۸ صفر ۱۱۴۸ھ/۱۰ جولائی ۱۷۳۵ء) سلطنتِ عثمانیہ کا شاہی تاریخ نویس۔ ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء میں شاہی مؤرخ مقرر ہوا۔ ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۰ء میں حلب کا قاضی مقرر ہونے تک شاہی مؤرخ کے منصب پر مامور رہا۔ کچھ مدت بعد قاضیٔ مکہ مقرر ہوا۔ ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں استنبول کا قاضی مقرر ہوا۔ چند ماہ بعد علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں اناطولی کا قاضیٔ عسکر بنا۔ اس نے نعیما کی تاریخ سلطنت عثمانیہ کا تکملہ (۱۱۳۴ھ تا ۱۱۴۱ھ) لکھا۔ یہ تکملہ عام طور سے "تاریخ راشد" کے نام سے مشہور ہے۔

راضی باللہ

(ربیع الآخر ۲۹۷ھ/دسمبر ۹۰۹ء — ربیع الاول ۳۲۹ھ/دسمبر ۹۴۰ء) ابوالعباس محمد بن مقتدر باللہ، خاندان عباسیہ کا بیسواں خلیفہ۔ مقتدر باللہ کے قتل کے بعد راضی باللہ کا نام خلافت کے لئے تجویز ہوا لیکن قرعۂ فال قاہر باللہ کے نام پڑا۔ اس نے راضی باللہ کو جیل خانے میں ڈال دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جمادی الثانی ۳۲۲ھ میں فوج کے بلوائیوں نے قاہر کو گرفتار کر لیا اور راضی باللہ کو جیل سے نکال کر تختِ خلافت پر بٹھا دیا۔ راضی باللہ نے قاہر کو اندھا کرا دیا۔ راضی نے مقتدر کے وزیر علی بن موسیٰ کو وزیر بنانا چاہا لیکن اس نے پیری کے باعث معذرت کر دی۔ اس پر قلمدانِ وزارت علی بن مقلہ کے سپرد ہوا۔ عہدے داروں میں سب سے زیادہ بارسوخ اور بااختیار محمد بن یاقوت تھا اور وہی معاملات سلطنت پر حاوی تھا۔ جمادی الاول ۳۲۳ھ/اپریل ۹۳۵ء میں محمد بن یاقوت کو معزول کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ جمادی الاول ۳۲۴ھ/اپریل ۹۳۶ء میں ابن مقلہ کو محمد بن یاقوت کے بھائی مظفر بن یاقوت نے گرفتار کر لیا۔ خلیفہ نے مجبوراً ابن مقلہ کو معزول کر دیا۔ اسی سال واسط اور بصرہ کے والی محمد بن رائق کو بغداد بلا کر امیرالامرا کا منصب تفویض

Marfat.com

کر دیا گیا۔ خلیفہ کی حکومت بغداد اور اس کے مضافات کے سوا اور کہیں نہ تھی نہ کسی صوبہ سے خراج آتا تھا۔ ہر جگہ لوگوں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں جنہوں نے خراج بھیجنے کے وعدے پر سندیں حاصل کی تھیں انھوں نے بھی اپنے وعدوں کو پورا نہ کیا۔ ۳۲۶ھ / ۹۳۸ء میں ابن رائق کی جگہ بجکم کو وزیر مقرر کیا گیا۔

خلیفہ راضی باللہ کے عہد خلافت میں محمد بن علی شمعانی معروف بہ ابن ابی العزاقر نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ اسے اور اس کے ہمراہیوں کو خلیفہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ قرامطہ نے بغداد اور مکہ کے درمیان ایسی لوٹ مار مچائی کہ ۳۲۷ھ تک اہل بغداد حج نہ کر سکے۔ ۳۲۷ھ میں ابو طاہر قرمطی نے حاجیوں پر فی شتر پانچ دینار محصول قائم کیا اور لوگوں کو حج کی اجازت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حاجیوں کو حج کرنے کے لیے محصول ادا کرنا پڑا۔ راضی آخری خلیفہ تھا جس نے خطبۂ جمعہ لوگوں کو سنایا۔ اس کے بعد خلفاء نے یہ کام بھی دوسروں کے سپرد کر دیا۔ عرب مؤرخین اس کی پارسائی، عدل و انصاف، رحمدلی اور فیاضی کی تعریف کرتے ہیں۔

راغب اصفہانی

(وفات (۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ء ؟) ابو القاسم حسین بن محمد بن مفضل دینی علوم کا نامور عربی مصنف۔ امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب "اساس التقدیس" میں اس کے اہل السنت اور صحیح العقیدہ ہونے کی توثیق کی ہے۔ راغب کی تصانیف تفسیر القرآن اور ادب و ثقافت سے متعلق ہیں۔ جامع التفاسیر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ امام راغب نے قرآن مجید کا ایک عمدہ لغت "المفردات" کے نام سے تالیف کیا۔ اس کا نام "کتاب المفردات فی غریب القرآن" ہے۔ المفردات کا اردو ترجمہ "مفردات القرآن" کے عنوان سے محمد عبدہ الفلاح فیروز پوری نے ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء میں لاہور سے شائع کیا۔ امام راغب نے مفردات سے پہلے اخلاقیات پر اپنی کتاب "الذریعۃ الی مکارم الشریعت" تالیف کر لی تھی امام غزالیؒ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا ایک نسخہ ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ امام راغب کی مقبول ترین ادبی تصنیف کتاب المحاضرات ہے جو عام ادبی موضوعات پر مشتمل ہے۔

راغب پاشا

(۱۱۱۱ھ / ۱۶۹۹ء ــ ۲۴ رمضان ۱۱۷۶ھ / ۸ اپریل ۱۷۶۳ء) راغب محمد پاشا بن کاتب محمد شوقی، عثمانی وزیر اعظم۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۱۷۰ھ / ۱۲ دسمبر ۱۷۵۶ء کو مصطفیٰ پاشا کو معزول کر کے راغب پاشا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ وہ سات برس تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کا شمار سلطنت عثمانیہ کے ممتاز وزرائے اعظم میں ہوتا ہے۔ وہ محض ایک بہت بڑا مدبر ہی نہیں بلکہ ترکی ادب کا ایک مستند مصنف اور ادیب بھی ہے۔ اس کی تصانیف ادب کی ہر صنف پر حاوی ہیں اور حسن اسلوب و شکوہِ بیان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ وہ ایک ممتاز سیاسی مورخ بھی تھا۔ اس نے میر خواند کی تاریخ عالم اور عبدالرزاق بن اسحٰق کی تاریخ آل تیمور دونوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کا دیوان اس کی اہم ترین منظومات پر مشتمل ہے۔

رافضی

امام اشعری کے نزدیک سب سے پہلے وہ لوگ رافضی کہلائے جنہوں نے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ امام اشعری نے روافض، زیدیہ اور غلات کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ طبری نے لکھا ہے کہ یہ لقب کوفہ کے زیدیوں کو ملا جنہوں نے زید بن علی کو اس بنا پر چھوڑ دیا تھا کہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ بعض کے نزدیک عبداللہ بن سبا کے ساتھی سب سے پہلے رافضی کہلائے۔

رافع

دیکھیے، اسماء الحسنیٰ

رافع بن خدیج

رسول اللہ کے صحابی جو بنو حارثہ کے رئیس اور سردار تھے۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ غزوۂ بدر میں کم سنی کی وجہ سے حصہ لینے کی اجازت نہ ملی۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ کے دوران ان کے سینے میں تیر لگا۔ تیر نکالنے کی کوشش میں تیر کی نوک جسم کے اندر ہی رہ گئی۔ ۷۴ھ میں سینے کا یہی زخم ابھرا اور انھوں نے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں وفات پائی۔ جنگ صفین میں آپ نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ آپ سے ۷۸ حدیثیں روایت کی گئیں۔

رافع بن مالک

بن عجلان بن عمرو بن زریق۔ نبی کریم صلعم کے صحابی جو قبیلہ خزرج کی شاخ سے تھے۔ آپؓ انصار مدینہ کے اس گروہ میں شامل تھے جس نے سب سے پہلے رسول اللہ کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ آپ بنو زریق کے نقیب مقرر کیے گئے۔ بنی زریق کی مسجد میں سب سے پہلے قرآن پاک آپ ہی نے پڑھایا۔ جو [illegible] ہوتی تھیں آپ فوراً لکھ کر لوگوں کو سناتے۔ سورۂ [illegible] سب سے پہلے مدینہ میں انھوں نے پہنچائی۔ غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔

رام پور

برطانوی ہند کی ایک مسلم ریاست۔ رام پور کے شمال میں ضلع نینی تال، مشرق میں ضلع بریلی، جنوب میں ضلع بدایوں کی تحصیل بسولی اور مغرب میں ضلع مراد آباد تھا۔ [illegible] تاریخ روہیل کھنڈ میں روہیلا طاقت کے نشو و نما کی تاریخ ہے۔ روہیلے افغانستان [illegible] روہ کے باشندے تھے وہ ہندوستان آکر روہیل کھنڈ میں بس گئے۔ ریاست کا بانی داؤد خان تھا۔ اس کی وفات پر اس کا متبنیٰ علی محمد خان مسند نشین ہوا۔ کچھ عرصے میں علی محمد خان [illegible] طاقت ور ہو گیا کہ اس کی طاقت کے فروغ سے اودھ کا نواب صفدر جنگ خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے شہنشاہ کو علی محمد خان کے خلاف ایک مہم روانہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ علی محمد خان نے شاہی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے گرفتار کر کے دہلی لے جایا گیا اور کچھ مدت بعد رہا کر کے سرہند کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ علی محمد خان نے چھ بیٹے چھوڑے۔ ان میں سے دو عبداللہ خان اور فیض اللہ خان افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قید میں تھے۔ باقی چار بالکل نوعمر تھے۔ علی محمد خان نے حافظ رحمت خان کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا لیکن وہ اس کے کمسن بیٹے سعد اللہ خان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ ۱۷۵۲ء میں عبداللہ خان اور فیض اللہ خان قید سے رہائی پا کر روہیل کھنڈ پہنچ گئے۔ حافظ رحمت خان نے ریاست کا علاقہ تینوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ ۱۷۶۳ء میں نواب سعد اللہ کی وفات پر سرداران روہیل کھنڈ نے حافظ رحمت کی سرداری میں رہنا قبول کر لیا۔ ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے اپنی توجہ روہیل کھنڈ کی فتح کی طرف منعطف کی۔ ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ وزیر شجاع الدولہ نے انگریزوں کی اعانت سے حملہ کر دیا۔ فیض اللہ خان اور بعض روہیلہ سرداروں نے جنگ سے

Marfat.com

علیحدگی اختیار کر لی۔ ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو روہیلوں کو شکست ہوئی۔ حافظ رحمت خان جنگ میں شہید ہوا۔ جنگ کے خاتمے پر فیض اللہ خان کو جو جاگیر ملی اس میں رام پور اور دوسرے اضلاع شامل تھے۔ اسے اپنی فوج میں پانچ ہزار سے زائد سپاہی رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی وفات پر اس کا بیٹا آصف الدولہ جانشین ہوا۔ ۱۷۸۱ء میں ہیسٹنگز کے کہنے پر آصف الدولہ نے فیض اللہ خان سے ایک نیا معاہدہ کیا جس کی رو سے نواب اودھ کے لیے فوج مہیا کرنے کی شرط کمپنی کی ضمانت کے تحت پندرہ لاکھ روپے کی نقد ادائگی سے بدل دی گئی۔ ۱۰۰ ء جب روہیل کھنڈ انگریزوں کی تحویل میں آیا تو فیض اللہ خاں کے خلاف کے مقبوضات برقرار رہے گئے۔ رام پور کا رقبہ ۸۹۳ مربع میل اور آبادی (۱۹۲۱ء) پانچ لاکھ تھی۔ جس میں پچاس فیصد لوگ مسلمان تھے۔ رام پور ان چھ تحصیلوں میں منقسم تھا: حضور، شاہ آباد، ملک، بلاس پور، سوار اور ٹانڈا۔ رام پور شہر میں ایک اعلیٰ درجے کا کتاب خانہ قائم تھا جس میں مخطوطات کا بیش قیمت ذخیرہ موجود تھا۔ رام پور میں یوسف زئی اور اورک زئی پٹھانوں کی کثرت ہے۔ ۱۹۴۷ء تک یہ ریاست گوالیار ریذیڈنسی سے ملحق رہی۔ یکم دسمبر ۱۹۴۹ء کو اسے ضلع کا درجہ دے کر اتر پردیش میں ضم کر دیا گیا۔ اس کے آخری فرمانروا میجر جنرل ہز ہائی نس نواب سید محمد رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ تھے۔ موجودہ ضلع رام پور کا رقبہ ۸۹۵ مربع میل اور آبادی (۱۹۶۱ء) سات لاکھ ہے۔ صدر مقام رام پور کی آبادی ایک لاکھ چھتیس ہزار ہے۔ رام پور شہر دریائے کوسی کے بائیں کنارے دہلی سے ۱۱۵ میل مشرق میں واقع ہے۔

رامی

حسن بن محمد شرف الدین، صاحب طرز ایرانی ادیب۔ اس کی شہرت "انیس العشاق" کی وجہ سے ہوئی۔ یہ ان معروف عام شاعرانہ تشبیہات و استعارات کا رسالہ ہے جو انسانی جسم کے مختلف اعضا کے بیان میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۷۲ء سے قبل مکمل ہوئی۔ "انیس العشاق" کے علاوہ اس کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔

رامی محمد پاشا

(۱۰۶۶ھ/۱۶۵۴ء — ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۸ء) عثمانی سلطنت کا وزیر اعظم اور شاعر۔ ۶ رمضان ۱۱۱۴ھ/۲۴ جنوری ۱۷۰۳ء کو اسے وزیر اعظم دال طبان مصطفیٰ پاشا کی جگہ مقرر کیا گیا۔ اس نے دیوانی انتظامات میں کامل اصلاح پر توجہ دی۔ مشرقی اور مغربی علاقوں میں سرحدوں پر قلعوں کا بارکم کیا۔ نہریں بنوائیں ویران مسجدوں کو آباد کیا۔ حجاج کے قافلوں کی حفاظت اور ایشیائے کوچک کے تحفظ کی تدابیر کیں۔ ترکمان قبائل کو بسایا۔ ۹ ربیع الثانی ۱۱۱۵ھ/۲۲ اگست ۱۷۰۳ء کو سلطان مصطفیٰ کی معزولی کے ساتھ ہی رامی کی وزارت بھی ختم ہو گئی۔ اسی سال اسے قبرص کا والی مقرر کیا گیا۔ اکتوبر ۱۷۰۴ء میں مصر کا والی ہوا۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۸ھ/ستمبر ۱۷۱۶ء میں اسے برطرف کر کے جزیرہ رہوڈس بھیج دیا گیا۔ وہیں اس نے وفات پائی۔ اس نے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ رامی کو اس کی سرکاری تحریروں (۴۰۰ منشآت) کے دو مجموعوں کی بنیاد پر صاحب طرز ادیب سمجھا جاتا ہے۔

راولپنڈی

پاکستان کا ایک اہم شہر اور چھاؤنی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک پاکستان کا عبوری دارالحکومت رہا۔ یہ شارع پاکستان (جی ٹی روڈ) پر لاہور سے ۱۸۰ میل شمال مغرب میں اور پشاور سے ۱۰۸ میل مشرق و جنوب مشرق میں واقع ہے کراچی سے ۹۴۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کسی زمانے میں گکھڑوں کے قبیلہ راول کا بسایا ہوا ایک گاؤں تھا چھاؤنی کے قریب پرانے شہر کے کھنڈر موجود ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ بھٹی قبیلے کے دارالحکومت گجنی پور کے آثار ہیں۔ یہ شہر تاتاریوں کے حملوں میں اجڑ گیا تھا۔ گکھڑ سردار جھنڈے خان نے اسے دوبارہ بسایا اور اس کا نام پنڈی یا راولپنڈی رکھا۔ ۱۷۶۵ء میں اس پر سکھ سردار ملکا سنگھ قابض ہوا۔ اس نے جہلم اور شاہ پور کے تجارت پیشہ لوگوں کو لا کر آباد کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں افغانستان کے جلاوطن امیر شاہ شجاع اور اس کے بھائی شاہ زمان نے راولپنڈی میں آکر پناہ لی۔ گجرات کی لڑائی کے بعد ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو چتر سنگھ اور شیر سنگھ کی سکھ فوجوں نے راولپنڈی میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ برطانوی عہد حکومت میں یہاں فوجی مرکز قائم کرنے کے علاوہ اسے ضلع اور ڈویژن کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد افواج پاکستان کا صدر مقام قرار پایا۔ قیام پاکستان کے بعد شہر کے شمال میں مری روڈ پر ایک اضافی شہر وجود میں آیا اور اس کے قریب ہی پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد تعمیر ہوا۔ لیاقت باغ، ایوب نیشنل پارک اور راول ڈیم قابل دید تفریحی مقامات ہیں۔ راولپنڈی ایک اہم علمی اور صنعتی مرکز ہے۔

رائٹ، ولیم

(وفات ۱۸۸۹ء) برطانوی مستشرق جو برطانیہ میں سامی زبانوں خصوصاً عربی میں سند تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی پیدائش اور پرورش بنگال میں ہوئی۔ اس نے سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی سکاٹ لینڈ اور جرمنی میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں لائڈن میں پروفیسر ڈوزی سے اکتساب فیض کیا اور وہیں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ لندن اور ڈبلن کی یونیورسٹیوں میں ملازمت کے بعد ۱۸۷۰ء میں وہ کیمبرج میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا اور ۱۹ برس تک اسی عہدے پر فائز رہا۔ رائٹ کی علمی زندگی کا آغاز ابن جبیر اندلسی کے سفرنامہ کی تدوین سے ہوتا ہے۔ پھر اس نے مبرد کی کتاب الکامل فی الادب کو مرتب کیا۔ اس کتاب میں سیکڑوں ادبی، نحوی اور تاریخی مسائل کا ذکر آتا ہے۔ رائٹ کی سب سے مشہور اور متداول کتاب عربی کی صرف و نحو (عربی گرامر) ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے اور انگریزی میں عربی کی جامع اور مستند قواعد سمجھی جاتی ہے۔ رائٹ نے سامی زبانوں کی تقابلی قواعد بھی لکھی تھی۔

رائے

دیکھیے اجتہاد

رب

دیکھیے، اللہ، اسماء الحسنیٰ

ربا (ربوٰا)

یا ربوٰا۔ عربی میں اس کے معنی زیادتی اور اضافے کے ہیں۔ اصطلاحاً اہل عرب ربا کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں وہ یہ تھیں۔ (۱) ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا ہے اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا ہے۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ (۲) ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنا ہوگی۔ (۳) قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ

Marfat.com

ہوتی تو [illegible] سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔

ارشادِ ربانی ہے: "جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے"۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ اور آئندہ وہ سود خواری سے باز آ جائے تو وہ جو کچھ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے گا وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔ (البقرہ: ۲۷۴ تا ۲۷۶)۔ حدیث نبوی ہے: "سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ ان میں سے ایک سود کھانا ہے (مشکوٰۃ شریف)۔

تجارت اور سود کا اصولی فرق جس کی بنا پر دونوں کی معاشی اور اخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے: (۱) تجارت بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اُجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے لیکن اس کے مقابلے میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں اگر اس نے سرمایہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے فریق کے نقصان پر ہوتا ہے یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے ایک ہی بار لیتا ہے لیکن سود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائل معیشت، حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مشتری کو کوئی بائع کو واپس نہیں دینی ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرائے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہ کرایہ دار کو واپس دے دی جاتی ہے لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ حاصل کرتا ہے مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنی ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے جو اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔

خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سود اخلاقی، روحانی، معاشی اور تمدنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ تنزل کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کے برعکس صدقات سے اخلاق و روحانیت اور تمدن و معیشت ہر چیز کو نشوونما نصیب ہوتا ہے۔ اخلاقی و روحانی حیثیت سے دیکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سود دراصل خودغرضی، بخل، تنگ دلی اور سنگ دلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ انھی صفات کو انسان میں نشوونما بھی دیتا ہے۔ اس کے برعکس صدقات فیاضی، ہمدردی، فراخ دلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔ تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو جس سوسائٹی میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خودغرضی کا معاملہ کریں۔ کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے، اور مالدار طبقوں کا مفاد عامۃ الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے۔ ایسی سوسائٹی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی محبت کے بجائے باہمی بغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نشوونما پائے گی۔ معاشیات کے نقطۂ نظر سے سودی قرض کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ قرض جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے مجبور اور حاجت مند لوگ لیتے ہیں۔ دوسرا وہ قرض جو تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کے کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے قرض پر سود وصول کرنے کا طریقہ نہایت تباہ کن ہے۔ مہاجن افراد اور مہاجنی ادارے اس ذریعے سے غریب مزدوروں، کاشت کاروں اور قلیل المعاش عوام کا خون چوستے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے سود کی وجہ سے قرض کا ادا کرنا مشکل بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے وہ دوسرا اور پھر تیسرا قرض لیتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رقم سے کئی گنا سود دے چکنے کے بعد بھی اصل رقم جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ سودی قرض کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ چند افراد تو لاکھوں محنت کشوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے رہتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی پوری قوم کی پیدائش دولت اپنے امکانی معیار کی بہ نسبت بہت گھٹ جاتی ہے۔ غریب عوام کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں۔ ان کی بدولت مالدار لوگوں کے خلاف غصے اور نفرت کا ایک طوفان دلوں میں اٹھتا رہتا ہے اور کسی انقلابی ہیجان کے موقع پر جب یہ آتش فشاں پھٹتا ہے تو ان ظالم مالداروں کو اپنے مال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

دوسری قسم کا قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے اس پر ایک مقرر شرحِ سود کے عائد ہونے سے بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں۔ جو کام رائج الوقت

Marfat.com

شرح سود کے برابر نفع نہ لا سکتے ہوں، چاہے ملک اور قوم کے لیے کتنے ہی ضروری اور مفید ہوں، ان پر لگانے کے لیے روپیہ نہیں ملتا اور ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے جو بازار کی شرح سود کے برابر یا اس سے زیادہ نفع لا سکتے ہوں چاہے اجتماعی حیثیت سے ان کی ضرورت اور ان کا فائدہ بہت کم ہو یا کچھ بھی نہ ہو۔ جن کاموں کے لیے سود پر سرمایہ ملتا ہے خواہ وہ تجارتی کام ہوں یا صنعتی یا زراعتی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کا منافع اس ایک مقرر میعاد سے اوپر اوپر ہی رہے گا اور کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا بلکہ کسی کاروبار میں اس بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ اس میں ضرور منافع ہی ہوگا اور نقصان کبھی نہ ہوگا لہٰذا کسی کاروبار میں ایسے سرمایہ کا لگنا جس پر سرمایہ دار کو ایک مقرر شرح کے مطابق منافع دینے کی ضمانت دی گئی ہو نقصان اور خطرے کے پہلوؤں سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ ایک مقرر شرح منافع کی ضمانت پر روپیہ دیتا ہے۔ جب کبھی اسے ذرا سا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ منڈی پر کساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیہ کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ اس طرح کبھی تو محض اس کے خود غرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کساد بازاری کا واقعی حملہ ہو جاتا ہے اور کبھی اگر دوسرے اسباب سے کساد بازاری آ گئی ہو تو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

جب سود کی بندش کے لیے قرآن حکیم نازل ہوا تو اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو نبی صلعم نے اپنے عمال کے ذریعے سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی تو معاہدے میں تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمہارے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی۔ ابن عباس، حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دارالاسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اسے نہ چھوڑا جائے۔

صحابہ کے متواتر عمل سے ثابت ہے کہ وہ سود کی ہر مقدار کو حرام سمجھتے تھے اور قرض پر معاہدے میں طے کیا جانے والا ہر اضافہ ان کے نزدیک ربا تھا۔

رباط

مراکش کا شہر اور دارالحکومت۔ رباط کی تاسیس موحدون کے ہاتھوں ہوئی۔ ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں موحدین کے خانوادۂ عبدالمؤمن کے بانی عبدالمؤمن نے قلعے اور اس کے گرد و نواح کو عساکر کی تیاری کا مرکز بنایا۔ یہ لشکر اندلس میں جہاد کرنے کے لئے اکٹھے کئے گئے تھے۔ یہاں متعلق تعمیرات، مسجد اور شاہی قیام گاہ سے ایک چھوٹے شہر کی تشکیل ہو گئی۔ اس کا نام المہدیہ رکھا گیا۔ عبدالمؤمن کے جانشین ابو یوسف یعقوب المنصور (۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء ـ ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء) کے زمانے میں یہاں تعمیرات اور ترقی جاری رہی۔ ۱۱۹۵ء میں موحدون نے قشتالہ کے الفانسو ہشتم کے خلاف جو فتح حاصل کی تھی اس کی یادگار میں اس شہر کا نام رباط الفتح رکھ دیا گیا۔ یعقوب المنصور نے رباط الفتح

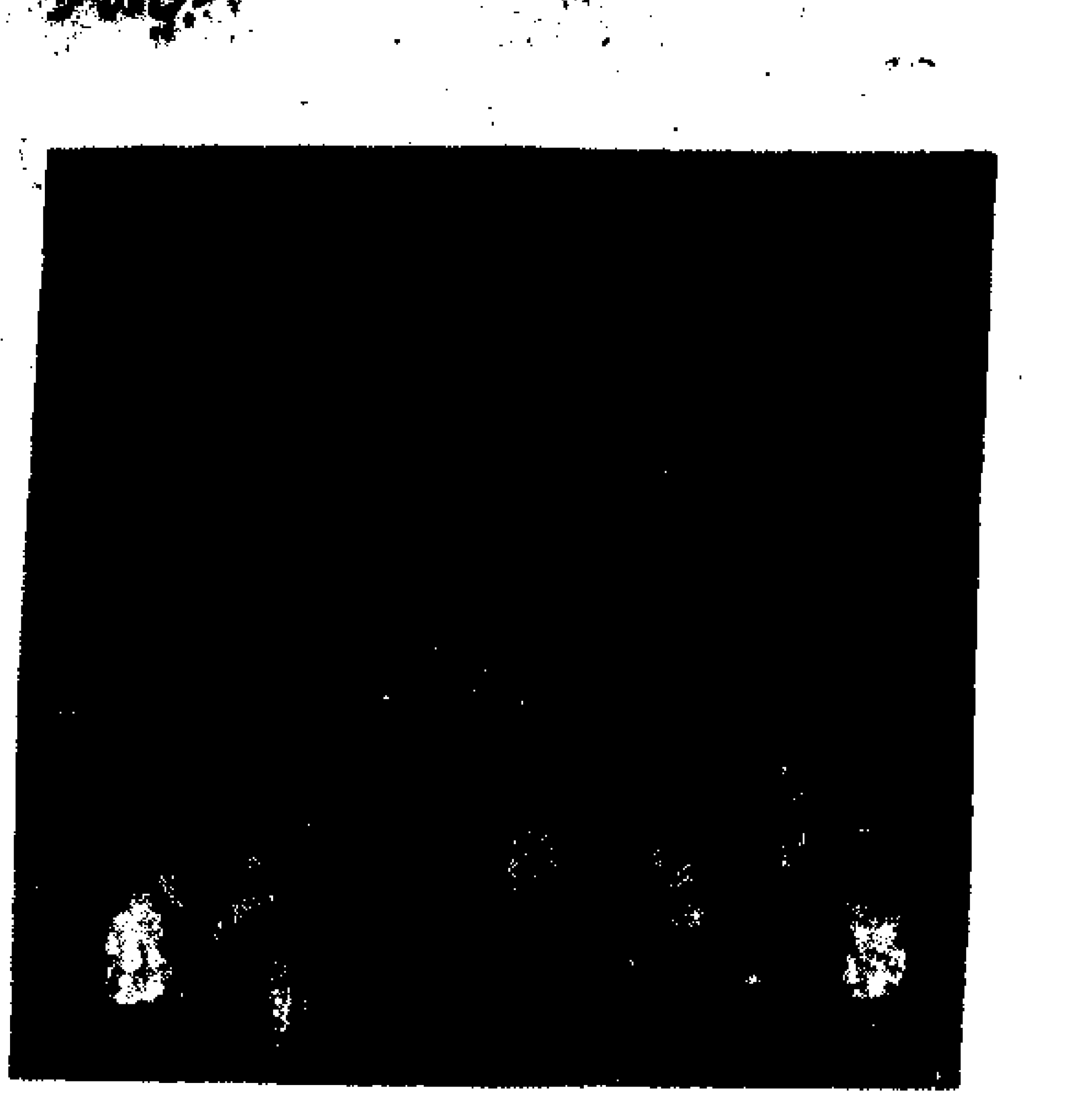

شہر رباط کا ایک منظر

کے اندر ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی لیکن وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ مسجد ۶۱۰ فٹ لمبی اور ۴۷۰ فٹ چوڑی تھی اور اس سے زیادہ وسیع مسجد دنیائے اسلام میں صرف سامرا کی تھی۔ مسجد کے سولہ دروازے اور تین صحن تھے۔

رباط کے بالمقابل شہر سلا کی سیاسی اور تجارتی اہمیت چودھویں صدی عیسوی تک برقرار رہی۔ ۱۲۴۸ء میں رباط اور سلا بنو مرین کے زیر نگیں آ گئے۔ ۱۶۱۰ء میں سقوط غرناطہ کے بعد رباط اور سلا اندلسی پناہ گزینوں کی نو آبادی بن گئے۔ رباط جلد ہی ایک چھوٹی سی بحری جمہوریہ کا مرکز بن گیا جس کی باگ ڈور ان اندلسی موروں کے ہاتھوں میں تھی۔ رباط کے ہسپانوی موروں کے جذبۂ حریت اور ان کی دولت نے جلد ہی شہر کو مراکش کے سلاطین کی نگاہوں میں مرغوب ترین چیز بنا دیا۔ ۱۹ جولائی ۱۹۱۱ء کو سلا اور رباط پر فرانسیسی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء میں رباط کی آبادی ۳۲ ہزار تھی جس میں ۲۸ ہزار مسلمان اور چار ہزار یہودی تھے۔ ۱۹۶۱ء میں مسلمانوں کی آبادی ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ فرانسیسی عملداری کے زمانے سے یہ شہر دولت شریفیہ کا انتظامی پایۂ تخت اور فرانسیسی حکام کا صدر مقام رہا۔ عموماً سلطان مراکش کا قیام بھی یہیں رہتا تھا۔ مراکش کا انتظامی مرکز منتخب ہو جانے کے بعد اسے معتد بہ ترقی حاصل ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں یہاں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۲۵ اسلامی ممالک نے شرکت کی۔

ربیع الاول

اسلامی تقویم کا تیسرا مہینہ۔ اس ماہ کے خاص واقعات یہ ہیں: یکم ربیع الاول ۴۹ھ وفات حضرت امام حسنؓ۔ ۲ ربیع الاول ۴۶۵ھ وفات داتا گنج بخشؒ۔ ۵ ربیع الاول وفات امام ابو یوسف، ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ وفات حضرت امام مالکؒ، ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ وفات حضرت امام احمد بن حنبلؒ، ولادت اور رحلت حضرت محمد صلعم۔ ۱۸ ربیع الاول وفات حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

ربیع الآخر

یا ربیع الآخر۔ اسلامی تقویم کا چوتھا مہینہ۔ اس ماہ کے اہم واقعات یہ ہیں: وفات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (۱۷ ربیع الآخر ۵۶۲ھ) قابل

Marfat.com

ذکر ہیں۔

ربیع بن زیاد

بن ربیع حارثی، رسول اللہ کے صحابی۔ ۱۷ھ میں جنگ مناذر آپ کی قیادت میں لڑی گئی۔ جس میں دشمن کو شکست ہوئی۔ امیر معاویہؓ نے انھیں سیستان کا والی مقرر کیا۔ بعد میں مغیرہ بن شعبہ کی وفات پر کوفہ کے حاکم بنے۔ زیاد نے انھیں سیستان سے ہٹا کر خراسان کا حاکم بنایا۔ آپ نے بلخ فتح کیا۔

ربیعہ و مضر

قدیم شمالی عرب کے دو بڑے اور طاقتور قبیلے جو نزار بن معد بن عدنان کی اولاد تھے۔ مضر کے گروہ میں ربیعہ نام کے مشہور قبائل یہ ہیں:۔ ربیعہ بن عامر بن صعصعہ جن میں سے کعب' کلاب اور کلیب نکلے، ربیعہ بن عبداللہ بن کعب' ربیعہ بن کلاب' ربیعہ بن المنبط' ربیعہ بن مالک بن جعفر، ربیعہ بن عقیل اور ربیعہ بن جعدہ۔ عبد شمس کی تین شاخیں بھی ربیعہ کہلاتی ہیں۔ یمن کے بڑے بڑے قبائل میں درج ذیل قابل ذکر ہیں، ربیعہ بن خیار' ربیعہ بن جرول اور ربیعہ بن حارث بن کعب۔ بنو ربیعہ (یا بنو ابی ربیعہ) شیبان کی ایک شاخ ہے۔ ربیعۃ الکبریٰ' یا ربیعۃ الوسطیٰ اور ربیعۃ الصغریٰ تمیم کی ان تین شاخوں کو دیئے جاتے ہیں (۱) ربیعہ بن مالک بن زید مناۃ (۲) ربیعہ بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ اور (۳) ربیعہ بن مالک بن حنظلہ۔

نزار بن معد کے تین بیٹے مضر' ایاد اور ربیعہ تھے۔ شجرۂ نسب کے مطابق مضر کے دو بیٹے تھے الیاس اور عیلان الناس۔ الیاس کی نسل بنو خندف کے نام سے مشہور ہوئی۔ الیاس کے تین بیٹے تھے، مدرکہ' طابخہ اور قمعہ۔ مدرکہ اور طابخہ مشہور قبیلوں کے جد ہیں۔ مدرکہ کے بیٹے ہذیل اور خذیمہ تھے۔ خذیمہ' اسد اور کنانہ کے جد ہیں۔ انہی کی نسل سے دیگر قبیلوں کے علاوہ قریش بھی ہیں۔ اُدّ بن طابخہ کے یہ بیٹے تھے، ضبہ' عبد مناۃ' عمرو' مر اور حمیس۔ تمیم بن مر عربوں کے ایک بزرگ ترین قبیلے کا جد ہے۔

ربیعۃ الفرس (ربیعہ بن نزار) کے تین بیٹے تھے اکلب' ضبیعہ اور اسد۔ اسد کے یہ بیٹے تھے، عمیرہ' عنزہ اور جدیلہ۔ جدیلہ سے عبد القیس' النمر اور وائل بن واسط اپنا نسب ملاتے ہیں۔ وائل عربوں کے نہایت طاقتور قبیلوں' بکر اور تغلب کا مورث اعلیٰ تھا۔ حنیفہ' شیبان' ذہل' قیس بن ثعلبہ اور دیگر قبائل بکر کی نسل سے ہیں (ابن درید' ابن حزم)

ربیعہ اور مضر یمن کے زیر اقتدار رہے یہاں تک کہ حبشیوں نے حمیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ کچھ عرصہ تک ان کا تعلق کندہ کی سلطنت سے رہا جس کے حکمران معد اور ربیعہ کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ کندیوں نے یمن کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو بکر اور تغلب کے درمیان حرب بسوس چھڑ گئی۔ اس جنگ کا خاتمہ تغلب کے حق میں ہوا اور اضور بنے۔ بنو بکر شاہ حیرہ منذر ثالث کی طرف رجوع کر لیا۔ اس نے ربیعہ' مضر اور وسطی عربستان کے دیگر قبائل کو مسخر کر لیا۔ اسی زمانے میں بنو تغلب نے الجزیرہ پر چڑھائی کی اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان کے بعد بنو نمر بن قاسط اور دیگر ربیعہ قبائل وہاں آ گئے۔ تہامہ کے حکمران اور کعبہ کے پاسبان جرہم کو ایاد اور مضر نے مکہ سے نکال دیا۔ کعبہ کی جنگ میں مضر فتح مند ہوئے۔ کعبہ اور مکہ کا نظم و نسق بنو خزاعہ کے سپرد ہوا۔ حج سے متعلق صرف تین مذہبی عہدے ان کے پاس رہ گئے، عرفات کا اجازہ' مزدلفہ کا افاضہ اور منیٰ کا اجازہ۔ یہ عہدے قصی کی از سر نو تقسیم کے بعد بھی خاندان مضر ہی میں رہے (ابن خلدون)۔

آنحضرت صلعم کے زمانے میں بنو ربیعہ میں عیسائیت کا چرچا تھا لیکن مضر قدیم مشرکانہ طور طریقوں پر عامل رہے۔ قبیلہ مزینہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ قبائل مضر میں سے سب سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ ۸ھ میں خالد بن ولید نے نخلہ میں عزیٰ کا بت توڑا۔ قریش' کنانہ اور تمام مضر اس بت کی تعظیم کرتے تھے (طبری)۔ سنۃ الوفود (۹ھ) میں بنو مضر اور بنو ربیعہ کی کئی بڑی شاخیں' تمیم' ثقیف' عبد القیس اور بکر بن وائل' مسلمان ہو گئیں۔

رٹر، ہلموٹ

(۱۸۹۲ء — جون ۱۹۷۱ء) جرمن مستشرق جو عنفوان شباب ہی سے استنبول کے کتب خانوں میں عربی اور فارسی مخطوطات کی تحقیق و جستجو میں مصروف ہو گیا اور اسلامی ثقافت کے ادبی آثار کو دریافت کرنے میں حصہ لیا۔ مشرقی ادبیات کی اشاعت کے لیے ۱۹۲۹ء میں ایک سلسلہ BIBLIOTHECA ISLAMICA کے نام سے جاری کیا اور ذیل کی کتابیں شائع کیں، (۱) ابو الحسن اشعری، مقالات اسلامیین (۲) الصفدی، الوافی بالوفیات (۳) النوبختی، فرق الشیعہ (۴) فرید الدین عطار، الٰہی نامہ۔ اس کے تحقیقی اور علمی کارناموں میں استنبول کے ذخائر حدیث کی فہارس اور اسرار البلاغہ کا جرمن ترجمہ قابل ذکر ہے۔

رجب

اسلامی تقویم کے ساتویں مہینے کا نام جو اشہر حرم ہی سے ہے۔ اسی مہینے میں [illegible] کیا جاتا تھا جو ظہور اسلام سے پہلے حج کے لازمی ارکان میں سے تھا۔ اسی مہینے میں [illegible] لڑی گئی جس میں آنحضرت صلعم نے چودہ یا بیس برس کی عمر میں شرکت فرمائی تھی۔ رجب [illegible] میں شب معراج (۲۷ رجب) کی وجہ سے زیادہ اہمیت حاصل کی ہے۔ رجب کی [illegible] شب کو لیلۃ المعراج کہتے ہیں۔

رجم

سنگساری کی وہ سزا جو کسی محصنہ (شادی شدہ عورت) اور محصن (شادی شدہ مرد) کو زنا کے ارتکاب پر دی جاتی ہے۔ زنا بعد احصان کے لیے نقلی اور عقلی [illegible] شرط یہ ہے کہ مجرم آزاد ہو۔ غلام کو رجم کی سزا نہیں دی جاسکتی۔ لونڈی اگر نکاح کے بعد [illegible] کی مرتکب ہو تو اسے غیر شادی شدہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدھی سزا دینی چاہیے [illegible] کیا ہے کہ قرآن کا یہی قانون غلام پر بھی نافذ ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مجرم باقاعدہ شادی شدہ ہو۔ پہلی شرط کی طرح یہ شرط بھی متفق علیہ ہے اس شرط کی رو سے کوئی ایسا شخص جو ملک یمین کی بنا پر تمتع کر چکا ہو یا جس کا نکاح کسی فاسد طریقے سے ہوا ہو شادی شدہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا محض نکاح ہی نہ ہوا ہو بلکہ نکاح کے بعد خلوت صحیحہ بھی ہو چکی ہو صرف عقد نکاح کسی مرد کو محصن یا عورت کو محصنہ نہیں بنا دیتا۔ اس شرط پر اکثر فقہا متفق ہیں مگر امام ابو حنیفہ اور امام محمد اس میں اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ایک مرد یا ایک عورت کو محصن صرف اسی صورت میں قرار دیا جائے گا جب کہ نکاح اور خلوت صحیحہ کے وقت زوجین آزاد' بالغ اور عاقل ہوں۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ مجرم مسلمان ہو۔ اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے امام شافعیؒ' امام ابو یوسفؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ذمی بھی اگر زنا بعد احصان کا مرتکب ہو تو رجم کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک اس امر پر متفق ہیں کہ زنا بعد احصان کی سزا رجم صرف مسلمان کے لیے ہے۔

شرعی سزا کے طور پر رجم کا تذکرہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں ملتا ہے۔ بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ موسوی شریعت میں متعدد جرائم کی سزا رجم کر کے ہلاک کر دینا تھی۔

Marfat.com

قرآن مجید میں رجم کا حکم مذکور نہیں لیکن متواتر احادیث اور اجماعی تعامل کی وجہ سے اس کا ثبوت ناقابل انکار ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "مجھے ڈر ہے کہ لوگوں پر زمانہ دراز گزر جائے تو کوئی کہنے والا یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں نہیں پاتے پھر کہیں لوگ ایسے فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ نہ ہو جائیں جو اللہ نے نازل کیا تھا۔ خوب سن لو کہ رجم کا حکم اس شخص کے لیے حق ہے جو محصن ہونے کی حالت میں زنا کرے جب کہ اس پر گواہیاں قائم ہو جائیں یا حمل ثابت ہو جائے یا ملزم خود اعتراف کرلے (بخاری، الصحیح)۔ جن صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلعم سے زانی محصن کو رجم کرنے کا حکم یا عمل روایت کیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں، حضرت عمرؓ بن الخطاب حضرت علیؓ ابن ابی طالب، عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ، جابرؓ بن عبداللہ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، زید بن خالدؓ۔ ان سب کی روایات "بخاری، الصحیح" میں موجود ہیں۔ عبادہؓ بن صامت، سلمہؓ بن المحبق، ابوبرزہؓ، ہزالؓ، جابرؓ بن سمرہ، لجلاجؓ، ابوبکر صدیقؓ، بریدہؓ، ابوذر غفاریؓ، نصرؓ بن دہر اسلمی، عمران بن حصین، ابوبکرہؓ، ابوسعید خدریؓ، النعمان بن بشیر، براءؓ بن عازب کی روایات مسند احمد میں مروی ہیں۔

رجم کا طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو کسی کھلی جگہ میں لے جایا جائے جہاں عام لوگ بھی موجود ہوں۔ اگر مجرم عورت ہو تو اس کے لیے گڑھا کھود کر عورت کو اس میں کھڑا کر دینا مناسب ہے۔ اگر زنا کا ثبوت گواہوں سے ہوا ہے تو پتھر مارنے کی ابتدا گواہ کریں گے اور اگر اعتراف ہوا ہے تو ابتدا امام المسلمین کرے گا۔ پھر تمام حاضرین رجم میں حصہ لیں گے یہاں تک کہ مجرم کی موت واقع ہو جائے (ابن الہمام: فتح القدیر)۔ اسلام کا اصل منشا یہ ہے رجم کی سزا کم سے کم جاری ہو لیکن جب جاری ہو تو سالہا سال کے لیے سامان عبرت بن جائے۔ چنانچہ اول تو معاشرہ میں عفت و عصمت عام کرنے کے لیے ایسے احکام وضع کیے گئے ہیں جن کی موجودگی میں زنا کا صدور مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے پھر قابل رجم زنا کے ثبوت کے لیے شرائط انتہائی سخت رکھی گئی ہیں یعنی چار قابل اعتماد گواہوں کا بغیر کسی کنایہ کے صریح الفاظ میں چشم دید واقعہ کی گواہی دینا۔ اگر سزا جاری ہونے سے پہلے ان گواہوں میں سے کوئی ایک بھی رجوع کرلے یا گواہی دیتے وقت ان میں کوئی معمولی اختلاف ہو جائے یا اقرار کی صورت میں مجرم کسی بھی وقت (سزا جاری ہونے کے دوران میں بھی) اپنے اقرار سے منحرف ہو جائے تو سزا ساقط ہو جاتی ہے (فتح القدیر)۔ دوسری طرف اگر کسی پر زنا کا الزام لگانے کے بعد کوئی شخص قانونی شرائط کے مطابق اسے ثابت نہ کر سکے تو اس کے لیے اسّی کوڑوں کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔

رحم

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ جو شخص رزق میں فراخی چاہتا ہو اور یہ چاہتا ہو کہ اس کی عمر میں ڈھیل دی جائے تو اسے چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے (مشکوٰۃ شریف)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہؐ سے عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں تو ان سے ملتا ہوں مگر وہ مجھ سے کٹتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہوں لیکن وہ میرے ساتھ برائی سے پیش آتے ہیں۔ میں ان کی باتوں سے درگزر کرتا ہوں مگر وہ مجھے برا کہتے ہیں۔ فرمایا اگر تو ایسا ہی کرتا ہے جیسا کہ تو کہہ رہا ہے تو تو جلتی بھوبھل ان کے منہ میں جھونک رہا ہے اور جب تک تو ایسا کرتا رہے گا اللہ کی طرف سے ایک مددگار ہمیشہ ان کے مقابلے میں تیری مدد کرے گا (مشکوٰۃ شریف)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا قرابت داری اللہ کی رحمت کی ایک شاخ ہے۔ اللہ عزوجل نے فرما دیا ہے کہ جو قرابت داری اور رشتہ داری کا خیال رکھے گا میں اس کے ساتھ ہوں اور جو اس سے گریز کرے گا میں اس کا ساتھی نہیں ہوں (مشکوٰۃ شریف)۔ حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس قوم پر رحمت نازل نہیں ہوتی جس کے اندر ایسا شخص موجود ہو جو قرابت داروں سے قطع تعلق کرکے بیٹھا رہا ہو۔

رحمان

دیکھئے اسماء الحسنیٰ۔

رحمان (سورہ)

قرآن مجید کی ایک سورت۔ دیکھئے الرحمان

رحمان بابا

(پیدائش ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۲ء) پشتو کے مشہور و معروف اور مقبول شاعر۔ وہ افغانستان کی شاخ سٹرین کی ذیلی شاخ غوریا خیل میں قبیلہ مہمند سے تھے۔ وہ پشاور سے تین میل جنوب میں واقع گاؤں بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ ملا یوسف زئی سے فقہ و تصوف کی تحصیل کی کوہاٹ جا کر علوم کی تکمیل کی۔ رحمان بابا نے ساری زندگی زہد و تقویٰ میں بسر کی۔ افغانوں میں خدا شناسی پرہیزگاری اور حق پرستی کی وجہ سے شہرت پائی۔ ان کا مسلک صلح کل تھا اور وہ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے دور رہتے تھے۔ دو حصوں پر مشتمل ان کے دیوان میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ اس میں چند قصائد و مخمس اور زیادہ تر غزلیں ہیں۔ انہوں نے معرفت، تصوف اور بشر دوستی کے مضامین کو کمال سلاست و روانی سے بیان کیا ہے۔ ان کے کلام میں دینی، اخلاقی اور اجتماعی مضامین ملتے ہیں۔ عاشقانہ غزلیں ان کے درد دل اور معنوی احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کا کلام اہم درسی کتابوں میں شامل ہے۔ ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۸ء اور ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۲ء کے درمیان۔ ان کا انتقال ہوا۔ رحمان بابا کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خانہ کے مقام پر اخوند درویزہ کے مزار کے نزدیک واقع ہے۔ زیارت کے لیے لوگ بڑی عقیدت و ارادت کے ساتھ دور دور سے آتے ہیں۔

رحمت

اللہ تعالیٰ کی شفقت و احسان۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ رحمت باری تعالیٰ کی صفات ذاتیہ میں سے ہے جس سے مقصود بندوں کو بھلائی پہنچانا اور شر سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس لیے اللہ کی رحمت کا نتیجہ یا انتہائی غایت اپنے بندوں کو ایسا اجر عطا فرما دینا ہے جو ان کے استحقاق سے بالاتر ہو اور ایسی عقوبت سے محفوظ رکھنا ہے جس کے وہ مستحق قرار پا چکے ہیں۔ امام راغب نے رحمت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد ایسی نرمی ہے جو احسان و انعام کی مقتضی ہو۔ چنانچہ رسول کریم صلعم سے جو روایات منقول ہیں ان سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ جب رحمت کی نسبت اللہ سے ہو تو اس سے مراد بندوں پر احسان و افضال اور انعام و اکرام ہے اور اگر آدمیوں سے ہو تو اس سے مقصود رقت قلب ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا چاہیئے" (الزمر ۵۳)۔ ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں رحمت کے تصور کو خدا کے ایک وسیع تر عقیدے سے وابستہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ کائنات کا جمال خدا کی صفت رحمت ہی کا عکس ہے اور یہی صفت زندگی کی نشوو ارتقا کی ذمہ دار ہے۔ خدا کی صفات قہریہ اپنی جگہ ہے مگر اس کی صفت رحمت عام اور وسیع تر ہیں جو صرف نیکوکار تک محدود نہیں بلکہ ساری کائنات کے لیے افادہ و فیضان عام کا سرچشمہ ہیں۔

رحمت خاں

دیکھئے، حافظ رحمت خاں

Marfat.com

رحیم

دیکھیے اسماء الحسنیٰ۔

ردہ

دیکھیے ارتداد

رزاق

دیکھیے، اسماء الحسنیٰ

رزق

اُردو زبان میں اس کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پہ ہوتا ہے ۔ لیکن عربی میں اس کے معنی عطا، بخشش اور نصیب کے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے وہ سب اس کا رزق ہے ۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق، اس کی مدت عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے ۔ اللہ تعالےٰ کے رزق سے مراد رزقِ حلال ہے ۔ ارشادِ ربّانی ہے : " اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے ۔ وہ تو ہم نے انھیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے ۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے ۔ رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں ۔ اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے ۔" (طٰہٰ : ۱۳۱ تا ۱۳۲) ۔ اللہ تعالےٰ جس کو چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، رزق عطا فرماتا ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے : " تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے اور رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے ۔ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی ۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے ۔" (بنی اسرائیل : ۳۱) رزق کی کمی بیشی اخلاق کے حسن و قبح پر مبنی نہیں ہوتی ۔ ارشاد ربانی ہے : " اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے (النور : ۳۸) ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے ۔ ارشادِ ربانی ہے : " زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے ۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے ۔" (ہود : ۶) ۔ جنت میں جانے والوں کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو کچھ بطور " رزق " عطا ہوگا، اس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے : " مگر اللہ کے چیدہ بندے محفوظ ہوں گے ۔ ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے ہر طرح کی لذیذ چیزیں ۔ اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے ۔ تختوں پہ آمنے سامنے بیٹھیں گے ۔ شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے ۔ چمکتی ہوئی شراب، جو پینے والوں کے لیے لذّت ہوگی ۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی ۔ اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی ۔ ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی ۔" (الصّٰفّٰت : ۴۱ تا ۵۰)

رسالت

دیکھیے، رسول

رس، بنو

یمن کا ایک حکمران خاندان ۔ بنو رس کا نام مکہ معظمہ کے قریب واقع ایک جاگیر "الرّس" سے ماخوذ تھا ۔ یہ جائداد امام اوّل کے دادا قاسم رسی کی ملکیت تھی جو حضرت حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی اولاد میں سے تھے ۔ ۲۸۰ھ/۸۹۳ء میں یحییٰ المعروف بہ الہادی الی الحق، حجاز سے یمن میں داخل ہوئے اور صنعا کے قریب تک پہنچ گئے ۔ وہ اس ملک کو فتح نہ کر سکے اور انھیں پسپا ہونا پڑا ۔ ۲۸۴ھ میں انھوں نے صعدہ پر قبضہ کر کے نجران بھی فتح کر لیا ۔ قرامطہ نے ۲۹۰ھ میں صنعا کو مسخر کیا اور دوسرے قصبات فتح کرنے کے علاوہ صنعا پر بھی تین سال تک قابض رہے ۔ امام موصوف نے ۲۹۸ھ میں وفات پائی ۔ ان کی زندگی میں یمن میں عباسی والی مقرر ہوتے رہے ۔ یحییٰ نے قرامطہ سے ستر جنگیں کیں ۔ یحییٰ کے انتقال پر ان کے بیٹے محمد کے ہاتھ پر فوراً بیعت ہوگئی ۔ محمد ۳۰۱ھ میں تخت سے دستبردار ہوگئے ۔ ان کے بھائی احمد جانشین ہوئے ۔ ۳۲۲ھ/۹۳۴ء میں احمد نے بنو یعفر سے شکست کھائی اور اس کے بعد فوت ہوئے ۔ احمد کے بیٹے حسن نے امام ہونے کا دعویٰ کیا ۔ لیکن احمد کے دوسرے بیٹے قاسم المختار کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی ۔ نزاع کے باعث دونوں بھائی معزول کر دیے گئے ۔ قاسم نے ۳۴۵ھ/۹۵۶ء میں صنعا کو مسخر کر لیا ۔ اسی سال کے اواخر میں قاسم قتل ہو گیا حسن اس سے قبل وفات پا چکا تھا ۔ ۳۸۸ھ/۹۹۸ء میں قاسم منصور نے صعدا اور صنعا پر قبضہ کیا ۔ اس نے ۳۹۳ھ میں وفات پائی ۔ اس کے بیٹے نے ۴۰۴ھ تک حکومت کی ۔ اسی برس وہ قتل ہوا ۔ دوسرا امام حجاز سے آیا اور اسے کچھ کامیابی حاصل ہوئی ۔ اس کی وفات سے قبل باہر کے ایک شخص ابوالفتح نے ۴۳۰ھ میں صعدا اور دوسرے مقامات فتح کر لیے اور بالآخر صلیبی سلطان سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ ۵۳۲ھ میں احمد بن سلیمان کی فرمانروائی کا اعلان ہوا اس نے ہمدانی سلطان سے صنعا لے لیا اور قرامطہ کے ساتھ بھی کامیابی کے ساتھ جنگیں لڑیں ۔ ۵۶۶ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ ۵۹۳ھ میں عبداللہ بن حمزہ نے امام کی حیثیت سے استحکام حاصل کر لیا ۔ وہ کچھ عرصہ صنعا پر قابض رہا لیکن اسے ایوبی سلطان کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑا ۔ ۶۱۱ھ میں اس نے صنعا اور ذمار پر قبضہ کیا اور لاج پر چڑھائی ۔ آخر اسے صنعا سے ہاتھ دھونے پڑے ۔ ۶۱۴ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس کے بعد قریباً دو سو برس تک رسولیہ حکمران رہے ۔ طاہریوں کی حکومت کے آغاز میں صنعا میں ایک امام نے ان سے جنگ کی لیکن شکست کھائی اور طاہری صنعا پر قابض ہو گئے ۔ ۸۶۹ھ میں امام محمد بن ناصر نے صنعا پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔ یحییٰ شرف الدین کا مختصر عہد ۹۱۲ھ میں شروع ہوا ۔ طاہریوں اور امرا کی مزاحمت کے علی الرغم امام نے بہت سے کوہستانی علاقے اور جازان اور ابوعریش فتح کر لیے ۔ ترکوں نے امام اور اس کے بیٹوں کے باہمی نزاعات کی وجہ سے قوت حاصل کر کے جلد ہی جازان، تعز اور صنعا پر قبضہ کر لیا ۔ ۹۵۳ھ میں امام نے اپنا ملک اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا ۔ امام کے بیٹے مطہر نے ۹۷۴ھ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی ۔ ترکوں نے مطہر کو شکست دی اور اسے صعدا میں خانہ نشین ہو جانے کی اجازت دے دی اس کے بعد کسی اور خاندان کے ایک امام نے سر اٹھایا اور سات برس تک حکمران رہا ۔ بالآخر ترکوں نے اسے قید کر لیا اور ۹۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں ملک

Marfat.com

گیری کی یہ مہم پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ۱۰۰۶ھ میں مطہر کے ایک بزرگ قاسم نے امام ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بیٹے نے ۱۰۴۵ھ میں ترکوں کو نکال باہر کیا اور اس وقت سے یہی خاندان یمن کا حکمران چلا آرہا ہے۔

رسم الخط

قرآن کا رسم الخط عربی سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خط کو حضرت اسمٰعیلؑ نے ا... تھا۔ نبطی، حمیری، حجری اور کوفی وغیرہ اس خط کی مختلف شاخیں اور ... یافتہ شکلیں ہیں۔ حضرت اسماعیل کے پڑپوتے نبطا بن حمل نے خطِ عربی میں اصلاح کر کے جس خط کو باقی رکھا اس کا نام نبطی ہوا۔ اہلِ سبین نے اصلاح کی تو وہ جزم کہلایا۔ جزم کو اہلِ سبا نے مزید ترقی دی تو وہ مسند حمیری بنا۔ حمیری میں بنی ہاشم کے قیرابن مونے اصلاح کی تو "قراموز" مشہور ہوا۔ اہلِ عراق نے اس میں اصلاح کر کے خطِ کوفی بنا لیا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق عربی خط کا سلسلۂ نسب فنیقی خط سے جا ملتا ہے۔ جب فنیقی خط کا زوال ہوا تو آرامی خط کو غلبہ حاصل ہوا۔ غالباً سب سے پہلے آرامی خط میں حروف کو ملا کر لکھنے کی کوشش کی گئی۔ عبرانی، نبطی، سریانی، سینائی اور عربی، یہ سب آرامی خط کی شاخیں ہیں۔ عربوں نے تیسری صدی عیسوی میں نبطی خط کو اختیار کر لیا تھا۔ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں اس میں تبدیلی کر کے انفرادیت پیدا کی گئی تھی۔ ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں خط حیری (خط انباری) رائج تھا جسے اہلِ مکہ نے اہلِ حیرہ اور انبار (عراق کے دو مقامات) سے سیکھا تھا۔ غالباً اسی کو بعد میں خط کوفی کہا گیا۔ ۵۶ء میں نبی صلعم نے جو تبلیغی خطوط مختلف حکمرانوں کو ارسال فرمائے تھے ان میں سے بعض کے جو عکس دستیاب ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خطوط خط کوفی میں لکھے گئے تھے۔ مورخین کا اس بات پر اجماع ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے خط کا تعارف حرب بن امیہؓ کے ذریعے ہوا۔ مدینہ میں ما سکہ کے یہودیوں میں سے ایک یہودی تھا جو بچوں کو پڑھنا سکھایا کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہاں آنحضور صلعم پہنچے تو اس سے کچھ اور لوگ اس فن سے متعارف تھے۔ ان ہی میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی تھے جو عربی اور سریانی دونوں زبانوں میں لکھ پڑھ سکتے تھے۔ آنحضور صلعم کی تحریص و ترغیب پر مدینہ میں کثرت سے لوگوں نے فن کتابت سیکھ لیا۔ غالب گمان یہی ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن مجید کی کتابت بھی اسی خط میں کرائی ہو گی جسے بعد میں خطِ کوفی کا نام دیا گیا۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ وغیرہ کے لکھے ہوئے مصاحف کے جو عکس ملتے ہیں وہ خط کوفی میں ہیں۔

عام روایات کی رُو سے حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں قرآن کو لغتِ قریش (جس میں رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا) کے مطابق تحریر کرایا تھا۔ اسی رسم الخط کی پیروی آج بھی جاری ہے۔ سوادِ اعظم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کا رسم الخط توقیفی ہے یعنی وہی ہے جس کے مطابق حضرت عثمان نے تدوین کرائی اور جس میں رسول اللہ نے بھی تحریر کرایا تھا۔ آنحضور صلعم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں قرآن مجید کو مدوّن کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے دَور میں اس سلسلے میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں قرآن مجید لغتِ قریش کے مطابق لکھا گیا اور اس کی نقول تمام قلمروئے سلطنت میں ارسال کی گئیں۔ ابن اشتر کے بقول یہ نسخہ ۳۰ھ میں تیار ہوا۔ اور بلاشبہ وہ خط کوفی میں تھا۔ یہ نسخہ مصحف امام کہلاتا ہے۔ مصحف امام اور حضرت عثمانؓ کے عہد کے دوسرے مصاحف بلا نقطہ تھے اور اس پر تقریباً تمام علماء کا اجماع ہے کہ آجکل معرّیٰ حروف کے علاوہ جو زیادات دکھائی دیتے ہیں وہ اس وقت موجود نہ تھے۔

ایک رائے یہ ہے کہ یہ صحابہ ہی تھے جنہوں نے مصاحف میں نقاط کا اضافہ کیا، تخمیس (ہر پانچ آیتوں کے بعد نشان) اور تعشیر (ہر دس آیتوں کے بعد نشان) کی۔ البتہ باقاعدہ نظام کی تشکیل نہیں ہوئی تھی جس کے تحت نقاط الفاظِ قرآنی پر لگائے جاتے۔ صحابہ کے بعد تابعین نے آکر اس کا اہتمام کیا اور نقاط و اعراب لگانے کے اصول و قواعد وضع کیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کام کو صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے انجام دیا۔ سرفہرست نام ابوالاسود دؤلی کا آتا ہے بعض کا خیال ہے کہ وہ پہلا شخص یحییٰ بن عمیر ہے اور بعض کے نزدیک نصر بن عاصم اللیثی ہے۔ اس اوّلین مرحلے میں نقاط کا وجود تو ہے مگر ان کی حیثیت ان نقاط کی نہیں ہے جن سے ہم آج واقف ہیں۔ اس کے بعد بھی بہت سے ہم شکل حروف کے درمیان امتیاز مشکل تھا۔ ب، ت، ث، ج ح خ، د ذ، ر ز، س ش، ع غ کا صحیح تلفظ اور ادائیگی ایک مسئلہ تھا۔ الفاظ کو ملانے اور جوڑنے کے لیے کوئی خاص نظام نہ تھا۔ جملوں کے درمیان وقف و امتیاز کی دوسری علامتیں مفقود تھیں۔ نقاط کی ایجاد امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں ہوئی۔ دوسرا قدم عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اٹھایا گیا۔ حجاج بن یوسف نے غالباً ۶۵ھ میں یحییٰ ابن عمیر اور نصر بن عاصم کو اس غرض کے لیے طلب کیا۔ نصر بن عاصم کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ انھوں نے حجاج کی منشا کے مطابق باقاعدہ نقطے وضع کیے جن کے ذریعے ہم شکل حروف میں امتیاز قائم ہو گیا۔ سوادِ اعظم کو اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔ الفاظ کا تلفظ اور سمجھنا آسان ہو گئے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان اور اس کے جانشین ولید نے مصاحب کی کتابت کے لئے خالد بن ابی ہیاج کو مقرر کیا۔ جو اپنے خط کی خوبصورتی میں مشہور تھے۔ انہوں نے مسجدِ نبویؐ کی محراب میں بھی خطاطی و نقاشی کی تھی۔

رسم الخط کو عام فہم، آسان اور حسین بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ بنو عباس کے زمانے میں خلیل بن احمد نے اعراب کی خاص شکلیں وضع کیں۔ لفظوں کی حسین شکل متعین کی اور کتابت میں اصول و قواعد کو منضبط کیا۔ تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ابن مقلہ نے رسم الخط میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ خط کی تاریخ میں ابن مقلہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس نے قدیم اور مروج خطوط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چھ خطوط ایجاد کیے۔ جن میں سے "نسخ" قابلِ ذکر ہے۔ ان میں سے ہر خط کا دارومدار "سطح" اور "قدر" پر رکھا اور پہلی مرتبہ خطاطی کے اصول و قواعد اور حروف کے ناپ مقرر کیے، تاکہ ہر خط میں امتیاز اور خفی و جلی قلم میں یکسانی برقرار رہے۔ خطِ نسخ ۳۱۰ میں ایجاد ہوا۔ یہ خط قرآن مجید لکھنے کے لیے مخصوص ہوا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک قرآن مجید کا رسم الخط کوفی تھا۔ پانچویں صدی کے اوائل میں اس کی جگہ خطِ نسخ نے لے لی۔ اس کی ایجاد کے بعد تمام پچھلے خطوط منسوخ ہو گئے۔ نسخ میں سب نقاط، حرکتیں علامتیں وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ ساری اصولی اور بنیادی ضرورتیں جو ابتدائے کتابت میں محسوس کی جاتی تھیں، نسخ کے ذریعے پوری ہو گئیں۔ ساتویں صدی ہجری میں میر علی تبریزی نے خط نستعلیق ایجاد کیا۔ اس کے لیے قواعد و ضوابط بھی وضع کیے اور نظم میں انھیں تالیف کر دیا۔ یہ خط بھی بہت مقبول ہوا اور عموماً اختیار کر لیا

Marfat.com

گیا۔ (نیز دیکھیے مقالہ "کاتبانِ وحی")

رسوا، مرزا محمد ہادی

(۱۸۵۷ء ــــ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء) اردو کے نامور ادیب اور شاعر۔ اصل نام مرزا ہادی۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی، حساب، نجوم اور ہیئت کی تعلیم اپنے والد مرزا محمد تقی سے حاصل کی۔ منطق کمال الدین سے، طب غلام حسین کنتوری سے اور خطاطی حیدر بخش خوشنویس سے سیکھی۔ انجینئرنگ کالج رڑکی سے اوورسیئر ہوئے اور بی اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ شعر و سخن میں مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے۔ دبیر کی وفات کے بعد مرزا اوج سے اصلاح لیتے رہے۔ ابتدا میں مرزا رسوا کوئٹہ میں اوورسیئر مقرر ہوئے۔ یہاں انھیں فن کیمیا کا شوق پیدا ہوا اور وہ مستعفی ہو کر گھر آگئے اور اپنے تجربات میں منہمک ہوگئے۔ کچھ عرصہ آئزیبلا تھوبرن کالج میں پڑھاتے رہے۔ اسی ۔۔۔ء میں علم نجوم کا شوق ہوا اور ملازمت چھوڑ کر اسی کے ہو رہے۔ گزر اوقات کے لئے مختلف ناشرین کے لیے معاوضے پر ناول لکھتے رہے یا ترجمہ کرتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں مرزا رسوا نے علم مذہب کا ایک ہفت روزہ 'المحکم' جاری کیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ بند ہوگیا۔ اسی دور میں انھوں نے اردو شارٹ ہینڈ ایجاد کی اور اردو کی ٹائپ مشین تیار کی۔ پھر ان میں علم ہیئت کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے "زیچ میرزائی" تیار کی جسے بڑی شہرت ملی۔ ۱۹۲۱ء میں دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں ملازم ہوگئے۔ وہاں دس برس قیام رہا۔ یہاں کئی بلند پایہ کتابیں ترجمہ کیں جو جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں شامل ہوئیں۔

مرزا رسوا نے آلاتِ سائنس اور اصطرلاب تیار کیے اور اپنے گھر میں ایک رصدگاہ بھی تعمیر کی۔ مرزا نے موسیقی میں علامات تحریر ایجاد کیں۔ مرزا نے اپنے کلام کی حفاظت نہیں کی، اسی لیے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ وہ دبستانِ دہلی سے متاثر تھے اور ان پر غالب کا رنگ غالب تھا۔ مرزا ہادی عزیز نے انھیں مجددِ غزل تسلیم کیا ہے۔ ان کا ناول "امراؤ جان ادا" ایک شاہکار ہے یہ اردو کا پہلا ناول ہے جو ناول کی تکنیک پر پورا اترتا ہے۔ مرزا کی درج ذیل تصانیف قابلِ ذکر ہیں: (۱) مثنوی بہارِ ہند (۲) مثنوی لذت فنا (۳) مثنوی نو بہار (۴) طلسم اسرار (۵) طلسمات (۶) مرقع لیلیٰ مجنون (۷) شگوفۂ بلاغت۔ تراجم میں (۸) معذرت سقراط (۹) کرائیٹو (۱۰) فیدو (۱۱) سوفسطائی (۱۲) مینو (۱۳) پرمانیدس (۱۴) غورجیاس۔ اس کے علاوہ انھوں نے درج ذیل کتابیں لکھیں (۱۵) کتاب فصوص الحکم (۱۶) ابطال ریفارم (۱۷) منطق استقرائی (۱۸) جوزف آف لاک (۱۹) کتاب الاخلاق ارسطو (۲۰) رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود (۲۱) رسالہ در اصول مناظرہ (۲۲) مصطلحات کیمیا (۲۳) رسالہ در اعمال اصطرلاب مذہبی تصانیف ہیں۔ (۲۴) تحفۃ السنیہ (۲۵) الحکم والاشراق۔ حیدر آباد دکن سے ان کی یہ کتب شائع ہوئیں، (۲۶) مفتاح المنطق (۲۷) معاشرتی نفسیات (۲۸) مبادی علم نفس (۲۹) فلسفۂ اسلام (۳۰) فلسفۂ مذہب (۳۱) مفتاح الفلسفہ (۳۲) کتاب اخلاق نقوماجس (۳۳) فیدرس لاسیس اور پروطاغورس (۳۴) جمہوریۂ افلاطون۔ مرزا کے یہ ناول یادگار ہیں (۳۵) افشائے راز (۳۶) ذات شریف (۳۷) اختری بیگم (۳۸) امراؤ جان ادا (۳۹) شریف زادہ (۴۰) خونی شہزادہ (۴۱) بہرام کی رہائی (۴۲) خونی جورو (ترجمہ)

رسول

اللہ کا وہ برگزیدہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ رسول منتخب کرنا اللہ عزوجل کا اپنا کام ہے (الحج ۷۵) کیونکہ وہی بہتر جانتا ہے کہ منصب رسالت کہاں اور کسے سونپا جائے (انعام ۱۲۴) اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ڈرانے اور خوش خبری دینے کا فریضہ انجام دیں (النساء: ۱۶۵) اللہ تعالیٰ نے ہر قریہ اور قصبہ میں اپنا رسول بھیجا مگر ہر امت میں سے بعض نے اپنے رسول کو فوراً جھٹلایا (آل عمران ۳: ۱۸۴) اور ان جھٹلانے والوں میں ہمیشہ اہلِ ثروت پیش پیش رہے (سبا ۳۴) رسول سب کے سب انسان تھے اور انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے (الفرقان ۲۱)۔ سب واضح دلائل لے کر آئے تھے (الروم: ۴۷)۔ سب کا پیغام ایک ہوتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (انبیاء ۲۵)۔ ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل تھی (البقرہ: ۲۵۳) تمام رسولوں کو یہی حکم تھا کہ وہ پاکیزہ چیزیں کھائیں اور اعمال صالحہ پر کاربند رہیں (المؤمنون: ۵۱)۔ رسولوں میں بعض کے بارے میں آنحضرت صلعم کو بتایا گیا اور بعض کے بارے میں نہیں بتایا گیا (النساء)۔ سب رسول اپنی اپنی امت اور اپنے اپنے زمانے کے لیے تھے مگر حضرت محمد صلعم ہر زمانے کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے (سبا: ۲۸، اعراف: ۱۵۸) آپ ہی تمام جہانوں کے لیے رسولِ رحمت ہیں (انبیاء ۱۰۷، القصص: ۷۵)۔ آنحضرت صلعم کو ایسی امت میں بھیجا گیا ہے جس کے پاس اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول نہیں بھیجا تھا (القصص: ۴۶، السجدہ: ۳، سبا ۴۴)۔ آنحضرت صلعم صرف پیغمبر نہ تھے بلکہ کلام الٰہی کی تشریح و توضیح بھی ان کے فرائض منصبی میں شامل تھی (النحل: ۴۴)۔ اولوالعزم رسول چھ ہیں (احقاف: ۳۵)۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلعم۔ اور یہی صاحب شریعت بھی ہیں۔ قرآن مجید نے حضرت لوطؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کو بھی رسول کا اعزاز دیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، ذوالنونؑ اور آنحضرت صلعم کو قرآن مجید میں بعض اوقات رسول کہا گیا ہے اور بعض اوقات نبی۔ رسول اور نبی میں فرق یہ ہے کہ رسول بیک وقت رسول بھی ہوتا ہے اور نبی بھی لیکن نبی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسول وہ ہے جسے جبرئیلؑ کے ذریعے وحی آتی ہو، صاحب کتاب و شریعت ہو، اسے تبلیغ رسالت کا حکم ملا ہو اور وہ اپنے سے پہلے رسولوں میں سے کسی کی شریعت یا کتاب کے تابع نہ ہو۔ نبی وہ ہے جسے فرشتے کے ذریعہ قلبی الہام کے ذریعے وحی ہو خواہ اسے تبلیغ کا حکم ہو یا نہ ہو (تھانوی: کشاف، دستور العلماء)

رسول اور اس کی امت کے درمیان ایک قریبی تعلق ہوتا ہے۔ رسول اللہ کا پیغام اپنی امت کو پہنچاتا ہے۔ سب سے پہلے وہ خود وحی الٰہی پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے ماننے والے بھی اللہ کے کلام اور احکام پر ایمان لاتے ہیں۔ رسول خود بھی احکام الٰہی پر عمل کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو بھی عمل کی تلقین کرتا ہے۔ نیز وہ احکام الٰہی کی توضیح و تشریح کرکے امت کے لیے لائحہ عمل اور صحیح طریقِ کار متعین کرتا ہے۔ رسول زمام قیادت و سیادت اپنے ہاتھ میں لے کر انسانی فلاح کے لیے روحانی بنیادوں پر انقلاب بپا کرتا ہے۔

رشیدؒ

دیکھیے اسماء الحسنیٰ

رشید احمد گنگوہی

(۶ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء ــــ ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ/۱۱ اگست ۱۹۰۵ء) مشہور محدث۔ مولانا ہدایت احمد انصاری گنگوہی کے فرزند۔ قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں پیدا

Marfat.com

ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ۱۲۵۲ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہوگیا تو دادا نے پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے کرنال میں اپنے ماموں اور فارسی کے مسلم الثبوت استاد مولوی محمد تقی سے فارسی پڑھی۔ صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں محمد بخش رامپوری سے پڑھیں۔ ۱۲۶۱ھ میں دہلی گئے اور مولوی قاضی احمد الدین جہلمی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مولانا مملوک العلی نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق ہوئے۔ حدیث شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی۔ درسیات سے فارغ ہو کر قرآن مجید حفظ کیا۔ تحصیل علم کے بعد تھانہ بھون گئے اور مولانا شیخ محمد تھانوی سے بیعت ہوئے اور کچھ عرصہ وہیں قیام کرنے کے بعد چاروں سلسلوں کی اجازت و خلافت حاصل کی۔ ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی میں حصہ لینے کے الزام میں چھ مہینے جیل میں رہے۔ رہا ہو کر گنگوہ آ گئے۔ پچاس برس انھوں نے گنگوہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیا۔ ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۵ء کے بعد ان کی بصارت جاتی رہی۔ ان کے درس حدیث سے تین سو سے زائد جید علماء فیض یاب ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی اور سید حسین احمد مدنی بھی آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ چاروں طریقوں میں بیعت کرتے تھے لیکن عام تعلیم چشتیہ صابریہ طریقے کی تھی۔ "تذکرۃ الرشید" میں آپ کی کم و بیش پندرہ تصانیف کا ذکر آیا ہے۔ ترمذی پر آپ کی تقاریر کا مجموعہ "الکوکب الدری" دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ مکاتیب اور فتاویٰ کے مجموعے بھی ہیں۔

رشید الدین طبیب

(۱۲۴۷ء — ۱۸ جولائی ۱۳۱۸ء) ایران کا نامور مورخ۔ ہمدان میں پیدا ہوا۔ اس کا عروج مغول فرمانروا اباقا خاں (۱۲۶۵ء — ۱۲۸۲ء) کے عہد حکومت میں طبیب کی حیثیت سے ہوا۔ غازان خاں کے عہد (۱۲۹۵ء — ۱۳۰۴ء) میں صدر جہاں اور درباری وزیر ہوا۔ الجائتو کے عہد (۱۳۰۴ء — ۱۳۱۶ء) میں رشید الدین کو انتہائی عروج حاصل ہوا۔ اس نے دولت خیراتی عمارات پر صرف کی۔ ایک نئی بستی تعمیر کرائی جو اس کے نام سے رشیدیہ کہلائی۔ یہ بستی ایک مسجد، ایک مدرسہ، ایک ہسپتال اور کئی ہزار مکانات پر مشتمل تھی۔ ۱۴ اپریل ۱۳۰۶ء کو اس نے تاریخ عالم "جامع التواریخ" کی پہلی جلد بادشاہ کو پیش کی۔ وہ الجائتو کو شہر بنانے میں بھی کامیاب ہوا۔ ۱۳۰۹ء میں اس نے تبریز کے مشرق میں غازانیہ کے مضافات میں ایک اور بستی بنوائی۔ اس بستی کو سراو رود سے ایک بڑی نہر کے ذریعے پانی مہیا کیا۔ اکتوبر ۱۳۱۷ء میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ اس پر الجائتو کو زہر دے کر ہلاک کرنے کا اتہام لگا چنانچہ رشید الدین اور اس کے بیٹے خواجہ ابراہیم کو قتل کر دیا گیا۔ ۱۳۳۶ء میں اس کے بڑے بیٹے غیاث الدین کو بھی سزائے موت دے دی گئی۔ اسی سال بعد تیمور کے بیٹے میران شاہ (۱۴۰۴ء — ۱۴۰۷ء) نے رشید الدین کی ہڈیاں نکلوا کر انھیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کرایا۔

"جامع التواریخ" رشید کی غیر فانی تالیف ہے۔ جلد اول میں ترک و مغول قبائل کی تاریخ اور جلد دوم میں آنحضرت صلعم اور خلفاء (۱۲۵۸ء تک) ایران کے فرمانروا خاندانوں کی تاریخ، مشرقی و مغربی اسمٰعیلی، اوغز اور ترک، چینی، یہودی، افرنگ، ان کے شہنشاہ اور یورپ، ہندوستان، نیز مہاتما بدھ اور بدھ مت۔ "مجموعۃ الرشیدیہ" میں رشید کی چار عربی کتابیں شامل ہیں: (۱) توضیحات، متصوفانہ دینی رسالہ (۲) مفتاح التفاسیر، قرآن مجید کی فصاحت اور تفاسیر کے بارے میں (۳) الرسالۃ السلطانیہ، ایک دینی مناظرے کی روداد (۴) لطائف الحقائق، متصوفانہ اور الہیاتی نوعیت کے چار خطوط۔

رشید، مولائی

(۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء — ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ/۹ اپریل ۱۶۷۲ء) بن شریف بن علی بن محمد بن علی علوی، سلطان مراکش اور اس خاندان کا حقیقی بانی جو شریفی مملکت پر حکمران رہا۔ اس کے اسلاف نے مراکش کے جنوب میں ایک مرغزار تافیلالت میں اپنا سیاسی اقتدار پیدا کر لیا۔ مراکش میں اس زمانے میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اس لیے سجلماسہ کے حسنی شرفا بڑے بڑے صحرا نما قطعات کے مالک بن گئے۔ یہ قطعات نخلستان کے شمال میں واقع تھے۔ مولائی محمد نے مراکش کے جنوب مغرب میں زاویۂ ایلغ کے مرابطہ (مذہبی پیشوا) سے کامیاب جنگ کی اور ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں شاہی لقب اختیار کر لیا۔ مشرقی مراکش پر اس کا موثر اقتدار قائم ہوگیا۔ ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں مولانا شریف کی وفات پر اس کے بیٹے مولائی رشید نے اپنے بھائی مولائی محمد پر اعتماد نہ کیا اور اپنا آبائی زاویہ چھوڑ کر الدلا کے حریف زاویہ میں چلا گیا۔ الدلا والوں کی سرد مہری کے پیش نظر وہ آزرو اور بعد میں فاس چلا گیا۔ فاس کے حاکم دریدی نے اسے داخلے کی اجازت نہ دی۔ یہاں سے وہ مشرقی مراکش گیا اور بہت جلد اپنے حامیوں کی بڑی تعداد جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء میں انگاد کا بڑا قبیلہ اس کے جھنڈے تلے آگیا اور وجدہ میں اس نے باقاعدہ فرمانروا کی حیثیت سے قدم جمایا۔ مولائی محمد یہ غیر مستحکم تافیلالت سے رشید مولائی پر حملہ آور رہا۔ مولائی محمد لڑائی کے آغاز میں مارا گیا اور اس کے آدمی رشید سے آملے۔ اس کے بعد رشید نے تازا پر قبضہ کیا۔ مارچ ۱۶۶۶ء میں اس نے ریف کے حکمران ابو محمد عبداللہ اعراس کو بے دخل کر کے قبضہ کر لیا۔ ۳ ذوالحجہ ۱۰۷۶ھ/۶ جون ۱۶۶۶ء کو رشید نے فاس فتح کیا۔ دریدی فرار ہوگیا۔ اس کے بعد کے چند سال رشید نے اس کوشش میں صرف کیے کہ اپنے مقبوضات کو مغرب اور جنوب کی طرف وسعت دے۔ تعز اکیز، مکناس، تطوان، تازا اور زاویۂ الدلا پر قبضہ کیا۔ ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں اس نے مراکش پر قبضہ کر کے مقامی رئیس عبدالکریم الشبانی کو سزائے موت دی۔ اب وہ تمام مراکش کا مالک ہوگیا تھا۔ رشید گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھائی مولائی اسمٰعیل ۱۵ ذوالحجہ کو سلطان بنا۔ مراکش کے مسلمان مورخین مولائی رشید کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔

رضا خاں

دیکھیے بریلوی، احمد رضا خاں

رضا شاہ پہلوی

(۱۶ مارچ ۱۸۷۸ء — ؟) شاہ ایران۔ رضا خاں نام۔ مازندران کے قلعہ اشت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عباس علی خاں مازندران میں مقیم فوج کے ذمہ دار افسر اور متوسط طبقے کے زمیندار تھے۔ اپریل ۱۸۷۸ء میں والد کا انتقال ہوا تو والدہ انھیں شوہر کے عزیزوں کے پاس تہران لے آئیں۔ چودہ سال کے تھے تو ایرانی قزاق بریگیڈ میں بھرتی ہوگئے۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے جنگلی قبائل کے خلاف کارروائی میں نام پیدا کیا جب بریگیڈ کو دوبارہ منظم کیا گیا تو انھیں جونیئر کرنل بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں ملک کی بدحالی کے پیش نظر نوجوانوں میں احمد شاہ قاچار کی حکومت کے خلاف عام اضطراب پایا جاتا تھا۔ ۱۸ فروری ۱۹۲۱ء کو قزاق بریگیڈ نے رضا شاہ کی قیادت میں تہران کی طرف کوچ کیا۔ ۲۱ فروری کو انھوں نے تہران پر قبضہ کر لیا۔ رضا خاں نے احمد شاہ قاچار کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا دوسرے ہی دن احمد شاہ نے ضیاء الدین طباطبائی کو وزیر اعظم اور رضا خاں کو ایرانی فوج کا "سردار سپاہ" بنا دیا۔ رضا خاں کے مطالبے پر حکومت کے نااہل افسران برطرف کر دیے

Marfat.com

گئے۔ وزارتوں کی جانچ پڑتال کی گئی اور غیر ملکی زیرِ حمایت ملازمین کو الگ کر دیا گیا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۲۱ء کو سیا طباطبائی مستعفی ہوا اور قاسمت علی قوام السلطنت نے سنبھالی۔ وزارت جنگ رضا خاں کے سپرد ہوئی۔ اس نے فوجی جمعیت اڑھائی ہزار سے بڑھا کر پچاس ہزار کر دی اور اسے جدید اسلحہ سے مسلح کر دیا گیا۔ محصولات وصول کرنے اور خرچ کرنے کے اختیارات اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ رضا خاں نے شمال ایران میں باغیوں کی سرکوبی کی۔ دوسرا اقدام کردوں، لوریوں، بختیاریوں، قاشقائیوں اور دوسرے جنگجو قبائل کے خلاف اٹھایا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ان قبائل کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ آذربائیجان کو مرکز کے تحت لانا بڑا کارنامہ سمجھا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں خرم آباد کے لوریوں کو غیر مسلح کیا گیا۔ قوام السلطنت نے رضا خاں کو ہٹانے کی سازش کی لیکن رضا خاں کو اس سازش کا بروقت پتا چل گیا اور قوام السلطنت کو ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو رضا خاں وزیر اعظم بنا۔ احمد شاہ خرابی صحت کے باعث فرانس چلا گیا اور اپنے بھائی کو ولی عہد بنا دیا۔ ایران کے تمام صوبوں سے رضا خاں کو عرضداشتیں موصول ہونے لگیں کہ ملک میں جمہوریت کا اعلان کر دیا جائے۔ مجتہدین نے تحریکِ جمہوریت کی شدید مخالفت کی۔ بالآخر رضا خاں کو ملک میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ رضا خاں نے مذہبی پیشواؤں سے گفت و شنید کے بعد تحریکِ جمہوریت ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ محمرہ کے شیخ خزعل نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ رضا خاں ۶ نومبر ۱۹۲۴ء کو بائیس ہزار فوج کے ساتھ خوزستان کی طرف بڑھے۔ ۶ دسمبر کو خزعل نے غیر مشروط طور پر اظہارِ اطاعت کی۔ اسی عرصے میں رضا خاں کی فوج نے خوزستان پر قبضہ کر لیا۔ شیخ محمرہ نے وعدہ کیا کہ وہ بقایا پانچ لاکھ تومان کے علاوہ نئے ٹیکس بھی ادا کرے گا۔ رضا خاں تہران واپس آئے تو ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اب تہران، تبریز، اصفہان، کرمان، شیراز اور خوزستان کے عوام مطالبہ کرنے لگے تھے کہ بادشاہ کو معزول کر کے قاچاری خاندان کا خاتمہ کر دیا جائے۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پارلیمنٹ نے کثرتِ رائے سے قرارداد منظور کی کہ مجلس شوریٰ ملی فلاحِ عامہ کے پیش نظر قاچاری حکومت کے خاتمے کا اعلان کرتی ہے اور دستور اور دوسرے قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے عبوری حکومت رضا خاں کے سپرد کرتی ہے۔ رضا شاہ صرف چھ ہفتے ریجنٹ رہے۔ مجتہدین، حکام، سیاستدانوں، رجعت پسندوں، قوم پرستوں اور اعتدال پسندوں سب نے استدعا کی کہ رضا خاں ایران کا تاج و تخت قبول کر لیں۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں مجلس دستور ساز کا اجلاس ہوا اور دستور میں ترمیم کر کے خاندان قاچار کے افراد کو تخت سے محروم کر دیا گیا۔

رضا خاں کی تاجپوشی کی رسم ۵ اپریل ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔ رضا شاہ پہلوی نے اسلامی ممالک کے ساتھ الگ الگ معاہدے کیے۔ نتیجتاً ایران کا خام مال اسلامی ممالک میں برآمد ہونے لگا۔ پارلیمنٹ نے ملک بھر میں جدید تعلیم عام کرنے کے لیے قانون منظور کیا اور ملکی مالیات کا نصف حصہ تعلیم کے لیے وقف کر دیا گیا۔ ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو دانشگاہِ تہران کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ ملٹری اکیڈمی قائم ہوئی اور ابتدائی فوجی سکول تہران، تبریز، مشہد، اصفہان اور کرمان شاہ میں قائم کیے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ٹیکنیکل سکول کا قیام عمل میں آیا۔ یہ سکول جرمن ماہرینِ صنعت نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں تمام غیر ملکیوں کے سکول وزارتِ تعلیم نے اپنی تحویل میں لے لیے مگر ٹیکنیکل سکول کو اس فیصلے سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ شمالی ایران کو جنوبی ایران سے اور مشرقی ایران کو مغربی ایران سے بذریعہ ریل ملانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ ریلوے ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۹ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ ریلوے کی تعمیر پر قومی جشن منائے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں سوتی کپڑے کے کارخانے مازندران، اصفہان اور تہران میں اور ریشمی پارچہ بافی کے کارخانے چالوس اور مازندران میں قائم ہو گئے۔ اصفہان میں اونی کپڑا بنانے کے

رضا شاہ پہلوی

کارخانے قائم ہوئے۔ ان کے علاوہ سیمنٹ بنانے اور شکر سازی کے کارخانے بھی قائم ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں ملکی سرمائے سے قومی بنک قائم ہوا جس سے ملکی معیشت میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں وزارتِ صحت قائم ہوئی۔ متعدد شہروں اور بڑے دیہات میں ہسپتال قائم کیے گئے۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے روس کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ ایران نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ ۲۵ اگست کو روس اور برطانیہ نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر دیں۔ بالآخر ایران نے رسد کے لیے خلیج فارس کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ محمد رضا خاں پہلوی اپنے جانشین محمد رضا شاہ پہلوی کے حق میں دستبردار ہو کر جنوبی افریقہ چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کا جسدِ خاکی تہران لایا گیا اور شاہ عبدالعظیم کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ شہزادہ محمد رضا شاہ پہلوی نے ۱۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو دستور کے مطابق حلف اٹھایا۔

رضاعت

فقہی اصطلاح اس سے مراد وہ رشتہ ہے جس کی بنا پر دودھ کے رشتہ داروں کا باہمی نکاح ناجائز ہو جاتا ہے۔ اس امر پر ساست میں اتفاق ہے کہ ایک لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے۔ تمام وہ رشتہ دار جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں۔ رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ حرمتِ رضاعت کتنا دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ سکتا ہے اتنی ہی مقدار میں اگر بچہ کسی کا دودھ پی لے تو حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کس عمر میں پینے سے یہ رشتے حرام ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مختلف فقہا کے اقوال حسب ذیل ہیں: (۱) اعتبار صرف اس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جبکہ بچے کا دودھ چھڑایا نہ جا چکا ہو اور شیر خوار گی

Marfat.com

ہی پر اس کے تغذیہ کا انحصار ہو۔ ورنہ دودھ چھڑائی کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے اس نے پانی پی لیا ہو۔ یہ رائے ام سلمہ اور ابن عباس کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی ایک روایت اس معنی میں آئی ہے۔ زہری، حسن بصری، قتادہ، عکرمہ اور ناعی اسی کے قائل ہیں (۲) دو سال کی عمر کے اندر اندر جو دودھ پیا گیا ہو صرف اسی سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوگی یہ حضرت عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابو ہریرہؓ اور ابن عمرؓ کا قول ہے۔ فقہا میں امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور سفیان ثوری نے اسے قبول کیا ہے۔ (۳) امام ابو حنیفہؒ اور امام زفر کا مشہور قول یہ ہے کہ زمانۂ رضاعت ڈھائی سال ہے اور اس کے اندر دودھ پینے سے حرمتِ رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ (۴) خواہ کسی عمر میں دودھ پیا جائے، حرمت ثابت ہو جائے گی۔ یعنی اصل اعتبار دودھ کا ہے نہ کہ عمر کا۔ پینے والا اگر بوڑھا بھی ہو تو وہی حکم ہے جو شیر خوار بچے کے لیے ہے۔ یہی رائے حضرت عائشہؓ کی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی صحیح تر روایت اسی تائید میں منقول ہے۔ فقہا میں سے عروہ بن زبیر، عطار، لیث بن سعد اور ابن حزم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

رضاقلی خاں ہدایت

(۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء ــــ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء) بن محمد ہادی بن اسمٰعیل کمال، ایرانی فاضل، ادیب اور مورخ۔ ۱۸۰۲ء میں رضاقلی یتیم ہو گیا۔ اس کی زندگی کے ابتدائی ایام فارس میں گذرے۔ اس کے بعد وہ تہران آ گیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ فارس کے نائب السلطنت کی سرپرستی میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوا۔ ۱۸۳۸ء میں محمد شاہ نے اپنے بیٹے عباس مرزا کی تعلیم رضاقلی کے سپرد کر دی۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۱۸۵۱ء میں ناصر الدین شاہ نے اسے ایک سفارت پر خیوہ روانہ کیا۔ اس کے بعد وہ وزیر معارف مقرر ہوا۔ پندرہ برس بعد شاہزادہ مظفر الدین کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس کی درج ذیل کتب قابلِ ذکر ہیں: (۱) دیوان، عشقیہ اشعار کا مجموعہ۔ اشعار کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے۔ (۲) فہرس التواریخ، ترتیب وار تاریخی واقعات (۳) اجمل التواریخ، ایران کی تاریخ کا اختصار (۴) روضۃ الصفائے ناصری، یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس میں سیاسی واقعات کے علاوہ بہت سی جغرافیائی، ادبی اور فنون لطیفہ سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ (۵) ریاض العارفین، صوفی شعرا کا تذکرہ (۶) مجمع الفصحا، یہ کتاب ایرانی شاعری کی تاریخ کے لیے اولین اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مصنف کی بہترین تالیف ہے، ایرانی شاعری کی تاریخ پر ایک عمومی مقدمے کے علاوہ تمام شعرا کے حالات اور ان کے کلام کے منتخب نمونے دیئے گئے ہیں۔ آخر میں ہدایت کے اشعار کا انتخاب اور خود نوشت سوانح عمری درج ہے (۷) فرہنگ انجمن آرائے ناصری، اس میں فارسی الفاظ کے مختلف معنی اور سند میں مشہور شعرا کے اشعار درج کیے گئے ہیں۔ (۸) مدارج البلاغہ، خطیبانہ و شاعرانہ اصطلاحوں کی فرہنگ۔

رضیہ سلطانہ

(عہدِ حکومت: ۱۲۳۶ء ــــ ۱۲۴۰ء) سلطنت دہلی کی فرمانروا۔ سلطان شمس الدین التتمش نے رضیہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ لیکن التتمش کی وفات پر درباریوں نے اس کے ایک بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ عیش پرست انسان تھا۔ حکومت کا حقیقی اقتدار اس کی ماں شاہ ترکان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے التتمش کے ایک بیٹے قطب الدین کو بلاوجہ قتل کروا دیا۔ اس کی بے رحمی سے ارکان سلطنت باغی ہو گئے۔ ملتان کا صوبیدار ملک اعز الدین ایاز سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے دہلی کی طرف بڑھا تو رکن الدین اپنی فوج لے کر

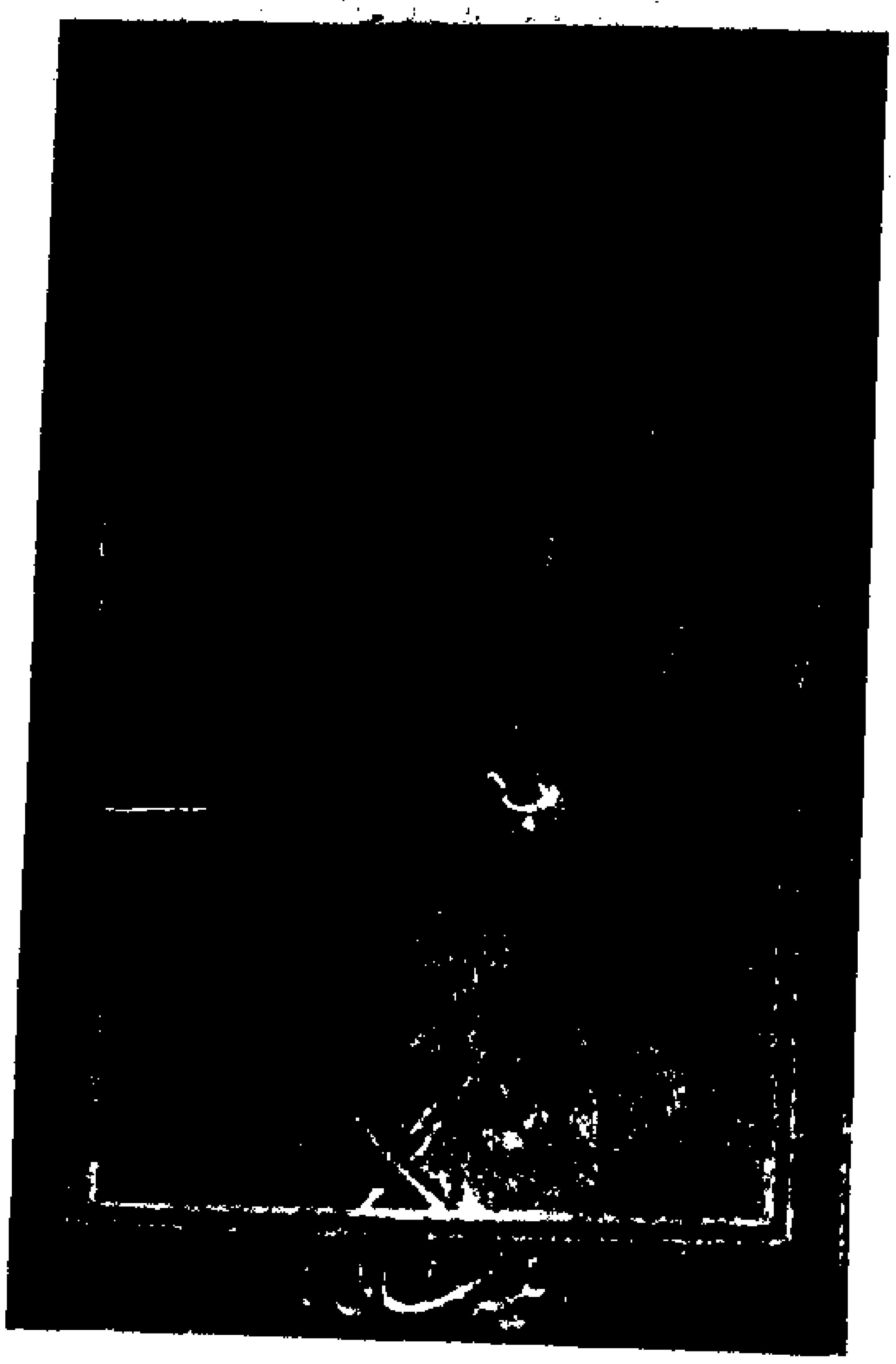

بہرام میں پہنچا۔ امرائے سلطنت اس کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے اور رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کر دیا۔ شاہ ترکان کو قید میں ڈال دیا گیا۔ رکن الدین، رضیہ کے خلاف بھی آمادہ ہوا۔ شکست کھا کر گرفتار ہوا۔

رضیہ سلطانہ بڑی زیرک اور تیز فہم تھی۔ اس نے تمام مخالفوں کو کچل ڈالا۔ اس نے خواجہ مہذب الدین حسین کو وزیر مقرر کیا۔ جب ایک حبشی ملک جمال الدین یاقوت، مہتمم شاہی اصطبل کو امیر الامرا کا خطاب ملا تو ترک امرا بگڑ گئے اور انھوں نے ملک التونیہ، حاکم بھٹنڈہ کی قیادت میں بغاوت کر دی۔ باغی امرا نے یاقوت حبشی کو قتل کر دیا اور رضیہ کو قید کر کے اس کے سوتیلے بھائی بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملک اختیار الدین التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ ملک التونیہ اور رضیہ دونوں میدانِ جنگ میں کام آئے۔

رعد (سورہ)

دیکھیے الرّعد۔

رفاعہ بک طہطاوی

(۱۸۰۱ء ــــ ۱۸۷۳ء) انیسویں صدی کا مشہور مصنف۔ اس کا شمار ان اہلِ قلم کا ملک میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید عربی نشاۃ کی داغ بیل ڈالی۔ رفاعہ بالائی مصر کے مقام طہطہا میں پیدا ہوا۔ ۱۸۲۴ء میں وہ ازہر سے فارغ التحصیل ہوا۔ اس نے فرانسیسی میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۳۲ء میں مدرسۂ طب میں فرانسیسی زبان کا ترجمان اور معلم مقرر ہوا۔ اس کے بعد وہ مختلف مدرسوں میں کام کرتا رہا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ پندرہ روزہ تعلیمی مجلہ "روضۃ المدارس" کا مدیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ رفاعہ نے تاریخ، جغرافیہ، صرف و نحو، قانون، طب میں معتدبہ تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ رفاعہ اور اس کے شاگردوں نے عربی اور ترکی زبانوں میں تقریباً دو ہزار کتابوں کے ترجمے کیے۔

Marfat.com

رفاعہ بن رافع

بن مالک بن عجلان بن عمرو بن زریق ، رسول اللہ کے صحابی ۔ عقبہ ثانیہ میں اسلام قبول کیا ۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے ۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا ۴۱ھ میں امیر معاویہ کے عہد خلافت میں وفات پائی ۔

رفاعی ، احمد

(۱۱۰۶ء ــــ ۲۳ ستمبر ۱۱۸۲ء) طریقۂ رفاعیہ کے بانی ۔ ضلع بصرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد علی ابوالعباس ۵۱۹ھ میں بغداد میں فوت ہوئے ۔ رفاعی کی پرورش ان کے ناموں منصور لبطائحی نے کی ۔ رفاعی کی تعلیم ستائیس برس کی عمر تک جاری رہی ۔ تب الخطیب علامہ ابوالفضل علی الواسطی کی طرف سے "اجازہ" اور اپنے ماموں امام منصور کی طرف سے خرقہ ملا ۔ ۴۰ ۵ھ میں منصور کا انتقال ہوا اور وہ اپنے فرقے "مشیخہ" کی مشیخت احمد رفاعی کے لیے چھوڑ گئے ۔ رفاعی کی سرگرمیاں ام عبیدہ اور نواحی دیہات تک محدود رہیں ۔ سبط ابن الجوزی کہتے ہیں کہ ان کے شیوخ میں سے ایک کے بیان کے مطابق رفاعی کے پاس شعبان کی ایک رات کو ایک لاکھ آدمی دیکھے گئے (مرآۃ الزمان)

رفع یدین

دیکھئے صلوٰۃ ۔

رفیع الدین

(۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰ء ــــ ۶ شوال ۱۲۳۳ھ/ ۹ اگست ۱۸۱۸ء) مولانا شاہ محمد رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری ممتاز عالم دین ۔ انھوں نے حدیث اپنے والد شاہ ولی اللہ سے پڑھی ۔ ۱۱۷۶ھ میں والد کے انتقال کے بعد ان کی تربیت بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء ــــ ۱۸۲۳ء) نے کی ۔ ان کے پاس رفیع الدین نے علوم متداولہ کی تکمیل کی ۔ بیس سال کی عمر میں مفتی اور مدرس کا منصب سنبھالا انھوں نے کم و بیش بیس کتابیں لکھیں جن میں سے بیشتر عربی اور فارسی میں اور چند اردو میں ہیں ۔ چند مشہور تصانیف یہ ہیں ۔ (۱) قرآن مجید کا اردو ترجمہ (۲) تکمیل الصناعت الاذہان (۳) مقدمتہ العلم (۴) اسرار المحبت (۵) تفسیر آیتہ النور (۶) العروض والقافیہ (۷) دمغ الباطل (۸) قیامت نامہ (۹) فتاویٰ (۱۰) لطائف خمسہ ۔

رقیبؒ

دیکھئے ، اسماء الحسنیٰ

رقیہؓ بنت محمدؐ

آنحضرت صلعم کی دوسری صاحبزادی اور تیسری اولاد ۔ حضرت رقیہؓ ہجرت مدینہ سے انیس سال قبل مکہ معظمہ میں اپنی والدہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے مکان میں پیدا ہوئیں نبی کریم کی رسالت کے پہلے روز مسلمان ہوئیں ۔ آنحضرت صلعم کے چچا ابولہب کے لڑکے عتبہ سے آپ کا نکاح ہوا ۔ عتبہ کی ماں ام جمیل ابوسفیانؓ کی ہمشیرہ تھی ۔ اسلام کے مخالفین میں آنحضرت صلعم کے یہ دونوں چچا چچی پیش پیش تھے ۔ ابولہب آپ کے پڑوس میں رہتا تھا ۔ بعثت کے تین سال بعد جب اعلانِ دعوت کا حکم آیا تو آپ نے قریش کو جمع کر کے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر تبلیغ فرمائی ۔ ابولہب نے مخالفت میں آواز اٹھائی ۔ اس پر سورہ تبت نازل ہوئی ۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو ابولہب اور حمالتہ الحطب (ام جمیل) نے عتبہ سے کہا کہ تم محمدؐ کی بیٹی کو چھوڑ دو ۔ آنحضرت صلعم کی دوسری بیٹی ام کلثومؓ عتیبہ بن ابی لہب سے بیاہی ہوئی تھیں ۔ دونوں بہنوں کو طلاق دے دی گئی ۔ استیعاب اور ابن ہشام دونوں کی روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ طلاق کا واقع اس وقت پیش آیا جب چچا اور بھتیجے (آنحضرت صلعم) کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی ۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ صاحبزادیاں ازدواجی تعلقات سے پیشتر ہی علیحدہ ہوگئیں ۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے سن ۲ بعثت میں ہوا ۔ اس وقت حضرت رقیہؓ کی عمر دس برس تھی ۔

حضرت رقیہؓ بارہ برس کی تھیں کہ رجب ۵ بعثت میں انھیں حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہجرت حبشہ کا سفر پیش آیا ۔ حضرت رقیہؓ نے حبشہ میں آٹھ سال قیام فرمایا ۔ پندرہ سال کی تھیں کہ ان کا ایک بچہ ساقط ہوا (ابن سعد) ۔ ۱۰ البعثت میں حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا ۔ اس وقت حضرت رقیہؓ حبشہ میں مقیم تھیں ۔ ۱۱ البعثت میں جب ان کی عمر اٹھارہ سال تھی تو ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ۔ آنحضرت صلعم نے اس کا نام عبداللہ رکھا ۔ انھی کے نام پر حضرت عثمانؓ کی کنیت ابوعبداللہ ہے ۔ ۱۲ بعثت میں حضرت رقیہؓ مکہ واپس آئیں ۔ حضرت عثمانؓ تنہا ہجرت نبوی سے پہلے مدینہ آگئے تھے ۔ حضرت رقیہؓ آنحضرت صلعم کی ہجرت کے بعد مدینہ پہنچیں (ابن سعد) ۔ صرف حضرت رقیہؓ ہی آپؐ کی وہ صاحبزادی ہیں جنھوں نے دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہے ۔

فیاض اور رئیس ہونے کی بنا پر حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں آسائش اور آسودگی کی زندگی گزارتے تھے ۔ اسی قسم کی زندگی حضرت رقیہؓ کی بھی تھی ۔ گیارہ سال کی رفاقت میں ناگواری کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا ۔ عرب میں ضرب المثل کے طور پر یہ مقولہ رائج تھا (ترجمہ ، "میاں بیوی کے جوڑوں میں سب سے بہتر جوڑا جو کسی انسانی آنکھ نے دیکھا وہ حضرت رقیہؓ اور ان کے شوہر حضرت عثمانؓ ہیں ۔ رمضان المبارک ۲ ہجری میں حضرت رقیہؓ کو دانے (خسرہ) نکل آئے ۔ ۱۲ رمضان کو آنحضور صلعم غزوۂ بدر کے لئے روانہ ہوئے ۔ آپؐ حضرت عثمانؓ کو حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے چھوڑ گئے اور فرمایا تمہیں اور شخص کے برابر ثواب اور حصہ ملے گا جو بدر میں شریک ہوگا (بخاری شریف) ۔ ۱۷ رمضان المبارک کو غزوۂ بدر لڑی گئی ۔ جس روز حضرت زیدؓ بن حارثہ فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ منورہ پہنچے اسی روز حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا ۔

رکعت

دیکھئے صلوٰۃ ۔

رکن الدین

(وفات ۶ ذوالقعدہ ۶۰۰ھ/ ۶ جولائی ۱۲۰۴ء) سلیمان ثانی بن قلیج ارسلان ثانی ، روم کا ایک سلجوقی فرمانروا ۔ اس کا باپ بوڑھا ہوا تو اس نے سلطنت اپنے متعدد بیٹوں میں تقسیم کردی ۔ شعبان ۵۸۸ھ/ اگست ۱۱۹۲ء میں جب قلیج ارسلان کا انتقال ہوا تو رکن الدین پوری سلطنت پر قابض ہوگیا ۔ اس نے سیواس ، آق سرائے ، قیساریہ ، قونیہ ، ملطیہ ، ارض روم ، انقرہ کے علاقے اپنے بھائیوں سے چھین لیے ۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ رکن الدین ایک زبردست اور باہمت حکمران تھا ۔

رکن یمانی

دیکھئے ، کعبہ

Marfat.com

رکوع

نماز میں ایک خاص انداز میں جھکنا۔ رکوع کی کیفیت علما نے یہ بیان کی ہے کہ قیام کے بعد تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھلی رکھ کر دونوں گھٹنوں کو اچھی طرح پکڑے اور سر کو زیادہ نیچے نہ لے جائے۔ جمہور علمائے امت اس بات پر متفق ہیں کہ حالت رکوع میں اطمینان و اعتدال واجبات میں سے ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول کریم صلعم رکوع میں جاتے تو نہ تو سر کو بہت نیچے لے جاتے اور نہ اوپر کو اٹھائے رکھتے بلکہ اعتدال سے کام لیتے۔ عورتوں کو انگلیاں ملا کر صرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لینا کافی ہے۔ مرد رکوع کی حالت میں پنڈلیاں سیدھی رکھیں اور دونوں بازو پہلوؤں سے جدا رکھیں۔ حضرت علیؓ سے مروی ایک حدیث کی بنیاد پر حالت رکوع و سجود میں تسبیح کے سوا کچھ اور پڑھنا منع ہے۔ امام شافعیؒ نے رکوع کی حالت میں بہت ادعیۂ ماثورہ نقل فرمائی ہیں جن میں سے مختصر ترین "سبحان ربی العظیم" ہے۔ رسول کریم صلعم کا فرمان ہے کہ جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو تین بار سبحان ربی العظیم کہے کیونکہ تسبیح کی یہ کم سے کم مقدار ہے جو حالت رکوع میں ضروری ہے۔ نمازی رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہو جائے اور ہاتھ کھلے چھوڑ کر ربنا لک الحمد کہے۔ نماز باجماعت میں امام رکوع سے اٹھتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدی رکوع سے کھڑے ہو کر ربنا لک الحمد کہیں۔

رمضان المبارک

اسلامی تقویم کا نواں مہینہ۔ رمضان ہی وہ بابرکت مہینہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ رمضان کے مہینے میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ (البقرہ: ۱۸۵)۔ اس مہینے میں ایک رات (لیلۃ القدر) ایسی آتی ہے جو ہزار راتوں سے افضل و بہتر ہے (القدر: ۳)۔ حضرت سلمانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلعم نے شعبان کی آخری تاریخ کو فرمایا کہ تمہارے اوپر ایک مہینہ آ رہا ہے جو بہت بڑا اور مبارک مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزاروں مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کے روزہ کو فرض فرمایا اور اس کے رات کے قیام کو ثواب کی چیز بنایا۔ جو شخص اس مہینہ میں کسی نیکی کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے وہ ایسا ہے جیسے غیر رمضان میں فرض ادا کیا اور جو شخص کسی فرض کو ادا کرے وہ ایسا ہے جیسے غیر رمضان میں ستر فرض ادا کرے۔ یہ مہینہ لوگوں کے ساتھ غمخواری کرنے کا ہے۔ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ تمام آسمانی کتابیں اسی ماہ میں نازل ہوئیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے یکم یا تین رمضان، حضرت داؤد کو زبور ۱۲ یا ۱۸ رمضان کو، حضرت موسیٰؑ کو تورات ۶ رمضان کو، اور حضرت عیسیٰؑ کو انجیل ۱۲ یا ۱۳ رمضان المبارک کو عطا ہوئی۔ حضرت جبرئیلؑ ہر سال رمضان میں تمام قرآن شریف نبی کریم صلعم کو سناتے تھے اور بعض روایات میں آیا ہے کہ نبی کریم صلعم سے سنتے تھے۔ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری امت کو رمضان شریف کے بارے میں پانچ چیزیں خصوصی طور پر دی گئی ہیں جو پہلی امتوں کو نہیں ملیں: (۱) ان کے (روزہ دار) منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (۲) ان کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں۔ (۳) جنت ہر روز ان کے لیے آراستہ کی جاتی ہے۔ (۴) اس میں سرکش شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں۔ (۵) رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں [illegible] ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، یہ شب مغفرت شب قدر ہے؟ فرمایا نہیں [illegible] دستور یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم ہونے کے وقت مزدوری دی جاتی ہے۔ (ابن حبان)

رمضان زادہ

(وفات: جمادی الاولیٰ ۹۷۹ھ/ستمبر ۱۵۷۱ء) محمد پاشا معروف بہ کوچک نشانجی، ایک عثمانی مورخ۔ ابتدا میں بطور کاتب ملازمت کرتا تھا۔ ۱۵۵۴ء میں وہ وزیر مملکت اور ۱۵۵۸ء میں سلطان کا مہر بردار (کاتب طغری) مقرر ہوا۔ اس کے بعد دفتردار حلب اور بعد ازاں عامل مصر مقرر ہوا۔ ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ سلیمان اعظم کے حکم سے ایک تاریخ لکھی جو "تاریخ رمضان زادہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ کتاب کا اصل نام "ابنیۂ عظام و احوال خلفائے قرآن و مناقب سلاطین آل عثمان" ہے۔ اس کا شمار آل عثمان کی مقبول ترین تاریخوں میں ہوتا ہے۔

رملہ

فلسطین کا صدر مقام جو بیت المقدس کے شمال مشرق میں ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ولید کے عہد خلافت میں اس کے بھائی سلیمان والی فلسطین نے نئے قصبے رملہ کی بنیاد رکھی۔ صوبے کا صدر مقام ۱۸ھ/۶۳۹ء میں لد سے رملہ منتقل کیا۔ جب سلیمان خلیفہ ہوا تو وہ رملہ ہی میں مقیم رہا (۷۱۵ء — ۷۱۷ء)۔ لد کی پوری آبادی رملہ میں منتقل کر دی گئی۔ سلیمان نے یہاں اپنا محل تعمیر کرایا۔ اس نے مسجد کی تعمیر بھی شروع کروا دی تھی جو عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں مکمل ہوئی۔ رملہ ایک مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ناصر خسرو نے ۴۳۸ھ/۱۰۴۷ء میں رملہ کی سیاحت کی۔ اس کا بیان ہے کہ رملہ ایک بڑا قصبہ ہے جس میں پتھر کی اونچی اور مضبوط فصیلیں اور تانبے کے دروازے تھے۔ شہر کے باشندوں نے ہر گھر میں دروازے پر بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے تحزن بنا رکھے تھے۔ ۱۵ محرم ۴۲۵ھ/۱۰ دسمبر ۱۰۳۳ء کے زلزلے نے رملہ کا ایک تہائی حصہ تباہ کر دیا اور مسجد بھی کھنڈر بن گئی (ابن اثیر)۔ سلطان صلاح الدین نے ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں اس قصبے کو منہدم کرا دیا۔ جدید رملہ کی آب و ہوا صحت بخش اور اس کے آس پاس کا علاقہ سرسبز ہے۔

رملہؓ

دیکھئے: ام حبیبہؓ

رمی جمار

دیکھئے: حج

روح

اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو ملکہ و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقات ارضی سے ممتاز اور حامل خلافت ہستی بنتا ہے۔ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ اللہ تعالےٰ کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجودات ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی

Marfat.com

بولی مٹی سے جو سٹرے ہوئے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا (الحجر ۲۸-۲۹)۔ مخلوقات میں پائی جانے والی ہر صفت کا مصدر و منبع اللہ تعالےٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ حدیث نبوی ہے: "اللہ تعالےٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا۔ پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اتارا۔ یہ اسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھر اٹھاتا ہے کہ بچے کو ضرر نہ پہنچے تو یہ بھی دراصل اسی حصہ رحمت کا اثر ہے۔" (بخاری و مسلم)

قرآن و حدیث کی رو سے موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔

روح القدس

دیکھئے، جبرائیل

روح اللہ

دیکھئے، حافظ روح اللہ

روح بن حاتم

(وفات ۱۹ رمضان ۱۷۴ھ/۳ فروری ۷۹۱ء) والی افریقیہ۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ۱۷۱ھ/۷۸۷ء میں اسے افریقیہ کا والی مقرر کیا۔ اس سے قبل وہ بصرہ کا والی رہ چکا تھا۔ مہدی نے اسے یکے بعد دیگرے کوفہ، سندھ، طبرستان اور فلسطین کا والی مقرر کیا۔ سوانح نگار اس کے حسن تدبر، علم، جرأت اور بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔

رودس

بحر ایجین کے مجمع الجزائر میں مشرق کی جانب آخری جزیرہ جو ایشیائے کوچک کے جنوبی ساحل سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ تین براعظموں کے قریب ہونے کے باعث اس کا محل وقوع جہازرانی کے نقطۂ نظر اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم رہا ہے۔ امیر معاویہؓ نے ۵۳-۵۲ھ میں جنادہ بن ابی الامیہ الازدی کی قیادت میں ایک بیڑہ رودس روانہ کیا تھا جس نے وہاں ایک عارضی بستی کی بنا ڈالی۔ ۶۰ھ میں یزید بن معاویہ نے اسے خالی کرا دیا۔ اور رودس بوزنطی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں رودس صلیبی جنگوں کا اہم مرکز بن گیا۔ یہیں سے وہ ترکیہ اور مصر کے خلاف صلیبی جنگوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۴۴۰ء میں مملوک فرمانروا چقمق نے ایک بحری بیڑا رودس کی طرف روانہ کیا مگر اسے پسپا ہونا پڑا۔ ۱۴۴۴ء میں مملوک افواج نے چالیس روز تک شہر کا محاصرہ جاری رکھا لیکن محصورین کے اچانک حملے سے شدید نقصان اٹھا کر انھیں واپس دمیاط آنا پڑا۔ سلیمان اعظم کے عہد میں رودس پر باقاعدہ قبضہ ہوا اور جزیرے کو صلیبیوں سے بالکل خالی کرا لیا گیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۵۲۲ء میں یہ ایک ترکی پاشا کا مستقر بنا۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ میں اس پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو رودس اطالوی حکومت کے زیر تسلط چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں اٹلی سے صلح کرتے وقت اتحادیوں نے رودس یونان کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۶۱ء میں جزیرے کی آبادی ۶۴ ہزار اور صدر مقام کی ساڑھے ستائیس ہزار تھی۔

رودکی

(وفات ۳۲۹ھ/۹۴۱ء) ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمن بن آدم عبدالکریم بن محمد سمعانی، مشہور شاعر جسے اہل ایران نے "استاد شاعران و مقدم شعرائے عجم" کہا ہے۔ رودکی نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت کا فن بھی سیکھا۔ شعر گوئی میں کمال حاصل کیا۔ موسیقی کی وجہ سے بھی اس کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ بعض مصنفین کے بیان کے مطابق رودکی نے تیرہ لاکھ اشعار اور چھ مثنویاں لکھیں۔ اشعار کی یہ تعداد اس کے دیوان کے علاوہ تھی۔ اس نے کلیلہ و دمنہ کو ایک فارسی نثر سے نظم کا جامہ پہنایا۔ رودکی کو قصیدہ گوئی میں ایک ممتاز حاصل ہے۔ قصیدے میں اسلوب "سبک خراسانی" کا وہ موجد ہے۔ بعد کے شعرا اسے قصیدے کا استاد تسلیم کرتے ہیں۔ غزل میں عنصری اس کی برتری کا موجد ہے۔ وہ فارسی میں زندانہ شاعری کا موجد تھا۔

روزہ

ارکان خمسہ اسلام میں سے ایک اہم رکن۔ ارشادِ ربانی ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی مقدار پوری کر لے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں اور (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھلانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تعالےٰ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو (البقرہ: ۱۸۳ تا ۱۸۵)۔ اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ آنحضرت صلعم نے ابتدا میں مسلمانوں کو ہر مہینے میں صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ ۲ھ میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا۔ مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض، مسافر، حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بوڑھے لوگوں کے لیے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔ اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان

Marfat.com

میں ان سے چھوٹ گئے ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے : " تمہارے لیے روزوں کے زمانے میں راتوں کو اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔ مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ اور تم سے درگزر فرمایا۔ اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شب باشی کرو اور جو لطف اللہ نے تمہارے لیے جائز کر دیا ہے اسے حاصل کرو۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ تم کو سیاہیٔ شب کی دھاری سے سپیدۂ صبح کی دھاری نمایاں نظر آ جائے۔ تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ (البقرہ ۱۸۷)

شریعت نے سحری اور افطار دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ اِدھر اُدھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہو۔ حدیث نبوی ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا : اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور اذان کی آواز آ جائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔ اسی طرح افطار کے وقت میں بھی غروب آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دن کی روشنی ختم ہونے کا انتظار ضروری نہیں۔ آنحضور صلعم سورج ڈوبتے ہی حضرت بلالؓ کو آواز دیتے تھے کہ لاؤ ہمارا شربت۔ بلالؓ عرض کرتے کہ یا رسول اللہؐ ابھی تو دن چمک رہا ہے۔ آپؐ فرماتے کہ جب رات کی سیاہی مشرق سے اٹھنے لگے تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کی دعا رَد نہیں ہوتی۔ ایک روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعا، دوسرے عادل بادشاہ کی دعا، تیسرے مظلوم کی دعا جس کو حق تعالےٰ بادلوں سے اوپر اٹھا لیتے ہیں اور آسمان کے دروازے اس کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ میں تیری ضرور مدد کروں گا گو (کسی مصلحت سے) کچھ دیر ہو جائے "۔ (ترمذی، ابن حبان)۔ نبی کریم صلعم کا ارشاد ہے کہ جو شخص بلا کسی شرعی عذر کے ایک دن بھی رمضان کے روزہ کو افطار کر دے۔ غیر رمضان کا روزہ چاہے تمام عمر کے روزے رکھے اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، بخاری)۔ ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ آنحضور صلعم نے رمضان المبارک کے پہلے عشرہ میں اعتکاف فرمایا۔ اور پھر دوسرے عشرہ میں بھی پھر ترکی خیمہ سے جس میں اعتکاف فرما رہے تھے، باہر سر نکال کر ارشاد فرمایا کہ میں نے پہلے عشرہ کا اعتکاف شب قدر کی تلاش اور اہتمام کی وجہ سے کیا تھا، پھر اسی کی وجہ سے دوسرے عشرہ میں اعتکاف کیا۔ پھر مجھے کسی تبلانے والے نے تبلایا کہ وہ رات اخیر عشرہ میں ہے لہٰذا جو لوگ میرے ساتھ اعتکاف کر رہے ہیں وہ اخیر عشرہ کا بھی اعتکاف کریں۔ (متفق علیہ)

روزے کی چھ قسمیں ہیں : فرض، واجب، سنت، نفل، مکروہ اور حرام۔ سال بھر میں صرف رمضان المبارک کے تیس روزے مسلمانوں پر فرض ہیں۔ رمضان کے روزوں کا فرض ہونا قرآن وحدیث سے صراحتاً ثابت ہے۔ جو شخص روزۂ رمضان کے فرض ہونے کا انکار کرے وہ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص بغیر کسی عذر کے ترک کرے وہ فاسق اور سخت گنہگار ہے۔ رمضان کے روزے اگر کسی عذر سے یا محض غفلت سے رہ جائیں تو ان کی قضا رکھنی فرض ہے۔ نذر اور کفارے کے روزے واجب ہیں۔ اگر کسی متعین دن کے روزے کی نذر مانی جائے تو اسی دن رکھنا ضروری ہے۔ اگر دن متعین نہیں کیا ہے تو پھر جب چاہیں رکھ سکتے ہیں لیکن بلاوجہ تاخیر نہ کرنا چاہیئے۔ جو روزے خود نبی صلعم نے رکھے یا جن کے رکھنے کی آپؐ نے ترغیب دی ہے وہ روزے سنت ہیں اور ان کے رکھنے کا بڑا اجر اور ثواب ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی روزہ سنت مؤکدہ نہیں۔ مسنون روزے یہ ہیں : (۱) عاشورے کے روزے، یعنی محرّم کی نویں اور دسویں تاریخ کے دو روزے۔ (۲) یوم عرفہ کا روزہ، یعنی ذوالحجہ کی نویں تاریخ کا روزہ (۳) ایام بیض کے روزے، یعنی ہر مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کے روزے۔ نفلی روزوں میں، ماہ شوال کے چھ روزے، پیر اور جمعرات کا روزہ، ماہ شعبان کی پندرھویں تاریخ کا روزہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی عشرے کے آٹھ روزے شامل ہیں۔ مکروہ روزوں میں صرف سنیچر یا اتوار کے دن کا روزہ رکھنا، صرف یوم عاشورہ کا روزہ رکھنا، کسی خاتون کا شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنا اور بیچ میں ناغہ کیے بغیر مسلسل روزے رکھنا شامل ہیں۔ سال بھر میں چھ روزے رکھنا حرام ہے : عید الفطر کے دن کا روزہ، عید الاضحیٰ کے دن کا روزہ۔ ایام تشریق، ۱۱، ذوالحجہ اور ۱۳، ذوالحجہ کا روزہ۔

روزوں میں صبح صادق نمودار ہونے سے غروب آفتاب تک تین باتوں سے رکا رہنا فرض ہے۔ (۱) کچھ نہ کھانا۔ (۲) کچھ نہ پینا۔ (۳) جنسی لذت سے پرہیز کرنا۔ سحری کا اہتمام کرنا سنت ہے۔ چاہے چند گھونٹ پانی ہی ہو۔ سحری اخیر وقت میں کھانا مستحب ہے جبکہ صبح صادق ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہو۔ روزے کی نیت رات ہی سے کر لینا مستحب ہے۔ افطار جلد مستحب ہے یعنی غروب آفتاب کے بعد خواہ مخواہ دیر نہ کرنا چاہیئے۔ چھوہارے، کھجور یا پانی سے افطار کرنا مستحب ہے۔ غیبت، چغلی، غلط بیانی، شور و ہنگامہ، غصہ اور زیادتی سے بچنے کا اہتمام کرنا مسنون ہے۔ یہ کام ویسے بھی ناجائز ہیں، لیکن روزوں میں ان سے بچنے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے۔ وجوب کفارہ اور قضا میں یہ اصولی باتیں شامل ہیں : (۱) اگر کوئی چیز قصداً پیٹ میں پہنچ جائے اور اس کو نفع بخش ہونے کا خیال بھی ہو جائے، یا کوئی ایسا فعل کیا جائے جس کی لذت جنسی فعل جیسی نہ ہو تو صرف روزے کی قضا واجب ہو گی کفارہ لازم نہ آئے گا۔ (۳) کفارہ صرف رمضان کا روزہ فاسد ہونے سے واجب ہوتا ہے۔ (۴) رمضان کا قضا روزہ فاسد ہونے سے کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ جیسے مسافر کا روزہ نابالغ کا روزہ، حیض و نفاس والی خواتین کا روزہ (۶) ہر وہ فعل جس میں اپنے قصد اور ارادہ کو دخل نہ ہو تو کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ (۷) جنسی فعل میں فاعل و مفعول دونوں کا عاقل ہونا شرط نہیں۔ دونوں میں سے جو عاقل ہو اور قصداً یہ فعل کرے اس پر کفارہ لازم آئے گا۔ (۸) رمضان میں روزے کی نیت کیے بغیر کوئی کھائے پیئے تو اس پر کفارہ واجب نہیں صرف قضا واجب ہے۔ کفارہ اسی صورت میں واجب ہو گا جب روزے کی نیت کر لینے کے بعد روزہ توڑنے۔ (۹) کسی شبہ کی بنیاد پہ اگر کوئی اپنا روزہ فاسد کر دے تو کفارہ واجب نہ ہو گا (۱۰) کسی کی آنکھ دیر میں کھلی اور یہ سمجھ کر کھا لیا کہ ابھی سحری کا وقت باقی ہے پھر معلوم ہوا کہ صبح ہو چکی ہے تو اس روزے کی قضا رکھنا واجب ہے۔ (۱۱) کسی نے غروب آفتاب سے قبل یہ سمجھ کر افطار کر لیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو قضا واجب

Marfat.com

ہے۔ (۱۳) کسی نے روزہ دار کو زبردستی کچھ کھلا پلا دیا تو صرف قضا واجب ہے۔ (۱۴) کسی نے روزے کی نیت ہی نہیں کی لیکن کھانے پینے سے رکا رہا تو قضا لازم ہوگی۔ (۱۵) روزہ دار نے قصداً منہ بھر قے کی تو قضا واجب ہوگی۔ (۱۶) کسی نے روزے میں بھولے سے کھا پی لیا اور پھر یہ سمجھ لیا کہ روزہ ٹوٹ گیا ہے قصداً کچھ کھا پی لیا تو قضا واجب ہے۔ (۱۷) کسی خاتون نے اپنی شرمگاہ میں انگلی یا روئی وغیرہ داخل کی تو قضا لازم ہوگی۔ (۱۸) جماع اور لواطت کے علاوہ جنسی لذت کا کوئی ایسا فعل کیا جس سے انزال ہوگیا تو قضا لازم ہوگی۔

ان امور سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا۔ (۱) کسی چیز کا ذائقہ چکھنا۔ اگر کوئی عورت بد مزاج اور سخت گیر شوہر کے خوف سے چیزوں کا ذائقہ پکاتے وقت چکھ لے تو مکروہ نہیں۔ (۲) منہ میں کوئی چیز ڈالے رکھنا یا چبانا۔ کسی کا بچہ بھوکا ہے اور وہ صرف وہی چیز کھاتا ہے جو منہ میں چبا کر دی جائے تو اس صورت میں چبا کر کھلانا مکروہ نہیں بشرطیکہ کوئی بے روزہ آدمی بھی موجود نہ ہو۔ (۳) روزے میں ایسا کام کرنا مکروہ ہے جس کی وجہ سے روزہ توڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ (۴) کلی کرتے یا ناک میں پانی ڈالنے میں ضرورت سے زیادہ اہتمام کرنا۔ (۵) بلاوجہ منہ میں تھوک جمع کر کے نگلنا۔ (۶) غسل کی حاجت ہو اور بلاوجہ غسل نہ کرنا۔ (۷) منجن، پیسٹ یا کوئلہ وغیرہ چبا کر دانت صاف کرنا مکروہ ہے۔ دن میں سرمہ لگانا، سر میں تیل ڈالنا یا بدن پر مالش کرنا، خوشبو سونگھنا، مسواک کرنا سب درست ہے۔ ان سے روزہ مکروہ نہیں ہوتا۔ خواب میں انزال ہو جائے یا کسی جسمانی تصادم کے بغیر انزال ہو جائے تو روزہ مکروہ نہیں ہوگا۔

کان میں پانی چلا جائے یا کوئی قصداً پانی ڈال لے تو اس سے روزہ مکروہ نہیں ہوگا۔ دانتوں کے درمیان غذا یا بوٹی یا ریشہ یا چھالیہ کا کوئی ٹکڑا رہ گیا ہو اور روزہ دار اسے نگل لے۔ اگر اس کی مقدار چنے کی مقدار سے کم ہے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ بے اختیار قے ہونے سے روزہ مکروہ نہیں ہوگا۔

روم (سورۃ)

دیکھئے الروم۔

رویا (خواب)

حکما کے نزدیک موت میں نفس انسانی کی ایک حرکت یا نفس انسانی کی متعدد اشکال کی تصویر کا نام خواب ہے جو مستقبل کے اچھے یا بُرے واقعات پر دلالت کرے۔ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ خواب حقیقت میں انسان کی تصویر کی کسی جھلک کے مشاہدے کا نام ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نفس ناطقہ جب جسم کی مادیت اور بدن کی حدود سے کسی شکل میں آزاد ہو کر روحانیت کی کیفیت اختیار کرلے تو اس وقت وہ مستقبل کے معاملات کو دیکھ کر اپنی قوت حافظہ یا قوت ادراک کے ذریعے انھیں محفوظ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ نفس ناطقہ کی یہ قوت حافظہ وادراک مستقبل کے واقعات کی تصاویر کا جو اقتباس حاصل کرتی ہے کبھی تو وہ اتنا واضح ہوتا ہے کہ تفسیر و تعبیر کی حاجت نہیں رہتی لیکن کبھی کبھار یہ اقتباس اتنا ضعیف اور مبہم ہوتا ہے کہ تعبیر و تفسیر کا محتاج ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک انسانی نفس ناطقہ کا بدن کی قیود سے آزاد ہو کر حالت خواب میں مستقبل کے واقعات کی جھلک دیکھنا اس لیے ممکن ہے کہ نفس ناطقہ جب تک بدن کی قیود میں پابند ہے اس وقت تک اس میں روحانی قوت تو ہوگی لیکن عملی طور پر بالفعل روحانی بننے کے لئے اس کا جسمانی قیود سے آزاد ہونا ضروری ہے تاکہ وہ تعقل محض کی صورت اختیار کر کے جسمانی وسائل کے بغیر واقعات کا ادراک کرنے کے قابل ہو جائے۔ انسانی نفس ناطقہ کو جس قدر عملی طور پر روحانیت کی دنیا کے قریب تر آنے کا موقع ملے گا اسی قدر حالت خواب میں واقعات کا ادراک مکمل اور صحیح ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آدمی کے خواب سے ایک ولی اللہ کا خواب زیادہ مکمل اور صحیح ہوتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کو اس قسم کی جو استعداد و دلیعت ہوتی ہے وہ روحانیت کے بلند ترین مدارج کی حامل ہوتی ہے اور بشری خصائص سے قطعی آزاد ہو کر خالص عالم ملکوت و روحانیت میں پہنچی ہوئی ہوتی ہے (مقدمہ ابن خلدون)۔

قرآن مجید اور حدیث نبوی کی رو سے الرؤیا (خواب) کا برحق اور قابلِ عمل ہونا صراحت سے ثابت ہے۔ نص قرآنی صراحت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ قالب انسانی میں دو نفس یا روحیں موجود ہوتی ہیں ایک نفس التمییز (تمیز کرنے والا) اور دوسرا نفس الحیات (جس پر زندگی کا دارومدار ہے)۔ حالت بیداری میں دونوں نفس جسم میں موجود رہتے ہیں لیکن حالتِ خواب میں نفس التمییز کو جسمانی قید سے اللہ کے حکم سے آزادی مل جاتی ہے (الزمر: ۴۲)۔ حدیث نبوی ہے کہ اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے (بخاری، مسلم)۔ ابو قتادہؓ کی حدیث میں ہے کہ الرویا (اچھا خواب) تو من جانب اللہ ہوتا ہے لیکن الحلم (پریشان کن خواب) شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور جب کوئی بُرا خواب دیکھے تو اسے بائیں جانب تھوک دینا چاہیئے اور اعوذ باللہ پڑھنا چاہیئے۔ بُرا خواب کسی کو بتانا نہیں چاہیئے۔ اگر کوئی اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور صرف پسندیدہ لوگوں کو بتائے (مسلم، بخاری)۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو گویا اس نے واقعی مجھے دیکھا کیونکہ شیطان میری شکل میں نہیں آسکتا (بخاری، مسلم)

رؤف

دیکھئے، اسماء الحسنیٰ

رہبانیت

خانقاہی زندگی۔ ترک و تجرد کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں افضل و اعلیٰ سمجھنا رہبانیت کی بنیاد ہے۔ رہبانیت کا مطلب ہے سلکِ خوف زدگی، اصطلاحاً اس سے مراد کسی شخص کا خوف کی بنا پر تارک الدنیا ہو جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہ ہائے عزلت میں جا بیٹھنا (سید ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن)۔

مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں میں ہمیشہ سے یہ میلان پایا جاتا رہا ہے کہ نفس رحم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا اور اپنے نفس کو دنیاوی لذتوں سے محروم کرنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔" ارشادِ ربانی ہے:" اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کرلی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا (الحدید ۲۷)۔ نبی کریم صلعم کا فرمان ہے کہ" اسلام میں رہبانیت نہیں" (مسند احمد)۔" اس امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے" (مسند احمد۔ مسند ابی یعلی)۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ صحابہؓ میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا اور عورت سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔ رسول اللہؐ نے ان کی یہ ساری باتیں سنیں اور فرمایا

Marfat.com

خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس سے تقویٰ کرتا ہوں مگر میرا طریقہ یہ ہے کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس کو میرا طریقہ پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔"

ایک صحابی کے متعلق نبی کریم صلعم نے سنا کہ وہ ایک مدت سے اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے اور شب و روز عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ آپؐ نے بلا کر ان کو حکم دیا کہ ابھی اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ انھوں نے کہا میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا روزہ توڑ دو اور جاؤ۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک خاتون نے شکایت پیش کی کہ میرے شوہر دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی بزرگ کعبؓ بن سور الازدی کو اُن کے مقدمہ کی سماعت کے لیے مقرر فرمایا۔ انھوں نے فیصلہ دیا کہ اس خاتون کے شوہر کو تین راتوں کے لیے اختیار ہے کہ جتنی عبادت چاہیں کریں مگر چوتھی رات لازماً ان کی بیوی کا حق ہے۔

رہن

گروی، ضمانت۔ ارشادِ ربانی ہے: "اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے والا میسر نہیں تو رہن بالقبض پر معاملہ کرلو (البقرہ: ۲۸۳)۔ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اگر دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے سکتا ہے۔ گروی رکھنے والا شئے مرہونہ کے قائم رکھنے کا پابند ہے۔ شافعیوں کے نزدیک اسے استعمال کر سکتا ہے۔ گروی لینے والے کے لیے بھی اس کا استعمال ناجائز ہے (باستثنائے حنابلہ) بلکہ منافع گروی رکھنے والے کا ہے۔ لیکن وہ کفالت کا جزو بھی بن جاتا ہے (باستثنائے شوافع)۔ اگر کوئی شخص رہن لیے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے تو دراصل سود کھاتا ہے۔ قرض پر براہ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جا سکتی ہے کیونکہ دراصل یہ اُس چارے کا معاوضہ ہے جو مرتہن اس جانور کو کھلاتا ہے (سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن)۔

ریاست

اسلامی ریاست کی غایتیں کچھ تو ایسی ہیں جن سے نسلِ انسانی کی روحانی پاکیزگی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ کچھ ایسی ہیں جو نظام تمدن کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ مجموعی طور سے اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے جس میں فرد و جماعت کو فوز و فلاح اور سعادت سے ہمکنار کرنا ہے۔ اس طرح اسلامی ریاست کا اصل مقصد اس اصلاحی اور فلاحی لائحہ عمل کو نافذ کرنا ہے۔ جو اسلام نے دنیا کی بہتری اور برتری کے لیے پیش کیا ہے۔ اسلامی زندگی کے لیے اسلامی اجتماعیت اور اسلامی اجتماعیت کے لیے اسلامی حکومت کے ناگزیر ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ اسلامی معاشرے کے تمام افراد کو مل کر بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ ریاست کے ادارے کو ختم کر دیں۔ اسلامی ریاست کے دستور کے لیے اصول مستقل طور پر طے شدہ ہیں:

(۱) اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ مسلمان کی انفرادی زندگی اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اسی صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت و وفاداری کی مدِّ مقابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور تابع ہوں۔ نبی کریم صلعم کا فرمان ہے: خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔

(۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے کوئی اطاعتِ خدا کے رسول کی سند کے بغیر معتبر نہیں۔ اور رسول کی پیروی سے منحرف ہونا خدا کے خلاف بغاوت کرنا ہے۔ حدیث نبوی ہے، جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔

(۳) تیسری اطاعت جو مسلمانوں پر فرض ہے وہ اُن "اولی الامر" کی اطاعت ہے جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسولؐ کا مطیع ہو۔ حدیث نبوی ہے: "تم میں سے ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کے بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں۔ آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔" (مسلم)

(۴) اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ پر نزاع ہو اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنّت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

"تنظیم تمدن کے لیے اسلام نے کچھ بنیادی انسانی حقوق تسلیم کیے ہیں۔ یہ حقوق اسلامی ریاست کے دستور کا ناقابل تغیر جزو ہیں اور ان کے نفاذ کا ذمہ دار ریاست کو ٹھہرایا گیا ہے:- (۱) حرمت جان۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ناحق کسی کی جان ضائع کرنا حرام ہے (بنی اسرائیل ۳۳) (۲) حرمت ناموس۔ (۳) حیثیت عرفی یعنی انسان کی عزت و تکریم (۴) بنیادی حقوق شہریت کا تحفظ (۵) معصیت سے اجتناب کا حق۔ کسی شخص کو معصیت کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن مجید کا واضح حکم ہے، حد سے بڑھنے والوں کی بات نہ مانو (الشعراء ۱۵۱)۔ (۶) انصاف کا حق۔ (۷) بربنائے ضمیر برائی سے عدم تعاون کا حق (۸) مساوات کا حق۔ ہر شہری کو اصولاً برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ (۹) حکومت میں شرکت کا حق۔ سب مومن خلافت کے حامل ہیں اور ہر ایک خلافت و حکومت میں برابر کا شریک ہے۔ ضروری ہے کہ حکومت کا نظام مشورے سے چلایا جائے (۱۰) ضمیر کی آزادی۔ ارشاد ربانی ہے: جنہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں انھیں لعن طعن نہ کرو۔ یہ ہر شخص کا ذاتی حق ہے کہ اس کے مذہب کے پیشواؤں کی عزت کی جائے اور مذہبی دل آزاری سے اجتناب کیا جائے (۱۱) شخصی ذمہ داری۔ انسان صرف اپنے اعمال اور اپنے جرائم کا ذمہ دار ہے دوسروں کے اعمال اور جرائم کے بارے میں اس سے مؤاخذہ نہیں ہو سکتا۔ (۱۲) معاشی تحفظ۔ کوئی شخص بھوکا، پیاسا، ننگا اور بغیر مکان کے نہ رہے۔

اسلام دین و سیاست کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ دین و سیاست کے یکجا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امورِ سیاست (دنیا) میں بھی یہ دیکھا جائے کہ ریاست کی اساس دینی اخلاقیات کے مطابق ہے۔ ریاست کے بنیادی رہنما اصول قرآن مجید میں آگئے ہیں اور اس کے عملی نمونے آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین نے قائم کر دیئے ہیں۔ یہ اخلاقی اساس اسلامی ریاست کی قطعی بنیاد ہے۔ اس بنیاد پر قائم رہ کر ریاست کی تفصیل تشکیل میں عقل اور تمدنی تجربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اسلامی ریاست کے قوانین کا مستند ماخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور یہی وہ بالاتر قانون ہے جو اس حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ قرآن مجید اور سنت نبوی اسلامی نظام حکومت میں قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام نے حکومت کا جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ حاکمیت حقیقی کا سرچشمہ صرف ذات خداوندی ہے اس کا قانون وہ شریعت ہے جس نے انفرادی و اجتماعی اور انفرادی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح معیار قائم کیا ہے۔ ربانی قانون انسان

Marfat.com

کو گمراہی اور ہلاکت سے بچانے کے لیے ہے۔ ایک اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی ریاست "قانون سازی کی اسلامی شرائط اور مزاج کے مطابق تمدنی امور کے انصرام کے لیے جو قانون وضع کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔

اسلامی ریاست کے سربراہ (امام یا خلیفہ) کا انتخاب عام رائے سے ہوتا ہے۔ وہ تنقید عوام سے بالاتر نہیں۔ ہر شہری اس کی ساری زندگی پر نکتہ چینی کر سکتا ہے۔ قرآن و سنت کے خلاف حکم دینے کا نہ انھیں حق حاصل ہے اور نہ ایسے حکم کی اطاعت ضروری ہے مسلمان کے لیے حکومت کی اطاعت واجب ہے خواہ وہ احکام و قوانین اسے پسند ہوں یا ناپسند لیکن یہ اطاعت اسی وقت تک لازم ہے جب تک شریعت کی نافرمانی کا حکم نہیں دیا جاتا۔ (نیز دیکھیے "خلافت" اور خلافت راشدہ") ۔

ریاض

سعودی عرب کا دارالسلطنت۔ جو نخلستانِ ریاض میں وادی حنیفہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ نخلستان تین میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ یہ شہر شمال مشرق کے سوا تمام اطراف میں کھجوروں کے گھنے جھنڈوں میں گھرا ہوا ہے۔ ریاض چونے کے پتھر کے ایک پست ٹیکرے پر بے قاعدہ سی مستطیل شکل میں آباد ہے۔ شہر کے گرد ۲۵ فٹ بلند فصیل کو برجوں اور میناروں سے مستحکم کیا گیا ہے۔ برج اور مینار دیوار سے تیس سے چالیس فٹ تک بلند ہیں شہر کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔

رینان ارنسٹ

(۱۸۲۲ء—۱۸۹۲ء) فرانسیسی مستشرق، ادیب اور مؤرخ جس نے یہود و نصاریٰ کے مذہب اور ان کی تاریخ کا علمی اور فلسفیانہ انداز سے مطالعہ کیا۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا منکر تھا مگر انھیں "بے نظیر انسان" تسلیم کرتا تھا۔ کیتھولک پادری اسے ملحد قرار دیتے تھے۔ یورپ کے علمی حلقوں میں وہ بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ رینان نے ۲۹ مارچ ۱۸۸۳ء کو پیرس یونیورسٹی میں "اسلام اور علم" کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ اسلام علم کے راستے میں حارج رہا ہے۔ سیّد جمال الدین افغانی ان دنوں پیرس میں مقیم تھے۔ انھوں نے رینان کے رد میں (JOURNAL DES DABAIS) میں ایک مضمون لکھا اور تاریخی دلائل اور براہین سے رینان کے قول کی تردید و تغلیط کی۔ رینان کی حسب ذیل تالیفات قابلِ ذکر ہیں (۱) سیرت حضرت مسیحؑ (۲) تاریخ بنی اسرائیل (۳) نصرانی مذہب کے اصول و مبادی (۴) السنۂ سامیہ کی تاریخ۔

ریو، چارلس

(۱۸۲۰ء—۱۹۰۲ء) سوئس مستشرق جس نے برٹش میوزیم لندن کے اسلامی مخطوطات کی فہرست نگاری میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس سے قبل کیورٹن عربی قلمی کتابوں کی فہرست (جلد اول) شائع کر چکا تھا۔ ریو نے ۱۸۷۱ء میں اس فہرست کی دوسری جلد اور ۱۸۹۴ء میں اس کا تکملہ شائع کیا۔ ۱۸۸۸ء میں ترکی مخطوطات کی فہرست شائع کی۔ فارسی مخطوطات کی فہرست تین جلدوں اور ایک ضمیمے کی صورت میں مرتب کی۔ ۱۸۸۵ء میں ریو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اور اپنی وفات تک اس منصب پر کام کرتا رہا۔

زبور

آسمانی کتاب جو حضرت داؤدؑ پر نازل ہوئی۔ امام راغب فرماتے ہیں "بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف عقلی حکمتوں پر مشتمل ہو۔ اس میں شرعی احکام نہ ہوں اور کتاب وہ ہے جس میں احکام اور حکمتیں ہوں۔ حضرت داؤدؑ کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہ تھا۔" احمد بن عبداللہ بن سلام مولیٰ خلیفہ ہارون الرشید سے منقول ہے کہ زبور سے مراد وہی مزامیر ہیں جو یہود و نصاریٰ کے ہاں متداول ہیں اور جن کی تعداد ڈیڑھ سو ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں بیان کرتے ہیں کہ "موجودہ بائیبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبورِ داؤد نہیں ہے اس میں بکثرت مزامیر بھی بھر دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤدؑ کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلامِ حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔" موجودہ صحیفہ پانچ دواوین کا مجموعہ ہے۔ اس میں حضرت داؤد کے علاوہ دوسرے عبرانی شعرا کا کلام بھی شامل ہے۔ اس طرح الہامی اور غیر الہامی کلام مخلوط ہو گیا ہے۔

زبیرؓ بن عوام

بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصّی بن کلاب ان کی والدہ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب آنحضرت صلعم کی پھوپھی تھیں۔ حضرت زبیرؓ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ حدیث کے مطابق وہ پانچویں شخص تھے۔ جنھوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ اس وقت حضرت زبیرؓ کی عمر آٹھ برس تھی۔ آپ ان دس حضرات میں شامل ہیں جن کے جنّتی ہونے کی آنحضرت صلعم نے بشارت دی تھی۔ حضرت زبیرؓ نے حبشہ اور مدینہ دونوں طرف ہجرت کی۔ نبی کریم صلعم کی زندگی میں تمام بڑی بڑی جنگوں میں شریک ہوئے۔ آنحضور صلعم نے حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب ان خدمات کے سلسلے میں عطا فرمایا تھا جو انھوں نے بنو قریظہ سے جنگ کے دوران میں بطور مخبر انجام دی تھیں۔ فتح مکّہ کے دن حضرت زبیرؓ کے ہاتھوں میں دو جھنڈے تھے ان کا شمار بڑے بہادر اور دلیر صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت زبیرؓ کے کارناموں کے لیے دیکھیے مقالہ "خلافتِ راشدہ"۔ حضرت زبیرؓ نے جنگ جمل میں شہادت پائی اس وقت آپ کی عمر ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

زخاؤ، ایڈورڈ

(۱۸۴۵ء—۱۹۳۰ء) ممتاز جرمن مستشرق جس نے مشرقیات کے شعبوں میں خدمات سرانجام دیں۔ اس نے جوالیقی کی کتاب "المعرب من الکلام الاعجمی" کو مرتب کیا اور اس پر مفید حواشی لکھے اور اس کے صلے میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۸۶۹ء میں ویانا کی یونیورسٹی میں عربی کا استاد مقرر ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں برلن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۸۸۸ء میں جب برلن میں مدرسۃ السنۃ شرقیہ کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت زخاؤ کے سپرد ہوئی۔ زخاؤ کا نمایاں کام یہ ہے کہ اس نے البیرونی کی "کتاب الہند" اور "الآثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" کے عربی متن شائع کیے اور ان کے انگریزی تراجم تیار کیے۔ زخاؤ نے محمد بن سعد (کاتب الواقدی) کی کتاب الطبقات الکبیر شائع کی۔ اس کام میں اسے چند فضلاء کی معاونت حاصل تھی۔ یہ کتاب سیرت نبوی، صحابہ کرام اور تابعین کے حالات میں ایک قدیم مأخذ کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

زخرف (سورہ)

دیکھیے الزّخرف

زکوٰۃ

شرائط مخصوصہ کے ساتھ کسی مستحق آدمی کو اپنے مال کے ایک معین حصے کا مالک بنا دینا۔

Marfat.com

امام راغب کے الفاظ میں وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقرا کو دیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ صدقۂ مفروضہ اور ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اسے زکوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی اور اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں: "زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے۔ ایک 'پاکیزگی' دوسرے 'نشوونما'۔ کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں ان کو دور کرنا اور ان کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا۔ یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو مقصدِ تزکیہ کے لیے نکالا جائے۔ دوسرے زکوٰۃ بجائے خود تزکیہ کا فعل ہے۔" زکوٰۃ کا لفظ عام صدقات کے معنوں میں ابتدائے اسلام ہی سے مروّج ہو گیا تھا۔ اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح مل جاتی ہے۔ محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام قوانین و احکام مکمل ہو کر نافذ ہو گئے تھے (سید سلیمان ندوی: سیرت النبی)۔ زکوٰۃ ہر زمانے میں دینِ اسلام کا اہم رکن رہی ہے۔ تمام انبیا کی طرح انبیائے بنی اسرائیل نے بھی اس کی سخت تاکید کی تھی۔ زکوٰۃ کے احکام تورات اور انجیل دونوں میں موجود ہیں لیکن ان کتب سماوی میں مدت کی تعیین میں قطعیت نہ تھی۔

زکوٰۃ صرف مسلمان پر ہے کافر پر نہیں۔ زکوٰۃ چار قسم کے اموال پر فرض ہے (۱) سائمہ جانوروں پر۔ سائمہ کے معنی وہ جانور ہیں جو سال کا اکثر حصہ باہر چر کے گزر کرتے ہیں، گھر میں نہیں کھاتے (۲) سونے چاندی پر (۳) ہر قسم کے تجارتی مال پر (۴) کھیتی اور درختوں کی پیداوار۔ ان تمام کے نصاب اپنے اپنے ہیں۔ نصاب مال کی وہ خاص مقدار ہے جس پر شریعت نے زکوٰۃ فرض کی ہے۔ چاندی سونے اور تمام تجارتی مال میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہے جس کے ساڑھے باون تولے بنتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ۳۶ تولے ۵½ ماشے بنتے ہیں (مفتی محمد شفیع: قرآن میں نظام زکوٰۃ)۔ سونے کا نصاب بیس مثقال ہے جس کے ساڑھے سات تولے اور بعض کے نزدیک پانچ تولے ڈھائی ماشے بنتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے وقت سونے چاندی کی جو قیمت ہو اس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ قیمت خرید کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنا درست نہیں۔ تجارتی مال کا نصاب قیمت کے اعتبار سے ہوگا۔ اگر مال کی قیمت ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کے برابر یا اس سے زائد ہو تو سال گزر جانے پر اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ دینا فرض ہے۔

زکوٰۃ کے مستحقین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: "یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو صدقات کے کام پر مامور ہوں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو نیز یہ غلاموں کے آزاد کرانے، قرضداروں کی مدد کرنے، راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے" (التوبہ: ۶۰)۔ فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سرِدست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انھیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں، مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کے شکار ہو گئے ہوں۔ مسکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی کریم صلعم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحقِ امداد ٹھیرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پاتے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انھیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے یا ان کا حساب کتاب رکھنے اور انھیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں ایسے لوگ خواہ وہ فقیر و مسکین نہ ہوں ان کی تنخواہیں صدقات کی مد میں سے دی جائیں گی۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ ان پر فرض ہے لیکن اگر وہ غریب، محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں لیکن اکثر فقہا اس کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ تالیفِ قلب کے لیے زکوٰۃ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو۔ جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر انھیں مال سے توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہیں یا جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی دل جوئی نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط ضروری نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے بلکہ وہ مالدار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیے جانے کے مستحق ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو گئی ہے اور اب تالیف قلب کے لیے کچھ دینا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے مگر کفار کو نہیں۔ اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں رقمطراز ہیں کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیف قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہ کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ان کے زمانے میں جو حالات تھے ان میں تالیف قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہ کے اجماع نے اس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا ہے جو قرآن میں بعض اہم دینی مصالح کے لیے رکھی گئی تھی۔

زکوٰۃ کا ذکر قرآن مجید میں نماز (صلوٰۃ) کے ساتھ بیس مقامات پر آیا ہے کئی مقامات پر اس کا ذکر علیحدہ بھی آیا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے اجر عظیم کی بشارت ہے اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لیے سزا اور عذاب کی وعید ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والے یہی لوگ ہیں جنھیں ہم اجر عظیم دیں گے (النساء: ۱۶۲)"۔ "جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ بخل ان کے لیے اچھا ہے۔ بخل تو ان کے حق میں بُرا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن ان کا مال ان کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ (آل عمران: ۱۸۰)"۔ "اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو اے نبی! آپ انھیں دردناک عذاب کی بشارت دیجیے۔ جس دن کہ سونا اور چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی سونا چاندی ہے جو کہ تم نے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب تم اس چیز کا مزا چکھو جو تم جمع کرتے رہے ہو۔" (التوبہ: ۳۴—۳۵)۔

Marfat.com

زکریا ؑ

انبیائے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: "ذکر ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی جبکہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اس نے عرض کیا اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں کبھی تجھ سے دُعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی برائیوں کا خوف ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو اپنے فضلِ خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کی میراث بھی پائے اور اے پروردگار اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔ (جواب دیا گیا) اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔ عرض کیا پروردگار بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں۔ جواب ملا ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے۔ آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا۔ زکریا نے کہا اے پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔ چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔" (مریم، ۱ تا ۱۱)۔ اس واقع کی تفصیل لوقا کی انجیل میں یوں بیان ہوتی ہے: "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں ابیاہ کے فریق سے زکریا نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بےعیب چلنے والے تھے اور ان کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مذبح کی داہنی طرف کھڑا ہوا اس کو دکھائی دیا اور زکریا دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی مگر فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دُعا سن لی گئی اور تیرے لئے تیری بیوی الیشبع کے بیٹا ہوگا تو اس کا نام یوحنا (یعنی یحییٰ) رکھنا اور تجھے خوشی و خرمی ہوگی۔ اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب سے خوش ہوں گے کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے اور نہ کوئی اور شراب پئے گا اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا۔ اور وہ ایلیا (الیاس ؑ) کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے۔ اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔" زکریا نے فرشتے سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں؟ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔ فرشتے نے اس سے کہا میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ اور لوگ زکریا کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مقدس میں کیوں دیر لگی جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس میں رویا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا" (لوقا باب ۱ آیت ۵ تا ۲۲)۔

حضرت زکریا ؑ حضرت ہارون کے خاندان سے تھے۔ بنی اسرائیل نے فلسطین پر قابض ہونے کے بعد ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوب کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا اور تیرھواں قبیلہ (لاوی بن یعقوب کا گھرانہ) مذہبی خدمات کے لیے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی حضرت ہارون کا خاندان مقدس میں خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت اور پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام کرتا تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوی "مقدس" کے اندر جا سکتے تھے بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے۔ سبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے اور مقدس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مقدس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انھی خاندانوں میں سے ایک ابیاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریا ؑ تھے اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مقدس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب تواریخ اول باب ۲۳–۲۴)۔

حضرت زکریا ؑ کے والد کے بارے میں مختلف روایات ہیں: زکریا بن ادن، زکریا بن برخیاہ (فتح الباری، الثعلبی، طبری، ابن اثیر)۔ حضرت زکریا ؑ اور حضرت مریم کے والد عمران بن ماثان ہم زلف تھے (طبری)۔ حضرت زکریا ؑ کے بیٹے حضرت یحییٰ ؑ کی پیدائش بابل پر سکندر کے حملے کے تین سو بیس سال بعد اور حضرت مسیح ؑ کی ولادت چھ ماہ قبل ہوئی تھی (طبری)۔ حضرت زکریا ؑ اور حضرت یحییٰ کا قتل رفع مسیح سے ایک سال قبل ہوا (ابن اثیر، الکامل)۔ حضرت زکریا ؑ کی شہادت کے سلسلے میں ابن اثیر نے بیان کیا ہے کہ بعثت مسیح ؑ سے جو احکام تورات منسوخ ہوئے ان میں سے ایک بھتیجی سے نکاح بھی تھا۔ بنی اسرائیل کا بادشاہ ہیرودس اپنی ایک بھتیجی سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ حضرت یحییٰ ؑ چونکہ شریعت عیسوی پر ایمان رکھتے تھے اس لیے وہ مانع آئے تب بادشاہ کے حکم سے حضرت یحییٰ ؑ کو ذبح کر دیا گیا اس واقع سے حضرت زکریا ؑ بھاگ کر ایک باغ میں پہنچے اور ایک درخت کے تنے میں پناہ لی۔ بادشاہ کے آدمیوں نے درخت کو حضرت زکریا ؑ سمیت آرے سے چیر دیا۔ ثعلبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہودیوں نے حضرت زکریا ؑ پر حضرت مریم کے ساتھ تعلقات رکھنے کی تہمت لگائی اور کہا کہ یہی ان کے حجرے میں داخل ہوتے تھے۔ چنانچہ یہودی آپ کی تلاش میں نکلے اور آرے سے چیرنے کا واقع پیش آیا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت زکریا ؑ اپنی روزی کمانے کے لئے بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

زکریا

دیکھیے، بہاؤ الدین زکریا

زکریا رازی

دیکھیے رازی، ابوبکر محمد۔

زلزال (سورۃ)

دیکھیے الزلزال

زلیخا

دیکھیے، حضرت یوسف ؑ۔

Marfat.com

زمخشری

(۲۷ رجب ۴۶۷ھ ۸ / مارچ ۱۰۷۵ء – ۹ ذوالحجہ ۵۳۸ھ / ۱۴ جون ۱۱۴۴ء)

ابوالقاسم محمود بن عمر فقہ، کلام اور لسانیات کے ایرانی عالم۔ خوارزم میں پیدا ہوئے زمخشری کی اہم ترین تصنیف قرآن مجید کی تفسیر "الکشاف عن حقائق التنزیل" ہے جو ۲۸ ربیع الآخر ۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء میں مکمل ہوئی۔ ان کی توجہ زیادہ تر عقائد کی فلسفیانہ تفسیر پر ہے اور وہ حدیث سے کم سے کم استفادہ کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر معتزلی تھا۔ ابن خلدون نے انہیں دوسرے مفسرین پر فضیلت دی ہے۔ قواعد عربی میں زمخشری کی تصنیفات میں سے "المفصل" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود بڑی جامع ہے اور اس کا اسلوب بے حد صاف اور واضح ہے۔ زمخشری نے علم النحو میں دو رسالے "المفرد والمؤنث فی النحو" اور "الانموذج فی النحو" لکھے جو بے حد مقبول ہوئے زمخشری نے مقدمۃ الادب اور فارسی میں اس کی شرح لکھ کر اہل علم کیلئے عربی زبان کا ایک وسیع ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ لغت حدیث میں انھوں نے "کتاب الفائق" لکھی۔ ان کی کتاب "المستقصی فی الامثال" قدیم ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ ان کی نظموں کا ایک دیوان مرتب ہو چکا ہے حدیث میں انھوں نے دو کتب تالیف کیں (۱) مختصر الموافقت بین آل البیت والصحابۃ (۲) خصائص العشرۃ الکرام البررۃ۔

زمر (سورہ)

قرآن مجید کی انتالیسویں سورت۔ دیکھیے الزمر۔

زمزم

دیکھیے آب زم زم

زمین

دیکھیے ارض

زنا

ایسی عورت کے ساتھ صحیح اور مکمل قسم کے جنسی تعلقات جو شرعاً صحیح نکاح کے ذریعے مرد کی زوجیت میں نہ ہو، اپنی مطلقہ بائنہ نہ ہو، عقد فاسد سے نکاح میں لائی گئی ہو، محرمات میں سے ہو۔ زنا کی قانونی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ اس کی یہ تعریف کرتے ہیں "ایک مرد کا کسی ایسی عورت سے قبل میں مباشرت کرنا جو نہ تو اس کے نکاح یا ملک یمین میں ہو اور نہ اس امر کے شبہ کی کوئی معقول وجہ ہو کہ اس نے منکوحہ یا مملوکہ سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کی ہے"۔ شافعیہ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "شرمگاہ کو ایسی شرمگاہ میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو مگر طبعاً جس کی طرف رغبت کی جا سکتی ہو" اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے "شرعی حق یا اس کے شبہ کے بغیر قبل یا دُبر میں مرد یا عورت سے وطی کرنا"۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں رقمطراز ہیں "قانوناً ایک فعل زنا کو مستلزم سزا قرار دینے کے لیے صرف ادخال حشفہ کافی ہے۔ پورا ادخال یا تکمیل فعل اس کے لئے ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ادخال حشفہ نہ ہو تو محض ایک بستر پر یکجا پایا جانا یا ملاعبت کرتے ہوئے دیکھا جانا یا برہنہ پایا جانا کسی کو زانی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے اور اسلامی شریعت اس حد تک بھی نہیں جاتی کہ کوئی جوڑا ایسی حالت میں پایا جائے تو اس کا طبی معائنہ کرا کے زنا کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور پھر اس پر حد زنا جاری کی جا سکے"۔

"قرآن مجید میں اس فعل کو قبیح سے شدید نفرت کا اظہار ہوا ہے۔" زنا کے قریب بھی مت جاؤ کیونکہ یہ بے حیائی کی بات اور بڑا راستہ ہے" (بنی اسرائیل : ۳۲)۔ سورہ الممتحنہ میں (آیت ۱۲) نبی کریم صلعم کو حکم دیا گیا ہے کہ جب مومنات آپ سے بیعت کرنے کے لیے آئیں تو انھیں زنا سے بچنے کی بھی تلقین کیجیے۔ سورہ النور (آیت ۱۹) میں ان لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب الیم کی وعید ہوئی ہے جو اسلامی معاشرے میں بدکاری کو پھیلانے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سورہ الطلاق میں (آیت ۱) میں ارشاد ربانی ہے کہ اگر کوئی مطلقہ مدت کے دوران بدکاری کا ارتکاب کرے تو اس کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں۔ سورہ النساء میں (آیت ۲۵) پاکیزہ اور زنا سے اجتناب کرنے والی لونڈیوں کو عقد زوجیت میں لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ النور (آیت ۳ اور ۳۳) میں اللہ تعالیٰ نے عصمت فروشی اور بدکاری کی لعنت سے منع فرما دیا ہے۔ زانی کو مشرک کی طرح اور زانیہ کو مشرکہ کے برابر ٹھیرا کر زنا کو بھی شرک کی طرح اکبر الکبائر قرار دیا گیا۔ سورہ النور (آیت ۲ تا ۳) میں ہے کہ "بدکار مرد اور بدکار عورت میں سے ہر ایک کو سو درے مارو۔ اللہ کا حکم نافذ کرنے میں تمہیں ان پر ترس نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور اس سزا کو دیکھنے کے لیے مؤمنین کی ایک جماعت بھی موجود ہونی چاہیے"۔ حدیث نبوی ہے: "مجھ سے لے لو مجھ سے لو۔ اللہ نے ان کے لیے صورت پیدا کر دی کنوارا مرد اور کنواری عورت زنا کریں تو سو سو درے اور ایک سال کی جلا وطنی سزا ہے اور اگر شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت زنا کریں تو سو سو درے اور رجم (سنگساری) کی سزا ہے (مسلم : الصحیح)۔

شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ قتل میں قصاص، زنا میں رجم اور سرقے میں قطع ید ہماری طرح ہم سے پہلے کی سماوی شریعتوں میں بھی معمول تھا۔ تمام انبیائے کرام اور تمام امتوں نے اس پر عمل کیا (حجۃ اللہ البالغہ)۔ بائیبل میں زنا کے متعلق جو حکم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں "اگر کوئی آدمی کسی کنواری کو جس کی نسبت نہ ہوئی ہو پھسلا کر اس سے مباشرت کرے تو وہ ضرور ہی اسے مہر دے کر اس سے بیاہ کرے لیکن اگر اس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق اسے نقدی دے (کتاب خروج باب ۲۲ آیت ۱۶–۱۰)۔ ہندوؤں کے ہاں منو کی دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ "جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ زنا کرے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔ لڑکی کا باپ راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دے کر شادی کر لے۔ البتہ اگر لڑکی اونچی ذات کی ہو اور مرد نیچ ذات کا تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہیے اور مرد کو قطع اعضا کی سزا دینی چاہیے (ادھیائے ۸ شلوک ۳۶۵–۳۶۶) اور یہ سزا زندہ جلا دیئے جانے کی سزا میں تبدیل کی جا سکتی ہے جبکہ لڑکی برہمن ہو (اشلوک ۳۷۷)۔ یہودی قانون میں زنا بزن غیر کے یہ احکام پائے جاتے ہیں: "اگر کوئی کسی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ ہی دیا گیا ہو اور نہ ہی وہ آزاد کی گئی ہو تو ان دونوں کو سزا ملے لیکن وہ جان سے نہ مارے جائیں اس لیے کہ عورت آزاد نہ تھی" (احبار ۱۹–۲۰)۔ "جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیئے جائیں" (احبار ۲۰–۱۰)۔ "اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں (استثنا ۲۲:۲۲)۔ اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرلے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس

Marfat.com

[illegible] اپنے ہمسائے کی بیوی کی [illegible] حرمت کیا۔ اگر اس آدمی کو منسوبہ لڑکی کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے تو فقط وہ آدمی ہی جس نے صحبت کی مار ڈالا جائے پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا (استثناء ۲۲: ۲۳ تا ۲۶)۔

ملتِ اسلامیہ کے تمام فرقوں کے نزدیک زنا حرام ہے۔ اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کسی مرد یا عورت کو مجرم قرار دینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ اس سے فعل زنا صادر ہوا ہے بلکہ اس کے لیے مجرم میں کچھ شرطیں پائی جانی چاہیں۔ زنائے محض کے معاملے میں شرط یہ ہے کہ مجرم عاقل ہو اور بالغ ہو۔ اگر کسی مجنون یا کسی بچے سے یہ فعل سرزد ہو تو وہ حد زنا کا مستحق نہیں ہے۔ زنا بعد احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ بھی چند شرطیں ہیں (تفصیل کے لیے دیکھئے ؛ رجم)۔ فعل زنا کے مرتکب کو مجرم قرار دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے یہ فعل کیا ہو۔ جبر و کراہ سے اگر کسی شخص کو اس فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا گیا ہو تو وہ نہ مجرم ہے نہ سزا کا مستحق۔ اس معاملے میں شریعت کا صرف یہ عام قاعدہ ہی منطبق نہیں ہوتا کہ آدمی جبراً کرائے ہوئے کاموں کی ذمہ داری سے بری ہے بلکہ خود قرآن ان عورتوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے جن کو زنا پر مجبور کیا گیا ہو۔ عورت کے معاملے میں تو قانون متفق علیہ ہے لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا مرد کے معاملے میں بھی جبر و کراہ معتبر ہے کہ نہیں۔ امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام حسنؒ بن صالح کہتے ہیں کہ مرد بھی اگر زنا کرنے پر مجبور کیا گیا ہو تو معاف کیا جائے گا۔ امام زفر کہتے ہیں کہ اسے معاف نہ کیا جائے گا کیونکہ انتشار عضو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی اپنی شہوت اس کی محرک ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اگر حکومت یا اس کے کسی حاکم نے آدمی کو زنا پر مجبور کیا ہو تو سزا نہیں دی جائے گی لیکن اگر حکومت کے سوا کسی اور نے مجبور کیا ہو تو زانی کو سزا دی جائے گی۔ اسلامی قانون حکومت کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ زانی اور زانیہ کے خلاف کارروائی کرے اور عدالت کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس پر سزا دے۔ اس امر پر تمام امت کے فقہا کا اتفاق ہے۔ اسلامی قانون زنا کی سزا کو قانون مملکت کا ایک حصہ قرار دیتا ہے۔ اس لئے مملکت کی تمام رعایا پر یہ حکم جاری ہوگا خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس امر سے امام مالک کے سوا کسی کو اختلاف نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ غیر مسلم زانی کو رجم کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ مستأمن اگر دارالاسلام میں زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی (امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ) امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔ اسلامی قانون میں یہ جرم قابل راضی نامہ نہیں ہے۔ قریب قریب تمام کتب حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک لڑکا ایک شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس شخص کو راضی کر لیا مگر جب مقدمہ نبی صلعم تک پہنچا تو آپ نے فرمایا: "تیری بکریاں تیری لونڈی تجھی کو واپس" اور پھر آپ نے زانی اور زانیہ دونوں پر حد جاری فرما دی۔ اسلامی حکومت کسی شخص کے خلاف زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہ کرے گی جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت نہ مل جائے۔ قرآن مجید تصریح کرتا ہے کہ زنا کے لیے کم سے کم چار عینی شاہد ہونے چاہئیں۔ شہادت کے بغیر قاضی محض اپنے علم کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا خواہ وہ اپنی آنکھوں سے ارتکاب جرم ہوتے دیکھ چکا ہو۔ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو اسلامی قانون شہادت کی رو سے قابلِ اعتماد ہوں یعنی وہ پہلے کسی مقدمے میں جھوٹے گواہ ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں اور ملزم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو۔ گواہوں کو اس بات کی شہادت دینی چاہیئے کہ انھوں نے ملزم اور ملزمہ کو عینِ حالتِ مباشرت میں دیکھا ہے جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنوئیں میں رسی۔ گواہوں کو اس امر پر متفق ہونا چاہیئے کہ انھوں نے کب، کہاں اور کس کو کس کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے۔ (ابومحمد عبداللہ ابن قدامہ حنبلی، المغنی؛ امام شافعی، کتاب الاُم)۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پایا جانا ثبوتِ زنا کے لیے کافی شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں جبکہ عورت کا کوئی شوہر یا لونڈی کا کوئی آقا معلوم و معروف نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی شہادت ہے اور اسی کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے مگر جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر رجم کر دیا جائے یا کسی کی پیٹھ پر سو کوڑے برسا دیئے جائیں۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ شبہ سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ معاف کرنے کیلئے محرک ہونا چاہیئے۔ حدیث نبوی ہے کہ مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اگر کسی ملزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہو تو اسے چھوڑ دو کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے (ترمذی)۔

شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیئے۔ (امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ، ابن ابی لیلیٰ، اسحاق بن راہویہ، حسن بن صالح)۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک ہی اقرار کافی ہے (امام مالکؒ، امام شافعی، عثمان البتی، حسن بصری)۔ ایسی صورت میں اگر مجرم اقرارِ جرم سے پھر جائے (عین سنگساری کے دوران میں بھی) تو سزا کو روک دینا چاہیئے۔ اس امر میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اگر فریق ثانی اس کے ساتھ مرتکب زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے تو اقرارِ جرم کرنے والے پر حد زنا جاری کی جائے گی یا حد قذف۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ حد زنا کا مستوجب ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے میں اس پر حد قذف جاری کی جائے گی کیونکہ فریق ثانی کے انکار نے اس کے جرمِ زنا کو مشکوک کر دیا ہے۔ امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ اسے زنا اور قذف دونوں کی سزا دی جائے گی۔

ثبوتِ جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو کیا سزا دی جائے، اس مسئلے پر فقہا میں اختلاف ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سو کوڑے لگانا اور اس کے بعد سنگسار کرنا یہ امام احمدؒ، داؤد ظاہریؒ اور اسحاق بن راہویہ کا مسلک ہے۔ باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سزا صرف سنگساری ہے۔ رجم اور سزائے تازیانہ کو جمع نہ کیا جائے گا۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی یہ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اسحاق، داؤد ظاہری، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن صالح کا مسلک ہے۔ امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک مرد کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور عورت کے لیے صرف سو کوڑے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگرد امام ابویوسفؒ، امام زفرؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حد زنا مرد اور عورت دونوں کے لیے صرف سو کوڑے ہے۔ ضرب تازیانہ ایسی ہونی چاہیئے جس کا اثر جلد تک رہے گوشت تک نہ پہنچے۔ ایسی ضرب تازیانہ قرآن کے خلاف ہے جس سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے۔ موطا میں امام مالکؒ کی روایت ہے کہ نبی صلعم نے ضربِ تازیانہ کے لیے کوڑا طلب کیا اور وہ کثرتِ استعمال سے بہت کمزور ہو چکا تھا آپ نے فرمایا اس سے زیادہ سخت لاؤ۔ پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا جو ابھی استعمال سے نرم نہیں پڑا تھا آپ نے فرمایا دونوں کے درمیان۔ پھر ایسا کوڑا لایا گیا جو سواری میں استعمال ہو چکا تھا اس سے آپ نے ضرب لگوائی گرہ لگا ہوا کوڑا، دو شاخہ یا سہ شاخہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے۔ تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ ضرب مبرح نہیں ہونی چاہیئے یعنی زخم ڈال دینے والی نہ ہو۔ ایک ہی جگہ نہیں مارنا چاہیئے۔ صرف منہ، شرمگاہ اور سر کو بچا کر باقی ہر عضو پر کچھ نہ کچھ مار پڑنی چاہیئے۔ مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہیئے اور عورت کو بٹھا کر۔ جاڑے میں گرم وقت اور گرمی میں ٹھنڈے وقت مارنے کا حکم ہے۔ باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں۔ الا یہ کہ مجرم بھاگنے

Marfat.com

کی کوشش کرے۔ فقہانے اس کو جائز رکھا ہے کہ روزانہ کم از کم بیس بیس کوڑے مارے جائیں لیکن اولیٰ یہی ہے کہ بیک وقت پوری سزا دی جائے۔ مار کا کام اجڈ جلادوں سے نہیں لینا چاہیے بلکہ صاحب علم و بصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے جو یہ جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی صلعم کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، مقدادؓ بن عمرو، محمدؓ بن مسلمہ، عاصمؓ بن ثابت اور ضحاکؓ بن سفیان جیسے صحابہ سے جلادی کی خدمت لی جاتی تھی۔

زندگی

دیکھیے، حیات

زندگی بعد الموت

دیکھیے، حیات بعد الموت

زندیق

وہ شخص جو حضرت صلعم کی نبوت کا اعتراف کرنے کے باوجود کافرانہ عقائد رکھتا ہو۔ فقہ اسلامی میں یہ اصطلاح اس فاسد العقیدہ بدعتی کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کی تعلیم حکومت کے لیے خطرہ بن جائے۔ یہ جرم سزائے موت اور عذاب جہنم کا مستوجب ہے۔ مالکیوں کے نزدیک مجرم سے توبہ کرنے کے لیے کہنا بھی بے فائدہ ہے۔ بقول تھانوی یہ فرقہ ثنویت کا قائل ہے جو دو خالقوں کو مانتا ہے یعنی یزداں و اہرمن۔ یزدان خالق خیر اور اہرمن خالق شر ہے۔ زندیق حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اگر ایمان ظاہر بھی کرے تو در حقیقت باطن میں کافر ہوتا ہے۔ مسعودی کے نزدیک مزدکیوں میں اس بدعتی کو زندیق کہتے تھے جو اوستا کی عبارت کی تاویل کرکے اس کی نئی شرح نکالتا تھا۔ داتا گنج بخش بھی یہی رائے ظاہر کرتے ہیں۔ خوارزمی کے نزدیک مزدک کے پیرو کو زندیق کہتے ہیں جو مانوی خارجی ہوتا۔ ادبی روایات میں تین مشہور مصنفوں: ابن راوندی، توحیدی اور معری کو اسلام کے تین زندیقوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عملاً قدامت پسند لوگ مناظرانہ تحریروں میں ہر اس شخص کو زندیق یا آزاد خیال بتاتے ہیں جو ان کے نزدیک دین کا ظاہری اقرار کرنے میں کافی خلوص نہ رکھتا ہو۔ فقہا نے زندقہ کو بتدریج ایسی ذہنی بغاوت بنا لیا جس میں نبی کریم صلعم کی عزت کا استخفاف ہوتا ہے (امام ابن تیمیہؒ، ابن حجر ہیتمی)۔ حنبلیوں کے نزدیک زندیقوں کے پانچ فرقے ہیں: (۱) معطلہ جو خلق و خالق کے منکر ہیں (۲) مانویہ (۳) مزدکیہ۔ جو ثنوی ہیں۔ (۴) عبدکیہ (۵) روحانیہ جو عشق کے ذریعے روح کو خدا سے واصل کرکے اپنے آپ کو شرعی حدود و قوانین سے نجات دلوانا چاہتے ہیں۔ امام غزالی کے نزدیک زندقہ میں خدا کے وجود سے انکار پایا جاتا ہے۔ حسین بن منصور حلاجؒ (جو خود اسی جرم میں سزائے موت سے ہمکنار ہوئے) اخبار الحلاج میں لکھتے ہیں کہ قلب ماہیت کرنے والے وصال کے آستانے پر پہنچ کر تصوف میں عین ذات (خدا) ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جو زندقہ ہے۔

زنگی عماد الدین

(وفات ربیع الآخر ۵۴۱ھ/ ستمبر ۱۱۴۶ء) بن قاسم الدولہ آق سنقر بن عبداللہ، موصل کے اتابک اور سلجوقی دور کے ممتاز ترین امرا میں سے تھا۔ زنگی کے باپ آق سنقر کو حلب کا شہر سلطان ملک شاہ نے بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ ملک شاہ فوت ہوا تو آق سنقر نے اس کے بھائی تتش کے خلاف بغاوت کر دی۔ نتیجتاً ۱۰۹۴ء میں قتل کر دیا گیا۔ زنگی کی عمر اس وقت دس برس تھی۔ باپ کی جاگیر اس سے چھین لی گئی۔ ۵۱۶ھ/ ۱۱۲۲ء میں وہ واسط کا حاکم مقرر ہوا اور ۵۲۱ھ/ ۱۱۲۷ء میں موصل کا والی بنا۔ سلطان محمود سلجوقی نے اپنے دونوں بیٹوں الپ ارسلان اور فرخ شاہ کی تعلیم زنگی کے سپرد کر دی اور اسی بنا پر زنگی کو اتابک کا لقب عطا ہوا۔ زنگی نے جزیرہ ابن عمر، نصیبین، سنجار، حران، رحبات اور قلعہ اثارب فتح کیے۔ ۱۱۳۷ء میں اس نے قلعہ بعرین فتح کیا۔ ۱۱۳۸ء میں دمشق کے حاکم شہاب الدین محمود نے حمص کا شہر زنگی کے حوالے کر دیا۔ ۵۳۹ھ/ ۱۱۴۴ء میں اس نے صلیبی سپاہیوں سے اہم شہر رہا چھین لیا۔ ۱۱۴۶ء میں اس نے عراق عرب کے قلعہ الجعبر پر حملہ کیا اور مملوکوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مشرقی مورخین اتابک زنگی کی سیاسی صفات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ابن اثیر نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ اس کے دور حکومت میں وہ ممالک پھر بحال و با رونق ہو گئے جن کو فرنگیوں کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور جنہیں والیوں کے بار بار تبادلے اور دستانیوں نے کنگال کر دیا تھا۔

زوج

دیکھیے، شوہر

زہاوی

(۱۸ جون ۱۸۶۳ء — ۲۳ فروری ۱۹۳۶ء) جمیل صدقی عراق کے دور جدید کا سب سے بڑا عربی شاعر۔ اس کا باپ محمد فیضی الزہاوی بغداد کا مفتی تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ نسب حضرت خالدؓ بن ولید سے ملاتا تھا۔ اس کا باپ کچھ عرصہ تک زہاو (ایران) میں رہا۔ اسی نسبت سے وہ زہاوی کہلایا۔ اس نے مغربی علوم کو عربی، فارسی، ترکی اور کردی کتابوں کے ذریعے حاصل کیا۔ آزاد خیال اور زندیق مشہور ہونے کی وجہ سے کوئی مستقل جگہ حاصل نہ کر سکا۔ شاعری میں اس کا پہلا مجموعہ "الکلم المنظوم" ۱۹۰۹ء میں دوسرا مجموعہ "رباعیات زہاوی" ۱۹۲۴ء میں "دیوان زہاوی" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ آخری مجموعۂ کلام "الاوشال" ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اسے موضوع اور اسلوب دونوں میں عربی شاعری کا حقیقی مجدد کہا جاتا ہے۔ جدید عربی ادبیات میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔

زہد

دیکھیے، تقویٰ

زہری، امام

(۵۰ھ — ۱۲۴ھ) ابوبکر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ الاصغر بن شہاب، مشہور محدث اور فقیہہ۔ قریش مکہ کے مشہور قبیلہ بنو زہرہ سے تعلق کی وجہ سے ان کی نسبت زہری ہوئی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔ یزید ثانی نے انھیں قاضی مقرر کیا۔ یزید ثانی کے جانشین ہشام نے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کیا۔ شغب کے قریب اپنی جاگیر اداما میں ان کا انتقال ہوا۔ نوجوانوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں سے دریافت کرتے رہنے کی وجہ سے زہری نے احادیث کا وسیع ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ انھوں نے آثار صحابہ کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی۔ زہری علم الانساب کے بڑے ماہر تھے۔ وہ شعر و شاعری کے نقاد اور سیرت کے بھی امام ہیں۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد کے بیس سال کے واقعات کے لیے ان کا حوالہ طبری میں اکثر آتا ہے۔

زیاد بن ابیہ

والیٔ عراق۔ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ کے والی تھے تو زیاد ان کے کاتب کے

Marfat.com

فرائض انجام دیتا تھا۔ حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں کئی اہم امور انکے سپرد کیے۔ امیر معاویہؓ خلیفہ ہوتے تو زیاد کی ذہانت اور قابلیت سے استفادہ کرنے کے لیے انھوں نے سرکاری طور پر تسلیم کرلیا کہ زیاد ان کے والد ابوسفیان کا بیٹا ہے اور اسے بصرہ کا والی مقرر کیا۔ زیاد نے سخت سزاؤں کے ذریعے بصرہ میں امن و امان قائم کیا۔ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے اسے کوفہ کی حکومت بھی سونپ دی۔ عرب مورخین نے اس کی بھی وہی خوبیاں گنوائی ہیں جو امیر معاویہؓ میں موجود تھیں۔ زیاد کا شمار عرب کے چار اعلیٰ درجے کے مدبروں میں ہوتا ہے باقی تین مدبر حضرت امیر معاویہؓ، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور حضرت عمروؓ بن عاص ہیں۔ علویوں اور عراق کے عربی قبائل کی مخالفت کا سدباب کرنے کے لیے زیاد نے پچاس ہزار بدویوں کو خراسان منتقل کر دیا تھا۔

زیار، آل

سامانیوں کا ایک باجگزار خاندان جس نے ۳۱۶ھ/۹۲۸ء سے ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء تک عراق عجم، طبرستان اور بعدازاں جرجان پر حکومت کی۔ یہ خاندان گیلان کے بادشاہ وردان شاہ کے باپ زیاد سے منسوب ہے۔ اس خاندان کا بانی مرداویج بن زیاد تھا۔ اس نے ۳۱۶ھ/۹۲۸ء سے ۳۲۳ھ/۹۳۵ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد وشمگیر بن زیار نے ۳۲۳ھ/۹۳۵ء سے ۳۵۶ھ/۹۶۷ء تک حکومت کی۔ اس کے بیٹے ظہیر الدولہ ابومنصور بیستون نے ۳۵۶ھ/۹۶۷ء سے ۳۶۶ھ/۹۷۶ء تک حکومت کی۔ چوتھا حکمران قابوس اول (شمس المعالی) تھا جس نے ۳۶۶/۹۷۶ء سے ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء تک حکومت کی۔ منوچہر بن قابوس اول پانچواں حکمران تھا جس نے ۴۰۳ھ/۱۰۱۲ء سے ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں سلطان محمود نے رے پر حملہ کیا تو منوچہر نے ۵ لاکھ دینار دے کر صلح کر لی اور محمود کو اپنا فرمانروا تسلیم کرلیا۔ چھٹا حکمران انوشروان بن منوچہر ہوا۔ اس نے ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء سے ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء تک حکومت کی۔ اس نے سلطان محمود کے جانشین سلطان مسعود کی فرمانروائی تسلیم کی۔ ۴۳۳ھ/۱۰۴۲ء میں سلجوقی سلطان طغرل بیگ نے جرجان کا علاقہ اس سے چھین لیا۔ اس کے عہد حکومت میں دارا بن قابوس اول کو سلطان مسعود نے جرجان اور طبرستان کا والی مقرر کیا تھا۔ ساتواں حکمران قابوس ثانی بن دارا ثانی سلطان محمود کا داماد تھا۔ آل زیاد کا آٹھواں اور آخری حکمران گیلان شاہ بن قابوس ثانی تھا۔ وہ صرف پہاڑی علاقے کا حکمران تھا کیونکہ طغرل بیگ نے طبرستان پر قبضہ کرلیا تھا ملک شاہ سلجوقی نے اسے تخت سے اتار دیا اور ۱۰۷۷ء میں گیلان شاہ نے وفات پائی۔

زیب النساء

(۱۰ شوال ۱۰۴۷ھ — محرم ۱۱۱۴ھ) نامور مغل شہزادی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی سب سے بڑی اولاد۔ جب وہ چار سال کی ہوئی تو اورنگ زیب کے معتمد عنایت اللہ خاں کی والدہ حافظ مریم کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ ان کی کوشش سے زیب النساء نے بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی تو اس نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں عنایت کیں۔ زیب النساء نے علم صرف و نحو ملا جیون سے حاصل کیا۔ ملا سعید اشرف ماژندرانی سے دوسرے ضروری علوم حاصل کیے (مقالات شبلی نعمانی)۔ ملا اشرف نے زیب النساء کو چودہ سال پڑھایا۔ علم فقہ و حدیث کی تعلیم کے علاوہ شعر فہمی کا شوق بھی زیب النساء کو ملا اشرف ہی کی بدولت حاصل ہوا۔ ۱۰۷۳ھ میں جب اورنگ زیب کشمیر جانے کے ارادے سے لاہور آیا تو بیمار ہو گیا۔ اس پر اس نے زیب النساء کو مع حرم شاہی لاہور بلا لیا۔ زیب النساء کو لاہور میں قیام کا خاصا موقع ملا۔ زیب النساء درباری سیاست سے الگ رہتی تھی اور

زیب النساء

ہمیشہ علمی و ادبی مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔ زیب النساء کے متعلق کئی بے بنیاد عشقیہ قصے کہانیاں مشہور ہوئیں۔ تاریخی شواہد کی رو سے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے زیب النساء نے ایک مسجد آگرہ میں اور ایک مسجد کشمیر میں تعمیر کرائی۔ زیب النساء شعر ضرور کہتی تھی لیکن اس کا کوئی مجموعہ محفوظ نہیں رہا۔ زیب النساء نے دہلی میں وفات پائی اور تیس ہزاری باغ میں دفن ہوئی۔ مقبرہ انگریزوں کی آمد تک موجود تھا (سرسید احمد خاں: آثار الصنادید)۔ جب "راجپوتانہ — مالوہ" ریلوے لائن ۱۸۸۵ء میں تیار ہوئی تو یہ مقبرہ اس کی زد میں آگیا۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ زیب النساء کا مقبرہ لاہور میں نواں کوٹ کے پاس ہے مگر یہ درست نہیں۔

زید بن ارقمؓ

رسول اللہ کے صحابی۔ قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ بیشتر غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگ صفین میں حضرت علی کا ساتھ دیا۔ آپ کوفہ میں مقیم رہے۔ ۶۸ھ میں یہیں انتقال ہوا۔ ۹۰ حدیثیں آپ سے مروی ہیں۔ علم و فضل میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اعلیٰ پایہ کے صحابہ بھی کئی باتوں میں آپ سے مشورہ لیتے تھے۔

زید بن اسلم

حضرت عمر کے غلام جو قرآن پاک، حدیث اور فقہ کے بلند پایہ عالم تھے مسجد نبوی میں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ درس حدیث کے دوران میں کسی کو بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ۱۳۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔

زید بن ثابت

بن ضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن نجار انصاری خزرجی، نامور صحابی اور کاتب وحی۔ ان کے والد ہجرت سے پانچ سال قبل جنگ بعاث میں مارے گئے تھے اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر چھ سال تھی۔ گیارہ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ہجرت کے بعد نبی کریم صلعم کے کاتب وحی مقرر ہوئے۔ یہودیوں کے ساتھ خط و کتابت کے فرائض بھی حضرت زیدؓ ہی سرانجام دیتے تھے۔ سریانی زبان انھوں نے سترہ دن کے اندر سیکھ لی تھی مسعودی کہتے ہیں کہ وہ فارسی، رومی، نبطی اور حبشی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ حضرت زیدؓ

Marfat.com

قرأت، فرائض، قضا اور فتویٰ میں نہایت ممتاز تھے۔ غزوۂ بدر کے وقت ان کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی چنانچہ رسول اللہ نے انھیں جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی۔ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ غزوۂ تبوک میں اپنے قبیلے کے علم بردار تھے۔ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جب خلافت کا مسئلہ پیش ہوا تو حضرت زیدؓ پہلے انصاری تھے جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کی تائید کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جمع قرآن کا کام انھی کو تفویض ہوا۔ حضرت زیدؓ نے مسیلمہ کذاب کے خلاف مہم میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ جنگِ یرموک میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا اس کی تقسیم کے قواعد بھی حضرت زیدؓ کے مشورے پر مقرر ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ناظر بیت المال کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت زیدؓ کا انتقال ۴۵ھ اور ۵۶ھ کے درمیان ہوا۔ مروان بن حکم والیٔ مدینہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

زید بن حارثہ

آنحضور صلعم کے آزاد کردہ غلام اور صحابی۔ حضرت زیدؓ قبیلۂ کلب کے حارثہ بن شراحیل کے بیٹے تھے۔ ان کی ماں سعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ حضرت زیدؓ کی عمر آٹھ سال تھی کہ ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے کر گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ کر لے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انھوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں زیدؓ کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انھوں نے زیدؓ کو مکہ لاکر اپنی پھوپھی کی خدمت میں نذر کر دیا۔ آنحضور صلعم سے حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہوا تو حضرت خدیجہؓ نے زیدؓ کو بعثت سے قبل ہدیتاً آنحضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر پندرہ سال تھی۔ کچھ مدت بعد حضرت زیدؓ کے باپ اور چچا کو پتہ چلا تو وہ آنحضور صلعم کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ آپ جو چاہیں فدیہ لے لیں مگر ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ لیے بغیر چھوڑ دوں گا لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ آنحضور صلعم نے حضرت زیدؓ کو بلا کر ان سے ان کی خواہش دریافت فرمائی۔ حضرت زیدؓ نے جواب دیا کہ میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ آنحضور صلعم نے اسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع میں اعلان فرمایا کہ آپ سب گواہ رہیں آج سے زید میرا بیٹا ہے یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے لگے۔ نبی کریم صلعم منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ایک لمحہ شک و تردد کے بغیر آپؐ کے دعوائے نبوت کو تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ دوسرے حضرت زیدؓ تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکرؓ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۳۰ سال تھی۔ ۴ھ میں نبی کریم صلعم نے حضرت زیدؓ کے لیے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت زینب اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا۔ اس پر قرآن مجید کی سورہ احزاب کی آیت ۳۶ نازل ہوئی "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا"۔ اس آیت کے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان والے راضی ہو گئے۔ نبی صلعم نے ان کا نکاح پڑھایا۔ زیدؓ کی طرف سے دس دینار اور ۶۰ درہم مہر ادا کیا۔ کپڑے دیئے اور کچھ سامان خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا۔ حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان کر زیدؓ کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا لیکن اپنے دل سے وہ اس احساس کو نہ نکال سکیں کہ زید ایک آزاد کردہ غلام ہیں اور ان کے اپنے ہی خاندان کے پروردہ ہیں۔ یہی بات تلخیوں کو بڑھانے کا سبب بنی۔ ایک سال سے کچھ ہی مدت زیادہ گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ حضرت زینبؓ کے بعد حضرت زیدؓ نے ام کلثوم بنت عقبہ سے شادی کی جن کے بطن سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔ اس کے بعد ان کی شادی درّہ بنت ابی لہب سے ہوئی۔ لیکن ان دونوں کو بھی حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی۔ انھوں نے ہند بنت عوام اور آنحضرتؐ کی آزاد کردہ کنیز ام ایمنؓ سے بھی شادی کی تھی۔ ام ایمنؓ سے ان کے ہاں اسامہؓ پیدا ہوئے۔

حضرت زیدؓ بہادر سپاہی تھے۔ بدر سے موتہ تک تمام اہم غزوات میں شریک رہے۔ غزوہ مریسیع میں آنحضرت صلعم نے انھیں مدینہ منورہ میں اپنی جانشینی کا فخر بخشا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی میں زیدؓ شریک ہوتے امارت کا عہدہ انھی کو عطا ہوتا۔ اس طرح وہ نو بار سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے۔ غزوہ موتہ میں شہادت پائی۔ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اگر زیدؓ زندہ رہتے تو رسول اللہؐ انھی کو جانشین بناتے۔

زید بن دثنہ

بن معاویہ بن عبید، رسول اللہ کے صحابی۔ آپ کا تعلق بنو خزرج کے خاندان بیاضہ سے تھا۔ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ حضرت زیدؓ ان صحابہ کے ساتھ تھے جنہیں رسول کریم صلعم نے حضرت عاصمؓ کی امارت میں قبیلہ عضل و قارہ کی درخواست پر تبلیغ دین کے لیے بھیجا تھا۔ راستہ میں مقام رجیع پر جو المناک واقعہ پیش آیا اس میں حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ اسیر ہوئے۔ مشرکین انھیں رسیوں میں جکڑ کر مکہ لائے۔ حضرت زیدؓ کو صفوان بن امیّہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ صفوان کا باپ امیّہ بن خلف حضرت زید کے ہاتھوں ایک غزوہ میں ہلاک ہوا تھا۔ صفوان نے قتل کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مقام تنعیم مقتل قرار پایا۔ قتل گاہ میں ابوسفیان سمیت تمام رؤسائے قریش موجود تھے۔ صفوان کے غلام نسطاس نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے پوچھا: "زید تمہیں خدا کی قسم سچ سچ بتانا اگر تمہارے بجائے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں اور ہم ان کی گردن ماریں اور تم اپنے گھر میں محفوظ رہو تو تم اس کو پسند کرتے ہو؟" حضرت زیدؓ نے فرمایا: "واللہ مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ محمدؐ کے کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر بیٹھا رہوں"۔ ابوسفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا، اس نے کہا: "محمدؐ کے اصحاب ان سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ دنیا میں کسی کے دوست ایسے گرویدہ نہیں"۔ اس کے بعد نسطاس نے حضرت زیدؓ کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۳ھ کا ہے۔

زید بن علی بن حسینؓ

(۸۰ھ ــــ ۱۲۲ھ) فاطمی و علوی خانوادے کے جیّد عالم اور فرقۂ زیدیہ کے امام۔ زیدؒ امام زین العابدین علیؒ جیسے والد اور باقر العلوم محمد باقرؒ جیسے بھائی کی شفقت و رحمت کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ امام محمد باقرؒ سے درس لیتے رہے۔ اس عہد کے دوسرے مدنی علماء و فقہاء و محدثین سے مستفید ہوئے۔ انھیں بچپن ہی سے قرآن مجید سے غیر معمولی شغف تھا۔ اس لیے جوانی میں "حلیف القرآن" کہلائے۔ تدبر فی القرآن کی وجہ سے ان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور قرآنی نظام حکمرانی کا جذبہ پیدا ہوا جسے عام کرنے کیلئے انھوں نے تقریریں کیں۔ مدینہ سے دمشق گئے اور قید میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ الدیف ان ازدی بیان کرتے ہیں کہ ہشام نے زید بن علی کو پانچ ماہ تک قید رکھا۔ وہ وہاں سورہ الحمد و البقرہ کی

Marfat.com

... فرماتے ہیں میں نے ان جیسا عالم قرآن نہیں دیکھا (تاریخ الکوفہ) - عمر بن موسیٰ کے نزدیک ناسخ و منسوخ اور متشابہات میں زید بن علی سب سے بڑے عالم تھے (طوسی: الفہرست)۔ فقہ میں ان کے معاصر ان سے مستفید ہوتے تھے۔ بلا اختلاف تمام فقہا ان کی حیثیت کو مسلم جانتے تھے۔ (ابو زہرہ: الامام زید)۔ عبادت میں خشوع و خضوع کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتے اور دیکھنے والے سمجھتے کہ روح پرواز کر گئی ہے (ناجی حسن: ثورہ زید) شب فروز نماز، طویل سجدے، ایک دن بیچ روزہ رکھنا عام دستور تھا (الامام زید: المسند) سخاوت، خودداری، بلند ہمتی اور حق گوئی کے علاوہ ان کا طرۂ امتیاز خطابت و ادب و بلاغت، حاضر جوابی اور توضیح مدعا تھا۔ لوگ ان کے جملے حفظ کیا کرتے تھے (ثورہ زید)

زیدؒ ابھی پینتیس چالیس سال کے درمیان تھے کہ ہشام بن عبدالملک نے انھیں قید کر دیا۔ پھر خالد بن عبداللہ کے عائد کردہ الزامات کا جواب دینے کے لیے کوفہ بھیجا گیا۔ ۱۲۰ھ میں خالد معزول ہوا اور ان کی جگہ یوسف بن عمر نیا والی مقرر ہوا۔ خالد اور زیدؒ کی بات چیت ہوئی اور زیدؒ بے گناہ ثابت ہوئے۔ زیدؒ نے کوفہ میں تبلیغ شروع کی حکومت پر تنقید کی وجہ سے انھیں کوفہ چھوڑنے کا حکم ہوا۔ زیدؒ کوفہ ہی میں رہے۔ حکومت نے ان کی تلاش میں گھروں میں چھاپے مارے۔ زیدؒ نے وقت معینہ سے ایک ہفتہ قبل ہی کوفہ میں اعلانِ انقلاب کر دیا۔ رات بھر مشعل بردار جلوس کوفہ کے بازار میں نعرے لگاتا رہا۔ صبح کو حکومت کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ زید کے مخلص فوجی سالار قتل ہوئے۔ دوسرے روز بھی جنگ جاری رہی۔ تازہ کمک کے باوجود سرکاری فوج شکست کھاتی رہی۔ زید جامع مسجد میں جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ لڑتے رہے۔ دوسرے روز کئی ساتھی مارے گئے۔ یوسف بن عمر نے تجربہ کار فوجی سالاروں کے ساتھ تازہ حملہ کیا۔ تیروں کی بارش نے بہت سی جانیں لے لیں۔ ایک تیر زیدؒ کی پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ بچے کھچے جاں نثار آپ کو مسجد سے لے گئے جہاں آپ نے انتقال فرمایا۔ جاں نثاروں نے رات ہی کو مسجد میں دفن کر کے قبر پر نہر کا پانی جمع کر دیا۔ صبح کو حکومت کے آدمی نعش نکال کر لے گئے۔ یوسف بن عمر سر تن سے جدا کر کے ہشام کے پاس لے گیا۔

امام زیدؒ کے بعد ان کی تحریک کو ان کے دو فرزندوں یحییٰ اور عیسیٰ نے خون دے کر آگے بڑھایا۔ یہ خون رنگ لایا اور ابو مسلم خراسانی اور پھر خاتمۂ حکومتِ بنو امیہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ بنی عباس کے زمانے میں زیدیوں نے طبرستان میں حکومت بھی قائم کی اور اہل دیانت نے ان کے اصول و افکار کو مستقل مذہب کی شکل دی جو فرقہ زیدیہ کی شکل میں اب باقی ہے۔

زیدان

(۱۴ ستمبر ۱۸۶۱ء ــــ ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء) جرجی بن حبیب زیدان، عیسائی عرب فاضل، صحافی اور ادیب جو بیروت میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں وفات پائی۔ یورپ کے دو سفروں کے علاوہ اس کی تمام ادبی سرگرمیاں مصر تک محدود رہیں۔ اس کی قابل ذکر تصنیفات یہ ہیں: (۱) الفلسفۃ اللغویہ' یہ لسانیات سے متعلق ہے (۲) تاریخ اللغت العربیہ' یہ بھی لسانیات سے متعلق ہے۔ (۳) تاریخ مصر الحدیث (۴) تاریخ الماسونیۃ العام (۵) التاریخ العام (۶) تاریخ یونان و روما' (۷) مختصر جغرافیۂ مصر (۸) انساب العرب قدماء (۹) تاریخ تمدن اسلامی' پانچ جلدوں میں؛ اسلامی ممالک میں اس کا شمار صف اول کی تصنیفات میں ہوتا ہے (۱۰) تاریخ آداب اللغت العربیہ' یہ عربی زبان کی پہلی کتاب ہے جو جدید اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی۔ اس نے بائیس ناول لکھے۔

زیدیہ

شیعوں کی ایک شاخ جسے زید بن زین العابدین علی کو امام تسلیم کرنے کی بنا پر اثنا عشریہ اور سبعیہ سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ زیدیہ کے نزدیک امام حسینؓ کے بعد حسنی و حسینی سادات میں جو شخص شرائط امامت کا حامل ہو وہ امام ہوگا ان کے نزدیک شرائط امامت یہ ہیں: بالغ، عاقل، مرد، زندہ، مسلمان، عادل، مجتہد، صاحب تقویٰ اور سخی ہو، سیاست دان، منتظم جو حقوق میں تبدیلی نہ کرے، رعایا کے معاملات خود انجام دے، صحیح الرائے ہو، بہادر اور جرأت مند ہو اور سامعہ و باصرہ سے درست ہو (ناجی حسن، ثورہ زید بن علی) زیدیہ کے نزدیک امام کے لیے جہاد کرنا اور تقیہ نہ کرنا لازمی ہے۔ وہ زید بن علی کو اصول و فروع کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ توحید میں ان کے بیشتر عقائد شیعہ اثناعشریہ و معتزلہ کے مطابق ہیں۔ مثلاً ذات الٰہی کو منزہ عن الجسم و الجسمانیات اور صفات کو عین ذات مانتے ہیں۔ رویت کی نفی کرتے ہیں۔ عدل کے قائل ہیں اور وعد و وعید میں شفاعت کو خلف وعدہ کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں جس کی جو سزا ہے وہ اسے ضرور ملے گی۔ اصحاب کبائر کی شفاعت ماننے سے اللہ کا وعدہ و وعید باطل ہو جائے گا۔

امام برحق حضرت علیؓ پھر امام حسنؓ و امام حسینؓ ہیں، پھر حضرت زید۔ بعض کے نزدیک زین العابدین علی اور ان کے بعد زید بن علی، ان کے بعد حسنی و حسینی سادات میں جو بھی صاحب سیف ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیک وقت دو امام ہوں (اشعری: کتاب المقالات و الفرق)۔ چھٹی صدی میں زیدیوں کی اکثریت اور معتزلہ کے عقائد میں بال برابر بھی اختلاف نہیں تھا زیدی فقہ میں عموماً امام ابوحنیفہؒ سے اور بعض مسائل میں امام شافعیؒ سے متفق ہیں (ابوزہرہ: الامام زید)

زیدیوں کے فلسفۂ دعوت پر عہد حاضر کے فاضل زیدی بزرگ ابراہیم بن علی بن وزیر نے "العرفان" میں قلم اٹھایا ہے جس کا ملخص یہ ہے: "زید نے اپنی دعوت کے مرکزی نکتے یہ قرار دیے ہیں۔ (۱) مسلمانوں کے معاملات شوریٰ سے طے ہوں۔ استبداد، بدعت اور شہنشاہیت کا مقابلہ کیا جائے (۲) شوریٰ کا انکار اور استبداد۔ اگر حکومت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو یکسر نظر انداز کر دے تو امام کو حکومت سے ٹکر لینے کی اجازت ہوگی۔ امام عادل قرآنی معاشرہ و نظام کا ذمہ دار ہوگا۔ کتب تاریخ میں زیدیوں کے بہت سے فرقے بتائے گئے ہیں: جارودیہ، سلیمانیہ، بتریہ، یعقوبیہ، نعیمیہ، مطرفیہ، زیدیہ و امامیہ، ابریہ، عقبیہ، جریریہ، سالحیہ، صباحیہ، محمدیہ، طالقانیہ، عمریہ، رکبیہ، خشبیہ، حلسفیہ اور قاسمیہ (ثورہ زید)۔

زین العابدین، امام

دیکھیے۔ علی بن حسینؓ

زینبؓ بنت ابی سلمہ عبداللہ

بن عبدالاسد بن عمرو بن مخزوم صحابیہ۔ حبشہ میں ام سلمہؓ کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ انھی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے دودھ پلایا (ابن سعد)۔ پہلے برّہ نام تھا۔ آنحضور صلعم نے زینب نام رکھا (مسلم)۔ ۴ھ میں ابو سلمہؓ نے وفات پائی تو حضرت ام سلمہؓ آنحضرت صلعم کے نکاح میں آئیں۔ والدہ ماجدہ کے ساتھ زینب آنحضرتؐ کے آغوش تربیت میں آئیں۔ آپؐ غسل فرماتے تو ان کے منہ پر پانی چھڑکتے۔ اسی کی برکت سے بڑھاپے تک ان کے چہرے پر شباب کا آب و رنگ باقی رہا۔ حضرت عبداللہ بن زمعہ بن اسود اسدی سے شادی ہوئی۔ دو لڑکے ہوئے ایک کا نام ابو عبیدہ تھا ۶۳ھ میں حرہ کی لڑائی میں دونوں کام آئے۔ حضرت زینبؓ نے ۷۳ھ میں انتقال فرمایا۔ وہ اپنے زمانے کی فقیہہ بیوی تھیں (اسد الغابہ)۔ جن محدثین نے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: امام زین العابدینؒ، ابو عبیدہ، محمد بن عطاء، عراک بن مالک، حمید بن نافع، ابو سلمہ، کلیب بن وائل، ابو قلابہ جرمی۔

Marfat.com

زینبؓ بنت جحش

بن رباب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کثیر بن غنم بن دودان بن سعد بن خزیمہ۔ آنحضور صلعم کی پھوپھی زاد بہن، امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی۔ نبوت کے ابتدائی دور میں اسلام لائیں۔ ابتدا ہی میں سارا کنبہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلا گیا اور ان کے خالی مکانوں پر قریش نے قبضہ کر لیا۔ ۴ھ میں حضرت زینب کا نکاح رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ زیدؓ بن حارثہ سے ہوا۔ ایک سال کے بعد حضرت زیدؓ رسول کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "زینب مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں" (ترمذی)۔ آپ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ شکایتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر ربانی حکم نازل ہوا (احزاب: ۳۸) اور حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی۔ نسائی اور طبری نے حضرت زینبؓ کے مزاج کی تیزی کا ذکر کیا ہے۔ حضرت زینبؓ ابتدا میں حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی نہ تھیں لیکن جب آنحضورؐ نے سورہ احزاب کی آیت ۳۶ پڑھ کر سنائی جو بطور خاص نازل ہوئی تھی تو حضرت زینبؓ تیار ہو گئی تھیں۔

عدت گزرنے کے بعد حضرت زینبؓ رسول کریم صلعم کے نکاح میں آئیں۔ چار سو درہم مہر بندھا۔ دعوت ولیمہ میں تین سو افراد شریک ہوئے۔ آنحضرتؐ نے دس دس کی ٹولیاں کر دی تھیں باری باری آتے اور کھانا کھا کر واپس جاتے۔ ولیمے کی دعوت کے بعد آیت حجاب اتری (احزاب: ۵۳)۔ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے۔ آنحضرت صلعم حضرت زینبؓ کی عبادت و ریاضت کے باعث انھیں بہت محبوب رکھتے تھے (نسائی)۔ ابن سعد کے مطابق وہ ہاتھ کی محنت میں اعتقاد رکھتی تھیں۔ چمڑوں کی دباغت اور منکوں کے ہار پرونے سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ راہ خدا میں خیرات کر دیتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بارہ ہزار درہم سالانہ ان کا وظیفہ آیا تو آپؓ نے اس رقم کو ہاتھ تک نہ لگایا اور سب خیرات کر دی۔ تمام رقم تقسیم ہو چکی۔ دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیے نہ اٹھاؤں۔ دعا قبول ہوئی اور اسی سال آپ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ازواج میں سے وہی (حضرت زینب) رسول اللہ کی نگاہ میں عزت و مرتبہ میں میرا مقابلہ کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کوئی عورت زینبؓ سے زیادہ دیندار، زیادہ پرہیزگار، زیادہ راست گفتار، زیادہ فیاض اور خدا کی رضا جوئی میں اتنی سرگرم نہیں دیکھی۔ فقط مزاج میں ذرا تیزی تھی جس پر ان کو بہت جلد ندامت بھی ہوتی تھی (مسلم)۔ آنحضرت صلعم نے پیشن گوئی کی تھی کہ "مجھ سے میری بیویوں میں سب سے پہلے وہ آملے گی جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہوں گے"۔ ہاتھوں کی لمبائی سے آپؐ کی مراد فیاضی تھی۔ حضرت زینبؓ نہایت فارغ اور فیاض تھیں۔ آپ نے ۲۰ھ میں ۵۳ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ ازواج مطہرات میں سے سب سے پہلے آپ نے انتقال فرمایا۔ کفن کا سامان آپ نے خود کر لیا تھا۔ چنانچہ یہ وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک کو صدقہ کر دینا۔ چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اسامہ بن زیدؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے انھیں قبر میں اتارا۔ بقیع میں دفن ہوئیں۔ مال متروکہ میں صرف ایک مکان یادگار چھوڑا تھا جس کو ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد حکومت میں پچاس ہزار درہم میں خرید کر مسجد نبوی میں شامل کر دیا۔ (طبری)

زینبؓ بنت خزیمہ

بن حارث بن عبداللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ۔ ازواج نبی کریم صلعم میں سے تھیں۔ فقرا اور مساکین کی خدمت کی وجہ سے زمانہ جاہلیت ہی میں آپ کا نام ام المساکین مشہور ہو گیا تھا۔ آپ کے پہلے شوہر طفیل بن حارث نے آپ کو طلاق دے دی تو آپ عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں آئیں۔ وہ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے۔ آنحضرت صلعم نے رمضان ۳ھ میں آپ سے شادی کی۔ چار سو درہم مہر ادا ہوا۔ دو تین ماہ بعد حضرت زینبؓ رحلت کر گئیں۔ آنحضرت صلعم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

زینبؓ بنت عبداللہ

بن معاویہ بن عتاب بن اسد بن غاضرہ بن حطیط بن جشم بن ثقیف۔ صحابیہ۔ عبداللہؓ بن مسعود سے آپ کا نکاح ہوا۔ ان کا ذریعہ معاش کوئی نہ تھا اور حضرت زینب دستکار تھیں۔ جو کچھ کماتیں گھر ہی میں خرچ ہو جاتا۔ ایک دن حضرت زینبؓ رسول اللہؐ کے پاس پہنچیں اور عرض کیا کہ میں دستکار ہوں اور جو کچھ پیدا کرتی ہوں شوہر اور بچوں پر صرف ہو جاتا ہے اس بنا پر میں محتاجوں کو صدقہ نہیں دے سکتی۔ اس حالت میں کیا مجھ کو کچھ ثواب ملتا ہے؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہاں تم کو ان کی خبرگیری کرنا چاہیے (مسلم)۔ آپؓ کے بیٹے ابوعبیدہؓ مشہور محدث گزرے ہیں۔ چند حدیثیں حضرت زینبؓ سے بھی مروی ہیں۔

زینبؓ بنت علیؓ

(۵ جمادی الاولی ۵ھ – ۱۵ رجب ۶۲ھ) فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ صلعم کی بیٹی اور تاریخ اسلام کی محترم شخصیت۔ حضرت علیؓ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ انھیں عقیلۂ بنی ہاشم کہا جاتا تھا۔ ام کلثوم و ام الحسن آپ کی کنیت تھی صدیقۂ صغریٰ آپ کا لقب تھا۔ محدثین حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہوئے انھیں "ابی زینب" سے یاد کرتے تھے۔

دمشق میں حضرت زینبؓ کا مزار

Marfat.com

ولادت کے بعد آپ کا نام رسول اللہؐ نے زینب رکھا۔ ساتویں دن آنحضورؐ نے عقیقہ فرمایا۔ چھ سات برس کی تھیں کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد آپ کو ام البنین اور اسماء جیسی بلند پایہ خواتین کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ امام حسینؓ حضرت زینبؓ کی بڑی تعظیم کرتے۔ جب وہ آتیں تو کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ بڑی صاحبزادی ہونے کی بنا پر گھر کے تمام معاملات کی ذمہ دار تھیں حضرت علیؓ کے بڑے بھائی اور رسول اللہؐ کے چچیرے بھائی جعفر طیارؓ کے فرزند عبداللہ سے آپ کی شادی ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ عرب کے مشہور جواد و کریم اور حضرت علیؓ کے جاں نثار تھے۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے جو اولاد ہوئی ان کے نام یہ ہیں، علی، عون اکبر، عباس، ام کلثوم، جعفر اکبر، محمد۔ عون اکبر محمد کربلا میں شہید ہوئے۔ واقعۂ کربلا کے بعد حضرت زینبؓ دمشق میں اہل بیت کے ساتھ رہیں۔ استقامت، عبادت، ایثار، جہاد اور حمایت دین کا جو مظاہرہ آپ نے فرمایا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کا امام حسینؓ کے ساتھ مکہ سے مدینہ اور وہاں سے کربلا تک کا سفر غیر معمولی کارنامہ ہے۔ دس محرم کو امام حسینؓ کے شہید ہو جانے پر یتیموں، بیواؤں، بچوں، جوانوں عورتوں اور مردوں کی نگرانی، دشمنوں کے مقابلے میں صبر و تحمل کا مظاہرہ، لٹے ہوئے قافلے کا قید ہونا، کوفہ میں ان کی لاجواب تقریریں اور عبیداللہ بن زیاد کی گستاخیوں کا جواب، اس کے بعد شام کا سفر، شام کے بازار اور یزید کے دربار میں اپنی حقانیت اور واقعات کربلا کا اعلان، فصیح و بلیغ خطبے اور برجستہ جوابات، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علیؓ خطبہ دے رہے ہیں۔ امام زین العابدین کو ابن زیاد کے بے رحم ہاتھوں سے زندہ بچا لانا بھی ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔ دمشق سے رہا ہو کر مدینہ تشریف لائیں تو واقعات کربلا کو مؤثر انداز میں بیان فرمایا۔

زینب بنت محمدؐ

آنحضرت صلعم کی سب سے بڑی صاحبزادی۔ بعثتِ نبوی سے دس برس قبل پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی بعثتِ نبوی سے قبل ابوالعاص بن ربیع لقیط سے ہوئی جو حضرت زینبؓ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ نبی کریم صلعم نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس وقت وہ طائف میں تھیں۔ ان کے شوہر ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ ابوالعاص غزوہ بدر میں گرفتار ہوئے حضرت زینبؓ نے اپنا ہار (جو حضرت خدیجہؓ کی ملکیت تھا) بطور فدیہ ارسال کیا۔ رسول اللہؐ نے انھیں اس شرط پر رہا کیا کہ مکہ جا کر حضرت زینب کو بھیج دیں گے۔ ابوالعاص نے مکہ جا کر حضرت زینب کو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینہ روانہ کیا۔ مقام ذی طویٰ میں پہنچے تو قریش کے چند آدمیوں نے تعاقب کیا اور حضرت زینبؓ کو نیزہ سے زمین پر گرا دیا۔ ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ ابوسفیان نے کہا تم علانیہ رسول اللہؐ کی لڑکی کو ہمارے قبضے سے نکال کر نہیں لے جا سکتے جب شور و ہنگامہ کم ہو گا تو چوری چھپے لے جانا۔ کنانہ حضرت زینبؓ کو لے کر مکہ واپس آ گئے۔ چند روز بعد رات کے وقت لے کر روانہ ہوئے۔ آنحضرت صلعم نے زیدؓ بن حارثہ کو پہلے بھیج دیا تھا۔ کنانہ نے زینبؓ کو ان کے حوالے کیا اور وہ زینبؓ کو مدینہ لے گئے (زرقانی)۔ سریہ عیص ۶ھ میں ابوالعاص دوسری بار گرفتار ہوئے۔ حضرت زینبؓ کی سفارش پر دوبارہ رہائی ملی۔ ابوالعاص نے ۷ھ میں اسلام قبول کیا اور مدینہ میں ہجرت کی۔ مدینہ آئے تو حضرت زینبؓ کی دوبارہ ان سے شادی ہو گئی۔ ان کا انتقال ۸ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔ حضرت ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور ام عطیہؓ نے غسل دیا۔ رسول اللہؐ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کی دو اولادیں تھیں ایک بچہ علی کمسنی میں فوت ہوا دوسری بچی امامہ تھیں جو حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

زبینی

(وفات ۵۳۸ھ/۱۱۴۴ء) ابوالقاسم علی بن طراد بن محمد، خلفائے عباسیہ کا وزیر۔ ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء میں جلال الدین بن صدقہ کی جگہ عارضی طور پر وزیر مقرر کیا گیا۔ ربیع الآخر ۵۲۳ھ/ اپریل ۱۱۲۹ء میں خلیفہ المسترشد نے اسے عہدہ وزارت پر مامور کیا۔ ۵۲۶ھ میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ مسترشد کے قتل کے بعد ۵۲۹ھ میں اس کا راشد خلیفہ بنا۔ زبینی کے اکسانے پر کئی علمائے دین اور فقہا نے سرکاری فتوے کی رو سے راشد کو نا اہل قرار دے دیا۔ سلجوق سلطان مسعود بن محمد نے زبینی سے مشورہ کیا کہ بہترین شخص کون ہے؟ زبینی نے راشد کے چچا محمد بن مستظہر کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ اسے خلیفہ تسلیم کر لیا گیا اور وہ مقتفی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ مقتفی نے زبینی کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ کچھ مدت بعد خلیفہ اور زبینی کے درمیان اختلافات ابھر پیدا ہوئے اور اس نے سلطان مسعود کے دربار کی راہ لی۔ خلیفہ نے اسے طلب کیا تاکہ وہ اپنے فرائض منصبی سنبھالے۔ لیکن زبینی نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ ۵۳۴ھ میں اسے برطرف کر دیا گیا۔

زین الدین

(۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء - ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء) ابوبکر محمد بن محمد خوافی، سلسلۂ تصوف زینیہ کے بانی۔ خراسان کے شہر خواف میں پیدا ہوئے۔ مصر جا کر نورالدین عبدالرحمٰن مصری سے اجازہ حاصل کیا۔ مصر میں عبدالرحیم بن امیر المرزونی اور بیت المقدس میں عبداللطیف بن عبدالرحمٰن مقدسی اور عبدالمعطی المغربی نے ان کی بیعت کی۔ تصانیف میں "رسالہ الوسایا القدسیہ" اور "الاوراد الزینیہ" قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا پوتا زین الدین بابر کا درباری تھا اور اس نے تزک بابری کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

سارہ

دیکھیے، ابراہیمؑ

سارق

دیکھیے، چوری

ساسانیاں

ایرانی شاہی خاندان، جس نے ۲۲۶ء سے ۶۵۱ء تک حکومت کی۔ ساسانی سلطنت میں ایران و عراق شامل تھے۔ عموماً خراسان، آرمینیا اور جارجیا شامل رہے۔ افغانستان (موجودہ) ترکستان، شام، مصر، عرب اور شمال مغربی ہندوستان کے بعض حصے بھی عارضی طور پر ساسانی سلطنت میں شامل رہے۔ یہ سلطنت رومی اور بوزنطی سلطنتوں کی بہت بڑی مد مقابل تھی اور ہتھیاروں سے مسلح پہلوانوں کے ذریعے جنگ کرنے کی حامی تھی۔ ساسانی سلطنت اشکانیوں کی سلطنت (۲۵۰ ق م تا ۲۲۴ء) سے ترقی پا کر بنی تھی۔ ساسانی سلطنت بہت سی ایسی سلطنتوں کے وسیع وفاق تھے جن پر ان کے اپنے موروثی بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ ان سب کے اوپر شاہنشاہ کی حکومت ہوتی تھی۔ ہر بادشاہی

Marfat.com

بہت سی ریاستوں اور جاگیروں پر مشتمل ہوتی تھی جو اپنے اپنے امیروں کے قبضے میں تھیں۔ ساسانی، فارس (ایران) کے باشندے تھے اور اپنے آپ کو ہخامنشی بادشاہ دارا کی اولاد بتاتے تھے۔ یہ ایک اصلاح یافتہ زردشتی مسلک اور خالص ایرانی تہذیب کے علمبردار تھے۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔

اس خاندان کے بادشاہوں کے نام جدید فارسی میں یہ ہیں: (۱) اردشیر ۲۲۶ء تا ۲۴۱ء۔ (۲) شاہ پور اوّل ۲۴۱ء تا ۲۷۲ء (۳) ہرمز اول ۲۷۲ء تا ۲۷۳ء (۴) بہرام اوّل ۲۷۳ء تا ۲۷۶ء۔ (۵) بہرام دوم ۲۷۶ء تا ۲۹۳ء (۶) بہرام سوم ۲۹۳ء (۷) نرسی ۲۹۳ء تا ۳۰۳ء (۸) ہرمز دوم ۳۰۳ء تا ۳۱۰ء۔ آذر نرسی ۳۱۰ء (۹) شاپور دوم ۳۱۰ء تا ۳۷۹ء (۱۰) اردشیر دوم ۳۷۹ء تا ۳۸۳ء (۱۱) شاپور سوم ۳۸۳ء تا ۳۸۸ء (۱۲) یزدگرد اول ۳۹۹ء تا ۴۲۰ء (۱۳) بہرام پنجم ۴۲۰ء تا ۴۳۸ء (۱۴) یزدگرد دوم ۴۳۸ء تا ۴۵۷ء (۱۵) ہرمزد سوم ۴۵۷ء تا ۴۵۹ء (۱۶) فیروز ۴۵۹ء تا ۴۸۴ء بلاش ۴۸۴ء تا ۴۸۸ء (۱۷) قباذ اول ۴۸۸ء تا ۵۳۱ء (۱۸) خسرو اوّل ۵۳۱ء تا ۵۷۹ء (۱۹) ہرمزد چہارم ۵۷۹ء تا ۵۹۰ء (۲۰) خسرو دوم ۵۹۰ء تا ۶۲۸ء (۲۱) قباذ دوم ۶۲۸ء (۲۲) اردشیر سوم ۶۲۸ء تا ۶۳۰ء (۲۳) متعدد مختصر مدت کے حکمران ۶۳۰ء تا ۶۳۲ء (۲۴) یزدگرد سوم ۶۳۲ء تا ۶۵۱ء۔

عرب سے دعوت اسلام بڑے زور سے پھیل رہی تھی۔ ساسانی سلطنت کی عربی سرحد کی حفاظت حیرہ کے لخمی بادشاہوں کے سپرد تھی۔ ۶۰۲ء میں خسرو دوم نے آخری لخمی بادشاہ نعمان سوم کو قتل کر کے حیرہ پر ایک ایرانی حاکم مقرر کر دیا تھا۔ ۶۳۳ء میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں عراق پر فوج کشی کی گئی۔ ابتدائی لڑائیاں ذات السلاسل، مذار، دلجہ اور الیس کی فتح پر ختم ہوئیں۔ اسی سال حیرہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۶۳۷ء میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ کے مقام پر رستم کو جا لیا۔ تین دن کی خونریز جنگ کے بعد مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ رستم قتل ہوا اور بالآخر مدائن جو ایک ہزار سال تک ایرانی دنیا کا پایۂ تخت رہا ہے تھا مسلمانوں نے زیر نگیں کر لیا۔ یزدگرد سوم حلوان کی طرف بھاگ گیا پھر آذربائیجان پہنچ گیا۔ یزدگرد نے ایک اور فوج فراہم کی اور جرنیل فیروزان کو کمان دے کر مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجا۔ ۶۴۲ء میں اس فوج کو بھی شکست ہوئی۔ فیروزان قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اصفہان مغلوب ہوا تو یزدگرد اصطخر کی طرف بھاگ گیا۔ وہ مشرقی ولایات سے فوج جمع کرنے کی غرض سے سیستان اور خراسان گیا مگر خوزستان کی حفاظت کرنے والی فوج ناکام ہو گئی۔ اس کا پایۂ تخت ایران خورہ شاہ پور سوسہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یزدگرد نے نیشاپور، طوس اور مرو کی طرف کوچ کیا۔ مشرقی ولایات نے یزدگرد کی امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ ۶۵۱ء میں نخلستان مرو کے مفصلات میں سو رہا تھا کہ کسی نے طلائی ملبوسات کے لالچ میں اسے قتل کر دیا۔ یزدگرد کے دوسرے بیٹے فیروز نے چینیوں کی مدد سے آخری ناکام کوشش کی جس کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ یزدگرد کی ایک شہزادی شہر بانو نے حضرت حسینؓ بن علیؓ سے شادی کر لی تھی۔ سلطنت ساسانیاں کے زوال کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مقالہ "خلافت راشدہ"۔

سالم [illegible]

(وفات ۳ رجمادی الآخرہ ۱۰۱۵ھ/ ۷ اکتوبر ۱۶۰۶ء)

بن محمد بن عز الدین ابو النجا سنہوری مصری، نامور مالکی فقیہہ اور محدث۔ سنہور میں پیدا ہوئے۔ ۲۱ برس کی عمر میں قاہرہ آئے اور مالکیوں کے مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ قریباً ستر برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ وہ اپنے زمانے میں مخزن علوم تھے۔ مصر، شام اور حرمین کے بے شمار لوگوں نے ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے صرف شیخ خلیل کی "المختصر" پر "حاشیہ" باقی بچی ہے۔

سالم محمد امین

ترک فقیہہ، شیخ الاسلام میرزا مصطفیٰ افندی کا بیٹا۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد استنبول میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر محکمہ قضا کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ذوالقعدہ ۱۱۳۴ھ/ اگست ۱۷۲۲ء میں مکہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۳ھ/ نومبر ۱۷۳۰ء میں استنبول کے قاضی اور اناطولی کے قاضی عسکر مقرر ہوئے۔ ربیع الآخر ۱۱۴۶ھ/ اگست ۱۷۳۳ء میں روم ایلی کے قاضی عسکر بنے۔ ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء میں ساقز کی طرف جلاوطن کر دیے گئے۔ ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء میں دوبارہ مکہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ۱۱۵۱ھ میں انھیں دمشق جانے کی ہدایت کی گئی۔ محرم ۱۱۵۲ھ/ اپریل ۱۷۳۹ء میں دمشق کے نزدیک معرق کے مقام پر راستے ہی میں انتقال ہو گیا۔

انھوں نے کئی کتب فقہ کے ترجمے کیے اور شرحیں لکھیں۔ ترکی فارسی لغت لکھی۔ جہاد پر کتاب "نیل الرشاد فی امر الجہاد" تصنیف کی۔ عینی کی تاریخ عالم "عقد الجمان فی تاریخ اہل الزمان" کا ترکی میں ترجمہ کیا جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "تذکرہ شعراء" ہے جو ۴۱۰ شعراء اور عروضیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

سالمیہ

متکلمین کا ایک فرقہ۔ اس کے عقائد میں تصوف کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اس کا آغاز تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بصرہ کے مالکی سنیوں میں ہوا۔ سالمیّہ کے بانی ابو محمد سہل بن عبداللہ التستری تھے۔ تستری کی وفات ۲۸۳ھ/ ۸۹۶ء میں ہوا لیکن اس فرقے کا نام تستری کے مرید اعلیٰ ابو عبداللہ محمد بن سالم (وفات ۲۹۷ھ/ ۹۰۹ء) اور ان کے بیٹے ابوالحسن احمد بن محمد بن سالم (وفات ۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) کے نام پر مشہور رہا۔ یہ دونوں یکے بعد دیگرے اس فرقے کے امام بنے۔

سالمیّہ کے عقائد یہ ہیں:

خدا تعالےٰ کا فعل خلق ہر لحظہ جاری رہتا ہے۔ یہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکتا۔ اسی لیے وہ اپنی ذات قدرت غیر مخلوقہ کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، خاص طور پر قرآن مجید کے ہر قاری کی تلاوت میں۔ اللہ تعالےٰ میں مشیئت غیر مخلوقہ اور ارادۂ مخلوقہ دونوں پائے جاتے ہیں۔ ارادۂ مخلوقہ مخلوقات کے افعال قبیحہ کے وجود کا سبب بنتا ہے اگرچہ اس کی مشیت ذاتی ان افعال کے قبح کی مقتضی نہیں ہے۔

Marfat.com

[redacted]

مکتبۂ شاہکار

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو باقاعدگی سے کتب شائع کرنے والا واحد ادارہ

* [illegible] ۲/۵۰
* [illegible] ۳/-
* [illegible] ۲/۵۰
* علی اور [illegible] ۲/۵۰
* صحرا نورد کے خطوط (اول) ۳/-
* شاہنامۂ اسلام (دوم) ۳/-
* [illegible] ۲/۷۵
* [illegible] ۴/-
* [illegible] ۴/-
* شاہنامۂ اسلام (سوم) ۳/-
* قائد اعظم میری نظر میں ۴/-
* مقدس نازنین ۴/-
* صحرا نورد کے خطوط (دوم) ۲/۵۰
* خزینۂ معلومات ۴/-
* علی گڑھ کے تین نامور فرزند ۲/-
* شاہنامۂ اسلام (چہارم) ۳/-
* محبت عظیم ہے ۲/۵۰
* نقوش قائد اعظم ۲/۵۰
* رحمت عالم ۲/-
* اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ۳/۵۰
* اردو کے چار مزاحیہ شاعر ۲/-
* پولیس افسر کی ڈائری (دوم) ۳/-
* قاسم کی مہندی ۳/۵۰
* پیغمبر صحرا ۴/-
* نوجوان دو شیزہ کی داستان غم ۲/۵۰

* بیاد قائد اعظم ۲/۵۰
* افلاطون کی ری پبلک ۳/۵۰
* تھیلا ۴/-
* ذہن کی آزمائش (دوم) ۲/-
* دفاع پاکستان ۳/۵۰
* الحسینؓ ۲/۵۰
* اقبال کا فلسفۂ خودی ۳/۵۰
* ذہن کی آزمائش (سوم) ۳/-
* دین عمل ۳/-
* تذکرۂ غوثیہ ۲/-
* ذہن کی آزمائش (چہارم) ۳/-
* داستان ہٹلر ۲/۵۰
* گم شدہ شہر اور ملیامیٹ تہذیبیں ۳/۵۰
* یاد اقبال ۴/-

ڈائجسٹ کتب

* اقرو ڈائٹ (ناول) ۳/۵۰
* شہزاد (ڈرامے) ۲/۵۰
* امیر علی ٹھگ (جرم و سزا) ۳/-
* گڈ ار تھ (ناول) ۲/۵۰
* ڈاکٹر کے آنے تک (طب و صحت) ۲/۵۰

شاہکار انسائیکلوپیڈیا معلومات

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے اب مکمل سیٹ موجود ہیں

بے بی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

تاریخ اشاعت: ۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء

چلتے ہو تو چین کو چلیے

تاریخ اشاعت: ۱۵ جولائی ۱۹۷۷ء

نفسیات داں

نفسیات کے موضوع پر ایک

دنیا کے تین عظیم علمائے نفسیات

کے افکار و نظریات

تصنیف: پروفیسر سلیم اختر

تاریخ اشاعت: یکم اگست ۷۷ء

ہنکار تیر

مجھ کو شاعر

اردو کے منفرد شاعر

تاریخ اشاعت: یکم اگست ۷۷ء

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط نمبر ۲۱

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار ۲۱

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش
شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط ○ وار
ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

۲۱

• مدیرِ اعلیٰ : سید قاسم محمود
• نائب مدیر : کفیل احمد صدیقی
اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۲
تار : "شاہکار"
خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

"دائیں سلام"

یہ مئی ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ اُن دنوں "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادارت میرے سپرد تھی۔ پاکستان حال ہی میں دولخت ہوا تھا۔ میں کالش کا مورچہ دیکھنے گیا۔ یہ قصور سے چند میل کے فاصلے پر بھارت کی سرحدوں میں ایک چھوٹا قصبہ ہے جس پر ہماری افواج کا قبضہ تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے کیپٹن آفتاب احمد اس آپریشن کے انچارج تھے۔ انھوں نے مجھے مفتوحہ علاقے میں دُور دُور تک گھمایا پھرایا اور فتح کی تفصیلات بتائیں۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ "ستمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں سلکھیر اسب ڈویژن میں جو خونریز معرکہ ہوا تھا، میں اُس میں عملاً شریک تھا۔ جیسور محاذ کے شہیدوں، غازیوں اور "باغیوں" کی زندہ جاوید کہانی، پاکستان اور اس کی دلیر فوج کی امانت کے طور پر میرے سینے میں محفوظ ہے۔"

میں نے عرض کیا: "آپ یہ امانت لوٹاتے کیوں نہیں؟" کہنے لگے: "ادیب یا صحافی نہیں ہوں، لکھنا نہیں آتا۔" میں نے کہا: "معاف کیجئے، ہمارے ہاں کے ادیب کے پاس قلم ہے، مگر زندگی نہیں ہے۔ ہمارے سپاہی کے پاس زندگی ہے لیکن قلم نہیں ہے۔ جیسی بھی ٹوٹی پھوٹی زبان اور بکھرے اسلوب میں آپ لکھ سکیں، لکھیئے ضرور۔ اُس تحریر میں کم ازکم زندگی تو ضرور ہوگی۔" انکساری سے فرمایا: "اچھا کوشش کروں گا۔ میرا تو اپنا سینہ اُبلا پڑتا ہے۔"

اور آج یوں ہوا کہ اُس ملاقات کے بعد پہلی مرتبہ آفتاب احمد صاحب دفتر شاہکار تشریف لائے۔ اب وہ کیپٹن نہ تھے۔ میجر تھے۔ چار موٹی موٹی ڈائریاں انھوں نے میز پر رکھتے ہوئے کہا: "یہ رہی قوم کی امانت۔ اس کا نام فوجی اصطلاح میں رکھا ہے "دائیں سلام" دیکھ لیجئے اگر کام کی چیز ہے تو شائع کر دیجئے، ورنہ رہنے دیجئے۔ میں جی ایچ کیو سے اس کی اشاعت کی اجازت لے چکا ہوں۔" میں نے مسودے کو چھونے سے بھی پیشتر کہا: "یہ ایک قیمتی اور مستقبل کی دستاویز ہے۔ ہم کو شائع کر کے قوم کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

قارئین کرام نے "چلتے ہو تو چین کو چلیے" کا نیا سائز دیکھا اور پسند کیا۔ فرمائش کی [illegible] پیش کی جایا کریں، لیکن کاغذ کے بارے میں اعتراضات کی بوچھاڑ جاری ہے۔ اچھا [illegible] سفید کاغذ ہی لگایا جائے گا۔ آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر۔

Marfat.com

شیطان نے انجام کار خدا کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اللہ تعالےٰ بروز حشر بہ تجلیل صورت ایک انسانی شکل میں تجلّی فرمائے گا اور اسے بلا حجاب تمام مخلوق دیکھ سکے گی۔ شریعت پر عمل اپنے اختیاری ارادے کے ساتھ، اس کی مطابقت کی کوشش سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر و تحمل کا درجہ لذت اندوزی سے بلند ہے۔ انبیا ء کا درجہ اولیاء سے بلند ہے۔ حکمت اور ایمان ایک ہی شے ہے۔ مومن کے لیے اپنی اصل کے ساتھ وصال باطنی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی شخصیت کا شعور حاصل کرے، جس قدر ازل میں اس کے لیے اس کی استعداد کے مطابق مقرر ہو چکی ہے۔ ابن الفراء سے کہ ابن جوزی اور امام ابن تیمیہ تک جتنے بھی حنبلی علماء گزرے ہیں انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ ان نیم معتزلی رجحانات اور ان کے وحدت الوجودی میلانات کی مخالفت کی ہے۔ چونکہ سالمیہ ہی علمائے اہل سنت کا ایک ایسا گروہ ہے جو بدن سے جدا ہو جانے کے بعد روح کی تا قیامت بالاستقلال بقا کا قائل ہے اس لیے سنی متصوفین کی اکثریت انھی کی طرف مائل رہی ہے۔

سام ابن نوح

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے۔ انھیں ثعلبی کی قصص الانبیاء میں قطعی طور پر نوحؑ کا پہلا بیٹا بتایا گیا ہے۔ طبری نے حضرت نوحؑ کے بیٹوں کی ترتیب بصورت یافیث، حام اور سام بتائی ہے۔ سام حضرت نوحؑ کے چہیتے بیٹے تھے وہ باپ کی دعائے برکت میں شریک تھے حضرت نوحؑ نے مرتے وقت انھیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ سام کی بیوی صلیب حضرت نوحؑ کے دوسرے بیٹوں کی بیویوں کی طرح قین بن آدم کی نسل سے تھی۔ عربوں کو ہمیشہ سام کی اولاد بتایا جاتا ہے۔ جب نوحؑ نے زمین اپنے بیٹوں میں تقسیم کی تو اس کا مرکزی حصہ یعنی دریائے نیل، فرات، دجلہ اور جیحون و سیحون کا درمیانی علاقہ سام کو دیا۔ سام خود مکہ میں رہتے تھے۔

سامری

سامری قبیلے کا ایک شخص جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش کرائی یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا ہے۔ سامری کے کہنے پر بنی اسرائیل نے اپنے اپنے زیورات آگ میں ڈال دیئے اور اس نے ان زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑا بنا لیا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل نے اس کی عبادت شروع کر دی۔ حضرت ہارونؑ نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔ جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالےٰ سے ہمکلام ہونے کے بعد واپس آئے تو ہارونؑ کو ڈانٹا کہ آپ نے انھیں کیوں نہ روکا۔ حضرت ہارونؑ نے فرمایا کہ "ان لوگوں نے مجھے دبا لیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ اس ظالم گروہ میں مجھے شامل نہ کر۔" موسیٰ علیہ السلام نے سامری کی سرزنش کی تو اس نے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا جرم ثابت ہونے پر حضرت موسیٰؑ نے اس کی سزا کا اعلان کیا: "سو جب تک تو زندہ رہے گا تو جس سے بھی ملے گا اس سے کہے گا مجھے مت چھوؤ۔"

قرآن مجید میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔ "موسیٰؑ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنا لیا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انھوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی ٹوٹ گئی اور انھوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ ادھر سے موسیٰؑ غصے اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ آتے ہی اس نے کہا بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد۔ کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے! اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارونؑ) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔ ہارونؑ نے کہا، اے میری ماں کے بیٹے! ان لوگوں نے مجھے دبا لیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے شامل نہ کر۔ تب موسیٰؑ نے کہا اے رب مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما تو سب سے بڑا رحیم ہے۔ (جواب میں ارشاد ہوا) جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں" (اعراف ۱۴۸ تا ۱۵۲)۔ سورہ طٰہٰ میں یہ واقعہ یوں بیان ہوا ہے: "اور کیا چیز تمھیں اپنی قوم سے پہلے لے آئی موسیٰؑ؟ - اس نے عرض کیا وہ بس میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں۔ میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں۔ اے میرے رب تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے فرمایا اچھا تو سنو ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انھیں گمراہ کر ڈالا۔

موسیٰؑ سخت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ جا کر اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کیے تھے! کیا تمہیں دن لگ گئے ہیں یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی ہے! انھوں نے جواب دیا۔ ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے اختیار سے نہیں کی۔ معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس ان کو پھینک دیا تھا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور ان کے لیے ایک بچھڑے کی مورت بنا کر نکال لایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی لوگ پکار اٹھے "یہی ہے تمہارا اور موسیٰؑ کا خدا۔ موسیٰ اسے بھول گیا"۔ کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ ان کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کے نفع، نقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے؟۔

ہارونؑ (موسیٰؑ کے آنے سے) پہلے ہی ان سے کہہ چکا تھا کہ لوگو تم اس کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تمہارا رب تو رحمٰن ہے پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔ مگر انھوں نے اس سے کہہ دیا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰؑ واپس نہ آ جائے۔ موسیٰؑ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد) بولا ہارون! تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟" ہارون نے جواب دیا اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ موسیٰؑ نے کہا اور سامری تیرا کیا معاملہ ہے! اس نے جواب دیا میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں کو نظر نہ آئی پس میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مٹھی (خاک) اٹھا لی اور اس کو ڈال دیا میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سجھایا۔ موسیٰؑ نے کہا اچھا تو جا اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا اور تیرے لیے باز پرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا اور دیکھ اپنے اس خدا کو جس پر تو ریجھا ہوا تھا اب ہم اسے جلا ڈالیں گے اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہا دیں گے۔ لوگو تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے" (طٰہٰ، ۸۳ تا ۹۸)

قرآن مجید کے برعکس بائبل حضرت ہارونؑ پر یہ الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے اسے معبود قرار دینے کا گناہ عظیم سامری کی بجائے ہارونؑ سے سرزد ہوا تھا (خروج ۳۲ آیت ۱ تا ۵)۔

Marfat.com

ساؤجی

تین سے عثمانی شہزادے، جو مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) **ساؤجی بیگ** ، سلطنتِ عثمانیہ کے بانی عثمان کا چھوٹا بھائی اور ارطغرل کا بیٹا تھا۔ اس نے کئی مہمات میں اپنے بھائی عثمان کا ساتھ دیا اور ۶۸۴ھ/۱۲۸۶ء ایتجیلوکوم کے حاکم کے خلاف ایک جنگ میں صنوبر کے درخت کے نیچے مارا گیا۔ اس درخت کو آج بھی "صنوبر قندیل دار" کہا جاتا ہے۔

۲۔ عثمان نے اپنے ایک بیٹے کا نام بھی ساؤجی رکھا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ وہ ایک جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔

۳۔ مراد اوّل کا بیٹا بھی ساؤجی کہلاتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے خلاف ہی سازش تیار کرکے بغاوت کر دی تھی۔ مراد اوّل نے اپنے باغی شہزادے کے خلاف جنگ کی جس میں ساؤجی شکست کھا کر دیمیتوتیخوس کی طرف بھاگ گیا جہاں اسے گھیر کر باپ کی اطاعت پر مجبور کر دیا گیا لیکن ۷۸۷ھ/۱۳۸۶ء میں اسے آنکھوں سے محروم کرکے قتل کر دیا اور لاش کو برسے جاکر دفن کیا

سبا

جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم جس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے "سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجا لاؤ اس کا، ملک ہے عمدہ پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انھیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔ اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور ان میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں۔ چلو پھرو ان راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ۔ مگر انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے۔ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا آخر کار ہم نے انھیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انھیں بالکل تتر بتر کر ڈالا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو" (سبا: ۱۵ تا ۱۹)

تاریخ کی رو سے سبا جنوبی عرب کی ایک بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر اور ترمذی نے رسول اللہ صلعم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسب ذیل قبیلے پیدا ہوئے، کندہ، حمیر، ازد، اشعریین، مذحج، انمار، عاملہ، جذام، لخم اور غسان۔ قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا اس کا وطن عرب کا جنوب مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے اس کا عروج گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک سورج پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (۹۶۵—۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت بھی ایمان لے آئی لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے المقہ (چاند دیوتا) عشتر (زہرہ) ذات حمیم اور ذات بعدان (سورج دیوی) جیسے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ المقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں اور خصوصاً المقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا

آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً تین ہزار کتبات ملے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان معلومات کی رو سے سبا قوم کی تاریخ کے اہم ادوار یہ ہیں۔ (۱) ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دور۔ اس زمانے میں ملوک سبا کا لقب مکرب سبا تھا۔ اس زمانے میں ان کا پایہ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب پائے جاتے ہیں اور خریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس دور میں مارب کے مشہور بند کی بنیاد رکھی گئی۔ وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔ (۲) ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور۔ اس دور میں بادشاہوں نے مکرب کا لقب چھوڑ کر ملک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا تھا اس زمانے میں ملوک سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے ۳۹۰۰ فٹ کی بلندی پر صنعا سے ۶۰ میل مشرق کی جانب واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک متمدن قوم کا مرکز تھا۔ (۳) ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حمیر کا قبیلہ غالب ہو گیا۔ اس دور میں مارب کو اجاڑ کر ریدان پایہ تخت بنایا گیا جو قبیلہ حمیر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب ایک قبیلہ حمیر کے نام سے آباد ہے۔ اسی زمانے میں پہلی مرتبہ یمنت اور یمنات کے لفظ کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوب مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضر موت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔ (۴) ۳۰۰ء کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور۔ یہ دور قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑ دیا۔ اور آخر کار آزادی ختم ہو گئی۔ ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی بحال ہوئی مگر مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ابرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی نہ ہی آب پاشی اور زراعت کا نظام دوبارہ بحال ہو سکا۔ ۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت نے انتقاماً حملہ آور ہو کر اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے [illegible] کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی [illegible] ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں مکہ معظمہ پر حملہ کیا۔ اور اس کی پوری [illegible] آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب فیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ۵۷۵ء میں [illegible] کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سن سن کر یونان اور روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو

Marfat.com

لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں اور ان کے مکانوں کی چھتیں دیواریں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت سونے چاندی اور جواہر کا کام کیا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے یہ اس وقت دنیا کی سب سے مالدار قوم ہے۔ اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات کھیتوں اور مواشی سے بھرا ہوا ہے۔ آرمیڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی عام لکڑی کی بجائے دار چینی صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے۔ یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعار کی بلند پہاڑی پر وہ فلک بوس عمارت تعمیر کی جو قصر غمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی بیس منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ اس وقت تک جاری رہا جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ جب انھوں نے کفران نعمت کی حد کر دی تو خداوند تعالیٰ کی نظر عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

سبا، سورۃ

قرآن مجید کی چونتیسویں سورت۔ اس سورت کے چھ رکوع اور چوّن آیات ہیں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس کی سب آیات مکی ہیں صرف چھٹی آیت کے بارے میں بعض علماء کا قول ہے کہ یہ مدنی ہے۔ تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں ہے کہ جب ابو سفیان نے سنا کہ قرآن کی رو سے منافق و مشرک عذاب میں ڈالے جائیں گے تو از راہ تمسخر و استہزا کہنے لگا "لات اور عزیٰ کی قسم! نہ قیامت آئے گی نہ کوئی حشر و نشر ہوگا"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ سورۂ سبا کے شروع میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد کفار کے انکار قیامت اور ان کے مدلل جواب کا ذکر ہے پھر رسول اللہ صلعم سے کافروں کے استہزا اور آپ پر جنون کے افترا کا ذکر ہے۔ پھر حضرت داوٗدؑ پر اللہ کی نعمتوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد قوم سبا کے عیش و آرام اور تباہی کا ذکر ہے۔ پھر بت پرستوں کی ناکامی اور خسارے کا تذکرہ کرنے کے بعد قیامت کے دن گمراہ کرنے والے قائدین اور ان کے تبعین کے درمیان مخاصمت کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ مال و دولت کی فراوانی کے نشے میں لوگوں نے انبیائے کرام کی مخالفت کی۔ اس کے بعد قرآن مجید کے بارے میں کفار کے ردِ عمل کا بیان ہے۔ پھر مقام رسالت کے بیان کے بعد قیامت کے دن کافروں کے پچھتانے اور دوبارہ دنیا میں نیک عمل کے لئے لوٹ آنے کی خواہش کا ذکر ہے۔

سورہ سبا کے فضائل کے سلسلے میں حدیث نبوی ہے کہ جس نے سورت سبا کی تلاوت کی قیامت کے دن تمام رسول اور انبیا اس سے مصافحہ کریں گے اور اسے ان کی مصاحبت نصیب ہوگی (الکشاف، البیضاوی)

سباء، ملکہ

دیکھیے، بلقیس

سبحان اللہ

"اللہ کی ذات منزّہ اور پاک ہے"۔ ایک جملہ جو قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ فعل تسبیح کا اشتقاق اسم سے ہے۔ قرآن مجید میں یہ ایک باقاعدہ جملے کے طور پر حضرت موسیٰؑ علیہ السلام (الاعراف : ۱۴۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام (المائدہ : ۱۱۶) خوش نصیب اہل جنت (یونس ۱۰) اور فرشتوں (البقرہ ۲۱ : ۲۷) - (النحل) کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔ یہ جملہ قرآن میں مختلف مقامات پر مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "پاک ہے وہ ذات جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات ....." (بنی اسرائیل ۱:) "پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارا مطیع کیا" (الزخرف ۱۴) "پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے پیدا کیے" (یٰسٓ ۳۶) "اللہ کی پاکیزگی بیان کرو جب شام اور جب صبح ہو" (الروم : ۱۷) "جن لوگوں کو اس سے قبل علم عطا ہوا تھا جب ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہے تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں" (بنی اسرائیل : ۱۰۷، ۱۰۸) "وہ کہیں گے پاک ہے ہمارا رب، بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے" (القلم : ۲۹) اس کے علاوہ بعض ایسی جگہوں پر یہ جملہ استعمال ہوا ہے جب اللہ تعالیٰ کی کسی صفت پر حرف آتا ہو۔ جیسے "پاک ہے اللہ، جو مالک ہے عرش کا، ان کے بیان کردہ اوصاف سے (الانبیاء : ۲۲)"۔ "اللہ تعالیٰ پاک ہے ان چیزوں سے جن میں وہ شریک ٹھہراتے ہیں" (الزمر : ۶۷)

اس کے علاوہ مکی سورتوں میں اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کو کفر قرار دے کر اس کی مخالفت کرتے وقت اس جملے کا استعمال ہوا ہے۔ ان سورتوں میں اس کلمے کی تکرار سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور تقدس بیان کرنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ مثلاً

"وہ جس کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں"۔ (۹ التوبہ : ۳۱)

"اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔

(۱۲ (یوسف) : ۱۰۸)

"پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں"۔

(۱۷ - بنی اسرائیل : ۴۳)

اسی طرح بعض ان مقامات پر بھی اس جملے کا استعمال ہوا ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض غلط قسم کے معجزے دکھانے کے مطالبے کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا ہے کہ وہ صرف ایک انسان اور رسول ہیں۔ ۱۷ (بنی اسرائیل : ۹۳)

سبعۃ احرف

وہ سات حرف جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف ان حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ اور ہر ایک لفظ کافی و شافی ہے"۔ (متفق علیہ)

اس حدیث پر تمام علماء متفق ہیں لیکن سب نے اس کی تفسیر مختلف بیان کی ہے کچھ علماء کہتے ہیں کہ سات حروف سے خاص قبائل عرب یا قبائل قریش کے وہ مختلف محاورات مراد لیے جاتے ہیں جن سے مطلب میں کوئی تغیر نہ آئے۔ اور ہر ایک کو ادا کرنے میں بھی آسانی ہو۔ چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی استدعا کے مطابق خدا نے اس بات کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ لیکن حضورؐ نے قرآن مجید کی تمام آیات اپنی مخصوص زبان میں ہی لکھوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سات زبانیں ان قبیلوں کی تھیں قریش، طی، ہوازن، یمن، ثقیف، ہذیل، تمیم ۔

سبکی

ایک دینی مصلح۔ جن کا نام شیخ محمد بن محمد بن احمد تھا۔ انھیں سبکی کا خطاب ملا ہوا تھا۔ آپ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں سبک کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی

Marfat.com

عہد میں ہی آپ پر تصوّف کا غلبہ معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ والدین نے انھیں دنیوی زندگی بسر کرنے کے لیے ان کی تربیت کی تھی۔ جامع الازہر میں داخل ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے اساتذہ سے کتاب و سنّت کے مسائل پر سیر حاصل بحث کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں آپ نے بدعت کے خلاف کئی رسالے لکھے۔ جامع الازہر سے سند فضیلت حاصل کر چکنے کے بعد مرتے وقت تک تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ سلسلہ انہوں نے دوران طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا۔ سبکی نے اپنے خیالات کا پرچار اور اشاعت کے لیے ایک تنظیم قائم کی۔ اس جماعت نے ۱۳۲۱ھ/۱۹۱۲ء میں کام شروع کیا۔ اس جماعت کے ارکان ہر طرح کی بدعت سے اجتناب کرنے کا حلف اٹھاتے تھے اور ہر ماہ ایک مخصوص رقم بطور چندہ ادا کرتے تھے۔ ہر رکن کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ وہ تجارت بھی جماعت کے ارکان کے درمیان ہی محدود رکھیں بلکہ یہاں تک کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بھی ایک دوسرے سے ہی مشورہ کریں۔ اس جماعت کا کام مساجد کی تعمیر، مبلغین کا تقرر اور غریب اور مستحق لوگوں میں خیرات کی تقسیم ہے۔ اس جماعت کی کوششوں کے باعث ۱۹۳۵ء تک مصر میں ۱۰۰ سے زیادہ مساجد موجود تھیں۔ اس جماعت کی آمدنی کا سب سے زیادہ اور بڑا ذریعہ مصری کپڑے کی صنعت ہے۔ ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء میں شیخ محمد سبکی نے اپنی رہائش گاہ تعمیر کی جو اب تک سلسلہ سبکیہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہ کو سلسلہ سبکیہ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

آپ کا انتقال ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں قاہرہ میں ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا اس جماعت کے کا منتظم اعلیٰ بن گیا۔ شیخ محمد سبکی نے اپنی تمام عمر بدعات کی مخالفت میں بسر کی۔ وہ اذان کو ترنم کے ساتھ، سورۂ کہف کی خصوصی تلاوت اور اعمال صوفیہ کو سنت نبویؐ کے خلاف سمجھتے تھے۔ تمباکو نوشی اور عمامے کے بغیر ٹوپی پہننے کو انہوں نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ ان کے احکام کو بجا لانے کی کوشش میں ان کے پیروکار سفید لباس کو دوسرے لباسوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم تصنیف "سنن ابی داؤد" کی مفصل شرح ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی میں ہی شائع ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن تکمیل ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کُل چھبیس کتابیں لکھی ہیں۔

سبیل

سبیل کے لغوی معنی ہیں "ایسا راستہ جس پر چلنا آسان ہو"۔ یہ لفظ سُبُل کی جمع ہے۔ قرآن مجید میں بھی سبیل کا لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ "وہ جو اس کی طرف سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہو" (آل عمران - ۹۷)۔ "کاش میں نے رسول اللہؐ کے ساتھ (حق کا) راستہ اختیار کیا ہوتا" (الفرقان - ۲۷) اس آیت میں مجازاً سیدھے راستے کے معنوں میں سبیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاحی ذریعہ حصول مقصد، کسی مصیبت یا مشکل سے نکلنے کے راستہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے "یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے" (النساء ۱۵)

برعظیم پاک و ہند میں سر راہ پینے کے پانی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس انتظام کو بھی سبیل کہتے ہیں۔ اس لفظ کو اس کام کے لیے استعمال کرنے کا رواج غالباً "فی سبیل اللہ" کے جملہ کے باعث پڑ گیا ہے۔ کیونکہ یہ جملہ ہر اس کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے اللہ کے نام پر کیا جائے۔

ستر

دیکھیے: پردہ

سجاح۔ ام صادر

عرب کی ایک مشہور کاہنہ جس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے شجرہ نسب سے علم ہوتا ہے کہ وہ بنو تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ جبکہ اس کی ماں کا تعلق بنو تغلب سے تھا۔ بنو تغلب ایک عیسائی قبیلہ تھا۔ وہ عیسائیت کے متعلق بہت سی معلومات رکھتی تھی۔ بلکہ وہ اکثر اوقات تقریروں کے ذریعے اس کا پرچار بھی کیا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ خدا کے بہت سے القاب میں سے ایک لقب رَبُّ السَّحَاب تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے وصال کے بعد کھل کر منظرِ عام پر آئی اور اپنے نبی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے بنو تمیم جس کے افراد زیادہ تر مصلحتاً حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے، کا شیرازہ بکھرتا ہوا دیکھ کر اپنی تیز گفتاری اور چرب زبانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنا پیرو بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئی۔ چنانچہ سجاح نے ایک فوج تیار کر کے ایک من گھڑت الہام کی متابعت میں بنو رباب پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں سجاح کی فوج کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث وہ النباج کی جانب بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن راستے میں بنو عمرو کے ساتھ جھڑپ ہو گئی جس میں ایک بار پھر اس کی فوج کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس پر سجاح نے یہ عہد کر لیا کہ وہ بنو تمیم کا علاقہ چھوڑ جائے گی اور ساتھ ہی مسیلمہ کذاب سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ انھی دنوں اسلامی فوج مسیلمہ کذاب پر جگہ جگہ حملے کر رہی تھی اس لیے سجاح اور مسیلمہ کذاب میں ایک عجیب و غریب سمجھوتہ ہو گیا، اور ان دونوں نے آپس میں شادی کر لی جس کے باعث سجاح کے معتقدین اس سے علیحدہ ہونے لگے۔ جب حضرت امیر معاویہؓ کا زمانہ آیا تو ایک سال سخت قحط پڑا۔ جس کے باعث قبیلہ بنی تغلب کو بصرہ لا کر آباد کیا گیا۔ تو سجاح بھی جو ان کے ساتھ خاموشی کی زندگی بسر کر رہی تھی، بصرہ آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے اور قبیلہ بنی تغلب نے اسلام قبول کر لیا۔ سجاح ام صادر کا انتقال بطور ایک پکی مسلمان کے ہوا۔ حضورؐ کے صحابی حضرت سمرہ ابن جندبؓ جو ان دنوں بصرہ کے حاکم تھے، نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

سجادہ

جائے نماز، مُصلّٰی۔ وہ چٹائیاں جن پر نماز پڑھی جاتی ہو۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں ملتا۔ لیکن لوگ اس سے ابتدا سے ہی واقف تھے۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اپنے صحابہ سمیت مدینہ منورہ کی مسجد کے فرش پر موسلا دھار بارش کے بعد نماز ادا کی جس کے نتیجے کے طور پر آپؐ کی ناک اور سرِ مبارک کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ (بخاری)۔ اس کے علاوہ کئی ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جن میں حضورؐ کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ "ساری زمین آپؐ کے لیے مسجد بنا دی گئی ہے"۔ (بخاری) اس کے علاوہ بعض علماء اور فقہا بھی سوکھی زمین پر نماز ادا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آج کل مصر اور مراکش میں بھی نماز ادا کرنے کے لیے چٹائیاں وغیرہ استعمال نہیں کرتے۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ اپنے پہننے کے کپڑوں پر سجدہ کرنا منع ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "آنحضرتؐ نے اپنے "فراش"

Marfat.com

بعض احادیث سے نہیں اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ نماز چٹائیوں پر ادا کی جاتی تھی۔ فقہا کا ایک عام فتوے ہے کہ ہر اس چیز پہ جو زمین سے اُگی ہوئی چیزوں سے بنائی جائے، نماز پڑھنا جائز ہے۔

آجکل مکہ میں تمام لوگ مخملی چٹائیوں پہ نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ چٹائیاں اتنی بڑی ہوتی ہیں جن پہ بآسانی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ نماز پڑھنے کے بعد اس چٹائی کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ اگر جائے نماز کو نماز پڑھنے کے بعد پلٹا نہ جائے تو شیطان کو اس پہ نماز پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جائے نماز اور چٹائیوں کی ہر ملک میں ملتی جلتی شکلیں اور سائز ہوتے ہیں۔ مختلف مزاروں پہ بزرگوں کے جانشینوں کو بھی سجادہ نشین کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ عام طور پہ دن بھر مصلّے پہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں ؛

سجاوندی

ایک حنفی فقیہ۔ آپ کا نام سراج الدین ابوطاہر محمد بن محمد بن عبدالرشید ہے۔ لیکن سجاوندی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ آپ کی سب سے مشہور اور اہم تصنیف "الفرائض السراجیہ" یا صرف "سراجیہ" ہے۔ اس کتاب میں قانونِ وراثت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اسی لیے فنِ میراث کا شاہکار تصوّر کی جاتی ہے۔ اس کتاب پہ خود سجاوندی نے سب سے پہلے حاشیہ لکھا بعد میں دوسرے علماء بھی اس کتاب پہ حواشی لکھتے رہے ہیں۔ یہ کتاب ترکی اور فارسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔

سجاوندی کا زمانہ حیات ۱۲۰۰ء کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے لیکن ان کی پیدائش کا سال معلوم نہیں ہو سکا ؛

سجدہ

جھکنا۔ خاص انداز میں جھک کر ماتھے اور ناک کو زمین پہ رکھنا۔ سجدہ نماز کا ضروری حصّہ ہے۔ ہر سجدے میں کم سے کم تین تسبیحیں پڑھنا، سجدہ میں جاتے وقت پہلے دونوں گھٹنے، پھر دونوں ہاتھ دونوں کانوں کے قریب اس انداز میں رکھنا کہ منہ ان دونوں کے درمیان رہے اور سجدہ میں ناک اور ماتھا زمین پہ ٹکے رہیں۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں سے اور دونوں بازو پیٹ سے اور پیٹ رانوں سے الگ رہے، جبکہ پاؤں کی انگلیوں کا رُخ قبلہ کی جانب ہونا ضروری ہے۔

سجدہ صرف اللہ تعالےٰ کے حضور کرنا جائز ہے۔ کسی پیر، صوفی، ولی، عالم یعنی خدا کے سوا ہر چیز کے آگے سجدہ کرنا حرام اور گناہ ہے۔ کیونکہ خدا کے علاوہ کسی اور چیز یا شخص کے سامنے عبادت کی نیت کے ساتھ سجدہ کرنے والا شخص کافر ہو جاتا ہے۔ تعظیم کی خاطر بھی سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ ایک حدیث ہے جو سعد کے بیٹے قیس سے مروی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ "میں حیرہ میں گیا۔ وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے دل میں سوچا کہ اس طرح سے تو رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سجدہ کیے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ پھر جب میں حضورؐ کے پاس پہنچا تو میں نے آپؐ سے کہا کہ حیرہ میں تو لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا دل کہتا ہے کہ آپؐ کو اس بات کا حق ہے کہ آپؐ کو سجدہ کیا جائے۔ اس پہ رسولِ خدا نے کہا کہ نہیں۔ تم ایسا نہ کرو۔ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو وہ عورتوں کو دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے خاوندوں کا ان پہ حق رکھا ہے۔"

اس کے علاوہ قرآن مجید کی ۴۱ اور ۳۲ ویں سورت کا نام بھی حٰمٓ سجدہ اور الٓمٓ سجدہ ہے۔

یوں تو حضرت آدمؑ کو ابلیس کے علاوہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا تھا لیکن وہ صرف اللہ تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا تھا۔ اسی لیے وہ سجدہ حضرت آدمؑ کے لیے نہیں تھا۔ اسی طرح یوسف برادران نے جو سجدہ کیا تھا وہ بھی یوسف کے آگے نہیں بلکہ خدا کے آگے اس کام کے شکریہ کے طور پہ کیا تھا کہ یوسفؑ نے ان کی بہت بڑی خطا کو معاف کر دیا تھا ؛

سجدہ، سورہ

قرآن مجید کی ۳۲ ویں سورۃ ہے۔ اس کا زمانۂ نزول مکّہ کا دورِ متوسط ہے۔ بلکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے بھی ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں کل ۳۰ آیات ہیں جن میں سے ۱۶ تا ۲۰ آیتوں کے علاوہ باقی تمام مکّی ہیں۔ اس سورت میں تین رکوع ہیں۔ یہ الٓمٓ کے حروف مقطعات سے شروع ہونے والی آخری سورت ہے۔ اس کو سورۃ "حٰمٓ السجدۃ" سے ممتاز کرنے کے لیے "الٓمٓ السجدہ" یا "سجدۃ لقمٰن" بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سے مفسروں نے اس سورۃ کا اس سے پہلی سورۃ لقمٰن کے ساتھ تعلق بھی بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لقمٰن میں اللہ تعالےٰ کی ذات اور توحیدِ خداوندی کے دلائل بیان کیے گئے ہیں جبکہ سجدہ میں بھی اللہ کے وجود اور توحید کے دلائل ہی بیان کیے ہیں۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ لقمٰن میں توحیدِ خداوندی کے ساتھ یومِ آخرت کا ذکر بھی ملتا ہے جو عقیدۂ اسلام کی دو اہم بنیادیں ہیں۔ جبکہ سجدہ میں دینِ اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے یعنی اللہ تعالےٰ کے رسولوں پہ ایمان لانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ لقمٰن میں علمِ غیب کی پانچ باتیں جن کا علم صرف خدا کو ہے یعنی قیامت کب آئے گی؟ (۲) بارش کب ہوگی؟ (۳) موت کب آئے گی! (۴) حاملہ کے پیٹ میں کیا ہے؟ اور (۵) کل کیا ہوگا؟ کا صرف اجمالی سا ذکر آیا ہے۔ جبکہ سجدہ میں ان سب باتوں کا ذکر تفصیلاً ملتا ہے۔ سورۃ سجدہ کے مضمون میں ہمیں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے اللہ کی جانب سے ہونے کا بیان ملتا ہے۔ اس کے بعد حشر و نشر کے ساتھ ساتھ انسانی تخلیق اور زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر ہے۔ اس سورت کے آخر میں قیامت کے بارے میں کافروں کے شکوک و شبہات بیان کرکے کافروں کی رسوائی اور اہلِ ایمان کی سرخروئی کا تذکرہ ہے۔

اس سورت کے بارے میں حضورؐ نے بھی کئی احادیث ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک حدیث میں حضورؐ نے بتایا ہے کہ آپؐ اس وقت تک نہیں سوتے جب تک کہ سورۃ السجدہ اور سورۃ الملک کی تلاوت نہیں کر لیتے تھے"۔ (روح المعانی : ۱۱، ۱۱۵) ایک اور حدیث ہے کہ "جس نے سورۃ السجدہ اور سورۃ الملک کی تلاوت کی اُسے لیلۃ القدر کے برابر اجر اور ثواب ملے گا۔" (الکشاف۔ ۳)

اس سورۃ کے خاتمۂ کلام پہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ آپؐ کی باتیں سن کر مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ حضرت یہ فیصلہ کن فتح آپؐ کو کب ملنے والی ہے، ذرا تاریخ تو بتا دیں۔ ان سے کہو کہ جب ہمارے اور تمہارے فیصلے کا وقت آجائے گا تو اس وقت میری باتوں کو ماننا تمہارے لیے بالکل مفید نہیں

Marfat.com

ہوگا۔ اگر ماننا ہے تو ابھی مان لو اور آخری فیصلے ہی کا انتظار کرنا ہے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔

سجدۂ تلاوت

قرآن مجید میں چودہ ایسی آیتیں ہیں جن کے پڑھنے یا سننے کے بعد ایک سجدہ واجب ہوجاتا ہے۔ اس سجدے کو سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔ سجدہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جائیں اور کم سے کم تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ کہہ کر تکبیر کے ساتھ سر اٹھائیں۔ اس کے بعد تشہد، درود اور دعا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باقی تمام شرائط اور مسائل نماز کے سجدے کے ہی ہیں یعنی اس سجدے کو ادا کرنے سے پہلے باوضو ہونا اور قبلہ رُو ہو کر سجدہ کرنا وغیرہ۔

سجدہ کی آیات مندرجہ ذیل سورتوں میں آئی ہیں۔

(۱) سورۂ اعراف (۲) سورۂ رعد (۳) سورۂ نحل، (۴) سورۂ بنی اسرائیل (۵) سورۂ مریم۔ (۶) سورۂ حج۔ (۷) سورۂ فرقان۔ (۸) سورۂ نمل۔ (۹) سورۂ الم سجدہ (۱۰) سورۂ ص، (۱۱) سورۂ حٰم سجدہ (۱۲) سورۂ النجم۔ (۱۳) سورۂ انشقاق (۱۴) سورۂ اقراء۔

اس سجدہ کو جب واجب ہوجائے تو فوراً ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر طہارت سے نہ ہوں اور سجدۂ تلاوت واجب ہوجائے تو پھر جب وہ طہارت میں ہوں تو اس طرح کے واجب سجدے اکٹھے ادا کر دیں۔

اگر نماز کے دوران ان سورتوں کی قرأت کی جائے تو سجدہ فوراً واجب ہو جاتا ہے جسے اسی وقت ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ قیام کر کے باقی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اگر نماز میں سجدہ ادا نہ کیا جائے تو پھر اس سجدے کے ادا ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی بلکہ حسرت توبہ استغفار لازم ہو جاتا ہے۔ اگر سجدے کی کئی آیات اکٹھی تلاوت کی جائیں تو بھی اتنے ہی سجدے واجب ہو جاتے ہیں۔

سجدۂ سہو

بھول چوک کا سجدہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "تمہاری نماز میں شیطان آکر شبہ ڈالتا ہے۔ حتیٰ کہ تم رکعتیں بھول جاتے ہو۔ لہٰذا جب کبھی ایسا ہو تو بیٹھے ہوئے دو سجدے کر لو۔" (متفق علیہ)

اگر نماز پڑھتے وقت کوئی واجب یا کئی واجب رہ جائیں یا ان کی ترتیب بگڑ جائے، کوئی فرض زیادہ ہوجائے، یا پھر نماز میں سوچتے سوچتے اتنی دیر لگ جائے کہ اس مدت میں تین مرتبہ تسبیح پڑھ سکیں یا چار رکعت نماز ادا کرتے ہوئے پہلا تشہد دو مرتبہ پڑھ لیں یا درود شریف اس کے ساتھ ملانے لگیں تو سجدہ سہو کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ اگر یہ سجدہ نہ کیا جائے تو نماز مکمل نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک حدیث بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز ادا کی تو بجائے چار رکعت کے پانچ رکعت پڑھ لیں۔ چنانچہ آپ کو بتایا گیا کہ نماز میں زیادتی ہوگئی ہے۔ اس پہ آپ نے فرمایا "کیا ہوا" صحابہ نے آپ کو بتایا کہ آپ نے پانچ رکعت نماز ادا کی ہے۔ اس کے بعد آپ نے سلام کے بعد دو سجدے کیے۔ ایک روایت میں یہ بات کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "حقیقتاً میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہی ہوں، اور بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو۔ لہٰذا اگر میں بھول جاؤں تو یاد دلا دیا کرو۔ اور جب تم کو نماز میں شک ہوجائے تو چاہیے غور کیا کرو۔ اگر یاد نہ آئے تو سلام پھیر کر دو سجدے کر لیا کرو۔" (متفق علیہ)

اگر فرض نماز پڑھ رہے ہو اور نماز ادا کرتے وقت پہلا قعدہ یاد نہ رہے اور تیسری رکعت کے لیے اٹھتے ہوئے یاد آجائے۔ ایسی صورت میں اگر نیچے کا دھڑ ابھی سیدھا نہ ہوا ہو تو فوراً قعدے میں بیٹھ جانا چاہیے۔ سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ لیکن اگر نیچے کا دھڑ سیدھا ہوجائے تو پھر قعدے میں جانا گناہ ہے۔ ایسی صورت میں قیام میں چلے جانا ہی درست ہوتا ہے۔ لیکن نماز سجدۂ سہو کے ساتھ ختم کرنا پڑتی ہے۔ اگر نفلی نماز ادا کر رہے ہوں اور قعدہ بھول جائیں تو فوراً قعدہ میں آکر سجدۂ سہو کرنا درست ہے۔

سجدۂ سہو ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آخری قعدہ میں صرف تشہد پڑھ کر دائیں جانب سلام پھیر لیا جائے۔ پھر دو سجدے کر کے قعدہ کریں اور تشہد، درود شریف اور دعا پڑھنے کے بعد سلام پھیریں۔ اگر نماز باجماعت ادا کی جا رہی ہو اور امام سے کوئی غلطی ہوجائے یا بھول چوک ہوجائے تو اس کے باعث تمام مقتدین پر سجدہ سہو لازم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی مقتدی سے بھول چوک ہو جائے تو تمام جماعت پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

بعض فقہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ جب سجدۂ سہو واجب ہو تو پہلا سلام پھیرنے سے نمازی نماز سے نہیں نکلتا خواہ وہ دونوں جانب سلام پھیرے۔ اس لیے مقتدی سجدۂ سہو میں بھی شامل جماعت ہو سکتا ہے۔

سجدۂ شکر

کسی خوشی یا نعمت کے حاصل ہونے پر بطور شکر سجدہ کرنا۔ حضرت ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کوئی خوشی حاصل ہوتی یا کوئی کام خوشی کا سبب بنتا تو آپ سجدے میں جا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے تھے۔ ابو جعفر بھی ایک حدیث بیان فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک بونے کو دیکھا تو سجدے میں گر پڑے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اشاعت دین کے لیے یمن بھیجا۔ جب حضرت علیؓ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اہل یمن کے مسلمان ہونے کی اطلاع پہنچائی تو آپ بہت خوش ہوئے اور سجدۂ شکر ادا کیا۔

سجیل

قرآن مجید کی سورۃ الفیل اور الحجر میں یہ لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی کے بارے میں علمائے تفسیر اور اہل لغت کی رائے مختلف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ سجیل کا مطلب مٹی کا پتھر ہے۔ اس بات کا ثبوت قرآن مجید کی سورت الذٰریٰت کی ایک آیت سے مل جاتا ہے۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ۝ (ذاریات: ۳۳)

"تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر برسا دیں۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سجیل اور حجارہ من طین ایک ہی چیز ہے۔

ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ سجیل کا مطلب ہے: اَلشَّدِيْدُ الْكَثِيْرُ "بہت سخت" اس سلسلے میں الفرا کہتے ہیں کہ سجیل اس پتھر کو کہا جاتا ہے جو پکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ابن عباس۔ ابن جبیر وغیرہ کہتے ہیں کہ اصحاب الفیل پر جو پتھر پھینکے گئے تھے

Marfat.com

والے انسانوں کی طرح پختہ ہو گئے۔ لیکن حسن بصری اور مجاہد نے سجیل کے معنی سخت پتھر جو گارے سے خشک ہو کر سخت پتھر بن گیا تھا کہہ کر تمام اختلافات کو کافی حد تک ختم کر دیا ہے۔ امام راغب نے بھی سجیل کے معنی پتھر اور گارا ملا ہوا بیان کئے ہیں۔

اس لفظ کے معنی کے بارے میں دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ لفظ درحقیقت عربی الاصل ہے جو اَسْجَلَ سے ماخوذ ہے۔ اَلسِّجِلُّ عربی میں کسی عہد نامے یا دستاویز یا رجسٹر وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ اس سے انہوں نے یہ مطلب اخذ کیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ پتھر مرنے والوں کے مقدر میں لکھ دیئے تھے۔ بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گارے کے ان پتھروں کو دوزخ کی آگ میں پکایا تھا اور ہر ایک پتھر پر مرنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس بات کی تائید قرآن مجید کی سورۃ المطففین کی آیات ۷ تا ۹ کے ذریعے بھی ہو جاتی ہے۔ جس میں "لکھی ہوئی کتاب" کے الفاظ آئے ہیں:

سجین

سجین کا لفظ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ "ہرگز نہیں! یقیناً بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین میں ہے اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سجین کیا ہے؟ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔" (المطففین: ۷ تا ۹)

مفسرین اس لفظ کو ایسی جگہ سے تعبیر کرتے ہیں جہاں "اشرار" کے اعمال نامے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ یہ لفظ صرف اعمال نامے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ سجین دوزخ میں ایک وادی ہے، ساتواں طبقہ جہاں شیطان جکڑا ہوا ہے، زمین کے نیچے چٹان یا ساتواں طبقہ، مقام ابلیس کے نیچے ایک جگہ ہے جہاں "اشرار" کی روحیں ہوتی ہیں، یا ایک رجسٹر جس میں جنوں اور انسانوں کے نامہ اعمال درج ہیں۔

اگر السجین سے ال کا لفظ کاٹ دیا جائے تو یہ نارِ جہنم کا نام بھی بن جاتا ہے۔

بہت سے لغت داں اسے لفظ سجن کا مترادف بھی بتاتے ہیں جبکہ سجن کا مطلب قید خانہ ہوتا ہے۔ اسی لیے امکان غالب ہے کہ علمائے جو لفظ سجین سے جگہ کا مطلب لیا ہے اس کی وجہ لغت دانوں کا قول ہی ہے۔ قرآن مجید سے ان دونوں مطالب و توضیحات کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اس لیے ہم کسی ایک مطلب حرفِ آخر کا درجہ نہیں دے سکتے۔

سچائی

دیکھیے: صدق

سچل سرمست

صوبہ سندھ کے نامور صوفی بزرگ و شاعر۔ آپ کا اصل نام عبدالوہاب ہے۔ آپ کو بچپن سے ہی سچی بات کہنے کی عادت تھی اسی لیے انھیں اس صفت کے باعث "سچو" "سچل" یا "سچیڈنہ" کہا جانے لگا۔ انہیں سچل سرمست کے نام سے زیادہ ناموری اور شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے اب وجد شیخ شہاب الدین، محمد بن قاسم کے ساتھ اس کے خصوصی مشیر کی حیثیت سے سندھ تشریف لائے تھے۔ جب سندھ کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا گیا تو انہوں نے محمد بن قاسم کو اس علاقے کی خوشحالی اور بہبودی کے لیے بے شمار مفید اور کارآمد مشورے دیے۔ جن کے باعث سندھ میں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گیا۔ جب مسلمانوں نے سیوستان موجودہ سیون شریف فتح کر لیا تو شہاب الدین کو وہاں کا عامل بنا دیا گیا۔ اس طرح سچل سرمست کے جدِ امجد سندھ میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ سچل سرمست کے والد کا نام میاں صلاح الدین تھا۔ آپ ۱۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر صرف چھ سال کی ہوئی تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ سچل سرمست کی پرورش ان کے دادا نے کی۔ ان کے دادا عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ سندھی اور پنجابی کے شاعر بھی تھے اور ان کے چچا بھی سندھی اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے بزرگوں کی صحبت میں پرورش پانے سے ان کی شخصیت کو نکھرنے اور جلا حاصل کرنے کا بہت موقع ملا۔

سچل سرمست بچپن سے ہی فقیری کی جانب مائل تھے۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ عبدالحق کے زیرِ ہدایت سلوک کی منزلیں طے کیں اور چالیس سال کی عمر میں ان سے خرقۂ خلافت حاصل کر لیا۔

آپ نے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی۔ ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء کو آپ کا انتقال ہوا، اور آپ کو درازا شریف میں دفن کیا گیا۔

سچل سرمست کے ابتدائی دور میں سندھ میں جا بجا جنگ و جدل کا دور دورہ تھا۔ سیاسی طور پر ماحول بہت پُر آشوب تھا۔ ہر جانب طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں میں خوف و ہراس اور مایوسی عام تھی۔ آپ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس زمانے میں فارسی زبان سرکاری طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ سندھ کے میروں کی زبان پنجابی تھی جبکہ اردو تمام سندھ میں سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اسی لیے سچل سرمست نے سندھی جو اُن کی مادری زبان تھی، کے علاوہ فارسی، پنجابی اور اردو کو بھی اپنی تخلیقات کا ذریعہ بنایا۔ آپ کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

سندھی: (۱) "بیت، کافیاں اور دوہے" (۲) "مرغ نامہ" (۳) "وحدت نامہ" (۴) "قتی نامہ" (۵) "مرائی"۔

پنجابی: (۱) "کافیاں اور دوہے"۔ (۲) جھولنے اور گھڑولیاں۔

اُردو: (۱) غزلیات، (۲) کافیاں

فارسی: (۱) دیوانِ آشکار (۲) راز نامہ (۳) وحدت نامہ (۴) رہبر نامہ (۵) عشق نامہ (۶) گداز نامہ (۷) وصلت نامہ (۸) تار نامہ (۹) درد نامہ۔ (۱۰) غزلِ بحرِ طویل۔

آپ فارسی کلام کے لیے آشکار تخلص کرتے تھے جبکہ سندھی کے لیے سچو اور سچیڈنہ، اور اردو کے لیے سچل سرمست کا تخلص اختیار کرتے تھے۔

سحر

دیکھیے: جادو

سحنون

ایک مشہور محدث اور فقیہ۔ آپ کا نام عبدالسلام بن سعید بن حبیب التنوخی تھا۔ آپ چونکہ بہت جلدی سے ہر ایک بات کا مطلب سمجھ لیا کرتے تھے اسی خاصیت کی بنا پر آپ کو سحنون کہا جانے لگا۔ اس نام کا ایک پرندہ بھی ہوتا ہے جو بہت بشاش اور خوش کن حرکات کرتا ہے۔ آپ کے والد سعید حمص سے ایک سپاہی کی حیثیت میں قیروان پہنچے۔ قیروان میں رہائش کے دوران میں ہی سحنون ۱۶۰ھ/ ۷۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے زمانے کے مشہور علماء خاص طور پر بہلول بن راشد سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد سحنون مزید تعلیم حاصل کرنے کے

Marfat.com

لیے تونس چلے گئے۔ وہاں انہوں نے علی بن زیاد سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے جہاں عبدالرحمٰن بن القاسم، ابن وہب اور اشہب سے جو امام مالکؒ کے پیرو تھے۔ جب سحنون قیروان سے واپس آئے تو اپنے ہمراہ موطا کے کچھ حصے لے آئے۔ یہ حصے اسد بن فرات نے خود امام مالکؒ سے سنے تھے۔
اس کے بعد سحنون نے سیاحت شروع کی اور اشہب ابن وہب کی معیت میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ بعد میں مدینہ منورہ اور شام کی سیر کو بھی گئے۔ ۱۹۱ھ میں وہ دوبارہ قیروان آ گئے اور امام مالکؒ کے مسلک کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے بڑی محنت سے ایک کتاب المدوّنہ میں امام مالکؒ کے فقہی مسائل کو جمع کیا۔ اس کتاب میں فیصلوں کی بنیاد زیادہ تر ایسے دلائل پر رکھی گئی ہے جنہیں عقلِ سلیم مان لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف مسئلوں کی تائید میں صحیح یا موضوع احادیث کو پیش نہیں کیا۔
آپ نے اس کتاب کے علاوہ اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ سحنون کا انتقال ۹ یا ۷ رجب ۲۴۰ھ کو قیروان میں ہوا۔

سخاوت

اپنے حق کو بخوشی دوسرے کے حوالے کر دینے کو سخاوت کہا جاتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں مثلاً اپنا حق کسی کو معاف کر دینا۔ اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنا یا کسی دوسرے کی خاطر اپنے جسم کی توانائی خرچ کرنا، اپنے ذہن اور دماغ کی قوت کو دوسروں کے لیے خرچ کرنا۔ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا یا کسی کو بچاتے ہوئے یا حق و صداقت کی حمایت میں جان دے دینا، سب سخاوت کے زمرے میں آتی ہیں۔
سخاوت اور فیاضی کی تعلیم بہت وسیع اور اپنے اندر بے انتہا معنویت کو لیے ہوئے ہے۔ اس تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ سخاوت کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے متقی اور پرہیزگار لوگوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے کہ "اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔" اسی طرح سورۂ بقرہ ۳ ویں آیت میں کہا گیا ہے کہ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اس میں سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خرید نہ ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش۔ اور کافر ہی ظالم ہیں۔"
اس آیت کی تلاوت کے بعد ہمیں علم ہوتا ہے کہ جو شخص سخاوت اور فیاضی سے کام لے کر خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے احتراز کرتا ہے درحقیقت وہ کفر کے نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ پھر خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی نیت کو بھی دیکھا جاتا ہے اگر وہ خلوص نیت سے یہ کام انجام دے رہا ہو یعنی اللہ کی راہ میں سخاوت کر رہا ہو تو وہ ہی درست تصور ہوگی۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ اذیت دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے، اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (سورۂ بقرہ: ۳۶) سخاوت کے بارے حضورؐ کی بھی حدیثیں ملتی ہیں حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے کہا کہ "اے بنی آدم جو مال تمہاری ضروریات سے بچ رہتا ہے اس کو صرف کرنا ہی افضل ہے اور جمع کر لینا اچھا نہیں ہے۔ البتہ اپنی ضروریات کے لیے روک لینے میں کوئی حرج نہیں اور سخاوت کی ابتدا گھر والوں سے کرنا چاہیئے۔" (مسلم)
سخاوت کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ سے دو حدیثیں مروی ہیں: (۱) آنحضرتؐ نے فرمایا "سخی اور کنجوس ان دو آدمیوں کی طرح ہوتے ہیں کہ جن کو لوہے کی زرہ پہنا دی جائے اور ان کے ہاتھ ان کے سینوں سے باندھ دیئے جائیں چنانچہ جب سخی صدقہ دے تو اس کی زرہ کشادہ ہو جاتی اور جب کنجوس ارادہ کرے تو اس کی زرہ کے حلقے ایک دوسرے سے مل جل جائیں" (بخاری، مسلم)
(۲) حضورؐ نے فرمایا کہ سخا ایک جنت کا درخت ہے لہٰذا جو شخص بھی سخاوت کرے گا دراصل اس درخت کی ایک شاخ کو پکڑے گا تو وہ شاخ اسے جنت میں لے جائے گی۔ اسی طرح کنجوسی بھی ایک درخت ہے جو جہنم میں ہے جس نے کنجوسی کی اس نے بھی اس کی شاخ پکڑ لی جو اسے جہنم میں لے جانے کا موجب بنے گی۔ (امام بیہقیؒ)
ان احادیث اور آیات سے ہمیں سخاوت کی اہمیت اور ضرورت کا بہت حد تک احساس ہو جاتا ہے۔

سخاوی

ایک مؤرخ۔ آپ کا پورا نام شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن ہے۔ لیکن سخاوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ ربیع الاوّل ۸۳۱ھ / نومبر ۱۴۲۷ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے استادوں میں ابن حجر عسقلانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ ان کی وفات کے بعد سخاوی نے حجاز کے دوسرے عالموں سے استفادہ کیا تھا آپ قاہرہ میں استاد بھی رہے۔ بعد میں مدینہ منورہ چلے گئے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے درس و تدریس کا پیشہ ترک نہ کیا۔ آپ کی وفات مدینہ میں ۹۰۲ھ / ۱۴۹۷ء میں ہوئی۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں زیادہ مشہور "الاعلان بالتوبیخ" ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر یوسف صاحب نے کیا تھا جو لاہور بورڈ نے شائع کیا ہے۔

سخی سرور سلطان

آپ کا اصل نام سید احمد تھا۔ کیونکہ کوئی بھی ضرورت مند آپ کے دروازے سے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا اسی نسبت سے لوگ انھیں سخی سرور کہنے لگے۔ آپ ملتان کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب آخری پیڑی میں حضرت علیؓ سے مل جاتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد اسحاق لاہوری سے حاصل کی۔ انھیں تصوف کی تعلیم اپنے والد سے ملی۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت غوث اعظمؒ اور شہاب الدین سہروردی سے بھی فیضان حاصل کیا۔ آپ بکریاں چرا کر گزر اوقات کیا کرتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو تلقین و درس کا سلسلہ سودھرا اور بعد میں موضع دھونکل میں شروع کیا۔ لیکن یہاں زیادہ عرصہ نہ رہے کیونکہ وطن کی یاد ستانے لگی تھی۔ چنانچہ آپ اپنے آبائی وطن چلے گئے۔ بعد میں ڈیرہ غازیخان کے ایک گاؤں شاہ کوٹ میں رہائش پذیر ہوئے۔ آپ کے معتقدوں میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی شریک ہیں۔ آپ کے ہندو معتقد اپنے آپ کو سلطانی کہتے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں سلطانیوں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گوبند سنگھ کے زمانے میں تقریباً تمام جاٹ اپنے آپ کو سلطانی کہتے تھے۔ یہ سلطانی سخی سرور کے مزار کی زیارت کو اپنی سب سے بڑی رسم گردانتے ہیں۔ یہ زیارت فروری کے

Marfat.com

اور تمام علاقوں سے سلطانی آکر آپ کے مزار کی زیارت کرتے ہیں۔ آجکل ان کے مسلمان معتقد بھی اپنے آپ کو سلطانی کہتے ہیں اور مزار کی زیارت کرنے کے لیے مخصوص دنوں میں ٹولیاں بنا کر آتے ہیں۔ ان کا عرس ہر سال ۲۸ رجمادی الاوّل کو ہوتا ہے ؛

سدوم

حضرت لوط علیہ السلام کے شہر کو سدوم کہا جاتا ہے۔ اس شہر کو فرشتوں نے الٹ دیا تھا۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "کیا ان (منافقوں) کو ان لوگوں کی خبر نہیں ملی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (یعنی) نوحؑ کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین کے لوگ اور الٹی ہوئی بستیوں (یعنی قوم لوطؑ کے دیہات) کے رہنے والے،" (سورہ توبہ۔ ۹۴)

ابتداً اس سدوم کے علاوہ چھ بستیوں کو جہاں حضرت لوطؑ کی قوم آباد تھی فرشتوں نے الٹ دیا تھا کیونکہ سدوم کے لوگوں نے ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی بدکرداریاں اور بداعمالیاں دیکھ کر اُن سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں خود سدوم کے باشندے بھی انہی بداعمالیوں کے مرتکب ہونے لگے جن کا ارتکاب ان چھ بستیوں کے لوگ کر رہے تھے۔ چنانچہ فرشتوں نے شہر سدوم کو بھی اٹھا کر الٹ دیا ؛

سراج الدین عثمان

شیخ سراج الدین عثمانؒ کمالات صوری معنوی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ آپ کی پیدائش کے سال کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ جب آپ حضرت شیخ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے تو آپ بچے سے ہی تھے۔ آپ کو سماع اور عشق و محبت کا بہت شوق تھا۔ آپ کے اصل وطن کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ لکھنوتی (بنگالہ) تھا لیکن بعض عالم اودھ کے شہر لکھنؤ کو آپ کا وطن بتاتے ہیں آپ حضرت سلطان جیؒ کے خلیفہ بھی تھے۔ سلطان جیؒ آپ پر بہت نظر کرم کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سراج الدین عثمانؒ کے بارے میں کہا کہ وہ ہندوستان کا آئینہ ہیں۔ سراج الدین نے علم باطنی مولانا فخرالدین سے باقاعدہ درس کے ذریعہ حاصل کیا۔ آپ کی وفات لکھنوتی (یا لکھنؤ) میں ۸۵۸ء کو ہوئی۔ جب آپ کو محسوس ہوا کہ وقت آخری قریب آ گیا ہے تو انہوں نے خود اپنی قبر کے لیے جگہ تجویز کی چنانچہ وفات کے بعد وصیت شدہ جگہ پر ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

سراج الدولہ نواب

اصل نام مرزا محمد تھا۔ اس کے نانا نواب علی وردی خاںؒ جو ان دنوں بنگال بہار اور اڑیسہ کے ناظم اعلیٰ تھے، انھیں سراج الدولہ کا لقب دیا جس کے بعد وہ اپنے نام کی بہ نسبت لقب سے زیادہ مشہور ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت نہایت خوبصورت اور بہترین انداز سے ہوئی۔ نواب وردی علی خاں کا اپنا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے اس نے سراج الدولہ کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔ ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں سراج الدولہ کے باپ کو دربھنگے کے پٹھانوں نے مار دیا جس کے بعد علی وردی خاں نے اسے بہار کا ناظم مقرر کر دیا اور مرنے سے پہلے ہی سراج الدولہ کی ولی عہدی کا اعلان بھی ۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو کر دیا۔ نواب علی وردی خان کی وفات کے بعد سراج الدولہ تخت نشین ہوتے ہی اپنے چچا صولت جنگ کے بیٹے شوکت جنگ پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوا۔ شوکت جنگ اُن دنوں پورنیہ کا فوجدار تھا، اور خود کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا ناظم سمجھتا تھا لیکن انگریزوں نے شوکت جنگ کی پشت پناہی کی، جس کے باعث سراج الدولہ نے فورٹ ولیم کی جانب ہی رجوع کیا۔ اس وقت تک یورپین لوگوں کو بنگال میں اپنے مقبوضہ علاقوں کی قلعہ بندی کا حق نہیں تھا لیکن انگریزوں نے کلکتے کے قلعہ کو اپنے قبضہ میں لانے کے بعد وہاں فوجی نوعیت کے سخت انتظامات جاری رکھے۔ انھی دنوں ڈھاکہ کے دیوان کے بیٹے کرشن داس کو بھی انگریزوں نے اپنی پناہ میں رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ اس پر سرکاری خزانہ سے ۵۳ لاکھ روپیہ خرد برد کرنے کا الزام تھا۔ نواب سراج الدولہ نے اس موقع پر فورٹ ولیم کے گورنر کے پاس اپنا ایلچی بھیجا اور مطالبہ کیا کہ فورٹ ولیم کونسل قلعہ بندی میں مزید اضافہ فوری طور پر روک دے، "مرہٹہ خندق" جو شہر کے اردگرد تیار کی گئی ہے، اسے بند کر دے اور کرشن داس کو واپس بھیج دے۔ لیکن انگریزوں نے اُس کے یہ تینوں مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نواب نے ہگلی کی بندرگاہ سے انگریزوں کے جہاز روانہ ہونے پر پابندی لگا دی، اور فوج کے ایک دستے کو قاسم بازار فیکٹری کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیج دیا جس نے اپنا کام احسن طریقے پر انجام دیا۔ ۴ر جون کو نواب سراج الدولہ خود بھی ہگلی کی بندرگاہ کے پاس پہنچ گیا۔ چنانچہ درلبھ رام نے ولیم واٹس کو نواب کے سامنے پیش ہونے کے لیے خط لکھا جس کے بعد وہ سراج الدولہ کے پاس حاضر ہوا۔ نواب نے انگریزوں کی روش پر اُسے سرزنش کی۔ اس پر واٹس نے مصالحانہ رویّہ اختیار کیا اور نواب کے تمام مطالبات مان لیے۔ لیکن کمپنی نے ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ڈریک نے فوج کو تیار کر کے ساگر سکھ اور قلعہ تھانہ کی طرف بھیج دیا۔ اس فوج نے دونوں جگہ نواب کی فوجوں سے شکست کھائی۔ اس کے بعد ۱۶ر جون کو نواب خود تیس ہزار سپاہیوں کی معیت میں فورٹ ولیم کے سامنے آ گیا۔ دونوں فوجوں میں زبردست معرکہ ہوا۔ انگریزی دستے پسپا ہوئے اور انگریزوں نے اپنے بیوی بچوں کو جہاز پر سوار کرا کر فرار کرا دیا۔ خود ڈریک بھی بھاگ نکلا۔ اس کے بعد ڈریک کی جگہ ہال ویل نے لے لی، اور نواب کے ساتھ صلح کرنے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۲۰ر جون کو انگریزوں کی تمام فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح نواب سراج الدولہ کی نوجیں بآسانی فورٹ ولیم میں داخل ہو گئیں۔ فورٹ ولیم کی فتح حاصل کر چکنے کے بعد ۱۶ر اکتوبر ۱۷۵۶ء کو سراج الدولہ نے راجہ رام نرائن کی مدد سے شوکت جنگ کو منہاری کے مقام پر شکست دی۔ اس جنگ میں شوکت جنگ مارا گیا۔ اس کے بعد سراج الدولہ کی فوجوں نے کلکتہ اور پورنیہ کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔ لیکن اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اسی دوران میں مدراس سے کرنل کلائیو اور واٹسن بری اور بحری فوج لے کر مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے لگے۔ راجہ مانک رام نے بھی انگریزوں کے خلاف مزاحمت نہ کی۔ اس طرح انہیں کلکتہ پر قبضہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔ جب نواب نے کلکتہ کا رُخ کرنا چاہا تو میر جعفر، درلبھ رام اور جگت سیٹھ جیسے غداروں نے انگریزوں کو خفیہ پیغامات پہنچانے شروع کر دیئے دوسری جانب سے احمد شاہ ابدالی کے حملے کی اطلاع بھی نواب کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ نواب سراج الدولہ نے فروری ۱۷۵۷ء کو معاہدۂ علی نگر پر دستخط کر دیئے، جس کی رُو سے بنگال کے تمام مقبوضات دوبارہ کمپنی کو واپس مل گئے۔ اس کے علاوہ تاوان کے طور پر انگریزوں کو سکہ سازی اور قلعہ بندیوں کے حقوق بھی دے دیئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صلح عارضی ثابت ہوئی اور پانچ ماہ کے بعد ہی یہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں جنگ شروع ہو چکی تھی جو سات سال تک جاری

Marfat.com

رہی۔ انگریزوں نے نواب کی مرضی کے خلاف فرانسیسی مقبوضات پر خود قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کچھ فرانسیسی نواب کے پاس پناہ کے لیے آ گئے جنہیں انگریزوں نے واپس مانگا۔ نواب نے انھیں دینے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں انگریزوں نے میر جعفر سے ساز باز مکمل کر لی تھی۔ چنانچہ نواب کے ساتھ انگریزوں کی جنگ تقریباً ناگزیر ہو چکی تھی اور ۱۳ جون کو کلائیو نے شمالی علاقوں پر حملہ کر بھی دیا۔ نواب سراج الدولہ نے کسی مزاحمت کے بغیر قوتوہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ نواب نے بھاگیرتی ندی کے پاس ہی ۵۰ ہزار پیدل ۱۸ ہزار سوار فوج پچاس توپوں کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ فوج کا بیشتر حصہ غدارِ اعظم میر جعفر کے ماتحت تھا۔

نواب نے انگریزوں کی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ لیکن گھیرے میں رہنے والی فوج میر جعفر کے ساتھ تھی جو خفیہ طور پر انگریزوں سے مل چکا تھا۔ اس لیے جنگ شروع ہوتے ہی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ نواب کا معتمد اور حق نمک ادا کرنے والا ساتھی میر مدن لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔ شام تک نواب کو میر جعفر کی غداری کا بھی علم ہو گیا تھا چنانچہ وہ اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا، اور مرشد آباد پہنچ گیا۔ میر جعفر نے انگریزوں کا استقبال کیا اور پلاسی کی یہ مشہور جنگ اپنے بھیانک انجام کو پہنچی۔ اس لڑائی کے بعد میر جعفر نے نواب سراج الدولہ کو گرفتار کر کے نہایت اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔

سراقہ بن عمرو

حضور ؐ کے ممتاز صحابی۔ آپ کا سلسلہ نسب کچھ یوں ہے:-

سراقہ بن عمرو بن عطیہ بن خنسا بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مالک بن النجار الانصاری۔ آپ نے حضور ؐ کے زمانے میں بیشتر غزوات میں شرکت کی۔ جنگ موتہ میں بھی آپ شریک ہوئے تھے۔ اسی جنگ میں آپ نے بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

سراقہ بن مالک

جب حضور ؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کر لی تو کفار مکہ نے آپ ؐ کو اور حضرت ابو بکر صدیق ؓ کو گرفتار کر کے لانے والے کو ایک سو اونٹ انعام میں دینے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی سُراقہ بن مالک آپ ؐ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جب وہ آپ ؐ کے قریب پہنچا تو اُس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ اس نے گرتے کے بعد ترکش سے تیر نکالے اور سوچا کہ استعمال کیا جائے یا نہیں۔ لیکن اس کے ذہن میں انعام کا لالچ زیادہ تھا اس لیے تیر زیادہ استعمال نہ کیے اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر حضور ؐ کے تعاقب میں چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اس مرتبہ گھوڑے کے پاؤں ٹخنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ چنانچہ وہ مجبوراً گھوڑے سے اترا اور فال نکالی۔ جواب نفی میں پا کر وہ سمجھ گیا کہ حضور ؐ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی مرضی شامل ہے۔ چنانچہ فوراً حضور ؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر تحریری طور پر امان کی درخواست کی۔ حضرت ابو بکر ؓ کے غلام عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر "امان کا فرمان" لکھ دیا۔ حضور ؐ نے سراقہ کو دیکھ کر کہا۔ "میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں"۔ سراقہ ؓ فوراً اسلام لے آئے۔ جب حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا تو انہوں نے کسریٰ کے کنگن بھی پہنے۔ اس طرح حضور ؐ کی دعا بھی پوری ہوئی۔ آپ نے حضرت عثمان ؓ کے عہدِ خلافت میں ۲۴ ھ میں وفات پائی۔ آپ نے حضور ؐ کی کتنی ہی احادیث بیان کی ہیں۔ سراقہ بن مالک ایک بلند پایہ عربی شاعر بھی تھے۔

سرپرستی

دیکھیے: ولایت وخصانت

سرپل

افغانستانی ترکستان کا ایک شہر جس کا نام آب سفید کے پل کے باعث سرپل مشہور ہے۔ معرب جغرافیہ دان اسے راس القنطرہ کہتے ہیں۔ ابتداءمیں PAROPAMISUS کی شمالی سرحد پر واقع پہاڑیوں دریائے جیحون کے جنوب میں واقع رتیلے میدانوں کے درمیان ایک زرخیز علاقے میں چار ازبک ریاستیں موجود تھیں جو آقچہ، شبرغان، میمنہ اور سرپل کہلاتی تھیں۔ لیکن افغانستان کے درانی اور بارک زئی امیروں نے ان کی آزاد حیثیت کو ختم کر دیا اور انہیں اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا اور چاروں ریاستوں میں سرپل سب سے آخر میں کابل کے بادشاہ کے سامنے سرنگوں ہوا۔ آج کل سرپل کو صرف ایک شہر کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ ان چاروں ریاستوں کی سیاسی حد بندیاں آج بھی برقرار ہیں۔ اس شہر میں ازبک باشندے بھی کافی تعداد میں آباد ہیں جنہیں فوجی خدمت سے مستثنےٰ کر دیا گیا۔

سرخسی

آپ کا پورا نام ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل تھا لیکن آپ کو سرخسی بھی کہا جاتا تھا۔ آپ کی پیدائش کا سال معلوم نہیں ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بخارا میں پائی۔ عبدالعزیز حلوائی آپ کے استادوں میں سے تھے۔ آپ پر زیادہ عرصہ تک حکومتِ وقت کے عتاب نازل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کو ایک کنویں میں بند کر دیا گیا۔ آپ کنویں کی منڈیر پر آ کر بیٹھ جانے والے شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے۔ ان شاگردوں نے ان کے درس کی باتوں کو لکھ لیا۔ بعد میں انہی تحریروں سے "المبسوط" نامی کتاب ترتیب دی گئی۔ یہ کتاب فقہ کے بارے میں بہت اہم تصنیف کے طور پر مشہور رہی۔ آپ نے اپنی قید کے دوران میں ہی "السیر الکبیر" کی شرح مرتب کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا انتقال ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں ہوا۔

سردار احمد خاں تپانی

آپ کا تعلق بلوچی قبیلہ تپانی سے تھا۔ یہ قبیلہ جام پور سے ڈیڑھ میل دور دریا کے کنارے ایک گاؤں لنڈی تپانی میں آباد ہے۔ یہ تمام گاؤں تپانی خاندان کی ملکیت ہے۔ سردار احمد خاں نے ابتدائی تعلیم باقاعدہ کسی مدرسے وغیرہ میں حاصل نہیں کی۔ دین و دنیا کی بھی واجبی تعلیم حاصل کی تھی۔ البتہ انگریزی، فارسی اور اردو زبانیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اردو زبان تو لکھ بھی لیتے تھے جبکہ باقی دو صرف پڑھنے تک ہی محدود تھیں۔ آپ دینی علوم کا عربی مکتب یا مدرسے سے باقاعدہ پڑھے بغیر صرف از خود مطالعہ کے ذریعے وسیع علم رکھتے تھے۔ آپ حالانکہ زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن آپ کا اپنا دل و دماغ زمیندارانہ نہیں تھا۔

سردار صاحب میں اسلام کی تبلیغ کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کے لیے آپ نے روپیہ پیسہ بے دریغ خرچ کیا۔ آپ نے ضلع ڈیرہ غازی خاں میں جہاں جہالت

Marfat.com

و بدعت کی ظلمت اور تاریکی چھائی ہوئی تھی اسلام کی تبلیغ کا کٹھن کام انجام دیا۔ ان دنوں آریہ سماج اور مرزائیت کا بہت چرچا تھا۔ سردار احمد خان صاحب نے آریہ سماج کے برہمنوں کو مناظرہ کا چیلنج کر دیا۔ چنانچہ جام پور میں یہ مناظرہ ہوا۔ اس مناظرہ کو سننے کے لئے تمام ضلع سے لوگ جوق در جوق آئے۔ اس مناظرہ کا اہتمام سردار صاحب نے ہی کیا تھا۔ جب یہ مناظرہ شروع ہوا تو مسلمانوں کی جانب سے اکیلے مولانا لال حسین صاحب نے ہی آریہ سماج کے دو چوٹی کے افراد کو مناظرے میں شکست فاش دی۔ آپ نے تبلیغی کام کو منظم کرنے کے لیے لاہور، دیوبند اور دہلی کا سفر بھی کیا۔ اور مختلف علماء سے اس موضوع پہ بات چیت کی۔ آپ نے تبلیغ دین کی تحریک کا آغاز ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ/ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ڈیرہ غازیخان میں کیا۔ اس دن بہت سے دین کے مبلغوں کا اجتماع آپ کے دولت خانے پہ ہوا۔

وفات سے ایک سال پہلے آپ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ آپ نے مقامی حکیموں اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا لیکن طبیعت بحال نہ ہو سکی۔ بالآخر ۲۵ نومبر ۱۹۶۰ء کو جمعہ کے روز انتقال کر گئے۔

آپ نے ترکہ میں تقریباً پون لاکھ روپیہ نقد چھوڑا، جو اُن کی وصیت کے مطابق تعلیمی اور تبلیغی اداروں میں تقسیم کر دیا گیا۔

سرقسطہ

ہسپانیہ کا ایک شہر جو اپنے ہی نام کے موجودہ صوبے کا صدر مقام ہے۔ پرانے زمانے میں یہ شہر سلطنت ارغون کا دارالحکومت تھا۔ یہ شہر دریائے ابرو ABRO کے دائیں کنارے پر آباد ہے۔ سطح سمندر سے اس کی اونچائی چھ سو فٹ ہے۔ اس شہر کے ارد گرد کا علاقہ سر سبز ہے۔ کیونکہ اس علاقے میں پانی کی بہتات ہے جس کے باعث زراعت آسان ہے۔ آج کل اس شہر کا نیا نام رکھ دیا گیا ہے جو زاراگوزا ZARAGAZA ہے جو پرانے زمانے کے لاطینی نام سے اخذ کیا گیا ہے۔ شہر کا یہ نیا نام عربی میں سرقسطہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں دوبارہ آنے سے پہلے اندلس کی اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں سرقسطہ کی آبادی بہت گنجان تھی۔ اس شہر میں ایک فصیل بنی ہوئی تھی اس فصیل کا رنگ سفید تھا۔ اسی لئے سرقسطہ کو المدینۃ البیضا یعنی سفید شہر بھی کہا جاتا تھا۔ اس شہر کو مسلمانوں نے ۹۴ھ/ ۷۱۲ء میں فتح کیا تھا۔ سرقسطہ کے باغات کے پھل تمام اندلس میں مشہور تھے اور بہترین پھلوں میں شمار ہوا کرتے تھے۔ یہاں پر اودبلاؤ کی کھال سے بنائے ہوئے گریبان اور کالر تمام اسلامی ممالک میں مشہور تھے۔ ۱۱۱۹ء میں یہ شہر دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ آج کل اس شہر میں مسلمانوں کے دور کی بہت کم یادگاریں باقی رہ گئی ہیں۔ سرقسطہ میں موجود قدیم ترین جامع مسجد کی جگہ سیو (SEO) کا گرجا تعمیر کیا جا چکا ہے۔ آج کل اس شہر میں مسلمانوں کی سب سے اہم یادگار ایک محل ہے "الجعفریہ" کہا جاتا ہے۔

سرقسطہ میں پیدا ہونے والے مشاہیر میں ایک بہت بڑے محدث ابو علی حسین بن محمد بن فیرہ بن حیون الصدفی بھی شامل ہیں۔ یہ عام طور پر ابن سکرہ کے نام سے مشہور ہیں۔

سرقہ

دیکھئے: چوری

سرمد

ایک صوفی شاعر۔ اصل نام محمد سعید تھا۔ ۱۶۱۸ء میں کاشان کے یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ خاندانی روایات کے مطابق سرمد نے مذہبی تعلیم ایک مذہبی درس گاہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے طور پہ عربی اور فارسی زبان اور ادب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سرمد نے عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ لیکن اپنے مطالعہ سے مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ اسی غرض سے اصفہان آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد اس وقت کے دو بڑے عالموں ملا صدرا شیرازی اور ملا ابو القاسم فندرسکی سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اصفہان میں ہی وہ مشرف بہ اسلام ہوا اس کے بعد ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شامل ہو کر ٹھٹھہ آ گیا۔ اس وقت کے عہد میں ٹھٹھہ سندھ کا صدر مقام تھا۔ یہاں اسے کسی سے محبت ہو گئی جس کے عشق نے اس کی دنیا ہی بدل دی۔ اس واقعہ کے باعث اسے عالمی شہرت بھی ملی۔ سرمد نے اپنی تمام دولت غریبوں میں تقسیم کر دی۔ پھر ٹھٹھہ سے لاہور آیا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد دہلی چلا گیا۔ بعد میں ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۶ء میں وہ حیدر آباد (دکن) چلا گیا جہاں گولکنڈہ کے حاکم نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور اسے اپنا مرشد بنا لیا لیکن داراشکوہ کے قتل ہو جانے کے بعد سرمد کے مخالف عالموں نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ چنانچہ سرمد کو گرفتار کر کے ملا قوی، جو قاضی شہر تھا، کی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے اُسے سزائے موت کا حکم سنایا۔ سرمد کو جامع مسجد کے عین سامنے سرعام پھانسی پہ لٹکا دیا گیا۔ بعد میں اس کا مزار بھی اسی مقام پہ بنایا گیا۔

سری بن منصور

سری بن منصور "ابو سرایا" کے نام سے زیادہ معروف تھا کیونکہ وہ گدھوں کو کرائے پہ چلایا کرتا تھا۔ بعد میں یزید بن مزید بن الشیبانی کے ہاں ملازمت اختیار کر لی جس نے اسے اپنی فوج

اختیار کر لی جس نے اُسے خرمیوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیا جب الامین اور المامون کی خانہ جنگی شروع ہوئی تو وہ ہرثمہ کا ساتھی بن گیا جس نے اسے اپنی فوج کے ایک دستے کا سالار مقرر کر دیا۔ جب ہرثمہ نے اسے بیس ہزار درہم کی غیر معمولی رقم دے کر حج پہ جانے کی اجازت دی تو اس نے وہ تمام دولت اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دی، اور خود حج کے سفر پہ روانہ ہو گیا۔ اس نے راستے میں مسافروں کو گرفتار کر کے ان سے رہائی کا فدیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح حج کے اخراجات پورے کرنے لگا۔ جب ہرثمہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے کچھ فوج اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجی جسے سری بن منصور نے باآسانی شکست دی۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل راستے سے ہٹ کر صحرا کی جانب ہو گیا جہاں رقہ پہنچنے پہ وہ محمد بن ابراہیم طباطبا العلوی سے ملا اور اس کا حامی بن گیا۔ یہاں سے اس نے ایک کشتی میں بیٹھ کر دریائے فرات کے راستے کوفے جانے کا پروگرام بنایا۔ کوفے پہنچ کر اس نے ابن طباطبا کو ذاتی رنجشوں کے باعث زہر دے کر ہلاک کر دیا اور اس کی جگہ محمد بن محمد بن زید کو مامور کر دیا۔ اس طرح کوفے کے تمام اختیارات سری بن منصور کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس کے بعد اس نے بصرہ اور واسط کی تسخیر کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بھی اپنی پسند کے حاکم مقرر کر دیے۔ ہرثمہ نے اسے اس بغاوت کا مزا چکھانے کے لیے فوج مدائن بھیج دی جس

Marfat.com

سری بن منصور کی فوجوں کو شکست دی۔ سری بن منصور کوفے میں محصور ہو کر رہ گیا۔ جب اس کے ساتھیوں کے حوصلے پست ہونے لگے تو وہ ۲ ہزار سواروں کو لے کر سوسہ کی طرف بھاگ نکلا۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ حسن بن علی المامونی کی فوجوں سے ہوگئی۔ لڑائی میں اس کے ساتھی مقابلہ نہ کر سکے اور سری بن منصور گرفتار کر لیا گیا۔ اسے خلیفہ المامون کے پاس بھیج دیا جو اس وقت نہروان میں مقیم تھا۔ اس نے سری بن منصور کو موت کی سزا دی۔ چنانچہ ۱۰ ربیع الاوّل ھ/ ۱۸ اکتوبر ۸۱۵ء کو اس کا سر قلم کر دیا گیا اور بغیر سر کے دھڑ کو بغداد کے پل پر لٹکا دیا گیا۔ سری بن منصور بغاوت کو دس ماہ تک جاری رکھ سکا تھا۔

سترجبیہ

اصولِ فقہ کا ایک بہت پرانا مسئلہ۔ اس کا شمار ان مسئلوں میں ہوتا ہے جو وضع کرنے والوں کے نام سے موسوم ہیں۔ (جیسے الغزالی، حنبلی، ابن سریج وغیرہ)۔ اس مسئلہ کی رو سے "یمین بالدائرہ" سے کام لے کر کسی بھی ایسے حلفیہ معاہدے کو منسوخ کیا جا سکتا ہے جس میں معاہدہ کرنے والا اس بات کا عہد کرے کہ اگر وہ اپنے عہد سے پھر جائے تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہ مسئلہ ابن سریج نے وضع کیا تھا اسی اعتبار سے سترجبیہ کہلایا۔

سریکتِ اسلام

انڈونیشیا کی ایک سیاسی جماعت جس کی بنیاد سوروکارتا (جاوا) میں ڈالی گئی۔ مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا، غیر اسلامی دل... بدعت اور فرسودہ رسم و رواج کی بیخ کنی، اسلامی اخوت، رواداری اور باہمی اسلامی اتحاد کو فروغ دینا، ملک میں بسنے والے لوگوں کی تعلیمی اور ذہنی ترقی کے لیے کام کرنا اور صنعت و تجارت کو فروغ اور عوام کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا، اس جماعت کے بنیادی مقاصد تھے۔

اس جماعت کے وجود میں آنے کے بارے میں ایک معمولی سے واقعہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو ۱۹۱۱ء میں ظہور پذیر ہوا۔ جاوا کے نواح میں ایک قصبے لاوین میں بہت سے جاوی تاجر اور سوداگر رہتے تھے۔ یہاں چینی سوداگروں اور جاویوں میں بہت مقابلہ تھا۔ ایک چینی کونگسی (KONGSI) کمپنی کی بددیانتی کا قصہ زبان زدِ عام ہو گیا۔ اس موقع پر جاوی تاجروں نے متحد ہو کر چینی مال و اسباب کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ اسی وقت تاجروں نے متحد ہو کر ایک جماعت "سریکتِ دکانگ اسلام" یعنی اسلامی تاجروں کی جماعت تشکیل دی تھی چینی مال و اسباب کے مقاطع کی تحریک کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کے باعث عام لوگ بھی اس میں شامل ہونے لگے۔ چنانچہ لاوین کے تمام مسلمانوں نے متحد ہو کر ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کا نام انہوں نے "سریکت اسلام" یعنی اسلامی جماعت رکھا۔

اس جماعت کی تاریخ کو لوگ عام طور پر تین ادوار میں بانٹتے ہیں:

ا۔ پہلی قومی کانگرس تک کا دور۔

ب۔ قومی کانگرس کے عروج کا دور۔

ج۔ انتہا پسند سریکت رعایا کے قیام سے قبل سریکت اسلام کے زوال کا دور۔ سریکتِ اسلام اپنی بعض خامیوں کے باعث زوال پذیر ہوئی جس کی وجہ اقتصادی میدان میں ناکامیاں تھیں۔ جاویوں میں مالی تربیت مفقود تھی۔ اس لیے اقتصادی سرگرمیوں کو نقصان پہنچا۔ اس کے علاوہ بعض رہنماؤں نے سریکت اسلام کا سرمایہ اپنی ذاتی منفعتوں میں خرچ کر دیا تھا۔

بہر حال سریکت اسلام نے کچھ نہ کچھ مثبت کام بھی سرانجام دیئے تھے۔ سریکت اسلام کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی اصلاح کا کام جمعیت المحمدیہ نے سنبھالا جو انڈونیشیا کی آزادی کے بعد ملک کی سب سے بڑی اسلامی جماعت ماشومی سے وابستہ ہو گئی۔

سری السقطی

ایک صوفی بزرگ۔ آپ کا پورا نام ابوالحسن بن مغلس ہے۔ آپ حضرت جنیدؒ کے ماموں اور نوری، خرّاز اور خیر نسّاج کے مرشد تھے۔ صوفیوں کے قدیم اسنادِ خرقہ میں آپ کا ذکر حضرت معروف الکرخیؒ اور حضرت جنیدؒ کے درمیان کیا گیا ہے۔ حضرت جنیدؒ آپ کے مرید تھے اسی لیے وہ اپنی خواہش کے مطابق سری السقطیؒ کے مقبرے میں ہی مدفون ہیں۔ آپ کی وفات بغداد میں ۲۸ رمضان ۲۵۷ھ / ۸۷۰ء یا ۲۵۳ھ / ۸۶۷ء کو ۸۸ یا ۹۸ سال کی عمر میں ہوئی۔ آپ کا مقبرہ شونیزیہ میں آج بھی موجود ہے۔

سری السقطیؒ اپنے عقائد کے مطابق المحاسبی کے شاگرد تھے۔ عقائد کے لحاظ سے وہ ایک ایسی دو طرفہ محبتِ حقیقی پر زور دیتے نظر آتے ہیں جو خدا کو بندے سے ملا دیتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عشقِ حقیقی کو پا لینے کے بعد کسی جسمانی تکلیف کا احساس باقی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ قیامت کے روز عاشقوں کا مقام موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی امتوں سے بلند تر ہوگا۔ آپ پر امام حنبل نے اس لیے اعتراض کیا ہے کہ وہ قرآن مجید کو مخلوق مانتے تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں زہد سے کام نہیں لیا کرتے تھے۔

سریہ موتا

دیکھیے: جنگِ موتا

سزا

دیکھیے: حد، حساب، تعزیہ، عقوبت

سعادت

نیک بختی۔ یہ لفظ اسلام کے بہت سے تصورات کے ساتھ مختلف النوع صورتوں میں وابستہ ہے۔ عام انداز میں اس لفظ کے معنی نیک فال اور خوش نصیبی کے لیے جاتے ہیں۔ اس لفظ کے بہت سے مفاہیم ہیں لیکن یہ لفظ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث میں ضرور آیا ہے۔

"اللہ سعادت کے کاموں میں اہلِ سعادت کی مدد کرتا ہے۔" (بخاری مسلم)

دربار کی اصطلاح میں اس لفظ سے شان و عظمت لیے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ کا ایک نام "در سعادت" بھی تھا۔ اس کے علاوہ ترک عہدے داروں کا ایک خطاب "سعادتلو" بھی تھا۔ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب الفوز الاصغر میں لفظ سعادت کو نفس کی ایک حالت بیان کیا ہے۔ بقول ان کے، یہ حالت اس صورت میں

Marfat.com

حاصل ہوتی ہے جب نفس [illegible] کی طرف رجوع کرے، اس سے زہد اختیار کرے [illegible] ۔ ابن مسکویہ نے یہ بھی کہا ہے کہ سعادت حاصل کرنا حکمت پہ منحصر ہے اور حکمت نظری و عملی ہے، جو انفرادی اور اجتماعی امور میں عدل کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں بار بار سعادت کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس سے مراد اطمینانِ نفس کے علاوہ فوز و فلاح کو بھی لیا ہے۔

سعدان

سعدان سے مراد دو مشہور ستارے زہرہ اور مشتری ہیں۔ یہ لفظ زحل اور مریخ کے متضاد کے طور پہ استعمال ہوتا ہے۔ مشتری کو سعد الاکبر کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ جو شخص اس کے زیر سایہ پیدا ہوگا وہ آئندہ زندگی میں خوش و خرم رہے گا۔ وہ عبودیت، خدا کے خوف، راستبازی اور زہد و اتقا میں امتیازی حیثیت کا مالک ہوگا۔ زہرہ کو سعد الاصغر کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اس کے زیر سایہ پیدا ہونے والا آدمی اپنی زندگی میں خوش بختی اور تمام دنیوی مسرتیں حاصل کرنے میں کامیابی کی توقع رکھ سکتا ہے۔

سعد الدین حموی

سعد الدین حموی بن محمد بن المؤید بن ابی الحسن بن محمد حمویہ ۵۸۷ھ/ ۱۱۹۱ء یا ۵۹۵ھ/ ۱۱۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خاندانِ حموی کا ایک قصبے حما کے نام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ الیافعی کہتے ہیں کہ آپ دراصل بحوین کے رہنے والے تھے۔ سعد الدین اپنی جوانی کے زمانے میں خوارزمی درویشوں کی ایک جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ جماعت ایک مقتدر صوفی نجم الدین کبریٰ کے زیر اثر قائم ہوئی تھی۔

سعد الدین اپنے زمانے کے مشہور و معروف صوفیہ کے گروہ میں سے ایک تھے۔ الیافعی نے بھی اپنی کئی کتابوں میں ان کی کرامتوں اور ان کے مریدوں کا ذکر کیا ہے، انہوں نے ان کے ملفوظات بھی نقل کیے ہیں۔ ایک کتاب جو مناقب و کرامات سے متعلق ہے میں الیافعی نے لکھا ہے کہ سعد الدین کی روح تیرہ دن تک ان کے جسم سے الگ رہی۔ سعد الدین نے فارسی اور عربی میں بے شمار صوفیانہ نظمیں اور رباعیات لکھی ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں تصوف کے بارے میں شائع ہونے والے کئی رسائل کے مصنف تھے۔ آپ نے شام میں جبل قاسیون کے مقام پہ کافی عرصہ تک گمنامی کی زندگی بسر کی۔ بعد میں خراسان کی جانب مراجعت کی اور بحر آباد میں رہائش اختیار کرلی۔ آپ کا انتقال ۱۰ ذی الحجہ ۶۵۸ھ/ ۱۰ نومبر ۱۲۶۰ء کو ہوا۔ آپ کا مزار آج بھی بحر آباد میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

سعد الدین کوپک

ایشیائے کوچک کی ایک اہم شخصیت۔ اس کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے مذہب اسلام خود اختیار کیا تھا۔ لیکن اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے والد کا نام محمد بتایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور حسب و نسب کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ علاؤ الدین کے عہد حکومت میں سعد الدین سلطنت کی ایک اہم شخصیت مانا جاتا تھا۔ ایک سرائے جو قونیہ سے تین گھنٹے کی مسافت پہ واقع ہے کے بارے میں مشہور ہے کہ سعد الدین کوپک نے بنوائی تھی۔ اس کا اندرونی حصہ علاؤ الدین کے دورِ حکومت کے آخری سال ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ بعد میں غیاث الدین کیخسرو کے دور میں سعد الدین کا کردار خاصا اہم نظر آتا ہے۔ وہ غیاث الدین کے ساتھ وابستہ تھا اور اسی کے زیر اثر یہ واقعہ بھی رونما ہوا۔ کہ حسام الدین قیرخان کو جو سیواس کا والی تھا اور جو سلجوقیوں کے دامن میں پناہ گزین تھا، کو عز الدین کی حمایت کرنے کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خوارزم کے امیروں نے جو اس وقت ایشیائے کوچک میں رہائش پذیر تھے، ہزاروں خوارزمیوں کی مدد سے سلطنتِ سلجوق کو تباہ و برباد کر دیا اور خود شام اور عراق کی جانب چلے گئے۔

سعد الدین کی تعمیر کردہ سرائے لوگوں میں زنانہ دین خانی کے نام سے مشہور ہے۔ اس سرائے کے بیرونی دروازے پہ ۶۴۳ھ کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے جو غیاث الدین کی جانب سے پیش کیا گیا تھا۔

سعد بن ابی وقاص

ایک نامور سپہ سالار اور صحابیٔ رسولؐ۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ آپ کا نام سعد اور کنیت ابو اسحاق ہے، سعد بن ابی وقاص کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ اسی لیے کئی مواقع پہ رسولِ اکرمؐ آپ کو ماموں کہہ کر بھی مخاطب کر لیا کرتے تھے۔ آپ اسلام کے آغاز میں ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں بعض علماء انہیں چھٹے اور بعض چوتھے مسلمان قرار دیتے ہیں۔ قبولِ اسلام کے وقت آپ کی عمر ۱۷ سال تھی۔ آپ نہ صرف تمام غزوات میں بھی شریک رہے۔ بلکہ اسلام اور کفر کے تقریباً ہر معرکے میں شامل ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں خالدؓ بن ولید کے واپس چلے جانے کے بعد الحیرہ میں المثنیٰ بن حارثہ نے فوج کی قیادت سنبھال لی۔ لیکن جب ایرانیوں کے حملہ کر دینے کا خطرہ محسوس ہوا تو حضرت عمر فاروقؓ سے کمک کی درخواست کی۔ اس پر حضرت عمرؓ پہلے تو فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے تیار ہو گئے لیکن بعد میں آپ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو سپہ سالارِ اعظم کا عہدہ سونپ دیا۔ اس کے بعد آپ نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ ایرانیوں پہ چڑھائی کر دی اور قادسیہ کے مقام پہ پڑاؤ ڈال دیئے۔ یہاں ۱۶ھ میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سعدؓ خود عملی حصہ نہ لے سکے کیونکہ وہ بیمار تھے۔ لیکن اپنی فوجوں کو برابر احکامات اور جنگی نقل و حرکت کے بارے میں ہدایات جاری کرتے رہے۔ بالآخر ساسانی سپہ سالار رستم کے مارے جانے کے بعد یہ جنگ ختم ہو گئی اور ایرانی شکست کھا کر مدائن کی طرف کوچ کر گئے۔

یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہے۔ لیکن ایرانی زیادہ عرصہ تک مدائن پہ بھی قابض نہ رہ سکے اور ساسانی بادشاہ یزدگرد کو یہاں سے بھی بھاگ جانا پڑا۔ اس کے بعد سعدؓ اس شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں سے آپ کو بے شمار مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا۔ آپ نے مدائن کو ہی اپنا عارضی طور پہ صدر مقام بنا لیا۔ اس سال حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے ایرانیوں کو جلولا کے مقام پہ شکستِ فاش سے دوچار کیا اور اس کے قریب ہی کوفے کی بنیاد رکھ دی۔ حضرت سعدؓ نے کوفے آکر فوجی چھاؤنی قائم کر دی۔ یہ مسلمانوں کی پہلی چھاؤنی تھی۔ یہ نیا شہر تیزی سے ترقی کی جانب منازل طے کرنے لگا تو خلیفہ حضرت عمرؓ نے سعدؓ

Marfat.com

کو اس شہر کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہاں آپ نے طاقِ خسرو سے ملتا جلتا ایک محل تعمیر کرایا۔ جسے حضرت عمرؓ نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو سادہ زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو ۲۰ھ/۶۴۱ء میں اس عہدے سے برخاست کر دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے آپ کی عظیم الشان فوجی اور انتظامی خدمات کا شایانِ شان اعتراف کیا۔ جب حضرت عمرؓ بستر علالت پر تھے تو انھوں نے نئے خلیفہ کا چناؤ کرنے کے لیے جن چھ صحابہ کرام کو منتخب کیا تھا اُن میں سے ایک آپ بھی تھے۔

بعد میں حضرت عثمانؓ نے سعدؓ بن ابی وقاص کو دوبارہ کوفے کی گورنری سونپ دی لیکن سعدؓ زیادہ عرصہ تک گورنر نہ رہے بلکہ جلد ہی انھیں ایک بار پھر برخاست کر دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد آپ نے سپاہیانہ زندگی سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی، اور بقیہ زندگی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر گزار دی۔ ایک روایت کے مطابق آپ کا انتقال ۵۰ھ/۶۷۱ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا۔ آپ نے اپنے پیچھے کچھ ترکہ بھی چھوڑا تھا۔ آپ کو مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

سعد بن حبتہ

حضورؐ کے مشہور صحابی۔ آپ کا نام سعد تھا۔ حبتہ آپ کی والدہ کا نام تھا جو آپ کے نام کے ساتھ بطورِ ابن کے لگایا جاتا ہے۔ آپ نے پندرہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا تھا۔ جب غزوہ خندق ہوا تو آپ کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ آپ نے اس غزوہ میں بھرپور شرکت کی۔ حضورؐ نے بھی آپ کی بہادری اور جانبازی دیکھ کر اُن کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ سعد بن حبتہ نے اپنی وفات کے بعد تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی۔ آپ حنفی فقہ کے دستِ راست کے طور پر مشہور ہیں۔ اسلام کے پہلے قاضی بھی آپ ہی تھے۔ امام ابو یوسفؒ آپ کی اولاد میں سے ہی ہیں۔ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ نے کوفہ میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں ہی آپ کا انتقال ہوا۔

سعد بن ربیع

خزرج قبیلہ کے سردار اور حضور کے ممتاز صحابہ میں سے ایک تھے۔ آپ بیعت عقبہ اولیٰ میں مسلمان ہوئے۔ آپ کا نام اسلامی بھائی چارہ کا بہترین مظاہرہ کرنے والے انصاروں میں شامل ہے۔ آپ نے اپنے تمام مال و دولت، جائیداد وغیرہ میں سے آدھا حصہ مہاجرین کو دے دیا تھا، بلکہ آپ اس کام میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک بیوی بھی حضرت عبدالرحمٰنؓ مہاجر کو پیش کر دی تھی۔ لیکن انہوں نے اس پیش کش کو بصد احترام شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ آپ کتابت بھی بہت اچھی کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہؓ بھی آپ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ غزوہ احد میں آپ نے شرکت کی۔ دشمنوں کے ساتھ لڑائی میں آپ کے نیزوں سے بارہ زخم لگے۔ آپ نے اسی لڑائی میں جامِ شہادت نوش کیا۔ آپ کو ان کے چچا خارجہ بن ابی زبیر کے ساتھ ہی، ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

سعد بن زید

ایک مشہور صحابی۔ آپ کا نام سعد بن زید انصاری الاشہلی تھا۔ ابن اسحاق کہا کرتے تھے کہ سعدؓ بن زید کا سلسلہ نسب سعد بن زید بن مالک بن عبید بن کعب بن عبید الاشہل ہے۔ آپ نے غزوہ بدر میں شرکت کی تھی۔ اس کے بعد بھی ہونے والے کئی غزوات میں شریک ہوئے اور حضور کے ہمرکاب رہے۔ جنگِ عقبہ میں بھی آپ شریک ہوئے اور اس میں بہادری اور جانبازی کے خوب جوہر دکھائے۔

سعد بن عائذ

آپ حضرت عمارؓ بن یاسرؓ جو مشہور صحابی تھے، کے غلام تھے۔ عام طور پر سعدؓ بن القرظ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ حضورؐ نے انھیں مقامِ قبا میں مؤذن مقرر کیا۔ جب حضورؐ کا وصال ہو گیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دینا ترک کر دیا۔ اس وقت ابوبکر صدیقؓ نے سعد بن عائذ کو مسجدِ نبویؐ میں اذان دینے کا کام سونپ دیا۔ یہاں آپ اپنے انتقال سے قبل تک اذان دیتے رہے۔ بعد میں آپ کی اولاد اور ورثاء نے اذان دینے کا کام کیا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے انھیں اذان دینے کے لیے قبا سے مدینہ بلایا تھا۔

سعد بن عبادہ

حضورؐ کے صحابی۔ آپ کا نسب سعد بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ بن ابی حزیمہ بن ثعلبہ بن طریف ہے۔ سعدؓ بن عبادہ ایک متمول شخص تھے اور ان کا شمار زمانۂ جاہلیت میں عرب میں لکھنا جاننے والے لوگوں میں ہوتا تھا۔ آپ بہترین تیراک اور تیرانداز کے طور پر بھی مشہور تھے۔ آپ جنگِ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ البتہ جنگِ احد میں شریک ہوئے۔ آپ نے حضرت سعد بن معاذؓ کے ساتھ مل کر حضور کی تیمارداری بھی کی تھی۔ کیونکہ اس جنگ میں حضورؐ کا دندان مبارک شہید ہو گیا تھا اور زخم بھی آئے تھے۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے غزوات میں ایک جانباز سپاہی کے طور پر شرکت کی۔ کئی مرتبہ آپ کو علم کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ آپ کو سخاوت میں بھی خاص امتیاز حاصل تھا۔ جب قبیلہ بنو نضیر کا محاصرہ کیا گیا تھا تو محاصرے کے دوران میں اپنے خرچ پر کھجوریں لا کر مسلمانوں میں تقسیم کیں۔ اسی طرح بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے والی فوجوں کو انہوں نے سامانِ رسد فراہم کیا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض لوگوں نے آپ کو جانشین مقرر کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ کے وصال کی خبر مدینے میں مشہور ہوئی تو اوس اور خزرج کے قبیلے جمع ہو گئے اور سعدؓ بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہو گئے۔ لیکن اسی وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ چنانچہ اجتماع نے معمولی سی بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت سعد بن عبادہ اس کے بعد سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے، اور شام کی طرف ہجرت کر گئے جہاں آپ کا انتقال ۱۵ھ/۶۳۷ء میں ہوا۔

Marfat.com

سعد بن مالک

ایک ممتاز صحابی۔ آپ کا نسب کچھ یوں ہے۔ سعد بن مالک بن منان بن جلید بن ثعلبتہ بن الابجر۔ آپ کی کنیت "حسن ذری" مشہور ہے۔ آپ حضورؐ کے ساتھ کئی غزوات میں شامل ہوئے۔ آپ غزوہ خندق میں بھی شامل تھے۔ آپ ایک بلند پایہ عالم اور فاضل شخص تھے۔ آپ کو حضورؐ کی بہت سی حدیثیں یاد تھیں۔ آپ کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا۔

سعد بن معاذ

ایک ممتاز اور جلیل القدر صحابی۔ آپ کا تعلق بنی اوس سے تھا۔ آپ مدینہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سعد بن معاذ رضؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد بنو عبدالاشہل بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ حضور نے آپ کا لقب سید الانصار یعنی انصار کا سردار، رکھا تھا۔ آپ کا شمار اپنی قوم کے پیشوا اور اکابر صحابہ میں کیا جاتا ہے۔ آپ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استقلال اور جوانمردی سے کھڑے رہے۔ جنگ خندق میں بھی آپ شریک تھے۔ جنگ کے دوران آپ کی آنکھ میں تیر لگا جس سے ایک ماہ تک خون جاری رہا۔ بعد میں آپ اسی زخم کے باعث ذیقعد ۵ھ میں صرف ۳۷ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔

سعد، بنو

مراکشی شاہی خاندان کا نام۔ یہ خاندان ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء تا ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء وطاس خاندان کے بعد فاس پر حکمران ہوا۔ ان دنوں پرتگالیوں اور ہسپانویوں نے اندلس اور شمالی افریقہ

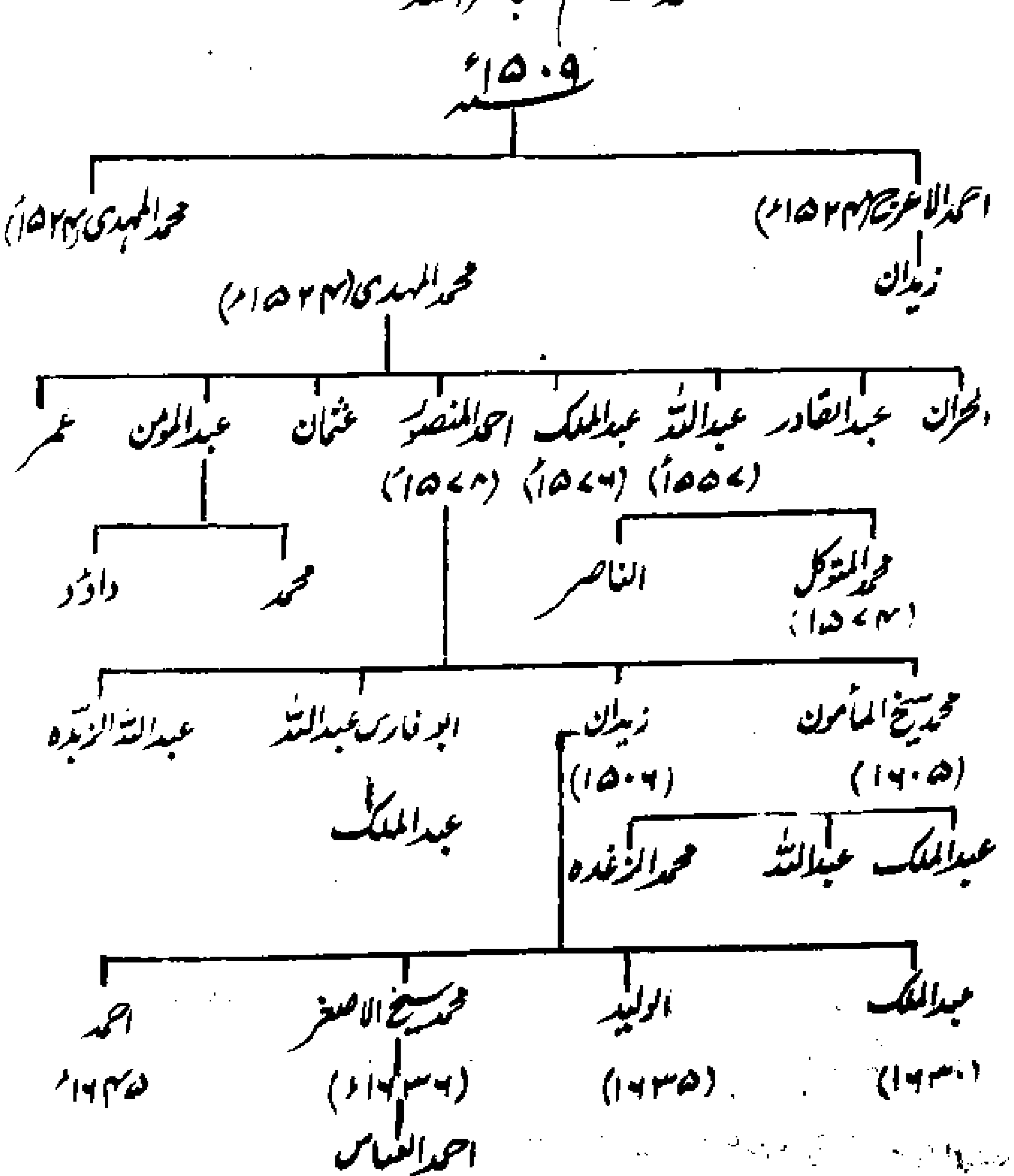

نوٹ: قوسین میں جو سنین لکھے ہیں وہ حکمران کے پہلے اعلان تخت نشینی کو ظاہر کرتے ہیں۔

کے اسلامی ملکوں کے خلاف زبردست مہمات کا آغاز کر رکھا تھا۔ ان دنوں بیشتر خاندان جو اپنی مدافعت نہ کر سکے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ خاندان بنو سعد کا سب سے پہلا شخص جو برسر اقتدار آیا اس کا نام محمد الملقب بہ المہدی والقائم بامر اللہ تھا اس نے الوہال کے علاقہ الماحر میں ۹۲۳ھ / ۱۵۱۷ء یا ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ اس کے دونوں بیٹے احمد الاعرج اور محمد ملقب بہ مہدی اس کے جانشین ہوئے انہوں نے دارالسلطنت تارودانت کے مقام پر اپنا مضبوط مرکز بنا لیا تھا۔ کیونکہ انہیں عیسائیوں کے حملے کا شدت کے ساتھ احساس تھا۔

خاندان بنو سعد کے آخری حکمران احمد العباس کو حکمران ہونے کا اعلان کرنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ محمد شیخ الاصغر نے ۱۶۵۴ء تک حکومت کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ خاندان بنو سعد کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ حکومت ختم ہو گئی اس خاندان کے مختلف لوگوں کی ترتیب جانشینی یہ تھی۔

(۱) القائم بامر اللہ ۹۱۵ھ ۱۵۰۹ء جب بادشاہ بنا (۲) محمد المہدی اپنے بھائی سمیت ۱۵۲۴ء جب بادشاہ بنا (۳) محمد المہدی ۱۵۵۴ء (۴) عبداللہ ۱۵۵۷ء (۵) المتوکل ۱۵۷۴ء (۶) عبدالملک ۱۵۷۶ء (۷) احمد المنصور ۱۵۷۸ء (۸) ابو فارس عبداللہ زیدان ۱۶۰۳ء (۹) عبدالملک بن زیدان ۱۶۲۳ء (۱۰) الولید ۱۶۳۱ء (۱۱) محمد شیخ الاصغر ۱۶۳۶ء تا ۱۶۵۴ء اس کے بیٹے احمد العباس کو بادشاہ بننے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

سعد زاغلول پاشا

سعد زغلول پاشا مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں ابیانہ میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ اس کے والد کا نام ابراہیم زغلول تھا۔ وہ ایک کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ جب سعد زغلول چھ سال کا ہوا تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش اس کے بڑے بھائی نے کی۔ سعد زغلول نے پانچ سال تک مکتب میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں اس نے پڑھنا لکھنا اور حساب کتاب سیکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کر لیا۔ بعد میں علم نحو اور فقہ کی تعلیم جامع الدسوقی میں حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامعہ الازہر چلے گئے۔ اس وقت یہ ادارہ علوم اسلامیہ کا بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ سعد زغلول شیخ محمد عبدہ کا شاگرد تھا۔ اسی لئے ان کے افکار و خیالات کا بھی دل و جان سے حامی تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں سید جمال الدین افغانی بھی مصر تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ سعد زغلول ان کے اصلاحی خیالات سے مستفید ہوئے۔ اسی لئے مصر کی تحریک آزادی میں سعد زغلول نے خوب خوب تقاریر کیں اور عملی حصہ لیا۔ جب ۱۸۸۰ء میں شیخ محمد عبدہ الوقائع مصری کے مدیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے زغلول کو بھی مجلس ادارت میں شامل کر لیا۔ یہ ملازمت تقریباً دو سال تک جاری رہ سکی۔ کیونکہ ان پر اعرابی پاشا کی بغاوت میں شریک ہونے کا الزام لگا کر قید کر لیا گیا تھا زغلول کو تین ماہ تک قید میں رکھا گیا جب کہ شیخ محمد عبدہ کو ملک بدر کر دیا گیا قید سے رہائی حاصل کرنے کے بعد زغلول نے وکالت کی تعلیم شروع کی اور کامیابی کے بعد وکالت شروع کر دی اس پیشہ میں اسے قانونی قابلیت اور معاملہ فہمی کے باعث اسے مصری عدالتوں کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں سعد زغلول کو وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں مصر کے تمام سکول اور مدرسے سیاسی تحریکوں کا گڑھ بنے ہوئے تھے ان کے نظم و نسق کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ زغلول نے بڑی محنت اور لگن سے ان مسائل پر قابو پایا۔ اس کے دور وزارت کا نا؟

Marfat.com

ترین کارنامہ انگریزی کی بجائے عربی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ہے۔

۱۹۱۰ء میں سعد زغلول کو وزیر انصاف بنا دیا گیا۔ لیکن دو سال بعد لارڈ کچنر نے اسے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر ۱۹۱۷ء میں پہلی مصری پارلیمنٹ قائم ہوئی تو زغلول اس کا نائب صدر بن گیا۔ لیکن جب ۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں نے مصر کے خدیو عباس کو معزول کر کے حسین کامل کو تخت کی ذمہ داری سونپ دی۔ حسین کامل کی وفات کے بعد ۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو سلطان احمد فواد تخت نشین ہو گیا۔ ان دنوں مصر میں مارشل لاء جاری تھا۔ جنگ کے خاتمے تک سعد زغلول انتظار کرتا رہا۔ جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوئی تو سعد زغلول نے پیرس کی صلح کانفرنس میں مصر کے قومی مطالبات پیش کرنے کی کوشش کی جو برطانوی ہائی کمشنر کی بھرپور مخالفت کے باعث پیش نہ کی جا سکی۔

۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو برطانیہ نے سعد زغلول پاشا کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد تمام مصر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ سعد زغلول نے ایک وفد پیرس کی صلح کانفرنس میں بھیجنے کے لئے تشکیل دیا تھا لوگوں نے اس کی رعایت سے زغلول کے ساتھیوں کو وفد پارٹی کا نام دے دیا چنانچہ اس کی گرفتاری پر وفد پارٹی نے خوب خوب احتجاجی تحریک چلائی۔ لارڈ ایلنبی نے ہڑتالوں اور مظاہروں کے پیش نظر سعد زغلول اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ رہائی پاتے ہی وہ مالٹا سے پیرس آگیا۔ جہاں سیاسی لوگوں سے مصر کے مطالبات منوانے کی کوشش کرتا رہا جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مصر آگیا۔ مصر آنے کے بعد مصری لوگوں نے مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد تیز تر کر دی۔

۱۹۲۱ء کے آخری دنوں میں مصر ایک بار دوبارہ ہڑتالوں، مظاہروں اور توڑ پھوڑ کی زد میں آگیا۔ زغلول پاشا کو بھی دوبارہ گرفتار کر کے عدن اور پھر سیشلز کے جزائر میں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کے دوران میں اس نے انگریزی زبان سیکھ لی۔ ۴ اپریل ۱۹۲۳ء کو اسے خرابی صحت کے باعث رہا کر دیا گیا چنانچہ جب وہ مصر واپس آیا تو اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس سے پہلے انگریزوں نے مصر کو آزاد ملک بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ مصری لوگ اس اعلان سے قطعی ناخوش تھے۔ کیونکہ اس کی رو سے سول پولیس اور اعلیٰ افسران فوج جو برطانوی تھے کو زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ جبکہ بادشاہ کو کم اختیارات ملنے تھے۔ پھر جب اس نئے قانون کے تحت ۱۹۲۴ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو وفد پارٹی نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی۔ سعد زغلول نے وزارت بنائی۔ اس وقت مصر کی فوجوں کا کمانڈر انچیف بھی انگریز تھا اور مصر پر برطانوی فوجوں کا قبضہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

نومبر ۱۹۲۴ء کو کسی مصری شخص نے برطانوی کمانڈر انچیف کو قتل کر دیا۔ وفد پارٹی نے اس واقعے کی پرزور مذمت کی۔ لیکن برطانیہ کا پارہ عروج پر پہنچا ہوا تھا چنانچہ اس نے مصری حکومت کو ایک الٹی میٹم دے دیا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر معافی مانگے۔ مجرموں کو سزا دے۔ پانچ لاکھ پونڈ ہرجانہ کے طور پر ادا کرے اور ہر قسم کے جلسوں جلوسوں اور مظاہروں کو بند کر دے اور مصر پر برطانوی بالادستی قبول کرے ساتھ ہی سوڈان سے مصری افواج کو نکال لیا جائے حکومت مصر نے برطانیہ کے آخری مطالبے کے علاوہ باقی تمام مطالبے منظور کر لئے

لیکن برطانیہ نے اسی [redacted] سعد کا بازار گرم کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مصری [redacted] سعد زغلول نے پارلیمنٹ کو برخاست کر کے خود بھی استعفیٰ دے دیا۔ مئی ۱۹۲۶ء میں مصری پارلیمنٹ کے دوبارہ انتخابات ہوئے۔ ان میں بھی وفد پارٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ لیکن سعد زغلول نے وزارت بنانے سے احتراز کیا اور اپنی جگہ عبدالخالق ثروت پاشا کو وزیر اعظم بنا دیا۔ اس کے بعد برطانیہ کی حکومت سے مصالحت کی بات چیت شروع کر دی گئی۔ بات چیت کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ سعد زغلول پاشا بیمار ہو گیا اور چند دن بیمار رہنے کے بعد ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء کو انتقال ہو گیا۔ تمام مصر میں اس کی موت سے صف ماتم بچھ گئی۔ وفد پارٹی میں اس کے جانشین مصطفیٰ نحاس پاشا نے مصر کی آزادی کے لئے جدوجہد جاری رکھی

سعدی شیرازی

آپ کا نام شیخ مشرف الدین تھا۔ آپ تقریباً ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ چھوٹے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کے بعد سعد بن زنگی جو اتابک تھا نے ان کی اپنی نگرانی میں پرورش کی۔ اسی لئے آپ نے اپنا تخلص سعدی رکھ لیا۔ آپ کو ابتدائی تعلیم دلا کر مزید تعلیم کے حصول کے لئے بغداد بھیج دیا۔ آپ نے یہاں پر مشہور درس گاہ نظامیہ میں علم حاصل کیا اور بعد میں علم باطن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے حضرت عبدالقادر گیلانی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے ساتھ ہی حج کا مقدس فریضہ بھی انجام دیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں چودہ حج کئے۔ آپ بہترین شاعر کے طور پر بھی مشہور ہیں۔ اور اسی لئے آپ کو بھی فردوسی اور حافظ شیرازی کی طرح شہرت حاصل ہوئی۔ آپ نے اپنی طویل زندگی کے پہلے تیس سال صرف مطالعے میں صرف کئے۔ اس کے بعد تیس سال تک سیر و سیاحت اور شعر گوئی کرتے رہے۔ تیسرے ۳۰ سالوں میں آپ نے مراقبہ و مجاہدہ اور اپنے کلام کی تکمیل اور ترتیب کی۔ بقیہ عمر کے بارہ سال تصوف کی اشاعت و تبلیغ میں صرف کئے۔

جن دنوں آپ سیاحت کر رہے تھے تو آپ ہندوستان بھی تشریف لائے آپ نے اپنی ہندوستان میں آمد کا ذکر بوستان میں بھی کیا ہے۔ آپ کی دو تصانیف گلستان اور بوستان بہت زیادہ مشہور ہیں۔ بوستان ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء اور گلستان ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں لکھی گئیں۔ بوستان میں اخلاقی موضوعات پر نظمیں ہیں جبکہ گلستان بنیادی طور پر نثر میں ہے۔ اس میں بھی اہم اخلاقی مسئلوں کو کہانیوں میں مؤثر طور پر پیش کیا ہے۔ آپ نے ان دو کتابوں کے علاوہ غزلوں کا دیوان، قصائد اور چند نظموں کے مجموعے طیبات اور ہزلیات کی صورت میں بھی لکھے ہیں۔

سعدی شیرازی کا انتقال ذیقعدہ ۶۹۱ھ/ستمبر ۱۲۹۲ء میں ہوا۔ اس وقت آپ شیراز میں ہی مقیم تھے۔ ان کا مزار شہر کے مشرقی جانب [illegible] موجود ہے۔

سعدیہ (جباویہ)

درویشوں کا ایک فرقہ۔ اس فرقے کے بانی سعد الدین الجباوی [illegible] جو جبا کے علاقے میں مقیم تھے۔ درویشوں کا فرقہ ان کے اعتبار سے ہی سعدیہ یا جباویہ کہلانے لگا۔ سعد الدین جباوی کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے عہد شباب میں [illegible] نافرمانی [illegible] گھر سے [illegible]

Marfat.com

[illegible] لینا نہاد [illegible]
[illegible] کی [illegible] آپ [illegible] بیت المقدس اور [illegible] مقامات مقدسہ کی زیارت کو گئے اور پھر
[illegible] واپس آگئے جہاں آکر دمشق میں سلسلہ طریقت کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے کا تعلق
حضرت جنید [illegible] سری السقطی اور معروف الکرخی سے ہوتا ہوا اہل بیت تک
پہنچ جاتا ہے۔ بعض مورخین سعدیہ کو فرقہ رفاعیہ کی ایک شاخ تصور کرتے ہیں
ایک روایت ہے کہ فرقہ سعدیہ کی ٹوپیوں میں بارہ ترک ہوتے ہیں جو زرد رنگ کی
پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ان کی ٹوپیوں میں چھ کلیاں ہوتیں اور لمبے لمبے بال رکھے ہوتے
ہیں۔ یہ فرقہ مصر میں کافی تعداد میں رہائش پذیر تھا۔ وہ "مولد" کی رات سے ایک
دن پہلے ایک رسم ادا کیا کرتے تھے جسے وہ دوسہ کا نام دیتے تھے۔ اس رسم کی
ادائیگی کے وقت اس فرقے کا شیخ ایک گھوڑے پر سوار ہوتا جو درویشوں کی پشت
پر چلتا تھا۔ بہت سے درویش اس مقصد کے لئے منہ کے بل زمین پر لیٹ جاتے تھے
لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ان لوگوں کو گھوڑوں کے پاؤں سے کسی قسم کی تکلیف نہیں
پہنچتی۔ رسم دوسہ کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں بعض
درویش زندہ سانپوں کو کھا جایا کرتے تھے۔ اس رسم کو مصر کے خدیو توفیق نے
حکماً بند کرا دیا تھا۔ اس کے بعد رسم دوسہ کی ادائیگی کے بعد ذکر کیا جانے لگا جس
میں الفاظ کی ترتیب مقرر تھی۔ جو "اللہ حیّ" اور "یا دائم" تھے۔

تصوف کے بارے میں لکھنے والے اصحاب نے اس فرقہ کی جانب بہت
کم توجہ دی ہے۔ جن اصحاب نے اس کی جانب توجہ کی بھی تو وہ صرف اجمالی ذکر سے آگے
نہ بڑھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس فرقے کی ابتدا فرقہ رفاعیہ سے علیحدہ ہونے سے ہوئی ہوگی
اور بعد میں یہ صوفیوں کا ایک فرقہ بن گیا ہوگا۔

سعدیہ حلیمہ

آپ حضرت محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ تھیں۔ آپ کا تعلق قبیلہ
بنو سعد بن بکر سے تھا۔ عرب میں رواج تھا کہ بچوں کو ان کی مائیں خود دودھ نہیں پلاتی
تھیں بلکہ انہیں دوسری خواتین کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو انہیں دودھ پلاتی تھیں
اسی طرح جب آنحضورؐ پیدا ہوئے تو انہیں بھی حلیمہؓ سعدیہ کے حوالے کر دیا گیا
اس سال عرب میں قحط پڑا تھا۔ اس لئے دائی حلیمہؓ مکہ آئیں تاکہ کسی بچے کو دودھ
پلانے کے لئے حاصل کر سکیں۔ آخر کار وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ جب
وہ حضورؐ کو اپنے ہمراہ لے کر گئیں تو جلد ہی آپؐ کی برکت سے گھر میں خوشحالی آگئی۔ روایت ہے
کہ جب آپؐ دائی حلیمہؓ کے ہاں مقیم تھے تو دو فرشتے آئے جنہوں نے آپؐ کے
سینے کو چاک کر کے خون کا ایک سیاہ جما ہوا قطرہ نکال لیا (دیکھئے شق صدر) بچوں کو ان کی
رضاعی والدہ کے حوالے کرنے کا رواج صرف متمول گھرانوں میں تھا۔

حضرت حلیمہؓ بنت ابی ذؤیب کا خاوند الحارث تھا۔ اس طرح ان کا
ایک بیٹا عبداللہ آپؐ کا رضاعی بھائی بن گیا۔ آپؐ کی انیسہ اور شیما دو رضاعی بہنیں
تھیں۔ جب غزوۂ حنین ہوا تو شیما ہوازن کے قیدیوں کے ساتھ قید ہو کر مسلمانوں
کے پاس آپہنچیں۔ جب حضورؐ نے انہیں دیکھا تو ان کی عزت کی اور کئی تحفے تحائف
دے کر آزاد کر دیا۔

سعود بن عبدالعزیز

دیکھئے ابن سعود

سعودی عرب

آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے اپنی سرتوڑ
کوششوں سے حجاز اور نجد کی مملکتوں کو متحد کر کے ایک لڑی میں پرو دیا۔ اس طرح
دنیا میں ایک نئے ملک کی بنیاد پڑی۔ ریاستوں کو باہم مدغم کرنے کے بعد اس نئے ملک کا نام
المملکۃ العربیہ السعودیہ رکھا گیا۔ اس ملک کا کل رقبہ تقریباً
۹۲۷۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس طرح جزیرہ نمائے عرب کا تقریباً ۹/۱۰ حصہ سعودی عرب
میں شامل ہے۔

سعودی عرب ایک اسلامی ملک ہے اور یہاں اسلامی قوانین نافذ العمل ہیں۔ تمام
سربراہان مملکت کا قوانین شرعیہ کا پابند ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اسی لیے حکومت کو
اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ملک میں موجود تمام علماء کا مکمل تعاون حاصل ہوتا
ہے۔ اس ملک میں رائج قوانین کی اساس قرآن حکیم کے احکامات پر رکھی گئی ہے اسی
لیے ملک میں باقاعدہ کوئی پارلیمنٹ یا آئین نہیں ہے۔ بادشاہ جو سربراہ مملکت اور
وزیراعظم ہوتا ہے، اپنی مجلس وزراء کے مشورہ سے انتظامی اور مذہبی اختیارات استعمال
کرتا ہے۔ اس ملک کے پرچم کا رنگ سبز ہے جس پر کلمہ طیبہ تحریر ہوتا ہے۔ سعودی عرب
میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور آبادی تقریباً ایک کروڑ ہے۔ یہاں کے تمام لوگوں کی
عام بول چال عربی زبان ہے۔

سعودی عرب کا شاہی دارالحکومت ریاض ہے لیکن انتظامی دارالحکومت
کا درجہ جدہ کو حاصل ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جیسے قابل احترام شہر بھی اسی
ملک میں شامل ہیں۔ اسی لیے بادشاہ سعودی عرب کو پاسبان حرم بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا
کے تقریباً ہر ملک سے لاکھوں مسلمان یہاں آکر فریضہ حج ادا کرتے ہیں جن کے لیے
حکومت عرب خصوصی انتظامات کرتی ہے۔

سعودی عرب کی معیشت کا دارومدار تیل اور پٹرولیم کی مصنوعات پر ہے
کیونکہ یہ تیل پیدا کرنے والا دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے۔ یہاں سے تیل اور پٹرولیم
کی مصنوعات بھاری مقدار میں دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ سعودی عرب
میں تیل کی پیداوار ۸۵ لاکھ بیرل روزانہ سے زیادہ ہے۔ تیل کی پیداوار کا نصف

ایک عرب بچی کھجوریں چن رہی

Marfat.com

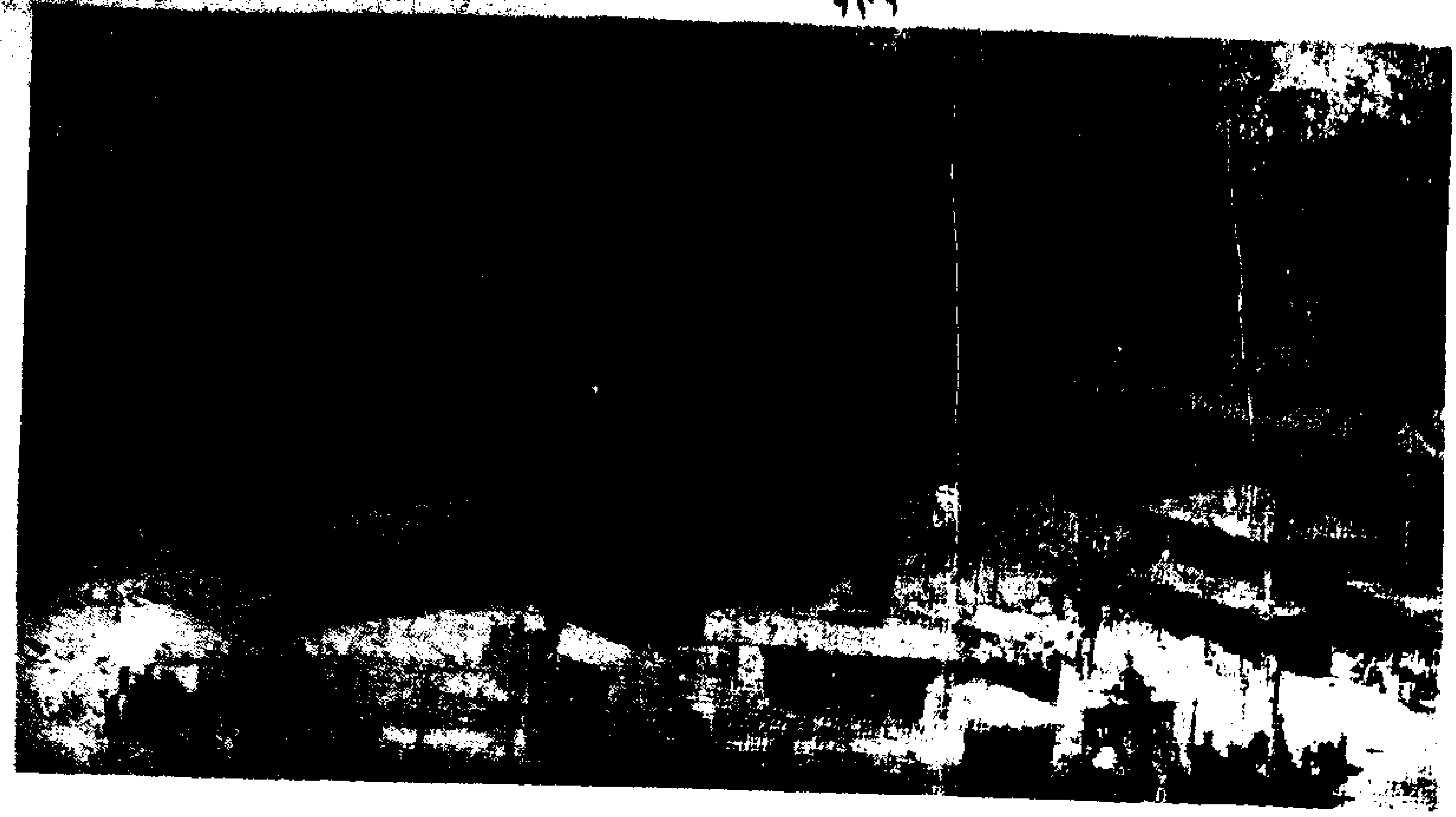

کعبۃ اللہ کا ایک منظر

حصہ مغربی یورپ اور بقیہ نصف امریکہ اور ایشیا کو برآمد کیا جاتا ہے جس سے اربوں ڈالر سالانہ کا زرِمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ تیل کے علاوہ یہاں خام لوہا، تانبہ، چاندی، نمک اور جپسم کے بھی وسیع ذخائر موجود ہیں۔ ان اشیا کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ سعودی عرب نے گزشتہ برسوں میں زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ آجکل وہاں زراعت کو ترقی دینے کے ایک منصوبہ پر تیزی سے عمل جاری ہے اس کے لیے آبی وسائل کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ بند بھی تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ تعلیم کے شعبہ میں بھی گزشتہ سالوں کے دوران میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ شاہی دارالحکومت ریاض میں شاہ سعود یونیورسٹی ہے جس میں آرٹس، سائنسی مضامین، کامرس، ادویہ سازی (فارمیسی) اور اسلامیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی سے ملحق کئی کالج بھی بنائے گئے ہیں۔ جن میں سینکڑوں طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جس کا مقام دنیائے اسلام میں بہت بلند ہے۔ بیشتر اسلامی ملکوں سے طالب علم اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز ابن سعود کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ ان کی جگہ شاہ سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے۔ بعد میں نومبر ۱۹۶۴ء میں ان کے بھائی شاہ فیصل بادشاہ بنے اور شاہ سعود بن عبدالعزیز معزول کر دیے گئے۔ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں شاہ فیصل کو قتل کر دیا گیا۔ جن کے بعد ان کے بھائی شاہ خالد نے تاج و تخت سنبھال لیا۔ شاہ خالد نے سعودی عرب کی تعمیر و ترقی کے متعلق کوششوں کو تیز سے تیز تر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ فیصل کے زمانے میں عرب نے اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے جو کردار ادا کیا تھا اس کو بھی شاہ خالد نے مزید مضبوط اور موثر بنانے کا کام کیا ہے۔

سعودی عرب کی حکومت اب غریب اور برادر اسلامی ملکوں کو بغیر سود کے بھاری قرضے اور امداد فراہم کر رہی ہے۔ جس سے یقیناً اتحادِ عالمِ اسلامی کے کام کو مزید تقویت ملی ہے۔

حکومتِ عرب اپنی ضروریات کی چیزیں مثلاً ٹرانسپورٹ، تعمیراتی سامان، کیمیاوی سامان وغیرہ دوسرے ممالک سے درآمد کرتی ہے۔ عرب کے سکے کا نام سعودی ریال ہے جو پاکستان کے ڈھائی روپے کے برابر ہوتا ہے۔

سعی

"سَعْی" کے لغوی معنی تیز چلنے کے ہیں۔ اس کے بارے میں ایک حدیث ہے: "جب نماز کے لیے آؤ تو دوڑتے ہوئے، بے چینی اور اضطراب کے ساتھ نہ آؤ۔ بلکہ سکون، وقار اور اطمینان کے ساتھ آؤ۔"

الزجاج کہتے ہیں کہ ہر کام میں ذوق و شوق، کوشش، عمل اور سرگرمی دکھانا سعی ہے۔ قرآن مجید میں بھی سَعْی کا ذکر آیا ہے، جس کی چند مثالیں پیش ہیں۔ اس کا عمل رائیگاں نہیں جائے گا" (الانبیاء - ۹۴)۔ "انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ عمل کرتا ہے اور اس کا عمل اسے ضرور دکھایا جائے گا" (النجم: ۳۹-۴۰) "جب وہ کام کاج میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے (یا سرگرم عمل ہونے) کے قابل ہو گئے" (الصّٰفّٰت - ۱۰۲) سَعْی کا لفظ عام طور پر کسی کام کے لیے سرگرم عمل ہونے یا کوشش کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن اصطلاحی معنوں میں عمرہ یا مناسک حج کے سلسلے میں صفا اور مروہ کے درمیان تیز تیز چلنے کے لیے مخصوص ہے۔

سعید بن العاص

حضورؐ کے مشہور کم عمر صحابی آپ کوفہ اور مدینہ کے والی تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت آپؓ کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ آپ کا والد غزوۂ بدر میں اہلِ کفار کی جانب سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ آپ کے خاندان کا تعلق اہلِ قریش کے بہت ہی اونچے اور ممتاز گھرانوں میں ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضؓ بھی آپ کی بے حد عزت و تکریم کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے قرآن مجید نقل کروانے کا پروگرام بنایا تو سعید بنؓ العاص کو حضورؐ کے لہجے سے مشابہت کے باعث قرآن نقل کرنے والی جماعت کا رکن بنایا۔ حضرت عثمان رضؓ نے آپ کو ۳۰ھ / ۶۵۰ء میں الولید بن عقبہ کی بجائے سعید رضؓ کو کوفہ کا والی مقرر کیا۔ آپ رضؓ نے اپنے زمانہ ولایت میں طبرستان اور جرجان کے خلاف کئی مہمیں سر کیں۔ لیکن کوفہ کے لوگ آپ کی عزت و احترام بجا طور پر نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے وہ اہل کوفہ کا ایک گروہ خلیفۂ وقت کے پاس آپ کی شکایت لے کر بھی گیا تھا۔ لیکن حضرت عثمان رضؓ نے ان کی شکایت کو نظر انداز کر دیا کہ سعید بن العاص کو بطور والیٔ کوفہ کام کرتے رہنے کے لئے کہا۔ جب آپ

Marfat.com

کو واپس جارہے تھے تو راستے میں کچھ لوگوں نے روک لیا اور مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد آپ مدینہ ہی میں رہے۔ بعد میں جب ایک بار کچھ باغیوں نے حضرت عثمان رضؓ پر حملہ کیا تھا تو آپ ان کی جانب سے لڑے۔ اس لڑائی میں سعیدؓ بن العاص شدید مجروح بھی ہوگئے تھے۔ شہادت عثمان کے بعد آپ مکہ تشریف لے گئے۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ کے زمانے میں ملاً مدینہ بھی رہے آپ نے مدینہ سے تین میل دور قصر العقیق کے مقام پر جہاں آپ کی کچھ زمین تھی وفات پائی اس علاقے میں حضرت سعید نے اجازت حاصل کر کے اپنے لئے ایک محل اور باغات وغیرہ بنوائے تھے۔

سعید بن جبیر

آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور آپ کا شمار آئمہ کبار میں کیا جاتا ہے۔ علم حدیث میں آپ کو بہت کمال حاصل تھا۔ فقہ کے بھی بہت بڑے عالم تھے، آپ صحابہ کرام سے وقتاً فوقتاً مسائل اور احادیث سن کر اپنے پاس لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ قرآن مجید کے بھی بہترین قاری تھے۔ قراٗت اور تفسیر کا فن آپ نے عبداللہ بن عباس سے سیکھا تھا۔ ریاضی کے علم میں بھی آپ کو کافی مہارت حاصل تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی آپ کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے آپ کو کوفہ کا قاضی بھی مقرر کر دیا تھا۔ سعیدؒ بن جبیر حجاج بن یوسف کو اس کے کاموں کے باعث اچھا خیال نہیں کرتے تھے۔ جب ابن اشعث نے حجاج اور بنو امیہ کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تو سعیدؒ بن جبیر نے ابن اشعث کی حمایت کی۔ لیکن ابن اشعث کو اس لڑائی میں شکست ہوئی جس کے بعد حجاج بن یوسف نے آپ کو قید کروا کر بلایا اور انہیں قتل کرا دیا۔

سعید بن زید

ایک مشہور صحابئ رسولؐ۔ آپ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے بھتیجے اور بہنوئی تھے آپکے والد زید بن عمرو اپنے زمانے میں عرب کے مشہور موحد مانے جاتے تھے۔ صحیح بخاری میں ان کے بارے میں درج ہے کہ دور جاہلیت میں ہی زید بن عمرو نے حق کا جلوہ دیکھ کر بت پرستی ترک کر دی اور دین ابراہیمی کی جانب رجوع کر لیا تھا ان کا انتقال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال پہلے ہو گیا تھا اور انہیں کوہ حرا کے نیچے دفن کیا گیا۔ حضرت سعید بن زید کے اسلام لانے کے بارے میں بہت سی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ حضرت سعید نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دار الارقم میں داخل ہونے اور دعوت حق شروع کرنے سے پیشتر ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یوں بھی اسلام لانے والے جلیل القدر صحابہ میں ان کا نمبر اٹھائیسواں بتایا گیا ہے۔ جب کہ ان کی بیوی کا نمبر ستائیسواں ہے۔ حضرت سعید کی شادی دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے بہت پہلے ہی ہو چکی تھی۔ آپ کی زوجیت میں حضرت فاطمہ رضؓ بنت خطاب تھیں جو رشتے میں آپ کی پھوپھی بھی تھیں حضرت سعیدؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ اسلام لانے سے قبل ہی لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔ اس کا علم ہمیں اس واقعے سے بھی ہوتا ہے: جسے ابن سعد نے حضرت عمر کے اسلام لانے کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے وہ لکھتے ہیں کہ: حضرت عمر رضؓ کی بہن اور بہنوئی (یعنی حضرت فاطمہ رضؓ اور حضرت سعید رضؓ) سورہ طٰہٰ پڑھ رہے تھے جو ان کے پاس لکھی ہوئی موجود تھی۔"

آپ غزوۂ بدر میں شریک رہے اس کے علاوہ غزوہ، احد، خندق اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ہجرت کے موقع پر حضرت رافع بن مالک زرقی کو آپ کا اسلامی بھائی بنایا گیا تھا۔ وہ انصار کے ابتدائی مسلمانوں اور بیعت عقبہ کے بارہ افراد میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں آپ کو شام پر حملہ کرنے والی ایک پیدل فوج کی کمان بھی سونپی گئی۔ رجب ۱۴ھ میں دمشق فتح ہوا۔ اس کے محاصرے میں حضرت سعید بن زید نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ اسی لئے جنگ کے دوران ہی حضرت ابو عبیدہ رضؓ نے آپ کو دمشق کا گورنر مقرر کر دیا۔ آپ نے یہ منصب سنبھال تو لیا لیکن شوق جہاد کے ہاتھوں بے چین رہے۔ چنانچہ گورنری سے خود ہی دستبردار ہو گئے اور دوبارہ جہاد میں شامل ہوئے۔ جب ۲۳ھ میں حضرت عمر رضؓ زخمی ہوئے تھے تو اس وقت حضرت سعید رضؓ ان کے گھر ہی موجود تھے۔

آپ نے ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں وفات پائی تھی۔ آپ کا جنازہ مدینہ لا کر دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۰ برس سے زیادہ تھی۔ آپ کی اولاد میں چودہ لڑکے اور بیس لڑکیاں تھیں۔

سعید بن عامر

آپ غزوۂ خیبر سے پہلے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر لی۔ غزوہ خیبر اور اس کے بعد ہونے والے جنگی معرکوں میں شریک رہے۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں یرموک کی جنگ میں لڑنے والی فوج کو بھیجی جانے والی امدادی فوج کا دستہ لے کر پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو حمص کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ سعیدؒ بن عامر کا صرف چالیس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آپ نے اپنی حمص کی گورنری کے دوران میں بھی فقیرانہ زندگی گزاری اور ہمیشہ رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا۔

سعید بن مسیب

نام سعید اور کنیت ابو محمد تھی۔ آپ کے والد مسیب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کی پیدائش ۲ھ میں ہوئی۔ آپ کا شمار مدینہ کے سات مشہور فقہا میں ہوتا ہے۔ آپ بہت بڑے محدث اور امام تھے۔ جابر بن اسود نے جو آپ سے عبداللہ بن زبیرؓ کے حق میں بیعت لینے آیا تھا آپ کے بیعت سے انکار پر کوڑوں سے پٹوایا۔ عبداللہ بن زبیر کے بعد عبدالملک خلیفہ ہوا لیکن سعیدؒ بن مسیب نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ آپ کو قید بھی ہونا پڑا۔ آپ کا انتقال ۹۴ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں ہوا۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ خواب کی تعبیر بتانے میں بہت ماہر تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ لباس کے معاملے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے لیکن صفائی پسند تھے۔ آپ کو حکومت کی جانب سے وظیفہ دیا جاتا تھا جسے آپ نے حکومت سے اختلافات کے باعث لینا بند کر دیا۔ چنانچہ آپ کی وظیفہ کی رقم بیت المال میں جمع ہونے لگی۔ یہ رقم آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، یہاں تک کہ تیس ہزار ہو گئی بیت المال کے منتظم کی جانب سے آپ کو بار بار بلایا جاتا رہا لیکن سعیدؒ بن مسیب اس رقم کو لینے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔

Marfat.com

سعید پاشا

محمد سعید پاشا مصر کا خدیو (نائب السلطنت) تھا۔ اس کے باپ کا نام محمد علی پاشا تھا۔ محمد سعید پاشا ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا لیکن اس کا باپ اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اسی لیے انیس سال کی عمر میں سعید پاشا کو مصر کے ذمے واجب الوصول خراج کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) بھیجا تھا۔

وہ نیک سیرت اور ہر دل عزیز شہزادہ تھا۔ سعید پاشا ۱۸۵۴ء میں مصر کا خدیو بنا۔ اس نے نومبر ۱۸۵۶ء میں ایک مجلس شوریٰ کی بنیاد رکھی جس میں شاہی خاندان کے تمام شہزادوں، چار جرنلوں اور چار اعلیٰ عہدیداروں کو شامل کیا۔ اس نے اپنے زمانے میں نظم و نسق کی سخت گیر مرکزیت کو نرم کر دیا۔ سعید پاشا اپنے دور کا پہلا فرد تھا، جس نے حبشی غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے کے لیے بہت کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء میں اس نے سوڈان کے شہر خرطوم کا دورہ کیا۔

سعید پاشا کے دور میں قاہرہ اور سویز کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اس کے علاوہ ایسٹرن ٹیلیگراف کمپنی کو تار برقی کا نظام لگانے کی اجازت ملی۔ اس کمپنی کو تار برقی کے نظام کی اجارہ داری حاصل تھی۔ اس نے اپنے عہد میں نہر سویز کھودنے کا کام بھی انجام دیا۔ نہر سویز پر ۱۸۵۹ء میں کام شروع کر دیا گیا تھا۔ آج بھی بندرگاہ سعید جو نہر سویز کے شمالی نکاس پر واقع ہے اسی کے نام سے موسوم ہے۔ مصر میں بنکاری کی ابتدا بھی اسی کے عہد میں ہوئی۔

۱۸۶۰ء میں سعید پاشا یورپ کی سیاحت کی غرض سے مصر سے باہر گیا تو اس کی غیر حاضری سے اس کے بھتیجے اسماعیل پاشا نے فائدہ اٹھایا اور اس کی جگہ خود سنبھال لی حالانکہ وہ سعید پاشا کا متوقع وارث بھی تھا۔

سعید پاشا کا انتقال سکندریہ میں ۱۷ جنوری ۱۸۶۳ء میں ہوا اور یہیں پر دفن کیا گیا۔

سعید پاشا

ترکی کا ایک سیاسی مصلح۔ جو اکتوبر ۱۸۷۹ء تا جون ۱۸۸۰ء، ستمبر ۱۸۸۰ء یا ۱۸۸۲ء تا ۱۸۸۵ء، ۸ نومبر ۱۹۰۱ء تا ۱۵ جنوری ۱۹۰۳ء، ۲۲ جولائی ۱۹۰۸ء تا ۷ اگست ۱۹۰۸ء اور ۴ اکتوبر ۱۹۱۱ء تا ۱۷ جولائی ۱۹۱۲ء تک ترکی کا وزیر اعظم رہا۔ سعید پاشا ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں سرزمین روم میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد علی نامی آفندی اپنے زمانے میں تہران میں قونصل اور بعد میں نائب سفیر ترکی رہا تھا۔

سعید پاشا نے ابتدائی تعلیم روم میں حاصل کی اور سولہ سال کی عمر میں محکمہ دیوانی میں ملازم ہو گیا۔ جہاں اسے خدمات کی بہترین ادائیگی پر خوب ترقیاں اور مناصب ملتے چلے گئے۔ چنانچہ وہ دو سال کے قلیل عرصے میں ہی اناطولیہ کے فوجی محکمہ نظم و نسق میں ایک انتہائی اہم عہدے پر فائز ہو گیا۔ وہ ملازمت کے دوران ہی قسطنطنیہ آیا اور اپنی ذہانت کے باعث قسطنطنیہ کی مجلس اعلیٰ کے دفتر میں اونچا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۸۷۵ء میں سعید پاشا وزارت تجارت و زراعت کا رکن مجلس اور اصلاحات کرنے والے کمشن کا رکن بھی بن گیا۔ بعد میں تھوڑے عرصے تک انقرہ اور برسہ کے والی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۸۷۹ء میں وہ پہلی بار وزیر اعظم کے جلیل القدر منصب تک پہنچا [illegible]

سعید پاشا ایک ایسے نازک دور میں [illegible] عہدے پر فائز تھا جب جدید یورپی ترقی سے رابطہ قائم کر لینے کی جدوجہد اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنے ملک کی بہترین نمائندگی اور رہنمائی کی۔ سیاست دان کے علاوہ بہادر کا تعلق قدامت پسند عوام سے تھا لیکن [illegible] اصلاحات کا بھرپور حامی تھا۔ اس نے سلطان ترکی عبدالحمید کی بڑی قابلیت اور لیاقت کے ساتھ تائید و حمایت کی اور ہمیشہ یہ کوشش کی کہ کسی طرح سلطان کے ہاتھ تمام قوت اور اختیارات آ جائیں۔ اس نے ترکی میں غیر ملکی اثرات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

سعید پاشا کا انتقال یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو قسطنطنیہ میں ہوا۔ اسے گورستان ایوبؓ میں حضرت خالدؓ کی مسجد کے نزدیک دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی یادداشتیں خود ہی ایک کتابی صورت میں تحریر کی ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۲۸ھ میں "سعید پاشا نن خاطرات" کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔

سفاح ابوالعباس

پہلا عباسی خلیفہ۔ لقب سفاح تھا۔ اصل نام عبداللہ بن محمد بن علی ابن عبداللہ بن العباس تھا۔ کوفے پر حسن بن قحطبہ کے قبضہ کے کچھ ہی عرصہ بعد صفر ۱۳۲ھ/ستمبر ۷۴۹ء کو کوفے میں آ کر پناہ لی۔ بعد میں ۱۲ ربیع الثانی/۲۸ نومبر کو شہر کی جامع مسجد میں پہلی مرتبہ اس کی خلافت کا اعلان

کو شہر کی جامع مسجد میں پہلی مرتبہ اس کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ اس موقع پر اس نے خطبہ بھی دیا تھا جو کافی مشہور ہوا۔ سفاح نے خلافت کا اعلان کرنے کے بعد امویوں کو مکمل طور پر شکست دینے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے اس ارادے میں بے انتہا خونریزی کرنے کے بعد کامیاب بھی ہوا۔ اور آہستہ آہستہ تمام علاقے عباسی خلافت میں شمار کیے جانے لگے۔ ۱۳۳ھ/۷۵۱ء میں علویوں نے بنو امیہ کے افراد کی حمایت میں بغاوت کر دی۔ سفاح نے شدید خونریز مقابلہ کر کے بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔

ابوالعباس سفاح کا ذوالحجہ ۱۳۶ھ/جون ۷۵۴ء کو الانبار میں انتقال ہو گیا۔ جہاں اس نے رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ اس کے کردار کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دور حکومت میں خونریزی بہت کی گئی۔ جہاں تک عباسی حکومت کا تعلق ہے تو سفاح کے دور میں عباسی تحریک انقلابی دور سے گزر کر آئینی منزل میں داخل ضرور ہو گئی تھی۔ ابوالعباس سفاح نے خلافت پر اپنے پاؤں بھی خوب جما لیے تھے۔ اس کے انتقال کے بعد المنصور مسندِ خلافت پر متمکن ہوا۔

سفاقس

تیونس کا ایک شہر۔ جو مشرقی ساحل پر خلیج قابس کے شمال میں آباد ہے۔ اصل شہر ایک صاف ستھری اور ہموار جگہ پر واقع ہے۔ اس شہر کو باقاعدہ ایک نقشہ بنا کر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی شکل مستطیل ہے اور تمام سڑکیں ایک دوسری کو قائمہ زاویہ پر کاٹ کر گزرتی ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک شاندار جامع مسجد ہے جو ۲۷۵ھ/۸۴۹ء میں تیار کی گئی تھی۔ لیکن اس کی حالت بہت مخدوش ہو جانے کے باعث دسویں صدی ہجری کے آخر میں دوبارہ از سر نو تعمیر کی گئی۔

Marfat.com

شہر کے گرد ایک فصیل بنی اغلب کے عہد میں مٹی، گارے اور اینٹوں سے بنائی گئی تھی جس کے بعض حصوں کے گر جانے کے بعد انھیں پتھروں سے بنا دیا گیا۔

بنو ہلال کے حملے کے باعث پھیلنے والی بدنظمی کے نتیجے میں سفاقس ۱۰۹۵ء تا ۱۰۹۹ء ایک چھوٹی سی ریاست کا صدر مقام بنا رہا۔ اس ریاست کے لوگ عرب کی حمایت کرتے تھے۔ ۱۱۴۸ء میں اسے صقلیہ کے بادشاہ روجر (ROGER) نے فتح کر لیا۔ ۱۱۵۹ء میں تقریباً گیارہ سال بعد عبدالمؤمن نے اس شہر کو دوبارہ اپنے زیرنگیں کر لیا۔ لیکن اس وقت تک سفاقس کی عظمت اور شان و شوکت ماند پڑ چکی تھی۔ بنو ہلال کے حملے سے پہلے یہ شہر نمایاں اقتصادی اہمیت کا حامل تھا، اور اسے زیتون کی کاشت کرنے والے بڑے بڑے مرکزوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس شہر کے تاجر زیتون کا تیل، شاورؔ خاص طور پہ اٹلی کو برآمد کرتے تھے۔ سفاقس شہر کپڑے کی صنعت کے لیے بھی بہت مشہور تھا۔ یہاں کے رہنے والوں کا ذریعۂ آمدنی زیادہ تر ماہی گیری تھا۔

۱۸۸۱ء میں سفاقس نے فرانسیسی تسلط کا زبردست مقابلہ کیا۔ فرانس کے جنگی جہازوں کا ایک دستہ اس شہر پہ بمباری کرنے کے لیے آیا جس کے باعث شہر کو بہت نقصان پہنچا لیکن اس کے بعد یہاں خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ آجکل اس کی آبادی چار لاکھ سے زیادہ ہے۔ لوگ خلیج قابس سے اسفنج اکٹھا کر کے برآمد کرتے ہیں۔ تمام شہر میں زیتون کے باغات ہی باغات موجود ہیں۔ یہ درخت نہایت ہی خوبصورت اور ترقی یافتہ طریقہ ہائے کاشت کے مطابق لگائے گئے ہیں۔

سفانہ

آپ ایک مشہور صحابی عدیؓ بن حاتم الطائی کی بہن تھیں۔ ان کا تعلق عیسائیوں کے ایک قبیلہ طے سے تھا۔ عدی بن حاتم طائیؓ اس قبیلے کا سردار تھا۔ جب مسلمانوں نے اس قبیلے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو عدیؓ علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن ان کی بہن سفانہؓ وہیں رہ گئیں۔ جنہیں مسلمانوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ پکڑ لیا اور مدینہ لے آئے۔ یہاں آ کر تمام قیدی حضورؐ کے سامنے لائے گئے۔ سفانہؓ نے آپؐ سے رہائی کی درخواست کی جسے حضورؐ نے مان لیا، اور سفانہؓ کو نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ ان کے شایانِ شان سواری، لباس اور خوراک وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا۔ آپؐ نے سفانہ کو تنہا جانے سے بھی منع فرما دیا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی عدیؓ بن حاتم کے پاس پہنچیں تو ان کے سامنے حضور کی بہت تعریف کی۔ جس کے بعد عدیؓ بن حاتم الطائی اپنی بہن کے کہنے پہ مدینہ آ کر رسولِ خداؐ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ ملاقات کے دوران ہی آپ نے اسلام قبول کر لیا۔ بعد میں آپ کی بہن سفانہؓ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

سفر

ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ہمیں سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر مختلف نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ تجارتی سفر یا تفریحی سفر۔ رسولِ پاکؐ کی کچھ احادیث اس موضوع پہ ہمیں ملتی ہیں مثلاً بخاری شریف میں حضرت کعب بن مالکؓ سے مروی ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعرات کے دن غزوۂ تبوک کو تشریف لے گئے۔ آپ جمعرات کو سفر پہ جانا پسند فرماتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ "رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ اگر لوگوں کو تنہا سفر کرنے کے نقصانات کا اندازہ ہو جائے تو وہ کبھی بھی رات کو اکیلے میں سفر نہ کریں۔ (بخاری)

حضرت ابوسعید خدریؓ کے بیان کے مطابق وہ ایک مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ شریکِ سفر تھے کہ ایک آدمی اونٹ پہ آیا اور اونٹ کو دائیں بائیں پھیرنا شروع کر دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس پہ حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی فالتو سواری ہے تو وہ اس راہ گیر کو دے دے کیونکہ اس کی سواری کمزور اور تھکی ہوئی ہے اور جس کے پاس زادِراہ فالتو ہو وہ بھی اس شخص کو دے دے۔ اس کے بعد آپؐ نے زادِراہ اور مال اسباب کی اقسام بیان فرمائیں۔ یہاں تک کہ ہم نے یہ محسوس کر لیا کہ کسی بھی شخص کو ضرورت سے زیادہ زادِراہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (مسلم)

اس کے علاوہ دو حدیثیں حضرت جابرؓ سے مروی ہیں۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جب تم میں سے کسی کو سفر میں زیادہ عرصہ گزر جائے تو وہ رات کے وقت اپنے گھر میں داخل نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

ایک مرتبہ آنحضورؐ نے فرمایا کہ "جب تو رات کے وقت سفر سے واپس آئے تو اپنے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ تیری بیوی زیرِ ناف بالوں کو صاف نہ کر لے اور کنگھی کر کے پریشان بالوں کو درست نہ کر لے۔" (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی سفر پہ روانہ ہوتے تو سفر کی ابتداء دعاؤں سے کرتے تھے۔ آپؐ جب رکاب میں پاؤں مبارک رکھتے تو یہ دعا پڑھتے۔ جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: "اللہ کے نام سے شروع ہے۔ خداوند تو سفر میں میرا رفیق اور اہل و عیال میں جانشین ہے۔ خداوند تو زمین کو ہمارے واسطے طے کر دے اور ہم پہ سفر کو آسان کر دے۔ خداوندا میں سفر کی سختی اور رنجِ واپسی اور اہل و مال کی بدحالی دیکھنے سے پناہ مانگتا ہوں۔"

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ سفر سے واپسی پہ بھی دعا مانگا کرتے تھے اس دعا کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

"خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا ملک ہے اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اپنے پروردگار کو سجدہ کرنے والے، اس کی تعریف کرنے والے ہیں۔ خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا تمام لشکروں کو بھگا دیا۔"

سفرِ نماز

دیکھیے: صلوٰۃ

سفی

اوقیانوس کے کنارے مراکش کا ایک صوبہ اور بندرگاہ جو راس کینٹن کے جنوب کی طرف چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں تقریباً پچیس ہزار افراد آباد ہیں۔ جن میں سے ساڑھے تین ہزار یہودی اور ایک ہزار کے قریب یورپی باشندے ہیں۔ سفی کی شہرت پرتگالیوں کی آمد کے بعد ہی ہوئی۔ وہ مراکش کے ساحل کے ساتھ ساتھ مسلسل بڑھتے بڑھتے ۱۵۰۷ء تک سفی آ کر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہاں آ کر ایک چھاؤنی بھی قائم کر لی تھی جس کے باعث انہوں نے ۱۵۱۵ء میں ایک زبردست حملے کے خلاف دفاع کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ پرتگالیوں نے ایک مقامی

Marfat.com

سربراہ یحییٰ بن تفوف کی مدد اور اعانت سے سفی کو اپنی مہمات کا مرکز بنائے رکھا انہوں نے آس پاس کے قبیلوں کے سرداروں کی حمایت حاصل کرکے اپنی عمل داری قائم کرلی۔ بنو سعد کے اشراف نے سفی پر اپنا قبضہ جمالیا اور اس علاقے کو اپنی صدر بندرگاہ کا درجہ دے دیا سفی کی شہرت سولہویں اور سترھویں صدی تک عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یہ بندرگاہ عیسائیوں کی تجارت کا بڑا مرکز بن چکی تھی۔ لیکن جب علوی برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنا دارالحکومت شمالی قصبوں میں منتقل کرلیا جس کے باعث سفی کے نزدیک ایک اور بندرگاہ سلا (SALE) پُر رونق ہوگئی اور سفی میں رونق کم ہونے لگی۔ انیسویں صدی میں اس علاقے کو بہت زوال آیا اب سفی ایک چھوٹا سا بارونق قصبہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں سے عبدہ کے زرخیز علاقے کی پیداوار اب بھی دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے۔ اور سفی کا علاقہ عبدہ کا مرکزی علاقہ مانا جاتا ہے۔

سفیان بن عبداللہ

آپ کا شمار اہل طائف میں ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں آپ طائف کے عامل مقرر ہوئے۔ آپ کی تقرری عثمان بن ابی العاص کے اس عہدے سے علیحدگی کے بعد عمل میں آئی تھی۔ عثمان بن ابی العاص کو بحرین میں عامل مقرر کردیا تھا۔ آپ کا پورا نام سفیان بن عبداللہ الثقفی تھا۔

سفیان ثوری

دوسری صدی ہجری کے ایک مشہور عالم، محدث اور صوفی۔ آپ کا نام ابو عبداللہ سفیان بن سعید بن مسروق الثوری الکوفی تھا۔ آپ کی پیدائش کا سال عام طور پر ۹۵ھ یا ۹۶ھ یا ۹۷ھ بتایا جاتا ہے۔ لیکن زیادہ تر علماء ۹۷ھ/۷۱۵ء ۷۱۶ء پر متفق ہیں۔ حضرت سفیانؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی جنہوں نے آپ کو حدیث کی اعلیٰ تعلیم دی۔ کیونکہ ان کا شمار اس عہد کے جیّد عالم فاضل اشخاص میں ہوتا تھا۔ سفیان ثوریؒ کا شمار ان عالموں میں ہوتا ہے جنہوں نے اہم سرکاری عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اور صرف اسی وجہ سے حکومتوں کے زیر عتاب آئے۔ آپ کو اکثر اوقات حکام کی جانب سے تحفے تحائف ارسال کئے جاتے تھے جنہیں آپ لینے سے انکار کردیتے تھے۔ اسی لیے ۱۵۰ھ میں کوفے سے ہجرت کرلی۔ سفیان ثوری سرکار کی جانب سے تحائف لینے سے انکار اس خیال کے تحت کرتے تھے کہ سرکاری منصب یا تحائف قبول کرنے کے بعد ان میں دنیاداری کے بعض بُرے اثرات پیدا ہوجائیں گے اور یہ کہ ممکن ہے کہ حکومتِ وقت انھیں اپنے غلط فیصلوں کی تائید پر مجبور کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ طریقِ حکومت سے بھی بہت بیزار تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اقتدار میں جبر نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جبر کی حقیقی اسلامی سیاست میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے وہ حکومت سے تعاون کرنے کو "تعاون علی الاثم والعدوان" خیال کرتے تھے۔

اس کے علاوہ آپ کو سلطان اور خلفا کی ذاتی زندگی سے گزارنے کے طریقوں پر بھی اعتراض تھا۔ امام سفیان ثوریؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو حنیفہؒ جیسے جیّد عالموں نے ہمیشہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا اور تکالیف برداشت کیں۔ اسی لیے سفیان ثوری بھی عراق کی حدود سے نکل کر یمن پہنچے۔ یہاں پر بھی وہ بغدادی حکمرانوں کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ انھوں نے آپ کو تلاش کرلیا اسی لیے سفیان ثوری یمن سے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ مکے کے امیر محمد بن ابراہیم کو ۱۵۸ھ میں خلیفہ نے حکم دیا کہ انھیں تلاش کرکے قتل کردیا جائے۔ لیکن امیر مکہ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ ابن سعد کہتا ہے کہ اس نے آپ کو اس بات سے آگاہ کردیا۔ اس لیے آپ جلد ہی روپوش ہوگئے۔ طبری کہتا ہے کہ اس نے آپ کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد خود ہی رہا کردیا۔

ابن سعد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ آپ کو اپنا پیچھا کرنے والوں سے کعبہ کے اندر جاکر اپنی جان بچانی پڑی۔ آخر کار مکہ میں بھی ان کا رہنا دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آپ کو یہاں سے بصرہ ہجرت کرنا پڑی۔ جہاں بہت سے عالموں نے آپ سے حدیث کا درس لینا شروع کردیا۔ لیکن بعد میں آپ کے دشمنوں نے بصرہ میں رہنا بھی آپ کے لیے محال کردیا اور انھیں دربارِ خلافت سے مصالحت کرنے کے لیے خط و کتابت شروع کرنا پڑی جس کے بعد آپ کسی قسم کا معاہدہ آپس میں طے ہوجانے کے بعد بغداد جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ انھی دنوں آپ بیمار ہوگئے اور شعبان ۱۶۱ھ/مئی ۷۷۸ء میں ۶۴ سال کی عمر پاکر جہانِ فانی سے کوچ کرگئے۔

ایک راوی کی حیثیت سے ان کے "تبحرِ علمی اور ثقاہت" کا ہر ایک فرد معترف ہے۔ ابن ندیم کی الفہرست میں آپ کی جن تالیفات کا ذکر آیا وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) الجامع الکبیر (۲) الجامع الصغیر (۳) کتاب الفرائض، ۴ اور ۵ دو رسالے۔ لیکن ان کے موضوعات کی بابت کچھ درج نہیں ہے۔

بطور فقیہ آپ ایک مسلک کے بانی تھے۔ لیکن یہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا۔ آپ صفاتِ باری تعالیٰ کو جیسا کہ وہ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ لغوی معنوں میں مانتے تھے اور صرف خدا کے ساتھ ہی مخصوص جانتے تھے۔ آپ قرآن پاک کے غیر مخلوق ہونے کا ذکر کرنے کے بعد کہتے تھے کہ ایمان، قول، عمل اور نیت پر مشتمل ہے

آپ کے دیگر عقائد کچھ یوں ہیں۔ (۱) ایمان بڑھ سکتا ہے اور گھٹ سکتا ہے۔ (۲) عقیدے میں فضیلت (حضرت علیؓ پر) شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ہی حاصل ہے۔ (۳) وضو میں پاؤں کو دھونے کی بجائے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے (۴) بسم اللہ کا اخفا اس کے جہر سے اولیٰ ہے۔ (۵) قضاء قدر پر ایمان لانا ضروری ہے (۶) آدمی جمعہ اور عیدین میں کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن دوسرے تمام موقعوں پر اس آدمی کو اپنا امام منتخب کرنا چاہیئے، جس کے تقویٰ پر مکمل اعتماد ہو اور جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اہل السنت والجماعت میں سے ہے۔ (۷) جہاد روزِ قیامت تک جاری رہے گا (۸) ہر آدمی کو اولی الامر کی اطاعت کرنی چاہیئے وہ عادل ہو یا غیر عادل۔

آپ کے یہ تمام عقائد اہل سنت کے عقائد کے مطابق ہیں۔ لیکن بعض لوگ آپ کو مائل بہ تشیع بھی کہتے ہیں۔ طبری کہتا ہے کہ وہ پہلے شیعہ تھے۔ لیکن بصرہ میں ان کی ملاقات دو ایسے علماء سے ہوئی جنہوں نے انھیں عقیدہ بدلنے پر آمادہ کرلیا بعض لوگ ان کے زیدی ہونے کا شبہ بھی ظاہر کرتے ہیں۔ بہت سے صوفی انہیں اپنے مشائخ کبار میں خیال کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کو ایک صوفی کا درجہ بھی مل جاتا ہے شیخ فریدالدین عطار نے سفیان ثوریؒ کے بارے میں اپنی کتاب "تذکرۃ الاولیاء" میں آپ کے صوفی ہونے کے بارے میں ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔ الفہرست میں بھی آپ کا ذکر صوفیاء کے ضمن میں ہی آیا ہے۔

Marfat.com

بہرحال یہ طے ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور محدّث تھے۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے ہمعصر بھی تھے۔ اسی لیے آپ دونوں میں باہمی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد غالباً یہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ اہل الرّائے میں شمار کیے جاتے تھے جبکہ حضرت سفیان ثوری کا شمار اہل الحدیث میں ہوتا تھا۔

سفید کوہ

افغانستان کے شمالی علاقے کا مشہور پہاڑی سلسلہ۔ اس سلسلہ کوہ کی سب سے اونچی چوٹی کوہ سکارام ہے، جس کی اونچائی سطح سمندر سے ۱۵۶۲۰ فٹ ہے۔ یہ پہاڑ دریائے سندھ کے شہر اٹک تک پھیلا ہوا ہے اور دریائے کابل کی وادی کو وادیٔ کرّم اور آفریدی تیراہ سے الگ کرنے کا باعث ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کا آخری سرا پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے۔ کوہِ سفید کے شمالی اور مشرقی حصّے جو آگے کو نکلے ہوئے ہیں، میں درۂ خیبر، پشاور اور دوسرے کئی دشوار گزار درّے موجود ہیں۔ ان درّوں میں ۱۸۴۱ء۔۱۸۴۲ء کی جنگ میں برطانوی اور ہندوستانی فوجوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ کوہ سفید کے شمالی سلسلے چٹیل ہیں، جبکہ بالائی ڈھلوانوں پر صنوبر، دیودار اور دوسرے درختوں کے جنگلات بکثرت موجود ہیں۔ سلسلے کے جنوبی حصّوں میں اکثر پہاڑوں پر صنوبر اور خود رو زیتون کے جنگل پائے جاتے ہیں۔ ان سلسلوں کی وادیوں میں میوہ دار درختوں کے باغات اور کھیت بھی موجود ہیں۔

سفینہ

سمندری جہاز یا کشتی۔ عربی زبان میں اس معنی اور مفہوم پر مبنی کئی لفظ موجود ہیں۔ کئی لفظ قرآن مجید میں بھی آئے ہیں مثلاً فلک، قرآن کریم میں تیئیس ۲۳ جگہ آیا ہے۔

لغت کے عرب عالموں کے نزدیک سفینہ سفن سے مشتق ہے۔ جہازرانی کے طور پر عربی میں عام طور پر **سفانۃ** اور **ملاحۃ** کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ہی عرب لوگ کشتی رانی اور جہازرانی سے آگاہ تھے۔ جب عرب میں اسلام کا ظہور ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ عربوں میں جسمانی اور ذہنی نشوونما اور ترقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی جہاز سازی کے فن اور جہاز رانی کو بھی ترقی ملی۔ اسی لیے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی جہاز سازی اور جہازرانی میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

قرآن مجید میں کشتی، سمندر اور ان کے متعلقات کا ذکر بہت آیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد کے طوفان اور اس کشتی کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے جو انہوں نے اللہ کے حکم سے تیار کی تھی اور اس کا حکم ملتے ہی اپنے تمام ہمسفروں سمیت اس میں سوار ہو گئے۔ "وہ کشتی نوحؑ اور ان کے ہمسفروں کو لے کر پہاڑوں کی سی بلند موجوں میں تیرتی چلی جاتی تھی" (ہود: ۳۷ تا ۴۲)

اس کے علاوہ قرآن مجید کی سورۂ شوریٰ میں جہازرانی اور قوت بحریہ کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ اس میں سمندر میں پہاڑوں کی مانند فلک بوس رواں دواں کشتیوں کو خدا کی کائنات کے عجائبات قرار دیا ہے۔

پھر بحری تجارت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ: "اللہ نے سمندروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس میں سے تر و تازہ گوشت نکال کر کھا سکو، سمندر میں اللہ کا فضل و کرم (مال و تجارت) تلاش کر سکو اور اس کے شکر گزار ہو سکو۔" (النحل: ۱۴)

قرآن مجید کی سورۂ الروم میں جہازرانی کے لیے موافق اور مددگار ہواؤں کو اللہ کی آیات سے تعبیر کیا ہے اور بحری تجارتی کاروانوں کے لیے اسے ایک خوشخبری قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جہازرانی کے لیے ضروری چیزوں مثلاً بندرگاہوں، سمندری اور دریائی راستوں اور بحری سفر میں راہنمائی کے لیے زمین اور آسمان پر مختلف علامتوں کا ذکر بھی آیا ہے!

"اور اللہ تعالےٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے ہیں تاکہ زمین تمہیں لے کر ایک طرف کو جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیے تاکہ تم راہ پاؤ، اور علامتیں بنا دی ہیں اور ستاروں کے ذریعے بھی وہ راہ پاتے ہیں۔" (النحل۔ ۱۵ تا ۱۶)

ان آیات کے ذریعے انسانوں کو اللہ کی نعمتوں اور اس کی ہیبت و قدرت کا احساس دلا کر انہیں نیکی اور خدا ترسی کی جانب مائل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان آیات میں ہمیں جہازرانی اور سمندر شناسی کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس کے بھی واضح تاریخی شواہد ملتے ہیں کہ زمانہ قبل از اسلام میں بلادِ عرب کی بندرگاہوں پر تجارتی بحری جہاز معمول کے مطابق آتے جاتے تھے۔ اور بیشتر عرب تاجر سمندری تجارت اور سمندری سفروں سے اچھی طرح آشنا تھے۔

اسلام آنے کے بعد حضورؐ کے زمانے میں مسلمانوں نے کئی بحری سفر کیے۔ اس کے بعد خلفاء راشدینؓ کے عہد میں تو بحری سفروں کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا تھا۔ خاص طور پر حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے مہذب دنیا کی بڑی بڑی بندرگاہوں اور تمام سمندری راستوں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی دریائے نیل اور بحر احمر کو تجارتی اغراض کے لیے ایک مصنوعی نہر کے ذریعے ملا دیا گیا تھا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے موجودہ نہر سویز کی جگہ بھی ایک نہر کھودنے کی اجازت چاہی تو حضرت عمرؓ نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس وقت اسی میں مصلحت تھی۔ اس زمانے میں ایران کی بحری قوت زیادہ تھی۔ اسے بحر احمر اور بحر روم کو آپس میں مصنوعی نہر کے ذریعے ملانے سے اسلامی مملکت کا دفاع خطرہ میں پڑ سکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے اپنی بحری قوت میں خوب خوب اضافہ کیا۔ اور اپنے دشمنوں پر اپنی سمندری طاقت کی دھاک بٹھا دی۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی نگرانی میں مسلم بحری بیڑے نے بحیرہ روم میں اپنی قوت کا لوہا منوا لیا۔

اموی عہد میں عکّا کی بندرگاہ میں عربوں کا جہاز سازی کا سب سے پہلا کارخانہ قائم ہوا تھا۔ مسلمان جہازرانوں اور عرب علماء نے بحری راستوں کی نشاندہی، سمندروں کی پیمائش، جہازرانوں کی رہنمائی کے لیے خطرات کے نشانات، ستاروں، ہواؤں، قطب نما، فنِ جہازرانی اور دیگر مفید ملکی آلات کے بارے میں کتنے ہی ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔

سقمان

حصین کیفا کا فرمانروا۔ سقمان بن ارتق۔ معین الدولہ کے لقب سے بھی مشہور تھا۔ اپنے والد ارتق کی وفات کے بعد ۴۸۴ھ/۱۰۹۱ء میں سقمان اور اس کے بھائی کو بیت المقدس کا شہر بطور جاگیر مل گیا۔ لیکن شعبان ۴۸۹ھ/جولائی ۱۰۹۶ء میں ان سے یہ شہر فاطمیوں نے چھین لیا۔ یہ دونوں بھائی وہاں سے دمشق چلے گئے دمشق سے سقمان کا بھائی عراق چلا گیا اور خود سقمان نے الرھا E.I. F.E.S

Marfat.com

میں پناہ لے لی۔ یہاں پر رہنے والے ارمن باشندوں نے انگریزوں کو بلوا کر سقمان کو وہاں سے جانے پر مجبور کرنا چاہا۔ لیکن اس نے ان چند جان نثار سپاہیوں کی مدد سے مقابلہ کیا اور شہر مروّج کو فتح کر لیا۔ اس کے تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی انگریزوں نے مروج میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا جس کے بعد سقمان کی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعے کے تھوڑے عرصہ بعد سقمان کو حصین کیفا کا قبضہ مل گیا۔ ۴۹۷ھ / ۱۱۰۴ء میں حرّان پر انگریزوں نے حملہ کر دیا جس کے باعث سقمان نے اپنے دشمن جکرمش سے صلح کر لی اور اس طرح دونوں اکٹھے ہو کر حران میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے پہنچ گئے جب وہاں کے باشندے بے بس ہو چکنے کے بعد انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کے لئے بات چیت کر رہے تھے۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا جس میں انگریزوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے سقمان اور جکرمش میں دوبارہ حالتِ جنگ پیدا کرا دی۔ لیکن اس وقت سقمان نے ہوش سے کام لیا۔ جکرمش نے حران پر قبضہ کر لیا اس واقعے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ابن عمار جو طرابلس کا امیر تھا، نے سقمان سے انگریزوں کے خلاف مدد چاہی۔ سقمان فوراً اس کی مدد کے لئے دمشق کی طرف چل دیا۔ لیکن راستے میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سقمان کا بیٹا حصین کیفا میں اور اس کا بھائی ایلغازی ماردین میں اس کے جانشین بن گئے۔

سقیفہ بنی ساعدہ

بنو خزرج کے سردار حضرت سعدؓ بن عبادہ کے مکان کے پاس ایک سائبان بنا ہوا تھا۔ اس سائبان کو سقیفہ بنی ساعدہ کہا جاتا ہے۔ جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو بہت سے انصاری سردار اس سائبان میں جمع ہو گئے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ سعدؓ بن عبادہ کو حضورؐ کا جانشین منتخب کیا جائے۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے بھی ایک تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ امارت ہمارا حق ہے۔ تمام سرداروں نے اس بات کی تائید و حمایت کی۔ اس موقع پر ان سرداروں نے مہاجرین سے بھی ایک امیر لینے کی تجویز پیش کی۔ جب اس واقعے کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ صدیق کو ملی تو وہ فوراً حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے اور تمام انصاری سرداروں کی موجودگی میں نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ خطاب فرمایا جس میں انصار کی خدمات کا اعتراف کیا اور ساتھ ہی یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے، نومسلم بدو قبائل کے لوگ قریش سردار کے علاوہ کسی اور کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دیں۔ پھر یہ بھی بتایا کہ انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج میں باہمی جھگڑے موجود رہتے ہیں، اس لیے اگر کسی ایک قبیلے کے سردار کو حضورؐ کے جانشین کے طور پر چن لیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا قبیلہ اس کے خلاف سازشوں میں مصروفِ عمل ہو جائے اس لیے بہتر یہی ہے کہ قریش کے کسی سردار کو ہی امیر منتخب کر لیا جائے۔ اس پر آپس میں جھگڑے کے سے آثار نمایاں نظر آنے لگے تو حضرت ابو عبیدہؓ تمام حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ سب سے پہلے اسلام کی حمایت انصار نے ہی کی تھی اب انہیں اسلام کی تباہی میں پہل نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس کے بعد سعدؓ انصاری نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے رسولؐ خدا کی رضا کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اس لیے یہ بات نامناسب ہے کہ ہم اپنی قربانیوں کے بدلے دنیا کے طلب گار ہوں۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ حضورؐ کی قوم آپؐ کی جانشینی کی زیادہ مستحق ہو سکتی ہے۔ سعدؓ انصاری کے خطاب کے بعد انصاری سرداروں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ جس کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق نے کہا کہ یہاں پر حضرت ابو عبیدہؓ بھی موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ اس پر ان دونوں نے کہا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس منصب کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر آپ دونوں نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے ہاتھ پر بیعت کر لی جس کے بعد تمام انصاری سرداروں نے بھی خوشی خوشی حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں میں جس اختلاف کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، وہ انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گیا۔

سکاکی

سراج الدین یوسف بن ابوبکر بن محمد ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک صنعت کار تھا اور دھاتوں پر نقش کاری کے فن میں خوب طاق تھا اسی لئے لوگ اسے سکاکی کے لقب سے بلانے لگے۔ سکاکی تالے بنانے کے فن میں بھی بہت ماہر تھا اور طرح طرح کے پُر پیچ تالے بناتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک خوب صورت قلمدان بنایا۔ اس قلمدان میں ایک نہایت چھوٹا سا تالا بھی بنا کر لگایا۔ اس تالے کا وزن ایک قیراط تھا اس قلمدان کو اس نے حاکم شہر کو بطور تحفہ پیش کر دیا جس کا اسے بہت انعام ملا اور اس کی خوب آؤ بھگت بھی ہونے لگی۔ لیکن چند دنوں بعد اسی حاکم کے ہاں ایک اور آدمی آیا جس کی سکاکی سے زیادہ قدر و منزلت ہوئی تھی۔ اس پر اس نے معلوم کیا کہ ایسا کس وجہ سے ہوتا ہے جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شخص عالم ہے تو اس نے خود بھی عالم بننے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس کی علم کے حصول کی ابتدائی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور اس نے ہمت ہار دی پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک جگہ بھاری پتھر پر قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا ہے اور پانی کے مسلسل ٹپکنے کے باعث پتھر میں کافی گہرا سوراخ پیدا ہو گیا ہے تو اس نے بھی دوبارہ علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ سکاکی نے فقہ حنفی کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام الکنیہ ہے۔ سکاکی کو زیادہ شہرت اپنی کتاب مفتاح العلوم کے باعث حاصل ہوئی۔ یہ کتاب بلاغت پر اپنی نوعیت کی واحد مگر جامع کتاب سمجھی جاتی ہے سکاکی کا انتقال فرغانہ کے شہر المالغ کے قریب قریہ الکندی میں ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء کو ہوا۔

سکندر قادری

شاہ سکندر قادری ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت شاہ عماد الدینؒ تھے۔ آپ نے روحانی تعلیم اپنے جد امجد سے بچپن میں ہی حاصل کر لی تھی۔ یوں بھی آپ کا سلسلۂ نسب چودھویں پشت میں غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ سے مل جاتا ہے۔ آپ کا اصل نام عبداللہ اور شاہ سکندر ہے۔ رئیس الاولیا لقب اور ابوالحسنات کنیت ہے۔

سیر و سیاحت آپ کی عادت تھی۔ اسی لیے زیادہ عرصہ آپ نے سیر و سیاحت میں گزارا جس کے دوران میں اشاعتِ دین اور اسلام کی تبلیغ بھی فرمائی۔

آپ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ لاہور آئے اور حضرت طاہر

Marfat.com

[illegible] کے شیخ طاہر بندگی اس وقت اپنے مکان کی اوپر کی [illegible] انھوں نے آپ کو دیکھتے ہی چھت پر آ کر اوپر کی منزل سے چھلانگ لگا کر فوراً حضرت سکندر شاہ کی قدم بوسی کریں۔ اس بات کا انھیں فوراً علم ہو گیا چنانچہ آپ نے فرمایا "طاہر تم جلدی نہ کرو اور زمین کے راستے سے آجاؤ"۔

اسی طرح ایک اور واقع روایت کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے لاہور میں قیام کے دوران حضرت طاہر بندگی سے کہا کہ "تمام شہر میں منادی کرادی جائے کہ جس کسی کو لڑکے کی پیدائش کی خواہش ہو وہ نذر نیاز لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے"۔ اس منادی کے ہوتے ہی ہزاروں خواتین نذر نیاز لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگیں۔ آپ ہر ایک سے اس کی نذر قبول کرتے اور انھیں "جاؤ لڑکا ہوگا" کہہ کر لڑکے کی بشارت دیتے۔

لاہور کے بعض لوگوں نے اس پر آپ کا مذاق اڑایا۔ اور ایک لڑکے کو عورت کا لباس پہنا کر آپ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپ کو نذر دی جسے آپ نے قبول فرما لیا اور اسے لڑکے کی بشارت دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد وہ تمام لوگ جنہوں نے اس لڑکے کو آپ کے پاس بھیجا تھا۔ آپ کا اور بھی زیادہ مذاق اڑانے لگے۔ اسی دوران ایک بوڑھی عورت بھی لڑکے کی تمنا لے کر آپ کے پاس آئی۔ آپ نے اس بوڑھی خاتون کو کہا کہ اب لڑکوں کی تعداد پوری ہو چکی ہے۔ جس پر وہ خاتون رونے لگی۔ اس پر آپ بہت متاثر ہوئے اور اس کی نذر قبول کر لی۔

اس واقعے کے بعد آپ کا قیام لاہور ہی میں رہا۔ جن کو آپ نے لڑکوں کی بشارت دی تھی ان کے ہاں وضع حمل کے وقت خدا کے حکم سے اولادِ نرینہ پیدا ہو رہی تھی جس لڑکے کو چند لوگوں نے عورت کے لباس میں آپ کے پاس بھیجا تھا اسے بھی ایک دن اچانک دردِ زہ شروع ہو گیا۔ لڑکا درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگا۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر جن لوگوں نے اسے حضرت سکندر قادریؒ کے پاس بھیجا تھا اس لڑکے کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ آپ نے اس لڑکے کا اور ان لوگوں کا قصور معاف کر دیا۔ اسی دوران بوڑھی خاتون جو سب سے آخر میں آپ کے پاس آئی تھی وہ بھی پہنچ گئی۔ آپ نے فوراً اس خاتون سے کہا کہ اس لڑکے کے پیچھے سے نکل جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہوتے ہی حمل لڑکے سے نکل کر بوڑھی خاتون کے قرار پا گیا اور لڑکا دردِ زہ کی مصیبت سے بچ گیا۔

اس واقعے کے بعد اہلِ لاہور جوق در جوق آپ کے مرید ہونے لگے۔ آپ نے لوگوں سے حاصل کی ہوئی نذر کی تمام رقم اور اشیا کو یتیموں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔ آپ کی وفات ۱۴ جمادی الاوّل ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کو ہوئی۔ آپ کا مزار کیتھل میں آج بھی ہر خاص و عام کے لیے زیارت گاہ ہے۔ آپ کے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔

سکینہ

عربی اور عبرانی زبان کا ایک لفظ جس کے معنی عربی میں اطمینان سکون اور وقار کے ہیں۔ عبرانی میں اس لفظ کو خالص روحانی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس لفظ سے ذاتِ باری تعالیٰ کی موجودگی مراد لی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی ہی جگہ پر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "اس میں تمہارے رب کی جانب سے سکینہ (تسلی کا سامان) ہے۔ (البقرہ ۲۴۸)
وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی" (الفتح : ۴)

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، مفسرین اس سے عام طور پر سکون، اطمینان اور سکونِ قلب، سکونِ روح ہی مراد لیتے ہیں۔ امام راغب اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ سکینہ مومن کے دل کو تسکین دینے والا فرشتہ ہے۔ وہ تسکینِ دل کے ساتھ ساتھ حفاظت کرنے کا کام بھی سر انجام دیتا ہے۔ امام راغب سکینہ کے ایک معنی عقل بھی لیتے ہیں۔ فضائلِ قرآن بیان کرتے ہوئے بخاری شریف میں آیا ہے کہ "جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کی برکت سے سکینہ و ملائکہ کا نزول ہوتا ہے"۔

بعض مفسرینِ قرآن لفظ "سکینہ" کو ایک حیوان سے ملتی جلتی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام سیوطی اور سید رشید رضا نے اس بات کو غلط قرار دیا ہے۔

سکینہ

حضرت امام حسینؓ کی بیٹی۔ آپ کی والدہ رباب بنو کلب کی شاخ بنو عدی کے مشہور سردار امرؤ القیس بن عدی بن ادس کی دختر تھیں۔ سانحۂ کربلا کے وقت حضرت سکینہؓ اور ان کی والدہ دونوں میدان کربلا میں موجود تھیں۔ شہادتِ حسینؓ کے بعد آپ کو گرفتار کر کے کوفہ اور بعد میں شام پہنچا دیا گیا۔ جب آپ کو کافی عرصہ کے بعد رہائی ملی تو آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئیں۔ یہاں آنے کے بعد آپ کی زندگی کے حالات منظرِ عام پر نہیں آئے۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سوگ نشین ہو گئی تھیں اور اسی غم میں اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔

شیعہ مورخ اپنی کتابوں میں حضرت سکینہ کے بارے میں لکھتے ہیں: سانحۂ کربلا کے وقت وہ کم عمر تھیں۔ ایک کتاب "اسعاف الراغبین" میں حضرت امام حسینؓ سے منسوب کر کے یہ جملہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "سکینہ پر استغراق مع اللہ غالب ہے" آغا مہدی اپنی کتاب "سکینہ بنت حسینؓ" میں لکھتے ہیں کہ حضرت سکینہ نے قیدِ شام کے دوران میں وفات پائی اور دمشق میں سکینہؓ کا مزار موجود ہے۔

بعض غیر شیعی مورخ کہتے ہیں کہ حضرت سکینہ نے لمبی عمر پائی۔ آپ کا نکاح یکے بعد دیگرے ابوبکر عبداللہ بن امام حسینؓ، مصعب بن الزبیرؓ، عبداللہ بن عثمان خزامی اور زید بن عمرو بن عثمانؓ بن عفان سے ہوا۔ آپ کے ہاں حضرت زید سے ایک بیٹا عثمان اور حضرت عبداللہ سے ایک بیٹی رباب پیدا ہوئی۔ رباب کمسنی میں ہی فوت ہو گئی جبکہ عثمان نے مدینہ منورہ میں اپنی زندگی گزاری۔ لوگوں میں وہ "قرین" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بیشتر مورخین نے حضرت سکینہ کے حسنِ صورت و سیرت، جرأت، کریم النفسی اور سخن پروری کی بے حد تعریف کی ہے۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے عہد کے مشہور شاعروں اور مغنیوں کی سرپرستی کی۔ ابن خلکان ان کی وفات کی تاریخ ۵ ربیع الاوّل ۱۱۷ھ بتاتے ہیں۔ نیز یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی۔

سلاح دار

اسلحہ رکھنے والا۔ مملوکوں کے دربار میں ایک عہدہ تھا جسے سلاح دار کہا جاتا تھا۔ ان کے پاس بادشاہ کے ہتھیار موجود ہوتے تھے۔ ہر سلاح دار صرف ایک ہتھیار اپنے پاس رکھتا تھا جسے وہ بوقتِ ضرورت بادشاہ کو پیش کر دیا کرتا تھا۔ اس طرح ہر بادشاہ کے بے شمار سلاح دار ہوتے تھے۔ ان سب سلاح داروں کا ایک سردار بھی ہوتا تھا جسے امیر سلاح کہا جاتا تھا۔ وہ سلاح داروں کی سرداری کے

Marfat.com

علاوہ اسلحہ خانے کے محافظ کے طور پر بھی کام کرتا تھا۔ اس عہدے کو عثمانی ترکوں نے بھی بطور خطاب برقرار رکھا۔ سلاح دار آغا اور چوقہ دار دو عہدے دار عثمانی ترکوں کے عہد میں ملتے ہیں۔ وہ سلطانِ وقت کو مسجد میں داخل ہوتے ہی تین مرتبہ عرقِ گلاب اور عود کا عطر پیش کیا کرتے تھے۔

سلافیہ

ایک جماعت جس کی بنیاد روس نے عثمانیہ سلطنت کو سبوتاژ کرنے کے لیے رکھی تھی۔ اس جماعت کا نام جمعیتِ سلافیہ رکھا گیا۔ اس نے سلافی قوموں میں روس کے ادب کی اشاعت کی ابتدا کی اور آہستہ آہستہ لوگوں کے دل میں گھر کرتی گئی۔ یہاں تک کہ بہت قلیل مدت میں ریاستِ بلقان کے بیشتر عیسائی جمعیتِ سلافیہ کے ہمدرد اور طرف دار بن گئے۔ جمعیتِ سلافیہ کو ایک روسی مفکر اگناتیف چلا رہا تھا۔ جنگِ کریمیا کے بعد سے اتحادِ سلافی کا چرچا شروع کیا گیا۔ روسیوں نے سلافی لوگوں نے کو اپنی ہم نسل قوموں میں پروپیگنڈا کرنے پر اکسائے رکھا۔ اس زہریلے پروپیگنڈے کے نتیجے میں ۱۸۶۷ء میں "اتحادِ سلافی" کی ایک بہت بڑی کانگرس منعقد ہوئی۔ یہ کانگرس ایک علمی اور ادبی انجمن کا چغہ پہنا کر منعقد کرائی گئی تھی۔ اس کانگرس میں اتحادِ سلافی کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا صدر مقام ماسکو میں بنایا گیا۔ ساتھ ہی اس کی ایک ذیلی شاخ بخارسٹ میں بھی قائم ہوئی۔ جمعیت سلافیہ نے سلافی نوجوان لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے پردے میں روسی یونیورسٹیوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ جہاں سے وہ اتحادِ سلافی کے کٹر مبلغ بن کر نکلتے تھے۔ جب مدحت پاشا کو اس ساری روئداد کا علم ہوا تو اس نے بلغاریہ کے تمام شہروں میں اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے درسگاہیں کھولنے کا پروگرام سلطان کے سامنے پیش کیا کہ عیسائی اور مسلمان اکٹھے ہی تعلیم حاصل کریں۔ مدحت پاشا کے اس پروگرام کو جنرل اگناتیف نے درہم برہم کرا دیا۔ اس طرح جمعیتِ سلافیہ نے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اپنا معاندانہ رویہ برقرار رکھا۔ اور اس میں آہستہ آہستہ کامیابیاں حاصل کرتی رہی۔

سلام

ایک عربی زبان کا لفظ ہے جو بطور اسم بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سلام سے سلامتی کا مطلب بھی لیا جاتا ہے بعربی میں سلام کرنے یا نماز کے اختتام پر سلام کو "تسلیمۃ" کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ سلام ۴۵ مختلف آیات میں موجود ہے جیسے :۔

"اہلِ جنت ایک دوسرے کو لفظ سلام سے تحیہ پیش کریں گے" (یونس ۱۰) اسی طرح "سلام ہو کہ تم نے صبر کیا اب دارِ آخرت تمہارے لیے بہت عمدہ ٹھکانا ہو گا (الرعد ۲۴) قرآن پاک میں یہ لفظ بطور امن اور سلامتی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

"امن اور سلامتی طلوعِ فجر تک رہتی ہے" (القدر ۵) اس کے علاوہ ہم عام زندگی میں بھی ایک دوسرے سے ملتے وقت، یا جدا ہوتے وقت اس کی سلامتی کی دعا کے طور پر بھی سلام کرتے ہیں۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے شخص سے کہے "السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) تو دوسرے آدمی کو اس کا جواب "وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ" (اور تم پر بھی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) کہہ کر دینا چاہیے اسی طرح اگر پہلا شخص ہی رحمۃ اللہ کا لفظ بھی سلام کے ساتھ کہے تو دوسرے شخص کو چاہیے کہ وہ جواب دیتے وقت "وبرکاتہ" کا اضافہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سورت النساء کی آیت ۸۶ میں فرمایا ہے کہ اگر تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر طریقے سے اس کا جواب دو۔ شرعی نقطۂ نظر سے سلام کرنا سنت رسولؐ ہے لیکن اس کا جواب فرض کفایہ ہے جس کا مطلب ہے کہ اگر خطاب کسی اجتماع سے ہو تو ان میں سے ایک یا کئی افراد جواب دے دیں تو کافی ہے لیکن اگر مخاطب تنہا ہو تو پھر یہ سلام کا جواب فرض عین ہو جاتا ہے۔ ابن العربی کے بقول اگر کسی شخص سے صرف جان پہچان ہو تو سلام فرض ہے لیکن اگر جان پہچان نہ ہو تو پھر سنت اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر جان پہچان والے شخص کو سلام نہ کیا جائے تو دل میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ (احکام القرآن از ابن العربی) ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس سے تمہاری باہمی محبت میں اضافہ ہو گا؟ آپس میں سلام کو عام کرو! (تفسیر القرطبی)، سلام کرنے میں پہل کرنا مستحسن ہے کیونکہ حضورؐ کا طریقہ یہی تھا۔ خطبہ، نماز، تلاوت، غسل اور رفعِ حاجت کے وقت سلام کا جواب واجب نہیں۔

سلانیکی مصطفیٰ

ایک ترک مؤرخ سالونیکا، ترکی میں پیدا ہوا۔ مصطفیٰ کے والد کا انتقال بہت جلد ہو گیا۔ جس کے بعد وہ روم ایلی کے شمسی احمد پاشا کے پاس قرآن خواں کی حیثیت میں ملازم ہو گیا۔ ۱۵۸۴ء میں تھوڑے عرصے تک نشانجی محمد پاشا کے کاتب کے طور پر کام کرتا رہا بعد میں سلحدار کا کاتب بن گیا۔ اس کے بعد فوج کا کاتب اور پھر حرمین کے دفتر محاسبہ حسابات کا صدر بن گیا۔ جہاں سے بہت جلد اُسے میر سامان شاہی بنا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۵۵۸ء میں قسطنطنیہ آکر ایرانی شہزادے حیدر کا مہماندار بن گیا۔ اس نے ایک تاریخ کی کتاب "تاریخ سلانیکی" لکھی۔ جو ۱۲۸۱ء میں استنبول سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں سلیمان اعظم کے عہدِ حکومت کے آخری سالوں سلیم ثانی، مراد ثالث کے پورے عہد اور محمد ثالث کے ابتدائی پانچ سالوں کے واقعات و حالات پر شامل ہیں۔

مصطفیٰ سلانیکی کے انتقال کا اصل سال معلوم نہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۰۰۸ھ ۱۵۹۹ء کے لگ بھگ استنبول میں انتقال ہوا۔

سلجوق آل

ایک ترک شاہی خاندان۔ اس خاندان نے گیارھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک وسطی اور ایشیائے قریب کے بہت بڑے علاقوں پر حکومت کی۔ ان میں چند نمایاں خاندان یہ ہیں۔ (۱) سلجوقیان ایشیائے کوچک (۲) سلجوقیانِ اعظم (۳) سلجوقیانِ عراق (۴) سلجوقیان شام اور (۵) سلجوقیان کرمان۔

سلجوق خاندان کا مورثِ اعلیٰ سلجوق بن دُقاق تھا جسے تیمور یلیغ یعنی لوہے کی کمان والا بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ترکوں کا لیڈر تھا۔ تمام لوگوں کو اس پر غیر متزلزل اعتقاد تھا اسی لیے وہ اس کی کسی تقریر یا عمل پر قطعاً حرف گیری نہ کرتے تھے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے میں عجلت سے کام لیتے تھے اور جلد از جلد اس کے حکم کی بجا آوری اپنا فرض سمجھتے تھے انہیں دنوں اتفاقاً ترکوں کے بادشاہ بیغو نے اپنی فوجوں کو جمع کر کے اسلامی ممالک پر چڑھائی کرنے کا پروگرام بنایا۔ سلجوق بن دقاق نے اس کی مخالفت کی اور دربار میں بادشاہ کے خلاف تقریر کر دی۔ بادشاہ نے سلجوق کے خلاف چند نازیبا الفاظ کہے جس پر اس نے بادشاہ کے کان پر ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ بادشاہ کا سر اس ضربِ کاری کے باعث زخمی ہو گیا اس پر خادموں نے سلجوق بن دقاق کو گرفتار کرنا چاہا تو اس نے ان کے ساتھ بڑی عمدہ لڑائی کی جس کے باعث بادشاہ کے تمام خدام اُسے تنہا چھوڑ گئے بعد میں

Marfat.com

سلجوق بن دقاق اور بادشاہ چین صلح ہوگئی ۔ (ابن الاثیر۔ الکامل)

سلجوقیوں کے بارے میں بعض روسی علماء نے رائے ظاہر کی ہے کہ وہ عیسائیت اختیار کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے سلجوق بن دقاق کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ ایک سو جات سال کی عمر پا کر جند کے مقام پر انتقال کر گیا۔ بعد میں اس کے بیٹوں میں سے ایک جس کا نام ارسلان تھا نے اپنے باقی بھائیوں کی قیادت سنبھال لی تھی۔

مختلف سلجوقیوں نے جتنے عرصہ حکومت کی ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے :۔

۱۔ سلجوقیان اعظم (۱۰۳۸ء تا ۱۱۵۷ء)

(۱) طغرل بیگ ۱۰۶۳ء تک۔ ب۔ الپ ارسلان ۱۰۷۲ء تک۔ ج۔ ملک شاہ ۱۰۹۲ء تک۔ د۔ محمود اور برکیا روق ۱۱۰۴ء تک۔ ہ۔ ملک شاہ ثانی اور محمد ۱۱۱۷ء تک س۔ سنجر ۱۱۵۷ء تک۔

۲۔ سلاجقہ عراق۔ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۹۴ء)

محمد سلجوقی کی وفات کے بعد اس کا تیرہ سالہ بیٹا محمود خراسان اور شمال مشرقی سرحدی علاقوں کے علاوہ باقی تمام سلطنت کا وارث بنا۔ سلاجقہ عراق میں مندرجہ ذیل بادشاہ بنے۔

۱۔ محمود ۱۱۳۱ء تک ۲۔ داؤد ۱۱۳۲ء تک۔ ۳۔ طغرل اول ۱۱۳۴ء تک ۴۔ مسعود ۱۱۵۲ء تک۔ ۵۔ ملک شاہ ثانی ۱۱۵۳ء تک۔ ۶۔ محمد ثانی ۱۱۵۹ء تک ۷۔ سلیمان شاہ ۱۱۶۱ء تک ۸۔ ارسلان شاہ ۱۱۷۵ء تک ۹۔ طغرل ثانی ۱۱۹۴ء تک۔

۳۔ سلاجقہ کرمان۔ ۱۰۴۱ء تا ۱۱۸۶ء۔

(۱) اس سلسلے کا بانی اور جداعلیٰ چغری بیگ کا بیٹا "قاورد قرہ ارسلان بیگ" تھا اس نے ۱۰۴۱ء سے ۱۰۷۴ء تک حکومت کی۔ (۲) سلطان شاہ ۱۰۸۴ء تک (۳) توران شاہ ۱۰۹۷ء تک (۴) ایران شاہ ۱۱۰۱ء تک (۵) ارسلان شاہ ۱۱۴۲ء تک (۶) محمد ۱۱۵۶ء تک (۷) طغرل شاہ ۱۱۶۹ء تک (۸) بہرام شاہ اور ارسلان شاہ ثانی ۱۱۷۶ء تک (۹) توران شاہ ثانی ۱۱۸۳ء تک (۱۰) محمد شاہ ۱۱۸۶ء تک۔

۴۔ سلاجقہ شام ۱۰۷۶ء تا ۱۱۱۷ء۔

۱۔ نصر مروانی حلبی ۱۰۸۵ء (۲) ملک شاہ ۱۰۹۲ء تک (۳) تتش ۱۰۹۵ء تک (۴) رضوان ۱۱۱۴ء تک (۵) الپ ارسلان ۱۱۱۷ء تک۔

۵۔ سلاجقہ ایشیائے کوچک۔ ۱۰۷۷ء تا ۱۳۰۲ء۔

اس خاندان کا بانی سلیمان بن قتلمش بن ارسلان تھا۔ ابتداء میں وہ طغرل بیگ کے ماتحت سرداروں میں سے ایک تھا لیکن بعد میں اس نے بغاوت کر دی اور ۱۰۶۴ء میں طغرل بیگ کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ سلاجقہ ایشیائے کوچک میں سب سے پہلے ہم سلیمان کو ۱۰۷۷ء میں فرمانروائی کی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔

(۱) سلیمان ۱۰۸۶ء تک (۲) قلیج ارسلان اول ۱۱۰۷ء تک (۳) ملک شاہ اور مسعود ۱۱۵۵ء تک (۴) قلیج ارسلان ثانی ۱۱۹۲ء تک (۵) رکن الدین سلیمان ثانی ۱۲۰۴ء تک (۶) قلیج ارسلان ثالث اور غیاث الدین کیخسرو اول ۱۲۱۰ء تک (۷) عزالدین کیکاؤس اول ۱۲۱۹ء تک (۸) علاؤالدین کیقباد ۱۲۳۷ء تک (۹) غیاث الدین کیخسرو ثانی ۱۲۴۵ء تک (۱۰) عزالدین کیکاؤس ثانی ۱۲۵۶ء تک (۱۱) رکن الدین قلیج ارسلان رابع ۱۲۶۶ء تک (۱۲) غیاث الدین کیخسرو ثالث ۱۲۸۴ء تک (۱۳) غیاث الدین مسعود ثانی اور علاؤالدین کیقباد ثالث ۱۳۰۲ء تک۔

سلسبیل

جنت کے ایک چشمے کا نام۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے "ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی، یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے" (الدھر ۱۷-۱۸)

سلسبیل جنت کا ایسا چشمہ ہوگا جس کے پانی میں سونٹھ کی خوشبو موجود ہوگی۔ مولانا مودودی اس کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا، ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بسہولت گزر جائے۔

اس کے بارے میں ہمیں ایک حدیث صحیح مسلم میں ملتی ہے۔ " بہشت کا وہ چشمہ جس سے مومنین شادکام ہوں گے، سلسبیل کہلاتا ہے۔" امام راغب کے بقول سلسبیل ہر اس چشمے کو کہتے ہیں جو تیزی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ اس لفظ کے بارے میں صرف و نحو کے ماہرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

سلطان باہو

آپ ضلع جھنگ کے ایک گاؤں اعوان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سلطان بایزید تھا۔ آپ کے آباء و اجداد حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد عرب سے ہندوستان ہجرت کر آئے تھے۔ ابتدا میں وہ ضلع جہلم کے گاؤں پنڈ دادن خان میں رہائش پذیر ہوئے۔ وہاں ہزاروں ہندوؤں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ بعد میں رہائش شورکوٹ منتقل کر لی۔ مغلیہ شہنشاہ شاہجہاں سلطان باہوؒ کے خاندان کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کے والد کو بہت بڑی جاگیر بھی دے رکھی تھی۔

سلطان باہوؒ نے حبیب اللہ قادری سے باطنی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے آپ کو تعلیم سے فارغ کرنے کے بعد اپنے استاد پیر عبدالرحمٰن کے پاس بھیجا۔ جو ان دنوں دہلی میں مقیم تھے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سلطان باہو نے پیر عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی لیکن زیادہ تر اس واقعے سے اختلاف کیا جاتا ہے۔ حاجی محمد دین گجراتی اپنی کتاب "فیض ہدایت" میں لکھتے ہیں کہ سلطان باہوؒ روحانی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہوئے تھے۔

سلطان بخش قادری جنہوں نے تواریخ سلطان باہو لکھی ہے اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے تصوف کے مسائل پر فارسی اور عربی زبان میں ایک سو چالیس کتابیں لکھی تھیں۔ (مناقب السلطانی۔ ص۔ ۸)

ان کے علاوہ سلطان باہو نے پنجابی زبان میں صرف ایک شعری کتاب ابیات سلطان باہو لکھی جو آج بھی دستیاب ہے۔ آپ کی چند فارسی کتابوں کے نام یہ ہیں "شمس العارفین، مفتاح العارفین، محکم الفقراء، عین الفقر، عقل بیدار اور دیوان باہوؒ"

سلطان باہوؒ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ آپ نے چار شادیاں کی تھیں جن سے آپ کے ہاں آٹھ بیٹے پیدا ہوئے۔

جب ہم آپ کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں علم ہوتا کہ آپ صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے عقائد میں اتباع کتاب و سنت کو درجہ اول پر رکھتے ہیں آپ کسی ایسے قول و فعل کے قائل نہیں تھے جن سے شریعت محمدیؐ کی خلاف ورزی ہوتی ہوتی ہو۔ آپ نے تصوف کے نہایت گمبھیر مسائل کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ آپ نے اپنی بات کو وزن دینے کے لیے جگہ جگہ قرآن مجید اور احادیث نبوی سے دلائل و حوالے پیش کئے ہیں۔ آپ نے ۶۳ سال کی عمر پا کر بروز جمعۃ المبارک جمادی الآخر

Marfat.com

١١٠٢ھ میں وفات پائی۔ آپ کو ابتداً کالگیان نامی مقام پر سپردِ خاک کیا گیا تھا لیکن ١١٩٠ھ / ١٧٧٥ء میں موجودہ مزار میں دفن کیا گیا جہاں ہر سال ۴ جمادی الاوّل کو عرس ہوتا ہے جس میں لوگ جوق در جوق شرکت کے لیے جاتے ہیں۔

سلطان محمد شاہ بہمنی

دیکھیے : بہمنی سلطنت

سلف

سلف یا سَلَم کو فقہ میں جائز بیع تصور کیا جاتا ہے۔ اس بیع میں گاہک کو قیمت خرید پیشگی ادا کرنا پڑتی ہے اور دوسری جانب بائع کی ذمہ داری صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ خریدی گئی چیز کو ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد خریدار کے سپرد کر دے۔ بیع کردہ شے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیز ہونی چاہیے جس کا بدل موجود ہو، اور معاہدے میں اس چیز کی نوعیت کا نام لینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی تمام کیفیات کا بیان کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس جگہ کا تعین بھی ہونا چاہیے جہاں وہ شے خریدار کے سپرد کی جائے گی۔ شافعی مذہب کے پیروکار خریدی جانے والی چیز کو خریدار کے سپرد کرنے کا وقت مقرر کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن دوسرے فرقوں کے افراد معاہدے میں ایک خاص مدت کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ حجازی فقہا ایسی بیع کو سَلَم کہتے تھے، لیکن عراق میں سلف کہا جاتا تھا۔

سلمان فارسیؓ

ایک مشہور صحابی۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ آپ سلمان الخیرؓ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ آپ کے والد آتش پرست تھے۔ اس لیے وہ ایک آتش کدے کے منتظم تھے۔ ان کے قبیلے کے لوگ ایک گھوڑے "الخیل البلق" کی پرستش بھی کیا کرتے تھے لیکن حضرت سلمانؓ فارسی نے نہ تو آگ کی پرستش کی اور نہ ہی گھوڑے کو پوجا۔ آپ کی پرورش بڑی احتیاط کے ساتھ ہوئی کیونکہ ان کے والد کو سلمانؓ سے بہت پیار تھا۔ ایک مرتبہ حضرت سلمان کو ان کے والد نے زمین کی نگہداشت کے لیے بھیجا۔ راستے میں آپ کا گذر ایک گرجا کے قریب سے ہوا۔ عیسائی اس وقت عبادت میں مصروف تھے۔ آپ کو ان کا اندازِ عبادت بہت پسند آیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کھڑے ان کو دیکھتے رہے۔ جب وہ عبادت سے فارغ ہو گئے تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے مذہب میں دلچسپی رکھتا ہوں اس مذہب کی تعلیمات حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے ان لوگوں نے آپ کو بتایا کہ ملک شام میں عیسائیت کا مرکز ہے اس کے بعد آپ گھر واپس آ گئے اور اپنے والد کو تمام قصہ بتلا دیا جسے سن کر وہ بہت سخت ناراض ہوئے اور ان کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ لیکن جب عیسائیوں کے ایک قافلے نے جو ارضِ شام جا رہا تھا آپ کو اطلاع دی تو وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح شام پہنچ گئے۔ وہاں آپ پادریوں کے ساتھ رہے اور عیسائیوں کے تمام علوم آپ کو عیسائیت کی تعلیمات میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ ارضِ حجاز میں ایک پیغمبر آئیں گے چنانچہ آپ حجاز مقدس چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو آپ ہر ایک شخص کو غور سے دیکھتے۔ خاص طور پر خستہ وہ پشانی والے اصحاب کو۔ بالآخر ایک دن آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی خبر سنی چنانچہ آپ کچھ صدقے کی کھجوریں لے کر حضور کے پاس پہنچے لیکن جب کھجوریں حضورؐ کو پیش کیں تو آپؐ نے انہیں نوش فرمانے سے احتراز کیا۔ اس طرح سلمانؓ فارسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ایک علامت مل گئی تھی چنانچہ جب حضور دوبارہ مدینے میں قیام پذیر ہو گئے تو آپ نے دوبارہ کھجوروں کا تحفہ پیش کیا۔ انہیں آپؐ نے [illegible] بھی نوش فرمایا اور دوسرے صحابہ کو بھی کھانے کے لیے دیا۔

سلمان فارسی اس کے بعد آپؐ میں دوسری علامات نبوی تلاش کرنے لگے اور جب آپ کو یقین ہو گیا کہ آپؐ ہی پیغمبر ہیں تو ایمان لے آئے ۵ھ میں حضرت سلمانؓ فارسی کے مشورے سے کفار سے اپنی حفاظت کرنے کے لیے خندق کھودی گئی جس کے باعث کفار کا لشکر خندق کے دوسری جانب ہی رکا رہا۔ اس غزوہ میں خندق کے باعث مسلمانوں نے کفار کو اپنے ارادے میں کامیاب ہونے سے باز رکھا اور وہ شکست کھا کر واپس چلے گئے۔

سلمانؓ فارسی اصحاب صفہ کے رکن بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے ساتھ طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حذیفہ بن یمان کے بعد سلمان فارسی کو مدائن کا گورنر بھی بنایا تھا۔ آپ نے مدائن میں حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت سلمانؓ فارسی کی اولاد کا سلسلہ ابھی تک باقی ہے۔

سلمہ بن اکوع

ایک صحابی۔ آپ کا نام سنان اور کنیت ابوایاس تھی۔ آپ ۶ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسلام لانے کے بعد آپ نے بھی مکہ سے مدینہ ہجرت کر لی تھی۔ سلمہؓ بن اکوع نے بیعتِ رضوان کے موقع پر حضورؐ کے دستِ مبارک پر تین مرتبہ بیعت کی۔ ایک مرتبہ جب ذی قردۃ کی چراگاہ سے کافروں کا ایک ٹولہ رسول اللہؐ کے اونٹ بھگا لے گیا تو آپ نے اُن کا پیچھا کیا۔ سلمہؓ بن اکوع ایک ماہر تیرانداز بھی تھے۔ چنانچہ کافروں پر اتنی شدت کے ساتھ تیراندازی کی کہ وہ حضورؐ کے تمام اونٹ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بلکہ ساتھ ہی اپنی چادریں تک چھوڑ گئے۔ اس کے بعد غزوۂ خیبر میں بھی آپ شریک ہوئے۔ بعد میں جب ہوازن اور ثقیف کے ساتھ غزوات ہوئے تو ان میں بھی نمایاں حصّہ لیا۔ ۷ھ میں حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں بنوفزارہ کی سرکوبی میں بھی شریک ہوئے اس لڑائی سے واپسی پر سلمہؓ بن اکوع نے کئی عورتوں کو گرفتار کر لیا تھا جنہیں وہ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان میں ایک لڑکی بہت حسین و جمیل تھی۔ حضورؐ نے اس لڑکی کو واپس مدینہ بھیج کر کتنے ہی مسلمانوں کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرایا۔

سلمہؓ بن اکوع حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ سے زبدہ چلے گئے جہاں سے ۷۴ھ میں دوبارہ مدینہ واپس آئے لیکن اسی سال آپ کا انتقال ہو گیا آپ بہت دلیر، شجاع اور بہترین تیرانداز تھے۔ پیدل دوڑنے میں آپ تمام صحابہؓ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اکثر اوقات فیض یاب ہوتے رہتے تھے اسی لیے آپ نے بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً اسّی کے لگ بھگ احادیث آپ سے مروی ہیں۔

سلمہ بن ہشام

آپ رشتے میں ابوجہل کے بھائی تھے۔ اسلام کی ابتدا ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے۔ بعد میں کچھ عرصہ کے بعد جب وہ واپس مکہ آئے تو ابوجہل نے انہیں قید کر دیا اور طرح طرح سے اذیتیں پہنچانا شروع کر دیں۔ وہ دن رات آپ کو پیٹتا رہتا تھا یہاں تک کہ انہیں کھانے کو بھی کچھ نہ دیتا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے تمام سختیاں صبر کے ساتھ برداشت کیں اور دینِ اسلام پر قائم رہے۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم نے کفار کے چند قیدی واپس کر کے انھیں اس مصیبت سے نجات دلائی۔ رہائی پانے کے بعد آپ مدینہ چلے گئے۔ آپ غزوات میں برابر حصہ لیتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں بھی مختلف جنگوں میں شریک ہوتے رہے۔ آپ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت ۱۴ھ میں ہونے والے "مرج روم" کے معرکے میں شہید ہوگئے۔

سلوک

راہِ طریقت پر وہ سفر جس کا آغاز کوئی صوفی کسی طریقے میں داخل ہونے پر اپنے شیخ و پیر کی ہدایت پر کرتا ہے۔ اس کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی استعداد کے مطابق بلند ترین درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ بعض صوفیوں کے نزدیک سلوک سے مراد وہ تعلق باللہ کی جستجو ہے جو عمداً اختیار کی جاتی ہے اور جسے باقاعدہ جاری رکھا جاتا ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذکر، توکل، فقر، عشق اور معرفت وغیرہ جیسے تمام مقامات سے گزرے۔ ان میں کمال پیدا کرے۔ یہ تمام کمالات، ذاتِ الٰہی سے واصل ہونے سے پہلے ہی مکمل کر لینے چاہئیں۔ بہت سے علما سلوک کو جذب کی ضد خیال کرتے ہیں۔

سلول

سلول نام کے دو قبیلے عرب میں آباد ہیں۔ جنوبی عرب میں رہنے والا سلول قبیلہ دراصل خزاعہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ ابتداء میں حجاز آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس قبیلے کو کعبے کی تولیت بھی مل گئی تھی۔ اس قبیلے کے ایک شخص ابو غبشان المحترش بن حبیس بن سلول نے کعبے کی چابی ایک اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔

۲۔ اس نام کا دوسرا قبیلہ شمالی عرب کے علاقے میں آباد تھا۔ اس قبیلے کے لوگ بھی بنیادی طور پر ہوازن قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ ہوازن کے ننھیال کی بزرگ عورت ذہل ابن شیبان کی بیٹی کے نام پر سلول کہلانے لگا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ کا نام مرہ بن صعصعہ بن معاویہ بن بکر بن ہوازن تھا۔ یہ لوگ مکے کے مشرقی جانب آباد تھے جو دس خاندانوں میں منقسم تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی عمرانؓ بن حصین کو حضرت عمرؓ نے بصرے کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ انکا اسی قبیلے کے ایک خاندان غاضرہ سے تعلق تھا۔

جب ہم اس قبیلے کا شجرہ نسب بناتے ہیں تو بے شمار الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ سلول کسی مرد کا نام نہیں تھا بلکہ ایک عورت کا نام تھا اور اس زمانے کے عرب میں عورتوں کے نام سے پکارے جانے والے قبیلے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتے تھے۔

سلویٰ

دیکھیے : من و سلویٰ

سلیطؓ بن عمرو

آپ کا نام سلیطؓ اور تعلق قریشی خاندان سے تھا۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مسلمان ہو کر مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کر لی۔ یہاں سے مدینہ چلے گئے۔ تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ ۶ھ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کو دعوتِ حق دینے کے لیے خطوط ارسال کیے تھے۔ اس زمانے میں ایک خط ہوذہ بن علی حنفی کے پاس پہنچانے کی ذمہ داری حضرت سلیطؓ کے سپرد کی گئی۔ ہوذہ بن علی حنفی آپ کا نامہ مبارک پڑھ کر مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور حضرت سلیطؓ کو نہایت احترام کے ساتھ خط کا جواب دے کر رخصت کیا۔ اس جواب میں ہوذہ نے اس شرط کے ساتھ مسلمان ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ایک سردار کی حیثیت سے اسے بھی بعض امور میں شریک کر لیا جائے۔ اس پر حضورؐ نے اُسے جواب دیا کہ تمھیں زمین کا ایک ادنیٰ ترین خطہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ سلیطؓ بن عمرو نے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ہونے والی مشہور جنگِ یمامہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

سلیم اوّل

عثمانی سلطنت کا نواں خلیفہ۔ وہ بایزید کا بیٹا تھا اور ۸۷۲ھ/ ۱۴۶۸ء یا ۸۷۵ھ/ ۱۴۷۰ء میں پیدا ہوا۔ سلیم کے باپ بایزید نے بڑے بیٹے احمد کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ لیکن سلیم کو تخت کی زیادہ آرزو تھی۔ چنانچہ دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فوج کا ایک بڑا حصہ سلیم کی حمایت کر رہا تھا۔ تقریباً دو سال تک ان میں اقتدار کے حصول کے لیے رسہ کشی ہوتی رہی۔ بالآخر جنوری ۱۵۱۲ء میں قسطنطنیہ کے لوگوں اور ینی چریوں نے سلیم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں ۸ صفر ۹۱۸ھ/ ۲۵ اپریل ۱۵۱۲ء کو سلیم کے طرفداروں نے بایزید کو تخت سے محروم کر دیا۔ اس طرح سلیم نے تمام عثمانی سلطنت پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اس نے حکومت کا پہلا سال اپنے بھائی بھتیجوں کا استیصال کرنے ہی میں گزارا۔ اس نے تقریباً آٹھ سال حکومت کی جس کے دوران میں کتنے ہی معرکے اور مہمیں سر کیں اور فتوحات کو پھیلایا۔ ۱۵۱۹ء میں سلیم ادرنہ سے قسطنطنیہ کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں بیمار ہو گیا اور اسی بیماری میں ۷ شوال ۹۲۶ھ/ ۲۲ ستمبر ۱۵۲۰ء کو وفات پا گیا۔ اس کی موت کو اس کے وزیروں نے اخفا میں رکھا۔ جب نیا سلطان سلیمان قسطنطنیہ پہنچ گیا تو اس کی موت کا اعلان کیا گیا۔ سلیم اوّل کی میت کو استنبول میں شمال مغرب کی جانب ایک پہاڑی پر دفن کیا گیا۔ بعد میں یہاں ایک مسجد بھی بنوا دی گئی تھی۔ اس کی قبر کے نزدیک ہی سلیم کی والدہ، بیٹیوں اور چند بیٹوں کی قبریں بھی بنا دی گئیں۔

سلیم نہایت سخت گیر رویّے کے باعث یاوز کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ جس کا مطلب دہشت پسند لیا جاتا تھا جو بعد میں ایک طرح سے اعترافِ عظمت کا لفظ سمجھا جانے لگا تھا۔

سلیم اوّل کی شخصیت اس کے دورِ حکومت کے تمام واقعات پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ ایک شاعر کے طور پر بھی اتنی ہی شہرت کا مالک تھا جتنی کہ بادشاہ ہونے کے ناطے سے اسے حاصل تھی۔ اس کا دیوان فارسی میں ہے جو ۱۳۰۶ھ میں قسطنطنیہ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔

سلیم ثالث

سلیم ثالث سلطنتِ عثمانیہ کا اٹھائیسواں سلطان بنا تھا۔ وہ سلطان مصطفےٰ ثالث کے ہاں ۲۴ر دسمبر ۱۷۶۱ء کو پیدا ہوا۔ سلیم ثالث اپنے چچا عبدالحمید اول کے انتقال کے فوراً بعد ۱۱ رجب ۱۲۰۳ھ/ ۷ اپریل ۱۷۸۹ء کو تخت نشین ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں انگریزوں کے خلاف جنگیں اور اندرونی بغاوتیں بہت زیادہ ہوئیں۔ سلیم ثالث نے اپنے دور میں ملک کے تمام پہلے سے فرسودہ اور زوال پذیر اداروں کو منظم اور فعال بنانے کی بہت سی کوششیں کیں

Marfat.com

جو اس کے عہد کی ایک نمایاں خصوصیت بن کر ابھرتی ہیں۔ لیکن انہی کوششوں کے باعث وہ خود معزولی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ ۲۲ ربیع الاوّل ۱۲۲۲ھ ۳۰ مئی ۱۸۰۷ء کو وہ مجبوراً تخت سے دستبردار ہوگیا۔ سلیم ثالث کا چونکہ کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے سلطان عبدالحمید کے دو بیٹوں میں سے بڑے لڑکے مصطفیٰ کو تخت نشین کرا دیا گیا۔ جس نے مصطفیٰ چہارم کے نام سے حکومت کرنا شروع کر دی۔ بعد میں سلیم ثالث کو مصطفیٰ چہارم کے حکم پر قتل کر دیا گیا، اس لیے کہ بعض وزیر اور دوسرے لوگ اسے دوبارہ تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔

سلیم ثالث بذاتِ خود بہت سے کمالات اور فنون کا مالک تھا۔ وہ بہترین اشعار کہتا تھا۔ اس نے اپنے اٹھارہ سالہ دورِ حکومت میں دس وزیر اعظم بدلے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے نزدیک مضبوط کردار کے لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے میں حضرت ایوبؓ انصاری کے مزار پر ایک چاندی کا خوبصورت دروازہ بھی بنوایا۔ مسجد فاتح کو نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ اس کی زیادہ تر تعمیرات اصلاحی منصوبوں کے لیے بارکوں اور مدرسوں پر مشتمل ہیں

سلیم ثانی

ترکی کا گیارہواں بادشاہ۔ وہ مشہور ملکہ خرم سلطان کا بیٹا تھا جو ایک خیال کے مطابق ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء میں پیدا ہوا۔ سلطان سلیمان کی وفات کے بعد ترکی کے تخت پر بیٹھا اور فوج سے بیعت لینے کی بجائے خود ہی ان میں تخت نشینی کے تحائف تقسیم کرا دیے۔ فوجیوں نے ان تحائف کو کم سمجھا۔ اس کے بعد سلیمان کی میت کو شاہی رسم و رواج ادا کیے بغیر ہی دفنا دیا۔ اسی دوران میں سلیم کے قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے ہی ینی چریوں نے بغاوت کرتے ہوئے ادرنہ پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح سلیم ثانی دارالحکومت میں داخل ہونے سے رک گیا۔ فوج نے اسے اپنے من مانے تحائف وصول کرنے کا وعدہ لینے کے بعد ہی ادرنہ میں داخلے کی اجازت دی۔ سلیم ثانی نے اس مرتبہ تحائف خوب جی کھول کر دیے۔ ینی چریوں نے علماء و امراء کو اور خاص طور پر مفتی ابو سعود کو نہایت قیمتی تحائف دیئے۔ یہاں تک کہ شاہی خزانہ خالی ہوگیا اور اس کے پاس فوج کو ان کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے بھی روپیہ موجود نہ رہا۔

محل میں آنے کے بعد سلیم اپنی عادات کے مطابق مختلف خرافات میں مشغول ہوگیا۔ سلیمان ثانی کے دور میں سلطان سلیمان کے دورِ حکومت کی اعلیٰ روایات کو اس کے وزیر اعظم صوقولی نے برقرار رکھا۔ سلیم نے حکومت کے بیشتر اختیارات اپنے وزیر اعظم کو دے دیئے تھے۔

سلیم ثانی ۱۲ اور ۱۳ دسمبر ۱۵۷۴ء کی درمیانی رات کو اپنے محل میں ہی کسی حادثے کے باعث فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت کی ساری زندگی اپنے حرم سرا میں ہی گزار دی۔ اس کے حرم سرا میں نور بانو کا بہت بول بالا رہا۔ اس کے زمانے میں لہو و لعب کی عادتیں جو اونچے درجے کے عاملوں میں بُری طرح سرایت کر چکی تھیں، معاشرے کے تمام طبقوں میں پھیل گئیں۔ رشوت اور بدعنوانیوں کا بازار گرم ہونے لگا۔ اس نازک وقت میں اس کے وزیر اعظم صوقو لی نے سلیمان اوّل کے قانون نامے کو مفتی اعظم کے فتوے کے بعد ملک میں نافذ کر دیا۔ یہ کام سلطنتِ عثمانیہ کی اونچی شان و شوکت کو برقرار رکھنے میں خاصی حد تک کامیاب ثابت ہوا۔

سلیم ثانی کے دور کی تعمیرات میں سے ایک مسجد سب سے زیادہ مشہور ہے جو ادرنہ کی سلیمیہ مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجد سنان معمار دون نے ۱۵۶۷ء سے ۱۵۷۴ء تک کے عرصے میں تعمیر کی تھی۔ اس کے عہد میں آیا صوفیا اور قسطنطنیہ میں بھی کئی عمارتیں اور مسجدیں بنوائیں یا ان کی مرمت کرائی گئی۔ سلیم ثانی کو شاعری کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے اس کے اردگرد شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ خود بھی شاعری کرتا تھا۔ اس نے زیادہ تر نظمیں لکھی ہیں۔ اس کا تخلص سلیمی تھا۔

سلیمانؑ

حضرت سلیمان علیہ السلام ایک پیغمبر تھے وہ بنی اسرائیل پر حکومت بھی کرتے تھے آپ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد بادشاہ بنے تھے۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان کا ذکر کئی سورتوں میں آیا ہے۔ مثلاً البقرہ، النساء، الانعام، الانبیاء، النمل، سبا اور ص۔

حضرت سلیمان نے بہت جلد بنی اسرائیل کے دشمنوں کو زیر کر کے ایک بہت بڑی سلطنت بنالی تھی حضرت داؤد علیہ السلام جس ہیکل بیت المقدس کی تعمیر کو ادھورا چھوڑ گئے تھے آپ نے اُسے مکمل کرایا آپ علم و حکمت اور فہم و فراست میں نہایت بلند مرتبہ تھے تمام وحشی جانور پرندے اور جن و انس آپ کے تابع فرمان تھے مقدمات کے فیصلے کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ان کی تمام تر عبادات اور معاملات مملکت شریعت تورات کے مطابق ہوتے تھے۔ قرآن مجید نے آپ کا درجہ انبیا کے شایانِ شان بیان فرمایا ہے۔ حضرت داؤدؑ نے آپ سے ایک مرتبہ مشورہ بھی لیا تھا۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر ہوا ہے: "اے پیغمبر داؤد اور سلیمان کا واقعہ بھی لوگوں کو یاد دلاؤ۔ جب کہ وہ دونوں ایک کھیتی کے بارے میں جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں جا پڑی تھیں فیصلہ کرنے لگے اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے اور ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا تھا۔" (الانبیاء ۷۸، ۷۹)

حضرت سلیمان نے چالیس سال تک حکومت کی اور ۵۳ یا ۶۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ آپ کو داؤد علیہ السلام کے شہر میں ہی دفن کیا گیا۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان کی کچھ خصوصیات کا ذکر بھی آیا ہے جیسے:

"ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل مہینہ بھر کی راہ ہوتی تھی اور شام کی منزل مہینہ بھر کی راہ ہوتی تھی اور پگھلے ہوئے تانبے کا اس کے لیے چشمہ بہا دیا تھا کہ اس کو سانچوں میں ڈھال کر جنات بڑے بڑے برتن دیگیں اور لگن وغیرہ تیار کرتے تھے۔ (الانبیاء ۱۲، ۱۳)

ان آیات میں پگھلے ہوئے تانبے کے جس چشمہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے آثار تانبے کی ان بھٹیوں کی صورت میں مل چکے ہیں جو ایلات کی بندرگاہ کے آس پاس دریافت ہوئی ہیں۔

بعض لوگوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق بھی طرح طرح کے من گھڑت افسانے بنا کر لوگوں کو دکھانا شروع کر دیا اور ان کے سطوت اور اقتدار کا باعث کفر اور جادو کو قرار دینے لگے اور بنی اسرائیل ان گمراہوں کے پیرو ہو کر اللہ کی کتاب (تورات) سے غافل ہوگئے۔ ان گمراہ لوگوں کو بخت نصر قید کر کے بابل لے گیا۔ وہاں انہوں نے ہاروت اور ماروت کے بارے میں سنا کہ انہیں جادو آتا ہے چنانچہ وہ ان سے جادو سیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

آج کل کی انجیل میں حضرت سلیمانؑ کے بارے میں بے شمار ایسے قصّے درج ہیں جو ایک پیغمبر اور نبی کی شان کے قطعاً منافی ہیں لیکن مذہب اسلام میں تمام پیغمبروں کے بارے میں بڑا واضح موقف پایا جاتا ہے۔ اسلام میں کسی بھی پیغمبر یا نبی کے بارے میں ایک بھی نازیبا واقعہ یا بات کی گنجائش نہیں ہے۔

آپ کے بارے میں ایک واقعہ قرآن مجید میں سورۂ النمل میں بیان ہوا ہے۔

"حضرت سلیمانؑ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ملکۂ سبا آپ کے پاس آرہی ہے تو آپ

Marfat.com

نے خواہش ظاہر کی کہ ان کے آنے سے پہلے اس کا تخت وہاں سے اٹھا کر لایا جائے یہ حکم پا کر ایک عفریت جن نے جو بہت قوی ہیکل تھا کہنے لگا کہ میں ملکہ کا تخت آپ کا (حضرت سلیمانؑ) کا دربار برخاست ہونے سے پہلے لے آؤں گا لیکن ایک اور شخص جو صاحب علم الکتاب تھا کہنے لگا کہ میں پلک جھپکنے میں ایسا کر سکتا ہوں۔ جب حضرت سلیمانؑ نے اپنے سامنے تخت پایا تو اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے اتنا اقتدار عطا کیا ہے۔ (دیکھئے سورہ النمل آیات ۳۸ تا ۴۱)

اس واقعے سے ہمیں علم نہیں ہوتا کہ آیا تخت کو لانے کا کام صاحب علم الکتاب شخص نے انجام دیا یا جن نے۔ لیکن اتنا مزید معلوم ہوتا ہے کہ ملکۂ سبا کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت حضرت سلیمان کے پاس مزید آ گیا تھا اور جن ایک ایسی ہستی تھی جو جسمانی طاقت اور مادی ذرائع کی مالک تھی اسی طرح صاحب "علم من الکتاب" ممکن ہے ایک ماہر طبیعیات ہو جسے حرارت نور، صوت، مقناطیس اور بجلی سے کام لینے کے طریقوں کا علم تھا۔ بعض مفسرین قرآن سورۃ النمل کی تفسیر بیان کرتے وقت لکھتے ہیں کہ یہاں جو مدت بیان ہوئی ہے اس سے حقیقی مدت مراد لینا درست نہیں۔ بعض مفسرین اس سارے واقعے کو ایک بہت بڑا معجزہ قرار دیتے ہیں۔

حضرت سلیمان کے بارے میں قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ انہوں نے اپنے اور اپنے خاندان پر خدا کی نعمتیں گنواتے ہوئے کہا کہ انہیں جانوروں کی بولی سمجھنی سکھائی گئی تھی۔ (النمل : ۱۶)

حضرت سلیمان کے جس فیصلے کا ذکر اوپر آیا ہے وہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد حکومت میں ایک شخص کے باغ میں ایک گلہ بان کی بکریاں گھس گئیں اور خوب نقصان کیا۔ باغ والے نے داؤدؑ سے جا کر تمام واقعہ بیان کیا جس پر آپ خود باغ میں گئے اور نقصان کا اندازہ لگایا اور اس کی قیمت گلہ بان کے سارے ریوڑ کے برابر ہوئی چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ گلہ بان اپنی تمام بکریاں بطور تاوان باغ والے کے سپرد کر دے۔ یہ فیصلہ سن کر دونوں فریق باہر آئے تو ان کی ملاقات حضرت سلیمانؑ سے ہوئی آپ نے کہا کہ ایک اور فیصلہ جو فریقین کے حق میں اس سے زیادہ بہتر ہے اور ہے۔ حضرت داؤد کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے سلیمان کو بلایا اور معلوم کیا کہ وہ بہتر فیصلہ کیا ہے اس پر حضرت سلیمانؑ نے انہیں بتایا کہ گلہ بان کی تمام بکریاں باغ والے کے سپرد کر دیں اور باغ گلہ بان کے سپرد کریں تاکہ گلہ بان باغ کی دیکھ بھال کرے یہاں تک کہ اس میں انگور آ جائیں اس مدت کے دوران میں باغ والا گلہ بان کی بکریوں سے دودھ اور اُون وغیرہ سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن جب باغ میں انگور آ جائیں تو باغ واپس باغ والے کو لوٹا دیا جائے اور بکریاں گلہ بان کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو آپ کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔

جن حضرت سلیمانؑ کے تابع تھے اور ان کے لیے بہت سے کام بھی انجام دیتے تھے۔ اس بات کا ذکر سورۂ سبا اور صٓ میں آیا ہے۔ کوئی بھی جن فطرتاً سرکش ہونے کے باوجود آپ کے فرمان سے سرتابی نہیں کرتا تھا۔

حضرت سلیمان کی وفات کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے کہ آپ ہیکل کی تعمیر کروا رہے تھے۔ آپ عصا کے سہارے کھڑے ہو کر خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے اسی طرح عبادت کے دوران آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی لیکن آپ کا جسم عصا کے سہارے کھڑا رہا جس کے باعث ہیکل کی تعمیر کا کام پورے زور شور سے جاری رہا۔ اگر اس وقت ان کی وفات کا علم ہو جاتا تو جن جو ہیکل کی تعمیر میں مصروف تھے بھاگ جاتے کیونکہ وہ صرف حضرت سلیمان کا حکم ہی مانتے تھے۔ جب کئی ماہ بعد عصا کو دیمک نے کھا لیا تو حضرت سلیمان کا جسد خاکی گر پڑا جس کے باعث لوگوں کو آپ کی وفات کے بارے میں علم ہوا۔ اس واقعے کے بعد جنوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ علم غیب سے بے بہرہ ہیں۔

سلیمان اشرف

آپ کی پیدائش ضلع پٹنہ کے نزدیک محلہ میر میں ہوئی۔ آپ نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم بھی محلہ میر میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور آ گئے۔

آپ حضرت فاضل بریلوی کے جلیل القدر خلفاء میں سے تھے اور آپ کے ہی کہنے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہوئے تھے۔ آپ رشد و ہدایت اور صداقت و ریاضت کے بہترین مجسمہ تھے۔ آپ کی سیاسی بصیرت بھی بہت تیز تھی۔ آپ اکثر اوقات لاہور تشریف لاتے رہتے تھے۔ یہاں آپ کے شاگردوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ آپ کی وفات ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کو علی گڑھ میں ہوئی اور یونیورسٹی کے قبرستان میں ہی دفن ہوئے۔

سلیمان اوّل

سلطنت عثمانیہ کا دسواں حکمران۔ اس نے ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء یعنی ۴۶ سال تک حکومت کی۔ ترک اسے سلیمان قانونی کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ عائشہ سلطان کریمیا کے خاندان منگلی گرامی میں سے تھی اور اپنے حسن و جمال کے باعث بہت مشہور تھی۔ سلیمان اپنے دادا بایزید کے دور حکومت میں کفہ کا حاکم تھا۔ بعد میں سلیم اوّل کے دور میں مغنیسا کے والی کے طور پر کام کرتا رہا۔ جب اس کے والد سلیم کا انتقال ہوا تو تقریباً ایک ہفتے بعد ۳۰ ستمبر ۱۵۲۰ء کو وہ دارالحکومت پہنچ گیا۔ اس وقت اسے کوئی بھی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔

سلیمان اوّل فطرتاً صلح پسند تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دور حکومت میں تیرہ سے زائد بڑی بڑی جنگی مہموں میں شریک ہوا۔ عام طور پر وہ یورپ پر فوج کشی کیا کرتا تھا جس کے نتیجے میں عثمانی سلطنت وسیع سے وسیع تر ہو جاتی تھی۔ اس نے دس مرتبہ یورپ پر اور تین مرتبہ ایشیا پر لشکر کشی کی۔ اس طرح تیرہ مرتبہ اس نے اپنی سلطنت کو کشادہ کیا۔ وہ پکا دین دار آدمی تھا۔ اس نے آٹھ قرآن پاک اپنے ہاتھ سے نقل کیے تھے جو آج بھی سلیمانیہ میں بحفاظت موجود ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی اسلامی راسخ الاعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ سلیمانی دور میں سلطنت عثمانیہ کا سلطنت کے ارتقاء کے عمل میں اس کی قائدانہ اور نظم و نسق کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ہاتھ تھا۔ اسی طرح ترکی تہذیب اور علم و ادب نے بھی اس کے دور میں ترقی کی کئی منازل طے کیں۔ سلیمان نے بطور ایک شاعر کے شعراء اور عالموں کا مربی و سرپرست ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ اپنے دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کی حوصلہ افزائی کر کے انھیں قصائد، شاہنامے اور تاریخ لکھنے کی ترغیب دی۔ سلیمان اوّل نے اپنے دور میں بے شمار مساجد اور عمارتیں بنوائیں۔ ایک مسجد اس نے پایۂ تخت میں سلیمانیہ مسجد کے نام سے بنوائی جسے بہت اونچا مقام حاصل ہوا۔ یہ مسجد ۱۵۵۰ء اور ۱۵۵۶ء کے درمیان مکمل ہوئی تھی۔ بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کا مزار اور قونیہ میں جلال الدین رومیؒ کا مزار بھی سلیمان نے ہی بنوایا تھا۔ اس کے علاوہ کعبہ کو از سر نو تعمیر کرایا۔ مکہ میں پختہ کار نہریں تعمیر کرائیں۔

سلیمان اوّل کی زندگی کے آخری ایام بڑے پریشانی میں گزرے کیونکہ ان دنوں شہزادہ سلیم اور بایزید کے درمیان آپس میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بایزید مارا گیا تھا۔ اسی دوران آسٹریا سے جنگ شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ سلیمان اوّل نے خود فوجوں کی قیادت سنبھال لی تھی اور ایک شہر سگتوار کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے

Marfat.com

کے دوران ہی میں سلیمان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ پانچ اور چھ ستمبر ١٥٦٦ء کو ناسازیٔ طبع کے باعث خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ ٨ ستمبر کو شہر سگتوار بھی فتح کر لیا گیا اس کی موت کو ابتدا میں تین ہفتے تک اخفا میں رکھا گیا۔ اسی دوران سلیم ثانی نے آ کر کاروبارِ حکومت سنبھال لیا :

سلیمان بن صرد الخزاعی

صحابیٔ رسول۔ آپ کا اصلی نام یسار تھا لیکن جب آپ نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا نام تبدیل کر کے سلیمان رکھ دیا۔ جب مسلمان کوفے میں جا کر آباد ہونے لگے تو آپ نے بھی وہاں پہنچ کر رہائش اختیار کر لی۔ جنگِ جمل اور صفین میں حضرت علیؓ کی جانب سے شریک ہوئے حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد حضرت امام حسینؓ کے بہت بڑے ہمدرد اور طرفدار بن گئے چنانچہ واقعہ کربلا سے پہلے حضرت امام حسینؓ کو آپ نے ہی پیغام بھیجا تھا کہ وہ کوفہ تشریف لے آئیں لیکن جب حضرت امام حسینؓ اپنے جانثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں خیمہ زن تھے تو اس وقت آپ نے امام حسینؓ کی مطلقاً کوئی مدد نہ کی پھر جب ١٠ محرم ٦١ھ/١٠ اکتوبر ٦٨٠ء کو حضرت امام حسینؓ شہید کر دیئے گئے تو تمام کوفی اپنی بزدلی اور بے عملی پہ نادم اور پشیمان ہوئے اس کے بعد انہوں نے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے ایک جماعت کی طرح ڈالی۔ اس جماعت کا سالارِ اعظم حضرت سلیمانؓ کو بنایا گیا۔ اس جماعت میں شریک تمام افراد ساٹھ سال سے زائد عمر کے تھے ابتدا میں یہ تحریک بے جان رہی لیکن یزید بن معاویہ کے انتقال کے بعد اس تحریک میں تیزی آ گئی جب عبید اللہ بن زیاد کوفے میں داخل ہونے لگا تو سلیمانؓ نے یہاں آنے کی اجازت نہ دی۔ بعد میں رمضان ٦٤ھ/مئی ٦٨٤ء میں مختار بن ابی عبید کوفے پہنچ گیا۔ اس نے حضرت سلیمانؓ کو وہاں سے نکالنا چاہا لیکن حضرت سلیمانؓ اس کے ساتھ باقاعدہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے اکٹھے ہو کر تمام لوگ کربلا میں امام حسینؓ کے مزار پر حاضر ہوئے اور چوبیس گھنٹے وہاں انتظار کرنے کے بعد عین الوردۃ کی جانب چل پڑے جہاں ٢٢ جمادی الاوّل ٦٥ھ/٤ جنوری ٦٨٥ء کو جنگ شروع ہو گئی دشمن کی فوجیں حصین بن نمیر کی سرکردگی میں لڑ رہی تھیں۔ لڑائی تین روز تک جاری رہی جنگ کے تیسرے روز حضرت سلیمانؓ ترانوے برس کی عمر میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس جنگ کا انجام بہت خطرناک نکلا شیعیوں کی شکست کے بعد ان کا زبردست استیصال ہوا حضرت سلیمانؓ نے حضورؐ کی پندرہ احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک

ایک اموی خلیفہ: ٥٤ھ/٦٧٤ء میں پیدا ہوا۔ عبدالعزیز بن مروان کی وفات کے بعد عبدالملک نے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان دونوں سے بحیثیت آئندہ جانشین کے حلف وفاداری لیا۔ بعض لوگوں نے کوشش کی کہ سلیمان اپنے بھائی ولید کے حق میں دستبردار ہو جائے لیکن سلیمان جمادی الآخر ٩٦ھ/فروری ٧١٥ء میں امیر المؤمنین بن گیا اور تقریباً تین سال حکومت کی اس کے دورِ حکومت کے آخری سال میں قسطنطنیہ کا محاصرہ جاری تھا کہ صفر ٩٩ھ/ستمبر اکتوبر ٧١٧ء میں دابق میں سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ قسطنطنیہ کا محاصرہ بھی عین اس کی موت کے فوراً بعد اٹھا لیا گیا۔ اس وقت تک اگرچہ عبدالملک اپنے بھائی یزید کو سلیمان کا جانشین نامزد کرا چکا تھا تاہم سلیمان نے وفات سے قبل اپنی جانشینی کے احکامات کو تبدیل کر دیا اور اپنے بیٹے ایوب کی ولی عہدی کے لیے لوگوں سے بیعت لی۔ بعد میں بستر مرگ پر انھیں ایک باخبر عالم دین رجاء بن حیوۃ کے ساتھ یہ طے کر لیا کہ اس کے چچا زاد بھائی (اپنی جگہ عمر بن عبدالعزیز) ان کی جگہ خلیفہ مسند نشین ہوں گے۔ بائیس اعلان کے بعد لوگوں نے سلیمان کو "مفتاح الخیر" کا لقب بھی دیا۔ بعض عرب تاریخ دانوں کے مطابق سلیمان حسن صدتک پرہیزگار ہونے کے باوجود بے رحم اور نفسانی خواہشوں تک پہنچنے کا اسیر تھا۔

سلیمان بن محمد

مراکش کا سلطان جو ١١٨٠ھ/١٧٦٦ء کو پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ابتدائی اور بعد کی تعلیم سیاست میں حصہ لیے بغیر حاصل کی۔ اس کا باپ مراکش کا سلطان تھا جب اس کا انتقال ہو گیا تو مراکش کے کچھ لوگوں نے سلیمان کے ایک بھائی مولائی یزید کو اپنا سلطان بنا لیا لیکن بعض علاقوں کے لوگ اس کے خلاف رہے۔ انھوں نے اس کے دوسرے بھائی مولائی ہشام کو سلطان بنانے کا اعلان کر دیا۔ مولائی یزید اور مولائی ہشام میں جنگ ہوئی جس میں یزید مارا گیا۔ اس کے بعد تمام مراکش میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ایسی صورت میں بہت سے علاقوں کے لوگوں نے مولائی سلیمان بن محمد علوی کو اپنا سلطان بنانے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلیمان کے اعلانِ بادشاہت کے ساتھ ہی اس کے بڑے بھائی مولائی مسلمہ نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلیمان اور مسلمہ میں جنگ ہوئی۔ جس کا نتیجہ سلیمان کے حق میں برآمد ہوا۔ اس طرح سلیمان مراکش کا سلطان بن گیا۔ اس نے رجب ١١٧٧ھ/مارچ ١٧٩٢ء سے ١٣ ربیع الاول ١٢٣٨ھ/٢٨ نومبر ١٨٢٢ء تک حکومت کی، لیکن اس تمام وقت میں بہت کم ایسا عرصہ گزرا جب اُسے اپنے خلاف ہونے والی بغاوتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے خلاف نبرد آزما رہنے والے زیادہ تر بربروں کے جتھے تھے۔ جو عربی تسلط کے خلاف اس کے ساتھ بغاوت پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ اس کے دورِ اقتدار کے آخری چند سال تو لامتناہی شورشوں اور بغاوتوں کی نذر ہو گئے۔

اسی کشمکش کے دوران ١٣ ربیع الاول ١٢٣٨ھ/٢٨ نومبر ١٨٢٢ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ سلیمان نے اس ابتلائی دور میں حکومت کرنے کے باوجود چند ایسے کام انجام دیئے جن کے باعث وہ آج تک مشہور ہے۔ اس نے خدا پرستی، عدل و انصاف اور جود و کرم میں بہت نام کمایا۔ اس کے علاوہ اس نے تمام غیر اسلامی محاصل (مثلاً مکوس) یک جنبشِ قلم سے منسوخ کر دیئے۔ اسے خوبصورت عمارتیں بنوانے کا بھی بہت شوق تھا اسی لیے اپنے زمانے میں کتنی ہی خوبصورت عمارات بنوائیں :

سلیمان پھلواری

آپ عظیم آباد پٹنہ کے قریب موضع پھلور میں ١٨٥٠ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی محمد داؤد تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ بعد میں لکھنؤ میں مولانا عبدالحئی فرنگی، سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث اور دہلی میں سید نذیر حسین مونگیری سے کسبِ فیض کیا۔

آپ ہر سال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں شریک ہوا کرتے تھے آپ کی وفات ١٩٣٥ء میں ہوئی اور موضع پھلور میں دفن ہوئے۔ آپ کے مکتوبات ١٩٤٩ء میں کراچی سے شمس المعارف کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

[redacted]

مکتبہ شاہکار

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو باقاعدگی سے کتب شائع کرنے والا واحد ادارہ

[illegible] کا گیرا	۲/۵۰
[illegible] بہار / آتش رفتہ	۳/-
[illegible] جنکشن	۲/۵۰
علی اور [illegible]	۲/۵۰
★ صحرانورد کے خطوط (اوّل)	۳/-
★ شاہنامۂ اسلام (دوم)	۳/-
★ فردوس بریں	۲/۷۵
★ [illegible]	۴/-
★ محبوب آوازیں	۴/-
★ شاہنامۂ اسلام (سوم)	۳/-
★ قائداعظم میری نظر میں	۴/-
★ مقدس نازنین	۴/-
★ صحرانورد کے خطوط (دوم)	۳/۵۰
★ خزینۂ معلومات	۴/-
★ علی گڑھ کے تین نامور فرزند	۲/-
★ شاہنامۂ اسلام (چہارم)	۳/-
★ محبت عظیم ہے	۲/۵۰
★ نقوش قائداعظم	۲/۵۰
★ رحمت عالم	۲/-
★ اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں	۳/۵۰
★ اردو کے چار مزاحیہ شاعر	۲/-
★ ابلیس [illegible] ڈائری (دوم)	۳/-
[illegible] کی [illegible]	۳/۵۰
[illegible]	۴/-
[illegible] داستانِ غم	۲/۵۰

★ بیادِ قائداعظم	۲/۵۰
★ افلاطون کی ری پبلک	۳/۵۰
★ بھگیلا	۴/-
★ ذہن کی آزمائش (دوم)	۲/-
★ دفاعِ پاکستان	۳/۵۰
★ الحسینؓ	۲/۵۰
★ اقبال کا فلسفہ خودی	۳/۵۰
★ ذہن کی آزمائش (سوم)	۳/-
★ دینِ عمل	۳/-
★ تذکرۂ غوثیہ	۲/-
★ ذہن کی آزمائش (چہارم)	۳/-
★ داستانِ ہٹلر	۲/۵۰
★ گم شدہ شہر اور ملیامیٹ تہذیبیں	۳/۵۰
★ یادِ اقبال	۴/-

[illegible]

✳ افروڈائٹ (ناول)	۳/۵۰
✳ شہرزاد (ڈرامے)	۲/۵۰
✳ امیر علی ٹھگ (جرم و سزا)	۳/-
✳ گڈ ارتھ (ناول)	۲/۵۰
✳ ڈاکٹر کے آنے تک (طب و صحت)	۲/۵۰

[illegible] معلومات

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے اب مکمل سیٹ

بے بی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

۱۵ اگست کو آنے والی شاہکار کتاب

زندہ قائداعظم

چوہدری ...
اشتیاق ...
فقیر سید ...
غلام عباس ...
عباس احمد عباسی ...
اے بی اکرم، محمد ...
فاطمہ بائی، محمد نعمان ...

ولی دکنی سے آج تک کے سو شاعروں کی منتخب غزلوں کا انوکھا مجموعہ

ولی، حاتم، سراج، سودا، درد، میر، ناسخ، آتش، جرات، انشا، ظفر، مومن، مجروح، نظام، نسیم، غالب، شیفتہ، تلق، آشفتہ، امیر مینائی، داغ، شہیدی، جلال، حالی، شاد، اکبر، ریاض، حسرت، ثاقب، آرزو، اقبال، فانی، سیماب، اصغر، چکبست، نوح، یگانہ، سالک، اثر، جگر، تبسم، فراق، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، تاثیر، فیض، مجاز، عدم، احسان دانش، جذبی، عابد، حفیظ ہوشیارپوری، قیوم نظر، یوسف ظفر، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، ساحر، قتیل شفائی، ظہیر، سیف، ادا، خاطر غزنوی، احمد فراز، منیر نیازی، شاعر، ساغر، شکیل، شکیب، مصطفیٰ زیدی، ناصر کاظمی، سلیم احمد، ابن انشا، شہزاد احمد، مرتضیٰ برلاس، غلام جیلانی اصغر، عبداللہ جاوید، ساقی فاروقی، عالی، زہرا نگاہ، اسلم انصاری، شاذ تمکنت، ناصر زیدی، اختر امام، حبیب جالب، شان الحق حقی، محسن احسان، کشور ناہید، اقبال ساجد، بانی، عبیداللہ علیم، عدیم ہاشمی، جون ایلیا، ریاض مجید، صفدر میر، جمیل یوسف، رفیق احمد ساقی،

مصباح الایمان

یکم ستمبر

۳/-

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

داستانِ ہٹلر

قسط ۲۳

Marfat.com

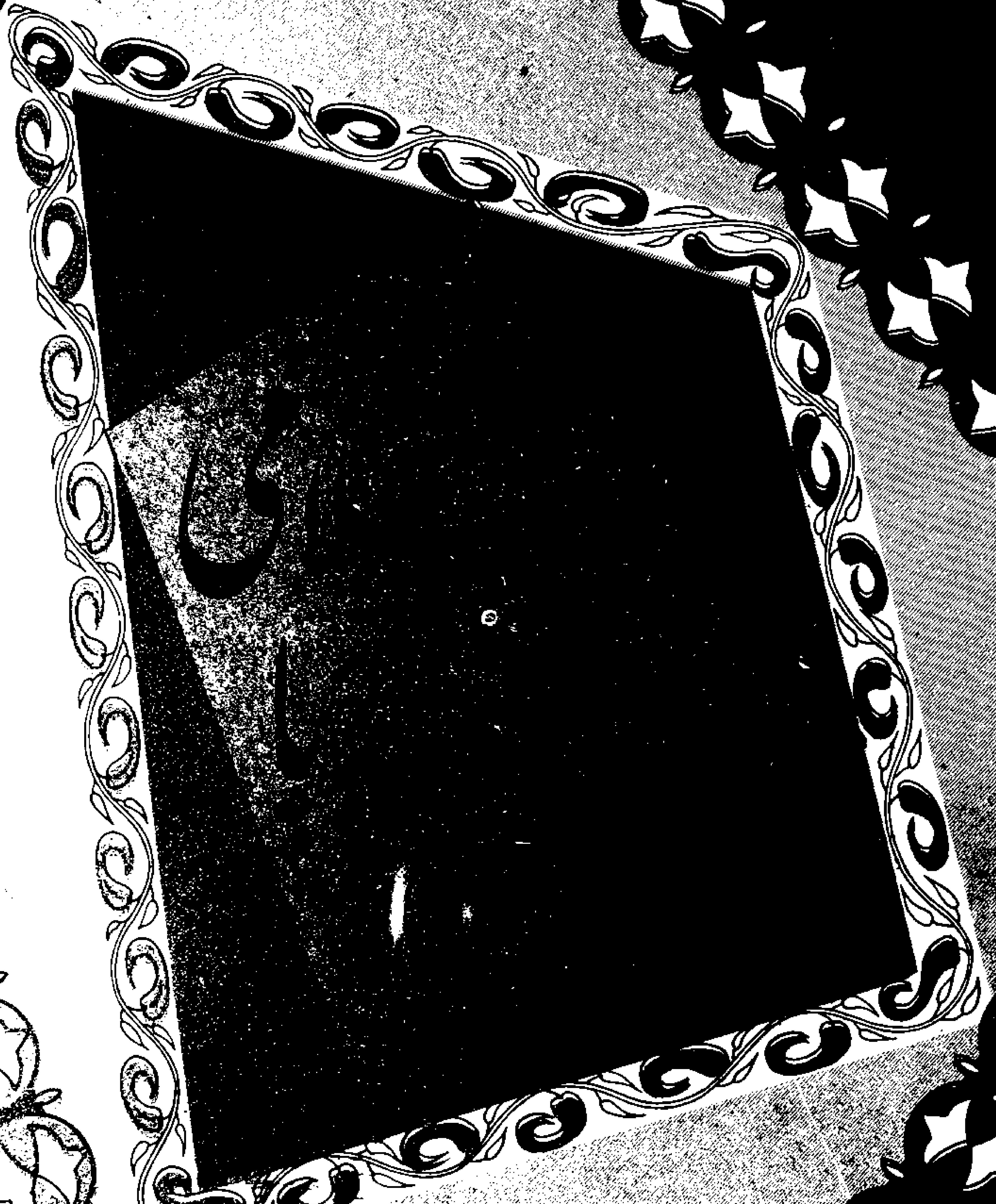

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

شاہکاریہ

کیا یہ سال اچھا ہے ؟

۷ رجنوری کو جب یہ اعلان ہوا کہ اسمبلی کی مقررہ میعاد سے سال ڈیڑھ سال پہلے ہی الیکشن کرایا جا رہا ہے تو نجومی نے کہا کہ یہ سال اچھا ہے، لیکن اُس کے سارے اندازے غلط ہو گئے ہیں۔ ۱۹۷۷ء کا سال ہر لحاظ سے ہماری قومی زندگی کا ایک منفی سال ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ برسوں میں اس کی تلافی ہو سکے، لیکن فی الحال ہماری سیاست، معیشت، معاشرت اور بیرونی ساکھ پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔

بالخصوص کتابوں کی صنعت پر اس بحران کے اثرات ناقابلِ برداشت ہیں۔ پہلے ہی ہمارے ملک میں کتابوں کی نشرواشاعت اور خرید و فروخت بہت کم تھی، اور جتنی بھی تھی، امن و امان سے مشروط تھی۔ بحران اور طوائف الملوکی کی حالت میں کتاب کون خریدے، کون چھاپے اور کون لکھے۔ کسی اور شعبے میں "پہیہ جام" ہڑتال ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، علمی و ادبی کتابوں کی سُست رفتار گاڑی کو یک طرفہ طور پر اچانک "بریک" دے کر کھڑا کر لیا گیا ہے۔ البتہ سیاسی لٹریچر سے بھری ہوئی طوفان میل چھکا چھک چھکا چھک چلی جا رہی ہے۔ "شاہکار" کے اکثر قارئین ہمیں مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ اس طوفان میل میں سوار ہو جاؤ۔ ہاتھ رنگ لو، پھر خوب ادب کی خدمت کیا کرنا۔ لیکن میں اُستادِ ازل کو کیا کہوں، اُس نے سب گُر سکھائے، اک یہی جذبات سے کھیل کر، حصولِ منفعت کا گُر نہیں سکھایا۔

قوم کے سامنے اس وقت الیکشن کا ٹائم ٹیبل پھیلا پڑا ہے۔ ہم شاہکار والے اپنا اشاعتی پروگرام اس ٹائم ٹیبل کے مطابق مرتب کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ "انسائیکلوپیڈیا معلومات" جو کرفیو آرڈر وغیرہ کے زمانے میں ملتوی ہو گیا تھا، اب الیکشن کے فوراً بعد ہی پیش کیا جا سکے گا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ اس افراتفری کے زمانے میں انسائیکلوپیڈیا جیسی خشک اور بوجھل چیز کو کون پسند کرے گا۔ نیا حرف ہے، نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ۱۸ ر اکتوبر کو خیریت سے الیکشن ہوئے (خدا کرے) تو یکم نومبر یا یکم دسمبر سے "معلومات" کی قسط نمبر ۱۳ آپ کے پاس ہو گی۔ یقین جانیئے کہ ہم اپنا ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے کام میں منہمک ہیں۔ علم و ادب کے قافلے کو ہم رکنے نہیں دیں گے، انشاءاللہ۔

اصیل کبوتر کے نشان والی شاہکار عوامی کتب کا سائز قارئین نے پسند کیا ہے۔ اس لیے اب ہر پہلی کو جریدی سائز میں اور ہر پندرہ کو نئے سائز میں کتابیں شائع کی جائیں گی۔

"عوامی کتاب" کی اصطلاح ہم نے "پیپر بیک" کے لیے استعمال کی ہے۔ اس انگریزی لفظ کا کوئی اور بہتر متبادل آپ تجویز کر سکیں تو ہم شکریہ ادا کریں گے۔

آپ کا
سیّد قاسم محمود

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط ◯ وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

قیمت فی قسط ۳/- روپے

سالانہ معہ رجسٹری ۳۰/- روپے

۲۲

• مدیرِ اعلیٰ : سیّد قاسم محمود

• نائب مدیر : آذر تمنّا

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳

تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

مکتبۂ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

تاریخِ اشاعت: یکم ستمبر ۱۹۷۷ء - ناشر: سیّد قاسم محمود - طابع: ریاض حسین الجدّہ پرنٹرز، راوی روڈ، لاہور

Marfat.com

[illegible] سے ۱۰۹۹ھ/۱۶۸۷ء تا ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء
[illegible] سلطان ابراہیم کا بیٹا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں
[illegible] میں اختلاف ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ قید و بند میں گزارا۔
[illegible] اس کے والد کی وفات کے بعد اس کا بھائی محمد چہارم تخت پر بیٹھ گیا تھا، جس
نے اسے قید میں ڈال دیا۔ لیکن جب موہاج کے مقام پر ہونے والی مہم میں ترکی فوجوں کو شکست
کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے بعد محمد چہارم کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ سلیمان ثانی
کو ۸ر نومبر ۱۶۸۷ء کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ لوگوں کو اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں
لیکن سلیمان ثانی میں بہترین انتظامی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی جنگی
صلاحیتوں کا برملا اظہار کیا اور دو مرتبہ فوج کو اپنی قیادت میں میدانِ جنگ میں لے
کر گیا۔ لیکن انھی دنوں باغی فوج ہنگری سے واپسی پر دارالسلطنت پر حملہ آور
ہو گئی۔ اس بغاوت میں وزیراعظم سیاوش پاشا کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے
بعد دارالحکومت کے باشندے باغیوں کے مقابلے کو اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں
نے بغاوت کو جلد ہی کچل دیا۔ اس کے بعد بھی سلیمان ثانی کو کئی بغاوتوں کا سامنا
کرنا پڑا۔ سلیمان ثانی کتنی ہی جنگوں اور مہموں میں کامیاب و ناکام ہوتا رہا۔ بالآخر
۲۳ر جون ۱۶۹۱ء یا بعض لوگوں کے مطابق ۱۲ر جولائی ۱۶۹۱ء میں وفات پائی۔ اس
کے بعد اس کا بھائی احمد ثانی تخت نشین ہوا۔ سلیمان ثانی کو قسطنطنیہ کی جامع مسجد
سلیمانیہ میں سلیمان اوّل کی قبر کے پاس ہی دفن کیا گیا۔

سلیمان ندوی:

سید سلیمان ندوی صوبہ بہار کے گاؤں دیسنہ میں جو پٹنہ کے ضلع میں تھا ۲۲ر
نومبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے آپ کا تعلق زیدی سادات کے خاندان سے تھا۔ اس
خاندان میں بہت سے علماء اور اطبا گزرے ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر میں ہی
حاصل کی بعد میں پھلواری شریف اور دربھنگہ میں بھی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے۔ آپ
نے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے طلبہ کی انجمن میں ایک مضمون پڑھا تو اساتذہ نے بہت داد دی۔ بعد میں
آپ کی یہ تحریر پٹنہ کے مشہور ہفت روزہ اخبار "الپنچ" میں شائع ہوئی آپ ۱۹۰۱ء
میں دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ ندوے میں آپ کے ادبی اور علمی ذوق
کو بہت جلا ملی۔ آپ نے اس زمانے میں بہت سے مضامین لکھے۔ اس زمانے میں جب
نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ میں تشریف لائے تو آپ نے ان کی شان میں عربی
زبان میں ایک قصیدہ پڑھا جسے سنکر نواب صاحب بہت خوش ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں
جب شبلی نعمانی ندوے کے معتمد بن کر لکھنؤ آئے تو سید سلیمان نے آپ کی شان میں فارسی
قصیدہ لکھا مولانا اس قصیدے سے بہت محظوظ ہوئے اور آپ کو اپنی تربیت میں
لے لیا۔ سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے پاس آنے والے عربی رسائل وغیرہ بڑے ذوق و
شوق سے پڑھنے لگے۔ آپ جدید عربی کے بھی بہت اچھے ادیب شمار ہونے لگے تھے
۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی نعمانی نے جب ندوۃ العلماء کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ
"الندوہ" نکالا اس رسالے کی دیکھ بھال کا کام سید سلیمان کے سپرد کیا گیا۔
۱۹۰۶ء میں دستار بندی کے موقع پر بھی ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ دستار
[illegible] خواجہ غلام الثقلین نے سید سلیمان سے عربی زبان میں تقریر کرنے
[illegible] آپ نے نہایت فصیح و بلیغ اور برجستہ تقریر کی جس سے تمام حاضرین
[illegible] ہو گئے مولانا شبلی نعمانی کا خوشی کے باعث یہ حال تھا کہ اپنی نشست سے اٹھ
کر اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔ ۱۹۰۸ء میں آپ دارالعلوم ندوہ
میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد بھی مقرر ہو گئے۔ آپ نے درس و تدریس
کے زمانے میں دو عربی کتابیں "دروس الادب" لکھیں جو آج بھی مشہور ہیں۔ آپ نے
درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ۱۹۱۲ء تک "الندوہ" کی ادارت بھی کی۔ بعد میں آپ مولانا
ابوالکلام آزاد کے رسالے الہلال کے ساتھ منسلک ہو گئے ۱۹۱۵ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ
العلماء کے معتمد تعلیمات مقرر ہوئے اور ۱۹۵۰ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے
آپ نے اپنے استاد مرحوم کی تحریر کردہ "سیرۃ النبیؐ" کو مرتب کر کے شائع کرایا
سید سلیمان ندوی نے خلافت کی تحریک میں بھی زور و شور سے حصہ لیا چنانچہ جب ایک
ترکی کے معاملات میں انصاف کے حصول اور مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کرنے
کے لیے یورپ گیا تو اس کے تین ارکان میں سے ایک آپ تھے۔ آپ اس وفد کے ساتھ
اٹلی فرانس اور انگلستان میں زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعے [illegible]
یورپ سے واپسی کے بعد آپ نے تمام ملک کا دورہ کیا۔ ۱۹۲۱ء میں جب [illegible]
کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا تو آپ نے اس کی صدارت بھی کی آپ نے ہندوستان
کی آزادی کے لیے چلائی جانے والی تقریباً ہر تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ
جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی یونیورسٹی کی سینٹ اور پاکستان
ہسٹاریکل کانفرنس کے رکن رہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ادارۂ تعلیمات اسلام
کا جو بورڈ قائم کیا تھا اس کے باضابطہ صدر بھی آپ ہی تھے انھوں نے اس بات پر بھرپور
طریقے سے زور دیا کہ پاکستان کی حکومت کے تمام قوانین قرآن مجید اور سنت رسولؐ
کے مطابق ہوں۔
بالآخر ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو آپ اس فانی جہان سے کوچ کر گئے۔ آپ
نے بے شمار علمی یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں حیات شبلی، "رحمت عالم" (بچوں کے لیے)
"نقوش سلیمانی"، "خیام" اور "خطبات مدارس" شامل ہیں۔ آپ نے "سیرت النبی" بھی
مرتب کر کے شائع کرائی۔ جس کی چھ جلدیں ہیں۔

سماٹرا

انڈونیشیا کا ایک جزیرہ۔ یہ دنیا کے بڑے ترین جزیروں میں پانچویں نمبر پر ہے۔ اس
جزیرے کے تقریباً درمیان سے خطِ استوا گزرتا ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ پہلے
صرف اس جزیرے کے ایک مخصوص علاقے کا نام سماٹرا تھا لیکن آہستہ آہستہ یہی نام تمام
جزیرے کے لیے رواج پا گیا۔
سماٹرا کے جزیرے میں اسلام کی اشاعت تیرھویں صدی میں ہوئی مشہور سیاح
مارکوپولو نے ۱۲۹۲ء میں اپنے سفرنامے میں یہاں کے مسلمانوں کا تذکرہ کیا۔ مارکوپولو کی اس بات
کا ثبوت بھی مسلمانوں کی پرانی قبروں کے کتبے کو پڑھنے کے بعد مل جاتا ہے کہ آچے کے
شمال مغربی ساحل سمودرہ پاسائی کی مسلم حکومت کا بانی ۱۲۹۷ء میں وفات پا گیا تھا۔
اس ثبوت کے مل جانے کے باعث علماء کا کہنا ہے کہ سماٹرا میں ۱۲۷۰ء اور ۱۲۷۵ء
کے درمیانی عرصے میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔
آجکل سماٹرا کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مبنی ہے جو اس خطے کی آب و ہوا اور گرم موسم
کے باعث نہایت پرجوش اور سرگرم مسلمان ہیں۔

Marfat.com

یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا لیکن پہلے زمانے کی طرح یہ لفظ [illegible] یا گانا بجانا کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لغوی اعتبار سے احمد مثل سماعی کے یعنی جو کسی سند پر مبنی ہو لیکن ایک سلسلۂ قیاسی کے، دیکھ سماع اور صحیح دراز عقل کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ لفظ سب سے زیادہ اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بطور اصطلاح سماع سے مراد موسیقی نہیں۔ انہماک، گانا، الاپنا اور وجد پیدا کرنے کے لئے کسی خاص انداز یا سر تال میں گانے بجانے کے ہیں۔ الغزالی نے اپنی کتاب احیاء، میں ایک باب سماع کے بارے میں ہی تحریر کیا ہے۔ الغزالی نے اس موضوع پر ایک محقق صوفی ایک صاحب حال اور ایک راسخ العقیدہ اشعری اور شافعی کی حیثیت سے غور کیا ہے۔ اسی طرح ہجویری عرف داتا گنج بخش نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں سماع کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سماع اس صورت میں درست ہے کہ ملے خواہ مخواہ تکلف کر کے سماع نہ سنے۔ جب تقاضا از خود غالب ہو صرف اسی وقت سنے۔ سماع زیادہ بھی نہیں سننا چاہیئے تاکہ طبیعت کو اس کی عادت نہ پڑ جائے۔ مرشد یا شیخ طریقت محفل سماع میں موجود رہے۔ محفل میں عوام شریک نہ ہوں۔ قوال پاکباز ہوں اور فسق و فجور کے عادی نہ ہوں۔ دل مکروہات دنیوی سے خالی ہو۔ طبیعت لہو لعب کی جانب آمادہ نہ ہو۔ تکلفات و اہتمام نہ کیا جائے۔

سماع سننے کے بارے میں مندرجہ بالا ہدایات کے باوجود آپ مزید لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں [illegible] کا ایک بہت بڑا گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ نا سمجھوں کی محفل سماع میں شریک ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم سماع حق کے لئے سنتے ہیں۔ حالانکہ فاسق اس سے فسق و فجور پر اور زیادہ حریص ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ اور وہ دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔

سمرقند

روسی ترکستان میں صوبہ سغد کا صدر مقام۔ سمرقند شہر دریائے سغد کے جنوبی کنارے پر آباد ہے۔ اس شہر کے محل وقوع کا ذکر کرتے ہوئے روسی، یورپی اور بیشتر مشرقی سیاح کہتے ہیں کہ یہ شہر درحقیقت جنت الفردوس ہے۔

عربوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے سمرقند کے مقامی حکمرانوں کو طرخون کہا جاتا تھا۔ لیکن جب قتیبہ بن مسلم خراسان کے والی مقرر ہوئے تو انہوں نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا جو کافی عرصہ تک جاری رہا۔ بالآخر یہاں کے حکمران ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت وہاں کے حکمران اخشید غورک کو تخت پر بحال رکھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک عرب والی بھی طاقتور فوجی جمعیت کے ساتھ مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں یہ شہر بخارا کے ساتھ مل کر آئندہ فتوحات اور تبلیغ و اشاعت اسلام کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

۲۰۴ھ/۸۱۹ء میں مامون الرشید نے سمرقند کی گورنری اسد بن سامان کے بیٹوں کو سونپ دی۔ اس کے بعد یہ اعلیٰ منصب کافی عرصہ تک سامانی خاندان کے پاس ہی رہا یہاں تک کہ اسمٰعیل بن احمد نے ۲۸۷ھ/۹۰۰ء میں سامانی حکومت قائم کر لی۔ اس زمانے میں سمرقند و بخارا کو بہت عروج حاصل ہوا لیکن اس کے بعد پھر پانچ صدیوں تک زوال پذیر رہا۔ اور امیر تیمور اور اس کے جانشینوں کے دور میں ہی دوبارہ عروج ملا۔ اس کے زمانے میں دارالسلطنت کو بخارا منتقل کر دیا گیا مگر اسلامی ممالک میں تجارتی اور ثقافتی مرکز کے طور پر سمرقند کو اولیت حاصل رہی۔

اصل شہر اب [illegible] سمرقند کا [illegible] خاص طور پر تعریف کی ہے۔ شہر میں سب سے [illegible] کا مقبرہ اور مسجد ہے۔ حضرت قثمؓ ابن عباس کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے سمرقند کے لوگوں میں مذہب اسلام کی تبلیغ کی۔ جس کے نتیجہ میں بیشتر اہل شہر مسلمان ہو گئے تھے۔ آجکل اس شہر کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے۔

سمرہ بن جندب

آپ کے والد کا انتقال آپ کی کم سنی ہی میں ہو گیا تھا۔ ہجرت کے بعد آپ اپنی والدہ کے ہمراہ مسلمان ہو گئے۔ اپنی کم عمری کے باعث ابتدائی غزوات میں حصہ نہ لے سکے۔ جوان ہونے کے بعد تمام غزوات میں شامل رہے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد آپ بصرہ چلے گئے۔ ۵۰ھ میں زیاد بن سمیہ نے، جو ان دنوں کوفہ کا حاکم تھا، آپ کو اپنا نائب مقرر کر لیا۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں آپ نے خوارج کے فتنہ کو دبانے میں نمایاں اور بھرپور حصہ لیا۔ اس کے بعد آپ کو بصرہ کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ آپ کی وفات کا واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ آپ کو سخت سردی لگی، جس کے باعث آپ نے ایک دیگ کھولتے ہوئے پانی سے بھروائی اور اس پر بیٹھ گئے تاکہ کچھ افاقہ ہو، لیکن آپ دیگ میں گر پڑے اور فوراً ہی انتقال کر گئے۔ آپ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں جل کر مرنے کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ سمرہؓ بن جندب نے حضور کی بہت سی احادیث بھی بیان فرمائی ہیں۔

سمیع

دیکھیئے، "اسماء حسنیٰ"

سمیہ

حضرت عمارؓ بن یاسر کی والدہ۔ آپ ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی کی کنیز تھیں۔ آپ کا نکاح ابو حذیفہ کے حلیف یاسر سے ہوا۔ آپ کے ہاں جب عمار بن یاسر پیدا ہوئے تو ابو حذیفہ نے آپ کو آزاد کر دیا تھا۔ آپ پر اسلام لانے کے بعد طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ آپ کو مکہ کی ریت پر لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ آپ اسلام کی سب سے پہلی شہید بھی ہیں۔ ابوجہل نے آپ کو برچھی مار کر شہید کر دیا تھا۔

سنت

سنت کا لفظی مطلب طریقہ، منہج، سیرت یا راستہ ہیں۔ اس کے علاوہ لفظ سنت اچھا طریقہ اور برا طریقہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضور اکرمؐ کی ایک حدیث سے ہمیں ان دونوں معنوں کا علم ہوتا ہے۔ [illegible] جس نے اسلام میں ایک اچھا طریقہ [illegible]

Marfat.com

[illegible]

... ان تمام [illegible] جانے کا انھوں نے اس ... [illegible] ہی کوئی ... ہو گی۔"

[illegible] کا لفظ قرآن مجید میں مختلف سورتوں میں آیا ہے:

"اور اگر وہ پھر (ظلم و قتال کی طرف) لوٹیں گے تو بے شک پچھلوں کا طور طریقہ پڑ چکا ہے۔" (الانفال: ۳۸)

"(یہ مجرم) رسول پر ایمان نہیں لاتے اور بے شک پہلی قوموں کا طریقہ گزر چکا ہے۔" (الحجر: ۱۳)

"(ان لوگوں کا انجام) اسی قانون کے مطابق (ہوگا) جو ان رسولوں کے بارے میں تھا جو آپ سے پہلے ہم نے بھیجے تھے اور تو ہمارے قانون میں تغیر نہیں پائے گا۔ (بنی اسرائیل: ۷۷)

"اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آئی تو ان کو ایمان لانے اور اپنے رب سے گناہوں کی مغفرت طلب کرنے سے اور کسی بات نے نہیں روکا صرف یہی کہ ان کو پچھلی قوموں کا سا معاملہ پیش آجائے۔" (الکہف: ۵۵)

"پس کیا وہ انتظار نہیں کرتے مگر اس قانون کا جو پچھلی قوموں کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ پس تو اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا اور تو اللہ کے قانون کو کبھی ٹلتا نہیں پائے گا۔" (فاطر: ۴۳)

"یہ اللہ کا قانون ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت منکر خسران ہی رہتے ہیں۔" (المؤمن: ۸۵)

ان تمام آیات میں لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔ یہاں سنت اللہ سے مراد وہ قانون ہے جو اس نے ہمیشہ اپنے پیغمبروں کے بارے میں جاری رکھا۔ جو لوگ ان پیغمبروں پر ایمان لاتے اور ان کے بنائے ہوئے راستے پر چل پڑتے، وہ کامیاب قرار دیئے جاتے تھے۔ اور ایسے لوگ جو پیغمبروں کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے رکھتے اور ان کے بتائے ہوئے راستوں سے دُور بھاگتے تھے، ان پر اللہ تعالیٰ اپنا قہر اور عذاب نازل کرتا تھا۔ سورۃ النساء کی آیت ۲۶ کی جانب دیکھئے:

"اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (احکام) کھول کر بیان کر دے اور تمہیں ان لوگوں کے سنن (قوانین اور ضابطے) بتادے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔"

اس آیت میں سنن سے مراد شریعت ہے جس کی پابندی پرانے زمانے میں علماء اور صالحوں نے کی تھی۔ ممکن ہے قرآن مجید میں لفظ سنت کے اس استعمال کے باعث ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اقوال و اعمال کو سنت کہا جانے لگا ہو۔

آنحضورؐ کی احادیث میں بھی سنت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں بھی اس لفظ کے معنی طریقے کے ہی لیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر چند احادیث کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) "اللہ کے ہاں تین طرح کے آدمی مبغوض ترین ہیں: ایک وہ جو حرم میں بے راہ روی (ظلم) کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو اسلام میں دورِ جاہلیت کے رسم و رواج چاہتا ہے اور تیسرا وہ جو ناحق کسی شخص کا خون بہانے کے درپے ..." (بخاری۔ کتاب الدیات باب ۹۱)

[illegible] الجاهلية کا لفظ آیا ہے۔ جس کا مطلب دورِ جاہلیت کے طور طریقے یا رسم و رواج لیا جاتا ہے۔

(۲) "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ تم ان لوگوں کے طریقے پر چلنے لگو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔" (الترمذی۔ کتاب الفتن، باب)

(۳) "تم ضرور ان لوگوں کے راستے پر چلو گے جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ بالشت در بالشت اور گز در گز، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں چلے ہوتے تو تم بھی اس میں چلے جاتے۔" (البخاری۔ کتاب الانبیاء)

صرف چند جگہ کو چھوڑ کر جہاں کہیں بھی لفظ سنت استعمال ہوا ہے اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت ہی ہوتی ہے۔

علوم دینیہ کی ایک اصطلاح کے طور پر سنت کے تین معنی بیان کیے جاتے ہیں

(۱) سنت اس نظام کا نام ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بتایا اور اس کی پابندی کی۔ پھر آپؐ کے بعد آپ کے خلفائے راشدینؓ بھی اس کے پابند رہے اور ان کے بعد امتِ مسلمہ کی اکثریت بھی اس نظام پر کاربند رہی۔

اس سلسلے میں ایک حدیث بھی ان معانی کو واضح کرتی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی کسی امت میں بھیجا اس کی امت میں اس کے کچھ مقرب ساتھی اور صحبت یافتہ افراد ایسے ہوتے جو اس کے طریق کار پر کاربند رہے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے رہے پھر ان کے بعد ایسے اخلاف آنے رہتے جو زبان سے وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں اور کرتے وہ ہیں جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا۔" (مسلم، کتاب الایمان)

اس اصطلاح کے مطابق سنت اس طریق کار کو کہا جاتا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رائج فرمایا اور جو آپؐ کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف نہیں، چاہے اس طریق کار کا ثبوت قرآن مجید کی کسی آیت سے ہو یا آپؐ کی حدیث سے یا خلفائے راشدین کے طریقہ سے۔

اصولِ فقہ میں سنت سے مراد وہ امور لیے جاتے ہیں جو حضور اکرمؐ سے کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کے علاوہ منقول ہوئے ہیں۔ امام راغب نے اصولِ فقہ کی اس اصطلاح کے بارے میں لکھا ہے کہ "نبیؐ کی سنت ان کا وہ طریق کار تھا جو وہ سوچ سمجھ کر اختیار فرمایا کرتے تھے۔" (مفردات القرآن)

مجد الدین ابن الاثیر اس بارے میں رقم طراز ہیں: "جب اصطلاح شرع میں سنت کا لفظ بغیر کسی قید کے استعمال ہو تو اس سے مراد وہ امور ہوتے ہیں جن کا نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حکم دیا ہو یا ان سے منع فرمایا ہو قولاً یا فعلاً اور وہ امور ایسے ہوں کہ قرآن مجید میں ان کی تصریح نہ ہوئی ہو۔" (نہایۃ)

اس طرح ہمیں اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ حضور اکرمؐ کے قول و فعل کے ذریعے جو امور قرآن مجید کے علاوہ ثابت ہوں وہ سنت ہیں۔

شاطبی نے سنت کے تین معنی بیان کیے ہیں۔ (۱) سنت بمقابلہ بدعت۔ (۲) سنت بمعنی اقوال و افعالِ رسول اللہ۔ (۳) سنت کے معنی وہ احکام ہیں جن پر صحابہ کرامؓ کا عمل رہا ہو، چاہے ان کا ذکر کتاب و سنت میں ہو یا نہ ہو۔ (الموافقات)

امام شاطبی کی اس اصطلاح کے مطابق حدیثِ موقوف یعنی کسی صحابیؓ کا قول، فعل یا تقریر وغیرہ بھی سنن میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ہمارے گزشتہ بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سنت کا اطلاق چار اشیاء پر ہوتا ہے۔ (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قول، (۲) آپؐ کا فعل، (۳) آپؐ

Marfat.com

کا اقرار (اجازت) چاہے یہ اشیاء بذریعہ وحی آپ تک [illegible] اجتہاد کا نتیجہ ہوں۔ بشرطیکہ یہ قول صحیح ہو کہ آپ اجتہاد بھی [illegible] ان تین اشیاء کے ساتھ چوتھی شے وہ احکام ہیں جو صحابہ کرامؓ یا خلفاء سے منقول ہوں"۔ (الموافقات)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت جن الفاظ میں کی وہ امام شاطبی کے بیانات کو درست ثابت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "میں تمہاری بیعت، اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے بعد کے دو خلفاء کی سنت پر کرتا ہوں۔

حجیت سنت : اہل اسلام کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ کتاب و سنت شریعت اسلامی کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ یعنی ایسے احکامات جو حضورؐ کے قول، فعل یا تقریر کے ذریعے ثابت ہوتے ہیں، اور بالکل اسی طرح واجب التعمیل ہیں جیسے خود قرآن مجید کے ذریعے ثابت شدہ احکامات ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جن قرآنی آیات کا سہارا لیا جاتا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ (اللہ) کی اطاعت کرو"۔ (آل عمران: ۳۲، المائدہ: ۹۲)، الانفال: ۱، ۲۰)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے ارباب اختیار کی اطاعت کرو پھر اگر تم کسی امر میں آپس میں نزاع کرنے لگو تو اسے (فیصلے کے لیے) اللہ اور رسولؐ کے پاس لے جاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہو"۔ (النساء: ۵۹)

"تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں اچھا نمونہ ہے اس شخص کے لیے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو"۔ (الاحزاب: ۲۱)

"تیرے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں کہلائیں گے جب تک یہ نہ ہو کہ وہ تمہیں اپنے آپس کے تنازعوں میں حَکَم تسلیم کرلیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر وہ اپنے دلوں میں گھٹن محسوس نہ کریں اور پورے طور پر آپ کے اطاعت گزار ہیں"۔

(الانساء: ۶۵)

ان آیات کی رو سے نبی کریمؐ کی اطاعت لازم ہو جاتی ہے اور آپس کے تنازعات میں آپؐ کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ اس لیے آپؐ کی پیروی کرنا چاہیے۔

سنت کو حجت شرعیہ ثابت کرنے کے لیے چند احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً "جو کچھ تم کو کتاب اللہ میں سے دیا گیا ہے اس پر عمل کرنا (لازم ہے) اس کے چھوڑنے پر کسی کا عذر قبول نہ ہوگا۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو میری کوئی سنت جاریہ ہو۔ اگر میری سنت جاریہ بھی نہ ہو تو جو میرے اصحاب (اجماعاً) فرمادیں :

"علم میں تین قسم کی باتیں ہیں اور ان تین کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زائد (یعنی علم سے خارج) ہے، آیت محکمہ (جو متشابہات میں سے نہ ہو)، سنت قائمہ (جو منسوخ نہ ہو) اور فریضہ عادلہ (مسئلہ علم میراث)"۔ (ابو داؤد۔ کتاب الفرائض)

اہل یمن نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دیجیے جو ہمیں اپنے رب کی کتاب اور سنت سکھادے۔ حضور اکرمؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ کا ہاتھ پکڑ کر ان کے حوالے کیا اور فرمایا۔ "یہ اس امت کے امین ہیں"۔

(احمد بن حنبل! "المسند")

دراصل مسلمانوں کا حضور اکرمؐ کی ذات سے گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے بعض علماء اور متکلمین احتیاج ایمان بالرسول کے عقیدے پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان

حضرت [illegible] بھی فرمائیں۔ ان کی پیروی [illegible] نے اسے قرآن مجید کہا۔ جس کے بارے میں آپ [illegible] مانا، جس کے بارے میں حضورؐ نے بتایا کہ یہ حکم الٰہی ہے [illegible] اور جسے حضورؐ نے متروک گردانا ہم بھی اسے متروک ہی سمجھتے ہیں۔

ابن حزم اپنی کتاب الاحکام میں لکھتے ہیں کہ "دو مسلمان بھی ایسے نہیں ملیں گے جن کو اس امر سے اختلاف ہو کہ جس بات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثبوت مل جائے کہ یہ آپؐ کا ارشاد اور فرمان ہے تو اس کی پیروی لازم ہے اور وہی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی مراد کی تفسیر اور اس کے اجمال کی تشریح ہے"۔

امام شافعیؒ اپنی تصنیف "الرسالہ" میں رقم طراز ہیں کہ "مجھے اہل علم میں اس رائے سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں کہ سنت نبوی تین طرح کی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی حکم قرآن مجید میں موجود ہو اور حضورؐ بھی وہی حکم سنت میں بیان فرمادیں، دوسری یہ کہ قرآن مجید کا حکم اجمالی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے حکم کے مطابق اس کی تفصیل بیان کر دیں۔ تیسری قسم کی سنت وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کی آیت نہ ہو، گویا آنحضرتؐ کے احکام موجود ہیں۔ قرآن مجید میں حکمت کا جو ذکر آیا ہے اس سے یہی سنت مراد ہے۔

لفظ سنت ان احکام شریعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو فرض اور واجب نہیں۔ اس قسم کی سنت کی دو قسمیں ہیں۔ سنن ہدیٰ (۲) سنن زوائد۔ پہلی قسم کی سنت کا ترک کرنا جرم اور مکروہ ہے۔ مثلاً جماعت اور اذان و اقامت وغیرہ۔ دوسری قسم یعنی سنن زوائد کو چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسے حضورؐ کا طریقہ لباس اور نشست و برخاست۔ اس میں حضورؐ کے وہ مستحب اعمال بھی شامل ہیں جو آپؐ نے بطور عبادت اختیار کیے اور ان کی عادات کا جزو بن گئے۔ نفل پڑھنے والے کو ثواب ملے گا اور ترک کرنے والے پر کوئی ملامت نہیں۔ لیکن نفل کا تعلق سنن زوائد سے نہیں بلکہ یہ اس کے بعد ہے۔ کیونکہ وہ فرض، واجب اور سنت سے زائد احکام میں شامل ہیں۔ نفل عام طور پر وہ امور ہیں جن پر حضورؐ نے دوام نہیں کیا۔ مگر ان کے بارے میں استحباب کی کوئی عام یا خاص دلیل موجود ہو۔ بعض اوقات سُنن کو بھی نفل کہہ لیا جاتا ہے کیونکہ وہ لازم امور کے علاوہ ہیں۔

سنت کی چند مثالیں : صبح کی نماز میں دو رکعتیں فرض ہیں ان سے پہلے دو رکعتیں سنت ہیں۔ اسی طرح ظہر کی نماز میں فرض سے پہلے چار اور فرض کے بعد دو رکعت سنت ہیں۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں میں فرض کے بعد دو دو رکعتیں سنت کی ہیں۔ ہر نماز میں قیام، قرأت، رکوع و سجود سب فرض ہیں۔ لیکن رکوع و سجود میں تسبیحات وغیرہ اعمال سنت ہیں۔

سنت موکدہ نماز

سنت موکدہ سے مراد وہ امور ہیں جو حضرت اکرمؐ یا صحابہؓ نے ہمیشہ کیا ہو اور ایک یا دو دفعہ کے سوا نہ چھوڑا ہو۔ اس کے نہ کرنے میں گناہ ہو۔ یہ سنت الہدیٰ یا سنت موکدہ کہلاتی ہے۔

سنت موکدہ سے مراد فجر کی دو سنتیں، ظہر کی چھ سنتیں، [illegible] کے بعد فرضوں کی دو دو سنتیں ہیں۔

Marfat.com

احادیث میں ان کا بارہا اور بیشتر جگہ ذکر آتا ہے۔ چند ایک احادیث درج ذیل ہیں:

ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو آدمی دن اور رات میں بارہ رکعتیں نماز پڑھے اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنایا جاتا ہے۔ چار ظہر سے قبل اور دو بعد میں، دو مغرب کے بعد اور دو عشاء کے بعد اور دو قبل فجر۔ (ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ صبح کی دو رکعتیں عالم و عالمیان اور جو کچھ اس میں ہے سب سے افضل ہیں (مسلم)

حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، چار رکعتیں ظہر سے پہلے جن میں سلام کی ضرورت نہیں ہے ان کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ (ابوداؤد اور ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلعم آفتاب ڈھلنے کے بعد قبل ظہر چار رکعتیں پڑھا کرتے اور فرماتے کہ اس وقت آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں لہذا اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرے نیک اعمال وہاں جائیں۔ (ترمذی)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس نے بعد مغرب چھ رکعتیں پڑھیں اور درمیان میں کلام بد نہ کیا تو وہ چھ رکعتیں بارہ برس کی عبادت کے برابر ہو جاتی ہیں۔ (ترمذی)

سنجاق شریف

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عَلم مبارک۔ یہ عَلم آج بھی استنبول (قسطنطنیہ) میں بحفاظت رکھا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۲ فٹ ہے۔ اس عَلم یا جھنڈے پر ایک مکعب شکل کا چاندی کا خول ہے جس کے اندر قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھا ہوا ہے۔ اس قرآن مجید کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس عَلم پر ایک اور رایت (جھنڈا) لپٹا ہوا ہے۔ اس رایت کو حضرت عمر فاروقؓ کی جانب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس عَلم پر چالیس غلاف جو تافتے کے بنے ہوئے ہیں، چڑھائے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سبز رنگ کے غلاف کے اندر لپٹا ہوا ہے۔ ان تمام غلافوں کے اندر ایک اور چھوٹا سا قرآن مجید موجود ہے جو حضرت عمرؓ کا ہے۔ اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کی ایک نقرئی کنجی بھی اسی میں لپٹی ہوئی ہے۔ یہ کنجی شریف مکہ نے سلطان سلیم اوّل کو پیش کی تھی۔

یہ عَلم مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں کے قبضے میں رہا۔ وہ اسے مختلف مہموں پر جاتے ہوئے اپنے ہمراہ لے کر چلتے تھے اور مہم کے اختتام کے بعد اس عَلم کو آبنوس کے عصا سے اتار کر بہت سی رسومات کی ادائیگی اور دعائیں مانگ کر اور عنبر و عود کی خوشبو میں بسا کر، نہایت خوبصورتی سے آراستہ صندوق میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس صندوق کو حضورؐ کے دوسرے تبرکات مثلاً خرقہ شریف وغیرہ کے ساتھ رکھ دیا جاتا تھا۔

سنجر بن ملک شاہ

ناصر الدین ابو الحارث ایک سلجوقی سلطان۔ اس کا اسلامی نام احمد تھا۔ مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۵ رجب ۴۷۹ھ/۵ نومبر ۱۰۸۶ء کو پیدا ہوا۔ بعض کے نزدیک اس کی پیدائش دو سال قبل ہوئی۔

۴۹۰ھ/دسمبر ۱۰۹۷ء میں اس کے چچا ارسلان ارغون کے قتل کے بعد نوجوان سنجر کو اس کے بھائی برکیاروق نے خراسان کا والی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے بعد تیسرے بھائی محمد نے برکیاروق کے خلاف بغاوت کر دی۔ برکیاروق شکست کھا کر خراسان کی طرف مراجعت کر گیا۔ اسی دوران میں سنجر نے محمد کے ساتھ، جو ماں کی طرف سے اس کا بھائی تھا گٹھ جوڑ کر لیا اور جب برکیاروق طبرستان، جرجان اور خراسان کے والی امیر داد کا حلیف بنا تو سنجر کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا اور انہیں شکست دی اور اپنے بھائی سنجر کا نہایت وفاشعاری سے ساتھ دیا۔

جنگی مصروفیات کے باعث سمرقند کے حاکم بدرخان نے سنجر کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر اور سنجر کے ایک امیر سے سمجھوتہ کر کے اپنی حکومت کو خراسان تک وسیع کرنا چاہا مگر گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اور سنجر نے اپنے خواہر زادہ محمد ارسلان خان بن سلیمان کو سمرقند اور دریائے جیحون پر واقع سرحدوں کا حاکم مقرر کر دیا۔

ارسلان شاہ بن مسعود غزنوی سے بھی سنجر کی جنگ ہوئی جس میں ارسلان شاہ نے غزنی فتح کر لیا اور بہرام شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ سلطان محمد کی وصیت کے مطابق اس کی وفات کے بعد سلطنت اس کے بیٹے محمود کو ملنی چاہیئے تھی لیکن نہ تو محمود کا بھائی مسعود (جو موصل اور آذربائیجان کا حاکم تھا) اور سنجر اس سے مطمئن تھے۔ محمود کو مسعود کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں تو کوئی دشواری پیش نہ آئی لیکن سنجر کو مطمئن کرنا بہت کٹھن کام تھا۔ اسی کشمکش میں سنجر ایک بڑی فوج ہمراہ لے کر خراسان سے نکل پڑا۔ اور ساوہ کے مقام پر ایک لڑائی لڑی۔ ابتدا میں لڑائی کا پلہ محمود کی طرف جھکا لیکن چند سنجر کے ہاتھیوں نے محمود کی فوج میں ابتری پیدا کر دی تھی اس لیے اس لڑائی کا انجام محمود کی مکمل شکست اور تباہی پر ہوا اور آخر طویل گفت و شنید کے بعد ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے محمود کو ری کے سوا باقی عراق کا والی تسلیم کر لیا گیا اور قرار پایا کہ سنجر کا نام خطبے میں پہلے لیا جائے گا۔ جب سمرقند کا حاکم محمد ارسلان خاں اپاہج ہو گیا تو اس نے حکومت اپنے بیٹے نصر خاں کو تفویض کر دی لیکن اس کو بہت جلد قتل کر دیا گیا جس پر محمد ارسلان خان نے سنجر سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان سنجر کے سمرقند پہنچنے سے پہلے ہی نصر خان کا ایک بھائی بغاوت ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ارسلان خان نے سنجر کو پیغام بھیجا کہ اب وہ واپس چلا جائے۔ ارسلان خان نے سنجر کو پیغام بھیجا کہ اب وہ واپس چلا جائے لیکن سلطان سنجر اس پر برافروختہ ہو گیا۔ اسے ارسلان خان پر شبہ ہو گیا کہ وہ اس کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ اس نے ارسلان خان کے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا جس میں وہ پناہ گزین تھا۔ آخر ارسلان خان ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا اور سنجر نے اس کی جان بخشی کر دی۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے داؤد کو تخت نشین ہونا چاہیئے تھا لیکن اس کے دونوں چچا سلجوق اور مسعود بھی تخت کے دعوے دار بن بیٹھے۔ بعد میں دونوں دعوے دار اس پر متفق ہو گئے کہ مسعود کو سلطان اور سلجوق کو اس کا ولی عہد تسلیم کر لیا جائے اور عراق کا نظم و نسق خلیفہ المسترشد کے سپرد کر دیا جائے لیکن سنجر اس سمجھوتے پر رضامند نہ ہوا۔ اس کے برعکس اس نے محمود کی جانشینی کے لیے طغرل بن محمد کا اعلان کر دیا جو اس وقت اس کے پاس خراسان میں موجود تھا۔ علاوہ ازیں اس نے عماد الدین زنگی سے اتحاد کر کے اس کو بغداد کا والی مقرر کر دیا۔ اور دُبیس بن صدقہ کو حلّہ کی حکومت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اب جنگ ناگزیر ہو گئی۔

چنانچہ ۱۸ رجب ۵۲۶ھ/۲ مئی ۱۱۳۲ء کو دینور کے مقام پر سنجر کے

Marfat.com

ناکام شکست کھانے کے بعد مسعود خراسان کی سمت چل دیا۔ ستمبر ۱۱۳۵ء میں اس نے غزنی پر فوج کشی کی کیونکہ وہاں بہرام خان خود مختار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بہرام خان نے اطاعت قبول کر لی۔ الا سنجر نے اس کی جان بخشی کر دی۔

سلطان سنجر اس کے بعد خوارزم کے حاکم عزیز بن محمد کے ساتھ ایک طویل جنگ میں الجھ گیا۔ لیکن پے بہ پے جنگوں اور شکستوں کے بعد وہ آخرکار گرفتار ہو گیا اور تین سال کی قید کے بعد رہائی حاصل کی۔

اس کی وفات ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء میں ہوئی۔ اس بالغ نظر اور طاقت ور سلطان کی موت کے بعد سلجوقی سلطنت تیزی کے رو بہ زوال ہونے لگی۔

سندھ

پاکستان کا جنوب مشرقی صوبہ۔ اس کا کل رقبہ اٹھاون ہزار آٹھ سو کیس مربع میل اور آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ سندھ کے شمال مغرب میں پنجاب اور بلوچستان کے صوبے ہیں۔ مشرق و جنوب میں اس کی حدیں ہندوستانی علاقے سے جا ملتی ہیں۔ جنوب مغرب میں بحیرۂ عرب کا ۱۵۰ میل لمبا ساحل واقع ہے۔ اس صوبے کا زیادہ تر حصہ دریائے سندھ کا ڈیلٹائی علاقہ ہے۔ ایرانیوں اور عربوں نے دریائے سندھ کو مہران کا نام دیا ہے۔ اسی لیے اس علاقے کو وادیٔ مہران کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد وحدت پاکستان کا قانون بن جانے کے بعد مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کی انفرادیت ختم کر دی گئی تھی۔ لیکن یکم جولائی ۱۹۷۰ء کو سابق مغربی پاکستان کو دوبارہ چار صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ حیدر آباد ڈویژن، خیرپور ڈویژن اور ضلع کراچی کو ملا کر صوبہ سندھ بنایا گیا۔ موجودہ صوبہ سندھ کے گیارہ اضلاع ہیں۔ لیکن ۱۹۷۷ء کے مالی سال کے دوران میں لاڑکانہ کو بھی ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

سندھ کی قدیم تہذیب کے آثار موہنجوڈارو، عامری اور کوٹ ڈیجی کی صورت میں دریافت ہو چکے ہیں۔ محمد بن قاسم بھی دیبل کے علاقے میں پہنچا تھا۔ اس کے بعد ہی یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی اور اس برعظیم پاک و ہند میں مذہب اسلام پھیلا۔

سندھ کا علاقہ نیم گرم منطقے میں واقع ہے اس لیے یہاں موسم گرما میں سخت گرمی اور سرما میں شدید سردی پڑتی ہے۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ (تقریباً سات انچ سالانہ) یہاں کی زمین ریتلی ہے۔ وسطی علاقے میں ببول کے خودرو درخت بہت زیادہ ملتے ہیں اس کے علاوہ سندھ کے علاقے میں بیر، جھاؤ، ماکھ بیر (کیر) اور کنڈی کے درخت کافی پائے جاتے ہیں پھل دار درختوں میں آم، کھجور، امرود، نارنگی اور کیلے کے درخت عام ہوتے ہیں۔

سندھ کے بیشتر علاقوں میں بیلوں، بکریوں اور اونٹوں کی بہترین نسلیں پالی جاتی ہیں جنگلی جانوروں میں اڑیال (جنگلی بھیڑ) اور جنگلی بکرہ سیرہ مغربی چٹانی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ پہلے یہاں سیاہ ریچھ اور چیتے بھی پائے جاتے تھے لیکن اب کمیاب ہو گئے ہیں۔

یہاں کی عام بول چال کی زبان سندھی ہے۔ اردو بھی عام سمجھی جاتی ہے۔ کراچی سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ صرف کراچی کی آبادی تقریباً ۴۵ لاکھ ہے۔ کراچی شہر ساحل سمندر پر واقع ہے اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ صوبائی دارالحکومت کا درجہ بھی اسی شہر کو حاصل ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بیشتر مہاجرین کراچی حیدرآباد اور سکھر میں آکر آباد ہو گئے۔ اس کے علاوہ ملحقہ صوبوں، پنجاب، سرحد اور بلوچستان سے اب بھی آبادکار سندھ جا کر آباد ہو رہے ہیں۔ سندھ پاکستان کا دوسرا بڑا صوبہ ہے۔

ایک اشعری فقیہ۔ ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن عمر بن شعیب تلمسان کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس نے اسلامی علوم، ریاضی اور علم ہیئت کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی جن میں اس کے اپنے والد ابو یعقوب یوسف، التلالی، ابو عبداللہ الحباک، ابو الحسن القلصادی، ابن مرزوق اور قاسم العقبانی ہیں۔ سنوسی کے بارے میں مشہور ہے کہ تحصیلِ علم کی غرض سے وہ الجزائر بھی گیا تھا جہاں اس نے عبدالرحمن الثعالبی سے علم حاصل کیا۔ مغرب کے بیشتر علماء اسے نویں صدی ہجری کا مجدد اور عالم تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کے تفقہ، زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ سنوسی کے شاگردوں میں ابن الحاج الیبدری، ابن العباس الصغیر، ابن صعد اور ابو القاسم الزوادی شامل ہیں۔

سنوسی نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کتابیں شمالی افریقہ میں بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:

(۱) "عقیدۃ اھل التوحید المخرجۃ من ظلمۃ الجھل و ربقۃ التقلید" یا "العقیدۃ الکبریٰ"۔ (۲) "عمدۃ اھل التوفیق والتسدید" یہ کتاب پہلی کتاب کی شرح ہے۔ (۳) "عقیدہ اھل التوحید الصغریٰ" یا "اُم البراھین" اس کتاب کو عرفِ عام میں "سنوسیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ (۴) شرح علیٰ اُم البراھین در کتاب خانۂ ملی۔ (۵) "السنوسیۃ الوسطیٰ یا العقیدہ الوسطیٰ"۔ سنوسی نے ان کے علاوہ اور بھی بیسیوں کتابیں تصنیف کی ہیں۔

سنوسی ادریس

سید محمد بن علی السنوسی المجاہری الحسنی الادریسی۔ آپ دینی اور فوجی جماعت سنوسیہ کے بانی تھے۔ آپ ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱ء میں الجزائر کے شہر مستغانم کے قریب ترش میں پیدا ہوئے۔ آپ زیانی بربر نسل کے خطاطیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے ابتدائی تعلیم الوت میں پائی۔ بعد میں ۱۸۲۱ء تک فاس میں تفسیر القرآن حدیث اور اصولِ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ تیونس اور قاہرہ سے ہوتے ہوئے مکہ پہنچ گئے، جہاں سب سے پہلے فریضۂ حج ادا کیا۔ آپ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۳ء تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔ یہاں قیام کے دوران میں ادریسیہ سلسلے کے بانی احمد بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اجازۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ ۱۸۳۷ء میں آپ نے ابو قیس پر اپنے سلسلے کا پہلا زاویہ قائم کیا۔ اس کے بعد آپ نے رفاعہ کے زاویے کی بنیاد رکھی۔ پھر درنہ کے قریب البیضا کے زاویے کی، اس کے بعد آپ نے تمسہ اور آخر میں جغبوب میں زاویے قائم کیے۔ یہ زاویے دینی اور اجتماعی مرکز ہوتے تھے جہاں آس پاس کی آبادی کے بچوں کو قرآن مجید اور معمولی پڑھائی لکھائی کے علاوہ زراعت و باغبانی، کپڑا سازی، معماری اور نجاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان بچوں میں جذبہ جہاد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا تھا۔ ان زاویوں میں اساتذہ اور متعلمین اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے بھی کوشش کرتے رہتے تھے۔

آپ کی وفات ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء کو ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے جن میں سے بڑا بیٹا آپ کا جانشین بنا جس کا نام سید محمد المہدی تھا اور دوسرے کا نام سید محمد شریف تھا۔

سنوسی اگرچہ مالکی مذہب کے مقلد تھے لیکن اجتہاد کے بھی داعی تھے۔ آپ

Marfat.com

کی دعوت کا ہوا اور تصنیف طلبہ میں قرآن مجید اور حنفیہ نحوی پڑھتا تھا۔ آپ ابن تیمیہ اور الغزالی کے افکار سے بھی متاثر تھے۔ آپ کی کتابوں میں " الدرر السنیۃ فی اخبار السلالۃ الادریسیۃ " " الشموس الشارقۃ من اسانید المغاربۃ المشارقۃ " " کتاب المسائل العشر المسمی بغیۃ المقاصد فی خلاصۃ المراصد " " السلسبیل المعین فی الطرائق الاربعین " اور " ایقاظ الوسنان فی العمل بالحدیث و القرآن " شامل ہیں ۔

سنوسی تحریک

شمالی افریقہ میں چلائی گئی ایک مذہبی تحریک ۔ اس کا بنیادی مقصد سنت نبویؐ اور شریعت پہ عمل کرانا تھا ۔ اس تحریک کی ابتداء سید محمد بن علی سنوسی نے کی تھی جو اٹھارھویں صدی میں الجزائر کے ایک چھوٹے سے قصبے سنوس میں پیدا ہوئے تھے۔ سنوسی تحریک کے عقائد نہایت سادہ اور اصلاحی تھے ۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ظاہر و باطن میں یکسانیت پیدا کرنا اور ہر انسان کو بلا امتیاز مذہب اپنا بھائی سمجھنا اس تحریک کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا ۔ سنوسی تحریک کو منظم طریقے پہ چلانے کے لیے جگہ جگہ تربیت گاہیں بنائی گئی تھیں جہاں پہ لوگوں کو عبادت ، مذہبی تعلیم اور فن حرب سکھلائے جاتے تھے ۔ آہستہ آہستہ ان تربیت گاہوں نے عوام میں خاصی مقبولیت حاصل کر لی تھی ۔ اس کے علاوہ اس تحریک کے ، نجد میں چلائی جانے والی " وہابی تحریک " سے بھی اچھے تعلقات استوار تھے ۔ سنوسی تحریک کے پیروکار ، اسلامی ممالک میں یورپی اقتدار کے سخت مخالف تھے ۔ اسی کے باعث اس تحریک کو بیشتر اسلامی ممالک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ۔ ۱۸۶۰ء میں اس تحریک کے بانی کا انتقال ہو گیا جس کے بعد احمد الشریف ان کے جانشین بنے ۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر اب تک مراکش اور سوڈان سے جتنی بھی تحریکیں اٹھیں اُن سب پہ سنوسی تحریک کا اثر موجود تھا ۔ جنگِ طرابلس ۱۲-۱۹۱۱ء میں سنوسیوں نے ترکوں کے ساتھ مل کر اٹلی کی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا اور پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں انہوں نے تمام طرابلس پر قبضہ کر لیا ۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں مسولینی نے سنوسیوں کو کچلنے کی مہم شروع کر دی اور اس طرح ۱۹۲۷ء تک سنوسی تحریک کو عارضی طور پہ کچل دیا گیا ۔ سنوسی تحریک کے مرکز کفرہ میں اٹلی کی فوجیں ۱۹، جنوری ۱۹۳۱ء کو داخل ہو گئیں ۔ یہاں انہوں نے مذہبی راہنماؤں اور تحریک کے دوسرے لوگوں کو سخت سزائیں دیں ۔ لیکن سنوسی تحریک کو مکمل طور پہ نیست و نابود نہ کر سکے ۔ دوسری جنگِ عالمگیر میں سنوسی تحریک کے راہنماؤں نے اتحادی فوجوں کا ساتھ دیا ۔ اسی لیے جنگ کے اختتام پہ طرابلس میں سنوسیوں کے راہنما شیخ سنوسی کے ماتحت ایک خود مختار حکومت قائم کر دی گئی ؛

سُنی

سنّت رسولؐ اور اجماعِ امّت کرنے والے مسلمانوں کا گروہ سنّی کہلاتا ہے ۔ سنّی مسلمان عام طور پہ ان چار اماموں کے پیروکار اور مقلد ہوتے ہیں ۔ (۱) امام ابو حنیفہؒ (۲) امام مالکؒ (۳) امام شافعیؒ (۴) امام احمد بن حنبلؒ ۔

سنّی عقیدے کے افراد چاروں خلفائے راشدین کو ترتیب وار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جائز جانشین مانتے ہیں جن کی ترتیب یہ ہے : حضرت ابوبکر صدیقؓ ، حضرت عمرؓ ابن الخطاب ، (۳) حضرت عثمانؓ غنی اور حضرت علیؓ ۔ ان چاروں خلفاء کے دور کو اسلامی دورِ حکومت بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ آج کل تمام دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت سنّی عقیدے سے تعلق رکھتی ہے ؛

سواد

عراق کا ایک نام ۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ لفظ عراق (عربی میں) پہلوی زبان سے مستعار ہے ۔ عربی فتوحات کے مؤرخ عراق کے لیے سواد کا لفظ اس کی سیاسی تقسیم مراد لیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

اس کے علاوہ محاصل پہ مخصوص کتابوں اور سیاسی رسائل کے مصنفین (دیکھئے ابو یوسف ، یحییٰ بن آدم ، قدامتہ ، الماوردی ، نیز ابن خلدون) ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے کے پیمائشِ اراضی و مال گزاری کے قواعد و ضوابط میں لفظ سواد سرکاری طور پہ استعمال ہوتا تھا ۔

یہ لفظ یا نام کسی ضلعے کے اندر مزروعہ علاقے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ مثلاً سواد العراق ، سواد خوزستان ، سواد الاُردن ۔

ایک اور معنی میں اس سے مراد شہر کے نام سے پہلے شہر کے وہ کھیت ہوتے ہیں جن کی باقاعدہ آب پاشی کی جائے ۔ مثلاً سواد بصرہ ، کوفہ ، واسط ، بغداد ، بخارا وغیرہ ۔؛

سُود

وہ رقم جو ادھار پہ دیئے ہوئے روپے کے صلے میں مقررہ وقفوں کے بعد واجب ادا ہوتی ہے ۔ سود مقررہ فیصد سالانہ کے حساب سے لگایا جاتا ہے ۔ روپیہ جو قرض دیا جاتا ہے اصل زر کہلاتا ہے ۔ اگر واجب الادا ہونے پہ سود ادا کیا جائے اور سود پہ سود نہ لیا جائے تو اسے سود مفرد کہتے ہیں ۔ اگر سود کو ہر مرتبہ جبکہ وہ واجب الادا ہو اصل زر میں شامل کر دیا جائے تو اسے سود مرکب یا سود در سود کہتے ہیں ۔

عربی میں یہ لفظ " ربٰو " ہے اور اس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باولا کر دیا ہو اور اس میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ۔

اسی سورہ میں آگے ذکر ہے کہ " اے لوگو ! جو ایمان لائے ہو ، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پہ باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے ۔ اب بھی توبہ کر لو اور سود چھوڑ دو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو ۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پہ ظلم کیا جائے ۔ تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے ۔"

سورہ بقرہ میں ہے کہ جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خوری سے باز آ جائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اس حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے ۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا ۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے ۔ نہ کسی ناشکرے بداعمال انسان کو پسند نہیں کرتا ؛

Marfat.com

سودہؓ، اُم المومنین

اُم المومنین۔ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری بیوی۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے بعد اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پہلے کاشانہ نبویؐ میں آئیں۔ حضرت سودہ بنت زمعہ کا خاندان عامر بن لؤی کے بیٹے حسل سے چلا۔ عامر، کعب کے بھائی تھے۔ کعب بن لؤی آنحضورؐ کے جد اعلیٰ تھے۔ حضرت سودہؓ کا نکاح سب سے پہلے السکرانؓ بن عمرو سے ہوا۔ آپ ان کے ساتھ مسلمان بھی ہوئی تھیں۔ اسلام لانے کے بعد السکرانؓ کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کی۔ بعد میں وہ دوبارہ مکے چلے گئے لیکن مکہ جانے کے بعد السکرانؓ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت سودہؓ حضورؐ کی نبوت کے دسویں سال، حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے عقد میں آئیں۔

حضرت خدیجہؓ کا انتقال ۱۰ رمضان ۱۰ نبوی کو ہوا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد بچوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے حضرت خولہؓ بنت حکیم نے حضورؐ کو مشورہ دیا کہ آپ حضرت سودہؓ بنت زمعہ کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ جب تمام مراحل طے ہوئے تو حضورؐ ان کے گھر خود تشریف لے گئے۔ حضرت سودہؓ کے والد نے آپؐ کے ساتھ نکاح پڑھا دیا اور بچوں کی نگرانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی کے لیے فوراً ہی رخصت بھی کر دیا

حضرت سودہؓ کو تقریباً ساڑھے بارہ سال تک آپؐ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد تقریباً گیارہ سال تک حیات رہیں۔ آپ کی تاریخ وفات ۵۴ھ ہے۔

حضرت سودہؓ کے پہلے شوہر سکرانؓ سے ان کے ہاں ایک صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے جنگ جلولا میں شہادت پائی۔ حضرت سودہؓ کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت سودہؓ میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف کے طور پر نظر آتی ہے۔ ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آپ کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی جس میں درہم تھے۔ آپ نے لانے والے سے سوال کیا کہ "اس میں کیا ہے؟" لانے والے نے جواب دیا کہ "درہم"۔ آپ نے فوراً کہا: "کھجور کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں؟" اس کے بعد کنیز کو حکم دیا کہ ان تمام درہموں کو اہل حاجت میں تقسیم کر دیا جائے۔" (ابن سعد) آپ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ طائف کی کھالیں بناتی تھیں اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی تھی اسے نہایت فیاضی کے ساتھ نیک کاموں میں خرچ کیا کرتی تھیں۔ (الاصابہ)

آپ کے اخلاق کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ "سودہؓ کے سوا کسی عورت کو دیکھ کر مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ اس کے قالب میں میری روح ہوتی۔" (ابن سعد)

سوڈان

افریقہ کا ایک آزاد ملک۔ سوڈان کو ۱۹۵۶ء میں آزادی ملی۔ وہاں پر جمہوری نظام رائج ہے۔ برطانیہ اور مصر کی مشترکہ عملداری ۱۹۵۶ء میں ہی ختم ہوگئی تھی۔ وہاں پر آجکل دس افراد پر مشتمل ایک انقلابی کونسل قائم ہے جو صدر نمیری کی نگرانی میں ملک کا انتظام و انصرام چلا رہی ہے۔ سوڈان کا کل رقبہ نو لاکھ سڑسٹھ ہزار پانچ سو مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ آبادی کی اکثریت یعنی ۳/۴ حصہ مسلمان ہے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر عرب اور نوبی نسل سے تعلق رکھتے ہیں [illegible] میں نیلی اور زندگی نسل کے قبائل رہتے ہیں۔

اس ملک کا دارالحکومت خرطوم ہے جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ سوڈان کے دوسرے بڑے بڑے شہر اور ان کی آبادی مندرجہ ذیل ہے:

(۱) اُم درمان۔ ۰۰۰،۱۸۵ تقریباً (۲) خرطوم شمالی۔ ۰۰۰،۹۲ تقریباً

(۳) پورٹ سوڈان۔ ۰۰۰،۶۰ تقریباً (۴) اتبرا۔ ۰۰۰،۵۰ تقریباً

(۵) کوستی۔ ۰۰۰،۳۵ تقریباً

سوڈان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ زرعی پیداوار میں لمبے ریشے کی کپاس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے ذریعے کافی زرمبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ کپاس کے علاوہ کھجوریں، تیل اور کھالیں بھی دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں۔

سوڈان میں رسل و رسائل کا نظام بہت عمدہ ہے۔ جا بجا سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ دور دراز کے تمام علاقوں کو ریلوے لائن کے ذریعے خرطوم سے ملا دیا گیا ہے۔ ہوائی سروس بھی نہایت موثر ہے۔

سوڈان میں خرطوم یونیورسٹی موجود ہے جس میں تقریباً چار ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں اس کے علاوہ کتنے ہی دینی مدارس ہیں۔ پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس بھی سوڈان کے دارالحکومت خرطوم میں ہی منعقد ہوئی تھی۔

سورت

قرآن مجید کے مختلف ابواب۔ سورت کے معنی ایک قطعہ کے ہیں۔ اس لیے سورت القرآن کا مطلب ہوا کہ قرآن مجید کا ایک ٹکڑا۔ سورت قرآن مجید کی آیات کے ایک ایسے مجموعہ کو کہا جاتا ہے جس کا آغاز اور انجام ہو اور وحی الٰہی کی بنا پر یا رسولِ خدا کے حکم سے دیگر آیات سے الگ کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں کچھ سورتیں ایسی ہیں جو کہ میں نازل ہوئیں اور کچھ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔

قرآن مجید میں مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں لفظ سورت کا مفہوم بیان ہوا ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ کا مفہوم وحی کے وہ مختلف اجزا ہیں جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے۔ سورۃ البقرہ کی تیئیسویں آیت میں آپؐ کے مخالفین کو دعوت دی گئی کہ وہ ان سورتوں جیسی ایک سورت ہی بنا لائیں۔ "اور (دیکھو) اگر تمہیں اس (کلام) کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا ہے تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ۔" (البقرہ: ۲۳)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی رسولِ خدا) نے اللہ کے نام پر یہ افترا کیا ہے؟ تم کہو "اگر تم اپنے قول میں سچے ہو (اور اگر ایک آدمی اپنے جی سے گھڑ کر ایسا کلام بنا سکتا ہے) تو قرآن کی مانند ایک سورت ہی بنا کر تم پیش کر دو۔ (یونس: ۳۸)

اسی طرح ایک اور جگہ آیا ہے کہ "یہ سورت ہے کہ ہم نے اسے اتارا ہے اور اسے فرض کر دیا ہے اور اس میں اپنی نشانیاں اتار دی ہیں۔" (النور: ۱)

قرآن مجید میں کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ جن میں سب سے پہلی سورۃ "الفاتحہ" اور آخری "والناس" ہے۔ ان ایک سو چودہ سورتوں میں سے ہر ایک سوائے سورۃ توبہ کے بسم اللہ سے شروع ہوتی ہے جو پہلی سورت کے اختتام اور نئی سورت کے آغاز یعنی افتتاح کی علامت ہے۔ کسی بھی سورت کی کم سے کم آیات کی تعداد تین قرار دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں حضورؐ کی ایک حدیث کا حوالہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

سلم نے آپ نے فرمایا "مجھے اللہ تعالیٰ نے تورات کی جگہ السبع الطوال (البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور الکہف) زبور کی جگہ المئین (یعنی وہ سورتیں جن کی آیات سو یا سو سے زیادہ ہیں) اور انجیل کی جگہ المثانی (وہ چھوٹی سورتیں جن کی آیات سو سے کم ہیں) عطا کی ہیں۔ المفصل (چھوٹی سورتیں) عطا کر کے مجھے سب پر فضیلت دی گئی ہے۔"

اسی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف علماء نے قرآن مجید کی تمام سورتوں کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے لمبی سورتوں کو "الطوال" ان سے کم آیات والی سورتوں کو المئون، ان سے کم آیات والی کو المثانی (المثانی تمام قرآن مجید اور سورۃ الفاتحہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے) اور ان سے کم آیات والی کو المفصل کہا جاتا ہے۔

المفصل کے زمرے میں آنے والی سورتوں کو مزید تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ سورۃ النباء تک کو طوال مفصل کہا گیا ہے۔ الضحیٰ تک کی سورتیں اوساط مفصل قرار پائی ہیں اور الضحیٰ سے آخر تک والی سورتوں کو قصار مفصل کہتے ہیں۔ (دیکھیے بخاری اور کشاف اصطلاحات الفنون")

ہجرت سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں کو مکی اور ہجرت کے بعد نازل ہونے والی سورتوں کو مدنی سورتیں کہا جاتا ہے۔ جبکہ بعض مدنی سورتوں میں مکی آیات اور مکی سورتوں میں مدنی آیات بھی شامل ہیں۔ کہتے ہیں سب سے پہلی سورۃ العلق اور سب سے آخری سورت المطففین نازل ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مدنی سورتیں زیادہ تر لمبی ہیں اور مکی چھوٹی۔

سوری خاندان

افغانوں کا ایک قبیلہ۔ جس کے ایک شخص فرید ملقب بہ شیر شاہ سوری نے ہندوستان پر حکومت بھی کی۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سور اپنا سلسلۂ نسب شنسبانیان غور سے ملاتے ہیں۔ لیکن عام لوگ اس شجرہ کو فرضی خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ شجرہ شیر شاہ سوری کی خوشنودی کے لیے بنایا گیا ہو۔

سوری خاندان کے لوگ اصل میں لودھیوں کے ایک قبیلے کی شاخ ہیں۔ جس سے بہلول لودھی اور اس کے دو جانشین تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک محقق سر جن جنرل بلیو (BELLEW) نے تحقیق کی ہے وہ کہتا ہے کہ لودھی قبیلے کی تین بڑی بڑی شاخیں ہیں: سیانی، نیازی اور دوتانی۔ سیانی شاخ مزید دو شاخوں پرنگی اور اسمٰعیل میں بٹی ہوئی ہے۔ اسمٰعیل پھر تین شاخوں میں بٹ جاتی ہے: سور، لوہانی، اور میہال۔

جب بہلول لودھی ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اس کے دور میں بہت سے افغانی قبیلے یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ اسی دوران میں ابراہیم خان سور کی قیادت میں ایک جماعت بھی یہاں آ کر آباد ہو گئی۔ ابراہیم خان سور کو حصار، فیروزہ اور نارنول کے اضلاع میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر بھی متعین کیا گیا۔

ابراہیم خان سور کے چار بیٹے تھے۔ حسن، احمد، محمد اور غازی۔ حسن کے بھی چار بیٹے تھے۔ فرید، نظام، سلیمان اور احمد۔ فرید (شیر شاہ سوری) ہندوستان کا بادشاہ بھی بن گیا۔ سوری خاندان کا شجرہ نسب کچھ یوں ہے:۔

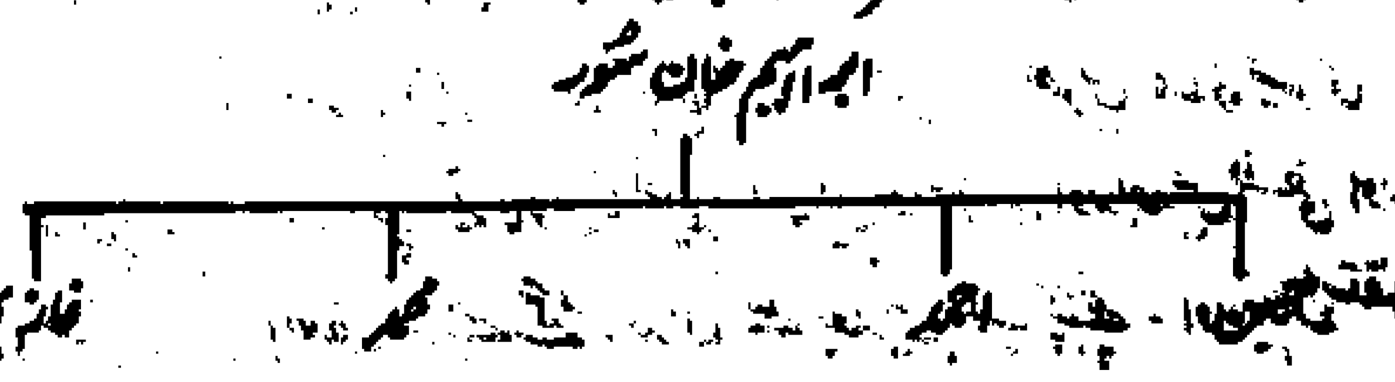

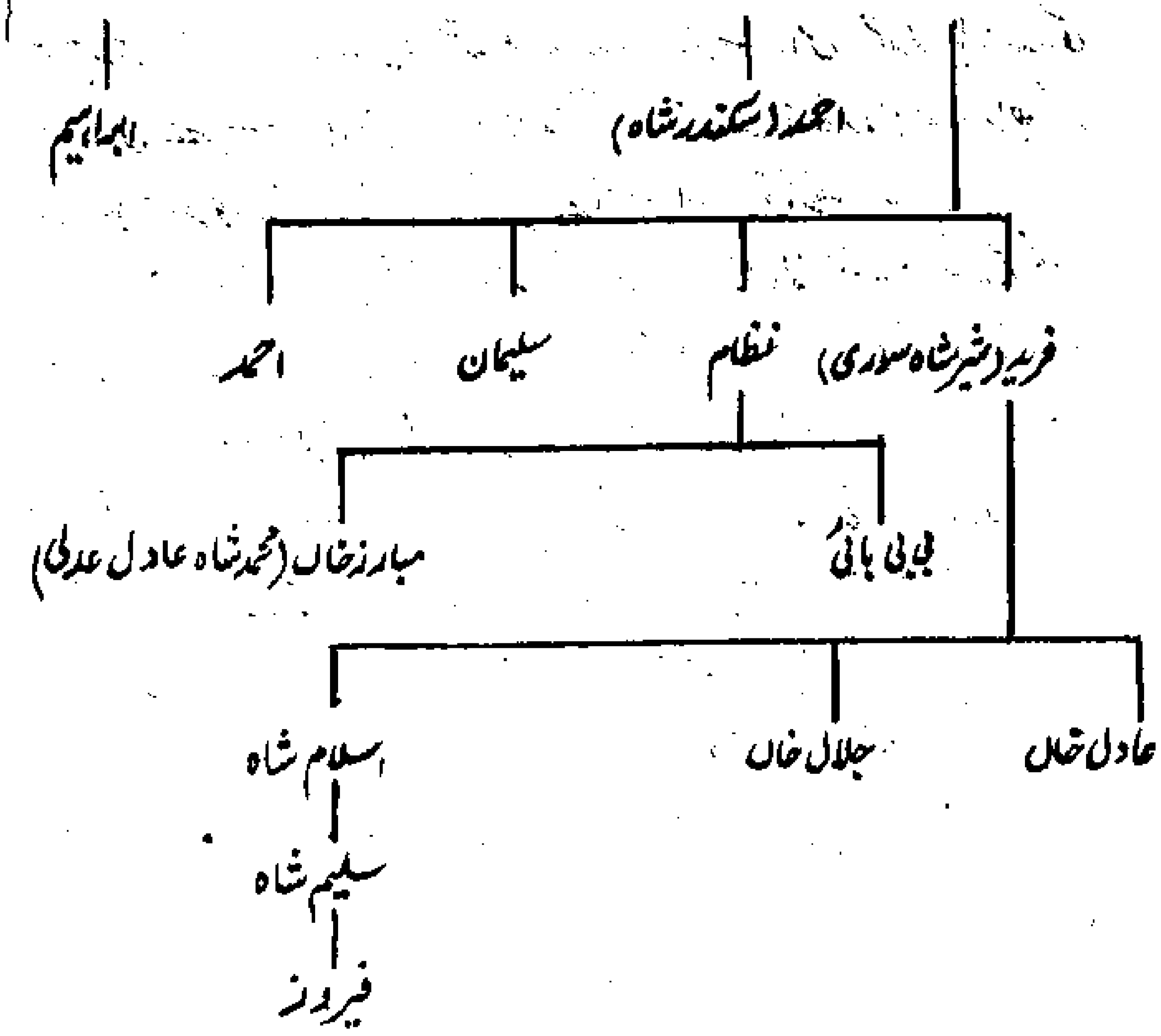

شیر شاہ سوری نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور کردار کی مضبوطی کے باعث افغانوں کی کمزوریوں اور علتوں کو سختی سے دبا دیا تھا۔ لیکن شیر کی موت کے بعد کوئی بھی ایسا باصلاحیت شخص نہیں تھا جو اس کا جانشین بنتا۔ شیر شاہ کا بیٹا جلال خاں اسلام شاہ یا سلیم شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا لیکن صحیح طرح سے حکومت نہ چلا سکا۔ تقریباً نو سال تک جلال خاں نے حکومت کی۔ اس کے بعد سلیم شاہ کا نو عمر بیٹا فیروز تخت پر بیٹھا جو اپنے ماموں مبارز خاں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس وقت مبارز خاں محمد شاہ عادل کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں تین افراد اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھتے تھے۔ (۱) ابراہیم شاہ جس نے دہلی اور آگرے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ (۲) محمد شاہ عادل جو چنار کے علاقے پر قابض تھا اور (۳) احمد سور جس نے پنجاب کے علاقے میں سکندر شاہ کے لقب سے حکومت چلا رکھی تھی۔ اس نے ابراہیم کو دہلی اور آگرے سے لڑائی کے بعد نکال باہر کیا تھا۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے ان سب کو تخت سے محروم کر دیا۔

سومنات

ریاست جوناگڑھ واقع گجرات کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے ایک مشہور شہر۔ سومنات کے مندر میں چاند دیوتا کا ایک قوی ہیکل بت رکھا تھا۔ ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے اس بت سے عقیدت رکھتے تھے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے موقع پر یہاں ایک زبردست میلہ لگتا اور سونا چاندی، ہیرے جواہرات اس بت کی خاطر نذر کیے جاتے تھے۔ مندر کے مصارف پورے کرنے کے لیے مختلف راجاؤں نے دس ہزار گاؤں وقف کر رکھے تھے۔

سلطان محمود غزنوی جب ہندوستان کے مختلف مقامات فتح کر رہا تھا۔ بت پرستوں کا خیال یہ تھا کہ ان پر عتاب سومنات کی ناراضی کے باعث ہوا ہے۔ سلطان کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے بت کو توڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا تاکہ لوگوں کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے لیکن طویل صحرائی سفر کا انتظام کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پھر سومنات پر حملہ کرنا پورے ہندوستان کے خلاف اعلان جنگ کرنا تھا۔ مگر محمود نے ان تمام مشکلات پر فتح پائی اور تیس ہزار بہادر سپاہیوں کے ہمراہ غزنوی سے روانہ ہوا اور سومنات پہنچ گیا۔ سومنات کے لیے ہندو راجاؤں کا ایک لشکر جرار

Marfat.com

موجود تھا۔ مگر محمود نے نہایت شجاعت اور بہادری سے اس پر حملہ کر دیا۔ مندر کی فصیلوں سے ہونے والی تیر اندازی اور مختلف سمتوں سے آنے والی ہندو راجاؤں کی مسلسل عسکری امداد نے بھی اس کے پائے استقلال کو ڈگمگانے نہ دیا۔

نہایت گھمسان کی خونریز جنگ کے بعد ہندوؤں کو شکست دے کر محمود غزنوی مندر کے اندر داخل ہو گیا۔ پجاریوں اور دیگر ہندو راجاؤں نے محمود سے التجا کی کہ وہ اس بت کو نہ توڑے بلکہ اس کی منہ مانگی قیمت لے کر اس سے باز آ جائے لیکن اس موقع پر محمود نے جو الفاظ کہے وہ تاریخ کا ورثہ ہیں۔ اس نے کہا میں تاریخ میں اپنا نام بت فروش کی حیثیت سے نہیں بلکہ بت شکن کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں چنانچہ اس نے اپنا گرز مار کر اس بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس بت کے اندر محفوظ اس قدر دولت نکلی جو سلطان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس طرح محمود کو اپنی دیانت اور دینداری کا صلہ مل گیا۔

سونا

قیمتی دھات کی ایک قسم۔ عموماً زیورات بنانے اور سکہ سازی کے کام آتی ہے اسلام میں ذاتی ملکیت کے سونے پر بیس مثقال یعنی ساڑھے سات تولہ یا بعض کے نزدیک پانچ تولہ ڈھائی ماشہ کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر کی خواتین سونے کے زیورات نہایت شوق سے استعمال کرتی ہیں۔ آنحضرتؐ نے مردوں کو سونے کی انگوٹھی یا اس کا کوئی اور زیور پہننے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ آپؐ نے انگوٹھی کو اس کے ہاتھ سے اتار لیا اور پھینک دیا۔ پھر فرمایا "تم میں سے کوئی دوزخ کی آگ کے انگارے کا ارادہ کرتا اور اس کو ہاتھ کی انگلی میں پہن لیتا۔" (مسلم)

سوید بن صامت

سوید بن صامت مدینہ کے عمائد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی اشرافت، شجاعت، اور ہمت کی وجہ سے اس کا لقب "کامل" پڑ گیا۔ ایک مرتبہ وہ مکہ کی زیارت کے لیے گیا تو وہاں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے دعوتِ اسلام دی۔

سوید نے حضورؐ سے کہا، "آپ کے پاس جو چیز ہے شاید ایسی ہی میرے پاس بھی ہے" رسول اللہ صلعم نے اس سے معلوم کیا کہ "بتاؤ وہ کونسی چیز ہے؟" سوید نے جواب دیا کہ "حکمت لقمان"۔ حضورؐ نے اس میں سے کچھ سنانے کو کہا۔ سوید نے لقمان کے چند مقولے سنائے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ "یہ واقعی بہت اچھی چیز ہے لیکن جو چیز میرے پاس ہے وہ اس سے بھی بہتر ہے۔ وہ قرآن حکیم ہے جو اللہ نے مجھ پر نازل کیا ہے، وہ ہدایت اور نور ہے۔" یہ کہہ کر حضورؐ نے کچھ قرآنی آیات سوید کو سنائیں اور پھر دعوتِ اسلام دی۔ قرآنی آیات سن لینے کے بعد سوید کہنے لگا کہ یہ کلام واقعتاً میرے کلام سے بہتر ہے۔" سوید بن صامت یہ کہتا ہوا چلا گیا لیکن باقاعدہ دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب خزرجیوں نے اسے قتل کیا تو اس وقت تک وہ مسلمان ہو چکا تھا۔

سویق، غزوہ

جَو کا آٹا (ستو)، گندم کا آٹا یا خشک میووں کا آٹا۔ اس کے علاوہ اس شوربے کو بھی سویق کہا جاتا ہے جو اس آٹے میں پانی ملا کر بنایا جائے۔ یا ہریرہ جس میں شہد، گھی یا شربت [illegible]

غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لیے ابوسفیان [illegible] سواروں کا ایک گروہ لے کر مدینہ منورہ کی جانب چل پڑا [illegible] کے ساتھ اس کی ایک معمولی سی جھڑپ بھی ہوئی۔ اس جھڑپ میں جب حضور [illegible] رفقاء سمیت مقابلے کے لیے آئے تو تمام کفار بھاگ نکلے اور بھاگتے وقت اپنا سامان خوراک جو ستو کی شکل میں تھا پھینک گئے۔ اس سویق کو مسلمانوں نے اٹھا لیا۔ اس واقعے کے باعث مختلف کتابوں میں اس جھڑپ کو غزوۂ سویق بھی لکھا جاتا ہے۔

سہارنپور

یو۔پی (بھارت) کا ایک شہر۔ اس شہر کی بنیاد محمد بن تغلق کے عہد میں ۱۳۴۰ء میں رکھی گئی تھی۔ اس کا نام اسی علاقے میں رہنے والی مشہور ولی شاہ ہرن یا شاہ ہارون چشتی کے نام پر سہارنپور رکھ دیا گیا تھا۔ یہ اتر پردیش کا ایک ضلع بھی ہے۔ اس ضلع کا رقبہ ۲۲۲۸ مربع میل اور آبادی تقریباً ۱۸ لاکھ ہے۔ اس ضلع میں دریائے گنگا اور جمنا کا دوآبہ واقع ہے۔ شہر کی شمالی سرحد پر شوالک کی پہاڑیاں ہیں جن میں کئی پُرپیچ درّے موجود ہیں۔ یہاں پر زیادہ تر گندم، چاول، چنا، باجرہ، مکئی، جو، گنا اور کپاس کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ اصل شہر ایک نشیبی اور مرطوب جگہ پر دمرم نالہ ندی کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔

یہاں ایک درسگاہ مدرسہ مظاہر العلوم واقع ہے جو علوم عربیہ کے بارے میں بہت مشہور ہے۔ اس درسگاہ میں ہر سال ایک ہزار کے لگ بھگ طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مولانا خلیل احمدؒ سہارنپوری، مولانا ظفر احمد تھانوی اور مولانا محمد زکریا کاندھلوی اسی درسگاہ سے متعلق رہے تھے۔ لیکن اب ان کی سیاسی اہمیت زوال پذیر ہے۔

سہروردی

شہاب الدین، ابوحفص عمر ابن عبداللہ۔ ایک صوفی بزرگ۔ آپ شافعی المذہب کے عالم دین مانے جاتے ہیں۔ ۵۳۹ھ/۱۱۴۵ء میں ایران کے صوبہ جبال کے ایک مقام سہرورد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تصوف کی ابتدائی تعلیم اپنے چچا ابوالنجیب اور مشہور صوفی بزرگ عبدالقادر جیلانیؒ سے حاصل کی۔ آپ زیادہ عرصے تک بغداد میں مقیم رہے۔ شیخ سعدیؒ نے شہاب الدین سہروردی سے تعلیم حاصل کی چنانچہ انہوں نے بوستانِ سعدی میں ایک حکایت ان سے منسوب کر کے بھی لکھی ہے۔ سہروردی نے کئی بار حج بھی کیا تھا۔ آپ سب سے زیادہ راسخ الاعتقاد صوفیوں کے نمائندہ مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے "عوارف المعارف" اور "القصائح الایمانیہ وکشف الفضائح الیونانیہ" ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر علم الاخلاق اور عملی تصوف پر لکھی گئی ہیں۔ آپ کا ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں انتقال ہو گیا۔ آپ نے طویل عمر پائی۔

سہروردی

شہاب الدین یحییٰ بن حبش بن امیرک۔ ایک فلسفی اور صوفی بزرگ۔ آپ کی درست تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ آپ بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قانون کی تعلیم مراغہ میں حاصل کی اور بعد میں فلسفی اور صوفی کی حیثیت سے اصفہان چلے گئے۔ جہاں سے بعد میں حلب پہنچے۔ اور یہاں مستقل

Marfat.com

معرفت اختیار کرلی۔ ابتدا میں حلب کے والی نے آپ کے صوفیانہ عقائد کی سرپرستی کی لیکن اس زمانے کے بعض دوسرے علماء نے ان کے عقائد کو درست ماننے سے انکار کر دیا اور آپ کو بدعتی قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا۔ کیونکہ ان کے بقول سہروردی کے ان خیالات و تصورات کے پیچھے ایک عقیدہ وہ سارا متصوفانہ فلسفہ موجود ہے جو اسلام نے دوسرے نظریہ تطبیق معتقدات اور اتحادِ مذاہب سے اخذ کیا تھا۔ علماء کہتے تھے کہ اسلام میں اتحادِ مذاہب کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس اتحادِ مذہب کا تصور موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور ازل سے ہے۔ اور اس کی آخری صورت وہ ہے جو نبی کریم آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کی صورت میں نازل ہوئی۔ اس میں اسلامی تعلیم سے قریب ترین یہود و نصاریٰ ہیں لیکن اسلام مکمل آجانے کی صورت میں یہ شریعتیں منسوخ قرار پا چکی ہیں۔ اسی لیے اتحادِ مذاہب کا عقیدہ باطل ہے اور صرف اتحادِ مذہب کا عقیدہ درست ہے۔

ان علماء کے مطالبہ کرنے پر والیٔ حلب الملک الظاہر ابنِ صلاح الدین نے سہروردی کو قید کرکے قتل کرا دیا۔ اس وقت سہروردی کی عمر تقریباً ۳۶ یا ۳۸ سال تھی۔

سہروردی ابونجیب

چھٹی صدی کے ایک صوفی، بزرگ۔ آپ صفر ۴۹۰ھ کو سہرورد نام کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ جوانی کے زمانہ میں آپ بغداد چلے گئے جہاں آپ نے جامعہ نظامیہ میں علم حاصل کیا۔ آپ نے امام اسعد میہنی سے فقہ، اصولِ فقہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے علاوہ امام بیہقیؒ، خطیب بغدادیؒ، اور امام قشیریؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ کو حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا "سفینۃ الاولیا" کے مطابق آپ نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے خرقہ بھی حاصل کیا تھا۔

آپ علوم ظاہری حاصل کر لینے کے بعد علوم باطنی کی جانب بھی متوجہ ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑ کر درویشوں کی صحبت میں شامل ہو گئے۔ کتنے ہی چلے اور مجاہدے کیے۔ حضرت احمد غزالیؒ کی صحبت میں رہ کر بھی سلوک کی منزلیں طے کیں۔ آپ کا فیض صرف عالموں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بعض مقتدر افراد اور یہاں تک کہ خلیفۂ وقت تک آپ کے معتقد تھے۔

آپ کی وفات ۵۶۳ھ کو بغداد میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر بہتر[۷۲] سال تھی۔

سہروردی بہاؤالدین ذکریہ

حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ کے آب و جد مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ملتان آکر آباد ہو گئے۔ بہاؤالدین ذکریاؒ کے سنِ پیدائش کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ آپ ۵۶۵ھ یا ۵۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام وجیہہ الدین تھا جب ذکریاؒ کی عمر بارہ سال ہوئی تو آپ کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ نے قرآن پاک حفظ کیا اور پھر مزید تعلیم کے حصول کے لیے خراسان چلے گئے جہاں سات سال تک بزرگوں سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیا۔ خراساں سے بخارا گئے۔ جہاں مزید علم حاصل کیا۔ آپ کے اوصافِ حمیدہ کے باعث اہلِ بخارا بہاؤالدین فرشتہ کہنے لگے تھے۔ آٹھ سال تک بخارا میں رہنے کے بعد آپ حج کے لیے مکہ گئے وہاں سے روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے مدینہ چلے گئے جہاں پانچ سال رہے۔ مدینہ میں رہائش کے دوران میں آپ نے مولانا کمال الدین محمد جیسے جلیل القدر محدث سے حدیث پڑھی۔ آپ نے روضۂ اقدس کے نزدیک تزکیۂ قلب اور تصفیہ باطن کے لیے مجاہدہ بھی شروع کیا۔ بعد میں یہاں سے بیت المقدس پہنچے اور وہاں سے بغداد چلے گئے۔ یہاں آپ نے شہاب الدین سہروردی کی صحبت سے کسبِ فیض کیا۔ اور خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ آپ اپنے مرشد شہاب الدین کے پاس صرف سترہ دن رہے تھے۔ خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان آگئے اور یہاں اپنے رشد و ہدایت کا فیض جاری کیا۔ حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ سہروردی بابا گنج شکرؒ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ذکریاؒ اور گنج شکرؒ خالہ زاد بھائی تھے۔

حضرت بہاؤالدین ذکریا کے سنِ وفات میں بھی علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اخبار الاخیار میں آپ کی وفات کا سال ۶۶۱ھ درج ہے جبکہ سفینۃ الاولیا اور تاریخ فرشتہ میں ۶۶۶ھ درج ہے۔ آپ کا مزار ملتان میں ہے جہاں ہزاروں مرید باصفا ہر سال اکٹھے ہوتے ہیں۔

حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ کی کسی تصنیف کا علم نہیں اور نہ ہی ملفوظات کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن آپ نے جو خطوط اپنے مریدوں کو لکھے تھے۔ ان کے اقتباسات کو اخبار الاخیار میں درج کر دیا گیا ہے۔ ان اقتباسات سے آپ کی صوفیانہ تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے۔

سہل التستری

ایک سُنی متکلم اور صوفی۔ ابو محمد سہل بن عبداللہ بن یونس۔ ۲۰۳ھ/۸۱۸ء میں تستر (آہوانہ) میں پیدا ہوئے۔ ابنِ خلکان کو اس تاریخ پیدائش سے اختلاف ہے وہ پیدائش کا سال ۲۰۰ھ/۸۱۵ء بتاتا ہے۔

سہل الثوری اور ابو عمرو بن العلاء جیسے سُنی عالموں کے شاگرد تھے۔ آپ زہد و تقشف میں بڑے کڑے ضابطۂ اخلاق کے پابند تھے۔ اسی لیے علمائے متکلمین میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔ آہوانہ کے علماء نے آپ کے "رسالہ عقائد" کی جو فرضیتِ توبہ سے متعلق تھا، شدید مذمت کی جس کے باعث انہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی۔ سہل نے خود کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ان کے شاگرد محمد بن سالم نے "ایک ہزار ملفوظات" مرتب کیے ہیں۔ آپ کے عقائد میں بہت تسلسل اور باہمی ربط موجود تھا۔ اسی لیے ان کے باعث ایک الگ مذہب، سالمیہ وجود میں آگیا۔ سالمیہ مذہب کی بیشتر خصوصیات سہل کے عقائد سے ہی ماخذ ہیں۔

سہل التستری کا ایک قول ہے کہ "ہمارے سات اصول ہیں (۱) کتاب اللہ سے تمسک، (۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء، (۳) اکل حلال، (۴) کسی کو تکلیف و اذیت دینے سے بچنا، (۵) گناہوں سے اجتناب، (۶) توبہ، (۷) ادائے حقوق۔"

ان کا ایک اور قول بھی کافی مشہور ہے کہ "جو دل آخرت کے ذکر سے خالی ہوگا اس میں شیطانی وسوسے گھر کر لیں گے۔"

سہل التستری کا انتقال جلاوطنی کی حالت میں ہی ۲۸۳ھ/۸۹۶ء میں بصرے میں ہوا۔

سہیلؓ بن حنیف

آپ کی کنیت ابوسعد تھی، ہجرت سے پہلے ہی آپ دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں آپ کو مدینہ کی امیری بھی ملی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کوفہ چلے گئے۔ جنگ جمل کے خاتمے کے بعد آپ بصرہ کے حاکم بھی مقرر ہوئے۔ جب جنگ صفین کا آغاز ہوا تو آپ حضرت

Marfat.com

علیؓ کی فوجوں کے ساتھ مل کر لڑے۔ لڑائی کے اختتام پر آپ دوبارہ کوفہ تشریف لے آئے۔ آپ ایک مرتبہ فارس کے حاکم بھی بنے۔ لیکن اہلِ فارس نے بغاوت کر دی۔ اور انہیں وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کے فارس سے نکل جانے کے بعد زیاد بن ابیہ کو وہاں کا حاکم بنا دیا گیا۔ سہیلؓ بن حنیف فارس سے نکل کر واپس کوفہ پہنچے۔ جہاں ۳۸ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ نہایت خوبصورت اور مناسب قد و قامت کے حامل شخص تھے کہ ہر کوئی انہیں دیکھ کر تعریفی کلمات کہے بغیر نہیں رہتا تھا۔ غزوۂ احد میں آپ ان چند جاں نثاروں میں شامل تھے جو میدانِ جنگ میں حضورؐ کی حفاظت کے لیے ثابت قدمی سے جمے رہے۔ آپ نہایت بہادر اور جری مجاہد تھے۔

سہیلؓ بن سعد

آپ کا اصل نام حزن تھا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے نام تبدیل کر کے سہیل رکھ دیا۔ آپ کی کنیت ابو مالک، ابو یحییٰ تھی اور قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام سعد بن مالک تھا جنہوں نے ہجرت سے قبل ہی سہیل بن سعد کے ہمراہ اسلام قبول کر لیا تھا۔ جنگ احد اور خندق کے وقت آپ کمسن تھے۔ اس لیے شریک نہ ہوئے۔ جب آپ کی عمر ۱۰ برس ہوئی تو حضورؐ کا وصال ہو گیا۔ آپ حضورؐ سے بہت محبت کرتے تھے۔ رسول اللہؐ خطبہ دیتے وقت کھڑے کھڑے تھک جایا کرتے تھے، سہیلؓ بن سعد کو جب اس بات کا علم ہوا تو فوراً جنگل سے ایک لکڑی کاٹ لائے اور ممبر کے پاس ستون کی مانند کھڑا کر دیا۔ تاکہ حضورؐ تھک جانے کی صورت میں اس لکڑی کا سہارا لے سکیں۔ آپ نے ۹۶ سال کی عمر پائی اور ۹۱ھ میں انتقال ہوا۔

۷۴ھ میں مدینہ کے گورنر حجاج بن یوسف نے دوسرے بزرگوں کے ساتھ ظلم و ستم کرتے وقت آپ کی گردن پر بھی اپنے ظلم کی مہر ثبت کر دی تھی۔ آپ نے ۱۸۸ احادیث بیان فرمائی ہیں جن میں سے ۲۸ پر تمام متفق ہیں۔

سہیلؓ بن عامر

حضورؐ کے ایک ممتاز صحابی۔ آپ کا پورا نام سہیل بن عامر بن سعد الانصاری ہے۔ آپ نے غزوہ بیر معونہ میں شرکت کی اور اسی غزوہ میں لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

سہیل بن عمرو

اسلام لانے سے پہلے آپ حضورؐ کے بدترین دشمن تھے۔ عام اجتماعات میں حضورؐ کے خلاف تقاریر کرتے تھے اور اسلام قبول کرنے والوں پر طرح طرح کے مظالم اور سختیاں کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ میں قریش کی جانب سے معاہدہ لکھنے پر مامور بھی ہوئے تھے۔ معاہدے میں لفظ "رسول" لکھنے پر بھی آپ نے ہی اعتراض کیا تھا آپ جنگِ حنین سے واپس آتے وقت جرانہ کے مقام پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے آپ نے رسولؐ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جنگِ یمامہ میں آپ کے بڑے بیٹے عبداللہ شہید ہوئے۔ آپ جنگ یرموک میں ایک دستے کے افسر بھی مقرر ہوئے۔ شام کی مہم کے دوران ہی ۱۸ھ کو آپ پر طاعون کا حملہ ہوا جس کے باعث آپ نے وفات پائی۔ آپ کے ایک اور بیٹے ابوجندلؓ نے بھی بطور ایک سپاہیٔ اسلام کے خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

[illegible]

[illegible]

اس فرقہ کی بنیاد سہل بن عبداللہ [illegible] محنت اور نفس کا جہاد ریاضت ہے۔ آپ کے [illegible] ایک مرید سے کہا کہ کوشش کر یہاں تک کہ [illegible] طرح دوسرے [illegible] ۔ جب [illegible] اب بات کو بھی شامل کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ [illegible] ہو گئی کہ اگر اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا تو خواب میں بھی اللہ اللہ کہتا۔ یہ اس کی اصلی عادت ہو گئی تھی۔ تب آپ نے اس سے کہا کہ اب اس سے باز آ جا [illegible] اللہ دوست کے خیال میں مشغول ہو جا۔ یہاں تک کہ اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ وہ تمام وقت اسی میں مستغرق رہنے [illegible]

اس فرقے کے لوگوں کا طریقہ درویشوں کی خدمت کرنا تھا۔ وہ جنیدیوں کی طرح [illegible] کی حرمت کرتے تھے اور باطن کا مراقبہ جنیدیوں کی طرح کرتے تھے۔ اس فرقے کے لوگوں کا خیال تھا کہ ریاضت و مجاہدہ سب کچھ نفس کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا۔ خاص طور پر جس کو نفس کی شناخت نہ ہو ریاضت اور مجاہدوں سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک نفس کی رہبری فقط خواہشات اور عقل کی تدبیر حق ہے۔ جبکہ خواہش کی تدبیر خطا۔ اس لیے حق کے طالب افراد کو ہمیشہ نفس کی مخالفت میں چلنا چاہیے۔ تاکہ اس کے خلاف روح و عقل کی مدد کر سکیں۔

سیالکوٹ

پاکستان کا ایک مشہور شہر، صوبہ پنجاب کا ضلع۔ اس ضلع کا کل رقبہ تقریباً ۲۰۶۰ مربع میل ہے۔ سیالکوٹ ضلع کی آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ سیالکوٹ کا اصل شہر سطح سمندر سے ۸۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ مشرق اور شمال کی جانب اس کی حدیں بھارت اور کشمیر سے جا ملتی ہیں۔ ضلع سیالکوٹ دریائے راوی اور چناب کے درمیانی علاقے میں واقع ہے۔ اس کا بالائی علاقہ بہت زرخیز ہے۔ یہاں پر سالانہ بارش کا اوسط ۲۶ انچ کے قریب ہے۔ گندم، چاول، جو، جوار اور گنے کی فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

صرف شہر سیالکوٹ کی آبادی ۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس شہر کا محلِ وقوع سیاسی اور فوجی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ شہر صنعت و حرفت کا بہت اہم مرکز بن چکا ہے اس شہر کا بنا ہوا کھیلوں کا سامان، آلاتِ جراحی اور آلاتِ موسیقی بہت مشہور ہیں۔ تمام دنیا میں ان چیزوں کی بہت مانگ ہے۔

اس شہر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی بنیاد راجہ سل (یا سلا) نے رکھی تھی۔ وہ پانڈوؤں کا ماموں تھا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ بھی بنوایا تھا اور اس بستی کا نام اپنے نام کی مناسبت سے سلکوٹ رکھ دیا تھا۔ بعد میں بکرماجیت کے عہد میں ایک اور ہندو راجہ سالی واہن نے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔

آجکل اس کے بارے میں ایک نیا نظریہ بھی سننے میں آتا ہے کہ سیالکوٹ ایک قدیم شہر "سکالا" کے کھنڈرات پر آباد ہے اور یہ کہ یونانی بادشاہوں کے زمانے میں یہ شہر ایوتھی ڈیمس (EUTHYDEMUS) خاندان کے بادشاہوں کا دارالحکومت بھی بنا رہا۔ لیکن بعد میں اس پر ہن قبائل نے اپنا قبضہ جما لیا۔

شہر سیالکوٹ میں ایک گوردوارہ "بابے کی بیری" کے نام سے مشہور ہے موجود ہے۔ یہاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشہور صوفی بزرگ حضرت امام علی الحق کا مزار

یہی یہاں موجود ہے جسے دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔

مغلوں کے زمانے میں سیالکوٹ شہر تمام ہندوستان کے علمی مرکزوں میں خاصا اہم مرکز شمار ہوتا تھا۔ پاکستان کے قومی شاعر حضرت علامہ اقبالؔ اور آجکل کے مشہور شاعر فیض احمد فیضؔ اسی شہر میں پیدا ہوئے۔

سیپارہ

ایک فارسی اصطلاح، جو قرآن مجید کے ایک مخصوص حصّے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ قرآن تیس مختلف حصّوں میں تقسیم ہے۔ ہر حصّہ سیپارہ کہلاتا ہے۔ ہر سیپارے میں مختلف تعداد میں آیات اور سورتیں ہوتی ہیں۔ تیس سیپارے اگر ایک ہی جلد میں جمع ہوں تو مکمل قرآن کی صورت میں ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہر سیپارہ اپنی جگہ قرآن کا ایک علیحدہ حصہ ہوتا ہے۔ خدا کے احکام میں قرآن کی سند کے لیے مسلمان عموماً سیپاروں کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ فلاں سیپارے میں یہ بات کہی گئی ہے۔ ہر سیپارے کا اپنا مخصوص نام ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سیپارہ قرآن کے کون سے حصّے پر مشتمل ہے۔

سیّد

سردار، حاکم، شہزادہ یا مالک جو اپنے اوصاف، املاک یا کسی اور وجہ سے ممتاز ہو۔ آخری معنی میں یہ لفظ تمام عالمِ اسلام میں بلاشرکتِ غیرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اولاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ دو جگہ استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ سورۂ آل عمران کی ۳۹ ویں آیت میں حضرت یحییٰؑ کے لیے اور دوسری جگہ سورۂ یوسف کی ۲۵ ویں آیت میں زلیخا کے شوہر کے لیے آیا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الاحزاب کی ۶۷ ویں آیت میں سیّد کی جمع سادۃ دینوی اور مذہبی گمراہ سرداروں کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ عرب کے باشندے لفظ سیّد کو انسانوں کے علاوہ جنّوں، حیوانوں اور بے جان چیزوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

سیرت

لفظ سیرۃ، سار یسیر سیراً مَسِیراً سے نکلا ہے۔ اس کے معنی ہیں، جانا، چلنا، طریقہ و مذہب، سنت، ہیئت، حالت، کردار، کہانی، پرانے لوگوں کے قصے اور واقعات کا بیان، بایوگرافی۔ لیکن سیرت کے اولین اصطلاحی معنی آنحضرتؐ کے مغازی اور سوانح حیات ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بمعنی ہیئت و حالت آیا ہے۔ ابتدا میں عرب کی عام روایت میں مغازی کا رواج ہُوا جن میں حضورؐ کی فتوحات اور معرکوں کا ذکر ہوتا تھا لیکن بعد از آں خلفائے راشدین نے سیرت میں ان پہلوؤں پر زور دیا جن کا تعلق شرعی احکامات سے تھا۔ چنانچہ اس لحاظ سے سیرت ابن ہشام غالباً پہلی کتاب ہے جسے مغازی سے ممتاز کیا جا سکے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ابن سعد نے اپنی تصنیف "طبقات" میں اس کا پہلے استعمال کیا۔ سیرت نگاری کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے آپؐ کی زندگی کو قابلِ تقلید مثالی زندگی قرار دیا۔ اسی وجہ سے امّت نے آپ کی زندگی کا ہر واقعہ اور ہر گوشۂ عمل کو محفوظ کرنے کا پورا اہتمام کیا۔ بقول شبلی مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے حالات و واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ کیے جا سکتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے افعال و اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار اشخاص کے نام اور حالات قلمبند کیے گئے۔ شپرنگر کی رائے میں نہ کوئی قوم دنیا میں گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال حدیث کے راویوں کے تراجم اور چھان بین) کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب فراہمیٔ معلومات کے وسائل کم سے کم اور مشکلات زیادہ سے زیادہ تھیں۔ حدیث و سیرت کے مواد کی فراہمی اور ان کی تنقید دنیا بھر میں بایوگرافی اور تاریخ کے فن کا محیرالعقول اور عقیدت و محبت کا ناقابلِ یقین کارنامہ ہے۔ دنیا کی ہر مہذب اور معزز زبان میں حضور اکرمؐ کی سیرت پر عقلی، فنی، علمی اور ادبی بنیادوں پر نہایت اعلیٰ تصانیف لکھی گئی ہیں۔

سیرین

حضرت سیرینؓ اور ان کی حقیقی بہن ماریہ قبطیہؓ مصر کے بادشاہ مقوقس نے تحفہ کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس بھیجا تھا۔ حضورؐ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ سے خود نکاح کر لیا تھا۔ جبکہ حضرت سیرینؓ کا نکاح حضورؐ کے صحابی اور شاعر حسانؓ بن ثابت سے ہوا۔ یہ دونوں بہنیں مذہباً نصرانی تھیں لیکن مدینہ آ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ ان کا بھائی مابور بھی مصر سے ان کے ساتھ آیا تھا۔ ابتدا میں وہ کافی عرصہ تک اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن بعد میں وہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔

سیاریہ

ایک فرقہ۔ سیاریہ فرقہ سے متعلق لوگ حضرت ابو العباسؒ سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ آپ مَرو میں امام تھے اور سب علوم کے عالم اور حضرت ابوبکر واسطیؒ کے ہم نشین تھے۔ آج بھی نسا اور مَرو میں آپ کے طبقہ کے بہت سے لوگ موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ آپ کے مذہب کے سوا کوئی اور مذہب تصوف میں اپنے حال پر نہیں رہا کیونکہ کسی وقت بھی مَرو اور نسا کسی ایسے پیشوا سے خالی نہیں رہا ہے جو آپ کے اصحاب کو آپ کے مذہب پر قائم رکھنے کے لیے آج تک ان کی حفاظت نہ کرتا رہا ہو۔ آپ کے ان اصحاب کی طرف سے جو اہلِ نسا کی طرف سے ہیں۔ کچھ عمدہ رسالے اور خطوط اہلِ مرو کے نام بھیجے گئے تھے اور جن کے ذریعے انہوں نے اہلِ مرو سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کی عبارتیں جمع و تفریق پر مبنی ہیں۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو تمام اہلِ علوم کے درمیان مشترک ہے اور ایک خاص گروہ خاص طور پر اسی لفظ کو اپنی عبارت کے سمجھانے میں استعمال کرتا ہے لیکن ہر ایک گروہ کی مراد اس سے جُدا جُدا ہے۔

سیل، جارج

جارج سیل (George Sale) ایک انگریز عالم۔ اس نے سب سے پہلے قرآن مجید کا براہِ راست عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیا اور توضیحی حواشی لکھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بہت بڑا مقدمہ بھی لکھا تھا۔

سیل لندن کے ایک تاجر کے ہاں ۱۶۹۷ میں پیدا ہُوا تھا۔ اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ساتھ ہی اپنے فارغ وقت میں عربی زبان سیکھی۔ پھر ۱۷۳۴ء میں قرآن مجید کا مشہور عالم انگریزی ترجمہ کیا۔ سیل کا کیا ہُوا ترجمہ لفظی نہیں اور نہ ہی بالکل آزاد، بلکہ اس نے درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ سیل نے اپنے مقدمے میں اسلامی تعلیمات کے بارے

Marfat.com

ہیں کافی معلومات اور واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے ۔ اسی لیے اس کے بعض ہمعصر مذاقاً نصف مسلمان کا خطاب دیتے ہیں ۔ اس ترجمے کے باعث سیل کی شہرت یورپ کے تقریباً تمام ملکوں میں پھیل گئی تھی ۔ جب بائیل (Bayle) نے اپنا انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا تو عربی اور مسلم موضوعات پر سیل سے ہی مقالے لکھائے گئے ۔

۱۳ ارنومبر ۱۷۳۶ کو سیل کا انتقال ہوگیا ۔ وہ زیادہ عمر نہ پا سکا ۔ انتقال کے وقت اس کی عمر چالیس سال سے بھی کم تھی ۔

سیّئات

سَیِّئَۃ کی جمع ۔ یہ کلمہ سَاءَ یَسُوْءُ سُوْءً وَ سَوْءًا سے مشتق ہے ۔ اَلسَّیِّئَۃُ کا لفظ عملِ قبیح کے لیے ہوتا ہے ۔ مذکر کی صفت میں اَلسَّیِّئ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اَلسَّیِّئَۃُ کا لفظ مونث کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ یہ لفظ قرآن پاک میں بھی مختلف سورتوں میں آیا ہے جن میں سے کچھ پیشِ خدمت ہیں :

" اور بری تدبیر کا وبال صرف اس کے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ۔ " (فاطر : ۴۳)

" اور جنہوں نے برے کام کیے " (یونس : ۲۷)

" ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) برے کام کرتے رہیں " (النساء : ۱۸)

یہ لفظ بعض سورتوں میں عذاب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ جیسے " ان پر ان کے اعمال کے وبال پڑ گئے " (الزمر : ۵۱)

سورۂ ھود کی دسویں آیت میں یہ لفظ بطور ضرر ، دکھ ، تکلیف کے استعمال ہوا ہے " اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزا چکھائیں تو (خوش ہوکر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دور ہوگئیں ۔

ان معنی کے علاوہ کچھ جگہ یہ لفظ بے حیائی اور گناہ کے ضمن میں آیا ہے ۔ جیسے :

" اور یہ لوگ (قوم لوطؑ) پہلے ہی سے فعلِ شنیع کیا کرتے تھے " (ھود : ۷۸)

" اور ان کے گناہوں سے درگزر فرمائیں گے " (الاحقاف : ۱۶)

" کچھ شک نہیں کہ نیکیاں ، گناہوں کو دور کر دیتی ہیں " (ہود : ۱۱۴)

راغب اصفہانی السَّیِّئَۃ اور السُّوْء کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ " السوء ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں مبتلا کر دے ، خواہ اس کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے اور اسی طرح احوالِ نفس سے ہو یا احوالِ بدن سے ۔ عزت اور مذہب کا زوال یا کسی عزیز کی موت بھی السوء ہے ، عیب ، اعمالِ فاحشہ اور عذاب بھی اس کے معانی میں شامل ہیں ۔ السیئۃ کے معنی عام استعمال کی رو سے برائی کے ہیں جیسے کہ سورۂ المؤمنون کی آیت ۹۶ میں آیا ہے " اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو " انہی میں ایک حدیث مبارک بھی بیان کی جاتی ہے " اے انس ! برائی کا تعاقب نیکی سے کرو کہ اس کا اثر زائل کرے گی " ۔

طاہر پٹنی السیئۃ کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں : " جس چیز سے خدا نے روکا ہو وہ سیئۃ ہے ۔ " علمائے تصوف نے انسان کی اس کمزوری پر خاص تنبیہ کی ہے کہ وہ سیئات صغار (گناہ) کے ارتکاب کو سہل انگاری کی بنا پر کچھ زیادہ موجب خاطر نہیں سمجھتا حالانکہ عملِ فاحشہ اور گناہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اس کا مرتکب ہوکر انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کی نافرمانی کرتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ بلال بن سعد کا یہ قول پیش کرتے ہیں : " کسی گناہ کے چھوٹا ہونے کی جانب نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ تم کس ذات کی نافرمانی کر رہے ہو ۔ "

شاباشیہ

بصرے اور الاحساء کے علاقے میں آباد ایک قبیلے کا نام ۔ یہ قبیلہ غلاۃ قرامطہ میں سے تھا اور اس کی قیادت شیخ بنو شاباش کے ہاتھ تھی ۔ ان لوگوں کی سیاسی سرگرمیاں تقریباً ایک صدی تک خلیج فارس کے علاقوں میں جاری رہیں ۔ راسخ العقیدہ علمائے کرام اس قبیلے کے لوگوں کو دائرۂ اسلام سے خارج گردانتے تھے لیکن دروزی فرقے کے لوگ انہیں اپنے مذہب کا پیرو خیال کرتے تھے ۔ دروزی قانون نامے ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء میں لکھا ہوا مقتنیٰ کا ایک رسالہ ملتا ہے ۔ یہ رسالہ خاص طور پر شاباشیہ کے لوگوں کے بارے میں ہی ہے ۔

شاذلی ، ابوالحسن

ایک معروف صوفی بزرگ ۔ انھوں نے تصوف میں ایک سلسلے کی بنیاد بھی رکھی تھی ۔ جسے شاذلیہ کہا جاتا ہے ۔

آپ سبتہ کے نزدیک غمارہ میں ۵۹۳ھ / ۱۱۹۶ء کے قریب پیدا ہوئے لیکن بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ تونس میں جبل ظفران کے قریب شاذلہ کے مقام پر پیدا ہوئے ۔ ان کے مرید انھیں سادات میں شامل کرتے ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب امام حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالبؓ تک پہنچاتے ہیں ۔

جوانی میں ہی آپ مطالعے میں مشغول رہنے لگے ۔ یہاں تک کہ آپ کی بینائی کو ضعف پہنچا ۔ آپ نے فاس میں حضرت جنیدؒ جو ایک عظیم صوفی تھے کے خلفاء کے خطبے سنے ۔ آپ ابومدین شعیب تلمسانی کے شاگرد تھے ۔ جب آپ کی تعلیمات مقبول ہونے لگیں تو آپ پر جبر و تشدد کیا جانے لگا ۔ اس نازک وقت میں آپ نے مصر کے شہر سکندریہ میں پناہ حاصل کی ۔ یہاں آنے کے بعد آپ کی شہرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ۔ آپ نے کئی مرتبہ حج کیا ۔ جب آپ آخری مرتبہ حج کو جا رہے تھے تو بالائی مصر کے صحرائے عیذاب کو عبور کرتے ہوئے ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں انتقال ہو گیا ۔ آپ کا مزار آج بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ شاذلی نے اپنی زندگی سیر و سیاحت میں بسر کی جس کے دوران میں ذکر و فکر میں بھی مشغول رہتے تھے اور خدا کے ساتھ وصالِ دائمی اور ابدی وجدانی مسرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔ آپ اپنے مریدوں کو تمام وقت عبادت میں صرف کرنے کے لیے کہا کرتے تھے ۔

شاذلیہ

افریقہ میں اس کا تلفظ شادلیہ ہے ۔ یہ تصوف کا ایک سلسلہ ہے جس نے ابوالحسن علی بن عبداللہ الشاذلی کی نسبت سے یہ نام پایا ۔ الشاذلی نے کوئی ضخیم کتاب نہیں لکھی البتہ کئی ایک ملفوظات ، متعدد ادعیہ اور ایک نظم ان سے منسوب ہے ۔ الشاذلی کی تصانیف میں سے سب سے زیادہ مشہور " حزب البحر " ہے ۔ غالباً الشاذلی کا اصل مقصد یہ تھا کہ اخلاق عالیہ کی تلقین کریں ۔ اس سلسلے کے پانچ اصول یہ ہیں (۱) ظاہر و باطن میں خدا سے ڈرنا ۔ ۲ ۔ قول و فعل میں سنت کی پابندی ۳ ۔ فقر و غنا میں دنیا سے نفرت ۔ ۴ ۔ چھوٹی بڑی ہر بات میں رضائے الٰہی پر قانع رہنا ۔ ۵ ۔ غم ہو یا مسرت اللہ تعالیٰ ہی سے رجوع کرنا ۔ الشاذلی چاہتے تھے کہ ان کے پیرو اپنے اپنے کام اور پیشے میں لگے رہیں اور ممکن ہو سکے تو اپنی روزمرہ کی باتوں کے ساتھ ساتھ عبادت میں بھی مشغول رہیں ۔ دوسرے صوفیاء کی طرح الشاذلی کا منتہائے نظر بھی فنا ہی تھا اور اس کے حصول کا طریقہ بھی مجوزہ ریاضتیں ہی تھیں ۔ ان کے طریقے کے راہنماؤں کا کہنا ہے کہ الشاذلی

Marfat.com

ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کا کوئی الہام اگر سنت سے ٹکراتا تھا تو وہ ہدایت کر دیتے تھے کہ سنت کو ترجیح دی جائے۔ اس کے باوجود ان کے بعض دعاوی ابن تیمیہ کے اعتراضات کا ہدف بنے۔ اس سلسلے پر چلنے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی امتیازی خصوصیات تین ہیں۔ ایک یہ کہ ان سب کا انتخاب لوح محفوظ سے ہوا۔ یعنی ان کے لیے روز اوّل ہی سے اس حلقے میں شمولیت مقدر ہو چکی تھی۔ دوم یہ کہ ان کی وجدانی کیفیت فوراً ہوش میں بدل جاتی ہے یعنی ان کے روحانی مشاغل ان کو روزمرہ کی زندگی سے خارج نہیں کرتے اور سوم یہ کہ ہر زمانے میں جو بھی قطب ہوگا انھیں میں سے ہوگا۔ غالباً ان کی اولیں جماعت تونس میں قائم ہوئی۔ سلسلہ شاذلیہ کا اصل مرکز افریقیہ کا وہ علاقہ تھا جو مصر کے مغرب میں واقع ہے بالخصوص الجزائر اور تونس۔ انیسویں صدی میں اس سلسلے کی بہت توسیع ہوئی۔

شافعی، امام

(۷۶۷ء - ۸۲۰ء) ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافعی بن السائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف۔ اہل سنت کے ائمۂ اربعہ میں شمار ہوتے ہیں اور شوافع کا فقہی مسلک ان سے منسوب ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب عبد مناف پر آنحضرتؐ سے مل جاتا ہے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں انہیں فتویٰ دینے کی اجازت مل چکی تھی۔ انھوں نے خاصا عرصہ بدوی قبائل میں گزارا۔ اس لیے انہیں زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اپنے وقت کے ماہرین زبان و ادب ان کے شاگردوں میں رہے۔ پرورش مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ تیرہ برس کی عمر میں امام مالکؒ بن انس کے پاس مدینہ منورہ چلے گئے اور ان کی وفات تک ان کی شاگردی میں رہے امام مالکؒ کی وفات کے بعد مکہ واپس آئے اور وہاں مختلف علماء سے حدیث و فقہ کا علم حاصل کیا۔ حاکم یمن نے انہیں ایک سرکاری عہدہ پیش کیا لیکن وہاں مخالفین نے ان پر الزام عائد کر دیا کہ آپ درپردہ زیدی مدعی خلافت یحییٰ بن عبداللہ کے حامی ہیں انہیں گرفتار کر کے خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہ ان کے دلائل سن کر قائل ہو گیا اور انہیں رہا کر دیا۔

۸۱۰ء / ۸۱۱ء میں وہ بغداد آ کر مقیم ہو گئے۔ اور ایک حلقۂ درس قائم کیا بعد میں آپ مصر چلے گئے۔

انہیں بجا طور پر اصول فقہ کا مؤسس و بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف مکالمے کی صورت میں ہیں وہ مخالفین کا رد کرتے ہوئے ان کا نام نہیں لیتے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کے علم و فضل کی داد دیتے ہوئے فرمایا۔ اس قرشی نوجوان سے زیادہ کتاب اللہ کا فقیہہ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ امام شافعیؒ نے بکثرت لکھا اور ان کی تصانیف اپنی اہمیت کے اعتبار سے فقہ کے طالب علموں کے لیے نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ ان احادیث کی تحقیق پر تھی جن سے احکام شرعی کے ثبوت مہیا ہوں۔ اس وقت شافعیؒ فقہ کا ذوق شوق سے مطالعہ ہوتا ہے۔ مشرق وسطیٰ، افریقہ، وسط ایشیا کے بعض حصوں میں اس وقت بھی شافعی مذہب کو ہی اقتدار حاصل ہے۔

شام

مشرق وسطیٰ کا ایک اسلامی ملک۔ سرکاری نام جمہوریہ عربیہ سیریا۔ موجودہ رقبہ ۷۱،۷۷۲ مربع میل ہے۔ اس کے مغرب میں بحیرہ روم اور لبنان، جنوب میں اسرائیل اور اردن، مشرق میں عراق اور شمال میں ترکی ہے۔ ملک کی موجودہ آبادی تگ بھگ ساٹھ لاکھ ہے۔ بیشتر آبادی سنی مسلمانوں کی ہے۔ شیعہ، اسمٰعیلی، دروز اور عیسائی بھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ اس کے مشہور شہر دمشق (دارالحکومت)، حلب، حمص اور حماۃ ہیں۔ اور صدیوں سے اسلامی علوم و فنون کے مراکز رہے ہیں۔ قاہرہ کے بعد دمشق دنیائے اسلام کا دوسرا علمی و ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں کی جامعہ دمشق ۱۹۲۴ء سے قائم ہے۔

شام بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ گندم، جو اور دالیں بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ شکر قند، زیتون اور تمباکو کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ یہ ملک ریشمی مصنوعات اور کانچ کے کام کے لیے مشہور ہے۔ حلب کے بلوری برتنوں اور آرائشی اشیا کی یورپ اور ایشیا میں بہت مانگ ہے۔

گزشتہ سالوں میں دمشق اور حلب میں مختلف چھوٹی صنعتوں کے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ عراق پٹرولیم کمپنی کے پائپ لائن شام سے ہو کر گزرتی ہے جس سے شام کو بھاری رقم رائلٹی کے طور پر ملتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے شام ایک قدیم تہذیبی و ثقافتی مرکز ہے۔ اپنی زرخیزی کے باعث یہ سرزمین لٹیرے بدوؤں کے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی۔ دوسری صدی ق۔م کے آغاز ہی میں ان عرب بدوؤں نے حمص، تدمر اور الحجر میں اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ شام کی زبان و ثقافت کے اختیار کرنے میں انہیں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔

پانچویں صدی عیسوی میں شامی سرحدوں کی حفاظت و مدافعت کا کام غسانی سرداروں کے سپرد تھا۔ جو نسلاً عرب اور مذہباً عیسائی تھے۔ یہ شامی عرب ایک ایسی بولی بولتے تھے جو عربی اور ارامی کے اختلاط سے بنی تھی۔

تبوک عرب اور شام کا سرحدی مقام ہے۔ اس علاقے میں بازنطینی حکومت کی طرف سے عرب سردار حکومت کرتے تھے۔ آغاز اسلام سے عرب پر ان کے حملوں کی افواہیں پھیلتی رہتی تھیں۔ اس خطرے کے پیش نظر آنحضرت صلعم نے ۹ھ میں تبوک کا قصد کیا۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ حملے کی افواہیں غلط تھیں۔ آپ نے بیس روز تبوک میں قیام کیا اور اردگرد کے حکمرانوں کو جن کی جانب سے خطرات تھے مطیع بنا کر مدینہ شریف تشریف لے آئے۔

آنحضرت صلعم کی وفات تک ہر وقت رومیوں کے حملے کا خطرہ رہتا تھا۔ اسی اس خطرے کے انسداد اور شہدائے موتہ کے انتقام کے لیے حضورؐ نے اسامہ بن زیدؓ کو شام بھیجنے کا ارادہ کیا تھا کہ آپؐ کی وفات ہو گئی۔ اس لیے ۱۳ھ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کبار صحابہ کے مشورے سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ دمشق کی مہم پر یزید ابن ابی سفیانؓ، حمص پر ابوعبیدہؓ بن الجراح اُردن پر شرجیل بن حسنہ اور فلسطین پر عمرو بن العاص مقرر ہوئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ ان سب کے سالار مقرر ہوئے۔ بازنطینی افواج کی کثرت کا اندازہ کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو جو اس وقت عراق میں تھے حکم دیا کہ وہ شام چلے جائیں چنانچہ وہ شام کے لیے روانہ ہو گئے۔

مارچ ۶۳۵ء میں عربوں نے دمشق کی دیواروں کے زیر سایہ ڈیرے ڈال دیئے۔ لڑائی میں شامی عربوں نے رومی شہنشاہ کی افواج کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس لیے انہیں مکمل طور پر شکست ہوئی۔ جنگ یرموک (۶۳۶ء) نے شام کی قسمت کا

Marfat.com

تلوار اٹھائے فتح ہوتے چلے گئے۔
ہجری کا اٹھارھواں سال عموماً اس میں طاعون کی وبا پھیلنے کے لیے مشہور ہے اس میں ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے شام کا سفر کیا اور مناسب اقدامات کیے۔ یزید بن ابوسفیان کا انتقال ۱۸ھ میں ہوا تو حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ کو ان کی جگہ حاکم مقرر کیا اور حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں پورے شام کا والی بنا دیا۔ امیر معاویہؓ نے شام کے سرحدی علاقے فتح کرکے اس کی حدود کو وسعت دی۔ حضرت عثمانؓ کی اجازت سے امیر معاویہؓ نے ایک بحری بیڑہ بھی تیار کیا اور اس کے ذریعے جزیرہ قبرص فتح کیا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان خانہ جنگیوں کے باعث حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں امیر معاویہؓ شام کے آزاد حکمران ہو گئے۔ حضرت علیؓ کے انتقال اور حضرت امام حسنؓ کی دستبرداری کے بعد امیر معاویہؓ تمام عالم اسلام کے خلیفہ ہو گئے، اور ان کی خلافت کا دارالحکومت دمشق قرار پایا۔ ان کے عہد میں اسلامی سلطنت کی سرحدوں میں وسعت ہوئی۔ امیر معاویہؓ کی کامیابیاں ان کی ذاتی فہم و فراست کے علاوہ ان کے مشیروں کی بھی مرہون منت ہیں۔ امیر معاویہؓ کا انتقال ۶۰ھ میں ہوا۔

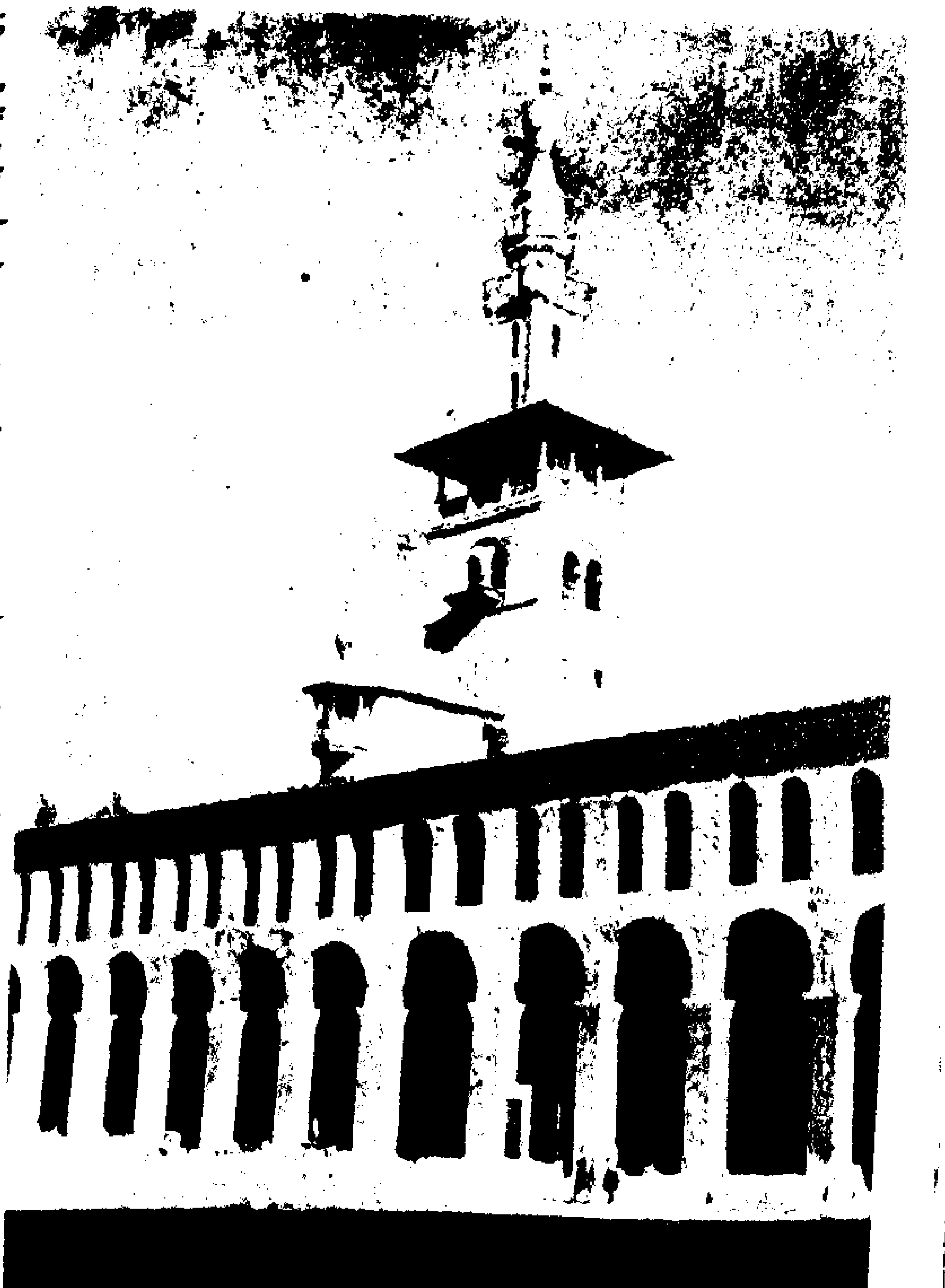

دمشق کی ایک قدیم مسجد

امیر معاویہؓ کے جانشین ان کے بیٹے یزید بن معاویہ کو صحابہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے عہد حکومت میں شہادت امام حسینؓ، مدینۃ الرسول کی پامالی اور حرم محترم کی بے حرمتی ہوئی۔ جس کی وجہ سے عالم اسلام میں بنو امیہ کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ یزید شعر و شاعری کا دلدادہ اور سیر و شکار کا شوقین تھا۔

یزید کے بیٹے دائم المرض معاویہ ثانی کا عہد حکومت محض چند روزہ تھا۔ وہ ۶۴ھ میں طاعون کا شکار ہو گیا۔ اس کے دوسرے بھائیوں کی کم سنی کے باعث امرائے شام مروان بن الحکم کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ مروانی خاندان کا پہلا خلیفہ بنا۔ اس کا عہد حکومت پیہم لڑائیوں اور جھگڑوں کا عہد تھا اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا عبدالملک تخت نشین ہوا وہ اموی حکومت کا دوسرا بانی تھا۔ اس نے نہایت عزم و استقلال سے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ اسلامی سکے کا اجراء اس کا ممتاز کارنامہ ہے۔ اس کا دوسرا کارنامہ عربی کو دفتری زبان قرار دینا ہے۔ وہ عقل و دانش، تدبیر و سیاست اور علم و فضل جیسے اوصاف میں بھی کامل تھا۔ عبدالملک نے بیس سال حکومت کی۔ اس کا انتقال ۸۶ھ میں ہوا۔

اس کے بعد اس کا جانشین ولید اول تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد کا زریں کارنامہ فتح اندلس ہے۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک اور اس کے بعد اس کا چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیزؒ نے کوئی فرق
چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیزؒ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ان کے عدل و انصاف نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ ذمیوں اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے کوئی فرق روا نہ رکھا۔

عمر بن العزیزؒ کے بعد نا اہل لوگ خلافت پر قابض ہو گئے جس کے باعث ملک میں فساد پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ خارجیوں کی بغاوت نے ملک میں الگ آفت مچا رکھی تھی۔

اہل شام کی بے چینی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوالعباس السفاح نے کوفے میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ مروان کو اس کے خلاف لڑائی میں شکست ہوئی۔ پہلے تو اس نے عراق عرب کا علاقہ خالی کیا۔ بعد ازاں شام بھی چھوڑ دینا پڑا۔ شامی اس کا ساتھ دینے پر رضامند نہ تھے۔ اس نے مصر میں پناہ لی جہاں ۱۳۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بنو امیہ کا ہر جگہ تعاقب کیا گیا اور انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کی قبروں کو اکھاڑ کر ان کی خاک ہوا میں اڑا دی گئی۔ شامیوں نے نہایت کوشش کی کہ کسی طور اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لے لیں لیکن انہیں اس میں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

فتح شام کے بعد اہل شام کی زبان عربی ہو گئی۔ عبدالملک نے عربی کو دفتری زبان قرار دیا تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کے لیے بھی عربی کا سیکھنا لازمی ہو گیا۔ اموی خلفاء شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے چنانچہ بہت سے نامور شاعر مثلاً اخطل، جریر، فرزدق، ابن ابی ربیعہ اور جمیل ابن معمر وغیرہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ حجاج بن یوسف، حسن بصریؒ اور طارق بن زیادؒ اس دور کے ممتاز خطیب تھے۔

اس زمانے میں دینی علم کی تحصیل کا عام ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ مکے، مدینے، کوفے اور بصرے میں اکابر صحابہؓ کے تلامذہ حلقے لگا کر قرآن، حدیث، فقہ، مغازی کی تعلیم دیتے تھے۔ حدیث کی تدوین و اشاعت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اعمال حسنہ میں شامل ہے۔ مغازی اور سیرت کے مشہور امام محمد بن اسحاق اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

Marfat.com

... ابتدا میں عربی خط میں نقطے اور اعراب نہ تھے۔ عجمی قومیں مسلمان ہوئیں تو پڑھنے میں غلطی ہونے لگی۔ اس لیے حجاج بن یوسف نے قرآن مجید پہ اعراب اور نقطے لگوائے۔

بنو امیہ کے زوال کے ساتھ ہی شام اپنی ممتاز حیثیت سے محروم ہوگیا۔ شامیوں کی برتری ختم ہوگئی۔ اب نیا صدر مقام بغداد تھا جو صدیوں تک اسلامی شکوہ و جلال کا عظیم نشان رہا۔ قیسی اور یمنی عربوں کی باہمی چپقلش خونریز خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ ۲۱۴ھ/۸۲۵ء میں مامون الرشید شام آیا اور اراضیات کی از سرِ نو پیمائش کرائی۔ ۸۵۸ء میں متوکل نے مرکز حکومت دمشق منتقل کر دیا۔

عباسی دور میں اسلام کی اشاعت وسیع پیمانے پہ ہوئی۔ بہت سے عیسائی قبیلے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ شامی عیسائیوں کو فلسفے اور الٰہیات کے علاوہ طب اور ہیئت سے بھی شغف تھا چنانچہ اس عہد میں بہت سی سریانی اور یونانی کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں۔ اس طرح ارسطو اور جالینوس کی بیشتر کتابیں عربی خواں طلبہ کی دسترس میں آگئیں۔

شام کی سرحدی قلعہ بندیوں کا ابتدائی سلسلہ عباسی خلفاء کا تعمیر کردہ ہے۔ یہ قلعے بوزنطی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

۹۷۷ء سے ۱۰۹۸ء تک شام ایک علوی یا زیادہ صحیح طور پہ ایک اسماعیلی خاندان یعنی فاطمیوں کے قبضے میں رہا۔ ان کا براہ راست اثر و رسوخ اس وقت تک رہا جب تک کہ ان کی افواج ملک پہ قابض رہیں۔

۱۰۹۷ء میں صلیبی جنگجوؤں کی ایک فوج انطاکیہ کی دیواروں تک آموجود ہوئی اور ایک ہمت آزما محاصرے کے بعد ۳ جون ۱۰۹۸ء کو یہ فوجیں قلعے میں داخل ہوگئیں۔ اور ہوتے ہوتے یہ فرنگی بیت المقدس کی دیواروں کے سامنے آ نکلے اور ۱۰۹۹ء میں دھاوا بول کر یہ علاقہ فتح کر لیا اور اس کو ایک لاطینی ریاست بنا کر بوئیلوں کے گوڈفرے کو اس کا سردار بنا دیا گیا۔ لیکن بیت المقدس کا پہلا بادشاہ درحاصل اس کا بھائی اور جانشین بالڈون اوّل تھا۔ اس نے ساحل کے کئی شہر سر کیے۔ اس کے جانشین بالڈون ثانی نے ۱۱۲۴ء میں صور فتح کر لیا۔ دمشق کے سامنے اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

بالڈون ثانی کے بعد لاطینی ریاست کا زوال شروع ہوگیا اور اس کی بنیادی وجہ صلیبی سپاہیوں کا عدم تعاون اور فقدانِ اتحاد تھا۔ ہر گروہ اپنی اپنی علیحدہ سلطنت اور اقتدار کا خواہش مند تھا۔ اس اتحاد کے فقدان کا فائدہ اٹھا مسلمان نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ اور صلیبیوں کے ساتھ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس میں بالآخر صلاح الدین کو کامیابی نصیب ہوئی۔

صلاح الدین کے انتقال کے بعد متعدد وارثوں میں تنازعے شروع ہوگئے اس سے فائدہ اٹھا کر خوارزمیوں نے حملہ کر دیا اور غزہ کے مقام پہ شامی اور فرنگیوں کی متحدہ افواج کو شکست فاش دی اور مصریوں کو بیت المقدس، دمشق اور حمص پہ قبضہ کرنے کا موقع دیا۔

اس جنگی حالت نے مسلمانانِ شام کی ذہنی سرگرمیوں میں رکاوٹ تو پیدا کی لیکن اسے بالکل ہی روک دیا۔ سلطان صلاح الدین کے عہد کی علمی اور ثقافتی سرگرمیاں اس بات کا ثبوت ہیں۔

ایوبیوں کے بعد مملوک سلاطین مصر و شام میں برسرِ اقتدار آئے۔ ۱۲۶۰ء

کے چوتھے فرمانروا بیبرس نے جالوت کے مقام پہ تاتاریوں کے مقام پہ کو شکست فاش دی اور صلیبیوں کے خلاف شاندار کامیابی حاصل کی۔ شام پہ تاتاری یورشوں میں آخری یورش امیر تیمور کی تھی۔ وہ آندھی کی طرح وسط ایشیا سے اٹھا اور طوفان کی طرح اسلامی دنیا پہ چھا گیا۔ اس نے ۱۴۰۰ء میں حلب فتح کر لیا۔ اور تین روز تک قتل و غارتگری کا نشانہ بنائے رکھا۔ نوری اور ایوبی عمارتیں جلا کر خاک کر دیں، شہر کو لوٹا اور مساجد کو آگ لگوا دی۔ دمشق کے بہترین اربابِ فن، مشاہیر اور علماء سمرقند بھیج دیئے گئے اور یوں شام کی علمی فنی اور صنعتی برتری ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں تین اشخاص منظرِ شہرت پہ آئے۔ یہ ظاہر العمر، احمد پاشا الجزار اور نپولین بوناپارٹ تھے۔ ظاہر نے عکہ پہ قبضہ کر لیا لیکن آخر مارا گیا۔ احمد پاشا الجزار کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے نپولین کی پیش قدمی روک دی۔ ترکوں کے تین سو سالہ عہدِ حکومت تک شام اور فلسطین کی آبادی جو عرب فتوحات کے وقت چالیس لاکھ تھی صرف پندرہ لاکھ باقی رہ گئی تھی۔

۱۸۶۴ء کے بعد شام دو ولایتوں میں بٹ گیا۔ حلب اور دمشق۔ ۱۸۸۸ء میں بیروت کو جو شام کی بڑی بندرگاہ تھی اور اہم تجارتی مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا، علیحدہ ولایت بنا دیا گیا۔

ابراہیم پاشا کے زمانے سے شام کے دروازے مغرب کے ثقافتی اثرات کے لیے کھل گئے تھے۔ اس کے بعد امریکی مشنریوں نے مضبوطی سے وہاں قدم جمانا شروع کر دیے فرانسیسی اور انگریزی کتابیں بکثرت عربی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ یسوع فرقے نے بیروت میں سینٹ جوزف یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ حفظانِ صحت کے وسائل بہتر ہوگئے۔ اور درجۂ معیشت بلند ہونے لگا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو ترکیہ پہلی جنگِ عظیم میں شامل ہوگیا۔ جمال پاشا (ترکی) نے سارے شام کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ بہت سے قوم پرور عرب رہنماؤں کو تختۂ دار پہ لٹکا دیا۔ وہ نہر سویز پہ حملہ کرنے کے لیے بڑھا لیکن ناکام رہا۔ اور دھیرے دھیرے انگریزوں نے بزورِ قوت ملک پہ قبضہ کر لیا اور فرانسیسی امدادی فوج نے بھی شام کی طرف اپنے قدم جما لیے۔

۲۴ جولائی ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی دمشق میں داخل ہوگئے۔ ایک معاہدے کی رو سے شام کو ترکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔

آہستہ آہستہ شامی عوام کو یہ محسوس ہونے لگا کہ فرانسیسی اقتدار ترکی حکومت کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے بعض ایسے اقدامات کیے جن کو لوگ برداشت نہیں کر سکتے تھے آخر کار تنگ آمد بہ جنگ آمد ہڑتالوں اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ بغاوتیں ۱۹۲۵ء کی عام بغاوت کا باعث بنیں۔ فرانسیسیوں نے اڑتالیس گھنٹے تک دمشق پہ گولہ باری کی۔ ان کے اس اقدام کو دنیا بھر میں غم و غصہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ بالآخر ایک سمجھوتے کے تحت ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو تمام فرانسیسی فوجیں شام سے ہمیشہ کے لیے نکل گئیں۔

اب شام نے صدر شکری القوتلی کی رہنمائی میں آزادی کا سفر شروع کیا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام نے عالم عرب میں ہیجان پیدا کر دیا۔ عرب ممالک (جن میں شام بھی شامل تھا) نے اسرائیل کے خلاف ناکام پیش قدمی کی۔ اس دوران شام کے حالات بگڑتے چلے گئے اس سیاسی خلفشار کے پیشِ نظر یکم فروری ۱۹۵۸ء میں قاہرہ سے دونوں ملکوں مصر اور شام کے اتحاد کا اعلان ہوگیا اور اس کا نام جمہوریہ متحدہ عرب رکھا گیا۔ اور جمال عبدالناصر اس کے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن مصریوں کی بالادستی کے باعث یہ اتحاد برقرار نہ رہ سکا۔

Marfat.com

اور ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء میں شامیوں نے مصریوں کو شام سے علیحدگی پر مجبور کر دیا۔

شامل، امام

داغستان کے ایک ہر دلعزیز قائد، نقشبندیہ سلسلے کے پیشوا، روسی حکومت کے خلاف جہاد آزادی کا سب سے آخری اور سب سے کامیاب رہنما۔ اپنے پیشروؤں کی طرح وہ بھی اور انہی سے تعلق رکھتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں خونزاق کے قلعے پر ناکام حملہ کر کے شہرت حاصل کی۔ ۱۸۳۴ء میں ان کے پیشرو حمزہ بیگ کی شہادت کے بعد حریت پسندوں نے انہیں اپنا سالار بنا لیا۔ ۱۸۳۷ء میں شکست کھائی اور ہتھیار ڈال دیئے ایک سال بعد پھر حملہ کیا اور داغستان کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کر لی ان کا نظام حکومت احکام شریعت پر مبنی تھا۔ ترکوں کے عدم تعاون اور اپنے فوجی قبائل میں اتحاد نہ ہونے کے باعث انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ مجبوراً اطاعت زار کا حلف اٹھایا۔ ۱۸۶۹ء میں انہیں مکہ مکرمہ جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۸۷۱ء میں مدینہ منورہ میں وفات پا گئے۔

شامی

شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن علی بن یوسف الدمشقی الصالحی الشامی الشافعی۔ دسویں صدی ہجری کے نامور محدث شہرہ آفاق سیرت نگار اور مورخ تھے۔ شام کو خیرباد کہہ کر مصر چلے گئے اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے انہوں نے بہت سی قابلِ ذکر اور اہم کتابیں تصنیف کیں۔

شاہ اسمٰعیل شہید

دیکھیے: "اسماعیل شہید"

شاہجہان

ابو المظفر شہاب الدین شاہ جہاں۔ خاندان مغلیہ کا مشہور فرمانروائے ہند

مغل شہنشاہ شاہجہان

نورالدین جہانگیر کا تیسرا بیٹا جس کا نام خرم تھا۔ ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوا۔ ایک علم دوست، فن دوست اور شریفانہ جذبات رکھنے والا بادشاہ تھا جس کے عہد میں علم و فن، حسن پرستی، عام زندگی کے ہر شعبے میں دور رس تبدیلیاں اور ارتقاء ہوا۔

۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی وفات پر بغاوتوں اور سازشوں کو فرو کرنے کے بعد ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ۱۶۳۲ء میں اس نے دولت آباد فتح کر لیا۔ پھر جلد بعد گولکنڈہ اور بیجاپور کو شاہی اقتدار تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی سال یعنی ۱۶۳۲ء میں ہگلی کا محاصرہ کر کے اسے انگریزوں سے چھین لیا۔

شاہجہان کے دور تک مغلوں کی سلطنت میں وسعت اور استحکام پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے اورنگ زیب نے جو دکن کا نائب الحکومت تھا، ۱۶۵۷ء میں شاہجہان کی خرابی صحت کی خبر پا کر بغاوت کر دی۔ اس کے اور اس کے بھائیوں کے درمیان تخت کے لیے کشمکش شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو شکست دی، اپنے دوسرے بھائی مراد کو قید کر کے قتل کروا ڈالا اور شاہجہان کو قید کر کے خود تخت نشین ہو گیا۔

شاہجہان کا انتقال اسی قید میں ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء کو آگرے کے قلعے میں ۷۴ سال کی عمر میں ہوا۔

شاہجہان کی بشری کمزوریوں سے قطع نظر اس کا عہد بہت سے امتیازات کا حامل ہے۔ اس کا دور آسودگی اور معاشی اطمینان کا دور تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی قدر اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ فن موسیقی میں اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ مصوری، خطاطی اور کندہ کاری کے فنون میں قدر افزائی اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ فن تعمیر کے اعتبار سے شاہجہان کا عہد تمام مغل بادشاہوں سے زیادہ شاندار ہے۔ مغل فن تعمیر کے لیے یہی دور سنہری دور کہلا سکتا ہے۔ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ، آگرے میں تاج محل، لاہور میں شالامار باغ اور مقبرہ جہانگیر اپنے حسن تعمیر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔

شاہ حسین

۹۴۵ھ - ۱۰۰۸ھ / ۱۵۳۹ء - ۱۵۹۹ء۔

معروف صوفی، مجذوب، پنجابی زبان کے عظیم شاعر۔ عوام میں مادھو لال حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مزار باغبانپورہ لاہور میں ہے۔ جہاں ہر سال میلہ چراغاں کے نام سے شاندار عوامی تقریب ہوتی ہے۔ دارا شکوہ نے اپنی تصنیف "شطحیات" میں ان کی بہت سی کرامات درج کی ہیں۔ شاہ حسین کا تعلق درویشوں کے فرقہ ملامتیہ سے تھا۔ داڑھی مونچھ منڈوا کر ناچنا گانا ان کا معمول تھا۔ عمر کا آخری حصہ جذب و سکر کی حالت میں بسر ہوا۔ شاہ حسین کی کافیاں پنجاب بھر میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ پنجابی شاعری میں انہیں ایک اعلیٰ منصب حاصل ہے۔ انہوں نے پنجابی زبان میں پہلی بار کوشش کی کہ مختلف راگ اور راگنیوں کا اپنی کافیوں میں استعمال کریں۔ ان کی شاعری، زبان کے رس اور چاشنی، تصوف کی بلند فکری، روحانیت اور عجز و انکسار کی روح سے بھری ہوئی ہے۔

شاہ دولہ گجراتیؒ

نام دولہ۔ سلسلۂ نسب بہلول لودھی سے اور سلسلۂ طریقت بہاؤالدین ذکریا ملتانی سے جا ملتا ہے۔ بچپن ہی میں کسی بردہ فروش نے انہیں اٹھا کر ایک ہندو کے پاس

Marfat.com

فرو ہوتا گیا۔ آپ نے اس ہندو کی اتنی خدمت کی کہ اس نے خوش ہو کر آزاد کر دیا۔ آزادی ملنے کے بعد انہوں نے سید شاہ سیالکوٹی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سخی اور فیاض تھے۔ سماع سے شغف تھا۔ لوگ آپ کے بہت معتقد تھے۔ اور آپ سے اولاد کے لیے دعا کرنے کو کہتے۔ آپ اس شرط پر دعا کرتے تھے کہ پہلا بچہ ہونے پر ان کی خدمت میں دے دیا جائے گا۔ یہ بچے مخبوط الحواس ہوتے تھے۔ ان کے سر چھوٹے ہوتے اور وہ گویائی سے محروم ہوتے تھے۔ اس طرح کے بچے اب بھی آپ کے مزار پر موجود ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۰۷۵ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار گجرات میں ہے۔ ہر سال ۱۹ ربیع الاول کو ان کا عرس ہوتا ہے۔

شاہ رفیع الدین

دیکھیے : "رفیع الدین شاہ"

شاہ عبدالعزیز

آپ شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حلیم ہے۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ سترہ سال کی عمر تک تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، عقائد، منطق، کلام، ہندسہ، ہیئت، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ تقریر نہایت شستہ اور نصیح ہوتی تھی۔ نہایت مشکل مسائل کو حیرت انگیز انداز میں بیان کرتے تھے۔ والد کی وفات پر مسندِ درس سنبھالی اور اپنے انتقال تک محوِ درس و تدریس رہے۔ حافظہ بے مثل تھا۔ غیر معروف کتابوں کی لمبی لمبی عبارتیں فقط یاد کے زور پر لکھوا دیتے تھے۔ تمام علوم عقلی و نقلی از بس تھے۔ گفتگو کرتے تو حاضرین پر حالتِ استغراق طاری ہو جاتی۔ سلیقۂ وعظ و انشاء، تحقیق و جستجو اور مذاکرہ و مباحثہ میں انہیں درجۂ امتیاز حاصل تھا۔ ان کی تالیفات فضلاء کے نزدیک معتمد علیہ ہیں۔ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء کو انتقال ہوا۔

شاہ عبدالغنی

شاہ عبدالغنی دہلوی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے چھوٹے صاحبزادے۔ ممتاز مفسر، محدث اور فقیہہ۔ درس و تدریس اور اشاعتِ اسلام ان کا شب و روز کا معمول تھا۔ یادِ خدا میں ہمیشہ مشغول رہے۔ ان کی صحبت میں جذبۂ ایثار اور اخلاص کا فیض عام تھا۔

شاہ عبدالقادر

شاہ ولی اللہ کے تیسرے صاحبزادے۔ انہیں علم فقہ و حدیث میں کمال حاصل تھا۔ گوشہ نشینی پسند کرتے تھے۔ دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں ساری عمر گزار دی۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا اور اس کا نام "موضح القرآن" رکھا۔ ان کی وفات دہلی میں ہوئی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

دیکھیے : "بھٹائیؒ، عبداللطیف"

شاہ عنایت قادری

دیکھیے : "عنایت قادری"

شاہ محمد غوث

دیکھیے : "غوث شاہ محمد"

شاہ محمد مخصوص اللہ

مغلیہ عہد کے آخری دور کے مشہور عالم اور محدث۔ دہلی کے متقی بزرگوں کے سربراہ اور سالک تھے۔ علم و عمل میں اسم بامسمیٰ اور فی الحقیقت اللہ تعالےٰ کے مخصوص بندوں میں سے تھے۔

شاہ مدار

سید بدیع الدین احمد شاہ مدار بن قاضی قطب الدین علی بن بہاؤ الدین احمد بن ظہیر الدین احمد بن اسماعیل احمد بن احمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر۔ قطب المدار جو عوام میں شاہ مدار کے نام سے معروف ہیں۔ انہوں نے نہایت طویل عمر پائی۔ ان کی پیدائش یکم شوال ۲۴۲ھ بتائی جاتی ہے۔ ایک جگہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۵۰ھ بھی درج ہے۔ اور تاریخ وفات ۸۳۸ھ اور ایک جگہ ۸۴۴ھ درج ہے۔ اس طرح انہوں نے پونے چھ سو سال سے زائد کی عمر پائی۔ جہاں گرد تھے۔ کئی بار حج کے لیے گئے۔ ہندوستان میں ان کی آمد کی تاریخ ۲۴۲ھ ہے جو غلط فہمی کی بنا پر ان کی تاریخ پیدائش بھی سمجھی جاتی ہے۔ نہایت خوبصورت شخص تھے اور اس خوف سے چہرے پر نقاب ڈالے رہتے تھے کہ ان کے حسن سے مسحور ہو کر خدا کی مخلوق انہیں سجدہ نہ کرنے لگے۔ ان کا لباس کبھی میلا نہیں ہوا۔ تمام عمر دائم الصوم اور مجرد رہے۔ وہ نیرنجات اور الکیمیا کے ماہر تھے۔ ان سے اور ان کے پیروؤں سے عجیب و غریب کرامات منسوب ہیں۔ شاہ مدار کے جسم پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی اور تا ہنوز دربار کے اندر نہیں جاتی۔ مزار کے اندر قدرتی روشنی ہے اور ان کے مزار کے گنبد کا سایہ نہیں ہے۔

آپ زندہ شاہ مدار کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ باون ڈاکوؤں کا ایک گروہ شاہ مدار کے اوصاف سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے بعض افراد بازی گر تھے۔ بعد میں وہ پورا گروہ بازی گری پر اتر آیا جو باون گولی کے نام سے معروف ہے۔ غلط فہمی کی بنا پر سارے بازی گروں کو شاہ مدار سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ان کے مزار پر ان کے سالانہ عرس کے موقع پر برصغیر کے مختلف حصوں سے بے شمار پیرو وہاں آتے ہیں۔ ان کا مزار مکن پورہ میں ہے جو کانپور (بھارت) سے چالیس میل دور واقع ایک گاؤں ہے۔

شاہ ولی اللہ

دیکھیے : "ولی اللہ، شاہ"

شاہد

شہادت دینے والا۔ گواہی دینے والا۔ کسی شخص یا واقعے کے جھوٹے یا سچے ہونے کی گواہی دینے والا۔ اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انصاف کے قیام کے لیے عدالت کو اصل صورتِ حال سے واقف ہونے میں مدد دیتا ہے۔ کیونکہ صورتِ حال کا عینی شاہد ہونے کی حیثیت میں وہ واقعات کا معتبر اور حقیقت سے زیادہ نزدیک بیان کر سکتا ہے۔ لیکن اس نظامِ شہادت میں جو اسلام نے عدل

Marfat.com

کو قائم کرنے کے لیے وضع کیا بنیادی شرط یہ ہے کہ شاہد (گواہ) اپنی گزشتہ زندگی میں جھوٹا نہ رہا ہو اور وہ اس بات کا یقین عدالت کو دلادے یا اس کو جاننے والے لوگ اس کا اعتراف کریں۔

اسلام میں مختلف معاملات کے لیے گواہوں کی تعداد مختلف ہے اور ان میں مردوں اور عورتوں کی شہادتیں بھی مختلف ہیں۔ زنا کے معاملے میں سزا کی شرعی حد مقرر کرنے کے لیے چار مرد شاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ معاملات جن میں مال کا کوئی معاملہ نہ ہو مثلاً چوری، قتل، شادی، طلاق یا غلاموں کی رہائی وغیرہ، ان میں دو مردوں کی شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان معاملات میں جن کا تعلق نسوانی امور سے ہو (مثلاً بچے کی پیدائش یا عورتوں کے جسمانی نقائص وغیرہ) شافعی فرقے کے مطابق چار، مالکی کے مطابق دو اور حنفی فرقے کے مطابق ایک خاتون کی شہادت کافی ہے۔ مال کے معاملے میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو خواتین کی گواہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے۔

ایک شاہد اپنی شہادت سے بری الذمہ ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنے دیئے گئے بیان کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اگر زنا کے معاملے میں کوئی شاہد اپنی شہادت سے پھر جاتا ہے تو اس کے لیے سزا کی حد مقرر ہے ؛

شاہی مسجد

دیکھئے : "بادشاہی مسجد"

شائتہ

سرمائی فوج۔ رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کے معرکوں کے دوران دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے امیر معاویہؓ نے زبردست عسکری قوت اور تنظیم کا اہتمام کیا۔ سامان حرب کے دو ہزار جہاز بھی تھے جو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انہوں نے خشکی کی جنگ کے لیے "شائتہ" یعنی سرمائی فوج اور "صائفہ" یعنی گرمائی فوج کے نام سے دو مستقل لشکر تیار کیے جو اپنے اپنے موسموں میں سرحدوں پر برسرپیکار رہتے تھے ؛

شب برات

قمری سال کے آٹھویں مہینے شعبان کی چودھویں رات۔ قرآن میں اسے لیلۂ مبارکہ کہا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس رات ہر معاملے کا حکیمانہ اور محکم فیصلہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ اس رات افراد، قوموں، ملکوں اور قسمتوں کے فیصلے کر کے اللہ تعالےٰ اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ آنحضرتؐ نے نصف شعبان کی اس مبارک رات قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ حدیث ہے کہ اس رات اللہ تعالےٰ سب سے نچلے آسمان پر اتر آتا ہے اور انسانوں کو ان کے گناہ معاف کرنے کے لیے پکارتا ہے۔ یہ رات لیلۃ البراۃ بھی کہلاتی ہے۔ یعنی مغفرت کی رات ؛

شب قدر

دیکھیے "لیلۃ القدر"

شبلی، ابوبکر

ایک جلیل القدر مالکی المذہب صوفی۔ بغداد میں ۲۴۷ھ/۸۶۱ء کو پیدا ہوئے اور ۸۷ سال کی عمر میں بغداد ہی میں وفات پائی۔ علم و معرفت میں [illegible] مسلک مالکی کے سربرآوردہ فقیہہ اور عالم تھے۔ حدیث بھی [illegible] کہتے تھے۔ انہوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن ان کے بعض اقوال مستند مجموعوں میں ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف "تالف و تعطف" کا نام ہے۔ ان سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ دل کو اشیاء سے ہٹا کر رب الاشیاء کی طرف پھیر دینا تصوف ہے۔ شبلی کا قول ہے کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا ہر چیز اس کے تابع ہو گئی۔ نیز فرمایا کہ جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ کبھی غم سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا کہ اہل معرفت کی اللہ سے ایک لمحہ کی غفلت شرک باللہ کے مترادف ہے۔

انتقالِ خرقہ کے دستور کی رو سے شبلی حضرت جنیدؒ اور نصر آبادی کے مابین ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موخرالذکر شبلی کے شاگرد تھے۔ ان کا مزار بغداد میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے قریب ہے جسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ؛

شبلی نعمانی

محمد شبلی منسوب بہ امام اعظم نعمان بن ثابت بوجہ عقیدت۔ ان کی پیدائش بندول (اعظم گڑھ) میں ۱۸۵۷ء کو شیخ حبیب اللہ کے ہاں ہوئی جو ایک متمول تاجر زمیندار اور کامیاب وکیل تھے۔ سلسلۂ نسب ایک نومسلم راجپوت شیخ سراج الدین سے ملتا ہے سب بھائیوں میں بڑے تھے۔ تعلیم قدیم طرز پر ہوئی۔ اساتذہ میں زیادہ مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے متاثر ہوئے۔

علمی شغل سے پہلے انہوں نے نقل نویسی، نیل سازی کی تجارت اور وکالت کی طرف توجہ کی لیکن ذہنی میلان اس طرف نہ ہونے کے باعث ان کا دل نہ لگا۔ ۱۸۸۳ء میں علیگڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور سرسید کے رفقاء میں شامل ہو گئے۔ یوں

مولانا شبلی نعمانی

[illegible] اور شغلہ نصیب ہوگیا۔ شبلی کی زندگی کے [illegible] ہیں۔

۱۸۸۳ء [illegible] اعظم گڑھ میں ایک نیشنل سکول کا قیام۔ ندوۃ العلماء کی تحریک و ترقی۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک حیدر آباد میں قیام اور سررشتۂ علوم و فنون اور انجمن ترقی اردو کی نظامت۔

دارالعلوم ندوہ کی معتمدی (۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک)۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک ندوۃ العلماء کے رسالے "الندوہ" کی ادارت۔

[illegible] تمغۂ مجیدی کا حاصل ہونا۔

دوسرے بہت سے تعلیمی اور سیاسی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کی تجویز جس کی تکمیل سے کچھ ہی عرصہ قبل ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

ان کی بیشتر تصانیف علم کلام، تاریخ ادب اور تاریخ سے متعلق ہیں۔ سرسید احمد خان کے رفقا میں شامل ہونے کے بعد انہوں نے ٹھوس علمی تصانیف کی طرف توجہ دی۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۸ء تک مدرسۃ العلوم کے استاد رہے۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے مصر اور ترکی کی سیاحت کی اور سفرنامہ شام و روس کے نام سے سفرنامہ اور مشاہدات تحریر کیے۔ ۱۸۹۳ء میں "سیرت النعمان" کے نام سے امام ابوحنیفہؒ کی سیرت لکھی۔ ان کا ایک اہم علمی کارنامہ "الفاروق" ہے جو حضرت عمرؓ کی سیرت پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۸۹۹ء میں مکمل ہوئی۔ ان کی ایک اور اہم ادبی تصنیف "موازنۂ انیس و دبیر" ہے جو تنقیدی تحریر پر مشتمل ہے۔

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ شبلی کی ذہنی پریشانیوں کا زمانہ تھا جس میں سیاسی نظریات کے انتشار اور علمی و مجلسی منصوبوں کی تجویز و تشکیل کے عوامل شامل تھے لیکن اسی عہد میں انہوں نے فارسی شاعری کی تاریخ پر "شعر العجم" کے عنوان سے پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔

ندوۃ العلماء سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی اہم ترین تصنیف "سیرت النبیؐ" کی تالیف کی طرف توجہ کی۔ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ لیکن ابھی پہلی جلد ہی لکھ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ سیرت النبیؐ کی کل چھ جلدیں ہیں باقی کا کام ان کے لائق جانشین سید سلیمان ندوی نے پورا کیا۔

شبلی ایک حساس اور اثر پذیر شخص تھے اور اسی کے باعث ان کے ذہنی رجحانات میں عہد بہ عہد تغیر رونما ہوتا تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر وہ سرسید کو پسند کرتے تھے لیکن کچھ معاملات میں ان سے بیزاری کا اظہار بھی ان کے ذہنی رجحانات میں تبدیلیوں کا ثبوت ہے۔ ان کی زندگی پر ان کی طبیعت کے باعث طرح طرح کے اثرات مرتب ہوئے لیکن سب سے زیادہ گہرا اور پائیدار تاثر ان کی شخصیت پر مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور سرسید احمد خاں ہی کا مرتب ہوا۔

شبلی کے لیے سرسید کی رفاقت بہت مفید تھی۔ انہوں نے سرسید کے کتب خانے سے بہت استفادہ کیا۔ گو بعد میں شبلی اور سرسید کے نقطۂ نظر میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا لیکن ان کی شخصیت پر سرسید اور علی گڑھ کے اثرات سے انکار کرنا تاریخی واقعے سے انکار کے مترادف ہے۔

شبلی علی گڑھ تحریک کے اہم راہنما تھے۔ شبلی کی مصنفانہ حیثیتوں میں سب سے اہم ان کی مورخانہ حیثیت ہے۔ المامون، الفاروق، تاریخی مقالات و مضامین اور سیرۃ النبی کی پہلی جلد ان کی تاریخی کاوشوں کے شاہکار ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ کو فلسفۂ [illegible] اور اسے تہذیب انسانی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ شبلی ایک نقاد، ایک اچھے مکتوب نگار اور نثر لکھنے والے کی حیثیت سے اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ ان کی دیگر حیثیتیں اردو اور فارسی کے ایک اچھے شاعر، سیاست دان، ماہر تعلیم، صحافی مقالہ نگار کی ہیں۔

شبیب بن یزید

ابن نعیم۔ ایک خارجی سردار۔ وہ چھاپہ مار جنگ کا ماہر تھا۔ وہ کبھی جم کر ایک جگہ نہیں رہتا تھا۔ بلکہ مستقل اپنا مقام بدلتا رہتا تھا۔ حجاج نے اس کے تعاقب اور خاتمے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بہت چوکنا اور باخبر رہتا تھا۔ حجاج نے اپنی مدد کے لیے خلیفہ سے درخواست کی اور ایک بڑی جمعیت اس کی مدد کے لیے آگئی۔ آخر ایک خونریز لڑائی کے بعد شبیب پسپا ہوکر پیچھے ہٹا اور ایک دریا عبور کرتے وقت ڈوب گیا۔ اس کی شکل و صورت قد کاٹھ اور جسمانی طاقت اس کے افسانوی معرکوں کے عین مطابق تھی۔

شبیر احمد عثمانیؒ

معروف فقیہہ و عالم۔ پیدائش ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء۔ والد کا نام مولانا فضل الرحمٰن عثمانی تھا جو مولانا محمد قاسمؒ کے ساتھ بانئ دارالعلوم دیوبند میں برابر کے شریک تھے۔ جو علامہ شبیر احمد کی پیدائش کے وقت بجنور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی تعلیم کا آغاز ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ اور ۱۳۲۵ھ میں وہ تمام دورے کے طلبہ میں اول رہ کر تعلیم سے فارغ ہوئے۔

عہد طالب علمی میں ہی ذہانت و فطانت کا شہرہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں طلبہ کو منطق وغیرہ کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ آپ نے مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی لیکن ان میں سب سے بڑے استاذ الحدیث مولانا محمد حسن صاحب مالٹا تھے۔ منطق و فلسفہ میں انہوں

علامہ شبیر احمد عثمانی

Marfat.com

نے مولانا غلام رسول صاحب سے کسب فیض کیا۔
تعلیم سے فارغ ہوکر آپ نے چند ماہ دارالعلوم میں اونچے درجے کی کتابیں پڑھائیں بعد ازاں فتح پوری مسجد دہلی کے عربی مدرسے میں صدر مدرس کے عہدے پر ۱۹۰۹ء میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی تقاریر کے باعث آپ کے علم اور حسنِ بیان کا بہت شہرہ ہوا۔ علامہ کے قیام دہلی کے دوران مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند پہنچ چکے تھے۔ اور وہاں انہوں نے جمعیۃ الانصار کی بنیاد ڈال دی تھی۔ علامہ بھی دہلی سے دیوبند کی مجالس میں شرکت کے لیے جاتے تھے۔ اس انجمن کا مقصد مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ جمعیۃ الانصار کے پہلے جلسے میں جو مراد آباد میں ہوا۔ علامہ نے اپنا مقالہ "اسلام" پڑھا جس کو سن کر علماء و فضلاء حیرت زدہ رہ گئے اور ان کے علم و فضل کے معترف ہو گئے۔ بعد میں ہونے والے جلسوں میں بھی انہوں نے تقاریر کیں اور مقالے پڑھے اور ہندوستان بھر میں ایک جید عالم کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔
آپ کو فنِ تفسیر سے کمال حاصل تھا۔ آپ کا زبردست شاہکار قرآن کریم کے وہ تفسیری فوائد ہیں جو پاک و ہند میں چھپ کر مقبول ہوئے۔ فن حدیث و فقہ میں ان کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مسلم کی شرح، فتح الملہم کی تین جلدیں نہ صرف ہند و پاک کے مسلمانوں بلکہ تمام عالم اسلام کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ وہ فقط اپنے دور کے مشہور مفسر ہی نہ تھے ایک اعلیٰ متکلم بھی تھے اور علم کلام میں انھیں مایۂ ناز دسترس حاصل تھی۔ وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ قادر الکلام عالم تھے۔
علامہ نے ۱۹۱۱ء کی جنگِ بلقان و طرابلس سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا اور مسلمانوں کی بڑی سیاسی خدمت سرانجام دی۔ تحریکِ خلافت میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد علامہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اور تحریک پاکستان کے ہندوستان کے طول و عرض میں دورے کیے۔ علامہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی وہ ملک و قوم اور دین کی خدمت میں مشغول رہے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

شبینہ

ایک مذہبی اصطلاح۔ اس کا مطلب ہے ایک رات میں نماز تراویح کے دوران قرآن ختم کرنا۔ پاک و ہند میں اس کا بڑا رواج ہے۔ ایک یا کئی حافظ مل کر رمضان کی آخری راتوں میں قرآن ختم کرتے ہیں۔ اس خوشی میں چراغاں کیا جاتا ہے اور شیرینی تقسیم کی جاتی ہے۔ بعض علماء نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔

شجاع بن وہب

ایک صحابیٔ رسولؐ۔ جو شرجیل بن عمرو والی بصریٰ کے پاس آنحضرتؐ کا مکتوب لے کر گئے جس میں حضورؐ نے اسے دعوتِ اسلام دی تھی۔ لیکن شرجیل والی بصریٰ کو دعوت اسلام دینے پر آگ بگولا ہو کر شہید کروا دیا۔

شجر ممنوعہ

وہ درخت جس کا پھل کھانے کی آدم اور حوّا کو جنت میں ممانعت کر دی گئی تھی۔ قرآن میں باقاعدہ ایک آیت درج ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم (آدم و حوّا) جنت میں جہاں چاہو پھرو اور جو چاہو کھاؤ لیکن اس درخت کے نزدیک مت جانا۔ یہ درخت کس پھل کا تھا اس پر مختلف مذاہب میں اختلاف ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک وہ گندم کا پودا تھا۔ عیسائیوں کے نزدیک وہ [illegible] گیہوں کا پودا تھا۔ اور بعض کے نزدیک انگور کا [illegible] رس نشہ آور ہوتا ہے جو ہر جاندار کو بدمست [illegible] (دیکھیے: آدم و بائبل)

شجر الدر

اسلامی دور کی ایک عورت جو مصر کی تخت نشین ہوئی۔ وہ الصالح نجم الدین ایوب کی کنیز تھی۔ جس نے اسے اپنے چچا زاد بھائی الملک ناصر داؤد کے پاس اس کے زمانہ قید میں بھجوا دیا۔ شجر الدر کے پیروؤں کو اس کی عقل و دانش پر بہت اعتماد تھا انہوں نے اپنے سکے پر اس کا نام "ملکۃ المسلمین" لکھوایا۔ اہلِ مصر تو اسے ملکہ تسلیم کرتے تھے لیکن امرائے شام نے ان کی موافقت نہ کی۔ دمشق ملک الناصر یوسف ثانی کے سپرد کر دیا۔ خلیفہ نے اہلِ شام کی طرفداری میں اہلِ مصر کو حکم دیا کہ وہ اپنے لیے کوئی نیا سلطان منتخب کرلیں۔ مصریوں نے اتابک عزالدین کو سلطان منتخب کر لیا جس کے مراسم پہلے ہی سے شجر الدر کے ساتھ تھے۔ اس نے سلطان منتخب ہوتے ہی اس سے شادی کرلی۔ شجر الدر کی حکمرانی کی مدت کل ۸۰ دن ہے۔ اقتدار کی کشمکش میں اتابک قتل ہو گیا۔ اس کے قتل کے بعد اس کی پہلی بیوی کی باندیوں نے شجر الدر کو کھڑاؤں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ ایسی۔ اس جیسی زبردست عورت مصر کے اسلامی عہد میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ نہایت مدبر اور منتظم تھی۔

شجرہ

وہ جدول جس سے سلسلۂ نسب، سلسلۂ تلمذ یا سلسلۂ طریقت بیان کیا جائے اس کی شکل درخت کی سی ہوتی ہے۔ اس میں اصول جڑ اور فروع شاخوں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے، اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی سی ہے اول اول اس کا رواج شجرۂ انساب میں ہوا۔ پھر صوفیاء وغیرہ نے اپنے شجرے بنا لیے اور پھر علوم و فنون میں بھی اس طرح کی شکلیں بنائی جانے لگیں۔

شداد بن اوس

نام شداد۔ کنیت ابویعلیٰ نیز ابوعبدالرحمٰن۔ قبیلہ خزرج۔ اپنے سارے خاندان کے ساتھ اسلام لائے۔ آپ نے پچاس کے قریب احادیث روایت کی ہیں۔ نہایت عابد اور پرہیزگار تھے۔ اکثر تمام رات مشغولِ عبادت رہتے، حلیم الطبع، کم سخن۔ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر فیض یاب ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی شہرت دور دور تھی۔ ۵۸ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بیت المقدس میں دفن ہوئے۔

شر

عربی زبان کا لفظ جو اردو میں مستعمل ہے۔ اس کے معنی۔ فساد، لڑائی، خرابی کے ہیں۔ یہ لفظ خیر کے اختلاف میں استعمال ہوتا ہے۔ اسلام نے خیر کو پسند اور شر کو ناپسند کیا ہے اور رفع شر کے لیے تاکید و قیام خیر کی ہدایت کی ہے۔

شراب

نشہ آور مائع جو پانی اور دیگر چیزوں کو ملا کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کا

Marfat.com

[illegible] ایتھائل الکحل اور پانی ہے۔ یہ اناج اور بہت سے دیگر پھلوں سے بھی تیار کی جاتی ہے۔ عموماً انگور سے تیار ہوتی ہے۔ شراب ایک قدیم نشہ آور مشروب ہے۔ بائبل میں اس کا ذکر حضرت نوحؑ کے حوالے سے آتا ہے۔ اسے پی کر آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔ زیادہ پینے سے بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس کے استعمال سے اخلاق اور معاشرتی نظم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور اسلام میں اس کے لیے سزا کی حد مقرر ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے شراب پینے کی سزا میں کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دوران خلافت شرابی کو چالیس درّے لگوائے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں شرابی کے لیے کوڑوں کی سزا اسّی تک ہو گئی تھی۔

شرابی

دیکھیے: "اشربہ"

شرات

ایک قرآنی اصطلاح جس کا مطلب ہے "وہ جنہوں نے اپنی جانیں خدا کو بیچ دیں" یعنی ان کا مقصودِ حیات خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہونا ہے۔ اس اصطلاح کو انتہا پسند خارجیوں نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

شرب

بندگی کی شیرینی، بندگی کی لذت، محبت کی راحت۔ شرب کے بغیر انسانی امور عدم دلچسپی اور کوفت پیدا کر دیتے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں افعال میں ایسے بنیادی دخل حاصل ہے۔ ذوق اور شرب میں اتنا فرق ہے کہ شرب فقط راحتوں میں استعمال ہوتا ہے اور ذوق رنج و الم میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔

شرحبیلؓ بن حسنہ

کنیت ابوعبداللہ۔ ان کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام حسنہ تھا۔ جنہوں نے عبداللہ کی وفات کے بعد سفیان انصاری سے شادی کر لی۔ اس لیے ماں کے نام سے منسوب ہوئے۔ آغاز اسلام میں ہی مسلمان ہوئے۔ مکہ سے حبشہ ہجرت کی اور بہت عرصہ وہاں گزارا۔ بعد میں مدینہ آ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں پہلے معرکۂ بصریٰ میں افسر مقرر ہوئے۔ بعد میں سپہ سالارِ اعظم مقرر ہوئے۔

۱۸ھ کو اسلامی فتوحات کے دوران ہی شام میں طاعون کا مرض پھیلا جس میں آپ کا انتقال ۶۷ سال کی عمر میں ہو گیا۔ بہت بہادر اور قوی ہیکل تھے۔ علم و فضل میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ نے چند احادیث بھی روایت کیں۔

شرح صدر

دیکھیے: شقِ صدر۔

شرع

دیکھیے: شریعت

شرف الدینؒ احمد منیری

خطۂ ہند کے ان صوفیاء اور اولیائے کرام میں سے ہیں جنہوں نے اتباعِ سنت خدمتِ خلق اور تعلیمات دین کی ترویج و ترقی کے لیے بہت کوششیں کیں۔ تصوف اور فقہ پر ان کی تصانیف اہمیت کی حامل ہیں۔ ۲۶ شعبان ۶۶۱ھ میں منیر کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ہاشم بن عبد مناف سے ملتا ہے۔ والدہ کا نسب نامہ چودھویں پشت میں حضرت امام جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔ ان کا خاندان بیت المقدس سے ہندوستان آیا۔ اس کا امتیاز زہد و تقویٰ تھا۔ بہت سے لوگ اس خاندان کی بدولت مسلمان ہوئے۔ ابوتوامہ نے انھیں کلام پاک، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم دی۔ شیخ نجیب الدینؒ کی بیعت کی۔ شرف الدینؒ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔

وہ سماع کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تین شرائط وضع کیں۔

۱۔ مکان یعنی مجلس سماع مشائخ کی جگہ ہو، پاکیزہ، کشادہ اور روشن ہو۔

۲۔ اخوان یعنی مجلس سماع کے شریک درویش ہوں یا ان کے دوست ہوں۔ اہل تمیز اور تربیت یافتہ ہوں۔

۳۔ زمان یعنی وقت سماع دل تمام چیزوں سے خالی ہو۔

آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑیں۔ زیادہ اہمیت آپ کے مکتوبات کو ہے۔ آپ اپنے مریدوں کو عموماً مکتوبات کے ذریعے ہدایت و دعوتِ شریعت دیا کرتے تھے۔ ان مکتوبات میں تصوف و فقہ پر عالمانہ فکر اور مدبرانہ حل ہوتے تھے۔

شرقپوری شیر محمد

دیکھیے: "شیر محمد شرقپوری"

شرک

قرآن میں توحید کے انکار کو شرک کہا گیا ہے اور منکر کو "مشرک" کہا گیا ہے۔ شرک کے لفظی معنی کسی کو شریک کرنے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں کسی کو خدا کی ذات یا صفات میں شریک بنانا شرک کہلاتا ہے۔ قرآن نے شرک کو بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کے لیے معافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تنویت، تثلیث اور بت پرستی کو باطل قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان کسی وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔

شرم

دیکھیے: "حیا"

شرود

لغوی معنی بھاگنا۔ اصطلاحی معنوں میں خدا تک پہنچنے میں جو موانع اور پردوں سے دل میں بے قراری پیدا ہوتی ہے اس سے خلاصی پانے کے لیے بھاگنا۔ طالب حق کے تمام مصائب حق تعالیٰ سے حجاب کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اس حجاب کو دور کرنے میں طالبان حق کی ہر تدبیر کو شرود کہتے ہیں۔

Marfat.com

۲۸۹۸۴

شریح قاضی

تفسیر، حدیث اور فقہ کے جید عالم۔ اپنے وقت کے قاضی القضاۃ تھے۔ انہوں نے تدوین حدیث کے باب میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ ان کا تعلق تابعین سے ہے۔

شریعت

لغوی معنی کھلا اور سیدھا راستہ۔ اصطلاحی معانی میں اسلامی قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں تعین شدہ اصولوں اور قوانین پر مشتمل ایک ضابطہ جس میں بحث یا اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کا نفاذ اور ترتیب عین خدائی احکامات پر مبنی ہے۔

شریعت دراصل وہ خدائی احکامات ہیں جو اخلاقیات سے علیحدہ ہیں۔ ان میں حقوق، فرائض، وراثت، جرم و سزا وغیرہ شامل ہیں۔ شریعت کی بنیاد چونکہ قرآن اور سنت پر ہے۔ اس لیے کسی جماعت یا فرقے کو اس میں تنقید کا حق حاصل نہیں۔

قوانین شریعت دو قسموں پر مشتمل ہیں:

۱۔ حقوق اللہ! جن میں عبادت وغیرہ سے متعلق قوانین و احکام ہیں۔

۲۔ حقوق العباد۔ ان میں عدالتی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر احکام شامل ہیں۔

اسلامی شریعت میں انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے صاف، کھلے اور واضح احکام موجود ہیں۔ کسی عہد یا کسی شخص کو ان میں رد و بدل کی اجازت نہیں انھیں ان کی اصل حالت میں تسلیم و قبول کا حکم ہے۔

شریف حسین بن علی

حجازی سادات کے ایک مقتدر گھرانے کا فرزند۔ اس خاندان کے متعدد افراد عثمانی حکومت میں مکہ معظمہ کے والی رہ چکے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں استنبول میں پیدا ہوئے۔ شریف حسین نے مکہ معظمہ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ جوانی میں شعر و شاعری اور شکار کا دلدادہ تھا۔ شریف حسین نے حجاز کی خود مختار حکمرانی کے لالچ کے عوض ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ شریف حسین جاہ طلب اور طالب اقتدار تھا۔ اس نے فرات سے نیل تک اپنی حکمرانی قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ وہ آخری عمر میں ناکامی اور محرومی کا شکار رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر شریف حسین اور اس کے بیٹے انگریزوں کے دام فریب میں آ کر خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت نہ کرتے تو آج اسرائیل کا کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

شطاریہ

یہ لفظ، عیاری اور چابکدستی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صوفیا کا ایک فرقہ جو بنو عباس کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس گروہ کے سیاسی عقائد دوسرے لوگوں کے نظریات سے مختلف تھے۔ شطاریہ شکایت سے گریز کرتے ہیں اور جو کچھ کھانے کو مل جائے کھا لیتے اور یہ کہ خدا بقا میں وہ فنا کے شغل کو فعل عبث گردانتے ہیں اس کا نفس ربوبیت میں ہے اور تمہارا نفس (مخلوق مراد ہے) عبودیت میں ہے۔

شط العرب

لفظ شط کے معنی کسی ندی کا کنارہ ہیں۔ عراق عرب میں بڑے دریاؤں کے معنی میں استعمال ہوا [illegible] شط العرب [illegible] دجلہ کے سنگم سے [illegible] کہتے تھے [illegible] دریاؤں کے علاوہ شط العرب [illegible] شط العرب تقریباً [illegible] میل لمبا اور ۲۰۰ گز چوڑا ہے [illegible] جن کے لیے پندرہ فٹ پانی کی گہرائی درکار ہوتی ہے۔

شطح

عربی لفظ جمع شطحات۔ تصوف کی ایک اصطلاح جس سے مراد عالم سکر میں کہے گئے الفاظ مراد ہیں نیز خلاف شرع الفاظ زبان سے ادا کرنا۔ کشف کی رو سے وہ کلمات جو عالم مستی میں بے اختیار زبان سے ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً منصور کا انا الحق کہنا۔ مشائخ نے ایسے کلمات کو نہ رد کیا ہے اور نہ تسلیم کیا ہے۔ یہ اصطلاح دسویں صدی عیسوی میں صوفیا نے اختیار کی۔ مسلم صوفیا متفقہ طور پر اس میں وہ علامات دیکھتے ہیں جو ابتدائی صوفیانہ واردات کے ظہور کے بعد صوفی کی روح تک پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن اہل علم کی اکثریت نے عقیدۂ توحید اور پابندیٔ شرع کے خیال سے فنائے ذات کے مقام سے قبل اس سے گریز کرنے پر اتفاق کیا ہے۔

شعب ابی طالب

مکہ معظمہ کے قریب ایک درہ جو بنو ہاشم کی موروث تھا۔ ۷ھ میں کفار مکہ نے طے کیا کہ بنو ہاشم اگر آنحضرتؐ کو ہمارے حوالے نہیں کرتے تو ان سے ہر قسم کے تعلقات توڑ لیے جائیں۔ بنو ہاشم اور خاص طور پر حضورؐ کے چچا یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ رسولِ خدا کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ سوائے ابولہب کے تمام بنو ہاشم اس درے میں چلے گئے۔ اور تین سال تک نہایت تنگی اور تکلیف سے وہاں گزارے۔ ایک دن حضورؐ نے ابوطالب سے کہا کہ میرے پاس آنے والے فرشتے نے خبر دی ہے کہ مقاطعے کی عبارت کو کیڑے کھا گئے ہیں۔ ابوطالب نے کفار مکہ سے کہا کہ میرے بھتیجے نے اس طرح کہا ہے اگر یہ درست ہے تو یہ مقاطعہ ختم کر دو۔ اگر یہ بات درست نہ ہوئی تو ہم اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ کاغذ دیکھا گیا تو حضورؐ کا ارشاد درست تھا۔ اس طرح ۱۰ھ میں حضورؐ بنو ہاشم کے ساتھ اس درے سے باہر آ سکے۔

شعبان

قمری سال کا آٹھواں مہینہ۔ پاک و ہند میں یہ مہینہ شب برات کے لیے مشہور ہے۔ حدیث کی رو سے حضور اکرمؐ نفلی روزے ترجیحاً شعبان ہی میں رکھا کرتے تھے۔ شعبان کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس مہینے میں عرب پانی وغیرہ کی تلاش یا لوٹ مار کے لیے نکل جاتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے شعبان سے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مہینہ رجب اور رمضان کے درمیان آتا ہے۔

شعبی

ابو عمرو بن شراحیل بن عمرو الشعبی محدث۔ ابتدائے اسلام کے ان مشاہیر میں سے ہیں جنہوں نے ناموری اور شہرت حاصل کی۔ ان کے والد ممتاز ترین قاریوں میں سے تھے۔ شعبی ایک دبلے پتلے مختصر سے آدمی تھے [illegible] اکثر ستاتے تھے۔ دوسرے علمائے دین کے برعکس ان میں ظرافت بھی موجود تھی

Marfat.com

سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ... ۵ صحابہ سے احادیث سنیں۔ امام ابوحنیفہؒ اُن کے شاگردوں میں سے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے خود کبھی فقیہہ ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا لیکن کوفے کے فقہا ان سے مشورہ کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے بقول وہ ایک ماہ تک مسلسل اشعار سن سکتے اور ان کے اشعار کا ذخیرہ پھر بھی ختم نہیں ہوتا تھا۔

شعراء۔سورۃ

دیکھیے : "الشعرا"

شعرانی

ایک نسبت جس سے بہت سے لوگ مشہور ہیں۔ ابوالواہب الشعرانی ایک جامع العلوم صوفی۔ وہ نقد و جرح کے قائل نہ تھے اور اپنی قدر و منزلت کے متعلق حد سے بڑھا ہوا مبالغہ ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ اپنی تصانیف کے متعلق ان کا دعوےٰ ہے کہ انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اسلامی دنیا پر اپنے دُور رس اثر کے لیے وہ اپنی ذہنی قابلیت و استعداد کے علاوہ وہ اپنی کثرتِ تصنیف کے ممنون ہیں۔ ان کا سہل اور قابلِ فہم انداز ان کی مقبولیت کا باعث ہے ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں مقبول عام ہو گئیں۔ ان کے اپنے دعووں کے باوجود ان کے ہاں کوئی خاص جدت نہیں۔ مثلاً وہ بعض کتابوں میں محی الدین ابنِ عربی کی کتاب "فتوحات مکیہ" سے متاثر ہیں بلکہ ان کی ایک تصنیف تو محض ابنِ عربی کی اس کتاب کا خلاصہ ہے۔ الشعرانی نے اپنے اندر فقہ اور تصوّف کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اس لیے وہ کسی طور شریعت کے مخالف نہیں کہے جا سکتے۔

شعریٰ

ایک روشن اور چمکدار ستارہ۔ اپنی چمک دمک میں اسے سب ثوابت پر سبقت حاصل ہے۔ عربوں کے ہاں زمانہ جاہلیت میں بھی یہ ستارہ معروف تھا اسے المرزم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دو ہیں۔ ایک الشعریٰ العبور اور دوسرا الشعریٰ الغمیصا۔ کچھ جاہلی عرب شعریٰ العبور کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ قدیم عربی شاعری میں شعریٰ کا ذکر آتا ہے۔

مسلمانوں کے علمِ نجوم میں اس ستارے کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس کے دور کی بنا پر پیش گوئی کے امکانات بے شمار ہیں۔ چاند کے ساتھ اس کے بیک وقت طلوع کو منجموں نے ہمیشہ اسے ایک مسعود قرآن تصور کیا ہے۔

شعوبیہ

عجمیوں کی وہ جماعت جو اپنے مقابلے پر عربوں کے تفاخر کو اعتراض کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس جماعت سے تعلق رکھنے والے کو شعوبی کہا جاتا ہے۔

گو اسلام نے عرب و عجم کے رہنے والوں کے درمیان رنگ و نسل کے تمام تر امتیازات کو ختم کر دیا اور ان کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ لیکن عربوں کے مقامی اور اہلِ عجم کے غیر مقامی ہونے کے باعث بعض عرب جو برتری کا احساس روا رکھتے تھے ان پر اعتراض کرتے ہوئے شعوبیوں نے قرآن کی آیات اور حضورؐ کی احادیث بطور سند پیش کیں۔ عربی میں شعوب کا لفظ غیر عرب قبائل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

شعیا

ابن آموص۔ ایک نبی جو یہودا کے بادشاہ حزقیا بن آحاز (۷۲۹ - ۶۸۸ ق م) کے عہدِ حکومت میں بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ جب سنحریب نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو وہ بھی بنی اسرائیل کے ساتھ محصور تھے۔ انہوں نے اس بادشاہ کو خبر دی کہ تیری موت پندرہ سال کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے علاوہ باقی تمام محاصرین فنا ہو گئے۔

محمد بن اسحاق کے بیان کے مطابق شعیا یہودیوں سے بھاگ کر جو ان کی پیشگوئیوں کی بنا پر ان کے خلاف ہو گئے تھے ایک درخت کے پاس پہنچے جو ان کے لیے پھٹ گیا۔ اور انہوں نے اس میں پناہ لے لی۔ شیطان نے ان کے لبادے کا ایک کونہ پکڑ لیا جو درخت سے نکلا ہوا نظر آتا تھا اور ان کا سراغ دیتا تھا۔ بنو اسرائیل نے درخت کو درمیان میں آرے سے کاٹ دیا۔

شعیب

شعیب علیہ السلام۔ ایک پیغمبر جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہ حضرت ھودؑ، صالحؑ اور لوطؑ کے بعد مبعوث ہوئے۔ وہ اصحاب الایکہ کی طرف بھیجے گئے تھے۔ بعد کے مفسرین انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر تصور کرتے ہیں حالانکہ قرآن نے حضرت موسیٰؑ کے خسر کا کوئی نام نہیں بتایا۔

اشاعتِ توحید کے علاوہ انہوں نے اپنی قوم کو ناپ تول میں ایمانداری برتنے کی تاکید کی اور حقوق العباد ادا کرنے، اور امن عامہ میں خلل اندازی سے انہیں ڈرایا۔ لیکن قوم کے امرا نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ اور انہیں اور ان کے پیرووں کو نکال دینے کی دھمکی دی۔ قوم کے دلوں میں ان کے لیے احترام اور عزت نہیں تھی اور اگر قوم کو ان کے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ انہیں سنگسار کر دیتی۔ ان گناہوں کی پاداش میں وہ ایک زلزلے کی زد میں آ گئے اور اپنے اپنے گھروں میں مردہ پائے گئے۔

شفاعت

بمعنی دعا، سفارش، توسط، میانجی گری۔ میانجی کو شفیع کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح امور دنیا و آخرت دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ عدلیہ اور قضا کے سلسلے میں سفارش کے متعلق بہت کم ذکر ہے۔ خصوصاً یہ اصطلاح دینی مفہوم میں اور خاص کر قیامت کے سلسلے میں مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں لفظ شفاعت زیادہ تر ایک منفی سیاق و سباق میں ملتا ہے۔ قیامت وہ دن ہوگا جب کسی کی شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔ اسلام میں شفاعت کو کاملاً امکان سے خارج قرار نہیں دیا گیا۔ روزِ حساب ... کی شفاعت کا ذکر ایک حدیث میں ملتا ہے۔

شفائیؒ

ایران کے دو طبیبوں کا تخلص جو شاعر بھی تھے

(۱) مظفر بن محمد حسینی شفائیؒ کاشانی جو حکیم شفائیؒ کے نام سے معروف ہے اپنے عہد کے نامور اطبا میں سے تھا۔

ابتدا میں اس کا تعلق کاشان کے لوگوں سے تھا۔ لیکن اس نے اپنی زندگی اصفہان میں گزاری۔ اس کا انتقال ۹۶۳ھ میں ہوا۔ فارسی زبان میں اس نے طب پر چند کتابیں لکھیں جن میں سے ایک قرابادین (علم الادویہ) کے موضوع پر قرابادین حکیم شفائیؒ

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

کے نام سے مشہور ہے۔

۲۔ حکیم شرف الدین حسین بن حکیم ملا اصفہانی المتخلص بہ شفائی۔ اس کا باپ اصفہان کے مشہور طبیبوں میں سے تھا۔ اس نے طب کی تحصیل اپنے باپ ہی سے کی۔ اور خود بھی اپنے دور کے نامور اطباء میں شمار ہونے لگا۔ وہ شاہ عباس کا طبیب خاص تھا جو اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔

شفائی نے رمضان ۱۰۳۷ھ میں وفات پائی وہ ایک حاذق اور دانش مند طبیب تھا۔ طب میں اس نے کئی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں اس کی ایک کتاب قرابادین ہے۔

علاوہ بریں وہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا۔ شروع میں اس نے جی بھر کے ہجویہ شاعری کی اور اپنے ہمعصروں کی ہجویں لکھیں لیکن آخر میں تائب ہو گیا۔ اس کی کلیات اشعار، قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات اور چند مثنویوں پر مشتمل ہے۔

شفق

(الصبح، الفجر)

طلوع سحر اور شام کی وہ سرخی جو افق آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔ اس کو دنیائے اسلام اور اسلامی علم ہیئت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس سے نماز کے دو اہم ترین اوقات کا تعین ہوتا ہے۔

البیرونی نے اپنی کتاب میں شفق کی تشریح کی ہے۔ صبح کے وقت پہلے روشنی کا ایک پتلا اور لمبا سا عمود نمودار ہوتا ہے جو اس مقام کے عرض بلد کے لحاظ سے افق کی جانب کم و بیش جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اسے صبح کاذب یا الفجر الکاذب کہتے ہیں۔ اس کے بعد صبح صادق کا ظہور ہوتا ہے جو پہلے ہلکی سی سفید روشنی پر مشتمل ہوتی ہے۔ پھر افق پر بتدریج پھیل کر ہلال کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اس سے نماز فجر کے وقت کے آغاز کی نشاندہی ہوتی ہے اس کے بعد صبح کی سرخی نظر آنے لگتی ہے۔ بعینہٖ یہی مظاہر شام کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ صرف ان کی ترتیب برعکس ہوتی ہے۔

شافعی، مالکی اور حنبلی اس پر متفق ہیں کہ نماز مغرب کے وقت کا آخر اور نماز عشاء کے وقت کا آغاز اس لمحے ہوتا ہے جب شفق الاحمر کی سرخ جھلک غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ سفیدی کی جھلک پر اعتبار کرتے ہیں۔

شقران صالح رض

نام صالح۔ لقب شقران۔ والد کا نام عدی۔ عبدالرحمٰن بن عوف رض کے مشہور صحابی رسول اللہ ﷺ کے حبشی نژاد غلام تھے جنہیں بعد میں رسول اللہ ﷺ نے خرید لیا۔ آپ اسلام کے اولین دنوں میں مسلمان ہوئے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور مستقل وہیں رہے۔ عموماً جنگوں میں قیدیوں کی حفاظت کرتے تھے۔ غزوہ بدر میں انہوں نے محافظت کے فرائض اس دیانت داری اور محنت سے ادا کیے کہ حضور اکرم ﷺ نے خوش ہو کر انہیں آزاد کر دیا۔

شق صدر

شق کھولنا۔ پھاڑنا۔ صدر: سینہ۔ سینے کا کھولنا یا پھاڑنا۔

قرآن میں حضرت محمد صلعم کا سینہ شق کرنے کا ذکر ہے۔ روایت ہے کہ دایہ حلیمہ کے پاس پرورش کے دوران ایک دن جبکہ حضور ﷺ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف تھے۔ جبرائیلؑ ان کے پاس آئے اور انہیں لے گئے۔ پھر انہیں زمین پر لٹایا اور ان کا سینہ شق کیا اور پھر ان کے دل کو کھول کر اس میں سے کچھ خون نکالا۔ آپ سے کہا یہ نفس شیطانی کا حصہ تھا۔ اس کے بعد آپ کا دل اور سینہ اپنی اصل حالت میں لوٹا دیا۔ حضور ﷺ کے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں نے حلیمہ رض کو جا کر بتایا کہ آپ ﷺ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آگیا ہے۔ لیکن فوراً ہی آپ ﷺ حسب معمول مشاغل میں لگ گئے۔

شق قمر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ۔ اہل مکہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ اگر آپ خدا کے نبی ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے کر دیجئے۔ آپ نے انگلی سے اشارہ کیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس معجزہ کی طرف سورہ القمر میں اشارہ ہے۔ معتزلہ اس معجزے سے انکار کرتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب امریکی خلاباز چاند پر اترے تو واپسی پر انہوں نے چاند پر قیام کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے چاند پر ایک ایسی دراڑ دیکھی جو نگاہ کی حد سے بھی پرے چلی جاتی ہے۔ معجزہ شق القمر کے تیرہ سو سال بعد ایک غیر مسلم خلاباز کا یہ تائیدی بیان اس روایت کو نہ ماننے والوں کے لیے فکر پیدا کرتا ہے۔

شکر

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں، روحانی، ذہنی، جسمانی قوتوں، اختیارات اور مال و متاع کا صحیح طور پر استعمال کرنا اور ان کے غلط استعمال سے گریز اور احتیاط کرنا۔ اس کے برعکس کفر یا کفران نعمت ہے۔ اس کا مفہوم ناشکر گزاری میں داخل ہے۔

شکور

دیکھیے: "اسمائے حسنیٰ"

شگون

شگون لینے کا رواج زمانہ قدیم سے ہے باوجودیکہ انسانی عقل و ذہن میں بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے لیکن اس کے باوصف عوام کی کثیر تعداد اس پر اعتقاد رکھتی ہے مختلف مذاہب اور گروہوں میں شگون کے مختلف طریقے اور انداز ہیں۔

یہ توہمات فقط مشرق تک ہی محدود نہیں بلکہ مغرب کی جدید تہذیب بھی اس کی اسیر ہے۔ اسلام نے ان توہمات کی شدید مذمت کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رض روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ شگون کوئی چیز نہیں ہے۔ بہترین چیز فال نیک ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ فال کیا چیز ہے تو فرمایا کہ وہ اچھا کلمہ جس کو تم میں سے کوئی شخص کسی شخص سے یا کسی ذریعہ سے سنے۔

شماس بن عثمان

نہایت خوش شکل ہونے کے باعث شماس نام پڑا۔ اس سے قبل ابن عثمان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ مکہ سے حبشہ کو ہجرت کی اور وہاں سے مدینہ چلے آئے۔ جنگ بدر میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ جنگ

Marfat.com

[illegible] جنگ [illegible] ہوگئے دوسرے مجاہدین میدان چھوڑ [illegible] بہت ہجوم ہے۔ یہاں سے نہ گھوڑے سے جدا ہو کر گر پڑے۔ آپ کو زخمی حالت میں مدینہ لایا گیا لیکن جانبر نہ ہو سکے۔ ۴۳ برس کی عمر میں وفات پائی ؛

شمر ذی الجوشن

یزید اوّل کا ایک جرنیل۔ سخت دل، سخت طبیعت کا مالک تھا۔ ابن زیاد نے اسے اپنی خوبیوں کے باعث حضرت امام حسینؓ کے مقابلے پر بھیجا تھا۔ اس نے امام حسینؓ پر نارَوا سختیاں کیں۔ شہداۓ کربلا کے سر قلم کرنے کا حکم اسی نے دیا تھا۔ شمر پہلے حضرت علیؓ کے ساتھیوں میں تھا اور جنگ صفین میں ان کی جانب سے بہت بہادری سے لڑا تھا۔ اس نے اپنی ایک بہن کی شادی بھی حضرت علیؓ سے کی۔ حضرت عباسؓ اس کے ہمشیر زاد تھے۔ لیکن بعد میں وہ یزید کے ساتھ شامل ہو گیا ؛

شمس

دیکھیے : "الشمس"

شمس الدّینؒ ترک

نام شمس الدّین۔ شمس الاولیا خطاب ہے۔ خواجہ احمد   کی اولاد سے تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہؒ تک   ہوتا ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند تھے۔ حضرت شیخ علاؤ الدّین صابرؒ کے خلیفہ و جانشین۔ سلسلۂ صابری چشتی آپ ہی کے واسطے سے جاری ہے۔ ریاضت و مجاہدات۔ ذوق و شوق و استغراق میں بے نظیر، علوم ظاہری و باطنی، کشف و کرامات میں کمال درجہ رکھتے تھے۔

جب حضرت علی احمد صابر کلیری کی وفات کے دن قریب آئے تو انھوں نے شیخ شمس الدّین کو بلا کر خرقۂ خلافت عطا کیا اور وصیّت کی کہ میرے انتقال کے بعد تین دن سے زیادہ یہاں قیام مت کرنا بلکہ پانی پت جا کر خلق خدا کی خدمت کا فرض سرانجام دینا۔ پانی پت میں آپ خلق اللہ کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ وصال سے قبل خرقۂ خلافت شیخ جلال الدّین پانی پتی کو عطا کیا اور جانشین مقرر کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا ؛

شمس الدّین سبزواری

پیدائش سبزوار (عراق) ۵۶۰ھ، وفات ملتان ۶۷۵ھ۔ اصل نام محمد تھا ان کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس طرح ملتا ہے۔

محمد تبریزی ابن سید صلاح الدین محمد نوربخش ابن سید علی ملقب سلام الدین ابن سید عبدالمومن بادشاہ افریقہ ابن سید علی خالد الدین ابن سید محمد محب الدین ابن سید محمود سبزواری ابن سید محمد ابن ہاشم علی ابن سید احمد ہادی ابن سید منتظر باللہ ابن سید عبدالمجید ابن سید غالب الدین ابن سید محمد منصور ابن اسماعیل ثانی ابن سید محمد عرلیعنی ابن سید اسماعیل المرج اکبر ابن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام۔ شاہ شمس الدین تبریزی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ سبزوار میں پیدا ہوئے اس لیے آپ کو سبزواری بھی کہتے ہیں۔ کشمیر گئے تو وہاں میر شمس الدین عراقی کہلائے شام و مصر میں آپ کو شمس مغربی کہتے تھے۔ تبریز میں کافی عرصہ قیام کیا تو شمس تبریزی کہلائے۔

شمس تبریزی کے حالات زندگی، پیدائش، وفات اور قیام مزار وغیرہ کے متعلق بھی مورخین میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا مزار ملتان میں ہے۔ بعض کے نزدیک ان کا مزار تبریز میں ہے۔ ان کی وفات کے بارے میں اخبار الصالحین کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شمس سبزواری مولانا روم کے پاس بیٹھے تھے کہ کسی نے اشارے سے آپ کو باہر بلایا۔ آپ نے مولانا سے کہا کہ مجھے قتل کرنے کو بلاتے ہیں۔ پھر اٹھ کر باہر چلے گئے۔ جہاں سات افراد کھڑے تھے۔ انہوں نے آپ پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ قتل ہوتے وقت آپ نے اس قدر زور سے نعرہ لگایا کہ سات آدمی بے ہوش ہو گئے۔ ان میں مولانا روم کا بیٹا علاؤ الدین محمد بھی تھا۔ قتل کی جگہ آپ کی لاش موجود نہیں تھی فقط خون کے چند قطرے تھے۔ علاؤ الدّین ایک عجیب بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ مولانا روم نے اس کے جنازے میں شرکت نہیں کی۔

شمس الدین ہراتیؒ

تاریخ وفات ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء ہے۔ شجرہ نسب اس طرح ہے۔

شیخ شمس الدین ہراتیؒ بن شیخ امداقی بن خواجہ حسن انداقی بن شیخ حسین بن امام عاقل فقیہہ حقانی انداقی بن قاضی عبدالکریم انداقی بن ابی حنیفہ انداقی۔

آپ کے آباؤ اجداد بغداد سے بخارا کے ایک مضافاتی علاقے انداق آئے تھے۔

آپ نے انداق سے ہرات نقل مکانی کر لی۔ سلسلہ عالیہ قادریہ سے منسلک تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں کامل ہونے کے علاوہ کشف و کرامات میں بھی یکتا تھے۔ اپنے وقت کے فاضل تھے۔ آپ نے خواجہ عارف ایوگری مرید حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی زیارت کی اور ان سے فیض حاصل کیا۔ سیر و سیاحت کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلے میں لاہور بھی آئے لیکن جلد ہی واپس لوٹ گئے۔

شروع ہی سے آپ کی طبیعت مجاہدہ اور ریاضت کی طرف مائل تھی۔ اس لیے آپ جنگلوں، بیابانوں اور ویرانوں میں ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ شریعت کے نہایت پابند تھے۔ رزق حلال کماتے اور کھاتے تھے۔ امراء و سلاطین کے ہاں جانا معیوب سمجھتے تھے۔ آپ محب اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کی وفات ۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء کو ہرات میں ہوئی۔ آج بھی ان کا مزار ہرات میں مرجع خلائق ہے۔ ہزاروں لوگ یہاں سے فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں ؛

شمسیہ

درویشوں کا ایک سلسلہ جو شمس الدین ابو الثنا احمد بن ابی البرکات محمد سیواسی محمد ثالث کے عہد حکومت میں ان اولیاء کا ذکر ملتا ہے۔ سلسلوں کے ایک سلسلے میں جو ایک نقشبندی نے تیار کیا ہے۔ شمسیہ کو خلوتیہ کی ایک شاخ بتایا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط سیواس تک ہی محدود تھے۔ ایک اور مصنف اس نام کے ایک سلسلے کا بدویہ کی ایک شاخ کے طور پر ذکر کرتا ہے ؛

شوال

قمری سال کا دسواں مہینہ۔ اس کی پہلی تاریخ کو عید الفطر ہوتی ہے۔ اس مہینہ کی فضیلت عید کی وجہ سے ہے ایک حدیث میں نفلی روزہ رکھنے کے واسطے عید کے بعد چھ دن کی فضیلت بیان کی گئی ہے ؛

Marfat.com

شوریٰ (سورۃ)

لفظی معانی رائے، مشورہ، مجلس، تشاور سے ماخوذ جس کے معنی باہم صلاح مشورے کے ہیں۔

قرآن مجید کی ایک مکی سورت کا نام ہے جسے حمعسق یا عسق بھی کہتے ہیں۔ اس کا عدد تلاوت ۴۲ اور عدد نزول ۶۲ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس کی پانچ آیات مدینے میں نازل ہوئیں۔ اس سورۃ میں رکوع ۵، آیات ۵۳، کلمات ۸۶۰، حروف ۳۵۸۸ آئے ہیں۔

سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کی نبوت اور انبیائے گزشتہ کی نبوت کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم ایک ہی تھی۔ اور فروع میں اختلاف اوہان ایک قدرتی امر ہے لیکن دین کے معاملے میں جھگڑا کرنا اور بے معنی مخالفت پہ اتر آنا سرکشی اور عناد کے مترادف ہے۔ اس کے بعد قیامت کا ذکر ہے کہ مشرکین کو قیامت کی جلدی ہے لیکن اہل ایمان اس کے برپا ہونے سے ڈرتے ہیں کیونکہ مشرکین دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور آخرت پہ ان کا ایمان نہیں لیکن اہل ایمان قیامت پر یقین کے باعث اس سے ڈرتے ہیں۔ پھر تقسیم رزق کو مشیت ایزدی قرار دیا گیا ہے اور اس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد نیکی اور بدی کی جزا و سزا کا ذکر ہے۔ آخر میں منصب رسالت کے لوازم کے ساتھ ربوبیت و مشیت مطلقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

شوستری

دیکھیے، "شستری"

شوکت علی، مولانا

مولانا شوکت علی۔ تحریک پاکستان کے ایک قابل ذکر راہنما۔ مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی تھے لیکن جو امتیازی حیثیت مولانا محمد علی نے سیاسی زندگی میں حاصل کی وہ مولانا شوکت علی کے حصے میں نہ آئی۔ لیکن بہرحال جرأت و بے باکی اور ایثار و قربانی میں اپنے بھائی سے پیچھے نہ تھے۔

ابتدا میں بریلی میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ چلے گئے اور وہاں کھیلوں میں بہت شہرت حاصل کی۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر جب مولانا محمد علی جوہر نے ترکی کے حق میں اپنے رسالے کامریڈ میں ایک طویل اور زوردار مضمون لکھا تو ان کے ساتھ مولانا شوکت علی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے اور تحریک خلافت میں نہایت جوش و خروش سے شامل ہوگئے۔ ۱۹۲۱ء میں پھر نظر بند ہوگئے۔

تحریک خلافت کے حوالے سے "علی برادران" کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور وہ مسلمہ طور پر مسلمانوں کے راہنما تسلیم کیے جانے لگے۔

کانگرس نے علی برادران کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کے خلاف اپنی کارروائیوں میں ان کو شامل کرلیا لیکن برصغیر میں تحریک خلافت کے بعد جو صورت حال پیدا ہوچکی تھی اس کے تحت مسلمان ایک علیحدہ قوت کی حیثیت سے ابھر رہے تھے۔ بعد میں کانگرسی کارروائیوں کی ہندی ذہنیت کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد مولانا شوکت علی مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کرتے رہے۔

جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک چلی تو مولانا شوکت علی زیادہ نمایاں طور پہ قوم کے [illegible]

[illegible] آغا خاں [illegible]

آغا خاں کے ساتھ لندن [illegible] شامل ہوگئے [illegible]

۱۹۳۸ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ علی برادران تقریباً چالیس سال تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور برصغیر کی تاریخ میں اپنے لیے جگہ محفوظ کرلی۔

مولانا شوکت علی

شہاب الدّین سہروردی

دیکھیے: "سہروردی، شہاب الدین"

شہادت

لغوی معنی گواہی، قطعی خبر۔ عام طور پہ اس سے مراد وہ بیان جو اس علم کی بنا پر ہو جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدہ بصر سے حاصل ہوا ہو۔ وہ بات جو کامل یقین اور علم سے کہی جائے۔

شریعت کی اصطلاح میں ایک مسلمان کی بلا شرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حضور اکرمؐ کی رسالت کے اقرار کو شہادت کہا گیا ہے۔ روئے زمین پر اللہ کی حاکمیت اور کلمۃ اللہ کی اشاعت کی غرض سے ایک مسلمان کا اپنی جان دے دینا بھی شہادت ہے۔ شہید کا لفظ شہادت ہی سے مشتق ہے اسی لیے قرآن مجید میں شہید بمعنی شاہد آیا ہے۔ شہید وہ شخص جس کے حق میں جنت کی شہادت دی گئی ہے۔

Marfat.com

[illegible] شریعت میں [illegible] الفاظ [illegible] معنوں میں بھی استعمال [illegible] ان کے لیے دیکھیے "شاہد"۔

شہباز قلندر

دیکھیے: "لال شہباز قلندر"

شہد

ایک بہت گاڑھا مائع جسے مخصوص قسم کی مکھیاں پھولوں کا رس چوس کر تیار کرتی ہیں۔ نہایت قلیل تعداد میں شہد تیار کرنے کے لیے مکھیوں کو سینکڑوں پھولوں کا رس چوسنا پڑتا ہے۔ شہد قدیم ترین غذا اور قدیم ترین دوا ہے۔ خالص شہد ہزارہا برس تک اپنی اصل حالت میں رہتا ہے۔ قدیم یونانی دیوتاؤں کی غذا کے طور پر شہد کا ذکر ان کی کتابوں میں ہے۔ مصریوں کے ہاں بھی اس کی افادیت کا ذکر ہے۔ یہ توانائی زندگی کے لیے نہایت مفید قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں اسے شفا کا تحفہ کہا گیا ہے۔ یہ نہایت میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔ طول عمر اور قیام صحت کے لیے اطبا نے اسے تجویز کیا ہے۔ اس کی مختلف اقسام اور ذائقے بھی ہوتے ہیں۔ ان دنوں شہد کی مکھیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرکے مصنوعی طور پر شہد تیار کرنے کی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں۔

شہید

دیکھیے: "اسمائے حسنیٰ"

شیبہ (بنو)

قریش مکہ کا ایک خاندان جو حضرت شیبہ بن عثمان بن ابی طلحۃ عبداللہ بن عبدالعزیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصی کی اولاد ہیں۔ اس خاندان کو حاجب کعبہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بیت اللہ کی کلید برداری اور پاسبانی ان کے سپرد تھی اور یہ سعادت قبل اسلام بھی انہیں حاصل تھی۔ فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے یہ پاسبانی حضور نے اسی خاندان کو سپرد کر دی۔ عہد اسلام سے ہی یہ سعادت اسی خاندان میں چلی آ رہی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے والد طلحہ اور حضرت شیبہؓ کے والد عثمان دونوں بھائی غزوہ احد میں مشرکین مکہ کی طرف سے اسلام کے خلاف لڑتے ہوئے حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس خاندان کے کئی اور آدمی بھی مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ خاندان شیبہ کی نمایاں اسلام دشمنی کے باوجود فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے کلید برداری اور حجابت و شدانت بیت اللہ کا شرف اسی خاندان کے سپرد کر دیا۔

شیبانی ابو عبداللہ

ابو عبداللہ محمد بن الحسن بن فرقد۔ بنو شیبان کے ایک مولیٰ۔ نامور بزرگ حنفی فقیہ ۱۳۲ھ/۷۴۹ء - ۷۵۰ء میں واسط میں پیدا ہوئے۔ کوفہ میں پرورش پائی اور [illegible] سال کی عمر میں امام ابوحنیفہ سے تعلیم حاصل کی اور اپنے آپ کو علم فقہ کی تحصیل [illegible] سے واقف کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں وہ مسجد کوفہ میں خطبہ دیا کرتے تھے۔

انہوں نے علم حدیث حضرت سفیان الثوری اور امام مالک بن انس سے حاصل کیا۔ فقہ میں ان کی تربیت زیادہ تر امام ابو یوسف کی مرہون منت ہے۔

۷۹۳ء میں خلیفہ ہارون الرشید نے زیدی امام یحییٰ بن عبداللہ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ انہوں نے خلیفہ کی منشا کے خلاف رائے دی۔ خلیفہ یحییٰ بن عبداللہ کو سزا دینا چاہتا تھا اور امام محمد شیبانی کا مؤقف یہ تھا کہ یحییٰ بن عبداللہ کو امان دے کر عہد سے پھرنا اور انہیں سزا دینا کسی طور جائز نہیں۔ اس پر ناراض ہو کر خلیفہ نے عہدہ قضا سے انہیں ہٹا دیا، اور آئندہ افتا سے بھی روک دیا۔

وہ اصحاب الرائے میں اعتدال پسند تھے اور اپنی تعلیم کو حدیث تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ ایک قابل نحوی مانے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں امام شافعی کا نام بھی لیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے استاد سے کئی مسائل پر اختلاف کیا ہے۔ حنفی مذہب کی نشر و اشاعت کا سہرا ابو یوسف اور شیبانی کے سر ہے۔ انہوں نے کئی قابل قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔

شیث علیہ السلام

لغوی معنی اللہ کی بخشش۔ حضرت آدم علیہ السلام کے تیسرے بیٹے جو ہابیل کے قتل کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے جبکہ ان کے والد کی عمر ایک سو تیس سال تھی۔ چونکہ قابیل کے ہاتھوں ہابیل قتل ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نعم البدل کے طور پر اسے عطا کیا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام شیث یعنی اللہ کا عطیہ رکھا گیا۔ ابن الشیر کی تصریح کے مطابق وہ اللہ کے نبی تھے جن پر پچاس صحیفے نازل ہوئے۔ جب حضرت آدم فوت ہوئے تو انہوں نے انہیں اپنا وارث اور وصی مقرر کیا تھا۔ یہ شیث ہی ہیں جن سے نسل انسانی چلی کیونکہ ہابیل نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا تھا اور قابیل کے وارث سیلاب میں غرق ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ مکہ میں رہتے تھے اور تا زیست رسم حج ادا کرتے رہے۔ انہوں نے ان صحائف کو ایک جگہ اکٹھا کیا جو ان پر اور حضرت آدم پر نازل ہوئے تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کو پتھر اور چکنی مٹی سے بنایا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے انوش جانشین ہوئے۔ ان کی عمر ۹۱۲ سال بیان کی گئی۔ حضرت آدم بے ریش تھے۔ حضرت شیث کی داڑھی تھی۔ انہیں اوریا بھی کہا جاتا۔ اس سریانی لفظ کو "استاد" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے عہد میں انسان دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو ان کی اطاعت کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو قابیل کی اولاد کے پیرو تھے۔ حضرت شیث حضرت آدم کے چہیتے بیٹے تھے۔ ان کے بہت سے اقوال و حکم نقل کیے جاتے ہیں۔ المقنع کے خیال سے روح الوہیت حضرت آدم سے حضرت شیث میں منتقل ہو گئی تھی۔ یہ اعتقاد ایک مصری باطنی فرقے سے آیا ہے۔

شیخ

لفظ شیخ سے دو مفہوم وابستہ ہیں ۱- خاص ۲- عام

پہلے مفہوم کے مطابق شیخ الطریقۃ اپنے سلسلے کا دینی اور دنیاوی طور پر پیشوا ہوتا ہے۔ اس میں اخلاق حسنہ کا ہونا لازم ہے۔ اسے عالی ظرف، زہد کیش اور تمام اوصاف

Marfat.com

حمیدہ کا حامل ہونا چاہیے۔ وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے اس لیے اس میں علم وافر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسے شریعت کا گہرا علم اور نفس کے دشمنوں کا علاج معلوم ہوتا ہے۔ وہ بندے کو اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اپنے طریقے کی مخصوص تعلیمات یا بانی یا وارث ہوتا ہے اس لیے اس کی رضا کو خدا کی مشیت حاصل ہوتی ہے اور وہ خلق کو ہدایات کا جاری رکھنے والا ہوتا ہے۔ اسے کشف و کرامات کی

لیبا اوقات مرید متعدد شیوخ کی پیروی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان شیوخ کو سالکوں کے رہنما ہونے کے باعث مخصوص خطاب دیئے جاتے ہیں جن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ فلاں شیخ نے سالک کی کس طور راہنمائی کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سب سے پہلے شیخ الارادۃ ہے جو طریقہ صوفیا کا سب سے بلند مرتبہ شخص ہوتا ہے۔ اور صوفیا کے خیال کے مطابق جس کی رضا کے ساتھ قضائے الٰہی ہوتی ہے اور جس کی ہدایت یا وسیلے سے مرید روحانی اور جسمانی طور پر سلسلے میں داخل ہوتا ہے۔

۲۔ شیخ الاقتداء وہ ہے جس کی تقلید قولاً فعلاً مرید کرتا ہے۔

۳۔ شیخ التبرک وہ شخص جس کے پاس مرید برکت و فیض سے مالا مال ہونے کے لیے جائے۔

۴۔ شیخ الانتساب وہ ہے جس کی سفارش سے مرید کو جماعت میں داخل کیا جاتا ہے اور جس کا وہ خادم ہو کر رہتا ہے اور دنیوی امور میں اسی کی فرمانبرداری کرتا ہے اور اس کا خادم ہو کر رہتا ہے۔

۵۔ شیخ التلقین روحانی استاد ہوتا ہے جو جماعت کے ہر فرد کے لیے پڑھنے کے واسطے اوراد و وظائف کی تعداد و مقدار کا تعین کرتا ہے۔

۶۔ شیخ التربیہ وہ ہے جس کے ذمہ ابتدائے سلوک میں سالکوں کی تربیت ہوتی ہے۔ ان سب عہدوں کا حامل، جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے کوئی ایک شخص یا مختلف اشخاص ہو سکتے ہیں۔

شیخ کے دوسرے مفہوم کے مطابق اس سے مراد اس شخص سے ہے جو معمر ہو اور اس کی عمر پچاس سے زائد ہو چکی ہو۔ قوم یا خاندان کا سردار بھی شیخ کہلاتا ہے۔ اسلامی دور کی تاریخ میں یہ لفظ کثرت کے ساتھ علی سردار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک مہذب طریقہ خطاب بھی ہے۔ اور اس کے لیے عمر اور مرتبے کی تفریق نہیں ہے عموماً ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں عنان اقتدار ہو یا کوئی اعلیٰ منصب رکھتے ہوں۔ علماء فضلاء کے لیے یہ لفظ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو بھی شیخین کہا جاتا ہے۔ مفتی اعظم کو شیخ الاسلام اور پولیس کے اعلیٰ افسر کو شیخ المدینہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کی اصل اہمیت مخصوص طور پر اسلامی مذہبی اخوت یا طریقے میں ظاہر ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام

یہ ان اعزازی القاب میں سے ایک ہے جو چوتھی ہجری کے نصف آخر میں اختیار کیے گئے لفظ اسلام سے مرکب بعض دوسرے القاب مثلاً عز الاسلام، جلال الاسلام، سیف الاسلام وغیرہ ان لوگوں نے اختیار کیے جو زیادہ تر دنیوی اقتدار کے مالک تھے۔ لیکن شیخ الاسلام ان القاب مثلاً شیخ الدین، شیخ الفتیا وغیرہ میں سے ہے جو صرف علماء اور کبھی کبھی صوفیا کے لیے مخصوص رہا۔

یہ لقب بہت کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں خراسان میں اسماعیل بن عبدالرحمٰن کو وہاں کے سنی شیخ الاسلام کہتے تھے اسی زمانے میں صوفی ابو

رازی شیخ الاسلام [illegible]
بن گیا تھا۔ جو صرف ان [illegible]
حاصل کر چکے ہوں۔ ایران میں شیخ الاسلام ایک [illegible]

اس لقب کو زیادہ شوکت اس وقت حاصل ہوئی جب اس کا اطلاق [illegible] پر قسطنطنیہ کے مفتی اعظم پر ہونے لگا ایک وقت میں علماء و فضلاء کا [illegible] حکمرانوں میں بہت زیادہ ہوتا تھا اس کی تکفیر اور کبھی [illegible] چنانچہ [illegible] کی سیاسی و مذہبی حیثیت نہایت احترام و اعزاز کی مستحق تھی لیکن جوں جوں [illegible] اور حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عام معاشرت میں بھی دنیوی مشغولیت بڑھتی گئی ان کے اثرات اور رسوخ کم ہوتے گئے۔ لیکن عام عوام میں ان کا احترام بہرحال کسی نہ کسی حد تک موجود رہا۔

شیر محمد شرقپوریؒ، سائیں

میاں شیر محمدؒ بن میاں عزیز الدین بن محمد حسین بن حافظ محمد عمر بن محمد صالح بن حافظ محمد بن حافظ ہاشم۔ ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں شرقپور میں پیدا ہوئے۔ میاں شیر محمد شرقپوری پاک و ہند کے ان صوفیا کرام میں سے تھے جنہوں نے اس صدی میں اپنی قوت روحانی اور عظمت کردار کی بدولت لاکھوں گم کردہ راہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھایا ان کا ہر لمحہ سنت نبویؐ کے مطابق گزرتا تھا۔ خلاف سنت و شریعت فعل انھیں دیکھنا بھی برداشت نہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں جن بزرگوں کی علمی و باطنی تبلیغ سے نقشبندی سلسلہ کو آخری دور میں فروغ حاصل ہوا ان میں میاں صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا میاں حمید الدین سے حاصل کی اور اس کے بعد طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں خواجہ امیر الدین سے بیعت ہوئے۔ ان کا سلسلۂ طریقت حضرت مجدد الف ثانی تک پہنچتا ہے۔

میاں صاحب کی ساری زندگی اتباع شریعت کی تبلیغ میں صرف ہوئی۔ میاں صاحب نے ۳، ربیع الاول ۱۳۴۷ھ/۲۸ اگست ۱۹۲۸ء بروز پیر وفات پائی۔

شیطان

لفظی معانی خبیث، سرکش، خودسر، دور ہونے والا، سرکشی دکھانے والا، مخالفت کرنے والا۔ کیونکہ ابلیس نے سرکشی دکھائی اور حکم الٰہی کی مخالفت کی اسی لیے اسے یہ نام دیا گیا۔ عربی زبان میں شیطان سانپ کی ایک قسم کو بھی کہتے ہیں جو نہایت سرکش اور خبیث ہوتا ہے۔

کشاف اصطلاحات الفنون کے مصنف لکھتے ہیں کہ شیطان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو جنوں کو گمراہ کرتے ہیں انہیں شیاطین الجن کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو انسانوں کو گمراہ کرتے ہیں انہیں شیاطین الانس کہتے ہیں۔

روایت ہے کہ ابلیس ملائکہ کے ایک گروہ میں سے تھا جس کو جن کہتے ہیں، نیز وہ جنت کے خازنوں میں سے تھا۔ ابلیس کا نام عزازیل تھا۔ [illegible] حسن خلق اور شرف سے نوازا تھا۔ [illegible] کی عبادت و تقدیس میں بھی [illegible] اور اپنے [illegible] شیطان [illegible]

[illegible] ۲۔ [illegible] آدم [illegible]

قرآن میں شیطان کا لفظ اور اس کا تکبری کی ایک بد دست قوت کے لیے آیا ہے جو ازل سے آدم کو گمراہ کرنے کے لیے بضد ہو چکا ہے۔ وہ عظمت آدم کا بھی انکاری ہے۔ وہ آدم و حوا کے جنت سے نکالے جانے کا سبب تھا۔ منافقین کے گمراہ کن قائدین کو بھی قرآن میں شیاطین (جمع شیطان) کہا گیا ہے۔

شیعہ

عموماً واحد جمع، مذکر مؤنث کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اسم دوست پیروکار، جماعت، گروہ، رفقاء، کسی کے پیچھے چلنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دوست داران علی و اولاد علی۔ سلف سے اب تک فقہا و متکلمین کے روز مرہ میں حضرت علی کے پیروکاروں کو شیعہ کہا جاتا ہے۔

النوبختی کا قول ہے: وفاتِ رسول اللہؐ کے بعد امت کے تین گروہ ہو گئے۔ ۱۔ شیعہ، جو حضرت علی بن ابی طالب کے پیروکار ہوں گے۔ ۲۔ انصار جنہوں نے امارت کی سعی کی اور سعدؓ بن عبادہ کو امیر بنانا چاہا۔ اور تیسرا وہ جس نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔ درحقیقت شروع ہی سے حامیان علیؓ شیعہ کہلاتے تھے لیکن جنگ جمل اور جنگ صفین نے علیؓ کے طرف داروں کو نمایاں کر دیا۔

شیعہ عقائد و فقہ میں قرآن و سنت اور تمام مسائل میں آئمہ اہل بیعت سے رجوع کرتے ہیں۔ شیعہ نقطہ نظر سے اسلام چند عقائد و اعمال کا مجموعہ ہے شیعہ اللہ کے لیے ترکیب و تجسیم اور حلول و اتحاد جائز نہیں سمجھتے نہ ان کے لیے مکان اور سمت تجویز کرتے ہیں اور نہ اسے قابل رویت سمجھتے ہیں نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ شیعہ تمام صحابہ کو یکساں حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں شیعہ عقائد دوسرے فرقوں سے اختلافی ہیں۔ عراق اور ایران شیعیت کے اہم مراکز ہیں۔ پاک و ہند، دمشق، لبنان، بیروت، بحرین، افغانستان اور روس میں کافی تعداد میں شیعہ آباد ہیں۔

ص۔ (سورۃ)

ص (صاد) قرآن کریم کی ایک سورۃ عدد تلاوت ۳۸، عدد نزول ۳۸۔ یہ سورۃ القمر کے بعد نازل ہوئی، لیکن ترتیب میں یہ سورۃ الصٰفٰت کے بعد اور سورۃ الزمر سے قبل واقع ہے "ص" ان حروف مقطعات میں سے ہے جو بالاجماع آیت شمار نہیں ہوتے۔ اس سورۃ میں اٹھاسی آیات ہیں اور پانچ رکوع ہیں۔ اس حرف کے مفہوم کے بارے میں چونکہ علماء کے مختلف اقوال ہیں، اس لیے اس کے تلفظ کے بارے میں بھی مختلف روایات ہیں۔ ایک قول کے مطابق صاد دراصل مصاداۃ بمعنی معارضہ اور مقابلہ سے امر کا صیغہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کا تلفظ "صَادِ" دال کے زیر کے ساتھ، اور معنی یہ ہوں گے، ان منکرین کا بذریعہ قرآن ذی الذکر معارضہ اور مقابلہ کیجیے۔ اہل علم کی اکثریت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ ایک علیحدہ حرف ہے جس کے معنی دیگر حروف مقطعات کی طرح صرف خدا کے علم ہی میں ہیں۔

اس کی شان نزول کے سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی جاتی ہے کہ جب [illegible] ابو طالب علیل ہوئے تو ان کی عیادت کے لیے قریش مکہ حاضر ہوئے [illegible] حضرت [illegible] تشریف لائے۔ ابوجہل اور دیگر سرداروں نے ابی طالب سے شکایت کی کہ یہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ابو طالب پوچھنے لگے: اے بھتیجے! اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟ آپ نے فرمایا، میں ان سے فقط ایک کلمہ کہلوانا چاہتا ہوں، جس کے طفیل سارے عرب ان کے مطیع اور تمام عجم ان کے باجگزار بن جائیں گے۔ وہ کہنے لگے صرف ایک کلمہ؟ ہم اس کے لیے تیار ہیں، مگر وہ کلمہ ہے کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر قریش یک زبان ہو کر بول اٹھے، کیا اس نے کئی معبودوں کو ایک ہی معبود بنا دیا ہے۔ یہ تو بڑی ہی انوکھی بات ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

اس سورۃ کا اپنی پہلی سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ یہ گذشتہ سورۃ کا تتمہ ہے یعنی جو مضامین سورۃ الصٰفٰت میں بیان ہوئے ان کے تکملہ کے طور پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اس سورۃ کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ یہ قرآن ذی الذکر تمہاری ہدایت کے لیے آیا ہے۔ اس سورۃ میں کفار کی ہٹ دھرمی اور انکار توحید و نبوت کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد جنت اور اہل جنت کا بیان ہے پھر رسول اللہؐ کو تبلیغ رسالت کا حکم ہے پھر کہا گیا ہے کہ قرآن ساری کائنات جن و انس کے لیے ہدایت ہے اور آخر میں ذکر ہے کہ حقائق قرآن قیامت تک دنیا پر منکشف ہوتے رہیں گے۔

ابوبکر ابن العربی کے مطابق سورۃ "ص" میں گیارہ آیات الٰہی ہیں جن سے انچاس شرعی احکام اور فقہی مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس سورۃ کی فضیلت کے بارے میں حدیث ہے کہ جس نے اس کی تلاوت کی اُسے اللہ تعالیٰ ان پہاڑوں سے دس گنا زیادہ نیکیاں عطا فرمائے گا، جو حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے اللہ نے مسخر کیے تھے۔

صابر کلیری۔ علی احمد

ان کا اصل نام علی احمد ہے۔ القاب علاؤالدین، مخدوم، صابر ہیں۔ سلسلہ نسب یوں ہے: علی احمد صابر بن سید شاہ عبدالرحیم بن عبدالسلام بن سید سیف الدین بن سید عبدالوہاب بن حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی۔ آپ کی والدہ فرید الملت والدین بابا شکر گنجؒ کی ہمشیرہ ہیں۔ اخبار الاخیار میں ہے کہ آپ بابا کے داماد بھی تھے۔ سہارنپور کے قصبے پیران کلیر میں آپ کا مزار ہے۔ ۱۹ ربیع الاوّل ۵۹۲ھ میں پیدا ہوئے اخبار الصالحین میں آپ کی تاریخ پیدائش ۱۷ شعبان ۵۱۲ھ درج ہے۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا۔ والدہ آپ کو لے کر اپنے بھائی فرید شکر گنج کے پاس حاضر ہوئیں حضرت شیخ نے انہیں اپنے مسلک ارادت میں داخل کر لیا۔ بارہ سال تک ان کی خدمت میں رہے اور علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ آپ کا زہد و تقویٰ کمال کا تھا۔ ہمیشہ روزے سے رہتے اور اکثر تنہا رہا کرتے ہمیشہ پا برہنہ رہتے تھے۔

۶۲۵ھ میں حضرت بابا فرید شکر گنج نے آپ کو خلافت عطا کر دی اور ان کی ہدایت پر کلیر شریف تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ آپ قلندرانہ مشرب کے آدمی تھے اور ظاہری رسوم و قیود کی زیادہ پابندی نہ کرتے تھے۔ خواجہ شمس الدین ترک آپ کے خلیفہ اور جانشین تھے جن سے سلسلہ صابری چشتی جاری ہوا۔

صابی

ابو اسحٰق ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن زہرون الحرانی مذہباً صابی تھا۔ صابی انہیں کہتے

Marfat.com

ہیں، جو فرقۃ الصابئون میں سے ہوں۔ الصابی [illegible]
یہودی عیسائی فرقہ جو اسم اصطباغ کا پابند [illegible]
خاصے عرصے تک باقی رہا۔ ابراہیم علم طب، ہیئت اور ریاضی [illegible]
وہ دیوان الانشا میں کاتب تھا اس وقت شہرت ہوئی جب معزالدولہ نے وزیر المہلبی کے پاس ایک قاصد بھیجا اور حکم دیا کہ کرمان کے والی محمد بن الیاس کے نام فوراً ایک خط لکھے جس میں اس کی بیٹی کا رشتہ شہزادہ بختیار کے لیے طلب کرے۔ یہ مکتوب ابراہیم نے لکھا۔ اس کی تحریر کو سب نے پسند کیا۔ ممکن ہے اس واقعے نے اس کی وقعت بڑھا دی ہو۔ اس نے گو اسلام قبول نہیں کیا تھا اور مرتے دم تک اپنے مذہبی عقائد پر قائم تھا لیکن وہ اچھے اخلاق و عادات کا مالک تھا اور جہاں تک ممکن تھا وہ مسلمانوں کے رسم و رواج کی پیروی کرتا تھا اور رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا تھا۔ اُسے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل تھی اور اپنی سرکاری خط و کتابت میں وہ اکثر قرآنی آیات کا حوالہ دیا کرتا تھا اس کی زیادہ تر شہرت اس کے رسائل یا سرکاری مکاتیب پر مشتمل تھی۔

صاد

دیکھیے: "سورۃ ص"

صالحؑ

ایک پیغمبر جو عرب کی قوم ثمود میں بھیجے گئے۔ آپ کا ذکر قرآن مجید میں تمثیل کے طور پر آیا ہے آپ نے جب اپنی قوم کو دعوت توحید دی تو ان میں دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو آپ کی بات پر ایمان لایا اور دوسرا گروہ وہ تھا، جو آپ کی مخالفت میں تھا انہوں نے لوگوں کو ان نعمتوں کے بارے میں بتایا، جو خدا نے ان پر بھیجی تھیں انہیں اس بات پہ فخر تھا کہ وہ اپنی خدمت کا کوئی اجر نہیں چاہتے۔ جو لوگ ان پر ایمان لائے وہ کمزور لوگ تھے، لیکن طاقت ور لوگ آپ کے مخالف تھے۔ وہ آپ کی باتوں کی تردید کرتے آپ کو سحر زدہ بتاتے اور یوم جزا کے خیال کی تکذیب کرتے۔ تبلیغ سے قبل قوم ثمود کو حضرت صالحؑ پر بہت اعتماد تھا اور ان سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں لیکن تبلیغ کے بعد وہ لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ قرآن میں ذکر آتا ہے کہ اللہ نے حضرت صالحؑ کو نشانی کے طور پر ایک اونٹنی عطا کی۔ حضرت صالحؑ نے لوگوں سے کہا کہ اسے بے ضرر چرنے دیں اور اسے اپنے پینے کے پانی میں شریک کریں، لیکن لوگوں نے الٹا اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالحؑ نے کہا کہ تم ہمیں جس عذاب سے ڈراتے ہو اسے اب ہم پر لے آؤ۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے گھروں میں تین دن مزے کریں۔ پھر ایک زبردست طوفان آ گیا اور تب اگلی صبح وہ اپنے گھروں میں مردہ پڑے تھے۔

صالحات

لفظی معنی اچھے کام، پاک دامن، نیک عورتیں۔ اسلام میں اچھے کام کو [illegible] جزا ایمان کے ساتھ ہے یعنی اگر اچھے کاموں کی بنیاد ایمان باللہ پر نہیں ہے تو دوزخ کی آگ سے حفاظت مشکوک ہے۔ بغیر ایمان کے نیک کاموں کی چونکہ کوئی سمت متعین نہیں ہوتی اور ان کا کوئی منبع نہیں، اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ بے سمتی نیک اعمالی کے باوصف انسان کو فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔ اس لیے نیک اعمال کے ساتھ ایمان کی شرط ایسی ہے جو روز حشر انسان کو وہ صالحین [illegible]
ہیں، اپنی نیت اور اعمال میں اور اپنے اقوال و افعال میں [illegible] اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتے ہوں قرآن مجید میں [illegible] کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں یہ حقیقی فضل ہے اللہ کی طرف سے ملتا ہے۔

صائفہ

گرمائی فوج کے ایک لشکر کا نام جو امیر معاویہؓ نے رومیوں کے خلاف [illegible] موسم گرما میں جنگ جاری رکھنے کے لیے تیار کیا۔ (مزید دیکھیے شاتیہ)

صبر

عربی لفظ ہے۔ یہ ایک اہم اسلامی تصور ہے۔ ایک خاص ذہنی و روحانی رویہ ہے جو کردار میں توازن اور استقامت پیدا کرتا ہے۔ عرب لغت نویسوں کے نزدیک مبادہ ص ب ر سے ہے۔ جس کے معنی روکنا باندھنا کے ہیں۔ صبر کا یہ اسلامی تصور جہاد کے ساتھ خاص طور پر وابستہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات صبر کا لفظ صلوٰۃ کے ساتھ بھی آیا ہے مفسرین کے قول کے مطابق ان عبارتوں میں یہ لفظ روزے کے مترادف بھی استعمال ہوا ہے اس کی تاکید اس بات سے کی جاتی ہے کہ ماہ رمضان کو شہر الصبر بھی کہا گیا ہے۔ صبر کی نمایاں اہمیت کا اس حقیقت سے بھی اظہار ہوتا ہے کہ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں الصبور بھی شامل ہے اخلاقی نظام فکر میں صبر ایک بنیادی فضیلت ہے۔ اس کا مفہوم ضبط نفس کے طور پر بھی آیا ہے۔ امام غزالیؒ نے صبر کی بحث کو سات عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

اشاعت اسلام اور قیام اسلام کے سلسلے میں مصائب اور دشواریوں کے باعث قرآن اور احادیث بیشتر جگہ مومنین کو صبر اور استقامت سے کام لینے کی تلقین کی گئی ہے اور اس کے صلے میں نصرت و کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ صبر کی فطری اہمیت یہ ہے کہ اس کے باعث انسان میں قوت ارادی اور قوت عمل میں کمی نہیں آتی، بلکہ کٹھن حالات اور مشکل معاملات کو قابل برداشت بنانے میں اس کا بنیادی حصہ ہوتا ہے عام معاشرے میں نظم برقرار رکھنے اور خوشگوار تعلقات باہمی کے لیے صبر کی بنیادی اہمیت ہے صبر اپنے مفاہیم کے لحاظ سے ایک وسیع اصطلاح ہے۔

صبور

دیکھیے "اسمائے حسنیٰ" [illegible]

Marfat.com

مکتبۂ شاہکار

ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو باقاعدگی سے کتب شائع کرنے والا واحد ادارہ

- ذہن کی آزمائش (دوم) ۲/-
- پاکستان ۳/۵۰
- ۲/۵۰
- اقبال کا فلسفۂ خودی ۳/۵۰
- ★ ذہن کی آزمائش (سوم) ۳/-
- ★ دینِ عمل ۴/-
- ★ تذکرۂ غوثیہ ۲/-
- ★ ذہن کی آزمائش (چہارم) ۳/-
- ★ داستانِ ہٹلر ۲/۵۰
- ★ گم شدہ شہر اور ملیامیٹ تہذیبیں ۳/۵۰
- ★ یادِ اقبال ۴/-

- ★ افروڈائٹ (ناول) ۳/۵۰
- ★ شہزاد (ڈرامے) ۲/۵۰
- ★ شیر علی خٹک (جرم و سزا) ۳/-
- ★ (ناول) ۲/۵۰
- ★ (طب و صحت) ۲/۵۰

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

بے بی انسائیکلوپیڈیا

سرورق: الشریف آرٹ پریس، ۱۲، میکلوڈ روڈ، لاہور

Marfat.com

۱۵ ستمبر کو آنے والی شاہکار عوامی کتب

نمبر ۵

اقبال، غیر مسلموں کی نظر میں

اقبال کے فلسفے، شاعری اور شخصیت کے بارے میں غیر مسلم مشاہیر کے افکار و خیالات : سر تیج بہادر سپرو، رابندر ناتھ ٹیگور، سر ٹامس آرنلڈ، مہاراجہ سر کشن پرشاد، ڈاکٹر نکلسن، سر جوگندر سنگھ، سردار گوربچن سنگھ، میری شمل، رشبروک ولیمز، رام بابو سکسینہ، ہربرٹ ریڈ، ملک راج آنند، ڈاکٹر بوسانی، تلوک چند محروم، سر مالکم ڈارلنگ، جگن ناتھ آزاد، تربھے رام جوہر، پروفیسر استیتاس، کلدیپ کور دیپ

مرتبہ : شمیم حیات سیال، محمد حیات سیال

قیمت : چار روپے

نمبر ۴

قول اقبال

شاعر مشرق کے مقالات ۔ تقدیم ۔ بیانات ۔ مکاتیب سے منتخب نثری اقتباسات اور اقوال زریں کا حسین مجموعہ ۔ ایک ایک فقرہ علم میں کھب جانے والا۔

مرتبہ : عزیز احمد

قیمت : دو روپے

ستاروں کا سجدہ

نیوران کے جیالے

قسط نمبر ۲۲

Marfat.com

ہر پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اسلامی کا گزشتہ شمارہ پریس میں جا چکا تھا کہ اخبار الوفیات کا تانتا بندھ گیا صرف ایک ماہ اکتوبر میں ملت اسلامیہ کئی نامی گرامی شخصیتوں سے محروم ہو گئی ان میں مولانا سید یوسف بنوری ۔ مولانا عبدالغفار سلفی پروفیسر محمد شریف اشرف اور مولانا عبدالرشید امرتسری قابل ذکر ہیں ۔

مولانا یوسف بنوری اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے کراچی سے راولپنڈی آئے ہوئے تھے کہ بلاوا آ گیا اور ۱۷ اکتوبر کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے ۔ سید بنوری کی وفات سے دنیائے علم ادب میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے ۔ آپ اپنے شیخ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے علم و فضل کے صحیح جانشین تھے ، علمی تبحّر وسعت معلومات اور ادب و نظم عربی میں کمال حاصل تھا مصر کے علامہ طنطاوی نے سلف صالحین کی روش سے ہٹ کر تفسیر قرآن لکھی تو مولانا بنوری نے مصر جا کر عربی میں ان کی غلطیوں کو ان پر واضح کیا جس سے عالم اسلام پر آپ کے علم و فضل کی دھاک بیٹھ گئی ۔ ترمذی شریف کی شرح معارف السنن عربی میں تحریر کی ۔ ۷۴ء میں تحریک ختم نبوت کی قیادت کا شرف آپ کو حاصل ہوا علاوہ ازیں منکرین حدیث اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے متجددین کی شر انگیزیوں کا بھی پردہ چاک کرتے رہے ۔ مولانا عبدالغفار سلفی کراچی میں ۱۲ اکتوبر کو وفات پا گئے ۔ ۱۹۴۴ء میں اپنے والد مولانا عبدالستار دہلوی کی وفات پر کل پاکستان جماعت غربا اہلحدیث کے مرکزی امیر مقرر ہوئے تھے اس خاندان نے تقریباً ڈیڑھ صدی برصغیر میں توحید و سنت کے دیپ جلائے رکھے ۔ ان کی خدمات بین الاقوامی سطح پر مسلم ہیں ۔ مولانا سلفی اپنی جماعت کے ایک خاص مزاج کے باوجود علمی و اصلاحی خصوصیتوں کی بنا پر ہر دلعزیز تھے ۔ مرحوم بہترین خطیب، قاری اور عالم و فاضل تھے ۔ سعودی عرب کے علاوہ کئی اسلامی ممالک کے تبلیغی دورے کئے ۔ رویت ہلال کمیٹی کے رکن بھی تھے وفات کے وقت ان کی عمر ۱۵ برس تھی ۔

مولانا محمد شریف اشرف بیس برس تک مدینہ یونیورسٹی اور حرمین میں تدریسی و تبلیغی خدمات سرانجام دیتے رہے بعد میں پاکستان آ گئے اور فیصل آباد میں علمی و تنظیمی کاموں میں مصروف تھے وسیع الظرف و علم خطیب اور مدبر تھے ۔ جماعت اہلحدیث کی تنظیم کے سلسلہ میں مرحوم نے بڑی محنت کی ۔ انجمن شبان کے تا آخر ناظم اعلیٰ رہے

مولانا عبدالرشید امرتسری توحید و سنت کے معروف، سحر انگیز اور ہر دلعزیز خطیب تھے ۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری و دیگر بزرگوں کے خلوص و جذبہ دینی کی ہو بہو تصویر تھے ۔ کسی نے شرارت سے افواہ اڑا دی کہ انہوں نے تحریک اسلامی کی حمایت میں کام نہیں کیا ۔ یہی شرارت ان کے لئے لقمہ اجل ثابت ہوئی بالآخر ۳۰ اکتوبر کو دنیا سے منہ موڑ گئے ۔ یہ سطور زیر تحریر قلم تھیں کہ معروف وکیل ایم انور بار ایٹ لاء کے انتقال کی خبر بھی آ گئی ۔ رہے نام اللہ کا جانے والوں نے تو جانا ہی ہے ۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(عبدالاعلیٰ رحمانی)

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
قسط ○ وار

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے
قیمت فی قسط ۲/- روپے
سالانہ معہ رجسٹری ۳۰/- روپے

۲۵

• مدیر اعلیٰ : سید قاسم محمود
• نائب مدیر : آذر تمنا
عبدالاعلیٰ رحمانی

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجئے

ٹیلیفون : ۲۵۴۱۰۲
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

تاریخ اشاعت : یکم دسمبر ۷۷ء ۔ ناشر : سید قاسم محمود ۔ طابع : ریاض حسین الجدہ پریس اردو بازار، لاہور

Marfat.com

عبداللہ بن مغفلؓ

کنیت ابوسعید۔ ۶ھ میں مسلمان ہوئے۔ غزوۂ حدیبیہ اور بعد کے سب غزوات میں رسول اللہؐ کے ساتھ شریک ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں اپنے دورِ خلافت میں بصرہ میں مسلمانوں کی دینی تعلیم پر مامور کیا۔ عراق کی مہم میں بھی مجاہدانہ شرکت کی۔ بصرے میں وفات پائی۔ آپ کافی عرصہ تک حضورؐ کی خدمت میں رہے اس لیے بہت سی احادیث سننے کا موقع ملا۔ آپ سے ۴۳ احادیث منسوب ہیں جو کتبِ احادیث میں درج ہیں۔

عبداللہ بن میمون اہوازی

اہواز کا ایک باشندہ۔ اہواز مضافات کوفہ میں ہے۔ یہ شخص شعبدہ کے فنون کا ماہر تھا۔ سحر و طلسمات میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ نبوت و مہدویت کا دعوے دار تھا۔ ابتدا میں حضرت امام جعفر صادقؒ اور ان کے صاحبزادے اسمٰعیل کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ اسمٰعیل کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محمد کے پاس رہنے لگا۔ محمد ہی کے ساتھ وہ مصر گیا۔ اس نے محمد کی وفات کے بعد ان کے غلام کو جس کا نام مبارک تھا اس غرض سے کوفہ بھیجا کہ لوگوں کو مذہب اسماعیلیہ کی دعوت دے۔ وہاں وہ اسمٰعیلی مذہب کے داعی کی حیثیت میں مدت تک کام کرتا رہا۔ اسی اثنا میں عبداللہ بھی پہلے کوہستان عراق میں اور پھر شہر بصرہ میں جاکر اسمٰعیلی مذہب کی اشاعت و ترویج میں کوشاں رہا۔

عبداللہ بن میمون کو باطنی فرقہ کا بانی سمجھا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔ باطنی فرقہ کا بانی دراصل عبداللہ کا باپ میمون بن دیصان تھا جو امام جعفر صادقؒ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ یہ شخص درپردہ اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ جب اسے والیٔ عراق نے کسی جرم میں قید کیا تو اس نے عزم کیا کہ اسلام میں الحاد کے جراثیم شامل کر کے اسے بگاڑ دے گا۔ چنانچہ اسی قید خانے میں اس نے باطنی مسلک کے اصول قائم کیے۔ قید سے رہا ہونے کے بعد میمون نے اپنے بیٹے عبداللہ کو پہلے تو شعبدہ بازی اور ڈھٹ بندی سکھائی اور پھر اپنے ملحدانہ مسلک کی تعلیم دی۔ اس سے پیشتر عبداللہ نے مسلمان ہوکر اسمٰعیلی مذہب اختیار کرچکا تھا اور اسماعیلیت کا سرگرم رکن تھا۔

عبداللہ کو اپنے باپ کے وضع کردہ اصول پسند آئے اور اس نے باپ کا مذہب اختیار کرلیا اور باطنی مسلک کی دعوت و تبلیغ شروع کردی اور یہ مسلک مختلف علاقوں میں بہت پھولا پھلا۔ کیونکہ اس میں حد درجہ کی آزادی اور بے باکی تھی لہٰذا اس میں روز افزوں نفری میں اضافہ ہونے لگا۔ لیکن میمون نے جب علمائے اہلِ سنت سے مناظرے کیے تو اس کو بہت شکست و ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال اس کی مقبولیت میں فرق نہ آیا۔ اسی دوران اس خوف سے کہ اہلِ سنت کے رؤسا انہیں گرفتار نہ کرلیں وہ فرار ہوکر مرو چلا گیا اور خفیہ طور پر اپنے مسلک کی تبلیغ کرتا رہا۔ وہاں سے وہ رے لوٹا لیکن دورانِ سفر ہی مرگیا۔

عبداللہ بن میمون کو باپ کی وفات سے اس درجہ صدمہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گیا اور جانبر نہ ہوسکا۔

عبداللہ بن نافعؓ

صحابیٔ رسولؐ۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں مصر کے حاکم مقرر ہوئے۔ افریقہ کی مہم سے کامیابی کے ساتھ لوٹنے پر حضرت عبداللہ بن سعد جب واپس لوٹے تو انہیں دوسری ذمہ داریاں سونپ دی گئیں اور ان کی جگہ عبداللہ بن نافع کو حاکمِ مصر مقرر کیا گیا۔ اس کے اس ذمہ داری کے سنبھالتے ہی قسطنطین پھر جنگی تیاریاں کرنے لگا۔ ۲۸ھ میں اس نے ایک بحری فوج افریقہ کی جانب روانہ کی۔ رومی فوج نے اہلِ افریقہ سے ادائے خراج کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ اس پر طرفین میں مقابلہ ہوا اور رومیوں نے فتح حاصل کرکے سکندریہ کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں حضرت عبداللہ بن نافعؓ مدافعت کے لیے نکلے۔ ادھر خود قیصر روم ایک زبردست فوج لے کر عازم سکندریہ ہوا۔ رومیوں کی دونوں فوجیں وہاں جمع ہوگئیں اور اسلامی لشکر کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ آخر رومی ناکام و نامراد پسپا ہوکر اپنے جنگی مرکز قرص کی طرف چلے گئے۔

عبداللہ بن وہب

راسبی۔ خارجی سردار۔ اس کا تعلق قبیلہ بجیلہ سے تھا اور یہ شجاعت و تقویٰ میں معروف اور "ذوالثفنات" کے لقب سے مشہور تھا۔ یعنی گھٹنوں والا، یہ گھٹے اس کی پیشانی پر کثرتِ سجود سے پڑ گئے تھے۔ وہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ماتحت عراق میں اور حضرت علیؓ کے تحت صفین میں شریک ہوا۔ لیکن جب حضرت علیؓ نے اپنی طرف سے حکم مقرر کیا تو حضرت علیؓ سے الگ ہوکر حروراء میں ان کا ساتھ چھوڑ دینے والوں میں شامل ہوگیا۔

شوال ۳۷ھ میں خارجیوں نے کوفے کو آخری دفعہ چھوڑنے سے ذرا پہلے اسے اپنا سپہ سالار (امیر) چن لیا۔

وہ ۹ صفر ۳۸ھ کو جنگ نہروان میں مارا گیا۔

عبداللہ بن یاسرؓ

آپ عمار بن یاسرؓ کے بھائی تھے۔ اپنے والد یاسرؓ کے ہم نشین و ہم مجلس تھے۔ عمارؓ بہت بلند پایہ صحابہ میں سے ہیں۔ یاسر اور ان کے بیٹے مکہ میں مسلمان ہوکر فوت ہوئے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہیں فی سبیل اللہ کفار نے نہایت سخت اذیتیں پہنچائیں۔

عبداللہ چکڑالوی

دیکھیے: "چکڑالوی، عبداللہ"

عبداللہ روپڑیؒ

(۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء – ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء) مشہور محدث۔

نام عبداللہ، کنیت ابو احمد۔ والد کا نام میاں روشن دین۔ آباؤ اجداد امین آباد ضلع گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں ان کے کسی بڑے کبیر نامی شخص کو کمیر پور میں جاگیر ملی تھی۔ اس نے اپنے بڑے بھائی کمیر کو بھی یہاں بلا لیا۔ کمیر پور اسی نام سے مشہور ہوا۔ مولانا عبداللہ کے والد انہی کی اولاد سے ہیں۔ مولانا کی

Marfat.com

پیدائش یہیں ہوئی۔ کچھ مدت بعد ان کے والد نے فیروز پور سے سکونت ختم کر کے چھانگا مانگا میں رہائش اختیار کی تو حافظ صاحب کی عمر اڑھائی برس کی تھی۔ وہیں قرآن مجید آٹھ برس کی عمر میں حفظ کیا۔ ان کے بڑے بھائی میاں رکن دین مزید تعلیم کے لیے "لکھوکے" آئے تو انہیں بھی اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر میرٹھ چلے گئے۔ وہاں نعمانیہ مدرسہ جو اونچی مسجد والا کے نام سے مشہور تھا، میں ایک سال رہے۔ پھر ان کے والد نے انہیں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے مدرسہ غزنویہ امرتسر بھیج دیا۔ اس مدرسہ میں آپ کی ابتدائی تعلیم مکمل ہوئی اور عملی تربیت بھی مولانا عبدالجبار نے کی۔ سند فراغت حاصل کر کے آپ دہلی چلے گئے۔ دہلی کے مشہور محدث استاذ میاں نذیر حسین آٹھ برس قبل وفات پا چکے تھے۔ دہلی میں آپ نے تین سال قیام کیا اور منطق و فلسفہ، فقہ و اصول فقہ پر عبور حاصل کیا۔ اجازت حدیث کی سند آپ نے حافظ پنجاب عبدالمنانؒ وزیر آبادی سے حاصل کی۔ دہلی سے آپ مدرسہ عالیہ رام پور چلے گئے۔ وہاں سے بھی علمی تشنگی بجھائی۔ ۱۹۱۴ء میں آپ واپس روپڑ آ گئے اور یہاں مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ کچھ تصانیف آپ نے اسی دوران تصنیف کیں اور ساتھ ساتھ تنظیمی اور تبلیغی مقاصد کے لیے پندرہ روزہ "تنظیم اہل حدیث" پرچہ نکالا جسے کچھ عرصہ بعد ہفت روزہ کر دیا گیا۔ جریدہ تنظیم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے سلیس عبارت میں تحقیق و تدقیق کے حامل مجتہدانہ استدلال پر مشتمل فتاویٰ تھے۔ روپڑ اور اس کے نواح میں برسوں ٹھوس علمی، اصلاحی اور تبلیغی کام کرنے کے سبب ہی شاید "روپڑی" آپ کے نام کا لاحقہ بن گیا۔ حالانکہ آپ اصلاً کمیرپوری تھے اور خود اپنے آپ کو امرتسری لکھا کرتے تھے۔ روپڑ سے قیام پاکستان سے پندرہ برس پہلے آپ امرتسر مبارک مسجد آ گئے اور وہاں کا کام اپنے برادر زادہ عبدالقادر روپڑی کے سپرد کر دیا۔ ۴۷ء میں لاہور آ گئے۔ یہاں مسجد قدس کی بنیاد رکھی اور مدرسہ قائم کر دیا۔ درس و تدریس کا فریضہ بھی خود ہی سنبھالا۔ ایک خاص طرز سے ترجمہ قرآن ایک سال میں پڑھایا کرتے تھے۔

مولانا عبداللہ روپڑی کا شمار جماعت اہلحدیث کی حالیہ تاریخ کے ان ممتاز علماء و فضلاء میں ہوتا ہے جنہیں تمام مکاتب فکر کے علماء و محققین اور عالم اسلام کے نامور محدثین و فضلا کی تائید و حمایت اور عقیدت حاصل ہے۔

حافظ صاحب علوم قرآن و حدیث کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، صرف و نحو، معانی و ادب، عقائد و کلام اور فنون لطیفہ میں تدریساً و تحریراً ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فقہ الحدیث جو دنیائے علم کا انتہائی نازک موضوع ہے، میں یک گونہ بصیرت حاصل تھی۔

حضرت کی جلالت علم مسلمہ تھی۔ بڑے سے بڑے مسائل اور ادق ترین گتھیاں سے حل کرنے میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ نامور محقق بھی تھے۔ ان کی تحقیق کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اسلاف امت میں سے جن عالی مرتبت حضرات سے تحقیق میں کمی رہ گئی، حافظ صاحبؒ نے اس سے چشم پوشی نہیں کی۔ پچاس کے قریب کتب حضرت کی لکھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ آخری دنوں آپ نے قرآن مجید اور مشکوٰۃ پر بھی حاشیہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اہل حدیث مکتبہ فکر کی سب سے زیادہ خدمت خاندان دہلوی (کراچی) خاندان غزنوی، خاندان لکھوی اور خاندان روپڑی نے کی۔ حضرت روپڑیؒ اس خاندان کے بانی ہیں۔ اب اس کی سربراہی آپ کے برادر زادہ مولانا عبدالقادر روپڑی کے سپرد ہے۔

محدث روپڑیؒ نے اپنی زندگی میں تین حج کیے۔ آپ کم گو، خاموش طبع لیکن جذبہ تبلیغ سے سرشار، ذوق عبادت میں صائم الدھر اور شب زندہ دار۔ وضع و لباس میں سادگی شعار، روعظ پر تاثیر۔ مدلل اور سنجیدہ بحث و تحریر۔ عقائد سلف صالح میں چٹان کی طرح ناقابل تسخیر تھے۔ کھانا ایک وقت کھاتے۔ سفر و حضر میں تہجد کبھی نہیں چھوڑی۔ فرضی نماز ہمیشہ باجماعت پڑھی۔ شمس العلماء محمد حسین بٹالویؒ اور محدث مبارکپوریؒ انہیں رازی و غزالی روحی قرار دیتے تھے۔ چند یوم علیل رہ کر ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ گارڈن ٹاؤن لاہور میں دفن ہیں۔

عبداللہ صحابیؒ، سید

سید عبداللہ صحابیؒ صوفی بزرگ۔ ان کا سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے۔ ذکر خفی میں مشغول رہتے۔ بچپن ہی سے بارہ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ جوانی میں بھی رزرداہی زندگی میں پھنس کر ذکر الٰہی سے دور ہونا پسند نہیں کیا بلکہ تمام عمر مجرد رہ کر خدا کی یاد اور تسبیح میں گزاری۔ الگ تھلگ رہ کر عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اس لیے آپ کے حالات زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے اور کسی تذکرہ نگار نے آپ کا سن پیدائش و سن وفات نہیں لکھا۔

سید عبداللہ گجرات میں اپنے دوستوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے اور ذکر خدا میں منہمک تھے کہ ان کے دوستوں نے سندھ کے حکمران مرزا شاہ بیگ ارغون (۹۲۴ھ تا ۹۳۸ھ) کی علم دوستی اور علم دوستی رعایا پروری کا حال سن کر گجرات سے ٹھٹھہ کا قصد کیا۔ سید عبداللہ صحابیؒ بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ ٹھٹھہ آ گئے۔ آپ چونکہ تنہائی میں ذکر خدا کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے ٹھٹھہ کی بجائے مکلی میں قیام کو ترجیح دی۔ مکلی تقریباً ۱۲ میل لمبی ایک پہاڑی ہے جو ٹھٹھہ کے بالکل متصل ہے اس پہاڑی پر ان گنت (بعض کے نزدیک سوا لاکھ) اولیاء اللہ، علماء و فضلاء، سفراء، مورخین، حکمران اور یگانہ روزگار ہستیاں مدفون ہیں۔ اس لیے ٹھٹھہ کے اس قبرستان کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ مکلی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ٹھٹھہ کے متصل اور مکلی سے بالکل ملی ہوئی زمین کا نام ساموئی تھا۔ اس کے زیریں حصے میں شیخ حماد جمالیؒ کی خانقاہ تھی۔ سندھ کا حکمران جام تماچی سندھ کے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد شیخ حماد جمالی کی خدمت میں ایک بھاری رقم بطور نذر لے کر آیا تھا۔ آپ نے اسے کہا کہ وہ ان کی خانقاہ کے متصل اس رقم سے ایک مسجد تعمیر کرا دے۔ جام تماچی نے حکم کی تعمیل کی اور خانقاہ کے متصل ایک مسجد تعمیر کرا دی۔ اسی زمانے میں ایک درویش جو حرمین شریف کی زیارت کے قصد سے سفر میں تھے اس مسجد میں مقیم ہوئے تو انہوں نے مسجد کے ارد گرد واقع وسیع و عریض قبرستان میں غیر معمولی انوار و برکات محسوس کرنے کے بعد "یہی میرے لیے مکہ ہے" کہنا شروع کر دیا۔ شیخ حماد جمالیؒ کو ان کی اس کیفیت سے آگاہی ہوئی۔ انہوں نے اس مسجد کا نام مکلی رکھ دیا۔ اس وقت سے وہ پہاڑی جس پر یہ مسجد واقع ہے مکلی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اور آج اس وسیع قبرستان کے سارے علاقے کو مکلی کہتے ہیں۔

سید عبداللہ مکلی میں جس جگہ ابتدا میں مقیم ہوئے تھے آخری عمر تک اسی جگہ سکونت پذیر رہ کر عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔

سندھ میں شہباز قلندرؒ کے مزار کے بعد سب سے زیادہ، عقیدت مندوں کا اژدھام آپ کے مزار مبارک پر ہوتا ہے اور ہر سال سندھ کے دور دراز

Marfat.com

کے علاقوں سے لاکھوں زائرین آپ کے سالانہ عرس کے موقع پر مزار پر حاضری دیتے ہیں ۔

عبدالمجید، سلطان

عبدالمجید اول ۔ عثمانی سلطان ۔ سلطان محمود ثانی کا بیٹا ۔ ۱۴ شعبان ۱۲۳۸ھ/ ۲۵ اپریل ۱۸۲۳ء کو پیدا ہوا ۔ اس کی ماں "بزم عالم" غیر معمولی قابلیت کی ایک خاتون تھی ۔

عبدالمجید ۱۹ ربیع الآخر ۱۲۵۵ھ/ یکم جولائی ۱۸۳۹ء کو اپنے باپ کی مسند پر بیٹھا ۔ یعنی نیزیب کی شکست کے چند روز بعد جو ترکوں نے ابراہیم پاشا سے کھائی ۔ تاہم اتحاد دول نے جس میں ترکی پہلی بار شامل ہوا تھا ۔ گو فرانس اس میں شامل نہ تھا ، سلطنت عثمانیہ کو بچا لیا ۔ عبدالمجید اول نے اپنے باپ کی نافذ کردہ اصلاحات کو جاری رکھا ۔

اس کے عہد کے اہم ترین واقعات میں سے ایک تو گل خانہ کے خط شریف یا خط ہمایوں کے اعلان شاہی کا اجرا ہے ۔

اس کے عہد میں مسلسل فسادات ، بغاوتیں اور قتل عام رونما ہوتے رہے وضع قوانین کے علاوہ سلطان بہت سی اصلاحات کا بانی بھی ہے ۔ اس نے عسکری اور تعلیمی نظام میں خصوصاً اصلاحات کو فروغ دیا ۔ متعدد شفاخانے اور عمارات تعمیر کرائیں ۔ سرکاری اسناد و اوراق کے لیے سب سے پہلا "خزینۂ اوراق" اس نے بنوایا ۔ سب سے پہلا تھیٹر اسی کے عہد میں تعمیر ہوا ۔

عبدالمجید اول وہ پہلا سلطان تھا جو کوئی یورپی زبان (فرانسیسی) بول سکتا تھا ۔ وہ ایک زیرک اور مہذب ، چھریرے بدن کا آدمی تھا ۔ مگر اس کی صحت حرم کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے خراب رہتی تھی ۔ وہ فضول خرچ اور متلون مزاج تھا مگر دلیر تھا ۔

اس نے ۱۸۴۹ء میں پناہ گزینوں کو آسٹریا کے حوالے کرنے سے انکار کر کے عالم گیر سطح پر نیک نامی حاصل کی ۔ ترکی کی تاریخ میں ابھی تک اس سے زیادہ رحم دل ، شریف اور ایسے رجحانات سے مزین حکمران مذکور نہیں ہوا ۔ اس کے لطیف اور دلکش خد و خال اپنے اندر عالی حوصلگی کی روح رکھنے کی خبر دیتے تھے ۔

وہ ۱۷ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ / ۲۵ جون ۱۸۶۱ء کو جواں عمری ہی میں فوت ہوگیا ۔ اس کی وفات کے وقت اس کا ملک مالی مشکلات میں پھنسا ہوا تھا ۔ اسے جامع سلطان سلیم کے نزدیک ایک معمولی سے مقبرے میں دفن کیا گیا ۔

عبدالمطلب بن ہاشم

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا ۔ قریش مکہ کے نامور سردار ۔ ان کا نام عامر ، کنیت ابوحارث اور لقب شیبہ ہے ۔ (انہیں فیاض اور مطعم (کھانا کھلانے والے) کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے) ۔

حضرت نبی اکرم صلعم کے پردادا ہاشم بن عبد مناف شام کے تجارتی سفر پر جاتے ہوئے مدینہ سے گزرے تو قبیلہ خزرج کے خاندان عدی بن نجار میں اپنے ایک دوست عمرو بن زید کے ہاں مہمان ٹھہرے ۔ اسی اثنا میں عمرو کی بیوہ صاحب زادی سلمیٰ سے شادی کی صورت بن گئی ۔ نکاح کے بعد دونوں میاں بیوی مکہ چلے آئے ۔

اس قبیلے کے دستور کے مطابق بچے کی پیدائش سے پہلے ہاشم اپنی بیوی سلمیٰ بنت عمرو کو لے کر اپنے سسرال یثرب میں آئے ۔ بیوی کو اس کے باپ کے گھر چھوڑا اور خود بغرض تجارت شام کا رخ کیا ۔ اتفاق یہ ہوا کہ فلسطین کے شہر غزہ میں پہنچے تو ہاشم ہیں پچیس برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ ادھر سلمیٰ بنت عمرو کے ہاں عبدالمطلب پیدا ہوئے ۔ ان کے سر میں چند سفید بالوں کی وجہ سے انہیں "شیبۃ الحمد" پکارا گیا ۔ مادری سلسلہ قرابت داری کے رواج کی بنا پر جو اس خاندان میں رائج تھا ۔ ماں بیٹے یثرب ہی میں اپنے گھر میں رہے ۔ یہ مدت قیام سات آٹھ سال ہے ۔ ہاشم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہاشم کے بھائی مطلب اپنے ہونہار بھتیجے کو مدینہ سے مکہ لے آئے ۔ یہ عام خیال ہے کہ اس بچے کا نام عبدالمطلب اس لیے پڑا کہ لوگوں نے غلطی سے انہیں مطلب کا غلام سمجھ لیا تھا ۔

عبدالمطلب مکے کے سرکردہ رئیس ، قریش کے نامور قائد اور سردار تھے ۔ انہوں نے مکے کے نواحی قبائل مثلاً خزاعہ ، کنانہ اور ثقیف سے حلف (اتحاد) کے معاہدے کر رکھے تھے ۔ وہ طائف میں ایک کنوئیں کے مالک بھی تھے ۔ ان کی خوشحالی کی ایک وجہ تو ان کی تجارت تھی جو وہ شام اور یمن سے کرتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ انہیں سقایہ و رفادہ (کعبے کے زائرین کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے) کا امتیازی حق بھی حاصل تھا ۔ یہ حق انہیں اپنے باپ ہاشم سے وراثت میں ملا تھا ۔ کئی کنوئیں ، خاص طور پر چاہ زم زم کو از سر نو کھدوانے کا سہرا انہی کے سر ہے ۔ کیونکہ چاہ زم زم کو عمرو بن حارث جرہمی نے بند کر دیا تھا اور بہت مدت گزرنے کے بعد لوگ یہ بھول ہی گئے تھے کہ یہ کنواں کہاں تھا ۔ عبدالمطلب تین راتیں مسلسل چاہ زم زم کو کھودنے کے بارے میں خواب دیکھتے رہے اور خواب ہی میں انھیں چاہ زم زم کی جگہ بھی دکھائی گئی ۔

ان کی زیادہ تر اولاد کی ماں قبیلہ بنو مخزوم کی فاطمہ بنت عمرو تھیں ۔ ان کے بطن سے عبداللہ (نبی اکرم ؐ کے والد محترم) اور ابوطالب بھی پیدا ہوئے ۔ جناب عبدالمطلب کی اور بیویاں بھی تھیں جو قریش کے قبائل بنو زہرہ ، النمر ، عامر بن صعصعہ اور خزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں ۔ یہ بالترتیب حضرت حمزہؓ ، حضرت عباسؓ ، حارث اور ابولہب کی مائیں تھیں ۔

جب آنحضرت صلعم کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا تو عبدالمطلب چھ سال کے ان بچے کو اپنے گھر لے آئے اور نہایت محبت و شفقت سے آپ کی پرورش کی ۔ اور اپنے بعد آپ کو اپنے صاحبزادے حضرت ابوطالب کے سپرد کر گئے ۔

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر پاکر ۵۷۹ء میں وفات پائی ۔ ان کی عام نصیحت یہ تھی " اچھے اور اعلیٰ اخلاق حاصل کرو اور ظلم و سرکشی اختیار نہ کرو " ۔

عبدالملک الاصمعی

(۷۴۰ء — ۸۲۸ء) بصرہ میں پیدا ہوئے ۔ عربی کے مشاہیر اہل لغت میں شمار ہوتا ہے ۔ اساتذہ میں خلیل ، عیسیٰ ، ابن عمر اور ابو عمرو بن علی جیسے لوگ ہیں ۔ اصمعی کے شاگرد ابوعبیدہ ، سجستانی اور سُکری ہیں ۔ ان کو عربی زبان کے تمام نحوں اور بولیوں پر کامل عبور حاصل تھا ۔ خلیفہ ہارون الرشید نے امین کی اتالیقی و تعلیم پر مامور کیا ۔ اصمعی کی تصانیف میں "الفرس" ، "الاراجیز" ، "المیسر" اور "مجموعہ الاصمعیات" مشہور ہیں ۔

عربی ادب کے مورخوں کا خیال ہے کہ اگر عبدالملک اصمعی پیدا نہ ہوتا تو ادب اور لغت کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ۔

Marfat.com

عبدالملک بن مروان

بنو امیہ کا پانچواں خلیفہ جس نے ۶۵ھ/۶۸۵ء سے ۸۶ھ/۷۰۵ء تک حکومت کی۔ اس کا باپ مروان بن الحکم اور ماں عائشہ بنت معاویہ بنت مغیرہ تھی۔ اس کی عمر دس برس تھی جب اُس نے حضرت عثمانؓ کے گھر پہ باغیوں کے حملے کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سولہ سال کی عمر میں امیر معاویہؓ نے اسے بوزنطیوں کے مقابلے میں مدینے کی افواج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ یزید اول کے خلاف بغاوت کے شعلے بلند ہونے کے وقت تک وہ مدینے ہی میں تھا۔ جب باغیوں نے بنو امیہ کو مدینے سے نکال دیا تو وہ اپنے باپ کے ہمراہ مدینے سے نکل گیا۔ راہ میں ان کی ملاقات اس فوج سے ہوئی جو مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں مدینے کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے مسلم کو مدینے اور اس کے دفاع کے بارے میں ضروری اطلاعات بہم پہنچائیں۔ اور فوج کے ساتھ ہی مدینہ لوٹ آیا۔ مدینے کے قریب حرہ کے مقام پہ لڑائی ہوئی اور اہل مدینہ نے شکست کھائی۔

رمضان ۶۵ھ میں بنو امیہ کے طرف داروں نے عبدالملک کو باقاعدہ خلیفہ تسلیم کر لیا۔ لیکن اسے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرحدوں پہ بوزنطیوں نے فساد کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے ۶۸ھ میں انطاکیہ پہ دوبارہ قبضہ جما لیا تھا۔ اور وہ شام میں بھی بعض قبائل کو مدد دے رہے تھے۔ مکے میں عبداللہ بن زبیرؓ کو خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا گیا تھا اور سلطنت کے اکثر صوبوں میں انہیں برائے نام خلیفہ تسلیم کیا جا رہا تھا۔ عبدالملک نے ان مشکلات سے خود سے عہدہ برآ ہونے کا اہل ثابت کیا اور چند ہی سال میں شامی قیادت کے تحت عربوں کا اتحاد بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

عراق سے نمٹنے کے لیے عبدالملک نے ۶۹ھ میں بوزنطی شہنشاہ سے دس سال کے لیے صلح کر لی۔ اس صلح کے فوراً بعد عبدالملک مصعب کے مقابلے کے لیے دمشق سے روانہ ہو گیا۔ لیکن دارالحکومت میں ایک بغاوت برپا ہو جانے کے باعث اسے واپس آنا پڑا۔ بغاوت کے سرغنہ کو اس نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ اگلے سال مصعب کے خلاف از سرِ نو مہم اختیار کی گئی جزیرہ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تیسرے سال اس نے بنو قیس کی کمک کے ساتھ عراق پہ چڑھائی کی۔ مصعب اور ابن اشعر کو شکست دی اور وہ دونوں مارے گئے۔ عراق کی اکثریت جنگ و جدال سے تنگ آ چکی تھی کیونکہ ان لوگوں کو سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ چنانچہ جب خلیفہ کوفے میں داخل ہوا تو ساری ولایت نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے فوراً بعد خلیفہ نے دو ہزار شامیوں کا لشکر حجاج کی قیادت میں عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف مکے روانہ کیا۔ حجاج نے مکے کا محاصرہ کیا اور چھ ماہ بعد عبداللہ ابن زبیرؓ میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور اہلِ شہر نے حجاج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ حجاج کو اس فتح کے صلے میں حجاز کا والی بنا دیا گیا۔

عراق کی بازیابی سے عبدالملک کے سامنے خارجیوں کے خلاف فوری کارروائی کی ضرورت پیدا ہو گئی، اور کوفے اور بصرے کی متحدہ افواج نے ابتدائی ناکامی کے بعد ۷۳ھ میں مشحر کے مقام پہ   کے نجدیہ کو شکست دی اور اس کے بعد بھی بہت سی بغاوتوں اور فسادات سے عبدالملک کا سامنا رہا اور وہ انہیں رفع کرنے کے لیے حکمتِ عملی سے کام لیتا رہا۔

گو عبدالملک اندرونی خلفشار اور بیرونی جنگوں کے باعث نہایت مصروف رہتا تھا لیکن اس نے مملکت کے نظم و نسق پہ پوری توجہ دی۔ قبائل کے منتشر رجحانات کے علاج کے لیے اس نے مرکزیت کے قیام کے سلسلے میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ ان میں ایک اہم اصلاحی اقدام یہ تھا کہ دیوان میں حسابات کے اندراج کے لیے یونانی اور فارسی کی جگہ عربی زبان رائج کی گئی۔ ایک دوسری اصلاح یہ کی گئی کہ قرآن مجید کا مشکول و منقوط نسخہ تیار کیا گیا۔ مشہور یہی ہے کہ یہ کام حجاج نے کیا تھا عبدالملک کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ تعمیر کرایا۔

اس کے عہد کے آخری سال خوش حالی و امن و استحکام کے سال تھے اگر اسے کوئی پریشانی تھی تو جانشینی کے سوال پر تھی۔ کیونکہ مروان اپنے بھائی عبدالعزیز کو اس کا جانشین مقرر کرنا چاہتا تھا۔ اور عبدالملک اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو تخت پہ بٹھانا چاہتا تھا۔

۸۶ھ/۷۰۵ء میں جب عبدالملک کی وفات ہوئی تو عبدالعزیز پانچ ماہ پہلے انتقال کر چکا تھا۔ چنانچہ عبدالملک کے بعد اس کا بیٹا باپ کا جانشین بنا۔

عبدمناف

قریش کے بادا، حضورؐ کے جدِ امجد اور قصی کے بیٹے۔ عبدمناف کے بیٹے عبدشمس اور ہاشم تھے۔ عبدشمس کے بیٹے کا نام امیہ تھا۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب نام کے تھے۔ عبدالمطلب کے لڑکے عباس، عبداللہ، ابولہب اور ابوطالب نام کے تھے۔ ان میں عبداللہ رسول اکرم صلعم کے والد تھے۔

عبدالمنانؒ وزیرآبادی

(۱۲۶۷ھ - ۱۳۳۴ھ)، محدث پنجاب۔ مقام پیدائش کردل ضلع جہلم ۸ سال کی عمر میں آشوبِ چشم کے مرض میں بینائی چھن گئی۔ تحصیل علم کے لیے مختلف مقامات پہ گئے۔ آخر میں دہلی شیخ الکل سید نذیر حسین دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں جملہ علوم و فنون بالخصوص حدیث و تفسیر کی تکمیل کی۔ شیخ الکل کے علاوہ امام شوکانی کے تلمیذ خصوصی شیخ عبدالحق سے بھی حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ قیامِ دہلی کے دوران بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ و دیگر نامی گرامی علماء سے ملاقاتیں کیں۔ تکمیل دورہ حدیث کے بعد امرتسر مولانا عبداللہ غزنویؒ کے پاس آ گئے۔ مولانا غزنوی نے انہیں مسند درس حدیث پر بٹھا دیا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد وزیر آباد گئے۔ جہاں تاحیات رہے۔

وزیر آباد میں آپ نے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو بعد میں برصغیر کا ممتاز مدرسہ بن گیا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا میر سیالکوٹیؒ۔ سیف بنارسیؒ۔ مولانا اسمٰعیل گوجرانوالویؒ وغیرہ نے یہیں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ حافظ عبدالمنانؒ کو محدث پنجاب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ پنجاب میں پہلے مدرس ہیں جنہیں "حدیث کی امام کتاب" بخاری شریف ساٹھ مرتبہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ وزیرآباد میں کچھ عرصہ آپ کی مخالفت ہوئی۔ لیکن آپ کی درویشانہ عادات نے جلد ہی آتش شورش کو ٹھنڈا کر دیا۔ آپ کا چہرہ بارعب، آواز بلند، قد دراز طبیعت قلندری اور عادات سکندری تھیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ آئمہ دین کا احترام بے حد کرتے۔ مسائل میں متشدد اور تنگ دل نہیں تھے۔

۱۳۱۹ھ میں جب دہلی شیخ الکلؒ کے پاس پہنچے تو واپسی پر شیخؒ نے خدمت

Marfat.com

حدیث کے باعث آپ کے حق میں دعائے خیر کی اور اپنی پگڑی دیتے ہوئے کہا "گرتہ عبد الجبار (غزنوی) ہے لے گیا۔ پگڑی تم لے جاؤ"۔ چنانچہ پگڑی آپ کی وفات کے بعد آپ کے کفن میں رکھ دی گئی۔ آپ کا کتب خانہ بڑا وسیع تھا جو آپ کی وفات کے بعد جامع مسجد اہل حدیث وزیرآباد کی تحویل میں رکھا گیا۔

مولانا عبدالمنانؒ کا انتقال رمضان ۱۳۳۴ھ میں وزیرآباد میں ہوا۔ آپ کی قبر وزیرآباد سیالکوٹ روڈ چونگی کے قبرستان میں ہے۔ ان کی وفات پر مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے کہا۔ "آج زمانۂ حاضر کا امام بخاری فوت ہوگیا ہے"۔

عبرانی

ایک سامی زبان جو یہودیوں کی قدیم ترین زبان ہے۔ عہد قدیم کی بیشتر تحریریں عبرانی زبان میں ملتی ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں عبرانی نے کافی ترقی کی ہے اور فلسطین کے یہودیوں کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ جدید عبرانی میں اب شعر و ادب کا ذخیرہ ملتا ہے۔ عبرانی زبان دائیں سے بائیں ہاتھ کی طرف لکھی جاتی ہے۔ عبرانی اور عربی کے بعض اصول باہم مشترک اور یکساں ہیں۔

عَبَس، سورۃ

قرآن مجید کی ایک سورت کا نام۔ لفظی ترجمہ، اس ایک آدمی نے تیوری چڑھائی یا ترش روئی کی۔

اس سورت میں "اس آدمی" سے مُراد خود حضور اکرم صلعم کی ذات ہے۔

اس سورت کا عدد تلاوت ۸۰ ہے۔ قرآن پاک میں یہ سورۃ "النّٰزِعٰت" کے بعد اور سورۃ "التکویر" سے پہلے درج ہے۔ اس سورت کے دوسرے نام "الساخۃ" "السفرۃ" اور "الاعمٰی" بھی منقول ہیں۔ یہ مکی سورت ہے۔ اس کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی ابن اُم مکتومؓ، حضور اکرم صلعم کی خدمت میں تعلیم قرآن مجید کے لیے حاضر ہوئے۔ آپؐ اس وقت قریش کے سرداروں سے گفتگو کر رہے تھے اور انہیں اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔

ان میں عتبہ، شیبہ، ابوجہل، عباسؓ بن عبدالمطلب، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ بھی شامل تھے۔ ابن ام مکتومؓ مادر زاد نابینا تھے۔ بلا جھجک حضورؐ کے پاس آگئے، اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہؐ! مجھے قرآن مجید پڑھایئے اور جو کچھ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو سکھایا ہے مجھے بھی سکھایئے۔ وہ لاعلمی میں یہ الفاظ دوہراتے چلے گئے، آپؐ کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی تو انہیں چپ رہنے کو کہا اور ان سے منہ پھیر کر وفد قریش کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالےٰ کو یہ ادا بھلی نہ لگی اور اس نے اپنے پیغمبر پر یہ سورۃ نازل کی کہ اس نابینا سے جس کا دل ایمان کی پاکیزگی سے آباد ہے یہ اعراض کیوں ہوا؟ کیسے معلوم کہ حق کی تعلیم کا فائدہ اسی کو پہنچا ہو اور حق سے لاپروائی برتنے والوں پہ اتنی توجہ دینے کا کیا فائدہ؟ اگر یہ حق پر نہ بھی چلیں تو اس سے آپ کو کیا فرق پڑ جاتا۔

یہ سورۃ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایک جانب تو حق کے لیے ذوق و شوق کا اظہار کرنے والوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے اور دوسری جانب خود رسول اکرمؐ پر کسی اور ہستی کے نگراں ہونے کی دلیل مہیا کی گئی ہے اور وہ منکرین جو کہتے ہیں کہ قرآنی آیات نعوذ باللہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ خود حضورؐ نے وضع کی ہیں، اب اس سورۃ کے نزول کے بعد بے جواز اور لاجواب ہو جاتے ہیں۔ رسول اکرم صلعم سے مروی ہے کہ جس نے اس سورۃ کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن ہشاش بشاش مسکراتے چہرے کے ساتھ آئے گا۔

عبیداللہ احرار، خواجہ

ماوراء النہر کے بلند پایہ بزرگ۔ خواجہ یعقوب چرخی کے مرید اور خلیفہ۔ آپ کا نام عبیداللہ اور لقب ناصر الدین تھا مگر خواجہ احرار کے نام سے شہرت پائی۔ رمضان ۸۰۶ھ میں باغستان تاشقند میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۹ ربیع الاول ۸۹۵ھ کو سمرقند میں وفات پائی وہیں دفن ہوئے۔ آپ کے جد امجد ایک بہت بڑے ولی تھے انہوں نے حضرت قاسم تبریزی اور مولانا سعد الدین کاشغری سے روحانی تربیت حاصل کی مشہور شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی ان کے دوست تھے۔

عبیداللہ بن زیاد

دیکھیے: "ابن زیاد"

عبیداللہ بن عامر

شامی فوج کا ایک سردار۔ اس نے حضرت امیر معاویہؓ اور امام حسنؓ کے درمیان امر خلافت امیر معاویہؓ کے حوالے کر دینے کا معاہدہ طے کرایا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کی خبر پاتے ہی امیر معاویہؓ نے امیر المومنین کا لقب اختیار کر لیا۔ اور اہل شام سے تجدید بیعت کرائی، اور ساٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ کوفہ پر چڑھائی کر دی۔ اور امام حسنؓ سے کہلا بھیجا کہ جنگ سے صلح اچھی ہے۔ اور آپ مجھے خلیفہ وقت مانتے ہوئے میرے ہاتھ پہ بیعت کر لیں۔ اس پر حضرت امام حسنؓ چالیس ہزار کا لشکر لے کر کوفہ روانہ ہوئے اور مقام دیر عبدالرحمٰن پہنچنے کے بعد قیس بن سعدؓ کو بارہ ہزار فوج دے کر مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بھیجا۔ لشکر ساباط مدائن پہنچا تو قیس بن سعد کے مارے جانے کی خبر مشہور ہو گئی۔ حضرت امام حسنؓ نے فوج سے خطاب فرمایا اور کہا کہ تم میں سے اکثر جنگ سے احتراز کرتے ہوئے کمزوری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس لیے میں تمہاری مرضی کے خلاف تم پر جبر کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر فوج میں شامل خارجی اور منافقین آپ کے خلاف ہو گئے اور آپ کے خیمے میں داخل ہو کر سامان لوٹ لیا اور بدن کا لباس تار تار کر دیا۔

یہ شورش ختم ہونے کے بعد امام حسنؓ مدائن روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک خارجی نے نیزے سے وار کیا۔ اور آپ کی ران میں زخم آیا۔ اسی دوران انہوں نے سنا کہ عبیداللہ بن عامر شامی فوج کے ساتھ مدائن میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے حضرت امام حسن مقابلے کے لیے نکلے۔ عبیداللہ نے قریب پہنچ کر اہل عراق سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا۔ تم لوگ میری طرف سے امام حسنؓ کی خدمت میں سلام پہنچانے کے بعد عرض کرو کہ جنگ سے احتراز کریں تاکہ ہلاکت سے بچ جائیں۔ کیونکہ امیر معاویہ کی عسکری قوت بہت زیادہ ہے اس پر امام حسنؓ نے کہلا بھیجا کہ مندرجہ ذیل شرائط پہ صلح کرنے اور خلافت سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں:

۱۔ امیر معاویہؓ کتاب و سنت پہ عامل رہیں۔

۲۔ پہلی دشمنی کو بھلا کر کسی کی جان و مال سے مزاحمت نہ کریں۔

۳۔ ہمارے طرف داروں کی جان کی حفاظت کا عہد کریں۔

عبیداللہ بن عامر نے یہی الفاظ امیر معاویہؓ کے سامنے دوہرائے۔ امیر

Marfat.com

معاویہؓ نے یہ شرائط منظور کرلیں اور ایک سادہ کاغذ پر اپنے دستخط کرکے مہر لگائی اور عبیداللہ کو دیتے ہوئے کہا۔ یہ کاغذ حضرت امام حسنؓ کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ ان پہ جو شرائط چاہیں لکھ دیں میں سب کی سب پوری کروں گا۔

عبیداللہ بن عامر یہ کاغذ لے کر امام حسنؓ کے پاس پہنچا اور ان سے ایک صلحنامہ تحریر کروایا جس میں امام حسنؓ حق خلافت سے دست بردار ہوگئے۔

عبیداللہ سندھیؒ، مولانا

ہندوستان میں تحریک آزادی کے معروف رہنما اور دینی بزرگ۔

ضلع سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آبائی پیشہ زرگری تھا پیدائش سے چار ماہ قبل والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ بچپن میں ہی خاندان کے دیگر سربراہوں کی وفات کے باعث ان کی والدہ انہیں ان کے ماموں کے پاس جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں لے آئیں۔ یہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر میں اسلام کے ساتھ محبت پیدا ہوئی تو جستجو میں سیالکوٹ پہنچے۔ یہاں آکر مشن سکول میں داخل ہوگئے۔ اسی دوران آپ نے حافظ محمد لکھویؒ کی معروف پنجابی کتاب "احوال الآخرۃ"، مولانا عبیداللہؒ کی "تحفۃ الہند" اور سید اسماعیلؒ شہید کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" کا مطالعہ کیا، تو قبول اسلام کا اظہار کر دیا۔ خاندان نے تعاقب کیا تو آپ سندھ چلے آئے۔ یہاں سے روحانی تربیت حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی والے) سے حاصل کی۔ ۱۳۰۶ھ میں آپ ہند کی عظیم دینی و تحریکی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ یہاں صرف و نحو اور فقہ و حدیث کی کتابیں پڑھیں اور مزید تعلیم کے لیے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں پہنچے۔

بیمار ہوکر آپ گنگوہ سے دہلی چلے آئے یہاں سے آپ نے مولوی عبدالکریم اور شیخ الکل سید نذیر حسین دہلویؒ سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ میں دہلی سے سندھ پہنچے اور درس حدیث شروع کر دیا۔ ان دنوں تحریک آزادی کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ اور عالم اسلام کے اتحاد کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ ۱۳۲۴ھ میں آپ شیخ الہندؒ کے حکم پہ کابل روانہ ہوئے۔ یہاں کانگریس کی تشکیل کی۔ ۱۹۲۲ء میں کابل سے روس روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ روس رہنے کے بعد ترکی چلے گئے۔ اس بین الاقوامی دورے کے اختتام پہ آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور وہاں مولانا عبدالوہاب دہلویؒ۔ مولانا عبدالستار دہلویؒ (کراچی) اور ابوالاشرف مجددیؒ وغیرہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور یہاں آکر تحریکی کام شروع کر دیا۔

مولانا سندھیؒ نے تحریک ریشمی رومال میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی فکر ملی غیرت سے متشکل ہوئی تھی۔ آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے۔ کسی کے پوچھنے پر دکھ اور حسرت کے لہجہ میں فرمایا۔ میری ٹوپی اس دن سے ہی اتر گئی تھی جس دن لال قلعہ ہم سے چھن گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں مولانا لاہور اپنی صاحبزادی کے ہاں آئے تو یہیں راہی ملک بقا ہوئے۔

عبیداللہ مہدی

مصر کے عبیدی فرمانرواؤں کا مورث اعلیٰ۔ انھیں مہدویہ، علویہ، فاطمیہ اور اسماعیلیہ بھی کہتے ہیں۔ عبیداللہ کی جائے پیدائش غالباً کوفہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہاشمی کہتا اور سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد بتاتا تھا لیکن اکثر مورخوں نے اس کے فاطمی ہونے سے انکار یا فدا اس کے نسب پر طعن کیا ہے۔

اس نے ۲۷۰ھ میں مہدویت کا دعوے کیا اور اپنے تابعین کو مہدویہ کہا۔ ۲۷۸ھ میں اس نے حج کیا۔ جو کنانہ کے لوگ اس کی مہدویت پہ ایمان لے آئے اور اس کے ساتھ ہولیے۔ وہ باون برس اپنے دعوے پہ قائم رہا۔ یہاں تک کہ ۳۲۲ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔

عبیدہ بن حارثؓ

مشہور صحابیؓ۔ کنیت ابوحارث یا ابومعاویہؓ۔ خاندان قریشی۔ حضرت عبیدہ، ابوسلم بن اسدؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ قبل از ہجرت ایک ساتھ مسلمان ہوئے۔ اور آنحضرتؐ ہی کے حکم سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت کی جہاں رسول اللہؐ نے انھیں اپنے کنبہ کی سکونت کے لیے زمین کا ایک ٹکڑا عطا کیا۔ ہجرت کے آٹھ ماہ بعد مجاہدین اسلام کے امیر بنا کر وادی رابغ کی طرف بھیجے گئے تاکہ قریش کی نقل و حرکت کا اندازہ لگائیں۔ اسلام میں یہ دوسرا عہدہ امارت تھا جو حضرت عبیدہ کو دیا گیا۔ راستہ میں ابوسفیان اور اس کے دوسو ساتھیوں کے ساتھ معمولی سی جھڑپ ہوئی، اور واپس آگئے۔ جنگ بدر کے موقع پہ ولید کے مقابلہ میں سخت زخمی ہوئے۔ ایک ٹانگ جاتی رہی اور اسی باعث ۶۳ برس کی عمر میں وفات پاگئے۔ مقام صفرا میں دفن ہوئے۔ آپ نہایت خوبصورت اور میانہ قد تھے۔ آنحضرتؐ آپؓ کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔

عتبانؓ بن مالک

نام عتبان۔ قبیلہ سالم۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ جنگ بدر میں شامل تھے۔ اس کے بعد نابینا ہوجانے کے باعث باقی غزوات میں شریک نہ ہوسکے۔ بڑے پائے کے صحابی اور بزرگ تھے۔ علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ مسجد بنو سالم کے امام مقرر کیے گئے۔ اور عمر بھر اسی عہدہ جلیلہ پہ فائز رہے۔ مسجد اور مکان کے درمیان ایک وادی تھی جس میں پانی جمع رہتا تھا۔ آپؓ نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ نابینا ہوں گھر سے مسجد تک جانا دشوار ہے۔ اجازت ہو تو گھر پہ ہی نماز ادا کرلیا کروں۔ آنحضرت صلعم نے پوچھا کیا اذان کی آواز گھر تک پہنچتی ہے، فرمایا ہاں۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا جب آپ اذان کی آواز سن سکتے ہیں تو مسجد میں جاکر نماز ادا کیا کیجئے۔

قرآن و حدیث سننے کا اس قدر شوق تھا کہ قبا میں رہنے کی وجہ سے دربار رسالت دو میل دور پڑتا تھا اور آپ نابینا تھے۔ اس لیے آپ نبی اکرم صلعم کی خدمت میں ایک دن حاضر ہوکر جو کچھ سنتے حضرت عمرؓ کو آکر سنا دیتے۔ دوسرے دن آپ نہ جاتے اور حضرت عمرؓ جاکر سن آتے تو گھر آکر آپ کو سناتے۔ چنانچہ حدیث میں آپ کے حوالے سے بہت سی احادیث درج ہیں۔

اتباع رسول کا یہ عالم تھا کہ باوجود نابینا اور عمر رسیدہ ہونے کے رسول اللہ کے حکم کے اتباع میں مسجد میں جاکر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

عتبہؓ بن ابی لہب

حضور کے چچا، اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابی لہب کے بیٹے فتح مکہ

Marfat.com

سے وقت عتبہؓ مسلمانوں کے خوف سے مکہ چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیے۔ حضرت محمد صلعم نے حضرت عباسؓ کو ان کی تلاش کے لیے بھیجا۔ حضرت عباسؓ انھیں اپنے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں لے آئے جہاں پہنچ کر آپؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ غزوہ حنین میں اسلام کی مدافعت میں جنگ لڑی۔ اس غزوہ کے بعد جنگ طائف میں بھی بڑی سرفروشی دکھائی۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی ٭

عتبہ بن ربیعہ

امیر معاویہؓ کا نانا تھا۔ زمانہ قبل اسلام میں قریش میں نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست شمار ہوتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جو قریش کی طرف سے حضور اکرمؐ کے پاس آیا اور دولت کی پیش کش کی اور دعوت اسلام ترک کر دینے کو کہا لیکن جواب میں حضورؐ نے چند آیات قرآنی پڑھ کر سنائیں۔ اس نے واپس جا کر کہا محمد (صلعم) جو کلام پیش کہتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو اس میں تمہاری عزت ہے ورنہ عرب انھیں خود فنا کر دے گا۔ مگر قریش نے اس کی بات نہ مانی۔

جنگ بدر میں لشکر قریش کا سردار تھا۔ اسی جنگ میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں مارا گیا ٭

عتبہؓ بن غزوان

کنیت ابو عبداللہ۔ والد کا نام غزوان بن جابر۔ ابتدائی زمانۂ اسلام میں مسلمان ہوئے۔ کفار کے مظالم سے تنگ آ کر دوسری ہجرت میں مکہ سے حبشہ چلے گئے۔ پھر حالات موافق ہونے پر واپس چلے آئے۔ یہاں سے پھر مدینہ کو ہجرت کی جنگ احد اور دیگر غزوات میں رسول اللہ کے ہمراہ لڑے۔

۱۴ھ میں خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے میں آپ نے بحیثیت ایک جرنیل کے دجلہ کا سارا ساحلی علاقہ فتح کر لیا۔ اسی سال بندرگاہ ابلہ کے قریب ۸۰۰ افراد کو ساتھ لے کر ایک نیا شہر بسایا اور اسی شہر کے والی مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد حکومت چھوڑ کر مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا لیکن حضرت عمرؓ نے بصرہ واپس جانے کو کہا۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں واپس ہوئے لیکن راستے میں اونٹ سے گر کر وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۷ برس تھی۔

صحابہؓ میں آپ بہت متقی اور پرہیزگار مانے جاتے تھے۔ غرور و تکبر سے بہت نفرت تھی ہر شخص کے ساتھ انکسار سے پیش آتے تھے ٭

عتبہؓ بن مسعود

مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کے سگے بھائی۔ دعوت اسلام کے آغاز میں اسلام قبول کیا، ہجرت ثانیہ میں حبشہ اور پھر وہاں سے مدینہ گئے۔ سب سے پہلے غزوہ احد میں شریک ہوئے۔ بعد کے تمام غزوات میں بھی شریک رہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں وفات پائی ٭

عثمان اوّل

خاندانِ سلاطین عثمانیہ کا بانی اور تاریخی روایات سے اس خاندان کا پہلا فرد۔ اسے عثمان غازی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں تاریخ کے تحریر شدہ ابواب میں کچھ ایسی زیادہ تفصیل نہیں ہے لیکن اس کے نام سے ایک سلسلہ سلاطین کا آغاز یقیناً اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر حوالہ ضرور پوشیدہ ہے۔

عثمان اوّل

متفقہ روایت کے مطابق عثمان ارطغرل کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد ایک نیم خانہ بدوش قبیلے کا سردار بنا جس کی سرمائی قیام گاہ وادی قرہ صو میں سُغد کے مقام پر تھی۔ عثمان نے اپنے پہلے دَور میں عثمانی طاقت کے اس چھوٹے سے مرکز کو اپنے اردگرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے وسعت دی۔ اس سے قبل یہ علاقہ بوزنطیوں کے باجگزار تھا۔ قرہ بحصار میں عثمان کے نام پر پہلی دفعہ خطبہ پڑھنا شاید فتوحات کے اسی دَور سے متعلق ہے۔ اس دوران میں مفتوحہ علاقے میں اضافہ ہوا۔

عثمان کا دوسرا دَور وہ ہے جس میں اس نے اپنے مرکز یکی شہر سے مغربی سمت برُوسہ کی جانب اور شمال کی طرف ازنیق کی جانب فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ترکوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان شہروں پر قبضہ کرتے۔

اس کا تیسرا دور وہ ہے جو جس میں وہ فوجی مہمات میں ذاتی طور پر شریک نہیں ہوتا تھا اور اس کے ساتھی ان فتوحات کے سلسلے کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اس کے ایک ساتھی خان کا پہلا معرکہ تاتاریوں کے ایک جم غفیر کا اخراج تھا جنھوں نے اس کے شہر کے ایک حصے پر یلغار کر دی تھی۔

آخری دَور میں عثمان نے اپنے آپ کو ازنیق اور بُرسہ کے شدید محاصرے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آخر الذکر شہر ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں فتح ہو گیا۔ یہ واقعہ عثمان کی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے ظہور پذیر ہوا۔

عثمان اوّل کو اپنے عہد کے آغاز میں ہی مخلص ساتھیوں کا ایک حلقہ مل گیا تھا۔ ان میں کچھ اس کے بھائی بھتیجے تھے اور کچھ شیخ ادب علی جیسے لوگ شامل تھے۔ شیخ ادب علی کی لڑکی مال خاتون (ایک دو اور حوالوں میں اس کا نام "رابعہ" درج ہے) کی شادی عثمان سے ہوئی۔ عثمان نے مفتوحہ علاقوں کا شہری اور فوجی انتظام اپنے دوستوں میں بانٹ دیا تھا۔

اس کے حالاتِ زندگی کی تاریخ یقینی نہیں ہے اس لیے اس کے عہد حکومت یا ذاتی حالات و واقعات کا اندراج معتبر نہیں معلوم ہوتا ٭

عثمانؓ بن ابی العاص

کنیت ابو عبداللہ۔ غزوہ طائف کے بعد بنی ثقیف کے وفد کے ساتھ مدینہ گئے۔ یہ اس وفد میں سب سے کم عمر تھے۔ اس وفد کے اسلام لانے کے بعد حضور اکرم صلعم نے حضرت عثمانؓ کو مشہور حافظ اور مفسر قرآن، ابی بن کعبؓ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ

Marfat.com

آپ نے اپنی بے پناہ ذہانت کے باعث جلد ہی سارا دینی علم اخذ کر لیا اور بنی ثقیف کی درخواست پر حضور اکرم صلعم نے عثمانؓ کو ان کی تربیت کے لیے بھیجا۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں بصرہ چلے آئے اور یہی فرائض وہاں انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں حضرت عمرؓ نے انھیں بحرین اور عمان کا حاکم بنا دیا۔ عثمانؓ نے اپنے بھائی مغیرہ کو بحرین میں اپنا قائم مقام بنایا اور خود ایران کے مختلف حصوں میں لشکر کشی کی۔ ابو موسیٰ الاشعری ان کی امداد پر تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایران کے بہت سے علاقے فتح کر لیے۔

۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ غنی کے دورِ خلافت میں عثمان ابی العاص نے اصطخر کا علاقہ دوبارہ فتح کر لیا۔ گو وہ لوگ باغی ہو گئے تھے۔

۵۵ھ میں امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات پائی۔ احادیث کے سلسلے میں ان کی مرویات کی تعداد تیس کے قریب ہے۔

عثمانؓ بن حنیف

نام عثمان کنیت ابو عمر۔ قبیلہ اوس اصحابِ رسولؐ میں سے ہیں۔ انصار میں بڑی عزت رکھتے تھے۔ علم حساب میں بڑی دسترس اور مہارت تھی۔ اسی لیے حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں عراق اور کوفہ فتح کرنے کے بعد مالگزاری کے نظم و نسق کے لیے مجلس شوریٰ کی تجویز پر انہیں وہاں بھیجا اور یہ فرض انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ واپسی پر کوفہ کے صاحب الخراج مقرر ہوئے۔ انہوں نے زمین کا ایسا اعلیٰ بندوبست کیا کہ آمدنی ہر سال بڑھنے لگی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کے اختیار کردہ طریقے کو ساری اسلامی دنیا میں رائج کر دیا۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بصرہ کے حاکم مقرر ہوئے۔

مسلمانوں کی خانہ جنگی کے وقت جب بصرہ ظلم و ستم کا مرکز بنا تو حضرت عثمانؓ بھی اس سے نہ بچ سکے چنانچہ انہیں گرفتار کر کے حضرت عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کے سامنے لایا گیا اور بڑی بے رحمی سے ان کی داڑھی اور سر کے بال نوچے گئے اور کوڑے مار مار کر ان کی بری حالت کی گئی۔

ان کا انتقال امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں ہوا۔ علم حساب میں مہارت کے علاوہ حدیث اور فقہ میں بھی طاق تھے۔ چند احادیث نبویؐ آپ سے مروی ہیں۔

عثمانؓ بن طلحہ

ماں کا نام سلامہ۔ زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کی کلید برداری کا منصب عثمان کے والد طلحہ کے سپرد تھا جو جنگ احد میں حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارا گیا قبول اسلام کے بعد یہی عہدہ عثمانؓ کو باپ کی وراثت کی وجہ سے دلایا گیا۔ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ۸ھ میں ہجرت کر کے مدینہ میں مقیم ہو گئے۔

فتح مکہ کے بعد جب حضورؐ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے اندر داخل ہونے لگے تو وہ دروازہ مقفل تھا اور چابی حضرت عثمانؓ کی والدہ کے پاس تھی۔ انہوں نے ماں سے چابی مانگی۔ وہ مشرکہ تھی لہذا اس نے پس و پیش کی۔ جس پر آپ نے غضب ناک ہو کر چابی چھین لی اور رسول اللہؐ کے سامنے لا کر پیش کی۔ آپؐ نے دروازہ کھولا اور عثمانؓ کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوئے۔ باہر آنے پر آپؐ نے چابی حضرت عثمانؓ بن طلحہ کے حوالے کر دی اور فرمایا جو شخص تم سے یہ چابی چھینے گا وہ ظالم ہو گا۔

آپؓ ہمیشہ رسول اللہؐ کے ساتھ مدینہ میں رہے اور آپؐ کی وفات کے بعد کعبہ کے کلید بردار ہونے کی وجہ سے مکہ چلے آئے اور یہیں ۴۲ھ میں فوت ہوئے۔

عثمانؓ بن عفان

عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف تیسرے خلیفہ راشد۔ امیر المومنین۔ قریش کی مشہور شاخ بنو امیہ میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کا قومی علم "عقاب" جنگ کے وقت اسی خاندان کے سپرد ہوتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں عبد مناف پر رسول اللہؐ سے مل جاتا ہے۔ ان کی والدہ کا نام اروی بنت کریز ہے اور نانی ام حکیم البیضاء بنت عبد المطلب۔ ان کی نانی حضرت محمد صلعم کی سگی پھوپھی تھیں۔ اور آنحضرتؐ کے والد عبد اللہ کی توام بہن۔

حضرت عثمانؓ کی ولادت عام الفیل کے چھ سال بعد ۵۷۶ء میں ہوئی اس طرح وہ حضور اکرمؐ سے چھ سال چھوٹے تھے۔ ان کا شمار ان چند ایک لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے انھیں بھی وحی لکھنے پر مامور کیا۔ اس طرح وہ وحی کے کاتبوں میں بھی شمار ہوئے آنحضرتؐ کے معتمد کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیے۔

بہت نیک فطرت تھے۔ قبل اسلام کی زندگی میں بھی ان کا دامن آلودگیوں سے بچا رہا۔ شرم اور حیا ان کے اعلیٰ اخلاق کا امتیاز تھا۔ مسلمانوں میں "کامل الحیاء والایمان" کے الفاظ حضرت عثمان کے لیے ہی استعمال کیے گئے ہیں۔

جوانی میں انہوں نے اہل قریش ہی کی طرح تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اپنی دیانت اور صداقت کے باعث تجارت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ وہ مکے کے معاشرے میں ایک ممتاز، معزز اور دولت مند تاجر کی حیثیت سے مشہور تھے اور "غنی" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کا شمار سابقون الاولون، عشرہ مبشرہ اور ان چھ اکابر صحابہؓ میں ہوتا ہے جن سے رسول اکرم صلعم تمام زندگی خوش رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کے گہرے مراسم تھے اور ان ہی کی تبلیغ و تحریک پر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ انہوں نے بعثت نبوی کے آغاز ہی میں رسول اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور پھر عمر بھر اپنی جان و مال و دولت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مشغول رہے۔ خود حضرت عثمانؓ کا قول ہے "میں اسلام قبول کرنے والے چار میں سے چوتھا ہوں۔" آپؓ حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے پہلے شخص تھے۔

گو وہ قریش کے معزز افراد میں سے تھے لیکن اسلام قبول کرنے پر انھیں بھی سختیوں اور ایذا رسانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؓ کا چچا حکم بن ابی العاص بیڑیوں سے جکڑ کر مارا کرتا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا۔

رسول اکرم صلعم نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا عقد حضرت عثمانؓ سے کیا۔ یہ عقد اتنا بابرکت تھا کہ مکے میں عام طور پر لوگ کہا کرتے تھے کہ بہترین جوڑا جو کسی انسان نے دیکھا، رقیہؓ اور ان کے خاوند عثمانؓ ہیں۔

Marfat.com

بعثت کے پانچویں سال حبشہ کو ہجرت کرنے والوں میں حضرت عثمانؓ اور ان کی زوجہ حضرت رقیہؓ شامل تھیں۔ یہ اسلام میں سب سے پہلی ہجرت تھی یعنی حضرت عثمانؓ اول المہاجرین تھے۔ حبشہ میں قیام کے دوران ان کے ایک صاحبزادے کی ولادت ہوئی جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ اسی لیے حضرت عثمان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔

دوسری ہجرت انھوں نے مدینہ کی طرف کی۔ یہاں حضور اکرم صلعم نے حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری کے بھائی اوس بن ثابتؓ سے ان کی مواخات کر دی۔ اس تعلق سے دونوں گھرانوں میں انس و محبت بہت بڑھ گیا۔ اسی لیے جب حضرت عثمان کی شہادت ہوئی تو حضرت حسانؓ نے ایک دردناک مرثیہ کہا اور تمام عمر اس سانحے پر رنجیدہ رہے۔

آپؓ بڑے مالدار تاجر تھے اور حد درجہ سخی اور فیاض بھی۔ اپنا مال ہمیشہ رفاہی و اسلامی امور پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ غزوات کے موقع پر خصوصاً ان کا مال بے تحاشا کام آتا تھا۔ ان کی فیاضی اور سخاوت کے واقعات اسلامی تاریخی کتب میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

آپؓ عہد نبوی کے تمام غزوات میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کی زوجہ حضرت رقیہؓ علیل تھیں۔ حضور اکرمؐ نے انھیں ان کے پاس ہی ٹھہرنے کے لیے کہا اور فرمایا کہ تمھیں اس جنگ میں شریک لوگوں ایسا اجر اور مالِ غنیمت ملے گا۔ اسی لیے غزوہ بدر میں شامل مجاہدین کی جو فہرست بخاری میں چھپی ہے اس میں آپؓ کا نام درج ہے۔ غزوہ ذات الرقاع اور غزوہ بنی غطفان دونوں مواقع پر آنحضرت صلعم نے انھیں اپنا قائم مقام مقرر فرمایا۔

حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضرت محمد صلعم نے اپنی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمان سے کر دیا۔ یہ نکاح منشائے الٰہی کے مطابق تھا۔

شعبان ۹ ہجری کو ام کلثوم کی وفات پر حضور صلعم نے فرمایا اگر میری کوئی اور بیٹی بھی ہوتی تو میں عثمانؓ سے بیاہ دیتا۔ ابن الاثیر نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے نبی اکرمؐ سے سنا۔ آپؐ نے فرمایا اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو میں انہیں یکے بعد دیگرے عثمانؓ سے بیاہ دیتا۔ حضرت علیؓ ہی سے نقل ہے کہ لوگوں نے ان سے حضرت عثمانؓ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا "وہ ایک ایسے شخص تھے جنھیں ملاءِ اعلیٰ میں "ذوالنورین" کہہ کر پکارا گیا۔ یہ اس لیے کہ وہ آنحضرتؐ کی دو بیٹیوں کے خاوند تھے۔

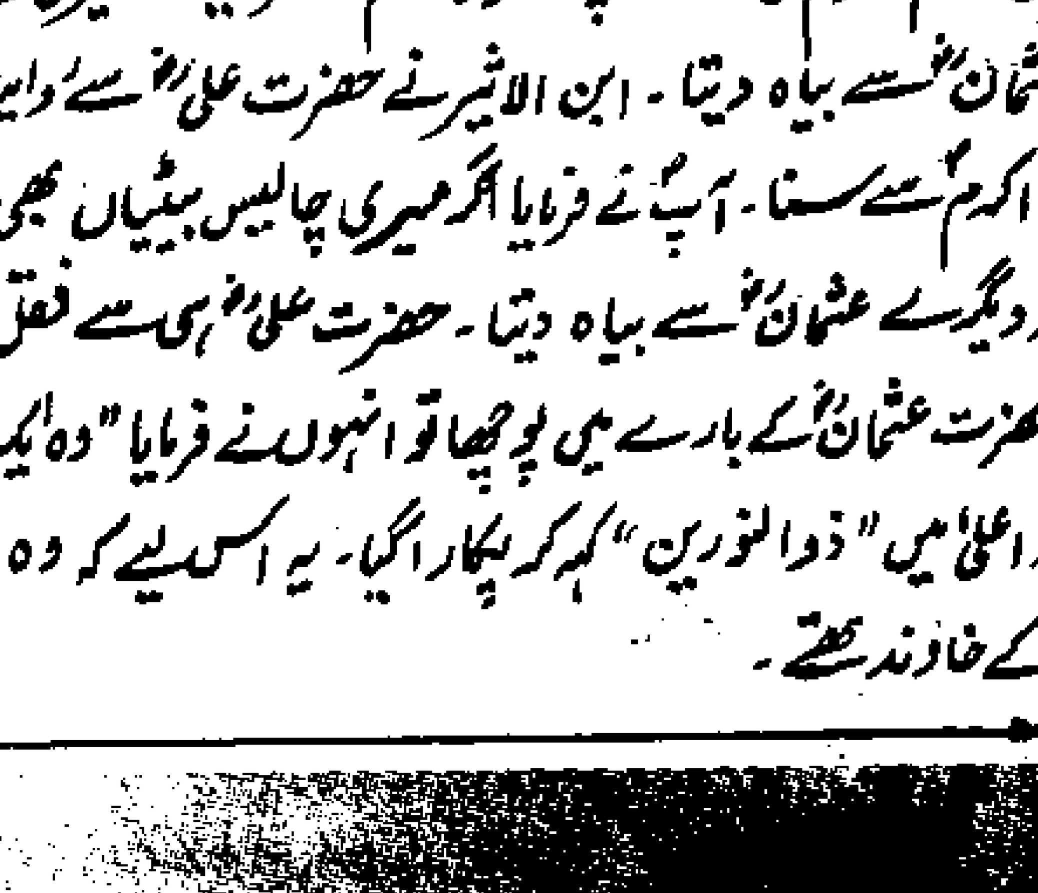
مسجد حدیبیہ جہاں بیعت رضوان لی گئی

حضرت عثمانؓ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جب آنحضرت صلعم نے انھیں ذوالقعدہ ۶ھ میں اہل مکہ کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اسی کے نتیجے میں "بیعت رضوان" اور صلح حدیبیہ کے واقعات پیش آئے۔

حضرت عثمانؓ، خلیفہ اول حضرت ابوبکر ... کے عہد خلافت میں ان کے مشیر تھے اور بعض دیگر صحابہ کے ساتھ افتا کی خدمت بھی انہی کے سپرد تھی۔ اور کاتب کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ کے ممتاز ارکان میں شامل رہے۔ عثمانؓ کی فضیلت صحابہ کرام میں تسلیم شدہ ہے۔ نافع نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہؐ کی زندگی میں اثنائے گفتگو میں نام لیتے وقت یہ ترتیب اختیار کیا کرتے تھے: ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اس سے ان حضرات کا درجہ فضیلت مدنظر تھا۔

حضرت عمرؓ جب ابولؤلؤ کے خنجر سے مجروح ہوئے اور ان کی زندگی کی امید باقی نہ رہی تو صحابہؓ نے ان کے سامنے ان کے جانشین کا مسئلہ پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا: "اگر امین الامت ابوعبیدہؓ بن جراح زندہ ہوتے تو میں انھیں اپنا جانشین بنا دیتا۔" جب حضرت عمرؓ کی حالت زیادہ بگڑتی نظر آئی تو پھر جانشین کا مسئلہ پیش ہوا۔ چنانچہ حضرت عمر نے فرمایا "میں اس امر کا حقدار ان لوگوں سے زیادہ کسی کو نہیں پاتا جن سے رسول اللہ اپنی وفات تک راضی رہے۔ پھر انھوں نے عشرہ مبشرہ میں سے مندرجہ ذیل چھ اصحاب کی ایک مجلس قائم کر دی۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو بھی مشورے کے لیے ان کے ساتھ کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے خاندان کو خلافت سے محروم کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد ان کی تدفین سے فارغ ہو کر مجلس کے مندرجہ بالا چھ اصحاب مسور بن مخرمہ کے مکان میں مشاورت کے لیے جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا تم اس معاملے کو تین شخصیتوں میں محدود کر دو۔ اس پر اتفاق ہوا اور حضرت زبیرؓ نے حضرت علیؓ کے لیے، حضرت طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کے لیے اور حضرت سعدؓ نے عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں دست برداری کا اظہار کیا۔ بعد میں عبدالرحمٰنؓ بھی دستبردار ہو گئے، اور باقی کے دو حضرات (حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ) سے کہا کہ اس امر کو مجھ پر چھوڑ دیں۔ دونوں نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے "ہاں" کہا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مسلسل تین دن تک خلافت کے امیدواروں، شہر کے اہل الرائے افراد اور لشکروں کے سپہ سالاروں سے مل کر مشورہ کیا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اکثریت کی رائے حضرت عثمان کے حق میں ہے تو مسجد نبوی میں مسلمانوں کے سامنے مختصر لیکن مؤثر تقریر کی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اور سب سے پہلے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے بیعت کی اور بعد میں باقی حضرات نے باری باری ان کی بیعت کر لی۔ عثمانؓ کی بیعت حضرت عمرؓ کی وفات کے تین دن بعد محرم ۲۴ھ / نومبر ۶۴۴ء میں ہوئی۔ عبداللہؓ بن مسعود نے اس موقع پر کہا، ہم نے اپنے میں سے بہترین شخص کی بیعت کی۔

خلافت عثمانیؓ کی مدت لگ بھگ بارہ سال ہے اور یہ عرصہ اسلامی فتوحات کے سلسلے میں پہلا عظیم الشان عہد ہے جس کی مثال اس سے قبل کی تاریخ اسلام میں نہیں ہے۔ ان فتوحات کا سہرا عثمانیؓ عہد کے سپہ سالاروں ولید بن عقبہ، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور حضرت معاویہؓ کے سر تھا۔ اس زمانے میں اسلامی جغرافیائی حدود میں بہت وسعت ہوئی۔ اس کی حدود سندھ سے اندلس تک جا پہنچیں۔ اسلامی افواج اسی عہد میں بحری قوت کو بھی منظم کیا اور قبرص و روڈس کے جزائر فتح کیے۔ ایک عظیم بحری بیڑہ تیار کیا گیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کے پاس ایک کشتی بھی نہیں تھی۔ حضرت معاویہؓ تو سمندری راستے سے اتنی دور نکل گئے کہ ۳۲ھ میں آبنائے قسطنطنیہ (باسفورس)

Marfat.com

تک جا پہنچے۔ اس لحاظ سے خلافتِ اسلام کا دور اسلام میں فتح و کامیابی کا باب ثابت ہوا۔ اس عہد میں دو طرح کی فتوحات ہوئیں۔ ایک تو وہ ممالک جو حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی فتح ہو گئے لیکن رومیوں اور ایرانیوں کی شہ پا کر باغی ہو گئے تھے حضرت عثمانؓ کے عہد میں انھیں دوبارہ زیرِ اطاعت لایا گیا۔ ۲۵ھ میں سکندریہ میں بغاوت ہوئی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے فوراً بڑھ کر رومیوں کو شکست دی اور امن و امان قائم کر دیا۔ اسی سال آذربائیجان اور آرمینیہ میں بغاوتیں ہوئیں جنہیں کوفے کے امیر ولید بن عقبہ اور سلیمان بن ربیعہ باہلی نے فرو کیا۔ مغرب میں رومیوں نے شامی سرحد کے قریب ایشیائے کوچک کی طرف چھیڑ چھاڑ کی تو امیر معاویہؓ بڑھے اور انطاکیہ و طرطوس کے درمیان واقع رومی قلعوں کو فتح کر لیا۔

دوم وہ ممالک جو پہلی بار عہدِ عثمانیؓ میں حلقۂ اطاعت میں آئے۔ ۲۵ھ میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح امیر مصر نے طرابلس (لیبیا) پر فوج کشی کی۔ دو ہی سال بعد تونس، الجزائر اور مراکش کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ مشرقی افریقہ کی فتوحات میں عبداللہ بن زبیرؓ نے بہت نام کمایا۔ اسی سال عبداللہ بن نافع نے سمندر پار کر کے اندلس کا محاصرہ کر لیا کچھ فتوحات بھی ہوئیں۔ لیکن اس جانب مستقل مہم کا آغاز نہ کیا گیا۔ شمال کی طرف حبیب بن مسلمہ اور سلیمان بن ربیعہ نے علاقے فتح کیے۔ مسلمانوں کی فوجیں بحرہ اسود تک جا پہنچیں۔ ۳۰ھ میں عبداللہ بن عامر اور سعید بن العاص نے خراسان اور طبرسان کی طرف پیش قدمی کی۔ سعید بن العاص نے جرجان، خراسان اور طبرستان کو فتح کیا اور عبداللہ بن عامر نے مزید آگے جا کر سوات کابل، سجستان، نیشاپور اور ارد گرد کے علاقوں کو مطیع بنایا۔ عہدِ عثمانیؓ میں مسلمانوں نے تقریباً پچاس بحری لڑائیاں لڑیں اور بحری قوت کا انتظام اسی عہد کا کارنامہ ہے۔

اسی عہد میں مسلمانوں نے ہندوستان کی طرف بھی توجہ کی۔ اور گجرات کے ساحلی علاقوں تک جا پہنچے اور یہ فتوحات کا سارا سلسلہ صرف ۴ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ اس نے عثمانؓ کی زبردست سیاسی بصیرت اور پُر جوش خدمتِ دین کا پتہ چل جاتا ہے۔

ان کے عہد میں تہذیب و تمدن۔ صنعت و حرفت، تجارت اور علوم و فنون کو بھی ترقی ہوئی۔ دولت اور فارغ البالی و خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ اور قرب و جوار میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کروائیں۔ قدیم بازاروں کے علاوہ نئے بازار بھی قائم کیے گئے۔ اور عمائد قریش حجاز سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پہنچ گئے عثمانؓ کی اسلامی خدمات کا تذکرہ طویل ہے۔ ان کی ایک اہم خدمت مسجد الحرام کی توسیع ہے جو ۲۶ھ میں کی گئی۔ ۲۹ھ میں انہوں نے مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کرائی۔ اس کام میں پورے دس ماہ صرف ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسجد کا طول ۱۴۰ گز اور عرض ایک سو بیس گز تھا، اب طول ۱۶۰ گز اور عرض ۱۵۰ گز ہو گیا۔ سب سے بڑا کارنامہ جو ان کے عہد میں ہوا وہ عالمِ اسلام کو ایک مصحف اور ایک قرأت پر جمع کرنا تھا۔ قرآن مجید کو لکھوا کر تمام ممالکِ اسلامیہ میں شائع کرنا اور ایک ہی قرأت پر تمام عالمِ اسلام کو متفق کر دیا عثمانؓ کا نہایت بڑا کام ہے اور اسی باعث اُمت میں ان کا لقب جامع القرآن مشہور ہوا۔

روایات اس طرح ہیں کہ عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ مصحف کی سات نقلیں کروائیں اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، یمن، بحرین، بصرے اور کوفے میں ایک ایک نسخہ محفوظ کیا گیا۔ مصحفِ عثمانی کے ان نسخوں میں سے اس وقت چار نسخے دنیا میں محفوظ ہیں:

۱۔ حجرہ نبوی کا نسخہ۔
۲۔ خزانۂ آثارِ نبویہ استنبول۔
۳۔ کتاب خانۂ مصریہ۔
۴۔ کتاب خانۂ ماسکو۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کا نصف آخر نہایت پُر سکون رہا۔ فتوحات کی کثرت کے سبب مالِ غنیمت اور محاصل میں اضافہ ہوا۔ تجارت و زراعت میں ترقی ہوئی۔ اس کے نتیجے میں معاشرے میں خوشحالی پیدا ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں فساد اور بگاڑ بھی پیدا ہو گیا۔ اس بگاڑ اور فساد میں بہت سے عناصر کا حصہ تھا۔ کچھ عرب قبائل کی باہمی چپقلش، کچھ غیر مسلم اقوام اور علاقوں کا حلقۂ اسلام میں آنا۔ اور کچھ غیر مسلمان یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی سازشیں، یہ سب باتیں اس فتنے کے ظہور کا باعث بنیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مزاج میں جو تحمل بردباری اور فطری نرم دلی تھی اس نے سازشیوں کو دلیر بنا دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکنے والی اس آگ کے مراکز کوفہ، بصرہ اور مصر تھے گو اس سازش میں اور بہت سے لوگ بھی شریک تھے لیکن اس کا سرغنہ (ایک یہودی بظاہر مسلمان) عبداللہ بن سبا تھا۔ (اس کے خلاف بہت سی متضاد روایات ہیں۔ نیز دیکھیے مضمون "عبداللہ بن سبا")۔ اس نے حبِ اہلِ بیت اور بنی ہاشم کے پردے میں حضرت عثمانؓ اور پھر بنو امیہ کے خلاف وسیع پیمانے پر منظم پروپیگنڈے کا جال بچھا دیا۔ یہ سب غلط بیانیوں اور غلط شکایات پر مبنی تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ عثمانؓ کے خلاف ان چیزوں پر اظہارِ ناراضگی کیا گیا کہ اگر عمرؓ نے کی ہوتیں تو لوگ خفا نہ ہوتے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت عمرؓ ایک سخت گیر خلیفہ تھے جبکہ عثمانؓ نہایت گداز دل اور نرم خو آدمی تھے اور اسی بات سے سازشی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ حالانکہ ان پر جو الزامات لگائے گئے ان کو جب بعد میں پرکھا گیا تو کوئی الزام بھی مضبوط اور قابلِ گرفت نہ تھا۔

اپنے خلاف ابھرنے والی افواہوں کی حقیقت جاننے کے لیے انہوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی اور مختلف صحابہ کو مختلف مقامات پر بھیجا تاکہ وہ ٹھیک ٹھیک صورتِ حال کا اندازہ کر سکیں۔ پھر پورے ملک میں اعلان کر دیا کہ جس شخص کو میرے عمال کے خلاف شکایت ہو وہ حج کے موقع پر بیان کرے۔ میں ظالم سے مظلوم کا حق دلاؤں گا۔

۳۵ھ کے آخر میں باغیوں نے مدینے کا رخ کیا۔ اس زمانے میں حج کے باعث مدینہ تقریباً خالی تھا۔ ان لوگوں نے پہلے تو امیر المومنین مسجد میں آنا جانا دشوار کر دیا پھر ان کے مکان کا محاصرہ کر لیا جو کم و بیش چالیس دن تک جاری رہا۔ اس دوران کئی بار امیر المومنین نے اپنے مکان کی چھت سے باغیوں کو خطاب فرمایا، شورش پسندوں کو نصیحت کی۔ حضور اکرم صلعم کے ساتھ اپنی نیازمندی کے حوالے دیے۔ اسلام کے واسطے اپنی خدمات گنوائیں لیکن کسی نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ انہوں نے باغیوں کو تنبیہ کی کہ بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو پھر تا قیامت نہ ایک ساتھ نماز پڑھو گے اور نہ ایک ساتھ جہاد کرو گے۔ باغیوں نے ان سے خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کیا اور بعض صحابہ نے مدینہ منورہ چھوڑ کر مملکت کے کسی اور حصے میں چلے جانے کی رائے دی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا کہ نہ تو میں اس قمیص کو اتاروں گا جو مجھے اللہ تعالےٰ نے پہنائی ہے اور نہ جوارِ رسولؐ سے جدائی ہی برداشت کروں گا۔ ان کی حفاظت کے لیے بعض اکابر صحابہؓ نے اپنے فرزندوں کو ان کے مکان کے باہر مقرر کر دیا تھا ان میں حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور

Marfat.com

حضرت عبداللہ بن عمرؓ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ایک جم غفیر ان کے پاس موجود تھا۔ ان کے پاس موجود لوگوں نے ان سے باغیوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن حضرت عثمان نے منع کر دیا اور فرمایا جس پر میرا کچھ بھی حق ہے میں اسے اللہ کی قسم دلا کر کہتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روکے رکھے اور اپنے گھر کو چلا جائے۔

آخر یہ حالت تھی کہ خلیفہ امتِ رسولؐ کا پانی بند کر دیا گیا، انھیں پتھر مارے گئے، ان کے گھر کو آگ لگا دی گئی لیکن انہوں نے اس ساری صورتِ حال کا حیرت انگیز استقلال اور استقامت کے ساتھ سامنا کیا اور اپنی حمایت میں کسی کو جنگ کی اجازت نہ دی۔

انھیں حضرت محمد صلعم کی پیش گوئی کے مطابق اپنی شہادت کا یقین ہو چکا تھا آخری رات انہوں نے نبی اکرم صلعم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا: "اے عثمانؓ! ہمارے ساتھ روزہ افطار کرنا۔"

۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن چند باغیوں نے گھر میں داخل ہو کر رسول اللہؐ کے تیسرے خلیفہ کو اس وقت شہید کر دیا جب وہ تلاوت کلام پاک میں مشغول تھے شہادت کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے اوپر تھی۔ ابن جریر کے مطابق امیر المومنینؓ کی میت

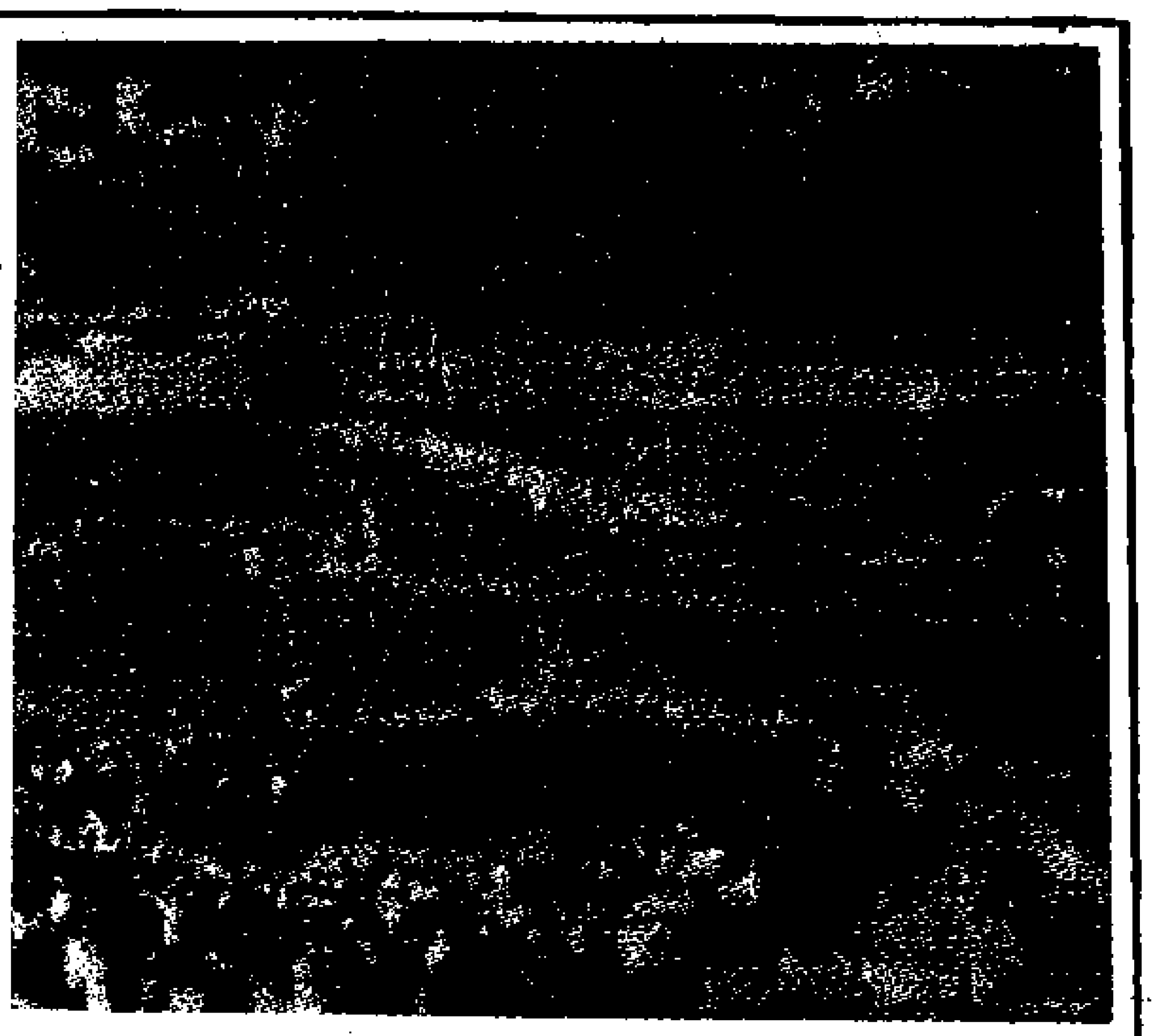

جنت البقیع، جہاں حضرت عثمانؓ کا مزار واقع ہے

کو چند صحابہؓ نے جن میں علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، کعبؓ بن مالک، زیدؓ بن ثابت اور حزامؓ شامل تھے، اٹھایا اور البقیع کی مشرقی جانب "حش کوکب" میں سپرد خاک کر دیا۔

شہادتِ عثمانؓ پر صحابہ کرامؓ دم بخود تھے۔ خذیفہؓ نے فرمایا سب سے پہلا فتنہ قتلِ عثمان ہے اور سب سے آخری فتنہ دجال ہوگا۔ حضرت علیؓ نے شہادتِ عثمانؓ کی خبر مسجدِ نبوی میں سنی اور فرمایا: جاؤ اب ہمیشہ کے لیے تمہارے واسطے ہلاکت اور بربادی ہے۔ عبداللہؓ بن سلام نے کہا قتلِ عثمان سے فتنوں کا جو دروازہ کھل گیا وہ اب تا قیامت بند نہ ہو سکے گا اور دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی طرح رنج و تاسف کا اظہار کیا۔ حسان بن ثابتؓ کے علاوہ کعب بن مالکؓ، حمید بن ثور الہلالی، قاسم بن امیۃ بن صامت، زینب بنت عوام نے ان کی وفات پر الم انگیز مرثیے لکھے۔

حضرت عثمانؓ سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں جن میں سے تین متفق علیہ ہیں۔ آٹھ صرف بخاری میں ہیں اور پانچ صرف مسلم میں۔

مزید دیکھیے "خلافت راشدہ"

عثمانؓ بن مظعون

قدیم ترین اور فاضل صحابہؓ رسولؐ میں شمار ہوتے ہیں۔ کنیت ابوالسائب تھی۔ ان سے پہلے فقط تیرہ افراد اسلام لائے تھے۔ حبشہ کی ہجرت میں شریک تھے۔ بعد میں واپس آ گئے تھے۔ پھر عثمانؓ نے مدینے کو ہجرت کی۔ ان کے صاحبزادے سائب ان کے ہمراہ تھے۔ عثمانؓ کے بھائی قدامہؓ، عبداللہ اور سائبؓ بھی مہاجر اور بدری تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی اور ۳ھ میں وفات پائی۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو بقیع الغرقد میں مدفون ہوئے۔

رسولؐ خدا کی نگاہ میں ان کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ اس رنج و غم سے ہوتا ہے جس کا اظہار آپؐ نے عثمانؓ کی میت دیکھ کر کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے حضورؐ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کو ان کی قبر کے نزدیک دفن کیا۔

عثمانؓ بہت زاہد، عابد اور متقی انسان تھے۔ عبادت و ریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ شراب کے ممنوع قرار دیئے جانے سے قبل ہی اس سے اجتناب کرتے تھے۔ رات بھر نوافل پڑھتے اور دن بھر روزہ رکھتے۔

عثمان ثالث

عثمانی حکمران جو اپنے بھائی سلطان محمود خان کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ اس نے ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۷۱ھ/۱۷۵۷ء تک فقط تین سال حکومت کی اور اسی دوران اپنے بھائی سلطان محمود ہی کے سیاسی اصولوں کا پابند رہا۔ چنانچہ ہمسایہ حکومتوں سے اس کی کوئی آویزش نہیں ہوئی۔

۱۷۵۶ء میں آسٹریا کی جنگ ہفت سالہ شروع ہو گئی جس نے یورپین حکومتوں کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر کے سات سال تک وسطِ یورپ کو میدانِ کارزار بنائے رکھا۔ دولتِ عثمانیہ کے لیے یہ دوسرا نادر موقع تھا جب وہ دشمنوں کی باہمی جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی مگر عثمان ثالث اس جنگ میں اخلاق و شرافت کے اسی اصول پر کاربند رہا جس کی مثال محمود اول نے آسٹریا کی جنگِ جانشینی کے موقع پر پیش کی تھی۔

سلطنت کے اندرونی نظم و نسق میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس عہد میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۶ صفر ۱۱۷۱ھ/۳۰ اکتوبر ۱۷۵۷ء کو سلطان عثمان ثالث نے وفات پائی۔

عثمان ثانی

ایک عثمانی سلطان اور سلطان احمد اوّل کا بیٹا۔ سلطان احمد اوّل کا پہلا جانشین اس کا بھائی مصطفیٰ ہوا۔ لیکن اس کی سادہ لوحی اور نااہلیت کے باعث تین ہی مہینے بعد اسے معزول کر کے ارکینِ سلطنت نے ۱۶ جنوری ۱۶۱۸ء کو چودہ سالہ شہزادہ عثمان (ثانی) کو تخت پر بٹھا دیا۔

عثمان ثانی کا عہد حکومت بھی بہت مختصر رہا اور سلطنت اور خود اس کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ ترکوں کی مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنا پڑی (۱۶۱۸ء) اور وہ تمام فتوحات جو مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں حاصل ہوئی تھیں ایرانیوں کو واپس کر دی گئیں۔ سلطنت عثمانیہ کی سرحد پھر اسی خط پر پہنچ گئی جہاں

Marfat.com

عثمان ثانی

سلطان سلیم ثانی کے زمانے میں تھی۔ اُدھر سے فارغ ہوکر عثمان سلطنت کے اندرونی دشمنوں یعنی وسپاہی دستوں کی جانب متوجہ ہُوا جس کی خودسری اور سرکشی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ تھی۔

۱۶۲۱ء میں سلطان نے پولینڈ کے ساتھ جنگ چھیڑ دی۔ جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس فوج کی قوت بھی کچھ کمزور پڑ جائے۔ یہ مقصد ایک حدتک پورا تو ہوا اور سلطانی فوجوں کو جزوی کامیابی کے بعد کافی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ لیکن اس جنگ سے عثمان کے خلاف ایک عام برگشتگی پیدا ہوگئی۔ بجائے اس کے کہ وہ رعایا کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے قوانین وضوابط میں نامناسب تبدیلیاں اور سختیاں نافذ کرکے اور زعمائے سلطنت کو اپنے برتاؤں سے ناخوش کرکے ہر طبقہ کے لوگوں کو بیزار کردیا۔

۱۶۲۲ء میں اس نے سفر حج کا ارادہ کیا لیکن یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اس کا اصلی مقصد دمشق پہنچ کر کُردوں اور دوسرے سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کرنا ہے جسے جدید طرز پہ منظم کرکے وہ ینی چری اور اسپاہی کی بیخ کنی کے لیے قسطنطنیہ لانا چاہتا تھا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا تو سلطنت کی بیشتر خرابیاں دُور ہوجاتیں لیکن چونکہ اس مہم کی رازداری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اس لیے چری کو اس کے مقصد کا علم ہوگیا۔ اور انہوں نے برافروختہ ہوکر سلطان کو اس سفر سے روک دیا اور موجودہ وزیروں کے قتل کا مطالبہ کیا۔ عثمان کے پاس ایسی فوج نہ تھی جو ان کا مقابلہ کرسکتی اور نہ عوامی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں باغیوں نے وزراء سے بڑھ کر خود سلطان کی ذات پر حملہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے عثمان کو گرفتار کرکے قید کردیا اور مصطفےٰ کو رہا کرکے دوبارہ تخت سلطنت پر بٹھایا۔ داؤد پاشا جس کو اس بغاوت میں بہت دخل حاصل تھا، صدراعظم بن گیا۔ انقلاب کے کسی آئندہ خدشے کے پیش نظر وہ اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ عثمان کے قیدخانے میں داخل ہُوا اور نہایت بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ اسے پھانسی دے کر ختم کردیا۔

عثمان علی خان

دیکھیے : " نظام دکن "۔

عثمان ہارونیؒ

معروف صوفی۔ ان کی پیدائش خراسان کے قصبہ ہارون میں ہوئی۔ تاریخ ولادت کا علم نہیں ہوسکا۔ وفات ۲۱ شوال ۶۱۷ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی اور وہیں مزار ہے۔
زیادہ تر زندگی سفر میں گزاری اور اپنے وقت کے تقریباً تمام مشہور مشائخ سے ملاقات کی۔ بڑے پائے کے ولی اللہ تھے۔ ان کے پیر حاجی شریف زندنیؒ نے خرقۂ خلافت عطا کرتے وقت آپ کے فرقِ مبارک پہ ایک کلاہ رکھی اور فرمایا "عثمانؒ! اس کے چار گوشوں سے مراد چار چیزوں کا ترک یعنی ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک خورد و خواب مگر بقدر ضرورت اور ترک خواہش نفس۔ پھر فرمایا یہ کلاہ اس شخص کو اپنے سر پہ رکھنا چاہئے ہے جو ان چاروں چیزوں کو ترک کرے۔ سب لوگوں کو اپنے سے بہتر اور اپنے آپ کو سب سے کمتر جانے [illegible] حرام ہے۔

خواجہ عثمان ہارونیؒ نے اپنے پیر کی ان باتوں پہ پوری طرح عمل کیا اور [illegible] ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ تین سال تک ایسی زندگی بسر کی جب پیرو مرشد نے امتحان لے لیا اور دیکھا کہ آپ ہر طرح سے کامیاب ہوگئے ہیں تو خرقۂ خلافت عنایت کیا۔ اس کے بعد پیر کی اجازت سے سفر کا آغاز کیا۔ اور مختلف علاقوں کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں۔

خواجہ اجمیریؒ کو مرید کرنے کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو خواجہ صاحب بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ مکہ سے مدینہ پھر بدخشاں اور بغداد کا سفر کیا۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد پھر طویل سفر اختیار کیا۔

" انیس الارواح " کے نام سے ایک کتاب میں خواجہ اجمیریؒ نے آپ کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ خواجہ عثمان ہارونیؒ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو خدا کے لیے حاصل کیا جائے۔ اور دوسرا علم وہ ہے جو عوام کے طریقے پر سیکھا جائے اسی طرح عمل کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک عمل جو خالص اللہ کے لیے کیا جائے اور دوسرا وہ جو لوگوں کے لیے کیا جائے۔ مزید فرمایا۔ مومن وہ شخص ہے جو تین چیزوں کو دوست رکھے، موت، فاقہ اور درویشی۔

عثمان غنیؓ

دیکھیے : عثمان بن عفانؓ اور خلافتِ راشدہ

عجمی

لغوی معنی گونگا۔ اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا جو عرب کی جغرافیائی حدود سے باہر کے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ غیر عربی لوگوں کو دیے گئے اس لقب کی تہہ میں اہلِ عرب کا اپنی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت پر ناز پوشیدہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے علاوہ دنیا کے کسی بھی خطے میں بسنے والے انسان اپنا مافی الضمیر پوری صحت کے ساتھ ادا نہیں کرسکتے۔ اس طرح دل کی بات کا اظہار نہ کرنا گونگے ہونے کے برابر ہے اس لفظ کے انتخاب میں بھی یہ رمز موجود ہے۔ یعنی ان کی نگاہ میں امتیاز۔ صرف زبان ہی کی وجہ سے ہے۔ یہ خیال اسلام نے غلط قرار دیا اور بتایا کہ سبھی انسان برابر ہیں۔ اگر کسی میں کوئی امتیاز ہے تو وہ صرف اللہ سے ڈرنے کی وجہ سے۔ کیونکہ تمام لوگوں نے مرکر اپنے خدا کے حضور جانا ہے۔
تو وہاں صرف اس کی فرمانبرداری ہی کام آسکے گی۔ زبان و بیان کسی پہلو بھی کام نہیں آسکے گا۔ اصل کامیابی اور وجہ عزت خدا کی رضامندی یعنی جنت میں داخلہ ہے اور وہ تبھی ممکن ہے جب اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر انسان عمل پیرا ہو۔ اصل بڑائی، بزرگی اور فضیلت اللہ کی اطاعت پر منحصر ہے۔ فصاحت و بلاغت یا زبان دانی نہیں۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے اپنے آخری خطبہ میں بھی فرمایا، کسی عربی کو عجمی پر محض عربی ہونے کی بنا پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کے لیے عربی پہ کوئی برائی نہیں بلکہ فضیلت اللہ سے زیادہ ڈرنے میں ہے۔

عجمی حبیب

دیکھیے : "حبیب عجمی"

Marfat.com

عداس مسیحی

ایک مسیحی غلام۔

حضورِ اکرم صلعم جب طائف پہنچے اور قبیلہ بنی ثقیف سے مدد چاہی اور انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے جواباً اپنے میں سے بعض دریدہ دہن لوگوں کو آپؐ پر آوازے کسنے پر اکسایا۔ ان لوگوں نے نازیبا باتیں کہنے کے ساتھ ساتھ آپؐ پر پتھر بھی برسائے۔ آپؐ زخمی ہوکر لہولہان ہوگئے۔ اور ایک باغ میں پناہ لی۔ باغ کے مالکان کچھ دیر تو آپؐ کو دیکھتے رہے پھر انہیں خیال آیا اور انہوں نے عداس مسیحی نامی عیسائی غلام کے ہاتھ ایک برتن میں کچھ انگور بھیجے۔ آپؐ نے انگور کھانے سے قبل بسم اللہ کہا۔ عداس حیرت سے آپکا منہ تک رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس علاقے کے لوگ تو کھانے سے قبل یہ کلمہ نہیں کہتے۔ عداس نے آپؐ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یونس میرا بھائی اور پیغمبر تھا اور میں بھی پیغمبر ہوں۔ یہ سن کر عداس آپؐ کے سر اور ہاتھوں کو بوسہ دینے لگا۔ جب وہ باغ کے مالکوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے ایسا نہ ہو کہ یہ شخص تجھے تیرے دین سے برگشتہ کردے اور یہ سب لوگ اپنے مذہب پر ہٹ دھرمی کے ساتھ قائم رہے۔

عِدّت

لغوی معنی شمار کرنا۔

اصطلاحی معنوں میں وہ مدت مراد ہے جس کے دوران کوئی عورت۔ اپنے خاوند کے مرنے یا اس سے طلاق لینے کے بعد دوسرا نکاح نہیں کرسکتی۔ یہ مدت مطلّقہ عورت کے لیے کم از کم تین مہینے یا تین حیض کے برابر۔ بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن اور حاملہ کے لیے وضع حمل تک ہے۔ اس پابندی میں حکمت یہ ہے کہ اس دوران مرنے والے یا طلاق دینے والے شوہر کا بچہ اس کے رحم میں اگر ہو تو اس کا پتہ چل سکے تاکہ نسب خلط ملط نہ ہوسکے۔ مطلقہ کے لیے تین حیض اس لیے کہ اگر وہ حاملہ ہوگی تو حیض بند ہوجائے گا۔ اس طرح پتہ چل سکے گا۔ بیوہ کے لیے سوا چار ماہ، کہ اتنی مدت میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ اتنی دیر انتظار کرنے کے بعد اگر حمل وغیرہ کی کوئی نشانی نہ ہو تو وہ عورت نکاح کرسکتی ہے۔ بصورت دیگر بچے کی پیدائش تک انتظار کرے۔

اسلام نے حسب و نسب میں "خالص" کا جو لحاظ رکھا ہے وہ اسلام کے دینِ فطرت ہونے کی بذاتِ خود دلیل ہے۔

عدل

عربی زبان کا لفظ۔ لغوی معنی برابری۔ ظلم کے اختلاف میں استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ اسلام نے عدل کو بنیادی اہمیت دی ہے کیونکہ اس کے بغیر ایک صالح معاشرے کا قیام عمل میں نہیں آسکتا۔ علاوہ ازیں کسی بھی معاشرے میں خوشحالی، امن اور ارتقاء کے مراحل اسی وقت طے ہوسکتے ہیں جب وہاں عدل موجود ہو۔ بصورت دیگر معاشرہ میں بسنے والے افراد خوف و ہراس اور بے راہ روی کا شکار ہوکر سوسائٹی کے قیام کے اصل مطالب سے ہٹ جائیں گے۔

ریاست یا فرد کی حفاظت ایک لازمی امر ہے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب عدل کے ذریعے حق دار کو حق دلایا جائے اور ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یہ کسی قانون کے تحت ہی ہوسکتا ہے اور اسلام اسی قانون کو عدل کا نام دیتا ہے۔ جہاں مخلوق کے درمیان برابری کی بنیاد پر حقوق اور فرائض کی تقسیم کی جائے ایک فرد یا گروہ دوسرے فرد یا گروہ کو زک یا تکلیف نہ پہنچائے اور اگر ایسا ہوجائے تو ایک عادل (یا عدالت) غلط اور صحیح کا فیصلہ کرکے معاملے کو احسن طریقے پر نمٹائے عدل کے تحت خون کا بدلہ خون اور عضو کا بدلہ عضو ہے یعنی اگر ایک شخص دوسرے کو جتنی تکلیف یا نقصان پہنچاتا ہے، اسلامی نگاہ میں مظلوم کو حق ہے کہ وہ ظالم کو اتنی ہی تکلیف یا نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس میں کسی رعایت یا لچک کی گنجائش نہیں ہے البتہ اگر مظلوم ظالم کو معاف کردے تو یہ احسان ہے۔ تاریخ اسلام کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

رسول اللہؐ کے پاس قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت فاطمہ چوری کے جرم میں پکڑ کے لائی گئی آپؐ نے اس پر تعزیر نافذ کرنے کا حکم صادر کردیا۔ تو اس قبیلے کے کچھ معزز افراد نے آنحضرتؐ سے حضرت اسامہ بن زید کے ذریعے سفارش کی۔ تو آپؐ کا چہرہ مارے غصّہ کے سُرخ ہوگیا اور لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا کہ خبردار تم سے پہلی قومیں اسی لیے عذابِ الٰہی کا شکار ہوئیں کہ ان میں جب کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو قانون اس سے چشم پوشی کرلیتا۔ لیکن اگر کوئی غریب اور لوگوں کی نگاہوں میں غیر معزز جرم کر بیٹھتا تو اسے سزا دی جاتی۔ سنو۔ اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ یہ تو مخزوم قبیلے کی فاطمہ ہے اگر کہیں فاطمہ محمد کی بیٹی اس جرم میں ملوث ہوتی تو میں اس پر بھی قانون نافذ ضرور کرتا اور اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس کا نام عدل ہے کہ یہاں لحاظ شخصیت کا نہیں اصول کا ہے۔ عدل کے لفظ کے ساتھ ایک اور لفظ بھی ہے۔

"احسان"۔ قانونی زبان میں اس کی ترکیب یوں ہوگی، قانون اور اخلاق۔ قانون کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور اخلاق میں ہر شخص مختار ہے۔ مثلاً مقتول کے ورثاء قاتل کو سزا دینے کے حقدار نہیں۔ اگر اس طرح کیا جائے گا تو عدل ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہر شخص اپنی مرضی سے جسے چاہے زندگی سے محروم کردے۔ اور اس بے عدلی سے قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا۔ جسے روکنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے یہ قانون مقرر کیا ہے۔ عدالت کو عدالت بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں سے انصاف ملتا ہے۔ اب عدالت مقتول کے وارثوں اختیار دے گی قتل کیا جائے یا معاف کردیا جائے۔ اگر ورثاء قتل پر آمادہ ہوں تو یہ عدل ہے اور اگر معاف کردیں تو یہ احسان ہے۔

قرآن مجید میں عدل، شرک کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی برابری کا مفہوم یہ تو نہیں کہ خدا کے ساتھ اس کی مخلوق میں سے کسی کو صفات و خصوصیات میں برابر کردیا جائے بلکہ یہ برابری انسانوں میں انسان ہونے کی بنا پر ہے خالق کے ساتھ نہیں۔

ایک اور مقام پر مال کے معنی استعمال ہوا۔ یعنی قیامت کے روز کسی کے لیے جہاں سفارش و عذر فائدہ نہ دے گی وہاں مال بھی بدلے میں دے کر تو کوئی گرفت سے بے قابو نہ ہوا جاسکے گا۔ اہلِ لغت نے عدل کے معنی ہیں ایسے کہ اونٹ کے دونوں کجاوے ایک جیسے بھرے ہوں۔ ایک جیسا وزن ہو۔ تو معلوم ہوا معنی دراصل برابری کے ہیں۔ مخلوق کے حق میں ہو تو عدل۔ اور خدا کے ساتھ کیا جائے تو یہ شرک۔

عدلؓ

دیکھیے " اسماء الحسنیٰ "

Marfat.com

عدن

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے میں برطانیہ کی ایک نوآبادی۔ برطانیہ یہاں ۱۹۳۸ء میں قابض ہوا۔ رقبہ تقریباً ۷۵ مربع میل ہے۔ یہاں بالواسطہ برطانیہ کا کنٹرول ہے۔ آبادی تقریباً ساڑھے تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے

عدن کی نوآبادی کی قانون ساز کونسل بارہ منتخب۔ پانچ بہ لحاظ عہدہ اور چھ نامزد ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ انگریزی اور عربی دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ عدن کی صنعت سمندر کے پانی سے نمک حاصل کرنا ہے۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے بھی یہاں موجود ہیں۔

۱۹۶۵ء سے برطانیہ نے عدن کی حکومت برطرف کر کے آئین معطل کر رکھا ہے۔ حریت پسندوں اور انگریز فوجوں میں جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ جنوبی عربی عرب کی تحریک آزادی کا موقف ہے کہ برطانیہ کے خلاف جنگ کر کے ہی عدن کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ جب سے عدن کو جنوبی عرب وفاق میں شامل کیا گیا ہے۔ عدن کے قوم پرستوں نے اپنی جدوجہد آزادی تیز تر کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وفاق میں شامل گیارہ عرب ریاستیں عدن کے مقابلے میں پسماندہ ہیں۔ وفاق میں کل اٹھارہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں جن کے سربراہ کا نام امیر یا سلطان ہوتا ہے۔ فیڈریشن کا صدر مقام "الاتحاد" ہے۔ ادھر برطانیہ عدن سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اقوام متحدہ کئی بار تحریک پیش کر چکی ہے کہ عدن کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔

عدنان، بنو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک شخص سرزمین عرب میں عدنان نامی گزرا ہے جس کی اولاد عدنانی کہلاتی ہے عدنان کے دو لڑکے تھے۔ عک اور معد۔ مگر آئندہ نسل صرف معد کے لڑکے نزار سے پھیلی۔ اس سے پانچ قبیلے مشہور نکلے جن کو تاریخ عرب میں بہت اہمیت حاصل ہوئی ہوئی۔

اغار۔ ایاد۔ ربیعہ۔ قضاعہ اور مضر۔ ان میں سے اغار اور ایاد بہت پھیلے البتہ ربیعہ اور مضر نے کثرت تعداد۔ دنیاوی اعزاز اور تاریخی اہمیت وغیرہ کے لحاظ سے بڑی شہرت پائی۔ ربیعہ بن نزار کی متعدد اولادیں ہوئیں جن سے بڑے بڑے قبائل منصۂ شہود پہ آئے۔ انتہائی دنیاوی اعزاز حاصل کیا اور حکومتیں قائم کیں۔ مشہور قبائل یہ ہیں: بنو جدیلہ۔ بن افصی (خاندان حضرت صہیب رومیؓ) بنو وائل۔ بنو عجل۔ بنو قیس۔ بنو تغلب اور بنو تمیم وغیرہ۔ پھر ان سے بھی بہت سے قبائل شاخ در شاخ ہو کر نکلے۔ ان سب قبائل کو بنو عدنان یا عدنانی کہا جاتا ہے۔

عدیؓ بن حاتم

عدی بن حاتم بن عبداللہ بن سعد طائی۔ ابوظریف۔ حضور اکرم صلعم کے صحابی جو حضرت علیؓ کے حامیوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مشہور شاعر حاتم طائی کے بیٹے اور اسی کے ہم مذہب یعنی عیسائی تھے۔ قبیلے کی سرداری بھی انہیں اپنے باپ سے ورثے میں ملی۔

ایک وفد کی صورت میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے عزت افزائی فرمائی۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر ۹ھ/۶۳۰ء میں اسلام قبول کر لیا۔ ایک جگہ عدی کا اپنا بیان نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے مشرف بہ اسلام ہونے کی وجہ حضور اکرمؐ کے اخلاق و انصاف سے متاثر ہونا بتایا ہے۔

نبی اکرم کی وفات کے بعد عدی اسلام پہ ثابت قدم رہے اور فتنہ کے دوران انہوں نے اپنے قبیلے کو مرتد ہونے سے بچائے رکھا۔ بعد ازاں انہوں نے عراق کی فتح میں حصہ لیا اور حضرت عثمانؓ سے نہر عیلی پہ روحار بطور جاگیر پائی۔

جنگ جمل میں عدی بن حاتم حضرت علیؓ کے ماتحت لڑے۔ جنگ صفین سے پہلے جو نامہ و پیام فریقین کے درمیان ہوا۔ اس میں وہ اس وفد میں شامل تھے جو حضرت علیؓ کی طرف سے امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا گیا۔ بعد ازاں وہ علم بردار بن کر اس جنگ میں لڑے جس میں ان کے تین بیٹے مارے گئے۔ اس لڑائی میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ بعد میں وہ کوفے میں رہنے لگے اور حضرت علیؓ کی حمایت کے جذبات ترک نہ کیے۔ وہ اپنے قبیلے کے ان افراد کو مؤثر طور پر پناہ دیتے تھے جن کو عراق کا طاقتور والی زیاد ابن ابیہ ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا تھا۔

حضرت عدیؓ نے تقریباً ۱۲۰ برس عمر پائی۔ اور ۶۸ھ/۶۸۷ء میں فوت ہوئے۔

عدی بن مسافر

قرشی اموی عرب۔ عدویوں کے شیخ طریقت۔ بعلبک کے قریب بیت فار میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مندرجہ ذیل بزرگوں سے ملاقات کی۔ عقیل ۔ حماد الدباس عبدالقاہر سہروردی۔ عبدالقادر جیلی۔ ابو الوفا حلوانی اور ابو محمد شبکی۔

انہوں نے دور دور کے سفر کیے اور بہت سا زمانہ جنگلوں میں گزارا۔ بعد میں موصل کے قریب لیلش میں مستقل سکونت اختیار کر کے اپنے لیے ایک خانقاہ بنائی اور ایک سلسلہ تصوف کی بنا ڈالی جسے عدویہ کہتے ہیں۔ ان کا طریقہ اتنا مشقت طلب تھا کہ بہت سے مشائخ ان کی پیروی نہ کر سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شیخ طریقت تھے جنہوں نے نوآموز مریدوں کو باقاعدہ تربیت دینے کا آغاز کیا۔

ان کا مسلک سنت کے مطابق ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی عنصر شامل نہیں۔ وہ معتزلہ اور تمام مبتدعین کے مخالف تھے۔ تصوف میں وہ غزالی کے ہم مسلک تھے۔ ابن تیمیہ انہیں ایک صحیح الاعتقاد، پرہیزگار، متبع سنت بلکہ شیخ طریقت بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ شیخ عدی پہ وجد و حال کی کیفیات طاری ہوتی تھیں۔ اور ان کے دوران میں کسی قدر شریعت کی حد سے تجاوز ہو جاتا تھا جو ان کے جانشینوں کے زمانے میں بڑھتا چلا گیا۔

ان کی وفات ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء میں یا اس سے دو سال پہلے یا ایک سال بعد میں ہوئی۔

ایک عیسائی راہب کی حکایت کی رو سے عدی بن مسافر کرد تھے۔ ان کا باپ ایک عیسائی خانقاہ کے ریوڑ چرایا کرتا تھا اور خود عدی نے بھی اس کے کام کا انتظام سنبھال رکھا تھا

شیخ عدی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے ان کے سلسلہ تصوف کی سربراہی ان کے بھائی صخر کی اولاد میں چلی گئی۔ ایک روایت یہ ہے کہ عدی نے اپنے ایک

Marfat.com

قادم کے بیٹے حسن البصلیہ کو متبنیٰ کر لیا تھا اور اسی کی اولاد میں سے اس سلسلے کے پیشوا ہوئے جن کا غیر معمولی احترام کیا جاتا تھا۔ لوگ انھیں عقد میں اپنی بیٹیاں دینا فخر سمجھتے تھے۔ یہ سلسلہ زیادہ کردوں ہی تک محدود تھا۔

اس کی ایک خانقاہ قاہرہ میں قرافہ کے مقام پر بھی تھی۔ اس سلسلے کے ارادت مند شیخ عدی کی عقیدت و احترام میں اس حد تک بڑھ گئے کہ یہ اعتقاد رکھنے لگے کہ شیخ عدی اپنے معتقدین کو روزی دیتے ہیں۔ یہ فرقہ اتنا طاقت ور ہو گیا کہ حکومت کو اس طرف توجہ کرنا پڑی اور ان کے استیصال پر آمادہ ہونا پڑا۔

عدی، بنو

عرب کا مشہور قبیلہ، اہلِ عرب عموماً عدنان یا قحطان کی اولاد ہیں۔ عدنان کا سلسلہ حضرت اسمٰعیلؑ تک پہنچتا ہے۔ عدنان کے گیارھویں پشت میں فہر بن مالک بڑے صاحب اقتدار تھے۔ قریش انہی کی اولاد ہیں۔ قریش کی نسل میں دس شخصیتوں نے اپنی لیاقت کے باعث بڑا امتیاز حاصل کیا۔ اور ان کے انتساب سے دس جدا نامور قبیلے بنے۔ ان میں سے ایک نامور قبیلہ عدی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ انہی کی اولاد سے ہیں۔ عدی کا ایک اور بھائی مُرّہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ان سے ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کا سلسلۂ نسب آنحضرتؐ سے آٹھویں پشت میں جا کر مل جاتا ہے۔

عذاب

عربی زبان کا لفظ۔ ثواب کے اختلافی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا اور اس پر طرح طرح کے انعامات کیے اس کی پیدائش اور ان گنت انعامات کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اسی کے بذریعہ انبیاءؑ بھیجے ہوئے راستہ پر چلے۔ جو شخص اس مقصد کو پہچان کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ خوش ہوتے اور دنیا و دین میں اسے سرفراز کرتے ہیں۔ مرنے کے بعد قبر سے لے کر قیامت کے دن تک اللہ کی رحمتیں اس پر ہوتی ہیں۔ بالآخر اسے جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اس درجہ کا نام ثواب ہے لیکن اس کے برعکس جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے رسولوں پر ایمان نہیں لاتا، اور اپنی زندگی کو نیک کاموں میں صرف نہیں کرتا۔ ایسے شخص پر اللہ ناراض ہوتے اور دنیا و دین میں اس سے امن و سکون چھین لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ بڑا طویل ہے۔ مرنے کے بعد اس کا ٹھکانہ بھڑکتی ہوئی آگ ہوگا۔

عذاب کا اطلاق افراد کے علاوہ قوموں پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ان تباہ شدہ قوموں کا تذکرہ بالتفصیل آیا ہے جنہوں نے انبیاء علیہ السلام کی دعوت کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی زندگی کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں کی، آخرکار وہ تباہ ہوگئے۔ یہ نہیں کہ وہ مال و دولت سے محروم تھے بلکہ ان کے پاس سر بفلک عمارتیں بھی تھیں۔ شان و شوکت کے بھی مالک تھے۔ صرف نافرمانی کے جرم میں عذاب کا شکار ہوگئے۔

عذاب کے سلسلے میں اللہ نے کچھ اصول بتائے ہیں۔

۱ - اللہ تعالیٰ اس قوم پر عذاب نہیں بھیجتا جن میں کوئی نبی یا رسول نہ آیا ہو۔

۲ - جس قوم میں اصلاح کی گنجائش ہو وہ بھی عذاب کا شکار نہیں ہوتی۔

۳ - جن میں چند افراد نیک اور صالح ہوں، ساتھ ساتھ اچھائی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے روکتے ہوں، ایسی قوم پر بھی عذاب نہیں آتا۔

۴ - دنیا میں جو لوگ عذاب سے ہلاک کر دیئے جائیں، آخرت میں بھی وہ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔

۵ - عذاب کی آمد سے پہلے انہیں آخری مرتبہ تنبیہہ کی جاتی ہے۔

۶ - نیک اور صالح لوگوں سے بستی خالی ہو جاتی ہے

۷ - خوشحالی کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور پھر یکدم تنگ دستی ان پر چھا جاتی ہے۔

اور جب عذاب آجاتا ہے تو:

۱ - ان کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔

۲ - نفع کی چیزیں ہی عذاب بن جایا کرتی ہیں۔

۳ - کوئی ایک شخص بھی بچ نہیں سکتا۔

۴ - مال و دولت، حسن و جمال اور فنکاری کسی کام نہیں آتی۔

قرآن مجید میں عذاب کا شکار ہونے والی جن قوموں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں قوم نوحؑ، قوم ہودؑ، قوم شعیبؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ اور بنی اسرائیل کے کچھ گروہ خاص طور پر مذکور ہیں۔

ان کے جرائم یہ تھے:

۱ - قوم نوحؑ، قبر پرستی اور شرک کے مرض میں مبتلا تھی۔

۲ - قوم ہودؑ، ناشکرگزاری کے باعث۔

۳ - قوم شعیبؑ، خرید و فروخت میں بددیانتی کی وجہ سے

۴ - قوم صالحؑ، اللہ تعالیٰ سے معجزہ مانگا پھر بھی ایمان نہ لائی اور معجزہ (اونٹنی) کو نقصان پہنچانے کے باعث۔

۵ - قوم لوطؑ، بدفعلی کے باعث۔

۶ - بنی اسرائیل، نافرمانی اور نعمتوں کی ناقدری کے باعث۔

مجموعی طور پر یہ قومیں شرک کے علاوہ دیگر معاشرتی، معیشتی، اخلاقی، تہذیبی برائیوں میں ملوث تھیں۔

عذاب کی صورتیں عموماً یہ ہوئیں:

۱ - زوردار آندھی اور طوفان۔ (۲) - پانی کا سیلاب۔ (۳) پتھروں کی بارش، (۴) زلزلہ۔ ۵، قحط سالی۔ ۶، طاعون۔

عذاب کی تین قسمیں ہیں:

(۱) الیم۔ منافقوں اور ان جیسے کردار والوں کے لیے۔ (۲) عظیم۔ کفار و مشرکین اور متکبروں کے لیے۔ (۳) مھین، احکاماتِ الٰہیہ سے بے نیاز رہنے والوں کے لیے۔

عذاب کس قوم پر اور کب آتا ہے۔؟

جب عدالتوں سے عدل و انصاف کی توقع اٹھ جائے۔

جب فحاشی و عریانی۔ بے غیرتی اور بے شرمی حد سے بڑھ جائے۔

جب احکامات الٰہیہ کے ساتھ تمسخر کیا جانے لگے۔

جب شراب و نشہ عام ہو جائے۔

جب زنا کی وبا پھیل جائے۔

جب ماپ تول اور ترازو میں بددیانتی معمول بن جائے۔

جب اخلاق، رحم، شرافت اور عصمت کالعدم ہو جائے۔

Marfat.com

جب شرک و بدعات، توحید و سنت کی جگہ لے لیں۔ تو وہ قوم عذاب الٰہی کا شکار ہو جایا کرتی ہے۔

عذاب قبر

روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ جب میت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور لوگ واپس ہو جاتے ہیں تو دو فرشتے اس کے پاس آکر اسے (میت کو) بٹھا دیتے ہیں۔ پھر دریافت کرتے ہیں کہ محمد صلعم کے متعلق تیرا کیا عقیدہ ہے۔ اگر تو وہ (مُردہ) مومن ہوتا ہے تو جواب دیتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں، محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ تو اس سے کہا جاتا ہے ذرا دوزخ کی حالت دیکھ لے۔ اور خدا نے تجھے جنت عطا کی ہے۔ اور اگر وہ منافق یا کافر ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تو لوگوں کی سنا سنی میں ہی کہہ دیا کرتا تھا۔ اس سے فرشتے کہتے ہیں۔ تو نے عقل سے کام نہ لیا اور اپنے رسول نہ مانا۔ نہ قرآن پڑھا۔ پھر اسے لوہے کے گرز سے مارا جاتا ہے اور اتنی سخت مار لگائی جاتی ہے کہ وہ چیخنے لگتا ہے۔ اس کی چیخ کو سوائے انسان و جن کے ہر چیز سنتی ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان سے قبر میں سوال ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں۔ اور محمدؐ اللہ کے برحق رسول ہیں اور خداوند تعالےٰ کا یہ فرمان کہ "ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے دنیا و آخرت میں اور بھٹکا دیتا ہے ظالموں کو، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (یہ آیت کریمہ) عذاب قبر کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ مومن سے قبر میں سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے۔ تو وہ جواب دیتا ہے۔ میرا رب اللہ تعالےٰ ہے۔ میرے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (اور میرا دین اسلام ہے)۔

مسلم کی ایک حدیث حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلعم بنی نجار کے باغ میں خچر پر سوار تھے۔ ہم لوگ بھی ہمرکاب تھے کہ خچر بدکنے لگا قریب تھا کہ حضورؐ کو گرا دے۔ وہاں پانچ چھ قبریں نظر آئیں۔ آپ نے دریافت فرمایا تم لوگ ان قبروں کے مُردوں کو جانتے ہو۔ ہم میں سے ایک شخص نے عرض کیا حضورؐ میں جانتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا یہ کس دین پہ مرے تھے۔ عرض کیا۔ حالت شرک میں مرے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ قبروں کے اندر ان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور اگر مجھے اس کا یقین ہوتا کہ وہ تمام امور جو عذاب قبر کے متعلق مجھے خداوند عالم بتاتا ہے سن کر مردے کو دفن کرنا ترک نہ کر دوگے تو وہ سب میں تمہیں بھی بتا دیتا۔ اس کے بعد آپؐ نے ہم سے فرمایا۔ دوزخ کی آگ سے پناہ مانگو۔ حاضرین نے عرض کیا ہم توبہ کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی اس آیات سے اشارۃً عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن میں اس عالم کو "برزخ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں۔ چار جہان ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے:

(۱) عالم ارواح: جہاں اللہ تعالےٰ کو تمام انسانوں کی روحوں نے اپنا رب تسلیم کیا۔

(۲) عالم دنیا: جس میں زندہ لوگ موجود ہیں۔

(۳) عالم برزخ: روح کے بدن سے جدا ہونے کے بعد جس جہان میں انسان قدم رکھتا ہے۔

(۴) عالم محشر: جب عزرائیل دوبارہ صور پھونکیں گے تو سبھی مردے جی اٹھیں گے۔ اور خدا کے حضور پہنچ جائیں گے۔ حساب و کتاب ہوگا۔ پھر جنت و دوزخ میں دھکیلے کا فیصلہ ہوگا۔ اس عالم کے بعد کا [illegible] جنت میں اور جہنم والے جہنم میں ابد الآباد تک رہیں گے۔ ہر عالم کی کیفیت جدا جدا ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کا بیان ہے کہ اللہ تعالےٰ نے [illegible] سے اپنے رب ہونے کے بارے میں پوچھا۔ تو سب نے اس کا اقرار کیا۔ مگر اس واقعہ کا ہمیں کوئی احساس نہیں۔ انسانی عقل سے اس عالم کی کیفیات ماوراء ہے اسی طرح قرآن میں یہ ہے کہ جب لوگوں کو میدان حشر میں جمع کیا جائے گا تو وہ کہیں گے۔ ہمیں ہماری سونے کی جگہ سے کس نے بیدار کیا؟ حالانکہ نیک لوگ تو واقعی آرام سے سو رہے ہوں گے۔ جس طرح کہ حدیث میں ہے مگر برے لوگ عذاب میں مبتلا ہوں گے: تو ان کا یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ سابقہ عالمت انہیں کچھ بھی یاد نہیں۔

عذاب قبر سے ہر نماز میں پناہ مانگنے کی تاکید ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا قبر قیامت کی پہلی گھاٹی ہے جو اس میں کامیاب ہو گیا وہ آخرت میں بھی کامیاب ہوگا۔ اور جو اس میں ناکام ہو گیا وہ آخرت میں بھی ناکام رہے گا۔ قرآن مجید کی دس آیات سے عذاب قبر کا ثبوت ملتا ہے اور احادیث کی تعداد ستر ہے۔

عراق

رقبہ ۱۷۱۰۰۰ مربع میل، آبادی ۷۰۸۵۰۰۰۔ دارالحکومت کا نام بغداد ہے۔ دریائے دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ ہے۔ جسے پہلے میسوپوٹیمیا (MESOPTAMIA) کہتے تھے۔ اس کے جنوب میں کویت اور سعودی عرب مغرب میں اردن اور شام، شمال میں ترکی اور مشرق میں ایران ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں صحرائے شام ہے۔ بحری آمد و رفت خلیج فارس سے ہوتی ہے۔ ملک کی اقتصادیات کا انحصار تیل اور زراعت ہے تیل کی صنعت پہ انگریزوں کا قبضہ ہے۔ ۱۹۲۵ء کے معاہدہ کے مطابق ۲۰۰۰ سال تک تیل کی کشید۔ صفائی اور برآمد کے حقوق حاصل کر رکھے ہیں۔ خوراک کے معاملے میں ملک خود کفیل ہے۔ تیل کے علاوہ کھجور سب سے بڑی برآمدی پیداوار ہے۔

عراق کی تاریخ کا آغاز جیر تکی حملہ آوروں سے ہوتا ہے۔ جو ۳۵۰۰ ق م اور ۳۲۰۰ ق م کے مابین دریائے فرات اور دجلہ کے سنگم پہ اُر کے مقام پہ آباد ہوئے اور انہوں نے سمیر SUMER کی دو تاج والی منسلک بادشاہت قائم کی۔ سمیری لوگوں نے غالباً سب سے پہلے پہیّہ گاڑیاں استعمال کیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کیونی فارم (CUNEI FORM) نامی طرز تحریر ایجاد کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ہندوستان کے قدیم باشندوں سے روابط تھے کیونکہ ان کی مہروں پہ بعض ہندوستانی جانوروں کی تصاویر ہیں۔ اور موہنجوڈارو کے مقام پہ بعض ایسی اشیا برآمد ہوئی ہیں جو سمیر یا کے کھنڈرات سے بھی ملیں سمیری لوگ تاریخ عالم کے اولین سپاہی منش لوگوں میں سے ہیں۔ سمیر اور عکاد کی حکومت ۲۳۰۰ ق مسیح تک قائم رہی جس کے بعد بابل کو اقتدار حاصل ہوا۔ اور اس پر عموررو (یا عامری) کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ لوگ سمیریوں کے برعکس سامی نسل سے تھے اور غالباً شمالی شام سے آئے تھے۔ حمورابی ۱۷۰۰ ق م ان کا سب سے مشہور حکمران گزرا ہے جس کے عہد حکومت میں حتی لوگوں نے شمال مغرب سے اور کاسی لوگوں نے شمال مشرق سے حملے شروع کر دئیے۔ ۱۷۴۶ ق م میں ایک کاسی بادشاہ نے اپنے [illegible]۔ سمیر

Marfat.com

[illegible] بابل دوبارہ [illegible] بادشاہ مقرر کیا۔ اور ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھی جو آئندہ ۵۰۰ برس تک بابل پر حکمران رہا۔ ۱۱۸۲ ق م میں ایلام سے ایک حملہ ہوا جس نے کاسی حکومت کو شکست دی۔ ۱۲۰۰ کے چند برس بعد بابل میں بغاوت ہو گئی۔ اور ایک مقامی خاندان پاشے کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آ گئی۔ یہ خاندان ۱۳۲ برس حکمران رہا۔ حتیٰ کہ اہلِ اشور نے ۱۰۲۵ ق م میں اس خاندان کے سب سے نامور بادشاہ بخت نصر اوّل کو شکست دی۔ ۷۴۰ ق م کے قریب یعنی دو صدیوں کے اندرونی خلفشار کے بعد تمام بابل اہلِ اشور کی عملداری میں آ گیا۔ اہلِ اشور نے غالباً سب سے پہلے ڈاک رسانی کا شعبہ قائم کیا۔ ان کا دارالحکومت نینوا تھا۔

۶۲۵ ق م کے قریب بابل پھر برسرِ اقتدار آیا اور وہاں بنوکد نصر ثانی نے ایک ایسی ہی سلطنت قائم کی جو ۵۳۹ ق م تک قائم رہی۔ ۵۳۹ ق م میں بابل پر پھر اہلِ ایلام نے حملہ کیا اور آخری بادشاہ بل شیرز کو شکست ہوئی اور فارس کا بادشاہ سائرس فاتح ہو کر بابل میں داخل ہوا۔ اگرچہ بابل کے شہر کو ایرانی عہدِ حکومت میں بھی اقتدار حاصل رہا۔ مگر اب بابل تجارتی مرکز تھا۔ اس کی وہ سیاسی اور فوجی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ جو اسے اشوری سلطنت کے عہدِ حکومت میں حاصل تھی۔ عراق پر فارس کی حکومت ۳۳۱ سے ۵۳۹ ق م تک قائم رہی۔ اس کے بعد ۱۴۱ ق م تا ۳۳۱ اس پر سکندر مقدونی اور اس کے جانشین جرنیل حکمران رہے۔ اس کے بعد ۱۴۱ ق م سے ۲۲۶ء تک اس پر پارتھیا کی حکومت رہی۔ ۲۲۶ء / ۶۳۷ء تک اس پر ساسانی بادشاہوں کا تسلط رہا اور ۶۴۱ء سے ۱۲۵۸ء عیسوی تک اس پر حجازی النسل مستولی رہے۔

مسلمانوں نے عراق پر پہلا حملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں خالد بن ولیدؓ کی زیرِ قیادت ۶۳۲ء میں کیا۔ جس کے بعد آئندہ پانچ برسوں میں وہ تمام عراق پر چھا گئے۔ ۷۵۰ء کے قریب اس پر بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی ان کے دورِ اقتدار میں جو ۱۲۵۸ء تک قائم رہا۔ ایرانی اثرات اس کی زندگی میں دخل پانے لگے۔ بنی عباس کے بعد یکے بعد دیگرے منگولوں، ترکوں اور سفاری حکمرانوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کا مجموعی دورِ اقتدار ۱۲۵۸ء سے ۱۵۳۴ء تک رہا۔ اس کے [illegible]تمام پر عراق، عثمانی ترکوں کی عملداری میں آ گیا۔ اور ۱۹۱۸ء تک ان کے زیرِ تسلط رہا۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۲۰ء میں عراق کو برطانیہ کی تولیت میں دے دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انگریزوں نے شاہ فیصل اوّل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۹۲۴ء میں ملک میں نیا آئین نافذ ہوا جس کی رُو سے طے پایا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہوں گے اور وہ پارلیمانی حکومت کی زیرِ ہدایت کار فرما ہو گا۔ شاہ فیصل اوّل جو سابق شاہ شریف حسین کا فرزند اور شاہ اردن عبداللہ کا سوتیلا بھائی تھا ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء میں فوت ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا غازی تخت نشین ہوا۔ جس نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے شاہ فیصل ثانی کو بادشاہ بنایا گیا وہ اس وقت کم سن تھا۔ اس لیے اس کا چچا عبدالالٰہ ایجنٹ مقرر ہوا۔ امیر فیصل دوم کی رسم تاجپوشی ۱۹۵۳ء میں ادا ہوئی۔ اور امیر عبدالالٰہ کو ولی عہد مقرر کیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۸ء میں جنرل عبدالکریم قاسم نے امیر فیصل کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور امیر فیصل کو قتل کر کے ملک کی زمامِ حکومت ایک انقلابی کونسل کے سپرد کر دی۔

۱۹۶۳ء میں عبدالسلام عارف نے جو قاسم کا ایک حلیف تھا، فوجی بغاوت کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عبدالکریم قاسم کو پھانسی دے دی گئی۔ ۶۶ء میں عبدالسلام عارف ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن عارف تخت نشین ہوئے۔

عراقیؒ، فخرالدین شیخ

صوفی۔ پورا نام شیخ فخرالدین ابراہیم ہے۔ ولادت ہمدان کے نواح میں ۶۰۰ھ کو ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں ہمدان کے مدرسہ سے معقولات و منقولات پڑھ کر فارغ ہو گئے۔ روایت کے مطابق ہمدان سے بغداد آئے۔ اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے روحانی تربیت حاصل کی۔ اور ان ہی سے بیعت کی۔ اور انہوں نے ہی شیخ فخرالدین کو عراقی کا تخلص عطا کیا۔

قلندروں کی ایک جماعت کے ساتھ ہمدان سے نکلے اور عراق و عرب کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ ملتان آ کر شیخ بہاؤالدین ذکریہ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہاں باہم کشش نے انھیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اور شیخ بہاؤالدین نے وقتِ وصال شیخ عراقی ہی کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنایا۔

ان کی تصانیف میں لمعات کے علاوہ ایک مثنوی اور ایک دیوان بھی ہے۔ مثنوی کا نام برٹش میوزیم کے فارسی خطوط کی فہرست میں عشاق نامہ درج ہے۔

چہرے پر دموی ورم ظاہر ہونے کے باعث ان کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر شیخ محی الدین ابن العربی کے برابر ہے۔

عرب

براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں ایک بڑا ریگستانی جزیرہ نما۔ جسے بحیرۂ قلزم افریقہ سے جدا کرتا ہے اس کے مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں ہند۔ اور خلیج عدن اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقع ہے۔ اس میں سعودی عرب، یمن، عدن، مسقط، عمان، بحرین اور کویت وغیرہ شامل ہیں۔ جو اپنی اپنی جگہ خود مختار علاقے ہیں۔ سخت گرم خطہ ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ ریگستانوں میں کئی کئی میل تک پانی نہیں ملتا۔ بہت کم علاقے قابلِ کاشت ہیں۔ عموماً کھجور کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ ریگستانوں میں اونٹ بہت کار آمد جانور ہے۔ لوگ زیادہ تر خانہ بدوش ہیں اور بھیڑ بکریاں وغیرہ پالتے ہیں۔ اس ملک کا گھوڑا جسے عربی گھوڑا کہتے ہیں۔ دنیا میں بہترین گھوڑا سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں یہاں تیل کے چشمے دریافت ہوئے۔ جو امریکی تیل کمپنی کے تصرف میں ہیں۔ مکہ اور مدینہ مسلمانوں کے بڑے متبرک مذہبی مقامات ہیں۔ مکہ میں رسول اکرمؐ پیدا ہوئے اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ عرب کا زیادہ علاقہ سعودی عرب کہلاتا ہے جس پر سلطان ابن سعود نے ۱۹۲۵ء میں قبضہ کیا تھا۔ ۷۵ء تک ان کے بیٹے شاہ فیصل حکمران رہے۔ وہ مارچ میں قتل کر دیے گئے۔ ان کی جگہ ان کے ولی عہد شاہ خالد برسرِ اقتدار ہیں۔ اس خاندان کی سب سے بڑی خواہش یہ رہی ہے کہ عالمِ اسلام میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ سعودی عرب میں مکہ، مدینہ، ریاض اور جدّہ مشہور شہر ہیں۔

ظہورِ اسلام سے قبل عرب کے لوگ ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا تھے لیکن جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو انہوں نے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے تمام ملک سے برائیوں کا خاتمہ کر دیا اور دینِ اسلام کو رائج کر کے اہلِ عرب کو ہر لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا۔ اور ان سب مفتوحہ اقوام نے ان مسلمان عربوں کے اخلاقِ حسنہ اور سنہری اور افضل اصول دیکھ کر ان کا دین قبول کر لیا۔ اور یوں دینِ اسلام نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا قبلہ اور متبرک مقام خانہ کعبہ بیت اللہ

Marfat.com

اسی ملک میں ہے۔ جس کی طرف منہ کرکے مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور جہاں ہر سال حج کے دنوں میں دنیا بھر سے مسلمان حج کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

دین اسلام کے سیاسی و مذہبی نفاذ کے باعث چوری، ڈاکہ، قتل و ڈکیتی و دیگر معاشرتی و اخلاقی برائیوں سے یہ شہر اور اس سے متعلقہ علاقے پاک اور یہاں کے لوگ بڑی پُر امن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

عرب لیگ

عرب ملکوں کی اتحادی تنظیم جس کا اوّلین مقصد عرب ملکوں کے درمیان اتحاد کو فروغ اور ان کے باہمی تنازعوں کو افہام و تفہیم کے ذریعے طے کرنا ہے۔ یہ تنظیم ١٠ مئی ١٩۴۵ء کو معرض وجود میں آئی۔ اس سے قبل ١٩۴۴ء میں اتحاد عرب کانفرنس سکندریہ میں ہوئی جس میں ایک ایسے سیاسی ادارے کے قیام کی ضرورت پر صاد کیا گیا جو عرب ملکوں کے مفادات کی نگرانی کر سکے۔ اس کے ابتدائی ارکان میں مصر، عراق، اردن، لبنان، سعودی عرب، شام اور یمن شامل ہوئے۔ بعد میں مراکش، تونس، الجزائر، لیبیا، سوڈان وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ لیگ نے اس کے بعد رکن ممالک کی آزادی اور حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ نومبر ١٩۴٦ء میں ایک ثقافتی معاہدہ طے ہوا جس کے تحت عرب ملکوں کے مابین ثقافتی اور تہذیبی رشتوں کو مضبوط اور استوار کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ عرب لیگ کی کونسل میں تمام رکن ممالک کے نمائندے شامل ہیں۔ لیگ کا صدر دفتر قاہرہ میں ہے۔ عرب لیگ نے فلسطین کا مسئلہ طے کرنے کو اپنے پروگرام میں ہمیشہ اولیت دی ہے ١٩۴٦ء اور ١٩۴٨ء میں علی الترتیب لندن اور اقوام متحدہ میں فلسطین کے مسئلے کی وضاحت اور فلسطینیوں کی نمائندگی کے فرائض بھی عرب لیگ نے ہی ادا کیے۔ مئی ١٩۴٨ء میں عرب لیگ کے رکن ممالک نے بالعموم اور مصر و شام اور اردن نے بالخصوص فلسطینی عربوں کی عملی فوجی امداد کی۔

عرب لیگ کے قیام کے بعد میں سے اب تک یہ تنظیم کئی مرتبہ بحران سے دوچار ہوئی۔ ایک موقع تو وہ تھا جب عراق معاہدہ بغداد میں شامل ہوا۔ اس کے نتیجہ میں عربوں ملکوں میں اتحاد کی ضرورت کا احساس اور زیادہ بڑھا۔ ١٩٦٢ء میں متحدہ عرب جمہوریہ نے بعض اختلافات کی بنا پر اس تنظیم سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ لیکن بعد میں جب اختلافات رفع ہو گئے۔ تو وہ پھر سے عرب لیگ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ اب یہ تنظیم ہر اعتبار سے مؤثر اور فعال ہے۔ اور دنیائے عرب کی صحیح نمائندہ تصور ہوتی ہے۔ اس نے شروع سے لے اب تک عرب مفادات کی نگہداشت اور حفاظت کا فرض بڑی سنجیدگی اور دیانت سے انجام دیا ہے۔ عرب لیگ کے اہتمام میں عرب فوجی کمان قائم کرنے کی تجویز بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔

عربی زبان

سرزمین عرب اور بیرون عرب دُنیا کے تقریباً پندرہ کروڑ سے زائد افراد کی بولی عربی کا سب سے قدیم ذکر ان تقریباً چالیس اسمائے معرفہ کی شکل میں آیا ہے جو ٨۵٣ تا ٦٢٦ قبل مسیح کی عربوں کے خلاف جنگوں کے آشوری بیانات میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مختلف جگہوں پر کچھ ایسے امکانات پائے گئے ہیں کہ ان کی مماثلت جنوبی عربی یا عربی کی نہایت ابتدائی شکل سے ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ قدیم عرب [illegible] کی زبان [illegible] تقریباً [illegible] تصنیف میں دیتے ہیں اور شاید جیسے صلاح الدین المنجد نے اسماعیل بن عمر [illegible] کی تصنیف کے طور پر شائع کیا۔ جرہم یقیناً عرب العاربہ یا البائدہ میں سے تھے جن سے بقول عرب مورخین ان قبائل نے جو چھٹی صدی عیسوی میں آبادی کا بیشتر حصہ بن گئے تھے ملک عرب اور عربی زبان پر اپنی سیادت قائم کر لی تھی۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ بنو طے نے بنو صحار کی زبان اختیار کر لی تھی۔

علم لسان کے متعلق عربی ادب میں نجد کی ابتدائی بولیوں کے بارے میں بہت کچھ مواد محفوظ ہے اسی طرح حجاز اور جنوب مغرب کے مرتفع علاقے کے بارے میں لیکن اور علاقوں کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے یمن کی بولیوں کو ایک مخصوص مقام حاصل ہے ان کے بارے میں معلومات بہ کثرت ہیں ان کی صحیح قدر و قیمت بھی جانچی جا سکتی ہے اس لیے کہ آج کل یہاں جو عوامی بولی ہے اس میں قدیم بولی کا تسلسل قائم رہا ہے حمیری بولی جس کا ذکر عرب ماہرین لسان نے کیا ہے مغربی عرب کی متروک زبان تھی۔ جو جنوبی عربی سے بہت زیادہ مناسبت تھی اس بولی میں چند اشعار اور کہاوتیں محفوظ ہیں قدیم حمیر اور سبا کے جنوبی عربی بادشاہ ساتویں صدی عیسوی کی حمیری زبان بولتے تھے۔

عربی کے ابتدائی دور کے جو کتبے موجود ہیں جو نبطی رسم الخط میں ہیں لیکن ان کی زبان عملی طور پر خالص عربی ہے عربی میں قدیم ترین متون سینا میں رَم کے معبد میں دیواروں پر کندہ تین نقوش ہیں جن کی تاریخ تقریباً ٣٠٠ء ہے یہ بات اغلب ہے کہ بائبل کے کم از کم جزوی ترجمے عربی میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بائبل کے بعض عربی مخطوطات زمانہ قبل اسلام کے ہیں۔ الحان داودی کا عربی میں ایک حصہ بھی یونانی رسم الخط میں موجود ہے۔

کسی حوالے سے ایک ایسی زبان کا پتہ چلتا ہے جو مستند عربی سے بہت قلیل حد تک عوامی بولیوں کی طرف ہٹی ہوئی تھی۔ عیسوی عربی ادب کا یہ ایک مخصوص پہلو ہے جو علمی تحریروں کی زبان میں نمایاں ہے اس کا باعث ابتدائی عوامی زبان کا اثر ہو سکتا ہے لیکن ایک ایسی عربی زبان بھی ہو سکتی ہے جسے اب تک نحویوں نے معیاری نہیں بنایا تھا۔

اس کا امکان کم ہے کہ عرب کے یہودیوں نے بھی مستند عربی کی ادبی نشو و نما میں کوئی حصہ لیا ہو۔ اس لیے کہ اس عہد میں عہد نامہ قدیم کے ترجمے یہودی نہیں کرتے تھے تاہم یہودی ظہور اسلام سے پہلے مستند عربی استعمال کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ وہ مدینے میں مسلمانوں کو لکھنا سکھاتے تھے۔

یہ خیال بہت معقول ہے کہ کلاسیکی عربی کی نشو و نما میں حیرہ کے دربار کا بھی حصہ ہے اسلامی روایت ان لوگوں میں جنہوں نے سب سے پہلے عربی لکھی۔ زید بن حماد اور اس کے بیٹے شاعر عدی کا نام بھی شامل کرتی ہے یہ دونوں حیرہ کے عیسائی تھے اس وقت عربی زبان اپنے ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی اس لیے عدی کی زبان کو زیادہ فصیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔ عدی نے کئی قبائلی بولیوں سے کام لیا ہے جس سے بعض دیگر علماء کے بقول قریش کی بولی کی ترجیح کی جا سکتی۔ آج کل اقامت پذیر عربوں کی شاعری بیشتر بدوی بولیوں کی شاعری ہے اور حیرہ بدوی شعراء کا مرکز رہا ہے اس سے شاعری کی زبان کے ارتقاء اور یکسانیت میں مدد ملی۔ حیرہ میں اس کے تحریری استعمال نے اسے ٹکسالی بنانے میں مزید مدد کی۔

جہاں تک خود اس شاعرانہ کتاب کے منبع کا تعلق ہے قدیم تر اسلامی روایت اسے مختلف قبائل میں تلاش کرتی تھی حالانکہ موخر علماء نے بلاشبہ مذہبی وجوہ کی

Marfat.com

تاجرانِ قریش کی بولی قرار دیا۔

حقیقی کلاسیکی عربی کے بارے میں تحقیق کے ماخذ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ زمانہ قبل اسلام اور آغاز اسلام کی شاعری۔

۲۔ قرآن مجید۔

۳۔ رسول اکرم صلعم اور خلفائے راشدین کے رسمی خطوط جنہیں ابتدائی مورخین نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے اور قدیم اوراق بردی۔

۴۔ حدیث۔

۵۔ ایام العرب کی نثر۔

زمانہ قبل اسلام اور آغاز اسلام کے اسلامی شعراء کی زبان ایک بدوی روایت کی شاہد ہو سکتی ہے جو قرآن مجید سے جداگانہ تھی۔

قرآن پاک ایک الہامی کتاب ہے جو اپنے اسلوب اور اعجاز کے باعث منفرد حیثیت رکھتی ہے اس کی نثر میں بھی وہ فصاحت بلاغت اور حسن و جمال ہے جس کی نظیر بہترین شاعری میں بھی کم ملتی ہے بعض الفاظ کی املا کے بارے میں قرآن مجید کی اولین املا کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس میں کسی قسم کا ردو بدل کئے بغیر انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے قرآن مجید قریش کی زبان میں نازل ہوا۔ قریش کی زبان صوتی لطافت، پاکیزگی ساخت اور حسن ترتیب کے اعتبار سے عرب کی تمام بولیوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ قرآن مجید کے اثر سے عربی زبان میں حسن اسلوب، کثرت مضامین اور زور استدلال پیدا ہوا۔

حدیث کی زبان سادہ، دل نشین اور زیادہ تر روزمرہ کی جانب مائل ہے ایام العرب کی زبان میں جو ہم تک ماہرین لسان کے ذریعے پہنچی ہیں صرف چند انحرافی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

کلاسیکی عربی میں ایک بیش بہا ذخیرۂ لغات تھا۔ اس کا کچھ تو سبب بدویوں کی قوت مشاہدہ تھی اور کچھ شعر و شاعری کی کثرت و فراوانی۔ عرب کے زمانہ جاہلیت ہی میں فصیح زبان کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اور جب غیر عربوں کو بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں اسے سیکھنے کی ضرورت پیش آئی تو جن لوگوں کے پاس یہ محفوظ تھی اور جو اسے سکھاتے تھے، یعنی راوی، موقع پر موجود اور تیار تھے۔ خلیل بن احمد انہی میں سے تھے۔ لیکن جلد ہی ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جو یونانی فکر سے متاثر تھے اور جنہوں نے راویوں کے روایتی علم کو نحو کی ایک منظم شکل دے دی جو علم (صرف و نحو) اس طرح تخلیق ہوا اُسے نہ صرف شاعری بلکہ قرآن مجید کی توضیح و تشریح کے لیے بھی استعمال کیا۔

مدرسی اعتبار سے ادبی عربی زبان کا معیار تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے زمانے سے معین ہو گیا تھا اس کے صرف و نحو، جملوں کا استعمال۔ لغات اور محاورات ادبی کی تعین منظم اور پر مشقت تحقیق و تدقیق کے بعد واضح طور پر کر دی گئی تھی اس وقت سے لے کر زمانہ موجود تک اسے ایک مسلسل اور بے روک و ٹوک زندگی حاصل رہی ہے اگرچہ ہر عربی بولنے والے ملک میں روزمرہ کی زندگی کے لیے ایک مخصوص عوامی زبان بن گئی ہے تاہم لکھنے کے لیے سب لوگ برابر وہی معیاری ادبی زبان استعمال کرتے رہے ہیں۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں کے علماء نے جن کے سر اس لسانی معیار کی تدوین کا سہرا ہے اپنا نقطۂ آغاز قرآن مجید کے متن کو قرار دیا، جو تاریخی لحاظ سے معتبر اور مستند ہے اور اپنی تعریف بطور ایک عربی کتاب کے کرتا ہے اور جس کا انضباط تالیف اور سرکاری طور پر اشاعت پہلی صدی ہجری کے چوتھے عشرے/ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی

احادیث کے مجموعے، رسول اکرم کے رسائل و خطب خلفائے راشدین اور صدر اسلام کے مشہور خطبا کے اقوال و خطبات نیز عربی شاعری کے منتخب مجموعے بھی حواریوں اور ادبی زبان کے تحریری نمونوں کے طور پر سامنے لائے گئے لیکن ان علماء کی سب سے بڑی مساعی زمانۂ جاہلیت کے ادب کو جو اب تک راویوں اور بدویوں کے ذہن میں محفوظ تھا، جمع کرنے، اُسے نئی زندگی بخشنے اور اس کی توثیق و تصدیق کی طرف مبذول رہیں زمانۂ جاہلیت کے آخری ڈیڑھ سو سال کی شاعری خطبات اور امثال کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کیا گیا ان کی شرحیں لکھی گئیں اور انہیں محاورات قرآنی کی توضیح کے لیے اور لسانی و ادبی صحت کی سند کے طور پر استعمال کیا گیا۔

جب عربوں نے قرآن مجید سنا اور اسے سمجھا تو اس کے ادبی محاسن کے معترف ہوئے اور اس کی اعلیٰ پائے کی وضاحت نے ان پر بہت اثر کیا۔

زمانہ جاہلیت کی شاعری کے مستند ہونے کے لیے جیسے تلاش و جستجو سے حاصل کیا گیا تھا اس کی ترکیب، ساخت، اسلوب بیان اور زبان اس قرآن سے مطابق اور بعد اسلام کی شاعری سے اصول نظم میں مماثلت کے دعویٰ کی تائید میں بہت سے حوالوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے ایک اور حقیقت جس پر تاریخی حوالے متفق ہیں یہ ہے کہ جاہلیت کی شاعری جس شکل میں کہ وہ جمع کی گئی ہے اور ہم تک پہنچی ہے پورے ملک عرب میں پڑھی جاتی تھی اس طرح قرآن مجید اسلام کی پہلی اور اولین تحریر کا سب سے زیادہ مستند نمونہ بن گیا۔

عرب دنیا کے زاویۂ نظر میں یورپ کی دخل اندازی نپولین کی ۱۷۹۸ کی مصری مہم سے شروع ہوتی ہے مغربی تمدن کے بے شمار عناصر کو اپنا لینے سے عربی اسلوب پر دور رس اثرات مرتب ہوئے یہ عمل محمد علی پاشا کی اصلاحات کے لائحہ عمل سے شروع ہو چکا تھا جس میں بلا ارادہ مغربی اسلوب کو اختیار کرنا شروع کیا اور جس کا مرکز توجہ فرانس تھا طلبہ کی جماعتوں کی فرانس میں درس و تدریس کے لیے روانگی مدارس کی یورپی اصولوں پر تاسیس اور ایک عربی پریس کے قیام اور سب سے بڑھ کر بکثرت یورپی کتابوں کے تراجم کے نتیجے میں بے شمار مغربی خیالات کے اظہار کے لیے تعبیرات کی ضرورت پہلے مصر میں اور پھر دوسرے ملکوں میں بھی محسوس کی جانے لگی یعنی ان خیالات کے لیے جن کے متعلق پہلے صرف غیر ملکی الفاظ ہی مل سکتے تھے۔

تاہم ناگزیر ازضرورت غیر ملکی الفاظ کے بکثرت استعمال کے برخلاف صحیح معنوں میں کوئی تحریک انیسویں صدی کے نصف آخر سے پہلے شروع نہیں ہوئی یہ مسئلہ کہ عربی میں نئی تعبیرات کو روز افزوں ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے۔ فکری زندگی کا ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ خود یورپ کے اختلاط سے عربوں میں صدیوں کے وقفے کے بعد اپنی لسانی اور ادبی روایات پر نظر ثانی کا جذبہ بیدار ہوا قدیم عربی تصانیف خاص طور پر عربی لغات اور صرف و نحو کی طباعت سے بہت سی قدیم روایات کے احیا میں سہولت پیدا ہو گئی۔ یہ عقیدہ کہ عربیہ بحیثیت عربی زبان کی قدیم ترین ادبی شکل کسی بھی بعد کی شکل سے بہتر اور زیادہ صحیح تھی اس بنا پر عصر حاضر صحت لسانی کے لیے اس کو اعلیٰ ترین سند ماننا چاہیے، پوری لسانی تحریک کا رہنما خیال بن گیا۔ اگرچہ اس کے خلاف بھی کچھ آوازیں بلند ہوئیں اس طرح قدیم لغت و اسلوب کا دوبارہ احیاء ہوا اور ساتھ ہی اس رجحان کا کہ جہاں کہیں بھی ممکن ہو قدیم مثالی زبان سے رجوع کر کے ارتقائی زبان کو مصنوعی طریقے سے قابو میں رکھا جائے اس تحریک کا آغاز شامی اور لبنانی علاقے میں ہوا۔

Marfat.com

لغات میں ایک معتدبہ بنیادی سرمایہ قدیم ترین زمانے سے محفوظ رہا ہے مابعد کلاسیکی الفاظ جن میں مؤخر تر قرون وسطیٰ کے الفاظ بھی شامل ہیں جدید لغات کے ایک عنصر کی تشکیل کرتے ہیں ان خیالات کے اظہار کے لیے جو یورپ سے آئے ہیں ایک بڑی تعداد ایسی تعبیرات کی موجود ہے جنہیں عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ عربیہ کے فراموش شدہ الفاظ کو از سر نو زندہ کر دیا گیا ہے اور انہیں بغیر کسی رسمی تبدیلی کے، لیکن کم و بیش بدلے ہوئے مفہوموں میں استعمال کیا گیا ہے۔ عربیہ کے ان الفاظ کو جو اب تک استعمال میں ہیں نئے اور زائد معنی دے دیئے گئے ہیں بعض دفعہ معنوں کے تغیر میں اس اجنبی لفظ سے مماثلت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جس نے نمونے کا کام دیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بڑی تعداد ایسی اشکال اسمی کی جنہیں پرانی اصلوں سے عربی کے اسمی صیغوں کے اوزان پر بنایا گیا ہے عام طور پر رائج ہو گئی ہے اسی طرح اسم مصدر اور اسم فاعل کی شکلوں کو نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ یائے نسبتی کو وسیع پیمانے پر نئے الفاظ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کے استعمال کو وسعت دے کر اسمائیں سے بہت سے اسمائے صفات مشتق کر دیئے گئے ہیں ان کے ذریعے یورپی ترکیبوں کو نسبتاً آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے اور اصلی مرکب شکلیں اب تک بھی لائے نفی کے ساتھ مرکب الفاظ تک محدود ہیں۔

پہلی جنگ عظیم تک اکثر الفاظ فرانسیسی سے مستعار لیے جاتے تھے اور بعض اطالوی سے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد انگریزی کے اثرات بھی نمایاں طور پر مرتب ہوئے خصوصاً مصر اور عراق میں۔ عربی میں اجنبی الفاظ کی قلت فصیح زبان کے شیدائیوں کا شاندار کارنامہ ہے اس صدی کے آخری عشروں میں ترکی الفاظ تقریباً مکمل طور پر غائب ہو گئے ہیں۔ ایسے الفاظ کو جو عربی اسم مصدر سے مطابقت رکھتے ہیں یا جنہیں بآسانی اس میں جذب کیا جا سکتا ہے مستعار الفاظ تصور کیے جا سکتے ہیں یا جنہیں آخر میں یہ کے اضافے سے جو اسم نسبتی کے آخری حصے کا کام دیتا ہے عربی الفاظ سے مماثل بنا لیا گیا ہے۔

یہ متعدد نئے الفاظ جنہیں قبول کر لیا گیا ہے ابھی تک ناکافی ہیں خاص علمی اور فنی جزئیات آج بھی عربی میں کما حقہٗ ایسی شکل میں پیش نہیں کی جا سکتیں جسے سب متعلقہ لوگ سمجھ لیں کسی ایک ملک میں بھی مخصوص فنی مصطلحات وضع کرنے کا باقاعدہ نظام موجود نہیں ہے صورت حال اس بات سے اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر افہام و تفہیم کی غرض سے لاطینی اور یونانی کی جن اصطلاحات سے مدد لی جاتی ہے ان کا عربی میں ترجمہ کر دیا جاتا ہے ایک ہی چیز کے لیے کئی اصطلاحات رائج ہیں دوسری طرف ایسی صورتیں بھی ہیں کہ ایک ہی اصطلاح سے مختلف مصنفین مختلف معنی اخذ کرتے ہیں تاہم علمی و فنی اصطلاحات کو معیاری بنانے کا کام جو آج کل کی عربی زبان کا بنیادی مسئلہ ہے خاصی ترقی کر چکا ہے اور اس طرح مستقبل میں ہمیں مزید تسلی بخش اور حسب دل خواہ نشو و نما کی توقع ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سب عرب ملکوں میں عراق سے مراکش تک ایک بنیادی طور پر یکساں تحریری زبان موجود ہے عرب اقوام کے لیے بہت فکری اور عملی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ یہ ان کی قدیم ثقافتی یکجہتی اور زمانہ موجودہ میں ان کی سیاسی وحدت کی علامت ہے اس طرح ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس چیز کا پتہ بہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ کبھیں یہ تحریری زبان ... کوئی مقامی بولی لے لے گی۔

آج کل جو عربی عام بول چال میں رائج ہے وہ بنیادی طور پر وسطی اور شمالی عرب کی قدیم بولیوں سے مشتق ہے عہد قدیم میں اگرچہ ان میں فرق ضرور کیا جاتا ہے لیکن بظاہر ان کے درمیان بنیادی اختلافات ... لسان صرف تلفظ اور رسائل کے اختلاف کا ذکر ... کی ساخت یکساں تھی ان ماہرین لسان نے فصاحت کو ... کر کے قدیم بولیوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا۔ حجاز کی بولیاں جنہیں خالص ترین مانا جاتا ہے نجد کی اور آخر میں ہمسایہ قبائل کی زبانیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک دوسری سامی یا غیر سامی زبانوں کی آمیزش سے بگڑ گئیں تھیں یہ امتیاز جو ہمیشہ سے لطیف رہا ہے آج قابل قبول نہیں اس لیے کہ متعلقہ بولیاں نمایاں حد تک ترقی کر چکی ہیں ان سب تقسیموں میں جو قابل اعتنا ہیں سب سے زیادہ سہل اور قابل قبول اگرچہ وہ ہے جو جغرافیائی اصولوں پر مبنی ہے نہ کہ لسانی معیاروں پر۔

حجاز اور قریش مکہ کی بولی زمانہ جاہلیت کی بولیوں میں سے ایک تھی اسے ترقی دے کر ایک ادبی زبان کا درجہ دے دیا گیا لیکن زمانہ جاہلیت کے شاعرانہ محاورہ زبان میں دخل اندازی کیے بغیر نہیں، تاہم قدیم بولیاں باوجود اس کے باقی رہیں۔

لغات کے نمایاں اختلافات مغربی بولیوں کو مشرق قریب کی بولیوں سے جدا کرتے ہیں۔ یا تو واقعی مستعمل الفاظ کے اعتبار سے یا ان کی شکل یا ان کے مخصوص معنی کے اعتبار سے اگر اس سے بڑھ کر نہیں تو اس کے برابر اختلافات خود مغربی بولیوں کے مابین موجود ہیں جو اس وسیع علاقے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں وہ بولی جاتی ہیں، مثلاً "متعلق فعل" اب - کے اظہار کے لیے اصطلاحات علاقے کے اعتبار سے مختلف ہیں، لیکن المغرب کی بولیوں کے باہمی اختلافات خواہ کچھ بھی ہوں وہ ایک دوسرے سے اب بھی قریبی تعلق رکھتی ہیں اور بڑی حد تک مخصوص طور پر عربی ہیں۔ زبان کی آوازوں کی اکثریت عربی نظام صوتی ہی سے ماخوذ ہے اور اسی طرح اشکال نحوی، مواد نحوی اور خیالات کو پیش کرنے کے طریقے بھی۔ بولیوں کے وہ اختلافات جو مغرب میں پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر ان اختلافات جیسے ہی ہیں جو درمیان مشرقی بولیوں میں نظر آتے ہیں انہیں کسی حد تک ایسے اثرات کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جو عربی سے بیگانہ ہیں۔

۱۔ بربری اساس کا اثر جیسے واضح طور پر بعض علاقوں اور اظہار کے بعض میدانوں میں ایک نئی قوت حاصل ہو گئی تھی لیکن بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں بربروں کی یاد زبان سے بالکل محو ہو چکی ہے۔

۲۔ شمالی خطوں کی سیاہ فام اقوام کا جو حبشی ممالک کی سرحدوں پر آباد ہیں۔

۳۔ رومانی زبانوں کا، لاطینی کا جو اثر اکثر اندلسی، ہسپانوی اور اطالوی زبانوں کے واسطے سے آیا۔

۴۔ آخر میں فرانسیسی کا ایسا اثر جو ابھی تک کارفرما ہے!

تاہم موروثی اور مستعار عناصر نے جو حصہ لیا ہے، وہ تنہا ایسا سبب نہیں ہے جسے مغربی زبان کے اصلی اور مخلوط کردار کی تشریح کے لیے پیش کیا جا سکے ایک اور اور سبب عربی بولیوں کا تنوع ہے جو اس کے قبل کر فاتحین انہیں مغرب میں اپنے قدم جماتے وقت مختلف زبانوں میں ساتھ لائے ایک دوسری سے مختلف ہو چکی تھیں علاوہ ازیں ایک اور سبب شاید سب سے اہم امتیازی عنصر جدتوں کا تھا جو اختیاری یا اضطراری تھیں جو در جو در آتی رہیں اور مختلف اطراف میں پھیلتی رہیں۔ بعض اوقات اپنے آپ کو وسیع جغرافیائی حدوں میں منتشر کرتے ہوئے اور بعض دفعہ خود کو ایسے اضلاع میں محدود رکھتے ہوئے جو سختی سے الگ الگ حصوں میں منقسم ہیں۔

Marfat.com

عربی مہینے

انھیں قمری اور اسلامی مہینے بھی کہا جاتا ہے۔ قمری اس لیے کہ ان کی ابتدا و انتہا کا انحصار چاند دیکھنے پہ ہوتا ہے اور اسلامی اس لیے کہ اللہ نے قرآن مجید میں انھیں حج اور وقت معلوم کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ ان کی تعداد بھی بارہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے : اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ ہے۔ (پ۱۰) ۔ ان کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ محرم ۔ ۲۔ صفر۔ ۳۔ ربیع الاوّل ۔ ۴۔ ربیع الآخر۔ ۵۔ جمادی الاوّل ۔ ۶۔ جمادی الآخر۔ ۷۔ رجب۔ ۸۔ شعبان۔ ۹۔ رمضان ۱۰۔ شوال ۔ ۱۱۔ ذی قعد۔ ۱۲۔ ذی الحجہ ۔

ان میں چار مہینے ایسے ہیں جن میں لڑائی و قتل حرام ہے : (۱) محرم (۲) رجب (۳) ذی قعد ۔ (۴) ذی الحجہ ۔ کسی مہینے کے دن ۲۹ اور کسی کے ۳۰ ہوتے ہیں ۔ ۲۹ سے کم اور ۳۰ سے زیادہ کبھی بھی نہیں ہوتے ؛

عُرس

صوفیاء کرام یا مذہبی پیشواؤں کے مزاروں پہ ہر سال یوم وفات کے موقع پہ جو اجتماع ہوتا ہے اسے عرس کہتے ہیں ۔ عرس کے موقع پہ مزار پہ چادریں اور پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ معتقد لوگ نذر و نیاز پیش کرتے اور منتیں مانتے ہیں۔ نیز محفل سماع منعقد ہوتی ہے۔ جس میں موسیقار ۔ حمد۔ نعت اور صوفیانہ و عارفانہ کلام گا کر سناتے ہیں۔ پاکستان میں حضرت علی ہجویریؒ، معروف بہ داتا گنج بخشؒ (لاہور) حضرت بابا فرید شکر گنج (پاکپتن) حضرت شاہ عبداللطیفؒ بھٹائیؒ (سندھ) و دیگر صوفیاء کرام کے مزاروں پہ ہر سال دھوم دھام سے عرس منعقد ہوتے ہیں جن میں پاک و ہند کے ہزاروں مسلمان شریک ہوتے ہیں ۔ عرس کے جواز و عدم جواز میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے ۔ معتقد حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بزرگوں کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار ہے جبکہ توحید کے مدعی حضرات اسے خطرناک بدعت قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نذر و نیاز و دعا وغیرہ عبادات میں شامل ہیں اور عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیئے ۔ مزاروں اور قبروں پہ جانے کی اس لیے اجازت ہے کہ وہاں جانے سے موت یاد آتی ہے ۔ لیکن عرس کے موقع پہ یہ مقصد سرے سے ہوتا ہی نہیں ۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ اس کا ثبوت نہ تو قرآن و حدیث میں ہے نہ ہی اسلاف امت یا ائمہ دین کے طرز عمل میں ۔ چونکہ یہ امور ایجاد بندہ ہیں اس لیے ان کے ارتکاب پہ ثواب کی امید غلط ہے ۔

عرس پر والہانہ جوش و خروش

عرش

دیکھیے : " کرسی "

عرفات

مکہ مکرمہ سے تیرہ میل دُور مشرق کی جانب طائف کی راہ پہ ایک میدان جو شمالی جانب سے اسی نام کے ایک پہاڑی سلسلے جبل عرفات سے گھرا ہوا ہے ۔ عرفات ایک وسیع و عریض میدان ہے ۔ یہاں حج کے موقع پہ بعض بنیادی ارکان ادا کیے جاتے ہیں ۔ ان مناسک حج کا مرکز اس کے شمال مشرق میں سرخ رنگ کی ایک مخروطی پہاڑی ہے جس کی بلندی دو سو فٹ سے کچھ کم ہے اور عرفات کے اصل پہاڑی سلسلے ذرا الگ سی ہو گئی ہے ! اس پہاڑی کو بھی عرفات کہتے ہیں ۔ لیکن اس کا زیادہ معروف نام جبل رحمت ہے اس کی مشرقی سمت پتھر کی چوڑی سیڑھیاں چوٹی تک چلی گئی ہیں جس کے اوپر ایک مینار بنا ہوا ہے ۔ ساٹھویں سیڑھی پہ ایک چبوترہ ہے ۔ جس پہ ایک منبر رکھا ہے ۔ اس منبر پہ کھڑے ہو کر خطیب نویں ذوالحجہ کو بعد دوپہر خطبہ پڑھتا ہے ۔

عرفات کا میدان حرم مکہ (حدود حرم) کے باہر واقع ہے ۔ یہ شرقاً غرباً عرض میں چار میل کے قریب اور طول میں تقریباً ساٹ آٹھ میل ہے ۔ مکے سے آنے والے حاجی درہ مازمین سے نکل کر ان ستونوں کے پاس سے گزرتے ہیں ۔ جو حرم کی حد بندی کرتے ہیں ۔ ان ستونوں کے مشرق کی جانب عرنہ نامی ایک نشیب ہے جس کے دُور کے کونے پہ ایک مسجد ہے جو مسجد ابراہیم ، مسجد نمرہ یا مسجد عرفہ کے مختلف ناموں سے موسوم ہے ۔ موقف یا مقام اجتماع جو اس مسجد سے مشرق اور جبل رحمت سے مغرب کی جانب دُور تک چلا گیا ہے ۔ مشرق کی جانب کوہستان طائف کے سلسلے سے گھرا ہوا ہے ۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اس میدان میں کئی کوئیں کھود دیے گئے تھے اور متعدد باغوں اور مکانوں کا ذکر ملتا ہے ۔

ملکہ زبیدہ کے حکم سے طائف کے علاقے سے مکے تک پانی لانے کے لیے جو نہر بنائی گئی تھی وہ بھی عرفہ پہاڑی کے دامن میں بہتی ہے ۔

یہاں زندگی کے آثار صرف " یوم عرفہ " ہی کو نظر آتے ہیں ۔ جبکہ حاجی وقوف عرفہ ادا کرنے کے لیے یہاں خیمے نصب کر لیتے ہیں ۔ (عرفات میں وقوف و قیام) حج کا بڑا ضروری رکن ہے ۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے) ۔ وقوف ظہر کے خطبے اور نماز کے بعد شروع ہوتا ہے اور مغرب سے تھوڑی دیر بعد تک جاری رہتا ہے ۔

عرفہ کے نام کی ابتدا کے متعلق کچھ معلوم نہیں ۔ روایات میں اس کی توجیہہ اس طرح کی گئی ہے کہ جب حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جنت سے نکالے گئے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے دوبارہ اس مقام پہ ملے اور انھوں نے ایک دوسرے کو پہچانا ۔

ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیل نے حضرت ابراہیمؑ کو یوم عرفہ کے مناسک سکھائے تھے بعض نے یہ توجیہہ بھی کی ہے کہ اس مقام پہ لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور اللہ کے حضور استغفار کرتے ہیں ؛

Marfat.com

عروہ بن زبیرؓ

صحابیٔ رسولؐ ۔ عروہ بن زبیر بن عوام اسدی ۔ قریشی ، مدنی ۔ کنیت عبداللہ مدینہ منورہ کے قدیم ترین محدثوں اور ائمہ حدیث میں سے ہیں ۔ ان کا شمار مدینے کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے ۔ ۲۳ھ اور ۲۹ھ کے درمیان کسی سال میں پیدا ہوئے ۔ اور ۹۱ھ ۹۹ھ کے مابین وفات پائی ۔

ان کی والدہ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیق ہیں ۔ گویا وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے ہیں ۔ ان کے والد حضرت زبیر بن عوام بن خویلد ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضرت محمد صلعم کے ہم زلف تھے ۔

وہ اپنے بڑے بھائی عبداللہ بن زبیرؓ سے بیس پچیس برس چھوٹے تھے ۔ اپنے زمانے کی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر علمی مشاغل میں منہمک رہے ! جب ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر کو حجاج نے شکست دی تو کچھ عرصے بعد وہ مدینہ منورہ واپس آ گئے ۔ اور وفات تک اپنی ہی جائیداد کو وسیلۂ معاش بنا کر ہمہ تن علمی کاموں میں مصروف رہے ۔ یہیں انھوں نے خلیفہ عبدالملک کی فرمائش پر اسلام کے بالکل دور کے متعلق مراسلات کا ایک سلسلہ غالباً خلیفہ کے نام خطوط کی شکل میں لکھنا شروع کیا ۔

ان کے متعلق رائے روایت ہے کہ ہر رات ایک چوتھائی قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے ۔ جب ان کا سرطان زدہ پاؤں کاٹا گیا تو انہوں نے اُف تک نہ کی ۔

حضرت عروہؓ اپنی خالہ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں ان کی وفات سے تین سال پہلے تک بہت التزام کے ساتھ حاضر ہوتے رہے اور ان سے سن کر بہت سی اہم احادیث جمع کر لیں ۔ اسی طرح انہوں نے اپنے والدین نیز حضرت علیؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے احادیث روایت کی ہیں ۔

خود ان سے جن بزرگوں نے روایت کی ہے اُن میں محمد بن مسلم ، ہشام ، سلیمان بن یسار ، عبداللہ ، عثمان اور خود حضرت عروہؓ کے صاحبزادے محمد شامل ہیں ۔

انہوں نے ایک کتب خانہ جمع کر لیا تھا جن میں تاریخی و فقہی دونوں طرح کی کتابیں تھیں ۔ ایک کتاب " المغازی " تصنیف کی تھی ۔ ان کی مرویات کی خصوصیت یہ ہے کہ باقاعدہ اسناد کے بغیر روایت کرتے ہیں ۔ اسناد کا دستور بعد میں رائج ہوا ؛

عروہ بن مسعودؓ

حضورؐ کے ممتاز اور مشہور صحابیؓ اور راوی حدیث ہیں ۔ ان سے کتب احادیث میں بہت ساری روایات مروی ہیں ۔ جب حضور طائف سے واپس تشریف لائے تو عروہؓ ان کے ساتھ ہوتے ۔ اور اسلام قبول کر لیا ۔ اپنے قبیلے میں اشاعتِ اسلام کی اجازت چاہی ۔ حضورؐ نے فرمایا ۔ لوگ تمہاری مخالفت کریں گے اور آپ سے برسرِ پیکار ہوں گے ۔ چنانچہ محبتِ دین کے جوش سے جب آپ دعوتِ دین دینے کے لیے گئے تو قبیلہ والوں نے چاروں طرف سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی ۔ حتّٰی کہ آپؓ کے ایک زخم کاری لگا اور آپ شہید ہو گئے ۔

کہتے ہیں کہ حضرت عروہؓ کی شکل و صورت حضرت مسیحؑ جیسی تھی ؛

عریّہ

فروخت کی ایک قسم جس کی اسلام نے اجازت دی ہے ۔ جب ایک آدمی ایک درخت پر لگے ہوئے پھل کا حساب لگا لے (اندازہ) اور اُسے فروخت کر دے اس سے قبل کہ وہ پھل (جس کو اس نے فروخت کیا) درخت سے اتار لیا گیا ہو ۔ اسے عریّہ کہتے ہیں ؛

عُزّیٰ

عرب کی ایک قدیم دیوی ۔ اس کے نام کا مفہوم ہے مضبوط ، طاقتور ۔ اس کا تعلق خاص طور پر قبیلۂ غطفان سے تھا ۔ لیکن اس کا بڑا استھان اس راستے پر تھا جو طائف سے مکہ مکرمہ کو جاتا ہے ۔ یہاں ببول کے تین درخت تھے جن میں سے ایک پر جاہلی عربوں کے عقیدے کے مطابق اس دیوی نے ظہور کیا تھا ۔ یہیں ان کا متبرک پتھر نصب تھا اور ایک غار بھی جو غبغب کہلاتا تھا ۔ اس میں ان جانوروں کا خون گرایا جاتا تھا جن کو اس دیوی کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا ۔

خاص عرب کے باہر عزّیٰ کی پرستش خاص طور پر حیرہ لخمی بادشاہوں کے ہاں ہوتی تھی ۔

فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے خالد بن ولیدؓ کو عزّیٰ کے استھان پر بھیجا تاکہ وہ اسے تباہ کر دیں ۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر حکم رسول اللہؐ کی تعمیل کی اور اس کے بعد جلد ہی یہ مذہب جس کا مرکز یہ بُت تھا ختم ہو گیا ؛

عزرائیلؑ

وہ فرشتہ جس کے ذمہ روحیں قبض کرنا ہے ۔ جبرائیلؑ ، میکائیل ، اسرافیل اور عزرائیل ، یہ چار فرشتے خدا کے مقرب سمجھے جاتے ہیں ۔ اور کاروبارِ عالم چلانے کے لیے ان کو مختلف فرائض سونپے گئے ہیں ۔ قرآن میں صرف جبرائیل اور میکائیل کا نام آیا ہے ۔ باقی دو فرشتوں کا نہیں ۔ انگریزی ادب میں عزرائیل کا ذکر آتا ہے اسرائیلیات کے ذریعے اس فرشتے کی شکل و صورت کے متعلق جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ۔ ان کے مطابق ان کی شکل بڑی بھیانک اور ڈراؤنی ہے ۔ اس کے چار ہزار پر اور ستر ہزار پاؤں ہیں ۔ چاروں جانب منہ اور تمام بدن پر آنکھیں ہیں ۔ تمام جانداروں کی موت عزرائیل کی وساطت سے ہوتی ہے ۔ جس کی تعمیل فرشتے کرتے ہیں عزرائیل صرف نبیوں اور نیک انسانوں کی روح قبض کرتا ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب خدا نے موت کو پیدا کیا تو تمام فرشتے اس سے خوفزدہ ہو گئے ، سوائے عزرائیل کے ۔ اس پر یہ کام اس کے سپرد کر دیا گیا ؛

عزل

لغوی معنی جدا ہونا ۔ کنارہ کش رہنا ۔

اصطلاح میں عورت سے مجامعت کرتے وقت بغیر انزال کے علیحدہ ہو جانا ۔ قدیم عرب میں بعض لوگ بوجہ غربت اولاد پیدا نہ ہونے کے واسطے یہ صورت اختیار کرتے اور مباشرت میں انزال سے قبل ہی عورت سے علیحدہ ہو جاتے تھے ۔ شرعی طور پر یہ منع تو نہیں تاہم صرف اسی صورت میں اجازت دی ہے کہ عورت کے حالات ۔

... یا شیرخوار بچے کی وجہ سے یا اس کی صحت پہ خراب اثر پڑنے یا اس کی موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ دوسری شرط یہ بھی ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے عورت کی اجازت ضروری ہے ؛

عزیرؑ

(۔۔۔ ۵۰۰ ق م) حضرت ہارون بن عمران کی نسل سے تھے۔ قرآن اور احادیث کی رو سے عزیرؑ نبی تھے اور یہود انہیں خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔

جب بخت نصر نے بیت المقدس پہ حملہ کر کے تمام یہودیوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں بابل لے آیا۔ اس وقت حضرت عزیرؑ کم عمر تھے۔ چالیس برس کی عمر میں آپ بنی اسرائیل کے فقیہہ بنے اور رشد و ہدایت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اردشیر کے زمانے میں جب بنی اسرائیل نے بیت المقدس کو از سر نو تعمیر کرنا چاہا تو اس سلسلے میں حضرت عزیرؑ نے شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور بیت المقدس کی تعمیر میں بنی اسرائیل کی مدد کی۔ بیت المقدس کی تباہی کے وقت تورات کے تمام نسخے تباہ ہو چکے تھے۔ حضرت عزیرؑ نے یہ نسخے از سر نو مرتب کرائے۔ غالباً اسی وجہ سے یہود انہیں خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے۔

روایت ہے کہ حضرت عزیرؑ کو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ تم یروشلم جاؤ ہم اسے دوبارہ آباد کریں گے۔ یہ اپنے گدھے کے ساتھ ایک اجڑے ہوئے شہر کے قریب سے گزرے تو ان کے دل میں خیال آیا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ کریم ان مرے ہوئے لوگوں کو زندہ کر دے۔ یہ کہہ کر آرام کی خاطر ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ اور قریب ہی آپ نے گدھا باندھ دیا۔ تو اللہ تعالےٰ انہیں ایک سو سال تک سلائے رکھا۔ اور جب بیدار ہوئے تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ بہت تھوڑی دیر سوئے ہیں، لیکن ان کا گدھا مر چکا تھا جس کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے گدھے کو ان کے سامنے دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور یہ دلیل دی کہ خدا تعالےٰ مردوں کو زندہ کرنے پہ قادر ہے ؛

عزیزؓ

دیکھیے : اسماء الحسنیٰ ۔

عزیز مصر

جس آدمی نے حضرت یوسفؑ کو عرب قافلہ والوں سے خریدا تھا۔ قرآن پاک میں اسے عزیز (یعنی صاحب وقار اور بلند پایہ آدمی) کہا گیا ہے۔ تورات میں اس کا نام "فوطی فار" بتایا گیا ہے۔ جو فرعون کا ایک امیر اور سردار فوج تھا۔ عزیز نے حضرت یوسفؑ کو ایک خوبصورت غلام سمجھ کر خریدا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس پہ ان کے جوہر کھلے تو انہیں اپنے گھر بار اور علاقہ کا مختار بنا دیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ عزیز مصر اس کا نام نہیں بلکہ اس وقت مصر کے بادشاہ کو عزیز کہا جاتا تھا۔ جیسے کسی وقت فرعون کہا جاتا رہا۔ یا روم کے بادشاہ قیصر اور شام کے حکمران کسریٰ اور ترکی کے بادشاہ کو سلطان کہا جاتا رہا ہے ؛

عسقلانی

دیکھیے : "ابن حجر عسقلانی رحؒ"

عسل

دیکھیے : "شہد"

عُشر

زرعی پیداوار کا دسواں حصّہ جو اسلامی حکومت وصول کرتی ہے۔ یہ اصطلاحی طور پہ اشوری زبان کا لفظ ہے۔ چنانچہ اشوری تہذیب میں بھی اناج، کھجور اور دوسری زرعی پیداوار کا دسواں حصّہ مندر کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ عبرانی میں اسے معشر کہتے ہیں۔ چنانچہ یہودی بادشاہ بھی زراعت کا دسواں حصّہ وصول کیا کرتے تھے۔ جنوبی عرب میں بھی یہی رواج تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ جس زمین کو بارش یا قدرتی چشموں کا پانی سیراب کرتا ہو اس سے زراعت کا دسواں حصّہ اور جس زمین کی آبپاشی کنوئیں یا نہر سے (قیمتاً یا محنت سے) اس سے بیسواں حصّہ وصول کیا جائے۔ اسلامی عہد میں مکہ مدینہ۔ حجاز۔ یمن۔ اور دیگر عرب علاقوں کی زمین عشری تھی اور غیر عرب علاقوں کی زرعی زمین سے خراج وصول کیا جاتا تھا۔ عشر فقط مسلمانوں سے لیا جاتا تھا ؛

عشرہ مبشرہ

یہ وہ دس جلیل القدر صحابہؓ ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ اصطلاح حدیث میں نہیں آئی لیکن یہ تصور انہی سے ماخوذ ہے۔ اس قسم کی حدیثوں میں عموماً یہ الفاظ ملتے ہیں۔ "عشرۃ فی الجنۃ" (دس حضرات جنت میں ہوں گے) جس کے بعد ان کے نام درج ہیں۔ مختلف فہرستوں میں ان صحابہ کرامؓ کے نام درج ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت طلحہؓ۔ حضرت زبیرؓ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ۔ بعض روایات میں ان نو حضرات سے پہلے خود آنحضرت صلعم کا اسم مبارک ہے۔ دوسری روایات میں آنحضرتؐ کا اسم مبارک نہیں بلکہ ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کا نام ہے۔

اس قسم کے رجحانات کی اصل مراتب مذہبی کے وہ تصورات ہیں جو ملت اسلامیہ میں نمایاں تھے۔ دینی خدمت سرانجام دینے، خیر میں سبقت لے جانے اور راہ حق میں ثابت قدمی کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے رسول اکرم صلعم نے مختلف موقعوں پہ اصحاب کو مغفرت اور جنت کی بشارت سے نوازا ؛

عِشق

عربی زبان کا لفظ۔ لفظی معنی وفور محبت۔ شدید شوق۔ انتہائی شدید جذباتی تعلق خاطر۔ یہ لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے کیونکہ قرآن اعتدال کی تلقین کرتا ہے اور عشق ایک انتہائی جذبہ ہے۔ قرآن میں محبت اور اُنس کی تلقین ہے جو ایک متوازن اور تعقل کی حد میں پرورش پانے والا جذبہ ہے۔

دنیا بھر کے ادب کی طرح عربی ادب میں بھی اس لفظ نے خاصی اہمیت اختیار کی ہے۔ عالموں، فقیہوں، صوفیوں، دانشوروں اور عام لوگوں نے عشق کے اسباب اور مظاہر اور اس کے درجوں کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال کیا ہے مذہبی میں اس پہ ایک خاص طرز پہ گفتگو کی جاتی رہی اور اس کو سلجھانے کی کوشش کی گئی۔

Marfat.com

عام طور پر مسلمہ تعریف کی رُو سے عشق کسی محبوب شئے یا ہستی کے حصول کی ناقابل مزاحمت خواہش کا نام ہے۔ اس تجربے سے گزرنے والے شخص (عاشق) کو اپنے اندر کسی نہ کسی نقص یا کمی کا احساس ہوتا ہے، جسے وہ "حصول کمال" کے لیے ہر قیمت پر دور کرنا چاہتا ہے اسی لیے دوسرے کمالات کی طرح جن کی روح اور جسم کو خواہش ہوتی ہے۔ عشق میں بلند و پست مراتب ہوتے ہیں۔ اس کے محرکات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس کی علیت یا معنی ایک ہی کار فرما ہوتا ہے جو بلاشبہ سب انسانوں کے دل و دماغ پر شدت سے چھایا رہتا ہے۔ یہ اس جمال (حسن) کی انتہائے آرزو ہے جس کو عالم موجودات میں اللہ تعالٰی نے آدمؑ کو اپنی صورت پر تخلیق کرتے وقت ظاہر کیا۔ سب موجودات میں ہستی کے اس مرتبے کے حصول کی خواہش کار فرما ہے جو ان کے اپنے درجے سے اوپر ہے۔ یہ محرک خواہش جو تمام کائنات میں جاری ہے عشق کائناتی ہے۔

انسانوں کے مابین انس اور محبت کا متوازی جذبہ عشق کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس نے نفسیاتی اور جسمانی کیفیتیں ظہور میں آتی ہیں اور انھیں رائج العام الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بالخصوص شاعری میں استعمال ہوتے ہیں۔

نفسانی خواہشوں سے مبرّا اور پاک ہو کر یہ جذبۂ عشق عبادت کی ایک اعلیٰ شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے بعض اوقات ایک دماغی عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے جو اعمال پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یہ کسی مثالی نسوانی شکل کی روحانی پرستش کی کیفیت ہوتی ہے۔

فلسفیوں کے ہاں عشق ایک عقلی چیز ہے۔ یہ اُس بلند ترین خوشی کی جانب غیر ارادی، واضح اور باقاعدہ میلان کے مترادف ہے جو حواس خمسہ کے ذریعے منتقل ہونے والے علم سے آزاد ہو چکی ہے۔ خالص نیکی کا مفہوم حاصل کر لیتی ہے۔

صوفیوں کے ہاں عشق کا شوق و ولولہ کسی حد تک مزاحمت کے باوجود مذہبی زندگی کا ایک جزو ہے۔ کیونکہ یہ اس منظم اُنس و محبت کا قدرتی ارتقاء ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے۔ "اللہ کی طلب لازمی" کو محبت سے زیادہ عشق یعنی عشقِ الٰہی کا درجہ دیا جاتا ہے۔

عصر

لغوی معنی، زمانہ۔ وقت۔

قرآن مجید میں ہے، اور قسم ہے وقت (زمانے) کی، انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں (پ۳۰)

نمازوں میں سے ایک نماز کا نام بھی عصر ہے۔ ظہر کے بعد اور مغرب سے پہلے، اس کو بروقت ادا کرنے کی بڑی تلقین کی گئی ہے۔

حفاظت کرو تمام نمازوں کی بالخصوص درمیانی نماز کی۔ (پ۲)

اس درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک دفعہ نئے آئے ہوئے گھوڑے دیکھنے میں لگ گئے کہ عصر کی نماز کا وقت فوت ہو گیا۔ آپ کو بڑا دکھ ہوا۔ اور تلافی کے طور پر سبھی گھوڑے خیرات کر دیے۔ حدیث میں آتا ہے کہ انسانوں کے اعمال لکھنے والے فرشتے دن میں دو مرتبہ ڈیوٹی بدلتے ہیں۔ ایک صبح اور ایک عصر کے وقت۔ اس لیے عصر کی نماز میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

دیکھیے: "العصر" سورۃ

عصمت

عقائد دین میں خطا و گناہ سے بری ہونا۔ اسلام کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم ہیں۔ ان سے بتقاضائے بشریت بھول ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالٰی اپنی وحی سے ان کی غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔

(مزید دیکھیے "عفت")

عصمت انونو

جمہوریہ ترکی کے سابق صدر۔ اب ترکی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے قائد۔ ۱۸۸۸ء کو سمرنا میں پیدا ہوئے۔ حسب دستور مسجد میں دینی تعلیم حاصل کی۔ پھر سرکاری مکتب سے تحصیل علم کر کے فوجی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر استنبول کے ملٹری کالج میں داخل ہوئے۔ یہیں انجمن اتحاد و ترقی کے رکن بنے۔ ۲۷ برس کی عمر میں کالج سے فارغ ہو کر فوج میں کپتان بنا دیے گئے۔

عصمت انونو

۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی میں پیش پیش تھے۔ جنگ طرابلس اور پہلی جنگ عظیم میں انور پاشا کے ماتحت حصہ لیا۔ گیلی پولی اور درۂ دانیال کے معرکوں میں سپلائی پر مامور تھے۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو انھیں محاذ کاکیشیا پر بھیج دیا گیا۔ جنگ عظیم کے اختتام پر جب انگریزوں نے قسطنطنیہ اور یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر لیا تو انونو مرکز خلافت سے بھاگ کر اناطولیہ پہنچ گئے۔ اور مصطفٰی کمال پاشا سے مل کر کسانوں کی ایک فوج تیار کر لی۔ انونو کے مقام پر آپ نے یونانیوں کو فیصلہ کن شکست دے کر اپنے وطن کو آزاد کرا لیا۔ "فاتح انونو" کی حیثیت سے انونو ان کا نام کا جزو بن گیا۔

پہلی لوزان کانفرنس میں عصمت انونو نے جس قابلیت، ہوشیاری اور تدبر کا ثبوت دیا وہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لارڈ کرزن کی دھمکیوں کا عصمت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اور وہ انگورہ واپس چلے آئے۔ دوسری لوزان کانفرنس میں ترکوں کی حسب منشا صلح ہو گئی۔ جب مصطفٰی کمال جمہوریہ ترکی کے پہلے صدر بنے تو عصمت کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں وزارت عظمٰی سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد چار مرتبہ ترکی کے وزیر اعظم بنے۔ کمال اتاترک کی وفات کے بعد عصمت انونو جمہوریہ ترکی کے دوسرے صدر بنے اور دوسری عالمگیر جنگ میں انتہائی تدبر سے کام لے کر ترکی کو جنگ کے شعلوں سے بچائے رکھا۔ جنگ

Marfat.com

گئے بعد ازاں انتخابات میں غضنفر علی کی جماعت ناکام رہی۔ فوجی انقلاب کے بعد پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آج کل پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے قائد ہیں۔

عطاء اللہ حنیف مولانا

(۱۳۲۷ھ/۱۹۱۰ء) کنیت ابوالطیب۔ جائے ولادت بھوجیاں ضلع امرتسر۔ والد کا نام صدر الدین حسین۔ ابتدائی تعلیم بھوجیاں ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں دہلی چلے گئے۔ اور مولانا ابوسعید شرف الدین دہلویؒ اور مولانا عبدالرحمٰن سے حدیث و دیگر علوم پڑھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالجبار کھنڈیلویؒ، حافظ محمد محدث گوندلوی اور مولانا عطاء اللہ لکھویؒ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ طے کیا۔ آپ کی تعلیم کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ حدیث و اصول حدیث کی کتابیں صرف ایک "کلیئے" کے سہارے پڑھیں۔ صرف و نحو و دیگر علوم کی تعلیم تکمیل بعد میں کی۔

مولانا حنیف دہلی سے تکمیل علم کے بعد پنجاب آئے تو ان دنوں متحدہ جمعیت اہل حدیث کی تشکیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس جمعیت کے زیر اہتمام قائم ہونے والے پہلے مدرسہ میں بطور شیخ الحدیث آپ ہی کا تقرر ہوا۔ دو سال یہاں رہنے کے بعد آپ لکھوکے اور پھر فرید کوٹ کے مشہور قصبہ کوٹ کپورہ چلے گئے۔ تقریباً دو سال یہاں رہے اور تحریک آزادی میں سرگرمی دکھانے کے "جرم" میں والیٔ ریاست سے چپقلش کے باعث واپس فیروز پور آ گئے۔ ۱۹۴۶ء کے آخر میں صوفی محمد عبداللہ کے کہنے پر ان کے مدرسہ دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈانوالہ (جو اب ماموں کانجن منتقل ہو چکا ہے) میں شیخ الحدیث کی مسند سنبھالی۔ سالانہ تعطیلات کے باعث فیروز پور گئے۔ تو اسی سال رمضان میں ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے بعد پھر گوندلانوالہ آ گئے۔ قیام پاکستان کے باعث جماعت اہل حدیث کا شیرازہ بھی بکھر چکا تھا۔ مولانا حنیف کی مساعی سے مولانا محمد اسماعیلؒ اور مولانا داؤد غزنویؒ نے جماعت کو از سر نو منظم کیا۔ مرکزی مدرسہ کا قیام اس کے بنیادی مقاصد میں سے تھا چنانچہ جامعہ سلفیہ کے نام سے ایک مرکزی مدرسہ شیش محل روڈ لاہور کی ایک عمارت میں جاری کیا۔ اس کی مسند شیخ الحدیث کے لیے بھی مولانا کا ہی انتخاب ہوا۔ ۱۹۵۰ء تک اسی مدرسہ کے شیخ الحدیث رہے۔ بعد ازیں یہ مدرسہ لائلپور (فیصل آباد) منتقل ہو گیا تو آپ نے تحریر کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ حدیث کی مشہور کتاب سنن نسائی پر حاشیہ لکھنا شروع کر دیا جسے ۱۹۵۷ء تک مکمل کر لیا۔ آپ نے "الاعتصام" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ تھوڑے عرصے بعد ایک اور جریدہ "رحیق" نکالا جو کچھ مدت بعد بند ہو گیا۔ البتہ "الاعتصام" اب تک مولانا کی زیر ادارت نکل رہا ہے۔ اسی دوران مکتبہ سلفیہ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ سنن نسائی پر حاشیہ التعلیقات السلفیہ کے نام سے اس ادارہ نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اس ادارے کے زیر انتظام کئی ایک نادر کتب شائع ہوئیں۔

ہندوستان میں ان کا ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جو فسادات کی نذر ہو گیا۔ لیکن اب انہوں نے اس سے بھی بڑا کتب خانہ بنا لیا ہے۔ امام ابن تیمیہ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ پروفیسر ابوزہرہ کی عربی کتاب "حیات ابن تیمیہ" کا ترجمہ رئیس جعفری سے کروایا۔ اور اس پر کتاب کی ضخامت کے برابر حاشیہ تحریر کر کے اپنے ادارے سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی کتابوں پر آپ نے حواشی تحریر کیے۔ اور نادر و نایاب کتب کی جستجو کر کے منظر عام پر لائے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف جماعت اہل حدیث کے بلند پایہ محققین میں سے ہیں۔ احتساب کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں۔ یہی وجہ جماعت اہل حدیث سے عملاً علیحدہ رہے۔ ویسے بیس برس سے لاہور کی جمعیت کے امیر چلے آ رہے ہیں۔ مولانا نے مبارک مسجد اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں اکتیس برس تک خطابت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ قیام و طعام سادہ۔ شروع سے ہی کھدر پوشی۔ تکلف سے احتراز اور خلوص و خوش اخلاقی ان کا خاص شعار رہا ہے۔ ۹ سال سے الاعتصام کی نگرانی اور دیگر علمی کاموں میں مصروف ہیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مولانا

(۱۳۱۰ھ/۱۸۹۱ء - ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) عہد ساز خطیب۔ قافلۂ آزادی کے عظیم راہنما۔ بے باک مجاہد۔ پٹنہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید ضیاء الدین احمد اور والدہ کا نام سیدہ فاطمہ تھا جو ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حافظ قرآن تھیں۔ چار سال کی عمر میں والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی۔ اردو خاندانی زبان تھی۔ فارسی و عربی اور شعر و سخن میں ذوق پیدا ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں پٹنہ سے امرتسر مولانا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی کے پاس آ گئے۔ صرف و نحو اور فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ وہیں ان کے استاد نے تقریر کی مشق کرائی ان کی آواز کی حلاوت نے بہت جلد لوگوں کو اپنی جانب مائل کر لیا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری

۱۹۱۹ء میں کوچہ جبل خانہ رام باغ امرتسر کے لوگ شدید اصرار کر کے اپنے ہاں لے آئے۔ اس مسجد سے مفتی صاحب کی درسگاہ دور تھی چنانچہ اسی زمانہ میں مفتی محمد حسنؒ اور مولانا حبیب الرحمٰنؒ چاٹگامی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیریؒ سے بھی کچھ اسباق تبرکاً سنے۔ ان کے علاوہ اساتذہ میں مولانا نور احمد اور مولانا محمد عالم آسی بھی شامل ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں روحانی تربیت کے لیے پیر سید مہر علی شاہ گولڑہ شریف کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ وہ دور تھا کہ جنگ عظیم کے اثرات ابھی باقی تھے۔ ایک طرف تحریک آزادی اور تحریک خلافت زور پکڑ رہی تھی۔ دوسری طرف برطانوی سامراج اور مرزائی مسلمانوں کے جذبہ ایمانی کے لیے چیلنج بنے ہوئے تھے۔ جلیانوالہ باغ کا سانحہ بھی انہی دنوں رونما ہوا تھا۔ ان حالات سے وہ متاثر ضرور رہتے۔ لیکن عملاً سیاست سے کنارہ کش رہتے تھے۔ حتیٰ کہ تحریک خلافت کی مخالفت کرنے لگے۔ مولانا سید داؤد غزنوی برصغیر کے وہ پہلے عالم دین ہیں جو اس تحریک کے روح رواں تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کو کافی محنت سے قائل کر لیا۔ تب شاہ صاحب نے قولاً و عملاً بڑھ

Marfat.com

بڑھ کر تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کمیٹی توڑ دی گئی تو آپ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حکم پر امرتسر سے پہلی دفعہ تحریک کے رہنما کی حیثیت سے لاہور آئے۔ موچی دروازے میں تقریر کی اور لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ لوگوں نے بڑھ چڑھ کر روپیہ جمع کیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات تک دے دیے۔ اگلے دن دہلی دروازہ کے باہر تحریک کا دفتر قائم کر دیا گیا۔ انگریز اور مرزائی کی مخالفت آپ کا مشن تھا۔ چنانچہ آپ نے فرنگی سیاست پر بھرپور وار کرنے شروع کر دیے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو راولپنڈی میں تحریک آزادی کے موضوع پر ولولہ انگیز تقریر کی۔ پھر ۲۵ مارچ کو امرتسر مسجد میں اس تقریر نے انگریز حکومت سے بغاوت کی تحریک کو دو آتشہ کر دیا۔ چنانچہ انہیں ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور تین سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ اس گرفتاری کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاج ہوا۔ یوں آپ پورے برصغیر کے مسلمانوں کے راہنما بن گئے۔ ۱۹۲۳ء میں رہا ہوتے تو پہلے سے زیادہ جدوجہد شروع کر دی۔ اور یہ جدوجہد آخر دم تک جاری رہی۔ انہی دینی و ملی خدمات کی بناء پر مارچ ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے زیر انتظام لاہور ایک جلسے میں علامہ سید انور شاہ کشمیری نے امیر شریعت کا خطاب دیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ یوں پانچسو کے قریب علماء نے آپ کی بیعت کی۔ عقیدہ ختم نبوت کو تحریکی طور پر عام کرنے کا کام بھی آپ کے ہاتھوں شروع ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں انجمن احرار اسلام قائم ہوئی تو پنجاب بھر میں احرار کے دفتر قائم کرنے کا کام بھی آپ کے سپرد ہوا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں کی دوستی بہت گہری تھی۔ کیونکہ ان دونوں کا مشن ایک ہی تھا، الہلال اور ستارۂ صبح نے آپ کی فکر کی تشکیل کی۔

سید بخاریؒ کو انگریز اور مرزائیوں سے شدید نفرت تھی۔ انگریز سے آپ کے بغض کی انتہا یہ تھی کہ آپ ولایتی مرغی یا انڈہ تک بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک تقریر پر آپ کو چھ ماہ قید ہوئی۔ اہلِ محلہ نے چپکے سے ضمانت کر دی۔ شاہ جی ایک عرصہ تک محلہ والوں سے ناراض رہے کہ انھوں نے اپنی حلال کی کمائی اس حکومت کے خزانے میں جمع کیوں کرا دی؟

مرزائیوں کی یہ جسارت تو ایک علیحدہ بات تھی کہ انھوں نے خاتم النبیینؐ کی رسالت میں گستاخی کی۔ لیکن شاہ جی کو اس کے علاوہ ان سے اس بنا پر بھی نفرت تھی کہ مرزائیت انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے:

۱۹۲۵ء میں جب کہ آپ نئے نئے میدان سیاست میں اترے تھے، مرزائیوں کے خلیفہ بشیر الدین نے ایک جلسے میں جو بندے ماترم ہال امرتسر میں ہوا تھا میں مرزائیوں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ایک حدیث کے الفاظ غلط پڑھے تو شاہ جی نے فوراً ٹوکا۔ اس پر اچھا بھلا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ خلیفہ صاحب کی سبکی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزائیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ پھر اس کے بعد مرزائی کسی بھی میدان میں نظر نہیں آئے۔ تحریک ترکِ موالات میں غالباً اسی وجہ سے حصہ نہیں لیا۔

شاہ جی اس صدی کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کی خطابت کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کہا کرتے تھے کہ جہاں بخاری تقریر کرنے کے لیے جائیں گے وہاں کسی کو جرأت نہیں ہو گی۔ اگر پہلے کی جائے تو یہ بعد میں آکر اثر اڑا دیں گے۔ اگر بعد میں کرنے کی کوشش کی جائے تو سننے گا کون۔؟ ہر جلسے کے آخری مقررین کی حیثیت سے ہی ہوتے۔ نماز وقت ہوتا ایک عادت تھی۔ اپنی تقریر میں بے شمار اشعار، لطیفے، چٹکلے، خصوصاً قرآن مجید بکثرت پڑھتے۔ سادہ غذا اور سادہ لباس استعمال کرتے تھے۔ کھدر کا استعمال آخر تک رہا، حتیٰ کہ کھدر کا نام بخاری کھدر پڑ گیا۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں لاہور سے ملتان پہنچے اور ۲۵ روز بعد ۲۱ اگست کو جہاں آگاہی میں جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

عطّار، شیخ فریدالدین

فارسی کے مشہور صوفی شاعر۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ جوانی کا زمانہ علوم و معارف میں تحصیل علوم میں گزرا۔ آخر میں خود بھی مقام ارشاد پر فائز ہوئے۔ مولانا رومیؒ نے ان کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی عطار سے بہت متاثر ہیں۔ آپ نے مصر، دمشق، ہندوستان، ترکستان اور مکہ کی سیاحت بھی کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عطار یعنی عطر فروش تھے۔ کہ ایک روز ایک درویش ان کی دوکان کی چوکھٹ پر آکر لیٹ گیا۔ شیخ نے اسے پوچھا کہ کیا چاہیے تو اس نے کہا یہاں ہمیں کیا چاہیے ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ خود اپنی فکر کرو، زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ ادھر دیکھو یہ ہے زندگی۔ یہ کہہ کر وہ لیٹ گیا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ شیخ اس سے بڑے متاثر ہوئے۔ اسی وقت دوکان سے نکلے اور مشائخ کی تلاش میں چل پڑے۔

عفّت

(پاکدامنی، پاکبازی:۔ نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہو جانا جس کے ذریعے قوۂ غلبۂ شہوت سے محفوظ رہے۔) عفت ان ساری خوبیوں کی جان ہے جن کا مآل عزت و آبرو ہے۔ اسی لیے اسلام نے اُسے اخلاقی محاسن میں شمار کیا ہے۔

قرآن کریم میں عفت و عصمت کے لیے اصطلاحی "حفظ فروج" یعنی شرمگاہ کی حفاظت ہے۔ سورۃ مومنون، میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں اس اخلاقی وصف کا خاص طور پر ذکر ہے۔ سورۃ المعارج میں بھی یہی مضمون ہے۔ حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنیٰ میں مجازی لفظ ہے۔ کتنے ہی الفاظ جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہل مجازی طور پر استعمال ہوتے رہے۔ مگر بعد میں کثرت استعمال کے باعث وہ اپنے مفہوم میں بالکل بے پردہ ہو گئے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کریم نے ایک اور لفظ "احصان" استعمال کیا ہے جو حصن سے بنا ہے اور اس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں یہ لفظ قرآن مجید میں تین مرتبہ آیا ہے۔ دو دفعہ حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے ضمن میں اور ایک دفعہ مجہول صیغے سے۔

یہود نے جو بہتان باندھا تھا۔ قرآن نے نہ صرف اس کی تردید کی۔ بلکہ ان کی پاکدامنی کی شہادت بھی دی۔ جو دو جگہ پر ہے۔ ایک سورہ تحریم کی آخری آیت میں اور دوسری سورۃ انبیاء کے چھٹے رکوع میں، حضرت یوسف کی پاکبازی کا ثبوت خود عزیز مصر کی بیوی نے دیا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مستقل خصلت بھی یہی بیان کی۔ سیداً و حصوراً وہ سردار ہوگا۔ اور اپنی ترغیب شہوانی پر ضبط

Marfat.com

دکھا ہوگا۔

اسلام میں اہلِ بیتؑ کی زندگی جس عفت و پاکبازی سے عبارت تھی اس کی گواہی خود عَلَّامُ الْغُیُوْب نے دی، ۔ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔ یہ (یعنی اہلِ بیت) لوگ تہمت سے پاک ہیں نیز ان کے لیے مغفرت و اجرِ عظیم ہے۔

عفت کے خلاف کا لفظ قرآن مجید میں فَاحِشَۃٌ آیا ہے جس کے معنی کھلی بے حیائی کے ہیں۔ ایک مقام پر فاحشہ کو زنا کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

زنا اور اس کے تمام محرکات و متعلقات (مثلاً کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں یا برائی کے ارادے سے دیکھنا۔ تنہائی میں ملنا۔ بلاوجہ اس کے بدن کو چھونا۔ اور کبھی اس کی بات چیت۔ یا آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا) سب کا نام عفت اور مبتلا ہونے کا نام فاحشہ کھلی بے حیائی ہے۔

اسلام نے عفت کی خاطر عورت پر چند ایک پابندیاں بھی لگائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں۔ چھنکتے ہوئے زیور پہن کر بازاروں میں نہ نکلیں، تیز خوشبو استعمال نہ کریں۔ غیر محرم کے ساتھ نرم لہجہ میں بات نہ کریں۔ سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو چادر لپیٹ کر جائیں۔ درمیان راہ نہ چلیں راستہ میں باتیں نہ کریں۔ بغیر اجازت کسی کے گھر میں نہ داخل ہوں۔ اور مردوں پر بھی اس قسم کی پابندیاں لگائی ہیں۔ تاکہ عصمت و عفت کا دامن داغدار نہ ہونے پائے۔

اسلام نے صرف اخلاقی برائیوں پر ہی بس نہیں کی بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی میں عصمت و عفت کا دامن چاک کرنے کے ذمہ دار ہوں شرعی ثبوت کے بعد دنیا ہی میں قانونی سزا مقرر کی ہے۔ تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی گزارنے پر مجبور کر دے۔ بدکار مرد و عورت کی سزا سو سو کوڑے مقرر کی ہے۔ بعض حالتوں میں سنگساری کی سزا بھی رکھی ہے۔ صرف سزا پر ہی بس نہیں۔ بلکہ انہیں مسلم سوسائٹی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ کہ زانی مرد صرف زانیہ یا مشرک عورت کے ساتھ ہی نکاح کر سکتا ہے۔ اور زانیہ عورت صرف زانی یا مشرک مرد ہی سے نکاح کر سکتی ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا: خبیث (ناپاک) عورتیں خبیث (ناپاک) عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہیں۔ پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لیے اور پاکباز مرد پاکباز عورتوں کے لیے ہیں اور فرمایا پاکباز مومنوں پر ناپاک عورتوں سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں سے سب سے بڑا گناہ مشرک بندوں کے حقوق میں سے سب سے بڑا گناہ ناحق قتل اور اس کے بعد جس برائی کا ذکر ہے وہ کسی کی عصمت و پاکدامنی کا پردہ چاک کرنا ہے۔ دنیا میں اس جرم کے ارتکاب پر اسے پاک کرنے کے لیے تو حالات کے تحت دو قسم کی سزائیں ہیں۔ سنگسار کرنا یا کوڑے مارنا لیکن جو سزا مرنے کے بعد دی جائے گی وہ اس سے کہیں زیادہ سخت اور عبرت انگیز ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک روحانی خواب میں دکھایا گیا۔ کہ بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے نعل تبیح کے مشابہ تھی۔ یعنی تنور کے مانند ایک سوراخ تھا۔ جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا۔ اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور عورتیں تھیں۔ جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا یہ لوگ اس کے اندر سے باہر نکل آئیں گے لیکن جب آگ ٹھنڈی ہو جاتی تو یہ اس کے پھر اندر چلے جاتے ہیں۔ یہ عالم برزخ کا عذاب تا حجرِ قیامت ہمیشہ جاری رہے گا۔

اس کے برعکس پاکبازی مردوں اور عورتوں کے فضائل میں نہایت موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ کے سوا کوئی سایہ ہوگا۔ خداوند تعالیٰ سات قسم کے آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں سے ایک شخص وہ ہوگا جسے ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ یہ تو وہ شرف ہے۔ جو پاکبازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا۔ لیکن صاحب عفت لوگوں کے لیے دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں۔ حدیث میں ہے:۔ آپ نے قدیم زمانہ کے تین آدمیوں کا قصہ بیان فرمایا:۔

جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعتاً بارش شروع ہوگئی تینوں نے بچنے کے لیے ایک غار میں پناہ لی۔ سوء اتفاق سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہوگیا۔ اب نجات کی صورت انہیں سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھی کہ اعمال کے واسطہ سے خدا سے دعا کریں۔ چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور اعمال صالحہ کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹتا گیا۔ ان میں سے ایک کی دعا یہ تھی۔

> خداوندا! میری ایک چچا زاد بہن تھی جس سے بڑی محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ راضی نہ ہوئی، ایک دن تو وہ ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے پاس آئی۔ میں نے اسے ضرورت سے زیادہ درہم دیئے اور اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔ تو وہ رضامند ہوگئی۔ عین اس وقت کہ ہم برائی میں ملوث ہونے والے تھے اس نے کہا:۔
> " اللہ سے ڈر "

یہ سنتے ہی میں رک گیا۔ بارالٰہی:۔ اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میں نے صرف تیرے ڈر اور رضا کے لیے کیا ہے تو ہمیں اس عذاب سے نجات دے، چنانچہ وہ پتھر ہٹ گیا اور یہ باہر آگئے۔

عفت و پاکبازی ان اعمال میں سے ہے۔ جن سے خدا کا قرب اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ نیز عفت ہی عصمت کا بہترین زیور ہے

عفریت

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور بلقیس کے ذکر میں اس کا نام آیا ہے۔ قرآن کے بقول اس نے دعویٰ کیا تھا کہ میں وہ تخت آپ کی مجلس برخاست ہونے سے پہلے حاضر کر سکتا ہوں۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ عفریت جن نہیں تھا۔ بلکہ انسان تھا (جب کہ قرآن کریم کے الفاظ میں ہے ایک عفریت جو جنوں سے تھا) جن بطور استعارہ کے استعمال ہوا ہے۔ مگر طبری نے اسے جن ہی شمار کیا ہے۔ عفریت جن اور شیطان دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور عموماً برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

عفو
درگزر کرنا

اخلاق کی سب سے بڑی جاری اور دشوار تعلیم جو اکثر گراں گذرتی ہے۔ قوتِ عفو و درگزر۔ ضبطِ نفس۔ تحمل اور برداشت کی تعلیم ہے۔ لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے۔ مثلاً شرک و بت پرستی سب سے سنگین جرم ہے۔ اس کا جو تصور قرآن مجید نے پیش کیا ہے۔ تو خالص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ ان مشرکوں کے معبودوں کو برا نہ کہو یہ چند میں تمہارے خدا کو برا بھلا کہہ بیٹھے گئے۔ (ب) یہ برداشت کی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب

Marfat.com

ہو اگر کفار و مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو۔ اور ان سے درگذر کرو۔
اور یہی حکم عام مسلمانوں کو صراحت ہو رہا ہے — معاف کرنے کی عادت بناؤ۔ ایمانی
کا حکم دو۔ جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ اور جب شیطان بڑھکائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔(۱)
عام حالات میں عفو و درگذر آسان ہے۔ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان غصہ
کی حالت میں بھی اپنے پر ضبط رکھے۔ قرآن کریم میں صحابہؓ کی تعریف یوں آئی ہے اور جب
غصہ میں آتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ نیکوکاروں کی تعریف یوں کی گئی۔
اور یوں غصہ پی کر جانے والے۔ اور لوگوں کو معاف کر دینے والے (یہ نیکوکار ہیں)
اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پہلوان کی تعریف یہ بیان فرمائی
کہ جو غصہ کی حالت میں اپنے اوپر ضبط رکھتا ہو۔ یعنی شیطان کی طرف ہوتا ہے۔ غصہ پر
قابو پا جانا گویا شیطان پر قابو پا جانا ہے۔ اور یہ بہت بڑا کمال ہے۔ لطف اس
بات کا نہیں کہ غصہ آئے ہی نہ۔ بلکہ کمال اس بات کا ہے کہ آئے اور ضبط کر جائے۔

حضرت حسنؓ کے بارے میں ایک مشہور روایت ہے کہ ایک دفعہ لونڈی کے
ہاتھوں سے سالن کا برتن آپ کے کپڑوں اور ہاتھ پر گر پڑا۔ جب آپ نے غصیلی نگاہ
سے اس کی طرف دیکھا تو فوراً بولی والکاظمین الغیظ — اور غصہ کو پی جانے والے۔
آپ نے غصہ تھوک دیا۔ پھر بولی والعافین عن النّاس (لوگوں سے
درگذر کرنے والے) آپ نے جواباً فرمایا میں نے تجھ سے درگذر کی۔ پھر اس لونڈی
نے آخری فقرہ پڑھا۔ واللہ یحب المحسنین۔ اور اللہ احسان کرنے والوں
کو دوست رکھتا ہے۔

تو آپ نے فرمایا جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔

ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے نصیحت چاہی
آپ نے فرمایا۔ لاتغضب۔ غصہ نہ کھاؤ۔ پھر اس کے دوبارہ، سہ بارہ پوچھنے پر
بھی آپ نے یہی جواب دہرایا۔ ایک اور حدیث میں کہ جب آدمی کو غصہ آئے تو جس
حالت میں بھی ہو وہ حالت تبدیل کرے۔ اور شیطان سے پناہ مانگے۔ اعوذ باللہ
یا لاحول ولاقوۃ پڑھے، مثلاً کھڑا ہے تو بیٹھ جائے یا چل پڑے چل رہا ہے
تو رک جائے۔ امام ابن حزمؒ نے لکھا ہے غصہ آئے وضو کرنا شروع کر دے غصہ رفع
ہو جائے گا۔

امام غزالی فرماتے ہیں۔ آدمی کی عظمت و مقام کا اندازہ لگانا ہو تو جب اسے
غصہ آئے اس وقت جانچو — سمجھداری کی علامت یہ بھی ہے کہ جب لڑائی ہو گی تو
وہ غضب میں آ کر گالی گلوچ پر اتر آئے گا۔

قرآن مجید میں صحابہؓ کی شان یہ بھی بیان ہوئی کہ وہ کفار کے لیے سخت اور آپس
میں رحیم ہیں۔ نیک بخت اس لیے کہ مومن کا غصہ اور ناراضگی بھی اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے
حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں اپنے دشمن پر قابو پا لیا۔ اور اسی کے سینے پر چڑھ
بیٹھے تو اس نے آپ پر تھوک دیا، آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ پوچھنے پر فرمایا کہ پہلے غصہ
اللہ کے لیے تھا۔ پھر ذاتی انتقام کا خدشہ لاحق ہو گیا تو میں نے چھوڑ دیا۔ بہرحال عفو
میں ہی عافیت ہے۔

عفو

دیکھئے اسماء الحسنیٰ

عُقبیٰ

دیکھئے آخرت

عقبہ ابن ابی معیط

بنو امیہ میں سے تھا حضور اکرم صلعم کے اعلان نبوت کے بعد سب سے زیادہ
اسلام دشمنی اسی نے کی یہی وہ شخص ہے جس نے نماز کی حالت میں حضورؐ کے کندھوں
پر اونٹ کی اوجھ لا کر ڈال دی تھی۔ ایک بار جب حضورؐ حرم میں نماز ادا کر رہے
تھے آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر اس زور سے کھینچا کہ حضورؐ گھٹنوں کے بل گر پڑے
جنگ بدر میں کفار کی جانب سے اسلام کے خلاف جنگ آزما تھا۔ مسلمانوں نے
اسے گرفتار کر لیا۔ حضور اکرمؐ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ بہ اختلاف روایت
حضرت علیؓ یا حضرت عاصم بن ثابتؓ نے اسے تہ تیغ کیا۔

عقبہ بن عامر جہنیؓ

نام عقبہ، کنیت ابوعمرو۔ ایام جاہلیت میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔ مدینہ
میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اور یہیں مقیم ہو گئے۔
جنگ صفین میں امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت علیؓ کے خلاف لڑے۔

چنانچہ مصر پر تسلط قائم ہو جانے کے بعد یہ وہاں کے امیر الخراج مقرر
ہوئے۔ اور نماز کی امامت بھی انہیں کے سپرد ہوئی ۴۷ھ میں حضرت امیر معاویہ
کے حکم سے روڈس پر حملہ کیا۔ لیکن دوران جنگ عہدہ سے معزول ہو گئے۔ ۵۸ھ
میں وفات پائی۔

آپ کو قرآن حدیث، فقہ پر عبور حاصل تھا۔ شاعری میں بھی بڑی شہرت رکھتے
تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ جو نویں صدی ہجری
تک مصر میں موجود تھا۔ اسی نسخہ کے آخر میں ان کی خود نوشتگی کی سند بھی تھی۔ آپ
بڑے مشہور تیرانداز اور ماہر فنون جنگ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی مجلس میں بڑے شوق سے حاضر ہوتے تھے۔ اسی باعث قرآن و حدیث میں بڑی
دل چسپی لی۔ اور کافی مہارت حاصل کی۔ کتب احادیث میں آپ کی ۵۵ روایات موجود ہیں

عقبہ ثانیہ — دیکھئے بیعت عقبیٰ ثانیہ

عقل

کلام پاک میں یہ لفظ "فقہ" یعنی "سمجھ" کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا
ہے اور یہ عربی زبان کے محاورے کے مطابق ہے۔ لیکن علمی لحاظ سے "عقل"
کے مختلف نظریوں کو فلسفیانہ، متکلمانہ اور متصوفانہ استعمال کے تحت استعمال کیا
جا سکتا ہے۔ پھر فلسفیانہ لحاظ سے بھی عقل کے دو الگ الگ نظریے ہیں۔ ایک نفسیاتی
دوسرا مابعد الطبیعاتی۔ نفسیاتی لحاظ سے ارسطو کے زیر اثر مسلم فلاسفہ نے عقل کو
دو بنیادی اجزاء میں تقسیم کیا ہے۔ عقل نظری، جس کا کام غیر متبدل معقولات
کا علم ہے۔ اور عقل عملی۔ جس کا کام کون و فساد کو جاننا اور اس میں عمل کر کے
تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ انسانی ذہن میں ان دونوں عقلوں کے ارتقاء کے عموماً چار مدارج
شمار کیے گئے ہیں۔

۱۔ عقل ہیولانی یا عقل بالقوت یا عقل منفعل۔ ۲۔ عقل بالملکہ۔ ۳۔ عقل

Marfat.com

کا حصول ہوتا ہے۔ ان کے نظریۂ اشراق اور فلسطینیوں کے نظریۂ اشراق میں فرق یہ ہے کہ جہاں فلسفیوں نے احساس کے موضوعات کے علم کو اشراق قول کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن مابعد الطبیعاتی درجے پر صوفی اور اسمٰعیلی مفکرین نے عقول کے نظریے کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ایسے طویل بحثوں کا موضوع بھی بنایا ہے۔

متکلمین کے نزدیک عقل (اکثر "عقل صریح") ایک فطری قوت ہے جس سے انسان غلط اور صحیح کے درمیان قدرتی طور پر تمیز کرتا ہے۔ یہ عقل فطری طور پر تمام انسانوں کو بخشی گئی ہے۔ اسی لیے اسے "عقلِ مشترک" یا "عقل عام" کہتے ہیں۔ اس عقل کا اولین وظیفہ علمی نہیں بلکہ اخلاقی ہے اور اس کے ذریعے انسان اچھے اور بُرے میں تمیز کرتا ہے۔

عام انسانی فکر میں "عقل" زندگی کی استواری میں ایک بنیادی عنصر کی حامل صفت ہے۔ عام زندگی میں بقا کے لیے عقل انسان کے لیے ایک راہنما کی مثال ہے۔

عقیدہ

(پختگی۔ گرہ لگانا) یہ لفظ انسان کے ذہنی طور پر ایک بات پر مطمئن ہو جانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً فلاں شخص کا یہ عقیدہ ہے۔ یعنی اسے اس بات کا یقین ہے۔ کسی بات پر عقیدہ (یا یقین) رکھنے والے کو معتقد کہا جاتا ہے۔

تمام اُمتوں کے اپنے اپنے مذہبی عقائد ہوتے ہیں۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ حضرت عزیرؑ اللہ تعالےٰ کے بیٹے ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسےٰ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور ان دونوں کا عقیدہ ہے کہ جنت صرف ہمارے ہی لیے ہے۔ اگر ہم جہنم میں چلے بھی گئے تو صرف چند روز رہیں گے۔ کمیونسٹ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ جہان اپنے ہی آپ بن گیا اور توڑ پھوڑ بھی خود بخود ہوتی ہے۔ اچھے بُرے کا پیدا کرنے والا انسان ہے۔ ہندو لوگوں کا عقیدہ ہے کہ "ماتا" ہی ہر چیز کا وارث ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان عقائد میں بنیادی غلطی خالقِ کائنات کے بارے میں ہے جبکہ اہلِ اسلام کا عقیدہ یہ ہے:

(۱) کہ اللہ تعالےٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا ہے۔ ساری مخلوق اسی کے حکم کے تابع ہے۔ کسی بھی انسان کو اس پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ زمین و آسمان کا غیب صرف اسی کو ہے۔

(۲) انسان کو اشرف و اکرم بنایا۔ اس کی ہدایت کے لیے اس نے انسانوں سے کئی بہترین انسان پیدا کیے۔ انہیں (جن پر کتاب یا شریعت اتری انہیں) رسولؑ اور (جن پر شریعت نہیں اتری بلکہ وہ پہلے کی شریعت کے پیروکار اور مبلغ ہیں) نبی کہا جاتا ہے۔ ان کی صحیح تعداد صرف اللہ کو معلوم ہے۔ وہ سب برحق تھے۔

(۳) سب سے آخر میں حضرت محمد صلعم کو بھیجا۔ جن پر اپنا دین پورا کر دیا۔ ان پر قرآن مجید نازل کیا۔ وہ بھی دیگر انبیاء کی طرح صرف اللہ کے رسولؐ اور پیامبر ہی تھے۔ اور وہ اسی کے بندے تھے۔

(۴) قرآن و دیگر آسمانی کتابیں و صحائف اس (اللہ) نے اپنے ایک فرشتے کے ذریعے نازل کیے۔

(۵) ہر انسان پر ایک دن ایسا آئے گا۔ جب اس کی رُوح اس کے بدن سے علیحدہ ہو گی اور وہ مر جائے گا۔ پھر ایک روز جی اٹھے گا اور میدان محشر میں جمع ہو گا۔ اپنے کیے کا حساب دے گا۔ اگر کوئی اچھے کام کرنے والا ہو گا تو اسے جنت میں بھیجا جائے گا اور جو بُرے عملوں والا ہو گا اسے جہنم میں بھیجا جائے گا۔

(۶) ہر چیز کا خالق بھی اللہ تعالےٰ ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی تکلیف یا خوشی نہیں پہنچ سکتی۔ اس عقیدے میں سارا دارومدار عمل و کردار پر ہے۔ خدا کی توحید انبیاء کی رسالت۔ موت کے بعد زندگی۔ اور جنت و دوزخ میں داخلے کا صحیح ترین تصور صرف اسی عقیدہ میں ہے جس شخص کو ان میں سے کسی ایک شق سے اختلاف ہو گا وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

مزید دیکھیے "ایمان"

عقیقہ

لغوی معنی کسی چیز کا پھاڑنا۔ علیحدہ کرنا، اصطلاحی معنی بچے کی پیدائش پر جانور کی قربانی کرنا۔ اس سے پہلے بچے کا نام رکھنا اور اس کے بال منڈوانا سنت ہے۔ لڑکے کے واسطے دو اور لڑکی کے لیے ایک دنبہ یا ایک ایک بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ سنت یا مستحب ہے۔ عقیقہ پیدائش کے ساتویں روز ہوتا ہے۔ وگرنہ پھر چودھویں یا اکیسویں دن۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر سال کے اندر کسی دن کرنا چاہیے۔ اگر تب بھی توفیق نہ ہو تو بچے کی بالغ ہونے سے پہلے کیا جائے۔ اگر والدین نہ دے سکیں تو بچہ جوان ہو کر خود کرے بعض روایات میں ہے کہ جب تک عقیقہ نہ کیا جائے، برکت و سعادت سے اُسے بہت کم حصّہ ملتا ہے۔

عقیقہ کے گوشت کا زیادہ حصّہ فقیروں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور بچے کے بالوں کے برابر چاندی خیرات کر دیتے ہیں۔

اسلام سے قبل بچے کا نام رکھتے وقت قربانی کرتے تھے اور اس کا خون بچے کے سر پر ملتے تھے۔ عیسائیوں میں اس کی جگہ بپتسمہ ہے۔ جس میں بچے پر مقدس پانی چھڑکا جاتا ہے۔

عقیل بن ابی طالبؓ

ہاشمی قریشی۔ کنیت ابو یزید۔ حضرت علیؓ اور حضرت جعفر طیار کے بڑے بھائی تھے، غزوہ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی، گرفتار ہوئے اور حضرت عباسؓ نے فدیہ دے کر رہائی دلائی۔

صلح حدیبیہ کے بعد انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ۸ھ میں مدینہ کو ہجرت کی۔ ایک مدت تک صاحبِ فراش رہے۔ اسی باعث جنگِ موتہ کے بعد کسی غزوے میں ان کا ذکر نہیں۔

خوشحال آدمی تھے اور کافی خدم و حشم رکھتے تھے۔ غالباً ۵۰ھ، ۶۰ھ میں وفات پائی، مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔ اپنے پیچھے کئی بیٹے چھوڑے جو حضرت امام حسینؓ کے (یزید کے خلاف) جہاد میں ان کے ساتھ ہو گئے تھے ان میں سے ایک یعنی مسلم کو ابن زیاد نے قتل کیا اور باقی جو تعداد میں چھ یا نو تھے، میدان کربلا میں شہید ہوئے۔

عقیل علم الانساب اور تاریخ قریش پر مسلّم سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں قریش کے چار حکموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں فہرست وظائف کی تدوین میں مدد دینے کے لیے بلایا تھا۔

Marfat.com

بہت خوش بیان، خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی تھے۔

عکاشہ بن محصن

کنیت ابو محصن، والد کا نام محصن بن حرثان۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا خاندان بنو عبدالشمس کا حلیف تھا۔ ہجرت سے پہلے مسلمان ہوئے اور آنحضرتؐ کے ہمراہ مکّے سے مدینہ ہجرت کی۔ جنگ بدر اور بعد کی ساری جنگوں میں بڑی شجاعت سے لڑے۔ سنہ ۶ھ میں چالیس ہزار افراد کی جمعیت کے ساتھ بنو اسد کی سرکوبی کرنے گئے۔ اور کامیاب لوٹے۔ سنہ ۱۲ھ میں خلیفہ اوّل کے زمانے میں حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں طلیحہ کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا گیا۔ جس میں ان کے علاوہ حضرت ثابت بن اقرم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار فوج کے آگے آگے جا رہے تھے۔ کہ راستہ میں غنیم کے چند سوار مل گئے۔ جن میں خود طلیحہ بھی شامل تھا۔ جس نے رسول اللہ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ طلیحہ نے دونوں کو نرغہ میں لے کر شہید کر دیا۔ آپ کا شمار آنحضرت کے ممتاز صحابہؓ میں ہے۔

عکاظ

زمانہ جاہلیت میں منعقد ہونے والا عربوں کا ایک مشہور قومی، ملّی اور علمی میلہ جس میں شرکت کے لیے دور دور سے عرب قبائل آتے تھے۔ اس میں زیادہ تر توجہ اپنے اپنے قبائل کی بہادری اور شاندار کارنامے پیش کرنے کی طرف منعطف ہوتی۔ شعرا اپنا اپنا کلام پیش کرنے اور فیصلے کے لیے بیت اللہ میں لٹکا دیا کرتے۔ ایک روایت کے مطابق سبعہ معلّقہ (سات مشہور عربی قصائد) کی ترتیب عکاظ کے علمی مقابلوں کا نتیجہ ہے۔

عکرمہ بن ابی جہل

مشہور دشمن اسلام ابوجہل کے بیٹے۔ ابوجہل جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔ عکرمہ بھی اسلام لانے سے پہلے اسلام کے سخت مخالف تھے معاذ اور معوذ پر جنہوں نے ابوجہل کو قتل کیا تھا۔ تلوار کا وار کیا۔ جس سے معاذ کا ایک بازو کٹ گیا۔ باپ کے مارے جانے کے بعد جنگ احد میں اس کا بدلہ لینے کی غرض سے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کی بیوی مسلمان ہو گئی تھیں لیکن عکرمہ اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ اور مکہ چھوڑ کر یمن چلے گئے۔ عام معافی کا سن کر واپس آئے اور آنحضرت کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپؐ نے اتنے بڑے دشمن کی سب خطائیں معاف کر دیں لیکن دوسرے مسلمانوں کو عکرمہ سے پھر بھی پرخاش رہی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جب فتنہ ارتداد اٹھا۔ اس فتنہ کو روکا۔ یمن کے مرتدین کی سرکوبی کی اور بہت سے مرتدین کو تہ تیغ کیا۔ معرکہ شام میں نہایت جانبازی سے لڑے جنگ یرموک میں ایک دستہ کے افسر تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے آپ نے بیت المال سے عمر بھر ایک پائی تک نہ لی۔ جنگ اور زندگی کے تمام مصارف اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔

علاؤالدین، علاءالحق شیخ

بنگال کے مشہور صوفی۔ آپ نے شیخ اخی سراج کے بعد سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو سب سے زیادہ فروغ بخشا۔ سلسلہ نسب حضرت خالد بن ولید سے جا ملتا ہے۔ تاریخ پیدائش کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔ ایک متمول اور مالدار خاندان میں پیدا ہوئے۔

شیخ علاؤالدینؒ نے حضرت اخی سراجؒ کے ہاتھ پر بیعت کی جو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدینؒ محبوب الٰہی کے خلیفہ مجاز تھے۔ متمول ہونے کے باعث بہت زیادہ فیاض تھے۔ ان کی فیاضی کی وجہ سے بادشاہ کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ملک کے خزانے کو لٹا رہے ہوں کیونکہ ان کے والد شاہی خزانہ کے مہتمم تھے۔ حاکم وقت نے آپ کو دارالخلافہ چھوڑ کر سنار نامی ایک گاؤں جو ڈھاکہ سے ۱۸ میل کے فاصلے پر تھا چلے جانے کا حکم دیا۔ وہاں آپ نے پہلے سے بڑھ کر سخاوت و فیاضی کی۔ دو سال تک اس گاؤں میں مقیم رہے، مشہور ہے کہ ان کے دو باغ تھے۔ جن کی آمدنی آٹھ ہزار تنکہ تھی۔ کسی نے ان کے دونوں باغوں پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ لیکن انھوں نے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا کثرتِ فیاضی کے باعث آپ نے اپنا لقب گنج نبات رکھ لیا۔ جب اس کی اطلاع ان کے شیخ خواجہ نظام الدینؒ کو پہنچی تو بہت ناراض ہوئے کہ یہ تو ہمارے شیخ خواجہ فریدالدین شکر گنج سے بھی آگے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اس ناراضگی کی وجہ سے آپ کی زبان بند رہی جو حضرت اخی سراج سے بیعت تک رہی۔

شیخ علاؤالدین اپنے استاد کے بہت زیادہ خادم تھے۔ اس کثرت خدمت کو آپ کے اعزہ و اقربا جو اراکین سلطنت تھے۔ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حضرت اخی سراج نے انہیں خرقہ خلافت عطا کیے۔ آپ کی وفات سنہ ۸۰۰ھ ۱۳۹۸ء میں ہوئی جب کہ ایک روایت کے مطابق آپ ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار چھوٹی درس گاہ پنڈوہ میں مرجع خلائق ہے۔

علاؤالدین خلجی

دیکھیے خلجی دہلوی۔

علاؤالدین محمد شاہ سلطان

(خاندان تغلق کا ایک ناکارہ بادشاہ)

۱۴۴۳ء میں اپنے باپ سلطان محمد شاہ کی وفات پر مبارک آباد کے تخت پر بیٹھا۔ اس کا والد باغیوں کو کچلنے میں ناکام ہو چکا تھا اس کے باوجود اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کے ہاتھ پر ملک بہلول خان خاناں اور دیگر ارکان سلطنت نے خدمت کی بیعت کر لی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اپنے باپ سے بھی ناکارہ ثابت ہوا۔ جس پر ملک بھر میں بغاوت عام ہو گئی۔ اور علاؤالدین اس پر قابو نہ پا سکا۔ یہ حال دیکھ کر مالوہ، بنگالہ، دکن، گجرات، اور جونپور کے سلاطین نے دہلی کی فتح کے منصوبے باندھے۔ لاہور، دیپال پور سرہند بلکہ پانی پت تک ملک بہلول کی عملداری تھی۔ خاص دہلی کے نواح میں سرائے لاڈو تک احمد خان میواتی کا قبضہ تھا۔ اس طرح تمام علاقوں کے امراء خود مختار بن گئے۔ اور سلطان کا تصرف صرف دہلی اور بدایوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ پورے بیس سال تک برائے نام بادشاہ رہا۔ آخرکار چند وزیروں کی ملی بھگت سے ملک بہلول نے

Marfat.com

اقتدار سنبھال لیا۔ اور سلطان علاؤالدین کو بدایوں کی عملداری سونپ دی۔ ۸ سال تک بدایوں ہی رہا۔

علاؤالدین مسعود شاہ سلطان

خاندان غلاماں کا ایک بادشاہ ۶۳۹ھ اس کے باپ معزالدین بہرام شاہ کو اس کے نظام الملک وزیر نے دھوکہ دے کر اقتدار سے محروم کرکے قتل کر دیا تھا۔ اور خود تختِ خلافت سنبھال لیا۔ لیکن امیر الامراء ملک معزالدین اسمٰعیل نے اسے سنبھلنے نہ دیا۔ دولت وشوکت کے باعث تخت چھین لیا۔ اور مقتول خلیفہ بہرام کے بیٹے علاؤالدین مسعود شاہ کو قید سے نکال کر تخت خلافت سپرد کر دیا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی نظام الملک کو قتل کروا دیا۔ اور اپنے باپ کی دنا داری کے باعث محبوس کیے گئے افراد کو قید سے نکال کر عہدے دیئے کچھ عرصے بعد سلطان علاؤالدین نے ظلم وستم کا طریقہ اپنا لیا۔ اس وسیع پیمانے پر قتل وغارت نے امراء کو بغاوت پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے اسے متفقہ طور پر معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔ جہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی مدت خلافت چار سال ایک اور ایک دن بنتی ہے۔

علاء حضرمی

نام علاء :۔ باپ کا نام عبداللہ۔ اصل وطن یمن۔ لیکن حضرت بن امیہ کے حلیف بن کر مکہ میں مقیم ہو گئے۔ دعوت اسلام کے شروع میں مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ نے انھیں منذر بن ساوی حاکم بحرین کے پاس خط دے کر بھیجا جس پر وہ اور اس کی کل رعایا مسلمان ہو گئی۔ رسول اللہ نے علاء کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ معزول ہو گئے۔ اور ان کی جگہ ابان بن سعید بن العاص کو عامل مقرر کیا گیا حضرت ابوبکرؓ نے انھیں اپنے دورِ حکومت میں دوبارہ بحرین کا حاکم بنا دیا۔ اسی زمانہ میں منذر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے لڑکے نے خود سرغنہ بن کر بغاوت کر دی اور مرتدین کی کافی تعداد اس کے ساتھ شامل ہو گئی لیکن علاء نے ان کا اچھی طرح قلع قمع کیا۔ اور حضرت عمرؓ کے خلیفہ بنتے تک سارا علاقہ مطیع کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے بصرہ کا حاکم بنا دیا۔ علاء بحرین سے بصرہ جا رہے تھے۔ تو راستہ میں ہی انتقال کیا اور ایک بے آب وگیاہ جنگل میں دفن ہوئے۔

آپ کی تیس کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے تین خاص طور پر مشہور ہیں۔ اول قصائد اور غزلیات کا دیوان جس میں دس ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ قصائد نعت اور پند ومعرفت پر مشتمل ہیں۔ دوم تذکرۃ الاولیاء۔ سوم مثنوی منطق الطیر ایک پندنامہ عام عربی مدرسں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ آپ کا سن وفات ۱۲۲۶ھ ہے۔

بالملکت۔ ۴۔ عقل متفاد۔

انسانی ذہن میں علم کے وجود اور عقل کی ترقی کی توجیہ اس طرح کی گئی ہے کہ عقل فعال کو تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کے عمل سے انسانی عقل منفعل قوت سے فعل میں آجاتی ہے۔ یہ عقل فعال اسلامی فلاسفہ کے نزدیک ایک خارجی عقل ہے جو نہ صرف ہمارے ذہنوں کو صورِ عقلیہ بخشتی ہے۔ بلکہ تحت القمر کائنات کی تمام خارجی اشیاء کو بھی صورت دیتی ہے۔

مابعد الطبیعاتی نظریئے کے مطابق خارجی عقول نو پارس ہیں۔ جو درجہ بدرجہ ذات الاقصیٰ سے صدور یا فیضان کے طریقے پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ ظہور مابعد الطبیعاتی اعتبار سے ہے۔۔ زمانی اعتبار سے نہیں۔ زمانی اعتبار سے تمام عقول ازلی ہیں۔

متصوفہ نے نفسیاتی لحاظ سے عقل کی متفقہ مخالفت کی ہے، لیکن جس عقل کی یوں مخالفت کی گئی ہے۔ وہ استدلالی عقل ہے۔ جس کا طریقہ منطقی برہان ہے۔ اس کی جگہ انھوں نے ذکر پر زور دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں کشف اور معرفت

علاج

رفعِ مرض کے لیے کی جانے والی تدبیر علاج کہلاتی ہے حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج فطرت کے پاس موجود نہ ہو۔ ہر مرض کا کوئی نہ کوئی علاج کسی نہ کسی تدبیر میں مضمر ہے۔ چنانچہ آپؐ کا فرمان ہے کہ مریض کو چاہیئے کہ وہ اپنے مرض کے خاتمے کے لیے ہر طریقہ بروئے کار لائے۔ البتہ ان طریقوں سے گریز کرنے کے لیے کہا گیا ہے جن سے توحید وایقان کو زد پہنچتی ہو ورنہ باقی ان تمام تدابیر علاج کے لیے اصرار کی حد تک کہا گیا کہ ان پر عمل کیا جانا چاہیئے تاکہ مرض کو ختم کیا جا سکے۔ اسی لیے بہت سی مرضوں اور بیماریوں کا علاج خود حضورِ اکرم صلعم نے بتایا جن پر عمل کرکے بیماری سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اچھے معاشرے کے قیام کے لیے اچھی صحت کے لوگوں کا ہونا ضروری عوامل میں سے ہے اور اچھے افکار صحت مند ذہانت اور پرجوش عملی جدوجہد ظاہر ہے کہ صحت مند لوگوں پر منحصر ہے۔ لہذا اسلام نے علاج مرض پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ آج کی جدید دنیا کی زیادہ تر توجہ بھی انسانی صحت کو مستحکم کرنے اور بیماریوں کے علاج دریافت کرنے پر ہی ہے۔

علق "سورہ"

اس سورہ کا عدد تلاوت ۹۶ ہے۔ تیسویں پارے کی انیسویں سورت ہے۔ اس میں آیات بھی انیس ہیں۔ اس کے مضامین دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی پانچ آیات پہلی وحی کے طور پر نازل ہوئیں۔ باقی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب آپ نے حرم میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل آپ کو دھمکیاں دے کر عبادت سے باز رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں عبادت میں مصروف تھے کہ اچانک ایک فرشتہ آیا اور آپؐ کو بھینچ کر کہنے لگا۔ پڑھیئے۔ آپؐ نے جواب دیا، میں نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اس نے دو تین بار بھینچا اور کہا۔ اقرا باسم ربک الذی خلق۔۔ اپنے خالق کے نام سے پڑھیئے۔ جب آپؐ گھر آئے تو علیل ہو گئے۔ اور اپنی جان کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ تب حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور اپنے ایک خاندانی بزرگ ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ اس لحاظ سے یہ سورہ آنحضرتؐ کی نبوت کی دلیل تھی۔ چونکہ آپؐ نے اپنی تبلیغ کا آغاز نماز سے ہی کیا تھا اس لیے یہ حصہ پہلے بھیجا تھا۔

علماء

دیکھیے: "عالم"

Marfat.com

عَلَم

دیکھیے : "جھنڈا"

علم

عربی زبان کا لفظ۔ اس کا مادہ ع ل م ہے۔ جہل کی ضد میں استعمال ہوتا ہے۔ مفردات میں ہے۔

اسلامی ادبیات میں علم کے مختلف معنی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں علم کے ساتھ "حکمت" کی اصطلاح بھی آئی ہے یعنی اس طرح حکمت میں علم سے زائد معانی کی نشاندہی ہے۔ امام غزالی نے علم کے ساتھ "فضل" کی اصطلاح کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ یہ علم سے بڑھ کر، یعنی زائد و برتر حقیقت ہے۔ علم کے مترادفات ہیں ادراک، شعور اور معرفت جیسے الفاظ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن کبھی محدود مفہوم میں فن اور صناعت کو بھی علم کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔

سرسری طور پر ہر ادراک (چاہے وہ حسی سطح پر ہو) ادراک کہلا سکتا ہے لیکن لفظ عالم کا اطلاق ان انسانوں پر ہوتا ہے جو ادراکات کے کسی منظم سلسلے میں مزاولت اور ممارست کے بعد درجۂ خاص یا امتیاز خاص حاصل کر لیتے ہیں۔ امام غزالی نے اس تخاطب پر اس بنا پر اعتراض کیا ہے کہ جو الفاظ خدائے تعالیٰ کے لیے استعمال ہوئے ہیں (مثلاً عالم الغیب) ان کا اطلاق انسانوں پر درست نہیں شعور اور ادراک اگرچہ ایک سطح پر علم کہلا سکتے ہیں لیکن ایک خاص دائرہ استعمال کی وجہ سے عالم اور عارف و فقیہہ میں فرق ہے۔

شعور کے معنی ہیں ادراکِ جزئیات کرنے والا جو ضروری نہیں کہ کلیات کا بھی مدرک ہو۔ فقیہہ کا مطلب ہے معلومات و مدرکات کا عقلی تجزیہ کرنے والا۔ اسی لیے فقیہہ عاقل و دانا شخص، یا کسی علم کی اصول بندی کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ بمرورِ زمانہ سے فقیہہ صرف قانونِ شریعت کے عالم کو کہا جانے لگا۔ اور عالم و فقیہہ کچھ ہم معنی سے الفاظ بن گئے۔

علم کے اس مفہوم میں جب وسعت ہوئی اور حکمت اس کے دائرے میں آگئی تو ایسے علم کا عالم حکیم اور بعض اوقات محقق کہلایا۔ عمومی طور پر علم میں وسعت اور فوقیت زائد رکھنے والوں کو فاضل کہنے لگے۔ تاہم قانونِ شریعت کے جاننے والوں اور علومِ دینیہ میں دسترس رکھنے والوں کو عالم کہنے کا رواج ہر دور میں غالب نظر آتا ہے۔

معرفت اور علم میں جزوی ترادف پایا جاتا ہے۔ قشیری نے اپنے رسالے میں لکھا ہے۔ "المعرفت ...... ہو العلم"۔ اس کے باوجود اس نے ان دونوں لفظوں کے امتیاز پر خاصا لکھا ہے۔ موصوف کے یہ فقرے قابلِ ذکر ہیں کہ در اصل عارف وہ شخص ہے جو براہِ راست، یعنی حواس و عقل کے واسطے کے بغیر روحانی واردات کے طور پر علم حاصل کرتا ہے اور عالم وہ شخص ہے جو حواس و عقل کے ذریعے بعض حقائق کا ادراک کرتا ہے۔

متکلمین میں سے جن بزرگوں نے علم و معرفت میں امتیاز کیا ہے وہ علم کو مرکبات اور معرفت کو بسائط کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

علم کی اقسام اور مختلف صورتوں کی بحث آگے آتی ہے۔ اس کے بنیادی طور پر دو بڑے عنوانات ہیں: (۱) ذات باری کا علم۔ (۲) [illegible] کے لیے میسر کیا گیا ہے۔ عقائدِ نسفی اور مواقف میں علم کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں: علم قدیم اور علم حادث۔

ان تمام علوم کو جو کسی اصولی نظام کے تحت ضبط تحریر میں آ گئے، علوم مدونہ کہا جاتا ہے۔

علما نے علم کی کسی قطعی اور جامع و مانع تعریف سے بالعموم احتراز کیا ہے لیکن ان کی پیش کردہ سینکڑوں تعریفوں کو اگر مجمل صورت دے دی جائے تو بھی ان کی تعداد خاصی ہو جاتی ہے۔ یہاں ان میں سے چند نمایاں تعریفات دی جاتی ہیں۔ علم ایک صفت ہے جس کے ذریعے کسی شے کا ادراک حاصل ہوتا ہے اس لحاظ سے یہ ایک ذہنی عمل ہے یا صفتِ اضافیہ ہے۔

علم ادراک یا تخیل یا وجدانِ حقیقت ہے۔ علم ثبوت ہے۔ علم احاطہ ہے۔ علم معنی النفس ہے، علم اذعان النفس ہے۔ علم نام ہے بیان و اثبات یا تمیز اور قطع کا یا تبیین کا اور یہ صفت النفس ہے۔ علم تشکلِ ذہنی ہے۔ علم ذہن میں اسم و نقشِ معنی ہے۔ یا معنی کی علامت ہے۔ علم ہیئت برہانیہ ہے۔ علم ذہن میں کسی شے کی صورت و شکل ہے۔ علم شے کی شکل و صورت ہے۔ علم تحقیق ہے۔ علم افادہ ہے۔ عقل معانی فطرت کا نزول ہے اور علم ان معانی کا اکتساب ہے۔ علم تخیل اور خیال کی ذہنی تحقیق ہے۔ علم ایمان ہے۔ علم اعتقاد ہے۔ علم معلوم کا خیال ہے۔ علم رائے ہے۔ علم حرکتِ نفس کا نام ہے۔ علم ضد جہل ہے۔ علم وجدان ہے اور صوفیا اسے تجلی کہتے ہیں۔ علم کلیات کی بصیرت کا نام ہے۔ علم نور ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے دل میں ڈالا جاتا ہے۔ علم شہادت ہے خدا کے وجود کی اور اس کی حقیقت کی۔ علم بدیہی بھی ہے اور اکتسابی بھی۔ علم کشف سر ہے جو نفس کی گہرائیوں میں موجود ہے۔

لیکن ان تمام کثیر التعداد تعریفوں کے باوجود علم کی قطعی تفسیر نہیں ہو سکتی چنانچہ امام غزالی نے اپنی کتب میں کوئی حتمی تعریف پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ البتہ انھوں نے فرمایا کہ تعریف کی بجائے مثال اور تجزیہ سے نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

امام فخر الدین رازی کا قول ہے کہ علم کی تعریف علم ہی سے کی جا سکتی ہے اور یہ دور ہے جو محال ہے لہذا علم کی تعریف کی کوشش لاحاصل ہے۔ اس کے معانی یہ ہوئے کہ علم ایقان و ایمان اور ذوق و کشف کا نام ہے جو ہوتا ضرور ہے مگر اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تعریفیں کی گئی ہیں اور اس کثرت سے علم کی تعریفوں کا سبب نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے، کہیں دینی کہیں منطقی کہیں تصوف کے مابین، کہیں حکمت کے مابین اور ظاہر ہے کہ زاویۂ نظر و فکر کسی بھی بارے میں کوئی تعریف معین کرتے وقت بنیادی اہمیت رکھتا ہے جس کے نتیجے میں ایک ہی شے کے بارے میں مختلف تعریفیں سامنے آتی ہیں۔ لیکن جب ایک شے، واقعے یا صفت کے بارے میں بے شمار رائیں اور تعریفیں متعین کی جائیں تو ایک طرف یہ اس بات کی دلیل ہے کہ "متعارف" نہایت اہم ہے: دوم یہ کہ جتنی زیادہ تعریفیں سامنے آتی ہیں اتنی ہی زیادہ "متعارف" کے بارے میں وسعتِ خیال اور ادراک و فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

آسان ماہوار قسطوں پر
گھریلو کتب خانے قائم کرنے کا اوّلین منظّم منصوبہ

شاہکار ہوم لائبریری

جوں جوں مکتبہ شاہکار کی مطبوعات کی تعداد اور کُل مالیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، نئے قارئین کے لیے اِن سب مطبوعات کو یکمشت حاصل کرنا دُشوار ہو رہا ہے۔ ایسے شائقین کتب کے لیے "شاہکار ہوم لائبریری" قائم کی جا رہی ہے، جس کے تحت وہ آسان ماہوار قسطوں پر شاہکار کی تمام کتابیں اور ہر انسائیکلوپیڈیا کی تمام قسطیں یکمشت حاصل کر سکتے ہیں۔ قواعد و ضوابط حسبِ ذیل ہیں:۔

۱ — کُل آرڈر کا پانچواں حصّہ بذریعہ بنک ڈرافٹ / منی آرڈر / نقد جمع کرانے پر تمام مطلوبہ مطبوعات، مطبوعہ قیمت پر فوراً مہیا کی جائیں گی۔

۲ — بِل کا بقیہ حصّہ بارہ ماہوار مساوی قسطوں میں ادا کیا جائے گا۔

۳ — صِرف حاضر سٹاک کی مطبوعات مہیا کی جائیں گی۔ ختم شدہ مطبوعات نیا ایڈیشن چھپنے پر دی جائیں گی

۴ — لاہور میں کتابیں دستی دی جائینگی اور لاہور سے باہر بذریعہ رجسٹری ارسال کی جائینگی۔ اخراجات ترسیل بذمّہ شاہکار ہوں گے۔

۵ — کتابیں حاصل کرنے سے پہلے ہوم لائبریری کے ہر رُکن کو شاہکار کے ایک مطبوعہ فارم پر تحریری معاہدہ کرنا ہو گا جو دفتر سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی سب سے بڑی بُک کلب

شاہکار بُک کلب

تازہ بتازہ شاہکار کتابیں اور مختلف انسائیکلوپیڈیا گھر بیٹھے منگوانے کیلئے کم از کم پچیس روپے (زیادہ پر قید نہیں) بذریعہ بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر پیشگی جمع کرا کر شاہکار بک کلب کی مستقل رکنیت حاصل کیجئے۔ جمع شدہ پیشگی کے حساب میں سے ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو مطلوبہ مطبوعات بذریعہ ڈاک ارسال کی جاتی ہیں۔ انتخاب کا حق کلب کے ارکان کو حاصل ہے جن کو دس فیصد رعایت دی جاتی ہے اور اخراجات ترسیل بذمّہ کلب ہوتے ہیں —— شاہکار ہوم لائبریری یا شاہکار بک کلب کا رُکن بننے کے لیے فہرست کتب اور قواعد و ضوابط دفتر سے طلب کیجئے۔

مکتبہ شاہکار۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

آئندہ آنے والی کتب کا اعلان دُوسری طرف ملاحظہ کیجئے

Marfat.com

عیسائیت، یہودیت اور

ارباب، مبلغین

ان کو اپنے آبائی مذہب

تاریخ اشاعت یکم جنوری ۱۹۷۸ء

چادر اور چار دیواری

مسلمان عورت

۵۰۰
روپے انعام

Marfat.com

سلامی

سائیکلوپیڈیا

قسط وار ۲۷

ہر مہینے آخری جمعے کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

شاہکاریہ

توجّہ کی آنکھ

جس طرح توبہ کے دروازے کھلے رہتے ہیں، اسی طرح رحمت کے دروازے بھی ہمہ وقت کھلے رہتے ہیں۔ حدیث شریف ہے۔ "گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ شخص کی مانند ہے" اپنی غلطیوں کی طرف توجہ کی آنکھ کھل جائے تو دوگونہ نعمتیں حاصل ہوجاتی ہیں۔ ایک طرف سے توبہ کے، اور دوسری طرف سے رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ بند ذہن کی گھٹی ہوئی مسموم ہوا تحلیل ہوجاتی ہے، اور تخلیق کی تازہ اور شفاف ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔

دو سالہ بیماری سے صحت یاب ہونے پر ایک روز میں "اسلامی" کی تمام قسطیں لے کر بیٹھ گیا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ یہ منصوبہ جگہ جگہ سے اپنی اصل منزل سے ہٹا ہوا ہے۔ غلطیاں ایسی ہیں کہ نہیں ہونی چاہئیں تھیں اور جن کو معمولی توجّہ سے دُور کیا جاسکتا تھا۔ توجّہ کی آنکھ کھل گئی اور "معلومات" کی طرح "اسلامی انسائیکلوپیڈیا" کی عنانِ ادارت بھی (دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ) مجھے ہی سنبھالنی پڑی۔ بے شک تنہا ہوں لیکن خدا نے اتنی اہم ذمّہ داری میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی ہے تو وہی اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق بھی دے گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔

اس سے بڑی رحمت ایک ناشر کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے کہ اپنے عہد کے بڑے بڑے مصنفین اپنی گرانقدر تصانیف اُس پر بارانِ رحمت کی طرح نچھاور کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے پروفیسر محمد اقبال جاوید تشریف لائے اور ایک خوشنما مسوّدہ ہمارے سپرد کر گئے۔ عنوان ہے "مرقع چہل حدیث"۔ سرورِ کائنات ؐ نے فرمایا تھا کہ جو شخص چالیس حدیثیں یاد کرے گا، اُنھیں محفوظ کرے گا اور دوسروں تک پہنچائے گا، اسے قیامت کے دن علماء اور فقہاء کے ساتھ اٹھایا جائے گا"۔۔۔ اس فرمانِ اقدس کے تحت ابتدا ہی سے ایسی چالیس حدیثوں کا انتخاب ہوتا رہا جو مختصر ہوں اور آسانی سے یاد ہوجائیں۔ چنانچہ اربعین کا سلسلہ چل نکلا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے "مرقع" میں ایک جدّت پیدا کی ہے، وہ یہ کہ ہر حدیث کے ساتھ اُس کا فارسی، اُردو، پنجابی اور انگریزی میں ترجمہ بھی موجود ہے، اور ترجمانی کا حق عبدالرحمٰن جامی، مولانا ظفر علی خان، مولوی ہادی علی لکھنوی، روشن صدیقی، راسخ عرفانی، صدرالدین احمد، مولوی دلپذیر، پروفیسر غلام رسول عدیم اور اطہر حسین نے وفورِ محبّت اور جذبۂ عقیدت سے کیا ہے۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید نے مشہور مجموعہ ہائے اربعین سے اور بالخصوص شاہ ولی اللہ دہلوی اور خواجہ حسن نظامی کی تدوین سے مدد لے کر، انتہائی سلیقے سے اپنا "مرقع" مرتّب کیا ہے۔

میں نے اسے شائع کرنے کی ذمّہ داری قبول کرلی ہے۔ تا بحدِ استطاعت یہ عالیشان مجموعۂ احادیث خوبصورتی سے شائع کرکے "دوسروں تک پہنچانے" کی پوری پوری کوشش کروں گا، تاکہ علماء اور فقہاء کے قدموں کی خاک کے ذرّوں کے ساتھ اٹھائے جانے کی سعادت حاصل کرسکوں۔

آپ کا

سید قاسم محمود

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط (27) وار

تاریخ اشاعت: جمعہ ۳۱ مارچ ۷۸ء

قیمت فی قسط ۔/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری ۔/۳۰ روپے

مدیر اعلیٰ

سید قاسم محمود

اصلاح و ترمیم کا حق قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون: ۳۵۴۱۰۲

تار: "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

مکتبہ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴۔ لاہور

Marfat.com

سید عبداللہ غزنوی کچھ مدت بعد پھر حاضر ہوئے۔ شیخ کو بڑا تعجب ہوتا کہ معمولی مسائل کے لیے کتنا سفر طے کرنا پڑتا ہے تو شیخ نے مجمع عام میں فرمایا۔ دینی مسائل کو جس طرح آپ سمجھتے ہیں، ہم بھی سمجھ نہیں پاتا اگر آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اتنی دور آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کسی در و دیوار سے بھی جواب مل جایا کرے گا۔ مولانا فرماتے تھے میرے شیخ کے ارشاد کے مطابق خدا تعالیٰ نے میرے لیے در و دیوار کو گویا کر دیا۔

مولانا عبدالحئیؒ کے مطابق مولانا غزنوی کی روحانی تربیت خدا تعالیٰ نے خود کی تھی۔ بعض علماء ان کی عبادت و پرہیزگاری دیکھ کر حیران ہو جاتے یوں آپ گوشہ نشین ہونے کے باوجود مرجع خلائق بن گئے۔

دور دراز سے علماء و مشائخ آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ لا الٰہ کا جب آپ ورد کرتے تو نباتات بھی آپ کے ساتھ تسبیح و تہلیل کرتے۔

آپ باجمال تھے امراء اور دنیا دار قسم کے لوگ محض آپ کے چہرے کی زیارت کے لیے بہت کوشش کرتے، لیکن آپ انہیں اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب افغانستان میں عوام و خواص نے شرک و بدعات کو دین بنا رکھا تھا۔ توحید و سنت فراموش کر چکے تھے۔ آپ کو الہام کے ذریعے قوم کی اصلاح کی تلقین کی جاتی رہی۔ پہلے پہل آپ حیران ہوتے کہ توحید و سنت کو کہاں سے حاصل کروں اور کیسے پھیلاؤں۔ اللہ کی قدرت سے آپ کو حدیث و تفسیر کی کتابیں غزنی پہنچنے لگیں۔ اور آپ نے محدثین کا مسلک اختیار کر لیا۔ جب آپ مولانا حبیب اللہ کے پاس استفادہ کے لیے قندھار آئے تو علماء قندھار آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

جب آپ نے خالص توحید و سنت کی دعوت دینی شروع کی تو جہاں آپ کے کچھ حامی ہوئے وہاں مخالف بھی ہو گئے اور آپ کے عمل بالحدیث پر مباحثہ کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ دوسرے علاقوں کے علماء نے مل جل کر لشکر اکٹھا کیا اور والئ کابل امیر دوست محمد خان کے پاس گئے اور آپ کی شکایت کی امیر نے اس جم غفیر سے مرعوب ہوتے ہوئے آپ کو ترک وطن کا حکم دے دیا جس پر مولانا سوات وہاں سے کوٹھا ہزارہ سے ہوتے ہوئے شیخ الکل سید نذیر حسینؒ کے درس سے مستفید ہونے کے لیے دہلی پہنچے اور سند حدیث کی اجازت حاصل کی۔ برصغیر میں تحریک آزادی کا زمانہ تھا، چنانچہ دہلی سے مولانا غزنوی پنجاب آئے اور کچھ دیر قیام کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان کے راستہ سے وطن واپس اس خیال سے چلے گئے کہ شاید امیر دوست محمد کا خیال بدل چکا ہوگا۔ جب آپ غزنی پہنچے تو امیر دوست محمد کا فوجی قاصد اخراج کا پروانہ لے کر پہنچا آپ ملک نادہ چلے گئے۔ والئ کابل نے وہاں سے بھی نکالنے کا حکم دیا اور آپ کو اہل و عیال سمیت یاغستان کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہونا پڑا۔

جب نادہ کے علماء سو کو پتہ چلا کہ حضرت غزنوی یاغستان کے پہاڑی علاقے میں بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے ایک لشکر لے کر آپ پر حملہ کر دیا گھر بار کو جلا دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔

انہی دنوں والئ کابل امیر دوست محمد فوت ہو گیا تو آپ پھر غزنی پہنچے اور اس کے بیٹے سے جو تخت نشین تھا پناہ مانگی۔ اس نے بھی انکار کر دیا اور آپ کو نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اہل و عیال سمیت ایک راستے پر بن سوچے چل پڑے پیچھے سے فوج آتی دکھائی دی اور آگے بڑے بڑے پہاڑ تو آپ نے پہاڑ سے مخاطب ہو کر سورہ المومنون کی آخری آیات افحسبتم انما خلقنٰکم ... الخ پڑھیں تو پہاڑ پر زلزلہ آیا۔ اور ایک غار بن گیا۔ آپ اس قدر بچے دیئے ہوئے غار میں روپوش ہو گئے۔ آپ کو الہام ہوا کہ اللہ ان ظالموں کی جڑ کاٹنے پر قادر ہے چنانچہ اسی زمانے میں شیر علی خان والئ ریاست کا تختہ الٹ دیا گیا آپ پہاڑ سے نکل کر واپس پہنچے۔ تو پھر وہی صورتحال درپیش آئی۔ اور گرفتار کر لیا گیا جب آپ نے توحید و سنت کی ترویج کے اسباب بیان کیے تو امیر بہت متاثر ہوا لیکن علماء سو نے کہا کہ امیر دوست کے زمانے میں ہم اس کا کفر ثابت کر چکے ہیں اب تحقیق کی ضرورت نہیں چنانچہ حضرت غزنوی کے قتل کا فتویٰ تیار کر والیا۔ مگر ان علماء میں سے ملا مشکی قدرے انصاف پسند تھا اس نے قتل کے فتوے پر دستخط نہ کیے لیکن آپ کو درے مارے گئے۔ داڑھی مونڈھ دی گئی چہرہ پر سیاہی مل دی گئی اور گدھے پر سوار کرا کے شہر بھر میں پھرایا گیا پھر قید خانے میں ڈال دیا اس ابتلا کے دور میں آپ ثابت قدم رہے دو سال تک اپنے بیٹوں کے ساتھ قید خانے میں رہے۔ ۱۸۶۷ء میں امیر افضل کا انتقال ہو گیا اور امیر اعظم تخت پر بیٹھا۔ اس نے آپ کی جلاوطنی کے احکام صادر کر دیئے اور پیادہ پا پشاور کی طرف نکال دیا۔ ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ امیر اعظم کا تختہ بھی الٹ گیا۔ اور وہ بھی ذلیل و خوار ہوا۔

حضرت غزنوی پشاور میں کچھ مدت قیام کے بعد امرتسر تشریف لے آئے اور کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت میں ڈوب گئے۔ للٰہیت اور خلوص سید غزنویؒ کا امتیاز تھا۔ آپ کے بارہ صاحبزادے اور پندرہ صاحبزادیاں تھیں۔ جن میں سے ہر ایک عالم باعمل اور محدث و فقیہ تھا۔

مولانا غزنوی کی نیک نفسی، روحانی بلندی اور جرأت و استغنا کے بارے میں بے شمار واقعات مشہور ہیں علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ جب آپ دہلی میں تھے تو ۱۸۵۷ء کی ساڑھ ستی کا زمانہ تھا گورا فوج نے چاروں طرف گولیوں سے ہلاکت کا طوفان اٹھا رکھا تھا۔ مسجد اور گرد و نواح کا علاقہ خصوصیت کیساتھ اس قتل عام کا مرکز تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو آپ مسجد کے حوض پر آ گئے گولیاں چلتی رہیں ذرہ برابر بھی کھٹکا محسوس نہ کیا۔ اس معجز نما جرأت کو دیکھ کر مقتدیوں نے بھی حوصلہ کیا۔ اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وضو کر کے نماز میں لگ گئے۔ ایک دفعہ آپ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کسی نے مطلع کیا کہ آپ کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ یہ اندوہناک خبر سنی۔ ایک منٹ خاموش رہے پھر کہنے لگے :۔

"وہ خدا کی امانت تھی اس نے اپنا کام کیا ہم اپنا کام کریں" یہ کہہ کر پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ آپ کے جذب و کیفیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی آپ بدستور نماز میں مشغول رہے سلام کے بعد ہاتھ اٹھائے تو داڑھی تر تھی فرمانے لگے :

"باراں شد! واللہ عبداللہ را خبر نہ شد"

ربیع الاول ۱۲۹۸ھ ۔ ۱۸۷۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا مزار شہر امرتسر میں دروازہ سلطان ونڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے پر ہے۔

(سید ابوبکر غزنویؒ ۔ عبدالاعلیٰ رحمانی)

Marfat.com

غزنوی محمود (۹۷۱ء-۱۰۳۰ء) عظیم سلطان اور سپہ سالار ۲ر اکتوبر ۹۷۱ء کو پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام ابوالقاسم محمود تھا۔ باپ کا نام ناصرالدین سبکتگین تھا جو الپتگین کا ترک غلام تھا۔ الپتگین سامانیوں کا ترک سردار تھا۔ اور اس نے ۹۶۲ء میں اپنے زورِ بازو سے غزنی فتح کیا اور اس کا بادشاہ ہوگیا۔ امیر بخارا نے الپتگین سے صلح کر لی اور جو علاقے اس نے فتح کر لیے تھے، ان پر اس کی بادشاہت تسلیم کر لی۔ الپتگین کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق تختِ غزنی پر بیٹھا، پھر بلکاتگین اور اس کے بعد پری تگین۔ یہ دونوں الپتگین کے غلام تھے۔ ان تینوں بادشاہوں کا زمانۂ حکومت مختصر رہا۔ آخر میں امرائے دربار نے اتفاق رائے سے سبکتگین کو غزنی کا بادشاہ منتخب کیا (۲۰ر اپریل ۹۷۷ء)۔ ایک دو سال کے اندر ہی امیر سبکتگین نے بہت سی فتوحات کیں۔ بست اور قزدار فتح کیا۔ غزنی اور راجہ جے پال کی سرحدیں مل گئیں۔ جب دو طاقت ور فرماں رواؤں کی سرحدیں متصل ہوں تو جنگ کے اسباب پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ نونک جھونک رہنے لگی۔ نیز سبکتگین کے سامنے یہ ایک اہم مقصد بھی تھا کہ ملتان اور سندھ کو باطنیوں کے تسلط سے نجات دے۔ جے پال کو سبکتگین کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر وحشت ہوئی اور دونوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں۔

۹۹۴ء میں محمود کو "سیف الدولہ" کا خطاب دے کر، خراسان کا گورنر بنایا گیا۔ دو سال بعد اس کا باپ امیر سبکتگین اگست ۹۹۷ء میں بلخ میں انتقال کر گیا جہاں وہ ایک بغاوت کچلنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے اسماعیل کو جانشین مقرر کیا جو اس وقت اس کے پاس تھا۔ اسماعیل نے بلخ کے مقام پر فوراً تخت و تاج سنبھال لیا۔ اس وقت محمود نیشاپور میں تھا۔ محمود نے اسے برادرانہ انداز میں پیشکش کی کہ سلطنت کو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، لیکن اسماعیل نے اسے مسترد کر دیا۔ چنانچہ تاج و تخت کی وراثت کے لیے دونوں بھائیوں میں ۹۹۸ء میں جنگ ہوئی۔ محمود فتحیاب ہوا اور ۹۹۸ء میں غزنی کا حکمران بن گیا۔

اُس زمانے میں سامانیوں کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کئی ریاستوں میں بٹ گئی تھی۔ محمود نے پہلے تو سامانیوں کی ماتحتی سے آزادی حاصل کی۔ پھر آس پاس کی ریاستوں کو نیچا دکھا کر غزنی کی حکومت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ عباسی خلیفہ کو محمود کی فتوحات کا حال معلوم ہوا تو خراسان کی حکومت کا پروانہ اور خلعت بھیجا۔ یمین الدولہ امین الملّت کا خطاب بھی دیا۔ چنانچہ آگے چل کر محمود کے خاندان نے یمینی خاندان کے نام سے شہرت پائی۔

سلطان محمود غزنوی سکندرِ اعظم کی طرح ایک خوش نصیب جوان تھا، جس کے قابل و منتظم باپ نے اسے ورثے میں بہت بڑی سلطنت دی، سکندر کی طرح محمود کو بھی اپنے باپ کی طرف سے ایک جرّار، آزمودہ کار اور منظّم لشکر ملا۔ سکندر کی طرح محمود کو بچپن ہی سے نہ صرف پریڈ گراؤنڈ اور ورزشی اکھاڑے میں فنِ سپاہ گری کا ماہر بنایا، بلکہ ابھی وہ سات برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ اُس کو اپنے جنرل باپ امیر سبکتگین کے ہمراہ خراسان کی مہم میں شرکت کرنا پڑی۔ اسی طرح محمود نے پندرہ برس کی عمر میں غور و طغان کی جنگوں میں اپنی شمشیرزنی اور بہادری کے جوہر دکھا کر اپنا یہ مستقبل متعین کر لیا کہ وہ دنیا کا ایک عظیم فاتح ہوگا۔ محمود غزنوی نے غزنی میں ایک خوبصورت باغ اور مکان بنوا کر اعیانِ حکومت، امرائے سلطنت اور خود شاہِ مملکت کی ضیافت کی۔ اس موقع پر امیر سبکتگین نے اپنے نامور بیٹے کو یہ کارآمد نصیحت کی:

"یہ باغ اور عمارت [illegible] ... مکان ہر وہ امیر بنا سکتا ہے جس کے پاس دولت ہے۔ [illegible] لازم ہے کہ وہ ایسی عمارت تعمیر کریں جس کی مثال دوسرے افراد پیدا نہ کر سکیں۔ یہ عمارت علم و عمل سے بنتی ہے۔"

محمود نے باپ کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی اور اپنی آئندہ زندگی اسی پر عمل کرنے میں گزار دی۔

فتوحات

۹۹۸ء میں سلطان محمود اپنے بھائی اسمٰعیل کو شکست دے کر غزنی اور خراسان کے تخت پر بیٹھا۔ ایک سال بعد سلطان نے امیر منصور سے بلخ، ہرات، ترمذ اور بست کی امارت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ امیر نے خراسان کی حوالگی پر اظہارِ معذرت کیا تو محمود نے نیشاپور پر چڑھائی کر دی۔ امیر منصور مرغاب چلا گیا۔ باغیوں نے امیر منصور کو تخت سے علیحدہ کر کے اس کے بھائی کو تخت نشین کر دیا۔ اس پر سلطان مرو کی طرف بڑھا۔ آخرکار ۱۶ر مئی ۹۹۹ء کو اس نے دشمنوں کو شکست دے کر خراسان کے بڑے حصّے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۰۰ء میں محمود نے طغان کے نواح میں چند قلعے فتح کر لیے۔ اگلے سال محمود نے جے پال کو شکست دی اور اسے گرفتار کر کے غزنی لوٹ گیا۔ ۱۰۰۲ء میں وہ سیستان چلا گیا اور وہاں بغاوت فرو کر کے غزنی لوٹ آیا۔ لیکن اسے جلد ہی دوبارہ سیستان جانا پڑا، کیونکہ باغیوں نے دوبارہ علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔

سلطان محمود غزنوی زیادہ تر ہندوستان پر اپنے سترہ حملوں کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ ان دنوں ہندو راجاؤں کا ایک خاندان، جو ہندو شاہی کہلاتا تھا، پنجاب پر حکومت کرتا تھا۔ محمود کے باپ امیر سبکتگین کی حکومت کے زمانے میں اس خاندان کے ایک راجہ جے پال نے بہت سے ہندو راجاؤں کو ساتھ لے کر کابل پر چڑھائی کی، لیکن شکست کھائی اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے لوٹا۔ گھر پہنچ کر اس کی نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اب کے پھر سبکتگین سے معرکہ ہوا جس میں جے پال نے پھر شکست کھائی۔ محمود اُن معرکوں میں باپ کے ساتھ ساتھ رہا تھا اور ہندو شاہیوں کی طاقت کو اچھی طرح آزما چکا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد جب اسے اندرونی جھگڑوں سے اطمینان نصیب ہوا اور غزنی میں اس کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس نے ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا اور سترہ حملے کر کے اس سرزمین میں ہلچل مچا دی۔ جے پال کا جانشین انند پال بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کا راستہ روکنے آیا۔ کئی راجپوت راجاؤں نے اس کی مدد کی، لیکن محمود نے انھیں ایسی ایسی شکستیں دیں کہ وہ اسے راستہ دینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ وہ سرکش راجپوتوں کو نیچا دکھاتا، جنگلوں اور پہاڑوں کے جنگجو قبیلوں کو دباتا، وادیٔ گنگا میں جا پہنچا۔ ان دنوں ملتان پر اسماعیلیوں کی حکومت تھی۔ سلطان نے اُن پر دو مرتبہ چڑھائی کی۔ آخر انھوں نے ہار مان کر اطاعت کر لی۔

سلطان محمود نے وادیٔ گنگا پر پورے زور سے پہلی مرتبہ جو حملہ کیا، اُس میں قنوج، بلند شہر، متھرا، اٹاوہ، میرٹھ کے علاوہ کئی اور چھوٹے بڑے شہر فتح ہو گئے۔ ان شہروں اور اُن کے مندروں سے وہ بے شمار دولت سمیٹ کے غزنی لے گیا۔ اس موقع پر اُسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی وجہ سے سارے عالمِ اسلام میں اس کی بہادری اور اولوالعزمی کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور جا بجا اس کا نام بڑی عزت سے لیا جانے لگا۔ اب کے ہندو شاہیوں اور دوسرے راجاؤں نے مل کر ایک جتھا بنایا اور محمود کو روکنے کا منصوبہ باندھا، لیکن دلوں پر اس کی ہیبت ایسی چھائی ہوئی تھی

Marfat.com

[illegible] فتوحات کی طرح ہندوکش کے پہاڑوں سے اُترا تو یہ جھٹکا خود محمود غزنوی کی ابتدائی کامیابی کا راستہ روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ محمود نے پنجاب کو غزنوی سلطنت میں مستقل طور پر شامل کر لیا۔ اور لاہور اس صوبے کا صدر مقام قرار پایا۔ اس نے کانجر بھی فتح کیا تھا جیسے گوالیار کے قلعے کو جا گھیرا۔ پھر کالنجر پر جا چڑھا۔ یہ مقام دریائے گنگا کی وادی محمود کی فتوحات کی آخری حد ہے۔ اس سے وہ آگے نہیں بڑھا۔

سلطان محمود کا سب سے بڑا کارنامہ سومناتھ کی فتح ہے۔ سومناتھ گجرات کاٹھیاواڑ کے علاقے میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ یہاں ایک مشہور مندر تھا جس کی یاترا کو دُور دُور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ کہاں غزنی، کہاں گجرات۔ راستے میں ہر طرف لق و دق میدان اور سنسان ریگستان پھیلے ہوئے تھے، جن میں دُور دُور تک نہ پانی کا پتا چلتا تھا نہ کہیں ہریاول نظر آتی تھی۔ لیکن محمود نے سفر کی صعوبتوں کی پروا نہ کی اور فوج لے کر بڑھتا ہوا چلا۔ اگرچہ راجپوت ہر طرف سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گئے تھے، فوجوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، لیکن محمود نے اس طرح جھپٹ جھپٹ کر حملے کیے کہ راجپوتوں کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ اس فتح میں اَن گنت دولت ملی سومناتھ کا بُت بھی ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس کامیابی پر اسلامی ملکوں میں جا بجا بڑی خوشیاں منائی گئیں۔

محمود کا لشکر

ان عظیم فتوحات کا سہرا سلطان کے لشکر کے سر ہے جس کا مفصل حال میجر جنرل محمد اکبر خان نے اپنی تصنیف "اسلامی طریق جنگ" میں قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"زمانہ امن میں سلطان کا وزیر اعظم فوج کے انتظامی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا وزیر اعظم اپنی مدد کے لیے ایک تجربہ کار اور ممتاز افسر کو "عارض" کے عہدے پر متعین کر دیتا تھا تاکہ وہ فوجی مسائل سے بخوبی واقف ہونے کے باعث تنظیم، تربیت اور دیگر انتظامی معاملات میں پوری دلچسپی لے سکے۔ وزیر اعظم اور عارض سپاہ کی بہبود، جانوروں کی دیکھ بھال، اسلحہ، سامان رسد و حرب وغیرہ کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ وہ ہر سال کم از کم ایک بار تمام فوج کا معائنہ کرتے۔ بسا اوقات سلطان بنفس نفیس بھی اس معائنے میں شرکت کرتا۔ کمزور جانوروں کو چراگاہوں میں اور ہاتھیوں کو موٹا ہونے کے لیے ہندوستان بھیج دیا جاتا۔

سپاہیوں کو ہر تین ماہ کے بعد تنخواہیں ملتی تھیں۔ دوران جنگ عساکر کے اہل و عیال کی خبرگیری بھی عارض کے ذمہ ہوتی تھی۔ فتح کے بعد عارض ہی تمام مال غنیمت جمع کرتا اور سلطان کے حکم کے بموجب اُسے تقسیم کرتا تھا۔ غنیمت کی تقسیم شرعی طریق پر ہوتی تھی۔ مثلاً پیادہ کو سوار سے نصف حصہ ملتا اور غنیمت کا پانچواں حصہ سلطان کے خزانے میں بھیج دیا جاتا۔

فوج کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ دوران جنگ میں رضاکاروں کی شرکت سے بہت اضافہ ہو جاتا تھا۔ فوج کا دستہ اس طرح مرتب ہوتا تھا:

(الف) ۱۰ سواروں یا پیدل جوانوں کا افسر ـــــ خیل تاش

(ب) ۱۰۰ سواروں یا پیدلوں کا افسر ـــــ قائد

(ج) ۵۰۰ سواروں یا پیدلوں کا افسر ـــــ سرہنگ

(د) دستے کا سالار جو کہ عموماً ایک ہزار ہوتا تھا ـــــ حاجب

سلطان محمود کو اپنی سالاری اور فن حرب کی مہارت پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ اس کی فوج میں عرب، مغل، سلجوقی، ترک، افغان، غوری، ہندی، سب قسم کے

لوگ تھے۔ مگر محمود کی زندگی میں اس کی فوج نے کبھی بغاوت اور حکم عدولی نہ کی اور ہمیشہ نازک اور خطرناک حالات میں اپنی جان پر کھیل گئی۔

ملکی انتظام و اخلاق و عادات

سلطان محمود غزنوی نے ۳۳ برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۰ء میں وفات پائی۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا۔ محمود بڑا عادل اور انصاف پسند فرمانروا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی سلطنت کے مختلف حصوں کا دورہ کرتا رہتا تھا تاکہ اسے مختلف علاقوں کے حالات سے آگاہی ہوتی رہے۔ اہلکار چوکس رہیں اور اپنے فرائض سے غفلت نہ برتیں۔ اس نے سوداگروں اور دکانداروں کی نگرانی کے لیے جا بجا افسر مقرر کر رکھے تھے۔ کوئی تاجر مول تول میں گاہک کو دھوکہ دیتا تو پکڑا جاتا تھا اور اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

محمود غزنوی کی سلطنت بڑی مضبوط تھی۔ ساری سلطنت میں پورا پورا امن و امان تھا۔ سڑکیں محفوظ تھیں اور لوگ خوشحال اور مطمئن۔ دوسری خوبیوں کے علاوہ محمود علماء اور شعراء کا بڑا قدردان تھا۔ احکام شریعت پر بھی پوری طرح عمل کرتا تھا۔ لیکن تعصب اور مذہبی تنگ نظری سے ہمیشہ اس کا دامن پاک رہا۔ اس نے ہندوؤں کی ایک فوج بھرتی کر رکھی تھی۔ یہ فوج غزنی میں رہتی تھی اور بڑی آزادی سے اپنی مذہبی رسمیں بجالاتی تھی۔ اس نے کبھی کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم کرنے کا سہرا محمود ہی کے سر ہے اس نے اوپر تلے ایسے میدان مارے اور ایسے ایسے دھاوے کیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی شجاعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ہندو شاہی خاندان ایسا طاقتور تھا کہ کابل اور غزنی پر فتح کا پرچم لہرانے کا خواب دیکھ رہا تھا، لیکن محمود نے اس کا زور توڑ کر پنجاب کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور یہاں اس مضبوطی سے قدم جمائے کہ آگے چل کر جب اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے غزنی کا علاقہ نکل گیا تو پنجاب میں اُن کی حکومت قائم رہی۔

سلطان محمود میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ بڑی سختی سے اسلام کا پابند تھا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور ہر روز قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑا شجاع اور بہادر شخص تھا۔ خطرے کے وقت ذرا نہ گھبراتا اور کیسی ہی مصیبت کیوں نہ آ پڑے ہمت نہ ہارتا تھا۔ میدان جنگ میں فوج کے آگے آگے نظر آتا اور بڑھ بڑھ کر تلواریں مارتا تھا۔ اس کی ذاتی شجاعت کی وجہ سے سپاہیوں کے حوصلے بڑھ اور وہ جی توڑ کر لڑتے تھے۔

سلطان محمود نے نہ صرف فتح ممالک اور جمع اموال میں کمال حاصل کیا بلکہ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں زمانے بھر کے منتخب شعراء اور علماء و فضلاء جمع کر دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعراء کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا، ایران و توران کے کسی دوسرے فرمانروا کو میسر نہیں ہوا۔ ان شعرا کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چار چاند لگا دیے۔ جن شعرا نے محمود کے دربار میں شہرت پائی ان میں فردوسی، عنصری، عسجدی اور فرخی خاص طور پر مشہور ہیں۔ اسی زمانے میں البیرونی ہندوستان میں آیا اور ہندوستانی علوم رسوم کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد اس علاقے اور ہندوؤں کے متعلق ایک نہایت اہم اور سیر حاصل کتاب لکھی۔

سلطان محمود ایک عجیب دل گردے کا مالک تھا اور زبردست قوت ارادی کا انسان تھا۔ ۱۰۲۷ء میں اسے بخار رہنے لگا جس نے تپ دق کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے معمولات میں فرق نہ آنے دیا۔ دربار اور باریابی کا سلسلہ

Marfat.com

اسی طرح برقرار رکھا۔ خراسان سے سلجوقیوں کو نکالا۔ رے کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۱۰۲۹ء اور ۱۰۳۰ء کا موسم گرما خراسان میں اور اگلا موسم سرما بلخ میں گزارا۔ لیکن اب صحت نے بالکل جواب دے دیا۔ اور ۲۲ اپریل ۱۰۳۰ء کو اسے غزنی واپس آنا پڑا۔ سات آٹھ روز بعد قضا کا پیغام آ پہنچا۔

محمود کا بیٹا مسعود بھی بڑا بہادر سپاہی تھا، لیکن نہ باپ جیسا عقلمند تھا نہ ویسا دور اندیش۔ اس سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ سلجوقیوں سے جنگ چھیڑ دی۔ چنانچہ وسط ایشیا کا جتنا علاقہ اس کے قبضے میں تھا، اس لڑائی میں سارا چھنوا بیٹھا، اور پیچھے ہٹ کر غزنی چلا آیا۔ یہاں سے پنجاب کا رخ کیا، لیکن راستے میں اپنے غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس کا بیٹا مودود تخت پر بیٹھا تو غزنویوں کی وسیع سلطنت گھٹتے گھٹتے پنجاب اور غزنی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر جب غوریوں کو عروج حاصل ہوا تو غزنی بھی چھن گیا اور محمود کے خاندان کے لوگوں کے پاس صرف پنجاب کا علاقہ ہی باقی رہ گیا۔ چنانچہ جن دنوں سلطان معز الدین غوری نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو غزنوی خاندان کی حکومت صرف لاہور اور اس کے آس پاس کے چند اضلاع پر تھی۔

غزوات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول ۱۳ نبوی میں ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ مشرکین نے اسی وقت اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کے خلاف طاقت آزمائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ وصال نبوی تک دس برس کی مختصر مدت میں آنحضورؐ کو تقریباً مسلسل حالت جنگ میں رہنا پڑا۔ دشمن کے مقابلے میں چوکس رہنے کی ہر وقت ضرورت ہے۔ آپؐ صحابہؓ کے چھوٹے چھوٹے مسلح دستے مختلف اطراف میں روانہ فرماتے رہتے تھے۔ ان مہمات کا نام مؤرخین نے سرایہ رکھا۔ جن مہمات میں نبی کریمؐ بنفس نفیس شریک ہوئے، انھیں غزوات کہا گیا۔ اصحاب سیر و مغازی نے سرایہ کی تعداد میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے ۳۵، بعض نے ۴۸، بعض نے ۵۰، بعض نے ۶۶ اور بعض نے ۷۳ تعداد بیان کی ہے۔ البتہ غزوات کی تعداد بہ اتفاق ۲۷ تھی۔ ان کا مجمل تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ غزوۂ وَدّان یا غزوۂ الابواء

اوائل صفر ۲ھ میں روانہ ہوئے۔ مشرکین مکہ کے حلیف بنو ضمرہ کو مرعوب و خائف کرنا مقصد تھا۔ اسلامی لشکر صرف ساٹھ مہاجرین پر مشتمل تھا۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ مدینے میں نائب مقرر کیے گئے۔ بنو ضمرہ میں نے لڑے بغیر صلح کر لی۔ آپ پندرہ روز مدینے سے باہر رہنے کے بعد تقریباً ۲۰ صفر کو واپس تشریف لے آئے۔

۲۔ غزوۂ بواط

اگلے ہی مہینے ربیع الاول ۲ھ میں آپؐ دو سو مہاجرین کو لے کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کو خائف کرنے کی غرض سے بواط تشریف لے گئے۔ سعدؓ بن معاذ مدینے میں نائب مقرر ہوئے۔ لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور آپ چند روز بعد واپس تشریف لے آئے۔

(نیز دیکھیے: بواط)

۳۔ غزوۂ سفوان

بواط سے واپسی پر معلوم ہوا کہ کرز بن جابر فہری مسلمانوں کے مویشی لوٹ کر لے گیا ہے۔ آپؐ فوراً چند مہاجرین کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ حضرت زید بن حارثہ کو مدینے میں نائب مقرر کیا۔ بدر کے قریب سفوان کی وادی تک تلاش کیا۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا لہذا واپس تشریف لے آئے۔

۴۔ غزوۂ ذی العُشیرۃ

ایک مہینہ گزر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ قریش نے خلاف معمول موسم سرما میں ایک بڑا تجارتی قافلہ شام کی طرف روانہ کیا ہے [illegible] لیے ہتھیار خریدنے کو سرمایہ فراہم [illegible] اس قافلے کو روکنے کے لیے [illegible] ذو العشیرہ کے مقام پر پہنچ گئے [illegible] قافلہ ہاتھ نہیں آیا۔ چند روز قیام کے بعد [illegible] واپس تشریف لے آئے۔ اس دوران حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مدینے میں آپؐ کے نائب رہے۔

۵۔ غزوۂ بدر

اس کے دو ماہ بعد پہلا غزوہ پیش آیا جس میں لڑائی ہوئی۔ دراصل اسی قافلے نے جس کے خلاف آپ ذوالعشیرہ تشریف لے گئے تھے، واپسی کے وقت مکہ والوں کو پیغام بھیج کر فوج طلب کی تھی۔ جو بدر تک پہنچ گئی۔ لڑے بغیر چارہ نہ تھا۔ آپؐ نے حضرت ابو لبابہؓ کو مدینے میں نائب بنایا اور ۳۰۵ جاں نثاروں کے ہمراہ ۸ رمضان ۲ھ کو روانہ ہوئے۔ اس بار انصار بھی لشکر میں شامل تھے۔ ۱۷ رمضان مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کو معرکہ ہوا۔ ۱۴ مسلمان شہید ہوئے اور ستر دشمن ہلاک ہوئے۔ ۲۲ رمضان کو آپؐ واپس مدینہ تشریف لائے۔

(نیز دیکھیے: بدر)

۶۔ غزوۂ بنی قینقاع

بدر سے واپسی کے صرف بیس دن بعد یعنی شوال ۲ھ کے آخر میں بنو قینقاع کے یہودی قبیلے کے لفنگوں نے ایک مسلمان خاتون کے چہرے سے پردہ اٹھا دیا۔ حضورؐ نے انھیں تنبیہ کی تو وہ اکڑ گئے۔ چنانچہ آپؐ نے مجبوراً صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بنو قینقاع پر چڑھائی کر دی۔ مدینے میں حضرت ابو لبابہؓ کو نائب مقرر کیا۔ پندرہ روز کے محاصرے کے بعد دشمن صلح پر آمادہ ہو گئے۔ آپؐ نے ان کی جان تو بخش دی مگر مال و اسباب ضبط کر کے انھیں جلاوطن کر دیا۔ ذی القعدہ کی چاندرات کو غزوہ بنو قینقاع سے فراغت ہوئی۔

۷۔ غزوۂ سویق

اگلے ہی مہینے ابو سفیان بدر کی شکست کا بدلہ لینے کی غرض سے مدینے پر حملہ آور ہوا۔ دو مسلمانوں کو سوتے میں شہید کر کے فرار ہو گیا۔ رسول کریمؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ حضرت ابو لبابہؓ کو نائب مقرر کر کے دو سو صحابہ کے ہمراہ ۵ ذی الحجہ ۲ھ کو تعاقب میں روانہ ہوئے۔ ابو سفیان نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ستو (سویق) کے بورے راستے میں پھینکے اور بھاگ نکلا۔ آنحضورؐ پانچ روز کی مہم کے بعد لوٹ آئے۔

۸۔ غزوۂ قرقرۃ الکدر

اگلے مہینے اطلاع موصول ہوئی کہ عراق اور مکہ کے راستے میں بنو سلیم اور غطفان شرارت پر آمادہ ہیں۔ آپؐ نے دو سو صحابہ ساتھ لیے۔ حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم کو مدینے میں نائب مقرر کیا اور محرم ۳ھ کے پندرہ روز گزرنے کے بعد دشمنوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ قرقرۃ الکدر پہنچے تو دشمن اپنے مویشی چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ پانچ سو اونٹ مال غنیمت میں ہاتھ لگے۔ محرم کے اواخر میں آپؐ واپس تشریف لے آئے۔

۹۔ غزوۂ بنی غطفان

ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ ذوامر کے مقام پر ثعلبہ اور محارب کے مشرکین کے اجتماع کی خبر آئی۔ آپؐ نے حضرت عثمان غنیؓ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ چار سو پچاس گھوڑ سوار مجاہدین کے ہمراہ ۱۲ ربیع الاول ۳ھ کو روانہ ہوئے۔ دشمن سے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ ۲۴ ربیع الاول کو واپس تشریف لے آئے۔

۱۰۔ غزوۂ بنی سُلیم

پھر دو ماہ بعد اطلاع موصول ہوئی کہ بنو سلیم بحران کے مقام پر جمع ہو رہے ہیں۔ آپؐ عبداللہؓ بن ام مکتوم کو نیابت سپرد کر کے تین سو صحابہ کے ہمراہ ۶ جمادی الاولیٰ ۳ھ کو [illegible]

Marfat.com

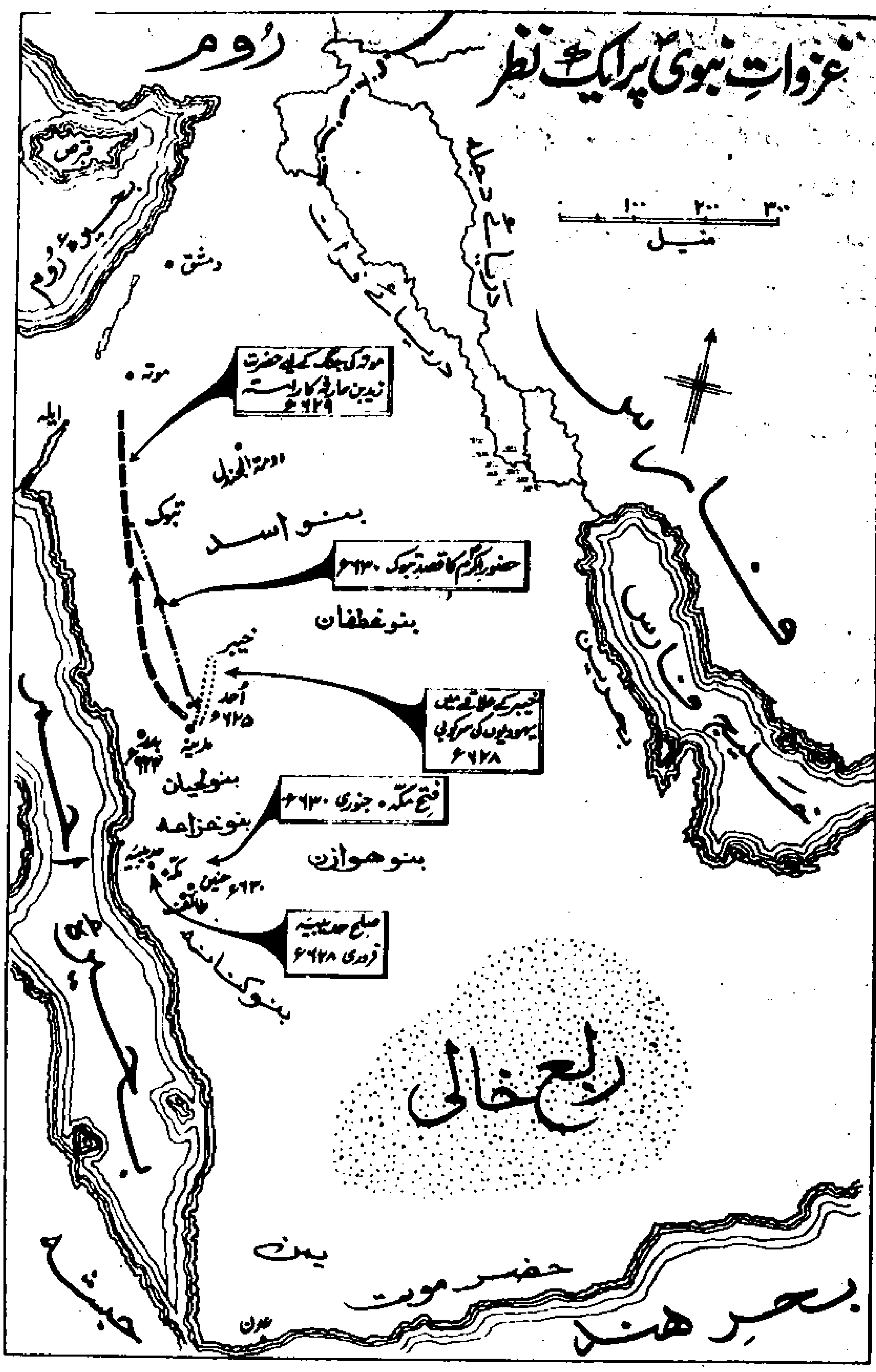

خطرے کے سدِ باب کے لیے روانہ ہوئے ۔ دشمن آپؐ کی آمد کی خبر پا کر منتشر ہو گئے ۔ چنانچہ جنگ نہیں ہوئی ۔ اور آپؐ ۱۲ جمادی الاول کو مدینہ لوٹ آئے ۔

۱۱- غزوۂ احد

تین ماہ بعد مکہ سے خبر آئی کہ قریش بدر کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تین ہزار کا لشکر لے کر آ رہے ہیں ۔ ۵ شوال کو دشمن فوج کی آمد کی اطلاع ملی ۔ آپؐ اگلے ہی روز حضرت ابن ام مکتومؓ کو نائب مقرر کرنے کے بعد ایک ہزار مسلمانوں کو لے کر مقابلے کے لیے نکلے ۔ رستے میں تین سو منافقین ساتھ چھوڑ گئے ۔ ۷ شوال کو مدینہ کے شمال مشرق میں جبل احد کے دامن میں معرکہ ہوا ۔ مسلمان تیر اندازوں کی ایک غلطی کے باعث مجاہدین کا جانی نقصان زیادہ ہوا ۔ ستر صحابہ شہید ہوئے ۔ دشمن کے ۲۳ آدمی ہلاک ہوئے ۔ مشرکین کا پلہ اگرچہ بھاری تھا ، مگر واپس لوٹ گئے ۔ (نیز دیکھیے : احد)

۱۲ ۔ غزوۂ حمراء الاسد

رسول اللہؐ احد میں زخمی ہو چکے تھے ۔ اس کے باوجود آپؐ ۸ شوال کو تھکے ماندے مجاہدین کے ساتھ ہی دشمن کے تعاقب میں روانہ ہو گئے ۔ مقصد یہ تھا کہ وہ پلٹ کر مدینے پر حملہ نہ کر دے اس مہم میں قتال کی نوبت نہیں آئی ۔ اور آپؐ تین روز حمراء الاسد میں قیام کے بعد ۱۳ شوال ۳ھ کو مدینے لوٹ آئے ۔

۱۳ ۔ غزوۂ بنی النضیر

جنگ احد کے چار ماہ بعد حضورؐ نے بنو عامر کے لوگوں کے کہنے پر اکتالیس منتخب صحابہ کو تبلیغ کے لیے بئر معونہ بھیجا ۔ وہاں بنو سلیم نے گھیر کر چالیس مسلمانوں کو شہید کر دیا ۔ ایک صحابی زندہ بچ کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں جوشِ انتقام میں انھوں نے بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا ۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ اس قبیلے کے ساتھ یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کے واسطے سے آنحضرتؐ کا عہد و پیمان تھا ۔ رسول اللہؐ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ ان دونوں آدمیوں کی دیت ادا کرنے کے لیے بنو نضیر سے گفتگو کرنے گئے ۔ انھوں نے گفتگو کے دوران آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کی سازش کی ۔ آپؐ نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا کہ اس بدعہدی کی پاداش میں تم دس روز کے اندر اندر مدینے سے نکل جاؤ ۔ انھوں نے گستاخی سے جواب دیا ۔ اس پر آنحضرتؐ نے ابن ام مکتومؓ کو اپنا نائب بنا کر صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ یہودی قلعے کا محاصرہ کر لیا ۔ پندرہ روز کے محاصرے کے بعد دشمن نے ہتھیار ڈال دیے ۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہو ۔ یہودیوں کا اسلحہ ضبط کر لیا گیا اور

Marfat.com

انھیں اجازت دے دی تھی کہ اونٹوں پر جتنا مال لے جا سکتے ہیں، لے جائیں۔ یہ غزوہ ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا۔

۱۴۔ غزوۂ بدر الموعد

شوّال ۳ھ میں اُحد سے واپس جاتے وقت ابوسفیان نے للکارا تھا کہ آئندہ سال بدر میں مقابلہ ہوگا لیکن وہ جنگ کی تیاریاں نہ کر سکا۔ اس لیے مدینے میں یہ پروپیگنڈہ کرایا کہ ... سال تو ... ہمت ... ہے، مسلمان مقابلے پر نکلے تو نقصان اٹھائیں گے۔ آنحضرتؐ نے جب یہ سُنا تو فوراً جہاد کا اعلان فرما دیا۔ اس مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو قائم مقام مقرر فرمایا۔ ۲۶ شوّال ۴ھ کو پندرہ سو مجاہدین کی معیت میں بدر کی طرف روانہ ہوئے۔ ذی قعدہ کی چاند رات کو وہاں پہنچے۔ ابوسفیان دو ہزار کا لشکر لے کر مکّے سے چلا لیکن ہمت ہار کر مرّ الظہران سے ہی لوٹ گیا۔ حضورؐ آٹھ روز انتظار کر کے ۱۲ یا ۱۳ ذی قعدہ کو مدینہ لوٹ آئے۔

۱۵۔ غزوۂ ذات الرقاع

ڈیڑھ ماہ بعد اطلاع ملی کہ انمار اور ثعلبہ نامی قبیلے مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے مدینے پر حضرت عثمانؓ کو قائم مقام مقرر کیا۔ چار سو اصحاب کے ساتھ ۱۰ محرّم ۵ھ کو ذات الرقاع کے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ چار روز کے سفر کے بعد وہاں پہنچے۔ دشمن پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ قتال کی نوبت نہیں آئی۔ آپؐ چند روز قیام کے بعد ۲۵ محرّم کو مدینے لوٹ آئے۔ (نیز دیکھیے: ذات الرقاع)

۱۶۔ غزوۂ دُومۃ الجندل

مدینے سے تیرہ چودہ روز کی مسافت پر شمال میں دُومۃ الجندل کا نصرانی والی اکیدر مسلمانوں کے تجارتی قافلوں کو متواتر پریشان کر رہا تھا۔ آخر آپؐ نے اس کی سرکوبی کے لیے ایک ہزار صحابہ کا جیش تیار کیا۔ مدینے میں حضرت سباعؓ بن عرفطہ انصاری کو اپنا نائب مقرر کر کے ۲۵ ربیع الاوّل ۵ھ کو روانہ ہوئے۔ دشمن کے علاقے میں پہنچے تو کوئی مقابلے پر نہ آیا، چند اونٹ ہاتھ لگے۔ چند روز قیام کے بعد ۲۰ ربیع الآخر کو مدینے واپس پہنچ گئے۔ (نیز دیکھیے: دُومۃ الجندل)

۱۷۔ غزوۂ بنی المصطلق

تین ماہ بعد پتا چلا کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو مصطلق نے مدینے پر حملے کی تیاری کی ہے۔ آپؐ تحقیق حال کے بعد ایک مختصر سی فوج لے کر ۲ شعبان ۵ھ کو مریسیع کی جانب روانہ ہوئے۔ مدینے میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو قائم مقام چھوڑا۔ دشمن نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، مگر مجاہدین کے حملے کی تاب نہ لا سکے۔ دس کفّار ہلاک ہوئے اور ایک صحابی شہید ہوئے۔ چھ سو کفّار گرفتار ہوئے۔ ان میں سردارِ قبیلہ کی صاحبزادی جویریہ بھی تھیں۔ آنحضورؐ نے ان کی خواہش پر انھیں آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ اس پر صحابہ نے دوسرے قیدی بھی آزاد کر دیے۔ ۳۰ شعبان کو مدینے میں واپسی ہوئی۔

۱۸۔ غزوۂ خندق

ابھی ایک مہینہ امن میں گزرا تھا کہ خبر ملی قریش اور یہود نے مل کر مدینے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ آپؐ نے اس مرتبہ مدینے میں رہ کر مقابلے کا فیصلہ کیا۔ شہر کے شمال مغرب میں جہاں سے دشمن آ سکتا تھا، ساڑھے تین میل لمبی سرحا خندق کھود دی گئی تین ہفتے میں یہ کام مکمل ہوا۔ شوّال کے اواخر میں دس ہزار سے زائد دشمنانِ اسلام یلغار کرتے ہوئے آئے۔ ۲۷ یا ۲۸ شوّال کو مقابلہ شروع ہو گیا۔ خندق کے باعث بڑا معرکہ نہیں ہو سکا۔ چوبیس روز تک دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی رہیں۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی جن میں دو مشرک ہلاک ہوئے۔ ایک صحابی زخمی ہوئے اور ایک ماہ بعد شہید ہو گئے۔ اس دوران ... [illegible] ... دشمن کی ... [illegible] ... نامراد ہو کر ۲۱ یا ۲۲ ذی قعدہ کو کفّار واپس لوٹ گئے۔ (نیز دیکھیے: خندق)

۱۹۔ غزوۂ بنی قریظہ

مدینے کے نواح میں بنو قریظہ کے یہودیوں نے جنگ خندق میں مسلمانوں سے عہد شکنی کی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی حملہ آور رخصت ہوئے، آنحضورؐ نے حضرت ابن اُمّ مکتومؓ ہی کو نائب مقرر کر کے ۲۳ ذی قعدہ ۵ھ کو تین ہزار صحابہ کے ساتھ بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز تک مسلمان تیر برساتے رہے۔ آخر یہودیوں نے مقابلے سے ہاتھ اٹھا لیے صلح کی درخواست کے ساتھ ہی کہا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ کو ثالث بنا دیا جائے، جو وہ فیصلہ کریں گے انھیں قبول ہوگا۔ ثالث کے فیصلے کے مطابق بنو قریظہ کے تمام مرد، جن کی تعداد چھ سو اور سات سو کے درمیان تھی، قتل کر دیے گئے۔ عورتیں اور بچے قید کر لیے گئے، مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ مہم ۷ ذی الحجہ کو ختم ہوئی۔

۲۰۔ غزوۂ بنو لحیان

دو مہینے ہی گزرے تھے کہ الرجیع کے قبیلہ بنو لحیان نے دھوکے سے دس صحابہ کو تعلیم اسلام کے لیے بلوایا اور انھیں شہید کر دیا۔ اس غدّاری کی سزا دینے کے لیے آنحضرتؐ نے دو سو کا جیش تیار کیا، حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور ۹ صفر ۶ھ کو کوچ کیا۔ دشمن نے آپؐ کی آمد کی اطلاع پا کر راہِ فرار اختیار کی۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی، مگر کوئی ہاتھ نہ آیا۔ پھر آپؐ قریش کو مرعوب کرنے کی غرض سے چند روز عسفان کے نواح میں فروکش رہے۔ ۱۴ ربیع الاوّل کو واپس تشریف لائے۔

۲۱۔ غزوۂ ذی قرد

ابھی آپؐ کو لوٹے ہوئے بمشکل دو روز ہوئے تھے کہ بنو غطفان کے لٹیروں نے مدینے کی چراگاہ پر شب خون مارا، ایک صحابی کو شہید کر دیا اور بیس اونٹنیاں ہنکا کر لے گئے۔ آپؐ نے اطلاع ملتے ہی چند سوار تو آگے روانہ فرما دیے اور ۱۶ ربیع الاوّل ۶ھ کو پانچ سو مجاہدین کے ہمراہ لٹیروں کے تعاقب میں خود بھی روانہ ہو گئے۔ اس دوران حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ آپؐ ایک شب و روز ذی قرد کے چشمے پر قیام فرما کر ۱۸ ربیع الاوّل کو واپس لوٹ آئے۔ اس واقعہ میں دو مسلمان شہید، اور ایک کافر ہلاک ہوا۔

۲۲۔ غزوہ (صلح) حدیبیہ

اواخر شوال ۶ھ میں آنحضرتؐ چودہ سو صحابہ کے ہمراہ عمرے کی نیت سے عازم مکّہ ہوئے۔ یہ سفر جنگ کی نیت سے نہیں تھا لیکن چونکہ حضورؐ نے بہ نفس نفیس اس میں شرکت فرمائی اس لیے غزوات میں شمار کیا جاتا ہے اور ایک موقع پر جنگ کا اندیشہ پیدا بھی ہو گیا تھا جس کے پیش نظر آپؐ نے صحابہ سے بیعت لی۔ حدیبیہ میں قیام کے دوران قریش سے معاہدۂ امن ہوا اور آپؐ اواخر ذی قعدہ میں واپس تشریف لے آئے۔ اس دوران مدینے میں حضرت عبداللہؓ بن اُمّ مکتوم ہی آپؐ کے قائم مقام تھے۔ (نیز دیکھیے: حدیبیہ)

۲۳۔ غزوۂ خیبر

صلح حدیبیہ کے ذریعے قریش کے فتنے سے مامون ہوتے ہی آنحضرتؐ نے ایک طرف دعوتِ اسلام کا دائرہ وسیع کیا۔ دوسری طرف یہودیوں کی شرارت کے کلّی استیصال کی طرف توجہ دی۔ وہ لوگ خیبر کے علاقے میں مجتمع تھے۔ آپؐ چودہ سو صحابہ کو لے کر اواخر محرّم ۷ھ میں خیبر کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت سباعؓ بن عرفطہ انصاری کو مدینے میں قائم مقام چھوڑا۔ ڈیڑھ دو ماہ کی مدت میں مختلف قلعے فتح کیے گئے۔ پندرہ مسلمان شہید ہوئے اور ۹۳ دشمن ہلاک ہوئے۔ اس طویل مہم کے نتیجے میں جزیرۃ العرب سے یہودیوں کا ... [illegible]

Marfat.com

ہوگیا۔ آپ جمادی الاولیٰ ۷ھ میں مدینہ واپس تشریف لائے۔ (نیز دیکھیے: خیبر)

۲۴۔ غزوۂ عام الفتح

حدیبیہ کی صلح اور یہود خیبر کی سرکوبی کے بعد آنحضرتؐ کو صرف سترہ ماہ کا عرصہ ایسا ملا جس میں آپؐ کو بذاتِ خود ہتھیار نہیں اٹھانے پڑے۔ کیونکہ قریش اور ان کے حلیف بنو بکر دو سال بھی اس معاہدے کو نہ نبھا سکے۔ ان کی عہد شکنی کی سزا دینے کے لیے آپؐ نے وسیع پیمانے پر تیاری فرمائی۔ حضرت ابو رہم غفاریؓ کو مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ کو مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ ۱۷ رمضان کو مرّ الظہران میں خیمہ زن ہوئے۔ دس ہزار حامیانِ دین متین آپؐ کے جلو میں تھے۔ قریش سراسیمہ تھے۔ ۲۰ رمضان کو اسلامی فوجیں مکّے میں داخل ہوئیں۔ ایک جگہ چند کفّار نے مزاحمت کی۔ اس جھڑپ میں تین مسلمان شہید ہوئے۔ ۲۴ کفار ہلاک ہوئے۔ چار مشرکین سابقہ جرائم کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ مکّہ میں امن رہا۔

۲۵۔ غزوۂ حنین

مکہ معظمہ میں پندرہ روز قیام فرمایا۔ اس اثنا میں ہوازن اور ثقیف کے قبائل نے اسلام کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک لشکرِ جرار تیار کیا۔ آنحضرتؐ مکہ میں حضرت عتابؓ بن اسید اموی کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے بارہ ہزار صحابہ کی معیت میں ۶ شوال کو روانہ ہوئے۔ حنین کی تنگ گھاٹیوں میں دشمن نے اچانک حملہ کیا جس سے اسلامی لشکر تتر بتر ہو گیا۔ آپؐ نے لوگوں کو پکار کر دوبارہ مجتمع کیا اور کفار پر جوابی حملہ کیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پسپا ہو کر اوطاس میں پہنچے۔ وہاں مسلمانوں نے تعاقب کر کے شکست دی۔ اس جنگ میں چھ مسلمان شہید ہوئے۔ ۷۰ کفار ہلاک ہوئے۔ چھ ہزار قید ہوئے۔ مال غنیمت میں چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں شامل تھیں۔ (نیز دیکھیے: حنین)

۲۶۔ غزوۂ طائف

حنین کے معرکے سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے توقف نہیں فرمایا۔ کیونکہ بنو ثقیف شکست کھانے کے بعد طائف میں جا کر قلعہ بند ہو گئے تھے۔ ۱۳ شوال ۸ھ کو آپؐ نے طائف کا محاصرہ کر لیا جو اٹھارہ روز جاری رہا۔ فصیل توڑنے کی کوشش میں بارہ مسلمان شہید ہوئے۔ اصحاب کے مشورے سے آپؐ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ کیونکہ کفّار کی اس جمعیت کی طرف سے اب کوئی بڑا خطرہ نہ تھا۔ آپؐ نے واپسی میں عمرہ ادا کیا اور ۲۶ ذی قعدہ کو مدینہ پہنچ گئے۔ (نیز دیکھیے: طائف)

۲۷۔ غزوۂ تبوک

فتح مکہ سے قبل آنحضرتؐ نے جمادی الاوّل ۸ھ میں روم کی افواج قاہرہ کے مقابلے کے لیے تین ہزار کا ایک لشکر شام کی طرف روانہ فرمایا تھا جو مُوتہ کے مقام پر دشمن سے متصادم ہوا۔ دشمن کی تعداد دو لاکھ تھی۔ مگر لشکرِ اسلام نے بے جگری سے مقابلہ کیا۔ تین سپہ سالار اور نو مجاہد شہید ہوئے۔ مورخین نے دشمن کے ہلاک شدگان کی تعداد نہیں بتائی ہے۔ اعداد کی کثرتِ تعداد کے باعث جنگ فیصلہ کن نہیں ہوئی۔ چنانچہ رومی مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ہوئی تو تیس ہزار کا لشکر تیار کر کے آپؐ اواخر رجب ۹ھ میں شام کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینے میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ تبوک میں خیمہ زن ہوئے۔ دشمن مقابلے پر نہیں آیا۔ آپؐ نے ایک دستہ دومۃ الجندل کی طرف بھیجا۔ ایک نصرانی ہلاک ہوا اور دومۃ الجندل کا والی اکیدر گرفتار ہو کر آیا۔ اس نے جزیہ دینا قبول کر لیا۔ آنحضرتؐ تبوک میں بیس روز قیام کے بعد اوائل رمضان ۹ھ میں مدینے واپس تشریف لائے۔ یہ آخری جنگ تھی جس میں حضورؐ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی لیکن وہ حالتِ جنگ جو رمضان ۸ھ ہی میں شروع ہو چکی تھی، اس کے بعد بھی جاری رہی۔ وصالِ نبوی تک مسلمانوں کی فوجیں مختلف اطراف میں مشرکین کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوتی رہیں اور پھر وفات سے چند روز پہلے آپؐ نے حضرت اسامہؓ کی قیادت میں ایک لشکر رومیوں سے جہاد کے لیے تیار کیا، جو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں روانہ ہوا۔ (نیز دیکھیے: تبوک)

تحریر: عرفان غازی

غسّان: بنی غسّان ایک قبیلہ کا نام ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحرائے شام میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ مذہب کے عیسائی تھے اور ہرقل روم کے باج گزار تھے۔ ۸ھ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ بنی غسان کے پاس ایک قاصد دعوت اسلام کے لیے بھیجا جس کو ان لوگوں نے بین الاقوامی دستور کے خلاف قتل کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہؓ کی جمعیت ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے بھیجی۔ اُدھر مخالفین نے ایک لاکھ فوج مقابلہ کے لیے جمع کر لی۔ موتہ کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں نے سخت نقصان اٹھایا اور زید ابن حارثہ اور جعفر ابن ابی طالب اور عبداللہ ابن رواحہ جیسے نامی گرامی سپہ گر یکے بعد دیگرے کمال دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے۔ آخر فوج کی کمان خالد بن ولید کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے اپنی خداداد قابلیت اور شجاعت سے ایک دن کامل محاربہ و مقاتلہ کے بعد دوسرے دن صبح ہوتے ہی دشمن کی فوج میں کھلبلی ڈال دی۔ اور مخالفین کو تتر بتر کر دیا اور اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ اسی فتح سے خوش ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ کو سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا۔

غُسل (ل)، تمام بدن کا دھونا۔ بعض خاص صورتوں کی حکمی نجاست کے ازالہ کو غسل کہتے ہیں۔ غسل کی کیفیت اس حدیث سے خوب واضح ہوتی ہے۔ حضرت میمونہ کہتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے لیے پانی رکھا اور کپڑے کا پردہ کیا۔ حضرتؐ نے پہلے دونوں ہاتھ تین دفعہ دھوئے، پھر داہنے ہاتھ سے بائیں پر پانی ڈال کر ستر دھویا اور رانوں پر پانی بہایا اور وہاں سے علیحدہ ہو کر دونوں پاؤں مبارک دھوئے۔ ایک وقت میں کئی عورتوں یا ایک ہی عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے ایک ہی غسل واجب ہوتا ہے۔ غسل کرتے وقت اگر ایک بال بھی سوکھا رہ جائے۔ تو پھر سے غسل کرنا پڑے گا۔ ہاں اگر کچھ بدن خشک رہ جائے اور نماز سے پیشتر اپنا تر ہاتھ اس پر پھیر دیا، تو یہی غسل کفایت کرے گا۔

عورت کو غسل جنابت کے لیے بالوں کی مینڈھیاں کھولنے کی ضرورت نہیں صرف بالوں کی جڑیں تر کر لینا کافی ہے۔

کھلے میدان میں جہاں آبادی ہو، ننگا نہانا حرام ہے۔ البتہ غسل خانے میں یا کسی آڑ یا پردک میں ننگے نہانے کا مضائقہ نہیں۔ غسل میں چار پانچ سیر پانی سے زیادہ صرف نہ کریں۔ شریعت اسلامی میں نو طرح کے غسل ہیں:

۱۔ عورت کو حیض و نفاس سے فارغ ہونے کے بعد۔

۲۔ مرد و عورت کو ہم بستری یا احتلام کے بعد۔

۳۔ جمعہ کے دن، نماز جمعہ کے لیے۔

۴۔ کسی شخص کو مشرف باسلام ہوتے وقت۔

۵۔ عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن، عید گاہ جانے سے پیشتر۔

۶۔ حج کا احرام باندھتے وقت۔

۷۔ بیت اللہ میں داخل ہوتے وقت۔

Marfat.com

۸۔ سینگی لگوانے کے بعد۔
۹۔ مردہ نہلانے کے بعد۔

پہلی قسم کے دو غسل فرض ہیں اور نمبر ۳ سے ۵ سنت مؤکدہ۔ اور نمبر ۶ و ۷ کے دونوں غسل سنت مستحبّہ اور آخر کے دو غسل احتیاطی ہیں۔ آدمی کے لیے یہ بھی مستحب ہے کہ ہر ہفتے میں کم از کم ایک روز سر اور سارا بدن دھو ڈالے۔

غَسل (غین کی فتحہ سے) معنے دھونا۔ نجاست کو دُور کرنا جس کا قرآن مجید کی اس آیت میں آیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ (الی) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۰ (س۔ مائدہ۔ ۶۱) مسلمانو! جب تم نماز پڑھنا چاہو (اور بے وضو ہو) تو اپنے منہ دھو ڈالو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو ڈالو اور اپنے سر پر مسح کرو اور پاؤں کو دونوں ٹخنوں تک دھو ڈالو۔ اور اگر تم کو نہانے حاجت ہو تو اچھی طرح پاک ہو جاؤ اور جو تم بیمار ہو، یا تم میں سے کوئی پاخانہ پھر کر آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو اور پانی نہ پاؤ، تو پاک مٹی کا قصد کرو اور منہ اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ اللہ تعالیٰ تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، بلکہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے اور اپنا احسان تم پر پورا کرنا۔ اس لیے کہ تم شکر کرو۔

تمام مذاہب اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان آدمی کو نجاست ظاہری کے علاوہ نجاست حکمی (ناپاکی) کی صورتوں میں بھی بدن پاک کرنا واجب ہے۔ ۱۔ حیض ۲۔ نفاس ۳۔ انزال منی ۴۔ جماع۔

شرعی غسل یعنی نہانے کا وہ طریقہ جو سنت کے موافق یا شرعی حکم کے مطابق ہے شرع کا حکم ہے کہ بعض حالتوں میں [illegible] ست کے ساتھ جسم اور بال بال کی جڑ میں پانی پہنچانا شرعاً فرض ہے [illegible] جنب کی حالت میں یا حیض یا نفاس کا خون بند ہو جانے کے بعد غسل کے مواقع تو ہیں۔ ان میں سے تین موقعوں پر غسل کرنا فرض ہے۔

۱۔ جنابت یعنی منی کا جوش کے ساتھ نکلنا یا حشفہ کا مقعد کی آگے یا پیچھے کی راہ میں غائب ہونا۔
۲۔ حیض کا خون آنا۔
۳۔ نفاس کا خون آنا۔

ایک موقع پر غسل واجب ہے اور وہ میت کا غسل ہے۔ چار موقعوں پر غسل کرنا سنت ہے:
۱۔ جمعہ کے روز۔
۲۔ عید کے روز۔
۳۔ عرفہ کے روز۔
۴۔ احرام باندھتے وقت۔

ایک موقع پر غسل مستحب ہے اور وہ کفر سے اسلام میں داخل ہوتے وقت ہے۔

شرعی غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوئے پھر استنجا کرے اور اس کے بعد بدن پر جہاں کہیں نجاست لگی ہو دھوئے۔ پھر وضو کرے اور پاؤں کی جگہ زمین پر پانی جمع ہو جاتا ہو تو پاؤں نہ دھوئے۔ پھر سر پر تین چلو پانی ڈالے کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے اس کے بعد سارے بدن پر تین مرتبہ پانی پہنچائے۔ اور پاؤں اگر وضو میں نہیں دھوئے تھے تو آخر میں دھوئے۔ غسل میں بدن کو ملنا شرط نہیں ہے البتہ اگر بال کے برابر بھی کوئی جگہ خشک رہ گئی تو غسل نہ ہوگا۔

غشاوة: آنکھوں کا پردہ۔ سورہ بقر کی آغاز کی آیات میں آیا ہے۔ ان کے دلوں پر اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کو بڑا عذاب دیا جانے والا ہے۔

غصب: چھیننا، جبراً لے لینا۔ ظلماً وصول کرنا۔ شریعت نے اس قسم کے لین دین کی سخت ممانعت کی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ "مسلمانو! آپس میں (ناجائز) ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ یا کرو۔ ہاں آپس کی رضامندی سے تجارت ہو اور اس میں کچھ ہاتھ لگ جائے تو وہ ناروا نہیں"۔

سعید ابن زید سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص بالشت بھر زمین بھی زور و ظلم سے لے لیگا۔ قیامت کے دن اس قطعہ زمین کو ساتوں زمین کی انتہا سے لے کر طوق بنایا جائے گا اور اس کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ اور فرمایا! لوگو خبردار! ظلم نہ کرو اور کسی شخص کا مال اس کی خوشی اور رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے ایسی چیز غصب کر لے جس کی شکل ہو، خواہ وہ چیز جو موزونات و مکیلات کی قسم سے ہو اور اس کے پاس وہ تلف ہو جائے تو اس کے برابر اسی قسم کی چیز کے دینے کا ذمہ دار ہوگا۔ غاصب کو مجبور کیا جائے گا کہ غصب کردہ چیز واپس دے دے۔ اگر کوئی شخص کسی کی بکری غصب کر کے ذبح کر دے تو مالک کو اختیار ہے خواہ اُس کی قیمت لے اور جو نقصان ہوا ہے وہ بھی وصول کرے اور پھر اس کے حوالے کرے یا بکری بھی لے لے۔ غاصب کو حلال نہیں ہے کہ شے مغصوب سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے۔

غضب: غصہ میں آنا، خشمناک ہونا، کرودھ کرنا، بھڑک اٹھنا۔ اللہ نے انسان کو غضب فرو کرنے اور غصہ کو دبانے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے (یعنی جنت تیار ہے پرہیزگاروں) اور غصہ کو فرو کرنے والوں کے لیے اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے"۔

ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے اصل پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے (صحیح) یہ بھی روایت ہے کہ فرمایا! آنحضرتؐ نے غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے (دمشق)

یہ بھی روایت ہے کہ فرمایا آپؐ نے غضب شیطان (کے بہکانے) سے پیدا ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی ہی سے بجھائی جاتی ہے تو جب کوئی تم میں سے غصے میں آئے تو اسے وضو کرنا چاہیئے۔

غفار۔ دیکھیے: اسمائے حسنیٰ

غفار: بنو کنانہ میں سے ایک شخص تھا غفار بن ملیک بن بکر بن عبد مناف بن کنانہ۔ اس کی اولاد قبیلہ بنی غفار کے نام سے مشہور ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اسی قبیلے سے تھے۔

غفور: بخشنے والا۔ خدا تعالیٰ کا نام ہے اور اس کے اور غفار کے ایک ہی معنی ہیں، مگر غفور میں مبالغہ ہے یعنی بڑے بڑے گناہ بخشنے اور اس کی بخشش اتم و اکمل ہو۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بندوں کے گناہ اعمالناموں سے محو کر دینے یعنی جناب

Marfat.com

[illegible] کرے کیونکہ غفور کے معنی مٹانے اور
[illegible] قرآن مجید کی سورۃ فاطر رکوع ۵ میں یہ تقاضا یوں آیا ہے۔
ترجمہ: بے شک اللہ آسمانوں کو اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ کہیں اپنی جگہ سے
ٹل (نہ) جائیں اور اگر بالفرض ٹل جائیں تو پھر اس کے سوا کوئی بھی نہیں جو ان کو تھام
سکے۔ بے شک اللہ (بڑا) تحمل والا (بندوں کے گناہوں کا) بخشنے والا ہے۔

غلاف کعبہ وہ سیاہ مخملی اور ریشمی کپڑا، جو خانہ کعبہ پر چڑھا رہتا ہے
یہ غلاف ایک سال کعبے پر چڑھا رہتا ہے۔ اگلے سال نیا غلاف چڑھانے سے پہلے اتار
لیا جاتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر حاجیوں میں تبرکاً بانٹ دیئے جاتے
ہیں اور نیا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کعبے کو آب زمزم سے غسل دیا جاتا
ہے اور پھر عرق گلاب چھڑکا جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی کعبے پر غلاف چڑھانے کی رسم ادا کی جاتی تھی جس کو آنحضرتؐ
نے بھی جاری رکھا۔ رسول اکرمؐ کے زمانے میں دھاری دار غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ کوئی
ایک ہزار سال تک مصر سے غلاف کعبہ تیار ہو کر آتا رہا۔ وہ لوگ بڑی عقیدت و محبت
سے تیار کیا کرتے تھے اور بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے اسے مکہ معظمہ لایا جاتا
تھا۔ حکومت مصر نے یہ کام محکمہ اوقاف کے سپرد کر رکھا تھا، مگر جب مصر پر صدر
ناصر برسر اقتدار آئے، تو سعودی عرب اور مصر میں شدید اختلاف پیدا ہو گئے چنانچہ
سعودی حکومت نے غلاف کعبہ لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ سعادت پاکستان
کے حصے میں آئی اور یہاں کے کاریگروں نے بڑی محنت اور عقیدت سے غلاف کعبہ
تیار کیا۔ پورے ملک میں اس کی نمائش ہوئی اور عوام نے ہر جگہ اس کا پرجوش استقبال
کیا۔ غلاف کعبہ میں زری کے تاروں سے قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ عربی
زبان میں اس غلاف کو قصوی اور دروازے کے کپڑے کو برقعہ کہتے ہیں۔

غلام۔ لونڈ۔ بردہ۔ قرآن میں لونڈی غلاموں کا ان آیتوں میں ذکر آیا ہے:
(۱)۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ تا لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ۔ (مائدہ۔ ع ۱۲) تمہاری
تمہاری قسموں میں جو لا یعنی ہیں ان پہ تو خدا تم سے (کچھ) مواخذہ کرتا نہیں۔ ان
پکی قسم کھاؤ (اور پھر اس کے خلاف کرو) تو خدا تم سے (اس کا) مواخذہ کرے
گا۔ تو (اس پکی قسم کے توڑنے) کا کفارہ دس مسکینوں کو متوسط درجے کا کھانا کھلا
دینا ہے۔ جیسا تم اپنے اہل و عیال کو کھلایا کرتے ہو۔ یا ان (ہی دس مسکینوں) کو
کپڑا بنا دینا یا ایک بردہ آزاد کر دینا۔ پھر جس کو (بردہ) میسر نہ ہو تو تین دن کے
روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم (تو) کھا لو (اور اس
میں پورے نہ اترو) اور اپنی قسموں (کے پورا کرنے) کی احتیاط رکھو۔ اس طرح
اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم اس کی شکر گزاری
کرو۔ (کہ وہ تم کو ادب سکھاتا ہے۔)
۲۔ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تا وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ٥ (مجادلہ۔ ع ۱) اور وہ لوگ اپنی بیبیوں سے
ظہار کرتے ہیں۔ پھر پلٹ کر وہی کام کرنا چاہتے ہیں جس کو کہہ چکے ہیں (کہ نہیں کریں
گے) تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے (مرد کو) ایک بردہ آزاد کرنا چاہیئے
(ایسا فرمایا) تم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے (تاکہ اس پہ کاربند رہو) اور جو کچھ بھی
تم کرتے ہو اللہ کو اس کی (سب) خبر ہے۔

۳۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ٥ اَوْ اِطْعَامٌ تا ذَا مَتْرَبَةٍ ٥ (س۔ بلد۔ ع ۱)
ترجمہ (گھاٹی سے مراد ہے کسی) گردن کا (غلامی یا قرض کے پھندے سے) چھڑا
دینا یا بھوک کے دن یتیم (کو خاص کر جب کہ وہ اپنا) رشتہ دار (بھی ہو)
یا محتاج خاک نشین کو (کھانا کھلانا)۔
۴۔ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ تا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥
(س۔ نور۔ ع ۴) اور (مسلمانو!) اپنی رانڈوں کے نکاح کر دو۔ اور اپنے
غلاموں اور لونڈیوں میں سے ان کے جو نیک بخت ہوں۔ اگر یہ لوگ محتاج ہوں
گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش والا (اور سب کے
حال سے) واقف ہے۔
۵۔ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ تا الَّذِيْ اٰتٰىكُمْ
(س۔ نور۔ ع ۴) اور (مسلمانو!) تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی غلاموں) میں
سے جو مکاتبت کے خواہاں ہوں تو تم ان کے ساتھ مکاتبت کر لیا کرو بشرطیکہ
تم ان میں بہتری (کے آثار) پاؤ اور مال خدا میں سے جو اس نے تم کو دے رکھا
ہے ان کو (بھی) دو۔
۶۔ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ تا غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥
(س۔ نور۔ ع ۴) اور (لوگو!) تمہاری لونڈیاں جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں
ان کو دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے کی غرض سے حرامکاری پہ مجبور نہ کرو۔
اور جو ان کو مجبور نہ کرو۔ اور جو ان کو مجبور کرے گا تو اللہ ان کے مجبور کئے گئے
پیچھے نہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(۱) براء ابن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بادیہ نشین جناب رسول اللہؐ کی
خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ مجھے کوئی ایسا کام بتا دیجیے جو مجھے جنت
میں لے جا داخل کرے۔ فرمایا۔ تو نے اگرچہ کلام میں بہت اختصار کیا ہے مگر تیرا
سوال بڑا لمبا چوڑا ہے۔ اچھا تو تو بردہ آزاد کر اور گردن خلاص کر۔ (بیہقی)
(۲)۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈی کو کہا
کرتا تھا کہ جا اور ہمارے لیے خرچی کی کمائی سے کچھ لے آ۔ اس پہ خدا تعالٰی
نے آیت وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا
نازل فرمائی۔ (مس)
(۳)۔ ابو ایوبؓ کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسول خداؐ کو فرماتے سنا کہ جو شخص
(لونڈی) ماں اور اس کے فرزند میں جدائی ڈالے گا (مثلاً ماں کو فروخت کر دے
اور اس کے فرزند کو رہنے دے۔ یا فرزند کو بیچ ڈالے اور ماں کو رہنے دے یا
ایک کو ایک کے ہاتھ اور دوسرے کو دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالے) تو خدا قیامت
کے دن اس میں اور اس کے پیاروں میں جدائی ڈال دے گا۔ (تر)
(۴) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ مجھے جناب رسول خداؐ نے دو غلام عطا کئے جو
دونوں بھائی بھائی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو فروخت کر دیا۔ پیغمبر خداؐ
نے مجھ سے فرمایا۔ علی! تمہارا غلام کیا ہوا۔ میں نے اسے بیچ دینے کی خبر دی۔
فرمایا۔ (بیع کو رد کر کے) اسے پھیر لو! بیع کو فسخ کر کے۔ (تر)
(۵)۔ ابو موسٰیؓ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبر خداؐ نے ان لوگوں پر
لعنت پر لعنت کی جو باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں جدائی ڈالیں۔ (ابن)
(۶) ام المومنین حضرت ام سلمہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

Marfat.com

کرتی ہیں کہ آپ اپنی مرض وفات میں فرماتے تھے کہ (لوگو!) نماز کی پوری پوری محافظت کرنا۔ اور لونڈی غلاموں کے حقوق کی رعایت کرتے اور ان کے ساتھ ہمیشہ نرمی کے ساتھ پیش آتے رہنا۔ (مسند امام احمد)

(۷)۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا نے فرمایا کہ (لوگو!) جب تم میں سے کسی کا خادم اس کے لیے کھانا تیار کرکے لائے۔ حالانکہ اس نے آگ کے سامنے بیٹھ کر آگ کی گرمی اور دھوئیں کی تکلیف اٹھائی ہے تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر اس کے ساتھ کھانا کھائے۔ اگر کھانا بہت ہی کم اور تھوڑا ہو تو اس میں سے خدمت گار کے ہاتھ پہ ایک لقمہ یا دو لقمے رکھ دے۔ (مس)

(۸)۔ حضرت جابرؓ جناب نبی اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا جس میں تین خصلتیں ہوتی ہیں خدا اس کی موت آسان کر دیتا ہے۔ اور (آخرت میں) اسے اپنی جنت میں داخل کرے گا۔ (۱) ناتوانوں اور مسکینوں کے ساتھ نرمی کرنا۔ (۲) ماں باپ کے ساتھ نیکی اور مہربانی سے پیش آنا۔ (۳) لونڈی غلاموں کے ساتھ نیکی خوش خلقی۔ (تر)

(۹) لیث کے بیٹے رافع سے روایت ہے کہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لونڈی غلاموں کے ساتھ نیک خوئی سے برتاؤ کرنا موجب برکت ہے اور بدخلقی سے پیش آنا باعث بے برکتی۔ (ابو)

(۱۰) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (لوگو) میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں بدترین لوگ کون ہیں۔ وہ جو تنہا کھاتا اور اپنے غلام کو تازیانہ مارتا اور اپنی بخشش اس سے روک لیتا یعنی کچھ نہیں دیتا ہے۔ (مس)

(۱۱) معرور بن سوید کہتے ہیں۔ میں نے ابو ذر غفاری کو دیکھا کہ وہ ایک حلّہ (جوڑا) پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ویسا ہی حلّہ پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ویسا ہی حلّہ پہنے ہوئے تھا۔ جب ہم نے اس کی وجہ دریافت کی تو کہا مجھ میں اور ایک شخص میں گالی گلوچ ہو گئی تھی۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت جا لگائی۔ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا! ابوذر! کیا تم نے اسے ماں کی گالی دی ہے۔ پھر فرمایا کہ (تمہارے لونڈی غلام جو باعتبار آدم زاد ہونے کے تمہارے) بھائی (ہیں) تمہارے اعوان و انصار ہیں۔ خدا نے ان کو تمہارے قبضے میں کر دیا ہے تو جس کا بھائی اس کے قبضے میں ہو اسے چاہیئے کہ جیسا خود کھاتا ہے اسے کھلائے جیسا خود پہنتا ہے اسے پہنائے۔ (بخ)

(۱۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لونڈی غلام کا کھانا کپڑا اس کا حق ہے اور وہ (یعنی لونڈی غلام) اسی چیز کی تکلیف دیے جائیں جو ان کے بس کی ہو۔ (مس)

(۱۳)۔ ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ لونڈی غلام تمہارے بھائی (بہن) ہیں۔ خدا نے انھیں تمہارا زیر دست کر دیا ہے۔ تو جس کے بھائی (بہن) کو خدا اس کا زیر دست کر دے تو اسی قسم کا کھانا اسے کھلائے جس قسم کا خود کھاتا ہے اور اسی قسم کا لباس پہنائے جیسا آپ پہنتا ہے اور کسی ایسے کام کی (اوّل تو) تکلیف (ہی) نہ دے جو اس پہ غالب آ جائے۔ (اور کرتے بن نہ پڑے) اور اگر (احیاناً ایسے کام کی) تکلیف دے (بھی) جو اس کی طاقت سے باہر ہو تو خود اس کی مدد کرے۔ (صحیح)

(۱۴)۔ روایت ہے کہ عبد اللہ بن عمر کے پاس ان کا داروغہ آیا تو انھوں نے فرمایا کیا تو غلاموں کو ان کی قوت دے آیا ہے۔ داروغہ نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو جلد جا اور انہیں ان کی قوت دے۔ کیونکہ جناب پیغمبر خداؐ نے فرمایا ہے کہ آدمی کو ایک [illegible]

(۱۵) ابو مسعود الانصاری کہتے ہیں کہ [illegible] غلام کو [illegible] پیچھے سے آواز آئی کہ ابو مسعود! [illegible] میں نے جو منہ موڑ کر دیکھا تو جناب پیغمبر خداؐ [illegible] عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اس غلام کو میں نے خدا کی خوشنودی کے لیے آزاد کر دیا۔ فرمایا۔ اگر تو ایسا نہ کرتا تو دوزخ کی آگ تجھے جھلس دیتی۔ (مس)

(۱۶) ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے جناب پیغمبر خداؐ کو فرماتے سنا۔ کہ جو شخص اپنے غلام کو حدّ مارے حالانکہ غلام اس (گناہ) کا مرتکب نہیں ہوا ہے۔ (جو موجب حد ہے) یا (ناحق) اس کو طمانچہ مارے تو اس کا کفارہ بس یہی ہے کہ غلام کو آزاد کر دے۔ (مسلم)

(۱۷) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے جناب ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جو شخص اپنی لونڈی غلام کو عیب لگا بیٹھے حالانکہ وہ (اس عیب) سے بری ہے تو عیب لگانے والا قیامت کے روز تہمت لگانے کی حد مارا جائے گا۔ ہاں اگر لونڈی غلام ویسا ہی ہو جیسا اس نے کہا ہے تو اس صورت میں اس پہ کچھ الزام نہیں۔ (صحیح)

(۱۸) حضرت عمرؓ کے فرزند عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم خدمت گاروں کے قصوروں سے کتنی دفعہ درگزر کیا کریں۔ رسول خداؐ خاموش ہو رہے۔ اس نے پھر اسی بات کو دہرایا۔ حضورؐ اب بھی خاموش ہو رہے۔ تیسری مرتبہ جب اس نے دریافت کیا تو فرمایا۔ ہر روز ستر دفعہ درگزر کیا کرو۔ (ابو۔ تر)۔

مکاتب کے سوا دوسرے غلاموں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ امام صاحب کے نزدیک مکاتب کی کھیتی میں عشر واجب ہے۔ اس کے سوا اس کے اور کسی مال میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ امام ابو ثور کے نزدیک مکاتب پہ مطلقاً زکوٰۃ واجب ہے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک مکاتب پہ زکوٰۃ واجب نہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ بیٹے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ (س-آل عمران-ع۴) عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میرے ہاں کیسے لڑکا ہو سکتا ہے اور (میرا حال یہ ہے کہ) مجھ پہ بڑھاپا آ چکا ہے۔ اور میری بی بی بانجھ ہے :

غلام احمد قادیانی

غلام احمد قادیانی : (۱۸۳۷ء۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء) جماعت احمدیہ کے بانی۔ قادیان ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر ملازم ہو گئے، لیکن چند سال کے بعد مستعفی ہو گئے۔ سیالکوٹ کے دوران قیام ہی میں مذہبی امور سے اُن کی دلچسپی بڑھی اور عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں سے مباحثے اور مناظرے کرنے لگے۔ پھر ۱۸۹۱ء میں آپ نے مہدی اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حضرت مسیحؑ کے متعلق احمدیہ جماعت کا عقیدہ ہے کہ انہیں نہ آسمان پر اٹھایا گیا اور نہ وہ مصلوب ہوئے، بلکہ وہ کشمیر میں آ کر اپنی طبعی موت مرے۔ ۱۸۹۲ء میں مرزا صاحب نے قادیان سے رسالہ "ریویو آف ریلیجنز" جاری کیا اور اسے اپنے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ اب اُن کا بیشتر وقت مباحثوں، مباہلوں، پیش گوئیوں اور تصنیف و تالیف میں گزرنے لگا۔ مرزا صاحب نے بے شمار کتابیں لکھیں اور پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور اعلان کیا کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ لاہور میں ہیضہ سے مرزا صاحب کا انتقال ہوا۔ لاش

Marfat.com

قادیان میں ... مرزا صاحب نے نہ صرف مسیح موعود، مہدی اور نبی ہونے کا دعویٰ کیا ... اور کوئی کرشن ... بھی ہیں ... ان کے ان دعوؤں سے مسلمانوں میں ... پھیل گئی۔ ... احمدیوں کو ... مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے تمام زندگی تنسیخ جہاد اور انگریزوں کی وفاداری و اطاعت کی تلقین کی۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا)

احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا عوامی مطالبہ ہمیشہ جاری رہا۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان میں تحریک چلی جو کچل دی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں پھر زبردست تحریک چلی جس کے نتیجے میں پاکستان کی وفاقی پارلیمنٹ نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ (نیز دیکھئے احمدیہ جماعت)

غلام حسن شاہ

(۱۲۷۲ھ-۱۳۲۷ھ) عارف کامل اور درویش بزرگ فخرِ اولیاء حضرت پیر پٹھان خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی کی وفات کے پانچ سال بعد ۱۲۷۲ھ تونسہ شریف کے نواح اور درۂ سلیمان کے دامن میں آباد برسوں کے قدیمی قصبہ مندرانی میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسمِ گرامی سید محمد عنایت اللہ شاہ بخاری تھا جن کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ دینی علوم حافظ سو ہانزا اور اپنے دادا حضرت نور شاہ بخاری سے حاصل کئے اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت حجۃ الاسلام حضرت خواجہ شاہ اللہ بخش تونسوی سلیمانی سے کی پھر اس قدر قرب پایا کہ سفر و حضر میں اپنے مرشد کی رفاقت میں رہتے تھے۔

حرمین شریفین کا سفر اور اجمیر شریف، دہلی وغیرہ کا سفر آپ کی رفاقت میں کیا۔ ہزاروں ہندو آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ لاتعداد پہاڑی لوگ آپ کے ہاتھ پر دینِ اسلام کی برکتوں سے مالامال ہوئے آج بھی کوہ سلیمان میں بسنے والے ہزاروں خانہ بدوش آپ سے نسبت کو سعادتِ ازلی شمار کرتے ہیں۔ مرزا قادیانی کے خلاف آپ نے بھرپور کام کیا۔

۱۷ صفر المظفر ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۰۹ء بروز بدھ انتقال فرمایا۔ مادۂ تاریخ وفات یوں ہے:

قطب اقطاب زمن شاہ حسن
۱۳۲۷ھ

غلام قادر

(۱۸۴۲ء-۱۹۲۶ء) سلسلہ قادریہ کے بزرگ کامل۔ جالندھر میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا بڑے ہوئے تو پیر قادری سے بیعت کی۔ ملٹری ہیڈ کوارٹر ز شملہ میں ملازم تھے وہاں سے پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے مولانا غلام قادر گرامی آپ کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

آپ نہایت حلیم الطبع اور خوش گفتار تھے۔ آپ کے خلفاء میں حضرت بابا محمد حسین قادری (وفات ۱۹۱۲ء) بہت مشہور ہیں آپ کا وصال بعمر ۸۳ سال جالندھر میں ہوا۔ آپ کے بعد میاں شمس الحق قادری آپ کے فرزند سجادہ نشین ہوئے۔

غلام مصطفیٰ نوشاہی

مولانا سید (۱۸۹۰ء-۱۹۶۵ء) نوشاہ ثالث جید عالم، بزرگ کامل، عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے شاعر اور نثر نگار

نام غلام مصطفیٰ، کنیت ابوالشریف اور تخلص و لقب نوشاہی تھا۔ آپ حضرت سید حافظ محمد شاہ صاحب نیک اختر کے فرزند ارجمند، مرید خلیفہ اعظم اور سجادہ نشین تھے آپ کی ولادت ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ علم ادب کی فارسی درسی کتابیں پڑھیں پھر مولانا محمد شیخ احمد سے صرف، نحو اور منطق حاصل کیا۔ علم تجوید کے قواعد حافظ عالم دین صاحب اگرو یہ والے سے سیکھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف میں آپ نے خاص ملکہ حاصل کیا۔

آپ کی بیعت طریقت اپنے والد بزرگوار کے ساتھ تھی اور سلسلہ آبائیہ میں خلافت یافتہ تھے۔

آپ کو خواب اور بیداری میں اکثر مرتبہ رسول اکرم ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ دیگر انبیائے کرام اور صحابہ عظام اور اولیاء کی زیارتیں اکثر آپ کو ہوتی رہتی تھیں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت اکثر فرماتے تھے ہر روز ختم کیا کرتے۔ کلمہ طیبہ اور درود شریف کئی ہزار مرتبہ آپ کا روزانہ ورد تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور تاریخ سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ دینی اور تبلیغی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ کی علمی، ادبی اور تاریخی خدمات یادگار ہیں۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں جو مفید خاص و عام ہیں۔

۱۔ فیض محمد شاہی۔ دس جلدیں (۲) پنج گنج نوشاہی (۳) دیوان شاہی (۴) ترجمہ گلستان سعدیؒ (۵) ترجمہ بوستان سعدیؒ اور دیگر تصانیف و تراجم آپ کا مزار بمقام ساہن پال ضلع گجرات میں موجود ہے۔

غلام نظام الدین

اسم گرامی غلام نظام الدین سکنا تونسوی ملکاً سنی حنفی مشرباً چشتی نظامی والد ماجد کا نام حضرت خواجہ محمد محمود چراغ سلیمانی تھا۔ جد امجد حجۃ الاسلام حضرت خواجہ شاہ اللہ بخش تونسویؒ تھے جد اعلیٰ شہرہ آفاق شیخ طریقت حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں بقول سرسید احمد خاں جن کی شہرت قاف سے قاف تک محیط ہے۔

حضرت مولانا علی گوہر چشتی علامہ احمد جراج سے دینی علوم کی تکمیل کی اور علم معرفت کی دولت اپنے والد محترم حضرت چراغ سلیمانیؒ سے پائی۔ اکیس برس کی عمر میں مسند ارشاد پہ رونق افروز ہوئے اور مختصر مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو برسوں کی ریاضت و مجاہدہ سے بھی دوسرے سالکان طریقت کو نصیب نہیں ہوئے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جو بھی کوششیں آپ ان میں پیش پیش رہے۔ تحریک ختم نبوت میں مشائخ کرام کو خانقاہوں سے کھینچ کر باہر لائے۔ کراچی میں منعقدہ آل پاکستان مشائخ کانفرنس میں ایوب خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قرآنی دستور کی قباحتوں اور حکمرانوں کی حیلہ بازیوں کو واشگاف کیا۔

علامہ اقبال اسی خوبی کی بنا پر آپ سے بے پناہ محبت رکھتے تھے اور متعدد مرتبہ راجہ حسن اختر اور دیگر ساتھیوں کو فرمایا۔ "تونسہ شریف کے یہ صاحبزادے بہت بلند مقام کے مالک ہیں۔" نواب فتح اللہ خاں علیزئی لکھتے

Marfat.com

غلام نظام الدین

ہیں۔ میرے مکان منزلِ عشقیہ لاہور میں حضرت موصوف رونق افروز تھے علامہ اقبال آپ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور حسنِ عقیدت اور جوشِ محبت کا اظہار فرمایا۔

۱۹۶۴ء میں صدر ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن میں محترمہ کی حمایت میں ملک بھر کا طوفانی دورہ کیا۔ آپ کے مریدوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم ہیں جن کا سلسلہ برصغیر پاک و ہند کے علاوہ مسلم ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ سعودی عرب اور کابل میں لاکھوں کی تعداد میں آپ کے حلقہ بگوش پائے جاتے ہیں۔

۷ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق ۷ جون ۱۹۶۵ء بروز منگل واصل بحق ہوئے۔ مادۂ تاریخ وفات یہ ہے۔

کاملِ اکمل پیر نظامؒ

۱۳۸۵ھ

غلمان۔ غلام کی جمع، جس کے معنی لڑکے کے ہیں۔ قرآن مجید میں جنّت کی نعمتوں کے سلسلے میں حوروں کے ساتھ غلمان کا بھی ذکر ہے۔ ایک دو جگہ ان کو ولدان بھی کہا گیا ہے۔ نیز ان کو دُرِ مکنون سے تشبیہ دی گئی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بچے اہل جنّت کے وہ فرزند ہوں گے جو صغر سنی میں انتقال کر گئے تھے، لیکن اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ جس طرح جنّت کی اور نعمتیں ہیں، اسی طرح اہل جنّت کی دلجوئی کے واسطے یہ لڑکے ہوں گے، جو معصوم بھی ہوں گے اور دیکھنے میں خوبصورت بھی ہوں گے (نیز دیکھئے حُور)

غلول۔ دغا، فریب، مکر، دھوکہ۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا جس کی شریعت سے سخت ممانعت کی ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ آل عمران کے رکوع ۱۷ میں ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥ "اور پیغمبر (کی شان) سے (نہایت) بعید ہے کہ (پیغمبر ہو کر) خیانت کرے۔ اور جو (جرم) خیانت کا مرتکب ہوگا۔ تو جو چیز خیانت کی ہے قیامت کے دن (خدا کے روبرو) بعینہٖ وہی چیز اس کو لا حاضر کرنی ہوگی۔ پھر جس نے جیسا کیا ہے اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر (کسی طرح کا زور) ظلم نہیں ہوگا۔"

غم۔ خدا کے نیک بندوں پر خدا کی طرف سے طرح طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہوتی رہتی ہیں جن سے ان کا امتحان مقصود ہوتا ہے اور یہ دکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ یہ لوگ جو خدا کی محبت کا دم بھرتے ہیں یہ اپنے دعوے میں کہاں تک سچے ہیں جس قدر اولیاء اللہ اور دوسرے نیک بندے گزرے ہیں وہ ہمیشہ رہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ غم سے دل ایسا صاف ہو جاتا ہے جیسے صابن سے کپڑا۔ قرآن و حدیث میں غم کے بے شمار فائدے مذکور ہوئے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۃ ۲۔ آیت ۱۵۵، ۱۵۶۔ رکوع ۱۹ میں اس کا ذکر یوں آیا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ تا رَاجِعُوْنَ ٥ اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جان اور پیداوار (اراضی) کی کمی سے آزمائیں گے۔ اور (اے پیغمبر) صبر کرنے والوں کو (خوشنودی خدا اور کشائش کی) خوشخبری سنا دو۔ یہ لوگ جب ان پر مصیبت آپڑتی ہے تو بول اٹھتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔

غمرات۔ جمع غمرہ۔ گرداب۔ [illegible] سختی موت کی بیہوشی۔ آخری معنوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں یوں آیا ہے: وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ (س۔ انعام۔ ع ۱۱)۔ "اور (اے پیغمبر) کاش تم (ان) ظالموں کو اس وقت دیکھو کہ موت کی بیہوشیوں میں (پڑے) ہیں اور فرشتے (ان کی جان نکالنے کے لیے طرح طرح کی) دست درازیاں کر رہے ہیں"۔

غنا و راگ۔ اس مسئلے میں آیات و احادیث متعارض واقع ہوئی ہیں۔ اللہ تعالٰے فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ تا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ٥ یعنی بعض آدمی وہ ہے جو بیہودہ بات خرید کرتا ہے تاکہ خدا کے راستے سے گمراہ کرے بغیر علم کے اور اس کو مسخری بنائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔" یہ آیت راگ کی حرمت میں وارد ہوئی ہے۔

(۱)۔ ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، جب کبھی کوئی راگ سے اپنی آواز بلند کرتا ہے تو اللہ تعالٰے اس کے کندھوں پر دو شیطان بھیج دیتا ہے جو اس کے سینے پر اپنی ایڑیاں مارتے ہیں، یہاں تک کہ وہ راگ سے باز آتا ہے۔ (الکبیر للطبرانی)

(۲) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالٰے نے عزّ و جل گانے والی لونڈی کو اور اس کی خریداری کو اور اس کی قیمت کو اور اس کی تعلیم کو حرام کر دیا ہے۔ (اوسط للطبرانی)

(۳)۔ ابومالک اشعری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کہ میری امّت میں ایسے گروہ ہوں گے جو شراب اور ریشمی لباس اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔ (بخ)

(۴)۔ قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: کہ اللہ تعالٰے نے مجھ پر شراب اور سامان لہو اور مطرب عورتیں حرام کر دی ہیں۔

(۵) ابوالشیخ نے مکحول کی روایت سے رسول اللہؐ سے بطور مرسل روایت کیا ہے کہ باجوں کا سننا گناہ ہے اور ابوداؤد ابن عمرؓ سے روایت کرتا ہے کہ ابن عمر کو مزمار کی گت سنائی دی، تو آپ نے دونوں ہاتھوں کی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں پر رکھ لیں۔

(۶) عقبہ بن عامر سے اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ مسلمان کا کھیلنا باطل (یعنی حرام) ہے مگر تین کو قعوں پر (یعنی اپنی کمان سے (تیراندازی کی) مشق کرنا اور اپنے گھوڑے سے سدھانا اور اپنی بیبیوں سے دل لگی کرنا۔

(۷) حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا راگ دل میں نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتی ہے۔ (شعب الایمان)

راگ کے مباح ہونے کی دلیلیں مذکورہ بالا احادیث تو راگ اور باجوں کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں

(۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ و سلم میرے گھر آئے۔ اس وقت میرے پاس دو لڑکیاں جنگِ بعاث کا گیت گا رہی تھیں۔ (ساری حدیث صحیحین میں ہے)۔

Marfat.com

(لغات الصحیم یا مدینہ منورہ کے قریب ایک مقام ہے جہاں اوس اور خزرج کے قبیلوں کی بابت جنگ عظیم واقع ہوئی تھی، پھر صلح ہوگئی اور دونوں قبیلے متفق ہوگئے ۔

اور ایک روایت میں ہے کہ ابوبکر ان کے پاس آئے اور ان کے پاس دو لڑکیاں دف بجاتی اور گاتی تھیں، نبی اکرمؐ نے اپنے کپڑے سے منہ ڈھانپا ہوا تھا۔ توان (لڑکیوں) کو ابوبکرؓ نے منع کیا۔ رسول اللہؐ نے منہ کھول کر فرمایا۔ ابوبکر ان کو چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ خوشی کے دن ہیں۔

(۲) سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ جب نبی اکرمؐ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور بنی نجار کے قبیلے میں فروکش ہوئے تو قبیلہ مذکور کی لڑکیاں اس شعر کے ساتھ گاتی بجاتی تھیں ؎

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِیْ نَجَّارٍ
وَحَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِّنْ جَارٍ

ترجمہ: ہم قبیلہ بنی نجار کی لڑکیاں ہیں اور کیا مبارک بات ہے کہ محمدؐ ہمسایہ ہوں۔

(۳) بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عائشہؓ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیث روایت کی ہے جو آنحضرتؐ کے غزوہ تبوک سے تشریف لانے کے وقت عورتوں کے یہ شعر پڑھنے کے متعلق ہے۔ ؎

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعٰی لِلّٰہِ دَاعٍ

ترجمہ: ثنیات الوداع سے ہم پہ بدر نے طلوع کیا جب تک دعا کرنے والا دعا کرتا رہے گا ہم پہ شکر ہے۔

امام غزالیؒ نے ان کی شعر خوانی دف اور خوش آوازی کے ساتھ بیان کی ہے۔

(۴) محمد بن حاتم سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حرام اور حلال کے درمیان فرق یہ ہے کہ نکاح میں سب دف بجائیں اور گائیں۔

(۵) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ اس نکاح کا اعلان کرو اور اس پہ دف بجاؤ۔

(۶) ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ میرے پاس اس وقت آئے جبکہ میں نکاح کے بعد شوہر کے گھر بھیجی گئی تھی۔ پس میرے فرش پہ بیٹھ گئے۔ لڑکیاں دف بجا بجا کر اپنے باپوں کے مرثیے پڑھنے لگیں جو جنگِ بدر میں کام آئے تھے اور ان میں سے ایک نے یہ مصرعہ کہا۔ " وَفِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ "۔ یعنی ہم میں وہ نبی ہے جو کل کی آنے والی بات جانتا ہے"۔ پس آپ نے فرمایا۔ اس کو چھوڑ اور وہی گا جو پہلے گا رہی تھی۔

(۷) حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت (نکاح کے بعد) شب عروسی میں انصار میں سے ایک آدمی کی طرف (جو اس کا شوہر تھا) بھیجی گئی تو نبی صلعم نے فرمایا کیا تمہارے ساتھ سامانِ سرود نہ تھا۔ کیونکہ انصار کو گانا بجانا اچھا لگتا ہے۔

(۸) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے پاس انصار کی لڑکی تھی جس کا میں نے نکاح کر دیا تھا تو رسول اللہؐ نے فرمایا۔ عائشہ! کیا تو گانے کا سامان نہیں کراتی کیونکہ اس قبیلہ انصار کو گانا پسند ہے۔

(۹) عامر بن سعدؓ سے مروی ہے کہ میں قرضہ بن کعب اور ابن مسعودؓ کے پاس شب نکاح میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں گا رہی ہیں۔ میں نے کہا اے مصاحبانِ رسولؐ اور اہلِ بدر کیا تمہارے ہاں ایسے کام کیے جاتے ہیں (ان میں سے ایک) بولا۔ اگر تم چاہو تو ہمارے پاس بیٹھ کر سنو۔ اور اگر چاہو تو چلے جاؤ۔ ہم کو تو رسول اللہؐ نے نکاح میں گانے بجانے کی اجازت دے دی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ ایک بار راستے میں چلے جا رہے تھے۔ باجے کی آواز سن کر پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ بیان کیا گیا کہ ختنہ کی شادی ہے تو آپؓ خاموش ہوگئے۔ اور منع نہیں فرمایا۔

فیصلہ

چونکہ راگ کی حلّت اور حرمت میں متعارض نصوص آئی ہیں۔ اس لیے امام ابوحنیفہؒ نے احتیاطاً اس کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے جیسا کہ اصول کا قاعدہ ہے کہ دلائل کے تعارض کے وقت حرمت کو اباحت پہ مقدم رکھتے ہیں۔ یہاں تک آپ نے ولیمہ میں بھی گانا جائز نہیں رکھا۔ چنانچہ ہدایہ کی کتاب الکراہیۃ میں اس مضمون کی عبارت آئی ہے کہ جو شخص ولیمہ یا کسی دوسری ضیافت میں مدعو کیا جائے تو وہ (وہاں) کھیل کا سامان یا گانا پائے تو وہاں بیٹھے اور کھانا کھانے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں خود ایک بار اس میں مبتلا ہوگیا تھا تو میں نے صبر کیا تھا۔ صاحب کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ کھیل کے سامان سب حرام ہیں۔ یہاں تک کہ زسل مار مار کر گانا بھی حرام ہے اور اسی لیے امام ابوحنیفہؒ نے مبتلا ہوگیا کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ کیونکہ مبتلا ہونا حرام چیز ہی سے ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ نے حرمت سرود کی احادیث کو اس گانے بجانے پہ محمول کیا ہے جو محض کھیل اور دل لگی کے لیے ہو۔ یا اس میں فتنے کا خوف ہو۔ اور جو گانا بجانا کسی غرض صحیح پہ مبنی ہو۔ مثلاً نکاح کے اعلان یا ایسے ہی کسی دوسرے امر پہ۔ اس کو وہ مباح سمجھتے ہیں۔ کتب حنفیہ میں بھی ایسی روایت موجود ہے۔ چنانچہ ہدایہ کی کتاب الغصب میں لکھا ہے کہ " غازیوں کا نقارہ اور وہ دف جس کا بجانا بیاہ میں مباح ہے اس کے ضائع کرنے سے ذمہ داری لازم آتی ہے۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ راگ کی حرمت میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ اس گانے پہ محمول ہیں جو شہوت اور عشق مجازی سے دل کی شیطانی مرادیں پوری کرتا ہے لیکن جو گانا خدا کی محبت پیدا کرتا ہے، وہ بذاتِ خود مباح ہے، جب گانا سننا شادی کے موقع پر خوشی بڑھاتا ہے تو اگر وہ خوشی مباح ہے تو وہ گانا بھی مباح ہے۔ چنانچہ عید کے روز اور نکاح کے موقع پہ۔ اور کسی بچھڑے ہوئے عزیز کی آمد پہ۔ اور ولیمہ کی دعوت کے وقت، اور بچے کی پیدائش کی تقریب پہ اور عقیقہ اور ختنے کے دن اور حفظِ قرآن کی آمین کے دن۔ وغیرہ وغیرہ۔

خزانۃ اور کافی میں لکھا ہے کہ گانے بجانے وغیرہ کی حرمت لہو کے ساتھ مقید ہے اور گانا بجانا لہو کے بغیر کسی اور غرض کے لیے ہو۔ جیسے نکاح کے وقت اور ولیمہ میں۔ اور غازیوں کی تیاری اور قافلے کے کوچ کے وقت۔ اور بندگانِ خدا یعنی صوفی لوگوں کے دل کو رقت میں لانے کے لیے جن سے خدا راضی ہے حنفیہ کے مذہب میں حرام نہیں۔

امتناع میں ہے کہ راگ سننے سے رقّت قلب اور خشوع اور وصال الٰہی کے شوق کا جوش اور اس کے قہر اور عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور جس امر کا نتیجہ یہ ہو وہ ایک عبادت ہے اور جب گانا سننا ایسا ہو تو اس میں کھیل اور بیہودگی کا کیا دخل ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر علمائے ظواہر میں سے ہیں اور اولیاء اللہ کے رئیس ہیں عوارف میں فرماتے ہیں کہ اَلسَّمَاعُ یَسْتَجْلِبُ الرَّحْمَۃَ مِنَ اللّٰہِ الْکَرِیْمِ۔ یعنی سماع خدا وند کریم

Marfat.com

کی رحمت لاتا ہے۔

حضرت خواجہ خواجگان عالیشان خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے سماع کے بارے میں فرمایا ہے کہ نہ "انکارِ میکنم و نہ ایں کار میکنم"۔ یعنی میں نہ انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کام کرتا ہوں۔ چونکہ ان کے طریقے کی بنا کمال اتباع سنت پر ہے اور یقین ہے کہ گانا سننا رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کا دستور نہ تھا اس لیے انھوں نے منع فرمایا کہ "نہ ایں کار میکنم" اور چونکہ ان کے نزدیک سماع کی حرمت ثابت نہیں تھی اس لیے فرمایا کہ "نہ انکار میکنم"۔ اگر وہ حرام سمجھتے تو ضرور انکار کر دیتے۔

پس جب اعلانِ نکاح کے لیے دف کا بجانا حلال یا مستحب ہے۔ تو ڈھول اور نقارہ اور طنبور وغیرہ میں بمقابلہ دف کے کونسا فرق ہے۔ کھیل اور بیہودگی کے لیے سب حرام ہیں اور صحیح غرض کے لیے سب حلال ہو سکتے ہیں۔ نکاح کا اعلان ہر چیز سے ہو سکتا ہے۔ دف وغیرہ میں فرق کرنا ایک نامعقول بات ہے۔

مزامیر کی حرمت کو تسلیم کرنے کی تقدیر پہ حرمت قطعی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دلیل قطعی حرف محکم آیت یا متواتر حدیث یا اجماع امت ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرات کا اہل غنا کے حق میں یہ کہنا کہ لَا ھَلِہٖ مُبَاحٌ یعنی جو اس کے اہل ہیں ان کو مباح ہے۔ حق ہے۔ لیکن موجودہ درویشی لوگ اس کے اہل نہیں ہیں بلکہ یہ تکلف اور بناوٹ کے ساتھ وجد کرتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نہ کہنا چاہیئے کہ اس زمانے میں کوئی شخص اس جماعت سے نہیں ہے جو اس کی اہل تھی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے: میری امت میں برابر ایسا گروہ موجود رہے گا جو خدا کے حکم پر قائم ہوگا۔ ان کی یہ راہ چھوڑ دینے والا شخص ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور نہ وہ شخص جو ان کی مخالفت کرے گا۔ اور فرمایا: میری امت کی شال مینہ کی سی ہے جس کی نسبت معلوم نہیں کہ اس کا اول اچھا ہے یا آخر۔ برادرمن! اہل وجد تین قسم کے ہیں۔ ایک تو اہل کمال ہیں جن کے باطن میں دردِ الٰہی پیدا ہو جاتا ہے اور ان کو بے اختیار کر دیتا ہے۔ یہ جماعت خدائی گروہ ہے۔ اس کا انکار خرابیٔ دین کا موجب ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ حالات کو پیدا کرنے کے لیے راگ سنتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تدبیر سے واردات حاصل کریں۔ یہ بھی محمود ہے۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جو ریا کے طور پہ وجد کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو اہلِ کمال سمجھیں یہ لوگ فاسق اور بدعتی ہیں۔

امام محمد غزالیؒ فرماتے ہیں کہ تکلف سے وجد کرنے کی ایک قسم مذموم ہے۔ اور وہ ہے جس سے دکھاوا اور احوال شریفہ کا اظہار مقصود ہو۔ اور ایک قسم محمود ہے۔ اور وہ احوال شریفہ کی تلاش کا ذریعہ ڈھونڈنا، اور ان احوال کو اس تدبیر سے پیدا کرنا اور حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ کسب کو احوال پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جسے قرآن کی قرأت میں رونا نہ آئے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ تکلف سے رونی صورت اور غمگین شکل بنائے۔ کیونکہ ان حالات میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کے شروع شروع میں تکلف کیا جاتا ہے اور انجام کار وہ احوال سچ مچ پیدا ہو جاتے ہیں۔

پس یاد رکھنا چاہیئے کہ سماع میں جس شخص کو وجد طاری ہوتا دیکھیں اس کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ (رد)

(رسالہ ازالۃ العنود فی مسئلۃ السماع و وحدۃ الوجود مصنفہ قاضی [illegible] ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ) [illegible]

فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ راگ کا جواز مذکورہ ذیل شرائط پر موقوف ہے۔

(۱) راگ گانے والا لڑکا اور عورت نہ ہو۔

(۲) بیہودہ اور فحش باتیں راگ میں نہ کہی جائیں۔

(۳) راگ سننے والوں کی غرض خواہش نفسانی کا پورا کرنا نہ ہو۔ بلکہ وہ سب کے سب یادِ حق میں مستغرق ہوں۔

(۴) مزامیر اور سازوں سے راگ نہ گایا جائے۔ پس اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ ہو تو راگ سننا حرام ہے۔ (مشن محبوب عالم)

غنی

اللہ تعالےٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام ہے جس کے معنی ہیں بے پروا۔ قرآن میں یہ اسم کئی جگہ آیا ہے۔ سورۃ بقرہ رکوع ۳۶ میں ارشاد ہے وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ۔ یعنی اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے۔

سورۃ فاطر کے تیسرے رکوع میں آیا ہے: لوگو! تم (ہمہ وقت) اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ (جو ہے تو) وہی بے نیاز ہے (اور ساری) خوبیاں رکھتا ہے۔

سورۃ ممتحنہ میں ہے: "جو شخص منہ پھیرے گا تو اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد و ثنا ہے"۔

غوث

وہ شخص جس سے مدد طلب کی جائے اور وہ فریاد سن کر مدد دینے والا ہو۔ مشہور ہے کہ ولایت کے درجوں میں سب سے بڑے درجہ کا ولی غوث ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک غوث سے بھی بڑا درجہ قطب کا ہوتا ہے۔ غیاث اللغات میں منقول ہے کہ قطب کے دائیں بائیں دو غوث ہوتے ہیں۔ پس اس لحاظ سے قطب کا درجہ غوث سے بڑا ہوا۔

غوری، معز الدّین

(۱۱۷۵ء - ۱۲۰۶ء) وہ پہلا مرد مجاہد جس نے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے ارادے سے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ریاست غور (افغانستان) کی نسبت سے غوری کہلایا۔ اصل نام محمد تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے معز الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس لیے صحیح طور پر اس کا نام سلطان معز الدین محمد غوری ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ اسے ایام شاہزادگی میں شہاب الدین بھی کہتے تھے اور مملکت ہند میں اس کی اکثر فتوحات اسی زمانے میں ہوئیں جب وہ ابھی شہزادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا نائب تھا، اس لیے اسے بعض تاریخوں میں شہاب الدین غوری بھی کہتے ہیں۔

سلطان معز الدین غوری کو ملک مارنے، علاقے فتح کرنے اور اپنے خاندان کی حکومت کو دور دور پھیلانے کا بڑا شوق تھا۔ پھر اس کام کے لیے جن جن خوبیوں کی ضرورت ہے، وہ بھی اس میں موجود تھیں۔ یعنی وہ فوج کی ترتیب اور تنظیم کے علاوہ اس کی رہنمائی کرنے اور اسے لڑانے کا ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی حکومت صرف غزنی کے علاقے پر تھی۔ اس کا بڑا بھائی غیاث الدین غوریوں کا سلطان تھا، اور معز الدین اپنے بھائی کے نائب کی حیثیت سے اس علاقے کا حاکم تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے علاقے کی حکومت پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا اسے مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس نے شروع ہی سے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ اس نے غزنی کی فتح کے بعد ملتان اور اُچ پر قبضہ کر لیا۔ پھر یہاں سے آگے

Marfat.com

پڑھی اور پہاڑ کے پاس پہنچا تو راجپوتوں کی ایک فوج نے راستہ روکا اور اسے شکست کھا کر پلٹنا پڑا۔ ۱۱۷۹ء سے ۱۱۸۶ء تک اس نے تین مرتبہ پنجاب پر چڑھائی کی یہاں ابھی تک غزنوی خاندان کی حکومت چلی آتی تھی (یعنی تقریباً دو صدیاں گزر گئی تھیں) اور لاہور اس حکومت کا صدر مقام تھا۔ معز الدین نے غزنوی خاندان کی حکومت کو ختم کرکے اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔

ان دنوں اجمیر پر پرتھوی راج چوہان کی حکومت تھی جو بڑا طاقت ور راجہ تھا۔ دلّی کی حکومت بھی اُس کے قبضے میں آ گئی تھی۔ پنجاب پر معز الدّین کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے چوہانوں کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ چھڑ گئی۔ پہلا معرکہ ترائن (موجودہ تراوڑی) کے میدان میں ہوا جس میں غوری نے شکست کھائی۔ اگلے سال وہ پھر لشکر لے کر چڑھ آیا اب کے پھر ترائن کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ پرتھوی راج شکست کھا کر مارا گیا اور دلی اور اجمیر کی حکومت معز الدّین کے قبضے میں آ گئی۔ یہ معرکہ ۱۱۹۲ء میں سر ہُوا۔ دو سال کے بعد معز الدین پھر غزنی سے چلا اور قنوج پر جا پڑا۔ ان دنوں قنوج کی ریاست کا شمار راجپوتوں کی بڑی بڑی حکومتوں میں ہوتا تھا۔ اور جے چند یہاں کا حکمران تھا۔ اس حملے میں قنوج کے علاوہ کئی اور علاقے بھی ہاتھ آئے۔ لیکن ۱۱۹۴ء سے ۱۱۹۵ء تک برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اب معز الدّین نے ہندوستان کا خاصا بڑا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ جو علاقہ آج کل پاکستان کہلاتا ہے، وہ تو تقریباً سارا کا سارا اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ راجپوتانہ اور بہار کے صوبے کا ایک حصّہ بھی غوری سلطنت میں شامل تھا۔

موت سے چند برس پہلے معز الدین غوری نے وسط ایشیا کے ایک معرکے میں شکست کھائی تھی۔ اس شکست کی وجہ سے ہندوستان میں بھی اُس کے اقتدار کو بڑا صدمہ پہنچا۔ کھوکھروں نے پنجاب میں سر اٹھایا اور اس صوبے کو غزنی سے علیحدہ کر دیا۔ غوری کو یہ خبریں پہنچیں تو غزنی سے یلغار کرتا چلا اور کھوکھروں کو شکست دے کر اس علاقے میں امن قائم کر دیا۔ وہ ابھی پنجاب ہی میں تھا کہ ایک باطنی فدائی نے اس کے خیمے میں گھس کر اُسے سوتے میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۶ء میں پیش آیا۔

سلطان معز الدین محمد غوری صحیح معنوں میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا بانی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سپہ سالار کی حیثیت سے وہ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن اس میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو محمود میں بھی نہیں تھیں، اور اس کی یہی خوبیاں ہیں جن کی بدولت اُس نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔ یہ بڑا مستقل مزاج، بردبار اور دُور اندیش شخص تھا، اور شکست کھا کر بھی ہمّت نہ ہارتا تھا۔ محمود نے کسی معرکے میں شکست نہیں کھائی اور معز الدین محمد غوری کو ہندوستان کے معرکوں میں دو مرتبہ شکست ہوئی، لیکن اس کی فتوحات زیادہ مستقل اور پائیدار ثابت ہوئیں۔ اُس نے جو علاقے فتح کیے وہاں مستقل طور پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

معز الدین غوری دُھن کا بڑا پکا تھا، اور جب کوئی ارادہ کر لیتا تھا تو اُسے پورا کر کے چھوڑتا تھا۔ وہ ناکامیوں سے گھبراتا نہیں تھا۔ اُس نے بڑے لائق غلام جمع کر رکھے تھے جو ملکی انتظام اور سپہ گری کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ ان غلاموں کو وہ اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا، اور وہ بھی ہمیشہ جان نثاری پر آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ ان غلاموں نے کئی علاقے فتح کر کے سلطان معز الدین کی حکومت میں شامل کیے اور اسے ایک مستقل سلطنت بنا دیا۔ سلطان کو خدا نے کوئی فرزند عطا نہیں کیا تھا۔ ایک مرتبہ کسی مصاحب نے کہا کہ اگر اللہ آپ کو فرزند عطا فرماتا تو آپ کے بعد آپ کے تخت و تاراج کا وارث ہوتا۔ سلطان نے جواب دیا: "میرے غلام میرے بیٹے ہیں۔ یہی میرے بعد میری سلطنت کے وارث ہوں گے۔" اور اس نے جو کہا تھا وہ صحیح نکلا یعنی اُس کے غلام ہی اس کے وارث ثابت ہوئے۔ اس کی سلطنت اس کے ان غلاموں میں تقسیم ہوئی جن کو اس نے شہزادوں کی طرح تربیت دی تھی۔ ہندوستان قطب الدین ایبک کے حصے میں آیا۔

غول

غول سے مراد وہ بھوت ہے جو بیابان میں طرح طرح کی شکلوں میں نمودار ہو کر راہرووں اور مسافروں کو ڈراتا ہے اور اس کی بناء عموماً ڈرپوک طبائع کے تخیّل و توہمات پر ہوتی ہے۔ اصلیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ شریعت غول کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا: "نہ کسی کو کسی سے بیماری لگتی ہے اور نہ ماہ صفر کی کوئی نحوست ہے جو اثر کرتی ہے اور نہ غول کوئی چیز ہے"۔

غیاث الدّین بلبن

(دورِ حکومت ۱۲۶۶ء - ۱۲۸۶ء) اسلامی ہند کے بادشاہوں میں ایک خاص رنگ اور شان کا بادشاہ۔ اصل میں ایک ترک امیر زادہ تھا۔ چنگیز خان کے حملے میں گرفتار ہُوا اور بغداد میں بطور ایک غلام کے بکا۔ وہاں ایک بزرگ جمال الدین بصری نے اسے خریدا اور تربیت کی۔ پھر دہلی میں آیا۔ شروع میں ایک معمولی سپاہی بلکہ بہشتی اور فراش کا کام کیا۔ سلطان التتمش نے اُسے خرید کر اپنے غلاموں میں شامل کر لیا۔ چونکہ وہ بڑا ذہین اور لائق شخص تھا، اس لیے ہر فرمانروا کے عہد میں کوئی نہ کوئی نیا عہدہ پایا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتا سلطان ناصر الدین محمود کے عہدِ حکومت میں نائب الممالک کے عہدے پر جا پہنچا۔ چنانچہ چند برس کے سوا اس سلطان کے سارے عہدِ حکومت میں ملکی اختیارات بلبن ہی کے قبضے میں رہے۔ اگرچہ یہ زمانہ بڑا نازک تھا۔ قدم قدم پر مشکلات درپیش تھیں تاہم جس طرح بن پڑا، اس نے ملک میں امن و امان قائم رکھا۔

ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد سارے امیروں کی رائے سے بلبن تخت نشین ہوا بلبن نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلے مفسدوں اور شورش پسندوں کو سزائیں دے کر ملک میں امن و امان قائم کر دیا۔ میواتی بڑے سرکش تھے۔ بلبن نے انھیں ایسا دبایا کہ پھر انھیں سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کے علاقے میں جنگل پھیلے ہوئے تھے جو ضرورت کے وقت قلعوں کا کام دیتے تھے۔ بلبن نے یہ جنگل کٹوا دیئے۔ اور ان لوگوں کے لیے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

گنگا اور جمنا کے درمیان کا زرخیز علاقہ جو عام طور پر دو آب کہلاتا ہے، یہاں بھی بڑی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ راستے لٹتے تھے۔ اس لیے سفر کرنا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ مالِ تجارت لے جانا مشکل ہو گیا تھا۔ سلطان نے شورش پسندوں اور لٹیروں کو سخت سزائیں دیں۔ اس طرح سڑکیں محفوظ ہو گئیں۔ لوگ اطمینان سے سفر کرنے لگے۔ آنولہ کے کاٹھیار راجپوتوں نے، سرکشی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ بلبن نے انھیں بھی دبا دیا۔ رنتھمبور، گوالیار، چندیری اور مالوہ نئے سرے سے فتح کیے۔ میوات کی بدنظمی دُور کی۔ غرض تھوڑی مدت میں ملک میں بغاوت اور سرکشی کا نام و نشان باقی نہ رہا اور ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔

لیکن بلبن اچھی طرح جانتا تھا کہ ملک کے اندر امن و امان قائم کرنے کے لیے باغیوں اور سرکش لٹیروں کو سزائیں دینا ہی کافی نہیں۔ یہ لوگ جب موقع پائیں گے، ضرور

Marfat.com

سر اٹھا ئیں گے۔ چنانچہ اس نے کئی تدبیریں اختیار کیں۔ جابجا مسلمانوں کی بستیاں بسائیں۔ جگہ جگہ چوکیاں قائم کیں اور آس پاس کے علاقوں میں ترک اور افغان سرداروں کو جاگیریں دیں۔ جو مقامات زیادہ اہمیت رکھتے تھے، وہاں قلعے بنوائے۔ اور ان کی حفاظت کے لیے فوج مقرر کی۔ لشکر کو اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا۔ پنجاب اور سندھ میں جابجا فوجی چھاؤنیاں قائم کیں تاکہ تاتاری یورشوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ طغرل حاکم بنگال کی بغاوت کا علم ہوا تو اگرچہ بلبن کی عمر اس وقت اسّی برس کی تھی، لیکن اس پیرانہ سالی میں بھی فوج لے کر یلغار کرتا ہوا چلا۔ طغرل مارا گیا اور بنگال پھر سلطنتِ دہلی کے قبضے میں آ گیا۔ وہاں کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خان کے سپرد کر دی۔ تاتاریوں کی مسلسل یورشوں کے باعث پنجاب کو سلطنت کے دفاع میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ بلبن نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کو جو زیادہ تر خان شہید کہلاتا ہے، ملتان اور لاہور کی حکومت پر مامور کیا جو بڑا قابل سالار اور علم دوست تھا۔ وہ ۱۲۸۵ء میں تاتاریوں (مغلوں) کو شکست دے کر نماز ادا کر رہا تھا کہ اچانک ایک تاتاری دستے نے حملہ کر دیا۔ شہزادہ تیر کھا کر جاں بحق ہوا۔ ساتھی پکڑے گئے۔ ان میں میر حسن اور خواجہ سنجری بھی تھے اور کچھ مدت بعد رہا ہوئے۔ لائق بیٹے کی وفات کے صدمے نے بلبن کی کمر توڑ دی۔ چنانچہ اُس کا آخری زمانہ طرح طرح کے تفکرات میں گزرا۔ آخر ۱۲۸۶ء میں وفات پائی۔

بلبن بڑا طاقتور حکمران تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ طاقتور کے مقابلے میں ہمیشہ کمزور کی حمایت کرتا تھا۔ جو لوگ قانون پہ چلتے تھے، ان کے حق میں وہ باپ سے زیادہ شفیق تھا۔ لیکن قانون شکنی کرنے والوں کا اُس سے بڑا دشمن کوئی نہ تھا۔ نماز پڑھتے وقت جب اُسے یہ خیال آتا تھا کہ قیامت کے روز اُسے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ علماء اور مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا اور اکثر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی کوششوں سے بادشاہت کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کا رعب قائم ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس نے لٹیروں سے ملک کو نجات دلائی۔ جو لوگ آئے دن بد امنی پھیلاتے رہتے تھے انھیں بالکل کچل ڈالا اور سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچائے رکھا۔ بلبن کو سلطنت کے استحکام کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی، لیکن اس نے کبھی کوئی نیا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بلکہ جو علاقہ فتح ہو چکا تھا، اسی کو مستحکم کرنے اور اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے میں اپنی ساری عمر خرچ کر دی۔ (نیز دیکھیے "بلبن")

غیاث الدّین تغلق (دورِ حکومت: ۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء)

اسلامی ہند میں خاندانِ تغلق کا بانی۔ ۱۳۲۰ء میں دہلی کے تخت پہ بیٹھا تو اس کی عمر خاصی ہو چکی تھی۔ بادشاہ بننے سے پہلے ہی وہ بڑی شہرت اور ناموری حاصل کر چکا تھا، کیونکہ مغلوں کو نیچا دکھانے میں علاؤ الدین خلجی کو بھی جو کامیابی ہوئی تھی، اس میں غیاث الدین کی شجاعت اور تدبر کا بڑا دخل تھا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں پنجاب کا حاکم مقرر ہوا۔ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں اس نے مغلوں کو انتیس لڑائیوں میں شکستیں دیں اور "غازی ملک" کا خطاب حاصل کیا۔ غاصب خسرو کا مقابلہ کرنے کے لیے لاہور سے فوج لے کر روانہ ہوا۔ خسرو کی فوج کو پہلے سرہند کے قریب، پھر دہلی میں شکست فاش دی اور خسرو لڑائی میں مارا گیا۔ چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی اولادِ نرینہ باقی نہ رہی تھی، اس لیے امراء نے غیاث الدین کو بادشاہ بنا لیا۔

غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کے وقت ملک کی جو حالت تھی، اُسے دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اصلاح کی کوششوں میں زمانہ لگ جائے گا، لیکن اس نے چند برس کے اندر ملک کا سارا انتظام درست کر دیا۔ غیاث الدین کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ دُور اندیشی اور مصلحت اندیشی کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں بڑا اعتدال تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی حکم دیا کہ اراضی کے رقبے کے حساب سے مال گزاری وصول کرنے کی بجائے پیداوار کے حساب سے مال گزاری وصول کی جائے۔ یہ طریقہ بڑا سادہ اور منصفانہ تھا، اس لیے ساری دیہاتی آبادی خوش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی نافذ ہوا کہ اگر کسی علاقے میں زیادہ غلہ پیدا ہونے لگے تو مال گزاری کی شرح میں بتدریج اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر مال گزاری کی شرح یکبارگی بڑھا دی گئی تو کسانوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ زمین کو زرخیز بنانے کی جانب زیادہ توجہ نہیں کریں گے۔

غیاث الدین تغلق نے مقدموں اور چودھریوں کو بھی بعض مراعات دیں، کیونکہ یہ لوگ دیہات کے انتظام میں حکومت کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ صوبیداروں کے اعزاز اور منصب میں بھی اضافے کیے گئے۔ غیاث الدین رعایا کی دلجوئی میں تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بڑا سخت گیر بھی تھا۔ جرائم کی سزائیں سنگین تھیں گداگری کا انسداد بھی کیا۔ اس کے عہد میں ایسا امن و امان تھا اور قانون کی پابندی پر اتنا زور دیا جاتا تھا کہ اکثر چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنا پرانا پیشہ چھوڑ کر کھیتی باڑی شروع کر دی۔

قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کے بعد افراتفری پھیل گئی تھی۔ اس لیے تلنگانہ کے راجہ نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ غیاث الدین نے ولی عہد سلطنت جونا خان کو تلنگانہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دو مرتبہ زور کے معرکے ہوئے۔ دونوں مرتبہ تلنگانہ کے راجہ نے شکست کھائی۔ اور یہ علاقہ بھی دہلی کی سلطنت میں شامل ہو کر اس کا صوبہ قرار پایا۔ بلبن کی وفات کے بعد بنگال کا علاقہ بالکل خود مختار ہو گیا تھا اور چالیس سال سے برابر خود مختار چلا آتا تھا۔ غیاث الدین نے اسے فتح کر کے پھر سلطنتِ دہلی میں شامل کر لیا۔ ترہت کا مضبوط قلعہ جو شمالی بہار میں تھا، اس پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

بنگال اور ترہت کی فتح سے فارغ ہو کر غیاث الدین تغلق نے دہلی کا رُخ کیا لیکن موت نے شہر تک پہنچنے کی مہلت نہ دی۔ جب دہلی کا شہر ایک منزل کے فاصلے پر رہ گیا تو ولی عہد سلطنت جونا خان اور امراء پیشوائی کو حاضر ہوئے۔ افغان پور دہلی کے پاس ایک بستی تھی۔ یہاں ولی عہد نے سلطان کی ضیافت کے لیے ایک کوشک (بنگلہ) بنوایا تھا۔ وہیں لا کر اتارا۔ بدقسمتی سے یہ بنگلہ گر پڑا۔ اور سلطان اس کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ پینسٹھ برس کی عمر پائی۔ مقبرہ دہلی میں ہے۔ اگرچہ صرف چار سال حکومت کی، مگر نیک دلی، حسنِ انتظام، انصاف اور رعایا پروری میں بڑی شہرت پائی۔ اس کی زندگی بڑی بے داغ تھی اور دین داری اور پرہیزگاری اس کی طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ ایک مسلمان بادشاہ میں جو جو خوبیاں ہونی چاہییں، سلطان غیاث الدین تغلق میں وہ سب موجود تھیں۔

غیب

پوشیدہ۔ اس پوشیدگی کی کئی قسمیں ہیں۔ اوّل اضافی، کہ ایک چیز ہمارے سامنے ہے مگر اس شخص سے جو کوس دو کوس دُور ہے غائب اور غیب ہے۔ یہاں تک کہ عالمِ ناسوت کی جمیع چیزیں اگر ایک سے غیب میں ہیں تو دوسرے کے نزدیک موجود ہیں۔ اس قسم کا غیب خاصہ خدا نہیں کیونکہ یہ غیب مطلق نہیں بلکہ من وجہٍ مشہود ہے۔ اس کو ایک جانتا ہے تو دوسرا نہیں جانتا۔ جنات اگر اسی

Marfat.com

بیان کیے ۔ غیب کا حصول جیسے جان کر دیتے تھے اور اب بھی بیان کر دیں تو کچھ بات باقی نہیں رہتی۔

دوم : عالم ناسوتی سے غیب یعنی عالم مثال کی چیزیں عام ہیں کہ وہ ابھی اس عالم میں نہیں آئیں بلکہ آنے والی ہیں یا چلی گئی ہیں ۔ اب وہ نہ ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں ، نہ ان کانوں سے سنی جا سکتی ہیں نہ ان ہاتھوں سے ٹٹولی جا سکتی ہیں ۔ نہ ناک سے سونگھی جا سکتی ہیں نہ زبان سے چکھی جا سکتی ہیں ۔ اس قسم کا غیب اوّل غیب سے بلند ہے ۔ مگر یہ بھی غیب مطلق نہیں جس کو غیب الغیب کہتے ہیں ۔ کیونکہ یہ چیزیں عالم ملکوت کے لوگوں کے سامنے ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کبھی روح خواب میں جبکہ اس کو کثافت جسمانیہ سے نورانیت حاصل ہوتی ہے ۔ ان چیزوں میں سے بعض یا کل کو دریافت کر لیتی ہے اور اسی طرح اہل کشف صادق بحالت بیداری اپنی روحانی تجلّی میں دریافت کر لیتے ہیں جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام ۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث کسوف ہے جس میں روایت ہے کہ نبی صلعم کو نماز میں اس عالم غیب کی چیزیں دکھائی گئیں اور اس لیے اشراقی اور اہل ریاضت بھی کبھی کبھی بعض چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں اور کاہن اور رمّال و جفار اور نجومی بھی کبھی کبھی اپنے قواعد سے کچھ اڑتی ہوئی بات معلوم کر کے اپنی قوتِ متوہمہ سے ایک قالب میں ڈھالتے ہیں ۔ مگر خود ان قواعد کی غلطی یا ان سے استنباط کی لغزش اور اسی طرح خواب و مکاشفہ میں قوت وہمیہ کی آمیزش اس علمی مرتبے کو ظن کے مرتبے میں کر دیتی ہے ۔ یعنی بجز کشف انبیاء علیہ السلام کے اور جس قدر طریقے ہیں علی قدر مراتب ان میں غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے اس لیے ان کے جاننے کو علم بمعنی یقین نہیں کہہ سکتے ۔ پس اس قسم کا غیب بھی اس کی طرف سے خاص حضرات انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتا ہے جس کی یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ آگے اور پیچھے ملائکہ کا پہرہ رہتا ہے تاکہ شیاطین اور قوتِ فکریہ و قوتِ وہمیہ و خیالیہ آگے سے اور عادات و طبائع سامنے سے اس میں کچھ بھی دست اندازی نہ کریں ۔ رمّالوں ، جفاروں ، نجومیوں اور کاہنوں وغیرہ کے غیب میں تو ہزاروں من کوڑا کرکٹ ہوتا ہے اور حضرات اولیاء کرام کے مکاشفات میں بھی یہ محافظت نہیں ہوتی اس لیے ان کو بھی آخر الامر کتاب و سنت پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے ۔ جو وحی کے اقسام سے ہیں اور اسی لیے اور مکلفین کو بھی ان کے الہامات کا پابند نہیں کیا گیا ۔ اور نہ وہ الہامات حجّت قاطعہ ٹھہرائے گئے ہیں ۔

تیسری قسم غیب الغیب اور غیب مطلق ہے جس کو حق سبحانہٗ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ بعض وہ ہیں کہ جن کے جاننے کی کسی ممکن میں قدرت ہی نہیں اور یہ ایک بے انتہا غیب ہے ۔ لَا یَعْلَمُہٗ اِلَّا ھُوَ ۔ اور بعض ایسی بھی ہیں جن کو ملائکہ مقربین و حاملان عرش جان تو سکتے ہیں مگر نہیں بتلائی جاتیں ۔ اور بعض ایسی ہیں کہ کبھی بتلائی بھی جاتی ہیں ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے : اللہ غیب جاننے والا ہے ۔ اپنے غیب پر ایک کو واقف نہیں کرتا مگر اپنے پسندیدہ رسول کو ۔ پھر اس کے آگے اور پیچھے پاسبان مقرر کر دیتا ہے ۔ (س ۔ جن ۔ ع ۲)

غیبت

غیبت کے معنی ہیں کسی کو اس کے پس پشت برا کہنا عام اس سے کہ وہ برائی اس میں ہو یا نہ ہو ، ہے تو نری غیبت ہے اور نہیں تو غیبت کے ساتھ بہتان بھی ۔

شریعت میں غیبت کی بڑی مذمت آئی ہے ۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : (مسلمانو!) اور نہ تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا کہے ۔ بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے ۔ یہ تو (یقیناً) تم کو گوارا نہیں (تو غیبت کیوں گوارا ہو کہ یہ بھی ایک قسم کا مردار کھانا ہے ۔

ابو سعید اور جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جناب پیغمبر خدا ؐ نے فرمایا : غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت ہے ۔ آدمی زنا کر کے توبہ کرتا ہے تو خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور غیبت کرنے والے کی بخشش نہیں ہوتی ۔ تاوقتیکہ وہی شخص بخشے جس کی غیبت کی ۔

غیر ظاہر المذہب

ان مسائل کا نام ہے جو مبسوط ۔ جامع صغیر ۔ جامع کبیر ۔ سیر کبیر میں نہ ہوں ۔ خواہ امام محمدؒ کی دوسری کتابوں مثلاً کیسانیات ۔ رقیات جرجانیات ۔ ہارونیات میں ہوں یا کسی اور کی تصنیفات میں جیسے حسن بن زیاد ۔ کی کتاب مجرد ۔

غیر مہدی

مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا شیعی الاصل فرقہ ہے جس کا بانی سید محمد نامی ایک شخص جے پور کا باشندہ ہے ۔ غیر مہدی لوگوں کا عقیدہ ہے ۔ کہ سید محمد ہی مہدی موعود ہے وہی بارہواں امام ہے اب اس کے بعد اور کوئی مہدی نہیں آئے گا ۔ یہ لوگ سید محمد کی پیغمبروں کے برابر تعظیم و توقیر کرتے ہیں ۔ اس کے گھر کو کعبۃ اللہ سمجھتے ہیں اور اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس کے بعد ایک کلمہ کا ورد کرتے ہیں جس میں اللہ اور اس کے رسول اور قرآن مجید اور مہدی کی سچائی اقرار ہوتا ہے ۔

فاتحہ

سورۃ فاتحہ ۔ قرآن مجید کی پہلی سورت کا نام ہے اور وہ یہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ الحمد للہ رب العالمین الخ غیر المغضوب علیہم ولا الضآلین ۰ اس سورۃ کا نام فاتحۃ الکتاب ہے اس لیے کہ قرآن مجید کا آغاز اسی سے ہوتا ہے ۔ یہ سورۃ مکی ہے ۔ بعض مدنی کہتے ہیں ۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے ۔ ایک بار مکہ میں نازل ہوئی جب نماز فرض کی گئی ۔ پھر مدینہ میں نازل ہوئی جب قبلہ کی تبدیلی ہوئی ۔ اس کا نام اُمّ الکتاب اور ام القرآن بھی ہے ۔ کیونکہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو ام القرآن نہ پڑھے ۔ سورہ وافیہ اور سورہ کافیہ بھی اس کا نام ہے ۔ اس لیے کہ یہ قرآن کے اکثر مضامین پر جامعیت کے ساتھ مشتمل ہے ۔ سورۃ الکنز بھی اس کا نام ہے ۔ کیونکہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے : فاتحۃ الکتاب میرے عرش کے خزانوں سے ایک خزانہ ہے ۔ سورۂ شفاء اور سورہ شافیہ بھی اس کا نام ہے ۔ کیونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے فاتحۃ الکتاب شفاءٌ من کل داءٍ الا السّام ۔ سورۃ المثانی بھی اس کا نام ہے ۔ کیونکہ وہ ہر نماز میں دو دو بار پڑھی جاتی ہے ۔ سورۃ الصلوٰۃ بھی اس کو کہا جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ نماز میں پڑھنی واجب اور بعض مذاہب کے نزدیک فرض ہے ۔ سورۃ الحمد اور سورۃ الاساس بھی اس کو کہا جاتا ہے ۔ کیونکہ وہ قرآن مجید کی اساس (بنیاد) ہے ۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے : جب تو بیمار ہو جائے یا تجھے صحت کی شکایت ہو جائے تو اساس (الحمد) کو لازم پکڑ ۔ سورہ الحمد اس لیے کہ اس میں خدا کی حمد درج ہے ۔ یہ سات آیات ہیں :

آنحضرت صلعم نے ابو سعید بن المعلیٰؓ سے فرمایا : کیا نہ سکھلاؤں میں تجھ

Marfat.com

کو ایسی سورت جو قرآن میں (از روئے فضائل) سب سورتوں سے بڑی ہے۔ پھر فرمایا وہ سورۃ الحمد للہ رب العالمین ہے۔ وہ سات آیات ہیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن ہے بڑا کہ دیا گیا ہے مجھ کو۔ اس حدیث کے آخری کلمات میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے، ولقد اٰتینٰک سبعًا مّن المثانی والقراٰن العظیم۔ (اے پیغمبر) دیں ہم نے تم کو سات آیتیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں نماز میں یا ثنا کی گئی ہے۔ ان کی فصاحت و اعجاز کے متعلق۔ اور دیا ہم نے تم کو قرآن عظیم۔ اس سے مراد فاتحہ ہے۔ چونکہ یہ قرآن کا جزو اعظم ہے۔ اس لیے اس کو قرآن عظیم سے تعبیر فرمایا۔ (نیز دیکھیے: الفاتحہ)

فارابی (۸۷۰ء۔۹۹۰ء)۔ ابوالنصر محمد بن محمد بن ترخان۔ ترکی النسل عظیم مسلمان فلسفی، محمد نامی ایک ترک سپہ سالار کا بیٹا تھا۔ مغربی دنیا میں لاطینی شکل میں ALPHARABIUS (الفارابیوس) کے نام سے مشہور ہے۔ اپنے وطن ایران ترکستان میں تحصیل علوم کے بعد قاضی کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ فارابی نے عربی زبان قیام بغداد کے زمانے میں سیکھی۔ اسی زمانے میں اس نے منطق اور فلسفہ عیسائی فلسفی ابوبشر متی اور نحو ابوبکر بن السراج سے پڑھی۔ اور یوحنا بن حیلان سے بھی درس لیا جو خلیفہ المقتدر کے زمانے کے تنگ خیال پیشوایان دین فلسفیوں اور آزاد خیالی کے خلاف اقدامات کرتے رہتے تھے، ان سے فارابی ضرور متأثر ہوا ہوگا، چنانچہ بغداد چھوڑ کر شام چلا گیا۔

فارابی جب بغداد سے شام گیا تو وہ حمدانی خاندان کے امیر سیف الدولہ کے دربار میں حاضر ہوا جو حلب کا حکمران تھا اور وہاں اس کی بہت عزّت و تکریم ہوئی۔ اس کے باوجود فارابی نے اس امیر سے صرف چار درہم کا روزینہ قبول کیا تھا۔ الغرض فارابی نے سیف الدولہ کے سایۂ عاطفت میں بہت اعتبار اور شرف کی زندگی بسر کی۔ ایک بار وہ امیر کے ہمراہ دمشق گیا اور وہیں اس نے وفات پائی۔

فارابی سکون، تنہائی اور عزلت میں بیٹھ کر کام کرنے کا دلدادہ تھا۔ اکثر اوقات باغوں اور باغیچوں میں گشت کیا کرتا اور لوگوں میں ملنے جلنے سے گھبراتا تھا، وہ اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے: "میں اپنے گھر کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گیا ہوں، کیونکہ میں نے یہ دیکھا کہ زمانہ اپنا سر زانو پہ جھکائے ہوئے ہے۔ صحبت سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنے لوگ بڑے بڑے رتبوں پہ فائز ہیں، وہ سب غم و اندوہ کا شکار ہیں اور ہر سر کسی نہ کسی درد میں مبتلا ہے۔" فارابی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہمارے پاس معلومات بہت کم ہیں۔ تاہم یہ طے ہے کہ فارابی نے بغداد، حلب اور دمشق میں، یہاں تک کہ مصر میں بھی ہمیشہ ترکی لباس اور وضع قطع قائم رکھی۔

فارابی کو، جو اسلامی فلسفے کا سب سے پہلا فلسفی ہے، نہ صرف مغرب کی علمی دنیا میں بلکہ مشرق میں بھی وہ شہرت نہیں ملی جو اس کے معنوی شاگرد ابن سینا اور ابن رشد کو حاصل ہے۔ علمی تفکّر کا سلسلہ الکندی نے شروع کیا تو حقیقی علم کی بنیاد اسی ترکی الاصل نابغہ نے ڈالی تھی اور اسلامی مکتب فلسفہ کی اساس رکھنے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہوا۔ فارابی خاص طور پر علم منطق کے ذریعے علم فلسفہ کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے بعد مابعد الطبیعیات پر غور و فکر کرتا ہے۔

فارابی نے ارسطو کی تصانیف کے عربی ترجموں کی جس طرح شرح کی ہے، اس کی بدولت فلسفۂ طبعی کی بجائے فلسفۂ ذہنی کا آغاز ہوا۔ اُسے علم طب سے بھی شغف تھا، مگر اس حد تک نہیں، جتنا ابن سینا اور ابن رشد کو تھا۔ بہرحال فارابی کو سب سے زیادہ دلچسپی مابعد الطبیعیات [illegible] مکتب فلسفہ کا بانی اور اسلامی فلسفے کا موجد شمار ہوتا ہے۔ اس نے ایسا ہم آہنگ اور مربوط نظام فلسفہ پیش کیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی اور نظام فلسفہ آسانی سے نہیں مل سکتا۔ یہ ہم آہنگی اور ارتباط کا دلدادہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ فارابی نے افلاطون اور ارسطو کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ قدیم یونان کے ان دو فلسفیوں نے دو علیحدہ علیحدہ فلسفیانہ مسلک قائم کیے تھے، بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نتیجے کے اعتبار سے وہ ایک ہی فلسفیانہ عقیدے کا التزام کرتے تھے۔

چونکہ فارابی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں فلسفے بالکل ایک ہی ہیں، اس لیے مستشرقین نے اُسے SYNCRETIST کا خطاب دیا ہے جو حق بجانب ہے۔ چونکہ فارابی اور دیگر مسلمان فلسفیوں کے نزدیک یہ راستہ بہت صحیح اور مناسب ہے اس لیے وہ دوسرے مسلمان مفکرین کی طرح اپنی معلومات کو یکجا کرکے، ایک دوسرے سے مطابقت دینا اور ان میں ایک ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ فارابی کو بھی مختلف نقطہ ہائے نظر کو یکجا کرکے ایک "کُل" پیدا کرنے سے بے حد ذوق و انہماک ہے۔ اور اس ترکیبی ذہنیت کا فکر اس کے تمام اصول اور اسلوب میں بہت نمایاں طور پہ نظر آتا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کو ایک جگہ جمع کرکے ان سے ایک "کُل" پیدا کرنے میں فارابی کے احساسِ تاریخی نے بھی اُسے بہت مدد دی ہے۔ ہمیں بخوبی علم ہے کہ فارابی نے اپنے سے پہلے کے یونانی فلسفیوں، بالخصوص افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ترتیب اور تجزیے کی باہمی آمیزش سے وہ فلسفی مسلک پیدا کیا تھا جسے فارابی کا نظریۂ اتحادِ عقائدِ گوناگوں (SYNCRETISM) کہا جاتا ہے۔

فارابی تزکیۂ نفس کو تمام فلسفے کی اصل شرط اور ماحصل سمجھتا ہے، اور ارسطو کے نظریے کے برعکس حقیقت کو عشق کے ذریعے تلاش کرنے کا قائل ہے۔ اسی طرح فارابی طبیعی اور معنوی علوم کی چھان بین کرتے وقت بھی یہ چاہتا ہے کہ جو بھی حکم لگائے جائیں، اُن تک سند سے اور منطق کی راہ سے پہنچا جائے۔ مابعد الطبیعیات اور طبیعیات کا گہرا مطالعہ بھی اس نے اسی اصول کے تحت کیا ہے۔ خدا کو سب موجودات کا علم ہے، اس لیے اگر ہم اس تک پہنچ سکیں کو ہم ایک حد تک خدا سے مشابہ ہو جائیں گے۔ یہ فلسفہ ہی ہے جو ہر چیز پر حاوی ہے اور جو ہمیں اس عالم کو ایک کُل، ایک منظم کائنات کی مانند دکھا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فارابی سب سے پہلے منطق کی اساس پہ اپنے فکر کو مستحکم کرنے کے بعد اُس راستے کو اختیار کرتا ہے جس سے تمام موجودات کی علّتِ اولیٰ کے بارے میں تحقیق کی جا سکتی ہے۔ وہ علم منطق کو دو بڑی اقسام یعنی تصوّرات اور تصدیقات میں تقسیم کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ تصورات صدق اور کذب دونوں پر محمول ہو سکتے ہیں۔ فارابی کسی معلوم شئے سے شروع کرکے کسی نامعلوم شئے کے علم تک پہنچنے کے اصول یعنی "بُرہان" کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ وہی اصل منطق ہے۔

منطق کے بعد فارابی کی مابعد الطبیعیات و طبیعیات اور فلسفۂ سیاست کی تدقیق کرنے کے لیے مصنفین ان مباحث کو تین اقسام یعنی نظریۂ الوہیت، نظریۂ عقل اور نظریۂ نبوت میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان تین جدا جدا نظریوں کو فارابی نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہے اور وہ یوں کہ تینوں میں چونکہ ایک ہی مقصد کارفرما ہے، لہٰذا نتیجے کے اعتبار سے بھی وہ ایک ہی ہو جاتے ہیں۔

اپنے نظریہ الوہیت کے مطابق فارابی اس امر کا قائل ہے کہ خدا واحد ہے، واجب الوجود ہے، کسی شکل، مادّے اور علّت کا محتاج نہیں اور ذات اور موجودیت اس کے لیے مخصوص

Marfat.com

جسے پیدا ... اللہ بجز ذات باری تعالیٰ کے علاوہ انتہائی درجے مکمل ہونے کے کسی اور وجود (ہستی) میں نہیں ملتی۔ فارابی انسان کو بجز اللہ کے انتہائی قریب پہنچانے کے لیے تصوف کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی رائے میں مراقبے کا مقصد عقل کی اللہ سے مشابہت کو یقینی بنانا ہے۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے عالم محسوسات ہی سے نہیں بلکہ عالم معقولات سے بھی ماوراجانا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ عقل جب اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے تو وہ کمال روحانی، علم حقیقی اور آخرکار سعادت مطلق کو پالیتی ہے۔

فارابی کا نظریۂ نبوت یہ ہے کہ جس طرح علم منطق علم کے اصولوں کی تدقیق اور تحقیق کرتا ہے، اسی طرح علم اخلاق افعال وحرکات کے بنیادی قاعدوں کی چھان بین کرتا ہے۔ ہر حالت میں عقل اور تجربے کو علم اخلاق میں منطق سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ فارابی اس عقیدے میں متکلمین سے اختلاف رکھتا ہے کہ عقل کے ذریعے علم حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن صرف حال وحرکت کے قواعد کو (یعنی اخلاق کو) عقل کے ذریعے معین کرنا ممکن نہیں اور صاف طور پر یہ مانتا ہے کہ بسا اوقات عقل کسی چیز کے اچھا یا برا ہونے کا حکم لگا سکتی ہے۔ اسی طرح یہ دیکھتے ہوئے کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے، وہ لکھتا ہے کہ جو عقل عالم بالا سے ہم تک آتی ہے اور ہمیں علوم سکھاتی ہے، وہ ہمیں ہمارے حال وحرکت کے متعلق قاعدے کیوں نہیں بنائے گی؟

روح اپنی طبیعت اور ماہیت کے تقاضے سے آرزو رکھتی ہے۔ روح اپنی قوتِ ادراک کی وجہ سے ارادے کی بھی مالک ہے۔ پاکیزہ فکر صرف آزادی کی فضا ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ حریت جو غور وخوض کے نتیجے کے طور پر حاصل ہوتی ہے، نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ آخر میں محض خدا کی عقلی ماہیت کی وجہ سے حریت حاصل کرتی ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے فارابی ہی نے دینِ اسلام اور فلسفے کی باہمی مناسبت اور دونوں کے درمیان افتراق واختلاف سے بحث کی، اس کا مسلک زیادہ تر یہ تھا کہ ایک خوش فہم درویش کے انداز پر مذہب اور فلسفے کے باہمی تعلقات کا پتا لگایا جائے۔

تصانیف: (۱) **إحصاءُ العلوم والتعریف باغراضِہا۔** یہ عربی کا اولین انسائیکلوپیڈیا ہے جو علوم کی تقسیم وتعریف اور ان کے موضوعات پر حاوی ہے۔

(۲) رسالہ "المجموع"، جس میں فارابی کے متعدد مقالات جمع کر دیے گئے ہیں۔

(۳) فصوص الحکم (استنبول - ۱۲۹۱ھ)

(۴) السیاسۃ المدنیۃ (لائیڈن ۱۹۰۴ء)

(۵) کتاب تحصیل السعادت

(۶) رسالہ فی اثبات المفارقات (حیدرآباد ۱۳۴۵ھ)۔ اس کتاب نے ابن سینا کے فلسفے پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

(۷) التعلیقات (حیدرآباد ۱۳۴۶ھ) مقولات کی شکل میں حواشی۔ یہ زیادہ تر اس کی مختلف تصانیف کے باقی ماندہ اجزا ہیں۔

فارابی نے ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں لکھی تھیں، لیکن یہ کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں اور صرف ان کے نام دوسرے مشہور مصنفین کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

فارس

فارس: پارس کی معرب شکل، جس کی اصل پرسا (PERSA) ہے۔ اس کے شمال مغرب میں خوزستان، شمال مشرق میں اصفہان، مشرق میں کرمان، مغرب خلیج فارس ہے۔ یہ صوبہ آٹھ اضلاع میں منقسم ہے۔ شیراز، بوشہر، لار، فسا، کازرون، جہرم، فیروزآباد اور داراب (آباده)۔ موجودہ آبادی تقریباً سولہ لاکھ اور مجموعی رقبہ تقریباً دو لاکھ کیلومیٹر ہے۔

یہی وہ سرزمین ہے، جہاں سے کوروش اعظم (۵۵۹ تا ۵۳۰ ق م) نے اپنی اُن عظیم الشان فتوحات کا آغاز کیا، جو قدیم دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے قیام پر منتج ہوئیں۔ دو صدیوں کے بعد سکندر اعظم نے پارس کو بقیہ ایران کے ساتھ تاخت و تاراج کیا۔ کوروش اعظم کی طرح ساسان کا پوتا اور بابک کا بیٹا اردشیر پارس کا رہنے والا تھا اور ۲۲۸ء میں وہاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ساسانیوں کے عہد میں پارس پانچ اضلاع میں منقسم تھا۔

حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں نے پہلی بار فارس کی تسخیر کی کوشش کی۔ حضرت عثمان ؓ کے دورِ خلافت میں عربوں نے فارس پر دوبارہ چڑھائی کی کوشش کی۔ ری شہر کے نزدیک عثمان ابن ابی العاص اور اس کے سپاہی ساسانی افواج کے خلاف بہت بے جگری سے لڑے۔ آخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ساتھ ہی عربوں کی دوسری فوج حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کی سپہ سالاری میں بصرے سے روانہ ہو کر مغرب کی طرف فارس پر حملہ آور ہوئی دونوں سپہ سالاروں کے لشکر ایک جگہ آ کر مل گئے اور انہوں نے فارس کے اندرونی علاقے میں پیش قدمی کر کے شیراز پر قبضہ کر لیا۔

بعد میں داراب گرد، نسا، شاہ پور اور فیروزآباد پر بھی تسلط ہو گیا اور اس طرح کی تسخیر مکمل ہوئی۔ شروع میں خراج تین کروڑ تیس لاکھ درہم مقرر ہوا۔ بعد ازاں المتوکل کے زمانے میں اُسے بڑھا کر تین کروڑ پچاس لاکھ کر دیا گیا۔ جزیے سے سرکاری خزانے کو ایک کروڑ اسی لاکھ درہم کی آمدنی ہوتی تھی۔

نویں صدی عیسوی میں خلافت کے دینوی اقتدار میں ضعف آیا تو فارس صفاری خاندان کے بانی یعقوب بن لیث کے قبضے میں آ گیا اس نے شیراز کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، جہاں اس کے بھائی عمرو بن لیث نے جامع مسجد تعمیر کرائی۔ بعد ازاں آل بویہ نے فارس پر قبضہ کر لیا۔ بنو بویہ کے بعد سلجوقی فارس کے حکمران ہوئے۔ منظفری خاندان کے بانی مبارزالدین محمد نے ۱۳۵۳ء میں فارس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

صفوی خاندان کے اولین حکمران شاہ اسماعیل اول نے ۱۵۰۳ء میں فارس کو اپنے دائرہ اختیار میں شامل کر لیا۔ شاہ عباس اول کے عہد میں فارس کے حاکم اعلیٰ امام قلی خان نے تقریباً شاہانہ شان وشوکت سے شیراز میں حکومت کی شیراز کو فارس کے دوسرے شہروں کی طرح نادر شاہ کی سرکردگی میں ایرانی افواج اور غلزئی افغانوں کی جنگ میں بڑے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ غلزئی افغانوں کی کمان اشرف کر رہا تھا۔ جنگ کا خاتمہ ۱۷۳۰ء میں غلزئیوں کی شکستِ فاش کی صورت میں ہوا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد شورشوں کے نتیجے میں فارس کو دوبارہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن نیک خصلت کریم خان زند کے اقتدار سنبھالنے پر جس نے شیراز کو اپنا صدر مقام قرار دیا تھا ملک میں جلد ہی امن وامان اور خوشحالی کا دور بحال ہو گیا۔

زمانۂ حال میں فارس کی تاریخ میں کوئی خاص، قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں خرگ میں کچا تیل بار کرنے کی گودی کا افتتاح ہوا۔ یہاں بڑے بڑے سائز کے تیل بردار جہاز کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ کچا تیل ۱۶۰ کیلومیٹر لمبی پائپ لائن کے ذریعے گچ سران کے تیل کے کنوؤں سے لایا جاتا ہے۔ ۳۰ کیلومیٹر تک یہ پائپ لائن خلیج فارس کے پانی کے نیچے سے ہو کر گزرتی ہے۔

Marfat.com

فارس الشدیاق

فارس الشدیاق احمد بن یوسف ایک عرب مصنف اور صحافی بیروت میں پیدا ہوا۔ قاہرہ کے مارونی سکول میں تعلیم پائی۔ کچھ عرصے تک مصر کے سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" میں کام کیا۔ کچھ عرصہ مالٹا میں قیام کیا اور وہاں کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۵۰ء کے بعد چند برسوں میں پیرس کا سفر کیا اس کے بعد وہ لندن گیا اور ایک سفر نامہ لکھا جس میں عربوں اور دوسری اقوام کا ناقدانہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ لندن سے استنبول گیا اور وہاں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے ترکی حکومت کی مالی اعانت سے ایک ہفت روزہ اخبار "الجوائب" جاری کیا جس میں اس نے اسلام کی حمایت کو اپنا موقف قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس نے مسلمانوں کو یورپی علوم سے بھی روشناس کرایا۔ ۱۸۸۴ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیم اس اخبار کا پرانا معیار قائم نہ رکھ سکا اور کچھ عرصہ بعد اخبار بند ہو گیا۔

فارسی

فارسی (۹۰۰ء۔ ۹۸۷ء) ابو علی الحسن بن علی، چوتھی صدی ہجری کا ایک ممتاز نحوی۔ بغداد میں ابن السراج، الزجاج اور دوسرے نحویوں سے تحصیل علم کی۔ بغداد ہی میں وفات پائی۔ اسے اعتزال سے متہم کیا جاتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے محمد علی الجبائی المعتزلی کی تفسیر کی شرح لکھی۔ جو "المتتبع" کے نام سے موسوم تھی۔ اور اب معدوم ہو چکی ہے۔ الفارسی کی تصانیف میں اہم ترین "الایضاح فی النحو"، علم نحو میں اونچے درجے کی کتاب ہے جس کا "تکملہ" اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

فارسیہ

فارسیہ خلیج فارس میں ایک جزیرہ۔ سعودی عرب اور ایران کے ساحلوں کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ جزیرہ العربیہ کی طرح، جو اس سے چودہ میل جنوب میں ہے اور رقبے میں ایک مربع میل سے کم ہے۔ یہ جزیرہ حکومت ایران کے ماتحت ہے، جس نے ایک موسمیاتی مرکز قائم کر رکھا ہے اور ایران ہی کا محکمۂ روشنی یہاں جہاز رانی کے لیے روشنی کا انتظام کرتا ہے۔

فارقلیط

فارقلیط ۔ انجیل مقدس میں رسول اکرمؐ کا نام۔ "ڈکشنری آف اسلام" میں لکھا ہے کہ یہ عبرانی لفظ "Paraclete" کی عربی شکل ہے۔ اس لفظ کے معنی اور تشریح میں سخت اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اس کے معنی "ہمدرد" کے ہیں۔ موجودہ عیسائی اس کے معنی "روح القدس" کرتے ہیں۔ غرضیکہ یہ لفظ بحثوں اور مناظروں میں بہت کھینچا تانی کا موجب بنا ہوا ہے۔ اس بحث کا آغاز انجیل یوحنا کے چودھویں باب کی سولھویں آیت سے ہوتا ہے:۔ **"وَ انا من الأب فیعطیکم فارقلیط"** (ترجمہ: اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔") اس کے بعد سترھویں آیت ہے۔ "یعنی روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی۔" یہ ایک قابل غور حقیقت ہے کہ آیت سابق میں "فارقلیط" کا ترجمہ ہمدرد کیا جاتا ہے اور اگلی آیت میں اسی لفظ کا ترجمہ "روح القدس" کیا گیا ہے۔ "اُردو انسائیکلوپیڈیا" کے مطابق "ایک اور نسخے میں اس کے معنی زندگی کی پاک روح کے لکھے ہیں جو انجیل ۱۹۰۰ء میں رائج تھی، اس میں سترھویں آیت تھی ہی نہیں، یہ آیت بعد میں تشریح کے طور پر بڑھائی گئی۔"
مسلمان کہتے ہیں کہ فارقلیط کے معنی احمد کے ہیں۔ مسلمان مصنفین کا دعوٰی یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورۃ الصف کی چھٹی آیت میں خاص طور پر ایک نبی کی خوشخبری دی گئی ہے جس کا نام احمد بتایا گیا اور وہ فارقلیط ہی ہو…

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

(ترجمہ: اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: "اے بنی اسرائیل، میں تمہاری طرف اللہ تعالےٰ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق کرتا ہوا جو میرے سامنے تورات سے ہے۔ اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوا، جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ ان کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آیا تو انھوں نے کہا، یہ صریح جادو ہے)

اس آیت میں "احمد" اشارہ ہے نبی صلعم کی طرف۔ احمد کے دو معنی ہیں۔ ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے وہ شخص جس کی سب زیادہ تعریف کی گئی ہو یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابل تعریف ہو۔ گویا حضرت عیسیٰ نے رسول اللہؐ کا صاف صاف نام لے کر آپؐ کی آمد کی بشارت دی تھی۔

انجیل یوحنا اس بات پر گواہ ہے کہ مسیح کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے ایلیاہ اور تیسرے وہ "نبی"۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور یوحنا (حضرت یحییٰؑ) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا، بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا، پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انھوں نے اس سے کہا، پھر تو کون ہے!.... اس نے کہا، میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔ انھوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے یا ایلیاہ، نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟"

باب ۱۔ آیات ۱۹-۲۵)

یہ الفاظ اس بات پہ صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیحؑ اور حضرت الیاسؑ کے علاوہ ایک اور نبی کے بھی منتظر تھے اور وہ حضرت یحییٰؑ نہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ "وہ نبی" کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا۔ یہ کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ "جس کی خبر تورات میں دی گئی ہے۔"

خلاصہ یہ کہ جس نبی کی طرف انجیل مقدس میں پیشین گوئی کی گئی، وہ رسول اکرمؐ ہی تھے۔ آپ ہی احمد ہیں یعنی فارقلیط۔ اس موضوع پر انتہائی مفصل اور فاضلانہ بحث سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "تفہیم القرآن" کی جلد پنجم میں "سورۃ الصف" میں کی ہے۔ "فارقلیط" کے عنوان سے اردو کے مشہور شاعر عبدالعزیز خالد نے نہ صرف آنحضورؐ کی خدمت میں منظوم و طویل نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ فارقلیط سے متعلق مباحث اور تاریخی استناد کو بھی شامل نظم کیا ہے۔

Marfat.com

فاروقی، ملا محمود (۱۵۸۵ء – ۱۶۵۲ء) ملا محمود بن محمد بن شاہ محمد جونپوری ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور منطقی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد استاذ الملک محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفے کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انھیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیر اعلیٰ سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انھیں درباری علما میں شامل کر لیا گیا اور صدر صدری کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ لاہور کے شاہی دورہ کے موقع پر ملا شاہ میر بدخشی نے انھیں سختی سے فہمائش کی کہ وہ دنیاداری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ملا موصوف نے شاہی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گاؤں واپس جا کر تدریس کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اور اس وقت کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو ان سے فلسفے اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انھیں ڈھاکہ بلا لیا۔

فلسفے اور علم البلاغت پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انھیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے منہ سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لینا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ سُنی علما اور مصنفین کی اکثریت کے نظریات کے برعکس شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شمار قدیم شیعی فقہا میں کیا ہے۔ جونپور میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ملا صاحب کی تصانیف یہ ہیں :-

(۱) الشمس البازغۃ (۲) الفرائد فی شرح الفوائد (۳) الفرائد المحمودیہ (۴) حاشیہ علی الآداب الباقیہ ♦

فاروقیہ خاندانِ فاروقی، نسبت حضرت عمر فاروقؓ سے ہے۔ اس خاندان نے ہندوستان میں دریائے تاپتی اور دریائے نربدا کے مابین واقع خاندیش کی نیم خود مختار مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی اور ۱۶۰۱ء تک دو سو سال تک حکومت کی۔ شہنشاہ اکبر نے فاروقی خاندان کے باقی ماندہ بہت سے افراد کو گرفتار کر لیا۔ انھیں مغلوں کا وظیفہ خوار بننے پر مجبور کیا اور خاندیش کے علاقے کو داندیش نام کے ایک مغل صوبے میں تبدیل کر دیا۔

اس خاندان کا بانی ملک راجا احمد غالباً پہلے بہمنی سلطان علاؤ الدین بہمن شاہ اور اس کے جانشین محمد اوّل کے وزیر خارجہ جہان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ فیروز تغلق نے شکارگاہ میں خدمات کے صلے میں راجا احمد کو اس کی درخواست پر تھال نیر کے قریب کروند کا گاؤں دے دیا تھا۔ وہ ۷۲۲ھ میں وہاں گیا تھا اور اس نے مقامی طور پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد گرد و نواح کا مزید علاقہ زیر کاشت لے آیا۔ راجا احمد نے بگلانہ کے پڑوسی راٹھور راجا کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر کے اور گونڈوانہ پر حملہ کر کے اتنے وسائل حاصل کر لیے کہ تقریباً ۱۳۸۲ء کے بعد وہ حکومتِ دہلی سے خود مختار ہو جانے کے قابل ہو گیا اور اپریل ۱۳۹۹ء میں فوت ہو گیا۔

اکبر کے عہد تک فاروقی خاندان کی خود مختاری کا دارومدار اس پر رہا کہ سلطنتِ دہلی کے تعلقات اپنے پڑوس میں واقع مضبوط مسلم سلطنتوں مثلاً مالوہ، گجرات، سلطنتِ بہمنیہ اور اس کی وارث ریاست احمد نگر سے کس خوش اسلوبی سے برقرار رہتے ہیں۔ ان حکمرانوں نے فاروقیوں کو اپنے برابر کبھی تسلیم نہیں کیا۔ راجا احمد نے اپنی بیٹی کی شادی سلطنتِ مالوہ کے بانی دلاور خاں کے بیٹے ہوشنگ سے کر دی تھی۔ آگے چل کر مشرقی خاندیش میں راجا احمد کا جانشین نصیر خان اس دوستی و یگانگت کو ترک کر کے گجرات کی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ مالوے کا حکمران ہوشنگ شاہ اسے گجرات کے سلطان احمد اوّل کے حملوں سے بچانے میں اپنی نااہلیت ثابت کر چکا تھا۔ چونکہ نصیر خان کو بہمنیوں کے ساتھ تعلق سے جو امیدیں وابستہ تھیں، وہ موہوم ثابت ہوئیں۔ لہٰذا اس نے گجرات کے احمد شاہ کی رضامندی سے ۱۴۳۵ء میں برار پر حملہ کر دیا لیکن دو مرتبہ بہمنی سپہ سالار ملک التجار کے ہاتھوں سخت شکست کھائی اور اس کا دارالحکومت برہانپور اس کی نظروں کے سامنے تاخت و تاراج ہو گیا۔ بالآخر ستمبر ۱۴۳۷ء میں وفات پا گیا۔

نصیر خان کے دو فوری جانشینوں عادل خان اور مبارک خان نے کسی ظاہری تامل کے بغیر گجرات کی بالادستی قبول کر لی، لیکن عادل خان ثانی نے گونڈوانہ اور جھارکنڈ کے راجاؤں اور کول اور بھیل جیسے رہزن قبیلوں کے خلاف حملوں میں کامیابی حاصل کر کے، مقررہ خراج کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی، یہاں تک کہ ۱۴۹۸ء میں محمود بیگڑا نے تاپتی کی طرف پیش قدمی کر کے اُسے اس تاخیر کی تلافی کرنے پر مجبور کیا۔

عادل خان ثانی کی وفات کے بعد خاندیش کی سیاسی حالت خاندانی رقابتوں کے باعث ابتر ہو گئی اور اس کی مضبوط ہمسایہ ریاستوں کو یہاں مداخلت کا موقع مل گیا۔ خاندیش میں محمد اوّل کے جانشین مبارک شاہ ۱۵۶۶ء کے عہد میں مغلوں کے ساتھ فاروقیوں کا پہلا معرکہ ہوا۔ ۱۵۸۵ء سے یعنی جب اکبر شمال میں اپنی سلطنت کی توسیع کر چکا، جنوبی ہند میں مغلوں کا دباؤ خطرناک طور پر محسوس کیا جانے لگا۔ اور ۱۵۸۷ء میں عادل چہارم سے، جو فاروقی خاندان کا آخری حکمران تھا، مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس مغل فوج کو، جو احمد نگر میں مداخلت کے لیے مامور ہوئی تھی، راستہ دے اور اس کی مدد کرے۔ ۱۵۹۷ء میں عادل خان چہارم احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجوں کے خلاف آشتی کی لڑائی میں مغلوں کی مدد کرتے ہوئے مارا گیا۔ اور یوں فاروقی خاندان کی دو سو سالہ حکومت بھی ختم ہو گئی۔

موجودہ شواہد سے زیادہ تر فاروقیوں کی تاریخ کے اس حصے پر تو روشنی پڑتی ہے جو اُن کے بیرونی طاقتوں سے تعلقات کے متعلق ہے، لیکن ان کے اپنے ملازموں اور رعایا کے ساتھ معاملات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ کتبِ تصوّف سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروقیوں کے دارالحکومت برہان پور میں صوفیا کا پسندیدہ قبرستان تھا اور فاروقیوں نے شیخ برہان الدین غریب کے مریدوں اور جانشینوں کو مدد معاش کے طور پر زمینیں دے رکھی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ برہان الدین غریب نے اس جگہ برہان پور کی تاسیس اور اس میں فاروقیوں کی حکومت کے قیام کی پیش گوئی کی تھی۔

خود مختار فاروقی حکمران خاندان کا قیام، جن کا ملک آبادی اور وسائل کے اعتبار سے اپنے ہمسایوں کے مقابلے میں کمزور تھا، نیز فاروقیوں کی بقا، کسی حد تک خاندیش کے جغرافیائی محلِ وقوع ہی کے باعث ہو سکی، کیونکہ ان کے علاقے کے جو تاپتی اور دریائے نربدا کے درمیان ہے، ایک سرحدی ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ اور مشرق میں وہ گونڈوانہ کے دشوار گزار خطے کے باعث محفوظ تھی۔ جب تک مالوہ، گجرات اور بہمنی سلطنت اور بعد ازاں احمد نگر کے مابین طاقت کا توازن برقرار رہا، خاندیش کو گجرات کے ساتھ ایک معمولی سے رابطے کے علاوہ پوری آزادی تھی۔ بہادر شاہ گجراتی کی وفات کے بعد گجرات میں افراتفری اور انتشار پھیلا۔ باز بہادر کے زمانے میں مالوے پر مغلوں نے قبضہ کر لیا اور بیجاپور اور گولکنڈہ سے مخاصمت میں احمد نگر کے روز افزوں

Marfat.com

فاروقیہ

الجھاؤ کے سبب طاقت کا وہ توازن بگڑ گیا جس پر فاروقیوں کی خود مختاری کا انحصار تھا۔ اسی دوران میں ان کی غلط حکمتِ عملی نے اس خاندان کے لیے مغل نظامِ حکومت کے اندر ایک باعزت، نیم خود مختار حیثیت کے امکان کو بھی ختم کر دیا جو اکبر راجپوت سرداروں کو دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

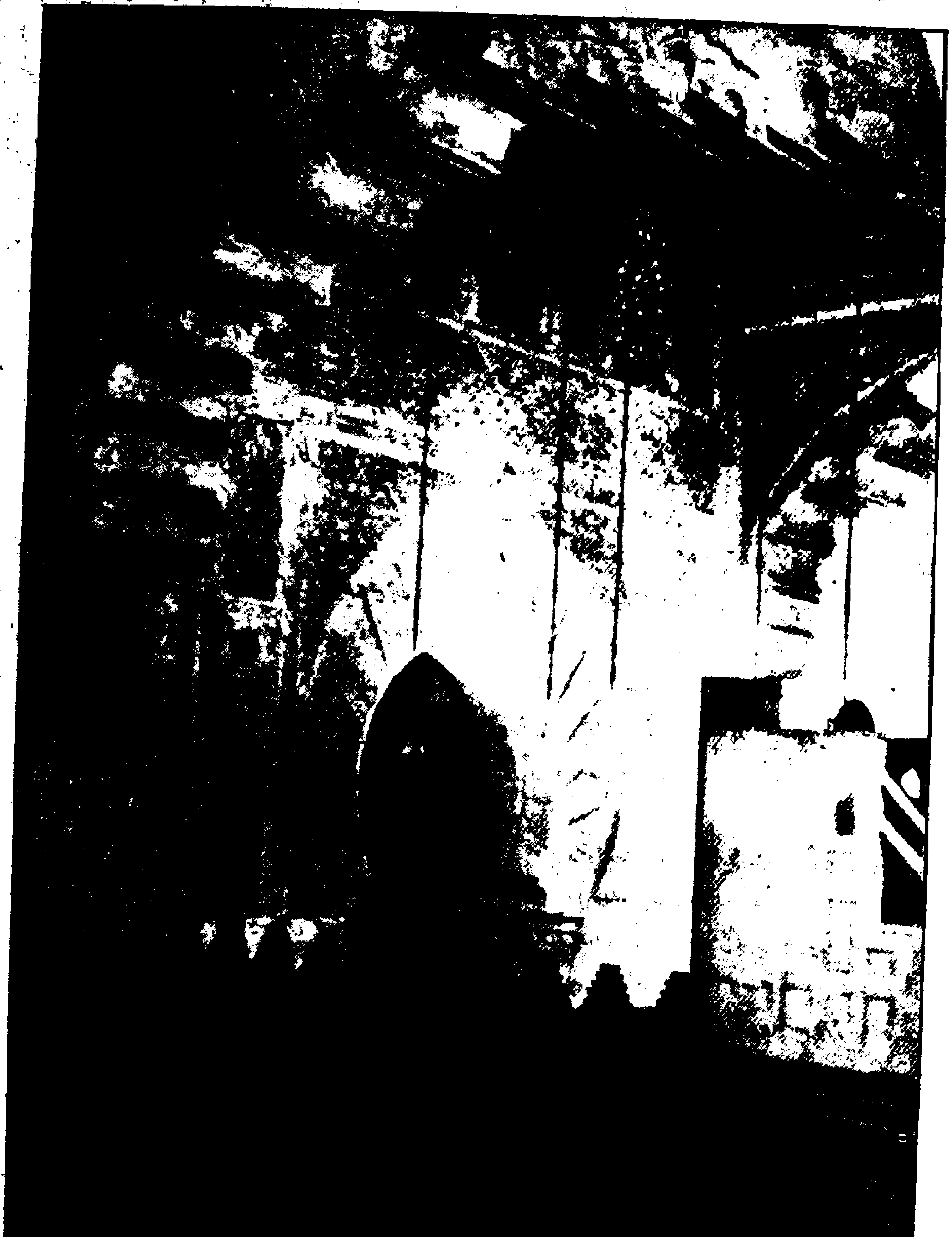

فاس۔ مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا ایک مقامِ سکونت۔ آبادی دو لاکھ سے زائد۔ محل وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر)۔

فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دار المخزن ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دار المخزن ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت مراکش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ [illegible] ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان [illegible] اپنی سبز رنگ کے ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کورٹ، شاہی چڑیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔ متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مسجد جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔

فاس الجدید، در اصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دریائے فاس کی تنگ

Marfat.com

[illegible] پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلوان چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو ان فصیلوں تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پشتوں پر بنائی گئی ہے۔

فاس صرف اپنے محل وقوع کی خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصٰی میں ممتاز و معروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور انھوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

فاسد و باطل

اصول فقہ کی اصطلاح میں فاسد و باطل صحیح کی ضد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ فساد و بطلان، عبادات۔ اور ہر معاملات ہر دو میں جاری ہوتا ہے۔ جب کوئی عبادت یا معاملہ ارکان اور شرائط کے ساتھ مکمل ہو جائے، تو اس پر صحیح عبادت یا صحیح معاملے کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن جب کوئی رکن مفقود ہو جائے، تو اس پر باطل کا اطلاق ہوتا ہے اور جب شرط مفقود ہو تو اُسے فاسد کہا جائے گا۔ فاسد قابلِ اصلاح ہے، جبکہ باطل قابلِ اصلاح نہیں ہوتا، کیونکہ باطل میں رکن مفقود ہوتا ہے اور فاسد میں کوئی شرط ناقص ہوتی ہے۔ اگر یہ شرط صحیح طور پر پوری کر دی جائے تو عبادت اور معاملہ دونوں صحیح قرار پا سکتے ہیں۔

فاسق

لغت میں کھجور کا پک کر چھلکے سے نکلنا فسق کہلاتا ہے، لیکن شریعت میں فسق کا مطلب ہے، حدِ شرع سے نکلنا۔ کافر کو بھی اس بنا پر فاسق کہا جا سکتا ہے کہ شرع کو بھی نہیں مانتا اور عقل اور فطرت کے تقاضوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں مومن کو فاسق کی ضد بھی کہا گیا ہے، لیکن زیادہ قطعی طور پر فاسق کا اطلاق اُس شخص پر ہوتا ہے، جس نے مسلمانوں کی حیثیت سے شرع کو تسلیم تو کیا، لیکن اس سے گناہ صغیرہ یا کبیرا سرزد ہوئے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک اگر کسی کے دل میں تصدیق موجود ہے، لیکن ضعفِ ایمان کی وجہ سے عمل میں کوتاہ ہے اور فرائض کا تارک اور کبائر کا مرتکب ہوتا ہے تو ایسے شخص کو فاسق کہتے ہیں۔ یوں منافق اصلی فاسق سے بدتر ہوتا ہے، کیونکہ وہ تصدیقِ قلبی بھی نہیں کرتا اور صرف ظاہر داری کرتا ہے، لیکن اگر فاسق تصدیق میں بھی کمزور ہے تو یہ بھی منافق کی صف میں شامل ہوگا۔

معتزلہ کے خیال میں مومن وہ ہے، جو دل سے ایمان کی تصدیق کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور اعضاء و جوارح سے احکام شریعت بجا لائے، جو مسلمان تیسری شرط کو پورا نہیں کرتا، وہ حقیقی طور پر مومن نہیں ہو سکتا اور نہ عذاب آخرت سے بچ سکتا ہے۔

علم کلام کے بیشتر مصنفین بھول چوک کے صغیرہ گناہ کے مرتکب کو فاسق نہیں سمجھتے۔ اب کسے فاسق کہا جائے، تو یہ مسئلہ علم کلام کے اہم مباحث سے تعلق رکھتا ہے یہ اصطلاح جنگ صفین میں نمایاں طور پر سامنے آئی، جب خلیفہ کے بارے میں بہت سے اعتراضات و سوالات اٹھائے گئے تو معلوم ہوا کہ مسئلہ تحکیم پر دو واضح گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں ایک خوارج کا گروہ تھا۔ یہ گروہ توبہ نہ کرنے والے کو فاسق [illegible] خلود فی النار کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ فسق کے ارتکاب سے امام، امامت کا منصب کھو دیتا ہے۔ دوسرا بڑا گروہ شیعہ کا تھا، جن کے نزدیک امام برحق معصوم ہوتا ہے۔ واصل بن عطاء کے خیال میں فاسق نہ ہو تو تمام تر مومن ہوتا ہے اور نہ مطلق کافر، بلکہ اس کا مقام دونوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس دُنیا میں وہ امت کے قوانین کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، لیکن اگر وہ توبہ نہیں کرتا، تو اُسے دوزخ کے ابدی عذاب کی سزا دی جائے گی اگرچہ یہ سزا کافر کی سزا سے ہلکی ہوگی۔

فاطر

بلفظی معنی، مُوجد یا کسی چیز کی ابتدا کرنے والا، جبکہ اس چیز کا پہلے وجود یا اصل بالکل موجود نہ ہو۔ فاطر اللہ کے اسمائے حُسنٰی میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالٰے کا یہ صفاتی نام استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی ایک مکی سورت کا نام۔ عددِ تلاوت ۳۵۔ عدد نزول ۴۳۔ اس کا دوسرا نام سورہ الملائکہ ہے لیکن فاطر زیادہ مشہور ہے۔ یہ صورت قرآن مجید کی اُن سورتوں میں سے آخری سورت ہے، جن کا آغاز "الحمد للہ" سے ہوتا ہے۔

فاضل الدین قادری

سید ابوالفرح محمد، المعروف بہ قطب معظم، پنجاب میں سلسلۂ قادریہ فاضلیہ کے بانی۔ گیلانی سادات میں سے تھے۔ انہوں نے گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں روحانیت کی شمع روشن کی اور سلسلہ قادریہ کی اشاعت کابل و بخارا کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں بھی کی۔ ان کے اجداد کئی پشت سے برصغیر کی اسلامی حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے بٹالے میں انہوں نے علوم دینی کے لیے ایک وسیع مدرسہ قائم کیا، جہاں سے بڑے بڑے عالم فارغ التحصیل ہوئے اور متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ بے شمار لوگوں نے ان کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی۔ انہوں نے ۷ ذوالحج ۱۱۵۱ھ کو بٹالہ میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار ہے۔ اُن کی ایک تصنیف "بیان الاسرار" پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

فاطمہؓ

آنحضرت صلعم کی سب سے چھوٹی لڑکی تھیں۔ ان سے آنحضرتؐ کو بہت الفت تھی۔ ان کی پیدائش بقول ابن جوزی نبوت سے پانچ برس پہلے ہوئی اور نکاح پندرہ برس پانچ مہینے کی عمر میں حضرت علیؓ سے غزوہ اُحد کے بعد ہوا۔

فاطمہ انھیں اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰے قیامت کے دن ان کو اور ان کی اولاد کو آتش دوزخ سے یکسو رکھے گا۔ مدارج النبوۃ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کا دستور تھا کہ جب فاطمہؓ آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ پکڑ کر جبیں مبارک پر بوسہ دیتے اور اپنے مقام پہ بٹھلاتے۔ اور اسی طرح جب کبھی آنحضرتؐ فاطمہؓ کے پاس تشریف لاتے تو یہ تعظیم کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں اور استقبال کر کے آنجناب کا ہاتھ پکڑتیں اور اپنی جگہ بٹھاتیں۔ زاکیہ۔ راضیہ اور بتول حضرت سیدہ کے القاب سے ہیں اور وجہ تلقیب بہ بتول یہ ہے [illegible] بتل بمعنے قطع ہے سو حضرت سیدہ فضل و کمال و حسن و جمال میں عورات عالم سے منقطع تھیں اور بہ سبب بہجت اور نورانیت دینیہ کے زہرا کہلاتی تھیں۔ آپ کو بتول اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ آپ دنیا سے بکلی منقطع تھیں

ان کے نکاح کا حال یوں ہے کہ جب یہ جوان ہوئیں تو اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اور بعدہٗ عمر فاروقؓ نے نکاح کی خواہش حضرت سیدہ سے ظاہر

Marfat.com

کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ تب حضرت علیؓ نے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا کہ مرحبًا و اہلاً۔ بعد ازاں حضرتؐ نے فاطمہؓ سے ذکر کیا۔ وہ خاموش ہو رہیں۔ پھر آپؐ نے حضرت علی سے فرمایا کہ تیرے پاس کچھ ہے۔ انھوں نے عرض کی کہ ہاں گھوڑا اور زرہ ہے۔ فرمایا۔ گھوڑا جہاد کے لیے ضروری ہے۔ زرہ کو بیچو۔ انھوں نے ۴۸۰ درہم کے عوض زرہ بیچی۔ حضرت عثمان نے خرید کر قیمت ادا کر کے زرہ بھی واپس کر دی۔ آنحضرتؐ نے دراہم لے کر اپنے پاس رکھے۔ پھر آنجنابؐ نے ایک مٹھی دراہم لے کر بلال کو دیے اور فرمایا کہ اس کی خوشبو لے آؤ۔ اور اہل بیت سے ارشاد کیا کہ فاطمہ کا سامان تیار کرو۔ چنانچہ ایک چارپائی بنائی گئی اور ایک تو شک چمڑے کی تیار ہوئی جس میں درخت خرمے کا پوست بھرا گیا۔ امام احمد نے روایت کیا ہے کہ ایک کملی مخطط اور ایک مشک اور ایک تکیہ چرمی بھی جہیز میں تھا۔ غرض کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے نکاح کر دیا۔ اور چار سو مثقال چاندی مہر قرار دیا۔

بروایت صحیحہ ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے تاحیات سیدہ دوسری عورت سے نکاح نہیں کیا۔ ایک مرتبہ حارث ابن ہشام برادر ابوجہل نے علی مرتضیٰؓ سے درخواست کی کہ تم مسماۃ عوراء بنت ابی جہل سے نکاح کرو۔ یہ حال سن کر حضرت سیدہؓ نے حضرت صلعم سے شکایت کی۔ تب حضرتؐ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا خبردار ہو کہ بنی ہشام بن مغیرہ کی اولاد مجھ سے اس کی اجازت مانگتی ہے کہ اپنی بیٹی کو علی مرتضیٰ ابن ابی طالب سے نکاح کریں۔ سو میں ان کو اجازت نہیں دیتا۔ مگر یہ کہ ابوطالب کا بیٹا یہ چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔

حضرت فاطمہؓ کی عمر اٹھائیس برس کی، اور ایک روایت میں انتیس برس کی ہوئی۔ اور وفات بروز سہ شنبہ بتاریخ سوم رمضان ۱۱ھ میں واقع ہوئی اور قبر شریف بروایت صحیحہ جنت البقیع میں ہے۔

ان کا شمار اُن چار خدا پرست خاتونوں میں ہے جو دنیا بھر کی خواتین سے عالیجاہ ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

(۱) آسیہ۔ زوجۂ فرعون

(۲) مریم اُمّ عیسیٰ علیہ السلام

(۳) خدیجۃ الکبریٰؓ

(۴) فاطمۃ الزہراءؓ

آنحضرت صلعم کو فاطمہ اپنی تمام صاحبزادیوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ آپؐ نے وفات سے پیشتر حضرت فاطمہ کو بشارت دی تھی کہ میری وفات کے بعد سب سے پہلے مجھ سے تم ملوگی۔ اس خوش خبری سے حضرت فاطمہؓ کو خوشی ہوئی اور آپ کی زبان مبارک سے آپ کے قرب انتقال کی خبر سن کر ان کو جو صدمہ ہوا تھا اس کی بہت کچھ تلافی ہو گئی۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات سے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت فاطمہؓ نے انتقال کیا ان کی زندگی میں حضرت علیؓ نے دوسری شادی نہیں کی اور نہ ان کو شرعًا اس کی اجازت تھی۔

فاطمہؓ بنت اسد

نام فاطمہؓ، اسد بن ہاشم کی دختر اور رسول اکرمؐ کے جدِ امجد جناب عبدالمطلب کی بھتیجی تھیں۔ آپ کا نکاح عبدالمطلب کے فرزند ابوطالب سے ہوا، جن سے حضرت علیؓ پیدا ہوئے۔ آپ حضرت علیؓ کی والدہ اور اس نسبت سے حضرت فاطمہ الزہرا کی خوشدامن تھیں، اگرچہ آپ کے شوہر ایمان نہیں لائے تھے، لیکن خود آپ اور آپ کی بعض اولاد نے اسلام قبول کیا، جب

مسلمانوں نے مکہ [illegible]
گئیں۔ سال کی وفات [illegible]

فاطمہؓ بنت خطاب

فاطمہ نام [illegible] حضرت عمر فاروقؓ کی ہمشیرہ تھیں، جن کا نام نامی اس جلیل القدر شخصیت کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی وجہ سے مشہور یا اور ہو گیا ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ایک روز حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے جا رہے تھے کہ انہیں راستے میں نعیم بن عبداللہ نے ٹوکا کہ پہلے گھر کی خبر تو لو۔ تمہاری اپنی ہمشیرہ اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں زور زور سے چلتے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن مجید پڑھ رہی تھیں۔ آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بولے، سنا ہے کہ تم مرتد ہو گئی ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہو گئے پھر ہمشیرہ کو بھی لہولہان کیا۔ اس کے باوجود وہ دونوں کہنے لگے: "عمر جو جی چاہے کر گزرو ہم اسلام کا دامن نہیں چھوڑ سکتے"۔ ان الفاظ نے عمرؓ کے دل پر بہت اثر کیا اور قرآن سن کر رقت طاری ہو گئی۔ بولے مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ اور یوں عمر فاروقؓ نے اسلام قبول کیا۔

حضرت فاطمہؓ بنت خطاب کا نکاح حضرت سعیدؓ بن زید سے ہوا اور انہی کے ساتھ مسلمان ہوئیں۔ آپ کا سن وفات معلوم نہیں۔ آپ کے ہاں ایک لڑکا بھی تولد ہوا، جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔

فاطمہؓ بنت قیس

رسول اکرمؐ کی صحابیات میں تھیں اور قبیلہ بن کنانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لائیں اور ہجرت اختیار کی۔ پہلا نکاح ابوعمرو حفص بن مغیرہ سے ہوا۔ ۱۰ھ میں ابوعمرو نے طلاق دے دی۔ عدت کی میعاد پوری ہونے کے بعد امیر معاویہؓ، ابوجہمؓ اور اسامہؓ بن زید نے نکاح کا پیغام بھیجا چنانچہ آنحضورؐ کے ایما پر اسامہؓ سے نکاح کر لیا۔ ۵۴ھ میں اسامہؓ کے انتقال کے بعد پھر شادی نہیں کی اور اپنے بھائی ضحاک کے ساتھ رہیں۔ ۲۴ھ میں جب حضرت عمرؓ نے انتقال فرمایا، تو مجلس شوریٰ کا اجلاس حضرت فاطمہؓ ہی کے مکان پر ہوتا تھا۔ فاطمہؓ بنت قیس بڑی عقلمند اور حسین و جمیل تھیں۔ فاطمہؓ نے آنحضورؐ سے چند احادیث روایت کی ہیں، جو متعدد شخصیتوں کے ذریعے سے مروی ہیں۔ وفات کا سال معلوم نہیں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے زمانہ خلافت تک زندہ رہیں (اُردو انسائیکلو پیڈیا)

فاطمی خاندان

ایک حکمران خاندان جس نے شمالی افریقہ اور بعد ازاں مصر میں ۹۰۹ء سے ۱۱۷۱ء تک حکومت کی۔ اس خاندان کا نام حضرت فاطمہؓ کے اسم گرامی سے منسوب ہے، کیونکہ خلفائے بنو فاطمہ اپنا نسب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ تک پہنچاتے تھے۔

بنو فاطمہ اپنا سلسلۂ نسب اسماعیل بن جعفر الصادقؓ سے ملاتے ہیں، لیکن انہوں نے کچھ عرصے تک اعلانیہ اور باضابطہ طور پر اپنے نسب نامے کے بارے میں اعلان نہیں کیا اور چونکہ غائب اماموں کے زمانے کے دوران محمد بن اسماعیل اور عبیداللہ المہدی کے درمیان آنے والے تمام اماموں کے نام دانستہ طور پر اخفا میں رکھے گئے تھے اس لیے مختلف انساب رائج ہو گئے اور [illegible] کہ آج تک بنو فاطمہ کی اصل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ فاطمیوں کے حریفوں نے ان کے علوی [illegible] اولاد [illegible] کیا کہ وہ

Marfat.com

مدعیان کا فرق ہیں۔

اسماعیلی ماخذ میں عبید اللہ سے قبل کے آئمہ کا سلسلہ ہر جگہ یکساں نہیں ملتا اور نہ ان کے ناموں کے بارے میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ بہر صورت بنو عباس نے تو سرکاری طور پر بنو فاطمہ کے اس سلسلۂ نسب کی شد و مد سے مخالفت کی، کیونکہ اس کی بدولت فاطمیوں کے اثر اور وقار میں بے حد اضافہ ہوا تھا۔ فاطمی خاندان نے طاہری، صفاری اور طولونی وغیرہ حکومتوں کے برعکس اپنے آپ کو خلافت بغداد کی سیادت سے بالکل آزاد کرکے دولت عباسیہ کی مد مقابل بن گئی۔

اہل بیت میں مختلف اماموں کے پیرو فرقوں میں سے ایک فرقہ باطنیہ اسماعیلی تھا جو امام جعفر صادق کے بعد ان کے صاحبزادے اسماعیل کی امامت کو تسلیم کرتا تھا اسی سے عبیدی فرقہ ظہور میں آیا، جو عبید اللہ المہدی بن محمد بن جعفر مصدق بن محمد مکتوم بن جعفر صادق کو امام مانتا تھا۔ اس فرقے کے مبلغین نے یمن، حجاز، بحرین وغیرہ میں اپنی دعوت کی اشاعت کی، لیکن مغرب میں محمد الحبیب کے زمانے میں اس کا آغاز اور عبید اللہ کے لئے ملنے میں تکمیل ہوئی۔ عبید اللہ مہدی نے فاطمی حکومت کے قیام کے بعد سسلی سے مصر تک دولت فاطمیہ کا پرچم لہرانے کی کوشش کی، چنانچہ ۹۱۳ء میں ان کے بیٹے ابو القاسم نے مصر پر فوج کشی کرکے برقہ، فیوم اور سکندریہ کو زیر نگیں کیا، لیکن عباسی امیر مونس نے انہیں واپس لے لیا اور مہدی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ فاطمی خاندان کے بعض قابل ذکر حکمران یہ ہیں۔

عبید اللہ مہدی	۹۰۹ء تا ۹۳۴ء
القائم، ابو القاسم	۹۳۴ء تا ۹۴۶ء
المنصور، ابو طاہر اسماعیل	۹۴۶ء تا ۹۷۵ء
المعز، ابو تمیم صالح	۹۵۳ء تا ۹۷۵ء
العزیز، ابو منصور	۹۷۵ء تا ۹۹۶ء
الحاکم، ابو علی منصور	۹۹۶ء تا ۱۰۲۱ء
الظاہر، ابو الحسن	۱۰۲۱ء تا ۱۰۳۶ء
المستنصر، ابو تمیم	۱۰۳۶ء تا ۱۰۹۴ء
المستعلی، ابو القاسم	۱۰۹۴ء تا ۱۱۰۱ء
الآمر، ابو علی منصور	۱۱۰۱ء تا ۱۱۳۰ء
الحافظ، ابو المیمون	۱۱۳۰ء تا ۱۱۴۹ء
الظافر، ابو المنصور	۱۱۴۹ء تا ۱۱۵۴ء
الفائز، ابو القاسم	۱۱۵۴ء تا ۱۱۶۰ء
العاضد، ابو محمد	۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۱ء

بنو فاطمہ کا نظم و نسق ایک مضبوط مرکزی نظام پر قائم تھا، جس کا حاکم اعلیٰ خلیفہ ہوتا تھا یا اُس کا وزیر جس کی حیثیت یا تو ایک تعمیل کنندہ کی ہوتی تھی یا اُسے خلیفۂ وقت کی طرف سے اختیارات تفویض ہوتے تھے۔ ہر شعبہ مرکزی انتظامیہ کے ماتحت ہوتا تھا۔ صوبائی حکومت کو صحیح معنوں میں حقوق خود اختیاری حاصل نہ تھے۔

عہد بنو فاطمہ میں معاشی سرگرمی خاص تیز ہو گئی تھی شہری زندگی کی ترقی کی بدولت شمالی افریقہ میں عبید اللہ المہدی کو خوشحالی اور آسودگی نظر آئی تھی، اس خوشحالی کے باعث ابتدائی فاطمی خلفا کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے انتظامی اور مالی نظام کے استحکام، زیادہ محاصل اور واجب الادا رقوم حکومت کی کانوں سے آمدنی، تجارت اور محصول درآمد کی یافت اور جنوبی سوڈان کی کانوں جیسے بڑی مقدار میں سونے کی برآمد کی بدولت عہد بنو فاطمہ میں شورشوں، بغاوتوں اور لسانیات کے باوجود، مصر عام طور سے بڑی خوشحالی سے بہرہ ور رہا۔ صنعت و حرفت کو بھی ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں اولیت پارچہ بافی کو حاصل تھی۔ قاہرہ میں مختلف قسم کے ریشمی کپڑے تیار کئے جاتے تھے جن کے الگ الگ نام تھے دوسری صنعتوں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔ لکڑی کی صنعت، شیشہ سازی، سفال سازی، کوزہ گری، پچی کاری، دھاتوں کا کام، ہاتھی دانت کا کام، کاغذ سازی، چینی اور نیل تیار کرنا۔ بنو فاطمہ کے دور میں مذہبی، ادبی اور فنی سرگرمیوں کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ شمالی افریقہ میں درباری شاعروں نے بڑی قدر و منزلت پائی۔ خلیفہ المنصور اور المعز ان سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ مصر میں ثقافتی سرگرمیاں اس سے بھی زیادہ زوروں پر تھیں۔ خلفاء کو خود بھی شعر و سخن سے شغف تھا اور ان کے دربار میں غیر اسماعیلی شعراء تک کا بھی خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

عہد بنو فاطمہ میں عروج و عظمت کے کئی ادوار آئے۔ یہ عظمت اس خاندان کو اداری اور مالی تنظیم اس کی معاشی ترقی اور اعلیٰ درجے کی فکری و فنی سرگرمی، دربار و قیصر خلافت کی شان و شوکت اور اس کی پورے آداب و رسوم کے ساتھ منعقد ہونے والی پُرتکلف ضیافتوں کی بدولت نصیب ہوئی، جنہیں دیکھ کر معاً دربار قسطنطنیہ سے مقابلے کا خیال پیدا ہوتا تھا اور بغداد کے بارے میں ماضی کی تمام باتیں محض افسانہ معلوم ہونے لگی تھیں۔ بایں ہمہ بنو فاطمہ پر ایسے دور بھی آئے، جو قحط و مصائب اور فوجی گروہوں کے درمیان خونریز لڑائی جھگڑوں سے عبارت ہے اور جب مخالف وزرا باہمی سازشوں کے باعث غیر ملکی طاقتوں کو مداخلت کی دعوت دینے لگے تو بالآخر اُسے ایک المناک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تاریخ متضاد باتوں سے معمور ہے۔ مورخ کو اس کے عروج اور زوال دونوں سے بڑا دلکش مواد ملتا ہے، جس کی بنا پر اس خاندان کو تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ (دائرہ المعارف)

فال

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ شگون کوئی چیز نہیں، اور اچھا شگون فال نیک ہے۔ لوگوں نے عرض کیا فال کیا ہے۔ نیک کلمہ ہے جو تم میں سے کوئی سنے۔

مطلب یہ ہے کہ بُرے شگون کی کوئی اصلیت نہیں جیسے کہ ایام جاہلیت میں عام لوگ اور آجکل بھی بعض جہلا بعض پرندوں کی اڑان سے نحوست و سعادت کے آثار قرار دے لیتے ہیں۔ اور ان کے مقاصد میں اس التزام بالا میں سے کئی قسم کی رکاوٹیں واقع ہوتی ہیں۔ شریعت نے اس سے قطعی ممانعت کی ہے اور حکم دیا ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں۔

جائز قسم کی فال یہ ہے کہ مثلاً کوئی بیمار ہے اور ایک طرف کسی نے عبد السلام کا نام پکارا تو سلام کے لفظ سے نیک فال لے کر کہہ سکتے ہیں کہ اللہ اس بیمار کو سلامت رکھے گا۔ اور مثلاً کوئی شخص طلب رزق کی فکر میں جا رہا ہے۔ راستہ میں کسی کے منہ سے سُنا کہ خدا رازق ہے تو اس سے وہ فال لے سکتا ہے کہ خدا مجھے کامیاب کرے گا۔

انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ جب کسی کام کے لیے نکلتے تو آپ کو "اے راشد" (سیدھی راہ پر چلنے والے) اے نجیح" (کامیاب) کی قسم کی مبارک آوازیں سننا بہت پسند ہوتا تھا۔

الفائز بنصر اللہ

: ایک فاطمی خلیفہ، جو ۵۴۴ھ/۱۱۴۹ء میں پیدا ہوا۔ وہ خلیفہ الظافر کا بیٹا تھا۔ اس کا اصلی نام ابو القاسم عیسیٰ تھا۔ اس کے باپ کے قتل پر وزیر سلطنت عباس اُسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر باہر لایا اور تخت پر بٹھا دیا اس وقت اس کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ ان ایام میں اس نے، جو ہولناک مناظر اپنی آنکھو

Marfat.com

سے دیکھیے، بالخصوص جب عباس کے حکم سے اس کے چچا یوسف اور جبریل قتل کئے گئے۔ ان سے اس بدنصیب بچے کا دماغ اس قدر متاثر ہوا کہ اس پر مسلسل دورے پڑنے لگے حتیٰ کہ وہ کم سنی ہی میں وفات پاگیا۔ اس کے شش سالہ دورِ خلافت میں عنانِ حکومت طلائع بن رزیک کے ہاتھ میں رہی۔ عباس کی موت اور اس کے بیٹے نصر کی سزائے موت کا واقعہ اسی زمانے میں پیش آیا۔ الفائز ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔

فتاح

اسمائے حسنیٰ سے ہے مشکل کشا یا بندوں میں حکم کرنے والا۔ فتح سے مشتق ہے جس کے معنے کھولنے اور حکم کرنے کے ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحمت کے دروازے کھولتا ہے اور وہ خلائق میں حاکم علی الاطلاق ہے۔

قرآن مجید میں یہ اسم بعینہٖ موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو کہ ہمارا پروردگار (قیامت کے دن) ہم (دونوں فریقوں) کو (ایک جگہ) جمع کرے گا۔ پھر ہم میں (تم میں) انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے گا۔ اور وہ بڑا ٹھیک فیصلہ کرنے والا اور (سب کے حال سے) واقف ہے۔ (س۔ سبا۔ ع ۳۴)

فتح

قرآن مجید کی ایک سورۃ کا نام ہے جس میں جنگِ حدیبیہ کی صلح کو اللہ تعالیٰ نے عین فتح قرار دے کر آنحضرت صلعم کو خوشخبری دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ہم نے حکم لگا دیا تیرے لیے فتح غالب کا۔ (س۔ فتح۔ ع ۱)

ابن جریر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ہجرت کے چھٹے سال نبی اکرمؐ عمرہ کرنے مکہ چلے اور مشرکوں نے بمقام حدیبیہ آپؐ کو روک دیا اور اس بات پر فیصلہ ٹھہرا کہ اگلے سال آپ عمرہ کریں اور آنحضرت نے وہیں اپنی قربانی ذبح کر دی۔ اس سے صحابہ کی ایک جماعت کو رنج تھا جن میں عمر بن الخطابؓ بھی تھے۔ پھر جب قربانی کر کے مدینے کو واپس چلے تب یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی جس میں اُن شکستہ دل مسلمانوں کو مژدہ ہے کہ یہ صلح تمہارے لیے فتح و ظفر ہے چنانچہ بخاری نے براءؓ سے نقل کیا ہے کہ اے لوگو! تم مکہ فتح ہوجانے کو فتح سمجھتے ہو وہ بھی سہی ہم تو یوم حدیبیہ میں بیعت الرضوان کو فتح سمجھتے ہیں۔ ہم چودہ سو آدمی حضرتؐ کے ساتھ تھے اور حدیبیہ جو ایک کنواں ہے اس میں جس قدر تھوڑا سا پانی تھا سب کھینچ لیا۔ ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا۔ آنحضرتؐ نے کسی قدر پانی مانگا۔ وضو کر کے کلی اس میں ڈال دی۔ پھر اس میں اس قدر پانی ہوگیا کہ سب آدمیوں اور اونٹوں نے سیر ہو کر پیا۔

فتح مبین میں علماء کے چند اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں فتح مکہ گو اس وقت تک نہ ہوئی تھی مگر یقینی چیز کو بلفظ ماضی تعبیر کرنا قرآن کا محاورہ ہے۔ بعض کہتے ہیں فتح روم وغیرہ جو اہل اسلام کو یکے بعد دیگرے اس سورۃ کے بعد سے ہونی شروع ہوگئیں۔ خیبر فتح ہوا اور علاقے عرب کے زیر حکومت ہوئے۔ یمن میں تسلط ہوا۔ خراج بھی آنے لگے۔ بعض کہتے ہیں براہین و حجج اسلامیہ۔ بعض کہتے ہیں صلح حدیبیہ جو مقدمہ ہے تمام فتوحات کا۔

یہ اقوال باہم متعارض نہیں۔ ہر ایک درست ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صلح حدیبیہ سے مسلمانوں کو ایک رنج تھا کہ کفار قریش نے مکہ کے قریب سے مسلمانوں کو اور حضرتؐ کو مکہ میں آنے نہ دیا۔ اور اگلے سال پر ٹال دیا۔ گویا مسلمان دب گئے آنحضرت صلعم نے اس جگہ فروتنی کو اختیار کیا۔ جنگ و جدال کرنا مناسب نہ جانا۔

اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ نے فتوحات کے دروازے حضرتؐ چند روز کے بعد پیروؤں پر کھول دیئے۔ تھوڑے دن بعد حضرتؐ نے خیبر فتح ہوا جس سے مدینے کے مسلمانوں کا فقر و فاقہ دور ہوگیا۔ اس کے بعد مکہ فتح ہوا اور بہت سے فتوحات ظاہر ہوتے گئے جن کی مفصل کیفیت کتب تواریخ میں موجود ہے۔

فتاویٰ

(دیکھیے فتویٰ)

فتاویٰ جہانداری

مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کی تصنیف۔ یہ کتاب فیروز شاہ تغلق کے عہد کے پہلے چھ برسوں کے دوران میں لکھی گئی۔ اس میں برنی نے غیاث الدین بلبن سے لے فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی عہد تک کے سیاسی و معاشرتی حالات کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ برنی ذاتی طور پر سیاست کو مذہب سے الگ نہیں سمجھتا، بلکہ اس کی دلی خواہش تھی کہ ملکی، سیاسی و معاشی مسائل کے حل کرنے میں قدیم ضابطۂ حیات کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے اس نے قرآن مجید ارشادات نبویؐ اور خلفائے راشدین کے احکام کی روشنی میں بعض مسائل کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ سلطان محمود غزنویؒ کو اس نے خاص طور سے شاہانہ رہنمائی کیلئے مثالی رہنما کے ذریعے اپنے نظریات کو بیان کرنے کا انداز قدیم علماء نے اختیار کیا تھا۔ برنی نے بھی یہی انداز اپنایا، چنانچہ سیاسی حالات میں اپنے ذاتی تاثرات کو بھی وہ سلطان محمود کی زبانی بیان کرتا ہے۔ "فتاویٰ جہانداری" کے اہم موضوعات یہ ہیں۔ بادشاہ کو خدا کی خلافت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کا مرتبۂ دینی۔ مشورے کی اہمیت۔ مشیروں کے اوصاف، مساواتِ خاص و مساواتِ عام، عسکری نظام، حق و باطل، عفو و تعزیر۔ اس تصنیف کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے علمائے دہلی کے علاوہ سلطنت کے اطراف و اکناف سے ایسے علماء جمع کیے جنہیں علم فقہ میں کامل دستگاہ تھی اور انھیں حکم دیا کہ مختلف کتابوں کی مدد سے ایک ایسی مستند اور جامع کتاب تیار کریں جس میں نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ تمام فقہی مسائل جمع کیے جائیں تاکہ قاضی اور مفتی، نیز دیگر تمام مسلمان علم فقہ کی بہت سی کتابیں جمع کرنے اور اُن کی ورق گردانی کرنے سے بے نیاز ہوجائیں۔

اس جماعت میں شیخ نظام، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپاموی، ملا حامد جونپوری، ملا محمد اکرم لاہوری، جلال الدین محمد، سید محمد قنوجی، شیخ رضی الدین بھاگل پوری، محمد جمیل صدیقی، قاضی غلام محمد لاہوری، شاہ عبدالرحیم دہلوی، مولانا محمد شفیع سرہندی، قاضی محمد غوث اور دیگر علمائے کبار شامل تھے۔ ان لوگوں نے کم و بیش آٹھ سال کی مدت میں فتاویٰ کی ایک ضخیم کتاب تیار کی جسے شہنشاہ کے نام پر "فتاویٰ عالمگیری" کہا گیا۔ اس کتاب کی تالیف، علماء و فقہا کے وظائف، نیز دیگر اخراجات پر عالمگیری سکے کے دو لاکھ روپے صرف ہوئے۔

کتاب کی تالیف پورے انضباط کے ساتھ عمل میں آئی۔ کام کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا، جن میں سے ہر حصہ ایک عالم کے سپرد ہوا اور عالم کی امداد و اعانت کے لیے دس اور علماء مقرر کئے گئے۔ صدارت کے فرائض شیخ نظام برہان پوری کے سپرد تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر خود بھی تالیف کے کام میں دلچسپی لیتے تھے اور ایک زمانے میں تو شیخ نظام دو چار صفحے روز شہنشاہ کو سنایا کرتے تھے جو موقع

Marfat.com

... موقع تصنیف کرتے ہیں نہیں بلکہ فروگزاشتوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے کتاب کی تکمیل کے بعد پورے مسودے پر نظر ثانی بھی کی گئی۔ انھی احتیاطوں کا نتیجہ ہے کہ "فتاوی عالمگیری" ایسی ضخیم کتاب اغلاط اور نقائص سے بڑی حد تک پاک ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ دستیاب ہے۔

فتاوی غیاثیہ

سلطان غیاث الدین بلبن سے منسوب مخطوطہ۔ اس کو فقہی اعتبار سے اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ غیاث الدین بلبن کو فقہی مسائل سے بہت دلچسپی تھی۔ یہ عربی زبان میں ہے اور فقہ حنفی کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

فتاوے قاضیخان

فقہ حنفی میں نہایت مستند فتاوے ہے مصنف فخرالدین حسن بن منصور اوزجندی فرغانی جو ۵۹۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس فتاوے میں اکثر ایسے مسائل بیان کیے گئے ہیں جو اکثر وقوع میں آتے رہتے ہیں۔ یہ فتاوے چار جلدوں میں ختم ہوا ہے۔ پہلی دو جلدوں میں عبادات اور آخری دو جلدوں میں معاملات کا بیان ہے۔

فتاوی قراخانی

جلال الدین فیروز تغلق کے عہد کا ایک فقہی مخطوطہ جو فقہ حنفی کے مسائل پر مشتمل ہے۔ فارسی زبان میں ہے اور اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مولانا امام ہمام صدرالملت والدین یعقوب مظفر کرامی کا تصنیف کردہ ہے۔

فترۃ

سستی۔ کمزوری۔ رکاوٹ۔ دھیما پڑ جانا۔

وہ مدت جو ایک پیغمبر کی وفات سے لے کر دوسرے پیغمبر کے مبعوث ہونے تک ہوتی ہے۔

فترۃ کا اطلاق اس سہ سالہ مدت پر بھی کیا جاتا ہے جس میں آنحضرتؐ پر وحی کے نازل ہونے میں توقف پڑ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ نازل ہوئی۔ تو پھر تین سال تک وحی نہ آئی جس میں خداوند تعالیٰ کی کوئی حکمت تھی۔ اس توقف و التوا سے آنحضرتؐ اس قدر ملول و تنگدل رہتے تھے کہ کئی مرتبہ آپؐ نے اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر سے گرا دینے کا ارادہ کیا مگر ہر مرتبہ جبرئیلؑ آپؐ کے سامنے نمودار ہوتے۔ اور کہتے "یا محمدؐ! آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میں آپ کا دوست اور بھائی ہوں ایسا نہ کیجئے"۔ اس عرصہ میں آنحضرتؐ نے جبرئیلؑ کو آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ اس وقت آپ کے دل پر ایک ہیبت اور بے قراری طاری ہوئی گھر آئے اور فرمایا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ۔ "مجھ پر چادر ڈال دو۔ مجھ پر چادر ڈال دو۔"

پہلی مرتبہ وحی کے نازل ہونے پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غرض جب چادر اوڑھ کر آپ کی طبیعت بحال ہوئی تو وحی نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ (اے پیغمبر) جو چادر اوڑھے پڑے ہو اٹھو اور لوگوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈراؤ۔ پھر وحی متواتر آتی رہی۔

فتن

فتنہ کی جمع۔ مراد فتنہ و فساد۔ باغیانہ شورشیں۔ جنگ و جدل ہنگامے، بلوے۔

اس میں جنگ و جدل کے وہ واقعات مراد ہوتے ہیں جن کے متعلق آنحضرتؐ نے اپنے بعد واقع ہونے کی پیش گوئیاں کی ہیں۔ کتب احادیث میں باب الفتن کے نام سے ایک خاص باب درج ہے جس میں ان واقعات کے متعلق آنحضرتؐ کی پیش گوئیاں جمع کی گئی ہیں۔

الفتن۔ جس میں سے چند احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میری امت کی ہلاکت قریش کے چند لڑکوں کے ہاتھ پر ہوگی۔

سفینہؓ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہؐ نے خلافت تیس سال رہے گی پھر بادشاہی ہو جائے گی۔ سفینہؓ کہتے ہیں۔ گن لو۔ ابوبکرؓ کی خلافت دو سال۔ عمرؓ کی خلافت دس سال۔ عثمانؓ کی خلافت ۱۲ سال۔ اور علیؓ کی خلافت چھ سال۔

ثوبان سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرتؐ نے جب میری امت میں تلوار رکھی جائے گی تو قیامت تک اس سے نہ اٹھائی جائے گی اور قیامت نہ آئے گی تا وقتیکہ میری امت کے قبائل بت پرستی نہ کرنے لگ جائیں۔ اور میری امت میں تیس کذاب پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک اپنے نبی اللہ ہونے کا گمان کرے گا۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اور برابر ایک جماعت میری امت میں سے بر طاحق پہ قائم رہے گی۔ کوئی مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آئے۔

فتنہ

فتنہ سے مراد فساد، عذاب یا وہ آفت ہے جس کے ذریعے مسلمان کو آزمائش میں ڈال کر اس کے ظرف کی پہچان کی جاتی ہے قرآن حکیم میں فتنہ کا لفظ صرف آفت و مصیبت ہی نہیں بلکہ آسائشات کے حوالے سے بھی آزمائش کے لفظوں میں آیا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن) یعنی تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے فتنہ ہے ایک دوسری جگہ (البقرہ) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ فساد (دین سے گمراہ کرنے والا) قتل سے بڑا ہے۔

فتنہ و فساد اگر رونما ہونے لگے تو خانہ جنگی، بدامنی اور ابتری کا پھیلنا لابدی ہے جس کے نتیجے میں گروہی عصبیت جنم لیتی ہے اور مومن کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اس لئے فتنہ کو سر اٹھاتے ہی ختم کر دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جنگ صفین دو گروہوں کے مابین پیدا ہونے والے نزاع اور فساد کی منہ بولتی مثال ہے جسے عظیم فتنہ کہا گیا ہے کہ نتیجہ میں امت محمدی میں تفریق کا دروازہ کھل گیا۔ اسی طرح ہر قسم کی بدعت کو بھی فتنہ کہا گیا ہے۔ حضرت امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو فتنے (فساد) بپا کرتے ہیں وہ بدعتی ہیں۔ فتنے کی اصطلاح بذات خود بہت وسیع ہے اور مصنفین نے اس کے استعمال میں لچک رکھی ہے مگر اصولاً لفظ فتنہ سے مراد وہ شورش ہے جو مسلمانوں کے راسخ و صحیح عقائد کے لئے خطرے کا باعث بن سکے۔

فتوحات مکیہ

تصوف میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی طائی کی تصنیف ہے جو ۶۳۸ھ میں فوت ہوئے۔ یہ کتاب حضرت شیخؒ کی آخری تصنیف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حج اور عمرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اور جب مکہ معظمہ میں پہنچا تو خدا نے میرے دل میں اس کتاب کی تالیف کا خیال ڈالا۔ آپ کہتے ہیں کہ اس

Marfat.com

فتوحات مکیہ

کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جس ہنج پر اس کی ترتیب دی گئی ہے اس میں کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے ۔ شیخ عبدالوہاب بن احمد شعرانی نے اس کی تلخیص کی اور اس کا نام لواقح الانوار القدسیۃ المنتقاۃ من فتوحات المکیۃ رکھا ۔

فتوہ

فتوہ ۔ ایک اصطلاح ، جو آٹھویں صدی عیسوی میں " مُروہ " کے مترادف کے طور پر ایجاد کی گئی اور اس سے ایک پختہ سن کے آدمی کی صفات مراد ہوتی ہیں ، فتوہ سے اس چیز کا اظہار مقصود تھا جسے " فتی " ، یعنی جوان آدمی کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا ۔ عام طور پر اس اصطلاح کو ان مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے جو عصر حاضر کے آغاز تک تمام مشرقی ممالک کے شہری حلقوں میں وسیع پیمانہ پر تشکیل ہوئی تھیں ۔

فتویٰ

فتویٰ اس سے مراد وہ حکم ہے جو کسی عالم دین نے دیا ہو جسے اصطلاحی زبان میں فقیہہ یا مفتی کہا جاتا ہے ۔ لفظ فتویٰ صرف دینی و شرعی مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مسائل بھی وہ جن کا حل عام انسان نہ نکال سکے اور مفتی اپنے علم و مہارت اور قوت استدلال زور آوری سے کام لیتے ہوئے ایک حکم واضح وضع کردے جیسا کہ ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے " میں نے اس سے فتویٰ دریافت کیا تو اس نے مجھے یہ فتویٰ دیا چنانچہ فتویٰ " مدلل ثبوت والا جواب " ہوا جو کسی عالم وقت نے اپنے اجتہاد و استنباط کی روشنی میں دیا ۔

فتویٰ کا سلسلہ حضور اکرم صلعم کی زندگی سے شروع ہوتا ہے گویا اس کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہوئی جتنی اسلام کی ۔ جب لوگ رسول مقبول صلعم سے کچھ پوچھتے تو بسا اوقات اس کا جواب بزبان قرآن حکیم ملتا ۔ کبھی حضور القادر وحی کے ذریعے جواب دیتے ۔ عہد رسالت ہی میں کچھ صحابہ کرام نے بھی اپنے علم و اجتہاد سے مدد لیتے ہوئے کچھ فتاویٰ صادر فرمائے جن کو حضور اکرم ؐ نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ اجر و ثواب کا وعدہ بھی کیا ۔ ان خوش نصیبوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت معاذ بن جبل حضرت خدیفہ ابن الیمان ؓ اور حضرت عمرو بن العاص کے نام قابل ذکر ہیں ۔ یہ سلسلہ دور نبوت کے بعد بھی جاری و ساری رہا ۔ زیادہ تر فتاویٰ زبانی ہی ہوتے تھے مگر بسا اوقات ان کو ضابطۂ تحریر میں لایا جاتا تھا ۔

خلفائے راشدین کے علاوہ تاریخ اسلامی میں ایک سو تیس کے قریب ایسے جلیل القدر صحابۂ کرام اور امہات المومنین کے نام ملتے ہیں جو وقتاً فوقتاً اور بسا اوقات بیک وقت مسند فتویٰ پر فائز رہے اور لوگ ان کی طرف رجوع کرتے رہے (الخضری ۲ - ۱۰۵) حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کے وصال کے بعد ۱۱ھ سے تبع تابعین کا دور شروع ہوا اور لوگ ان سے فتاویٰ دریافت کرتے رہے ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے صحابۂ کرام سے دینی و اخلاقی تربیت حاصل کی تھی اور ان کی موجودگی میں فتوے دیتے تھے جیسے حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ اور سعیدؒ ابن جبیر بھی شامل تھے ۔ صحابہ کرام کے دور میں بعض اسلامی مسائل کے بارے میں مجتہدین میں اختلاف رائے ہو دور تدوین فقہ میں یہ اختلاف اور بڑھ گیا اور دو گروہ پیدا ہو گئے ۔ پہلا گروہ اہل حدیث کا تھا جو صرف حدیث اور قرآن ... فتوے دیتے تھے ان میں زیادہ تر ... اہل حجاز ... جو اسلامی شریعت کی بنیاد عقل و حکمت اور افعال کے فلاح و اصلاح پر قرار دے کر اور حدیث کو زیر نظر رکھتے ہوئے فتویٰ دیتے تھے یہ گروہ اہل عراق پر مشتمل تھا اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ عراق منبع اسلام سے دور تھا اور وہاں احادیث اس سرعت اور کثرت سے نہ پہنچ سکیں نیز کچھ لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر حدیثیں گھڑ لی تھیں جس کی وجہ سے فقہا کو فتویٰ دینے میں جید احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا ۔

ائمہ مجتہدین کے دور کے بعد فتاویٰ کا اجرا اجتہاد کے بجائے تقلید کی بنیاد پر ہونے لگا اور چار مکاتیب فکر وجود میں آگئے ۔ ۱ ۔ حنفی ۲ ۔ مالکی ۳ ۔ شافعی اور ۴ ۔ حنبلی ۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ فتاویٰ کا کثیر حصہ حنفی مسلک کے فقہا کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی زیادہ تر اسی مسلک کے پیروکار ہیں البتہ پاکستان میں پہلی بار مالکی مسلک کی بنیاد پر مفتی محمد شفیع دیوبندی نے مفقود الخبر کی بیوی کے نکاح ثانی کے بارے میں فتویٰ دیا ہے (تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۵۳)

فتی

فتی ۔ جمع فتیان ۔ اصلی معنی " نوجوان " کے ہیں ۔ عربی میں اس لفظ کے کئی معنی ہو گئے ہیں ۔ ایک مفہوم ، جو اندلس میں رائج تھا ، خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ وہاں امیر یا اس کے گھرانے یا کسی صاحب اقتدار صاحب کے ملازم غلام (خواہ وہ خواجہ سرا ہوں یا نہ ہوں) درحقیقت غلمان کہلاتے تھے ۔ اور وہ غلام جو شاہی محل میں کسی اعلیٰ منصب پر مامور ہیں فتی کے نام سے مامور ہوتے تھے ۔ امرا کے گھرانے کا پورا انتظام دو اعلیٰ ملازموں یا اہلکاروں کے حوالے کر دیا جاتا تھا ۔ اندلس کی تاریخ شاہد ہے کہ بعض غلام کو جو بالعموم یورپی اصل کے ہوتے تھے ، آزاد کر دیے ... اعلیٰ مقام میں بڑھنے سے ... دیئے جاتے ہیں یہ غلام نمایاں سیاسی کردار ادا کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے لیے خود مختار ریاستیں قائم کرتے ... بھی کامیاب ہو گئے ۔ مراتب میں اس ترقی کا نتیجہ لازمی طور پر عرب امیر گھرانے کے جھگڑوں کی صورت میں برآمد ہوتا تھا اور آپس میں مار دھاڑ شروع ہو جاتی ہے ۔

فتح نامہ

فتح نامہ ۔ فتح و نصرت کا سرکاری اعلان ۔ اس تعریف کی حدود سے فتح ناموں کی بیشتر تعداد خارج ہو جاتی ہے جن کے مصنف غیر سرکاری افراد تھے اور بعضوں نے یہ فتح نامے محض ادبی ذوق کی تسکین کے لیے لکھے تھے ۔ عام طور پر فتح نامہ پندرہ اجزا میں منقسم ہوتا ہے :-

(۱) ۔ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا

(۲) ۔ آنحضورؐ پر درود و سلام

(۳) ۔ ظلم و ستم سے نجات دلانا سلطان کا فرض ہے ۔

(۴) ۔ ظلم کے استیصال کی وجوہ

(۵) ۔ سلطان کی روانگی

(۶) ۔ سلطان افواج کی کثرت تعداد

(۷) ۔ غنیم کے حالات

(۸) ۔ غنیم کی جرأت

Marfat.com

جنگ کا بیان

(۱۰) سلطان کی فتح

(۱۱) اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں شکرگذاری۔

(۱۲) دشمن کے علاقے پر قبضہ

(۱۳) بحر و بر کے راستوں سے فتح کا اعلان

(۱۴) ان مقامات کے نام جہاں فتح نامہ بھیجا گیا، اور فتح نامہ بھیجنے والے کا نام۔

(۱۵) فتح پر سلطان کا اظہار مسرت۔ مرسل الیہ کو خوشخبری کی اطلاع اور طلب دعا۔

الفجار ۔ گناہ اور محرمات کا ارتکاب کرنا۔ عربوں کے ہاں دستور تھا کہ چار حرمت والے مہینوں (ذی قعد، ذوی الحج، محرّم، رجب) میں جنگ اور لڑائی نہیں کرتے تھے، لیکن ۵۸۵ء میں قریش اور قیس عیلان میں انھی حرمت والے مہینوں میں ٹھن گئی اور یہ جنگ چار مرتبہ پیش آئی۔ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ شاہ حیرہ نعمان بن منذر کا ایک قافلہ خوشبو اور ریشم وغیرہ لے کر حجاز میں پہنچا اور اس کی سربراہی عروۃ الرّحال بن عتبہ بن جعفر بن کلاب کے سپرد ہوئی، جس نے یہ ذمہ لیا کہ وہ قافلے کو بخیر و عافیت منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ بَرّاض بن قیس بن رافع کو یہ بات ناگوار گزری، کیونکہ وہ خود بھی اس قافلے کی سربراہی کا امیدوار تھا۔ چنانچہ بَرّاض نے عروۃ الرّحال پر اچانک حملہ کرکے اُسے قتل کر دیا۔ اور خود قافلے کی سربراہی سنبھال لی۔ جب ذوی الحج میں عکاظ کا میلہ منعقد ہوا تو عروہ کے قتل کی خبر پھیل گئی۔ بنو ہوازن نے قریش پر حملہ کر دیا۔ فریقین کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ قریش بہرحال مکّہ میں داخل ہو گئے، اور جنگ بغیر صلح کے عارضی طور پر بند ہو گئی۔ ایک روایت ہے کہ اس جنگ کے وقت آنحضورؐ کی عمر چودہ برس تھی۔ یہ سلسلہ جنگ چار پانچ سال تک جاری رہا۔ یہ سارے معرکے ہر سال ذوالحج کے مہینے میں پیش آتے رہے اور یہ وہ مقدس مہینہ ہے کہ قریش اس میں جنگ کرنا حرام سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے کہا:۔ "قَدْ فَجَرْنَا" (ہم نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے)۔ اسی وجہ سے اس سلسلہ جنگ کا نام "حروب الفجار" مشہور ہوا۔ جنگ کا انجام قریش کے حق میں ہوا۔

زمانہ جاہلیت میں اوس و خزرج کے درمیان جو جنگیں ہوئیں، اُن میں بھی ایک یوم الفجار اوّل اور دوسری یوم الفجار ثانی کے نام سے مشہور ہے۔

الفجیرہ ۔ عرب میں شیوخ کی اُن سات ریاستوں میں سے ایک جو متارکہ جنگ کی پابند ہیں۔ یہ ریاست تمام کی تمام جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی جانب واقع ہے اور خلیج فارس اور خلیج عمان کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ یہ چھوٹی سی ریاست کبھی آزاد اور خود مختار تھی۔ ۱۹۵۲ء سے کلبہ کا علاقہ شارجہ کی ریاست کا حصّہ بن گیا ہے جس کا شیخ متارکہ جنگ کا پابند بن گیا ہے۔ یہ علاقہ الفجیرہ اور سلطان مسقط کے مقبوضات کے مرکزی حصّے کے درمیان واقع ہے۔ الفجیرہ کا قصبہ وادی حام کے دہانے پر ہے اور سمندر سے دو میل دور ہے۔ قصبہ اور وادی کے بیشتر باشندے الشرقیون کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

الفجیرہ عرصہ دراز تک راس الخیمہ اور شارجہ کے القواسم کے زیر اثر رہا ہے۔ یہ قبائل ۱۸۵۰ء سے قابض چلے آ رہے تھے۔ بالآخر الفجیرہ ۱۹۰۲ء میں ملکی آزادی سے ہمکنار ہو گیا۔ ۱۹۵۲ء میں برطانیہ نے اس کی آزادی تسلیم کر لی اور ریاست کے فرمانروا شیخ محمد بن محمد الشرقی نے ان معاہدات پر دستخط کر دیے جن پر برطانیہ اور متارکہ جنگ کے پابند شیوخ کی ریاستوں کے مابین عملدرآمد ہو رہا تھا۔

فخّ ۔ ایک وادی کا نام جو مکّہ معظمہ سے کچھ زیادہ دور نہیں اور جہاں ۸ ذوالحج ۱۶۹ھ / ۱۱ جون ۷۸۶ء کو حسین بن علی بن الحسن متعدد علویوں کے ساتھ شہید ہوئے لہذا یوم کربلا کی طرح شیعہ یوم فخ کو بھی سوگ کا دن مناتے ہیں۔ ان کی شہادت سے کچھ عرصہ قبل اہلِ مدینہ نے حسین مذکور کی بیعت کر لی تھی اور جب وہ اپنے چند حامیوں کو ساتھ لیے مکّہ جا رہے تھے تو فخ میں عباسی لشکر کا سامنا ہو گیا، جس نے ان کی مٹھی بھر جماعت کو منتشر کرکے انھیں شہید کر دیا۔ وہ اور ان کے ہمراہی جس مقام پر شہید اور مدفون ہوئے اور جسے اب الشہداء کہتے ہیں، اہلِ مکّہ کے نزدیک متبرک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۴ صفر کو ہر سال ان کا ایک اجتماع ہوتا تھا۔ فخ کے قتل عام سے بچنے والوں میں ایک ادریس بن عبداللہ بن حسن علوی بھی تھے، جو بھاگ کر المغرب چلے گئے اور وہاں انھوں نے بنو ادریس کی بنا رکھی۔

فخر قرآن و حدیث میں فخر کی نہی آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک (آدم) اور ایک عورت (حوّا) سے پیدا کیا۔ اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ (ورنہ) اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے، بے شک اللہ جاننے والا باخبر ہے۔ (س۔ حجرات۔ ع ۲)

(۱) حمار مجاشعی کے بیٹے عیاض سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا (لوگو!) خدا تعالےٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تم تواضع اور فروتنی (اختیار) کرو حتیٰ کہ ایک دوسرے پر فخر نہ کرے۔ اور ایک ایک پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا جو لوگ اپنے مرے ہوئے آباء و اجداد پر فخر کرتے ہیں انھیں اس سے باز رہنا چاہیے وہ تو دوزخ میں جل بھن کر کوئلے ہو گئے ہیں (پھر ان پر فخر ہی کیا کرنا) اور (اگر یہ لوگ فخر کرنے سے باز نہ آئیں گے تو) خدا کے نزدیک اس کالے کرم سے زیادہ ذلیل ٹھہریں گے جو (پلیدی میں رہتا اور) پلیدی کو اپنی ناک سے الٹ پلٹ کرتا ہے۔ خدا نے جاہلیت کی نخوت اور آباء و اجداد کے ساتھ فخر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ (آدمی دو حال سے خالی نہیں) مومن پرہیزگار ہے یا بدبخت بدکار۔ آدمی سب کے سب (ایک) آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے (بنائے گئے) ہیں (اور مٹی تعزز و ترفع کے قابل نہیں۔

(۳) ابو عقبہ کے بیٹے عبدالرحمٰن اپنے باپ عقبہ سے روایت کرتے ہیں اور ابو عقبہ (اگرچہ) اہل فارس میں سے ہے (مگر مسلمان ہونے کے بعد انصار کی حمایت و کفالت میں آ گئے تھے (الغرض) ابو عقبہ کہتے ہیں کہ میں جناب پیغمبرِ خداؐ کے ساتھ معرکہ اُحد میں موجود تھا۔ تو میں نے مشرکوں میں سے ایک شخص کو (تلوار) مارتے ہوئے کہا کہ لے یہ ضرب میری طرف سے، اور میں ہوں جوان فارسی (یہ ایک کلمہ ہے جو دلیر آدمی دشمن کو مارتے وقت کہا کرتے ہیں) رسولِ خداؐ نے میری طرف مُڑ کے دیکھا اور فرمایا، ابو عقبہ! تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ لے اس ضرب کو میری طرف سے اور میں ہوں جوان انصاری۔

کبر۔ نخوت۔ غرور۔ تعلّی۔ ترفّع۔ تفضّل۔ حبّ جاہ۔ عجب۔ خود پسندی۔

Marfat.com

خودستائی۔ اپنے منہ میاں مٹھو بنجن۔ مگو بدیہ کہ دوغ من ترش است تعظیم طلبی یہ سب ایک ہی عقیل کے چٹے بٹے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام خصلتوں کی جڑ کیا ہے جڑ یہ ہے وہی حفظ نفس جو تمام اخلاق کی جڑ ہے۔ آدمی حفظ نفس پر مجبول ہے اسی لیے ہر شخص کو اپنی جان یعنی اپنا نفس عزیز ہے اور آدمی جب تک اپنے نفس کو متصف بجمیع الکمالات نہ سمجھے وہ اس کو عزیز نہیں رکھ سکتا۔ "ہر کس را عقل خود بکمال وفرزند خود بجمال"۔ آدمی غرور کرتا ہے مال پر، جمال پر۔ جاہ پر۔ زور پر۔ نسب پر۔ علم وفضل پر۔ تقوے پر۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے جمال اور نسب تو اتفاقات ہیں، جمال سریع الزوال بھی ہے اور لوگوں کے مذاق اس کے بارے میں مختلف ہیں زور کا غرور بھی حسن کی طرح سریع الزوال ہے۔ مال اگر بزرگوں کا کمایا ہوا ہے تو جائے فخر نہیں۔ اور اپنی کمائی ہے تاہم عرضۂ خطرات ہے۔ تقوے طہارت سے مراد ہے اور شاید ہی کوئی متنفس اس غرور سے خالی ہو۔ ایسے لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ۔ نجات کی طرف سے مطمئن۔ خواہ مخواہ اپنے تئیں برگزیدۂ خدا اور مبشر بالجنۃ فرض کر لیتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کی نظر ہمیشہ دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے۔

فخر الدین رازی

(۱۱۴۹ء - ۱۲۰۹ء) ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن الحسین۔ اسلام کے مشہور ترین علمائے دین ومفسرین میں سے ایک سربرآوردہ عالم۔ بمقام رے پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضیاء الدین ابو القاسم اپنے شہر کے خطیب تھے، اسی لیے بیٹے کا لقب ابن الخطیب ہو گیا۔

ادب اور دینیات کی تحصیل سے فراغت کے بعد فخر الدین خوارزم چلے گئے۔ جہاں وہ معتزلہ کے خلاف مناظروں میں مسلسل مشغول رہے، جنھوں نے انھیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ماوراء النہر پہنچے تو وہاں بھی ایسی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ رے واپس آکر انھوں نے شہاب الدین غوری سے تعلقات استوار کیے، جس نے ان پر اعزازات اور دولت کی بارش کر دی۔

۱۱۸۴ء میں جب وہ بخارا کے ارادے سے ماوراء النہر جاتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے سرخس میں ٹھہرے تو وہاں کے ایک طبیب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اظہارِ تشکر کے طور پر انھوں نے بو علی سینا کی "کلیات" کی شرح لکھی بخارا میں انھیں حسبِ توقع سرپرستی نہ ملی تو وہ ہرات چلے گئے، جہاں غزنہ کے غوری سلطان غیاث الدین نے انھیں شاہی محل ہی میں عوام کے لیے ایک مدرسہ کھولنے کی اجازت دے دی۔

سمرقند اور ہندوستان اور دیگر مقامات کی سیاحت کے بعد وہ ہرات میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور عمر کا بڑا حصہ وہیں گزارا۔ ہرات میں وہ شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اس زمانے میں ان کی شان وشوکت عروج پر تھی، چنانچہ تین سو سے زائد شاگرد اُن کے ہمرکاب رہتے تھے۔ آغازِ زندگی میں تنگ دست اور آخر عمر میں خوشحال تھے۔

اُن کی ذکاوت، ذہانت، ان کے زبردست حافظے، ضابطہ پسند ذہن اور سلامتِ عقل وفکر نے انھیں ایک ایسا متکلم بنا دیا تھا جسے سارے وسطِ ایشیا میں شہرت حاصل تھی۔ بہترین خطیب تھے، حد درجہ متقی اور متدین تھے، چنانچہ اپنی وصیت میں بھی لکھا۔ "میں نے علم کلام کے تمام طریقوں اور فلسفے کی تمام راہوں کو آزمایا، لیکن میں نے ان میں اطمینان نہ پایا۔ جو مجھے ان [illegible] قرآن میں ملا۔"

رازی نے فارابی کا غائر مطالعہ کیا [illegible] کی شرحیں بھی لکھی تھیں۔ فلسفے کے گہرے علم نے انھیں اس قابل بنا دیا [illegible] دین میں تطبیق کر سکیں، لیکن ایسا کرتے وقت انھوں نے اپنی آزادی [illegible] جہاں کہیں وہ ابن سینا کا تتبع نہیں کرنا چاہتے، وہاں بے دھڑک ابن سینا پر سختی سے تنقید کرتے ہیں۔

رازی نے مسلکِ اہلِ سنت والجماعت کے دفاع میں غیر معمولی انہماک دکھایا۔ جس کی وجہ سے ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے۔ معتزلہ کے علاوہ انھیں کرامیہ سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ رازی ایک بہت بڑے فلسفی اور علم الکلام کے عالم بے بدل تھے۔ بعد میں آنے والے علما جن میں خصوصیت سے امام ابن تیمیہ شامل ہیں، اُن سے متاثر ہوئے۔

رازی کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے، جن کا تعلق زیادہ تر کلام، فلسفہ، فقہ اور تفسیر سے ہے۔ اہم تصنیفات یہ ہیں:۔ (۱) اساس التقدیس فی علم الکلام۔ (۲) لوامع البینات فی الاسماء والصفات (۳) شرح الاشارات (۴) المعالم فی اصول الدین۔ (۵) مفاتیح الغیب (۶) المناظرات (۷) المباحث المشرقیہ۔

فخر الدین عراقی

دیکھیے "عراقی"

فدا

فدا۔ منیٰ کے مقام پر جو قربانی دی جاتی ہے، اسے الفدی کہتے ہیں، کیونکہ یہ رسم اس فدیے کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جو حضرت اسماعیل کے لیے مینڈھے کی قربانی کر کے دیا گیا تھا۔ فدیٰ کے معنی ہیں۔ "انسان کو کسی مصیبت سے اس کی طرف سے کچھ خرچ کر کے محفوظ کرنا۔"

فدائی

فدائی۔ وہ شخص جو کسی جذبے کے تحت کسی نیک مقصد کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے اس کے مرادف "دلیر نڈر بے باک" "جان نثار" سورما اور جری" بھی لیا جاتا ہے۔ عربی لفظ فداوی سے بگڑ کر فدائی ہو گیا ہے الجزائر میں فداوی اسے کہتے ہیں جو بہادری کے کارناموں کی داستان بیان کرے اور ایسی داستان کو فداویہ کہتے ہیں۔

یہ نام اسمٰعیلیوں اور بالخصوص ان "حشاشین" کو ملتا تھا جو کسی کو راہ سے ہٹانے کے لئے قتل پر مامور کئے جاتے تھے۔ انقلاب ایران کے دوران میں شروع میں فدائی وہ لوگ کہلاتے تھے جو جمہوریت پسند جماعت کے حامی تھے مگر بعد میں عام حریت پسند اور دستور کے حامی بھی فدائی کہلانے لگے۔

شیخ زادہ لاہیجی جسے شاہ اسمٰعیل صفوی نے سفیر بنا کر محمد خان شیبانی کے پاس بھیجا تھا فدائی تخلص کرتا تھا۔ محمد شاہ قاچار کا منظورِ نظر شاعر سید مرزا سعید اردستانی (جو اصفہان کا رہنے والا تھا) بھی فدائی تخلص کرتا تھا۔

فدائیانِ اسلام

فدائیانِ اسلام۔ ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی و [illegible] پسند جماعت، جس کی سرگرمیوں کا مرکز تہران تھا، اور جس نے بارہ سال [illegible] (۱۹۴۳ء - ۱۹۵۵ء)

کے دوران میں متعدد سیاست دانوں کے قتل کی ذمہ داری آئی۔ فدائیان کی تنظیم اگرچہ خفیہ تھی لیکن ان کے اجتماع سرِ عام ہوتے تھے اور وہ اپنے اغراض و مقاصد کا کھلے بندوں اعلان کرتے تھے۔ اُن کا نصب العین شریعت کا ں نفاذ اور بے دینی کا استیصال تھا۔

فدائیوں کی بدنامی کا آغاز اس وقت ہُوا جب اُن کی جماعت کے بانی سیّد مجتبیٰ میرلوحی نے، جو آگے چل کر نواب صفوی کے نام سے مشہور ہوا۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں مشہور عالم احمد کسروی پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا اور پھر اگلے سال مقدمے کی کارروائی کے دوران فدائیوں نے کسروی کو قتل کر دیا۔ شہادت نہ ہونے کے باعث وہ بری کر دیئے گئے۔ فدائیوں کے لیے آیت اللہ کاشانی کی حمایت تھی، ان کے اثرورسوخ اور روز افزوں انتقامی کارروائیوں کے خوف نے فدائیوں کی بریت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں فدائیوں نے وزیر دربار عبدالحسین ھژیر کو ہلاک کر دیا۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں سنئے وزیراعظم جنرل رزم آرا کو قتل کیا گیا۔ اس کے بعد حسین علاء وزیراعظم مقرر ہُوا، لیکن فدائیوں کی دھمکی کے پیشِ نظر اُسے مستعفی ہونا پڑا۔ اور ڈاکٹر محمد مصدق نے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالا۔ ڈاکٹر مصدق کی معزولی کے بعد فدائیوں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور وہ کچھ عرصے تک نئی حکومت کے خلاف تیز و تند بیانات شائع کرتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں وزیراعظم حسین علاء پر قاتلانہ حملہ ہُوا، جو ناکام رہا۔ اس طرح سے حکومت کو فدائیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ فدائیان، نواب صفوی، واحدی اور طہماسپی، ان کے رہنما گرفتار ہو کر تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے اور ان کی جماعت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

فِدک

فِدک شمالی حجاز میں خیبر کے قریب ایک قدیم قصبہ بظاہر اس نام کی کوئی بستی اب موجود نہیں ہے۔ یہ سرسبز و شاداب بستی کھجور اور اناج کی پیداوار کے لیے مشہور تھی کمبل سازی اور دیگر دستکاریوں میں بھی فدک کے لوگ بہت آگے تھے۔

آنحضورؐ نے فتح خیبر کے بعد محیصہ بن مسعود انصاری کو فدک کے لوگوں کے پاس تبلیغ کے لئے بھیجا اس زمانے میں ان کا سردار یوشع بن نون یہودی تھا بقول ابن حزم آپؐ نے حضرت علیؓ کو بھی اہل فدک کی طرف بھیجا تھا اہل فدک نے اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن انہوں نے اس شرط پر صلح کر لی کہ زمین معہ پیداوار مسلمانوں کے حوالے کریں گے۔ چنانچہ بغیر جنگ و جدل یہ سرزمین اللہ تعالیٰ نے بطور فی، اپنے رسول کو عطا فرمائی۔ فدک کی زمین اور باغات آنحضورؐ کی زندگی میں آپ کے لئے مخصوص رہے اور آپؐ ان کی آمدنی کو اپنے اہل بیت اور مسافروں کے اخراجات کے لئے استعمال فرماتے رہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے تک فدک میں یہودی موجود تھے مگر حضرت عمرؓ نے بقیہ نصف زمین کی قیمت بھی ان کو ادا کر دی اور ان کو وہاں سے نکال کر شام کی طرف روانہ کر دیا۔

جب حضورؐ نے دنیا سے پردہ فرمالیا تو حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول کی حیثیت سے امیرالمومنین منتخب ہوئے اس وقت وراثت کا سوال اٹھا۔ امہات المومنین کے علاوہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اور حضرت فاطمہؓ اور ان کے ہمراہ ان کے شوہر حضرت علیؓ نے بھی فدک کی وراثت میں حصہ مانگا جسے حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ حضور اکرمؐ کی حدیث کی رو سے ہمارا کوئی ورثہ نہیں ہو گا مگر جو ہم چھوڑ جائیں گے وہ صدقہ ہو گا" مگر آپ نے اہل بیت کی ساری وہ مراعات اور اخراجات برقرار رکھے جو حضورؐ کے زمانے میں ان کو حاصل تھے اس بات سے حضرت فاطمہؓ کسی قدر رنجیدہ ہوئیں مگر جب حضرت ابوبکرؓ ان کی بیماری میں مزاج پرسی کو بنفس نفیس تشریف لائے تو انہوں نے دل سے ساری کبیدگی ختم کر دی خلفائے راشدین نے سختی سے اس حدیث پر عمل کیا کہ نبی کی میراث نہیں ہوتی یہ قضیہ بعد میں بھی چلتا رہا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنو ہاشم کی طرف داری کی مگر دوسرے افراد بھی اسے اپنے ذاتی استعمال میں لاتے رہے مگر اس کا وہ اصول برقرار نہ رہ سکا جس کی ابتدا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کی تھی اور نبیؐ کی میراث کو ساری قوم کی ملکیت قرار دیا تھا۔

حضورؐ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت پر عمل پیرا رہے۔ البتہ حضرت عمرؓ نے بذریعہ اجتہاد حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو فدک کی تولیت دی مگر فدک مسلمانوں کے لئے صدقہ کی حیثیت میں رہا امیر معاویہؓ نے یہ جاگیر مروان بن حکم کو عطا کر دی جس نے اسے اپنے بیٹے عمر بن عبدالعزیز کو دیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی حضرت امام زین العابدین کو یہ جاگیر دے دی۔ یزید بن عبدالملک نے اپنے دور میں یہ جاگیر ان سے واپس لے لی۔

بنو عباس کے پہلے حکمران ابوالعباس السفّاح نے یہ زمین واپس اہل بیت کے وارثوں کو دے دی۔ منصور نے اسے پھر ضبط کر لیا المہدی نے پھر اہل بیت کو لوٹا دی۔ جب المامون خلیفہ ہوا تو اس نے فدک بنو ہاشم کو دے دیا آخر میں المتوکل نے خلیفہ ہوتے ہی فدک پر قبضہ کر لیا اور عبداللہ بن البازیار کو جاگیر میں دے دیا اس کے بعد فدک ویران ہو گیا۔

فدیہ

فدیہ اس کے لغوی معنی ہیں، خبرا، معاوضہ، قربانی اور بدل۔

اسلامی شریعت میں فدیہ سے مراد ایسا بدل ہے جس کے ذریعے انسان خود کو کسی ایسے نقصان سے محفوظ کر لے جو اس کا مقدر بن چکا ہو۔ عبدالنبی احمد نگری نے دستور العلماء میں لکھا ہے "وہ مال یا طعام جو خود کو آزاد کرانے کے لئے ادا کیا جائے فدیہ کہلاتا ہے حضرت امام راغبؒ نے اس کی تعریف یوں بیان کی ہے۔ "وہ مال جو انسان اپنی عبادات میں قصور یا کمی کے لئے ادا کرے فدیہ کہلاتا ہے۔

قرآن حکیم میں یہ لفظ بار بار آیا ہے اس کے وسیع تر معانی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے قریب تر دیگر الفاظ کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ ایک تو خود فدیہ جس سے ماخوذ لفظ فدا ہے۔ لفظ کا استعمال اسیرانِ جنگ سے رہائی کے طور پر مستعمل ہے جبکہ فدیہ دینی عبادت میں کمی یا قصور کو پورا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ کفارّہ ہے۔ اکثر لوگ فدیہ اور کفارہ میں فرق نہیں کر پاتے۔ شرعی گناہ یا غلطی سرزد ہو جانے پر کفارّہ اس گناہ کو ساقط کرنے کا نام ہے جیسے روزہ توڑنے کا کفارّہ، حالت احرام میں شکار کرے گا۔ کفارّہ۔ قسم میں جھوٹا ہونے کا کفارہ ادا کرنا یہ واجب ہے۔

حالت مجبوری میں روزہ نہ رکھ سکنا، بیماری کے باعث دوران حج سفر

Marfat.com

بنڈوانے سے معذوری کا فدیہ لازم ہوتا ہے۔ فدیہ ایک وقت کا کھانا کسی محتاج مسکین کو کھلانے کا نام ہے جو انسان عام حالات میں خود کھاتا ہو۔

فرات ف کے ضمہ سے بمعنی آب شیریں اور کوفہ کے پاس ایک دریا کا نام بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ بہشت کی ایک نہر کا نام بھی ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ سورۃ فرقان اور سورۃ فاطر میں آیا ہے۔ سورۃ فرقان میں ہے " اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے دو دریاؤں کو (آپس میں) ملایا ایک (کا پانی) میٹھا مزے دار اور ایک (کا) کھاری کڑوا۔ اور دونوں میں ایک روک اور اٹل آڑ بنا دی "

فرائض فریضہ کی جمع ہے جو فرض سے مشتق ہے۔ فرمودۂ خدا جیسے نماز روزہ۔ زکوٰۃ وغیرہ۔ علم میراث کا نام ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ متروکہ میت کے ساتھ چار حق متعلق ہوتے ہیں۔ اس ترتیب سے کہ اول تو اس کی تجہیز و تکفین بغیر اسراف لی اور تنگی کے کی جائے۔ بعدہٗ اگر اس کے ذمے قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے۔ پھر جو مال بچے اس کی تہائی سے اس کی وصیت نافذ کی جائے۔ اگر وصیت کی ہو۔ بعد ازاں جو مال بچے وہ اس کے ورثہ میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ پہلے اصحاب فرائض کو دیا جائے۔ اگر نہ ہوں تو عصبات پر تقسیم کیا جائے۔ اگر یہ بھی نہ ہوں تو ذوی الارحام پر تقسیم کریں۔

اصحاب الفروض

وہ جن کے حصے کتاب اللہ میں متعین ہو چکے ہیں اور وہ بارہ ہیں۔

مردوں میں چار۔ باپ۔ دادا۔ اخیافی بھائی (یعنی جن کی ماں ایک ہو اور بھائی مختلف)۔ شوہر۔

عورتوں میں آٹھ۔ زوجہ۔ بیٹی۔ پوتی اور پوتی میں پڑوتی اور اس کی نسل بھی داخل ہے۔ حقیقی بہن۔ علاتی بہن۔ اخیافی بہن۔ ماں۔ جدہ صحیحہ۔

والدین کا حصہ قرآن مجید میں یوں مذکور ہے: " اور میت کے ماں باپ یعنی دونوں میں ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ اس صورت میں کہ میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث صرف ماں باپ ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی (باقی باپ کا)۔"

توضیح اس کی یہ ہے کہ باپ کی تین حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں تو اسے فرض مطلق یعنی چھٹا حصہ ملتا ہے اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت کا بیٹا موجود ہو۔ یا بیٹا موجود نہ ہو تو پوتا یا پڑپوتا۔ وَاِنْ سَفَل۔ کیونکہ والد کا لفظ بیٹے اور پوتے اور پڑپوتے سب کو عام ہے۔ اسی طرح بیٹی اور پوتی اور پڑپوتی کو بھی۔

دوسری حالت میں فرض مطلق اور عصوبت مقا۔ یعنی بحیثیت ذی الفروض ہونے کے چھٹا حصہ لے گا۔ اور بحیثیت عصبہ ہونے کے باقی مال کا مالک قرار پائے گا۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت کے باپ کے ساتھ میت کی بیٹی یا پوتی یا پڑپوتی یا پڑپوتی (وَاِنْ سَفَلَتْ) موجود ہو۔

تیسری حالت یہ ہے کہ محض عصبہ ہو۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ میت کا بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی کوئی بھی موجود نہ ہو

دادا باپ کی جگہ ہے یعنی میت کا باپ نہ ہو تو دادا تمام احکام میراث میں باپ کی مانند ہے۔ مگر چار صورتیں ایسی ہیں جن میں دادا باپ کے حکم سے مستثنیٰ ہے اور ان کی تفصیل علم فرائض کی طویل کتابوں میں موجود ہے۔ رہی میت کی ماں۔ اس

کی [illegible] [illegible] کے بعد یا وصیت [illegible] بھائی [illegible] سے قبل باپ ماں کی اطراف سے [illegible]

(۳) میت کے بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی نہ ہو یا دو یا زائد [illegible] تو ماں کو کل متروکہ میں سے کی تہائی ملے گی۔ لیکن ماں کے [illegible] ہونے ہیں۔ ان کا اجراء اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ میت کے ماں باپ کے ساتھ احد الزوجین نہ ہوں۔ احد الزوجین ہوں گے تو پہلے فرض احد الزوجین کے بعد ماں کو مابقی کا ثلث ملے گا۔ جیسا کہ اس کی تفصیل علم فرائض کی مطول کتابوں میں موجود ہے۔

زوجین کے بارے میں قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا ہے " اور جو مال تمہاری بیبیاں چھوڑ مریں۔ اگر ان کے اولاد نہیں تو ان میں سے تمہارا حصہ آدھا اور اگر ان کے اولاد ہے تو ان کے ترکے میں تمہارا چوتھائی حصہ (مگر یہ تقسیم) ان کی وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد اور تم کچھ ترکہ چھوڑ مرو اور تمہارے کچھ اولاد نہ ہو تو بیبیوں کا حصہ چوتھائی۔ اور اگر تمہارے اولاد ہو تو تمہارے ترکے میں سے بیبیوں کا آٹھواں حصہ۔ اور یہ حصے بھی تمہاری وصیت کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد دیے جائیں۔ (س۔ النساء۔ ع ۲)

خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں وہ نصف متروکۂ زوجہ کا مالک ہوگا۔ اگر زوجہ کے اولاد یعنی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی موجود نہ ہوں۔

دوسری حالت میں چوتھائی حصے کا مالک ہوگا۔ اگر بی بی کے بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی موجود ہوں۔

بی بی کی بھی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت میں چوتھائی ملک کی مستحق ہوگی، بشرطیکہ تنہا ہو۔ یعنی میت کی دوسری بی بی نہ ہو۔ اگر ہوگی تو یہ اور وہ سب اسی چوتھائی حصے میں برابر کی شریک ہوں گی۔ غرضیکہ جب شوہر کے اولاد یعنی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی نہ ہو تو بی بی کو چوتھائی حصہ ملے گا۔ دوسری حالت میں آٹھویں حصے کی مالک ہوگی۔ جبکہ شوہر کی اولاد یعنی بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی موجود ہوں۔

اخیافی بھائی بہن کے حصوں کی نسبت قرآن مجید میں یوں مذکور ہے۔

" اور اگر کسی مرد یا عورت کی میراث ہو اور اس کے باپ بیٹا (یعنی اصل و فروع) نہ ہو اور (دوسرے باپ سے) اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا (حصہ) اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں (برابر کے) سب شریک۔ یہ حصے بھی میت کی وصیت (کی تعمیل) اور (ادائے) قرض کے بعد دیے جائیں بشرطیکہ میت نے (کسی کو) نقصان نہ پہنچانا چاہا ہو۔"

(س۔ النساء۔ ع ۲)

میت کے اخیافی بہن بھائی کی تین حالتیں ہیں۔ ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو چھٹا حصہ۔ دو یا زیادہ ہوں تو تہائی کے بالمساوات مالک۔ یعنی تہائی میں مرد عورتیں برابر کے شریک ہوں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میت کے بیٹا بیٹی یا پوتا پوتی ہوں تو اس صورت میں اخیافی بھائی بہن خواہ ایک [illegible] ساقط الارث ہوں گی۔ اسی طرح باپ [illegible] دادا [illegible] جائیں گے۔

Marfat.com

پروفیسر سلیم اختر
تین بڑے نفسیات داں
۵/-

سینتھیے نوگانوی
تاریخ اقوامِ عالم (اوّل)
۴/-

ایچ سیگل / ستار طاہر
لوسٹوری
۳/-

ایچ سیگل / مظفر اقبال
اولیور سٹوری
۴/۵۰

عبدالرحمٰن عبد
داستانِ ہٹلر
۳/-

ابوضیا اقبال۔ محمد ظفیر ندوی
راسپوٹین
۳/-

ابنِ انشا
چلتے ہو تو چین کو چلیے
۳/-

ابنِ انشا
اُردو کی آخری کتاب
۳/-

پاکستان
چوک اردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

کسی قوم کے زوال کی نشانی

پنجاب کی قلوپطرہ

غمزہ و ادا سے بھرپور سولہ سالہ کی الہڑ مٹیار **چند کور**، جس کو ستاون سالہ رنجیت سنگھ نے اپنی رانی بنایا —— مغلانی بیگم، ایک ایسی دبنگ عورت کہ اُس نے اپنے کردار سے دہلی، لاہور، شیخوپورہ بٹالہ، جموں، سیالکوٹ، امین آباد اور جہلم کے لوگوں کو اپنی انگلی پر نچایا —— لال بائی، لاہور کی میراثن جو دہلی کی ملکہ بنی —— منی بیگم، جس کو حکومتِ برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خطاب دیا —— بیگم سومرو آف سردھانہ، ایک غریب کشمیری عورت —— زینت النساء بیگم، شرف النساء بیگم، غوثیہ بیگم، امینہ بیگم، لطف النساء بیگم، بیگماتِ اودھ، جو برصغیر کی قسمت پر اثر انداز ہوئیں۔

تاریخی تحقیق کے نئے زاویے —— مرتبہ: **پروفیسر ریاض حسین**

کسی قوم کے عروج کی علامت

چین کا ماؤ

فرانس کا مشہور ادیب آندرے مالرو، دنیا بھر میں جہاں بھی آزادی کے لیے جنگ ہوئی، حرّیت پسندوں کا ساتھ دینے پہنچ گیا۔ سپین میں جنرل فرانکو کے خلاف لڑنے گیا۔ بیسیوں بار مختلف فضائی مہمیں سر کیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کا قیدی بنا۔ چارلس ڈیگال کے وزیر اطلاعات کی حیثیت سے چین کے انتہائی اہم مشن پر پہنچا، تاکہ امریکا کی دھمکیوں کے باوجود فرانس کے لیے چین سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی راہ کھل سکے۔

آندرے مالرو نے چین کے عظیم انقلابی قائد ماؤزے تنگ سے اپنی طویل اور اہم ترین سیاسی ملاقات کو شاہکار ادب پارہ بنا دیا ہے —— اور ماؤ کا وہ رُخ دکھاتا ہے جو آج تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔

پیش کش: **ستار طاہر**

جمعہ ۷ / اپریل * **ایک کتاب میں دو کتابیں** * شاہکار جریدی کتاب (۱۴)

دونوں کی قیمت: تین روپے

Marfat.com

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

ہر مہینے آخری جمعے کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار
اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

تاریخِ اشاعت: جمعہ ۲۸ اپریل ۱۹۷۸
قیمت فی قسط -/۳ روپے
سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

مدیرِ اعلیٰ

سیّد قاسم محمود

اصلاح و ترمیم کا حق
قارئین کو حاصل ہے

دیگر شائع شدہ کتب کا
اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون : ۳۵۴۱۰۳
تار : "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار
پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکاریہ

ان سطور کا راقم قارئین "اسلامی" کے لیے اجنبی تو ہو سکتا ہے لیکن وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہے کہ شاہکار مطبوعات کے آغاز ہی سے قارئین اور ادارہ شاہکار سے اس کا ایک بلا واسطہ تعلق رہا ہے یعنی میں بھی آپ ہی کی طرح شاہکار مطبوعات اور خصوصی طور پہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا قاری تھا اور ہوں۔ قارئین محترم۔ کیا خیال ہے، میں آپ سے اپنے تعلق کو قدیم اور قریبی ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔

ادارہ شاہکار کے زیرِ اہتمام محدود وسائل سے جاری شدہ ان اعلیٰ علمی کاموں میں عملی تعاون کا جذبہ شروع ہی سے تھا۔ لیکن اس میں بعض عملی رکاوٹیں حائل تھیں۔ اللہ تعالےٰ کے خصوصی فضل سے ان رکاوٹوں کو عبور کر لیا گیا ہے اور اب میں ادارہ شاہکار میں ایک "خادم" کی حیثیت سے شریک ہوا ہوں اور قارئینِ "اسلامی" کی خدمت میں اپنی پہلی کوشش، علمی بے مائیگی کے اعتراف کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اپنی آرا سے میری مناسب رہنمائی فرمائیں تاکہ "شاہکار اسلامی" بہتر سے بہتر طور پر پیش کیا جا سکے۔ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالےٰ مجھے اس علمی کام کی تکمیل تک قارئین شاہکار کی خدمت کا موقع دے۔ میں بھی اللہ تعالےٰ کی خصوصی عنایات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، جو کہ اکثر میرے شاملِ حال رہتی ہیں اور جن میں سے ایک ادارہ شاہکار میں میری شمولیت ہے، اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ اپنے "تن من" سے اس علمی خدمت میں بھرپور حصّہ لوں گا۔

اٹھائیسویں قسط میں "ف" کے تحت کئی اہم مضامین آئے ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ، تفسیر میں نظمِ قرآن کے منفرد انداز کی وجہ سے کم از کم پاک و ہند میں اس فن کے امام کہے جا سکتے ہیں۔ ان کے حالات اور اندازِ فکر پر تفصیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔ عام حلقوں میں مولانا فراہی معروف نہیں ہیں لیکن اصحابِ علم کے اعلیٰ حلقوں میں اپنے منفرد اندازِ تفسیر کی وجہ سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی ایک موقع پر مولانا فراہی کے اندازِ فکر کو تحسین کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔

مسلمانوں کے ۷۳ فرقوں میں تقسیم کے لیے نبی کریمؐ کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ایک مخصوص نظریہ کارفرما ہے حالانکہ قرآن مجید اور اسوۂ رسول کریمؐ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دیتا ہے۔ فرقہ بندی کے اس پیچیدہ موضوع پر دلائل سے اصل حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اسلامی "فقہ" اور فقہ کے ماخذ پر قارئین تفصیلی مباحث سے استفادہ کر سکیں گے۔

صوفیائے کرام اور مشائخ اسلام کی چند معروف شخصیات میں سے فرید الدین گنج شکرؒ اور خواجہ غلام فریدؒ کے احوال بھی بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے اہم عنوانات میں معروف شعراء فردوسی اور فرزدق کے احوال، فرعونِ موسیٰ کا تفصیلی تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قسط کا آخری عنوان "فن" اگلی قسط میں بھی جاری رہے گا۔

سیّد امتیاز حسین
(مدیر)

Marfat.com

سگی سوتیلی بہنوں کی نسبت قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا ہے :

"(اے پیغمبر) لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ تو (ان لوگوں سے) کہہ دو کہ اللہ کلالہ کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مرد مر جائے جس کے اولاد نہ ہو (اور نہ باپ دادا کہ اسی کو کلالہ کہتے ہیں) اور اس کے (صرف ایک) بہن ہو تو بہن کو اس کے ترکے کا آدھا۔ اور بہن (مر جائے اور اس سے) اولاد نہ ہو۔ تو اس (کے سارے مال) کا وارث یہ (بھائی) پھر اگر بہنیں دو ہوں (یا زیادہ) تو ان کو اس کے ترکے میں سے دو تہائی اور اگر بھائی بہن (ملے جلے) ہوں (کچھ) مرد اور (کچھ) عورتیں تو دو عورتوں کے حصے کی قدر ایک مرد کا حصہ۔ تم لوگوں کے بھٹکنے کے خیال سے اللہ (اپنے حکم) تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔" (س۔ النساء۔ ع ۲۴)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میت کی حقیقی بہنوں کی پانچ حالتیں ہیں(۱) اگر تنہا اور اکیلی ہے تو نصف کی مستحق ہو گی۔(۲) اور دو یا دو سے زیادہ ہیں تو دو ثلث لیں گی۔(۳) جب بہنیں حقیقی بھائی کے ساتھ جمع ہوں گی تو لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کی رو سے تقسیم ہو گا اور بہنیں بھائی کے ہوتے عصبہ ہو جائیں گی۔(۴) میت کی بیٹیاں یا پوتیاں بہنوں کے ساتھ جمع ہوں گی۔ تو بیٹیوں یا پوتیوں کے لینے کے بعد جو باقی رہے گا وہ سب بہنوں کا حق ہو گا۔ میت کی بہنیں اس کے بیٹے یا پوتے یا باپ اور بقول امام اعظمؒ دادا کے ساتھ جمع ہوں تو تمام بہنیں بالاتفاق ساقط الارث ہوں گی۔

میت کی سوتیلی بہنیں سگی بہنوں کی مانند ہیں اور ان کی سات حالتیں ہیں:۔

(۱) میت کی سگی بہنیں نہ ہوں تو سوتیلی کو نصف جبکہ وہ تنہا اور اکیلی ہو۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی میں بالمساوات شریک ہوں گی۔

(۳) سوتیلی بہنیں اگر ایک سگی بہن کے ساتھ جمع ہوں تو سوتیلیوں کو صرف چھٹا حصہ۔

(۴) جب میت کی دو سگی بہنیں موجود ہوں تو سوتیلی بہنوں کا کچھ حق نہیں۔

(۵) مگر جب ان کے ساتھ سوتیلا بھائی ہو تو اس صورت میں بھائی کی وجہ سے عصبہ ہو جائیں گی۔ اور اب باقی ترکہ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کی رو سے ان میں تقسیم ہو گا۔

(۶) سوتیلی بہنیں میت کی بیٹیوں یا پوتیوں کے ساتھ عصبہ ہو جائیں گی۔

(۷) میت کی سوتیلی بہن اس کے بیٹے یا پوتے یا پڑپوتے یا باپ اور ایک قول میں دادا کے ہوتے سب بالاتفاق ساقط الارث ہوں گی۔

بیٹی اور پوتی کا حصہ قرآن مجید میں یوں مذکور ہے :

"(مسلمانو) تمہاری اولاد (کے حصوں کے بارے میں) اللہ تم سے کہے رکھتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا کرو۔ پھر اگر لڑکیاں دو یا دو سے زیادہ ہوں تو ترکے میں ان کا حصہ دو تہائی اور اگر اکیلی ہو تو پھر اس کو آدھا۔" (س۔ النساء۔ ع ۳)

میت کی بیٹی کی تین حالتیں ہیں۔ (۱) ایک حالت میں نصف متروکہ میت سے لے گی اگر صرف ایک ہے۔(۲) اور دو یا دو سے زیادہ ہیں تو سب دو تہائی لیں بالمساوات ما کر۔ (۳) تیسری حالت میں عصبہ ہو جاتی ہیں جبکہ میت کی بیٹیاں اس کے بیٹے کے ساتھ جمع ہوں۔ اس صورت میں بیٹا دو بیٹیوں کے برابر حصہ لے گا۔ اور باقی بیٹیوں میں تقسیم ہو گا۔ میت کی پوتیاں صلبی بیٹیوں کی مانند ہیں اور ان کا علیحدہ ذکر قرآن میں اس لیے نہیں ہوا کہ بیٹیوں میں پوتیاں بھی داخل ہیں۔ تو پوتیوں کی چھ حالتیں ہیں۔

ایک یہ کہ ایک ہے تو نصف کی مستحق ہو گی۔ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو دو تہائی بشرطیکہ میت کی صلبی بیٹیاں موجود نہ ہوں۔ تیسری حالت میں میت کی پوتی کو چھٹا حصہ ملتا ہے جبکہ کوئی ایک صلبی بیٹی موجود ہو۔ چوتھے میت کی دو صلبی بیٹیاں موجود ہوں تو پوتیاں ساقط الارث ہوں گی۔ ہاں ان کے درجے میں یا ان سے نیچے کے درجے میں کوئی مرد ہو تو اس کی وجہ سے عصبہ ہو جائیں گی اور باقی ترکہ میت سب میں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ کے قاعدے سے تقسیم ہو گا۔ یہ پوتیوں کی پانچویں حالت ہوئی۔ چھٹی حالت یہ ہے کہ میت کا بیٹا موجود ہو تو پوتیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

عصبات

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ میراث کے حصے جو خدا نے قرآن مجید میں مقرر و معین فرمائے ہیں۔ اہل فرض کو پہنچا دو اور جو اہل فروض سے باقی رہے وہ اس مرد کا حق ہے جو میت سے قریب تر ہو۔ (اور اسی کو عصبہ کہتے ہیں)

عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔ عصبہ نسبی اور عصبہ سببی۔ عصبہ سببی وہ ہے کہ اس میں اور میت میں من حیث النسب تعلق نہ ہو جیسے آقا جس نے اپنے غلام کو آزاد کر دیا ہو تو غلام کے مرنے کے بعد آقا اس کے متروکہ کا وارث ہو گا بحق خصوصیت۔ بشرطیکہ غلام کا کوئی عصبہ نسبی نہ ہو۔ پھر عصبہ نسبی کی تین قسمیں ہیں: عصبہ بنفسہ۔ عصبہ بغیرہ۔ عصبہ مع غیرہ۔

عصبہ بنفسہ وہ مذکر ہے جس کی نسبت میت کی طرف بے واسطہ مؤنث ہو۔ یعنی جب اسے میت کی طرف نسبت کریں تو بیچ میں مؤنث داخل نہ ہو۔ جیسے میت کا بیٹا یا پوتا۔ اور جو بیچ میں مؤنث کا دخل ہو تو اسے عصبہ نہیں کہتے جیسے میت کے اخیافی بہن بھائی کہ ان کی نسبت میت کی طرف ماں کے واسطہ سے ہے اور اسی وجہ سے میت کے اخیافی بہن بھائی اصحاب الفروض ہیں نہ عصبات۔

عصبہ بنفسہ کی جماعت میں چار طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو میت کے جزو ہیں۔ مثلاً بیٹا، پوتا۔ دوسرے وہ جو میت کی اصل ہیں جیسے باپ۔ دادا۔ تیسرے وہ جو میت کے باپ کے جزو ہیں۔ مثلاً بھائی۔ بھتیجے۔ چوتھے وہ جو میت کے دادا کے جزو ہیں۔ جیسے چچا اور اس کی اولاد۔ تو تقسیم ترکہ کے وقت ان اصناف میں سے ان لوگوں کو مقدم کیا جائے گا جو قرب درجے کے لحاظ سے ترجیح رکھتے ہیں۔ پس جزو میت یعنی میت کا بیٹا یا پوتا احق اور اقدم ہو گا۔ پھر میت کی اصل یعنی باپ دادا۔ پھر میت کے باپ کے جزو یعنی بھائی بھتیجے۔ پھر دادا کی اولاد یعنی سگے چچا۔ پھر ان کے بیٹے۔ پھر دو حیثیت سے قرابت رکھنے والا۔ ایک قرابت رکھنے والے سے مذکر ہو تو اور مونث ہو تو۔

عصبہ بغیرہ چار عورتیں ہیں۔ بیٹی۔ پوتی۔ سگی بہن۔ سوتیلی بہن۔ انہیں عصبہ بغیرہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ میں عصبہ ہوتی ہیں۔

عصبہ مع غیرہ وہ عورت ہے جو دوسری عورت کے ساتھ جمع ہو کر عصبہ بن جاتی ہے۔ مثلاً میت کی سگی یا سوتیلی بہن۔ جب میت کی بیٹی یا پوتی کے ساتھ جمع ہو تو عصبہ ہو جائے گی۔ ایک ہو تو بھی اور ایک سے زیادہ ہو تو بھی۔

Marfat.com

ذوی الارحام

" اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جہاد بھی کیے تو وہ تم ہی میں داخل ہیں اور رشتہ دار اللہ کے حکم کے مطابق (غیر آدمیوں کی نسبت) ایک دوسرے (کی میراث) کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے (از انجملہ میراث کی مصلحتوں سے بھی) ۔ (س۔ انفال۔ ع۔ ۱۰)

ذورحم کہتے ہیں صاحب قرابت کو اور مراد وہ قرابت والا ہے جو ذی فرض نہ ہو یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جن کے حصے قرآن مجید یا حدیث شریف یا اجماع امت سے متعین ہو چکے ہیں اور عصبہ بھی نہ ہو۔

ذوی الارحام کی چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جو میت کی طرف منسوب ہو اور وہ میت کی بیٹیوں اور پوتیوں کی اولاد ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جن کی طرف میت منسوب ہو جیسے میت کا نانا اور نانا کا باپ یا نانا کی ماں یا نانا کی نانی۔ تیسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو میت کے ماں باپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اور وہ ہیں بہنوں کی اولاد، بھائیوں کی بیٹیاں، اخیافی بھائیوں کی اولاد۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ ہیں جو میت کی دو جد یعنی دادا اور نانا یا دو جدہ یعنی دادی اور نانی کی طرف منسوب ہوں اور وہ پھوپیاں ہیں۔ عینی ہوں یا علاتی یا اخیافی اور اخیافی چچا ہیں اور ماموں اور خالائیں پس یہ چاروں قسمیں اور جو ان کے واسطے سے میت کی طرف منسوب ہوں۔ سب ذوی الارحام ہیں۔ ان میں اولیٰ بالمیراث وہ ہے جو میت کی طرف سب سے زیادہ قریب ہو۔ جیسے نواسے نواسیاں کہ وہ کنواسوں اور کنواسیوں کی نسبت میت سے زیادہ قریب ہیں اور اسی لحاظ سے اولیٰ بالمیراث بھی۔ باقی رہی اقسام اربعہ کی تفصیل۔ وہ علم فرائض کی مطول کتابوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

فرائض سراجیہ

فرائض سراجیہ ۔ علم فرائض میں سراج الدین محمد بن سجاوندی حنفی کی تصنیف ہے۔ اس مستند کتاب کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔

فرائضی فرقہ

فرائضی فرقہ یہ بنگال کے مسلمانوں کا ایک فرقہ تھا۔ حاجی شریعت اللہ اس فرقہ کے بانی تھے۔ حاجی شریعت اللہ ۱۷۸۱ء میں ضلع فرید پور کے ایک گاؤں بندرکھولہ میں پیدا ہوئے۔ وہ اٹھارہ برس کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور وہاں شیخ طاہر السنبل الشافعی المکی سے وابستہ ہو کر تقریباً بیس برس تک اکتساب علم کرتے رہے۔

ڈاکٹر ٹیلر (TAILOR) کے بیان کے مطابق حاجی صاحب قیام مکہ کے دوران وہابی تحریک سے کافی متاثر ہوئے۔ ۱۸۲۰ء میں وطن واپسی پر وہ ایک عالم اور مناظر کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ گھر واپسی پر راستے میں اُن کے قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار میں حاجی صاحب کی کتب اور تبرکات بھی ضائع ہو گئے۔ حاجی صاحب اس حادثہ سے دل برداشتہ ہو کر ان کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ حاجی صاحب کی دینداری اور بلند کرداری کو دیکھتے ہوئے ڈاکوؤں کا گروہ تائب ہو کر ان کا پیرو ہو گیا۔

بنگال کے مسلمانوں کی حالت انگریز تاجروں اور ہندو زمینداروں کے ہاتھوں نہایت پست تھی۔ مسلمان ہندو تہذیب کے بیشتر اثرات قبول کر چکے تھے۔ حاجی صاحب نے رواداری سے دیہات میں تبلیغ شروع کر دی اور مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ غیر اسلامی رسم ورواج ترک کر دیں [illegible] کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن [illegible] اور سادگی کی تعلیم سے متاثر ہو کر ڈھاکہ، فرید پور، باریسال [illegible] کے مسلمان آپ کے ہمنوا بن گئے۔ کیونکہ اس تحریک میں فرائض دین کی پابندی پر زور دیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ " تحریک فرائضی " کے نام سے مشہور ہوئی۔ حاجی صاحب نے پیر اور مرید کی اصطلاحوں کو ترک کر کے استاد اور شاگرد کی اصطلاحیں جاری کیں۔ حاجی صاحب نے ہاتھ پر بیعت لینے کی رسم بھی ترک کر دی۔ وہ لوگوں کو گناہوں سے توبہ کی ترغیب دیتے اور نیکوکاری کی تعلیم دیتے تھے۔

اس بنا پر یہ لوگ " توبار " (توبہ کرنے والے) بھی کہلاتے تھے۔ تحریک کی مقبولیت اور لوگوں میں بھائی چارہ ہونے کے باعث ان میں جرأت پیدا ہو گئی اور انھوں نے ہندوانہ عقائد ورسوم سے پہلو تہی شروع کر دی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی طرف سے مقرر کردہ درگا پوجا ٹیکس دینے سے صاف انکار کر دیا اور بیگار دینا بھی بند کر دیا۔ ان کی بہو بیٹیوں نے زمینداروں کے گھروں میں کام کاج چھوڑ دیا۔ اس سے ان میں منافرت اور غصہ پھیلنے لگا۔ انگریزوں کے مسلمانوں پر مظالم کی وجہ سے اسی زمانے میں حاجی شریعت اللہ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں کو عیدین اور جمعہ کی نماز سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی، ہندو اور زمیندار اس تحریک سے بہت خوفزدہ تھے۔ چھوٹے چھوٹے فسادات نے بڑھ کر ۱۸۳۱ء میں باقاعدہ شدت اختیار کر لی۔ مسلمانوں پر مقدمات قائم ہونے لگے۔ خود حاجی صاحب پر مقدمہ چلا مگر عدم ثبوت کی بنا پر سزا سے بچ گئے۔

حاجی صاحب کا کردار بے داغ تھا۔ وہ مخلص اور دیندار تھے۔ اسی لیے لوگ ان کو باپ کا درجہ دیتے تھے۔ بنگالی مسلمانوں خصوصاً کسانوں اور کاشت کاروں کے دلوں پر آپ کا انمٹ اثر تھا جس نے ان میں بیداری اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کی وفات کے بعد اس فرقے کی قیادت ان کے بیٹے محمد محسن نے سنبھالی جو دودھو میاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ملک کے سیاسی اور معاشی بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنا دائرہ کار پورے بنگال میں پھیلا دیا اور باقاعدہ بیعت لینی شروع کر دی۔ انھوں نے بنگال کو متعدد حلقوں میں تقسیم کر کے ان پر خلیفے مقرر کیے جو مقامی مریدوں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور دودھو میاں کو ہر وقت حالات سے باخبر رکھا کرتے تھے۔ خلیفہ مریدوں سے بیت المال کے لیے چندہ جمع کرتے جو بالعموم جنس کی شکل میں ہوتا۔ ہر مرید روزانہ ایک چٹکی چاول جمع کر کے رکھتا تھا۔ خلیفہ کے آدمی یہ امداد جمع کرتے تھے جسے ضرورت مندوں اور مسافروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ دودھو میاں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ کوئی زمیندار اُن کے مریدوں پر زیادتی نہ کر سکے لوگ ٹیکسوں سے بچنے کے لیے جوق در جوق اس تحریک میں شامل ہونے لگے۔ اس زمانے کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈیمپیر کے بیان کے مطابق ان کے گرد کم از کم اسی ہزار سرگرم کارکن تھے۔ اس تحریک کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ دودھو میاں پر ۱۸۳۸ء میں لوٹ مار ۱۸۴۱ء میں قتل اور ۱۸۴۴ء میں اغوا اور لوٹ مار کے مقدمات بنائے گئے مگر کسی نے ان کے خلاف گواہی نہ دی۔ اس لیے وہ ہر مقدمہ سے بری ہو جاتے۔

۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کے دوران اُن کو علی پور اور پھر فرید پور میں نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۸۵۹ء میں جب وہ رہا ہوئے تو شدید بیمار تھے۔ اور ۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے بعد تحریک کو ان کے تین بیٹوں [illegible] نہ مل سکا جس کی بنا پر رفتہ رفتہ یہ تحریک ختم ہونے لگی [illegible]

Marfat.com

[illegible] ادبی حیثیت اور اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حقوق کے لیے [illegible] کا جو جذبہ پیدا کیا، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فراہی، حمیدالدین

فراہی، حمیدالدین۔ (۱۲۸۰ھ - ۱۳۴۹ھ) برِعظیم کے ممتاز عالم دین ضلع اعظم گڑھ (یوپی - بھارت) کے ایک گاؤں پھریہا میں پیدا ہوئے۔

مولانا کا خاندان ضلع کے معزز گھرانوں میں شمار ہوتا تھا اور تعلیم و دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے پہلے ہی سے ممتاز رہا ہے۔ مولانا فراہی، شبلی نعمانیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی زبان کی تحصیل کی۔ حتیٰ کہ اس زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ شعر کہنے لگے۔ شاعری کا مذاق ان میں فطری تھا۔

عربی زبان کی تحصیل زیادہ تر مولانا شبلی نعمانیؒ سے کی۔ مولانا شبلی ان سے چھ سال بڑے تھے اور عربی علوم میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا فراہی کو ایک مشفق بھائی کی طرح پوری توجہ سے صرف و نحو، ادب اور معقولات وغیرہ کی تعلیم دی۔ مولانا شبلی سے کسبِ فیض کے بعد مولانا فراہی نے وقت کے مشہور اساتذہ سے مستفید ہونے کا ارادہ کیا۔ فقہ کی تعلیم انھوں نے مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ لکھنوی فرنگی محلی سے حاصل کی۔ لکھنؤ چھوڑنے کے بعد مولانا فراہی نے لاہور کا سفر کیا۔ لاہور میں مشہور ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے جو کہ اورنٹیل کالج میں پروفیسر تھے اور عربی ادب میں پورے ملک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مولانا شبلی بھی ادب میں ان کے شاگرد تھے۔

مولانا حمیدالدین فراہی نے ادب کی تکمیل ان سے کی۔ ان کے استاذ ان کی قابلیت و ذہانت سے کافی متاثر تھے۔ شاگرد کو بھی استاذ سے جو خصوصی تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فراہی نے اپنے استاذ کا عربی دیوان اپنے خرچ اور اہتمام سے شائع کرایا۔ ان کی وفات پر مولانا نے جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ایک ایک شعر درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ مولانا فیض الحسن نے اپنے شاگرد کو اپنی شرح سبعہ معلقہ کا قلمی نسخہ یادگار کے طور پر دیا۔

مولانا فراہی عربی زبان اور دینی تعلیم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد انگریزی زبان کی تحصیل کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں قیام کے دوران سرسید احمد خان نے ان سے امام غزالیؒ کے ایک کرم خوردہ قلمی نسخے کی دوبارہ تدوین و ترتیب کرائی۔ سرسید ان کی اس ذہانت سے کافی متاثر ہوئے اور پوچھا آپ نے کیسے اس نسخہ میں ضائع شدہ مقامات پر مناسب الفاظ لکائے ہیں، تو مولانا فراہی نے جواب دیا۔ میں نے سیاق کلام اور امام غزالی کی زبان دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر الفاظ متعین کیے ہیں۔

علی گڑھ میں مولانا نے انگریزی اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ فلسفۂ جدیدہ کی تعلیم فلسفہ کے پروفیسر، مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ سے لی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ہی سرسید نے مولانا سے طبقات ابن سعد سے سیرت نبوی کے کچھ حصے فارسی میں ترجمہ کروائے اور اس کو کالج کے نصاب میں شامل کیا۔

مولانا نے بی اے کی ڈگری الٰہ آباد یونیورسٹی سے لی۔ ایم اے کی بھی تیاری کی۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ مولانا ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعض اسباب کی وجہ سے انھوں نے مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت منظور کی۔ [illegible]۱۹۰۰ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کو دورہ سواحل عرب اور خلیج [illegible] لیے ترجمان کی ضرورت تھی جو عربی اور انگریزی دونوں میں مہارت رکھتا ہو۔ مولانا شبلی کے اصرار پر مولانا نے وائسرائے کے ترجمان کی ذمہ داری سنبھالی۔

اس سفر سے واپسی کے بعد مولانا فراہی علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں قیام کے دوران عربی کے پروفیسر جرمن مستشرق یوسف ہارویز سے عبرانی زبان کی تعلیم لی۔ چند سال علی گڑھ میں قیام کے بعد مولانا الٰہ آباد چلے گئے اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد نظام حیدرآباد نے دارالعلوم حیدرآباد کے پرنسپل کی حیثیت سے مولانا فراہی کی خدمات حاصل کیں۔ مولانا نے حیدرآباد کے قیام کے دوران ایسی یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ بنایا۔ جس میں تمام دینی اور عصری علوم کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ مولانا فراہی کا یہی تخیل بالآخر عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں عملی صورت میں ظاہر ہوا۔

مولانا ملازمت سے استعفیٰ دے کر وطن واپس آئے۔ اب ان کو فرصت ملی کہ وہ مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنفین کی طرف متوجہ ہوں جن کے انتظامی، علمی اور تعلیمی معاملات ابتدا ہی سے مولانا سے متعلق تھے۔ لیکن بیرونِ وطن ملازمت کے سبب کماحقہٗ ان اداروں کی طرف توجہ نہیں دے سکتے تھے۔

مولانا فراہی نے ایک بیماری کے لیے متھرا (ہندوستان) میں اپریشن کروایا۔ اپریشن ناکام رہا۔ مولانا فراہی ۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ بمطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

مولانا فراہی فلسفی، متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے اچھے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان اعلیٰ علمی صفات کے باوجود مولانا کا جو کام اُن کو ایک منفرد شخصیت کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے وہ ان کا اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں قرآن مجید پر تدبّر و تفکر کرنا ہے۔ مولانا نے تفسیروں کے واسطے سے قرآن کو سمجھنے کے عام طریقہ کو چھوڑ کر براہِ راست قرآن پر غور کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ مولانا نے واضح دلائل سے اس بات کو غلط ثابت کیا کہ قرآن ایک غیر منظم کلام کا مجموعہ ہے۔ بلکہ قرآن کی ہر سورت کا دوسری سورت سے ربط و نظم ہے۔ ہر سورت کا ایک خاص عمود مضمون ہے جس پر اس سورۃ کی آیات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس لیے قرآن مختلف سورتوں کی حد بندیوں کی شکل میں موجود ہے جن میں سے کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی یعنی نظم قرآن مولانا فراہی کی تحقیقات کا موضوع ہے۔ مولانا فراہی تفسیر قرآن میں اپنے مخصوص اور منفرد انداز کی وجہ سے اس فن کے امام کہے جاتے ہیں۔ کیونکہ امام اسی شخص کو کہا جا سکتا ہے جو کسی فن میں اپنے اصول وضع کرے۔ اور یہ اصول قرآن و سنت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں۔ امام فراہی تفسیر قرآن میں مستقل اصولوں اور فن کے بانی ہیں۔ اس بات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ فراہی ہی پہلے شخص ہیں جن پر نظم قرآن کا یہ عقدہ کھلا۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں جن میں ابوحیانؒ کے شیخ ابوجعفر بن زبیر، شیخ برہان الدین بقاعی، شیخ ابوبکر نیشاپوری اور امام رازیؒ شامل ہیں۔ مولانا فراہی نے مذکورہ بالا علماء کے ابتدائی کام کو آگے بڑھایا ہے اور تفسیر میں نظم قرآن کے اصول معین کیے ہیں۔

مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے نظریات و افکار کو پھیلانے کے لیے ہندوستان میں دو ادارے مدرسۃ الاصلاح اور دائرۂ حمیدیہ کام کر رہے ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے موجودہ ناظم مولانا فراہی کے پوتے ہیں۔

دائرۂ حمیدیہ کی بنیاد مولانا فراہی کے شاگردِ خاص مولانا امین احسن اصلاحی نے رکھی تھی اور آج کل بھی یہ ادارہ کام کر رہا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنے استاذ کے علوم کے صحیح وارث ہیں۔ مولانا فراہیؒ کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل میں مصروف

Marfat.com

ہیں۔ انھوں نے مولانا فراہی کے مسودات میں سے مختلف سورتوں کو ایک مجموعہ کی صورت میں عربی سے اُردو میں منتقل کیا ہے اور" مجموعۂ تفاسیر فراہی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنے استاذ کی کئی کتابوں کے مترجم بھی ہیں اور مولانا فراہی کے اندازِ تفسیر کو مدلّل انداز میں اپنی تفسیر تدبّر قرآن میں بیان کیا ہے، اسی طرح پاکستان کے مختلف شہروں میں کئی اصحابِ علم مولانا فراہی کے اندازِ فکر اور تعلیمات کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی زیرِ سرپرستی لاہور میں ایک "حلقۂ تدبّرِ قرآن کام کر رہا ہے۔

مولانا حمیدالدین فراہی عام معنوں میں مصنف نہیں تھے وہ لکھنے کے لیے صرف اس وقت قلم اٹھاتے جب غور و فکر سے ان کے سامنے کوئی نئی تحقیق آتی۔ مولانا الگ الگ عنوانات سے اس طرح یادداشتیں لکھتے رہتے۔ اس طرح کی جو بھی یادداشت لکھتے اس پر لکھ دیتے کہ یہ فلاں کتاب سے متعلق ہے۔ مولانا کے اس مخصوص طرزِ تصنیف کے سبب بیک وقت اُن کے زیرِ فکر متعدد تصنیفات رہتی تھی جن میں بعض تکمیل کو پہنچ جاتی تھی، بعض چلتی رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے ان کی تفسیر بھی مکمل نہ ہو سکی۔

مولانا حمیدالدین فراہی کی مطبوعہ کتب یہ ہیں :-

۱۔ تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان
۲۔ فاتحۃ نظام القرآن
۳۔ مفردات القرآن۔
۴۔ الامعان فی اقسام القرآن۔
۵۔ الرائی الصحیح فی من ھو الذبیح
۶۔ جمھرۃ البلاغۃ
۷۔ اسباق النحو حصہ اول و دوم
۸۔ مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ" دیوان حمید"
۹۔ امثال سلیمان کا خالص فارسی میں منظوم ترجمہ " خرد نامہ"
۱۰۔ عیسائیوں کے عقیدۂ شفاعت اور کفارہ کی تردید میں ایک رسالہ بزبان انگریزی۔
۱۱۔ دلائل النظام
۱۲۔ اسالیب القرآن
۱۳۔ اصول التاویل
۱۴۔ فی ملکوت اللہ
۱۵۔ القائد الی عیون العقائد

مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف میں تفسیر نظام القرآن کے باقی حصے اور انکے عربی کلام کے دیوان کے علاوہ چند کتب ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مولانا کی مختلف عنوان سے کئی یادداشتیں بھی ہیں جن کی مدد سے ان مخصوص مباحث پر بہت کام کیا جا سکتا ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے ایک رکن ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، مولانا حمیدالدین فراہی کے حالاتِ زندگی اور اُن کے افکار پر تفصیلی کام کر رہے ہیں۔

فرّخ سیر

فرّخ سیر۔ (۱۶۸۳ء - ۱۷۱۹ء) ابوالمظفر محمد معین الدین بن عظیم الشان بن شاہ عالم بہادر شاہ اوّل بن اورنگ زیب عالمگیر۔ ہندوستان کا مغل شہنشاہ۔ اورنگ آباد (دکن) میں ۱۶۸۳ء میں پیدا ہوا۔ دس برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ آگرہ آیا۔ ۱۶۹۷ء میں بنگالہ کے صوبے دار مقرر ہونے پر شہزادہ عظیم الشان [illegible]

فرخ سیر نے [illegible]

کہنے کا بھی شوق تھا۔ اپنے والد کی بنگالہ سے واپسی [illegible]

۱۹ محرم ۱۱۲۴ھ / ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو بہادر شاہ [illegible] کے بعد فرخ سیر نے اپنے والد عظیم الشان کی بادشاہت کا اعلان [illegible] بہادر شاہ کے بیٹوں جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہان شاہ [illegible] بادشاہت کے مسئلہ پر جنگ ہو رہی تھی۔ سپہ سالار ذوالفقار خان کی مدد سے جہاندار شاہ اپنے تینوں بھائیوں کے لڑائی میں مرنے کے بعد بادشاہ بن گیا۔ ادھر فرخ سیر نے دہلی میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بہار اور الٰہ آباد میں فرخ سیر کے والد عظیم الشان کی نیابت کرنے والے بارھہ کے مشہور سید برادران حسن علی اور حسین علی کے ہمراہ فرخ سیر آگرہ پہنچا۔ کھجواعہ کے مقام پر اس کا مقابلہ شہزادہ اعزالدین کی فوج سے ہوا۔ ۲۸ نومبر ۱۷۱۲ء کو اعزالدین کی فوج اپنا سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ آگرہ سے باہر دریائے جمنا کے کنارے جہاندار شاہ سے ۱۰ جنوری ۱۷۱۳ء کو مقابلہ ہوا۔ شاہی فوج کی شکست کے بعد جہاندار شاہ بھیس بدل کر دہلی پہنچا۔ وزیرِ سلطنت اسد خان نے اسے قلعہ میں نظربند کر کے فرخ سیر سے اپنی اور اپنے بیٹے ذوالفقار خاں کی حمایت اور جان بخشی کی درخواست کی۔ فرخ سیر ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ / ۱۱ جنوری ۱۷۱۳ء کو تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ۱۱ فروری کو دہلی پہنچ کر حکم دیا کہ جہاندار شاہ کو قیدخانہ میں ہلاک کر دیا جائے۔ فرخ سیر نے ۱۳ جنوری کو ذوالفقار خاں کو قتل کروا دیا۔ اس کی اور اس کے والد اسد خاں کی املاک بھی ضبط کروا لیں۔

سید برادران سے بعض وجوہات کی بنا پر اختلافات شروع ہوئے۔ اس طرح فرخ سیر کا سارا عہدِ حکومت سید برادران کے ساتھ ایک مسلسل کشاکش میں بسر ہوا۔ بعد میں فرخ سیر نے سید برادران سے صلح کر لی۔ ۱۷۱۴ء میں جودھ پور کے راجہ اجیت سنگھ کی سرکوبی کے لیے فرخ سیر نے حسین علی کو روانہ کیا۔ فرخ سیر نے باغی راجہ کو خفیہ طور پر لکھا کہ اگر وہ حسین کو ختم کر دے تو اُسے شاہانہ اعزاز دیئے جائیں گے۔ حسین علی کے جودھ پور پہنچنے پر اجیت سنگھ نے شکست تسلیم کرتے ہوئے خراج پیش کیا اور اپنی بیٹی بادشاہ سے شادی کے لیے پیش کی۔ ۲۶ ستمبر ۱۷۱۵ء کو راجکماری نے اسلام قبول کیا۔ اگلے دن اس کا بادشاہ فرخ سیر سے نکاح ہوا۔ رخصتی بعد میں ہوئی، کیونکہ بادشاہ بیماری کی وجہ سے زیرِ علاج تھا۔ انگریز ڈاکٹر ولیم ہملٹن کے علاج سے شفایاب ہونے کے بعد بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیگر مراعات کے علاوہ ایک مخصوص رقم کی سالانہ ادائیگی پر بنگالہ، اڑیسہ، بہار، سورت اور مدراس میں سامانِ تجارت پر محصول کی معافی عطا کر دی۔

فرخ سیر کے عہد کا ایک اہم واقعہ سکھوں کے نام نہاد پیشوا بندہ بیراگی کا خاتمہ ہے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمان اس کی لوٹ مار اور ظلم و ستم سے تنگ تھے۔ ۱۷۱۳ء میں اس نے گورداسپور میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اپریل ۱۷۱۵ء میں پنجاب کے صوبیدار نواب عبدالصمد خاں نے اُسے گورداسپور کے قلعے میں گھیر لیا، ۱۷ دسمبر کو سکھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ بندہ بیراگی کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔ ۱۹ جون ۱۷۱۶ء کو اسے موت کی سزا دی گئی۔

سید برادران سے بادشاہ کے اختلافات بڑھتے گئے۔ بادشاہ خود ان دونوں بھائیوں کو اپنے راستے کی دیوار سمجھتا تھا اور انھیں قتل کروانے کے منصوبے بناتا رہا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ سید برادران نے بادشاہ کے خلاف کئی امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ [illegible] ۱۱۳۱ھ

Marfat.com

[illegible] محل [illegible] اور [illegible] امراء کی افواج کے ہمراہ محل کے مضافات [illegible]

[illegible] ربیع الآخر ۱۱۳۱ھ / ۲۷ فروری ۱۷۱۹ء کو حسن علی نے محل پر قبضہ کر لیا اور حسین علی اپنی فوج [illegible] شہر میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ فرخ سیر کو اندھا کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ بہادر شاہ اول کے ایک پوتے رفیع الدرجات بن رفیع الشان کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ فرخ سیر کو دو ماہ بعد قید خانہ میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔

فرخان۔ (وفات: ۷۲۲ء)

گیلان شاہ ابن دابویہ، جو ۷۰۹ء سے ۷۲۲ء تک طبرستان کا سپہ سالار رہا۔ خلیفہ المہدی کے بیٹے المنصور کا نانا تھا۔

فرخان نے مازندران فتح کیا اور سرحدوں پہ امن و امان قائم رکھا۔ باغی دیلمیوں سے شکست کھانے کے بعد وہ آمل کی جانب بھاگا۔ فیروز آباد میں کافی عرصہ محصور رہا۔ بالآخر اس نے محاصرے سے نجات پائی۔ یوسف بن حجاج کے ظلم و ستم کے شکار خوارج کو اس نے پناہ دی۔ لیکن جب سفیان بن ابی الابرد الکلبی نے اس کے خلاف لشکر کشی کی تو فرخان نے خوارج کے خلاف اقدام کیا اور ان کے سرداروں کو قتل کر دیا۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں خراسان کے عامل یزید بن المہلب نے طبرستان کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ فرخان کا بیٹا دادبُرز مہر اس کا جانشین ہوا۔

فرخی۔ ابوالحسن علی بن جولُوغ (وفات ۴۲۹ھ / ۱۰۳۸ء)

ایرانی شاعر۔ سیستان میں پیدا ہوا۔ تذکرۃ الشعراء میں دولت شاہ سمرقندی نے اُسے ترمذ کا بتایا ہے۔ لیکن دراصل فرخی خود کو سیستان کا بتاتا تھا۔

فرخی، عنصری کا شاگرد تھا۔ فرخی کا والد، صفاری خاندان کے امیر خلف کا ملازم تھا۔ فرخی کی ایرانیوں کے نزدیک وہی حیثیت ہے جو عربوں کے لیے المتنبی کی ہے۔

فرخی بڑے اچھے شعر کہتا تھا اور چنگ بجانے میں ماہر تھا اور اپنے شعر چنگ کے ساتھ گایا کرتا تھا۔ اس کی موسیقی کا اثر اس کے اشعار میں جھلکتا تھا۔

فرخی کو تشبیب اور غزل کہنے میں کافی دسترس تھی۔ تشبیب کے اشعار رواں، سادہ ہوتے لیکن ان میں گہرائی نہیں ہوتی تھی۔

فرخی کے کلام اور اس کے استاد عنصری کے کلام کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصری کے کلام میں گہرائی اور متانت ہے اور فرخی کے کلام میں سادگی اور روانی۔

ترجمان البلاغت، فن شاعری پر فرخی کا ایک یادگار رسالہ ہے۔

فرخی نے امیر چغانیاں ابوالمظفر کے دربار میں امیر کی مدح میں قصیدے کہے اور اسی طرح سلطان محمود غزنوی کے دربار سے بھی وابستہ رہا۔ سلطان محمود کے ہمراہ فرخی متعدد جنگوں میں رہا۔ اس نے جنگ کے مناظر کی اپنے کلام میں بہترین عکاسی کی ہے فرخی نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ خصوصی طور پہ محمود غزنوی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ اس قدر اثر انگیز ہے کہ پتھر دل بھی پسیج اٹھتا ہے۔ اس کا دیوان تہران سے ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔

فرد۔ از روئے لغت واحد شے یا شخص، جس کے ساتھ دوسری نہ ملائی گئی ہو۔ اس کی جمع عربی میں فُرادیٰ ہے۔ لہٰذا ناقابلِ تقسیم، یکتا، اس طرح موجود کہ [illegible] مشخص علیٰحدہ و علی الدوام قائم رہے۔ کسی بھی علم اور فن میں جب بھی لفظ فرد اصطلاحاً استعمال ہوتا تو اس سے مقصود اس کے محمول کی انفرادیت پر زور دینا ہوتا ہے۔

قواعد لغت میں فرد سے مراد مفرد ہے یعنی ایک شخص یا شے۔ ادب میں صرف ایک بیت (چاہے دونوں مصرعے مقفیٰ یا غیر مقفیٰ)، حدیث میں غریب مطلق، وہ حدیث جس کی ایک ہی سند ہو۔ جیسے بھی روایت کی جائے اس کا راوی ایک ہی ہو۔ متکلمین کے نزدیک وہ نوع جو قید تشخص سے مقید، یعنی منفرد ہے۔ مابعد الطبیعیات میں وہ ہستی جو قائم بالذات ہے۔ الٰہیات میں فرد کامل یا فرد مطلق وہ ہستی جو توالد و تناسل سے پاک ہے، غنی ہے، بے نیاز ہے، کسی کی محتاج نہیں۔ کوئی اس کا ثانی اور ہمسر نہیں۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورۃ الشوریٰ)

ویسی کوئی شے نہیں۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ (سورہ اخلاص)۔ اللہ بے نیاز ہے۔

فردوس۔ دیکھیے: "جنّت"

فردوسی۔ (۹۴۱ء – ۹۴۰ء – ۱۰۲۰ء)

ابوالقاسم حسن، فردوسی، ایران کے ایک عظیم شاعر۔ علاقہ طوس میں طابران کے قریب ایک گاؤں باژ کا رہنے والا۔ اس کے والد کے نام پہ مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کے آباؤ اجداد باژ میں کھیتی باڑی کیا کرتے تھے۔

فردوسی نے بعض روایات کی رو سے ۲۵ سال اور بعض کی رو سے ۳۵ سال کی محنتِ شاقہ سے "شاہنامہ" لکھ کر شہرت حاصل کی۔

شاہنامہ پچاس فصلوں پر مشتمل ہے، ہر فصل ایک بادشاہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ شاہنامہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد عقل و دانش کا بیان ہے۔ پھر نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کا ذکر ہے۔ پھر شاہنامہ کے لیے مواد حاصل کرنے کے احوال کا ذکر ہے۔ شاہنامہ کی پچاس فصلوں میں مختلف بادشاہوں رستم، اردشیر بابکان، جمشید، فریدون، کیخسرو، نوشیرواں، خسرو پرویز، یزدگرد کا خاص طور پہ ذکر ہے۔ یزدگرد ساسانی حکمرانوں میں آخری تاجدار تھا۔ جسے عربوں نے شکست دے کر ایران میں اسلامی حکومت قائم کی تھی۔

فردوسی نے شاہنامہ کی تالیف اس لیے شروع کی تھی کہ وہ اپنی تنگ دستی اور پریشاں حالی کی وجہ سے اپنی بیٹی کا جہیز نہیں بنا سکتا تھا۔ شاہنامہ کی تالیف سے معقول رقم حاصل کر کے بیٹی کا جہیز بنانا تھا۔ اس دوران میں اس نے عشقیہ داستان "بیژن و منیژہ" کو نظم کیا۔ اپنے بیٹے کے اچانک انتقال پہ اس نے مرثیہ لکھا۔

۳۸۸ھ / ۹۹۸ء میں غزنی میں امیر سبکتگین کی وفات کے بعد سلطان محمود تخت نشین ہوا۔ فردوسی معقول انعام کی امید میں سلطان محمود کے دربار میں آیا اور وہاں کچھ سال رہا۔ اس دوران شاہنامہ مرتب کر کے سلطان کو سناتا تھا اور داد تحسین حاصل کرتا تھا۔ سلطان نے دربار کے بعض حاسدوں کی بدگوئی سے متاثر ہو کر فردوسی سے ایفائے عہد نہ کیا۔ اور صرف بیس ہزار درہم دے کر ٹال دیا۔ فردوسی اس ناروا سلوک سے کافی رنجیدہ ہوا۔ بیس ہزار درہم وہاں ایک حمام میں غسل کرنے کے بعد حمامی اور عطار میں تقسیم کرنے کے بعد غزنی سے چلا گیا۔ دربدر بھٹکتا رہا۔ بالآخر طوس پہنچ کر سلطان محمود کی ہجو لکھی۔

محمود شیرانی نے جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت کی ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو نہیں لکھی تھی، بلکہ ہجو کے اشعار شاہنامہ میں بعد میں داخل کیے گئے۔

Marfat.com

فردوسی۔ سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کے عہد میں بروسہ کا ایک ترک شاعر۔ فارسی کے بلند پایہ شاعر فردوسی سے ممیز کرنے کے لیے اسے فردوسی رومی یا فردوسی طویل کہتے ہیں۔ اس کی ضخیم تصنیف کی وجہ سے، جو کہ ۳۶۰ یا ۳۸۰ جلدوں پر مشتمل تھی۔ یہ ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا تھا جس میں فردوسی نے اپنے دَور کے فلسفہ، تاریخ، ہیئت، انساب سے متعلق تمام علوم جمع کر دیئے تھے۔ تاہم سلطان بایزید ثانی نے اس کی صرف ۸۰ اور بعض روایات کی رو سے ۹۹ جلدیں پسند کر کے باقی جلدیں نذرِ آتش کر دی تھیں۔ فردوسی کو اس حادثہ سے کافی دُکھ ہوُا اور اس نے بھی فارسی شاعر فردوسی کی طرح سلطان کے لیے ہجویہ اشعار لکھے تھے بعد میں وہ ایران چلا گیا۔ وہاں ہی اس کا انتقال ہوُا۔

فرزدق۔ (۲۰ھ/ ۶۴۱ء - ۱۱۴ھ/ ۷۳۲ء - ۷۳۳ء)

ابو فراس ھمام بن غالب بن صَعْصَعہ الفرزدق بصرہ میں پیدا ہوُا۔ اُموی دورِ خلافت کے تین مشہور ہجو گو عرب شاعروں میں سے ایک شاعر تھا۔ قبیلہ بنو تمیم کے ایک خاندان مجاشع بن دارم سے متعلق تھا۔ فرزدق کے باپ نے اسے جنگ جمل کے بعد حضرت علی کے پاس بھیجا تھا۔

معاصر ہجو گو شاعر جریر سے اکثر مقابلہ ہوتا رہتا۔ اموی دَور کے اکثر حکمران اس سے ناراض رہتے کیونکہ وہ اُن کی ہجو گوئی کیا کرتا تھا۔ عبدالملک پہلا خلیفہ تھا جس کی اس نے مدح سرائی کی اور اسی طرح خلیفہ سلیمان بھی اس پر مہربان تھا۔ خلیفہ ہشام نے ایک بار ہجو گوئی کرنے پر اُسے قید کر دیا تھا۔ فرزدق اہلِ بیعت کا مدح خواں تھا۔ اس لیے بھی اکثر اموی حکمران اُس سے ناراض رہتے تھے۔

الفرزدق نے ۱۱۴ھ/ ۷۳۲ء - ۷۳۳ء میں ذات الجنب کے عارضے سے بصرہ میں وفات پائی اور بنو تمیم کے قبرستان میں دفن ہوُا۔

فرس۔ بمعنی گھوڑا۔ فرس عربی کا لفظ ہے۔ اسم جمع کے لیے الخیل بولا جاتا ہے۔ اشرف المخلوقات انسان کے بعد گھوڑا اپنی مخصوص صفات کی وجہ سے بہترین مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں اسے عام سواری کے لیے کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ جنگوں میں اس کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ عرب مسلمانوں کی فتوحات میں گھوڑے کا بڑا اہم حصہ ہے اسی وجہ سے عربی نثر و کلام میں گھوڑے کا ذکر ملتا ہے۔ ابن الندیم نے کتاب الفرس، کتاب الخیل اور کتاب صفات الخیل بھی ذکر کیا ہے۔ اسی زمانے کی جنگی ضروریات کے پیشِ نظر قرآن مجید نے رباط الخیل (س۔ انفال۔ آیت ۶۰) کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

المسعودی نے مُرُوجُ الذَّھَب میں گھڑ دوڑ کے متعلق بہت سی معلومات جمع کی ہیں۔ اُردو اور فارسی میں بہت سے "فرس نامے" اور "اسپ نامے" ہیں۔ ان میں رنگین کا فرس نامہ اور مرزا سوداؔ کا گھوڑے پر مشہور قصیدہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان میں آج بھی گھوڑے کی سواری ایک محبوب مشغلہ ہے۔ گھڑ دوڑ چوگان (گاف) کے علاوہ گھوڑے کو فوج اور پولیس کے دستوں میں استعمال کیا جاتا ہے گھوڑے پر سوار ہو کر نیزہ بازی کی جاتی ہے۔ گھوڑوں کو سدھا کر رقص کے کرتب بھی کروائے جاتے ہیں۔

گھوڑا نہایت وفادار اور اطاعت کیش جانور ہے۔ اس کی عادات میں شائستگی کا ثبوت۔ اس امر سے ملتا ہے کہ جب کسی تربیت یافتہ گھوڑے پر کوئی شخص سوار ہو تو وہ لید اور پیشاب نہیں [illegible] دیتا۔ جب کسی دشمن یا درندے کی طرف سے [illegible] کا خطرہ ہو تو [illegible] کرتا ہے۔ گھوڑے کی ایک قابلِ ذکر عادت یہ ہے کہ وہ [illegible] ہے۔ صاف اور ساکن پانی میں اپنے عکس سے ڈرتا ہے [illegible] اور گدلا کر کے پانی پیتا ہے۔

فرشتہ۔ فرشتہ فارسی کا لفظ ہے اور اُردو میں بھی مستعمل ہے۔ عربی میں اس کے لیے مَلَک کا لفظ ہے اور جمع ملائکہ ہے۔ اس کے لغوی معنی پیامبر (قاصد) کے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرشتوں کے لیے مُرسَل (سورۃ ہود آیت ۶۹) کا لفظ بھی آیا ہے۔ فرشتے محض وہ مجرد قوت نہیں جو شخصیت نہ رکھتی ہو، بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ قرآن مجید میں انسان کی تخلیق کے متعلق تو ذکر ہے کہ یہ مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جنات کے متعلق ذکر ہے کہ وہ آگ سے بنائے گئے ہیں۔ لیکن فرشتوں کے متعلق ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ کس مادہ سے بنائے گئے ہیں۔

لیکن ابن ماجہ کی ایک حدیث سے، جس کی روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کی ہے، معلوم ہوتا ہے فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ جو زندگی اور بولنے کی صفات رکھتے ہیں۔ جن، شیطان اور فرشتوں میں نوع کے اعتبار سے فرق ہے۔ فرشتے نفسانی خواہشات اور غصہ سے پاک ہیں۔ ان میں خداوند کریم کے احکام کی معصیت کی صلاحیت نہیں۔ انھیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی اطاعت کرتے ہیں اُن کی خوراک اللہ تعالٰے کی تسبیح و تحمید ہے۔ ......"

اللہ تعالٰے فرشتوں سے اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام کے کام لیتا ہے۔ یعنی یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ اللہ تعالٰے اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو اللہ تعالٰے کی مخلوقات میں جاری اور نافذ کر دیتے ہیں۔ فرشتوں کو اس کے سوا کوئی ذاتی اختیار نہیں۔ وہ سراپا اطاعت ہیں۔ دنیا پر رحمت و عتاب کی جیسی بھی صورتیں نازل ہوتی ہیں وہ فرشتوں کے ذریعے ہی ہوتی ہیں اور اللہ تعالٰے اپنے انبیاء کے لیے جو ہدایات و احکام بھیجتا تھا وہ فرشتوں کے ذریعے ہی بھیجتا تھا۔

فرشتوں کی مختلف ذمہ داریاں ہیں جن میں وہ مصروف رہتے ہیں۔ ان کی تعداد لامحدود ہے۔ جس کے متعلق قرآن اور نہ ہی سنت سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات کی رو سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے اور فرشتوں کو وجود بخشا گیا ہے، اس وقت سے فرشتے عرش پر اللہ کے گھر "بیت المعمور" کا طواف کرتے ہیں۔ جس فرشتہ کی ایک بار باری آ گئی ہے اس کی قیامت تک دوبارہ باری نہیں آئے گی۔

اسلام میں ایمانیات میں سے فرشتوں کے وجود پر بھی ایمان لانا ضروری ہے دیگر مذاہب میں بھی فرشتوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے بلکہ عیسائیوں کے اقانیم ثلاثہ میں ایک اقنوم یعنی روح القدس فرشتہ ہی ہے۔ پارسی اور ہندو مذہب کے پیروکار بھی فرشتوں کے وجود کو کسی نہ کسی انداز میں تسلیم کرتے ہیں۔ ان تمام مذاہب میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ ہی ہے۔ کبھی ان کو خالق کا مقام دے دیا جاتا ہے یعنی قابلِ پرستش اور کبھی مخلوق کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اہلِ عرب اسلام سے قبل فرشتوں کو اللہ تعالٰے کی بیٹیاں قرار دیتے تھے یونانی فلسفہ میں ان کو عقلِ اول اور عقول عشرہ، تمام عالم کے خالق کا درجہ دیا جاتا تھا۔

Marfat.com

... [illegible] فرشتوں کے متعلق تمام غلط قسم کے عقائد ختم ہو گئے۔ [illegible] نے انسانوں کو آگاہ کیا کہ فرشتے اللہ تعالےٰ کی نہایت مطیع و فرمانبردار مخلوق ہیں اور ان کے ذمہ اللہ تعالےٰ کی اس کائنات کے مختلف کام ہیں۔ ان فرشتوں میں جن بڑے فرشتوں کے نام روایات کی کتب سے ملتے ہیں۔ جبرائیل، عزرائیل، اسرافیل اور میکائیل۔

جبرائیل، جو اللہ تعالےٰ کے پیغامات ان کے انبیاء اور رسولوں کو پہنچاتے ہیں۔ (سورۃ الحج، آیت ۷۵)

عزرائیل، جو انسانوں کی ارواح قبض کرتے ہیں۔ عزرائیل کو ملک الموت بھی کہتے ہیں۔ (سورۃ السجدہ، آیت ۱۱)

اسرافیل۔ قیامت کے دن صور پھونکیں گے تو تمام جاندار مر جائیں گے۔

میکائیل۔ حضرت جبرائیل کے بعد میکائیل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ذمہ داری لوگوں کو رزق پہنچانا اور بارش برسانا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے جو جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے، جب اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو جبرائیل اور میکائیل نے ہی سب سے پہلے سجدہ کیا۔

اسی طرح کراماً کاتبین (سورۃ انفطار آیت ۱۱) دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ مقرر ہیں جو اس کے اعمال کو درج کرتے ہیں۔

اسی طرح فرشتے جنت اور جہنم کے محافظ بھی ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت اور عذاب کو انسانوں پر نازل کرنے کے لیے بھی فرشتے مقرر ہیں۔ روز قیامت کو اللہ تعالےٰ کا عرش اٹھانے والے آٹھ فرشتوں کا ذکر سورۃ الحاقہ میں آیا ہے۔ حدیث کی بعض روایات سے قبر میں انسانوں سے سوال کرنے والے منکر نکیر دو فرشتوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ حدیث کی روایات سے جنت کے داروغہ (نگہبان) فرشتہ کا نام رضوان اور جہنم کے نگہبان فرشتہ کا نام مالک معلوم ہوتا ہے۔

فرشتے انسانی شکل میں بھی انبیاء کرام کے پاس آتے رہتے ہیں۔ سورۃ ہود میں ذکر ہے، جب فرشتے انسانی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ کے پاس فرشتہ انسانی شکل میں آیا تھا۔ (سورۃ مریم، آیت ۱۷)

حضرت جبرئیل کے نبی کریمؐ کی خدمت میں انسانی شکل میں آنے کی کئی روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔

فرشتہ

فرشتہ۔ محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی المعروف بہ فرشتہ۔ مسلم مؤرخ، طبی مصنف اور احمد نگر و بیجاپور کے سلاطین کا ایک درباری۔ اس کے باپ کا نام غلام علی ہندو شاہ تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نے گردشِ زمانہ سے تنگ آ کر ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں بیجاپور میں پناہ لی تھی۔

فرشتہ کی شہرت اس کی مشہور تاریخ "گلشن ابراہیمی" کی وجہ سے ہے۔ گلشن ابراہیمی، تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں لکھی گئی تھی۔ ۱۷۶۸ء میں اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔

تاریخ فرشتہ ایک سن وار تاریخ ہے جو تمام تر قدیم تواریخ، زبانی روایات اور خود فرشتہ کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے شاندار دورِ حکومت کی روداد بیان کرنا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں ہندوؤں کے عہد کی تفصیل زیادہ ملتی ہے۔

تاریخ فرشتہ کا آغاز مسلمان بادشاہوں کے واقعات اور مشائخ کے حالات سے ہوتا ہے۔ مقدمہ تاریخ میں ہندوؤں کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ کتاب کے آخری ابواب میں ہندوستان کا جغرافیہ، ہندوؤں کی تاریخ شناسی اور ہندو راجاؤں کا ذکر ہے جو فرشتہ کے زمانے میں باجگزار حاکم تھے۔

اہل یورپ اٹھارہویں صدی کے وسط تک فرشتہ کو ہندوستان کے اسلامی دور کا مستند مؤرخ مانتے تھے، لیکن سنین کی غلطیوں کی وجہ سے اب اس پر اعتماد کم ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پر اب ایسی کتابیں دستیاب ہیں جن میں ہر تاریخی واقعہ کو تحقیق اور تنقید کی کسوٹی سے پرکھ کر درج کیا گیا ہے۔ اس لیے تاریخ فرشتہ جیسی کتاب کو اب مستند تاریخ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ درحقیقت تاریخ فرشتہ تاریخی واقعات کا ایک مجموعہ ہے۔

فرض

فرض۔ یہ اصطلاح دین کے ان کاموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن کے کرنے کا سختی سے حکم دیا گیا ہو اور جن کا کرنا لازمی ہو۔ جن کے ترک کرنے پر کفر لازم ہوتا ہے اور سزا ملتی ہے اور کرنے پر جزا ملے گی۔

حنفی فقہا کے مطابق فرض وہ کام ہے جو دلیل قطعیہ یعنی قرآن، سنت، اجماع سے ثابت ہو جس میں شک کی گنجائش نہ ہو۔

فصول الحواشی صفحہ ۲۹۸ پر فرض کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

"شرع میں فرض وہ کام ہے جو دلیل قطعیہ سے ثابت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں جس طرح اس کا ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح اس پر اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ فصول الحواشی کے اسی صفحہ پر واجب (ضروری) کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔" شرع میں واجب وہ کام ہے جس کا ثبوت دلیل ظنی سے ہو جو شبہ سے خالی نہیں ہوتی۔

امام شافعی اور دوسرے فقہا کے نزدیک فرض اور واجب دونوں مترادف اور ہم معنی ہیں لیکن امام ابو حنیفہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ بعض اوقات حنفی حضرات بھی فرض اور واجب دونوں کو ایک ہی مفہوم کے ادا کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

دینی فرائض کے علاوہ انسان پر معاشرتی، ملکی اور اخلاقی فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کی پابندی قانون اور معاشرت کی رو سے لازمی ہے۔ فرض اور واجب میں یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ فرض کو ضروری نہ ماننا کفر ہے اور واجب کو ضروری نہ ماننے سے کفر تو نہیں لازم ہوتا بلکہ گناہ ہوتا ہے۔ یہ اعتقادی حیثیت ہے۔ عملی طور پر دونوں لازمی ہیں۔

فرض عین

فرض عین۔ فقہا نے فرض کی دو قسمیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک فرض عین ہے۔ فرض عین جس کا ادا کرنا ہر مسلمان مرد، عورت کے لیے ضروری ہے سوائے کسی شرعی عذر کے، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔

فرض کفایہ

فرض کفایہ۔ وہ فرض جس کا ادا کرنا تمام مسلمانوں کے لیے ضروری تو ہے لیکن فرداً فرداً اگر تمام مسلمان اس فرض کو ادا نہ کریں اور صرف مسلمانوں کی جماعت میں سے چند افراد اُسے ادا کریں تو یہ سب کے لیے کافی ہے۔ چند افراد کی طرف سے ادا کرنے کو سب کی طرف سے ادا کرنا سمجھا جائے گا اور اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب کے لیے اس فرض کا ترک کرنا گناہ ہوگا۔ جیسے نماز جنازہ، رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں اعتکاف کرنا۔

Marfat.com

علمائے اسلام نے فرض کفایہ میں مزید چند امور بھی بیان کیے ہیں :

(۱) سلام کا جواب دینا۔
۲۔ مریض کی عیادت کرنا اور اس کی ضروریات کے متعلق دریافت کرنا۔
۳۔ جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانا۔
۴۔ کھانے کی دعوت قبول کرنا۔
۵۔ چھینک کا جواب دینا۔
۶۔ کسی کے پوچھنے پر مناسب مشورہ دینا۔
۷۔ کسی مسلمان کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنے کسی وعدہ کو پورا کرسکے اور اُسے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔

فرضہ۔ وہ غیر معمولی محصول جو بالعموم کسی خاص مقصد کے لیے رکھا جاتا ہے عثمانی عہد حکومت میں مصر کے کسانوں پر ۱۷۰۵ء میں محصول عائد کیا گیا۔ ۱۷۹۲ء میں اسے قانونی شکل دے دی گئی۔ اس محصول کی رقم معین نہ تھی۔ یہ محصول مختلف ضروریات کے پیش نظر عائد کیا جاتا تھا اور اسے مقامی ضروریات پر خرچ کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمد علی پاشا نے بھی ایک محصول بلا تفریق مذہب وملت عائد کیا۔ یہ محصول دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ۵۰۰ قرش تک کی آمدنی والے ہر شخص پر عائد کیا گیا۔ اس سے آمدنی کا بارھواں حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ جب دفاعی ضروریات کے مصارف پورے ہوگئے تو یہ محصول موقوف کر دیا گیا۔ بعد میں یہ محصول دوبارہ ہر شخص پر عائد کیا گیا۔ ہر مسلم اور غیر مسلم کے لیے اب اس کی شرح آمدنی کا آٹھ فی صد تھی۔ اس محصول کو فرضۃ الرؤس کہا جاتا تھا۔

فرع یہ ایام جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اور یہ اونٹنی کے اُس بچے کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے پیدا ہو۔ جہلائے عرب اس بچے کو اپنے بتوں کی قربانی کے طور پر ذبح کیا کرتے تھے۔ شریعت نے اس کی ممانعت کر دی۔

بعض کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ سے دستور تھا کہ جب کسی کے پاس سو اونٹ ہو جاتے تو وہ ایک اونٹ بتوں کے لیے ذبح کرتا۔ آغاز اسلام میں بھی خدا کی نذر کے طور پر یہ رسم جاری رہی مگر پھر منسوخ ہوگئی۔

فرعون۔ قدیم زمانہ میں مصر کے بادشاہوں کا لقب۔ زمخشری نے اپنی تفسیر الکشاف میں لکھا ہے کہ جس طرح روم کے بادشاہ قیصر، ایران کے بادشاہ کسریٰ، حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور ترک کے بادشاہ خاقان کہلاتے تھے۔ اسی طرح مصر کے بادشاہوں کو فرعون کہا جاتا ہے۔ اہل لغت نے فرعون کے مختلف معنی بیان کئے ہیں، لیکن ایک رائے یہ بھی ہے جسے صاحب تفہیم القرآن نے درج کیا ہے: لفظ فرعون کے معنی سورج دیوتا کی اولاد۔ قدیم اہل مصر سورج کو، جو اُن کا مہا دیو یا رب اعلیٰ تھا۔ رَع کہتے تھے اور فرعون اُسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے یہ معیار تھا کہ وہ رَع کا جسمانی مظہر اور اُس کا ارضی نمائندہ ہو۔ اسی لیے ہر شاہی خاندان، جو مصر میں برسر اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا اور ہر فرماں روا فرعون کا لقب اختیار کرکے اہل مصر کو یقین دلاتا تھا کہ وہ اُن کا رب اعلیٰ یا مہا دیو ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرعون کے ذکر میں اُس کا یہ دعویٰ بیان کیا گیا ہے۔ انا ربکم الاعلیٰ۔

تاریخی کتب میں مصر کے [illegible] بادشاہوں کا [illegible] ہے اور مختلف خاندانوں کی صورت میں [illegible] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور سے متعلق دو بادشاہ [illegible] تھے۔ تفسیر فتح البیان میں سورۃ بقرہ کی تفسیر کے ذیل میں [illegible] حضرت موسیٰ کے عہد کے فرعون کا نام قابوس تھا، مگر بقول وہب اُس کا نام ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ اس کی عمر چار سو برس تھی۔ حضرت موسیٰ کی ۱۲۰ برس تھی۔ بائبل میں مصر کے گیارہ بادشاہوں کا ذکر ہے۔ فرعون ابراہیمؑ، فرعون یوسفؑ، فرعون موسیٰؑ وغیرہ۔

امریکن انسائیکلوپیڈیا اور برٹانیکا اور تفسیر حقانی میں فراعنہ مصر کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ اُس کے مطابق ۵۰۰۰ قبل مسیح سے یارا سکندر رومی تک مصر کے حکمرانوں کے تیس خاندان تھے، جن کے پھر تین دور کیے گئے ہیں، جو ساڑھے تین ہزار سال تک برسر اقتدار رہے اور اُن کی تعداد ۳۰۰ کے قریب تھی۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے واقعات میں جس فرعون کا ذکر ہے وہ انیسویں خاندان اور تیسرے دَور کا فرعون ہے۔ اس خاندان کی حکومت کا آغاز ۱۳۵۰ ق۔م کے بعد رعمسیس اوّل سے ہوا۔ اس خاندان کا تیسرا بادشاہ رعمسیس ثانی تھا۔ اس کی حکومت کا آغاز ۱۳۰۴ ق۔م سے ہوا۔ گو وہ باپ کے بڑھاپے کی وجہ سے عملاً پہلے سے ہی حکمران تھا۔ اس کی حکومت ۶۷ برس تک رہی عام خیال ہے کہ جس فرعون کے گھر حضرت موسیٰ نے پرورش پائی تھی اسی کے ساتھ بعد میں مقابلہ کرکے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لے گئے، لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ جس فرعون کے گھر حضرت موسیٰ کی پرورش ہوئی وہ رعمسیس ثانی تھا اور جس کا حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ ہوا، وہ منفتہ یا منفتاح تھا۔ اس کی تائید بائیبل اور تلمود کے اس متفقہ بیان سے ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ قیام مدین میں وہ فرعون مر چکا تھا جس کے ہاں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ حضرت موسیٰ اُس کے محل میں چالیس برس رہے تھے۔ جب ایک قبطی آپ کے مُکّے سے ہلاک ہوگیا، تو آپ مدین چلے گئے۔ وہاں حضرت شعیب کے ہاں رہے اور اُن کی ایک بیٹی سے حضرت موسیٰؑ کی شادی ہوئی۔ مدین آپ نے وادیٔ ایمن میں اللہ تعالیٰ سے کلام کیا اور آپ کو فرعون کے ہاں جانے کا حکم ملا۔

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى

جب حضرت موسیٰ مصر میں داخل ہوئے تو رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح اس کا جانشین بادشاہ تھا اور یہ دوسرا فرعون تھا جس سے حضرت موسیٰ کو واسطہ پڑا تھا۔ اسی نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تھا۔ جب بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ مصر سے نکال کر ساتھ لے جا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے سمندر میں اُن کے لیے راستہ بنا تھا۔ جب فرعون اور اُس کا لشکر اُسی راستے پر اُترا تو پانی کے دوبارہ آنے سے وہ مع لشکر کے دریا میں غرق ہوگیا تھا۔ علامہ جوہری طنطاوی مصری نے اپنی تفسیر جواہر القرآن کی جلد ۶ میں مصر کے ایک محقق و مفتش کے حوالے سے اس بات کو درج کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا واسطہ دو فرعونوں سے پڑا تھا اور صاحب تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۃ الاعراف کی تفسیر میں بھی دو فرعونوں کا ذکر کیا ہے۔

فراعنہ کے تیرھویں اور چودھویں خاندانوں کی حکمرانی کے دوران مرکزی حکومت کمزور ہوگئی تو بابلیی بادشاہ مصر کے حکمران ہوئے۔ اُن کو بھی فراعنۂ مصر میں شمار کیا جاتا ہے۔ انیسویں خاندان کی حکومت کا آغاز رعمسیس اوّل (۱۳۱۵ ق۔م) سے ہوا جس کی حکومت دو برس تک رہی۔ اس کے بیٹے ساتی اوّل کے دَورِ حکومت کے بعد رعمسیس دوم چھوٹی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے لبنان کے حتیوں سے جنگ کی اور شکست پائی۔ ۱۲۵۰ ق۔م میں حتیوں کے سردار نے اپنی بیٹی کی شادی فرعون سے کر [illegible]

Marfat.com

بیٹے منفتاح نے بھی اپنے دورِ حکومت میں کچھ فتوحات کیں لیکن اس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا اور بعد کے فراعنۂ مصر کا دورِ حکمرانی مختصر ہوا۔

فراعنۂ مصر کے اس سلسلہ میں ایک فرعون امیسس دوم تھا جس کا عہدِ حکومت ۵۷۰ تا ۵۲۵ ق م تھا۔ دورِ حکومت کے آغاز میں اس نے شاہ ایران خورس کے دشمنوں [illegible] فراعنۂ مصر کے اقبال کا نقیب بنا۔ امیسس دوم نے ۴۴ سال حکومت کی۔ اس کے انتقال کے بعد ۵۲۵ ق م میں کیقباد کی قیادت میں [illegible] دوم [illegible] کو شکست دے کر مصر پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ۴۰۵ ق م میں فراعنۂ مصر [illegible] پر قابض ہو گئے اور فرعون امستیس نے داریوس دوم کو شکست دے کر اٹھائیسویں خاندان کی حکومت کا آغاز کیا۔ اس خاندان کا دورِ حکومت مختصر تھا۔ فراعنۂ مصر کے تیسویں خاندان کا آخری بادشاہ نختنب تھا، جسے یونانیوں نے شکست دی اور بعد میں ۳۴۱ ق م میں یہی بادشاہ بھاگ کر حبشہ چلا گیا۔ اس پر فراعنۂ مصر کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کے واقعات میں فرعون کے لیے "اِنَّہٗ طَغٰی" یعنی سرکش باغی، "وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ" (سورۃ الفجر آیت ۱۰) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

قرآن مجید میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ہمراہ بحفاظت نکل گئے لیکن فرعونِ مصر منفتاح، جو اُن کے تعاقب میں تھا، اپنی فوج کے ہمراہ بحیرہ قلزم میں غرق ہو گیا۔ یہ فرعون اپنے باپ کا تیرھواں بیٹا تھا اور ۲۵ سال تک حکمران رہا۔

قرآن مجید میں فرعون کے غرق ہونے کا نقشہ اس انداز میں بیان ہوا ہے :۔

"یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا، بولا! میں نے یقین کر لیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اُس کے جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی فرمانبرداروں میں سے ہوں"۔ (سورۃ یونس آیت ۹۰)

لیکن غرق ہونے کے وقت ایمان لانے کی یہ صورت اُس کے کسی کام نہ آئی، البتہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے بدن کو ڈوبنے سے بچا لیا۔

"سو آج ہم تیرے بدن کو بچائے دیتے ہیں، تاکہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی (عبرت) رہے"۔ (سورۃ یونس آیت ۹۲)

چنانچہ اس کی لاش سطحِ سمندر پر آ گئی اور کنارے سے لگ گئی اور اُسے حنوط کر کے مصر کے اہرام میں محفوظ کر دیا گیا۔ قاہرہ کے عجائب گھر میں رعمسیس دوم اور منفتاح دونوں فرعونوں کی لاشیں حنوط شدہ ممیوں کی صورت میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق (مصنف کتب کثیرہ) نے اپنے ایک مضمون "فرعونِ موسیٰ کی لاش" مطبوعہ ماہنامہ میثاق لاہور (جلد ۲۶، اپریل ۱۹۷۸ء کا شمارہ) میں صاحبِ تفہیم القرآن کے ایک خط (مکتوبہ ۲۰ نومبر ۱۹۶۷ء) کے حوالے سے فرعونِ موسیٰ کی لاش کے متعلق حقائق کا انکشاف کرتے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے خط میں لکھتے ہیں :۔

"غرق شدہ فرعون کے بارے میں زیادہ تر معلومات مجھے (LOUIS GOLDING) کے سفرنامے (IN THE STEPS OF THE LAW GIVER) سے حاصل ہوئی ہیں۔ لوئیس گولڈنگ اپنے اس تحقیقاتی سفرنامے میں لکھتا ہے کہ رعمسیس دوم وہ فرعون تھا، جس کے زمانے میں حضرت موسیٰؑ [illegible] بنی اسرائیل پر جس کے مظالم مشہور ہیں۔ اسی لیے اُس کو (PHARAOH OF PERSECUTION) (فرعونِ عقوبت) کہا جاتا ہے اور جس فرعون کے زمانے میں حضرت موسیٰ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اور جو سمندر میں غرق ہوا تھا وہ رعمسیس کا بیٹا منفتاح (MINEPTAH) تھا۔"

برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے مضمون ممی (MUMMY) میں ذکر ہے کہ ۱۹۰۱ء میں ایک انگریز ماہرِ آثارِ قدیمہ سر گرافٹن ایلیٹ سمتھ نے ممیوں کو کھول کر اُن کے حنوط کی تحقیق شروع کی تھی اور جو ایسی ممیوں کا مشاہدہ کیا تھا گولڈنگ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں منفتاح کی ممی ملی۔ اس کی پٹیاں کھولی گئیں۔ تو سب حاضرین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے جسم پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی تھی جو کسی اور ممی کے جسم پر نہ پائی گئی۔ گولڈنگ مزید لکھتا ہے کہ فرعون بحیراتِ مُرّہ (یعنی کڑوے پانی کی وہ جھیلیں جو بحیرہ احمر اور بحیرۂ قلزم کے مابین واقع تھیں۔ اب نہر سویز کا حصہ بن گئی ہیں) میں غرق ہوا تھا۔ آگے مزید لکھتا ہے جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر ایک پہاڑی "جبلِ فرعون" کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑی کے نیچے ایک غار میں گرم پانی کا ایک چشمہ ہے "جسے حمام فرعون" کہا جاتا ہے اور سینہ بہ سینہ روایات کے مطابق فرعون کی لاش اُسی جگہ سے ملی تھی۔

۱۹۷۷ء میں قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑی ممیوں سے ایک کے متعلق انکشاف ہوا کہ خراب ہو رہی ہے، جو اتفاقاً روایت کے مطابق فرعونِ موسیٰؑ کی ممی تھی۔ اُس ممی کو بڑے اہتمام سے فرانس لے جایا گیا اور وہاں ماہر ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بنایا گیا۔ اُس میڈیکل بورڈ نے ممی کے خراب ہونے کی وجوہات اور آئندہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے اقدامات و تجاویز پر غور کیا۔ قرآن مجید نے فرعون اور موسیٰؑ کے حالات کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے :۔

سورۃ البقرۃ۔ آیات ۴۹ کے بعد، سورۃ آلِ عمران آیت ۱۱

سورۃ الاعراف۔ رکوع ۱۳ تا ۲۱ (آیت ۱۰۳ کے بعد) میں موسیٰؑ فرعون اور بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر ہے۔

سورۃ الانفال آیت ۵۲ تا ۵۴، سورۃ یونس آیات ۷۵ تا ۹۲۔

سورۃ ہود۔ آیت ۹۷، سورۃ ابراہیم۔ آیت ۶

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱ تا ۱۰۴، سورۃ طٰہٰ آیت ۲۴ سے ۱۰۹ تک موسیٰؑ فرعون اور بنی اسرائیل کا تفصیلی ذکر ہے۔

سورۃ المومنون آیت ۴۶، سورۃ الشعراء میں آیات ۱۱ تا ۶۶

سورۃ النمل آیت ۱۲، سورۃ القصص۔ آیات ۳ تا ۴

سورۃ العنکبوت۔ آیت ۳۹، سورۃ المومن آیات ۲۴ تا ۳۷

قرآن مجید فرعون کی اُس نیک بیوی کا ذکر بھی کرتا ہے، جو اُس کے بُرے کاموں میں شریک نہ تھی۔ "اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کیلئے ایک مثال فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی کہ اُس نے اللہ کی بارگاہ میں گذارش کی: اے میرے رب! میرے لیے جنت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اُسکے اعمال سے نجات عطا کر اور ظالم لوگوں سے مجھے نجات دے (سورۃ تحریم آیت ۱۱)

فرغانہ۔ تین سو کیلومیٹر لمبی اور ستر کیلومیٹر چوڑی سیر دریا کے وسط میں ایک وادی کا نام ہے۔ خاص طور پر اس علاقے کو فرغانہ کہتے ہیں جو شمال میں سلسلہ ہائے کوہ جتقل، مشرق میں کوہستانِ فرغانہ اور جنوب میں سلسلہ ہائے کوہ الائی سے ملتی ہے۔ دریا کے جنوبی کنارے پر ایک کھلی جگہ کے ذریعے وادیٔ فرغانہ دوسرے علاقوں سے مربوط ہے۔ موجودہ روسی حکومت کے تحت شمال، شمال مشرقی اور جنوبی کوہستان وادیوں کو، وادیٔ فرغانہ میں شامل کر کے ایک ضلع بنا دیا گیا ہے۔ ضلع فرغانہ کا رقبہ ۸۰۰ ۴ مربع میل ہے جس میں اصل وادی کا رقبہ ۲۰۰ ۱ مربع میل ہے۔ چار ہزار مربع میل رقبہ دریا سے سیراب ہوتا ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد ترک کچھ علاقوں میں آباد ہوئے۔ انیسویں صدی عیسوی میں روسی بھی ان علاقوں

Marfat.com

میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔

۱۰۴ ق م اور ۱۰۱ ق م میں چینیوں نے فرغانہ پر حملے کیے۔ چینی تاریخی کتب سے فرغانہ کے قدیم حالات سے پتہ چلتا ہے۔ ایک چینی تانگ مؤرخ کے بیان کے مطابق فرغانہ پر ایک ہی خاندان تیسری سے ساتویں صدی عیسوی تک حکمران رہا۔ ۶۲۰ء سے ۶۲۹ء کے درمیان ترک خاندان فرغانہ پر قابض ہو گیا۔

فرغانہ کے بادشاہوں نے عرب فاتحین کا زبردست مقابلہ کیا۔ مسلمانوں کو اس ملک کو فتح کرنے میں تقریباً ایک سو سال لگ گئے۔ پہلا حملہ قتیبہ بن مسلم کی زیر سرکردگی ۹۴ھ/۷۱۲ء - ۷۱۳ء میں ہوا۔ بعض روایات کے مطابق قتیبہ کے انتقال کے بعد یہ وادی مسلمانوں سے خالی کرالی گئی۔ نصر بن سیار حاکم خراسان نے ۱۲۱ھ/۷۳۹ء میں فرغانہ میں اپنا عامل مقرر کیا۔ اس بار بھی عرب حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ عباسی خلافت میں خلیفہ منصور، خلیفہ مہدی، ہارون الرشید، مامون الرشید کے زمانے میں بھی فرغانہ کے علاقے پر لشکرکشی کی گئی۔ فرغانہ کے پہاڑوں سے سونا، چاندی، پارہ، نفت (پٹرولیم) فیروزہ، تانبا، سیسہ اور نوشادر حاصل کیے جاتے رہے ہیں۔

فرغانہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں ترکوں کے ہاتھ فتح ہوا۔ مختلف ادوار میں فرغانہ پر مختلف خاندانوں کے بادشاہ حکومت کرتے رہے۔

چینیوں کی بھی اس علاقہ پر ایک طویل عرصہ تک حکومت رہی۔ آج کل اس علاقہ پر روسی حکومت قائم ہے۔

فرغانی

فرغانی :- دیکھئے احمد کثیر فرغانی۔

فرغانی

فرغانی دسویں صدی عیسوی کے دو مؤرخوں ابو محمد عبداللہ بن احمد بن جعفر (۲۸۲ھ/۸۹۵ء - ۸۹۶ء تا ۳۶۲ھ/ ۹۷۲ء - ۹۷۳ء) اور اس کے بیٹے ابو منصور احمد بن عبداللہ (۳۲۷ھ/ ۹۳۹ء تا ۳۹۸ھ/ ۱۰۰۷ء) کے نام۔

عبداللہ کے جد اعلیٰ عراق سے فرغانہ آنے پر المعتصم کے عہد میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عبداللہ فرغانی، شہرۂ آفاق مؤرخ اسلام امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کا شاگرد تھا اور اس نے استاد کی تصانیف کی روایت و اشاعت کی۔ اس نے طبری کی تاریخ کا ایک تتمہ لکھا۔ بعد میں وہ مصر چلا گیا وہاں اس کے ایک بیٹا ہوا۔ اس نے بھی طبری کی تاریخ پر ایک تتمہ "مزید صِلَۃ الصِّلَۃ" کے نام سے لکھا۔

فرقان

فرقان۔ بمعنی دلیل، برہان۔ حق اور باطل میں امتیاز کرنے والی چیز۔ اس لیے قرآن مجید کو "الفرقان" کہا گیا ہے کہ وہ حق و باطل میں واضح فرق بتاتا ہے۔ (س۔ بقرہ۔ آیت ۱۸۵)

قرآن مجید کی پچیسویں سورۃ کا نام بھی الفرقان ہے۔

سورۃ انفعال کی آیت ۴۱ میں "یوم الفرقان" جنگ بدر کے فیصلہ کن دن کو کہا گیا ہے۔ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ قرآن کو اس معنی میں بھی فرقان کہا گیا ہے کہ یہ متفرق حصوں میں نازل ہوا ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۵۳ میں حضرت موسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ "فرقان" ایسے دین کے علم اور فہم کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ مفسرین نے اسے تورات کی ایک صفت بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الانبیاء کی آیت ۴۸ میں بھی فرقان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہاں بھی تورات کی صفات میں سے یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ

[illegible]

فرقان، [illegible]

[illegible]

فرقہ بندی۔ [illegible] ہے [illegible]

[illegible]

قرآن مجید کا ارشاد ہے: [illegible] نے اپنے کلام میں بھی اختلاف کی مذمت کرتا ہے [illegible] اور فرقہ بندی تک پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ: [illegible] کو کہتا ہے، یعنی اتحاد کی تعلیم دی گئی ہے۔

قرآن مجید اس اختلاف رائے کا مخالف نہیں جو [illegible] میں متحد رہ کر محض احکام و قوانین کی تعبیر میں عالمانہ تحقیق کی بنا پر [illegible] اختلاف ذہنی نشو و نما کی ترقی اور زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس قسم کے اختلاف کی کئی مثالیں نبی کریمؐ کے زمانے میں بھی آچکی ہیں۔ آپ نے اس قسم کے اختلاف رائے کو پسند فرمایا [illegible] اختلاف اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ امت میں غور و فکر، تحقیق اور فہم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ایسی صورت میں جو اختلاف رائے سامنے آتا ہے، وہ خدا اور رسول کی اطاعت [illegible] قرآن و حدیث پر اتفاق رائے کرتے ہوئے دو عالموں یا مجتہدوں کے درمیان ہوتا ہے جو دونوں اپنی [illegible] نہیں بناتے اور نہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والے پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہیں، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل کے ذریعے کسی مسئلہ پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور دونوں میں سے کسی بھی رائے کو اپنایا جا سکتا ہے۔

حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی مسئلہ پر [illegible] اختلاف صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی ہوا اور بعض مسائل پر مشورہ کے دوران صحابہ کرامؓ نے نبی کریمؐ کی رائے سے بھی اختلاف کیا ہے۔ صحابہ کرام کے درمیان قرآن مجید کی آیات کی تفسیر میں بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے کسی اختلاف کی وجہ سے کسی صحابی نے امت سے ہٹ کر اپنا کوئی الگ گروہ یا فرقہ نہیں بنایا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے آگاہ تھے کہ دین میں تفرقہ بندی کرنے والے ظالم ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول کریمؐ نے بھی اتحاد و اتفاق کا حکم دیا ہے اور اختلاف و تفرقہ سے منع فرمایا ہے بایں ہمہ امت میں جو اختلاف اور بہت سے فرقے پائے جاتے ہیں ان سے کافی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اختلافات کو اصولی طور پر [illegible] جائے اور اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے دوسروں سے نفرت نہ کی جائے۔

فرقہ بندی کے سلسلہ میں دو انتہا پسند مسلک پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسلک یہ ہے کہ احقاق حق کے لیے تحقیق کی خاطر [illegible] اختلاف [illegible] ہونا چاہیے اور دین میں کسی قسم کی مصلحت اور مفاہمت اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ مصلحت کو مقدم رکھا جائے اور کسی بھی مسئلہ پر اختلاف نہ کیا جائے۔ یہ دونوں [illegible] افراط و تفریط پر قائم ہیں۔

درحقیقت تعبیر میں اختلاف ایک فطری امر ہے [illegible] یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اختلاف کی بنیاد [illegible] رفع ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اختلاف نفاق، اغراض اور تعصب پر مبنی ہو تو [illegible]

[illegible] اس طرح ہے کہ عہد صحابہؓ میں جو اختلافات [illegible]

[illegible]

Marfat.com

[illegible] کے بعد صحابہ کرامؓ میں اختلافات ہوئے ان کا ذکر شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں کیا ہے۔

۱۔ حضور نبی کریمؐ کے مرض الموت میں قلم دوات طلب کرنے کا واقعہ۔

۲۔ جیش اسامہؓ کی روانگی کا مسئلہ۔

۳۔ حضور نبی کریمؐ کی وفات: کہ کیا آپ وفات پا سکتے ہیں یا نہیں؟

۴۔ آپ کو دفن کہاں کیا جائے۔

۵۔ خلافت کی منتقلی کا مسئلہ۔

۶۔ باغ فدک کا معاملہ۔

۷۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ۔

۸۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنا۔

۹۔ تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں شوریٰ کا اختلاف۔

۱۰۔ حضرت علیؓ کے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سے اختلافات

چونکہ یہ تمام اختلافات ایک نئی صورت حال میں صحیح تعبیر کی تلاش میں اصولی نوعیت کے تھے۔ اور ان کی بنیاد حق اور اخلاص پر تھی۔ اس لیے ان اختلافات کی وجہ سے مستقل فرقے نہیں بنے۔

بعض حضرات نبی کریمؐ کی اس حدیث کو فرقہ بندی کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں: نبی کریمؐ نے فرمایا، میری اُمت بنی اسرائیل کی طرح فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (کتاب الفتن ابن ماجہ)

یہ حدیث ہر لحاظ سے واجب الاحترام ہے، لیکن اس کی تعبیر کرتے وقت فرقوں کی کثرت کو ناگزیر بنانا زیادتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ نے بنی اسرائیل کی مثال بیان فرما کر مسلمانوں کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی حدود کو پھلانگ کر آپس میں تفرقوں کی صورت نہ پیدا کر لینا، کیونکہ تفریق کی وجہ سے بنی اسرائیل تباہ ہو گئے۔ اس حدیث مبارکہ میں فرقوں کے لیے ترغیب نہیں دی گئی اور نہ ہی فرقوں کے لیے اس حدیث سے جواز نکلتا ہے بلکہ وَلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۱۰۳) کی روشنی میں فرقے بنانے کے خطرناک انجام سے بنی اسرائیل کی تمثیل کے ذریعے متنبہ کیا ہے۔

اختلاف ایک فطری امر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے طبائع اور اذہان میں ایک دوسرے سے فرق رکھا ہے مسلمانوں میں سیاسی اور عقائد کے معاملات پر اختلافات ہوئے ہیں، لیکن ہر اختلاف سے فرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ دیانت دارانہ اختلاف رائے تو نبی کریمؐ کی حدیث اختلافُ اُمتی رحمۃٌ کی رو سے باعث رحمت بن سکتا ہے اس لیے کہ اختلاف رائے کے ذریعے مختلف احکامات کی تعبیر کے لیے اجتہاد کے دروازے کھلتے ہیں اور دین کے حقائق واضح و روشن ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اختلاف رائے نہ ہونے سے اُمت میں جامدیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں اختلاف اکثر سیاسی مسائل ہی پر ہوا۔ مسلمانوں کے دینی اختلافات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اصولی اختلافات: اسلام کے سیاسی نظام یعنی امامت و خلافت کے مسئلہ پر اختلاف جس سے دو گروہ سامنے آئے۔ اہل سنت اور شیعہ۔

۲۔ ہنگامی نوعیت کے اختلافات: عقائد کے مسئلہ پر چند متشدد نقطہ نگاہ رکھنے والے مسالک جو اب موجود نہیں ہیں۔ مثلاً، جبریہ، قدریہ، معتزلہ وغیرہ۔

۳۔ فقہی اختلافات: فروعی مسائل پر فقہی مسالک۔ مثلاً اہل سنت میں آئمہ اربعہ کے فقہا سے اور چند دوسرے مذاہب جن کا اب وجود نہیں رہا شیعہ مذہب کے ذیلی فرقے۔

۴۔ سیاسی اور قبائلی اختلافات۔

جو اصحاب نبی کریمؐ کی مذکورہ حدیث سے مسلمانوں میں ۷۳ فرقوں کے جواز کی صورت نکالتے ہیں جب وہ فرقوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں، تو فرقوں کی تعداد ۷۳ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اختلاف رائے میں شدت کی وجہ سے اب تک سینکڑوں فرقے بنے اور مٹ بھی گئے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے صرف شیعہ مسلک کے ۷۳ سے زائد فرقوں کا اپنی کتاب "تحفہ اثنائے عشریہ" میں ذکر کیا ہے۔

ابتدا میں فرقوں کی تعداد کم تھی۔ پھر بعد کے ادوار میں کثرت کا تاثر پیدا ہو گیا، چنانچہ معمولی اختلافات کی بنا پر ذیلی مسالک کو مستقل فرقوں کا نام دے دیا گیا۔

الاشعری نے (م ۳۲۴ھ/۹۳۶ء) اپنی کتاب مقالات الاسلامیین" میں ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے، جو وجہ اختلاف تھے۔ ان میں مسئلہ امامت کا ذکر سب سے پہلے ہے اس مسئلہ کی حیثیت بنیادی ہے۔ کیونکہ طرز حکومت کے معاملہ میں اب تک وہی دو نقطہ نظر کارفرما ہیں۔ ایک موقف شخصی موروثی طرز حکومت یعنی شیعوں کا امامت سے متعلق نظریہ، دوسرا موقف شورائی نظام یعنی خلافت۔ یہاں تک کہ مسئلہ امامت پر نزاع تمام اختلافی معاملات میں نظر آتا ہے۔ شہادت عثمانؓ جنگ جمل اور جنگ صفین اور بعد کے معاملات میں اصولی وجہ نزاع امامت تھی جو مختلف احوال مقامات اور اشخاص سے متعلق ہو کر نئی نئی ذیلی شاخوں میں پھیلتی چلی گئی۔

مقالات اسلامیین میں مذکور فرقوں کا اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اصولی فرقے تھوڑے سے ہیں۔ لیکن ذیلی نقطۂ نظر کی وجہ سے فرقوں کی کثرت معلوم ہوتی ہے اصولی فرقوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نظر نہیں آتی۔

۱۔ اہل سنت (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی۔ اصحاب الحدیث و اہل حدیث) وغیرہ۔

۲۔ شیعہ۔ (علویہ، زیدیہ، امامیہ، اسماعیلیہ وغیرہ)

۳۔ خوارج۔ (ریاضیہ، اباضیہ، ازرقیہ وغیرہ)

۴۔ مرجئیہ۔ (راجیہ، شاکیہ، تارکیہ وغیرہ)

۵۔ معتزلہ۔

اہل سنت کے عروج کے بعد مرجئیہ اور معتزلہ آہستہ آہستہ اصولی فرقوں میں مدغم ہو گئے۔ ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بن محمد البغدادی (م ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء) نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں اہل سنت کے علاوہ ۷۲ فرقوں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ شیعوں خوارج اور قدریہ کے بیس بیس، مرجئیہ کے دس، نجاریہ اور کرامیہ کا ایک ایک فرقہ ہے۔ عبدالقاہر البغدادی فرقوں کی مزید تقسیم اس طرح کرتا ہے۔

۱۔ فرق الاہواء الضالۃ، خواہشات نفسانی پر قائم گمراہ فرقے۔

۲۔ الفرقۃ الناجیۃ

شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں بیان کیا ہے کہ اصل فرقے تو چار ہیں اور باقی ان میں سے نکلے ہیں اور ان فرقوں کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

۱۔ قدریہ، ۲۔ صفاتیہ، ۳۔ خوارج، ۴۔ شیعہ۔

بہرحال اُمت مسلمہ کے ان فرقوں میں بڑے فرقے صرف دو ہیں سُنّی اور شیعہ یہ افکار و عقائد میں ایک دوسرے کے نسبتاً قریب ہیں۔

نبی کریمؐ کی مذکورہ حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ۷۳ فرقوں میں ایک فرقہ ناجیہ، ہوگا اور باقی ۷۲ فرقے جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرامؓ کے سوال کرنے پر نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا ناجی فرقہ وہ ہوگا، جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقہ پر چلے گا۔ مسلمانوں میں موجود

Marfat.com

ہر فرقہ خود کو "ناجی" فرقہ کہلواتا ہے۔

اہلِ سنت یعنی سنیوں میں دین کے فروعی مسائل کے نقطۂ نگاہ سے چار مشہور مسلک ہیں، جو اپنے اپنے آئمہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کو اصطلاحاً مذاہب کہتے ہیں۔

۱۔ حنفی۔ جو امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے پیروکار ہیں۔ امام ابوحنیفہ عراق کے دارالحکومت کوفہ میں ۸۰ھ/۷۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے نبی کریمؐ کے چند صحابہ کرامؓ کو پایا ہے۔ وہ فقہ میں "امام اعظم" تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان کے دو شاگرد امام ابویوسف اور امام محمد "مصنف فقہ" کے طور مانے جاتے ہیں۔ حنفی ترکی، وسطی ایشیا اور شمالی ہند کے علاقے (پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ) میں پائے جاتے ہیں۔

۲۔ شافعی۔ جو امام محمد بن ادریس الشافعی کے پیروکار ہیں۔ امام شافعی فلسطین کے علاقہ عسقلان میں ۱۵۰ھ/۷۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ شافعی مصر اور جنوبی ہند کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

۳۔ مالکی۔ امام مالکؒ بن انس کے پیروکار ہیں۔ امام مالک مدینہ میں ۹۵ھ/۷۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی امام ابوحنیفہ سے بھی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور وہ اپنے وقت کے نامور عالم تھے۔ مالکی مراکش اور افریقہ کے ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

۴۔ حنبلی۔ جو امام ابوعبداللہ احمدؒ بن محمد بن حنبل کے پیروکار ہیں۔ امام حنبل بغداد میں ۱۶۴ھ/۷۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ حنبلی مشرقی عرب اور افریقہ کے بعض ممالک میں پائے جاتے ہیں۔

"وہابی" نام سے معروف مسلک کے پیروکار بھی حنبلی مسلک سے ہی نکلے ہیں جو بعض مسائل میں محمد بن عبدالوہابؒ کی تقلید کرتے ہیں۔

ان چار اہلِ سنت کے مسالک میں سے کئی اور فرقے بھی بنے ہیں۔ اکثر علماء اُمت مسلمہ کی فرقوں کی تقسیم کو مانتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اسلام میں ۱۵۰ فرقوں کو بیان کرتے ہیں۔ "غیاث اللغات" میں اسلام کے ۷۳ فرقوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک ناجیہ فرقہ اہلِ سنت کا ہے باقی چھ گروہوں میں تقسیم ہیں۔

(۱) رافضیہ (۲) خارجیہ (۳) جبریہ (۴) قدریہ (۵) جہمیہ (۶) مرجیہ

پھر ان میں سے ہر ایک کے بارہ بارہ گروہ ہیں۔

رافضیہ فرقے حسب ذیل ہیں (۱) علویہ۔ جو حضرت علیؓ کو نبی کہتے ہیں (۲) ابدیہ۔ حضرت علیؓ کو شریکِ نبوت سمجھتے ہیں۔ (۳) شیعہ۔ جو کہتے ہیں کہ جو شخص حضرت علی کو تمام صحابہ سے افضل نہ سمجھے وہ کافر ہے۔ (۴) اسحاقیہ کہتے ہیں کہ نبوت ختم نہیں ہوئی (۵) زیدیہ کہتے ہیں کہ نماز کی امامت میں سوائے اولادِ علیؓ کے اور کوئی شخص نہیں چاہیئے۔ (۶) عباسیہ۔ جو عباس بن عبدالمطلب کے سوا اور کسی کو امام نہیں سمجھتے۔ (۷) امامیہ جو زمین کو امام غیب سے خالی نہیں جانتے اور نماز صرف بنی ہاشم کے پیچھے ہی پڑھتے ہیں (۸) ناوسیہ۔ جو کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسرے پر فاضل جانے وہ کافر ہے۔ (۹) متناسخیہ کہتے ہیں کہ جب جان قالب سے نکل جاتی ہے تو جائز ہے کہ دوسرے قالب میں چلی جائے۔ (۱۰) لاعنیہ جو حضرت طلحہؓ، زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ پر لعنت کرتے ہیں۔ (۱۱) راجعیہ۔ جو کہتے ہیں کہ علیؓ پھر دنیا میں آئیں گے۔ (۱۲) مرتضیہ۔ جو کہتے ہیں کہ مسلمان بادشاہ کے ساتھ جنگ کرنا جائز ہے۔

خارجیہ فرقے حسب ذیل ہیں:- (۱) ازرقیہ۔ جو کہتے ہیں کہ خواب میں کوئی شخص نیکی نہیں دیکھتا کیونکہ وحی منقطع ہو گئی ہے۔ (۲) ریاضیہ۔ جو کہتے ہیں کہ ایمان قولِ صالح، عمل صالح، نیت اور سنت ہے۔ (۳) ثعلبیہ کہتے [illegible] خدا [illegible] ہے (۷) [illegible] کہتے ہیں کہ کفار کے مقابلے [illegible] زیادہ [illegible] کے بدن پاک نہیں ہوتا۔ (۸) کنزیہ کہتے [illegible] کہتے ہیں کہ شر تقدیر الٰہی سے نہیں ہے [illegible] ایمان کسب بندہ سے ہے اور قرآن مخلوق ہے [illegible] نفع نہیں پہنچتا اور معراج بیت المقدس کے آگے ثابت نہیں [illegible] و میزان کچھ نہیں ہے۔ اور فرشتے مومنین سے افضل ہیں [illegible] حق نہ ہوگا۔ اور کرامت اولیاء کوئی چیز نہیں [illegible] اور مقتول اپنی موت سے نہیں مرتا [illegible] کچھ نہیں ہیں۔ (۹) میمونیہ کہتے ہیں کہ ایمان بالغیب [illegible] کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا خلقت پر کوئی حکم نہیں [illegible] کہتے ہیں کہ پہلے لوگوں کے احوال ہمارے لیے حجت نہیں ہیں [illegible] انکار کرنا [illegible] (۱۲) خفیہ کہتے ہیں کہ جنت کو اعمال کی جزا [illegible]

جبریہ فرقے حسب ذیل ہیں:- (۱) مضطریہ کہتے ہیں کہ خیر و شر خدا کی طرف سے ہے اور بندہ کا اس میں اختیار نہیں ہے۔ (۲) افعالیہ کہتے ہیں کہ بندہ فعل تو کرتا ہے مگر اسے قدرت و اختیار نہیں ہے۔ (۳) معیہ کہتے ہیں کہ [illegible] قدرت ہے لیکن وہ طاقت اور قدرت خدا سے [illegible] (۴) [illegible] کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد اور کوئی چیز فرض نہیں ہے۔ (۵) بخیلیہ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنا حصہ کما [illegible] کسی کو کچھ دینا [illegible] نہیں ہے (۶) متمنیہ کہتے ہیں کہ خیر وہ خیر ہے جس سے دل تسلی پائے (۷) کسانیہ کہتے ہیں کہ ثواب و عقاب کسی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ (۸) حبیبیہ کہتے ہیں کہ دوست اپنے دوست کو ہرگز عذاب نہیں کرتا۔ (۹) خوفیہ کہتے ہیں کہ دوست [illegible] ہرگز نہیں ڈراتا (۱۰) فکریہ کہتے ہیں کہ معرفت حق میں فکر کرنا عبادت سے بہتر ہے (۱۱) حسبیہ کہتے ہیں کہ عالم میں قسمت نہیں ہے (۱۲) حجتیہ کہتے ہیں کہ جب کام خدا کی تقدیر سے ہوتے ہیں تو بندے پر کوئی حجت نہیں ہے جس کے سبب وہ گنہگار ہو۔

قدریہ فرقے حسب ذیل ہیں:- (۱) احدیہ کہتے ہیں کہ فرائض کا تو ہمیں اقرار ہے مگر سنت سے انکار ہے (۲) ثنویہ کہتے ہیں کہ نیکی یزدان سے ہے اور بدی اہرمن سے۔ (۳) کیسانیہ کہتے ہیں کہ ہمارے افعال مخلوق ہیں [illegible] (۴) شیطانیہ کہتے ہیں کہ شیطان کا وجود نہیں ہے۔ (۵) شریکیہ کہتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ (۶) وہمیہ کہتے ہیں کہ ہمارے افعال کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا (۷) رویدیہ کہتے ہیں کہ امام کے ساتھ [illegible] جائز ہے۔ (۸) [illegible] کہتے ہیں کہ گنہگار کی توبہ قبول نہیں ہوتی (۹) قاسطیہ کہتے ہیں کہ علم، مال، حکمت اور ریاضت کا حاصل کرنا فرض ہے (۱۰) نظامیہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو شے کہنا جائز ہے (۱۱) [illegible] کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ شر مقدر ہے یا نہیں۔

جہمیہ فرقے حسب ذیل ہیں:- (۱) معطلیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق ہیں۔ (۲) متراجعیہ کہتے ہیں کہ علم، قدرت اور مشیت مخلوق [illegible] غیر مخلوق ہے۔ (۳) متراقبیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکان میں ہے۔ (۴) واردیہ کہتے ہیں جو دوزخ میں جائے گا وہ پھر وہاں سے باہر نہیں آئے گا [illegible] (۵) حرقیہ کہتے ہیں کہ اہلِ دوزخ [illegible] (۶) مخلوقیہ کہتے ہیں کہ قرآن [illegible]

Marfat.com

... رسول ... ایک عاقل و حکیم شخص تھے رسول نہیں تھے۔ (۸) فانیہ کہتے ہیں کہ جنت و دوزخ قیامت کے بعد فنا ہو جائیں گے۔ (۹) زنادقیہ کہتے ہیں کہ معراج روح کی تھی جو آنحضرت کا بدن سے ... اور حق تعالیٰ کو دنیا میں دیکھ سکتے ہیں اور عالم قدیم ہے اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ (۱۰) لفظیہ کہتے ہیں کہ قرآن قاری کی کلام ہے نہ کلام الٰہی۔ (۱۱) قبریہ عذاب قبر کے منکر ہیں۔ (۱۲) واقفیہ کہتے ہیں کہ قرآن قاری کے مخلوق ہونے کے بارے میں ہمیں توقف ہے۔

مرجیہ فرقے حسب ذیل ہیں: (۱) تارکیہ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد اور کوئی چیز فرض نہیں ہے۔ (۲) شائیہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جو چاہے کرے اس پر کوئی عذاب نہیں ہے ——— (۳) راجیہ کہتے ہیں کہ بندہ طاعت سے مقبول اور معصیت سے عاصی نہیں ہوتا۔ (۴) شاکیہ اپنے ایمان میں شک رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح ایمان ہے (۵) بہمیہ کہتے ہیں کہ ایمان علم ہے۔ جو شخص جمیع اوامر و نواہی کو نہیں جانتا پس وہ کافر ہے۔ (۶) عملیہ کہتے ہیں کہ ایمان عمل ہے۔ (۷) منقوصیہ کہتے ہیں کہ ایمان کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ۔ (۸) مستثنیہ کہتے کہ ہم انشاء اللہ تعالیٰ مومن ہیں۔ (۹) اشریہ کہتے ہیں کہ قیاس باطل ہے اور صلاحیت دلیل نہیں رکھتا۔ (۱۰) بدعیہ کہتے ہیں کہ امیر کی اطاعت واجب ہے اگرچہ وہ معصیت کا حکم ہی کرے۔ (۱۱) مشبہیہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آدمی کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ (۱۲) حشویہ کہتے ہیں کہ واجب، سنت اور مستحب سب ایک ہیں۔

فرمان - فارسی لفظ ہے۔ بادشاہوں کے احکام کے معنی میں مستعمل ہے ایسے شاہی احکام جن کی رُو سے کسی کو عطیہ، انعام یا جاگیر عطا کی جاتی ہے۔ کسی عہدے پر تقرری کی جاتی ہے۔ دورِ قدیم میں کسی اجنبی کو ملک میں سفر کے لیے اجازت بھی فرمانِ شاہی کے ذریعے ہی دی جاتی تھی یعنی سربراہ حکومت کی طرف سے ضابطے کے تحت جاری شدہ ہر قسم کے احکام کو فرمان کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کا ہند کے علاقہ پر قبضہ کرنے اور حکومت قائم کرنے کی ابتدا بھی ایک فرمان کے ذریعے ہوئی تھی جو شاہجہان نے انگریزوں کو ہند میں تجارت کرنے کی اجازت کے لیے دیا تھا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں نے سازشوں کا ایسا جال پھیلایا کہ وہ پورے ہند پر قابض ہو گئے بعد میں شاہ عالم ثانی مغل شہنشاہ نے انگریز جنرل کلائیو کو ایک فرمان کے ذریعے کافی اختیارات دے دیے

عربی میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے توقیع کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن مسلم ممالک میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے جدید عربی لغات میں فرمان کا لفظ بھی مل جاتا ہے جس کی جمع فرامین ہے۔

مغل بادشاہوں کے فرامین کے مجموعے ملتے ہیں جس میں ایک کا عکس دیا جا رہا ہے۔

فرنگی محل، علماء :- فرنگی محل لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ اس علاقہ کی زرخیز مٹی سے جو علماء پیدا ہوئے وہ فرنگی محل علماء کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس علاقہ میں ایک فرانسیسی تاجر مقیم تھا جس کی وجہ سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلانے لگا۔ اس محلہ میں ملا قطب الدین انصاری نام کے ایک عالم رہتے تھے۔ جن کا بعض امور پر عثمانی خاندان سے جھگڑا تھا۔ عثمانیوں نے ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء کی ایک رات انھیں قتل کر دیا۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے تھے جو علمی مقام میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ ملا قطب الدین کے بیٹوں میں سب سے برگزیدہ ملا نظام الدین تھے۔ جن کے نام پر درس نظامیہ مشہور ہے آپ کی تصانیف میں حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمت، مسلم الثبوت، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ شرح عقائد دوانی بہت مشہور ہیں۔

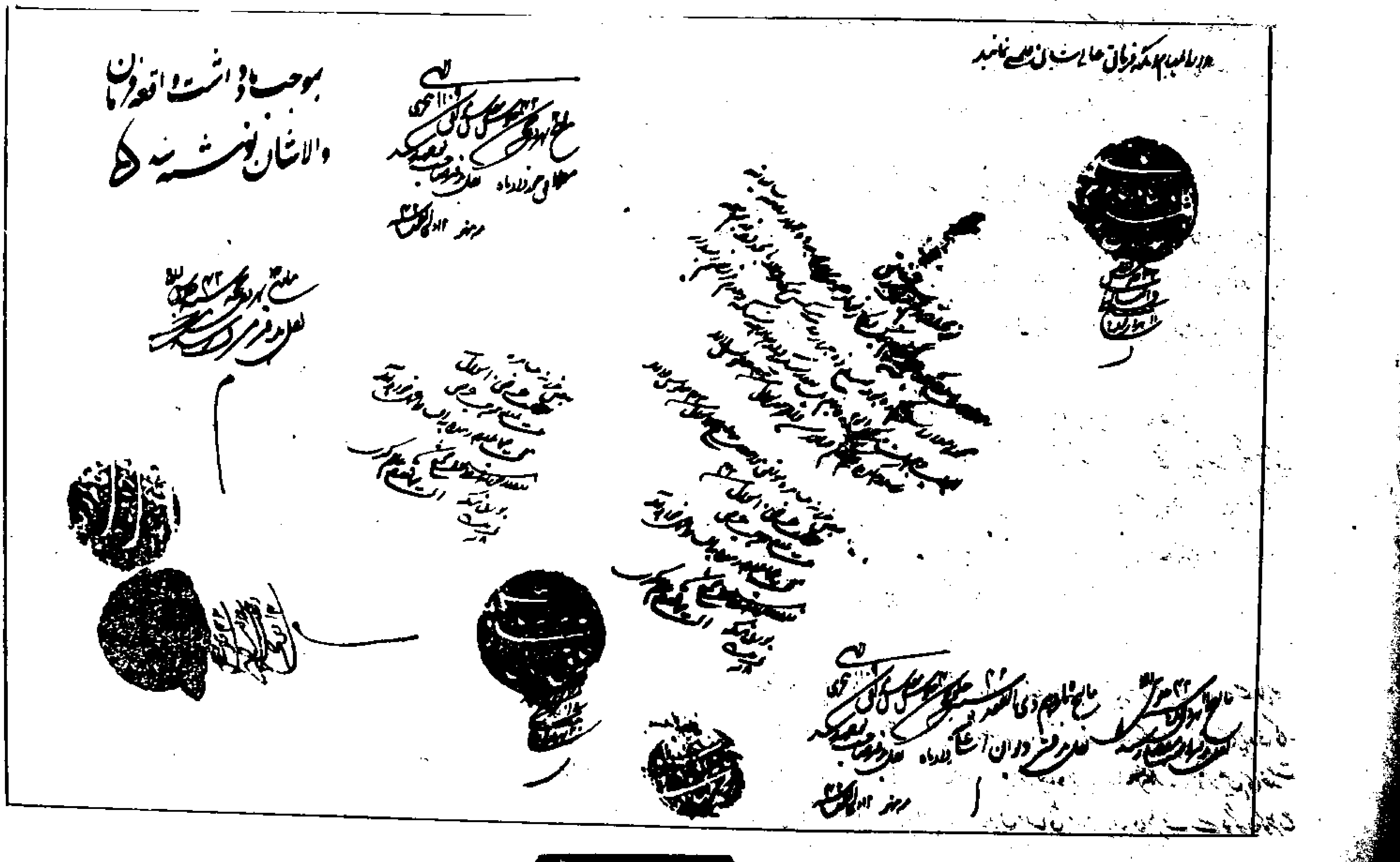

Marfat.com

آپ نے اپنے مرشد شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ملفوظات بھی مرتب کئے ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۷۴۸ء میں ہوا۔

درسِ نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت مولوی عبدالعلی لکھنوی بحرالعلوم نے پائی۔ بحرالعلوم کا خطاب انہیں کرناٹک کے رئیس نواب محمد علی خاں نے دیا تھا۔ آپ کی وفات ۱۲ رجب ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں مدراس میں ہوئی۔ آپ کی تصانیف میں ارکانِ اربعہ در اصولِ فقہ، شرح مثنوی روم، شرح فقہ اکبر اور رسالہ توحید شامل ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی نے انہیں ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ کے پائے کا عالم کہا ہے۔ مولوی عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے چلے گئے تھے لیکن اُن کے بعد ان کے بیٹے مولوی عبدالرب نے لکھنؤ میں اُن کی مسندِ علم کو رونق افروز کیا۔ اس خاندان میں اولاد در اولاد علماء پیدا ہوتے گئے جو اپنے اپنے زمانے میں علم کی انتہائی بلندیوں تک پہنچے یہ پورا خاندان علمائے فرنگی محل کے نام سے ہند کی تاریخ میں مشہور ہوا۔ اسی خاندان کے ایک اور عالم مولوی عبدالحیٔ لکھنوی نے بھی کافی شہرت پائی ان کی ولادت ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ آپ کو صاحب کثیر الدرس اور کثیر التصانیف کہا جاتا ہے۔ آپ کی فقہ کے علوم پر گہری نظر تھی۔ صاحب "تذکرہ علمائے ہند" نے آپ کی بلند پایہ ۴۳ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحیٔ کا انتقال ۱۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء کو ہوا۔

علمائے فرنگی محل کے تفصیل احوال کے بیان کے لئے مولوی محمد عنایت اللہ نے "تذکرہ علمائے فرنگی محل" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ مولوی رحمان علی نے اپنی کتاب "تذکرہ علمائے ہند" میں فرنگی محل کے اہم علماء کے تفصیلی احوال بیان کئے ہیں۔

اسی طرح آثار الاول من علمائے فرنگی محل اور احوال علمائے فرنگی محل بھی ان علماء کے تذکرہ میں مستقل کتابیں ہیں۔ نزہۃ الخواطر اور حدیقۃ المرام میں علمائے فرنگی محل کا ذکر ہے۔

فرو بمعنی پوستین یعنی پوستین کا بنا ہوا یا پوستین سے آراستہ پیراستہ لباس۔ اگرچہ فروہ سے اونٹ کے بالوں والے جبہ یا چادر کا مفہوم نکلتا ہے، لیکن قدیم شاعری میں اس اصطلاح سے بھیڑوں کی پشم دار کھالیں مراد لی جاتی تھی۔ ان کھالوں کی اون سے قالین بنائے جاتے ہیں اور مسندوں کے ڈھانکنے اور سردی سے بچاؤ کا کام لیا جاتا ہے۔

قیمتی پوستینوں کے پہننے کا رواج اہلِ عرب میں اُس وقت رائج ہوا جب وہ تہذیب و تمدن کے قدرے اونچے مدارج پر پہنچ گئے تھے۔ اس زمانے میں بعض افراد کو فرا یعنی سمور پوش کہا جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول کریمؐ کے ہمراہ سفرِ ہجرت میں جو پوستین پہنی ہوئی تھی اسے انھوں نے غار میں قیام کے وقت رسولِ کریمؐ کی استراحت کے لیے بچھایا تھا۔ (البخاری)

پوستین کے بنانے کے لیے کھالوں کی تجارت کے لیے خاص قوانین و ضوابط کی ضرورت تو نہ تھی البتہ فقہی نکتہ نظر سے کھال سے بنی ہوئی پوستین پہن کر ادائے نماز کے جواز یا عدم جواز کا سوال پیدا ہوسکتا تھا۔ اہلِ سنت اور شیعہ مذاہب میں ممنوع حیوانوں کی کھالوں سے بنی ہوئی پوستین پہننے میں کوئی قباحت نہیں لیکن انھیں پہن کر نماز نہیں ہوسکتی۔

فروغ الدین۔ پیدائش (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء)

محمد مہدی بن محمد باغر اصفہانی۔ ایرانی شاعر، تبریز میں پیدا ہوا۔ تہران میں حکومت کے دفاتر میں ملازمت کی۔ کئی بلند مرتبہ لوگوں کے ہاں بھی ملازمت کی جن میں شہزاد

عباس مرزا اور شجاع [illegible] نسبت سے فروغ فرنگی کے نام سے [illegible] اس کی عربی اور فارسی نظموں کا [illegible] اور فردوستان، شامل ہیں۔ [illegible] اور رائج الوقت سکوں کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں۔

فرہاد پاشا۔ سلطنتِ عثمانیہ کا صدرِ اعظم۔

سلطان سلیمان قانونی (۹۷۴ھ/۱۵۶۶ء) کے اواخر عہد میں وہ سلطانی شاہی سواروں کا افسرِ اعلیٰ اور چری فوج کا سپہ سالار بھی ہو گیا تھا۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں اسے روم ایلی کا بیگلر بیگی بنایا گیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد وزارت کے منصب پر فائز ہوا۔ ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء میں ایران کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والی افواج کا سپہ سالارِ اعظم بھی رہا۔

ذی قعدہ ۹۹۳ھ/اکتوبر ۱۵۸۵ء میں عثمان پاشا کی وفات کے بعد فرہاد پاشا کو دوبارہ سردار مقرر کر دیا گیا۔ اور ۹۹۸ھ/۱۵۹۱ء تک اسی عہدے پر فائز رہا۔ اس نے ترکی محاذ پر اہم فوجی خدمات انجام دیں۔ ۹۹۶ھ/۱۵۸۸ء میں کئی علاقوں کو فتح کیا۔ شوال ۹۹۹ھ/اگست ۱۵۹۱ء میں فرہاد پاشا صدرِ اعظم مقرر ہوا لیکن فوج میں بغاوت کی وجہ سے جمادی الآخر ۱۰۰۰ھ/مارچ اپریل ۱۵۹۲ء میں اس عہدے سے معزول ہوا۔ سلطنت عثمانیہ اور آسٹریا میں جنگ کے آغاز کے وقت ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں جب صدرِ اعظم قوجہ سنان پاشا ہنگری کے محاذ پر گیا، تو اس کی عدم موجودگی میں فرہاد پاشا استنبول میں اس کے قائم مقامی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں سلطان محمد ثالث کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد فرہاد پاشا کو دوبارہ صدرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد اپنے حریف قوجہ سنان پاشا کی سازش سے شوال ۱۰۰۳ھ/جولائی ۱۵۹۵ء میں اسے عہدہ سے الگ کر دیا گیا اور بعد میں صفر ۱۰۰۴ھ/اکتوبر ۱۵۹۵ء میں سلطان کے حکم سے اُسے سزائے موت دی گئی۔

فریدالدّین اودھی۔ عالم کبیر فریدالدین اودھی [illegible] اعتبار سے شافعی المسلک تھے۔ برصغیر ہند کے بلند پایہ علماء میں سے تھے۔ اپنے [illegible] علوم عربیہ، تفسیر نحو اور لغت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ علاقہ اودھ میں منصب شیخ الاسلام پر فائز رہے۔ شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اور شیخ علاؤ الدین نیلی جیسے علماء ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

فریدالدّین دولت آبادی۔ (وفات ۲۹ محرم ۷۳۸ھ)

شیخ فریدالدین دولت آبادی عالم و فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ کبار مشائخ چشتیہ میں سے گردانے جاتے ہیں۔ تصوف و طریقت میں شیخ برہان الدین محمد ہانسوی کے شاگرد تھے۔ طویل عرصہ ان کے ساتھ رہے اور تصوف میں درجہ کمال تک پہنچے۔ اپنے استاذ اور شیخ کی وفات سے تیرہ دن قبل ۲۹ محرم ۷۳۸ھ کو انتقال ہوا۔

فریدالدّین سیّد۔ ایک عالم باعمل۔ آپ کے والد پیر سید معز الدین مشہد سے لاہور منتقل ہوئے تھے۔ آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ کے [illegible] نے پوری کی۔ چونکہ آپ کی والدہ کا انتقال پیدائش سے تھوڑا عرصہ بعد ہو گیا تھا۔ لاہور میں ہی خدمت دین کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ان دنوں عیسائی مشنریوں کی طرف سے لوگوں کو طرح

Marfat.com

طرح کے لالچ دیتے جارہے تھے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائی ہو جائیں۔ اس موقع پر حضرت پیر سید فرید الدین کی ذات پاک نے مسلمانوں کی آبرو رکھ لی۔ آپ نے عیسائی مشنری کو پیغام بھیجا کہ وہ اتوار کے روز آپ کے ساتھ برسرِعام مناظرہ کر لیں اگر انہوں نے اسلام کو جھوٹا ثابت کر دیا تو آپ اپنے مریدین سمیت عیسائیت قبول کر لیں گے بصورت دیگر وہ آئندہ مزنگ میں تبلیغ کی غرض سے تشریف نہیں لائیں گے۔ کہتے ہیں کہ حضرت فرید الدین کی یہ پیش کش عیسائی مشنری نے تسلیم کر لی۔ اتوار کے روز وقت مقررہ پر عوام و خواص کھک منڈی میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مناظرہ نہایت زور و شور سے شروع ہوا اور بالآخر حضرت فرید الدین نے یہ ثابت کر دیا کہ حضور سرورِ کائنات کی بعثت کے بعد کسی دوسرے مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت فرید الدین عالم باعمل تھے۔ آپ کے دل میں مقامی ہندو آبادی کو مشرف بہ اسلام کرنے کی بڑی لگن تھی۔ اس لیے آپ نے ضروری سمجھا کہ یہ مقصد پورا کرنے کے لیے مقامی زبانوں کا سیکھنا ازحد ضروری ہے۔ آپ نے ہندی اور سنسکرت پر ایسا عبور حاصل کیا کہ لوگ آپ کی گفتگو سن کر حیران رہ جاتے تھے۔ تقریر اتنی دلپذیر ہوتی تھی کہ مسلمان اور غیر مسلم یکساں لطف اندوز ہوتے تھے۔

کسی مرشد باصفا کی تلاش کے لیے سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش کے مزار پُرانوار پر چلّہ کھینچا۔ پھر خواجہ اجمیری اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزاروں پر حاضری دی۔ حضرت فرید الدین نے اجمیر اور دہلی کے علاوہ دیگر مقامات کی سیاحت بھی کی اور علماء کی محفلوں میں شریک ہوئے۔ اسی تلاش و جستجو کے زمانے میں آپ کو غیب سے اشارہ ہوا کہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے دربار سے دلی مراد پوری ہوگی۔ لہٰذا دہلی سے سیدھے پاک پتن شریف پہنچے وہاں ایک بزرگ صاحب علم و عمل کو اپنا منتظر پایا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی بے اختیار قدم بوس ہو گئے اور جب پیر و مرشد نے اٹھا کر سینے سے لگایا تو کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ بیعت کے بعد حضرت فرید الدین نے کچھ عرصے کے لیے پاک پتن شریف میں قیام کیا۔ بعد میں مرشد کے حکم پر لاہور کو اپنا مستقر بنایا۔ اس وقت حضرت صاحب کی عمر ۳۰ سال تھی اور پنجاب پر سکھوں کا اقتدار حاصل تھا۔

حضرت فرید الدین شریعت کے بڑے پابند تھے۔ آپ نے مزنگ میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا اور درس و تدریس کے لیے قابل اساتذہ مقرر کیے۔ سکھوں کے دورِ اقتدار کے بعد انگریزوں کی عمل داری شروع ہو گئی۔ اس کڑے زمانے میں بھی آپ نے تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ موقوف نہ ہونے دیا۔ شہر لاہور کے انگریز حاکم نے آپ کی علمیت کا احترام کرتے ہوئے آپ کو قاضی مقرر کرنے کی پیش کش کی۔ آپ کو ملازمت منظور نہیں تھی، لیکن اہل مزنگ کے اصرار پر آپ نے عدالت کی رائے طلبی پر جج کو شریعت کے فیصلے سے آگاہ کرنا منظور کر لیا جس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ آپ کے صادر کردہ فیصلوں کی قدر تمام علماء کرتے تھے۔

حضرت پیر فرید الدین کو تصنیف و تالیف کا شغف بھی تھا۔ کئی یادگار کتابیں آپ کے ورثا کے پاس موجود ہیں، جن میں تشریح غوثیہ اور انتخابات خمسہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے مرتبے کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کی لوح مبارک پر جو قطعہ کندہ ہے وہ آپ ہی کے فکر رسا کا نتیجہ ہے۔ حضرت پیر فرید الدین کا مزار چاہ جنڈی والا مزنگ لاہور میں واقع ہے۔ ہر سال ۷ ربیع الاوّل کو یہاں عرس منعقد ہوتا ہے۔

فریدالدّین، گنج شکر۔ (۵۶۹ھ - ۶۶۴ھ)

برعظیم پاک و ہند کے مشہور بزرگ۔ سلسلہ چشتیہ کے مجدّد

آپ کا اصل نام مسعود، لقب فرید الدین گنج شکر۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام جمال الدین سلیمان تھا جو کھوتوال کے قاضی شعیب کے فرزند تھے۔ آپ کے دادا شعیب چنگیز خان کے حملہ کے دوران کابل سے ہجرت کر کے قصور آئے تھے۔ تذکرہ نگاروں میں آپ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کے متعلق کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

سیر الاولیاء میں ۵۶۹ھ/۱۱۷۳-۱۱۷۴ء بیان کی گئی ہے۔ تاریخ فرشتہ میں ۵۸۴ھ/۱۱۸۸ء درج ہے۔ لقب گنج شکر کے متعلق کئی روایات مشہور ہیں۔ ایک وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ کو شکر بہت پسند تھی۔ دوسری روایت اس طرح ہے کہ چند سوداگر اونٹوں پر شکر لادے لیے جارہے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ اونٹوں پر کیا ہے۔ سوداگروں نے مصلحتاً کہہ دیا کہ نمک ہے۔ آپ نے فرمایا نمک ہی ہوگا۔ سوداگروں کو منزل پہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ بوریوں میں تو نمک ہے۔ الٹے پاؤں واپس آکر حضرت فرید الدین سے معافی مانگی۔ چنانچہ جب واپس جا کر دیکھا تو بوریوں میں شکر تھی۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم جس میں درسی کتب اور حفظ قرآن مجید شامل ہیں، کھتوال ہی میں حاصل کی۔ آپ اٹھارہ سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے ملتان تشریف لائے جو برصغیر پاک و ہند میں علمی اور دینی مرکز تھا مولانا منہاج الدین ترمذی سے فقہ کی کتاب "النافع" پڑھی۔ ملتان میں ہی خواجہ بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

مزید تحصیلِ علم کے لیے قندھار کا سفر کیا۔ وہاں سے بغداد، سیوستان، بدخشان چشت اور بخارا کی سیاحت اختیار کی۔ اسی سفر میں حج کی سعادت حاصل کی۔ انھوں نے کئی مشہور مشائخ وقت سے استفادہ حاصل کیا جن میں شہاب الدین سہروردی، فرید الدین عطار، بہاؤالدین زکریا، شیخ سیف الدین باخرزی اور اوحد الدین کرمانی جیسے اکابر شامل ہیں۔

پانچ سال سے زائد کے اس سفر کے بعد اپنے شیخ اور مرشد کے پاس دہلی حاضر ہوئے اور خرقہ خلافت پا کر دہلی میں دروازہ غزنویہ کے قریب ایک برج میں مجاہدہ میں منہمک ہو گئے۔ اسی دوران اپنے شیخ کے مرشد خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بھی تعلق قائم ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ آپ کے جذب و شوق سے کافی متاثر تھے۔ خواجہ معین الدین نے آپ کو خلعت خاص مرحمت فرمایا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ کے حکم سے ہانسی چلے گئے۔ جب حضرت بختیار کاکی کا انتقال ہوا تو آپ ہانسی سے دہلی پہنچے۔ مزار پہ فاتحہ خوانی کی۔ شیخ کی وصیت کے مطابق قاضی حمید الدین ناگوری نے آپ کو خرقہ اور دوسری امانتیں پیش کیں۔

دہلی میں چند روز قیام کے بعد دوبارہ ہانسی چلے گئے۔ اب آپ کی روحانی عظمت کا پھریرا عرفان کی آخری بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ خلق خدا کا ایک ہجوم آپ کے پاس چلا آتا۔ کثرتِ اژدہام کی وجہ سے کسی پُرسکون اور گمنام مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ راستہ میں اپنے آبائی گاؤں میں والدہ سے ملنے کے لیے ٹھہرے۔ مابعد آپ نے اشاعت اسلام، رشد و ہدایت، اور تبلیغ کے لیے دریائے ستلج کے کنارے ایک مقام اجودھن کو منتخب کیا۔ یہی مقام اب پاک پتن کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام شہنشاہ اکبر نے اس قصبہ کے لیے تجویز کیا تھا۔ شہنشاہِ دہلی سلطان ناصر الدین محمود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان ناصر الدین نے نقد نذرانہ اور چار گاؤں کی جاگیر کا فرمان دے کر اپنے سپہ سالار غیاث الدّین بلبن کو بھیجا۔ آپ نے نقد رقم مساکین میں تقسیم کر دی اور جاگیر لینے سے معذرت کی۔ غیاث الدین بلبن کی لڑکی بعد میں آپ کے عقد میں رہی۔ آپ کے انتقال کے بعد غیاث الدین بلبن نے حضرت خواجہ نظام الدین کی نگرانی میں آپ کا مزار تعمیر کروایا۔ آپ کی تاریخ وفات صاحب سیر الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدین کی روایت سے، ۵ محرم (سہ شنبہ) ۶۶۴ھ بیان کرتے ہیں۔

Marfat.com

حضرت فریدالدین گنج شکر کو اشاعتِ اسلام میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پہ ایمان لائے۔ اضلاع ملتان اور ساہیوال کے گزیٹیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیال راجپوت اور وٹو وغیرہ قبائل آپ ہی کی تبلیغ و دعوت سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

حضرت فریدالدین گنج شکر کو خواجہ معین الدین چشتیؒ اور بختیار کاکیؒ نے جس طرح روحانیت، معرفت، طریقت و حقیقت کے بلند مقام پہ فائز المرام کیا تصوف میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، مؤلفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں تحریر ہے کہ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید باصفا اور عظیم خلیفہ تھے لیکن آپ کی نسبت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے بھی تھی۔ آپ کے خلفاء میں خواجہ نظام الدین اولیاء اور خواجہ علاؤالدین علی صابر کلیار شریف، شیخ جمال الدین ہانسوی جیسے مشائخ، اکابر شامل ہیں۔ جنہوں نے تبلیغ دین اور اصلاح اخلاق عوام کے لیے بہت کام کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد معین الدین چشتیؒ نے رکھی تھی۔ اس کی تجدید میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے انھیں برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کا مجدد کہا جا سکتا ہے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر کا اکثر وقت مریدوں کی روحانی تربیت اور عباداتؒ و مجاہدات میں گزرا ہے۔ اس لیے وہ اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات اور ارشادات کو مرتب کرنے کے علاوہ کوئی اور کتاب تصنیف نہ کر سکے۔

ان کے ارشادات و اقوال کو اُن کے خلیفہ اور جانشین خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے راحۃ القلوب کے نام سے مرتب کیا ہے۔ "سیرالاولیاء" میں بھی آپ کے ارشادات و ملفوظات کو جمع کیا گیا ہے۔

شیخ موصوف نے مجاہدہ و ریاضت میں مشغولیت کے باوجود سنتِ رسول کی اتباع میں متاہل زندگی گزاری۔ ان کی اولاد میں جو بیٹے مشہور ہوئے وہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ شیخ نصیرالدین، جنہوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔
۲۔ شیخ شہاب الدین سلیمان، جنہوں نے عسکری پیشہ اختیار کیا۔
۳۔ شیخ بدرالدین سلیمان جو والد کے جانشین مقرر ہوئے۔
۴۔ شیخ نظام الدین۔ یہ بھی عسکری پیشہ میں تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے لشکر میں شامل تھے، ایک معرکہ میں شہید ہوئے۔
۵۔ شیخ یعقوب۔ مجذوب۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں پاکپتن میں فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پہ اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے۔ اس نے مزار کے سجادہ نشین، شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاؤالدین کا بھی ذکر کیا ہے۔

سلطان فیروز تغلق بھی شیخ علاؤالدین کا مرید تھا اور اس نے اپنے مرشد سے فیض حاصل کرنے کے لیے پاک پتن کا سفر بھی کیا۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے مزار پہ عرس ہر سال ۵ محرم الحرام کو ہوتا ہے ہزاروں زائرین اس موقع پہ جمع ہوتے ہیں اور ایک دروازے میں سے گزر کر روضہ تک پہنچنے میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس دروازہ کا نام "بہشتی دروازہ" ہے۔

فرید الدین عطار [illegible]

فریدالدین ناگوری۔ (وفات ۷۵۲ھ)

شیخ محمود بن علی بن حمید سعیدی سوالی ناگوری، اپنے لقب شیخ فریدالدین سے ہی مشہور ہوئے۔ ناگور میں پیدا ہوئے۔ وہاں ہی پرورش پائی۔ اپنے والد ماجد سے جو عالم و صوفی تھے، اخذ علم کیا۔ اپنے والد سے ہی حدیث کی اجازت لی۔ اپنے دور کے جلیل القدر عالم و فقیہ تھے اور مشائخ میں بھی شمار کیے جاتے تھے۔ ان سے شیخ عثمان بخشبی اور بہت سے حضرات نے علم حاصل کیا۔ ۷۵۲ھ میں دہلی میں وفات پائی اور وہاں ہی دفن ہوئے۔

فریدؒ، خواجہ غلام

(۱۲۶۱ھ - ۱۳۱۹ھ) مشہور صوفی شاعر اور جلیل القدر عالم۔ آپ کے والد کا نام حضرت محبوب الٰہی بخش تھا۔ وہ بھی ایک جید عالم تھے۔ ریاست بہاولپور کے پہلے نواب صادق محمد خاں اوّل کی درخواست پر وہ مٹھن کوٹ سے چاچڑاں شریف آباد ہو گئے۔ یہیں خواجہ فرید کی ولادت ہوئی۔ خواجہ فریدؒ ابتدائی عمر ہی سے بڑے ذہین تھے۔ انہوں نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں دینی علوم سے فارغ ہو گئے۔ خواجہ صاحبؒ آٹھ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی تربیت بڑے بھائی خواجہ غلام فخرالدین کی نگرانی میں ہوئی وہی آپ کے ظاہری علوم میں استاد تھے اور باطنی علوم کا بھی انہیں سے اکتساب کیا۔ تکمیل علم کے بعد انہوں نے پیر و مرشد خواجہ فخرالدین کے سامنے دس برس تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں لوگوں نے ان سے کسب فیض کیا۔ خواجہ فریدؒ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ مالک بن یحییٰ اس خاندان کے پہلے شخص تھے، جو سندھ میں وارد ہوئے ان کی اولاد میں سے شیخ حسین ٹھٹھہ میں ملازمت کرتے تھے۔ ٹھٹھہ ان دنوں سندھ کا مرکزی شہر تھا۔ شیخ حسین یہیں مقیم تھے۔ آخر عمر میں انہوں نے دولت و امارت چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی اور سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت کی۔ ان کے فرزند مخدوم محمد زکیا جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں مٹھن کوٹ (علاقہ ملتان) میں آکر مقیم ہوئے۔ مخدوم محمد شریف نے دریائے سندھ کے کنارے سیت پور میں سکونت اختیار کی۔ ان کے ایک مرید مٹھن خان تھا جو دریائے سندھ کے مغربی جانب رہتے تھے۔ ان کی دعوت پر آپ نے مٹھن کوٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ سکھوں کے زمانے میں حکومت میں خواجہ فریدؒ کے والد خواجہ محبوب الٰہی بخش سکھوں کے مظالم سے تنگ آ گئے، تو آپ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر تحصیل خانپور کے ایک گاؤں چاچڑاں چلے آئے۔ خواجہ فریدؒ کو سیر و سیاحت اور مناظر قدرت سے بڑی دلچسپی تھی۔ اولیاء کرام کے مزاروں کی زیارت کے سلسلہ میں انہوں نے پورے برصغیر کا سفر اختیار کیا۔ فریضہ حج ادا کرنے کیلئے مکہ معظمہ گئے تو پورے عرب کی سیاحت کی۔ مناظر قدرت سے اُن دلچسپی کا اظہار ان کے کلام سے ہوتا ہے چولستان کا علاقہ آپ کو بہت پسند تھا اور اپنی تصانیف میں انہوں نے اس سے اپنی دلبستگی کا اظہار بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے۔ انہیں ہفت زبان مانا جاتا ہے۔ اُردو، فارسی اور پنجابی کے علاوہ انہیں سندھی، عربی اور ہندی پر بھی عبور حاصل تھا۔ پوربی زبان بھی خوب جانتے تھے اور عروض موسیقی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے انہوں نے نئی بحریں اور اوزان ایجاد کیے اور جس صنف ادب میں بھی قلم اٹھایا، اپنے انفرادی طرز فکر سے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ وہ اہل دل صوفی، عالم متبحر اور آتش بیان شاعر تھے۔ امیر بہاولپور کے خاندان کے لوگ ان کے خاص مریدوں میں تھے امیر بہاولپور

Marfat.com

نے ان کا کلام بڑے اہتمام سے مع ترجمہ و تشریح شائع کرایا تھا۔ ملتانی لہجے میں اُن کے ہم پلے کا کوئی دوسرا شاعر نہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُن کا خیال پڑھنے والے لوگوں کو متاثر نہیں کرتا، بلکہ اُن کی حیثیت عوامی گیتوں کی سی ہے، جو بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ عشق و محبت اور نفسیاتی و جذباتی رموز و اسرار کی ترجمانی میں اُن کے ہاں بعض ایسی خصوصیات ہیں، جو انہیں تمام متقدمین اور متاخرین سے ممتاز کرتی ہیں۔

تصوف اُن کا خاص موضوع تھا۔ وہ علمی جستجو اور تحقیق کے میدان میں بہت ماہر تھے۔ تاریخ و تصوف کے مسائل میں روایات کو محققانہ نظر سے پرکھتے تھے۔ ان کے رسالہ "فوائد فریدیہ" اور اُن کے ملفوظات "مقابیس المجالس" "مناقب فریدی" اور "ارشادِ فریدی" سے اُن کی علمی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ احکام شریعت کے سخت پابند، بدعات اور غیر شرعی رسوم کے سخت مخالف تھے۔ سلسلہ چشتیہ سے وابستگی کی بنا پر سماع سے شغف تھا، لیکن اداب سماع کا خاص اہتمام کرتے تھے ——— ان کی محفل سماع میں عورتیں اور بے ہودہ لوگ شرکت نہیں کر سکتے تھے۔

خواجہ غلام فرید نے اپنے جن پیشرو صوفی شعراء کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اُن سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اُن میں سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ، پنجاب کے بلھے شاہؒ اور شاہ حسینؒ اور سرائیکی علاقہ کے حیدر علی ملتانیؒ اور سیف الملوک کے مصنف مولوی لطف علی شامل ہیں۔

خواجہ صاحب کے کلام میں ہمہ اوست کے تصور کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ شیخ ابن العربی "وحدت الوجود نظریہ" کے بانی سے بھی متاثر ہیں۔ عشق مجاز بھی ان کے کلام کا اہم حصہ ہیں۔ اُن کے نزدیک عشق کے بغیر معرفت کا حصول ممکن نہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری میں راہِ عشق کی صعوبتوں، وصل کی تڑپ اور جدائی کے سوز اور درد کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُن کے کلام میں مقامی لوک کہانیوں کے کرداروں (سسی پنوں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال) کو خلوص و وفا کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ان کے کلام میں خیالات کی نوعیت اور مضامین کی رُوح کو مدِنظر رکھتے ہوئے مختلف زبانوں کے الفاظ، استعارات کو استعمال کیا گیا ہے، جس سے اُن کے کلام کی خوبصورتی میں حد درجہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ اپنے کلام میں قرآنی آیات، احادیثِ رسولؐ فارسی ہندی اُردو، سندھی، سنسکرت زبانوں کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ جدت پسند اور کثیر اللسان شاعر ہیں۔

خواجہ غلام فرید کافیوں والے کے نام سے مشہور ہیں۔ خواجہ صاحب نے دو شادیاں کی ہیں۔ پہلی بیوی سے اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ دوسری بیوی سے اُن کوئی اولاد نہیں۔ دوسری شادی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

خواجہ صاحب کا انتقال ۶ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ/ ۲۴ جنوری بروز چہار شنبہ کو ہوا اور کوٹ مٹھن میں ہی دفن ہوئے۔ ہر سال اُن کے مزار پر باقاعدہ عرس ہوتا ہے۔

فریش ۔ صوبہ اشبیلیہ کا علاقہ، قسطنطینہ کے نواح میں، فریش فحص البلوط کے متصل اور قرطبہ سے شمال مغرب کی طرف دو منزلوں کے فاصلے پر تھا۔ اندلس کے علاقوں کا ذکر کرتے ہوئے تمام جغرافیہ نولیس فریش کا محل وقوع فحص البلوط کے نزدیک بتاتے ہیں۔ اس کے جنگلات شروع سے شاہ بلوط کے درختوں سے پٹے ہوئے تھے۔ اہم ترین معدنی دولت لوہا تھی جس کے ذخائر بعد میں ختم ہوگئے۔ یہ لوہا عمدہ قسم کا ہوتا تھا اور اندلس بھر میں استعمال میں آتا تھا۔ اسی وجہ سے اس علاقے کا نام "قسطنطینۃ الحدید" مشہور ہوگیا۔

فریق ۔ عربی میں اس کا مطلب، لوگوں کی ایک جماعت، قافلے کا ایک حصّہ۔ ترکی میں فوج کے ایک ڈویژن کے سپہ سالار اور بحری بیڑے کے نائب امیر البحر کو فریق کہا جاتا ہے۔

فزارہ، بنو ۔ شمالی عرب کا ایک قبیلہ جس کے قبضے میں کافی سارے علاقے تھے یہ لوگ نجد کی وادی الرمّہ میں رہتے تھے اور ایّام جاہلیت میں 'حلال' نامی بت کی پوجا کرتے تھے۔

بنو فزارہ کی پانچ شاخیں تھیں: (۱) عدی، (۲) سعد، (۳) شمخ، (۴) مازن۔ (۵) ظالم۔

زمانہ جاہلیت میں حکومت بدر بن عدی کا خاندان کرتا تھا۔ حذیفہ بن بدر اور عینیہ اسی قبیلے سے تھے۔ عبس اور ذبیان کے درمیان ربع صدی تک جاری رہنے والی جنگ میں بنو فزارہ نے بھی حصّہ لیا اور اس کی قیادت حذیفہ بن بدر اور اس کے بیٹے حصن نے کی۔

غزوۂ خندق (۵ھ/ ۶۲۶ء) میں بنو فزارہ نے عینیہ بن حصن کی قیادت میں غطفان کے دیگر قبائل اور خیبر کے یہودیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا تھا۔ ۶ھ میں بنو فزارہ کے لوگوں نے نبی کریمؐ کے اونٹوں پر مدینہ منورہ سے چند میل کے فاصلے پر حملہ کیا اور ایک قافلے کو لوٹا اور قافلے کے سردار زید بن حارثہ کو زخمی کیا۔

۸ھ/ ۶۲۹ء میں بھی یہود خیبر کے ہمراہ نبیؐ کریمؐ کے مقابلے پر آنے کو تیار تھے۔ بنو فزارہ کے لوگ ۹ھ/ ۶۳۰ء میں خارجہ بن حصن کی قیادت میں اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ منورہ آئے۔ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد بنو فزارہ نے بھی دوسرے قبائل کی طرح سرکشی اختیار کی، لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انھیں زیر کر لیا۔ بعد میں وہ لوگ تائب ہوگئے۔ یزید بن عمر ہبیرہ بھی بنو فزارہ سے متعلق تھے۔

فزاری ۔ آٹھویں صدی ہجری کے کوفہ کے ایک عالم، ابراہیم بن محمد بن ابی حسن فزاری۔ اعمشؒ کے شاگرد اور سفیان ثوریؒ کے استاذ تھے۔ آپ فزارہ، جو کہ قبیلہ غطفان کی ایک شاخ تھی، سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے کتاب فی الاخبار والاحداث تصنیف کی۔

فساد ۔ کسی چیز کے حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کو فساد کہتے ہیں۔ یہ صلاح کی ضد ہے اور نفس، بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالتِ استقامت سے نکل چکی ہو۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں فساد اور صلاح کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے:

" اور خوب جانتا ہے کہ خرابی پیدا کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۲۰)

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶، ۲۷ میں اللہ تعالےٰ نے ایسے لوگوں کے لیے اُولٰئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور انہی کے لیے گمراہی کو مقدر ٹھہرایا ہے جو اسلام کے عہد کو توڑتے ہیں اور جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ سورۃ

Marfat.com

البقرہ کی آیت ۲۰۵ میں اللہ تعالے ایسے لوگوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جو زمین میں اقتدار ملنے کے بعد فساد برپا کرتے ہیں۔ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۔

اسی طرح اللہ تعالے نے قرآن مجید کے مختلف مقامات پہ ایسے غلط قسم کے اعمال کا ذکر کیا ہے جن کو فساد کہا جاتا ہے اور ایسے اعمال کرنے والوں کو مفسدین کہا جاتا ہے ۔ کم تولنے والوں کو مُفسِدین کہا ہے (سورۃ الشعراء آیت ۱۸۳) حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کرنے والے مفسدین کے انجام کا ذکر کیا ہے ۔ (سورۃ النمل آیت ۱۴) جب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالے کے طلب کرنے پہ کوہِ سینا کے لیے روانہ ہوئے تو اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ جاتے وقت اپنے بھائی کو اس انداز میں نصیحت کرتے ہیں : "میرے بعد تم میری قوم میں جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور مفسدین (بگاڑ پیدا کرنے والے) کے طریقے پر نہ چلنا" ۔ (س ۔ اعراف آیت ۱۴۲)

فسخ ۔ عربی لغت میں فسخ کے معنی "زوالُ المفصلِ عن موضعہٖ (جوڑ کا اپنی جگہ سے ہٹا دینا) نقضُ الشیءِ (کسی چیز کو توڑنا) ۔

اسلامی فقہ کی اصطلاح میں فسخ سے مراد معاملات نکاح، بیع و شریٰ اور دیگر معاہدوں میں کسی طے شدہ بات کو توڑ دینا، لیکن فریقین میں سے کوئی بھی فسخ عقد کے موقع پر کوئی اضافہ نہ کر سکے گا۔ اور نہ ہی کمی کر، جن احوال و شرائط کے تحت عقد ہوا تھا، انہی شرائط کی بنا پر عقد کو توڑ دینا 'فسخ' کہلائے گا۔ مثلاً کسی خرید و فروخت کے معاہدہ کو اس بنا پہ توڑے کہ خریدار کو اس چیز میں خریدنے کے بعد کچھ پوشیدہ عیوب نظر آئے تو اسے فسخ کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی سیاسی معاہدے کو دونوں فریق منسوخ کریں تو اسے مفاسخہ کہتے ہیں۔

معاہدہ نکاح اس صورت میں کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے کہ جب معلوم ہو کہ نکاح کے فریقین میں سے ایک بعض شرائط کو پورا نہیں کرتا۔ مثلاً شافعی فقہ کے مطابق "مرد کا اپنی بیوی کے لیے مناسب نان و نفقہ کا انتظام نہ کر سکنا یا حق مہر ادا کرنے کے ناقابل ہونا" اکثر مذاہب کی فقہ کی رو سے بعض امراض جیسے جنون، برص اور جذام کا ہونا۔ حق زوجیت ادا کرنے کے قابل نہ ہونا بھی فسخ نکاح کے لیے مناسب وجوہ ہو سکتی ہیں۔ فسخ کے متعلق بعض فروعی مسائل کے بارے میں علماء اور فقہا کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۹ میں عورت کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ازدواجی حقوق پورے نہ ہونے کی صورت میں خاوند سے خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اس کے لیے عدالت سے بھی رجوع کر سکتی ہے۔ نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین کے عہد میں بھی فسخ نکاح کے ایسے کئی معاملات طے کیے گئے ہیں جن میں خاوند بیوی کے حقوق پورے کرنے میں معذور تھا۔ شریعت میں فسخ نکاح کے لیے قانونی حق حاصل ہے۔ ضمنی بحث کے طور پہ اس موضوع کے تحت اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ فسخ نکاح اور طلاق میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(۱)۔ طلاق میں عقد کو ختم کرنا شوہر کا حق ہوتا ہے لیکن فسخ نکاح میں ایسا نہیں۔

(۲)۔ فسخ میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ فسخ کی صورت میں طلاق بائن ہوتی ہے۔

(۳)۔ طلاق میں ایک طلاق کے اعلان کے بعد دو طلاقیں باقی رہتی ہیں اور رجوع کیا جا سکتا ہے۔ جب تین طلاقیں دے دی جائیں تو رجوع کرنے کے لیے دوبارہ عقد اس صورت میں ہو گا کہ عورت کسی دوسرے [illegible] نہیں ہے۔ فسخ نکاح سے طلاق کی تعداد کم نہیں ہوتی [illegible] فسخ نکاح کے بارے میں تفصیل کے لیے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی "حقوق الزوجین" دیکھیے۔

فشتالی ۔ (۱۵۴۹ء – ۱۶۲۱ء) مراکش کے ایک مورخ۔

عبد العزیز بن محمد بن ابراہیم الصنہاجی فشتالی، مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے شرفائے حسینی (مراکش) کی تاریخ "مناہل الصفا فی اخبار الملوک الشرفا" کے نام سے لکھی۔

فُصِّلَت قرآن کی ایک سورت کا نام ہے جس کا اصل نام حٰم سجدہ ہے۔ چونکہ بتیسویں سورۃ کا نام بھی سجدہ ہے اس لیے اس سے امتیاز رکھنے کے لیے اس کا نام فصلت قرار دیا گیا ہے اور یہ کلمہ اس سورۃ کی دوسری آیت میں آیا ہے۔

فصوص الحکم علم تصوف میں شیخ محی الدین بن عربی کی تصنیف ہے جو ۶۳۸ ھ میں فوت ہوئے۔ اس کے خطبہ میں شیخ لکھتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت نے ایک کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ کتاب فصوص الحکم ہے۔ اس کو لوگوں پر پیش کرو تاکہ وہ اس سے نفع اٹھائیں۔ متعدد علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں جن میں سے مولانا جامیؒ کی شرح نہایت مقبول اور مستند ہے۔

فصیح الدّین دہلوی۔ شیخ فصیح الدین دہلوی، سلطان غیاث الدین بلبن کے دور کے ایک معروف و نامور عالم اور فقیہہ تھے۔ اصولِ فقہ کی تعلیم شیخ شمس الدین توشجی سے حاصل کی۔ باقی علوم دوسرے علماء سے حاصل کیے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے لڑکوں کے معلم رہے۔ بعد میں تمام امور سے منقطع ہو کر زہد و عبادت کو زندگی کا مقصد بنا لیا۔ تصوف کی منازل شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی زیر نگرانی طے کیں اور کافی عرصہ اُن کے ساتھ رہے۔

فصیح الدّین ہروی۔ فصیح الدین ہروی خراسانی، فاضل شخصیت تھے اور ممتاز فقہائے حنفیہ میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ شہر ہرات کے قاضی تھے۔ ہند کے بادشاہ محمد شاہ تغلق نے ان کی علمی قابلیت اور تنظیمی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر لاہری میں بلادِ سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ ابن بطوطہ اپنی سیاحت کے دوران جب سندھ کے علاقہ میں آیا تو اس کی ملاقات قاضی فصیح الدین ہروی سے ہوئی۔ اُس نے اپنے سفرنامہ میں بندرگاہ لاہری اور قاضی فصیح الدین ہروی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے قاضی فصیح الدین کے ہمراہ لاہری تک کا سفر دریائے سندھ میں کشتیوں کے ذریعے کیا۔

فضالہ بن عبیدؓ۔ (وفات : ۵۳ ھ)

نام فضالہ۔ کنیت ابو محمد۔ آپ کے والد عبید بن نافذ قبیلہ اوس سے متعلق تھے اور فن نیزہ بازی اور شہسواری میں ماہر تھے۔ حضرت فضالہؓ مدینہ میں مسلمان ہوئے اور بیعتِ رضوان میں بھی شریک ہوئے۔ جنگ بدر کے علاوہ سب غزوات میں شریک ہوئے۔ مصر اور شام کے معرکوں میں بھی شرکت کی۔ حضرت ابو الدرداء

Marfat.com

پھر انتقال کے بعد دمشق کے قاضی رہے ۔ امیر معاویہؓ جب حضرت علیؓ کی افواج سے جنگ کے لیے گئے تو فضالہ بن عبیدؓ کو دمشق میں اپنا قائم مقام مقرر کر گئے ۔

کتب احادیث میں کئی حدیثیں آپ سے مروی ہیں ۔ ۴۹ھ میں روم پر لشکر کشی کے وقت مسلمانوں کے امیر تھے ۔ ۵۳ھ میں دمشق میں انتقال کیا ۔

فضل

افزونی ، زیادتی بخشش اور کسی پر فضیلت کی وجہ سے غلبہ حاصل کرنا بطور ایک شاعر کا نام ہے اور قرآن مجید میں بھی کئی جگہ آیا ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہے :

" یہ پیغمبر (جو) ہم نے (بھیجے) ان میں سے بعض کو بعض پر برتری دی "
(س ۔ بقرہ ۔ ع ۳۳)

" یہ (پیغمبری) اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عنایت کرے ۔ اور اللہ کا فضل (بہت) بڑا ہے " (س ۔ جمعہ ع ۱)

(" اور یہ تم سے اس لیے کہا جاتا ہے کہ فضل اللہ کے ہاتھ ہے جس کو چاہے عنایت کرے اور اللہ کا فضل (بہت) بڑا ہے " ۔ (س ۔ حدید ع)

فضل اللہ

مملوک عہد میں قاہرہ کا ایک خاندان ، جس کے افراد سرکاری اہلکار رہے اور اہم مناسب پر فائز ہوتے ۔ بعد کے زمانے میں یہ دمشق منتقل ہو گئے وہیں اس خاندان کے ذاتی قبرستان میں ان کے اکثر افراد دفن ہیں ۔ اس خاندان کے افراد اپنا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملانے کی نسبت سے العمری بھی کہلواتے تھے ۔ بانی خاندان کا نام جمال الدین ابو الماثر فضل اللہ بن عز الدین ہے ۔

فضل اللہ

(۷۴۰ھ / ۱۳۳۹ء ۔ ۷۹۶ھ / ۱۳۹۳ء)

الملقب بہ حُروفی ۔ حروفی فرقہ کا بانی ۔ استر آباد میں پیدا ہوا ۔ مذہبی مسائل میں قرامطہ کا ہم خیال تھا ۔ اس کا سارا نظام فلسفہ ، اسماعیلیہ سے ماخوذ ہے ۔ غلط عقائد کی وجہ سے ۷۹۶ھ میں تیمور کے بیٹے میراں شاہ نے اسے موت کی سزا دی ۔ فضل اللہ خود کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا ۔ اس کا ایک شاگرد بکتاشی خانقاہ (ایشیائے کوچک) میں فضل اللہ کی تعلیمات کا پرچار کرتا رہا ۔

مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے " حروفیہ "

فضل امام

خیر آبادی سلسلۂ علما کے پہلے نامور بزرگ ۔

فضل امام بن محمد ارشد العمری خیر آبادی معقولات کی تدریس و ترویج کے لیے بہت معروف ہوئے ۔ ۳۳ واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے ۔ اس خاندان کے کچھ افراد ایران کے ایک علاقہ پر حکومت کرتے رہے ۔ اس خاندان کے ایک بزرگ شیر الملک کے دو صاحبزادے ، بہاؤالدین اور شمس الدین ہندوستان چلے آئے ۔ ان دونوں بھائیوں نے علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا ۔ ان دونوں بھائیوں کی اولاد میں بڑے بڑے اصحاب علم پیدا ہوئے ۔ بہاؤالدین کی نسل سے خیر آبادی سلسلہ کے علما پیدا ہوئے ۔ مشہور محدث و عالم شاہ ولی اللہ شمس الدین کی اولاد میں سے تھے ۔ فضل امام شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے ہمعصر تھے ۔ ان کے والد شیخ محمد ارشد بڑے نیک دل اور پرہیزگار انسان تھے ۔ فضل امام نے خیر آباد کے ایک نامور عالم سید عبد الواجد کرمانی سے درسیات کی تعلیم لی ۔ مولانا فضل امام علوم عقلیہ کا خاص ذوق رکھتے تھے ۔ اور فلسفہ و منطق میں اعلیٰ علمی مقام رکھتے تھے

پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کے مفتی اور صدر الصدور کا منصب دیا تھا ۔ ۱۸۲۷ء میں اس عہدہ سے الگ ہوئے ۔ ان کی جگہ ان کے تلمیذ خاص مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور کے منصب پر فائز ہوئے بعد میں اپنے وطن چلے آئے اور ۵ ذوالقعدہ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء کو انتقال ہوا ۔

مولانا فضل امام کی دو بیویوں سے ۵ لڑکے تھے ۔ ایک لڑکے فضل حق خیر آبادی نے علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کیا ۔ مولانا فضل امام کے کثیر تلامذہ میں ، مفتی صدر الدین آزردہ کے علاوہ شاہ غوث علی پانی پتی جیسی معروف شخصیت بھی شامل ہے جن کے ملفوظات " تذکرہ غوثیہ " کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔

فضل با

حضرموت کے تریمی مشائخ کا ایک خاندان ۔ " فضل با " نام ان کے ایک جدِ اعلیٰ الفقیہ فضل بن محمد بن عبد الکریم بن محمد سے مشتق ہے ۔ تریمی مشائخ کو " باعلوی " سادات کے زمانۂ عروج یعنی نویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی تک مذہبی معاملات میں مکمل اختیارات حاصل تھے ۔ اس خاندان میں صوفی ، فقیہ اور ماہر قانون لوگ رہے ہیں ۔ ان کی ایک شاخ سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں عدن میں رہی ہے جس کا بانی جمال الدین محمد بن احمد بن عبد اللہ تھا ۔ اس خاندان کی دوسری شاخ جو " بل حاج " کے نام سے مشہور تھی ۔ الشحر میں آباد اس شاخ کا بانی عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن ابی بکر ، فقہ اور تصوف کے بہت سے درسی رسائل کا مصنف تھا ۔

فضل برمکی

(ولادت ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء ۔ وفات ۱۹۳ھ / ۸۰۸ء)

فضل بن یحییٰ برمکی ، خلیفہ ہارون الرشید العباسی کا رضاعی بھائی بھی تھا ۔ اپنے والد یحییٰ بن خالد کے ساتھ شروع سے ہی امورِ مملکت میں حصہ لیتا رہا ۔ یحییٰ برمکی خلیفہ ہارون الرشید کا مدار المہام تھا ۔ امور مملکت کا تمام نظام اس کے ہاتھ میں تھا ۔ ۱۷۶ھ / ۷۹۲ء تا ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء میں جرجان ، طبرستان ، الرّی اور خراسان کا عامل رہا ۔ اس نے اپنے والد کی عدم موجودگی میں ۱۸۱ھ / ۷۹۷ء میں سلطنت کے انتظام کو سنبھالا اور ایک روایت کے مطابق شاہی مہر جو کہ اس کے والد کے پاس تھی ۔ اس کو منتقل ہو گئی ۔

برامکہ خاندان میں سے علم و فضل اور سیاسی امور کا ماہر فرد تھا ۔ اس نے اپنے دورِ وزارت میں انتظامی ، معاشی اور تمدنی اصلاحات نافذ کیں ۔ دنیائے اسلام میں فضل برمکی پہلا شخص تصور کیا جاتا ہے جس نے رمضان المبارک میں مساجد میں چراغاں کے سلسلے کو رواج دیا ۔

خلیفہ ہارون الرشید نے ۱۸۶ھ / ۸۰۲ء میں حج سے واپسی کے بعد برامکہ کے رسوخ و اقتدار کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ۔ یکم صفر ۱۸۷ھ / ۲۸-۲۹ جنوری ۸۰۳ء کو خلیفہ کے حکم سے اپنے والد اور دوسرے بھائیوں کے ہمراہ گرفتار ہو کر الرّقہ کے قید خانے میں ڈال دیا گیا ۔ محرم ۱۹۳ھ / اکتوبر نومبر ۸۰۸ء میں ۴۵ سال کی عمر میں قید خانے میں ہی انتقال ہوا

فضل بن احمد

سلاطین سامانیہ میں " مَرو " کے صاحب البرید کے منصب پر فائز تھا ۔ سامانی سلطان نوح بن منصور نے ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء میں سبکتگین کی درخواست پر اسے افواجِ خراسان کے حاکم محمود کا وزیر بنا کر نیشاپور بھیجا تھا ۔ سلطان محمود کے وزیر کی حیثیت سے اس نے امور سلطنت کو ۴۰۴ھ / ۱۰۱۳ء تک بڑے احسن انداز میں نبھایا ۔ ۴۰۴ھ میں وفات پائی ۔

Marfat.com

فضل بن ربیع ۔ (ولادت ۱۳۸ھ/۷۵۵ء ۔ وفات ۲۰۸ھ/۸۲۴ء)
فضل بن ربیع، کنیت ابوالعباس۔ اس کے باپ ربیع بن یونس نے خلیفہ المنصور اور خلیفہ المہدی کے دور میں وزیر کی حیثیت سے سیاسی واقعات کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ خلیفہ ہارون نے تخت نشین ہونے کے بعد برامکہ خاندان کے افراد کو امورِ مملکت میں ترجیح دینا شروع کی تو فضل بن ربیع نے برامکہ خاندان کے خلاف حاسدانہ کارروائیاں شروع کردیں۔ ہارون نے اسے ۱۷۳ھ/۷۸۹۔ ۷۹۰ء میں اپنا وزیر مقرر کیا اور ۱۷۸ھ/۷۹۴۔ ۷۹۵ء تک اس منصب کے فرائض انجام دیتا رہا۔

بعد میں برامکہ خاندان امورِ مملکت پر چھا گئے تو وزارت سے الگ ہوکر اور برامکہ خاندان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوگیا۔ خلیفہ ہارون کے ہاتھوں برامکہ خاندان کے زوال کے بعد ہارون کا وزیر مقرر ہوا۔ ہارون کے جانشین الامین کے عہد میں بھی وزارت پر فائز رہا۔ ہارون کے دونوں بیٹوں مامون اور امین کو لڑانے میں فضل بن ربیع کی سازشوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ کیونکہ یہ بڑا مفسد اور کینہ پرور قسم کا انسان تھا اور مامون کو برسرِاقتدار نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

مامون اور امین کی جنگ میں امین کو شکست ہوئی اور رجب ۱۹۶ھ/ مارچ اپریل ۸۱۲ء میں امین قید ہوا اور مامون تخت نشین ہوا تو فضل روپوش ہوگیا۔ ۲۰۱ھ/۸۱۶۔۸۱۷ء میں دارالخلافہ میں بعض باغیوں کی بغاوت کے موقع پر دوبارہ سامنے آیا۔ باغیوں کی شکست کے بعد دوبارہ روپوش ہوگیا۔ خلیفہ مامون نے خراسان کے عامل طاہر بن حسین کی سفارش پر فضل بن ربیع کو معاف کردیا۔ ۲۰۸ھ/۸۲۴ء میں وفات پائی۔

فضل بن سہل ۔ (۱۵۴ھ/۷۷۱ء ۔ ۲۰۲ھ/۸۱۸ء)
ایرانی النسل۔ ۱۹۰ھ/۸۰۶ء میں اسلام قبول کیا۔ ہارون کے پاس اس نے خاندان کی سفارش برامکہ نے کی۔ اس طرح سے اسے مملکت کے امور میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ مامون اور امین کے درمیان کشمکش اور لڑائیوں میں فضل بن سہل کا بھی حصہ ہے۔ فضل بن ربیع جو کہ برامکہ خاندان سے حسد رکھتا تھا، فضل بن سہل کے لیے برامکہ خاندان کی ہمدردیوں کی وجہ سے اس کا بھی دشمن بن گیا۔ اس عداوت و دشمنی میں ایک وجہ نسلی تعصب بھی۔ فضل بن ربیع عرب النسل تھا۔ امین اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور مامون پر فضل بن سہل کا اثر تھا۔ فضل بن سہل کی چالاکی اور سازش سے ۱۹۵ھ/۸۱۱ء میں امین نے مامون کی افواج کے خلاف لڑنے کے لیے جو لشکر بھیجا اس کی قیادت علی بن عیسیٰ کے سپرد کردی۔ علی بن عیسیٰ، مامون کی افواج سے شکست کھا کر جنگ میں مارا گیا۔ مامون نے اس کامیابی پر فضل بن سہل کو مشرقی صوبوں کی حکومت کے علاوہ ذوالریاستین کا خطاب بھی دیا۔ مملکت کے معاملات میں فضل بن سہل نے ہمیشہ ذاتی مفاد کو سامنے رکھا۔ جب مامون کو معلوم ہوا کہ وہ کبھی بھی اس کے سامنے سچائی سے کام نہیں لیتا تو مامون نے اپنے اس منظورِ نظر وزیر فضل بن سہل کو ۲۰۲ھ/۸۱۸ء یا ۲۰۳ھ/۸۱۹ء میں سرخس کے حمام کے اندر قتل کروادیا۔

فضل بن عباسؓ، ابو محمد ۔ نبی کریمؐ کے چچا زاد بھائی۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایمان لائے۔ اور فتح مکہ کے بعد اپنے والد کے ہمراہ مدینہ منورہ ہجرت کی۔ اس کے بعد غزوات فتح اور حنین میں حصہ لیا۔ حجۃ الوداع کے دن رسول کریمؐ کے ساتھ ایک ہی اونٹ پر سوار تھے۔ اسی وجہ سے "ردفِ رسولؐ" کا لقب پایا۔ چوبیس کے قریب احادیث کی روایت آپ نے کی جن میں سے تین متفق علیہ ہیں۔ ام کلثومؓ آپ کی بیٹی تھیں جو حضرت حسن بن [illegible] پائی۔ [illegible]

فضل بن مروان ۔ (۱۷۰ھ/۷۸۶ء ۔ ۲۵۰ھ/۸۶۴ء)
عباسی خلیفہ المعتصم کا وزیر، جو نسباً عیسائی تھا۔ معمولی مقام سے ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا ہارون الرشید کے عہد میں ایک محافظ دستے کے کپتان کے مصاحب سے ترقی کرتا ہوا دیوان الخراج میں دبیر ہوگیا۔ کچھ عرصہ سرکاری کاموں سے الگ رہا۔ مامون کے عہد میں عراق کے علاقہ بردان میں قیام کے دوران آئندہ ابھرنے والے خلیفہ المعتصم کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ المعتصم نے خلیفہ بننے کے بعد ۲۱۲ھ/۸۲۷ء یا ۲۱۳ھ/۸۲۸ء میں دیوان الخراج کا مہتمم بنادیا۔ فضل نے المعتصم کی عدم موجودگی میں بغداد میں اس کے لیے حلفِ وفاداری لیا۔ رمضان ۲۱۸ھ/ستمبر ۸۳۳ء میں وزیر مقرر ہوا۔ وسیع اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے اس نے شاہی خزانہ پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اسی بنا پر بعد میں یعنی ۲۲۱ھ/فروری ۸۳۶ء میں اور ابن کثیر کی روایت کے مطابق ۲۲۰ھ میں المعتصم نے اسے گرفتار کرکے قید خانہ میں ڈال دیا اور جائیداد ضبط کرلی۔

فضل بن محمد ملتانی ۔ فضل بن محمد بن زکریا اسدی قریشی ملتانی۔ شیخ فضل اللہ ملتانی کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ فقیہ اور زاہد تھے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ شمس الدین مصری محدث شامل ہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے زمانے میں نائب وزیر تھے۔

فضل حق، خیرآبادی ۔ (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء ۔ ۱۷۹۷ء ۔ ۱۸۶۲ء)
برصغیر کے معروف عالم دین۔ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور سپاہی۔ خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ علم حدیث کی تکمیل شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں کمشنر دہلی کے سررشتہ دار کی حیثیت سے ملازم رہے۔ کئی ریاستوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ منطق، فلسفہ و ادب، کلام و اصول، شعر و شاعری اور علوم دینیہ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا قیام اکثر دہلی میں رہا۔ ان کے مکان پر غالب، مومن، صہبائی، شیفتہ جیسے بلند پایہ شعراء اور مولانا مملوک علی، مولوی کریم بخش، مولوی نصیرالدین شافعی جیسے علماء علمی و ادبی مجالس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ خود مولانا شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے عربی اشعار کی تعداد چار ہزار ابیات سے زائد ہے۔ مرزا غالب ان کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے ان کے امتناع النظیر کے مسئلہ پر کئی مناظرے ہوئے۔ مولانا نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے نقطۂ نگاہ کے رد میں کئی رسائل لکھے۔
اُن کی تصانیف زیادہ تر منطقی مسائل پر مبنی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کے الزام میں انگریزوں نے عمر قید کی سزا دی۔ جزائر انڈیمان میں دوران نظربندی ۱۸۶۲ء میں انتقال ہوا۔

فضل الحق، مولوی ۔ (۱۸۷۳ء ۔ ۱۹۶۲ء) قرار دادِ پاکستان پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرنے والے مشہور سیاست دان۔ پورا نام ابوالقاسم فضل الحق [illegible]

Marfat.com

[illegible] فضل الحق [illegible] پاکستان [illegible] بنگال، بنگالی لیڈر اور [illegible] آزادی [illegible] مسلمانوں کی سیاسی [illegible] تعلیمی بہبود اور ترقی کے لئے [illegible] خدمات [illegible] بنگال کے مسلمانوں کو پسماندگی سے نجات دلانے کے لئے انہوں نے ناقابل فراموش کام کیا۔

مولوی فضل الحق ۲۶ اکتوبر ۱۸۷۳ء میں ضلع باریسال کے ایک چھوٹے سے گاؤں ستوریہ میں پیدا ہوئے۔ آپ مشہور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد باریسال کے وکیل تھے۔ مولوی فضل الحق کی ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی۔ بعدازاں انہوں نے کلکتہ کے پریذیڈنسی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ بنگال کے پہلے گریجویٹ تھے۔ ۱۸۹۵ء میں قانون کی تعلیم مکمل کی اور کلکتہ میں وکالت کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے وکالت ترک کر دی اور ڈپٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۲ء تک اس منصب پر فائز رہے بعدازاں ملازمت چھوڑ دی اور دوبارہ وکالت کرنے لگے۔ مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اسی سال آپ بنگال لیجسلیٹو کونسل کے رکن چنے گئے۔ اس کے بعد ہر انتخاب میں حصہ لیتے اور کامیاب ہوتے رہے۔ انہوں نے بنگالی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے سلسلے میں نمایاں کام کیا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن رہے۔ ۱۹۳۵ء ہی میں کلکتہ کے میئر مقرر ہوئے۔ یکم اپریل ۱۹۳۷ء میں بنگال کے وزیراعظم بنے اور ۱۹۴۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۴۳ء کے بعد صوبائی اسمبلی میں حزب مخالف کی قیادت سنبھالی اور ۱۹۴۶ء تک کرشک پرجا پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے بنگالی اسمبلی کی کارروائی میں حصہ لیتے رہے ۱۹۴۶ء میں کل ہند مسلم لیگ سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے انتخابات میں متحدہ محاذ کی کامیابی کے بعد آپ صوبے کے وزیراعلیٰ بنے۔ انہیں برسراقتدار آئے ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ صوبے میں دفعہ ۹۲۔الف نافذ کر دی گئی۔ ان کی کابینہ برطرف ہو گئی۔ مسٹر محمد علی وزیراعظم بنے تو پارلیمانی حکومت بحال کر دی گئی اور مولوی صاحب کے ایما سے مسٹر ابو حسین سرکار نے نئی کابینہ مرتب کی۔ مولوی صاحب خود مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے شریک ہوئے ۱۹۵۶ء میں ملک کے پہلے آئین کی منظوری کے بعد مولوی صاحب مشرقی پاکستان کے پہلے گورنر مقرر ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۸۳ برس کے لگ بھگ تھی۔ چند ماہ بعد صوبے میں ان کے اور عوامی لیگ کابینہ کے درمیان اختلافات رونما ہوئے جس کے بعد آپ گورنری اور اس کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۶۰ء کو انہیں ہلال پاکستان کا اعزاز دیا گیا۔ زندگی کے آخری چند برس میں ان کی صحت بہت خراب رہی۔ مولوی فضل الحق نے بنگال کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور فروغ تعلیم کے باب میں اہم خدمات انجام دیں۔ انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ بنگال کا قانون زراعت انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس قانون کا مقصد بڑے زمینداروں اور مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ سے کسانوں کو نجات دلانا تھا۔ مولوی فضل الحق نے برصغیر بالخصوص بنگال کے مسلمانوں کو خودنگری اور خودشناسی کے جوہر سے آشنا کرنے کے لئے جو عدیم النظیر خدمات انجام دیں تاریخ انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔

فضل شاہ جلالپوری، پیر۔

(۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۲ھ/ نومبر ۱۸۹۴ء — ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۸۶ھ/ یکم دسمبر ۱۹۶۶ء)

ضلع جہلم کے گاؤں جلالپور کے سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مظفر علی شاہ تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے دادا پیر حیدر علی شاہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ درسی کتب، صرف و نحو مولوی عبدالرحیم سے، منطق، فلسفہ، ادب عقائد، کلام اور علوم نقلیہ کی تعلیم مولوی فیض الحسن سے، صحاح ستہ، فقہ اور باقی علوم مولوی قادر بخش ملتانی، حافظ جلال الدین اور مولوی محمد سعید سے پڑھیں۔ ماہانہ رسالہ "صوفی" منڈی بہاؤالدین میں مضامین لکھتے رہے۔ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں آپ نے حزب اللہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی اصلاح کے ساتھ سیاسی آزادی بھی تھا۔ تحریک مسجد شہید گنج میں حصہ لیا۔ تحریک پاکستان میں قائداعظم کو اپنی جماعت "حزب اللہ" کی طرف سے مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت میں پنجاب کا تفصیلی دورہ کیا خضر وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں اور پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ء میں جہاد کشمیر میں جماعتی طور پر حصہ لیا۔ ۲۴ صفر ۱۳۶۷ھ/ ۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو جمعیت المشائخ قائم کی۔ آپ اس کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ جمعیت المشائخ نے آپ کی سرپرستی میں پاکستان میں اسلامی آئین کے نفاذ اور ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں حصہ لیا۔

فضل شاہ، سیّد۔

(۱۸۲۸ء — ۱۸۹۰ء) معروف پنجابی شاعر لاہور کی متصل آبادی نواں کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی فطرت میں شاعری رچی بسی ہوئی تھی۔ پنجابی شاعری میں انھوں نے بڑا اہم مقام حاصل کیا۔ پیر وارث شاہ کی طرح ان کی کتاب "سوہنی مہینوال" کو پنجابی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے لیلےٰ مجنوں، ہیر رانجھا، یوسف زلیخا نامی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

انھوں نے بڑی سادہ زبان میں تحفۂ فضل نامی کتاب میں رسول کریمؐ کے معجزوں کو قلمبند کیا ہے۔

فضل عثمان مجددی، صدرالمشائخ۔

(۱۳۱۹ھ — ۱۲۹۲ھ)

۱۳۱۹ھ شور بازار کابل میں نامور دینی راہنما اور سیاسی راہبر حضرت نورالمشائخ فضل عمرؒ کے ہاں پیدا ہوئے آپ بچپن ہی سے متین، عابد اور حساس شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی ابتدائی پرورش آپ کے دادا غلام قیوم قدوس سرہ نے کی جو سلسلہ مجددیہ کے برگزیدہ بزرگ اور قطب وقت تھے اور قلیل عرصہ میں علوم معقول، منقول اور فقہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے والد حضرت نورالمشائخؒ سے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ معصومیہ قیومیہ میں بیعت ہوئے۔ بہت قلیل عرصہ میں علم سلوک کو مکمل کر کے زینت بخش مسند ارشاد ہوئے۔

جب افغانستان کے بادشاہ غازی امان اللہ خاں نے افغانستان کی مستقل آزادی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو حضرت صدرالمشائخ نے اپنے والد کے ساتھ جنوبی افغانستان کے مقام پر انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ تل اور دانا کے فتح کے بعد انگریزوں نے اپنی شکست کا خود اعتراف کر لیا اس دینی و ملی خدمت کے صلے میں امان اللہ خاں نے حضرت کو سونے کا تمغہ پیش کیا۔

جب بچہ سقہ نے امان اللہ خاں کی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور سلطنت پر غاصبانہ قبضہ جمانا چاہا تو اس وقت حضرت صدرالمشائخ افغانستان کے شمالی علاقہ ترکستان میں اقامت پذیر تھے۔ آپ نے باغیوں کے خلاف غازی امان اللہ خاں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں جنرل غلام نبی خاں کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ ترکستان کے سقوی گورنر عطا محمد نے حضرت صدرالمشائخ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تاکہ آپ امان اللہ خاں کی حمایت سے باز آ جائیں مگر آپ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ لٹیرے اور غاصب کو مسلمانوں کا بادشاہ تسلیم نہیں کریں گے۔ گورنر نے آپ کے لئے پھانسی کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں جنرل غلام نبی نے بلخ پر بھرپور حملہ کر کے بچہ سقہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سقوی گورنر

Marfat.com

اس دور کے فقہاء صحابہؓ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، خلفائے راشدینؓ اور عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ اور ابی بن کعبؓ شامل ہیں۔ فقہائے کبار کے مختلف مسالک بعد میں جغرافیائی ناموں سے مشہور ہوئے کیونکہ اکثر فقہاء صحابہ مختلف مقامات پر مقیم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اصحاب مدینہ، اصحاب عراق اور اصحاب شام کا فرق اس دور سے شروع ہوا۔

تیسرا دور عہد صغار صحابہؓ اور تابعینؒ

صغار صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا دور حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت ۴۱ھ سے لے کر بنو امیہ کے زوال تک ہے۔ اس دور میں داخلی سیاسی کشمکش میں شدت پیدا ہو گئی، شیعہ اور خوارج کے گروہ مضبوط ہوئے اور دوسری طرف مملکت اسلامیہ کا دائرہ چین کی سرحدوں سے اندلس تک پھیل گیا۔ ان تمام معاملات سے فقہ پر بھی اثرات مرتب ہوئے۔ صحابہ کرامؓ فتوحات کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں پھیلتے چلے گئے اور غیر اقوام کے داخلے سے حدیث کی روایت میں جو کثرت پیدا ہوئی تھی اس کی وجہ سے کافی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اسی زمانے میں فقہی نقطۂ نگاہ سے تین گروہ بن گئے۔ اہل حدیث (اہل حجاز) اہل الرائے (اہل عراق) اور ظاہریہ (رائے کا انکار کرتے تھے اور داؤد ظاہری اس گروہ کے امام تھے)، اس زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے احادیث کی حفاظت اور تدوین کا کام شروع کرایا اور ابن شہاب زہری نے اس کام میں اہم کردار ادا کیا۔

اکابر صحابہ کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ، عمرو بن العاصؓ، انس بن مالکؓ اور تابعین میں سے شریح بن حارثؒ، ابراہیم بن یزید نخعیؒ، طاؤس بن کیسان جندیؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس دور میں فتاوی دیا کرتے تھے۔

شیعی فقہ کی باقاعدہ ترتیب بھی اسی دور سے شروع ہوئی۔

چوتھا دور عہد خلافت بنو عباس

دوسری صدی ہجری (مطابق آٹھویں صدی عیسوی) کے اوائل سے لے کر چوتھی صدی ہجری (مطابق دسویں صدی عیسوی) کے وسط تک کا دور فقہ اور احادیث کی تدوین کا دور ہے اس دور سے ہی حدیث اور فقہ کے مشہور آئمہ کرام کی قیادت کو جمہور نے تسلیم کیا۔ اس عہد خلافت کا آغاز اُن لوگوں کی کامیابی تھی جو عرصہ طویل سے خلافت کو بنی امیہ سے آل رسولؐ میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اسی دور میں اہل بیعت کے ماننے والوں کے درمیان بھی اختلاف واضح ہو کر سامنے آئے اور امامت و خلافت کے سلسلے میں آئمہ اہل بیعت میں کافی تفریق پیدا ہو گئی اور ان کے دو مذہب مشہور ہوئے اور وہ شیعہ زیدیہ اور شیعہ امامیہ ہیں۔ شیعہ فقہی مسائل میں امام جعفر صادقؒ کی فقہ جعفریہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس دور میں کئی فقہی مذاہب پیدا ہوئے۔ اُن میں چار اپنے مذاہب کے بانیوں کے نام سے مشہور ہوئے۔ حنفی مسلک کے بانی امام ابو حنیفہؒ، مالکی مسلک کے بانی امام مالک بن انسؒ، شافعی مسلک کے بانی امام شافعیؒ اور حنبلی مسلک کے بانی امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے مشہور شاگردوں نے تدوین فقہ میں تاریخی کردار ادا کئے ہیں۔ ان مسالک اربعہ کے علاوہ چند اور مسلک بھی وجود میں آئے لیکن جلد ہی زوال پذیر ہوئے جن میں ابن شبرمہ (م ۱۴۴ھ)، ابن ابی لیلےٰ (م ۱۴۸ھ) امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ)، سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)، شریک نخعی (م ۱۷۷ھ)، لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ)، اسحٰق بن راھویہ (م ۲۳۸ھ)، ابو ثور بغدادی (۲۴۶ھ) داؤد ظاہری (۲۷۰ھ)، امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں احادیث نبوی جمع ہوئیں اور ان کے مجموعے مرتب ہوئے جن میں سے بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، ابو داؤدؒ، بیہقیؒ، نسائیؒ کے مجموعے مشہور ہوئے۔ قرآن مجید کی تفاسیر لکھی گئیں، فقہ کے اصول اور فروع پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ کئی نئے

عموم وجود میں آ گئے مثلاً علم معاملات حدیث، علم اصول [illegible]

[illegible]

جمود چھا گیا اور تقلید پھیل گئی۔ فقہی اجتہاد ترک کیا گیا۔ اس دور کو تقلید [illegible] دور کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی تعصبات [illegible] کے وجود میں آنے سے شیعہ مذہب کے کئی گروہ بن گئے [illegible]

چھٹا دور، تقلید محض کا دور

بغداد کی فتح نے جو ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوئی [illegible] محض پر قائم و دائم ہے۔

ساتواں دور، موجودہ بیداری کا دور

تقلید محض سے امت مسلمہ میں بدعات اور خرافات کثرت سے پھیل گئیں جن کی بنیاد وہم اور جہالت پر تھی۔ لوگ شریعت کی اصل روح کو نظر انداز کر کے بعض متقدمین کے اجتہاد کے پابند ہو گئے۔ اس دوران تقی الدین ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ جیسے مجددین یہ اعلان کے ساتھ سامنے آئے کہ تقلید کو ترک کیا جائے اور مذاہب فقہ میں وسعت پیدا کی جائے۔ شریعت کے اصل مصادر قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے اور بدعات و خرافات سے دوری اختیار کی جائے۔ یہ دونوں آٹھویں صدی ہجری کے مجددین [illegible] کے حنبلی فقہا میں سے تھے۔ بارہویں صدی ہجری میں محمد بن عبدالوہابؒ جو [illegible] وہابی تحریک کے بانی کہلاتے ہیں، انہی کے نقش قدم پر چلے۔ انیسویں صدی عیسوی میں جمال الدین افغانی اور مصر کے شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ یہ دعوت لے کر اٹھے [illegible] فقہائے قدیم نے اسلامی فقہ کی تدوین جن حالات میں کی تھی موجودہ دور کے مسائل ان سے مختلف ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی فقہ کی تشکیل نو کی جائے اس انداز فکر پر کام کرنے والوں میں عرب دنیا سے المحمصانی، علی حسن عبدالقادر، عودہ شہید، احمد مصطفیٰ الزرقاء، سید قطب شہید، استاذ ابو زہرہ، استاذ دوالیبی جیسے ماہرین قانون و فقہ شامل ہیں ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلامی فقہ کی تشکیل نو کے لئے قرآن و سنت سے ہی رہنما اصول لئے جائیں اور فقہائے قدیم کے فیصلوں سے نظائر (قیاس) کے اصول اپنا کر مسائل جدید کا حل نکالا جائے۔

برصغیر ہند و پاک میں علامہ اقبال نے اجتہاد کے ذریعے اسلامی کی تشکیل نو کے لئے اہم تجاویز مدراس کے اپنے مشہور عالم چھ خطبوں میں سے ایک خطبہ

میں پیش کی ہیں۔

پاکستان میں فقہ جدید کی تشکیل کے لئے اساس علماء کے [illegible] مشہور و معروف علماء کا بائیس نکاتی متفقہ فارمولا موجود ہے [illegible] کے اسلامی نظام شریعت کے نفاذ کے مطالبے پر اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی لیکن وہ کوئی مفید کام نہ کر سکیں نہ ہی اُن کی تجاویز پر [illegible] کوشش کی۔

۱۹۷۷ء اور پھر پاکستان کے عوام کی طرف سے اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ [illegible] شدت سے پیش کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء [illegible] حکومت نے عوام کے مطالبے کے پیش نظر اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اہم اقدامات کئے [illegible]

Marfat.com

کے عمل کرنے کے لیے مطلوبہ فقہی لائحہ عمل ایک اسلامی نظریاتی کونسل کی سرپرستی میں تیار کیا جاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند، افغانستان، ترکی کے علاقوں میں زیادہ تر فقہ حنفی پر عمل کیا جاتا ہے۔

فقیر ۔ عربی کا یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو ضرورت مند یا حاجت مند ہوں، نہ چاہے دنیاوی ضروریات کے نقطہ نظر سے یا روحانی نقطہ نظر سے۔ فقیر اور مسکین میں یہ فرق ہے کہ فقیر تو صرف محتاج ہوتا ہے اور مسکین تباہ حال۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے آپ کو غنی اور اس کے مقابلے میں انسان کو فقیر یعنی حاجت مند کہا ہے۔ (سورۂ فاطر آیت ۱۵)۔ فقیر کو فارسی میں درویش کہتے ہیں۔ فقیر اور درویش، دونوں الفاظ اردو میں عام مستعمل ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں مانگنے والوں اور سائل کے لیے یہ لفظ مستعمل ہونے سے اس کا اصل مفہوم بدل گیا ہے۔ حالانکہ جس انداز میں یہ لفظ سورہ فاطر میں اللہ نے استعمال کیا ہے کہ انسان تو اللہ سے مانگنے والا ہے اور اللہ تعالےٰ کسی بھی چیز کا محتاج نہیں۔ نوع انسان بہر صورت فقیر ہے چاہے وہ اللہ سے مانگے یا نہ مانگے۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کرتے ہیں اور دوسروں سے کچھ طلب نہیں کرتے ان کو متوکل کہتے ہیں۔

نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا الفقر فخری۔ (فقر میرے لیے باعث فخر ہے) فقر کی اصطلاح اہل تصوف میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ شیخ علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فقر کی تعریف اور اہل فقر کی صفات بیان کی ہیں۔ چنانچہ تصوف کی اصطلاح میں فقیر وہ ہوتا ہے جو متاع دنیا سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس کے پاس خواہ سرے سے کچھ موجود نہ ہو یا اس کے پاس دنیا کے سارے اسباب موجود ہوں دونوں میں سے کسی حالت میں اس کی کسی چیز میں خلل نہ آئے۔ نہ کسی چیز کے نہ ہونے سے اسے کوئی پریشانی لاحق ہو اور نہ سارے اسباب موجود ہونے سے وہ اپنے آپ کو غنی اور دولتمند محسوس کرے۔ گویا دنیا کی کسی متاع کا ہونا اور نہ ہونا اس کے نزدیک یکساں ہو بلکہ تنگ دستی اور افلاس کی صورت میں وہ زیادہ خوش ہو۔ کیونکہ فقیر جس قدر تنگ دست ہو ٹھیک ہے کہ اس صورت میں اس پر حال کا انکشاف زیادہ ہوگا اور اس پر غفلت کم طاری ہوگی۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں فقیر وہ ہے "جسے اللہ عزوجل کے سوا کسی اور چیز سے چین نہ آئے"۔ اسی طرح نبی کریمؐ نے فقراء کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ بروز قیامت حکم دے گا:

"میرے دوستوں کو میرے پاس لاؤ۔ فرشتے سوال کریں گے کہ آپ کے دوست کون ہیں تو اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ فقراء اور مساکین"۔

فقیر اللہ، جلال آبادی

۔ ایک صاحب کرامت بزرگ۔

قصبہ روتاس کے ایک قریشی ہاشمی گھرانے میں عبدالرحمٰن حنفی کے ہاں پیدا ہوئے علم کے حصول اور مراتب سلوک و ریاضت کو طے کرکے حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے گئے۔ حج و زیارت سے واپسی کے بعد نقشبندی سلسلہ میں شیخ محمد مسعود پشاوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شیخ محمد مسعودؒ، شیخ محمد سعید لاہوریؒ کے مرید تھے۔ جو کہ شیخ سعد اللہؒ کے مرید تھے، جنہوں نے حضرت آدم بنوریؒ خلیفہ مجدد الف ثانیؒ سے فیض حاصل کیا۔

سلسلہ نقشبندیہ کے علاوہ شاہ فقیر اللہ کو قادریہ سلسلہ میں بھی اجازت تھی۔

احمد شاہ درانی کے عہد حکومت میں شکار پور سندھ کے علاقہ میں ہر دلعزیز اور معروف عالم دین و زاہد شخص تھے۔

شاہ فقیر اللہ کے مکتوبات میں احمد شاہ درانی، نصیر خان بلوچ، شاہ ولی خان صدر اعظم، شہزادہ سلیمان ولی عہد اور دوسرے اکابر و مشاہیر کے نام ان کے خطوط موجود ہیں۔ شاہ فقیر اللہ نے شکار پور میں ۱۱۹۵ھ کو انتقال کیا۔ ان کا مزار بھی یہیں ہے۔ آپ کی تصانیف میں معروف کتب درج ذیل ہیں:۔

١۔ فتح الجمیل فی مدارج التکمیل، (تصوف و سلوک کے موضوع پر) عربی زبان میں۔
٢۔ النجات من مصائب الدنیا والعرصات۔ (فارسی)
٣۔ طریق الارشاد فی تکمیل المومنین والاولاد۔ (عربی)
٤۔ فیوضات الٰہیہ۔ (فارسی)
٥۔ منتخب الاصول در علم اصول فقہ۔
٦۔ وثیقۃ الاکابر۔ (عربی)
٧۔ مدارج عالیہ در فقہ و تصوف و اسرار و اخلاق
٨۔ فتوحات غیبیہ: (صوفیائے کرام کے عقائد کی شرح) (فارسی)
٩۔ جواہر الاوراد۔ (عربی)
١٠۔ کتاب الازہار فی ثبوت الآثار۔ (عربی)
١١۔ محمود الاوراد۔ (عربی)
١٢۔ فوائد فقیر اللہ۔ (پشتو)
١٣۔ مکتوبات، مشتمل بر ۳۹۰ صفحات۔ (عربی۔ فارسی)
١٤۔ قصیدہ مبرورہ (عربی) جو نبی کریمؐ کے روضۂ اقدس پر نظم کیا۔

فقیر اللہ شاہ، قادری نوشاہی

۔ (وفات ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء)

آپ کے والد کا نام پیر احمد شاہ تھا۔ نوشاہی پراز قلندری سلسلہ میں اپنے والد سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔ آپ ایک بہت بڑے صوفی اور زاہد انسان تھے۔ آپ کئی بیماریوں کا روحانی طور پر علاج کیا کرتے تھے جن میں جذام اور اٹھرا بھی شامل ہیں۔ آپ کا مزار بدوملہی ضلع سیالکوٹ میں ہے۔

فقیر، شمس الدّین

۔ (۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء۔ ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء)

دہلی کے ایک عالم، ادیب اور شاعر۔ علمی، ادبی اور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۴۰ھ میں اورنگ آباد (دکن) چلے گئے۔ جہاں گوشہ نشین رہے۔ پانچ سال بعد دہلی آئے۔ دوبارہ گوشہ نشین ہو کر آگرے میں رہے۔ ۱۱۷۵ھ میں لکھنؤ گئے اور وہاں سے ۱۱۸۰ھ میں نجف و کربلا کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ زیارات مقام مقدسہ سے واپسی پر کشتی کے ایک حادثہ میں انتقال ہوا۔

شمس الدین فقیر برصغیر پاک و ہند میں معانی، بیان و عروض کے استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی تصانیف میں حدائق البلاغۃ، خلاصۃ البدیع، الوافیہ فی العروض والقافیہ، مثنوی شمس الضحیٰ، مثنوی در مکنون، مثنوی حسن و عشق شامل ہیں۔ حدائق البلاغۃ دو سو سال سے نصاب میں داخل ہے۔

فقیر نور محمد سروری قادری

۔ (۱۸۸۳ء) ۔ ۱۹۶۰ء)

آپ کی ولادت کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ہوئی۔ خواجہ گیسو درازؒ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد کا نام حاجی گل محمد تھا۔ آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم

Marfat.com

مکمل کی۔ ۱۹۱۲ء میں بغداد بھی گئے۔ حضرت سلطان باہوؒ کے سجادہ نشین سوئم صالح محمد قادری سے بیعت کی تھی۔ حضرت سلطان باہوؒ سے عقیدت کی وجہ سے ان کی ایک سو کے قریب کتب کی ترتیب و تدوین کا ارادہ کیا۔ مکتبہ سلطانی کے زیر اہتمام چالیس کتب کو نئے انداز میں مرتب کیا۔ لیکن ان میں سے صرف چند شائع ہو سکیں۔

آپ کے دو صاحبزادے ہیں جن میں سے ایک کا نام فقیر عبدالحمید کامل سروری قادری ہے۔ دوسرے فقیر عبدالرشید خاں ہیں۔ مخزن الاسرار، سلطان الاوراد عرفان حصہ اوّل۔ حصہ دوئم (انگریزی) اور حضرت سلطان باہو کی فارسی کتاب گنج الہدیٰ کا اُردو ترجمہ "حکم نامہ" آپ کی تصانیف ہیں۔

آپ کا انتقال ۱۷، ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو (فیصل آباد (لائل پور) میں ہوا۔ بعدازاں آپ کی میت کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں، لے جا کر دفن کی گئی۔

فقیر محمد جہلمی ۔ (برِصغیر کے نامور عالم)

مولانا فقیر محمد جہلمی ۱۲۴۰ھ میں جہلم کے موضع چتن میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سفارش علی تھا۔ ابتدائی تعلیم میاں قطب الدین سے حاصل کی۔ باقی علوم میں صرف و نحو مولانا نور محمد سے، منطق مولانا عبدالکریم شاہ پوری سے، معقولات مولوی محمد حسن سے حاصل کیے۔ دہلی میں میاں نذیر حسین محدّث کے درس میں شریک رہے۔ میاں نذیر حسین کے مشورہ پہ مولوی محمد شاہ صاحب کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ بعد میں مفتی صدر الدین آزردہ کے مدرسہ سے بھی اعلیٰ تعلیم دینی حاصل کی۔ ۱۲۷۸ھ میں جہلم واپس آئے۔ اس کے بعد لاہور آئے۔ مولوی کرم الٰہی صاحب سے علمی استفادہ کے علاوہ لاہور میں قیام کے دوران خوشنویسی کی تربیت حاصل کی۔ مطبع آفتاب لاہور میں کاتب کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ ۱۲۸۴ھ میں حافظ ولی اللہؒ لاہوری، پنجاب کے نامور مناظر امرتسر کے ایک پادری عماد الدین سے تحریری بحث کر رہے تھے۔ مولانا فقیر محمد جہلمی یہ تحریری بحث کو لکھتے تھے۔ اس ذریعے سے انھیں عیسائیت کے وسیع مطالعہ کا موقع ملا آپ نے اس مناظرہ کی مکمل روئیداد کو ترتیب دے کر خود چھپوایا۔ فارسی کی کتاب ... "تصدیق المسیح" کا اردو ترجمہ کیا۔ حافظ ولی اللہ کی تصانیف 'صیانۃ الانسان' اور 'ابحاث ضروری' پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔

۱۱ محرم ۱۲۹۱ھ میں مولانا جہلمی "آفتاب پنجاب" کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۳۰۱ھ تک یہ فریضۂ ادارت سرانجام دیتے رہے۔ ۱۳۰۲ھ میں اپنے وطن واپس آئے اور "سراج المطابع" کے نام سے ایک پرنٹنگ پریس لگا کر "سراج الاخبار" کے نام سے ایک پرچہ نکالا۔

آپ کی تصانیف میں حدائق الحنفیہ، زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل، اور آفتاب محمدی، بڑی مشہور کتابیں ہیں۔

فقیہہ

:۔ عام معنوں میں کسی شے کا علم و فہم رکھنے والے شخص کو کہتے ہیں۔ فقہ کے باقاعدہ علم کی شکل اختیار کرنے سے اس لفظ کا استعمال دین کے علم، شریعتِ اسلامی کا فہم رکھنے والے افراد کے لئے مخصوص ہو گیا۔

فقیہ با

۔ حضرموت میں تریم کے باعلوی سادات کا ایک خاندان۔ ان کے جدِ اعلیٰ محمد بن علی تھے جو تریم سے عیدید میں آگئے تھے۔ اسی لیے صاحب عیدید کے نام سے بھی معروف ہوئے

[illegible] بافقیہوں کے مورثِ اعلیٰ [illegible] تھے۔ ان کے اخلاف میں کئی فقیہ اور صوفی حضرات [illegible] اپنے [illegible] زمانے میں بہت مشہور ہوئے [illegible] (نیز دیکھیے [illegible])

فقیہ بل

۔ حضرموت میں تریم [illegible] کے باعلوی سادات کا ایک [illegible] اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ [illegible] فقیہ محمد بن عبدالرحمٰن المعروف بہ [illegible] تھے۔ [illegible] نے اپنے وطن تریم کے علاوہ عدن، زبید، مکّہ اور مدینہ میں علوم [illegible] کی تحصیل کی۔ تریم میں ہی ۹۱۷ھ/۱۵۱۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ (نیز دیکھیے "باعلوی")

فکر

۔ جمع افکار۔ بمعنی سوچ بچار۔ بعض ادبا کے خیال میں اس کے معنی کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس کے بارے میں چھان بین کرنا ہے۔ رَجُلٌ فِکِّیْرٌ۔ بہت زیادہ غور و فکر کرنے والے شخص کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ فکر سورۃ سبا کی آیت ۴۶ میں (تَتَفَکَّرُوْا)، سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۹ میں (تَتَفَکَّرُوْنَ) سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۴ میں (اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا) آیا ہے۔

اہلِ تصوّف عموی طور پر فکر کے مقابلے میں ذکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

فکری، عبداللہ پاشا

۔ (۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء - ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء)

مصری سیاست دان اور ادیب۔ مکہ مکرمہ میں پیدائش ہوئی۔ جب فکری کا والد محمد آفندی بلیغ وہاں تعینات تھا۔ مصر پر فرانسیسی قبضہ کے وقت ان کا دادا عبداللہ جامع الازہر میں معلّم تھا۔ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں والد کا انتقال ہوا۔ جامع ازہر میں تعلیم پائی۔ ترکی زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔

۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء میں سرکاری ملازمت شروع کی۔ اور مختلف دیوانوں میں کام کرتا رہا۔ حتیٰ کہ تھوڑے عرصہ کے لیے وزیر بھی رہا۔ شہزادگان محمد توفیق، حسن اور حسین کا اتالیق بھی رہا۔ عرابی پاشا کی بغاوت کے وقت اسے بھی قید کر دیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں حج بیت اللہ کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں شام کی سیاحت کے لیے گیا۔ حکومت مصر کے نمائندے کی حیثیت سے مؤتمر المستشرقین میں شرکت کے لیے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں سٹاک ہوم گیا۔ ۱۱ ذوالحج ۱۳۰۷ھ/۲۹ جولائی ۱۸۹۰ء کو انتقال ہوا۔ عبداللہ پاشا فکری نے کئی کتب تصنیف کیں۔ فکری ایک صاحبِ طرز انشاپرداز تھا۔

فلاح

۔ کامیابی، خوشحالی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ خسران کی ضد ہے جو نقصان، گھاٹے اور نامرادی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے صرف دنیاوی کامیابی کا ہی تصور نہیں بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج نہ ہو۔ اَفْلَحَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں، فلاں شخص کامیاب ہوا، اپنی مراد کو پہنچا۔ اس کی کوشش بارآور ہوئی۔

قرآن مجید کے مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو فلاح پائیں گے، جو کامیاب ہوں گے اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ظالم اور مجرم لوگوں کے لیے کوئی فلاح نہیں۔

سورۃ الاعلیٰ کی آیات ۱۴ تا ۱۷ میں ان لوگوں کے لیے فلاح کا ذکر ہے جو اللہ کا [illegible] یاد کرتے ہیں، آخرت پر یقین رکھتے ہیں، برے اخلاق اور غلط باتوں سے [illegible]

Marfat.com

یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ آیات میں ان فلاح پانے والے لوگوں کا ذکر ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، کتب الٰہی اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

فلاسفہ :۔ فیلسوف کی جمع، مسلمانوں کے ہاں ابتدا میں یہ لفظ یونانی حکماء کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ الشہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں یونان کے حکمائے سبعہ کا ذکر کیا ہے جو یونانی فلسفہ کے بانی کہے جاتے ہیں۔

یونانی زبان میں لفظ فلسفہ دو الفاظ PHELEIN بمعنی محبت کرنا اور SOPHIA بمعنی حکمت سے بنا ہے۔ قرآن مجید میں حکمت کو خیر کثیر کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل و فکر سے کام لینے کی دعوت دی ہے اس لئے ان مسلم فقہا کو بھی فلاسفہ کہا جا سکتا ہے جو کہ عقل و فکر سے کام لے کر دین کے مسائل اخذ کرتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ فلاسفہ کا وہی مفہوم رہا یعنی حکماء اور علماء کے لئے بولا جاتا ہے۔ الجاحظ نے اپنی کتاب الحیوان کے مقدمے میں فلاسفہ کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

فلاسفہ اپنے غور و فکر کی بنا پر بعض ایسی باتیں پیش کرتے ہیں جو عام انسانی ذہن کی عقل سے بالاتر ہوتی ہیں۔ بعض فلاسفہ الٰہیات میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ عجیب و غریب دعوے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلم فلاسفہ ابتدائی دور میں یونانی فلسفہ سے کافی متاثر رہے ہیں۔ جس سے کئی گمراہیوں نے جنم لیا۔ کیونکہ یونانی فلسفہ مسلمانوں کے نظریات اور معتقدات میں رس بس گیا۔

مسلم فلاسفہ میں امام فخر الدین رازی، نصیر الدین طوسی، ابن سینا، امام غزالی، فارابی اور ابن رشد معروف ہیں۔

فلپائن :۔ دو ہزار جزائر پر مشتمل ایک ملک جس کی آبادی پونے چار کروڑ ہے۔ ان جزائر میں تقریباً ہر ایک کا رقبہ ایک مربع کلو میٹر سے بھی کم ہے۔ دارالحکومت منیلا ہے۔ پچاس سے زائد بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سب سے اہم تاگالوگ ہے جو منیلا اور اس کے مضافات میں بولی جاتی ہے۔ جزائر فلپائن کا بیشتر علاقہ ہسپانیہ کے زیر اقتدار رہا ہے اس بنا پر اکثریت نے عیسائیت قبول کر لی ہے ۲۰ لاکھ غیر مسیحی آبادی میں سے پندرہ لاکھ مسلمان ہیں۔

منڈاناؤ کا جزیرہ فلپائن کا دوسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ ۳۶۲۵۹ مربع میل ہے۔ سولو جزائر کا سلسلہ جو منڈاناؤ سے ملا جلا ہے تقریباً ۱۵۰ جزائر پر مشتمل ہے اور بورنیو کی سرحد تک پہنچا ہے۔ پلاوان جزیرہ بھی کافی بڑا ہے اور بحیرہ سولو میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ جب ان علاقوں میں ہسپانوی مہم جو اور طالع آزما داخل ہوئے تو انہوں نے ان تمام علاقوں کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ ان علاقوں میں سب سے پہلے ۱۲ مارچ ۱۵۲۱ء کو ایک ہسپانوی ملاح میگیلن داخل ہوا۔

ملاحوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور ۱۵۶۵ء میں لیگاسپی نے ہسپانوی نوآبادیات کی بنیاد ڈالی۔ ۱۵۶۹ء میں بحرالکاہل کے ان دو ہزار کے قریب جزائر کو فلپائن کا نام دے کر ہسپانوی ریاست قرار دے دیا گیا۔ مختلف جزائر میں ہسپانوی اقتدار کی مخالفت شروع ہوئی خصوصاً سولو اور منڈاناؤ کے سینکڑوں جزائر میں بسنے والے مسلمان اپنی آزادی اور حکومت سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے ہسپانوی اقتدار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سولو کے سلطان تقریباً تین سو سال تک جنگ کرتے رہے۔

فلپائن کے جزائر میں اسلام کی اشاعت سماترا اور ملاکا سے ہوئی۔ ان کے عقائد میں جاہلانہ رسوم کی کثرت ہے۔ مسلم علاقوں میں سولو کی تاریخ سب سے قدیم ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۴۵۷ء میں جوہور کے ایک شخص ابوبکر نے جزائر سولو میں مسلم حکومت قائم کی جو آہستہ آہستہ مضبوط حکومت کی شکل اختیار کر گئی۔ ۱۵۷۸ء میں ہسپانیوں نے پہلی مرتبہ جزائر سولو پر بحری جہازوں کے ایک بیڑے کے ذریعے حملہ کیا۔ اس جنگ کی وجہ سے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت میں شدت پیدا ہو گئی۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان مسلمانوں کی جدوجہد سے منڈاناؤ پر ان کو دوبارہ تسلط حاصل ہو گیا اور ۱۸۷۶ء میں جولو پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۷۸ء میں سلطان جزائر سولو کو حکومت زیر حمایت کی شکل میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے میں ہی بہتری نظر آئی جس کی رو سے اندرونی علاقہ پر اس کا کنٹرول تو ہو گیا لیکن ہسپانیہ کا حلقہ بگوش ہو کر حاکمانہ اقتدار اس کے حوالے کرنا پڑا۔ ۱۸۷۸ء کے معاہدے کی بنیاد پر ۱۸۹۷ء میں عہد نامہ پیرس ہوا۔ جس کی رو سے جزائر سولو اور فلپائن کا الحاق ہوا۔ ۴ جولائی ۱۹۴۶ء کو امریکہ نے جمہوریہ فلپائن کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس میں اقتدار عیسائیوں کے حوالے ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مختلف اوقات میں عیسائی حکمران طبقہ ظلم و تشدد کے ہر حربے استعمال کر کے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۳ء میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خونریز لڑائیاں ہوئیں۔

مسلمان عیسائی اقتدار سے اپنی آزادی کے لئے بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ مورو تنظیم آزادی عیسائیوں کے خلاف گوریلا جنگ میں مصروف ہے۔ فلپائن کے عیسائی صدر مارکوس مسلمانوں کی جدوجہد اور کامیابیوں سے گھبرا اٹھے ہیں اور ان سے معاہدے کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی ان کوششوں میں بھی خلوص نہیں ہے اور مسلمان اپنی آزادی اور حقوق کے لئے برسرِ پیکار ہیں اور انہیں مسلم ممالک اور خصوصی طور پر سعودی عرب اور لیبیا کی حمایت حاصل ہے۔

فَلْس ۔ جمع فلوس۔ اسلام کے ابتدائی زمانے کا تانبے کا سکہ۔ تانبے کے سکے اسلام سے پہلے کے زمانوں میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ ان کے وزن گھٹتے گھٹتے فتح شام کے وقت چھ گرام کے رہ گئے تھے۔ مختلف شہروں کے سکوں کے مختلف سائز اور وزن ہوا کرتے تھے۔

فلسطین :۔ منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے کا اس علاقے سے گہرا تعلق رہا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں یہودہ اور بن یامین کی اولاد فلسطین کے علاقہ یہودیہ پر حکومت کرتی تھی۔ عہد نامہ عتیق کی روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد یوشوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو فتح کیا۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی علاقے میں اسرائیلی سلطنت قائم کی ۷۲۱ ق م میں اشوریوں نے اس سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ بخت نصر نے ان علاقوں پر شدید حملے کئے۔ کئی یہودیوں کا قتلِ عام کیا باقی کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ اس حادثہ کے ساٹھ سال بعد شاہِ فارس سائرس نے دریائے فرات اور بحر روم کے درمیانی علاقہ کی فتح کے بعد یہودیوں کو فلسطین جانے کی اجازت دی۔ سکندر یونانی نے ۳۳۲ ق م میں اس علاقے پر حملہ کیا اور فلسطین کے لوگوں کی آزادی سلب کر لی۔ ۳۲۰ ق م بطلیموس نے اور ۶۳ ق م میں پامپی (رومی) نے ان علاقوں کو تاخت و تاراج کیا۔ ۵۱ ق م میں اس علاقے کے تیس ہزار یہودیوں کو ایک یورش کے بعد غلام بنا لیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت یہودیوں

Marfat.com

کی تنبیہ کے لئے آخری حجت کی تھی لیکن یہودیوں نے اُن کے ساتھ کافی بدسلوکی کی۔ اب فلسطین کے ان بنی اسرائیلیوں (یہودیوں) کے لئے تباہی و بربادی مقدر بن گئی تھی۔ ۷۰ء میں رومیوں نے اس قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کردی۔ ۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرسن نے یروشلم پر قبضہ کرکے یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ فلسطین پر ایک طویل عرصہ تک مختلف مسلمان خاندانوں کے ذریعے میں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ بارہویں صدی عیسوی میں یہودیوں نے فلسطین کو مسلمانوں کے قبضہ سے حاصل کرنے کے لئے مشہور صلیبی جنگیں لڑیں پھر بھی فلسطین کا علاقہ مسلمانوں کے پاس ہی رہا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں بھی یہ علاقہ مسلمانوں کی زیرِ حکومت تھا۔ ۱۹۱۷ء میں فلسطین پر جنرل ایلن بی کی قیادت میں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر تاریخ کے مختلف ادوار میں فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک یہودیوں کی فلسطین میں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو اعلان بالفور کے ذریعے فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کا اعلان ہوا جو کہ استعماری طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف سازش کا ایک حصہ تھا۔ تمام دنیا سے یہودی آکر فلسطین کے علاقوں میں بسنا شروع ہوگئے اور غریب مقامی آبادی سے زمینیں خرید کر اپنے پاؤں جماتے گئے۔ اب فلسطین کی حکومت انگریزوں کی زیرِ نگرانی آگئی۔ یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو انگریز ہائی کمشنر کے تحت ملکی حکومت کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ اس حکومت کے تحت فلسطین کے اضلاع کی تعداد ابتدا میں تیرہ تھی۔ آہستہ آہستہ کم ہو کر سات ہوگئی۔ بعد میں پورے علاقہ کو دو اضلاع میں تقسیم کردیا جنوبی ضلع (یافہ) اور شمالی ضلع (حیفہ)۔ ۱۹۲۶ء میں یروشلم اور اسکے اردگرد کے علاقے کو یافہ سے الگ کرکے ایک خاص ضلع بنا دیا گیا۔

برطانوی اقتدار کے تحت علاقے کا رقبہ ۲۶۳۰۰۰ مربع کلو میٹر تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اس کی آبادی دس لاکھ تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۲۲ء کے دستورِ سیاسی کے مطابق اور ۴ مئی ۱۹۲۳ء میں دستور میں کی گئی ترامیم کے مطابق برطانوی ہائی کمشنر سب سے اعلیٰ فوجی اور ملکی اقتدار کا حامل تھا۔ وہی مجلسِ عاملہ کا صدر تھا۔ مختلف ممالک سے یہودی چھپ چھپا کر فلسطین میں داخل ہو کر انگریزوں کی مدد سے اپنی آبادیاں بسانے لگے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ۶ لاکھ ہوگئی۔ عام عرب آبادی سے ان کے تضادات شروع ہوگئے۔ جنہوں نے ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۹ء میں خونریز فسادات کی شکل اختیار کرلی۔ ۱۹۳۹ء میں لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ اہلِ عرب اور یہودیوں میں کوئی مصالحت نہ ہوسکی۔ یہودیوں کی دہشت پسند تنظیموں نے نظام حکومت کو معطل کرنے کیلئے تشدد کی کاروائیاں شروع کردیں۔ حکومت نے اس بنا پر ملک میں عرب اور اسرائیل دو ریاستوں کے قیام کا اعلان کردیا۔ فلسطین میں برطانوی اقتدار ۱۹۴۸ء میں ختم ہوگیا۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اپنی ایک آزاد اور خود مختار ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کردیا۔ اسرائیل نے کئی عرب علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ ۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے اپنے ہمسایہ عرب ممالک پر بھرپور حملے کرکے انکے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مصر کو غزہ کی پٹی اور جزیرہ نمائے سینا، اردن کو دریائے اردن کے کچھ قریبی علاقے اور یروشلم، شام کو قنیطرہ اور جولان کی پہاڑیوں سے محروم ہونا پڑا۔ رمضان ۷۳ء میں عرب ممالک اور اسرائیل میں ایک بار پھر جنگ ہوئی۔ عرب ممالک نے اپنے کئی علاقے اسرائیل سے واپس لے لئے اور مصر کیلئے نہر سویز کو بھی استعمال کرنے کی راہ کھل گئی۔ فلسطینی عوام اپنے علاقوں اور بیت المقدس کے شہر پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ کو ختم کرانے کیلئے تنظیم آزادی فلسطین کے تحت بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ [illegible] ہیں اُن کو عرب ممالک کی [illegible] علاقے آزاد کروا کر وہاں آزاد حکومت قائم کرنا [illegible]

دنیا کی استعماری طاقتیں یہودیوں (اسرائیل) [illegible] کو ان کے جائز حقوق اور ان کے علاقوں سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کو بڑی طاقتوں کی طرف سے اعلیٰ قسم کا اسلحہ دیا جارہا ہے۔ اسرائیل ایک [illegible] اور مضبوط دفاعی ملک بننے کی وجہ سے عرب ملک جو کہ منتشر ہیں۔ اُس کا مقابلہ کرنے کی [illegible] نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر ابھی تک فلسطین کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا۔

فلسفہ:۔ علوم عقلی، وہ علم جس کے ذریعے قدرت کو سمجھنے اور کائنات کے ساتھ انسانی تعلق کی تہ تک پہنچنے کی سعی و کوشش کی گئی ہو۔ ادب میں سب سے پہلے افلاطون نے فلسفہ کا لفظ استعمال کیا۔ جس نے اسے اپنے استاد سقراط سے منسوب کیا ہے۔ کئی صدیوں تک علم کا تمام میدان فلسفہ کی حدود میں شمار ہوتا رہا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں فلسفہ اور سائنس کے علوم کی حد بندی شروع ہوئی۔ آجکل وہ تمام علوم جو تجربات سے ثابت ہیں وہ کسی نہ کسی عنوان کے تحت سائنس میں شمار ہوتے ہیں۔ فلسفہ عمومی طور پر ان مضامین کے لئے بولا جاتا ہے جو تجربات یا اکتشافات کی صورت میں نمایاں نہیں ہیں۔ فلسفہ اور اسلامیات (دینیات) کو آسانی سے متمیز کرنا مشکل ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلسفہ انسانی استدلال کے ذریعے وجود میں آتا ہے اور اسلامیات الہیاتی نظام اور کلام ربانی کے تحت ہے۔

تاریخی اعتبار سے فلسفہ کو کئی شاخوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ مابعد الطبیعات‘ ایسے امور جو حقیقت مطلق سے بحث کرتے ہیں۔

۲۔ نیچرل فلسفہ‘ ایسے امور جن میں معاملات کی نوعیت‘ زمان و مکان‘ حرکت اور دیگر طبیعاتی نظریات زیرِ بحث ہوں اسے طبیعاتی سائنس بھی کہتے ہیں۔

۳۔ علم النفس‘ ایسے امور جو انسان کے شعور اور تحت الشعور سے اور ان سے متعلق مفروضات پر بحث کرتے ہیں

۴۔ علم منطق‘ اسے فن استدلال بھی کہا جاتا ہے لیکن جدید فلسفہ میں تجزیہ اور تحلیل کی ترقی یافتہ شکل ہے جس سے اکثر اوقات نئی نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔

۵۔ علم الاخلاق‘ یہ ایک نظریاتی علم ہے جو انسانی اخلاقیات سے بحث کرتا ہے۔ انسانوں کے سوسائٹی اور سیاسی گروہوں سے وابستہ رہنے سے جو محرکات اور استدلال پیدا ہوتے ہیں ان کا علم سیاسیات اور عمرانیات کہلاتا ہے۔ عملاً ان تمام موضوعات نے قدیم یونانیوں کے جذبہ تجسس کو ابھارا جن کے ذریعہ فلسفہ چھ سو سال قبل مسیح وجود میں آیا۔ بعض روایات کی رو سے تھیلس اس کا موجد ہے۔ اس کے بعد اینکسمنڈر، فیثا غورث، ہرکلیس اور پارمینڈیس ایسے مفکر اور فلاسفر پیدا ہوئے۔ ان کے بعد سقراط، افلاطون اور ارسطو عظیم ترین فلاسفر شمار کئے جاتے ہیں۔ جن کی فلسفیانہ موشگافیوں نے بعد کے زمانوں کے عالم، فاضل اور مفکر طبقہ کو متاثر کیا۔ قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کا سرکردہ تھامس ایکوئناس تھا۔

تحریک احیائے علوم کے بعد جدید فلسفہ نے یورپ میں جنم لیا اور دنیا کو ڈیکارٹ، لیبنز، اسپنوزا، ہوبس، لاک، برکلے، ہیوم، کانٹ، ہیگل، نطشے، شوپنہار، کئی اشٹرن، ہاربرٹ اسپنسر، ولیم جیمس، جان ڈیوی، برگساں، ہائیڈیگر اور برٹرینڈ رسل جیسے عظیم فلاسفر دیئے۔

تاریخ عالم میں فلسفہ کو چار مشہور ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ یونانی دور، جس کے امتیازی ستون افلاطون اور ارسطو ہیں جو

Marfat.com

۲۔ جدید یونانی دور، جس میں افلاطونی خیالات کو مشرقی روحانی افکار کے ساتھ مدغم کیا گیا۔
۳۔ از منہ وسطیٰ جس میں عیسائی مذہبی تصور کے ساتھ عقلی ضروریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی اسی دور کے فلسفہ پر یہودیوں اور عربوں کے خیالات کا اثر ہوا۔
۴۔ دورِ جدید، جس کی ابتدا ڈیکارٹ، لیبنز اور سپینوزا سے ہوئی۔

ان کے علاوہ چینی اور ہندوستانی فلسفہ بھی مغربی فلسفہ سے کسی طرح کم حیثیت نہیں اور ان دونوں ممالک میں بھی عظیم فلاسفر پیدا ہوتے۔

یونانی اثرات کے تحت نشو و نما پانے والی اسلامی فکر کو فلسفۂ اسلامی کہتے ہیں اسکی ضرورت علمائے اسلام نے اس لئے محسوس کی تھی کہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو ایک بلند ذہنی سطح پر اس وقت کے علمی تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے۔

اسلامی فلسفہ میں یونانی اثرات کے نفوذ کا راستہ حکمائے یونان کی فلسفیانہ تصانیف کے ترجموں سے ہوا۔ ان ترجموں کا آغاز حنین بن اسحٰق اور اس کے بیٹے اسحٰق بن حنین نے کیا۔ الکندی اور فارابی (م ۹۵۰ء) نے ان علوم کو باقاعدہ طور پر منضبط کیا۔ دونوں جملہ علوم و فنون پر دسترس رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے زیادہ تر منطق میں شہرت پائی۔ فارابی کے بنیادی نظریات پر ابن سینا (م ۱۰۳۷ء) نے اپنا زبردست نظامِ فلسفہ تعمیر کیا۔ سارے اسلامی فلسفہ میں حدوث یا امکانِ وجود کے تصورات جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ فلسفیانِ اسلام نے منطق اور فلسفہ کے مختلف موضوعات پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔

فلق

:۔ دیکھئے "الفلق"

فلک

:۔ دیکھئے "آسمان"

فلکِ نوح

حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی۔ حضرت نوحؑ نے اپنی امت کو راہِ راست پہ لانے اور کفر و شرک کے چھوڑانے پر کئی سال لگائے۔ لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ جوں جوں حضرت نوحؑ انھیں وعظ و نصیحت یاد کرتے توں توں وہ فسق و فجور کے میدان میں قدم بڑھاتے۔ آخر حضرت نوحؑ نے خدا سے دعا مانگی کہ الٰہی کہ الٰہی ان پر سخت عذاب نازل کر۔ خدا نے ان کی دعا قبول کی اور ایک کشتی بنانے کا ارشاد فرمایا۔ حضرت نوحؑ نے کشتی بنائی جس کا طول تین سو ہاتھ۔ عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔ اس کے تین درجے بنائے۔ ایک میں مرد۔ ایک میں عورتیں اور ایک میں دیگر حیوانات بٹھائے گئے۔ آخر پانی کا ایک سخت طوفان آیا۔

حضرت نوحؑ نے کشتی میں اپنے ماننے والوں اور ہر جاندار کا جوڑا جوڑا بٹھا دیا اور خدا کے بھروسہ پر کشتی کا لنگر اٹھا دیا کشتی بڑی بڑی موجوں کو چیرتی ہوئی کوہ جودی پر جا لگی۔ حضرت نوحؑ اتر کر ملک آرمینیہ کے ایک گاؤں میں جس کا نام ازگوری تھا آ بسے۔

قرآن مجید کی آیات ذیل میں اس کا ذکر آیا ہے:

" اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے ایما کے مطابق ایک کشتی بنا چلو اور نافرمان لوگوں کے بارے میں ہم سے کچھ سفارش نہ کرنا کیونکہ یہ لوگ ضرور غرق ہوں گے۔ چنانچہ نوحؑ نے کشتی بنانی شروع کی اور جب کبھی ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس سے ہو کر گزرتے ان سے تمسخر کرتے۔ نوحؑ (ان کے تمسخر کا یہ) جواب دیتے کہ اگر (آج) تم (ہم پہ) ہنستے ہو (اسی طرح) ہم (ایک دن) تم پر ہنسیں گے"

(س۔ ہود۔ ع ۴) آیت ۳۶،۳۷

(۲) " اس پر ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے زیرِ نظر اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آ جائے اور تنور (زمین سے پانی) اُبلنے لگے تو اس میں ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا لے کر سوار ہو جاؤ اور ان کے ساتھ اپنے گھر والوں کو (بھی) مگر ان میں سے جن کی نسبت پہلے سے (غرق ہونے کا) حکم ہو چکا ہے (ان کو نہیں) اور جن لوگوں نے نافرمانیاں کی ہیں ان کے بارے میں ہم سے کچھ عرض نہ کرنا (کیونکہ) ان کو (بہر حال) ڈوبنا ہے "

(س۔ المومنون۔ ع ۲)

فنا

:۔ اہلِ تصوف میں یہ اصطلاح عام مستعمل ہے۔ فنا فی اللہ، فنا فی الرسول۔

اہلِ تصوف میں فرقۂ خرازیہ کے بانی حضرت ابوسعید خرازؒ نے فنا اور بقا کی اصطلاحیں جاری کیں اور سمجھنے کیلئے دونوں کے متعلق جاننا ضروری ہے۔ شیخ علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں بعض صوفیاء کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے " فنا سے مراد اپنی ذات اور اپنے وجود کو مٹا دینا ہے اور بقا سے مراد خدا سے متحد ہو کر اس سے پیوستہ ہو جانا ہے یعنی اس میں حلول کر جانا۔" فنا کے معنی اسطرح بیان کئے جاتے ہیں کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام اشیاء فانی ہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے "جو کچھ بھی ہے اُس کو فنا ہونا ہے یعنی ختم ہو جانا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہے گی" (سورۃ الرحمٰن آیت ۲۷) فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کا صحیح معنی یہ ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت و بندگی میں اپنی زندگی کو گزار دے اور اس فانی دنیا کی تمام خواہشات سے منہ موڑ کر آخرت کی پائیدار اور باقی رہنے والی زندگی کیلئے عمل کرے اور اس طرح فنا فی الرسول کا معنی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی جو تعبیر اور تشریح نبی کریمؐ نے کی ہے۔ اس کے مطابق اپنی زندگی کو گزارے اور سنتِ رسول کا ہر پہلو مسلمان کی زندگی سے جھلکتا ہو۔

فن

۔ جمع فنون۔ ہنر، آرٹ۔ صناعت، طریقہ، طرز۔ یہ لفظ نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مصوری، سنگ تراشی، شاعری، موسیقی، رقص، معمار سازی وغیرہ اور بہت سے دوسرے فنون اس میں شامل ہیں۔ عمومی طور پر فن چار معنی میں بولا جاتا ہے۔

۱۔ کوئی خاص مدوّن علم یا اس کی کوئی شاخ۔
۲۔ وہ عمل، جس کے لیے کسی تدبیر کو استعمال کیا گیا ہے۔
۳۔ صنعت یا صناعت۔
۴۔ ہنر (آرٹ)

عربی کے اس لفظ کے مختلف معانی و استعمال اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ فن میں ساختگی و پرداختگی کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں ابن الندیم نے ایک کتاب " الفہرست " لکھی۔ اس میں فن، مختلف ابواب (علوم کی شاخوں) کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ " کشاف اصطلاحات الفنون " میں بھی فنون کے معنی علوم کے ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں فن کے معنی خاص آرٹ کے نہیں۔ اگرچہ ایک معنی یہ بھی ہیں۔ انگریزی لفظ ART کے لیے عربی میں زخرف یا صناعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ابن رشیق نے اپنی کتاب " العمدۃ فی صناعۃ الشعر " میں اور چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی میں بھی شاعری کو صناعۃ کہا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں لفظ فن جدید معنوں میں عمارتگری، نقاشی، مصوری وغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

Marfat.com

اکثر یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن سے ہماری نگاہیں لطف اندوز ہوتی ہیں. جیسے کسی فنکار کی تصویر، کسی مجسمہ ساز کی تخلیق، کسی ماہر تعمیر کی تعمیر کردہ جاذب نظر عمارت. یورپی ممالک نے فن میں خاصی ترقی کی ہے. قدیم زمانے میں اطالیہ کے باشندے فن میں کمال رکھتے تھے. چین، ایران اور روم کے لوگ بھی مخصوص فنون میں بلند مقام رکھتے تھے. مسلمانوں نے بھی مختلف فنون میں بے مثال کارنامے سرانجام دیے ہیں.

فن کا مقصد محض حظ و مسرت نہیں بلکہ تسخیر ہے. اسلام نے جس طرح زندگی کا تصور بدل دیا، اسی طرح فن کا تصور بھی بدل دیا. مسلمانوں کے نزدیک فن، نقل نہیں بلکہ عمل مطلق ہے. مسلمانوں کی نظر میں فن کمال کا ایک شعبہ ہے. اگرچہ بہت سے مصنفین نے فنون اور صنائع میں فرق نہیں کیا بلکہ عملی فنون پر زیادہ زور دیا ہے.

زندگی میں ہر عمل ایک معنی کا طلب گار ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی سی بھی کوشش صحیح نہیں. معنی کی یہ جستجو مسلم فن کاروں کی اہم غایت رہی ہے. مسلم فن کار بے معنی اور بے مقصد فن کا حامی نہیں ہو سکتا. وہ فطرت پرستوں کی طرح فطرت کا نقال نہیں. وہ اپنے فن کو اوّل تو اللہ تعالےٰ کی بڑائی اور تقدیس کے لیے وقف کرتا ہے یا پھر مخصوص مگر اعلیٰ اور مفید ضرورت کے لیے جن کی ایک غایت زندگی کے عملی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے.

مسلمانوں میں بعض فنون کوئی فروغ حاصل نہ کر سکے کیونکہ دنیا میں ہر تہذیب ایک مخصوص مزاج کی حامل ہوتی ہے. مسلمان کا خاص مزاج، ذوق کے بعض میلانات کا تو طالب ہوتا ہے لیکن بعض سے بیزار اور یہ سب کچھ اس تہذیب کے مخصوص عقائد کی اتباع کی وجہ سے ہوتا ہے. بعض تہذیبوں میں بت تراشی اور مجسمہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہے مثلاً ہندوؤں میں. بعض میں تعمیر کو افضلیت دی جاتی ہے مثلاً رومی اور اسلامی تہذیب میں. اسی بنا پر مسلمانوں نے بعض فنون سے اجتناب کیا. مثلاً جانداروں کی مصوری سے، شبیہ سازی سے جو خالقیت کے عقیدہ سے متصادم ہے. مسلمانوں کے خصوصی فنون کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے.

۱۔ فن تعمیر
۲۔ فن نقاشی، فنون آرائش کتاب و تعمیرات.
۳۔ فن خطاطی.
۴۔ شاعری.

موسیقی بطور علم اور بطور فن مسلمانوں میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے کبھی ترتیل میں، کبھی نعت و قوال میں، کبھی سماع میں. کئی مسلم اکابرین نے اس فن پہ کتابیں بھی لکھی ہیں. ابن خلدون نے اسے "صناعت شریف" لکھا ہے. اسی طرح مسلمانوں نے تمثیل. (ڈرامے) سے اجتناب کیا ہے. علامہ اقبالؔ نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس میں اپنی ذات کو کسی کا قائم مقام بنا کر پیش کرنا پڑتا ہے اور یہ شرف خودی کے تقاضے کے خلاف ہے.

اسلامی آرٹ بہت سی تہذیبی وراثتوں کے میل ملاپ سے وجود میں آیا ہے ان میں یونانی تہذیب سرفہرست تھی. جس کے زیر اثر بوزنطی سلطنت کے جنوبی صوبے تھے. دوسری ایرانی تہذیب جو اسلام سے پہلے ساسانی حکمرانوں کے زیر سایہ ایک مقام بنا چکی تھی اوّلین اسلامی آرٹ جامد نہیں رہا. کیونکہ یہ مختلف قوموں کے فنون سے اخذ و استفادہ کرتا رہا. جذب و تحلیل اور تغیر و تبدل کے یہ مظاہر مشرق قریب کے ان مسلم ممالک میں دیکھے جا سکتے ہیں جو کہ اسلامی دنیا کا مرکز ہیں. فن کے مشرقی رجحانات کی مقبولیت بہت پہلے واضح ہو گئی تھی. عراقی سنگ تراشی میں ایشیائی آرٹ کی گل کاری نے رواج پایا. سلجوقیوں کے زمانے میں ترک فاتحین کا ذوق و فکر فن کے تمام رجحانات پر چھا گیا.

... [illegible] ... کے تحفظات میں تبدیلی پیدا کی۔ [illegible] مساجد کی تعمیر میں ہوئی جو کہ دسویں صدی ہجری [illegible] کے فن کاروں کی پیروی کرتے ہوئے بنائی گئی تھی۔

اسلامی فن کے ادوار اور ان کے خصائص

اسلامی فن کی تشکیل ان ممالک کے تحت فتح عمل، رد عمل اور مشترکہ مفروضات سے ہوئی جہاں اسلام نے غلبہ حاصل کیا۔ اسلامی فن مغربی ترکستان، افغانستان و شمال مغربی ہندوستان، جنوب مشرقی ہندوستان، بہار، بنگال، انڈونیشیا، ایران، عراق، عرب، شام، مصر، مراکش، شمالی سوڈان، شمالی افریقہ، نائجیریا میں پھیلا۔ مسلمانوں کا فن بحر ہند کے سواحل کے ساتھ ساتھ اور عربوں کی تجارت کے طفیل میں مشرقی افریقہ، سری لنکا، سماٹرا، جاوا، بورنیو اور چین میں پہنچا۔ اسلامی فن کے اہم ترین ادوار یہ ہیں۔

خلافت راشدہ

مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، دمشق، فسطاط اور قیروان کے علاقوں میں قدیم عمارات اور ان کے سامان آرائش میں کچھ عرصہ بعد تجدید ہو گئی تھی۔ اس لیے ان کی شہادتیں کتب سے ملتی ہیں۔ جو عموماً بہت اختلافی ہیں۔

اموی فن

پتھر کی عمارات، ستون پر گول محرابیں، چھتیں، نیم یونانی طرز کی دیواروں پہ تزئین، پارتھیائی شامی طرز کی گچ کا ابھرواں کام جس کی مثالیں، دمشق، بیت المقدس، مدینہ منورہ، بصرہ وغیرہ کی مساجد، صحرائے شام کے محلات میں ملتی ہیں۔

عباسی فن

۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک۔ خصوصیات میں، عمارتیں جن کی بھاری بھر کم دیواریں تھیں، چوکور پلپائے جن کے کناروں پر پتلے ستون، تکیلی محرابیں اور لداؤ چکر دار مینار، رومی ساسانی طرز کے محلات، آرائش کے لیے گچ کی استر کاری، دیواری تزئین اور مرقع کشی جو بوزنطی اور ساسانی روایت سے ظہور پذیر ہوئی۔ اہم ترین یادگاروں میں المنصور کا شہر بغداد، نویں صدی کا پایۂ تخت سامرا وغیرہ۔

مغربی اموی اور اندلسی فن

اندلس کے اموی خلفاء کے دور (۷۵۶ء - ۱۰۳۱ء) میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور اس نے بعد کے شاہی خانوادوں کے عہد میں مزید ترقی کی۔ ترقی کے یہ مراحل اندلس میں پندرھویں صدی تک طے ہوتے رہے۔ اس دور کی اہم خصوصیات میں نعل نما محراب اور ہلالی کمان پتلے پتلے ستونوں پر یا پست چوکور پلپائیوں پہ، ان گتھی ہوئی محرابوں پہ گنبد، مقرنس چھتوں اور دیواروں پر طغرائی نقش و نگار، گچ کی رنگین استر کاری یا لکڑی میں تراشے ہوئے نقوش اور پچی کاری وغیرہ۔ اہم ترین یادگاروں میں قرطبہ کی جامع کبیر، مدینۃ الزہرا اور امیریہ کے محلات وغیرہ۔

فاطمی فن ۹۵۴ء سے ۱۱۷۱ء تک۔ مصر اور شام میں اموی اور عباسی فنون کا لطیف امتزاج اور مزیدار ارتقا یافتہ شکل، جس کی تکمیل میں زیادہ تر پتھر استعمال ہوا۔ اس دور کی اہم خصوصیات میں ستونوں پہ اونچی ڈاٹ کی ہلکی دار کمانیاں، لکڑی گچ کے کھانچے، ابتدائی طرز کی مقرنس تزئین اور مشبک یا منجر جالیاں۔ اہم یادگاروں میں جو کہ قاہرہ میں ہیں، قلعے کے برج، دمدموں کے جھتے، جامع الازہر، حاکم، اقمر، مسجد رقیہ وغیرہ۔

Marfat.com

فن مصوری

کتاب اللہ، احادیث رسول اور علمائے اسلام کی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تصویر کشی ناجائز ہے۔

قرآن مجید کی جن آیات سے یہ استدلال نکالا جاتا ہے ان میں سورۃ آل عمران کی آیت ۶، سورۃ الاعراف کی آیت ۱۱، سورۃ المومن کی آیت ۶۴، سورۃ الحشر کی آیت ۲۴، سورۃ التغابن کی آیت ۳ میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت کے واضح دلائل و براہین بیان کئے گئے ہیں۔ احادیث مبارکہ جو بخاری، مسلم اور احمد بن حنبل سے روایت کی ہیں۔ ان میں بھی تصاویر کشی کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ آنحضرت کریم کے دور میں تصویر کشی کی جو حرمت ملتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں شرک کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اس حرمت سے بت پرستی سے باز رکھنے اور خداوند کریم کی شان خالقیت سے مشابہت اختیار نہ کرنا مقصود تھا۔ اسی بنا پر حرمت سے متعلق احادیث کی تشریح میں فقہا کے درمیان اختلافات بھی رہے ہیں۔ موجودہ دور کے علما اور مفسرین میں سے شیخ محمد عبدہ اور شیخ عبدالعزیز شاویش تصویر کے جواز کے قائل ہیں۔ اگر اس بات پر بھی اتفاق کرلیا جائے کہ تصویر کے لئے حرمت کا واضح حکم ہے پھر بھی مسلمانوں کے ہاں اس فن کا رواج ہر دور میں رہا۔ اس لئے اس بحث میں الجھنے کی بجائے کہ اسلام میں تصویر کا جواز ہے یا نہیں چونکہ خالصتاً علمی اور فقہی مسئلہ ہے ہم معلوماتی نقطۂ نظر سے فن مصوری میں مسلم فنکاروں کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں عمارات کی دیواروں

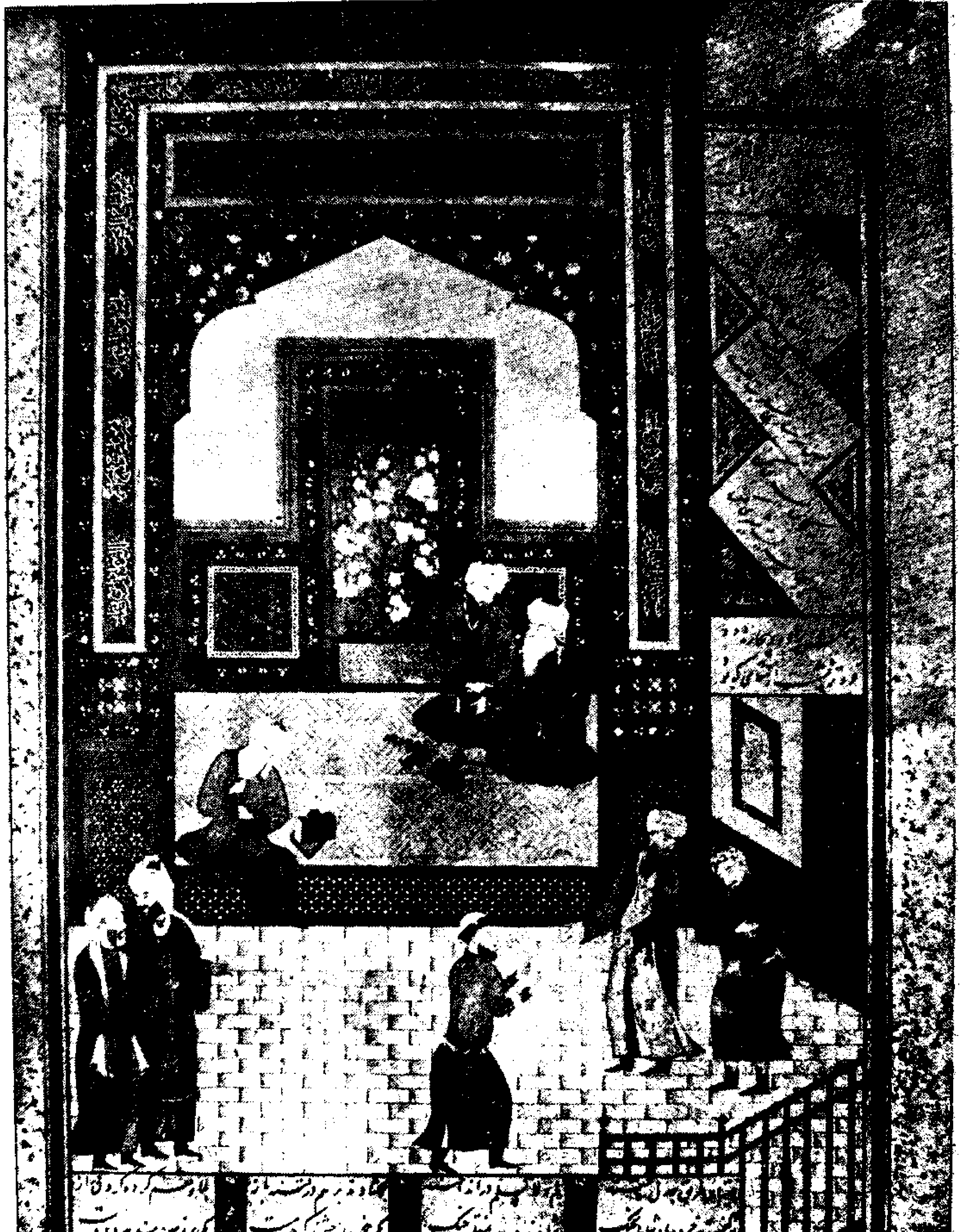

[illegible] ایک صفحہ کا [illegible] [illegible]ستان؛ در کتاب خانۂ مصریہ، قاهره

Marfat.com

پر جانداروں کی تصاویر کا مشاہدہ قصیر عمرۃ اور سامرا وغیرہ یادگاروں سے کیا جا سکتا ہے۔ ہند اور ایران میں بھی تصویر کے فن نے جلا پائی لیکن حرمت کی وجہ سے تصویر کشی مسلمانوں کے ہاں مذہبی زندگی کا ایک جزو تو نہیں بنی۔ چنانچہ قرآن مجید، مذہبی عمارات مثلاً مساجد اور مقبرے تصویروں سے الگ رکھے گئے۔ ان وجوہ کی بنا پر مسلمانوں میں تصویر کا فن عروج حاصل نہ کر سکا جو اُسے یورپ میں حاصل ہے۔

اسلام سے قبل بعض ممالک میں مصوری کا مقصد صنم پرستی تھا۔ مصور اپنے جذبۂ پرستش کی تسکین الوان اور خطوط کے ذریعے کر لیتے تھے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی میں مصوری کے نشو و ارتقا کا آغاز ہوا تو اسلام کے عقیدۂ توحید کی وجہ سے مصوری کی معنویت اور صورت دونوں میں انقلاب آیا۔ کیونکہ اسلام کے عقیدۂ توحید سے ہر قسم کے شرکانہ اور بت پرستانہ عقائد کی نفی ہوتی ہے۔ مصوری صنم پرستی کی بجائے فکری اور تخلیقی مقاصد کے لیے کی جانے لگی اور یہ روش شروع کے دور سے کر اب تک جاری ہے۔ عجمی اقوام کے اسلام میں داخلے سے اس فن کو مزید جلا حاصل ہوئی کیونکہ یہ اقوام اسلام لانے سے قبل اپنی مخصوص تہذیبوں کی وجہ سے فن مصوری میں بھی مہارت اور کمال رکھتی تھیں۔

اسلامی فن مصوری میں ایران کا اہم حصہ ہے۔ حال ہی میں ایرانی مصوری کی جو قدیم ترین یادگار دستیاب ہوئی ہے وہ قابوس بن وشمگیر [illegible] کا مخطوطہ ہے جو ۹۰ اشکال تصاویر پر مشتمل ہے۔ ان کتابی تصاویر میں سے بعض سامانی [illegible] (۳۹۰ھ) کی ہیں اور بہت جاذب توجہ ہیں۔ مغلوں کی فتوحات کے بعد وہاں [illegible] میں ارتقا ہوا اور اس پر چینی طرز کا سایہ ہے۔ اس دور کی یادگاروں میں ساتویں صدی کے اواخر کے منافع الحیوان کے مخطوطات جو نیویارک کے کتب خانہ پیرپونٹ مورگن [illegible] ہیں اور استنبول [illegible] اور معراج نامہ (۷۳۰ھ) کے باقی ماندہ اجزا۔ اس دور میں [illegible] زیادہ [illegible] رنگ گہرے اور شوخ تھے۔ دسویں صدی کے وسط [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے باکمال فن کار [illegible] جنہوں نے علی الترتیب ابو سعید ایلخانی (۷۱۶ تا [illegible]) (۷۵۷ تا [illegible]) کے عہد میں تربیت پائی [illegible] شیراز سے نکال دیا۔ ان کے دور حکومت کے [illegible] مصوری کی قدیم ترین مثالیں [illegible] ہیں۔

Marfat.com

پروفیسر سلیم اختر
تین بڑے نفسیات داں
۵/-

سیفی سوہدروی
تاریخ اقوام عالم (اوّل)
۴/-

ایچ جی ویلز / ستار طاہر
لو سٹوری
۳/-

ایچ جی ویلز / مظفر اقبال
اولیور سٹوری
۴/۵۰

عبدالرحمٰن عبد
داستانِ ہٹلر
۳/-

ابو ضیا اقبال، محمد ظفیر ندوی
راسپوٹین
۳/-

علی اکبر
اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں
۳/۵۰

کے ایل گابا
پیغمبرِ صحرا
ترجمہ:- پروفیسر احمد الدین مارہروی
۴/-

سٹاکسٹ برائے کل پاکستان
مکتبہ شاہین۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

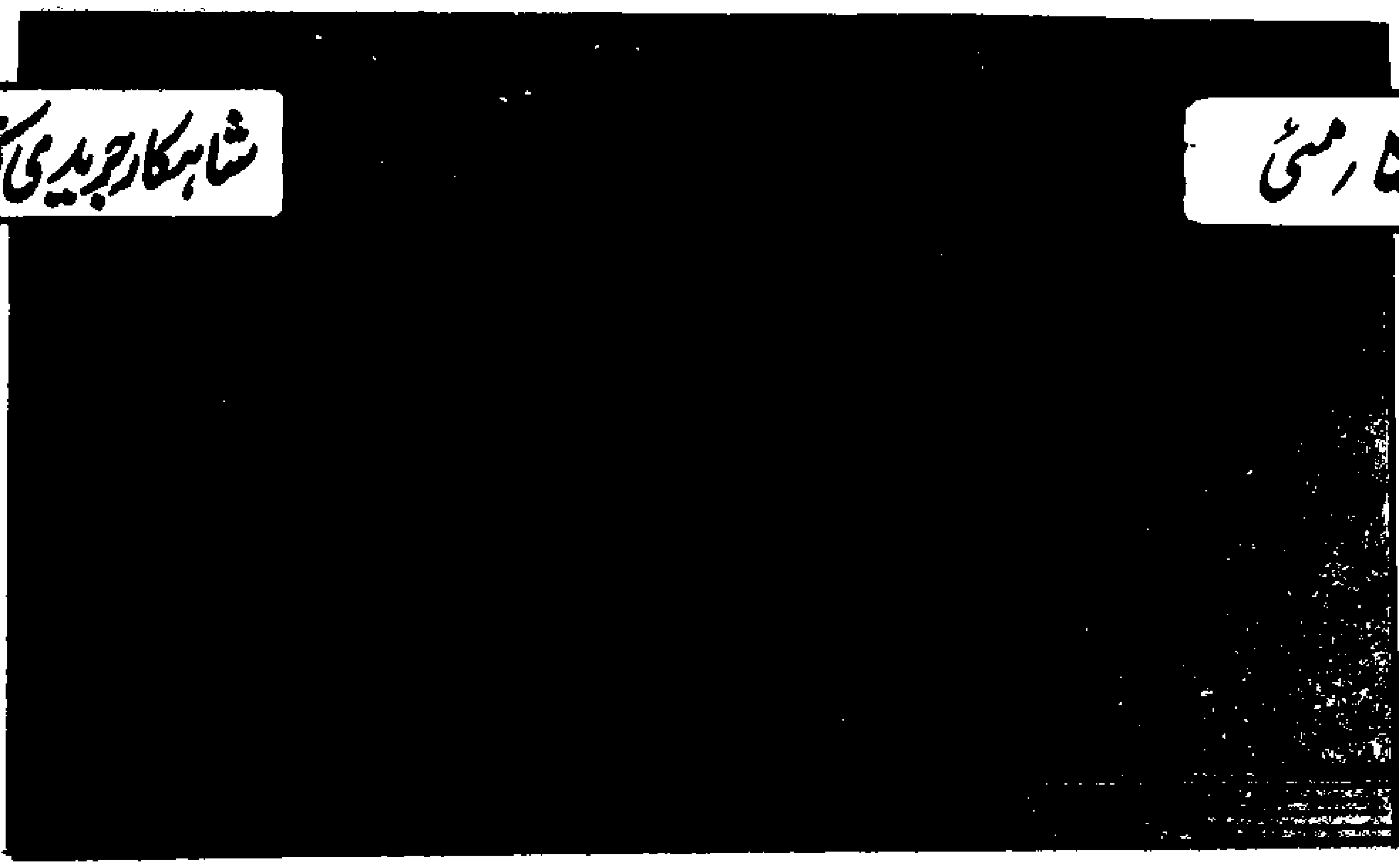

اس حصّے کے مندرجات کی ایک جھلک

ہندوستان — بُدھ مت، جین مت، چندرگپت، اشوک، راجپوت

چین — دوسرا دور۔ کنفیوشس، لاؤتسی، موتسی، شاہی، بُدھ مت، ٹانگ خاندان۔

منگول — چنگیز خان، امیر تیمور

جاپان — اخلاق، قانون، عہدِ ترقی

اسلام — صحرائے عرب میں ظہور، خلافتِ راشدہ، بنی اُمیّہ بنی عباس، اسلام افریقہ میں، سپین میں، ایران میں، ترکی میں۔

(ھندوستان میں مسلمانوں کی آمد تک)

Marfat.com

ہر مہینے، آخری جمعے کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

میں ملتان روڈ پر چوبرجی کی طرف جا رہا تھا کہ دیوار پر لکھے ہوئے ایک نعرے نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرالی۔ نعرہ تھا۔ "پاکستان کا مطلب کیا ......"

میں لا الہ الا اللہ کی وادیوں میں سفر کرتا ہوا اتنی دُور پہنچ گیا کہ مجھے سڑک پر ٹریفک کے ہجوم کا خیال تک نہ رہا۔ اور ایک کار کے تیز ہارن نے مجھے تصورات سے باہر نکالا۔

میرا خیال ہے قارئین "اسلامی" کو ان چند لمحات میں اپنے طے کیے ہوئے تصوراتی سفر کی داستان سناؤں۔ مئی کی اُن تپتی دوپہروں کا سماں میری نظروں میں گھوم گیا۔ جب برّصغیر کی جنگِ آزادی کا آغاز ہوا۔ برطانوی سامراج خوابِ غفلت میں مخمور مسلمانوں کے جسموں پہ اپنے پنجے گاڑ رہا تھا۔ کہ چند مجاہد اٹھے اور میسور کے سلطان، ٹیپو سلطان شہید کی قیادت میں برطانوی سامراج سے ٹکرا گئے۔ سلطان ٹیپو ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم میں شہید ہوئے۔ آزادی کا یہ سفر جاری رہا اور مجاہدینِ اسلام انھی راہوں پر بڑھتے رہے۔ بالاکوٹ کی وادیوں میں خانوادۂ شاہ ولی اللہؒ کے تربیت یافتہ دو عظیم مجاہد سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید اسلامی خلافت کا پرچم بلند کرتے ہوئے ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو جامِ شہادت نوش کر کے امر ہو گئے۔ چند مفاد پرست ان دونوں معرکوں میں اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کرنے کی کوششوں میں مجاہدینِ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بنتے رہے۔ آزادی کا جذبہ فروزاں ہوتا رہا۔ بالآخر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو منظم طور پر مجاہدینِ اسلام نے انگریز سامراج کے پاؤں میں ایسی بیڑیاں ڈالیں کہ اُسے پاؤں سمیٹتے ہی بنی۔ بالآخر علامہ اقبال اور قائدِ اعظم جیسے عظیم راہنماؤں کی قیادت میں مسلمانانِ ہند اپنی منزل کو پا گئے۔ پاکستان، پاک لوگوں کا وطن، دنیائے عالم کے نقشے پر اُبھرا۔

ماضی کی تاریخ کے یہ چند اوراق قارئین "اسلامی" کے لیے اس وجہ سے اٹھائے ہیں کہ ہم اپنے بھُولے ہوئے سبق کو دوبارہ پڑھیں اور پاکستان میں لا الہ الا اللہ کی سربلندی کے لیے اپنی زندگیوں کو کھپا دیں کیونکہ یہ زندگی بھی تو اسی کی امانت ہے جس کے نام کی سربلندی مطلوب ہے۔

اس قسط میں ایسے ہی ایک عظیم مجاہد اور مردِ مومن کے تفصیلی احوال کا تذکرہ ہے جو زندگی بھر اُمّتِ مسلمہ کے درد میں تڑپتا رہا۔ یعنی فیصل بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ۔

آخر میں ادارۂ شاہکار کی طرف سے تعزیت کے چند کلمات ہیں، کہ اُردو کے معروف شاعر، نقاد، ادیب اور ماہنامہ فاران، کراچی کے مدیر مولانا ماہر القادری ۱۲ مئی کو جدّہ میں انتقال کر گئے۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

سیّد امتیاز حسین

(مدیر)

خدمتِ اسلام کی عاجزانہ مگر منظم کاوش

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار (29)

تاریخ اشاعت: جمعہ ۲۶ مئی ۷۸ء

قیمت فی قسط -/۳ روپے

سالانہ معہ رجسٹری -/۳۰ روپے

مدیر اعلیٰ

سیّد قاسم محمود

مدیر

سیّد امتیاز حسین

طابع: محمد سلیم۔ معارف پرنٹرز، داتا دربار۔ لاہور

دیگر شائع شدہ کتب کا اعلان آخری صفحہ پر ملاحظہ کیجیے

ٹیلیفون: ۳۵۴۱۰۳

تار: "شاہکار"

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

مکتبۂ شاہکار

پوسٹ بکس ۱۷۵۴۔ لاہور

Marfat.com

... ابوا جیحانی صفوی دربار کے اسلوب مصوری کے نمونے خواجو کرمانی کی تین ... [illegible] ... تبریزی نے لکھا اور استاد ... [illegible] ... ایک شاعر جنید نے اسے مصور کیا۔ جنید کے کارنامے نفاست و نزاکت کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے یادگار رہیں گے۔ یہ گویا پائے تخت کی درباری مصوری کے اس اسلوب کا آغاز تھا جو تیموریوں کے ماتحت بغداد سے ہرات تک (۸۲۰ تا ۹۰۷ھ) اور پھر کسی وقفے کے بغیر تبریز (۹۰۷ تا ۹۵۵ھ)، قزوین (۹۵۵ تا ۱۰۰۸ھ) اور اصفہان (۱۰۰۸ تا ۱۱۳۵ھ) کے صفوی پائے تختوں تک ملتا ہے۔ اس تمام زمانے میں ایرانی مصوری کا سلسلہ مسلسل ارتقا میں رہا۔ اس دور کے مصوروں کو بادشاہوں اور سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس زمانے کے معروف مصوروں میں بہزاد، میرزا علی، میر سید علی، مظفر علی، رضائے عباسی، افضل الحسینی، قاسم علی اور محمد یوسف شامل ہیں۔ جن کا طرز نقاشی و مصوری طویل عرصے تک جاری رہا۔ ان کی یادگاروں میں "خسرو شیریں" جو کہ فریئر گیلری واشنگٹن میں ہے، "موزۂ گلستان کا شاہ نامہ (۸۳۳ھ)"، خمسۂ نظامی کے مخطوطے مختلف ادوار کے شاہنامہ کے مخطوطے، ملک الشعرا فتح علی خاں صبا کاشانی کی رزمیہ مثنوی "شہنشاہ نامہ"، کلیلہ و دمنہ کے مختلف نمونے، مخطوطے شامل ہیں مسلمانوں میں کتابی مصوری کے ارتقا میں کئی عناصر کا حصہ ہے جب ایران میں ۶۴۲ء میں اسلام مستحکم ہو گیا تو مانی مذہب کے بہت سے پیروکار بھی اسلام میں داخل ہوئے جن میں مانی مذہب کے صحیفوں کو تیار کرنے والے مصور اور خوشنویس بھی تھے۔ اسی وجہ سے کتابت اور نقاشی نے اس نہج پر مسلمانوں میں فروغ حاصل کیا۔

دوسرا عنصر بھی غیر ملکی ہے۔ جو اسلامی عہد میں مصوری پر اثر انداز ہوا۔ چین کے ساتھ تعلقات کا آغاز نبی کریمؐ کے دور سے ہو گیا تھا۔ عربوں اور چینیوں میں تجارت کے روابط بڑھنے شروع ہوئے جو تیسری صدی ہجری تک جاری رہے۔ عربوں میں چینی اشیا خصوصی طور پر چینی منقش برتنوں کا استعمال رائج ہوا۔ اسلامی مصوّر مخطوطات (جن میں تاریخی، ادبی اور فنی کتابیں شامل ہیں) کو چینی روایات کے مطابق مصور کیا۔ مغلوں کے حملے کے ساتھ ساتھ چینی اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگے کیونکہ ان حملہ آوروں کے ہمراہ چینی ماہرین میں مصوّر اور کاتب بھی تھے۔

تیسرا عنصر، اسلامی ادب و تاریخ کی ذاتی خصوصیت ہے کہ جن میں واقعات کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ خود بخود ان کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ شاعر، مؤرخ کے علاوہ مصور بھی ان کو اپنی تصاویر میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پاک و ہند میں مسلمانوں کے فنِ مصوّری کا آغاز غزنی کے یمینی سلاطین کے عہد (۹۷۶ء) سے ہوتا ہے اسی زمانے کا کلیلہ و دمنہ کا ایک مخطوطہ کتاب خانۂ ملی پیرس میں موجود ہے۔ مغلیہ دورِ حکومت میں فنِ مصوّری کو عروج حاصل ہوا۔ مختلف محلات کی منقش دیواریں اور کتب خانوں میں موجود مخطوطے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ سلطان غیاث الدین (۱۴۶۹ء تا ۱۵۰۰ء) کے "نعمت نامہ" سے اسلوبِ فن کا نمونہ سفینے سے منفرد معلوم ہوتا ہے۔ سولہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے تمام بادشاہوں کے دربار سلاطین تیموریہ کے اسلوب سے آراستہ تھے۔ دکن میں لکھے ہوئے با تصویر شاہنامۂ خمسۂ نظامی اور مثنویاتِ امیر خسرو کے متعدد مخطوطات میں سلاطین تیموری کے عہد کا ایرانی اسلوب غالب نظر آتا ہے لیکن ان میں ہندی خدوخال کی آمیزش بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نسخے ہندوستان کے بعض نجی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ شمالی ہندوستان میں مغل شہنشاہ بابر اور ہمایوں نے پہلے تو ہرات کا تیموری اسلوب متعارف کرایا پھر شاہ طہماسپ اول کے دربار کا ایرانی اسلوب اکبر کے عہد میں ایرانی، ہندی، یورپی انتخابی اسلوب وجود میں آیا لیکن ان پر دبستان طہماسپ کا صفوی رنگ غالب رہا۔ شہزادہ سلیم کے دربار میں الٰہ آباد کے مقام پر ۱۶۰۰ء میں ایک ایرانی استاد آقا رضا کے

لڑکیاں اور آتش بازی، بینا نوری، لکھنؤ، تواحّ ۱۷۸۰ء

ذریعے ایک نئے اسلوب نے جنم لیا۔ یہ راجپوت اسلوب سولہویں صدی میں مختلف سرچشموں سے ارتقا پذیر ہوا تھا۔ مصوری کا یہ علاقائی عوامی اسلوب ۱۵۸۰ء سے ۱۵۹۰ء تک کافی مستحکم اور ۱۶۱۵ء کے قریب مقبولِ عام ہوا۔

اکبر کے عہد میں جن صدہا فارسی مخطوطات کو مصوّر کیا گیا ان کے [illegible] تھے۔ لیکن ان میں خصوصاً وقائع و سوانح، تاریخ، کہانیاں اور افسانے [illegible] فارسی اور سنسکرت رزمیے شامل ہیں۔ اکبر کے زمانے کا سب سے پرانا مصور مخطوطہ کہانیوں کی ایک کتاب "انوار سہیلی" ہے جو لنڈن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں موجود ہے اس پر [illegible] ۱۵۷۰ء کی تاریخ درج ہے۔

اکبر کے بیٹے اور جانشین جہانگیر کے عہد (۱۶۰۵ تا ۱۶۲۷ء) میں مغل مصوّری [illegible] نقطۂ عروج پر تھی اسلوب کا تغیر اگرچہ تدریجی ہے، لیکن اکبری اور جہانگیری عہد کی تصاویر میں نمایاں فرق ہے۔ اکبری عہد کی تصاویر میں اضطراب پایا جاتا ہے اور رنگ ہلکے ہیں جہانگیری عہد کی تصاویر میں سکون اور ٹھہراؤ ہے اور بہتر رنگوں کے امتزاج میں لطافت اور نفاست عیاں ہے۔ عہد شاہجہانی اور عہد جہانگیری کی مصوری میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اورنگ زیب کے عہد (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء) میں مذہبی اصلاحات نے اس فن کا درجہ یہاں تک کم کر دیا کہ تصویریں محض سیاسی واقعات کی دستاویزی تمثیلات ہو کر رہ گئیں۔ اور

Marfat.com

مغل شہزادے (شجاع، اورنگ زیب، مراد) بعہد شاہجہانی۔ نواح ۱۶۳۷ء

Marfat.com

فنِ مصوری شاہی سرپرستی سے محروم ہو گئی لیکن بہت سے مصور اورنگ زیب کی اولاد کے ہاں اور دوسرے امراء اور سپہ سالاروں کے ہاں ملازم ہو گئے۔ اورنگ زیب، بہادر شاہ ظفر اور فرخ سیر کے دَور کی مخارجات کے بہت سے مرقع با آسانی پہچانے جا سکتے ہیں کہ ان میں خاکی مائل سبز فوجی وردیوں کا غلبہ ہے اور اکثر قدرتی مناظر بھی یکساں نظر آتے ہیں۔

محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے دربار میں مغل مصوری کا دوبارہ احیا ہوا۔ لیکن اُس پر رومانیت اور لذتیت کا غلبہ تھا۔ فن میں روایت پرستی آ گئی۔ حرم سرا کے مناظر، معاشقے اور رومانوی افسانے مصور کئے جانے لگے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال سے فنِ مصوری میں بھی انحطاط آنا شروع ہوا کیونکہ اس وقت تک تو فنِ مصوری کو شاہی سرپرستی حاصل تھی لیکن اب سلطنت کا نظام درہم برہم ہوا تو، مغل دربار مفلسی کی بنا پر مصوروں کی سرپرستی نہ کر سکتا تھا۔ مصور مختلف صوبوں کے نوابوں اور ہندو راجاؤں کے ملازم ہو گئے۔ اس دور میں مصوری کی روح پژمردہ اور نظر تنگ ہو گئی۔

نادر شاہ کے حملے سے پنجاب، ایران اور پھر افغانستان کا حصہ بنا۔ اس دور میں مغلوں کے آخری دور کے اسلوب اور صفوی ایرانی اسلوب کے امتزاج سے ایک نیا اسلوب سامنے آیا۔ اس طرح سے فنِ مصوری کو کچھ زندگی ملی۔ پنجاب پر سکھوں کے تسلط سے مصوری کا فن کشمیر میں داخل ہوا۔ یورپ کے بارونق طرز سے متاثر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز کے ایرانی اسلوب کے اثرات سے کشمیری اسلوب کی شکل برآمد ہوئی۔ اس اسلوب کے متعدد نسخے بالخصوص شاہنامہ، نظامی اور جامی کے مخطوطات کی شکل میں دستیاب ہیں۔ پاک و ہند کے علاقوں میں ۱۹۴۷ء تک اس فن میں ارتقاء کی بجائے انحطاط و زوال ہوا۔

پاکستان میں فنِ مصوّری

جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔ تخلیقی فنون میں فنِ مصوّری کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ پاکستان میں فنِ مصوّری مختلف قدیم و جدید ثقافتی عناصر کے امتزاج سے ظہور میں آتی ہے۔ پاکستان میں فنِ مصوّری نے جدید اثرات کو بھی جذب و قبول کیا ہے۔ حکومت کی سرپرستی، صنعتی اور کاروباری ضروریات کی بدولت فنِ لطیف (FINE

حیدر آباد کی شہزادی

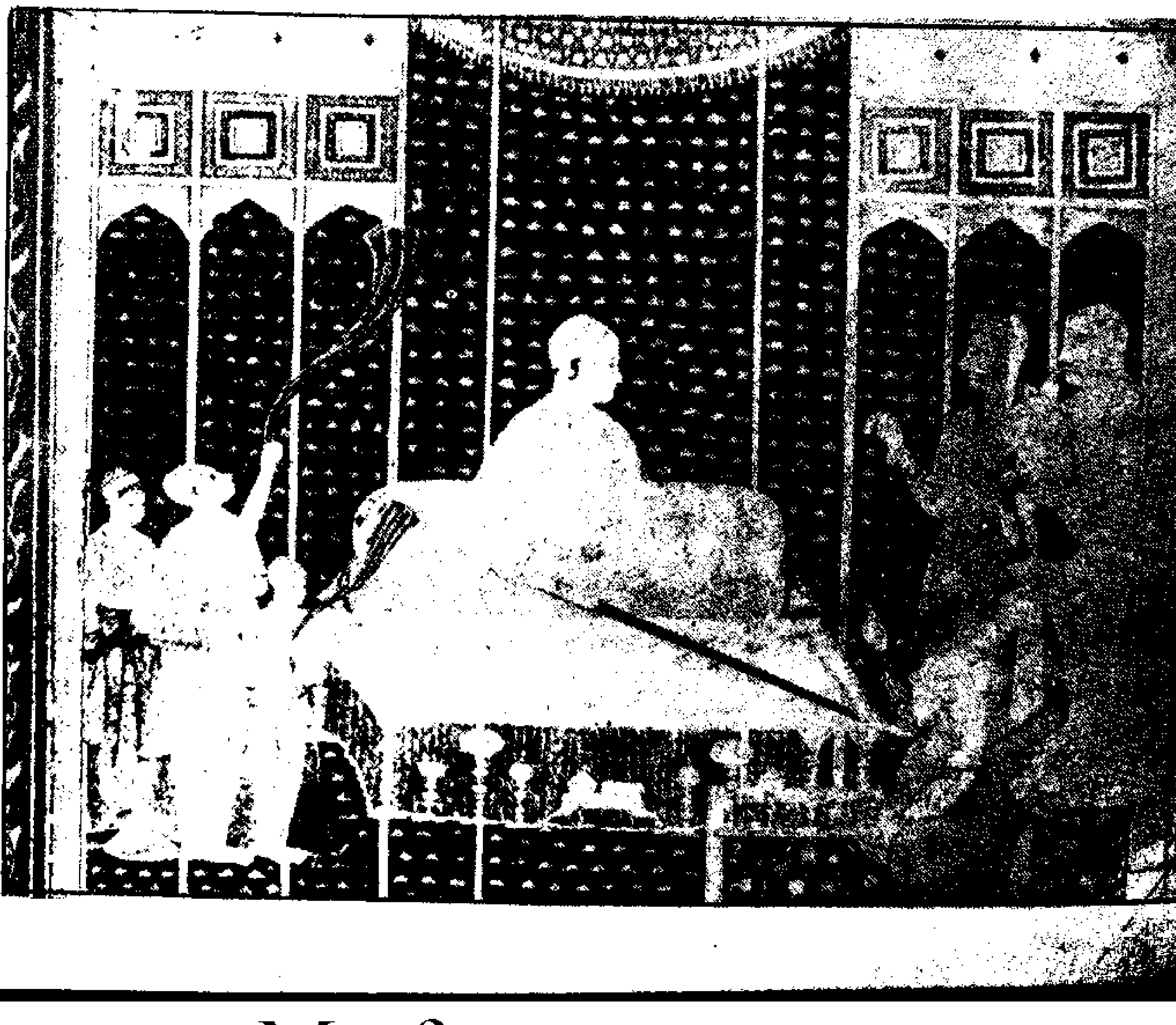

ایک کم سن شہزادہ
بیجاپور
نواحی ۱۵۸۵ء

Marfat.com

عملِ صادقین

Marfat.com

[illegible] COMMERCIAL ART دونوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ مصوری کے فروغ کے لئے حکومت کی طرف سے مختلف شہروں میں آرٹس کونسلز اور دیگر ادارے قائم ہیں۔ لاہور میں پاکستان کا قدیم ترین فنی تربیت کا ادارہ نیشنل کالج آف آرٹس، کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ ڈیزائن اور اسلام آباد میں آرٹس اکیڈمی کام کر رہے ہیں۔ مصوّروں کے فن پاروں کی نمائش کے لئے راولپنڈی، لاہور، کراچی وغیرہ میں آرٹ گیلریاں قائم ہیں۔ قالینوں میں شکارگاہوں اور علاقائی رومانی داستانوں کی تصویرکشی سے بھی مصوری کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور ان کی بیرونِ ممالک کافی مانگ ہے۔

قرآن مجید اور شعری شاہکاروں مثلاً دیوانِ غالب اور کلام اقبال کو مصوّر کرنے کے جذبہ و شوق نے پاکستانی مصوری میں ایک منفرد رنگ پیدا کیا ہے۔ پاکستان میں دو قسم کے دبستانِ فن پائے جاتے ہیں۔ ایک دبستان جسے کلاسیکی دبستان بھی کہا جاتا ہے، مذہبی اقدار کی پاسداری کرتا ہے اور فطرت کے نقوش کو انکے اصل رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اس دبستانِ فن میں عبدالرحمٰن چغتائی، فیضی رحیمن، استاد اللہ بخش اور شیخ احمد جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے فن کار ہیں۔ جو اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور اپنے اسلوب کی انفرادیت میں بھی یدطولیٰ رکھتے ہیں۔

جدید دبستانِ فن کے علمبردار مذہبی اقدار کے قائل نہیں اور نہ ہی فطرت کی پیروی کے قائل ہیں۔ اس دبستانِ فن میں صادقین، زبیدہ آغا، ملک، ناگی، عنایت اللہ آذر جیسے معروف مصور ہیں۔ صادقین نے اپنے منفرد فنِ خطاطی اور جداری تصویریں کی وجہ سے تھوڑے عرصہ میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ صادقین نے قرآنی آیات کی بہترین خطاطی کی ہے۔

عملِ چغتائی

فنِ شعر و شاعری

بمعنی علم، آگاہی۔ عام مفہوم میں کلامِ منظوم کیونکہ یہ ایسی آگاہی ہے جس میں قافیہ اور وزن بھی ہوتا ہے۔ اصطلاح میں شعر کے معنی "کلام موزوں و مقفیٰ بالقصد" ہیں اور شاعر "صاحبِ کلام موزوں و مقفیٰ" کو کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں شعر اور شاعر کے الفاظ کئی جگہ آئے ہیں۔ بعض مقامات پر منصبِ نبوت کو شاعری سے نسبت دینے کی مذمت کی گئی ہے۔ علمائے اسلام نے اچھی شاعری اور بُری شاعری میں فرق کو واضح کیا ہے۔ بعض علماء اور مفسرین سورۃ الشعراء کی آیت ۲۲۷ سے شاعری کی مخالفت کے لئے استدلال نکالتے ہیں حالانکہ اس آیت میں مشرکین شعراء کی مذمت کی گئی ہے جو کہ نبی کریمؐ کی ہجو کرتے تھے اور اسلام کے مخالف تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ اور دوسرے کئی صحابۂ کرامؓ کی طرف اشعار منسوب ہیں۔ نبی کریمؐ کے اپنے صحابی حسان بن ثابتؓ سے ان کا کلام سننے کی روایات کتبِ حدیث میں ملتی ہیں۔ ابنِ رشیق نے اپنی کتاب العمدۃ میں نبی کریمؐ کی کئی احادیث درج کی ہیں۔ جو کہ آپؐ نے شاعری کے متعلق بیان فرمائی ہیں ....
اِنَّ مِنَ الشعرِ لحکمۃ (الحدیث) ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا "شعر موتلف کا کلام ہے جس نے اس کے حق کو پہچانا تو اس کا کلام بہتر ہے اور جس نے اس کے حق کو نہیں پہچانا اس میں کوئی خیر نہیں"۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "ان الشعر دیوان العرب" اور حضرت علیؓ کا قول بھی قابلِ توجہ ہے۔

"الشعر میزان القوم" یعنی شعر کسی قوم کے حق و کذب اور شائستگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شاعری میں سچے جذبات کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے خصوصاً عربی شاعری میں۔ شاعری کے مقصد کے سلسلے میں کئی آرا بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ صداقت کی تعلیم دینا۔
۲۔ جذبات اور زندگی کی عکاسی کرنا۔
۳۔ تنقید و تطہیرِ حیات کرنا۔
۴۔ شخصیت کا اظہار کرنا یا اخفا کرنا۔

ابنِ قتیبہ نے "الشعر والشعراء" میں اور ابنِ رشیق نے "العمدۃ" میں شاعروں کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ شاعری کی دو قسمیں ہمیشہ مروّج رہی ہیں۔ ایک جو دلی جذبات کی تحریک سے ابھر کر بے تکلف اسلوب اختیار کرتی ہے، دوسری جو کسی خارجی مقصد سے، شعوری طور پر آراستہ اور پُرتکلف اسلوب اختیار کرتی ہے۔

مسلمانوں میں صوفی شعراء کی غزلیات، مثنویات اور رباعیات اخلاق اور روحانی معارف کا خزانہ ہیں اور ان میں سے بعض کو دنیا کے ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے مثلاً حافظؔ اور سعدیؔ کے کلام کو۔

مسلمانوں میں قصیدے کو شعری سرمائے میں ایک صناعت کہا جا سکتا ہے۔ قصیدے کا فن اصلاً عربی شاعری کا ہے۔ اس کے بعد یہ فارسی، ترکی اور اردو میں منتقل ہوا۔

Marfat.com

عربوں نے اپنا پورا قدرتِ کلام قصیدے میں پیش کیا اور ہر قسم کے جذبات کو بھی اس میں ظاہر کیا ہے۔ قصیدہ اختراعی اور مصنوع شاعری کا سب سے بڑا بیان ہے۔ اس مجلسی فن میں مخاطب اور مقاصد معین و مقرر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں مخاطب کو متوجہ کرنے کے لئے تکلف اور شان و شوکت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے صنفِ شاعری کے عمدہ نمونے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح شعری سرمایہ میں غزل نہایت دلکش اور منفرد صنف ہے۔ یہ فارسی شاعری کا عطیہ ہے لیکن غزل کا اندازِ شاعری نسب یا تشبیب کی صورت میں عربی قصیدوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے اسے خراسان کے فارسی شعراء نے بالکل الگ صورت میں، ایک مخصوص نوع کی صنف بنا کر پیش کیا۔ ساختی لحاظ سے غزل کی ساخت میں ردیف و قافیے کی وحدت اور مضامین کی کثرت سے جو حسین امتزاج پیدا ہوتا ہے اس کی اثر آفرینی سے انکار ممکن نہیں۔ غزل کا ایک ایک شعر اپنی ذات میں مکمل معنی کا حامل ہوتا ہے اور آسانی سے یاد ہو جاتا ہے اور متاثر کرتا ہے۔ ایجاز و ایماز کی انتہائی بلاغت غزلیہ شاعری میں ملتی ہے۔ غزل کے ایک ایک شعر کو دانشِ زندگی کی کتاب کہا جا سکتا ہے اور اخلاق و حکمت کا یہ عنصر اسے لازوال بنا دیتا ہے۔ غزل کے استعارے مختلف ادوار میں مختلف نظر آتے ہیں۔ غزل میں عشق و محبت کے علاوہ سیاسی و سماجی احوال کے اشارے، آداب و اخلاق کے اسباق اور حیات و کائنات کے بہت سے حقائق بھی ملتے ہیں۔

فنِ تحریر کی ابتدا سے پہلے شعراء کے دل پسند کلام لوگ حفظ کر کے ایک دوسرے کو سناتے اور غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کی تعلیم کا یہ سلسلہ چلتا تھا۔ شعراء نے اپنے کلام کے ذریعے مردہ قوموں میں نئی روح پھونکی ہے۔ ایسی کئی مثالیں تاریخ کے ہر دور سے ملتی ہیں۔ برصغیر میں ماضی قریب کے ایام سے علامہ اقبال کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جنہوں نے اپنی مسلسل شاعرانہ تخلیقات سے مسلمانانِ ہند میں بیداری پیدا کی۔ اسلام کی جنگوں کی تاریخ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کے جذبۂ شجاعت و بہادری کو ابھارنے میں شعراء کے کلام کا بھی حصہ ہے جو اپنے شعروں میں ان سپاہیوں کے مردانہ اوصاف بہادری کو تعریف کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ہر دور میں بڑے بڑے معروف شاعر گزرے ہیں۔ اسلام سے پہلے کے زمانہ کے شعراء کے سبعہ معلقہ کا کلام عربی ادب میں ایک بلند مقام رکھتا ہے بعد کے اسلامی زمانوں میں فردوسی، فرزدق، سعدی، حافظ، حالی، اقبال کو معروف شعراء میں مانا جاتا ہے۔

فنِ موسیقی

خوارزمی نے موسیقی کا شمار ریاضیاتی علوم میں کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ یونانی زبان کا لفظ ہے اور الحان کی ترتیب و ترکیب کا علم ہے۔ نغموں کے مرتب کو موسیقور یا موسیقار کہتے ہیں"۔ رسائل اخوان الصفاء میں موسیقی کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے "موسیقی سے غنا مراد ہے اور موسیقار سے مغنی"۔ عربوں، ایرانیوں کے ہاں بہت پہلے سے موسیقی کا اپنا نظریہ بھی موجود تھا۔

موسیقی کے ایرانی اور عربی نظریوں کا ایک قدیم ترین ماخذ سامی نظریہ تھا اس کے یونانی نظریہ موسیقی پر بہت اثرات پڑے تھے۔ پہلی صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی میں عربوں اور یونانیوں کے نظریۂ موسیقی کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں ابن مسجح (م ۹۷ھ/۷۱۵ء) نے ایرانی موسیقی کے مطابق گانے اور بجانے (غنا اور ضرب) کا فن سیکھا تھا۔ اس نے یونانی اور اصولیوں سے اکتساب کر کے ایک نظامِ فن مدون کیا اور اس نے ایرانی اور یونانی طریقوں سے موسیقی کے مناظر کو مسترد کر دیا [illegible] الکاتب (م ۱۴۸ھ/۷۶۵ء) الخلیل (م ۱۷۵ھ/۷۹۱ء) عبید اللہ بن عبد اللہ بن طاہر (م ۳۰۰ھ/۹۱۲ء) علی بن ہارون بن یحییٰ بن ابی منصور (م ۳۵۲ھ/۹۶۳ء) اور سلیمان بن ایوب المدینی نے کتابیں لکھی تھیں لیکن یہ کتابیں ضائع ہو گئیں اور عربی نظریہ موسیقی پر قدماء میں مسعودی کی مروج الذہب، یحییٰ بن ابی منصور کے الرسالۃ فی الموسیقی اور الاغانی کی کتاب سے مسلمانوں میں فنِ موسیقی کی تدریج اور دوسرے متعلقہ امور کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسی دور میں الکندی (م ۲۶۰ھ/۸۷۴ء) نے موسیقی کے نظریہ پر سات رسالے تصنیف کئے۔ الکندی کے بعد ایک صدی کا خلا ہے۔ موسیقی کے نظریات پر لکھنے والوں کے نام تو بکثرت ملتے ہیں لیکن ان کی تصانیف ناپید ہیں۔ الکندی کے دو شاگردوں، احمد بن محمد السرخسی اور منصور بن طلحہ نے نظریۂ موسیقی پر کتابیں لکھی ہیں۔ السرخسی کی چھ کتب کا ذکر ملتا ہے۔ ثابت بن قرّہ (م ۲۸۸ھ/۹۰۱ء) کی تین کتابیں، محمد بن ذکریا رازی کی تصانیف نظریہ موسیقی پر اہم کتب ہیں۔ لیکن ان میں فارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰ء) کا مقام سب سے بلند نظر آتا ہے۔ اگرچہ موسیقی پر اس کی دو کتابیں "کلام فی الموسیقی اور کتاب فی احصاء الایقاع" دستیاب نہیں لیکن اس کی مایۂ ناز تصنیف "کتاب الموسیقی الکبیر" محفوظ رہ گئی۔ فارابی عملی طور پر ایک موسیقار بھی تھا۔ جسے موسیقی کے فن اور اس کے علم، دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس کتاب کو مشرقی موسیقی کے اصول کے متعلق اہم ترین تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ فارابی کے اپنے الفاظ کے مطابق اس کتاب کی تصنیف کی وجہ یہ تھی کہ یونانیوں سے جو کچھ ہم تک پہنچا وہ نامکمل تھا۔ موسیقی پر ابوالوفا بوزجانی (م ۳۸۸ھ/۹۹۸ء)، ابنِ سینا (م ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) اور ابنِ زیلہ (۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء) نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ابنِ سینا جو یورپ میں AVICENNA کے نام سے مشہور ہے، نے موسیقی پر دو رسالے لکھے۔ رسائل اخوان الصفاء فنِ موسیقی پر اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ان میں صوتیات سے فاضلانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ موسیقی پر کتابیں لکھنے والوں میں مصر کا بھی اہم حصہ ہے۔ ابن الہیثم (۴۳۰ھ/۱۰۳۹ء) اور ابوالصلت اُمیہ (م ۵۲۹ھ/۱۱۳۴ء) دو ممتاز مصری مصنف تھے۔ ابن الہیثم نے اقلیدس کی تصنیفات کی شرحیں لکھی ہیں۔

مغرب میں ابنِ باجہ اور ابنِ رشد کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ابنِ باجہ کی موسیقی کی کتاب کو مغرب میں وہی وقعت دی جاتی ہے جو مشرق میں فارابی کی کتاب کو۔ ابنِ رشد نے ارسطاطالیس کی کتاب کی شرح لکھی ہے۔

ابنِ سینا اور ابنِ زیلہ کے بعد نظریۂ موسیقی کی مکمل ترین تشریح کے لئے صفی الدین عبد المومن بن فاخر (م ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء) نے دو کتابیں "رسالۃ الشرفیہ" اور "کتاب الادوار" لکھیں۔ بعد کے ہر مصنف نے زیادہ تر انہیں کتابوں سے استناد کیا ہے۔ عبد القادر بن غیبی نے صفی الدین کو نظریۂ موسیقی کا اصل سرچشمہ قرار دیا ہے اور زمانہ حال کے ایک مصنف نے اسے مشرق کا ZARLINO قرار دیا ہے۔ عبد القادر بن غیبی نے فنِ موسیقی پر پانچ کتابیں لکھی ہیں۔ جن کے نام جامع الالحان، مقاصد الالحان، مختصر الالحان، شرح الادوار اور کنز الالحان ہیں۔ ابن غیبی اگرچہ فارابی، ابن سینا اور صفی الدین پر انحصار کرتا ہے۔ لیکن اُن کا جامد مقلد نہیں۔ اس کے بیٹے اور پوتے نے بھی نظریۂ موسیقی پر کتابیں لکھی ہیں۔ سلاطین ترکیہ کے دور میں نظریۂ موسیقی پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ سلاطین ترکیہ اہلِ فن کی سرپرستی کیا کرتے تھے

Marfat.com

بعد کے زمانوں میں بھی اہلِ فن نے موسیقی پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ فنِ موسیقی میں مسلمانوں کی کوششوں کو مختلف ادوار اور ممالک کی نسبت سے تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ عربوں کی موسیقی
۲۔ شامی موسیقی
۳۔ مغرب کی موسیقی
۴۔ مصری موسیقی
۵۔ عراقی موسیقی
۶۔ ایرانی موسیقی
۷۔ ترکی موسیقی
۸۔ ترکستانی موسیقی
۹۔ اندلسی موسیقی
۱۰۔ برصغیر پاک و ہند کی موسیقی

عربوں کی موسیقی:۔ طلوعِ اسلام کے بعد عربوں کی موسیقی عمومی طور پر زمانۂ جاہلیت کی تہذیب کے ورثہ کی صورت میں سامنے آئی۔ جزیرہ نمائے عرب اور شمالی عرب کے اُن علاقوں میں جن میں نبطی، غسانی اور لخمی عرب شامل ہیں۔ یہ نظریۂ موسیقی سقوطِ بغداد (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) تک رائج رہا۔ ریاست مدینہ کے قیام کے بعد جب مسلمانوں نے دوسرے ممالک میں فتوحات حاصل کیں تو دوسری اقوام کے ساتھ میل جول کی وجہ سے عربی موسیقی میں بھی تبدیلی آئی۔ پہلی صدی ہجری میں عربی موسیقی ایرانی اور شامی موسیقی سے اثر پذیر ہوئی اور نئی اصطلاحات پیدا ہوئیں۔ ابنِ عبدربہ (م ۳۲۸ھ) بیان کرتا ہے کہ حجاز قدیم فن کا گہوارہ تھا اور موسیقی بڑی عمر کی گانے والیوں (مغنیہ) اور نوجوان لڑکیوں (قینہ) کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ تہواروں، خوشی کی تقاریب اور جنگ کے میدانوں میں گایا کرتی تھیں۔ ان کے آلاتِ موسیقی مُوَتّر اور مُعَزَّف تھے۔ ان کے ساز مزہر، دَف اور قضیب تھے۔ حیرہ کے لخمی عرب طنبور، عُود اور بربط کا استعمال بھی کرتے تھے۔ شمالی مغربی علاقے کے غسانی عربوں میں ایرانی بربط مقبول تھا اور نبطی عربوں میں سہ تارہ یعنی "کنیرہ" کا رواج تھا۔ عرب مؤرخین نے اسلامی زمانے میں پہلے مردِ مغنی طویس (م ۸۸ھ/۷۰۵ء) کا ذکر کیا ہے۔ جو ایرانی طرز پر ہزج کے سُر دل پذیر اور دَف کی گت پر گانے میں ماہر تھے۔ اس کے معاصر صاحب خاثر (م ۶۵ھ/۶۸۴ء) نے قضیب پر گانا شروع کیا، لیکن جلد ہی اُسے چھوڑ کر عُود پر گانے لگا۔ عود کا رواج مکہ مکرمہ میں ۳۰ھ سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن مدینہ منورہ میں سب سے پہلے اُس نے عود کا استعمال شروع کیا۔ اس دور کے دو مشہور موسیقار، جن میں ایک خاتون عزّت المیلاء (م ۸۶ھ/۷۰۵ء) اور دوسرا مرد نشیط فارسی، مدینہ منورہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ دوسرے مشہور موسیقاروں میں حُنین الحیری اور احمد نصیبی شامل ہیں۔

اموی دورِ خلافت (۴۰ھ تا ۱۳۲ھ) میں موسیقی نے کافی ترقی کی۔ اموی خلفاء معاویہ اوّل، یزید اوّل، عبدالملک اور ولید اوّل موسیقی کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اہلِ فن کی کافی قدر کی۔ اس دور کے مشہور اہلِ فن میں ابنِ سریج، معبد اور ابنِ مسجح تھے۔ یونس الکاتب (م ۹۶ھ/۱۵ء) نے اس دور کے چار مشہور اور بڑے مغنیوں میں معبد اور ابنِ سریج کو بھی شمار کیا ہے۔

بنو عباس کے دورِ خلافت کی پہلی صدی میں عربوں نے ثقافتی اعتبار سے علم و فن کے ہر میدان میں بے حد ترقی کی۔ ابراہیم موصلی (م ۱۸۸ھ/۸۰۴ء) ہارون رشید کے دربار کا مقبول ترین مغنی تھا اور ایک مجلس میں اسے ڈیڑھ لاکھ دینار کا انعام بھی دیا گیا تھا۔ ابنِ جامع (م ۱۸۷ھ/۸۰۳ء) کی معیت میں اُس نے ایک سو چیدہ گانوں کا انتخاب کیا اور اسی انتخاب کی بنا پر ابوالفرج اصفہانی نے کتاب الاغانی کبیر مرتب کی۔ اُس کے بیٹے اسحٰق (م ۲۳۵ھ/۸۳۰ء) نے اپنے باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی۔ اسحٰق نے قدیم عربی موسیقی کے اسالیب کا احیاء کیا۔ اسی دور میں قدیم عربی موسیقی سے ہٹ کر نیا انداز بھی اختیار کیا گیا۔ ان ترقی پسند اندازِ موسیقی اور نئے خیالات کا حامی ابراہیم کو کہا جاتا ہے۔ جو کہ خلیفہ ہارون رشید کا بھائی تھا۔ وہ موسیقی میں اعلیٰ درجے کا ذوق رکھنے کے علاوہ ایک بہترین مغنی اور موسیقار تھا۔

دوسرے عباسی خلفاء بھی موسیقی کے دلدادہ تھے اُن کے درباروں میں فنِ موسیقی کے ماہروں اور مغنیوں کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ مامون کے عہد میں علم موسیقی کے موضوع پر یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔ کتابوں کے ترجموں اور موسیقی کی حوصلہ افزائی کا کام معتصم اور واثق کے عہد میں بھی ہوا۔ خلفاء کے محل مشہور مغنیوں کے نغموں اور سازوں سے گونجتے رہتے۔ خلیفہ واثق خود فنکار تھا اور اُسے عود نوازی میں کمال حاصل تھا۔

مختلف خلفاء کے درباروں کے مغنیوں میں عمر بن بانہ (م ۲۷۸ھ/۸۹۱ء)، صاحبِ کتاب مجرّد الاغانی، ابوحشیشہ، اخبار الطنبوریین کا مصنف، جاحظ برکی عُثمان بن عمرو شامل ہیں۔ اسی دور میں علم موسیقی کے مصنفین میں سے چار کو شہرت حاصل ہوئی۔ یعنی السرخسی (م ۲۸۶ھ/۸۸۹ء) ثابت بن قرہ (م ۲۸۸ھ/۹۰۲ء) ابوبکر رازی (م ۳۱۳ھ/۹۲۵ء) اور فارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰ء)۔ چوتھی صدی ہجری سے نظامِ حکومت پر بویہی امیروں کے غلبہ سے فنِ موسیقی پر ترکمانی اثر کسی حد تک دب گیا۔ تاہم خلفاء کے محلوں میں راگ و رنگ کی محفلیں قائم رہیں۔ عزالدولہ اور عضدالدولہ دونوں موسیقی کے بے حد شائق تھے۔ مشرف الدولہ کے وزیر ابوالقاسم مغربی نے ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کی تلخیص بھی کی تھی۔ اسی زمانے میں اخوان الصفاء ادارہ بھی قائم ہوا۔ اس کے شائع کردہ رسالوں میں موسیقی پر بھی ایک رسالہ ہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کی اہم شخصیات میں ابن سینا شمار کیا جاتا ہے جو شفاء اور نجات نامی دو کتابوں کا مصنف ہے۔ ان کتابوں میں موسیقی پر معرکۃ الآرا بحث کی گئی ہے۔

موسیقی میں ایک اور انقلاب ترکمانی سلاطین کے نظامِ حکومت سنبھالنے سے ہوا۔ جو تقریباً ڈیڑھ صدی تک برسرِ اقتدار رہے (۴۴۷ھ تا ۵۹۱ھ)۔ یہ سلاطین موسیقی کے شائق تھے۔ بالخصوص آخری سلجوقِ اعظم "سلطان سنجر" جس کے درباری مغنی نے اپنے نام کمال الزمان کے مطابق عالمگیر شہرت حاصل کی۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں حکمرانوں کی طرف سے اہلِ فن اور علماء کی سرپرستی ہوتی رہی۔ ان میں ابن النقاش (م ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء)، ابوالحکم باہلی (م ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء) جس نے ارغنون سازی میں شہرت حاصل کی، کمال الدین بن مَنَعَہ نظامیہ کالج بغداد کا معلم اور علمِ موسیقی کا ماہر تھا، اس کا شاگرد علم الدین قیصر (م ۶۴۹ھ/۱۲۵۱ء) شامل ہیں۔ بغداد کے آخری خلیفہ معتصم کے عہدِ حکومت میں صفی الدین عبدالمومن درباری مغنی تھا۔ نظریہ موسیقی پر اس کی معروف کتاب الادوار بعد کے مصنفین کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوئی اور اُس کی کئی شروع لکھی گئیں۔ اس زمانے میں عربی موسیقی پر ایرانی اثرات بھی عروج پر تھے۔ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کے بعد علوم و

Marfat.com

فن کا یہ مرکز درس گاہ عبرت کی صورت اختیار کر گیا۔

شامی موسیقی:۔ شام میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے (۱۷ھ/۶۳۸ء) کلیسائی موسیقی پر بھی اثرات پڑنے شروع ہوئے۔ شامی کلیساؤں میں دعائیں بھی عربی زبان میں پڑھی جانے لگیں۔ جب ۴۰ھ میں دمشق اموی خلفاء کا دارالحکومت بنا تو ملک شام میں موسیقی اپنے معراج کو پہنچ گئی۔ اموی خلفاء موسیقی کا ذوق رکھتے تھے۔ اور اہلِ فن کی قدر کرتے تھے۔ ابنِ مسجح نے علم موسیقی کی عملی تعلیم شام کے بزنطیہ ہی سے پائی تھی۔ بنو امیہ کی جگہ عباسی خلفاء کے حکمران ہونے سے دارالحکومت عراق منتقل ہو گیا یہاں ایرانی تہذیب کے غلبہ سے موسیقی اور فنونِ لطیفہ بھی متاثر ہوئے، تاہم شام میں قدیم حجازی استادوں کی موسیقی مقبول رہی۔

پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام پر صلیبی جنگوں کی وجہ سے علوم و فنون پر بھی گہرا اثر پڑا۔ البتہ فوجی موسیقی اپنے کمال پر پہنچ گئی۔ چھٹی صدی ہجری بیزنطی موسیقی کے جن ماہروں کو شام میں پناہ ملی اُن میں ابوالحکم باہلی۔ ابن النقاش، محمد بن ابی الحکم شامل ہیں۔ شام پر دسویں صدی ہجری تک مصر کے ایوبی سلاطین اور مملوک بادشاہوں کی حکومت کے دوران فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی کو کافی ترقی ہوئی۔ ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں ترکانِ عثمانیہ کے مصر و شام پر قبضے کے بعد ملک میں ترکی موسیقی کو فروغ حاصل ہوا لیکن حلب اور دمشق کے مرکزوں میں قدیم شامی موسیقی بھی مروج رہی۔ بعد کے ادوار میں شام پر فوجی معرکہ آرائیوں کی وجہ سے علوم و فنون کو زوال آ گیا۔

فی زمانہ اس علاقے میں موسیقی کا سب سے بڑا مرکز بیروت ہے۔ دمشق میں بھی موسیقی کی تعلیم کے لئے ادارے قائم کئے گئے لیکن اب یہ فن یورپی اثرات کے تحت ہے اور جو افراد اس فن سے وابستہ ہیں وہ فرانسیسی اور امریکی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ آج کل شام ریڈیو پروگرام "ھنا دمشق" کے ذریعے اپنی آواز کو دنیا میں متعارف کرانے کی سعی کر رہا ہے۔ شام کے موسیقاروں کی بیرونِ ملک شہرت بیسویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ ان میں سے ایک موسیقی المصریہ اور تاریخ الموسیقی العربیہ کا مصنف ہے۔

مغرب کی موسیقی:۔ مراکش سے طرابلس تک رہنے والوں کی موسیقی میں علاقے کی نسبت سے ایک قدر مشترک ہوتے ہوئے کچھ علاقائی اختلافات بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں نے ۸۹ھ/۷۰۸ء میں مغرب کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا تو مغرب کے ان علاقوں میں مشرقی موسیقی کے اثرات آتے گئے۔ قیروان میں زیادۃ اللہ کے دربار میں زریاب المغنی کی ۲۰۶ھ/۸۲۱ء میں پذیرائی سے بغداد کی موسیقی مغرب میں متعارف ہوئی۔ اندلسی موسیقی کے عروج کے زمانے میں، مغرب کی موسیقی پر بھی اُس کا اثر پڑا۔ ابنِ باجہ اور اُس کی کتاب کو مغرب میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔ مغرب نے بہت سے آلاتِ موسیقی بھی اندلس سے لئے۔ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی میں مغرب کی موسیقی کو کافی ترقی ملی۔ اس ترقی کی وجہ سقوطِ قرطبہ کے بعد اندلس کے تارکینِ وطن کا تلمسان میں آباد ہونا ہے۔ سقوطِ اشبیلیہ (۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) اور اندلس میں آخری اسلامی حکومت کے خاتمے (۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء) کے بعد غرناطہ کے پناہ گزینوں کے آنے سے مغرب کی موسیقی کو ترقی ملی۔ یہ لوگ تونس اور طیطاوین میں آ کر آباد ہوئے۔ بلنسیہ کی جبری ہجرت ۹۲۰ھ/۱۵۲۲ء سے فاس کا شہر مستفید ہوا۔

۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں اندلس کے علاقوں سے مسلمانوں کے مکمل اخراج کے بعد پانچ لاکھ مسلمان جلاوطن ہو کر مغرب کے علاقوں میں آ کر آباد ہو گئے اور مغربی موسیقی کو اس سطح پر لے آئے جس پر یہ اندلس میں تھی۔ مغرب کے مختلف علاقوں کی موسیقی میں اختلاف کی وجہ بھی یہ نو وارد تھے۔ قرطبی موسیقی کا اثر الجزائر تلمسان میں ملتا ہے۔ تونس کی موسیقی میں اشبیلی انداز غالب ہے۔ فاس اور طیطاوین میں غرناطہ کی موسیقی کا اثر نمایاں ہے۔ دسویں صدی ہجری میں مغرب کے علاقوں پر ترکوں کے قبضے سے مغرب کی موسیقی پر غیر ملکی اثرات زیادہ نمایاں ہو گئے۔

مغرب کی موسیقی سے متعلق تصانیف میں طبائع والطبوع والاصول، انیس المطرب ملتی ہیں۔ بارہویں صدی ہجری میں مراکش میں حسن بن احمد اور اُس کا بیٹا محمد دو مایۂ ناز موسیقار پیدا ہوئے۔ محمد نے ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس کا نام "الحائک" مشہور ہوا۔ اسی دور میں ایک اور مشہور نغز ساز علال البطلہ کا ذکر بھی آتا ہے۔

ان علاقوں میں آلاتِ موسیقی میں عود، رباب اور طنبورہ استعمال ہوتے تھے۔ مغرب کی موسیقی پر غیر ملکی اثرات بالخصوص مصری اور ترکی نمایاں ہیں۔ مراکش اور تیونس کے علاقوں میں قدیم کلاسیکل موسیقی کے احیاء کی کوششیں موجودہ دور میں ہو رہی ہیں۔

مصری موسیقی:۔ مصر شروع سے ہی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور اس کی تہذیب قدامت کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے درجے پر آتی تھی۔ اسلام سے قبل بھی یہاں فنِ موسیقی عروج پر تھا۔ مسلمانوں کی افواج نے ۲۰ھ/۶۴۱ء میں مصر فتح کیا۔ اُس کے بعد یہاں اکثر ایسے عامل حکمران رہے جو موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اس دور میں فنِ موسیقی کی اساس حجاز کی عملی موسیقی پر قائم تھی اور اس کی ترتیب و نظام کا ذمہ دار ابنِ مسجح تھا۔ طولونی اور اخشیدی حکمرانوں کے دور میں (۲۵۴ھ/۸۶۸ء تا ۳۵۸ھ/۹۶۹ء) ہر طرف موسیقی کا چرچا تھا۔ فاطمی خلفاء کے عہد میں یہ ملک اسلامی تہذیب کا مرکز رہا۔ امیر تمیم بن المعز بھی الظاہر کی طرح موسیقی کا اعلیٰ درجے کا ذوق رکھنے والا تھا اس کا جانشین مستنصر (م ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) موسیقی کا اُس سے بھی زیادہ مشتاق تھا۔ فاطمی عہد میں عود، طنبور، چنگ، زمر اور تار جیسے آلاتِ موسیقی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان دنوں مشہور ماہرِ موسیقی ابن الہیثم زندہ تھا۔ اُس نے اقلیدس کی تصنیف قانونِ اقلیدس اور الارمانیقی کی شرح لکھی تھی اُس کے ہمعصر مصنف المسبحی (م ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء) نے کتاب "مختار الاغانی" لکھی۔ ایوبی سلاطین کے عہد میں (۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء تا ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء) فنِ موسیقی میں ترکمانی طرز غالب تھی۔ مملوک بادشاہوں کے عہد میں (۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء تا ۹۲۲ھ/۱۵۱۷ء) میں صلیبی جنگوں اور دوسرے جنگی معرکوں کی وجہ سے فنِ موسیقی میں کوئی تنوع پیدا نہ ہو سکا بلکہ مخلوط قسم کی موسیقی کا رواج رہا۔

جب عثمانی ترکوں نے مصر فتح کیا (۹۲۲ھ/۱۵۱۷ء) تو فنِ موسیقی کے نظام میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ کیونکہ پانچ صدیوں سے ترکمانی فن ہی مروج تھا۔ عمالِ حکومت تو عثمانیہ خلافت کے مرکز سے مقرر ہو کر آتے تھے لیکن اٹھارویں صدی عیسوی تک ملک کا نظام مملوک حکمرانوں کے ہاتھ میں رہا۔ موسیقی پر قدامت پسندی کا غلبہ رہا لیکن عثمانی حکمرانوں (پاشاؤں) کے محلات میں ترکمانی موسیقی کی بہ نسبت اناطولی اور روم ایلی کی موسیقی زیادہ

Marfat.com

مقبول ہوگئی۔ مصر کے پہلے خدیو محمد علی پاشا کے عہد (۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء تا ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۸ء) سے مصری تمدن پر عثمانی اثرات کا غلبہ رہا اور ساتھ ساتھ یورپی اثرات بھی کارفرما رہے آگے چل کر مصر کے موجودہ موسیقاروں کے خاندان کے بانی مصطفیٰ العقاد نے مصری موسیقی کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ رفتہ رفتہ مقامی موسیقی میں غیر ملکی فن کی پیوند لگنے شروع ہوتے۔ لیکن شاہ فؤاد اول کے آغازِ عہد (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء) سے شاہ کے ذوقِ موسیقی اور سرپرستی سے مصری موسیقی کا زریں دور شروع ہوا۔ فنِ موسیقی سے متعلق کئی ادارے قائم کیے گئے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں قاہرہ کے ایک ادارہ .... "معہد الموسیقی الشرقی" میں مراکش، الجزائر، تونس، مصر، ترکی، شام اور دنیا کے دوسرے ممالک کے ماہرینِ موسیقی کا اجلاس ہوا۔ مختلف انجمنیں اور ماہرین مقامی فنِ موسیقی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ موجودہ دور کے مشہور گانے والوں میں اُم کلثوم اور عبدالوہاب قابلِ ذکر ہیں۔

عراقی موسیقی:۔ سقوطِ بغداد کے بعد موسیقی کا کلاسیکی دور ختم ہوگیا۔ آخری خلیفہ کے درباری مغنی صفی الدین عبدالمومن کو ہلاکو کے وزیر شمس الدین جوینی کی ملازمت قبول کرنا پڑی۔ خاندان جوینی ایرانی النسل تھا اور اُس کے سب افراد علمِ موسیقی کی سرپرستی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے مغول کے ابتدائی زمانۂ حکومت میں اس فن کو عراق میں ترقی حاصل ہوئی۔ اس دوران کے چند معروف مغنی زین العابدین موصلی (م ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء) عبدالعزیز فصیح (م ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) فخرالدین شہربانا شرف الدین سہروردی (م ۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء) اور خطیب اربلی (م ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء یا ۱۳۳۰ء) جو کہ جواہر النظام فی معرفۃ الانغام کا مصنف ہے۔ اس دور میں ایرانی موسیقی جس میں تورانی رنگ غالب تھا، رائج تھی۔ جلائری خاندان کے دورِ حکومت میں بھی تورانی موسیقی کا اثر قائم رہا۔ سلطان حسن بزرگ (م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کے عہد میں علم موسیقی کو بڑا عروج حاصل تھا۔ اس دور کے مشہور اساتذہ فن ابن العلائی بغدادی، مصنف قرۃ الزمان فی علم الالحان، محمد بن عیسیٰ، مصنف غایۃ المطلوب فی فن الانغام، خلیل بن ایبک عفدی، مصنف جامع فی الموسیقی اور نظام الدین ابن نورالحکیم، جمال الدین عمر ابن عمر الکندی، مصنف کنز المطلوب فی علم الدوائر والضروب، جمال الدین ماردینی مصنف مقدمہ فی علم الانغام اور مشہور عود نواز صارم الدین ابراہیم المعروف ابن بابا کے نام قابلِ ذکر ہیں ابنِ بابا کا تعلق ملک مؤید شیخ کے دربار سے تھا۔ حسن بزرگ کے جانشین سلطان حسین (۷۸۴ھ/۱۳۸۲ء) کے دورِ حکومت میں رضا الدین رضوان شاہ نامی ایک شخص عراق کا سب سے بڑا موسیقار مانا جاتا تھا۔ اسلامی دنیا کا ایک نامور موسیقار عبدالقادر ابن غیبی بھی بغداد آگیا تھا اور سلطان حسین کے دربار کا موسیقار رہا۔ ۹۱۳ھ/۱۵۰۷ء میں ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی نے عراق کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ لیکن ۹۴۱ھ میں ترکیہ کے سلطان سلیمان اوّل نے اس صوبے کا الحاق اپنی مملکت سے کر لیا۔ ۱۰۳۲ھ کے بعد یہ ملک پھر ایران کے قبضہ میں رہا۔ ۱۰۴۸ھ میں سلطان مراد چہارم نے عراق کو دوبارہ فتح کرلیا اور ۱۹۱۸ء تک یہ علاقہ عثمانیہ خلافت کے زیرِ نگیں رہا۔ مراد بغداد کے مشہور موسیقار شاہ قلی کو اپنا درباری مغنی بنا کر اپنے ساتھ استنبول لے گیا تھا۔ اس وقت سے ترکی تہذیب اور اس کے طور طریقے عراق میں داخل ہوگئے۔ اور موسیقی بھی ترکی طرز پر آگئی۔

... آج کل بغداد میں مکاتیب اور ابتدائی مدارس میں بچوں کو گانا سکھایا جاتا ہے اور ساز نوازی کی تعلیم کے ادارۂ فنونِ لطیفہ میں دو استاد مقرر ہیں۔ بغداد ریڈیو پر جو موسیقی پیش کی جاتی ہے اس پر یورپی رنگ غالب ہے۔

ایرانی موسیقی:۔ ایرانی تہذیب قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ ساتویں صدی قبل مسیح یعنی آشوری زمانے کی تاریخ سے ایران میں فنِ موسیقی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ سکندرِ اعظم کی فتوحات، چوتھی صدی قبل مسیح سے ایران پر یونانی تہذیب و تمدن کے اثرات پڑنا شروع ہوگئے۔ دوسری صدی قبل مسیح کے بعد یونانی زبان و تمدن کو ترک کر کے آرامی زبان و تمدن کو اپنایا گیا۔ مشہور شاعر فردوسی کے شاہنامہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سماجی زندگی میں کسی تقریب کی تکمیل کے لئے گانے بجانے کو لازم سمجھا جاتا تھا۔ محافل رقص و سرود کیلئے چنگ، وین، بربط، رباب اور طنبور کے ساتھ ساتھ تنار، مشتک، نای اور تنبک بجائے جاتے تھے۔

صبحِ اسلام کے طلوع ہوتے ہی سارے عالم میں جو تہذیبی و تمدنی انقلاب آیا۔ اس میں ایرانیوں کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ دربارِ خلافت کی موسیقی کے بعض محقق ایرانی النسل تھے، مثلاً السرخسی، عبیداللہ بن عبداللہ بن طاہر، جو فلسفۂ موسیقی میں بلند مقام پر مانا جاتا ہے، علمِ موسیقی کا مورخ ابن خُرداذبہ اور مفاتیح العلوم کا مصنف محمد بن احمد خوارزمی۔ ان سب کی تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ سامانی حکمرانوں کے دور (۲۶۱ھ/۸۷۴ء تا ۳۸۹ھ/۹۹۹ء) میں ایران نے علم موسیقی اور ادب میں بڑی ترقی کی۔ اسی دور میں معروف مغنی رودکی نے چنگ و بربط نوازی میں مہارت تامہ کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ ابنِ سینا، سامانی بادشاہ نوح ثانی کا منظورِ نظر تھا۔ شاہی درباروں میں مغنیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ فرخی بھی رودکی کی طرح شاعر ہونے کے علاوہ چنگ بجانے میں مہارت رکھتا تھا اور غزنہ کے سلاطین و امراء کے ہاں اُس کا بڑا مقام تھا۔ غزنہ کے سلاطین ایران و ترکستان کے بہت سے علاقوں پر حکمران تھے۔ بعد میں سلجوقی سلاطین کے درباروں سے مشہور عالم مغنی کمال الزمان نے شہرت حاصل کی۔ خوارزمی بادشاہوں کے عہد میں (۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء تا ۶۲۸ھ/۱۲۳۱ء) فاگ رنگ عام ہوگیا۔ قبولِ اسلام کے بعد مغول حکمرانوں نے فن اور مغنیوں کی سرپرستی بڑی فراخ دلی سے کی۔ ہلاکو کے شاہی منجم نصیرالدین طوسی نے فنِ موسیقی پر ایک رسالہ لکھا۔ طوسی کے شاگردوں میں سے قطب الدین شیرازی نے اپنی تصنیف دُرۃ التاج میں موسیقی پر ایک باب لکھا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد محمد بن محمود الآملی نے نفائس الفنون کے نام سے ایک دائرۃ المعارف مرتب کیا۔ المختصر مغول حکمرانوں کے دورِ حکومت (۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء تا ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء) ایران میں موسیقی کو عروج حاصل ہوا۔

اس کے بعد ترکمان خانوادوں، جائری سلاطین و شیوخ کے دورِ حکمرانی میں بھی فنِ موسیقی اور ماہرِ فن کی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ ایران کے صفوی خاندان (۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء تا ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) میں ایرانی موسیقی کا احیا مکمل طور پر عمل میں آیا۔ بعد کے زمانے میں غیر ملکی سیاحوں اور ماہرِ فنِ موسیقی کی آمد سے ایرانی موسیقی اپنے اصل رنگ میں نہ رہی اور پرانے آلاتِ موسیقی متروک ہو کر یورپی طرز کے آلاتِ موسیقی رواج پا رہے ہیں۔ پیانو، گراموفون، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے رواج پا جانے کی وجہ سے مغربی طرزِ موسیقی کی زیادہ قدر ہو رہی ہے اور قدیم طرزِ موسیقی کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ایسے ادارے قائم ہو چکے ہیں جو یورپی طرزِ موسیقی کے فروغ میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

ترکی موسیقی:۔ اس کی بنیاد اگرچہ عربی، ایرانی فن پر قائم ہے تاہم اس

Marfat.com

کی تہہ میں قدیم اوغز تہذیب بھی نظر آتی ہے۔ عثمانی قبیلہ کے لوگ سلجوقی مملکت کے وارث بنے اور ۹۴۸ھ/ ۱۵۴۱ء تک دنیا کے ایک وسیع علاقے پر حاکم ہو گئے۔ عثمانی ترک ہمیشہ سے جنگی موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ترکوں کی جنگی موسیقی برابر دوسرے ملکوں پر اثر انداز ہوتی رہی۔ حکومت کے قیام سے قبل ترکوں کے آلاتِ موسیقی فاطمی خلفا کے مصر کی ترکی فوجوں میں مقبول تھے۔ عثمانی ترکوں نے جہاں دوسری تہذیبوں سے استفادہ کیا وہاں اپنے فنون اور تہذیب کی بھی حفاظت کی۔ عثمانی خاندان کے درباروں میں ترکی تہذیب و تمدن کا اثر غالب تھا اور ایرانی، عرب ثقافت و تمدن قرب کے باوجود ان میں کم نفوذ کر سکا۔ ترکی میں پانچویں صدی ہجری کے اواخر اور چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں سلسلۂ درویشیہ بکتاشیہ کے قیام کی وجہ سے مذہبی موسیقی کو بھی کچھ فروغ حاصل ہوا۔ گو یہ موسیقی صوفی جلال الدین رومیؒ کے سلسلۂ درویشیہ جلالیہ سے مستعار لی گئی تھی۔

سلطان محمد اوّل کے عہد میں (م ۸۲۴ھ/ ۱۴۲۱ء) ترکوں کی سلطنت کے احیاء سے عام ثقافت اور فنونِ لطیفہ نے اناطولیہ میں بے حد ترقی کی۔ اس کے جانشین مراد ثانی کا دربار مغنیوں اور شاعروں سے بھرا رہتا تھا۔ مشہور مغنی ابنِ غیبی کی تصنیف جامع الالحان سے ترکوں میں مستعمل آلاتِ موسیقی کا پتہ چلتا ہے۔ اُن میں طنبورۂ ترکی، قُوپُوز، رومی، اوزان، نائی، چِدور اور بلبان شامل ہیں۔ ابنِ غیبی خود ترکی النسل تھا۔ ادوارِ موسیقی کے نام سے ایک رسالہ ایک اور ترکی مصنف خضر ابن عبداللہ نے لکھا ہے۔ نظری اور عملی موسیقی پر ترکی زبان میں ایک کتاب احمد اوغلو شکر اللہ نے فارسی تصنیف کنز التحف کی طرز پر لکھی ہے۔ سلطان محمد ثانی کے زمانے کو (۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء) فنونِ لطیفہ کی ترقی کے اعتبار سے سلطنتِ عثمانیہ کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ سلطان کے دربار میں ابنِ غیبی کا بیٹا اور نقاوۃ الادوار کا مصنف عبدالعزیز بھی موجود رہتا تھا۔ ابنِ غیبی کے پوتے نورالدین نے سلطان بایزید ثانی کے عہد (۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء) میں مقاصد الادوار نامی ایک کتاب لکھی۔ مراد چہارم کے عہد میں (م ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۴۰ء) عام تہذیب و تمدن کو ترقی حاصل ہوئی۔ سلطان مراد چہارم شعراء اور مغنیوں کو پسند کرتا تھا۔ کچھ اور عثمانی سلاطین بھی موسیقی کے دلدادہ تھے۔

احمد ثانی (م ۱۱۰۶ھ/ ۱۶۹۵ء)، محمود اوّل (م ۱۱۶۸ھ/ ۱۷۵۴ء) بذاتِ خود ایک مغنی تھا اور سلیم ثالث (۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء) جو ہارون رشید کی طرح موسیقاروں پر زر و جواہر لٹایا کرتا تھا، خود بھی ایک موسیقار تھا۔ آلاتی موسیقی ترکوں میں ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ترکی فوجی بینڈ کا نگران غیر ملکی تھا بعد میں تین اطالوی اہلِ فن یکے بعد دیگرے حکمران طبقے میں اعلیٰ مقام پر فائز رہے۔ اس طرح سے یورپی موسیقی نے ترکی موسیقی پر غالب ہونا شروع کیا۔

۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں جب ترکیہ کو جدید سیاسی آئین ملا تو استنبول میں موسیقی کے ایک نئے مدرسہ سے جدید ثقافتی دور کا آغاز ہوا۔ جس نے مغربی موسیقی کو مقبول بنانے کے علاوہ مقامی موسیقی کے نہایت قیمتی اور قدیم خزانوں کو محفوظ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

ترکستانی موسیقی:۔ جو علاقے آجکل ازبکستان، قرغزستان اور تاجکستان کہلاتے ہیں اُن کو ۱۹۲۶ء سے پہلے مغربی ترکستان یا ترکستان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان علاقوں سے متعلق کئی افراد نے موسیقی میں نام پیدا کیا۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری کے رودکی، فارابی، ابوعبداللہ محمد خوارزمی، پانچویں صدی ہجری کے ابنِ سینا، آٹھویں صدی ہجری کے محمد بن محمود الاملی اور امیر خسرو، نویں صدی ہجری کے سعیدالدین کدری کا رسالہ' چنگ کے موضوع پر ایک [illegible] دسویں صدی ہجری کے فخرالدین خجندی جس نے موسیقی پر [illegible] صفی الدین عبدالمومن کے نظریوں پر حواشی لکھے اور علی شیر نوائی اور اس کے چچا [illegible] گیارہویں صدی ہجری میں قاسم بن دوست علی بخاری، جس نے علم موسیقی پر ایک رسالہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے لئے لکھا اور اس کا ہم نام درویش علی بخاری جو ایک مشہور گویا اور چنگ نواز تھا۔

ان ممالک کے سب سلاطین بڑی کشادہ دلی سے علم موسیقی اور فنِ موسیقی کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ مشہور مغنی عبدالقادر بن غیبی تیمور اور شاہ رخ کے دربار سے منسلک تھا۔ پچھلے زمانے میں قدیم ترین اور مقبول ساز دوتار تھا۔

موجودہ ترکمانستان، ازبکستان، قرغزستان اور تاجکستان کی موسیقی قوس و قزح کی طرح رنگا رنگ ہے۔ یہ تنوع بیرونی ثقافتی تعلقات اور اثرات کی وجہ سے ہوا ہے۔ ترکمانستان اپنے ہمسایہ ملک خراسان کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے فنِ موسیقی میں بھی خراسانی اثرات نمایاں ہیں۔ اسی طرح تاجکستان میں موسیقی پر ایرانی اثر نمایاں ہے۔ ازبکستان اور قرغزستان میں مقامی موسیقی کا رنگ غالب ہے۔

اندلسی موسیقی:۔ اندلس میں دلبستانِ بغداد کی قدیم عربی موسیقی سقوطِ بغداد کے بعد کوئی دو سو برس تک یعنی ۸۹۷ھ/ ۱۴۹۲ء تک قائم رہی۔ اندلس کی فتح کے بعد پچاس سال بعد ہی اموی حکمران اس علاقہ پر حکومت کرنے لگے۔ ان کے دورِ حکمرانی میں فنِ موسیقی نے کافی فروغ پایا۔ یگانۂ روزگار موسیقار زریاب نے ۲۰۶ھ/ ۸۲۲ء میں اس طرزِ موسیقی کو پیش کیا جو اس کے استاد اسحٰق موصلی نے منظم کی تھی۔ اس سے قبل اُمرا قدیم طرز کی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ زریاب کی زندگی میں اس سرزمین کی تاریخ میں موسیقی کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔

امیر الحکم اوّل (م ۲۰۶ھ/ ۸۲۲ء) اور عبدالرحمان ثانی (۲۳۸ھ/ ۸۵۲ء) نے موسیقی کی سرپرستی کی۔ زریاب کے دبستان کا دوسرے ملکوں میں بھی چرچا ہوا اور اس کی موت کے بعد اس کی اولاد و احفاد نے اس فن کو جاری رکھا۔ عبدالرحمان ثالث (م ۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) کے شاندار تاریخی عہدِ حکومت میں موسیقی کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اُس نے اپنے بچوں کو اس فن کی تعلیم دلائی۔ ان میں سے ایک تو طنبورہ اور قیثارہ بجایا کرتا تھا اور دوسرا بیٹا ابوالولید صبح کہا کرتا تھا کہ جب تک اللہ کی جانب سے پرندوں کو گانے کی اجازت ہے میں بھی گاتا رہونگا۔ بعد کے خلفاء حکم ثانی (۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء)، محمد ثانی (م ۴۰۰ھ/ ۱۰۰۰ء) ہشام ثانی (۱۰۱۳ء) اور محمد ثالث (۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء) کے زمانوں میں علوم و فنون کی ترقی میں کوئی انحطاط نہ آیا۔ محمد ثالث کی بیٹی وَلّادہ ایک مشہور شاعرہ ہونے کے علاوہ مغنیہ بھی تھی۔ مغربی خلافت کے خاتمے اور مختلف ولایات کے خود مختار ہونے سے سیاسی اقتدار میں انتشار تو ہوا لیکن عام تہذیب و تمدن میں کچھ ترقی ہی ہوئی۔ مختلف ولایات کے حکمرانوں کے دربار علوم و فنون کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ بعد کے زمانوں میں بربر حکمرانوں کے تشدد کے باوجود بہت سے مشہور و معروف فن کار پیدا ہوئے۔ کیونکہ بربر حکمران موسیقی کو بالکل ناجائز سمجھتے تھے۔ رسالہ فی الموسیقی کا مصنف ابوالصلت اُمیہ، دانیہ کا رہنے والا تھا۔ اندلس کے دو موسیقار، جنہوں نے مشرق میں نام پیدا کیا' ابوالحکم باہلی اور ابوزکریا یحییٰ البیاسی تھے۔ اسی طرح ابنِ باجہ جیسی نامور شخصیت کے علاوہ ایک اور حکیم مشہور و معروف فلسفی ابن رُشد (م ۵۹۴ھ/ ۱۱۹۸ء) تھا اُس نے ایک تلخیص فی النفس لارسطا طالیس لکھی تھی اساتذہ موسیقی میں آخری شخص ابن

Marfat.com

المخاطب المعروف بہ ذوالوزہاتین (م ۷۷۶ھ/۱۳۷۴ء) تھا جو کتاب فی الموسیقی کا مصنف تھا۔ عیسائیوں کی طرف سے اسپین کی فتح کی کوشش برابر جاری تھیں حتیٰ کہ ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد اندلس کی اس آخری اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسپین میں تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی وجہ سے مسلمانوں کے تہذیبی و تمدنی اثرات کو مٹایا نہ جا سکا اور اندلس کے موروں کی موسیقی نے اسپین بلکہ یورپ تک اپنے اثرات ڈالے۔

پاک و ہند کی موسیقی :۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی غیر مذہبی موسیقی کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ برصغیر میں اسلام کے متعارف ہونے کے بعد ایک طویل عرصہ تک تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ اسلام کے چار بڑے فقہی مذاہب موسیقی کو ایک ممنوع چیز سمجھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ صوفیوں اور درویشوں کے سلسلے موسیقی اور رقص دونوں کو اپنے ہاں جائز سمجھتے ہیں۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنے دورِ حکومت کے آغاز میں فقہا کے دباؤ پر موسیقی کو ممنوع قرار دیا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ دہلی کے چشتی درویشوں کے سماع اور وجد سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے موسیقی پر سے پابندی اُٹھالی۔ صوفیاء کے اس سلسلہ کی بنیاد حضرت معین الدین چشتی نے (۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء) رکھی تھی اور یہ ہندوستان بھر میں مقبول تھا۔ صاحبِ تاریخ فرشتہ لکھتے ہیں کہ سلطان فیروز شاہ اول رکن الدین (۶۴۲ھ/۱۲۳۹ء) نے فنِ موسیقی کی سرپرستی کی۔ غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ/۱۲۹۵ء) کے دربار میں ایک شام شاعروں اور ادیبوں کے لئے مخصوص تھی اور ایک شام مغنیوں رقاصوں اور داستان گوؤں کے لئے مقرر تھی۔ سلطان کیقباد (۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) کے عہد میں موسیقی کا قریب قریب ہر گھر میں چرچا تھا۔

خلجی سلاطین میں سے پہلے بادشاہ فیروز شاہ ثانی جلال الدین (۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء) نے بھی فنِ موسیقی کی کافی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں امیر خاصہ اور حمید راجا جیسے بلند پایہ مغنی اور محمد شاہ چنگی، نصیر خان اور بہروز جیسے مطرب موجود تھے۔ امیر خسرو کا بھی اس دربار سے تعلق رہا ہے۔ امیر خسرو سلطان غیاث الدین بلبن اور کیقباد کے درباروں سے بھی متعلق رہے ہیں۔

خاندانِ سادات کے زمانہ میں موسیقی کو دربارِ شاہی اور عوام کی زندگی میں بدستور اہمیت حاصل رہی۔ تاریخ مبارک شاہی میں لکھا ہے کہ سلطان مبارک شاہ (م ۸۳۷ھ/۱۴۳۳ء) فنِ موسیقی کا بہت شیدا تھا۔ لودھی خاندان کے عہدِ حکومت میں فقہا کے کہنے پر موسیقی پر کچھ پابندی سی رہی لیکن سلطان سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) نے خصوصی طور پر اپنے لئے چار ایسے غلام رکھے ہوئے تھے جو اُس کے ذوقِ موسیقی کی تسکین کرتے تھے۔ ان غلاموں میں سے ایک چنگ، دوسرا قانون، تیسرا طنبور اور چوتھا بین بجانے میں کمال رکھتا تھا۔

سوری خاندان کے بادشاہ (دورِ حکومت ۹۴۶ھ/۱۵۳۹ء تا ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) بھی موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اسلام شاہ سوری اور عادل شاہ سوری نے فنِ موسیقی کی خصوصی طور پر سرپرستی کی۔ سلطان عادل شاہ گانے بجانے کے فن میں ایسا ماہر تھا کہ موسیقی کا مشہور اور نامور استاد تان سین بھی اس سلطان کا شاگرد ہونے کا فخر سے اظہار کرتا تھا۔ دوسری ریاستوں کے حکمران بھی فنِ موسیقی کی اور فن کاروں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ تاریخ فرشتہ میں ان درباروں کے احوال تفصیل طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ کشمیر راگوں کے لئے مشہور تھا۔ سلاطینِ کشمیر (۷۳۵ھ/۱۳۳۴ء تا ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء) میں سے ایک بادشاہ زین العابدین کے عہد میں موسیقی پر کافی کتابیں لکھی گئیں۔

دکن میں بہمنی خاندان کے بادشاہوں میں سے تاج الدین فیروز شاہ (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء) کو موسیقی سے بہت شغف تھا۔ بہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہوں میں سے احمد شاہ اول (۸۳۸ھ)، علاؤ الدین احمد شاہ ثانی (۸۶۲ھ)، محمد شاہ ثانی (۸۸۷ھ) اور محمود شاہ ثانی (۹۲۴ھ) نے اپنے درباروں میں مستقل معروف مغنیوں اور رقص و موسیقی کی ماہر لڑکیوں کو رکھا ہوا تھا۔ بہمنی خاندان کے زوال کے بعد بیجاپور کی ریاست کے بادشاہ یوسف عادل شاہ (۹۱۶ھ/۱۵۱۱ء) کے متعلق تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ موسیقی میں اس کا ذوق اور کمال اس درجے کا تھا کہ اُس دور کے ماہرِ فن اس سے مات کھا جاتے۔ وہ کئی ساز نہایت خوبی سے بجاتا تھا۔ اُس کے جانشین اسمٰعیل (۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء) نے دکن کی موسیقی کے مقابلہ میں ترکی اور ایرانی موسیقی کو ترجیح دی۔ ابراہیم عادل شاہ اوّل اور ثانی کے زمانوں میں بھی موسیقی کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء) نے فنِ موسیقی پر ایک کتاب نورس لکھی تھی۔

مغلیہ دورِ حکومت میں فنِ موسیقی کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس سلطنت کا بانی اور پہلا شہنشاہ بابر (۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء تا ۹۳۶ھ/۱۵۳۰ء) نے موسیقی کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ اُس کے تایا سلطان احمد مرزا کے دربار میں فنِ موسیقی کے ماہرین کا جمگھٹا رہتا تھا۔ قیامِ کابل کے ابتدائی ایام میں بابر کے دربار میں مشہور مطرب علی شیر نوائی کے تین تربیت یافتہ شاگرد قل محمد عودی، حسین عودی اور شیخ نائی جیسے موسیقار موجود تھے۔ نصیر الدین ہمایوں (م ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء) بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا حامی اور مربی تھا۔ عہدِ ہمایوں میں موسیقی دان اور مغنی "اہلِ مراد" میں شامل تھے اور ان کے اظہارِ فن کے لئے دربار میں دوشنبہ اور سہ شنبہ کے دن مقرر تھے۔ اس کے دربار میں میر عبداللہ قانونی، مولانا قاسم قانونی، استاد شاہ محمد سرنائی، حافظ دوست ۔ خوافی (مغنی) اور استاد یوسف مودود (مغنی) جیسے ماہرِ فن موجود تھے۔

مشہور مغل بادشاہ اکبر (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے زمانے کی موسیقی زمانۂ ماضی کی موسیقی پر بھی سبقت لے گئی بلکہ اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ابوالفضل نے موسیقی کے نظری اور عملی پہلوؤں پر اپنی کتاب آئینِ اکبری میں سنگیت کے نام سے ایک باب مخصوص کیا ہے۔ آئینِ اکبری میں ہی اس عظیم مغل بادشاہ کے دربار کی موسیقی کے متعلق تفصیلی احوال بیان کئے گئے ہیں۔ اُس کے موسیقار سات طائفوں میں منقسم تھے اور ہر طائفے کے گانے بجانے کے لئے ایک ایک دن مقرر تھا۔ ابوالفضل نے ان میں سے چھتیس مطربوں کے نام لکھے ہیں، جن میں سے بعض گانے والے تھے، بعض انشاد کرنے والے (خوانندہ) تھے اور بعض آلاتِ موسیقی کے ماہر تھے۔ یہ سب موسیقار دنیائے اسلام کے مختلف ممالک سے آئے تھے۔ جہانگیر (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء) ہر قسم کی موسیقی کا دلدادہ تھا اور اُس کا بھائی دانیال ہندی گیتوں کا خاص شائق تھا۔ شہاب الدین شاہ جہاں (م ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء) کے عہد میں موسیقی تمام درباری اور عوامی جشنوں اور تہواروں میں تفریح کا ذریعہ بن چکی تھی۔ شاہ جہاں نے گوالیار کے مشہور شاعر اور طرز طراز بخشو کی تمام تصانیف کا مجموعہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ مجموعہ ایک ہزار دُھرپدوں پر مشتمل تھا۔ جس میں چار راگ اور چھیالیس راگنیاں شامل تھیں۔ اُس کے فرزند اورنگزیب نے حکومت سنبھالنے کے بعد موسیقی کے متعلق سخت روش اختیار کی فنِ موسیقی بالکل متروک

Marfat.com

ہوگئی۔ بادشاہ نے درباری مطربوں کو موقوف کر دیا۔ گو موسیقی کا عمل ممنوع تھا لیکن موسیقی کے علم و فن پر اورنگ زیب کے دور میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۲ء) میں نقیر اللہ نامی ایک شخص نے (۱۱۹۱ھ/۱۷۰۷ء) "راگ درپن" کے نام کی ایک کتاب لکھی۔ مرزا روشن ضمیر (م ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء) نے فارسی میں "سرجات سنگیت" نامی کتاب لکھی۔ ان دونوں کتابوں کا ماخذ سنسکرت میں موسیقی کی کتابیں تھیں۔

مرزا خان محمد بن فخر الدین محمد نے فارسی زبان میں "تحفۃ الہند" نامی کتاب لکھی۔ محمد کامل خانی نے ایک کتاب "رسالہ در عمل بین و حفظ راگ" لکھی۔ ابوالحسن قیصر نے "کتاب معرفۃ النغم" اور "مصباح السرور" حسن بن خواجہ طاہر نے لکھی۔ اس زمانے میں نظری اور عملی اعتبار سے ایرانی موسیقی کا اثر غالب تھا۔ اورنگ زیب کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اول (م ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) نے موسیقی کو دربار اور گھروں میں دوبارہ مقبول عام بنایا۔ اس کے دربار میں تین ولندیزی مطرب بھی تھے۔ اس کے جانشین جہاندار شاہ کے عہد میں مطرب اور رقاص ترقی کر کے صاحبِ منصب ہو گئے۔ فرخ سیر (م ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) ناصر الدین محمد شاہ (م ۱۱۶۱ھ) اور شاہ عالم ثانی (م ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) کے زمانوں میں خانہ جنگی کے ہنگاموں اور مغلیہ سلطنت کے رو بہ زوال ہونے کے باوجود موسیقی کو فروغ رہا۔

مشہور فرانسیسی فاضل JOANNY GROSSET جو ہندوستانی موسیقی پر ایک مستند مصنف مانا جاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ بارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر سے برطانوی عہد میں ممتاز اور دولت مند خاندانوں کی سرپرستی سے علم موسیقی کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون میں از سرِ نو جان پڑ گئی۔

برصغیر ہند و پاک میں فن موسیقی کے ارتقا میں مسلمان موسیقاروں کا اہم حصہ ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں کلاسیکی موسیقی کے تحفظ کے سلسلے میں عبدالکریم خان، مہربان خان، ولایت خاں، امام الدین خان، فیاض خاں، عاشق علی خاں اور عبدالوحید خان جیسے معروف مسلمان موسیقاروں نے نمایاں حصہ لیا۔ کرانا، پٹیالہ اور شام چوراسی کے گھرانوں نے فنِ موسیقی کے مختلف اسالیب کو بنانے سنوارنے میں قابلِ ذکر کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد اکثر مسلمان مغنی اور فن کار پاکستان چلے آئے۔ ان میں روشن آرا بیگم، امانت علی خان، فتح علی خان، نزاکت علی خان، سلامت علی خان، شاہد احمد دہلوی، برکت علی خان، نذر حسین شاہی اور فیروز نظامی جیسے نامور ماہرِ فن کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ سازندوں میں بندو خان سارنگی نواز، عبدالعزیز خان بین کار، فتح علی خاں ستار نواز، قادر بخش پکھاوجی اور علاقائی ساز بجانے والوں میں میر سرحدی، مصری خان اور خمیسو خان قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان میں آجکل علاقائی دھنوں کا احیاء ہو رہا ہے۔ مشرقی اور مغربی موسیقی کے امتزاج سے نئی نئی دھنیں بنائی جا رہی ہیں۔ سازینوں میں قدیم مشرقی سازوں کے ساتھ ساتھ جدید یورپی آلاتِ موسیقی کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی دھنوں کو بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس ضمن میں اہم حصہ لے رہے ہیں۔ عسکری موسیقی پر بھی کافی توجہ دی جاتی ہے اسی وجہ سے پاکستان آرمی اور پنجاب پولیس کے بینڈ متعدد قومی اور بین الاقوامی مظاہروں میں دادِ تحسین پا چکے ہیں۔

پاکستان میں مختلف بزرگوں کے مزاروں پر منعقدہ عرس اور محافلِ میلاد کے قوالیوں کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ قوال بھی قدیم انداز کے ساتھ ساتھ جدید اندازِ موسیقی کو بھی اپنا رہے ہیں۔ عزیز میاں قوال اور صابری برادران اپنے مخصوص اندازِ قوالی کی وجہ سے عالم گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ بڑے شہروں میں ایسے ادارے قائم ہیں جو فنِ موسیقی کے فروغ کے لئے نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

فنِ تعمیر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں حجاز مقدس یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بیت اللہ شریف کے سوا ایسی کوئی قابلِ ذکر عمارت نہ تھی جسے اسلامی فنِ تعمیر کے بیان میں پیش کیا جا سکے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ شریف بھی ایک چھوٹا سا مستطیل شکل میں بغیر چھت کے اور بغیر گھڑے ہوئے پتھروں کی ایک عمارت تھی۔

فتوحات کے ذریعے مملکتِ اسلامیہ میں توسیع ہوئی تو دوسرے ممالک میں مسلمانوں کو ان کی تہذیب و تمدن سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ مصر اور شام میں فنِ تعمیر کے بہترین نمونے موجود تھے۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں ایسی کوئی عمارت تعمیر نہ ہو سکی جسے تاریخی کہا جائے۔ بنو امیہ کے دور میں مساجد کی عالیشان عمارتوں کے ذریعے ابتدائی اسلامی فنِ تعمیر کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ بیت المقدس کا "قبۃ الصخرہ" جو آج مسلم فنِ تعمیر کی قدیم ترین یادگار ہے۔ خلیفہ عبدالملک نے تعمیر کروایا اور ۷۲ھ/۶۹۱ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ خلیفہ ولید نے دیوانِ عام اور حمام پر مشتمل ایک عمارت بنوائی جو آج کل شرق اردن میں قصیرِ عمرہ کے نام سے مشہور ہے۔

محلات تعمیر کرنے میں خلفائے بنو امیہ کا درجہ بہت بلند ہے۔ اگرچہ یہ محل سلطنت کے وسط اور قریبی سرحدوں سے دور بنائے جاتے تھے لیکن ان کی بیرونی صورت مستحکم قلعوں کی شکل میں بنائی جاتی تھی۔

بنو امیہ کی تراشیدہ پتھروں سے بنی ہوئی شاندار عمارتوں میں محرابی چھت مرمریں ستونوں پر کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ عمارتیں اندر سے مرمریں چوکوں اور پچی کاری سے حد درجہ مزین کی جاتی تھیں۔ مسجدوں پر عام طور سے کوئی چھتیں ڈالی جاتی تھیں۔ مینار وں کی شکل اونچے مربع برجوں کی سی تھی۔ ان یادگار عمارتوں پر مخلوط اثرات محسوس ہوتے تھے۔ جن میں ایرانی، مصری اثرات کے ساتھ شامی اثر سب سے نمایاں تھا۔ خلافتِ بنو عباس میں بغداد کو پایۂ تخت بنانے سے یونانی تہذیبی اثرات کی جگہ ساسانی، ایرانی اثرات نے لے لی۔ بغداد شہر کی ایک ایک چیز کو یادگار فنِ

دمشق کی جامع کبیر صحن کا منظر، مشرقی رواق کی چھت سے

Marfat.com

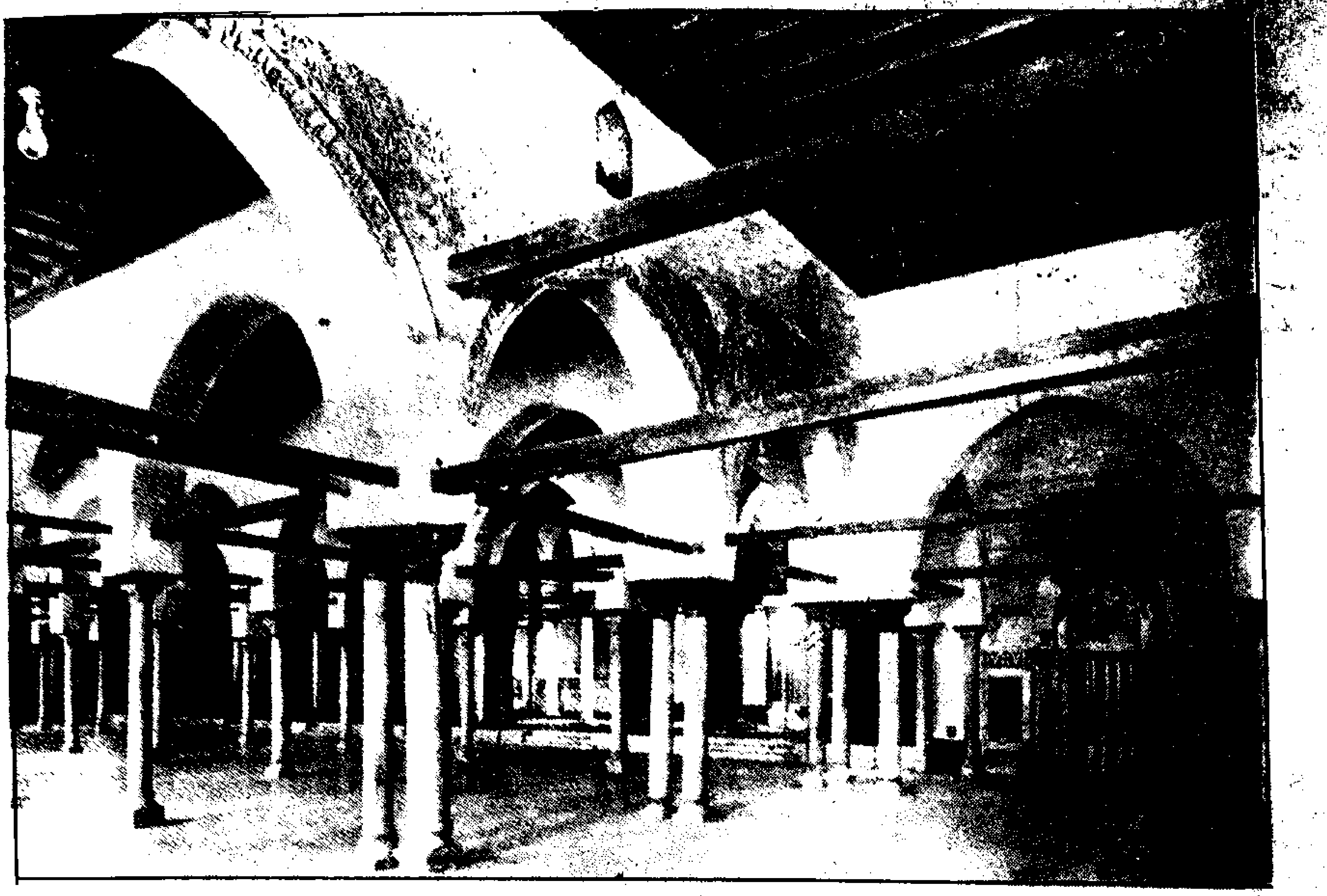

جامع الازہر، وسطی دالان اور محراب

تعمیر کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مشہور مورخین یعقوبی اور خطیب نے تفصیل سے اس شہر کے احوال بیان کیے ہیں۔

اسلامی فنِ تعمیر، شام میں:۔ شام یعنی سوریا کے علاقوں میں فنونِ لطیفہ کے اصل مرکز بصریٰ، بعلبک، حمص، حماۃ، معرۃ، دمشق اور حلب رہے ہیں۔ کیونکہ یہ شہر معاشی اور سیاسی طور پر مضبوط تھے۔ سوریا (شام) کے علاقوں پر جب عربوں نے غلبہ حاصل کیا تو اُس وقت یہ علاقے دس صدیوں سے یونانی ثقافت کے زیرِ اثر تھے۔ شامیوں میں ہر چیز کو اپنا لینے کی جو قابلِ ذکر خصوصیات پائی جاتی ہے، اس کے باعث وہ جلد ہی ایک نئی ثقافت کو اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنا لیتے ہیں۔

قیصر عمرہ کے حمام میں، جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں ہے، دیواری تصویروں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ محفوظ ہے، جس میں مناظرِ خصوصی، رموز اور عشق بازی کی ہیلینی روایات کی عکاسی ہوتی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد میں بھی بوزنطینی اثر اس طرح نمایاں ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ اصل میں یہ گرجا کی عمارت ہے۔ بعد کے زمانوں میں یعنی چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں تعمیر کی گئی عمارت میں بھی ہیلینی روایات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مملوک دور میں شام کے علاقوں میں فنِ تعمیر میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں مغول کے حملوں سے یادگار عمارات تاخت و تاراج ہو گئیں۔

۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں عثمانی ترکوں کی فتح سے، شام (سوریا) ایک عظیم الشان سلطنت کا جز بن گئے۔ استنبولی فنِ تعمیر کو بہت جلد ہی شامی علاقوں میں اپنا لیا گیا کیونکہ مقامی روایتی اصولِ فن فرسودگی کی حالت کو پہنچ گئے تھے۔ اب سوریا فنِ لطیف کے اعتبار سے ترکیہ کا محض ایک صوبہ ہو کر رہ گیا اور جو عمارتیں تعمیر ہونا شروع ہوئیں ان میں استنبولی اثر نمایاں تھا۔ سابقہ زمانوں کی طرح دمشق نے بیرونی اصولِ تعمیر و آرائش کو من و عن اختیار کر لیا لیکن حلب کا فن ہمیشہ کی طرح اب بھی نسبتاً انفرادیت کا حامل رہا۔ اگر پاشاؤں کی تعمیر کردہ بڑی بڑی عمارات میں استنبولی طرز نمایاں ہے تو چھوٹی عمارتوں میں مقامی تعمیراتی رنگ باقی رہا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں کی طرح سوریا میں بھی استنبولی فنِ تعمیر کو زوال آ گیا۔ تیرھویں صدی ہجری/انیسویں صدی عیسوی میں یورپی اثرات کے بول بالا سے تمام علاقے متاثر ہوئے اور شام کے علاقوں کی تقسیم در تقسیم سے مقامی فنِ تعمیر پر بیرونی اثرات غالب آ گئے۔ اب ان علاقوں میں یورپی فنِ تعمیر کے اثرات نمایاں ہیں۔

اسلامی فنِ تعمیر، مصر میں:۔ ابتدائی عہد کی تعمیرات میں قیروان کی جامع کبیر اور قصرِ سامرا کو یادگار کہا جا سکتا ہے۔ فاطمیوں کے دور میں (۳۵۸ھ تا ۵۶۷ھ) قاہرہ شہر تعمیر کیا گیا۔ فاطمی خلیفہ المعز کے سپہ سالار جوہر، جس نے مصر فتح کیا تھا، نے ایک مسجد جامع الازہر تعمیر کروائی، جو ۳۵۹ھ سے شروع ہو کر ۳۶۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کی دیواریں پختہ اینٹوں کی تھیں اور اس میں پایوں کی جگہ سنگِ مرمر کے ستون استعمال کیے گئے تھے۔ اس مسجد کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیچوں بیچ ایک طویل دالان بنا ہوا ہے جو صحن کو محراب سے ملاتا ہے۔ چند برس بعد شہر کی شمالی فصیل کے باہر خلیفہ حاکم نے اس سے بھی بڑی مسجد تعمیر کرائی جس کی پیمائش ۱۲۰ × ۱۳۳ میٹر تھی۔

جامع الاقمر سب سے پہلی مسجد ہے۔ جسکی رد کار بڑی محنت سے آراستہ کی گئی یہ ۵۱۹ھ میں تعمیر کی گئی تھی۔ آٹھ برس بعد سیدہ رقیہ کا چھوٹا سا خوبصورت مشہد تعمیر

Marfat.com

ہوا۔ یہ اپنی اعلیٰ درجے کی گچ کی محراب کے لئے مشہور ہے، جس پر گھونگھٹ بنا ہوا ہے۔ فاطمیوں کی آخری یادگار مسجد صالح طلئع ہے، جو ۵۵۵ھ میں باب زویلہ کے بالمقابل تعمیر کی گئی تھی۔ یہ قاہرہ میں معلقہ مسجد کی پہلی مسجد مثال ہے، یعنی ایسی مسجد جسکے نیچے پست چھتوں والی دکانیں تعمیر ہوں اور مسجد تک پہنچنے کے لئے تین زینے مہیا کئے جائیں۔ فاطمیوں کا دور فنِ تعمیر میں تزئین اور آرائش کے لئے مشہور رہے۔ اس دور کی تعمیر کردہ مساجد کا نفر ادیت نمایاں ہے۔ فاطمی دور کے زوال کے بعد دورِ ایوبی ہے (۵۶۷ تا ۶۴۸ھ) صلاح الدین کا تعمیر کردہ قلعہ اور امام شافعی کا مقبرہ یادگار ہیں۔ امام شافعیؒ کا مقبرہ مصر کے حسین ترین مقبروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دورِ ایوبی کا آغاز صلاح الدین کی عسکری تعمیرات سے ہوتا ہے۔ اس دور میں اندلسی فنِ تعمیر کا اثر غالب نظر آتا تھا۔ جو امام شافعیؒ کے مقبرے اور مناره ضریح حضرت امام حسینؓ کی گچ کی استرکاری میں نمایاں ہے سلطان نورالدین زنگی نے اسلامی مدارس کو شام میں رواج دیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے انہیں مصر میں رائج کیا۔ ان میں اولین عمارت مدرسہ سلطان صالح کی تھی، جو ۶۴۰ تا ۶۴۱ھ میں تعمیر ہوئی۔ بحری مملوکوں کے دور میں (۶۴۸ تا ۷۹۲ھ) فنِ تعمیر میں کافی ارتقا ہوا۔ اس دور کی پہلی عمارت جامع مسجد تھی جو سلطان بیبرس نے قاہرہ کے شمال میں تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد جمادی الآخر ۶۶۵ھ تا شوال ۶۶۷ھ میں

مکمل ہوئی۔ یہ [illegible] عمارت [illegible] تھی۔

بحری الملوک کے سلطان قلاؤن نے [illegible] مقام پر ایک لمبی چوڑی عمارت تعمیر کی۔ جو شفاخانہ [illegible] تھی۔ یہ وسیع عمارت تیرہ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل ہوئی۔ بحری [illegible] اول کی خصوصیت یہ ہے کہ علوم و فنون کے دو مختلف دھارے آپس میں گھل مل رہے ہیں یعنی اندلس میں مسلمانوں کے اخراج کے بعد دوسرے مسلم ممالک میں آنے سے وہاں کے تہذیب و تمدن پر اندلسی اثرات کو غالب کرنا اور دوسرے مغلوں کے حملوں کے بعد اُن کے تہذیبی و تمدنی اثرات۔ قلاؤن کا بیٹا ناصر تعمیرات کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں وہ مدرسہ و مقبرہ تعمیر ہوا جس کی تعمیر ۷۰۳ھ میں اختتام کو پہنچی۔ اسی سلطان کے عہد میں چینی پچی کاری کا مصر میں رواج ہوا۔ یہ پچی کاری مسجد اسلام بہائی اور شہزادی طغائی نے مقبرہ کے گنبد کے ڈھولنے پر نظر آتی ہے۔ بحری مملوکوں کے دور کا نصف آخر سلطان حسن کے مدرسہ و مقبرہ کی وجہ سے ممتاز ہے، جو مصر میں اسلامی فنِ تعمیر کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس میں مختلف اثرات کا امتزاج نظر آتا ہے۔ جن میں شامی و اناطولی اثرات واضح اور نمایاں ہیں۔

چرکسی مملوکوں کے دور (۷۸۴ تا ۹۲۲ھ) میں فنِ تعمیر میں پہلے زمانوں کی تقلید ہ

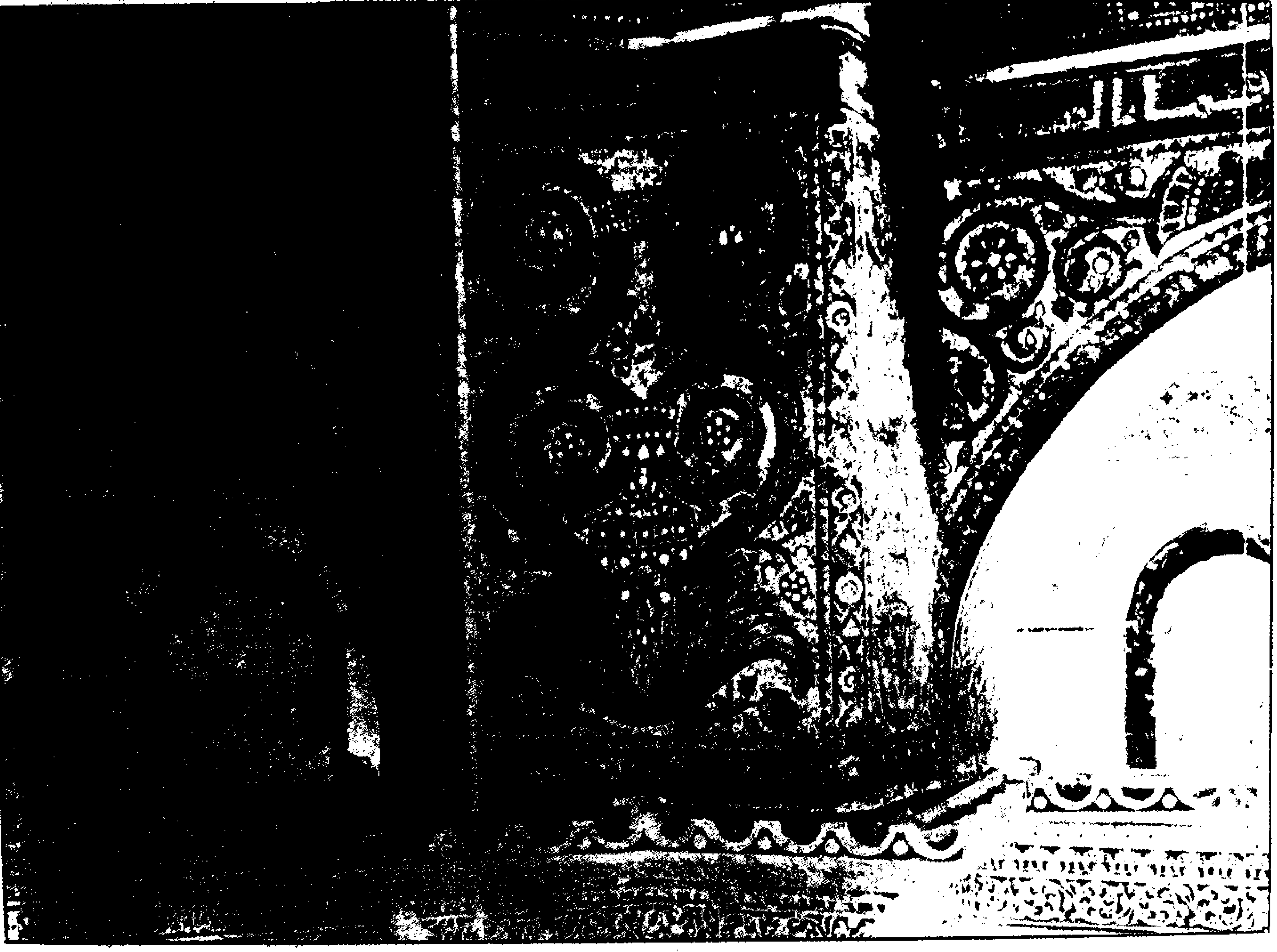

قبۃ الصخرۃ، محرابوں والے مثمن دالان کے اندرونی طرف

ہوئی لیکن تعمیر و ارتقا میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ۸۰۳ھ سے ۸۱۳ھ تک مکمل ہونے والی وہ طویل اور وسیع عمارت قابل ذکر ہے جس میں سلطان برقوق اور اس کے بیٹے فرج کے مقبرے، مسجد، صوفیوں کے لئے خانقاہ، ایک سبیل اور مکتبی خانہ شامل ہیں۔ گوہر لالہ کی چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی اس دور کے وسطی زمانہ کی ایک عمدہ مثال ہے، جو ۸۳۳ھ میں تعمیر ہوئی۔

۹۲۲ھ میں ترکوں کی فتح سے عثمانی ترکوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں فن تعمیر کو زوال ہی رہا کیونکہ پہلے بادشاہوں کی طرح ان سلاطین نے یادگار عمارتوں کی تعمیر کے لئے روپیہ کی فراہمی میں کمی کر دی۔ ان کے اثرات قلعۂ شہر کے اندر مسجد سلای ماریا (۹۳۵ھ)، بولاق میں جامع سیفان پاشا (۹۷۹ھ) اور مسجد ملکہ صفیہ (۱۰۱۹ھ) میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے آخر میں تعمیر کی جانے والی محمد بے ابوذھب کی مسجد کو کامیاب نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ جو ازہر کے بالمقابل ۱۱۸۸ھ میں تعمیر ہوئی۔

انیسویں صدی کے آغاز تک مصری اثر نمایاں رہا لیکن اس کے بعد استنبولی اثرات غالب ہو گئے۔ بعد میں یورپی اثرات نے اس علاقے کو بھی متاثر کیا اور موجودہ تعمیرات میں یورپی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

اسلامی فن تعمیر، شمالی افریقہ میں: طرابلس سے بحر ظلمات تک اور بحر روم سے صحرائے اعظم تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کو شمالی افریقہ کہا جاتا ہے۔ تونس، الجزائر اور مراکش، شمالی افریقہ کے ممالک ہیں۔ ان ممالک کو اسلامی فن تعمیر میں مستقل دبستان فن کی حیثیت حاصل نہیں۔ ہمسایہ ممالک کے ساتھ اس کی فنی ترقی ایک طرح مشترک رہی ہے۔ شمالی افریقہ میں عرب فاتحین کی یادگار عمارات قیروان، موجودہ تونس کے علاقوں میں ملتی ہیں۔ عقبہ بن نافع نے ۷۰ھ میں قیروان کی بنیاد رکھی تھی۔ عقبہ بن نافع نے یہاں ایک مسجد بھی بنوائی تھی جس کا اب کوئی نام و نشان نہیں اسی جگہ پر تیسری صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی کی تعمیر کردہ ایک وسیع و عریض مسجد ہے مسجد کی رو کار میں تیرہ محرابی دروازے ہیں۔ تونس کی جامع زیتونہ کی تعمیر ۲۵۰ھ/۸۶۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ قیروان کی مسجد سے مشابہت رکھتی ہے۔ سوس کی جامع مسجد ایک اور طرز کی ہے جو ۲۳۶ھ/۸۵۰ء میں مکمل ہوئی۔

شمالی افریقہ کے علاقوں پر تیسری صدی ہجری کے وسط کے قریب فاطمیوں نے سیاسی اقتدار حاصل کر لیا۔ ان کے دور میں، تونس کے ساحل پر ایک چھوٹے سے جزیرہ نما میں قلعہ بند شہر مہدیہ میں ۳۰۴ھ میں ایک مسجد تعمیر ہوئی جو اب تک باقی ہے۔ ایک دوسرے شہر صبرہ منصوریہ میں فاطمی بادشاہوں کا تعمیر کردہ ایک محل پایا جاتا ہے۔ فاطمی دور کے بعد صنہاجی بربروں کے ایک خاندان مرابطون نے سیاسی قوت حاصل کی۔ مرابطون نے شہر مراکش آباد کیا۔ الجزائر اور تلمسان میں مساجد تعمیر کروائیں جو اب تک موجود ہیں۔ بعد کے زمانوں میں صاحب اقتدار حکمرانوں نے جو تعمیرات کروائیں اُن میں اندلسی مراکشی فن تعمیر نمایاں ہے۔ ترک خلافت کے زمانے میں الجزائر اور تونس پر اُن کے قبضے کے بعد سے استنبولی طرز تعمیر غالب آگیا۔

اسلامی فن تعمیر، اناطولی (ترکیہ) میں: اس ملک کی ثقافت بہت قدیم تھی، جو تین ہزار سال سے چلی آ رہی تھی۔ اس کی حیثیت بوزنطی سلطنت کی ایک مسیحی ریاست کی تھی۔ جب ایران کو مغول نے برباد کیا تو بہت

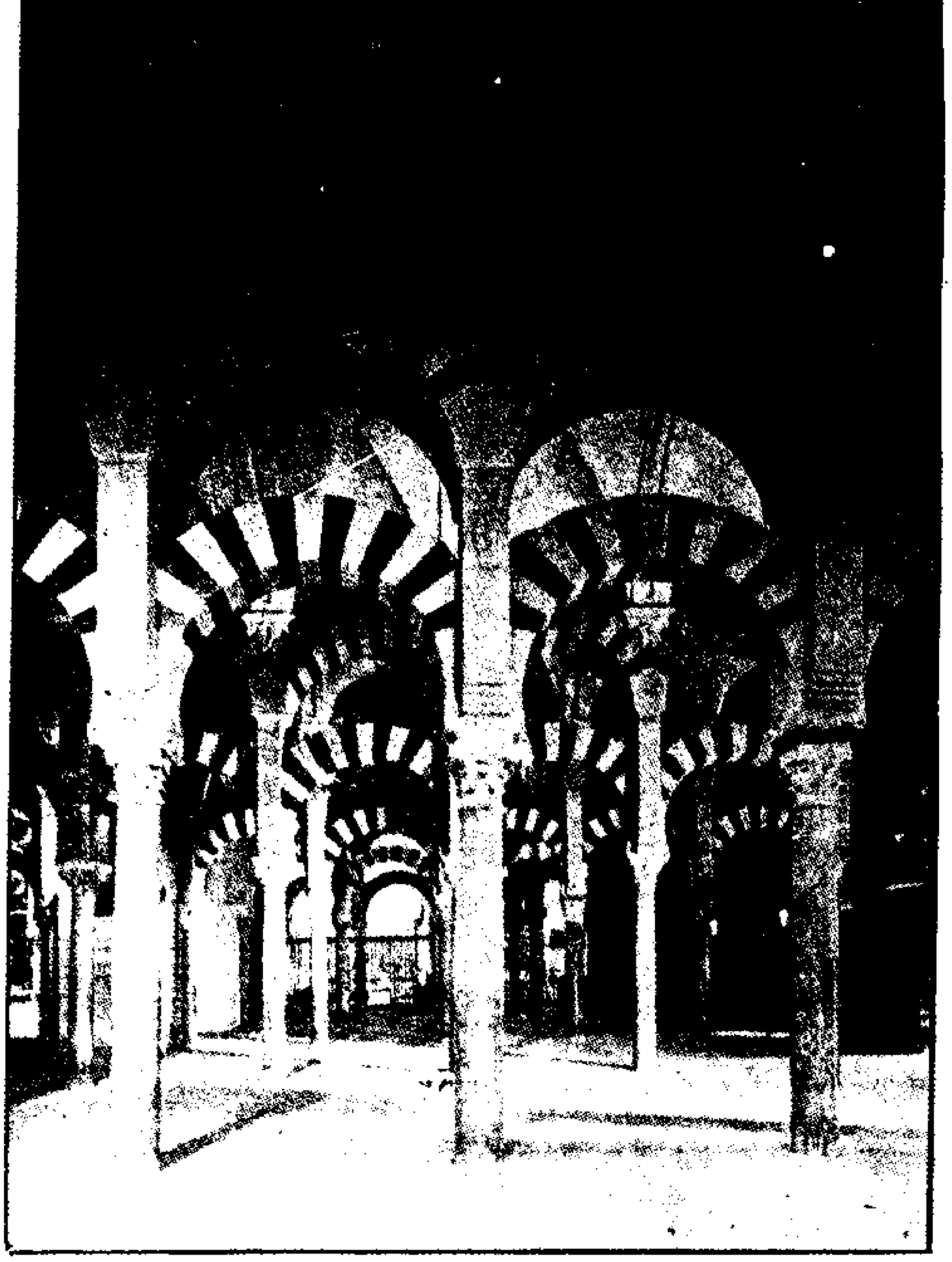

قرطبہ: جامع کبیر

کاریگر اناطولی آگئے جس نے ترکی اسلجوقی، اسلوب تعمیر پیدا کیا۔ ابتدائی عہد کی تعمیرات، مدرسوں، مساجد اور کاروان سراؤں میں یہ اسلوب نمایاں ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز سے ترکان عثمانیہ کی خلافت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس خاندان کے ۳۷ بادشاہ حکومت کرتے رہے۔ ان کے دور میں ابتدائی تعمیرات ان کے دو پہلے صدر مقامات ازنیق اور برسہ میں ہوئیں۔ ان کی اولین تعمیر کردہ عمارتوں نے قبے دار تعمیرات کے ایک نئے اسلوب کو رواج دیا، جو ارتقا کی منازل سے گزرتا ہوا استنبول اور عثمانی ترکوں کی عظیم الشان مساجد کے اسلوب تعمیر تک پہنچ گیا۔ عثمانی سلاطین میں سے اورخان سے محمد ثانی تک چھ سلاطین نے (۱۳۲۶ تا ۱۴۵۳ء تک) ایک ایک مسجد سلسلے کی شکل پر تعمیر کروائی، ہر مسجد پر سلطان کا نام ثبت ہے۔ جس کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ یہ مساجد مخصوص قسم کی تھیں جن میں خود سلطان ہی نماز ادا کرتے تھے۔ ان سلطانی مساجد میں سب سے زیادہ عظیم الشان برسہ کی یشیل جامع ہے۔ جسے محمد اول (۱۴۰۲ تا ۱۴۲۱ء) اور مراد ثانی (۱۴۲۱ تا ۱۴۵۱ء) نے تعمیر کیا۔ عثمانی ترکیہ کے ہر بڑے شہر میں عامۃ الناس کے لئے ستون دار تالاروں کی شکل میں جامع مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ استنبول کی پہاڑیوں پر سلطانی مساجد کے گنبدوں کے ساتھ تعمیر کئے گئے مینار شہر کو ایک خصوصی شان بخشتے ہیں۔ فواروں کی تعمیر کا رواج عثمانی ترکوں کے زمانے میں فروغ پایا۔ گرم اور سرد پانی سے غسل کرنے کے لئے خصوصی

Marfat.com

طرز کے حمام بھی اسی زمانے میں معروف ہوئے۔

اسلامی فنِ تعمیر، ایران میں :۔ مسلمانوں نے ایران کے فنِ تعمیر میں بڑا حصہ لیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نئی مذہبی قسم کی عمارات تعمیر کیں بلکہ فنِ تعمیر میں نئی جدتیں پیدا کیں۔ ایران کے خشتی معماروں کو عہدِ اسلامی کے ابتدائی دنوں میں ہی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ اسلامی فتوحات کے ابتدائی سالوں میں بدرؒ بن عبداللہ نے دریائے الرس پر "پل خدا آفرین" بنوایا۔ عسکری نقطہ نظر سے کئی اہم مقامات پر قلعے تعمیر کیے گئے مثال کے طور پر اصطخر کے نزدیک "قلعہ زیاد"۔ ۹۳ھ میں قتیبہ بن مسلم نے سمرقند میں ایک ایسی وسیع مسجد تعمیر کروائی جس میں بیک وقت چار ہزار آدمی نماز ادا کر سکتے تھے۔ ارجان کے مقام پر حجاج کے ایک عامل نے ایک مسجد اور ایک بہت بلند مینار تعمیر کروایا تھا۔ اس خوبصورت مینار میں چونے گچ کے استعمال کے بغیر پتھر ایک دوسرے پر جمائے گئے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے خاتمے سے قبل فضل بن یحییٰ برمکی نے خراسان میں متعدد مساجد، کارواں سرائیں اور حوض تعمیر کروائے تھے۔ یعقوبی مؤرخ کے بیان کے مطابق تیسری صدی ہجری تک بلخ میں چالیس جامع مسجدیں بن چکی تھیں۔ ابتدائی دور کی تمام عمارات ساسانی طرز پر بنائی گئی تھیں۔ ان کی چار بنیادی او ضاع آنے والے زمانوں میں ایران کے فنِ تعمیر پر غالب رہیں۔ پہلی وضع گنبد دار حویلی، دوسری وضع بلند ایوان، تیسری وضع کھلے صحن کے چاروں طرف مسقف محرابی دالان، چوتھی وضع ستون دار عمارات تھیں۔

نیشاپور کی جامع مسجد چوبی ستونوں پر قائم تھی۔ بعد میں عمرو بن لیث نے ان کی جگہ اینٹ اور گچ کے ستون بنائے۔ قزوین میں حجاج نے ۸۱ھ

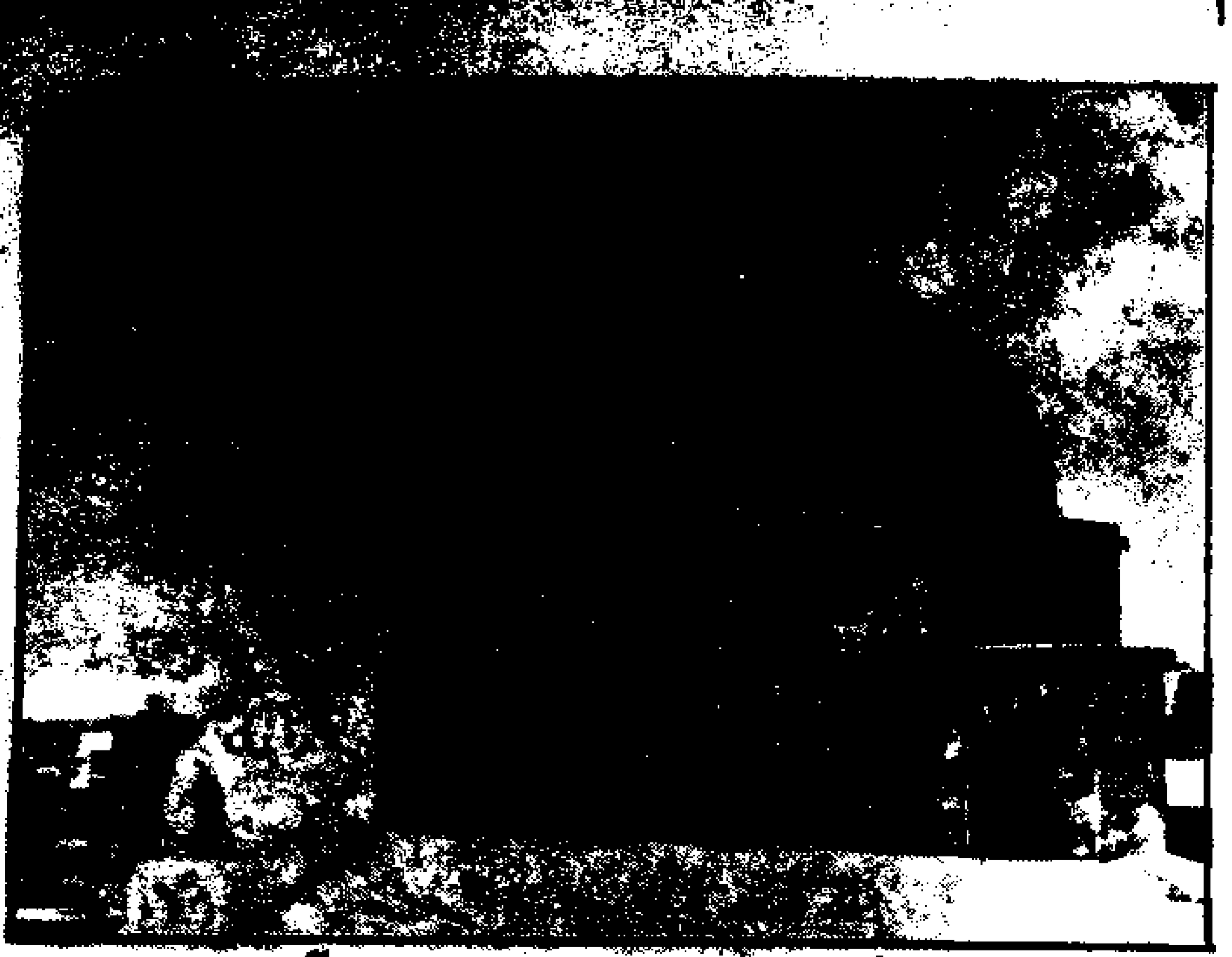

قیروان، جامع کبیر، محرابِ قبلہ کے سامنے کا گنبد

میں مسجد نور کے نام سے بنوائی۔ اس میں ہخامنشی دور کے گاؤ سر ستونوں کا احیاء کیا گیا۔

کوفے کی مسجد اور کاشمر (خوارزم) کی مسجد بھی ستونوں والی عمارات میں بہترین یادگاریں ہیں۔ مرو میں ابو مسلم کا دارالامارۃ (۱۳۲ھ/۷۵۰ء تا ۱۳۸ھ/۷۵۵ء) کو بھی فنِ تعمیر میں یادگار کہا جا سکتا ہے۔ ایران میں چوکور عمارات کا نقشہ بھی بہت مقبول ہوا۔ سامانیوں کے دورِ حکومت (۲۸۰ تا ۳۸۹ھ) میں فنِ تعمیر نے کافی ترقی کی۔ بخارا اور سمرقند جیسے ثقافتی مرکزوں میں اس دور کی کئی یادگار عمارات موجود ہیں۔

گنبدِ قابوس ان یادگار میناروں میں سب سے پرانا اور زیادہ معنویت کا حامل ہے جن کا سلسلہ سات سو برس تک چلا جاتا ہے اور جو تعداد میں پچاس ہیں۔ یہ بلوری قلم جیسی گول دیواروں والے مینار، ایران کے قریب قریب ہر حصے میں ایک دوسرے سے دور استادہ نظر آتے ہیں اور ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان کی تعمیر کے سلسلے کا آغاز لاجم (مازندران) کے مقام پر ۴۱۳ھ میں ہوا اور آٹھویں صدی ہجری تک چلا گیا۔ ان میں سے بعض مینار ۴۰ فٹ سے زیادہ بلند نہیں اور بعض گنبدِ قابوس اور اصفہان کے پر شکوہ مینار ساربان کی طرح تقریباً ۱۵۰ فٹ تک بلند ہیں۔ ان میناروں میں انکے زمانے اور مقامی طرز کی جھلک نہایت واضح ہے چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں محمود غزنوی نے اپنی وسیع سلطنت میں ایران، ہندوستان اور مشرق بعید کے تہذیبی اور تمدنی عناصر کے امتزاج سے ایک نئی ثقافت کو متعارف کروایا۔ محمود غزنوی کے بیٹے مسعود نے گوشۂ سعودی کے نام سے ایک طویل عماراتی منصوبے کا آغاز کیا۔ جو بیس سال سے زائد عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ محلات کی بڑی بڑی عمارات کی تعمیر میں چار چار سال لگ گئے۔

ہخامنشی بادشاہوں کے پایۂ تخت اصفہان میں چوتھی صدی ہجری میں تعمیر کی گئی مسجد اصفہان اپنی طرز کی ایک یادگار تعمیر ہے۔ اس کا شمار بلادِ اسلامی کی اہم ترین مساجد میں ہوتا ہے۔ یہ تقریباً بیس جدا جدا عمارات پر مشتمل ہے جو چوتھی صدی ہجری سے اب تک تعمیر ہوتی رہی ہیں۔ قبلے کی سمت اسکا ایک اونچا مینار ۶۰ ذرع بلند تعمیر کیا گیا تھا۔ اصفہانی طرز کی جو دوسری اہم جامع مسجدیں تعمیر کی گئیں ان میں قزوین کی مسجد (۵۰۷ھ/۱۱۱۳ء تا ۵۰۹ھ/۱۱۱۵ء) بالخصوص بہت وسیع ہے۔ منگول کے حملوں سے کئی شہر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور تہذیب و تمدن کی

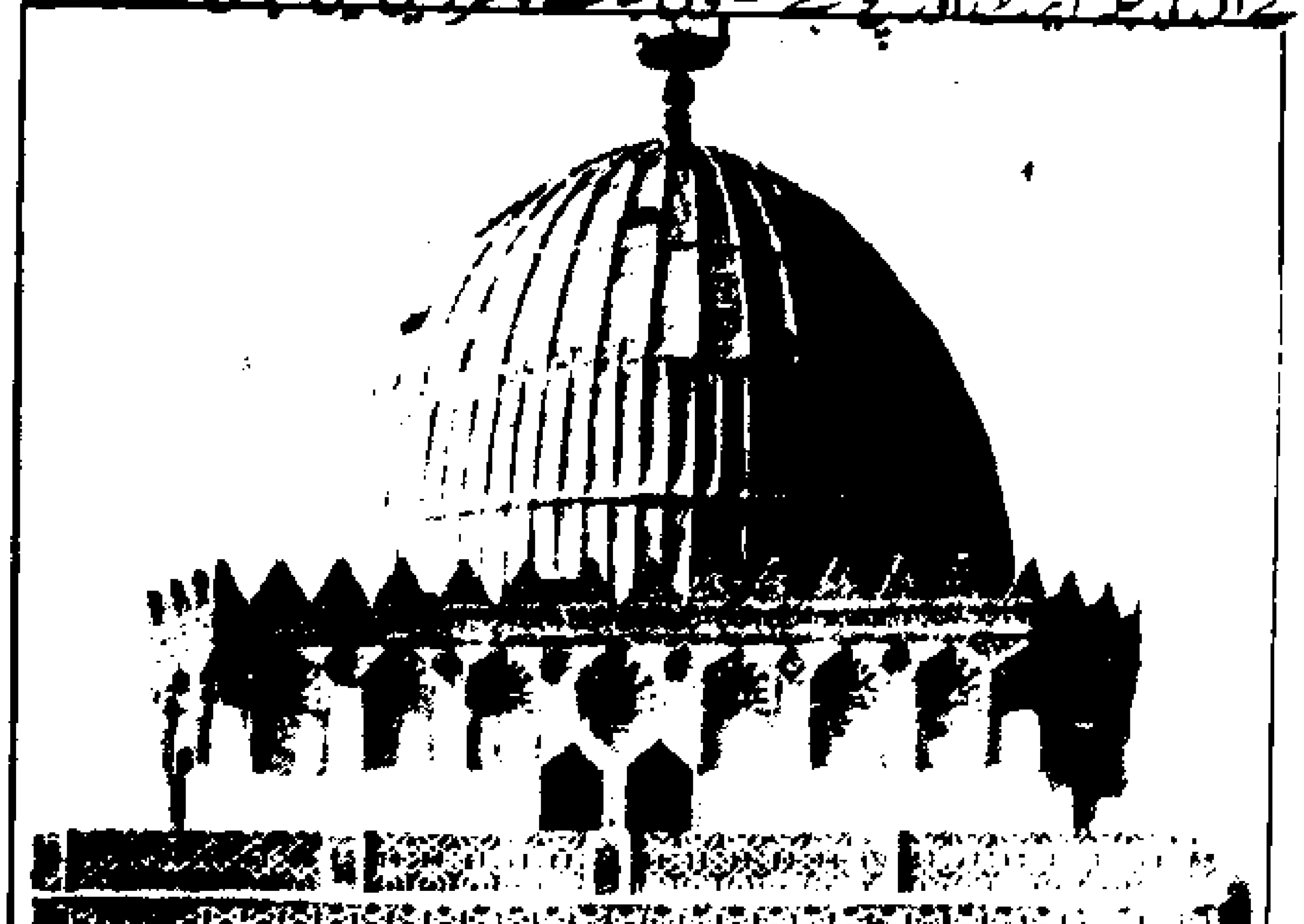

مقبرۂ امام شافعیؒ

Marfat.com

ایران کی روایات کا نام و نشان مٹ گیا۔ لیکن منغول کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ادوار میں فنون کے احیاء اور ارتقاء میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کے دورِ حکومت کی عمارات میں مساجد، مدارس، مقبرے یادگار تعمیرات میں شمار کئے جاتے ہیں۔

غازان خان نامی ایک بادشاہ نے تبریز شہر کے گرد ۷ افٹ موٹی اور ۰۰۰،۴۵ قدم طویل ایک فصیل تعمیر کروائی تھی۔ منغول حکمرانوں نے کئی نئے شہر تعمیر کروائے جن کی ایک ایک عمارت فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ ایران میں کثرتِ تعمیر کے اعتبار سے چودھویں صدی عیسوی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مختلف شہروں میں مختلف قسم کی عمارات کے مجموعے تعمیر کئے گئے۔ ان شہروں میں بطام اور وسطی ایران کا ایک قصبہ نفنز شامل ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کا فنِ تعمیر سلجوقی اوضاع اور طریقِ تعمیر پر مبنی تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں بھی وہی اوضاع جاری رہیں۔ تیمور کے دورِ اقتدار میں سمرقند کو دوبارہ شان و شوکت کا مرکز بننے کا موقع ملا۔ تیمور کی بنا کردہ عمارتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں شاندار محلّات، مساجد، مدارس اور مقابر شامل ہیں، جو دریائے جیحوں کے خطّے کے دوسرے شہروں اور سمرقند میں تعمیر کئے گئے۔ تیمور کے بیٹے شاہ رُخ (۱۴۰۷ تا ۱۴۴۶ء) نے شہر کے شہر دوبارہ آباد کئے اور کئی عالیشان عمارات تعمیر کروائیں۔ ان یادگار اور ممتاز عمارتوں میں مسجد ملکہ گوہر شاد (۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء میں تعمیر ہوئی)، مدرسہ و مصلّی، ہرات (۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء تا ۸۴۱ھ/۱۴۳۷ء) اور مدرسہ خرگرد شامل ہیں۔ تیمور کے پوتے الغ بیگ نے سمرقند میں پُرشکوہ عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا۔

مخصوص طرزِ آرائش والی عمارتوں کی تعمیر کے فن نے توران کے علاقوں میں کافی نشوونما پائی۔ اس طرزِ تعمیر میں عمارتوں کی تزئین پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اس روایت کی بنیاد مقبرۂ اسماعیل سے رکھی گئی اور مقبرۂ جلال الدین میں پوری ہو گئی۔

صفوی دورِ حکومت کو فنِ تعمیر کے نقطۂ نگاہ سے ترقی پذیر زمانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس زمانے میں بھی یادگار عمارات بنائی گئیں۔

ایران میں مسلمانوں کے ۱۲ سو سالہ عہد میں فنِ تعمیر میں ساخت اور جمالیات دونوں کے اعتبار سے تنوع کا اظہار ملتا ہے۔ اس نے قدیم روایات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلسل اور بتدریج ترقی کی اور بنیادی طور پر اسلامی اوضاع اور

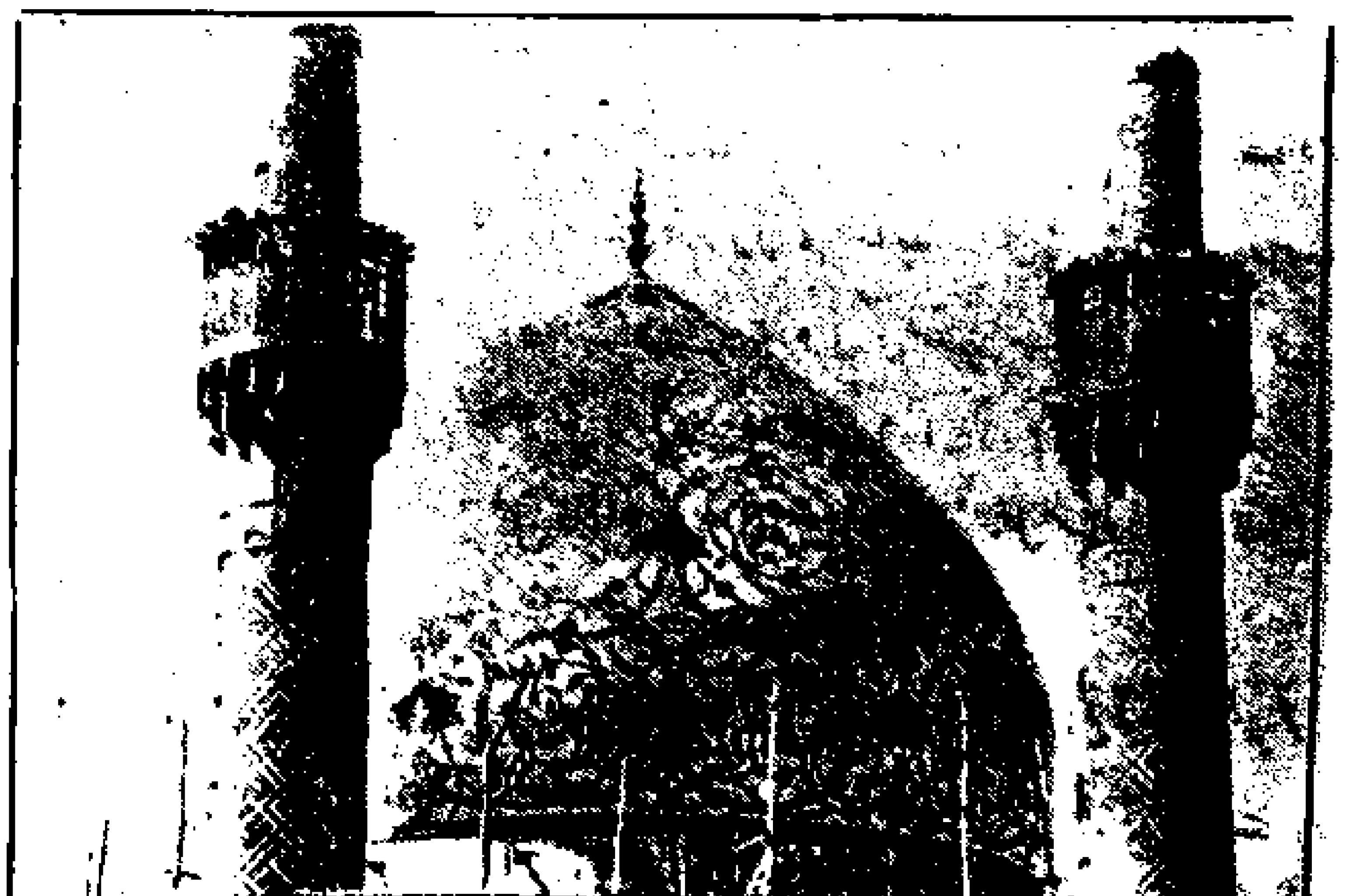

اصفہان، مسجد مادرشاہ (۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) گنبد اور صدر دروازے کا منظر

دامغان، مینار کا گنبد، مقبرہ پیر علمدار (۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء)

احساسات کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھا۔ عمارات کی تعمیر اور آرائش میں اعلیٰ درجے کا سلیقہ، صناعانہ کمال، لطافت اور نفاست کے اعلیٰ خواص پائے جاتے ہیں۔ ایسی یادگار عمارات کی تعمیر کی گئیں جن کا استفادہ تا دیر قائم رہے۔

اسلامی فنِ تعمیر، پاک و ہند میں: مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کا باقاعدہ قیام ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں کیا۔ اس سے پہلے متفرق علاقوں پر مسلمان حکمران حکومت کرتے تھے۔ ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے قدم اس خطۂ زمین سے محمد بن قاسم کے ذریعے آشنا ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل تک یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مقامی آبادی میں سے اکثر مسلمان ہوئی تھی جن کو وراثت میں قدیم ہندی ثقافت بھی ملی تھی۔ اس وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے فنون نے ایک حد تک جنوب مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی اسلامی تہذیب سے علیحدہ نشوونما پائی۔ آہستہ آہستہ مقامی ہندی فن سے اُن باتوں کو بھی اپنا لیا گیا جو اسلامی ضروریات و تصورات کیلئے موزوں تھیں۔

اسلامی فنِ تعمیر میں ہندوستان کے باہر جو ترقی ہوئی اس کی قبولیت کا انحصار سیاسی اقتدار پر تھا۔ گو ہندوستانی مسلمان اسلامی برادری کے رکن تھے لیکن اس کے ساتھ انہیں وسط ایشیا اور ایران کی طرف سے متواتر فوجی حملوں اور عربوں، ایرانیوں کی ثقافتی نخوت کا مقابلہ کرنا تھا۔ منغول کے حملوں کے بعد جو تھوڑا بہت رابطہ تھا وہ بھی منقطع ہو گیا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں فنِ تعمیر کی کئی جدید طرزیں ایران اور ترکستان سے دہلی، جونپور، بہمنی میں، ایوبی اور مملوک دور کے مصر سے سلطنت مالوہ، سلطنت بہمنی سے گجرات اور بیجاپور میں اور عثمانی ترک سے بیجاپور میں ختم ہو گیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ تعمیر نے سولھویں ص

روایت کو جاری رکھا۔ مغل بادشاہوں نے ایران کا خالص صفوی طرزِ تعمیر رائج کیا۔ لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوؤں کے سیاسی اثرات کے مضبوط ہونے سے فنِ تعمیر میں ہندی اثر غالب ہو گیا۔ سلطنتِ دہلی کے باقاعدہ قیام سے قبل مختلف علاقوں میں جو تعمیرات اس دور کے مسلمان حکمرانوں نے کروائیں ان میں غیر مقامی اور خصوصی طور پر ایرانی رنگ غالب تھا۔

دہلی کی پہلی یادگار عمارت لال کوٹ کی مسجد قوت الاسلام ۱۱۹۳ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس میں ہندوانہ طرز کی گلکاری نظر آتی ہے۔ اس کے پاس ہی ایک بہت بڑے مینار اور برج کی تعمیر ۱۱۹۱ء میں شروع ہوئی۔ یہ شہرۂ آفاق قطب مینار تھا۔ سلجوقی مقابر کے میناروں کی طرح چار منزلوں پر مشتمل تھا۔ اس میں اسلامی طرز کی گلکاری اور ہندی طرز کی زیبائش ہے۔

سلطان التتمش نے ۱۲۳۰ء میں مسجد قوت الاسلام کو وسیع کیا اور قطب مینار کی بالائی تین منزلوں کو بھی مکمل کیا۔ لیکن ان میں سے آخری منزل کو ۱۳۶۹ء میں فیروز شاہ نے دوبارہ تعمیر کروایا۔ اس کا بالاترین حصہ ۱۵۰۳ء اور ۱۸۲۸ء میں از سرِ نو درست کیا گیا۔ اس وقت مینار کی اونچائی ۲۳۸ فٹ ہے۔ زمانہ بعد کے مملوک سلاطین کی تعمیر کردہ عمارات میں سے جو اب تک باقی ہیں، ملتان میں حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ، حضرت شمس تبریزیؒ کے مقبرے ہیں۔

خاندانِ خلجی (۱۲۹۰ تا ۱۳۹۸ء) اور خاندانِ تغلق (۱۳۹۸ تا ۱۴۱۴ء) کے زمانے میں ہندی مسلم فن کا رشتہ سلجوقی روایات سے بالآخر منقطع ہو گیا۔ مغول کے حملوں سے دفاع اور وسیع پیمانے پر جنگی نظام کے قیام سے فنِ تعمیر عسکری خصوصیات کے علاوہ ہندی اثرات بھی روز افزوں نمایاں ہوتے گئے۔ تغلق خاندان کے دور میں کئی نئے شہر تعمیر کئے گئے ان میں عامۃ الناس کے مفاد کے لئے کئی تعمیرات کی گئیں۔ غیاث الدین تغلق نے لال کوٹ سے پانچ میل دور تغلق آباد تعمیر کروایا۔ محمد بن تغلق نے دارالحکومت کو دولت آباد (دکن) میں منتقل کر کے اس شہر کو آباد کیا۔ اس دور کی تعمیرات میں عسکری رنگ غالب ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے کئی یادگار درگاہیں تعمیر کروائیں۔ جن میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ، حضرت روشن چراغ دہلیؒ کی درگاہ شامل ہیں۔ دہلی کا خاندانِ سادات (۱۴۱۴ تا ۱۴۵۱ء) اور خاندانِ لودھی (۱۴۵۱ تا ۱۵۲۶ء) کے زمانوں میں تغلقوں کے فنِ تعمیر کی تقلید ترک کر دی گئی اور ایک بار پھر ایسی مسجدیں اور مقبرے تعمیر ہونے لگے جن کی دیواریں انتصابی اور گنبد بلند ہوتے تھے۔ خاندانِ سادات کی عمارتیں دہلی کے قصبہ مبارک پور اور خیر پور میں ہیں۔ لودھیوں کی عمارات دہلی، خیر پور، سرہند، سکندرہ، آگرہ، بیانہ، دھولپور، سنبھل وغیرہ میں پائی جاتی ہیں۔ خاندان سور کے پٹھان بادشاہوں کے عہد میں (۱۵۴۰ تا ۱۵۵۴ء) جمال اور تزئین کے پہلوؤں پر زور دیا جاتا رہا۔ لودھیوں کا طرزِ تعمیر مغل سلطنت کے ابتدائی دور یعنی بابر اور ہمایوں کے زمانوں میں بھی باقی رہا۔ سلاطینِ مغلیہ نے اکبر بادشاہ کے عہد (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) سے ترکستان کا تیموری فن اور اس سے ماخوذ صفوی طرز رائج کیا، لیکن جلد ہی انہیں مقامی ماہرین کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اکبر کے عہد کی عمارات میں وہی تلون پایا جاتا ہے۔ جو اس کے مذہبی خیالات میں ہے۔ آگرہ کے قلعہ میں تعمیر کردہ اس کا محل اب تک موجود ہے اور جہانگیری محل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ابتدائی عہدِ حکومت میں گوالیار میں حضرت محمد غوثؒ (م۱۵۶۲ء) کا مقبرہ تعمیر ہوا جو سہسرام میں شیر شاہ سوری کے مقبرہ سے مشابہ ہے۔ فتح پور سیکری، اکبر کے بنا کردہ نئے شہر میں [illegible] کمال کو پہنچ گیا۔ فتح پور سیکری ۱۵۶۹ء سے [illegible]

فتح پور سیکری میں اکبر نے ایک پنج محل (پانچ منزلہ [illegible]) اکبری وضع کی بہترین عمارات میں سے فتح پور میں تین چھوٹی عمارات سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ بیربل کی بیٹی کا محل، جہانگیر کی والدہ مریم زمانی کا محل اور اکبر کی پہلی بیوی سلطانہ رقیہ بیگم کا محل۔ جامع مسجد دکن اس کی فتوحات کی یادگار میں سے ہے۔ یہ ۱۵۷۱ء میں تعمیر ہوئی تھی اور اسی سال اس نے مجتہد العصر ہونے کا اعلان کیا۔ اس مسجد کے کتبے کی رو سے اکبر کے مرشد شیخ سلیم چشتیؒ نے اس کا نقشہ خانہ کعبہ کے نمونے کے مطابق بنایا تھا۔ اس کے صحن میں شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ ہے۔ یہ مسجد بہت مزین ہے لیکن اس میں ہندوستانی اثر کی کوئی علامت نہیں۔ آلہ آباد جہاں اکثر اکبر بادشاہ کا قیام رہتا تھا، اس نے چالیس ستونوں والا کوشک تعمیر کروایا۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد اکبر کی تعمیر کردہ کئی عمارات کو منہدم کرا دیا۔

جہانگیر کے عہد میں فنِ تعمیر پر اکبر کے عہد کی طرح توجہ نہ دی گئی۔ جہانگیر نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا۔ اس نے قلعہ لاہور میں چند اضافے کروائے۔ انار کلی کا مقبرہ بھی لاہور میں بنوایا۔ کشمیر میں سری نگر کے قریب اس نے اس نے شالامار باغ مع کوشکوں کے بنوایا۔ جہانگیر کے عہد کی سب سے شاندار عمارات ڈھاکہ میں تعمیر ہوئیں۔ ۱۶۰۰ء میں اس نے لاہور میں موتی مسجد تعمیر کروائی جو ہندوستان میں اپنی نوع کی پہلی مسجد ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانوں میں فنِ تعمیر میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ جہانگیر کے عہد میں اکبر کے عہد کی بہ نسبت پچی کاری کی آرائش پر انحصار کیا گیا۔ جس کی مثالیں اکبر کا مقبرہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ (نورجہاں کا والد) کا مقبرہ ہیں۔ جہانگیر کے وزیر، وزیر خان نے لاہور میں جو مسجد تعمیر کروائی وہ محض آرائش ہی کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔ شاہجہان کے عہد (۱۶۲۷ تا ۱۶۵۸ء) میں مغل فنِ تعمیر اپنے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ اس دور کی ابتدائی عمارتوں میں سے ایک بے نظیر عمارت تاج محل ہے، جو اس کی ملکہ ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل کی وفات کے ایک سال بعد بننا شروع ہوا تھا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون میں بھی زوال آنا شروع ہو گیا۔ اورنگ زیب کے جانشین بادشاہوں نے اندرونی انتشار اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اورنگ زیب کے عہد (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء) کی یادگار عمارات میں، دہلی میں حیات بخش باغ کی بارہ دریاں اور موتی مسجد، لاہور میں عالمگیر شاہی مسجد اور حضوری باغ، اورنگ آباد میں قلعۂ ارک اور ملکہ رابعہ درانی کا مقبرہ اور کئی دوسرے شہروں کی مساجد شامل ہیں۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کے عہد کی تعمیر کردہ عمارات میں مہرولی کی سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کردہ موتی مسجد (۱۷۰۹ء)، دہلی کی زینت المساجد (۱۷۱۰ء)، قلعۂ دہلی کا ظفر محل اور ہیرا محل اور مہرولی کا ظفر محل (۱۷۴۰ء) شامل ہیں۔ ظفر محل بہادر شاہ ثانی نے تعمیر کروایا تھا۔

مغلوں کا فنِ عمارت ان کے دوسرے فنون کی طرح بہت سی قوتوں کا مجموعی نتیجہ تھا، لیکن ہندو فن پر اس کی فوقیت، اس کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ہے کیونکہ اس نے غیر ملکی اور ہندی فن کی تکنیک کو بڑے متوازن طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ہندوستان کے ابتدائی مسلمانوں کے فن کی طرح مغل طرزِ تعمیر بھی یکے بعد دیگرے کئی منزلوں سے گزرا۔ ان میں سے پہلی تعمیراتی منزل تھی۔ جیسے تیموری، صفوی، ایرانی،

Marfat.com

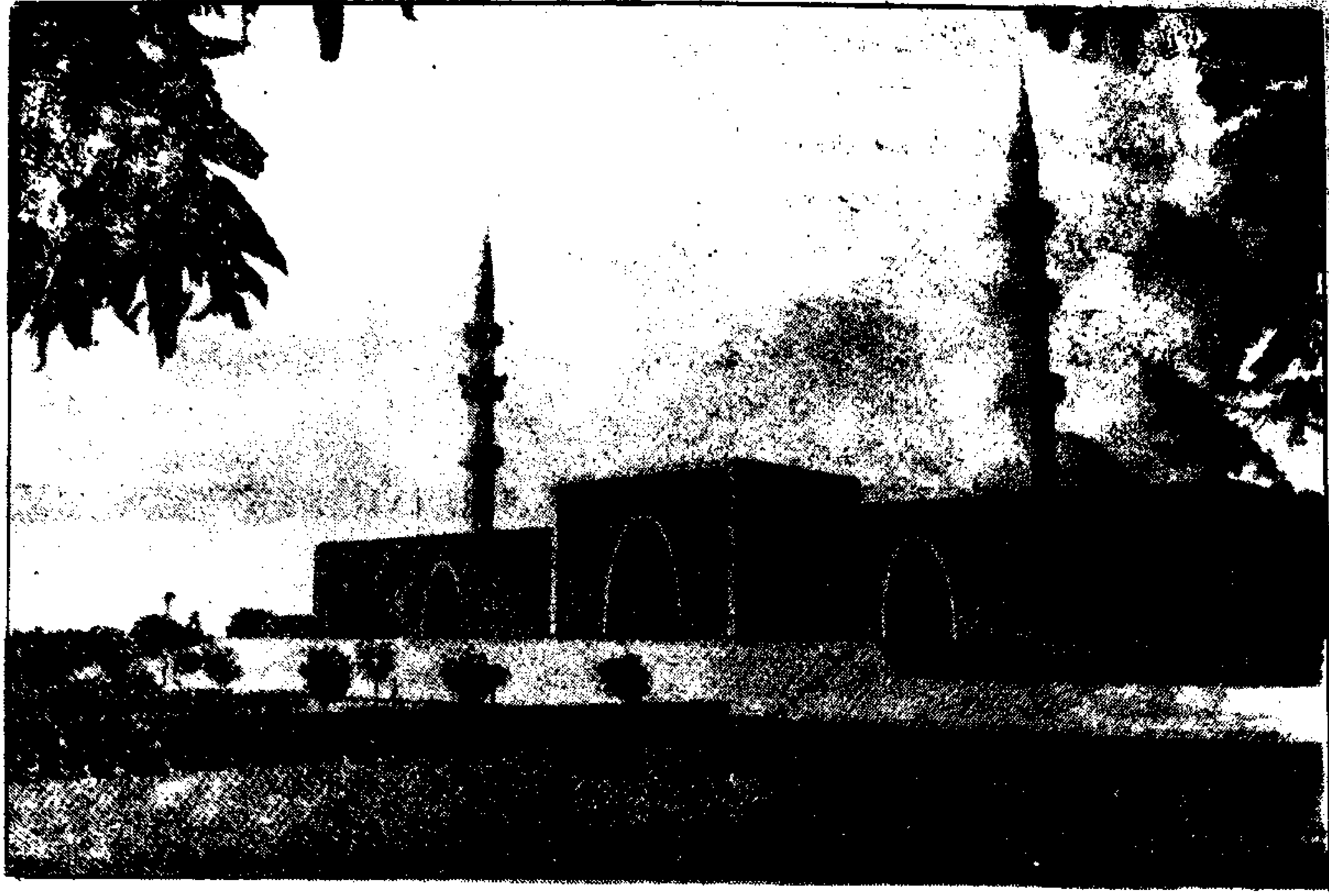

جامع مسجد اسلام آباد

منزل بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس کا غلبہ ۱۵۲۶ تا ۱۵۸۰ء تک کے زمانہ میں رہا ۔ تاہم یہ سترھویں صدی کے آخر تک دہلی اور آگرہ کے علاقے میں ، اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک پنجاب میں اور انیسویں صدی کے آغاز تک سندھ میں رائج رہی بلطنت میں وسعت ہونے کے بعد صفوی طرز میں لودھی ، سوری اور مالوہ و گجرات کی اسلامی اور ہندو راجپوتی طرز کے اثرات بڑھتے گئے ۔ اسی دور کی اہم یادگار عمارتوں کی فہرست تو کافی طویل ہے ۔ جن میں مساجد اور مقابر کی کثرت ہے اور یہ زیادہ تر آگرہ ، لاہور اور دہلی کے علاقوں میں ہیں ۔ آگرہ کا تاج محل ، شاہدرہ لاہور میں آصف خاں کا مقبرہ اور لاہور کا شالامار باغ ان یادگاروں میں سے ہیں ۔

. دوسری امتزاجی منزل ہے ۔ اپنے اسلاف کے برخلاف اکبر بادشاہ نے اپنے عہد میں (۱۵۵۶ تا ۱۶۰۵ء) اپنی تمام رعایا کو ایک مشترک سلطنت ، ایک تہذیب بلکہ ایک مذہب تک میں متحد کرنے کی کوشش کی ۔ اسی کا ایک جزو یہ مخلوط فن تھا ، جس میں تعمیر کے وہ تمام طرز جمع کر دئے گئے جو اس وقت ہندوستان میں رائج تھے ۔

خاص مغل طرزِ تعمیر جسے سلطانی منزل کہا جا سکتا ہے ۔ جہانگیر کے عہد کے آخری حصے

بلکہ زیادہ تر شاہجہان کے عہد (۱۶۲۸ تا ۱۶۵۸ء) میں اس طرز نے نشوونما پائی ۔ مقبروں اور ایک حد تک مسجدوں میں دوبارہ صفوی طرز رائج ہوا ۔ شاہ جہاں نے اس طرز کو آگرہ کے قلعہ نما محل میں استعمال کیا ۔ اس قلعہ نما محل میں اس نے مینا بازار ، موتی مسجد ، دیوانِ عام ، دیوانِ خاص ، نگینہ مسجد ، انگوری باغ ، خاص محل اور مثمن برج تعمیر کروائے ۔

پنجاب میں مغل ایرانی طرزِ تعمیر زکریا خان کے زمانے (۱۷۱۷ تا ۱۷۳۸ء) میں عروج پہ تھا ۔ مغلانی بیگم سے قریب مبارک خان کی سنہری مسجد (۱۷۵۳ء) کے ساتھ مغل طرزِ تعمیر یہاں ختم ہو گیا ۔ اودھ میں شجاع الدولہ (۱۷۵۳ تا ۱۷۷۵ء) نے فیض آباد کی بنا ڈالی ۔ آصف الدولہ (۱۷۷۵ تا ۱۷۹۲ء) نے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا ۔ ان

شہروں کی تعمیر میں یورپی طرز غالب ہے سوائے مذہبی عمارات کے ۔ بنگال میں مرشد علی (۱۷۰۳ تا ۱۷۲۵ء) نے دارالحکومت ڈھاکہ سے مرشد آباد منتقل کیا ۔ شروع کے زمانے کی عمارات میں مغل طرزِ تعمیر نمایاں ہیں ۔ لیکن بعد کے اُمرا اور حکام نے یورپی طرز کو رواج دیا ۔ بھوپال میں اسلام نگر (جو سب سے پہلا دارالحکومت تھا ۱۷۰۹ تا ۱۷۲۲ء) کی تعمیرات یعنی قلعہ فتح گڑھ ، جامع مسجد اور عیشں باغ (تعمیر قدسیہ بیگم) بڑا محل اور عظیم الشان تاج المساجد میں مغل طرزِ تعمیر کو اپنایا گیا ۔ حیدر آباد کے نظاموں کی عمارات میں ایرانی اور یورپی اثرات نمایاں ہیں ۔ کرناٹک کے نوابوں کے دارالحکومت ارکاٹ میں تعمیر کردہ محلوں ، مساجد اور مقابر میں مغل طرزِ تعمیر غالب ہے ۔

میسور کے سلاطین حیدر علی اور ٹیپو کا سرنگا پٹم کا بڑا محل ، دریا دولت باغ کا محل مع باغ ، بنگلور میں ٹیپو کے قلعہ نما محل اور حیدر علی کے لال باغ اور مقابر میں بھی مغل طرز عیاں ہے ۔

اس کے علاوہ ہندو والیانِ ریاست نے بھی مغل طرزِ تعمیر کو اپنایا ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں اورنگ زیب عہد کے مغل طرز کا رواج ہوا ۔ اس زمانے میں تمام اوضاع باہم خلط ملط اور مجتمع تھیں ۔

آخرکار رجحانات کے الگ الگ طریقے اختیار کرنے کا مرحلہ آگیا ۔ ایک طرف نیم یورپی طرز کی طرف میلان تھا تو دوسری طرف مغل روایت پرستی کا رجحان تھا ۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ اور حکومت سے یورپی طرزِ تعمیر کے غالب آنے کے مواقع پیدا ہوئے بعد کی تعمیرات میں یورپی رنگ نمایاں ہیں ۔ پاکستان میں عام تعمیرات میں تو یورپی رنگ واضح ہے لیکن خاص تعمیرات اور یادگاروں میں اسلامی ممالک کے طرز کو اپنانے کا رجحان ہے ۔

Marfat.com

فنِ خطاطی

خطاطی، خط سے مشتق ہے۔ خطاطی، خط کی مصوری کو کہا جا سکتا ہے۔ کتابت ایک عام کاروباری عمل ہے اور خطاطی اس کی جمالیاتی قسم ہے، جس میں مسلمانوں نے کمال حاصل کیا اور اسے ایک برتر فن کے درجے تک لے گئے۔ خطاطی کا سب سے بہترین استعمال قرآن مجید کی کتابت میں ہوا، جس میں مسلمان خوشنویسوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتیں صرف کیں۔ بعض دوسری اقوام کی طرح مسلمانوں میں بھی جمالیاتی فن بالعموم دینی جذبوں اور عقیدت کے زیرِ اثر رہا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید کی خوشنویسی و خوشنمائی اور آرائش و زیبائش کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ یہ فن عام کتابوں، شعر و ادب کی کتابوں، افسانہ و حکایات کی کتابوں میں بھی استعمال ہُوا۔ ایسی کتابوں میں بعض اوقات حسنِ خط اور تصاویر دونوں کتاب کی آرائش و زیبائش میں قابلِ قدر اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ خطاطی کا استعمال مسجدوں اور قلعوں کی پیشانی پر اور اندر کی دیواروں پر، روضوں اور مقابر کی دیواروں پر، قالینوں اور فرامین میں بھی ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں بچوں کی ابتدائی تدریس و تعلیم میں خوش خطی کو ایک اہم مضمون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل تک مسلم ممالک میں خوشنویسی پر زور دیا جاتا رہا ہے، مگر اب پرنٹنگ پریس کے فروغ کے بعد اور بعض دوسرے عملی وجوہ کی بنا پر خوشنویسی کی اہمیت میں زوال آگیا ہے۔

خطاطی آغازِ اسلام ہی سے اسلامی روح کی آئینہ دار رہی ہے۔ اس کی اصل وجہ قلم اور تحریر کی وہ اہمیت ہے جس کا ذکر قرآن مجید کے مختلف مقامات پر آیا ہے چنانچہ مسلمانوں نے اسلام کی ابتدائی زمانہ ہی سے قرآن مجید کی کتابت ایسے انداز میں شروع کر دی جو اس کے جاودانی حسن کے لئے شایانِ شان تھی۔ اگرچہ اسلوبِ تحریر میں مرورِ ایام کے ساتھ کچھ مقامی خصوصیتیں شامل ہوتی گئیں، لیکن عربی خط میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ عربی خط کے ارتقا کا مطالعہ قدیم کتبوں، مزارات کی الواح اور قدیم سکوں کے تحریری نقوش سے کیا جا سکتا ہے۔ کچھ مختصر سی یادداشتیں اوراق بردی پر بھی محفوظ ہیں۔ سب سے بڑھ کر قرآن مجید کے مختلف مخطوطات ہیں، جو خطاطی کے مختلف اسالیب کو ظاہر کرتے ہیں۔

اسلامی دور میں عربی خط کی جس شکل نے سب سے پہلے ترقی کی اسے عرفِ اسلام میں کوفی کہتے ہیں۔ زمانے کے اعتبار سے کوفی قدیم اور کوفی جدید دو قسمیں ہیں۔ عہدِ بنو امیہ میں عبدالحمید الکاتب نے دفتری ضروریات کے لئے اس میں مناسب ترامیم کیں۔ جدید کوفی کی ایجاد دورِ ہارون رشید کے نامور فاضل خلیل بن احمد عروضی سے منسوب کی جاتی ہے۔ بنو عباس کے زمانے میں اسحٰق بن حماد (م ۱۵۴ھ) نے زیادہ سے زیادہ عملی، کاروباری اور استعمال کے لئے سہل بنانے کے واسطے اس کی کچھ شکلیں پیدا کیں، مثلاً مساجد و عمارات کی پیشانی کے لئے خط طومار، دفتری دستاویزات کے لئے سجلات اور فرامین و احکام کے لئے عہدہ۔ بعد میں مختلف مقاصد کے لئے کوفی سے ۷۰ قسمیں (شاخیں) ایجاد ہوئیں۔

ابنِ مُقلہ نے اس سے بھی سہل تر خط ایجاد کیا اور اس کا نام محقق رکھا۔ اس سے ریحان اور ثلث نکلے۔ نسخ کی ابتدا بھی ابنِ مقلہ نے کی، جسے ابن البواب نے تکمیل تک پہنچا کر ایک ریاضیاتی فن بنا دیا۔ اس کے اندازِ خط کو خط نسب کہتے ہیں۔ کوفی کا ناسخ ثابت ہونے کی وجہ سے اسے نسخ کہتے ہیں۔ کوفی اور نسخ کے بعد خط کی بنیادی اور نمایاں اقسام یہ ہیں۔ تعلیق، نستعلیق، دیوانی، شکستہ، شکستہ آمیز اور شفیعہ۔ ہر قسم کے اندر درجنوں چھوٹی قسمیں بھی ہیں، جنہیں قلم کہا جاتا تھا۔ ابن الندیم کی کتاب الفہرست اور ابن البواب کے ایک معاصر کے "رسالۃ الکتابۃ المنسوبہ" میں ان قسموں کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری [illegible] کا ذکر ملتا ہے۔

مشہور خطاط اور مصنف محمد بن حسن بن محمد بن احمد [illegible] کے ایک رسالے "جامع محاسن کتابۃ الکتاب ونزہۃ اولی البصائر والالباب" [illegible] ۱۵۰۲ھ میں لکھا گیا ہے، میں ۱۶ مختلف قسموں کا ذکر ہے۔ ابوالفضل [illegible] قسموں کے بیان کے بعد لکھا ہے کہ رائج الوقت خطوں میں سے [illegible] ابنِ مقلہ نے معقل اور کوفی سے اختراع کئے ہیں، (۱) ثلث (۲) توقیع (۳) محقق (۴) نسخ (۵) ریحان (۶) رقاع (۷) تعلیق (۸) نستعلیق۔

رسالۂ خط و سواد، مصنفہ مجنون بن محمود الرفیقی کے مطابق معقل، کوفی، ثلث، محقق، توقیع، نسخ، ریحان، رقاع، تعلیق اور نستعلیق مروج و معروف خط ہیں۔

شیخ محمد اکرام اپنی کتاب میں ہندوستان کی ایجاد چند قسموں کا ذکر کرتے ہیں: (۱) خطِ گلزار (۲) خطِ غبار (۳) خطِ ریحان (۴) خطِ پیچان (۵) خطِ ناخن۔

غلام محمد راقم دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے تذکرۂ خوش نویسان میں مختلف قسموں کا ذکر کیا ہے۔

خطِ معقلی۔ اس کی شکلی خصوصیات کے بیان میں مجنون بن محمد الرفیقی نے لکھا ہے کہ یہ تمام تر سطح تھا یعنی دور سے بالکل خالی۔ صاحبِ مراۃ العالم نے لکھا ہے کہ ایامِ سلف میں عربوں میں خطِ معقلی رائج تھا۔ اس کے بعد خطِ معقلی سے خطِ کوفی کا اختراع ہوا اور یہ خط عرب اور غیر عرب ممالک میں متعارف ہوا۔

خطِ کوفی۔ اس کی شکلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک دانگ دور ہے اور باقی سطح۔ خطِ کوفی تقریباً پانچ سو سال تک کتب نویسی اور قرآن نویسی میں مستعمل رہا۔ خطِ کوفی میں مختلف علاقوں کی نسبت سے کئی شکلیں پیدا ہوئیں۔

اوپر مذکور ابنِ مُقلہ کے وہ آٹھ خط جو انھی نے ابوالفضل کے مطابق معقل اور کوفی سے ایجاد کئے تھے۔ ایران، روم، توران اور ہندوستان میں مروج رہے۔ ان میں سے ایک کو خط ثلث اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا ۱/۳ (ثلث) دور تھا۔ ابنِ مُقلہ نے اس کی بنیاد نقطے پر رکھی تھی۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں کوفی خط رائج تھا۔ اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ۵۶ھ/۶۷۵ء میں نبی کریمؐ نے جو تبلیغی مراسلے مختلف حکمرانوں کو ارسال فرمائے وہ خطِ کوفی میں تھے۔ خطِ کوفی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عراق کے دو مشہور شہر حیرا اور انبار تھے۔ جن کے قریب کوفہ شہر آباد ہوا۔ یہاں سریانی خط سے ایک مخصوص خط ابھرا، جو اس شہر کی نسبت سے خطِ کوفی کہلایا۔ عرب بن امیہ اُسے کوفہ سے مکہ مکرمہ لے گئے، جہاں یہ خطِ کوفی کے نام سے رائج ہوا۔ خطِ کوفی نے ابتدائی زمانہ میں مختلف ارتقائی مراحل طے کئے۔ خطِ کوفی کے حروف جلی اور مدوّر شکل کے ہیں۔ حروف کے جوڑ زاویہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے چھ میں سے پانچ حصے سطح ہوتی ہے اور ایک حصہ دور۔ اس قدیم خطِ کوفی میں شروع شروع میں نقاط، اعراب، اعجام، زیادات کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالاسود الدؤلی (م ۶۹ھ/۶۸۸ء) نے اعراب کیلئے نقطے ایجاد کئے۔ بعد میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں حجاج بن یوسف نے رسم الخط میں اصلاح کی کوشش کی اور اعراب، اعجام و زیادات کا اضافہ ہوا۔ مختلف بلادِ اسلامیہ میں خطِ کوفی میں خطاطوں کے ذاتی جمالیاتی ذوق کی وجہ سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایران، مصر، عراق، اندلس اور شمالی افریقہ کے علاقوں میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں۔ پانچویں صدی ہجری [illegible]

Marfat.com

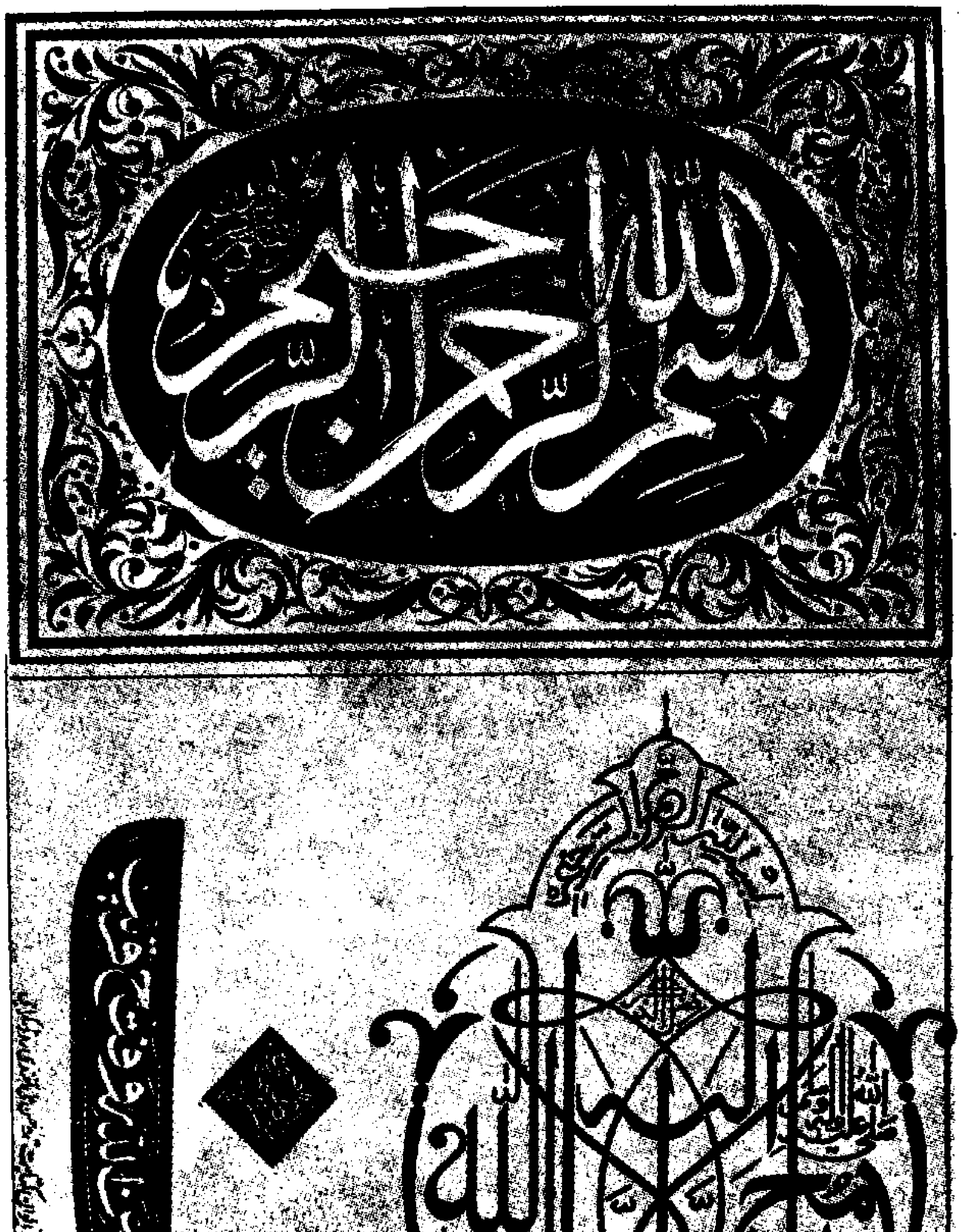

فنِ خطاطی کے مختلف نمونے

Marfat.com

عیسوی سے قرآن مجید کی کتابت کے لئے خطِ کوفی کا استعمال کم ہوتا گیا اور اس کی جگہ خطِ نسخ نے لے لی۔ خطِ نسخ کا موجد خلیفہ الراضی باللہ کا وزیر اور مشہور خطاط ابنِ مُقلہ (م ۳۲۸ھ) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام خطِ بدیع تھا، لیکن دوسرے تمام رسوم الخط کے ناسخ ہونے کی وجہ سے خطِ نسخ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس خط میں پہلی مرتبہ خطاطی کے اصول و قواعد کے لئے ناپ مقرر کئے گئے تاکہ موزونیت اور تناسب قائم رہے۔ ابنِ مقلہ کے بعد ابوالحسن علی بن ہلال معروف بہ ابن البواب نے خطِ نسخ میں مزید صفائی اور رعنائی پیدا کرکے اسے عروج تک پہنچایا۔ اس خط نے عباسی خلیفہ المقتدر باللہ (م ۳۲۰ھ/۹۰۸ء) کے زمانے میں باقاعدہ شکل اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ قرآن مجید کی کتابت میں مزید دلکشی اور رعنائی پیدا ہوگئی۔ ایلخانی عہد (م ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء تا ۷۳۶ھ/۱۳۳۶ء) اور عہدِ ممالیک (۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء تا ۹۲۲ھ/۱۵۱۷ء) میں نقاشی اور رنگ آمیزی کی وجہ سے خطِ نسخ کو کافی عروج حاصل ہوا۔ نقاشی اور رنگ آمیزی قرآن مجید کے علاوہ دوسری کتابوں کے لئے بھی کی جانے لگی۔

صفوی دورِ حکومت (۹۰۷ھ/۱۵۰۲ء تا ۱۱۴۸ھ تا ۱۷۳۶ء) میں بھی شاہانِ وقت نے فنِ خطاطی کی بہت سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے صاحبِ کمال منظرِ عام پر آئے۔ اُن میں مشہور خطاط سلطان نیشاپوری، میر عماد حسنی سیفی قزوینی اور مرزا اسداللہ شیرازی جیسے نامور ماہرِ فن کے نام آتے ہیں۔ تیموری سلاطین اور شہزادگان نے کاتبوں اور فن کاروں کی بے مثال حوصلہ افزائی کی۔

سلطان علی مشہدی جیسا ماہرِ فن تیموری خاندان کے سلطان حسین مرزا بالقیرا (م ۹۱۲ھ) کے دربار ہرات سے وابستہ تھا۔

خطِ نسخ و نستعلیق پاکستان اور ہند میں:۔ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد برصغیر میں عربی رسم الخط کا اجرا ہوگیا اور رفتہ رفتہ اسی خط میں قرآن مجید کی کتابت ہونے لگی۔ پھر ایران سے روابط کی وجہ سے خط نسخ یہاں رواج پاگیا۔ مغل سلطنت کا بانی بابر جب برصغیر آیا تو اپنے ساتھ علماء اور خطاطوں کو بھی لایا تھا۔ وہ خطاطی کا بڑا قدر دان تھا۔ اُس نے خود ایک خط ایجاد کیا۔ جو خطِ بابری کے نام سے موسوم ہوا۔ اُس نے اس خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ کتابت کروا کر مکہ معظمہ بھیجا تھا۔ ہمایوں جب ترکِ وطن کرکے ایران گیا تو وہاں اس کی ملاقات بعض ماہر خطاطوں اور مصوروں سے ہوئی۔ وہ ہندوستان واپسی پر خواجہ عبدالصمد، شیریں قلم، اور میر سید علی تبریزی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اب ان ماہرِ خطاطوں نے شاہی سرپرستی میں کام شروع کیا۔ اس دور کا ایک اور مشہور خطاط خواجہ سلطان تھا جسے اکبر بادشاہ نے اپنے عہد میں افضل خاں کا خطاب دیا تھا۔ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں فنِ خطاطی کی بہت حوصلہ افزائی کی، خطاطوں کو جاگیریں اور خطابات سے نوازا اور دفترِ انشاء میں مختلف عہدوں پر سرفراز کیا۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں عہدِ اکبر کے اساتذۂ خطِ نستعلیق کا ذکر اس طرح کیا ہے

”محمد حسین کشمیری جو خطاب ’زریں قلم‘ سے روشناسِ آفاق ہے۔ مولانا عبدالعزیز کا شاگرد ہے، لیکن وہ اس فن میں اپنے اُستاد سے بھی سبقت لے گیا .... اس کے علاوہ اور خطاط یہ ہیں۔ مولانا محمد حسین باقر، محمد امین مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبدالحیٔ، مولانا دوری، مولانا عبدالرحیم، میر عبداللہ نظامی قزوینی، علی چمن کشمیری، نوراللہ قاسم ارسلان ــــ زریں رقم نے آئینِ اکبری کا پورا نسخہ لکھا تھا، جس میں مشہور مصوروں نے تصاویر بنائی تھیں۔ اس نسخے پر تین لاکھ روپے خرچ ہوتے تھے۔

مغل بادشاہ اور شہزادے علم و ہنر کے بڑے قدردان تھے۔ عبدالرحیم ہروی ایک نامور ماہرِ فن اکبر کے دربار سے وابستہ تھا جہانگیر نے اُسے ”عنبریں قلم“ کا خطاب دیا تھا۔ اکبر نے جو نیا دارالحکومت ”فتح پور سیکری“ بنوایا تھا اُس کے کتبے سندھ کے نامور مؤرخ اور خطاط میر معصوم بھکری نے لکھے تھے۔ عہدِ شاہجہان میں تاج محل پر امانت علی شیرازی نے خطِ ثلث میں جو آیات قرآنی تحریر کیں اور جو طغرے لکھے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ شاہجہان کے عہد میں سید علی تبریزی اورنگ زیب کو خطاطی سکھانے پر نامور ہوا تھا اور اسے ”جواہر رقم“ کا خطاب ملا۔ اورنگ زیب کو نسخ اور نستعلیق دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ اس کے عہد میں بھی خطاطوں کی بہت سرپرستی ہوئی۔ خاندانِ مغلیہ کا آخری بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ فن خطاطی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے زمانے کے کئی خطاطوں نے شاہی سرپرستی کے بغیر بھی فنِ خطاطی کو ترقی دی۔

خطاطوں نے مقبروں پر اور قرآن مجید کی جلدوں میں فنِ خطاطی کے نادر نمونے پیش کئے ہیں۔ خطاطی کے اعلیٰ ذوق کی وجہ سے برتنوں پر بھی خطاطی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ بعض برتنوں پر تو یہ فن حدِ کمال کو پہنچ گیا۔ خطاطی نے قالینوں کو بھی پیرایۂ زینت دیا۔

کتابت کی خطاطی کو برصغیر پاک و ہند میں اوجِ کمال پر پہنچا دیا گیا۔ یہاں کتابت میں ہندسی ڈرائنگ کو ملحوظ رکھا گیا۔ پاکستان میں موجودہ دور کے بعض نمائندہ اور نامور خطاط عبدالمجید پروین رقم، تاج الدین زریں رقم، محمد صدیق الماس رقم، حافظ محمد یوسف سدیدی، صوفی خورشید عالم اور سید انور حسین نفیس رقم ہیں۔ جنہوں نے قدیم خطاطوں کی پیروی کرتے ہوئے فنِ نستعلیق میں قابلِ ستائش اضافے کئے اور اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی۔ حال ہی میں مشہور مصور صادقین نے خط نسخ میں آیاتِ قرآنی کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

مسلمانوں نے کئی دوسرے فنون میں اپنی مہارت کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔ اور مختلف ممالک میں ہر دور کے اندر مسلمانوں نے ان فنون کی سرپرستی کی۔

وہ فنون یہ ہیں۔

(۱) فنِ تجلید یعنی کتابوں کی جلد بندی۔

(۲) فنِ تذہیب یعنی کتابوں کی طلاکاری

(۳) فنِ تکفیت یعنی پچی کاری (کسی بیش قیمت دھات کو کسی ادنیٰ دھات کے اندر پچی کرکے جما دینا)۔

(۴) فنِ فخار یعنی ظروف سازی و کوزہ گری

(۵) فنِ فلز کاری یعنی نقرئی ظروف سازی اور ظروف پر مناظر کشی کرنا۔

(۶) فنِ قالین بافی۔ قالینوں کو منقش کرنا (ان پر مصوری اور خطاطی کے فن کا اظہار کرنا)

(۷) فنِ سنگ تراشی و پچی کاری۔

(۸) فنِ سکوکات یعنی سکے بنانا

(۹) شیشے اور بلور کے ظروف بنانے کا فن

(۱۰) لکڑی پر کندہ کاری کا فن

(۱۱) فنِ پارچہ بافی۔

فن اور اس کے مختلف شعبوں کے اس تفصیلی تذکرہ کے بعد اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان فنون میں سے اکثر پر علماء و فقہا کا اتفاق ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے

Marfat.com

مناظر ہیں لیکن یہاں ان کی تفصیلی بیان سے مقصد صرف معلومات سے آگاہی حاصل کرنا ہے کیونکہ مسلمانوں کی طویل تاریخ کے مختلف ادوار میں مذکورہ بالا فنون میں مسلمانوں نے بڑی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اور کئی ماہرِ فن پیدا ہوئے اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی اصل روح کے مفقود ہونے کے بعد جب اسلامی خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی کی وجہ سے ان فنون کا رواج ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عجمی علاقوں کے تہذیبی و تمدنی اثرات کی وجہ سے مسلمان ان فنون کو اپنانے پر مجبور ہوتے تاکہ غیر مسلم اقوام پر ہر لحاظ سے اپنی برتری ثابت کر سکیں۔

فن کے مضمون کے شروع کے صفحات میں "اسلامی فن کے ادوار اور خصائص" میں فاطمی فن ۱۱۷۱ء تک کا ذکر ہو چکا ہے۔ فن اور اس کے مختلف شعبوں کے تفصیلی تذکرہ کے بعد ۱۱۷۱ء کے بعد سے اب تک کے اسلامی فن کے ادوار کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ایوبی و مملوک فن

۱۱۷۱ء تا ۱۵۱۶ء تک مصر و شام میں، تاہم اٹھارویں صدی تک بھی مروّج رہا۔ اس دور کی خصوصیات میں مدرسے اور ایوان والی مساجد، مختلف رنگوں کے پتھروں کا جوڑ، سنگِ مرمر میں جڑت اور پچی کاری، پتلے اور بلند طاقچے جو مدوّر یا سہ گوشہ محرابوں پر ختم ہوتے ہیں۔ کئی کئی منزلوں اور جھروکوں والے پتلے پتلے مینار۔ اہم یادگاروں میں کثیر التعداد مساجد، مدارس، محلات اور مقبرے جو کہ قاہرہ اور دمشق میں ہیں۔

ساسانی روایات کا احیاء

آل بویہ، سامانیوں، غزنویوں اور غوریوں کے عہد میں نویں سے گیارہویں صدی میں، ایران، عراق اور ترکستان میں ہوا اور آخری دور میں عباسی اسلوب میں مدغم ہو گیا۔ اس دور کی خصوصیات میں مقبروں کے مینار، گاؤ دم مینار، مخروطی، کروی، بیضوی گنبد اور محرابیں، نئی تجسیمی اور تجریدی تزئین۔ اہم یادگاروں میں بخارا، خوارزم نیشاپور، گنبد قابوس، سنگ بست، اصفہان، یزد، غزنہ، لشکری بازار، جام۔

سلجوقی فن

ایران، شام، عراق میں ۱۰۳۸ء تا ۱۱۸۶ء تک اور ایشیائے کوچک میں ۱۰۷۴ء تا ۱۳۰۲ء تک ایرانی اسلامی فن کے ارتقاء کے تکمیل یافتہ پہلا مرحلہ کی اہم خصوصیات میں چار ایوانوں کی مسجدیں، بڑے بڑے گنبد، پتلے مینار، خشتی اور رنگی رنگین روغنی چوکے کی پچی کاری، دیواروں پر ابھرواں تصاویر، چمکیلے روغن کے برتن وغیرہ اہم یادگاروں میں بغداد میں مستنصریہ اور بابِ طلسمان، موصل، دیار بکر، اصفہان کی جامع مسجد، نخجوان میں مقبرہ مومنہ خاتون وغیرہ۔

مغل اور تیموری فن

۱۲۵۲ء تا ۱۵۱۷ء۔ ایرانی فن کے انتہائی عروج کے اس دور کی اہم خصوصیات میں نوکدار اور بصلہ نما گنبد، بلند ڈھولنے اور پشتے کی ڈاٹوں پر چوکوں کی پچی کاری اہم یادگاروں میں اصفہان، ورامین کی مسجد، سلطانیہ، سمرقند، بخارا، ہرات، بلخ، مشہد میں مختلف مساجد اور مقبرے۔

صفوی اوزبک فن

سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی کے اس دور کی خصوصیات میں منقش چوکے۔ اہم یادگاروں میں قزوین، اصفہان، مشہد اور بخارا کے شہر کی تعمیرات، اردبیل میں شیخ صفوی کے روضے کی مسجد وغیرہ۔

ہندی مسلمانوں کا فن

۱۲۹۶ء سے انیسویں صدی کے آغاز تک۔ اس دور کی خصوصیات میں ہندو فنِ تعمیر کی جزئیات کو اپنانا ہے جن میں ستون، دیوار گیریاں، چھجے، منڈیروں والی چھتیں۔ بیشتر یادگاریں دہلی اور آگرہ میں ہیں۔ لیکن بعد میں کئی دوسرے شہروں میں بھی تعمیر ہوئیں۔

عثمانی ترکی فن

چودہویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی تک ایشیائے کوچک میں اسکا ارتقاء سلجوقی فن سے ہوا۔ اہم یادگاروں میں استنبول کی عظیم الشان گنبدوں والی مساجد کا سلسلہ۔

مذکورہ بالا ادوار میں مسلمان فنِ تعمیر میں نمایاں محسوس ہوتے ہیں درحقیقت انہوں نے دوسرے فنون میں بھی ارتقاء کیا۔ اُن کا ذکر مختلف فنون کے ذیل میں آچکا ہے گیارہوں اور سترھویں صدی کے درمیان کا زمانہ مسلمانوں کے فن کا دورِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا فن ساخت کی صفائی، تنوع اور حسن کے اعتبار سے بے مثال رہا۔ مذکورہ بالا مختلف ادوار سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی فن نے مختلف تہذیبوں سے استفادہ کیا۔ اس لئے اسلامی فن کے لئے درج ذیل فنون کو ماخذ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور ان فنون کی جھلکیاں اسلامی فن کی یادگاروں میں محسوس کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ بوزنطی فن
۲۔ ایرانی فن
۳۔ ترکی فن
۴۔ چینی فن
۵۔ ہندوستانی فن
۶۔ یورپی فن

اسلامی فن نے خود ہر دور میں ایک مروّجہ شکل اختیار کر کے دوسرے ممالک کی تہذیبوں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے دور میں دوسری اقوام کے لوگ اسلامی تہذیب اور اسلامی فن کو اپنانے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان کے علاقوں میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور ترک، عرب علاقوں میں خلافت عثمانیہ کے زوال سے انیسویں صدی عیسوی کے بعد مسلمان سیاسی طور پر ختم ہو گئے۔ دوسری اقوام کے غلبہ سے مختلف فنون میں مسلمانوں کی اقدار کو بھی زوال آگیا۔ مغربی علوم و فنون مسلم علاقوں میں آہستہ آہستہ رواج پا گئے کیونکہ انیسویں صدی کے آغاز سے مغرب علوم و فنون کے عروج پر تھا اور سیاسی طور پر بھی غالب تھا۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں مغربی علوم پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ فنون کے ہر شعبہ کی تعلیم میں بھی مغربی اثر نمایاں ہو گیا اور آہستہ آہستہ مسلم ممالک میں تعمیر، مصوری، موسیقی وغیرہ میں خالص مغربی انداز اور طرز کو اپنا لیا گیا ہے یعنی موجودہ بیسویں صدی مغربی علوم و فنون کے غلبہ کا دور ہے۔ قدیم اسلامی روایات کو اپنانے کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی اقدار کو دوبارہ زندہ کریں۔

فناری عثمانی علماء اور فقہا کا ایک خاندان، جس کا مؤسس اعلیٰ شمس الدین محمد تھا۔ ایک روایت کے مطابق آپ مملکتِ عثمانیہ کے پہلے شیخ الاسلام تھے۔ آپ

Marfat.com

کی پیدائش ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء - ۱۳۵۱ء میں برسہ میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام شیخ حمزہ تھا۔ شمس الدین نے اپنے زمانے کے مشاہیر علماء سے اناطولی اور مصر میں اکتسابِ علم کیا۔ برسہ کے مناستیر مدرسہ میں بطور استاد تقرر ۷۷۰ھ میں ہوا۔ اگلے سال شہر کے قاضی بنا دیے گئے۔ جبکہ آپ کی عمر صرف بیس سال تھی۔ ملکی سیاست میں آپ کو اہم مقام حاصل تھا۔ آپ کے بیٹوں اور پوتوں کو مراد ثانی اور محمد ثانی نے خصوصی مراعات عطا کی تھیں۔ اپنی وفات یکم رجب ۸۳۴ھ/۱۵ مارچ ۱۴۳۱ء تک مفتیٔ اعظم (شیخ الاسلام) کے منصب پر فائز رہے۔

اس خاندان کا دوسرا فرد جس نے اعلیٰ منصب حاصل کیا۔ شمس الدین کا پوتا علاؤ الدین علی بن یوسف بالی تھا جو ۸۷۲ھ تا ۸۷۴ھ برسہ کی قضا پر فائز رہا۔ اگلے سال قاضیٔ عسکر مقرر ہوا۔ جہاں ۸۸۱ھ تک کام کرتا رہا۔ ۸۹۴ھ میں اس کا تقرر روم ایلی کے قاضی العسکر کے طور پر ہوا۔ اور ۹۰۰ھ تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد اسے اناطولی کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ اس کا انتقال ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء - ۱۴۹۸ء میں ہوا۔ علاؤ الدین کی اولاد میں سے بھی کئی افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔

فنج ۔ خانہ بدوش لوگ تھے اور ان کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ انھوں نے بتدریج اپنا عمل دخل نیل ازرق کے بہاؤ کی جانب ٹول ضلع سے سنار کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ سنار اس خانوادے کا مستقر امارت بنا۔ اس خاندان کا ظہور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں ہوا۔ عمارہ دُنقس نے ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء - ۱۵۰۵ء میں سنار کی تاسیس رکھی تھی۔ سنار کے قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد فنج خاندان کی سلطنت میں توسیع ہوتی چلی گئی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس خاندان کی حکومت کو زوال آیا۔ ۱۸۲۱ء میں ترکوں اور مصریوں کی متحدہ افواج سوڈان پر حملہ آور ہوئیں۔ تو فنج کے آخری حکمران بادی ششم نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اور ان علاقوں پر فنج خاندان کی حکومت کا اختتام ہو گیا۔

فن لینڈ ۔ فن لینڈ میں مسلمانوں کی حیثیت ایک مذہبی اقلیت کی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مسلمانوں کی تعداد صرف نو سو تھی۔ فن لینڈ کی آبادی چالیس لاکھ ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں روس سے مسلمان ہجرت کر کے فن لینڈ میں آکر آباد ہوئے۔ فن لینڈ کے مسلمان چنگیز خان کی نسل سے ہیں۔ کیونکہ ان کے آباؤ اجداد تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خان کے ہمراہ روس آئے تھے۔ ان مسلمانوں میں سے بیشتر صوبہ نجنی سے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں پورے ملکی حقوق حاصل ہو گئے۔ اور وہ فن لینڈ میں مستقل آباد ہو گئے۔

۱۹۲۵ء حکومت فن لینڈ کی اجازت سے ہیلسنکی میں اسلامی انجمن قائم کی گئی اور ۱۹۴۳ء میں تامپیری میں بھی ایک اسلامی انجمن بنائی گئی۔ فنی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

فواحش ۔ مادہ۔ ف ح ش، فَحُشَ یَفْحُشُ فُحْشًا، فُحش، فَحَاشہ، فحشا اور فاحشہ بمعنی القبیح من القول والفعل (لسانی)، یعنی قبیح قول و فعل بہت ہی قبیح گناہ، حد سے گزرنے والا قول، اسی سے فَحَّشَ، اَفْحَشَ، تَفَحَّشَ اور تفاحُش بمعنی القبیح من القول والفعل، یعنی بری بات کرنا یا کہنا، برائی میں زیادہ ہونا، بدکلامی کرنا اور گالی دینا۔ فواحش جمع کا صیغہ ہے اور اس کا واحد فاحشہ صیغۂ مونث ہے، جس کے معنی کسی چیز کا بدی و برائی میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ نیز بمعنی زنا بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ فاحشہ اکثر زنا کے معنوں میں آتا ہے۔ فاحشہ کے ایک معنی گھر سے خاوند کی اجازت کے بغیر نکلنے والی عورت کے ہیں یا اس عورت کے فعل کے ہیں۔ نیز اقوال و افعال میں ہر قبیح خصلت کو فاحشہ کہتے ہیں۔ فاحشہ کا یہ مطلب بھی ہے کہ وہ چیز جس کی بدی یا برائی کو عقل اور قانون ناپسند کرے۔ اللہ کی منع کردہ اشیاء کو بھی فاحشہ کہتے ہیں۔ اکثر اقوال سے اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فواحش ان برائیوں کو کہا جاتا ہے جن کا تعلق شہوانیات سے ہے۔

امام رازی نے فواحش کے اس طرح معنی بیان کیے ہیں، "وہ گناہ جن کا تعلق شہوانیات سے ہے"۔ اُردو اور فارسی میں اسی لیے اس کے معنی بے حیائی کے لیے جاتے ہیں۔

حدیث میں الفحش، الفاحشہ، الفاحش کے الفاظ کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ فُحش کے معنی گناہ اور معصیت کا حد سے بڑھ جانا کے ہیں۔ فاحش (مذکر) کے معنی حد سے تجاوز کرنے والے کے ہیں۔ فاحشہ اور فحشاء ہم معنی ہیں، فاحش اور فاحشہ سے مبالغے کا صیغہ فحّاشہ ہے۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر یہ مادّہ مختلف انداز میں آیا ہے۔ ان مقامات کے مطالعہ سے اس کے مفہوم کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو سکتی ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۳۵ میں فاحشہ بمعنی کھلا گناہ۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۲۸ میں فحشاءِ بے حیائی کے کاموں کے معنی میں آیا ہے۔ اور اسی معنی میں سورۃ نور کی آیت ۱۹ میں الفَاحِشَۃُ کا استعمال ہوا۔

سورۃ نساء کی آیت ۱۵ میں زنا کے ذکر کے ساتھ فاحشہ کا لفظ بے حیائی کے کام کے معنی میں آیا ہے۔ سورہ نمل کی آیت ۵۴ اور سورۃ عنکبوت کی آیت ۲۹ میں قومِ لوط کی بدکاری کے معنی میں فاحشہ کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ نساء کی آیت ۱۹ میں فاحشہ کا لفظ بدکاری کے لیے آیا ہے۔ سورۃ احزاب کی آیت ۳۰ میں فَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ اس سے مراد پیغمبر کی کھلی نافرمانی اور حکم عدولی ہے۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ جب قرآن مجید میں الفاحشۃ بطور معرفہ آتا ہے تو اس کا مفہوم زنا اور لواطت ہے اور جب فاحشہ بطور نکرہ آتا ہے تو اس سے مراد تمام گناہ ہوتے ہیں۔ اور جب مرکب توصیفی کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد میاں بیوی کی کشیدگی، خاوند کی نافرمانی اور حکم عدولی ہوتی ہے۔ (تفسیر ماجدی)

لفظ فواحش جمع کی صورت میں قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ انعام آیت ۱۵۲، سورۃ اعراف آیت ۳۳، سورۃ شوریٰ آیت ۳۷ اور سورۃ نجم آیت ۳۲۔ ان آیات سے فواحش کے مفہوم میں وہ سب بری باتیں اور بے حیائی کے کام شامل ہیں جو ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ۔ فواحش میں وہ سارے گناہ شامل ہوتے ہیں جن میں حیا، آداب، حدود شرعی اور اخلاق سے تجاوز کیا گیا ہو خواہ یہ قولاً ہوں، فعلاً یا تحریراً۔ اسی طرح چاہے یہ ظاہر ہوں یا خفیہ۔

فحشا کے بھی وہی معنی ہیں جو فاحشہ یا فواحش کے ہیں لیکن محلِ استعمال کی وجہ سے مفہوم میں کچھ فرق آجاتا ہے۔ تفسیر ماجدی میں ہے کہ فحشاء ایسی برائی ہے جو کھلی ہوئی اور صریح ہو۔ تفسیر بیضاوی اور روح المعانی میں اس سے

Marfat.com

مراد وہ گناہ لیے گئے ہیں جو قوۃ شہوۃ کی افراط سے وجود میں آتے ہیں۔
مختار کا لفظ سورۃ النحل کی آیت ۹۰، سورۃ عنکبوت کی آیت ۴۵ اور سورۃ بقرہ کی آیات ۱۶۹ اور ۲۶۸ میں استعمال ہوا ہے۔
اس مادے سے جتنے الفاظ ہیں اُن میں حد، جائز، معروف و مناسب سے تجاوز کے علاوہ قبح کی کثرت و شدت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

فؤاد اوّل :۔ (۲۶ مارچ ۱۸۶۸ء ــــ ۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء)
خدیو مصر احمد فؤاد' قصرِ جیزہ میں پیدا ہوا۔ اُس نے جنیوا اور تورین میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۵ء میں اطالوی فوجی اکادمی میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۸۷ء کے دوران' جب وہ روم کے توپ خانہ میں سیکنڈ لفٹیننٹ تھا تو اس کا اطالوی شاہی خاندان سے کافی رابطہ رہا۔ ترکی کی طرف سے وی آنا میں کچھ عرصہ تک فوجی اتاشی رہا اور پھر استنبول میں مختصر سے قیام کے بعد ۱۸۹۲ء میں مصر چلا آیا۔ شہزادگی کے زمانے میں اُس نے آزاد جامعۂ قاہرہ کی وائس چانسلری (۱۹۰۸ تا ۱۹۱۳ء) قبول کر لی اور اپنے بھائی حسین کی وفات (۹ اکتوبر ۱۹۱۷ء) پر سلطانِ مصر بنا۔ اُس نے ۱۵ مارچ ۱۹۲۲ء کو بادشاہِ مصر کا لقب اختیار کیا۔ وہ تہذیب' شائستگی اور اسلامی روایات کا بڑا احترام کرتا تھا۔
مصر کی بیداری کی تاریخ میں احمد فؤاد کا عہدِ حکومت بڑی اہمیت رکھتا ہے قومی تحریک کے رہنماؤں سعد زغلول اور وفد پارٹی کی قیادت نے مصر پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف منظم تحریک شروع کی۔ احمد فؤاد اس قیادت سے الرجک تھا اور خود کو مطلق العنان بادشاہ بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے دستور کو ایک کھلونا بنا دیا اس وجہ سے مصر ایک سیاسی بحران سے دوچار رہا۔ پارلیمنٹ کے انتخابات میں اکثر وفد پارٹی کامیاب ہوتی رہی لیکن احمد فؤاد نے اس کو حکومت کرنے کا موقع نہ دیا۔ بادشاہ اقلیتی جماعتوں اور غیر جماعتی سیاستدانوں پر اعتماد کرتا تھا۔ دوسرے سیاسی رہنماؤں کے علاوہ وہ احمد زوار (۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ء)' محمد محمود (۱۹۲۸ تا ۱۹۲۹ء) اور اسمٰعیل صدقی (۱۹۳۰ تا ۱۹۳۳ء) سے معاونت طلب کرتا رہا۔ اس کے عہدِ حکومت کے آخر میں حبشہ میں جنگ کی وجہ سے اطالوی خطرے کے پیشِ نظر انگریزوں سے معاہدے کی ضرورت واضح ہو گئی اور یہ اس کی وفات کے چار ماہ بعد ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کو ہوا۔
اُس کے دورِ حکومت میں مصری بینک کی تاسیس سے مصر کی معاشی ترقی میں اضافہ ہوا۔ اُس نے ملک کی علمی سرگرمیوں میں بڑے شوق سے حصہ لیا۔ نئے مدارس تعمیر کروائے۔ اُس نے بہت سے ثقافتی ادارے قائم کروائے اور بہت سے علمی اداروں کو اس کی بدولت نئی زندگی ملی۔ اُس نے جیزہ میں جدید جامعہ کی تاسیس کی حوصلہ افزائی کی اور جامعۃ الازہر میں کئی اصلاحات نافذ کیں۔

فؤاد پاشا :۔ (۱۸۱۵ء ــــ ۱۸۶۹ء)' ترکیہ کا پانچ دفعہ وزیرِ خارجہ اور دو دفعہ صدرِ اعظم رہا۔
استنبول میں پیدا ہوا۔ شاعر عزت مّلا کا بیٹا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں اپنے والد کی کی جلاوطنی کے بعد فؤاد نے دینی تعلیم چھوڑ کر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں اُس نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اس نے ۱۸۳۴ تا ۱۸۳۵ء بحیثیت فوجی ڈاکٹر طرابلس میں بسر کئے۔ فؤاد کو فرانسیسی زبان میں درک حاصل تھا۔ اس لئے اس نے اگلے سالوں میں دولت عثمانیہ کے ترجمان اور سفیر کی حیثیت سے ترقی کی منازل طے کیں اور یورپی معلامات سے بلاواسطہ آگاہی حاصل کرتا رہا۔ ۱۸۳۹ اور ۱۸۴۰ء میں وہ بابِ عالی کا ترجمان رہا اور ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۴ء تک لندن میں ترکی سفارت خانہ کا فرسٹ سیکرٹری رہا۔ مارچ ۱۸۴۵ء میں اُسے ایک مخصوص تعلیمی کمیشن کا رکن مقرر کیا گیا۔ وہ جون' جولائی ۱۸۴۵ء میں شاہی دیوان کا ترجمان مقرر ہوا۔ اور ۱۸ فروری ۱۸۴۷ء کو اُس نے آمدجی کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء میں دو خصوصی مشنوں کی کامیابی پر اُسے صدارتِ مُستشاری کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ ۱۸۵۱ء میں اُس نے جدید طرز پر ترکی قواعد گرامر کی ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۵۲ء کے اوائل میں اُس نے جودت کے ساتھ اشتراک سے کشتی رانی کی ایک کمپنی قائم کی۔ ۹ اگست ۱۸۵۲ء کو اُس کا تقرر بطورِ وزیرِ خارجہ ہوا۔ اس سے تین دن پہلے اس کے استاد رشید پاشا کا ایک اور شاگرد علی پاشا صدارتِ عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ بعض سیاسی معاملات میں اُلجھاؤ کی وجہ سے اُس نے مارچ ۱۸۵۳ء میں استعفٰی دے دیا۔ مارچ ۱۸۵۴ء سے ایک سال تک فؤاد نے ایپیرس اور تھسلی میں با اختیار فوجی اختیارات کے حامل خصوصی کمشنر کی حیثیت سے کام کیا۔ مئی ۱۸۵۵ء میں جب محمد امین علی نے رشید پاشا کی جگہ دوسری مرتبہ وزارتِ اعلیٰ کا قلمبندان سنبھالا تو فؤاد بھی وزیرِ خارجہ مقرر ہوا۔
سٹریٹ فورڈ (STRATFORD) نے بلقانی ریاستوں کے بارے میں دباؤ ڈالا تو نومبر ۱۸۵۶ء میں فؤاد وزارت سے مستعفی ہو گیا۔ اگست ۱۸۵۷ء میں وہ دوبارہ مجلسِ تنظیمات کا صدر مقرر ہوا۔ مصطفٰی رشید پاشا کی وفات کے چار دن بعد علی پاشا صدرِ اعظم اور فؤاد پاشا وزیرِ خارجہ بنا۔ اس نے ۲۲ مئی سے لے کر ۱۹ اگست ۱۸۵۸ء تک پیرس میں بلقانی ریاستوں کے متعلق بلائی گئی ایک کانفرنس میں دولتِ عثمانیہ کی نمائندگی کی۔ جب مارونیوں پر دروز کے حملوں سے بڑی طاقتوں کو ترکیہ کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع ملا تو فؤاد کو ہر قسم کے اختیارات دے کر ۱۲ جولائی ۱۸۶۰ء کو بیروت روانہ کیا گیا۔ شام میں قتل و غارت کے واقعات سے مجبور ہو کر اُسے دمشق جانا پڑا وہاں اُس نے دمشق کے والی احمد پاشا سمیت ۱۶۷ افراد کو پھانسی دی۔ اس سختی کی وجہ سے مقامی آبادی میں ابوالجبل (پھانسی کا باپ) کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اس بین الاقوامی کمیشن کا بھی صدر رہا جو دمشق میں قتل و غارت کے واقعات کی تحقیق کے لیے آیا تھا۔ کمیشن کے نتیجہ میں نئے لبنانی نظم و نسق کے قانون کی صورت ظاہر ہوئی جس کا اعلان ۹ جون ۱۸۶۱ء کو ہوا۔

فوائد فیروز شاہی :۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے عہد میں علوم و فنون کی بہت حوصلہ افزائی کی اس کے دور میں کئی نامور علماء اور فقہا ہوئے اور بادشاہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس زمانے کے علماء کی تصانیف میں سے ایک اہم کتاب "فوائد فیروز شاہی" ہے یہ کتاب اس دور کے ایک ذی علم بزرگ شرف محمد عطائی کی تصانیف ہے اور متعدد مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ مخطوط کی شکل میں اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ دو جلدوں میں مجلد اور محفوظ ہے۔ پہلی جلد مع فہرست کے ۲۰۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد ۲۱۰ سے شروع ہو کر ۳۴۷ اوراق پر ختم ہوتی ہے۔ فہرست کتاب ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ایک سو پندرہ ابواب اور پانچ سو چہتر فصول کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس مخطوطہ میں بعض مقامات پر کتاب کے ابواب و فصول' فہرست کے ابواب و فصول کے مطابق نہیں ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ فوائد فیروز شاہی کے صرف چار نسخے ہیں۔ دوسرے تین نسخے مختلف

Marfat.com

مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ ترکی میں استنبول کی لائبریری میں ہے دوسرا نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ہے۔ تیسرا نسخہ خدابخش لائبریری بانکی پور انڈیا میں ہے۔ چوتھے نسخہ کا اوپر ذکر ہے۔ جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں ہے۔

فوائد السالکین :۔ تاریخی روایات میں آتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات ان کے مریدِ خاص بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے مرتب کئے تھے۔ ان ملفوظات کو "فوائد السالکین" کا نام دیا گیا ہے۔

شیخ محمد اکرام مصنف آبِ کوثر نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۵ کے حاشیہ میں فوائد السالکین کی حیثیت مشتبہ قرار دی ہے اور وضعی کہا ہے۔ اس لئے فوائد السالکین کتاب کے تفصیلی تذکرہ سے اجتناب کیا گیا ہے۔

فوائد الفوائد :۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات جو اُن کے مرید باختصاص میر حسین علاء سنجری نے مرتب کئے ہیں۔ اکابر خواجگانِ چشت کے سلسلہ کے خاتم حضرت نظام الدینؒ ہیں۔ آپ کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کا آخر اور آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔ آپ کے ملفوظات جمع کرنے کی سعادت ایک سے زائد مریدان با اخلاق کے حصہ میں آئی۔ ان میں ایک مجموعہ فوائد الفوائد ہے جو اہلِ دل کے نزدیک چشتیہ بہشتیہ کے نظام تصوف کا ایک مکمل دستور العمل ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث ایسی رائے کا اظہار اپنی کتاب اخبار الاخیار صفحہ ۳۸ پر کرتے ہیں

"یہ کتاب شیخ نظام الدینؒ کے مجازین و مریدین کے درمیان بطور دستور العمل کے ہے" اسی قسم کی آراء کا اظہار شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلویؒ، میر خورد دہلویؒ نے بھی کیا ہے۔ امیر خسرو کی بابت منقول ہے کہ فرمایا کرتے تھے "کاش میری تمام تصانیف حسن سنجری کے نام سے ہوتیں اور یہ ایک میرے نام سے" (اخبار الاخیار صفحہ ۹۰)

یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اول۔ شعبان ۷۰۷ھ تا ذی الحجہ ۷۰۸ھ کی ۳۴ مجالس کے ذکر پر مشتمل ہے۔

حصہ دوم۔ شوال ۷۰۹ھ تا شوال ۷۱۲ھ کی ۳۷ مجالس کے ذکر پر مشتمل ہے

حصہ سوم میں ذی قعدہ ۷۱۲ھ تا ذی الحجہ ۷۱۳ھ کی ۱۵ مجالس کا بیان ہے۔

حصہ چہارم میں محرم ۷۱۴ھ تا رجب ۷۱۹ھ کی ۶۲ مجالس کا بیان ہے اور اسی طرح حصہ پنجم۔ شعبان ۷۱۹ھ تا رجب ۷۲۲ھ کی ۳۲ مجالس کے ذکر پر مشتمل ہے۔

یہ مجالس اور اُس کی گفتگوئیں حضرت نظام الدینؒ کی زندگی کے آخری چند سالوں کی ہیں۔ آپ کا انتقال ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو ہوا۔

یہ کتاب حقائق و معارف کا ایک خزانہ ہے اور تشنگانِ حق کے لئے ایک رہنما کتاب ہے۔

فوج :۔ بمعنی آدمیوں کا گروہ لیکن مجازی معنوں میں ایک تربیت یافتہ گروہ کو کہتے ہیں۔

قدیم زمانوں میں نہ کوئی باقاعدہ فوج تھی اور نہ فوجی تربیت کا نظام۔ دشمن کے مقابلے کے لئے مردوں کی ساری آبادی میدانِ جنگ میں آجاتی تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل مصر میں اور بعد میں بابل اور ایران میں باقاعدہ فوج کا پتہ چلتا ہے۔ سکندر اعظم کی فتوحات کے بعد باقاعدہ فوج کی ضرورت کا احساس ہوا اور بعد میں روم نے بھی مستقل فوج کا نظام قائم کیا [illegible] کے انتظامات تھے۔ نپولین کے وقت سے باقاعدہ اور مستقل فوج کا نظام قائم تھا۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں بھی کوئی باقاعدہ فوج کا نظام [illegible] لیکن بوقت ضرورت تمام صحت مند مسلمان دشمن کے مقابلے کے لئے نکل [illegible]۔ بعد میں مسلمان حکمرانوں نے باقاعدہ اور مستقل تنخواہ دار فوج کا انتظام قائم کیا۔

پُرانے وقتوں میں انگریزوں نے فوج کے لئے ایک الگ سا طریقہ اختیار کیا تھا۔ جن اُمرا کو جاگیریں دی جاتی تھیں اُن کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ ایک مقررہ تعداد میں پیدل یا سوار فوج کا مستقل انتظام کریں۔ اس طریقہ کو جاگیرداری طریقہ کہتے تھے اور انگلستان میں اس کو فیوڈل سسٹم کہتے تھے یہی طریقہ خاندانِ مغلیہ کے حکمران یا اُس سے پہلے کئی مسلمان حکمرانوں نے اختیار کیا۔ ایسے اُمرا یا جاگیرداروں کو پنج ہزاری یا دس ہزاری کہا جاتا ہے۔ جو پانچ ہزار یا دس ہزار افراد کو باقاعدہ فوج کی صورت میں ہر وقت تیار رکھتے تھے۔

موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے باقاعدہ تنخواہ دار فوج کا نظام قائم ہوگیا ہے اُس میں الگ الگ بری، بحری اور ہوائی فوجیں قائم کی جاتی ہیں۔ بعض ممالک میں ان تینوں افواج کو ایک مشترکہ کمان کنٹرول کرتی ہے اور بعض ممالک میں ہر فوج کے لئے الگ الگ کمان ہوتی ہے اور وہ اپنے اپنے معاملات کے لئے سربراہِ حکومت یا مملکت کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ اچھی کارکردگی کے لئے تینوں افواج کے مربوط نظام کو بہتر تسلیم کیا گیا ہے

فوجدار :۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت میں فوج یا پولیس کے اعلیٰ ترین عہدیدار کا لقب تھا۔ اس کے فرائض میں نظم و نسق قائم کرنا، باغیوں کو گرفتار کرنا اور سزا دلوانا اور بعض اوقات مالیہ جمع کرنے کے فرائض شامل تھے۔ فوجدار صوبائی حاکموں کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ لیکن انہیں دربارِ شاہی سے براہِ راست رابطہ کا اختیار ہوتا تھا۔

تیموریوں کے عہد میں فوجدار کا خطاب فیل خانوں کے ماتحت اہلکاروں کو بھی دیا جاتا تھا۔

فوری، احمد بن عبداللہ :۔ سولھویں صدی عیسوی میں سلطنتِ عثمانیہ کا ایک شاعر اور عالم۔ پیدائشی طور پر عیسائی تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ فوری ایک ممتاز عالم اور مدرس تھا اس نے مکہ معظمہ کا بھی سفر کیا تھا۔ ۹۶۰ھ/۱۵۵۲ء میں اُس نے سلطان سلیمان کی سرکردگی میں نخچوان کے خلاف مہم میں بھی حصہ لیا۔ وحش کا قاضی بھی رہا، جہاں اُس کا انتقال ذوالقعدہ ۹۷۸ھ/ اپریل ۱۵۷۱ء میں ہوا۔ ریاضی کے بیان کے مطابق فوری پہلا شاعر تھا جس نے مخمس اور مسدس لکھے تھے۔ اُس نے سلطان سلیمان کا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

فوق، منشی محمد دین۔ (فروری ۱۸۷۷ء - ۱۹۴۵ء)

کشمیر کے ایک نامور صحافی اور مؤرخ۔

منشی محمد دین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے اور ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں وفات پاگئے۔ منشی صاحب ایک نامور صحافی، ادیب، مؤرخ اور شاعر کی حیثیت سے اپنے پیچھے اتنے کارنامے چھوڑ گئے

Marfat.com

یہ کہ دنیا انھیں مدتوں نہیں بھلا سکتی۔ ان کی تصانیف ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

فوق صاحب نہایت سادہ مگر باوقار زندگی بسر کرتے تھے۔ سیر و سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ سفر میں گزرا۔ کشمیر ان کا وطن تھا۔

منشی محمد دین فوق

اس کے علاوہ انھوں نے وسط ہند، راجپوتانہ اور کانگڑہ کی ریاستوں مثلاً متھرا، ناگور، میہر، ریوال، سکیت، شملہ، لکھنؤ، دہلی، بھوپال، بنگال اور صوبہ سرحد کے متعدد سفر کیے۔

فوق صاحب بڑے محنتی تھے۔ شعر و شاعری کا شوق انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف خیال بہت کم رہتا تھا چنانچہ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا، سیالکوٹ میں جاکر پٹوار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے کسی اور ملازمت کی توقع پر جموں کا رخ کیا اور کئی ماہ کی لگاتار کوششوں سے محکمہ پرمٹ دچونگی میں سردار ہری سنگھ رئیس و ٹھیکیدار کے پاس ملازمت حاصل کی۔ جہاں قاضی فقیر علی عاقل کی ہم نشینی میسر آ جانے سے جموں میں چند دن خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔ جب چونگی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا تو بیکاری کے چند ماہ گھر تل میں گزار کر ۳۱ رجنوری ۱۸۹۷ء کو اپنے بھائی کے پاس لاہور چلے آئے۔ یہاں پیسہ اخبار کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مزید مشق کے لیے اخبار بھارت سیوک جالندھر کی نامہ نگاری بھی کرتے رہے۔ 'اخبار عام'، اور 'خالصہ بہادر' میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے مندرجہ ذیل چار اخبار خود مرتب کرتے رہے :-

(۱) 'کوہ نور' جو پنجاب کا سب سے پہلا اردو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کے آخری ایڈیٹر فوق تھے۔
(۲) 'گلزار ہند' جو اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔
(۳) 'آفتاب پنجاب' جو ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں بند ہوا۔
(۴) 'بہاول گزٹ' جو منشی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے "شالامار باغ کی سیر" ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ چونکہ ان دنوں ناولوں کی گرم بازاری تھی، آپ نے بھی 'انارکلی' 'عظم نصیب'، 'عصمت آرا'، اور 'اکبر' وغیرہ چند ناول لکھے، جو بہت مقبول ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۰۱ء میں آپ نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کرکے نومبر میں اپنا اخبار اور پریس جاری کیا۔ اس اخبار کا نام "پنجۂ فولاد" تھا۔ یہ اخبار ڈیڑھ ماہ تک پندرہ روزہ ہوگیا۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں ہفتہ وار ہوگیا۔ جولائی ۱۹۰۲ء میں اس کی اشاعت پانچسو تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۴ء میں سات سو اور رفتہ رفتہ اس کی اشاعت دسمبر ۱۹۰۵ء میں بارہ سو سے بڑھ گئی۔ اتنی اشاعت اس زمانے میں غیر معمولی سمجھی جاتی تھی کیونکہ اخبار بینی کا ذوق آجکل کی طرح اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ وسط ستمبر ۱۹۰۶ء میں بعض نا گزیر وجوہات کی بنا پر یہ اخبار بند ہوگیا۔

محمد دین فوق صاحب لالہ منشی کرم اگروال کے "اردو اخبار" میں بھی بطور مدیر کام کرتے رہے۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں چند ماہ کے لیے آپ نے سنبھالا تھا مگر دوسرے مشاغل کی مصروفیات کی بنا پر بعد میں اس سے علیحدہ ہو گئے۔ ۱۸۹۹ء میں میاں جان محمد گنائی نے 'کشمیر گزٹ' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی رہے۔ آخر گنائی کی وفات کے ساتھ ہی اس رسالے کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد محمد دین فوق نے ۱۹۰۶ء میں اپنا ماہوار 'کشمیری میگزین' جاری کیا جو غالباً پنجاب کا سب سے پہلا رسالہ تھا۔

۱۹۱۲ء میں کشمیری میگزین نے ماہوار سے ہفتہ وار 'اخبار کشمیری' کی شکل اختیار کی اور یہ اخبار عوام کی آواز بنا رہا۔ اخبار کشمیری کے ساتھ ساتھ فوق نے یکے بعد دیگرے 'طریقت'، اور 'نظام' دو ماہانہ رسالے جاری کیے جو تین چار برس تک شائع ہوتے رہے۔

فوق صاحب نے کشمیر کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، خواتین کشمیر، راہنمائے کشمیر، حکایات کشمیر، شباب کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر، اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے انھوں نے کشمیریوں کے شاندار کارناموں سے قوم کو روشناس کیا۔

فوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندی وضع کا پایہ اتنا بلند تھا، اگر وہ کشمیر کے چکر سے نکل کر اپنے محدود دائرہ عمل کو وسعت دیتے تو ہندوستان کے بہترین تاریخ نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں وطنی تاریخ کی تدوین کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا، کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا نعم البدل دستیاب ہونا مشکل تھا۔ پھر بھی جب ہم ان کی تصانیف "لاہور عہد مغلیہ میں" "تذکرہ علمائے لاہور" "یاد رفتگان"، (تذکرہ صوفیہ لاہور) 'حیات داتا گنج بخش'، 'تاریخ سیالکوٹ'، 'تذکرۃ الصالحین'، مہاراجہ رنجیت سنگھ'، " شالامار باغ " 'مآثر لاہور'، اور 'فاتح ملتان'، وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخ کے متعلق بھی ان کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ "تاریخ حریت اسلام" ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ انھوں نے ۵۹ کتابیں تصنیف کیں۔

فوق صاحب محض تخلص ہی کے گنہگار نہ تھے۔ بلکہ فطرتی شاعر تھے اور غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پہ حاوی، ان کے کلام کے دو مجموعے 'کلام فوق'، اور 'نغمۂ گلزار' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

فومنی، عبدالفتاح

:- سولھویں، سترھویں صدی کا ایک ایرانی مؤرخ۔

گیلان کے قدیم دارالخلافہ فومن میں سرکاری ملازمت کرتا رہا۔ ۱۰۱۸ - ۱۰۱۹ھ ۱۶۰۹ء - ۱۶۱۰ء میں گیلان کے وزیر بہزاد بیگ نے اُسے ناظم حسابات مقرر کیا۔ کئی دیگر وزیروں کے ساتھ بھی کام کرتا رہا۔ بعد میں عادل شاہ کے ہمراہ عراق چلا گیا۔

Marfat.com

اس نے فارسی میں گیلان کی تاریخ لکھی جس میں ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء سے لے کر ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء تک کے احوال درج ہیں۔

فہم :۔ دیکھیے 'عقل'

فہمی شیخ :۔ ارزنجان کے نقشبندی خالدی طریقے کے شیخ۔ ارزنجان میں پیر محمد وہبی نقشبندی خالدی سلسلے کے شیخ طریقت تھے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں پیر محمد وہبی کی وفات کے بعد مصطفیٰ فہمی آنکے خلیفہ بنے۔ مقامی تاجروں اور عہدے داروں کے علاوہ اعلیٰ فوجی افسروں سے بھی اُن کے تعلقات تھے۔ انہیں پارسائی اور زہد کی نمائش ناپسند تھی۔ ان کے گھر میں ہر روز نے نوازی کی محافل ذکر جمتی تھی۔ اپنے تیسرے حج کے موقع پر ۲۱ محرم ۱۲۹۹ھ/۱۴ دسمبر ۱۸۸۱ء میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا اور حضرت خدیجہ الکبریٰ کے مزار کی پائنتی دفن ہوئے۔

فہیم پاشا :۔ ولادت ۱۸۷۳ء میں استنبول میں ہوئی۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے رضاعی بھائی کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر اُس نے مکتبہ حربیہ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۴ء میں کپتان کے عہدے کے لیے نامزد ہوا۔ دو سال بعد ترقی کر کے "یاور شہریاری" بن گیا اور ۱۸۹۸ء میں اسے پاشا کا خطاب ملا۔ فہیم پاشا ایک طویل عرصہ تک سلطان عبدالحمید ثانی کی خفیہ پولیس کا سربراہ رہا۔ بعض وجوہات کی بنا پر ۱۷ فروری ۱۹۰۷ء کو اُسے برطرف کر کے برسہ کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد برسہ کے نزدیک ینی شہر میں عوام کے ایک مشتعل ہجوم نے اُسے قتل کر دیا۔

فہیم سلیمان افندی :۔ (۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء ــــ ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) ایک ترکی شاعر اور عالم، جو خوجہ فہیم کے نام سے بھی مشہور ہے قسطنطنیہ میں پیدا ہوا۔ دیوان ہمکسال اور محکمہ محصول میں ملازمت کرتا رہا اور آخرکار روم ایلی میں قائمقام کے عہدے پر رہا۔ ملازمت کے بعد قسطنطنیہ میں ایک مدرس کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ شاعری میں اُس نے زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ اُس کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اس نے فارسی شاعر صائب اصفہانی کی منتخب غزلوں کی ایک شرح .... "صائب شرحی" لکھی اور سفینۃ الشعراء کے نام سے تذکرۂ دولت شاہ کا ترکی میں ترجمہ کیا۔

فئ :۔ فاءَ یَفیءُ سے مصدر جسکے معنی ہیں واپس آنا، رجوع کرنا، پلٹنا اور لوٹنا ـــ ـــ ـــ اسلامی شریعت میں فئ اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ مخالفوں سے حاصل ہو خواہ اس طور پر کہ کفار چھوڑ کر چلے جائیں یا جزیہ کے طور پر ادا کریں یا رعب میں آکر جان بچانے کے لیے کچھ رقم یا چیزیں دے دیں۔ یہ سب فئ ہے۔ اس کو لغوی معنے کے لحاظ سے فئ اس لیے کہتے ہیں کہ کفار سے اللہ نے مسلمانوں کے پاس بھیجا ہے۔

فئ کے صرف کی بابت قرآن مجید میں اس طرح حکم آیا ہے: "جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے لے کر دیا ہے سو وہ اللہ اور رسول اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے دولتمندوں میں ہی دائر نہ رہے۔"

آیت میں چھ اشخاص ذکر ہوئے ہیں۔ اول اللہ جل جلالہ یعنی گو سب اسی کا ہے مگر یہاں اللہ کا مال کہنے سے یہ غرض ہے کہ یہ اللہ نے مخصوص حاجتوں کے لیے اپنا خزانہ بنا رکھا ہے۔ اس تقدیر پر یہ کہنا کہ لفظ اللہ تبرکاً مذکور ہے بے فائدہ بات ہے۔ دوم رسولؐ۔ سوم قرابت دار۔ چہارم یتامیٰ۔ پنجم مساکین۔ ششم مسافر۔ آیت میں یہ قید نہیں کہ قرابتدار اور آنحضرتؐ کے بعد جو آپ کا جانشین ہو اس کو بھی اپنے اقارب کے ساتھ حسن سلوک کرنا انسانی خاصہ ہے جس کا بار بقدر ضرورت شاہی خزانہ پر ہونا عین انصاف ہے اور یتیم و مسکین و ابن السبیل قومی ذوحاجت لوگ ہیں بخصوصاً شاہی مہمان جو سلطنت اور اس کے فوائد آئندہ پیدا کرنے میں مؤثر ہوں انکو مدد بھی اس شاہی خزانے سے ہونی چاہیئے۔ آیت میں یہ مذکور نہیں کہ ان چھٹوں کے حصے مساوی ہیں یا کم زیادہ کیونکہ ان چھٹوں کی طرف تقسیم نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ان اشخاص کو دینا مراد ہے جس کی کوئی تعداد معین قبل از وقت ہو نہیں سکتی اور آیت میں یہ چند ذوحاجت اس لیے مذکور ہیں کہ ان کی طرف زیادہ تر توجہ مبذول ہوتی ہے اور یہ اس کے منافی نہیں کہ اور کسی کام پر جو قومی اور سلطنت کے لیے مفید ہو صرف نہ کیا جائے۔ الحاصل فئ شاہی خزانے میں داخل ہو کر اشخاص مذکورہ بالا کے لیے ہے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ بنونضیر کے اموال جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو بطور مالِ غنیمت عطا کیے تھے اس قسم کے تھے جس پر مسلمانوں نے گھوڑے نہیں دوڑائے تھے۔ پس وہ مال خاص رسول اللہؐ کے لیے تھا۔ آپ اس میں سے سال بھر اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے تھے پھر جو بچتا تھا اس کو اللہ کی راہ میں اسلحہ اور گھوڑے تیار کرنے پر لگاتے تھے۔

فیروز آبادی ، (۷۲۹ھ/۱۳۲۹ء ــــ ۸۱۷ھ/۱۴۱۵ء) عربی لغت نویس۔ ابوالطاہر محمد بن یعقوب ابن محمد بن ابراہیم مجدالدین الشیرازی الشافعی۔ شیراز کے قریب ایک گاؤں کازرون میں پیدا ہوا۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ نے شیراز میں پڑھنا شروع کیا اور پھر تحصیل علم کے لیے واسط اور ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء میں بغداد گیا۔ ۱۳۴۹ء میں اس نے دمشق میں تقی الدین السبکی سے تعلیم پائی اور پھر اپنے استاد کے ہمراہ بیت المقدس گیا۔ وہاں دس سال تک درس و تدریس میں مصروف رہا۔ اس کے بعد اُس نے ایشیائے کوچک اور قاہرہ کی سیاحت کی ایک روایت کے مطابق وہ ۷۷۰ھ/۱۳۶۸ء میں مکہ مکرمہ گیا اور وہاں تقریباً چودہ سال تک رہا۔ اس کے بعد وہ بغداد اور ایران میں بھی رہا۔ سلطان تیمور نے جب ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں شیراز فتح کیا تو ابوالطاہر فیروز آبادی جنوبی عرب کے علاقے میں چلا گیا۔ ربیع الاول ۷۹۶ھ/ جنوری ۱۳۹۴ء میں سلطان ملک الاشرف کی دعوت پر تعز گیا وہاں چودہ ماہ تک رہا۔ ۶ ذوالحجہ ۷۹۷ھ/۲۲ ستمبر ۱۳۹۵ء کو یمن کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔ سلطان نے اپنی ایک لڑکی کی شادی اُس سے کر دی۔ ۸۰۲ھ/۱۴۰۰ء میں اس نے ایک بار پھر حج کا سفر کیا۔ حج کے بعد مکہ مکرمہ میں رہا۔ اسی کے قیام مکہ کے دوران ۸۰۳ھ/۱۴۰۱ء میں اُس کے خسر کا انتقال ہو گیا۔ رمضان ۸۰۵ھ/ اپریل ۱۴۰۳ء میں اس نے مکہ کا ایک اور سفر کیا لیکن جلد ہی زبید لوٹ آیا۔ جہاں ۲۰ شوال ۸۱۷ھ/ ۳ جنوری ۱۴۱۵ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی اہم اور مشہور تصنیف اس کی لغت 'القاموس' ہے، جسے اس نے اپنی کتاب (جو اب ضائع ہو چکی ہے) اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم

Marfat.com

(از ابن سیدہ) والعباب (از الصغانی) کے اقتباسات سے مرتب کیا تھا یہ لغت تمام عالم اسلام میں مستند مانی جاتی ہے۔ اس میں الفاظ کی کثیر تعداد موجود ہے۔ دوسری تصنیفات میں نزہتہ الاذہان (تاریخ اصفہان)، طبقات الحنفیہ، طبقات الشافعیہ، روضتہ الناظر (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سوانح) التحفتہ العنبریہ (سیرت رسول کریمؐ)، البُلغہ (ائمہ نحو ولغت کے سوانح) شامل ہیں۔

فیروز دہلوی۔ برصغیر کے عالم بے مثل، جو اپنی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے علمائے ہند میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا لقب شیخ شرف الدین ہے۔ انھوں نے شیخ نظام الدین اولیاء سے اخذ فیض کیا۔ دیوگیر میں ان کا انتقال ہوا۔

فیروز شاہ بن اسلام شاہ۔ خاندان سوری کا تیسرا بادشاہ۔
شیر شاہ سوری کا پوتا۔ اپنے باپ اسلام شاہ کی وفات کے بعد امرائے سلطنت کے مشورہ سے دس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اسلام شاہ کی بیگم بی بی بائی کا بھائی مبارز خان بھی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جس کا احساس خود اسلام شاہ کو اپنی زندگی میں بھی ہوا تھا۔ فیروز شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد مبارز خان سازش کے ذریعے اپنے بھانجے فیروز شاہ کو قتل کرواکر خود تخت نشین ہوا۔

فیروز شاہ تغلق۔ دیکھیے 'تغلق بنو' میں تیسرا بادشاہ۔

فیروز شاہ، جلال الدین خلجی۔ دیکھیے خلجی (دہلی) میں خاندان خلجی کا پہلا بادشاہ۔

فیصل اول۔ (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء ـــ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء) عراق کا بادشاہ۔
شریف حسین بن علی کے تیسرے لڑکے فیصل اوّل کی پیدائش طائف میں ہوئی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں اپنے والد کے ہمراہ استنبول گیا اور وہاں اٹھارہ سال گزارے۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں اپنی چچازاد بہن حزیمہ سے شادی کی۔ اپنے والد کے ساتھ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں مکہ مکرمہ واپس آیا اور ۱۳۳۱ تا ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۲ تا ۱۹۱۳ء میں العسیر کے ادریسی کے خلاف مہم میں حصہ لیا۔ اُس کے بعد عثمانی پارلیمنٹ کا رکن رہا۔ ترکی حکومت نے ۱۹۱۵ء میں شام کے عرب حریت پسندوں کی تحریک کو سختی سے کچل دیا تو ۱۹۰۶ء میں فیصل بھی ترکی کے خلاف عربوں کی بغاوت میں شریک ہوگیا اور اور دو سال تک شریف حسین کی باغی عرب افواج کی کمان کرتا رہا۔ ۱۹۱۸ء میں اُس نے شام میں عربوں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن فرانسیسیوں کی مزاحمت سے اُس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔
جولائی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں فرانسیسیوں نے اُسے شام سے نکال دیا، لیکن اس وقت انگریزوں نے اس کی مدد کی۔ اگست ۱۹۲۱ء میں عراق نمائندگان نے اُسے بغداد کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔ آئندہ بارہ سال میں فیصل نے عراقی مملکت کے قیام اور استحکام میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے انگریزوں کے مطالبات اور مقامی آبادی کے درمیان توازن برقرار رکھا اور ملک کے نظم ونسق کو چلانے میں اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ عراق ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں مجلس اقوام کا رکن بنا۔ ستمبر ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء میں فیصل کا انتقال سوئٹزرلینڈ میں ہوا تو غازی اُس کا جانشین ہوا۔

فیصل ثانی۔ (۱۹۳۵ء ـــ ۱۹۵۸ء)
شاہ غازی کا فرزند اور فیصل اول کا یہ پوتا بغداد میں پیدا ہوا۔ ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء میں اپنے والد کے ایک حادثہ میں انتقال کے وقت امیر عبدالالٰہ کی سرپرستی میں عراق کے تخت وتاج کا مالک قرار پایا۔ اُس وقت اس کی عمر صرف چار سال تھی۔ ابتدائی تعلیم وتربیت ایک انگریز معلم نے کی۔ اعلیٰ تعلیم ہیرو سے حاصل کی۔ مئی ۱۹۵۳ء میں اُس نے باقاعدہ طور پر شاہانہ فرائض کو ادا کرنا شروع کیا۔ اپنے مختصر دور حکومت میں اُس نے عراق کے استحکام کیلئے کوششیں جاری رکھیں اس دوران اُسے اپنے سرپرست عبدالالٰہ اور معروف سیاستدان نوری السعید کی رہنمائی حاصل تھی۔ عوام میں پسند کیا جاتا تھا۔ ایک ترکی نژاد مصری شہزادی سے اس کی منگنی ہو چکی تھی کہ اچانک چند باغیوں نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ خود فیصل اُس کے چچا اور دوسرے اقارب کو ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کو قتل کر دیا گیا اور اس طرح سے عراق میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔

فیصل، شاہ۔ (۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء ـــ ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء)
فیصل بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن الفیصل آل سعود، اپنے والد کے دوسرے بیٹے تھے، اپنے والد کی روضۃ النہا کے معرکہ میں فتح کے موقع پر صفر ۱۳۲۴ھ/اپریل ۱۹۰۶ء میں ریاض میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام آپ کے دادا فیصل بن ترکی کے نام پر رکھا گیا۔ فیصل بن ترکی سعودی سلطنت کے قیام پر منتج ہونے والی تحریک کے بانی رہنماؤں میں سے تھے۔ والدہ کی طرف سے شاہ فیصل کا سلسلہ نسب شیخ محمد بن عبدالوہاب سے جاملتا ہے۔ آپ کے نانا الشیخ عبداللہ بن عبداللطیف، شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پوتے اور نجد کے سب سے بڑے عالم تھے۔
دینی علوم کی تحصیل آپ نے اپنے نانا سے ہی کی۔ آپ کی والدہ امیرہ طرفہ کا انتقال آپ کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد ہوگیا تھا۔ ابتدائی تعلیم ان نامور اساتذہ سے حاصل کی جو علم وادب میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ آپ کی پرورش خالص دینی ماحول میں ہوئی، جس کے ساتھ ساتھ آپ کو سیاسی، جنگی اور معاشرتی تربیت بھی بہم آتی رہی۔ آپ نے ۱۳ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ شہ سواری کے اسرار و رموز سے بھی آگاہی حاصل کی۔ ۱۳۳۶ھ میں ۱۳ سال کی عمر میں والد کے ہمراہ غزوہ یاطب میں بھی شریک ہوئے۔ ۱۳۳۹ھ میں حائل کے معرکہ میں شہزادہ فیصل نے اعلیٰ جنگی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ یہ محاصرہ کوئی تین ماہ تک جاری رہا۔ جنگ عظیم اوّل کے ختم ہو جانے کے بعد ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء میں آپ کے والد نے آپکو یورپ روانہ کیا تاکہ وہاں رہ کر سیاسی تربیت حاصل کریں۔ اسی دوران آپ ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے برطانیہ بھی گئے۔ تاکہ عمائدین برطانیہ سے جنگ میں برطانیہ کی فتح کے بعد استقلال عرب کے لئے مذاکرات کریں۔ برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کرزن کے نامناسب رویہ کی وجہ سے آپ ناراض ہوکر پیرس چلے گئے۔ عمائدین برطانیہ کی معذرت پر پیرس سے دوبارہ برطانیہ آگئے۔ برطانیہ کے شاہ جارج اور ملکہ میری سے ملاقات کی۔ برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کرزن سے حجاز اور نجد کے معاملات پر گفتگو کی۔ آپ نے برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں دارالامراء اور دارالعوام کا معائنہ کیا۔

Marfat.com

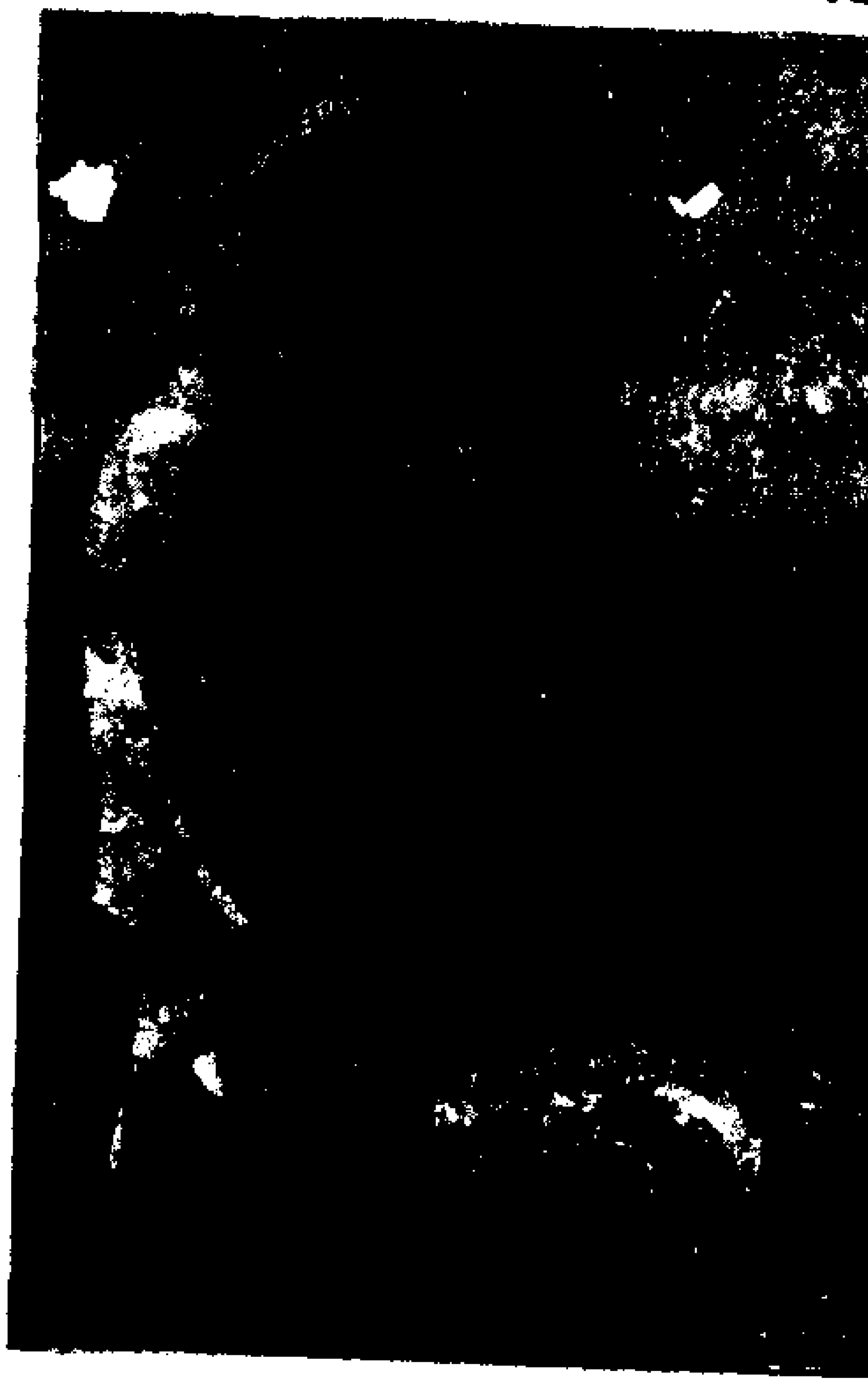

شاہ فیصل بن عبدالعزیز

کیمبرج یونیورسٹی بھی گئے ۔ لندن کے دورہ کے اختتام پر آپ نے دوبارہ پیرس (فرانس) کا دورہ فرانس کی حکومت کی دعوت پر کیا ۔ اس کے بعد بلجیکا کا دورہ کیا ۔ یورپ کے دورہ سے واپسی کے بعد نجدی افواج کے عسیر کے معرکہ میں لشکر کے سپہ سالار تھے ۔ اس معرکہ میں عظیم الشان کامیابی کے بعد ۲۱ رجادی الثانی ۱۳۴۱ھ میں ریاض واپسی پر عوام نے آپ کو عظیم سپوت کا خطاب دیا ۔

۱۳۴۴ھ میں اپنے والد کے ہمراہ جدہ کے محاصرہ میں شریک تھے ۶ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ کو جدہ کی فتح کے بعد آپ کے والد عبدالعزیز کو حجاز' نجد اور ملحقہ علاقوں کا سلطان تسلیم کر لیا گیا اور شہزادہ فیصل کو ۲۸ رجمادی الثانی ۱۳۴۴ھ/ ۱۳ رفروری ۱۹۲۶ء کو حجاز کا گورنر مقرر کیا گیا ۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال کی تھی ۔ ۱۳ راگست ۱۹۲۶ء کو حکومت حجاز کا نائب السلطنت اور شوریٰ کا رکن بنایا گیا ۔ ۲۰ رمئی ۱۹۲۷ء کو آپ نے برطانیہ کے ساتھ معاہدہ جدہ کیا ۔ اس معاہدہ کے مطابق برطانیہ نے سعودی مملکت کو مکمل طور پر تسلیم کر لیا ۔ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء میں وزیر خارجہ مقرر کئے گئے ۔ ۱۹۳۲ء میں ہی سعودی مملکت کے دوسرے ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے والے ایک خیرسگالی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے آپ نے اٹلی' سوئٹزرلینڈ' فرانس' برطانیہ' ہالینڈ' جرمنی' روس' ترکی' ایران' عراق اور کویت کا دورہ کیا ۔ یہ دورہ تین ماہ تک رہا ۔ روس میں لینن' سٹالن اور مولوٹوف سے ملاقات کی ۔ روس کے ان رہنماؤں سے روس میں مقیم مسلمانوں کے حقوق اور دوسرے مسائل پر گفتگو کی ۔

غیر ملکی دورے سے واپسی پر ۱۳۵۲ھ میں عسیر اور تہامہ میں متعین سعودی افواج کے سالار اعلیٰ بنا کر ایک جنگی مہم پر بھیجے گئے ۔ سب سے پہلے آپ جیزان پہنچے ۔ میدی' حدیدہ' بیت فقیہ' زیارت اور قحیط کو فتح کیا ۔ زانیقیوں' لحیہ اور مور قبائل کو اپنا مطیع بنایا ۔ ادریسی کے عسیر اور تہامہ پر غارت گری کے اس موقع پر امام یمن نے عسیر اور تہامہ پر حملہ کر کے نجران کو زیر کر لیا ۔ شاہ فیصل کا حملہ بھی اسی طرف جاری تھا ۔ جب آپ ہدنہ پہنچے تو سرداران عرب نے درمیان میں آکر صلح کی بات چیت شروع کی ۔ ۶ رصفر ۱۳۵۴ھ کو ایک صلح کا معاہدہ طے پا گیا ۔ اس معاہدے کی رو سے یمن نے عسیر اور تہامہ کو سعودی مملکت کا حصہ تسلیم کر لیا ۔ فروری ۱۹۳۹ء میں مؤتمر فلسطین لندن میں سعودی وفد کی قیادت کی ۔ ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء میں شہزادہ فیصل اپنے بھائی خالد بن عبدالعزیز کے ہمراہ امریکی صدر روزویلٹ کی دعوت پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دورہ پر گئے ۔ واپسی پر لندن میں جارج ششم سے ملاقات کی ۔

۲۵ را پریل ۱۹۴۵ء کو سان فرانسسکو میں اقوام متحدہ کے تاسیسی اجلاس میں سعودی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔ ۱۹۴۶ء میں اپنے بھائی امیر منصور مرحوم کے ہمراہ شام سے فرانسیسیوں کے انخلاء کے مسئلہ پر ہونے والی کانفرنس میں شریک ہوئے ۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں نیویارک میں اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں سعودی وفد کی قیادت کی ۔ ۱۹۴۸ء میں ہی پیرس میں اقوام متحدہ کی جمعیت عامہ کے اجلاس میں شریک ہوئے ۔ ۱۹۵۰ء (۱۳۷۰ھ) میں آپ نے انگلستان کے دورہ میں برطانوی وزیر خارجہ سے اپنے ملک بحرین اور کویت کی سمندری حدود کے تعین کرنے کے مسئلہ پر گفتگو کی ۔

۹ رنومبر ۱۹۵۳ء (۲ رربیع الاول ۱۳۷۳ھ) میں سلطان عبدالعزیز کے انتقال پر سعود بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو فیصل کو ولی عہد مقرر کیا گیا ۔ ۱۰ راگست ۱۹۵۴ء (۱۶ رذی الحجہ ۱۳۷۳ھ) کو شاہ سعود نے علماء اور امرا کا متفقہ فیصلہ قبول کرتے ہوئے مجلس وزارت کی قیادت اپنے بھائی فیصل کو سپرد کر دی یعنی آپ سعودی عرب کے وزیر اعظم ہو گئے ۔

۱۹۵۵ء (۱۳۷۴ھ) میں بندونگ کانفرنس میں سعودی وفد کی قیادت کی شاہ سعود اکثر بیمار رہتے تھے اور بعض دوسری وجوہات کی وجہ سے امور سلطنت کی طرف کم توجہ دیتے تھے ۔ اس وجہ سے سعودی خاندان کے افراد ان کے خلاف ہو گئے ۔ ۲۲ رمارچ ۱۹۵۸ء کو مملکت کے تمام اختیارات' مجلس وزارت نے فیصل بن عبدالعزیز کو منتقل کر دیے ۔

اب آپ [illegible] داخلہ' خارجہ اور مالیات اور دفاع کی وزارتوں کے سربراہ بھی ہو گئے ۔ آپ کے بھائی سعود بن عبدالعزیز صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی طویل علالت کی وجہ سے امور مملکت کے ادا کرنے سے معذور ہو گئے تو ۲ رنومبر ۱۹۶۴ء کو مجلس وزارت اور مجلس شوریٰ کی قرار دادوں' علماء کے شرعی فتویٰ اور افراد خاندان کی تجویز پر آپ یعنی فیصل بن عبدالعزیز کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا ۔ آپ نے اپنے برادر اصغر خالد بن عبدالعزیز کو اپنا ولی عہد مقرر کیا ۔ سابق شاہ سعود نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ۔ اب فیصل بن عبدالعزیز' سعودی مملکت کے تیسرے با اختیار سربراہ تھے ۔ شاہ فیصل نے اپنے دس سالہ دور حکومت میں سعودی مملکت کی کایا پلٹ دی اور اپنے تدبر' اعتدال پسندی' سلامت روی اور محنت و لگن سے ملک کو بام عروج پر پہنچا دیا ۔ آپ نہایت ہی منکسر المزاج شخصیت تھے ۔ عام سا لباس پہنتے ۔ رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو کر مستقل تہجد کی نماز ادا کرتے تھے ۔ محل کی مسجد میں باجماعت نماز فجر ادا کرتے ۔ اس سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت بھی مستقلاً کرتے تھے ۔ دن کی پانچ نمازیں مسجد میں باجماعت ادا کرتے ۔ روزانہ ایک ترتیب اور ٹائم ٹیبل سے کام کرتے تھے وہ اپنے دفتر میں تین اوقات میں کام کرتے تھے ۔ چاشت سے ظہر تک' عصر سے مغرب تک' اور عشا سے رات گئے تک اس دوران وہ ملاقاتیوں' دوسری حکومتوں کے سفراء' سعودی افسران' وزراء اور معاونین سے بھی ملتے تھے ۔

Marfat.com

شاہ فیصل کا دورِ حکمرانی عرب کی تاریخ میں اہم دور ہے۔ ان کے عہد میں تیل کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ انہوں نے سعودی عرب کو جہاں آج سے تیس چالیس سال پہلے بھوک، افلاس، لوٹ مار اور جہالت کا دور دورہ تھا خوشحال مملکت بنا دیا۔ انہوں نے حاجیوں کی سہولت کیلئے بہترین اور اعلیٰ انتظام کئے اور حرمین الشریفین کی توسیع و تزئین پر کروڑہا روپیہ خرچ کیا۔ عرب میں پانی کی قلت کو دور کرنے کے لئے آب رسانی کے متعدد منصوبے بنائے اور سمندری پانی کو صاف کرنے کے کئی پلانٹ لگوائے۔ زراعت اور باغبانی کے فروغ کے لئے ماڈل فارم بنوائے۔ مواصلات کی ترقی کے لئے سڑکوں کے جال بچھا دیئے اور نئی بستیاں تعمیر کروائیں۔ جدہ اور ینبوع کی بندرگاہوں کی توسیع اور اصلاح کے علاوہ مشرق اور مغربی ساحل پر کئی بندرگاہیں بنانے کے منصوبے تیار کروائے۔ معدنیات کی دریافت اور برآمد کا کام سرگرمی سے شروع ہوا۔ ان کے دورِ حکومت میں بنیادی صنعتوں کے علاوہ بھاری صنعتیں بھی قائم کی گئیں۔ انہوں نے ملکی دفاع اور استحکام پر خصوصی توجہ دی۔ سعودی افواج کو نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ ہوائی اڈے اور فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں اور نوجوانوں کو فوجی تربیت کے لئے پاکستان، برطانیہ اور امریکہ بھیجا گیا۔ ملک میں مروجہ قدیم مصری نظامِ تعلیم کو بدل کر جدید طرز پر اسلامی نظامِ تعلیم اختیار کیا گیا۔ ابتدائی درجہ سے کر یونیورسٹی تک تعلیم مفت کر دی گئی۔ دینی تعلیم کے نصاب میں اصلاح کی گئی۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ قائم کی گئی۔ آن کی تجاویز پر جدہ میں، ریاض میں اعلیٰ دینی اور عصری تعلیم کے لئے جامعات (یونیورسٹیاں) قائم کی گئیں۔ ان یونیورسٹیوں میں غیر ملکی طلباء بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان سب طلباء کے قیام، طعام اور تعلیم کے مصارف سعودی حکومت برداشت کرتی ہے۔ ملک میں سائنسی اور فنی تعلیم کے لئے اعلیٰ درس گاہیں قائم کی گئیں۔ ظہران میں پیٹرولیم اور معدنیات کی یونیورسٹی بنائی گئی۔ شاہ فیصل کے عہد سے پہلے لڑکیوں کے لئے علیحدہ تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے الگ درس گاہیں تعمیر کروائیں۔ مختلف شہروں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کالج بنائے گئے۔ عوام کو طبی سہولتوں کی فراہمی کے لئے مختلف شہروں اور قصبات میں ہسپتال تعمیر کروائے۔ ٹرانسپورٹ اور ذرائع آمدورفت کیلئے سہولتیں دی گئیں۔

شاہ فیصل شروع سے ہی مسلم ممالک کے اتحاد اور یک جہتی کے داعی تھے اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی میں بھرپور جدوجہد کی۔ مسلم ممالک کے کثرت سے دورے کئے اور غیر مسلم ممالک کے بھی دورے کئے تاکہ مسلم حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ تختِ سلطنت سنبھالنے کے بعد وہ کسی لمحہ چین سے نہیں بیٹھے۔ ان کے مختلف ممالک کے دوروں سے اس بات سے بخوبی آگاہی ہوسکتی ہے کہ شاہ فیصل امتِ مسلمہ کے درد میں ہر وقت تڑپتے رہتے تھے۔

۱۹۶۴ء ۵ ستمبر کو آپ نے اسکندریہ میں ہونے والی عرب سربراہوں کی کانفرنس میں سعودی وفد کی قیادت کی اور ۵ اکتوبر کو قاہرہ میں ہونے والی غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۶۵ء اپریل میں رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت شاہ فیصل نے کی اور اپنے خطبے میں تضامنِ اسلامی کی دعوت دی۔ اور مسلمانوں کو اسلام کے نام پر اتحاد کرنے پر زور دیا۔

۱۳ ستمبر کو آپ عرب سربراہوں کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ جو دارالبیضا میں منعقد ہوئی۔ عالم اسلام کے باہمی اختلافات ختم کرانے اور اس کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۶۵ء میں شاہ فیصل نے اسلامی ملکوں کا وسیع دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور اس کا آغاز انہوں نے ایران سے کیا۔ چنانچہ وہ ۸ دسمبر کو ایران پہنچے۔ دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے باہمی مذاکرات کے بعد اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت پر زور دیا۔ اور مشترکہ اعلان میں شاہ فیصل نے تضامنِ اسلامی کی تجویز کی پوری تائید کی۔

۱۹۶۶ء ۱۷ جنوری کو شاہ فیصل اردن پہنچے۔ اردن کے شاہ حسین سے تضامنِ اسلامی کے بارے میں بات چیت کی۔ اور شاہ حسین نے ان کے اس اتحادِ عالم اسلامی کے منصوبے کی بھرپور حمایت کی۔ ۱۲ فروری کو مرحوم شاہ اس سلسلے میں سوڈان گئے اور سوڈان کے اس وقت کے صدر اسمٰعیل ازہری سے اس موضوع پر بات چیت کی۔ انہوں نے بھی آپ کے اس پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ پھر اسی سلسلے میں آپ ۱۹ اپریل کو پاکستان کے دورے پر گئے اور پاکستان کے صدر ایوب خان سے بات چیت کے بعد مشترکہ اعلان میں دونوں رہنماؤں نے عالم اسلامی کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔

۲۶ اگست کو آپ ترکیہ پہنچے۔ ترک رہنماؤں نے بھی عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ شاہ نے وہاں بھی یہ اعلان کیا کہ ہماری اصلی قوت دین اسلام کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے میں ہے۔ ۴ ستمبر کو مراکش کے دورے پر گئے۔ اور اتحادِ عالم اسلامی کے مسئلہ پر شاہ حسن ثانی کی تائید حاصل کی۔ ۹ ستمبر کو تیونس پہنچے اور اس موقع پر صدر حبیب بورقیبہ نے تضامنِ اسلامی کی تجویز کی حمایت کی۔ ۱۵ ستمبر کو افریقہ کے ایک ملک مالی پہنچے۔ مالی کے صدر سے مذاکرات کے بعد مشترکہ اعلان کے ذریعہ دونوں رہنماؤں نے اتحادِ اسلامی کے لئے متحدہ کوشش کرنے کا اعلان کیا۔

اس طرح ۱۹۶۶ء کا یہ سال اس کوشش میں گزرا۔ کہ اسلامی ممالک کو زیادہ سے زیادہ قریب کر کے ان کی قوتوں کو یکجا کیا جائے۔ شاہ کے تدبر اور فراست کا اثر تھا کہ جن ملکوں کا دورہ کیا وہاں کے سربراہوں نے اتحادِ اسلامی کے لئے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

۱۹۶۷ء کئی یورپی ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد آپ ۴ جون یعنی عرب اسرائیل جنگ سے ایک دن پہلے سعودی عرب پہنچے۔ یورپ کے اسی دورے کے دوران شاہ فیصل نے عرب ملکوں کو آگاہ کیا تھا کہ اسرائیل ان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لئے انہیں اس سے پہلے ہی حملہ کر دینا چاہیئے۔ بعد کے واقعات نے اُن کی اس پیشن گوئی کو درست ثابت کیا۔

۱۰ جون کو شاہ نے اسرائیلی جارحیت کی وجہ سے امریکہ اور برطانیہ پر تیل کی بندش کا اعلان کیا۔ ۲۹ اگست کو خرطوم میں ہونے والی عرب سربراہوں کی کانفرنس میں شاہ فیصل نے یہ مجاہدانہ اعلان کیا کہ اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ۲۰ ستمبر کو شاہ صومالیہ کے دورے پر پہنچے اور اس وقت کے صدر عبدالرشید شیر مارکر سے اتحاد عالم اسلامی کے موضوع پر بات چیت کی۔ اور دونوں رہنماؤں نے اس پر مکمل اتفاق کا اظہار کیا۔

۱۹۶۸ء اپریل میں آپ امیر کویت کی دعوت پر کویت گئے اور دونوں رہنماؤں نے باہمی تعاون کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔

۱۹۶۹ء ۲۲ دسمبر کو پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے آپ رباط پہنچے۔ جس سے مسلم ممالک میں باہمی تعاون اور مفاہمت میں بہت اضافہ ہوا

Marfat.com

۵ار ستمبر کو قاہرہ پہنچے اور جمال عبدالناصر سے پانچویں عرب سربراہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے بات چیت کی۔ ۲۰ر دسمبر کو رباط کی پانچویں عرب کانفرنس میں یہ مومنانہ اعلان کیا کہ جب بھی جنگ ہوگی۔ اس کے لئے سعودی عرب کا پورا میزانیہ وقف ہوگا۔ اور رمضان کی جنگ میں انہوں نے ایک سچے مومن کی طرح اپنا یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔

۱۹۷۰ء ۷ر جون کو ملائیشیا کے سرکاری دورے پر پہنچے اور اسلامی ملکوں کے جنرل سیکرٹری کے لئے تنکو عبدالرحمٰن کا نام پیش کیا۔ ۱۰ر جون کو وہاں سے انڈونیشیا چلے گئے اور صدر سوہارتو سے اسلامی ملکوں کے مابین تعاون کی ضرورت کے بارے میں بات چیت کی ۱۳ر جون کو افغانستان کا دورہ کیا۔ اور ۱۵ر جون کو الجزائر کے صدر بومدین سے مذاکرات کئے۔ اور ۲۱ر جون کو جنیوا میں اقوام متحدہ کے اس وقت کے جنرل سیکرٹری او تھانٹ سے ملاقات کی۔ اور ۲۲ر ستمبر کو قاہرہ میں ہونے والی اس عرب سربراہ کانفرنس میں شرکت کی جو اردن اور فدائین کے درمیان اختلافات ختم کرنے کے لئے بلائی گئی تھی۔

۱۹۷۱ء ۱۶ر مارچ کو آپ مشرق وسطیٰ کے دورے پر روانہ ہوئے راستے میں تہران تھوڑی دیر کے لئے رُکے اور شاہ ایران سے مختصر ملاقات کی۔ ۱۷ر مارچ کو تائیوان روانہ ہو گئے۔ ۲۰ر مارچ کو جاپان کے دورے پر ٹوکیو روانہ ہوتے۔ ۲۷ر مئی کو صدر نکسن کی دعوت پر امریکہ پہنچے۔ ۳۱ر مئی کو فرانس کے دورے پر پیرس گئے اور جون میں واپس جدہ پہنچے۔

۱۹ر جون کو صدر سادات کی دعوت پر مصر کا ایک ہفتہ کا دورہ کیا۔ ۲۸ر جولائی کو اردن کے شاہ سے ملاقات کی اور اس کے بعد اردن اور فلسطینی فدائین میں اختلافات ختم کرانے کے لئے ثالثی کے فرائض بھی انجام دیتے۔ ۲۷ر ستمبر کو لبنان کے صدر کی دعوت پر بیروت گئے۔ اور صدر فرنجی سے کامیاب مذاکرات کئے۔

۵ر دسمبر کو شاہ فیصل مرحوم نے پاکستان کے خلاف بھارتی جارحیت کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ اس جارحیت کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی وحدت کو پارہ پارہ کیا جائے۔ اور اسلامی عقیدے کی بنیادوں کو کمزور کیا جاتے۔

۱۹۷۲ء کے آخر میں آپ نے کئی افریقی ممالک کا دورہ کیا اور انھیں مسلمانوں کے خلاف صہیونی سازشوں سے آگاہ کیا۔ اس دوران آپ نے یوگنڈا، چاڈ، سینیگال، موریطانیہ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں آپ نے جہاں اتحاد عالم اسلامی کی ضرورت پر زور دیا وہاں افریقی ممالک کو اسرائیل سے ہر قسم کے تعلقات پر نظر ثانی کے لئے کہا۔ اس دورے کا نتیجہ چند دنوں کے بعد سامنے آگیا۔ جب اکثر افریقی ممالک نے اسرائیل سے ہر قسم کے تعلقات ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اس وقت سے کر اب تک سعودی عرب افریقی ممالک کی ہر میدان میں مدد کر رہا ہے۔

۱۹۷۴ء فروری میں آپ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور آئے جس میں ۳۷ اسلامی ملکوں نے شرکت کی۔ اکتوبر میں شاہ فیصل نے رباط میں ہونے والی ساتویں عرب سربراہ کانفرنس میں شرکت کی جس میں اسرائیل کے خلاف عربوں کا متحدہ موقف اختیار کیا گیا۔ اس کانفرنس کے بعد آپ الجزائر میں قومی دن کی تقریبات میں شرکت کے لئے وہاں گئے۔ اس کے علاوہ گزشتہ سالوں میں مختلف اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے آپ سے ملاقات کے لئے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ آپ کی شہادت سے چند دن پہلے جن سربراہوں نے آپ سے ملاقات کی ان میں موریطانیہ کے صدر، مالی کے صدر، لیبیا کے صدر قذافی اور فلسطین کی تحریک آزادی کے سربراہ یاسر عرفات شامل ہیں۔

شاہ فیصل اسلام کی حقانیت اسلامی نظام حیات کی برتری اسلامی ملکوں میں اتحاد و اخوت کی ضرورت اور اسلامی تہذیب اور اقدار کی ضرورت سے ایمان رکھتے تھے۔ عربوں کی سیاسی سربلندی کے لئے وہ اسلامی اقدار کے فروغ اور اتحاد بین المسلمین کو ضروری قرار دیتے تھے۔ مسلم ممالک میں اقتصادیات دین کے فروغ کے لئے اسلامی بنک کا قیام ان کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کی وجہ سے اسلامی دنیا کا مرکز ثقل ریاض میں منتقل ہو گیا تھا اور ہر مشکل وقت میں ان سے مشورہ کرنا تمام مسلم حکمران ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے فلسطینی فدائین اور اردن کے شاہ حسین میں مصالحت ہوئی۔ عراق اور ایران کے قدیم تنازعات ان کی کوششوں سے ختم ہوئے۔ فلپائن، بھارت، ایتھوپیا اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں محصور مسلم اقلیتوں کو ان کی خصوصی توجہ اور ہمدردی حاصل تھی۔ شاہ فیصل پاکستان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ انہوں نے ہر مصیبت میں اور مشکل وقت میں پاکستان کی بھرپور مدد کی۔ ان کی زود پاشیوں سے عرب و عجم دونوں مستفید ہوتے تھے۔ انہیں اشاعتِ اسلام سے خصوصی دلچسپی تھی۔ یورپ اور افریقہ میں کئی مساجد، اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں کی تعمیر اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ شاہ فیصل کی کوششوں سے اسلامی ممالک میں احیائے دین کا جذبہ اور اتحاد بین المسلمین کی ضرورت کا احساس ہوا اور مختلف ممالک میں تحریکی انداز میں کام شروع ہوا۔ ایسی ہر تحریک کو شاہ فیصل کی سرپرستی حاصل تھی۔ شاہ فیصل کی ان تھک محنت سے جزیرہ نمائے عرب کو عالمی سیاست میں اہم مقام حاصل ہوا۔

قومیت، وطنیت اور لادینیت کی تاریکیوں میں روشنی کا یہ مینارۂ نور ۱۱ر ربیع الاوّل ۱۳۹۵ھ/۲۵ر مارچ ۱۹۷۵ء کو ایک ظالم کے ہاتھوں بجھا دیا گیا۔ اُن کے بھتیجے شہزادہ فیصل بن ساعد نے بھرے دربار میں ان پر کئی گولیاں چلائیں اور خادم الحرمین شاہ فیصل زخموں کی تاب نہ لاکر ریاض ہسپتال میں چل بسے اس حادثۂ جانکاہ پر ہر درد مند مسلمان کی آنکھ نم تھی۔ دنیا کے ہر حصے میں اس حادثہ پر سوگ منایا گیا۔ شاہ فیصل شہید کو ریاض میں ہی دفن کیا گیا۔ شاہ فیصل مرحوم کی ۸ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہیں۔ بیٹوں کے نام عبداللہ، محمد، خالد، عبدالرحمان، سعود، سعد، بندر اور ترکی ہیں۔ ان میں سعود کو موجودہ شاہ خالد نے سعودی عرب کا وزیر مملکت برائے امور خارجہ مقرر کیا ہے۔ خالد بن فیصل ایک صوبے کا گورنر ہے اور باقی مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں اور سعودی مملکت کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا عبداللہ سعودی عرب کا معروف تاجر ہے شاہ فیصل شہید کے بھائی خالد بن عبدالعزیز ان کے جانشین ہیں اُنکے دوسرے بھائی شہزادہ فہد بن عبدالعزیز شاہ خالد کے ولی عہد اور وزیر اعظم ہیں۔ یہ دونوں بھائی اپنے شہید بھائی کے مشن کو اُسی تندہی سے پورا کرنے میں منہمک ہیں۔

فیض

فیض۔ فیض کے معنی کثرت کے ہیں۔ عربی محاورہ کے مطابق اَعْطَاہُ غَیْضاً مِنْ فَیْضٍ (اُسے زیادہ مال میں سے تھوڑا سا دیا) سیلان اور صدور کے معنی میں بھی آتا ہے اسی معنی کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم فلاسفہ نے بڑی عجیب بحثیں کی ہیں جن کے مطالعہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور خالص فلسفیانہ محشر آرائیاں ہیں۔ جن کو فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن رشد کی کتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

بچوں کا شکسپیئر

دنیا کے عظیم شاعر اور ڈراما نگار ولیم شکسپیئر کے بیس ۲۰ ڈراموں پر مبنی کہانیاں جو چارلس لیمب نے بچوں کے لیے انگریزی میں لکھی تھیں اور دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ اب اردو میں پروفیسر عبدالسلام فاروقی نے خوبصورتی سے ترجمہ کی ہیں۔ ہر ماہ دو کہانیاں شائع کی جائیں گی۔

دو کہانیاں چھپ چکی ہیں

(۱)- بھول بھلیاں

(۲)- وینس کا سوداگر

فی کتاب: ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ شاہین - چوک اردو بازار، لاہور

شاہکار جریدی کتاب (۷۸)

جمعہ ۲ جون ۱۹۷۸ء

چارلی چپلن کی آپ بیتی

موجودہ صدی کے مشہور ترین مزاحیہ اداکار چارلی چپلن کی خود نوشت سوانح عمری۔ بے پناہ غربت، وافلاس اور گمنامی سے لے کر دولت و امارت اور شہرت کے زمانہ عروج تک۔
با تصویر دلچسپ کہانی

تلخیص و ترجمہ

رانا احسان اللہ خان

قیمت:

تین روپے

Marfat.com

اسلاف کی بیش بہا دولت
نسلِ جدید کے سینوں میں

اُردو ادب کا کلاسیکی سرمایہ قدیم و عظیم
محفوظ و منتقل کرنے کی جرأت مندانہ ادبی تحریک

طلسمِ ہوشرُبا

گزشتہ سو سال سے برعظیم پاک و ہند کا بچہ بچہ "طلسمِ ہوشرُبا" کے نام سے واقف ہے، لیکن ایم اے کرنے والے طلباء نے بھی اس کی صورت تک نہیں دیکھی، پڑھنا تو کجا۔ اسے پہلی بار ٹھیک سو سال پیشتر اُردو ادب کے عظیم محسن منشی نولکشور نے شائع کیا تھا۔

دوسری بار اب "مکتبہ شاہکار" جیسا بے مایہ ادارہ شائع کر رہا ہے، جس نے اُردو کی تمام کلاسیکی نثری داستانوں کو جدید زیب و زیبائش کے ساتھ "حیاتِ ثانی" دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ "طلسمِ ہوشرُبا کی آٹھ ضخیم جلدوں کو سیّد قاسم محمود نے جدید رواں دواں نثر میں لفظ بہ لفظ، اس خوبی سے دوبارہ لکھا ہے کہ داستان کا کلاسیکی مزاج بھی قائم رہا ہے — پیرابندی اور اوقاف نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق پوری عبارت کو از سرِ نَو آراستہ پیراستہ کیا ہے۔

اُردو کی عظیم ترین، دلچسپ ترین، ضخیم ترین داستانِ مسلسل

ماہوار قسطوں میں

مکمل ▫ بلا تلخیص ▫ بہ نثرِ جدید ▫ بصورتِ ڈائجسٹ

المعروف بہ

ہوشرُبا ڈائجسٹ

۵۰ قسطوں پر مشتمل، تقریباً بارہ ہزار صفحات پر مبنی، ہمارے اسلاف کا یہ گم شدہ ادبی سرمایہ، آئندہ چھ برسوں میں کم از کم ایک لاکھ گھرانوں میں، ایک لاکھ لائبریریوں کی صورت میں، ابدالاباد تک محفوظ و مامون رہے گا۔

دلچسپ سے دلچسپ کہانی سے بھی زیادہ دلچسپ۔ غیر ملکی کہانیوں کے بے ہنگم ہجوم میں اپنے ہی ادب کا جگمگاتا ہوا، ترشا ہوا ہیرا کہ جسے فنا نہیں۔ وہ گمنامی اور نایابی کے ہزار پردوں کو چاک کر کے مستقبل میں ادبی تخلیق کے چراغوں کو روشنی دینے نکل آیا ہے۔

Marfat.com

اسلاف کی بیش بہا دولت
نسلِ جدید کے سینوں میں

اُردو ادب کا کلاسیکی سرمایہ قدیم و عظیم
محفوظ و منتقل کرنے کی جرأت مندانہ ادبی تحریک

طلسم ہوشرُبا

گزشتہ سو سال سے برعظیم پاک و ہند کا بچّہ بچّہ "طلسم ہوشرُبا" کے نام سے واقف ہے، لیکن ایم اے کرنے والے طلبا نے بھی اس کی صورت تک نہیں دیکھی، پڑھنا تو کُجا۔ اسے پہلی بار ٹھیک سو سال پیشتر اُردو ادب کے عظیم محسن منشی نولکشور نے شائع کیا تھا۔

دوسری بار اب "مکتبہ شاہکار" جیسا بے مایہ ادارہ شائع کر رہا ہے، جس نے اُردو کی تمام کلاسیکی نثری داستانوں کو جدید زیب و زیبائش کے ساتھ "حیاتِ ثانی" دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ "طلسم ہوشرُبا" کی آٹھ ضخیم جلدوں کو سیّد قاسم محمود نے جدید رواں دواں نثر میں لفظ بہ لفظ، اس خوبی سے دوبارہ لکھا ہے کہ داستان کا کلاسیکی مزاج بھی قائم رہا ہے — پیرابندی اور اوقاف نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق پوری عبارت کو از سرِ نَو آراستہ پیراستہ کیا ہے۔

اُردو کی عظیم ترین، دلچسپ ترین، ضخیم ترین داستانِ مسلسل

ماہوار قسطوں میں

مکمل ▫ بلا تلخیص ▫ بہ نثرِ جدید ▫ بصورتِ ڈائجسٹ

المعروف بہ

ہوشرُبا ڈائجسٹ

۵۰ قسطوں پر مشتمل، تقریباً بارہ ہزار صفحات پر مبنی، ہمارے اسلاف کا یہ گم شدہ ادبی سرمایہ، آئندہ چھ برسوں میں کم از کم ایک لاکھ گھرانوں میں، ایک لاکھ لائبریریوں کی صورت میں، ابدالآباد تک محفوظ و مامون رہے گا۔

دلچسپ سے دلچسپ کہانی سے بھی زیادہ دلچسپ۔ غیر ملکی کہانیوں کے بے ہنگم ہجوم میں اپنے ہی ادب کا جگمگاتا ہوا، ترشا ہوا ہیرا کہ جسے فنا نہیں۔ وہ گمنامی اور نایابی کے ہزار پردوں کو چاک کر کے مستقبل میں ادبی تخلیق کے چراغوں کو روشنی دینے نکل آیا ہے۔

Marfat.com

16891

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط وار

(۲)

ہر پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے

Marfat.com